"خورش اسی حال میں جو ہر بھی ہے آزادگی ہے"

یہ مصرع بھی کلیاتِ حسرت میں صفحہ ۲۲۴ پر موجود ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا محمد علی کا ایک شعر تمام تر حسبِ حال ہے اور صورتِ حالات کا تاریخ بلیغ ؎

کرج تک ہے ایک کنعانی سے شہرت مصر کی
… فیض سے حسرت کے ہوگا نام فیض آباد کا

تقلیدِ سنتِ یوسفی" اور "ایک کنعانی سے شہرت مصر کی" ایک ہی بات کے دو مختلف روپ ہیں۔ خط کے اس حصّے سے بھی صاف واضح ہے کہ مکتوب الیہ حسرت موہانی کے سوا اور کوئی نہیں۔ ان قرائن کے بعد خط کو پڑھا جائے تو اس میں اور بھی قطعی شواہد دستیاب ہوں گے۔ لکھتے ہیں :-

"اچھا اب رخصت ہوتا ہوں، تمہارے دونوں دیوان پڑھ چکا اور نہایت غور سے پڑھے ارتقائے سخن ظاہر ہے تم میری غزلیں منگواتے ہو اچھا بھیج دوں گا مگر بھائی تم شاعر تھے میں شاعر نہ تھا، البتہ عنایت ایزدی نے تمہیں تین دیوانوں والا بنا دیا تو اس قسم کی عنایت سے مجھ سے بھی تین چار غزلیں لکھوا دیں، پہلے بھی تک بندی کر لیتا تھا۔ مگر کاغذ کے پھولوں میں خوشبو نہیں ہوتی اب اگر کچھ بوباس آنے لگی ہے سو بقول تمہارے :

"ترے غم کو نہ دے کیونکر دعا دل"

اس وقت نظر بندی کی پہلی غزل لکھ بھیجتا ہوں :-

سوچنے کی باتیں یہ ہیں "تم آلِ رسول ہو، تقلیدِ سنتِ یوسفی سے مشرف ہو چکے ہو" "بقول تمہارے، خود لکھ چکے ہو" "تم تو پہلے ہی لکھ چکے ہو……." ایسے جملے کیا اس امر کی نشاندہی نہیں کر رہے ہیں کہ یہ خط قطعی طور پر مولانا حسرت موہانی ہی کو لکھا گیا تھا؟ پھر حسرت کے دواوین کے سنہ تصنیف دیکھئے۔

پہلا دیوان ۱۹۰۳ء تا ۱۹۱۲ء ــــ، دوسرا ۱۹۱۲ تا ۱۹۱۶ اور تیسرا ۱۹۱۶ تا ۱۹۱۷ء کے کلام پر مشتمل ہے۔ بڑی ہی قوی شہادت ہے۔ کیونکہ مولانا نے خط ۲۶ اپریل ۱۹۱۷ء کو لکھا تھا۔ حسرت کے تینوں دیوان ۱۹۱۷ء تک کے کلام پر مشتمل ہیں۔ تمام اشعار اور مصرعے انہی کے کلیات میں ہیں اور انہی کی تصنیف ہیں۔

اکبر الملک کے متعلق اتنا معلوم ہوا ہے کہ وہ حیدرآباد دکن میں کوتوال شہر تھے۔ کوئی ادیب نہ تھے۔ شاعر تو قطعی طور پر نہ تھے۔ پھر مولانا محمد علی جیسے حکومتِ وقت کے باغی کی کسی سرکاری ملازم سے خط و کتابت سمجھ میں نہیں آتی۔ مولانا کی حریت پسندی کے پیشِ نظر یہ بات وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی کہ وہ کسی سرکاری آدمی سے دوستانہ روابط رکھیں گے۔ ان کی حالت تو یہ تھی کہ ؎

ہے یہاں نام عشق کا لینا
اپنے پیچھے بلا لگا لینا

ظاہر ہے کہ رئیس الاحرار سے وہی شخص دوستی رکھ سکتا تھا جو حکومت سے ٹکر لینے کو ہر وقت آمادہ اور سر بکف رہے۔

امید ہے کہ ان گزارشات کے پیشِ نظر حق اسی کو پہنچنا چاہیے جو حقدار ہے۔ اور زیر بحث خط کو ایک غیر شاعر، غیر ادیب، غیر حریت پرست شخص کی بجائے ایک شاعر، ایک ادیب، ایک صاحبِ ذوق، ایک زندہ دل انسان ہی سے منسوب کرنا چاہئے جو تمام تر پیکرِ حریت تھا ــــ مولانا حسرت موہانی ؒ

★

خطاطی کا ایک نمونہ

تصویری صفحات میں صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کے ورودِ مکہ مکرمہ کی چند تصاویر اس شمارہ میں بھی پیش کی جا رہی ہیں جن سے عوام مملکت کے دلی جذبات ان کے تپاک اور خیر سگالی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اس تصویری صفحہ پر کلمہ طیبہ بھی تبریک و تحریم اور خطاطی کے ایک نادر نمونہ کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ جو فن کی ندرت کاری سے قطع نظر اس ضمن میں ایک علامتی حیثیت لئے ہوئے ہے۔ کلمہ کی کتابت کا مابہ الامتیاز خطاطی و نقاشی کا نہایت لطیف و بدیع امتزاج ہے۔ اسمائے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کتابت جو حاشیہ میں بطور زینت دیے گئے ہیں نمونۂ فن کو اور بھی ممتاز بنا دیتی ہے۔ یہ لطیف فن ایک باکمال خطاط، حافظ غلام رسول یار محمد صاحب کے حسنِ قلم کا شاہکار ہے جو انہوں نے ہمیں ناسک (ہند) سے بطور خاص عنایت کرکے مرحمت فرمایا۔ (ادارہ)

بابِ حرم پر

چوں عشقِ حرم باشد سہل است بیاباں ہا

صدرِ پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے حال ہی میں سعودی عرب اور متحدہ عرب جمہوریہ کا دورہ کیا، جس میں انہیں عمرہ کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ بابِ حرم کے سامنے اکابر بلدیہ مکہ مکرمہ واہالیٔ حرم شریف کا ایک اجتماع بھی ہوا تاکہ پاکستان کے اس مہمانِ عزیز اور زعیمِ شہیر کو اہلاً و سہلاً کہا جاسکے۔

اس موقع پر مکہ مکرمہ کی مشہور دینی درسگاہ "مدرسۂ صولتیہ" کے ناظم، مولانا محمد سلیم نے ساکنانِ حرم کی طرف سے جو تقریرِ استقبالیہ فرمائی، یہاں ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہے۔

مولانا نے اُن خیالات و جذبات کا ہی اظہار کیا ہے جو خود صدرِ محترم کو شروع ہی سے اس قدر عزیز رہے ہیں اور فی الحقیقت ان کے جہانِ اسلام کے حالیہ دورہ کا اصل محرک بنے ہیں یعنی روابط عالمِ اسلام کو از سرِ نو استوار کرنا، مسلمانوں کی دینی اخوت و یکجہتی کے رشتے پیدا کرنا اور ان کی مشترک ثقافتی اقدار کی دریافتِ نو۔ تاکہ ہر جگہ کے مسلمان باہمی تعارف، اخوت اور احیائے روابط کے باعث ایک دوسرے کے نزدیک تر ہوتے چلے جائیں اور ان میں وہ استحکام و قوت پیدا ہو سکے جو حقیقی معنوں میں "بُنیانِ مرصوص" ثابت ہو۔

عالی مقام صدرِ محترم جمہوریت اسلامیہ پاکستان!

آج کا یہ پُرمسرت دن ساکنانِ حرم محترم کے لئے ہمیشہ یاد رہنے والا دن ہے۔ اس لئے کہ خلوص و محبت سے وہ مکہ معظمہ کے دروازہ پر اپنی سب سے بڑی اسلامی جمہوریت پاکستان کے عظیم المرتبت صدر کا استقبال کر رہے ہیں۔ یہ نقوش صفحاتِ دل سے مٹنے والے نہیں۔

یہ کعبۂ مقدس کی پاک سرزمین، یہ ولادت گاہِ رحمۃ للعالمین، یہ اسلام کا روحانی مرکز جہاں سے آفتابِ ہدایت طلوع ہوا اور جہاں سے فاتحِ اوّل محمد بن قاسم پیغامِ توحید لے کر بحرِ عرب اور بحرِ ہند کے اس پار پہنچا۔ جس کے نتیجہ میں آج سے تیرہ سال قبل دوبارہ سب سے بڑی اسلامی ریاست وجود میں آئی — ایمانی اور روحانی عظمتوں کے اس لبریز ماحول میں آپ کی آمد پر ساکنانِ حرم محترم کی طرف سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

صدرِ محترم: ہم سب کو اس کا یقین ہے کہ ایک جانباز خادمِ اسلام کی حیثیت سے آپ نے مسلمانوں کی جو عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں اور ایک کلمہ گو مسلمان کی حیثیت سے آپ کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت اور فلاح و بہبود کے جو بے لوث جذبات موجزن ہیں ان کے پیشِ نظر اس مقدس ماحول میں آپکی تشریف آوری یقیناً ایک انعامِ الٰہی ہے جس کو اگر دنیاوی زندگی میں انسانی خوش بختی اور تکمیلِ سعادت کہا جائے تو بیجا نہیں۔

صدرِ محترم! ابھی چند لمحات کے بعد آپ خدائے ذوالجلال والاکرام کے واجب الاحترام گھر کعبہ معظمہ کے سامنے اور اسکے دروازے پر زندگی میں پہلی بار کھڑے ہوں گے۔ ایک سچے مسلمان کیلئے یہ خوش قسمتی کی معراج ہے کیونکہ آخرت کی ہر نعمت اور دنیا کا ہر راج اسی معراج میں پنہاں ہے۔ اور رب العالمین سے قرب و تعلق ہی سرمایہ تخت و تاج ہے۔

یہی در ہے جہاں شاہانِ دنیا سر جھکاتے ہیں سوالی بن کے آتے ہیں مرادیں لے کے جاتے ہیں

وذالِکَ فضلُ اللّٰہِ یؤتیہ من یشاء۔

صدرِ محترم! دلوں کی مسرت، جذبات کا یہ جوش اور اسلامی اخوت کے یہ شاندار اور دلنشیں مظاہرے یقیناً ان مضبوط اور مستحکم روابط و تعلقات کا اثر ہیں جو مملکتِ سعودیہ اور جمہوریت پاکستان کے درمیان قائم ہیں جغرافیائی اعتبار سے پاکستان اور مملکت کے تعلقات کی عمر گو تیرہ سال سے زیادہ نہیں، مگر ہمہ گیر اسلامی رشتۂ اخوت و محبت کی عمر تیرہ سو سال ہے۔ الحمدللہ! قیامِ پاکستان سے اب تک دونوں ملکوں اور دونوں حکومتوں کے باہمی روابط انتہائی خلوص اور باہمی احترام و محبت کے ساتھ دو حقیقی بھائیوں کی طرح نہ صرف قائم بلکہ روز افزوں ترقی پر ہیں۔ اس کا سب سے روشن ثبوت خود جناب والا کی تشریف آوری ہے جس پر میں جلالۃ الملک سعود المعظم و ولیعہد محبوب امیر فیصل کی جانب سے، نیز اہلِ حرم اور ان تمام پاکستانی بھائیوں کی طرف سے جو جلالۃ الملک سعود کے زیرِ سایہ عاطفت ان کی عادل حکومت کے زیرِ امن و احسان مقیم و آباد ہیں اور مکہ معظمہ کے لارڈ میئر عالیجناب شیخ عبداللہ عریف کی طرف سے آپ کے قدم رنجہ فرمانے پر ہدیۂ تہنیت و مبارکباد کو سب کی دلی دعاؤں کے ساتھ یہ کہتے ہوئے ختم کرتا ہوں "ادخلوھا بسلام آمنین"۔

(مکہ معظمہ، ۱۴ جمادی الاوّل ۱۳۸۰ھ مطابق [illegible])

اِس کنارے سے اُس کنارے تک

عاصمہ حسین

اِس دیار سے اُس دیار تک - اِس کنارے سے اُس کنارے تک
تیرا طیارۂ تیز رفتار سرگرمِ پرواز ہے
ایک سیارۂ نغمہ گر، ایک شاہیں نما ساز ہے
تختِ شعلہ کار، طشتِ شعلہ بار - سر سے پشت تک ایک شعلہ زار
جوہری دور کا شعشعہ ریز کوندا لپکتا ہوا
ایک جوہر بھڑکتا ہوا، ایک پیکر بھبکتا ہوا
یہ خدائے رزم، ناخدائے بزم - انتہائے شوق، انتہائے عزم
شرق سے غرب اور غرب سے شرق تک اسکی جولانیاں
قاف تا قاف تکتی ہیں شام و سحر جس کو حیرانیاں
صبحِ ناصبور، شامِ ناصبور - برقِ بے قرار، دور دور دور
جیسے محور بہ محور ہوں گردش میں برقِ رواں
جس طرح ابر تا ابر ہوں جست زن دمبدم بجلیاں
یہ جہانِ شوق، جذبے نے گراں - پا بہ گِل کہاں پیکرِ جواں؟
خطۂ پاک سے تا بہ مصر و عرب یہ سفر ہی سفر
یہ جزیرے جزیرے اڑان اور گلگشت رومانی بحر و بر
خونِ تیز رو، روحِ گرم جوش - جانِ شعلہ پوش، تندِ شعلہ نوش
ہے انہی سے وہ ہستی کے سینے میں ہنگامۂ ہاؤ ہو
ہے یہی جوہرِ آتشیں جس سے گردش میں ہے زندگی کا سبو
دل سے تا بہ دل، تا بہ ہر بشر - مدعائے شوق، مقصدِ سفر
ایک ہوں ایک تا اس دیارِ کہن، اس زمیں کے مکیں
اپنا گہوارۂ خاک، یہ مسکنِ زندگی غیر انسانیت کچھ نہیں
خاکِ پاک سے اک نئی نمود - تازہ کار ہے بزمِ ہست و بود
اک نئی شعلہ زن ذات سے ایک پیغام ہے نزد و دور
اک عظیم انقلاب، اک تپاں زندگی، اک توانا شعور

جوہری دور کا آہنگ

سید فیضی
ضیاء الحسن موسوی

قران السعدین: سید فیضی

"جوہری دور کا آہنگ بن جائیے"۔ یہ مشورہ ہے جو صدر پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں، نے اپنے ایک حالیہ دورہ کی تقریر میں دیا، خصوصاً اقوام مشرق کو جنہیں موجودہ زمانہ کی برق سے تیز تر رفتار کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی شدید ضرورت ہے۔ صدر پاکستان پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس حقیقت کا ادراک بھی کیا اور اعلان بھی کہ موجودہ تیز رفتاری کے زمانہ میں ہمیں ایسا ہی طوفانی آہنگ پیدا کئے بغیر چارہ نہیں۔ اس برق رفتاری کی حیرت انگیز مثال ہمیں اس وقت نظر آئی جبکہ ہمارے ہر دلعزیز صدر نے "پاک جمہوریہ اسپیشل" میں مغربی و مشرقی پاکستان کا تاریخی دورہ کیا تاکہ وہ جمہوریتیں بھی اپنے جیسا ذوقِ عمل پیدا کریں۔ یہ سرگرمی قومی پیمانے پر تھی۔ ایک اہم تجربہ، ایک تیاری۔ ایک عالمگیر مشن پر روانگی کی تمہید۔ تاکہ جو سرگرمی پہلے قومی و مقامی تھی، اب بین الاقوامی اور عالمگیر بن جائے۔ چنانچہ یہ جوہری دور کا آہنگ پیدا کرنے ہی کا نتیجہ ہے کہ صدر پاکستان ابھی مغرب میں مصروف تگ و تاز تھے تو ابھی مشرق میں محبت و خیر سگالی کے دورہ پر روانہ ہیں۔

صدر ایوب کا دورۂ عرب و مصر پاکستان کی حالیہ تاریخ کا سب سے اہم واقعہ ہی نہیں بلکہ جوہری دور کی توانائی کا ایک ایسا آئینہ ثابت ہوا ہے جس کی برد قت افادیت سے مجالِ انکار نہیں۔ آج اگر ایک طرف عصرِ جدید کے گوناگوں تقاضے دامن کش ہیں تو دوسری جانب زمان و مکاں کی تسخیر بھی انسانی دسترس سے باہر نہیں۔ آدم خاکی کے عروج سے انجم کا سہم جانا اس لحاظ سے قابلِ مواخذہ نہیں ہو سکتا کیونکہ ٹوٹے ہوئے تاروں کا مہِ کامل بن کر چمکنا بھی آج ممکنات میں سے ہے۔ زندگی کی اس تگ و دو میں جن قوموں نے بھی حصہ لیا ہے، وہ حالات کی برق رفتاری کے مقابل مردانہ وار لگی رہی ہیں۔ مصائب و شدائد کو برداشت کیا ہے۔ لیکن عزم و حوصلہ پر آنچ تک نہیں آنے دی۔ اس طرح یہ قومیں نہیں بلکہ دنیا کی باعزت طاقتوں کی شکل میں اپنے ماحول کی دہکتی ہوئی بھٹی سے کندن بن کر نکلی ہیں اور عرصۂ حیات میں اپنی جولانیوں کے لئے ایک قابلِ رشک جگہ ڈھونڈنے میں کامیاب ثابت ہوئی ہیں۔ جوہری توانائی کے دور سے ان کی ہم آہنگی نے جہاں منازلِ ترقی کو ان سے قریب تر کر دیا ہے وہاں بیرونی دنیا کے تجارب سے بھی مستفید ہونے کا موقع دیا ہے تاکہ اپنے آپ کو ایک خاص نہج پر ڈال کر زندہ قوموں کے دوش بدوش جگہ حاصل کی جائے۔ اس طرح انہیں اپنی ہر اس خامی کو دور کرنے کا موقع ملتا رہا جس سے نہ تو انسانیت داغدار ہو سکتی تھی اور نہ شرفِ آدم پر کوئی دھبہ آ سکتا تھا۔

اخوت اور دوستی کا جذبہ نیا نہیں۔ صدیوں سے انسان اسی زنجیر میں جکڑا چلا آیا ہے۔ باہمی تعلقات کی استواری سے اُسے مفر نہیں اور وہ مجبور ہے کہ پہلے اپنے ماحول کو سازگار بنا لینے کے بعد اپنے گردوپیش پر نظر ڈالے، فکر و نظر میں وسعتیں پیدا کرے اور صرف ذاتی مفاد کے حصول پر ہی نظریں نہ جمائے بلکہ اپنی ذات سے دوسروں کے لئے بھی سرچشمۂ فیض ثابت ہو۔ یہی انسانیت کا منتہائے کمال ہے اور ہمیں یہ کہنے میں باک نہیں کہ صدرِ پاکستان نے اس حقیقت کو آج سے بہت پہلے سمجھ لیا تھا۔ مشرقی و مغربی پاکستان میں ان کا طوفانی دورہ اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ خلوص کے ساتھ عزم راسخ ہو تو کوئی طاقت راستے میں مزاحم نہیں ہو سکتی۔ انسان ہر مشکل پر غالب آ سکتا ہے اور کسی نہ کسی طریقے سے اپنے مافی الضمیر کو دوسروں پر ظاہر کر کے رہتا ہے اس میں اس کی اپنی بھلائی بھی مضمر ہوتی ہے اور دوسروں کی فلاح کے راستے بھی متعین ہوتے رہتے ہیں۔

یہی وہ نظریہ تھا جس کے تحت صدر ایوب نے مسلسل چودہ روز مملکتِ پاکستان سے باہر رہ کر سعودی عرب اور متحدہ عرب جمہوریہ کے

سربراہوں سے ملاقات کی۔ اُن کے مسائل کو سمجھا، اپنے مسائل کو سمجھایا، عالمی صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کیا اور اس طرح دونوں ملکوں میں برادرانہ اور دوستانہ تعلقات مستحکم کرنے کے لئے خوشگوار فضائیں تیار ہوتی رہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ صدرِ پاکستان نے عرب عوام کے دلوں پر اپنے اس دورے کے جو نقوش چھوڑے ہیں وہ کبھی مٹ نہیں سکتے۔ پاکستان کی انقلابی حکومت کا یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جو کسی اور سربراہِ مملکت سے شاید آج تک سرانجام نہیں پاسکا۔ جدّہ کے ہوائی اڈے پر اترتے ہی اپنے استقبال کا منظر دیکھ کر اور اس کے ساتھ ہی حرم قدس میں حاضری دینے کے نیازمندانہ احساس سے مغلوب ہو کر صدر کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے تھے۔ یہ کیا چیز تھی جس نے ایک فوجی جرنیل کو اتنا رقیق القلب بنادیا؟ یہ اس کا قلبِ سلیم تھا اور عالمِ عرب سے اس کا فطری و ازلی رشتہ۔ اسی رشتے کی وجہ سے اسلام کی تیرہ سو سالہ تاریخ درخشاں دستاویز بنکر آج بھی دنیا کی نگاہوں میں جگمگا رہی ہے یوں تو پاکستان نے سعودی عرب کے معاملات و مسائل میں ہمیشہ برادرانہ دلچسپی لی ہے اور سعودی عرب نے بھی نہ صرف اپنے موجودہ حکمراں کے زمانے میں بلکہ ان کے والدِ محترم جلالۃ الملک سلطان عبدالعزیز کے عہد میں بھی پاکستان کے لئے ہمیشہ دوستی اور اخوت کا مظاہرہ کیا ہے لیکن سچی اور حقیقی بہی خواہی کا وجود صرف صدر ایوب کے حالیہ دورے ہی سے عمل میں آیا ہے۔ دونوں سربراہ اپنی ملاقاتوں کے دوران خانگی اور بین الاقوامی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مسلمان ممالک کے درمیان مفاہمت اور تعاون ناگزیر ہے۔ اسلامی نصب العین کا تقاضا بھی یہی ہے تاکہ یگانگت کے احساسات میں روز بروز اضافہ ہوتا رہے۔ صدر ایوب اور سلطان سعود کے سیاسی مذاکرات تین روز تک جاری رہے اور ان تمام مسائل کی افہام و تفہیم جو ہر دو ممالک کو درپیش ہیں ایک نہایت خوشگوار اور دوستانہ ماحول میں صورت پذیر ہوتی رہی۔

ظاہر ہے کہ صدر کے اس دورے نے تعلقاتِ اخوت کو اور زیادہ مستحکم بنادیا ہوگا اور اس کا نتیجہ دونوں سربراہوں کے اس کلی اتفاق میں ظاہر ہوا ہے کہ اپنے عوام کی فلاح اور مقاصدِ اسلامی کے فروغ کا طریقہ صرف یہ ہے کہ اسلامی ممالک ایک دوسرے سے بے حد قریب ہوں۔ سیاسی روابط کی حمایت اور استحکام کے لئے تجارتی اور اقتصادی تعلقات کی مضبوطی پر بھی زور دیا گیا۔ فکرِ اسلامی کے تحت روحانی قدروں کا احیاء

صدرِ پاکستان کا وہ محبوب نظریہ تھا جس کی ترویج و اشاعت کو ہر قدم انہوں نے ملحوظ رکھا اور واضح الفاظ میں مشہور برطانوی مؤرخ ٹائن بی کے اس خیال کو دہرایا کہ اسلام ایک بار پھر مغرب کے مقابلے میں ڈٹ چکا ہے لیکن اس بار اس کے دشمنوں کی تعداد صلیبی جنگوں کے نازک دور سے بھی زیادہ ہے۔ مقابلہ سخت ہے لیکن اسلام کو بہرحال غالب آنا ہے، اور اس کے لئے یہ لازم ہے کہ اسلامی ممالک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر عصرِ حاضر کے چیلنج کو قبول کریں اور اپنے زندہ رہنے کا ثبوت دیں۔

اس سلسلہ میں چند باتیں خاص طور پر قابلِ لحاظ ہیں۔ اسلامی ممالک کا یہ اختلاط اب پہلے کی طرح منفی و بے نتیجہ اختلاط نہیں ہے بلکہ مثبت و نتیجہ خیز اختلاط ہے۔ جب کہ وہ مجبور و مقہور، مغرب سے مرعوب ممالک نہیں بلکہ آزاد ممالک ہیں۔ اور خالصتاً جدید ماحول میں ایک دوسرے کے ساتھ نئے نئے عزائم و مقاصد لئے ہوئے مل رہے ہیں۔ وہ موجودہ تخریب کے زمانے میں پھر اسلام کا عَلم بلند کر رہے ہیں جو اقوامِ عالم کی نجات کے لئے نسخۂ کیمیا اور دوائے جملہ علّت ہائے ما کی حیثیت رکھتا ہے۔ اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں کے مقابلے میں اسلامی اشتراکیت جس میں تمام خرابیوں کا حل موجود ہے۔

اور پھر مصر نہ وہ پرانا مصر ہے نہ پاکستان پرانا پاکستان۔ دونوں اسلامی افکارِ جدیدہ سے مالامال ہوچکے ہیں۔ پاکستان نے حکیم ملت علامہ اقبالؒ کے تخیلات سے، اسلام کو عجمی، یونانی اور دیگر غیر اسلامی اثرات سے نجات دلاکر اس طرح تجدید کی ہے کہ وہ اپنی حقیقی معنوں میں حرکی وارتقاء پذیر روح کے ساتھ سرگرمِ کار ہو رہا ہے۔ اقبالؒ کے یہ حیات افروز تصورات تمام دنیائے اسلام بلکہ دنیائے مغرب میں بھی دور دور تک پھیل چکے ہیں، اور مصر و عرب تو ان سے بالخصوص سرشار ہیں۔ اقبال کے فکرِ فلک رس کی معجز آفریں نوعیت موجودہ جوہری دور کے لئے خاص طور پر موزوں ہے۔ اور اس کی بصیرت افروز روشنی عالم اسلام میں سینہ چاکانِ چمن کا دیگر سینہ چاکوں سے آملنا خاص معنی رکھتا ہے۔ صدرِ پاکستان نے ربط و تعلق کا یہ سلسلہ پیدا کر کے ایک نئے دور کی بنیاد رکھ دی ہے۔

صدر ایوب کے اس دورے کا اہم ترین مقصد بھی یہی تھا کہ نہ صرف سعودی عرب بلکہ متحدہ عرب جمہوریہ کو بھی اپنا ہمنوا بنالیا جائے۔ آج یہ دونوں ممالک پاکستان سے ہم آغوش ہیں۔ اس ہم آغوشی سے فکر و نظر کی وہ تمام خلفشار بھی دور ہو گیا ہو گا جو اس سے قبل دونوں کے درمیان [illegible]

کے بیچ بو رہی تھیں۔ عرب جمہوریہ کے صدر اور مصری عوام کے خلوص و محبت سے متاثر ہو کر صدر ایوب نے واشگاف الفاظ میں اعلان کر دیا کہ "غیر ملکی اقتدار کی چھوڑی ہوئی لعنتوں کے سلسلے میں پاکستان اور متحدہ عرب جمہوریہ کو ایک ہی جیسے مسائل کا سامنا ہے۔ اس نقصان کی تلافی کرنے اور ترقی یافتہ قوموں کی صف میں شامل ہونے کے لئے تیز قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم نے وقت کے ساتھ چلنے میں کوتاہی کی تو آزادی سے ہاتھ دھو کر پھر غلامی کی زنجیریں پہننا پڑیں گی"! صدر کے یہ الفاظ اسلامی جدوجہد کا وہ آئینہ ہیں جس سے ایک سچے مسلمان کے کردار کی عکاسی ہوتی ہے۔ وہ امن چاہتے ہیں اور امن پرور فضاؤں میں آگے بڑھنے کے آرزومند ہیں۔ موجودہ عالمی کشیدگی اور اعصابی جنگیں انہیں پسند نہیں کیونکہ انکی موجودگی میں ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اور بین الاقوامی بد اعتمادی کا سلسلہ بڑھتا رہتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس سلسلے کو ختم کیا جائے تاکہ اسلحہ کی دوڑ کا یہ بھیانک تماشہ خود بخود کالعدم ہو کر رہ جائے جو انسانیت کو ایک تباہ کن ایٹمی جنگ کے دہانے کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہا ہے۔

دیکھا جائے تو اسلام کا ہی وہ مقدس رشتہ ہے جس نے دنیا بھر کے مسلمان کو حبل اللہ میں جکڑ رکھا ہے اور یہ ایسا رشتہ ہے جس میں کبھی لچک نہیں پیدا ہو سکتی۔ قاہرہ یونیورسٹی میں صدر ایوب نے اسی ایک رشتے کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے کہا تھا: "جب تک اسلام کا رشتہ باقی ہے مسلمانوں کے مصائب پر خواہ وہ الجزائر، فلسطین، کشمیر یا کسی اور جگہ ہوں، تمام دنیائے اسلام میں ان کا درد محسوس کیا جائے گا۔ جدید دور کی ضروریات کی روشنی میں ایک دوسرے کی قومی پالیسیوں اور بین الاقوامی معاہدوں میں مداخلت کئے بغیر اسلام کے مطالبے کے مطالعہ اور اس عمل کے لئے اسلامی ممالک میں قریبی تعلقات قائم ہونے چاہئیں۔ پاکستان کا وجود نظریۂ اسلام کی بنیاد پر عمل میں آیا تھا لہٰذا ہم چاہتے ہیں کہ مادی ترقی و خوشحالی کے لئے جدید علوم و سائنس کی روشنی میں قرآن کو صحیح طور پر سمجھیں، اور اس کے لئے ہمیں قاہرہ اور دمشق کا تعاون بھی درکار ہے جو صدیوں سے اسلامی روایات و علوم کے مرکز ہیں۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے ہماری وفاداری صرف اللہ کے لئے ہے اور یہی وہ رشتہ ہے کہ جس میں بیرونی اثرات، سیاسی تنازعات وغیرہ کے باوجود دنیا کے تمام مسلمان منسلک ہیں۔"

کراچی اور قاہرہ سے بیک وقت شائع ہونے والے مشترکہ اعلامیہ میں بھی یہی کہا گیا تھا کہ دونوں حکومتیں تمام اقوام کے حق خود اختیاری پر یقین رکھتی ہیں۔ عالمی امن و انصاف اور انسانی حقوق کے احترام کی خاطر ضروری ہے کہ تمام ممالک اقوام متحدہ کے منشور اور بنڈونگ کانفرنس کی قرار دادوں پر عمل کریں۔ اس کے علاوہ دونوں سربراہوں نے افریقہ اور دوسرے علاقوں میں آزاد ہونے والے نئے ملکوں کا خیر مقدم بھی کیا اور جنوبی افریقہ کی نسلی پالیسی کی مذمت کی۔ دونوں ملکوں نے اپنے باہمی اقتصادی اور ثقافتی رشتوں کو مضبوط تر بنانے کا اعلان بھی کیا۔ اس طرح دوستانہ فضا جو ایک عرصے سے دھندلی ہوتی جا رہی تھی ایک بیک صاف ہو گئی۔ پاکستان اور متحدہ عرب جمہوریہ کے مقتدر صدروں کا یہ قران السعدین اس لحاظ سے بھی کافی اہم ہے کہ باہمی غلط فہمیوں کے ازالے سے تاریخ کا ایک پرانا اور ناخوشگوار ورق الٹا جا چکا ہے اور محبت و اتحاد سے پیدا ہونے والے ان تعلقات کا باب کھل گیا ہے جن پر دونوں ملکوں کے مستقبل کا انحصار ہے۔ ان کے صاف صاف اور واضح بیانات سے ہر وہ خدشہ دور ہو چکا ہے جو اس سے پہلے تشویش انگیز تھا۔ نہر سوئیز کے قضیئے کے متعلق صدر ناصر کی شکایت سن کر صدر ایوب نے کہا تھا: "مصر نے جب نہر سوئیز کو قومی ملکیت بنایا تو میں نے سمجھ لیا کہ اسکے خلاف اب جارحانہ کارروائی ہوگی۔ چنانچہ پاکستان کے کمانڈر ان چیف کی حیثیت سے میں نے اپنی حکومت کو مشورہ دیا تھا کہ نہر سوئیز مصریوں کی ہے۔ پاکستان کے ہر معقول آدمی کی بھی یہی رائے تھی۔ یہ صحیح ہے کہ اس وقت پاکستان کے نمائندوں نے پاکستانیوں کے جذبات کی ٹھیک ٹھیک ترجمانی نہیں کی جس کی وجہ سے مصریوں کو ہمارے مؤقف کے بارے میں غلط فہمی کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ مصر پر اس وقت زبردست دباؤ تھا اور پاکستان پر بھی حالات کا بہت بڑا بار تھا تاہم پاکستانی فوج سوئیز پر جارحانہ کارروائی کے خلاف تھی۔" کشمیر کے جھگڑے کا ذکر کرتے ہوئے صدر پاکستان نے کہا "آپ خود اندازہ لگائیے کہ فلسطین سے جب صرف ساڑھے سات لاکھ عربوں نے ہجرت کی تو عرب ممالک کو کس قدر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ پاکستان میں تو نوے لاکھ مہاجرین آئے تھے۔ بہرحال جو واقعات تھے انہیں دیکھتے ہوئے پاکستانی مسلمانوں کی یہ شکایت غیر فطری نہ تھی کہ عالم اسلام نے انکی کوئی خاص اور قابل ذکر حمایت نہیں کی۔" یہی وہ سادہ سادہ اور خیر بھرے الفاظ تھے جنہیں سن کر صدر ناصر نے پاکستان کے مؤقف کو صحیح طور پر سمجھ لیا اور پہلی بار کشمیر کے لئے حق خود اختیاری اور رائے شماری کی حمایت کا

ہم قدم و ہم شعار
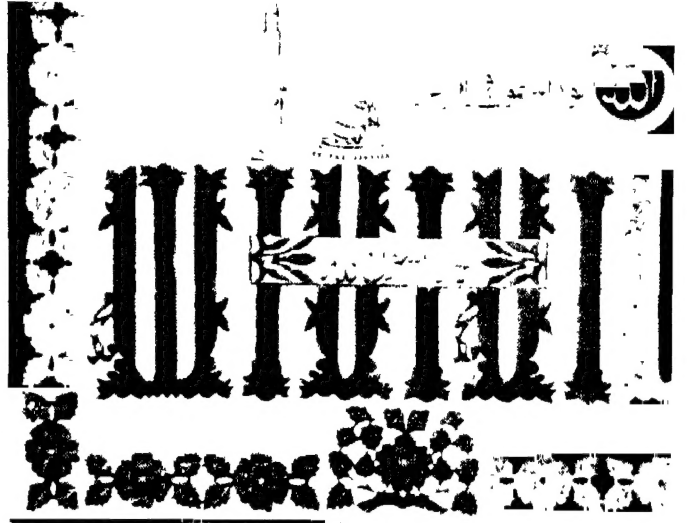
نقش دوام

غرب

''طریق من عربیست'' (عامۃالمسلمین سے خطاب)

''بیا تا گل به افشانیم'' : مہمان گرامی کے اعزاز میں ایک جشن رقص (برما)

شرق

مہ ذوق و همه شوق : صدر سوئیکارنو (انڈونیشیا)
اور صدر ایوب تپاک سے بغلگیر

بطل عظیم آزادی ، بہادر شاہ ظفر کے مزار پر (رنگو

یسیم شاہراهیں فرش راه هیں (جکارتا ، انڈونیشیا)

مہمان کی خوشنودی کے لئے خاص قومی تزئین و آر
(انڈونیشیا)

یقین دلایا۔ پاکستان کی انقلابی قیادت کے اس سنہری کارنامے کو تاریخ عالم کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ سچ پوچھئے تو انہی حقائق کی پردہ کشائی نے پاکستان اور متحدہ عرب جمہوریہ کے درمیان لازوال محبت و اخوت کی فضائیں پیدا کر دی ہیں۔ صرف باہمی دلچسپی کے معاملات میں ہی نہیں بلکہ عالمی مسائل میں بھی ان کے خیالات میں ہم آہنگی پیدا ہو چکی ہے اور یہ اتحاد و اشتراک یوں بھی قابل قدر ہے کہ اس کی وجہ سے افریقہ اور ایشیا کے دیگر ممالک بھی ایک دوسرے کے قریب آتے جا رہے ہیں اور سامراج کا طلسم ٹوٹ کر امنِ عالم کی کوششوں میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے ؛

مشرقین: ضیاء الحسن موسوی

مشرقی ممالک کے عوام کو اشتیاق تھا کہ وہ اس عظیم شخصیت کو اپنی محفلوں میں بلائیں اور قریب سے دیکھیں جس نے پسماندہ مشرق کو حقیقت پسندی کی ایک نئی راہ دکھلائی ہے۔ صدرِ پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں بھی جذبۂ و احساس کی رو ہے جس نے پاکستان کے اس فرزندِ جلیل کے دل میں بھی ایسی ہی والہانہ رو پیدا کی اور وہ مشرقِ بعید کے دور و دراز ممالک کے سفرِ شوق پر روانہ ہو گیا۔

غیر ملکی اقتدار کے "مزے میٹھے اثر خواب آوری" کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ یہ ممالک بری طرح مغرب کی تقلید کر رہے تھے۔ زبان سے تو وہ مغرب کے استعمار کو برا کہتے اور سیاسی آزادی کے لئے جد و جہد کرتے مگر احساس کمتری اس حد تک سرایت کر گیا تھا کہ وہ اپنے نظام اجتماعی کے قیام میں مغرب ہی کی تقلید کرتے۔ اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ پسماندہ نہیں ہیں ایسے طرز اختیار کرتے رہے جو ان کے اپنے حالات ان کی تاریخ اور ان کے عوام کی تعلیمی و ذہنی صلاحیت سے دست و گریباں تھے۔ اگرچہ یہ طرز ناکام ہوتے رہے اور اجتماعی زندگی کی الجھنیں بڑھتی رہیں مگر مشرقی عوام اور ان کے قائدین نے اس ناکامی کا اعتراف کرنے یا حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرنے کو اپنی عزتِ نفس کے خلاف سمجھا۔

یہ صورت حال تھی جب ہمارے ہر دلعزیز صدر قائد انقلاب بن کر سامنے آئے۔ انہوں نے بڑی اخلاقی جرأت سے کام لے کر قوم اور وطن کے صحیح حالات کا اعتراف کیا اور ان کی درستی کے لئے حقیقت پسند اقدامات کئے۔ ہمسایہ ممالک کی نگاہیں اس نو طلوع ستارۂ مشرق کو دیکھنے لگیں۔ وہ پاکستان میں طوفانی رفتار سے ہونے والے حیرت انگیز تجربوں پر تجربے ہو رہے تھے، ان کا بغور مطالعہ کرنے لگے۔ چونکہ سارے مشرق کے مسائل بڑی حد تک ملتے جلتے ہیں اس لئے یہ ممالک ہر تجربے اور اس کے نتائج سے بڑی حد تک متاثر ہوئے۔ ہمارا بین الاقوامی وقار کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ اور ہمسایہ ممالک کی توجہ ہماری طرف اور بڑھ گئی۔ ہمارے نئے تجربات میں "بنیادی جمہوریتوں" کے نظام کو بے حد اہمیت حاصل ہے جس نے مشرق کی ان تمام قوموں کو چونکا دیا ہے۔ آخر وہ بار بار نئے نئے تجربے تو نہیں کر سکتیں یہی وجہ ہے کہ ماضیٔ قریب میں بیرونی تسلط سے آزادی حاصل کرنے والے سارے مشرقی ممالک کو پاکستان کے ہمارے نئے نظام سے گہری دلچسپی ہے۔

تصویر کا ایک اور اہم پہلو جس کے باعث مشرقی ممالک پاکستان کے صدر مملکت کی قدر کرتے ہیں، یہ ہے کہ قومی مسائل کو سلجھانے کی کوششوں میں وہ بین قومی مسائل سے غافل نہیں رہے بلکہ اپنی مخصوص حقیقت پسند پالیسی اور طرز عمل سے انہوں نے دوسرے ممالک اور پاکستان کے تعلقات کا جائزہ لیا ہے اور جن ممالک سے چھوٹے یا بڑے مسائل پر اختلافات یا شکایات تھیں ان کو سلجھانے کے لئے روایاتی انداز کے بجائے صاف گوئی اور خلوص کا سہارا لیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ نہری پانی جیسا مسئلہ یوں حل ہو گیا جیسے کوئی بات ہی نہ تھی اور جو مسائل باقی رہے ان میں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ پاکستان کے قائدین کی ذرا سی بھی کوتاہی کو ان میں دخل ہے۔ اس پس منظر میں جب ہم صدر پاکستان کے دورۂ مشرق بعید کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ واقعی ان ممالک نے ہمارے صدر کا جو استقبال کیا ہے اس میں کیا جذبہ کارفرما ہے۔

اگرچہ صدر پاکستان کا یہ دورہ ہم کو طویل معلوم ہوتا ہے مگر مشرقِ بعید کے وسیع و عریض علاقے کے پیش نظر اس کی مدت بہت ہی کم رہی۔ ذرا تصور کیجئے ان کے دورے میں برما اور انڈونیشیا سے لے کر جاپان تک کے ممالک کا طول طویل زنجیرہ ہے۔ یہ ممالک ثقافت کی گہرائی کے علاوہ صنعت تجارت کے اہم مرکز ہیں۔ یہ ترقی کی راہوں پر گامزن ہیں۔ اور پاکستان سے ان کے بڑے گہرے تعلقات ہیں۔

برما میں صدر کا جو استقبال ہوا وہ ظاہر کرتا ہے کہ اس ملک کے عوام اور وہاں کی حکومت پاکستان سے اقتصادی اور ثقافتی تعلقات بڑھانے کے کتنے مشتاق ہیں۔ صدر پاکستان اور وزیر اعظم برما کے مشترکہ اعلان سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ملک آپس کے مسائل کو دوستانہ طریقے

پر عمل کرنا چاہتے ہیں، ایک دوسرے سے تعاون کے خواہاں ہیں اور بین الاقوامی امور اور عالمی سیاست کے متعلق دونوں کے انداز فکر میں بڑی مماثلت ہے۔ عالمی امن کی خواہش کے علاوہ وہ دونوں ممالک استعمار کے ہر روپ کو ناپسند کرتے ہیں اور تمام اقوام کے لئے حق خود ارادی کے مؤید ہیں۔ یہ وہی حق ہے جس کے لئے پاکستان گزشتہ بارہ سال سے جدوجہد کر رہا ہے، وہ مُصر ہے کہ اہلِ کشمیر کو بھی یہ حق دیا جائے تاکہ وہ اپنے مستقبل اور اپنی ریاست کے پاکستان یا ہندوستان میں انضمام کا آزادی سے فیصلہ کر سکیں۔ برما اور پاکستان کے تعلقات ابتدا ہی سے خوشگوار رہے ہیں اور بعض معاملات میں اختلاف کبھی ہوا تو دونوں ممالک نے کوشش کی کہ اس کو طول نہ دیا جائے اور ان کو مفاہمت کی فضا میں سلجھایا جائے۔ گزشتہ مالی سال میں دونوں ملکوں کے درمیان آٹھ کروڑ روپے کا لین دین ہوا۔ چند ماہ قبل برما کے تجارتی وفد نے ایک کروڑ ۲۵ لاکھ روپے کا سامان خریدا ہے۔ مشترکہ بیان میں اس صورت حال پر اطمینان کا اظہار کیا گیا ہے۔ اور یہ عزم ظاہر کیا گیا ہے کہ تعاون میں مزید اضافہ ہونا چاہئے۔ سرحدی تجارت اور برما اراکان کو مشرقی پاکستان سے ایک شاہراہ کے ذریعے ملانے کے امکان کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ سرحدی تنازعات کے متعلق بھی یہ طے کیا گیا کہ جلد ہی دوستانہ فضا میں ان کو طے کر لیا جائے۔

برما کے دورہ کے بعد ۳ دسمبر کو صدر ایوب انڈونیشیا گئے اور ۱۱ دسمبر تک مشرق بعید کے اس عظیم اسلامی ملک کے مختلف مقامات کا دورہ کیا۔ ہزاروں جزیروں پر مشتمل یہ ملک وہ ہے جہاں اسلام کا پیغام بغیر کسی فاتح کے پہنچا ہے۔ مشرق بعید میں فقط علماء و فقراء کی مساعی سے اسلام کی اشاعت، دشمنانِ اسلام کے اس بہتان کا تشفی بخش جواب ہے کہ "اسلام بزورِ شمشیر پھیلا ہے"۔ سچے مسلمانوں نے تلوار کا استعمال فقط اس وقت کیا ہے جسے علامہ اقبالؒ نے "تیغ بہر حفظ آئین ست و بس" سے تعبیر کیا ہے۔

انڈونیشیا نے پاکستان سے دو برس قبل یعنی ۱۷ اگست ۱۹۴۵ء کو آزادی حاصل کی۔ انڈونیشیا کی تحریک آزادی بھی ہم سے ملتی جلتی ہے۔ ۱۹۰۸ء میں پہلی آزادی خواہ جماعت "بودی اوتومو" قائم ہوئی جس کے رہنما ڈاکٹر ستومو مرحوم تھے۔ یہ دراصل دانش وروں کی جماعت تھی اور ہماری تاریخ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تحریک سے ملتی جلتی ہے۔ ۱۹۱۱ء میں حاجی شمس ہدیٰ نے "شرکت اسلام" (بالکل ہماری مسلم لیگ کی طرح)

قائم کی جو بہت جلد مقبول عوام ہو گئی تھی۔ ۱۹۳۳ء میں ولندیزی سامراج نے متعدد قومی رہنماؤں کو گرفتار کر کے ملک پر آمرانہ قوانین مسلط کر دئے۔ کچھ دنوں بعد ڈاکٹر سوکارنو نے ایک اور جماعت بنائی جس کا نعرہ تھا "انڈونیشیا مردیکا" یعنی آزاد انڈونیشیا۔ ڈاکٹر سوکارنو نے تمام جماعتوں کو آزادی کی جدوجہد کے لئے متحد کر دیا۔ اس طرح ڈاکٹر سوکارنو انڈونیشیا کے لئے "قائد اعظم" کی حیثیت رکھتے ہیں جنہوں نے انڈونیشی عوام کو متحد کر کے ملک کو آزادی کی منزل تک پہنچایا۔ اور ۱۹۵۰ء تک مکمل آزادی حاصل کر لی جس میں سولہ خود مختار ریاستیں وحدانی طرز حکومت میں متحد ہو گئیں۔ اب یہ ملک انتظامی حیثیت سے دس صوبوں میں منقسم ہے۔ یہاں سات کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ جولائی ۱۹۵۹ء سے انڈونیشیا میں پرانا سیاسی نظام ختم کر کے انقلابی حکومت قائم ہے۔

انڈونیشیا کا دارالسلطنت جاکارتا، جہاں صدر پاکستان کا پہلا استقبال ہوا، مشرق کے بڑے حسین اور عظیم شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ جاکارتا میں صدر ایوب کا ایسا استقبال ہوا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ جاکارتا ہی پر کیا منحصر ہے، وہ اس ملک میں جہاں بھی گئے ان کا خیر مقدم اس جوش و خروش سے ہوا جو دونوں ملکوں کی دوستی کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔

صدر ایوب ۷ دسمبر کو مغربی جاوا کے مشہور شہر بندونگ گئے جو ۱۹۵۵ء کی مشہور افریشیائی کانفرنس کی وجہ سے شہرۂ آفاق ہو چکا ہے۔ یہ بڑا رنگین اور صحت افزا شہر ہے اور یہاں کے باشندوں کی نفاست اور خوش مزاجی کی وجہ سے اس کو جاوا کا "پیرس" کہا جاتا ہے۔ صدر ایوب انڈونیشیا کے مشہور جزیرہ "بالی" بھی گئے جو شادابی حسن اور قدرتی مناظر کی وجہ سے مشہور عالم ہے۔ بالی کی آبادی گیارہ لاکھ ہے۔ جزائر شرق الہند میں یہ واحد جزیرہ ہے جہاں ہندو مت موجود ہے مگر یہ ہندو دھرم ہندوستان کے ہندو دھرم سے مختلف ہے اور بدھ مت کے امتزاج کا نتیجہ ہے۔ بالی کے لوگ فنون لطیفہ کے عاشق ہیں، یہاں کا ہر شخص موسیقی اور رقص کا شائق ہے جس کا پس منظر پرانے دیومالائی کہانیاں ہیں۔ اس جزیرہ میں لوگوں نے اپنے روایتی انداز سے صدر ایوب کا عدیم النظیر استقبال کیا۔ وہ اس شخصیت کا استقبال کر رہے تھے جو ایک بڑے اسلامی ملک کا سربراہ اور قائد انقلاب ہے اور جس کے عہد میں پاکستان کی اقلیتیں انہی شہری حقوق سے فیضیاب ہیں جو اکثریت کو حاصل ہیں۔ ملک کی بھی

چھوٹی لڑکیاں ہاتھوں میں نقرئی پیالیاں اور پیالیوں میں گلاب کا عرق لئے کھڑی تھیں۔ صدر کے ورود کے بعد انہوں نے راستے میں گلاب چھڑکا، صدر پر گلاب کی پتیاں برسائیں اور ان کے قدموں پر لوبان ڈالا۔ اس کے بعد بیشمار ہار پہنائے گئے۔ بالی کا جزیرہ جاوا کے مشرق میں واقع ہے اور چھوٹا جاوا کہلاتا ہے۔ جاوا کے مسلمان بڑے عقیدت مند مسلمان ہیں۔ جاوا کے اکثر نوجوان حج سے مشرف ہوتے ہیں۔ شادی سے قبل کسی نوجوان کا حج کر لینا اس کے لئے ایک اضافی صفت سمجھا جاتا ہے۔ حجاز میں جو انڈونیشی طلبا دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں، اُن میں جاویوں کی اکثریت ہوتی ہے۔

صدر ایوب اور صدر سوکارنو کا مشترکہ اعلامیہ مشرق کی تاریخ حریت واتحاد میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ انہوں نے بندونگ کانفرنس کے اصولوں پر استقامت کا اعلان کرتے ہوئے اقوام متحدہ کو نئے زمانے کے مطابق بنانے کی ضرورت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ انڈونیشیا سے رخصت ہوتے ہوئے صدر ایوب نے اس سلسلہ میں تاریخی بیان دیتے ہوئے اخباری نمائندوں سے کہا کہ اقوام متحدہ کا منشور پندرہ برس پرانا ہے۔ اس عرصے میں دنیا بہت بدل گئی ہے، اس لئے یہ عالمی ادارہ اور اس کی تنظیم نظر ثانی کی محتاج ہے تاکہ بڑی اقوام کے ساتھ چھوٹی اقوام کے مفاد بھی اس کے پیش نظر رہیں اور انہیں مختلف اداروں میں خاطر خواہ نمائندگی مل سکے۔ جاپان کی پریس کلب میں صدر ایوب نے اس مسئلہ کو دوبارہ وضاحت سے بیان کیا۔ صدر ایوب نے اس مطالبہ سے اُن عالمی حقائق کی طرف اشارہ کیا ہے جن کی بدولت الجزائر اور کشمیر جیسے اہم اور واضح مسائل "سیاسی اقتدار کی رسہ کشی" کی وجہ سے اب تک الجھے ہوئے ہیں۔ صدر ایوب اور صدر سوکارنو کا یہ متفقہ مطالبہ اُس تجویز سے بالکل الگ ہے جو مسٹر خروشیف نے پیش کی تھی اور جس کی بدولت اقوام متحدہ کا سکریٹریٹ معطل ہو کے رہ جائے گا۔ وہ تجویز بڑی طاقتوں کی سرد جنگ کا ایک محاذ ہے اور یہ تجویز چھوٹی اقوام اور دنیا کی اکثریت کے حقوق کی نمائندگی ہے۔

انڈونیشیا سے صدر ایوب جاپان تشریف لے گئے۔ جہاں انہوں نے آٹھ دن اُس ملک کا دورہ کیا جو اپنی صنعت و حرفت اور ذہانت کے صحیح استعمال کی بدولت ترقی یافتہ اقوام کی صف میں شامل ہے اور جس نے گزشتہ جنگ عظیم میں بے انتہا نقصان اٹھانے کے باوجود نہایت قلیل عرصے میں اپنی تعمیر نو کے مراحل اتنی تیزی سے طے کئے ہیں جس کی مثال جرمنی کے علاوہ اور کہیں نہیں۔

جاپان سے ہمارے تعلقات کی سب سے مضبوط کڑی تجارت اور صنعت ہے۔ جاپان میں ہمارے صدر کا جو استقبال ہوا ہے وہ اس کی تاریخ میں ایک نادر مثال ہے۔ جاپانیوں نے بڑی گرم جوشی سے اس قائد انقلاب کا خیر مقدم کیا جو ایک عظیم اسلامی مملکت کا سربراہ، انسانیت کا خیر خواہ، اور ایک قوم کو جگانے اور اس کو تعمیر نو کی راہ پر لگانے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ دنیا نے اب تک صدر ایوب کو ایک عظیم قومی قائد کی حیثیت سے خراج عقیدت پیش کیا ہے مگر اب وہ ان کو ایک بین الاقوامی شخصیت کی حیثیت سے محبوب ہوتے دیکھ کر یہ محسوس کر رہی ہے کہ بناوٹی باتوں اور پرانی سیاست بازی کا زمانہ گیا۔ زبان سے امن کا پرچار کرنے اور عملاً امن پسند ملکوں کی آزادی چھیننے والی سیاست ختم ہو رہی ہے اور سچے صاف گو اور پرخلوص قائدین بین الاقوامی صفوں میں آگے بڑھتے نظر آ رہے ہیں۔

اس دورہ میں ہر کہیں عوام کے پُرجوش خیر مقدم سے کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا وہ زبان دل سے یوں گویا ہوں ؎

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد

ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا

صدر پاکستان نے اپنے دورہ کے شروع ہی میں ایک نہایت اہم بات کہی تھی جو دور جدید میں اقوام مشرق کے لئے سب سے اہم بات ہے۔ یہ کہ "جوہری دور کا آہنگ بن جائیے"۔ یعنی اپنے اندر وہی برق رفتاری پیدا کیجئے جو دور جدید کے لئے لازم ہے۔ ہمارے تمام مسائل کا حل خود ہمارے برق منش بن جانے پر ہے۔ چنانچہ صدر پاکستان نے خود اندرون و بیرون ملک اس کا عملی ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ وہ بذات خود "جوہری آہنگ" کا شاندار مظہر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جہاں بھی گئے ہیں انہوں نے اپنی شخصیت کی براقی سے چکاچوند پیدا کر دی ہے اور اپنی مقناطیسی کشش سے گوناگوں اقوام کو مسحور کیا ہے۔ وہ بے تکلف اور بے ساختہ، حقیقت پسندانہ گفتگو اور وہ بے باکی جو ان کا جوہر کامل ہے، کس کو متاثر نہیں کرے گا!

ایں سعادت بزور بازو نیست

تا نبخشد خدائے بخشندہ

ہمیں کوئی شبہ نہیں کہ اس دورہ اور صدر پاکستان کی متحرک شخصیت نے پاس اور دور کے مشرقوں میں پہلی بار گہرا ربط اور نیا رشتہ پیدا کیا ہے۔ جس سے دنیائے مشرق میں ایک نئے دور کے آغاز کی توقع کی جا سکتی ہے۔

افکارِ جدید :

ادب میں اشاریت کی تحریک

ضمیر علی بدایونی

ایڈگر ایلن پو نے جب یہ کہا تھا کہ شعری موسیقی کو غیر واضح اور معنی خیز ہونا چاہیئے اور ابہام کا عنصر اس کی موزونیت کا لازمی جزو ہے، تو وہ غیر شعوری طور پر شاعری کے اشاریتی نظریہ کی بنیاد ڈال رہا تھا۔ بادلیر کی شاعری اور نظریۂ شاعری پر ایڈگر ایلن پو کے خیالات کا اثر صاف ظاہر ہے۔ اس نے اپنی زندگی کا آغاز ہی پو کے تراجم سے کیا۔ واگنر کی اسرار زا موسیقی اور پو کے فکر افروز نظریۂ شاعری کے تحت ہی اس نے دنیا کو "علامتوں کا جنگل" (FOREST DE SYMBOLES) سے تعبیر کیا تھا۔ اور بقول تھامس مین، بودلیر زندگی بھر انہیں دو فدائیانِ شعر و نغمہ کی پرستش کرتا رہا۔ سنہ ۱۸۴۹ء کے ایک خط میں بودلیر نے واگنر کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا:

"میں تم میں ایک ایسے عظیم انسان کی جھلک دیکھ رہا ہوں جسے مستقبل اکابرین میں سب سے عظیم خیال کرے گا۔"

پو اور واگنر کے لئے بودلیر کا جذبۂ ستائش ہی آخر کار "اشاریتی شاعری" کی بنیاد ثابت ہوا۔ پروست نے بودلیر سے متعلق ایک مکتوب میں اسے جدید شاعری کا سرچشمہ کہا ہے۔ بودلیر کی عظمت و اہمیت کے متعلق ہمارے ایک مرد نکتہ داں نے بہت درست لکھا ہے:۔

"پچھلے سو سال سے فرانسیسی شاعری میں جتنے رجحانات ظاہر ہوئے ہیں، ان سب کی ابتدا بودلیر سے ہوتی ہے۔ وہ رجحانات مثبت ہوں یا منفی، ان کا سرچشمہ بنا ہوا ہے ..... بودلیر کی شاعری کے دو پہلو ہیں۔ ایک طرف تو عدم پرستی ہے، اور دوسری طرف وجود پرستی۔ میلارمے اور والیری نے عدم پرستی کے رجحان کو ترقی دی۔"

بودلیر کی شاعری نے جسے پال والیری نے "جدید دنیا کی شاعری" کہا ہے، فرانسیسی شاعری میں بڑے وسیع امکانات پیدا کر دیئے تھے۔ اشاریت اسی امکان کا بھرپور اور مکمل اظہار ہے۔ بعض حالتوں میں یہی امکانات مختلف بلکہ متضاد صورتوں میں نمودار ہوئے۔ ریمبو نے شاعری میں "ہر ایک چیز" کو سمیٹنے۔ اور میلارمے نے اپنی شاعری کی دنیا سے "ہر ایک چیز" کو خارج کرنے کی کوشش کی۔ سنہ ۱۸۹۴ء میں میلارمے نے آکسفورڈ لیکچر میں کہا تھا:

"جی ہاں، ادب واقعی موجود ہے۔ اور اگر تم یہ چاہتے ہو کہ ادب ہی صرف موجود رہے تو اس میں سے ہر چیز کو خارج کر دو۔"

میلارمے کے یہ الفاظ فرانسیسی ادب میں تاریخی اہمیت کے حامل ہیں، کیونکہ ان لفظوں میں اشاریتی نظریۂ شاعری کی پوری روح موجود ہے۔ اور میلارمے کی جملہ تصریحات اسی اجمال کی تفصیل ہیں۔ میلارمے زبان و الفاظ کی "خالصیت" کو ہر چیز سے بچانا چاہتا تھا، لیکن زبان و الفاظ کی اس "خالصیت" کو کس طرح بچایا جا سکتا ہے۔ اس سوال کے میلارمے اور والیری نے اس قدر گوناگوں جوابات دیئے ہیں کہ اکثر اوقات اس نظریہ کی پوری روح کو سمجھنا بے حد مشکل ہو جاتا ہے۔

اشاریتی نظریۂ شاعری قبل رفائیلی (PRE - RAPHAELITE) انگریزی نقاشوں اور واگنر کی عمیق اور پیچیدہ موسیقی سے متاثر ہے۔ اشاریتی تحریک کو اپنانے اور آگے بڑھانے میں فرانسیسی ادب کے بیشتر ادبا اور شعرا نے حصہ لیا ہے۔ اور ایک دور ایسا بھی گزرا ہے جب کسی اہلِ قلم کے لئے اشاریت سے دامن بچا کر گزرنا ممکن نہ تھا۔ اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں تقریباً تمام فنکاروں نے کسی نہ کسی حد تک اشاریتی عنصر کو اپنے فن میں شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہ پال والیری نے آندرے ژید کو سنہ ۱۸۹۱ء کے ایک خط میں مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اشاریت کا باغ زمین تمام خوشبوؤں اور [illegible]

تمام پہلوؤں کے ساتھ ہمارے سامنے کھل رہا ہے اور
اب اس سے باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں۔"

میلارمے نے شعر و ادب سے چند ایسی خصوصیات منسوب کی ہیں جو اُس سے پہلے کسی نے نہیں کی تھیں۔ بقول گستاو کاہن (KAHN) میلارمے نے جو نظریۂ شاعری پیش کیا ہے دنیا کے ادب میں اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

میلارمے نے اشاریت کے لئے ایک مابعد الطبیعاتی جواز پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ الفاظ کی ماہیت کے متعلق ایک خاص نظریہ رکھتا تھا۔ اس نے اپنے ۱۸۶۶ء کے ذہنی بحران میں کہا تھا کہ اشیاء اس لئے موجود ہیں کہ وہ شاعرانہ تعبیرات سے اپنی معراج کو پہنچ جائیں۔ اس کے نزدیک "دنیائے واقعی" فن کار کی دنیا کے سامنے ایک لغویت انگیز انتشار سے زیادہ نہیں۔ جس دنیا کا ہم روزمرہ مشاہدہ کرتے ہیں، وہ حقیقی دنیا کی پراگندہ و مسخ شدہ شکل ہے۔ یہ حقیقی دنیا ہی در اصل ابدی ہے اور اسی ابدی کی بازدریافت شاعری کا مقصد ہے۔ یہ عقلی دنیا میلارمے کے نزدیک نامکمل اور پراگندہ ہے، کیونکہ حقیقی دنیا کی مسخ شدہ شکل ہے۔ اشیاء کے عقلی مشاہدہ میں ہمیں جو خلا محسوس ہوتا ہے، شاعری اسی خلا کو پُر کرتی ہے۔ اور کائنات کے لم نہیہ اجزاء کا سراغ لگاتی ہے۔ شاعر کا کام یہ ہے کہ عالمِ مشہود کی کاذب نمود کا پردہ چاک کر کے براہِ راست حقیقت سے رابطہ پیدا کرے لیکن ہم اشیاء کے قلب میں کس طرح داخل ہو سکتے ہیں۔ میلارمے نے اس کا سب سے عجیب و غریب جواب دیا ہے۔ اور وہ یہ کہ صرف الفاظ کی مدد سے اشیاء کے اندرونی حقائق تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اشیاء قلبِ ماہیت کے بعد الفاظ میں تبدیل ہو جاتی ہیں خیالات کو تو وہ جہان کا ذہب کی منطق سے تعبیر کرتا ہے جس میں ہم سمجھتے ہیں ہمیں خیالات سے گزر جانا چاہئے۔ اور الفاظ کی مدد سے تخلیق کرنا چاہئے۔ ماہیت کی مدد سے وہ مخفی دروازے کھولنا چاہئے جو اشیاء کے قلب تک پہنچا سکے۔ اشیاء اور موجودات کی حقیقی دنیا کو ہم اپنی عقل اور حواس سے نہیں پا سکتے کیونکہ یہ اپنی ماہیت ہی میں محدود اور نارسا واقع ہوئی ہے۔ صرف شاعری ہی ایک ایسا طریق کار ہے جس کی مدد سے اشیاء اور موجودات کی اصل ماہیت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ فلسفیانہ ادراک کو ظاہری حقیقی دنیا کے خدوخال کو مسخ کر دیتی ہیں۔ لیکن شاعری اس حقیقی و ابدی دنیا کا ایک عکس تخلیق کرتی ہے جو خود حقیقی و ابدی ہوتا ہے۔ اور جس کی صداقت کا یہی ثبوت ہے کہ ہم اسے سمجھ نہیں سکتے لیکن اسے محسوس کر سکتے ہیں۔

میلارمے کے نظریہ کے مطابق کائنات کے وجود کا مقصد اظہار میں تبدیل ہو جانا ہے۔ یعنی فن کار کی کائنات میں بدل جانا ہے کیونکہ کائنات کے انتشار و بدنظمی کو دور کرنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ اس کو فن کار کی کائنات میں بدل دیا جائے۔ یعنی اس کا جمالیاتی اظہار میلارمے کے نزدیک لفظ "شے" کا آغاز نہیں بلکہ منتہا و اختتام ہے۔ اشاریت الفاظ کا ایک ایسا استعمال ہے جو انہیں قابلِ تفہیم اور فنا ہونے سے بچا سکے۔ کیونکہ میلارمے اور اس کے تابعین قابلِ فہم ہونے کو فنا ہونے کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ الفاظ کو فنا ہونے سے بچانے کے لئے وہ انہیں علامتوں (SYMBOLS) کے خول پہنا دیتے ہیں اور پیچیدہ ہیئت کی دیواریں ان کے گرد کھڑی کر دیتے ہیں۔ اشاریت الفاظ کے تحفظ پر بے حد زور دیتی ہے اور ان کا ایک رفیع تر تصور پیش کرتی ہے۔

میلارمے کے نزدیک شاعری صرف الفاظ کے استعمال سے وجود میں آتی ہے۔ مشہور مصور دیگاس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے فرصت کے لمحات میں سانیٹ لکھ کر خود کو محظوظ کیا کرتا تھا۔ ایک بار جب اس کی تحریک ذہنی سست پڑ گئی تو ناامیدی کے عالم میں اپنے دوست میلارمے کے پاس پہنچا اور کہا۔ "میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ میں بہترین خیالات سے لبریز ہوں لیکن شعر نہیں کہہ سکتا۔" "میرے پیارے دوست۔" میلارمے نے جواب دیا۔ "شاعری خیالات کے ذریعہ نہیں کی جاتی بلکہ الفاظ کے ذریعہ کی جاتی ہے۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ میلارمے نے جو نظریۂ شاعری پیش کیا ہے وہ الفاظ کے علامتی استعمال کو فن کا مقصود قرار دیتا ہے۔ پال والیری کے نزدیک تو شاعری اور نثر کا فرق ہی الفاظ کے استعمال کا فرق ہے۔ الفاظ کا استعمال تو شاعر بھی کرتا ہے اور صحافی اور لیڈر بھی لیکن شاعر اور دوسرے افراد میں وہی فرق ہے جو نظم و انتشار نغمہ اور بے ہنگم صدا میں ہے۔ پال والیری اپنے مخصوص والہانہ اسلوب میں نثر اور شاعری کے اس نمایاں اور بنیادی فرق کی وضاحت کرتا ہے:

> "نثر کا مقصود غائب ہو جانا، قابلِ تفہیم ہونا، تحلیل ہو جانا اور کلیتاً فنا ہو جانا ہے اور لسانی روایت کے مطابق اس تصور یا جذبہ کے لئے جگہ خالی کر دینا جس کا اس میں اظہار ہوتا ہے۔ کیونکہ نثر ہمیشہ عمل و تجربہ کی دنیا کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ ایک ایسی کائنات کی طرف

جس میں ہمارے مشاہدات، ہمارے اعمال وجذبات
کا اسلوبِ اظہار تقریباً یکساں ہی ہوتا ہے۔ عملی دنیا
"مقاصد کے مجموعہ" کی تعبیر میں محدود کی جاسکتی ہے"

برخلاف اس کے شاعری کبھی فنا نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ شعراء الفاظ کا استعمال ایک مخصوص انداز سے کرتے ہیں۔ شاعری میں الفاظ کا فنا (ANNIHILATION OF WORDS) نہیں ہوتا۔ اس میں الفاظ بطور ذریعۂ اظہار کے استعمال نہیں ہوتے بلکہ میلارمے۔ والیری نظریہ کے مطابق شاعری کو کبھی بھی اظہارِ خیال کی حد تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔ ایک بڑی معنی خیز تمثیل کی مدد سے والیری نے شاعری اور نثر کے اس بنیادی فرق کو واضح کیا ہے۔ نثر چلنے کی مانند ہے۔ جس کا ایک طے شدہ مقصد ہوتا ہے اور ہر حرکت، مابعد کی نمود کے بعد بالکل ختم اور فنا ہوجاتی ہے۔ شاعری رقص کی مانند ہے جو بجائے خود اپنی غایت اور اپنا مقصود ہے۔ اس کا کوئی خارجی مقصد نہیں بلکہ ایک کیفیت کو پیدا کرنا ہی اس کا مقصد ہے۔ اور شعرو رقص اپنے اختتام کے بعد غائب نہیں ہوتے (QUESTION DE POESIE) والیری کے نزدیک شاعری زبان کے معمولی اعمال کو پایۂ تکمیل و اتمام کو نہیں پہنچاتی۔ وہ اپنے اوپر نئی ذمہ داریاں عاید کرلیتی ہے۔ یہ وہ زبان نہیں ہے جو عموماً تقریروں، خطوط، فلسفہ طرازی اور داستان گوئی میں استعمال ہوتی رہتی ہے اور جسے شاعر تکمیل کو پہنچا کر ممتاز و منفرد کرلیتا ہے۔ بلکہ شاعری ایک ایسی ہمہ گیر چیز ہے جو کئی نوعیتوں کی زبان کا احاطہ کرتی ہے شاعری ممتاز و بے مثل خصوصیات کی حامل ہے۔ یہ ایک "UN LANGAGE DANS LE LANGAGE" ہے۔ اشاریت کا مقصود میلارمے کے الفاظ کی ان تمام صلاحیتوں پر زور دینا، محفوظ کرنا اور تکمیل کو پہنچانا ہے جن کی وہ اہل ہے۔ اشاریت نگاروں کے نزدیک رومانیت اور فطرت نگاری دونوں زبان کے ایسے استعمال ہیں جو حقیقت کے ماسکہ کو زبان کی حدود سے پرے رکھتے ہیں۔ اشاریت ان سارے مکاتبِ فن سے بغاوت کا اعلان کرتی ہے جو زبان و ہیئت کو ثانوی درجہ دیتے ہیں۔ میلارمے اور اس کے متبعین نے الفاظ کو مقصود بالذات قرار دے کر ان کو کانٹ کی "شے بذاتہ" (THING IN ITSELF) کا درجہ دے دیا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اشاریت کا سارا فلسفہ الفاظ کا فلسفہ ہے۔ اشاریتی شاعر کا سارا مسئلہ ایک ایسی ہیئت کی تخلیق کرنا ہوتا ہے جو الفاظ کو خیالات کی تحتی سے آزاد کردے۔ اور ان کے بقاء و تحفظ کی ضامن ہو۔ دیکارتیت نے کہا تھا " CORGITO ERGO SUM " (میں سوچتا ہوں، اس لئے میرا وجود ہے) لیکن میلارمے ہمیں بڑے عجیب وغریب انداز سے کہتا ہوا نظر آتا ہے کہ یہ زبان ہی کا فیضان ہے جس سے میں موجود ہوں زبان دفن اس کے نزدیک ایسی چیزیں ہیں جس کے آگے ارتقا ناممکن ہے اور زبان کے حدود ہماری دنیا کے حدود ہیں۔

اشاریت سے میلارمے کا مقصود یہ نہ تھا کہ بجز امکان کبھی مکمل، زندہ اور مفید کارنامۂ فن کی تخلیق کی جائے بلکہ اس نظریہ کو پیش کرنے سے اس کا مقصود یہ تھا کہ جہاں تک ممکن ہو فرانسیسی شاعری کو مطلقیت کی طرف ڈھکیلا جائے۔ اس نے پیرناسی این ازم (PARANASSIANISM) کی واقعیت نگاری میں فرانسیسی ادب کو دم توڑتے دیکھا۔ اس لئے اس نے سب سے پہلے اسی واقعیت نگاری کے خلاف بغاوت کی۔ وہ قارئین کی ذہنی کم مائیگی سے کسی حالت میں سمجھوتہ کرنے پر تیار نہ تھا۔ اسے اس بات کا اندازہ تھا کہ جس قسم کے ادب کی تخلیق کے لئے وہ جد و جہد کر رہا تھا وہ کبھی بھی مقبول نہیں ہوسکتا۔ لیکن وہ ہمارے غالب کی طرح زندگی بھر بڑے فخر سے کہتا رہا ؎

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

اشاریتی تحریک کبھی مقبولِ عام تو نہ ہوسکی۔ البتہ دنیا کی مختلف زبانوں کے ادیبوں کا ایک بہت بڑا حصہ اشاریتی نظریۂ ادب سے متاثر ہوا ہے۔ میلارمے کے بعد یورپین ادب میں جتنے بڑے ادیب و شاعر ہوئے ہیں۔ ان سب نے کسی نہ کسی حد تک اشاریت کو ضرور اپنایا ہے۔ انگریزی ادب میں ییٹس اور ایلیٹ کی شاعری اس رجحان کی نمائندگی کرتی ہے۔ جیمس جوائس تو سراسر اسی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ ییٹس کی طویل تمثیلی نظم "SHADOWY WATER" اور ایلیٹ کی "BURNT NORTON" اس سلسلہ میں بڑی کامیاب نظمیں ہیں۔

اردو ادب میں اشاریت کا آغاز بہت بعد میں ہوا۔ جب دوسری زبانوں کے ادب میں میلارمے کے نظریۂ شاعری کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگیں، اس وقت میراجی نے اردو ادب میں اشاریت کو روشناس کرایا ہے۔ جس زمانے میں میراجی نے اردو میں پہلی بار میلارمے

کی کچھ نظموں کا ترجمہ شائع کیا تھا، اس سے پہلے ییٹس اعلان کر چکا تھا کہ ہاں میں بہت دیر میلارمے کے ساتھ چلتا رہا۔ بہرحال اردو ادب میں اشاریت کا آغاز میراجی کی نظموں سے ہوا۔ میراجی نے روشِ عام سے ہٹ کر اپنے لئے ایک نیا راستہ ڈھونڈھ نکالا تھا۔ یہ راستہ صرف علامتوں اور اشاروں کی مدد سے طے کیا جا سکتا تھا۔ گو میراجی فطری طور پر یہ رجحان لے کر پیدا نہیں ہوئے تھے، لیکن میلارمے نے زبان کا فانوس روشن کرنے کے لئے ساری کائنات میں اندھیرا برپا کر دیا تھا، اس لئے میراجی بھی اشاریت کے دائرۂ جذب و کشش میں آ گئے۔ اس سلسلہ میں خود میراجی کا بیان ملاحظہ ہو:

" یہ شاید ۱۹۳۶ء یا ۱۹۳۷ء کا ذکر ہے کہ مغرب
کے شعر و ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے فرانسیسی شاعر
اسٹیفانے میلارمے کے کلام سے شناسائی ہوئی۔ میلارمے
مغرب کے ابہام پسند شاعروں میں سب سے نمایاں ہے۔
مجھے اس کی کچھ نظموں کا مجموعہ انگریزی میں ملا۔ یہ ترجمہ آرٹ
کے مشہور نقاد راجر فرائی نے اپنے فرصت کے لمحات
میں کیا تھا۔"

میراجی نے راجر فرائی کے مترجمہ مجموعۂ نظم کا گو بالاستیعاب مطالعہ کیا لیکن انہوں نے اشاریت کی پوری مابعد الطبیعات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ابہام کے وقیع تر پہلوؤں پر ان کی نظر پڑی۔ ان کی ایک مشکل یہ بھی تھی کہ وہ اپنے ذوقِ جدت پسندی کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کی روایت کا ساتھ نہ دے سکے۔ انہیں نہ تو الفاظ پر وہ حیرت انگیز قدرت حاصل تھی جس کی اشاریتی ہیئت مطالبہ کرتی ہے اور نہ نظریاتی طور پر وہ میلارمے اور والیری سے متفق نظر آتے ہیں۔ "خیال" کو میلارمے نے جس نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے، وہ سطورِ بالا سے واضح ہے۔ لیکن میراجی رقمطراز ہیں:

"خیال ہی میری نظر میں بنیادی شے ہے۔ اس میں اگر
کوئی نئی بات نہیں۔ اس میں اگر کسی کو دو قدم آگے بڑھانے
کی صلاحیت نہیں تو اظہار کی کوشش بے مصرف اور بیکار ہے۔"

میلارمے نے تو خیال کو لفظوں کے "تار و پود" سے زیادہ کوئی اہمیت نہ دی۔ میلارمے کے یہاں اظہار کا عمل بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ خیال تو قدیم دم کی چیز ہے۔ شاعری صرف ہیئت کی تخلیق سے وجود میں آتی ہے۔ خیالات کو تو وہ منطقی دنیا کی پیداوار قرار دیتا ہے۔ اور شاعری کو اظہارِ خیال کی حد تک محدود کرنے والا شاعر تو یقیناً ہو سکتا ہے۔ لیکن اشاریت نگار نہیں ہو سکتا۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ میراجی کی اس سلسلہ میں تمام کوششیں "جرأتِ رندانہ" سے زیادہ نہیں۔ ییٹس جیسے بھاری بھرکم شاعر نے بھی اس راہ کی مشکلات سے فرار کی صورت اختیار کی تو بیچارے میراجی کی حیثیت ہی کیا۔ الفاظ پر مکمل قدرت حاصل کرنے کے بعد ہی علامتوں کی طرف قدم بڑھایا جا سکتا ہے۔ لیکن میراجی کی بدقسمتی یہ ہے کہ ان کے پاس الفاظ بھی نہیں تھے۔

دہن کا ذکر کیا یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

میراجی کے یہاں ابہام موجود ہے۔ لیکن ان کا یہ ابہام میلارمے اور والیری کے ابہام کے مقابلہ میں کئی درجہ پست اور غیر اہم ہے۔ ان کی شاعرانہ ہیئت میں اشاریت کافی حد تک ان کی لاشعور سے وابستگی اور پیچیدگی سے پیدا ہوئی ہے۔ فرائڈ تو پہلے ہی انسانی ذہن کو "علامتوں کی دنیا" کے نام سے پکار چکا تھا۔ میراجی نے اشاریت کو اپنا کر ابہام کو کہیں زیادہ ژولیدگی سے اپنے فن میں جذب کر لیا۔ اگر غالب غزل گو نہ ہوتا تو اس کی شاعری کا ابہام بہ نسبت میراجی کے ابہام کے اشاریتی شعراء کے ابہام سے کہیں زیادہ قریب ہوتا۔ لیکن غزل کے منفرد اشعار اس ابہام و اشاریت کے متحمل نہیں ہو سکتے جو میلارمے کے نظریۂ شاعری کا مقصود تھا۔ پال والیری سے جب یہ پوچھا گیا تھا کہ وکٹر ہیوگو کے کلام میں آپ کو کونسا بند سب سے زیادہ پسند ہے تو اس نے نفی میں جواب دیا تھا۔ کیونکہ اشاریت کا تعلق نظم کے مجموعی تاثر سے ہے۔ تمام اشعار کو آخری شعر پر مرتکز ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اشعار کا باہمی تعامل خود ایک نغمہ زا کیفیت پیدا کرتا ہے۔ غزل کے اکثر اشعار منفرد ہوتے ہیں، اس لئے اشاریتی نظریۂ شاعری کے مطابق یہ صنفِ سخن بالکل توجہ کے قابل نہیں رہتی۔ لیکن منفرد اشعار کی غزل اشاریت کے لئے جس قدر ناموزوں ہے غزلِ مسلسل اسی قدر زیادہ موزوں و مناسب ہے۔ غالب کے بعض اشعار میں مکمل اشاریت موجود ہے۔ یہ اشاریت اس کی الفاظ پر قدرت کا ملہ اور اسلوبِ اظہار کی پیچیدگی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں کچھ شعر ملاحظہ ہوں:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

تو اور آرائشِ خمِ کاکل!
میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

سمجھ اس فصل میں کوتاہیٔ نشو و نما غالبؔ
اگر گل سرو کی قامت پہ پیراہن نہ ہوجائے

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالبؔ
آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیٔ چشم و گوش ہے

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیٔ آزادی
ہوئی زنجیرِ موجِ آب کو فرصت روانی کی

جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی
تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی

اور اس طرح کے بہت سے اشعار غالبؔ کی ایک مخصوص اشاریت اور ابہام کی نمائندگی کرتے ہیں۔ غالبؔ کا ابہام میراؔجی کے ابہام سے کہیں زیادہ وقیع اور اہم ہے۔ ژولیدگیٔ بیاں غالبؔ کی شاعری کا فطری اسلوب ہے۔ لیکن میراؔجی کی بعض نظمیں اس سلسلے میں کامیاب کہی جا سکتی ہیں، کیونکہ وہ قاری کی کوششِ تفہیم سے مکمل مدافعت کرتی ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کی نظم "بعد کی اڑان" قابلِ ذکر ہے۔ اندازِ بیاں بہت پیچیدہ ہے۔ لیکن سعیٔ تفہیم ناشکور نہیں ہوتی۔ لکھتے ہیں:-

چوم ہی لے گا بڑا آیا کہیں کا کوا
اڑتے اڑتے بھلا دیکھو تو کہاں آپہنچا
کلموا، کالا کلوٹا کاجل
میں اگر مرد نہ ہوتا تو یہ کہتا تجھ سے

. . . .

وہ تو اک رات کے طوفان کا اعجاز تھا طوفان مٹا
کیسا طوفان تھا! اندھا طوفاں
جس کے مٹنے پہ مجھے نوحؔ کی یاد آتی ہے۔
اور پھر نوحؔ نے بیٹوں سے کہا
کھول دو پنجرا، اسے چھوڑ دو۔ اس فاختہ کو
جا کے خشکی کا پتہ لے آئے
چند لمحوں ہی میں وہ فاختہ لوٹ آئی مگر ناکامی
اس کی قسمت میں لکھی تھی،
اور پھر کوے کو چھوڑا، یہی خشکی کا پتہ لائے گا
اڑتے اڑتے بھلا دیکھو تو کہاں آپہنچا

. . . .

یہ پوری نظم بڑی خوبصورت ہے۔ اس میں ان تمام کیفیات کا بڑے دلنشیں اسلوب میں اظہار کیا ہے جو شاعر کے شعور و تحت الشعور میں شبِ وصال کے بعد پیدا ہوتی ہیں۔ شبِ وصال گزر چکی ہے۔ شب کی بدمستیوں نے محبوبہ کی آنکھوں کے کاجل کو رخساروں پر پھیلا دیا ہے۔ اسی کاجل کی لکیر کو جو صبیح رخساروں پہ پھیلی ہوئی ہے، وہ کالے کلوٹے کوّے کے نام سے پکارتا ہے۔ ماتھے کی بندی منتشر ہو کر مدار ستارے کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ وہ اس مدار ستارہ کو قدرے تعجب سے دیکھتا ہے کہ یکایک اسے غسل خانہ میں انگلی پہ سرخ نشان کی یاد آتی ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ "بندی" کو انگلیوں کے لمس نے مدار ستارے کی شکل دے دی ہے۔ وہ انگلی کا سرخ نشان تو غائب ہو گیا۔ لیکن اپنے پیچھے یادوں کے نقوش چھوڑ گیا ہے۔ "تان" جذبات کے تلاطم کے لئے استعمال ہوا ہے۔ پھر شاعر سوچنے لگتا ہے کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ گیسو بکھر گئے ہیں، کاجل رخساروں پر پھیل گیا ہے اور بندی کا سرخ نشان بھی پراگندہ ہو گیا ہے۔ وہ گزری ہوئی رات میں جذبات کی متلاطم کیفیت کو طوفان سے ایک اندھے طوفان سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ اسی اندھے طوفان کا اعجاز تھا جو ہر چیز بکھر گئی ہے۔ لیکن اب وہ طوفان مٹ چکا ہے۔ اسی طوفان کے مٹنے پہ اسے طوفانِ نوحؔ کی یاد آتی ہے۔ طوفانِ نوحؔ کی یاد سے رخساروں پر کاجل کی سیاہ لکیر سے آتی ہے۔ جیسے اس نے کوّے سے تشبیہہ دی ہے کیونکہ نوحؔ نے طوفان مٹنے کے بعد کوّے کو خشکی کا پتہ لانے کے لئے چھوڑا تھا۔

یہ نظم اندازِ بیان کے اعتبار سے اشاریتی نظریۂ شاعری سے قریب ہے۔ میراؔجی کی شاعری پر ہیئت اور مضامین دونوں اعتبار سے سخت تنقید کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کا یہاں موقع نہیں۔ اردو ادب میں ان کی اہمیت اس اعتبار سے زیادہ ہے کہ وہ اردو کا پہلا شاعر ہے جس میں

اشاریت نے جنم بھی لیا اور دم بھی توڑ دیا۔ گو مختار صدیقی، قیوم نظر اور اختر الایمان اور دوسرے شعراء نے بھی اس راہ پر چلنے کی کوشش کی ہے لیکن جلد ہی انہوں نے مختلف راہیں اختیار کر لیں۔ مختار صدیقی کی نظم "مغل معارین" اس سلسلے میں قابلِ ذکر ہے۔ اس نظم میں اس نے محبت کو ایک "نادرہ کار خالق" کے نام سے پکارا ہے۔ جس نے محبوبہ اور "تاج محل" دونوں کی تخلیق کی ہے۔ وہ اپنی محبوبہ کو اپنے جذبۂ عشق کی تخلیق کہتا ہے۔ اور تاج محل کو شاہ جہاں کے جذبۂ محبت کی تعمیر کہتا ہے۔ پھر وہ اپنی محبوبہ اور "تاج محل" کی باہمی مماثلت کو نمایاں کرتا ہے۔ اور آخر میں خود کو شاہ جہاں کے نام سے پکارتا ہے۔ اس کا مرکزی خیال یہ ہے کہ جذبۂ عشق ہی حسن کا خالق ہے۔ نظم بڑی خوبصورت ہے اور اشاریتی لب و لہجہ لئے ہوئے۔ اردو ادب میں اشاریت باقاعدہ تحریک کی صورت اختیار نہ کر سکی بلکہ رجحان کے طور پر نمودار ہو کر غائب ہو گئی۔ دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی اشاریت غائب ہو رہی ہے۔ بقول پروفیسر محمد حسن عسکری "نئی شاعری کا پہلا اصول ہے میلارمے اور والیری سے بغاوت" اس کی وجہ انہوں نے یہ بتلائی ہے کہ میلارمے اور والیری کی شاعری میں تجریدی عنصر کی فراوانی اور ٹھوس حسیاتی تجربے کے فقدان نے نئے شاعروں کو اشاریت سے منحرف کر دیا۔ لیکن اشاریت نے فرانسیسی ادب میں جو روح پھونکی تھی، وہ اب بھی پژمردہ نہیں ہوئی گو اپنی تاثیر کسی حد تک کھو چکی ہے۔ لیکن اشاریت کے اثرات واضح طور پر موجود ہیں۔ سوریلزم اور "وجودیت" دونوں اشاریتی عنصر سے خالی نہیں۔ آندرے بریتوں نے اشاریت ہی کے زیرِ اثر کہا تھا کہ "انتشار کو تحیر" میں بدل دو۔ سارتر نے کیرک گارڈ سے براہِ راست اثر نہیں لیا تھا بلکہ اشاریت کے مداحوں کے زیرِ اثر اس نے "وجودیت" تک رسائی حاصل کی۔ آج کا شاعر اس لئے بھی اشاریت کو نہیں اپنا سکتا کہ اشاریت غایت و مقصد سے دستبردار ہو جانے کا مطالبہ کرتی ہے۔ اور آج کا شاعر بغیر کسی مقصد کے میلارمے کے بحری سفر میں شریک نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کی کوئی منزل نہیں جیسا کہ آرتھر سیمنس نے کہا ہے۔ یہ معلوم کرنا تو آسان ہے کہ میلارمے نے کس چیز سے فرار کیا لیکن وہ کس چیز کی طرف بھاگا یہ معلوم کرنا بے حد مشکل ہے۔ اور آج کا شاعر اس لئے لکھتا ہے کہ بقول سارتر وہ "ایک مطلق" کی ضرورت کو پورا کرتا ہے یا پورا کرنا چاہتا ہے ٭

★

ہمارے ملک نے صنعت و حرفت، کاروبار تجارت، رسل و رسائل، مواصلات ہر میدان میں جو غیر معمولی ترقی کی ہے۔ اس سے ایک رنگا رنگ تصویر نظروں میں پھر جاتی ہے۔ تصویری صفحات میں ہم قومی نمائش۔ ۱۹۶۰ منعقدہ کراچی کے چند اہم مناظر پیش کر رہے ہیں جن سے اس نمائش کی خوبصورتی اور افادی پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ اور پچھلے دنوں اس نمائش کے ساتھ ہی ایک بین الاقوامی کانفرنس بھی کراچی میں ہوئی جو اہلِ تجارت و کاروبار کا ایک بڑا اہم اجتماع تھا۔ اس میں مختلف ممالک کے تقریباً ۵۰۰ نمائندگان نے شرکت کی۔ یہ ایشیائی اور مشرق بعید کے مسائل اور بین الاقوامی ایوانِ تجارت کے نمائندے تھے جن کا نواں اجلاس کراچی میں منعقد ہوا۔ یہ مذاکرات ۵ دن تک جاری رہے۔ اس تقریب کا افتتاح قائم مقام صدر پاکستان لفٹیننٹ جنرل جناب واجد علی برکی نے فرمایا۔ اور اہم اجتماعات سے ہمارے وزیر مالیات جناب محمد شعیب نے بھی خطاب کیا۔ ملک کے کاروباری حلقوں کے کئی سربراہوں نے اپنے ملک کی نمائندگی کرتے ہوئے پاکستان کا نقطۂ نظر اور اقتصادی و تجارتی کوائف پر روشنی ڈالی۔ کانفرنس کے مذاکرات میں سب سے اہم دیہی ترقی اور فلاحِ عوام پر خصوصاً زور تھا۔ جو انقلابی حکومت کا شروع ہی سے مطمحِ نظر اور خصوصی مرکزِ توجہ رہا ہے۔ چنانچہ وہ زرعی اصلاحات، بنیادی جمہوریتوں کے قیام اور دوسرے حقیقت پسندانہ اور قابلِ عمل پنجسالہ منصوبے کے ذریعہ اس پالیسی پر عمل بھی شروع کر چکی ہے۔ تجارت و کاروبار کے اس اہم اجتماع کی چند تصاویر اس شمارہ میں پیش کی جا رہی ہیں ٭

غزل

سیماب اکبرآبادی (مرحوم)

میں رہِ عشق میں بچتا ہوا رہبر سے چلا
پاؤں سے چلنے کی تقلید نہ کی سر سے چلا

رفعتوں کا مری گلشن میں نہیں کوئی حریف
کون یہ میرے نشیمن کے برابر سے چلا

طُورِ دیدار گہہِ دوست بنا، دل نہ بنا
جو نہ انساں سے چلا کام، وہ پتھر سے چلا

دل کی دھڑکن میں سُنی رات کو تیری آواز
کچھ پتہ تیرا چلا، تو دلِ مضطر سے چلا

کیا کوئی میرے سوا اور رہے شایانِ نشاط؟
ابر اُٹھ کر یہ کدھر چشمۂ کوثر سے چلا؟

آخرِ کار ہوا ختم شگفتِ دل پر
رنگ و بو کا وہ شگوفہ جو گلِ تر سے چلا

سر فروشی تھی خطا سرمدؒ و منصورؒ کے بعد
میری ملّت میں یہ دستور نئے سر سے چلا

تھا میں وہ مہرہ بساطِ عدم و ہستی کا
آ گیا پھر اُسی گھر لوٹ کے جس گھر سے چلا

پیکرِ خاک، کو بدنام نہ کر عالم میں
کہ ترا نام اسی خاک کے پیکر سے چلا

تھا تو انساں، مگر رفعتِ سدرہ تھی نصیب
دمِ پرواز میں جبریلؑ کے شہپر سے چلا

ہو گئے خود ہی یہ سب میرے مقدر میں دخیل
میں تو بچ بچ کے نظامِ مہ و اختر سے چلا

دیکھ اے حجرہ نشیں، قافلۂ اہلِ جمود
تیری باتوں سے چلا یا مری ٹھوکر سے چلا

میں کہ پیغمبرِ تہذیبِ سخن تھا سیماب
سلسلہ شعرِ مہذّب کا مرے گھر سے چلا

افسانہ:

بہار جلتی رہی!

(ایک طنز ایک حقیقت)

سلیمان پاشا

"سردی کی سرد راتیں بھی عذاب بن گئی ہیں، میرے لئے۔ اب میری زندگی کا کوئی آسرا نہیں۔ پیلے پان اور پکے آم کا کیا اعتبار۔ ہوا کا ایک جھونکا زندگی کا خاتمہ کر سکتا ہے" عبدل نے حقے کی نلی بوسے کرتے اور کھانستے ہوئے کہا۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ کھانستے کھانستے بیدم ہوگیا۔ چوپال پر بیٹھے ہوئے کسانوں نے اس کا سینہ سہلایا۔ سامنے الاؤ پر جلتی ہوئی آگ اب اس کے جسم کی حرارت کو قائم نہ رکھ سکتی تھی۔ نورا الاؤ سے مٹی کی پیالی ہاتھ میں لئے بھاگا تاکہ عبدل کے جسم کو سرما کی سرد ہواؤں سے بچا کر عارضی گرمی پہنچا سکے۔ نورا نے پیالی عبدل کو دیتے ہوئے کہا "گرم گرم چائے پی لو تاکہ تمہیں سکون ہو بابا۔" رحمن نے اپنی میلی پرانی صدری جس سے پسینہ کی بدبو آرہی تھی، اتار کر بابا کو پہنا دی۔ لیکن بابا کا جسم ان چیزوں سے عارضی گرمی ہی تو حاصل کر سکتا تھا۔ زندگی تو نہیں! اور زندگی بغیر روح کے ممکن نہیں۔ لیکن جو جینا ہی نہ چاہے اسے کون گرمی اور روح دے سکتا ہے؟

الاؤ کے چاروں طرف بابا کی کھانسی اور سانس کے دورے سے ایک ہیجان پیدا ہوگیا تھا۔ عبدل بابا کوئی اسّی کے لگ بھگ ہوگا۔ کبھی یہ بہت بڑا زمیندار تھا لیکن اب فقیر تھا۔ اور گذر اوقات صرف گاؤں کی روٹیوں پر تھی۔ دن رات سے لیکر گرمی، سردی، بارش سب ہی اس چوپال پر گذرتے تھے۔ دن بھر کھیتوں میں جا کر محنت کرنے کے بعد جب شام کو کسان کھانے پانی سے فارغ ہوتے تو چوپال پر جمع ہو جاتے۔ جب عبدل ہوش میں نہ ہوتا تو بڑی عقلمندی کی باتیں کرتا، نصیحتیں کرتا اور بیج بونے، فصل کاٹنے اور مناسب جگہ محفوظ کرنے اور مناسب وقت پر فروخت کرنے کی ہدایتیں دیتا۔ پھلوں کی دیکھ بھال کرنے، ان کو کیڑوں سے بچانے اور کھاد بنانے اور وقت پر ڈالنے کی ہدایات بھی سب کسان اس سے حاصل کرتے تھے۔ لیکن جب عبدل ہوش میں ہوتا تو بہکی بہکی باتیں کرنے لگتا جس پر کبھی کبھی کسان اسے پاگل خیال کرنے لگتے تھے۔ اب کون جانے اسّی سالوں میں اس نے کیا کیا گرم و سرد نہ دیکھے ہونگے، کتنی مصیبتیں نہ جھیلی ہوں گی اور کتنے دکھ نہ اٹھائے ہوں گے۔ لگان نہ دینے پر کبھی تو اسے پوری پوری فصل سے ہاتھ دھولینا پڑا ہوگا۔ اس کے مویشی تھانیدار کے گھر ہوں گے اور اس کی بیٹی تحصیلدار کے یہاں برتن مانجھنے پر مجبور۔ کتنے دن اسے حوالات کاٹنی پڑی ہوگی۔ کبھی کبھی تو لگان نہ دینے پر اس کے سر پہ جوتے بھی پڑے ہوں گے۔ اور صرف لگان کی خاطر اس کے گھر کے برتن، لوٹا تھالی تک بھی نیلام کر دئے گئے ہوں گے۔ کون جانے کیا کیا نہ ہوا ہوگا یہی وجہ تھی کہ اب وہ صرف بے ہوشی میں ہوش کی باتیں کرتا تھا، نصیحتیں کرتا تھا، کسانوں کو کہتا تھا "میرے بچوں! یہ تحصیلدار، تھانیدار، پٹواری وغیرہ سب بادشاہ ہیں ان کے قہر اور عذاب سے ہر وقت پناہ مانگتے رہو۔ ان میں اور خدا میں صرف یہ فرق ہے کہ وہ رزق پہلے دیتا ہے، پھر رحم کرتا ہے اور آخر میں قہر کرتا ہے۔ لیکن ان کے پاس نہ رحم ہے نہ روزی! صرف قہر ہی قہر ہے۔ ان کے اور ہمارے درمیان صرف اناج ہے اور اناج کی وہی صورت ہے جیسے دو بھوکوں کے درمیان صرف ایک روٹی کی ہو۔ ظاہر ہے جو طاقتور ہوگا، وہ روٹی کھلئے گا۔ اور جو کمزور ہوگا وہ ننگا بھوکا رہے گا۔ ہمارا کام صرف غلہ پیدا کر کے ان کے سپرد کر دینا ہے، اپنے لئے صرف جوتا لات، برہنگی اور فاقہ رکھ لینا ہے۔"

جب عبدل ہوش کی باتیں کرتا تو پاگل کہلاتا ہوش میں ہوتا تو کہتا "نورا بھاگ، وہ میری لڑکی تحصیلدار بھگائے لئے جا رہا ہے، چوٹی پکڑے ہے۔ دوڑ دوڑ! نورا کی لڑکی بھاگ گئی۔" پھر وہ زور زور سے قہقہے لگاتے لگاتے خاموش ہو جاتا کبھی کبھی وہ کہتا "مجھے معاف کر دو، میرا گھر نہ اجاڑو۔ میں لگان کی ایک ایک پائی دیدوں گا۔ میرا سامان نیلام نہ کرو میری لڑکی کا جہیز نہ تباہ کرو۔ میری لڑکی کا سہاگ نہ اجاڑو۔ مجھے چھوڑ دو، مجھے زندہ رہنے دو۔ میں ایک ایک پائی لگان کی ادا کروں گا!

آج چوپال پر شام ہی سے سب کسان جمع تھے۔ گاؤں میں تو میلہ تھا۔ اور کچھ عبدل بابا بھی خدا کے شکر سے صبح ہی سے بے ہوشی کے عالم میں تھے۔

کھانستے کھانستے بابا نے چار لی۔ اور چند منٹ خاموش ہو گئے سب منتظر تھے کہ آج ضرور کوئی اچھی سی بات کہیں گے۔ جو ان کی زندگی کی طرح اسّی سال پرانی ہوگی۔ پرانی چیز یا بات بھی جب بہت پرانی ہو جائے تو نئے انسانوں کے لئے بڑی عجیب غریب ہو جاتی ہے۔ اور لوگ اسے بڑے اشتیاق سے دیکھتے اور سنتے ہیں۔

بابا نے تھوڑی دیر کے بعد آنکھیں کھولیں اور ذرا تن کر بیٹھ گئے۔ اپنی نحیف اور خزاں رسیدہ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ ان کی بارعب آنکھیں پُر وقار بن گئیں۔ انہوں نے اپنے سر کو کھجایا اور کوئی چیز سر کے بکھرے اور الجھے ہوئے بالوں سے نکالی اور دونوں انگوٹھوں کے ناخنوں پہ مارتے ہوئے کہا۔

"اب اس چمن میں کبھی بہار نہ آئے گی۔ چاہے تم پسینہ کے بجائے اس دھرتی کو خون ہی کیوں نہ پلا دو۔ اپنے دیس کے تمام انسان ہی کیوں نہ اس پر قربان ہو جائیں۔ آج سے چالیس سال قبل یہ دھرتی مسکراتی تھی — جب دھرتی مسکراتی تو ہر چیز مسکرانے لگتی تھی۔ زمین کی مسکراتی اور اٹکھیلیاں کرنے لگتی تھی — ہوا کے مسکرانے سے کائنات کا ذرہ ذرہ مسکرانے لگتا تھا۔ اس زمین کا ریزہ ریزہ، اس پر اُگنے والا دھان، دھان پر چہچہانے والی چڑیاں مسکرانے لگتیں اور مسکراتے مسکراتے ناچنے لگتی تھیں۔ کبھی ایک نازک کونپل پر تو کبھی دوسری ننھی ننھی نازک ٹہنی پر بیٹھتی، اُچکتی، کودتیں اور مسکراہٹوں کو ایک شاخ سے دوسری شاخ تک بکھیر دیتیں ایک سمت سے دوسری سمت پہنچا دیتیں۔ یہ مسکراہٹ جب جوانی میں سماتی تو تائل بن جاتی۔ بن پٹے جھومنے لگتے۔ ہم سب اپنے گھروں سے نکلتے، کھیتوں میں پہنچتے۔ کسی کے پاس ڈھول ہوتے تو کسی کے پاس نقارے اور سنکھ ہوتے، کوئی البیلا بانسری اور اک تارہ لئے آتا ہم سب جوانی اور خوشی سے مست ہو جاتے اور خوب جھوم جھوم کر گاتے اپنی دھرتی کے لوک گیت۔ اپنی کلو دھوبن بھی ہوتی، اور رمنا چمار کی بھی۔ آشا سنارن بھی ہوتی اور — ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان نوجوان لڑکیوں کے سینوں میں مسرت، مسکراہٹ اور خوشی اب سما نہ سکے گی، پھوٹ نکلے گی یہ جوانی! — دودھ کی دھاروں کی طرح۔ اور پھر یہ جوانی کئی ایک معصوم روحوں کو جنم دے گی۔ آکاش مسکانے لگتا! دھرتی ناچنے لگتی۔"

"فصل بوتے، فصل کاٹتے۔ ایک بوتے سالم کاٹنے کتنی فیاضی تھی قدرت کی! کتنی فراوانی تھی غلہ کی، اجناس کی، دودھ کی گھی کی اور پھلوں کی۔ پھلوں سے ڈالیاں جھک کر زمین چومنے لگتی تھیں، پھولوں سے پودوں کے پتے چھپ جاتے تھے، فضا مہک اٹھتی، دھان بوتے تو کاٹتے کاٹتے تھک جاتے، رکھنے کی جگہ نہ ہوتی۔ کپاس بوتے تو ہر جگہ یہ ریشمی ریشے اڑتے نظر آتے جس کا جی چاہے حاصل کرے۔ پٹسن بوتے تو فضا میں ریشمی تاروں کا جال بن جاتا۔ دودھ دہی اور مکھن ہر گھر میں ہوتا۔ اس کا کوئی مول نہ ہوتا۔ دودھ شہد کو پیسے سے بیچنا پاپ تھا، پاپ۔"

"بابا یہ اس دھرتی کی بات تو نہیں جس میں ہم رہتے ہیں" نور رانے تعجب سے پوچھا۔

"بیٹا! یہ اسی دھرتی کی بات ہے لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب تم نہ تھے اور یہ کھیت ہمارے کھیت تھے۔ ہمارے باغوں پر ہماری بادشاہت تھی۔ ہمارے مویشی ہم کو پیارے تھے۔ ہم دھرتی کے مالک تھے اور جب زمین کا بیچنا بھی گناہ تھا۔ ہمارے گاؤں میں کوئی بھوکا نہ رہتا تھا۔ کوئی ننگا نہ تھا۔ اور دوا کی تو ضرورت ہی نہ تھی۔ اس لئے کہ سب چیزیں قدرت کی بنائی ہوئی کھاتے تھے۔ اپنی بنائی ہوئی نہ کھاتے تھے۔"

رحمان جواب تک چپ بیٹھا، بابا کی باتیں سن رہا تھا۔ بولا اب بھی تو ہم سب چیزیں قدرت کی بنائی ہوئی کھاتے ہیں۔ انسان نے کیا بنایا ہے جو کھایا جا سکے۔"

بابا ذرا سنبھلے اور انہوں نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا "ہاں میرے بچے! انسان نے بہت سی چیزیں بنا دی ہیں جو آج ہم کھاتے ہیں۔ دودھ کے بجائے سنگھاڑا کھاتے ہیں گھی کے بجائے بنولہ کھاتے ہیں۔ مکھن کے بجائے ہم وہ کھاتے ہیں جو موٹریں کھاتی ہیں۔ گیہوں کے بجائے ہم آٹا کھاتے ہیں وہ آٹا جو سرکنڈوں اور بھوسے سے تیار کیا جاتا ہے جیسے جانور کھاتے ہیں۔ ہاں بیٹا!" بابا نے بڑی طنزیہ مسکراہٹ سے کہا۔ "مرغ کے بجائے ہم سرخ رنگ کپڑے رنگنے کا کھاتے ہیں۔ اور دھنیے کے بجائے ہم برادہ کھاتے ہیں۔ سب کچھ کھاتے ہیں، دھوکہ ہی دھوکہ کھاتے ہیں۔ فریب ہی فریب

کھلتے ہیں!"

"مگر تم میں سے کسی نے کبھی سوچا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس حسین وادی اور اس خوبصورت گاؤں سے قدرت نے اپنی بہار کیوں چھین لی؟ یہ چمن کیوں اجاڑ ہو گیا؟ یہ بہار کیوں جلنے لگی۔ بادِ صبا کے بجائے یہ لو کیوں چلنے لگی؟ اصلیت کے بجائے دھوکہ کیوں کھانے لگے؟"

چالیس سال میں چار سو سال کا کیوں فرق ہو گیا، صرف اسلئے کہ انسان نے چار سو میں کچھ اور شامل کر دیا۔ یہ دھرتی، سونا اور چاندی اگلنے والی دھرتی، یہ امرت کی ندیاں، یہ پھولوں میں رنگ ہی رنگ بھرنے والی کرنیں، یہ پھلوں میں رنگ، مزہ اور خوشبو پیدا کرنے والی ہوائیں سب کیوں بدل گئیں؟ یہ زندگی کا سویرا رات کی تاریکی میں کہاں کھو گیا؟ اور جب آنکھ کھلی تو ہم در در بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئے! ہم روٹی، پانی، کپڑے اور گھی دودھ تک خیرات مانگنے پر مجبور ہو گئے۔ ہمیں زندگی کی ہر سانس کیوں غیروں سے بھیک مانگنی پڑی؟ وہ غلہ جس کی کوئی قیمت نہ تھی کیوں ناپ کر تول کر ملنے لگا؟

آج بھی وہی زمین ہے، وہی آسمان ہے۔ وہی ہوا اور وہی پانی ہے۔ میرے بچوں! نورا۔ رحمان کیا تم محنت نہیں کرتے؟ کیا تم زمین کے سینہ کو چیر کر اناج نہیں بوتے؟ انگریزی کھاد، انگریزی بیج نہیں ڈالتے؟ انگریزی دیوزاد مشینیں تمہاری دھرتی کو کمر کمر چیر کر اس کے سینہ کے دونوں پلڑوں کو الگ نہیں کر دیتیں، کیا اُودے اُودے نیلے نیلے آسمان کے تلے ہمارے دیس کی کنواریوں کے بالوں کی رنگت کے بادل ہماری زمین کی پیاس نہیں بجھاتے؟ کیا تمہارے چوڑے چکلے سینے اپنی زمین کو اپنا خون نہیں پلاتے؟ تمہارے جسم سے نکلتے ہوئے سینہ کے قطرات شبنم کی طرح جذب نہیں ہوتے؟ مگر دیس بھوکا ہے ننگا ہے۔ کیوں؟ آؤ، آج میں تمہیں تمہارے دشمنوں سے ملا دوں — دوست نما دشمن، کالے ناگ جو تمہاری زمینوں کا سہاگ تم سے چھین لیتے ہیں، تمہاری محنت کی کمائی لوٹ لیتے ہیں۔ اور تمہیں بھیک مانگنے پر مجبور کرتے ہیں۔ تمہارے دھان کی بالیں۔ دشمنوں کی غذا بن جاتی ہیں۔"

"ملو، ان سے ملو۔ کلو۔ رحمان دوڑو۔ تمہاری لڑکی کو تحصیلدار بھگا کر لے جا رہا ہے۔ پکڑ لو۔ دوڑ لو۔ وہ چوٹی پکڑ لے۔ رحمان۔ رحمان دوڑو۔ وہ گوداموں کا تالا ٹوٹا۔ وہ دھان لاریوں پر لاد کر لے چلا۔ دوڑو دوڑو۔ ہم بھوک کے مر جائیں گے۔ یہ ہمیں بھوکا مار ڈالیں گے۔ لٹیرے ڈاکو کہیں کے۔"

"یہ چلے کپاس کے گالے۔ یہ سب قطار در قطار۔ دشمن کی طرف اڑتے ہوئے۔ بھاگو طوفان آیا۔ بھاگو سیلاب آ رہا ہے۔ بھاگو۔ سیلاب آیا۔ یہ ریشمی ریشہ کے جال اڑنے لگے۔ یہ سب جال اب ماہی گیر کے جال کی طرح دشمن کی ندی میں گریں گے۔ اب جالوں سے کوئی سنہری روپہلی مچھلی ماہی گیر کے ہاتھ نہیں لگ سکتی۔"

بابا گھبراہٹ اور خوف سے کانپنے لگا۔ مگر اس کی زبان چل رہی تھی۔ ایک گرامو فون کی مشین کی طرح جس کی چابی ختم ہو رہی تھی، بابا کی آواز بکھر گئی! "اب ہماری زمین بیوہ ہو جائے گی۔ ہمارے گاؤں میں قحط آ جائے گا، لوگ دانہ دانہ کو محتاج ہو جائیں گے، لوگ بھوک سے مر جائیں گے۔ بھاگو۔ آگ لگ رہی ہے۔ ہر چیز سرحد پار جا رہی ہے بھاگو۔" بابا پر چلاتے چلاتے کھانسی کا دورہ پڑا اور وہ بیدم ہو گیا۔ بابا کا سانس رکنے لگا۔

کہیں دیر میں جا کر کچھ سنبھلا۔ اور اس کا چہرا چمک اٹھا۔ جیسے کوئی بجھتا ہوا دیا یکدم لو دے اٹھے۔ اس کے چہرے پہ ایک نورانی مسکراہٹ چھا گئی۔ اور وہ بولا "ہاں ہاں۔ یہ سب کچھ ہے یہ سب کچھ تھا۔ مگر اب۔ اب۔ میری یہ بوڑھی آنکھیں کچھ اور بھی دیکھ رہی ہیں۔ دیکھ چکی ہیں۔ اور تم، میری آنکھوں کے نور، اور بھی بہت کچھ دیکھو گے۔ اب رُت بدل رہی ہے۔ تیزی سے، بڑی تیزی سے۔ گیا وہ زمینداری کا دور گیا۔ وہ تھانیدار، وہ تحصیلدار، وہ پٹواری سب کے سب لد گئے۔ چند ہی دن میں کیا سے کیا ہو گیا۔ اب وہ برسوں پہلے کی رت سے بھی اچھی، سہانی رت، چہکتی بولتی زندگی آ گئی۔ اب ہم ہی ہم ہیں ہم ہی ہم..... یہ دھرتی، یہ غلہ، یہ پھل پھول، دھن دولت سب ہمارا اپنا ہے۔ خدا کرے۔ جو ہماری پرانی پود نہ پا سکی وہ نئی پود پا لے۔ خوشی ہی خوشی۔ شادی ہی شادی ..." شادی! اس لفظ پر بابا کا سانس رکنے لگا۔ جیسے وہ اس کی تاب نہ لا سکا ہو۔ پاگل ہو گیا ہو۔ جانے کیا بات تھی۔ اور تھوڑی دیر میں وہ پاگل بابا اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ایک روشنی، ایک مسکراہٹ کھیل رہی تھی — پاگل بابا، پاگل — مگر کتنے سیانوں سے زیادہ سیانا پاگل!

★

بنگلا افسانہ:

لا = ۰

عبد الغفار چودھری
مترجم: احمد سعدی

"شیلی! نہ معلوم کیوں آج تمہیں آپ کہہ کر مخاطب کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ دل چاہتا ہے تمہیں تم، تم، تم اور صرف تم کہہ کر مخاطب کر دوں، آج میری دنیا میں جیسے صرف تم ہی تم دکھائی دے رہی ہو..."

چند سطریں لکھنے کے بعد رضوی اٹھ کھڑا ہوا۔ میز پر ایک زرد رنگ کا لفافہ پڑا ہوا تھا۔ اس پر شناسانہ تحریر میں کے۔ کے۔ رضوی، ۲۲/۵ بی، میمن سنگھ روڈ، ڈھاکہ لکھا ہوا تھا اور اس کے اندر نیلے رنگ کے کاغذ پر لکھے ہوئے خط میں مکتوب الیہ کو رضوی صاحب کے القاب سے مخاطب کیا گیا تھا۔

خط پر ایک نظر ڈالنے کے بعد رضوی نے اسے دوبارہ میز پر رکھ دیا۔ میز کے قریب ہی ایک تپائی پر ایش ٹرے تھا جس میں بہت دیر سے پڑا ہوا سگریٹ جلتے جلتے ختم ہو رہا تھا اور دھوئیں کی پتلی سی بل کھاتی ہوئی لکیر فضا میں تحلیل ہو رہی تھی۔ پیچھے مہوگنی کی ایک بڑی سی الماری تھی، جس کے دونوں تختوں پر اسی سائز کا آئینہ لگا ہوا تھا۔ آئینہ میں رضوی کا عکس بالکل ساکت تھا۔ کمرے میں دو تین چکر لگا لینے کے بعد وہ الماری کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ شیو کافی بڑھ گیا تھا۔ سر کے سامنے کے حصہ میں اس کے خوبصورت گھونگریالے بال بکھرے ہوئے تھے۔ کان کے قریب بالوں پر گرد کی ہلکی سی تہہ جمی ہوئی تھی۔ سامنے دیوار پر اس کی ایک خوبصورت تصویر آویزاں تھی۔ گھونگریالے بال پیشانی پر جھول رہے تھے۔ دونوں بھنویں جڑی ہوئی، ستواں ناک، ہونٹوں پر مونچھ کی پتلی سی لکیر۔ بیس سال کی عمر کی اس تصویر اور تیس سال کے عکس میں کتنا فرق تھا! کہاں دھان کے پودے کی طرح دبلا پتلا، تلوار کی دھار کی طرح تیز اور چمکیلا جسم اور کہاں موٹا پا لئے ہوئے بے ڈول جسم اور اداس، بے رونق چہرہ۔

میز کے قریب واپس آکر رضوی نے خط کو پرزے پرزے کر کے پھینک دیا۔ اس کے بعد بیٹھ کر پھر خط لکھنے لگا۔

"ڈیر مسز خان! آپ کا خط ملا، جواب دینے میں ایک دن کی تاخیر کیوں ہوئی، جانتی ہیں؟ مشتری کی تصویر کا شیشہ کل اچانک دیوار سے گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، اب دوبارہ اسے فریم بھی کرایا نہیں جا سکتا کیونکہ تصویر بھی برباد ہو گئی ہے۔ دیکھا تو معلوم ہوا گتے کو بھی کیڑوں نے چاٹ کر جھرجرا کر دیا ہے، جانے دیجیے تم آپ کیسی ہیں؟ آپ تو لڑکیوں کی ایک جماعت کو ساتھ لئے تمنائی عظیم کرسی پر بیٹھ کر پیچھے نیلگوں افق پر چھائے ہوئے سنہرے رنگ کو ضرور ہی بھول جاتی ہوں گی۔ ماضی کو آپ بھول چکی ہوں گی۔۔۔ بالکل فطری بات، لیکن موجودہ زندگی میں کیا آپ کو اس کا ذرا بھی عکس نظر نہیں آتا؟

"آپ نے میری خیریت دریافت کی ہے۔ اچھا ہوں، لیکن یہ اچھائی بھی بڑی تکلیف دہ، بے کیف اور بے رنگ ہے۔ میمن سنگھ روڈ پر سورج طلوع ہوتا ہے اور سر خیاٹل لیک میں غروب ہوتا ہے، اس کے درمیان دفتر، فائل، ریکارڈ اور ریفرنس کا ایک کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ اپنے مقابلہ میں آپ کو بہتر سمجھتا ہوں۔ آپ کا اسکول ضرور کسی اونچے سے ٹیلے پر ہوگا۔ چھوٹی بڑی، درمیانہ عمر کی بہت ساری لڑکیوں کے قہقہے گونجتے ہوں گے۔ محبت، ڈانٹ، شرارت اور فرمانبرداری کا بڑا میٹھا مدھر ماحول۔ کم از کم آپ تنہا ہوتے ہوئے بھی تنہائی سے خوف نہ کھاتی ہوں گی۔

"مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہر روز شام کو جب دھان کے پودوں کا بالائی سرا کشتی کے بادبان کی طرح ہوا کے جھونکے پر ہلکورے لیتا رہتا ہے۔ اس وقت دور رویہ سپاری کے درختوں کے درمیان سبزے سے ڈھکے ہوئے راستے چل کر آپ اپنے کوارٹر میں واپس ہوں گی اور ممتاز کی تصویر کو بڑے پیار اور اہتمام سے صاف کرتی ہوں گی۔ مغرب کی طرف کے کھلے ہوئے جنگلے سے افق پر چھائی ہوئی سرخی کا عکس کمرے میں آکر ممتاز کی تصویر کو اور بھی مدھر اور بھڑک اور پیارا بنا دیتا ہوگا۔ بڑا رشک آتا ہے، جی چاہتا ہے اس زندگی کو تیاگ کر میں اسی تصویر

میں سما جاؤں۔"

خط کو لفافہ میں بند کرکے وہ دیر تک اصل پتہ پر لکھتا رہا "مسز سہیلی ممتاز خان، کروناگر گرلس اسکول، کروناگر۔"

تین دن بعد اس خط کا جواب آگیا۔" آپ نے غلط لکھا ہے میرے پاس ممتاز کی کوئی تصویر نہیں۔ شادی کے بعد ہم دونوں نے ایک ساتھ ایک تصویر کھنچوائی تھی، وہ بھی کہیں گم ہوگئی ہے۔ دل کو ٹٹول کر تلاش کرنے کے باوجود اسے نہیں پاتی۔ وہ ناک، وہ آنکھیں، وہ چہرہ، جو کبھی مجھے اپنی پانچ انگلیوں کی طرح پیارے اور جانے پہچانے تھے، اب جیسے ایک ایک کرکے سبھی کچھ کھو چکی ہوں۔ آپ پھر بھی اچھے ہیں اور میں؟ تنہائی میں کوئی بھی تنہا نہیں ہوتا۔ اپنے دل سے باتیں کرتا ہے، ہنستا ہے، روتا ہے، لیکن بہنوں کے مجمع میں بھی میرا دل لاپتہ ہے، میں سچ مچ تنہا ہوں۔

"معلوم ہے، کروناگر میں بہار آئی ہے۔ بڑا حسین موسم ہے۔ آسمان پر، زمین پر، درختوں کے پتوں اور ہواؤں میں حسن اور کیف بھر گیا ہے۔ بڑا سہانا منظر ہے۔ اس وقت میرا یہ احساس اور بھی شدت اختیار کرلیتا ہے، جب میں اسکول کی اونچے درجوں کی طالبات کو دیکھتی ہوں اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے موسمی پھولوں کی طرح وہ سب اَن گنت رنگوں میں کھل اٹھی ہوں۔ آنکھوں میں گہرے نیلے ستارے، جسم پر زرد، سرخ بینگنی ساڑیاں۔ گہرا رنگ، باتوں میں شوخی، لہجے میں گہرائی اور رنگینی۔ جب چلتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اڑنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ میں اکثر اپنے آپ کو بھول جاتی ہوں اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میری عمر بھی اٹھارہ سال کی ہوگئی ہو۔

" ایک بار آئیے نا۔ یہاں اسکول کا مہمان خانہ ہے۔ اگر آپ نے پہلے ہی خبر بھیج دی تو میں بھوجو دربان کو اسٹیشن پر بھیج دوں گی....."

رضوی نے دھیرے سے مسکرا کر خط کو جیب میں رکھ لیا۔

پندرہ دنوں کے اندر اسے چار خط اور ملے۔ آخری خط میں رضوی نے لکھا تھا۔ "سہیلی! میں آرہا ہوں، لیکن اسٹیشن پر تم خود آنا۔"

ٹرین کروناگر صبح چھ بجے پہنچی تھی۔ پانچ بجے بستر سے اٹھ کر غسل کرنے کے بعد رضوی نے کرتا پاجامہ پہن لیا، ایک سگریٹ سلگایا اور تیار ہو کر بیٹھ گیا۔ بہت دنوں بعد ایک بار پھر وہ سہیلی کو حیران کردے گا۔

ٹرین آدھ گھنٹہ دیر سے پہنچی۔ سہیلی تھوڑی دیر پہلے ہی اسٹیشن آگئی تھی۔ وہ اپنے سر پر چینی چھتری نچاتے ہوئے مسافروں کو دیکھ رہی تھی، رضوی کو دیکھتے ہی آگے بڑھ آئی اور بولی۔ " تو آپ آگئے، آئیے....."

پلیٹ فارم مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ سڑک پر پہنچنے کے بعد جب بھیڑ بھاڑ ذرا کم ہوئی تو رضوی نے دھیرے سے مسکرا کر کہا۔ "آئیے نہیں۔ آؤ۔ خط و کتابت میں کیا ہم دونوں 'تم' کی حد تک نہیں پہنچ چکے ہیں۔؟"

سہیلی کے چہرہ پر دوشیزاؤں جیسا خوبصورت حجاب نہیں تھا، پھر بھی اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اس نے کہا "یاد ہے، لیکن پہلے پہل کہنے پر شرم آرہی تھی۔"

دائیں جانب دھان کا کھیت، بائیں جانب سپاری کے باغ اور درمیان ایک پتلا سا راستہ تھا۔ تھوڑی دور پر ایک نہر بہہ رہی تھی۔ اور اس کے اوپر بانس کا بنا ہوا پل جھکا ہوا تھا۔ رضوی نے پل دیکھ کر کہا "مار دیا! اب کس طرح پار ہوں گے؟ مجھے تو اس کی ذرا بھی عادت نہیں۔"

سہیلی مسکرائی "لیکن مجھے تو عادت ہوگئی ہے۔ اگر گاؤں قریب نہ ہوتا تو میں ہاتھ پکڑ کر پل پار کرا دیتی۔" "گاؤں ہے تو کیا ہوا؟"

"ارے باپ! میں گاؤں کے لوگوں کی نظروں میں دیوی بنی ہوئی ہوں۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو کلنکی ہو جاؤں گی۔"

اس نے غور سے سہیلی کی طرف دیکھا۔ نہیں، یہ وہ سہیلی نہیں تھی۔ وہ سرو قد، نازک اندام چنچل لڑکی یہ نہیں تھی۔ بلکہ اس کے برعکس ایک معمر اسکول مسٹرس جیسے اس کی راہنمائی کر رہی ہو۔ خط کی سہیلی اور اس سہیلی میں جیسے کوئی مماثلت ہی نہ ہو۔

پل پر چڑھنے کے بعد سہیلی نے اپنی چینی چھتری اس کی طرف بڑھا دی ــ "اسے تھام لو۔" پھر اسے پل کے دوسری طرف اتارتے ہوئے بولی "اب ہم لوگ تقریباً پہنچ گئے ہیں وہ دیکھو، تھوڑی ہی دور مہمان خانہ نظر آرہا ہے۔ دکھائی دیا؟"

رضوی نے دیکھا۔ ناریل کے پیڑوں کے پتوں کی اوٹ سے ایک بنگلہ نما عمارت جھانک رہی تھی، چاروں طرف اینٹ کی چہار دیواری کھنچی ہوئی تھی، بڑے دروازے کے دونوں جانب پام کے دو چھوٹے چھوٹے پیڑ تھے۔ بڑے دروازہ کے اندر داخل ہونے کے راستہ پر ایک پتھر کی مورتی تھی۔ عورت کی مورتی، بالکل بے زرد۔ ایک ہاتھ میں سمٹا ہوا دوپٹہ، دوسرا ہاتھ اوپر کی طرف اٹھا ہوا تھا۔

رضوی نے محویت کے عالم میں کہا " بہت خوبصورت ہے۔"

"ہاں" سہیلی نے جواب دیا "لیکن اس عمارت کا نام اور بھی خوبصورت ہے، کلوپیٹرا کیسل۔"

رضوی چونک پڑا "اچھا، مگر وہ کیوں؟"

عورت کی مورتی کو بائیں جانب چھوڑ کر سہیلی آگے بڑھ گئی۔

"ہاں یہی نام ہے۔ آؤ، میں تمہیں کلوپیٹرا بھی دکھاؤں۔ کلوپیٹرا ہی کی طرح اس کی زندگی بھی پُراسرار ہے۔"

زینہ سفید سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا۔ اوپر جاتے ہی ایک وسیع و کشادہ کمرہ تھا، جس کے ہر جنگلے کے اوپر نصف چاند کی شکل بنا کر اس میں سرخ، نیلے، زرد اور سبز، مختلف رنگوں کے شیشے کے ٹکڑے جڑے ہوئے تھے۔ اور ان ٹکڑوں پر سورج کے سات رنگ بکھر کر کمرے میں تمام دن قوس قزح کا رنگ پھیلاتے رہتے تھے، دیوار پر ٹنگے ہوئے ہرن کے سینگ میں اپنی چھتری لٹکا کر سہیلی نے کہا "وہ دیکھو۔"

رضوی نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ دیوار پر ایک بڑی سی روغنی تصویر آویزاں تھی۔ ایک خوبصورت عورت کی تصویر، قدیم یونانی تصویروں کی طرح، کندھا کٹا بلاؤز، سڈول بازو، باریک ساڑی گردن پر سے خم کھا کر پھیلتی ہوئی جھول رہی تھی۔ ستواں ناک، بڑی بڑی کشادہ آنکھیں جیسے اس کی مست و معطر جوانی کے گرد گلابی رنگ کا جال پھیلا ہوا تھا۔ گویا یونانی مجسمہ میں کسی بنگالی لڑکی کی روح ڈال دی گئی تھی۔ تصویر کے نیچے بڑے بڑے حروف میں لکھا ہوا تھا: بیگم صورت النساء فردوس مالکہ شمس آرا فخر یار، تاریخ پیدائش ۱۴ رجب ۱۳۳۴ھ، وفات ۱۲ رمضان ۱۳۶۳ھ"

لوگوں کی آہٹ سن کر دربان آ کر کھڑا ہو گیا۔ سہیلی نے کہا "بھوجو! انہیں سونے کا کمرہ، باتھ روم دکھا دو۔ کھانے پینے کا انتظام کر دو، یہ سات دن یہاں رہیں گے۔"

رضوی نے اس کی طرف دیکھا "اور اس کے بعد؟"

"اب مجھے اجازت دو۔ اسکول کا وقت ہو گیا ہے۔ شام کو تیار رہنا، میں آؤں گی۔ اس وقت اطمینان سے باتیں کروں گی، کچھ خیال مت کرنا"

سہیلی تیزی سے باہر چلی گئی اور ہرن کے سینگ میں اس کی رنگین چھتری جھولتی رہی۔

سہیلی کے چہرہ پر اب بھی بلاشبہ حسن اور ملاحت باقی تھی۔ صبح کے وقت اس نے جسے شباب کی حد سے گزر جانے والی استانی سمجھا تھا وہی شام کے وقت ایک حریص بھونرے کی طرح اڑ کر اس کے پاس آ گئی تھی۔

رضوی گول برآمدے میں بیٹھا ہوا چائے کی چسکی لے رہا تھا۔ سہیلی پاتا بہار کے پیڑ کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی۔ رضوی اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔

سیاہ ساڑی میں وہ بے حد خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سیاہ ساڑی کے پیچ و خم میں کوئی خوبصورت سفید گلاب کھلا ہوا ہو۔ ویسے بھی سہیلی کا رنگ گورا تھا اور اس وقت اس کا گورا رنگ سیاہ ساڑی میں جگمگا اٹھا۔ سہیلی کی آنکھیں حجاب سے جھک گئیں۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟"

"تمہیں دیکھ رہا ہوں!"

"چھی! نظریں نیچی کرو۔"

"کیوں؟"

"میری عمر کچھ کم تو نہیں۔ تقریباً ستائیس سال کی ہو چکی۔ اس پر سیاہ اور سفید کپڑوں کے علاوہ دوسرے رنگوں کے کپڑے پہن بھی تو سکتی۔"

سہیلی کچھ افسردہ سی ہو گئی۔ رضوی اپنی کرسی کھسکا کر پاتا بہار کے پیڑ کے نیچے لے گیا اور بولا "بیٹھو۔"

ایک دوسری کرسی کھینچ کر سہیلی بیٹھ گئی۔

"میں کروں نا مگر کیوں آیا ہوں، جانتی ہو؟" رضوی نے چائے کی خالی پیالی میز پر رکھ دی اور غور سے سہیلی کا چہرہ تکنے لگا۔

سہیلی یکایک جلدی سے بول اٹھی "دیکھو تو کتنی عجیب بات ہے۔ میں نے اب تک تمہیں اصل بات تو بتائی ہی نہیں۔"

رضوی کا دھیان بٹ گیا۔ اس نے پوچھا "کیا؟"

"مجھے ترقی مل گئی ہے۔ یقین نہیں آتا؟ یہ دیکھو، یہ مجلس انتظامیہ کا خط ہے۔"

"مبارک ہو!" رضوی مسکرایا۔ اس کے بعد جیب سے سگریٹ کیس نکال کر ایک سگریٹ سلگایا۔

سہیلی پاتا بہار کی اوٹ سے باہر آ کر بولی "چلو ذرا گھوم آئیں۔"

"بہت اچھا" رضوی اٹھ بیٹھا۔

اب وہ گاؤں کے پتلے راستہ کی بجائے چوڑے راستہ پر چل رہے تھے۔ کہیں کہیں کوئی ابھرا ہوا اینٹ کا کونہ راہ چلنے والوں کے لئے بڑا خطرناک معلوم ہوتا تھا۔ دونوں جانب جھاؤ کے پیڑ کی قطاریں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔

رضوی نے کہا "اب تم اپنی کلوپٹرا کی کہانی سناؤ۔"

"ان کی تصویر تم نے دیکھی ہے نا؟" سہیلی نے پوچھا۔ "یہ گاؤں، اس گاؤں کی زمینداری کلوپٹرا کیسل، اسکول، سب کچھ ان ہی کا ہے۔ ورنہ پس ماندہ گاؤں میں لڑکیوں کے اسکول کی تم توقع کر سکتے ہو؟"

رضوی نے دھوئیں کا مرغولہ چھوڑتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے، اب تو کافی ترقی یافتہ ہے۔ دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہاں کبھی اصطبل میں گھوڑے، فیل خانہ میں ہاتھی اور حرم میں لاتعداد۔۔۔"

سہیلی نے دھیرے سے مسکرا کر اسے ٹوکتے ہوئے کہا "نہیں، حرم میں صرف ایک صورت النسا فخر بانو ہی تھیں۔"

"یقین نہیں آتا۔"

"اچھا تو پھر پہلے کہانی سن لو۔"

"بہت خوب" رضوی جھاؤ کے ایک پیڑ کے سایہ میں کھڑا ہو گیا۔ یہاں سے پورا گاؤں نظر آ رہا تھا۔ دور تک سنسان اور ویران کھیت نظر آ رہے تھے فصل کٹے ہوئے بہت دن ہو چکے تھے اور اب چند لڑکے اس میدان میں اپنے ہاتوں میں لوٹی ہوئی ڈور پتنگ اٹھا رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔

سہیلی نے کہا "تم نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ ایک اونچے سے ٹیلہ پر میرا اسکول ہے، سچ مچ ایسا ہی ہے۔ وہ دیکھو، مصنوعی پہاڑی کے اوپر میرا اسکول ہے گویا ننھا لکڑی کا گھر، چھت پر ٹائل کی چھت ہے۔ ہوسٹل بھی قریب ہی ہے۔ پڑھنے والی لڑکیوں کی تعداد کتنی ہے، جانتے ہو؟ ڈیڑھ سو۔"

"اچھا!" حیرت کے اظہار کے ساتھ ہی رضوی نے پھر سگریٹ کا دھواں فضا میں اگل دیا۔

سہیلی پھر چلنے لگی "میں غلط نہیں کہتی، پہلے پہل جب میں یہاں آئی تھی تو میں نے بھی اس گاؤں کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ میں نے اسے محض ایک غیر ترقی یافتہ گاؤں سمجھا تھا لیکن یہاں آنے کے بعد محسوس کیا کہ میں نے اس گاؤں سے متعلق جو کچھ خیال کیا تھا حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔"

سہیلی چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گئی پھر مسکراتے ہوئے بولی "اس گاؤں کے زیادہ تر لوگ تعلیم یافتہ ہیں اور یہ محض فخر بانو کی وجہ سے ہے۔ اپنے گھر یعنی پیلس کو بھی وہ کالج بنانے کے لئے وقف کر گئی ہیں۔ اسی راستے پر تھوڑی دور جانے کے بعد ہم لوگوں کا اسٹاف کوارٹر ہے۔ پہلے وہ اسٹیٹ کے نائب گماشتہ کا محل تھا۔ زمینداری اب نہیں رہی، لیکن دوسری تمام چیزیں باقی رہ گئی ہیں۔"

رضوی چپ چاپ چلا جا رہا تھا۔ "اب اصل بات کی طرف آؤ۔ تم اپنی معزز بیگم صاحبہ کی کہانی سناؤ۔"

اس وقت سورج سپاری کے پیڑ کی اوٹ میں چھپ گیا تھا۔

سہیلی نے کہا "جب میں یہاں آئی تو میں نے سب سے پہلے کلوپٹرا کیسل کے دربان کی زبانی یہ کہانی سنی تھی۔ یہ نام خود فخر بانو ہی نے رکھا تھا۔ دراصل یہ عمارت زمینداری کے زمانہ میں مہمان خانہ تھی لیکن فخر بانو مرنے سے پہلے اسی عمارت میں آ رہی تھیں۔"

"کیوں؟" رضوی نے مڑ کر دیکھا۔

"مرنے کے لئے، انہوں نے اپنے پہلے شوہر سے بے وفائی کی تھی!" سہیلی سنجیدہ ہو گئی۔ بولی "فخر بانو اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھیں، وہ اپنے خاندان کی دوسری لڑکیوں کی طرح پردے میں رہ کر جوان نہیں ہوئی تھیں بلکہ تجھون میں تعلیم حاصل کی تھی۔ آگرہ، دلی، کراچی اور لاہور کی سیر کرتی پھری تھیں، لیکن آخر میں کرونا نگرا اسٹیٹ کے بارہ آنہ گیارہ پائی کے حصہ دار سے ان کی شادی ہو گئی، جس کے خیالات پرانی وضع کے تھے۔ سوچنے سمجھنے کے انداز اور مزاج میں ایک جگ کا فرق تھا۔ شوہر کو شکار، سیاست، دولت، عزت، اور مقدمہ کا شوق تھا اور فخر بانو کو تصویروں، ناچ، گانے، مجلسوں اور پارٹیوں سے لگاؤ تھا۔ وہ جلد ہی اسٹیٹ کے لندن رٹرن نوجوان منیجر کی طرف مائل ہو گئیں۔ ان کے شوہر سکندر خان کو اس کا علم ہو گیا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتے، اس عظیم زمیندار کا ایک دن اچانک انتقال ہو گیا۔"

"انتقال؟" رضوی چونک پڑا۔

"ہاں، اور اس کے چند ماہ بعد ہی نوجوان منیجر پیلیس میں آ کر رہنے لگا۔ سکندر خاں کی کوئی اولاد نہ تھی، نہ کوئی وارث تھا۔ سب نے سمجھا بیگم صاحبہ نے دوسری شادی کر لی ہے۔ لیکن میں؟

بعد ہی منیجر کو ملیں سے نکال دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کی ملازمت بھی ختم ہو گئی۔ اس واقعہ کے بعد ایک سال تک بیگم صاحبہ اسی مہمان خانہ میں رہیں اور بے شمار دولت خیرات کر دی، پہلے شوہر کے نام ایک لائبریری اور ایک کلب قائم کیا، راستہ بنوایا، تالاب کھدوائے، اور بقیہ تمام جائداد کو اس اسکول کے نام وقف کر دیا۔ اس کے بعد ایک دن یہ دیکھا گیا کہ اسی تصویر کے نیچے ان کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ ڈاکٹروں نے کہا، انہوں نے خودکشی کی ہے۔" سہیلی خاموش ہو گئی اور جھاؤ کے پیڑ کی جھومتی ہوئی ڈالیوں پر لہراتی ہوئی ہوا کے شور میں اس کی گہری اور طویل سانس کی آواز ڈوب گئی۔

رضوی نے کہا "آج میں تم سے ایک بات دریافت کروں گا سہیلی۔ ٹھیک ٹھیک جواب دو گی؟"

"بولو۔"

"کیا تمہیں بھی ممتاز سے محبت رہی ہے؟"

یکایک سمندر کے موجوں کی طرح سہیلی بپھر گئی۔ پھر راستہ پر کھڑے کھڑے اس نے اپنا چہرہ چھپا لیا اور روہانسی ہو کر بولی "نہیں، نہیں میں نے اس سے بے وفائی نہیں کی۔"

اس دن تمام رات سہیلی بڑے ڈراؤنے خواب دیکھتی رہی۔—

دوسرے دن اتوار تھا۔ اسکول میں چھٹی تھی اور صبح کے وقت رضوی سے ملنے کا وعدہ تھا لیکن باہر بادل کی گرج سن کر وہ چپ چاپ لیٹی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سورج شاید دن بھر نہ نکلے گا اور بارش رکنے کے متعلق بھی وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ آسمان پر بادلوں کے اوپر سیاہ بادل چھلتے جا رہے تھے اور بادلوں کا سیاہ رنگ اور بھی زیادہ گہرا سیاہ ہوتا جا رہا تھا۔

سہیلی نے بید کی کرسی پر لیٹ کر انگڑائی لی۔ اس وقت اپنے چھوٹے سے کمرہ میں وہ خود اپنے مقابل بیٹھی ہوئی تھی۔ رضوی کا کوئی سوال ہی نہ تھا، لیکن اگر خود اس کا دل اس سے کوئی سوال کرے "کیا تمہیں سچ مچ ممتاز سے محبت رہی" سہیلی کہے گی "ہاں" لیکن دل اگر پھر اس سے سوال کرے "پھر تم نے رضوی کے بلانے پر کیوں آواز دی۔ اسے کیوں بلایا؟"

اسی کے بلاوے پر تو رضوی دوڑا ہوا یہاں تک آیا تھا۔ آج وہ اسے کیا کہہ کر اپنے سے دور کر سکتی ہے؟ کیا سچ مچ وہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہے، اسے اپنی زندگی سے نکال سکتی ہے؟

سہیلی یکایک کرسی سے اٹھ کر، دوڑتی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل کے قریب گئی اور دراز کھول کر ایک فوٹو اسٹینڈ نکالا جس میں ممتاز اور اس کی اپنی تصویر لگی ہوئی تھی۔ یہ تصویر شادی کے بعد کھنچوائی گئی تھی چھبیس سال کا مسکراتا ہوا جوان کھڑا تھا اور اس کے ساتھ اٹھارہ سالہ سہیلی۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کبھی اس کا چہرہ اتنا خوبصورت تھا کہ آج خود اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ لیکن آج اس کے چہرہ پر نہ جانے کس نے برسوں کا بوجھ لاد دیا تھا۔

مگر چھبیس سال کی عمر کی یہ بے ریا مسکراہٹ زیادہ دنوں تک ممتاز کے لبوں پر قائم نہ رہ سکی تھی۔ شادی کے چند ماہ بعد ہی جب اسے یہ محسوس ہوا کہ وہ سہیلی کو خوش رکھنے میں ناکام ہے تو اس نے اس کے لئے جان توڑ محنت کرنی شروع کر دی تھی، لیکن اس غریب کو اس حقیقت کا کبھی علم نہ ہو سکا کہ آخر سہیلی چاہتی کیا ہے۔ اس کے سکھ کے راستے میں کون سی رکاوٹ حائل ہے۔

کیا سہیلی خود بھی اس کی وجہ معلوم کر سکی تھی؟ کیا وہ آج بھی اس کی وجہ جان سکی ہے! کبھی کبھی وہ ایسا محسوس کرتی ہے جیسے یہ اس کی ذہنی بیماری ہے، اس کے مریضانہ جذبات ہیں اور بلاوجہ کا روگ ہے، ورنہ شادی سے پہلے رضوی کے ساتھ اس کی معمولی ہی جان پہچان تھی اور اس کو اپنے دل میں بسا کر وہ اپنی دوشیزگی اور شباب کے تصور کو رنگین بھی نہ بنا سکی تھی کہ ممتاز اس کی زندگی میں داخل ہو گیا تھا، لیکن وہی رضوی پھر کس طرح اس کے اور ممتاز کے درمیان دیوار بن کر کھڑا ہو گیا تھا؟

شاید وہ دیوار نہ بن سکتا، مگر ممتاز کی بزدل محبت نے ہی رضوی کے اندر کے نڈر مرد کو، موازنہ کرتے وقت سہیلی کے سامنے پُرکشش بنا دیا تھا۔ ممتاز کی بزدل محبت نے سہیلی کو جتنا زیادہ خوش رکھنے کی کوشش کی اس کی اداسی اور بھی بڑھتی گئی۔ اسے بار بار احساس ہوتا جیسے گھر کی چار پانچ دوسری جانی پہچانی پیاری چیزوں کی طرح ایک ممتاز بھی ہو، جیسے اس کے بارے میں سوچتے وقت اس کے خیالات منجمد ہو جاتے ہوں، جوش اور ولولہ سرد پڑ جاتا ہو اور رضوی کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے روحانی خوشی حاصل ہوتی ہو۔

پھر بھی ممتاز کی اچانک موت پر سہیلی بہت روئی تھی۔ اس نے خود کو بہت مجبور اور بے سہارا محسوس کیا تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی بادل کی اوٹ سے جس طرح یکایک بجلی کوند جاتی ہے ٹھیک اسی طرح اچانک آزادی پانے کے احساس نے اس کے ذہن کو بارش ہونے کے بعد کھلے ہوئے آسمان کی طرح صاف اور روشن بنا دیا تھا۔ پھر وہ گرلس اسکول کی ملازمت پاکر کرونا نگر چلی آئی تھی اور اس کے تھوڑے ہی دن کے بعد رضوی اس کی زندگی میں دوبارہ داخل ہوگیا تھا۔ وہ چھٹیوں میں ڈھاکہ گئی تو اس کی ملاقات رضوی سے ہوگئی۔ ان ہی دنوں رضوی کی بیوی مشتری کا انتقال ہوگیا تھا، اور یہ کتنی حیرت کی بات تھی کہ رضوی بھی اپنی ازدواجی زندگی سے کبھی خوش نہیں رہا تھا۔

باہر یخ بستہ ہوا کے جھونکے آ رہے تھے، بارش اب تک نہیں رکی تھی بغل کے کمرے میں ریڈیو بج رہا تھا اور کبھی کبھی اونچی الاپ کی آواز اس کمرے میں بھی تیر جاتی تھی۔ آج سے پہلے فرصت کے دن سہیلی بھی ہمیشہ ان لوگوں کے ساتھ جاکر مل جاتی تھی، بلاوجہ شور مچاتی تھی، ناکام محبت کی داستان سناتی تھی اور کسی لڑکی سے متعلق ہونے والے اسکینڈل پر تبصرہ کرتی تھی، لیکن آج اپنا کمرہ چھوڑ کر کہیں جانے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ایک انجانے خوف، حجاب اور جھجک اور کمزوری کے احساس سے اس کا دل دھڑک رہا تھا، جیسے آج وہ کسی بہت بڑی مصیبت میں پھنس گئی ہو۔ رضوی آج پھر وہی سوال دہرائے گا "بتاؤ تو، میں کرونا نگر کیوں آیا ہوں؟"

اور اب فخر بانوں کی کہانی سنا کر اس سوال کا جواب دبایا بھی نہیں جاسکتا۔ سہیلی کو سر جھکا کر جواب دینا ہوگا "جانتی ہوں۔"

اس کے بعد تکمیل آرزو۔ پھر اسی بہت پرانے عظیم رشتے میں اُسے بندھ جانا ہوگا۔ کالی بیساکھی کے زور آور جھونکے کے ساتھ اسے اپنی ستائیس سالہ عمر میں اڑنا پڑے گا۔ وہ اتنے دنوں سے یہی تو چاہتی تھی، اپنے تصورات کے لئے قوت بال و پر اور بلند پروازی کے لئے لامحدود وسعتیں۔

سوچتے سوچتے وہ اٹھ بیٹھی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس دم گھونٹ دینے والے ماحول سے جتنی جلدی نکل بھاگے گی اتنی ہی جلدی اسے ذہنی سکون مل جائے گا۔ سہیلی نے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کئے اور بال سنوارے۔ اس کے بعد کمرے سے باہر نکلنا ہی چاہتی تھی کہ کسی نے اس کا آنچل پکڑ لیا۔ اس کی نظر پیچھے مڑتے ہی ممتاز کی تصویر پر پڑی۔ ممتاز مسکراتے ہوئے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے آنچل کا کونا دروازہ کی کنڈی میں اٹک گیا تھا اور ابھی وہ آنچل چھڑا ہی رہی تھی کہ کسی نے اسے آہستہ سے پکارا "سہیلی!"

یہ آواز ممتاز کی تھی۔ سہیلی کے تمام جسم میں بجلی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ تقریباً چیخ اٹھی "کون ہے؟ کون ہے؟"

ممتاز کے ہونٹوں کی مسکراہٹ فوٹو سے ابھر کر سارے کمرے میں پھیل گئی "ڈر گئیں؟"

سہیل کا رنگ فق ہوگیا۔ دروازہ پر رضوی کھڑا تھا۔

ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا ہوا فوٹو اسٹینڈ اس نے اپنے ہاتھ میں اٹھا لیا اور دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولا "میں نے ہی آواز دی تھی، تم ڈر گئیں کیا؟"

سہیلی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سوچ رہی تھی، دراز میں چھپائی ہوئی تصویر کو باہر نکال کر اس نے اچھا نہیں کیا۔ رضوی کے سامنے اس کا جھوٹ ظاہر ہوگیا۔

رضوی نے فوٹو پھر اسی جگہ رکھ دیا اور تھوڑی دور آگے بڑھ کر بولا "کرونا نگر سے کینوا ایشنے چھی جانو؟" (میں کرونا نگر کیوں آیا ہوں، جانتی ہو؟)

سہیلی نے مغموم چہرہ اور غمناک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "جانی!" ("جانتی ہوں!")

"تو پھر بتاؤ، اب کیا کروگی؟"

سہیلی سے ممتاز کے مسکراتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا نہ گیا۔ اس نے اپنی نظریں جھکا لیں۔

رضوی نے آہستہ سے پوچھا "اس کا جواب کون دے گا، تم یا ممتاز؟"

سہیلی کو یکایک ایسا محسوس ہوا جیسے وہ پھوٹ پڑے گی۔ رونے کی آواز اس کے حلق میں پھنس گئی، وہ کیوں رونا چاہتی تھی، یہ وہ خود نہ جانتی تھی۔ انجانے درد کے احساس سے اس کی آواز تھرا گئی۔ اس نے جواب دیا "آمی" ("میں!")

فوٹو کو اَنٹ میں کرکے رضوی سہیلی کے سامنے کھڑا ہوگیا اور اس کے کان کے پاس منہ لے جاکر بہت دلوں قبل کے بھولے ہوئے لہجہ میں بولا "تو پھر آج ہی استعفیٰ دے دو۔ چلو ڈھاکا نے پھیرے جائی!"

(تو پھر چلو گی ڈھاکے ؟")

"چلوں گی" سہیلی نے یوں دھیمے لہجہ میں کہا، جیسے موت کی کھائی سے بول رہو۔

شام کا وقت تھا، دونوں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے کلوپیٹرا کیبل کے لان میں پاپا بہار کے پیڑ ہوا کے جھونکوں سے جھوم رہے تھے، افق پر پھر سیاہ بادل چھانے لگے تھے، سہیلی کا چہرہ اس وقت بشاش اور کھلا ہوا تھا، کبھی کبھی کسی انجانے درد اور تکلیف دہ خیالات کا عکس اس کے چہرے پر پھیل جاتا تھا۔ چائے کی خالی پیالی میں سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے رضوی کھڑا ہو گیا "دیکھ رہی ہو، کیسا اندھیرا چھا گیا ہے۔ دن ہی کے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شام ہو گئی ہو۔ بارش ہونے لگی ہے "۔

"ہاں، اب میں جاتی ہوں" سہیلی اٹھنے لگی۔

"نہیں، ابھی ٹھہرو تو ــ" رضوی مسکرایا

وہ کرسی اس کے قریب کھسکا کر بیٹھ گیا۔ آہستہ آہستہ اس نے اپنا ایک ہات سہیلی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ سہیلی نے پہلے ایک گوشت پوست کے نیم ہاتھ کا لمس محسوس کیا، پھر اس کا ہلکا سا گرم دباؤ پڑتے ہی بہت دنوں کے بعد سہیلی کے دل میں رکی ہوئی ایک رو بند توڑ کر آزاد ہو گئی۔ رم جھم برستے ہوئے ٹھنڈے پانی کی بوندوں نے اسے خیالوں کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں پہنچا دیا۔ سہیلی نے رضوی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "ہم پھر کب چلیں ؟"

"کل ہی"

بادلوں سے ڈھکے ہوئے آسمان اور شام کے پھیلتے ہوئے گھنے اندھیرے میں سہیلی رضوی کا چہرہ اچھی طرح نہ دیکھ سکتی تھی اتنا قریب ہونے کے باوجود جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کے پاس نہیں تھے ، کہیں گم ہو گئے تھے۔ رضوی اٹھ کر قریب آ گیا۔ اور قریب۔ اور قریب۔ سہیلی نے محویت و حیرت کے عالم سے نکلتے ہی محسوس کیا رضوی اس کی طرف سراپا طلب بڑھ رہا ہے.... اس نے ایک احساسِ سپردگی خود بھی محسوس کیا ــ مگر اچانک وہ چونک پڑی، سہم اٹھی۔ اس کے تصور نے لمبی سی ایک جست لگائی اور ان چند برق رفتار لمحوں میں اسے اپنے انجان (SUB-CONSCIOUS) میں یوں محسوس ہوا جیسے اس کے لبوں کو ممتاز کے لبوں نے چھو لیا ہو ــ تصور بھی کیا کیا جل دے جاتا ہے ــ مگر نہیں ــ مگر ہاں ــ مگر خیر،

یہ لمس، یہ کیفیت ہاں شاید وہی تو تھی ــ سہیلی کا بدن تھر تھر کانپ اٹھا اور اس نے آگے بڑھتے ہوئے رضوی کو پوری طاقت سے پیچھے دھکیل دیا۔ وہ چیخ پڑی: "تم کون ہو، کون ہو؟"

"میں ہوں مشتری!"

ایک آواز تھی مخمور سی، بے اختیار سی۔ مگر رضوی کہتا ہے نہیں یہ آواز تو اس کے ہونٹوں سے نکلی تھی!

باہر یکایک بجلی چمکی اس کی روشنی میں کلوپیٹرا کیبل کا اندھیرا دھل گیا اور لمحہ بھر کی روشنی میں رضوی نے سہیلی کو دیکھا اور سہیلی نے رضوی کو۔ رضوی شرمندہ ہو گیا۔ اس نے ندامت بھرے لہجہ میں کہا "دیکھو تو کیسی بھول ہو گئی! تمہارا نام لینے کے بجائے میں نے مشتری کا نام لے لیا۔ لیکن تم اس طرح کیوں چیخ اٹھیں ؟"

سہیلی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کرونا نگر کے تمام راستے آج پانی سے دھل گئے تھے اس میں کہیں شرابور ہو گئے تھے۔ وہ تیزی سے بھاگ کر راستے پر چلنے لگی۔ اسٹاف کوارٹر قریب ہی تو ہے۔ اسے وہاں لوٹ کر جانا ہے۔ بارش اس کی لمحہ بھر کی بدنامی کا داغ دھو دے گی۔

پتہ نہیں آج بارش کی وجہ سے بھوجو جانے کہاں رہ گیا تھا۔ اسی لئے کلوپیٹرا کیبل میں کسی نے چراغ نہیں جلایا تھا۔ رضوی نے خود ہی ایک موم بتی جلا دی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ آگے بڑھ گیا۔ دیوار پر وہ بڑی سی روغنی تصویر آویزاں تھی۔ وہ اور بھی قریب پہنچا، وہ بیگم صورت النساء فخر بانو نہیں تھیں، مشتری تھی اور جیسے دیوار پر سر ٹکائے اندھیرے میں وہ اتنی دیر سے رو رہی رہی ہو!

فکاہیہ:

غسلِ صحت

باقر علیم

ہمارے اچھو کو نمونیہ ہو گیا تھا۔ اگرچہ اسے صحت یاب ہوئے اب مہینہ ہو چلا تھا، مگر غسلِ صحت کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ایک آدھ ہفتہ تو میں نے عفت کو پھر نمونیہ ہو جانے کا خوف دلا کر گزار دیا۔ ایک دو ہفتے خود اچھو نے نہ نہلانے کی ضد میں بسر کر لئے۔ اور ایک دو ہفتے یوں گزر گئے کہ عفت خود آسمان کے کسی گوشے میں دھواں یا ابر کا ایک آدھ ٹکڑا دیکھ کر سہم جاتی۔

آج منگل کا دن تھا اور نومبر کی پہلی تاریخ۔ مطلع بالکل صاف تھا اور موسمیات والوں نے دھوپ ہی دھوپ کی پیشین گوئی کر رکھی تھی۔ آج عفت نے اچھو کو نہلانے کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔ ناشتے کے وقت سے اس کو آمادہ کرنے کی مہم میں لگی تھی۔ پہلے اچھو کو روبہیٹ کرا دمی پیالی چائے کی دستیاب ہوئی تھی۔ مگر آج اس نے حالات سے فائدہ اٹھا کر دو پیالیاں نوشِ جاں کیں۔ اس کی ساری ضدیں صبح سے پوری ہو رہی تھیں۔ عفت نے اس کے سارے قیمتی کھلونے چھپا کر رکھ دیے تھے مگر آج فرش پر دہلیزوں پر چاروں طرف کھلونے بکھرے پڑے تھے۔ حیرت ہے کھلونوں کے معاملے میں بچوں کا حافظہ بہت تیز ہوتا ہے۔ اچھو نے کچھ ایسے کھلونے عفت کو یاد دلا کر برآمد کرائے جن کو دھِل کر کے عفت فی الواقع بھول چکی تھی۔ مٹھائی، بسکٹ، ٹافی، چاکلیٹ۔ غرض جس چیز کے گھر میں موجود ہونے کا علم اچھو کو تھا، اس نے آج مانگ کر لے لی یا خود اٹھالی اور عفت کے ماتھے پر بل نہ پڑا کم از کم اس وقت تک اچھو بھی ہمہ تن اپنے غسلِ صحت کے حق میں نظر آتا تھا۔

آج ہی آٹھ بجے کی ٹرین سے عفت کے ابا نے ریلوے اسٹیشن سے گذرنا تھا۔ وہ پشاور سے لاہور جا رہے تھے۔ ان کا خط دو دن سے آیا ہوا تھا۔ ان کو لینے بھی جانا تھا۔ وہ ہمارے لئے پشاوری گڑ کی بوری لا رہے تھے۔ "عفت! میرا خیال ہے۔ تم آج اچھو کو نہلاؤ گی"۔

"جی ہاں..." اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا

"ابا جان کو لینے اسٹیشن پر نہیں جاؤ گی؟" میں نے سوچا شاید اسی بہلانے سے اچھو کی جان آج پھر بچ جائے۔

"میں کیا کروں گی۔ ابا جان ایک ہفتہ پہلے یہاں سے گئے ہیں۔ رہی گڑ کی بوری..... مجھے یقین ہے اس کے معاملے میں آپ زیادہ ذمہ داری کا ثبوت دیں گے......" اس نے مسکرا کر آخری فقرہ ادا کیا۔

"اچھو! تم چلو گے۔ نانا سے ملنے...... کپڑے......" میں نے چھیڑ خوباں سے چلی جائے کے طور پر کہا۔ مگر عفت نے میرا جملہ مکمل نہ ہونے دیا۔

"اچھو نہیں جاتا.... نہ میرے بیٹے۔ آج نہانا ہے".... پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگی "یہ آپ اس کو کیوں گمراہ کر رہے ہیں؟"

گمراہ پہ مجھے ہنسی آگئی۔ مگر اب تک اچھو میری ٹانگوں سے لپٹا ہوا تھا اور مچل مچل کر اسٹیشن جانے کے لئے رو رہا تھا۔

میں نے عفت سے کہا۔ "اب آٹھ بجے تو تم اس کو نہلانے کا ستم نہیں کرو گی۔ ذرا دھوپ نکل آنے دو۔ میں تو کہتا ہوں تم بھی چلو ریلوے اسٹیشن۔ ابا جان کو بھی مل لینا۔ پھر آ کر اسے نہلا لینا"

اچھو کے بدلے ہوئے لب ولہجہ کی وجہ سے عفت کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ اس نے تیل کا چولہا جلایا۔ پانی کا دیگچہ گرم ہونے کے لئے رکھ دیا۔ اور ہم تینوں ریلوے اسٹیشن چلے گئے۔

پلیٹ فارم سے باہر ہی ایک وزن کرنے والی مشین عفت کو نظر آگئی۔ کہنے لگی۔ "اچھو کا وزن کریں۔ دیکھیں کتنا کمزور ہو گیا ہے"۔

اچھو وزن کرنے کے لئے مشین پر سوار ہو گیا۔ ایک چھوٹا آنہ سلیٹ میں ڈالا۔ اور جھٹ سے ایک ٹکٹ نکل آیا۔ ہم تینوں نے ٹکٹ اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھائے۔ مگر عفت نے ٹکٹ اٹھا لیا۔ اور وزن کی بجائے ٹکٹ کی پشت پر لکھا ہوا قسمتی جملہ پڑھنے لگی۔ اس کا ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔

"کتنا وزن ہے؟ تم کیا پڑھ رہی ہو؟"

عفت نے وزن پڑھے بغیر ٹکٹ میرے ہاتھ میں دے دیا۔

میں نے بھی پہلے ٹکٹ کی پشت دیکھی۔ لکھا تھا "تم پر بڑی بھاری مصیبت آنے والی ہے صبر کے بغیر چارہ نہیں" متوقع غسل کی نسبت سے کیسی برمحل پیشین گوئی تھی! میری بے اختیار ہنسی نکل گئی۔ عفت نے مارے غصے کے منہ دوسری طرف کر لیا۔

پھر میں نے وزن پڑھ کر عفت اور جملہ مسافران کو سنایا۔ اچھو کا وزن بیماری سے پہلے کے وزن سے کوئی دو پاؤنڈ زیادہ تھا۔ مجھے بڑی خوشی اور عفت کو حیرت ہوئی۔ مشین کو اس نے دروغ گوئی پر لعنت ملامت کی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ بیماری کے بعد اچھو نے جو ایک مہینہ گزارا تھا اور سرکاری سانڈ کی طرح جو اس کی تواضع ہوئی تھی اسکو عفت بھول رہی تھی۔ ماؤں کو اپنے بچے نہ جانے کیوں پیلے پیلے نظر آتے رہتے ہیں۔

میں نے عفت کا ذائقہ بدلنے کے لئے کہا "اچھو تو ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ تمہارا وزن البتہ کم ہو گیا ہے۔ ذرا جوتے اتار کر مشین پر چڑھو۔ دیکھیں"

عفت نے سر گھما کر ادھر اُدھر دیکھا۔ اگرچہ یہ بات اور کسی نے نہیں سنی تھی۔ مگر وہ رضامند نہ ہوئی۔

میں پلیٹ فارم ٹکٹ لینے گیا تو معلوم ہوا کہ گاڑی تین گھنٹے لیٹ ہے۔ عفت نے شکر کا کلمہ پڑھا۔ اس کو یقین ہو چکا تھا کہ ٹکٹ کی پیشین گوئی کسی حادثے کی صورت میں ضرور نمودار ہو گی اور اس کا ذہن بار بار اچھو ہی کی طرف جاتا تھا۔ ہم اپنا سامان لیکر واپس آگئے۔ عفت نے مزید حفاظت کے لئے اچھو کو جبراً اپنے پاس بٹھایا۔ تانگہ روانہ ہوا تو پھر اچھو کا غسل یاد آگیا اور وہ ایک بار پھر منحوس پیشین گوئی کو بھول کر اس کو غسل پر آمادہ کرنے لگی۔ یہ بچے بڑے ڈپلومیٹ ہوتے ہیں۔ اچھو نے انکار نہیں کیا تو اقرار کی بات بھی اس کے منہ سے نہیں نکلی۔ تانگے والے نے سردی سے بچنے کے لئے رضائی اوڑھ رکھی تھی۔ اور اپنے حلیے سے "کل پاکستان انجمن مخالفانِ غسل سرما" کا سرگرم ممبر معلوم ہوتا تھا۔ کافی دیر عفت کی تقریر نہانے کے فوائد پر سنتا رہا۔ اچھو کی خاموشی کو مبنی بر انکار سمجھ کر مظلوم کی حمایت میں زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکا:

"بیگم صاحبہ بچہ مارچ اپریل میں نہائے گا۔ آج کل تو بڑی سردی ہے"...... عفت نے دو ایک بار تانگے والے کی پیٹھ کو گھورا اور وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی، مگر منہ سے کچھ نہ کہہ سکی۔

ہم گھر پہنچے تو پانی کھول رہا تھا۔ عفت نے برقع جلدی جلدی اتارا اور پیشتر اس کے کہ اچھو کچھ سوچ سکتا اسے بازو سے پکڑ لیا۔ ایک ہاتھ سے اسے ساتھ ساتھ گھسیٹے پھر رہی تھی اور دوسرے ہاتھ سے غسل کے ضروری آلات اکٹھے کر رہی تھی۔ ابھی اچھو نے رونے والا حربہ استعمال نہیں کیا تھا، البتہ بسورنا شروع کر دیا تھا۔ عفت نے ایک بڑی سی بالٹی دھوپ میں رکھی تو اچھو چلا اٹھا "میں بالٹی میں نہیں نہاؤں گا۔ چارپائی پر نہاؤں گا"۔ اچھو کو دو سال پہلے کا زمانہ یاد آگیا۔ جب وہ بہت چھوٹا تھا اور عفت اسے چارپائی پر بٹھا کر نہلایا کرتی تھی۔ عفت نے غصے سے ایک بان کی بنی ہوئی چارپائی گھسیٹ لی۔ صابن اٹھایا تو اچھو چیخا "یہ صابن نہیں۔ میں اس سے نہیں نہاتا..." عفت نے وہ لکس کی ٹکیا اپنی جیب میں ڈال لی اور کپڑے دھونے والے دیسی صابن کی ایک لمبی سی بار چارپائی پر سجا دی۔ اچھو نے تولیے پر اعتراض کیا کہ یہ ابا کا تولیہ ہے۔ تو وہ حسبِ حکم اس کا نیلا تولیہ لے آئی۔ دُھلے ہوئے کپڑے نکالے تو اچھو نے دوسرے کپڑے منگوائے حتیٰ کہ اس نے جھوٹ سچ عفت سے اپنے بوٹ بھی پالش کروائے۔ اس طرح اچھو کوئی گھنٹہ بھر کنی کترانے میں کامیاب ہو گیا۔ عفت کے چہرے سے خوشدلی کے آثار کب کے غائب ہو چکے تھے۔ مگر سب کچھ برداشت کئے جا رہی تھی۔ تیاری مکمل ہو گئی۔ اب اچھو کے پاس بھی کوئی دلیل باقی نہیں رہ گئی تھی۔

عفت نے اچھو کو پکڑ کر چارپائی پر بٹھا لیا۔ اس کے کپڑے اتارے۔ بالٹی میں پانی لینے کے لئے مگ ڈالا۔ پانی بہت گرم تھا۔ اور ٹھنڈا پانی ملانے کے لئے جلدی سے اٹھی اور اچھو کو وہ ایک لمحہ نصیب ہوا۔ جب وہ اس کے چنگل میں نہیں تھا۔ اُٹھا، چارپائی سے چھلانگ لگائی اور دور بھاگ گیا۔

عفت کو اس کی اس گستاخی پر بڑا غصہ آیا۔ ٹھنڈا پانی ملانا بھول گئی۔ صحن کے عین وسط میں، بہت سی چارپائیاں اکٹھی کر کے عفت نے گھر کے سب گرم کپڑے دھوپ میں پھیلا رکھے تھے۔ اچھو نے عفت سے مقابلے کے لئے دوسری طرف پوزیشن لے لی۔ میں آرام کرسی پر نیم دراز ایک چارپائی پر پاؤں رکھے اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس تماشے پر مجھے ہنسی آگئی۔ عفت نے زخمی شیرنی کی نظر سے مجھے

دیکھا" آپ ہنس رہے ہیں۔ اچھو کو ادھر بلائیں ورنہ میں پیٹ پیٹ کر اس کا برا حال کر دوں گی۔"

میں کسی انجمن کا رکن تو نہیں مگر میری ہمدردیاں عام طور پر سردیوں میں نہ نہلانے والوں کے ساتھ ہوتی ہیں۔ میں نے عفت کے انتباہ کا کوئی جواب نہ دیا۔

عفت کا غصہ دوبالا ہو گیا اس نے آستینیں چڑھائیں چوٹی کو گول کر کے پیچھے باندھا، دوپٹہ اتار پھینکا، پائنچے چڑھائے اور اچھو کے پیچھے سرپٹ بھاگی۔ اچھو بھی تیار کھڑا تھا۔ بھاگ کھڑا ہوا۔ اچھو آگے آگے، عفت پیچھے پیچھے۔ دونوں چارپائیوں کے گرد گول چکر میں دوڑ رہے تھے۔ دو تین چکر میں ہی عفت ہانپنے لگی۔ شاید اسے چکر بھی آ گیا۔ دیوار کو تھام کر کھڑی ہو گئی۔ عفت کے عین سامنے چارپائیوں کی دوسری دوسری طرف اچھو نے بھی بریکیں لگائیں اور کھڑا ہو گیا۔ ہانپ تو وہ بھی رہا تھا۔ مگر عفت کے غصے کے برعکس ہنس رہا تھا۔ عفت کافی دیر ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتی رہی۔ شاید کچھ سوچ رہی تھی۔ اچھو نے دو ایک بار "امی بس"! کا چیلنج بھی پھینکا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ آخر عفت کو ایک ترکیب سوجھی۔ میں نے جس چارپائی پر پاؤں رکھے تھے آ کر وہ گھسیٹی کر دیوار اور ان چارپائیوں کے درمیان اسے کھڑا کر کے اچھو کا راستہ بند کر دے۔ میں نے چارپائی پاؤں سے دبا لی۔

عفت! یہ فیئر نہیں ہے۔ فاؤل مت کھیلو....."

اس ثواب کے کام کو کھیل بننا اسے پسند نہ آیا۔ غصے سے آگ بگولا ہو گئی۔ جھٹکے سے اپنا ہاتھ الگ کیا۔ اور چارپائی کو میرے پاؤں میں دبا چھوڑ کر کمرے میں چلی گئی۔ اچھو کو کوسے جا رہی تھی اور وہ ننگا ہنسے جا رہا تھا۔

کمرے میں اس کا جہیز والا بڑا پلنگ تھا۔ میرا خیال تھا اب اسکو باہر نکال کر اچھو کا راستہ روکے گی۔ پھر مجھے یاد آ گیا کہ وہ اس سے باہر نکلنے کا نہیں۔ اس گھر کے دروازے چھوٹے ہیں۔ میں اخبار رسالے پھینک کر دروازے کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ کوئی پانچ منٹ بعد عفت برآمد ہوئی۔ اس نے برقع پہن رکھا تھا اور ہاتھ میں پلاسٹک کا بنا ہوا شاپنگ بیگ تھا۔ اچھو ہنستا ہنستا چپ ہو گیا۔ جب وہ دروازے کے قریب پہنچا تو اس کو یاد آ گیا کہ وہ تو ننگا ہے اور اس طرح بازار جانا ٹھیک نہیں۔ مڑا، اپنے میلے کپڑے ہاتھ میں پکڑے اور پھر عفت کے پیچھے دوڑ پڑا۔ عفت دروازے سے باہر جا چکی تھی۔ اچھو روتا ہوا دروازے سے باہر نکلا۔ عفت دروازے کے باہر اس کی منتظر کھڑی تھی۔ اس نے اچھو کو جھپٹ لیا۔ گھسیٹتی ہوئی واپس آئی۔ برقع اتار پھینکا۔ اس کے ہاتھ سے کپڑے الگ کئے اور چارپائی پر گرا لیا۔ مجھے عفت کی یہ حرکت بالکل پسند نہ آئی۔ "یہ ٹھیک نہیں مکا ر عورت..." عفت اس وقت میری بات کہاں سننے کے موڈ میں تھی۔ اس نے بالٹی میں ہاتھ ڈال کر پانی کی حرارت محسوس کی۔ پھر پانی کا لوٹا بھرا اور گرم گرم پانی اچھو کے سر پر انڈیل دیا۔ اچھو نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ہائے پانی ٹھنڈا ہے، ہائے پانی ٹھنڈا ہے! عفت نے معاملہ مکمل طور پر طے کرنے کے لئے دو لوٹے اور اچھو کے سر اور جسم پر ڈال دیئے۔ جیب سے لکس کی ٹکیا نکالی۔ اچھو نے روتے روتے بہتیرے اشارے دوسرے صابن کی بار کی طرف کئے مگر عفت نے وہی صابن اسکے جسم پر گھسانا شروع کر دیا۔ پیٹ پر صابن لگاتی تو "پیٹ پر صابن نہیں" کی چیخ سنائی دیتی۔ اور ٹانگوں پر صابن لگاتی تو "ٹانگوں پر صابن نہیں" کا نعرہ بلند ہوتا۔ عورت غصے کے وقت اپنی سماعت کھو بیٹھتی ہے، عفت نے اچھو کی پر درد گزارشات کی طرف بالکل توجہ نہ کی اور صابن منہ اور سر پر گھسانا شروع کیا یہ دو مقامات صابن کے لئے بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ اب رقت کے مارے اچھو کی فریاد قابلِ فہم نہیں رہ گئی تھی۔ اس پر طرفہ یہ کہ عفت نے دو تین لوٹے اوپر تلے اچھو کے سر پر ڈال دیئے۔ لڑکے کا سانس بند ہونے لگا مگر اس نے چیخنے میں کمی نہ آنے دی۔ صابن اتر گیا تو عفت نے اچھو کے پاؤں کا میل اتارنے کے لئے منجیاڑ جیب سے نکال لی، غسل کی تیاری کے وقت منجیاڑ کا پتہ عفت نے چلنے نہیں دیا تھا۔ وہ اسے بطور خفیہ ہتھیار کے استعمال کرنا چاہتی تھی۔ اچھو منجیاڑ کو دیکھ کر اتنا رویا کہ اس کی ہچکی بندھ گئی۔ یہ منجیاڑ نہ ادا مجھے بھی پسند نہ آئی مگر جی! ابھری ہوئی شیرنی کے منہ کون لگتا۔ بچے کی بے تحاشا چیخ پکار سن کر شمال والی بڑھیا ہمسائی نے دیوار پر چڑھ کر ہمارے گھر جھانکا۔

"ہائے کتنی ظالم اے۔ کیوں ذبح کر رہی اے بچے کوں۔ کوئی گھنٹے بھر سے رو رہا ہے معصوم....." بڑھیا نے یہ بات صورتِ حالات کا جائزہ لئے بغیر کہہ دی تھی۔ جب اس نے اچھو کو نہاتا اور اس سے قریب کر عفت کی خون آلود آنکھیں دیکھیں تو وہ بالکل مطمئن ہو کر اوجھل ہو گئی۔

اب اچھو بھی تقریباً تقریباً فارغ تھا۔ عفت نے ہر طرح سے اطمینان کر کے اپنی انتقامی کارروائی ختم کی۔ ایک بڑے سے نرم نرم تولئے سے پونچھا۔ اور اسی تولئے میں لپیٹ کر اسے چارپائی پر بٹھا دیا خود اس کے دُھلے ہوئے کپڑے اٹھانے کے لئے چارپائی سے اتر آئی۔

اچھو کا رونا کم ہوتا ہوتا بالکل ختم ہو گیا۔ بس ذرا دھیمے کے طور پر کبھی کبھی "ٹھسک" لیتا۔ عفت نے اسے کپڑے پہنائے، تیل لگایا، کنگھی کی، بوٹ پہنا کر زمین پر اتار دیا اور میری طرف بڑے فاتحانہ انداز میں دیکھ کر مسکرائی۔ غسل کے دوران میں اچھو کی مذبوحی حرکات نے عفت کی وہ گت بنا دی تھی کہ معلوم ہوتا تھا محترمہ کپڑے پہنے خود نہانے کی سعی فرماتی رہی ہیں۔ اس کی اس ہیئت کذائی کو دیکھ کر میری ہنسی نکل گئی۔ ہنسی کے ساتھ ہی مجھے یاد آگیا کہ اب تو لیٹ گاڑی کا وقت ہو رہا ہوگا۔ گھڑی دیکھی کوئی پون گھنٹہ باقی تھا۔

"عفت گاڑی کا وقت ہو گیا ہے۔ جلدی کرو، چلنا نہیں؟"

"میں نہیں جاتی اب کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ گاڑی کے لیٹ ہونے کی وجہ سے پتہ نہیں ابا جان آتے بھی ہیں کہ نہیں۔ اب چلے جائیں۔ اچھو کو بھی لے جائیں۔"

میں اور اچھو ریلوے اسٹیشن چلے گئے۔ ابھی گاڑی کے آنے میں پانچ دس منٹ باقی تھے۔ ہم ادھر اُدھر گھومتے رہے۔ میں نے اچھو کی دلجوئی کے لئے اسے کیلے کھلانے دیئے پھل بڑا نافع الیاس سے؟ گاڑی کا سگنل ہوا تو ہم ایک جگہ پلیٹ فارم پر انتخاب کر کے کھڑے ہو گئے۔ وہیں وزن کرنے والی ایک مشین بھی پڑی تھی۔ میں نے سوچا۔ گاڑی میں ابھی کچھ سیکنڈ ہیں۔ چلو آج اپنا وزن کرتے ہیں حالانکہ گھر کے مرد کا اپنا وزن کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ وزن کیا پہلے اپنی قسمت پڑھی وہ "ڈ سٹیٹس کو" والی بات تھی یعنی جوں کا توں۔ وزن دیکھا تو اپنا وزن باقاعدہ کم ہونے کا ایک اور ثبوت مل گیا۔ میں نے سوچا اپنے وزن کا ٹکٹ عفت کو دکھا کر ذرا اسے غیرت دلاؤں گا۔ ٹکٹ میرے ہاتھ میں دیکھ کر اچھو مچلنے لگا۔

"ابا میں بھی وزن کروں گا۔ میں بھی۔۔۔"

"بھائی تم ابھی دو تین گھنٹے پہلے اپنا وزن کر چکے ہو" میں اپنی جیب میں اس کا ٹکٹ ٹٹولنے لگا۔

مشین کے سہارے ایک بیکار قلی کھڑا تماشہ دیکھ رہا تھا کہنے لگا "کوئی بات نہیں صاحب۔ ایک آنے کی بات ہے۔ بچہ رو پڑے گا۔" میں نے اس بیکار شخص کی طرف دیکھے بغیر اس کے حکم کی تعمیل کی۔ ایک آنہ جیب سے نکال کر اچھو کو دیا۔ وزن کا ٹکٹ نکلا تو اچھو نے جھپٹ لیا۔ پھر شاید اپنی عینکیں پاس نہ ہونے کی وجہ سے مجھے پڑھنے کے لئے دیا۔ اتفاق سے ٹکٹ کا وزن سامنے تھا میں ٹکٹ وزن دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ ان تین گھنٹوں میں یعنی عفت والے غسلِ صحت کے بعد اچھو کا وزن دو پاؤنڈ کم ہو گیا تھا!

غزل

ضمیر جعفری

ایک اندازِ نظر جس کا کوئی نام نہیں
زندگی رات نہیں، صبح نہیں، شام نہیں

عمر بھر ایک تصور کی پرستش کی ہے
میں وہاں ہوں کہ جہاں گردشِ ایام نہیں

میری راحت طلبی سے کوئی کہدے کہ حیات
رقصِ بسمل ہے، تماشائے لبِ بام نہیں

لوگ ہر بات کو افسانہ بنا دیتے ہیں
شوق کچھ جرم نہیں، عشق کچھ الزام نہیں

مرگ و ہستی میں محبت رہی حائل ورنہ
حشر کہتے ہیں جسے مہلتِ یک گام نہیں

اپنی راہوں کیلئے اپنی نگاہوں سے تراش
وہ ستارے کہ مقدر ہیں مگر عام نہیں

حُسن ہر لحظے کا اک اپنا نیا پن ہے ضمیر
عشق ہو یا کہ ہوس کوئی طلب خام نہیں

پینگ ہلارے

شیر افضل جعفری

جب پینگ چڑھاتی ہے ساون میں کوئی ناری
جیون میں چٹکتی ہے رومان کی چنگاری

اُس گندمی چہرے کا جھلکار سنہرا ہے
چِیکو نے عطا کی ہے افلاس کو زرکاری

اب تک مرے کانوں میں بجتی ہے غزل بن کر
اس ململی گھونگھٹ میں تڑتی ہوئی کِلکاری

افشاں کی دل افروزی، مہرانیوں کے منہ پہ
گالوں کی ترائی میں آکاش کی پھلواری

وہ بھاگ بھری جٹّی، وہ نور بھری ٹھمری
وہ میری پری جوگن، میں اس کا جٹا دھاری

چوپڑ تو بچھائی ہے ساندل کے جواری نے
جی جان کی بازی میں "اللہ تری یاری!"

•

فن :

رامش و رنگ

اقبال حامد

این در رہِ چشم افگن، آن در پئے گوش آور

مشرقی پاکستان کی عوامی و رومانوی زندگی نے کوی جسیم الدین کی تصنیف "نقشی کا تھر ماٹھ" میں جو منظوم روپ دھارا ہے وہ زندگی اور قدرت کے حسن و کیف کا ایسا دلآویز مجموعہ ہے جسے ایک بار دیکھ کر بار بار دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ اس کو دیکھ لیا تو گویا مشرقی پاکستان کا سارا رنگ رس دیکھ لیا اور اس کا سارا مسحور کن سماں آنکھوں میں پھر گیا۔ چنانچہ اس منظوم کتھا کو تمثیلی رقص کی شکل میں پیش کرنے کے لئے باکمال فن کاروں کا ایک طائفہ اس سرزمینِ کیف و رنگ، اس دیار سحر و افسوں سے مغربی پاکستان روانہ ہوا۔ "بلبل اکاڈمی آف فائن آرٹس ڈھاکہ" کی ۳۴ اداکار خواتین اور مددگار فن کار — جنہوں نے حال ہی میں مشرقی پاکستان کی زندہ علامات اور پیامی بن کر مغربی پاکستان کے تمام بڑے شہروں کا دورہ کیا اور جا بجا نہ صرف مشرقی پاکستان کے حسین و جمیل فنون اور ثقافتی و جمالیاتی ذوق کے پُرکیف و دلآویز مظاہروں سے مغربی پاکستان کے لوگوں کو روشناس کرایا بلکہ ہم خرما و ہم ثواب کے مصداق اپنے ہم وطنوں اور بہن بھائیوں کی۔۔۔ و خدمت کے جذبہ سے سرشار ہو کر مظاہروں کی ساری آمدنی مشرقی پاکستان کے تباہ کن طوفان کے مصیبت زدوں کی نذر کر دی۔ اور اس طرح فن کو فن ہی نہیں رہنے دیا بلکہ تمام تر زندگی بنا دیا۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے فنی و ثقافتی مظاہرے اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے روابط سے نہ صرف دونوں حصوں میں محبت و اخوت کا احساس بڑھتا ہے، بلکہ ملک کے دونوں حصے ایک دوسرے سے بہتر طور پر آشنا ہوتے رہتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کے ثقافتی سرمایہ کو اپنا ہی سرمایہ سمجھتے اور اس پر ناز کرتے ہیں۔ مشرقی پاکستان کے ان ثقافتی پیامیوں نے اپنے فنی مظاہروں سے ہمیں پھر یہ یقین دلایا ہے کہ ہمارا ملک فنی صلاحیتوں سے مالا مال ہے اور اس نئے دور میں جس طرح ان کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے، اس سے یہ امید بڑھتی جا رہی ہے کہ ہمارے ملک کے ثقافتی سرمایہ میں روز بروز بڑی تیزی سے اضافہ ہوتا جائے گا۔

مشرقی پاکستان کے اس طائفہ رامش و رنگ نے ہمیں اس کی اصل روح تک پہنچنے کا موقع دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک ہی تمثیل ہر جگہ پیش کی — بنگال کی جادو بھری دنیا کی دیہاتی کہانی، دھرتی کا روپ جو ناٹ اور سوانگ کی شکل میں پورے خلوص اور فن اداکاری و پیشکش کے بھرپور کمال کے ساتھ ہماری نظروں کے سامنے آیا۔ کوی جسیم الدین کی یہ کہانی جسے بنگلا میں "نقشی کا تھر ماٹھ" اور انگریزی میں

(FIELD OF EMBROIDERED QUILT)

کہتے ہیں، ساری دنیا میں مشہور ہو چکی ہے۔

تمثیلی رقص کی پیشکش کوئی اچھوتا تجربہ نہیں ہے کیونکہ رقص کے ساتھ ہی تمثیلی رقص نے بھی جنم لیا مگر "بافا" (بلبل اکاڈمی آف فائن آرٹس) نے یہ جدت کی ہے کہ پوری نظم کا ناٹکی روپ پیش کیا ہے اور اس اہم نظم کے اجزاء ذرا سی دیر کے لئے اسٹیج پر لانے پر اکتفا نہیں کیا۔ اس طرح یہ پوری نظم اپنے تمثیلی روپ میں ڈیڑھ گھنٹے اسٹیج پر جاری رہتی ہے اور ناظر کی آسودگیٔ طبع کا باعث بنتی ہے۔ بیچ میں کوئی وقفہ تعطل بھی نہیں آتا اور یہ ناٹک کہانی ایک بھرپور اور مسلسل دستاویزی فلم کی طرح نظر کے سامنے آتی چلی جاتی ہے۔

کسی اسٹیج پر پورے ڈیڑھ گھنٹہ حرکات جسم سے ایک اہم نظم کے نکات، کہانی کی ترتیب و تہذیب اور عوامی زندگی کے روپ پیش کرتے رہنا فن رقص اور اداکاری کی ایسی مشکل ادا ہے جو بڑی کاوش اور غیر معمولی کمالِ فن چاہتی ہے۔ داستان میں قحط کا حال، آغاز محبت، ہجر اور فراق کا دکھڑا، بجلی کی چمک، بادلوں کی گرج، جرم، فرار اور جدائی غرض زندگی

لے گوناگوں مظاہر، مناظر سامنے آتے ہیں۔ معاشری حالات، مثلاً سرپرستوں
کی ذمہ داریاں، جذبات و احساسات، رسوم و قیود کے مناظر، ناظرین کو ایک
دوسری دنیا میں پہنچا دیتے ہیں۔ روشنی اور ساز و آہنگ کے تال میل سے
سٹیج پر یہ مناظر بہت ہی دلکش نظر آتے ہیں اور دیکھنے والے حسن و کیف
کے اس امتزاج سے بے خود ہوتے جاتے ہیں۔

"نقشی کاتھ رہانڈ" یا "منقّش رضائی کا کھیت" مشرقی
پاکستان کے ایک مثالی کردار اور دیہاتی نوجوان، روپائے اور وہیں پر کسی
گاؤں کی لڑکی ساجو کی داستانِ الفت ہے۔ جب تمثیل سامنے آتی ہے
تو پہلا ہی نظارہ قحط کا مارا گاؤں ہے۔ کھیت کھلیان سب خشک اور
جاڑ پڑے ہیں۔ کسان، عورتیں اور جوان لڑکیاں بارش کی طلب ظاہر کرنے
کے لئے ایک روایتی رقص پیش کرتی ہیں۔ اس موقع پر علاقہ کی سب سے
حسین لڑکی ساجو بھی مجمع میں موجود تھی اور روپائے بھی۔ دونوں کے دلوں
میں الفت راہ پالیتی ہے۔ اس کے بعد روپائے کا عزم یہ ہوتا ہے کہ وہ
ساجو کو حاصل کر کے رہے گا۔ اور یہ کہانی دو اجنبی دیہاتی لڑکے لڑکی کی
ایک دلکش تفسیرِ حیات بن جاتی ہے۔ دیکھنے والے مبہوت ہو کر رہ جاتے ہیں۔
منظر میں بادل اور موسلادھار بارش ہے، اس کے بعد طوفان باد آتا ہے
جس میں روپائے کا سرکنڈوں کا بنا ہوا مکان اڑ جاتا ہے اور یہ نوجوان
بانس تلاش کرنے نکل جاتا ہے کہ پھر اپنا گھر بناسکے۔ اس مہم میں اسے ایک
دلچسپ انکشاف ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ساجو کی ماں سے اس کی اتفاقیہ
ملاقات ہوتی ہے اور اس میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ساجو کی ماں اور روپائے
کی ماں آپس میں سہیلیاں ہیں۔ اس سے روپائے کے دل میں کرن پیدا ہو جاتی
ہے۔ ساجو کی ماں اسے اپنے ہاں آنے جانے کی دعوت دیتی ہے اور پہلی دفعہ
اسے کھانے پر بھی مدعو کرتی ہے۔ اس کے بعد روپائے کا ساجو کے
ہاں آنا جانا ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے آنے جانے پر گاؤں کے لوگوں میں کانا
پھوسی بھی شروع ہو جاتی ہے جس سے تنگ آ کر ساجو کی ماں روپائے کا آنا جانا
بند کر دیتی ہے، اس سے روپائے کے دل کو سخت صدمہ پہنچتا ہے مگر وہ بادلِ
ناخواستہ اس حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ جدائی کے دن تڑپتے گذرتے ہیں۔
اور رات کو اگر کبھی نیند آ بھی جاتی ہے تو خواب میں وہ ساجو کو اپنی طرف آتا
دیکھتا ہے۔ مگر ایک بار وہ دیکھتا ہے کہ کوئی قزّاق ساجو کو راستہ سے
اٹھا کر لے گیا۔ رقص میں خواب کی یہ کیفیت، الم، تڑپ اور سونے کی حالت
میں بھیانک خواب کا منظر بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے ـــــ

غرض اس طرح کہانی چلتی رہتی ہے اور کہانی میں ایک خوشگوار موڑ جب
آتا ہے کہ گاؤں کا ایک شخص جس کا نام دکھی ہے، اپنی مخلصانہ کوششوں
میں کامیاب ہوتا ہے اور وہ روپائے اور ساجو کا رشتہ کرا دیتا ہے، اور
یہ دونوں میاں بیوی بن کر خوش و خرم زندگی بسر کرنے لگتے ہیں۔

فصلیں پک گئی ہیں۔ دیہاتی مسرت میں سرشار ہیں اور ہر طرف
خوشی کی لہر ہے کہ ایک واقعۂ دلدوز حائل ہو جاتا ہے یعنی روپائے کسی
جھگڑے میں پھنس جاتا ہے۔ یہ جھگڑا ملواں کھیتوں کی فصل پر ہوتا ہے۔
اور روپائے ہمیشہ کے لئے روپوش ہو جاتا ہے۔ روپوش ہونے سے
قبل وہ ساجو سے آ کر ملتا ہے ـــــ یہ ان کی ایسی ملاقات ہے جس
کے بعد وہ کبھی نہ مل پائے۔ اس آخری ملاقات کا منظر بڑا ہی دلخراش
اور غم انگیز ہے جسے اسٹیج پر پیش کرنے میں اداکاروں نے کمال کر دیا۔
اور لوگ عش عش کر اٹھے۔

روپائے کو روپوش ہوئے کئی سال گذر جاتے ہیں اور اس کی
کوئی خبر نہیں آتی۔ ساجو مجبوراً اپنے میکہ آجاتی ہے اور ایک رضائی
کاڑھنا شروع کر دیتی ہے، اس کے ہر ٹانکے میں ایک ایک آنسو کڑھا
ہوا ہے ـــــ! جب رضائی مکمل ہو جاتی ہے تو ساجو جان دیدیتی ہے۔
گویا روپائے کے بعد اس کی زندگی کا مقصد اس یادگار کی تکمیل کے
علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

روپائے کو بھی اس منقش رضائی کا علم ہو جاتا ہے، اور
وہ اپنی باوفا بیوی کے اس انوکھے فن پارہ کو دیکھنے کے لئے چھپ چھپا کر
گاؤں آتا ہے۔ ساجو کی موت کے بعد اس کی بنائی ہوئی یہ رضائی اس
کی قبر پر پھیلادی جاتی ہے۔ روپائے جب اس رضائی کو آ کر دیکھتا
ہے تو کرب والم سے تڑپ اٹھتا ہے ـــــ اور اس نظارہ کا اس کے
قلب پر ایسا گہرا چرکا لگتا ہے کہ وہیں دم توڑ دیتا ہے۔

جسیم الدین کی اس منظوم لوک کہانی میں خوبرو روپائے کا کردار
منان نے ادا کیا ہے ساجو کا کردار رضیہ خانم نے۔ ان کے ساتھ جو دوسرے
مددگار اداکار ہیں اُن کی اداکاری اور کاموں کی خوبی معیاری ہے۔ اسٹیج
پر مشرقی پاکستان کا گاؤں تک پیش کیا گیا ہے۔ کھیت بھی ہے اور گھر کا
منظر بھی ہے۔ بادلوں کی گھن گرج کے لئے کنستر اور ڈھول سے کام لیا
گیا ہے۔ اور بڑی خوبی سے منظر کے ساتھ اس کا آہنگ ملا دیا گیا ہے۔
رضی اللہ نے مختلف رنگوں کی برقی روشنی کو خوب ملایا اور ڈرامی دیر

میں بادل گھِر آنے کا منظر پیش کر دیا، جو بڑی مہارت اور چابکدستی کا کام تھا اور اسٹیج پر بالکل ایسا لگتا ہے کہ ہم مشرقی پاکستان میں ہیں اور بادل گھِر کر آئے ہیں۔

رقص کے انچارج خود جی۔ اے منّان تھے ــــ ساز نوازی خادم حسین خاں نے کی۔ بدر الدین نے موسیقی کا سمجھاؤ اپنے ذمہ لیا۔ سیٹنگ اور کوسٹیوم (لباس و منظر) قمر الحسن نے ترتیب و تجویز کئے تھے کہانی کا ناٹکی مسودہ مجتبیٰ نے تیار کیا اور عبد السلام نے میک اپ کا انتظام کیا۔ غرض اس ٹیم کے ہر فنکار نے اپنی مہارت اور خوبی و کمال کو ایسا نبھایا کہ مغربی پاکستان کے دیکھنے والے عش عش کر اٹھے اور مشرقی پاکستان کے بھائیوں کے اس ثقافتی تحفے سے بیحد محظوظ ہوئے۔

"بلبل اکاڈمی آف فائن آرٹس" میں یہ اداکار شامل تھے:

بیگم نور النہار، رضیہ خانم، شاہدہ احمد، لیلیٰ نرگس۔ نیلوفر چودھری، نرگس مرشدہ، زبیدہ محبوب، پٹن دلیو، اور جھرنا باسک، جی۔ اے منّان، انور حسین بھوٹیاں، کمال لوہانی، دلال تعلقدار، محی الدین چودھری، راجہ حسین خاں، امین الحسن خاں، یونس حسین خاں، محمد حمایت علی، عبدالقادر چودھری، سوبل داس گپتا اور اجیت ڈے۔

مغربی پاکستان کے اس دورے میں "بلبل اکاڈمی" ڈھاکہ کے فنکاروں نے نہ صرف ہمیں اپنے اس حصہ ملک کی عوامی زندگی سے روشناس کرایا بلکہ فن رقص و اداکاری کے بھی وہ مظاہرے پیش کئے جو خالص فنی صلاحیت و صداقت کے اعتبار سے بھی خاصے کی چیز تھے۔ نئے دور میں ملک کی عوامی صلاحیتوں کی ہمت افزائی کرنے اور دونوں صوبوں کے درمیان روابط و تعلقات کو بہتر بنانے کے لئے جو کوششیں ہو رہی ہیں ان میں بلبل اکاڈمی کی اس پیشکش نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

ملتانی کافی:

محویت

(خواجہ غلام فریدؒ بہاولپوری)

مترجمہ حشمت فضلی

عشق ہوا گھر بھول گیا — زر اور شوہر بھول گیا

گذرے حسن کے ناز اور نخرے — جامہ و زیور بھول گیا

سرمہ سرخی منہدی بھولے — بولا[1] بنیسر[2] بھول گیا

درد و غم دل کا سرمایہ — اور کل جوہر بھول گیا

دیر کنشت و دوارہ مندر — مسجد و منبر بھول گیا

اس کی سوگند اس کی خاطر — سب خیر و شر بھول گیا

ہر دم اللہ یاد ہے ہم کو — اور اماں ہر[3] بھول گیا

جاؤں کیچ[4] فرید نہ لوٹوں

جنگل کا ڈر بھول گیا

[1] [2] ناک میں پہنے جانے والے زیورات۔
[3] بمعنی شر شے۔ سب کچھ
[4] پنوں کے وطن کا نام

★

مقامات،

خُلدزار

(وادئ کرم)

محمد شفیع صابر

وادئ کُرّم کا شمار سرحد کی خوبصورت ترین وادیوں میں ہے۔ اگر اسے سرحد کا کشمیر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، کُرّم خاص یعنی پاڑہ چنار کی وادی تو بالخصوص دلکش نظاروں کا ایک زندہ بہشت اور پھلوں پھولوں کا سرسبز و شاداب گلستاں ہے۔

کشمیر جنت نظیر کی طرح یہاں برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں بھی ہیں اور سرو و شمشاد کے سرسبز درخت بھی اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ جگہ جگہ پتھروں سے پھوٹنے والے چشمے بھی موسیقی نواز سُروں سے تماشائیوں کا دل لبھانے کو موجود ہیں۔ دریائے کُرّم اور اس کے معاون بھی لہریں لیتے پیچ در پیچ راستوں اور گہری گھاٹیوں سے گذرتے، چٹانوں سے ٹکراتے اور شور مچاتے اپنا راستہ طے کرنے میں مصروف ہیں۔ جہاں سیاحوں اور مسافروں کے ٹھہرنے کو ڈاک بنگلے موجود ہیں، وہیں میووں اور سبزیوں کی بھی افراط ہے۔ اگر شکار کے لئے مرغابیاں، سِسی، چکور اور مارخور عام ہیں تو سیر کے لئے قدرتی نظاروں کی بھی کمی نہیں۔ اگر یورپ کو اپنے سوئٹزرلینڈ پر فخر ہے، تو علاقۂ سرحد بجا طور پر کُرّم کی جنت نظیر وادی کو اس کے مقابلے میں پیش کر سکتا ہے۔

پھر قدرتی مناظر کی دلکشی کے ساتھ ساتھ وادئ کُرّم کے لوگ بھی حسن و جمال اور صحت و تندرستی کے زندہ نمونے ہیں خصوصاً طوری اور پاڑہ لوگ بیحد چاق چوبند اور شکیل و وجیہہ ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس خوشنما ماحول میں رہتے رہتے وہ خود بھی اسی سانچے میں ڈھل گئے ہیں۔ دوسرے قبائل کی طرح وادئ کرم کے لوگ مہمان نوازی اور رندانہ دلی میں بھی خاص شہرت کے مالک ہیں۔ ضروریاتِ زندگی بھی نسبتاً سستی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان بھر میں سیاحوں کو اگر گرمیاں گذارنے کا سب سے سستا اور خوشگوار صحت افزا مقام نصیب ہو سکتا ہے تو وہ وادئ کُرّم ہے۔ نہ صرف اس کا صدر مقام، پاڑہ چنار اپنے قدرتی حُسن کے باعث مشہور ہے، بلکہ وادی کے کسی بھی گاؤں میں چلے جائیے، ہر جگہ مفتوں ہونے کو جی چاہتا ہے۔ اور ہر مقام پر "کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست" کی کیفیت ہے۔

پھر یہاں کی زندگی بیحد امن و سکون کی زندگی ہے۔ گو یہ وادی آزاد قبائلی علاقہ ہی کا حصہ ہے، لیکن اس کے رہنے والے تمام پاکستانی شہریوں کی طرح بلکہ قیامِ پاکستان کے بعد تو ان میں اُخوت و ہمدردی کے جذبات اور بھی نمایاں ہو رہے ہیں۔ وہ ہر نووارد کو اپنا مہمان اور بھائی سمجھتے ہوئے اس کی خاطر و مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔

اگرچہ اب بھی ہر سال ہزاروں لوگ گرمیاں گذارنے کُرّم پہنچتے ہیں۔ لیکن اگر اس علاقے میں سیاحوں کی آمد و رفت پر توجہ دی جائے۔ اور فروغِ سیاحت کا کوئی ادارہ قائم کر کے اہلِ پاکستان کو اس وادی کے قدرتی نظاروں سے متعارف کرایا جائے۔ تو کُرّم دوسرا کشمیر بن سکتا ہے۔

وادئ کُرّم کوئی ساٹھ میل لمبی اور دس میل چوڑی ہے۔ شمال میں سلسلۂ کوہ سفید اسے شنواری علاقے سے جدا کرتا ہے۔ جنوب میں وزیرستان مشرق میں چمکنی، زائی مشت اور اورک زائی کے علاقے اور میران زائی کی وادی اور مغرب میں افغانستان واقع ہے۔

کُرّم کی وادی اسی نام کے دریا اور درہ کے باعث مشہور ہے۔ یہ کوہ سفید کے بلند سلسلوں کے درمیان پھیلتی چلی گئی ہے اور تاریخی لحاظ سے بھی بیحد قدیم ہے۔

مالاکنڈ، خیبر، کرّم، ٹوچی، گومل اور بولان کے درے پاکستان کی شمال مغربی سرحد پر بیحد سیاسی اہمیت کے حامل ہیں، کیونکہ انہی سے ہو کر وہ شاہراہیں گذرتی ہیں جو صوبہ سرحد کو افغانستان اور وسط ایشیا کے باقی ملکوں سے ملاتی ہیں۔ وادئ کُرّم بھی درہ کُرّم کے دہانے پر واقع ہونے کے باعث بیحد اہم دفاعی مقام ہے۔ پاڑہ چنار اور ٹل کی چھاؤنیاں اسی اہمیت اور حفاظتی نقطۂ نظر کے پیشِ نظر قائم کی گئی ہیں۔ کوہاٹ سے ٹل تک تو ریلوے لائن بھی موجود ہے۔ اور اس امر کے امکانات بھی ہیں

کر اسے مزید چھپن میل تک بڑھا کر پاڑہ چنار کو بھی ریل کے ذریعے پاکستان کے باقی حصوں کے ساتھ ملا دیا جائے۔ پاڑہ چنار اس لحاظ سے بھی ایک کلیدی مقام ہے کہ یہاں سے پیواڑ کوتل کا مقام، جہاں افغانستان اور پاکستان کے ڈانڈے ملے ہوئے ہیں، صرف پندرہ میل دور ہے۔ پیواڑ کوتل سمندر کی سطح سے کوئی نو سوا نو ہزار فٹ بلند ہے۔ یہاں سے ایک راستہ افغانستان کی طرف نکلتا ہے جو پاکستان سے کابل پہنچنے کا نزدیک ترین راستہ ہے۔ پیواڑ کوتل سے چل کر یہ راستہ "شتر گردن" کے درے اور لوگر وادی سے ہوتا ہوا کابل جا پہنچتا ہے۔ افغانستان کی دوسری اور تیسری جنگوں میں اس راستے سے کافی فائدہ اٹھایا جا چکا ہے ۱۹۲۰ء میں امان اللہ خاں نے بھی اسی راستے سے ٹل کی چھاؤنی اور قلعے پر حملہ کیا تھا۔ تاہم چونکہ یہ راستہ سال کے اکثر حصہ برف سے ڈھکا رہتا ہے اس لئے اسے زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہو سکی۔ نہ یہ سڑک ہی اتنی بڑی ہے کہ اس پر موٹر لاریاں آجا سکیں۔ پھر چونکہ وادیٔ کرم کے لوگ بھی پاکستان کے انتہائی وفادار ہیں۔ اس لئے آجکل اس طرف سے کسی خطرے کا گمان تک نہیں کیا جا سکتا۔

کوہ سفید اور دریائے کرم کی تہذیب بےحد پرانی بیان کی جاتی ہے۔ چنانچہ رگ وید میں دریائے کرم کو "کورمو" اور کوہ سفید کو "سوآسیتا" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ وادی میں اب تک جا بجا پرانے زمانے کے بت اور سکے ملتے ہیں۔ اسی طرح کئی دیہات اور مقامات کے نام بھی ویدک زمانے کی یاد دلاتے ہیں۔

دریائے کرم افغانستان کے اونچے پہاڑوں سے نکل کر خرلاچی کے مقام پر کرم ایجنسی میں داخل ہوتا ہے اور کوہاٹ سے پاڑہ چنار جانے والی سڑک کے ساتھ ساتھ ٹل تک بہتے ہوئے پھر وزیرستان کی طرف مڑ جاتا ہے۔ وہاں سے شیوہ، بنوں اور لکی مروت ہوتا ہوا میانوالی کے شہر کے بالمقابل دریائے سندھ میں جا گرتا ہے۔ چونکہ یہ دریا کوہ سفید کی برفانی چوٹیوں سے نکلتا ہے اس لئے اُن دنوں جب پہاڑوں پر برف کافی پڑی ہو اس کے پگھلنے سے کرم میں بھی اکثر طغیانی آجاتی ہے۔ بنوں کے ضلع میں اس سے کچھ نہریں بھی نکالی گئی ہیں جو علاقے کی سرسبزی اور شادابی میں اضافہ کرتی ہیں۔ کچی کوٹ اور کرم گڑھی کی نہریں اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد حکومت کی طرف سے کرم گڑھی سکیم کے ماتحت دریا پر ایک بہت بڑا بند باندھا جا رہا ہے۔ جہاں سے نہ صرف متعدد نہریں نکالی جائیں گی اور اس طرح لاکھوں ایکڑ بنجر زمین سیراب ہونے لگے گی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اسی بند پر ایک قدرتی آبشار پیدا کر کے تین ہزار کلوواٹ برقابی قوت بھی حاصل کی جائے گی جو ضلع بنوں کے گھریلو اور صنعتی استعمال میں آ کر اس علاقے کی خوشحالی کو چار چاند لگا دے گی۔ اس ساری سکیم پر ایک کروڑ روپیہ خرچ ہوگا۔ انقلاب اکتوبر کے بعد سے اس جگہ کام تیزی کے ساتھ جاری ہے اور اندازہ ہے کہ ایک سال تک آبپاشی کی نہریں کام کرنے لگیں گی۔

کافی تحقیق کے باوجود پندرہویں صدی عیسوی سے پہلے کرم کی تاریخ کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ خیال ہے کہ اُن دنوں یہ علاقے بھی مختلف قبیلوں کے مختلف سرداروں کے ماتحت تھے اور کوئی قابلِ ذکر حکومت یہاں موجود نہ تھی۔ پندرہویں صدی عیسوی میں یہ سارا علاقہ (وادی کرم، میران زائی اور موجودہ ضلع کوہاٹ) قبیلہ بنگش کے ماتحت آ گیا۔ کہتے ہیں کہ بنگش لوگ عرب سے ہجرت کر کے یہاں پہنچے تھے تاہم اُن کا اقتدار بھی زیادہ دیر تک قائم نہ رہنے پایا اور کچھ عرصہ بعد طوری اور جاجی لوگ وہاں وارد ہوئے تو بنگش کو کافی علاقے سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اس طرح وقت کے ساتھ دوسرے قبیلے بھی یہاں پہنچتے اور آباد ہوتے رہے۔

آج کل یہاں کے بڑے بڑے قبیلے بنگش، طوری، زائی مشت اور چمکنی ہیں، لیکن ان کے علاوہ آفریدی، علی شیر زئی، غلزئی، ہزارہ، جاجی، خوست وال، ماموزائی، لسیانی، ماؤزئی، مقبل، شنوار، پاڑہ، ادرک زائی، یوسف زائی، وزیر اور سید بھی کچھ تعداد میں ملتے ہیں، اور ان سب کو ملا کر وادیٔ کرم کی آبادی قریباً ستر ہزار ہو جاتی ہے۔

پاکستان کے قیام کے بعد ملک میں فرقہ دارانہ سوال قریباً ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ اب سبھی قبائل پاکستان کی حکومت کو اپنی حکومت سمجھتے ہیں کیونکہ پاکستان کے حصول کے لئے دونوں نے ایک جیسی قربانی دی ہے۔ اس میں سرحدیوں کا بھی وہی حصہ ہے جو پنجابیوں کا، اور بنگالیوں کو بھی وہی مقام حاصل ہے جو سندھیوں کو۔ کیونکہ وہ سب ایک ہی ملک کے فرزند ہیں۔

بانیٔ پاکستان قائداعظمؒ نے اپنے آخری دورہ سرحد کے دوران پر آزاد قبائل کے ایک جرگہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا: "ہمیشہ میری یہ کوشش رہی ہے کہ مسلمانوں میں اتفاق و یکجہتی پیدا ہو اور

اُمید ہے اس عظیم مملکتِ پاکستان کی تعمیر و ترقی کا جو کام اس وقت ہمارے سامنے ہے اسے دیکھتے ہوئے سب کو اس بات کا کامل احساس ہوگا کہ اس وقت اتحاد باہمی کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے ہم مسلمانوں کا خدا ایک ہے، قرآن ایک ہے، رسولؐ ایک ہے۔ اس لئے ہمیں ایک قومِ واحد کی طرح متحد ہو کر رہنا چاہئیے۔ ایک پرانی کہاوت ہے اتفاق میں طاقت اور نا اتفاقی میں ہلاکت ہے۔" (جرگہ جملہ قبائل سرحد، اپریل ۱۹۴۸ء)

میرانِ زائی کی وادی ضلع کوہاٹ کے عمدہ علاقوں میں سے ایک ہے۔ اور دو حصّوں میں بٹی ہوئی ہے۔ سدّہ ان دونوں حصّوں کا نقطۂ اتّصال ہے۔ سدّہ سے شمالی علاقے کو کرّم یا پاڑہ چنار کی وادی اور جنوبی کو میران زائی کی وادی یا لوئر کرّم کہا جاتا ہے۔

ٹل سے گذر کر سڑک دریائے کرّم کے ساتھ ساتھ پاڑہ چنار پہنچی ہے۔ ٹل سے آگے چھپری، مندوری، بادشاہ کوٹ، ارا ولی اور دُرّانی سے ہوتے ہوئے سدّہ آتا ہے۔

زیریں کرّم یا میران زئی کی وادی کا یہ آخری مقام ہے۔ سدّہ سے آگے بالائی کرّم یا پاڑہ چنار کی وادی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ وادی نسبتًا کُھلی ہے۔ جگہ جگہ ندی نالے بہتے ہیں اور اس طرح آبپاشی کی سہولتیں میسّر ہیں۔ سبز و شاداب اور سدا بہار درختوں سے گھرے ہوئے نشیب فراز میں واقع پاڑہ چنار کے اونچے نیچے مکان سیّاحوں کے لئے بیحد دلچسپ نظارہ پیش کرتے ہیں۔ گورنر اور پولیٹیکل ایجنٹ کے بنگلے، کُرّم ملیشیا کا ہیڈ کوارٹر، سول ہسپتال، ہائی سکول، لائبریری اور دوسری عمارتیں خاص طور پر قابلِ دید ہیں۔

پاڑہ چنار کی وجہ تسمیہ بھی عجیب و غریب ہے۔ "پاڑہ" وادی کرم کا ایک قبیلہ ہے۔ جو کوہ سفید کی انتہائی بلندیوں پر آباد ہے۔ یہ لوگ حجروں کی بجائے چنار کے کسی بڑے درخت کی چھاؤں میں اپنی مجلسیں منعقد کرتے ہیں اور وہیں قومی معاملات کے متعلق مشورے ہوتے ہیں۔ چنانچہ چنار کا ایک ایسا ہی بوڑھا پیڑ اب تک کرّم ملیشیا کے قلعہ کے سامنے موجود ہے۔ جہاں پاڑہ قوم کے جانباز آکر ایک دوسرے سے مشاورت کرتے ہیں۔ قوم پاڑہ کی مناسبت سے چنار کے اس پیڑ کا نام بھی "پاڑہ چنار" پڑ گیا۔ اور بعد میں بسنے والا یہ شہر بھی اس طرح پاڑہ چنار ہی کہلایا۔ اگرچہ اب اس پیڑ کا تنا کھوکھلا ہو چکا ہے پھر بھی پاڑہ چنار کے لوگوں کو اس تاریخی "چنار" سے اتنا اُنس ہے کہ اس کے تنے کو مضبوط رکھنے کے لئے اس کے اردگرد سہارے کے طور پر سیمنٹ کا ایک چبوترہ بنا دیا گیا ہے۔

چنار کے درخت کو یوں بھی اس وادی میں ایک خاص حیثیت حاصل ہے۔ جب بھی کوئی معزز مہمان یہاں آکر ٹھہرتا ہے، تو اُس کی یاد تازہ رکھنے کے لئے یہ لوگ اس کے ہاتھوں چنار کا ایک درخت لگواتے ہیں۔ چنانچہ عرصہ ہوا جب محترمہ فاطمہ جناح سرحد آئیں اور اہلِ کُرّم کی مہمان بنیں تو انہوں نے بھی اپنے ہاتھ سے ایک خاص جگہ پر چنار کا ایک درخت لگایا۔ یہ درخت اب کافی بڑا ہو چکا ہے۔

پاڑہ چنار تک موٹروں اور لاریوں کی عمدہ سڑک موجود ہے۔ بلکہ سیاحوں کی سہولت کے لئے نہ صرف پاڑہ چنار بلکہ بہت سے دوسرے اہم مقامات، مثلاً مندوری، علی زئی، سدّہ، پیواڑ، من جال وغیرہ میں ریسٹ ہاؤس بنے ہوئے ہیں۔ اور جہاں ریسٹ ہاؤس نہ بھی ہو وہاں ہر قبائلی کا مکان ہی مہمانوں کے لئے ریسٹ ہاؤس کا درجہ رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ بیحد مہمان نواز اور خلیق ہیں، اور باہر سے آنے والوں کی بیحد قدر و حرمت کرتے ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں چلے جائیے غریب سے غریب آدمی بھی آپ کو چائے پیش کرے گا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ گڑ کی چائے ہو یا چینی کی۔ چائے نوشی کرّم میں اتنی عام ہے کہ ہر گھر ایک بے تکلف قہوہ خانہ ہے اور بلا مبالغہ ہر روز ہر گھر میں گڑ کی چائے کے سو سو پیالے لنڈھائے جاتے ہیں۔ یہی حال تمباکو نوشی کا ہے۔ اس "لعنت" میں بھی اہلِ کُرّم سب سے آگے ہیں، سات سال کے بچے سے لے کر سو سال کے بوڑھے تک سب چلم پہ جان دیتے ہیں، یہاں تک کوئی مدرسہ، کوئی مسجد، کوئی خانقاہ اور کوئی زیارت بھی چلم سے خالی نہیں!

کُرّم کے باشندوں کی یہ مہمان نوازی اُن سیّاحوں کے لئے بیحد حوصلہ افزا ہے جو صوبہ سرحد کی اس جنّت نظیر وادی کے حسین قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ البتہ وادیٔ کرم کی سیر کا اصل لطف اکتوبر کے مہینے میں آتا ہے۔ یہ وہ دن ہیں جب کوہِ سفید کی نواحی چوٹیوں پر برف باری شروع ہو جاتی ہے۔ اور کرّم کے تمام پھل بھی پک جاتے ہیں۔ یوں تو انار، سیب، خوبانی، ناشپاتی، زرد آلو، شہتوت، آلوچہ، کون سا میوہ ہے جو وادیٔ کُرّم میں نہیں ہوتا، لیکن کرّم، خصوصًا زیمران کے "شلیل" اس علاقے کا خاص میوہ ہیں۔ شلیل زرد آلو سے ملتا جلتا ہے لیکن اس کا مزا زرد آلو سے کہیں بہتر ہے۔ یہ میوہ ہفتوں تک خراب بھی

نہیں ہوتا۔ اس لئے دور دور بھیجا جاتا ہے۔

سیر و شکار کے شوقین لوگوں کے لئے یہاں کوئی کمی نہیں۔ پاڑہ چنار کے علاوہ نواحی دیہات بھی قدرتی نظاروں سے مالامال ہیں۔ شلوزان تو ایجنسی بھر میں خوبصورت ترین مقام ہے۔ اسی طرح احمد زائی، پیواڑ، تری منگل، ڈنڈر، عوز گڑھی، کرمان اور زیڑان بھی قابل دید مقامات ہیں۔ مؤخر الذکر کا پانی صحت کے لئے بہت ہی مفید ہے۔

شکار بھی ساری وادی میں بہ افراط ہے۔ پہاڑوں میں چیتے، مارخور، بنڈھے، سؤر، بھیڑیئے، گیدڑ، لومڑیاں، نیولے، خرگوش، ہرن اور جنگلی چوہے عام پائے جاتے ہیں۔ ادھر دریائے کرم اور دوسرے ندی نالوں پر کونجیں، کبوتر، سسی، چکور، بطخیں، اور مرغابیاں بھی کثرت سے ہیں۔ خاص طور پر بطخ کا شکار بہت عام اور بے حد پر لطف ہوتا ہے۔ اس کے لئے خاص قسم کے تالاب بنائے جاتے ہیں، جن میں گوبر سے بنائی ہوئی بطخیں کھڑی کی جاتی ہیں۔ جب اصلی بطخیں ان پر اپنے ہم جنس ہونے کا گمان کرتے ہوئے نیچے اتر کر تالاب میں تیرنے لگتی ہیں۔ تو نہایت دلکش سماں بندھ جاتا ہے اور آسانی سے انہیں نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔ تیسری قسم کا شکار ماہی گیری ہے۔ شلوزان اور ڈنڈر کے قریب دریائے کرم میں مچھلی بہت ملتی ہے۔ اور لوگ جی بھر کر مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ گو یہ مچھلی ذائقے کے لحاظ سے بیحد لذیذ ہے، مگر چھوٹی اور کانٹے والی ہوتی ہے۔

کوہِ سفید کی مارخور بکری اور مرغِ زرّیں بھی خاص طور پر مشہور ہیں۔ ایک درخت "مارچوب" بھی یہاں ہوتا ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ اگر کسی گھر میں اس کی ٹہنی موجود ہو تو وہاں سانپ کا گذر نہیں ہوسکتا لیکن ساتھ ہی ساتھ مقامی لوگ اسے بیحد منحوس بھی خیال کرتے ہیں۔

منطقہ معتدلہ کے تقریباً تمام درخت بھی وادیٔ کرم میں پائے جاتے ہیں۔ اونچے پہاڑوں پر دیودار، چیڑ، زیتون اور بلوط وغیرہ کے گھنے جنگلات ہیں۔ جن کی لکڑی عمارتی کام میں لائی جاتی ہے۔

ان جنگلات میں طرح طرح کی ادویاتی جڑی بوٹیاں بھی ملتی ہیں جن میں سے آرٹیمیشیا، جسے مقامی زبان میں "ترخہ" کہا جاتا ہے، خاص طور پر بیحد قیمتی ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وادیٔ کرم کی خوشحالی کا دارومدار زیادہ تر اسی بوٹی پر ہے، تو مبالغہ نہ ہوگا۔ ہر سال ہزاروں من آرٹیمیشیا یورپ کے مختلف ملکوں کو بھیجا جاتا ہے۔ جہاں یہ بے شمار انگریزی دوایات کا جزو بنتا ہے۔ گو وادیٔ کاغان، گلگت اور چترال میں بھی یہ تھوڑی مقدار میں ضرور پایا جاتا ہے۔ مگر کرم کا "ترخہ" بہترین تسلیم کیا گیا ہے۔

اسی طرح کرم کے سیب، خوبانی اور ٹماٹر بھی خاص شہرت رکھتے ہیں اور صوبہ سرحد اور پاکستان کی منڈیوں میں ان کی بڑی مانگ ہے۔ اسی طرح "لال ماش" "د کرخہ" بھی سال میں ہزاروں من ہندوستان کو بھیجا جاتا ہے۔ یہ ہندو لوگوں کا من بھاتا کھاجا ہے۔

ان سب سے بڑھ کر کرم کے چار خاص تحفے ہیں ـــ کرمان کے چاول، ملانہ کے پتھر، اور پیواڑ کے جنگلات۔

کرم کی خوشحالی کی ایک اور وجہ تجارت ہے۔ نہ صرف پاکستان کے مختلف علاقوں کے ساتھ تجارتی سلسلہ قائم ہے بلکہ افغانستان کی طرف یہاں سے کئی راستے نکلنے کے باعث افغان پاوندے ہر سال کرم کے شہروں میں لین دین میں مصروف نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ کپڑا، چینی کے ظروف، تانبے اور ایلومینیم کے برتن، گڑ، چاول وغیرہ کابل اور دوسرے افغانی شہروں کو لے جاتے ہیں اور وہاں سے قراقلی، خشک میوے انگور اور سردے وغیرہ یہاں لاکر بیچتے ہیں۔

اسی طرح علی زائی سے بھی ایک راستہ افغانستان کے صوبہ خوست کی طرف جاتا ہے۔ علی زائی خاصا بڑا قصبہ ہے اور ٹل سے پاڑہ چنار جانے والی سڑک پر واقع ہے۔

کرم کے قدرتی مناظر اور دلکشی کے ساتھ ساتھ یہاں کے باشندے بھی اپنے بانکپن کے لئے مشہور ہیں۔ ان کا بانکپن عیدوں اور تہواروں پر اور بھی دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر یہ لوگ رنگین اور شوخ کپڑے پہنتے ہیں۔ منگل اور داور قبیلوں کے نوجوان عید کی تقریبات پر ایک ابرو اور اس کے دوسری طرف کی ایک مونچھ مونڈتے اور ایک آنکھ میں سیاہ اور دوسری آنکھ میں سُرخ سرمہ (گلنار) لگاتے ہیں۔ جن کے چہروں پر داڑھی ہوتی ہے، وہ داڑھی کا بھی ایک حصہ مُنڈا دیتے ہیں، ان دنوں وہ تلواروں کو بے نیام کر لیتے ہیں اور طرح طرح کے مردانہ کھیلوں سے شجاعت کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کھیلوں کے ساتھ ساتھ ایسے ہی موقعوں پر حسن و رومان کی داستانیں بھی، پروان چڑھتی ہیں۔ یہاں انہی نوجوانوں کو پسند کیا جاتا ہے جو زیادہ طرحدار اور شجاع ہوں اور شمشیر زنی اور نیزہ بازی میں دوسروں کو شکست دے سکیں۔

قبیلوں میں یہ بھی دستور ہے کہ شادی کے بعد جب دُلھن

عروج و ترقی کی منزلیں

قومی نمائش (۱۹۶۰ء) :
ہماری ہرجہتی ترقی کے چند در چند مظاہر

دستکاریاں : بیش بہا قومی ورثہ اور سرچشمہ دولت

مواصلات کی برق رفتار ترقی
(صدر پاکستان پی اینڈ ٹی کے اسٹال پر)
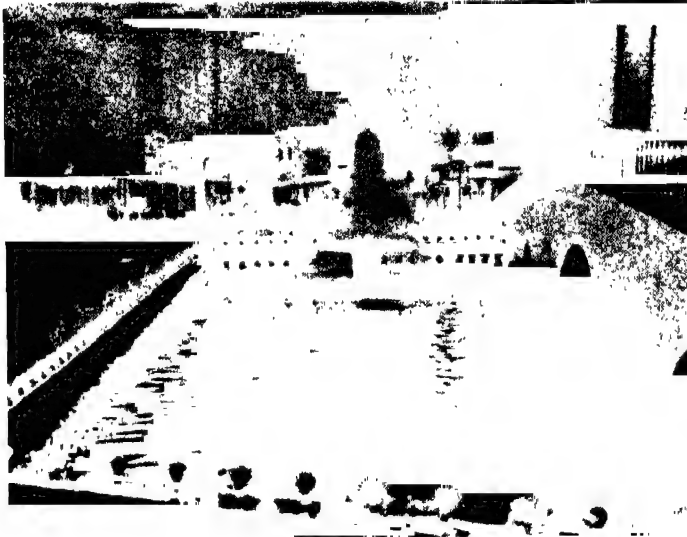
نمائش : رات کے وقت ایک دل آویز منظر
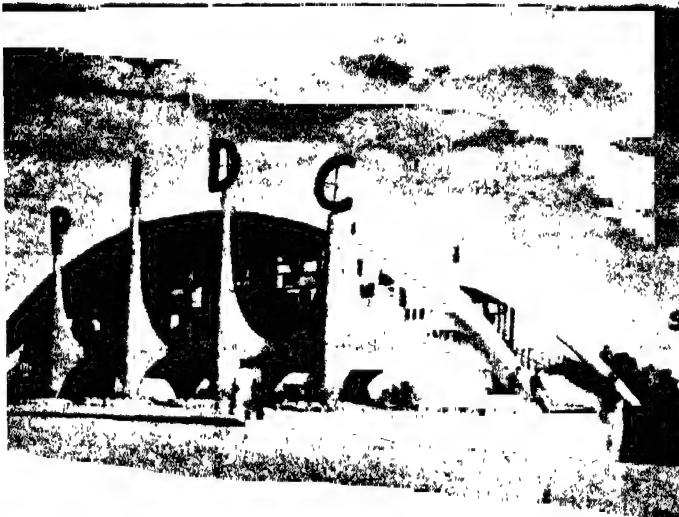
ہماری ہرجہتی ترقی کا سرچشمہ (پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی)

دولت کی کان : ہماری بوقلموں دستی مصنوعات

افتتاح : قائم مقام صدر پاکستان ، لفٹیننٹ جنرل واجد علی برکی

مندوب برطانیہ ، سر جرمی ریزمین کا خطاب

تقریر : ریورٹر ، بین‌الاقوامی ایوان تجارت

پاکستانی مندوب، مسٹر ایم ۔ اے ۔ رنگون والا کی استقبالیہ

ترقی کی نئی سمتیں

ی و معاشری سرگرمیوں کے علاوہ کاروبار و تجارت
ہمارا خصوصی مرکز توجہ ہیں ۔ پچھلے دنوں
چی میں وسیع پیمانہ پر ایک اجتماع اہل تجارت
جس میں ۳۰ ملکوں کے ۵۰۰ مندوبین نے شرکت کی

دولہا کے گھر پہنچتی ہے۔ تو کئی دن تک شرم و حیا کی گڑیا بنے کسی کونے میں دبکی پڑی رہتی ہے۔ جب یہ مقررہ دن گذر جاتے ہیں تو قبیلے کی دوسری دوشیزائیں دف بجاتی سر پر گھڑے اٹھائے دلھن کے گرد جمع ہو جاتی ہیں، اور اُسے ساتھ لے کر گاتی بجاتی، خوشیاں مناتی کسی دریا یا چشمے پر پہنچتی ہیں۔ جہاں سے گھڑوں میں پانی لے کر واپس گھر لوٹتی ہیں۔ دلھن بھی اس رسم میں شریک ہوتی ہے۔ جب یہ شگون پورا ہو جائے تو دلھن کی خلوت گزینی ختم ہو جاتی ہے اور وہ آزادی سے گھریلو زندگی بسر کرنے لگتی ہے۔

طوری قبیلے کا لباس خصوصاً بیحد دلچسپ اور رنگین ہوتا ہے۔ اُن کی قمیص کی آستین عموماً نیلی ہوتی ہیں اور گردن کے ارد گرد لال ڈوری یا کوئی سنہری فیتہ لگا ہوتا ہے۔ یہ لوگ اپنی بہادری کے اظہار کے لئے عجیب عجیب رسمیں ادا کرتے ہیں۔ چنانچہ جب بچہ چلنے پھرنے کے قابل ہوتا ہے اور پہلی بار باہر کے لوگوں سے متعارف کرایا جاتا ہے تو اس کے سر پر چند فائر کئے جاتے ہیں۔ اگر بچہ ان فائروں سے خوف زدہ نہ ہو، تو یہ شگون لیا جاتا ہے کہ آگے چل کر یہ بچہ قبیلے کا نامور سردار ثابت ہوگا۔

طوری اور بنگش عام طور پر سر پر لمبے بال رکھتے ہیں جسے "جوڑے" کہتے ہیں۔ پاڑا اور مقبل کے سر گھٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ خٹکوں کی طرح اہلِ کرم کا بھی ایک قومی ناچ ہے — "غرّہ"۔ جب لمبے لمبے بالوں والے، لمبے تڑنگے۔ بانکے نوجوان اس ناچ میں شریک ہوتے ہیں، تو عجیب منظر پیدا ہوتا ہے۔

"غرّہ" دراصل ناچ نہیں، بلکہ ایک جنگی لازمہ یا رزمیہ رجز ہے۔ اور غور سے دیکھا جائے تو اس کی تمام حرکات اور مختلف مراحلِ جنگ کی کسی نہ کسی حرکت کے مظہر ہیں۔ ڈھول کا بجنا نوجوانوں کو ایک جگہ جمع ہونے اور جم کر لڑنے کی دعوت دیتا ہے، اور لڑائی کا جوش پیدا کرتا ہے۔ "گتکا بازی" کی طرح اس سے شمشیر زنی کے مختلف کرتب بھی سیکھے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح جسم میں چستی، چالاکی کی لہر دوڑا دینے میں بھی "غرّہ" کو خاص رتبہ حاصل ہے۔

"غرّہ" کے علاوہ وادیٔ کرم کے رہنے والے موسیقی سے بھی ایک خاص لگاؤ رکھتے ہیں۔ شام کو جب ڈوبتے سورج کی کرنیں روسفیدکی برفانی چوٹیوں سے ٹکرا کر عجیب عجیب رنگ پیدا کرنے لگتی ہیں، وادی کے رنگین نوجوان بھی اپنے اپنے "ایکتارے" لئے کسی چشمہ کے پاس ماردوں کے جھنڈ میں جمع ہو جاتے ہیں اور پہروں اُن کے نغمے سارے ماحول میں خوشی و مسرت کی لہر دوڑاتے رہتے ہیں۔

کرم کے ان جوانمردوں نے بھی اپنے دوسرے سرحدی بھائیوں کے دوش بدوش جہادِ کشمیر میں شاندار حصہ لیا ہے، اور اب بھی وہ اپنے محبوب وطن پاکستان کی حفاظت کے لئے دن رات سینہ سپر اور سر بکف ہیں۔ حکومتِ پاکستان بھی ان کی بہتری کے لئے سرگرمِ عمل ہے تعلیمی اقتصادی اور مجلسی زندگی کے ہر شعبے میں شاندار ترقی دیکھنے میں آ رہی ہے۔ چنانچہ پاکستان کے قیام کے بعد متعدد نئے مدارس جگہ جگہ قائم کئے جا رہے ہیں۔ پارہ چنار میں گورنمنٹ کالج قائم ہو چکا ہے اور ایک اوّل درجے کا ہائی سکول موجود ہے۔ علی زائی کے مڈل سکول کو بھی ہائی سکول کا درجہ دیا جانا منظور ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ پیواڑ، شلوزان، تالم نشتر، کڑمان، ناستی کوٹ، احمد زئی، سامیر، سدہ، زیڑان اور دوسرے اہم دیہات میں پرائمری سکول بھی جاری ہیں اور تعلیم بالغان کے مراکز بھی دن رات اس علاقے کے لوگوں کی جہالت ختم کرنے میں مصروف ہیں۔ ایجنسی کے طلباء کو وظیفے دے کر پاکستان کے مختلف کالجوں اور اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں بھی بھیجا گیا ہے، اور سرکاری ملازمت کے دروازے بھی ان کے لئے کھلے ہیں۔

دورِ انقلاب نے یہاں کے لوگوں میں تعمیر و ترقی کی نئی لگن پیدا کر دی ہے اور وہ دیگر فرزندانِ وطن کی طرح پاکستان کو سربلند کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں ❊

"ماہِ نو" کے لئے

غیر طلبیدہ مضامین

- غیر طلبیدہ مضامین نظم و نثر صرف اس حالت میں واپس کئے جائیں گے جبکہ ان کے ساتھ ڈاک کے مناسب ٹکٹ روانہ کئے گئے ہوں۔
- مسترد مضامین کے سلسلے میں غیر ضروری خط و کتابت کرنے سے ادارہ کو معذور سمجھا جائے۔
- ایک ہفتہ تک اطلاع موصول نہ ہونے پر مرسلہ مضامین ناقابلِ اشاعت تصور کئے جائیں۔
- ادارہ ڈاک میں کسی مسودے کے گم ہو جانے کا ذمہ دار نہیں۔

(ادارہ)

ادارے:

مہران جا ماٹک[1]

(سندھی ادبی بورڈ)

امیر حسن سیال

مغربی پاکستان کا شاید ہی کوئی حصہ ایسا ہوگا جس نے علم و فن اور تہذیب و ثقافت کے فروغ میں حصہ نہ لیا ہو۔ وہ سب اپنے اپنے طور پر اچھوتے، انمول پارہ ہائے ادب کو جنم دیتے رہے ہیں بعض علاقوں خصوصاً سابقہ سرحد، پنجاب اور سندھ نے اس میں نمایاں حصہ لیا ہے اور اب بھی بیش از بیش حصہ لے رہے ہیں۔ کچھ دھرتی کی تاثیر، کچھ لوگوں کا خمیر، ان مقامات نے علمی، ادبی اور ذہنی و ثقافتی حیثیت سے زرخیز ہونے کا بہت عمدہ ثبوت دیا ہے۔ یہ نقش ہائے رنگ رنگ جو تاریخ ادب، عوامی شاعری، لسانیات اور دیگر علوم و فنون سے تعلق رکھتے ہیں۔ آج پاکستان کا نہایت ہی بیش بہا ثقافتی خزانہ ہیں۔ اور ہم میں سے کون ہے جس کو اس پر ناز نہ ہو؟

غور سے دیکھا جائے تو ہماری زندگی اور ملی وجود کی بنیاد ہی تہذیب و ثقافت کے ان آثار کہن پر قائم ہے۔ اور ہم ان سے جس قدر قریب آئیں گے اتنا ہی اپنی خودی سے قریب تر آئیں گے۔ اور ہماری حیات ملیہ کی بنیادیں استوار تر ہوں گی۔ قومی زندگی کے ان مضبوط رگ ریشوں کو تلاش کرنا، ان کو بروئے کار لانا اور نشو و نما دینا درحقیقت اپنے ملی وجود ہی کو اور مستحکم کرنا ہے۔ ہماری بولیاں، ہماری زبانیں، ان کا ادب، لوک شاعری، لوک گیت سب ہماری یکساں توجہ چاہتے ہیں۔ یہ پاکستان کی یکجہتی، اس کی سالمیت کے محکم ستون ہیں۔ کیونکہ یہی ہمارے دلیس کے مختلف حصوں اور اس باشندوں کو ایک دوسرے سے روشناس کرانے اور ان میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا نہایت عمدہ ذریعہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے پاکستان وجود میں آیا ہے، حکومت اور عوام کی توجہ برابر انہی پر مرکوز ہے۔ حکومت نے تو بالخصوص اس کو اپنی پالیسی کا سنگ بنیاد قرار دیا ہے کہ مغربی و مشرقی پاکستان ہی نہیں خود ان صوبوں کے مختلف حصوں کو بھی وحدت کے رشتہ میں منسلک کیا جائے جس میں ثقافتی وحدت کو نمایاں اور بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ہماری موجودہ انقلابی حکومت نے تو خاص طور پر اس وحدت کو اپنا خاص مطمع نظر قرار دیا ہے۔ اور ایسے اداروں کے قیام اور ان کی تائید پر زور دیا ہے جو ہر علاقے کے تہذیبی و ثقافتی دھاروں کو ابھاریں، ان کو آپس میں ملائیں تاکہ ایک پر زور قومی تحریک اور نیا، توانا شعور ملی وجود میں آئے۔

حالات کا یہ رخ آزادی کے پہلے ہی چند سالوں میں نمایاں ہو چکا تھا۔ اور مختلف علاقوں میں ایسے ادارے حکومت ہی کی تائید سے قائم ہو گئے تھے جنہوں نے یہ اہم قومی فرض ادا کرنا شروع کر دیا تھا۔ انہی میں سے ایک "سندھی ادبی بورڈ" ہے۔ بے حد سرگرم، تیز رفتار، براق — جس نے چند ہی سال کے عرصہ میں اس قدر کار نمایاں سرانجام دیا ہے جو قابل داد بھی ہے اور قابل فخر بھی۔ اس کی بدولت وادی مہران ایک بار پھر خواب گراں سے جاگ اٹھی ہے۔ اور ہم اس کے خد و خال کو ان کی پوری کشش و رعنائی کے ساتھ دیکھنے لگے ہیں۔ یہ پاکستان کے مستقبل کے لئے نہایت خوش گوار علامت ہے۔

"سندھی ادبی بورڈ" دراصل پہلے سابقہ صوبہ سندھ کی حکومت نے ۱۹۵۱ء میں قائم کیا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ سندھی زبان اور اس کے ادب کو ترقی اور فروغ دیا جائے۔ تب سے یہ برابر ایک سرکاری ادارے کے طور پر کام کرتا رہا اور اس کو تمام تر مالی امداد سالانہ حکومت سندھ سے ملتی رہی۔ یہاں تک کہ مارچ ۱۹۵۵ء میں اسے ایک آزاد اور خود مختار ادارہ بنا دیا گیا اور یہ اب تک اسی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔ اس کی

---

[1]: مہران کے موتی [مہران = مہران، دریائے سندھ؛ جا = کا؛ ماٹک = موتی]

آزاد و خود مختار حیثیت نے اس میں زندگی کی ایک نئی روح دوڑا دی اور ایسے انسانوں کی زیر سرکردگی جو اپنے علاقے اور اپنی قوم کی زبان و ادب کی زبردست لگن لئے ہوئے ہیں، اس نے حقیقتاً بہت ہی عمدہ کام کیا ہے۔ جس سے ہم وادیٔ مہرآن کی علمی و ادبی پہنائیوں کو ایک نئی نظر سے دیکھنے لگ گئے ہیں۔

بورڈ کی سرگرمیوں میں غیر معمولی تنوع دکھائی دیتا ہے۔ اس کا مقصد پاکستان کے اس حصہ کو جو کبھی سندھ کہلاتا تھا ہر حیثیت سے سامنے لاتا ہے، اسے پاکستان کے وسیع تر حلقۂ تہذیب و ثقافت کے ایک اہم عنصر کے طور پر اجاگر کرنا ہے۔ تاکہ اس قطعہ کے باشندوں کے علاوہ دیگر اہل وطن بھی اس ورثہ میں شریک ہو سکیں، اس خطہ اور اس کے باشندوں کو سمجھ سکیں، ان کی قدر کریں۔ اور ان سے ایک نئی جوت جگائیں۔ ایسا کام صدق دل سے کیا جائے تو اس سے کیا کچھ نتائج متصور نہیں؟

سندھ مدتوں آریائی، سامی، عجمی، مقامی اور ایک عرصہ مغربی قوموں اور تہذیبوں کا سنگم رہا ہے۔ جس کی بنا پر اسے تمدنوں کا گہوارہ بھی کہا گیا ہے اور اسی لئے یہاں کے اہلِ کمال جامع اللسان تھے اور انہوں نے اپنی مادری زبان، سندھی ہی میں جوہر نہیں دکھائے، بلکہ فارسی، عربی، اور اردو میں بھی گراں قدر نقوش یادگار چھوڑے ہیں اور آج بھی ان کی پرورش میں سرگرم ہیں۔ بنا بریں ان کی علمی و ادبی سرگرمیاں بھی گوناگوں رہی ہیں۔ چنانچہ وادیٔ مہرآن کی ثقافت کتنے ہی عناصر اور کتنے ہی میدانوں کو محیط ہے۔ اور اگر ہم اس کی صحیح کیفیت کو بروئے کار لانا چاہتے ہیں تو ہمیں ان سب کو نمایاں کرنا ہوگا۔ ذرا تصور کیجئے اس عظیم الشان ثقافتی ورثہ کو اجاگر کرنے کے کیا کیا طریقے ہو سکتے ہیں۔ اور وادیٔ مہرآن کی روح، اس کی تخلیقات کو کن کن صورتوں میں جلوہ گر کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ایک تو ظاہر ہے سندھی مصنفین کی طبع زاد تصانیف ہیں خواہ وہ کسی زبان میں ہوں۔ اور ان کا موضوع کچھ ہو، مذہب، تاریخ، ادب، لسانیات وغیرہ۔ ان باقاعدہ علمی و ادبی کاموں کے ساتھ عوام کا خود رو ادب بھی ہے۔ ان کے ساتھ ہی ساتھ سندھ سے متعلق جملہ امور ہیں۔ اسی قدر متنوع جتنے کسی بھی علاقے کے لئے متعلق امور ہو سکتے ہیں۔ زبان، تہذیب، فنون، تاریخ، حالات، واقعات، مشاہدہ وغیرہ آثار کہن ایک اور دلچسپ عنصر ہے جس میں مسودات و نایاب کتب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

بورڈ ان تمام امور پر بھرپور توجہ دینے میں کوشاں ہے۔ چنانچہ اس نے اب تک ۲۵ طبع زاد کتابیں شائع کی ہیں۔ ۱۲۰ زیر طبع ہیں، چالیس طباعت کے لئے تیار ہیں اور ۲۴ زیر تکمیل ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان متعلقہ تصانیف کے موضوعات بھی اتنے ہی متنوع ہوں گے۔

ایک بہت بڑا کام اُس منتشر ادب کو فراہم کرنا ہے جو سارے سندھی لوگوں کا سانجھا ادب ہے۔ یعنی عوامی ادب۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اس ادب کا ذخیرہ کس قدر وسیع ہے۔ ہم شاید اس کا تصور ہی نہ کر سکیں۔ بورڈ کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے یہ بیش بہا سرمایہ اس مقدار میں فراہم کر لیا ہے جو پوری ۴۰ ضخیم جلدوں میں شائع ہوگا۔ اس کی پہلی دو جلدیں منظر عام پر آ بھی چکی ہیں۔ ۲۴ چھپائی کے لئے تیار پڑی ہیں اور باقی زیر ترتیب ہیں۔ طبع زاد کتابوں کی طرح یہ عوامی ادب بھی ہمارے مجموعی ملّی ادب کو ایک بہت بڑی دین ثابت ہوگا۔

ان کتابوں کی اشاعت سیدھے سبھاؤ نہیں کی جاتی بلکہ ممتاز ترین دانشوروں کی ایک سرگرم و مستند جماعت فرداً فرداً یا اجتماعاً ہر کتاب کے بارے میں پوری پوری تحقیق و تدقیق سے کام لے کر اس کی تصحیح کرتی ہے۔ حاشیے اور مقدمے لکھتی ہے اور اس طرح ہر کتاب ہر اعتبار سے جامع و کار آمد ہو کر سامنے آتی ہے۔

کسی زبان کا علمی و ادبی سرمایہ وسیع کرنے اور اس کو ترقی دینے کے لئے ترجمہ کی اہمیت مسلّم ہے۔ اس سے نئے نئے ذہنی افق آشکار ہوتے ہیں۔ اور زبان کے ساتھ قوم کو بھی محدود دائروں سے نکال کر ایک وسیع تر دنیا میں لے جاتے ہیں جہاں طمانیت و جمود کے بجائے ارتقا ہی ارتقا ہوتا ہے۔ بورڈ نے سندھی میں اور سندھی سے تراجم کا دوگونہ اہتمام کر کے توسیع و ترقی کا راستہ تراشا ہے۔ اب تک سندھی میں ۳۰ تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ چار زیر طبع ہیں اور ۳۲ زیر تکمیل ہیں۔

ایک کام جس کی ہماری تمام زبانوں کو اشد ضرورت ہے زبان کا انفرادی و تقابلی مطالعہ ہے۔ جس کے لئے تحقیق۔ اور تدوینِ لغت از بس ضروری ہیں ہماری اکثر زبانیں اس لحاظ سے تہی دامن ہیں۔ سندھی ادبی بورڈ کی نظر اس پہلو پر بھی رہی ہے۔ چنانچہ اس نے چار جلدوں میں سندھی کی ایک ضخیم لغت ترتیب دینے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ جن میں سے ایک جلد چھپ چکی ہے۔ دوسری زیر طبع ہے۔ اور باقی دو منتظر طباعت ہیں۔ اگر ان میں جدید لغات کی فراہمی کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ اور

لغات کا مادہ و اشتقاق اور دوسری اہم تفصیلات بہم پہنچائی گئی ہیں، جیسا کہ یورپ کی ترقی یافتہ زبانوں میں ہوتا ہے۔ تو یہ واقعی بہت بڑا کام ہے۔ امید ہے رفتہ رفتہ گرامر اور علم لسانیات پر بھی ایسی ہی توجہ دی جائے گی۔

بورڈ کا مرکزِ توجہ تمام تر وادیِ مہران ہی نہیں بلکہ تمام پہنائے ملک ہے۔ اسی لئے اس نے ملی موضوعات پر بھی توجہ مبذول کی ہے۔ جو تاریخ، ادب، تصوف، طب وغیرہ جیسے اہم اصناف کو محیط ہے۔

اس مقصد کے لئے اس نے ایک شاندار منصوبہ بھی مرتب کیا ہے۔ جس کے تحت یہ عربی میں ۴ فارسی میں ۷۸، اردو میں سات اور انگریزی میں چھ کتابیں شائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ وزارت تعلیم نے اس منصوبہ کو منظور کر لیا ہے اور اب یہ اسی کی سرپرستی میں اور اسی کی مالی امداد سے روبہ عمل لائی جا رہی ہے اب تک اردو میں پانچ، انگریزی اور عربی میں دو، اور فارسی میں ۱۲ کتابیں چھپ بھی چکی ہیں۔ ۸ کتابیں زیر طباعت اور باقی زیر تکمیل ہیں۔ انہی کارناموں پر قناعت نہ کرتے ہوئے بورڈ نے اس منصوبہ کا ایک دوسرا حصہ بھی تیار کر لیا ہے۔ جس پر پہلے منصوبے کی تکمیل کے بعد عملدرآمد شروع ہو جائیگا۔ بورڈ کا ارادہ ہے کہ دوسرے منصوبے کے تحت ایسی ۱۰۹ اور کتابیں شائع کی جائیں جن میں سے ۷۷ عربی اور باقی فارسی میں ہوں گی۔

یہ تو خالص ثقافتی کارنامے ہوئے۔ بورڈ نے بعض اور قدم بھی اٹھائے ہیں جو کچھ اہم نہیں۔ اور جو فراہمی وسائل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اول، ایک عمدہ لائبریری خواہ وہ کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو، زبان کی ہمہ گیر امداد، ہمہ گیر ترقی اور قارئین تک ہمہ گیر رسائل کے لئے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ بورڈ نے ایک ایسا کتب خانہ قائم کر لیا ہے جس میں مطبوعہ کتب بھی موجود ہیں اور مخطوطات بھی۔

ایسا ہی اہم و بنیادی اقدام ہے ایک مطبع کا قیام۔ بورڈ نے حیدرآباد (سندھ) میں ایک اچھا خاصہ آراستہ و پیراستہ مطبع قائم کر لیا ہے جس میں بورڈ کی اپنی کتابوں کے علاوہ علاقۂ سندھ کے ابتدائی مدارس کی سات سندھی ریڈریں بھی طبع ہوتی ہیں۔ اسی سلسلہ کی ایک اور کڑی ہے۔ حیدرآباد ہی میں ایک بک اسٹال جہاں بورڈ کی تمام مطبوعات اور اس کی مطبوعہ ریڈریں دستیاب ہوتی ہیں۔ ایک عظیم تر کوشش یہ منصوبہ ہے کہ سندھ یونیورسٹی ٹاؤن شپ ایریا میں، جو کوٹڑی کے نزدیک واقع ہے، ۱۰ لاکھ روپے کے صرف سے بورڈ کے مرکزی عمارات تعمیر کی جائیں۔ یہ تمام لوازمات درحقیقت ضروری سہولتیں ہیں جن کے بعد تمام توجہ اور بھی شدت و کامیابی کے ساتھ اصل مقصد پر مرکوز کی جا سکتی ہے۔ جس کی تشریح اوپر کی جا چکی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ زیر نظر ادارے نے چند ہی سال کے عرصہ میں جو گوناگوں اور قابل قدر کارنامے انجام دیئے ہیں۔ وہ حیرت انگیز ہیں۔ ایسی کامیابی کے لئے سب سے اہم شرط پُرخلوص، دیانت دار، سرگرم اور قابل کارکن ہیں جو ذاتی اغراض سے بلند ہو کر متفقہ طور پر کام کے تمام امکانی پہلوؤں کا احاطہ کر سکیں اور ان تمام امور کا تصور کر سکیں جو متعلقہ زبان و ادب کی ہیئتاً ازبیش توسیع و ترقی کے لئے ضروری ہوں۔ ایسے کہ وہ روایت کے ساتھ اجتہاد کا حق بھی ادا کر سکیں اور سکونیت کے بجائے حرکت پیدا کریں۔ ابھی اس دوسرے عنصر کی طرف توجہ کم معلوم ہوتی ہے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ادب و فن کے جدید انداز میں جائزہ و تنقید کے ساتھ ساتھ انتقاد میں بھی نئی راہیں تلاش کی جائیں۔ اور یہ کچھ سندھی ہی نہیں ہماری تمام زبانوں کے لئے سب سے اہم و مقدم سوال یہی ہے۔ اور اسی پر ان کی قلب ماہیت کا دار و مدار ہے یعنی یہ کہ وہ ذہنی خط استوا کو پار کر کے جدید، حرکی دنیا میں داخل ہو جائیں یا روایت ہی کی دنیا میں گم رہیں

حسن اتفاق سے بورڈ کو ابتداءً شمس العلماء ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم جیسے فاضل اجل کی رہنمائی حاصل رہی۔ اور اب پیر حسام الدین راشدی اس کی روح رواں ہیں۔ جن کی تمام زندگی علم و ادب ہی کی خدمت کے لئے وقف رہی ہے۔ بورڈ کے نظم و نسق کا بار محمد ابراہیم ایم جویو جیسے مستعد و سرگرم سیکرٹری کے شانوں پر ہے جن کے والہانہ شغف کو بورڈ کی کامیابی میں کچھ کم دخل نہیں۔ زیادہ دلخوش کن بات یہ ہے کہ بورڈ کی سرگرمیوں اور اپنے دیس کی ایک لطیف و شیریں زبان اور اس کے ادب کی توسیع و ترقی میں اردو کے بہت سے نامور اہل قلم بھی اتنے ہی ذوق و شوق سے حصہ لے رہے ہیں۔ مثلاً مولانا غلام رسول مہر، جناب ممتاز حسن وغیرہ۔

یہ تمام معلومات محض ارباب نظر کو پاکستان کے اس اہم ادارے کے ظاہری خد و خال سے روشناس کرانے کے لئے ہیں مگر اصل چیز تو بلاشبہ اس کی معنوی کارگزاری ہے اور یہ وہ حدیث تازہ ہے جس کا حق ایک علیحدہ نگارش ہی میں ادا کیا جا سکتا ہے ◆

منزل کی طرف

(معاشری رفاہ و بہبود)

مصباح الحق

ایک طرف جبر دوسری طرف اختیار، ایک طرف استبداد دوسری طرف آزادی۔ ان میں جانے کب سے کشمکش برپا ہے۔ یہ چند صدیوں کی بات نہیں بلکہ ہزارہا سال کی بات ہے۔ جب سے نوع انسان وجود میں آئی ہے۔ اور اس دوران میں انسانی جدوجہد کا منتہائے مقصود ایک ہی رہا ہے۔ یہ کہ خدا کی بستی صحیح معنوں میں خدا کی بستی ہو۔ اور اس میں سب انسانوں کی بھلائی ہو۔ سب کو خوشی و خرمی اور خوشحالی میسر ہو۔ یہ بڑھتا ہوا آہنگ آخر کار ایک ایسی مملکت کے تصور پر منتج ہو جس کا مقصد کل معاشرہ کی رفاہ و بہبود ہو۔ اور آج جب کہ سلطانیٔ جمہور کا دور ہے ہر مملکت کا رفاہی ہونا لازم ہے۔ خواہ وہ ملوکانہ ہو یا جمہوری، آمرانہ ہو یا اجتماعی۔ اس طرح نوع انسان کا یہ ہزار سال پرانا خواب بالآخر شرمندۂ تعبیر ہو ہی گیا ہے۔

پاکستان کی بنیاد شروع ہی سے سلطانیٔ جمہور پر ہے۔ جس کا تصور علامہ اقبالؒ نے پیش کیا تھا۔ اس لئے اس کا مطمح نظر ابتداہی سے عوام کی رفاہ و بہبود رہا ہے۔ شومیٔ قسمت سے ناعاقبت اندیش قوم دشمن سیاست داں ایک عرصہ من مانی کرتے رہے۔ انہوں نے عوام کے حقوق کو پائمال کرنے کی کوشش کی اور انہیں برابر فریب پر فریب دیتے رہے۔ لیکن نابکے! قوم کی قسمت کا ستارہ آخر کار روشن ہو کر ہی رہا۔ اور عوام نے اپنا محبوب مقصد پا ہی لیا۔

عوام کی حکومت، عوام کے لئے، عوام کے ذریعہ۔ لہٰذا جب سے انقلابی حکومت قائم ہوئی ہے، اس نے زندگی کے ہر شعبے میں پے در پے وسیع، دور رس اصلاحات صادر کر کے قومی رفاہ و بہبود کی رفتار بدرجہا تیز کر دی ہے۔ چنانچہ اب ہم بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں کہ جس مملکت سے ہم تعلق رکھتے ہیں وہ تمام تر ایک رفاہی مملکت ہے۔ جس نے قومی رفاہ و بہبود کو خاص طور پر اپنا مطمح نظر ٹھہرایا ہے۔ اس پر بالخصوص زور دے رہی ہے۔ اس کو فروغ دینے کیلئے شدت سے کوشاں ہے اور ہر طریقے سے اس کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے

سچ پوچھئے تو پاکستان میں معاشری رفاہ و بہبود کی سرگرمیا[ں] کی غیر معمولی ترقی ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ جس کا باعث اولاً ایک دور اندیش، مستعد، کارگزار حکومت ہے اور اس کے بعد وہ سرگر[م] کارکن جن کا دلی شوق و ذوق اور پُر خلوص تعاون حکومت کی رفاہ[ی] سرگرمیوں کو عملی جامہ پہننے میں مدد دیتا ہے۔ یہ دونوں عناصر اندر[و] ہیں ــــ ملکی حکومت اور قومی خیر خواہ۔ جن کو رفاہ و بہبود کو تر[قی] دینے کی جدوجہد کرنی ہی چاہیئے۔ لیکن خوش قسمتی سے ان کی تدا[بیر] کو بروئے کار لانے کے لئے بعض مفید امدادگار عناصر اور [بھی] پیدا ہو گئے۔ یہ تھے اقوام متحدہ اور دیگر بین الاقوامی ادارے جو ا[ن] دونوں کو برابر فنی امداد بہم پہنچاتے رہے ہیں۔ انقلابی حکومت [کا] والہانہ جوش و ولولہ ان سرگرمیوں کے لئے ایک زبردست مہمیز ثابت ہوا ہے۔

قدرتی طور پر رفاہی کارروائیوں کی نوعیت بتدریج ترقی کرتی رہی ہے۔ پہلے پانچ چھ سال تو اس سلسلہ میں کوئی ایس[ی] منظم کوشش عمل میں نہیں آئی جن میں حکومت کو بھی دخل ہو۔ ا[ن] کوششوں کی نوعیت رضاکارانہ تھی جس میں مذہبی جذبہ اور ہما[را] کارفرما تھی۔ جیسے رفاہ و بہبود کی بنیاد محض خیرات اور خدمت خلق کے جذبہ پر ہو۔ بے شک حکومت کسی ہنگامی ضرورت [کو] پورا کرنے کے لئے امداد دیتی تھی لیکن سچ پوچھئے تو اس کو حکوم[ت کا] فرض منصبی خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ باقی رہے کارکن تو وہ نیک د[ل] قسم کے لوگ ہی ہو سکتے تھے۔ جو نیک کام کرنا ثواب جانیں یا ایس[ے] مالدار لوگ جو غریبوں کو، محتاجوں کی خدمت کو مشغلہ خیال کریں [حالانکہ] یہ کہ ایسے کاموں کے لئے بڑے تجربہ کار، تربیت یافتہ، پیشہ[ور] لوگوں کی ضرورت ہے اور وہی ان کو بطریق احسن انجام دے سک[تے ہیں]

ہیں، اس کا کوئی احساس نہیں پیدا ہوا تھا یہی وجہ ہے کہ ۱۹۵۲ء تک سارے ملک میں کل ۷ سماجی کارکن موجود تھے۔

آج صورتِ حالات اس سے بالکل مختلف ہے۔ اور ۵۰ کی بجائے ۳۰۰ تربیت یافتہ کارکن کام کر رہے ہیں۔ انقلابی حکومت نے جو معاشری فلاح و بہبود کو ملی زندگی کا نہایت محکم ستون خیال کرتی ہے، دوسرے پنج سالہ منصوبے میں مزید تین سو پوری طرح تربیت یافتہ کارکنوں کا اہتمام کیا ہے۔ جن کے ساتھ کتنے ہی امدادی کارکن بھی شامل ہوں گے۔

انقلابی حکومت سے پہلے رفاہِ عامہ اور صحت کا بندوبست بھی سرسری تھا۔ اب ان امور کے لئے ایک مستقل وزارت قائم کی گئی ہے جس کا نام "وزارت صحت و معاشری بہبود" ہے اور مرکز و صوبجات دونوں میں معاشری بہبود کے محکمے قائم ہیں۔ یہاں تک کہ نیشنل پلاننگ کمیشن میں بھی معاشری بہبود کا ایک شعبہ قائم کیا گیا ہے۔ اس طرح ہمارے ملکی معاملات میں معاشری بہبود کو پوری پوری اہمیت دی گئی ہے۔ اور دوسرے پنج سالہ منصوبے میں اس کو اس حد تک ملحوظ رکھا گیا ہے کہ سرمایہ کی قلت اور دیگر اشد ضروریات کے باوجود معاشری رفاہ و بہبود پر ۵ کروڑ روپے سے زائد رقم صرف کرنے کی تجویز کی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ اقدام کس قدر حوصلہ مندانہ ہے۔

پاکستان جن معاشری مسائل سے دوچار ہے ان میں روز بروز بڑھتی ہوئی آبادی کے مسئلہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اگرچہ یہ مسئلہ صرف پاکستان ہی تک محدود نہیں اور دنیا کے بڑے بڑے ترقی یافتہ ممالک بھی اس سے دوچار ہیں۔ لیکن پاکستان جیسے نئے ملک میں، جس کے وسائل یوں بھی محدود ہیں اور ان کو ترقی پذیر ہونے کے مواقع بھی فی الحال کم ہی میسر ہیں، اس کی شدت بہت بڑھ جاتی ہے۔ آبادی میں اضافہ کی رفتار شہری حصوں میں خصوصیت سے زیادہ ہے۔ چنانچہ کراچی۔ حیدرآباد۔ لائلپور۔ ڈھاکہ اور چاٹگام کی آبادی میں دس سال (۱۹۴۱ء - ۵۱) کے عرصہ میں ۲۰ - ۳۰ فیصد کی حد تک اضافہ ہوا ہے اور اگر یہی حالت رہی تو کچھ عجب نہیں کہ اگلے دس سال میں یہ آبادی بڑھ کر دوگنی ہو جائے۔

ظاہر ہے کہ اس بے پناہ اضافہ سے بڑے ہی خطرناک نتائج کا احتمال ہے۔

بے شک ملک کی اقتصادی و صنعتی ترقی کو فروغ دینا بہت ضروری ہے۔ لیکن اس طرح اندھا دھند نہیں کہ معاشری بہبود کے تقاضے نظر انداز کر دئے جائیں۔ اگر ہم اس سلسلہ میں محض اقتصادی پہلوؤں کو پیش نظر رکھیں تو اس سے لازماً معاشری نقصانات کا اندیشہ ہے۔ کچھ تھوڑے عرصہ کے لئے اور کچھ زیادہ عرصہ کے لئے۔ مثلاً یہی دیکھ لیجئے کہ لوگ کارخانوں میں نوکر ہونے کے لئے گاؤں سے شہروں میں دھڑا دھڑ چلے آ رہے ہیں۔ اس سے صنعتی ترقی کی فوری ضرورت تو پوری ہو جاتی ہے۔ لیکن شہروں میں جا بجا غریب و نادار لوگوں کی غلیظ آبادیوں کی بھرمار ہو جاتی ہے۔ جس سے بیماریاں پھیلتی ہیں، صحتیں گر جاتی ہیں، طبیعتوں میں سستی و کاہلی پیدا ہوتی ہے۔ نہ تہذیب باقی رہتی ہے نہ شائستگی۔ لوگوں کے اخلاق گر جاتے ہیں اور آخر کار یہ خرابیاں اقتصادی حیثیت سے بھی بڑی نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں اور انسانوں کی حالت بڑی ہی عبرت ناک ہو جاتی ہے۔ اس طرح اقتصادی ترقی ایک گھناؤنا روگ بن جاتی ہے۔ آبادی کا شیرازہ درہم برہم ہو جاتا ہے۔ خاندان پریشان، خستہ حال۔ ایک ہی جگہ رہنے سہنے اور سکھ چین سے زندگی بسر کرنے کی اچھی بھلی روایت برباد۔ اس طرح وہ نازک رشتے، وہ سوسائٹی کا نظم و ضبط جس پر چین آرام کی عمارت قائم ہے، ملیامیٹ ہو جاتا ہے۔ یہ ہیں وہ خوفناک بیماریاں جو روز بروز بڑھتی ہوئی صنعتی ترقی اور شہریت اپنے ساتھ لاتی ہے۔ ہم مشرق کے لوگ دیکھ ہی چکے ہیں کہ ان خرابیوں کے باعث اہل مغرب کا کیا حشر ہوا ہے۔ اس لئے ہمارے یہاں ابھی سے معاشرے کی مناسب تنظیم اور رفاہی امور پر توجہ دی جا رہی ہے۔

کوئی قوم اس وقت تک صحیح معنوں میں ترقی پذیر نہیں ہو سکتی جب تک وہ زندہ و توانا نہ ہو۔ اور اس کی زندگی و توانائی ایک صحت مند معاشرہ ہی پر موقوف ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ ناموافق حالات کی وجہ سے کس قدر بگڑ چکا تھا۔ ضرورت تھی کہ اس کی پوری پوری اصلاح کرنے کے لئے اس کی از سر نو تنظیم کی جائے۔ معاشرہ میں نئے سرے سے جان ڈالی جائے۔ اس لئے انقلابی حکومت نے شروع ہی سے اس کو اپنا مقصد اولیں قرار دیا ہے۔ اور اس بات پہ زور دیا ہے کہ بڑی ہی کارگزار، رضاکارانہ جماعتیں پیدا کی جائیں۔

شہریوں کی خاطر خواہ تنظیم ہو یہی باتیں چاق چوبند حکومت کی معاشری پالیسی اور منصوبہ بندی کا سنگ بنیاد قرار پاتی ہیں۔

حکومت اس حقیقت سے پوری طرح باخبر ہے کہ شہری آبادیوں کے اندھا دھند بڑھنے سے کیا خرابیاں پیدا ہوں گی۔ اس لئے وہ احتیاطی تدابیر پر زور دے رہی ہے۔ اس طرح نہ صرف فوری طور پر فائدہ ہوتا ہے بلکہ آگے چل کر بھی مضرت رساں نتائج سے بچاؤ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ توجہ ایسے منصوبوں پر دینی چاہئیے جو کم خرچ بھی ہوں اور بالانشین بھی یعنی ان سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو فائدہ پہنچے۔ اور دوسری ضرورتیں بھی رکی نہ رہیں۔ اور ہمارے محدود وسائل پر زیادہ بوجھ بھی نہ پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ہر شہری کو سماج کا ایک کار آمد رکن بنانے کے لئے جماعتی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی جارہی ہے۔ بنابریں بیماروں اور معذوروں کی بحالی پر خاص توجہ دی جارہی ہے۔ کیونکہ یہ معاشرہ پر بوجھ ثابت ہوتے ہیں اور اس کی ترقی کو روک لیتے ہیں۔ جبھی ہمارے دوسرے پنج سالہ منصوبے میں معاشری امداد کی سرگرمیاں کچھ محدود پیمانے پر شروع کی جارہی ہیں۔

آجکل کا زمانہ تربیت یافتہ لوگوں کا زمانہ ہے۔ جس میں تجربہ کار، ماہر لوگ بدرجہا بہتر کام کر سکتے ہیں۔ پہلے پانچ چھ سال تو پاکستان میں تربیت کی کوئی سہولتیں میسر نہ تھیں۔ اس لئے جدید نہج پر معاشری بہبود کے کام کا آغاز نہ ہو سکا۔ البتہ ۵۱-۱۹۵۲ء میں کراچی اور ڈھاکہ میں چھوٹے عرصہ کے چار تربیتی کورسوں کا بندوبست کیا گیا۔ جن میں کوئی ۱۰۰ مرد عورتوں نے تربیت حاصل کی۔ اگلے چار سالوں (۵۵-۵۸ء) میں ایسے ہی دو اور کورسوں کا بندوبست ہوا جن میں ۳۲ سماجی کارکنوں نے تربیت پائی۔ یہ تربیت کافی کامیاب اور سودمند ثابت ہوئی۔ مگر یہ تو وقتی بات تھی کوئی مستقل بندوبست نہ تھا۔ لہٰذا اس سلسلہ میں مزید کوشش یہ تھی کہ معاشری بہبود کی تربیت دینے کے لئے باقاعدہ درسگاہیں قائم کی جائیں۔

اس قسم کی پہلی درسگاہ "شعبۂ معاشری بہبود، دارالعلوم پنجاب" ۵۴ء میں قائم ہوئی جس کا کورس دو سال کا تھا۔ ۵۸ء میں یہ سلسلہ بی اے سے ایم اے تک پہنچ گیا۔ اس طرح سند یافتہ معاشری کارکن بروئے کار آنے لگے ہیں۔

ادھر ڈھاکہ میں اس غرض سے معاشری بہبود اور ریسرچ کا مرکز ۱۹۵۹ء میں قائم ہوا۔ جس میں دو سال کی تربیت سے سلسلۂ تعلیم ایم اے تک پہنچا ہے۔

یہ تو خالص تعلیمی بات ہوئی۔ حقیقی تربیت تو شہری خود دیتے ہیں چنانچہ مشرقی پاکستان میں امدادی کارکنوں کی محلہ وار تربیت کی داغ بیل پڑ چکی ہے۔ جس میں معاشری بہبود کے علاوہ گھریلو دستکاریوں تعلیم بالغاں، صحت و صفائی، امداد باہمی وغیرہ جیسے گوناگوں مقاصد شامل ہیں۔ ایسا ایک تربیتی کورس تو پورا ہو چکا ہے اور دوسرا جاری ہے۔ اس کے ساتھ ہی امدادی کارکنوں کی تربیت کے لئے ڈھاکہ میں ایک مستقل ادارہ بھی قائم کیا جارہا ہے۔ یہ کارکن سند یافتہ کارکنوں کے ساتھ مل کر شہری اجتماعی ترقی کے کام میں حصہ لیتے ہیں۔

ان دو تربیت گاہوں کی طرح ایک اور تیسری تربیت گاہ بھی ۱۹۶۱ء میں قائم کی جارہی ہے جو یونیورسٹی کراچی سے وابستہ ہو گی۔ ان کے علاوہ ڈگری سے کم درجہ پر کتنے ہی تربیتی کورس موجود ہیں۔

ہمارے ملک کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہ آج غالباً دنیا کا واحد ملک ہے جس میں شہری اجتماعی ترقیاتی منصوبوں کا قومی پروگرام موجود ہے۔ چنانچہ اس وقت پاکستان بھر میں ایسے ۲۵ منصوبوں پر عملدرآمد ہو رہا ہے جن کا تعلق ۱۰ لاکھ شہری باشندوں سے ہے۔

جو سماجی کارکن ان منصوبوں کے سلسلے میں کام کر رہے ہیں وہ کسی خاص مقصد کے تحت، منظم طور پر، کام کرنے والی جماعتوں کو ان کی سماجی ضرورتیں سمجھنے اور ان کو پورا کرنے کے وسائل تلاش کرنے میں مدد بہم پہنچاتے ہیں۔ ان جماعتوں نے رضاکارانہ طور پر اپنا وقت اور وسائل پیش کئے ہیں تاکہ اپنے اپنے علاقوں میں رہن سہن کا معیار بلند کیا جائے۔ ان کی آمدنی کتنی ہی کم سہی پھر بھی انہوں نے بڑی بڑی مہمیں جاری کی ہیں، اسکول بنائے ہیں اور اجتماعی مرکز قائم کئے ہیں۔ غرضیکہ ان کی سرگرمیاں بے شمار کاموں پر مشتمل ہیں۔ شہروں میں اجتماعی ترقی کے منصوبوں نے تو خصوصاً حب الوطنی کا ایک نیا عملی احساس پیدا کر دیا ہے۔

طبی خدمات نے بھی اس دوران میں نمایاں ترقی کی ہے۔ اب اگر ایک طرف ڈاکٹر اور ان کا عملہ ہسپتالوں میں مسائلِ صحت سے نبٹ رہا ہے تو دوسری طرف سماجی کارکن روزگار، رہائش، مکانات وغیرہ جیسے اہم مسائل کو نبٹانے کی کوشش کر رہے ہیں

یہ بھی بندوبست کیا جا رہا ہے کہ کراچی اور لاہور کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھی سماجی کارکن مقرر کئے جائیں۔

حکومت نے رضاکارادارون کو مالی امداد دینے کے لئے ایک "نیشنل کونسل آف سوشل ویلفیئر" اور دو صوبائی کونسلیں قائم کی ہیں جنہوں نے متعدد مقاصد مثلاً بچوں کی حفاظت اور دیکھ بھال، نوجوانوں، عورتوں اور معذوروں کی بہبودی، سماجی کام میں تربیت وغیرہ کے لئے ۲۲ لاکھ روپے کی رقم تقسیم کی ہے۔ بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ لوگوں نے خود ہی اس سے چار گنی رقم اپنی ذاتی کوششوں سے جمع کرلی ہے۔

معاشری تحقیق کی مرکزی ڈائریکٹریٹ میں ایک تحقیقی یونٹ قائم کیا گیا ہے۔ جو مختلف معاشری مسائل کی چھان بین کر رہا ہے۔ اس سلسلہ میں پاکستان بھر کی اولیں فقیر شماری خاص اہمیت رکھتی ہے۔ تعلیم، صحت، رہائش اور لیبر کے مسئلوں پر بھی خصوصی توجہ مرکوز کی جا رہی ہے۔ اسی طرح معاشری قوانین وضع کرنے پر بھی خاص زور دیا گیا ہے۔ کچھ ہی عرصہ ہوا کہ خاندان اور ازدواج سے متعلق ایک کمیشن مقرر کیا گیا تھا جس کی سفارشات زیرِ غور ہیں۔

حکومت کئی رضاکارانہ اداروں مثلاً یتیم خانوں کی کارکردگی کو بہتر بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ ٹی بی کے مریضوں کے لئے ایک رفاہی ادارہ قائم کیا گیا ہے جو حکومت کی امداد سے بڑا ہی کارگزار ثابت ہوا ہے۔

اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے اپوا (آل پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن) جو ملک بھر میں خواتین کی سب سے بڑی انجمن ہے جس نے رضاکارانہ سماجی رفاہ و بہبود کو بہت مدد دی ہے۔ اس کے تحت کئی عام اور زچوں کے ہسپتال، لڑکیوں کے اسکول اور کالج، ماؤں کی انجمنیں، صنعتی ہوم وغیرہ کام کر رہے ہیں۔

معاشری خدمات کا ایک نہایت خوشگوار اور قابلِ قدر پہلو بیرونی فنی امداد ہے جس میں اقوامِ متحدہ کو خاص دخل رہا ہے۔ چنانچہ یونیسف نے حکومت پاکستان سے ایک معاہدہ کیا ہے جس کی رو سے یہ ادارہ پاکستان میں شہری اجتماعی ترقی کے لئے ۳۷۵۰۰ ڈالر کا سامان مہیا کرے گا۔ اسی طرح فورڈ فاؤنڈیشن اور آئی سی اے نے بھی خاص امداد بہم پہنچائی ہے یا اس کا وعدہ کیا ہے۔ اندرونی طور پر سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ معاشری امداد کا سلسلہ نہ صرف جاری رہے گا بلکہ دوسرے پنج سالہ منصوبے کی تکمیل کے دوران اس کی توسیع بھی عمل میں آئے گی۔ اس منصوبے میں کتنے ہی نئے منصوبے بھی شامل کئے گئے ہیں جن سے آئندہ معاشری خدمات کی نوعیت اور رجحان ظاہر ہوتا ہے۔ دیگر اداروں کے علاوہ میونسپلٹیوں پر سابقہ معاشری خدمات کے علاوہ نئی نئی خدمات انجام دینے کی ذمہ داری بھی عائد کی گئی ہے۔

اس طرح ان گوناگوں کوششوں سے مجموعی صورتِ حال بدرجہا بہتر ہو گئی ہے۔ ہم زور و شور سے ترقی کی راہ پر گامزن ہو گئے ہیں۔ اور ہمارا ہر قدم تیزی سے منزل کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے جو ہمیں یقیناً بہت جلد عروج و ترقی سے پوری طرح ہمکنار کر دے گا۔

"ماہِ نو" میں مضامین کی اشاعت سے متعلق شرائط

(۱) "ماہ نو" میں شائع شدہ مضامین کا معاوضہ پیش کیا جائے گا۔

(۲) مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان "ماہ نو" کے معیار کا خیال رکھیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔

(۳) ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینا ضروری ہیں۔

(۴) ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔

(۵) مضمون کے ناقابل اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

(۶) ایڈیٹر کو مسودات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

(۷) مضامین صاف اور خوشخط کاغذ کے ایک طرف تحریر کئے جائیں اور مکمل صاف پتہ درج کیا جائے۔ (ادارہ)

نقد و نظر

"یورپ نامہ"

مصنف : حکیم محمد سعید دہلوی
ناشر : ہمدرد اکیڈمی بندر روڈ کراچی
ضخامت : ۴۹۶ صفحات
قیمت : آٹھ روپے

یہ باتصویر سفری دستاویز حکیم محمد سعید، متولی 'ہمدرد' وقف، کراچی نے مرتب کیا ہے۔ اور تحریر و پیشکش کی کئی اہم خصوصیات کا حامل ہے۔ گو یہ ہے تو سفرنامہ مگر مقامات، کوائف، لطائف، واقعات اور عجائبات سفر کا ایک رنگارنگ مرقع بھی ہے۔ حالاتِ سفر کے بیان میں قاری کو اپنا ہمسفر بنا لینے کا وصف کم ہی سفرناموں میں دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس نامۂ یورپ سے کچھ ایسا لگتا ہے جیسے قاری خود بھی حکیم صاحب اور ان کے برادر حکیم عبدالحمید صاحب کے ساتھ سفر کر رہا ہے اور ان ہی کی آنکھ سے دیکھتا، ان ہی کی فکر کے ساتھ سوچتا اور طعام و فواکہ کے لذائذ بوقلموں سے خود بھی لذت یاب ہوتا جاتا ہے! ممالک سفر کے سیاسی حالات اور تاریخی پس منظر، نیز ان کے تاریخی و ثقافتی جزئیات بھی جابجا نظر آتے ہیں، گویا یورپ نامے کے مذہّب صفحات پر ورقِ نقرہ کی چمک بھی آمیز ہے۔ یہ سفر چونکہ طب مشرق کی چھان بین اور یورپ میں "کتابیں اپنے آبا" کی تلاش کے لئے بھی کیا گیا تھا، اس لئے سفر کی افادیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ پھر تحریر ایک طرح سے کنز المجربات بھی بن گئی ہے اور پڑھنے والے کی بصیرت کے لئے گویا کحل الجواہر کا کام کیا ہے۔

کتاب میں بہت اچھی تاریخی و ثقافتی تصاویر کا اہتمام کیا گیا ہے۔ مگر رنگین تصاویر کی طباعت میں شاید کسی آنچ کی کسر ہو گئی ہے۔ "یورپ نامہ" ایک خوش ذوق راہی کی حکایتِ سفر ہے، دلکش اور لذیذ بھی، جسے پڑھنے کے بعد آدمی کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس نے مطالعہ میں جو کچھ وقت صرف کیا وہ اس کا مستحق تھا۔

(ظ۔ ق)

ہمارا پاکستان
۱۳ سال

مرتب و ناشر : زیڈ اے تمنائی
شائع کردہ : مطبوعات مشرق۔
ہرمزجی اسٹریٹ، کراچی
صفحات : (۴۰)
قیمت : ۵۰ پیسہ (۸/)

یہ کتابچہ "مطبوعات مشرق" کا "پس منظر پمفلٹ" نمبر ۳ ہے۔ یہ پمفلٹ بین الاقوامی اور قومی اہمیت رکھنے والے حالات حاضرہ کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ہماری زندگی پر ان کے اثرات کا اندازہ ہو سکے۔

ایسے پمفلٹ عوام کو ملکی و عالمی حالات سے باخبر رکھنے کے لئے نمایاں اہمیت رکھتے ہیں اور حکومت ہی نہیں نجی اداروں کو بھی اس قسم کے معلوماتی رسالے بہم پہنچانے میں حصہ لینا چاہئے۔ اور وہ جس قدر کثرت سے شائع ہوں اتنا ہی بہتر ہے۔ زیر نظر "پس منظر پمفلٹ" میں بہت ہی سیدھی سادی اور دلکش زبان میں پاکستان کے تیرہ سالہ حالات پر بڑی خوش اسلوبی سے روشنی ڈالی گئی ہے، خصوصاً موجودہ دور انقلاب پر جس سے ایک غیر معمولی "روشن مستقبل" کی نشان دہی ہوتی ہے۔ سرورق سے لے کر آخر تک پیشکش اور متن میں سادہ پُرکاری کی ایک ہی کیفیت نظر آتی ہے۔

ایران : ایک تعارف

صفحات : ۱۰۴
قیمت : ۲/۸

اسی نفاستِ ذوق کے ساتھ جو مطبوعات مشرق کراچی کا طرۂ امتیاز ہے، جناب تمنائی نے ایک خوش گوار سرزمین کے اس خوش آیند تعارف کو بھی مرتب اور پیش کیا ہے۔ وہی صاف سلیس زبان اور وہی ہر دلعزیز پیرایہ جس سے پڑھنے والا بہ آسانی اور جلدی جلدی پڑھ بھی لے اور سمجھ بھی لے، اس کتاب کی امتیازی خصوصیت ہے جو مختصر ہوتے ہوئے سیر حاصل بھی ہے۔ اور ایران کے متعلق تاریخ و جغرافیہ سے لے کر جملہ کوائف حاضرہ (نظام حکومت، لوگ، تہذیب و ثقافت، ترقیات، بین الاقوامی تعلقات وغیرہ)

تک مکمل معلومات بہم پہنچاتی ہے۔ جیسے یہ بھی مختصر پیمانے پر جامِ جہاں نما ہو۔ فاضل مؤلف نے بجا طور پر ایران و پاکستان کی دوستی و یکجہتی پر زور دیا ہے۔ اور ان کے گوناگوں باہمی روابط پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کا اس سے بڑھ کر ثبوت اور کیا ہوگا کہ ملک الشعرا بہار مرحوم نے برملا فرمایا کہ

دور حاضر خامۂ اقبال گشت
واحدے کز صد ہزاراں برگذشت

یہ تعارف ہر لحاظ سے ایک نہایت عمدہ تعارف ہے البتہ شروع میں بعض تفصیلات کی صحت محل نظر ہے۔ "پارسیوں" سے ذہن لازماً موجودہ پارسیوں کی طرف جاتا ہے۔ اول الذکر کو "پارتھیوی" کہا جاتا ہے۔ جو ایران قدیم کی ایک نامور شہسوار اور قدر انداز قوم تھی۔ اور جس نے دوبار رومنوں کے جرار لشکروں کو تہس نہس کر دیا تھا۔ وہ اس قدر ماہر تیر انداز تھے کہ انگریزی میں "پارتھین شاٹ" (تیر حکمی) ضرب المثل بن چکا ہے۔ تاریخ ان کو "ملوک الطوائف" کے نام سے یاد کرتی ہے جس سے خود "طوائف الملوکی" کی اصطلاح یادگار ہے۔ ان جری سورماؤں ہی نے 'پہلوان' کا ساد نتی لفظ بھی ہمیں دیا ہے۔ پہلوی بھی انہی کی دین ہے جس پر ایران کی شاہانہ سطوت آج بھی نازکناں ہے۔ اور خیال کیا جاتا ہے کہ برصغیر کے قدیم جنگ آزما قبیلہ "پاہلوں" کا دامن بھی ان ہی پارتھیوں سے وابستہ تھا۔ پارتھیوی کتنا ہی عرصہ بعد میدان میں آئے جب کہ رومنوں کا بول بالا تھا۔ فارس یا پارس کا جنوبی صوبہ ایران کے اولین نامور شاہی خاندان 'ہخامنشی' کے ساتھ ابھرا تھا جس کی ٹکر اہل یونان سے ہوئی تھی۔ جو پارس کو پرسس کہتے تھے۔ اور انہی نے سارے ملک کو "پرشیا" کا نام دیا تھا۔ سائرس اعظم اور دارا ہخامنشی خاندان کے رکن رکین تھے۔ پارتھیوں سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ یہ سب پارسی اور ہخامنشی میں التباس کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کتاب کی مجموعی افادیت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور یہ بات صرف برسر راہے، جملۂ معترضہ کے طور پر کہہ دی گئی ہے۔

ایران کے متعلق یکجا طور پر اتنی معلومات شاید ہی کسی اور کتاب میں دستیاب ہوں۔

(ز۔خ)

چینی نظمیں

مترجمہ:- ابن انشا

ناشر

لاہور اکیڈمی لاہور

صفحات - (۱۷۲) قیمت :- تین روپے

چین سے ہمیں بھی اتنی ہی نسبت ہے جتنی ابن انشا کو۔ یعنی ہمارا ادب خصوصاً شاعری لعبتانِ چین سے بھرا پڑا ہے۔ گو ان سے بھی ہم سب کو بڑی دور ہی کی نسبت رہی ہے۔ اور تو اور وارث شاہ نے بھی "ہیر رانجھا" میں "پتلی چین کی" کا ذکر کیا ہے۔ یا پھر تھوڑی سی نسبت اس طرح پیدا ہو جاتی ہے کہ برصغیر "چین و جاپان کا حرم" ہے۔ گوتم بدھ شاکی منی نے یہیں جنم لیا اور۔ فاہیان اور ہیون سانگ جیسے سیاحوں نے یہاں قدم رنجہ کیا۔ اور گندھارا آرٹ کا گہوارہ یہی خطۂ پاک ہے۔ یا پھر آج کل برصغیر کی شمالی پہاڑی سرحدوں پہ چینی منڈلا رہے ہیں۔ اور اس سے پرے کمیونزم کا دور دورہ ہے اور سرخ پھریرا لہرا رہا ہے مگر ہمارا سروکار تو لال چین سے نہیں پہلے چین سے ہے۔ کیونکہ مترجم بڑا ہوشیار ہے۔ اس نے ساری پہلی نظمیں ہی چنی ہیں۔ لال نظموں کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اس لئے کہ یہ لعبتان چینی وہ ہیں کہ — ہاتھ آئیں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے! لہٰذا اس نے "آہنی پردہ" کے پیچھے جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ اور دریچہ جھروکے ہی سے تاک جھانک کی ہے۔ جو "پہلے چین کے وسیع کھیتوں، آنگنوں، گلیوں، بازاروں، ندیوں لدے پربتوں کے بے ضرر منظروں" ہی پر کھلتا ہے۔

شاید اس نظر بازی میں پہل ابن انشا ہی نے کی تھی، برسوں پہلے جب سبز پرچم کے لہرانے کا گمان بھی نہ تھا۔ ان کی اس کوشش کو "نیا ضدا لاہور" نے بہت پسند کیا اور ذوق کی ایک اچھی خاصی چینی رو جاری ہو گئی سید فیاض محمود اس "نقش ارژنگ" کے بہت ہی دلدادہ تھے اور انہوں نے اس موضوع پر ایک سیر حاصل مضمون بھی لکھ ڈالا جو حلقۂ ارباب ذوق میں پڑھے جانے کے بعد "ہمایوں" میں بھی شائع ہوا۔ چینی نظموں

کی بہت بڑی خوبی جس کی بنا پر لوگ انہیں سراہتے تھے۔ ان کی غیر معمولی سادگی و صفائی تھی۔ اور ایسا اختصار کہ چند ہی لفظوں میں بہت کچھ کہہ جائیں۔ چند سیدھے سادے نقوش میں ایک مکمل اور بھرپور تصویر کھینچ کر رکھ دیں۔ بعض مغربی شعرا مثلاً ایذرا پاؤنڈ کو بھی اسی چینی کوتہ قبائی نے لبھایا اور ایک مدت انگریزی شاعری میں اس کا اچھا خاصا چرچا رہا بلکہ اس کا تتبع کیا گیا۔ اور بعض لوگ بے قافیہ شاعری کے ماخذ کی تلاش میں چین تک بھی پہنچے ہیں۔ وہی اطلبوا العلم ما فی السین کی آن جانے، آن بوجھے پیروی۔

اردو میں چینی شاعری کی جو وقتی لہر آئی تھی اس میں میراجی، حامد علی خاں اور مہدی علی خاں جیسے بزرگ بھی بہہ نکلے تھے۔ گو ان کی کاوشیں یا سراسر نظم تھیں یا سراسر نثر بے رس۔ سپاٹ، میکانکی۔ ابن انشا "چاند نگر" کا باسی ہونے کی وجہ سے طبعاً اس قسم کی ہلکی پھلکی شاعری سے بہت ہی قریب ہیں۔ اور ان کا دھیمی ذوق انہیں چینی پتلیوں کو اسی طرح اردو کے سانچے میں ڈھالنے میں مدد دیتا ہے جیسی کہ وہ حقیقتہً ہیں۔ اس قدر ہلکی پھلکی کہ ہاتھ میں ان کا وزن ہی محسوس نہ ہو۔ جیسے چاند کی کرنیں ہی نرم و نازک پتلیاں بن گئی ہوں۔

ابن انشا کے مزاج، ان کے ذوق اور زبان میں کچھ ایسی بات ہے جو انہیں ہلکی پھلکی، سجل سڈول چیزوں کو اپنانے میں مدد دیتی ہے۔ کہیں کہیں اصل کی لَے، اس کا روپ الوپ، اور رس بھاؤ اسے نئے نئے رمنوں کی طرف لے جاتا ہے۔ جس سے ایک انوکھی تراش خراش کا احساس ہو۔ جیسے وہ کوئی نیا اچھوتا تجربہ ہے۔ نظم 'جوانی' اس کی بڑی عمدہ مثال ہے۔ جس کی 'طرح' کو دوسروں نے اڑانے کی کوشش بھی کی ہے۔

دریا کے کنارے
گھاس اُگی ہے —— ہری ہری
اور باغ کے اندر
بید کے پیڑ ہیں —— گھنے گھنے

ابن انشا اُس بنیادی زبان کا رسیا ہے جس میں کوئی ثقل نہیں۔ اسی لئے اس کی طرز تحریر کو 'انداز' کہتے بھی جی نہیں پڑتی۔ اس کی نکہت بہت ہی کھری ہے، بہت ہی کومل ہے

لہسن کے پتوں کی شبنم
پل پل سوکھی جائے
بیر پک بھی چکے
اب اناروں کے پھلنے کے دن آگئے
ہر طرف ہر کہیں
بالیاں نرم پودوں کی لہرا گئیں'

یہی کیفیت شروع سے آخر تک۔ جیسے مترجم بھی افیون کی پینک میں پیلے چینیوں کے ساتھ بہکا چلا جا رہا ہو۔ وہی مدھر لَے، وہی بچپنے کی دھیمی دھیمی چال۔ جس سے یوں لگتا ہے کہ انشا چاند نگری نے لاہور میں ایک چینی کاریگر کی دکان پر جو سپنا دیکھا تھا وہ پورا ہوگیا ہے۔ اور اس نے سچ مچ عمدہ، نفیس جوتے کا ترجمہ کر ہی ڈالا۔ اور بڑے سلیقے، بڑے سبھاؤ سے۔ ایسے کہ اس پر ان کی اپنی چھاپ بھی ہے اور یہ کاریگری اس کی اپنی کاریگری معلوم ہوتی ہے۔ ایک بات اور —— کئی نظموں سے ایلیٹ کی رندھی رندھی سی لَے سُنائی پڑتی ہے۔ کہیں پاؤنڈ کی طرح اس نے بھی تو اس غمگین چینی راگنی سے اثر نہیں لیا؟

تاریخ معصومی

ناشر : سندھی ادبی بورڈ۔ کراچی
مترجم : اختر رضوی
صفحات : (۵۷۰)
قیمت : ۱۰-۸-۰

برصغیر ہند و پاک نے ایک عرصۂ دراز تک فارسی زبان و ادب کو نشو و نما دینے میں حصہ لیا۔ اور نظم و نثر کی وہ مایۂ ناز فصل پیدا کی جو "بہار ہند" کے نام سے موسوم ہے۔ ایسے گوناگوں اوصاف کی حامل کہ اسے بجا طور پر بہار عجم کی حریف کہا جاسکتا ہے۔

زیر نظر کتاب جو "چچ نامہ" کے بعد سندھ کے متعلق پہلی تاریخ ہے۔ اسی دریائے بے کراں کا ایک قطرہ ہے، وہ مجز جس سے کُل کی کیفیت نمایاں ہے۔ اسکے مصنف 'میر معصوم بھکری' عہد اکبری کے جلیل القدر امرا میں تھے۔ اور انہوں نے محمد بن قاسم کے عہد سے اکبر کے عہد تک کے حالات بالتفصیل رقم کئے ہیں۔ اس سے کتاب کی اہمیت ظاہر ہے، یہ ان کتابوں کے سلسلہ کی تیسری کڑی ہے جن کو سندھی ادبی بورڈ نے ترجمہ کروا کے تصحیح و حواشی کے ساتھ شائع کرنے اور ہمارے علم و ادب کے مخفی خزانوں کو برشتے کار لانے کا اہتمام کیا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی خدمت ہے

ہماری ڈاک

ہم ذیل کا دلچسپ خط اور تحریر اس کی مخصوص نوعیت کے پیشِ نظر بجنسہٖ پیش کر رہے ہیں۔ ذمہ داری بہرحال گردنِ راوی پر ہے۔ (مدیر)

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب۔ میں نے آپ کا رسالہ ماہِ نو دسمبر ۱۹۵۹ء کا دیکھا چونکہ یہ رسالہ میرے پاس نہیں آتا اس لئے میں بر وقت نہیں دیکھ سکا میرے ایک دوست نے حال ہی میں مجھے دکھایا جس میں میں نے ایک مضمون فضلی صاحب کا پڑھا۔ جسکو پڑھ کر میری حیرت و استعجاب کی کچھ حد نہ رہی۔ ..... کیا سارق یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان اور ہندوستان ایک دوسری دنیا ہے۔ اس دنیا کی اُدس دنیا میں کوئی چیز نہیں پہنچ سکتی یہ غلط ہے کوئی بات یہاں کی وہاں سے اور وہاں کی یہاں سے کتابت میں آنے کے بعد پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ معاف فرمایئے یہ میرا آپ سے متعلق نہیں ہے بلکہ یہ اعتراض میرا عام ہے۔ آپکو کیا خبر کہ یہ کلام کسکا ہے (ہماری اس بلاغت کا شکریہ (مدیر) اشک کون تھے اور افضل الشعرا حضرت محمود کون تھے اس مضمون کے لئے آئندہ کیلئے آپ پہچانیئے بغرضِ احتیاط میں نے ایک جلد دیوان حضرت محمود المرحوم جذباتِ محمود حکیم محمد اسمٰعیل خاں جوہر مقیم لالوکھیت ۴۴/۵ کراچی نمبر ۱۹ آپکو بھیجی ہے وہ آپکو پہنچا دینگے۔ (ہم اس جنسِ گرانمایہ سے ابھی تک محروم ہیں۔ مدیر) آپکو اس سلسلے میں کافی مدد ملیگی چونکہ فضلی صاحب کا مضمون سب سے پہلے آپکے پرچے ماہِ نو میں طبع ہوا ہے ...... اس لئے اسکی ضرورت ہے کہ یہ تحقیقاتی مضمون بھی آپ کے پرچے میں طبع ہو جائے اور ادبی دنیا میں اس سلسلے میں جو شبہات ہوں وہ دور ہو جائیں۔ میں اپنے ادبی فرض کو ادا کر رہا ہوں آپ کا بھی ادبی فرض ہے کہ آپ اس سلسلے میں امداد فرمائیں ..... رامپور۔

۲ نومبر ۱۹۶۰ء — محمد ابراہیم علیخاں قہر رامپوری

"چہ دلاور است دُزدے کہ بکف چراغ دارد"

جذباتِ محمود پر ایک محققانہ نظر

آئے دن مجھ سے لوگ یہہ پوچھتے رہے کہ یہہ اشعار یا غزلیات مفصلہ ذیل افضل الشعرا حضرت محمود کے ہیں یا اشک کے۔ چونکہ بعض نا سمجھ اور نا عاقبت اندیشوں نے اشک کی ہوا خواہی میں ناظرین کو اس شبہہ میں مبتلا کرنیکی کوشش کی کہ یہہ غزلیں جنکے یہہ اشعار ہیں ؎

؎ میں نے چکھی تھی کہ ساقی نے کہا جوڑ کے ہاتھ — آپ للّٰہ چلے جایئے میخانے سے۔

؎ جیسے دیدار اوسکی نصیب ہے وہ نصیب قابلِ دید ہے — جو شب برات ہے رات اوسے تو دن اوسکے واسطے عید ہے۔

؎ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں ہم وحشت میں — ہائے دامن نہوا ہائے گریبان نہوا — اشک کی ہیں

چنانچہ ماہِ نو مورخہ دسمبر ۱۹۵۹ء میں مینے ایک مضمون فضلی صاحب کا بھی اس کے متعلق پڑھا جس میں اونہوں نے ان اشعار کے متعلق ظاہر کیا کہ یہہ اشعار اشک نے اونہیں بھی خود راولپنڈی میں سنائے جس پر مجھے اسکی تحقیقات ناظرین کے سامنے پیش کرنی پڑی اور کہنا پڑا کہ یہہ اشعار اور یہہ غزلیں اشک کی نہیں ہیں بلکہ اونکے استاد افضل الشعرا حضرت محمود کے ہیں جو موصوف کے مطبوعہ دیوان جذباتِ محمود میں موجود ہیں جسکا ثبوت پیشِ نظر مضمون میں ناظرین کو ملیگا۔ ماہِ نو میں مینے پڑھا ہی تھا کہ نیا دور مورخہ نومبر ۱۹۵۹ء نظر پڑا جس میں راز صاحب رامپوری اشک صاحب کے دوست کا ایک مضمون میں نے پڑھا .... کہاں حضرت محمود اور کہاں راز صاحب اور کہاں اونکا توہین آمیز تخیل۔ گو راز صاحب کا یہہ گناہ ایسا ہے کہ خدا بھی معاف نہ کریگا۔ راز صاحب نے اس معاملے میں اپنی ذاتیات کو دخل دیکر خود اپنی شہادت کو غیر آزاد اور غیر صحیح کر لیا۔ میں بھی اس کا جواب ترکی بترکی دے سکتا تھا لیکن مجھے یہاں دوسرے خیالات میں اولجھکر اصل راستہ چھوڑنا نہیں ہے بلکہ اس معاملے کو صاف کرنا اور حقیقت کو واضح کرنا ہے یہہ میرا مقام نہیں کہ ادب کے نام پر بے ادبی کی رو میں بہہ جاؤں، یہاں اتنا کہنا کافی سمجھتا ہوں (تیر شرح بما فیہہ اِنا) یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ......

خیر خدا راز صاحب کو معاف کرے حالانکہ خدا حق لیا دمعاف نہیں کرے گا۔ میں اصل مطلب سے دور نہ ہوتے ہوئے ناظرین کو اصل معاملہ کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ راز اشک کے جذبۂ ہوا خواہی میں کچھ بہک گئے اور اپنی جگہ سے ہٹ گئے۔ اساتذہ کے پاس جو غزلیں اصلاح کو آیا کرتی ہیں وہ شاگردوں کے قلم کی لکھی ہوئی ہوتی ہیں اور جہاں اساتذہ اصلاح دیتے ہیں۔ یہاں یہ چیز ہے کہ جو یہ غزلیں حضرت محمود کے مسودات میں ملی ہیں وہ مطلع سے لیکر مقطع تک حضرت محمود کے قلم کی لکھی ہوئی

ہیں۔ یہاں راز صاحب کا فارمولا سر تا سر غلط ہو جاتا ہے کیونکہ مسودہ اگر اشک کے قلم کا لکھا ہوا ہوتا اور اس پر حضرت محمود کے قلم کی اصلاح ہوتی یا کوئی اور شعر جو ان اصلاح میں حضرت محمود کے خیال میں آیا ہوتا اور وہ خود اشک کے مسودے میں لکھدیا ہوتا تو راز صاحب کا قول کچھ قابل توجہ ہوتا۔ اب رہتا ہے کسی غزل کا اپنے نام سے کسی رسالے میں طبع کرا دینا اس طباعت سے وہ غزل کسی سارق کی نہیں ہو جاتی چنانچہ راز صاحب نے نگار مورخہ اپریل ۱۹۵۹ء میں حضرت محمود کے یہہ اشعار کہ (مین نے چکھی تھی کہ ساقی نے کہا جوٹھے کے ہاتھ = آپ للہ چلے جایئے میخانے سے)

(بات تاڑی تھی جو ہمنے تیرے شرمانے سے = اور بھی جم گئی دل میں وہ قسم کھانے سے)

اشک سے منسوب کئے ہیں حالانکہ یہہ اشعار حضرت محمود کی اوس غزل کے ہیں جس غزل کا عکس حضرت محمود کے قلم کا جذبات محمود میں موجود ہے اور اس غزل کی عمر اشک کی عمر سے آٹھہ سال زیادہ ہے۔ یہہ غزل حضرت محمود نے جے پور سے رامپور حضرت فصیح الملک کو ۲۰ مئی ۱۸۸۸ء کو اصلاح کے لئے بھیجی تھی یہہ وہ زمانہ ہے کہ حضرت محمود جے پور تھے اور حضرت فصیح الملک رامپور میں اور بقول راز صاحب کے اشک ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۸ء میں انتقال کر گئے اس طرح اشک کی عمر سرسٹھہ سال ہوتی ہے اور غزل کی پچہتر سال دوسری غزل (جسے دیدار ونکی نصیب ہے وہ نصیب قابل دید ہے = جو شب برات ہے رات اوسے تو دن اوسکے واسطے عید ہے) اور (ہاتھہ پہ ہاتھہ دہرے بیٹھے ہیں ہم وحشت میں = ہائے دامن نہوا ہائے گریبان نہوا) ان دونوں غزلوں کی عمر اڑسٹھہ سال ہوتی ہے جو اشک کی عمر سے ایک سال زیادہ ہے۔ آخرالذکر یہ دونوں غزلیں حضرت محمود نے ۹ رجب ۱۳۱۱ھ کو بغرض اصلاح فصیح الملک کو بمقام حیدرآباد بھیجی تھیں راز صاحب کے اس طرح کہدینے یا لکھدینے سے یہہ تینوں غزلیں اشک کی نہیں ہو سکتیں ـ حضرت فصیح الملک کی تحریریں ان غزلوں کے ساتھہ آ گئیں ہیں اور ان تحریروں کے عکس ناظرین کو جذبات محمود میں ملینگے۔ میں نہیں چاہتا کہ اشک کے مرنیکے بعد اونکے پراگندہ حالات صحافت یا تحریر میں آئیں لیکن راز صاحب نے مجھے مجبور کیا اسلئے میں قابل الزام نہیں جو شبہہ سخن فہموں اور ادب کے صحیح راہ پر چلنے والوں میں پیدا کیا جا رہا ہے اوسے دور کرنا میرا فرض ہے میں یہاں یہہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اشک صاحب نے اپنے نام و نمود کیلئے اپنے استاد حضرت محمود کے کلام کو اپنا کہکر اور سنا کر لوگوں کو مغالطے میں ڈالدیا اور یہہ موقع اونہیں پاکستان جاکر ہاتھہ آیا چونکہ پاکستان کے لوگ حضرت محمود کے حالات اور اونکے دیوان سے مستفید نہو پائے تھے اسی وجہہ سے فضلی صاحب نے بھی دھوکا کھایا جو قابل الزام نہیں۔ میرے پاس ہر زیر بحث غزل کا ریکارڈ اور حضرت فصیح الملک کی تحریروں کے عکس موجود ہیں تحریری ثبوت کے مقابلے میں راز صاحب کا یہہ کہدینا کہ یہہ غزل یا یہہ شعر اشک کا ہے بالکل غلط ہے جتنے قریب سے میں نے اشک کو دیکھا ہے راز صاحب کیا جانیں راز صاحب کی ایک غلط چیز پر ضد اور اونکی محض زبانی شہادت غیر صحیح ہے۔ اب جبکہ راز صاحب کے قول کی تحریری ثبوت سے تردید ہو جاتی ہے تو اس معاملے میں جو کچھ راز صاحب فرماتے ہیں قابل اعتبار نہیں رہتا۔ حضرت محمود کے متعلق راز صاحب کیا جانیں یہ ہمارے گھر کی باتیں ہیں (صاحب البیت ادری بما فیہا) راز صاحب اپنے گھر کو دیکھیں یہ مثال تو ملتی ہے کہ شاگردوں نے استاد کا کلام چرا لیا ہو جیسے اشک نے مگر ایسی مثال کہیں نہیں ملتی کہ استاد شاگرد کا کلام چرا لے دیکھئے نمونہ از خروارے اشک کی دو تحریریں بھی پیش کرتا ہوں جس سے زیر بحث واقعات پر کافی روشنی پڑیگی اور ثابت ہو جائیگا کہ اشک ایک مجبور اور سہارے کے شاعر تھے اگر غزلیات واشعار زیر بحث کا اشک کیلئے اپنی پیدائش سے آٹھہ سال یا ایک سال پہلے کہکر عالم ارواح سے عالم وجود میں پہنچنا ممکن ہے تو ناظرین اس طرف کچھ غور فرما سکینگے۔

(تحریر اشک)

جناب استاد مدظلہ تسلیم آج شب میں دلی جا رہا ہوں ۱۸ تاریخکو مشاعرہ ہے جو ابراہیم صاحب کلیم کے یہاں ہے۔ طرح یہ ہے (تمکو مرا خیال نہیں ہے نہیں سہی) خیال حال وغیرہ قافیہ نہیں سہی ردیف مجھے اتنا وقت نہیں کہ غزل لکھوں لہذا جناب ایک آٹھہ نو شعر فرما کر رکھدیں میں آکر لیلونگا مگر معرکہ کے اشعار ہوں اور ایک شرط یہ ہے کہ مطلع ایسا ہو جو کوئی دلخت نہو۔ بصد ادب فاحد۔

(دیگر) جناب استاد مدظلہ ـ آج سے مشاعرہ کے چار روز باقی ہیں اور مجھہ سے کچھ بھی نہ کہا گیا ایسی حالت میں سخت پریشانی ہے لہذا آپ ایک اکیس شعر کی غزل فرما دیجئے شاعرہ چونکہ عظیم الشان ہے اس واسطے یقین ہے کہ جناب غزل مرحمت فرمائینگے وہ ضرور باقی ہوگی اور یہ سبک ملکی بھی جا رہے ہیں اگر خدانخواستہ غزل نہیں ملی تو بڑی ذلت ہوگی میں تو ایک مبتدی ہوں میں کیا کر آپ سے امید رکہتا ہوں ـ والادب (آپ کا اشک)

موجودہ حالات و واقعات کی روشنی میں خود ناظرین فیصلہ کر لینگے کہ زیر بحث اشعار یا غزلیات قبلہ حضرت محمود کی ہیں یا اشک کی۔ (باقی آئندہ)

(نوٹ) اشک کا نام عابد علی خاں تھا پہلے واحد تخلص کرتے تھے اس کے بعد اشک تخلص کرنے لگے۔

(نوٹ) چونکہ رسالہ ماہ نو اور نیا دور دیر سے میری نظر سے گذرے اسلئے مضمون ہذا کی اشاعت و طباعت میں بہت دیر ہوئی۔

اعشاری سکّہ

ملک میں ایک بڑی اصلاح

چند ضروری باتیں

۱۔ پاکستان میں نئے اعشاری سکّے یکم جنوری ۱۹۶۱ء سے جاری ہو جائیں گے۔

۲۔ اس نظام میں ایک روپیہ کو ۱۰۰ برابر حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر جزو کا نام "پیسہ" ہے یعنی ایک روپیہ میں ۱۰۰ پیسہ ہوں گے۔

۳۔ روپیہ کی قیمت میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔

۴۔ اس وقت صرف ۱ پیسہ، ۵ پیسہ اور ۱۰ پیسہ کے نئے اعشاری سکے جاری کئے جا رہے ہیں۔

۵۔ رقم کی ادائیگی یا وصولی کے لئے نئے پرانے یا دونوں، سکّے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔

۶۔ پرانے سکّے کو نئے سکّے میں تبدیل کرنے کے لئے بعض اوقات کسریں آ جاتی ہیں ان کا حساب پورا کرنے کے لئے صرف ان شرحوں سے کام لیا جائے گا جو سرکاری طور شائع کر دی گئی ہیں۔ کسر پورا کرنے کے اس عمل کو صرف ایک مرتبہ کیا جائے گا۔

نقشہ شرح تبدیلی: استعمال کیسے کیا جائے؟

اس نقشہ کو صرف اس وقت استعمال کیجئے جب آپ کو واقعی کوئی ادائیگی کرنی ہو۔ یہاں جو شرح دی گئی ہے وہ موجودہ سکّے کے حساب میں پیسہ کے مساوی سکّوں کو ظاہر کرتی ہے جو کسی واحد معاملہ ادائیگی کے وقت پیش کئے جائیں۔

بالکل صحیح مساوات نکالنے کے لئے درج ذیل شرح سے حساب معلوم کر لیجئے:

۱۰۰ پیسہ برابر ہے ایک روپیہ یا ۱۶ آنے یا ۶۴ پیسے یا ۱۹۲ پائیاں۔

حساب کا سہل نقشہ:

۱ روپیہ — ۱۰۰ پیسہ	۸ آنے — ۵۰ پیسہ
۴ آنے — ۲۵ پیسہ	۳ آنے — ۱۹ پیسہ
۲ آنے — ۱۲ پیسہ	۱ آنہ — ۶ پیسہ
½ آنہ — ۳ پیسہ	۱ پیسہ (موجودہ) — ۲ پیسہ

شرح نامہ تبدیلی

ذیل میں جو نقشے دیئے گئے ہیں ان سے معلوم ہو سکتا ہے کہ پرانے سکوں کو نئی کرنسی یعنی اعشاری سکوں میں کس طرح تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ ان نقشوں کو کاٹ کر رکھ لیجئے ۔ خود اور اپنے اہلِ خانہ کو ان سے مانوس بنائیے۔

پرانے اور نئے سکے دونوں یکم جنوری ۱۹۶۱ء کے بعد جاری رہیں گے ۔ ادائیگی اور وصولی رقوم کے لئے نئے، پرانے یا دونوں سکوں کو استعمال کیا جا سکتا ہے ۔ بعض اوقات پرانے سکوں کو نئے سکوں میں تبدیل کرتے وقت حساب میں کسروں سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔ ان کا حساب پورا کرنے کے لئے سرکاری طور پر جو شرحیں بنائی گئی ہیں، انہیں کو برتا جائے گا۔ یہ بات یاد رکھئے کہ حساب پورا کرنے کا یہ عمل ایک معاملہ میں صرف ایک مرتبہ ہی کیا جائے گا۔ مثلاً:

اگر آپ کسی دن سے ایک چیز خریدتے ہیں تو اسے ایک معاملہ سمجھا جائیگا اگر آپ نے کسی موقع پر ۴، ۶، یا ۱۰ چیزیں کسی ایک دکان سے خریدیں تو اسے بھی صرف ایک معاملہ سمجھا جائے گا۔ اس صورت میں ہر چیز کی قیمت لگا کر پورا جوڑ لگا لیا جائے اور آخر میں جو کسر آئے اس کو از روئے شرح پورا کر دیا جائے ۔ ہر ہر چیز کی قیمت کی کسر پر یہ عمل نہیں کیا جائے گا۔

پائیاں	آنے	پیسہ
۱	٠	۱
۲	٠	۱
۳	٠	۲
۴	٠	۲
۵	٠	۳
۶	٠	۳

پائیاں	آنے	پیسہ
۷	٠	۴
۸	٠	۴
۹	٠	۵
۱۰	٠	۵
۱۱	٠	۶
—	۱	۶

آنے	پائیاں	پیسہ
۳	۱	۱۹
۳	۲	۲۰
۳	۳	۲۰
۳	۴	۲۱
۳	۵	۲۱
۳	۶	۲۲

آنے	پائیاں	پیسہ
۳	۷	۲۲
۳	۸	۲۳
۳	۹	۲۳
۳	۱۰	۲۴
۳	۱۱	۲۴
۴	٠	۲۵

آنے	پائیاں	پیسہ
۱	۱	۷
۱	۲	۷
۱	۳	۸
۱	۴	۸
۱	۵	۹
۱	۶	۹

آنے	پائیاں	پیسہ
۱	۷	۱۰
۱	۸	۱۰
۱	۹	۱۱
۱	۱۰	۱۱
۱	۱۱	۱۲
۲	٠	۱۲

آنے	پائیاں	پیسہ
۴	۱	۲۶
۴	۲	۲۶
۴	۳	۲۷
۴	۴	۲۷
۴	۵	۲۸
۴	۶	۲۸

آنے	پائیاں	پیسہ
۴	۷	۲۹
۴	۸	۲۹
۴	۹	۳۰
۴	۱۰	۳۰
۴	۱۱	۳۱
۵	٠	۳۱

آنے	پائیاں	پیسہ
۲	۱	۱۳
۲	۲	۱۴
۲	۳	۱۴
۲	۴	۱۵
۲	۵	۱۵
۲	۶	۱۶

آنے	پائیاں	پیسہ
۲	۷	۱۶
۲	۸	۱۷
۲	۹	۱۷
۲	۱۰	۱۸
۲	۱۱	۱۸
۳	٠	۱۹

آنے	پائیاں	پیسہ
۵	۱	۳۲
۵	۲	۳۲
۵	۳	۳۳
۵	۴	۳۳
۵	۵	۳۴
۵	۶	۳۴

آنے	پائیاں	پیسہ
۵	۷	۳۵
۵	۸	۳۵
۵	۹	۳۶
۵	۱۰	۳۶
۵	۱۱	۳۷
۵	٠	۳۷

آنے	پائیاں	پیسہ
۶	۱	۳۸
۶	۲	۳۹
۶	۳	۳۹
۶	۴	۴۰
۶	۵	۴۰
۶	۶	۴۱

آنے	پائیاں	پیسہ
۶	۷	۴۱
۶	۸	۴۲
۶	۹	۴۲
۶	۱۰	۴۳
۶	۱۱	۴۳
۷	۰	۴۴

آنے	پائیاں	پیسہ
۱۱	۱	۶۹
۱۱	۲	۷۰
۱۱	۳	۷۰
۱۱	۴	۷۱
۱۱	۵	۷۱
۱۱	۶	۷۲

آنے	پائیاں	پیسہ
۱۱	۷	۷۲
۱۱	۸	۷۳
۱۱	۹	۷۳
۱۱	۱۰	۷۴
۱۱	۱۱	۷۴
۱۲	۰	۷۵

آنے	پائیاں	پیسہ
۷	۱	۴۴
۷	۲	۴۵
۷	۳	۴۵
۷	۴	۴۶
۷	۵	۴۶
۷	۶	۴۷

آنے	پائیاں	پیسہ
۷	۷	۴۷
۷	۸	۴۸
۷	۹	۴۸
۷	۱۰	۴۹
۷	۱۱	۴۹
۸	۰	۵۰

آنے	پائیاں	پیسہ
۱۲	۱	۷۶
۱۲	۲	۷۶
۱۲	۳	۷۷
۱۲	۴	۷۷
۱۲	۵	۷۸
۱۲	۶	۷۸

آنے	پائیاں	پیسہ
۱۲	۷	۷۹
۱۲	۸	۷۹
۱۲	۹	۸۰
۱۲	۱۰	۸۰
۱۲	۱۱	۸۱
۱۳	۰	۸۱

آنے	پائیاں	پیسہ
۸	۱	۵۱
۸	۲	۵۱
۸	۳	۵۲
۸	۴	۵۲
۸	۵	۵۳
۸	۶	۵۳

آنے	پائیاں	پیسہ
۸	۷	۵۴
۸	۸	۵۴
۸	۹	۵۵
۸	۱۰	۵۵
۸	۱۱	۵۶
۹	۰	۵۶

آنے	پائیاں	پیسہ
۱۳	۱	۸۲
۱۳	۲	۸۲
۱۳	۳	۸۳
۱۳	۴	۸۳
۱۳	۵	۸۴
۱۳	۶	۸۴

آنے	پائیاں	پیسہ
۱۳	۷	۸۵
۱۳	۸	۸۵
۱۳	۹	۸۶
۱۳	۱۰	۸۶
۱۳	۱۱	۸۷
۱۴	۰	۸۷

آنے	پائیاں	پیسہ
۹	۱	۵۷
۹	۲	۵۷
۹	۳	۵۸
۹	۴	۵۹
۹	۵	۵۹
۹	۶	۵۹

آنے	پائیاں	پیسہ
۹	۷	۶۰
۹	۸	۶۰
۹	۹	۶۱
۹	۱۰	۶۱
۹	۱۱	۶۲
۱۰	۰	۶۲

آنے	پائیاں	پیسہ
۱۴	۱	۸۸
۱۴	۲	۸۹
۱۴	۳	۸۹
۱۴	۴	۹۰
۱۴	۵	۹۰
۱۴	۶	۹۱

آنے	پائیاں	پیسہ
۱۴	۷	۹۱
۱۴	۸	۹۲
۱۴	۹	۹۲
۱۴	۱۰	۹۳
۱۴	۱۱	۹۳
۱۵	۰	۹۴

آنے	پائیاں	پیسہ
۱۰	۱	۶۳
۱۰	۲	۶۴
۱۰	۳	۶۴
۱۰	۴	۶۵
۱۰	۵	۶۵
۱۰	۶	۶۶

آنے	پائیاں	پیسہ
۱۰	۷	۶۶
۱۰	۸	۶۷
۱۰	۹	۶۷
۱۰	۱۰	۶۸
۱۰	۱۱	۶۸
۱۱	۰	۶۹

آنے	پائیاں	پیسہ
۱۵	۱	۹۴
۱۵	۲	۹۵
۱۵	۳	۹۵
۱۵	۴	۹۶
۱۵	۵	۹۶
۱۵	۶	۹۷

آنے	پائیاں	پیسہ
۱۵	۷	۹۷
۱۵	۸	۹۸
۱۵	۹	۹۸
۱۵	۱۰	۹۹
۱۵	۱۱	۹۹
۱ روپیہ		۱۰۰

کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے!

احسان ملک

"ٹرام کا ٹکٹ پانچ پیسے میں ملتا ہے۔ آئیے دیکھیں یکم جنوری سے نئے سکوں میں کتنے کا ملے گا۔ موجودہ پانچ پیسے برابر ہوتے ہیں ۸۱۲۵ء نئے پیسوں (پیسہ) کے یا موٹے حساب میں پونے آٹھ نئے پیسے (پیسہ) ہوں گے۔ پورا پیسہ ہم کہاں سے لائیں؟ کوئی بات نہیں۔ آٹھ نئے پیسے دے دیں گے مگر پرانے سکوں ہی میں ٹکٹ خریدیں گے اور پیسہ کے نقصان سے بچیں گے لیکن پرانے سکے تو دھیرے دھیرے غائب ہوتے جائیں گے اور ان کی جگہ نئے سکے لے لیں گے۔ پھر تو نقصان برداشت کرنا ہی پڑے گا۔ ہم حکومت سے مطالبہ کریں گے کہ ٹرام کا ٹکٹ آٹھ پیسوں کی بجائے ۸ نئے پیسہ (نیا پیسہ) کردے"

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اور مفتیان عظام بیچ اس مسئلہ کے جو یکم جنوری سے پہلے ہی اٹھ کھڑا ہوا ہے؟ مگر خیر، یہ جھگڑا تو دوسروں کو نپٹانے دیں۔ اتنے — ابھی تو نیا پیسہ چلنے میں کئی دن باقی ہیں — ہم آپ کچھ کام کی باتیں کر لیں۔

بزرگوں کا کہنا ہے کہ عقل بڑی یا بھینس۔ اب یہ تو وہ جانیں جنھوں نے سچ مچ اس کا اندازہ کیا ہے یا تول کر دیکھا ہے۔ دیکھنے میں تو بھینس ہی بڑی نظر آتی ہے۔ مگر یہ بھی تو ہے کہ — دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا — آدمی آدمی انتر کوئی ہیرا کوئی کنکر۔ کوئی عقل کا دھنی کوئی بالکل کورا۔ مگر اتنا سب جانتے ہیں کہ کہاں عقل اور کہاں بھینس۔ خواہ ایک کی جگہ ہزاروں بھینسیں کیوں نہ جمع کر دی جائیں۔ اور عقل نے تو ماشاءاللہ وہ وہ بڑے بڑے کام کئے ہیں کہ اللہ میاں کی یہ اتنی بڑی بھاری بھرکم مخلوق اسکے سامنے کچھ بھی نہیں۔ سچ پوچھئے تو سیانوں کی بات کا مزا آنولے کی طرح کھانے کے بعد آتا ہے۔ بشرطیکہ آپ نے واقعی کبھی آنولہ کھایا ہو۔ اب دور کیوں جائیے۔ ذرا یہ پرانے اور نئے سکے ہی دیکھ لیجئے۔ ہم لوگ تھے کہ جگ پر

جگ بیتتے گئے، ان پرانے سکوں ھی پر ریجھے رھے۔ یہاں تک کہ ان کو برتتے برتتے زندگی اجیرن ھوگئی - وھی چھوٹی چھوٹی ننھی منی پائیاں جن کو ھاتھ میں لینا اور سنبھال کر رکھنا بھی کارے دارد ھو - وھی دھیلے، وھی پیسے — سوراخ دار یا بے سوراخ — وھی بڑے بڑے ادھنے، وھی آنے یا اکنیاں، دونیاں، چونیاں، اٹھنیاں، اور وھی چوڑا چکلا روپیہ — غرضیکہ ایک لامتناھی سلسلہ تھا - اور ان کی قیمت میں کوئی تک نہیں - لیجئے ۳ پائی کا ٹھہرا ایک پیسہ - کیوں؟ ۶ پائی یا ۲ پیسے کا آدھا - ۱۲ پائی کا آنہ - ۱۹۲ پائی کا روپیہ - اور ان کے بیچ دونیوں، چونیوں، اٹھنیوں - روپے کا اپنا اپنا حساب الگ - ہائے رے باپ! ھم کس چکر میں پھنس گئے!!

بیچارے بچوں کے لئے تو یہ - اک معمہ تھا سمجھنے کا نہ سمجھانے کا - برسوں مغز مارتے رھیئے پھر بھی پتھر میں جونک نہ لگی ھے نہ لگے - ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ ان چھوٹے بڑے بھانت بھانت کے سکوں کا آپس میں کیا رشتہ ھے - ھر قدم پر چکر ھی چکر - اور گھر سے نکل کر اسکول پہنچے تو اور بھی عذاب - دن دن بھر استاد کی مار پیٹ، کان پچی اور کیا کیا کچھ کہ ان سکوں کا ھیر پھیر مطلق سمجھ میں نہیں آتا - اور نہ ان کے کچھ لگتے حساب کا اور چھور ھی معلوم ھوتا ھے -

بوجھ وہ سر پہ گرا ھے کہ اٹھائے نہ اٹھے

کام وہ آن پڑا ھے کہ بنائے نہ بنے!

پہاڑوں کا پہاڑ بھی تو انھیں پائیوں، پیسوں کے کارن سر پر آن نازل ھوتا ھے - خوب یاد ھے یار لوگوں کی پائیوں، پیسوں، آنوں، روپوں کی بدولت کیا کیا جگ ھنسائیاں اور مار پٹائیاں ھوئی ھیں - اور مولا بخش ھو یا مشکلکشا - اس سے کیا کیا مشکلیں حل ھوئی ھیں -

اور بچے ھی کیا - بڑوں کو اس سلسلہ میں کیا کیا پاپڑ نہیں بیلنے پڑے - کبھی ان نقدی گھروں یعنی بنکوں کی طرف جا نکلے، تو کہا کیا مظلوم شکلیں اونچی اونچی بنچوں پر سر جھکائے دکھائی دینگی جن کا دن بھر ایک ھی ورد ھے

نقش فریادی ھے کسکی شوخیٔ تحریر کا

کاغذی ھے پیرھن ھر پیکر تصویر کا!

مطلب یہ کہ کاغذ کے لمبے لمبے تختے اور بھاری بھرکم رجسٹر پائیوں پیسوں آنوں دونیوں سے پٹر پڑے ھیں - کالے سیاہ - ھر بار گنتے گنتے ایک دو پائی کی کسر رہ جاتی ھے اور پھر سے آواگون کا چکر شروع ھو جاتا ھے - خیال کیجئے ان مصیبت کے ماروں نے پائیاں آنے بنانے والوں کو کیا کیا جی بھر بھر کر نہیں کوسا ھوگا - یہ حساب کتاب تو ایسی ضروری چیز ھے - اور پھر پائیوں کا حساب - جسے جہنم کی سزاؤں میں سب سے بڑی سزا قرار دینا چاھئے تھا - اس سے تو بڑے بڑوں کی سٹی گم ھو جاتی ھے - وہ آئن سٹائن تھا نا - بہت بڑا ریاضی داں سمجھتا تھا خود کو - کسی بس کنڈکٹر نے اس کی ساری شیخی کرکری کردی - ارے بڑے صاحب! اتنا حساب بھی نہیں جانتے!! - اور یہاں ایک آئن سٹائن تو کیا - بقول لسان الغیب حافظ -

ھماں مرحلہ است ایں بیابان دور

کہ گم شد درو لشکر سلم و طور

کچھ عجب نہیں کہ ھم صدھا سال اور انھی دقیانوسی سکوں کے گورکھ دھندے میں پھنسے رھتے - مگر خوش‌قسمتی سے عقل نے بھینس کے مقابلے میں اپنی برتری کا ثبوت دیا اور بزرگوں کی لاج رکھ لی - ذرا غور کیجئے - مکسور اعشاریہ - ھماری اپنی چیز - ھمارے پرکھوں نے بنائی - اور لغاروم جس نے اعشاریہ کی بھی ھندی کی چندی کر دکھائی ھے - اس کا سہرا کس کے سر بندھتا ھے؟ ھم، ھمارے آباو اجداد - یورپ نے یہ چیزیں کس سے حاصل کی تھیں؟ ھمیں سے - اور اب اینڈتے پھرتے ھیں کہ ھم بھی ھیں پانچوں سواروں میں - مگر ھم پر حیف ھے کہ

گنوادی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی! ہماری غفلت اور دانایان فرنگ کی ھوشیاری کہ انھوں نے پرانے، غیر سائنسی سکوں کے بجائے اعشاری سکے رائج کر ڈالے اور حساب کتاب کی کایا پلٹ دی ۔ اسکولوں، بنکوں، منڈیوں کے سر سے بےڈھب سکوں کی مصیبت ٹلی ۔

یہ ھماری انقلابی حکومت کی بڑی دانشمندی ہے کہ اس نے مال عرب پیش عرب کے مقولے پر عمل کرکے اصول اعشاریہ کو اپنایا ۔ واہ واہ! کیا عمدہ طریق ھے ۔ صفر، پانچ، دس، پچیس، پچاس ، سو ، ھزار ۔ جیسے انسان برابر پایوں پر قدم رکھتا ھوا زینے پر بڑھتا چڑھتا چلا جائے اور اسے اپنی ھر ھر منزل کا ٹھیک ٹھیک علم ھو ۔ یہ نہیں کہ ایک قدم کہیں پڑ رھا ھے، دوسرا کہیں ۔ اب بھلا کسی چھوٹے سے چھوٹے بچے کو بھی گننے، حساب لگانے میں کیا دقت ھوگی ۔ بس یہاں تو جو کچھ ھے پیسہ ھی پیسہ ھے ۔ ایک پیسہ، دو پیسہ ۔ دس پیسہ ۔ اور چونی آٹھنی کا سیدھا حساب ھے ۔ ۲۵ پیسہ ۔ ۵۰ پیسہ ۔ اور یکڑ بکڑ بھمبل بھو وغیرہ کچھ نہیں بلکہ روپے کا پورا سو پیسہ ۔ اب کسی استاد کو کان بچی، مولا بخش یا مشکلکشا کی ضرورت نہیں رھے گی ۔ اور نہ بچوں کو طرح طرح کی سزائیں بھگتنی پڑیں گی ۔ رھے بنک اور منڈیاں تو دن بھر کا حساب منٹوں میں طے ھوجائے گا ۔ نہ ھینگ لگی نہ پھٹکری ۔ رنگ چوکھا ۔

یہ تو ھے ۔ مگر سچ پوچھئے تو اول اول یار لوگوں کو خاصہ جھمیلہ رھا ھے ۔ اور بعض خداوندان عقل و ھوش تو اب بھی خوب چکرا اور جھنجھلا رھے ھیں ۔ اور جہاں جاتے ھیں جیب میں ایک نقشہ، ایک جدول، ایک پرچہ لئے پھرتے ھیں ۔ اس سائیس کی طرح جسے کسی رئیس نے نوشت پے ڈالی تھی ۔ اور ٹٹول ٹٹول کر موٹے موٹے شیشوں والی عینک لگاکر، پرانوں کی جگہ نئے تلاش کر رھے ھیں یا پرانوں کو نیا بنارھے ھیں ۔ گویا گھر گھر اور در در کاغذی تبادلہ گھر کھل گیا ھو ۔ ایک دن تو خوب مزا آیا ۔ میری ایک بچی ھے ۔ روز رو دھوکر ایک دونی ضرور لیتی ۔ اور اس چوکور سکے کو خوب پہچانتی ۔ جیسے مداری کا طوطا پہچانتا ھے ۔ دو آنے یا آٹھ پیسے دونی کا کوئی بدل بھی دیں، ھرگز قبول نہ کرتی ۔ اب جو حضرت پیسہ اور نئے سکے برا جمان ھوئے تو وہ کسی طرح منتی ھی نہ تھی ۔ لوٹ پوٹ ھوئی جاتی ۔ اسے نئے پیسہ اور نئے سکوں سے کیا؟ کئی دنوں میں اس اللہ کی بندی کو یہ پتہ چلا کہ وہ دن گئے جب خلیل خاں فاختہ آڑایا کرتے تھے یعنی اکنیوں دونیوں کا راج تھا ۔ اسکے برعکس کلشن کا بندوبست برنگ دکر ھے آج ۔ رفتہ رفتہ اسے پتہ چلا کہ پیسہ کی بھی اتنی ھی مونگ پھلیاں، چلغوزے یا ٹافیاں آتی ھیں جتنی دونی کی ۔ اب ستم ظریفی ھے کہ وہ پیسہ کے بغیر بات ھی نہیں کرتی ۔ اور شاید اسے پرانی دونی دے دی جائے تو اس پر ویسا ھی فیل مچائے گی جیسا اس نے نیا پیسہ پر مچایا تھا ۔

یہ تو ھوئی چھوٹی لڑکی کی بات ۔ بڑوں نے بھی وہ وہ لطیفے کئے اور کر رھے ھیں کہ کسی زمانہ کے خاص خاص لطیفے گرد ھوکر رہ گئے ھیں ۔ یہ لیجئے، ایک دکان پر ھلڑ مچا ھے ۔ ایک بزرگ مع اپنی لمبی چوڑی ڈاڑھی کے جھگڑ رھے ھیں ۔ لیں گے ۳ آنے کے تیس پیسے اور دیں گے بیس! سبھی لوگ بیس پر چار سو بڑھا رھے ھیں ۔ دے بحثا بحثی ھو رھی ھے ۔ اور ساتھ جدول کی ڈھنڈائی ۔ خدا خدا کرکے حساب برابر ھوا ۔ مگر یہ کون جانے کتنوں کو پیسہ زیادہ گیا کتنوں کو کم ۔ کوئی صاحب بس پر سوار بڑ بڑا رھے ھیں ۔ اسلئے کہ وہ جدول اپنی پرانی شیروانی میں بھول آئے ھیں ۔ اب دے ھاتھ نچا نچا کر اور زبان بڑھا بڑھا کر تکرار ھو رھی ھے ۔ جسے یار لوگ ریڈیو کا مفت کا جھگڑا سمجھ کر بڑی دلچسپی سے سن رھے ھیں ۔

مگر ان باتوں کا کیا ۔ یہ تو سب رفتنی و گذشتنی باتیں ھیں ۔ کب تک خیال طرۂ لیلیٰ کرے کوئی ۔ اب تو یار لوگ نئے سکوں اور ان کی قیمتوں کو خوب پہچان گئے ھیں ۔ اور دن راتہ

انہی کے گن گاتے ہیں - بڑی بات یہ ہے کہ نئے سکوں سے حساب کتاب کتنا سرل ہو گیا ہے - بلکہ طب یونانی کے متوالوں کی اصطلاح میں کھرل ہو گیا ہے - مجھے یقین ہے "ماہ نو" والوں نے ان نئے چاند تاروں کو چمکانے میں ضرور حصہ لیا ہو گا - اور یہ دانائی ضرور کی ہوگی کہ نئے سال کے پہلے شمارے میں، جسمیں غالباً یہ فکاھی چیز بھی چھپ رہی ہے، نئے سکوں کی بڑی عمدہ جدول بھی شائع کردی ہوگی جیسے رمضان شریف سے پہلے نقشہ سحری و افطار شائع کئے جاتے ہیں - بار لوگ اس حسین جدول کو تراش کر یا سارے رسالے ہی کو جیب میں ٹھونسے پھریں گے تاکہ عندالضرورت اسے جھٹ سند کے طور پر پیش کر سکیں اور پرانے پیسوں کا نیا پیسہ بنا لیں - کیونکہ پیسوں کے مقابلہ میں اب صرف 'پیسہ' ہی رہ گیا ہے 'پیسے' نہیں - اس سے ہمارے سکوں کا نظام عالمی سکوں کے نظام سے مل جائے گا اور ہمیں اپنے مالیاتی نظام کو استوار کرنے کے علاوہ زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کرنے میں مدد ملے گی -

اب اس لے کو کہاں تک بڑھاؤں - نظیر اکبرآبادی کا ہمنوا ضرور ہوں جس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا - پیسہ نہیں تو آدمی چرخے کی مال ہے - اور اس پر ایک لمبی چوڑی نظم لکھ ڈالی تھی - مگر میں نہ شاعر ہوں نہ مجھے شاعری سے مس ہے - بالکل روکھا پھیکا نثرنویس ہوں - یعنی پرلے درجے کا خشک انسان - پھر بھی نیا سکہ چلنے پر خوشی سے پھولے نہیں سماتا اور خدا کا شکر بجا لاتا ہوں کہ وہ پرانے سکے تو گئے - یا آہستہ آہستہ چلے ہی جائیں گے - جو بچوں، بوڑھوں، چھوٹوں بڑوں سب کو اسقدر ستایا کرتے تھے - کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے !

★★★
★★
★

ماہِ نو

جلد ۱۴ — شمارہ ۲

فروری ۱۹۶۱ء

مدیر: رفیق خاور — نائب مدیر: ظفر قریشی

چندہ سالانہ: پانچ روپے ۵۰ پیسے

شائع کردہ: ادارۂ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

فی کاپی: ۵۰ پیسے

غالب ــ ایک تہذیبی قوت

ممتاز حسین

جب بھی غالب کی شاعری کا ذکر آتا ہے تو ہماری نظر سب سے پہلے یا تو ان کے کلام کی آفاقیت پر جاتی ہے جہاں وہ پوری انسانیت کے ترجمان ہیں یا پھر ان کے کلام کے ایسے حصوں پر جہاں انہوں نے انسان کے عنصری جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ غالب کی یہ وسیع النظری اور نفسیاتی ژرف بینی دونوں ہی لائقِ صد تحسین و داد ہیں اور ان کے بقائے دوام کی ضامن لیکن تاوقتیکہ ہم ان کے کلام کی تاریخی اہمیت کو نہ جانیں، یا یہ کہ انہیں ایک مخصوص تاریخی تہذیبی ماحول میں رکھ کر نہ دیکھیں اس کا خطرہ باقی رہتا ہے کہ کہیں ہماری وہ تحسین، تحسین ناشناس ہو کر نہ رہ جائے۔ کیونکہ کسی بھی شاعر کے کلام کی عمومیت اور آفاقیت اپنی قوم اور تاریخ، زندہ اور معاصر تاریخ سے بے نیاز ہونے میں نہیں، بلکہ اس سے دست گریباں ہونے، اس کی کشمکش کو سمجھنے اور پھر اسے عالمی تہذیب کے ارتقائی رجحانات سے نسبت دینے میں ہے۔

کیا ہمارے یہاں غالب کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کیا گیا ہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ گزشتہ پندرہ بیس سالوں میں، جوں جوں ہمارا تاریخی تنقیدی شعور زیادہ سے زیادہ گہرا اور وسیع ہوتا گیا ہے، کچھ نہ کچھ اس کی طرف توجہ دی گئی ہے اور ہم نے غالب کے کلام میں ایک تاریخی آدم، کو بھی دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس موقع پر ہمارے بعض بزرگ، جو اگلے وقتوں کے ہیں، یہ کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ تو ایک گزراں حقیقت ہے۔ وہ جو وقتی اور ہنگامی، گزشتنی اور گزاشتنی ہے وہ کب ہم جیسے سرمستِ ازل، مطلق پرستوں، پردہ درانِ تعینات کو، اپنے دام موج میں الجھا سکتی ہے، ہم تو اس کی اس دامگاہ سے ایک چشم زدن میں جست کر جاتے ہیں۔ کیا غلامی اور کیا آزادی۔ کیا راکٹ اور کیا ایٹم۔ ہم تو بے مَرکب اڑتے اور بے تیغ لڑتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ بڑا خواب آور اور نشیلا فلسفہ ہے اور جب اپنے پاس کچھ بھی نہ ہو تو اس کا نشہ اور زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔

لیکن گزشتہ دو ڈھائی سو سال کی پیہم پسپائیوں اور زد و کوب نے اب ہمیں یہ سمجھایا ہے کہ عالم کی ہستی ناقابل تردید ہے اور یہ ایک عالم اسباب ہے نہ کہ عالم معجزات۔ میں نے یہ بات اس لئے چھیڑی کہ اب یہ جو شعور، عالم کے وجود کے ماننے اور اس کے اسباب و علل کے دریافت کرنے کا پیدا ہو چلا ہے وہ ہماری گزشتہ ڈیڑھ سو سال کی تاریخی تہذیبی جدوجہد ہی میں پروان چڑھا ہے۔ اور اس شعور کو فروغ دینے میں غالب کا بھی ایک حصہ ہے لیکن کس قدر افسوس کی بات ہے کہ اس سلسلہ میں ان کا نام نہیں لیا جاتا ہے۔ شاید اس لئے کہ ہمارے ذہن میں یہ بات بٹھا دی گئی ہے کہ مغرب کی روشنی نے ہمیں ۱۸۵۷ء کے بعد سے متاثر کرنا شروع کیا۔ جب سے کہ ہم انگریزوں کے بار امانت کو اپنے کندھوں پر اٹھائے یہ کہتے پھرے۔ "دیکھو اے مسلمانو، ان کی آمریت تم پر واجب ہے۔ اور ان کی حکومت تمہارے لئے امن و برکت کا باعث ہے۔ کہ یہ تم میں سے ہیں۔ صاحب کتاب ہیں"۔ یا پھر شاید اس لئے کہ غالب کی روشن خیالی اور روشن ضمیری میں "احیاء دین" اور تہافتہ الفلاسفہ کا کوئی علم الکلام نہ تھا۔ لیکن ابن رشد کی روح کب تک تہ تیغ رہتی۔ بالآخر یہ بات کھل کر ہی رہی کہ ہماری روشن خیالی اور ہمارے جدید ادب دونوں ہی کا آغاز غالب ہی کی نظم و نثر سے ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کے اس عمل میں قدیم اور جدید کے درمیان ایک شدید کشمکش ہے۔ ؎

کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

لیکن اس کشمکش میں کبھی کبھی جدید قدیم پر اتنا غالب آجاتا ہے کہ وہ سید احمد خاں کو ٹوک کر کہہ دیتے ہیں۔ ؎

مردہ پروردن مبارک کار نیست

مبادا آپ یہ کہیں گے کہ یہ واقعہ ۱۸۵۷ء کا ہے اور ۱۸۵۷ء میں کچھ بہت زیادہ بُعد زمانی نہیں ہے۔ اس لئے ہم آپ کو اس

زمانے سے بہت پہلے کی ایک فارسی غزل سناتے ہیں۔ جس میں مغرب کی روشنی کا خیر مقدم کیا گیا ہے ؎

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند
رخ کشودند و لب ہرزہ سرایم بستند
دل ربودند و دو چشم نگرانم دادند
گہر از رایت شاہان عجم برچیدند
بعوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند
افسر از تارک ترکان پشنگی بردند
بہ سخن ناصیۂ فر کیانم دادند
گوہر از تاج گسستند و بدانش بستند
ہرچہ بردند بہ پیدا بہ نہانم دادند

اس امر پر سارے مؤرخین کا اتفاق ہے کہ انگلستان کا صنعتی انقلاب ہندوستان سے لوٹی ہوئی دولت کا رہین منت رہا ہے۔ ہندوستان کا جب سونا لٹ گیا تو مغرب سے علم و دانش کا ایک آفتاب طلوع ہوا۔ جس کی روشنی سے ہرچند کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تاجروں نے، مشرق کو محروم رکھنے کی بڑی کوشش کی لیکن جب ۱۸۳۲ء کے ریفارم بل کے بعد دولتِ انگلشیہ میں تاجروں کا زور گھٹا اور صنعتی سرمایہ داروں کا زور بڑھا تو پھر اس کی روشنی یہاں بھی پھیلی۔ نہ صرف دخانی کشتیوں، ریل گاڑیوں، ٹیلیگراف اور دوسری سائنسی ایجادوں کی نمائش سے، بلکہ انگریزی تعلیم، سماجی اصلاحات (جس میں غلامی کی رسم کی منسوخی بھی شامل ہے) اور پریس کی آزادی کی صورت میں بھی۔ چنانچہ ۱۸۳۵ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک کا زمانہ، باوجود اس کولونیل حکومت اور شدید سرمایہ دارانہ استحصال کے جس سے ہندوستان دوچار ہوا، برطانوی ہندوستان کی تاریخ میں اس پہلو سے تابناک بھی ہے کہ یہ ذہنی آزادی اور مغربی علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کا زمانہ تھا۔ اسی زمانے میں دہلی کالج قائم ہوا تھا، جسکی اہمیت کے بارے میں ذکا اللہ لکھتے ہیں کہ سائنس اور نئے علم ہیئت کی باتیں گھر گھر میں پھیل گئی تھیں۔ غالب نے اسی خورشید مغرب کا خیر مقدم اپنی غزل میں کیا ہے ؎ شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند اور پھر اس کی تان اس شعر پر توڑی ہے ؎ ہرچہ بردند بہ پیدا بہ نہانم دادند لیکن جو کچھ مغرب تھا یورپ سے گیا اسے یہ باطن لوٹا یا، جو موتی کہ انگریز علانیے

ترکوں کے تاج سے توڑے انہیں علم و دانش کے ہار میں پرو یا۔ سیاسی پہلو سے یہ خیر مقدم ناخوشگوار سہی، لیکن قدیم مشرق کے مبلغ علم اور مطلق العنان حکومتوں کے پس منظر میں یہ حور کرن کوپرنکس، گلیلیو، نیوٹن، بنتھم اور مل کی یقیناً قابلِ قدر تھی، غالب کا تشکک خود اپنے ہی قدیم عقیدے کو معرض شک میں لانے کا ؎

لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللہ:-

جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

اسی فضا میں پروان چڑھا تھا۔ اور اسی فضا میں ان کے فلسفہ وحدت الوجود نے منفی اثرات کو ترک کر کے وہ مثبت پہلو اختیار کیا جو زندگی کو ایک عطیۂ الٰہی تصور کرنے کا اور اس خیال سے درگزرنے کا تھا کہ یہ زندگی گناہ ہے۔ وہ تمام تر نقد کے قائل تھے، نسیہ کے قائل ہی نہ تھے، کاش حالی کی سمجھ میں یہ بات آتی تو وہ انہیں حیوان ظریف نہیں بلکہ اردو ادب کا والٹیئر تصور کرتے۔ لیکن وہ تو ساری عمر یہی کہتے رہے۔ "ہرچند کہ مرزا نے شاعری کی نسبت سے شراب کی مدح کی ہے۔ لیکن وہ اسے اعتقاداً برا سمجھتے تھے"۔ نہیں معلوم حالی کا خیال غالب کے عشق کے بارے میں کیا تھا! چھوڑیے اس جملۂ معترضہ کو ؎

با من میاویز اے پدر فرزند آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد

لیکن یہ واقعہ، مژدۂ صبح کے پانے۔ شمع کے بجھانے اور آفتاب کے طلوع کرنے کا اس رات کا ہے جو بڑی مہیب اور تاریک تھی۔ اور غالب اپنے اس روحانی سفر میں تنہا اور اداس تھا کبھی کبھی ناامیدیوں کے طوفان نے اس پر ایسا ہجوم کیا ہے کہ اس کے دل کی ساری شمعیں بجھ گئی ہیں، اور اس نے ایک زہر گداز احساس شکست سے دوچار ہو کر رلہ فنا کی آرزو بھی کی ہے۔ ایسے لمحات شکست خوردگی، لمحات غم، غالب کی شاعری میں کچھ کم نہیں ہیں لیکن وہ لمحات بڑے حسین ہیں کہ وہ کشتۂ آرزوئے زیست ہیں ؎

نہ دانی کہ مینا شکستن بہ سنگ   نہ بخشد بہ دل ذوقِ گلبانگ چنگ

یہ غالب جو آتش گبر کا پجاری (ز آتش نشانِ خدائی دہند شمع یونانیاں کا عاشق اور خورشید باختر کا دلدادہ تھا۔ وہ میخانۂ مہر و صفا، صلح و آشتی اور وحدتِ انسانیت کا مسلک گمار کیوں تھا؟

یارب بہ جہانیاں دلِ خرم دہ   در دعوئے جنت آشتی باہم دہ
شداد پسر نداشت باغش از تست   آں مسکنِ آدم بہ بنیٔ آدم دہ

غالبؔ اور سرسیدؒ

سید قدرت نقوی

ابوالاثر حفیظ نے خوب کہا ہے کہ،

تنزل کی حد دیکھنا چاہتا ہوں
کہ شاید یہیں ہو ترقی کا زینہ

اور یہ بالکل بجا ہے۔ ہمارے اپنے ملّی انحطاط اور تاریخ ہی کو دیکھ لیجئے۔ انیسویں صدی عیسوی سے زیادہ سیاسی تنزل و درماندگی کا زمانہ اور کیا ہوگا جب کہ فلاکت سماں اپنا اثر دکھلا رہی تھا۔ اور نحوست واقعی پس و پیش منڈلا رہی تھی۔ مگر یہی انحطاط، یہی زبونی احوال تھی جس نے قوم کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کیا۔ بقول حالیؔ،

کھولی ہیں تم نے آنکھیں اے ساد تو ہماری
احسان یہ نہ ہرگز بھولیں گے ہم تمہارا

انسانی شعور جاگ اٹھا اور اس نے حالات و واقعات سے نپٹنے کی قوت کو ابھارا۔ اور طبیعتوں کے رجحان کو بدل دیا۔ طبائع خود بخود اس طرف مائل ہوئیں کہ اگر ایک اقتدار کی زمام چھن رہی ہے تو کوئی بات نہیں، اس کا بدل، ایک دوسرا اقتدار تو موجود ہے، اس کو حاصل کرنے کے لئے جد وجہد کی جائے۔ خیالی باتوں کو چھوڑ کر حقیقت کے ساتھ پیمان وفا باندھا جائے۔

اس آخری دور کی حقیقت پسند، جلیل القدر ہستیوں میں غالبؔ بطور خاص نمایاں ہے، انہیں محض شاعر، صوفی، فلسفی سمجھنا غلطی ہوگی۔ کیونکہ انہیں زندگی ـــــ عارفانہ و ماورائی نہیں بلکہ ارضی و مادّی زندگی۔ کے ساتھ گہرا مس تھا۔

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

وہ طبعاً زندگی کے ہنگاموں سے مانوس تھے اور ابنائے جنس کے علاوہ حالات و واقعات سے شدید لگاؤ رکھتے تھے۔ ان کا ہر بُنِ مو محرمیٔ حسن ہی نہیں محرمیٔ حیات کو بھی ترستا تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ بھی اپنے بزرگوں کی طرح تیغ و تفنگ زیب تن کرتے اور میدان جنگ میں داد شجاعت دیتے یا نہیں۔ بظاہر امکانات اس کے خلاف ہیں۔ فکر و عمل میں ہمیشہ منافات رہی ہے۔ اور فکر عموماً عملی حس کو ماؤف کر دیتا ہے۔ اور پھر غالبؔ جیسے سراپا خیال شاعر کا جید، پر زور فکر۔ گمان غالب یہی ہے کہ غالبؔ کے شعری و فکری میلان ہی نے ان سے سپہبدی کا دامن چھڑا دیا اور انہیں "نذم چنگ بہ شعر" کا ترانہ سنج بنا دیا۔ اور یہ سپہگری ہی نہیں بلکہ شاعری بھی تھی جو ان کے لئے سرمایۂ عزت بنی، مگر وہ طبعاً "جماعۂ اتراک" ہی کے ذوق حیات سے سرشار رہے اور ان کی روح تمام تر عملی روح تھی۔

بیکاریٔ ماگداز ش ماست
زخمے بہ تراوشش اندر آور
پر افشاں ہو گئے شعلے ہزاروں
رہے ہم داغ اپنی کاہلی سے!

یہی وجہ ہے کہ غالبؔ ہمیں ہر کہیں اپنی طرز و روش، اپنے لب و لہجہ سے ایک زمانہ شناس اور دور بیں مدبر کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ اور شیخ محمد اکرام جیسے بالغ نظر نے ان کو "مرد دانا" کہہ کر بڑی پتے کی بات کہی ہے۔ ان کا عملی رجحان، ان کا معاصرین، مقامی و اہل فرنگ، سے سروکار، میل جول، ان کے خطوط کی واقعات اور ناولوں سے ملتی جلتی وضع، غم روزگار کی طرف اعتنا اور ذاتی و اجتماعی تجربات کا ہجوم ـــــ یہ سب ایک نہایت واقعیت پسند روح کی خبر دیتے ہیں۔ جیسے وہ سرسیدؒ، قائد اعظمؒ اور فیلڈ مارشل ایوب خان کا ابتدائی روپ ہوں۔ وہی اصلیت پسندی، وہی ولولہ و جوش، مگر غالبؔ کی حد تک میدان عمل ندارد! ڈاکٹر سید عبداللہ نے کہا ہے۔ اور غالبؔ خود بھی تو یہی کہتے ہیں۔

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں!

ایسی شخصیت، ممکن ہے خود تو کچھ نہ کر سکے لیکن ان کی

سرگرمیٔ عمل کے لئے کوئی جولاں گاہ ہی نہیں۔ مگر وہ اپنا ذوق و شوق اپنی صاحب نظری، اپنا فیضان دوسروں کو تو پہنچا سکتا ہے۔ اور انہیں ہنگامہ زارِ عالم میں صبا رفتار کر سکتا ہے۔

سرسیدؒ کو غالب کے ساتھ خاندانی و ذاتی روابط کے باعث بے انتہا قرب تھا۔ جس پر ان کی طبعی ہم وضعی و ہم آہنگی مستزاد تھی۔ سرسیدؒ لکھتے ہیں:

> "راقم آثم کو جو اعتقاد ان کی خدمت میں ہے اس کا بیان نہ قدرت تقریر میں ہے اور نہ احاطۂ تحریر میں آسکتا ہے۔ اور چونکہ "دلہا را بہ دلہا راہ باشد" ان حضرت کو بھی وہ شفقت راقم کے حال پر ہے کہ شاید اپنے بزرگوں کی نظر سے کوئی مرتبہ اس کا مشاہدہ کیا ہوگا۔"

سرسید احمد خاں غالب کو "چچا" کہا کرتے تھے۔ اور یہ اتنا مقبول ہوا کہ آج بھی غالب کو اسی رشتہ سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ علی گڑھ والوں کا ایک قدیم دستور ہے کہ سرسیدؒ کے منہ سے نکلی ہوئی بات کو ہندوستان گیر بنا دیا۔ سرسید کا قرب جسمانی و روحانی جس قدر بڑھتا گیا، غالب کی روح ان کے دل و دماغ میں سماتی گئی۔ تقلیداً نہیں، جو شخصیت کے ذیلی اور ادنیٰ ہونے کی علامت ہے، بلکہ اس قدرتی انداز سے جو دل سے دل کو راہ ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔ اور ایک عظیم شخصیت کسی دوسری عہد آفریں شخصیت سے اثر قبول کرتی ہے۔

سرسید احمد خاں کے خاندان سے مراسم کا ذکر سب سے پہلے ایک خط بنام میجر جان جاکوب میں ملتا ہے۔ جنہوں نے غالب سے ان کا دیوان طلب کیا تھا۔ غالب نے اس کو جواب میں لکھ دیا کہ کاتب مل جائے تو نقل کرا کے بھیج دوں گا۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد سید محمد خاں نے اردو دیوان چھاپنا شروع کر دیا۔ دیوان اور اخبار کے لئے غالب سے خریداروں کے سلسلہ میں مدد چاہی۔ غالب نے منجملہ اور ناموں کے میجر جان جاکوب کا نام بھی تحریر کر دیا۔ اخبار پہنچا تو اس نے خط کے ذریعہ اخبار اور مطبع کے متعلق پوچھا۔ مرزا جواب میں لکھتے ہیں:

> "چہ شگرف دلکشا آتش راست، آنکہ در بارۂ سید الاخبار حادثہ نگارش داده انہ صفتے دیگر رخ نہاده اند۔ نہال جہاندار کہ نقش مطبع سید الاخبار را شگفتہ طبع یکی از دوستان مستحق است۔ ہانا از ... بدیع انگیزد۔ فرد ریختہ ہائے غالب بے نوا را بقالب الطباع فرو ریزد۔ از انجملہ دیوان ریختہ کہ در ناتمامی تمام است، عجب نیست کہ ہم دریں ماہ بتمامی و آنگاہ بنظر سامی رسد۔ ہم چنیں پنج آہنگ و دیوان فارسی کہ طراز ش ہر یکے وابستہ بفراہم آمدن درخواستہائے خریداران است بہنگام خود بیم بخدمت خواہد رسید و اوراق اخبار خود در ہر ہفتہ میرسد۔ و ایں رشتہ را بیم گسستن نیست۔ کارپردازان مطبع نام نامی را آرائش عنوان فہرست خریداران ساختند و مرا از نظر یافتگان والا نظر شناختند۔"

اسی طرح، غالب نے ممکن ہے اپنے دیگر احباب کو بھی خط لکھے ہوں، لیکن ایسا کوئی خط موجود نہیں۔ دیوان اردو اسی مطبع سے اکتوبر ۱۸۴۱ء میں شائع ہوا۔ یہ غالب نوازی کا سلسلہ، سرسید احمد خاں سے آج تک وابستہ ہے۔ چنانچہ علی گڑھ والوں نے جو کام غالب کے سلسلہ میں کیا اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ برلن سے دیوانِ غالب کا ایک اڈیشن اسی ادارہ کے ایک فرد نے شائع کرایا۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر ذاکر حسین، سید بشیر حسین زیدی[1] وغیرہ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں اور موجودہ دور میں علی گڑھ میگزین کا غالب نمبر، اس کے بعد اسی سلسلہ کی دوسری کتابیں اس محنت کے نتائج ہیں، جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ ایک بھتیجے کے خلوص کا نتیجہ ہے۔

سرسید احمد خاں نے ۱۲ ستمبر ۱۸۴۶ء کو آثار الصنادید مکمل کی، اور غالب سے تقریظ لکھوائی۔ غالب کو اگرچہ ابتدائے عمر سے تذکروں میں جگہ ملنے لگی تھی۔ لیکن سرسید احمد خاں نے "آثار الصنادید" میں جس تفصیل کے ساتھ غالب کے حالات لکھے، وہ اور کسی نے اس وقت تک نہیں لکھے تھے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ غالب کی کل تصانیف سرسید کے پیش نظر ہیں۔ فارسی و اردو دیوان کے علاوہ جو کتابیں غیر مطبوعہ تھیں ان تک دوسروں کو رسائی نہ تھی۔ نیز

---

[1] آپ جب ریاست رام پور میں وزیر اعظم تھے تو مکاتیب غالب کی اشاعت آپ ہی کی تحریک سے عمل میں آئی۔ غالب کی قیام گاہ و رام پور کو ایک یادگار مقام بنانے کا کام بھی آپ ہی نے انجام دیا۔

غالب سے خاندانی تعلقات کی بدولت جو حالات سرسید کو معلوم ہوسکتے تھے دوسروں کا اُن سے واقف ہونا ممکن نہ تھا چنانچہ مثنوی "ابر گہربار" کا ذکر سب سے پہلے انہوں نے ہی کیا ہے۔ حالانکہ یہ مثنوی دیوان مطبوعہ ۱۸۴۵ء میں شامل بھی نہیں کی گئی تھی۔ مثنوی کے متعلق سرسید احمد خاں نے لکھا ہے :

> " اور ایک مثنوی اوپر غزوات رسالت دستگاہی
> ختمی پناہی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اگرچہ ہنوز ناتمام ہے لیکن
> پھر بھی قریب پندرہ سو اجند کے ہو چکی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ
> جس وقت اتمام کو پہنچے گی، گلدستۂ بزم احباب ہوگی "

غالب "آثار الصنادید" کے بڑے مداح تھے، چنانچہ انہوں نے اس کی تعریف نہ صرف تقریظ میں کی بلکہ اپنے احباب کو تحفۃً بھی ارسال کی۔ ان کے ایک خط بنام مولوی سید رجب علی خاں ارسطو جاہ میر منشی گورنمنٹ پنجاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ "آثار الصنادید" غالب کو پسند تھی اور خود خرید کر ارسطو جاہ کو بطور ارمغان بھیجی تھی۔ یہ خط "پنج آہنگ" میں شریک نہیں۔ ارسطو جاہ کے پوتے سید آغا حسین کے پاس آج تک یہ خط موجود ہے۔ اس کا ترجمہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ القاب کے بعد لکھتے ہیں :

> " اس سے پہلے ایک عرضداشت جو آپ کے خط کے
> جواب میں بھی ڈاک کے ذریعہ بھیجی، غالباً آپ کی نظر سے گزری
> ہوگی۔ آج کل دوستوں میں سے ایک دوست نے ایک کتاب
> دہلی کی نئی اور پرانی عمارتوں کے نقشوں کے ساتھ لکھی۔ گویا
> ایک چمن سجایا ہے۔ علاوہ ازیں چوتھے باب میں جو کتاب
> کا آخری حصہ ہے، اس شہر کے شاعروں کے اشعار رقم
> کئے ہیں۔ کیونکہ یہ نسخہ جامعیت کے سبب سے مجھے پسند
> آیا۔ ایک نسخہ چھپا ہوا جو تین جلدوں پر مشتمل ہے میں نے
> خرید کر بطور ارمغان بھیج رہا ہوں۔ اور اس حقیر نذرانہ کے
> قبول ہونے کی امید رکھتا ہوں۔ اس کے پہنچنے کی رسید
> اور سابقہ خط کے جواب کا امیدوار ہوں۔ والسلام
> اسد اللہ۔ یکشنبہ ۱۸ دسمبر ۱۸۴۷ء

اس خط میں غالب نے اپنے تذکرہ کی طرف نہایت ہی عمدہ پیرایہ میں ارسطو جاہ کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ سرسید احمد خاں نے اس تذکرہ میں حالات کے علاوہ نظم و نثر کا انتخاب بھی شامل کیا تھا۔ جس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ غالب کے کس قسم کے کلام کو اس زمانہ میں پسند کیا جاتا تھا۔

سرسید احمد خاں نے جب نہایت محنت و جانفشانی سے "آئین اکبری" مصنفہ ابو الفضل کی تصحیح کر کے اس کو چھپوانا چاہا تو دہلی کی قابل ترین ہستیوں سے تقاریظ لکھوائیں۔ غالب نے بھی تقریظ لکھی لیکن غالب کے نزدیک چونکہ یہ کام اہم نہ تھا۔ اس لئے تقریظ میں اپنے دل کی بات کہے بغیر نہ رہ سکے۔ بظاہر تعریف کی جگہ تنقیص نظر آنے لگی۔ سرسید نے تقریظ واپس کردی۔ اس تقریظ کو بعض حضرات نے رنجش باہمی کا سبب قرار دیا ہے۔ ہوسکتا ہے سرسید کو کچھ ناگوار گزرا ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالب نے سرسید احمد خاں کو ایسا صحیح مشورہ دیا تھا کہ سرسید کچھ عرصہ بعد اسی پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہوگئے۔ غالب کی تقریظ کا خلاصہ یہ ہے :

> " سرسید احمد خاں کا یہ کام فضول اور بیکار ہے۔ اس
> کی ہمت بلند کے لائق نہیں۔ میں ریاکار نہیں ہوں، وفادار ہوں۔
> ایسے کام کی تعریف کرنا میرے نزدیک درست نہیں۔ اگر آئین
> کے متعلق بات کی جائے تو انگریزوں کی طرف دیکھو کہ انھوں
> نے کیسے آئین مرتب کئے ہیں۔ ان کی ایجادات کی طرف توجہ دو کہ
> کیسی کیسی چیزیں ایجاد کی ہیں۔ ان کے آئین کے سامنے پہلے
> زمانہ کے آئین تقویم پارینہ ہے اور اگر طرز تحریر کے متعلق کہا
> جائے تو یہ بھی کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ ایک سے ایک بڑھ
> کر عمدہ تحریر موجود ہے۔ خدا کو بخیل مت خیال کرو۔ مردہ پرستی
> کوئی اچھا کام نہیں ہے "

مولانا حالی اور ابو الکلام آزاد کے نزدیک یہ تقریظ رنجش باہمی کا سبب بنی۔ ان حضرات کے بیانات کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ سرسید احمد نے اس کا اثر ضرور لیا تھا۔ یہ شکر رنجی اس وقت دور ہوئی جب مرزا ۱۸۶۶ء میں رامپور سے واپس آرہے تھے۔ مولانا حالی نے "حیات جاوید" میں یہ دلچسپ واقعہ لکھا ہے :

> " سرسید کہتے تھے کہ جب میں مراد آباد میں تھا اس
> وقت مرزا صاحب نواب یوسف علی خاں مرحوم سے ملنے
> رامپور گئے تھے۔ ان کے جانے کی تو مجھے خبر نہیں ہوئی مگر

جب دلی واپس جاتے تھے تو میں نے سنا کہ وہ مراد آباد میں سرائے میں آ کر ٹھہرے ہیں۔ میں فوراً سرائے میں پہنچا اور مرزا صاحب کو مع اسباب اور تمام ہمراہیوں کے اپنے مکان پر لے آیا۔ بظاہر جب سے سر سید نے تقریظ چھاپنے سے انکار کیا تھا، گو مرزا سے اور مرزا ان سے نہیں ملے تھے۔ دونوں کو حجاب دامنگیر ہو گیا تھا۔ اور اس لئے مرزا صاحب نے مراد آباد آنے کی ان کو اطلاع نہیں دی تھی۔ الغرض جب مرزا سر سید کے مکان پر پہنچے اور پالکی سے اترے تو ایک بوتل ان کے ہاتھ میں تھی۔ انہوں نے اس کو مکان میں لا کر ایسے موقع پر رکھ دیا جہاں ہر ایک آتے جاتے کی نگاہ پڑتی تھی۔ سر سید نے اس کو وہاں سے اٹھا کر اسباب کی کوٹھری میں رکھ دیا۔ مرزا نے جب بوتل کو وہاں نہ پایا تو بہت گھبرائے۔ سر سید نے کہا آپ خاطر جمع رکھئے، میں نے اس کو بہت احتیاط سے رکھ دیا ہے، مرزا نے کہا۔ "بھئی مجھے دکھا دو تم نے کہاں رکھی ہے۔ انھوں نے کوٹھری میں لے جا کر بوتل دکھا دی۔ آپ نے اپنے ہاتھ سے بوتل اٹھا کر دیکھی اور مسکرا کر کہنے لگے۔" بھئی اس میں تو کچھ خیانت ہوئی ہے۔ سچ بتاؤ! کس نے پی ہے؟ شاید اسی لئے تم نے کوٹھری میں لا کر رکھی تھی۔ حافظ نے سچ کہا ہے

واعظاں کایں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند

سر سید ہنس کے چپ ہو رہے اور اس طرح وہ رکاوٹ جو کئی برس سے چلی آتی تھی دور ہو گئی۔"

مولانا ابوالکلام آزاد بھی "الہلال" میں مراد آباد کے قیام کا مختصراً اسی نوعیت سے ذکر کیا ہے:

"سر سید اور غالب کے درمیان آئین اکبری کی تقریظ کے وقت سے ایک گونہ کشیدگی پیدا ہو چکی تھی اور میل جول کے رسم ختم ہو گئے تھے۔ وہ پہلی مرتبہ رامپور گئے تو سر سید اس زمانہ میں مراد آباد کے صدر الصدور تھے۔ اگرچہ ذہاب و ایاب میں مراد آباد سے گزرے لیکن سر سید کو اطلاع نہ دی۔ واپس ہوتے ہوئے وہ سرائے میں ٹھہرے تو سر سید کو کہیں سے خبر مل گئی۔ وہ خود سرائے میں پہنچے۔ بہ اصرار غالب کو مکان پر لے گئے اور ایک دو روز ٹھہرایا۔ اس کے بعد کشیدگی دفع ہو گئی۔"

رامپور سے واپسی پر مراد آباد کے قیام کی وجہ سے بعض حضرات کا خیال ہے کہ سر سید نے غالب کی صفائی حکومت برطانیہ سے کرانے میں کوشش کی۔ مولانا آزاد کا کہنا ہے:

"جن لوگوں نے مرزا مرحوم کی صفائی کے لئے خاص طور پر کوشش کی تھی، مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ان میں سر سید مرحوم بھی تھے۔"

اگرچہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ذریعہ کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن سر سید اور غالب کے دیرینہ تعلقات کے پیش نظر یہ بات بعید بھی نہیں کہ جہاں غالب کے اور مخلصین اس سلسلہ میں کوشاں تھے ان کی پریشانی دیکھ کر سر سید نے بھی یقیناً کوشش کی ہوگی۔ اگرچہ غالب نے خود اس کا ذکر کہیں نہیں کیا۔ وہ اس کو خدا ساز بات کہتے ہیں۔ نواب رامپور کے دخل کو بھی نہیں مانتے، یوسف مرزا کو لکھا:

"خواجہ جان جھوٹ بولتا ہے۔ والئ رامپور کو اس پنسن کے اجرا میں کچھ دخل نہیں، یہ کام خدا ساز ہے۔ بعلی ابن ابی طالب علیہ السلام۔"

شاید یہ کہنا مبالغہ تصور کیا جائے گا کہ اگر غالب نہ ہوتا تو سر سید سب کچھ بن جاتے، مگر سر سید نہ بن سکتے۔ اگرچہ ہر عظیم انسان میں جوہر خداداد ہی ہوتے ہیں اور وہ انہی کی بدولت شہرت و ناموری حاصل کرتا ہے۔ پھر بھی بعض خدا ساز اتفاقات ایسے ہوتے ہیں جو اس کے جوہروں کو ابھرنے اور جلا پانے میں مدد دیتے ہیں۔ اگر وہ خدا ساز اتفاقات نہ ہوتے تو ممکن ہے یہ جوہر خوابیدہ ہی رہتے یا اتنی جلد اور اتنی شدت سے ترقی پذیر نہ ہوتے اور نہ ان کی وہ کیفیت ہوتی جو اس حسن اتفاق سے پیدا ہو گئی۔ سر سید پر غالب کا اثر کچھ اسی نوعیت کا ہے۔ کچھ تو وہ خود ہی مرد باعمل تھے۔ اور اصلیت و اقعیت کی طرف طبعاً مائل۔ اور کچھ غالب کی اصلیت پسندی سونے پر سہاگہ ثابت ہوئی۔ جس نے ان کا کتابی اور روایتی باتوں سے رُخ موڑ دیا اور پوری شدت سے حقائق زندگی کی طرف اعتنا کرنے اور ان سے نبٹنے کی تحریک دلائی۔ اس ضمن میں "آئین اکبری" کی تقریظ خاص اہمیت رکھتی ہے۔ صرف سر سید ہی کے سلسلہ میں نہیں بلکہ اس تمام دور کے سلسلہ میں۔ کیونکہ اس سے قرون وسطیٰ کے بجائے دورِ جدید کی طرف رُخ بدلنے کا عمل بیّن طور پر دکھائی دیتا ہے جس کی روح عقل، عمل اور تجسس ہے۔

سر سید جن وجوہ سے اپنے بلند مقام پر پہنچے۔ ان میں سے ایک اصلاح جدید اور دوسرا سادہ و سلیس طرز نگارش ہے۔ ان دونوں باتوں کا سرچشمہ غالب کی ذات ہے۔ اصلاح جدید کے سلسلہ میں حسب ذیل حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

"آئین اکبری" کی تقریظ کے سلسلہ میں مجملاً بیان کیا جا چکا ہے کہ غالب نے سر سید کے اس کام کی تعریف نہ کی اور ان کو ایک نیا راستہ دکھانے کی کوشش کی۔ غالب کلکتہ میں دو سال سے زائد عرصہ رہ کر انگریزوں کی ایجادات وغیرہ کا مطالعہ و مشاہدہ کر چکے تھے۔ چنانچہ تقریظ میں غالب نے یہی مشورہ دیا تھا کہ مردہ پرستی چھوڑ کر آئین و ایجادات نو کی طرف توجہ مبذول کرو۔ ایجادات میں سے دیا سلائی، دخانی کشتی، موٹر، ریل، ٹیلیگرام، ٹیلیفون، گراموفون اور گیس کی روشنی کے متعلق ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد آئین و شیوہ و انداز کی طرف اشارہ کرنے کے بعد مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

هست اے فرزانۂ بیدار مغز
درکتاب ایں گونہ آئیں ہائے نغز
چوں چنیں گنج گہر بیند کسے
خوشہ زاں خرمن چرا چیند کسے

اور ابوالفضل کے طرز تحریر پر نکتہ چینی کرنے کے بعد طنز کا ایک تیز نشتر لگاتے ہیں ؎

مردہ پروردن مبارک کار نیست
خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست

غالب کی اس تحریر اور مشورہ کا ناگوار اثر سر سید کی طبیعت پر اس وجہ سے ہوا کہ غالب نے یہ بات اپنی روشن طبعی اور بالغ نظری کی وجہ سے بہت پہلے محسوس کر کے لکھ دی تھی۔ ہم سر سید کے اصلاحی پروگرام کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ غالب نے جو بات اپنی مثنوی میں مبہم طور پر بیان کی تھی وہی سر سید کے ہاں ایک اصلاحی پروگرام بن گئی ہے۔ غالب نے اشارہ کیا تھا۔ انہوں نے عملاً اس کی تفصیل پیش کی ہے۔

غالب کے اس قسم کے افکار اس زمانہ کی روش کے خلاف تھے۔ کیونکہ اس زمانہ میں اکثر لوگ قدیم تہذیب کے دلدادہ تھے کورانہ تقلید لازمۂ تہذیب تھی۔ لیکن غالب کی نگاہ دور بیں اس دور اور اس تہذیب کو ختم ہوتے دیکھ رہی تھی۔ ایک نئے دور کی آمد کا اس کو شدید احساس تھا۔

چنانچہ جنوں بریلوی نے جب کسی مشاعرہ کی طرح طلب کی تو قطعہ کے مشاعرہ کے سلسلہ میں یہ بات صاف لکھ دی۔ "یہ صحبت خود چند بعضے ہے اس کو دوام کہاں؟ کیا معلوم اب کے نہ ہو۔ اب کے ہو تو آئندہ نہ ہو۔" غالب نے اپنے خیالات کی بدولت قدامت پرستی کے خلاف ایک جہاد کیا اور ترقی کے نئے راستے دکھائے، ہمارے خیالات کو بدلا، نیا انداز فکر عطا کیا غالب کی طبیعت ترقی کی طرف مائل تھی اور وہ ترقی کو بہر طور پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ سر سید کو بھی اسی ترقی کا راستہ دکھانا مقصود تھا۔

سادہ زبان و سادہ اسلوب کے سلسلہ میں بھی سر سید پر غالب کی بڑی چھاپ ہے۔ سر سید احمد خاں کو سادہ نثر نویسی کا امام خیال کیا جاتا ہے۔ اس میں بھی غالب کا فیضان صاف جھلکتا ہے۔ سر سید نے غالباً ۱۸۳۷ء سے لکھنا شروع کیا تھا۔ لیکن ۱۸۵۴ء سے کچھ عرصہ پہلے تک ان کی تحریر کا ڈھنگ وہی پرانا تھا جس میں عبارت کی رنگینی، الفاظ کی شوکت، تشبیہ و استعارہ کی کثرت ہوتی تھی اور حرف معاصر کے برابر۔ چنانچہ ان کی اور ان کے ہمعصروں کی تحریریں اس کی آئینہ دار ہیں۔ مثلاً غالب ہی کے ذکر میں "آثار الصنادید" کے یہ چند جملے،

" بہ سبب انس طبیعت اور میل خاطر کے شاہجہاں آباد میں تشریف لائے اور اس معاش پر قناعت کر کے گوشہ نشینی اختیار کی۔ اور بہترین شغل آپ کا اس عالم تنہائی میں سخن سنجی اور معنی پروری ہے۔ حق یہ ہے کہ جان سخن پر منت اور سر معنی پر احسان رکھتے ہیں۔ ہر دائرۂ الفاظ، دہن شکر اور ہر حرف زبان سپاس ہے ان کی نعمت تربیت کا۔"

یہ عبارت تو بہت صاف ہے۔ ان کے معاصرین کی عبارتیں دیکھی جائیں تو بہت ہی گنجلک ہیں۔ جب "آثار الصنادید" دوسری مرتبہ ۱۸۵۴ء میں چھپی تو سر سید نے اس کا اسلوب نگارش بدل ڈالا۔ سادہ و سلیس نثر میں کتاب کو دوبارہ لکھا۔ غالب کے خطوط ۱۸۴۸ء تک کے دستیاب ہو چکے ہیں اور خیال ہے کہ وہ اس سے قبل بھی اردو میں خط لکھتے رہے ہونگے۔ سر سید کا ان کے طرز سے متاثر ہونا بعید از قیاس نہیں بلکہ یقینی ہے۔ چنانچہ مشاہیر اہل قلم اور مورخین، صغیر بلگرامی، مولانا شبلی، رام بابو سکسینہ وغیرہ کا یہی خیال ہے کہ سر سید کی سادہ نثر نویسی غالب کا اثر قبول کرنے کی وجہ سے ہے۔ مولانا شبلی چونکہ سر سید کے ساتھی تھے، ان کا بیان سب سے وقیع ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

'' غالب نام آورم ''

'' کرمئی نشاط تصور سے نغمہ سنج''
سر سید رح

علی ' غمگین ، ملقب بہ 'خدانما'
ش قسمت افراد میں سے ایک جن کے ساتھ
ب نام آور کی رسم مراسلت رہی)

دو شخصیتیں جنھوں نے تاریخ ملت میں ا
منفرد کردار ادا کیا ۔

'' گلشن نا آفریدہ '' جو کبھی صرف نشاط ت
تک محدود تھا آج ایک حقیقت ہے

آدم جی ادبی انعامات ، ۱۹۶۰ (رائٹرز گلڈ) : عبدالستار (بنگلا)، غلام عباس (اردو)، شوکت صدیقی (ا

ملت کے افق کے لئے سامان تب و تاب

روشن یزدانی (بنگلا)

بیگم زینت رشید احمد (پرنسپل ویمنز کالج کراچی) : تمغ

"آثار الصنادید" جس زمانے میں نکلی اس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد تقریباً ۱۸۵۰ء میں دلی کے مشہور شاعر مرزا غالب نے اُردو کی طرف توجہ کی یعنی مکاتبات وغیرہ اردو میں لکھنے شروع کئے اور چونکہ وہ جس طرف متوجہ ہوتے تھے اپنا کوچہ الگ نکال کر لیتے تھے۔ اس لئے انہوں نے تمام ہم عصروں کے برخلاف مکاتبہ کو مکالمہ کر دیا۔ مکاتبات میں وہ بالکل اس طرح ادائے مطلب کرتے تھے جیسے دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ بہت سے خطوط میں انسانی جذبات مثلاً رنج و غم مسرت و خوشی، حیرت و بیکسی کو نہایت خوبی سے ادا کیا ہے۔ اکثر جگہ واقعات کو اس بے ساختگی سے ظاہر کیا ہے کہ واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا بیجا نہیں کہ اردو انشار پردازی کا آج جو انداز ہے اور جس کے مجدد اور امام سر سید مرحوم تھے اس کا سنگ بنیاد در اصل مرزا غالب نے رکھا تھا۔ سر سید کو مرزا سے جو تعلق تھا وہ ظاہر ہے۔ اس لئے کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ سر سید ضرور مرزا کی طرز سے مستفید ہوئے۔

رام بابو سکسینہ کا بیان ہے:

"سید صاحب اور غالب کے معاصرانہ تعلقات کو دیکھ کر ماننا پڑتا ہے کہ مرزا کی طرز خاص کا سید صاحب پر ایک خاص اثر پڑا اور جو سادگی اور بے تکلفی ان کی عبارت میں پائی جاتی ہے اس کا نقش اول غالب کے ہاتھوں صورت پذیر ہو چکا تھا:

صاحب "داستان تاریخ اُردو" (حامد حسن قادری) کا قول ہے:

"سر سید نے بعض مضامین "مکالمہ" کے طرز میں لکھے ہیں۔ اُردو میں یہ روش غالب کی ایجاد ہے۔ ان کے طرز مکالمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے غالب کا تتبع کیا ہے۔"

اختر جونا گڑھی کی بھی یہی رائے ہے:-

"۱۸۴۷ء میں جب "آثار الصنادید" ایسی معرکہ آرا کتاب لکھی جس کی بہت شہرت ہوئی۔ لیکن اس کے طرز تحریر میں کوئی خاص تبدیلی دکھائی نہیں دیتی۔ جب غالب کی سادہ نثر نے ان پر گہرا اثر ڈالا تو سید بھی اس رو میں بہہ نکلے چنانچہ ۱۸۵۴ء میں انہوں نے آثار الصنادید کا دوسرا ایڈیشن تیار کیا تو مقفّٰی [illegible]

نثر کے بجائے اس کی زبان بالکل سادہ و سلیس بن گئی۔"

سر سید نے غالب کے طرز نگارش کا اثر قبول کیا۔ مسجّع و مقفّٰی طرز تحریر کو ترک کر کے سادہ و سلیس زبان میں لکھنا شروع کیا اور اسی کو ترقی دے کر علمی اور اصلاحی مضامین لکھے۔ بلاشبہ ان کی کوششوں نے اردو زبان کو بہت جلد دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے بالمقابل لا کھڑا کیا۔ ان کے دور کے وہ ممتاز اہل قلم جنہیں اردو نثر کے عناصر خمسہ کہا جاتا ہے سب کے سب سر سید سے متاثر اور نئی پود تو کلیتہً ان کی متبع ہے۔

غالب کی عظمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انہوں نے زبان و ادب پر احسان کرنے کے علاوہ اپنے عہد کی چند ہستیوں کو ایسا متاثر کیا کہ وہ مستقبل کے لئے عظیم کارنامے سر انجام دینے کے لائق ہو گئیں۔ اس سلسلہ میں سر سید اور حالی ممتاز نظر آتے ہیں۔ سر سید نے اصلاح ملک و قوم اور زبان و بیان کی جو خدمات انجام دیں ان کو ہم فراموش نہیں کر سکتے۔ اگر غالب، سر سید کی توجہ دور جدید کے تقاضوں کی طرف منعطف نہ کراتے تو نہ معلوم ہمیں اس موجودہ منزل تک پہنچنا نصیب بھی ہوتا یا نہیں۔ اور اگر پہنچتے تو نا معلوم کتنے دشوار اور پُرپیچ راستوں سے گزرنا پڑتا اور کن سخت مراحل سے دوچار ہونا پڑتا کیونکہ دو قومی نظریہ کا نتیجہ پاکستان ہے اور دو قومی نظریہ کا مصدر و منبع سر سید کی ذات۔ اور اس کے بعد یہ سلسلہ براہ راست ہمارے موجودہ انقلاب اور اس کے سربراہوں تک پہنچتا ہے۔

شاعری میں مولانا حالی نے جو خدمات انجام دیں ان کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ غالب نے علم و ادب میں کورانہ تقلید سے گریز اور شاہراہ عام سے ہٹ کر چلنا اختیار کیا تھا اور کہا تھا ؎

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل — کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

مولانا حالی نے شاعری کے پرانے بُت توڑ کر اہل قلم کو نئے راستہ پر چلنے کی جرأت بخشی۔

موجودہ دور کی سیاسی اور قومی بیداری کی علمی اور ادبی ترقی، شعری اور فنی بلندی میں غالب براہ راست یا بالواسطہ اثر انداز رہا ہے۔ آج جب کہ ہم ترقی کی ایک منزل پر پہنچ کر کسی واضح اور متعین راہ کی جستجو میں سرگرداں ہیں۔ ہماری یہ منزل ارتقا، ایک مقصد ایک نصب العین کے سبب ہمیں حاصل ہوئی لیکن ہم اس منزل کو پا لینے کے بعد مقصد اور نصب العین کو کھو بیٹھے جس کے فقدان سے پیدا شدہ نتائج سب پر ظاہر ہیں۔ لہٰذا ہمارا ادب پھر کسی غالب کا خواہاں ہے ہمارا ملک، ہماری قوم، ہمارا معاشرہ، ہماری تعلیم پھر کسی سر سید کی طالب ہے۔ اور مقام مسرت ہے کہ ان عہد آفریں شخصیتوں کا یہ نظری و عملی فیضان ہمارے عہد میں بھی بیش از بیش تشکیل و تعمیر نو کا متقاضی ہوا ہے۔ اور اس کا سلسلہ بلاشبہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

نشانِ زندگیٔ دل ہے یہ دنستِ الست — جلائے آئینۂ چشم دید نستِ مشرب ٭

نقش ہائے رنگ رنگ ۔ ایک پہلو

(غالب کے چند نادر فارسی خطوط)

اکبر علی خاں

غالب کی کتنے ہی لوگوں سے مراسلت رہی ۔ وہ تھے ہی اردو میں مکتوب نگاری کے امام ۔ اور ان کی ساری زندگی شعر و سخن کے علاوہ اسی دشت کی سیاحی میں ہی گزری ۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جس معاصر کے نام بھی انہوں نے کوئی خط، رقعہ ۔ یا رسید تک لکھ دی، وہ زندۂ جاوید ہو گیا ۔ اگرچہ ان میں سے بعض اصحاب اس وصفِ اضافی نہیں بلکہ بہ زور ذات کی وجہ سے ممیز حیثیت کے مالک ہیں ۔ انہیں میں سے ایک میر سید علی غمگین المعروف "حضرت جی" ملقب بہ "خدا نما" تھے ۔ جن کے ساتھ غالب کے بہت گہرے مراسم رہے اور دونوں میں خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری رہا ۔

یہ خطوط کتابی شکل میں کتب خانۂ فیض کاشانۂ حضرت جی غمگین، گوالیار میں محفوظ ہیں ۔ یہ قلمی کتاب ۱۶ خطوط کا ایک نادر مجموعہ ہے ۔ اس میں دس خط غالب کے ہیں جو انہوں نے حضرت جی غمگین رح کو تحریر کیئے تھے اور دو لکھنؤ کے دوسرے احباب کے نام ہیں ۔ حضرت غمگین کے صرف ۴ جوابی خط ہیں ۔ یہ تمام ۱۶ خطوط فارسی میں ہیں ۔ تعداد صفحات ۹۴ اور تقطیع ۶/۹ ہے ۔

حافظ میاں ہدایت النبی قادری مرحوم نے انہیں اصل خطوط سے ۱۲۵۷ھ میں ایک مجموعے کی شکل میں نقل کیا تھا ۔ یہ بھی ایک صاحبِ ذوق بزرگ تھے اور ان کا ذاتی کتاب خانہ بہت قیمتی تھا ۔ جو ہنگامۂ ۵۷ء میں تباہ ہو گیا ۔ ممکن ہے اس ذخیرے میں غالب کے اصل خطوط بھی ضائع ہو گئے ہوں ۔

غالب شناسوں کے لئے حضرت غمگین کی شخصیت غیر معروف نہیں کیونکہ "پنج آہنگ" میں ان کے نام غالب کا ایک خط شامل ہے (دیکھئے کتاب مذکور طبع ۱۸۵۳ء ۔ صفحات ۳۶۴ ــ ۳۶۶) ۔ یہ خط اس مجموعۂ مکاتیب میں بھی شامل ہے ۔ اس مطبوعہ خط کی تاریخ تحریر بیجدہم ربیع الاول ۱۲۵۵ھ ہے ۔ لیکن "پنج آہنگ" میں تاریخ کا ذکر نہیں کیا گیا ۔

یہ مراسلت ۱۲۵۳ھ کے درمیانی وقفے کی ہے ۔ غالب کے صرف ۳ خطوط پر اندراجِ تاریخ ہے، باقی کسی پر نہیں ۔

غالب کے ساتھ روابط کی بنا پر غمگین میں قدرتی طور پر دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے اور ذوقِ شناسائی اپنی تسکین چاہتا ہے ۔ آیئے ہم اس بزرگ کو ذرا قریب سے دیکھنے کی کوشش کریں ۔

میر سید علی غمگین دہلی میں ۱۱۶۷ھ (۱۷۵۳ء) میں پیدا ہوئے ۔ ان کا خاندان دہلی کا ایک مشہور خاندان تھا جو اپنی خدا آگاہی اور درویشانہ طرزِ زندگی کے ساتھ حکومت میں بھی اثر و رسوخ رکھتا تھا اور وقت کی سیاست سے بھی وابستہ تھا ۔ غمگین آغازِ عمر میں عشقِ مجازی میں کھوئے رہے اور مومن کی طرح غمِ پردہ نشیں کی مستیوں سے دل بہلایا کئے لیکن فطری طور پر وہ اس کوچہ کی رہ نوردی کے لئے موزوں نہ تھے ۔ چنانچہ انکی زندگی نے پلٹا کھایا اور وہ جادۂ مجاز سے شاہراہِ حقیقت کی طرف نکل آئے ۔ یہی ان کے دہلی چھوڑنے کا سبب ہوا ۔ انہوں نے تلاشِ حق کی خاطر شاہ ابو العلا کے آستانے پر حاضری دی جو گوالیار کے قریب واقع ہے اور اس طرح ہمیشہ کے لئے گوالیار کے ہو گئے ۔ چنانچہ یہیں ۱۲۶۶ھ (۱۸۵۱ء) کو انتقال کیا ۔ گلستانِ بے خزاں، عمدۂ منتخبہ، عیار الشعراء، مجموعۂ نغز، گلشنِ بے خار، سخن شعراء اور آبِ حیات میں ان کا تذکرہ مل جاتا ہے ۔

اس میں شک نہیں کہ غمگین بلحاظ زمانہ اردو کے اہم شاعروں میں ہیں ۔ ان کا کلام ابھی منظرِ عام پر نہیں آیا لیکن جو کچھ بھی تذکروں وغیرہ میں ملتا ہے ۔ اس سے شاعر کے صالح ذہن کے نقوش اجاگر ہو جاتے ہیں ۔

تصوف اور عشقِ مجازی دونوں میدانوں میں انہوں نے نغمہ سرائی کی ہے ۔ ہنگامۂ شوق کے زیرِ اثر ان کے اشعار میں بیباکی بھی ہے مگر مذہب کا اثر عشقیہ لطافتوں کے بیباک اظہار پر قابو نہیں ہونے دیتا

اس لئے تاریخی اہمیت کے باوجود ادب کا طالب علم ان کے کلام میں شعری لذت سے دوچار نہیں ہوتا۔ یہاں حیات و ممات کی عقدہ کشائی کے ساتھ رندی و بیباکی کے عناصر بھی جلوہ گر ہیں لیکن طریق ادا میں کہیں بھی میر و سودا والی بات نہیں اور ان جیسے مزاج کے شعر گو سے یہ توقع کچھ زیادہ بھی ہے۔ پھر بھی غمگین کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

خود غمگین کے عہد میں ان کا جو مقام رہا ہوگا، اس سے واقفیت کے لئے ہمارے سب سے بڑے مددگار شیفتہ ہیں۔ انہوں نے اپنے تذکرہ میں غمگین کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ اور ان کے شاعرانہ مرتبے کے مداح نظر آتے ہیں۔ لیکن اس سب کے ہوتے ہوئے بھی غمگین کچھ زیادہ معروف نہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ مرکز شعر و ادب سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ دلی کو خیرباد کہہ کر گوالیار میں اقامت گزیں ہونا اُن کی ادبی شہرت میں مانع ضرور رہا ہوگا۔

نہیں کہا جا سکتا کہ غالب سے ان کے تعلقات کا آغاز کب ہوا۔ وہ عمر میں غالب سے بہت بڑے تھے اور نواب الٰہی بخش خاں معروف سے قدیم روابط رکھتے تھے جس کا اندازہ دیوان معروف سے بھی ہو جاتا ہے۔ اسلئے بعید نہیں کہ اسی راہ سے غالب کو ان کی خدمت میں خُردانہ نیازمندی حاصل ہوئی ہو۔

حضرتِ غمگین نے اپنے دیوانِ رباعیات موسوم بہ "مکاشفات الاسرار" (۱۲۵۵ھ) کے دیباچہ میں غالب کا ذکر جس انداز سے کیا ہے وہ غالب اور ان کے تعلقات پر خاصی روشنی ڈالتا ہے۔

دنیائے شعر و ادب میں غالب کی اہمیت کا احساس اس دور کے بزرگوں کو بھی تھا۔ اس کے ثبوت میں غمگین کے دیوانِ رباعیات سے مندرجۂ ذیل تحریر ملاحظہ فرمایئے۔

بعدازاں فقیر در بلدۂ گوالیار چند سال در صحبت شاہ ابوالبرکات صاحب و خواجہ ابوالحسین صاحب فایدہ ہا ربود۔ و از زمان سابق دیوان ریختہ گفتہ بودم، آں را دور کردم۔ والحال کہ عمر بہ ہشتاد و شش سالگی رسیدہ، آنچہ کہ واردات بر من غالب بودند، موافق آنہا دیوان دیگر (مخزن الاسرار ۱۲۴۴ھ) در حالات و واردات و ذوق و شوق عشق حقیقی و مجازی خود ترتیب دادم، و بعض غزلیات مخصوص دیوان سابق ہم دریں دیوان لاحق مندرج ساختم۔ و چوں دیوان نو بتمام سید و واردات و غلبات و کیفیات بر دلم استیلا داشت، خواستم کہ برائے برادر دینی عزیز از جان اسد اللہ خاں میرزا نوشہ متخلص بہ غالب و اسد کہ دریں زمانہ در نظم و نثر نظیر خود ندارد، و برائے برادرزادگان سید علی محمد عرف نواب شاہ جی و سید بدرالدین عرف فقیر صاحب و برائے فرزندان خود سید عبدالرزاق مشتہر بہ سید میرن علی و سید امیر حیدر و مریدان راسخ الاعتقاد و اعطاہم اللہ محبتہٖ، از ابتدائے سلوک حضرات قادریہ و نقشبندیہ تا انتہاد رپیرایہ رباعیات کہ بطور تصوف باشد، ترتیب دہم۔ بنا علیہ از مضامین ادنیٰ تا اعلیٰ و تمامی آنچہ کہ معلوم یا غیر معلوم مردم باشد در رباعیات حسن اندراج پذیرفت کہ ہم مبتدی و منتہی ازاں بہرۂ کافی و حظے وافی بردارند، و از مسائل و اصطلاحات و اشغال و اذکار و عقائد صوفیۂ صافیہ و معانی بعضی آیات کریمہ و احادیث شریفہ و اقوال اولیاء اللہ و مشاہدات و مراقبات کہ مبتدی را ازاں گریزے و منتہی را گزیرے نباشد، در ضمن رباعیات غیر ردیف وار مندرج گردید۔ و در رباعیات ردیف وار مقامات و حالات و غلبات عشق حقیقی و مجازی و تجلیات صوری و معنوی خود تعلیمات مریدان و پند و نصائح و ترغیبات کہ در قلب رباعی گنجائش بیاں داشت، بضبط انشاد در آمد۔ و باقی را قابلِ طرز حکایت مثنوی دانستہ اغماض ازاں نمودہ شد۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

حضرتِ غمگین نے مختلف اشعار میں بھی غالب کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

(۱) دو چار شعر لکھ کے رہے بیٹھ ہمدمو
جو قصد اسد کی طرح کرے انتخاب کا

(۲) بہت سی سیر دواوین ہم نے کی غمگین
مگر اسد کے نہیں انتخاب سے نسبت

(۳) غالب کے انتخاب کو جو دیکھے غور سے
دیواں سے اپنے کیا وہ کرے انتخاب پھر

(۴) اسد کا انتخاب اپنی تسلی کو کیا پیدا
جب آیا تنگ شعر شاعراں کی انتخابی سے

خود غالب کا رویہ غمگین کی طرف کیا تھا، یہ جاننے کے لئے غمگین کے نام اُن کے دو ایک خطوں کا طرز خطاب دیکھنا چاہئے۔ غالب نے ہر موقع پر اظہار نیازمندی سے کام لیا ہے۔ یہ عجز و انکسار جو غالب نے غمگین کے لئے برتا صرف اس حد تک نہیں تھا کہ وہ غمگین کو بلحاظ سن و سال قابلِ احترام جانتے تھے بلکہ انداز تخاطب سے ان کی علمی و ادبی عظمت

بزرگی کا اعتراف بھی غالب نے کیا ہے۔

یہ خطوط اپنے موضوع کے لحاظ سے متنوع نہیں۔ لیکن اس لئے بہت اہم ہیں کہ غالب کے مذہبی عقائد میں سیمابیت کا احساس دلا دیتے ہیں۔ بڑے حصے میں تصوف اور وحدت الوجود کے مسائل زیرِ بحث رہے ہیں۔ جن سے ایک طرف حضرت غمگین کی قابلِ احترام علمی شخصیت کا پتہ چلتا ہے تو دوسری طرف خود غالب کے طباع ذہن کی بھی جھلکیاں مل جاتی ہیں۔ انہوں نے ان خطوط میں جہاں خصوصیت سے خلافت اور کارِ قضا کو موضوعِ گفتگو بنایا ہے وہاں بڑی بہکی بہکی باتیں کی ہیں جن سے نہ کوئی شیعہ متفق ہو سکتا ہے نہ سُنّی۔

میں چاہتا تھا کہ غالب کے مذہب کے بارے میں تفصیل سے لکھتا اور غمگین کی بزرگ و برتر شخصیت پر بھی کھل کر بات چیت کرتا لیکن یہ اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک تمام خطوط مکمل شکل میں میرے سامنے نہ ہوں۔ اگر اس کا موقع مل سکا تو انشاء اللہ یہ گفتگو تفصیل سے کی جائے گی۔ اور چند خوشگوار نتائج تک پہنچ جانا ممکن ہو جائے گا۔

یہ اقتباسات اور تفصیلات مجھے جناب محترم و مکرم رضا محمد حضرت جی نے فراہم کی ہیں۔ حضرت غمگین کی شبیہہ مبارک بھی موصوف ہی کا عطیہ ہے۔ میں اس علمی و ادبی تعاون اور دستگیری میں فراخ حوصلگی کے لئے اُن کا بے حد ممنون ہوں۔

رضا محمد حضرت جی صاحب نے آئندہ بھی کرم فرمانے کا اقرار کیا ہے جو ان خطوط کی مکمل شکلوں کی صورت میں ہوگا۔ جب یہ مکمل خطوط دستیاب ہو جائیں گے تو غالب سے قریب تر آنے کے کچھ اور ممکنات پیدا ہو جائیں گے۔ فی الحال "غالب نام آورم" کے نقش ہائے رنگ رنگ کے اسی پہلو پر اکتفا کرتا ہوں جو اپنی تشنگی میں ایک گونہ سیرابی کی کیفیت لئے ہوئے ہے۔

(غالب کے نقش ہائے رنگ رنگ خواہ وہ اردو نظم و نثر کی شکل میں ہوں یا فارسی نظم و نثر کی شکل میں، یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ اسلئے ہم غالب اور غمگین کے چند فارسی خطوط، جو ادبی نوادر کی حیثیت رکھتے ہیں، ذیل میں پیش کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض کی اہمیت اسلئے بھی ہے کہ ان سے غالب کے امامت و خلافت کے بارے میں عقائد پر روشنی پڑتی ہے جن پر غمگین نے بہت عمدہ و مدلل بحث کی ہے۔ اور ساتھ ہی عین، غیر، اور باطل کا حقیقی مفہوم اور نازک فرق بھی ظاہر کیا ہے جس سے غالب کا حریف واقعی حریفِ غالب معلوم ہوتا ہے۔

اگرچہ فارسی اور وہ بھی غالب نکتہ داں کی فارسی ایسی جنس گراں مایہ ہے جس کی قدر دانی کا حق ادا کرنا مشکل ہے۔ پھر بھی ہم ان خطوط کو ان کی اہمیت کے پیشِ نظر تمام و کمال پیش کر رہے ہیں۔ (مدیر)

(۱) مکتوب غالب بنامِ غمگین

حضرت پیر و مرشد برحق مدظلہ العالی

بسا روزہا بہ شب آمد و شبہا بروز شد، تا صبح دولت من از افق اقبال دمید، و منشور لامع النور تعویذ بازوئے جاں گردید۔ نامہ موسومہ طالع یار خاں و حکیم قطب الدین خاں ہر دو بہ طالع یار خاں سپردہ شد، و فرمان جناب عالی رسانیدہ آمد۔ نامہ کہ بنام نامی فقیر صاحب بودہ بخدمت شاں رسید۔ اغلب کہ امروز یا فردا نزد من آیند، تا پیام حضرت بزبان نیز برگزارم می میرم از رشک کہ دیگراں آہنگ راہ گوالیار دارند، و مرا ہنگام آں قرار نیامدہ است کہ از دام بدر توانم جست۔ یارب زود باشد کہ کامِ دل بر آید و زمان انتظار حکم ولایت و روزگار ہجراں بسر آید۔ و ایں روزہا غزلے درمیانِ احباب طرح شدہ و در آں زمین دہ بیت گفتہ شدہ بود۔ بہ چشمداشت اصلاح دریں ورق نگارش می پزیرد۔ غزل فارسی:[1]

در وصل دل آزاری اغیار ندانم ۔۔۔ دانند کہ من دیدہ ز دیدار ندانم

زیادہ حد ادب ازاسد اللہ نگاشتہ ہژدہم رجب ۱۲۵۵ھ

"ہمیں روز و رود والا نامہ۔ سید حیدر علی صاحب و سید امانت علی صاحب سلام نیاز خوانند و مشتاق دانند۔ بندہ شاہ شمائیم و ثنا خوانِ شما۔ مکرمی جناب حکیم رضی الدین حسن خاں لوا لاخدمت حضرت صاحب مراسم تسلیم و آداب می رسانند فقط"

(۲) مکتوب غالب بنام غمگین

قبلۂ دیدہ و دل سلامت

من دانم و دل کہ فیض ورود والا نامہ با من چہ کرد۔ بہ آتش آب زد و چراغ آگہی برافروخت۔ ہمانا آں قدسی صحیفہ شرح نمود کہ روح بہ پرواز آں ارزد۔ چہ کنم فرصت تنگ است و گفتگو فراواں۔ آدینہ روز بیست

[1] کلیات غالب فارسی طبع سوم نولکشور لکھنؤ ۲۳ء صفحہ ۴۲۹ ملاحظہ ہو۔

بود، سخنے دیگر می گویم، تا حضرت را ذوق و مرا به اعتبار افزاید- بیشے از بیت ہائے فقیر داخل صحیفۂ منتخب است -

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

من خود فرماں پذیرفتم- لیکن فرمان خرد اندریں باب آنست کہ ہرگز رندہ بدیدن آں الفاظ بہ کنہ معنی نہ می تواند رسید- و ہر کہ معنی را نیک تواند فہمید، غیر نیست- چہ دریں عالم تفرقہ کعبہ و دیر نیست سخن ہائے دلآویز کہ گستاخانہ گزاردہ شد، خاطر نشاں و دل نشین باد-

زیادہ حد ادب

عریضہ نگار اسداللہ روسیاہ روز نگارش نامہ دہم ذی الحجہ ہنگام شام (۱۲۵۵ھ)

(۲) مکتوب غمگین بنام غالب

جواب از طرف جناب حضرت صاحب شاہ غمگین دہلوی

مشفقا! آنچہ اعتراض بر لفظ غیر کہ باطل است حق فرمودہ اند، بسیار شادماں شدم- اللہ تعالیٰ بایں جودت طبع و سخن رندانہ ملاقات جسمانی حاصل کناد- جوابش بشنوید "غیر" لفظی است بے معنی- چہ معنای او "عین" است نہ "غیر" پس دریں صورت معنی ندارد- اگر عین گوئی حق را یابی- و اگر غیر گوئی نیز حق را یابی- و اگر غیر چنانچہ در حق در باطل ہر جا کہ ظہور صفت "مضل" می باشد آں جا استعمال لفظ باطل می کنند و ہر جا کہ شانِ ظہور "ہادی" می باشد آں جا استعمال لفظ "حق" و ایں ہر دو صفت یک ذات اند ہماں طور لفظ "غیر" بہ مرتبۂ تقیید لفظ "عین" بمرتبۂ اطلاق خیال فرمایند و اگر انا و انت و ہو ہذا کہ ازیں دوئی بر می خیزد از عبارت دور کنند کہ معنی حاصل نہ شود و برائے فہمایش ہر چہ گوئی جائز است و از گفتن لفظ "غیر" غیر نہ می شود، و از گفتن "عین" عین نمی گردد- آنچہ ہست ہست بے نام و بے نشاں ہر جا نامے و نشانے دیگر دارد .....

...... اگر حال چناں است از طرف ما نیز اختیار دارید، والافلا مصرعہ ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مکانے دارد- مشفقا! ایں قوم برائے خدا با خدا ہمیشہ در جنگ اند ہر دم زنار می بندند و می شکنند تا بپایہ عالی کفر اسلام می رسند- خیال فرمائید کہ اکثر اسرار را پوشیدہ داشتہ اند و اگر رباعیات فقیر بدستے کسی تقلیدی افتد دکانے برپا سازند و خود را قرار دہند و خلق را گمراہ کنند و نہم بعضے سخنان تقلیدیان نیز ...

ہفتم شعبان و ہنگام بامداد است و من ہنوز از آنہا کہ مبتلائے آنم فراغ نہ یافتہ ام و آدم کمر بستہ روی بستہ رو بہ روی من نشستہ است- آنچہ در دیوان بعض عنوان دیدم کافر باشم اگر در مثنوی مولوی روم و دیگر کتب تصوف ایں ہا دیدہ باشم- خاصہ در رباعیات کہ ہر کوزہ دریای و ہر ذرہ آفتابے دارد و اگر حیات باقی است زیں سپس حال رباعیات نگاشتہ خواہد شد...... بہ خاطر باشد کہ ما نیز بریں جادہ دیدیں اندیشہ دل نہادہ ایم تا پایان کار از کدام پردہ سر بر زدن آوریم و در کدامیں گروہ شمردہ شویم- دیوان بہ مخدومی و مکرمی سید بدرالدین علی خاں المشتہر بہ فقیر صاحب سپردہ و دیوان سابق از ایشاں گرفتہ بہ آدم حضور رد دادہ شد- ایں نامہ بداں تعدی کہ اندیشہ برنہ تا بذنگاشتہ می شود- در حقیقت پاسخ عنایت نامہ ہنوز نہ نوشتہ ام- زیادہ حد ادب-

مشفقی میر حیدر علی صاحب پس از سلام مطالعہ فرمایند کہ پیر علی صاحب دریں روزہا بہ دہلی بودند- بعد عمرے ایشاں را دیدم امروز خود شاں بہ اکبرآباد روانہ شدہ اند می گویند ماہ روزہ بہ آگرہ بسر بردہ بہ گوالیار می روند اطلاعاً نوشتہ شد-

عرضداشت اسداللہ روسیاہ

(۳) مکتوب بنام غمگین

قبلۂ حاجات! آنچہ نخست دل را بہ نشاط توانگر کرد .....

عنوان دیوان رباعیات شادماں تر ساخت- سرمایۂ آنم کو کہ آں مطالب عالیہ را نیک باز دانم و از کجا در خور آنم کہ آں ہمہ گہر بر رشتۂ نگارش از بہر من کشیدہ آید، و آں گاہ ایں مایہ مکرمت کہ خود می پرسند کہ اگر دستورے دہی دیباچہ را بنام تو نگار بندم- ایں پرسش خداوندانہ نوازشے دیگر است کہ زباں اندازۂ سپاس آں بر نتابد- قبلہ گاہا! فضولی می کنم و چوں فرمان چنیں است می گویم کہ گنجیدنِ نام من در آں نامہ نہ تنہا از بہر من بلکہ از بہر آبادی من سرمایۂ نازش جاودانی ست- لیکن ہمہ آں خواہم کہ مرید خود را بیش از اندازہ در آں نگارش نستایند و کمترین بندۂ خود وا نمایند کہ ہر آئینہ اندریں صورت ہم مدعا مخدوم حاصل می شود، و ہم خواہش ایں ننگ آفرینش روائی می پذیرد- و بالجملہ چشم براہم کہ دیوان رباعیات کے می رسد و من بداں کے می رسم- فرماں چناں است کہ آں نوشتہ را از نظر اغیار نہاں دارم ہم چنیں خواہم کرد- اما غیر کو؟ پس از نگارش ایں پند کہ البتہ خلاف رائے دانش آرای خواہد

کردہ۔ زمانے نخواہد آمد کہ راز ایں رباعیات ہم افشا خواہد شد حالا ایں طور بہ ار ید و من ناچارم کہ بزرگانِ دیں چنیں کردہ اند و مارا انا بدء سلوک تا انتہائے جذب حضرات قادریہ و نقشبندیہ تحریر نمودن منظور بود و ایں اسرار کم کسے نوشتہ است .... و اگر فی الحقیقت پرسید و تکبر نہ بہ ار ید و فائدہ خود دانید غیر ما ازیں عین شما خوشتر است۔

رباعی

وہ شخص لطیف اور وہ فہم ہے پاک
شائستہ ہو اسپ جس کا چالاک
غمگین جو رخش بے محابا ہو تیز
انساں کو شرط اس سے ہے خوف و باک

زیادہ والسلام
۱۲۵۵ھ (۱۸۴۱ء)

(۵) مکتوب غالب بنام غمگین

قبلہ و کعبہ حضرت پیر و مرشد برحق سلامت!

گفتم وائے عقدۂ دیگر بکارم افتاد و ہولناک مقامے پیش آمد چہ من خود آں نخستیں نامہ را کہ در ڈاک بمن رسیدہ است حرزِ بازوئے اندیشہ ساختہ و بہ گرمی آں گفتار چوں شکر در آب گداختہ ام ہر چند می بایست کہ بہ پاسخ آں قدسی صحیفہ دیدہ و دل باہم آمیختے و بہ زنگار رنگ پوزش سخن انگیختے لیکن یزداں داند کہ از جرأت خود آں مایہ شرمسار بودم کہ ہرگز عذر نتوانستم کرد و جواب آں ہمایوں منشور نتوانستم نوشت ایں بار کہ نامۂ دیگر رسید بے قراری بر شرمساری افزود و خواستہ و ناخواستہ مرا در سخن آورد۔ ہی ہی در عرضداشتے کہ از فضولی و فزوں سری در عین و غیر سخن راندہ ام کہ ایں کلمہ کہ غیر کو؟ بدلہ بیش نیست ورنہ سخن ہماں است کہ حضرت می دانند و من نیز برآنم۔ واللہ آنچہ دریں ہر دو صحیفہ نگاشتہ کلک ہدایت رقم بودہ است ہمہ بجا و حق و ستودہ است و اندیشۂ ایں ننگ آفرینش نیز برخلاف آں نیست۔ اما چہ کنم کہ وقت از دست رفت و سخن بے خواست گفتہ آمد۔ ہمانا ذوق التفات حضرت پیر و مرشد و دولت آمد آمد سفینۂ رباعیات دل را آں چناں انجا بر انگیخت کہ از خود رفتم و در بیخودی سخنے گفتم۔ یا ایں ہمہ از حضرت پنہاں نخواہد بود کہ آں گفتار نہ بطریق دعویٰ بود نہ از راہ سرکشی۔ خواستم کہ ایں بذلہ ذوق افزاید۔ آں خود مرا بہ گرداب تشویر افگند۔ خوش گفت آں کہ گفت۔ مصرع

یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

....

.... چوں حضرت در منع ارسال رباعیات سرزنشے بہ سزا فرمودند آئینہ حیرانی بکار بردم و نہفتہ ہائے ضمیر پراگندۂ خود را دیوانہ وار آشکار کردم۔ اگر جرم من بخشیدنی نیست نوید عفو تقصیر دہند تا از سر مسلماں گردم و بہ رحمت الٰہی ایماں تازہ کنم۔ اللہ بس ماسواہوس۔

نگاشتہ بست ہشتم محرم روز شنبہ ہنگام چاشت از اسد اللہ

روسیاہ

میر صاحب مشفق سید حیدر علی[۱] صاحب سلام خوانند و خاکساری مرا بجناب پیر و مرشد عرض داشتہ سعی دراں فرمایند کہ خطائے من بخشیدہ شود فقط (۱۲۵۶ھ)

(۶) مکتوب غالب بنام غمگین

دیگر خط مرزا نوشہ بجناب حضرت صاحب مدظلہ العالی

... سخن در باب رباعیات می رود۔ یارب بیان من مخالف مزاج پیر و مرشد نبود۔ سہ رباعی کہ در آغاز رقم یافتہ مضمون آں دارد کہ علیؓ خلیفہ بود۔ و ایں عقیدہ را من ندارم۔ من علیؓ را امام دانم و دیگراں را خلیفہ، خلافت مرادف سلطنت و ریاست است۔ بزبان عرب رئیس و حاکم را خلیفہ گویند اگرچہ معنی لغوی نیابت است۔ بالجملہ علیؓ بلا فصل بعد از نبی امام است و امامت امریست یزدانی و علی امام است ہم در عہد خلافت ابوبکرؓ و ہم در عہد خلافت عمرؓ و ہم در عہد خلافت عثمانؓ۔ و ایں کہ مشہور است کہ علیؓ بعد از عثمانؓ خلیفہ شد غلط است۔ اصل اینست کہ امام برحق علی مرتضیٰؓ چوں بعد از رسول امام شد ابابکرؓ عہدہ را خلیفہ کرد و امر قضا بوے سپرد تا قطع خطرات مسلمیں نماید و بر مومنین فرمانروا باشد و پس از و عمر را برگزید و ازاں بعد عثمان را خلافت داد۔ ایں ہر سہ تن بداد و رو سپردند و نبی و امام را اطاعت کردند۔ بعد از عثمانؓ ہیچ کس لائق عہدۂ قضا در مسلمین یافتہ نشد و آں کہ آمد و کرد نیز شائستہ

---

(۱) یہ بزرگ حضرت غمگین کے خلیفہ بھی ہیں اور میر منشی بھی۔ انہی کے تعانیف غمگین انہیں کے قلم کی نقل کی ہوئی ہیں جو شاہ غمگین اکادمی گوالیار میں محفوظ ہیں۔

ایں کار نمود لاجرم امامِ وقت کار قضا بعہدۂ خود گرفت و خود بقطعِ خصومات اہلِ اسلام پرداخت۔ شاہ اگر کار قاضی کند او را قاضی نگویند و ہماں بالجملہ علی امام است در ہر عہد۔ امّا خلافت خود بعد از حضرت عثمان رضی اللہ عنہٗ به بنی امیہ منتقل شد و ازاں گروہ بہ آلِ عباس رسید و ایں ہر دو گروہ برعکسِ خلفائے ثلثہ ستمہا کردند و خونہا ریختند و امامت علی رضؓ و اولادش را نخو کردند و ائمہ را کشتند۔

خبیث کسے کہ علی را خلیفہ نداند زیادہ چہ برطرازم۔۔۔۔۔"

(۷) مکتوب غمگین بنام غالب

جواب باصواب از طرف جناب حضرت صاحب مرزا نوشہ متخلص غالب و اسد

"مشفقا! من در بابِ تفضیل امیر علیہ السلام تحقیق شما خواستہ بودم نہ در امامت و خلافت۔ شما از خلافت ہم جناب امیر را معزول کردید۔ اوّل عفو تقصیر خواہم بعد ازاں چند حروف مینویسم۔ آں مشفق را شاید کہ معنی خلافت و امامت بہ تحقیق نرسیدہ کہ امیر علیہ السلام را صرف امام می دانید و خلیفہ نمی پندارید۔ ایں مذہب تراشیدۂ سامی است۔ ہرچند خوب دانم کہ آں مشفق از طریقۂ خود برنخواہند گشت لیکن چونکہ ایں فقیر دوستِ شما است واجب شد کہ آنچہ حق باشد می نویسم۔ آں مشفق کہ خلافت را حمل بر سلطنت کردہ اند محض بے جا است و حقیقت سلطنت و خلافت ازیں حدیث نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم قیاس باید کرد کہ،۔۔۔۔؟

پس اگر خلافت مثل سلطنت می بود آں حضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بلفظ عضوض نمی فرمودند و دیگراں مشفق خلافت را حمل بر قضا بطور اہانت کردہ اند و حقیقت قضا ایں است کہ حدیث نبویؐ در حق علی مرتضیٰ واقع است کہ اقضٰی ہم علی یعنی در جمیع امت ما اقضیٰ علی است پس موافق حدیث شریف در ہماں سی سال تا شش سال علی مرتضیٰ خلافت کردند و داخل خلافت شدند۔ صرف امام دانستن بچہ وجہ و انصاب معنی خلافت تا آمدن بفہمیدہ اند کہ خلافت چیست نہ قضا است و نہ سلطنت بلکہ قضا و سلطنت نیز داخل خلافت اند نہ حقیقت خلافت۔ و صاحب فتوحات مکی از انواع چہارگانہ خاتمی دارد۔ خاتمی نوع اوّل از ولایت محمدی کہ جامع بداں صوری و معنوی و مقرون خلافت باشد علی ابن ابی طالب علیہ السلام را نوشتہ۔ زیرا کہ امر خلفائے راشدین است و مذہب سامی خلاف ایں حدیث است کہ:

الخلافۃ بعدی ثلثون سنۃ و قد تمت بعلی

و ایں خاتم را خاتم کبیر گویند و آں مشفق با وصف قد تمت بعلی بخلاف ایں حدیث بنی امیہ و آل عباس را خلیفہ پنداشتند و ایں سراسر خلاف است چرا کہ ایں ہمہ داخل ملک عضوض ہستند، داخل خلاف نیستند و چونکہ حق تعالیٰ بملائکہ فرمود کہ:

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ط

پس ملائکہ مثل سامی بنی امیہ و آلِ عباس و اقبال ایشاں را تصوّر نمودہ گفتند: اتجعل فیھا من یفسد فیھا و یسفک الدماء و نحن نسبح بحمدک و نقدس لک۔

پس تازیانۂ: انی اعلم ما لا تعلمون

خوردند۔ پس مناسب چناں است کہ معنی خلافت از انّی اعلم ما لا تعلمون دریافت نمایند و اگر عقل کار نکند از کسے عارف بپرسند۔ و ایں ہر چہار اصحاب در آں خلافت شریک کہ حق تعالیٰ ایں فرماید کہ انی اعلم ما لا تعلمون و در صورتیکہ ملائک از ادراک معنی خلافت محروم ماندند گلہ از آں مشفق عبث است و من چنانکہ از دو حدیث نبوی خلافت امیر علیہ السلام نمودہ ام شما از یک بطلان خلافت جناب امیر ثابت کنید۔ و ایں فقرہ کہ نوشتہ اند کہ حضرت امیر از طرف خود اصحاب ثلثہ را قضا سپردند و وقتیکہ کسے قابل قضا نماند خود قضا اختیار کردند، ایں سخن در ہیچ کتاب دیدہ نشدہ۔ شاید کہ در کتب روافض باشد۔ و لطف ایں است کہ در خلافت عمر رضی اللہ عنہٗ فیصلۂ قضایای مسلمین جناب امیر علیہ السلام میکردند و عمر رضی اللہ عنہٗ فرمودہ بودند کہ تا ایں خود دانا در شما است، ہیچ مسئلہ از ما مپرسید۔ مشفق من عجب تحقیق سامی است کہ اعیان ثابتہ را با امواج محیط و خطوط شعاعی را بہ آفتاب تشبیہ میدہید و خلافت را با قضا و سلطنت۔ آنچہ آں مشفق می فرمایند در ہیچ کتب صوفیہ و اہلِ سنت و جماعت دیدہ نشدہ۔ خداوندا کہ از کجا می فرمایند و مذہب ما موافق قرآن شریف و حدیث نبوی و اقوال عارفان صوفیہ است و خلاف ایں را مسلّم نمی دارم بلکہ باطل می دانم۔ و ایں چہ طریقہ است کہ خبیث کسے کہ امیر المؤمنین را خلیفہ نداند و چوں سابق ارقام نمودہ ام کہ گفتگوئے ما بر ملاقات موقوف است لہٰذا ہمیں قدر اکتفا نمودہ شد کہ آں مشفق بریں حدیث مرقومہ نگاہ فرمودہ تأمل فرمایند

(باقی صفحہ ۴۳ پر)

اخلاقیات غالب

اقبال سلمان

غالب طاؤس و رباب کے دور میں پیدا ہوا اور طاؤس و رباب کے دور کی شاعری میں غم عشق کو محور کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ غم روزگار اسکے موضوع سے خارج ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب اور اس کے زمانے کے دوسرے شعراء مثلاً مومن، ذوق، شیفتہ وغیرہ کا کلام غم روزگار سے قریباً خالی ہے، اور ظاہر ہے کہ جس فن میں غم روزگار نہیں ہوگا، اس میں کوئی پیغام بھی نہیں ملے گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ غالب کے زمانے کی شاعری کو ہدفِ ملامت بنائیں، نہ اس دور کی شاعری کو ہمارے سامنے شرمندہ ہی ہونے کی ضرورت ہے۔ ہر زمانہ کا ایک مخصوص تقاضا ہوتا ہے۔ تقاضے بدلتے رہتے ہیں اور اسی سبب سے فکر و عمل کے انداز بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں

جب غالب کے بعد، بلکہ یوں کہنا چاہیئے اس کی زندگی کے آخری ایام ہی میں طاؤس و رباب کے نغمے دم گھٹ کر رہ گئے، تو اُردو شاعری نے غم روزگار کو بھی اپنا موضوع بنایا۔ چنانچہ خواجہ حالیؔ وہ پہلے شاعر تھے، جنہوں نے بدلتے ہوئے حالات اور ان کے تقاضے کو ٹھیک وقت پر محسوس کیا اور اپنے کلام کو بڑی حد تک ایک پیغام کی شکل میں پیش کیا۔ ان کے بعد اکبر آبادی، اقبال اور متعدد دوسرے شعراء نے بھی پیغام و خطاب کی راہ اختیار کی جس سے فنِ شعر ہی کو وسعت نصیب نہیں ہوئی، بلکہ عوام کی ذہنی اور فکری تربیت میں بھی بڑی مدد ملی۔

اصل موضوع سے ان الفاظ کا تعلق یہ ہے کہ اصولاً ہمیں غالب سے کسی قومی، معاشری یا اخلاقی موضوع پر اظہار خیال کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے لیکن اس کے کلام کے مطالعے سے جہاں ہم یہ اعتراف کرتے ہیں کہ اپنے پُر شکوہ اندازِ بیان، ندرتِ خیال اور قدرتِ زبان کے لحاظ سے وہ ایک منفرد شاعر ہے، وہاں ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ غم عشق کے علاوہ کسی نہ کسی حد تک غم روزگار کا بھی نقیب ہے۔ یہ البتہ درست ہے کہ زندگی کے مسائل سے بحث کرتے وقت وہ ایک معلم یا واعظ یا پیغامبر کا انداز اختیار نہیں کرتا۔ اسے اپنی رندمشربی، حسن پرستی اور بادہ خواری کا بخوبی احساس ہے اور اخلاق و معاشرت یا زندگی کے کسی اور مسئلے پر براہ راست اظہار خیال کرتے ہوئے ہچکچاتا ہے۔ بالواسطہ بھی اس نے جو کچھ کہا ہے، اس میں اشارے کنائے سے کام لیا ہے، یا اپنے کسی تجربے کو اس پیرائے میں بیان کر دیا ہے کہ ہم خود بخود اس سے کوئی پیغام یا سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ دعویٰ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ یہ طریقِ بیان انسانی نفسیات کے عین مطابق ہے اور بدرجہٗ غایت مؤثر بھی۔

غالب کے کلام میں یا عمومی طور پر یوں کہہ لیجیئے تمام اُردو شاعری میں فکری یا نظریاتی تضاد اس ہمہ گیری کے ساتھ پایا جاتا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا، اسے عیب قرار دیا جائے یا خصوصیت۔ پھر یہ تضاد بھی ایسا نہیں کہ اسے کسی شاعر کے ذہنی ارتقا یا اُس کے مختلف حالات و تجربات کا نتیجہ قرار دے کے اپنے آپ کو مطمئن کر لیا جائے، بلکہ حالت یہ ہے کہ ایک شاعر ایک ہی وقت میں رجائیت کا اظہار بھی کرتا ہے اور قنوطیت کا بھی، خوشی کا بھی اور غم کا بھی، مدح کا بھی اور ہجو کا بھی، بے نیازی کا بھی اور نیازمندی کا بھی، خودداری کا بھی اور چاپلوسی کا بھی۔ ایک شاعر کی ایک ہی غزل میں یہ سارے مضامین یکجا مل جائیں گے۔ اگر اس کیفیت کو پیش نظر رکھا جائے تو غالب کے کلام میں کوئی غیر متضاد پیغام نہیں مل سکے گا۔ مثال کے طور پر اگر چند اشعار کے حوالے سے اُسے ایک رجائی شاعر ثابت کیا جا سکتا ہے تو ایسے اشعار بھی مل جائیں گے، جو اس کی قنوطیت پر دال ہو سکتے ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود غالب کے ہاں وہ جواہر ریزے پائے جاتے ہیں، جنہیں اردو شاعری کا بہترین سرمایہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس وضاحت کے بعد ہمیں غالب کی اخلاقی تعلیم پر روشنی ڈالنی چاہیئے۔ سب سے پہلے یہ بتانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو بے شکایت زندگی پر یقین رکھتا ہے اور یاد رکھنا چاہیے کہ بے شکایت زندگی کوئی معمولی مطمح نظر نہیں، بلکہ انسانی اخلاق کا ایک نہایت قیمتی [illegible] ہے۔ کسی آدمی کی شخصیت ناپنے کے لئے یہ جاننا کافی ہے کہ وہ [illegible]

یا اپنی قسمت کے خلاف شکایت کی زندگی بسر کرتا ہے یا اس سے سمجھوتہ کرکے خوش رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ جتنی زیادہ اُس کی زبان آلودۂ شکایت ہوگی، اتنی ہی اس کی شخصیت بھی کمزور ہوگی۔ شکایت دراصل انتقام ہی کی ایک شکل ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ جو شخص سیدھے طریقے سے انتقام نہیں لے سکتا وہ گلے شکوے کرکے اپنا دل ٹھنڈا کر لیتا ہے۔ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جس طرح ہم انتقام لے کر ایک دوسرے سے دور ہو جاتے ہیں، اسی طرح شکایتیں کرکے اپنے تعلقات کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ دوستی اور محبت کا نازک رشتہ شکایتوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ غالبؔ اس نفسیاتی حقیقت سے بخوبی واقف ہے، چنانچہ کہتا ہے:

شکوۂ یاراں غبارِ دل میں پنہاں کر دیا
غالبؔ ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا!

یعنی دوستوں کا لطف و کرم تو بہرحال عزیز ہوتا ہے، لیکن ان کی بے التفاتی اور سرد مہری بھی کچھ کم قابلِ قدر نہیں اور باوجودیکہ ان کی بے اعتنائی اور بے رخی سے میرا دل ویران ہو گیا ہے، حرفِ شکایت لب پر نہیں آ سکتا۔ اس کے برعکس میں نے شکایتوں کو اپنے دل میں اس طرح محفوظ کر لیا ہے، گویا ویرانے میں خزانہ دفن ہے۔ شعر میں "غبارِ دل" کے تعلق سے "ویرانہ" اور "گنج" کے لفظ استعمال کئے گئے ہیں۔ پرانے وقتوں کے لوگ اپنے مال و زر کو حفاظت کی غرض سے بیابانوں میں جا کر دفن کر دیتے تھے۔ ان لفظوں میں اسی دستور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

غالبؔ کا یہ خلق و مروت صرف دوستوں تک محدود نہیں، عام انسانی تعلقات میں بھی وہ یہی وطیرہ اختیار کرتا ہے۔ جب کسی نے بھی اس کے ساتھ زیادتی اور بے انصافی کی، اس نے درگزر سے کام لیا۔ حتیٰ کہ جہاں اُسے داد رسی کا یقین ہے، وہاں بھی کسی کے خلاف کوئی شکایت نہیں کرتا۔ اس کا ایک مشہور شعر ہے:

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالبؔ
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے!

مطلب یہ کہ جو کچھ ہونا تھا، ہو گیا۔ ملاح نے میرے ساتھ بدسلوکی اور ظلم و ستم روا رکھا، مجھے اذیت پہنچی اور مجھے یہ حق پہنچتا ہے کہ خدا سے شکایت کرکے داد و انصاف حاصل کروں اور خدا جو عدل ہے اس سے میرا بدلہ لے سکتا ہے۔ لیکن اس سے کیا حاصل؟ مناسب یہی ہے کہ ملاح کی ایذا رسانیوں کو فراموش کر دیا جائے۔ بُرائی کا بدلہ لینے میں نہیں، معاف کر دینے میں ہے۔ تقریباً یہی مفہوم اقبالؔ کے ایک شعر میں بھی پایا جاتا ہے:

تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایتِ زمانہ

بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اقبالؔ بھی غالبؔ کا ہم مسلک ہے، لیکن اس کے انداز بیان میں مجبوری سی پائی جاتی ہے، اس کے برعکس غالبؔ کا عفو و درگزر واضح طور پر رضا کارانہ ہے۔

عفو و درگزر کے علاوہ غالبؔ کے ہاں ہمیں خودداری یا عزتِ نفس کا پیغام بھی ملتا ہے۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ بے نیازی اور بے احتیاجی کی حالت میں تو خودداری قائم رکھی جاتی ہے، لیکن اضطرار کی حالت میں بہت کم لوگ اس گوہرِ بے بہا کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ مجبوری میں سب کچھ جائز سمجھا جاتا ہے۔ لیکن غالبؔ مجبوری اور اضطرار کی حالت میں بھی خودداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ محبت سے بڑی مجبوری کیا ہو سکتی ہے؟ یہ وہ کیفیت ہے، جس میں انسان آرام و آسائش، نام و ننگ، مال و دولت بلکہ جان تک قربان کر دیتا ہے۔ میر تقی میرؔ نے کہا ہے:

پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

مصحفیؔ کہتا ہے:

ترے کوچے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا

مگر غالبؔ نے ایک نہایت مشکل مرحلے پر اپنی خودداری کا ثبوت دیا ہے۔ اس کا محبوب روٹھ گیا ہے۔ اسے منانا تو بڑی بات ہے، ناراضی کا سبب دریافت کرنا بھی وضع داری کے خلاف سمجھتا ہے:

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو؟

اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ شاعر نے کتنا خونِ جگر کھا کے غیرت اور خودداری کی یہ کیفیت برداشت کی ہوگی۔ عشق کی بغاوت فرو کرنے کے لئے عقل نے کن کن مصیبتوں کا مقابلہ کیا ہوگا۔ جذبات کی طغیانیوں میں پامردی کے ساتھ ڈٹ جانا اور عزتِ نفس کا دامن کسی صورت نہ چھوڑنا وضع داری کی نہایت قابلِ رشک حالت ہے۔ غالبؔ کے سوا شاید ہی کسی شاعر نے خودداری کی اتنی بلند اور اچھوتی مثال پیش کی ہوگی۔ اسیرؔ کی خودداری کا

اونچا سے اونچا مقام اس کے نزدیک یہ ہے:

کسی امیر کی مجلس کا ذکر کیا ہے امیر
خدا کے گھر بھی نہ جائیں گے بن بلائے ہوئے

صرف پہلا مصرع معمولی سی خودداری کا پتہ دیتا ہے۔ دوسرا مصرع محض خیال آرائی ہے، جس میں انسان کے قدرتی انجام کی رعایت سے ایک بات پیدا کر لی گئی ہے۔ اختیاری خودداری سے اسے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔

ذوق کی خودداری کیا ہے؟ یہ کہ:

احسان ناخدا کا اٹھائے مری بلا
کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

شاعرانہ تعلّی اور رعایتِ لفظی کے لحاظ سے ممکن ہے، یہ شعر قابلِ تعریف ہو، لیکن خودداری کا قابلِ عمل نمونہ اس میں بالکل نہیں۔ اسی طرح شاہ نصیر نے کہا ہے:

آدمی تو کیا خدا کو بھی نہ ہم سجدہ کریں
گر نہ خم تعظیم کو پہلے سرِ محراب ہو!

یہاں بھی خودداری کی کوئی ٹھوس ترغیب نہیں پائی جاتی۔ زیادہ سے زیادہ اسے ایک لطیفہ کہہ لیجئے لیکن غالب اس موضوع کو چٹکلوں اور لطیفوں کی صورت میں بیان کر کے موضوع کی سنجیدگی اور متانت کو نقصان نہیں پہنچنے دیتا۔ بہرکیف، مقصود یہ نہیں کہ دوسرے شعراء سے اس کا مقابلہ کیا جائے ضمناً یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ غالب نے خودداری کا جو معیار اپنے سامنے رکھا ہے، وہ فی الحقیقت بہت بلند ہے۔ خودداری ہی کے متعلق ایک اور مقام پر کہتا ہے:

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

یعنی خضر کی بزرگی کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنی خودی اور خوداعتمادی کو جواب دے دیں اور انہیں اپنا رہنما تسلیم کر لیں۔ غالب تو اس بزرگ کو اس لئے بھی رہنما نہیں مانتا کہ وہ ایک دفعہ سکندر کو دھوکا دے چکے ہیں:

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی؟

"آزمودہ را آزمودن جہل است" کی کتنی جامع تفسیر کی گئی ہے:

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا!

بندگی، بے چارگی کا دوسرا نام ہے، لیکن اس حالت میں بھی جہاں ہم پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ ہم خدا کی طرف رجوع کریں، وہاں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ خدا کا رویہ کیسا ہے۔ اس کا بابِ اجابت ہمارے لئے وا ہوتا ہے یا نہیں۔ اگر اس کا دروازہ ہمارے لئے کھلا ہے تو بہتر، ورنہ حمیت کا تقاضا یہ ہے کہ اُلٹے پاؤں لوٹ آئیں۔ ایسے خدا کو ماننے کا کیا فائدہ، جو اپنے بندے کو قرب سے محروم رکھے؟

غالب کے ہاں رجائیت یعنی، امید پسندی کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ وہ عام طور پر زندگی کے روشن پہلو کی طرف نگاہ رکھتا ہے اور تاریک رُخ کو اس طرح نظر انداز کر دیتا ہے، گویا وہ سرے سے ہے ہی نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ امید ہی وہ بنیاد ہے، جس پر زندگی کی ساری عمارت قائم ہے۔ یہ چہل پہل یہ رونق، یہ خوب صورتی، یہ حرکت کرتی ہوئی، آگے بڑھتی ہوئی زندگی اور اس کی زندہ اخلاقی قدریں صرف امید کے سرچشمے سے سیراب ہوتی ہیں۔ زندگی میں سے امید سلب کر لی جائے، تو انسان کی اولوالعزمی، نیکی، ہمدردی، سچائی اور احسان و مروّت ایسے اوصاف اپنے آپ ختم ہو جائیں جس شخص کے دل میں امید کی شمع روشن نہیں، اس کی اخلاقی حالت مشکوک سمجھنی چاہیئے۔

غالب کی رجائیت کا یہ عالم ہے کہ وہ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی روشنی کی شعاعیں تلاش کر لیتا ہے۔ ایک دانش مندانہ کہاوت ہے کہ ہر چمکنے والی بجلی گرتی نہیں اور گرے بھی تو لازم نہیں کہ ہمیں پر گر پڑے۔ غالب کا اندازِ فکر بھی یہی ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر:

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو؟

یہ رجائیت، کردار کی یہ مضبوطی اور قلب و روح کی یہ صحت مند زندگی اردو شاعری کے پورے دفتر میں کہیں نہیں ملے گی۔ شعر کا بنیادی خیال یہ ہے کہ اگر کوئی مصیبت آتی ہے، تو آیا کرے۔ یہ کیوں فرض کر لیا جائے کہ وہ ہمیں پر نازل ہوگی۔ ایک روشن تجربہ یہ بھی تو ہے کہ مصیبت سامنے آتی ہوئی دکھائی دی، لیکن اپنے دھیان گزر گئی۔ یہ درست ہے کہ ایک آشیانہ بجلی کی زد میں آکر راکھ ہو گیا ہے، لیکن کیا ضرور ہے کہ وہ میرا ہی ہو۔ میں خواہ مخواہ اپنی جان کیوں ہلکان کروں؟

اگر کسی مہم کی ناکامی لوگوں میں مشہور ہو جائے، تو وہ اس کا عزم کرتے ہوئے ڈرتے ہیں، مبادا ہمیں ناکامی ہو۔ غالب کے نزدیک یہ جائز نہیں۔ چنانچہ وہ طور پر حضرت موسیٰ کی ناکامی سے بھی مایوس نہیں

ہوتا اور اعتماد کے لہجے میں سعیِ دیگراں کی دعوت دیتا ہے:

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

وفاداری، بشرطیکہ استوار دمصمم ہو، غالب کے نزدیک جزوِ ایمان نہیں، بلکہ اصلِ ایمان ہے اور اگر یہ خوبی کافر میں بھی پائی جائے، تو وہ مومن کی سی تعلیم و تکریم کا مستحق ہو جاتا ہے:

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

وہ ہمیں تسلی دیتا ہے کہ مشکلات و مصائب سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ ان کا تجربہ کرنا چاہیئے اور یہ تجربہ ہمیں بتائے گا کہ کوئی مشکل ایسی نہیں جو آخر کار آسان نہ ہو جائے:

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں!

وہ گفتگو میں ادب آداب، شائستگی اور مخاطب کا احترام ضروری سمجھتا ہے:

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے؟
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

وہ اپنا قصور کسی دوسرے کے سر تھوپنے کا قائل نہیں۔ مردوں، جو مردانہ وار اپنی غلطی کا اعتراف کرے اور اپنی بجائے کسی بے گناہ کو مصیبت میں مبتلا نہ ہونے دے:

قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریئے
اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

کسی ہنر میں کمال حاصل کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے اہلِ کمال سے بغض و کدورت روا رکھی جائے۔ خوبی جس کسی میں بھی پائی جائے، اس کا اعتراف کرنا چاہیئے:

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ایک اور غزل کا مقطع ہے:

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

ساتھ ہی ساتھ وہ یہ تلقین بھی کرتا ہے کہ ہر شخص کو کسی نہ کسی فن میں کمال پیدا کرنا چاہیئے تاکہ قدر و عزت حاصل کر سکے:

ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا بھی کسی میں ہو کمال اچھا ہے

غالب کے ہاں سچائی کی ترغیب بھی پائی جاتی ہے:

صادق ہوں اپنے قول کا غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

آخر میں دو شعر ایسے پیش کئے جاتے ہیں، جن میں غالب ہمیں براہِ راست خطاب کر کے اخلاقی تعلیم دیتا ہے۔ ان شعروں میں بدگوئی سننے اور غیبت کرنے کی مناہی کی گئی ہے، غلط کاری کو روکنے کی تلقین کی گئی ہے اور یہ نصیحت کی گئی ہے کہ خطا کار کو بخش دینا چاہیئے:

نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

★

غالب سرائیکی میں

دلشاد کلانچوی

ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں وہ آئے۔ اس لئے امید ہے اُردو خواں حضرات مغربی پاکستان کی بولی سرائیکی کو نہ جانتے ہوئے بھی اپنے محبوب شاعر غالب کو پہچان لیں گے۔ جو اس ترجمہ میں جلوہ گر ہے۔ مترجم کے حسنِ سعی سے دیوانِ اردو تمام و کمال سرائیکی میں منتقل ہو چکا ہے۔ (مدیر)

ایہہ نہ ہئی اساڈی قسمت، جو وصالِ یار ہوندا
جو بیا وی جیندے رہندے، ایہو انتظار ہوندا

ودے وعدے تے ہیں جیندے تاں ایہ جانی کوڑ ڈیکھیں
ایں خوشی توں مر نہ ویندے، جو کہیں اعتبار ہوندا

تیڈی نازکی کنوں ہے جو بدھا ہا قول ڈھلا
نہ تروڑ ایکوں سگدا، جے ایہو پکی تار ہوندا

کوئی میڈے دل توں پچھے تیڈے تیر ادھ چھکوں
ایہا دل کوں نہ کھٹکدا، جو جگر دے پار ہوندا

ایہ کتھوں دی دوستی ہے، جو بنڑ ویسے یار ناصح
کوئی میڈا دارو ڈھوندا، کوئی غمگسار ہوندا

جو پتھر وچوں ایہ وگدا تاں لہو کڈھیں نہ تھمدا
جیکوں ڈکھ سمجھ گیا ہیں، جے ایہو شرار ہوندا

ایہ جیڈ کھمدے، جاں بچدی ایہ جھول ہے نئیں سگدا
جے نہ عشق ڈکھ نہ ہوندا، ڈکھ ہی روزگار ہوندا

میں جو آکھاں کیکوں آکھاں، ڈکھی رات ہک بلا ہے
مینکوں مرن [illegible] ہا، جے ہک وار ہوندا

تھئے مرتے وی جو رسوا، تھئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ جنازہ کوئی چیندا، نہ کوئی مزار ہوندا

اوکوں ڈیکھ کون سگدا، جو ہے ہکو کلا
کوئی ڈو ڈٹھا وی جو ہوندا تاں [illegible] ہوندا

ایہے مسئلے تصوف، ایہ تیڈا بیان غالب
تیکوں تاں ولی سمجھدے، جے نہ بادہ خوار ہوندا

مضمون میں سرائیکی حروف تہجی:
ٻ = ب خفیف لہجے کے ساتھ مثلاً ٻال ٻچہ = بال بچہ۔
ڋ = ڈ خفیف لہجے کے ساتھ مثلاً ڋانگ = ڈانگ۔ [illegible]
ڳ = گ خفیف لہجے کے ساتھ مثلاً ڳئو = گئو

غالب کی تصویر کاری

(چند اشارے)

شمس الدین صدیقی

غالب کو تشبیہات و استعارات کا بادشاہ قرار دینے کی روش بہت عام ہے۔ اس سے اتنا تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ تشبیہ و استعارہ سے بکثرت کام لیتا ہے لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کونسی باتیں ہیں جو اس کی تشبیہوں اور استعاروں کو دوسرے شاعروں کی تشبیہوں اور استعاروں سے ممیز کرتی ہیں۔ غالب کے تخیل کے لئے بلندی، وسعت، گہرائی، گیرائی، باریکی، نزاکت، نفاست، لطافت غرض کتنی ہی صفات استعمال کی جاتی ہیں، لیکن تنقید کے میدان میں یہ الفاظ کچھ اس کثرت سے استعمال کئے گئے ہیں کہ اپنی معنویت کھو بیٹھے ہیں۔ اس لئے میں عمداً ان سے پرہیز کروں گا۔ میری کوشش یہ ہوگی کہ اجمالی طور پر غالب کی تصویر کاری (امیجری) کی امتیازی خصوصیات پیش کروں۔ تشبیہ، استعارہ، تمثیل یہ سب چیزیں تصویر کاری کے ذیل ہی میں آتی ہیں۔

غالب کی تصویر کاری کی جو خصوصیت سب میں ممتاز نظر آتی ہے یہ ہے کہ اس کی تصویریں سکونی نہیں بلکہ متحرک ہوتی ہیں۔ لرزش، ارتعاش، رقص، جوش، ہنگامہ، مختصر یہ کہ حرکت غالب کی تصویر کاری کا جزوِ اعظم ہے۔ ان اشعار پر غور فرمائیے:۔

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم — آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے

نہ شعلہ میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا — کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہے

دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا — موجِ خرامِ یار بھی کیا گُل کتر گئی

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل — گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر — میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے — نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے — ہر گوشۂ بساط ہے سرِ شیشہ باز کا

اسی سلسلہ میں دو غزلیں اور قابلِ ذکر ہیں جن کے ابتدائی مصرعے یہ ہیں:

ع پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

ع عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے

حد یہ ہے کہ غالب پُرسکون، قائم اور غیر متحرک چیزوں کا تصور بھی متحرک حیثیت میں کرتا ہے، جیسے،

نہ پوچھ بے خودیٔ عیشِ مقدمِ سیلاب — کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

نہیں ہے سایہ کہ سن کر نویدِ مقدمِ یار — گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار

شکلِ طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز — ذوق میں جلوے کے تیرے بہوائے دیدار

غالب کی تصویر کاری کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تصویریں سادہ و مفرد نہیں ہوتیں بلکہ مرکب، بوقلموں اور رنگا رنگ ہوتی ہیں۔ اکثر اوقات نہایت روشن اور چمکدار بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ چند شعر دیکھئے:

عشرتِ قتل گہہِ اہلِ تمنا مت پوچھ
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

فروغِ حسن سے روشن ہے خوابگاہ تمام
جو رختِ خواب ہے پرویں تو ہے پروین تکیہ

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

نگہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

صبح آیا جانبِ مشرق نظر
اک نگارِ آتشیں رخ، سر کھلا

دستگاہِ دیدۂ خونبارِ مجنوں دیکھنا
یک بیاباں جلوۂ گل فرشِ پا انداز ہے

پیشِ پا افتادہ، فرسودہ اور عام راہ سے ہٹ کر چلنا غالب کی ایک امتیازی خصوصیت ہے جو اس کی تشبیہوں اور تصویروں میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ ویسے بھی نئی بات کہنے کے لئے نیا پیکر ضروری ہے۔ نیا پن اور دوسروں سے مختلف ہونے کی خواہش غالب کو اُلٹی بات اور اُلٹے انداز کی طرف راغب کرتی ہے۔ چنانچہ بجائے اس کے کہ عارضِ معشوق کو پھول سے تشبیہ دے، وہ کہتا ہے:

عارضِ گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسد
جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

اسی طرح گھر کی ویرانی کو دشت سے تشبیہ دینے کی بجائے بات اُلٹ کر یوں کہتا ہے

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اس اُلٹے پن سے قطع نظر غالب کا نیا پن بجائے خود ایسی خصوصیت ہے جو اس کی اپجی طبیعت کی دلیل ہے۔ چند نئی نئی تصویریں اور تشبیہیں دیکھیے:

سیاہی جیسے گر جائے دمِ تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی
غم آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
چراغِ روشن اپنا قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے
درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو
صبحِ بہار پنبۂ مینا کہیں جسے
مجبوری و دعوائے گرفتاریٔ الفت
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے
مے عشرت کی خواہش ساقیٔ گردوں سے کیا کیجے
لئے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی
لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو
یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

نیا پن پیدا کرنے کے لئے غالب اپنے وسیع مطالعۂ علمی سے بھی مدد لیتا ہے چنانچہ ایسی چیزوں اور ایسے واقعات کی طرف اشارے کرتا ہے جو صرف وسیع المطالعہ اشخاص ہی سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

یہ سب تصویریں نہ صرف روشن بلکہ مرکب بھی ہیں اور متحرک بھی۔

غالب کے تخیل کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اسے وسیع و عریض، ارفع اور پُرعظمت چیزوں سے بہت رغبت ہے اور جلیل چیزوں کا بیان غالب اپنی تصویر کاری کے لئے غیر شعوری یا شعوری طور پر بہت کرتا ہے۔ چنانچہ دیوانِ غالب میں سیلاب، سیل، سمندر، بحر، قلزم، بیاباں، صحرا، دشت، گردوں، نہنگ، پلنگ اور اسی قسم کی اور کئی پُرعظمت چیزوں کا ذکر بار بار ملتا ہے۔ اس کی مثالیں سارے دیوان میں بکھری پڑی ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

ہے موجزن اک قلزمِ خوں، کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

★

ع بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا
ع کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

★

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اُدھر ہوتا کاش کے مکاں اپنا

★

ع دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ

وغیرہ وغیرہ

غالب کی لذت پرستی، خصوصیت سے لمسی لذت کا اشتیاق اس کی تصویروں میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ مگر غالب نے اس میں ارتفاع پیدا کیا ہے جو دوسروں نے نہیں کیا۔ جرأت، مومن اور داغ کے ہاں بھی لذت پرستی ہے لیکن غالب کی سطح سے نیچی:

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں
غالب مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے گلِ جیبِ قبائے گل
غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

آشوبِ فن

صہبا اختر

گیان دھیان کی سرد گپھا سے اُلجھی ہوئی خاموشی میں
اپنے اپنے فن کی سمادھی میں چنگاریاں ڈھونڈتے ہیں
اس امید میں راکھ سے جیسے فن کی جوالا پھوٹے گی!

ہم وہ جوگی ہیں جو ذہن کے برگد کی تاریکی میں
جب چنگاریاں بھی نہیں ملتیں راکھ کو کیا کیا پھونکتے ہیں
دل پر ہر دم جمنے والی برف یقیناً ٹوٹے گی

★

ہم وہ کالیداس ہیں جن کے خواب شکنتلا جیسے ہیں
وہ کجلی بن جس کے سائے کہر کی طرح برستے ہیں
جیسے بھی ہو تاریکی کے اک اک غار میں جانا ہے

لیکن سندر بن کے بجائے کجلی بن میں رہتے ہیں
وہ کجلی بن جس کے زہری سانپ ہمیں کو ڈستے ہیں
فن کو امر کرنے والے امرت کا کھوج لگانا ہے

★

ہم وہ میرؔ ہیں جو محروم ہیں زلفِ سیہ کی اسیری سے
لیکن اپنا بھی رشتہ ہے خونِ دل کی گلابی سے
کس دن خرقہ جُبّہ ہم نے مستی میں انعام کیا

واسطہ عطر فروشانِ حاضر کو نہیں دلگیری سے
ہم بھی بنے پھرتے ہیں پیئے بن کوچہ کوچہ شرابی سے
میرؔ کے رستے چل کر ہم نے میرؔ کو بھی بدنام کیا

★

ہم وہ غالبؔ ہیں اب جن کو قرض کی مے بھی ملتی نہیں
کوئی علائی جیسا نہیں اب ہم سے غزل لکھوانے کو
کوئی حالی کوئی شیفتہ نغمے سننے سنانے کو

کوئی رام کلی اپنے نغموں کی آنچ سے کھلتی نہیں
کوئی نہیں دور آتا دل میں رنگِ سخن برسانے کو
کوئی بہادر شاہ نہیں ہے لطف کا ہاتھ بڑھانے کو

★

میرے عہد کے کالیداسو، میرو، غالبو! بات سنو
ماہ و سال کے بارِ گراں سے جن پر جینا بھاری ہے
کون تمہاری نظم کا سامع کون غزل کا قاری ہے

مت شعروں کی سیج بچھا کر پیار کے کاغذی پھول چنو
اُن کی نظر میں شعر کا لکھنا مشغلۂ بیکاری ہے
دیدہ و دل کی گنگ فضا میں ہُو کا عالم طاری ہے

"نالۂ طائرِ بام"

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان

طائرِ زیرِ دام اور طائرِ بام کی نواؤں میں بنیادی فرق ہے۔ اور یہ فرق صدر پاکستان کی اس تقریر سے بخوبی نمایاں ہے جو انہوں نے اس سال راولپنڈی میں قائد اعظم کے یوم پیدائش کے موقع پر ارشاد فرمائی اور جس کی تلخیص ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں۔ - مدیر

آج کا دن ہم سب کے لئے مسرت و خوشی کا دن ہے کیونکہ آج قائد اعظم کا یوم ولادت ہے آج ہمارے اس عظیم لیڈر اور رہنما کی پیدائش کا دن ہے جس نے اپنی ہمت، اپنے حوصلے اور اپنی جانفشانی سے قوم کو صحیح راستہ دکھایا، پاکستان کا نظریہ لوگوں کے ذہن نشین کرایا اور ان کے ذہنوں میں اس کے خطوط کو اجاگر کیا۔

اس موقع پر ضرورت اس چیز کی ہے کہ ہم اس شخص کی روح کو خراج تحسین پیش کریں جس نے ہمارے لئے اتنا کچھ کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس مبارک موقع پر ہمیں اپنے گزشتہ افعال و کردار کا بھی جائزہ لینا چاہئے اور یہ دیکھنا چاہئے کہ ہم نے ماضی میں کون سے اچھے کام کئے ہیں اور کیا کیا غلطیاں کی ہیں۔ علاوہ ازیں ہمیں آئندہ کے لئے اپنا لائحہ عمل بھی متعین کر لینا چاہئے۔

میں اس بات کی تلقین کروں گا کہ جو باتیں میں نے کہی ہیں آپ ان پر غور و فکر کریں اور ملک کی بہبود کے لئے جو راہیں ہم نے نکالی ہیں، یا نکال رہے ہیں ان کا جائزہ لیں۔ یہی نہیں بلکہ آپ اپنے لئے جو طریقۂ کار مقرر کریں اس پر کمربستہ ہو کر عمل کریں اور اپنے اپنے دائرہ میں، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، اس کی پیروی کرنے کی کوشش کریں۔ اگر ہم یہ کر سکے تو انشاء اللہ خداوند تعالیٰ بھی ہماری مدد کرے گا اور ہمیں صحیح طور پر سوچنے اور صحیح طریقے پر عمل کرنے کی توفیق عطا کرے گا۔

دنیا میں عظیم رہنما، ایسے رہنما جو جرأت و ہمت اور اخلاق و کردار کے اعتبار سے ہم آپ سب سے بلند تر ہوں، کبھی کبھار ہی پیدا ہوتے ہیں۔ قانون قدرت یہی ہے کہ ہم ان عظیم رہنماؤں کی صفات کو اپنائیں جو کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں۔

دنیا میں ہر انسان کی زندگی میں، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا ایک دو مرحلے ایسے آتے ہیں جن پر اس کے سامنے کئی ایک راستے ہوتے ہیں اور یہ معلوم کرنا نہایت مشکل ہوتا ہے کہ کونسا راستہ ٹھیک ہے۔ جو شخص صحیح راستہ اختیار کر لیتا ہے اس کی تقدیر بن جاتی ہے۔ اور اگر خدا اس کی مدد نہیں کرتا اور بصارت اس کو مدد دینا چھوڑ دیتی ہے تو وہ غلط راستہ اختیار کر لیتا ہے۔ آج سے بیس پچیس برس پہلے قائد اعظم کے سامنے بھی یہی معاملہ تھا کہ آیا ہندوستان کی آزادی میں مسلمان بھی آزاد ہوگا یا نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد ہم غلام ہو جائیں۔ بہت سے عالموں کے دماغ میں جن میں علامہ اقبالؒ بھی شامل تھے، یہ سوال پیدا ہو رہا تھا۔

موجودہ زمانہ میں جب کہ ذرائع آمد و رفت سہل ہو گئے ہیں اور دنیا ایک چھوٹی سی جگہ بن گئی ہے اور کسی قوم کا راز کسی سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا، قوموں کے لئے اپنی آزادی برقرار رکھنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ ان حالات میں آزادی کا قائم رکھنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنے معاشرے کی خرابیوں کو دور کریں۔ بدقسمتی سے قیام پاکستان کے بعد ہمارے رہنما آزادی کے استحکام کی ضرورت کو فراموش کر بیٹھے اور قوم کو صحیح راہ نہ دکھا سکے۔ آزاد قوموں کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ ان میں ہر شخص کو اپنا فکر بعد میں ہوتا ہے اور دوسروں کا پہلے، مگر ہمارے ملک میں معاملہ اس کے برعکس تھا۔ ہم لوگ صوبائی اور قومی تعصبات کا شکار ہو کر رہ گئے تھے اور اپنے نصب العین کو بھول گئے تھے۔ ہم یہ بھی بھول گئے کہ ہمارا ملک دشمنوں میں گھرا ہوا ہے۔ بغرض قوم تباہی کے راستہ پر پڑ چکی تھی۔ لہذا یہاں انقلاب آیا۔ انقلاب اگرچہ کوئی خوشی کی بات نہیں ہے تاہم جب کوئی حکومت اپنے ملک کے معاملات کو صحیح طور پر نہیں چلا سکتی اور فتنہ و فساد کی قوتیں زور پکڑ جاتی ہیں تو وہاں انقلاب آنا لازم ہو جاتا ہے، اس لئے کہ قدرت کو امن و امان کی اقدار کو محفوظ کرنا مقصود ہے۔

انقلاب ایک ہمارے ملک ہی میں نہیں آیا بلکہ اکثر ممالک میں بشمول ایک اسلامی ملک کے، انقلاب آئے ہیں۔ مگر خوش قسمتی سے ہمارے ملک میں انقلاب اس لئے نہیں آیا کہ لوگ ایک دوسرے کے گلے کاٹیں یا لوٹ مار ہو، یا دوسری فضول باتوں میں اپنا وقت ضائع کریں۔

اس انقلاب کا رہنما میں تھا، اور مجھے صاف طور پر معلوم تھا کہ اس ملک کے مصائب کیا ہیں اور عام طور پر یہ بھی معلوم تھا کہ ان کا حل کیا ہے۔ آپ نے میری وہ نشری تقریر سنی ہو گی جو میں نے ۸ ر اکتوبر ۱۹۵۸ء کو کی تھی۔ آپ اسے پھر پڑھیں اور دیکھیں کہ گزشتہ دو سال میں ملک میں جو اصلاحات ہوئی ہیں وہ ان وعدوں کے مطابق ہیں یا نہیں جو اس تقریر میں کئے گئے تھے۔ گزشتہ دو سال میں جو اصلاحات نافذ کی گئی ہیں ان کا مقصد معاشرے کی خرابیوں کو دور کرنا اور قوم کو بیدار کرکے اس میں احساس ذمہ داری پیدا کرنا ہے۔ جب تک ہماری پوری قوم بیدار نہ ہو جائے گی، کچھ نہ ہو سکے گا۔ چند افراد کی بیداری سے کچھ نہ ہو سکیگا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم سب رات دن کام کریں، اور نہ صرف اپنا بوجھ اٹھانے کے قابل بنیں بلکہ اپنے بوجھ سے زیادہ اٹھائیں۔ موجودہ نسل کو ہی نہیں بلکہ آئندہ دو تین نسلوں کو بھی اپنی بساط سے بڑھ کر کام کرنا پڑے گا۔ تب کہیں جا کر قوم اپنے پیروں پر کھڑی ہونے کے قابل بنے گی۔ اگر آپ ایسا نہ کریں گے، تو قوم کو دو سو سالہ غلامی کے بُرے اثرات سے نجات دلا کر کس طرح ترقی کے راستے پر گامزن کر سکیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میں ایسا کرنے کی صلاحیت ہے اور انشاء اللہ! آپ ایسا ضرور کریں گے۔ اگر مجھے یہ یقین نہ ہوتا تو میں یوں انتھک محنت اور کوشش نہ کرتا اور میرے ساتھی اس طرح رات دن جانفشانی سے کام نہ کرتے۔

ہمارے ملک میں زرعی اصلاحات نافذ ہو چکی ہیں۔ یہ مساوات قائم کرنے کی طرف ایک بہت بڑا قدم ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہم جمہوریت نہیں چلا سکتے۔ حالانکہ جمہوریت تو مسلمانوں کے خون میں شامل ہے۔ ہماری تعلیمات کی بنیاد جمہوریت پر ہے۔ اسلام کا سب سے بڑا پیغام یہی ہے کہ ہم سب ایک خدا کے بندے ہیں۔ لہٰذا آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ہم میں ذات پات نہیں ہے۔ ہمارے یہاں کوئی شودر نہیں ہے۔ ہمارے یہاں رنگ و نسل کا امتیاز نہیں ہے۔ ہم سب برابر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں ہم سب برابر ہیں۔ ہم میں سے بڑا وہ ہے جس کا عمل اچھا اور ایمان پختہ ہے۔ لہٰذا ہمیں جمہوریت کا سبق سیکھنے کی ضرورت نہیں۔ صرف ایسی جمہوریت رائج کرنے کی ضرورت ہے جسے لوگ سمجھ سکیں اور جس پر عمل کر سکیں اور یہ کام ہمارے لئے کچھ مشکل نہیں ہے۔ ذرا آپ بنیادی جمہوریتوں کے اصولوں پر غور کیجئے۔ ان کا نفاذ بجائے خود کتنا بڑا انقلاب ہے۔

بنیادی جمہوریتوں کا مقصد یہ ہے کہ جہاں کہیں اور جس طرح پر بھی ہو سکے لوگوں کو حکومت کے کاروبار میں شریک کیا جائے تاکہ انہیں بھی معلوم ہو کہ ملک کے وسائل کیا ہیں اور ہم کیا کر سکتے ہیں اور کیا نہیں کر سکتے۔ علاوہ ازیں انہیں یہ بھی معلوم ہو سکے کہ ان وسائل کو کس طرح بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ اس کا دوسرا مقصد اس خلا کو ختم کرنا ہے جو لوگوں اور حکومت کے افسروں میں ہوا کرتا ہے۔ تاکہ ملک کے مختلف عناصر میں تصادم کی بجائے تعاونِ عمل پیدا ہو اور فروعات اور آپس کے جھگڑوں میں وقت ضائع نہ ہو۔ ہمارے پاس ضائع کرنے کے لئے ایک لمحہ بھی نہیں ہے۔ میں آپ سے گزارش کروں گا کہ آپ بنیادی جمہوریتوں کے فلسفے کو سمجھیں۔ بنیادی جمہوریتوں کے نفاذ کے ذریعے حکومت لوگوں کو یہ ذمہ داری سونپ رہی ہے کہ یہ تمہارا اپنا ملک ہے تم خود اس کا نظم و نسق چلاؤ۔ تم میں احساس ذمہ داری موجود ہے۔ تم اس ذمہ داری کو اٹھانے کی اہلیت بھی رکھتے ہو۔

زرعی اصلاحات اور بنیادی جمہوریتوں کے نفاذ کے علاوہ شعبۂ تعلیم میں بھی انقلابی اصلاحات نافذ کی جا رہی ہیں۔ ہم نے نئے طریقِ تعلیم کی بنیاد کچھ اس طرح رکھی ہے کہ آئندہ بیس پچیس برس کے عرصے میں ملک میں کوئی شخص ناخواندہ نہیں رہے گا۔ اس طرح آئندہ تعلیم کا مقصد بھی ضرورت کے مطابق تربیت یافتہ نوجوان پیدا کرنا ہو گا تاکہ جس قسم کے افراد کی ضرورت ہے وہ حاصل ہو سکیں۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ آئندہ حکومت مشرقی اور مغربی پاکستان کے مستحق بچوں کو سالانہ ڈیڑھ کروڑ روپے کے وظائف دے گی جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر سال تقریباً سات آٹھ ہزار مستحق طلباء وظائف حاصل کریں گے۔

یہاں ایک اور بات قابل غور ہے اور وہ یہ کہ ہماری ملی حالت پہلے سے کتنی درجہ بہتر اور مستحکم ہو چکی ہے۔ اب خدا کے فضل سے ہمارے ملک کے خزانے کی لوٹ کھسوٹ ختم ہو گئی ہے۔ ہمارے وزیر خزانہ ایک ایک پیسے کا حساب رکھتے ہیں اور میں بھی حساب کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ بھی اپنے دائرۂ اختیار میں قوم کے

سرمایہ کو ضائع ہونے سے بچانے کی پوری کوشش کریں گے۔ ہمارے ملک میں پہلے کی نسبت زیادہ تجارتی اور صنعتی سامان پیدا ہو رہا ہے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ہمارے ملک میں خوراک کی کمی بھی پوری ہو جائے۔

خدا کے فضل سے ہمارے عوام میں بھی حب الوطنی کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ اور ان میں بھی خودداری اور خود اعتمادی پیدا ہو گئی ہے۔ دیگر ممالک بھی اب ہماری ترقی کی رفتار کو محسوس کر رہے ہیں اور دیکھ رہے ہیں کہ ہم کس تیزی سے صحیح راستے پر گامزن ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے حالات پہلے کی نسبت بہت بہتر ہیں مگر یہ کہنا غلط ہوگا کہ ہماری مشکلیں بالکل ختم ہو گئی ہیں۔ ہمارے لئے ابھی سستانے کا وقفہ نہیں آیا۔ ابھی پچیس تیس برس تک ہمیں نہایت تندہی اور جانفشانی سے کام کرنا پڑے گا۔ میری نظریں دیکھ رہی ہیں، اور اگر آپ بھی ذرا دور بینی سے کام لیں تو آپ کو بھی نظر آئے گا، کہ آج سے پچیس تیس برس، زیادہ سے زیادہ پچاس برس کے بعد ہماری قوم پوری طرح منظم و مضبوط ہوگی اور ہماری طاقت بیکار باتوں پر صرف نہیں ہوگی۔

موجودہ حالات میں ایک اور خطرہ بھی درپیش ہے اور وہ یہ کہ کہیں مادی چیزوں کو حاصل کرنے کی دوڑ میں ہم روحانی اطوار کو فراموش نہ کر بیٹھیں اور اپنے نصب العین سے دور نہ ہٹ جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ مادی ترقی ہمارے لئے بہت ضروری ہے لیکن ہمیں اپنی آخرت یعنی دوسری زندگی کی بہتری کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم اسلامی اصولوں کی سختی کے ساتھ پیروی کریں۔ یہ کہنا تو آسان ہے مگر اس پر عمل کرنا مشکل ہے۔

ہم دیکھتے ہیں مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ رہی ہے اور سوائے ترکوں کے، جو کسی حد تک آزاد رہے ہیں، باقی اسلامی ممالک میں انتشار پھیلا رہا ہے، اور اکثر مسلم ممالک غیر کے قبضے میں آ گئے تھے۔ ان حالات میں قدرتی طور پر ہمارے دماغ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہم اسلام کے اصولوں کو صحیح طور پر سمجھ رہے ہیں اور ان کی صحیح پیروی کر رہے ہیں، کہ نہیں۔ ہماری سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ہم اصولوں اور طریقوں کو آپس میں ملا دیتے ہیں حالانکہ یہ دو مختلف چیزیں ہیں۔ یہ اصول کبھی نہیں بدلتے۔ طریقے بدلتے رہتے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے ملک کے مذہب دوست حضرات اس مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے غور و خوض کریں کہ اسلامی اصولوں کو برقرار رکھتے ہوئے موجودہ دور کے تقاضوں کو کس طرح پورا کیا جا سکتا ہے۔ یہ کام صرف میرا نہیں بلکہ پوری قوم کا ہے۔ ایسا نہ کیا گیا تو دنیا اسلام کو چھوڑ دے گی۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، آج سے بیس پچیس برس بعد ہر شخص پڑھنے لکھنے کے قابل ہو جائے گا۔ اور بذات خود ہر معاملہ پر غور و فکر کر سکے گا۔ اور اسے کھوکھلی نعرہ بازی سے دھوکہ نہیں دیا جا سکے گا۔ اسلام ایک سیدھا سادا مذہب ہے۔ وہ صرف سمجھنے اور پیروی کرنے کی چیز ہے بشرطیکہ ہم یہ سمجھ لیں کہ اصول اور چیز ہے اور فروعات اور شے ہیں۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو وقت کے ساتھ بدل جاتی ہیں۔ آج کل زندگی لمحہ بہ لمحہ بدل رہی ہے۔

حال ہی میں میں نے کئی ایک دوست ملکوں کا دورہ کیا جن میں کچھ اسلامی ممالک بھی تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہاں کے لوگوں کو پاکستان اور پاکستان کے حالات سے بہت دلچسپی ہے اور ان میں بڑا اسلامی جذبہ پایا جاتا ہے۔

ہمارا اپنا ملک ایک ایسا ملک ہے جو اسلام کی آواز پر بنا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی مختلف قسم کے لوگ موجود ہیں مگر اس کے باوجود مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں کے لوگوں نے مل کر پاکستان بنایا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ ان کے دلوں میں ایک جذبہ تھا۔ وہ سب ایک ہی برادری سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ ہے اسلامی برادری۔ لہٰذا ہم اس برادری سے کبھی الگ نہیں ہو سکتے۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو ہماری قومیت کی جڑ اکھڑ جائے گی۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہم اسلام کے اصولوں کو صحیح طور پر عوام کے سامنے پیش کریں۔

یہ ملک ہمارا ہے۔ ہمیں اس ملک کو بنانا ہوگا۔ ہمیں اس کے لئے قربانیاں دینا ہوں گی۔ اور انشاء اللہ ان قربانیوں کا صلہ اگر ہم کو نہ مل سکا تو ہماری آئندہ نسلوں کو ملے گا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آج قائد اعظم زندہ ہوتے تو وہ بھی یہی کچھ کہتے جو میں نے عرض کیا ہے کیونکہ یہ وقت کی سب سے بڑی اور اٹل ضرورت ہے۔ آخر میں چند ایک باتیں مختصر طور پر کہوں گا جن پر نظر رکھنی بہت ضروری ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ ہمیں سادگی اختیار کرنی چاہئے اور شادی بیاہ کی رسوم اور موت کے موقعے اور دیگر تقریبات پر جو بے جا اسراف ہوتا ہے اس کو ختم کر دینا چاہئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اپنے آپ کو محنت و کاوش کا عادی بنائیں

(باقی صفحہ ۵۰ پر)

وفاق پرور، عہد آفریں

شفیق بریلوی

چہل پہل کی ایک اور لہر جو اپنے پیچھے پُر کیف اور خوشگوار یادوں کا ایک طویل سلسلہ چھوڑ گئی اور اس کے ساتھ خیر سگالی اور یگانگت کا احساس بھی۔ یہ لہر ایک اور شاہی مہمان کی آمد سے پیدا ہوئی۔ ملکہ الزبتھ ثانی، برطانیہ جیسے عظیم تاریخی ملک کی تاجدار۔ جس جذبۂ خلوص کے ساتھ یہ شخصیت ہمارے یہاں آئی اُسی ذوق و شوق کے ساتھ اس کا خیر مقدم بھی کیا گیا اور کچھ عجب نہیں کہ جہاں تک دونوں ملکوں کے باہمی روابط کا تعلق ہے اس دورہ کے نتائج اس ہنگامی ذوق و شوق سے کہیں پائدار ثابت ہوں جن کے ساتھ ہمارے ملک میں آنے والی اس پہلی فرماں روا ملکہ کا خیر مقدم کیا گیا۔ بلاشبہ اس سے برطانیہ اور پاکستان کے باہمی تعلقات کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے اور تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ۔

خوشگوار تعلقات کا یہ دن بدن بڑھتا ہوا سلسلہ عین اُس یادگار دن تک پہنچتا ہے جب کہ آزادی کی صبح طلوع ہوئی تھی اور اس نے ہمارے باہمی تعلقات کی کایا ہی پلٹ دی تھی۔ پاکستان اور برطانیہ ایک دوسرے کے دوست اور خیر خواہ بن گئے۔ یہ برطانیہ کے روایتی تدبر کا ایک اور عمدہ ثبوت اور خوش خلقی کا مظاہرہ تھا۔ خواہ اس کی تہ میں کوئی اور ہی اسباب کارفرما ہوں جن کے باعث ترکِ اقتدار بالکل ناگزیر ہو گیا تھا ــــ کہ اس نے اپنے آزاد ہونے والے ممالک کو کلیتہً خود مختار ہو جانے پر بھی دولت مشترکہ میں شامل رکھا۔ ایسے روابط آج کل کی دُنیا میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

ان حالات میں ملکۂ برطانیہ کی ہمارے یہاں تشریف آوری ایک تاریخی اور بڑا خوش آیند واقعہ ہے۔ ان کا یہ دورۂ خیر سگالی نئے دوستانہ روابط کا نتیجہ ہے اور ان کو استوار کرنے کی عمدہ تدبیر۔ حُسنِ اتفاق سے یہ خیر سگالی ایک نسائی شخصیت کے پُر کشش روپ میں جلوہ گر ہوئی ہے جو اپنے ساتھ صنفِ نازک کا تمام تر کیف و افسوں، حسن و لطافت اور جاذبیت لئے ہوئے ہے۔

یہ امر مزید باعثِ مسرت ہے کہ تاجدار برطانیہ اور دولت مشترکہ کی سربراہ ملکۂ الزبتھ، دورِ انقلاب میں پاکستان آئی ہیں جب کہ قائدِ انقلاب کی رہنمائی میں قائد اعظمؒ اور ملت اسلامیہ کے تصور کا پاکستان عملی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اس عہد کا سب سے مؤقر ادارہ "بنیادی جمہوریت" ہے۔ ملکہ برطانیہ اس ادارے میں عوامی احساسات و جذبات کی ویسی ہی نمائندگی ملاحظہ فرمائیں گی جو ان کے یہاں برطانوی پارلیمنٹ میں نظر آتی ہے۔

دورِ انقلاب کے بعد پاکستان نے بین الاقوامی سیاست میں اپنا وقار پوری طرح قائم کر لیا ہے۔ صدر ایوب کے مشرق وسطیٰ سعودی عرب و مصر، مشرق بعید، یوگوسلاویہ اور مغربی جرمنی کے دوروں نے پاکستان کے بلند عزائم سے دنیا کے ایک وسیع حصہ کو روشناس کرا دیا ہے۔ کئی ممالک کے ممتاز فرمانرواؤں اور سیاست دانوں نے پاکستان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اس سے بیحد متأثر ہوئے ہیں۔ ملکۂ برطانیہ کا دورہ اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ ہمارے دیگر مہمانوں کی طرح وہ پاکستان کے متعلق بہترین تاثرات لے کر جائیں گی۔

اس کی جھلک ہم قبل ازیں ملکہ کے شوہر، ڈیوک آف ایڈنبرا کے دوروں میں بھی دیکھ چکے ہیں۔ جب وہ برطانوی ادارۂ ترقی سائنس کے سابق صدر کی حیثیت سے پاکستان کی ترقی سائنس کانفرنس میں شرکت کے لئے آئے تو اس موقع پر ملکہ الزبتھ نے بھی خیر سگالی کا پیغام بھیجا تھا۔ ان کا یہ دورہ دونوں ملکوں کے تعلقات کو خوشگوار بنانے اور ایک دوسرے کو زیادہ قریب لانے کا باعث ہوا۔ یوں برطانیہ نے ایک دوست ملک کی حیثیت سے پاکستان کی ترقی میں پہلے ہی سے جس اشتراک و تعاون کا عملی ثبوت دیا ہے وہ دونوں ملکوں کے باہمی روابط کا ایک روشن پہلو ہے۔

قدرتی طور پر نئے دور میں آپس کے تعلقات کی نوعیت ہی بدل گئی۔ اب دونوں ملکوں کی دلچسپی اس بات میں تھی کہ ایک کو دوسرا کیا دے سکتا ہے، اور اس سے کیا لے سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ برطانیہ جیسا پرانا، ترقی یافتہ ملک جسے زندگی کے ہر شعبہ میں صدہا سال کا وسیع تجربہ حاصل ہے، پاکستان جیسے نئے ملک کے کیا کیا کام نہیں آسکتا۔ اور حق یہ ہے کہ اس نے داد وستد کے تحت ہی سہی، اس سلسلہ میں بہت کچھ کیا بھی ہے۔ مثلاً ایک بہت بڑا کام تھا منصوبۂ کولمبو کو عملی جامہ پہنانا۔ جو کتنی ہی قوموں کے مشترکہ فائدہ کا منصوبہ ہے اور اس کے تحت ضرورت مند رکن ممالک کو فنی اور دیگر قسم کی امداد بہم پہنچائی جاتی ہے۔ حال ہی میں کولمبو پلان کی دسویں سالگرہ پر دو برطانوی عمائد نے بجا طور پر یہ اعلان کیا کہ کولمبو پلان میں شریک ممالک نے نہ صرف ایک دوسرے کو مدد دینا سیکھا ہے بلکہ دنیا کے سامنے ایک نہایت عمدہ مثال بھی پیش کی ہے۔ کہ کس طرح اس قسم کا تعاون سرمایہ اور فنی امداد دونوں میں ممکن ہو سکتا ہے۔ چنانچہ زراعت، انجینیری، طب و حکمت، تحقیق اور تعلیم کے میدانوں میں کامیابی بڑی ہی مؤثر اور حوصلہ افزا ثابت ہوئی ہے۔

اور یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ ۵۹-۱۹۵۸ء کے لئے کولمبو پلان کے تحت برطانیہ نے پہلے سے کہیں زیادہ سرمایہ و فنی امداد کا اہتمام کیا ہے۔ ۱۵ر فروری ۱۹۵۹ء میں برطانیہ نے کوئی ایک کروڑ پونڈ کا قرضہ دینے کا اقرار کیا تھا۔ تاکہ پاکستان کے ترقیاتی پروگرام، خصوصاً زرعی پروگرام، کو روبہ عمل لایا جا سکے۔ برطانوی حکومت نے جن اداروں کو تحقیق و تربیت کا سامان بہم پہنچایا یا پہنچانے کا وعدہ کیا ان میں سے بعض یہ ہیں۔ ڈھاکہ ٹیکسٹائل ٹریننگ سنٹر، گورنمنٹ کالج لاہور ریڈیو آئسوٹوپ سنٹر، سندھ ایگریکلچرل اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، اور سرامکس انسٹی ٹیوٹ ڈھاکہ۔

پچھلے سال کے وسط تک ۲۵۸۲ تربیت پانے والوں کو برطانیہ میں خندہ پیشانی سے قبول کیا گیا۔ اس سال برطانیہ نے کل ۳۷ ماہرین کی خدمات مہیا کیں۔ اسی طرح برطانیہ نے ڈھاکہ کا شہری پلان تیار کرنے کے لئے ایک برطانوی کمپنی کی خدمات مہیا کیں۔

برطانیہ شروع ہی سے سائنس اور صنعتی ترقی کا گھر رہا ہے اور یہاں کے کئی ادارے خاص خاص معاملات میں بے انتہا مہارت رکھتے ہیں۔ مثلاً یہ ایک ایسا ملک ہے جس کے عروج میں بحری طاقت کو خاص دخل رہا اور اس کی مہارت جہاز سازی کی صنعت میں مسلم ہے۔ چنانچہ برطانوی کمپنیوں نے ہمارے یہاں اس قسم کے کاموں میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ ایک طرف کراچی کی نئی بحری اور شہری گودیاں، دوسری بندرگاہ چاٹگام کی طویل المیعاد ترقی، انہی کی کاروباری سرگرمیوں کا نتیجہ ہے۔ ایک بہت بڑی مہم تھی سوئی گیس کی ۳۵۰ میل لمبی پائپ لائن بچھانا — سوئی (بلوچستان) سے لے کر کراچی تک اور وہاں سے ملتان تک اس کی کافی بڑی توسیع —— اسی سلسلہ میں ڈیزل طاقت کی تنصیب کی ضرورت بھی پیش آئی اور یہ کام بھی ایک برطانوی کاروباری ادارے ہی نے دوسروں کے ساتھ مل کر انجام دیا۔ ادھر سکھر بیراج پر ایک ۷۰۰ فٹ لمبا پل تعمیر کرنے کے علاوہ برطانوی انجینیر منگلا بند تعمیر کرنے میں بھی مصروف ہیں۔

ایک اور ماہرانہ صنعت الیکٹرونکس یعنی برقیات ہیں جن کی کتنی ہی صورتیں ہیں۔ اور جن کی پاکستان کو ایک نیا ملک ہونے کے باعث خاص ضرورت رہی ہے۔ اور اب جب وہ اپنے دوسرے پنج سالہ عظیم الشان منصوبے کو روبہ عمل لانے کی تیاری کر رہا ہے اسے اس کی اور بھی زیادہ ضرورت ہوگی۔ ظاہر ہے کہ موجودہ زمانے میں برقیات کو ہر قسم کی ترقیات میں کس قدر بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ٹکنالوجی کے اعتبار سے بھی اور اقتصادی حیثیت سے بھی۔ برطانیہ برقیاتی کنٹرول اور سامان دونوں میں بیک وقت شروع ہی سے مدد دے سکتا ہے۔

آج کل اُن تمام ممالک کو جو ترقی کے میدان میں قدم رکھ رہے ہوں، دوسرے ممالک کے ساتھ مواصلاتی ربط کی اشد ضرورت ہے جس کے لئے ٹیلیگراف، ٹیلیفون اور براڈکاسٹنگ کی سہولتیں اور تیز رفتار مواصلات لازم ہیں۔ اس سلسلہ میں برطانوی ماہرین کا تجربہ بہت مفید ثابت ہو رہا ہے۔ پاکستان میں اس کی اور بھی ضرورت ہے۔ اسلئے کہ اس کے دونوں حصوں میں بہت بڑا فاصلہ ہے اور اس کو پاٹنے کے لئے نہایت ہی اعلیٰ درجہ کے برقیاتی سلسلوں اور انجینیری میں مہارت کی ضرورت ہے۔ جن میں ملٹی چینل مائیکرو ویو سلسلے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ یوں بھی تمام اقتصادی ترقیاتی منصوبوں میں شہری انجینیرنگ کی اشد ضرورت ہے۔ پاکستان پہلے ہی برطانوی کاروباری اداروں کا مہیا کیا ہوا برقیاتی سامان برت رہا ہے۔ جس میں اعلیٰ ارتعاش کے وہ ٹرانسمٹر

بھی شامل ہیں جو ہند سے پار ٹیلیگرافی اور ٹیلیفونی سلسلہ میں کام آ رہے ہیں۔ پاکستان میں بعض بڑے بڑے معاون منصوبے اختیار کئے جانے کی بھی توقع ہے۔ مثلاً جہلم پر منگلا اور سندھ پر تربیلا کے مقام پر بندوں کی تعمیر ان کے لئے بھی غیر معمولی مہارت درکار ہے۔ اور برطانوی کاروباری ادارے ایسے معاملات میں اپنے حسن کارکردگی کے لئے مشہور ہیں۔

برطانوی کاروباری اداروں کو تیل کی تلاش سے بھی ربط و سروکار رہا ہے۔ یہ ایک اور میدان ہے جس میں ان اداروں نے خاص دلچسپی لی ہے اور پاکستان میں تیل کی جستجو میں بڑی سرگرمی دکھلائی ہے۔

یہ افادی نوعیت کی سرگرمیاں بجائے خود بہت اہم ہیں لیکن ان سے کہیں زیادہ دقیع اور نتیجہ خیز وہ تہذیبی و ثقافتی استفادہ باہمی ہے جو دونوں قوموں پر پہلے بھی اثر انداز ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے۔ اس سلسلہ میں برٹش کونسل کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ جو عملاً ثقافتی فیضان کا وسیلہ ثابت ہو رہی ہے۔

ان سطور میں مختلف قسم کی سرگرمیوں کا ذکر محض بر سبیل تذکرہ کر دیا گیا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ان کی کئی اور صورتیں بھی ہوں گی جو خاصی اہم ہیں۔ اور ان کا سلسلہ آئندہ بھی اسی طرح جاری رہے گا جو دونوں ملکوں کے لئے فائدہ مند ثابت ہوگا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۸۷۳ء میں برصغیر کی نمائندہ طاقت کی حیثیت سے ملکہ الزبتھ کی جدۂ ماجدہ ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں ایک بیش قیمت ہار پیش کیا تھا۔ اب ان کی جانشین آزاد و خود مختار عوام کی طرف سے اس ہار سے کہیں زیادہ خوشنما اور گراں قدر تحفہ لے کر اپنے وطن واپس جائیں گی۔ اور یہ تحفہ ہوگا آزاد انسانوں کی آزاد سرزمین، پاکستان کے گہرے نقوش و تاثرات۔

گنج خرابات: ——— بقیہ صـ۴۳

جواب: ارے بھئی! لکھنؤ اب لکھنؤ کہاں رہا۔ خدا کو منظور ہی یہ تھا کہ اِندر کا اکھاڑا شہرِ خموشاں بن جائے۔ ہم جیسے دو چار مرثیہ خواں رہ گئے ہیں۔ یہ بھی اپنی اپنی ہڑواڑیں جا بسے تو بس افسانے ہی افسانے رہ جائیں گے۔ کون یقین کرے گا کہ اس شہر میں کبھی ایسے بٹیر بھی لڑتے تھے۔ ایسی کنکوے بازی بھی ہوتی تھی ؎

مِٹ گئی زندہ دلی اِک لکھنؤ کیا مٹ گیا
میتیں رکھی ہوئی ہیں نوحہ خواں کوئی نہیں

نقش ہائے رنگ رنگ: بقیہ صـ۱۹

و دیگر من در جواب خط سامی جز خاموشی چارہ ندارم۔ ازیں جہت سکو[ت] در آں مشفق نوشتہ امامت امریست یزدانی۔ انصاف فرمایند کہ کدام [امر] کہ یزدانی نیست و ایں چہ تعریف امامت است کہ شما کردہ اید۔ [و] امامت و خلافت جز عارفان کامل کم کسے میداند۔ اگرچہ پیدا [شدہ] آید [افسو]س۔ افتد۔ اللہ تعالیٰ آں روز بظہور آرد کہ ملاقات ما و شما شود و گفتگو[ئے] جمع امور بالمشافہ کردہ آید۔ معنی المکتوب نصف الملاقا[ت] ازیں خط سامی دریافت گردید و اگر طبیعت سامی خواہد تحقیق [کند] و ایں خط را روبروئی علما و فقرا، آنجا گزارید و ملاحظہ فرمائید کہ کدا[م] محمود است و کدام مذموم و ما کہ علی علیہ السلام را تفضیل میدہیم م[وافق] کلام اللہ و حدیث شریف است نہ از مذہب تراشیدۂ خود [...] آنچہ از سینہ زوری جواب خواہند داد مسلم نخواہم داشت۔ اگر ا[ز] و حدیث شریف و قول علما صوفیہ و تحریر فقیر پسند افتد یا نہ افت[د] اس سوائی از کلام اللہ و حدیث شریف نمی خواہم۔ و عقل سلیم آں [کہ] مطابق کلام اللہ و حدیث شریف باشد نہ خلاف آں۔ بس اگر آیت در بطلان خلافت جناب امیر علیہ السلام ہم نہ رسد مناسب اس[ت] شوقیہ بنویسند و ایں قصہ را موقوف نمایند چرا کہ از چنیں سخناں [...] ہیچ فائدہ نیست والسلام علی من اتبع الہدیٰ فقط غمگین (۵۶)

غالب کی تصویر کاری: بقیہ صـ۲۵

چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے
خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جامِ جم سے تو مرا جامِ سفال اچھا ہے

یہاں پیراہنِ کاغذی، مہِ نخشب اور ساغرِ جم کی تلمیحیں علمی حیثیت [...]

غرض غالب کی تصویر کاری کی امتیازی خصوصیتیں [...] نیا پن، لذت پرستی، جلالت کا احساس، رنگا رنگی، چمک د[مک] حرکی انداز۔ ان کے علاوہ ایک اور خصوصیت بھی ہے ــ مشکل [...] لیکن میں نے عمداً اس کا ذکر نہیں کیا، کیونکہ یہ خصوصیت غالب [کے] ابتدائی کلام میں بہت نمایاں ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ غا[لب کو] غالب بنانے والا اس کا ابتدائی کلام نہیں جو بیدل کی پیرو[ی میں] لکھا گیا، بلکہ بعد کا کلام ہے۔

رپورتاژ:

اِک خواب نما دنیا!

محمد عمر میمن

حیدرآباد کی گرم خشک فضا میں میرا پانچواں دن ہے، اور کل میں پھر کراچی لوٹ جاؤں گا۔ روشنیوں کے شہر میں جہاں زندگی روشنیوں اور سایوں کے ہر لحظہ تغیر پذیر تماشے کا بڑے تواتر سے پیچھا کرتی ہے۔ زندگی پھر اسی ڈگر پر لوٹ آئے گی جس پر اب سے کچھ شب و روز پہلے محوِ خرام تھی — اور پھر وہی گہما گہمی ہوگی، نیم روشن نیم تاریک چائے خانوں کی مانوس، پرسکون ٹھنڈی فضا ہوگی، فیملی روم ہوں گے، بارہا آئی گئی مہربان گذرگاہیں ہوں گی اور پے در پے قدموں تلے روندی گئی ساحلی تفریح گاہیں۔

آیئے اس اثنا میں آپ کو حیدرآباد کی مختصر سی سیر کرا دوں۔ میرانِ سندھ کا سابق دار الخلافہ، حیدرآباد، محمد بن قاسم، فاتح سندھ کی امیدوں کا مرکز جس نے ماہر تاریخ دانوں کے اندازے کے مطابق نیرون کوٹ کے بھیس میں کفر کی بیخ کنی اور تبلیغ اسلام کی دعوت دی تھی۔ اور آج بھی اس کی حیثیت وادیٔ مہران کے سب سے بڑے اور بھرے پرے شہر سے کم نہیں۔ آج ہم بھی اس کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ موجودہ حکومت کے ماتحت یہاں ہونے والی بیشتر اصلاحی اسکیموں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ مستقبل میں یہ بھی ایک چھوٹے موٹے جگمگاتے، روشنی اور نور کے سیلاب میں بہکتے ہوئے کراچی سے کم نہ ہوگا۔ وادیٔ مہران کے تمام تجارتی لین دین کا سب سے بڑا مرکز۔

گو یہ شہر آج اپنے قابلِ فخر ماضی کی تمام شان و شوکت کھو بیٹھا ہے لیکن اس کے باوجود یادِ رفتہ کے چند مدھم مدھم، مبہم مبہم، مٹے مٹے سے نقوش جو کچھ ٹوٹی پھوٹی حالت میں زمانے کی دست برد سے باقی بچ گئے ہیں، ہمیں دعوتِ نظارہ دے رہے ہیں۔ اب سے کوئی دو سو سال پہلے اس چھوٹی چھوٹی گیروے رنگ والی اینٹوں کے شہر کی بنا رکھی گئی تھی۔ یہاں ہمیں لاہور کے سے پرشکوہ، مسکراتے گنگناتے، اپنے ماضی کی شان و شوکت کے فسانے ہائے جمیل دھیمی اور مدھم سرگوشیوں میں سناتے دیدہ زیب پُرکیف باغات نہیں ملتے اور نہ فنِ تعمیر کے اعلیٰ ترین شاہکاروں ہی سے نظر آسودہ ہوتی ہے۔ — لیکن ایک تاریخی شہر ہونے کی حیثیت سے اس کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے؟ کراچی سے ایک سو گیارہ میل دور یہ چھوٹا سا شہر ہمیں دعوتِ نظارہ دے رہا ہے۔

اس وقت ہم تلک چاڑھی پر کھڑے ہیں جس کے ہر دو جانب جگمگاتی زندگی کی ضروریات سے بھری پری دکانیں ہیں۔ اس کی شمالی جانب جو ایک پختہ سڑک جا رہی ہے، آگے چل کر یہ ایک دوراہے پر دو گزرگاہوں میں منقسم ہو جائے گی۔ دائیں سڑک آگے چل کر مارکیٹ سے ہوتی ہوئی لہرا کر شاہی بازار سے مل جاتی ہے اور بائیں جانب والی سڑک رکروٹنگ آفس سے ہوتی ہوئی لیاقت میڈیکل کالج یا سول اسپتال تک جاتی ہے۔ اب ہم اسی سڑک پر مغرب کی جانب رخ پھیر کر چلتے ہیں۔ یہ ابتدائی ہے یا نشیب ہے! کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے تک یہ نشیب باقی رہے گا۔ اس کے بعد ہم بائیں جانب مڑ جائیں گے۔ ایک طویل سڑک کی طرف جو برابر اسٹیشن تک پہنچتی ہے۔ اسے اسٹیشن روڈ اور بابائے ملت کے نام پر محمد علی جناح روڈ بھی کہتے ہیں۔

ہم نشیب طے کر چکے ہیں اور بائیں جانب مڑ گئے ہیں۔ بائیں طرف سب سے پہلی دو منزلہ سرخ عمارت نذرکھا کالج صرف خواتین کے لئے ہے۔ —— اور یہ اس سے ملا "سینٹ میریز کانوونٹ گرلز اسکول" ہے۔ جس میں ننھے شگوفوں جیسی بچیاں نرسری رائمز گنگناتی تیتریاں اپنے کومل وجود لئے منڈلاتی پھرتی ہیں۔ اس سے متصل چرچ ہے جس کے عقب میں ایک طویل و عریض میدان چھوڑ کر مستقبل کے جناح، سارتر، شیکسپیر اور کیٹس کے لئے ایک اسکول ہے۔ یہ چرچ اسکول کے احاطہ ہی میں ہے۔ اسکول کا نام "سینٹ بونا وینچرس کانوونٹ اسکول" ہے۔ ٹھہریئے، اپنے قدموں کے اضطراب کو روک لیجئے۔ اس اسکول سے میرے بچپن کی

بہت سی یادیں وابستہ ہیں، اس لئے کہ تقسیم کے بعد دو سال تک میں نے اسی کے ابتدائی درجوں میں تعلیم پائی ہے۔ میں جب بھی یہاں سے گزرتا ہوں اپنے گرد و پیش کو فراموش کر کے چند لمحات کے لئے بچپن کے اُن موہوم جزیروں میں لوٹ آتا ہوں جہاں خوشنما دھند ہر طرف پھیلی ہوتی ہے۔ اور ذہن حوادث عالم کی المناکیوں سے ناآشنا رہتا ہے۔ یہ میرا اسکول ہے، میں اسے سلام کرتا ہوں۔ رکئے، ٹھہریئے۔ مجھے ذرا دیر کو فادر روآس، فادر رفرانسس، پستہ قد ہنس مکھ شریر، شریف النفس مضبوط اعضاء، فادر پنٹو اور راما دام ـــ کے متعلق سوچ لینے دیجئے ـــ میری ذہنی تشکیل میں ان سب کا کتنا بڑا ہاتھ ہے۔

اس سڑک پر دونوں جانب میونسپل ہال ہے جس کے صحن میں نماز کے وقت مومنین کی ستھری قطاریں بے حد دلفریب لگتی ہیں۔ اور دل میں مانوس مذہبی جذبات کو بیدار کر دیتی ہیں۔ اور آگے چلئے۔ ہاں یہی، اسے حبیب بینک کہتے ہیں جس کی بیشتر شاخیں تمام پاکستان میں جال کی طرح پھیلی ہوئی ہیں۔ اور اس سے کوئی دو فرلانگ آگے ـــ جی! یہ گاڑی کھاتہ ہے۔ کہنے کو تو یہ گاڑی کھاتہ ہے لیکن یہاں گاڑیاں بس خال خال اور لوگوں کا اژدہام دکھائی دیتا ہے۔ غالباً اسے گاڑی کھاتہ اس مناسبت سے کہا جاتا ہے کہ یہاں ایک چھوٹا سا پیاؤ ہے جہاں وکٹوریہ والے اور تانگے والے اپنے گھوڑوں کو پانی پلاتے ہیں۔ گاڑی کھاتے کے چوک سے بائیں جانب فرانس ہے جس پر کوئی فرلانگ بھر چلنے کے بعد ہمیں ریڈیو اسٹیشن ملتا ہے۔ یہاں پر محض تین اسٹوڈیو ہیں، اکثر میں شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کی مترنم کافیوں کو سنتے سمے بے اختیار ریڈیو اسٹیشن کو یاد کر لیتا ہوں۔ ریڈیو اسٹیشن سے ملحق ایک باغ ہے جس میں ریڈیو کا بلند ایریل ایستادہ ہے۔ رات کے گھور اندھیروں میں اس کی چوٹی پر چمکتا ہوا سرخ قمقمہ بالکل سمندر کی لامحدود وسعتوں میں بڑے عزم اور استقلال سے ایستادہ روشنی کے مینارے کی طرح معلوم ہوتا ہے جس کا کام بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہ دکھانا ہے۔

چوک سے دائیں جانب جو سڑک جاتی ہے۔ اس پر آگے چل کر ہمیں دائیں جانب فردوس ٹاکیز اور اس سے ذرا آگے بائیں طرف سندھ یونی ورسٹی ملتی ہے۔ پھر آگے چل کر یہی راستہ گدو روڈ میں تبدیل ہو جاتا ہے جہاں کوٹری بند سے ذرا پہلے مشہور منحرف المرکز افراد کی آخری آرام گاہ ہے ـ مینٹل ہاسپٹل۔

اگر ہم بلا مڑے چوک سے ناک کی سیدھ میں گزر جائیں تو آدھے میل کی مسافت کے بعد ریلوے اسٹیشن آتا ہے۔ بات کہاں سے نکلی تھی کہاں جا پہنچی۔ گاڑی کھاتے کی اہمیت ایک اور وجہ سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ وہ یہ کہ چوک سے دائیں طرف یونی ورسٹی اور گدو بندر جانے والی سڑک پر دس ہی قدم دور بائیں ہاتھ کو "افضل ہوٹل" ہے اور دائیں طرف دو منزلہ "سلطان ہوٹل"۔ ذرا آگے ایک نام نہاد کافی ہاؤس ہے۔ سلطان ہوٹل کی زیریں منزل سے ملی ہوئی دو ایک پان فروشوں کی دکانیں ہیں اور رسائل فروشوں کے تختے۔ جن پر بڑی خوبصورتی اور سلیقے سے وہ رسائل اور کتب پھیلائے ہر راہ گیر کو منتظر نظروں سے گھورتے ہیں۔ ہوٹل کا چھت سے مبرا صحن، جس میں گردش دوراں کے خلاف مدت سے سینہ سپر میز کرسیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ ہوٹل کی بالائی منزل اور نام نہاد کافی ہاؤس کا ہال۔ یہ سب وادی مہران اور سابق صوبۂ سندھ کے اس مشہور شہر کے سخن وروں کے مراکز ہیں۔ شام کے ڈھلتے سایوں اور مدھم ہوتی ہوئی روشنیوں کے وقت یہاں بڑی چہل پہل اور گہما گہمی ہوتی ہے۔ کراچی کے زیلین کافی ہاؤس، کیفے ٹیریا، کیفے جارج، اور لاہور کے پاک ٹی ہاؤس، شیزان اور انٹرنیشنل، چائنیز لنچ ہوم، وائی ایم سی اے کی طرح یہ بھی یہاں کے شعراء اور ادباء کے اڈے ہیں۔ گاؤں کی چوپال کی طرح جہاں دن بھر کڑی دھوپ میں مشقت کر کے ستانے کی غرض سے اور حقہ گڑگڑانے کے لئے سادہ لوح دہقان آ بیٹھتے ہیں، ٹھیک اسی طرح اپنے اڈوں پر یہاں کے ادیب، شاعر اور نقاد حضرات دن بھر اپنی نوکریوں میں کولہو کے بیل کی طرح جُتے رہنے کے بعد سانجھ پڑے کرشن کنہیا کی طرح آن بیٹھتے ہیں اور اپنے زرد زرد چہروں پر پھیلے کرب کو سستی چائے کی چسکیوں اور سگریٹ کے دھوئیں میں سمو دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب دیکھئے ادب کے مختلف فیہ مسائل پر بحث ہو رہی ہے۔ اور موزیک کی میز پر دنادن اپنے نکتہ کی وضاحت کے لئے گھونسے برس رہے ہیں۔ یا بقول حبیب جالب:

بحث یہی کرتے رہتے ہیں سست ادب کی ہے رفتار

آپ کسی ادیب یا شاعر سے ملنا چاہیں تو اس کا گھر کہاں ڈھونڈتے پھریں گے کہیں "چھوٹی گھٹی" "فقیر کا پڑ" جیسے صوتی اعتبار سے بے ہنگم سے پھیلے نیم روشن محلہ کی پتلی پتلی گلیوں میں ہوگا۔ بس شام کو انہیں مراکز میں آ جائیے۔ ملاقات یقینی ہے۔

آپ کو یاد ہوگا، ٹانگہ گاڑی سے اُتر کر ہم اب اسٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔ بیچ میں یہ چوک آگیا ہے۔ نہ ہم یونی ورسٹی کی طرف مڑتے ہیں اور نہ ریڈیو اسٹیشن کی طرف بلکہ سیدھے ہی چلتے ہیں۔

رُک کیوں گئے؟ آسیئے نا۔ اچھا اچھا آپ پان خرید لیں۔

ہاں بالکل، یہ ایک گرم دوپہر ہے اور شہر کسی بچاری یا کاہن کی سنہری عبا کے جھلملاتے رنگوں کی طرح حسین اور جگمگاتا ہوا ہے۔ امواج کی مدھم مدھم، تیز آہنگ والی پرجوش، نقرئی، دھیمی، تیز آوازیں، اس کی چیخیں، اس کی کراہیں، ابلتے ہوئے قہقہے باہم مدغم ہوکر بالکل ان مناجات شکر کی مانند محسوس ہوتے ہیں جو زندگی کے لئے الجھی الجھی سانسوں کے درمیان گائی جا رہی ہوں۔ سورج نصف النہار پہ پوری شدت سے چمک رہا ہے۔ اور شدید گرمی کی لہریں نیلگوں آسمان کی دبیز دھندلاہٹوں سے نیچے یوں آرہی ہیں جیسے زمین کے فراخ سینے پر پڑنے والی سورج کی ہر ہر کرن کوئی آگ کی حدت سے گرم اور سرخ شمشیر ہے جو اس کے سینے میں پیوست کردی گئی ہے۔

یہاں دن کے وقت گرمی ضرور رہتی ہے، لیکن یہاں کی شام گو شام اودھ تو نہیں ہوتی، تاہم تپتے دن کے مقابلے میں ضرور فرحت بخش اور پر کیف ہوتی ہے۔ شام کو ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی آجاتی ہے اور راتیں، ریگستان کی راتیں تو اپنی ٹھنڈک کے لئے ویسے بھی مشہور ہی ہوتی ہیں۔

جی ہاں، یہی بالکل یہی۔ یہ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کا آفس ہے اور مشہور پختہ قلعے کے زیریں حصّہ میں ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں اسٹرک کے سہارے سہارے قلعے کی بلند و بالا فصیلیں دکھائی دیتی ہیں۔ بس اسٹیشن یہاں سے فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ دور ہی ہے۔ اچھا یوں ہی سہی، آپ کا اصرار ہے تو ہم اسٹیشن کی بجائے پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے آفس سے ملی ہوئی بائیں جانب والی سڑک پر مڑ جاتے ہیں، پہلے قلعہ ہی دیکھ لیں۔

یہ سڑک ہماری راہبر ہے۔ یہ ہمیں اونچائی پر لے جائے گی۔ حتیٰ کہ ہم شکستہ قلعے کے بھاری پھاٹک تک پہنچ جائیں گے جہاں ماضی کی عظمتوں کی کتنی ہی کہانیاں آج مدفون ہیں۔ ہم قلعے کے دروازے پہ پہنچ چکے ہیں۔ تاریخ کے اوراق الٹنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ قلعہ سندھ کے فرشتہ سیرت حکمران غلام شاہ کلہوڑا نے بنوایا تھا۔

یہ قلعہ چونے پتھر کی اس پہاڑی کے انتہائی جنوبی سرے پر واقع ہے جس کو یہاں کے لوگ مقامی زبان میں "گنجو ٹکر" کہتے ہیں۔ جس کا مطلب غیر سبز و شاداب ٹیکری نکلتا ہے۔ اس گنجو ٹکر پر حیدر آباد کا پورا شہر آباد ہے اور اس کے چاروں طرف نشیب میں دیگر علاقے ہیں۔ مغربی حصہ میں حیدر آباد چھاؤنی اور مشرقی حصّہ میں نہر پھلیلی وغیرہ۔

یہ پرشکوہ قلعہ جس میں اب صرف چند ہی ٹوٹے پھوٹے، لوگوں کی بد احتیاطی اور وقت کا شکار پرانے ڈھانچے ہی رہ گئے ہیں، ہمارے ذہن کو بے اختیار حال کی دبیز ردا ہٹا کر ماضی کی اُن گم گشتہ گزرگاہوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ جب یہ قلعہ کبھی زندگی کی تمام حرارت اور جلوہ سامانیوں سے مرصع رہا ہوگا۔ اور اس کے بلند میناروں سے جھانکتی ہوئی جمیل شہزادیوں کی محبت میں سرگرداں ہوکر اجنبی دیسوں کے شہزادے اس کی فصیلوں کے زیر سایہ آپس میں نبرد آزما ہوئے ہوں گے محض ایک مسکراہٹ کے حصول کے لئے، زر و سیم، پرنیاں و حریر میں لپٹے ہوئے ایک کنوارے نسوانی وجود کو اپنے میں جذب کر لینے کے لئے — اور کون جانے ان کی چشم بیمار سے گھائل ہوکر ہی کتنے قلعے کی فصیلوں تلے گرے ہونگے!

آپ کو اپنی امیدوں کے مطابق یہاں شہزادوں اور شہزادیوں کے محلات نہیں ملیں گے جن کا آپ نے تصور کیا ہوگا:

"وہ بزم اٹھی، وہ شمع بجھی، وہ ساز و سامان دور گئے!"

چنری کے ملائم کونوں کو دانتوں میں دبا کر بل دینے، شرما کے کبھی چھپ چھپ جانے اور ہنس ہنس کے دل میں آنے والے کی محبت کی جوت جگانے اپنی راچل دینے والیاں اب کہاں! حسن کے طوفان بہت دور بہک چکے ہیں اور عشق کے تمام ساحل ڈوب گئے ہیں۔ دیکھئے تو، ہاں کیسی فسردگی اور تیرگی ہی تیرگی پھیلی ہوئی ہے یہاں اپنی آنکھوں کی نمی کو پونچھ دیجئے، یہ تو زمانے کا ازل سے ہی دستور رہا ہے:

"مٹا کر بنانا، بنا کر مٹانا"

اس میں تعجب کیا؟ وہ دیکھئے، قلعے میں کتنی بے ترتیبی سے مہاجرین کی سیدھی سادی جھونپڑیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ دلچسپی کی وہاں دو ہی چیزیں رہ گئی ہیں۔ ایک تو حفاظتی مینارہ جو ہر قلعے کے لئے بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اور دوسرا وہ منقش کمرہ جہاں اب بھی شکستہ، رنگ و روغن سے کسی حد تک بھرا، پھیکی پھیکی

تصویریں ماضی کے ان باکمال مصوروں کی فن کاری اور ماہرانہ چابکدستی کے فسانے بیانگ دہل دہرا رہی ہیں۔ ویسے یہاں ایک بہت بڑا خوش وضع حوض بھی ہے جو باشندگانِ حیدرآباد کے لئے پانی فراہم کرتا ہے۔ آیئے اس منقش کمرے کی طرف چلیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں نا۔ اس کمرے کی چھت ملمع شدہ ہے۔ اور اس کی دیواروں پر اب بھی کچھ مٹی مٹی سی مختلف رنگوں سے مزین تصویریں ہیں۔ اس دیوار کو تو دیکھئے، ہاں یہی — یہ منظر خاصا واضح ہے معلوم ہوتا ہے وقت کی دودھاری تلوار اس کی حقیقت پسندی کے سبب اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ — یہ کیا منظر ہے! اچھا تو سنئے، اس میں رنجیت سنگھ کی لارڈ ڈلیک سے جو ۱۸۳۱ء میں ملاقات ہوئی تھی، اس کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

اگر آپ ذرا سی کوشش کر کے حفاظتی مینارے پر چڑھ سکیں تو آپ کو وہاں سے پورے حیدرآباد کا نقشہ دکھائی دے گا۔ اور سب سے پہلی چیز جو آپ کی نگاہ کو اپنی جانب مائل کرے گی وہ ہیں گھروں کی چھتوں پر ایستادہ لکھو کہا بادگیر۔ پرانے لوگوں کی ہنرمندی کی داد دیجئے۔ انہوں نے کتنی فنکاری سے گرمیوں کی جھلستی تپتی دوپہروں میں اپنے کو ٹھنڈی فرحت بخش ہوا پہنچانے کے لئے یہ نسخہ دریافت کیا تھا جو آج بھی ان کی عظمت کا معترف ہے۔

اچھا تو گویا آپ مُصر ہیں کہ حفاظتی مینارہ پر ضرور چڑھیں گے۔ یوں ہی سہی۔ دیکھئے سنبھل کے۔

اب ذرا مغرب کی جانب زاویۂ نگاہ مرکوز کیجئے۔ چند فرلانگ کے فاصلے پر آپ کو زمانے کے ہاتھوں شکست کھایا ہوا ٹوٹا پھوٹا مٹی کا یہ قلعہ جو نظر آرہا ہے — ہاں یہی، اس کے اندر ایک وہ مقام بھی ہے گا جہاں فرشتہ خصلت نیک صفت شاہ مکائی کا قیدِ حیات سے آزاد جسمِ خاکی ابدی نیند سو رہا ہے! اس سے اور آگے مغرب میں بہت دور جہاں ملاقت ور دریائے سندھ کا چمکیلا سنہری پانی سورج کی روشنی میں یوں جگمگا رہا ہے۔ جیسے کوئی ریشم کا کپڑا چاندی اور سونے کے موٹے موٹے تاروں سے مرصع جگمگا رہے۔ اگر آپ اس وقت دریا کے کنارے ہوسکے تو ضرور دریا کی گرم موجوں کو ریتیلے ساحل سے آشفتہ سر ٹکراتے سنئے، دلفریب موسیقی کو سنئے جس کو سن کر آپ کو بے اختیار یوں محسوس ہوتا جیسے وہ اس سرچشمۂ حیات، منبعِ زیست اور مسرت کے حضور بہت ہی دلکش سروں میں نغمۂ حمد گا رہی ہیں۔ یہ سورج — حیات کا سرچشمہ ہی تو ہے!

یہ ہندوؤں کی دیوی ہے۔ سندھ کا نیل ہے جو سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا سورج کی سنہری روشنی میں مسرور بہہ رہا ہے کبھی اس کا بہاؤ شہر کی مشرقی جانب تھا۔ لیکن اپنی لاابالی چلبلی روایت کے مصداق آج یہ بڑے الھڑپن سے دوسری جانب بہہ رہا ہے۔ اس کی ننھی منی سیمابی لہریں سورج کی کرنوں کی نورانی قبا میں جگمگا رہی ہیں۔ یہ ماں ہے، اس نے اپنی کوکھ سے کتنی ہی نہروں کو جنم دیا ہے۔ آہ! یہ وہی تو ہے جس کے پُرمسرت سینہ پر آنحضرت صلعم کی پیدائش سے صدیوں پہلے سقراط کے دیس یونان کے فوجوں سے بھرے جہاز بڑی ہم آہنگی سے ایک ذلیل ارادے سے بہے تھے، بڑے طمطراق سے۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کو مسخر کرنے چلے تھے۔ تاریخ کے صفحات کو ذرا اور الٹیئے۔ انگریزوں کے جہاز بھی اس کے سینے پر اپنی سفاکی کے ہزاروں نشانات ثبت کرتے اب سے صرف چند صدیوں قبل بہے تھے۔ یہ دیوی کتنی حسین ہے، یہ سدا جوان رہے گی اور آنے والی خزائیں اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گی۔ اس کو حیاتِ دائمی حاصل ہے۔ سنئے تو، کنارے سے ٹکراتی ہوئی موجیں کتنے دلکش مدھم سروں میں یہ مژدہ سنا رہی ہیں:

"پرانے چراغ جھلملا کر ایک نہ ایک روز خاموش ہو جائیں گے، پھر نئے چراغ روشن ہوں گے۔ لوگ یوں ہی آتے اور جاتے رہیں گے لیکن میں — سدا جوان رہوں گی۔ اسی ہم آہنگی سے بہتی رہوں گی۔ انسان کتنا ہی سفاک کیوں نہ ہو جائے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا!"

بہت دیر ہوگئی۔ آیئے اب حفاظتی مینارے سے نیچے اُتر آیئے۔ نہیں! کیوں بھلا —؟ اچھا! دریا کے حسن نے مسحور کرلیا ہے، اچھا اب تو آجایئے ہم شام کو اس کے پاس چلیں گے۔

اب ہم قلعے کے شکستہ دروازے سے نکلتے ہیں۔ اپنی نگاہیں، سامنے ہی جمائے رکھئے — یہ میل ڈیڑھ میل لمبا بازار ہے جسے شاہی بازار کہا جاتا ہے۔ یہ ایک محراب دار اونچے دروازے پر آکر ختم ہو جاتا ہے۔

یہ بازار یہاں کے تمام تجارتی لین دین، اور خرید و فروخت کا مرکز ہے۔ پان بیڑی سگریٹ سے لے کر آلات موسیقی تک یہاں دستیاب ہوتے ہیں۔ یہ یہاں کا سب سے بڑا شاپنگ سنٹر ہے۔ یہاں کی رونق ہے، یہاں کی ایلفی اور یہاں کا چاندنی چوک ہے! یہ بازار بہت تنگ ہے۔

بمشکل تین ساڑھے تین گز چوڑا راستہ ہے جس کے ہر دو جانب سہ منزلہ عمارات ہیں۔ ان عمارات کے زیریں حصہ میں دکانیں یوں برابر برابر ایک دوسرے سے پیوست اور منسلک ہیں۔ جیسے شہد کے چھتے میں مختلف خانے۔ سورج کی روشنی بھی بس یہاں خال خال ہی پہنچتی ہے، اس لئے کہ دکانداروں نے سائے کے لئے اوپر پردے کچھ اس طرح لگا رکھے ہیں کہ پورا بازار ڈھکا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں دن کے وقت بھی خاصا اندھیرا رہتا ہے اور دکانوں میں روشنیاں جلتی رہتی ہیں۔ سارا دن بازار ضرورت مندوں، شوقیہ چلنے والوں اور نظارہ بازی کرنے والوں کی آوازوں سے گونجتا رہتا ہے۔ سرکاری افسروں سے لے کر عام آدمیوں تک اور اژدحام میں بھول بھلیوں کی طرح ادھر سے ادھر اپنا راستہ بناتے، دھکے دیتے اور دھکے کھاتے آگے بڑھتے ہیں۔ اب سے کوئی دو ڈھائی سال پہلے اس تنگ بازار میں خوانچہ فروش ورٹھیلے والے چلنے والوں کا راستہ اور بھی دشوار کر دیتے تھے۔ لیکن بعد ازاں اس کی تنگی کو دیکھ کر ٹھیلے والوں اور خوانچہ فروشوں پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس کے باوجود اس کی گہما گہمی میں کوئی کمی نہیں واقع ہوئی۔ رات کو آٹھ بجے تک (جب دکانوں کے بند ہونے کا وقت ہوتا ہے) اور اس کے بعد بھی یہاں کھوے سے کھوا چھلتا ہے اور کبھی تو پہ برقع پوش معزز — اور باحجاب خواتین کو بڑی بے بسی سے اپنا رستہ بناتے، لوگوں کے ہجوم سے لڑتی بھڑتی دیکھ کر ان کی بے بسی پر اپنے جذبۂ ترحم کو بیدار ہوتا ہوا محسوس کریں گے۔

ہم بھی ہجوم کی ریل پیل سے لڑتے بھڑتے بازار سے نکل آئے ہیں۔ اور اب ہم اس میل ڈیڑھ میل لمبے بازار کے دوسرے سرے پر آ گئے ہیں جو محراب دار بلند دروازے پر ختم ہوتا ہے۔ اونچے دروازے پر بڑا سا گھڑیال آویزاں ہے جس کا کام دن رات محض گزرتے وقت کی پشت پر ضربیں لگانا ہی ہے۔

ہم اسی سڑک پر آگے چل کر دائیں جانب مڑیں گے تو ہمیں حیدرآباد کا مشہور علاقہ ملے گا۔ جس کو کبھی بہترین رہائشی علاقے کی حیثیت حاصل تھی۔ پورا علاقہ عموماً ایک منزلہ عمارتوں پر مشتمل ہے جن کی تعمیر میں چھوٹی سرخ، یا دامی اینٹیں استعمال کی گئی ہیں۔ یہاں کے بیشتر مکانات پہلی جنگ عظیم یعنی ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک کے دوران تعمیر ہوئے تھے۔

اور اب ہمارے سامنے حیدر آباد سینٹرل جیل کی بلند و بالا، سرخ اینٹوں سے تعمیر شدہ عمارت ہے۔ جس کی بنا ۱۸۵۱ء میں رکھی گئی تھی۔ اور یہ جگہ صوبہ سندھ پر انگریزوں کی فتح سے قبل مرحوم مرزا خسرو کی ذاتی قیام گاہ کا کام دیتی تھی۔

دیکھا آپ نے — ہم جیل سے نکل آئے ہیں۔ مگر ہمارے بائیں جانب ایک طویل و عریض قبرستان ہے۔ جس میں ابدی نیند سونے والے اس حقیقت سے قطعی بے خبر ہیں کہ ان کے یہ مقابر آج شکستگی اور تباہ حالی کے مختلف ادوار سے گزر رہے ہیں۔ کون جانے اپنی زندگی میں انہوں نے کیسے کیسے کارہائے لائقہ سرانجام دیئے ہوں گے۔ اور ان کے رعب اور دبدبہ سے زمین تھرا اٹھتی ہوگی لیکن آج — کس کم مائگی سے یہ زمین کے نیچے پڑے ہیں! دیکھئے۔ یہاں تقریباً ایک درجن مقابر ہیں۔ یہ مختلف جسامت کے ہیں اور تمام کے تمام کلہوڑا اور تالپور حکمراں خاندان کے مرحوم و مغفور حکمرانوں کے جسد خاکی کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہیں۔ سنسان مقام پر یہ شکستہ مقابر، شہر کی جگمگاتی گرم گرم زندگی میں رینگنے والے انسانوں کو دعوتِ نظارہ دے رہے ہیں۔ آپ جب یہاں آئیں گے تو ماحول کی یہ تیز، دبیز غمناک سنسناتی خاموشی آپ کے دل میں آخرت کا خوف بھر دے گی۔ آپ محسوس کریں گے آپ کو بھی ایک روز اس جہانِ فانی سے کوچ کرنا ہوگا جس کی رنگا رنگ بزم آرائیوں میں آپ اپنی انتہا، اپنے انجام کو بھولے بیٹھے ہیں۔ ان مقابر میں سے چند ایک پر خوبصورت اور رنگا رنگ ٹائلوں کا خوبصورت کام کیا ہوا ہے جو سندھ کی تہذیب کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس قسم کی رنگین، منقش اینٹیں آپ کو پاک و ہند میں اس کثرت سے سندھ کے علاوہ کہیں نہیں ملیں گی۔ دیکھئے، مقابر کے اندر قبریں سنگِ مرمر سے تراشیدہ ہیں۔ آپ کو معلوم ہے ان مقابر میں ممتاز مقبرے، غلام علی خاں، اور میر کرم علی تالپور کے ہیں۔ ان کے گرد بیرونی حصہ میں بے شمار قبریں ہیں جو بے توجہی کے سبب بڑی سرعت سے کھنڈرات اور ملبے میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ ہائے افسوس! ماضی کے ان پُر شکوہ حکمرانوں نے کبھی پل بھر کو بھی یہ نہ سوچا ہوگا کہ مرنے کے بعد ان کی حالت اس قدر ناگفتہ بہ ہوگی، ان کے گرد مویشی

آمادہ پھرا کریں گے اور اپنے فضلے سے ان مقدس زمینوں کو آلودہ کریں گے۔

چلئے تلک چاڑھی کی طرف واپس چلیں۔ وہاں سے ایک بار پھر نشیب میں اُترتے ہوئے ہم بجائے بائیں طرف مڑنے کے سیدھے مغربی سرے کی طرف رخ کریں گے جہاں حیدرآباد چھاؤنی ہے۔

دیکھا آپ نے، یہاں ہمیں بیشتر پرانی ڈھب کے بنگلے ملتے ہیں جو خوبصورت باغوں کے درمیان کھڑے قیام گاہ تھی۔ لیکن اب اس کی وسعتوں میں پاک بری فوج مقیم ہے۔ گدو روڈ سے ذرا اونچائی پر دیکھتے ہوئے ہمیں "پروٹیسٹینٹ چرچ آف سینٹ طامس" دکھائی دیتی ہے جو پہلے گیریژن چرچ کے نام سے مشہور تھی۔ اسے ۱۸۹۵ء میں برٹش گورنمنٹ نے تقریباً ۴۵۰۰۰ روپے کی لاگت سے تعمیر کروایا تھا۔ اس میں اب بھی بہ آسانی بیک وقت چھ سو افراد سما سکتے ہیں۔ اس میں کیمونین ٹیبل کے شمالی حصہ پر ایک پیتل کی لوح آویزاں ہے جس میں فتح سندھ کے موقع پر میانی اور ڈابو کی لڑائی میں کام آنے والے انگریز افسروں اور فوجیوں کی تعداد درج ہے۔ دوسری جانب ایک اور لوح پر اس عمارت کی تعمیر کی تاریخ درج ہے۔

فردوس ٹاکیز کے نزدیک گدو روڈ پر سندھ یونی ورسٹی کی عمارت ہے، یونی ورسٹی کا تصور ذہن میں آتے ہی جب ہم اس پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں قدرے مایوسی ہوتی ہے۔ یہ عمارت ایک یونی ورسٹی کے لئے بہت چھوٹی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ پہلے یہ عمارت بچوں کے لئے اسکول کا کام دیتی تھی۔

گدو روڈ پر چلتے ہوئے جب ہم پہاڑی سے اتر کر میونسپل باغ کی طرف بڑھتے ہیں تو ہمیں سڑک کے دو جانب چٹیل میدان دکھائی دیتا ہے۔ جہاں آنکھوں کی تازگی اور فرحت پہنچانے کے لئے ایک چھوٹا سا بھی سرسبز قطعۂ ارض موجود نہیں۔ لیکن ذرا آگے چلنے کے بعد سڑک کے دونوں جانب ایستادہ طویل قامت درختوں کے فرحت بخش سائے میں گرما کی اس جھلسا دینے والی گرمی کا احساس کم ہو جاتا ہے۔ یہاں پر چند خوبصورت لیکن پرانی وضع کے بنگلے ہیں۔ ان کے عین مقابل میونسپل باغ ہے جو پہلے ایکالونک گارڈن کے نام سے مشہور تھا۔ اور ۱۸۴۸ء سے قبل بحکم سر چارلس نیپیئر اس کی بنا رکھی گئی تھی تاکہ فوجی دستوں کے لئے تازہ اور سرسبز ترکاریوں کا انتظام ہو سکے۔

آیئے، اب مخرف المرکز لوگوں کی قیام گاہ آرہی ہے۔ مذکورہ باغ سے تھوڑی دور پر سڑک کے بائیں جانب پاگل خانہ ہے جو ایک شریف النفس، فرشتہ سیرت، ہمدردِ بنی نوع انسان پارسی سرکاؤس جی ریڈی منی کی سخاوت کے نتیجہ میں ۱۸۷۱ء میں تعمیر ہوا۔ یہ مختلف عمارتوں پر مشتمل ہے جن کا ایک چہار دیواری کے ذریعے احاطہ کیا گیا ہے۔

میر جو ٹنڈو، جہاں اب لطیف آباد کالونی ہے، حیدرآباد کے مغرب میں کوئی تین میل دور واقع ہے اور دریائے سندھ کے مشرقی کنارے سے نزدیک ہے۔

اور اب ہمارے سامنے ایک یادگاری ستون ایستادہ ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں نا۔ ہاں یہی، بالکل — اب اس کی تاریخی اہمیت بھی بتانی پڑے گی۔ ذرا رُکئے، میں دم تو لے لوں۔ بہت تھک گیا ہوں۔ آپ بھی تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ آیئے اس درخت کی چھاؤں میں چند لمحات کھڑے ہو کر سستا لیں۔ آپ نہیں پیتے، لیجئے نا، تکلف مت کیجئے۔ خیر، سگریٹ میری فطرت ثانیہ بن چکی ہے۔

ہاں تو یہ ستون ایسٹ انڈیا کمپنی کی ریذیڈینسی بلڈنگ کے مقام کا تعین کرتا ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں اب سے سالہا سال پہلے میروں کے بلوچی فوجیوں نے ریذیڈینٹ میجر اوٹرام کی زیر قیادت انگریزی دستوں پر پندرہ فروری ۱۸۴۳ء میں انتہائی بہادرانہ حملہ کر کے انہیں الٹے پاؤں لوٹ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

مغرب میں سورج کا خون ہو چکا ہے اور ہماری کشتی دریائے سندھ کی سطح پر، جو سینۂ مادر کی طرح شفیق ہے، بہت سہولت سے سہج سہج بغیر ہلکورے کھائے بہی جارہی ہے۔ ہولے ہولے، ہلکے ہلکے، — دریائے سندھ — عرب تاریخ دانوں کی الہیلی مہران — اور وہ دیکھئے چودھویں کا چاند اپنی تمام مہربان سیم گوں ٹھنڈی خواب آور کرنوں کے درمیان آہستہ آہستہ آسمان کی شفیق دھندلاہٹوں میں بلند ہو رہا ہے۔ اور یہ سیماب صفت بے کل ستارے جنہیں ہر لمحہ جگمگانے ہی سے کام ہے کس طرح اپنی تمام شفیق نرماہٹ لئے، ہماری مسرت میں ہمارے شریک ہو رہے ہیں۔ ان کی جگمگاتی روشنیاں۔ پانی کی مرتعش سطح پر منعکس دھیرے دھیرے ہلکورے لے رہی ہیں۔

یہ وہ لمحہ ہے جب پروازِ تخیل جانے کن کن اجنبی دیسوں کی طرف نکل جاتی ہے، وہاں جہاں زندگی تمام تر حسن اور احساسِ حسن ہے، جہاں غمِ دوراں غمِ جاناں جیسی کسی چیز کا وجود تک نہیں۔ سنئے، اب تو ماجھی نے بھی فطرت کے حسن سے مسحور ہو کر کوئی بہت ہی دلفریب لیکن غمگین نغمہ چھیڑ دیا ہے..... سسّی کی غمزدہ آہوں سے بھرپور کوئی المناک نغمہ جس کے ہر ہر بول میں اپنے پنّوں کی صحرا صحرا جستجو میں ریت اور بگولوں سے نبرد آزما ہوتی ہوئی، پنّوں پنّوں چلاتی ہوئی سسّی کے بے کل جیون کا تمام تر سوز ہے، غم ہے، طلب اور جستجو ہے!

اپنے ذہن کے تمام تر دریچوں کو کھول کر اسے اس جاوداں طلسمی لمحے کی یاد سے بھر لیجئے۔ کل آئے تو نہ جانے کن کن اجنبی دیسوں کی طرف جانا پڑ جائے۔ وہاں جہاں زندگی سرگرمِ عمل ہے اور جہاں جذبات فیکٹریوں اور دیگر صنعتی اداروں کی چمنیوں سے نکلتے ہوئے دھوئیں میں تحلیل ہو کر رہ جاتے ہیں ــــــ ایسی مصروف اور مدقوق زندگی میں کبھی اپنے دریچے کے باہر پڑی ہوئی کرسی پر نیم دراز ان لمحات کی یادوں کی آنکھوں میں بجلی کا ایک کوندہ بن کر لپک جائے گی تو آپ زندگی کے اس بے ہنگم تسلسل اور جمود میں تازہ دم ہو کر از سرِ نو زندہ رہنا سیکھ سکیں گے، ــــ یادوں کے سہارے، اور ایسے چند لمحے ہی تو حاصلِ زیست ہوتے ہیں۔

انسانی جستجو اور محنت کا مآل، ان کے سوا زندگی میں باقی ہی کیا رکھا ہے؟

ماضی کے جلال اور حال کے جمال کی یہ تصویریں، یہ جھلکیاں آپ نے دیکھ لیں، مگر میری نگاہیں مستقبل کے پردے کے پیچھے سے چمکنے والی روشنیوں سے بھی اکتسابِ نور کر رہی ہیں۔ اور آپ جب میری آنکھ سے دیکھ رہے تھے اور میرے ذہن کے ساتھ سوچ رہے تھے تو مستقبل کی کرنوں کو بھی آنکھوں میں اترتا محسوس کریں گے۔ حیدرآباد اور کوٹری میں جابجا مستقبل کی تعمیر کے ثبوت مل رہے ہیں۔

زمانہ نئی کروٹ لے رہا ہے اور دورِ انقلاب نے تو ایک نئی حیات، نیا ولولہ، نیا آہنگ زندگی کو بخش دیا ہے۔ میں نے دیکھا، اگلے لوگ جس طرح شہر کی آئینہ بندی کیا کرتے تھے، اب شہر کے بام و در سجانے کے ساتھ ساتھ معاشری و معاشی تعمیر کے کاموں میں خود حصہ لے رہے ہیں، نئی کاروباری تگ و دو، نئی نئی فیکٹریوں کا قیام، نوجوان صناعوں کا ذوقِ عمل، زندگی کی بھاگ دوڑ، ہماہمی، غرض جہاں جہاں نظر پہنچتی ہے تعمیرِ آشیاں کے لئے تنکے جمع کرنے کی سعی و کاوش کے ثبوت ملتے ہیں۔ شروع شروع میں جو فکرِ فردا نظر آتی تھی اب کوئی دو سال سے اسے پھر حیاتِ تازہ نصیب ہو گئی ہے۔

★

ماہِ نو، کراچی، فروری ۱۹۶۱ء

فکاهیہ:

کُنجِ خرابات

اشرف صبوحی

نواب کیا، نوابی کا کھنڈر، نواب گھسیٹا اپنے دیوانخانہ میں اکیلے بیٹھے حقہ پی رہے ہیں۔ اپنے ہم مشرب دوستوں کا انتظار کرتے کرتے بےچین ہو کر ملازم کو آواز دیتے ہیں۔

نواب (بےچین ہو کر): نفیرے او نفیرے! مردود کہاں ٹل گیا؟

ملازم: حضور کے آگو تو کھڑا ہوں

ارے لپک کر خبر لائیو۔ مرزا جانی اب تک کیوں نہیں آئے۔

ملازم: یہ کیا آگئے ہیں سرکار۔

مرزا جانی: آداب عرض کرتا ہوں نواب صاحب

نواب: آ گئے بھئی! بڑی راہ دکھائی۔

مرزا: سرکار! ذری نبسی خفیہ فروش سے معاملہ کرتا رہ گیا تھا۔

نواب: مرزا صاحب سید کربلائی بھی غائب ہیں۔ شیخ فجو کا بھی پتہ نہیں۔ آج ذری سا ابر کیا آیا ہے سب ہی سیل گئے۔

مرزا: حکم ہو تو بھجوا تنبولن کی دکان تک ہو آؤں۔ آپ جانیں، اس کے ہاتھ کی گلوری کھائے بغیر انہیں چین نہیں آتا۔ سو لبسوے وہیں اٹکے ہوں گے۔

نواب: اب تم کہاں جاؤ گے کسی کو دوڑا دو۔ یہاں تو جماہیاں آ رہی ہیں۔

مرزا: پھر اتنے میں تیار کر دوں؟

نواب: برا نہ ماننا ان کے ہاتھ میں سرور ہی اور ہے۔ خدا جنے (خدا جانے) کیا پڑھ کر پھونک دیتے ہیں!

مرزا: واقعی، کہیں ایسا نشہ ہی نہیں گھٹتا۔ ذری دیکھیے گا نواب صاحب! وہ کون بزرگ سفید ڈاڑھی، گھٹا ہوا سر، ایک ہاتھ میں تسبیح، دوسرے میں سفید لستنی چڑھی ہوئی نیری کی کابک لئے تشریف لا رہے ہیں۔ واہ رے استاد! واللہ ہاتھ چوم لے۔ عجائب خانے سے ہڈیوں کا ڈھانچہ نکال کر خوب کھال چڑھائی ہے۔

نواب: شیخ جی معلوم ہوتے ہیں۔

شیخ جی: آداب عرض نواب صاحب!

مرزا: اماں شیخ جی آج تو قسمت جاگ گئی بھئی خوب آئے۔

نواب: شیخ جی! واللہ آنکھیں ترس گئی تھیں۔ حضت اتنے دن کہاں رہے

شیخ جی: قبلہ ذری کلکتہ چلا گیا تھا۔

مرزا: سرکار! اب دیر کیا ہے۔ ہمارے شیخ جی تو ان فنون میں یکتا ہیں

نواب: میں کیا انجان ہوں؟ سامان تو سارا لیس ہے۔ شیخ جی آ جائیے میدان میں۔

شیخ جی: بسر و چشم! (پیالی دیتے ہوئے) لیجئے قبلہ نواب صاحب!

نواب: (چسکی لے کر) اے سبحان اللہ! لیجئے، یہ بھی آن پہنچے۔

سید: کیوں حضت ہمارا انتظار بھی نہیں کیا؟

نواب: ارے بھئی سید! تم کہاں کھپ ندیا گئے تھے؟

شیخ جی: چنچناؤ نہیں۔ تمہارا حصہ میں نے الگ لگا رکھا ہے۔ لو،

سید: ارے کون؟ استاد پنیک! بھئی آج تو جو خدا سے مانگتا ملتا۔ واللہ! (چسکی لے کر) لطف آگیا۔ میں بھی کہتا تھا کہ یہ رنگ تو دیکھا ہوا سا ہے۔ حلق سے اترتے ہی سرور آ اے سبحان اللہ۔ ان ہاتھوں کے صدقے۔

مرزا: کیا بات ہے بھئی دارالشفا کی برفیاں اس وقت یاد آ رہی ہیں تازی نبی ہوں گی۔

سید: واللہ مرزا صاحب! ایک ایک ڈلی بہت ہے۔ دونا لطف آجائے گا۔

شیخ جی: (منہ پھیر کر) ارے کلو! ذرا جھپاکے سے لانا تو بھی۔ لے آٹھ لیتا جا۔ ہات ترے ملاعون کی۔ حقہ پیتے پیتے رستے ہی میں فنا فی النار ہو گیا۔

نواب: (پنیک سے چونک کر) نفیرے ہوت۔ جب دیکھو غائب

ملازم: حاضر سرکار حاضر!

مرزا: بڑا کام چور ہے۔ ارے بھئی دوڑا چلا جا۔ رحیمو کی دکان تو جانتا ہے؟ آدھ سیر برفی تُلوا لا۔ دیکھتا رہیو باسی نہ چڑھا دے۔

سید: ارے میاں ذری سی گنڈیریاں بھی تو منگوا لو۔

مرزا: حضرت دانت بھی ہیں۔

شیخ جی: دانت نہیں تو کیا ہوا۔ پلپلا لیں گے۔

مرزا: ہا ہا ہا! عنقا کا نابود ہونا کیا معنی؟ میں چشم دید کہہ رہا ہوں۔ اسکے سر پر ایسی چوٹی ہوتی ہے جیسی گھوڑے کی دُم۔

شیخ جی: اور میں اپنا مشاہدہ عرض کروں۔ کلکتے جاتیوں کو رستہ میں ایک چڑیا کی منقار سے ڈھول تاشوں کی آواز سنائی پڑی۔ بالکل یہ معلوم ہوتا تھا کہ کئی ساز ملے ہوئے بج رہے ہیں۔ قریب جا کے غور جو کرتا ہوں تو موسیقار ہے۔

نواب: آپ کو جھٹلانے والا اپنے حسابوں خود جھوٹا۔

سید: شیخ جی وہ آپ کا لکھی بٹیر تو مر گیا ہوگا؟

شیخ جی: شیر انگن! یہ کابک بیں کیا ہے؟ مرنے کی ایک کہی۔ ارے صاحب اس کے دم خم ابھی ویسے ہی ہیں۔

نواب: بھئی ایسا بٹیر نہ دیکھا نہ سنا۔ کیوں حضرت کتنی ایک پالیاں جیتا ہوگا؟

شیخ جی: قبلہ! گنتی کس کو یاد ہے۔ مگر آخری کشتی انتخاب تھی۔ رستم و اسفندیار کے معرکے بھی ایسے نہ ہوں گے۔ خیال فرمایئے چھوٹے صاحب عالم کا دور دورہ۔ لکھنؤ کی اٹھتی ہوئی محفل، ایسا ہنگامہ کہ قیصر باغ میں تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ بادشاہ کا صف شکن۔ مرزا کنگرو کا مٹھیا یا ہوا پہنتے یا دام ٹھونگ ٹھونگ کر مُسنڈا۔ ادھر صاحب عالم نے اس حقیر کو ٹہوکا "شیخ جی آج آبرو رہ جائے تو بات ہے"۔ مجھے بھی اپنے مُسندر تن والے پر پورا بھروسہ تھا۔ اللہ کا نام لے کر چھوڑ دیا۔ یہ جھوبخل میں آکر جو پلا ہے تو ایک ایک لات میں دس دس لڑھکنیاں کھلا دیں۔ ایک میں بیچارہ کیا، ہر شخص تھرا رہا تھا۔ ادھر صف شکن بھاگا ادھر یہ چلا۔ مرزا کنگرو شاہی غرّے میں کہیں بھولے سے ڈپٹ بیٹھے۔ بھلا اسے کہاں تاب تھی۔ بہو بیگم صاحبہ جھروکوں میں سے جھانک رہی تھیں۔ فرماتی ہیں مجھے سیمرغ کا شبہ ہوا۔ حضرت یہ دنیا کے عجائبات میں سے ہے۔ مرزا کنگرو اُچک کر ہاتھی پر سوار ہوں تو اچھا کیا، لیکن بٹیر کو تو مفت خدا غصہ دلا دیا۔ وہ کیا رکتا۔ اُدھر میر تو ف فیلبان نے ہاتھی کو ریل دیا۔ ہاتھی کا سونڈا اٹھا کر آگے بڑھنا تھا کہ میرے شیر نے تیور بدلے۔ ایک جھنتوں لات جو رسید کرتا ہے تو ہاتھی مع عماری چاروں شانے چت۔ سناٹا سے بھیجا نکل گیا۔ پھر جو ہلڑ مچا ہے خدا کی پناہ! فوج میں کمر بندی ہو گئی۔ میں نے اسی دم بٹیر کو کابک میں بند کیا۔ یا تو خلقت نے اسے گیند کا گنبد دیکھا تھا یا میرا ہاتھ بڑھتے ہی مٹھی بھر پیٹ تھے۔ اور اس ڈر سے کہ کہیں لام نہ بندھ جائیں کلکتہ کی سیدھ پا بھریں۔

نواب: ہاں صاحب! اللہ نے سب طرح کی مخلوق پیدا کی ہے۔

مرزا: قبلہ و کعبہ فرمایا کرتے تھے ان جنگل کے پنچھیوں میں جنات ہوتے ہیں۔

سید: اور جنات کہاں سے آئے؟

شیخ جی: میں تو سمجھتا ہوں کہ ہمارا شیر انگن کوئی جنوں کا بادشاہ ہے۔ واللہ اس کے قصے سناؤں تو صبح ہو جائے اور ختم نہ ہوں۔ پھر سند کے ساتھ، عینی شاہد موجود ہیں۔

نواب: بھئی قسمیں کیوں کھاتے ہو۔ تمہاری تو شاعری میں بھی ہم نے کوئی مبالغہ نہیں دیکھا۔

شیخ جی: بلکہ میں تو لفظیں بھی ایسی بولتا ہوں جو پہلو دار نہیں ہوتیں۔

نواب: شیخ جی! آج تو کچھ سنا دو۔ بہت دن ہوئے کان ترسے پڑے ہیں۔

مرزا: ہاں بھئی، اب یہاں کون ہے۔ شاعری بانجھ ہو کر رہ گئی۔

شیخ جی: لیکن حضرت میں کیا اور میرا کلام کیا۔ پھر جب سے شیش محل کی صحبتیں چھوٹیں قسم لے لو جو ایک بیت بھی کہی ہو۔ سفر کی ماندگی بھی ہے۔ آواز کی خستگی ملاحظہ نہیں فرماتے؟

مرزا: یہ عذر آپ کی شان کے خلاف ہیں۔ ہاں خدا سلامت رکھے!

نواب: دو چار بیتیں ہی سہی۔ واللہ آپ کے شعروں کے تیور، پڑھنے کا طرز۔ کوئی دوسرا ہو تو لے۔ ہاں تمہیں ہماری جان کی قسم!

شیخ جی: دوستوں کی قدر دانی ہے۔ خیر سنئے۔ سفر میں کلکتہ سے آتیوں کو دو چار بند موزوں ہو گئے ہیں۔

سید: کوئی مسدس کہا ہے؟

شیخ جی: مسدس کیا۔ افیون پر ذری سی فکر کی تھی۔

نواب: خوب خوب! سید کربلائی! تم جانتے ہو۔ اس قسم کے مضامین تو ہمارے شیخ جی کا حصہ ہیں۔

مرزا: سبحان اللہ! ارشاد ہو۔

شیخ جی: (دو چار مرتبہ کھنکار نے کے بعد ہچکی لے کر) آپ حضرات کے ملال کا خیال ہے۔ توجہ فرمایئے۔ عرض کرتا ہوں۔

نواب: ارشاد۔

شیخ جی:

مردمِ چشمِ حسینانِ جہاں ہے افیوں — عنبرِ خالِ رخِ حورِ جناں ہے افیوں
طفل بھی مرتے ہیں جس پہ وہ جواں ہے افیوں — طرفہ معشوق عجب راحتِ جاں ہے افیوں

اس قدر عاشق مشیدا ہیں جہاں میں کس کے
یہ وہ لیلیٰ ہے کہ مجنوں ہیں زن و مرد اس کے

مرزا: کیا بات ہے!

شیخ جی:

اس پری زاد کے القاب کروں کیا میں بیاں — حبش اور ہند کے حکامِ اجل کی سلطاں
مستی کوہ سرور آتشِ موسیٰ کا دھواں — مرہمِ زخمِ دلِ عاشقِ بے ربطیٔ جاں

اہلِ غم بادۂ سرجوش بھی کہتے ہیں اسے
لوگ معشوقِ سیہ پوش بھی کہتے ہیں اسے

مرزا: اے سبحان اللہ! "اہلِ غم بادۂ سرجوش بھی کہتے ہیں اسے"

سیدؔ: اور سرکار! "لوگ معشوقِ سیہ پوش بھی کہتے ہیں اسے"

بند ملاحظہ ہو:

کوئی ساون کی گھٹا کہتا ہے کوئی ظلمات — کوئی لیلیٰ اسے کہتا ہے کوئی وصل کی رات
اس کی تلخی میں بھرا ہے مزۂ قند و نبات — اسی معجون کی تاثیر میں ہے موت و حیات

دل میں ہے کافر و دیندار کے الفت اس کی
سنگِ اسود کی طرح کرتے ہیں حرمت اس کی

مرزا: ہر کہ شک آرد کافر گردد!

سید: ذری حرمت کی لفظ کو دیکھنا کیا بات نکالی ہے۔

شیخ جی: آداب عرض ہے۔ تسلیمات۔ تسلیمات!

مرزا: کیوں، خاموش کیوں ہو گئے؟

شیخ جی: اب پھر سہی۔ حافظہ بھی یاری نہیں دیتا۔

نواب: دو چار بند تو اور سنائیے۔ آپ کا حافظہ تو ماشاء اللہ چھاپہ خانہ ہے

شیخ جی: اجی۔ جوانی گئی زندگانی گئی۔ ساری باتیں سن سے تعلق رکھتی ہیں۔ اب وہ اگلی جیسی یادداشت کہاں۔ صبح کا کہا یا تو رات کو بھول جاتا ہوں۔

مرزا: پھر بھی بالکل چٹ تو نہیں ہوا۔

شیخ جی: یہی اصرار ہے تو ادھر ادھر سے جو بند یاد آتا جائے گا، پیش کروں گا

نواب: کیا مضائقہ ہے۔

شیخ جی: لیجئے، دو بند اور یاد آ گئے۔

اس چھلاوے کے نرالے ہیں جہاں میں انداز — کہیں جادو ہے کہیں سحر کہیں شعبدہ باز
اسی سلطان کے ہیں سینکڑوں محمود و ایاز — بےخبر رہتا ہے اس شوخ کا ہر محرمِ راز

نہیں کھلتا ہے کہ بند آنکھوں سے کیا دیکھتے ہیں
دیدۂ دل سے مگر شانِ خدا دیکھتے ہیں

مرزا: چار مصرعوں سے کس قدر دست و گریباں ٹیپ پیدا کی ہے۔

نواب: مضمون کتنا سچا ہے۔

شیخ جی: تسلیمات! تسلیمات!

شیخ جی:

جامِ دل اس کی محبت سے اگر ہو مخمور — دائم الخمر رہے، بادۂ گلگوں سے نفور
پاک طینت ہے یہ دنیا میں نجاست سے دور — اس کے عشاق سے ہوتا ہی نہیں فسق و فجور

اس سے کرتے نہیں پرہیز کسی مذہب میں
صورتِ آبِ رواں پاک ہے ہر مشرب میں

سید: کربلا، نجف اشرف، خراسان ان سارے مقامات کے اکابر یہی کہتے ہیں

شیخ جی: بس حضور! اب کہاں تک سمع خراشی کروں۔

نواب: بھئی، ایک دو بند ہماری خاطر سے اور۔ واللہ کیا اچھوتے مضمون ہیں

شیخ: (کھنکار کر) عرض کرتا ہوں۔

مرزا: ارشاد۔ ارشاد

شیخ جی:

سانولے رنگ کا جلوہ ہے عجب ہوش ربا — دم بھرتا ہے شب و روز سیہ چشموں کا

مرزا: اے ماشاء اللہ! "دم بھرتا ہے شب و روز سیہ چشموں کا"

شیخ جی:

سحر ہے ناز و ادا، قہر و بلا ہے غمزا — بدمزاجی بھی ہے اس شوخ کی خوبی سے سوا

سید: اے منہ چوم لے۔ یہ لفظیں آج کسے نصیب ہیں؟ ہاں حضرت؟

شیخ جی:

یہ وہ محبوب ہے اس کا ہو اگر محوِ جمال — آدمی زاد میں پیدا ہوں فرشتوں کے خصال

نواب: سبحان اللہ! یہی بات ہے۔

شیخ جی: ابھی اور سنیئے

شیخ جی:

نہ ہوس کھانے کی رہتی ہے نہ پینے کا خیال — اپنی ہستی کو مٹا دیتے ہیں جو پائے وصال

اس سے صحبت جو تہِ گنبدِ افلاک رہے

جرمِ عصیاں سے فرشتوں کی طرح پاک رہے

مرزا: ـــــــ اور توبہ شاید اس کی ضرورت ہی نہیں رہتی

شیخ جی: بس حضرت! حقیقت عرض کر رہا ہوں، سنتے جائیے۔

یہ وہ ہے پیرِ طریقت کہ جو ہوا اس کا مرید — ما سوا اللہ سے اک آن میں ہو جائے بعید

نواب: وہ کیونکر؟

شیخ جی:

چونکہ رہتی ہے اسے نفس کُشی کی تاکید — کیا عجب ہے جو خدا راستے میں دے اجرِ شہید

مثلِ شمشیرِ اجل قاتلِ لذات ہے یہ

واہ کیا صاحبِ اعجاز و کرامات ہے یہ

سید: یہ دعویٰ، یہ ثبوت! سبحان اللہ! اے سبحان اللہ! اور پھر مصرعوں کی کروٹیں ملاحظہ ہوں.....

مرزا: بھئی ہمارے پاس کیا رکھا ہے۔ داد دینے میں بھی گھاٹے ہیں۔ بلا سے کچھ ہو، میں نے پانچ برسیں اپنی عمر کی آپ کو دیں۔ اللہ آپ کو جیتا رکھے!

شیخ جی: حضور کی ذرہ نوازی ہے۔

مرزا: کیا اچھی باتیں کہی ہیں۔ ہمارے شیخ جی تو چھپے رستم نکلے۔

نواب: کیوں بھئی سید! کتنی مدت میں ایسا صاف ستھرا کلام سنا ہے؟

سید: بندہ نواز! مختصر یہ ہے کہ مجھے تو سیروں افیم کا نشہ ہو گیا۔ شاعری کیا سارے مصرعے معجزے ہیں۔

شیخ جی: (تن کر) یہ سب حضرت میر انیس اعلیٰ اللہ مقامہٗ کی صحبت کا فیض ہے۔ ورنہ آج کل کے شاعر ان بندشوں کا کیا سلیقہ رکھتے ہیں۔ اور ایک شاعری پر کیا منحصر اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی۔ لکھنؤ جیسا منچلا، عیش کا متوالا شہر ایسا اجڑا ہے کہ کہیں زندہ دلی کا نام نہیں رہا۔ مرغ بازی، بٹیر بازی تو غارت ہوئی تھی۔ چانڈو و مدک پر تو پہرے لگے ہی تھے۔ کوئی برائی ہوگی۔ کنکوے اڑانا کیوں موقوف ہوا؟ آج کل کہیں پیچ بھی ہوتے نہیں دیکھے!

مرزا: حضرت! کنکوے لڑانے کو ہاتھ بھر کا کلیجہ چاہیئے۔ کنکوے کے ساتھ دولت اڑتی ہے۔ کوئی بیچارہ کیا کھا کے لڑائے گا۔ لڑانے والے مر گئے اور لڑائے ہم نے۔ باپ دادا کی کمائی ہوئی دولت گھر میں۔ کنکوے لڑتے تھے کہ ہاتھی۔ ایک دن کی سنئے۔ میں نے چھٹن صاحب سے پانچ اشرفی پیچ بدا تھا۔ ادھر میں نے بگلا بڑھایا، اُدھر انہوں نے الغیا کھینچا۔ اب دونوں کنکوے چھپکتے ہوئے، کندھے جھاڑتے متوالوں کی طرح جھومتے جھامتے چلے جاتے ہیں۔ واللہ ہے دو چرخیاں جن پر ساڑھے تین تین سیر ڈور چڑھتی ہے، خالی ہو گئیں اور پیچ آج نہیں ملتے کل نہیں ملتے۔ ایک بار ہی پیچ ملانے کی گھات میں غوطہ جو کھلاتا ہوں تو ڈور بنارسی باغ والے چھالیوں کے پیڑ میں جا پھنسی۔ لاحول ولا قوۃ! کمبخت لاسا ہو گئی، عاجز آ گیا۔ شرمندگی الگ۔ پیچ و تاب کھا کے رگڑا جو بتاتا ہوں تو پیڑ کے دو ٹکڑے اور کنکوا اوپر۔ واہ وا کا غل مچ گیا۔ اِدھر اُدھر پھیر پھار دو ہاتھ جو زناٹے کے لگاتا ہوں تو چھٹن صاحب کا کنکوا کھٹ سے الگ۔ لیکن ہاتھ لگاتا ہوا پیچھے جو ہٹا تو سہ منزلے کھپریل پر اور کھپریل سے گولی کی طرح لنڈھکتا ہوا پچھواڑے والی گڑھیا میں غڑاپ سے جا رہا۔

نواب: ارے رے رے! سارا کھیل پانی ہو گیا ہو گا؟

سید: بھئی کہیں چوٹ چپیٹ تو نہیں لگی؟

مرزا: اجی اس گڑھیا پہ خدا کی مار! پچھلی سینچر کے دن انجینئر صاحب نے اس کی تھاہ لینی چاہی تھی۔ چودہ ہزار فٹ ڈوری غائب غلّا ہو گئی۔ تھاہ ہوتی تو پلتے۔ گڑھیا کا ہے کو سمندر کی بچی کہیئے۔ دفتر میں اندراج موجود ہے۔

شیخ جی: اُفوہ! پھر؟

مرزا: پھر کیا؟ گرتے کے ساتھ ہی بس ایک غوطہ کھایا۔ ڈور تو ہاتھ میں تھی۔ پیرنے دیرنے سے تو نام کو بھی آشنا نہ تھا۔ لیکن کنکوے کے زور سے پانی کے اوپر بلبلے کی طرح پیرتا پھرتا ہوں۔ اتنے میں ہوا کا جنگی جھونکا جو آتا ہے اور کنکوا تن کے جو فرّاٹا بھرتا ہے تو بندہ پھر اسی سہ منزلے پر تھا۔ حضرت کسی کو یقین نہیں آئے گا۔ قسم ہے جناب امیر علیہ السلام کی! تول میں ساڑھے سات من پختہ کا آیا تھا۔

شیخ جی: پیر و مرشد بجا ہے! اس میں کوئی خلافِ عقل بات بھی نہیں۔ بلکہ یہ خبر تو لندن کے اخباروں میں بھی چھپی تھی۔ اور وہاں خبر کے ساتھ دونوں کنکووں کی تصویر بھی تھی۔ یہ انگریز بھی غضب کے چلتے ہیں۔ کہاں بیٹھے ہوئے کہاں کے فوٹو اتار لئے!

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

غزل الغزلات!

منیر جعفری

اس سال خاور (مشرقی پاکستان) سے باختر (مغربی پاکستان) تک فلو کی گرم بازاری دیکھ کر اس "جنگی بخار" کی یاد تازہ ہوگئی جس نے ۱۹۲۰-۱۹۱۹ء میں پہلی عالمی جنگ کے خاتمہ پر ایک کہرام مچا دیا تھا۔ اس سے خیال پیدا ہوا کہ یہ موضوع بھی کچھ کم قومی نہیں۔ اسلئے سید ضمیر جعفری صاحب کو اس پر طبع آزمائی کی دعوت دی گئی جس کو انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے قبول کیا مگر وہ غالباً خود ہی فلو کا شکار ہو گئے۔ اسلئے ایک مردے از غیب کو خدا داد موقع ملا کہ ان کی بذلہ سنجی کا حق نہ ادا کرے۔ اس زود قلم کا نتیجہ یہ پُر لطف نظم ہے جس کو ہم قارئین کے تفنن طبع کے لئے پیش کر رہے ہیں۔ مدیر

کچھ اس انداز سے اس سال اے یاراں فلو آیا
کہ آثارِ قیامت کا سا نقشہ روبرو آیا
بڑھا قریہ بہ قریہ، شہر شہر اور کو بکو آیا
پروبازوئے عزرائیل بن کر ہو بہو آیا
بچا مشرق میں کوئی اور نہ مغرب میں بچا کوئی
کوئی تو ابن مریم ہو، کرے دکھ کی دوا کوئی

کچھ آیا اس طرح اٹھ کر شکوہِ ترکمانی سے
کہ عاجز آ گئے سب ڈاکٹر بھی نسخہ دانی سے
ہوا شرمندہ ایٹم بم بھی اپنی قہرمانی سے
تھا پانی نقش بر دیوار بلغم کی روانی سے
وہ کھانسی جس سے ڈنکا بج رہا تھا چار سو اس کا
وہ نزلہ، وہ بہے جانا مثالِ آبجو اس کا

نہیں دیتا مسیحا گو اثر کر پاس آ جائے
کوئی مریخ کا باسی برد ئے طاس[1] آجائے
جہنم سے نکل کر اہرمن کی سانس آجائے
ہے داروئے اجل ہی جو کسی کو راس آجائے
اسی کا راج ہے جب تک بقلئے دورِ سرما ہے
خدائی کے لبوں پر رات دن "ردِّ کریما" ہے

میاں کی سانس اکھڑی ہے تو بیگم بھی روہانسی ہے
اُدھر چھینکوں پہ چھینکیں ہیں، اِدھر کھانسی پہ کھانسی ہے
وہ دم بجتی ہے چھاتی کہ جیسے تھال کانسی ہے
دمِ آخر ہے سب کا ہر طرف پھانسی ہی پھانسی ہے
جہاں دیکھو اُدھر اک قہقہوں کا دور جاری ہے
انوکھے بلبلوں کے چہچہوں کا دور جاری ہے

نہ کیوں بے اختیاری میں یہ لب پر اپنے لے آئے
ہو دم بھر جس سے تسکیں یا الٰہی ایسی شے آئے
کہاں سے کس طرح سے کاسۂ سر میں وہ مے آئے
جو شاندہ ہی سہی پیالہ اسی کا پے بہ پے آئے
افاقہ اس سے گو ہوتا نہیں ہے پھر بھی کیا غم ہے
کریں گے حق ادا کھانسی کا جب تک دم میں یاں دم ہے

اگر ہر درد کی حق نے یہاں کی ہے دوا پیدا
تو پھر کی ہوگی داروئے فلو نے کچھ ادا پیدا
کوئی تدبیرِ استیصالِ ظلمِ ناروا پیدا
جہاں کی ڈوبتی کشتی کا کوئی ناخدا پیدا
قضا و قدر نے خود ہی لگا رکھی ہے پابندی
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

رواں سکہ اسی کا باختر سے تا بہ خاور ہے
بظاہر دور دورہ جس کا عینِ حکمِ داور ہے
پلٹنا حکمِ حاکم کا نہ باور تھا نہ باور ہے
چلے صحت کا سکہ کس طرح اللہ ہی یاور ہے
کہ اس فتنے کا باعث ہے ہماری ہی زیاں کاری
جہاں دیکھو وہاں ہے گندگی کی گرم بازاری

نہ رستم اس سے بچتے ہیں نہ بہاں اس سے بچتے ہیں
گدا بچتے ہیں اس سے اور نہ سلطاں اس سے بچتے ہیں
نہ بچتی جھگیاں اس سے نہ ایواں اس سے بچتے ہیں
نہ بنگلے اور نہ سیٹھوں کے شبستاں اس سے بچتے ہیں
ادا کرنا ہی پڑتا ہے گنہ کا سب کو کفارہ
وبائے عام کا بجتا ہے چاروں کھونٹ نقارہ

جو روغن میں ملاوٹ ہے تو کھانوں میں ملاوٹ ہے
سپاری میں ملاوٹ ہے تو پانوں میں ملاوٹ ہے
جو گیہوں میں ملاوٹ ہے تو دھانوں میں ملاوٹ ہے
دکانوں میں زمانے بھر کی دانوں میں ملاوٹ ہے
جو یہ ہو تو مرض کیونکر نہ باسا زو براق آئیں
برائے ہر کہ و مہ آئیں! با صد طمطراق آئیں

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم تھا
یہ شغل چور بازاری، گراں جانی کو کیا کم تھا
ثمر اپنی ہی غفلت کا ستم رانی کو کیا کم تھا
یہ ہاتھ اپنا ہی اپنی فاتحہ خوانی کو کیا کم تھا
کہ یا رب! کر دیا برپا یہ تو نے محشرِ ثانی
چڑھے تپ مرغ بریاں کو یہ بریانوں کی بریانی!

غرض اب تا بکے اس زور سے آہ و فغاں کیجے
مناجاتوں کا لمبا سلسلہ وردِ زباں کیجے
جلے دل کا دھواں تا گنبدِ گردوں رواں کیجے
کہاں تک عرض کاوش ہائے اندوہِ نہاں کیجے
دعا ہے یہ فلو کا خاتمہ بالخیر ہو جائے
گلا چھوڑے کہیں، وقفِ گلوئے غیر ہو جائے!

[1] طاس — اُڑن طشتری جسے بعض لوگ اہلِ مریخ کا زمین کے ساتھ نامہ و پیام و راہ پیدا کرنیکا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔

غزل

عبدالعزیز فطرت

رگِ جاں جب بھی غزل خواں ہوگی
زندگی رقصِ بہاراں ہوگی
جانتا ہوں، شبِ غم کی مشکل
جان جائے گی تو آساں ہوگی
مرتے دم تک ہمیں معلوم نہ تھا
زیست شرحِ شبِ ہجراں ہوگی
درد نکھرے گا تو بن جائے گا دل
موج اگر پھیلے گی، طوفاں ہوگی
ہم جو ہم ہیں، تو ہماری مشکل
بڑی مشکل ہی سے آساں ہوگی
کیا خبر تھی کہ خوشی کی تنویر
پردۂ غم سے نمایاں ہوگی
گوشۂ دل میں سلگتی ہوئی آگ
دوستدارِ شبِ ہجراں ہوگی
جگرِ چاک ملے، تو کس کو
حسرتِ چاکِ گریباں ہوگی
عشق صادق ہے تو ویرانیٔ دل
اپنی آبادی پہ نازاں ہوگی
ہوں گے ہمدوش اثر سے فطرت
میرے نالوں میں اگر جاں ہوگی

غزل

ایاز صدیقی

ان کی بے گانہ روی رفتارِ دوراں ہوگئی
موجِ غم کچھ اس طرح پھیلی کہ طوفاں ہوگئی

آرزو اُبھری، خرد بھٹکی، جنوں کو دے اٹھا
درد چمکا، دل جلا، ہستی فروزاں ہوگئی

اس قدر بھٹکی ہے راہِ جستجو میں زندگی
گمرہی افسانۂ ہستی کا عنواں ہوگئی

ہم سکوں آغوش تھے، دنیا سکوں آغوش تھی
ہم پریشاں کیا ہوئے دنیا پریشاں ہوگئی

اوّل اوّل دشمنی میں بھی وفا کا رنگ تھا
آخر آخر دوستی بھی دشمنِ جاں ہوگئی

عقل ہی نے عقل کو زنجیر پہنا دی ایاز
زندگی سے زندگی دست و گریباں ہوگئی

فن:

نقّاش یا کندہ کار؟

ضیاء العین ضیاؔ

کچھ یہی سوال ہے جو مشرقی پاکستان کے جواں سال فنکار — اس کی عمر اس وقت کل ۳۰ سال ہے — صفی الدین کے سلسلہ میں پیدا ہوتی ہے۔ ہم سوچتے ہی رہ جاتے ہیں کہ اسے ایک نقاش کہیں یا کندہ کار۔ اور جب ہم اس کی تمام سرگرمیوں اور فنی مظاہر کا جائزہ لے بھی چکتے ہیں تو بھی اس سوال کا دوٹوک جواب نہیں دے سکتے۔ شاید اس کی وجہ فن کار کے وجدان ہی میں کوئی بات ہو۔ بہرحال اس سلسلے میں اس کی زندگی کے ظاہری پہلوؤں پر بھی نظر ڈالنا لازم ہے۔ اور اس کے دل کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھنا بھی ضروری ہے۔

مشرقی پاکستان کا یہ ہونہار فن کار — کشیدہ قامت، نرم دم گفتگو، اخلاق و شائستگی کا پیکر — کلکتہ میں پیدا ہوا۔ اُس کے اُبھرتے ہوئے شعور نے ابتدا ہی سے لیتھو کے کام سے دلچسپی پیدا کرلی جس سے رنگ و روغن کے گداز فن — نقاشی، کی بہ نسبت ایک ٹھوس فن سے رغبت ظاہر ہوتی ہے۔ اس طرح کندہ کاری سے ملتا جلتا فن اس کی "پہلی محبت" قرار پایا۔ لیتھوگرافی سے لکڑی کا کام کچھ دور نہیں۔ چنانچہ وہ رفتہ رفتہ لکڑی پر نقش کھودنے اور اس قسم کے دیگر مشغلوں سے دلچسپی لینے لگا۔ یہ محض ابتدا تھی۔ ایک ذہین و فطین جوہر کے اپنے آپ کو پانے یا ظاہر کرنے کی کوششیں۔ جس طرف طبیعت نکل جائے اور اس طرح اس کو اپنے فطری رجحانات کا سراغ مل جاتے۔

مگر ایسی اضطراری کوششیں زیادہ سے زیادہ ایک علامت ہوتی ہیں جو میلانِ طبع کی کچھ کچھ نشاندہی ہی کرتی ہیں۔ طبیعت کا حقیقی رنگ تو جب کھلتا ہے کہ انسان باقاعدہ تعلیم پائے، تربیت حاصل کرے۔ خام جوہر پختہ ہوں اور جو بات مبہم ہے وہ بالکل واضح ہو جائے۔ صفی الدین نے بھی یہی محسوس کیا اور فن کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنی شروع کی۔ اس نے کلکتہ آرٹ انسٹی ٹیوٹ میں کئی استادوں کی زیر تربیت فن کے رموز سیکھے یہاں تک کہ ڈپلوما بھی حاصل کرلیا۔ بلکہ ۱۹۴۵ء میں "اکیڈمی آف فائن آرٹس" کلکتہ کی طرف سے "طلائی تمغۂ صدر" بھی حاصل کیا۔ اور فن شناس حلقوں میں اس کی حیثیت تسلیم کی جانے لگی۔ اس زمانہ میں وہ روغنی و آبی رنگ استعمال کرنے کا دلدادہ تھا۔ مسی پلیٹوں پر کام کرنے یا ان میں کسی تیکھے اوزار سے کھود کھود کر نقش کندہ کرنے کی طرف زیادہ رجحان نہ تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء میں یونیسکو کی زیر نگرانی پیرس میں جو بین الاقوامی نمائشِ فنون منعقد ہوئی، اُس میں صفی الدین کے ایسے ہی نقوش رکھے گئے تھے جن میں رنگ و روغن ہی سے کام لیا گیا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اُس میں پہلے نقاش ہی بیدار ہوا، کندہ کاری کا شعور بعد میں پیدا ہوا۔

۱۹۴۶ء میں ایشیائی فنونِ لطیفہ کی ایک بین الاقوامی نمائش دہلی میں منعقد ہوئی تھی۔ صفی الدین نے اس میں بھی شرکت کی۔ اور ۱۹۴۷ء میں اس کی نقاشی کے نمونے "انڈیا ہاؤس" اور "برلنگٹن ہاؤس" (لندن) میں بھی آویزاں کئے گئے۔ اور اس کے بعد ۱۹۴۸ء میں سنگاپور میں بھی اس کے کام کی نمائش ہوئی۔

۱۹۴۷ء میں جب سارے ملک کی کایا پلٹ گئی تو وہ کلکتہ کو چھوڑ کر اپنے نئے وطن، مشرقی پاکستان آگیا۔ اور ڈھاکہ آرٹ انسٹی ٹیوٹ میں گرافک آرٹس کے لیکچرار کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ مگر یہ بھی اس کی پیکرِ فن کا ایک مرحلہ ہی تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کل جو شخص فن کی کسی شاخ میں مہارت پیدا کرنا چاہے، تو اس کے لئے یورپ جانا ضروری ہے۔ کیونکہ یہ فنون وہاں برسوں کی نشوونما کے بعد ترقی کے انتہائی مدارج تک پہنچ چکے ہیں۔ چنانچہ صفی الدین بھی

اس اہم مقصد کے لئے اِس دنیائے ہنر وفن کو روانہ ہوا۔ مگر یہ نسبتہً حال کی بات ہے۔ کیونکہ اس نے انگلستان اور یورپ کا دورہ ماضیٔ قریب ہی میں کیا ہے۔ اس طرح اسے یہ موقع ملا کہ وہ مغرب کے تجربہ و حکمت کے چراغوں سے روشنی حاصل کرے اور اپنے شعور وفن کو جِلا دے۔

۱۹۴۸ء تک صفیؔ الدین کی فنی کاوشوں کی جو کیفیت رہی، اس سے ایک بات بخوبی ظاہر ہے۔ ابھی تک اس کی طبیعت کے رجحانات غیر معین تھے۔ شعورِ ذات اور عرفانِ فن کے مرحلے ان کے لئے ابھی آسان نہیں ہوئے۔ اور صفیؔ الدین کی ابھی تک عمر ہی کیا تھی۔ اس لئے اگر صفی الدین کو بھی اپنا اور اپنے فن کا دھندلا دھندلا ہی تصور تھا، تو یہ کچھ عجب نہیں۔ ہر فن کار کو تلاش، جستجو اور دریافتِ خود کے ایسے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کی منزل نگاہوں سے پنہاں ہوتی ہے۔ اور وہ کبھی کبھی فیضان کے لطیف و براق لمحوں ہی میں اس کا سراغ پا سکتا ہے۔ صفیؔ الدین کے اس وقت دو مسئلے تھے۔ ایک اپنے آپ کی تلاش اور دوسرے اپنے مشاہدات کی تلاش اور محسوسات کو مادی شکل میں جلوہ گر کرنے کے لئے ایک برجستہ اسلوبِ اظہار۔ اس احساس کے تحت وہ تمام تراسی تلاش میں منہمک ہو گیا۔ اس کے نزدیک جہاں تہاں نمائشوں پر نمائشیں ترتیب دینا اور سستی شہرت حاصل کرنا بیکار تھا۔ ایک فن کار کے لئے حقیقی مایۂ شرف یہی ہے کہ وہ اپنی بصیرت اور اپنا اسلوب پیدا کرے ـــ دونوں منفرد، دونوں اس کی فطرت کی گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے اور اس کے طبعی جوہروں سے وجود پذیر۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۵۰ء کے بعد کوئی آٹھ سال تک اس کی زندگی خلوت ہی کی زندگی رہی۔ جس میں جلوت کو بہت کم دخل رہا۔ دریافت، تجربہ، تحقیق یہی تمام تر اس کی کاوشوں کا حاصل تھا۔ قدرتی طور پر جب یہ ایک ایک کر کے نمودار ہوں گے تو اس کو اپنی حقیقی قوتوں، اپنی صلاحیتوں، جوہروں، کا علم ہو جانے گا ـ یہ دراصل اپنی طبیعت کی رو میں بہے جانے کی تکنیک ہے۔ اس زمانے میں اگر اس کے ہاتھ میں موقلم تھا۔ اور نظر قرطاس پر تھی، تو اتنے ہی ذوق وشوق اور شدت کے ساتھ وہ نفیس چوبی نقش تراشنے میں بھی سرگرم رہا۔ وہ احساسِ تنہائی، وہ کھویا کھویا پن، وہ خوب سے خوب تر کی تلاش، یہ سب اس کی تمام شخصیت کو محیط تھے۔ گویا یہ لمحات خود شناسی کے مقام تک پہنچنے سے پہلے کے وہ لمحات تھے جن سے خلا کا احساس ہوتا ہے اور جب یہ لمحے رخصت ہو جاتے ہیں تو وہ روشن لمحات چھوڑ جاتے ہیں۔ جن میں ہر چیز روشن روشن اور نکھری نکھری نظر آتی ہے۔ مدتیں گزر گئیں مگر وہ لمحات یا لمحہ نہ آیا جب اس کو اپنا حقیقی کام، اس کی وضع معلوم ہو۔ اس گو مگو کے عالم میں اس نے یہ طے کیا کہ وہ یورپ کی وسیع دنیا کی سیر کرے جو فنی حیثیت سے روشن تر دنیا بھی تھی۔ شاید وہاں کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ جس مقصد کا وہ متلاشی تھا وہ حاصل ہو جائے۔

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید
دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد

مگر اسے مغرب کی آرٹ گیلریوں سے جوت جگانے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ اپنے ہی دیس میں طوفان حوادث اس کے لئے مکتب اور لطمۂ موج، سیلی استاد ثابت ہوا۔ یہ طوفان ایک حقیقی طوفان تھا، اور لطمۂ موج فی الحقیقت لطمۂ موج۔

مشرقی پاکستان کو سیلابوں کی سرزمین کہا جاتا ہے۔ اور یہ سچ مچ سیلابوں کی سرزمین ہے۔ انسان کی قدرت کے خلاف جنگ کی ایک شاندار مثال۔ صفیؔ الدین کے دیس کا ایک اور ہم پیشہ وہم مشرب تھا۔ زینؔ العابدین، جس کے لئے ایک ایسا ہی حادثہ الہام آفریں ثابت ہوا تھا۔ بنگال کا خوفناک قحط۔ زین العابدین نے اسی میں اپنے آپ کو پایا تھا۔ اور اب صفیؔ الدین کو اپنا عکس سیلاب کی ہیبت ناک موجوں میں نظر آیا۔ وہ چیز جس نے اس کے دل کو ہلا کر رکھ دیا۔ اور اپنی سب سے زیادہ گہری قلبی کیفیتوں کو جلوہ گر کرنے کی تحریک دلائی۔ اس نے دیکھا۔ ایک قہار بپھرا ہوا بے پناہ دریا، اونچے اونچے کگاڑوں کو توڑ پھوڑ کر ہڑپ کرتا ہوا۔ میلوں میل تک آبادیوں کو زیر و زبر کرتا ہوا، شہروں میں ہزاروں خوش وخرم، رستی بستی گھر گرہستیاں حلقۂ صد کام نہنگ کا شکار ہوتی ہوئیں۔ اور سیلاب، ہر قید و بند کو توڑتا ہوا بے تحاشا سیلاب، قاآنی کے مار گزیدہ کی طرح ایک خوفناک اژدھا، مسلسل شکنجے، کی طرح شہر کو اپنی لپیٹ میں لے کر اس کی ہڈیوں پسلیوں کو چکنا چور کرتا ہوا۔

اس سیلاب نے صفیؔ الدین کے ذہن میں ایک تہلکہ پیدا

یا کندہ کاری؟

ـتان کے جواں سال مصور،
، کے دو بدیع فن پارے

جال — جیون (ایچنگ)

سیلاب : جو مشرقی پاکستان کے باشندوں کو جہد حیات کی مستقل دعوت ہے (آرنگی نقش)

سنہری ریشہ : سنہری مستقبل (رپورٹ جوٹ انکوائری کمیشن)

سیلاب زدگان مشرقی پاکستان کی امداد کے لئے افو بنیادی جمہوریتوں کی سرگرم کارروائی

ن رو پہلی : پاکستان کے سب سے بڑے ضلع' میمن سنگھ، میں پٹ سن اور دھان کی وسیع پیمانہ پر پیداوار

بلوچستان کے پسماندہ علاقوں میں بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنانے کی تدابیر (اسکالکو، ضلع مستونگ)

کردیا۔ فنکار اور اس کا ماحول ایک ہو گئے۔ زندگی اور فن ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل گئے۔ اس کے دیدہ و دل نے مشرقی پاکستان کی حقیقی زندگی اور اس کے بنیادی تجربوں کو پالیا۔ اس کے مشاہدہ و تجربہ نے اس زندگی، اس تجربہ کا مکمل احاطہ کرلیا۔ وہ کوئی کنارے پر کھڑا ہوا ناظر نہ تھا کہ اس کی حیثیت محض تماشائی کی ہو۔ سیلاب خود اس کے کمرہ تک چڑھ آیا تھا۔ ایک بل کھاتا، پھنکارے مارتا، تندوتیز سیلاب جو سنہری دھوپ اور روپہلی چاندنی دونوں میں اپنی چھب دکھاتا، مصور کو لبھاتا اور اسے دعوت اظہار دیتا۔ اسے پانی میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں نظر پڑیں جیسے وہ سب سیمیائی پیکر ہوں، سربند مچھلی کی رفتار، تیز یا مدھم، ایک طلسمی نظارہ تھا۔ اس تباہ کن منظر میں نقاش کو موضوع ہی موضوع بکھرے نظر آئے۔ وہ فن کار کی نگاہِ بینا سے دیکھتا تو اسے سطحِ آب کے نیچے خطوط اور رطرحوں کی ایک دنیا جھکولے لیتی نظر آتی۔ جس نے اس کی روح کا ایک ایک تار ہلا کر رکھ دیا۔ اور پھر اُن سے جو لرزشیں پیدا ہوئیں، انہوں نے خود بخود قرطاس پر رنگوں کی صورت اختیار کرلی۔ اور فن کا معجزہ بروئے کار آیا۔ اب اسے اپنا موضوع معلوم ہوا۔ اسے اپنے آپ اپنے فن کا پورا پورا وثوق ہو چکا تھا۔ اور اس نے جو نقوش بنائے وہ واقعی اس کی اپنی چھاپ لئے ہوئے تھے۔ حقیقی معنوں میں تخلیقی و انفرادی۔ اب وقت تھا کہ وہ اپنے حقیقی سرمایۂ کمال کو دنیا کے سامنے پیش کرے۔ یہ موقع اسے ۱۹۵۹ء میں ملا۔ جب کہ لندن میں ایک نمائشِ فن منعقد ہوئی اور اس نے "نیوورن آرٹ گیلری" میں اپنے ۵۹-۱۹۵۸ء کے بنائے ہوئے فن پارے پیش کئے۔

ان تصاویر کی خوبی یہ تھی کہ ان میں موضوع یعنی سیلاب کی تصویر کشی کا حق بھی ادا کیا گیا تھا اور فن کار کی اپنی نظر بھی کام کر رہی تھی۔ باہر کی دنیا کا عکس بھی تھا اور صاحب فن کی اندرونی دنیا کا عکس بھی۔ برسوں کی مشق و تجربہ کے بعد اسے کندہ کاری جیسے فن پر بھی فی الجملہ دسترس حاصل ہو چکی تھی جس کی طرف اس وقت تک بہت کم لوگوں نے رجوع کیا تھا۔ اور یہی وہ نمایاں خصوصیت تھی جس کی بنا پر وہ سوئٹزرلینڈ کی بین الاقوامی سہ سالہ نمائش آبچی الوان نگاری منعقدہ ۱۹۵۹ء میں انعام

کا مستحق قرار پایا۔ اب وہ محض نقاش ہی نہ تھا، کندہ کار بھی تھا۔ اور کندہ کاری کی طرف اِس شدت سے مائل گویا نقاشی اس کے مقابلے میں ثانوی حیثیت رکھتی ہو۔ اسے لڑکپن میں لکڑی پر کھدائی اور لیتھوگرافی کا شوق تھا جو آہستہ آہستہ بڑھتے بڑھتے نقاشی پر چھا سا گیا۔ گویا وہ مرقع کشی کی بہ نسبت ارتسام اور تراش خراش کے فن کی طرف زیادہ مائل ہو۔

شاید محض یہ کہہ دینے ہی سے فن کار کا امتیاز پوری طرح ظاہر نہ ہو۔ اس کے لئے ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ موقلم کا فن ہمارے یہاں کتنا ہی پرانا سہی، مگر تیکھی نوک کی چیز سے کھود کھود کر، تراش خراش کر کوئی چیز تیار کرنا، اس کا ہمارے یہاں دستور نہ تھا۔ اگر اس سلسلہ میں کسی کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ غالباً ہمارا نامور فن کار، عبدالرحمٰن چغتائی ہی ہے۔ جو مصوری اور کندہ کاری دونوں فنون کا استاد تھا۔ اور کسی فن کار کو اس کا خیال نہ آیا۔ یا شاید وہ اس ذریعۂ اظہار کو عام عقیدہ کے مطابق درخورِ اعتنا ہی نہ سمجھتے تھے۔ مصوروں کی دنیا تو بس رنگ و روغن ہی کی دنیا تھی۔ وہ تو مشغلے یا تفریح کے طور پر تبدیلِ ذائقہ کے لئے بھی اس کی طرف رجوع ہونے پر تیار نہ تھے۔ چہ جائیکہ اسے باقاعدہ فن کے طور پر اختیار کرتے۔

ایشیا تو ایشیا مغرب میں بھی انگریونگ اور ایچنگ کو بہت کم فروغ حاصل تھا۔ بیشک سولھویں سترھویں صدی عیسوی میں کتابوں کے گرد پوش، فنِ ارتسام ہی کے شرمندۂ احسان تھے۔ اور اس طرح اس فن کو خاص ترقی ہوئی۔ مگر جونہی طباعت کے موجودہ طریقوں نے میدان میں قدم رکھا اور اُس تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگے جو مشینی دور کا خاصہ ہے، تو دوسرے دستی ہنروں کی طرح ارتسام اور کندہ کاری بھی گرد ہو گئے۔

جب یہ فنون اس طرح گلدستۂ طاقِ نسیاں بن گئے تو خوش قسمتی سے دو استاد میدان میں آئے جنہوں نے ان کو مٹتے مٹتے سنبھال لیا۔ ان میں سے ایک تھا ہالینڈ کا مشہور نقاش، ریمبراں اور دوسرا انگلستان کا نامور مصور و [illegible] دونوں نے ان فنون میں ایسے ایسے جوہر دکھائے کہ یہ پھر سے

چمک اٹھے۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے فن کاروں نے بھی ان کو اپنانا شروع کر دیا۔ اور یہ تھوڑے ہی عرصے میں کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔

کہاں یورپ اور کہاں ایشیا۔ ہمارے یہاں تو ہنوز روزِ اول کی کیفیت سمجھنی چاہیئے۔ ان فنون پر صرف ایک فن کار کے توجہ دینے سے کیا بنتا ہے۔ انگریزی کے ایک مقولے کے مطابق صرف ایک ابابیل سے بہار کی رُت تھوڑی بن جاتی ہے مگر اتنا ضرور ہے کہ چغتائی کی بدولت اس فن کا چرچا ضرور ہو گیا اور لوگ یہ جان گئے کندہ کاری بھی ایک مستقل اور اہم فن ہے۔ قدرتی طور پر چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں اگر مغربی پاکستان کے چراغ کی جوت مشرقی پاکستان تک جا پہنچی۔ اور وہاں کے ایک ہونہار فن کار نے ان فنون کو اپنا کر ان میں نئی لو پیدا کی۔ اور اس طرح سلسلہ برابر آگے بڑھتا جا رہا ہے، خصوصاً دورِ انقلاب میں جبکہ ادب وفن کو مکمل منشورِ آزادی حاصل ہو چکا ہے۔ اور وہ زیادہ سے زیادہ سازگار فضا میں انتہائی دلجمعی کے ساتھ ہر قسم کی تخلیقی سرگرمیوں کی داد دے سکتے ہیں۔ اب پاکستان میں گرافک فنون — چوبی نقاشی، ایچنگ، لیتھوگرافی، آبرنگی وغیرہ — ہی نہیں بلکہ ہر قسم کے فنون کا مستقبل یقینی اور غایت درجہ تابناک ہو چکا ہے۔ صفی الدین کے نقاشی وکندہ کاری کے نمونے جو زیادہ تر دورِ انقلاب ہی کی یادگار ہیں، اس سلسلۂ ارتقار کا نقطۂ آغاز ہیں۔ جسے ہم تاحدِ نظر خوب سے خوب تر اور بلند سے بلند تر درجے ہی درجے مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

اس نئے دور کے فن پارے دل پر جو کیفیت چھوڑتے ہیں ان کی تشریح کچھ اس طرح کی جا سکتی ہے کہ فنکار کا تصور اس پختہ کاری کے ساتھ جو امتدادِ وقت اور ذہنی ارتقا سے پیدا ہوتی ہے، گہرائی اور گیرائی دونوں کو پا چکا ہے۔ دریائے پدما کی موجِ بے قرار، الھڑ دریا جو بنگال کا خونِ حیات ہے، مصور نے اس کی لاابالی جھلکیاں بڑی چابکدستی سے اپنی گرفت میں لے لی ہیں اور سطحِ قرطاس پر پیش کر دی ہیں۔ کشتیوں کے رنگا رنگ بادباں یا پانی کی سطح پر سوئے سوئے ادھر ادھر

(باقی صفحہ ۵۴ پر)

ایک رنگ

جمیل نقوی

میں نے کچھ ایسے بھی لمحات گزارے ہیں جمیل
جن کی یادوں میں کئی رنگ ہیں ہلکے گہرے
بات یوں دیکھنے میں کچھ بھی نہیں ہے لیکن
ایک رنگ ایسا بھی ہے جس کی نظر تابی سے
میرے احساس کی دنیا ہے فروزاں اب تک
جیسے کچھ سوچ میں ہے دیدۂ حیراں اب تک
میرے جذبات کی لہروں میں دمکتا ہے وہ رنگ
میری تخئیل کے پردوں سے جھلکتا ہے وہ رنگ
میرے اشعار میں الفاظ کے رنگیں پیکر
اسی اک رنگ کے اعجاز کا آئینہ ہیں

سوچتا ہوں یہ حقیقت ہے کہ افسانہ ہے
میرے برّاق تصور نے تراشا ہے جسے۔
ہاں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر شے کا وجود
کسی بنیاد، کسی کنہ، کسی بات پہ ہے
لاکھ وہ بات فقط خام خیالی ہی سہی

لوگ کہتے ہیں کہ ہر رنگ کا مرکز ہے نگاہ
خواہ وہ ایک نگاہِ غلط انداز ہی ہو
رنگ ہر رنگ سما جاتا ہے آناً فاناً
آنکھ کے راستے احساس کی گہرائی میں
ذہن بُن لیتا ہے ہر رنگ کے تانے بانے
کوئی اس راز کو کیا سمجھے کوئی کیا جانے

بات میں بات نکل آئی تو کہنے دیجیے
اک نگاہِ غلط انداز کا مارا ہوں میں
اک حسین آنکھ کے مبہم سے اشارے کی قسم

اداریہ:

"خونِ گرم دہقاں کا"

(زرعی کالج، لائلپور، پر ایک نظر)

امیر حسن سیال

ابھی تھوڑا عرصہ ہوا ہمارے ایک اہم ادارے، زرعی کالج لائلپور کا جشن جوبلی بڑے اہتمام سے منایا گیا، جو ہمارے لئے ایک علامتی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلئے کہ یہ کالج محض ایک ادارہ ہی نہیں بلکہ ہماری ملکی ترقی کے لئے رگِ جاں کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس کا جشن جوبلی اس بات کا اعتراف ہے کہ ہمارا ملک بڑی حد تک زرعی ملک ہے۔ اس کی معیشت زیادہ تر زرعی ہے اور یہی ہونی بھی چاہیئے۔ اور ہماری آئندہ ترقی و خوشحالی کا دارومدار بھی اسی پر ہے۔ لہذا اس ادارے کا جشن جوبلی اُس چیز کی پہچان اور تائید ہے جو ہماری زندگی کا بنیادی عنصر اور روحِ رواں ہے۔ خونِ گرم دہقاں کی تاثیر، اس کی اہمیت اور دھرتی کے سینے سے بیش از بیش پیداوار، سامانِ نمو اور سرمایہ و دولت حاصل کرنے کی ضرورت۔

ہمارا ملک ایک زرعی ملک ہی ہے۔ وہی ملک جسکے گیت وارث شاہ، شاہ لطیف بھٹائی، خواجہ غلام فریدؒ وغیرہ نے گائے ہیں۔ اسکی آبادی ۸۵ فیصد گاؤوں کی آزاد فضا میں بستی ہے۔ اور اگر ہم حقیقی پاکستان کو دیکھنا چاہیں تو شہروں سے دور دیہات ہی میں پائیں گے۔ اس کے باشندے زیادہ تر زرعی کام دھندوں ہی سے روزی کماتے ہیں۔ اس لئے ہم اپنے معاشی و معاشری نظام کو غور سے دیکھیں تو دھرتی کی نسبجوں کا جال اسکی رگ رگ اور ریشے ریشے میں پھیلا ہوا پائیں گے۔ اور سچ یہ ہے کہ ہم صدہا سال سے دھرتی کے دھن، اس کے اناج، ہی سے اپنے آپ کو برقرار رکھتے رہے ہیں۔

اس لئے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جہاں تک ہمارے ملک کا تعلق ہے زراعت کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ جب ہی تو شروع سے اس پر خاص توجہ مبذول کی گئی ہے۔ اور دورِ انقلاب میں تو اس کی اہمیت کا احساس اور بھی بڑھ گیا ہے۔ اور سب سے پہلے اسکی نظر نظامِ اراضی کی طرف ہی گئی اور اسی کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا گیا چنانچہ زرعی اصلاحات نافذ ہوئیں ــــ ایسی کایا پلٹ دینے والی اصلاحات جن کا تصور ہی محال تھا۔ اور اس تیزی سے کہ ان کے دور رس نتائج ابھی سے نمایاں ہونے شروع ہو گئے ہیں۔

ملک میں زراعت کی ترقی اور اصلاح کے سلسلہ میں جو کوششیں ہو رہی ہیں وہ اپنی جگہ خوب ہیں اور انہیں اور بھی فروغ دینا چاہیئے۔ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح اس میں بھی تعلیم، تربیت، تجربہ، تحقیق کی اشد ضرورت ہے۔ جو سچ مچ سونے پہ سہاگہ ثابت ہوگی۔ اور یہ ایسی درسگاہوں سے ہی ممکن ہے جو زراعت کے فن کو مؤثر بنانے اور تقویت دینے میں مدد دیں۔ بالفاظ دیگر اُن سے زراعت کا علم بھی حاصل ہو اور ہنر بھی ہاتھ آئے۔ ہم اس کے نظری و عملی دونوں پہلوؤں سے واقف ہوں۔

لائلپور کا مشہور زرعی کالج اسی قسم کی مایۂ ناز درسگاہ اور تربیت گاہ ہے۔ ایشیا کی سب سے بڑی درسگاہ، جس کی افادیت اتنی ہی زیادہ ہے جتنی کہ یہ پرانی ہے۔ اس کے نام پہ نہ جائیے۔ یہ صرف نام ہی کا زرعی کالج نہیں۔ اگر ہم کبھی چلتے پھرتے اس طرف جا نکلیں تو ہمیں اس کے سرسبز و شاداب ماحول کو دیکھ کر حیرانی ہوگی۔

ایسی درسگاہ میں اساتذہ بھی اپنے اپنے میدان میں ماہر ہونے چاہئیں۔ چنانچہ اس زرعی کالج میں ان کا پورا پورا اہتمام کیا گیا ہے۔ اسٹاف ۱۷ پروفیسروں پر مشتمل ہے جو اپنے اپنے شعبۂ علم و تجربہ کے ماہر ہیں اور علمی و عملی جائزوں میں مصروف رہتے ہیں۔ پڑھانے والے ۳ پروفیسر علیحدہ ہیں۔ دیگر اساتذہ ان کے علاوہ ہیں۔ تین پروفیسر امریکہ سے بھی مستعار لئے گئے ہیں۔ اس طرح ۵۵ اساتذہ اور زرعی محقق اس ادارہ میں کام کرتے ہیں جس کا سالانہ بجٹ ۴۳ لاکھ روپیہ ہے۔ ان میں سے ۲۴ لاکھ روپیہ صرف زرعی تحقیق پر صرف کیا جاتا ہے۔

معلمین سے گذر کر متعلمین پر نظر ڈالی جائے تو تصویر اتنی ہی

روشن ہے اور فضا اچھی خاصی بین الاقوامی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کے چھ سات سو طلبہ میں افغانستان، ایران، مصر، شام، عراق، نیپال اور ہالینڈ تک کے طلبہ بھی شامل ہیں۔ کالج کے تین بڑے بڑے ہوسٹل ہیں جن میں چار سو سے زائد طلبہ قیام پذیر ہیں۔ ظاہر ہے کہ مقامی طلبہ جس طرح اپنی زبان میں کوئی بات سمجھ اور سیکھ سکتے ہیں، غیر زبان میں نہیں کر سکتے۔ اسلئے یہ بڑی اچھی بات ہے کہ انگریزی کے علاوہ اردو میں بھی ایک کورس کا بندوبست کیا گیا ہے جس سے دو ڈھائی ہزار طلبہ اس وقت تک استفادہ کر چکے ہیں۔ ہر سال ۵۰ گریجویٹ زرعی سائنس میں سند حاصل کرتے ہیں اور اب تک سترہ سو سے زائد طیلسانین بی، ایس، سی کر کے اپنے ملک کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

زراعت صرف بونے اور کاٹنے ہی کا نام نہیں۔ اس کا دامن بڑا وسیع ہے۔ اس کا ایک دلچسپ پہلو باغبانی بھی ہے۔ اور ہمارے ملک میں تو پھلوں کی کاشت کی خاص ضرورت ہے۔ اس کی بھی باقاعدہ تعلیم اور سند دیجاتی ہے۔ یہ امر موجب مسرت ہے کہ ابتک اس فن میں کوئی ساڑھے تین لاکھ طلبہ ایم۔ ایس سی کی سند حاصل کر چکے ہیں اور پانچ افراد نے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی ہے۔ لمبے چوڑے کورسوں کے ساتھ ساتھ مختصر کورسوں کا سلسلہ بھی ہے یعنی شجر کاری، میوہ ریزی سبزی ترکاری کی حفاظت، شہد کی مکھیاں پالنا، ٹریکٹر چلانا، ڈیری کا کام، پھلوں کی حفاظت وغیرہ۔ ان کاموں میں ہزارہا طلبہ تربیت حاصل کر چکے ہیں۔

زراعت ایک ایسا علم یا کام ہے جس کے کتنے ہی شاخ و برگ ہیں۔ استعارۃً ہی نہیں بلکہ حقیقتہً اِس کا صحیح اندازہ عالمِ خیال میں نہیں بلکہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم سچ مچ اس درسگاہ میں آئیں اور اس کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالیں۔ آپ کو ہر طرف شاخیں ہی شاخیں اور کونپلیں ہی کونپلیں پھوٹتی نظر آئیں گی۔ یہ ہے اگرانومی یعنی دیہی معاشیات کا شعبہ۔ یہ زرعی علم کیمیا کا شعبہ جو واقعی پیداوار کے حق میں کیمیائی اثر رکھتا ہے۔ یہ رہا پاتھالوجی کا شعبہ، جس میں پودوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ حیوانات کی طرح نباتات بھی جاندار ہیں، اسلئے پودے بیمار بھی پڑ جاتے ہیں۔ لہٰذا ایک شعبہ ان کے علاج معالجہ کا ہے۔ پودوں کے جوڑ، پیوند لگانا، یہ ایک اور شعبہ رہا۔ پھر علاج الحیوانات ہے۔ انٹومالوجی کا نام

تو آپ نے پہلے بھی سنا ہوگا۔ یہی کیڑوں مکوڑوں اور حشرات الارض کا علم، جو انسانوں اور حیوانوں کی طرح پودوں کے بھی دشمنِ جاں ہیں۔ ان کی ایک خاص زرعی شاخ بھی ہے۔ غرض زراعت بھی کوئی معمولی چیز نہیں کہ اسے ہتھیلی پر سرسوں جمانا کہا جا سکے۔ یعنی بس اتنی ہی بات کہ زمین پر دانے بکھیر دِئے اور کھل سم سم پڑھ دیا۔ جھٹ دانوں کے طلسمی پٹ کھل گئے اور آن کی آن میں فصل کی فصل تیار ہو گئی۔ یہ سمجھنا تو پرلے درجے کی ستم ظریفی بلکہ — حماقت ہوگی۔ بیشک بونے والا بیج بو دیتا ہے۔ مگر بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اس سے پہلے بھی اور بعد بھی کتنا ہی ریاض کرنا پڑتا ہے، خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے۔ خونِ گرمِ دہقاں مہینوں مصروفِ عمل رہتا ہے۔ اور پھر وہ برقِ خرمن نہیں بلکہ جانِ خرمن بن جاتا ہے۔ یہ سب علم و تجربہ کے بغیر ممکن نہیں۔ اور جتنے یہ وسیع ہوں گے اتنا ہی بہتر ہوگا یعنی جتنا گڑ اتنا ہی میٹھا۔ دھرتی کے سینے میں چھپی ہوئی دولت یونہی برآمد نہیں ہو جاتی۔ اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جنہوں نے اس کو کنی اور تیشہ رانی میں جان لڑائی ہو۔ آخر انسان تجربہ کی بھٹی سے ہی کندن بن کر نکلتا ہے۔ سائنس کے معجزوں سے کون واقف نہیں۔ "سُوپر فاسفیٹ" نامی ایک معمولی سا سفوف ہے۔ مگر اسے "برسیم" چارہ کی فصل پر چھڑک دیا جائے تو سچ مچ معجزہ ہو جائیگا۔ پیداوار تین گنا بڑھ جائے گی۔ کالج کے محقق تجربہ و تحقیق سے اس قسم کی مفید باتیں دریافت کرتے ہیں اور کسانوں کے سامنے مظاہرہ کر کے انہیں یقین دلاتے ہیں۔ اس طرح زراعت ترقی کرتے کرتے کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ اور یہ سفوف تو محض مشتے نمونہ از خروارے ہے۔ اس قسم کا ایک اور جادو اثر سفوف ہے — "امونیا سلفیٹ"۔ جس کے کرشموں کے کسان اس زراعتی کالج ہی کے ذریعہ سے قائل ہوئے ہیں۔ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ ایسی ہی بے شمار اور بھی اہم دریافتیں ہیں جو سچ مچ زمین کو آسمان بنا دیتی ہیں۔

اس درسگاہ میں شعبے ہی شعبے ہیں۔ اسلئے ضروری ہے کہ ان کا یہاں تعارف کروایا جائے۔ ایسا فنی ادارہ کسی اعلیٰ درجے کے ماہرِ فن ہی کے ماتحت بخوبی کام کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس کے موجودہ پرنسپل علم کیمیا کے ایک بہت بڑے ماہر ہیں۔ کالج میں ان کی زیرِ نگرانی جو تحقیق ہوتی ہے وہ محض علمی یا زرعی ہی نہیں بلکہ تکنیکی اہمیت بھی رکھتی ہے۔ مثلاً ہمارے آپ کے لئے ایک بڑا ہی دلچسپ اور رغبت آفریں کام ہے۔

پودوں کے لیس دار مادہ کی صنعتی تحقیق، جیسے آئس کریم، "کسٹرڈ"، پارچہ جات
ا اوپری سطح کو چکنا بنانے اور کاغذ پر ایسے ہی عمل کے لئے برتا جاتا ہے۔

جب کالج کھلا ہو، کام کا سلسلہ جاری ہو اور ہر طرف گہما گہمی
نظر آئے تو اس کا منظر بہت ہی دلکش ہوتا ہے۔ کوئی طالب علم
دمتِ جنت" کے جنگلی بیج پر تجربہ کر رہا ہے جس سے گوند نکلتا ہے۔ کھاد
کھاد اور گیس کا ماخذ، جیسا کہ حال ہی میں پتہ چلایا گیا ہے اور اس
ے فائدہ بھی اٹھانا شروع ہو گیا ہے۔ یہ تحقیق اعلیٰ ساز و سامان کے
یر کیسے ممکن ہے؟ چنانچہ کالج ہر طرح کے جدید ترین سامان سے لیس ہے۔
ن کی مدد سے مویشیوں کے چارہ، دودھ، مویشیوں کے وزن
ھانے وغیرہ کے سلسلہ میں جو اہم اور بکار آمد معلومات حاصل ہوئی
ی، ان کا تذکرہ ایک داستان سے کم نہیں۔

ہم آپ تو صرف ایک ہی مٹی کو جانتے ہیں۔ یہ بھوری بھوری
یز جو ہمیں عام طور پر نظر آتی ہے۔ مگر یہ ہماری بھول ہے۔ مٹی کی سینکڑوں
میں اور بہر حال۔ کالج کے کیمیاوی شعبہ میں آپ درجنوں بوریوں کا انبار
یکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ کیا یہ ہوائی حملے سے بچاؤ کی تدبیر ہے؟
ہیں یہ تو محض طرح طرح کی مٹی کے نمونے ہیں۔ اور یہاں کے محقق ان کے
اص معلوم کر کے ان کی درجہ بندی کرتے ہیں۔

کالج کی دیواریں تا حد نظر گوناگوں تصاویر سے آراستہ ہیں۔ سب
نباتات ہی کے مختلف پہلو اجاگر کئے گئے ہیں۔ عجیب تر یہ کہ بعض پودوں
خود ہی تصویروں کا روپ دھار لیا ہے! یعنی یہاں کے خوش
قوں نے پودوں ہی کو اٹھا کر فریموں میں جڑ دیا ہے۔ عجب عجب پودے،
ختوں کے نمونے برگ و بار — وہی بات ہے

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار ہر ورقے دفترے است معرفتِ کردگار

یہاں تو برگِ درختانِ خشک بھی درسِ بصیرت دیتے ہیں! یہاں
اڑیاں، جڑیاں، بوٹیاں، کیا نہیں؟ سب چھوٹے بڑے ایک ہی
ت میں! مستانہ وار جھومنے والے کھجور اور پام دیکھئے۔ ان میں سب
ے بڑا شاید "کاپوک" نامی پیڑ ہے۔ جس میں تیز قرمزی رنگ کے پھول
تے ہیں اور ایک پھل بھی ہوتا ہے جس کے اندر سے ریشمی روئی برآمد
تی ہے۔ مقدرت کی طرح یہاں بھی سرو و سمن یکجا ہیں۔

ہماری نہایت اہم فصلوں میں ایک گندم ہے۔ جس کی کاشت
لاکھ ایکڑ اراضی پر ہوتی ہے۔ اس کے سلسلے میں تحقیقاتی

کام ۱۸۹۳ء میں شروع ہو گیا تھا جو برابر ترقی کرتا رہا ہے۔ ظاہر ہے
کہ یہ سلسلہ اب بہت آگے بڑھ چکا ہے۔

ایک بڑا ہی اہم بنیادی کام بیجوں کی ترقی ہے۔ کالج ان کے
بارے میں تحقیق کا اہم ترین مرکز ہے۔ لوزیات کے شائقین کو یہ سن کر
یقیناً بڑی مسرت ہو گی کہ آزادی سے پہلے مغربی پاکستان میں مونگ پھلی
بالکل نہیں پیدا کی جاتی تھی۔ مگر رنگِ گلشن کا بندوبست برنگِ دگر ہے آج
اب مونگ پھلی اہلِ ذوق کی تسکین کے لئے بکثرت پیدا کیجاتی ہے۔
اگر آپ اس سمن کے ساتھ سرو کا تماشا بھی کرنا چاہیں تو گنے کی
ان گنت قسمیں بھی دیکھ لیجئے۔ کیوبا، جاوا، روس، سب کی بھانت
بھانت قسمیں یہاں حقیقی معنوں میں اپنی بہار دکھاتی ہیں۔ کیونکہ ان کو
چاروں طرف سے بجلی کے قمقموں سے نورٌ علیٰ نور کیا گیا ہے۔ اور معلوم
ہوا ہے کہ برقی روشنی ان کی بالیدگی میں بڑی مدد دیتی ہے۔

اپنی سنہری فصل گندم کا ذکر ہم اوپر کر ہی چکے ہیں۔ اس ضمن
میں روپہلی فصل — روئی، کا تذکرہ ایک لطیف مناسبت سے
خالی نہ ہوگا۔ روئی پاکستان کی سب سے بڑی نقد فصل ہے جو ۳۴ لاکھ
ایکڑ پر کاشت ہوتی ہے۔ اور اس سے ۱۷ لاکھ گانٹھ روئی پیدا ہوتی ہے۔
اسی لئے کالج جس طرح گندم کی سنہری فصل کو اور بھی سنہری بنانے کی کوشش
کر رہا ہے اسی طرح اس روپہلی فصل کو بھی اور روپہلی بنانے میں کوشاں ہے۔

غذا کا مسئلہ ہمارے یہاں ایک بڑا اہم مسئلہ ہے۔ اس کے بارے
میں جو کوششیں ہمارے یہاں اب تک ہوتی رہی ہیں ان کا سلسلہ موجودہ انقلابی
حکومت نے تیز تر کر دیا ہے۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے اور نہری پانی
کے معاہدہ کے تحت اس پر اور بھی شدید توجہ مبذول کی جائے گی تاکہ ہم
غذا کے سلسلہ میں مکمل طور پر خود کفیل ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس معاملہ میں
لائلپور کی قدیم زرعی درسگاہ ایک نہایت اہم کردار ادا کرے گی۔ اور اس سے
ہمیں بہترین نتائج کی توقع کرنی چاہئے۔

نیشکر، اور اسلئے التزاماً شکر کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ ان کے ساتھ
شہد کا ذکر نہ ہو تو شاید کام جاں پوری طرح حلاوت اندوز نہ ہو سکے۔
شہد کی مکھیاں پالنا اور شہد نکالنا ایک بڑی آسان، اہم، سستی اور ساتھ
ہی بیش بہا صنعت ہے۔ آزادی کے بعد اس پر بھی خاص توجہ دی جا رہی
ہے۔ لاکھ جس کے متعلق سنا کرتے تھے کہ لاکھ ٹکے کی ہیرکائے اور جو آزادی سے پہلے
ہندوستان سے آتی تھی اب اس کی پچاس فیصد ضروریات ہمارا ملک خود پوری کرنے

لگا ہے۔ شاید ہوتے ہوتے اور ترقی کرتے کرتے یہ واقعی ٹکے سیر بلکہ اس سے بھی سستی بکنے لگے۔

غرض یہ ہے اس پچاس سالہ درسگاہ کی پُر لطف روداد جو درحقیقت کسی صاحبِ ذوق و نظر کے لئے رومانوی داستان سے کم دلچسپ نہیں۔ اس ادارہ نے کسی ہنگامہ آفرینی سے نہیں بلکہ بڑی خاموشی سے ملک کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اور اب جبکہ ہم تعمیر و ترقی کے ایک نئے نہایت اہم مرحلے میں قدم رکھ رہے ہیں اور انقلابی حکومت نے سائنس، ٹکنالوجی اور زراعت پر خاص زور دینے کا تہیہ کیا ہے، اس کی پُرخلوص اور مسلسل جد و جہد ہمارے لئے اور بھی نتیجہ خیز ثابت ہوگی۔

★

"خاتونِ پاکستان" کراچی (نرسنگ نمبر) مدیر شفیق بریلوی قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ: پوسٹ بکس ۷۱۹۹ کراچی

"خاتونِ پاکستان" ایسا ماہانہ مصور مجلہ ہے جو ایک عرصے سے قومی میدان میں بہت وقیع خدمات انجام دے رہا ہے۔ بلکہ اس کا مطمحِ نظر ہی یہ ہے کہ موجودہ حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے عوام کی آگاہی و رہنمائی کے لئے اہم قومی موضوعات پر خاص نمبر ترتیب دے اور معاشرہ میں ایسے معاملات کا شعور پیدا کرے جو قومی اہمیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس کا پچھلا شمارہ قومی صحت کے متعلق تھا اور موجودہ اسی کی ایک نہایت اہم شاخ "نرسنگ" سے متعلق ایک خاصی وقیع پیشکش ہے۔ جس میں اس کی ضرورت، اہمیت اور مختلف پہلو بڑے دلکش پیرائے میں اُجاگر کئے گئے ہیں۔ "نبضِ مریض پنجۂ عیسیٰ میں چاہیئے"۔ یہ برجستہ الفاظ جو آخری تصویری صفحہ کی زینت ہیں، اس کی بخوبی عکاسی کرتے ہیں۔ امید ہے کہ یہ شمارہ اس پیشہ کو جو خواتین کے لئے نہایت موزوں ہے مقبول بنانے اور ایک اہم قومی ضرورت کو پورا کرنے میں بڑی مدد دے گا۔ اس سلسلہ میں بریگیڈیر شریف ڈائرکٹر جنرل آف ہیلتھ، حکومت پاکستان کی یہ رائے سند ہے کہ "خاتونِ پاکستان" نرسنگ نمبر نکال کر پاکستان کی بڑی خدمت انجام دے رہا ہے۔ میں اس نمبر کو حکومت اور عوام کا پہلا تعاون قرار دیتا ہوں" ——

نقاش یا کندہ کار: —— بقیہ صفحہ ۵۰

میگھ دونوں کی سہانی پرچھائیاں یوں تو ہر وقت موجود ہوتے ہی ہیں۔ مگر فن میں اُجاگر ہونے کے لئے صحیح معنوں میں دیکھنے والی آنکھیں اور سمجھانے والی زبان کے محتاج ہوتے ہیں۔ یہ زبان ان کو صفی آلدین نے عطا کی۔ اس کے بعد یہ کشتیاں محض کشتیاں نہیں رہتیں بلکہ ایک تاریخی حقیقت بن جاتی ہیں۔ یہ وہ نقوش ہیں جن میں آب رنگی، گہری ایچنگ اور کندہ کاری کی تکنیکیں برتی گئی ہیں اور اس طرح تینوں کی فسوں کاری آمیز ہوکر گویا سہ آتشہ بن گئی ہے۔ ان نقوش کو دیکھ کر انسان چونک پڑتا ہے۔ ان کے انوکھے پن کا جادو!

یہ کرشمہ آفرینی "مچھلی پکڑنے کا سمے" میں نمایاں ہے جس میں صفی آلدین نے سیاہ رنگ کو بڑی نفاست اور کاریگری سے برتا ہے۔ اس کے خطوط میں موسیقی کی لہروں جیسا اُتار چڑھاؤ ہے۔ سیاہ رنگ کا برتنا بڑا ہی کٹھن کام ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے صفی آلدین نے اس کے برتنے میں بہت ہی جی لگا کر محنت اور ریاض کیا ہے۔ اس نقش کی سیاہی میں ایک مخملیں گھلاوٹ اور ملائمت ہے۔ صفی آلدین کو بافت اور ڈیزائن سے بڑا لگاؤ ہے۔ جب بھی کہیں مناسب جگہ ملتی ہے وہ اس سے ضرور کام لیتا ہے۔ تصویر "بھاٹا" لندن کی رائل سوسائٹی آف ایچرز اینڈ انگریورز" میں دکھائی گئی۔ اس کے وسط میں مصور نے ایک سیاہ دائرہ بنایا ہے جسے ایک خط قطع کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بھاری خطوط اور ترتیب کی بھاری بھرکم وضع دیکھنے والے کو دیر تک محور رکھتی ہے۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کشتی اب رواں ہوئی، اب رواں ہوئی۔

اس میں شک نہیں کہ صفی آلدین نقاشی سے اُتنا ہی شغف رکھتا ہے جتنا کندہ کاری سے، بلکہ یورپ سے واپس آنے کے بعد اس نے پھر اپنی پہلی محبوب، نقاشی کی طرف توجہ کی ہے، مگر بنیادی طور پر وہ کندہ کار ہی معلوم ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی نقاشی بھی کندہ کاری ہی کا بدلا ہوا روپ لگتی ہے اور اس میں اسی فن کا عنصر غالب رہتا ہے۔ بہرکیف، جیسا کہ ایک نقاد نے کہا ہے صفی آلدین

(باقی صفحہ ۵۸ پر)

مسائل حاضرہ:

اعضائے قوم

اسلم قریشی

افراد حقیقی معنوں میں اعضائے قوم ہوتے ہیں۔ صرف تعداد و شمار ہی میں نہیں۔ بلکہ اس لئے بھی کہ وہ قوم کا دست و بازو ہوتے ہیں اور اس کی قوت بھی۔ ان کو قوم کا بہترین سرمایہ کہا جاتا ہے۔ وہ اس کے وسائل میں سب سے زیادہ اور بنیادی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ وہ دوسرے تمام وسائل کو کام میں لاتے ہیں اور اہم نتائج پیدا کرتے ہیں۔ اگر ہم قوم کو بڑا دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں پہلے اس کی اپنی اکائیوں پر توجہ دینی چاہئے۔ افراد کا ٹھیک ٹھیک شمار، ان کے متعلق ہر قسم کی معلومات کی فراہمی، ان کی صلاحیتوں وغیرہ کا جائزہ قوم کے لئے کوئی قدم اٹھانے، منصوبے باندھنے یا کام کرنے کے لئے مقدم ہے۔ بلاشبہ کسی قوم کا سب سے اہم خزانہ اس کے عوام ہی ہیں۔

اگر یہ درست ہے تو پھر کیا یہ ضروری نہیں کہ ہم وقتاً فوقتاً یہ پتہ چلائیں کہ ہماری تعداد کیا ہے۔ اور اس سے بھی بہتر یہ کہ ہر شخص کی ذات، مذہب، فرقہ، حیثیت، آمدنی، تعلیم، لیاقت اور دیگر امور کے متعلق اہم کوائف فراہم کریں اور جو بھی منصوبہ، تدبیر یا حکمت عملی اختیار کریں انہیں کی روشنی میں کریں۔ آج کا زمانہ تو پھر بھی بڑا ترقی کا زمانہ ہے۔ اور معمولی سے معمولی ملک بھی صحیح اعداد و شمار حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، مگر ہزارہا برس پہلے بنی اسرائیل نے بھی یہی کچھ کیا تھا۔ کون نہیں جانتا کہ ان کی مذہبی کتاب توریت میں پہلے پیدائش کا باب آتا ہے۔ اور اس کے بعد گنتی کا۔ پاکستان جیسے نئے ملک کے لئے یہ گنتی اشد ضروری ہے۔ ایسی کہ اس میں افراد کو گنا ہی نہ جائے بلکہ تولا بھی جائے یعنی ان کے متعلق تمام ضروری باتیں معلوم کی جائیں۔ اور ان کی خوب چھان بین کی جائے تاکہ ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جاسکے۔ یہ کام بالکل اسی طرح ہونا چاہئے جس طرح کوئی ڈاکٹر انسانی جسم کا معائنہ کرتا ہے۔ تاکہ اس کی صحیح حالت معلوم کی جائے اور پھر اس سے کام لیا جائے یا مناسب دوائیں یا تدبیریں تجویز کی جائیں تاکہ وہ معاشرہ کا ایک مفید عنصر ثابت ہو، اور اس کے لئے زیادہ سے زیادہ کام آسکے۔

اب جب ہمارے ملک نے انقلابی حکومت کے ساتھ ایک بھرپور زندگی کا آغاز کیا ہے اور تعمیر و ترقی کے ایک نئے دور میں قدم رکھنے والا ہے، خصوصاً دوسرے پنج سالہ منصوبے کے ساتھ طرح طرح کے اور منصوبے بھی باندھے جارہے ہیں، یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ ہم سب ہیں کتنے، ہماری ضرورتیں کیا ہیں، ہمارے لئے کیا کیا باتیں موزوں ہوں گی، وغیرہ وغیرہ۔ غذا، معاش، دولت، رہائش، صحت، تعلیم، ہر بات میں صحیح کیفیت اور صحیح ضرورتوں کا دریافت کرنا لازم ہے تاکہ ان کے مطابق مناسب قدم اٹھائے جاسکیں۔ انقلابی حکومت شروع ہی سے جس زور و شور کے ساتھ زندگی کے تمام معاملات و مسائل کے درپے ہے، اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ مردم شماری اور دیگر اعداد و شمار کا بھی پوری طرح احاطہ کیا جائے تاکہ صحیح نہج پر تعمیر و ترقی کی تدابیر کرنے اور موثر منصوبے مرتب کرنے میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ یہ نہ ہو کہ ہم اس صورت حال سے دوچار ہوں ؎

خشتِ اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

یہی وجہ ہے کہ سارے ترقی یافتہ ملکوں میں عموماً ہر دس سال بعد مردم شماری ہوتی ہے۔ پاکستان میں بھی اس سے پہلے ایک مردم شماری ہوچکی ہے۔ اور یہ دوسری مردم شماری ہے جس کو زیادہ سے زیادہ صحیح اور جامع ہونا چاہیئے تاکہ ہم اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں، یہ سب باتیں ہمارے صاحب نظر سربراہ — فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، کی نگاہ میں تھیں۔ اس لئے پہلے اس

مقصد کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا جو ایک سال تیاریاں کرتا اور منصوبے بناتا رہا۔ لہٰذا موجودہ شماری ان تمام سرگرمیوں کا نقطۂ عروج ہے۔ اس کی اہمیت و افادیت اظہر من الشمس ہے۔ اس لئے صدر پاکستان نے اس کے آغاز سے پہلے قوم کو خطاب کرنا اور اس کو مناسب ہدایات دینا ضروری سمجھا۔ انہوں نے پہلے ہی بتا دیا کہ مردم شماری کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانا ہمارے لئے من حیث القوم کیوں ضروری ہے۔ ہمارے یہاں غذا کا مسئلہ ہے آبادی کا مسئلہ ہے، رائے دہندگان اور انتخابات کے مسئلے ہیں۔ رہن سہن، معیار زندگی اور صحت کا مسئلہ ہے۔ آمدنی اور رفاہ و بہبود کے مسائل ہیں وغیرہ وغیرہ یہ سب بڑی احتیاط سے مطالعہ چاہتے ہیں۔ کیونکہ قوم کی حیثیت ایک بڑے کنبے، جماعت یا برادری کی ہے۔ اور جیسے ہم گھر گرہستی میں جو کچھ کرتے ہیں ہر بات کی ٹھیک ٹھیک جانچ کے بعد ہی کرتے ہیں۔ اسی طرح ساری قوم کے سلسلہ میں بھی ہونا چاہیئے۔ آخر ہم اپنے حال و مستقبل، زندگی اور موت کے اہم مسائل سے کیسے غافل ہو سکتے ہیں۔ جبھی تو اس کی اہمیت اور افادیت پر زور دیا گیا۔ اور کارکنوں کے ساتھ تعاون کی التماس اور تلقین کی گئی۔ یہ ایک یقینی بات ہے کہ جب اس غیر معمولی اہتمام کے ساتھ مردم شماری، یکم فروری ۱۹۶۱ء کی صبح تک ختم ہو گی تو ہمیں معلومات کا ایسا اہم ذخیرہ ہاتھ آجائے گا۔ کیونکہ سربراہ قوم کے الفاظ میں دو لاکھ سے زائد شمار کنندگان، جذبۂ خدمت سے سرشار، طول و عرضِ ملک میں، گھر گھر پہنچ کر معلومات فراہم کریں گے، ہر ہر فرد کا اندراج کیا جائے گا، اور ہم خواہ کہیں رہتے ہوں، ساحلِ مکران سے سلہٹ تک اور خیبر سے کوہستان چاٹگام تک یہ، مردم شماری کی جائے گی اور کوئی نہ کوئی شمار کنندہ ہم تک ضرور پہنچے گا — جس سے ہم بے شمار فوائد حاصل کر سکیں گے۔ ذرا چشمِ تصور وا کر کے اِن فوائد پر نظر ڈالئے۔ آپ کو تا حدِ نظر ایک نہایت شاندار اور روشن سلسلہ نظر آئے گا۔ آیئے ہم اس سلسلے پر نظر ڈالیں جو کہکشاں کی طرح دور تک پھیلا ہوا ہے اور اس میں سے اپنے حسنِ فردا کے چمکتے دمکتے ستارے چنیں، ان میں آنے والے دور کی تابانیوں کی جھلک دیکھیں۔

ہمارے ملک میں آئندہ رائے دہندگان کی فہرست اس مردم شماری کی بنا پر مرتب ہوگی۔

ہمارے آئندہ انتخابات اسی کی بنا پر ہوں گے اور بنیادی جمہوریتوں کے اراکین انہیں کی بنا پر چنے جائیں گے۔

ہماری غذائی صورتِ حال، غذائی حیثیت سے خود کفیل ہونے کی تدابیر، قوم کی غذائی ضرورتوں کا پتہ چلانا، ہر موقع کے لئے تیار رہنا، پیداوار کا بڑھانا سب اسی پر موقوف ہوں گے۔

نو آبادیوں، ذیلی بستیوں، مکانوں اور رہائش گاہوں کی حالت تعداد، ضرورت سب اسی پر منحصر ہے۔

قوم کے لئے جو سروسیں، سہولتیں، آسائشیں، منصوبے ضروری ہیں۔ ان کا اندازہ اسی سے ہوگا۔

شہروں، قصبوں اور گاؤں میں اسکول، اسپتال وغیرہ اسی کی بنا پر بنائے جائیں گے۔ کون کون سی صنعتیں کہاں کہاں قائم کی جائیں، اسی پر موقوف ہے۔ اسی کی بنا پر فیصلہ کیا جا سکے گا کہ کتنا اور کونسا مال تیار کیا جائے، کہاں کہاں بھیجا جائے، اور اس کی کھپت کہاں کہاں اور کس کس شکل میں ممکن ہے۔

نئے نئے علاقے کس طرح آباد کئے جائیں، بنجر زمینوں کو کس طرح بکار آمد بنایا جائے۔

زبان، فنی اور عمومی تعلیم، مذاہب، فرقوں، تاہل، بے کاری معذوری وغیرہ سب کے متعلق ضروری کوائف کی فراہمی اور ان کی روشنی میں ضروری اقدامات۔

صحت، صفائی، ملازمت، ہر بات کی پوری پوری جانچ اور اس کے بعد بہتر سے بہتر تدابیر۔

یہ تو ہوئیں محض جھلکیاں۔ مگر جب یہ اور دوسری جھلکیاں جمع ہو جائیں گی، جب یہ صاف اور واضح روشنیوں کی شکل اختیار کر لیں گی، تو ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ نگاہوں میں کیسی چکا چوند پیدا کریں گی۔ ایک حقیقتہً شاندار اور تابناک مستقبل کی تمہید بھی [illegible]

★

نالۂ طائرِ بام —— بقیہ صفحہ ۲۹

اور جو کام کریں خلوص اور تندہی سے کریں اور اس طرح کریں کہ کسی دوسرے کو یہ دیکھنے کی ضرورت نہ رہے کہ آپ کام ٹھیک طریقے سے کر رہے ہیں کہ نہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ اپنے میں خود اعتمادی پیدا کریں اپنے آپ کو منظم کریں، فضول جھگڑوں سے احتراز کریں اور اپنے قومی نصب العین کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھیں، اپنے مفاد کی خاطر کبھی قومی مفاد کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کریں۔ یاد رکھیں کہ اس سے کبھی آپ کو فائدہ نہیں پہنچے گا۔ آپ اپنے دل میں حکومت یا کسی اور کے خوف کے بجائے خدا کا خوف پیدا کریں اور ہر کام کرنے سے پہلے سوچ لیں کہ خدا اس سے خوش ہوگا کہ نہیں۔ اس طرح آپ کی بہت سی کمزوریاں اور غلطیاں از خود دور ہو جائیں گی ●

نقاش یا کندہ کار —— بقیہ صفحہ ۴۵

میں وہ قوت، بصیرت اور اعتماد پایا جاتا ہے جو اس کی تخلیقی سرگرمیوں میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم معمولی معمولی چیزوں کو بھی اس کے نقوش میں جلوہ گر پاتے ہیں اور وہ فن کے کیمیائی اثر سے کچھ کی کچھ بن جاتی ہیں۔ اسے اپنے موضوع پر جو گرفت حاصل ہے اور اسلوب میں اس نے جو خوبی بڑی حد تک پیدا کر لی ہے اس نے اس جواں سال فن کار کے کام کو زیادہ دلچسپ، نیا، اچھوتا اور پُر معنی بنا دیا ہے ●

بہار ۔۔۔ سراپا تبسم!

تبت ٹوتھ پیسٹ کے استعمال سے
دانت شبنم کے قطروں کی طرح شفاف اور چمکدار
رہتے ہیں اور منہ کی مہک میں نسیم صبح کی تازگی محسوس
ہوتی ہے۔ یہ حسین تبسم اس کی خصوصیات کا
اعتراف اور اس کی پسندیدگی کا ثبوت ہے

تبت
ٹوتھ پیسٹ
سادہ یا کلوروفل کے ساتھ

TIBET

کوہ نور کیمیکل کمپنی لمیٹڈ۔ کراچی، ڈھاکہ
آرائشِ جمال کی معیاری مصنوعات و عمدہ صابن بنانے والے

زر سازی

مصباح الحق

وہ کہانی تو آپ نے سنی ہی ہوگی ۔ ایک تھا عقل کا پورا اور گانٹھ کا پکا ۔ اس نے جو یہ کہاوت سنی تو کہنے لگا ازیں چہ بہتر؟ روپیہ روپے کو کھینچتا ہے تو کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے ۔ چنانچہ وہ اللہ کا نام لے کر چل پڑا ۔ اتفاق سے اس کا گذر صرافوں کے بازار میں ہوا ۔ جہاں دکانوں میں اشرفیوں کے ڈھیر کے ڈھیر لگے تھے ۔ دل میں کہا اس قول کی سچائی کو آزمانے کی اس سے بہتر جگہ اور کیا ہوگی ۔ جھٹ تہہ کیا اور بڑی احتیاط سے نشانہ کر کے روپیہ عین اس ڈھیر پر پھینک دیا اور لگا انتظار کرنے کہ اب سارے کا سارا ڈھیر اٹھ کر اس کی طرف آ جاتا ہے ۔ مگر وہ نہ آنا تھا نہ آیا ۔ بیچارہ بڑی دیر وہاں کھڑا حسرت سے تکتا رہا ۔ مگر اس کی امید پوری نہ ہوئی ۔ آخر لوگوں نے اسے سمجھایا کہ اس کہاوت کے معنی وہ نہیں جو اس نے سمجھے ہیں ۔ روپیہ اس بے ڈھنگے طریقے سے روپے کو نہیں کھینچا کرتا ۔ اگر انسان سوچ سمجھ سے کام لے تو ایک روپیہ واقعی سینکڑوں روپے کھینچ کر لا سکتا ہے ۔

مگر مشکل یہ ہے کہ بہت کم لوگ یہ نکتہ جانتے ہیں ۔ وہ تو بس یہی جانتے ہیں کہ خدا یا تو چھپر پھاڑ کر پیسہ دے دیگا یا اللہ میاں کی برکت سے آسمان سے دھن برسنے لگے گا ، یا پھر زمین سے کوئی خزانہ نکل آئیگا ۔ اگر ہم اس انمول چیز سے کام لیں جو قدرت نے ہم سب کو عطا کی ہے اور جسے ہم سوجھ بوجھ کہتے ہیں تو کسی آوہری دین ، اللہ دین کے چراغ یا چھپے خزانوں کی آس امید رکھنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی ۔ ہم چاہیں تو عقل کی مدد سے ایک ہی روپے کے سینکڑوں روپے بنا سکتے ہیں ۔ چاندی بوئیے سونا کاٹئیے ۔ اس کی ترکیبیں تو خیر بہت ہیں اور آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہمارے کتنے دوست جو کل تک کوڑی کوڑی کے محتاج تھے کس طرح ایکسپورٹ امپورٹ سے دنوں میں کہاں سے کہاں پہنچ گئے ۔ یا پھر روپیہ لگانے کا دھندہ ہے جو زر کے انبار لگا دیتا ہے ۔ یہی حصص خریدنے کا کاغذی بیوپار جس میں روپیہ جادو کی طرح بڑھتا جاتا ہے ۔ مگر میں آپ کو یہ ٹیڑھے میڑھے راستے کیوں دکھاؤں ۔ آخر روپیہ بڑھانے کے سیدھے سادے طریقے بھی تو ہیں ۔ بڑے آسان، بڑے محفوظ، بڑے فائدہ مند ۔ اور جن میں ہمارا ہی نہیں سینکڑوں کا بھلا ہے ۔ ساری قوم کا بھلا ۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ بڑی بڑی حکومتیں ہوں یا کمپنیاں، وہ روپے ہی کے بل بوتے پر چلتی ہیں ۔ فرق صرف یہ ہے کہ حکومتوں کے پاس بہت دھن ہوتا ہے ، ہمارے پاس کم ، اور پھر آج کل سکوں ہی سے کام نہیں چلتا ۔ بھلا اتنی مقدار میں سکے کیسے بنائے جائیں کہ وہ اربوں بدموں کی تعداد میں ہاتھ آسکیں ۔ اور دس بیس سو روپے تو خیر کسی نے دے دئیے یا لے لئے مگر پدموں، سنکھوں کی رقم کا کیا بنے ۔ بڑے بڑے تاجر، بیوپاری، بنک، کمپنیاں اور حکومت جو دن میں سینکڑوں بار لاکھوں کروڑوں کا لین دین کرتے ہیں ، وہ اتنے سکے کیسے اور کہاں فراہم کر کے رکھیں ۔ اس لئے نوٹوں یعنی کاغذی زر کی ترکیب نکالی گئی ۔ بڑی سیدھی بات ہے ۔ پریس موجود ہیں ہی ۔ ان سے بے شمار نوٹ چھاپ ڈالے اور انہیں علامتی روپیہ قرار دے دیا ۔ تا کہ ہر کوئی انہیں لے دے سکے ۔ آپ کہیں گے یہ تو بڑی عمدہ ترکیب ہے ۔ جتنے نوٹ جی چاہا چھاپ ڈالے ۔ مگر ٹھہرئیے ۔ نوٹ یوں نہیں چھاپے جاسکتے ۔ آخر یہ بھی لازم ہے کہ وقت آپڑنے پر اتنی ہی قیمت کی نقدی ادا بھی کی جاسکے ۔ یعنی اس مالیت کا سونا محفوظ ہونا چاہئیے ۔ پھر یہ بھی اندیشہ ہے کہ لوگوں کے پاس جتنے پیسے زیادہ ہونگے اور

وہ دوسروں کو دے سکیں گے، "اتنی ہی چیزوں" کی قیمت بڑھتی جائےگی - اور لوگ گرانی، گرانی کا شور مچانے لگیں گے - اس لئے ضروری ہے کہ زیادہ نوٹ گردش میں نہ رہیں - اور جہاں نوٹوں کو دھڑا دھڑ جاری کیا جاتا ہے وہاں انکے واپس آنے کی تدبیر بھی کی جائے - سچ پوچھئیے تو خرابیاں پیدا ہوتی ہی روپیہ کی زیادتی سے ہیں - جسے اصطلاح میں "افراط زر" کہتے ہیں - اسلام نے سودخوری کی ممانعت اور زکواۃ کی تلقین سے اس کو رو کنے کی کوشش کی ہے - صحیح راستہ تو آخر اعتدال ہی کا راستہ ہے - دولت زیادہ ہو جائے تو فتور ہی پیدا کرتی ہے - لوگ اسے فضول رسموں اور عیش و عشرت پر خرچ کرنا شروع کر دیتے ہیں - اس طرح روپیہ ، اور روپیہ پیدا نہیں کرتا بلکہ ضائع چلا جاتا ہے - ایسے ہی روپیہ تجوریوں میں بند رہے اور اس کا چلن رک جائے تو اس کو زنگ ہی لگتا چلا جائیگا - کوئی عمدہ ادارہ یا حکومت ہو تو وہ اسے مفید کاموں پر لگا کر دھڑا دھڑ دولت پیدا کر سکتی ہے - اس طرح ساری قوم دولت مند اور خوشحال ہو جاتی ہے - یاد رکھئیے جتنی کوئی چیز زیادہ ہوگی، اتنی ہی اس کی قدر کم ہو جائیگی - یہ ایک بڑا اصول ہے : پیسہ زیادہ مہنگائی زیادہ - ہمارے ملک میں تو خرابی کا اور بھی اندیشہ ہے - ہمارا ملک زرعی ہے - صنعتیں ابھی ابھی چالو ہوئی ہیں - مصنوعات کم ہیں، اس لئے باہر سے منگوانی پڑتی ہیں - جو برآمد سے ہم کماتے ہیں وہ درآمد پر خرچ کردیتے ہیں - اس لئے پھر منہہ دیکھتے رہ جاتے ہیں -

سوال یہ ہے کہ اس افراط زر کی خرابی سے کیسے بچا جائے - اس کا جواب بڑا واضح ہے - کوئی ایسی ترکیب کی جائے جس سے روپیہ واپس آکر حکومت کے خزانے میں جمع ہوتا رہے اور وہ اسے تعمیر و ترقی کے کاموں پر لگائے - اس سے کم سطح پر آسان اور عمدہ ترکیب یہ ہے کہ اگر ہمارے پاس نوٹ یعنی روپیہ کثرت سے آجائے تو ہم اسے بےتحاشا خرچ نہ کرتے پھریں - ہم روپیہ بچانا سیکھیں - ہم میں سے ہر ایک کو بچت کی عادت ڈالنی چاہئیے - اگر ہم خود ایسا نہ کرسکیں تو ہماری حکومت نے اس کے لئے سہولت پیدا کر دی ہے - اس نے قومی بچت کی اسکیم جاری کی ہے - اور وقتاً فوقتاً چھوٹی رقم کے سیونگز سرٹیفکیٹ یعنی بچت کے سرٹیفکیٹ جاری کرتی ہے جنہیں بانڈ کہتے ہیں - آپ کسی ڈاکخانہ میں ۱۰ روپے دیجئیے اور ایک سرٹیفکیٹ خرید لیجئیے - یہ حکومت کی طرف سے سند بھی ہے اور اقرار بھی - آپ چاہیں تو ہزاروں روپے کے سرٹیفکیٹ خرید لیں - جتنا گڑ اتنا میٹھا - آپ کی رقم محفوظ رہے گی اور اس میں برابر اضافہ بھی ہوتا رہےگا اور چند ہی سال میں رقم کہیں سے کہیں پہنچ جائیگی ! ادھر حکومت کو اتنے وسیع پیمانے پر روپیہ فراہم ہو جائے گا تو وہ اسے قومی تعمیر و ترقی اور رفاہ و بہبود کے بےشمار منصوبوں پر لگا سکتی ہے جس سے پھر آپ ہی کی آسودگی و خوشحالی میں اضافہ ہوگا -

ایسے سرٹیفکیٹ یا بانڈ تو حکومت کی ایک مستقل اسکیم کا جز ہیں اور ان کا سلسلہ برابر جاری رہا ہے - کیونکہ حکومت کی طرف سے مختلف قرضے جاری ہوتے رہے ہیں اور جو لوگ معاملات کی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں وہ ان سرٹیفکیٹوں اور بانڈوں کو خریدنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے ہیں اور ان سے حکومت اور قوم دونوں کو بے انتہا فائدہ پہنچتا رہا ہے -

اس سلسلہ کی تازہ ترین کڑی ہے **قومی انعامی بانڈ** جو عام سرٹیفکیٹوں سے کہیں زیادہ فائدہ مند اور پرکشش ہیں - کیونکہ ان سے بچت ہی نہیں ہوتی اور رقم دن دونی رات چوگنی ترقی ہی نہیں کرتی رہتی بلکہ اس سے آپ کو انعام ملنے کی بھی قوی امید ہے - اگر آپ قسمت کے دھنی واقع ہوئے ہیں تو کچھ عجب نہیں آپ کو صرف دس روپے کے بدلے بیس ہزار کا انعام مل جائے ! اور بیس ہزار نہیں تو ساڑھے سات یا دو ہزار ہی کا سہی - یا پھر آپ ایک ایک ہزار کے تین انعامات میں سے ایک، پانچ سو کے دس اور سو سو کے ایک سو بیس

انعامات ھی سے ایک پا سکتے ھیں - کبھی نہ کبھی اور کبھی نہ کبھی تو آپ کی قسمت یاور ھوگی - اور اس میں تمام تر فائدہ ھی فائدہ ھے - بہر حال آپ کی اصل رقم تو محفوظ ھے - اور بانڈ جتنی دیر قائم رھےگا اتنی ھی یہ بڑھتی چلی جائےگی - یعنی آم کے آم گٹھلیوں کے دام - اس سے کہیں زیادہ جتنا آپ خیال کرتے ھیں — شاید انعام ۲۰ ہزار ھی کا ھو - اور کیا عجب آپ ھی وہ خوش قسمت ھوں جسے سب سے پہلے یہ انعام ھاتھ آئے - مگر اس کا ایک اور روشن تر قومی پہلو بھی ھے - اس طرح اربوں روپے کی بچت بھی تو ھوگی - قیمتیں چڑھنے نہیں پائیں‌گی اور عین اس وقت جب ان کا زیادہ اندیشہ ھے کیونکہ دوسرے پنج سالہ منصوبے کے سلسلہ میں کتنے ھی بیرونی ذرائع سے پاکستان میں سرمایہ امڈتا چلا آئےگا اور چیزوں کی قیمت خواہ مخواہ بڑھتی چلی جائےگی - ھمیں ابھی سے ایسی صورت حال کے لئے تیار رھنا چاھئے اور جتنی بھی ممکن ھو بچت کر کے قومی بانڈ خرید لینے چاھئیں تا کہ حکومت کے پاس بڑی ھی کثیر مقدار میں روپیہ جمع ھوجائے اور وہ اسے قومی تعمیر و ترقی کے کاموں میں لگا کر ھمیں اور بھی خوش‌حال بنائے اور چڑھتی قیمتوں کے خطرے سے بچائے -

انعامی بانڈ خرید لینے کے معنی یہ نہیں کہ روپیہ کہیں بند ھو کر رہ گیا - حکومت تو ھر وقت اس کی قیمت دینے کی حامی بھرتی ھے - اگر آپ انہیں بیچ دینگے تو نقصان آپ ھی کا ھوگا - نہ بچت ھوگی نہ کوئی انعام مل سکےگا اور نہ آپ قوم کی مجموعی بھلائی اور خوشحالی میں شریک ھو سکیں گے - اور پھر آپ یہ بانڈ جس کو بھی چاھیں تحفہ میں دے دیں - عیدوں بقرعیدوں کے موقعوں پر جب آپ اتنے پیسے ضائع کرتے ھیں، کیا یہ بہتر نہ ھوگا کہ اپنے بچوں اور عزیزوں کو ایسی عمدہ چیز خرید کر دیں جو ان کے لئے ھمیشہ کارآمد ثابت ھو؟ اور پھر ان کے ملنے میں دشواری ھی کیا ھے - آپ اسٹیٹ بنک آف پاکستان جائیے یا کسی بھی منظور شدہ بنک میں تشریف لے جائیے اور کھڑکی پر رقم دے کر جتنے بھی بانڈ چاھیں حاصل کرلیجئے -

یہ بھی بڑی اچھی بات ھے کہ انعامات ایسے ھی انٹ شنٹ نہیں دے دئے جائیں گے بلکہ باقاعدہ، سب کے سامنے، قرعہ ڈال کر دیکھا جائےگا کہ کس کا نام آتا ھے - یہ تو قسمت آزمائی ھے اور بڑی اچھی قسم کی قسمت آزمائی - ایک دفعہ نہیں بلکہ متواتر کیونکہ ھر تیسرے ماہ یکم اپریل، یکم جولائی اور یکم اکتوبر کو قرعہ اندازی کی جائےگی - جو بانڈ آپ خریدیں گے وہ خریداری کے مہینے کے خاتمہ سے چھ ماہ بعد انعام کا اھل قرار دیا جائےگا - اور اس کا اھل ھی رھےگا تاوقتیکہ آپ اپنی رقم واپس نہ لےلیں یا حکومت خود اسکی واپسی کا اعلان نہ کر دے - خیال کیجئے ان انعامی بانڈوں کی مقدار بھی کچھ کم نہیں - ان کے تو کتنے ھی سلسلے ھیں : اے - بی - سی - ڈی - ای - ایف - ھر سلسلے میں پانچ پانچ لاکھ بانڈ جاری کئے جائیں گے اور ھر ایک میں ھر تیسرے مہینے ۵۰ ہزار روپوں کے انعامات تقسیم کئے جائیں گے - جن پر کوئی انکم ٹیکس یا سپرٹیکس واجب الادا نہیں ھوگا - بانڈوں کے نمبر عوام کی اطلاع کے لئے گزٹ آف پاکستان اور ملک کے دوسرے اھم اخباروں میں شائع کئے جائیں گے - جس سے آپ کو اپنی جیت کا علم ھو جائےگا - پہلی قرعہ اندازی یکم اپریل کو ھوگی -

غور کیجئے، آپ روپیہ حاصل کرنے کے لئے کیا کچھ پاپڑ نہیں بیلتے' بسا اوقات اس ھڑبونگ میں ستم ظریفی کی حد تک پہنچ جاتے ھیں - مثلاً ھم میں سے کتنے ھی سیانے بیانے لوگ ھیں جو کسی نہ کسی وقت روپے کے لالچ میں معمے حل کرنے پر نہیں اتر آتے اور خواہ ایک پیسہ بھی ھاتھ نہ آئے پھر بھی اندھا دھند اس فضول کام پر روپیہ لگائے چلے جاتے ھیں - جس کا نتیجہ یہ ھے کہ وہ اور ان کے کنبہ والے کھانے پینے تک کے لئے محتاج ھو جاتے ھیں - کیا اس سے یہ بہتر نہیں کہ آپ ایسے کام پر روپیہ لگائیں جس میں فائدہ ھی فائدہ ھے، آپ کا بھی اور دوسروں کا بھی؟

میں خدا لگتی کہونگا - میرے ایک چچا میاں ہیں، بڑے ہی کائیاں - ہمیشہ ایسے داؤں پر روپیہ لگائیں گے جس میں جیت ہی جیت ہو - چنانچہ جونہی ان کے کانوں میں قومی انعامی بانڈوں کی بھنک پڑی وہ اچھل پڑے اور کمر خم ہونے کے با وجود آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ تجوری سے روپیہ نکالا اور "سوسائٹی" سے پیدل چلتے چلتے اسٹیٹ بنک کے پرائز بانڈ سیکشن واقع بولٹن مارکیٹ میں آنکلے - اور صدری کے نیچے جو چور جیب تھیلی کی طرح بنی ہوئی زپ سے بند تھی اس سے ایک ہزار روپیہ نکال کر بانڈ خرید لئے اور انہیں اسی طرح چور جیب میں بند کرکے پیدل گھر آ گئے - اسے کہتے ہیں کفایت شعاری - ایسے ہوشیار شخص کا ایسے معاملہ میں اس قدر شد و مد سے شریک ہونا بجائے خود اس کے مفید ہونے کا ثبوت ہے - اور یہی کیا - بات کا سلسلہ اس سے بھی آگے جاتا ہے اور ہمیں اس خضر راہ کی تقلید کی تحریک دلاتا ہے - تو قصہ یوں ہے کہ ابھی تین چار دن نہیں گزرے تھے کہ انہیں پھر کچھ خیال آیا - شاید پڑوس میں چوری کی کوئی واردات ہوگئی اور سارا زیور اور نقدی لٹ گئی تھی - چچا میاں کے لئے یہ تازیانۂ عبرت تھا - وہ رات بھر جاگتے رہے اور دوسرے دن علی الصبح پھر اپنے سفر شوق پر روانہ ہو گئے - دوسرے کم نظر، نادان لوگ حج کرنے جاتے ہیں تاکہ واپسی پر خوب جی بھر کر سونا اسمگل کرکے قارون بن جائینگے - مگر چچا میاں ایسی کچی گولیاں کھیلنا نہیں جانتے - وہ وہی کام کریں گے جو ان کے لئے، حکومت کے لئے، قوم کے لئے فائدہ مند ثابت ہوں - چنانچہ انہوں نے دوسرے دن جاتے ہی اس روپیہ سے دو ہزار کے اور بانڈ خرید لئے - ایسے ہی چند دن بعد پھر کوئی رقم ہاتھ لگی تو سب کام چھوڑ چھاڑ بنک میں جا سر نکالا - اب ان کو یہی دھندا بھا گیا ہے - سو بیوپاروں کا ایک بیوپار - اور اب تک دس ہزار کے بانڈ اسی طرح خرید چکے ہیں! کیوں نہ ہو وہ جانتے ہیں کہ ان کی روٹی ہی نہیں، ساری قوم کی روٹی کس طرف چکنی پڑی ہے - پھر ہم کیوں نہ بساط بھر یہ بیش بہا بانڈ خریدیں اور چچا میاں کی طرح خریدتے ہی چلے جائیں - بلکہ اس سلسلہ کی منطقی تکمیل یوں ہوگی کہ جو انعام ہمیں ملے اس سے اور بانڈ خرید کر مزید انعام کے امیدوار ہوں - در کار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست - اور پھر زر را زر می کشد کی بہترین صورت بھی تو یہی ہے *

ہمارا حیرت انگیز نظامِ تنفس!

کیا آپ جانتے ہیں کہ ؟

ہمارے پھیپھڑے ایک اوسط مدتِ عمر میں قریباً پچاس کروڑ مرتبہ پھیلتے اور سکڑتے ہیں۔

- ہماری آنکھوں میں ایسی جراثیم کش رطوبت ہے جو ناک اور حلق میں پہنچکر ان لاتعداد جراثیم کو فنا کر دیتی ہے جو ہر سانس کے ساتھ ہمارے نظامِ تنفس میں داخل ہوتے ہیں۔
- ہماری سانس لینے والی نالیوں میں لاکھوں چھوٹے چھوٹے غدود ہیں جن سے ایک لیسدار رطوبت خارج ہوتی ہے جو سانس کے ساتھ جانیوالی گرد کے مہلک ذرات کو جذب کرلیتی ہے ورنہ یہ ذرات چند لمحوں میں سانس کی نالیوں کو بند کرکے ہماری ہلاکت کا باعث بن جائیں۔
- ہماری سانس کی نالیوں میں خوردبینی بالوں سے مرتب ایک نہایت جامع نظامِ صفائی موجود ہے جو فی سکنڈ بارہ مرتبہ جاروب کشی کرکے ان خطرناک ذرات کو نظامِ ہضم میں پہنچا دیتا ہے جہاں اُنکے مہلک اثرات زائل ہو جاتے ہیں۔
- سانس کی نالیاں پھیپھڑوں کی ۵، کروڑ تھیلوں کو جراثیم اور مٹی سے پاک ہوا پہنچاتی ہیں جسکی وجہ سے استعمال شدہ خون کی کاربن-ڈائی-اکسائڈ حیات بخش آکسیجن میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

نزلہ' زکام کی حالت میں ہوائی نالیاں بند ہونے لگتی ہیں اور سانس لینے میں تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ سعالین کا استعمال سانس کی نالیوں کو صاف کرکے بلغم کو خارج کرتا ہے اور ہمارے پیچیدہ نظامِ تنفس کو تقویت دیکر نزلہ' زکام اور کھانسی سے نجات دلاتا ہے۔

SUALIN

سعالین

نزلہ' زکام اور کھانسی کے لئے

ہمدرد (وقف) لیبوریٹریز پاکستان

کراچی - ڈھاکہ - لاہور - چٹاگانگ

اشاعت خاص

ماہ نو

بتقریب یوم پاکستان

جلد ۱۴ — مارچ ۱۹۶۱ء — شمارہ ۳

مدیر: رفیق خاور — نائب مدیر: ظفر قریشی

صد رنگ گلستاں!

"جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود!"

"مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کی ضیاء دیکھ!"

افسانہ از افسانہ می خیزد!

اِس کنارے سے اُس کنار تک

زبان بے زبا ں؟

غزل سرا ونواہائے رفتہ باز آور:

معمارِ حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز:

چندہ سالانہ: پانچ روپے ۵۰ پیسہ

شائع کردہ: ادارۂ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

قیمت اشاعتِ خاص: ایک روپیہ ۲۵ پیسہ

"یہ رنگ، یہ روپ، یہ آوازیں!"

(جائزہ)

رفیق خاور

یوم پاکستان ہمیں پھر اس دن کی یاد دلاتا ہے جب ہم نے تہیہ کیا تھا کہ ہم اپنے لئے ایک الگ وطن بنائیں گے جس میں ہمیں پوری پوری آزادی حاصل ہوگی اور جس میں ہم اپنی مرضی و خواہش کے مطابق زندگی بسر کرتے ہوئے اپنی تہذیب و ثقافت کو فروغ دیں گے۔ یہ اسی عزمِ محکم کا نتیجہ تھا کہ ہم بالآخر آزادی حاصل کر کے رہے۔ اگرچہ ہم عملاً ایک عرصہ تک اس کے فیضان سے محروم رہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ دورِ انقلاب کے ساتھ یوم پاکستان کا منشا حقیقی معنوں میں پورا ہوا، ہم حقیقی معنوں میں ایک آزاد قوم بنے اور ہمارا وطن صحیح معنوں میں ایک آزاد، ترقی پذیر مملکت بن گیا۔ لہٰذا یوم پاکستان اب ہمارے لئے وہ معنی رکھتا ہے جو قبل ازیں نہیں رکھتا تھا۔ حصولِ آزادی کے لئے ہماری تمام تحریکیں، ہمارے مقاصد اور تمناؤں کے تمام دھارے یوم پاکستان اور ہمارے اپنے دور میں منعکس ہوتے ہیں جو اس کا منطقی نتیجہ اور منتہائے عروج ہے اس لئے یوم پاکستان کا تذکرہ درحقیقت ہماری جد و جہد آزادی کی تمام تحریکات کی بازیافت اور ان کا بھرپور احساس ہے خواہ ان کا تعلق عہدِ رفتہ سے ہو یا قریبی عہد سے۔ اور اس کے ساتھ ان کارہائے نمایاں کی نشاندہی بھی جو دورِ انقلاب میں حقیقی آزادی کے جلو میں آئے ہیں اور جن کا فیضان تعمیر و ترقی کے سانچے میں ڈھل کر اب ہمارے ماحول، ہماری حیاتِ ملیہ پر بہ شدتِ تمام اثر انداز ہو رہا ہے۔ بلاشبہ اس ہنگامہ آفریں دور میں تاروں کی گردش بے حد تیز رہی ہے۔ اور کچھ عجب نہیں کہ دل ہر ذرہ میں غوغائے رستاخیز دکھائی دے۔

یہاں اُن واقعات کا تذکرہ تحصیل حاصل ہے جو اب تک رونما ہو کر حیاتِ ملیہ کا جزو بن چکے ہیں۔ زیادہ ضروری یہ ہے کہ ہم حالات پر زیادہ گہری نظر ڈالیں اور ان بنیادی رجحانات کا سراغ لگائیں جو ان کی تہہ میں کام کر رہے ہیں۔ خصوصاً وہ جو نسبتہً حال میں گذشتہ یوم انقلاب کے بعد نمایاں ہوئے ہیں۔

قبل ازیں انقلابی حکومت کی سرگرمیوں کا زور زیادہ تر اندرونی اصلاح، اندرونی استحکام، اندرونی نظم و نسق ہی پر رہا ہے۔ اور یہ لازم بھی تھا کہ ملکی حیثیت کو مستحکم کر کے آگے قدم بڑھایا جائے۔ اس دور کا سب سے اہم واقعہ اور اگلے دور کی سب سے بڑی تیاری بنیادی جمہوریتوں کا قیام تھا جو جمہوریت کو ہمارے قومی مزاج اور ضروریات کے مطابق بنانے کے سلسلہ میں ایک نہایت اہم اور منفرد تجربہ ہے۔ اس کے بعد دوسرا پنج سالہ ترقیاتی منصوبہ ایک اور نہایت اہم اقدام تھا جس کے لئے طاس سندھ کا معاہدہ آب ایک عظیم پیشقدمی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پنج سالہ منصوبے کو عملی جامہ پہنانے اور دیگر اہم مقاصد کے حصول کے لئے عالمی روابط کس قدر ضروری ہیں۔ موجودہ زمانہ ہے ہی بیش از بیش عالمی روابط کا زمانہ۔ اور دوسروں سے الگ تھلگ رہ کر زندگی بسر کرنا ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ اور پاکستان جیسے نئے ملک کو تو ہر قسم کے بیرونی تعاون اور امداد کی اشد ضرورت ہے۔ صدر پاکستان کی حقیقت شناس، دوربیں نگاہ نے اسے فوراً محسوس کر لیا اور انہوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ پاکستان کو تمام اقوامِ عالم کا مرکزِ توجہ بنا کر چھوڑیں گے تاکہ وہ ہمارے لئے زیادہ سے زیادہ فائدہ مند ثابت ہوں۔ چنانچہ ان کے ایک طرف سعودی عرب اور متحدہ جمہوریہ عرب اور دوسری طرف مشرقِ بعید کے برما سے جاپان تک کے عظیم الشان دورے تاریخی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے نتائج نہایت وقیع ہیں۔ ادھر مغرب کا دورۂ خیرسگالی بھی اتنا ہی اہم اور نتیجہ خیز ہے۔ حال ہی میں نظریاتی پیچیدگیوں میں الجھے بغیر روس کے ساتھ کاروباری روابط

ایک نہایت عمدہ رجحان کی خبر دیتے ہیں۔ یہ تمام خوشگوار روابط، جن میں ہمسایہ ملک ہندوستان کے ساتھ بہتر دوستانہ تعلقات بھی شامل ہیں، دوسرے پنج سالہ منصوبہ ترقی کی کامیابی کے لئے ایک نہایت عمدہ فال ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ پاکستان کی آئندہ تعمیر و ترقی اور خوشحالی کے سلسلہ میں یہ منصوبہ کس قدر اہمیت رکھتا ہے۔

اگر یہ صحیح ہے، اور یقیناً صحیح ہے کہ کوئی قوم اپنے تصورات ہی کا آئینہ ہوتی ہے۔ اس کی روح، اس کے افکار اس کو نشو و نما دیتے ہیں۔ تو اس سلسلہ میں صدر پاکستان بار بار حقیقت پسندی، سائنس اور علوم جدیدہ کی طرف رجوع اور حالیہ تقاضوں کی طرف، اقتناء پر جو زور دیتے ہیں اور روایت کی کورانہ پیروی سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں، وہ بے انتہا اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ ہم ایک خالصتاً جدید ذہنیت پیدا کریں اور روایت و جمود کی دلدل سے باہر نکل کر اجتہاد اور ارتقا کی راہ پر گامزن ہوں۔

اس ضمن میں تعلیم کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ جن لوگوں نے قومی تعلیم کے کمیشن کی رپورٹ پڑھی ہے انہیں بخوبی اندازہ ہوگا کہ اس کی سفارشات کس قدر انقلاب آفریں واقع ہوئی ہیں۔ اگر ان پر عمل درآمد کیا گیا اور یقیناً کیا جائے گا، تو آج سے دس پندرہ سال بعد پاکستان کی ذہنی فضا ہی کچھ اور ہوگی۔ علاقائی زبانوں کی ترقی، تراجم کے ذریعہ ان کا آپس میں ارتباط اور عوام کی ایک دوسرے سے شناسائی ایک مشترکہ ادب و ثقافت پیدا کرنے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ حال ہی میں صدر پاکستان نے مشترکہ رسم الخط پیدا کرنے کی جو ہدایت کی ہے وہ اس باہمی ربط و تعلق کی طرف ایک اور اہم اقدام ہے۔ اس کے علاوہ قومی تعلیم کے کمیشن میں ادب آفریں اداروں کی حوصلہ افزائی اور قیام، جیسا کہ پاکستان رائٹرز گلڈ کے سلسلہ میں کیا گیا ہے، ادیبوں کے لئے خوشگوار حالات اور ان کی حوصلہ افزائی اور اجتہادی فکر و نظر کے لئے زیادہ سے زیادہ سازگار فضا پیدا کرنے پر زور صریحاً سب نہایت دور رس نتائج کے حامل ہیں۔

حقیقت پسندی اور فہم و بصیرت کا ایک اور نہایت عمدہ ثبوت یہ اعتراف ہے کہ موجودہ حالات میں کوئی زبان خالص و بے آمیز نہیں رہ سکتی۔ اس کا دوسری زبانوں سے اختلاط ناگزیر ہے۔ ہمیں اس کا خیر مقدم کرنا چاہیئے۔ اردو کے سلسلہ میں یہ اختلاط بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ یہ نہ صرف اسے جامد ہونے سے بچائے گا بلکہ اس میں وسعت، توانائی اور جدت کو بھی بیش از بیش صلاحیت پیدا کرے گا۔ اس بنا پر صدر پاکستان نے بھی یہی لائحہ عمل اختیار کرنے کی رائے دی ہے۔ تاکہ وہ زبان پیدا ہو جسے قومی تعلیم کے کمیشن کی رپورٹ کے مطابق پاکستانی کہا جا سکے۔

جہاں تک زبان و ادب کے جدید ماحول میں نئی وضع پیدا کرنے کا تعلق ہے پُل کے نیچے سے کتنا ہی پانی گزر بھی چکا ہے اور اردو میں کتنے ہی علاقائی عنصر سرایت کر چکے ہیں۔ اور بظاہر یہ سلسلہ اور بھی آگے بڑھے گا علاقائی زبانوں کے متعدد قابل قدر تراجم، جن کی فنی حیثیت خاصی بلند ہے، دورِ حاضر کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔

ایک اور رجحان جو دور انقلاب کے بعد اور بھی نمایاں ہو گیا ہے فکر و نظر میں ایک عالمگیر پھیلاؤ ہے۔ آج کوئی صحیح معنوں میں جدید ادیب یا شاعر رسم و روایت یا محض اپنے ملک و قوم تک محدود تصورات کے ضمن میں نہیں سوچتا بلکہ اس کی نظر عالمی ادب و افکار پر ہے۔ اس لئے وقیع تخلیقات میں تمام زور طرح نو ہی پر دیا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ اب سے چند سال پہلے جو تصورات یا اسالیب جدید تر بن خیال کئے جاتے تھے وہ بھی اب کچھ ایسے جدید محسوس نہیں ہوتے۔ اور ان سے کہیں زیادہ جدید رجحانات کی جھلکیاں صاف دکھائی دے رہی ہیں۔ اس طرح روایت اور تجربہ کی پرانی کشمکش کا پلّہ اب پھر تجربہ ہی کی طرف جھک رہا ہے۔ نئے موضوعات اور پیرایوں کا شوق عبد العزیز خالد کی تصانیف سے نمایاں ہے۔ جن کے موضوعات کئی زبانوں، ملکوں اور قوموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً قدیم یونان، بنی اسرائیل، انگریزی، بنگلا۔ اور پھر اس کی تحریروں میں عربی، فارسی، ہندی سب کے دھارے ملتے نظر آتے ہیں۔ اس سوال سے قطع نظر کہ اس کے تجربے کس حد تک کامیاب ہیں، وہ ایک جدید ذہنی شعور اور جدید میلان کی خبر ضرور دیتے ہیں۔ اور ہم غور سے دیکھیں تو اسالیب و تخیلات اور تمثیلات میں بھی اپج کا عنصر صاف نمایاں نظر آئے گا۔

خالد اور جعفر طاہر ایک ہی قلزمِ ہفت آب کے شناور ہیں۔ جعفر طاہر اپنے موضوعات کی تلاش میں کشور بہ کشور اور اقلیم بہ اقلیم گھومتا ہے اور زبانوں کی حد تک ملک ملک اور نگر نگر کی بولیوں۔ عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی، انگریزی، ہنگری، بنگلا، کشمیری، پنجابی، سندھی وغیرہ سے جوت جگاتا اور دامانِ سخن بھرتا ہے۔

خالدؔ کی طرح اس کے بارے میں بھی شاید "تاب گراں باریٔ گوہر" کا سوال پیدا ہو۔ لیکن دونوں میں وسیع رجحان کی موجودگی بخوبی عیاں ہے۔ ایسے ہی کئی شعرا اور ادبا کے یہاں ہاپکنس، ایلیٹ، ایذرا پونڈ، پال والیری، بودلیئر، پروسٗ، ورجینیا وولف، فرائیڈ، برٹرینڈ رسل، برنارڈ شا وغیرہ کے افکار و اسالیب سے گہرا شغف نمایاں ہے۔ جوان کو ادبی، فنی اور ذہنی حیثیت سے "آفاقی شہری" بنا دیتا ہے۔ بلامبالغہ اس وقت عالمِ مشرق کی عالمِ مغرب کی ہر ہر تحریک، دبستانِ فکر اور مشاہیر پر گہری نظر ہے۔

جہاں تک افسانہ کا تعلق ہے، قرۃ العین حیدر اور ایک جواں سال افسانہ نگار، انورؔ کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ کیونکہ یہ عالمی رجحان ان دونوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ قرۃ العین کا ذہنی وطن شروع ہی سے مغرب رہا ہے اور خواہ اس کے موضوعات اپنے ہی ملک و معاشرہ اور فضا سے متعلق ہوں، اس کا شعور مغرب ہی کے نظریات اور تصوراتِ فن میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ "آگ کے دریا" میں مشرق و مغرب کا یہ ربطِ باہمی اور بھی نمایاں ہے۔ اس کا تصور عام روش اور سطح سے بہت پرے ہٹ کر کیا گیا ہے۔ جیسے وہ مغربی ناولوں کے سلسلہ کی ایک کڑی ہو۔ اسی لئے قرۃ العین حیدر کا تذکرہ کرتے وقت ٹامس مان، ایلیٹ، جیمز جوائس وغیرہ خود بخود معرضِ بحث میں آ جاتے ہیں۔ انورؔ کے لئے ہمیں ایک اور مغربی یگانۂ فن، برنارڈ شا کی طرف رجوع ہونا پڑتا ہے۔ وہ طنز، گہری طنز کا پیکر جسے ایک نقاد نے "تازیانوں اور بچھوؤں" (WHIPS & SCORPIONS) کے زمرہ میں شمار کیا ہے۔ انورؔ کو بھی مسائل کے ساتھ کچھ ایسا ہی لگاؤ ہے۔ اس کا تیز، چونچال ذہن اس کی ذکاوت، فطری چلبلاپن اور گہری نظر اسے قدرتی طور پر دوسرا برنارڈ شا بنا دیتی ہے۔ اس لئے اس کے یہاں مسئلے چھوٹے بڑے نہیں رہتے بلکہ سب بڑے اور نہایت پُر لطف، نہایت تہہ دار بن جاتے ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں افسانہ بنا تا ہے۔ ان میں کچھ بات، بڑی تپے کی بات پیدا کرتا ہے۔ لیکن عام روش کے خلاف بیان نہیں کرتا بلکہ مضبوط ذہنی مضبوط گرفت۔ اس لئے اس کا ہر لفظ، ہر فقرہ پوری طرح سوچا سمجھا ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ خبردار ہو کر لکھا ہوا۔ اس لئے اس کا ہر جملہ، یہاں تک کہ ہر علامت بھی فن ہے۔ وہ فکر و فن کا باغی ہے۔ اس لئے اس کی تکنیک بھی اپنی ہی ہے۔ اور موضوعات بھی بالکل الگ۔

جبھی اس کی آفاقیت نہایت اہم و منفرد ہے جیسے کوئی منچلا ہرا دلوں ہراول فکر و فن میں ایک نئی، بہت آگے بڑھی ہوئی چوکی پر جا دھمکے۔ صریحاً اس قسم کی آفاقیت اپنے اندر بہت وسیع امکانات رکھتی ہے۔

ایک اور صورت جس میں یہ وسیع رجحان تیزی سے ابھر رہا ہے نفسیات کے ساتھ شدید لگاؤ ہے۔ معلوم نہیں اس میں علم النفس کے عمیق مطالعہ اور فرائیڈ، یونگ وغیرہ کے اثر کو کس حد تک دخل ہے یا پھر جن حالات سے ہم گذر رہے ہیں، ان کا ردِعمل کس حد تک کارفرما ہے۔ لیکن شاعری کی حد تک ہم نئی پود کے کتنے ہی شاعروں کو نفسیات کی بھول بھلیوں میں کھویا ہوا پاتے ہیں۔ یہ حقیقتہً بھول بھلیاں ہے۔ کیفیات، اسلوب اور استعارات و تمثیلات سب کے اعتبار سے۔ نظموں میں عموماً معنی خبط، فی البطن شاعر یا زمین دوز نظر آتے ہیں۔ اور غزلوں میں بھی یہی کیفیت ہے۔ گویا شاعر کسی نفسی الجھن، فرار، شکست خوردگی، بغاوت، کچھ بھی کہہ لیجئے، کا شکار ہو۔ اور عنانِ کار عقل و شعور اور نظم و ضبط کے ہاتھ میں نہیں بلکہ نفسی انتشار اور لاابالیانہ پن کے ہاتھ میں ہو۔ اسی وجہ سے استعارات و تمثیلات اور اسلوب میں بھی بوالعجبی اور انوکھی اپج ہے۔ جیسے ہمارے کئی شاعر پلک جھپکنے میں سرریلسٹ بن گئے ہوں۔ غالباً اس رجحان کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم لوگوں پر شعور کا بہت زیادہ دیر غلبہ رہا ہے اور ہم اس کے زیرِ اثر حد سے زیادہ ظاہریت، میکانیت، سطحیت، ضابطہ پرستی اور جبر کے قائل رہے ہیں۔ جدید ذہن گہرائی چاہتا ہے۔ اس لئے وہ ان تمام روایتی اور جامد رویوں کے خلاف شدت سے ردِعمل کرتے ہوئے دوسری انتہا کی طرف جا رہا ہے۔ آرٹ میں فن کار تجریدی آرٹ کی طرف مائل ہیں۔ جو اشاراتی ہونے کے بجائے جامد ہے۔ اور واقعیت سے گریز کا نتیجہ۔ شاعری کی روش زیادہ ایمائی اور عمیق ہے۔

اس سے ہماری توجہ ایک نہایت اہم اور بنیادی مسئلہ کی طرف منعطف ہوتی ہے۔ ایک مدت سے ہماری ادبی جولانیاں درمیانی سطح پر نظر آتی ہیں۔ ادب ہو یا صحافت، شاعری ہو یا تنقید اور افسانہ یا ڈرامہ، ہم ایک معین روش، ایک معین تصور سے مطمئن ہیں۔ ہمیں بہت ہی ادنیٰ صورت میں یہ تصور صحتِ زبان، قواعد، محاورہ، پارینہ طرزِ تحریر، پارینہ وضع، فرسودہ ذوق اور میکانکی اسالیب و مضامین سے عبارت ہے۔ بلند سے بلند شکل میں یہ تقریباً

ہی خیالات اور طور وطریق کو اپنانے کے مترادف ہے جو اقبال تک کے زمانہ کے اندازسے کچھ ہی آگے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی صنف ادب میں بھی تخلیق کی سطحیں یکساں نہیں ہوتیں۔ درمیانی سطح پر تخلیق نسبتۃً بہت آسان ہے کیونکہ اس میں ادیب کو زیادہ کاوش سے کام نہیں لینا پڑتا اور وہ بڑی حد تک روایت اور مقبول عام، منجھے ہوئے آزمودہ طریقوں پر انحصار کرتا ہے۔ اس طرح تخلیق ایک کھیل، ایک مذاق، ایک مشینی عمل بن جاتی ہے۔ ایک سہل عمل بھی اور سہل انگاری بھی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے ایک سرسری احساس یا خیال کو سرسری، چلتی ہوئی زبان اور پیرایہ میں ادا کر دیا جس کو لوگ سن کر واہ واہ کر دیں، تو شعر و ادب کا مقصد پورا ہو گیا لیکن درحقیقت ایسا نہیں۔ پائدار ادب شدید کاوش اور بلند تصور چاہتا ہے ؎

آں ہیم باید کہ چو ریزم بجام
زد یمے زگردش آرد جام را

بدقسمتی سے ہم نے اپنی کسی صنف ادب میں بھی تصور کی اس بلندی اور وقعت کا احساس نہیں کیا۔ ہم استھائی پر قناعت کر رہے ہیں۔ انترہ کی طرف شاذ و نادر جاتے ہیں۔ حالانکہ عظیم ادب کا مسئلہ بڑی حد تک تصور کی عظمت ہی کا مسئلہ ہے۔ مثلاً ان دو شعروں کا فرق تصور اور اٹھان ہی کا تو فرق ہے ؎

نالہ پابندِ نے نہیں ہے
فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
شورِ فریاد گرفتارِ مزامیر نہیں
یہ وہ نالہ ہے کہ پابندِ بم و زیر نہیں

اسی طرح اقبال کے ؎

حسینوں میں ہیں کچھ وہی حسن والے
کہ جو حسن کو عارضی جانتے ہیں

اور انہی کی "حقیقتِ حسن" میں صرف غزل کے مفرد شعر اور نظم ہی کا فرق نہیں بلکہ تصور، سطح اور اٹھان کا بھی فرق ہے۔ غزل اسی سطحیت کے لئے رسوا ہوئی اور اسے بچانے کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ شعرا نے اس کو بچانے ہی کی خاطر داخلیت پیدا کرنے کی کوشش کی اور جب وہ پھر قوافی ہی کے گورکھ دھندے میں گرفتار رہے یعنی قافیہ ہی کے زیر اثر مضمون آفرینی کرتے رہے جس کا نتیجہ میکانیت تھا، تو نتیجہ ناسخ اور اس کے ہم مشربوں کی خارجی میکانیت کے مقابلے میں داخلی میکانیت کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟ چنانچہ ہمارے غزلگو شعرا، گلی، شہر، گاؤں، کوچہ، بازار، کتاب کو قافیہ ردیف ٹھہرا کر زبردستی خیالی مضامین وضع کرنے لگے جس کی سب سے مضحکہ خیز شکل وہ غزلیں ہیں جن میں سانپ، بچھو، ہاتھی وغیرہ کو قافیہ یا ردیف کے طور پر استعمال کر کے فرانسیس کی ٹوپی۔ الو کی گردن وغیرہ کا برجستہ جواب پیدا کیا گیا۔ اس طرح غزل ہے اور برائیوں کا ایک لامتناہی چکر۔

ادب میں بھی تصور کی عمومیت یہی کیفیت پیدا کر رہی ہے۔ اکثر نظمیں اسی لئے بلند نہیں ہوتیں کہ ان کا تصور بلند نہیں۔ اکثر افسانے اسی لئے اوسط درجہ کے ہوتے ہیں کہ ان کا تصور ارفع و اعلیٰ نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ اونچے درجہ کے افسانہ نگاروں میں بھی یہی کیفیت نظر آتی ہے۔ تنقید بھی تصور کی اوسط حدوں سے کم ہی متجاوز ہوتی ہے جس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ ادب اس سنبھالنے اور رہنمائی کرنے والے حیات افروز اثر سے محروم ہے جو اسے تنقید کی خیال انگیزی عطا کر سکتی ہے۔ لہٰذا ساری کی ساری بزم تہی پیمانہ ہے۔ اگر تنقید کی اٹھان بلند نہیں تو ادب کی اٹھان بھی بلند نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ہمیں جیسے بھی ہو تنقید کا معیار، اس کا تصور بلند کرنا ہو گا۔ یہ موجودہ عالمی فضا کے پیش نظر اور بھی ضروری ہے۔ ہم آخر تابکے "مشرق مشرق" اور "روایت روایت" پکارتے ہوئے فروتر تصورات سے مطمئن رہیں گے؟ یہ مسئلہ ایسا ہے جس پر بڑی سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

گذشتہ چند سال تخلیقی پیداوار بہت ناہموار رہی ہے۔ اردو ادب کا غیر ترقی یافتہ تصور اس ناہمواری کا کس حد تک ذمہ دار ہے خاص طور پر قابل غور ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم ان حقائق سے غافل رہیں اور کسی مسئلہ کو سرے سے مسئلہ ہی تسلیم نہ کریں۔

یہ نہیں کہ فکر و احساس کے سوتے بالکل خشک ہو گئے ہیں۔ اس کی جھلکیاں وقتاً فوقتاً دکھائی دیتی ہیں لیکن ضرورت یہ ہے کہ یہ

سادگی و پُرکاری:

مصوّر خطّاطی کا دلآویز مرقع ـــــ

عمل: حنیف رامے

لا اله

ملتِ بیضا تن و جاں لا اله — ساز مارا پردہ گرداں لا اله

لا اله سرمایۂ اسرارِ ما — رشتہ اش شیرازۂ افکارِ ما

حرفش از لب چوں بدل آید ہمے — زندگی را قوت افزاید ہمے

نقشِ او گر سنگ گیرد دل شود — دل گراز یادش نسوزد گِل شود

چوں دل از سوزِ غمش افروختیم — خرمنِ امکاں ز آہے سوختیم

آبِ دلہا در میانِ سینہ ہا — سوزِ او بگداخت ایں آئینہ ہا

شعلہ اش چوں لالہ در رگہائے ما — نیست غیر از داغ او کالائے ما

اسود از توحید احمر می شود — خویشِ فاروق رض و ابوذر رض می شود

دل مقامِ خویشی و بیگانگی است
شوق را مستی ز ہم پیمانگی است

(اقبالؒ)

جھلکیاں زیادہ نمایاں اور زیادہ کثیر ہوں۔ یہاں تک کہ وہ ایک نور فراواں کی شکل اختیار کر لیں۔ ایسی ایک جھلک "استانزے" کے مصنف جیلانی کامران کے یہاں نظر آتی ہے۔ پاکستان قائم ہوتے ہی یہ سوال پیدا ہو گیا تھا کہ بدلے ہوئے ماحول کے پیش نظر اردو زبان و ادب کا اینڈ انداز کیا ہو۔ علاقائی زبانوں کی غیر معمولی سادگی، بے ساختگی، رچی ہوئی اصلیت اور فضا کے ساتھ پوری پوری مطابقت کو دیکھتے ہوئے کئی لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اردو کو اِن کی وضع اپنانی چاہیئے۔ اس سے اس کی پُرتکلف، اجنبی وضع دور ہو سکتی ہے اور رسم و روایت کے بندھن ٹوٹ سکتے ہیں۔ چنانچہ اس خیال نے ایک پُر زور تحریک کی شکل اختیار کی اور یہ اب تک ایک نہایت قابلِ لحاظ رجحان ہے۔ اس نے اردو کو بہت کچھ دیا ہے اور آئندہ بھی اس سے بڑی وسیع توقعات کی جا سکتی ہیں۔ یہ رجحان پھر بھی مقامی ہے۔ اس کی کوشش ہے بدلیس سے دیس کی طرف آنا۔ ادب کا دھرتی سے گہرا تعلق۔

اس کے برعکس یہی مقصد ایک آفاقی وضع کو اپنانے سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ جیلانی کامران نے پہلے تو خواجہ غلام فریدؒ کو نمونہ قرار دیکر مسئلہ کا مقامی و علاقائی حل پیش کرنے پر زور دیا اور پھر انجیل کے سیدھے سادے اسلوب کی طرف رجوع کیا۔ اور فارسی روایت کو خیرباد کہہ کر جس میں غالب خیر نہیں کیوں باقی رہ گئے، دوسری روش کی حمایت کی۔ چنانچہ اس کا مجموعۂ کلام "استانزے" اور اس کی تمہید دونوں اُس کھری زبان اور بیان کا نمونہ پیش کرتے ہیں، جسے مغلق زبان میں "عنصری" کہا جاتا ہے۔ "کھری" اور "عنصری" کے الفاظ بجائے خود اس کے مؤقف کو پوری طرح واضح کر دیتے ہیں اور اس لحاظ سے اس کے خیالات کافی قابلِ غور ہیں۔ اگرچہ اس ضمن میں بعض بڑے بڑے سوالات پیدا ہوتے ہیں جن میں سانچہ کار اور عظیم ادب کا زیرِ بحث آنا ناگزیر ہے۔ پیش نظر شمارہ میں اسی نقاد نے شاعری کی بنیادی خرابی روایت سے انحراف قرار دی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس سلسلہ میں قدیم روایت ہی کیوں پیش نظر ہو۔ جدید اثرات کے ساتھ ایک نئی روایت بھی تو شروع ہوئی ہے۔ جدید شعرا اس روایت کو تعمیر کر رہے ہیں اور اسی کی روشنی میں انہیں دیکھنا چاہیئے۔ کامران کا مسلک وہی پرانا مسلک ہے کہ "اونٹ موجود ہے پھر ریل پر کیوں چڑھتے ہو"؟ اگر آج کل انگریزی لباس پہننے کا فیشن ہے تو یہ کہنا بیکار ہے کہ ہم مغلیہ لباس کیوں زیب تن نہیں کرتے۔ اور ہمارا لباس اس لئے موزوں نہیں کہ وہ مغلیہ نہیں۔

ایک اور نمایاں رجحان پرانے چکروں سے نجات حاصل کرنا ہے اس لئے مقصدیت اور افادیت کے جو تصورات کبھی ہمارے فکر و ادب پر شدت سے غالب رہے اب ان کی دھند چھٹتی جا رہی ہے اور ہم ادب و فن کو محض ادب و فن کی حیثیت سے دیکھنے کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ یعنی فن کی حیثیت آلۂ کار کی ہے۔ اس کا زندگی یا افادیت کے ساتھ کوئی لازمی تعلق نہیں۔ اگر جینس مین جیسا انسان ادیب ہو سکتا ہے اور بڑے پایہ کا ادیب، تو ادب کا انسان دوستی، اخلاق، تہذیب وغیرہ سے کیا سروکار رہا؟ یہ سوال خاصا بحث انگیز ہے۔ لیکن جہاں تک دورِ انقلاب کی فضا کا تعلق ہے ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہمارے ادیبوں اور فن کاروں کا شعور جاگ رہا ہے۔ وہ اس برزخ سے نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جس میں وہ تاریخی حالات کی ناگزیر منطق کے باعث پھنسا رہا ہے۔ اور یہ مستقبل کے لئے ایک نہایت خوشگوار علامت ہے۔

آخرش جاگ اٹھا وقت کا خوابیدہ شعور
سالہا سال کی ظلمت کا فسوں ٹوٹ گیا
اک کرن پھوٹ کے چمکا گئی گلشن کا نصیب
دستِ صرصر سے ہر اک دامنِ گل چھوٹ گیا

کل تلک سرد تھی جن ذروں کے احساس کی آگ
آج تپ تپ کے وہ خورشید ہوئے جاتے ہیں
جن کو روندا گیا برسوں وہی بے جان سے دل
اک نئے درد کی تمہید ہوئے جاتے ہیں

لاکھ پھینکے شبِ تاریک سویرے پہ کمند
کارواں صبح کا بڑھتا ہی چلا جائے گا!
اپنے ہمراہ لئے سینکڑوں کرنوں کا جلوس
سینۂ دہر پہ چڑھتا ہی چلا جائے گا!

—— حمایت علی شاعر

پیام

(پاکستانی ادیبوں کے نام)

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان

پاکستان رائٹرز گلڈ کی دوسری سالگرہ، منعقدہ کراچی کے موقع پر صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے پاکستانی ادیبوں کو جو پیغام ارسال فرمایا وہ ہمیشہ کی طرح بدرجۂ اتم حقیقت پسندانہ ہوتے ہوئے بقائے ملت کو تمام دیگر امور پر مقدم قرار دیتا ہے اور ادب کی نشوونما اور ادیبوں کی بہبودی و ترقی اور آزادیٔ اظہار کا ضامن ہے۔ اس اجمال کی تفصیل خود اُن کے ارشادِ گرامی میں ملاحظہ فرمائیے جو ادب اور اہلِ ادب میں غیر معمولی دلچسپی کا آئینہ دار ہے۔

آپ کی پہلی سالگرہ منعقدہ ڈھاکہ کے موقع پر میں نے جو پیغام دیا تھا اس میں ذاتی طور پر اہلِ قلم کی آزادیٔ اظہار کے تحفظ کا یقین دلایا تھا۔

مجھے مسرت ہے کہ بفضلہٖ تعالیٰ میں اپنے وعدے پر قائم رہا ہوں اور آج کی تقریب میں یہی مناسب خیال کرتا ہوں کہ بہ شدت تمام اس یقین دہانی کا اعادہ کردوں۔

میں اس موقع پر آپ کی توجہ ایک قومی مسئلہ کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اگرچہ یہ مسئلہ نیا نہیں ہے۔ اب جب کہ آپ کے ادارے کو قائم ہوئے دو سال گزر چکے ہیں کیا یہ ضروری نہیں ہوگا کہ آپ فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر پاکستان کی ملی تمناؤں کو بروئے کار لانے کی کوشش کریں؟ بے شک میری حیثیت محض ایک قاری کی ہے۔ مگر آپ اتفاق کریں گے کہ انتہا درجہ داخلی ادب بھی بالآخر معروضی ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ آفاقی تصوّر بھی اس جغرافیائی، تصوری، روحانی اور ذہنی ماحول سے بے نیاز نہیں رہ سکتا جس میں ادیب زندگی بسر کرتے اور سانس لیتے ہیں۔

میں یہ کہہ کر آپ کی ادبی تحقیقات کے موضوعات یا حدود کا تعین نہیں کر رہا بلکہ آپ کو صرف اتنا بتا دینا چاہتا ہوں کہ جہاں ملک و قوم پر آپ کے سلسلہ میں کئی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں وہاں آپ بھی ملت کے رکن ہیں اور رکن رکین۔ اس لئے اب وقت ہے کہ آپ پاکستان کی ذہنی سالمیت، استحکام اور عظمت کے باب میں اپنی جد و جہد کی ضرورت محسوس کریں اور اس کو شدید تر بنانے میں کوشاں ہوں۔

آپ جانتے ہیں اور مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ تاریخ ہر انسان کی فردِ اعمال کا بڑی سختی سے محاسبہ کرتی ہے۔ خواہ وہ ادیب ہوں یا قاری۔ بہرحال میں ہمیشہ آپ کی بہتری، آپ کی ترقی اور آپ کے حقوق کے تحفظ کا خواہاں ہوں۔

منظوم ڈرامہ:

"لہو ترنگ"

(جہادِ آزادی کا ایک غیر فانی واقعہ)

جعفر طاہر

(نواب سراج الدولہ، حاکم بنگال اپنی خوابگاہ میں جاگ رہے ہیں
آدھی رات بیت چکی ہے۔)

سراج الدولہ: ارضِ بنگال! مرے خوابوں کا فردوسِ حسیں۔
میرے آبا کا، مری قوم کا محبوب وطن،
عظمتِ دیں کی امیں پاک زمیں۔
میرے نانا کا زمانہ کیا تھا
آسماں اور زمیں عیش کے گہوارے تھے
دور گیرانِ بساطِ کرم و لطف و سرور
قبلۂ جم تھا کوئی گوہرِ آدم کوئی۔
کعبۂ راہرواں خانِ معظم ہی تو تھے۔
آج روپوش ہیں وہ کشورِ یانِ جانباز
آج آتی نہیں کوئی بھی کہیں سے آواز

وقفہ

(نواب کمرے کی ایک کھڑکی کھول دیتے ہیں)
سسکیاں لیتا ہوا سناٹا
جاگتی کروٹیں لیتی ہوئی یہ خاموشی
رات کی کوکھ سے مہتاب ابھرتے تھے کبھی
رات کی کوکھ سے اب غم کا دھواں اٹھتا ہے
مٹتی قبروں کی سیہ مٹی فغاں کرتی ہے
ہم سے مٹی کا یہ ماتم نہیں دیکھا جاتا
چیختی رات کی فریاد نہیں سن سکتے
ہم یہ فریاد نہیں سن سکتے!

(ملکہ لطف النساء خواب سے بیدار ہو جاتی ہیں)

ملکۂ عالیہ: کیا ہوا؟ خیر تو ہے میرے سراج!

سراج الدولہ: درد سے چیختی مٹی کی صدا سنتی ہو
آج ہر شاخ وہ خنجر ہے لہو جس پہ چمکتا ہے چمن زادوں کا
سانولی سرمئی آوازوں کا
رات جس طرح کوئی جھنڈ ہو ارمانوں کا
اور اس جھنڈ میں دیکھو کوئی جگنو بھی نہیں
سرِ مژگاں کوئی تارا، کوئی آنسو بھی نہیں!

ملکۂ عالیہ: آپ حالات سے مایوس نہ ہوں
مالک الملک محافظ ہوگا

سراج الدولہ: (غمگین لہجے میں) مگر یہ غم ہے کہ مٹنے لگا ہے دن کا جمال
عروسِ صبح ترسنے لگی اجالوں کو
ہمارے دیس پہ تاریکیاں سی پھیل چلیں
اجل کی نیند سلانے لگی غزالوں کو
ہم اس طلسم قضا کو نہ جیتنے دیں گے
ہمارے دل کا لہو راگ بن کے ابھرے گا
ہمارے دل کا دھواں آگ بن کے لپکے گا

ملکۂ عالیہ: مرے سراج! اندھیروں میں جگمگاتے سراج
ہمارے دین کی عزت، غریب دیس کی لاج
خدائے پاک محافظ ہو! تیرا ناصر ہو!

سراج الدولہ: کوئی نشاں ہے نہ منزل نہ راستوں کے چراغ
یہ تیرتی ہوئی لاشیں خلا کے آنگن میں
لٹک رہے ہیں جنازے ہوا کے دامن میں
گراں گراں یہ خموشی، یہ دردناک سکوت
یہ ہم اٹھائے ہوئے اپنی عمر کا تابوت

ملکۂ عالیہ: فرنگیوں کے ستم اب نہیں سہے جاتے

سراج الدولہ: مگر اٹھو تو یہ سایہ سا کیسا گذرا ہے؟
کسی وجود کی پرچھائیاں لرزتی ہیں

ملکۂ عالیہ: (آہستہ سے آواز دیتی ہیں) عالیہ! آؤ یہاں آجاؤ۔
سراج الدولہ: عالیہ خیر تو ہے؟
عالیہ: حضور ایسا گمان پڑتا ہے جیسے دھرتی تڑپ رہی ہو
ہماری مٹی کی روح غم سے نڈھال ہو کر بلک رہی ہو
غموں کے انبار میں جہاں دفن ہو رہا ہو!
خموشیاں بین کر رہی ہوں
یہ ہچکیاں ساحلوں کی، یہ ٹوٹتے ڈگارے
وہ ظلمتوں کی چٹان پر دست و پا بریدہ سسکتے تارے!
سراج الدولہ: عالیہ تم بھی اندھیروں کی مسافر تو نہیں؟
عالیہ: سفر میں شوقِ سفر ہی نشان منزل ہے
اندھیری شب میں بھٹکتے ہوئے جواں راہی
کسی سرائے میں آخر پہنچ ہی جاتے ہیں
سراج الدولہ: تری کنیز تو لطف النسا مجاہد ہے!
ملکۂ عالیہ: مجھے خوشی ہے نہیں آج راہبر تنہا
عالیہ: امیر کرتے نہیں ہیں کبھی سفر تنہا
سراج الدولہ: خدا نے چاہا تو یہ آخری سفر ہو گا
ستمگروں سے بہر حال جنگ کرنا ہے
عالیہ: کنیزِ شاہ بھی شامل جہاد میں ہو گی
ملکۂ عالیہ: ہماری ہمت عالی زمانہ دیکھے گا
لڑیں گے ہم بھی شہیدانِ کربلا کی مثال
ہماری خاک یہ روئیگا بیکراں گنگیر
عالیہ: مگر وطن کی دلہن
ہمارے خوں سے لگائیگی مانگ میں سیندور
ملکۂ عالیہ: جبیں پہ طلعتِ مہتاب و تابش خورشید
حرارتِ لب و عارض جمالِ شعلۂ طور
سراج الدولہ: نقدِ شش روزۂ دنیا کیا ہے
ظلم کے سائے میں جینا کیا ہے
عالیہ: رات کا سونا بنا جاتا ہے کبھی چاندی
رین رانی کو بھی نیند آنے لگی
نیند بھر کر تو کہاں سوئیے گا
پھر بھی آرام کریں ظلِ الٰہ

ملکۂ عالیہ: کٹ گئی آج کی شب باتوں میں
سراج الدولہ: اور پھر کتنی عجب باتوں میں
عالیہ: آپ آرام کریں
سراج الدولہ: اب کہاں سوئیں گے ہم
ملکۂ عالیہ: وضو کا پانی خجستہ ابھی لاتی ہو گی
عالیہ: سخت خود غرض ہے وہ بھی سرکار مگر
سب سے پہلے وہی پڑھتی ہے نماز
ملکۂ عالیہ: آج ہم پہلے پڑھیں گے اس سے
خجستہ خاتون: (اندر آتے ہوئے) پانی حاضر ہے وضو کا سرکار
(سب مسکرا دیتے ہیں۔ پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

منظر

محلسرائے کا ایک کمرہ

سراج الدولہ: میر صاحب مزاج کیسے ہیں؟
میر مدن: شکر ہے ظل الٰہ،
سراج الدولہ: آپ خاموش سے ہیں، خیر تو ہے؟
میر مدن: بھیڑیے، بھیڑوں کے بچے کھا کر
پوچھتے ہیں کہ حسین میمنے اچھے تو ہیں
ہائے تم لوگ اکیلا انہیں کیوں چھوڑ آئے؟
سراج الدولہ: اب تو اخلاق و مروت کے ہیں آداب یہی
میر مدن: ایک بچھو سے کسی نے پوچھا
آپ حضرات میں چھوٹوں یا بڑوں کی بھی ہے پہچان کوئی
سراج الدولہ: خوب بہت خوب!
میر مدن: ہنس کے بچھو نے کہا
ہم میں چھوٹے یا بڑے کی تو نہیں ہے پہچان
سب کے سب ہوتے ہیں زہری لیکن
کوئی بھی آنکھ نہیں رکھتے ہیں
سراج الدولہ: طنز محسوس کیا میر مدن!
میر مدن: راہرو کہنے لگا یا حضرت!
آپ کی قوم میں کچھ مرد نکو کام بھی ایسے ہوں گے
کاٹنے میں ہو تامل جن کو
بن ستائے نہ کسی کو کاٹیں

سراج الدولہ: بات بے چارے نے اچھی کہی

میر مدن: نیشِ تسم لبستہ کو بل دے کے وہ بچھو بولا
نیشِ عقرب سے تو پہچان ہماری ٹھہری
کنکھوروں سے بھی ڈر لازم ہے
کان میں ہاتھی کے رہ پائے تو چیونٹی بھی بہت

سراج الدولہ: زندگی نوش بھی ہے نیش بھی ہے

میر مدن: نوشش کم نیش زیادہ سرکار

سراج الدولہ: یعنی؟

میر مدن: اک مداری کی پٹاری میں کئی سانپ ہیں
ہر سانپ کی کوشش ہے کہ باہر نکلے
ایک دو سانپوں کے سر اب تو پٹاری سے ابھرتے ہوئے دِکھنے بھی لگے

سراج الدولہ: دُرلب رائے، اوما چند، موہن لال

میر مدن: حضور اک سانپ مارِ آستیں کہلاتا ہے شاید

سراج الدولہ: میر صاحب کو جو کہنا ہے وہ بے خوف کہیں

میر مدن: عین ممکن ہے مجھے آپ دِوانہ سمجھیں

سراج الدولہ: ہم اور میر مدن کی بات نہ مانیں!

میر مدن: کوئی ہماری بات نہ سنتا ہو سرکار

ملکہ عالیہ: (پسِ پردہ) ملکہ وقت کا والد بھی جو مجرم ہو تو بے خوف کہیں

سراج الدولہ: میر جعفر تو کہیں . . . .

میر مدن: میر جعفر ہو کہ میرن ہو وطن دشمن ہیں

ملکہ عالیہ: یہ مسلمان بھی کافر نکلا!

سراج الدولہ: قوم نے ہائے یہ کیا درس لیا
سرفرازوں نے چلن کون سا یہ اپنایا
آج بنگال تو کل دکن و دہلی و اودھ

میر مدن: کون پنجاب کو اور سندھ کو بخشے گا حضور

سراج الدولہ: آج کیا درس جنوں اہلِ وفا لیتے ہیں

ملکہ عالیہ: جن پہ تکیہ ہے دہی پتے ہوا دیتے ہیں

سراج الدولہ: میر جعفر کو ستایا تو نہیں ہے ہم نے
اس کی تحویل میں دے رکھا ہے سارا لشکر
اور پھر خون کا رشتہ بھی ہے

میر مدن: اپنوں کا سر لینے میں تسکین زیادہ ملتی ہے۔
خونی رشتے کا تو یہی وہ روپ ہے جو البیلا ہے
ورنہ غداری کیا معنی! اک بے کیف سی ہمدردی
بے کیف اور بے رنگ خوشامد بن جاتی ہے

ملکہ عالیہ: اب تنہا ہی لڑنا ہوگا

سراج الدولہ: اپنے خون کا دھبہ دھبہ سرخ سمندر بن جائیگا
ہندستان کے ہر سُونے ساحل سے جا ٹکرائیگا

ملکہ عالیہ: کشتیٔ عمرِ رواں غم نہیں جس گھاٹ لگے

عالیہ: اس دیوار سے دہلی تک
دہلی سے آگے سندھ کی آخری بستی تک
بحرِ ہند کی موجوں میں پدما کا پانی مل جائیگا،

ملکہ عالیہ: شارعِ شوری جادۂ خونیں بن جائیگی

میر مدن: دشمن سر پر چڑھ آیا ہے
اب سرکار پلاسی پہنچیں،

سراج الدولہ: مرنا عینِ شہادت ہوگا
سب ہم آواز ہو کر: جو بھی منظورِ مشیت ہوگا

منظر

میدان پلاسی۔ دونوں لشکر آمنے سامنے صف آرا ہیں نواب
اپنی فوجوں سے خطاب فرما رہے ہیں

سراج الدولہ: دوستو، ہم نفسو، ہم سفرو!
زندگی آج نئے موڑ پہ لے آئی ہے
آج درپیش نہیں اپنی حفاظت کا سوال
کشورِ ہند کی تقدیر کا لازم ہے خیال
جیت یا مات ہو اس کی کوئی پروا نہ کرو
آج اپنا سی مگر کر گذرو
چند قطرے ہیں تو کیا آؤ برس کر دیکھیں
ایک سر چشمۂ ہم سازِ نفس پر دیکھیں
جان جائے کہ رہے، نام مگر رہ جائے
ہم رہیں یا نہ رہیں کام مگر رہ جائے

میر جعفر: آپ کے حکم سے انکار نہیں ہے بیٹے
لیکن اک مشورہ دیتے ہیں جو منظور کریں،

سراج الدولہ: تجربہ کار ہیں، سالار و مدبرِ لشکر ہیں
آپ کی ذات پہ نازاں ہے زمینِ بنگال
آپ کی بات نہ مانیں گے بھلا

میر جعفر: تم جواں سال ہو، دنیا نہیں دیکھی تم نے
تم سمجھ سکتے نہیں جنگ میں کیا ہوتا ہے
پھر یہ افرنگ بُرے بھی تو نہیں

سراج الدولہ: عمو جان! آپ یہ کیا کہتے ہیں؟
سانپ کا پھن بھی کبھی پھول بنا؟
نیشِ عقرب سے کہیں زہر گیا؟
خوئے گرگانِ ستم پیشہ کبھی بدلی ہے؟

میر جعفر: شاعری کرنے لگے ہو بیٹے،
صلح جس طرح بھی ہو جیسے بھی ہو ہم کر لیں

سراج الدولہ: آپ ناراض نظر آتے ہیں

میر جعفر: ہم جو حق بات سمجھتے ہیں وہی کہتے ہیں

سراج الدولہ: جان کے خوف سے ہم شمر[۱] کی بیعت کر لیں!
کس توقع پہ کریں آرزوئے قربِ یزید
عزت و عظمت دیں بیچ کے اعلان کریں
صاحبِ فکر و عمل ہیں ہم لوگ
اپنے جمہور کی آواز ہیں ہم!

میر جعفر: دین و دنیا میں بہت فرق ہے میرے بیٹے!
اور پھر قوتِ افرنگ سے انکار نہیں
یہ کوئی قافلۂ مُور و ملخ بھی تو نہیں
فوج در فوج یہ بڑھتا ہوا سیلابِ عظیم
آج زندہ نہ ہمیں چھوڑے گا

سراج الدولہ: کیا ہمیں حشر تلک جینا ہے؟
پھر زمانے کو جگا دے تو جوانی اپنی
وقت دہرائے گا رہ رہ کے کہانی اپنی

میر مدن: عین ممکن ہے کہ تکلیف انہیں پہنچی ہو
آپ سے کوئی شکایت ہوا نہیں
آپ کا فرض ہے پہلے معافی مانگیں

میر جعفر: نہیں میر صاحب، ہمیں ان سے کوئی شکایت نہیں ہے

علی وردی خاں کا نواسہ مرا لختِ جاں ہے
یہ باتیں جو کی ہیں مرا فرض تھا۔ اونچ نیچ آپ لوگوں کو سمجھا دیا
ورنہ جھگڑا نہیں ہے،
بھلا اپنے بچوں سے ماں باپ کو زیب دیتا ہے جھگڑا؟

سراج الدولہ: ہم بھی انسان ہیں، خطا کار و گنہگار بشر ہیں عمو
عین ممکن ہے کہ تکلیف کبھی پہنچی ہو
ناگوارانہ کوئی فعل ہوا ہو ہم سے
آپ اس وقت ہمیں بخش تو دیں

میر مدن: جانے پھر وقت ملے یا نہ ملے

سراج الدولہ: بھائی میر مدن نہیں رو، عمِ گرامی سے کہو، کوئی سفارش تو کرو۔

میر جعفر: ارے یہاں کوئی گلہ ہے نہ شکایت نہ کوئی رنجش ہے

سراج الدولہ: (دستارِ شاہی اتار کر میر جعفر کے پاؤں پہ رکھتے ہوئے)
آپ کے پاؤں پہ دستار بھی رکھتے ہیں

اہلِ لشکر: الاماں! الاماں!

اور ایک لشکری: مرحبا! مرحبا!

سراج الدولہ: بخش دیں ہم سے اگر ہو بھی گیا کوئی قصور،
معذرت خواہ، طلبگارِ عنایات ہیں آج

میر جعفر: تم یہ دستار اٹھا لو بیٹے

سراج الدولہ: جب تلک بخش نہ دیں گے یہ نہیں ہونے کا

میر جعفر: آخری وقت میں کیا تم سے شکایت ہو گی

سراج الدولہ: آج ہم سر پہ نہیں رکھیں گے شاہی دستار

میر جعفر: ہم یہ دستار بندھاتے ہیں تمہیں
آؤ سینے سے لگاتے ہیں تمہیں
آؤ آؤ مرے بیٹے آؤ
بوڑھے عمو کو نہ اب اور پریشان کرو

سراج الدولہ: (مسکرا کر) آپ نے بخش دیا نا قبلہ!

میر جعفر: باپ بیٹے میں لڑائی کیسی!

سراج الدولہ: لیجے اب حکمِ صف آرائی دیں

میر جعفر: (یکلخت چونک کر) ہاں ہاں۔
قلبِ لشکر میں تو خود آپ رہیں

میمنہ کے لئے موجود ہے میرن سا غلام
میسرہ میر جہاں خاں ہی سنبھالے رکھیں
توپ خانے کے لئے میر مدن کافی ہیں،

سراج الدولہ: آپ کہاں پر ہوں گے

میر جعفر: تازہ دم لشکرِ جرار لئے ہم بھی رہیں گے موجود۔
کوئی رخنہ کہیں دیکھا تو وہیں پہنچیں گے

(منظر بدلتا ہے، توپوں کے گڑگڑانے کی آوازیں۔ آہستہ آہستہ فیڈ آؤٹ)

سراج الدولہ: ہم یہ کیا دیکھ رہے ہیں کاظم!

کاظم: حضور میر مدن رہ گئے تنہا
پلٹ کے آنے لگی ہے فرنگیوں کی سپہ

سراج الدولہ: میر جعفر کھڑے کیا تکتے ہیں؟

کاظم: ان کا لشکر بھی ہے چالیس ہزار

سراج الدولہ: میر مدن کی جنگ تو دیکھو گورے بگٹٹ بھاگ رہے ہیں

کاظم: میمنہ خالی نظر آتا ہے لیکن سرکار

سراج الدولہ: غم نہیں میر مدن کافی ہیں

کاظم: میر جعفر بھی جو اب آگے بڑھیں

سراج الدولہ: ہم انہیں کہتے ہیں (گھوڑا دوڑا کر میر جعفر کے پاس پہنچتے ہیں)

وقفہ

سراج الدولہ: (میر جعفر سے) چچا جان آپ سے درخواست ہے اب آگے بڑھیں
آپ کیا دیکھ رہے ہیں یہیں تنہا تنہا
اب تو گوروں کی سپہ ہونے لگی ہے پسپا

میر جعفر: آپ بے فکر رہیں، قلب سنبھالے جائیں
آخری ضرب لگاتے جائیں

سراج الدولہ: آپ، اور آپ؟

میر جعفر: ابھی بڑھتے ہیں بس بڑھتے ہیں۔

(سراج الدولہ گھوڑا دوڑا کر واپس اپنے لشکر میں آتے ہیں)

سراج الدولہ: دوستو آگے بڑھو، آگے بڑھو جم کے لڑو
پاؤں دشمن کے اکھڑنے لگے، شاباش بہادر بیٹو!

ایک مجاہد: حضور میر مدن ہو گئے وطن پہ نثار!

سراج الدولہ: آفریں باد بریں ہمتِ مردانۂ او
ایسے جانباز کہاں ملتے ہیں
(گھوڑا دوڑا کر میر جعفر کے پاس پہنچتے ہیں)

سراج الدولہ: آپ کیا دیکھ رہے ہیں عمو؟
ہو چکے میر مدن بھی تو شہید!
گورے پسپا ہوئے جاتے ہیں خدارا عمو!
آپ اب آگے بڑھیں حملہ کریں

میر جعفر: گورے پسپا ہوئے جاتے ہیں یہ کیسے جانا؟
تم نے اب تک نہیں پہچانا؟

سراج الدولہ: عمو جان! آپ یہ کیا کہتے ہیں؟

میر جعفر: ہم نہ کہتے تھے لڑائی نہ کرو
شکر ہے دیکھ لیا تم نے یہ اپنا انجام
کس بھروسے پہ چلے آئے تھے لڑنے مرنے
ہم نہ کہتے تھے چلو صلح ہی کر لو ان سے۔

سراج الدولہ: تجھ سا غدار و سیہ کار نہ کوئی ہوگا
تو کہ مردوں کی شہادت کا اڑاتا ہے مذاق
ننگِ دیں، ننگِ وطن، ننگِ وجود
ملک و ملت کا بھرم بیچ کے اتراتا ہے!؟

میر جعفر: سر پھرے چھوکرے کیا بکتا ہے
تختِ بنگال پہ بیٹھوں تو سہی
(اہلِ لشکر سے) دوستو جنگ تمہیں جیتنا ہے
آؤ، احباب کی جانب آؤ
دیکھتے کیا ہو، بڑھو آگے، بلاتے ہیں تمہیں.....

(میر جعفر گھوڑے کو ایڑ لگاتا ہے اور اس کے ساتھ چالیس ہزار کا لشکر گھوڑوں کی باگیں اٹھائے پیدل انگریزی کیمپ کی طرف بڑھتا ہے)

سراج الدولہ: (خود سے) جنگ ہم ہار گئے!
آج غدارِ وطن جیت گئے
اب یہاں پر ہے ٹھہرنا بے سود
اے پلاسی مری قسمت کے گواہ
شام تک آج بہے نور کے دھارے کیا کیا
گر گئے اپنی سی جانباز ہمارے کیا کیا
آنے والوں کو سنانا تو کہانی میری

ہر سو گرد آرزو کی تہہ ہے نشانی میری

منظر

(کافی رات بیت چکی ہے۔ سراج الدولہ ایک جنگل میں بھٹکتا پھر رہا ہے کہ اسے دور سے ایک فقیر کی کٹیا نظر آتی ہے جس میں چراغ جل رہا ہے)

سراج الدولہ: سائیں جی! سائیں جی!

فقیر: کون ہے بے؟

سراج الدولہ: سائیں جی آپ کواڑ یا کھولیں

فقیر: (آہستہ سے، جیسے پہچان کر خوش ہو گیا ہو) اُٹھیں نواب

سراج الدولہ: (بلند آواز سے) کون ہو تم؟

سراج الدولہ: سائیں جی پانی، خدارا پانی!

فقیر: آؤ تا پانی پیو، شوق سے تم پانی پیو۔

(سراج الدولہ پانی پی کر ٹھنڈی سانس بھرتے ہیں)

سراج الدولہ: شکر ہے ربّ کریم!

فقیر: کون ہو تم؟

سراج الدولہ: ایک درماندہ مسافر بابا!
اِک بھٹکتی ہوئی روح!

فقیر: ہوں!

سراج الدولہ: ایک ڈھلتا ہوا سایہ ہوں، کسی لمحے کی دم توڑتی پرچھائیں ہوں!

فقیر: راستہ بھول گئے ہو شاید

سراج الدولہ: ایک میں ہی نہیں بھولا بابا
آج سب لوگ ڈگر بھول گئے!

فقیر: لوگ، وہ لوگ کدھر ہیں بیٹا؟

سراج الدولہ: چھوڑ دو چھوڑ دو بھی وہ خود بخود راہ پہ آ جائیں گے،

فقیر: تم انہیں اٹھ کے پکارو تو سہی،

سراج الدولہ: میں بہت دور نکل آیا ہوں
درمیاں وقت کی دیوار ابھر آئی ہے
سامنے صدیوں کا پھیلا ہوا سُونا بن ہے

فقیر: تم انہیں اٹھ کے بلاؤ تو سہی

سراج: میں بلاتا رہا برسوں ان کو
میں نے اٹھ اٹھ کے صدا دی سب کو

کون سنتا ہے یہاں کون کسی کی آواز؟

فقیر: رات ہے، کتنے ہی بٹ مار یہاں پھرتے ہیں

سراج الدولہ: اب یہاں رات رہے گی بابا!
کتنے بٹ مار پھریں گے آزاد

فقیر: تیرے کپڑوں پہ یہ خون کیسا ہے؟
قتل کر کے تو نہیں بھاگے ہو؟

سراج الدولہ: نہیں بابا، مجھے بٹ مار ملے تھے رہ میں
لڑتا بھڑتا انہیں لوگوں سے یہاں پہنچا ہوں

فقیر: مرحبا! کتنوں کی ٹولی تھی وہ؟

سراج الدولہ: گرگ بندی کا سمے تھا بابا

فقیر: اچھا اب آرام کرو

سراج الدولہ: سائیں جی، اب مجھے جانا ہوگا

فقیر: تم یہیں ٹھہرو میاں،
زخم بھر جائیں تو پھر گھر جانا
یہ تو درویش کا استھان ہے خطرہ کیسا
اس طرف آن کے بٹ مار بھلا کیا لیں گے
اچھا اب سو رہو
باقی بھی ہے بجھتی جاتی ....

(آہستہ آہستہ پردہ گرتا ہے)

منظر

میر جعفر کا کیمپ

(میر جعفر بھنگ نوش کر رہا ہے)

میر جعفر: جانے کیا بات ہے زنگم بھائی

دِنگم: جے مہاراج کی دھن ہو سرکار!

میر جعفر: اب تو نشہ بھی نہیں ہوتا ہے

دِنگم: نشہ تو ہوتا ہے دھیرے دھیرے

میر جعفر: من کو تسکین جو حاصل ہو تو زنگم بھائی

دِنگم: اب تو کھٹکا نہیں رہا کوئی

میر جعفر: ابھی زندہ ہے سراجِ زنگم
خون اس کا جو پیوں، نشہ ہو

دِنگم: بوٹی تانبے کی پتیلی میں پکائی ہے جناب

میر جعفر: اب فلک سیر سے کیا ہوتا ہے
رنگم: ساغرِ سبز چڑھے ہیں کتنے
میر جعفر: اُن کے پیتے نہیں پینے والے
رنگم: آپ تو پورے ولی اللہ ہیں
شانت ساگر کی طرح مست سبھل
میر جعفر: تپش دل جو مٹے،
رنگم: بجھ گئی آگ تو پھر راکھ ہیں ہم
میر جعفر: آگ، اوہ آگ۔ مگر ....
گھول کر ایک پیالے میں کچھ افیون تو دے
تین تولے سے نہ کمتی ہو مگر
رنگم: ایسے درویش گنی لوگ کہاں ملتے ہیں
میر جعفر: تو نے پی کتنی بتا
رنگم: چانڈو چکھا تھا مگر لطف نہ آیا سرکار
ایک دو گھونٹ لئے سلفے کے
میر جعفر: اور افیون؟
رنگم: یہی دو تولے، مہاراج کی جے
میر جعفر: ساتھ دو گے نہ ہمارا رنگم
رنگم: ساتھ کیا دے گی کرن سورج کا
بندہ قطرہ تو سوامی جی سمندر ٹھہرے
پھر یہ گستاخی بھی ہے
میر جعفر: بھائی افیون تو مشروب ہے اوتاروں کا
دیوتا اس کی بدولت ہی جواں رہتے ہیں
سوم رس کیا ہے وہ افشردۂ افیوں ہی تو ہے
دیویاں پوست کے پھولوں کا عرق پیتی ہیں!
پدمنی رانیاں افیون پہ ہی جیتی ہیں!
کھیت لالے کا ہے تم جس کو شفق کہتے ہو
رنگم: یہ پرم پور پیالہ لیجے
میر جعفر: سنو کچھ گھوڑوں کی ٹاپوں کی صدا آتی ہے،
دیکھو میرن یا کوئی اور ہے
رنگم: کوئی ہو، آپ یہ امرت، یہ مہاجل تو پئیں
ایک سنجوگ سبھا ہے دنیا

ایک سنتاپ سنگھاسن ٹھہرا
میر جعفر: لطف و عالیہ بھی تو گم ہیں
رنگم: وہ بھی یدھ کرنے کو ....
میر جعفر: اتنا معلوم ہے میداں میں تھیں دونوں موجود
رنگم: عالیہ ہو وے جو بندے کو عطا
میر جعفر: ہم یہ سنتے ہیں کہ تم ہندو ہو
رنگم: یہ بھی کیا بات ہوئی
میر جعفر: وعدہ رہا
کہنے کو عالیہ لونڈی ہے مگر
چاند سورج کو بھی شرماتی ہے
رنگم: چھوٹے سرکار چلے آتے ہیں
میر جعفر: ساتھ وہ خود سر و مغرور جواں ہے کہ نہیں؟
رنگم: کوئی بھی ساتھ نہیں
میر جعفر: اپنے مخدوم کلائیو سے ملیں گے کیونکر
(میرن داخل ہوتا ہے)
میرن: ابا حضرت آداب!
میر جعفر: خالی ہاتھ آئے ہو شاید بیٹے،
میرن: حضور ہم ڈھونڈ ڈھونڈ کر آج تھک گئے ہیں
گلی گلی ایک اک مکان ہم نے چھان ڈالا
تمام ایواں کے فرش تک ہم نے کھود ڈالے
گماں یہی ہے کہ مرشد آباد سے کہیں اور جا چکا ہے
میر جعفر: ہمارے مخبر قدم قدم پر چھپے ہوئے ہیں
فقیر، مانجھی، تعلقہ دار، پرگنوں کے مہنت، مکھیا
ہمارے انعام یافتہ ہیں،
رنگم: حضور سے راج پال دھرتی پہ اب کہاں ہیں؟
مگر پیالہ نہ پیجیئے گا؟
میر جعفر: پیاس تو ہے
میرن: حضور دیکھیں وہ کوئی بھیک منگا آ رہا ہے
میر جعفر: دیکھو، ممکن ہے کوئی اپنا ہی آدمی ہو
رنگم: کوئی اسرار ہے اس میں سرکار
میر جعفر: تم پیالہ پیو۔ گھبراؤ نہیں،

(فقیر اندر داخل ہوتا ہے)

فقیر: تسلیم حضور!

میر جعفر: سائیں جی! کوئی خبر؟

فقیر: تھک گیا ظل اللہ!

میر جعفر: بیٹے درویشوں کی عزت نہ کرو گے —

میرن: سائیں جی آپ ادھر آ بیٹھیں

تکیہ حاضر ہے

میر جعفر: بوٹی، افیون کہ سلفہ، ارشاد!

فقیر: پہلے انعام ٹھہر جائے تو پھر بات بھی ہے

رنگمر: دھن مہاراج مبارک . . . . .

میر جعفر: ہار سونے کا یہ حاضر ہے —

فقیر: تین دن ہونے کو آئے سرکار

میری کٹیا میں ہے ٹھہرا مہمان

آپ کا خاص شکار!

میر جعفر: پہلے دن ہی یہ خبر دی ہوتی

فقیر: بدگماں ہو کے نکل جاتا تو پھر کیا ہوتا

میر جعفر: تم سمجھ دار ہو، دانا ہو فقیر

رنگمر: کام آتے ہیں فقیروں کے فقیر

میر جعفر: میرن بیٹے!

میرن: شیر بنگال!

میر جعفر: وقت پھر ہاتھ نہیں آئے گا!

جاؤ اور کام کرو

میرن: ظل اللہ!

رنگمر: یہ ہے وہ آپ کے بھائی نے جو بھجوائی ہے

اپنے ہاتھوں سے مہاراج ہی بوتل کھولیں

پی کے دیکھیں تو سہی

میر جعفر: بھئی افیون دو، افیون، خدارا افیون

بیٹھے ہی بیٹھے بہک جاتے ہو اب تو تم بھی

آب افرنگ وہی چائے کا رنگ

اور پھر ہم تو مسلمان ہیں، مومن، دیندار

کب بھلا پیتے ہیں افرنگ کی ناپاک شراب

(عرصۂ دراز کے بعد)

چاندنی رات ہے، خاکِ شہدا ہے، میں ہوں

ایک خوشبو سی رگ و پے میں رچی جاتی ہے،

درد کی دولتِ بیدار عطا ہوتی ہے

ہائے یہ خاک، یہ خلوت گہہ خونیں کفناں!

مشہدِ عشق و وفا، کعبۂ صاحب نظراں

دور شمعوں کی نظر تاب قطاریں، جگنو

مست و سرشار فضاؤں سے یہ رحمت کا نزول

ساحل بحر سے آتی ہوئی مخمور ہوا

ایک تقدیس و مسرت کی فضا

میں ہوں اور سامنے مٹتی ہوئی قبروں کے نشاں

ولولہ خیز، جنوں ساز، مہکتی مٹی

چھٹ گئی گردِ ملامت، وہ کدورت کا غبار

اب کہاں "تہمتِ مشہور" - مگر کون ہیں یہ؟

کون ہیں کون یہ خوش وقت، یہ زینندہ خرام؟

خلوتِ شب کو جگاتی ہوئی معصوم ہنسی

روئے پُر نور پہ چھایا ہوا شاداب سکوں

میں ذرا اوٹ میں ہو جاؤں، سنوں

گفتگو جیسے فرشتوں کا زمینوں پہ ورود

جیسے پھولوں کی طرف چاند ستاروں کے سلام

جس طرح راج کنول تال پہ بوندوں کی ملار

ایک آواز: آج آزاد ہے میرا بنگال!

آج سرسبز ہے شاداب ہے صحرائے خیال

آج ہر لمحہ نئی صبح کا لاتا ہے پیام

آج ہر شام کی آغوش میں ہے ماہِ تمام

زنانہ آواز: خوب ہے اپنی شہادت کا مآل

پہلی آواز: ملکہ عالیہ آزاد ہے اپنا بنگال!

اب نہ وہ ظلم کے دن ہیں نہ ستم کی راتیں

رات آتی تھی تو لے جام و سبو آتی تھی

دن کو پھولوں سے بھی بارود کی بو آتی تھی

باقی صفحہ ۱۴۰

کہ میں لبِ تشنۂ تقریر بھی تھا!

اے، ایم، یزدانی

تقریر کرنے کا شوق کسے نہیں ؟ ہر کوئی یہی چاہتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اسٹیج پر جا دھمکے اور ایک آدھ تقریر جھاڑ دے ۔ خواہ وہ دل ہی دل میں خوب جانتا ہو کہ وہ قوت تقریر میں دوسرا مرید پور کا پیر ہے اور منہ سے ایک دو بول نکلنے تو کیا ، اسٹیج پر جاتے ہی گھگھی بندھ جائیگی۔ ہے ہاتھ پاؤں تو مارے کپکپی کے ان کا جانے کیا حال ہو۔ اور پھر ہم تو پروفیسر ٹھہرے ۔یعنی پیشہ ور مقرر۔ خواہ طلبہ ہی کے سامنے سہی ، اور آپ جانیں اپنی گلی میں انسان کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور پھر شہرت تو ہر انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ مدعا یہ کہ ہمیں بھی پبلک میں تقریر کر کے نام پیدا کرنے ، اور جیسا کہ آج کل ہر کوئی چاہتا ہے ، لیڈر بننے کا شوق تھا ۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ہم جلسہ میں پہنچے بھی تو بہ تاخیر پہنچے ۔

حریفاں جادہ ہا بروند و رفتند اور بڑی دھوم دھام سے دھنواں دھار تقریریں جھاڑ دیں ۔ اور سچ پوچھئے تو ہمارا نام نامی اور اسم گرامی مقررین یعنی اپنے مظاہروں سے اہل محفل کو حظِ خاطر بہم پہنچانے والے محفل طرازوں کی فہرست میں شامل نہ تھا۔ جو اس روز یعنی شام یا شب کے چشم و چراغ تھے ۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! اور پھر ہماری شومیٔ قسمت یا شامتِ اعمال سے ، جو بھی آپ کے خیالِ شریف میں آئے ـــــ وہ شام تھی بھی بڑی گرم ، بلا کا اُمس تھا ۔ اور اس پر طرفہ یہ کہ گرمیٔ گفتارِ اعضائے مجالس کے باعث نمازِ مغرب میں دیر ہوتی جا رہی تھی ۔ جس کا پاس ہمارے عزیزانِ وطن سے زیادہ اور کس کو ہے ، خواہ وہ ظاہرداری کی بنا ہی پر کیوں نہ ہو۔ اس لئے چاروں طرف "مغرب مغرب" کا غل برپا ہو گیا ۔ اور ہم ـــــ آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے ! ـــــ یعنی صاحب صدر نے بکمال احساس ذمہ داری یہ اعلان کر دیا کہ اب "قومیت اور مذہب العین" کے مسائل گوناگوں پر یہ دلچسپ مذاکرہ ختم ہوتا ہے ۔ اور ہماری حسرتیں دل کی دل ہی میں رہ گئیں ۔ نہ ایک چھوٹا سا پرچہ دست بدست بھجوانے کے باوجود جناب صدر نے مجھے بلایا اور نہ میں جا سکا ، نہ کچھ کہہ سکا ۔ میں نے دل ہی دل میں مرگِ آرزو پر فاتحہ پڑھی اور انا للہ و انا الیہ راجعون کہہ کر چپ ہو رہا مگر جو آگ دل میں سلگ رہی تھی وہ سلگتی ہی رہی !

یہ تسلیم کہ اس محفل میں بڑے بڑے علماء و فضلاء ، سیاست داں ، مدبر اور خدا جانے کیا کیا کچھ موجود تھے ۔ اور انھوں نے اپنی ہمہ دانی اور آتش بیانی کی خوب داد دی مگر ایک فرد کی دلی تمنا بھی کچھ وقعت رکھتی ہے ۔ اور پھر ایسے فضلا و اکابرین ۔ اس لئے میرا خیال تھا کہ اگر میں بھی لہو لگا کر شہیدوں میں نام پیدا کروں تو کیا برا ہے ۔ زیادہ نہیں تین چار منٹ ہی سہی ۔ مقررین نے اپنے اپنے خطبات عالیہ میں سر سید ، بیکن ، آرنلڈ اور خبر نہیں کن کن مشاہیرِ عظام کا ذکر کیا تھا ۔ اور ہم بھی تھے آخر انگریزی کمپوزیشن کے معلم اور وہ بھی انٹرمیڈیٹ اور ایک حد تک بی اے جیسی اعلیٰ جماعتوں کے ، اور ایک بڑے ممتاز کالج میں ۔ پھر ہم تو تھے ڈنکے کی چوٹ پانچوں سواروں میں ۔ مدرس کی حیثیت سے تو مجھے بہت کچھ سننا پڑتا ہے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہی کرنا پڑتا ہے ۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا مگر کسی قدر فرق کے ساتھ اور خوشگوار فرق کے ساتھ کہ جلوہ ان کا باقی سب کچھ میرا تھا۔ یعنی استفادہ ہی استفادہ ۔

میں تو تقریر کے لئے آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا ۔ مگر وائے قسمت ! مجھے اس کی اجازت ہی نہ مل سکی ۔ میں حاضرین یا منتظمین کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ حضرات ! جب میں نے اس موقر دعوت نامہ کو کھول کر پڑھا تھا تو مجھے اس سے کچھ دھن پانے کی توقع ہوئی تھی ۔ کیونکہ اسمیں لکھا تھا : " ازراہ کرم اس دستاویز کو اپنے ساتھ لائیے " اور یقین جانئے میں اس اہم دستاویز کو

بڑی احتیاط سے اپنی جیب میں ڈال کر لایا تھا۔ یہ تو ہے کہ مجھے اس موقع پر کچھ زیادہ کہنا نہیں تھا۔ کوئی بڑی بات یا کام کی بات، خصوصاً ایسے عالم فاضل لوگوں کے مجمع میں۔ اور منہ میں آئیں بائیں شائیں سے کچھ زیادہ آگے بڑھ سکتا تھا۔ کیونکہ جب میں اسٹیج پر اٹھ کھڑا ہوتا ہوں تو جو چیز میرے آڑے آتی ہے وہ پبلک کی ٹریننگ یا عادت ہو نہیں اور نہ یہ کہ میں نے کہیں تقریر نہیں کی اور میں اس فن سے بے بہرہ ہوں بلکہ میری اور حاضرین کی بدنصیبی سے میری تمام سابقہ تقریریں یادر ہوا یعنی سیدھے سادے لفظوں میں ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ یہ نہیں کہ مجھے فصاحت و بلاغت کے گر نہیں آتے۔ بلکہ میری آتش بیانی کی نوعیت کچھ اور ہے یعنی جلوت کی بجائے خلوت میں گوہر فشانی۔ ایک دفعہ سارا مجمع چھٹ کر خلوت ہو جانے دیجئے۔ پھر اکیلے میں دیکھئے انداز گل افشانی گفتار!

بعض اوقات جب میں رات یا صبح سویرے بالکل اکیلا ہوتا ہوں تو ایک ایسے شخص کو جو میرے سامنے موجود نہ ہو بڑے زور شور سے خطاب کر سکتا ہوں۔ خواہ وہ کوئی نامی گرامی ڈکٹیٹر، وزیر، سفیر، سیاستداں یا ــــــ وائس چانسلر ہی کیوں نہ ہو۔ اگر میں یہ دیکھوں کہ اس کے کام میں کوئی کسر ہے تو اسے ایسا لکچر پلاؤں، ایسا لکچر پلاؤں کہ سٹی گم ہو جائے۔ میں اسے للکار کر کہتا ہوں: "جناب والا عام لوگ آپ کے یہ بڑے بڑے نصب العین کیا جانیں۔ مگر وہ یقیناً اس بات کی قدر کریں گے کہ آپ ان کے کچھ کام آئیں، ان کی خدمت کریں، ان کے لئے کچھ ایثار کریں۔ آپ کچھ اپنے پاس رکھ کر کھوتے ہیں، دوسروں کو دے کر پاتے ہیں" ایسا ہی ایک اور خلوت کا لمحہ تھا جب میں ایک بہت بڑے سیاستداں سے کہہ رہا تھا "حضور والا! اگر جناب ملک میں ایک بہت بڑی جماعت کے سردار ہیں تو شراب اور دوسرے نشوں کی ممانعت کیوں نہیں کرتے؟ اس سے تو ہمیں بہت بہتر شہری ہاتھ آئیں گے"۔

ایک اور روشن خیال صاحب صدر نے ثقافتی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے بارے میں جو فصیح و بلیغ تقریر فرمائی تھی وہ میرے سمند تقریر کے لئے ایک اور تازیانہ ثابت ہوئی۔ مگر وہ بھی حسب معمول خلوت ہی میں۔ میں نے کہا "جناب بے شک نیم عریاں رقص کے شوق میں سرتا پا غرق ہیں۔ این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔ مگر کیا آپ نے کبھی ان بے شمار بھوکے ننگے، غریب، نادار، حاجت مند، خستہ حال لوگوں اور بیماری کے مارے انسانوں اور بچے بچیوں کا تصور بھی کیا ہے جو گلی کوچوں میں مارے مارے پھرتے ہیں؟ اگر ہم ان کی حالت کو سنوار نہیں سکتے تو ہماری ثقافتی سرگرمیاں اور جمہوری ہمدردیاں کس کام کی؟ ٹھیک ہے، تمام بڑے بڑے لوگوں کی طرح آپ کا یہ خیال کرنا کہ انسان صرف روٹی ہی سے زندہ نہیں رہتا۔ مگر یہ بھی کیا کہ ہم بالکل گھسے پٹے فلمی گانوں اور راک این رول جیسے ناچوں کے ہو رہے ہیں۔ آخر ہماری قوم کو جوانمرد، اور باہمت انسانوں کی بھی تو ضرورت ہے۔ کیا ان کے متعلق کسی نصب العین کی ضرورت نہیں؟"

میں کرسی پر بیٹھا یہ سب کچھ سوچ رہا تھا۔ اور میرے کان ٹیلیفون کی گھنٹی پر لگے ہوئے تھے۔ گھنٹی بجی اور میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ آن بڑے صاحب یعنی صاحب صدر نے مجھے یاد فرمایا تھا۔ اور میں تھا کہ بری طرح بوکھلاہٹ کا شکار تھا۔ پتہ ہی نہ چلا کہ انہوں نے کیا فرمایا۔ اور میں نے اپنی تقریر یہی کہہ کر ختم کر ڈالی کہ "بہت خوب جناب۔ آپ کا بہت بہت شکریہ" اور ان صاحب کے پی اے نے مجھے بعد میں بتلایا کہ انہوں نے کیا ارشاد فرمایا تھا۔ میں نے ان کو بھی دوسرے بڑے بڑے افسروں کی طرح اپنے ہی انداز میں مخاطب کیا: "جناب کی تعلیم کو فروغ دینے کی بے لوث کوششیں بے حد قابل ستائش ہیں۔ مگر ہمیں اساتذہ کی زندگی کو خوشگوار بنانے کی اشد ضرورت ہے۔" ہاں تو ایسے موقعوں پر میری چرب زبانی کے کیا کہنے۔ اور یقین جانئے کوئی بڑے سے بڑا آدمی ہو میں اُسے ایسی بے بھاؤ کی سناتا ہوں، ایسی بے نقط، بے پناہ کہ بڑی بڑی بھٹیار نیں بھی مات ہو جائیں مگر خواہ ایک دو ہی آدمی سامنے بیٹھے ہوں، میرے گلے سے کچھ ایسی خرخر کی سی آوازیں نکلنے لگتی ہیں جیسے دم نزع گھنگرو بول رہا ہو۔ اس لئے یہ کیوں نہ ہو کہ تقریر کے بجائے تحریر سے[1] الّو سیدھا کیا جائے۔ جیسا کہ اب کر رہا ہوں خدا راس لائے!

تو جس بات پر میں سب سے زیادہ زور دینا چاہتا ہوں وہ ہے۔ یقین۔ بڑے لوگ ہمیشہ ایک ہی جیسا سوچتے ہیں۔ علامہ اقبال رح نے بھی تو یہی کہا تھا:

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اور بابائے ملت رح نے بھی تو تنظیم، اتحاد، ایقان ہی پر

---

[1] تو کار زمیں را نکو ساختی کہ با آسمان نیز پرداختی

اتحاد شرق و غرب

زیبھ ثانی کی پاکستان میں آمد ایک یادگار
یثیت عہد آفریں، وفاق پرور ۔ وہ پہلی خودمختار
ر آزادی میں ہمارے یہاں تشریف لائی ہیں،
ہ میں جبکہ دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات کی
چکی ہے ۔ ان کی آمد بلاشبہ خوشگواری کے ایک نئے
خوشگوار دور کی تمہید ہے

ش : اپنے لئے نہیں مہماں کے لئے
ہ دامن دل میکشد کہ جا اینجا است ،،

شاہانہ خراج عقیدت (مزار قائد اعظمرح پر) :
بہ زمینے کہ نشان کف پائے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

'' آپ حضرات کا بہت بہت شکریہ ،،

رے اردو کی قدر و منزلت ! ہماری شاہی مہمان کی جدۂ ماجدہ، م
و کٹوریہ اردو جانتی اور بولتی تھیں ۔ ان کی موجودہ وارث
عوام پاکستان کے خیر مقدم (فریئر ہال کراچی) اور سپاسنامہ
شکریہ اردو میں ادا کر کے اپنی جدۂ ماجدہ کی نمائندگی
حق ادا کیا ہے اور ہم پاکستانیوں کے دل میں گھر کر لیا

فنون لطیفہ آزاد مرداں"

مصوری سے مغل مصوری اور مغل مصوری سے پاکستان
ایہٗ ناز مصور عبدالرحمن چغتائی تک ایک شاندار روایت
سلسلہ ہے جس نے ہمیں فن کے بہترین شاہکار دئے ہیں۔
نظر مرقعات میں، جو اپنی ندرت ہوئے دور کی جھلکیاں
کرتے ہیں، ایرانی قلم کی ندرت کاری مشہور و معروف رزمیہ
داستانوں کی توضیح و تشریح پر صرف ہوتی ہے

صید افگن

بزم نشاط

سوزن چالاک

سب سے زیادہ زور دیا تھا۔ اگرچہ یہ بڑے کہاں اور میں کہاں ــــــ
چہ نسبت خاک را با عالم پاک ــــ تو ہمارے ملی نصب العین کا ایک
بہت بڑا جزو یہی ہونا چاہیئے۔ یقین، جس سے معجزے صادر ہوتے ہیں
معجزے ــ ہمیں یقین ہونا چاہیئے اور یقینِ محکم کہ ہم اپنی ملّت کا مقدر
بدل ڈالیں گے۔

اچھا یہ تو ہوئی ایک بات۔ دوسری وہ ہے جس پر ہمارے سربراہ
قوم، صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں ہمیشہ زور دیتے رہتے ہیں۔
محنت، مشقت۔ کیونکہ یہی چیز ہے جو خاک کے ڈھیر کو اکسیر بنا دیتی
ہے۔ محنت و مشقت اور صبر و استقلال سب مل کر ہمارے شہریوں
کو بدرجہا بہتر بنا دیں گے۔

اگرچہ میرا یہ عقیدہ ہے کہ ہماری موجودہ زندگی محض اُخروی
زندگی کا پیش خیمہ ہے۔ اور میں تو کیا سارے مسلمانوں کا یہی عقیدہ
ہے۔ پھر بھی جیسا کہ ہمارے جہاں دیدہ صدر نے بارہا فرمایا ہے، موجودہ
زمانہ سائنس اور فہم و بصیرت کو کام میں لانے کا زمانہ ہے۔ اور ہمیں
محض عاقبت یا عبادت ہی پر ادھار کھائے بیٹھا نہیں رہنا چاہیئے۔
"گفت حکمت را خدا خیر کثیر" پر بھی نظر رکھتے ہوئے نئی بصیرت اور
نیا ذوقِ عمل پیدا کرنا چاہیئے۔ تاکہ ہم توہّم پرستی اور کٹّرپن سے آزاد
ہو کر دنیا میں ٹھیک طرح زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ سیکھیں۔ اور زیادہ
سے زیادہ ترقی کر کے اقوامِ عالم میں سرفراز ہوں۔

کیا کیا جائے، تان خواہی نخواہی ہمارے پرانے سیاست دانوں
ہی پر آ کر ٹوٹتی ہے۔ افسوس! وہ اپنا وقت پاکستان کو بامِ عروج پر پہنچانے
کے لئے صرف نہ کر سکے۔ اور جب ان کی نیتیں بخیر بھی تھیں، تب بھی
ان کے وار اوچھے ہی پڑے۔ انہوں نے قوم، اس کے مزاج، اس کے
ماحول، اس کی ضرورتوں کو نہ سمجھا۔ اور پڑے دوسری قوموں کی اندھا دھند
ریس کرتے رہے۔ بھلا مانگے تانگے کے خیالات اور طور طریقے کب تک
کام آتے۔ ان کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ قوم کا صحیح نصب العین
تلاش نہ کر سکے۔ اور اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہے۔ کچھ ذاتی
اغراض بھی آڑے آئیں اور نفسا نفسی نے افراتفری پیدا کی۔ اسی لئے
مارشل لا کو میدان میں کودنا ہی پڑا۔ آخر قوم دشمن لوگوں کے کرتوت
کب تک ڈھکے چھپے رہتے۔

آپ مجھ سے پوچھئے معمارانِ انقلاب کا سب سے بڑا کارنامہ کیا ہے۔
یہ کہ انہوں نے قوم کا صحیح نصب العین دریافت کیا ہے اور اس پر عمل
کر کے دکھایا ہے۔ جس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ تعمیر و ترقی کی صحیح
داغ بیل کہیں اب آ کر پڑی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم زندگی کے
ہر میدان میں بڑی تیزی سے آگے بڑھنے لگے ہیں۔ چلئے گیارہ بارہ سال
کے بعد ہی سہی ہم نے اپنا صحیح راستہ تو پا لیا ہے۔ سچی بات ہے ہم اپنے
اسلاف کے کارناموں پر کب تک شیخی بگھارتے رہیں گے۔ وہی پدرم
سلطان بود والی بات۔ کیوں نہ ہم خود کچھ کر کے دکھائیں۔ صدر پاکستان برابر
اس بات ہی پر زور دے رہے ہیں۔ ہم کب تک خود کو لوریاں دے دے کر
سلاتے اور پرانے زمانوں کے سپنے دیکھتے رہیں گے؟ ہمارا زمانہ تو تمام تر
ٹھوس، دیانت دارانہ، وطن پرستانہ، بے لوث منظم و متحدہ کوششیں
بروئے کار لانے کا ہے۔ یہ وہی راستہ ہے جسے ہمارے موجودہ سربراہ
ہمیں دکھانے اور اس پر چلانے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہماری نجات،
ہماری عظمت اور جاہ و جلال کا صحیح آہنگ یہی حرکیاتی، یہی "جوہری
آہنگ" ہے۔ یہ نہیں کہ محض خالی خولی نقارے دھما دھم پیٹے چلے
جائیں نگر گت سرے سے ہو ہی نہیں اور ہو بھی تو اینڈی بینڈی۔

میری یہ خلوت میں کی ہوئی تقریر، یہ خود کلامی بے تحاشا بڑھتی تو
جارہی ہے۔ مگر چلئے، لگے ہاتھوں ایک دو باتیں اور سہی۔ یہ اصلاحاتِ
اراضی، یہ بنیادی جمہوریتیں، یہ مشرق و مغرب کے ساتھ نئے نئے روابط
اور دوستی و یگانگت کے مراسم درحقیقت پاکستان کے لئے ایک نئی
نشاۃ الثانیہ کی نوید ہیں۔ یہ بعینہ ویسی ہی بیداری کی لہر ہے۔ جو
چودھویں اور سولھویں صدی عیسوی میں جرمنی، فرانس، اور انگلستان
پر چھا گئی تھی۔ خیال کیجئے دو سال پہلے کیا نقشہ تھا۔ افراتفری، سیاسی
مناقشات، صوبہ پرستی، تعصب اور ہوسِ اقتدار۔ انہوں نے ہمارے
معاشرے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی اور دنیا ہمیں دیکھ دیکھ کر
ہنستی تھی۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا۔ انقلاب ہمارے لئے جہانِ تازہ
کی نوید بن کر آیا۔ اور اس نے چند ہی دنوں میں ایسی وسیع اور دوررس
اصلاحات صادر کر کے دکھا دیں کہ ملک کی کایا ہی پلٹ گئی۔ اس کا نتیجہ
ہے ایک نیا شعور، نئی ذہنیت، نئی بصیرت، نئے مقاصد، نئے عزائم۔
اصلاحاتِ اراضی نے ہر انسان کو آزادیٔ فکر و عمل بخش دی ہے۔ بنیادی
جمہوریتیں انسانی طاقت کے احیاء اور گرد و پیش کی دنیا کی آگاہی کی مترادف
ہیں۔ ہماری ثقافتی اور علمی و ادبی سرگرمیاں ایک دم تیز ہو گئی ہیں۔ جس

باقی صفحہ ۱۳۲ پر

جبینِ اُفق پر

سیّد فیضی

گھنٹیوں کی چھنک، بڑھتے قدموں کی چاپ
آج بھی نغمہ زن، آج بھی تیز ہے
مجھ کو احساس ہے جیسے دامن مرا
ہنستی کلیوں کے جوبن سے لبریز ہے

ایک میں ہی نہیں ——
خشک پتّوں کی مردہ رگوں نے سُنیں
دھڑکنیں!!
زندگی کے تقاضوں کی خوش فہمیاں
زندگی کے تقاضے مچلنے لگے
گرتے گرتے قدم پھر سنبھلنے لگے
اور — اُمید نے بھی سہارا دیا
ورنہ میں تھا کہ برسوں بھٹکتا رہا
کامرانی کے ساحل سے دور ——
اپنی منزل کے پاس، اپنی منزل سے دُور!

کس نے انگڑائی لی ——
کون سو کر اٹھا خوابِ پندار سے
اک زمانے کی آنکھوں نے تعظیم کو
اپنی پلکیں بچھا دیں سرِ رہگذر
اور سر جھک گئے ——
بے کلی جو بھرے گھر کی مہمان تھی

آپ سے آپ چُھپ چُھپ کے رخصت ہوئی
بے صدا، بے خروش!
مضمحل، سرفگندہ، اُداس اور خموش!
بڑھتے سورج نے پھیلا دئے ہر طرف
اپنی رنگیں شعاعوں کے جال ——
شام آئی تو وہ بھی نئے روپ میں
سرمئی سج دھج اور احمریں شوخیاں
مشک آلودہ زلفیں بکھرنے لگیں
چند کرنیں ازل سے جو تھیں زرفشاں
اپنی تابانیوں میں نکھرنے لگیں

گھنٹیوں کی چھنک سے فضا مست ہے
بڑھتے قدموں کی چاپ اور قریب آگئی
دل کے دروازوں نے ہاتھ پھیلا دئے
آنے والوں نے مہکا دئے
نغمے آزادیوں کے، دلوں کے چمن!
زندگی نے بھی بدلا نیا پیرہن
ٹوٹنا تھا طلسمِ نظامِ کہن
دیکھنے والو! دیکھو ذرا غور سے

وہ اُفق کی روپہلی جبیں پر کہیں
کیا سحر کا ستارہ تو روشن نہیں؟

”زیرِ دام“

(انقلاب سے پیشتر کا ایک تاثر)

چوھدری فضل حق

سرمگیں بحر کا کنارا یہ قربتِ ریگ زارِ دریا

نیلگوں وسعتوں کے دامن ہیں جن کے پہلو میں آشکارا

زاجِ فطرت کے سب کرشمے سپردِ نظارہ پارا پارا

عجب مقام آگیا ہے ہمدم

ہے دل کو فکر جہاں گوارا

۲

دل کو ڈستی تھیں ناگ بنکر وہ وحشتیں دور رہ گئی ہیں

رہگذاریں کہ جن پہ مردہ ثقافتیں نعش سی پڑی ہیں

طویل ناخون و پارسا رو گِدوں کا سامانِ زندگی ہیں

رہگذاریں کہ برق دامن ہر اک نظر میں چمک رہی ہیں

یہ آج معلوم ہو سکا ہے

یہ راہیں کچھ لابدی نہیں ہیں

عجب مقام آگیا ہے ہمدم

کہ ہم خدا کے بہت قریں ہیں

۳

کلفٹن سحر آفریں ہیں قدم قدم جنتیں بسی ہیں

قدم قدم مانگ روشن بتانِ زہرہ جبیں کھڑی ہیں

قدم قدم زندگی کی باہیں خوشی کے شانوں کو چھو رہی ہیں

قدم قدم دھڑکنیں دلوں کی بنائے رفتارِ زندگی ہیں

قدم قدم زلف و پیرہن نے جمال گاہیں سنوار دی ہیں

قدم قدم مثلِ انجمستاں ہیں خاک کے جسم نور افشاں حیاتِ غم دیدہ سے بچا کر انہیں کوئی داستاں سنائیں

عجب مقام آگیا ہے ہمدم

۴

عجب مقام آگیا ہے ہمدم

کہ ایک مرہونِ غم نظر بھی کنارِ دریا کے پار اترتی
جوانِ غم کے جگر جگر کو کرن کرن سے فگار کرتی
بکھیرتی دُور دُور مستی نفس نفس کامراں گذرتی
حسینۂ خواب کی طرح سے طبیعتوں میں شباب بھرتی

فضا پہ اس طرح حکمراں ہے
کہ جیسے یہ شام جاوداں ہے

۵

یہ غمزدہ رازداں نگاہیں یہ پھیلتی زندگی کی باہیں
یہ مہ جبینیں یہ کم ادائیں کہ زندگی کو ادب سکھائیں
الم کشوں کو وہ دیں ارادے کہ جو ستاروں کو چھین لائیں
وہ سیرگاہیں جہاں پہنچ کر چمن جبینوں کی شوخ ادائیں

ہر اک ادا داستانِ پیہم
عجب مقام آگیا ہے ہمدم

۶

بصد ادب سجدہ کر کے اے دل یہ داستاں آفرینِ ساحل
ہمارے ویرانۂ جہاں میں ہے مثلِ رنگِ بہار شامل
پگھل گئے ہیں یہاں پہ آکر الم فزا آہنی سلاسل
شعورِ انساں فراغتوں کے نئے تصور ابھارتا ہے
نئی حیات آفریں نظر سے نگاہ و گیسو سنوارتا ہے

تھی مدتوں سے تلاش جس کی
نگاہ و تخئیل و جاں کو باہم
وہ برق خو، تیز گام لمحہ
بزیرِ دام آگیا ہے ہمدم
عجب مقام آگیا ہے ہمدم

○

شہ رود

رئیس امروہوی

چل اے دل! سوئے شہرِ جانانہ چل
بصد شب روی ہائے مستانہ چل

یہی ہے تقاضائے خواب و خمار — سوئے ارضِ فسون و افسانہ چل
یہی ہے تمنائے شعر و شباب — سوئے خاک مہتاب و میخانہ چل
بہ تعمیلِ منشورِ مے خانہ اٹھ — بہ تعمیلِ پیمان پیمانہ چل
مبارز طلب ہیں حوادث تو کیا — رجز چھیڑ کر رزم خوامانہ چل
مصائب ہیں ہنگامہ آرا تو ہوں — علم کھول کر فتحمندانہ چل
جو مقصودِ خاطر ہے تنہا روی — تو آزاد و تنہا و بیگانہ چل
جو تنہا روی کا سلیقہ نہ ہو — تو انجان راہوں میں تنہا نہ چل

اٹھا دلق و کشکول و کاسہ اٹھا
قلندر صفت چل، فقیرانہ چل

دف و چنگ و طاؤس و طنبور و نَے — بہ قانونِ شہ رود و شاہانہ چل
شتربان لیلیٰ کو زحمت نہ دے — رہِ شوق میں بے نیازانہ چل
ابھی منزلیں، منزلوں تک نہیں — ابھی دور ہے شہرِ جانانہ چل
ابھی حسن کی خیمہ گاہیں کہاں؟ — ابھی اور رو، ویرانہ ویرانہ چل
ابھی شہرِ خوباں کی راہیں کہاں؟ — ابھی اور بیگانہ بیگانہ چل
جبل در جبل دشت در دشت ابھی — جواں مردِ کہسار، مردانہ چل
وہ بنتِ قبیلہ نہ ہو منتظر — ذرا تیز اے عزمِ مردانہ چل
وہ لیلائے صحرا نہ ہو مضطرب — رہِ دشت میں عذر خواہانہ چل
حریفوں کی چالوں سے غافل نہ ہو — کٹھن وادیوں میں حریفانہ چل
غزالوں کی آبادیاں ہیں قریب — غزل خوانیاں کر، غزالانہ چل

بہت اجنبیت ہے اِس شہر میں
چل اے دل! سوئے شہرِ جانانہ چل

چشمۂ سحر

جعفر شیرازی

مہکتے، ہنستے ہوئے موسموں کی چاہت میں
چُنے تھے شاخِ بہاراں سے رنگ رنگ کے پھول
روش روش پہ خزاؤں نے جو بکھیری تھی
ہمیں نے دھوئی تھی آئینۂ چمن سے وہ دھول
مگر یہ کیا، وہ نقیبِ بہار بھی نہ رہے
حیات جن کے تبسم کا نام تھی نہ رہے!
اور اُن کو سونپی گئی برگ و بار و گل کی کلید
گرے جو آپ ہی شاخوں پہ خوشہ چیں ہو کر
جنہیں سمجھتے تھے ہم اہلِ درد وہ بے درد
رہے خود اپنوں میں بھی مارِ آستیں ہو کر
طلسم ایسے خداؤں کا بھی مگر ٹوٹا
شبِ سیاہ گئی چشمۂ سحر پھوٹا
وہ دورِ مرگِ حمیت سے تھی بقا جس کی
وہ دورِ کہنہ ہوا ختم، انقلاب آیا
اُمڈ رہی تھیں جو سطحِ فرازِ دوراں پر
گئیں وہ تیرگیاں نورِ آفتاب آیا
نظر کے سامنے ضو ہے چمکتے جادوں کی
دمک رہی ہیں جبینیں اٹل ارادوں کی

اعتبارِ قوم

مشتاق مبارکؔ

آج میں ہوں اور لبوں پر ذوقِ استفسار ہے
نغمہ پردازِ نفس وارفتۂ گفتار ہے

شعلہ اندر شعلہ ہے کس کی حیاتِ آتشیں؟
گرمئ اندیشہ سے لبریز کس کا ساتگیں؟

کس کے پیکر میں حرارت ہے کہ ہے عینِ حیات
بن گئی ہے کس کی براقی سے دن تاریک رات

پھونک دی کس نے تنِ افسردۂ ملّت میں جاں؟
کس کے نطقِ آتشیں میں کوندتی ہیں بجلیاں؟

رازِ تعمیرِ ملل جس سے نہاں کوئی نہیں
وہ زمیں ہے جس کے سر پر آسماں کوئی نہیں

فکر ہے جس کی چراغِ راہِ تعمیرِ حیات
منتشر ذرات کو سامانِ تمکین و ثبات

بڑھ رہا ہے پرچمِ ملّت کو لہراتا ہوا
لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی گاتا ہوا

مصر و انڈونیشیا۔ جاپان میں جس کے قدم
گاڑ آئے شانِ پاکستاں کا پُرسطوت علم

بڑھ کے جس نے خاکِ بطحا کو کیا دل سے سلام
اہلِ برما کو دیا جس نے اخوت کا پیام

روضۂ ختم الرسل پر تھا جو مصروفِ دعا
جو درِ مولا پہ تھا کبر گداؤں کا گدا

ہو گئی جس کی دعائے مخلصانہ مستجاب
آ گیا طبعِ زمانہ میں یکایک انقلاب

بن گئے تھے کل جو بیگانے ہوئے حلقہ بگوش
آ گیا پیمانۂ غفلت کے متوالوں کو ہوش

جس کی تابانی سے پھیلی شش جہت میں روشنی
مشرق و مغرب میں تاب افزائے صلح و آشتی

تا بہ زار رگ رگ سراسر جوہری آہنگ سے
بہرہ ور ادراک ماورائی دانش و فرہنگ سے

ہر نفس مدِ نظر تدبیرِ کارِ نو بنو
روز و شب مصروفِ تشکیلِ شعارِ نو بنو

نقش زیبائے دیارِ پاک مقصودِ انام
کس طرح حاصل ہو اس شہ کار کو رنگِ دوام

کس سے جزا یوب ہو اس نقش کی صلوت گری
جو ہے وجہِ اعتبارِ قوم، وہ مردِ جری

اردو شاعری دوراہے پر

جیلانی کامران

اس مضمون میں میرے پیشِ نظر اردو شاعری کا ایک خاص دور ہے — اور چند ایسی باتیں بھی ہیں جو اس دور کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں۔ میں اُردو شاعری پر کسی قسم کی درسی گفتگو نہیں کرنا چاہتا اور نہ اُس نوع کی تنقید کو استعمال کرنا چاہتا ہوں جو شاعری اور قاری کے مابین ترجمان کے فرائض انجام دیتی ہے — میں اس شاعری کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جسے شاعر آج کل اور آج کی فضا میں لکھ رہا ہے یا لکھنا چاہتا ہے۔ اور وہ جس زبان میں لکھنا چاہتا ہے یا لکھ رہا ہے اُردو زبان ہے — اس اعتبار سے میرا اصل موضوع اردو شاعر ہے، اور وہ مسائل میرے پیشِ نظر ہیں جو اسے آج کل کی فضا میں اردو شاعری کی تخلیق کے سلسلے میں دکھائی دیتے ہیں۔ یہ مسائل تخلیقی شخصیت سے تعلق رکھتے ہیں اور چونکہ تخلیق ایک بالغ نظر اور ذی حس انسان میں، جو شاعر بھی ہے، ایک عمرانی مفہوم رکھتی ہے، اس لئے مجھے بعض ایسی باتوں کا ذکر بھی کرنا پڑے گا جو فن سے بظاہر غیر متعلق دکھائی دیں گی۔

پچھلے دس بارہ برسوں کے دوران میں لوگوں نے اردو شاعری کے متعلق کئی بار اس امر کا اظہار کیا ہے کہ اُردو شاعری تخلیقی طور پر رک چکی ہے۔ بعض لوگوں نے ادب میں جمود کے اعلان کو غلط ٹھہرانے کی کوشش بھی کی اور کہا کہ شاعری برابر لکھی جا رہی ہے اور شاعر اس فن کی طرف سنجیدگی کے ساتھ توجہ دے رہے ہیں۔ فارم اور ہیئت کے تجربات، نئی کتابیں، پرانے اساتذہ کے عروض کا استعمال، اور اس نوع کی دوسری کئی صورتیں ایسی تھیں جنہیں دیکھ کر یہ کہنا مشکل تھا کہ اردو شاعری جمود کا شکار ہو چکی ہے۔ اگر ہم اعداد و شمار پر بھروسہ کریں تو کالج کے میگزینوں۔ ادبی رسالوں اور مشاعروں میں حصہ لینے والے شاعروں کی تعداد میں کسی قسم کی کمی نظر نہیں آتی۔ ضخامت کے اعتبار سے پچھلے دس سال اپنے سے پہلے کے دس برسوں سے شعری پیشکشوں میں کسی طرح کمتر نہیں تھے۔ ان حالات میں جمود کا خیال درست دکھائی نہیں دیتا۔

میں جمود یا عدم جمود کے قائل فریقوں میں سے کسی کا بھی ساتھ دینا نہیں چاہتا۔ کیونکہ دونوں اپنے طور پر اعلیٰ مقصد کے لئے کوشاں تھے۔ دونوں کا طریقِ کار مختلف تھا لیکن وہ جس شئے کی پردہ کشائی چاہتے تھے وہ ایک غیر منقسم حقیقت تھی۔ دونوں چاہتے تھے کہ شاعری پیدا ہو، بہتر ہو، اور مختلف ہو۔ لیکن ایسی شاعری کیسے رونما ہو، دونوں اس راز سے ایک حد تک غالباً ناواقف تھے۔ اس لئے انہوں نے کاریگری کو فن اور ہیئت کو نظم کے معنی دیئے۔ اور شاعری کی نشو و نما میں اپنی طرف سے جتنا بھی ممکن ہو سکتا تھا، حصہ لیا۔

اس حقیقت سے شاید کسی کو اختلاف نہ ہو گا کہ شاعری ایک بہت بڑی ذمہ داری کا کام ہے جسے نہ صرف شاعر نبھانے کی سعی کرتا ہے بلکہ قاری بھی اس میں شامل ہوتا ہے قاری اپنی طرف سے شاعری پر کسی قسم کی ذمہ داری عاید نہیں کرتا بلکہ شاعری سے ذمہ داری اخذ کرتا ہے۔ اس لحاظ سے شاعر قاری تک، اپنی نظم کے ذریعے ایک مخصوص نوع کی ذمہ داری پہنچانے کا فرض پورا کرتا ہے۔ اگر ہم اس مفروضے کو مان لیں، تو جو بات توجہ طلب ہے وہ شاعر کے اس رشتے کا مسئلہ ہے جسے وہ اپنی مخصوص ذمہ داری کے ساتھ قائم کرتا ہے اور جسے وہ اپنی نظم کی وساطت سے قاری تک پہنچاتا بھی ہے۔ اس ساری صورتِ حال میں شاعر کی ذمہ داری کا مسئلہ مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔

نظم میں شاعر کی تمام تر ذمہ داریاں موضوع کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں۔ میں اُن ذمہ داریوں سے انکار نہیں کرتا جو تکنیک اور عروض سے تعلق رکھتی ہیں، تاہم اگر عروض اور تکنیک کو اپنے طور پر ایک مقصد کی حیثیت سے قبول کر لیا جائے اور موضوع کی طرف توجہ نہ کی جائے تو ایسی نظم کی عمرانی حیثیت نہ ہونے کے برابر ہو گی۔ وہ ذمہ داریاں جو خالصتاً فن سے تعلق رکھتی ہیں اور فن کو عمرانی تقاضوں کا حصہ نہیں بناتیں، ایسی ہیں جنہیں آج کل کوئی بھی شاعر قبول نہیں کر سکتا۔ پچھلے دس بارہ برسوں میں اُردو شاعری موضوع سے متعلق جملہ ذمہ داریوں کو احسن طور پر نہیں نبھا سکی۔ جس قسم کے موضوعات پچھلی نسل نے مختلف ادبی اور تصوراتی تحریکوں سے حاصل کئے تھے، وہی شاعری بدستور استعمال کرتی رہی۔ اور جہاں کچھ اچھے شاعروں نے اپنی منفرد افتادِ طبع کے ساتھ شاعری کی افزائش کی، وہاں وہ ان ہی موضوعات کا شکار بھی ہو کر رہ گئے۔ اردو شاعری اسی لہجے اور مذاق کو پختہ کرتی گئی جو ۱۹۴۴ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس رائے سے اختلاف ضرور ہو گا۔ تاہم میں کہوں گا کہ شاعروں نے موضوع کے بارے میں سوچنے کی شاید کبھی کوشش نہیں کی۔ اُن کا ذہن زمانہ حال اور اعزاز

سرحدوں، اپنی نفسیاتی الجھنوں اور اپنی دلی سوانحمری میں اُلجھا رہا ہے۔ وہ کبھی بھی خود سے آزاد نہیں ہو سکے اور انہوں نے جتنی بھی نظمیں پیدا کی ہیں ان کے اپنے قدرے بھی چھوٹی ہیں۔ ان کا موضوع ایک مختصر سے محل وقوع میں کچھ اس طرح سمٹ چکا ہے کہ شاعر اور اس کا قاری دونوں اسی قید خانے میں مطمئن نظر آتے ہیں۔ اور نہ تو ان کی آنکھیں اس محل وقوع کی حد بندیوں کو پار کر سکی ہیں اور نہ ان کا تخیل، مقام اور وقت کی سرزاپائی کو کوئی مفہوم دے سکا ہے۔ ایسی صورت حال میں ان کی ذمہ داریوں کا خلوص بھی زائل ہو چکا ہے لہٰذا جب ہم اپنی شاعری کے بارے میں بات چیت کرتے ہیں تو اپنے ضمیر کے سامنے خود بخود شرمسار ہوتے ہیں۔

اکثر لوگ جو علم وادب کے ساتھ گہرا شغف رکھتے ہیں اور عالمی ادبی سرگرمیوں سے واقف ہونے کی بنا پر بین الاقوامی انداز نظر کی تلقین کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ شاعری کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب تو موں کے سامنے کوئی کام کرنے کو نہیں ہوتا تو وہ شاعری کرتی ہیں۔ ان ہی میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ہماری ثقافت کی نمائندگی سے سروکار رکھتے ہیں۔ یہ لوگ وقتاً فوقتاً مشاعروں کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ جس میں شاعری کا منصب تفریحی ہوتا ہے اور شاعر کی حیثیت اس پیشہ ور سرکس ماسٹر کی سی ہوتی ہے، جس کے لئے تماشائیوں کو خوش اور مطمئن رکھنا لازمی ہوتا ہے۔ ان دونوں صورتوں کو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ہماری شاعری اپنے منصب سے واقعی گر چکی ہے۔ ایک طرف تو لوگ اس کی اہمیت سے منکر ہیں اور دوسری طرف وہ شاعری کو تفریحی چیز سمجھتے ہیں۔ بات اگر یہیں تک ہوتی تو ہم اس صورت حال کو کسی طریقے سے سنبھال لیتے۔ لیکن حقیقت ان سطحی تأثرات سے کہیں زیادہ گہری ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا زمانہ سائنسی عقل پرستی اور اقتصادی منصوبہ بندی کا زمانہ ہے اور ایک اچھی اور دور اندیش حکومت سائنسی عقل پرستی اور اقتصادی منصوبہ بندی کے ذریعے بہتر معیار زندگی اور مستحکم قومی شخصیت کی ضمانت دے سکتی ہے۔ اگر ہم ان باتوں کو مان لیں، تو ہمیں جس نوع کی فکری و سیاسی صداقتیں دستیاب ہوں گی وہ کچھ اس طرح کی ہوں گی:

(۱) چونکہ زمانہ سائنسی عقل پرستی کا زمانہ ہے اس لئے ہم شاعری میں کسی بھی طرز کی شعری دروغگوئی کو پسند نہیں کرتے، دروغگوئی سے مراد ایسی شعری کیفیتیں ہیں جنہیں ہم خارجی معیاروں سے ناپ نہیں سکتے اور جن کی صداقت کی جانچ بیرونی اور منطقی استدلال سے ممکن نہیں۔ یہ نقطۂ نظر شاعری میں ابہام کو سرے ہی سے خطرناک قرار دے کر نظم کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔

(۲) چونکہ اقتصادی منصوبہ بندی، بہتر معیار زندگی کی ضمانت دیتی ہے اور معیار زندگی میں تبدیلی لانے کے لئے وقت اور محنت درکار ہے، اس لئے ایسی شاعری جو معیار زندگی کے پست ہونے کی شکایت کرتی ہے وہ حالات کو صحیح اور درست سیاق و سباق میں نہیں دیکھتی بلکہ سستی جذباتیت کے ذریعہ لوگوں کو گمراہ کرتی ہے۔

(۳) اور چونکہ ایک اچھی اور دور اندیش حکومت، قومی صورت حال کو عملی طور پر بہتر شکل دینے کے لئے مختلف طریقوں سے حکمانہ اور غیر حکمانہ طور پر کوشش کر رہی ہے اور اس کی کوششوں کے نتائج اوسط منطقی اصولوں کے مطابق مفید اور کارآمد ہیں اور آئندہ بھی مفید اور کارآمد ہوں گے، اس لئے ایسی حکومت، یا اس ماحول کو جس میں ایسی حکومت کام کر رہی ہے منفی انداز میں پیش کرنا کسی طرح بھی درست نہ ہوگا۔ ایسا کرنا محض جذباتی ہوگا اور ایسے اقدام میں مرحوم ترقی پسند تحریک کی اُفتادِ طبع دکھائی دے گی چونکہ ہماری قومی زندگی ایک طرف بین الاقوامی کمیونزم اور دوسری طرف غیر ہمدرد ہمسایہ ممالک کے درمیان گھری ہوئی ہے، اس لئے اپنی ملکی سرحدوں کے اندر منفی تصورات کی افزائش، نزاعی رجحانات پیدا کرنے کا باعث ہوگی۔ جن کی اجازت کوئی بھی معقول شخص نہ دینا چاہتا ہے اور نہ کبھی دے سکتا ہے۔

جس صورت حال کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس کا شاعری کے ساتھ براہ راست تعلق ہے۔ کیونکہ اس صورت حال اور شاعر کا آپس میں براہ راست تعلق ہے ایک تو یہ حقیقت قابل غور ہے کہ شاعری اپنے منصب سے گر چکی ہے اور دوسری یہ کہ جس قسم کی صورت حال فکری و سیاسی حقائق کی پیروی کر رہی ہے، اس کی موجودگی میں موضوعات کا بیشتر ذخیرہ شاعری میں استعمال نہیں ہو سکتا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ حالات ان موضوعات کو شاعری میں استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ایسے موضوعات متروک ہو چکے ہیں اور ان کی شعری اور عمرانی افادیت ختم ہو چکی ہے۔ کیونکہ پچھلی نسل جس طرز کی شاعری پیدا کر رہی تھی اس کے میلانات معاشی اور اقتصادی نوعیت کے تھے۔ اور اب وہی میلانات ایک مثبت پروگرام اور عملی منصوبہ بندی کے ذریعے سرکاری محکموں کی ذمہ داری میں آ چکے ہیں۔ ان حالات میں شاعری کیلئے محکمۂ خوراک، لیبر ایکسچینج یا کسی اور محکمے کی ذمہ داری کو قبول کرنا مضحکہ خیز ہوگا۔

جب سے شاعروں نے اپنے آپ کو ذمہ دار فنکار کی حیثیت سے پہچانا ہے، ان کا احساس موضوع کی صورت میں رونما ہوا ہے۔ اور جب سے بیرونی زندگی اور ماحول کے ساتھ شاعر کی رشتہ بندی ہوئی ہے، ایک ذمہ دار شاعر کے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ اپنے ذریعے ان اکائیوں کی ترجمانی اور عکاسی کرے جو اس کے ماحول میں اور اس کے آس پاس موجود ہیں اور جو شاعر اس مقصد کی تائید میں

ل برتتا تھا اسے ذمہ دار شاعروں کی فہرست سے نکال دیا جاتا تھا۔ اس مادی
انی کا ہمارے پیشروؤں سے گہرا رابطہ ہے۔ خارج کو انہوں نے طبعی شباہت
ہے پہچانا تھا اور صرف طبعی رشتہ بندیاں ہی کو جائز قرار دیا تھا۔ اس طریق کا
ے خارج، محض معاشری اور سیاسی حقیقت کی شکل میں دستیاب ہوتا تھا لہٰذا
ان ان۔ گروہوں، طبقوں اور تقاضوں کی عکاسی اور ترجمانی کے لئے مواد مہیا
تا تھا۔ شاعر ذہنی و فکری طور پر اپنے آپ کو خارج میں جذب کر کے خارج
ضروریات اور مقاصد کی تکمیل کے لئے فن پیدا کرتا تھا اور اس طرح ان شرائط
پیدا کرتا تھا جو اسے ایک ذمہ دار شاعر بناتی تھیں۔

لیکن جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے معاشری اور سیاسی سطحوں پر
بعض ایسی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں جن کی وجہ سے شاعر سیاست اور معاشرے
ذمہ داریوں میں حصہ نہیں لے سکتا۔ کیونکہ اب وہ ذمہ داریاں منظم اداروں
تحویل میں آ چکی ہیں اور شاعر کا کام اس میدان میں ختم ہو چکا ہے۔ لہٰذا سوال
پیدا ہوتا ہے کہ ان حالات میں شاعر کی ذمہ داری کیا ہے اور ایسے طریقے کیا ہیں
شاعری کو ذمہ دار فن کا منصب عطا کر سکتے ہیں؟

مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ پچھلے کئی ایک برسوں سے شاعر ایک غلط
میدان میں سرگرداں رہا تھا۔ اس کا جس دنیا سے تعلق پیدا ہوا تھا وہ اس کی اپنی دنیا
نہ تھی بلکہ سیاسی کارکنوں، تنظیموں اور علم نفسیات کے ماہروں کی دنیا تھی۔ اس
دنیا کے لوگ شاعر سے شاید اس لئے رسم و راہ رکھنا چاہتے تھے اور رکھتے تھے کہ
وہ جذبات اور الفاظ کے ذریعے ان کے مقاصد کی نشر و اشاعت کرتا تھا۔ شاعر
کی اپنی آواز چھن چکی تھی، وہ دوسروں کے بتائے ہوئے محاوروں، اصولوں اور
اُن ہی کے بانٹے ہوئے جذبات کی ترجمانی کرتا تھا۔ وہ محض ایک ساز تھا جس پر جو
انگلیاں گیت پیدا کرتی تھیں وہ دوسروں کی تھیں! اگر ساری بات ساز اور ساز کار
کی ہوتی تو کوئی برائی نہ تھی۔ لیکن شاعر ساز نہ تھا، اس نے جو نقصان پہنچا وہ
یہ تھا کہ شاعر سے اس کی وہ صلاحیت چھن گئی جو اسے ان پیشہ ور انقلاب
پسندوں کے ملنے سے پہلے مہیا تھی۔ وہ صلاحیت جو اسے اپنے طور پر موضوع بتایا
کرتی تھی اور وہ راستہ دکھاتی تھی۔ لہٰذا اگر میں یہ کہوں کہ اس وقت اردو شاعری
کا سب سے بڑا مسئلہ موضوع کا مسئلہ ہے تو غلط نہ ہوگا۔

عجمی شاعری کی تاریخ میں موضوع کو کم و بیش ثانوی حیثیت دی گئی
ہے اور اسے ہمیشہ شاعر کی اپنی اُفتادِ طبع پر چھوڑ گیا ہے کہ وہ جس موضوع پر چاہے
لکھے اور جس موضوع پر لکھنا نہ چاہے اسے رد کر دے۔ مجھے اس صداقت سے
بہت کم اختلاف ہے تاہم یہ بات ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ انفرادی افتادِ طبع

اپنے طور پر کبھی بھی مطلق العنان نہیں رہی ہے وہ ایک یا دوسری طرح روایت
ہی کی تابع رہی ہے۔ اس نے ہمیشہ روایت ہی کی سمت نمائی میں کام کیا ہے اور
ایسے عمدہ نتیجے پیدا کئے ہیں جن سے ہماری ثقافتی عظمت قائم ہے۔

روایت، انفرادی افتادِ طبع اور موضوع کا آپس میں گہرا رشتہ
ہے۔ روایت پائیدار، مستقل، زرخیز اور حقیقتاً غیر فانی ہے۔ انفرادی اُفتادِ
طبع، شاعر کے وجود سے رونما ہوتی ہے روایت سے اپنا سلسلہ جوڑتی ہے،
اپنے طور پر روایت کی تفسیر اور ترجمانی کرتی ہے اور ایسا کرتے ہوئے موضوع
کو پیدا کرتی ہے۔ شاعر مر جاتا ہے اور اس کے ساتھ اس کی اپنی انفرادی اُفتادِ طبع
بھی جو کارگزاری کا باعث تھی، محو ہو جاتی ہے۔ لیکن موضوع باقی رہ جاتا ہے۔
اور روایت کی تاریخی سرگزشت میں شامل ہو کر آنے والے زمانوں کو روایت
کے ایک نئے نشانِ راہ کی خبر دیتا ہے۔ چونکہ ان تینوں اکائیوں کی باہمی رشتہ
بندی اصولی اور بنیادی ہے، اس لئے روایت کی عدم موجودگی میں باقی کی دو
اکائیوں کا تذکرہ بالکل بے سود ہے کیونکہ ایسا موضوع جسے روایت کی تائید
حاصل نہیں روایت کی تواریخی سرگزشت میں اسی طرح شامل نہیں ہو سکتا جس
طرح مسلمانوں کی ثقافتی تاریخ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی کوٹھیاں شامل
نہیں کی جا سکتیں۔

عجمی روایت جس سے اردو شاعری کی روایت برآمد ہوتی ہے، کبھی
بھی خالصتاً دنیاوی روایت نہیں رہی۔ اور نہ اس نے دنیاوی اندازِ فکر کو
قبول کیا ہے۔ عجمی اندازِ فکر طبعی اور خارجی حقائق کو بنیاد کے طور پر قبول کرتا
ہے اور پھر ان کو ایسے طور پر مرتب کرتا ہے کہ یہ شخصی تفسیر اور سمجھ سوچ کے وسیلے سے
اپنے اندر سے ان حقائق کو برآمد کرتے ہیں جو مستقل، دیرپا اور غیر فانی ہوتے ہیں۔ دوسرے
لفظوں میں خارجی اور داخلی کے باہمی سلوک اور رابطے سے ایک آفاقی نقش نامہ
ظاہر ہوتا ہے جسے عجمی اندازِ فکر ایک پُرمعنی صورت بخش کر عالمگیر علامت بنا دیتا ہے۔
اور یہ علامت انسان اور کائنات کے مابین ایک ایسا رشتہ قائم کرتی ہے جس سے
انسان اپنی زندگی کو ان معیاروں کے مطابق جانچتا ہے جو نیکی، خوبصورتی، اور خوشی کے
معیار ہیں۔ لیکن نیکی، خوبصورتی اور خوشی کے پیچھے جو عظیم روشنی نظر آتی ہے وہی
اس علامت کو مفہوم دیتی ہے جسے عجمی اندازِ فکر پیدا کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں
عجمی اندازِ فکر روشنی کا اندازِ فکر ہے جسے وہ دنیاوی حدود دار لعبہ میں تلاش کیا
کرتا لیکن اسے یہاں برپا ضرور کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس روشنی کو جس علاقے سے
حاصل کرتا ہے وہ جسم اور زیست کی سرحدوں سے باہر ایک ایسا علاقہ ہے جس
کی شناخت دل کے تجربے سے ممکن ہوتی ہے اس سارے اندازِ فکر میں خارج، خارج

نہیں رہتا بلکہ اس روشنی کے وسیلے سے اسی روشنی کا حصہ بن جاتا ہے اور اپنے طور پر اسی کے پائیدار اور مستقل ہونے کی شہادت بھی دیتا ہے۔ جب تک خارجی اور طبیعی حقائق اس روشنی کے بغیر ہوتے ہیں وہ انسانی زندگی کے دکھ کی روداد بیان کرتے ہیں اور نیکی، خوبصورتی اور خوشی کا چرچا نہیں کرتے۔ ان پر انسانی جسم کی سزایابی حاوی رہتی ہے۔ اور انسان اپنے محدود ارتقاء میں مطمئن لیکن ذہنی طور پر بے چین رہتا ہے۔ عجمی روایت اسی بے چینی کا اندمال کرتی ہے۔ وہ انسان کو کائنات کے ساتھ جس رشتے میں منسلک کرتی ہے وہ اس کے دل کو ان صداقتوں سے بہرہ ور کرتا ہے جنہیں میں نے نیکی، خوبصورتی، خوشی اور روشنی کہا ہے۔

اوپر کے پیراگراف میں عجمی روایت کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ عجمی روایت کو بیان کرنے کے سلسلے میں صرف لفظوں کی نمائش کی گئی ہے اور کہ عجمی روایت کا فلسفہ آج کل کی دنیا میں بیکار ہے۔ میں نے عمداً وہ الفاظ استعمال نہیں کئے جن سے عجمی روایت کا چہرہ بخوبی دکھائی دیتا۔ کیونکہ عجمی روایت میں مسلمانوں کی مذہبی تاریخ اور ان کا الہیاتی اور صوفیانی فلسفہ سب شامل ہیں۔ محدود کو لامحدود کے ساتھ، لمحے کو ہمیشگی کے ساتھ اور میں کو تو کے ساتھ منسلک کرنا عجمی روایت کی امتیازی خوبیوں میں سے ہے۔ روایت کی نشاندہی کے لئے لازم ہے کہ ہم عجمی روایت سے اسی نوع کی روایت مراد لیں جس کا اوپر سرسری تذکرہ کیا گیا ہے کیونکہ ہماری روایت کی یہی اصلی اور مستقل تعریف ہے، باقی سب کچھ اسی سچائی کا عکس ہے جو کبھی غزل کے شعروں میں، کبھی ایرانی مصوری اور کبھی ہمارے لوک گیتوں میں دکھائی دیتا ہے۔

آپ کہیں گے میں نے اردو شاعری کے چند مسائل پر کچھ کہنے کا وعدہ کیا تھا، اور اس وعدے کو نبھانے کی بجائے بعض ایسی متفرق باتوں کا تذکرہ کیا ہے جن سے یا تو آپ پہلے سے واقف ہیں یا آپ واقف ہونا نہیں چاہتے —— !
میں نے تھوڑی دیر پہلے کہا تھا کہ انفرادی افتادِ طبع روایت کی سمت نمائی کے بغیر کام نہیں کر سکتی اور چونکہ وہ کارآمد ثابت نہیں ہو سکتی اس لئے کسی قسم کا موضوع بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آج کل اگر اردو شاعری موضوع کے بغیر ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ انفرادی افتادِ طبع میں کسی قسم کی خامی ہے بلکہ یہ ہے کہ انفرادی افتادِ طبع روایت کے عملی اور فکری تعاون سے محروم ہے۔ پچھلے چند برسوں سے شاعری پر گفتگو کرنے والوں نے روایت پر بھی باتیں کی ہیں اور کہا ہے کہ اردو شاعری مختلف روایتوں سے مل کر بنی ہے اور یہ روایتیں اصنافِ سخن کی ہیں، غزل کی روایت، قصیدے کی روایت، نظم کی روایت اور عروض کی روایت' ان سے اردو شاعری کی تعمیر ہوتی ہے لیکن انہوں نے جس حقیقت کو فراموش کیا ہے وہ یہ ہے کہ خود اردو شاعری عجمی روایت کا نتیجہ ہے۔ میں اس فقرے کے لئے معذرت نہیں چاہوں گا۔ کیونکہ بعض لوگ یہ کہیں گے کہ اردو شاعری محض عجمی روایت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ آریائی روایت بھی اس میں شامل ہے اور میں اس حقیقت کو نظر انداز کر کے تعصب اور کم نظری کا ثبوت دے رہا ہوں۔ میں اس سلسلے میں صرف یہ کہوں گا کہ اردو شاعری کا ہندی، مراٹھی، گجراتی، تامل اور دوسری ہندوستانی زبانوں کی شاعری کے ساتھ موازنہ کر کے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اردو شاعری جن اقدار اور صداقتوں کو پیش کرتی ہے وہ اقدار اور صداقتیں ہندوستانی زبانوں کی شاعری کی صداقتوں اور اقدار سے بہت مختلف ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا کہ اردو شاعری عجمی روایت کا نتیجہ ہے غلط بیانی نہیں۔

آج کل کی دنیا میں ہمارے سامنے صرف دو راستے ہیں۔ جن میں سے ایک کا انتخاب از بس ضروری ہے۔ یا تو ہم پچھلی نسل کی شاعری کی پیروی کریں اور شاعری کو نظر آنے والے مسائل کی عکاسی کا ذریعہ بنائیں۔ یا ہم پچھلی نسل کے شعری محدود دائرے کو عجمی روایت کے تعاون کے ساتھ عبور کریں اور زندگی کو ایک جامع مفہوم دیں جو آج سے پہلے بعض وجوہ کی بنا پر ممکن نہ ہو سکا۔ میں ان میں سے کسی راستے کے حق میں نہیں ہوں۔ میں حاضر و غائب کے فلسفے، عجمی روایت اور پچھلی نسل کی شاعری، ان تینوں کو مربوط کرنے کے حق میں ہوں تاکہ اس دوراہے پر، جس پر میں اور آپ کھڑے ہیں، ایک ایسا شعری عکس رونما ہو، جس میں بیک وقت ماضی، حال اور آنے والا زمانہ دکھائی دے اور اس کے ساتھ ساتھ میں اور آپ بھی دکھائی دیں۔ کیونکہ میں اور آپ بھی اسی سرگزشت کا حصہ ہیں جس کا اوپر کے لکھے ہوئے فقرات ہیں۔

●

★

ایک کتاب، ایک جائزہ

نصرہ بشیر

(ارباب قلم کی آرا، اور بحث و نظر کے سلسلہ میں ادارہ قطعی غیر جانب دار ہے ـــــ مدیر)

یہ کتاب ہے "انیسویں صدی میں وسط ایشیاء کی سیاحت" مرتبہ محمد اشرف جسے ہمدرد اکیڈمی، کراچی نے شائع کیا ہے۔ تصنیف کا عنوان بہت مبہم ہے۔ بادی النظر میں یوں معلوم ہوتا ہے کہ کتاب مغرب کے ان من چلے سیاحوں کے کارناموں پر مشتمل ہے جنہوں نے اپنی قوم کے مفاد کے پیش نظر انیسویں صدی میں وسط ایشیاء کی سیاحت کی اور سیاسی و جغرافیائی اطلاعات بہم پہنچائیں۔ لیکن جلد ہی قاری کو اس ابہام کا پتہ چل جاتا ہے۔ درحقیقت یہ تصنیف ایک خاص سفر کی روئداد ہے جسے بحکم حکومتِ ہند، پنڈت من پھول اور ان کے رفقاء جن میں مولانا محمد حسین آزاد بھی شریک تھے، اختیار کیا تھا۔ ہمارے لئے اس تصنیف کی دلچسپی کا واحد باعث مولانا آزاد کی شخصیت اور حالات ہیں۔

کتاب کا مواد اتنا وسیع نہ تھا کہ وہ ایک مستقل تصنیف کا متحمل ہو سکے۔ بہتر ہوتا اگر اسے ایک جامع مگر مختصر مضمون کی شکل میں پیش کیا جاتا۔ مگر مصنف نے ایسا نہیں کیا۔ اس لئے کتاب فرو‌حات اور رطب و یابس کا مجموعہ بن کر رہ گئی ہے۔ عریض و طویل جغرافیائی حالات اور تاریخی اطلاعات جن کا نفسِ مضمون سے کوئی واضح تعلق دکھائی نہیں دیتا، عجیب و غریب قیاس آرائیاں جن میں مدحت سرائی کا کوئی پہلو نظر انداز نہیں کیا گیا، کتاب کا جزو غالب ہیں۔ جن میں کہیں کہیں سیاحوں کی نقل و حرکت کی روئداد ملتی ہے۔ کتاب کو دیکھ کر حضرت حفیظ جالندھری کا یہ مصرع یاد آتا ہے، جس میں حسب ضرورت کچھ ترمیم کی گئی ہے کہ:

"گنتی کے نخلستانوں کو دامن میں چھپائے بیٹھا ہے"

کتاب کا آغاز درحقیقت صفحہ ۳۴ سے ہوتا ہے۔ جہاں [illegible] کی فریب [illegible] پیدا ہوئی" کے ضمن میں بتایا گیا ہے کہ وسط ایشیاء میں روس کے اقدامات کے پیش نظر حکومتِ ہند نے ایک پولیٹیکل مشن وسط ایشیاء بھیجنے کا فیصلہ کیا جس کے ممبروں کو نام اور بھیس بدل کر ان علاقوں میں جانے کی ہدایت کی گئی۔ یہ مشن چار افراد یعنی پنڈت من پھول، میر منشی لفٹننٹ گورنر پنجاب، منشی فیض بخش، محمد حسین آزاد اور کرم چند نند رام زرگر پر مشتمل تھا۔ اور اس کے قائد اول الذکر یعنی پنڈت من پھول تھے۔ اس کے بعد "سوالنامہ" یعنی مطبوعہ اطلاعات کی تلخیص ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ مشن کو کون سے ممالک کا دورہ کرنا ہے اور کون سی اطلاعات بہم پہنچانی ہیں۔ بقول مصنف یہ مواد تمام تر انڈیا آفس لندن کے ایک فائل اور مولانا آزاد کی چند یادداشتوں سے حاصل کیا گیا ہے۔ کتاب ۱۹۷۶ء کے آخر میں چھپی ہے۔

مصنف کا دعویٰ ہے کہ اس سفر کے تمام تر حالات ان کی ذاتی کاوشوں کے مرہون منت ہیں اور ان سے پہلے کسی کو ان کا علم نہ تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔ "سب سے بڑی خوشی مجھے اس بات کی ہے کہ مولانا آزاد کی زندگی کا یہ دور اب تک پُراسرار پردوں میں چھپا ہوا تھا (یعنی اس دور کا پُراسرار پردوں میں چھپا رہنا بڑی خوشی کی بات تھی!) اور اس کی تفصیل پر انڈیا آفس کے بستوں میں ایک سو سال سے زیادہ احتیاط اور دور اندیشی کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔ الحمد للہ کہ آزاد کے عقیدت مندوں کے سامنے اس کی نقاب کشائی کا شرف مجھے حاصل ہو رہا ہے۔"

غالباً مصنف کو اس بات کا علم نہیں یا وہ دانستہ اس سے اغماض کر رہے ہیں کہ ان رازہائے سربستہ کی بابت تمام ضروری اطلاعات ڈاکٹر محمد صادق، سابق پروفیسر ادبیات انگریزی گورنمنٹ کالج، لاہور کے بیش بہا مقالے "MAULVI MUHAMMAD HUSAIN AZAD: HIS LIFE AND WORKS"

میں اجمالاً درج ہیں۔ جس کے مسودہ کی دو کاپیاں کتب خانہ پنجاب یونیورسٹی میں موجود ہیں۔ اور جس کا سن تصنیف ۱۹۳۶ء ہے۔"

چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ "ماہِ نو" بابت جنوری ۱۹۵۸ء میں پہلے ہی ان کی نقاب کشائی کا شرف حاصل کر لیا ہے"۔ اس میں شک نہیں کہ مسٹر محمد اشرف اور ڈاکٹر صادق کے بیانات میں معمولی سا فرق ہے۔ لیکن اس مشن کی ضرورت کیوں پیش آئی اور اراکین مشن کے ذمے کونسا کام سپرد کیا گیا تھا، ان کے متعلق دونوں کے بیانات میں ذرا فرق نہیں۔ ڈاکٹر صادق نے "سوالنامہ" تمام وکمال اصلی الفاظ میں پیش کیا ہے۔ مسٹر اشرف نے اس دعوے کے باوجود کہ "سوالنامہ" انہیں مولانا آزاد کے کاغذات میں مل گیا ہے محض اس کی تلخیص پیش کی ہے۔

ڈاکٹر صادق کے مقالہ میں بصراحت مذکور ہے کہ:

"۱۸۶۵ء کو جس بات نے یادگار حیثیت عطا کر دی وہ وسط ایشیا کو ایک سیاسی مشن کی روانگی تھی جس پر آزاد کو ڈاکٹر لائٹنر اور پنڈت من پھول کے ہمراہ روانہ کیا گیا تھا تاکہ وہ اس ملک کے حالات کے بارے میں معلومات بہم پہنچائیں۔ اس مشن کے اغراض و مقاصد کو سمجھنے کے لئے تھوڑی سی گریز لازم ہے۔

انیسویں صدی کے آغاز ہی سے، روس وسط ایشیا میں آگے بڑھنے کی پالیسی اختیار کئے ہوئے تھا۔ ۱۸۳۹ء میں ایک روسی لشکر اورن برگ سے روانہ ہوا تھا تاکہ خان خیوا کو روس کے لوگوں کو اغوا کر کے ترکستان کی منڈیوں میں فروخت کرنے کی سزا دے۔ لیکن یہ مہم ناکام ثابت ہوئی۔ جنگ کریمیا کے بعد روس نے پھر وسط ایشیا میں اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ ۱۸۶۳ء میں اس نے کامیابی کے ساتھ وسط ایشیا پر خروج کیا اور اس کی افواج کی خوقند، بخارا اور خیوا کے ازبک خوانین کی افواج سے مڈبھیڑ ہوئی۔

اپنا انجام دیکھتے ہوئے خان خوقند اور امیر بخارا نے ہندوستان، افغانستان اور قسطنطنیہ سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ اکتوبر ۱۸۶۷ء سفیر خوقند لاہور آیا اور لارڈ لارنس کے دربار عظیم میں شریک ہوا۔ اس وقت تک یہ دونوں ملک اپنی آزادی کھو کر زار روس کی سلطنت میں شامل ہو چکے تھے۔

حکومت ہند یہ چاہتی تھی کہ ان بیرونی معاملات میں نہ الجھے۔ پھر بھی یہ مناسب سمجھا گیا کہ ان دونوں ملکوں کے سیاسی حالات معلوم کرنے کے لئے ایک خفیہ مشن بھیجا جائے جو اُن کے متعلق رپورٹ پیش کرے۔ ڈاکٹر لائٹنر کو اس مشن کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ آزاد کا انتخاب اسی کی سفارش سے عمل میں آیا۔ مولوی خلیل الرحمٰن جنہوں نے یہ اطلاع خود آزاد سے حاصل کی تھی مجھے بتایا کہ ڈاکٹر لائٹنر نے ایک درویش کی حیثیت سے سفر کیا۔ آزاد نے معمولی حیثیتوں پر قناعت کرتے ہوئے کبھی درویش اور کبھی نانبائی کا روپ دھارا۔

بالواسطہ طور پر مشن نے آزاد کو ایک اور فائدہ بھی پہنچایا۔ اس سے وہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا جو انہوں نے انجمن پنجاب کے ساتھ وابستہ ہو کر شروع کیا تھا۔ جب سے غدر برپا ہوا تھا، حکومت ان کو شک کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اس یادگار خدمت کی بدولت انہوں نے حکومت کی پوری طرح خوشنودی حاصل کر لی۔ غدر کا وہ کابوس جو اُن کے سر پر تقریباً دس برس سوار رہا تھا، آخر کار دور ہو گیا۔"

علاوہ ازیں آج سے دو سال پیشتر مدیر "ماہِ نو" کی تحریک پر ڈاکٹر صادق نے اس سفر پر ایک مضمون لکھا تھا جس میں ان تمام واقعات پر مزید روشنی ڈالی گئی ہے۔

یہ واضح کرنے کے لئے کہ اولیت کا سہرا کس کے سر ہے دونوں کتابوں سے متوازی اقتباسات بے محل نہ ہوں گے۔ تاکہ شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ رہے اور حق، حق دار کو پہنچ جائے۔

مسٹر اشرف لکھتے ہیں "ترکستان میں طوائف الملوکی نے مقامی امیروں کو اس قدر کمزور کر دیا تھا کہ روس بے روک ٹوک ترکستان کے علاقوں میں در آیا۔ روسیوں نے ترکستان پر فوج کشی کا یہ عذر پیش کیا کہ بہت سے روسی تاجروں اور سوداگروں کو ترک چھاپہ مار اور قزاق پکڑ کر لے گئے ہیں۔ اور روسی فوجیں انہیں آزاد کرانے آ رہی ہیں.... انگریزوں کو ترکستان میں روسی اقتدار کا حال معلوم کرنے کی زبردست خواہش تھی.... اس لئے

ہندوستان کے گورنر نے صوبہ پنجاب کے لفٹنٹ گورنر کو یہ حالات معلوم کرنے کا حکم دیا تھا۔ یہ واقعہ ۱۸۶۵ء کا ہے۔ صوبہ پنجاب کے لفٹنٹ گورنر کو بھی اس علاقہ سے دلچسپی تھی۔ انہوں نے ایک پولٹیکل مشن وسط ایشیا بھیجنے کا فیصلہ کیا جس کے ممبروں کو نام اور بھیس بدل کر ان علاقوں میں جانے کی ہدایت کی گئی۔ اس مشن کے ممبر پنڈت من پھول، منشی فیض بخش، مولانا آزاد اور کرم چند تندرام تھے۔"

اس کے بعد مصنف نے بتایا ہے کہ آزاد نے یہ سفر کیوں اختیار کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

"آزاد کو ان ممالک سے گہری دلچسپی تھی..... ادبی دلچسپیوں کی بنا پر انہوں نے اسے فوراً قبول کر لیا۔ (۲) آزاد کو اپنے والد مولانا محمد باقر صاحب مجتہد کا بغاوت کے الزام میں شہید ہونا بھی یاد ہوگا..... مولانا آزاد کی گرفتاری کے لئے انعام بھی مقرر ہو چکا تھا..... ان کے دوستوں نے یہ بات بھی مولانا آزاد کو بتائی ہوگی کہ اگر اس خطرناک سفر سے صحیح سلامت اور کامیاب واپس آ گئے تو بغاوت کے الزامات اور دشمنوں کی ریشہ دوانیاں ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں گی۔ علاوہ ازیں، اُس سے آئندہ ترقی کے دروازے کھلتے ضرور نظر آتے تھے۔"

اس کے بعد ڈاکٹر صادق کا مضمون "آزاد کا سفر ایران" مطبوعہ "ماہِ نو" جنوری ۱۹۵۸ء بالتفصیل پڑھیئے۔ اس کو پڑھ کر کون مانے گا کہ اس رازِ سربستہ کا انکشاف مسٹر اشرف کے قلم معجز التیام سے ہوا ہے۔

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ایک دو باتوں میں مسٹر اشرف کا بیان زیادہ درست ہے۔ مثلاً اس مشن کے قائد پنڈت من پھول تھے نہ کہ ڈاکٹر لائٹنر۔ ڈاکٹر صادق کو دوسرے دو غیر معروف اراکین کے نام بھی معلوم نہیں تھے۔ مگر یہ کیا کم ہے کہ انہوں نے آج سے بیس پچیس برس پہلے ذاتی تحقیق اور کاوش سے ان پُر اسرار حالات کی نقاب کشائی کر دی تھی، جو کسی کو بھی معلوم نہ تھے اور جن کا کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا، یہاں تک کہ ان کے متعلق ہوائیاں اڑانے کی بھی نوبت نہیں آئی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر ان کی نہ انڈیا آفس کے خفیہ فائل تک رسائی تھی اور نہ ہو ہی سکتی تھی۔ جس کو دیکھتے ہی بہ آسانی عقدہ حل ہو جاتا۔ یہ تو وہ ناممکن الحصول چیز تھی جس پر ایک سو سال سے زیادہ احتیاط اور دور اندیشی کی مہریں لگی ہوئی تھیں" اور اُن دنوں اس تک پہنچنے میں دور افتادہ محقق تو کیا فرشتوں کے بھی پر جلتے تھے۔ اگر اس فروگذاشت سے قطع نظر کر لی جائے تو ڈاکٹر صادق کا بیان مورخانہ سنجیدگی اور ادبی لب و لہجہ کا وقار لئے ہوئے ہے۔ وہ مسٹر اشرف کی منتشر بیانی، مبالغہ اور خود نمائی (اپنے بزرگوں کی تعریف خود نمائی نہیں تو اور کیا ہے؟) سے پاک ہے۔ انہوں نے صاف صاف لکھ دیا ہے کہ اس سفر سے آزاد کی غرض حکام کی خوشنودی حاصل کرنا تھا۔ مسٹر اشرف نے اس کا بعلت مجبوری اعتراف کیا ہے اور مولانا کی سیاحت پسندی اور علم دوستی پر زیادہ زور دیا ہے۔ چنانچہ اپنے نظریہ کی تائید میں وہ فرماتے ہیں۔ (مولانا) "سخندان میں ایک جگہ فرماتے ہیں ایک دفعہ جوانی کی ہمت اور شوقِ سیاحت مل کر مجھے ترکستان کے ملک میں لے گئے۔ گویا اس سوال کا جواب (مولانا نے یہ سفر کیوں اختیار کیا؟) مولانا آزاد نے خود ہی دیا ہے"

مسٹر اشرف سے کوئی پوچھے کیا مولانا آزاد یہ لکھ دیتے "ایک دفعہ مخبری کا شوق مجھے ترکستان لے گیا تھا"! مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ زیرِ نظر کتاب ایک سنجیدہ تصنیف نہیں بلکہ مدلل مداحی ہے۔ مولانا آزاد کے محرکاتِ سفر کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"انہوں نے اس نکتہ پر بھی غور کیا ہوگا۔ کہ ۱۸۵۷ء کی قیامت ابھی ختم ہوئی ہے۔ اگر شمال مغربی سرحد سے ہندوستان پر روسیوں کا حملہ ہو گیا تو ملک کے لئے مصیبت پیدا ہو جائے گی۔ اس خطرے کا سدِ باب حکومتِ برطانیہ کی مدد کے ذریعے ہی کیا جا سکتا تھا۔"

تو کیا روس ہندوستان پر صرف اس لئے حملہ آور نہیں ہوا کہ مولانا آزاد نے وافر اطلاعات بہم پہنچا کر ہند اور اسلامی دنیا کے درمیان سدِ سکندری کھڑی کر دی تھی؟ کون مولانا آزاد؟ وہی جو اس وقت ایک نہایت ادنیٰ ملازمت پر بمشاہرہ ۳۵ روپے مامور تھے؟ جنہیں ان خدمات کے عوض ۳ سو روپے کی بیش بہا رقم بطور انعام ملی جسے بعد میں چھ سو روپے کر دیا گیا اور جو اُس انعام سے جو منشی فیض بخش کو دیا گیا آدھی تھی؟

مسٹر محمد اشرف پر انجیل مقدس کا وہ مقولہ صادق آتا ہے کہ انہیں دوسروں کی آنکھ کا ذرّہ نظر آتا ہے، مگر اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔ وہ انڈیا آفس والے فائل سے جب بھی ذرا پرے ہٹتے ہیں منہ کی کھائی ہے۔ اس سلسلہ میں ذیل کے نکات قابل دادہیں۔

(۱) صفحہ ۴۴ پر آپ لکھتے ہیں "مولانا اس وقت (سفر ترکستان کے وقت) انجمن پنجاب کے سکریٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے"۔

یہ واقعہ ۱۸۶۵ء کا ہے۔ اس کے برعکس گارساں دتاسی کے ۱۸۶۷ء والے مقالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آزاد مارچ ۱۸۶۷ء میں سکریٹری کے فرائض انجام دینے پر مامور ہوئے۔ اس کی توثیق ڈاکٹر محمد شفیع ڈین شعبہ آرٹس پنجاب یونیورسٹی کے مضمون "شمس العلماء محمد حسین آزاد" سے ہوتی ہے۔ جس میں درج ہے کہ مولانا آزاد ۲۷ مارچ ۱۸۶۷ء میں انجمن پنجاب کے سکریٹری مقرر ہوئے۔

(۲) صفحہ ۴۴ پر لکھا ہے "چند بزرگوں کا خیال ہے کہ اس مشن کے بعد مولانا آزاد اور پنڈت من پھول میں ایسی یگانگت بڑھی کہ مولانا آزاد نے اپنی ایک تصنیف کا نام "نصیحت کا کرن پھول"۔ انہیں کی رعایت سے رکھا .... مشن سے واپسی کے بہت دن بعد یہ کتاب لکھی گئی تھی۔ مگر مجھے اس سے اتفاق نہیں (کس چیز سے اتفاق نہیں) کیونکہ مولانا نے اور کسی جگہ اس کا ذکر نہیں کیا۔"

لیکن مولانا آزاد نے مخبر بن کر ترکستان جانے کا بھی کہیں ذکر نہیں کیا۔ کیا آپ کو اس سے بھی اتفاق ہے یا نہیں؟ آیئے دیکھیے دیباچۂ کتاب میں اس تصنیف کی بابت مصنف کے والد بزرگوار آغا ابراہیم کیا لکھتے ہیں۔ "معلوم ہوتا ہے کہ انہوں (آزاد) نے یہ (مسودہ) ۱۸۶۴ء میں لکھا تھا۔ پنڈت من پھول اس وقت جناب لفٹننٹ گورنر کے میر منشی تھے پنڈت صاحب کی ایک یادداشت مورخہ ۱۲ جون ۱۸۶۴ء مسودہ کے آخر میں لگی ہے۔

مولانا آزاد رعایت لفظی پر جان چھڑکتے تھے۔ آخر اس تصنیف کا نام "نصیحت کا کرن پھول" کیوں رکھا گیا؟ کیا کرن پھول کو موضوع کتاب سے کوئی خاص مناسبت ہے اور پھر پھول کی ضرورت ہی کیوں محسوس ہوئی؟ یہ بھی یاد رہے کہ یکم جنوری ۱۸۶۴ء کو پنڈت من پھول کی وساطت سے مولانا آزاد کو محکمہ تعلیم میں ملازمت ملی تھی۔ وہ اس مشن پر بھی پنڈت صاحب کی سفارش سے گئے تھے۔

حکومت کی طرف سے انہیں دعوت نہیں دی گئی تھی۔

بہرحال یہ کتاب سفر سے بہت پہلے کی تصنیف ہے، "بہت بعد" کی نہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ اس سفر کے بعد مولانا اور پنڈت صاحب کے تعلقات بگڑ گئے تھے اور انہوں نے اپنی رپورٹ میں آزاد کے خلاف بہت زہر اگلا تھا۔

(۳) پھر آپ لکھتے ہیں "سفر پر جانے سے پہلے سخندان فارس کا خیال بھی ان کے دماغ میں تھا" یہ محض قیاس آرائی ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہے کہ انہیں اس تصنیف کا خیال سفر کے دوران میں آیا ہوگا۔

(۴) آغاز سفر کی بابت آپ لکھتے ہیں کہ "یہ (آزاد) ایک اور قافلے کے ساتھ ۳ ستمبر ۱۸۶۵ء مطابق ۱۳ ربیع الثانی ۱۲۸۳ھ دوشنبہ کے روز پشاور سے روانہ ہوئے"۔ حساب سراسر غلط ہے۔ ۳ ستمبر ۱۸۶۵ء مطابق ۱۱ ربیع الثانی ۱۲۸۲ھ ہے اور ۱۳ ربیع الثانی ۱۲۸۳ھ مطابق ۲۵ اگست ۱۸۶۶ء۔

(۵) صفحہ ۱۲۶ پر لکھا ہے "اس سفر کے پندرہ برس بعد جب وہ شہرت کی مسند پر فراغت کا تکیہ لگائے اردو کی خدمت میں منہمک تھے، اس سفر کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ "ایک دفعہ جوانی کی ہمت اور شوق سیاحت مل کر مجھے ترکستان لے گئے"۔

مسٹر اشرف عجیب غلطیوں میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کے اپنے بیان کے مطابق مولانا آزاد اس سفر پر ۱۸۶۵ء میں تشریف لے گئے۔ اس سن پر ۱۵ کا اضافہ کیا جائے تو ۱۸۸۰ء بنتا ہے۔ یعنی بقول مصنف مولانا نے فقرہ ۱۸۸۰ء میں لکھا۔ یہ فقرہ "سخندان فارس" حصہ اول میں درج ہے جو بقول آزاد ۱۸۷۰ء سے کچھ پہلے رفاہ عام پر لاہور میں چھپی تھی۔ دوسرے حصے کے لکچر ۱۸۷۲ء میں دیئے گئے تھے۔

آپ پوچھیں گے مصنف کو ۱۵ سال کا خیال کیسے آیا جبکہ درحقیقت یہ فقرہ ترکستان سے واپسی کے ایک دو سال بعد لکھا گیا تھا؟ بات یہ ہے کہ مولانا آزاد نے "سخندان فارس" پر نظر ثانی کے بعد تمہید کتاب میں لکھا۔ "مگر کیا کروں انتظار فرصت میں ۱۵ برس گزر گئے .... " مولانا آزاد بالکل درست ہیں کیونکہ یہ تمہیدی الفاظ ۵ اگست ۱۸۸۷ء میں لکھے گئے تھے۔ لہٰذا اگر

۱۸۷۲ء یعنی سن تصنیف کتاب پر ۱۵ کا اضافہ کیا جائے تو ۱۸۸۷ء بنتے ہیں۔ مگر مصنف خبر نہیں کس سوچ میں تھے کہ سفر ترکستان سے سیدھے "سخندان فارس" پر جا دھمکے۔ آغا صاحب مزید فرماتے ہیں کہ

سخندان فارس کا خاکہ ان کے ذہن میں گھر بنا چکا تھا۔ جب حکومت کی جانب سے انہیں ترکستان جانے کی دعوت ملی تو ادبی دلچسپیوں کی بنا پر انہوں نے فوراً قبول کر لیا"۔ صفحہ (۵۰) ترکستان میں اس کی کیسے تکمیل ہو سکتی تھی۔ غالباً آزاد کو تو ایران اور ترکستان کا فرق معلوم تھا۔ اہلِ ایران تو کہتے ہیں کہ "زبان یار من ترکی و من ترکی نمیدانم"۔ لیکن جس ایران میں آزاد گئے تھے وہاں فارسی کا خوب چرچا ہو گا۔

(۶) سب سے زیادہ اچنبھے کی بات صفحہ ۱۲۷ پر درج ہے سرخی ہے: "مولانا آزاد کی زندگی کی چند اہم تاریخیں"۔ لکھا ہے۔

"۱۸۲۷ء ... دہلی میں پیدائش (مطابق ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۴۵ھ) اس سن ہجری کے مطابق جو تاریخ نکلتی ہے وہ ۱۰ جون ۱۸۳۰ء ہے اور یہی مولانا کی صحیح تاریخ پیدائش ہے۔ آگے چل کر آپ لکھتے ہیں کہ آزاد ۱۸۶۲ء میں محکمہ تعلیم پنجاب میں ملازم ہوئے۔ ملازمت کی صحیح تاریخ پہلی جنوری ۱۸۶۴ء ہے۔ آزاد کی "کتاب ملازمت" میں بھی یہی تاریخ درج ہے۔

یہ سوءِ ظن ہی سہی لیکن میں کچھ ایسا محسوس کرتی ہوں کہ مسٹر اشرف کو شروع ہی سے ڈاکٹر صادق کے مضمون مطبوعہ "ماہ نو" جنوری ۱۹۵۸ء کا علم تھا۔ اور وہی مضمون ان کی مزید تحقیق کا محرک بنا۔ واقعات یہ ہیں:۔

اپنی تصنیف کے آغاز و ارتقا کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر اشرف لکھتے ہیں۔ "جون ۱۹۵۸ء میں نیویارک سے کراچی جاتے ہوئے چند روز لندن ٹھہرا۔ اس گتھی کو سلجھانے کا خیال میرے ذہن میں بہت دن سے گھر کر چکا تھا۔ انڈیا آفس لائبریری کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہاں سے "میری تلاش" نے مجھے برٹش میوزیم پہنچایا۔ لیکن وہاں بھی گوہرِ مراد میرے ہاتھ نہ آیا.... اس سال ۱۹۵۹ء اپریل کے مہینے میں.... انڈیا آفس میں ایک بار پھر قسمت آزمانے کی کوشش کی"۔ اور ان کو مطلوبہ فائل مل گیا!

یعنی آپ کو اس تحقیق کا خیال پہلے جون ۱۹۵۸ء میں آیا۔

اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے۔ ڈاکٹر صادق کا مضمون "ماہِ نو" شمارہ بابت جنوری ۱۹۵۸ء میں چھپا۔ "ماہ نو" مغربی پاکستان کا سب سے زیادہ چھپنے والا رسالہ ہے۔ کیا مسٹر اشرف کو اس اہم مضمون کا جس کا ان کے جدِ امجد کی زندگی سے اتنا گہرا تعلق ہے علم نہ ہوا ہوگا؟ یہاں یہ بات خصوصیت سے قابلِ غور ہے کہ مسٹر اشرف کو اس تحقیق کا خیال "ڈاکٹر صادق کے مضمون چھپنے کے فوراً ہی بعد ہوا اور جونہی انہیں لندن جانے کا موقع ملا انہوں نے انڈیا آفس کا رُخ کیا۔ خیر مان لیجئے کہ آپ کو اس مضمون کا علم نہ تھا۔ اگرچہ یہ بات بھی بر بنائے شہادت پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے۔ لندن سے واپسی پر آپ پاکستان تشریف لائے تو "ماہِ نو" کے شعبۂ اُردو سے یہ نفس نفیس مطلوبہ شمارہ حاصل کیا۔ جسے انہوں نے ضرور پڑھا ہوگا۔ اس کے بعد آپ لاہور تشریف لے گئے، ڈاکٹر صادق سے ملے اور بہت دیر آزاد کی سیر و سیاحت پر گفتگو رہی لیکن آپ نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں اس کا ذکر تک نہیں کیا! شاید یہ بات اخلاقی فرائض اور دیانت داری کے تقاضوں میں شامل نہیں۔

میں یہ بھی ماننے کو تیار ہوں کہ یہ سب افسانہ ہے۔ مسٹر اشرف نہ کہیں تشریف لے گئے اور نہ ڈاکٹر صادق ہی سے ان کی ملاقات ہوئی۔ لیکن وہ اس بات سے کیسے انکار کر سکتے ہیں کہ انہوں نے مذکورہ شمارہ منگوایا، اسے پڑھا۔ غالباً اس کے حصول کیلئے خط کتابت بھی کی تھی۔ ماہِ نو کے شعبۂ اردو میں تشریف لے گئے اور ڈاکٹر صادق کی بے علمی اور بے مائیگی کا پیٹ بھر رونا رویا۔ مگر "عیب جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو" پر عمل نہ کرتے ہوئے انہوں نے ان کی تحقیق کا ذکر تک نہیں کیا حالانکہ وہ تمام گراں قدر اطلاعات جن کی تلاش میں وہ مہینوں آوارہ و سرگرداں رہے، ان کے یہاں سب کی سب موجود تھیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ وہ تو اسی بات پر اُدھار کھائے بیٹھے تھے کہ اس تحقیق کا سہرا اُن کے سر رہے اور ڈاکٹر صادق کا نام تک نہ لیا جائے! اگر ان کی یہی خواہش تھی تو متعلقہ شمارہ "ماہِ نو" کیلئے خط و کتابت کرنے میں ان سے بڑی چوک ہوئی۔ انہیں چاہیئے تھا کہ وہ چپ سادھے رہتے اور پھر ڈرامائی انداز میں میدانِ تحقیق میں داخل ہو کر دعوئ اولیت کرتے۔ مسٹر اشرف نے خواہ مخواہ خط کتابت کر کے اپنا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا!

تصنیف کا بین السطور ملاحظہ کیجئے۔ صاف پتہ چل جائیگا کہ انہوں نے اسے لکھتے وقت ڈاکٹر صادق کا مضمون پڑھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صادق نے لکھا ہے کہ آزاد کا اس مشن پر جانے کا مقصدِ اولی اُن سیاسی بداعمالیوں کا کفارہ ادا کرنا تھا جو ان کی ذات سے وابستہ ہو چکی تھیں۔ مسٹر اشرف نے یہ نکتہ وہیں سے لیا ہے۔ اگرچہ مولانا آزاد کی اخلاقی صفائی کے پیش نظر انہوں نے ادبی محرکات کو پہلی جگہ دی ہے جو ہرگز قابل قبول نہیں۔

دوسری قابل غور بات یہ ہے: پنڈت من پھول کی بابت وہ لکھتے ہیں "چند لوگوں کا خیال ہے کہ مولانا نے اپنی ایک تصنیف کا نام نصیحت کا کرن پھول انہی کی رعایت سے رکھا۔" یہ بات ڈاکٹر صادق کے مضمون میں درج ہے اور کسی اور محقق نے کسی اور جگہ اس کا ذکر نہیں کیا۔ کیا مسٹر اشرف بتا سکتے ہیں کہ "وہ چند لوگ" کون ہیں؟

مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ "سوالنامہ" انہیں آزاد کے کاغذات میں مل گیا تھا۔ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ مولانا آزاد کے پنشن کے کاغذات مرتب کرتے وقت آغا ابراہیم نے سارا گھر چھان مارا لیکن سوالنامہ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ تو پھر اب ۷۰ سال کے بعد یہ مسٹر اشرف کو دھر ادھر ایا کہاں سے مل گیا اور اگر مل گیا تو اسے جوں کا توں کتاب میں کیوں داخل نہ کر دیا؟ اس کا خلاصہ کس مصلحت کی بنا پر تیار کیا گیا؟ بے ادبی معاف یوں معلوم ہوتا ہے کہ اسے ڈاکٹر صادق والے "سوالنامہ" کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے۔ میری رائے میں نہایت موزوں ہوگا اگر ڈاکٹر صادق اور مسٹر اشرف سے درخواست کی جائے کہ وہ اپنے اپنے "سوالنامے" کا فوٹو "ماہِ نو" میں چھپنے کے لئے بھیج دیں۔ "ماہِ نو" غالباً ان کے اخراجات کا کفیل ہو سکیگا۔

آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ ماسوا اس اطلاع کے کہ ڈاکٹر لائٹنر اس مشن میں شامل نہ تھے، مسٹر اشرف کی تصنیف میں کوئی نئی بات نہیں اور مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ؎

گرچہ قندیلِ سخن کو منڈھ لیا تو کیا ہوا
ڈھانچ میں تو ہیں وہی اگلے برس کی تیلیاں!

شب گزیدہ سحر!
(انقلابی سرمہ)

اِس طرح کا ایک بھی سُرمہ نہیں بازار میں
لکھ رہے ہیں تا سند روزِ قیامت تک رہے

اِک سلائی سے ہماری دُور ہو کر رہ گئیں
آنکھ کی بیماریاں سب دیکھتے ہی دیکھتے!

بیچتی سورج کی کرنیں اب نہیں تاریکیاں
سُرخیوں کا اب نہیں ہوتا سویروں پہ اثر

اب فضاؤں، میں غبار آلودگی بالکل نہیں
شب گزیدہ اب نظر آتی نہیں ہم کو سحر!

سید باقر علیم

★

افسانہ:

"بحر ہے پایاب مجھے"

الاثر

اس وقت رات کے دو بجے ہیں۔

لیکن بندرگاہ میں رات کے دو نہیں بجتے۔ نہ یہاں دن کے دو بجتے ہیں۔ بندرگاہ میں رات نہیں ہوتی۔ نہ یہاں دن ہوتا ہے۔ یہاں نہ صبح ہوتی ہے، نہ شام ہوتی ہے۔ یہاں صرف کام ہوتا ہے، صرف روشنی ہوتی ہے۔ سورج کی روشنی، سرچ لائٹوں کی روشنی۔ روشنی اور کام۔ وقت کے سائے بندرگاہ سے باہر کھڑے رہتے ہیں۔ بندرگاہ کا گھڑیال وقت نہیں بتاتا۔ وہ کہتا ہے: زندگی حرکت میں ہے، زندگی اپنے محور کے گرد گھوم رہی ہے، زندگی ایک بہت بڑی کرین ہے جس کے دیوہیکل بازو کرۂ ارض کا بوجھ اٹھائے پھرتے ہیں۔

اس وقت رات کے دو بجے ہیں۔

لیکن دیوہیکل کرینوں کا دماغ وقت کا احساس نہیں رکھتا۔ وہ تو صرف یہ جانتا ہے کہ اس کے مضبوط فولادی بازو تیس ٹن بوجھ اٹھا سکتے ہیں۔ انسان کے بازو تیس ٹن بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ مشین کے بازو اٹھا لیتے ہیں۔ مشین کے بازو بھی تو انسان کے بازو ہیں۔ انسان کے بازو چھوٹے ہیں۔ اور کمزور ہیں۔ وہ تیس ٹن وزن کو پلیٹ فارم سے اٹھا کر جہاز کے عرشے پر نہیں رکھ سکتے۔ اس لئے اس نے اپنے لئے لمبے لمبے مضبوط فولادی بازو ایجاد کر لئے ہیں۔ انسان نے مشینوں کی مدد سے اپنی آنکھیں، اپنے کان، اپنے پاؤں اور اپنے ہاتھ بہت مضبوط کر لئے ہیں۔ مشین انسان کی زرخرید غلام ہے، محنت کش وفادار غلام۔ اور جب انسان رات کے دو بجے سرچ لائٹوں کی روشنی میں مشین سے کہتا ہے: اس وقت دن ہے۔ رات نہیں ہے۔ تو مشین سرِ تسلیم خم کر کے چپ چاپ تیس ٹن وزن اٹھا کر جہاز کے عرشے کی طرف روانہ ہو جاتی ہے۔

بندرگاہ میں کام ہو رہا ہے۔ بندرگاہ کو دیکھ کر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ کام اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ وہ بلند سطح کا کام جس کا تعلق تمام دنیا سے ہے۔ یہ وسیع و عریض دنیا۔ امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس، جرمنی، جاپان، پاکستان۔ امریکہ کا جہاز برتھ نمبر ۱ پر کھڑا ہے۔ روس کا جہاز برتھ نمبر ۲ پر۔ برطانیہ، فرانس، جرمنی اور جاپان کے جہاز برتھ نمبر ۳۔ ۴۔ ۵ اور ۶ پر کھڑے ہیں۔ پاکستان کا جہاز برتھ نمبر ۷ پر کھڑا ہے۔ کرینیں چیخ رہی ہیں، تجارتی سامان اتارا جا رہا ہے، لادا جا رہا ہے۔

کراچی سو رہی ہے۔ بندرگاہ جاگ رہی ہے کیونکہ بندرگاہ کراچی نہیں ہے۔ بندرگاہ نیویارک ہے۔ ماسکو ہے۔ لندن ہے۔ بندرگاہ پیرس، برلن اور ٹوکیو ہے۔ اور بندرگاہ کراچی ہے۔ بندرگاہ ایک بین الاقوامی ادارہ ہے، تجارتی جہاز اس بین الاقوامی ادارے کے سفیر ہیں۔ یہ سفیر دوسرے ملکوں کی ضروریات کا سامان لے کر ہر لحظہ، ہر لمحہ سمندروں کی ہولناک گہرائیوں سے الجھتے ہوئے بندرگاہوں کی طرف جا رہے ہیں۔ تجارتی جہاز بین الاقوامی محبت کے پیغامبر ہیں۔

اور پاکستان کا جہاز "طلوعِ اسلام" ٹوکیو جانے کے لئے تیار ہو رہا ہے۔

"طلوعِ اسلام" کے کوارٹر ڈیک پر اُس کا کپتان، اختر آفندی اپنے مہمانوں کے درمیان بیٹھا ہے۔ اس کے مہمان اسلام شپنگ کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کے ارکان ہیں جنہوں نے حال ہی میں یہ جہاز "طلوعِ اسلام" ایک غیر ملکی فرم سے خریدا ہے۔ کپتان اختر آفندی نے اُن کو کوک ٹیل پارٹی پر مدعو کیا ہے۔

شراب کپتان آفندی پر وہی اثر کرتی ہے جو شبنم کے چھینٹے پھولوں کی کلیوں پر کرتے ہیں۔ شراب سے اس کی ذہانت کے پھول کھِل اٹھتے ہیں، اور اُن کی خوشبو فضا میں پھیل جاتی ہے۔

اس وقت وہ کہہ رہا ہے:

"بندرگاہ ایک عبادت گاہ ہے۔ عام عبادت گاہوں کی طرح عام عبادت گاہوں میں خدا کی عبادت ہوتی ہے۔ بندرگاہ میں کام کی عبادت ہوتی ہے۔ میرے نزدیک کام کی عبادت خدا کی عبادت ہے۔

WORK IS WORSHIP کام عبادت ہے۔ بندرگاہ کام کا مندر ہے۔ عمل کی مسجد ہے۔ جہاز عالمی اتحاد کا سمبل ہے۔ اور جہازرانی کا پیشہ ملکوں کی کثرت میں وحدت پیدا کرنے کی کوشش۔ بندرگاہ میں پہنچ کر اختر آفندی ایرانی نژاد نہیں رہتا۔ سراج گونگلو ترکی نژاد نہیں رہتا اور یوسف بن یعقوب عربی نژاد نہیں رہتا۔ یہاں ہم سب ایک عالمی برادری کے رکن ہیں۔ اس وسیع دنیا کے باشندے ہیں۔"

یوسف بن یعقوب، جو اسلام شپنگ کمپنی کے بورڈ اوف ڈائرکٹرز کا چیرمین ہے، اپنا نام ایسی بے اعتنائی سے لئے جانے پر جھنجھلا کر بولا:

"معاف کیجئے، مجھے اپنے عربی نژاد ہونے پر فخر ہے۔ میرے آباواجداد عرب سے آکر اس ملک میں آباد ہوئے تھے اور اب میں اس ملک کا ایک معزز شہری ہوں۔"

یہ کہہ کر یوسف بن یعقوب نے اپنا کوک ٹیل کا گلاس اپنے ہونٹوں سے لگا لیا اور غصے کو غٹاغٹ پی گیا۔

کپتان آفندی نے جواب دیا:

"معاف کیجئے میں نے صرف یہ کہا ہے کہ اس ملک اور ہر ملک کے معزز شہری اس دنیا کے معزز شہری ہیں۔ یہ روکٹ کا زمانہ ہے۔ دنیا ایک شہر بن گئی ہے۔ اور ہمارا ملک اس شہر کا ایک محلہ۔ میں نے یہ کہا تھا کہ جہازرانی کا پیشہ ہم میں ایک عالمی شہریت کا احساس پیدا کرتا ہے، اس لئے یہ پیشہ دوسرے پیشوں کے مقابلے میں زیادہ ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔"

یوسف بن یعقوب اس بحث کو آگے بڑھانے کے لئے کپتان آفندی کی بات کا جواب دینا چاہتا تھا۔ لیکن سٹیورڈ کوک ٹیل کا ایک اور گلاس لے آیا۔ یوسف بن یعقوب اس کی طرف متوجہ ہوگیا اور بورڈ کے ایک اور رکن نے اس کی بجائے بات شروع کرکے گفتگو کا رخ بالکل بدل دیا۔

اس نے اپنے کوک ٹیل کے گلاس سے ایک گھونٹ پی کر کہا:

"میں مسٹر یوسف بن یعقوب سے معذرت کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ انسان کو ایک وقت میں ایک ہی کشتی پر سوار ہونے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔ ایک کشتی میں ایک پاؤں اور دوسری کشتی میں دوسرا پاؤں رکھنے والا انسان جہازرانی کے پیشے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ مجھے ایسے نام پسند نہیں آتے جیسے سراج الدور جاسانی۔ اور اختر الزمان آفندی اور یوسف بن یعقوب۔ یہ نام ہمارے ملک کے معلوم نہیں ہوتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ اپنے ملک سے شہر بدر ہوکر ہمارے ملک میں آباد ہوگئے ہیں۔ اور ہمارے ملک میں آباد ہوکر انہوں نے ہم پہ بڑا احسان کیا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی بڑے مضحکہ خیز نام ہوتے ہیں۔ مثلاً مہمیز ملیح آبادی اور جاں نثار جالندھری۔ شاید یہ حضرات اپنے نام کے ساتھ اپنا پتہ اس لئے دیتے ہیں کہ وہ کہیں گم نہ ہوجائیں۔ یا شاید وہ ایسے نام اس لئے پسند کرتے ہیں کہ جب وہ ترقی کرکے بڑے مرتبوں پہ پہنچ جائیں، لندن پہنچ جائیں، نیویارک پہنچ جائیں تو وہ اپنی اوقات نہ بھول جائیں۔ اور آسانی سے اپنے گھونسلے میں واپس آجائیں۔ مجھے تو سیدھے سادے نام پسند ہوتے ہیں۔ ایسے نام جو خاص اس ملک کی پیداوار معلوم ہوں، مثلاً ہمارے بورڈ کے ایک ڈائرکٹر کا نام نظام دین۔"

نظام دین نے چونک کر کہا:

"جناب میں نے آپ کی طرح کوک ٹیل نہیں پی ہوئی۔ آپ مرغے کی دم پی کر خواہ مخواہ دوسروں کے ناموں کی دُمیں کھینچتے پھرتے ہیں۔ ناموں میں کیا رکھا ہے۔ نام رکھنے میں انسان کو اپنے دین اور مذہب کا خیال رکھنا چاہیئے۔ میرے والد صاحب قبلہ چودہ گاؤں کے مالک تھے اور اُن کا نام محمد دین تھا۔ وہ بڑے دیندار تھے۔ اس کا ثبوت ان ناموں میں ملتا ہے جو انہوں نے اپنے بیٹوں کے لئے چُنے۔ انہوں نے میرا نام نظام دین رکھا۔ میرے ایک بھائی کا نام چراغ دین ہے۔ دوسرے کا سراج دین۔ تیسرے کا موج دین۔ چوتھے کا امام دین۔ پانچویں کا الہ دین ——"

بورڈ کے ایک بے دین شرارتی رکن نے اُس کی بات کو کاٹ کر کہا:

"چوہدری نظام دین، آپ کتنے بھائی ہیں؟"

نظام دین نے بڑے فخر سے جواب دیا:

"ہم ماشاء اللہ سب مل کر آٹھ بھائی ہیں۔"

اُس بے دین نے جلدی سے کہا۔

"اگر آپ بارہ بھائی ہوتے تو کسی کا کیا بگاڑ لیتے۔"

اس پر سب زور زور سے ہنسنے لگے ۔

جب ہنسی دب گئی تو چوہدری نظام دین نے کہا :

" جناب، میں آپ کی ہنسی کا مطلب سمجھتا ہوں۔ یہ آپ کا قصور نہیں ہے۔ یہ مرغے کی دُم ہل رہی ہے ۔ لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ دُودھ اور پُوت اس دنیا کی سب سے بڑی دولت ہے اچھے وقتوں میں دُودھ اور پوت کی دعائیں دی جاتی تھیں اور جس کے پاس سب سے زیادہ بھینسیں اور سب سے زیادہ بیٹے ہوتے تھے وہ بڑا خوش نصیب سمجھا جاتا تھا ۔ بھائی انسان کا بازو ہوتا ہے۔ میرے آٹھ بھائی میرے آٹھ بازو ہیں۔ آٹھ بازو مل کر ایک کرین کے بازو کے برابر ہوتے ہیں ؟

بورڈ کے بے دین ممبر نے پھر طنز کیا :

" اور خاندانی منصوبہ بندی ہماری کرینوں کی صنعت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہی ہے ۔ افسوس ! "

بورڈ کے ایک اور ممبر نے کہا۔

" لیکن میری رائے میں اولاد کی خواہش ایک فطری جذبہ ہے ۔ اور اس کو کسی سٹیج پر روکنے کی کوشش ایک غیر فطری حرکت ۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جن کے ہاں اولاد نہیں ہوتی یا جن کی اولاد بہت کم ہوتی ہے، وہ اولاد کی کمی پوری کرنے کے لئے کتے اور بلیاں پالتے ہیں۔ بندر اور ہرنیاں پلتے ہیں۔ طوطے، مینائیں اور عقاب پالتے ہیں بلکہ بعض حالات میں ریچھ، ہاتھی اور شیر بھی پالتے ہیں "۔

کپتان آفندی نے زور زور سے سر ہلاتے ہوئے کہا :

" جی نہیں، ہرگز نہیں۔ یہ فطری جذبہ نہیں ہے۔ یہ خالص اقتصادی مسئلہ ہے ۔ اگر کسی مائی کے لال میں ہمت ہو، تو وہ میدان میں آئے اور میرے چھ بچے مجھ سے لے لے ۔ میں شکریہ ادا کروں گا چھ بچے ! توبہ توبہ ! ابھی تو شکر ہے چار فوت ہو چکے ہیں ۔ ان دس بچوں میں سے تین اس وقت پیدا ہوئے تھے جب میں بے کار تھا ۔ بزرگوں سے سنا تھا ۔ بچہ اپنا رزق ساتھ لاتا ہے ۔ لیکن میرا بچہ رزق لے کر نہیں آیا ۔ راشن کارڈ لے کر آیا ۔ راشننگ کا زمانہ تھا ۔ بچے کے راشن کارڈ نے ہمارے راشن میں چار چھٹانک چینی کا اضافہ کر دیا۔ لیکن میرے خرچ پر ۔ اور میں بے کار تھا اور ادھار کھا رہا تھا ۔ آخر مجھے اپنی بیوی پر رحم آگیا۔ مجھے اپنی بیوی سے بے انتہا محبت ہے ۔ اس لئے میں نے اس کو ہر سال ایک بچہ پیدا کرنے کی دردناک روٹین سے رہائی دلانے کے لئے دوسری شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ۔ لوگ اولاد حاصل کرنے کے لئے دوسری شادی کرتے ہیں، میں اولاد سے بچنے کے لئے دوسری شادی کرنا چاہتا تھا ۔ دراصل اس دنیا میں میری سب سے بڑی خواہش ایک بانجھ عورت سے شادی کرنے کی تھی ۔ لیکن مجھے بانجھ عورت نصیب نہیں ہوئی ۔ میں نے اپنی دوسری شادی کا فیصلہ بڑے ڈرامائی حالات میں کیا ۔ ان دنوں میں پرتگال کی ایک شپنگ کمپنی میں ایک جہاز کا کپتان تھا ۔ ایک دن میں برازیل کی ایک بندرگاہ میں مرچنٹ نیوی کلب میں بیٹھا تھا ۔ میرے سامنے کلب کی سٹینوگرافر مس کرآسٹو بیٹھی تھی ۔ پینتیس سال کی مس کرآسٹو مجھے بہت پسند تھی ۔ وہ اُس وقت میرے سامنے بیٹھی میرے لئے چائے بنا رہی تھی ۔ کلب کے بیرے نے مجھے ایک تار دیا ۔ میری بیوی کا تار تھا ۔ یہ خبر آئی تھی کہ میری بیوی نے جڑواں بچوں کو جنم دیا ہے ۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مجھ پر کسی نے دونالی بندوق سے فائر کر دیا ہے ۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مس کرآسٹو بالکل بانجھ ہے ۔ اور مس کرآسٹو سے میری شادی ہو گئی ۔"

چوہدری نظام دین نے کہا :

" اچھا تو آپ کی بھی دو بیویاں ہیں ۔ مجھے بھی دوسری شادی کرنی پڑی ۔ میری پہلی بیوی سے صرف لڑکیاں پیدا ہوتی تھیں ۔ آپ کی دونوں بیویاں ایک ہی مکان میں رہتی ہیں ؟ دونوں لڑتی تو نہیں ؟ میری بیویاں تو ہر وقت لڑتی رہتی ہیں ۔ پہلے وہ ایک دوسرے کو مارتی ہیں ۔ پھر میں دونوں کو مارتا ہوں ۔ آپ کی دونوں بیویاں تو صلح صفائی سے رہتی ہوں گی ؟"

کپتان آفندی نے جواب دیا :

" چوہدری صاحب، میری صرف ایک بیوی ہے "

" لیکن آپ نے ابھی اپنی دوسری بیوی کا ذکر کیا تھا ؟"

" میں نے اس کو طلاق دے دی ہے "

" کیوں ؟ "

" وہ بانجھ نہیں تھی، اور نہ وہ کنواری تھی ۔ اس کے چھ بچے تھے ۔ اُس نے جھوٹ بولا تھا ۔"

چوہدری نظام دین کو غصہ آگیا :

"جھوٹ بولا تھا اُس نے؟ پھر آپ نے اُس کو طلاق کیوں دی؟ اُس حرامزادی کو سڑک پر بٹھا کر اُس کے اوپر سے رولر پھیرنا تھا۔ اُس کو تمام عمر جھوٹ بولنے کی سزا دینی تھی۔"

کپتان آفندی نے ندامت سے کہا:

"میں ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے بھی جھوٹ بولا تھا۔ میں نے کہا تھا میں کنوارا ہوں۔"

تھوڑے عرصے کے لئے گفتگو بند ہوگئی۔

اس وقفے سے فائدہ اٹھا کر یوسف بن یعقوب نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

"کیپٹن آفندی، اس جہاز کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"آپ نے میری رپورٹ نہیں پڑھی؟ اُس میں میں نے ..... اس جہاز کے بارے میں پوری تفصیل سے بحث کی ہے۔ میں نے اس میں ثابت کیا ہے کہ یہ جہاز نہیں گدھا گاڑی ہے۔"

"گدھا گاڑی!"

"گدھا گاڑی!"

"گدھا گاڑی!"

سب اپنا اپنا کوک ٹیل کا گلاس تپائی پر رکھ کر کپتان آفندی کی طرف متوجہ ہوگئے۔

چودھری نظام دین نے کہا:

"آپ نے اپنی رپورٹ میں یہ ثابت کیا ہے کہ یہ جہاز، جہاز نہیں ہے گدھا گاڑی ہے؟"

کپتان آفندی نے جواب دیا:

"جی ہاں۔"

"بڑی غلطی کی، ہم نے یہ رپورٹ نہیں پڑھی"

کپتان آفندی نے نہایت سنجیدگی سے کہا:

"مسٹر یوسف، آپ نے اسلام لائنز کے لئے 'طلوعِ اسلام' جیسا کھٹارا خرید کر اپنے پیسے سمندر میں پھینک دیئے ہیں۔ آپ اس جہاز کو مون سون سے پہلے بیچ ڈالیں۔ یہ جہاز مون سون کے تھپیڑے برداشت نہیں کرسکے گا۔ اس کی سٹار بورڈ سائڈ میں دس ڈگری کا جھکاؤ پیدا ہوگیا ہے۔ یہ جہاز اپنا توازن کھوچکا ہے۔ اس کا توازن قائم رکھنے کے لئے میں نے جہاز کے تمام وزن سٹار بورڈ سائڈ میں شفٹ کردیئے ہیں۔ اور لوڈنگ کا دباؤ ہولڈ کے سٹار بورڈ گوشوں میں منتقل کردیا ہے۔ اس طرح ایک تجربہ کار تربیت یافتہ کپتان اس سے معمولی موسم میں اور معمولی طوفان میں کام لے سکتا ہے۔ لیکن مون سون میں یہ جہاز خطرناک ہوجائے گا۔ لیکن اگر کمپنی اس جہاز سے ضرور کام لینا چاہتی ہے تو اس ٹرپ کے بعد اس کو ایک سال کے لئے سنگاپور کے ڈوکیارڈ میں ری فِٹ کے لئے جانا پڑے گا۔ لیکن اس مرمت پر اس کی لاگت سے دگنا خرچ آئے گا۔ اپنی رپورٹ کے آخر میں میں نے کمپنی کے سامنے ایک اہم تجویز پیش کی ہے۔ اس میں میں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ہمارا ملک صرف بین الاقوامی تجارت اور بین الاقوامی تجارتی جہازوں کی مدد سے دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کے دوش بدوش کھڑا ہوسکتا ہے۔ اس کے لئے ہماری سب سے بڑی ضرورت ایک بڑے معیار کا شپ یارڈ ہے جس میں بڑے سائز کے تجارتی جہاز بنائے اور مرمت کئے جاسکیں۔ ایسا ایک شپ یارڈ گوادر میں یا اُرمارا میں تعمیر کیا جاسکتا ہے۔ اگر کمپنی اس تجویز کو غور کے قابل سمجھے تو میں اس اسکیم کا بلیو پرنٹ تیار کرسکتا ہوں۔"

اسلام شپنگ کمپنی کے ڈائرکٹر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

پھر سٹرن کی طرف سے آنے والے کوریڈور میں چیف آفیسر کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ سب اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔

چیف آفیسر نے رپورٹ کی:

"کیپٹن، لوڈنگ ختم ہوگئی ہے۔ لائفبوٹس سیکیور کرلی گئی ہیں۔ واٹرٹائٹ ہیچ بند کردیئے گئے ہیں۔ جہاز سفر کے لئے تیار ہے۔"

کپتان آفندی نے پوچھا:

"شیڈیول کیا ہے؟"

"ساڑھے تین بجے۔"

"ہائی ٹائڈ کب ہے؟"

"پانچ بجے۔"

"ٹگ آگیا ہے؟"

"نہیں، اس کے لئے ٹیلیفون کیا ہے۔"

"کونسا ٹگ ہے؟"

"رستم۔"

مجاهدوں کی سر زمین

رے شمالی سرحدی علاقے کے شجاع، حریت
ت فرزندان وطن جہد آزادی میں همیشه
ں پیش رهے هیں - استعمار کے خلاف، حصول
کستان کے لئے، آزادی کشمیر کے لئے - اور
بھی نئی نسل اسی شجاعانه روایت پر
رش پاتے هوئے هر جہتی ترقی میں ملک
دوسرے حصوں کے ساتھ شریک ہے -

" حیات جاوداں اندر ستیز است "

" رقص سر مستانه رقص "
(زندگی اور فن میں مکمل هم آهنگی)

سنگلاخ پہاڑ، سخت کوش زندگی

"ہوا کی فورس کیا ہے؟"

"دو"

"ویدر رپورٹ کیا ہے؟"

"محکمہ موسمیات کی پیشن گوئی کے مطابق اگلے چوبیس گھنٹوں میں موسم خوش گوار رہے گا۔ ہوا کا وہ دباؤ جو جنوبی افریقہ کے نیچے بن رہا تھا، بحرِ اوقیانوس کی طرف چلا گیا ہے۔ ہوا کا رخ: شمال مغربی۔ درجۂ حرارت، اکیاسی اور ساٹھ۔ ہاربر کے اندر پانی ہموار ہے۔ ہاربر سے باہر دو درجے کی سوئیل ہے۔"

"لوڈنگ میری ہدایت کے مطابق ہوئی ہے؟"

"یس سر"

"جہاز سٹیم پر ہے؟"

"یس سر"

"اولرائٹ۔ ویل ڈن۔"

اب کوک ٹیل نے ڈائرکٹروں کے دماغ کو سیراب کر دیا ہے۔ اب اُن کے سروں پر مرغوں کی دُمیں اُگ آئی ہیں۔ اُن کی آنکھوں میں بدحواسی کے شعلے بھڑک اٹھے ہیں۔ اُن کی زبانیں مفلوج ہو گئی ہیں۔ وہ کپتان آفندی کے ساتھ ایک اہم معاملے پر گفتگو کرنے آئے تھے۔ اس لئے شروع شروع میں انہوں نے کوک ٹیل کو اپنے کنٹرول میں رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن انسان کوک ٹیل کو اپنے کنٹرول میں نہیں رکھ سکتا۔ کوک ٹیل انسان کو اپنے کنٹرول میں رکھتی ہے۔ انسان نے کوک ٹیل اس لئے ایجاد کی ہے کہ کوک ٹیل انسان کو دھکا دے کر گٹر میں گرا دے اور وہ ساری رات وہیں پڑا رہے۔ اس وقت حالات پر کوک ٹیل کی حکومت ہے۔ اور یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ ابھی تھوڑی دیر میں طلوعِ اسلام کے کوارٹر ڈیک پر ایسی شرمناک باتیں ہونے والی ہیں، جو انسان اپنے ہوش و حواس میں کبھی نہیں کر سکتا۔ تھوڑی دیر میں اسلام شپنگ کمپنی کے ڈائرکٹر گٹر میں گرنے والے ہیں۔

لیکن کپتان آفندی کو کوک ٹیل پر کنٹرول ہے۔ کیونکہ کپتان آفندی آدمی نہیں ہے۔ جن ہے کپتان آفندی جن پیتا ہے وہ کوک ٹیل پسند نہیں کرتا۔ اسے جن پسند ہے۔ وہ جن اس لئے پیتا ہے کہ وہ جن کو قابو میں کرنا چاہتا ہے، وہ تمام عمر جن پیتا رہا ہے اور اب اُس نے جن پر قابو پا لیا ہے۔ اب وہ جن کی بوتل کو اپنے سامنے میز پر رکھ لیتا ہے۔ بوتل میں سے سفید جن نکل کر زمین سے آسمان تک اُس کے سامنے پھیل جاتا ہے۔ اور کپتان آفندی کے حکم کا انتظار کرتا ہے۔

اور چوہدری نظام دین نے اپنا دماغ کوک ٹیل سے سیراب نہیں کیا۔ اس لئے اس کے سر پہ مرغے کی دم نہیں اُگی۔ وہ تو مرغے کی اذان کا انتظار کر رہا ہے۔ رات بہت ہو چکی ہے۔ وہ بار بار اپنی گھڑی کی طرف دیکھ رہا ہے۔

آخر اس نے کہا:

"چیئرمین صاحب، فجر کی نماز کا وقت ہو رہا ہے۔ جو بات کرنی ہے کریں۔"

یوسف بن یعقوب نے آخر اس اہم مسئلے کو چھیڑا جو اس پارٹی کا سبب تھا۔

"کیپٹن آفندی، بورڈ آپ کی تجاویز کو نہایت پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ بورڈ کو آپ کے بلند مقاصد اور بلند نظری کا اعتراف ہے۔ ہم آپ کے ملک اور کمپنی کے لئے خیر خواہی کے جذبات کی قدر کرتے ہیں۔ اور وعدہ کرتے ہیں کہ ہم ان تجاویز پر انتہائی سنجیدگی سے غور کریں گے۔ اور اس سلسلے میں جلدی ہی حکومت سے خط و کتابت کا آغاز کریں گے۔ لیکن آپ کو یقیناً ہم سے اتفاق ہو گا کہ ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کم از کم دس سال کا عرصہ درکار ہے۔ اور ہم اتنے لمبے عرصے کے لئے کمپنی کی ترقی کی سکیموں کو التوا میں نہیں ڈال سکتے۔ اس وقت ہمارے سامنے سب سے اہم پروگرام کمپنی کے کاروبار کی وسعت ہے۔ ہم اسلام لائنز میں ہر سال دو جہازوں کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اس سال دو جہاز خریدنا چاہتے ہیں جن کے نام پیغامِ اسلام اور نورِ اسلام ہوں گے۔ اور اگلے سال اسلام لائنز میں جن دو جہازوں کا اضافہ ہو گا ان کے نام شانِ اسلام اور فیضِ اسلام ہوں گے۔ اس کے بعد روحِ اسلام، کیفِ اسلام، معراجِ اسلام اور تہذیبِ اسلام۔ اور تمام دنیا کے سمندروں میں مغل لائنز اور سٹی لائنز کے ساتھ ساتھ اسلام لائنز کے جہاز بھی جلوہ فروز ہوں گے۔ کیپٹن آفندی ہمیں اس وسعت کے پروگرام میں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ ہم آپ کو ان جہازوں کی خرید و فروخت کے لئے یورپ بھیجنا چاہتے ہیں۔"

کپتان آفندی نے جواب دیا:

" میں کمپنی کا ممنون ہوں۔ یہ میری عزت افزائی ہوگی"۔

" کیپٹن آفندی، بورڈ کے علم میں ہے کہ کمپنی نے طلوعِ اسلام میں بہت خسارے کا سودا کیا ہے۔ ہم نے اس کو بیچنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ آخر ہم نے کسی منافعے کا خیال چھوڑ کر کم از کم اس کی قیمت وصول کرنے کے لئے اس کو سمندر کے قابل بنانے کا فیصلہ کیا لیکن انشورنس کمپنی نے اس کا بیمہ کرنے سے انکار کر دیا۔ بہت اصرار کے بعد آخر انشورنس کمپنی نے ایک شرط پر اس کا بیمہ کرنے کی رضامندی ظاہر کی۔ اگر ہم طلوعِ اسلام کے لئے کسی ایسے کیپٹن کا انتظام کر لیں جس کے پاس جہاز رانی کا انٹرنیشنل سرٹیفکیٹ ہو، تو اس کا بیمہ ہو سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی ڈوبنے کا نہیں، ایکسیڈنٹ کا۔ اور ایکسیڈنٹ بھی وہ جس میں انشورنس کمپنی کو جہاز کا سکریپ مل جائے۔ چنانچہ ہم نے بین الاقوامی جہازراں ایسوسی ایشن کی فہرست دیکھی۔ اس فہرست میں ہمیں اپنے ملک کا صرف ایک نام نظر آیا۔ کیپٹن اختر الزماں آفندی۔ آپ اُس وقت اُس پرتگالی کمپنی میں تھے جس کا آپ نے ابھی ذکر کیا ہے۔ ہم نے آپ کو ڈیڑھ گنا تنخواہ پر اپنی کمپنی میں لے لیا۔ جہاز کا بیمہ ہو گیا۔ بہت بھاری رقم پر۔ اس میں ہمارا چانس یہ تھا کہ اگر کوئی تجربہ کار تربیت یافتہ کیپٹن اس جہاز سے اس کی لاگت وصول کر لے تو ہم خود اس جہاز کا سکریپ بیچ کر اس سے کافی فائدہ اٹھائیں گے لیکن آپ کی رپورٹ نے ہمیں تشویش میں ڈال دیا ہے۔ ابھی مونسون تک اس جہاز کی آدھی لاگت بھی واپس نہیں آئے گی۔ اس طرح طلوعِ اسلام ہماری ترقی کے راستے میں ایک روڑا بن کے اٹک گیا ہے۔ اس سے نہ صرف کمپنی کو ناقابلِ تلافی مالی نقصان ہوا ہے بلکہ اس نے ہمارے کاروبار کی وسعت کے پروگرام کو بھی روک دیا ہے۔ کیپٹن آفندی، ہم آپ سے اس سلسلے میں مدد کی درخواست کرتے ہیں!"— " میں حاضر ہوں۔ حکم دیجئے"۔

" ہم چاہتے ہیں کہ آپ طلوعِ اسلام کو آگ لگا دیں"۔

کپتان آفندی کا کوک ٹیل کا گلاس اس کے ہونٹوں کے پاس ٹھہر گیا۔ اُس نے گلاس کے اوپر سے یوسف بن یعقوب کی طرف دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں نے کوک ٹیل سے انکار کر دیا۔ اس کا ہاتھ کوک ٹیل کے گلاس کو واپس لے آیا۔ اس کی نظریں یوسف بن یعقوب کے چہرے پر منجمد ہو گئیں۔ اُس نے کہا۔

" مسٹر یوسف، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ میں ا

کیوں آگ لگا دوں؟"

" کیپٹن آفندی، طلوعِ اسلام بھاری رقم پر انش

کمپنی کی ادائیگی سے ہم اپنے تمام نقصانات پورے کر لیں

نیا طلوعِ اسلام خرید سکیں گے اور اپنی ترقی کی سکیموں کو عمل

کے قابل ہو جائیں گے"۔

کپتان آفندی تلملا کر کھڑا ہو گیا اور بولا:

" یوسف صاحب، میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں

میں اس جہاز کا کپتان ہوں، اس کو کوئی آگ نہیں لگ

لئے میں اس جہاز کی کمان سے استعفا دیتا ہوں۔ اب

کا ہے۔ آپ اس کو آگ لگا سکتے ہیں"۔

" کیپٹن آفندی، ہم بہت پہلے ایسا کر سکتے تھے

کمپنی کی ہدایت ہے کہ طلوعِ اسلام کو اس بندرگاہ میں

جلے۔ اگر اس کے جلنے کی رپورٹ کسی غیر ملکی بند

تو ادائیگی میں آسانی ہوگی۔ ٹوکیو اس کے لئے بہترین

غالباً یہ سمجھنا تو مشکل نہیں ہے کہ اس آگ سے انشو

چند افسروں کو، آپ کو اور ہمیں بہت فائدہ پہنچنے وا

کیپٹن آفندی چلّایا:

" یوسف بن یعقوب!"

پھر غصّے کے جذبات کی فراوانی سے اُس کی

اور پھر اُس نے وہی کچھ کیا جو اپنے جذبات کو فرد کرنے

موقعوں پر وہ کیا کرتا ہے۔ اُس نے اپنے دائیں ہاتھ

کیا اور کوک ٹیل کے گلاس کو ڈیک پر پٹخ کر چکنا چور

کی زبان کی لکنت دور ہو گئی۔

" یوسف بن یعقوب، آپ کو معلوم ہونا چاہیے

جہازراں ایسوسی ایشن کا ممبر ہوں۔ میں ایک بین الاقوام

میرے وقار اور دیانت داری کا معیار بہت بلند ہے۔ آ

حریص اور بدکردار انسانوں میں شمار کر کے میری توہین کی

کو معلوم ہونا چاہیے کہ جہاز، جہازراں اور جہاز رانی

کا ایک مقدس عہد ہے۔ محبت کا ایک ابدی رشتہ

جذباتی رشتہ ماں اور باپ کے رشتے سے زیادہ قوی، بیوی اور بچوں کے رشتے سے بھی زیادہ قوی، عزیز ترین عزیزوں سے زیادہ عزیز۔ آپ اپنے بیمار عزیزوں کی کراہیں سُن کر بے تاب ہو جاتے ہیں۔ میں اپنے بیمار جہاز کی کراہیں سن لیتا ہوں تو ساری ساری رات نہیں سوتا۔ اور آپ مجھے کہہ رہے ہیں کہ میں اپنے بیمار جہاز کو جیتا پر پھینک کر اس کو سستی کر دوں۔ میں اپنے گھر کو اپنے چراغ سے آگ لگا دوں۔ میرے بیمار جہاز کو ــــ میرا بیمار جہاز ــــ میرا بیمار جہاز!"

اب جذبات کے دریا نے اُس کی زبان بند کر دی۔ اور اپنے لئے دوسرا راستہ بنا لیا۔ اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اور وہ کرسی کی ٹیک پکڑ کر چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔

پھر جب وہ سنبھل گیا تو اس نے سب سے مخاطب ہو کر کہا:

"پارٹی ختم ہو گئی ہے۔ آپ جا سکتے ہیں ــــ اور میں اس آخری ٹرپ کے لئے اپنا استعفا واپس لیتا ہوں۔ میرا جہاز لوڈ ہو چکا ہے۔ میرا ملک جاپان کو اس کی ضرورت کی اشیاء بھیج رہا ہے۔ میں اس مقدس فریضے کو پورا کروں گا۔ جاپان سے واپس آ کر میں اس کمپنی میں کام کرنا پسند نہیں کروں گا۔"

چیف آفیسر کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ سب کوریڈر کی طرف دیکھنے لگے، چیف آفیسر نے آ کر رپورٹ دی:

"کیپٹن، رستم آ گیا ہے۔"

"کپتان آفندی نے جواب دیا:

"مہمان جا رہے ہیں۔ گینگ وے کلیر کرو۔ اور ٹگ کو لائسنس دے دو۔"

"یس سر۔"

چیف آفیسر حکم کی تعمیل کے لئے چلا گیا۔ مہمان جہاز سے اتر گئے، کپتان آفندی برج پر پہنچ گیا۔ ٹگ نے جہاز کو کھینچ کر چینل کے درمیان کر دیا۔

اور جہاز روانہ ہو گیا۔

آسمان صاف اور سیاہ تھا۔ ستارے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ ہاربر گہرے نیلے اندھیرے میں لپٹی ہوئی تھی۔ ہوا بالکل ساکن تھی۔ چینل خاموش اور ہموار تھی۔ چینل کی سطح بندرگاہ کی سرخ لائٹوں، جہازوں کی نیویگیشن لائٹوں اور ہاربر کی سرخ، سبز اور سفید لائٹوں کے عکس سے قالین بنی ہوئی تھی۔ فضا پُر امن تھی اور پُر سکون تھی۔

کپتان آفندی برج پر کھڑا دوربین سے بندرگاہ کا مطالعہ کر رہا ہے۔ اُس کو وقت کا یہ حسین حصہ بہت اچھا لگتا ہے۔ وقت کا یہ حسین حصہ ایک جہازراں آرٹسٹ کو آرٹسٹ جہازراں بنا دیتا ہے۔ وہ رات کے اس نشاط انگیز حصے میں اپنے سفر کا آغاز کرنا پسند کرتا ہے۔ پورٹ ٹرسٹ کی مرضی کے خلاف اور پائلٹ کی مدد کے بغیر۔ جہاز ایک فرمانبردار بچے کی طرح اس کے احکامات کی تعمیل کرتا ہوا سرخ اور سبز لائٹوں سے بنے ہوئے راستے پر چینل کو آہستہ آہستہ عبور کر رہا ہے۔ کپتان آفندی کا دل اطمینان اور خوشی کے جذبات سے معمور ہے۔ آج اُس کی خوشی اور اطمینان کے جذبات زیادہ شدید ہیں کیونکہ اُن میں یہ احساس مل گیا ہے کہ وہ ایک بلند کردار کا بین الاقوامی جہازراں ہے۔ اس نے دوربین سے وارننگ ٹاور کی طرف دیکھا۔ اُس پر چار بلب جلے ہوئے تھے۔ نیلا، سبز، سرخ اور زرد۔ اس کا مطلب تھا۔ ایک جہاز ہاربر سے باہر جا رہا ہے۔

چیف آفیسر لنگر کی مشینری کے پاس جہاز کے ہیڈ پر کھڑا تھا۔ کپتان آفندی نے برج سے پکار کر کہا:

"ویل ڈن، چیف۔ پرفیکٹ لوڈنگ۔ جہاز میں لسٹ بالکل نہیں۔"

چیف آفیسر نے نیچے سے جواب دیا:

"تھینک یو۔ کیپٹن۔"

جب جہاز بوٹ کلب کے سامنے پہنچا تو موسم یکایک تبدیل ہو گیا۔ منوڑے کی طرف سے تند و تیز ہوا کے جھونکے جہاز کی سٹار بورڈ سائڈ سے بڑی طاقت کے ساتھ ٹکرائے۔ جہاز کئی ڈگری پورٹ سائڈ کو جھک گیا اور اس نے اپنی اصلی پوزیشن پر آنے کے لئے تین ہچکولے کھائے۔ مورس پیئر کے سامنے پورٹ ٹرسٹ کی عمارتوں کی وجہ سے ہوا کی شدت کم ہو گئی۔ اور جہاز کے ہچکولے بند ہو گئے۔

چیف آفیسر گھبرایا ہوا برج پر آیا اور بولا:

"کیپٹن، ویدر ٹاور پر طوفان کی وارننگ آ گئی ہے۔"

باقی صفحہ ۱۱۵ پر

سحر کے جلو میں

عنایت اللہ

(کیا یہ حقیقت ہے یا افسانہ، یا — رپورتاژ؟ قارئین کا تاثر اس بارے میں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا — مدیر)

میں نے گھوم کر دیکھا۔ آہنی دروازہ آہستہ آہستہ بند ہو رہا تھا۔

کس قدر ہیبت تھی اس آہستگی میں، کس قدر بھیانک تھا انداز اس کے بند ہونے کا۔ جیسے مہیب چٹان میرے وجود کو کچلتی، پیستی، ہڈیوں کو مسلتی، گزرتی جا رہی ہے۔

آہستہ، نہایت آہستہ۔

دل کچلا گیا، اعصاب پس گئے، ضمیر مسلا گیا، انانیت ریزہ ریزہ ہو کے قیدخانے کی بُو باس میں تحلیل ہو گئی۔

دروازہ بند ہو کر مقفل ہو چکا تھا۔ سنتری چابیوں کا گچھا کمر بند کے ساتھ باندھ چکا تھا اور دروازہ کی موٹی موٹی سلاخوں میں سے اُن ملول اور اداس اداس سی دو عورتوں کو دیکھ رہا تھا جو کسی قیدی کی ملاقات کے لئے آہنی دروازہ سے دور پرے کھڑی تھیں۔ میں نے بھی سلاخوں میں سے جھانکا۔ پھر اس ہولناک دروازے کی دہلیز کو دیکھا جس پر گر کر میری آزادی نے آخری ہچکی لی تھی اور دم توڑ گئی تھی۔ ان سلاخوں سے پرے مجھے آزاد دنیا نظر آ رہی تھی۔ میں اُس کی بُو سونگھ رہا تھا اور اسے دیکھ بھی رہا تھا — وہ دو ہاتھ پرے، دو قدم دور۔ لیکن مجھ میں اور میری آزاد دنیا میں قدم نہیں، اب سال حائل ہو چکے تھے۔ سات سال! اس احساس نے میری ذات کو بنیادوں تک ہلا دیا کہ اس ایک جست کے فاصلے کو طے کرنے میں مجھے سات برس کا عرصہ لگے گا۔

میں قید ہو چکا تھا۔ سات برس کے لئے! آنکھیں دھندلا گئیں، پھر اندھیرا چھا گیا گہرا، گھٹا ٹوپ اندھیرا۔ اُس رات کا اندھیرا جس کی طوالت سات سال تھی۔ میں اس گھپ اندھیرے میں بھٹک بھٹک گیا۔ میں نے ٹھوکر کھائی۔ میں گر بھی پڑا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا اور ٹٹولتا ٹٹولتا اندھیرے میں ہی چلتا گیا۔ پھر یوں کہ جیسے ذہن نے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا ہو۔ یا جیسے ذہن پیچھے رہ گیا ہو۔ میں رُک گیا کہ ذہن کو ساتھ لے لوں۔ اسے ساتھ لیا تو میں چکرا گیا۔ غشی کی کیفیت طاری ہونے لگی جو طاری ہوتی ہی چلی گئی۔

"اٹھو...." کوئی مجھے پیار سے جھنجھوڑ رہا تھا۔ "اٹھو...." میں نے آنکھیں کھولیں۔

"جاگو، سویرا ہو گیا ہے۔"

میں اٹھ بیٹھا۔

زنداں میں یہ میری پہلی سحر تھی — بے نُور، دکھیاری سحر جیسے اس کے حسن اور نکھار کو شب کی تیرگی ڈس گئی ہو۔

میں نے اپنا جائزہ لیا۔ اپنے تئیں پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔ مجھے قیدخانے کے کپڑے پہنائے جا چکے تھے۔ میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ قیدیوں کا انبوہِ عظیم انگڑائیاں لے رہا تھا۔ میں یوں اٹھا جیسے مجھے لاشوں کے انبار میں سے اٹھایا جا رہا تھا۔

"اللہ تیرا شکر!" قریب سے آواز آئی۔ "قید کی ایک اور رات گذر گئی"

اس ایک فقرے نے جیسے میری ڈوبتی ناؤ سنبھال لی ہو۔ مجھے ایک گونہ قرار آیا۔ "چلو سات سالوں کی پہلی رات تو گذری۔"

"بیٹا!" کسی نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ میں نے دیکھا ستر برس کی عمر کا ایک بوڑھا قیدی مجھ سے مخاطب تھا۔ شاید اسی نے مجھے جگایا تھا۔

"نئے ہو؟"

"ہاں بابا۔"

وہ مسکرا دیا۔
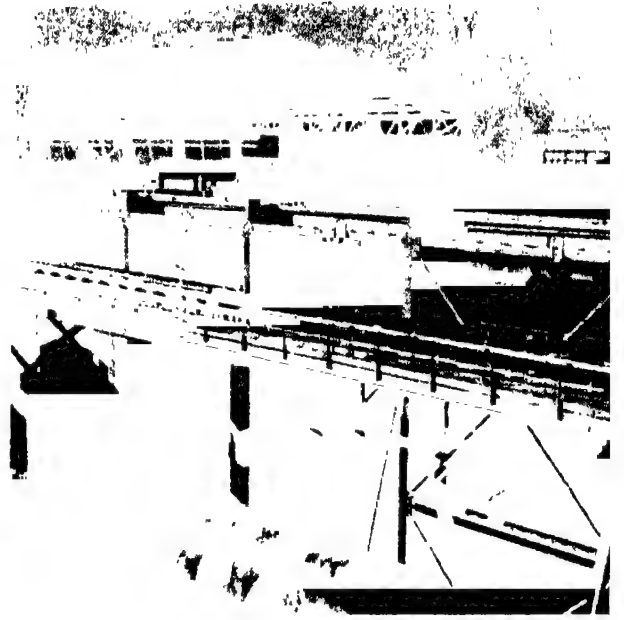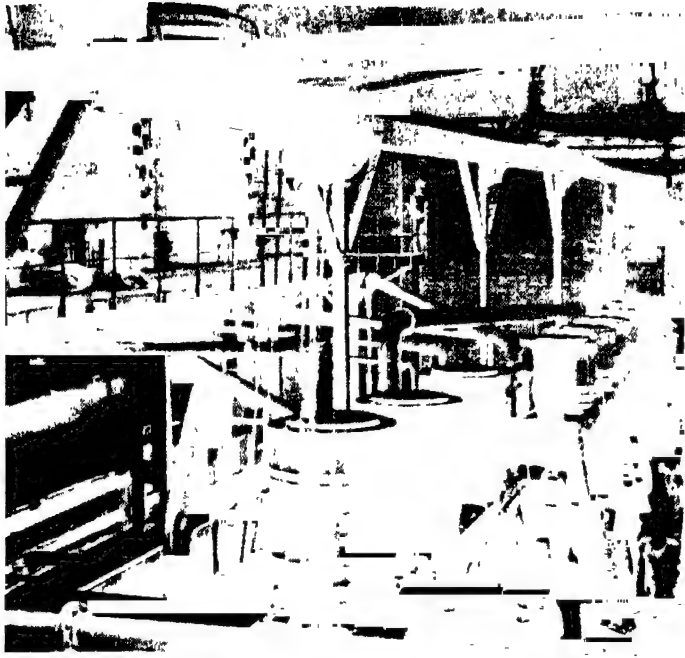
وذبات : ریل پاک کارخانہ شکرسازی (دیوان …

سامان تعمیر : زیل لیف کارخانہ سیمنٹ سازی، داؤد

شرق

غرب
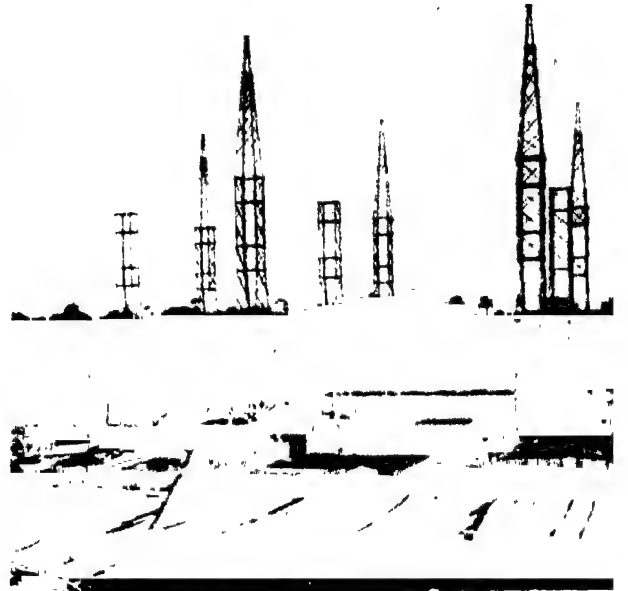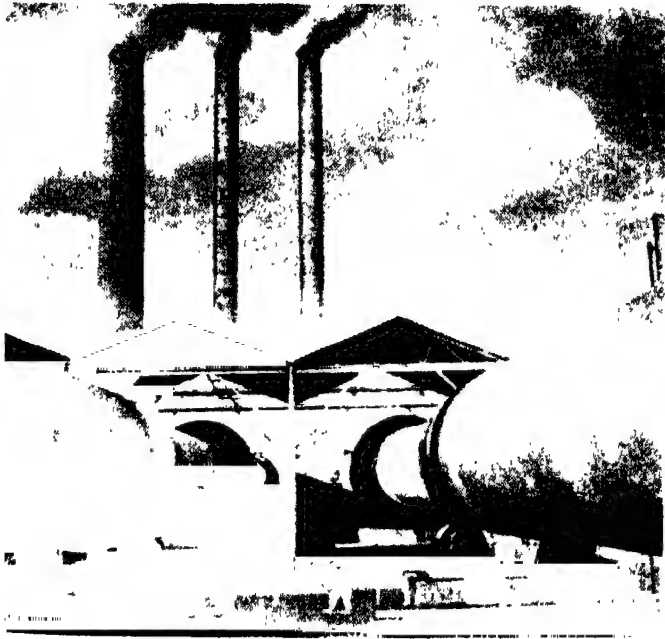
یب تر : ڈھاکہ اور چاٹگام کے درمیان جدید ترین لاسلکی پیام رسانی کا اہتمام

سیمنٹ فیکٹری - حیدرآباد

دور انقلاب میں صنعتی اعتبار سے جو تازہ بتازہ نو بہ نو، معجزنما ترقیات ہوئی ہیں یہ کارخانے ان کی صرف چند ہی جھلکیاں پیش کرتے ہیں

"آپ بابا! اس عمر میں یہاں کیسے ؟"

"اٹھائی گیری میں ... " سفید داڑھی والے اس قیدی نے کہا۔ "تالے بھی توڑتا ہوں، جیب بھی کاٹتا ہوں ۔"

"آپ ؟ "

"ہاں بیٹا! حیران نہ ہو" اس نے پیار بھری مسکراہٹ سے کہا۔ "نو برس کی عمر میں پہلی جیب کاٹی تھی" اس نے آہ بھری اور بولا " وہ بخت کُش (وقت کچھ) اور تھا آج کا بخت کُش اور ہے۔ اُس بخت بندے کو بندے کی چاہت تھی، آج بندہ بندے کا دشمن ہے۔ وہ جمانا (زمانہ) الفت کا تھا یہ جمانہ ظُلم کا ہے۔ پیسہ جیاستی ہے ٹھگی چوری بھی جیاستی ہے۔ سُن بیٹا! جب میں نے پہلی جیب کاٹی تھی ... ہائے ہائے! کیا جمانہ تھا بیٹا!" اور بڈھے نے ایسے انداز میں ایک کہانی سنا ڈالی جیسے دادا پوتے کو سنا کر سلا دیتا ہے۔

"پر بیٹا! جیل میں گھبرائیومت۔ روئیو مت۔ مر جاؤ گے" اس نے میری ٹھوڑی کو رعشہ دار انگلیوں میں تھام کر کہا۔ "اپنے دل کی سنائیو پر دوجے کی جرور سنیو۔ پھر اپنی بھول جاؤ گے۔ دنیا بڑی دکھی ہے بیٹا! یہ ستاون کا سن پاکستان پر بڑے ظُلم کا سال ہے۔ تم پڑھے لکھے ہو بیٹا! پر جانو گُش بھی نہیں میں جاہل چور اچکا، پر جانوں تیرے سے جیاستی بے گناہ تختے پر لٹک گئے ہیں اس ملک میں بیٹا! اس ملک میں نو لوبیں سمجھو کہ جھوٹ بولو تو تم سچے۔ سچ بولو تو گناہ گار۔ قتل میں کروں پھانسی تم پاؤ۔ اب پوچھو کیوں ؟ پر میں بتاؤں نہیں تیرے کو۔ جری قیدیوں کے سینوں پہ ہاتھ رکھنا، تیرے کو جواب مل جائے گا۔ پھر سُن لے بیٹا! دل کو دُکھی نہ کریو۔ اپنی سنا کر مت روئیو۔ دوجے کی سُن لیجو۔"

بڈھا کہے جا رہا تھا اور میرے سینے میں مرا پڑا ایک انسان بیدار ہوتا جا رہا تھا۔ میں قید تھا، یہ انسان آزاد ہو گیا۔ میرا دل جو ڈوب چلا تھا ابھرتے سورج کے ساتھ اُبھر آیا اور میں بدلے ہوئے روپ میں قیدیوں کے انبوہِ عظیم میں تحلیل ہو گیا۔

ہم مشقت کے لئے چل پڑے پھر ہم ایک میدان میں بکھر کر مشقت میں مصروف ہو گئے۔ میں نے ایک بکھرے ہوئے بے جوڑ ہجوم کو دیکھا۔ میرے سامنے سوسائٹی کی لغزشوں کا ہجوم بکھرا ہوا تھا۔ آزاد زندگی اور زنداں میں صرف ایک لغزش کا ہی تو فاصلہ ہے۔ لغزش اپنی بھی ہو سکتی ہے، کسی کی بھی۔ کیا خبر کبھی قانون کی لغزش بھی کسی کو اندر لے آئے۔ یہ ۱۹۵۸ء کا سال تھا۔ جب آدمے کا آدھا ہی بگڑا ہوا تھا اور گیہوں کے ساتھ گھن بھی پِسا جا رہا تھا۔

میں چند روز میں ہی اسیروں اور ان کی آپ بیتیوں میں جذب ہو گیا۔ اب میں سات سال کا سفر دو ہی سال میں طے کر کے سلاخوں سے نکل آیا ہوں لیکن آزاد نہیں ہوں۔ میرے ذہن میں پھانسی کا تختہ کھلتا اور بند ہوتا رہتا ہے۔ ایک دھماکہ سا ہوتا ہے، میں سوتے میں چونک اٹھتا ہوں اور پھر قید ہو جاتا ہوں ___ اپنے خیالوں میں قید، سیاست زدہ قیدیوں کی کہانیوں میں قید ___ چند ایک بیگناہوں کی گھٹی گھٹی سی آخری ہچکیاں میرے ذہن میں گونجتی رہتی ہیں، گونجتی ہی رہتی ہیں اور جانے کب تک گونجتی ہی رہیں گی۔ پتھروں کی دیواروں کی اوٹ سے میں چند کہانیاں چرا لایا ہوں۔ یہ حزنیہ ہیں، سناؤں کیسے؟ اپنے آپ کو ہی سنایا کرتا ہوں۔ دکھ بھرے قصے کون سنتا ہے ؟

جی میں آتی ہے کہ ایک بات سب کو سنا دوں۔ یہ راجہ کی کہانی ہے۔ راجہ رانی کی نہیں، ایک پڑھے لکھے دیہاتی کی کہانی۔ اس کا پورا نام تو پورا آتا تھا، ہم اسے راجہ کہا کرتے تھے کیونکہ وہ ذات کا راجہ ہے۔

میں اس وقت مغربی پاکستان کی ایک جیل میں راجہ کے ساتھ "بی کلاس" میں محبوس تھا۔ سال ۱۹۵۹ء کا تھا۔ راجہ بتیس چھتیس برس کی عمر کا بھرپور جوان تھا، پانچ دریاؤں کی مٹی کا شاہکار۔ قتل کے جرم میں عمر قید بھگت رہا تھا۔ زندہ دل آدمی تھا لیکن میں اسے اکثر خلاؤں میں تکتے یا کسی تصور میں گم دیکھا کرتا تھا۔ وہ تصور یقیناً حسین تھا کیونکہ ایسی خود فراموشی میں اس کے ہونٹوں پر مسرت سے لبریز مسکراہٹ ہوتی تھی۔

راجہ باتیں کم کرتا تھا اور سوال زیادہ پوچھا کرتا تھا۔ اس کے بیشتر سوالات عشق و محبت کے متعلق ہوا کرتے تھے۔ "دل کی لگی اپنی لگائی ہوئی ہوتی ہے یا خود لگ جاتی ہے؟ یا کوئی آ کے لگا جاتا ہے؟ محبت میں عورت ثابت قدم ہوتی ہے یا مرد؟ کیا عورت کے سینے میں دیوتاؤں کی قوت نہیں ہوتی کہ وہ محبت کی راہ سے پہاڑ کو بھی ہٹا لیتی ہے؟" بعض اوقات وہ ایک آدھ محبت بھری کہانی بھی سنا دیا کرتا تھا لیکن سوالیہ انداز میں۔ حاضرینِ محفل سے سوال پوچھے جاتا تھا اور انہی کے جوابوں سے کہانی مرتب ہو جاتی تھی۔

راجہ کے ہونٹوں پر ہر وقت ایک مسکراہٹ سی کھیلتی

رہتی تھی جو سوتے وقت اور زیادہ کھل جاتی تھی۔ بعض اوقات وہ نیند میں کھل کے مسکرایا کرتا تھا جب وہ محبت کی کوئی داستان سنایا کرتا تھا تو سنا کے گہری سوچ میں ڈوب جاتا تھا۔ ایسے میں ہزار جھنجھوڑو وہ محفل سے لاتعلق ہی رہتا تھا خیالوں کی لہروں پہ تیرتا، جانے کون سے دیس جا پہنچتا تھا۔ اس کا تبسم اور خود فراموشی اسے دوسرے قاتلوں سے ممیز کرتی تھی۔ اس نے یقیناً اپنے ذہن میں ایک من بھاتی دنیا بسائی ہوئی تھی۔ اس مقید زندگی سے بھاگ کر وہ اسی دنیا میں جا پناہ گزیں ہوتا تھا۔

اس نے اپنے جرم کی داستان کبھی نہیں سنائی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس نے جو قتل کیا ہے اس کا پس منظر بڑا ہی عجیب و غریب اور غیر معمولی ہوگا یا شاید خون اس کے اعصاب پر ابھی تک سوار تھا اور وہ تصور پرستی کو ذریعۂ فرار بنائے ہوئے تھا۔ میں نے اس کے دل میں جھانکنے کی بہت کوشش کی لیکن راجہ نے کچھ ایسے دبیز پردے ڈال رکھے تھے کہ کچھ دکھائی نہ دیا۔ وہ اسی قدر بتایا کرتا تھا کہ وہ قاتل نہیں ہے بے گناہ ہے۔

جیل میں میرا زیادہ تر وقت لکھنے میں گذرتا تھا۔ کتابیں بھی رکھی رہتی تھیں۔ ایک دن راجہ میرے پاس آ بیٹھا اور پوچھا کہ میں کیا لکھتا رہتا ہوں۔ میں نے کہا۔ "کہانیاں" بولا "کیسی کہانیاں؟" میں نے کہا "عشق و محبت کی، دکھ درد کی، ہنسی مذاق کی، قربانی اور ایثار کی اور جو کچھ جی میں آئے لکھ ڈالتا ہوں" راجہ یوں ہنس پڑا جیسے اپنے آپ میں کسی مذاق سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔ اس نے میرے دو چار افسانے سنے۔ میں نے دیکھا کہ وہ بیٹھا میرے پاس تھا لیکن اس کی آنکھیں دور، بہت دور، خلاؤں ... سے بھی آگے، جانے کس چیز کو دیکھ رہی تھیں۔ شاید لمحات کے اس کارواں کو جو افق سے اس پار ماضی کی گرد میں روپوش ہو چکا تھا۔

راجہ میرے قریب آتا شروع ہوا اور چند روز میں بے تکلف ہو گیا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ بات کرنے سے گریز کرتا ہے لیکن اس کے قریب ہو کر معلوم ہوا کہ وہ بات کرنے کو تڑپ رہا تھا۔ کوئی سننے والا نہ تھا۔ اس کا سینہ جیسے پھٹا جاتا تھا۔ وہ اب بھی مسکرا رہا تھا لیکن اس کی مسکراہٹ میں دکھ کا تاثر جھلک اٹھا تھا۔

"تم معجزوں کو مانتے ہو؟" ایک دن اس نے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں!"

"تم مانتے ہو کہ ہم جیسے انسانوں کی زندگی میں بھی معجزہ رونما ہو سکتا ہے؟"

"نہیں!" میں نے اسے گرمانے کے لئے کہہ دیا۔

اس نے میرے زانو پر ہاتھ مارا اور قدرے اچھل کر شگفتہ لہجے میں کہا "ہو سکتا ہے۔ میری زندگی میں ایک معجزہ رونما ہو چکا ہے اب ایک اور ہوگا" اور خلاؤں میں یوں دیکھنے لگ گیا جیسے اسے وہ معجزہ نظر آ رہا تھا۔

جون ۱۹۵۹ء کی تپتی دوپہر تھی۔ ہم دونوں "بی کلاس" کی کوٹھری میں بیٹھے تھے۔ کوٹھڑی تنور کی طرح تپ رہی تھی۔ راجہ کے چہرے کا تاثر یکسر بدلا ہوا تھا۔ تبسم کی شگفتگی اور کھل اٹھی تھی۔ آنکھوں میں ایسی چمک تھی جو میں نے اس کی آنکھوں میں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ اپنی داستان سنا رہا تھا۔

راجہ پنجاب کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ واجبی سی تعلیم بھی تھی۔ ۱۹۵۲ء کی ایک رات اس کی گھوڑی چوری ہو گئی۔ اس گھوڑی کے ساتھ اسے بے پناہ محبت تھی۔ راجہ پا پیادہ گھوڑی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا اور ایک مہینہ گاؤں گاؤں مارا مارا پھرتا رہا۔ لیکن گھوڑی کا سراغ نہ ملا۔ آخر تھک ہار کر اپنے گاؤں کو روانہ ہوا۔

راستے میں ایک گاؤں سے بارہ میل دور رات آ گئی۔ راجہ قریب ہی ایک گاؤں میں چلا گیا اور ایک گھر میں جا مہمان ہوا۔ کوئی جان پہچان نہیں تھی تاہم گھر والوں نے اسے سر آنکھوں پہ بٹھایا۔ گھر والوں کا اکلوتا بیٹا، شیر خاں، جو فوج میں لیس نائک تھا، ایک ماہ کی چھٹی پہ آیا ہوا تھا۔ چوبیس پچیس برس کا خوبرو نوجوان اور سپاہیانہ حسن و جلال کا نمائندہ مجسمہ۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو راجہ نے شیر خاں کو اپنی گھوڑی کی چوری کا واقعہ سنایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ خریدنے کو ایسی چار گھوڑیاں خرید سکتا ہے لیکن اس گھوڑی سے اسے عشق ہو گیا تھا۔ اس نے گھوڑی کی محبت کا ذکر ایسے الفاظ میں کیا جیسے کسی حسین و جمیل لڑکی کی محبت کی رومان انگیز داستان سنا رہا ہو۔ اس کے آنسو بھی نکل آئے تھے۔

لیس نائک شیر خاں کے دل پر اس محبت بھری داستان اور داستان سنانے والے کے دکھ بھرے انداز نے کچھ ایسا اثر کیا کہ ایک

داستان جسے شیر خاں جانے کب سے سینے میں چھپائے چھپائے پھر رہا تھا، ابھر کے باہر آ گئی۔ اس نے آہ بھر کر کہا "راجہ! تمہیں ایک گھوڑی سے محبت ہے مجھے ایک لڑکی سے عشق ہے"۔ اس نے راجہ کو ہمراز اور ہمدرد بنا کر تفصیل سنا ڈالی کہ دس میل دور ایک گاؤں میں ایک لڑکی راجو ہے جسے وہ دل میں بٹھا چکا ہے اور راجو اسے دل میں بسا چکی ہے۔ راجو سترہ اٹھارہ برس کی عمر کی کنواری لڑکی تھی جو سر دھڑ کی بازی لگا کر شیر خاں کو رات کے اندھیروں میں ملا کرتی تھی۔

باقی تمام رات راجہ اور شیر خاں کا موضوع گھوڑی اور راجو رہا۔ صبح طلوع ہوئی تو رات کے اجنبی گہرے دوست بن چکے تھے۔ شیر خاں، راجہ کے ساتھ اس کے گاؤں تک آیا اور رات رہ کر واپس چلا گیا۔

پانچ روز گزرے ہوں گے۔ نصف شب کا عمل تھا۔ راجہ کا گاؤں ہریالی کی سیج پہ گہری نیند سو رہا تھا کہ دیہات کی پُرسکون فضا کا معصوم سا ٹھہراؤ سرپٹ بھاگتے ہوئے کسی گھوڑے کی ٹاپوں سے تہہ و بالا ہونے لگا۔ گھوڑے کی آہٹ پا کر بھونکتے ہوئے کتوں سے بے نیاز راجہ کے دروازے پہ آ رکی۔ راجہ سو رہا تھا کہ دروازے پہ دستک نے اُسے جگا دیا۔ اس نے لالٹین جلا کر، اسے ہاتھ میں اٹھائے دروازہ جا کھولا۔ اسے خواب کا دھوکہ ہوا۔ ہونا ہی تھا، دروازے پر اس کی گمشدہ گھوڑی کھڑی تھی۔ گھوڑی کو دیکھ کر راجہ تو جیسے دیوانہ ہو گیا۔ لالٹین رکھ کر اس کے گلے لگ گیا، بوسے لئے اور رہ رہ کر اس کی گردن سے لپٹا۔ اپنی محبوب گھوڑی میں وہ اسقدر کھو گیا کہ اس کے سوار کو دیکھ ہی نہ سکا۔

سوار نے بڑھ کر راجہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو طلسم ٹوٹ گیا۔ راجہ نے چونک کر دیکھا۔ شیر خاں گھوڑی کی باگ تھامے کھڑا تھا۔ مسکرا کر بولا "لو راجہ! تمہاری ہیر کو لے ہی آیا ہوں" راجہ شیر خاں کے ساتھ لپٹ گیا۔ اسے بھینچ ہی رہا تھا کہ ٹھٹھک گیا۔ شیر خاں کے جسم سے تازہ خون کی بو آ رہی تھی۔ راجہ نے لپک کر بتی اٹھائی اور شیر خاں کو غور سے دیکھا۔ پیٹھ پر اس کی قمیض خون سے لت پت ہو رہی تھی۔ کان کے قریب سر سے بھی خون بہہ رہا تھا اور فوجی جوان مسکرا رہا تھا۔ راجہ نے گھبرا کر پوچھا "یہ کیا؟" پیشتر اس کے کہ شیر خاں جواب دیتا اسے غش آ گیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرنے ہی لگا تھا کہ راجہ نے اسے بازوؤں میں تھام لیا۔

راجہ کی بیوی بھی جاگ کے باہر آ گئی۔ دونوں نے شیر خاں کو اٹھا کر اندر چارپائی پہ لٹایا۔ زخم دیکھے۔ پیٹھ پہ کلہاڑی کے دو زخم تھے اور سر پر لاٹھیوں کی ضربیں۔ زخم گہرے نہیں تھے لیکن خون زیادہ بہہ جانے سے شیر خاں بے ہوش ہو گیا تھا۔ میاں بیوی نے گرم پانی سے اس کے زخم دھوئے۔ پھر ان میں کورے سوت کو جلا کر اس کی راکھ بھر دی۔ اور پھر دیسی شراب میں بھیگی ہوئی پٹیاں باندھ دیں۔ ہلدی رگڑ کر میٹھے تیل میں پکائی اور سر کی چوٹوں پہ باندھ دی۔ دودھ میں گھی ڈال کے پلایا اور تمام رات اس کی تیمارداری میں جاگتے رہے۔ صبح اس کے گاؤں آدمی بھیجا۔ اس کے ماں باپ اُسے لینے آئے تو راجہ نے جانے نہ دیا۔ بولا تندرست ہوئے بغیر نہیں جانے دونگا۔

شیر خاں نے اسے بتایا کہ محض اتفاق سے اُسے راجہ کی گھوڑی کا سراغ ملا اور وہ وہاں پہنچ گیا۔ گھوڑی کشمیر کی سرحد سے چند میل اس طرف ایک گاؤں میں تھی۔ یہ گاؤں شیر خاں کے گاؤں سے آٹھ میل دور تھا۔ گھوڑی سرحد پر جا رہی تھی۔ سودا طے ہو چکا تھا۔ راجہ کے بتائے ہوئے حلیے کے مطابق شیر خاں نے گھوڑی پہچان لی جو ایک درخت کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ زین کسی ہوئی۔ شیر خاں نے گھوڑی کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ وہ تین آدمی تھے۔ انہوں نے انکار کیا تو شیر خاں نے انہیں للکارا۔ وہ کلہاڑیاں اور لاٹھیاں لئے مقابلے پر آ کھڑے ہوئے۔ شیر خاں خالی ہاتھ تھا، ایک لاٹھی کا وار سر پہ لے کر ایک لاٹھی چھین لی۔ اور جم کے مقابلہ کیا۔ وہ لڑتا بھی رہا اور گھوڑی کھولنے کی کوشش بھی کرتا رہا۔ اسی کوشش میں پیٹھ پہ دو وار لئے۔ آخر اس نے گھوڑی کھول ہی لی اور ایک ہی جست میں گھوڑی کی پیٹھ پہ جا بیٹھا۔ ایڑ لگائی اور ہوا ہو گیا۔ رات گہری ہو رہی تھی، آگے بیس میل کی اندھیری مسافت تھی، پیٹھ اور سر سے خون بہہ رہا تھا۔ لیکن اس جوانمرد سپاہی نے ہوش ٹھکانے رکھے۔ اپنا خون ٹپکاتا اور گھوڑی کا پسینہ بہاتا راجہ کے ہاں پہنچ گیا۔

چودہ پندرہ دنوں میں اس کے زخم ٹھیک ہو گئے اور وہ اپنے گاؤں جانے کے قابل ہو گیا۔ ان چودہ پندرہ دنوں میں شیر خاں نے راجہ کو بتایا کہ چھٹی کے دوران وہ راجو سے دو بار ملا ہے اور وہ اس کے ساتھ بھاگ چلنے کو تیار ہے۔

"سب سے بڑی مشکل یہ ہے" شیر خاں نے دکھ بھرے لہجے میں

کہا "کہ اسمبلی کا ایک ممبر جو بہت بڑا زمیندار بھی ہے، لڑکی کا امیدوار ہے وہ راجو کے ماں باپ پر روپوں اور نوازشوں کی بارش کر رہا ہے۔ اس نے دو چار ایکڑ زمین بھی ان کے نام کر دی ہے۔ اس کی پہلے ہی دو بیویاں ہیں اور عمر پچاس سے کہیں زیادہ ہے۔ راجو کے ماں باپ نے ہاں کر دی ہے اور وہ دن رات رو رو کر ہلکان ہو رہی ہے" شیر خاں نے بتایا "پچھلی بار میں راجو سے ملا تو وہ میرا دامن چھوڑ ہی نہیں رہی تھی۔ کہتی تھی ابھی لے چلو۔"

راجہ اسمبلی کے اس ممبر کو جانتا تھا۔ اسمبلی کے ان ممبروں کو کون نہیں جانتا تھا۔ جو نہیں جانتا تھا اسے ان کی موجودگی کا احساس کسی نہ کسی طرح دلا ہی دیا جاتا تھا۔ راجہ گہری سوچ میں ڈوب گیا اور اس سے ابھر کر بولا "تم نے میری محبوبہ مجھے لا دی ہے، میں تمہیں تمہاری محبوبہ دلاؤں گا۔ تم میری محبت کی خاطر جان پہ کھیلے ہو، میں تمہاری محبت کی خاطر جان پہ کھیل جاؤں گا۔"

"لیکن یہ نہ بھولنا راجہ! کہ آجکل اختیار ان ہی ممبروں کے ہاتھ میں ہے۔"

"خدا کے ہاتھ میں ہے۔" راجہ نے جذباتی سی مسکراہٹ سے کہا۔

"پھر بھی راجہ!" شیر خاں نے کہا۔ "ذرا سنبھل کے۔"

"اللہ مالک ہے۔" راجہ نے پر عزم لہجے میں کہا۔ "تم یہ کام میرے سپرد کر دو۔"

شیر خاں نے راجہ کو راجو کے گاؤں کا اتا پتا بتایا ہوا تھا جب وہ تندرست ہو گیا تو راجہ نے اسے اپنی محبوب گھوڑی پہ بٹھایا اور خود پیدل چلتا ہوا اسے اس کے گاؤں جا چھوڑا۔ شیر خاں نے رات رکنے پہ اصرار کیا لیکن راجہ نہ مانا۔ وہ کسی اور دھن میں تھا۔ شیر خاں سے رخصت ہو کر اسمبلی کے اس بوڑھے ممبر کے قصبے کی طرف چل پڑا۔

یہ قصبہ وہاں سے چودہ میل دور تھا۔ قصبے کے وسط میں ایک محل نما مکان تھا۔ وہ ممبر اسی محل میں رہتا تھا۔ ایک بار شکار کے دوران اس نے راجو کو دیکھا تھا اور شکار بھول کر راجو کے لئے جال ڈال دیا تھا۔ راجہ اس سے ملا اور بغیر تمہید کے اسے کہا کہ وہ ایک نوخیز کلی کو یوں بے دردی سے نہ مسلے وہ غریب ہی سہی اور غریب خریدے بھی جا سکتے ہیں، لیکن ان کی امنگوں کو نہ خریدو۔ راجہ نے اسے یہ بھی یاد دلایا کہ اس کے ہاں پہلے ہی دو بیویاں موجود ہیں اور وہ راجو کے دادا کی عمر کا ہے اور یہ بھی کہا کہ وہ دولت اور حاکمیت کے نشے میں ایک معصوم دوشیزہ کی بددعائیں نہ لے لیکن وہ ممبر بوڑھی آنکھیں بند کئے حقے کے کش لگاتا رہا۔ آخر راجہ نے یہ بھی کہہ دیا کہ جس لڑکی کو وہ خرید رہا ہے وہ شیر خاں کو اپنا بنا چکی ہے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ بوڑھے ممبر نے ایک آنکھ کھولی اور اسی قدر کہا "تم خوش قسمت ہو کہ میرے مہمان ہو ورنہ میں کسی کو دوسری بات کرنے کا موقع نہیں دیا کرتا۔"

راجہ نے اس کی منتیں بھی کیں۔ خدا اور رسول کے فرمان بھی یاد دلائے لیکن جو بزعم خود "ایک خدا" بنا ہوا تھا وہ اصلی و حقیقی خدا کے فرمان کو کیونکر قبول کرتا۔ راجہ نے یہ بھی کہا "آپ کے پاس دولت ہے، حکومت آپ کے ہاتھ میں ہے، آپ چاہیں تو سینکڑوں لڑکیاں خرید سکتے ہیں۔ ایک راجو نہ ہوئی تو کیا۔"

اسمبلی کے بوڑھے ممبر نے اب دوسری آنکھ بھی کھول دی۔ اسے یاد آ گیا کہ وہ حاکم وقت ہے اور سب کچھ اس کے ہاتھ میں ہے۔ فرعون جاگ اٹھا۔ اس نے راجہ کو ایک فحش گالی دی اور گھر سے نکل جانے کا حکم دیا۔

راجہ اٹھ کھڑا ہوا اور بولا "تم راجو کو نہ پا سکو گے۔ راجو کا بیاہ لیس نائک شیر خاں سے ہو گا۔ تمہارے پاس دولت ہے، میرے پاس خون ہے۔" یہ کہہ کر اس نے بوڑھے جاگیردار کے سینے پہ ہاتھ مارا اور محل سے باہر نکل گیا۔ گھوڑی پہ بیٹھا اور راجو کے گاؤں کا رخ کیا۔

راجہ راجو کے باپ سے ملا۔ اس کی منتیں کیں کہ راجو کا رشتہ شیر خاں کو دے دے۔ لیکن وہ رضامند نہ ہوا۔ آخر راجہ نے اسے شرم دلائی کہ وہ نوجوان لڑکی کو بوڑھے کے ہاتھ بیچ رہا ہے۔ اس پہ باپ کے آنسو نکل آئے۔ بولا "تم مجھے پہاڑوں سے ٹکراتے ہو؟ ہم تو اسی کا دیا کھا رہے ہیں جو ہم سے لڑکی مانگ رہا ہے۔ ہم نے اسے لڑکی نہ دی تو ہمارا آب پانی بند ہو جائے گا۔ وہ بادشاہ ہے، ہماری زمینیں ضبط کرا دے گا۔" یہ سن کر راجہ بھی چپ ہو گیا اور وہاں سے نکل آیا۔

راجو صحن میں پھر رہی تھی۔ راجہ نے مجھے یہ روئیداد سناتے ہوئے کہا "میرے دوست! تم نے حسن دیکھا ہو گا، ایک بار راجو کو دیکھو تو غش کھا جاؤ۔ قسم پروردگار کی! حسن کے اس پتلے پر سو شیر خاں

پان بخدا جیسے اپنے ہاتھ سے اس کی آنکھیں اور نقش بناتا رہا ہے۔ سم کی بناوٹ ایسی کہ ہالیوں کے ہل رک جائیں۔ شیر خاں سچ مچ پاگل ہو رہا تھا۔"

راجو نے راجہ کو پہلی بار دیکھا تھا۔ اس نے راجہ کی باتیں سنیں تو مونے نکل آئی۔ راجہ مایوس ہو کر گاؤں سے نکلا اور باجرے کے اونچے اونچے کھیتوں میں سے گزرتا اپنے گاؤں جا رہا تھا — "ذرا ٹھہرنا!" پیچھے سے آواز آئی۔ وہ رک گیا۔ گھوم کے دیکھا۔ راجو آرہی تھی۔ گھوڑی سے اتر پڑا۔

"کون ہو تم؟"

"شیر خاں کا دوست" راجہ نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "لوگ پگڑی بدلتے ہیں، ہم نے خون کے قطرے بدلے ہیں۔"

"اللہ تیری جوانی ہیں اور خون ڈالے۔" راجو راجہ کے قدموں میں بیٹھ گئی اور اس کے پاؤں چھو کر کہا "میرے خون کا قطرہ قطرہ شیر وہ پہ قربان۔ مجھے اسی کے پاس لے چل تمہیں تو معلوم ہی ہے مجھے کس دوزخ میں پھینکا جا رہا ہے۔" راجہ نے اسے کندھوں سے تھام کر اٹھایا تو راجو زار و قطار رونے لگ گئی۔ "تیری گھوڑی جیئے میرے سگے ویر! اسی پہ بٹھا کے لے چل۔"

راجہ کے جذبات امنڈ آئے۔ ایک ولولہ شعلے کی طرح بھڑکا۔ اس نے ہاتھ راجو کے سر پہ رکھ دیا۔ بولا "سگا ویر بہن کو اسی گھوڑی پہ لے جائے گا۔"

راجو کانپ سی گئی۔ اس نے راجو کا ہاتھ پکڑ کر چوما، پھر اپنے گالوں پہ رکھا اور جذبات سے مغلوب ہو کر بولی "قسم کھاؤ تم پیٹھ نہ دکھاؤ گے۔ قسم کھاؤ دستگیر گیارھویں والے کی کہ تم ہمیں دھوکہ نہ دو گے۔"

راجہ نے قسمیں کھائیں اور راجو سے جذبات کے جوار بھاٹے سے نکال کر اپنے ساتھ فرار ہونے کی عملی صورت پہ بات چیت کی۔

"جب آؤ چلی چلونگی۔" راجو نے کہا۔ "لیکن رات کو آنا۔ اسی جگہ کھڑے ہو کر گیدڑ کی طرح تین دفعہ چیخنا اور میں پہنچ جاؤں گی۔ شیر و مجھے اسی طرح بلایا کرتا ہے۔ اس سے پوچھنا میں آواز سنتے ہی آجاتی ہوں، یا نہیں۔"

"میں آؤنگا، دو رات بعد۔"

"لیکن تم ہی آنا" راجو نے کہا۔ "شیر و کو نہ بھیجنا۔"

"کیوں؟" راجو چونکا۔

"اس لئے..... صرف اس لئے کہ .....؟" وہ جھجک سی گئی، پھر یکبارگی بولی "ایسے موقعوں پر پکڑے جانے کا ڈر رہتا ہے۔ قتل ہوتے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ قتل ہو جائے۔"

"تو تم مجھے قتل کرانا چاہتی ہو؟" راجہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میرے تین بچوں کو یتیم کرنا چاہتی ہو؟"

"میرے ویرا!" راجو نے لجائی ہوئی سی آواز میں کہا۔ "دوست دوستوں کی خاطر قتل ہوا ہی کرتے ہیں نا!..... مگر۔ نہیں، میرا ویر زندہ رہے گا پہلے تو اس کی یہ بہن مرے گی۔"

راجہ نے مجھے بتایا کہ راجو نے یہ فقرہ کچھ ایسے پُرعزم لہجے میں کہا تھا جیسے اس کے سینے سے کوئی غیبی طاقت بول رہی تھی۔ آواز مختلف لب و لہجہ مختلف اور اس کے چہرے کا تاثر بالکل ہی بدل گیا تھا۔

وہاں سے راجہ، شیر خاں کے گاؤں گیا اور اسے تمام روداد سنائی۔ شیر خاں نے اسے بتایا کہ اس کی چھٹی میں چار روز باقی ہیں۔ تیسری رات وہ گاڑی پہ جا رہا ہے۔ ویران سا ریلوے سٹیشن چھ کوس دور تھا جہاں نصف شب کے بعد ایک مسافر گاڑی دو منٹ کے لئے رکتی تھی۔ راجہ اور شیر خاں نے سکیم طے کر لی تھی۔

تیسری رات کی تاریکی میں راجہ گھوڑی پہ سوار، ہاتھ میں بھری ہوئی دو نالی بندوق اٹھائے راجو کے گاؤں کے قریب جا کر تین دفعہ گیدڑ کی طرح چیخا گھوڑی ہنہنائی اور گاؤں کے کتے یکبارگی بھونک اٹھے۔ پندرہ منٹ کے بیتابانہ انتظار کے بعد باجرے کی فصلوں پہ تیرتا ہوا ایک سر راجہ کی طرف تیزی سے بڑھنے لگا۔ گاؤں والوں کو کتوں نے یکبارگی بھونک کر جگا دیا تھا۔ راجو پہنچ گئی۔ راجہ نے جھک کر راجو کو اٹھا لیا اور اپنے آگے گھوڑی پہ بٹھا لیا۔ راجو بولی "جلدی، لوگ جاگے ہوئے ہیں۔" اُدھر گاؤں میں سے آواز آئی "خبردار بھئی اوئے! ہوشیار ہو کے۔" پیشتر اس کے کہ گاؤں والے کچھ دیکھ پاتے راجہ کی گھوڑی راجہ اور راجو کو اٹھائے گاؤں کو دو میل پیچھے چھوڑ آئی تھی۔

ہُو حق ویران سے سٹیشن میں مسافر گاڑی کی روشنی داخل ہو چکی تھی۔ شیر خاں ایک درخت کے اندھیرے سائے میں کھڑا ہوا گاڑی

کی جی کو بے قراری سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے اسے وہیں روک دینا چاہتا ہو۔ ابھی راجو نہیں پہنچی تھی۔ ادھر گاڑی بڑھی چلی آ رہی تھی، ادھر گھوڑی کے قدموں کی آواز شیر خاں کی طرف بڑھنے لگی۔ شیر خاں بھاگا۔ راجہ نے باگیں کھینچ لیں اور راجو چھلانگ لگا کر شیر خاں کے بازوؤں میں آ گری۔

گاڑی سٹیشن میں بمشکل رکی ہی تھی کہ انجن نے روانگی کی وسلیں دینی شروع کر دیں۔ شیر خاں نے راجو پہ چادر ڈال دی اور راجہ سے بغلگیر ہو گیا۔ راجو نے راجہ کے ہاتھ چومے، پھر گھوڑی کی گردن کے بوسے لئے اور بولی "میرا ویر جیئے، ویر کی گھوڑی جیئے"۔

شیر خاں اور راجو گاڑی کی طرف بھاگے۔ راجہ نے بندوق لہرا کر انہیں الوداع کہی۔ گاڑی چلی گئی۔ ریلوے سٹیشن پھر ویران ہو گیا۔

راجہ نے سکون کا سانس لیا اور فتح سے لبریز آہ بھری۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے دوست کے ایثار کی قیمت ادا کر دی ہے۔ لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ یہ اس قیمت کا عشرِ عشیر بھی نہیں تھا جو اسے ابھی ادا کرنا تھی۔

تیسری شام راجہ کے ہاں دو آدمی آئے اور بغیر سلام دعا کے اسے دھمکی بھرے لہجے میں کہا کہ لڑکی واپس کر دو۔ اسمبلی کے ممبر کو یقین تھا کہ راجہ کے اغوا میں راجو کا ہی ہاتھ ہے۔ راجہ نے لاعلمی کا اظہار کیا تو دونوں آدمی اسے دھمکی دے کر گھورتے ہوئے چلے گئے۔ مسلسل آٹھ روز ممبر اور راجو کا باپ راجہ اور شیر خاں کے ماں باپ کے پیچھے پڑے رہے۔ آخر ایک روز ممبر راجہ کے گھر آیا۔

"لڑکی لوٹا دو یا چکی میں پسنے کے لئے تیار ہو جاؤ" اس نے راجہ کو دھمکی دی۔

"لڑکی کو میں نے ہی اغوا کیا تھا" راجہ نے چیلنج قبول کرتے ہوئے کہا۔ "وہ شیر خاں کے ساتھ بیاہی جا چکی ہے۔ میں نے کہا نہیں تھا راجو شیر خاں سے بیاہ کرے گی؟ جاؤ اب زور لگا لو"۔

"میں تمہیں قتل نہیں کراؤں گا" حاکم زمیندار نے کہا۔ "ایسے شکنجے میں جکڑوں گا تمہیں کہ تمہاری رگ رگ کا خون نچوڑ لوں گا"۔

راجہ نے یہ چیلنج بھی قبول کر لیا۔

چوتھی صبح طلوع ہو رہی تھی کہ راجہ کو بیوی نے جگایا۔ وہ ڈری سہمی ہوئی تھی۔ بولی "پولیس آئی ہے"۔

راجہ باہر نکلا تو پولیس کے ایک انسپکٹر نے اسے وارنٹ گرفتاری دکھلائے۔ اسے بتایا گیا کہ اسمبلی کے اس ممبر کے ایک مزارع کے قتل کے الزام میں اسے گرفتار کیا جا رہا ہے۔ راجہ نے بات تک نہ کی کہ اس نے کسی کو قتل نہیں کیا، نہ یہ پوچھا کہ قتل کہاں ہوا ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ آگے کر دیئے اور ایک سپاہی نے ہتھکڑیاں پہنا دیں۔

استغاثہ کی کہانی ایسی خوبی سے گھڑی گئی تھی کہ راجہ کا وکیل چکرا گیا۔ کہانی کا تانا بانا ایسے طریقے سے تیار کیا گیا تھا کہ راجہ بری طرح الجھ گیا۔ استغاثہ کے گواہوں نے ایسی چابکدستی سے جھوٹ بولے کہ وہ فی الواقع موقع کے گواہ معلوم ہوتے تھے۔ حد یہ کہ ایک سرکاری ڈاکٹر نے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی پیش کر دی اور کیس مکمل ہو گیا۔ شہادتیں اور ثبوت مکمل ہو گیا۔ مقتول کی لاش کہاں تھی؟ کسی کو معلوم نہ تھا۔

راجہ کو سزائے موت دے دی گئی۔

راجہ نے زمین بیچ کر ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔

پشاور سے راجو اور شیر خاں اسے ملنے آئے۔ وہ پھانسی کی کوٹھڑی میں تھا۔ راجہ کو توقع تھی کہ راجو روئے گی اور اپیل کی منظوری کی دعائیں کرے گی لیکن اس کے چہرے کا تأثر یوں تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس نے راجہ کو حوصلہ اور تسلی دی اور سلاخوں میں سے ہاتھ اندر کر کے راجہ کے ہاتھ تھام کے کہا۔

"میرا ویر زندہ رہے گا"۔

ہائی کورٹ نے ایک سال بعد اپیل مسترد کرتے ہوئے سزائے موت بحال رکھی۔ استغاثہ کی کہانی مکمل تھی۔ بظاہر قانون کے سارے تقاضے پورے تھے۔

شیر خاں نے کچھ زمین بیچی، سوپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔ راجو اور شیر خاں ایک بار پھر راجہ سے ملنے آئے تو راجو نے پھر وہی بھرپور اعتماد ظاہر کیا۔

دس ماہ بعد سوپریم کورٹ نے بھی اپیل مسترد کر دی اور سزائے موت بحال رکھی۔

راجہ کی بیشتر زمین مقدمے کی نذر ہو چکی تھی۔

پھر گورنر کے حضور رحم کی درخواست بھیجی گئی جو دفتری مراحل طے کرتی ہوئی ایک سال بعد نامنظور ہو گئی۔ باقی ص۱۳۰ پر

کوِی دا

آدم جی ادبی انعام (بنگلا ۱۹۶۰ء)

تصنیف : سید عبدالستار (پیرس ریسنا)
ترجمہ : یونس احمر

کردار

قاضی نذرالاسلام	کوِی دا	
بلبل	نذرل کے تین لڑکے	
بستو ساچی		
اونی رودھو		
پراباہ — (کوی دا کے بچپن کا دوست)	کوی دا کے دوست احباب	
منظفر احمد		
پوتر گنگولی		
شیلجانند مکرجی		
نرا پندرا کرشن چٹرجی		
نلینی کانت سرکار		
قاضی عبدالودود		
خان معین الدین		
شانتی پدسنگھ		

شرت پنڈت	اسکول ماسٹر
عباس الدین احمد	عظیم موسیقار
پرفیسر ہیم دت گپتا	نذرل کے خیرخواہ
بریندرا سین گپتا	(بیراج سندری کا لڑکا)
ہمنت کمار سرکار	کانگریس لیڈر
عبدالحمید	نذرل کا پرستار
نرگس اثر خانم	نذرل کی پہلی بیوی
پرامیلا دیوی (آشالتا سین گپتا)	نذرل کی دوسری بیوی
گریبالا دیوی	پرامیلا کی ماں
بیراج سندری دیوی	پرامیلا کی چچی
کملا	بیراج سندری کی لڑکی
چھایا	پرامیلا کی سہیلی
لتیکا گھوش	نرس

"منظر : تخیل"

نذرل کی خوابگاہ

خاموش اور ساکت رات۔ پچھلے حصے میں ایک چارپائی پر نذرل اکیلا ہی محوِ خواب ہے۔ بستر پہ پہلے ہلکی تاریکی رہتی ہے، پھر اندھیرا گھپ ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد سازینہ جھنجھناتا اٹھتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ بستر پر رنگین روشنی کی پھوار سی گرنے لگتی ہے۔ خواب کی دیوی داخل ہوتی ہے۔ درمیان میں باریک ہلکا پردہ لٹک رہا ہے۔ پردے کے اس سمت نیند کا ماتا نذرل ہے۔ تخیل کے آہنگِ پُرخروش میں ڈوبا ہوا رقص سامنے آتا ہے جس سے نیند کے ماتے نذرل کے شباب کی والہانہ کیفیت کا اظہار مقصود ہے چہرے پر بھرپور جوانی کا جوش جھلکتا ہے۔

(پس منظر سے آواز)

"کون جانے میں اکیلا مسافر کہاں جا رہا ہوں؟"
دونوں طرف دکھ سکھ کے دو کنارے ہیں اور درمیان میں ہیں چہل
اور روانی کی لہریں!
زندگی کے پربت سے گرتے جھرنے اپنے ہی بہاؤ میں بہا جا رہا ہوں۔
ایک رہگذر سے دوسری رہگذر کی طرف، دن رات بے چین
آرام سے بے پروا!
میں بھاگا جا رہا ہوں، نہ جانے کہاں اور کچھ ہیں کہ معلوم نہیں

میرے لئے دام بچھاتے ہیں۔
شاید وہ سمجھتے ہیں کہ میں پہاڑوں کو چیر کر اُن ہی کی طرف آرہا ہوں"۔

نیند کا ماتا نذرل ـــــ اوّل اوّل اس کے چہرے پر مسرت و انبساط کی چمک ہے۔ وہ پرسکون ہے۔ لیکن پھر اس کے رگ و پے میں بجلی کی سی کیفیت سما جاتی ہے۔

(پس منظر سے آواز)

"میں جانتا ہوں، مجھے سب معلوم ہے کہ دونوں کناروں سے وہ والہانہ انداز میں بلا رہی ہیں اور جھیل کی طرف سے کنول کی آواز آرہی ہے۔
اب رک بھی جاؤ ہمیں اک گھر بسانا ہے"۔

باہر سے نرگس داخل ہوتی ہے۔ ایک تمثال خوبی، جمال عالمتاب، بھرپور جوانی، چال میں رقص کی دلربائی لئے ہوئے۔

(پس منظر سے آواز)

"میں کنمن کنمن کرتی ہوئی رواں دواں ہوں ـــــ بہتی جا رہی ہوں۔
گھر میں عورتیں سرگوشیاں کر رہی ہیں کہ میرا ساحل کہاں ہے ـــــ
مگر میں نہیں سنتی۔
سوداگر کی بیٹی جو ٹھہری ہیں ـــــ میری ناؤ لعل و گہر سے لدی ہوئی چلی جا رہی ہے"۔

نیند کے ماتے نذرل کے سامنے نرگس نمودار ہوتی ہے ـــــ نگاہیں چار ہوتی ہیں۔ حیرت و استعجاب اور مسرت و خوشی کی فضا میں دونوں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یکایک اندیشہ ہائے دور دراز کی گہری پرچھائیں چہرے پر پڑتی ہے۔ اور نذرل بڑی تیزی سے باہر نکل جاتا ہے۔ نرگس بھی عالم اضطراب میں اس کے ساتھ ہی نکل جاتی ہے۔ کچھ دیر کے لئے اسٹیج پر اندھیرا سا رہتا ہے۔ روشنی مدھم ہے ـــــ ساز بج رہا ہے۔

(پس منظر سے آواز):

"بدبخت حسینہ چھپ چھپ کر آدھی رات کو میری طرف آتی ہے۔
میں اُس سے کہتا ہوں ـــــ چل اے ماہِ درخشاں میرے ساتھ کہ تیری شکل جانی پہچانی ہے"۔

پرامیلا داخل ہوتی ہے۔ روپ کی رانی، سندری۔ جو دیکھے اُس کے دل پر خنجر سا چل جائے۔ نذرل اُسے دیکھ رہا ہے۔ ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہے۔ محبت کا وار چل چکا ہے لیکن فوراً ہی نذرل کے دل میں نرگس سما جاتی ہے۔ وہ تڑپ اٹھتا ہے۔ اور پرامیلا یکایک اُس کے نزدیک آجاتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ساز بجنے لگتا ہے

(پس منظر سے آواز):

"وہ لہروں میں غائب ہو جاتی ہے،
میں اپنی راہ لیتا ہوں اور میرے حافظے کی ریت کے ڈھیر میں اُس کا حُسن کب کا ڈھک چکا ہے"۔

پرامیلا خوف سے کانپ رہی ہے اُدھر نیند کا ماتا نذرل بے چین ہے۔

(پس منظر سے آواز):

"ربِّ عظیم! یہ کیسی تشنگی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی!
تشنگی کہاں ہے؟ کہاں ہے تشنگی؟"

نذرل کے پیچھے پیچھے نرگس کی پرچھائیں ہے ـــــ سیاہ لباس اور غمزدہ چہرہ تاکہ نذرل کی نگاہ اُس پر نہ پڑ سکے۔ اُس کی آنکھوں میں نفرت کی جوالا مکھی ہے پرامیلا مایوس ہو کر بیٹھ جاتی ہے۔

(پس منظر سے آواز):

"نہیں معلوم کس نامعلوم کشش کے زیر اثر کہاں چلا جا رہا ہوں
جتنا آگے بڑھتا ہوں، دریا اور گہرا ہوتا جاتا ہے۔
چلو آگے ـــــ اور آگے، کہ مڑ کر دیکھنا لاحاصل ہے!"

سازینہ جھنجھنا اٹھتا ہے۔ نرگس باہر چلی جاتی ہے۔ نذرل پرامیلا کو حیرت و استعجاب سے دیکھتا ہے۔

(پس منظر سے آواز):

"کیچڑ سے لت پت ہوں ہنسی کو اپنے آنچل میں بھر کر
گھر واپس چلی جاتی ہیں۔
وہ چلی جاتی ہیں اور میں چتا میں جلتی ہوتی لاش کو لے کر جاگتا رہتا ہوں اور درد کی آندھی میں ڈوب کر میرا دل چیخنے لگتا ہے"۔

نذرل کے سر کے نیچے سے تکیہ کھسک جاتا ہے اور اُس کے منہ سے اُف اُف، آہ، آہ کی آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔

(پس منظر سے آواز):

"وہ دیکھ سیلاب کا پانی بڑھتا آرہا ہے۔ چل آگے چل آگے۔
یہاں کیچڑ سے تیرا جسم ہمیشہ گندہ رہے گا!
مسافر! یہاں آنکھوں کا سیلِ رواں تجھے کہاں ملے گا۔

تیرا انتظار تو سات سمندر کی موجِ بیکراں کر رہی ہے!"

اتنے میں نذرل پرآمیلا کو دیکھتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں۔ نذرل اُس سے ہم آغوش ہونا چاہتا ہے کہ یکایک خوفناک ہنسی سے فضا گونج اٹھتی ہے۔ سازینہ جھناکے سے بجنے لگتا ہے۔ روشنی مدھم ہے۔

(پردہ گرتا ہے)

پہلا ایکٹ

پہلا منظر

زمانہ — ۱۹۲۱ء وقت: رات کے بارہ بجے۔ مقام: کومیلا۔
بیراج سندری دیوی کا بیٹھک خانہ۔

ایک طرف میز پر کھانا ڈھکا ہوا رکھا ہے۔ پانی سے بھرا ہوا گلاس ہے۔ نمکدان بھی پاس ہی رکھا ہوا ہے۔ پرآمیلا رومال میں پھول کاڑھ رہی ہے۔ کملا کچھ بُن رہی ہے اور ٹھنڈی آہ بھی بھرتی جاتی ہے دونوں ہم عمر ہیں۔

کملا: (سرد آہ بھرتے ہوئے) اب میں اٹھتی ہوں۔ تم سوؤ گی نہیں؟

پرامیلا: کچھ دیر اور۔ نیند آگئی تو کاکی ماں خفا ہو جائیں گی۔

کملا: خفا ہوں گی — ہنہ! میں تو چلی۔

پرامیلا: مگر کاکی ماں!

کملا: ارے جانے بھی دو۔ میں ڈرتی نہیں کسی سے۔ (جاتے جاتے رک جاتی ہے) تم تارے گنتی جاؤ۔

(پرآمیلا پھول کاڑھنے لگتی ہے اور کہیں دور سے گھڑیال کی آواز سنائی دیتی ہے)

پرامیلا: (گنتے ہوئے).... دو — چار — چھ — آٹھ — دس بارہ! ایں، بارہ بج گئے!

(بیراج سندری داخل ہوتی ہے۔ وہ پرامیلا کی کاکی ماں ہے)

بیراج: دُدکھو (نذرل) نہیں آیا اب تک! اور تُو — تو اکیلی ہے؟ کملا کہاں ہے؟

پرامیلا: اُسے نیند آ رہی تھی اسی لئے — کاکی ماں مجھے سب پتہ چل گیا ہے۔ ترددا نے بتایا کہ قاضی دا عجیب وغریب انسان ہیں۔ گلے میں ہارمونیم لٹکا کر اور سر کے لمبے لمبے بال منتشر کر کے باغیانہ نظمیں گاتے پھرتے ہیں۔ اُن کی نظموں کی بازگشت سے پورے کومیلا میں آگ لگ گئی ہے۔

بیراج: کچھ کھایا بھی اس نے دن بھر؟

پرامیلا: ترددا نے بتایا کہ دن بھر صرف چائے پیتے رہے۔

بیراج: میرا دل کہتا ہے کہ اگر وہ اسی طرح چائے پیتا رہا تو ایک نہ ایک دن پاگل ضرور ہو جائے گا۔ (تڑپ کر) یہ سارا کیا دھرا اُسی کمبخت گاندھی کا ہے۔ عدم تعاون کا راگ الاپ کر لڑکوں کو بگاڑ رہا ہے۔

(پردہ گرتا ہے)

پہلا ایکٹ

دوسرا منظر

زمانہ: ۲۶ ستمبر ۱۹۲۲ء۔ مقام: ۳ پرتاب چٹرجی لین کلکتہ۔
—— نذرل کے ہفتہ وار بنگلا جریدہ "دھوم کیتو" کا دفتر۔

ایک طرف ٹوٹا پھوٹا تخت ہے اور دوسری طرف لمبی سی میز۔ اس پر فلاسک، چائے کی پیالیاں، ایک طشتری میں پان کی گلوریاں، ہارمونیم اور دوسری چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ نیچے اگالدان بھی ہے۔

(پراباہ، نذرل کے بچپن کا دوست، سوٹ میں ملبوس داخل ہوتا ہے۔ منہ میں سگریٹ ہے)

پراباہ: ہیلو، کزی!

نذرل: بہت دنوں بعد دیکھا تمہیں۔ تھے کہاں؟

پراباہ: بنجارہ جیسی زندگی تم بھی گذار رہے ہو، میں بھی گزار رہا ہوں۔ سارے یورپ کا سفر کرلیا۔

نذرل: اتنے روپے کہاں سے آئے تمہارے پاس؟

پراباہ: مطلب؟ تو کیا میں بھی تمہاری طرح مفلس و قلاش ہوں؟

نذرل: مفلس (طنزیہ ہنسی)

پراباہ: ہنسے کیوں؟

نذرل: اس لئے کہ چھ سال پہلے جب آخری بار ہم ملے تھے۔ اُس وقت تم بھی مفلس ہی تھے۔

پراباہ: یہ تو ماضی کی باتیں ہوئیں۔ پیارے میرا خسر بہت بڑا زمیندار تھا۔ اور بیوی اپنے ماں باپ کی اکلوتی لڑکی۔ خسر کے مرنے کے بعد ساری جائداد پر میرا قبضہ ہو گیا۔ اب تو میرا کام صرف سیر و تفریح کرنا ہے۔ جنگ کے زمانے میں یورپ ہی ایک جگہ

گیا تھا۔

نذرل: تو پھر سناؤ وہاں کا حال۔

پراباہ: انگریزوں اور فرانسیسیوں کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑی ہوئی تھی۔ اُدھر کمال اتا ترک، اِدھر شیرِ مصر زغلول ــــ میں تو انہیں دیکھ بھی چکا ہوں۔

نذرل: تم دیکھ چکے ہو؟ کیسے ہیں وہ؟

پراباہ: بے مثال! اُن کو اپنے عوام سے بے پناہ محبت ہے۔ وہ اپنے ملک کو بالکل آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔

نذرل: اور میں بھی یہی چاہتا ہوں، پراباہ کہ میرا ملک آزاد ہو جائے۔ اسی لئے تو "دھوم کیتو" کا اجرا کیا ہے۔ اس کی پالیسی ہے ملک کی مکمل آزادی۔ ظلم و جور اور بے انصافیوں کا دشمن ہوں میں۔ میں مذہب کا قائل نہیں۔ راجہ مہاراجہ کو تسلیم نہیں کرتا۔ خون کا بدلہ خون ــــ انصاف اصل میں یہ ہے۔

پراباہ: مگر یہ راستہ تو ــــ

نذرل: ہاں تخریب ہی میں تعمیر چھپی ہوئی ہے۔ میں انقلاب چاہتا ہوں۔ نظامِ کہنہ کی جگہ نظامِ نو۔

پراباہ: (گھڑی دیکھتے ہوئے) بہت دیر ہو گئی مجھے۔ اب اجازت دو۔ ارے ہاں یہ کہنا تو بھول ہی گیا کہ بہت جلد روس جا رہا ہوں۔

(پراباہ رخصت ہوتا ہے اور نذرل ہارمونیم پر گانا شروع کر دیتا ہے۔ اسی اثنا میں مظفر احمد داخل ہوتے ہیں۔ ان کے چہرے پر فکر و تردد کے آثار ہیں)

نذرل: ارے مظفر بھائی ــــ کب آئے آپ؟

مظفر: جب تم گانے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ آج تم سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔

نذرل: ضروری؟ خدا خیر کرے (قہقہہ) کہئے۔

مظفر: پہلی بات یہ کہ ایک ALLEGATION ــــ

نذرل: ALLEGATION، کس کے خلاف؟

مظفر: تمہارے خلاف۔ میرا خیال ہے کہ تم تھوڑی دیر پہلے جو گیت گا رہے تھے وہ ایک خاص نظام، ایک خاص طبقہ کی نمائندگی کرتا ہے۔

نذرل: مطلب؟

مظفر: یعنی اس میں متوسط طبقہ کی آواز ہے۔ میرا مطلب ہے تمہاری نظموں میں صرف بنگال کے متوسط طبقہ کی آزادی کا اشارہ ملتا ہے۔

نذرل: ذرا اور وضاحت کیجئے۔

مظفر: میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے پاس دہشت پسند پارٹی کے لوگ آنے لگے ہیں۔

نذرل: تو حرج ہی کیا ہے؟ میں بھی تو یہی چاہتا ہوں۔ میرے "دھوم کیتو" کی آواز بھی ہے۔

مظفر: تم نے میرا مطلب نہیں سمجھا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا متوسط طبقہ کے چند دہشت پسند افراد ملک کو آزادی سے ہمکنار کر سکتے ہیں؟

نذرل: آپ کے خیال سے مجھے اتفاق نہیں۔ میں کانٹے ہی سے کانٹا نکالنا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح آزادی نہ ملے، آزادی کے لئے راہیں تو ہموار ہو سکتی ہیں۔ ان کی سرگرمیاں دیکھ کر عوام کے اندر جذبۂ آزادی کے شعلے بھڑکیں گے۔ میں کسی خاص نظام کا پرستار نہیں ہوں۔ میں تو دکھ درد کا شاعر ہوں۔ شاعرِ انسانیت ہوں۔ مظلوم اور ستم رسیدہ انسانوں کو آزادی دلانا میرا کام ہے۔

مظفر: بلاشبہ تمہارا نصب العین بہت بلند ہے لیکن میں کچھ اور چاہتا ہوں ــــ!

نذرل: یعنی کیا؟

مظفر: میں چاہتا ہوں کہ تمہاری نظموں میں کسانوں اور مزدوروں کی زندگیوں کی تصویریں ہوں۔ کیا بتا سکتے ہو کہ تم نے ان کی زندگی کی عکاسی کی ہے؟

نذرل: میں شاعر ہوں۔ ان ہی کی دلوں کی دھڑکنیں تو میری نظموں میں سنائی دیتی ہیں۔ زندگی کی تصویر گری ناول نگاروں اور اداکاروں کا کام ہے۔ لیکن یقین مانیے میں خود ان باتوں پر غور کر رہا ہوں۔

مظفر: کسان اور مزدور ــــ یہ دو نام اس ملک میں گالی سمجھے جاتے ہیں۔ میری درخواست ہے کہ کسانوں اور مزدوروں کو بھی بیدار کرو۔ انہیں بتاؤ کہ وہ بھی انسان ہیں ــــ دو

ملک کی سب سے بڑی طاقت ہیں۔

(نرپندرا کرشن چیٹرجی گنگناتے ہوئے داخل ہوتا ہے وہ طالب علم ہے لیکن آنکھوں میں جیسے آتش فشاں چھپا ہوا ہے۔ اس کے عقب میں شیلجانند مکرجی ہیں — نذرل کے بچپن کے دوست)

نرپندر: (گنگناتے ہوئے)

آ دھوم کیتو (شہاب ثاقب) آ بھی جا
اور اندھیرے میں آگ کا پل باندھ دے!

نذرل: (گنگناتے ہوئے)

میں ہر صدی، ہر دَور اور ہر جُگ میں آتا ہوں
میری پیشانی میں سات سوجنموں کی آگ روشن ہے

(نلینی سرکار داخل ہوتا ہے)

نلینی: دو خبریں لے کر آیا ہوں — اچھی اور بُری!

نذرل: تو پہلے خوش خبری سنادو۔

نلینی: "دھوم کیتو" کے اس شمارے کا دو پرنٹ ختم ہوگیا۔ تیسرے کا آرڈر دے آیا ہوں۔

نذرل: اب بُری خبر بھی سنادو۔

نلینی: سنا ہے تم جلد ہی گرفتار کرلئے جاؤگے!

نذرل: گرفتار — اچھا! تو بس تیار سمجھو۔

منظفر: کہیں روپوش ہوجاؤ تو اچھا ہے، یا پھر چند روز کے لئے روس چلے جاؤ۔ میں سارا انتظام کردوں گا۔

نذرل: نہیں میں ملک سے باہر نہیں جاسکتا۔ ناممکن، خواہ میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

منظفر: تو پھر کلکتہ سے کہیں دور چلے جاؤ۔ گرفتار ہوئے تو "دھوم کیتو" بھی بند ہوجائے گا۔

نذرل: "دھوم کیتو" کی آگ کبھی نہیں بجھ سکتی۔ اس کی آگ میں سب بھسم ہوجائیں گے۔

پوتر: ٹھیک ہے تم کہیں روپوش ہوجاؤ۔ منظفر ٹھیک ہی کہتے ہیں۔

نذرل: (کچھ سوچ کر) تو میں سمستی پور جاتا ہوں۔

شرت: سمستی پور!

نذرل: ہاں پرامیلا کے ماموں وہیں ہیں۔

(پردہ گرتا ہے)

پہلا ایکٹ
تیسرا منظر

زمانہ: ۲ر اپریل ۱۹۲۶ء۔ روز جمعہ۔ وقت: شام۔ مقام: کرشن نگر نذرل کی قیام گاہ۔

(پراباہ داخل ہوتا ہے جسم پر خوبصورت سوٹ اور سر پر فیلٹ ہیٹ ہے)

پراباہ: (کچھ یاد کرتے ہوئے) ماسی ماں! اوماسی ماں (گریبالا داخل ہوتی ہے)

گریبالا: کون؟

پراباہ: میں ہوں پراباہ۔

گریبالا: نذرل کی زبانی تمہارے بارے میں بہت کچھ سن چکی ہوں۔ بیٹھو کب لوٹے تم اپنے سفر سے؟

پراباہ: کل ہی لوٹا ہوں۔ جب معلوم ہوا کہ نذرل کرشن نگر میں ہے میں فوراً بھاگا۔

گریبالا: میں تو پریشان ہوگئی ہوں نذرل کی وجہ سے۔ جتنا لگام کھینچتی ہوں وہ فرار ہونے کی اتنی ہی کوشش کرتا ہے۔

پراباہ: وہ تو بندھنوں سے آزاد ہے۔ اُسے آپ باندھ کر نہیں رکھ سکتیں۔

گریبالا: بس یہی فکر مجھے کھائے جارہی ہے۔ ایک لڑکی ہے میری اور کوئی نہیں دنیا میں۔ نذرل جیسے پاگل کے ساتھ اس کی شادی کرکے اچھا نہیں کیا۔ کوئی رات ایسی نہیں گزری کہ میں بے فکر ہوکر سوئی ہوں۔ لڑکی بھی اتنی نیک ہے کہ سب کچھ سہہ لے گی پر منہ سے کچھ نہ پھوٹے گی۔

پراباہ: نذرل ہے کہاں ان دنوں؟

گریبالا: اور کہاں جائے گا۔ الیکشن میں مصروف ہے۔ ہمنت کو فتح دلانے کے جنون کے علاوہ اُسے اور کسی بات کی فکر نہیں۔ ہمنت کو تو جانتے ہی ہوگے؟

پراباہ: ہمنت کمار سرکار؟

گریبالا: ہاں، اس بار وہ کانگریس کے ٹکٹ پر صوبائی انتخاب لڑ رہا ہے اس کی وجہ سے تو ہم ہگلی سے یہاں آگئے۔ یہ بھی اچھا ہوا ورنہ وہاں ہوتے تو فاقہ کشی کی نوبت آجاتی۔

پراباہ: کتابوں اور رسالہ کی فروخت سے تو خاصی آمدنی ہوجاتی ہوگی۔

گر یبالا: تم تو جانتے ہو اس کی عادت۔ اِدھر پیسے آئے اُدھر منٹوں میں خرچ۔ بیٹھو میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔

(گر یبالا جاتی ہے، اور ہمنت داخل ہوتا ہے)

ہمنت: آپ کون؟

پراباہ: اور آپ؟

ہمنت: میں ـــ؟ آپ جاننا چاہتے ہیں، تو سنئے یہ مکان میرا ہے۔

پراباہ: وہ تو میں جانتا ہوں کر آپ ہمنت کمار ہیں۔

(گر یبالا داخل ہوتی ہے۔ ہاتھ میں چائے کی پیالی ہے)

گر یبالا: کیا بات ہے ہمنت؟

ہمنت: دیکھئے تو ماسی نہ جان نہ پہچان ـــ اور بکواس شروع کر دی۔

گر یبالا: ارے نہیں جانتے اس کو۔ یہ ہے پراباہ ـــ نذرل کا دوست

پراباہ: ماسی ماں، اور بھابی کہاں ہیں؟

گر یبالا: پرامیلا؟ طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس کی۔ اُدھر کئی ماہ سے اُس نے کھانا پینا ہی ترک کر دیا ہے۔ کھانے کی ہر چیز دیکھ کر ناک سکیڑ لیتی ہے۔

پراباہ: تو یوں کہیئے، ماسی ماں کیا یہ پہلا ـــ؟

گر یبالا: نہیں۔ پہلا بچہ آزاد کمال کب کا فوت ہو گیا۔ یہ دوسرا ہے۔

ہمنت: نذرل تو آ گیا ہے ماسی ماں۔ ہمارے گھر آیا تھا۔ یہاں بھی آتا ہی ہوگا۔ میں چلا۔

گر یبالا: ارے کیوں، چائے تو پی لو۔

ہمنت: نہیں ماسی ماں، کام کا انبار ہے (ہمنت چلا جاتا ہے)

گر یبالا: ارے چائے ٹھنڈی ہو گئی تمہاری۔ لو پیو جب تک میں اندر سے ہو آؤں۔

(نذرل داخل ہوتا ہے)

نذرل: ارے تم!

پراباہ: بتاؤ کیسی گذر رہی ہے؟

نذرل: کچھ نہ پوچھو۔ ذرا بھی سکون نہیں ہے۔ امن اور سکون کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں مگر ـــ لانگل کے پہلے شمارے میں وہ ساری نظمیں شائع ہوئی ہیں جو مساوات کے موضوع پہ ہیں۔ مجھے پختہ یقین ہے کہ مساوات ہی میں امن پوشیدہ ہے۔ لیکن (سرد آہ بھرتا ہے)

پراباہ: لیکن کیا؟

نذرل: لیکن کہاں ہے مساوات۔ ہر طرف تو اندھیرا نظر آتا ہے۔

پراباہ: یہی حال میں روس میں دیکھ کر آیا ہوں۔

نذرل: مگر وہ تو ایسا ملک ہے جہاں امرت ندی بہتی ہے۔

پراباہ: پیارے گلاب میں بھی کیڑے ہوتے ہیں۔ اندر کی خبریں کیسے مل سکتی ہیں۔ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔

نذرل: کیا دیکھا تم نے؟

پراباہ: لینن کی حد تک تو ٹھیک تھا لیکن اب وہاں آمریت ہے ذہنی آزادی کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے ـــ اچھا چلا۔

(پراباہ رخصت ہوتا ہے، اور پرامیلا داخل ہوتی ہے)

نذرل: اوہو ـــ بہت خفا نظر آتی ہو ـــ شاید اسی لئے ـــ

پرامیلا: چھوڑ دو مجھے۔ کب تک آخر یوں زندگی گذرے گی؟

نذرل: میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔

پرامیلا: جب دیکھو مجھ سے دور دور رہتے ہو۔

(خان معین الدین کی آمد)

معین: کوی دا!

نذرل: کیا بات ہے معین؟ اتنے پریشان کیوں ہو؟

معین: کلکتہ میں فساد ہو گیا۔ ہندو مسلم فساد۔

نذرل: ہندو مسلم فساد؟

معین: ہاں۔ ماں کے سامنے شیر خوار بچوں کو دو ٹکڑے کر دیا گیا۔

نذرل: اُف!

معین: سنا ہے "دیش بندھو" کے ہندو مسلم اتحاد فارمولا کو ختم کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بمبئی میں موپلا نے بغاوت کر دی

نذرل: موپلا؟

معین: مالابار کے مسلمان۔

نذرل: اور کانگریس کیا کر رہی ہے؟

معین: خاموش ہے۔ تم تو انتخابات میں اتنے مصروف ہو کہ فساد کی خبر ہی نہیں ملی تمہیں۔

نذرل: "دیش بندھو" کہاں ہو اس وقت؟ ہنس رہے ہو یارو ہو؟ ہاہاہا ـــ انتخاب؟ یہ تو ایک بہانہ ہے! لوگوں کا ہے کہ عوام کا شاعر ہوں۔ ہاں ٹھیک ہے۔

(دردناک آواز میں گنگنانے لگتا ہے)

"خالد نے شمشیر سنبھال لی ہے اور ارجن تیراندازی کے جوہر دکھا رہا ہے۔
بھارت بیدار ہوگیا ـــ ہندو اور مسلمان لاٹھی سے مسلح مقابلے کے لئے آگئے"!

(ہنستے ہنستے نذرل دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ لکھنے کا موڈ طاری ہوگیا ہے معین اور پرامیلا چپ چاپ ہیں)

(پردہ گرتا ہے)

دوسرا ایکٹ

پہلا منظر

زمانہ: ۱۰ اپریل ۱۹۲۹ء وقت: شام۔ مقام: کرشن نگر، نذرل کی قیام گاہ۔

(دروازے کے اوپر خوبصورت حروف میں تحریر ہے۔ 'GRACE COTTAGE' سامنے باغیچہ ہے بکول درخت کی ایک شاخ جھکی ہوئی ہے جس کے نیچے ایک سفید میز پر پوسٹ کارڈ رکھا ہوا ہے اور چند کتابیں بھی ہیں۔ قریب ہی تین چار کرسیاں بھی رکھی ہوئی ہیں گریبالا آٹھ ماہ کے بچہ بلبل کو گود میں لئے داخل ہوتی ہے۔ بلبل رو رہا ہے)

گریبالا: (چپ کراتے ہوئے) میرے چاند نہ رو۔ نہ رو۔ اچھی سی دلہن لادوں گی تیرے لئے۔ خوبصورت سا پھول دوں گی۔ نہ رو۔
(پریشان ہوکر بیٹھ جاتی ہے۔ بلبل چپ ہونے کا نام نہیں لیتا)
(پرامیلا داخل ہوتی ہے)

پرامیلا: کیوں خفا ہو رہی ہو ماں! کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کدھر کدھر دیکھوں۔ کتنی بار منع کیا انہیں کہ بخار تیز ہو رہا ہے۔ باہر نہ جاؤ مگر ـــ میری بات کوئی نہیں سنتا۔

گریبالا: تو پھر کھاؤ گی کیا؟ اگر وہ روپے پیسے کی فکر میں باہر نہ جائے۔

پرامیلا: فاقے کرلوں گی ـــ تم ایسا نہ کہو ماں۔ کل بھی وہ خاک چھانتے رہے مگر کہیں سے کچھ نہ ملا۔ بھوکے پیاسے اُس پر سے تیز بخار۔ کچھ ہوگیا تو ـــ

گریبالا: (بلبل برابر رو رہا ہے) یہ ننھا سا بچہ کیسے فاقہ کرسکتا ہے۔ دودھ تو پلا دو اسے۔

پرامیلا: کتنی بار کہا تم سے کہ دودھ نہیں ہے۔ دو دن سے فاقہ ہے۔ دودھ آئے گا تو کہاں سے؟

گریبالا: پھر؟

پرامیلا: پھر ـــ پھر ـــ پھر! لاؤ بلبل کو میں لے لوں۔
(پوتر گنگولی، نرپن اور نلینی داخل ہوتے ہیں)

پوتر: (پرامیلا سے) تمہاری آنکھیں سرخ کیوں ہیں اور بلبل رو کیوں رہا ہے؟
(پرامیلا چلی جاتی ہے)

پوتر: کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ماسی ماں دو نو (پرامیلا) کی طبیعت ٹھیک تو ہے؟

نرپن: بیمار! جسمانی نہ سہی اقتصادی ضرور ہے۔ اچھا بتاؤ کیا کیا لاؤں بازار سے۔ ایک کاغذ پر لکھ دو۔
(کاغذ تلاش کرتے کرتے میز کی طرف بڑھتا ہے۔ اور پوسٹ کارڈ پر نظر پڑ جاتی ہے)

نرپن: خط؟ کس کے نام ہے یہ؟

پوتر: نذرل نے لکھا ہے برمن کو۔

نلینی: برج بہاری برمن؟ ذرا پڑھو تو کیا لکھا ہے!

پوتر: پڑھوں؟ اچھا لو سنو۔

کرشن نگر
۲۰ اگست ۱۹۲۷ء

پیارے برمن!

ان دنوں بیحد پریشان ہوں روزانہ SLOW FEVER رہتا ہے۔ روپیہ بھیجنے کا وعدہ کیا تھا تم نے آج بھی مایوسی ہوئی۔ گھر میں کوڑی چھدام تک نہیں ہے۔ خط پاتے ہی کم از کم بیس روپے ہی T.M.O. کے ذریعہ بھیج دو ورنہ بہت ساری مشکلات میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ سودا سلف تک کے لئے پیسے نہیں ہیں۔ بہت سے لوگوں کا مقروض ہو چکا ہوں کہیں سے مزید قرض ملنے کی امید بھی نہیں ہے۔

تمہارا
قاضی دا

نرپن: ناشروں اور مدیروں نے مل کر تباہ کر دیا اسے۔

پوتر : ایسے میں بخار نہ آئے تو کیا ہوگا۔
نرین: کوی دا گئے کہاں ماسی ماں ؟
گریبالا: پیسوں کی فکر میں
پوتر : بخار اور ــــ
نلینی : ماسی ماں سودا لانے کے لئے تھیلا اور ایک کیتلی دیجئے۔ نرین تم بھی چلو میرے ساتھ۔
پوتر : یہ کارڈ بھی پوسٹ کر دینا۔
نلینی : تم بیٹھو۔ ہم فوراً لوٹ آئیں گے۔
(دونوں چلے جاتے ہیں اور پوتر کلول پڑھنے میں مصروف ہوجاتا ہے۔ اسی اثنا میں نذرل گنگناتے ہوئے داخل ہوتا ہے)
نذرل : "میرے بچے دودھ کے دو قطرے بھی نہیں دے سکتا تھیں۔
خوشی و مسرت پر میرا کوئی اختیار نہیں۔
افلاس کبھی بچہ، کبھی بیوی کے روپ میں برابر میرے دروازے سے لگ کر بین کرتا ہے!
بانسری کون بجائے گا! مسرت و انبساط سے بھرپور قہقہے کہاں پاؤں گا۔
نسرین و یاسمین کی خوشبوئیں کہاں ملیں گی ؟"
(نذرل ہانپ رہا ہے۔ پوتر اُسے سہارا دیتا ہے)
نذرل : (چونک کر) کون ؟ ارے پوتر تم !
پوتر : ادھر آؤ۔ اس کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ اب اندیشہ نہ کرو میں آگیا ہوں۔ کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔
نذرل : اندیشہ ! میری لغت میں تو یہ لفظ کبھی نہ تھا۔ مگر ہاں ــ وہ بلبل۔ پوتر اس بلبل کی وجہ سے بس اندیشہ میں مبتلا ہوگیا ہوں۔ مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔
پوتر : وہ دیکھو سامنے ــــ نلینی دا اور نرین آ رہے ہیں۔
(نلینی اور نرین داخل ہوتے ہیں)
نلینی : ماسی ماں، او ماسی ماں !
(گریبالا داخل ہوتی ہے)
نلینی : یہ لیجئے۔ کیتلی میں دو سیر دودھ ہے اور لفافے میں شکر اور اس میں چاول۔ اور یہ تھیلا ــــ اس میں بہت کچھ ہے۔ سبزی، مچھلی، تیل، نمک وغیرہ (نذرل کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے) اور اس میں کوی دا کے لئے چائے، پان، زردہ وغیرہ۔
(کچھ دیر تک شور غل رہتا ہے پھر سب چلے جاتے ہیں کے چلے جانے کے بعد معین داخل ہوتے ہیں)
معین : کوی دا، سیدھے "سوغات" کے دفتر سے آرہا ہوں۔ خوشخبری آپ کے لئے۔
نذرل : مطلب ؟
معین : ۱۱ ویلیسلی اسٹریٹ یعنی سوغات کے دفتر کی نچلی منزل میں کمرہ کی مرمت ہو رہی ہے۔ آپ لوگ وہیں رہیں گے۔
نذرل : کلکتہ ! تو کیا ہم سچ مچ کلکتہ جا رہے ہیں۔
معین : ماسی ماں اور بھابی کو بھی خوشخبری سنا دوں۔
(پرامیلا داخل ہوتی ہے۔ ہاتھ میں شربت کا ایک گلاس روٹی کے چند ٹکڑے اور انڈے بھی ہیں)
نذرل : پرامیلا، آؤ ــــ ادھر نہیں، ادھر۔ بلبل کہاں ہے ؟
پرامیلا : معین کے پاس ہے۔
نذرل : آہ ! (روٹی کا ایک ٹکڑا ہاتھ میں لے کر پرامیلا کو گرفت میں لے لیتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

دوسرا ایکٹ

دوسرا منظر

زمانہ : ۱۹۲۹ء شام سے کچھ پہلے۔ مقام : مسجد باڑی اسٹ کلکتہ۔ نذرل کی قیام گاہ۔
(پرامیلا میز پر سرنگوں سسکیاں بھر رہی ہے۔ کچھ دیر بعد کی آہٹ سے وہ چونک اٹھتی ہے اور آنچل سے آنکھیں ہے۔ سامنے دو ماہنامے رکھے ہیں۔ چھایا داخل ہوتی ہے
پرامیلا : آؤ، آؤ، کہاں تھیں اتنے دنوں تک ؟
چھایا : رنگ پور گئی تھی۔ مگر تم اکیلی کیوں ہو؟ بلبل کہاں !
پرامیلا : ماں کے ساتھ کہیں گیا ہے،
چھایا : آنکھیں سوجی ہوئی کیوں ہیں تمہاری۔ رو رہی تھیں کیا
پرامیلا : ہاں ساری زندگی تو روتے ہی بیت گئی !
چھایا : ساری زندگی !

پرامیلا: ہاں یونہی سمجھو۔ باپ کے مرنے کے بعد سے دکھوں کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ اب تک چل رہا ہے۔

چھایا: لیکن تم جیسی خوش بخت اور کون ہوگی؟ تمہارا میاں اتنا بڑا شاعر ہے ــــ اتنا بڑا مشہور گائک۔ اتنی خوبیوں کا آدمی کہاں ملتا ہے بھلا۔ ان کے گانے سن کر لطف اندوز کون نہیں ہوا۔

پرامیلا: کبھی لطف اندوز میں بھی ہوتی تھی۔

چھایا: اور اب؟

پرامیلا: ہر سوال کا جواب نہیں دیا جاتا پیاری۔ آج تم سے دل کی ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ سوچا تھا اپنا ایک گھر بساؤں گی، چھوٹا سا ہی سہی۔ مگر یہ بھی نہ ہوا۔

چھایا: جانے دو ان باتوں کو پرامیلا۔

پرامیلا: نہیں میں کہوں گی۔ ایک ماہ کے بعد نذرل کل گھر لوٹے ہیں۔ آنے کے فوراً بعد ہی گراموفون کمپنی چلے گئے۔

چھایا: ایک ماہ تک کہاں رہے؟

پرامیلا: اپنے کسی دوست کے گھر۔ سنگیت کی محفل جمتی ہوگی۔ ایک خانہ بدوش کی زندگی بھی مجھ سے بہتر ہوگی۔ پچھلے سال کہاں کہاں نہ گئی۔ آج ہگلی تو کل کرشن نگر۔ ابھی سوغات کے دفتر، پھر پان بگان ــــ پھر مسجد باڑی۔ یہ تو زندگی کا ایک رخ ہوا دوسرا رخ بھی ہے۔ یہ دیکھو (ایک رسالہ دکھاتے ہوئے)

چھایا: یہ تو نذرل کی نظم ہے۔

پرامیلا: ہاں اسی کو میں پڑھتی رہی ہوں آج۔ تم بھی پڑھو ذرا بلند آواز سے۔

(چھایا نظم سناتی ہے)

"کیا شاعر کی شاعری محض تخیل ہے؟
نہیں رانی تم نہیں سمجھو گی۔ آگ ہی آگ جلے تب چولھا ٹھیک گرم ہوتا ہے اور پانی سے آواز نکلتی ہے۔
کیا اُس دن صرف شاعر رو دیا تھا؟ کیا اس کے اندر کے انسان نے آنسو نہیں بہائے؟
تم نے آنکھوں کے پپوٹوں میں صرف نفرت دیکھی، آنسو نہیں دیکھے؟"

چھایا: مگر یہ رانی کون ہے پرامیلا؟

پرامیلا: اسی نے تو میری زندگی تباہ کردی ہے۔ وہ ہے میری سوکن نرگس!

چھایا: مگر نذرل تو اُسے طلاق دے چکے ہیں۔

پرامیلا: پر وہ نذرل کو نہیں چھوڑتی۔ ڈائن کی طرح دن رات اس کے پیچھے پیچھے گھومتی ہے۔ نذرل کی اور بھی کئی عشقیہ نظمیں ہیں جو اُس کے تاثر کا نتیجہ ہیں۔ اُف!

چھایا: اور وہ کیا ہے دیکھوں!

پرامیلا: وہ ہے "سوغات" کا خاتون نمبر۔ اس میں میرا بھی ایک گیت شائع ہوا ہے۔

چھایا: تمہارا گیت ــــ دکھاؤ تو۔ ایں ــــ گیت کا عنوان ہے۔ "اندیشہ" ــــ کیسا اندیشہ؟ (پڑھنے لگتی ہے)

"میرے من میں درد کیوں اٹھ رہا ہے؟
کیوں بے سبب آنکھیں اشکبار ہیں؟
یہ کیسا درد ہے کہ میرا من کانپ کانپ اٹھتا ہے،
کسے معلوم کہ یہاں درد کی کتنی قبریں چھپی ہوئی ہیں؟
ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کائنات میں میرا کوئی نہیں ہے، کوئی بھی نہیں۔"

چھایا: کیا یہ حقیقت ہے؟

(نذرل کی آہٹ سنائی دیتی ہے)

پرامیلا: نذرل آرہے ہیں چلو اٹھو۔

(دونوں چلی جاتی ہیں۔ نذرل داخل ہوتا ہے۔ رسالے کا وہ صفحہ جس میں اس کی نظم شائع ہوئی ہے کھلا دیکھ کر چونک پڑتا ہے)

نذرل: مدن، مدن!

مدن: (دور سے) آیا صاحب (مدن داخل ہوتا ہے)

نذرل: کون آیا تھا یہاں؟

مدن: چھایا!

نذرل: کون؟

مدن: چھایا دیوی ــــ بازو والے مکان کی میم صاحب کی بہن

نذرل: بہن!

مدن: ہاں صاحب۔ بیوہ ہیں وہ۔

نذرل: اچھا تم جاؤ۔

(کچھ گنگناتے ہوئے نرآین داخل ہوتا ہے)

نرائن: کیا بات ہے کوی دا۔ کیا سوچ رہے ہو۔ اور وہ کیا ہے تمہارے ہاتھ میں (اُچک کر دیکھتے ہوئے) او ہو تمہاری نظم ہے۔

نذرل: نرائن تم نے میرے خیالات منتشر کر دیئے۔ یہ دیکھو اس نظم کے اُوپر آنسوؤں کے قطرے جذب ہیں۔

(نلین داخل ہوتا ہے)

نذرل: اچھے وقت ہیں آئے۔ چلو تفریح کرائیں۔

(سب چلے جاتے ہیں۔ پوتر اور ودود داخل ہوتے ہیں)

ودود: کوی دا کہاں گئے؟

پرامیلا: مجھے نہیں معلوم کہاں گئے۔

ودود: کیا مصیبت ہے۔ ہم جب بھی آئے ملاقات نہیں ہوئی۔

پرامیلا: تم لوگ بیٹھو۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔

پوتر: بلبل کو بھی لیتی آیئے اپنے ساتھ۔

ودود: نذرل کی ان ہی غیر ذمہ دارانہ حرکتوں سے مجھے کوفت ہوتی ہے۔ وہ قطعی فرض شناس نہیں۔

پوتر: وہ تو انقلابی شاعر ہے، ودود بھائی! اسے چین کہاں!

(پرامیلا داخل ہوتی ہے۔ بلبل بھی ساتھ ہے۔ عمر ساڑھے تین سال ہے)

پوتر: بلبل، آؤ، آؤ، ادھر

بلبل: (گود میں بیٹھتے ہوئے) اچھا کاکا بابو، جانتے ہیں آپ باؤل گان کیا ہے؟

پوتر: نہیں نہیں، بات کیا ہے؟

بلبل: آج ایک باؤل گان سنا ہے میں نے۔ گا کر سناتا مگر ـــ

ودود: مگر کیوں؟

بلبل: طبیعت ٹھیک نہیں۔

پوتر: طبیعت ٹھیک نہیں (پیشانی چھو کر) ارے بھئی تو سچ مچ بخار ہے۔

ودود: بھابی اسے لے جاؤ کمرے میں۔ بخار تیز ہو رہا ہے۔

(پرامیلا بلبل کو لے کر چلی جاتی ہے۔ پوتر اور ودود بھی رخصت ہوتے ہیں۔ نذرل دوسرے دروازے سے داخل ہوتا ہے۔ اس کے ہمراہ ایک باؤل گانک بھی ہے)

نذرل: مجھے آپ کے گیتوں سے والہانہ محبت ہے۔ کبھی کبھی تشریف لایا کیجئے۔

باؤل: اب چلا۔ پھر آؤں گا۔

نذرل: (جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر) حقیر سی رقم آپ کی نذر کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے گانوں کی قیمت نہیں ہے یہ۔

باؤل: (ہنس کر) نہیں نہیں کوی بھائی۔ ہم باؤل تو روپے لیتے ہی نہیں۔ البتہ دو چار پیسے قبول کر لیتے ہیں۔

نذرل: تو پھر کیا دوں آپ کو؟

باؤل: محبت!

(باؤل گانک رخصت ہوتا ہے۔ پرامیلا داخل ہوتی ہے)

پرامیلا: سنو!

نذرل: کیا بات ہے؟

پرامیلا: کچھ یہ بتاؤ کر جا کہاں رہے تھے؟

نذرل: دیوی ذرا گھوم آؤں۔

پرامیلا: ساری زندگی تو گھومتے بیت گئی۔

نذرل: میں ہوں بھی تو خانہ بدوش۔

پرامیلا: مگر میں نہیں ہوں (ذرا رک کر) مجھے انسان سمجھتے ہو یا پتھر! پتھر بھی ہوتا تو اب تک ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔

نذرل: میں نے آخر کیا کیا ہے جو....

پرامیلا: تم نے کیا نہیں کیا میرے ساتھ۔ جہاں جی میں آتا ہے چلے جاتے ہو۔ جو دل میں آتا ہے کرتے ہو۔ کبھی یہ بھی سوچتے ہو کہ گھر میں کوئی اور بھی ہے۔

نذرل: کیا کہہ رہی ہو پرامیلا۔ میں تو تمہیں ـــ

پرامیلا: بس رہنے بھی دو۔ بہت سن چکی۔ آج تم سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ آخر تم نے مجھ سے شادی کیوں کی تھی؟

نذرل: شادی؟ شادی تو تم نے بھی کی ہے۔ میں تو سب کچھ بتا چکا تھا تمہیں۔ اب الزام نہ دھرو مجھ پر۔ میں نے تم کو کیا نہیں دیا ـــ عزت، اولاد، رتبہ۔ مفلس کے گھر میں اور کس چیز کی توقع رکھتی ہو؟

پرامیلا: اولاد؟ مجھے نہیں چاہیئے۔

نذرل: پرامیلا!

پرامیلا: اولاد سے مجھے کیا مل گیا؟ ایک دن کے لئے بھی تو خوشی نہیں ملی، سکون نہیں ملا۔

نذرل: ڈولی، ڈولی!

پرامیلا: اور میں نے تمہیں کیا نہیں دیا؟ روپ، جوانی، مان عزت، سب، سب کچھ، اور تم نے کیا دیا مجھے؟ میں بھی عورت ہوں۔ گوشت پوست کی بنی ہوئی عورت۔ کیسے کیسے سپنے نہ دیکھے تھے میں نے۔

(روتے روتے چلی جاتی ہے ــــ پرآباہ داخل ہوتا ہے)

پراباہ: ارے یہ کیا؟ کیا سوچ رہے ہو؟! ENTOY

نذرل: ! ENJOY ہا، ہا، ہا۔

پراباہ: ہاں!

"عدن اور باغات کے شگفتہ پھولوں سے لطف اندوز ہو۔ گلاب گوں ہیلن، کلوپٹرا اور طائیس کے باغ بہار سینوں سے لطف اندوز ہو۔"

نذرل: مطلب؟

پراباہ: مطلب نہ پوچھو۔ میں وقت برباد نہیں کرسکتا اچھا چلا۔

(طوفان کی طرح چلا جاتا ہے)

(معین داخل ہوتا ہے)

نذرل: معین تم بھی کہو ــــ 'میں چلا'!

معین: بات کیا ہے کوی دا؟

(گریبالا داخل ہوتی ہے)

گریبالا: معین! تم ہی کو یاد کر رہی تھی۔ اچھا یہ تو بتاؤ کل نوزرو (نذرل) نے بلبل سے کیا کہا تھا؟

معین: بلبل سے ــــ کوی دا ــــ

گریبالا: چھپانے کی کوشش نہ کرو۔ صاف صاف بتا دو۔

معین: مجھے اتنا یاد پڑتا ہے انہوں نے صرف اتنا کہا تھا۔ 'جاؤ یہاں سے'!

گریبالا: جاؤ یہاں سے! بھلا کوئی باپ اپنے بیٹے سے ایسا کہہ سکتا ہے۔

معین: میں سمجھا نہیں ماسی ماں بات کیا ہے؟

گریبالا: اُسے بخار ہے ــــ ایک سو تین ڈگری۔

معین: ایک سو تین ڈگری؟

(گریبالا نذرل کو تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے چلی جاتی ہے)

(نذرل چپ چاپ ہے۔ اسٹیج پر سیاہ پرچھائیں پھیل جاتی ہے)

(پردہ گرتا ہے)

دوسرا ایکٹ

تیسرا منظر

(کئی دن کے بعد کا واقعہ)

(عبدالقادر اور عبدالحمید داخل ہوتے ہیں۔ دونوں نذرل کے دوست ہیں)

قادر: ماسی ماں! او ماسی ماں!!

حمید: چلاّؤ مت، مریض کو تکلیف ہوگی۔

قادر: ہم اندر نہیں جا سکتے۔ ڈاکٹر نے منع کر دیا ہے۔ تم ہی بتاؤ اب کیا کیا جائے؟

(گریبالا داخل ہوتی ہے)

گریبالا: ارے قادر! بیٹھو بیٹھو۔ اور یہ کون ــــ؟

قادر: یہ ہیں عبدالحمید صاحب۔ ڈسٹرکٹ مذبح کے سپرنٹنڈنٹ، اور آپ ہیں ہم سبھوں کی ماسی ماں!

حمید: ماسی ماں بلبل کی طبیعت کیسی ہے؟

گریبالا: چیچک کے دانے اتنے زیادہ ہیں کہ اُسے کسی پہلو چین نہیں

قادر: ڈاکٹر نہیں آیا؟

گریبالا: کچھ دیر پہلے دیکھ کر گیا ہے۔

قادر: کیا کہا؟

گریبالا: اُس نے کہا اگر رات کسی طرح گزر گئی تو ــــ

قادر: ایں! اور کوی دا کہاں؟

گریبالا: بلبل کے سرہانے بیٹھے قرآن شریف پڑھ رہے ہیں!

حمید: مریض کے کمرے میں دن دن بھر بیٹھنا تو ٹھیک نہیں ہے۔

گریبالا: میری بات کوئی نہیں سنتا۔ چند دن پہلے اسی کمرے میں بیٹھ کر حافظ کی رباعیات کے ترجمے مکمل کئے۔ کھانا پینا تو بالکل ترک کر چکا ہے۔ نماز پڑھنے اور قرآن شریف کی تلاوت کرنے کے علاوہ اور کسی کام میں توجہ نہیں دیتا۔ اسے دیکھ کر پہچان بھی نہیں سکوگے۔ معین اور شانتی اب تک نہیں آئے۔

قادر: کہاں گئے ہیں دونوں؟

گریبالا: لُڈرو نے اُن کو ایک سادھو کے پاس دَم بھیجا ہے۔

حمید: تعجب ہے۔ سادھو سنیاسی پر نذرل کو تو کبھی ایمان تھا ہی نہیں۔ یکایک یہ تبدیلی کیوں!

قادر: اصل میں بچپن میں فقیروں، درویشوں اور سادھو سنیاسوں کے ساتھ وہ گھومتے رہے ہیں۔ چرولیا میں حاجی پہلوان کے مزار کے مجاور بھی رہ چکے ہیں۔

(یکایک مکان کے اندر سے رونے پیٹنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ قادر بڑی تیزی سے اندر چلا جاتا ہے اور حمید چپ چاپ بت بنا کھڑا ہے)

نذرل: معین، معین کہاں؟

(معین اور شانتی داخل ہوتے ہیں)

معین: بس ابھی ابھی آیا۔

نذرل: (معین کے شانے پر سر رکھ کر) سادھو کہاں؟ نہیں آئے وہ؟ کیا کہا؟ کیا وہ مردہ جسم میں روح پھونک سکتے ہیں؟

(معین حیرت زدہ ہو کر ادھر اُدھر تاکتا ہے)

قادر: بلبل ابھی ابھی چل بسا!

معین: چل بسا ـــ بلبل ـــ کوی دا!

نذرل: ہاں ہاں کہو، کیا سادھو سنیاسی مردہ جسم میں روح پھونک سکتے ہیں؟

معین: نہیں کوی دا نہیں۔

نذرل: نہیں۔ کوئی نہیں۔ ڈاکٹر، کویراج، سادھو، سنیاسی فقیر درویش کوئی نہیں۔ ہاہاہا ـــ بیٹے بلبل، تم کو کوئی زندہ نہیں کر سکتا!

(نذرل کی چیخ نکل پڑتی ہے۔ معین سنبھالتا ہے۔ اسٹیج پر اندھیرا چھانے لگتا ہے۔)

(پردہ گرتا ہے)

تیسرا ایکٹ

پہلا منظر

زمانہ ۱۹۴۲ء وقت، صبح۔ مقام، کلکتہ، نذرل کی قیام گاہ

(نذرل خط لکھ رہا ہے۔ اب وہ پہلی جیسی شوخی نہیں ہے، چہرہ اداس اور غمزدہ ہے)

(پرا باہ داخل ہوتا ہے)

نذرل: آؤ، آؤ، بڑے موقع سے آئے۔

پرا باہ: سنا ہے آج کل تم اداس اور غمزدہ رہنے لگے ہو لیکن آج موڈ تو خوب "جولی" ہے۔

نذرل: آج میری خوشی کا دن ہے۔ شاید زندگی میں ایسا خوشگوار اور حیات بخش دن پھر نہ آئے ـــ اول اور آخری دن!

پرا باہ: مگر بات کیا ہے بتاؤ تو سہی

نذرل: بیٹھو بتاتا ہوں۔ ارے عباس، وہ دیکھو۔

(عباس داخل ہوتا ہے)

نذرل: تم دونوں کا تعارف کرا دوں ـــ یہ ہیں عباس الدین احمد مسلم بنگال کا سب سے بڑا گائک۔ میں ہوں شاعر اور عباس ہے میری آواز! اور یہ ہیں پرا باہ۔ میرا پرانا اور پیارا دوست ہاں عباس میرا وہ گیت تو سنا دو۔ وہی "آمار کون کُولے آج ...."

عباس: اچھا! (ہارمونیم پر گانا شروع ہو جاتا ہے)

"یہ کون سنہرا دیس ہے جس کے کنارے آ کر میری کشتی رک گئی!
میری یہ ناؤ پھر بہاؤ کے خلاف کیوں جانا چاہتی ہے؛
میں شکستہ ناؤ پر بہتا جا رہا تھا،
آنکھوں کے اشارے سے کیوں بلایا تم نے اے ملکۂ خواب؟"

نذرل: لیکن یہ شکستہ ناؤ کیا کبھی بہاؤ کے خلاف جا بھی سکتی ہے پرا باہ!

پرا باہ: ذرا اور وضاحت کرو تو شاید سمجھنے میں کامیاب ہو سکوں۔

نذرل: پندرہ سال بعد پھر خط آیا ہے۔ اسی کا جواب لکھ رہا تھا۔

پرا باہ: نرگس نے لکھا ہے؟

نذرل: ہاں!

پرا باہ: جواب کیا دیا تم نے؟

نذرل: جہاں تک میں لکھ سکا ہوں وہی سنو۔

"جانم!
نوروز کی سہانی صبح کو تمہارا خط موصول ہوا۔ اس وقت آکاش پر ہلکے پھلکے بادل رواں دواں تھے ـــ آج سے پندرہ سال پہلے، اساڑھ کے اسی مہینے میں وہ دن بھی ایسا ہی تھا۔ ممکن ہے تمہارے حافظے میں بھی اس دن کی

بات تازہ ہو۔ یہی میگھ دُوت بس ہی ابلا کی بانی لے کر کالی
داس کے جگ میں گیا، ریوا ندی کے کنارے گیا اور پھر
اس کے ہیتم کے پاس پہنچا۔ یہ چوکڑی بھرتے ہوئے بادل
میرے پاس بھی دکھ کے پیغامات لاتے ہیں، اور یہ سارا
مجھ کو تخیل کی جنت سے علیحدہ کر کے درد اور کسک کی اتھاہ
گہرائی میں پھینک دیتا ہے!

یقین مانو میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے
اگر لوگوں کی سنی سنائی باتوں پہ تم یقین کر بیٹھیں تو اس
کا مطلب یہ ہے کہ تم نے مجھ کو سمجھنے میں غلطی کی۔ خدا شاہد
ہے کہ میرے دل میں تمہارے خلاف نہ کوئی عداوت ہے نہ کینہ
ہے، نہ حسد۔ تمہیں کیسے باور کراؤں کہ میں تمہارے لئے کتنا
دکھی ہوں اور اب تو اس دکھ کی آگ میں بالکل جھلس کر
رہ گیا ہوں۔ تم میرے دل کو یہ آگ نہ دیتیں تو شاید میں
آگ کا راگ نہ الاپ سکتا اور نہ شہابِ ثاقب بن کر آسمان
پر طلوع ہوتا.....!"

پرا باہ: پھر؟
نذرل: تم ہی بتاؤ؟
پرا باہ: میں؟ وہ نہ رام ہے اور نہ اجودھیا۔ پھر رام راج کہاں سے
آئے گا؟ ہا، ہا، ہا۔ میں چلا (یکایک چلا جاتا ہے)
عباس: قاضی دا تم اپنا کام ختم کر لو۔ میں میگافون سے ہو کر آتا ہوں۔
(عباس الدین کے آنے کے بعد نذرل پھر لکھنے بیٹھ جاتا
ہے۔ لیکن اس اثنا میں پوتر داخل ہوتا ہے)
نذرل: ارے پوتر۔ آج کل تو نظر ہی نہیں آتے تم۔ آؤ، آؤ۔
" ہمدمو آجاؤ واپس، میں پھر تم لوگوں کی صحبتوں سے لطف
اندوز ہونا چاہتا ہوں۔
ہماری محبت کسی محبوبہ کی محبت سے بھی زیادہ استوار تھی۔
ہم روشنی، چاہت اور آرزو کی گود میں سانس لیتے تھے۔
اپنے نور نظر کی موت کو بھلا چکا ہوں۔ پر تم لوگوں کو نہیں
بھلا سکا،
اب بھی یاد آتے ہو تو دل کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔
پوتر: نورو، میں تو بار بار تمہارے پاس آتا رہا ہوں۔ تم ہی گھر
سے غائب رہتے ہو۔
نذرل: آزادی کی منزل مجھے مل گئی ہے پوتر۔ یہ آزادی خودی کے
بلند مقام سے سحر نغمہ کی کشش پا کر آئے گی۔ لیکن ٹھیک
اسی وقت جانِ بہار کی آواز سنائی دے گئی۔
پوتر: یعنی؟
نذرل: نرگس!
پوتر: نرگس؟
نذرل: ہاں اس نے مجھے خط لکھا ہے!
پوتر: کیا لکھا ہے اس نے؟
نذرل: اس نے لکھا ہے ——
" کیا تم مجھے بھول گئے؟
لیکن تمہارے قدموں کا نشان آج بھی میری ندی کے کنارے
سے محو نہ ہو سکا!
وہ تحریر نہ مٹ سکی جو تم اس کی چھاتی پر لکھ گئے تھے!
قدموں کے نشان کو محفوظ کر کے زیچ سے لہریں بہتی جاتی ہیں۔
میں کنارے پر اکیلی بیٹھی لہریں گنتی ہوں اور اس کنارے
کو دیکھتی ہوں۔
لیکن زیچ کو جو پنچھی اڑ کر گیا تھا وہ واپس آشیانے میں نہیں
لوٹا!"
—— لیکن پوتر میں اس کو بھلا چکا ہوں —— بھول چکا
ہوں سبھوں کو —— آج میں صرف اسی کے دھیان میں
غرق ہوں جو لاہوت ہے۔
پوتر: نہیں تم کسی کو نہیں بھلا سکے!
نذرل: ہاں شاید میں بھلا نہ سکا! اگر بھلا دیتا تو پھر سبھوں کو
آواز کیوں دیتا؟ ایک ایک کر کے سبھوں کی باتیں یاد
کیوں آتیں؟ ڈھاکا میں وہ خوشی و مسرت سے معمور دن۔
ہا ہا ہا —— جیسے وہ آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے
ہیں۔ ڈاکٹر شہید اللہ —— ایں! نہیں رہنے بھی دو۔
زندگی کی ٹیڑھی بیکی رہ گزر پر کتنے لوگوں سے ملاقاتیں
ہوئیں —— کتنے نئے چہرے، کتنے معصوم دل ——
بہار —— نہار، ہاں، نہار! مگر کہاں؟ اب تو وہ

نہیں آتے۔ فضیلت ـــــ نہیں نہیں، ان کو بھول چکا
ہوں ..... مگر نہیں۔ بھولا کہاں! میری ماں! کہاں
ہو تم؟ آخری بار مجھ سے ملنے کے لئے جیل میں آئی تھیں۔
جیل کا آہنی پھاٹک تو کھل گیا تھا مگر میرے دل کا دروازہ
اس روز نہ کھل سکا (آنسوؤں کے قطرے رواں ہو جاتے ہیں)

پَوِتر: (نذرل کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر) نُورُو! اس طرح شکستہ
دل ہونا اچھا نہیں ـــــ دیکھو بنگال کے عوام تمہارا انتظار
کر رہے ہیں۔ تم شاعر ہو ـــــ!

نذرل: ہاں، ہاں۔ میں ان ہی کے لئے امن کا راستہ تلاش کرتا
پھر رہا ہوں۔ نور کا ایک ہالہ، ایک پیکرِ جمیل میرے درمیان
گشت لگا رہا ہے ـــــ میں اسے بیدار کر کے رہوں گا۔

پَوِتر: وہ پیکرِ جمیل تمہاری شاعری کے تخیل کے علاوہ اور کوئی نہیں۔
آج اب میں چلا۔ (چلا جاتا ہے)

نذرل: (آپ ہی آپ) کوئی مجھے سمجھ نہ سکا! کیا میں اپنے آپ
کو سمجھ سکا! مجھے کیا چاہئے! میری راہ کہاں ہے؟ کیا
میں باغی ہوں! خدایا! ہاہاہا! تو مجھے آزادی دے گا۔
سکون دے گا؟

(نذرل چلا جاتا ہے۔ پرآمیلا داخل ہوتی ہے۔ نرگس
کے نام لکھا ہوا خط میز پر کھلا رکھا ہے۔ اس کی نگاہ خط
پر پڑتی ہے)

پرامیلا: کون؟ (خط پڑھتے ہوئے) ایں! نرگس! (چہرہ نفرت
کی آگ سے سرخ ہو جاتا ہے) اب تک وہ تمہیں نہیں
بھولے؟ اب تک محبت کا راگ الاپا جا رہا ہے۔ آج
بھی تم دل و جان سے اس کی پرستش کرتے ہو! اُف!
ماں، ماں!

(پردہ گرتا ہے)

تیسرا ایکٹ

دوسرا منظر

زمانہ: ۱۹۴۲ء۔ وقت: شام۔ مقام: کلکتہ، نذرل کی قیامگاہ۔
(نذرل بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا ہے۔ کبھی کبھی وہ
دروازے کی طرف دیکھ لیتا ہے ـــــ جیسے وہ کسی کا
منتظر ہو۔ ہاتھ میں کاغذ کا پلندہ ہے۔ عمر ادھیڑ ہو چکی
ہے۔ بردا کانت مجمدار داخل ہوتا ہے)

نذرل: کافی دیر لگا دی۔ انتظار کرتے کرتے تھک گیا میں سمجھ
رہا تھا کہ اپنے دل کے ٹکڑے کو بھول جاؤں گا۔ پر بھول نہ
سکا۔ اسی لئے تو پرآمیلا کو علیل دیکھ کر میرا دل گھبرا رہا ہے
کیا یہ بھی مجھ سے چھن جائے گی۔ نہیں نہیں۔ جس طرح بھی
ہو گا اُس کو موت کے ہاتھوں سے بچانا ہو گا۔ کانت دا
بولو، بولو۔

بردا: CONCENTRATE YOUR MIND, MY FRIEND!

نذرل: کیسے دل کو اطمینان دلاؤں۔ ڈاکٹر، کویراج، حکیم ـــــ
سب ہار گئے۔

بردا: چلو دُولی کے کمرے میں۔ (دونوں جاتے ہیں مظفر احمد
داخل ہوتے ہیں)

مظفر: ماسی ماں! او ماسی ماں!

گریبالا: تم تو ہم لوگوں کو بھول ہی گئے۔

مظفر: اتنے دنوں تک پریشان رہا۔ کلکتہ سے سارے کمیونسٹوں
کو نکل جانے کا حکم ملا ہے۔ ان میں میں بھی شامل ہوں
کبھی کبھی پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کلکتہ
آجاتا ہوں۔

گریبالا: ادھر ہم بھی بہت پریشان ہیں۔

مظفر: یعنی!

گریبالا: دُولی علیل ہے۔ پہلے تو اس کے ہوش و حواس جاتے
رہے اور اب بستر سے لگ گئی ہے۔

مظفر: ڈاکٹر کو نہیں دکھایا؟

گریبالا: کچھ دیر پہلے تو ڈاکٹر آیا ہے۔ ابھی پرآمیلا کے کمرے
ہی میں ہو گا۔ ساتھ ہی کویراج اور ہومیوپیتھ علاج
بھی ہو رہا ہے۔

مظفر: علاج ایک قسم کا ہونا چاہئے ـــــ خیر میں دُولی کو دیکھ کر
فوراً بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ پولیس تعاقب میں لگی
ہوئی ہے زیادہ دیر تک یہاں رہنا SAFE نہیں ہے
(دونوں جاتے ہیں)

(ڈاکٹر گپتا داخل ہوتا ہے)

نذرل: کہو ڈاکٹر کیا حال ہے دُولی کا؟

ڈاکٹر: بہت پُر اُمید نہیں - لیکن!

نذرل: لیکن کیا؟

ڈاکٹر: مفلوج ہوجانے کا امکان ہے

نذرل: مفلوج؟

ڈاکٹر: ہاں!

(ہومیو پیتھ ڈاکٹر داخل ہوتا ہے)

نذرل: آپ لوگوں کا تعارف کرادوں۔ یہ ہیں ڈاکٹر رائے کلکتہ کے مشہور ہومیو پیتھ ڈاکٹر اور آپ ہیں ڈاکٹر گپتا۔

(شانتی پدسنگھ داخل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ سادھو جی ہیں)—

شانتی: کوی دا بہت مشکل سے باباجی کو ڈھونڈ کر لایا ہوں۔

باباجی: سب اُسی کی لیلا ہے۔ ہرے کرشن! ہرے کرشن!!

(مولوی صاحب داخل ہوتے ہیں)

نذرل: آیئے آیئے، تشریف لایئے۔ مولوی صاحب ساقی کی آنکھیں تو اب تک نہیں کھلیں۔

مولوی صاحب: اتنے پریشان کیوں ہوتے ہو۔ پیالہ تو اب بھی بھرا ہوا ہے پیتے جاؤ، پیتے جاؤ۔ ساقی آئے گا۔ آئے گا۔

(قاضی دُودو داخل ہوتے ہیں)

نذرل: ارے دُودو! آؤ آؤ۔

مولوی صاحب: اچھا میں رخصت ہوا۔ (مولوی صاحب جاتے ہیں)

دُودو: تم سادھوؤں، فقیروں اور درویشوں کے چکر میں کب تک پڑے رہو گے۔ جم کر علاج کیوں نہیں کراتے۔

نذرل: اب تو کوئی علاج کارگر نہیں ہوتا۔

دُودو: کیسے ہوگا۔ ایک طرح کا علاج کرا کے دیکھو (دُودو رخصت ہوتے ہیں)

پس منظر سے۔ (برواکانت کی آواز میں) ماں کی قوت ختم نہیں ہوتی۔ تم اُسی کو یاد کرو۔

نذرل: کون ہو تم؟

پس منظر سے (باباجی کی آواز میں) نہیں نہیں۔ قوت میں نہیں عبادت میں آزادی ہے۔

نذرل: محبت! قوت!! عبادت!!! ہا ہا ہا — سب جھوٹ ہے جھوٹ ہے!

پس منظر سے (مولوی صاحب کی آواز میں) شراب کے جرعے چڑھاتے جاؤ۔ ساقی آئے گا۔

نذرل: نہیں نہیں نہیں۔ کوئی نہیں آئے گا۔ کچھ بھی نہیں ہوگا۔

پس منظر سے آواز — ہومیو پیتھ! ہا ہا ہا — یہ تو بچوں کی مٹھائی ہے۔

(نذرل دونوں کان بند کر لیتا ہے)

پس منظر سے آواز — ایلو پیتھ! بکواس!! یہ بھی کوئی علاج ہوا۔

نذرل: میں سننا نہیں چاہتا — چلے جاؤ سب یہاں سے۔ جھوٹے — ! کسی کو کچھ نہیں آتا۔ میں پاگل ہو جاؤں گا

(یکایک کھڑا ہو جاتا ہے) ماں! ماں!!

(گریبالا داخل ہوتی ہے)

گریبالا: کیا بات ہے نورُو؟

نذرل: میں چلا!

گریبالا: کہاں؟

نذرل: ماں کے پاس۔ میں چلتا رہوں گا — ایک دن، دو دن، جب تک چل سکوں۔ جب تک یہاں سے نکل نہ جاؤں مجھے کوئی پریشان نہ کرے۔ ماں کے پاؤں کے پاس بیٹھا رہوں گا دیکھتا ہوں وہ کب تک آنکھیں نہیں کھولیں گی!

اسٹیج پر اندھیرا پھیل جاتا ہے

(پردہ گرتا ہے)

تیسرا ایکٹ
تیسرا منظر

(گیت کی آواز لہراتی ہوئی آ رہی ہے)

اے سیاہ پانی کی ندی!

دیکھ میں تیری لہروں میں ڈوب کر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا ہوں

تیری غضب ناک لہریں میرا گھر بہا لے گئیں۔

چرؔ میں بیٹھا تو یہ بھی غرقاب ہوگیا۔
اب تو سب کچھ کھو کر تیری گود میں پناہ گزیں ہوں۔
گھر تو مل جائے گا پر شکستہ دل کا جو موتی گم ہوگیا وہ کیسے ملے؟

زمانہ: ۱۵ر دسمبر ۱۹۵۳ء۔ وقت: رات کا پچھلا پہر۔ مقام: ڈمڈم کا ہوائی اڈہ ــــ ویٹنگ روم کے سامنے!

گریبالا: کوئی نظر نہیں آتا ــــ کیا سب چلے گئے۔

سنیاسی: دس منٹ پہلے ہی جہاز آیا ہے۔

گریبالا: کوئی آرہا ہے! میں اُس طرف چلی جاتی ہوں ــــ اندھیرے میں ــــ خبردار! میرے بارے میں کسی سے کچھ نہ کہئے گا۔

سنیاسی: مگر تم تو اتنی دور سے ملنے آئی ہو؟

گریبالا: نہیں، نہیں۔ میں صرف ایک نظر ــــ بس ایک نظر اپنی بچی کو دیکھنے آئی ہوں ــــ کوئی آرہا ہے۔ میں چلی۔

(ویٹنگ روم سے وُدود باہر آتے ہیں)

سنیاسی: سنئے تو!

ودود: کون ــــ کہئے کیا بات ہے!

سنیاسی: کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ میرے گرو دیو اسی جہاز سے آئے ہیں؟

وُدود: آپ کے گرو دیو! میں کیسے بتاؤں۔

سنیاسی: میرا مطلب ہے قاضی نذرالاسلام ــــ یعنی میرے گرو دیو برداکانت مجمدار کے دوست۔

وُدود: تو یوں کہئے۔ ہاں اسی جہاز سے روم سے آئے ہیں۔

(گریبالا ایک قدم آگے بڑھاتی ہے اور پھر پیچھے ہٹ جاتی ہے)

سنیاسی: چلو مایوسی نہیں ہوئی مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ آپ لوگ انہیں نیند سے نہیں جگا سکے!

ودود: کیا مطلب؟

سنیاسی: گرو دیو اب تک دھیان گیان میں ہیں۔ جب تک وہ نہیں جاگ جاتے کوئی ان کو نہیں جگا سکتا۔

ودود: FANTASTIC IDEA

(پوتر داخل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ نذرل کے چھوٹے صاحبزادے قاضی انی رودھو اسلام ہیں۔ عمر انیس بیس سال ہوگی)

پوتر: ارے تم اب تک یہیں کھڑے ہو؟ اُنی رودھو کاکا بابو آپ آیئے۔

پوتر: میں آتا ہوں تم جاؤ۔ لتیکا تمہاری مدد کریں گی (انی رودھو چلا جاتا ہے) سامان وغیرہ سب گاڑی میں لے جانے کا انتظام کرآیا ہوں ــــ وہ دیکھو کوبی دا کو لئے سب آرہے ہیں۔

(ساتھ میں نذرل کے بڑے صاحبزادے قاضی سبّو ساچی اسلام بھی ہیں۔ عمر اکیس بائیس سال ہوگی۔ سنیاسی نذرل کو پرنام کرتا ہے۔ گریبالا آگے بڑھتی ہے۔ دوسرے اسٹیچر پر پرامیلا ہے۔ اسے انی رودھو اور نرس بس لتیکا گھوش لارہی ہے۔ پرامیلا کی آنکھیں کسی کو تلاش کررہی ہیں)

گریبالا: دُولی!!

پرامیلا: کون؟ کون ــــ

پوتر: کیا ہوا، کیا ہوا دولی؟

پرامیلا: جیسے کسی نے آواز دی مجھے۔ ماں ــــ شاید میری ماں آئی ہے۔

پوتر: (اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے) کہاں، یہاں تو کوئی بھی نہیں۔ اچھا اب چلو۔ ثانی (سبّو ساچی) تم اپنے ابا کو سنبھالو۔

پرامیلا: نہیں نہیں ــــ میں ماں کو دیکھوں گی ــــ ماں ضرور آئی ہیں ــــ ماں ــــ ماں!!

(سب چلے جاتے ہیں۔ اسٹیج خالی ہے۔ گریبالا داخل ہوتی ہے)

گریبالا: دُولی! دُولی!! چلی گئی؟ میں بھی جاؤں گی ــــ نہیں نہیں! میں سامنے کھڑی ہوکر نہیں دیکھ سکتی۔ نورو! دُولی!! میری چھاتی پھٹ جائے گی۔ جاؤ، تم دونوں جاؤ ــــ ایں! کیا کہہ دیا میں نے؟ نہیں، نہیں، میں ہی جاتی ہوں ــــ تم لوگ زندہ رہو! مگر اس زندگی سے تو مرجانا ہی بہتر ہے! اُف!!... وہ کیا؟ اندھیرا! اندھیرا کیوں؟ روشنی ــــ روشنی کہاں گئی۔

(قدم لڑکھڑاتے ہیں۔ اسٹیج پر اندھیرا پھیل جاتا ہے)

(پردہ)

ڈراما:

حکمتِ عملی

آغا ناصر

ایک کمرہ خاصا کشادہ اور آراستہ۔ مغربی اور مشرقی سمت ایک ایک دروازہ۔ عقبی دیوار میں ایک کھڑکی۔

مغربی سمت دیوار کے ساتھ ایک خوبصورت چھوٹی سی مسہری۔ مشرقی کونے میں ایک نہایت نفیس صوفہ سٹ۔ درمیان میں ایک خوبصورت بُک شلف جس میں کتابیں بھری ہیں اور اوپر دو گلدان تازہ پھولوں سے بھرے ہوئے رکھے ہیں۔ کمرے کے وسط میں ایک آرام کرسی۔

جب پردہ اٹھتا ہے تو عائشہ مسہری پر پیٹ کے بل لیٹی کوئی میگزین پڑھنے میں مصروف ہے۔ گاہے گاہے وہ اپنی ٹانگیں ہلاتی جاتی ہے۔ اس کا چہرہ سامعین کی طرف ہے۔ چند لمحے بعد عقبی کھڑکی بہت دھیرے سے کھلتی ہے۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ باہر سخت بارش ہو رہی ہے۔ اور گرج اور چمک ہے۔ ایک نوجوان برساتی اوڑھے آہستہ سے کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہو جاتا ہے اور پھر آہستہ سے کھڑکی بند کر دیتا ہے۔ عائشہ میگزین پڑھنے میں محو ہے۔ نوجوان جیب سے سگریٹ نکالتا ہے اور پھر ماچس سے جلانے کی ناکام کوشش کرنے کے بعد مسہری کے قریب آ جاتا ہے۔

نوجوان:۔ معاف کیجئے گا۔ آپ۔۔۔۔

عائشہ:۔ (ایک دم چونک کر چیخ پڑتی ہے)

نوجوان:۔ اوہ! آپ تو گھبرا ہی گئیں۔

عائشہ:۔ (خوف سے کانپتے ہوئے) کون ہو تم!

نوجوان:۔ (بڑے اطمینان سے) تعارف بعد میں ہوتا رہے گا۔ فی الحال تو مجھے یہ بتایئے کہ آپ کے پاس ماچس ہوگی۔ میری ماچس بارش سے سیل گئی اور مجھے سگریٹ کی شدید خواہش ہو رہی ہے۔

عائشہ:۔ (بدستور گھبرائی ہوئی) کون ہو تم! تم یہاں کیسے آئے؟ کیوں آئے؟

نوجوان:۔ (مسکرا کر) آپ نے میری درخواست پر غور کرنے کے بجائے اپنے سوالات میں دو کا مزید اضافہ کر دیا۔ ڈریئے نہیں۔ خوف کی کوئی بات نہیں۔

عائشہ:۔ مگر آخر تم ہو کون؟

نوجوان:۔ ایک ہی سوال بار بار دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں اس وقت تک آپ کی کسی بات کا جواب نہیں دے سکتا جب تک مجھے ماچس نہ مل جائے۔

عائشہ:۔ ماچس میرے پاس نہیں۔

نوجوان:۔ اوہ! تو پھر مجبوری ہے۔

(وہ بڑے اطمینان سے اپنی برساتی اتار کر آرام کرسی کی پشت پر لٹکانے لگتا ہے۔)

عائشہ:۔ یہ کیا کر رہے ہیں آپ!

نوجوان:۔ برساتی اتار کر لٹکا رہا ہوں۔ دیکھ نہیں رہی ہیں آپ!

عائشہ:۔ آخر اس سب کا مطلب کیا ہے! (اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے) چاہتے کیا ہیں آپ!

نوجوان:۔ ایک ماچس چاہتا تھا۔ آپ نے انکار کر دیا، اب اور کیا چاہوں۔

عائشہ:۔ یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ تم کون ہو اور کس غرض سے رات کے وقت میرے کمرے میں آئے ہو۔ تم آئے کس طرح؟

اگر آپ اطمینان سے بیٹھ کر بات کر سکیں تو میں ان سارے

سوالات کا تفصیلاً جواب دے سکوں گا۔ اس طرح یہ ناممکن ہے۔

عائشہ:۔ عجیب آدمی ہو۔ (پریشان سی ہو کر اس کی طرف دیکھتی ہے)
(نوجوان مسہری پر پڑی ہوئی میگزین اٹھا کر دیکھنے لگ جاتا ہے۔
عائشہ جز بز ہو کر پیر پٹختی ہے)
آخر آپ ہیں کون؟

نوجوان:۔ (رسالے کے ورق پلٹتے ہوئے) یہ اسمر کا لکھا ہوا ڈرامہ پڑھ رہی تھیں آپ؟

عائشہ:۔ (جھپٹ کر رسالہ اس کے ہاتھ سے چھین لیتی ہے) آپ سیدھے سیدھے یہاں سے جاتے ہیں یا نہیں؟

نوجوان:۔ نہیں۔

عائشہ:۔ تو میں نوکروں کو بلاؤں تاکہ وہ تمہیں باہر نکال دیں۔

نوجوان:۔ میں آپ کو کمرے سے باہر نہیں جانے دوں گا۔ آپ بہت نازک ہیں۔ میں بہرحال مرد ہوں۔

عائشہ:۔ (ہونٹ کاٹتے ہوئے) میں آوازیں دے کر ڈیڈی اور ممی کو بلا لوں گی۔

نوجوان:۔ بارش بہت تیز ہے اور بجلی کی گرج چمک اپنے زور پر ہے۔ آپ کی آواز آپ کے والدین کے کانوں تک پہنچنا مشکل ہے۔

عائشہ:۔ (جیسے ہار مان گئی ہو۔ بڑی خوشامد سے) آپ چاہتے کیا ہیں۔ یہاں کیوں آئے ہیں؟ کس طرح آئے ہیں؟

نوجوان:۔ (ہنس کر) اب ٹھیک ہے۔ میں جو کہوں اس پر عمل کیجئے صرف اسی شرط پر میں آپ کے ان سارے سوالوں کے جواب دے سکتا ہوں۔ (تھوڑی دیر خاموشی) بولئے منظور ہے آپ کو!

عائشہ:۔ (بیزار سا ہو کر) جی۔

نوجوان:۔ ادھر آئیے (عائشہ ڈرتے ڈرتے اس کے قریب آتی ہے) مسہری پر بیٹھ جائیے (بیٹھ جاتی ہے) اپنی پریشانی دور کر لیجئے۔

عائشہ:۔ جی!

نوجوان:۔ (مسکرا کر) تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کیجئے۔ اس طرح کہ آپ کا یہ خوف وہراس سب دور ہو جائے اور جب آپ خود کو نارمل محسوس کرنے لگیں تو اپنے سوالات دہرائیے۔

عائشہ:۔ جی۔

نوجوان:۔ ہاں تو آپ اسمر کا ڈرامہ پڑھ رہی تھیں۔ کیا عنوان ہے اس ڈرامہ کا!

عائشہ:۔ عنوان۔۔۔! چور۔۔۔!

نوجوان:۔ اوہ! عجب اتفاق ہے۔ پلاٹ کیا ہے؟

عائشہ:۔ مجھے یاد نہیں۔ میں نے ابھی صرف پہلا منظر پڑھا ہے۔

نوجوان:۔ پھر بھی ہوتا کیا ہے؟

عائشہ:۔ ایک چور ایک طوفانی رات میں ایک نوجوان لڑکی کے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔

نوجوان:۔ (دلچسپی سے) ہوں، اس کے بعد!

عائشہ:۔ میں نے ابھی یہیں تک پڑھا ہے، چور داخل ہو چکا ہے اور لڑکی جاگ گئی ہے، وہ سہمی ہوئی اس سے باتیں کر رہی ہے۔

نوجوان:۔ میرا خیال ہے اس کے بعد چور اس کے یہاں چوری نہیں کر سکے گا۔

عائشہ:۔ کیوں؟

نوجوان:۔ اگر لڑکی خوبصورت ہے اور چور جوان ہے تو پھر ناممکن ہے، غیر فطری ہے۔

عائشہ:۔ ہوگا۔ اب آپ مجھے بتا سکتے ہیں آپ کون ہیں؟

نوجوان:۔ ہاں میں ضرور بتاؤں گا آپ ایک ایک کر کے اپنے سوالات دہرائیں۔

عائشہ:۔ آپ کون ہیں؟

نوجوان:۔ سوال کی نوعیت بڑی غیر یقینی سی ہے۔ میں کون ہوں! ظاہر ہے کہ ایک انسان ہوں۔ مرد ہوں، جوان ہوں، تعلیم یافتہ ہوں۔ اس سوال سے آپ کی مراد کیا ہے؟

عائشہ:۔ (پریشان ہو کر) میرا مطلب تھا آپ یہاں کیوں آئے ہیں۔ اور کدھر سے آئے ہیں؟

نوجوان:۔ دیکھئے خاتون، معاف کیجئے مجھے آپ کا نام معلوم نہیں ہے۔ (خاموش ہو جاتا ہے)

عائشہ:۔ (تھوڑی دیر انتظار کے بعد) آگے کہئے۔

نوجوان:۔ میں نے آپ کا نام پوچھا تھا۔

عائشہ:۔ میں نہیں بتاؤں گی۔

نوجوان:۔ میرے خیال میں اس میں کوئی عیب نہیں ہے۔

عائشہ:۔ ہوا کرے۔ مگر میں بتانا نہیں چاہتی۔

نوجوان:۔ تو پھر شاید میں کھل کر گفتگو نہ کر سکوں جب تک مجھے اپنے

مخاطب کا نام معلوم نہ ہو میں بے تکلفی سے بات چیت نہیں کر سکتا۔

عائشہ:۔ آپ مجھے کسی بھی نام سے پکار سکتے ہیں۔ فیروزہ، رضیہ، سلمیٰ۔

نوجوان:۔ (ہنس کر) چلئے یہی سہی۔ ہاں، تو فیروزہ صاحبہ آپ کا یہ سوال کہ میں کس طرح اور کس غرض سے یہاں آیا ہوں، واقعی بہت اہم ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جو جواب ان سوالوں کا ہوگا اُسے شاید آپ تسلیم نہ کریں۔

عائشہ:۔ کہئے۔

نوجوان:۔ مجھے شک ہے کہ میں واقعی یہاں کہیں سے آیا ہوں۔ کیا آپ نے مجھے آتے ہوئے دیکھا تھا؟

(عائشہ انکار میں سر ہلاتی ہے)

تو پھر کیا ممکن نہیں ہے کہ میرا اپنا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ شاید میں صرف آپ کے تخیل کی پیداوار ہوں۔

عائشہ:۔ (غصہ سے) میں یہ سب فضولیات نہیں سننا چاہتی آپ فوراً چلے جایئے ورنہ میں آپ کو پولیس کے حوالے کر دوں گی۔

نوجوان:۔ آپ ایسا نہیں کر سکتیں۔

عائشہ:۔ کیوں؟

نوجوان:۔ اتنے آپ پولیس کو بلانے کا انتظام کریں گی میں چلا جاؤں گا۔

عائشہ:۔ تو پھر آپ چلے جایئے۔

نوجوان:۔ لیکن ابھی آپ نے پولیس کو بلانے کا ارادہ کہاں کیا ہے۔

(باہر سے کسی کے پکارنے کی آواز آتی ہے)

عائشہ:۔ (گھبرا کر) یہ میرے ڈیڈی ہیں۔

نوجوان:۔ ہوا کریں۔

عائشہ:۔ آپ فوراً چلے جایئے۔ وہ اسی طرف آ رہے ہیں۔

نوجوان:۔ تو میرے لئے اس سے کیا فرق پڑتا ہے!

عائشہ:۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں! اتنی رات گئے کسی مرد کا تنہا میرے کمرے میں ہونا ٹھیک نہیں ہے۔

نوجوان:۔ یہ بات آپ کے لئے پریشانی کا باعث ہو سکتی ہے، میرے لئے نہیں۔
(بڑے اطمینان سے سامنے رکھی ہوئی چھوٹی میز پر پیر رکھ کر آرام کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

عائشہ:۔ خدا کے لئے آخر آپ سمجھتے کیوں نہیں!

(ڈیڈی کی آواز قریب آ جاتی ہے "عائشہ")

وہ آ گئے میں کیا کروں! اُف میرے اللہ!

(نواب علی داخل ہوتا ہے۔ وہ ادھیڑ عمر کا موٹا تازہ آدمی ہے۔ نائٹ گون پہنے ہوئے، سر گنجا ہے، آنکھوں پر موٹے سیاہ فریم کی عینک)۔

نواب علی:۔ بیٹی عائشہ آج تو بارش ـــــ

(اچانک نوجوان کی طرف دیکھ کر جو کرسی پر بڑے اطمینان سے لیٹا رسالے کی ورق گردانی کر رہا ہے)

یہ کون صاحب ہیں!

عائشہ:۔ (گھبرا کر) یہ ـــ یہ رضیہ کے بڑے بھائی ہیں ڈیڈی۔ بیچارے کسی پارٹی سے واپس آ رہے تھے کہ راستے میں بارش نے آگھیرا۔ بھیگتے بھاگتے مشکل سے یہاں تک پہنچے۔

نواب علی:۔ ہوں۔

نوجوان:۔ (اٹھ کر) آداب عرض!

نواب علی:۔ آداب۔ لیکن تم نے بیچاروں کو یہاں کیوں بٹھائے رکھا۔ ڈرائنگ روم میں لے کر آ جاتیں۔

عائشہ:۔ (لاجواب سی ہو کر) جی ۔ ۔ ۔ ۔

نوجوان:۔ جی ہاں، انہوں نے تو بہت کہا۔ لیکن میرے کپڑے اور جوتے سب کیچڑ میں لت پت تھے۔ میں نے مناسب نہ سمجھا۔ اور پھر خواہ مخواہ آپ سب کو تکلیف ہوتی۔

نواب علی:۔ تکلیف کیسی۔ رضیہ تو بالکل میری اپنی بیٹی کی طرح ہے۔ تم اس کے بھائی ہو۔ تمہیں ہم سے تکلف نہیں کرنا چاہیئے تھا۔

نوجوان:۔ جی تکلف کیسا۔ اگر ہوتا تو پھر ایسے موسم اور ایسی رات میں یہاں آتا ہی کیوں؟

نواب علی:۔ رضیہ اور فیروزہ تو میری نظر میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

عائشہ:۔ (زور سے کھانستی ہے) ہاں ڈیڈی۔ رضیہ تو خود ہی مجھ سے کہا کرتی ہے کہ عائشہ میرے سارے گھر والے اُنہیں بلکہ ایسا ہی سمجھتے ہیں جیسا خود مجھے۔

نواب علی:۔ ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ مگر وہ فیروزہ کا کیا ذکر تھا یہاں۔ فیروزہ کون ہے؟

نوجوان:۔ فیروزہ ـــ؟ جی، فیروزہ میری منگیتر کا نام ہے ۔ ۔ ۔ ہاں دراصل یہ تینوں بہت دوست ہیں آپس میں۔ رضیہ فیروزہ اور یہ۔

نواب علی۔ وہ! (ہنستا ہے) تمہاری سلیقے کی درست ہے عائشہ۔ تب ہی تم یہاں باتیں کرنے میں مگن ہو گئے۔
(پھر ہنستا ہے) کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ (عائشہ سے) لیکن تم نے انھیں۔ کیا نام ہے تمہارا صاحبزادے!

نوجوان۔ جی نام۔ میرا نام عشرت!

نواب علی۔ (گھور کر دیکھتا ہے) عشرت — لیکن یہ تو رضیہ کے چھوٹے بھائی کا نام ہے وہ جو گول مٹول سا آیا کرتا ہے اس کے ساتھ۔ بھائی بیٹا وہ تمہارا!

نوجوان۔ جی۔ جی ہاں۔ ہے تو بھائی لیکن اب کیا عرض کروں معاملات کچھ اور ہیں۔ دراصل ہمارے والد نے دوسری شادی کی اور وہ چھوٹا بچہ ہماری نئی امی کے ساتھ آیا۔ حسنِ اتفاق سے نام اس کا بھی عشرت ہی تھا (خود بھی زور سے ہنستا ہے) عائشہ اپنے ہونٹ چبا رہی ہے۔ نواب علی گھور رہا ہے)

نواب علی۔ کیا کہا۔ دوسری شادی۔ لیکن تم نے ہمیں تو کبھی نہیں بتایا عائشہ کہ رضیہ کی سوتیلی امی ہیں!

عائشہ۔ جی۔ وہ۔ ۔ ۔ ۔!

نوجوان۔ یہ بات کبھی کسی سے کہنے کی نہیں ۔ ۔ ۔ میں نے آپ سے جھوٹ بولنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس لئے یہ کہدیا۔ ورنہ آج تک ہم میں سے کسی نے کبھی یہ راز افشا نہیں کیا تھا۔

نواب علی۔ (لمبی سانس) ہوں! بھلا کتنے سال ہو گئے تمہارے والد کے انتقال کو!

نوجوان۔ والد کے انتقال کو۔ ٹھہرئیے ذرا یاد کرلوں۔ آں۔ آں۔ ۔ ۔ ۔

عائشہ۔ تین (دکھاتی کر) تین بجے سے لگاتار بارش ہوئے چلی جا رہی ہے۔

نواب علی۔ یہ جھڑی تو مجھے لگتا ہے ہفتہ بھر لگی رہے گی۔

نوجوان۔ جی ہاں — آثار تو کچھ ایسے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ جی تو آپ نے پوچھا تھا۔ والد صاحب کے متعلق۔ تین سال کے قریب ہو گئے۔ ان کی وفات کو — رضیہ تو بالکل ننھی سی گڑیا تھی۔ جب ان کا انتقال ہوا تھا۔

عائشہ۔ حرکتیں اس کی اب بھی بچوں ہی والی ہیں۔ کہنے کو کہتی ہے کہ دسمبر میں پورے سولہ سال کی ہو جائے گی۔

نوجوان۔ ہاں، مجھ سے دو ہی برس تو چھوٹی ہے۔

نواب علی۔ اچھا بیٹی تو تم عشرت میاں کو کچھ چائے وائے تو پلواؤ۔ یہ بھی کیا کہیں گے۔

عائشہ۔ جی بہتر۔

نواب علی۔ اچھا تم رہنے دو۔ تم باتیں کرو۔ میں مقصود سے کہے دیتا ہوں، چائے کے واسطے۔ اچھا میاں۔ اگر بارش بند نہ ہو تو جانے کی ضرورت نہیں۔ ٹیلیفون کر دینا۔ یہاں سونے کا انتظام کر دیا جائے گا —

نوجوان۔ جی شکریہ۔

نواب علی۔ (جاتے ہوئے) خدا حافظ! اچھا بیٹی شب بخیر۔ (جس دروازہ سے آیا تھا اسی سے نکل جاتا ہے)

نوجوان۔ (اطمینان کر لینے کے بعد کہ نواب علی چلا گیا) ہوں، تو آپ نے جھوٹ بولا تھا۔ لیکن جھوٹ کبھی نہیں چھپتا کیوں؟ آپ کا کیا خیال ہے عائشہ صاحبہ؟

عائشہ۔ اب آپ فوراً چلے جایئے۔

نوجوان۔ چائے آجانے دیجئے۔

عائشہ۔ میں کہتی ہوں اب میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتی۔ چلے جایئے فوراً۔

نوجوان۔ (اطمینان سے مسہری پر بیٹھ جاتا ہے) آپ پھنس چکی ہیں محترمہ عائشہ سلطانہ۔ اب یہ سب برداشت کرنا ہی ہوگا۔ میں نہیں جاؤں گا۔ صرف ٹیلیفون کر دوں گا۔ اور آپ کے والد میرے بستر کا انتظام کروا دیں گے۔ ہا ہا ہا۔ کیا سمجھیں آپ ۔ ۔ ۔ !

عائشہ۔ (سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)
میرے اللہ! میں کس مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہوں۔

نوجوان۔ (شرارت سے) خوبصورت لڑکیاں جب خفا ہوتی ہیں تو ان کا حسن کچھ اور بھی نکھر جاتا ہے۔

عائشہ۔ بند کرو یہ بکواس!

نوجوان۔ کمال ہے، میں نے سنا تھا ہر نوجوان لڑکی اپنے حسن کی تعریف سنکر خوش ہوتی ہے۔

عائشہ۔ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں۔ یاد رکھئے آپ کو ان باتوں سے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔

نوجوان۔ مجھے جو کچھ حاصل کرنا تھا کر چکا۔ اب مجھے کچھ نہیں چاہیے۔

عائشہ۔ کیا حاصل کر چکے آپ؟

نوجوان۔ جو حاصل کرنے کے لئے آیا تھا۔

عائشہ۔ یعنی ---- ؟ (ممدو ہاتھوں میں ٹرے لئے داخل ہوتا ہے)

ممدو۔ چائے۔

عائشہ۔ دیکھئے یہ میرا نوکر ہے۔ میں اس سے اگر کہوں تو وہ ابھی آپ کو گردن سے پکڑ کر باہر نکال سکتا ہے۔

(ممدو خاموشی سے چائے کا سامان میز پر لگا رہا ہے)

نوجوان۔ ممدو اتنا بدتمیز نہیں ہے کہ گھر آئے ہوئے ایک معزز مہمان کے ساتھ، جس کے لئے وہ ابھی چائے بنا کر لایا ہے، ایسا نازیبا سلوک کرے۔ وہ ایسا نہیں کریگا۔

عائشہ۔ وہ ایسا ہی کرے گا۔

نوجوان۔ میرا خیال ہے وہ فوراً آپ کے ڈیڈی کے پاس دوڑا ہوا جائے گا اور ان سے کہے گا کہ بی بی کے دماغ میں کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے سرکار۔ کیوں ممدو؟

ممدو۔ (چونک کر) جی ہاں سرکار (نوجوان زور زور سے ہنسنے لگتا ہے)

عائشہ۔ (زور سے) کیا جی سرکار؟ آپ کو معلوم ہونا چاہئے وہ بہرا ہے۔

ممدو۔ جی سرکار۔ بڑے سرکار نے کہا تھا کافی اور چائے دونوں چیزیں لے جانا۔

نوجوان۔ تم جا سکتے ہو ممدو؟

ممدو۔ انڈا تو گھر میں تھا نہیں سرکار، ورنہ میں ضرور لے آتا۔

عائشہ۔ چائے بنادو (ممدو چائے بنانے لگتا ہے) آپ چائے پی کر فوراً چلے جایئے ورنہ میں ویسا ہی کروں گی جیسا میں نے کہا تھا۔

نوجوان۔ کیا کہا تھا آپ نے؟

عائشہ۔ یہی کہ میں ممدو سے کہہ کر آپ کو باہر نکال دوں گی۔

نوجوان۔ (زور دے کر) آپ ایسا نہیں کر سکتیں۔!

عائشہ۔ میں کر سکتی ہوں۔

نوجوان۔ نہیں کر سکتیں۔

عائشہ۔ کیوں نہیں کر سکتی؟

نوجوان۔ اس لئے کہ چائے پی کر میں خود ہی چلا جاؤں گا۔

عائشہ۔ (سانس لے کر) اوہ! آپ نے پہلی بار شرافت کا ثبوت دیا ہے۔

نوجوان۔ شکریہ۔ ممدو تمہارے پاس ماچس ہوگی۔

ممدو۔ جی ہاں سرکار عمر اسی گھر میں گذری ہے۔

نوجوان۔ (ہنستے ہوئے) ماچس۔ مجھے ماچس چاہیئے

ممدو۔ ماچس۔ ہاں ہاں سرکار۔ کیوں نہیں۔ (اپنی جیب سے ماچس نکال کر دیتا ہے)

نوجوان۔ سگرٹ سلگاتا ہے جو اب تک اس کے ہاتھ میں تھی) شکریہ

ممدو۔ (چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھا رہا ہوتا ہے) شکر۔ دو چمچے سرکار۔

عائشہ۔ (جھڑک کر) تم اب جاؤ۔

ممدو۔ اور کیا لاؤں سرکار؟

عائشہ۔ کچھ نہیں، جاؤ۔ باہر چلے جاؤ۔ (ممدو اپنا جھاڑن کندھے ڈالے چلا جاتا ہے)

نوجوان۔ (چائے کا ایک گھونٹ بھر کر) آپ نہیں پیئیں گی چائے؟

عائشہ۔ جی نہیں۔

نوجوان۔ بہت خفا ہیں؟

عائشہ۔ (منہ دوسری طرف پھیر لیتی ہے)

نوجوان۔ میں جانے والا ہوں۔ صرف چند لمحے اور آپ کے پاس ہو[ں] شاید اس کے بعد ہم پھر کبھی ایک دوسرے سے نہ مل سکیں، ا[یک] دوسرے کو نہ دیکھ سکیں۔ چلتے چلتے اس قدر بے رخی تو نہ بر[تئے]

عائشہ۔ (کچھ سوچ کر) آپ ہی نے کونسی اپنائیت کا ثبوت دیا ہے۔

نوجوان۔ آپ نے چاہا بھی کب؟

عائشہ۔ یہ تک نہیں بتایا آپ نے کہ آپ ہیں کون اور کہاں آئے [تھے]

نوجوان۔ اگر آپ کسی اور سے اس کا ذکر نہ کریں تو بتا سکتا ہوں۔

عائشہ۔ (ظاہرا بے تعلقی سے) آپ کو غلط فہمی ہے کہیں آپ کو اس [قدر] اہمیت دے سکتی ہوں کہ ہر کسی سے آپ کا ذکر کرتی پھرو[ں] مجھے کیا پڑی ہے۔

نوجوان۔ تو پھر میں بتادوں؟

عائشہ۔ آپ کی مرضی۔

نوجوان۔ سنئے ـــ میں ڈرامے لکھتا ہوں۔ میرا ایک ڈرامہ ہے جس کا منظر یہ ہے کہ ایک نوجوان ایک غیر آباد علاقے میں ایک گھر [میں] داخل ہو جاتا ہے۔ یہ رات کا وقت ہے۔ شدید بارش ہے نوجوان کو سگرٹ کی سخت طلب ہے۔ لیکن اس کی ماچس

(باقی صفحہ ۱۳۱ پر)

افسانہ:

دوسری کہانی

یونس جاوید

چاندنی میں نہائی ہوئی اس خنک رات کو گاؤں سے آدھ میل دور، بیریوں کے جھنڈ کے پاس چاچا عمرے کے ڈیرے پر پڑا ہوا کھاٹ سائے میں ہونے کی وجہ سے گوبر کا ڈھیر معلوم ہوتا تھا۔ بیریوں کے گہرے گہرے سائے اس کے اوپر سے ہوتے ہوئے جوہڑ کے کنارے تک چلے گئے تھے۔ کھاٹ کے نیچے ڈبو گٹھڑی بنا سو رہا تھا اور اس سے کچھ دور بانکی چھپر تلے بندھی تھی۔ اور چھپر کے بالکل سامنے چاچا عمرا تنہا اپنی جھونپڑی میں بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔

گھاس پھونس کی اس چھوٹی سی جھونپڑی کا چھپر سرکا ہوا تھا۔ اور چاندنی کی ایک چھوٹی سی تہہ، اندر بچھی ہوئی پرالی پر جمی تھی۔ چاچے نے اپنا موٹا کھیس ڈھیلا کر کے از سر نو کس کر لپیٹا اور چلم میں پڑی ہوئی آگ کریدتے ہوئے پھونک ماری۔ پھونک مارنے سے تھوڑی سی راکھ بھی اڑی۔ اور چاندنی میں یوں تیرنے لگی جیسے دور کہیں برف گر رہی ہو۔

چاچا حقے کے ہلکے ہلکے کش لیتا رہا اور کچھ سوچتا رہا۔ پھر کچھ دیر بعد جب ڈبو بھونکتا ہوا کھاٹ کے نیچے سے نکل آیا۔ باکی ہنہنائی تو چاچا چونک کر کھڑا ہو گیا اور حقے کی نے گھما کر اسے بڑی احتیاط سے ایک کونے میں رکھنے کے بعد جھونپڑی کے دروازے پر آگیا۔ دور جوہڑ کے کنارے کنارے کوئی جوان گھوڑی پر جھک کر پوری رفتار سے چلا آرہا تھا۔ ٹاپوں کی آواز بڑی دھیمی تھی اور گھوڑی کے پیچھے اڑنے والی گرد دھند معلوم ہو رہی تھی۔ بیریوں کے قریب آکر جب سوار نے رخ جھونپڑی کی طرف پھیرا تو چاچا دروازے سے ہٹ کر اندر آگیا۔

سوار نے عین جھونپڑی کے سامنے پہنچ کر گھوڑی روکی۔ تو وہ پچھلی ٹانگوں پر کھڑی ہو گئی اور اس کا سایہ کانپتا ہوا جھونپڑی کے اندر تک آگیا۔ گھوڑی سنبھالنے کے بعد سوار نے اتر کر اسے ایک درخت سے باندھ دیا اور خود کھانستا ہوا جھونپڑی میں آگیا۔ چاچا اس وقت تک چارپائی پر بیٹھ کر حقے کی نے پر بوجھ ڈال چکا تھا۔

"جلدی پلٹ آئے ہو سردارے!" چاچے نے کش لئے بغیر سوار کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہوں۔" پھسپھسی آواز میں سردارا بڑبڑایا۔ پھر پرالی کو اکٹھا کر کے اس کی ایک موٹی سی تہہ بنائی اور اس پر بیٹھ کر بولا۔

"جیجا مجھے چودھریوں کی بیٹھک ہی میں مل گیا تھا۔"

"کوئی پنچایت تھی کیا؟" چاچے نے ابھی تک حقے کا کش نہیں لیا تھا۔

"نہیں" سردارا ایک بار پھر مری ہوئی آواز میں بولا "جیراں اور کھیلے کی منگنی تھی۔"

"کون کھیلا؟ نبی بخش ذیلدار کا؟"

"ہاں، وہی۔" سردارے نے بڑی دھیمی آواز میں کہا۔ اور کچھ دیر خاموش رہا۔ جب چاچا نے حقے کی نے اس کی طرف گھمائی تو اس نے ہلکا سا کش لے کر کہا۔

"منگنی تو خیر کل ہوئی تھی، گڑ آج بانٹا گیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"

"کس بات کی سمجھ؟ کچھ کھول کر بیان کرنا۔" چاچا تجسس بھری نگاہوں سے اس کی طرف مسلسل دیکھتا رہا۔ مگر سردارے نے جواب دینے کے بجائے گردن پوری طرح جھکا لی۔

چاچا جب دو تین کش لے چکا تو اسے احساس ہوا کہ اس کی بات کا جواب نہیں دیا گیا۔ وہ پہلے سے تند لہجے میں بولا۔

"منگنی تو جیراں اور کھیلے کی ہوئی ہے۔ تو کیوں گونگا بن رہا ہے؟ تجھے تو اس منگنی پر خوش ہونا چاہیئے۔ کیا ہوا اگر اب کھیلے سے تمہاری دوستی نہیں رہی۔ تھا تو تیرا ہی یار۔ بچپن کا ساتھی۔ دیر تو اس کی منگنی ......"

"کون کس کا ویری ہے چاچا۔" سردارا بات کاٹ کر بولا۔ "میں اس کا ویری ہوں نہ وہ میرا۔ پہلے اندر سے وہ میرا دشمن تھا۔ اب کھلے طور پر میں اس کے خون کا پیاسا ہوں ......"

چاچا کچھ دیر منتظر رہا کہ سردارا اپنی بات مکمل کرے گا۔ مگر جب سردارا کچھ نہ بولا تو چاچا تنگ آکر کہنے لگا۔

"کچھ بول تو سہی۔ کیا آئیں بائیں شائیں کر رہا ہے۔ جیجا کہاں ہے اور

وہ چیز ـــــ ؟"

سردار گردن گھما کر جھونپڑی سے باہر تکنے لگا۔

چاند بیریوں کے اوپر سے ہو کر جوہڑ کے کنارے اُگے ہوئے کھجور کے درخت میں اٹک سا گیا تھا۔

اور چاندنی میں گاؤں، سمندر کے کنارے بنے ہوئے ریت کے گھروندوں کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے چاند کو گھورتے ہوئے ہاتھ حقے کی نے کی طرف بڑھائے اور ایک کش لینے کے بعد بولا" وہ بھی آجائے گا۔ میں اسے راستے میں خود چھوڑ آیا ہوں۔ گو رتی تھکی ہوئی تھی نا۔ دونوں کا بوجھ اٹھا کر چل نہیں سکتی تھی۔"

وہ چپ ہوا تو سناٹے کی چادر پھر تن گئی۔ البتہ جب دونوں میں سے کوئی حقے کا کش لیتا تو سناٹا مجروح سا ہو جاتا۔ کتنی ہی دیر وہ گم سُم بیٹھے رہے۔ یہاں تک کہ سرکے ہوئے چھپر میں سے جھانکتی ہوئی چاندنی بھی آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگی۔ جب سردارا آیا تھا تو جھونپڑی کے اندر گز بھر چاندنی پھیلی ہوگی۔ اب آدھی بھی نہ رہ گئی تھی۔

یکایک ڈبو غراتا ہوا کسی جنگلی بلی کے پیچھے بھاگا تو دونوں باہر دیکھنے لگے۔ پھر سردارا چپ چاپ اٹھا اور دروازے تک آکر اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد واپس آگیا اور بولا "جیجا آرہا ہے شاید۔"

چاچے تمرے نے اپنی خشخشی داڑھی کھجاتے ہوئے نگاہیں جھونپڑی سے باہر جما دیں۔

تھوڑی دیر بعد جیجا اندر آگیا۔ اس نے سر پہ کوئی موٹا کپڑا لپیٹ رکھا تھا۔ ایک ہاتھ میں کھونٹا تھا۔ اور دوسرے میں کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز تھی جب وہ اندر آکر چارپائی پر بیٹھ گیا تو چاچے نے کہا" آ بھئی جوان۔ کتنی دیر سے تیری ہی راہ دیکھ رہے ہیں۔ لائے ہونا"

کیوں نہیں۔ آج تو سردارے کو بھی ٹوٹ ہے۔ کیوں دیر جی؟" اس نے آخری جملہ سردارے کی طرف رُخ پھیر کر کہا۔

سردارا کچھ بھی نہ بولا۔ جیجے نے کاغذ میں لپٹی ہوئی چیز چاچے کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا" اصلی کیکر کی ہے۔ اپنے ہاتھوں سے کیکر کی جڑیں ڈال کر بوتل دبائی تھی۔ میں تو پیوں گا نہیں تم دونوں موج میلہ مناؤ۔"

"خیر یہ تو ہوا" چاچے نے بوتل پرالی کی گٹھڑی میں اڑستے ہوئے کہا" اس کو کیا ہوگیا ہے۔ میری سمجھ میں تو نہیں آرہی اس کی بات۔"

"بات تیری سمجھ میں آبھی نہیں سکتی" جیجا حقے کا پہلا کش لے کر بولا" پھر بھی سُن لے۔ باتیں تو اس جوان سے تو ہر روز بھائی کی سنتا ہے۔ حالانکہ وہ بھی کب کی بیاہی جاچکی ہے۔ مگر نئی کہانی تو تم نے سنی ہی نہیں۔ دیکھو نا" چارپائی کے سامنے بیٹھ کر اس نے چاچا کو پوری طرح متوجہ کرلیا" اب اگر ہم سے نہ چھپاتا۔ تو یہ رشتہ بھی ہاتھ سے جاسکتا تھا۔؟"

"رشتے کی بات نہیں" پہلی بار سردارا اتنی اونچی آواز میں بولا" بات تو اس ضد کی ہے جو میرے اور بھیلے کے درمیان چلی آرہی ہے۔ کل تک بھیلا تھا۔ آج شہر سے لوٹا ہے تو محمد طفیل ہوگیا ہے۔"

"کس بات کی ضد؟" چاچے نے سردارے کو سانس لینے کی مہلت دیئے بغیر پوچھا۔

"جیراں کو بیاہ لانے کی ضد اور کون سی؟ میں ضدی تو نہیں ہوں۔ دعویٰ بھی اس لئے کر بیٹھا کہ جیراں مجھے دل و جان سے چاہتی ہے۔ میں نے اس سے کبھی بات نہیں کی تو کیا ہوا۔ مائی کمالاں مجھے صاف بتا گئی تھی کہ جیراں تو اب تیرے ہی گُن گاتی ہے۔ ورنہ ضد کس بات کی۔؟"

"پھر؟" چاچا تجسس بھری آواز میں بولا۔

"پھر کیا بتاؤں۔ میں بھی تو ایسی ہی لڑکی چاہتا تھا جو صرف مجھے چاہے میری ہو کر رہے۔ ورنہ گاؤں میں لڑکیوں کا کال تو نہیں ہے۔ چودھری کے گھر مائی طالعاں کے ذریعہ بات چیت ہو رہی تھی۔ جانے یہ بھیلا شہر سے ایک دم کیسے آن ٹپکا۔ خبر ہی نہیں سنی اس کے آنے کی۔ جیجے کی طرف گیا ہوں۔ تو راستے میں بڑی حویلی کے پاس چودھری کی بیٹھک میں ٹھٹھے مذاق کی باتیں سُن کر معلوم کیا تو شرم سے پانی پانی ہوگیا۔"

"تو ہوا کیا" جیجا بیچ میں بول پڑا" تو تو یوں کڑھ رہا ہے جیسے تیری رَستی بستی بیوی کو بھگا لے گیا ہو بھیلا۔ تو آج بول آدھی زبان سے۔ بھیلے کی بہن ـــ بیاہ دوں تجھے۔ دس گھماؤں زمین کا اکیلا مالک ہے، تو روتا کیوں ہے؟"

"تو بات نہیں سمجھا جیجے۔ خواہ مخواہ بیچ میں بول پڑتا ہے۔ سُن تیرے مولانے چاہا تو جیراں کو بیاہ کر نہ لے جاسکے گا بھیلا بھی۔ اور اگر وہ جیراں کی ڈولی لے گیا تو اسی دن تمہیں بھی جیرے کے جنازے کو کندھا دینا ہوگا۔ ارے پاگل! جوانوں کی بھری محفل میں قول دے کر آیا تھا۔ کیا منہ لے کر جاؤں گا سب کے سامنے!"

سردارے نے حقے کی نے اپنی طرف کھینچی، منہال کو ہاتھ میں لیا۔ اور مٹھی کے دہانے پر ہونٹ جما کر کش پینے لگا۔

کچھ دیر تینوں خاموش بیٹھے رہے، پھر سردارا فیصلہ کن انداز میں کھڑا ہو کر بولا" خدا کی قدرا بانکی لے جا رہا ہوں۔ گودی صبح سے بہت چلی ہے تھکی ہوگی۔"

"بانکی سو بار لے جا تو۔ پر اس وقت جا کدھر رہا ہے۔ اور پھر اس کا کیا بنے گا؟"

چاچے نے بوتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آخری جملہ کہا۔

"میں پھنک جاؤں گا گھنٹے بھر میں واپسی ہوگی۔ تب تک تم شغل کرو۔ سمجھ میں آیا؟" سردارے نے چٹکی بجائی۔

"جانا ہی کتنی دور ہے۔ میں زیادہ سے زیادہ دو مرحلے ہوں گا۔" اس نے جھونپڑی سے نکلتے ہوئے کہا۔ اور بانکی کھول کر اس کی ننگی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔

فضا میں بانکی کی ٹاپیں ابھریں پھر آہستہ آہستہ معدوم ہو گئیں۔

رات کے تیسرے پہر جب سردارا لوٹ کر ڈیرے پہنچا تو چاند مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ سردی سے بچنے کے لئے اس نے کان اور منہ کپڑے سے اچھی طرح لپیٹ رکھے تھے۔ یہ بانکی کا کمال ہی تھا کہ وہ اس قدر جلد لوٹ آیا تھا۔

جب وہ جھونپڑی کے سامنے پہنچا تو بانکی قدم قدم چل رہی تھی۔ اس بار محمدی ہنہنائی نہ ڈبو غرایا۔ بس گہرا سناٹا چھایا رہا۔ بڑی پھرتی سے اس نے بانکی سے اتر کر اسے کھونٹے سے باندھا اور جھونپڑی میں چلا آیا۔

جیجا اور چاچا چارپائی پر آڑے ترچھے سو رہے تھے۔ بوتل پر ابھی تک چاچے کا ہاتھ تھا۔

سردارے نے گھبرا کر جیجے کی پنڈلی پر آہستہ سے ٹھوکر ماری۔ اس کا خیال تھا کہ دونوں شراب پی کر نشے میں پڑے ہیں۔ مگر جب وہ چاچا پر جھکا تو اس کے ہاتھ کے نیچے بھری ہوئی بوتل دیکھ کر اسے کچھ تسلی ہوئی۔

اس نے دونوں کو باری باری جھنجوڑ کر جگایا۔ دونوں کچھ دیر اپنی اپنی آنکھیں ملتے رہے۔ اور جب ان کی آنکھوں میں روشنی اور تجسس ایک ساتھ امڈے، تو وہ سردارے کی طرف گہری نظروں سے دیکھنے لگے۔ سردارے نے آہستہ آہستہ کھیس کی بکل کھولی۔ اور دو نالی بندوق نکال کر دونوں کے سامنے رکھ کر مسکرانے لگا۔

"یہ کیا ہے؟" چاچے نے سوئی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"جیجے کی تقدیر!" سردارا ایک دم سنجیدہ ہو کر بولا۔

چاچا پہلے تو چپ چاپ سردارے کی طرف گھورتا رہا۔ پھر اٹھ کر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا: "جیجے کی تقدیر کے ساتھ کھیلتے ہوئے تو اپنی جوانی کے ساتھ بھی کھیل رہا ہے۔ دوسرے کو رت کے گھاٹ اتارنے سے عمر لمبی نہیں چھوٹی ہوتی ہے۔ اور پھر دس گھماؤں زمین بیچ کر تم اگر بچ بھی گئے۔ تو کیا وہ زندگی زندگی ہوگی؟"

"تو کیا جانے چاچا!" سردارا پھر بولا۔ "چودھری کی لڑکی سے منگنی کرا کے اس نے میرے جسم میں انگارے بھر دیئے ہیں۔ اپنے سر میں سات چولھوں کی راکھ اڑتی محسوس کرتا ہوں۔ مرد کے لئے یہ کوئی چھوٹی بات نہیں۔ ایک بار تو منا سا حلال چھوڑ اری

کے بھرے ڈیرے پر ہم نے ایک دوسرے کو ایک سال کے مقابلے میں کسنے کی دعوت بھی دی تھی۔ اصل بات تو جیر آن بھی مرنے مارنے کی بات ہوتی تو بھری محفل سے اس طرح نہ لوٹتا۔ لاش ہی آتی۔ اب ہر محفل میں اس کی شیخی سنکر شرم کے مارے گردن جھکا لینے سے یہ بہتر نہیں کہ ہم میں سے ایک نہ رہے۔ وہ تو خیر سرچکا ہوگا۔ میں کیوں نہ اس کا خون پی کر کلیجہ ٹھنڈا کروں؟ چودھری بھی تو یاد کرے گا۔" سردارے نے جیجے کی طرف دیکھ کر کہا۔ "معافی طالعاں سے تھوڑی سی بات کر کے بھی رات بھر میں بدل گیا۔ اب دیکھوں گا نا۔ کیسے گھر بستا ہے جیجے کا؟"

سردارا خاموش ہوا تو چاچے نے کھنکار کر بولنے کے لئے زمین ہموار کی۔ مگر سردارے نے اس کی کھانسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زور سے کہا۔

"چاچا! زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اسے اگر میرے ہاتھ سے اور مجھے پھانسی سے مرنا ہے تو کون روک سکتا ہے ہم دونوں کو؟ ویسے تو فکر نہ کر۔ سردارا کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوا۔ انتظام پورا ہے تیری دعا سے۔ سنے گا تو سر دھنے گا۔" سردارے نے زمین سے بندوق اٹھا کر چارپائی کے پائے کے ساتھ کھڑی کر دی۔ "یہ بندوق میر پور جا کر دتے ماچھی سے لایا ہوں۔ بغیر لائسنس کی ہے۔ فائر تو ہوگا اس بندوق سے۔ اور پھر مقدمہ چلے گا تا۔ سن رہا ہے نا میری بات! غور سے سن۔ مقدمے میں اپنی بندوق پیش کروں گا۔ سمجھا؟"

"کون سی اپنی؟" چاچا بے ساختہ بولا۔ "جس کی نالی نیچے سے پھٹی ہوئی ہے؟ اس کی تو ہر کل خراب ہے۔" "وہی نا؟" چاچے کی بات سے متصل جیجے نے کہا۔

"ہاں، وہی۔ مگر تم کیا جانو اس چکر کو؟ چھ سال سے اس ناکارہ بندوق کا ٹیکس دے رہا ہوں۔ بات بتانے کی نہیں مگر یاروں کی منڈلی میں جلنے کیوں راز اچھل اچھل کر حلق کی طرف آنے لگتے ہیں۔ تو بات اتنی ہے کہ اس زنگ آلود بندوق کا لائسنس بنوایا ہی اس غرض سے تھا۔ اور پھر کاؤں کے برتن ہیں نا۔ کچے ہی سہی مگر جب ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں تو شہر کے پکے برتنوں کی طرح خوبصورت شور پیدا نہیں کرتے بلکہ دونوں میں سے ایک ٹوٹ جاتا ہے۔ سمجھ رہے ہو نا میری بات! یہی کچھ سوچ کر میں نے اس کا لائسنس بنوایا تھا۔ کہ جب دو برتن ٹکرا جائیں اور میرے مقابلے کا برتن ٹوٹ جائے تو بچنے کے لئے ایک راستہ باقی رہے۔ یعنی فائر تو کروں گا دتے ماچھی کی بندوق سے اور عدالت میں یہ پیش ہوگی۔ عدالت اتنی پاگل تو ہے نہیں کہ اس کرڑکھائی بندوق کو دیکھ کر مجھے پھانسی دے دے، ہوں!"

سردارا خاموش ہوا تو کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ چاند

جھونپڑی کے اوپر سے ہو کر دوسری طرف اس حد تک نکل گیا تھا کہ جھونپڑی کا سایہ پیچھے بندھی باچھی کے قدموں کو چھونے لگا تھا۔ سناٹا اتنا گہرا تھا کہ گاؤں میں اذان دینے والے مرغے کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ کچھ دیر تینوں یوں چپ بیٹھے رہے جیسے کچھ سوچ رہے ہوں پھر چاچا اپنے پھیلے سفید بالوں کی ایک لٹ شہادت کی انگلی کے گرد لپیٹتے ہوئے بولا "ساری بات تو جوانی کی ہے، جوانی جب کسی پر آتی ہے، کچھ نہ کچھ کر گزرتی ہے جب میں جوان تھا تو شاید دودھ پیتا بھی ہوگا۔ عجیب سرور اور نشہ سا رہتا تھا ہر وقت۔ منڈلی بیٹھتی تو دوسرے لوگوں سے لڑنے کا پروگرام بنتا۔ خون تھا نا رگوں میں خواہ مخواہ لڑنے کو جی چاہتا تھا۔ کبھی کبھی جب کوئی بھی لڑنے پر آمادہ نہ ہوتا تو جی کرتا اونچے اونچے درختوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اکھیڑ دوں۔" چاچا منہال کر ہاتھ سے چھوڑ پرالی کو تنے پر لپیٹنے لگا۔ "تم جانو جب جوانی اتنی بے قابو ہو۔ تو اس کی لگام ضروری ہے۔ لگام ایسی ہو کہ دل خود قبول کرے۔ میری اس منہ زور جوانی کی لگام مجھے نوری کے ہاتھ میں نظر آئی۔ پہلے دن تو میں نے اسے یونہی نظر انداز کر دیا۔ مگر جب کچھ دنوں بعد اس نے مجھے دیکھ کر ناک چڑھائی اور منہ پھیرا تو یہ لگام ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے دل کو تسلی دی کہ مذاق کر رہی ہے۔ مگر شاید یہ مذاق نہ تھا۔ اس کی ہر حرکت سے پتہ چلتا تھا کہ وہ مجھ سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوئی۔ کیا کیا جتن نہ کئے ہوں گے میں نے۔ ململ کی قمیص پہن پہن کر پوس ماگھ کے مہینوں میں پھرا ہوں۔ بھرے چوپال میں بنی پچھڑے کے بہانے سے نور بخش دھوبی کے بیٹے کا انگوٹھا توڑ دیا۔ اور پھر ایک بھاگتے چور کے پیچھے چھری لے کر اس وقت بھاگا جب سارا گاؤں منہ دیکھ رہا تھا۔ چور کے پاس دیسی پستول تھا نا۔ مگر ان سب باتوں کا مطلب نوری کے دل کو پھیرنا تھا۔ میں چاہتا کہ نوری کسی طرح اس اندھی جوانی کی لگام بن کر میرے گلے سے آ لگے۔ مگر اس نے میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور پھر اس طرح بالکل تمہاری طرح، میں بھی نفرت کے شعلوں میں جل کر محبت جیتنے نکلا۔ مگر ہار گیا۔ تم نے تو دونے ماچھی سے بندوق مانگی ہے اور اپنے بچاؤ کے لئے سب منصوبے بنالئے ہیں۔ مگر میں اکیلا، بغیر کچھ سوچے سمجھے، اس آگ میں کود پڑا۔ رات کو اپنے ڈیرے سے گاؤں واپس آرہا تھا۔ ان دنوں میرا ڈیرا گاؤں کی پہلی جانب ہوتا تھا۔ جہاں آج کل جانے کے کھیت ہیں۔ خیر، پرانی چکی کے موڑ پر مجھے نوری ایک درخت کے نیچے کھڑی ہوئی دکھائی دی۔ اس وقت اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ جی میں آیا چیخیں مارتی ہوئی کو اٹھا کر بھاگ جاؤں سیدھا ڈیرے۔ مگر میں آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ مجھے تو وہ اس وقت کانچ کی بنی ہوئی لگتی تھی۔ اسی لئے میں نے ہاتھوں میں نرمی پیدا کر کے اس کی طرف بڑھایا۔ مگر آہٹ پا کر وہ یوں چونکی جیسے کوئی چلی ہو۔ اور پھر خوف سے وحشی ہرنی کی طرح اتنی تیز بھاگی کہ کھائی بھی نہ پھلانگ سکی۔ اور بری طرح گر پڑی۔ اس نے ایک بار تو اٹھنے کی کوشش کی مگر یوں ہانپ کے رہ گئی جیسے پاؤں میں من من بھا بندھا ہو۔ میں اپنی قسمت پر مسکرانے ہی والا تھا کہ جیرا ایک تیز تیکھی گھوڑی کو بھگاتا ہوا چکی کے موڑ سے یوں آپہنچا جیسے پہلے سے چھپا بیٹھا ہو۔ میرے قریب آکر اس نے صرف میری طرف گھور کر دیکھا اور جلدی سے گھوڑی سے اتر کر نوری کو اٹھانے لگا۔ میری طرف اس لئے نہ بڑھا ہوگا کہ میرے ہاتھ میں چم چم کرتی چھری تھی۔ نوری اٹھی اور اس کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ مجھے تو اس وقت اپنے کپڑے بھی آگ کے بنے ہوئے لگے۔ ہتھیلیوں پر پسینہ آگیا۔ کان شائیں شائیں کرنے لگے اور بات کی تہہ تک پہنچنے میں مجھے ذرا بھی دیر نہ لگی۔ پہلے ہی مجھے جیرے پر شک تھا کہ وہ ہر روز شام کے بعد گھوڑی پر بیٹھ کر اکیلا ڈیرے کی طرف کیوں جاتا ہے۔ جیرا ایک منٹ تک چپ چاپ مجھے گھورتا رہا۔ اور پھر اوپر تلے دو تین موٹی موٹی گالیاں دے کر غصے سے ہانپنے لگا۔ تھا تو وہ بھی اونٹ جتنا جوان۔ اور کم میں بھی نہ تھا چھری پاس نہ بھی ہوتی تو مقابلہ کئے بغیر کبھی نہ جاتا۔ مگر میں نے گالیوں کا جواب گالیوں سے دینے کے بجائے کہا۔ کیوں حرام موت مرتا ہے! گھوڑی پر بیٹھ اور گاؤں بھاگ جا، وہ میری اس بات پر اور بھی بپھر گیا۔ اور زمین سے ایک بڑا سا ڈھیلا اٹھا کر پوری طاقت سے میرے سر پر دے مارا۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش تو بہت کی۔ مگر مجھے ڈھیلا آن ہی لگا۔ سر پر لگتے ہی دو تین چکر سے آئے۔ غصے بھرے ناگ کی طرح میں نے چمکتی ہوئی چھری سے جیرے پر بھرپور وار کیا۔ مگر وہ اس کا کندھا چھیلتی ہوئی نوری کے سینے میں اتر گئی۔ میں نوری کو نہیں مارنا چاہتا تھا۔ لیکن جب میں نے چھری اس کے سینے سے باہر کھینچی اور خون کا دھارا بہہ نکلا۔ تو اس وقت مجھے اس کے مرنے کا ذرہ بھر بھی افسوس نہ ہوا۔ بلکہ میں نے اس پر دوسرا وار کر کے اسے جلدی ٹھنڈا کر دیا تھا۔ جیرا زخمی کندھے پر ہاتھ رکھے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر میں نے اس پر دوسرا وار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ خبر نہیں کیوں۔ مگر مجھے یاد ہے کہ میں نے ڈر کر نہیں بلکہ اپنی مرضی سے اس پر دوسرا وار نہیں کیا تھا۔"

"پھر؟" چاچا ایک لمحے کے لئے چپ ہوا تو جیا اور سردارا کل دار کھلونوں کی طرح پھڑک کر بول پڑے۔

"پھر کیا۔ جیرے کی گھوڑی سامنے کھڑی تھی۔ بس اس کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ کر چک نمبر ۸۰ بھاگ گیا۔ مگر جانے کیسے صبح ہونے سے تھوڑی دیر پہلے مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ پانچ چھ دنوں میں وہ وہ خبریں اڑی ہیں گاؤں میں کہ پہلے ان کی بھنک بھی دب پڑی تھی۔ سارا گاؤں کہتا پھر رہا تھا کہ نوری ہر روز جیرے کو ملنے جایا کرتی تھی اور جب دونوں کو جیرے نے دیکھ لیا۔ تو دونوں جانوں کی ٹھن گئی۔ بعض

لوگوں کا خیال یہ تھا کہ نورتی کا قاتل جیرا ہے۔ جب نمبردار کے ساتھ اماں جیناں مجھے ملاقات ملنے آئی تو اس نے مجھے ایسی ایسی باتیں بتائیں کہ میں تلملا کر رہ گیا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ نورتی پرانی چکی کے موڑ پر تمہاری راہ دیکھنے جایا کرتی تھی۔ اور جیرا اس پر مرتا تھا۔ ورنہ اس نے تو کبھی جیرے سے بات بھی نہ کی تھی۔ میں نے سب کی باتیں کان لگا کر سنیں اور خاموش رہا حتیٰ کہ میں نے اپنی صفائی میں کچھ کہا نہ نورتی کے خلاف۔ چپ چاپ جیل چلا گیا۔ معلوم نہیں میں نے ایسا کیوں کیا۔ جانے وہ کونسی شے تھی جو اندر ہی اندر مجھے جیل جانے پر اکسا رہی تھی۔ سات سال جیل میں سڑا۔ میں نورتی کو نہ بھول سکا۔ اتنی لمبی قید اور اس کی مصیبتیں جھیلنے کے بعد اور پھر آج چوبیس برس کے بعد بھی وہ مجھے اسی طرح یاد آ رہی ہے۔ وہی معصوم کانچ کی بنی ہوئی نورتی جو پرانی چکی کے موڑ پر چھپ کر مجھے دیکھا کرتی تھی۔ یوں لگتا ہے جیسے میں نے کوئی ایسا گناہ کیا ہے جس کا داغ میں پھانسی کی سزا پا کر بھی نہیں دھو سکتا۔ میں نے اکثر اسے خواب میں دیکھا ہے۔ وہ محبت کرتی تھی نا۔ مجھ سے نہ سہی جیرے سے ہی سہی۔ کسی ایک کے لئے تو اس کے دل میں محبت تھی۔ مجھے بعض اوقات ان خیالوں سے اس قدر وحشت ہوتی ہے کہ دل کا زخم ہرا ہو جاتا ہے۔ جیسے میں نے گلال جیسے چہرے والی معصوم نورتی کو نہیں بلکہ زہر میں بجھی ہوئی تلوار اپنے کلیجے میں بھونک دی ہو۔ دن گزرات کو سوتے جاگتے اس نے میرا دامن کھینچا ہے۔ آدھی آدھی رات کو اکثر مجھے جگا جگا کر رلایا ہے۔ یہ کیسی عورت تھی، میں نہیں سمجھ سکا۔ میں نے اسے قتل بھی کیا تھا۔ میں اس کی یاد میں تڑپا بھی ہوں۔ میری روح کو کسی وقت بھی چین نہیں ملا۔"

"جیرے کا کیا بنا؟" جیجا سہمی سہمی آواز میں بولا۔

"میرے جیل سے واپس آنے تک وہ یہ گاؤں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔" چاچا میلے کمیس کے کونے سے اپنی نم آلود آنکھوں کو خشک کرتے ہوئے، جھونپڑی کا چھپر سرکا کر باہر نکل گیا تو صبح کا ہلکا نور اندر آنے لگا۔ جیجا اور سرداآرا چپ چاپ جہاں بیٹھے تھے وہیں لیٹ گئے۔ دونوں نے کسی سے کوئی بات نہ کی۔ صرف ایک بار جیجے نے اٹھ کر چھپر کو جھونپڑی کے دہانے پر جما دیا اور پھر لیٹ گیا۔

پورنماشی کی رات سے لے کر چاند کی بیس تک گاؤں بھر میں وہ ڈھولک بجی ہے کہ کبھی کومل کنواریوں کے دل بھی شادی بیاہ کے تصورات میں ڈوب ڈوب گئے۔ کسی نے لال جوڑا چمکا کر، ہونٹوں پر اجلی مسکراہٹ سجائی ہے تو کسی نے سرخ سرخ آنچل کمر کے گرد لپیٹ کر پورے آنگن میں پاؤں تھرکائے ہیں۔ جیراں چودھری کی بیٹی نہ ہوتی تو مرغی کی طرح ڈربے میں بند کر کے سسرال پہنچا دی جاتی۔ مگر وہ تو چودھری جلال کی بیٹی تھی۔ اس کی شادی قریب کیا آگئی تھی، سر پر پہاڑ ٹوٹ رہا تھا سب کو۔ سلامت کی دکان کی کناری اور گوٹ دو دن میں پھیل کر چھوٹی بچیوں کے دوپٹوں سے الہڑ جوانیوں کے لہنگوں تک جا پہنچی تھی۔ شادی سے دو دن پہلے جب رات کو برگد کے پرانے درخت کے نیچے بچھی ہوئی بے شمار چارپائیوں پر بیٹھے جیرا اور چھیلے کا نکاح ہو گیا۔ اور چھوہاروں کی بارش شروع ہو گئی تو سرداآرا اندھیرے سایوں میں سے ہٹتا ہوا چاچا عمر کے ڈیرے آ پہنچا۔ اس وقت چونکہ وہ نکاح کو ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا تھا۔ اس لئے اس کے کان سرخ اور آنکھیں وحشیوں جیسی ہو رہی تھیں۔ چاچا کلف لگی سفید پگڑی کو سر پر جما چکا تو اسی طرح بندھی بندھائی پگڑی کو اتار کر کھونٹی پر لٹکا کر بولا: "نکاح ہو گیا خیر سے تیری جیراں کا۔"

سرداآرا اس وقت یہ بات سننے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس نے عجیب بڑی بڑی آنکھوں سے چاچے کی طرف دیکھا اور پھر منہ پھیر لیا۔

جب چاچا عمر نے دوبارہ بغیر کچھ کہے اس کا کندھا ہلایا تو وہ تقریباً روتے ہوئے بولا "نکاح ہی ہوا ہے، ڈولی تو نہیں اٹھ گئی۔ اور سرداآرا مر گیا ہے کیا؟" پھر جب چاچے نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تو وہ خود ہی چاچے عمر کی طرف بڑی تمکنت سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"برات پرسوں جا رہی ہے چراغ جلتے ہی چل پڑے گی۔ ڈلے ماچھی سے بلی میں مانگ لوں گا۔ وہ ذرا تیکھی گھوڑی ہے۔ بانکی پر جیجا ہوگا، اور اگر دلا رضامند ہو گیا تو اسے اپنی گھوڑی پر بٹھا کر ساتھ لے لوں گا۔ ان دونوں کو ساتھ لے جانے سے فائدہ یہ ہے کہ یہ میرے آگے آگے رہیں گے اور دوسرے گھوڑیوں والے جوانوں کو چھیلے کے قریب نہ آنے دیں گے۔"

سرداآرا اس بات کے انتظار میں چپ ہو کر چاچے کی طرف دیکھنے لگا کہ شاید وہ کوئی مشورہ دے گا۔ مگر جب چاچا سرداآرے کی طرف ٹپر ٹپر دیکھنے لگا تو سرداآرے نے خود ہی موضوع بدل دیا اور بولا "سوچتا تو شادی سے پہلے ہی ایک بار مل جاتا۔ لیکن وہ تو اندر سے نکلنے ہی کو رہا۔ ساری رات بھر گلیوں میں چھپ کر بیٹھا ہوں کہ مل جائے، مگر شاید میرے ارادوں کو بھانپ چکا ہے وہ۔ کیوں چاچا؟"

چاچا ابھی جواب دینے کے لئے کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ جیجا بھاگتا ہوا اس زور سے سامنے کی کھرلی پھلانگ آیا کہ بانکی ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔ سانس برابر کئے بغیر وہ سرداآرے کی طرف منہ کر کے بولا۔

"سرداآرے۔۔! چھیلا۔"

"کہاں؟" چاچا اور سرداآرا ایک ساتھ بولے۔

"نکاح کے بعد جب سب لوگ گھروں کو جا رہے تھے تو وہ اپنے ساتھیوں سے گھٹنے بھر کی چھٹی لے کر سیدھا کھیتوں کی طرف گیا تھا۔"

"سچ؟" سردارا ایک دم کھڑا ہو کر بولا۔

"میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

سردارے نے مزید کچھ کہنے کے بجائے پرالی اِدھر اُدھر ہٹائی اور بندوق نکال کر سامنے کھڑی کر دی۔ پھر ڈب میں دو تین کارتوس رکھے اور جھونپڑی سے باہر آ کر جیجے سے کہنے لگا "تو بھی میرے ساتھ آنا۔ بانکی پر تو بیٹھ جا۔ میرے پاس دتّے کی گھوڑی ہے۔ گو رتی کو تو پورا گاؤں جانتا ہے۔ پہچان لی جائے گی، ہوں!"

جاچا چپ چاپ دونوں کو دیکھتا رہا۔ اس کی خاموشی کو رضامندی سمجھ کر دونوں چھپر تلے آئے اور گھوڑیاں کھول کر جوہڑ کے کنارے کنارے کھیتوں کی طرف نکل گئے۔

پہلے آموں کا جھنڈ آیا، پھر میراں بخش کا باغ۔ اور اس کے بعد جماتے کے کھیت شروع ہو گئے۔ جماتے کے کھیتوں میں جب وہ میراثیوں کی جھونپڑیوں کے پاس پہنچے تو طرح طرح کے سوکھے سڑے کتے تھوتھنیاں اٹھا اٹھا کر بھونکنے لگے۔ مگر وہ ان کی پروا کئے بغیر گھوڑیاں بھگاتے ہوئے جماتے کے کھیتوں کی حدود پھاند گئے۔

جیجا دو گز پیچھے آ رہا تھا۔ جب وہ کھلے راستے پر آ گئے اور جیجے نے بانکی سردارے کے برابر کر دی تو سردارے نے امید کی لَو کو سنبھالا دینے کیلئے پوچھا۔

"وہی تھا نا۔۔۔؟ دھوکا تو نہیں کھا گئے؟"

"واہ یار" جیجا فوراً بولا "تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ وہی تھا، میں نے تو سب عمر اس کے ساتھ کھیل کر گزاری ہے۔"

حاجی گل محمد کے ڈیرے تک دونوں خاموش رہے۔ اس وقت دونوں گھوڑیاں قدم قدم چل رہی تھیں۔

جب وہ ڈیرے کی چاردیواری کے پاس سے گذرنے لگے تو جیجا ایک درخت کے نیچے کھڑی ہوئی سفید گھوڑی کو دیکھ کر چیخ اٹھا "وہ دیکھو۔ بالکل سفید پھنا۔ اسی کی ہے۔"

سردارے نے سانس روک کر لگام کھینچ لی۔ اور سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا "تو بانکی کو پیچھے ہی لے جا۔ جب بندوق چلنے کی آواز آئے تو تم میراں بخش کے کھیتوں میں سے ہو کر نکل جانا، چاچے کے ڈیرے پر۔ خیال رہے بانکی کو کوئی پہچان نہ سکے۔" وہ کچھ دیر خاموش رہ کر پھر بولا "اول تو بندوق کی آواز سنے گا کون؟ اور اگر کسی نے سن بھی لی تو لوگوں کے آنے تک میں میرپور پہنچ جاؤں گا۔ اور دتّے ماچھی کو گھوڑی اور بندوق سونپ کر خود بھی وہیں رہ جاؤں گا۔"

"اچھا" جیجا دھیمی آواز میں بولا "بانکی کو کتنا پیچھے لے جاؤں؟"

"میراں بخش کے کھیتوں کے موڑ پر۔" سردارے نے لمبی سانس کھینچ کر بندوق میں کارتوس بھرے۔ اور بولا "جا اب پلٹ جا۔ بانکی کو قدم قدم لے جانا۔"

جیجا آہستہ آہستہ گھوڑی موڑ کر واپس چلا گیا۔

سردارا ایک لمحے تک گھوڑی پر ہی بیٹھا رہا۔ پھر اس نے بڑی احتیاط سے قدم نیچے اتارا۔ اور بلّی کو ایک درخت کے نیچے گہرے سایوں میں باندھ دیا اور پنجوں کے بل چلتا ہوا حاجی گل محمد کے اجڑے ہوئے سنسان ڈیرے کی سمت بڑھنے لگا۔ ڈیرا کیا تھا چاردیواری سی تھی۔ اس کے ساتھ ایک شکستہ سا کمرہ تھا۔ چاردیواری سے باہر آموں کے گھنے گھنے درخت تھے۔ وہ درختوں کے تنوں کے ساتھ لگ لگ کر دیوار تک پہنچا۔ یہاں تک کہ آخری کونے میں کھرلی اور کچی اینٹوں کا چبوترا آ گیا۔ چبوترے پر چڑھ کر اس نے آہستہ آہستہ سر کو دیوار سے اونچا کیا اور ایک لمحے تک وہ اندھیرے میں سانس روکے کھڑا رہا۔ اس نے کھیلے کو دیکھ تو لیا تھا مگر اسے دیکھ کر مطمئن ہونے کی بجائے سُن ہو کر رہ گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ اپنے پاؤں برف میں دھنسے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ مگر اب اسے سردی کا مطلق احساس نہیں رہا تھا۔ جسم پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہونے پر وہ چبوترے سے نیچے اتر آیا۔ اس کے ذہن میں ایک لفظ ابھرا۔ کھیلا پھر ایک اور لفظ۔۔۔ جیراں۔ یہ دونوں الفاظ ابھرے، ناچے اور گڈمڈ ہو گئے!

وہ یہاں صرف کھیلے کی تلاش میں آیا تھا۔ کھیلے کے ساتھ رات کے گہرے سناٹوں میں لپٹی ہوئی جیراں کو دیکھ کر اسے ایک بار تو یقین ہی نہ آیا۔ دوسری بار پھر اس نے ہمت کر کے چبوترے کی طرف قدم بڑھایا تو اس میں اوپر چڑھنے کی سکت نہ تھی۔ وہ کچھ دیر چپ چاپ زمین پر ہی کھڑا رہا۔ بندوق کو بائیں ہاتھ میں تھام کر چبوترے پر قدم رکھا۔ اور بغیر کچھ سوچے اس کے اوپر چڑھ گیا۔ اور کسی خاص وقت کا انتظار کئے بغیر بندوق اٹھا کر سایوں کی شست لی۔

اسی اثنا میں جیراں کھیلے کا ہاتھ تھام کر بولی "کتنے بے صبر ہو تم، دو دن بھی انتظار نہ کر سکے۔ پرسوں تو میں تمہارے پاس چلی ہی آتی۔"

کھیلا اس کے جواب میں کھکھلا کر ہنسا تو سردارے نے بندوق نیچے کر لی اور ان کی باتیں سننے لگا۔

کھیلے نے جیراں کے قریب ہو کر اس کے کانوں میں دمکتے ہوئے جھمکوں کو آہستہ سے کھینچا اور بولا "چھپ چھپ کر ملنے میں جو مزہ ہے وہ تمہیں ہمیشہ کے لئے پا لینے میں بھی نہیں۔" جیراں کچھ نہ بولی۔

"بول جس وقت تو گھر سے نکلی ہو گی" کھیلا پھر بولا "تو کتنا مزہ آیا ہو گا؟"

(باقی صفحہ ۱۳۱ پر)

مثنوی،

ملکۂ برشگال

صہبا اختر

اک عالمِ برق و آب دیکھا
کل رات عجیب خواب دیکھا

اوڑھے ہوئے چار سو فضائیں
ظلمت کی ہزار ہا ردائیں

جنگل کی دھاڑتی ہوائیں
صحرا سے اٹھی ہوئی بلائیں

یکسار گھری ہوئی گھٹائیں
ہر سمت بلا کی شائیں شائیں

اک موسلا دھار تیز بارش
آئی تھی اجل سے کر کے سازش

پانی وہ برس رہا تھا چھاجوں
بیزار تھی روح جس کے ہاتھوں

ایسے میں کڑک کر ایک بجلی
یوں صحن میں میرے چھم سے اتری

اک پل میں دل و نظر کو روندا
نس نس میں اتر گیا وہ کوندا

دیکھا نہ گیا نظر سے کچھ بھی
مہلت نہ دی شعلہ بر نے کچھ بھی

شعلوں سے پھر ایک جسم ابھرا
ترشا ہوا اک طلسم ابھرا

اتنے میں گھٹا نے اک لبادا
اس پیکرِ شعلگی پہ ڈالا

جب ہو گئی وہ نقاب گھری
تب جا کے مری نگاہ ٹھہری

جادو بھرے بول اس نے بولے
ہاتھوں سے عجیب رنگ گھولے

جس طرح دھنک لچک کے ٹوٹے
یوں سرخ لبوں سے بول چھوٹے

ناہید سے لے کے تا بہ زہرہ
نغموں کا بہت ہے تیرے شہرہ

کیا ہو گیا نطقِ گلفشاں کو
کس بات نے سی دیا زباں کو

اک جانِ سکوں کی ہوں پیامی
آتی نہیں ورنہ خوش کلامی

اٹھ دیکھ رہی ہے تیرا رستہ
رم جھم کی سبھا میں میری ملکہ

سامانِ نشاطِ شب کیا ہے
خوش ہو کہ تجھے طلب کیا ہے

حیرت نے نہ میرے لب کو کھولا
میں سحر زدہ تھا کچھ نہ بولا

مسحور تھا سحر آفریں سے
سائے کی طرح اٹھا زمیں سے

اک ہاتھ میں میرا ہاتھ لے کے
چپ چاپ چلی وہ ساتھ لے کے

یک لخت کچھ اس کو دھیان آیا
آنکھوں پہ عجب خمار چھایا

اک موڑ پہ راستے میں رک کر
بادل سے کہا کچھ اس نے جھک کر

پلکوں سے کیا عجب اشارا
دیکھا کہ افق سے اک ستارا

تیزی سے زمیں کی سمت ٹوٹا
اندر کی کماں سے تیر چھوٹا

بادل سب اسکی زد سے بھاگے
پل بھر میں مری نظر کے آگے

موجود تھا کوئی برق پارہ
بلّور کا جوہریں غبارہ

اہرام کی طرح راز بستہ
دروازہ کھلا نہ کوئی رستہ

ہر سمت سے بند اس محل کے
پل بھر میں ستارہ گوں کنول کے

جادو بھری جنبشِ نظر سے
کس سحر سے جانے کس اثر سے

اڑنے لگے چرچرا کے ہیرے
کھلنے لگے پنکھ دھیرے دھیرے

آغوش کشادہ در تھے ایسے
اک پھول کھلا ہوا ہو جیسے

پہنچا جو میں بے ارادہ کھنچ کر
خود مڑ گئے مورپنکھ سے پر

اک ہاتھ سے ہم سفر نے میری
دھیرے سے کوئی طناب کھینچی

شعلوں کا بگولا تھرتھرایا
اک زور کا زلزلہ سا آیا

بادل کی طرح فضا میں ڈولا
پھر برق تھا وہ اڑن کھٹولا

آفاق کی وسعتوں کی جانب
انوار کی جنتوں کی جانب

میں نیلمیں بادلوں سے گزرا
ہر رنگ کے آنچلوں سے گزرا

دیکھے وہ قدم قدم کرشمے
آفاق کے خم بہ خم کرشمے

احساس کو منجمد جو کر دیں
آنکھوں میں دھنک کے برف بھو دیں

اسرار کے بحرِ بیکراں میں
مہتاب کو جوئے کہکشاں میں

دامن میں ستارے بھرتے دیکھا
انوار سے غسل کرتے دیکھا

گذرا میں غلاف سے فضا کے
چھونے لگے سلسلے خلا کے

موجوں کی لئے ہوئے روانی
اک دشت ہزار آسمانی

پھیلے ہوئے راستے شہابی
بکھرے ہوئے سلسلے سرابی

تھم تھم کے سر بساطِ آبی
کرتی ہوئی رقص نیم خوابی

باندھے ہوئے روشنی کے طرے
اڑتے ہوئے سیمیائی کرّے

چھائے ہوئے نشۂ طرب میں
اک قلزمِ بیکرانِ شب میں

گرتے ہوئے آبشار نیلے
ڈوبے ہوئے سیمگوں جزیرے

اک ہالۂ نور میں پر افشاں
نو چاند زحل کے گرد رقصاں

ہر چاند خود آفتاب جیسے
ہر خواب بنائے خواب جیسے

سیماب جبینِ مشتری پر
قطرہ جو کوئی گرے پھسل کر

ٹکرا کے فضا سے اپنا پارہ
بن جائے خود اک نیا ستارا

برفاب، بسیط، کہکشائیں
ہر تازہ جنم پہ مسکرائیں

صد رنگ کرو ڑہا ستارے
کرتے ہوئے اجنبی اشارے

کچھ پہ ہے غبارِ شب نوردی
کچھ اوڑھے ردائے لاجوردی

کچھ سرخ کنول کی طرح روشن
کچھ ایسے کہ جن کے سبز دامن

پھیلیں تو زمردیں فضائیں
آنکھوں سے لگا کے مسکرائیں

نارنجی، سنہرے، سبز، نیلے
ساغر ہیں الگ الگ نشیلے

کچھ ایسے کہ جن کا اک تبسم
انسان سے چھین لے تکلم

کچھ ایسے کہ جن کی آگ میں گم
ہو جائیں ہزار ہا جہنم

کچھ ایسے جو اُن کی برف پگھلے
آفاق کی وسعتوں کو بھر دے

کچھ ایسے کہ جن کی برق باری
ظلمت میں کرے ستارہ کاری

ہیروں کی رواں دواں یہ کانیں
بن پنکھ خلاؤں میں اڑانیں!

سیّارہ و ثوابتِ درخشاں
اک نور کی جستجو میں گرداں

وحشت ہے انھیں سفر کی کیسی
دوڑے چلے جا رہے ہیں وحشی

رخ کس کی طرف ہے ان پروں کا
سنگم ہے کہاں سمندروں کا

کی صحبتِ برق و رعد میں نے
اس خواب میں اس کے بعد میں نے

دیکھا کہ مرا اُڑن کھٹولا
اندر کی محلسرا میں اُترا

اک خلدِ فسانہ و فسوں میں
ہر سمت فضائے نیلگوں میں

اک شعلۂ آرزو سے سوزاں
نیلم کے چراغ تھے فروزاں

پریوں کے سنہرے آنچلوں کے
قالیں بچھے تھے بادلوں کے

یکبار فضا جو جگمگائی
کانوں میں صدائے شوق آئی

ہشیار نقیبِ خوشنوائی
وہ ملکۂ برشگال آئی

طاری تھی فضا پہ گنگناہٹ
نزدیک تھی دم بہ دم وہ آہٹ

کرنے لگے رقص رنگ جیسے
بجنے لگے جل ترنگ جیسے

نغموں کی پھوار پڑ رہی تھی
ہیرے جو فضا میں جڑ رہی تھی

چاندی کے ورق سے اُڑ رہے تھے
ہر سمت چراغ اُڑ رہے تھے

نزدیک ہجوم رنگ پا کر
حیرت سے کھلا یہ راز مجھ پر

جب حسن دکھاتا ہے کرشمے
پتھر کی بھی آنکھ دیکھتی ہے

تصویر کی طرح چپ کھڑا میں
حیرت سے کھلی نگاہ تھا میں

دیکھا کہ کوئی ستارہ پیکر
ڈالے ہے نقاب نصف منہ پر

سر تا بقدم لباس کالا
ہر انگ سے پھوٹتا اُجالا

اک ہاتھ میں سرخ پھول گہرا
اک ہاتھ میں مور چھل سنہرا

زلفوں میں چھپی ہوئی گھٹائیں
پلکوں میں نشوں کی خوابگاہیں

طوفان کی طرح لہری آنکھیں
پاتال کی طرح گہری آنکھیں

ابرو وہ کھنچے کٹار جیسے
پلکوں سے پڑے پھوار جیسے

کانوں کی لووں سے لو لگائے
گالوں میں شفق دئے جلائے

شانوں پہ کھنچے قہر سے ہالے
ہر انگ چھلکتی چاندنی سے
شانوں پہ سنہرے بال ایسے
شبنم سے رچے ہوئے شرارے
معبودۂ خلدِ رنگ و بو نے
دھیرے سے جہاں کبھی پاؤں رکھا
کرتی ہوئی ہر قدم چراغاں
وہ مثل نسیم صبحگاہی
پھر ڈال کے مجھ پہ چشمِ غائر
بن تیرے چراغِ رہگذر تھی
آخر تجھے جذب دل نے کھینچا
سب مجھ سے ہواؤں نے کہی ہیں
چہرہ ہے الم سے زرد میرا
ٹھنڈک نہیں روح کو ذرا سی
اس قرب پہ اضطراب کیوں ہے
کب تک یہ سکوت ڈسنے والا
گردن میں لچک کے باہیں ڈالوں
قابو میں دھڑکتے دل کو لے کر
میں نے یہ کہا کہ جانِ شاعر
رندوں کے لئے شراب تو ہے
میں تجھ سے خفا نہیں ہوں جاناں
بن بات نہ کر گمان کوئی
لیکن مجھے خاک سے ہے رشتہ

کانوں میں وہ بجلیوں کے بالے
سینے میں بھنور شگفتگی کے
اک انجمیں آبشار جیسے
آنچل میں ٹکے ہوئے ستارے
اس برق طرازِ آرزو نے
شعلہ سا وہیں زمیں سے لپکا
اک طرفہ وقار سے خراماں
رک رک کے مرے قریب آئی
بولی کہ خوش آمدید شاعر
میں ہجر کی شامِ بے سحر تھی
انمول ہے میرا پیار دیکھا
باتیں جو مرے فراق کی ہیں
کچھ کم نہیں تجھ سے درد میرا
میں خود ہوں جنم جنم سے پیاسی
آخر یہ تجھے حجاب کیوں ہے
ظالم تری چپ نے مار ڈالا
روٹھے ہو تو جانِ جاں منالوں
مشکل سے زباں کو نطق دے کر
قربان ترے ہزار ساحر
تعبیرِ ہزار خواب تو ہے
میں اپنے نصیب پر ہوں نازاں
چپ کر گیا مجھ کو دھیان کوئی
حاصل نہیں قسمتِ فرشتہ

گو عشق ہے تجھ فلک نشیں سے
کھولے ہیں جہاں نجومِ شہپر
تجھ کو ترے ظلم کے فسانے
سن اب نہیں اعتبار تیرا
باقی نہیں اعتدال تجھ میں
اب موت کا راگ ہے چھماچھم
اک وحشتِ مرگ زاد ہر سو
پانی نے ادھر کسے شکنجے
سن تو نے اٹھائے ہیں وہ طوفاں
ویران کیا ہے بستیوں کو
وحشت ہے زمیں کو بادلوں سے
برسے ہیں ترے سحاب ایسے
زخموں سے زمین ادھ موئی ہے
آندھی کے طویل جھکڑوں نے
آنکھوں کے گہر چرا لئے ہیں
حیرت ہے نہیں جنون مجھ کو
رکھ کر مرے منہ پہ ہاتھ اپنا
باتوں سے تری بکھر نہ جائے
انسان سے آج تک چھپا ہے
لیکن میں تجھے بتا رہی ہوں
سن جبر اساسِ دو جہاں ہے
ہر صید کو دام ایک سا ہے
قسمت جو بتائیں وہ ستارے

خاکی کو مفر نہیں زمیں سے
اترا ہوں سفیرِ خاک بن کر
آیا ہوں زمیں سے سنانے
بے رنگ ہوا ہے پیار تیرا
اب لطف نہیں بحال تجھ میں
ہر سمت چھڑا ہوا ہے ماتم
ہے ہلّہ برق و باد ہر سو
بجلی نے اُدھر چھوئے ہیں پنجے!
ملّاح بچے نہ جن سے دہقاں
اُلٹا دیا لاکھ کشتیوں کو
الجھی ہے فضائی زلزلوں سے
خود موت کا ہو نزول جیسے
چھائی ہوئی رات قحط کی ہے
طوفان بدوش ظلمتوں نے
ہر گھر کے دیے بجھا دئے ہیں
ایسے میں کہاں سکون مجھ کو
کہنے لگی سنگدل، یہ سپنا
ڈرتی ہوں یہ شب گزر نہ جائے
وہ راز جو آسمان کا ہے
مجبور ہوں تجھ کو چاہتی ہوں
یہ اصلِ زمین و آسماں ہے
فطرت کا نظام ایک سا ہے
تقدیر کے آپ بھی ہیں مارے

جاتے نہیں دائرے سے باہر
مقسوم ہیں اپنے اپنے محور

سوچا ہے کبھی یہ تو نے جاناں
ہر چیز ہے کیوں الم بداماں

مہتاب کے دل میں داغ کیوں ہے
سورج ہے تو بے فراغ کیوں ہے

اک آگیا تیرگیِ شب تک
اک آگ میں جل رہا ہے اب تک

چہروں پہ ہے خوف سے سپیدی
یہ بھی ہیں اُسی کشش کے قیدی

مربوط ہے جس سے بزمِ ہستی
افلاکِ بلند و خاکِ پستی

وحشت ہے اگر سرِ زمیں بھی
راحت سے نہیں فلک نشیں بھی

چلتی ہے یہاں ہوائے غم بھی
اک جبر سے منسلک ہیں ہم بھی

یہ راز ہے مستقل اندھیرا
اس عالمِ خیر و شر میں میرا

ہے کبھی تو برائے نام حصّہ
آ تجھکو بتاؤں اصل قصّہ

کہنے کو یہ آندھیاں ہیں میری
بس نام کی باندیاں ہیں میری

دن رات ہیں حیلہ جو یہ بدخو
وحشت ہے انہیں ہزار پہلو

افلاک کی وسعتوں پہ چڑھ کر
سورج پہ یہ خاک پھینکیں بڑھ کر

آنکھوں میں فضا کی راکھ جھونکیں
خنجر یہ سحر کے دل میں بھونکیں

ظلمت سے ہوئی ہیں ظلم پیشہ
پھرتی ہیں یہ چیختی ہمیشہ

آفت ہے نگر نگر مچائی
ان میں ہے ہر اک "ہزار پائی"

ہر چند ہیں بجلیاں کنیزیں
قابو میں نہیں یہ بدتمیزیں

دن رات پروں کو پھڑ پھڑاتی
پھرتی ہیں فضا میں کڑکڑاتی

کس غم کی بھلا کسک ہے ان کو
بس اپنی چٹک مٹک ہے ان کو

یہ حبشی غلام کالے بادل
اک کیف سے ہو چکے ہیں پاگل

آنکھوں میں اتر گیا ہے کاجل
اندھوں کو سکھائے کون اٹکل

نخوت میں کہیں اکڑ کھڑے ہیں
گرجے ہیں کہیں کہ ہم بڑے ہیں

الجھے ہیں کہیں، کہیں لڑے ہیں
آپس میں کہیں برس پڑے ہیں

چُپ چُپ جو کھڑی ہیں یہ ہوائیں
مت پوچھیے ان کی بھی ادائیں

اک روز اُڑا کے ابرِ نیساں
کرتی ہیں یہ روز مجھ پہ احساں

رکھتی نہیں یاد آسماں کو
جاتی ہیں جو سیرِ گلستاں کو

واپس نہیں ساری رات آتیں
یہ کون سے گل نہیں کھلاتیں

دن رات ہجومِ فتنہ گر سے
بیزار ہوں ان کے شور و شر سے

رہتی ہوں حیا سے پانی پانی
افسوس سرشتِ آسمانی

دیکھا جو اُسے اداس میں نے
محسوس کری وہ پیاس میں نے

اس نے جسے جان کر نہ سمجھا
اتنے میں کوئی طلسم چھنکا

اک شعلہ صفت کنیز آئی
ساغر میں کشیدِ ماہ لائی

وہ جام مری طرف بڑھا کر
دیکھا مجھے اس نے مسکرا کر

جیسے مری بات پا گئی ہو
کچھ اس نے کہا نہ جانے کس کو

خود تن گیا خیمۂ سحابی
خود بچھ گئی سیج اک گلابی

سب شعلہ نژاد جا چکے تھے
بادل کہیں منہ چھپا چکے تھے

دیکھا مجھے کس جنوں میں اس نے
اُس خلوتِ پرفسوں میں اس نے

انفاس سے مشکبار ہو کر
خود حسن سے بیقرار ہو کر

یوں اپنی قبا کے بند کھولے
ہر انگ ہزار رنگ گھولے

خوابوں کی فضا میں ڈھیر ڈھیرے
نشّوں کے دریچے کُھل رہے تھے

ایسے میں کہ بن رہوں میں پتھر
اس عالمِ امتحاں میں بڑھ کر

یوں شوق نے دامِ ضبط توڑا
اک تارِ حجاب بھی نہ چھوڑا

شعلوں سے اُلجھ رہے تھے شعلے
اس قربِ تمام کے نشے سے

یوں اس کا بدن مہک رہا تھا
جیسے کہ چمن چٹک رہا تھا

ہر حد سے گذر چکے تھے طالب
اک روح میں ڈھل گئے تھے قالب

اُس خلوتِ عنبریں میں جا کے
کوثر سے اٹھا تھا میں نہا کے

تعبیرِ تصوراتِ دوشیں — آنکھوں میں خمارِ خوابِ نوشیں
بکھری ہوئی دوش پہ وہ زلفیں — نشے سے جھکی جھکی وہ پلکیں
وہ ہونٹ کھلے گلاب جیسے — وہ جسم کہ خود شراب جیسے
اک قوسِ قزح کی طرح رنگیں — زرتار، گلابی، سرخ، سیمیں
سانسوں میں کنوارپن کی خوشبو — اب اور جگا رہی تھی جادو
پردے جو نشاط کے گرے تھے — سب اس کی سگندھ میں بسے تھے
اتنے میں فضائیں کپکپائیں — سب انجمیں شمعیں تھرتھرائیں
پہلو سے اٹھی وہ یوں تڑپ کے — جیسے کوئی تیز برق کوندے
تیزی سے چلے ہوا کے جھونکے — اُڑنے لگے سیمیائی پردے
کرنے لگے جام آپ گردش — یک سلسلہ ہو گئی تھی کاہش
یک رنگ ہوئے تھے ساغر و مے — اک دائرہ بن گئی تھی ہر شے
تیزی سے دریچے مڑ رہے تھے — اور سیج کے پھول اُڑ رہے تھے
چکر میں دل و دماغ گم تھے — روشن تھے مگر چراغ گم تھے
کہنے لگی کانپ کر وہ مجھ سے — اے جانِ وفا، یہ خواب بکھرے
آثار بُرے ہیں شور و شر کے — معلوم ہیں مجھ کو راز گھر کے
اِندر کی سواری آ رہی ہے — یا موت ہماری آ رہی ہے
یہ بات کسی نے کہہ نہ دی ہو — اِندر کو خبر نہ لگ گئی ہو
منحوس زُحل کی آنکھ چمکی — اب ختم ہے رات کیف و کم کی
کس مُنہ سے کہوں مگر مری جاں — اب دل ہے مرا بہت پریشاں
جانا ہے تجھے مگر یہاں سے — مجبور ہوں جبرِ آسماں سے
تجھ تک نہ کوئی کمند پہنچے — ڈرتی ہوں تجھے گزند پہنچے
اک رات کے خواب رنگ مہماں — دل تھا ترے قرب سے چراغاں
رخصت تجھے کر رہی ہوں ایسے — سم موت کا پی رہی ہوں جیسے

دل پر ہیں ترے نقوش گہرے — اب جو بھی مرا نصیب ٹھہرے
تابع ترے ہوں گے بادوباراں — میں باندھ چکی ہوں تجھ سے پیماں
ہنس ہنس کے ہر اک سزا سہونگی — لیکن میں تری سدا رہوں گی
سینے میں کہیں نہ جائے دل ڈوب — رخصت مری جان، میرے محبوب
یہ سُن کے میں فرشِ خاک پر تھا — پل بھر کو وہ خواب کا نگر تھا
لیکن مرا دل تڑپ رہا تھا — آنکھوں میں وہی فسوں بسا تھا
آنکھوں میں ہزار عکس اُترے — اس فکر میں صبح و شام گذرے
خاکی کے لئے یہ صبر کب تک — پستی پہ فلک کا جبر کب تک
کام آئے مری درازدستی — اندر سے جو چھین لائے شکتی
ہر وقت سوال تھا یہ لب پر — شبخون کوئی دیارِ شب پر
آخر مرا صبر رنگ لایا — شعلہ مرے عشق نے اٹھایا
تسخیرِ فلک کا عزم بن کر — جاگا مری خاک کا مقدّر
انسان کی کمان سے جو چھوٹے — ناوک وہ فلک کی سمت ٹوٹے
وہ میری زمین کے ستارے — بھرنے لگے عرش پر طرارے
سیارے بلند ہو رہے ہیں — خاکی سوئے آسماں چلے ہیں
اک دن یہ خلاؤں کے مسافر — چھو لیں گے تجھے بھی جانِ شاعر
محبوس جو خاک کو کئے ہیں — افسوں وہ شکست ہو چلے ہیں
ہم جبر کے ہاتھ موڑ دیں گے — ہم سارے طلسم توڑ دیں گے
آفاق کو مسکرانا ہو گا — سینے سے ہمیں لگانا ہو گا
حائل نہ رہے گی شامِ ہجراں — نزدیک ہے روزِ وصلِ جاناں

جس وقت یہ پورا خواب ہو گا
شاعر بھی تو ہمرکاب ہو گا

ملتانی کافی:

"سوہنڑیاں رمزاں"

خواجہ غلام فریدؒ
مترجمہ حشمت فضلی

درد سے دل ہے ٹکڑے ٹکڑے
پُرزے پرزے ذرّے ذرّے

ناز، نزاکت، عشوے، غمزے   طاقت حکم، ادائیں، نخرے
خوں کرتے ہیں لمحے لمحے

آپ ہی اپنا دوست بنایا   آپ اپنا مسکن دکھلایا
اب کیوں ہم سے روٹھے روٹھے

مست آنکھیں اور کالی زلفیں   پیاری رمزیں موہنی چالیں
جنکے بغیر اک پل نہیں گذرے

تیر نظر کے چھیدیں ہر دم   اس پر زلف کے پیچ و خم
اک بے بس کیا آخر بولے

رنج و غم اور درد اندیشے   ہیں دن رات فریدؔ کے آگے
ہجر سے جاں کانپے، تھرّائے

چن ماہی

شیر افضل جعفری

یہ دُھلے دُھلے اجالے
تری چودھویں نے پالے

تجھے چاندنی پرائیں
سدا آسمان والے

یہ حسین چاند سورج
ترے کانچ کے پیالے

ترے مست وار گیسو
بنے خوشبوؤں کے جھالے

تجھے دیکھ کر ہمیشہ
ہوئے باغ باغ لالے

ترے لوچ لوچ بازو
ہری ٹہنیوں نے ڈھالے

کڑی دھوپ کا اُپاؤ
تری چھاؤں کے سیالے[1]

تو ہے ماہتابِ نغمہ
مرے شعر تیرے ہالے

ترے پھول سے گلے میں
مرا پیار ہار ڈالے

[1] جاڑے

شیراب

(کوئٹہ میں غیر معمولی برفباری سے متاثر ہو کر)

ماہر افغانی

نورِ ازل تھا پردۂ ظلمات سے عیاں — اک صبح سردیوں نے کیا پیش وہ سماں
اُٹھتی تھی جس طرف بھی نظر برف زار تھا — گویا زمین پر اتر آئی تھی کہکشاں
تھی ہر طرف سفید سی چادر بچھی ہوئی — افشاں چھڑک رہی تھیں پہاڑوں کی چوٹیاں
گالوں سے جھول جھول رہی تھیں جو ڈالیاں — ہوتا تھا احتمال ہیں چاندی کی بالیاں
پہنے ہوئے کھڑے تھے جو اشجار ہر طرف — جنکی کلائیوں میں تھیں بھرپور چوڑیاں
پودے کھڑے تھے دودھ کا پیالہ لئے ہوئے — شیراب پی رہی تھیں درختوں کی ٹہنیاں
اٹھتے ہیں جس طرح کہ بخارات بحر سے — اس طرح ہو رہی تھیں فضائیں دھواں دھواں
جیسے کسی کی زلف کا عالم ہو دوش پر — قائم ہوئی تھیں کچھ اسی عنواں کی سرخیاں
زرغونؔ اک طرف تھا بہ اندازِ دلبری — مردارؔ اک طرف تھا بہ اور رنگِ آسماں
کچھ کم نہ تھی کسی سے تکاتوؔ کی شان بھی — تھا وہ بھی ہر لحاظ سے ہمرنگِ دیگراں
کہتا تھا دل کہ ہاتھ بڑھا کر میں تھام لوں — لہرا رہا تھا ناز سے دامانِ چلتنؔ
فطرت مئے نشاط میں مستِ خرام تھی — محسوس ہو رہا تھا کہ ہے زندگی جواں
کانوں میں آ رہی تھی صدا جل ترنگ کی — قطرات بن کے برف کے ذرات تھے چکاں
ملبوسِ کائنات خضر کا لباس تھا — دامانِ جوئے شیر کا ہمرنگ وہم عناں

وہ منظر حسیں تھا نگاہوں کے سامنے
جیسے خیال و خواب کی ہوتی ہیں وادیاں

"دوشیزۂ برفستاں"

نصیر حیدر

(گلگت میں جاڑوں کی چاندنی رات کا ایک تاثر)

لے کے آیا ہے مجھے قافلۂ عمر کہاں
قافلۂ عمرِ رواں —
کہر میں لپٹی ہوئی برف کے ہیکل پہنے
شب مہتاب کی شام
شب کم خواب کی شام
چوٹیاں برف قبا!
چوٹیاں کوہ کی پہنے ہوئے ابرک کے چغے
برف کی چادر شب تاب لپیٹے سر پر
برف کے فرغل پہنے
برف کی چادر صد چاک سنبھالے ہوئے
شانوں پہ اِدھر اور اُدھر
کوہساروں کے سمٹتے ٹیلے
برف سے ٹھٹھرے ہوئے نیل بدن
صف بہ صف رقص کے انداز میں گھیرا ڈالے
سب تشنج زدہ اجسام کشیدہ قامت
کہر میں ابھرے ہوئے اودے تن
صف بہ صف، صف بہ صف اونچے نیچے
برہنہ جسم فقط کہر کے فرغل پہنے
برف کے ہیکل پہنے
ابھی خورشید کا منہ چوم رہے تھے سارے
سرخ رو، سرخ قبا
کامرانی کے نشہ میں سرشار
ابھی ٹھٹھرے ہوئے سہمے ہوئے اک رقص
کے گھیرے میں سمٹ آتے ہیں
شام کے گھرتے ہوئے بڑھتے ہوئے اندھیارے
شب مہتاب کی شام، یہ شامِ کہسار
چاند نکلا کسی مسحور حسینہ کی طرح
ساحرہ اپنے ہی افسوں میں ہوئی ہے تحلیل
قُلّہ کوہ پہ پھیلائے ہوئے اپنی رِدا
کوہساروں سے بچاتی دامن
مڑتی، بچتی ہوئی دیوزادوں سے ڈرتی رکتی
ہچکچاتی ہوئی، کتراتی ہوئی
بے حجابانہ نکل آئی ہے
کوہ تنہا میں یہ مہتاب کی دوشیزۂ سیمیں تنہا
صبح کی پہلی کرن جیسی لبوں کی رنگت
خم ابرو کا دھندلکا کوئی کہسار کی شام

ایک دھندلا سا ردپہلا سا مہکتا ہوا جسم
لہریں لیتا ہوا برفاب کا موہوم بہکتا ہوا جسم
برہنہ کہر کی چادر باندھے
مرمریں برف کے گہنے پہنے
اس کا دوشیزہ و معصوم بدن
لہلہاتا ہوا بھرپور لہکتا جوبن
اپنے ہی نشہ سے بیتاب بہکتا جوبن
ایک بھٹکی ہوئی روح
بسترِ اطلس و کمخواب کے خوابوں میں مگن
منجمد اور دہکتا ہوا سینہ لبِ جُو
اور سینے میں وہی سینکڑوں کی دیرینہ جلن
وہی برہا کی اگن
قُلّہ کوہ پہ ڈھلکائے ہوئے سر سے ردا جلوہ فگن
ہمہ تن رقص، سراپا آغوش
خواب سا دیکھتی بے خود، مدہوش
وہ بڑھی جاتی ہے رقاصہ کسی کی جانب
اس کی مخمور نگاہوں سے ستارے مینوش
اس کا انگڑائیاں لیتا ہوا جسم
رسمساتی ہوئی سرمست آغوش
آرزو برق فگن دل میں پگھل جانے کی،
بڑھ کے خود گود میں آنے کی، مچل جانے کی
لمس پا کر کسی سینہ کا، مسل جانے کی
دو لچکتی ہوئی باہنوں میں تمنا کہ اٹھائے کوئی

سر سے ڈھلکے ہوئے آنچل کو سنبھالے کوئی
کسی آغوش میں وا ہونے کی طاقت ہی نہیں!
کوہ جکڑے ہوئے پابستہ، ہمہ تن زنجیر
ہمہ تن شوق مگر
گنگ شوق کے اظہار سے قاصر، مفلوج
شل کچھ اس طرح کہ سب تن بوجھل!
منجمد برف سے ٹھٹھرے ہوئے جسم
برف کے شیشہ میں پتھر کا طلسم
سر سے شانوں پہ ڈھلک آئی ردائے مہتاب
دیکھتے دیکھتے شانوں سے ڈھلک جائیگی
دامنِ کوہ سے الجھے گی، مسک جائیگی مانند کتاں
لے کے آیا ہے مجھے قافلۂ عمر کہاں
قافلۂ عمر رواں
مسکراتے ہی رہے ہیں یہ ستارے لبِ جُو
جگمگاتے ہی رہیں گے یہ شرارے لبِ جُو
اٹھ چکی بزمِ طرب
اب نہ وہ ہائے نہ ہُو
بجھ گئی شمع، فسردہ ہوئے چنگ اور رباب
بازگشت اپنی ہی خود ہے بہ صدائے مہتاب
اب چکوروں کی وہ چہکار کہاں!
اب وہ دیوانوں کی للکار کہاں!
قافلۂ عمر رواں!

*

بیلڈ :

لیلٰی مور

عاصم حسین

کون ہے جو سردیوں کا موسم آنے پر بلوچستان کے سراوان اور جھلاوان نامی علاقوں سے گزرا ہو، اور اس نے یہاں کے قافلہ در قافلہ پہاڑی قبیلوں کو سندھ روانہ ہوتے ہوئے "لیلٰی مور" کا صدہا سال پرانا گیت گاتے نہ سنا ہو۔ وہ لیلٰی جو مور کی طرح خوبصورت ہے۔ جب یہ لوگ سندھ کے گرم علاقوں کو روانہ ہونے سے پہلے جشن مناتے، سجی یعنی بھونی ہوئی سالم بھیڑ کھاتے، لوک گیت گاتے اور ملکۂ حسن کے گرد انتہائی ذوق وشوق کے ساتھ چاندنی رات کی پُر کیف فضا میں کوہستانی ناچ ناچتے ہیں تو ایک ایسا سماں بندھ جاتا ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ذیل کی نظم میں اسی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔

جگمگ جگمگ کرتا چاند
اُجلی اُجلی پھیلی دھرتی
جوت ہی جوت کا فرش بچھا
سرمئی نیلا نیلا انبر
جیسے ناچتے مور کے پنکھ
جھلمل جھلمل کرتا میداں
جادو ہی جادو کا سماں !

جانے کیوں ہر چار طرف سے
نگر نگر سے ڈگر ڈگر سے
لوگ ہی لوگ چلے آتے ہیں
جیسے دیپ کنول کے دوارے
ٹوٹ کے آتے ہیں پروانے
ڈیروں پہ ڈیرے گاؤں پہ گاؤں
چل چل کرتا روں کی چھاؤں
پاس نہ دوری کی پروا کوئی
وہ کیا جانیں کیا ہے دوری
دل میں سمایا رات اور دن جب
لیلٰی مور ہی کا سودا ہو
لیلٰی مور کو دیکھنے جائیں
ہر ہر دل میں یہی سمائی
لیلٰی مور کا مکھڑا دیکھیں
ایک جھلک اُس جن کی پائیں
جس سے نشے تن من پر چھائیں

لیلٰی مور جو مایۂ جاں ہے
لیلٰی مور جو جانِ جہاں ہے
ہر انسان کی روحِ رواں ہے
آن کی آن میں لاکھوں ہزاروں
تن گئے خیمے کھنچیں طنابیں

جاگ اٹھا جنگل کا جنگل
جنگل میں منگل ہی منگل
لو دے اٹھیں گھر گھر آگیں
لیلٰی مور کے جشن کی دھومیں
دل ہی دل میں یہ سب چاہیں
شب بھر دید کی عید منالیں
پھر کہیں دور ٹھکانا ہوگا
صبح سے وطن کو جانا ہوگا
کہاں میسر بات پھر ایسی
حسن پھر ایسا رات پھر ایسی
جس کی دید سدا کا جینا
سدا کی مے اور سدا کی مینا
اس محفل میں جو بھی آئے
رقص کا دیوانہ بن جائے

لو اُٹھے کہسار کے جائے
درسِ ادب آنکھوں کو سکھائے
دیکھو کیسے الغوزوں سے
نے کے سُر والے باجوں سے
میٹھے رسیلے بول اُٹھے ہیں
دشت اور در سب جھوم رہے ہیں
ڈھولوں کی سنگت کا جادو
جن سے بلاوا پہنچا ہر سو
"آؤ آؤ آؤ آؤ
ناچ مدھر کے روپ دکھاؤ"
ایسے رقص کی دھوم مچے گی
یہ شب کبھی نہ بھول سکے گی
وہ سجی وہ بھونی بھیڑیں
اور سردی کی لمبی راتیں !
ان میں یہ جشنِ شاہانہ
چنگ وچغانہ ، مئے مغانہ
قہقہے ، چہچہے ، باتیں چیتیں
مہمانی کی رسمیں ریتیں
ہنسیاں خوشیاں دل گرمائیں
ولولے اور مچلتے جائیں

لے کر اپنا مال اور ساماں
اپنا اناج اور ڈھورا اور ڈانگر
اپنے برتن ، بوریا بستر
اونٹ خوشی کے ساتھ خراماں
شوق بھرے یہ قافلے اُن کے
دور قریب سے آنے والے

لیلی مور جو ایک نظر سے
دیکھ لے ان کو، یہ متوالے
جیون جیون شاد رہیں گے۔
اور وہ رقص، وہ رقصِ یگانہ
اس کی خاطر نذرِ شبانہ
اس کی خاطر ان کی جنگیں
اس کے لئے جیون کی ترنگیں
دلوں کی رانی حسن کی رانی
روپ کی وہ مورت لاثانی
لیلی مور وہ اس کے دوارے
حلقہ باندھے تن من وارے
گھوم گھوم کے جھک جاتے ہیں
فرطِ ادب سے رک جاتے ہیں
وہ جو کہے تو کون نہ آئے؟
کون نہ اپنی جان لٹائے؟
ناچ میں اُن کے دل کی دھڑکن
ناچ میں کھویا اُن کا تن من
ناچ میں ان کی رُوح بچی ہے
اُن کی آن اور شان اسی میں
کوئی نہ کھوٹ نہ میل دلوں میں
عورتیں تک بھی اس کو چاہیں
دل میں رشک کی آنچ نہیں ہے
لیلی مور پہ بل بل جائیں
میٹھی رسیلی لیلی مور
کامنیوں کی کامنی نار
جس کے حسن اور زیبائی سے
وہ خود اپنی جوت جگائیں
چاند اور چاندنی رات کا جوبن
جس سے کنول دل کے کھل جائیں
اس میں یہ اور بھی پیارا سماں
ایسا رقص اور لیلی مور
جادو بھرے وہ اس کے نیناں

مدبھری پاکیزہ مسکانیں
چاندنی رات کو جو لو بخشیں

رات بھی اور سمے بھی بیتا
محو ہوا یہ سماں سہانا
چاند، نہ جشن، نہ گانے بجانے
رقص نہ رقص کے وہ متوالے
اور نہ کوئی لیلی مور!
شمع نہ شمع کے وہ پروانے
لوٹ چکے قافلے دور سدھارے
سندھ کے پھیلے میدانوں میں
گرم آغوش ہے جن کی فضا
لیلی مور کا پیارا پنچھی
راج دلارا، کلغی والا
اس کے سنگ رہے متوارا
اس کے ہاتھ سے کھائے چوگا

ختم ہوا جب یہ ہنگامہ
بیت چکی جب سگری رین
تب آیا کہیں بھور بھئے وہ
ایک جواں قسمت کا مارا
لیلی مور کا سچا پریمی
وہ البیلا وہ متوالا
اب آئے سے کیا ہووت؟
کیسے وہ قسمت کو رویا!
لب پر سسکیاں، آہیں، نالے،
یہ ہیں نشاں اس کے پاؤں کے
یہاں تھے خیمے، یہاں قناتیں
یہاں تھے جشن کے ہنگامے
یہ ہیں نشاں گزری ہوئی شب کے
یہاں حسیں لیلی کا محمل
یہاں تھی پیار بھری محفل

لیلی مور! او لیلی مور!!

آنکھیں ساری سرد ہوئیں
اور بجھ گئے سارے انگارے
کچھ بھی نہیں، اب کچھ بھی نہیں یاں
کیا ہے یہاں، اب کیا ہے یہاں؟
ہُو حق کا سماں، ہُو حق کا سماں!
جیسے جیسے دیکھے ڈھونڈے
ملیں نشانیاں بکھری بکھری
یہ ہے دوپٹہ، یہ ہیں بُندے
یہ ہے رنگ برنگا فیتہ
اور یہ پھول جو کبھی گندھا تھا
اس کے مہکتے جوڑے میں

آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ نکلے
لے لے نام وہ لب پر آہیں!
اُونی سانسیں، اونچی کراہیں!
پر اب رونے سے کیا حاصل؟
نالے پہاڑوں کے سینوں سے
ٹکرا کر یونہی لوٹ آئیں
درد بھری فریادیں ان میں
گونج گونج کے رہ جائیں!

شاید ہے جو اس کو آنکھیں
پھر کبھی جیتے جی دیکھیں
لیکن پھر بھی لیلی مور
ہیں ترے پاس وہ میٹھے دارو
دور ہوں جس سے دکھ پریمی کے
تو جو حسنِ ازل کا نشاں ہے
حسنِ ازل سب ہستی جس سے
ہر اک کیف اور مستی جس سے
جس کا ہر ہر دل میں ارماں
جو ہے ہر اک درد کا درماں

(خیال ماخوذ)

فرشتوں کا نغمہ

یوسف ظفر

تمہید:

کچھ ایسی بھی راتیں مری راہِ ہستی میں آئی ہیں جن میں
ہوس کے تقاضوں کی آوازِ یکبارگی سو گئی ہے
وہ راتیں کہ جن میں حوادث کی زنجیر گم ہو گئی ہے
وہ راتیں کہ جن میں نہ تھا خوفِ ماضی، نہ کل کا جنوں تھا
سکوں ہی سکوں تھا،
سکوں ـــــ جیسے گرما میں آبِ رواں پر سبک چاندنی کی پھوار
سکوں ـــــ جیسے سرما کی سوئی ہوئی دھوپ میں برف زار ـــــ
وہ راتیں کہ جن کے تبسّم سے شبنم کے موتی بنے ہیں،
اُنہی حاصلِ زندگی چند راتوں میں، میں نے سُنا ہے
فرشتوں کا نغمہ
برستا ہوا لامکاں سے، کچھ ایسے
کہ جیسے برس کر کھُلے ابر تو تیرگی میں چمن کی فضا پر
برستے ہیں جگنو
کہ جیسے وہ بے سوز چنگاریاں بے صدا آتشِ گُل کی شہزادیاں ہوں
کہ جن سے لپٹ کر نظر مسکراتی ہے اپنی ادا پر ـــــ
یونہی میں نے اُن پُرسکوں ساعتوں میں سُنا ہے فرشتوں کا نغمہ
برستا دل و جاں پہ اور پھیلتا نشّۂ تُند بن کر
بکھرتا ہُوا آخرِ کار، جیسے اُجالا سحر کا۔

(فرشتوں کا نغمہ)

دل دھڑکا، آئی آواز ـــ کیا آواز اور کیسا ساز
سرما کی صُبح کی پہلی کرن ـــ پہلی کرن، شرمیلا پن
دُور سے اک خاموش آواز ـــ چھیڑتی ہے یوں روح کا ساز
جیسے حُسنِ ازل ہے یہی ـــ جیسے روح کنول ہے یہی

یوں آتی ہے پچھلی رات   جیسے گیت بنیں لمحات

وہ آوازِ بے آواز   قدم قدم کرتی اعجاز
رفتہ رفتہ تیز ہوئی   کیفیت آمیز ہوئی
موجیں آہیں بھرتی ہیں   ناچتی دل میں اترتی ہیں
آنکھوں میں ہے نشہ ہے   کانوں میں ہے اچھوتی لے
جسم کا لوچ نظر کا نور   وہ آواز سراپا حور
پاکیزہ، نوخیز آواز   روح میں کرتی ہے پرواز
اس میں پھولوں کی خوشبو   اس میں رنگوں کا جادو
ایک ہیں قرب و دور اس میں   تاروں کا ہے نور اس میں
قوسِ قزح کا اچھوتا پن   اس نغمے کا حسنِ بدن
شرمیلی لچکیلی لے   دل میں اترتی جاتی ہے
جیسے وصل کی پہلی شب   نازک نرم رو پہلی شب
یوں لپٹی ہے باہوں میں   جیسے پھول نگاہوں میں
یوں اس کی آغوش میں ہوں   جیسے صبحِ نو کا فسوں
پیار سے ہاتھ لگاتا ہے   سارا بدن سہلاتا ہے
سرمائی کرنوں سے لہو   جیسے صحرائی آہو
دل میں زقندیں بھرتا ہے   گاتا رگوں سے گزرتا ہے
چہرے پر ہے اس کا نور   اور آنکھوں میں کیف و سرور

اور ہوا وہ نغمہ تیز — اور رُہوا — اور ہوا کچھ کیف آمیز
جیسے سورج کی کرنیں دُمدار ستارے بن جائیں
اور وہ تارے سارے کے سارے رس کے دھارے بن جائیں
اس کے دھارے پھوٹیں اور رنگوں کے غبارے بن جائیں
وقت کے گہرے بن جو نغمے پیارے پیارے بن جائیں
جیسے چندا کی نگری میں نغموں کی ہو پھوار
سیتل قطرے جگنو بن کر باندھیں ایک قطار
اُڑتے مڑتے جگنو مل کر یوں برسیں یکبار
جیسے برف گرے پربت پر، لگ جائے انبار
جیسے اک نغموں کی ندی، شام افق پر ٹھہری ہو
رنگِ شفق سے ساری موجیں اُبھریں سرخ سنہری ہو
پنچھی آئیں اس میں نہائیں، پیاریں، پُھر پھوٹ بہیں
ہر سُر ہو جیسے مہتابی اور شرارے ٹوٹ بہیں

برگِ گُل

در سخن پنہاں شدم مانند بو در برگِ گُل
(زیب النسا مخفی)

عبدالعزیز خالد

(ایک طویل منظوم ڈرامے کی خود کلامی)

اس کی پیشانی پہ اقبال کی تابانی ہے
پنجۂ دست میں تو تیغِ سلیمانی ہے
وہ ذرا سخت طبیعت کا ہے مالک، لیکن
سازش و ریشہ دوانی کے کچلنے کے لئے
دابِ تسلیم و توکل سے کہاں کام چلے!
اس کو ہے فکرِ جہاں، فکرِ جہاں کرتا رہے
فرصتِ عمرِ رواں، صرفِ زیاں کرتا رہے
زلفِ دوراں کے خم و پیچ کے سلجھانے میں
دلِ سیپارہ کو خونابہ فشاں کرتا رہے
آج تک حل نہ ہوا مسئلۂ سود و زیاں
ہے ازل سے وہی اندازِ جہانِ گزراں
موت برحق ہے تو پھر موت سے ڈرنا کیسا
مرنے سے پہلے ہی دن رات یہ مرنا کیسا؟
میں تو کہتا ہوں کہ فردوسِ بریں ہے دُنیا
تندرستی ہو تو طنّاز و حسیں ہے دُنیا
مبدأ فیض نے توفیقِ طرب بخشی ہے
فکرِ عقبیٰ ہی میں کیوں ذہن گرفتار رہے
ہر دم آشفتہ و رنجیدہ و بیزار رہے
روز و شب اپنے ہی سے برسرِ پیکار رہے
زندہ دل کیوں نہ مے و نغمہ سے سرشار رہے؟
میں نے خوبانِ وفاخو سے محبت کی ہے
سیرِ کنعانِ شباب و چہِ الفت کی ہے

رتبۂ حسن کی سرکارِ مغاں شیوہ سے
ملے چاہت کے مزے، لذتیں محبوبی کی
نالۂ بلبل کا، نزاکت گُلِ داؤدی کی
عنبریں کاکلیں چھٹکائے، نقاب الٹائے
اپسرائیں شبِ تاریک میں چھایا پتھ پہ
گوندنی کی طرح آراستہ اہلی گہلی
تنِ شفّاف پہ ہلکا سا لباسِ آبی
دُوج کے چاند کی مانند نمودار ہوئیں
چال جھرنے کی طرح، نیل کمل سی آنکھیں
تیر سی دل میں لگیں، نقدِ جوانی مانگیں
شمع فانوس میں مستور ہو جیسے — وہ بلا
گیہواں رنگ — کہ قربان ہو جس پر چندن
زلف واللیل تو والنور بیاضِ گردن
الغرض ہوتی رہی ذوقِ نظر کی تسکیں
رہیں موجودگیٔ گُل سے مجالس رنگیں
کیا کہوں کس طرح اس بارگہِ سرمد سے
دلِ شاداں نے کیا کسبِ فیوض و برکات
زندگانی ہے کہ نغمادِ یادی کی برات
دا دیاں فیضِ تجلّی سے ہیں ایمن ایمن
سینے داغوں کی بہاروں سے ہیں گلشن گلشن
زندگی میرے لئے ایک نگارِ پُرفن
جسکے جلووں سے فضائے دل و دیدہ روشن

غزل

فراقؔ گورکھپوری

اب قیدیوں کے پاؤں کی زنجیر سو گئی
زنداں کے قفل بند ہوئے رات ہو گئی

رو رو کے کچھ تو کر ہی گئی زندگیٔ عشق
وہ جان کھونے آئی تھی دنیا میں کھو گئی

مجھ سے یہ کہہ رہی ہے مری آبروئے عشق
یہ چشمِ اشک بار مجھے تو ڈبو گئی

اے دل وہ بارگاہ خطر کا مقام ہے
جاتا تو ہے وہاں جو کوئی بات ہو گئی

اے دل نہ کھینچنا تھی یہ نیم آہِ سرد بھی
نورس کلی لبوں کی کچھ افسردہ ہو گئی

وہ پھیر ہی رہے تھے ادھر گوشۂ نگاہ
اصرارِ دید کر کے یہ دولت بھی کھو گئی

اے دوست میری آنکھ تری جلوہ گاہ میں
رونے کے واسطے ہی تو آئی تھی رو گئی

یاد آ گئی وہ دل کی جواں مرگ آرزو
دیکھی نہ ایک صبح سرِ شام سو گئی

میں کھو کے رہ گیا سرِ زلفِ سیاہِ یار
ایسا ہوا کہ مجھ کو وہاں رات ہو گئی

ہے دیدنی تبسّمِ لبِ خوابِ ناز میں
اک پنکھڑی پہ کوئی کرن آ کے سو گئی

بس وہ تری نظر تھی بھری کائنات میں
جو زندگی و موت کو باہم سمو گئی

کہتے ہیں لوگ تا بہ ابد ڈھونڈتے رہو
دل نام کوئی چیز تھی پہلو میں کھو گئی

میرا خیال تھا کہ صدا دو گے تم مجھے
اے اہلِ کارواں مجھے تاخیر ہو گئی

دل رکھ دیا ہے پیکرِ خالی میں اے قضا
یا مزرعِ حیات میں تو آگ بو گئی

اے خوابِ مرگ سن نہ سکے صورِ حشر بھی
اُف اب کھلی ہے آنکھ قیامت بھی ہو گئی

آتی ہے یاد وہ مری تقدیر اے ندیم
چونکا کے مجھ کو خوابِ عدم سے جو سو گئی

وا حسرتا کہ ہو سکی پوری نہ حشر تک
ہر آرزوئے دید ترا عہد ہو گئی

کیسی یہ عرضِ غم تھی تری اے نگاہِ یاس
اس کی مژہ کا جو سرِ دامن بھگو گئی

اکثر یہی ہوا کہ سرِ شام دوستو
افسانۂ فراق چھڑا صبح ہو گئی

غزلیں

جلیل قدوائی

یہاں عشق میں ایسے بھی کچھ مجبور ہوتے ہیں
حریم ناز میں رہتے ہیں اور مہجور ہوتے ہیں

سمجھ میں کچھ نہیں آتا ہے منشاان اداؤں کا
نہ میرے پاس آتے ہیں نہ مجھ سے دور ہوتے ہیں

وہی ہے سرگرانی بعد یک عمرِ وفا ان کی
نہ جانے کون سے دن دیکھئے منظور ہوتے ہیں!

انھیں کو دہر میں دیکھا ہے ہنستے بھی ہنساتے بھی
دلوں کی تہہ میں جن کے بیشتر ناسور ہوتے ہیں

چلے ہیں ہم وہاں دردِ محبت کی دوا لینے
جہاں اہل وفا کے شیشۂ دل چور ہوتے ہیں

نگاہِ ناز کے ہیں وار یارب کس قیامت کے
اچٹتے پڑتے ہیں دل پر مگر بھرپور ہوتے ہیں

حقارت سے نہ دیکھو اہل دل کو اے جلیل ان میں
کوئی فرہاد ہوتے ہیں کوئی منصور ہوتے ہیں!

اختر احسن

رہے گا وادیٔ دل میں ستاروں کا سفر کب تک
چلے گا بے ندا یہ کارواں شام و سحر کب تک

کبھی سایہ سا بڑھ جانا کبھی سایہ سا گھٹ جانا
اسی اک خواب کی دیتا رہے گا دل خبر کب تک

سحر کا وقت آپہنچا ہے نقشِ صبح کو لے کر
رہے گا گلستاں پر سایہ وشِ عکسِ قمر کب تک

کرن اک آرزو کی اور پھوٹی بطنِ خاکی سے
یہاں ہوتا رہے گا رات دن رقصِ شرر کب تک

غم جاں آزمائے کب تلک رنگ دگر اپنا
یونہی ڈھلتا رہے گا خواب میں خونِ جگر کب تک

شبِ یلدائے غم کا آخرش انجام تو ہوگا
کرے گا اس حیاتِ جاوداں کو دل بسر کب تک

غزل

مشفق خواجہ

عشرتِ بوئے گل، شورشِ جامِ مے، حسنِ رخسار، رنگینیٔ پیرہن
حسبِ معمول پھر شام ہوتے ہی سجنے لگی ہے خیالات کی انجمن

اشک برسے تو جانا خزاں آگئی، ہنس لئے تو کہا موسمِ گل ہے یہ
بیٹھے تنہائی میں کرتے رہتے ہیں اکثر ہم اندازۂ رنگِ بزمِ چمن

سطحِ ساغر پہ موجِ مئے ناب کا اضطراب ایک ہلکا سا ہے اس طرح
جیسے شب بھر کی بے خوابیوں سے کسی بنتِ مہتاب کا ٹوٹتا ہو بدن

رات ہوتے ہی آہستہ سے یوں کوئی دل کی آبادیوں میں اترنے لگا
ریگ زاروں پہ جیسے حسیں چاندنی یا جزیروں میں سورج کی پہلی کرن

رفتہ رفتہ بڑھا تیرا غم اس قدر زندگی ہو گئی اک مسلسل خلش
ہم جسے سرخیٔ لالہ سمجھے وہ اک آگ تھی جس سے جلتا رہا ہے چمن

دیں اب الزام کیا ہم کسی شخص کو، دوستی ہی کے معیار بدلے گئے
منزلوں کی تمنا وہاں کیا کریں، راہ خود بن گئی ہو جہاں راہ زن

ہر قدم پر ملے بستیوں آرزوؤں کے لیکن میں بچ کر نکل ہی گیا
پھر بھی کچھ خواہشیں جو نہ پوری ہوئیں بن گئیں ضربتِ تیشۂ کوہ کن

زندگی جانے کس موڑ پر آگئی سوچنے کی بھی فرصت نہ ہم کو رہی
عقل کہتی ہے جو کچھ ہوا سو ہوا، دل یہ کہتا ہے کچھ اور دیوانہ پن

آج پھر ذہن میں کوئی شخص آگیا، آج پھر مجھ کو محسوس ہونے لگا
میری بے تابیاں باعثِ صد سکوں میری تنہائیاں خالقِ انجمن

آج ہی دل کی بے تابیوں نے ہمیں ترکِ الفت کا مشفقؔ دیا مشورہ
آج ہی اور بھی کچھ نکھرنے لگا ان نگاہوں کا معصوم سا بانکپن

عبداللہ خاور

یوں عارض و گیسو کی حکایات بہت ہیں
کہیئے تو ابھی رمز و کنایات بہت ہیں

آنسو ہیں سلامت، تو شبِ تار کا
آنکھوں میں تجلی کی روایات بہ

آئے ہیں دیارِ غمِ جاناں سے گزر کر
ہم تیرے لئے گردشِ حالات بہت ہیں

ماضی کے چمن زار سے آتی ہیں
اے عمرِ رواں! عیش کے لمحات

یادوں کے ترنم میں ہے آہنگِ مزامیر
لرزاں لبِ افکار پہ نغمات بہت ہیں

باقی ہیں ابھی اہل وفا، اے س
مٹنے کے لئے راہ میں ذرات ب

کہتے ہیں کہ ہم مشقِ ستم کرتے رہیں گے
جینے کو یہی چند اشارات بہت ہیں

کیوں شعلۂ جاں شام سے افسردہ
ہے رات بڑی اور حجابات ب

مشکیں دوشیزہ کا نغمہ
اور
پاٹ کا کھیت

(مشرقی پاکستان کی حیات کا ایک منظر)

مخمور اکبر آبادی

زمیں میری ہے میں بنگال کی گمنام دختر ہوں   مجھے عسرت نے پالا ہے، جمالِ فاقہ پرور ہوں
نہ خضرا ہوں، نہ حمرا ہوں، نہ میں پریوں کی ہمسر ہوں   فسونِ جانفشانی ہوں، تن آزاری کی خوگر ہوں
جسے اب تک نگاہوں نے نہیں پرکھا، وہ جوہر ہوں
نہ ڈالا میری گردن میں کسی نے ہار سونے کا
یہ لو، میں نے اگایا ہے زمیں سے تار سونے کا

زمانہ میرا دشمن ہے فلک مجھ کو کچلتا ہے   کھڑی رہتی ہوں دن دن بھر تپش سے تن پگھلتا ہے
لہو کی آگ کا لیکن زمیں پر زور چلتا ہے   جنوں کا جوش، آخر خاک کی فطرت بدلتا ہے
مری ہمت سے اِک دن کھیت میں سونا اُبلتا ہے
نہ ڈالا میری گردن میں کسی نے ہار سونے کا
یہ لو، میں نے اگایا ہے، زمیں سے تار سونے کا

یہ لو پٹ سن بناؤ اس سے شہزادی کا پیراہن   نہیں محتاجِ آرائش، ازل سے حسن کا تن من
مری تزئین کو کافی ہے، میرا مدھ بھرا جوبن   چھریرا تن، کمر پتلی، سُتی پنڈلی، نظر پُرفن
مری بدلی مرا کاجل، مرا دریا مرا درپن
نہ ڈالا میری گردن میں کسی نے ہار سونے کا
یہ لو، میں نے اُگایا ہے، زمیں سے تار سونے کا

مری سنگیں جوانی، تند ہے شبرنگ ہے نم ہے   خطوط و خم کا جادو ہے، نوید رامش و رَم ہے
لبوں کی نرم جنبش، ارغنِ فطرت کی سرگم ہے   میں جس دم گنگناتی ہوں، حیاتِ دل، وہی دم ہے
مری اٹھکھیلیوں کی چال رقصِ موجِ یم ہے
نہ ڈالا میری گردن میں کسی نے ہار سونے کا
یہ لو، میں نے اگایا ہے، زمیں سے تار سونے کا

ڈلی کے گنج میں جب لی ہے میں نے تن کے انگڑائی — تو دیکھا ہے کہ اکثر جھوم کر کالی گھٹا چھائی
فضا بدلی، اچھوتی سوندھی سی پھوٹی، مہک آئی — انوکھے روپ میں ہوتی ہے مستی کی پذیرائی

تڑپ جاتی ہوں، یوں دیتی ہے فطرت دادِ برنائی
نہ ڈالا میری گردن میں کسی نے ہار سونے کا
یہ لو، میں نے اُگایا ہے زمیں سے تار سونے کا

جدھر نظریں اٹھاؤں پنکھیوں کی چہل ہے ہر سُو — مرے اُڑتے کھلونے ہیں پلو نٹے، کوکلا، تیہو
پپیہے کی وہ پیہم پی کہاں، کویل کی وہ کُوکُو — فضا طوطوں سے پُر اور ڈالیوں پر اَن گنت لیچو

مجھے مدہوش سا رکھتی ہے پکے مور کی خوشبو
نہ ڈالا میری گردن میں کسی نے ہار سونے کا
یہ لو، میں نے اگایا ہے زمیں سے تار سونے کا

مرا ہر گام گت، باشے میں جب چاول لگاتی ہوں — مرا ہر گام سم، باشے سے جب کھیتی پہ جاتی ہوں
اندھیری رات کو ایمن کی لوری سے سُلاتی ہوں — گجردم، جوگئے سے نور کا جادو جگاتی ہوں

بھری برسات میں ملہار سے جھڑیاں لگاتی ہوں
نہ ڈالا میری گردن میں کسی نے ہار سونے کا
یہ لو، میں نے اگایا ہے زمیں سے تار سونے کا

مجھے دیکھو، مجھے دیکھو، میں ایمانِ فلاکت ہوں — مری ثروت یہ کیا کم ہے کہ میں محرومِ ثروت ہوں
مرا نام و نسب کیا، جذبۂ ایثار و خدمت ہوں — محبت کے لئے پیدا ہوئی ہوں میں محبت ہوں

مجھے پوچھو نہ پوچھو قوم کی دولت ہوں قسمت ہوں
نہ ڈالا میری گردن میں کسی نے ہار سونے کا
یہ لو، میں نے اگایا ہے زمیں سے تار سونے کا

بصیرت مٹ چکی تو مٹ چکی، لیکن یہ رونا ہے — کہ ذوقِ پاک بینی جس کو کہئے وہ بھی عنقا ہے
اندھیرا چھا رہا ہے لیکن ایک انجم جھلکتا ہے — مجھے اعجاز نے مخمور کی نظروں سے دیکھا ہے

وہ فخرِ اہلِ بینش، شوق کی آنکھوں کا تارا ہے
نہ ڈالا میری گردن میں کسی نے ہار سونے کا
یہ لو، میں نے اگایا ہے زمیں سے تار سونے کا

بوڑھی گنگا کا خواب: ڈھاکہ

وہ خواب جسے دریا بھی دیکھتا ہے اور دور مغربی پاکستان کے رہنے والے بھی، جن کی نگاہیں وطن کے ذرے ذرے میں ایک حسین و جمیل دنیا آباد پاتے ہیں
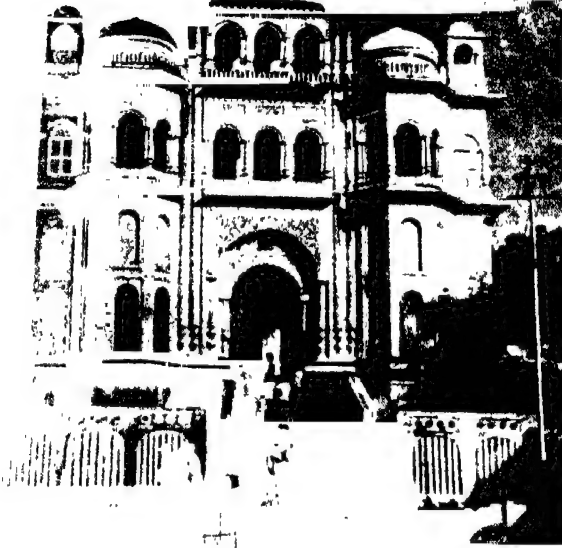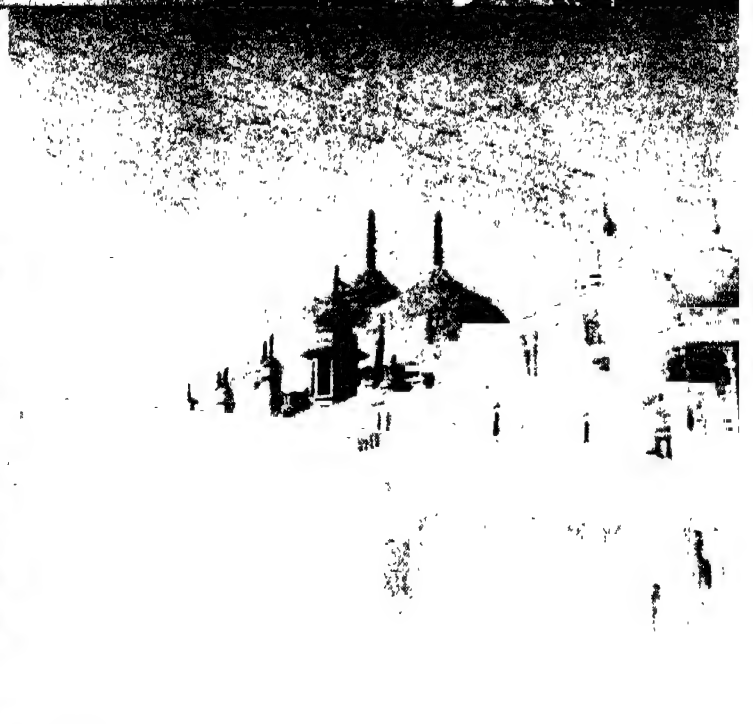
ہیں: چند در چند شاندار مساجد جو یہاں کے باشندوں کے مذہبی ذوق کی آئینہ دار ہیں

خواب تعمیر
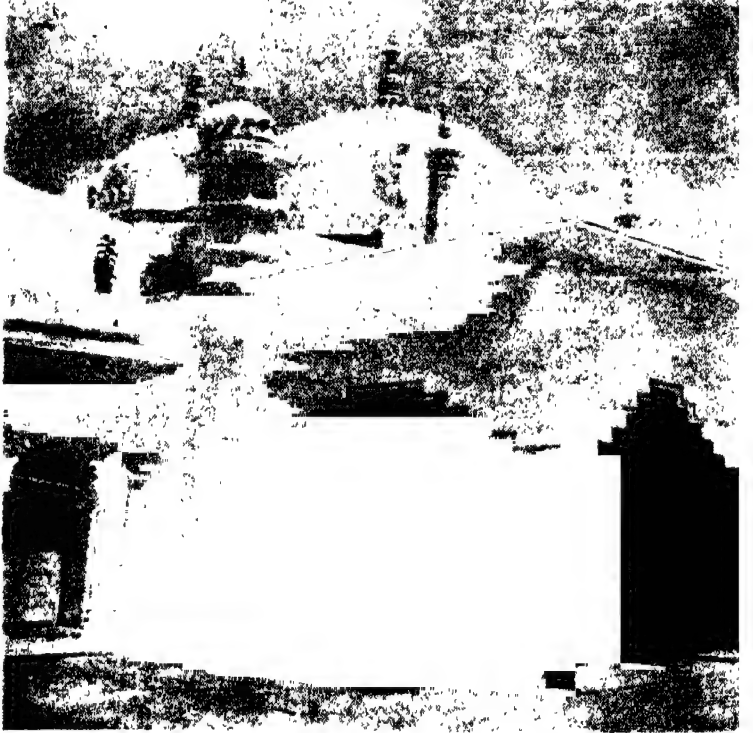
خطے: آزادیوں کے ابدی نشیمن

برف یا صبح کی خندۂ نورانی؟

مری: جہاں اس سال برف نے دور دور تک ایک دبیز چادر پھیلا
کشمیر پوائنٹ سے کشمیر پہنچتی ہوئی - جہاں برف کی سن کر دی
یخی کے نیچے زندگی بدستور آزادی کی آنچ لئے ہوئے ہے اور
تودوں کو پرے ہٹا کر انگاروں کی شکل میں آنے کے لئے بیتاب

برف یا منجمد چاندنی؟

: کشمیر کے آس پاس برف میں دم
سوز دروں کی بیداری کے خواب دیکھتا
ہوا اور برف کے باوجود سرو و صنوبر کی
آزادی کے منظر سے شادکام

کوئٹہ: جو مری کی طرح امسال برف کا بھاری لبادہ پہنے رہا

رپورتاژ
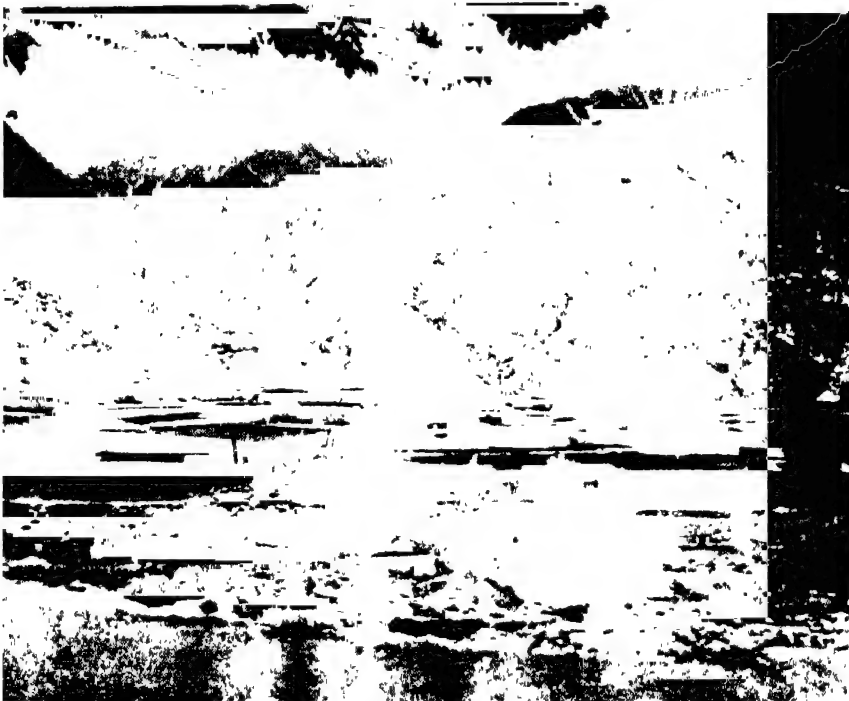
بوڑھی گنگا کا خواب — ڈھاکہ

عارف حجازی

نگاہوں کے سامنے دریا بہہ رہا تھا۔ بوڑھی گنگا۔ جس کے دونوں کناروں پر کشتیاں اور دخانی جہاز لنگر انداز تھے۔ اور ان کے عقب میں قدیم ڈھاکہ کے در و دیوار، بلند و بالا حویلیاں، کائی سے ڈھکے بوسیدہ مکانات، مسجدوں کے گنبد، مندروں کے کلس دور سے یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے پانی کی اتھاہ گہرائی سے کوئی جہاز نما شہر ابھر آیا ہو۔ یا یہ البیلا دریا کوئی خوش آئند خواب دیکھ رہا ہو۔ قلعہ لال باغ سے کر ڈھاکہ نرائن گنج "روڈ" تک کچھ ایسا ہی منظر تھا جس نے قدیم ڈھاکہ کی عظمتوں کی یاد تازہ کر دی تھی۔ ساڑھے تین سو سال قبل یہ شہر معرضِ وجود میں آیا تھا۔ ۱۶۱۲ء میں جب یہ بہار اور اودھ کا صدر مقام بنا تو اس کے چار چاند لگ گئے تھے۔ ۱۷۰۱ء تک کا دور اس کا سنہری دور تھا۔ انتظامی اور فوجی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ یہ شہر دنیا بھر میں اپنی نفیس تارکشی اور ریشم جیسی ملائم ململ کا واحد مرکز بن گیا تھا۔ جو ململ دنیا کے دور دراز علاقوں میں جاتی تھی اور جس کی نفاست کی شہرت ان ملکوں کے شاہی محلوں سے نکل کر زبان زدِ عام ہو گئی تھی اور جب یہ جادو بھری تارکشی کی ململ شہزادیوں اور نئی نویلی دلھنوں کے شرمیلے، سنہری جسموں کو اپنے آغوش میں چھپا لیتی تو ماہِ عسل کی پہلی رات کا سماں جادو کی کیفیت پیدا کر دیتا اور وہ اس شہر کے دلفریب مناظر کے خوابوں میں کھو جاتیں۔ یہ ڈھاکہ کے محنت کش جولاہوں کی انگلیوں کا جادو تھا جس نے دنیا کے بے شمار حسینوں کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ اور آج بھی وہ "طلسم ہوشربا" کے کسی قصہ کی طرح "سحرِ بنگال" کے نام سے مشہور ہے۔ یورپ والوں نے اس جادو کو اپنے قبضے میں لانے کے لئے جو بھی تدبیریں سوچی ہوں کم ہیں۔ ململ کی کشیدہ کاری سے جو اس کی اقتصادی ترقی کا سب سے بڑا وسیلہ تھا شہر ڈھاکہ نے دنیا کی جمالیاتی تشنگی کو آسودہ کرنے میں کتنا اہم کردار انجام دیا ہے۔ یہ اقتصادی ترقی اس وقت تک برقرار رہی اور اندرونی نظم و نسق میں خلل نہ پیدا ہوا۔ اس زمانے میں یہ لندن کی ٹکر کا شہر تھا۔ مشرقی ہندوستان میں کوئی اور شہر نہ تھا جو اس کا مقابلہ کر سکتا۔ لیکن گردشِ وقت کہیئے کہ ڈھاکہ کی اپنی بے پناہ اقتصادی ترقی و خوشحالی کو تھوڑی ہی مدت کے بعد زوال آنا شروع ہو گیا۔ آبادی گھٹتے گھٹتے پچاس ہزار رہ گئی اور اس طرح دنیا کا یہ مشہور شہر تقریباً ڈیڑھ سو برس تک گمنامی اور اقتصادی بدحالی کے اندھیروں میں کھو یا رہا۔ ۱۹۰۶ء میں جب لارڈ کرزن ہندوستان کا وائسرائے تھا تو اس شہر کو پھر ایک بار مشرقی بنگال اور آسام کا صدر مقام بننے کا موقع ملا۔ لیکن سات برس کی قلیل مدت کے بعد پھر اسی مرکز پر آ گیا۔ اور کوئی نمایاں ترقی نہ کر سکا۔

میں یہ سوچتا ہی رہا۔ قیام پاکستان سے قبل کسی کو یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ ڈھاکہ اپنی قدیم روایات اور سنہری دور کی یاد پھر تازہ کر دے گا۔ اس کے در و دیوار سے ماضی کی شان و شوکت پھر جھلکنے لگی۔ اور تقسیم سے تھوڑے عرصہ پہلے اس کے گلی کوچوں میں آگ اور خون کی جو ہولی کھیلی گئی تھی وہ اس کے زندہ دور کی نقیب ثابت ہو گی۔ چنانچہ آزادی کے فوراً بعد جب ڈھاکہ کو دنیا کی پانچویں بڑی آزاد مملکت کے مشرقی بازو کا صدر مقام ہونے کا اعلان ہوا تو اس کی کھوئی ہوئی عظمت پھر لوٹ آئی۔ لیکن ایک عرصہ تک شہر کے حالات ٹھیک نہ ہو سکے۔ دوسری طرف تخریبی عناصر اور غیر مسلم فرقے کے لوگوں کی متعصب ذہنیت نے ایک نئی سیاسی کشمکش پیدا کر دی تھی۔ ان غیر تسلی بخش حالات نے بہت نازک صورت اختیار کر لی جس کا واحد علاج ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کا فوجی انقلاب ہی تھا۔ یہ انقلاب سارے پاکستان کے لئے ایک نئی زندگی، شاندار مستقبل اور ترقی یافتہ رجحانات لے کر آیا تھا اور اس کے آتے ہی ملک دشمن عناصر کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے دور رس اثرات نے ڈھاکہ کے مستقبل کو بھی نہایت درخشاں کر دیا۔ قیام پاکستان سے لیکر انقلاب کے آنے تک ڈھاکہ بڑی سست رفتار سے ترقی کر رہا تھا۔ نئے دور کے آغاز سے یہ رفتار تیز ہو گئی۔

بڑی دیر تک دریا کی منجدھار سے قدیم شہر کا نظارہ کرنے کے بعد کشتی صدر گھاٹ پر آ لگی۔ اور ہم سب اتر پڑے۔ گھاٹ کیا تھا اچھی خاصی بندرگاہ تھی۔ دریا کے پختہ کنارے پر کشتیوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ان سے پرے مال بردار دخانی جہاز کھڑے تھے۔ جگہ جگہ پیلے پیلے کیلوں، انناس اور ناریل کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ہزاروں قسم کی مچھلیاں تھیں، بیوپاریوں اور گاہکوں کے جمِ غفیر میں کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ گھاٹ کی سڑک کے دوسرے کنارے پر چھوٹی چھوٹی دکانیں اور ہر قسم کے مٹھائی کے خوانچے لگے ہوئے تھے جن پر رسیلے اور خوش ذائقہ رس گلوں سے بھرے ہوئے تھال رکھے تھے۔

کہیں گرم گرم تلی ہوئی مچھلیاں۔ فضا ان کی سوندھی سوندھی خوشبو سے مہک رہی تھی اور لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو ان دکانوں پر ٹوٹا پڑ رہا تھا۔ ہم زندگی کے متحرک ماحول میں گھومتے گھامتے، بھیڑ بھاڑ سے تھوڑی دور نکل آئے تو دیکھا کہ چند بدیا[1] عورتوں کے گرد لوگوں کا بہت بڑا مجمع لگا ہے۔ دوتارا سے ملتے جلتے ساز کی نہایت دلکش صداؤں کے ساتھ ان عورتوں نے "سپورا گیت" کی مدھر تانوں سے سرمئی فضائیں بھی ان پھنکارتے ہوئے بدمست سانپ کے جوڑے کی مانند مرتعش ہو رہی تھیں۔ ہر شخص جیسے موت کے دیوتا "یاما مہاراج" کے دربار میں بڑی تعظیم سے کھڑا غم نصیب بیہولا دیوی کا رقص دیکھ رہا تھا۔ ساز کے پُر درد سُروں کے ساتھ دوسری بدیا عورت نے ایک داستان شروع کر دی: جب چاند سوداگر کا چاند سا بیٹا لکھندر، سانپ کے کاٹنے سے دوسری دنیا کو کوچ کر گیا تو اس کی نئی نویلی بیوی بیہولا غم کی آنچ سے زرد پڑ گئی، خوبصورت رخساروں پر سیاہی دوڑ گئی۔ پتی کی اچانک موت نے اس من موہنی سندرتا کا سہاگ لوٹ کر کتنا ظلم کیا تھا مگر اس نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اور اپنے پیارے شوہر کی نعش کو بیڑے میں رکھ کر دریا کے بہاؤ کی طرف روانہ ہو گئی۔ بالآخر کئی دنوں کے سفر کے بعد موت کے دیوتا یاما مہاراج کے دربار میں پہنچی اور اپنے رقص کے ایسے کمالات دکھائے کہ یاما کو اس سہاگن پر بڑا رحم آیا اور اس کے پتی لکھندر کے مردہ جسم میں پھر جیون کی لہر پیدا کر دی۔"

سپورا گیت، اس کے ساتھ یہ دلچسپ قصہ، لکھندر اور بیہولا کی محبت کا درد بھرا نغمہ۔ نازک بدن بدیا عورتوں کا والہانہ انداز بیان، ان کی میٹھی سُریلی تانیں سن کر ہم پر جیسے ایک جادو ہو گیا تھا۔ چنانچہ سانپ کا تماشہ ختم ہوتے ہی ہم سراج الدولہ پارک کے قریب ایک ہوٹل میں آ بیٹھے۔ یہیں سے شہر کی شہ رگ "نواب پور روڈ" گزرتی تھی۔ قومی انقلاب سے جہاں شہر کے دوسرے حصوں میں بڑی بڑی حیرت انگیز تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں وہاں نواب پور روڈ کو اور بھی چار چاند لگا دیئے تھے۔ ہٹ کولا روڈ، بنگلہ بازار، مٹ فورڈ روڈ، اسلام پور روڈ کے کیا کہنے۔ انہی شاندار سڑکوں کی طرح یہ بھی صاف ستھری، چم چم کرتی نظر آتی تھی۔ گہما گہمی نے اس کی شان اور بھی دو بالا کر دی تھی۔ سائیکل رکشوں گھوڑے گاڑیوں، بیل گاڑیوں کے ساتھ ساتھ موٹروں اور بسوں کا بے پناہ تانتا اور زبردست طنطنہ۔ وہ سیدھے سادے مرد اور عورتیں، ان کی شیریں زبان میں رس گلوں کی مٹھاس اور تر و تازہ گلاب کی خوشبوؤں کا احساس۔ قدیم شہر کی عمارتوں کی سنگین مشرقیت کا رعب ایسا پڑ رہا تھا کہ ہر نووارد خصوصاً اہلِ مغرب کے لئے وہاں زیادہ دیر ٹھہرنا محال ہوتا تھا۔ پھر شہر کے ہوٹلوں میں مغربی دلچسپیوں کا سامان کہاں، دکانوں میں ڈھاکیسوری کی ایک سے ایک نفیس ساڑھی، موسیقی اور ساز سنگیت کے آلات، طبلہ، سارنگی، ستار، ہارمونیم اور موہن بانسریاں، سیپ اور مچھلی کی ہڈی کے بٹن، انگرکھے اور ٹوپیاں، کرتے، لنگیاں، پاجامے، بید کا سامان اور فرنیچر، دیسی حکیموں کے مطب، ہومیوپیتھ ڈاکٹروں کی حویلیاں اور دواخانے، بیڑی بنانے والوں پان فروشوں اور نیواڑیوں کی چھوٹی چھوٹی سی دکانوں کے بیچ میں کہیں کہیں بڑی بڑی فیشن ایبل عمارتیں، ایسی دکانوں میں مغربی اشیاء اور ساز و سامان کی جھلکیاں اجنبیت کا احساس پیدا کر دیتی ہیں۔ لیکن چوک بازار میں پہنچ کر تو صدیوں کی قدامت کا شدید احساس ہونے لگا۔ کبھی یہاں ایرانی، یونانی، فرنگی، کشمیری، افغانی، ارمنی اور دیگر مقامی و غیر مقامی لوگ رہا کرتے تھے۔ بیرونی تجارت کا یہی سب سے بڑا مرکز تھا۔ اسی بازار میں مسلمان امراء و شرفا کی شان و شوکت اور کر و فر کی جھلکیاں نظر آتی تھیں۔ نقیب اور چوبداروں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں اور شاہانہ جلوس اور سواریاں گزرا کرتی تھیں۔ اسی چوک میں علماء اور مشائخ کے جلسے منعقد ہوا کرتے تھے۔ یہیں ایک چوگوشہ چبوترہ بھی تھا جو مقرروں کے کام آتا تھا۔ اسی مقام پر شہر کے خوش باش نوجوان تفریح کرتے نظر آتے تھے۔ پان اور شربت کی دکانوں پر ان کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ یہیں قصہ گو اور پُر مذاق لوگ مغل دربار اور حرم کے متعلق طرح طرح کے افسانے گھڑ گھڑ کر اور قہقہوں اور خوش گپیوں میں اپنے فرصت کے لمحات گزار دیتے تھے۔ صرف فرق اتنا معلوم ہوا کہ پرانے چوک کے تاریخی ماحول کی جگہ اب مقامی رنگ کی گہما گہمی نے لے لی ہے۔ جہاں کبھی چوکور چبوترہ ہوگا وہاں اب بساط خانے ہیں اور چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں میں گور دا اور خصی یعنی گلے اور بکری کا گوشت ملتا ہے۔ چنگڑی ماچھ (جھینگا) اور دوسری طرح طرح کی مچھلیوں کے سالن اور کھانے ملتے ہیں۔ شام کے وقت ریڈیو اور ریکارڈوں کے بنگالی گیتوں اور گانوں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اور چوک کے مربع نما علاقہ میں اچھا خاصا میلہ لگا معلوم ہوتا ہے۔

قدیم ڈھاکہ کے تنگ بازاروں، چوکوں اور پُر پیچ گلی کوچوں میں پرانی عمارتوں کے یہ بے شمار کھنڈر، ان میں دریا کے "بک لینڈ" بند کے پاس نوابین ڈھاکہ کا محل دیکھنے کے لائق ہے۔

یہ ہے بڑا کٹرا، چوڑی ہٹہ بازار یعنی چوڑی والوں کا بازار۔ جہاں شاہجہاں کے دوسرے بیٹے شاہ شجاع نے ایک شاندار مسجد تعمیر کی تھی۔ ایسے ہی ست گنبد، مشہور سپہ سالار، شائستہ خان کی تعمیر "چھوٹا کٹرا" ہے کیسی بانکی اور نرالی وضع ہے! سات گنبد پہلو بہ پہلو، نفیس و نازک جھرمٹ۔ گویا البیلی، خوشخرام بوڑھی گنگا کی سطح پر ایک ساتھ ابھرے ہوئے شفاف بلبلے۔ مغلوں نے یہاں کیا کیا یادگاریں نہیں چھوڑیں۔ ہم قلعہ لال باغ سے کیسے دل و دماغ میں عہد رفتہ کے حسین و جمیل

---

[1] بنگال کے خانہ بدوش۔ جن کا عام پیشہ سانپ کا تماشہ دکھانا ہے۔

تصورات کی شمعیں جلائے بغیر گزر سکتے ہیں۔ یہ اورنگ زیب جیسے جری باپ کے فرزند، محمد اعظم کی یادگار ہے۔ جس کا مشرقی حصہ منہدم ہو چکا ہے۔ اور اپنی شکستگی میں بھی شان و شوکت کے آثار لئے ہوئے ہے۔ افغانی عہد کا قلعہ جسے زمانہ کی ستم ظریفی نے جیل بنا دیا ہے حسینی دالان، لال کرتی، پرانا دروازہ، حویلی روپ لال، ڈھاکیسوری کا مندر، رنگ و نیرنگ، افسانہ در افسانہ۔ دیدہ و دل پر نئے نئے نقش ثبت کئے جاتے ہیں۔ یہ ہے دورِ کہن کی کرشمہ آفرینی اور جب ماضی نے حال کا چولا بدل لیا تو شعور فن نے نئے نئے روپ دھارے سلیم اللہ ہال، کرزن ہال، ڈھاکہ یونیورسٹی، شاہ باغ کا فوارہ، ہائی کورٹ (جس کی عمارت میں ڈھاکہ کا بانی، اسلام خان، مدفون ہے) اور زیادہ قریب آیئے۔ پاکستانی عہد میں۔ یہ ہیں انسانی شعور اور ذوق فن کے جدید ترین نقوش۔ شانتی نگر، موتی جھیل اور پرانا پلٹن کی رہائش گاہیں۔ دوسری طرف عظیم پورہ اور اس کی نئی مارکیٹ۔ دھان منڈی اور شاہ باغ کے علاقہ کے صوبائی دفاتر، شاہراہ گلستان، اسٹیڈیم وغیرہ جیسے مست کیف بوڑھی گنگا نے اپنے کناروں پر موتی ہی موتی اگل ڈالے ہوں۔ اور اب تو یوں لگتا ہے جیسے کچھ ہی سلسلے باقی رہ گئے ہوں۔ بالکل پاس۔ جیسے ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے نئے نئے نقوش ابھرتے جا رہے ہوں۔ یہ عمارات جیسے ابھی ابھی بنی ہوں۔ جنت کے ایک گوشے ہیں۔ آخر رمنا بھی تو جنت ہی کا ایک گوشہ ہے۔ اس قدر باغ و بہار۔ ہرے بھرے مناظر، سبز و شاداب کنج، گھنے سایہ دار درختوں کی لہریا بناتی ہوئی قطاریں، جل تھل تالابوں کی سطح پر ناچتے ہوئے کنول، چاروں طرف ہرا بھرا سبزہ ہی سبزہ جس کی تازگی و شگفتگی سے آنکھوں میں ایک نئی قوت اور طراوت کا احساس پیدا ہو۔ اور دل و دماغ اس بہار میں سبزہ زار اور قدرتی حسن سے مسحور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

رمنا کے خوبصورت مناظر اور خوشبوؤں سے مہکتی ہوئی فضاؤں میں پہنچ کر ہم پر کچھ اور ہی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ تمام دن قدیم شہر کے بازاروں، گلی کوچوں اور تاریخی عمارتوں کو دیکھتے دیکھتے اور چلتے پھرتے جو تھکن طاری ہوئی تھی اس کا خمار ٹوٹ چکا تھا۔ اور ایک نشہ آفریں کیفیت طاری ہونے لگی تھی — بادۂ شبینہ نے اس میں اور بھی کیف پیدا کر دیا۔ نیم خنک، متوالی ہواؤں کی سرسراہٹ کے ساتھ جب کسی مہ جبین کے نغمگیں قہقہوں کی آواز کانوں سے ٹکراتی تو دل فسانۂ زلفِ دراز کے قصے چھیڑ دیتا اور ہم ان شیریں قہقہوں سے متاثر ہو کر اپنی رفتار اور دھیمی کر دیتے۔ لیکن جب کسی دوسری کٹیا یعنی بنگلے سے سرگم کے جادو بھرے بول، پائل کی مدھم جھنکار کے ساتھ طبلے کی ہلکی ہلکی تھاپیں اور ستار کی سریلی گنگناہٹ سنائی دی۔ تو دل کسی البیلی رقاصہ کی طرح خود بھی رقص کرنے لگتا اور لمحہ بھر کے لئے ہمارے قدم نغموں کی سحر آفرینی سے اچھی طرح لطف اندوز ہونے کے لئے آپ ہی آپ رک جاتے موسیقی اور ساز کاری کا یہ دلچسپ امتزاج لوگوں کی عام زندگی سے اتنا ہم آہنگ ہے کہ امیر و غریب سب ہی اس کے پرستار نظر آئے۔ پھر پٹوا ٹلی کی بھول بھلیوں جیسی گلیوں کا ذکر ہی کیا جہاں شام ڈھلتے ہی شمع روشن ہونے کی دیر ہوتی ہے کہ ساز سنگیت کے دلنواز سُر تال چھڑ جاتے ہیں۔ اور دل پھینک لوگ پروانوں کی مانند ان گلیوں کا طواف کرتے نظر آنے لگتے ہیں۔

اس خواب کے سے عالم میں ہوتے ہوئے ہم سرکٹ ہاؤس پہنچے۔ وہ سرکاری قیام گاہ جو دور و نزدیک سے آنے والے مسافروں کو چند روز اپنے آغوش میں سکون و آرام بخشتی ہے۔ یہاں پہنچ کر ہم نے گھڑی بھر سانس لی۔ اور لمبی تان کر سو گئے۔ صبح اٹھتے ہی دیکھا کہ تمام ساتھی کوچ کی تیاری میں مصروف ہیں؛ ہم نے بھی الٹا سیدھا اپنا سامان باندھا اتنے میں ٹیکسیاں آ گئیں اور ہم دن نکلتے نکلتے تیج گاؤں کے ہوائی اڈے پر پہنچ گئے۔ وہاں تھوڑا بہت ناشتہ کیا۔ ڈھاکہ کو الوداع کہہ کر جان خدا کے سپرد کی اور پی۔ آئی۔ اے کے سپر کونسٹیلیشن ہوائی جہاز میں سوار ہو گئے ۔

رپورتاژ :

المنظر سے المہران

اقبال حامد

غلام محمد بیراج اور اس کے دائیں کنارے پر واقع حسین و مختصر ہوٹل ، "المنظر" دونوں دور سے ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے کوئی ذی وقار شہنشاہ سر کا تاج سرہانے رکھے لیٹا ہو اور تھوڑی ہی دیر بعد ہم اس تاج کے سائے میں بیٹھے چائے کا انتظار کر رہے تھے۔ ! شدید سردی کا دن اور دوپہر کی تیز دھوپ ، سردی اور گرمی کے اس امتزاج نے ہم میں سے ہر ایک پر عجیب کیفیت طاری کر دی تھی۔ نہ معلوم کب تک یہ کیفیت اور طاری رہتی اگر بیرا چائے کی ٹرے لاتا ہوا نظر نہ آجاتا۔ اس کو دیکھ کر ہم میں سے کسی نے خموشی کا طلسم توڑا۔

"دریائے سندھ خشک ہے۔ دوسری طرف یہ نہر کلری بگھار فیڈر اپنی خشک چھاتی کے زخم دکھا رہی ہے اور ان دونوں کے درمیان یہ "المنظر" اپنی رعنائی کے باوجود اکتانے لگا ہے۔ کہیں اور چلیں۔"

"جیکب آباد کیسا رہے گا وہاں بارش ہو رہی ہے۔"

"تو ٹھٹھہ بھی ہو آئیں گے۔ جہاں اس بیراج کا حریف یا حلیف ابھر رہا ہے۔ واپسی میں سکھر چلتے ایک ہی دن کے لئے۔"

"منظور۔ منظور۔"

"طے ہے"

کسی نے مخالفت نہیں کی۔ اور معلوماتی سفر کی ایک ایسی اسکیم بن گئی جس کے عملدرآمد کے بعد ہم غور کرتے ہیں تو ماننا پڑتا ہے کہ یہ سفر نہ کیا ہوتا تو معلومات کس قدر نامکمل رہتیں کیونکہ اس سفر کی ہر ہر منزل پر فرد کی عقل اور قوم کی محنت کے وہ وہ حاصل سامنے آئے جو عجیب بھی ہیں اور قابلِ فخر بھی اور جن کی قدر افزائی یا توصیف کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ان کو تصویر اور تحریر کے ذریعہ منظر عام پر لایا جائے۔

حیدرآباد سے رات ۱۱ بجے "چناب" روانہ ہو کر صبح ساڑھے سات بجے ہم شمالی سندھ کے آخری ضلع ، جیکب آباد پہنچ گئے جو اپر سندھ فرنٹیر" کے نام سے زیادہ معروف ہے۔ یہ مقام بے انتہا گرم ہونے کی وجہ سے پاکستان کا منطقۂ حارہ کہلاتا ہے یا پھر اس کا نام اس لئے سننے میں آتا تھا کہ یہاں ساٹھ فیصدی ہندو اور ۴۰ فیصدی مسلمان ہیں۔ مگر یہاں آکر معلوم ہوا کہ جیکب آباد حسن و عجائبات کا بھی مالک ہے۔ ۵۰ ہزار کی آبادی کا یہ شہر بڑے سلیقے سے بسایا گیا ہے سڑک کے دونوں طرف اس قدر جگہ چھوڑی گئی ہے کہ مزید دو دو سڑکیں تعمیر ہو سکتی ہیں اس قدر فاصلے کے بعد سیدھی قطار میں مکانات ہیں اور مکانوں کے سامنے ببول کے درختوں کی سیدھی لائن ضرور لگائی جاتی ہے۔ یہ ببول بھی اس لحاظ سے نرالے ہیں کہ سب پستہ قد اور پتلے تنے کے ہیں اور ایک بھی بلند اور گھنا پیڑ پورے شہر میں کہیں نہیں ملے گا۔ سڑکوں اور مکانوں کی اس قدر دوری اور لازمی شجرکاری مغربی پاکستان کے اور شہروں میں نہیں دکھائی دیتی۔

ہم جیکب آباد کو بسانے والے کی سلیقہ مندی کی تعریف کرتے ہوئے جب بیچ شہر میں آئے تو ہمارے سامنے چند قدم کے فاصلے پر ڈپٹی کمشنر کی رہائش گاہ اور نجی دفتر نظر پڑا۔ پشت پر تھوڑے ہی فاصلے پر گھنٹہ گھر تھا۔ تھوڑی دیر گنجان بازار ، اجناس کی منڈی ، فروٹ مارکیٹ اور سبزی مارٹ کا چکر لگا پھر ڈپٹی کمشنر کی قیام گاہ کا رخ کیا۔ یہاں پہنچ کر اطلاع کرائی۔ دو منٹ بعد ایک نو سی ایس پی ، سراپا اخلاق ، ڈپٹی کمشنر جیکب آباد سے ملاقات ہوئی جو ہمیں جیکب آباد کے بارے میں اس طرح بتائے جا رہے تھے جیسے پرانا لیکچرار کلاس روم میں بول رہا ہو۔ حالانکہ ان کو یہاں تعینات ہوئے صرف چھ ماہ ہی گزرے تھے۔ اگر ہم موصوف کی دل آویز تقریر لفظ بہ لفظ نوٹ کر لیتے تو ایک اعلیٰ نمونۂ انشا پردازی کا ہمارا ... بہرکیف ، ہم ان کی شیریں بیانی اور ذخیرۂ معلومات سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ معلومات سے ہم نے جو حقائق اخذ کئے وہ یہاں آپ کی خدمت میں پیش کئے جاتے ...

ایک سو دس برس قبل تک یہ شہر "خان گڑھ" کہلاتا تھا اور ایران افغانستان اور ہندوستان کے اکثر باغی اور جنگجو قبائل کا مرکز تھا۔ کیونکہ ... چمن اور بلوچستان کے بعد جیکب آباد سے براہ سمہ سٹہ ، بہاولپور ، دہلی کو حملہ آور کے لئے ایک مستقل جنگی راستہ تھا اور درۂ بولان کو بھی یہی راستہ جاتا تھا۔ ...

مغربی یا مشرقی پاکستان ؟

سابق سندھ کے تاریخی شہر، سکھر، میں '' پدما ،، اور '' میگھنا ،، کے مثل، دریائے سندھ پر گونا گوں سفینوں کا دل آویز نظارہ
شاید اسی لئے وادئی مہران کے ہردلعزیز شاعر، شاہ عبدالطیف بھٹائیؒ بار بار مانجھیوں اور کشتیوں کا ذکر کرتے ھیں

رنگین عکس : محمد اسماعیل صدیقی

انیسویں صدی کے نصف میں جبکہ انگریز ہندوستان میں قدم جمانے کی کوشش کر رہے تھے اور حریت پسند اُن کو اکھاڑ پھینکنے کی تاک میں تھے۔ ایک سمجھدار جنرل کو یہاں تعینات کیا گیا جس کا نام جان جیکب تھا۔

یہ فوجی نہ صرف ایک اچھا مدبر اور دور اندیش حاکم ثابت ہوا بلکہ موجد کی حیثیت سے بھی اس قدر مقبول ہوا کہ شورش پسند قبائل نے شہر کو ہی اس کے نام پر موسوم کر دیا۔ اور آج ایک صدی گزرنے کے بعد بھی جنرل جان جیکب کی قبر واقع جیکب آباد پر پھول چڑھائے جاتے ہیں اور چراغ جلائے جاتے ہیں!

جنرل جان جیکب کا زمانہ بڑا پُر آشوب تھا۔ اس کا عہدہ پولیٹیکل سپرنٹنڈنٹ اور کمانڈنٹ اپر سندھ فرنٹیئر تھا۔ یہ اس با اختیار فوجی اور سیاسی عہدے پر ۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۸ء تک فائز رہا (اس اثنا میں صرف ایک برس کے لئے "میری ویدر" نے اس کی جگہ کام کیا تھا۔ یہ وہی میری ویدر ہے جس کے نام کا ٹاور کراچی میں اب بھی موجود ہے) اس دوران میں وہ چاہتا تو کافی کشت و خون ہوتا اور تاریخ میں اس کا تذکرہ تعجب سے نہ کیا جاتا۔ مگر اس نے عقل و تدبر سے کام لیا۔ اور حکمت عملی سے بہت اچھے کام کئے۔ ایک بہت ہی خطرناک مقام پر بہت نازک ذمہ داریاں سنبھال کر اس فوجی نے اپنی خداداد صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اور تجارتی بنیاد پر یہاں ایک "ہارس شو" کا بھی آغاز کیا۔

اس علاقے کے بلوچ قبائل گھوڑے پالنا و رشہ سواری کے بےحد شوقین تھے۔ اسی بنا پر گھوڑوں کی بے قاعدہ درآمد اور خرید و فروخت بھی ہوتی تھی۔ جنرل جان جیکب کے قائم کردہ "سالانہ ہارس شو" میں گھوڑوں کے تاجر آتے اور خریداروں کو اچھے اچھے گھوڑے بہت آسانی سے مل جاتے۔ چند ہی سال بعد اس جنرل نے اس سالانہ ہارس شو کے موقع پر شہ سواری اور نیزہ بازی کے کرتبوں کا بھی اضافہ کر دیا اور اس کے لئے پُرکشش انعامات بھی مقرر کئے۔ ان مقابلوں میں بلوچوں نے زور شور سے حصہ لیا۔ اور یہی نقطۂ آغاز تھا جہاں سے غیر ملکی فوجی حاکم کے مخالف عوام کے درمیان تعاون و اعتماد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جیکب نے دوسرے ہی سال اس ہارس شو کی اہمیت میں اضافہ کیا اور دور و نزدیک کے قبائلی سرداروں کو بلا کر ان کے مفاد اور عام نظم و نسق کے مسائل پر گفتگو کی اور ان کے مشوروں کی قدر افزائی کا ثبوت دیا۔ یہ ہارس شو گزشتہ ایک سو برس سے اب تک نہایت باقاعدگی سے ہو رہا ہے۔ البتہ آزادی کے بعد اس میں جدت اور اضافے ہوتے رہے ہیں چنانچہ اب یہ ہارس شو کے علاوہ ایک بڑا میلہ اور نمائش بھی ہو گیا ہے۔ البتہ اس کے انعقاد کی تاریخوں میں فرق نہیں آیا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جیکب آباد کی ۵۵ سے ۱۳۰ ڈگری تک کی گرمی کے مارے ہوئے عوام کسی خوشگوار مصروفیت اور تفریح کے متلاشی ہوتے ہیں جو اُن کو سردی کے آغاز میں ہارس شو کی شکل میں ان ایام میں میسر آتی ہے جبکہ خریف کی فصل کٹ کر بازار میں آجاتی ہے اور ربیع کی فصل بوئی جا چکی ہوتی ہے۔ گویا ان دنوں میں اہلِ دیہات بالکل فارغ ہوتے ہیں اور دور و نزدیک سے آ کر اس ہارس شو میں حصہ لیتے ہیں جو اب صنعت و زراعت کی نمائندگی کے ساتھ ہی ثقافت کا بھی آئینہ دار ہو گیا ہے۔ صوبائی گورنر کی آمد سے اس کی اہمیت میں اور اضافہ ہونے لگا ہے۔ اس ہارس شو کی روایت یہ ہے کہ اس میں ہر سال ایک خصوصیت کا اضافہ ہوتا ہے مگر اس سال ایک بنیادی خصوصیت یہ پیدا ہوئی کہ ہارس شو کے قیام اور نمائش گاہ کو مستقل بنیاد پر پختہ تعمیر کر دیا گیا ہے۔ دوسرے اب تک اس پر حکومتیں ہر سال کچھ نہ کچھ صرف کرتی تھیں مگر اس سال اس کو آمدنی کا ذریعہ بنایا گیا چنانچہ ۵۰ ہزار روپیہ اس کی آمدنی میں سے مشرقی پاکستان کے طوفان زدگان کے امدادی فنڈ میں بھی دیا گیا ہے۔ اور ۴۲ ہزار روپے سے جیکب آباد میں ایک ڈیری فارم کھولا جا رہا ہے۔ اس تعمیری تبدیلی کا سہرہ موجودہ حکومت کے سر ہے جس نے پورے ملک کو تعمیر اور اصلاح کی راہ پر گامزن کر دیا ہے۔ اور اب تو ماضی کے فضول خرچ حکام کا طرز فکر بالکل بدل گیا ہے۔

ہارس شو تو جنرل جان جیکب کے سیاسی تدبر کا ثبوت ہے۔ لیکن اس سپاہی نے اس ہی دور میں ایسی ایجادات بھی کیں جنہیں آج بھی حیرت سے دیکھا جاتا ہے۔ ان ایجادات میں ایک گھنٹہ ہے جو زمین کے اوپر دس فٹ بلند ہے اور جملہ کل پرزوں سے لیس ہے اور تیس فٹ گہرائی میں زمین کے اندر اس کی وزنی زنجیریں چلی گئی ہیں جن کی متواتر گردش سے یہ گھنٹہ ۱۱۰ برس سے برابر چل رہا ہے۔ زمین کے اوپر آخری سرے پر اس کے پیتل کے ڈائل ہیں جو چار سمتوں کی طرف رکھے گئے ہیں۔ ان پر گھنٹے، منٹ اور سیکنڈ کے عدد کندہ ہیں۔ اور ان کے ساتھ ہی عیسوی و قمری سن، ماہ اور اس کی تاریخیں بھی کھدی ہوئی ہیں۔ چنانچہ تیس فٹ زیرِ زمین زنجیروں سے چلنے والا یہ گھنٹہ وقت کے ساتھ دونوں سنوں کی تاریخیں بھی ظاہر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے درمیان میں پیتل کا ایک چاند ہے جس پر ایک سرکنے والی پوشش ہے۔ یہ چاند اس پوشش کے سرکنے سے عین اس دن طلوع ہوتا ہے جب فلک پر چاند دکھائی دیتا ہے اور جس طرح آسمان کا چاند بڑھتا ہے اسی طرح اس گھنٹہ میں بھی قمر بڑھتا رہتا ہے۔ چودہ کی شب کو یہ چاند مکمل ہو جاتا ہے اور دوسرے دن سے گھٹنے لگتا ہے۔ غرضیکہ اس کی رفتار اصلی چاند کی طرح ہوتی ہے۔ ایک صدی اور دس برس کی مدت میں یہ گھنٹہ صرف ایک بار بند ہوا تھا۔ اور اس کے بند ہونے سے ایک حیرت ناک واقعہ بھی اس سے وابستہ ہو گیا۔ یعنی یہ کہ کوئی چھ مہینے تک اس کے بند رہنے کے دوران خرابی معلوم کرنے کی کوشش ہوتی رہی۔ اس کو

چلانے کے لئے بڑے بڑے ماہر مکینک اور نامور انجینئر تک بلوائے گئے۔ مگر سب ناکام ہو گئے۔ آخر کار جیکب آباد کا ایک نوجوان گھڑی ساز، محمد عظیم، ڈپٹی کمشنر کے پاس آیا اور کہا کہ میں اس گھنٹہ کی مرمت کرنے کا عزم رکھتا ہوں۔ انہوں نے اس معمولی گھڑی ساز کی حوصلہ افزائی کی اور اس کو کام کی پوری آزادی دی ۔۔۔ یہ ۲۲ سالہ گھڑی ساز ۔ اپنی معمولی دکان اور چھوٹے سے کاروبار کو بھول کر ایک جنونی کی طرح ۴۳ دن تک اس گھنٹہ کے پیچھے پڑا رہا اور سارا سارا دن بلکہ اکثر رات کو بھی اس کے کل پرزے کھول کر جوڑتا رہتا۔ آخر کامیابی نے اس کے قدم چومے اور کلاک کی پوری درستی ہو گئی اور وہ باقاعدگی کے ساتھ چلنے لگا۔

جنرل جان جیکب نے اپنی قیام گاہ میں جس کو "ریذیڈنسی" کہا جاتا تھا خود ایک ورکشاپ بنا رکھا تھا جو پوری عمارت کے لئے ائیر کنڈیشنگ تک کرتا تھا ۔ !
یعنی ہر حصے کو موسم سے محفوظ رکھتا تھا۔ یہ ورکشاپ اب محفوظ نہیں۔ اسی طرح اس جنرل کی ایجاد کردہ کرسیاں اور دوسری چیزیں ناقدری کے ساتھ گودام میں بھر دی گئی تھیں۔ ان کو بھی اس عہد قدردانی میں نکلوایا گیا ہے اور پورے سلیقے سے ان کی نمائش کی گئی ہے۔ لکڑی کی کرسیاں بہت آرام دہ ہیں۔ ان کے معیار کی کرسیاں اب نہیں بنتیں۔ ان ہی یادگاروں میں وسط انیسویں صدی کے دو جنوں قسم کے پستول اور بندوقیں بھی ہیں جو جنرل جان جیکب نے جنگوں میں جیتی تھیں

جیکب آباد سے سڑک کے راستے ہم کاشمور روانہ ہوئے جہاں سابق سندھ کی شمالی سرحد پر گڈو بیراج تعمیر ہو رہا ہے۔ ۱۱۰ میل کے اس راستے میں زمین زرخیز بھی شکار گاہیں بھی تھیں سیم اور تھور سے تباہ شدہ ہزاروں ایکڑ کا رقبہ بھی دیکھا جو زبانِ حال سے کہہ رہا تھا کہ بیماری اور روگ انسان اور جانوروں کیلئے ہی نہیں زمین کے لئے بھی ہوتے ہیں۔ اور جس طرح ایک فرد کی بیماری سارے گھر کی خوشیوں کو اداسی میں بدل دیتی ہے۔ اسی طرح زمین کو تباہ کر دینے والی سیم اور تھور کا "مرض" قوموں کو خوشحالی سے محروم کر دیتا ہے۔ بہر حال "حکمت" ہر روگ کی دوا مہیا کرتی ہے اس خرابی سے بھی نجات دلانے کا ذریعہ ہے۔ بہت سے ماہر سیم اور تھور کا جائزہ لے رہے ہیں۔ تاکہ اصل بات معلوم ہو سکے۔ اس کے بعد موجودہ حکومت اس کا صحیح علاج کرے گی یعنی ٹیوب ویل لگا کر یا سمندر تک نالیاں بنا کر اس خرابی کا سدباب کرے گی۔ ہمیں اس سفر میں ہی معلوم ہوا کہ غیر ملکی ٹیمیں سیم اور تھور سے تباہی کا سروے کر رہی ہیں ان کی رپورٹ ملتے ہی حکومت انسدادی تدابیر پر عملدرآمد شروع کر دے گی۔

جیکب آباد سے کاشمور تک ہمیں بہت سے بلوچ قبائل نظر پڑے ہم ان لوگوں سے ملے، ان میں قدیم نظریات کے حامی بزرگ بھی تھے اور جدید تعلیم سے بہرہ ور نوجوان بھی۔ یہ سب کے سب اسلامی اخلاق کے حامل، نہایت سادہ، دلیر اور صاف گو تھے۔ ہر جگہ ہمارا خندہ پیشانی سے استقبال کیا گیا اور معمولی گاؤں میں بھی خاطر تواضع سے زیر بار احسان کیا گیا۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ ہم مدارات سے زیادہ معلومات کے لئے اِدھر اُدھر کا سفر کر رہے ہیں تو ان میں سے ایک شخص کندھے پر کلہاڑی لئے ہوئے اونٹ چرانے والا اور ایک تعلیم یافتہ ممبر بنیادی جمہوریت سب ہی ہماری مدد کو تیار ہو گئے۔ اور تھوڑی ہی دیر میں ہمیں پتہ چل گیا کہ کھیتوں کی سوندھی سوندھی خوشبو میں بظاہر پُرسکون زندگی گذارنے والے یہ سرخ و سفید رنگت کے گرانڈیل اور توانا بلوچ کس قدر حیلے، کیسے سمجھدار اور معاشی تنگ دو کے کس قدر خواہاں ہیں۔ ان لوگوں کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ اگرچہ جیکب آباد بلوچستان کے علاقہ میں شامل نہیں مگر قدیم سے سندھ کا یہ سرحدی ضلع بلوچوں کا مرکز رہا ہے۔ چنانچہ جمالی جکھرانی۔ ڈومبکی۔ کھوسو۔ معرفانی۔ رند۔ بنگلانی۔ چانڈیو اور دوسرے جتوئی دوسرے بلوچ قبائل اپنے قدیم رسم و رواج کے ساتھ اسی ضلع میں رہتے بستے چلے آئے ہیں۔

راستے کے مناظر دیکھتے ہوئے ہم گڈو بیراج تک پہنچ گئے جو زیر تعمیر ہے۔
ہمارے ذہن وہاں کام کرنے والی دیوہیکل مشینوں اور ان پانچ ہزار کارکنوں کی طرف منعطف ہوئے جو ۲۴ گھنٹے بیراج بنانے میں مصروف ہیں۔ یہاں ہمیں بتایا گیا کہ یہ بند جون ۱۹۶۲ء میں مکمل ہو جائے گا۔ اس کے دائیں کنارے پر دو نہریں سندھ بیگاری اور صحرائی نہر کہلائیں گی۔ اور بائیں کنارے پر ایک نہر گھوٹکی فیڈر ہوگی۔ اس بیراج کی تکمیل سے خیرپور ڈویژن کی ۲۶ لاکھ ایکڑ اراضی سیراب ہوگی۔ دریائے سندھ پر مغربی پاکستان میں یہ پانچواں اور سب سے بڑا بیراج ہوگا جس کے ۶۵ پشتے ہوں گے۔ اور ہر دروازے میں خودکار آہنی دروازہ ہوگا جو بند ہو کر پانی کو روک سکے گا۔ اور اٹھ کر پانی کو راستہ دے سکے گا۔ فولاد کے یہ دروازے جن کی درآمد پر کروڑوں روپیہ صرف ہوتا تھا کراچی شپ یارڈ ورکشاپ میں تیار ہو رہے ہیں۔ جہاں تیاری کے بعد ان کا عکس ریز X RAY بھی کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ان کا معیار غیر ملکی فولادی دروازوں سے کہیں بلند ہے اور یہ صدیوں تک کام دے سکیں گے۔ جس وقت ہم بیراج پر پہنچے تو ۶۵ میں سے ۴۶ پشتے تعمیر ہو چکے تھے ۔ اور ایک میں فولادی دروازہ بھی لگایا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دائیں کنارے کی دونوں نہروں کے ہیڈورکس اور کنٹرول سسٹم پر کام پورے زور شور سے جاری تھا۔ ان دونوں مقامات پر بھاری مشینوں کی ضربات سے فولاد کی چادریں زمین میں نصب کی جا رہی تھیں۔ فلک بوس کرینیں بہت دور سے کنکریٹ کا مسالہ سینکڑوں ٹن کے حساب سے لا لا کر ڈال رہی تھیں اور بجلی کے ذریعہ پمپ کی راہ سے گھلا ہوا سیمنٹ دور دور سے یہاں پہنچ رہا تھا۔

عزم و تعمیراتی کام کا عجیب منظر سامنے تھا۔ اس عمل میں وقت کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور ذرا سی تاخیر خرابی کا باعث ہو سکتی ہے۔ چنانچہ آدمی پوری سمجھداری سے اور مشینیں بڑی برق رفتاری سے کام کر رہی تھیں۔ جس جگہ بیراج تعمیر ہو رہا ہے وہاں دریائے سندھ بہتا تھا۔ یہ دریا اکثر بپھر جاتا ہے اور یکدم رُخ بدل دیتا ہے مگر اب دریا کو بائیں کنارے پر ڈیڑھ میل دور دھکیل دیا گیا ہے تاکہ یہ ۴۴۴۵ فٹ لمبے زیر تعمیر بیراج پر حملہ نہ کر سکے۔ دریائے سندھ اور زیر تعمیر بیراج کے درمیان ملک کا سب سے بڑا حفاظتی بند ہے۔ بیراج کی تکمیل کے بعد اس سرکش دریا کو پاکستانی انجینیر سدھائے ہوئے جانور کی طرح پکڑ کر لائیں گے اور بیراج کے اندر سے اور اس کی تین نہروں میں اس کی رفتار اور بہاؤ کو اپنے قبضے میں لے آئیں گے۔ دریائے سندھ کے رُخ بدلنے کی تاریخ بڑی ہولناک اور دلچسپ ہے مگر اس پانچویں بیراج کی تکمیل کے بعد مغربی پاکستان میں کالا باغ سے (جہاں یہ پاکستان میں داخل ہوتا ہے) کیٹی بندر تک (جہاں یہ سمندر میں جا گرتا ہے) اس دریا کی تندی دائرۂ اختیار و ضبط میں آ جائے گی اور تباہ کاریاں ختم ہو جائیں گی۔

۳۷ کروڑ روپیہ کی لاگت سے تیار ہونے والے آبپاشی کے اس منصوبے کا خوب اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد ہم لوگ سکھر واپس آ گئے۔ جہاں ہم ثقافتی اور قومی سرگرمیوں کے مرکز، المہران میں داخل ہوئے یہاں گورنر مغربی پاکستان نے "سوال و جواب" کی ایک نہایت مفید و دلچسپ صحبت میں شرکت فرما کر ہمیں بہت سے مسائل کی آگہی بخشی۔ دراصل اس طرح کے جمہوری اجتماعوں کی ابتدا فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے پاک جمہوریت نامی اسپیشل ٹرین کے سفر سے کی تھی اور عوام کو بالکل آزادانہ سوالات کرنے کی اور جوابات حاصل کرنے کی اجازت دی تھی۔ یہ ان کی ہر دلعزیزی اور عوام دوستی کی عکاس ہے اور اس طرح عوام سے قریب تر آ کر ان کے مسائل اور مشکلات کو براہ راست سمجھنے کی ایسی مبارک کوشش تھی کہ جس نے بہت جلد ملک میں ایک نئی فضائے اعتماد پیدا کر دی۔

"المہران" اہلِ سکھر کی ترقی کا نشان ہے۔ جہاں ایک وسیع میدان کے گرد پختہ احاطہ ہے۔ خوبصورت مستقل اسٹیج بھی ہے۔ بیٹھوں، فنکاروں یا خطیبوں کے لئے تیاری کے کمرے وغیرہ بھی بنائے گئے ہیں۔ "مہران" سندھی میں دریائے سندھ کو کہتے ہیں۔ یہ نام دراصل عربوں نے دیا تھا۔

ان اجتماعوں میں عوام کے نمائندے یعنی بنیادی جمہوریتوں کے اراکین، سرکاری افسران و ملازمین اور دیہات کے ہزاروں آدمی شریک ہوتے رہے۔ گورنر مغربی پاکستان، ملک امیر محمد خان، نے سب سوالوں کا جواب بہت برجستگی، سلاست اور خلوص نیت کے ساتھ دیا جس سے عوام کو اپنی مشکلات کے پیش کرنے اور ان کے حل کی فوری تدابیر سامنے آ گئیں۔ چونکہ اعلیٰ حکام گورنر کے ساتھ ہوتے ہیں اس لئے ان کو فوری احکام اور تعمیل امور کی ہدایات ملتی رہیں۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ ہمارے عوام اور کم پڑھے لکھے لوگ اور اہلِ دیہات دارالحکومت تک طول طویل سفر کرنے یا خط و کتابت کرنے کی زحمت سے بچ گئے۔ ان اجتماعوں کی افادیت مسلّم ہے۔ اہلِ ملک سے براہِ راست رابطہ پیدا کرنے اور ان کی مشکلات کو حل کرنے کے لئے مخلصانہ اور عملی تدابیر سوچنا اور اکثر اوقات بر وقت فیصلے کرنا اس دور کی ایسی برکت ہے جسے ہر جگہ سراہا جا رہا ہے ٭

سندھی ظروف پر نقوش

ابوالجلال ندوی

گزشتہ پانچ چھ برس کے دوران "ماہ نو" میں مولانا ابوالجلال ندوی کے متعدد مضامین شائع ہوئے ہیں جن میں قدیم عراق اور سندھ کے نسلی، تہذیبی اور ثقافتی اشتراک کے قرائن پیش کئے گئے ہیں۔ یہ تمام اپنی نوعیت کے اولیں مضامین تھے۔ حال ہی میں شکاگو یونیورسٹی کے ایک امریکی فاضل، پروفیسر جاں بیری پاکستان آئے اور انہوں نے بھی سندھ اور سمیریا کے متعلق ایسے ہی خیالات ظاہر کئے۔ کیا عجب ہے کہ مشرق و مغرب کے محققین کی یہ کاوشیں نوع انسان کے اس دورِ کہن اور اس کے ساتھ سندھی مہروں کی زبان اور رسم الخط کو اجاگر کرنے میں مدد دیں۔ بہر حال اس سلسلہ میں پیشقدمی کا شرف ایک پاکستانی محقق ہی کو حاصل رہے گا جس کے نتائج تحقیق "ماہِ نو" کے ذریعہ سے پیش کئے جاتے رہے ہیں۔ یہ مضمون بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ باجازتِ مصنف مضمون میں اختصار سے شاید عبارت کسی قدر بدل گئی ہو۔ (مدیر)

قبل ازیں ہم "ماہ نو" کی اشاعت بابت جون ۱۹۶۰ء میں اس زبان بے زباں کو سمجھنے کی کوشش کر چکے ہیں جو بلوچی ظروف پر نقوش کی شکل میں ثبت ہے۔ ایسے ہی نقوش یا تحریریں اُن قدیم سندھی ظروف پر بھی پائی جاتی ہیں جو ہڑپا، موئن جودڑو اور چنہودڑو میں دستیاب ہوئے ہیں۔ چونکہ سندھی ظرف اور ظرف پارے ہوں یا سندھی مہریں، ان سب پر کچھ نقوش یا تحریریں پائی جاتی ہیں۔ اسلئے ہم زبانِ تحریر سے واقف ہوں یا ناواقف، بعض الفاظ کے مطالب یا ان مطالب کی نوعیت سے ہم ان ظروف اور مہروں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس طرح زبانِ تحریر کے تعین میں جو دشواریاں حائل ہیں وہ کچھ کم ہو سکتی ہیں۔

موئن جودڑو میں کچھ ایسے ظروف اور ظرف پارے بھی ملے ہیں جن پر ابھی رسم خط کی تحریریں ہیں۔ ان سے فی الحال ہمارا سروکار نہیں میکے نے اپنی تصنیف "FURTHER EXCAVATIONS AT MOHENJADARO" کی پلیٹ نمبر LXXXI پر اس عہد کے سات ظروف کی تحریریں نقل کی ہیں جن میں سے چھ کو آنجہانی ایل۔ جی مجمدار پڑھ چکے ہیں۔ اور انہوں نے ان کی قرأتیں اور ترجمے بھی درج کئے ہیں۔ ظروف کو تختۂ تحریر کے طور پر استعمال کرنے کا رواج عہد قدیم سے بودھی زمانہ تک پایا جاتا ہے۔ ان بودھی ظروف کی قرأتوں پر بھی ایک نظر ڈال لینا مناسب ہے کیونکہ اس سے ان الفاظ کی نوعیت کا اندازہ ہو سکے گا جو قدیم سندھی ظروف پر تحریر ہیں۔ مثلاً

33≷ hn	۲۷۴۰	۱۔ ایس ڈی (سندھ)
33≷hm))U	۲۷۹۱	۲۔ ایس ڈی
3ϸΣhn 4 hf n-->	۲۸۵۶	۳۔ ایس ڈی

پہلے ظرف پر ایک، دوسرے پر دو اور تیسرے پر تین الفاظ تحریر ہیں۔ پہلے نوشتے کو مجمدار نے یوں پڑھا ہے:

PRAWJITASA = ... OF THE ASCETIC

پہلے ظرف کا آخری نقش n تیسری تحریر کے پانچویں نقش n کی بدلی ہوئی صورت ہی ہے۔ n کو رومن S سے مشابہت ہے۔ "پری ہسٹارک انڈیا" صفحہ ۱۰۳ پر کلی کے ایک ظرف کے نقوش دیکھیے۔ اور پھر بلوچی ظروف کے نقوش "ماہ نو" بابت جون ۱۹۶۰ء میں ملاحظہ فرمائیے۔ S قدیم سندھی رسم خط کا ایک نقش ہے۔ ہنری فیلڈ کی کتاب "AN ANTHROPOLOGICAL RECONNAISSANCE IN WEST PAKISTAN 1955" اور کے صفحہ ۲۷۵ پر بہاولپور کے سماتِ اِبل یعنی اونٹوں پر داغے ہوئے نقوش میں سے نقش ۳۸ کو دیکھیے۔ یہ نقش وادیٔ سندھ کی وہ میراث ہے جو آج تک مستعمل ہے اگرچہ اسکے استعمال کرنے والے نہیں جانتے کہ یہ کس مطلب یا آواز کی علامت ہے۔ چونکہ n کو بعض سکوں پر انگریزی لفظ of کا مترادف پایا گیا اور سنسکرت میں sya پالی میں sa حرف اضافت ہے، اسلئے اس کو S کی آواز دی گئی۔ ظروف نمبر ۱، ۲ اور ۳ کے پہلے

چار نقوش کو "یہَ وَجیتا" پڑھ کر اس کا ترجمہ THE ASCETIC یعنی سنیاسی، بیاگی یا جوگی کیا گیا ہے۔ ان ظروف کی بناء پر ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ عہد قدیم کے ظروف پر ان کے مالکوں کے القاب، خطابات یا پدویاں مکتوب ہو سکتی ہیں۔

ظرف نمبر ۲ کا آخری لفظ لا((ہے جس کا حرف اوّل (پہلے لفظ کے آخری حرف ∩ سے ملحق ہو گیا ہے۔ براہمی نقوش کو حل کرنے والوں نے ان کی جو آوازیں تحریر کی ہیں ان کے مطابق لا((کا رومن حرفِ بدل TTP ہے۔ چونکہ یہ رسم خط جس زبان کو قلمبند کرتا ہے اس کے مطابق لا((ایک بے معنی لفظ ہے، اسلئے فاضل قاری نے اس لفظ کی قرأت چھوڑ دی ہے۔ اس کا تلفظ جو کچھ بھی ہو بہرحال ...... سنیاسی کا لا((" ایک ظرف پر مکتوب ہے۔ اسلئے صریحاً یہ لفظ اس ظرف کا نام ہے جس پر یہ تحریر منقوش ہے۔ لا((کے دونوں نقوش قدیم سندھی کے نقوش ہیں۔ لا کے لئے دیکھئے مادھو سروپ وٹس کی شائع کردہ ہڑپا کی مہر نمبر ۱۷ اور ((کے لئے مہر نمبر ۱۶۹ کا پہلا نقش۔

تیسرے ظرف کی تحریر کو "یہَ وجیتا سنا متکا سااِیا" پڑھ کر یوں ترجمہ کیا گیا: "سنیاسی مکتا کا کے پینے کا برتن"، > کو ⊂ کی بدلی ہوئی صورت خیال کر کے >-= کو IMA پڑھا گیا۔ > اور '' قدیم سندھی رسم خط کے نقوش ہیں۔ ممکن ہے لا((اور > '' قدیم سندھی الفاظ ہوں جو کوشانی دور تک کی سندھی تحریروں میں مستقل رہے ہوں۔

اب ان سات ظروف میں سے تین اور کو لیجئے:۔

۴۔ ایس ڈی ۲۷۳۷ : [illegible]

۵۔ ایس ڈی ۲۹۵۱ : [illegible]

۶۔ ایس ڈی ۲۷۳۸ : [illegible]

نمبر ۴ اور ۵ کے پہلے تین حرفوں کو بھداتا پڑھ کر ترجمہ BHADATA یعنی تقدس مآب کیا گیا ہے۔ نمبر ۴ کے چوتھے اور پانچویں نقوش کو ملا کر بدھا پڑھا گیا ہے۔ نمبر ۵ کے چوتھے، پانچویں اور چھٹے نقوش کے رومن حروفِ بدل SH. R. K ہیں۔ لیکن انہیں نہ معلوم کیوں (SGHA) RAKSHA پڑھا گیا ہے۔ اسی طرح خبر نہیں کس وجہ سے نمبر ۴ کے آخری لفظ (ا ٹا) کو RAAKSHITASA پڑھا گیا ہے۔ نمبر ۵ کے تیسرے، چوتھے اور پانچویں نقش کو رکشتا پڑھا گیا ہے۔ غالباً ع (ش) ہی کو ع (کش) خیال کیا گیا ہے۔ بہرحال منقول قرأت اور ترجمہ حسب ذیل ہیں:۔

نمبر ۴۔ بھداتا بدھا رکشتا سا = تقدس مآب بدھا رکشتا کا۔

نمبر ۵۔ بھداتا (ساگھا) رکشا سا اَیا کا ر(کی) = تقدس مآب سگھا رکشتا کے پینے کا برتن۔

نمبر ۶۔ تاسا (ساگھا) رکشتا ساا دکارا کی — یہ ہے سگھا رکشتا کے پینے کا پیالہ۔

ان تحریروں سے معلوم ہوا کہ ظروف پر حسب ذیل نوعیت کے الفاظ ملیں گے:۔

(۱) مالک یا صانع کا نام بلظرف

(۲) ظرف کا نام

(۳) ظرف کا مصرف

(۴) اس چیز کا نام جس کے لئے ظرف مخصوص تھا۔

قدیم تر عہد کے ظروف پر بھی اسی نوعیت کے الفاظ ہو سکتے ہیں۔ اگر قدیم ظروف پر لکھے ہوئے الفاظ ہم کو ان تحریروں میں ملیں جن کے نیچے کسی جانور کو مع ظرف پیش کیا گیا ہے تو ہم وثوق سے یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ وہ تحریریں یقیناً اس ظرف سے تعلق رکھتی ہیں۔

ساتواں ظرف نمبر ایس ڈی ۳۰۸۸ ہے جس پر تین نقوش ہیں۔ ان میں سے ایک تو براہمی خط میں ملتا ہے اور باقی دو نہیں ملتے۔ اسلئے مجمودار اس کی تحریر کو نہ سمجھ سکے۔ اور کہہ دیا کہ غالباً یہ بے معنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تحریر کے تینوں نقوش قدیم تر سندھی مہروں کے نقوش ہیں۔ اگر یہ ظرف قدیم نہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ سندھ کے کمہار بودھی زمانے تک قدیم سندھی رسم خط کے چند نقوش کو استعمال کرتے تھے۔

چنانچہ ان تینوں نقوش کی نظیریں سندھی مہروں پر دیکھئے۔

(۱) ⅄ = X دیکھئے میکے کی شائع کردہ موئن جو دڑو کی مہر نمبر ۳۵۲ کی دوسری سطر کا تیسرا نقش

(۲) ⋏ = ⋏ دیکھئے میکے نمبر ۲۲۹ IIII ⋏

(۳) ꝺ = D دیکھئے میکے نمبر ۱۴۸ ⋀ D E

نقش اول صوتی رمز نہیں بلکہ معنوی رمز یعنی آئیڈیو گراف ہے۔ ☐ پیالہ یا جام کی شکل ہے۔ مراد پیالہ یا پینے کا برتن۔ اس کے لئے جو سندھی لفظ لودھی زمانہ میں مستعمل تھا وہ نمبر ۹ کے ذریعہ ہم کو معلوم ہو چکا ہے۔ (ل - =) یعنی اِدْ۔ جس دو مکی چیزوں کے ساتھ یہ تحریلی ہے اس کے لوگ اس معنوی رمز X کو جن الفاظ کی صورت میں پڑھتے ہوں گے ان میں سے ایک اِدْ ہے۔ اس سے ملتا جلتا ایک عربی لفظ اِداوۃ ہے جس کا مطلب بتایا گیا ہے: اناء صغیر من جلد یعنی ایک چھوٹا برتن چمڑے کا (منجد) یعنی ننھی چھاگل۔ صاحب صراح نے اس کا مطلب مطہرہ (وضو کا برتن) اور آبدستان (ہاتھ دھونے کا برتن) بتایا ہے۔ X کو ہم اِدْ یا اداوۃ پڑھ سکتے ہیں کیونکہ یہ ایک معنوی رمز ہے۔ اسے کسی ایسے لفظ کی شکل میں بھی پڑھا جا سکتا ہے جو اداوۃ (ظرفِ آب) کا مطلب ادا کرے۔

دوسرا نقش بعد میں متغیر ہو کر ⋔، ⋔، ⋔ ہو گیا۔ پہلا اور آخری نقش سندھی مہروں پر بھی پایا جاتا ہے۔ یہ تینوں نقوش مسند کے رسم خط میں سعفص کا حرف اول ہیں جس کا نام سِن یا سین ہے۔ چونکہ مسند بتوسط اسناد کے سَنَد سے مشتق ہے اسلئے بدلیل ⋔ کے ہم ⋏ کو س یا سن پڑھ سکتے ہیں۔

تیسرا نقش رومن میں ابجد کا چوتھا حرف اور براہمی رسم خط کا دھ ہے۔ اسلئے ہم ⋏ D کو سد، سدھ، یا سندھ پڑھ سکتے ہیں۔ عربی کا نون ساکن جب د سے پہلے ہو تو عبرانی اور سماتی عربی میں نون ساقط ہو کر دال کو مشدد کر دیتا ہے۔ ہند کا ذکر سفر استر (انجیل) میں ہدّو کے نام سے آیا ہے۔ اسی کا سندھ کا نام عبرانی اور سماتی میں سِدّ ہونا چاہئے۔ ہیراس نے ⊗ کو سِد پڑھ کر سندھ کا مترادف قرار دیا ہے۔ اس کی اس قرأت کی صحت مشکوک ہے لیکن اس سے یہ معلوم ہوا کہ سندھ کا دراوڑی تلفظ سِد ہے۔ اسلئے ہم ایس ڈی ۸۸ - ۳ کو یوں پڑھ سکتے ہیں:-

D ⋏	⅄
سد	اداوۃ
سندھ کا	پیالہ

اگر یہ قرأت صحیح ہے (اور مجھے اس کی صحت میں شبہ نہیں) تو اس کے معنی یہ ہیں کہ قدمائے سندھ اپنی مصنوعات پر مقام صنعت کے نام بھی لکھا کرتے تھے۔ ان نقوش کو بے معنی قرار دینے سے کوئی نہ کوئی توجیہہ بہرحال بہتر ہے۔ اور پھر نقوش اور سندھی مہروں کے مقابلے سے یہ تو قطعاً ثابت ہو گیا ہے کہ ایس ڈی ۸۸ - ۳ اگرچہ بعد کے دور کا ظرف ہے لیکن اس کا نوشتہ زمانۂ ماقبل تاریخ کے سندھی رسم خط کا نوشتہ ہے۔ سندھ کے کمہار سمجھ بوجھ کر یا نقوش کے معنی کو سمجھے بغیر اپنی مصنوعات پر قدیم موروثی تحریریں اُسی طرح لکھا کرتے تھے جس طرح عرب اور بہاولپور کے شتربان نقوش کے رموز کو جانے بغیر اپنے اونٹوں پر قدیم سمات ♀، O، ى، ρ، Q، m، T، J، +، ⊟، ⊞، п، Y، 6، S، 8، 8، ш وغیرہ داغتے رہتے ہیں۔ عربی اونٹوں کے سمات ہو بہو یا معمولی فرق کے ساتھ سندھی مہروں پر بکھرے ہوئے ملیں گے۔ یہ نقوش مختلف ابجدوں کے حروف بھی ہیں لیکن ان کا اونٹوں پر مکتوب ہونا ظاہر کرتا ہے کہ یہ کبھی معانی و مطالب کے رموز بھی تھے۔ ان نقوش کا سندھی مہروں اور بہاولپور کے اونٹوں پر پایا جانا ظاہر کرتا ہے کہ قدیم رسم خط اس دیار میں مدتوں رائج رہا۔ ان نقوش کے معانی اور تلفظ تو دماغوں سے محو ہو گئے لیکن ان کی ظاہری صورتیں لوگوں نے قدیم تبرک کے طور پر محفوظ رکھی ہیں۔ لہٰذا ⅄ ⋏ D کو جو لودھی عہد کے ظروف پر مکتوب ہیں، عہد ماقبل تاریخ کے رسم خط کی تحریر باور کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ بہرحال ایسا خیال کرنے کے کافی وجوہ موجود ہیں۔

بعض سندھی ظروف پر بظاہر تحریریں نہیں بلکہ اشیاء کی شکلیں ہیں جو ممکن ہے آرائشی بھی ہوں۔ ایسے ظروف کو ہم مصور ظروف کہیں گے۔

بعض ظروف کی تصویروں سے ہمیں سندھی مہروں کے الفاظ کے معانی سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

۱ ۲ ۳ ۴

2 N × (III-L   ڈِنس (III × 18 S   ڈِنس (III × ۴۸

مارشل ۲ L × × × I × L   ڈِنس (II ۱۲   ڈِنس (III ۳۲

ظرف پارہ نمبر ۱ اور ۴ پر پتے کی صورت ہے۔ اس کو محض آرائشی خیال کرنا درست نہ ہوگا۔ کیونکہ مہروں کے نوشتوں میں بھی اسی شکل سے کام لیا گیا ہے۔ ایسے نوشتوں کے نیچے چوپایہ کی صورت بھی ہے۔ لہٰذا ہم ان نوشتوں کو جانور کی خورش سے متعلق تحریریں خیال کریں تو بیجا نہ ہوگا۔ ممکن ہے ظرف پارہ ۱، ایسے ظرف کا ٹکڑا ہو جو ساگ پات کے استعمال کے لئے مخصوص ہو۔ ہیراس، جس کا گمان یہ ہے کہ مہروں پہ دراوڑی الفاظ مکتوب ہیں، نے اسے پیپل کا پتہ خیال کیا ہے اور اس کو آرامرم پڑھا ہے۔ اس نقش کو پان بھی خیال کیا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے اس سے کسی خاص درخت کا پتہ نہیں بلکہ صرف پتہ اور ساگ مراد ہو۔ پیپل کا پتہ انسانی خورش میں داخل نہیں۔ چونکہ یہ نقش انسانی خورش کے لئے مخصوص برتن کے ٹکڑے پر ملا ہے۔ اسلئے اسے آرامرم پڑھنا غلط ہے۔ جس ظرف پر یہ مکتوب تھا اغلباً ساگ پات اور ترکاری کا برتن ہوگا۔

ظرف ۲ کی صورت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پیالی ہے۔ نمبر ۳ بھی پیالی ہے۔ ان دونوں میں کوئی چیز پی جاتی تھی۔ پہلے پر مکتوب ہے۔ مصری ہیروغلافی میں یہ پانی کی صورت ہے اور مصری پڑھنے والوں نے اسے کبھی نو نو پڑھا ہے اور کبھی مو۔ اس رمز کو جنوبی عرب کی سبائی زبان میں مو اور متداول عربی میں ماء پڑھا جا سکتا ہے۔ یہ پانی پینے کا برتن ہے۔ اس نقش کو سندھ کے قدیم باشندے جس لفظ کی صورت میں بھی پڑھتے ہوں، اس کا ایک تلفظ خود اس ظرف کا نام بھی ہوگا۔ بودھی یا کوشانی عہد کی تحریر نمبر ۳ سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اس زمانے کے سندھی پانی پینے کے اس برتن کو، جسے ہم آبخورہ کہتے ہیں = اِنا کہتے تھے۔ یہ نام عربی ماء سے ملتا جلتا ہے۔ سے ملتے جلتے نقش سے سندھی مہروں میں بھی کام لیا گیا ہے۔ ظرف ۲ اگر واقعی اِما کہلاتا تھا تو اور جیسے نقوش کو ہم کلمن کے حرف سوم کی صورت میں پڑھ سکتے ہیں بشرطیکہ یہ قرأت نوشتوں کو بامعنی قرار دے سکے۔

ظرف نمبر ۳ کے اوپری دوہرے خط پر چوپایوں کی صورتیں نظر آتی ہیں۔ اس کے نیچے اس شکل کی تکرار ہے۔ میکے نے جھوکڑو کی مہروں کے نقوش کی اپنی چنہودڑو سے متعلق کتاب کی پلیٹ ۱، نمبر ۲۱ پر مکتوب دکھایا ہے۔ اس تحریر کے نیچے یک سنگھے بیل کی تصویر ہے جس کے سامنے رکھا ہوا ہے۔ ان میں سے اوپر کا نقش آپ کو مارشل VIII × ۱۵۸ اور نیچے کا ہنٹر M ۲۵۸ میں جانور کے سامنے ملے گا۔ یہ نقش درحقیقت دو نقشوں کا مجموعہ ہے: (۱) یعنی چارہ کی ٹوکری اور (۲) یعنی پانی کی ناند۔ چن (چنہودڑو) ۱، ۲۱ میں کی حقیقت بتائی گئی ہے کہ یہ چارہ کی ٹوکری ہے جس کا مفہوم ادا کرنے کے لئے نقش اور ۷ بنا۔ ظرف ۳ چوپایہ کا پینے کا برتن ہے۔ یہ نقش (ما) کا عکس اور سبائی رسم خط میں شرب (پینا) شربہ (پینے کی) چیز کا حرف اوّل ہے۔ ظرف ۲ محض پینے اور ظرف ۳

دودھ پینے کا برتن ہے۔

ظرف ۵ پر چوپایہ کی تصویر ہے اور ظرف کی صورت اُسے تِپھری (دودھ دہنے کا برتن) ظاہر کرتی ہے۔ ممکن ہے یہ حیوانات سے حاصل کی جانے والی دوسری خورش یعنی گوشت پکانے کا برتن بھی ہو۔

ظرف ۶ کا نقش دراصل کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ ہمارا تختۂ نقوش اس حقیقت کو ظاہر کر دے گا۔ یہ ایک شخص کی تصویر ہے جو اپنے کندھے پر ایک لٹھ رکھے ہوئے ہے جس کے دونوں سروں پر رسیاں بندھی ہوئی ہیں اور ان رسیوں سے دو گھڑے بندھے ہیں۔ ان گھڑوں میں کیا ہے؟ دانہ یا پانی۔ اس کا جواب میکے ۵،۳ کا مہر نویس یوں دیتا ہے؛ اس کی تشریح کے لئے میکے ۱۱) ۱۲×۲ دیکھئے جس پر کے بائیں جانب لکھا ہے۔ والی چیز ہے۔ جب لاحقہ ہوتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے: "والی چیز" چنانچہ کے معنی ہیں "مچھلی والی چیز"۔ اس طرح کے معنی ہیں پانی لادنے والا۔ یہ بیل کی تصویر پر مکتوب ہے۔ بیل پر پانی مشکیں لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچایا جاتا تھا۔ الفاظ و اصوات کا رمز نہیں بلکہ مطلب و مراد کا رمز ہے۔ پانی اور پانی والے کا رمز ہے۔ ظرف ۶ پانی رکھنے کا ظرف ہوگا۔

ظرف ۶ پر مکتوب ہے۔ مارشل ۹۳ پر چوپایہ کے سامنے کے بجائے اس نقش کو اور اس کے نیچے ایک اور رمز مراد رکھا گیا ہے۔ سندھی مہروں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ اسم ظرف ہے۔ غالباً یہ نقش ۱۷ اور کا مجموعہ ہے۔ مچھلی کی شکل سے مہروں میں اس کثرت سے اور اس طرح کام لیا گیا ہے کہ اس کو رمز معنی ہی نہیں بلکہ رمز صوت بھی خیال کرنا ضروری ہے۔ سبائی مسند کی ع ہے اور عربی نام ت کا نصف ہونے کی وجہ سے نون (مچھلی) ہے۔ کو ہم سَطن پڑھ سکتے ہیں۔ عرب پانی کی چھاگل کو، جو پرانی ہو گئی ہو سَطن کہتے تھے۔ سندھی ہر ظرف کو کہتے تھے۔ میکے ۱۱ L۷ ۳۵ پر مکتوب ہے۔ یہ نقش دو مہروں پر بھی ہے مگر میں اس نقش کی حقیقت ابھی تک متعین نہیں کر سکا ہوں۔

وٹس ۱۱) ۱۶ : یہ نقش اس ظرف پارہ کے علاوہ کسی اور جگہ نظر سے نہیں گذرا لیکن اور جدا جدا ملتے ہیں۔ اگر یہ نقش ان دونوں کا مرکب ہے تو ان نقوش کی حقیقتیں معلوم کر لینے کے بعد اس کا مطلب سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر یہ ایک شخص ہے جو کا پھل لئے ہوئے ہے تو یہ ظرف پھل پھلاری اور میوہ کے استعمال کے لئے تھا۔

۸ - وٹس ۱۱) ۳۹

۹ - میکے ۱۱۱×L ۸ — دیکھئے ۱۵

۱۰ - میکے ۱۱ L۷ ۲۲ — دوسرے لفظ کے لئے دیکھئے میکے ۱۵۲ نقوش

ظرف ۸ کی تحریر کے نقش اول اور کا مجموعہ ہے جو نقش کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ اور کے معنی ہیں والی چیز۔ کا مطلب سمجھنے کے لئے یہ مہریں دیکھئے:۔

میکے ۱) ۱	ان تینوں مہروں کا نقش مشترک دراصل ایک میوہ دار درخت ہے۔ میکے ۱۰۸، ۳۴۲ پر درخت بار ور کے پاس ہاتھ میں عصا لئے ہوئے جو آدمی کھڑا ہے اس سے پوچھئے "اے موسیٰ! یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟"
میکے ۱۰۸	
میکے ۳۴۲	

جواب ملے گا "یہ ہے میرا عصا۔ اس پر میں ٹیک لیتا ہوں، اپنی بکری کے لئے پتیاں توڑتا ہوں اور میرے لئے اس میں اور بھی فائدے ہیں"۔ میکے کا آدمی ہاتھوں سے چارہ توڑ کر اپنے چوپایہ کے سامنے کی ٹوکری میں ڈال رہا ہے۔ میکے ۱۰۸، ۳۴۲ کا صاحب عصا پتے یا پھل توڑنے گا۔ کا مطلب چرواہا ہے، چارہ توڑنے والا، پھل توڑنے والا۔ وہ چیز ہے جسے درختوں سے توڑا گیا ہے۔
ظرف پارہ ۹ کے کاتب نے ۸ کو بتایا ہے۔ جب ہم اپنا تختۂ نقوش پیش کریں گے تو ۸ کے معنی معلوم ہو جائیں گے۔

ں، △، ◇، [نشان]، [نشان] چونکہ [نشان] کی صورت بدلتے بدلتے ناقابلِ فہم ہو گئی، اسلئے اس ∧ رمز کے مدلول کی توضیح ظرف نویس نے رمز [نشان] کے ذریعہ کی ہے۔ اس ظرف کا مصرف وہی تھا جو نمبر ا کا تھا۔

ظرف ۱۰ کا تیسرا نقش سبائی سند کے حرف ⊳ دال سے ملتا ہے۔ اسلئے یہ تحریر رمز معنی اور رمز لفظ دونوں کا مجموعہ ہے۔ [نشان] ⊳ کا مطلب بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ [نشان] ⊳ [نشان] مالک یا صانع کا نام اور لقب ہو۔

کئی ظروف بے تصویر ہیں۔ میرے خیال میں سندھی مہروں پر تین طرح کی تحریریں اور نقوش ہیں:—

۱۔ وہ تحریریں جن کے مطالب مختلف طریقوں سے خود مہر نویسوں نے سمجھا دئے ہیں۔

۲۔ وہ جن کے مطالب صرف نقوش کی صورتوں پر غور کرنے سے معلوم ہو جاتے ہیں۔

۳۔ وہ تحریریں جن کو تمام نقوش کی تقویم کے بغیر اور زبانِ تحریر معلوم کرنے سے پہلے قطعاً نہ پڑھا جا سکتا تھا اور نہ سمجھا جا سکتا ہے۔

ظروف کی تحریریں بھی انہی تین اقسام کی ہیں۔ سب سے پہلے آخری قسم کے نقوش کو لیجئے جن میں سے بعض مہروں میں بھی تکرار آتے ہیں:—

۱۔ میکے LXII ۱۱ ‏‏— [نشان] — یہ نقش صرف اسی ظرف پر ہے اور غالباً Ψ کی بدلی ہوئی صورت ہے

۲۔ وتس (۱۱) ۱۴ — ⋈ — دیکھئے مارشل ۔ جانور کی تصویر جانور کے منہ کے نیچے [نشان] ⋈

۳۔ چن XXVIII — ⋈ — دیکھئے میکے ۲۶۸ جانور مع ظرف ۔ ⊛ [نشان] ⋈ [نشان]

۴۔ وتس (۱۱۱) ۸ — [نشان] — میکے ۱۳ ایک سینگے بیل مع [نشان] کی تصویر کے اوپر [نشان]

۵۔ وتس (۱۱) ۳ — ⋈ — میکے ۷۷ بیل مع ظرف ⋈

۶۔ وتس (۱۱۱) ۴۴ — VVV [نشان]

۷۔ وتس (۱۱۱) ۴۶ — VVV [نشان]

۸۔ وتس (۱۱) ۲۳ — [نشان] ∧∧∧

۹۔ وتس (۱۱) ۲۶ — [نشان] X X

۱۰۔ وتس (۱۱) ۱۱ — [نشان]

۱۱۔ وتس (۱۱) ۵۶ — [نشان]

۱۲۔ مارشل ۵۶۰ — [نشان] لفظ [نشان] مختلف الفاظ کے ساتھ بہتیری مہروں پر ملے گا۔

۱۳۔ میکے (۱۱) ۱۳ (صندوق) [نشان]

۱۴۔ وتس (۱۱) ۲۷ — [نشان]

۱۵۔ وتس (۱۱) ۴۳ و ۵۱ — [نشان]

۱۶۔ وتس (۱۱) ۳۳ — (۱۱۱

۱۷۔ وتس LI ۱۷ — [نشان]

۱۸۔ وتس (۱۱) ۱۸ — [نشان]

۱۹۔ وتس (۱۱۱) ۲۱ — [نشان]

ان میں سے [نشان]، [نشان]، [نشان]، [نشان] اور | کے علاوہ تمام نقوش مغربی ایشیا کے ابجدی نقوش میں ہو بہو یا کسی قدر فرق کے ساتھ پا[ئے جاتے ہیں]۔ ضروری نہیں کہ یہ نقوش ابجدی ہوں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ یہ سب رموزِ اصوات ہیں خواہ یہ مکمل لفظ کو قلمبند کرتے ہوں یا شطرِ لفظ کو یا

آوازوں کو۔

دوسری قسم کے نوشتوں کے بہت سے نقوش رموزِ معانی ہیں۔ اور تمام مہروں کے نقوش کا مقابلہ کرنے سے ہر نقش کی معنوی قیمت، اور ممکن ہے کہ صوتی قیمت بھی معلوم ہو جائے۔

۱- وتس III) ۔ ظرف پارہ شکستہ نقش ناقص

۲- چین XXXIV کسی اور مہر پر نہیں

۳- وتس III) پہلا اور تیسرا نقش صرف اس ظرف پارہ پر ملا ہے۔

۲۲- مارشل) X

۲۳- وتس III)

۲۵- چین XXXVIII

۲۶- چین LXIX

۲۷- وتس III) ۔

۲۸- میکے LXIII

۲۹- چین XXXIX و XXXIV بکثرت عام مہروں پر

۳۰- میکے LVII ۴۳

۳۱- میکے LII ۲۸

پہلی قسم کے نوشتوں کے لئے زبانِ تحریر کا جاننا ضروری نہیں۔ خود نقوش کی صورتوں اور مہروں کے مقابلہ سے ان کا مطلب ظاہر ہو جاتا ہے۔

۳۲- وتس II) ۔ مہروں پر دیگر نقوش کے ساتھ

۳۳- چین XXXIII) ۔

۳۴- مارشل ۵۵۸ کئی مہروں پر اور بھی

۳۵- وتس II) ۔ صرف اسی ظرف پر

۳۶- مارشل X) ۔ مارشل نے یوں فرض کیا ہے

دراصل چارہ کے ریزوں، غلہ کے دانوں یا پانی کے قطروں کے رموز ہیں۔

وتس II) ۔ غلہ رکھنے کا ظرف ہے۔

دراصل صورت ظرف ہے۔ وتس کی ایک بے منظر مہر ہے۔ اس پر مکتوب ہے۔ اس مہر نویس نے کو آبخورے کی شکل کے مطلب کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ بھرے ظرف کی صورت ہے اور یہی مطلب دیتا ہے۔

کے معنی ہیں چارہ، غلہ یا پانی جو ظرف کے اندر ہو۔ جب سابقہ ہوتا ہے تو لفظ کو اسم ظرف بنا دیتا ہے۔ لاحقہ ہونے کی صورت میں اسم مظروف بنا دیتا ہے اور کبھی "والی شے" کا مطلب دیتا ہے۔ بھی بھرا ہوا ظرف ہے۔

پہلے نقش کو ہم جان چکے ہیں۔ دوسرا نقش جام کی بدلی ہوئی صورت بھی ہو سکتا ہے اور یعنی پودے کی بدلی ہوئی صورت۔ کا ٹھیک مطلب سمجھنے کے لئے ذیل کے منظر کو دیکھئے۔

۱- میکے III) ۔ ۲- مارشل XVIII) ۔ ۳- مارشل XVIII) ۔ ۴- مارشل XVII) ۔

۵- مارشل (XVII) ۱۳ ۔ ۶- مارشل (XVII) ۱۲ ۔ ۷- مارشل (XVII) ۶ ۔ ۸- مارشل (XVII) ۱۶

ان مہروں کی دوسری جانب جو تحریریں ہیں ان کو یہاں نقل نہیں کیا گیا۔ ۱۱۱ ۲ گھڑے کے ٹکڑے پر مکتوب ہے اور جانور کے پیٹ پر بھی۔ اسلئے یہ اس چیز کا نام ہے جو کہ جانور کے پیٹ میں بھی ہو سکتی ہے اور گھڑے کے اندر بھی۔ ۱۱۱۱ ۲ کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ اسلئے اس سے اناج مراد ہے۔ یہ رمزِ معنی ہے۔ اس کو یہ مطلب دینے والے کسی لفظ کی صورت میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ اس رمزِ معنی کے ساتھ ان تصویروں پر حسبِ ذیل الفاظ بھی ملے ہیں:-

(ا) ۲۷ پر M ۱۱	ان الفاظ کے تمام نقوش مغربی ایشیا کے ابجدی حروف میں ملتے ہیں ۱۱ مصری ہیروغلافی میں کسرہ موقوف طویلہ کے بجائے ملے گا، ؛؛؛؛ و ؛؛؛؛ و ؛؛؛ د ؛؛؛ ؛؛ ، ؛؛ ، ؛ د ۱۔ بکثرت ایک ہی نقش کے سے پہلے ملیں گے۔ ؛؛؛؛ ۲ کا لفظ آٹھ لفظوں سے شروع ہوا بتدریج ایک ایک نقطہ گھٹتا گیا اور آخر میں ۲۰ ہو کے رہ گیا۔ چونکہ مصری میں ۱۱ براہمی میں ؛؛ اور = رومن حرف نے کے ہم صوت ہیں اسلئے M ۱۱ کے
(ب) ۵ پر (UH	
(ج) ۶ پر ۵ ♀ h	
(د) ۸ پر T F ٦	

پہلے نقش کو ہم پڑھ سکتے ہیں۔ ان چار لفظوں کو مغربی ایشیا کے حروف کی مدد سے یم، زبر، فصن اور طو پڑھا جا سکتا ہے۔ ان لفظوں کو عربی زبان ہی بامعنی بنا سکتی ہے۔ جیم یم۔ اس نے قصد کیا M ۱۱ ۲۱۱۱ = خورش کا خواہشمند زبر۔ یہ عربی بذر (دانہ پاشی کی)۔ عربی "یرکموط" کے بجائے عبرانی میں یکر عو ملے گا۔ خود عربی میں بھی اس قسم کے قلب و عکس کی نظیریں ملتی ہیں۔ مثلاً جذب اور جبذ (زبر ۲۱۱۱) کے معنی ہیں دانہ پاشی۔ دوسری طرف کی تحریر کو اس موقع پر سمجھانا مشکل ہے لیکن اس کا مطلب ہے "بیل کھیت کو سینچنے والا"۔

فصن کا لفظ عربی میں موجود نہیں لیکن عربی میں عموماً لفظ کے آخر میں ان بڑھایا جاتا ہے جیسے عمران، عثمان، قحطان، کیسان وغیرہ، جنوبی عرب کی سبائی تحریروں میں عمران، ثوبان اور رحمان جیسے لفظ عمرن، ثوبن، رحمن کی طرح لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ اس کو ہم خاصان پڑھ سکتے ہیں۔ ♀ (ص) اور h (س) متبادل حروف ہیں۔ اسلئے فاصان کو ہم فاسان بھی پڑھ سکتے ہیں۔ حرف زائد کو حذف کر کے پڑھئے فاس۔ عربی میں گردن کی اٹھی ہوئی ہڈی کو جذی کہتے ہیں۔ صاحب صراح نے فاس کا ایک مطلب تندی نقا لکھا ہے۔ ۵ ♀ h کو دیکھئے، جانور کی گردن پر مکتوب ہے اور ہم یہ بتا چکے ہیں کہ سندھی مہریں زیادہ تر تعلیمی تختیوں کی نوعیت رکھتی ہیں۔
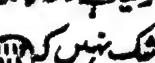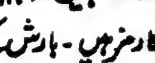
طو کو عربی طاوِ سے مماثلت ہے۔ طَوی کے معنی ہیں بھوک۔ طِوی وہ بھوکا ہے۔ TU ۱۱۱ ۲ کے معنی ہیں خورش کا بھوکا۔ اب تک جن لوگوں نے سندھی مہروں کو پڑھا ہے ان میں سے وڈل نے جانور اور سامنے والی طرف کو ح اور ▭ اور ▭ اور ۵ اور ۱ کی آوازیں دے کر الفاظ تعبیر کئے ہیں۔ بعض نے جانور کو دیوتا قرار دے کر قرأتیں تصنیف کی ہیں۔ بعض کے نزدیک تحریر کو اپنے ساتھ کی تصویر سے کوئی علاقہ نہیں۔ اس طرح انہوں نے اپنی مرضی اور پسند کے مطابق تحریروں کی قرأتیں تصنیف کی ہیں۔ لیکن سندھی مہروں کو غور سے دیکھا جائے تو کہنا پڑے گا کہ

تفہیم ندہ حرفے را کہ گفتی ۔۔۔ دلے تفسیرہائے آفریدند
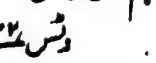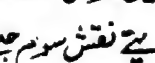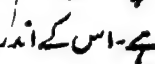
۱۱۱ ۲ اور ۱۱۱ ۲ جیسے الفاظ کبھی تنہا اور کبھی دوسرے الفاظ کے ساتھ ایسی متعدد مہروں پر مکتوب ہیں جن پر تحریر کے نیچے ایک سینگھے بیل کی تصویر ہے اور اسکے سامنے ▭ کا نقش ہے۔ جو کہ ناند پر دھری ہوئی ٹوکری کی صورت ہے۔ یہ تمام نوشتے جانور کی خورش سے تعلق رکھتے ہیں۔

۳۷- وٹس ۱۱۱، ۱۶ ◠ = وٹس ۳۲ دیکھئے، اک سینگھے بیل کا سر اور ظرف ▭ باقی رہ گیا ہے۔ باقی دھڑ غائب ہے۔ اسلئے تحریر بھی ناقص ہے۔ اس پر مکتوب ہے۔ ◠ (ریو رنڈ ہیراس نے اسکو چینی لفظ ◠ کا ہم صورت خیال کیا ہے اور اس کا تلفظ یا بتایا ہے۔ اس کا
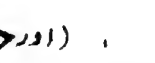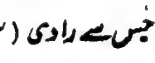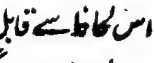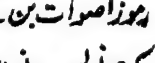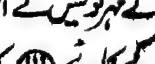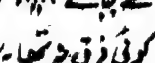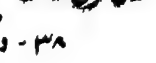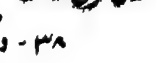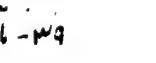
فارسی ترجمہ ہے بارش، عربی ترجمہ مطر، ہندی برشا اور ڈراویڈی آل ۔ موصوف نے زبردستی چینی یا کے ڈراویڈی ترجمہ کو سندھی لفظ ... کر لیا ہے ۔ حالانکہ یہ رمز صوت نہیں بلکہ رمز معنی ہے ۔ ایسے نقوش کا ڈراویڈی میں ترجمہ کرکے زبانِ تحریر کو چینی تحریر بنانا زبردستی ہے ۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اور آسمان سے برستے پانی کا نقشہ پیش کرتے ہیں ۔ کی بالائی قوس آسمان، زیریں قوس بادل اور نقطے پانی کی ... کا رمز ہیں ۔ بارش کے مفہوم کو ادا کرنے والے کسی لفظ کی صورت میں اس کو پڑھا جا سکتا ہے ۔ نمبر ۳۷ پر اس نقش کا ہونا ظاہر کرتا ہے کہ کبھی کبھار اس نقش کو بارش کے بجائے پانی کے لئے استعمال کرتے تھے ۔ ابجدی نوشتوں کے ذریعے جب مہروں پر پانی کے لئے کوئی لفظ مل جائے ہم اس کو اسی لفظ کی صورت میں پڑھیں گے ۔

وٹس ۳۲ کے نقش دوم کی حقیقت سمجھنے کے لئے میکے L × L) ۵۹ دیکھئے ۔ یہ صریحاً ایک تعلیمی مہر ہے ۔ مہر نویس نے جانور کے پیٹ میں تین نقوش دکھلائے ہیں ۔ دو تو صریحاً پتے ہیں جن کو جانور کے پیٹ میں ہونا چاہیئے ۔ نقش سوم کے لئے میکے ۱۱) ۵ دیکھئے ۔ اس کے درخت کے پتے نقش سوم جیسے ہیں ۔ جانور کے سامنے جو چیز ہے اسے مہر نویس نے بتایا ہے ۔ جو ہماری ی کی اصل ہے ایک ہانڈی کا نقش ہے ۔ اس کے اندر دو چیزیں ہیں ۔ ایک (جس کی صورت ہی سے ظاہر ہے کہ یہ نقش بہتے پانی کا رمز ہے ۔ دوسری چیز ہے ۔ میرگی نے اسے کونل یعنی چکی کا رمزِ معنی قرار دیا ہے ۔ ہانڈی کے اندر چکی یا موسل نہیں ہو سکتا سے مراد خورش ہے ۔ مہر نویس نے اس مہر کے ذریعے یہ بتایا
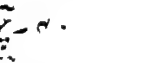
(= سے مراد ہے پانی
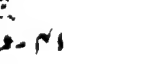
؎ = سے مراد ہے خورش

(اور سبائی مسند میں قرشت کے حرف دوم کی صورت ہے جیسے ہم عربی لفظ رَاعہ (آبِ شیریں) کا حرف اول بھی کہہ سکتے ہیں جس سے راوی (سیراب کرنے والا) مشتق ہوا ۔ پنجاب کا ایک دریا جو پہلے سندر رود کہلاتا تھا بعد میں راوی سندر بنا اور پھر راوی رہ گیا ۔ اس کا اس لحاظ سے قابلِ غور ہے ۔ عربی ابجد کے حرف ط سے مشابہت ہے جو کہ طعام (خورش) کا حرف اول ہے ۔ آئندہ چل کر یہ رموز معنی رموز اصوات بن گئے ۔ چونکہ ایسے شخص کے لئے جس کے سامنے میکے L × L) ۵۹ نہ ہو (کا مطلب اس کی صورت سے ظاہر نہ تھا ، اس لئے ڈمرا کے مہر نویس نے اس سے پہلے قابلِ فہم رمز معنی رکھ کر اس نقش کا مطلب سمجھایا ہے ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مہر نویس کا مقصد (کا مطلب سمجھانے کے بجائے کا تلفظ بتانا ہو ۔ بہر حال ، و (تینوں کے معنی ایک ہیں یعنی " پانی " ممکن ہے تینوں کے تلفظ مختلف ہوں مگر مطلب کوئی فرق نہ تھا ۔ سوائے اسکے کہ (آئندہ چل کر حرف ہجا R بن گیا ۔ اب چند اور نقوش لیجئے ۔
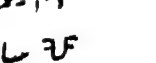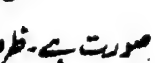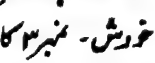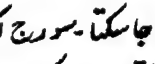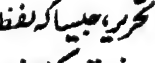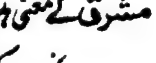
۳۸ - وٹس ۱۱) ۲۵ مقابلہ کے لئے دیکھئے میکے ۳ ۲۵ ꟻF

۳۹ - مارشل L××VIII

۴۰ - چین L×××IV ꟻF

۴۱ - وٹس ۱۱) ۲۷ ꟻF

ꟻF سابقہ ہونے کی صورت میں لفظ کو اسم ظرف بنا دیتا ہے اور لاحقہ ہونے کی صورت میں اسمِ مظروف ۔ اس نقش (۴) کی بدلی صورت ہے ۔ ظرف کے اندر چارہ دکھایا گیا ہے ۔ ꟻF کے معنی ہیں (۴) کے اندر والی چیز یعنی جو کہ پودہ کی شکل ہے ۔ اسکے معنی خورش ۔ نمبر ۳ کا دوسرا اور تیسرا نقش سورج کی شکل ہے لیکن اس سے مراد سورج نہیں ۔ اس کی دو دلیلیں ہیں ۔ سورج برتن میں نہیں آ جا سکتا ۔ سورج ایک ہی ہے ۔ دو سورجوں کا کچھ اور مطلب ہو سکتا ہے ۔ زبانِ تحریر میں سورج کے لئے جو لفظ تھا وہ کسی خورش کا بھی نام تھا ۔ اگر تحریر ، جیسا کہ لفظ ۱۱۱ کی تشریح میں پیش کی ہوئی مہروں کے چار الفاظ سے اندازہ ہوتا ہے ، عربی کی ہم نسل تھی تو کا ایک نام شارق ہے ۔ مشرق کے معنی ہیں گوشت بغیر چربی کا ۔ ظرف نمبر ۴ گوشت پکانے کا برتن ہوگا ۔

نمبر ۲ کے نقش دوم کے لئے دیکھئے میکے ۱۱۱) نمبر ۷ ایک طرف ꟻF دوسری طرف ///// ۔ مہر نویس نے کھڑی لکیروں کا مطلب

بتاتا ہے۔ والی چیز یعنی درخت سے حاصل کی جانے والی خورش۔ نمبر ۳۹ خورش کا ظرف ہے۔ نمبر ۳۸ کا مطلب بھی ایسا ہی ہے یعنی والی چیز لیکن ہر جانور کی خورش کا نام ہے۔ ثبوت کے لئے دیکھئے (الف) میکے ۶۷۲ کی تصویر پر

(ب) مارشل ۲۲۸، ۴۸۹ میکے ۴۵۹ یک سنگھے کی تصویر پر

(ج) میکے ۵۷۳ ہاتھی کی تصویر پر

(د) میکے ۶۴۰ باگھ کی تصویر پر

(ہ) مارشل ۳۸۵ کتے کی تصویر جس کے منہ میں ہڈی ہے اور سامنے بھی

اس سے معلوم ہوا کہ بیل، ہاتھی، باگھ، کتا ہر جاندار کی خورش کو کہتے تھے۔ یہاں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ مہروں کے کسی لفظ کا مطلب معین کرنے اور اسکو کسی زبان میں پڑھنے سے پہلے مکتوب لفظ کو ہر مہر پر دیکھ لینا چاہئے کیونکہ مہر نویسوں کا طرز تفہیم حسب ذیل تھا۔

(و) میکے نمبر ۴۰

(ز) میکے ۳۴۱

(ح) میکے ۵۱

دیکھئے ایک مہر پر ایک، دوسری پر دو، تیسری پر تین لفظ ملتے ہیں۔ مطلب تیسری سے جا کر پورا ہوا۔ لفظ "" کا مطلب معلوم ہونے پر کا مطلب بھی معلوم ہو جائیگا۔ بہر حال ظرف ہے کا طلب ہے خورش کا ظرف۔

ولس (۱۱) ۷۹

ایک اور مہر ولس (۱۱) نمبر ۷۹ ناقص ہے۔ لیکن ولس کی مہر نمبر ۴ کی مدد سے ہم اس کو پڑھ سکتے ہیں۔ یہ ایک گھر کی شکل ہے جس میں غلہ بھرا ہے۔ چونکہ یہ ایک ظرف کے ٹکڑے پر مکتوب ہے۔ اسلئے اس کو نہ صرف خانہ کا مترادف خیال کرنا چاہئے بلکہ ظرف کا نام بھی سمجھنا چاہئے۔ کا مطلب ہے "بھرا ہوا" اس وقت تک یہ ایک قرین قیاس مفروضہ ہے لیکن اس لفظ کی مہروں پر غور کیا جائے۔ تو یہ امر واقعہ ثابت ہوگا۔ ان کے بعد میکے کی دو مہریں دیکھئے

۴۳۔ میکے LXIII ایک طرف ظرف پر دوسری

۴۴ میکے LVIII ظرف پر خط پر

ان ظروف کی تحریروں میں سر دست صرف اور کو سمجھئے۔ دراصل ل کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ اور یہ نام ہے اس چیز کا (دیکھو ولس ۶۵۰) بعد میں بدل کر VIII اور VII ہوئے۔ ذیل کی مہروں کو دیکھئے اور مطلب ذہن نشین کیجئے۔ VIII اور VIIII وغیرہ جانور کی ایک خورش کے نام ہیں۔

میکے ۱۱) ۲
مارشل VII x ۱۱) ۱۱
مارشل VIII x ۱۱) ۱

ولس ۱۱، ۱

سندھی رسم خط پہلے تشکیلی تھا اور الفاظ کے بجائے معانی و مطالب کی تشکیل کرتا تھا۔ پھر بتدریج رسمی آوازوں کو قلمبند کرنے لگا۔ یہاں تک کہ ابجدی نوشتوں کی نوبت آئی۔ چنانچہ ظروف کے اوپر بھی ابجدی تحریریں ہیں۔ ذیل میں چند نوشتے پیش کئے جاتے ہیں جن کو پڑھ لینا بہت آسان ہے۔

۱۔ وٹس ۱۱۱) ۲۵ ظرف شکستہ، بعد کے حروف غائب
۲۔ وٹس ۱۱) ۴۱، ۵۳ ۱۱
۳۔ وٹس ۱۱) نمبر— ۱۱۱
۴۔ وٹس ۱۱) نمبر۱۰
۵۔ وٹس ۱۱) نمبر۲۴
۶۔ وٹس ۱۱) نمبر۴۵

کے علاوہ ان تحریروں کے تمام نقوش مغربی ایشیا کے ابجدی نقوش میں ملیں گے۔ ان کی مدد سے، ہم ان تحریروں کو حسب ذیل کی صورت میں پڑھ سکتے ہیں :۔

۱۔ فی ۔ اندر (فی کے اور معانی پر بھی دلالت کرسکتا ہے۔ یہ کسی لفظ کا شطر ہجا بھی ہوسکتا ہے)
۲۔ آن ۔ عربی آنیہ (برتن)
۳۔ آن ساد۔ لفظ دوم ساد صرف اسی ظرف پر ملا ہے۔ عربی سؤد (بس خوردہ۔ جھوٹا کھانا) سے ملتا ہے۔ یہ ظرف ہے۔ جھوٹی چیز کے لئے۔
۴۔ نل ۔ ممکن ہے کسی چیز یا مقام صنعت کا نام ہو۔
۵۔ ناذ ۔ عربی نذ نذیذ بمعنی پیشاب، نیکث، بھوک۔ یہ ظرف آلائشوں کے رکھنے کے لئے مخصوص ہوگا۔ مثلاً طشت یا اُگالدان کا کام د
۶۔ طلو ۔ عربی طُلّ۔ دودھ۔ یہ برتن شیردان تھا۔
۷۔ بتیو۔ باسی چیز کا برتن۔ خبز بابت۔ باسی روٹی۔

ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج سے پانچ ہزار برس پہلے وادی سندھ میں کیسی زبان بولی جاتی ہوگی۔

ممکن ہے میری اس رائے کو کہ سندھی ظروف اور مہروں کی تحریر عربی ہے۔ یا اس سے ملتی جلتی ہے، صحیح نہ سمجھا جائے۔ تحقیق کا میدان ہر کھلا ہے۔ اگر قرائن و شواہد میری رائے کی تردید کرتے ہیں تو لامحالہ وہی صحیح ہیں۔ مگر اس سلسلہ میں طرزِ استخراج شاید محل نظر نہ ہو۔ فرض کیجئے ایک ہے۔ BIRD کیا اس کو کوئی شخص اُردو، عربی، فارسی یا سنسکرت باور کرسکتا ہے؟ ایک حرف شناس جو صرف اتنا جانتا ہے کہ یہ حروف ا کے ہیں اور اُسی چیز کا نام ہے جس کی تصویر اس کے ساتھ ہے، کیا آپ اسے کسی بھی دلیل سے اس تحریر کے جاپانی ہونے کا قائل کرسکتے ہیں؟ اگر دلیل ذرا بھی وزن رکھتی ہے تو سیکے ۵۹۳ کو دیکھئے کو ہم نہایت آسانی سے ط (طَیر۔ طیر) پڑھ سکتے ہیں۔ چڑیا کی شکل ابجدی لفظ طیر کا تلفظ بتاتی ہے۔ اس مہر اور دوسری مہروں پر چڑیا کی شکل کا کیا مطلب ہے؟ ا دینے کے لئے وہ تمام مہریں سامنے رکھنی ہوں گی جن پر چڑیا کی شکل یا ۱۱۱ مکتوب ہے۔ اس لئے اگر محض ا کی ہوئی تصویر و تحریر کو انگریزی باور کرنا ضروری ہے تو لکھنے والے کی زبان کو ڈرا ویڈی یا آ۔ یائی فرض کرنا کیا قدر ضروری ہے اور عربی یا اس کی مثیل زبان قرار دینا کیوں ضروری نہیں!

تا بکے بر قولِ این و آں یقین
چشم بینا در بسرت داری ہمیں

★

"بحر ہے پایاب مجھے" ۔ بقیہ ص ۴۳

کیپٹن نے دوربین سے ویدر شادو کی طرف دیکھا۔ اور اُسی
یشن میں بولا:
"میرا بھی یہی خیال تھا۔ موسم حد سے زیادہ پر سکون ہو گیا تھا۔"
پھر کیپٹن نے دوربین کو اپنی بغل میں دبا لیا۔ اور برج کی
لنگ پر دونوں ہاتھ رکھ کر بولا:
"جہاز میں چار درجے کی لسٹ پیدا ہو گئی ہے۔"
چیف آفیسر نے جواب دیا:
"میرا خیال ہے کھالوں کے بنڈل ڈھیلے ہو گئے ہیں۔ اور
ولوں کی بوریاں پورٹ سائڈ میں کھسک گئی ہیں۔ اور شاید چھکولوں
سے وہ ویٹ بھی ہل گئے ہیں جو ہم نے سٹار بورڈ سائڈ میں شفٹ
کئے تھے۔"

یکایک ہوا کے ایک تیز جھونکے سے پسینجر پیئر کی ٹین کی چھت
اُڑی اور گڑگڑاتی ہوئی سمندر میں گر گئی۔ منورا بیچ کی سیمنٹ کی سڑک پر
ایک کا ڈرم لڑھکتا ہوا، کھڑکھڑاتا ہوا پسینجر پیئر کی ریلنگ کے ساتھ زور
سے ٹکرایا۔ اور جہاز کے ماسٹ، ڈیرک اور تاروں سے سیٹیوں کی آوازیں
آنے لگیں۔

چیف آفیسر نے کہا:
"کیپٹن، ہم منورے کی لی سائڈ میں ہیں۔ اس لئے ہم کو طوفان
کی طاقت کا اندازہ نہیں۔ ہاربر سے باہر طوفان کی شدت خطرناک ہو گی۔"
کپتان آفندی نے دوربین سے پسینجر پیئر کی چھت کو دیکھتے
ہوئے کہا:
"میں تمام دنیا کے طوفانوں کو جانتا ہوں۔ اور تمام دنیا کے
طوفان مجھے جانتے ہیں۔ کوئی طوفان خطرناک نہیں ہوتا۔ طوفان،
صرف طوفان ہوتے ہیں۔ طوفان آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ اور
جہاز طوفانوں سے لڑتے جھگڑتے ہنستے کھیلتے اپنی منزل کی طرف سفر
کرتے رہتے ہیں۔"
"کیپٹن، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ جہاز طوفان کا
مقابلہ کرنے کے قابل نہیں۔"
"طوفان کا مقابلہ جہاز نہیں کرے گا، میں کروں گا۔"
"کیپٹن، اس جہاز میں دس درجے کی لسٹ ہے۔ ہم نے اپنی
پوری قوت سے کام لے کر آپ کی ہدایت کے مطابق لوڈنگ کر کے اس کی
لسٹ رفع کی تھی۔ جہاز برتھ سے بالکل سیدھا ہٹایا گیا تھا۔ اب تیز ہواؤں نے
اس میں پھر لسٹ پیدا کر دی ہے۔ اور یہ لسٹ بڑھ رہی ہے۔ تھوڑی دیر
ہوئی یہ لسٹ چار درجے تھی اور اب چھ درجے ہے۔ اگر یہ لسٹ
بڑھتے بڑھتے دس درجے ہو گئی تو جہاز کو بچانا مشکل ہو جائے گا۔"
"اس لئے تم لسٹ کا مقابلہ کرو گے، میں طوفان کا مقابلہ
کروں گا۔ جہاز کے تمام عملے کو جگا لو اور ہولڈ میں اور لوئر ڈیک میں لے
جاؤ۔ اور پورٹ سائڈ کے تمام وزن سٹار بورڈ سائڈ سے تاروں
کے ساتھ باندھ دو۔ اور جو وزن اس طرح قابو میں نہ آئے اس کو
سمندر میں پھینک دو۔ یہ طوفان پینتالیس منٹ رہے گا۔ میرے
آدمیوں کو پینتالیس منٹ تک مصیبت کا سامنا ہو گا۔ اس کے بعد
میں دس درجے کی لسٹ کے ساتھ بھی منزل پر پہنچ سکتا ہوں۔"
چیف آفیسر نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا:
"یس سر۔"
وہ سیڑھیوں کی طرف چل پڑا۔
جب وہ سیڑھیوں کے پاس پہنچ گیا تو کیپٹن نے اُس
کو پھر بلایا:
"دیکھو۔"
چیف آفیسر سیڑھیوں کے پاس پلٹ کر کھڑا ہو گیا۔
کیپٹن نے کہا:
"اگر میرے آدمیوں نے اس طوفان کے دوران میں لسٹ
کو روکنے کے لئے پوری قوت سے کام نہ لیا تو جہاز بچ نہیں سکے گا۔"
چیف آفیسر نے ایک لمحہ کیپٹن کے پُر تمکنت چہرے کی
طرف دیکھا۔ پھر اُس کی نظریں برج کی ریلنگ پر لٹکے ہوئے
لائف بوائے پر چلی گئیں۔ وہ لائف بوائے کے پاس گیا۔ اس
نے لائف بوائے کو کھونٹی سے اتارا۔ اور اس کو کیپٹن کے پاؤں
کے پاس رکھ دیا۔ پھر وہ سیڑھی کی طرف بھاگا۔
کیپٹن نے کہا:

"تھینک یو"

پندرہ منٹ کے بعد کیپٹن نے میگا فون پر لوئر ڈیک سے خطاب کیا:

"ویل ڈن، چیف۔ لسٹ ٹھیک ہو رہی ہے۔ ہاربر کے منہ پر پہنچ کر میں جہاز کا کورس ستر درجے سٹار بورڈ کو تبدیل کروں گا۔ اس طرح میں طوفان کا مقابلہ سامنے کی طرف سے کر سکوں گا۔ اور اس کا زور جہاز کے ہیڈ پر لے لوں گا۔ پھر آپ کو توازن قائم رکھنے کے لئے زیادہ دِقت نہیں ہوگی۔ او۔ کے۔ گڈ لک"

ہاربر کے منہ پر طوفان نے لائٹ ہاؤس کی چٹانوں کے پیچھے سے نکل کر جہاز پر اپنی پوری قوت سے حملہ کیا۔ کیپٹن آفندی نے طوفان کے ساتھ سامنے سے لڑنے کے لئے اور جہاز کی سٹار بورڈ سائیڈ کو حملے کی زد سے بچانے کے لئے اپنا کورس تبدیل کر لیا۔

"ہارڈ سٹار بورڈ! ہارڈ سٹار بورڈ!" کیپٹن آفندی سٹیرنگ کیبن کے میگا فون پر چلایا۔

"ہارڈ سٹار بورڈ، سر۔ ہارڈ سٹار بورڈ، سر" سٹیرنگ وھیل پر کوارٹر ماسٹر نے جواب دیا۔

جہاز آہستہ آہستہ طوفان کی طرف بڑھنے لگا لیکن طوفانی ہواؤں نے دس دس فٹ اونچی لہروں کو اٹھا اٹھا کر جہاز کے ہیڈ سے پٹخ دیا۔ جہاز اپنے اصلی کورس پر آ گیا۔ پانی اوپر ڈیک پر چڑھ آیا۔ اور پانی کے چھینٹے کیپٹن آفندی کے منہ اور کپڑوں تک پہنچ گئے۔

"ہارڈ سٹار بورڈ"! کیپٹن آفندی میگا فون میں پھر چلایا۔

"ہارڈ سٹار بورڈ، سر" کوارٹر ماسٹر نے جواب دیا۔

"جہاز گھومتا کیوں نہیں؟ رڈر چیک اپ کرو"

"ـــ یس سر، رڈر جام ہو گیا ہے"

یکایک سٹار بورڈ سائیڈ پہ ہواؤں اور لہروں کی قیامت ٹوٹ پڑی۔ جہاز ان لہروں اور ہواؤں کے وزن کے نیچے پورٹ سائیڈ پر لیٹ گیا۔ جہاز کے تمام وزن گڑ گڑ گڑ گڑا کرتے ہوئے پورٹ سائیڈ میں کھسک گئے۔ پورٹ سائیڈ پانی میں ڈوب گئی۔ پانی ہولڈ، لوئر ڈیک اور انجن روم کی طرف دوڑا اور جہاز کا پچھلا حصہ جہاز کے تمام عملے اور سامان کے ساتھ سمندر میں غرق ہو گیا۔ پانی کے وزن سے جہاز سیدھا ہو گیا۔ اور اُس کا اگلا حصہ پچھلے حصے کے مقابلے میں ہلکا ہونے کی وجہ سے سمندر کی سطح سے اونچا اُٹھ گیا۔ اور آہستہ آہستہ سمندر کی تہ کی طرف جانے لگا۔

اب جہاز کا اگلا حصہ بھی پانی میں ڈوب گیا ہے۔ صرف برج پانی سے باہر نظر آ رہا ہے۔

کیپٹن آفندی برج کی ریلنگ کو مضبوطی سے پکڑے کھڑا ہے۔ برج آہستہ آہستہ پانی میں اتر رہا ہے۔ پانی کیپٹن آفندی کی کمر تک آ گیا ہے۔ لائف بوائے اس کے نزدیک ہی تیر رہا ہے۔ اور وہ اپنی سفید وردی میں برج کی ریلنگ کو مضبوطی سے پکڑے کھڑا ہے۔ اور پھر وہ پانی میں اس طرح غائب ہو گیا۔ جس طرح شام کے وقت لمبے دور دراز سفر کے بعد سورج سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔

اور سفید رنگ کا لائف بوائے گہرے سیاہ رنگ کے سمندر میں تیرتا ہوا ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے سنگِ خارا کے بنے ہوئے مزار پر چنبیلی کے سفید پھولوں کا ہالہ چڑھا ہوا ہے۔

★

وطن کے سپاہی

(ایک بچّے کے قلم سے)

رفعت جاوید

ہمارے یہاں بڑوں سے لے کر چھوٹوں تک وطن کے سپاہیوں کو جس محبت اور قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے ہیں اس کا اندازہ ایک کمسن بچے کی اس بھولی بھالی تحریر سے لگایا جا سکتا ہے جس میں اس نے اپنے دلی احساسات کا اظہار کیا ہے۔ مدیر

ابھی کچھ دن ہی کی بات ہے کہ میں اپنے کورس میں یہ نظم پڑھ رہا تھا۔

بہ صد ناز و تمکیں، بہ صد کج کلاہی
چلا جا رہا ہے وطن کا سپاہی

اس سے بے اختیار اپنے وطن کے سپاہی یاد آ گئے جن کا دن ہم نے ابھی ابھی منایا ہے اور جو واقعی ہمارے دلی دوست ہیں اور ہم سب کو اُن پر ناز ہے۔ کتنے بہادر ہیں وہ! کہانیاں تو سبھی اچھی ہوتی ہیں اور انہیں پڑھ کر خوب لطف آتا ہے۔ مگر جو بات ہمارے سپاہیوں کی بہادری کی کہانیوں میں ہے اس کے کیا کہنے۔ جو مزا ان میں ہے وہ اور کسی میں نہیں — مجھے تو بس ایسی ہی کہانیاں پسند ہیں۔ جی چاہتا ہے انھیں سنتا ہی جاؤں۔ اور اگر یہ کہیں ہاتھ لگ جائیں تو پڑھتا ہی چلا جاؤں۔ محمد بن قاسم ہو یا محمود غزنوی۔ ان کی بہادری کے کارنامے پڑھ کر دل سینے میں بلیوں اچھلنے لگتا ہے۔ اور پھر ہمارے پاکستانی سپاہیوں کے بہادری کے کارنامے تو ایسے ہیں کہ انھیں پڑھ کر آپ ہی آپ سینہ فخر سے تن جاتا ہے۔ دل میں ایک جوش اور ولولہ پیدا ہوتا ہے اور جی کرتا ہے میں بھی بڑا ہو کر اپنے ملک اور قوم کی ایسی ہی سچے دل سے دلیری اور بہادری کے ساتھ خدمت کروں۔ اب جب یوم پاکستان آ رہا ہے۔ وہ دن جب ہم نے اپنی آزادی کے لئے پہلا دلیری کا قدم اُٹھایا تھا — ان جاں نثاروں کا ذکر اور بھی ضروری ہے۔ کیونکہ انہیں نے بار بار نازک وقت پر قوم کو سنبھالا اور انہیں کی وجہ سے پاکستان سلامت ہے۔

ابھی تھوڑے دن ہوئے مجھے اپنے ملک کے بعض جری سپاہیوں کے کارنامے سننے کا اتفاق ہوا جس سے میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ اور میں ان کی دل ہی دل میں تعریف کئے بغیر نہ رہا۔ ان میں سے ایک بہادر سپاہی تھے کپتان محمد سرور کتنے بہادر، بے باک! اور جو کارنامہ انھوں نے انجام دیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ بیشک ہمارے ملک کے اس بے نظیر سپاہی کو اپنی جان دینی پڑی۔ اور اس نے یہ شاندار قربانی بڑی خوشی اور بڑی مسکراہٹ کے ساتھ دی۔ لیکن اس قربانی نے ان کو ہمیشہ کے لئے زندہ بنا دیا۔ اب ان کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ تازہ رہے گی۔ اور پھر بہادری کے سب سے بڑے اعزاز کا سہرا بھی تو انہیں کے سر بندھا۔ واقعہ یوں ہے کہ دشمن ایک چوکی پر بڑی سختی سے قبضہ جمائے بیٹھا تھا۔ اور اس کا وہاں سے ہٹانا جان جوکھوں کا کام تھا۔ مگر اس جانباز سپاہی نے اس کی ذرا بھی پروا نہ کی۔ اس نے خود اس چوکی پر حملہ کرنے کی خواہش ظاہر کی حالانکہ اس کو ایسا کوئی حکم نہیں ملا تھا۔ اس نے آپ ہی کہا کہ وہ اپنی پارٹی کے ساتھ اس چوکی پر حملہ کرے گا۔ جب اس کے ساتھی چوکی کے قریب پہنچے تو اُن پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ مشین گنیں، گولے، بم، بارود بموں کی اندھا دھند بوچھاڑ۔ اور ہر طرف موت ہی موت منڈلاتی ہوئی۔ اب بھی وہ چاہتا تو اپنی اور اپنے بچے کچھے ساتھیوں کی جان بچا کر واپس جا سکتا تھا۔ مگر شاباش ہمارے سپاہیوں کو جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکتے ہیں۔ اس شیر جیسے دل والے کپتان نے منہ نہ موڑا اور اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے خود آگے آگے چلتا ہوا ایک طرف سے ہو کر آگے بڑھا اور بڑھتا ہی چلا گیا۔ اگرچہ گولے بارود کی لگاتار بوچھاڑ جاری رہی۔ وہ رینگ رینگ کر آگے بڑھا اور دشمن کی مشین گن کو خاموش کرنے کے لئے ایک دستی بم پھینکا — اتنے میں پارٹی کا ایک برین گن چلانے والا مر گیا۔ ہمارا شیر دل کپتان ذرا بھی نہ گھبرایا۔ اس نے دوڑ کر

برین گن خود اٹھالی۔ اور اسے بے تحاشا چلاتا چلا گیا۔ دشمن نے آگے ۲۰ گز کے فاصلے پر بڑی بھاری کانٹے دار باڑھ لگا رکھی تھی۔ یہ جوان مرد یہاں بھی ذرا نہ ٹھٹکا اور ایک بار پھر جان پوجھ کر خطرہ مول لیتے ہوئے آگے بڑھا تاکہ باڑھ کو کاٹ ڈالے۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ گولیوں کی بوچھاڑ نے اس کا جسم چھلنی کر دیا۔ اور اسے جان دینی پڑی لیکن اس کا بے مثال نڈر پن، خطرے سے مکمل بے پروائی، اس کا زبردست ارادہ اور کمال کی بہادری اثر کر گئی۔ اور اس کے ساتھیوں کا حوصلہ اس قدر بڑھا کہ انہوں نے بڑھ کر چوکی پر قبضہ کر لیا اور دشمن کے چالیس آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اب ذرا مشرقی پاکستان کی طرف آیئے۔ یہاں بھی بہادری کی ایسی بے نظیر مثال نظر آتی ہے کہ ہم اس کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے اور بے اختیار پکار اٹھتے ہیں ــ بہادر ہو تو ایسا ہو ــ لیڈر اس قدر نڈر، قربانی اتنی بڑی اور جواں مردی ایسی جس پر ہم ناز کر سکیں۔ اگست کے دن تھے اور مشرقی پاکستان کی سرحد، دھوپ اور گرمی سے ابلتی ہوئی لو اور گرم ہواؤں سے بھرپور۔ دشمن پاکستانی علاقے پر دھرنا دیئے بیٹھا تھا۔ اور ہمارے جوانوں کا کام یہ تھا کہ اسے نکال باہر کرے۔ یہ مہم پنجاب رجمنٹ کے میجر طفیل احمد جیسے جری سپاہی کے سپرد کی گئی۔ رات کا وقت تھا میجر موصوف اور اس کے بہادر ساتھی ایک لمبے مارچ پر روانہ ہو گئے پاکستانی جواں مردوں نے دشمن کو گھیرنے کے لئے ایسی ہوشیاری سے چال چلی کہ بس اس کو پتہ ہی نہ چلا۔ اور پتہ چلا تو اس وقت جب پاکستانی دلیر دست بدست لڑائی کے لئے بالکل سامنے کھڑے تھے۔ عین اس وقت ایک مشین گن نے آگ برسانی شروع کر دی۔ اور پہلی ہی باڑھ سے پارٹی لیڈر، میجر طفیل جو آگے چلتے ہوئے مہم کی رہنمائی کر رہے تھے سخت زخمی ہو گئے۔ مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری اور برابر آگے بڑھتے گئے اور مشین گن کی ایک چوکی کو ختم کر دیا۔ ایک اور مشین گن سے جو دنادن گولیاں برس رہی تھیں، وہ زخمی ہو گئے۔ ان کے بعد جو دوسرے کمانڈر تھے وہ شہید ہو گئے۔ میجر طفیل خود سخت زخمی ہونے کے باوجود رینگتے ہوئے آگے بڑھے اور اس مشین گن کے ٹھکانے پر دستی بم پھینک کر اسے بھک سے اڑا دیا۔ ہلنے جلنے کی سکت تو نہ تھی پھر بھی یہ جیالا سپاہی برابر زمین پر پڑا پڑا اپنے ہمراہیوں کو ہدایات دیتا رہا۔ اتنے میں دست بدست لڑائی چھڑ گئی۔ اچانک اس نے دیکھا کہ دشمن کا کمانڈر آگے بڑھ کر ہمارے ایک جوان پر حملہ کرنے ہی والا ہے۔ میجر طفیل نے اپنی رہی سہی طاقت جمع کر کے اس کمانڈر کی ٹانگوں میں اپنی ٹانگیں اڑا کر اسے اپنی فولادی ٹوپی سمیت زمین پر منہ کے بل گرا دیا۔ اس دوران میں گو ان کا خون زور شور سے بہہ جا رہا تھا اور ان کی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے، پھر بھی وہ اپنے آدمیوں کا حوصلہ بڑھائے گیا۔ یہاں تک کہ دشمن پاکستان کی سرزمین چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ اس کے چار آدمی کھیت رہے اور تین قید ہوئے۔ میجر طفیل زخموں کی تاب نہ لا سکے۔ اور انہوں نے اپنی قوم وملک کی خاطر جان دے دی۔

بلاشک میجر طفیل کی موت ایک بڑے ہی منچلے اور دلیر آدمی کی موت تھی۔ موت نہیں شہادت اور اس کے ذکر سے ہمارے دلوں میں ہمت اور دلیری کے کیا کیا ولولے پیدا نہیں ہوتے۔ ان کی بہادری وطن سے محبت اور فرض کو پورا کرنے کی ایک شاندار مثال تھی۔ ایسے وقت میں جبکہ ان کا مقابلہ اپنے سے کہیں زیادہ لوگوں سے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی عظمت کے سامنے ہمارے سر خود بخود جھک جاتے ہیں۔ اور ان کا نام بچے بچے کی زبان پر ہے۔ ایسے باپ پر کسے ناز نہ ہوگا۔ چنانچہ جب پچھلے سال مرحوم میجر کی کم عمری بیٹی نسیم جان کو صدر پاکستان نے سب سے بڑا قومی اعزاز بخشا تو اس کی آنکھیں فخر سے چمک اٹھیں۔ اس کا جسم فخر سے تن گیا اور اس کی چال میں ایسی آن بان پیدا ہو گئی جیسے وہ کسی بہت بڑے بادشاہ کی بیٹی ہو۔ اے کاش! ہم سب کا انجام اپنے وطن کے اس جاں نثار سپاہی جیسا ہی شاندار اور فخر کے قابل ہو۔

ایک اور مثال لیجئے۔ ایک اور بہادر سپاہی کپتان ظفر اقبال کا شاندار کارنامہ ــ ان کے ساتھ کل چار آدمی تھے۔ پھر بھی وہ ان کے ساتھ بڑھتے بڑھتے دشمن سے چند ہی گز کے فاصلے پر پہنچ گئے اور گولیوں کی بوچھاڑ کے باوجود دشمن کی چوکی پر آٹھ دستی بم پھینک دیئے۔ بدقسمتی سے ایک سپاہی کو گولی لگ گئی ہمارے ملک کے اس جیالے سپوت نے جھپٹ گولیوں کی بوچھاڑ چاروں طرف پھٹتے ہوئے گولوں اور بموں سے بے پروا ہو کر اس کی مرہم پٹی کی اور اسے اٹھوا کر پیچھے بھجوا دیا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد اس کا ایک اور آدمی سخت زخمی ہو گیا۔ اس پر کپتان نے وہ کام کیا جو انتہائی ایثار اور فرض پورا کرنے کی ایک لاجواب مثال ہے۔ شیر دل ہو تو ایسا ــ وہ فوراً اپنے مرتے ہوئے ساتھیوں کو واپس لانے کے لئے آگے بڑھے ــــــ اور

اس کوشش میں دشمن کی گولیوں کا شکار ہو گئے!

اب ایک اور منچلے سپاہی کا جیالا پن دیکھیے۔ یہ تھے محمد آلشیر۔ ان کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ پل بنانے کا بڑا ضروری سامان اپنے آدمیوں کو پہنچائے۔ اور وہ بھی ایسے علاقے سے جس پر دشمن کے پاؤں بڑے مضبوطی سے گڑے تھے۔ اس جیدار سپاہی نے صرف اتنا ہی نہیں کیا بلکہ خود ہی اپنی پلٹن کو واپس لے جانے کی خدمات بھی پیش کیں۔ راستے میں دشمن کی مشین گن سے اچانک مڈبھیڑ ہوئی۔ اس نے بھی جواباً گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ یہاں تک تو خیر گولیوں سے گولیوں کا مقابلہ تھا۔ مگر دشمن نے اپنے ٹینک بھی چھوڑ دیئے۔ اس دلیر سپاہی نے انھیں اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ کوئی اور ہوتا تو حواس باختہ ہو کر بھاگ اٹھتا۔ مگر وہ ایک جوان مرد سپاہی تھا۔ پاکستان کا فوجی جوان اس نے بھاگنا اور دشمن کو پیٹھ دکھانا نہیں سیکھا تھا۔ اس نے پناہ کے لئے بھاگنا بزدلی سمجھا۔ اور برابر فیر کرتا رہا یہاں تک کہ ٹینکوں نے اسے کچل ڈالا۔ یہ سب اس جری سپاہی نے اس لئے کیا کہ اس کے ساتھی بچ جائیں۔

جب بہادری ہی کی باتیں ہو رہی ہیں تو حوالدار بوستان خان کا ذکر کیسے نہ کیا جائے جس نے استقلال اور ہمت میں حد کر دی۔ پہاڑوں پر بے اندازہ برف گر رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ بے پناہ طوفانی بارش بھی ہو رہی تھی۔ اس موسم میں یہ ہمت کا دھنی ننگے پاؤں برف سے بھرپور ایک میل لمبے راستے پر، عین دشمن کی نظروں کے سامنے، ان کے پاور ہاؤس کو تباہ کرنے بالکل اکیلا چل نکلا! یہ نہیں کہ وہ خطرے میں گھر گیا ہو اور پھر مجبوری سے لڑائی پر ڈٹ گیا ہو۔ بلکہ اس نے جان بوجھ کر موت کے منہ میں کودنے کی ٹھانی!

ایسی ہی جان بوجھ کر جان جوکھوں میں ڈالنے اور بہادری کی مثال جمعدار رستم خان کی دلیری کا واقعہ ہے۔ ایک نالے کے پار دشمن کی ایک بڑی مضبوط ہتھیاروں سے لیس چوکی تھی۔ جو کچھ اس طرح آڑے آ رہی تھی کہ ہمارے فوجیوں کا دستہ ایک بہت بڑے ٹھکانے کی طرف آگے بڑھنے سے رکا ہوا تھا۔ جمعدار رستم خاں نے اپنے ساتھ صرف ۲۶ آدمی لئے۔ بھاری گولوں اور گولیوں کی اندھا دھند بوچھاڑ کی پروا نہ کرتے ہوئے رسیوں کی مدد سے نالہ پار کر گیا! دوسری طرف پہنچ کر اس نے برف سے ڈھکی گھاٹی پر لپک لپک کر چڑھنا شروع کیا۔ اس چوکی کی طرف جس میں اس کے جوانوں سے تین گنا زیادہ سپاہی پوری طرح بندوقیں اور بم لئے جم کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اوپر سے دشمن کے ہوائی جہازوں نے انھیں دیکھ لیا۔ اور ان پر گولہ باری شروع کر دی۔ پہاڑی پر ہر کہیں برف ہی برف تھی۔ اس لئے چھپنے کی جگہ کہاں ملتی۔ ادھر آسمان سے گولہ باری، ادھر زمین سے! مگر یہ بھی بلا کے دل والے تھے۔ ذرا نہ گھبرائے۔ اور دشمن ان کی بے جگری دیکھ کر اس قدر گھبرا اٹھا کہ چوکی چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ جمعدار رستم خاں نے ان کا پیچھا کر کے ۶۲ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ محض کارنامہ ہی نہیں، کرشمہ ہے کہ جن لوگوں کو بھاگنا چاہیئے تھا وہ نہیں بھاگے اور جنھیں نہیں بھاگنا چاہیئے تھا وہ بھاگ نکلے! یہ اسی ابتدائی کامیابی کا نتیجہ تھا کہ ہم دشمن کے زیادہ بڑے ٹھکانے کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

ایسی کتنی ہی اور کہانیاں ہیں۔ کہانیاں کیا بہادری کے کارنامے۔ ان کو پڑھ کر جی چاہتا ہے میں بھی اپنے وطن کا ایسا ہی سپاہی بن جاؤں اور ملک و قوم کی خدمت میں ایسی ہی بہادری دکھاؤں۔ بلکہ ہمارے پاک وطن کا بچہ بچہ قوم کا ایسا ہی سچا خادم اور جاں نثار سپاہی بن جائے۔ اور جیسے شروع سے لے کر اب تک مشکل وقت پر ہمارے سپاہی برابر کام آتے رہے ہیں اسی طرح ہم بھی کام آئیں۔ کیا یہ سچ نہیں کہ ہمارے ملک کے سب سے بڑے سپاہی، فیلڈ مارشل ایوب خاں، نے ہمارے وطن کا نام تمام دنیا میں روشن کر دیا ہے۔ اور اس کی دھاک دنیا کی تمام قوموں پر بٹھا دی ہے ◆

•

تصوریہ:

"کھیل لڑکوں کا ہوا"

قاضی یوسف حسین صدیقی

دورِ انقلاب میں قومی زندگی کو خوب سے خوب تر بنانے کا جذبہ جس طرح ترقی کر رہا ہے اس کا ایک عمدہ ثبوت وہ دلچسپ کھیل ہیں جو پچھلے دنوں کراچی ہیلتھ کونسل کے زیرِ اہتمام یہاں کے کئی زنانہ مدارس کی طالبات نے صحت و صفائی کا احساس پیدا کرنے کے لئے پیش کئے تھے۔ اربابِ نظر شاید اس پُرلطف افسانوی پیشکش میں اس حقیقت کی جھلک دیکھ سکیں (مدیر)

مجھے اپنے دیدۂ بینا پر اعتماد ہے۔ پورا پورا اعتماد —— اس لئے میں اسے واہمہ تو بہرحال نہیں کہوں گا۔ اس کے پس پردہ کوئی حقیقت ضرور تھی۔ جانی پہچانی، محسوس و مرئی جسے مجھ جیسے گوشت پوست کے انسان دیکھ سکتے ہوں۔ خیر جانے دیجئے — یہ محض خیال ہی سہی خواب ہی سہی۔ خواب! مگر میں تو خواب دیکھنے کا عادی نہیں۔ کیا میں بھی شاعر ہوں جو خواب دیکھتا رہوں؟ نہیں یہ تو کچھ اور ہی چیز تھی۔ بڑی دلچسپ بڑی دلآویز اور بڑی سبق آموز۔ جیسے میں اپنا دیدۂ بینا لئے ہوئے خواب اور حقیقت کے سنگم پر کھڑا تھا اور بڑے ذوق و شوق سے دیکھے جا رہا تھا۔ میں سوچ میں کھو گیا۔ کھیل، تماشہ، ناٹک، سوانگ، وہم و گمان۔ آخر اسے کیا کہوں۔ چھوڑیئے خواب ہی سہی خیال ہی سہی۔ تھا تو کچھ۔ بہت دلچسپ جسے دیکھنے کو جی چاہے۔ اور بول اٹھے کاش ایسا ہو! کاش ایسا ہی ہوا کرے! ہم کیا، ہم سے ایک بہت بڑا کہہ گیا ہے کہ:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

وہ منظر، وہ نقشے، اول تو میں سمجھا جیسے شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار سج گیا ہے —— ناگہاں دیکھا کہ اک پیر کہن سال آئے - - مگر یہ کوئی پیر کہن سال تو نہ تھا۔ بلکہ ایک ماں اپنی بچی کے سرہانے غم کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ لب پر آہیں، ہونٹوں پر نالے! اس کی اکلوتی بچی ٹی بی جیسے موذی مرض کی شکار جیسے کہ جانے کتنے ہی اور ہیں۔ اور پھر ستم یہ کہ اس بدنصیب ملک میں جاہل ان پڑھ لوگ علاج معالجے کے لئے بھروسہ بھی کرتے ہیں تو کن پر۔ وہی نیم حکیم خطرۂ جان۔ اچھا اس سوانگ میں سارے کچھ سوانگ ہی کہتے بن پڑتی ہے۔ یہ نیم حکیم صاحب بڑا ہی انوکھا پارٹ ادا کرتے ہیں۔ ان حضرت کا وہ بے ہنگم ناچ کہ انسان ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو جائے۔ آخر ناچتے ناچتے وہ بیچاری بچی کے گرد ایک بھیانک بھوت کو خرمستیاں کرنے اپنے ہاتھ پاؤں کے ڈراؤنے پنجے بڑھاتے اور خوفناک دانت پیستے چھوڑ جاتے ہیں۔ موسیقی اور بھی دردناک اور کرب آفریں ہوتی جاتی ہے۔ دکھیا ماں بے آس ہو کر خدا کے حضور دعا کے لئے ہاتھ پھیلاتی ہے۔ اور رحم کی بھیک مانگتی ہے۔ خوش قسمتی سے اس کی دعا قبول ہو جاتی ہے اور ایک بڑی ہی پیاری گڑیا جیسی ننھی صورت آسمان سے نیچے اترتی ہے۔ ایک فرشتۂ رحمت نہیں نہیں یہ تو اور ہی کچھ ہے۔ ابھی ابھی ہمارے ملک میں ایک دور دیس کی رانی آئی تھی۔ اس لئے فضا اسی سے رسی بسی معلوم ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ذہن بھی۔ اس لئے تخیل بڑے ہی ڈرامائی طور پر سوچ بچار کے سارے مرحلے طے کر لیتا ہے۔ یہ ہنستی کھیلتی، چلبلی، ہشاش بشاش تندرست جیتی جاگتی خوبصورت گڑیا بھلا صحت کی رانی کے سوا اور کون ہو سکتی ہے؟ صحت اور اس کے ساتھ ہی حسن کی رانی بھی۔ کیونکہ صحت اور حسن تو لازم و ملزوم ہیں۔ اور ہونے چاہئیں۔ اس رانی کے جادو کی چھڑی لہراتے ہی مسکراہٹیں بکھیرتی ننھی ننھی چھوٹی پیاری

"بود سپاہ منظم حصار پاکستان"
(ملک الشعرا بہار مرحوم)
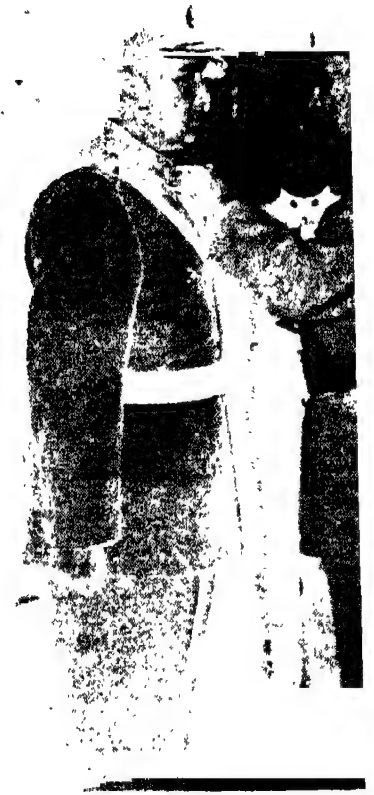
واج : زمیں جن سے حریف آسماں ہے

ملت کے دو محکم ستون : صدر پاکستان اور کمانڈر انچیف بحریہ پاکستان

ائیہ کے نو پر و بال شاہیں : بلندیوں کے حریف

سطوت کے نشان پائیدار : قومی و بحری پرچم

"جاگ اٹھا ہے شعور"

کراچی ہیلتھ کونسل کی دل آویز پیشکش

دور انقلاب کے حیات افروز اثر سے ملی شعور نے جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں میں نئی نئی سرگرمیوں کا ثبوت دیا ہے، وہاں قومی مسئلوں سے نبٹنے کے لئے بھی نئی نئی تدبیریں سوچی ہیں اور حیات کو خوب سے خوب تر بنانے کے لئے ہنر و فن کی سحرکاریوں سے کام لیا ہے۔ ڈرامے اور اداکاری، صحت و صفائی کی مہم میں جادو کا اثر رکھتے ہیں۔ جن کا ثبوت ان نقوش سے ملتا ہے

بے احتیاطی : بیماری کا
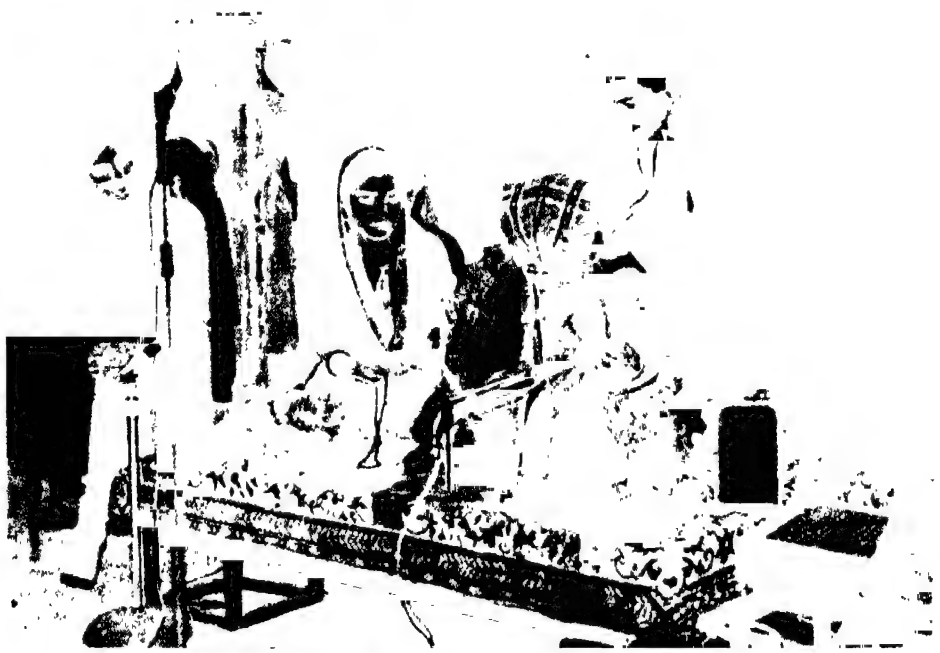
پھوڑپن : بیماری کا پیش

اک تماشہ ہے

"جس ڈھب سے کوئی سمجھے"

قومی صحت و صفائی کی مہم کا ایک دلچسپ پہلو، کراچی کے زنانہ مدارس کی طالبات کا پر لطف مظاہرہ۔

مچھروں، مکھیوں اور کیڑے مکوڑوں کا دلچسپ مشاعرہ جس میں وہ اپنے "کارنامے" بیان کرتے ہیں اور انجان لوگوں کو بتاتے ہیں کہ یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی کیسی بلائے جاں ہیں اور ان سے کیسے بچنا چاہئے۔

پیاری پھریوں کی ایک قطار چلی آتی ہے۔ موسیقی کی دھن یکلخت بدل جاتی ہے اور جہاں پہلے غمناک ماتمی صدائیں بلند ہو رہی تھیں وہاں ہشاش بشاش چلبلی صداؤں سے فضا گونج اٹھتی ہے۔ اور پل بھر میں سب کچھ رقص ہی رقص بن جاتا ہے۔ حقیقی معنوں میں رقص — صحت، تندرستی اور بشاشت کا رقص جس سے دل کے کنول خود بخود کھل جاتے ہیں۔ وہ اگلے دنوں کے پھاگن میں ہولیوں کے رنگا رنگ پروگرام تو قصّہ پارینہ ہو چکے۔ ہنسی خوشی کے ناچ کا اب تو اور نقشہ ہے۔ بہار آنے پر اب تو زندگی آتی ہے۔ جس کی عین علامت یہ صحت و حسن کی رانی — ایک کھلکھلاتی، اٹکھیلیاں کرتی ہوئی حور تھی اور اس کے وہ معصوم پیارے پیارے ساتھی' متعدد پھریاں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ناچ ایک سنگت بن جاتا ہے وہ پریاں ناچتی ہیں، رانی ناچتی ہے اور ماں بھی — بچی کے پھر سے پلٹ کر زندگی کی طرف آنے پر خوشی کی ترنگ میں خدا کا شکر ادا کرنے کے لئے والہانہ رقص کرتی ہے اور اس طرح ساری کی ساری ٹولی ناچنے لگتی ہے۔

یہ دیکھتے ہی دیکھتے ذہن کچھ اور راہوں پر ہو لیا۔ کچھ اور ہی سوچنے لگا۔ کیا کھیل ہے — کھیل کا کھیل اور کام کا کام۔ مشغلہ کا مشغلہ اور فائدہ کا فائدہ۔ اگر زندگی اور فن کا یوں تال میل ہو جائے تو کیا کہنے۔ اور یہ سچ پوچھئے تو ان میں فصل بھی کیا ہے۔ ان کا ساتھ تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ تو وہ بڑے بڑے شمس شاعر' فن کار یا فلسفی ہیں جو ان کو الگ الگ خانوں میں بانٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ اور یونہی فن اور افادیت کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دیتے ہیں۔ آخر فن کسی نہ کسی رنگ میں ہیلتھی ہی تو ہے۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ اسے کوئی ایسی چیز معلوم نہ ہونے دیا جائے۔ کوئی بات ہو' اسے سلیقہ سے پیش کر دیجئے' وہ فن ہے۔ اس کی کامیابی اسی میں ہے کہ اسے ٹھیک طرح پیش کیا جائے۔ اب یہ صحت و حسن کی رانی کا جو نقشہ پیش کیا گیا۔ اس سے زیادہ پر لطف چیز اور کیا ہو گی؟ خدا کرے ہمارے ملک میں ایسی لاکھوں پریاں آئیں تاکہ اس میں ہر جگہ خوشی اور مسرت ہی کا رقص نظر آئے۔

اور ایسے نکتے' ایسی باتیں کیا کچھ نہیں جن کو فن کے جادو سے کچھ کا کچھ بنا دیا جائے۔ دیکھنے والوں کو بہت کچھ سمجھا یا بھی جائے اور راہ پر بھی لایا جائے یہ فن اور تمثیل تو وہ چیز ہے جو خاک کے ڈھیر کو بھی اکسیر بنا دیتی ہے۔ معمولی سے معمولی بات میں وہ جادو جگا دیتی ہے کہ کیا کہنے۔

ہوں! میں بھی ان شمس فیلسوفوں کی طرح کن سوچوں میں جا پھنسا۔

مگر خیر تماشہ دیکھئے:۔

پردہ گرنے کے بعد پھر اٹھا اور بات بدل گئی۔ اور بات کے ساتھ نقشہ بھی۔ یہ رہا "وہم" — وہ نامراد چیز جو بڑوں بڑوں کو لے بیٹھتی ہے۔ مراق، مالیخولیا جس سے ارسطو اور فلاطون بھی نہ بچ سکے! ٹھیک ہی کہا تھا کسی نے۔ ع

بدگماں وہم کی دارو نہیں لقمان کے پاس

دیکھئے وہم اھساس کے شکار وہمی کے کرشمے۔ اپنی اور سب کی زندگی حرام کر دی ہے اور پھر ساری بات کس سلیقے سے ادا کی گئی ہے کہ ہم پارٹ ادا کرنے والوں کے کمال کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے — آخر یہی تو فن ہے جس کا ڈھنڈورا ہمارے نقاد پیٹتے ہیں۔ اور غلط طور پر پیٹتے ہیں۔ فن تو محض ہنر مندی کا دوسرا نام ہے۔ کوئی کام اچھی طرح' ڈھب سے کیا جائے تو وہی فن ہے۔

لو یہ تو بات بتانا تو میں بھول ہی گیا۔ یہ سب کیا دھرا لڑکوں کا نہیں لڑکیوں کا ہے۔ اس لئے کھیل لڑکیوں کا کہئے۔ یہ سب بھیس بھرنے بہروپ اختیار کر لے اور فن کو زندگی کے ڈھرے پر لگانے' اس کے کام میں لانے کا دلچسپ خیال۔ آخر صنفِ نازک ہی کے جو نہالِ لطیف ذہن اور لطیف دل و دماغ ہی کو سوجھا جو خدمتِ خلق کے کاموں میں ہمیشہ پیش پیش رہی ہے۔ یہ رہی ایک اسکول کی لڑکیاں اور ہیضہ کا سوانگ۔ اگر اب بھی سمجھنے والے نہ سمجھیں اور ہیضہ بھی شرم سے پانی میں جا کر ڈوب مرے تو افسوس ہے۔!

خیر اب زکام کی بھی گت بنتے دیکھ لیجئے۔ جو ہمیشہ ہم انسانوں ہی کی گت بناتا ہے۔ پھر لڑکیاں ہی لڑکیاں۔ مونچھوں ڈاڑھی سے آراستہ پیراستہ تاکہ کسی نہ کسی طرح اتنے بڑے شاعر کی لاج رکھ لیں جس کا نام ہی غالب تھا — اور لڑکیاں ہوتے ہوئے بھی کھیل کو لڑکوں کا کھیل بنا دیں۔ بعض ڈاکٹر کا پارٹ ادا کریں۔ مونچھ لگانے والی نے کس طمطراق سے مونچھ لگائی ہے کہ دھوکہ ہو اور بھرپور دھوکا۔ بڑی بی کا حال اور پوشاک در پوشاک کے ساتھ ہی ساتھ اس کے گھر کا نقشہ بھی دیکھتے جائیے۔ اگر ایسے میں گھر گھر بیماری نہ پھیلے تو اور کیا ہو۔ ہم لوگوں نے بھی تھوکنے کو ایک فنِ لطیف کا درجہ دے رکھا ہے۔ جہاں دیکھئے سادہ زہر کار یعنی سادہ تھوک اور پان کی رنگین تھوک کی پچکاریوں پر پچکاریاں جن سے یادش بخیر ہولیوں کی رنگ آرائیاں اور گلکاریاں بھی مات ہو جائیں — اب اور نہیں تو

ان ہونہار لڑکیوں نے جا بجا تھوکتے پھرنے کی جو درگت کی ہے اس سے سبق حاصل کر کے اس عادت کو خیرباد کہہ دیں جو ہم سب کے ماتھوں پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ خدا کے لئے اب اگر آپ کو ہمارے اس کہنے پر غصہ بھی آئے تو مت تھوکئے —— !

اگر ان چونچال اور ہونہار لڑکیوں نے تپ دق، ہیضہ، زکام وغیرہ کو یوں دھتا بتائی اور اپنے یہاں کے بڑے صاحبوں، بڑے بھائیوں اور بڑی بیوں کو سمجھ مت دی اور تمیز یا سگھڑاپا سکھایا۔ تو پھر "ماتا رانی" کو کیوں چھوڑا جائے —— لگے ہاتھوں اس کے ساتھ بھی دو دو ہاتھ ہو جانے چاہئیں جبھی بات بنتی ہے۔ یہ بھی کیا یاد کرے گی کہ کسی نے اس کو یوں آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

یہ تو ہے: مگر کون ہے جو اس دلچسپ مشاعرے کی داد نہ دے —— اگر اس کھیل یا تفریح کو جو ایک قومی شغل اختیار کر چکا ہے فن کے مصرف میں نہ لایا جاتا تو یہ ان ذہین لڑکیوں کے فہم رسا میں بہت بڑی کمی ظاہر کرتا مگر انہیں داد دینی چاہئے کہ قومی خدمت کی خاطر اس اہم ذریعہ سے کام لینا نہیں بھولیں۔ واللہ! کیا مشاعرہ تھا۔ وہ داد وہ داد کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔ اور اگر ہمارے کاشانہ فن کی چھتیں بہت ہی مضبوط نہ ہوتیں تو وہ کبھی کی اڑ چکی ہوتیں۔ اور داد شاید بے داد کی صورت اختیار کر لیتی، جیسی کہ ان کیڑے مکوڑوں کے سلسلے میں اس نے واقعی اختیار کی —— یہ مچھر، یہ مکھیاں، یہ پسّو، بھی کیا یاد کریں گے کہ کبھی یہ انسان بنے تھے۔ اور شاید اب آئندہ کے لئے "انسان" بن جائیں گے اور اپنے ساتھ سچ مچ کے انسانوں کو بھی "انسان" بنا دیں گے۔ کیونکہ وہ ان کیڑے مکوڑوں کی چال ڈھال، طور طریق اور کام کاج کو سمجھ کر صحیح روش اختیار کریں گے۔ کیا خوب کہا حضرت مچھر نے جن کی شبیہہ مبارک اعلان کے خطرہ کی علامت کے طور پر ایک بھیس بھرنے والی لڑکی کی دوپلی ٹوپی پر نقش تھی:

ہیں غضب میری جنگ کی چالیں
کام کیا دیں لحاف کی ڈھالیں

میں نے تن تن کرتے ہوتے تار کے ساتھ بھنگوں کے اس "تان سین" کا بھن بھن کرتا ہوا راگ —— بالکل راگ سنا اور اب تک اس کا نقشہ نظروں میں گھوم رہا ہے۔ اس کی بھنبھناتی راگنی کانوں میں گونج رہی ہے۔ کیا اس البیلے "جیون ناٹک" کا کمال نہیں؟

تو میں یہ خواب نما نقشہ یہ ناٹک دیکھتا ہی رہ گیا اور سوچتا ہی رہا بلکہ اب تک سوچتا رہا ہوں۔ کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ ایسی باتیں ہوں اور ہوتی رہیں۔ یہ کھیل، یہ تماشہ — لڑکوں کے تماشے ہی سہی — جو ہمارے کام آئیں، ہماری زندگی کو بہتر بنائیں اور ہمارے ملک کو ایک سچ مچ کی جنت؟ اگر فن کو اس طرح حیات کا ساتھی اور ساجھی بنا دیا جائے تو کیا کہنے۔ اس تجربے کو حکمت عملی یا خواب و خیال کی بات کہہ کر نہیں چھوڑ دینا چاہئے۔ بلکہ اس سلسلہ کو آگے بڑھانا چاہئے —— اور آگے، اور آگے۔ ہاں یاد آیا۔ اس کھیل میں کچھ دلچسپ بڑے بڑے پوسٹروں کی بھی جھلک دکھائی دی۔ جنہوں نے ناٹک میں تصویروں اور کارٹونوں کا روپ دھار لیا تھا۔ یہ بھی خوب ہے۔ مشغلہ کا مشغلہ اور فائدہ کا فائدہ۔ وہی بات آم کے آم گٹھلیوں کے دام اور اگر اس مقصد کے لئے جا بجا اچھے اچھے ادارے قائم ہوں جو بے لوث غرض کام کریں اور ایسے مفید کھیل تماشوں کا اہتمام کریں تو پھر کیا چاہئے۔ کہنے والے چاہے کچھ کہیں ہم تو یہی کہیں گے کہ —— اللہ کرے جوش عمل اور زیادہ۔

حق یہ ہے کہ صحت اور صفائی کسی ایک شخص کے فائدے کی چیز نہیں ہم سب کے ساجھے فائدے کی چیز ہے۔ جتنا گڑ ڈالو اتنا ہی میٹھا۔ اس میں بچے بوڑھے، بڑوں، عورتوں مردوں، افراد، کنبوں، قوم سب کو مل کر حصہ لینا چاہئے۔ اور پھر اس قدر بنیادی اہمیت رکھنے والے کام میں تاجر، صنعت کار، اہلِ تعلیم، قانون و انصاف، نظم و نسق یہ سب پرے کیوں ہٹے رہیں؟ یہ کیوں نہ اس میں حصہ لیں اور زیادہ سے زیادہ حصہ لیں؟ اس حرکت میں تو زیادہ سے زیادہ برکت ہے۔ کیوں نہ دودھ بیچنے والا گوالا دودھ دے۔ اور ایسے ہی اپنے طور پر زندگی کو بہتر بنانے میں حصہ لے جو اس کی اپنی بھلائی اور خوشی کا باعث بھی ہے۔

اب آپ اسے خواب سمجھئے یا حقیقت —— سچ مچ کی بیتی ہوئی کا آنکھوں دیکھا حال یا ایسی چیز کا تصور جو ممکن ہے۔ آپ کے حسن تصور پر منحصر ہو بہرکیف کھیل اور دیدۂ بینا کی اہمیت سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔

آزادی کا فیضان

(ترقیاتی جائزہ)

ایم، ایچ، مسعود بٹ

ہمارے ملک کے اقتصادی اور معاشی انتظام کو جس نئے قالب میں ڈھالا جا رہا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ آئندہ چل کر ہمارا ملک ترقی کی اس شاہراہ پر آجائے گا جہاں دنیا والے کسی ملک کی طاقت کا اندازہ آبادی یا رقبہ سے نہیں لگاتے بلکہ دھوئیں کے ان اٹھتے ہوئے بادلوں سے لگاتے ہیں جو کارخانوں ملوں اور فیکٹریوں سے اٹھتا ہے یا اس تیل اور پٹرول سے جو ان ملکوں کے کارخانوں کی مشینوں کو حرکت میں لاتا ہے یا برقی قوت کی فراوانی سے جس سے ایندھن کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ ان کے علاوہ ان ماہروں، سائنسدانوں، انجنیروں، مشین سازوں، مستریوں اور مزدوروں کی کثرت سے لگاتے ہیں جن کے بغیر نہ کارخانے چل سکتے ہیں نہ ریل گاڑیاں، پل، سڑکیں یا عمارتیں تعمیر ہو سکتی ہیں اور نہ آلاتِ حرب بن سکتے ہیں۔

پاکستان کی صنعتی ترقی کے پچھلے تیرہ برس کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بعض مرتبہ ایسے حوصلہ شکن حالات رونما ہوئے جن سے ترقی کی رفتار رکتی ہوئی نظر آئی اور بعض دفعہ سازگار حالات میں ترقی کی رفتار میں معتدبہ اضافہ ہوا۔ مگر بحیثیتِ مجموعی دیکھا جائے تو بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ صنعت و حرفت کے میدان میں ہم نے بڑی حد تک اطمینان بخش کام کیا ہے۔ کیونکہ ملک میں نئی نئی صنعتیں قائم ہوئیں اور آج ملک کے دونوں حصوں میں کئی کارخانے، ملیں اور فیکٹریاں کپڑا بنانے، سیمنٹ تیار کرنے، دیاسلائی بنانے، کاغذ تیار کرنے، جوٹ بیلنے، چائے تیار کرنے، انجنیرنگ کا سامان بنانے، برقی قوت فراہم کرنے اور پٹرول اور گیس کی نکاسی کے لئے دن رات کام کر رہی ہیں۔

۱۹۴۷ء سے پہلے کپاس بیلنے کے چند کارخانوں اور شکر تیار کرنے، کپڑا بننے اور سیمنٹ تیار کرنے کے ایک ایک دو دو کارخانوں کے علاوہ جو پاکستانی علاقوں میں تھے باقی تمام کارخانے، فیکٹریاں اور ملیں ہندوستان میں واقع تھیں۔ پاکستانی علاقوں کی یہ خطرناک پس ماندگی انگریزی حکومت کی اس عیارانہ حکمت عملی کا نتیجہ تھی جس سے برطانوی افواج کے لئے سپاہی حاصل کرنا مقصود تھا حالانکہ سندھ اور پنجاب کے ان حصوں میں جو آج مغربی پاکستان میں شامل ہیں اور مشرقی پاکستان، تمباکو، نیشکر اور چمڑہ بہ افراط ہوتے ہیں۔

دراصل حکومتِ برطانیہ کا منشا ہی یہ تھا کہ مسلمان اکثریت کے یہ علاقے زرعی پیداوار کے لئے مخصوص کر دیئے جائیں۔ بیشتر صنعتی کارخانے پاکستانی حدود سے باہر قائم کئے گئے، تاکہ یہ لوگ ہمیشہ دست نگر رہیں اور ان کی محنت کا ثمر دوسرے اٹھائیں۔ چنانچہ ہندوستان میں کپاس کی کل ۴۵۱ فیکٹریاں تھیں جن میں سے سولہ پاکستان کے حصہ میں آئیں۔ جوٹ کے ۹۱ کارخانوں میں سے ایک بھی ہمارے حصہ میں نہ آیا۔ شکر سازی کے ۱۶۰ کارخانوں میں سے صرف ۹ ہمارے ان علاقوں میں تھے۔ لوہے اور فولاد کے ۳۵ چھوٹے بڑے کارخانوں میں سے ایک بھی پاکستان کے حصہ میں نہ آیا۔ سیمنٹ کے ۱۸ کارخانے تھے جن میں سے صرف پانچ ہمارے حصہ میں آئے۔ کاغذ سازی کے ۲۱ کارخانوں میں سے ہمارے حصہ میں کوئی نہ آسکا۔ شیشہ سازی کے ۱۴۵ کارخانوں میں صرف چار پاکستانی علاقے میں تھے جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ پاکستان ۱۴۲۱ فیکٹریوں میں سے صرف ۳۴ فیکٹریاں مل سکیں۔ ان تمام فیکٹریوں میں مزدوروں کی تعداد ۱۱ لاکھ ۳۶ ہزار تھی لیکن پاکستانی مزدوروں کی تعداد ½ ۲۹ ہزار کے لگ بھگ تھی بہت سی ایسی صنعتیں بھی تھیں جن کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ تھا۔

بڑی صنعتوں کی حالت بہت خراب تھی لیکن چھوٹی صنعتوں کی حالت قدرے بہتر تھی کیونکہ ۱۴۵۶۹ فیکٹریوں میں سے ۱۴۰۶ فیکٹریاں پاکستان کے حصہ میں آئیں جن میں ۲۰ ہزار مزدور کام کر رہے تھے۔ اس افراتفری کے عالم میں جب ملک ایسے بحران سے گذر رہا تھا ملک کی تعمیری اساس پر غور و خوض شروع ہوا۔ منصوبہ بندی کا دور آیا اور زراعت پر خاص توجہ دی گئی۔ ملک کے معدنی ذخائر کا جائزہ لینے کے لئے تجاویز زیرِ غور آئیں۔ پن بجلی کے ترقیاتی منصوبے بنائے گئے تاکہ ایندھن کی کمی کو پورا کرنے کی کوئی نئی راہ تلاش کی جائے۔ ریلوے، ٹیلی فون، تار اور اسلحہ کو بھی مدنظر

رکھا گیا۔ پہلے پانچ سالہ منصوبہ میں دس ارب اسی کروڑ روپیہ کی لاگت کا عظیم پروگرام مرتب کیا گیا جس سے سوتی کپڑوں کی صنعت نے سب سے زیادہ ترقی کی۔ ترقی کی رفتار کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ ۱۹۵۹ء تک اس صنعت پر ایک ارب روپیہ صرف کیا گیا، جس میں ڈیڑھ لاکھ افراد کام کرتے تھے۔ ہمارے سوتی کارخانوں میں ۸۰ کروڑ پونڈ کپڑا تیار ہوتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۰ء کے مالی سال میں بیس کروڑ روپے کی لاگت کا سوتی دھاگہ اور کپڑا دساور بھیجا گیا جس سے زرِ مبادلہ مہیا کرنے میں بڑی آسانی ہوئی۔ ملک بھر میں ۸۰۰۰۰ پاور لوم کام کر رہے تھے جو فیکٹریوں اور کارخانوں میں دن رات کپڑا بن رہے تھے۔

بہر حال کھڈیوں کی تعداد کا اندازہ پانچ لاکھ کے لگ بھگ ہے جس سے نہ صرف ہم خود کفیل ہو رہے ہیں بلکہ دوسرے پنج سالہ منصوبہ کے بعد کافی کپڑا دوسرے ممالک بھیجنے کے قابل ہو جائیں گے۔

پچھلے برسوں میں اونی کپڑا ہمیشہ دساور سے منگایا جاتا تھا لیکن اب کئی کارخانے کام کر رہے ہیں چنانچہ پچیس ہزار سات سو تکلے ۳۵ لاکھ پونڈ مال تیار کر رہے ہیں۔ اگر ان کارخانوں کو اچھی طرح چلایا جائے تو ۵۲ لاکھ پونڈ مال تیار ہو سکتا ہے۔ ملکی ضروریات کے لئے چالیس لاکھ پونڈ مال کی ضرورت پڑتی ہے۔ پہلے ہماری کچے اون کی پیداوار تقریباً ۲ کروڑ ۸۰ لاکھ پونڈ سالانہ تھی۔ ۶۰ لاکھ پونڈ کچا اون قبائلی مہیا کرتے تھے پہلے یہ اون دساور بھیجا جاتا تھا لیکن اب ملک کے سترہ اونی کارخانوں میں کمبل بنانے، اونی کپڑا بننے اور دوسری ضروریات پوری کرنے میں استعمال ہوتا ہے۔ اب ہم ایسے مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ اونی کپڑے کو بیرونی ممالک میں بھیج سکیں۔

اسی طرح ریشم سازی کی صنعت کو بھی فروغ حاصل ہوا چنانچہ اس وقت ۲۰۶ فیکٹریاں کام کر رہی ہیں جن میں آٹھ ہزار لوم کپڑا تیار کرتے ہیں۔ اس صنعت کو اکثر دھچکا لگتا ہے کیونکہ اس کے لئے خام مال دساور سے منگایا جاتا ہے۔ پارچہ بافی کی اس صنعت کے علاوہ کئی اور چھوٹی موٹی صنعتیں ہیں جن میں قالین سازی اور ہوزری قابلِ ذکر ہیں۔ اس صنعت کی ترقی میں پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کو بہت اہم حیثیت حاصل ہے۔

زرِ مبادلہ کمانے کے لئے پٹ سن کی صنعت ہماری سب سے زیادہ نفع بخش صنعت ہے۔ قیامِ پاکستان کے وقت اگرچہ مشرقی پاکستان میں سب سے زیادہ پٹ سن ہوتا تھا لیکن وہاں ایک بھی ایسا کارخانہ نہ تھا جس سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ یہ دیکھتے ہوئے پاکستان کی صنعتی ترقیاتی کارپوریشن نے کافی کارخانے قائم کئے چنانچہ اب چودہ فیکٹریاں ہیں جن میں آٹھ ہزار چالیس لوم کام کر رہے ہیں۔ ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ۱۹۵۲ء میں ۳۰۵ ہزار ٹن کے لگ بھگ سامان تیار ہوا لیکن ۱۹۵۸ء میں ایک لاکھ بہتر ہزار ٹن سامان بنایا گیا اور ۱۹۵۹-۶۰ء میں دو لاکھ پچاس ہزار ٹن سامان تیار ہوا جس میں سے دو لاکھ ٹن کے لگ بھگ باہر کے ملکوں کو فراہم کیا گیا۔

ملک کی تعمیر میں سیمنٹ کا بڑا حصہ ہے مغربی پاکستان میں جہاں چونے کا پتھر، جپسم اور قدرتی گیس میسر آتی ہے، سیمنٹ کے کارخانے قائم ہوئے ان سے سیمنٹ کی مقدار میں اضافہ ہوا اور ۱۹۵۴ء میں چھ لاکھ بہتر ہزار ٹن سیمنٹ تیار کیا گیا۔ ترقی کی اس رفتار کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ ۱۹۵۹ء میں دس لاکھ ٹن سیمنٹ تیار ہوا۔ جوں جوں ملک میں تعمیری منصوبے تیار کئے جا رہے ہیں سیمنٹ کی کھپت بڑھتی جا رہی ہے۔

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد پٹرول کی صرف دو کمپنیاں کام کر رہی تھیں۔ حکومت نے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے اسٹینڈرڈ ویکوم آئل کمپنی میسرز این ای ہنٹ۔ ڈبلیو ایچ ہنٹ۔ سی ایچ ہنٹ۔ بیار ہنٹ۔ اور پاکستان شیل آئل کمپنی لمیٹڈ سے معاہدے کئے۔ اور تیل، پٹرول اور گیس کے ذخائر کا پتہ چلانے کے نئے کام ہونے لگے۔ سوئی گیس اور سلہٹ گیس سے مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے صوبوں کی قسمت جاگ اٹھی۔ اس طرح ایندھن کی کمی کا مسئلہ ہی حل نہیں ہوا بلکہ کارخانوں کو چلانے اور برقی قوت کو فراہم کرنے کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ مغربی پاکستان میں سوئی گیس کے ذخائر کا اندازہ چھ ہزار ارب مکعب فٹ ہے۔ ماڑی کے مقام پر یہ ذخیرہ ساڑھے تین ہزار ارب مکعب فٹ کے لگ بھگ ہے۔ علاوہ ازیں اوچھ کے مقام پر ساڑھے دو ہزار ارب مکعب فٹ، ڈھلوتی میں ایک ہزار سات سو ارب مکعب فٹ، خیرپور میں دو سو پچاس ارب مکعب فٹ، کھانڈ کوٹ میں دو سو ارب مکعب فٹ، زین میں ایک سو ارب مکعب فٹ اور ایک مقام مزارانی میں تیس ارب مکعب فٹ قدرتی گیس کے ذخائر موجود ہیں۔

چائے کی صنعت مشرقی پاکستان میں سلہٹ، چٹاگانگ اور سپرا کے پہاڑی علاقوں میں ہوتی ہے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء تک چائے کی سالانہ پیداوار پانچ کروڑ چالیس لاکھ پونڈ تھی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۱۹۶۵ء تک یہ مقدار بڑھ کر ساڑھے چھ کروڑ پونڈ ہو جائیگی۔

شکر سازی کی صنعت کا انحصار صرف آٹھ کارخانوں پر تھا ان میں تین مغربی پاکستان اور پانچ مشرقی پاکستان میں بحیثیت مجموعی سالانہ ۲۵ ہزار ٹن کے لگ بھگ پیدا کرتے تھے۔ جب نئے کارخانے کھلے تو یہی مقدار بڑھ کر دو

لاکھ ۳۵ ہزار ٹن ہوگئی۔ آج ان کارخانوں میں دو لاکھ ٹن سے زیادہ شکر بنانے کے منصوبے زیر تکمیل ہیں۔ یہ صنعت بڑی تیزی سے ترقی کے منازل طے کر رہی ہے اور قوی امید ہے کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب یہ ملک کی ضروریات کی کفیل ہو جائے گی۔

تمباکو کی صنعت کو جو فروغ حاصل ہوا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے کیونکہ ۱۹۵۹ء میں چار ارب ستر کروڑ سگریٹ تیار کئے گئے اور ۱۹۶۰ء میں نو ارب۔ اسی طرح سمندری نمک، بناسپتی گھی، کاغذ سازی، جہاز سازی، لکڑی کے کام، چمڑہ سازی، ربڑ کی مصنوعات، کیمیاوی سامان، رنگ سازی، تیل صاف کرنے، ظروف سازی، انجنیئرنگ کے سامان تیار کرنے، بجلی کا سامان بنانے، ذرائع نقل و حمل کا سامان تیار کرنے، پٹ سن بیلنے، کپاس بیلنے، کھیلوں کا سامان تیار کرنے، فن جراحی کا سامان بنانے، زرعی آلات تیار کرنے کے علاوہ کئی چھوٹی بڑی صنعتوں کی داغ بیل پڑی اس سلسلہ میں ہمارے پنج سالہ منصوبہ کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔

انقلابی حکومت سے ماقبل دور کا سرسری جائزہ لیا جائے تو بعض ایسی باتیں سامنے آتی ہیں جن سے ملک کی تعمیر کے وہ ارادے جن کی اساس صنعتی منصوبوں پر تھی، ناکامیوں کے دلدل میں پھنسے ہوئے نظر آتے ہیں اور تعمیر کا وہ جذبہ جس نے پاکستان کو وجود میں لانے کی کوشش کی تھی، سرد پڑتا ہوا نظر آتا ہے لیکن ہماری موجودہ حکومت نے ایسی چنگاری کا کام کیا جس سے ایک دفعہ پھر وہ حوصلے جو پست ہو رہے تھے نئی امنگوں اور نئے ارادوں سے ہم کنار ہوئے اور آج ملک کے اقتصادی و معاشی نظام کو نئے قالب میں ڈھالنے کے لئے جہاں قومی جذبات کا عمل و دخل ہے وہاں دوسرا پنجسالہ منصوبہ کئی ایک باتوں کے باوجود ملکی معیشت میں ایک نئی روح پھونکتا ہوا دکھائی دیتا ہے کیونکہ ۱۹۶۵ء تک سات ہزار نئے پاور لوم لگائے جائیں گے تاکہ کپڑا ملک کی ضروریات سے زیادہ پیدا ہو سکے، پٹ سن کی صنعت میں کافی ترقی کی جائیگی اور مصنوعات کی پیداوار بڑھ کر تین لاکھ اسّی ہزار ٹن ہو جائیگی تاکہ دو لاکھ نوّے ہزار ٹن دوسرے ملکوں کو بھیج کر زرِ مبادلہ فراہم کیا جا سکے۔ آرٹ سلک اور دیگر کپڑے کی صنعتوں میں ترقی کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔

چمڑہ سازی، لکڑی کے کاموں، کاغذ کی صنعت اور چمڑے کی دیگر مصنوعات کی ترویج و ترقی میں دوسرے پنج سالہ منصوبہ میں کافی گنجائش موجود ہے۔ رنگ بنانے کے لئے ایک فیکٹری داؤد خیل میں تین سو ٹن سلفرک اور ڈھائی سو ٹن کا سٹک سوڈا تیار کر رہی ہے جس سے ایک سو تیس ٹن دیگر اقسام کے رنگ بھی تیار کئے جائینگے۔ نوشہرہ میں بھی رنگ سازی کا ایک کارخانہ زیر تعمیر ہے جس میں دو سو پچاسی ٹن سے لگ بھگ رنگ تیار ہونگے۔ مشرقی پاکستان میں بھی ایک کارخانہ بنانے کا انتظام کیا جا رہا ہے تاکہ ملک کا یہ حصہ بھی اپنی ضروریات کا کفیل ہو سکے۔

ادویات کے کارخانے بھی زیر تعمیر ہیں تاکہ بیماریوں کا استیصال اور وباؤں کی روک تھام کی جا سکے۔ تیل صاف کرنے کا ایک کارخانہ کراچی میں زیر تکمیل ہے۔ سیمنٹ کی پیداوار میں بھی اضافہ کیا جائیگا۔ کیونکہ تعمیر و ترقی کے تمام شعبوں میں اس کی بڑی ضرورت ہے۔ فولاد کے کارخانے بھی بنائے جائینگے تاکہ پلوں کی تعمیر، منصوبوں کی تکمیل اور عمارات بنانے میں زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکے۔ جہاز سازی، انجنیئرنگ کا سامان بنانے، کھیلوں کے سامان تیار کرنے، فن جراحی کا سامان، فلمی صنعت، کھاد تیار کرنے، کوئلہ نکالنے، معدنیات کو زمین سے کھود کر نکالنے، پرزے بنانے غرضیکہ ملک کو استحکام بخشنے اور عوام کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں بہم پہنچانے کے منصوبوں پر تیزی سے کام ہو رہا ہے۔

انقلابی حکومت کے دو سالہ دور میں صنعتی و معاشی امور میں جس تیزی سے کام ہو رہا ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ پاکستانی صنعت ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہے۔ آج ہماری ملوں کا کپڑا انگلستان اور یورپ کی منڈیوں میں نہ صرف اپنا مقام حاصل کر چکا ہے بلکہ پٹ سن کی مصنوعات مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں ہر دلعزیز ہو رہی ہیں۔ کھیلوں کا سامان جہاں دنیا کی مختلف منڈیوں میں پہنچتا ہے وہاں فن جراحی کا سامان انگلستان میں خاص طور پر مقبول ہے۔ اس ترقی کے باوجود دوسرے پنج سالہ منصوبہ کو کامیاب بنانے کے لئے انتہائی محنت ہی نہیں بلکہ غیر ملکی سرمایہ کی بھی ضرورت ہے جس کے بغیر ممکن ہے ہمارے وہ ارادے پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکیں پھر بھی بظاہر بہت بہتر نتائج کی توقع ہے۔ یقین ہے کہ جس سرگرمی و مستعدی سے کاروبارِ ملک کو سرانجام دینے کی کوشش کی جا رہی ہے اس سے ہمارا اقتصادی اور معاشی نظام جلد ہی ایک ایسی راہ اختیار کرے گا جس پر ہماری آئندہ نسلیں فخر کر سکیں۔

لہو ترنگ : —— بقیہ صفحہ ۱۸

ملکہ عالیہ، سالہا سال کی دوری کے گلے دُور ہوئے
زخم بھرنے لگے تنہائی کے، مجبوری کے
قوم آزاد ہوئی، صاحبِ اقبال ہوئی
عالیہ کی آواز: کشورِ پاک جو زندہ ہے تو ہم زندہ ہیں
پہلی آواز: کشورِ پاک، یہ نوخیز، یہ نو کار وطن
اپنے خوابوں کا امیدوں کا جہاں ہے گویا
کوئی عفریت: اب آئیگا ان شہروں میں
اب نہ وہ سحر زدہ لوگ نہ ویران قریے
سانس لینے لگی اللہ کی محبوب زمیں
ملکہ عالیہ: زندگی کچے گھروندوں میں جنم لیتی ہے
چاند لہراتا ہے پدما کی حسیں لہروں میں
کتنا پُر نور نظر آتا ہے اپنا ڈھاکہ!
سراج الدولہ: سامنے کون چلا آتا ہے؟
ملکہ عالیہ: عالیہ دیکھ تو یہ کون ہے آہستہ خرام
عالیہ: خوں میں ڈوبا ہوا پیراہن ہے!
سراج الدولہ: کوئی میدان پلاسی کا جگر دار نہ ہو
کوئی خوش بخت شہید
ملکہ عالیہ: میرے سرتاج انہیں بڑھ کے ملیں

عالیہ: آج آئے ادھر یہ سر وقتیں اپنی روحیں
سراج الدولہ: عالیہ تم انہیں پہچانو تو
عالیہ: سرو قد، برق نظر، خستہ بدن
ملکہ عالیہ: فخرِ دنیا، فخرِ دیں، فخرِ وطن!
(دور سے آواز آتی ہے) آپ کا خادمِ دیرینہ، مدن
سراج الدولہ: میر جی آئیے نا، آئیے ——
ملکہ عالیہ: چچا جان پاس ادب سے نہیں آگے آتے
سراج الدولہ: میر جی آئیے، یہ آپ ہی کی بیٹیاں ہیں
آپ سے پردہ نہیں
میر مدن: آج سرکار کدھر آنکلے؟
سراج الدولہ: یونہی آوارہ خرامی کے لئے
چاندنی رات میں سیرِ دریا
بازدیدِ در و بامِ ڈھاکہ
میر مدن: زندگی آئی گئی اب تو کنارِ دریا
سراج الدولہ: گیت مانجھی کا سنیں آپ ذرا
(پس منظر میں مانجھی کی آواز ابھرتی ہے)
نیا باندھو رے کنارِ دریا
نیا باندھو رے کنارِ دریا

روزانہ زندگی کا اہم جزو.....

گھر ہو یا دفتر، زندگی اور حرکت کا ہمیشہ سے ہی ساتھ رہا ہے۔ اس دور میں میل دھول سے محفوظ رہنا آپ کے لئے کبھی بھی ممکن نہیں۔
یاد رکھئے جہاں میل دھول ہوگا وہاں جراثیم ضرور پیدا ہوں گے۔ لائف بوائے صابن نہ صرف تمام گندگی نہایت صفائی سے دھو ڈالتا ہے۔ بلکہ تھکاوٹ اور بے چینی کا احساس بھی دور کر دے گا۔
لائف بوائے سے ایک غسل نہ صرف آپ کی حفاظت کرتا ہے۔ بلکہ آپ کے جسم میں نئی زندگی اور نئی تازگی کا احساس بھی پیدا کر دیتا ہے۔

لائف بوائے صابن سے غسل

LIFEBUOY
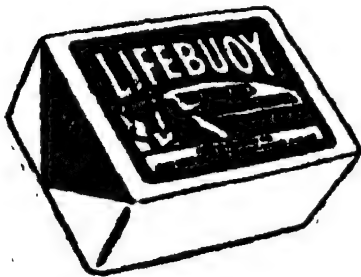
صحت مندی اور تروتازگی کے احساس کیلئے

سحر کے جلو میں : بقیہ صفحہ ۵۰

اور پھانسی کی تاریخ مقرر کردی گئی: ۲۵ مارچ ۱۹۵۶ء۔

شیر خاں اور راجو سے آخری بار ملنے آئے۔ شیر خاں کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ لیکن راجو کا اعتماد ویسے ہی غیر متزلزل رہا۔ اور وہ یہی کہتی رہی کہ "میرا دیر زندہ رہے گا"

راجہ کے لیے یہ فقرہ اب جھوٹی تسلی سے بڑھ کر کیا معنی رکھتا تھا۔ دادرسی کے تمام معلومہ دروازے بند ہو چکے تھے اور تیسری صبح اسے پھانسی دی جانے والی تھی۔ وہ ہاری ہوئی سی مسکراہٹ کے ساتھ مسکرایا! جیسے کہہ رہا ہو "میری بہن! اب تو موت دہلیز پہ آ بیٹھی ہے، صرف تین روز باقی ہیں"۔ لیکن راجو کی آنکھیں خشک تھیں اور چہرے پر ذرہ بھر تبدیلی نہیں تھی۔ بولی "پروردگار کی ذات اتنی بے رحم تو نہیں.... "شیر خاں ملاقات کے دوران راجہ کا ہاتھ پکڑ کے روتا ہی رہا۔

دوسرے ہی دن زنداں کی فضا میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ یہ کیسی دھماچوکڑی تھی۔ ہر کوئی خوش نہال نہال تھا۔ سرکاری اطلاع آگئی تھی کہ قیامِ جمہوریہ کی خوشی میں قیدیوں کی نصف سزائیں معاف کردی گئی ہیں اور سزائے موت عمر قید میں تبدیل کردی گئی ہے!

۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کی صبح راجہ کو پھانسی کی کوٹھڑی سے نکال لیا گیا اور اس کی عمر قید شروع ہو گئی۔ وہ سزا کے ساڑھے تین سال پھانسی کی کوٹھڑی میں ہی گذار چکا تھا۔ اسی سال سیلاب کے سلسلے میں قیدیوں کو باہر بھیجا گیا جن میں راجہ بھی تھا۔ ان قیدیوں کی سزاؤں میں معافیوں پر معافیاں ملتی رہیں۔ اس نے جیل میں کئی بار خون بھی دیا تھا جس کے عوض اسے ایک اور معافی ملی۔ پھر وہ کھلاڑی بھی تھا اور خاص طور پر ٹھیک رہا۔ ان تمام باتوں نے اسے اور معافیاں دلائیں۔

جون ۱۹۵۹ء کی دوپہر تھی جب راجہ مجھے اپنی کہانی سنا رہا تھا۔ اس نے میرے زانو پہ زور سے ہاتھ مار کر کہا "یہ تھا ایک معجزہ۔ اب میری زندگی میں ایک اور معجزہ رونما ہوگا۔ میری عمر قید بھی ختم ہو جائے گی۔ جب سے مارشل لاء نافذ ہوا ہے مجھے دوسرا معجزہ نظر آنے لگا ہے"۔

اور یہ معجزہ بھی رونما ہو کر رہا!

خبر گرم تھی کہ انقلابی حکومت قیدیوں کو عام معافی دینے پر غور کر رہی ہے کیونکہ سیاست دانوں نے ایسی فضا پیدا کر رکھی تھی کہ بہت سے بیگناہ جیلوں میں پڑے سسک رہے تھے۔ ان کی نجات کا ایک ہی ذریعہ تھا کہ تمام قیدیوں کو فیاضانہ معافی دے دی جائے۔ گو ان افواہوں کی کوئی سرکاری تصدیق نہیں ہو رہی تھی۔

۲۳ اکتوبر ۱۹۵۹ء کا پچھلا پہر تھا کہ جیل کی فضا قیدیوں کے نعروں سے گونج اٹھی۔ ہر طرف ایک ہڑبونگ سی تھی۔ ہر کوئی خوشیاں منانے کے موڈ میں تھا۔ جیل میں سرکاری چٹھی آگئی تھی کہ انقلابی حکومت کی پہلی سالگرہ کی خوشی میں ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۹ء کی صبح جن قیدیوں کی سزائیں (معافیاں ملاکر) نصف پوری ہو جائیں انہیں رہا کر دیا جائے اور سزائے موت عمر قید میں تبدیل کردی جائے!

راجہ کی قید کا حساب لگایا گیا تو وہ بھی معافی ملا کر رہا ہونے والوں کے زمرے میں شامل تھا۔ اس نے اپنے بیوی بچوں اور شیر خاں کو اطلاع بھیج دی کہ وہ ۲۷ اکتوبر کو رہا ہو رہا ہے۔

میں بھی اسی صبح رہا ہو رہا تھا۔ ایک طویل اور بھیانک رات کے بطن سے وہ صبح طلوع ہوئی جس کے حسن اور نکھار میں فرشتوں کی مسکراہٹ کا پرتو تھا۔ اُدھر سلامی کی توپیں دَغ رہی تھیں، جن کی گونج شہر کے کونے کونے میں پہنچ رہی تھی۔ اِدھر جیلوں کے دروازے یوں کھل گئے جیسے ضربِ کلیم نے ان دروازوں کو توڑ دیا ہو جنھوں نے نہ جانے کتنے ہی بے گناہوں کو نگل لیا تھا۔

قیدیوں کا ہجوم نعرے لگاتا ہوا باہر نکلا۔ راجہ کے استقبال کو شیر خاں (جواب حوالدار تھا)، اس کی بیوی راجو، ان کے دو بچے اور راجہ کی اپنی بیوی اور بچے آئے ہوئے تھے۔ شیر خاں نے ایک بوڑھی سی گھوڑی کی لگام تھام رکھی تھی جس کے سارے جسم پر روپوں، اٹھنیوں اور چونیوں کے ہار چمک رہے تھے۔ راجہ نے بھاگ کر سب سے پہلے گھوڑی کو چوما۔ پیشتر اس کے کہ میں اس خوبصورت منظر کو اچھی طرح دیکھ سکتا میں خود اپنے عزیزوں کے بازوؤں اور سینوں میں گم ہو چکا تھا!

حکمتِ عملی — بقیہ صفحہ ۷۱

سے بھیگ گئی ہے۔ جب ماچس کی تلاش میں وہ اس گھر میں آتا ہے تو وہاں اسے ایک لڑکی ملتی ہے۔ نوجوان بہت دیر تک اس لڑکی سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ (خاموش ہو جاتا ہے)

عائشہ:۔ پھر؟

نوجوان:۔ بس صرف اتنی سی بات تھی۔ میرا ڈائرکٹر کہتا ہے یہ ناممکن ہے کہ ایک اجنبی اتنی دیر ایک نوجوان لڑکی سے باتیں کرسکے۔ اس کا خیال تھا لڑکی فوراً شور مچا دے گی اور دوسرے لوگوں کو جمع کرلے گی۔ لیکن میں کہتا تھا کہ ایسا ممکن ہے۔ اور آج جب بارش شروع ہوئی تو میں گھر سے نکل پڑا تاکہ ذاتی طور پر اس کا تجربہ کرسکوں۔ آپ کی کھڑکی میں روشنی دیکھ کر میں نے چپکے سے اندر جھانکا اور سچ کہتا ہوں آپ کو اور اس کمرے کو دیکھ کر مجھے بالکل ایسا محسوس ہوا جیسے میرے ہی ڈرامہ کا کمرہ ہے۔ میں کھڑکی کے راستے چپکے سے اندر آگیا (نوجوان اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور برساتی اوڑھ لیتا ہے) میں نے (ہاتھ بڑھا کر) کھڑکی کا دروازہ کھولا۔ اس طرح (کھڑکی کا پٹ کھولتا ہے) اور پھر اوپر چڑھ گیا اس طرح (کھڑکی پر چڑھ جاتا ہے)۔

(عائشہ مضطرب سی ہو کر ایک دم اٹھ کھڑی ہوتی ہے) اور پھر آپ کے کمرہ میں کود گیا۔ اس طرح (نوجوان باہر اندھیرے میں کود جاتا ہے)

عائشہ:۔ سنئے (وہ بے چینی سے ایک لمحہ وسط میں کھڑی رہتی ہے، پھر کود کر بک شیلف پر چڑھ جاتی ہے اور باہر اندھیرے میں جھانکنے لگتی ہے) اپنا نام تو بتلاتے جائیے۔ آپ کا نام کیا ہے!

(دروازہ کھلتا ہے اور ممدو داخل ہوتا ہے)

نوجوان:۔ (باہر سے) اصغر (دور ہوتے ہوئے) خدا حافظ!

(ممدو حیرت سے تک رہا ہے)

عائشہ:۔ خدا حافظ!

(وہ بڑی بے دلی سے نیچے اترتی ہے، ممدو کی طرف گھور کر دیکھتی ہے، وہ ایک دم گھبرا جاتا ہے اور جلدی سے ٹرے اٹھا کر بھاگ جاتا ہے۔ عائشہ مسہری پر پڑا ہوا رسالہ اٹھا لیتی ہے اور اسی طرح مسہری پر لیٹ جاتی ہے۔ جیسے منظر کی ابتداء میں لیٹی تھی۔

اصغر:۔ ڈرامہ نگار ۔۔۔ اصغر ۔۔۔ ماچس ۔۔۔ اور پھر ۔۔۔

(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

دوسری کہانی — بقیہ صفحہ ۷۷

"خاک!" جیراں گنگناتی ہوئی کہنے لگی۔ "نیر ذاں اور چاچی کے پاؤں کو مہندی لگا کر یہی بہانے سے نکلی ہوں۔ ورنہ وہ میرے ساتھ آتیں۔ ابھی جیناں ساتھ آئی ہے۔ پر انھیں کیا پتہ کہ جیناں میری پکی سہیلی ہے۔" جیراں مسکرائی: "بڑی اچھی ہے بیچاری، سب عورتوں کے پاؤں میں مہندی لگا کر باہر نکلنے کی ترکیب بھی اسی نے بتائی تھی۔"

"مگر تم تو اکیلی آئی تھیں۔" ٹھیلا گھبرا کر بولا۔

"اکیلی کیسے آسکتی تھی جن جی؟ جیناں کے ساتھ آئی ہوں ___ جیناں کے ساتھ۔ چاچے نورے کے کنوئیں پر جو باڑہ ہے نا۔ وہاں کھڑا کر آئی ہوں اسے۔ بس تو جلدی بول، کیا کہنا ہے۔"

"کہنا کیا تھا۔" ٹھیلا اس کے بالوں کو چھیڑتے ہوئے بولا "بس نکاح کی مبارک دینی تھی۔"

"ہوں کہو۔ خواہ مخواہ تنگ کیا ہے مجھے۔"

"اری پگلی تو نہیں۔ برسوں کی محبت اور انتظار کے بعد آج تمہیں پایا ہے۔ ساری محنت وصول ہوگئی ہے سمجھو۔ سچی خوشی بھی آج محسوس کر رہا ہوں۔ پہلے تو ملاقات پر خوشی کے بجائے دکھ ہوا کرتا تھا۔ سوچتا تھا ممکن ہے تمہیں اور کوئی چھین کر لے جائے۔"

"اور کون؟" جیراں نے بات کاٹ دی۔

"بڑی بھولی ہو۔ جیسے کچھ جانتی ہی نہیں۔" ٹھیلا برجستہ بولا: "کتنے ہی اچکوں سے تمہیں جیت کر لایا ہوں۔ سردارے سے تو شرط بھی لگ گئی تھی۔ پھر دین جمعدار کا ___ اور پھوجی ذیلدار کا۔ ان کے بارے میں تو تو خود بھی جانتی ہے۔ کیا کچھ نہ کیا ہوگا ان کمبختوں نے"

"لیکن سردارا تو ان جیسا نہیں۔" جیراں نے فوراً کہا: "اگر اسے معلوم ہوتا کہ میں چکوری بن کر بچپن سے تمہیں پوج رہی ہوں تو وہ کبھی شرط نہ لگاتا۔"

"ہاں" ٹھیلا آہستہ سے بولا۔ "آدمی دل گردے کا ہے اور یاروں کا یار۔"

سردارے کا نئی بنی ہوئی چارپائی کی طرح تنا ہوا بدن یک لخت ڈھیلا پڑ گیا جیسے کسی نے اس کی ایک ایک دوائن کھینچ لی ہو۔ اس کے ہاتھوں میں لرزش آگئی۔ اور جسم میں بھرے ہوئے انگاروں پر برف کی تہہ جم گئی ہو۔ اس کا سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اور کندھے پر رکھی ہوئی بندوق پہلو پر لٹک آئی تھی۔ بندوق کو دیوار کے ساتھ کھڑا کرکے اس نے اپنی انگلیوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی پوروں کو یوں آنکھوں پر رکھ لیا جیسے نہ رکھتا تو وہ پتھر ہو جاتیں۔ چند لمحوں کے بعد ٹھیلے نے گھوڑی کی ٹاپوں کی آواز سنی جو سناٹے کو چیرتی چلی جا رہی تھی۔

وہ بھاگ کر چار دیواری سے باہر آیا۔ میر پور جانے والی پگڈنڈی پر کوئی گھڑ سوار سرپٹ اڑا چلا جا رہا تھا۔

کسی میں لب تشنہ تقریر بھی تھا! ——— بقیہ صفحہ ۲۱

کے معنی ہیں احیائے علوم و فنون، اور توہم پرستی اور خام خیالی زہد و ریاضت کے خلاف بغاوت ۔ برق رفتار مواصلات نے دنیا ہی بدل ڈالی ہے۔ گویا انسان کے اندرونی سوتے بے تحاشا پھوٹ پڑے ہیں۔ نیکی، حسن، علم ہر قسم کی اچھائیاں ہمارا بیش از بیش مطمح نظر بنتی جا رہی ہیں۔ ساتھ ہی آزادی فکر و عمل، ذمہ داری اور نظم و ضبط کا بھی بول بالا ہو رہا ہے۔ تن اب من کا حریف نہیں رہا بلکہ دونوں میں ساجھا ہے۔ دونوں ایک ہی منزل ترقی کے پُرشوق رہ نورد ہیں۔

ہماری اس نشاۃ الثانیہ کے اہم عنصر دو ہیں۔ نجات اور آزادیٔ اظہار۔ صدر پاکستان نے بار بار آزادیٔ اظہار کا یقین دلایا ہے اور حال ہی میں انہوں نے دوسری بار پاکستان رائٹرز گلڈ کی دوسری سالگرہ کے موقع پر جو پیغام دیا ہے۔ اس میں اسی بات پر زور دیا ہے۔ ان تمام باتوں کا لب لباب ہے؛ آزادیٔ بشر۔ ظلم و تشدد اور تعصب سے آزادی۔ غریبی، بیماری، پست حالی سے نجات۔ لاعلمی و جہالت سے نجات اور ان تمام رسموں ریتوں روایتوں سے نجات جو انسانوں کو نشو و نما سے باز رکھتی ہیں۔ اس لئے اب ہر پاکستانی کیلئے شاداں و فرحاں، پُر امید، دلیر و بے باک، مستعد و سرگرم اور قوم و وطن کا سچا خیر خواہ ہونے کی معقول وجہ موجود ہے۔

دوسری بڑی نمایاں بات ہے اظہار۔ اب ہمارے لوگ اپنی خودی سے پوری طرح آگاہ ہوتے جا رہے ہیں اور اس کے ساتھ اپنے گرد و پیش کی دنیا سے بھی۔ انہوں نے گذشتہ دو سوا دو سال میں بے شما کانفرنسیں، مذاکرے، مباحثے، نمائشیں کی ہیں، تعمیر و ترقی کے ادارے قائم کئے ہیں۔ اور رفاہ و بہبود کے مسائل پر تبادلۂ خیالات کیا ہے۔ گویا ہم اپنے دل کی باتیں کھلم کھلا زبان پر لا رہے ہیں، اپنی تمناؤں اور آدرشوں کو پیغام نمو دے رہے ہیں۔ اور اگر یہی عالم ہے تو ہم انشاء اللہ دنوں میں عروج و ترقی کی حدود کو چھو لیں گے۔ اور اسی پر میری اس حضور کے بجائے غیب کی، صیغۂ واحد متکلم میں تقریر ختم ہوتی ہے۔ وہی بات۔ خود بخود بانگ زنم خود بخود آوا شنوم ——— بہت اچھا ہے جو یہ جوش خطابت تقریر کے بجائے تحریر کے پیرائے میں خاص و عام تک پہنچ جائے۔ وما علینا الا البلاغ۔

جلد ۱۴ — ماہِ نو — شمارہ ۴

اپریل ۱۹۶۱ء

مدیر: رفیق خاور — نائب مدیر: ظفر قریشی

سرورق: "روحِ رومی پردہ ہا را بردرید" — رنگین نقش: آقائے بہزاد

چندہ سالانہ: ۵ روپے ۵۰ پیسہ

شائع کردہ: ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳، کراچی

فی کاپی: ۵۰ پیسہ

فن اور فطرت، فکرِ اقبال کے آئینے میں

ممتاز حسین

فطرت کی غلامی سے کر آزاد ہُنر کو
صیاد ہیں مردانِ ہنر مند کہ نخچیر؟

ہمارا قدیم ادب جو فلسفۂ وحدت الوجود کے ایک عالمی نقطۂ نظر کے تحت تخلیق ہوا وہ کبھی تمام تر "ایگو مرتکز" یا انسان مرتکز ہے مگر اس میں انسان کی تصویر باوجود اس تعلی کے کہ ؎

اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے
اس رمز کو ولیکن معدود جانتے ہیں

ایک خالق کی نہیں بلکہ ایک بندۂ مجبور کی ہے۔ اس کا ایک فلسفیانہ سبب میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ جب وحدت الوجود (ہمہ اوست) لاموجود میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس صورت کا پیدا ہو جانا لازمی ہے۔ انسان کی کبریائی محبس کا کہ ہمارے صوفیا کو دعویٰ تھا، فطرت یا غیر ذات پر عمل پیرا ہونے میں ہے نہ کہ فطرت کو لاموجود اور نابود سمجھنے میں ہے۔ فطرت انہیں کے سامنے سربسجود ہوتی ہے جو فطرت کے قوانین، اس کی ماہیت اور ہیئت سے واقفیت پیدا کرتے ہیں، یا جو بالفاظ دیگر فطرت کی نیابت اختیار کرتے ہیں، نہ کہ ان کے سامنے جو اسے لاموجود اور نابود سمجھ کر صرف عرفانِ ذات ہی پر بھروسہ کرتے ہیں اور پھر اس تلخ نوائی سے دوچار ہوتے ہیں۔

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

ہمارے یہاں فلسفۂ وحدت الوجود، جیسا کہ وہ اسپینوزا کے یہاں ہے، کیوں قابلِ قبول نہ ہو سکا۔ میں یہاں اس کی تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا ہوں۔ ممکن ہے اس کا یہ سبب ہو کہ اس فلسفے میں خدا متضمن بہ فطرت ہے اور یہ اسلام کی تنزیہی تصورِ وحدت سے ٹکراتا تھا، یا یہ سبب ہو کہ اس فلسفے میں مادہ اور شعور دونوں ایک ہی جوہر کے صفات بن کر قدم تا آخر اور قدیم اور حادث کی بحث سے آزاد ہو جاتے ہیں:

تنگے عالم عین تھا اس کا اب عینِ عالم ہے وہ
اس وحدت سے یہ کثرت ہم پیاں ہیر بہت ہی کیا کیا

اور ہم مذہبی نقطۂ نظر سے مادّے کو حادث تصور کرتے آئے تھے۔ بہرحال فلسفۂ وحدت الوجود کے لاموجود الا اللہ میں تبدیل ہونے کے کچھ ہی اسباب ہوں، یہ حقیقت اپنی جگہ پر رہتی ہے کہ ہم نے اس فلسفے میں جی کر نہ صرف فطرت ہی کو کھو یا بلکہ خودی کے تخلیقی جوہر سے بھی نا آشنا ہو گئے۔ آئیے ذرا اس خیال کو اور وسعت دیں۔ جس طرح ہم نے عالم یا فطرت کو غیر حقیقی تصور کر کے اسے ایک امرِ رب سے تعبیر کیا اور اسے کسی قانون کا پابند کرنا نہ چاہا، کہ اس سے قدرتِ کاملہ کی آزادی پہ حرف آتا تھا۔ اسی طرح ہم نے ظلِ الٰہ کو بھی ہر قسم کے قانون اور آئین کی پابندی سے آزاد رکھا۔ نتیجے کے طور پر نہ تو ہم میں انسان کے کسی فطری حق کا تصور پیدا ہوا اور نہ شہری حق کا کہ یہ تصور قانون اور آئین کی عدم موجودگی میں پیدا نہیں ہوتا ہے۔ لیکن ایسا نہ تھا کہ اس کے نتائج کی کسک ہم نے محسوس نہ کی ہو۔

تو اور سوئے غیر نظرہائے تیز تیز
میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

چلئے یہ شکوہ معشوق ہی سے سہی، لیکن کیا ایسا شکوہ آسمان سے اور خاکم بدہن خدا سے نہیں کیا گیا ہے؟ لیکن ہماری قدیم شاعری میں صرف یہی ایک شکوہ ہی نہیں ہے۔ اس میں کیش زرتہشتی کی آرزوئے زیست بھی ہے۔ ع شیخ جی آؤ مصلے گرو جام کرو۔ اس سے ہماری زندگی میں کچھ توازن یقیناً پیدا ہوا کہ کیش زرتہشتی عالم کو ہست کہتا تھا لیکن نیستی کی لے اس قدر زیادہ بڑھ چکی تھی کہ یہ آواز اسی میں ڈوب کر رہ گئی اور وہ محسوسات کی سطح سے ابھر کر کبھی بھی معقولات کی سطح پر نہ آ سکی۔ خدا غریقِ رحمت کرے غالب کو کہ وہ جو کہ نیستی، راہِ فنا اور لاموجود الا اللہ کا قائل تھا وہی ان ساری اقدار کو معرضِ شک میں بھی لایا اور جاتے جاتے حالی کو یہ سمجھا کر گیا کہ زندگی ایک عطیہ خداوندی ہے نہ کہ گناہ۔

لیکن ان ساری باتوں کے باوجود یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ہمارے معاشرے میں عالم کو ہست تسلیم کرنے کا تصور اور یقین اس وقت تک پختہ نہ ہوا

جب تک کہ مغرب کے طبعی علوم اور اس کی مادی صورتوں یعنی ٹیلیگراف اور آٹومیٹک رائفل نے ہمیں عملاً تہ تیغ کر کے یہ سمجھایا نہیں کہ یہ عالمِ خواب وخیال اور وہم کی دنیا نہیں بلکہ ایک سفاک حقیقت ہے۔ جس کا شعور عالمِ خواب کی بیداری نہیں بلکہ ایک حقیقی بیداری ہے، کہ انسان نے اسی بیداری سے خاک و آب اور بخار و باد پر حکمرانی حاصل کی ہے۔ چنانچہ یہ اسی سفاک حقیقت کی مسیحائی تھی کہ جب ہم نے کچھ کچھ فطرت کو پہچانا اسے علت و معلول کے رشتہ میں دیکھا تو پھر قوموں کے عروج و زوال میں بھی کچھ مادی اسباب نظر آئے۔ چنانچہ یہ اسی نئے شعور کا نتیجہ تھا کہ حالی نے قوم کی حالت بہتر بنانے کے سلسلے میں صنعت و حرفت کی ترقی پر بھی زور دیا، ورنہ اس سے پہلے تو صرف ایک اخلاق ہی کو بہتر بنانے کی دُھن تھی۔ اسکے یہ معنی ہوئے کہ ہم نے مغرب کے فلسفۂ ترقی کو قبول کیا تبھی تو حالی نے اس کی دھوم مچائی، لیکن "مدعیانِ تہذیب کی بداعمالیوں" سے یہ حقیقت حالی پر بہت جلد واضح ہوگئی کہ مغرب کی سرمایہ داری کا یہ فلسفۂ ترقی، جس نے انسان کی قوت میں اس قدر اضافہ کیا ہے مہذب غارتگری کا فلسفہ بھی ہے، لیکن چونکہ تاریخ نے حالی کے زمانے تک اس سرمایہ دارانہ نظام کے جبر سے آزاد ہونے کا کوئی راستہ نہیں سجھایا تھا، اس لئے نیک دل حالی اس کے آگے نہ سوچ سکے کہ اگر اسے شائستہ اخلاق کر دیا جائے تو شاید کہ اس سے اس کی حرص و آز اور استحصال کو کچھ لگام لگ سکے۔ حالی کا وہ اخلاق دل کے جذبات یا احساس مروت کا بھی ہے اور مبدا و معاد کے الہامی علم کا بھی۔ حالی نے یہیں پر سرسید سے ایک جدا راہ نکالی — سرسید نے اقوالِ الٰہی یعنی الہامی علم کا مطالعہ اعمالِ الٰہی یعنی سائنس اور معقولات کی روشنی میں کیا اور اس دلیل کے ساتھ کیا کہ قول عمل کی تکذیب نہیں کر سکتا ہے۔ نتیجے کے طور پر ان کے یہاں دینی اخلاقیات بھی معقول ہوگئی ہے۔ کیا معاش کا علم اور کیا مبدا اور معاد کا علم انہوں نے ان دونوں ہی کو ایک ہی اصول یعنی معقولات کے تابع کر دیا ہے۔ حالی اس کے برعکس یہ کہتے ہیں کہ "مبدا اور معاد کے علم کو عقل کے ساتھ وہی تعلق ہے جو آنکھوں کو تاریک کوٹھری کے ساتھ ہے۔" اس طرح حالی کے یہاں مبدا اور معاد کے علم کا ماخذ عقل نہیں بلکہ ایک فوق الحس شے ہے جسے وہ وجدان کا نام دیتے ہیں۔ اور وجدانی اور عقلی علم کے ٹکراؤ کی صورت میں وہ یہ نہیں کہتے ہیں کہ وجدانی علم کی تاویل معقولات کی روشنی میں کرنی چاہئے۔ بلکہ اسے عقلی تاویلات سے آزاد رکھتے ہیں کیونکہ وہ اسے تسلیم ہی نہیں کرتے ہیں کہ عقل کبھی بھی مبدا اور معاد کی حقیقت تک پہونچ سکتی ہے۔ حالی نے اس طرح اپنے مذہب کو مغرب کے مادی معقولات کی زد سے تو بچا لیا، لیکن کیا اس طرح انہوں نے عقلی اور الہامی علم، مادی علم اور روحانی علم، یا مادے اور شعور کی دوئی کو برقرار نہیں رکھا۔ سرسید نے تو فطرت کو کردارِ الٰہی کا نام دے کر یعنی فطرت کو ربوبیت اور رب کو فطرت عطا کر کے وحدت الوجودی سطح پر اپنے کو اس دوئی سے بچا لیا تھا، لیکن حالی کے یہاں وہ وحدت بکھر گئی، جس سے ایک قسم کی مادے اور شعور کی متوازیت پیدا ہو جاتی ہے۔

ہمیں علامہ اقبال کے یہاں سرسید کی وحدت الوجودیت اور حالی کی متوازیت دونوں ہی کے اثرات ملتے ہیں، لیکن ہم یہاں انکو اس طرح پیش نہیں کریں گے، ہم ان کے خیالات کو ٹھوس سماجی حقیقت سے ربط دینا پسند کریں گے۔ سرسید کا عمل ایک زبردست مخاصمت اور پسپائی کے پس منظر میں مغرب کو قبول کرنے، اس کی معقولات سے اپنے مذہبی افکار کو مطابقت دینے اور مغرب کی راہ پر ڈالنے کا تھا۔ حالی کا رویہ اس سے قدرے مختلف تھا، وہ سرسید کے ساتھ بھی تھے اور سرسید کے ناقد بھی تھے۔ انہوں نے اپنی مادی زندگی کو تو مغرب کی معقولیت کے حوالے کر دیا، لیکن اپنی روحانی زندگی کو اسکی دراز دستی سے بچانا بھی چاہا۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ دین اور دنیا ایک دوسرے پر اثرانداز ہوتے ہیں، اور اس اثر کو حالی بھی محسوس کرتے ہیں جبکہ وہ کہتے ہیں کہ فلاکت اُمّ الجرائم ہے لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ فلاکت کی حالت میں کوئی بھی شخص دیندار نہیں رہ سکتا؟ اور اگر یہ ضروری نہیں ہے تو پھر خوشحالی کو دینی نقطۂ نگاہ سے روحانی ارتقا، یا تکمیلِ اخلاق کا کوئی لازمی جزو کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے؟ اس پر مباحثہ حالی اور سرسید دونوں ہی کیا ہے، لیکن اس کا کوئی معقول حل ان مباحثوں سے نکلتا ہوا نظر نہیں آتا ہے بجز اسکے کہ نیکی کرنے کے لئے بھی ایک مالی استطاعت کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن کیا اس طرح ایک مالدار آدمی کے عقبیٰ بنانے، یا دین کمانے کے امکانات ایک غریب آدمی کے مقابلے میں بڑھ نہیں جاتے ہیں؟ ممکن ہے اس کا کوئی حل ہو۔ لیکن مجھے ان کی تحریر میں اس کا کوئی حل نہیں ملا۔ یہاں یہ چیز زیرِ بحث نہیں ہے۔ میں تو صرف اس دوئی کو پیش کرنا چاہتا تھا جو حالی کے یہاں، مبدا اور معاد کے علم کو علم معاش سے جدا کرنے کی صورت میں پیدا ہوئی، لیکن حالی نے اس دوئی کو ایک

دوسرے کی نقیض بننے سے روکے رکھا، انہوں نے دونوں کے حدود متعین کرکے ایک توازن پیدا کیا، گویا ایک طرح کا سمجھوتہ پیدا کیا۔ لیکن یہ توازن کب تک برقرار رہتا۔ جوں جوں ترقی کے فلسفے اور مغرب کے علوم طبعی کا اثر و نفوذ بڑھتا گیا، دوسری طرف سے اتنا ہی شدید ردِ عمل بھی پیدا ہوا۔

حالی کی نظر میں خلافت رحمانی کا منصب دار مغرب کا وہ انسان تھا جس نے قوانینِ فطرت پر دسترس حاصل کرکے، بحر و بر اور برق و باد پر اپنی حکومت قائم کی تھی، نہ کہ وہ جو کہ عرفان ذات میں کھویا ہوا، دو ہزار قبل کے علوم کے ساتھ لپٹا ہوا تھا، چنانچہ انہوں نے مشرق کے انسان کے لئے اس کی حکومت کے قبول میں کوئی قباحت محسوس نہ کی کہ وہ حکمرانی کا مستحق اور یہ غلامی کا مستحق تھا۔ غیرت دلانے کی حد تک تو یہ بات ٹھیک تھی لیکن جب وہ مسلمانوں کے حق میں فلسفۂ ترقی کی وضاحت کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ "اب جو قومیں (مغرب کی) ترقی کر چکی ہیں ان کا فرض ہے کہ مغلوب قوموں کو کبھی ان وسائل میں اپنے برابر نہ ہونے دیں جن کی سبب سے ان کو غلبہ ہوا ہے۔ پس ضرور ہے کہ ترقی یافتہ قوموں کا غلبہ اور رعب داب روز بروز بڑھتا جائے اور جن قوموں نے اپنی حد سے آگے قدم نہیں بڑھایا وہ نوبت بہ نوبت مضمحل ہوتی جائیں" تو وہ مغرب کی غلامی کو ہمارا ایک اٹل مقدر بنا دیتے ہیں۔ اور اس مقدریت کو مزید تقویت ان کے اس خیال سے ملتی ہے کہ "زبردستوں کا زیردستوں کو دلنا فطری ہے۔"

علامہ اقبالؒ نے حالی کی اسی مقدریت کے خلاف احتجاج کیا کہ ان کی جد و جہد مغرب کی غلامی سے اپنی قوم کو آزاد کرانے کی تھی۔ حالی کی منطق یہ تھی کہ ایک دفعہ جو قومیں کہ ترقی (مادی اور ٹکنیکل) کے میدان میں آگے نکل گئی ہیں وہ کبھی بھی مغلوب قوموں کو ان وسائل میں برابر نہ ہونے دیں گی جن کے سبب سے ان کو غلبہ پیدا ہوا ہے۔ اسلئے مغلوب قوموں کے حق میں حاکم قوموں کے غلبہ سے آزاد ہونے کی کوشش بے سود ہے۔ انہیں سیاسی آزادی کی جد و جہد کے بجائے معاشرتی اور اخلاقی اصلاح کی طرف توجہ کرنی چاہئے کہ اس کی انہیں حاکم کی طرف سے آزادی ہے۔

حالی کی یہ منطق کس قدر غلط تھی، اس کو بتانے کی آج چنداں ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ان کی یہ منطق صحیح ہوتی ہے تو پھر تو ایشیا کا کوئی بھی ملک آزاد نہ ہو پاتا۔ کوئی بھی محکوم ملک جب کسی دوسرے ملک کی حاکمیت سے آزاد ہوتا ہے تو اس میں صرف اسی ایک چیز کو دخل نہیں ہوتا ہے کہ آیا وہ اپنے وسائل میں حاکم قوموں کے برابر ہے کہ نہیں۔ بلکہ ان کی اپنی اجتماعی قوت ارادی یا تنظیم اور آزادی کے جذبے اور یقین کو بھی دخل ہوتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ انسان کی تخلیقی قوت کا انحصار، صرف اسی بات پر نہیں ہے کہ اس نے کس حد تک قوانین فطرت پر دسترس حاصل کرکے عالم موجودات کو مسخر کیا ہے اور نئی سے نئی مشینیں بنائی ہیں، بلکہ اس بات پر بھی ہے کہ اس کے پاس کوئی نظریہ اور شعور ہے کہ نہیں اور اس کے حاصل کرنے کا ذوق و شوق اور ایمان و یقین ہے کہ نہیں۔

حالی نے اس داخلی فیکٹر کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا، علامہ اقبالؒ نے اسی داخلی فیکٹر پر زور دیا۔ اور ان کا فلسفۂ خودی اسی حقیقت کا غماز ہے، لیکن ان کے یہاں خودی برگساں کے جذبۂ تخلیق کی طرح ایک اندھی طاقت بے نیازِ خیال نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس وہ قوتِ ارادی اور خیال کے اتحاد پر متضمن ہے۔ وہ خیال یا فطرت کے علم سے بے نیاز ہو کر خارجی حقائق پر عمل پیرا نہیں ہوتی ہے کہ جبکہ وہ منقلب کرنا چاہتی ہے، اس کی حقیقت سے باخبر ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ علامہ اقبالؒ نے علوم طبعی کی طرف سے بے نیازی نہیں برتی ہے۔

"فطرت کا علم خدا کی عادت یا کریکٹر کا علم ہے۔ اس کے مشاہدے اور مطالعے میں ہم انائے مطلق سے ایک قسم کی قربت کے طالب ہوتے ہیں اور یہ ہماری عبادت کی ایک دوسری صورت ہے۔" (خطبات)

لیکن یہ ضرور ہے کہ چونکہ وہ اس کی آگ یعنی اسکی تخلیقی قوت کا ماخذ اس خاکدان کے ارتقا کو نہیں بلکہ انائے مطلق کے نور کو ٹھیراتے ہیں اور انائے مطلق ہے بے نیازِ فطرت، آزاد، مطلق اور غیر مرکب ہے اس لئے ان کا انسان، جسدِ خاکی میں رہتے ہوئے بھی کبھی کبھی بے نیازِ فطرت بن جاتا ہے ؎

یہ کافری تو نہیں، کافری سے کم بھی نہیں
کہ مردِ حق ہو گرفتارِ حاضر و موجود

لیکن وہ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں ؎

جہانِ رنگ و بو گلدستۂ ما ۔۔۔ ز ما آزاد و ہم وابستۂ ما

یہ تضاد تو آپ کو ان کے یہاں ملے ہی گا کیونکہ کبھی تو وہ انائے مطلق کو فطرت سے بے نیاز سمجھتے ہیں کہ "فطرت اس کی زندگی کا ایک لمحۂ گریز پا ہے۔" "اسکی انا آزاد، غیر مرکب اور مطلق ہے۔" (خطبات)
توکبھی یہ بھی کہتے ہیں:۔

"انائے مطلق جس کی بدولت صادر (EMERGENT) یا صدور ہوتا ہے۔ فطرت میں متضمن یا جاری و ساری ہے کہ بقول اسے قرآنی وہی اوّل و آخر و ظاہر و باطن ہے" (خطبات) ممکن ہے یہ تضاد انہیں اسلئے نظر نہ آیا ہو کہ ان کے مطالعے کی رو سے جدید سائنس میں مادہ کوئی شئے نہیں بلکہ ایک نظامِ حوادث ہے، لیکن کیا وہی جدید سائنس یہ نہیں کہتی کہ جس طرح مادہ ایک نظامِ حوادث ہے اسی طرح ایگو، روح، شعور اور ذہن بھی ایک نظامِ حوادث ہے، چنانچہ اس منطق کے رُو سے ولیم جیمس اور برٹرنڈ رسل دونوں ہی، نہ تو روحانی وحدت کے قائل ہیں اور نہ مادی وحدت کے بلکہ نیوٹرل وحدت کے کہ ان کی نگاہ میں شعور اور مادہ کا "اسٹف" ایک ہے۔ یہ بات میں درمیان میں نہ لاتا اگر میں یہ محسوس نہ کرتا کہ ان کے فلسفے میں ایگو فطرت سے تخالف خارج میں پیدا کرتا ہے، نہ کہ جزو فطرت ہو کر اس سے تخالف اس لئے پیدا کرتا ہے کہ وہ اس سے ایک بلند سطح پر متحد ہونا چاہتا ہے۔ علامہ اقبال کے یہاں وہ فطرت سے وابستہ تو ہے کہ تخالف میں بھی ایک وابستگی ہے لیکن وہ اس سے متحد نہیں ہوتا ہے کہ "ہر موجود ممنونِ نگاہے است۔" چنانچہ ان کا انسان اپنے مقاصد کے تحت فطرت کو زیرِ دام لاتا ہے۔ سے انسان نواز بناتا ہے لیکن خود اپنے کو قوانینِ فطرت کی روشنی میں نیچرل نہیں بناتا ہے۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر "فطرت کردارِ الٰہی ہے اور اس کا مطالعہ بھی وسیلۂ قربتِ الٰہی ہے" تو وہ پھر اپنے کو کردارِ الٰہی میں کیوں نہیں ڈھالتا۔ کیا اس لئے کہ ایسا کرنے سے اس کی آزادی محدود ہو جاتی ہے اور اس کی تخلیقی قوت نیابتِ الٰہی (مطلق اور آزاد) کے بجائے نیابتِ فطرت کی پابند ہو جاتی ہے جسے وہ خودی کی تخلیق سمجھتے تھے "جہاں مجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں"۔ اور اگر یہی جواب ہے تو پھر فطرت میں ذوقِ نمو کے دیکھنے کا کیا باعث ہے:

بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت
جو اُس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

اس سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ وہ فطرت کے ارتقا میں کوئی مقصد پنہاں دیکھتے ہیں اور جہاں کہیں فطرت اس مقصد کے حصول میں خطا کرتی ہے، اس کی تلافی خود ہی اپنی طرف سے کرتی ہے اور اس طرح وہ فطرت پر اضافہ کرتی ہے۔ لیکن وہ اپنے خطبات میں اسی سے انکار کرتے ہیں کہ فطرت اپنے ارتقا میں کسی مقصد کو پنہاں رکھتی ہے، کہ اس طرح ایک خطِ تقدیر کھنچ جاتا ہے اور یہ مقدر پرستی کا دوسرا نام ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ذہنی زندگی (ایگو کی زندگی) ان معنوں میں غائی بھی ہے کہ اگرچہ ہم کسی بہت دور متعین کی ہوئی منزل کی طرف بڑھتے نہیں (کہ ایک خط کھنچا ہوا ہے اور اس کی طرف ہم بڑھتے چلے جا رہے ہیں) لیکن جوں جوں زندگی کا عمل بڑھتا اور پھیلتا ہے اسی اعتبار سے نئے نئے مقاصد وضع ہوتے ہیں اور قدروں کا آئیڈیل معیار ہمارے سامنے آتا رہتا ہے۔" (خطبات)۔

اس میں شبہ نہیں کہ زندگی عبارت ہے نئے سے نئے مقاصد کی تشکیل اور پھر ان کی تحصیل و تکمیل سے، لیکن کیا قدروں کا کوئی ایک ایسا آئیڈیل معیار ہم فطرت کے عمل پر عائد کر سکتے ہیں جو اس کے قوانینِ ارتقا کے منافی ہو؟ اگر یہ ممکن نہیں ہے کہ مستقبل، ماضی اور حال کا ایک تسلسل ہے ہرچند کہ وہ انقلابی جست ہی سے تخلیق کیوں نہ ہو۔ تو پھر کیا ایسی صورت میں یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ مقصد کے وضع کرنے میں تنہا ایگو ہی کو دخل نہیں ہے بلکہ کچھ "نگرِ غیر" (فطرت خارجی حالات، موجودات اور حاضرات) کے تقاضوں اور اشاروں کو بھی دخل ہے کہ مقصد ایک آرزوئے محض نہیں بلکہ خارجی حقیقت کے تضاد کا ایک جدلیاتی حل ہے جو انسانی ذہن میں منعکس ہوتا ہے۔ ہرچند کہ اس میں داخلیت کو بھی دخل ہوتا ہے تبھی تو عمل سے نظریے کی کمزوریاں دور ہوتی ہیں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مقصد کی اس تعریف کو وہ قبول نہیں کرتے ہیں ؎

حُسن را از خود برون جُستن خطاست
آنچہ می بایست پیشِ ما کجاست

بہرحال یہ داخلیت اور عینیت تو ان کے یہاں ہے ہی کہ ان کے فلسفے کی بنیاد ہی روحانی یا داخلی آئیڈیلزم پر ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اس عمل میں جہاں بقول غالب آئینۂ فطرت کو زیادہ سے زیادہ چمکانے کی ضرورت ہے کہ ہم باشعور ہو کر فطرت کے جبر سے آزاد ہوتے ہیں نہ کہ فطرت سے، وہاں حصولِ مقصد میں اک ذرا

(باقی صفحہ ۵۰ پر)

اقبال: وجودیوں کے درمیان

ضمیر علی بدایونی

اقبال اور وجودیوں میں کسی قسم کی مطابقت تلاش کرنا بالکل اس طرح ہو جائیگا کہ ہم ابن العربی کو فرائڈ، ژونگ اور رائیڈلر کا پیش رو قرار دے دیں کیونکہ اس نے بھی تو جنت کے پھلوں کو دوزخ کی گرمی سے پکتے ہوئے دیکھا تھا۔ یا بقول کیرک گور، یورپ کے ایک چھوٹے سے نقشہ کی مدد سے ڈنمارک کا سفر کرنا چاہوں۔ لیکن جب فرائڈ اور وجودیوں کے نظریات میں مماثلت ڈھونڈھی جا سکتی ہے حالانکہ وجودیوں نے متفقہ طور پر فرائڈ کے لاشعور اور اس کی کڑی جبریت کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کیا ہے، تو اقبال اور فلسفۂ وجودیت میں کسی نوع کی ہم آہنگی تلاش کرنا محض "روشنیٔ طبع" نہیں ہو سکتا۔ جب ہائیڈگر ہولڈرلن سے اور سارتر سے وجودیت کے ڈانڈے ملا سکتے ہیں تو اقبال میں وجودیت کا پرتو پایا جانا اس قدر حیران کن نہیں ہو سکتا کہ بے ساختہ کہہ دیا جائے کہ این چہ بوالعجبی ست! کیونکہ وجودیت نام ہے ہیگل سے نیٹشے کی طرف بڑھنے کا۔ اور اقبال بھی یہ کہتے ہوئے کہ "ہیگل کا صدف گہر سے خالی" کیرک گور اور نیٹشے سے جا ملے ہیں۔

نیشتر اندر دل مغرب فشرد
دستش از خونِ چلیپا احمرا ست
آں کہ بر طرحِ حرم بت خانہ ریخت
قلبِ او مومن دماغش کافر ا ست

اس میں شک نہیں کہ وجودیوں نے نیٹشے کے دماغ، اور اقبال نے قلب کو گلے لگایا۔ اور اسی اختلاف کی وجہ سے ہائیڈگر انسان کے متعلق کہنے پر مجبور ہوا کہ:

"انسان کائنات میں پھینک دیا گیا ہے لیکن اس کا پھینکنے والا کوئی نہیں۔ وہ اپنا جوہر خود متعین کرتا ہے۔"

اور اقبال نے کہا ؎

آیۂ کائنات کا معنیٔ دیر یاب تو
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو

اقبال کا انسان وجودیوں کے بے نام اور ناقابلِ تعریف انسان کی مانند نہیں لیکن اس اختلاف کے باوجود بعض اہم امور میں اقبال وجودیوں سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔

کیرک گور سے لیکر گبرئیل مارسل اور سارتر تک سب کے نزدیک انسان محض ایک امکان کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس کی زندگی امکانات کا ایک غیر مختتم سلسلہ ہے۔ اور ان امکانات کا انتخاب وہ خود کرتا ہے۔ اسی انتخابی عمل کے ذریعہ وہ خود کو بناتا بھی ہے اور بگاڑتا بھی ہے اور اپنی کامیابی و ناکامی دونوں کا ذمہ دار وہ خود ہے۔ اس کی وجہ سارتر کے لفظوں میں یہ ہے کہ،

"انسان سب سے پہلے وجود میں آتا ہے۔ اپنے آپ سے دوچار ہوتا ہے۔ دنیا میں ابل پڑتا ہے۔ اور اپنی تعریف بعد میں متعین کرتا ہے۔"

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وجودیوں نے انسان کو موجودات کی حیوانی و نباتی سطح پر پھینک دیا ہے۔ اور انسان مادہ کے بے جان ڈھیر میں دبا ہوا ہے۔ ان کے نزدیک انسان کائی اور گوبھی کے پھول سے بدرجہا بلند ہے۔ کیونکہ بقول سارتر وہ محض شے نہیں جس کی حیثیت معروضی ہو بلکہ اس میں داخلیت بھی موجود ہے۔ اور بقول کیرک گور داخلیت ہی صداقت ہے۔ اس لئے انسانی وجود کا مسئلہ جملہ موجودات سے بالکل مختلف ہے۔ یہ جاننے کے لئے کہ انسانی وجود کی نوعیت جسے ہائیڈگر نے DASEIN سے موسوم کیا ہے، کیا ہے؟ ہمیں موجود ہونے کی صحیح تعبیرات ڈھونڈنی ہوں گی کیونکہ بقول ہائیڈگر یہی مسئلہ فلسفیوں کے تغافل کی نذر ہو گیا۔ اقبال نے استفسار کیا تھا۔

آدمے با جوہرے اندر وجود
آنکہ آید گاہے گاہے در وجود

اسی سوال کا جواب کیرک گور نے دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ سوال کیرک گور کے لفظوں میں یہ ہے:

"جو وجود میں آرہا ہے وہ یا تو پہلے سے موجود تھا یا نہیں تھا۔ اگر وہ پہلے سے موجود تھا تو کوئی چیز وجود میں نہیں آئی۔ کیونکہ وہ یہاں ہمیشہ سے موجود تھی۔ اگر وہ پہلے سے یہاں موجود نہیں تھی۔ تو یہاں کچھ نہیں تھا جو وجود میں آیا۔ کیونکہ یہاں کچھ نہ کچھ ہونا چاہئے۔ جو وجود میں آنے کے عمل میں گرفتار ہو"

اسی مشکل سے گھبرا کر ہیگل نے کہہ دیا تھا کہ:

"خالص وجود اور خالص عدم ایک ہی جیسے ہیں"۔

ہیگل کا یہ حل مزید مشکلات کا سبب بنا۔ کیرک گور کے نزدیک اس کا حل "امکان کا تصور" ہے۔ جو ایک ایسی ہستی کی بات ہے کہ موجود ہوتے کے ساتھ غیر موجود بھی ہے۔ تب وجود میں آنا ——— "BECOMING" "امکان" سے "واقعیت" میں قدم رکھنا ہوگا۔ اور اس موجود ہونے میں اس کی آزادی مضمر ہے جو وجود میں آرہا ہے۔ کیونکہ واقعیت اختیار کرنے سے پہلے وہ محض ممکن ہوتا ہے۔ اور ممکن کبھی بھی لزوم کا پابند نہیں ہو سکتا کیونکہ لازم ہونا "جوہر" کی جبریت سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جو لازم ہے وہ اپنے جوہر کی وجہ سے لازم ہے لیکن ممکن اور واقعی کا فرق جوہر کا نہیں بلکہ ہستی کا فرق ہے۔ زیادہ روایتی لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ممکن اور واقعی (حقیقی) کا فرق جوہر کا نہیں بلکہ وجود کا فرق ہے۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو کیرک گور کے نزدیک مستقبل ایک کھلا ہوا امکان ہے۔ انسان اپنی تقدیر کا خود مالک ہے۔ اس میں کوئی جوہر نہیں کیونکہ ہمارا "جوہر" ہماری انتخابی صلاحیت کو اپنے دائرہ کا پابند بنا لیتا ہے۔ وجود اپنے جوہر کے جبر و لزوم میں گرفتار ہو جانے کے بعد اپنی آزادانہ حیثیت کھو بیٹھتا ہے۔ اس لئے سارے وجودی ہم آوازہ ہو کر کہتے ہیں کہ:

"انسانی وجود اس کے جوہر پر مقدم ہے۔ انسان پہلے وجود میں آتا ہے اور یہ جانے بغیر وجود میں آتا ہے کہ وہ کیوں آتا ہے۔ وہ جبر و لزوم کی زنجیریں توڑنے میں کامیاب ہو چکا ہے اور زندگی کی راہوں پر آزادانہ دوڑنے کے سوا اور کوئی راستہ اس کے سامنے نہیں۔ انسان اپنا جوہر خود تخلیق کرتا ہے اور اپنی تعریف خود متعین کرتا ہے"۔

چنانچہ ہائیڈگر لکھتا ہے:۔

"انسان ایک امکان ہے۔ اس میں ہو جانے کی قوت موجود ہے۔ اس کا وجود امکانات کا انتخاب ہے جو اسکے سامنے کھلے ہوئے ہیں۔ اور چونکہ اس کا یہ انتخاب کبھی قطعی اور آخری نہیں ہوتا، اس لئے ایک بار ہمیشہ کیلئے اس کا وجود غیر متعین ہے کیونکہ وہ محدود و پابند نہیں ہے"۔

اور کارل جیسپر لکھتا ہے:۔

"کوئی بھی انسان کی تمام امکانی قوتوں کا تصور نہیں کر سکتا۔ انسان خلاف توقع زیادہ سے زیادہ چیزیں کر سکنے کی قوت رکھتا ہے۔ وہ نامکمل ہے اور کبھی بھی مکمل نہیں ہو سکتا اور اس کا مستقبل کبھی بھی متعین نہیں ہو سکتا"۔

اقبال نے بھی انسانی ارادہ کی آزادی پر جس قدر زور دیا ہے اس قدر کسی اسلامی مفکر نے نہیں دیا۔ ان کے نزدیک انسان تقدیر کا زندانی نہیں بلکہ وہ ایک آزادانہ حیثیت رکھتا ہے ؎

نہ ستارے میں ہے نے گردشِ افلاک میں ہے
میری تقدیر مرے نالۂ بے باک میں ہے

برخلاف اسکے جملہ فطرت محض مجبور ہے۔ یہ صرف انسان ہے جس کے حصہ میں "ندرتِ فکر و عمل" آئی ہے ؎

ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی
ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارہ لعلِ ناب

اور اپنی اسی آزادی و مختاری کی بدولت وہ پوری فطرت سے وراء الورا نظر آتا ہے:۔

فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور
خودگرے، خودنگرے، خودشکنے پیدا شد

ناچیز جہانِ مہ و پرویں ترے آگے
وہ عالمِ مجبور ہے تو عالمِ آزاد

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاکِ زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں

اقبال کے نزدیک زمانہ کوئی خطِ کشیدہ نہیں جس پر انسان مجبورانہ حرکت کر رہا ہے بلکہ وقت کا خط ہنوز منت کشِ کشیدن ہے۔

"ہم زمانے کی حرکت کا تصور خطِ کشیدہ سے نہیں کریں گے۔ کیونکہ یہ خط ابھی کھنچ رہا ہے اور اس سے

مطلب وہ امکانات ہیں جو ہو سکتا ہے وقوع میں آئیں
یا نہ آئیں۔"

اس کے معنی یہ ہیں کہ اقبال کے نزدیک بھی مستقبل معرضِ امکان میں ہے۔ معرضِ وجود میں نہیں۔ انسان سعیٔ و عمل کی راہوں پر آزادانہ دوڑ سکتا ہے۔ وہ کسی جبر و لزوم کا پابند نہیں کیونکہ کائنات و حیات امکانات کا ایک غیر مختتم سلسلہ ہے۔ وہ پہلے سے سوچا ہوا منصوبہ نہیں۔ چنانچہ رقم طراز ہے ؎

"ہمارے نزدیک قرآن مجید کے مطمحِ نظر سے کائنات کا کوئی تصور اتنا بعید نہیں جتنا یہ کہ وہ کسی پہلے سے سوچے سمجھے ہوئے منصوبہ کی زبانی نقل ہے۔ جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے عرض کیا تھا۔ کہ قرآن مجید کی رو سے کائنات میں اضافہ ممکن ہے۔ گویا وہ ایک اضافہ پذیر کائنات ہے۔ کوئی بنا بنایا مصنوع نہیں۔ جس کو اس کے صانع نے مدت ہوئی تیار کیا تھا۔ مگر جو اب مادے کے ایک بے جان ڈھیر کی طرح مکانِ مطلق میں پڑا ہے۔ جس میں زمانے کا کوئی دخل نہیں۔ اس لئے اس کا عدم و وجود برابر ہے۔"

چونکہ کائنات کوئی پہلے سے سمجھا ہوا منصوبہ نہیں۔ اس لئے فکر و عمل کی راہیں اختیار کرنے کے لئے آزاد ہے۔ وہ پیدا ہی آزادی کے بطن سے ہوا ہے۔ اس کا وجود عبارت ہے آزادی سے۔ آزادی اس کی فطرت کا اقتضا ہے۔ جس کے بغیر وہ وجود ہی میں نہیں آتا ؏

کہ جاں بے فطرتِ آزاد جاں نیست

یہ وہی بات ہے جو سارتر نے کہی ہے:۔

"انسان بعض اوقات آزاد اور بعض اوقات مجبور نہیں ہو سکتا۔ وہ ہمیشہ اور مکمل آزاد ہے یا پھر وہ موجود نہیں"

کارل جیسپر کے نزدیک بھی انسان اپنی آزادی کا خود سر چشمہ ہے:۔

"بغیر فیصلہ کے انتخاب، بغیر عزم کے فیصلہ، بغیر فرض کے عزم اور بغیر وجود کے فرض نہیں ہو سکتا۔"

جیسپر کے نزدیک بھی انسان کوئی اتمام یافتہ شے نہیں جس کا پشت در پشت اعادہ ہوتا رہتا ہے۔ بلکہ وہ ایک ایسی ہستی ہے جو اپنی ایگو کی خود صورت گر ہے۔ اقبال کے نزدیک بھی خودی کی زندگی اختیار و خود گری کی زندگی ہے:۔

"خودی کی زندگی اختیار کی زندگی ہے جس کا ہر عمل ایک نیا موقف پیدا کر دیتا ہے۔ اور یوں اپنی خلاقی اور ایجاد و طباعی کے لئے نئے نئے مواقع بہم پہنچاتا ہے۔"

مراتبِ وجود کا تعین اسی خود گری و خود آفرینی کے عمل سے ہوتا ہے۔ بے عملی اور ذوقِ عمل کی محرومی وجودیوں کے نزدیک وجود اور اقبال کے نزدیک خودی کے تاروں کو ڈھیلا کر دیتی ہے۔ اگر انسان اپنی تخلیق کے لئے جد و جہد نہیں کرتا تو کائنات کی کوئی قوت اسے وجود میں نہیں لا سکتی۔ ہاں وہ خدا بھی نہیں جو ذوقِ کن فیکون کا شکار رہے۔ اگر انسان خود گری کی ذمہ داری قبول نہیں کرتا تو اس کے لئے معدوم ہو جانے کے سوا اور کوئی راہ باقی نہیں رہتی۔ سارتر کے نزدیک بھی انسان اپنے اعمال کا مجموعہ ہے۔ بلکہ وہ "عملِ محض" کے سوا کچھ بھی نہیں۔ چنانچہ وہ اقبال کا ہمنوا ہو کر کہتا ہے۔

"دنیا میں انسان کی موجودگی ایک طرح کا "ہونا" نہیں بلکہ محض "کرنے" کا "انتخاب" کا اور خود کو بنانے کا عمل ہے"

اقبال کے نزدیک انسان شے نہیں عمل ہے ؏

ہستم اگر می روم گر نہ روم نیستم

گویا اقبال کے نزدیک وہ سرے سے موجود ہی نہیں جو جنبش و حرکت کے اس کائنات گیر رقصِ بے تابی میں حصہ نہیں لے رہا ہو۔ اور وہ بھی انفعالی طور پر نہیں، جس طرح برگساں کی کائنات و انسان محوِ جنبش و اضطراب ہے بلکہ وجودیوں کے فاعلی انسان کی مانند۔ جنبش و سکون اور جمود و عمل کے دوراہے پر کھڑا ہوا ہے:

"اگر انسان کی طرف سے اقدام نہیں ہوتا اور وہ اپنے وجود کے قوٰی کو ترقی نہیں دیتا، اگر وہ زندگی کے بڑھتے ہوئے دھارے کا زور محسوس نہیں کرتا تو اس کی روح پتھر کی بن جاتی ہے اور وہ مثل مردہ مادہ کے ہو جاتا ہے"

اور اس مردہ مادہ کی سطح سے، جسے ہائیڈگر نے سرے سے موجود ہی نہیں مانا، بلند ہونے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ صرف سعیٔ و عمل اور مقصد کوش زندگی کا راستہ ہے بقول سارتر انسان صرف اپنے اعمال و مقاصد کی وجہ سے کائنات میں ممتاز ہے۔ گویا کائنات میں اس کا وجود مقصد کوشی، جفا طلبی اور اضطرابِ مسلسل کے
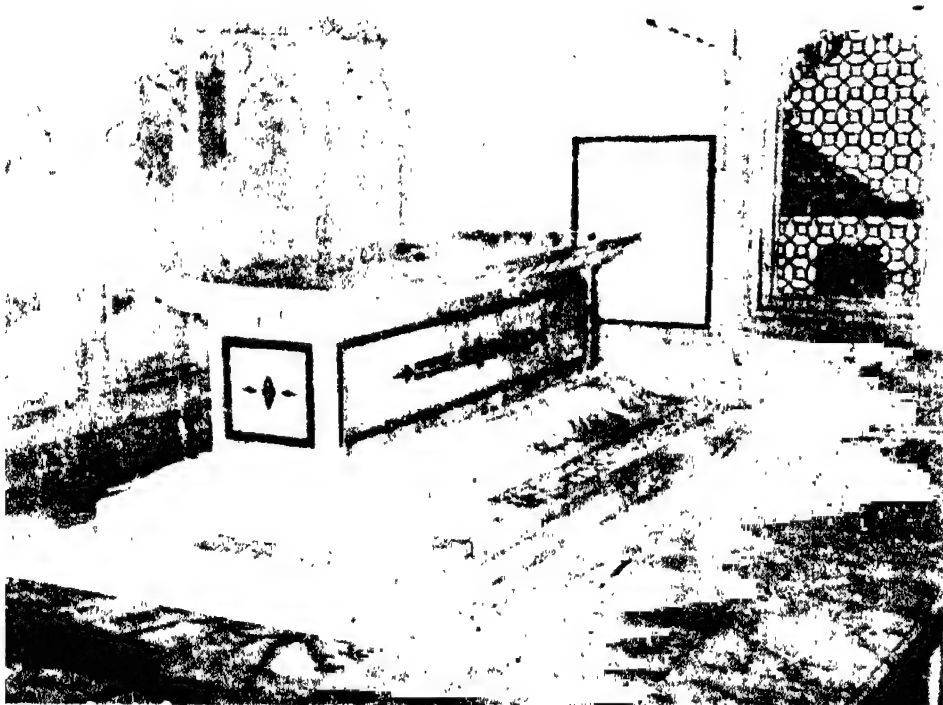
" افتخار پاکستان " : بنیادی جمہ

(ایک عظیم تجربہ — چند اقدام) :
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

ہد کا ثمر اولیں : خیراتی شفاخانہ قائم کردہ
ڈھوکہسا ناڑی یونین کونسل

زاد کشمیر: پاکستان کے نقش قدم پر۔ بنیادی جمہوریتوں کا انتخاب، وسیع تر پیمانہ پر انتخابات کے لئے چشم براہ

مغربی بازو : بیری (قلات سے چالیس میل دور) :
اسکول کا قیام — قومی ترانہ سے سرگرم د

ی بازو : چار کھات ڈویژن میں اسکولوں کی تعمیر

سوا کچھ بھی نہیں۔ اسی لئے اقبال نے زندگی کو جہد و عمل، روانیٔ محض اور اور ذوقِ سفر کہہ کر پکارا اور انہی اس حرکی قوت کے استعمال سے وہ فطرت کے اعمال پر بھی اثر انداز ہو سکتا ہے ؎

اگر خودی میں تری انقلاب ہو پیدا
عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے

اقبال نے خودی کو کہیں بھی انسانی وجود کے ایسے جوہر سے تعبیر نہیں کیا جو تانہ بخشندِ خدائے بخشندہ والے اصول کا عطیہ ہو بلکہ یہ انسان کے مرکزِ حیات کی انفعالی حالت ہے جسے سارتر نے POUR – SOI کا احساسِ ذات کہا ہے۔ اقبال کی نظر میں یہ اسی احساسِ ذات کا تقاضہ ہے کہ انسان فطرت پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے جد و جہد کرتا ہے اور یہ احساسِ ذات ہی کا تقاضہ ہے کہ اقبال کو جہانِ دیگراں میں انفعالی طور پر موجود رہنا گراں گزرتا ہے ؎

بندۂ آزاد را آید گراں
زیستن اندر جہانِ دیگراں

اور یہی احساسِ ذات اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کے عزائم بیدار کر دیتا ہے ؎

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

اور یہ خودی ہی کی بیداری ہے جو آزاد تخلیقی عمل کو اپنا شعار بناتی ہے۔ جسے سارتر نے POUR — SOI انسانی انا کی تخلیقی فعالیت سے تعبیر کیا ہے وہ اسی خودی کی بیداری کا تسلسل ہے۔ اس تسلسل کو برقرار رکھنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ انسان اپنی تخلیقی فعالیت کے سلسلہ کو ٹوٹنے نہ دے ع

سِرّ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح نہیں کہ اقبال اور وجودیوں کے نزدیک انسان ایک مطلق آزادانہ حرکت ہے اور فطرت کے ناگزیر جبر سے بھی آزاد ہے۔ وجودیت کے معترضین نے جب وجودیوں کے آزاد انسان کو خلافِ عقل اور خلافِ مشاہدہ قرار دیا تو سارتر نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے حسبِ ذیل بیان دیا۔

"میں اپنی جماعت، قوم اور خاندان کے مقسوم سے بھاگ نہیں سکتا اور نہ میں اپنے نصیب اور قوت ہی کو بنا سکتا ہوں۔ بلکہ میں اپنی معمولی احتیاجات و عادات پر بھی قابو حاصل نہیں کر سکتا۔ میں پیدائشی طور پر ایک مزدور اور فرانسیسی ہوں۔ جسے وراثت میں آتشک یا دق کا مرض ملا ہے ایک زندگی کی تاریخ خواہ کچھ بھی ہو۔ وہ شکست و ناکامی کی داستان ہے...... یہ ضروری ہے کہ فطرت پر حکمرانی کرنے کے لئے اس کی اطاعت کی جائے۔ گویا یکہ جبریت کے حلقۂ دام میں اپنے عمل کا نقش بٹھانا۔"

اقبال کے نزدیک بھی انسانی آزادی کی حدود ہیں اور انہیں حدود میں رہ کر وہ اپنی آزادانہ حیثیت برقرار رکھ سکتا ہے ؎

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بگل بھی ہے
انہیں پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

اقبال کے سامنے جبر و آزادی دونوں کی حدود روشن ہیں، اسی لئے وہ کہتا ہے:

راز ہے راز ہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز

لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے اوپر چند آئین کی قید گوارا کرے۔ اور اسی جبر سے اختیار پیدا ہوتا ہے ؎

در اطاعت کوش اے غفلت شعار
می شود از جبر پیدا اختیار

مطلق آزاد وجود وہی ہو سکتا ہے جو فطرت کے علائق سے قطعی مبرا ہو۔ انسان فطرت سے وابستہ بھی ہے اور آزاد بھی۔ وہ فطرت سے وابستہ اس لئے ہے کہ اس کے وجود کی حقیقت محض داخلی نہیں بلکہ معروضی بھی ہے۔ اور اسی معروضیت کا نام فطرت سے متعلق ہوتا ہے۔ انسان جسے سارتر نے POUR اور EN – SOI کا مجموعہ کہا ہے، اس پر قادر نہیں کہ کامل داخلیت حاصل کر لے۔ اس لئے فطرت سے اس کی وابستگی لازمی ہے۔ اسی لئے اس پر فطرت کی اطاعت بھی لازم آتی ہے۔ لیکن چونکہ وہ صرف کارگہہ فطرت کا مصنوع نہیں اور اس میں ایک ایسا عنصر موجود ہے جسے وجودیوں نے "داخلیت" سے تعبیر کیا ہے اور جسے ولیم جیمس شعور کے نام سے پکارتا ہے۔ اور چونکہ یہ فطرت کے خلاف ظہور میں آیا ہے، اس لئے انسان ایک خاص حد تک ہی فطرت کی پابندی گوارا کر سکتا ہے۔ کیونکہ بقول سارتر

شعور، انتخاب اور آزادی تینوں کے معنی ایک ہیں۔ شعور کا انتخابی عمل فطری اغراض کی تکمیل کے لیے نہیں ہوتا بلکہ اس کی اپنی اغراض اور اپنے مقاصد ہوتے ہیں جسے ہائیڈگر نے DASEIN (حقیقت انسانی) کی جستجوئے صداقت بلکہ تخلیقِ صداقت اور جسے سارتر نے اقدار کی تخلیق سے تعبیر کیا ہے۔ اقبال نے بھی خودی کے ایک پہلو کو قدر آفریں خودی سے تعبیر کیا ہے۔ یہ انسان، یا بقول سارتر انسانی داخلیت ہے جس کی وجہ سے اقدار کا وجود ہوا۔ انسانی ذات کا یہ عنصر اُسے فطرت پر تصرف و غلبہ حاصل کرنے کے لئے اکساتا ہے اور اسی لیے انسان فطرت سے مزاحم ہے۔ کیونکہ شعور کا تقاضہ ہی فطرت سے متصادم ہو جاتا ہے۔ جیسے سارتر نے اس طرح بیان کیا ہے:-

"وہ POUR- SOI آزاد نہیں ہو سکتی جو
عالم سے مزاحم نہیں!"

اقبال کی خودی بھی کشتۂ لذتِ پیکار ہے اور یہی لذتِ پیکار خودی کی زندگی ہے ؎

زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش

——— اور اسی لئے اقبال تصادم، پیکار اور ستیزہ کاری کے لئے اکساتا ہے ؎

بدریا غلط و با موجش در آویز

انسان کی آزادی کا سرچشمہ اس کا شعور ہے۔ جسے سارتر نے "فطرت میں اجنبی اضافہ" اور "داخلیت" کے نام سے پکارا ہے۔ اسی داخلیت اور شعور سے اس کی آزادانہ حرکات و اعمال کے چشمے پھوٹتے ہیں اور اسی شعور کی وجہ سے اس پر ایک ایسی ذمہ داری عاید ہوتی ہے جسے وجودیوں سے بہت پہلے حافظ نے کہہ دیا تھا ؎

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند

اسی "بار امانت" کو "وجودی" "شعور کا بوجھ" کہتے ہیں۔ اسی شعور کے بوجھ کی وجہ سے اس کی حیثیت "آزادیٔ محض" کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہتی اور اسی شعور کی وجہ سے انسان اقوال و ظروف اور قانونِ توارث کا پابند نہیں رہ سکتا۔ وہ ان کے حلقوں کو توڑ کر اپنی آزادی کا بیباکانہ نعرہ بلند کرتا ہے ؎

نہ ستارے میں ہے نے گردشِ افلاک میں ہے
میری تقدیر مرے نالۂ بیباک میں ہے

گو اقبال سارتر کی مانند یہ نہیں کہتے کہ "میرا بوجھ میری آزادی ہے"۔ لیکن اقبال کے نزدیک بھی شعور کی پیدائش آزادی و اختیار کی پیدائش ہے۔ وجودی انسان کو صرف اس لئے آزاد قرار دیتے ہیں کہ اس میں ایک ایسا عنصر موجود ہے جسے مارکس اور اس کے متبعین نے اس لئے تسلیم نہیں کیا تھا کہ اسے مان لینے سے "فطرت میں اجنبی اضافہ" کو تسلیم کرنا لازم آتا ہے۔ کیرک گورد سے لیکر سارتر تک سب کے نزدیک، شعور فطرت میں ایک اجنبی اضافہ ہے اور یہی انسان کی داخلیت ہے۔ اس داخلیت پر سارتر کو اس قدر یقین ہے کہ وہ بڑی جرأت سے کہہ اٹھتا ہے:-

"یہاں کوئی کائنات موجود نہیں ہے سوائے انسانی
کائنات اور انسانی داخلیت کی کائنات کے"

اور جسے اقبال نے یوں بیان کیا ہے۔ ؏

تو ہے، تجھے جو کچھ نظر آتا ہے نہیں ہے

سارتر نے کہا تھا کہ انسان اپنے آپ کو ایک ایسی ہستی تسلیم کرے جس کی وجہ سے عالم موجود ہے۔ یہی اقبال نے بہت پہلے کہہ دیا تھا ؎

جہانِ رنگ و بو گلدستۂ ما
زما آزاد و ہم وابستۂ ما

اس کے معنی یہ نہیں کہ اقبال اور سارتر منکرِ ہنگامۂ موجود کی اور اعیانِ نامشہود پیراں کی نظر ہے۔ بلکہ وہ عقل کی چشم غلط بیں کے فساد سے بچنے کے لئے ہم آواز ہو کر کہہ دیتے ہیں ؏

کہ ہر موجود ممنونِ نگاہ ہے ست

اقبال اور وجودیوں نے فطرت کے خارجی وجود سے انکار نہیں کیا بلکہ وہ "ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال" سے بچنے کے لئے شعور کی نسبت سے موجودات کے ہنگامہ کو بپا دیکھتے ہیں۔ جو ہم سے آزادانہ طور پر موجود ہونے کے باوجود ہم سے وابستہ ہے۔

زما آزاد و ہم وابستۂ ما

ہیگل کے ان "باغی شاگردوں" نے ہیگل کے حدود سے قدم

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

سرودِ رفتہ

(ایک خط)

علامہ اقبالؒ

نعیم آسذو صاحب کے بیان کے مطابق جنہوں نے حضرت علامہ کے اس خط کی نقل بھیجی ہے اور ان کے "علم دلقین" میں یہ اب تک کہیں شائع نہیں ہوا، یہ دراصل منشی محمد دین فوق امرتسری (مرحوم) کے نام لکھا گیا تھا۔ حضرت احسان مرحوم نے جو ان کے احباب سے تھے، اس کو نقل کر کے ہمارے کرم فرما کے نانا حضرت آثم بریلوی مرحوم (شاگرد امیر مینائی) کو ان کی فرمائش پر ارسال کیا تھا۔ اس کو ارباب ذوق تک پہنچانے کے لیے ایک اور نقل شاید بے محل نہ ہو۔ بہر حال۔ از طاق بادہ گیرم و در ساغر افگنم۔ (مدیر)

(از کیمبرج (انگلستان)

۲۵ نومبر ۱۹۰۵ء

مخدوم و مکرم السلام علیکم

میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ سوئز پہنچ کر دوسرا خط لکھوں گا۔ مگر چونکہ عدن سے سوئز تک کے حالات بہت مختصر تھے اس واسطے میں نے یہ ہی مناسب سمجھا کہ لندن پہنچ کر مفصل واقعات عرض کروں گا۔ میرے پاس ایک کاغذ تھا جس پر نوٹ لیتا جاتا تھا مگر افسوس ہے کہ منزلِ مقصود پر پہنچکر وہ کاغذ کہیں کھو گیا۔ یہی وجہ ابتک میرے خاموش رہنے کی تھی۔ شیخ عبدالقادر صاحب کی معرفت آپ کی شکایت پہنچی۔ کل ایک پرائیویٹ خط میں نے آپ کے نام لکھا تھا۔ دونوں خط آپ کو ایک ہی وقت ملیں گے۔

عدن میں قدیم ایرانی بادشاہوں کے بنائے ہوئے تالاب ہیں اور یہ اس طرح بنائے گئے ہیں کہ ایک دفعہ کی بارش کا تمام پانی ہر جگہ سے ڈھل کر ان میں جا گرتا ہے۔ چونکہ ملک خشک ہے اس واسطے ایسی تعمیر کی سخت ضرورت تھی۔ میں بوجہ گرمی کے اور قرنطینہ کے عدن کی سیر نہ کر سکا اور انجینئری کے اس حیرت ناک کرشمے کے نظارے سے محروم رہا۔

جب ہم سوئز پہنچے تو مسلمان دکانداروں کی ایک کثیر تعداد ہمارے جہاز پر آموجود ہوئی۔ اور ایک قسم کا بازار تختۂ جہاز پر لگ گیا۔ ان لوگوں کی فطرت میں میلانِ تجارت مرکوز ہے، اور کیوں نہ ہو؟ انہیں کے آبا و اجداد تھے جن کے ہاتھوں میں کبھی یورپ اور ایشیا کی تجارت تھی۔ سلیمان اعظم انہی میں ایک شہنشاہ تھا جس کی وسعت تجارت نے اقوام تجارت کو ڈرا کر ہندوستان کی ایک نئی راہ دریافت کرنے کی تحریک کی تھی۔ کوئی پھل بیچتا ہے، کوئی پوسٹ کارڈ دکھاتا ہے۔ کوئی مصر کے پرانے بت بیچتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا جاتا ہے کہ یہ ذرا سا بت اٹھارہ ہزار برس کا ہے جو ابھی کھنڈر کھودنے پر ملا ہے۔ غرضکہ یہ لوگ گاہکوں کو "قید" کر لینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔ انہی لوگوں میں ایک شعبدہ باز بھی ہے کہ ایک مرغی کا بچہ ہاتھ میں لئے ہے اور کسی نہ معلوم ترکیب سے ایک کے دو بنا کر دکھاتا ہے۔ ایک نوجوان مصری دکاندار سے میں نے سگرٹ خریدنے چاہے اور باتوں باتوں میں اس سے کہا کہ میں مسلمان ہوں مگر میرے سر پر چونکہ انگریزی ٹوپی تھی اس نے ماننے میں تامل کیا اور مجھ سے کہا تم ہیٹ کیوں پہنتے ہو؟ (تعجب ہے کہ یہ شخص ٹوٹی پھوٹی اردو بولتا تھا۔ جب وہ میرے اسلام کا قائل ہو کر یہ جملہ بولا کہ "تم بھی مسلم ہم بھی مسلم" تو مجھے بڑی مسرت ہوئی) میں نے جواب دیا کہ ہیٹ پہننے سے کیا اسلام تشریف لے جاتا ہے؟ کہنے لگا کہ اگر مسلمان کی ڈاڑھی منڈی ہو تو اس کو ترکی ٹوپی یعنی طربوش ضرور پہننا چاہیئے۔ ورنہ پھر اسلام کی علامت کیا ہو گی؟ میں نے اپنے دل میں کہا کہ کاش! ہمارے ہندوستان میں بھی یہ مسئلہ مروج ہو جاتا کہ ہمارے دوست موسمی علماء کے حملوں سے مامون و مصئون ہو جاتے۔ خیر آخر یہ شخص میرے اسلام کا قائل ہوا۔ اور چونکہ حافظ قرآن تھا۔ اس واسطے میں نے چند آیات قرآن شریف کی پڑھیں تو نہایت خوش ہوا

(باقی صفحہ ۴۰ پر)

جوئے کہستاں : ایک اور موجِ رواں

عابد رضا بیدار

اصل مینکش حسب سابق دو لخت تھی یعنی خطوط الگ اور تعارف الگ۔ ادارہ نے دونوں کو یکجا کر کے مناسب اضافہ و حاشیہ آرائی کے ساتھ مسلسل بنا دیا ہے تاکہ مضمون کا یکساں نظر مطالعہ کیا جا سکے ـــــ مدیر

اس سے پہلے ماہِ نو، نومبر ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں علامہ اقبالؒ کے چند قلمی نوادر پیش کر چکا ہوں۔ مگر ان کے فکر و فن کی جوئے رواں سے صرف چند قطرے، وہی بات ہے کہ :

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

اس لئے ایک بار پھر چند اور نوادر پیش کر رہا ہوں۔ جن کی نوعیت کسی قدر مختلف ہے۔ یہ اقبال کے چند مکتوبات ہیں جو ان کے فکر و فن ہی نہیں ان کے عہد کے بعض حالات اور ہمعصروں پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ ان میں سب سے اہم وہ خط ہے جو پنڈت دیا نرائن نگم مدیر "زمانہ" (کانپور) کے نام لکھا گیا ہے۔ اس صدی کی پہلی دہائی کسے یاد نہ ہوگی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ برصغیر پاک و ہند میں سیاسی بیداری اور سیاسی تحریکوں کی اولین ہلچل پیدا ہوئی اور اس کے نتیجے میں "سودیشی تحریک" کا آغاز ہوا جس نے ملکی اشیاء کے استعمال پر زور دیا، حب وطن کے جذبہ کو بیدار کیا اس سے نبرد آزما ہونے کی عملی راہ دکھائی اور بالآخر تحریک آزادی کا ایک زبردست حربہ بن گئی۔ یوپی میں اس تحریک آزادی کا سب سے بلند آہنگ نقیب ہونے کا شرف مولانا حسرت موہانی اور ان کے رسالہ "اردوئے معلیٰ" کو حاصل ہے۔ اور ان کے بعد پنڈت دیا نرائن نگم اور ان کے مشہور رسالہ "زمانہ" کو۔ اس لئے مذکورہ تحریک کی تاریخ کی جو کڑیاں ابھی تک بھول بھلیّوں میں کھوئی ہوئی ہیں، ان میں سے بیشتر "اردوئے معلیٰ" اور "زمانہ" جیسے رسالوں ہی کے اوراق میں بکھری پڑی ہیں۔ اور اگر ہم اس ہنگامہ آفریں دور کی گوناگوں تحریکات کے زیرِ دھاروں اور موقتی سیاست کے مدوجزر کا مطالعہ کرنا چاہیں تو ہمیں ان ہی جرائد و صحائف کی چھان بین کرنی ہوگی۔ ان سے جو تحریریں دستیاب ہوتی ہیں ان کو تحریک آزادی کے خاموش عوامل کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ یہ ان ذہنوں کو موڑتی، لچکاتی اور پگھلاتی ہیں جنہوں نے تحریک آزادی کو نیا رنگ و آہنگ اور جذبہ و جوش عطا کیا اور صالح امامت و قیادت سے منزلِ مقصود کو قریب تر کر دیا۔ بنگال پہلے ہی ان تحریکوں بلکہ "طغیان و طغیانی" کا مرکز تھا۔ آہستہ آہستہ اُردو اور اس کے ادیبوں اور صحافیوں کے ذریعہ شمالی ہند میں بھی خصوصیت سے ان تحریکات کا اثر عام ہوتا جا رہا تھا۔

۱۹۰۶ء میں مدیر "زمانہ" نے ممتاز مسلمان اصحاب فکر و نظر کے نام ایک سوالنامہ جاری کیا جس میں انہیں اس تحریک کے متعلق اظہارِ رائے کی دعوت دی گئی تھی۔ اس کے جواب میں مارچ، اپریل میں حالی، شبلی، ذکاء اللہ اور خواجہ غلام الثقلین اور مئی میں عبد القادر بی اے (جو بعد میں سر عبد القادر ہوئے) کے لندن اور پروفیسر شیخ محمد اقبال ایم۔ اے کے کیمبرج سے بھیجے ہوئے خطوط "سودیشی تحریک اور رہبران اسلام" کے زیر عنوان شائع ہوئے۔ اقبال کا خط جس کی نقل ذیل میں پیش کی جاتی ہے، ان کے سیاسی شعور اور حالات حاضرہ پر حکیمانہ نظر کا آئینہ دار ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں جو کچھ کہا ہے ایک ماہرِ معاشیات ہی کی حیثیت سے کہا ہے کیونکہ وہ اس علم کے معلم بھی رہ چکے تھے اور اس میں صاحب تصنیف بھی تھے۔ انہوں نے اہل وطن کو یہ مشورہ دیا کہ جذبات کی رو میں بہہ کر بدیسی کپڑوں کو آگ لگانا اور بغیر وسائل پیدا کئے بائیکاٹ کرنا معاشی خودکشی کے مترادف ہے۔ مگر حبِ وطن اور بدیشی تحریک کو موزوں و مناسب حدود میں رکھنے سے اتفاق کیا۔ بہرکیف اقبال کا یہ خط ہمارے

سامنے بہت سے اہم نکات پیش کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :۔

(۱) سودیشی تحریک ہندوستان کے لئے کیا ہر ملک کے لئے جس کے اقتصادی اور سیاسی حالات ہندوستان کی طرح ہوں مفید ہیں۔

کوئی ملک اپنے سیاسی حقوق کو حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ پہلے اس کے اقتصادی حالات درست نہ ہو جائیں۔ ہمارے اہل الرائے "سیاسی آزادی سیاسی آزادی" پکار رہے ہیں مگر کوئی شخص اس باریک اصول کی طرف توجہ نہیں کرتا کہ سیاسی آزادی کے شرائط میں سب سے بڑی شرط کسی ملک کا اقتصادی دوڑ میں سبقت لے جانا ہے، جہاں تک اس کا جغرافی مقام اور دیگر قدرتی اسباب اس کے ممد ہوں۔ سیاسی آزادی کوئی معمولی چیز نہیں کہ بغیر دام دیئے مل جائے۔ انگلستان کی سرزمین کے ہر ذرّے میں ان لوگوں کا خون چمکتا ہوا نظر آتا ہے جنہوں نے سیاسی حقوق کی خاطر اپنی جانیں قربان کیں۔ باغیوں کی طرح نہیں بلکہ ان لوگوں کی طرح جن کے دلوں میں اپنے وطن کے قانون اور اس کے رسوم کی عزت ہوتی ہے اور جو اپنے گراں قدر خون کے قطرے قانون کی تائید میں بہاتی ہیں، نہ اس کی تردید اور مخالفت میں۔ میرا تو یہ مذہب ہے کہ جو قوم خود آزادی کی دلدادہ ہو وہ اوروں کی آزادی کو رشک کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتی اور انگریزوں کی معاشرت دیکھ کر بھی میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے ہاں ہم لوگوں میں اس کی قابلیت ہونا ضروری ہے اور اس قابلیت کے پیدا ہونے کا سب سے بڑا سبب جیسا کہ میں نے اوپر اشارہ کیا ہے، اقتصادی قوانین کو ایک مرکز پر جمع کرنا ہے، جس کی طرف خوش قسمتی سے اب اہل وطن کو توجہ ہوئی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ بے وجہ جوش ہماری آرزو کو تاریک کر دیتا ہے اور ہم اس جوش میں ایسی طفلانہ حرکات کر دیتے ہیں جن کا مفید اثر کچھ نہیں ہوتا۔ اور جن کا نقصان دیرپا ہوتا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی عقل کی بات ہے کہ امریکہ اور جرمن کی چیزیں خریدو مگر انگلستان کی چیزوں کو ہندوستان کے بازار سے خارج کر دو۔ مجھکو تو اس کا اقتصادی فائدہ کچھ نظر نہیں آتا۔ بلکہ انسانی فطرت کے محرکات پر غور کرو تو اس میں سراسر نقصان ہے۔ اس طریق عمل سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان سے ہم کو سخت نفرت ہے، نہ یہ کہ ہم کو ہندوستان سے محبت ہے۔ اپنے وطن کی محبت کسی غیر ملک کے مستلزم نہیں ہے۔ علاوہ اس کے اقتصادی لحاظ سے اس میں کچھ فائدہ نہیں ہے۔ مغربی خیالات اور تعلیم کی اشاعت سے اب ہماری ضرورت کا احاطہ وسیع ہو گیا ہے، اور پھر اسی میں بعض اس قسم کی ہیں کہ سر دست ہمارا اپنا ملک ان کو پورا نہیں کر سکتا۔ پھر میں نہیں سمجھتا کہ اس طفلانہ فعل سے سوائے اس کے کہ حکام کو خواہ مخواہ بدظن کیا جائے اور کیا فائدہ ہے۔ قطع نظر ان تمام باتوں کے ہزاروں چیزیں ایسی ہیں کہ ہمارا ملک بعض حوالی خصوصیت اور دیگر قدرتی اسباب کے عمل کی وجہ سے ان کو ارزاں نرخ پہ تیار نہیں کر سکتا۔ اس بات کی کوشش کرنا کہ ہماری ساری ضرورتیں اپنی خصوصیات سے پوری ہو جایا کریں۔ سراسر جنون ہے۔ واقعات کے لحاظ سے دیکھو تو یہ بات کسی ملک کو نہ اب نصیب ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ اور اگر یہ بات ممکن بھی ہو جائے تو اس میں میرے خیال میں بجائے فائدے کے نقصان ہے جس کی مفصل تشریح اس مقام پر نہیں ہو سکتی۔

سودیشی تحریک کو عملی صورت دینے کے لئے میری رائے میں ان باتوں کا لحاظ ضروری ہے،

(الف) وہ کون سی مصنوعات ہیں جو اس وقت ملک میں تیار ہو رہی ہیں اور ان کی کمیت اور کیفیت کیا ہے۔

(ب) وہ کون سی مصنوعات ہیں جو پہلے تیار ہوتی تھیں اور اب نہیں ہوتیں۔

(ج) وہ کون کونسی مصنوعات ہیں جن کو ہم خصوصیات سے عمدہ اور ارزاں تیار کر سکتے ہیں۔

(د) ملک کے صوبوں یا دیگر قدرتی حصص کے لحاظ سے وہ کون کون سے مقام ہیں جو بعض اسباب کی وجہ سے خاص خاص مصنوعات کے لئے موزوں ہیں۔

(ہ) تخمیناً کس قدر سرمایہ زیورات وغیرہ کی صورت میں معطل پڑا ہے، اور اس کو استعمال میں لانے کے لئے

کیا وسائل اختیار کئے جائیں۔

ان تمام امور کا لحاظ رکھ کر عملی کام شروع کرنا چاہئے۔ ضرور ہے کہ ابتدا میں ناکامی کا سامنا بھی ہو۔ مگر کوئی بڑا کام سوائے قربانی کے نہیں ہوا۔ کسی ملک کے اقتصادی حالات کا درست ہونا تھوڑے عرصے کا کام نہیں ہے۔ اس میں صدیوں کی ضرورت ہے۔ ہم نقصان اٹھائیں گے تو ہماری آئندہ نسلیں فائدہ اٹھائیں گی۔ علاوہ اس کے مشترک سرمائے کی جماعتیں نہایت مفید ثابت ہوں گی، خصوصاً ہمارے ملک میں جہاں کے لوگ کم سرمایہ رکھتے ہیں۔ سرمائے کے بہترین نتائج اس وقت پیدا ہوتے ہیں۔ جب اس کی مقدار بڑی ہو۔ مگر عملی لحاظ سے کامیاب ہونے کے لئے سب سے بڑی ضرورت اصلاح اخلاق کی ہے۔ لوگوں کو ایک دوسرے پر اعتبار کرنا سکھاؤ، ان کے اسرافی عادات پر نکتہ چینی کرو۔ اور ان کے دل پر یہ امر نقش کرد و کہ انسان کی زندگی کا مقصد خود غرضی کے پردے میں بنی نوع انسان کی بہتری کی جستجو کرنا ہے۔

افسوس ہے کہ میں جیسا چاہتا تھا ویسا جواب نہیں لکھ سکا۔ کچھ اس خیال سے کہ زیادہ تعویق مناسب نہ ہوگی۔

(۲) سیاسی حقوق کے حصول کی دوسری بڑی شرط کسی ملک کے افراد کے اغراض کا متحد ہونا ہے۔ اگر اتحاد اغراض نہ ہوگا تو قومیت[1] پیدا نہ ہوگی، اور اگر افراد قومیت کے شیرازے سے ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ نہ ہوں گے تو نظام قدرت کے قوانین ان کو صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیں گے۔ قدرت کسی خاص فرد یا مجموعۂ افراد کی پروا نہیں کرتی۔

مگر رونا تو اسی کا ہے کہ لوگ اتفاق اتفاق پکارتے ہیں اور عملی زندگی اس قسم کی اختیار نہیں کرتے جس سے ان کے اندرونی رجحانات کا اظہار ہو۔ ہم کو قال کی ضرورت نہیں ہے۔ خدا کے واسطے حال پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ مذہب دنیا میں صلح کرانے کے لئے آیا ہے نہ کہ جنگ کی غرض سے۔

میری رائے میں اس تحریک کی کامیابی سے مسلمانوں کو ہر طرح فائدہ ہے۔ ایک صاحب نے کسی اخبار میں یہ خط چھپوایا تھا کہ مسلمانوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ عام طور سے مسلمان زراعت پیشہ ہیں۔ ان کا یہ ارشاد شاید پنجاب کی صورت میں صحیح ہو۔ تاہم یہ کہنا کہ مسلمان زراعت پیشہ ہیں، اس امر کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ سودیشی تحریک کی کامیابی سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔ اگر مصنوعات سستی ہوں (جو بالآخر اس تحریک کی کامیابی کا نتیجہ ہوگا) تو خریدنے والوں کو بھی فائدہ ہے اور بیچنے والوں کو بھی۔ مسلمان خواہ بیچنے والے ہوں خواہ خریدنے والے، ہر طرح فائدے میں ہیں۔ ہاں اگر بیچنے والے ہیں تو ان کو فائدہ ہے، اور یہ کون کہتا ہے کہ وہ بائع نہ بنیں۔

(۳) اگر صبر و استقلال سے کام کیا گیا تو اس تحریک میں ضرور کامیابی ہوگی۔ دور اندیشی تمام کامیابی کا راز ہے۔ ایک حد تک تو اس تحریک کے مطابق ملک میں عمل درآمد ہو رہا ہے۔ اس عمل کی توسیع کی ضرورت ہے جو اس صورت میں ممکن ہے کہ عمدہ اور ارزاں مصنوعات پیدا کر کے گراں اور ظاہری نمائش والی چیزوں کو ملک سے نکالو۔ مقدس عہد لینا کہ ہم خارجی ممالک کے مصنوعات کا استعمال نہ کریں گے۔ اور جوش میں آکر انگریزی کپڑے کے کوٹ آگ میں پھینک دینا ایک طفلانہ فعل ہے۔ جو اقتصادی لحاظ سے غیر مفید اور سیاسی لحاظ سے مضر ہے۔ اگر اس تحریک سے ہندو اور مسلمانوں میں اتحادِ اغراض پیدا ہو جائے اور رفتہ رفتہ قوی ہوتا جائے تو سبحان اللہ اور کیا چاہیئے۔ ہندوستان کے سوئے ہوئے نصیب بیدار ہوں اور میرے دیرینہ وطن کا نام جلی قلم سے فرقِ اقوام میں لکھا جائے۔

والسلام

محمد اقبال (۱۹۰۶ء)

---

[1] اقبالؒ کے محولہ بالا گراں قدر ارشادات اب بھی ہم اہلِ پاکستان کے لئے شمعِ راہ ہیں — مدیر

یہ تو تھے اقبال ایک ماہرِ معاشیات، ایک سیاسی ناظر، ایک محبِ وطن اور مردِ نکتہ داں کی حیثیت سے۔ اب ان کی روشن خیالی اور وسیع النظری کی طرف آیئے۔ ہم جانتے ہیں کہ اقبال کو اردو سے عشق تھا۔ اس سلسلہ میں ان کا یہ ارشاد کون نہیں جانتا کہ ؎

گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائی دلسوزئ پروانہ ہے

اس لئے جو بھی اس شمع کا پروانہ اور شانہ کش ہو اُن کی نظر میں عزیز تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء میں جب منشی پریم چند کی کہانیوں کا مجموعہ "پریم پچیسی" طبع ہوا تو انہوں نے اس کی بڑی فراخدلی سے داد دی۔ اور ان کی رائے اس کتاب کے ایک اشتہار مطبوعہ "الناظر" (لکھنؤ) ستمبر ۱۹۱۵ء میں بطورِ خاص شائع ہوئی۔ اشتہار کے الفاظ یہ ہیں:۔

"اُردو کے زندۂ جاوید شاعر حضرت اقبال نے اپنے ایک خط میں "پریم پچیسی" کے مصنف کو تحریر فرمایا ہے کہ:

"آپ نے اس کتاب کی اشاعت سے اُردو لٹریچر میں ایک نہایت قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے نتیجہ خیز افسانے جدید لٹریچر کی اختراع ہیں۔ میرے خیال میں آپ پہلے شخص ہیں جس نے اس دقیق راز کو سمجھا ہے اور سمجھ کر اس سے اہلِ ملک کو فائدہ پہنچایا ہے۔ ان کہانیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف انسانی فطرت کے اسرار سے خوب واقف ہے اور اپنے مشاہدات کو ایک دلکش زبان میں ادا کر سکتا ہے۔"

اس سے ظاہر ہے کہ اقبال ایک فلسفی، ایک دانائے راز ہوتے ہوئے افسانہ کا بھی حقیقت سے کم ذوق نہیں رکھتے تھے اور اس کی باریکیوں کو بخوبی سمجھتے تھے۔

اقبال کے خطوط کے سلسلہ کی ایک کڑی وہ ہے جو انہوں نے وحید احمد صاحب مدیرِ "نقیب" (بدایوں) کو تحریر کئے۔ ان میں سے پہلا خط یہ ہے:۔

لاہور، ۴ ستمبر

مکرمی تسلیم

"نقیب" کے لئے دو تین اشعار حاضر ہیں:۔

از من اے بادِ صبا گوئے بہ دانائے فرنگ
عقل تا بال کشود است گرفتار تر است
برق را ایں بہ جگر می زند آں رام کند
عشق از عقلِ فسوں پیشہ جگر دار تر است
چشم جز رنگِ گل و لالہ نہ بیند ورنہ
آنچہ در پردۂ رنگ است پدیدار تر است

مخلص

محمد اقبال

مدیرِ رسالہ، شیخ وحید احمد صاحب کی اطلاع کے مطابق، جو ہنوز حیات ہیں، نقیب مارچ ۱۹۱۹ء کو جاری ہوا تھا۔ پھر سال بھر بند رہ کر ۱۹۲۱ء میں دوبارہ نکلا اور سال بھر کے اندر ہی مر گیا۔ یہ رسالہ فروری ۱۹۱۹ء میں جاری ہوا اور اپریل ۱۹۲۲ء میں اس کا آخری نمبر نکلا۔ اقبال کا مرقومہ بالا خط بطورِ عکس تحریر طبع ہوا۔ اس میں جو اشعار درج ہیں ان ہی کے بارے میں اقبال نے اپنے ایک مکتوب محررہ ۷ ستمبر ۱۹۱۹ء میں سید سلیمان ندوی مرحوم کی ایک فرمائش کے جواب میں لکھا تھا کہ:۔

"انشاء اللہ معارف کے لئے کچھ نہ کچھ لکھوں گا۔ کئی ماہ کے بعد صرف تین شعر ہوئے تھے۔ نقیب کا عرصے سے تقاضا تھا، اس کے لئے بھیج دیئے۔ (اقبال نامہ ۱/۱۰۲)

یہ تین شعر بعد میں "پیامِ مشرق" کے اس حصہ کی پہلی نظم 'پیام' کے ابتدائی اشعار قرار پائے جو "نقشِ فرنگ" کے نام سے موسوم ہے۔ اور جس میں اقبال نے اہلِ مغرب کو مخاطب کرتے ہوئے اپنا مخصوص پیغام دیا ہے۔ یہ کہ نوعِ انسان کی نجات عقل نہیں بلکہ عشق سے ہے۔ فلسفہ و حکمت بجائے خود کتنے ہی مفید اور اہم کیوں نہ ہوں، ان کا تمام حیاتِ انسانی پر حاوی ہو جانا ان تمام خرابیوں کی جڑ ہے جن کا مغربی معاشرہ شکار ہے۔ اور جس کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔ "پیام" میں اس مرکزی خیال کو پھیلا کر پیش کیا گیا جس سے اس بات پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ شاعر کا ذہن بالعموم کیسے کام کرتا ہے۔ وہی بات جو کبھی ایک چھوٹا سا نکتہ ہوتی ہے بعض اوقات صرف ایک دو شعروں ہی میں ادا ہو کر رہ جاتی ہے اور کبھی بسیط نظم

ی شکل اختیار کرتی ہے۔ تہذیب مغرب کے متعلق اقبال کا نقطۂ نظر سب سے زیادہ شرح و بسط اور وضاحت کے ساتھ، مدلل طور پر، اسی نظم میں ظاہر ہوا ہے۔

صحافتی ضرورتیں تو پیہم ہیں، مسلسل ہیں۔ ایک سیل رواں جو کسی کے روکے نہیں رکتا۔ اس لئے مدیر "نقیب" نے غالباً مزید کلام کی فرمائش کی ہوگی۔ اس وقت اقبال علیل بھی تھے اور مصروف بھی۔ اس لئے معذرت چاہی لکھتے ہیں :-

لاہور - ۱۸ نومبر ۱۹۱۹ء

مکرم بندہ - السلام علیکم

آپ کے دونوں خط مل گئے تھے پہلے خط میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس کا جواب جلد دیا جائے۔ دوسرا خط ملا تو میں بخار کی وجہ سے صاحب فراش تھا۔ اب کچھ افاقہ ہے۔

افسوس ہے کہ کوئی شعر اس وقت لکھا ہوا موجود نہیں۔ مشاغل اجازت نہیں دیتے کہ جب چاہوں ادھر توجہ کر سکوں اور فکر کر کے کچھ شعر لکھ لوں۔

مخلص

محمد اقبال - لاہور

ایک اور خط بظاہر اس کے بعد کا لکھا ہوا ہے۔ کیونکہ اس میں بیماری سے شفا پانے کا ذکر ہے۔ مگر معلوم نہیں کیوں، اس پر ایک دن پہلے کی تاریخ ہے۔ غالباً مکتوب نگار نے اقبال سے اپنے حالات زندگی۔ بھیجنے کی فرمائش کی تھی۔ جس کی وہ تعمیل نہ کر سکے۔ ان کا یہ ارادہ کہ وہ اپنے حالات قلمبند کریں پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ پچھلے خط کی طرح اس خط کے آخر میں 'لاہور' دوبارہ تحریر نہیں۔

لاہور، ۱۷ نومبر ۱۹۱۹ء

مخدومی - السلام علیکم

نوازش نامہ مل گیا ہے جس کے لئے سراپا سپاس ہوں خدا کے فضل و کرم سے اب بالکل اچھا ہوں۔ میری زندگی میں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں جو اوروں کے لئے سبق آموز ہو سکے۔ ہاں تدریجی خیالات کا تدریجی انقلاب البتہ سبق آموز ہو سکتا ہے۔ اگر کبھی فرصت مل گئی تو لکھوں گا۔ فی الحال اس کا وجود محض عزائم کی فہرست میں ہے۔

مولانا اکبر کا خط مجھے دہلی سے آیا تھا۔ اگر وہ کچھ روز وہاں ٹھہرتے، تو میں ان کی زیارت کے لئے آ جاتا۔

مخلص

محمد اقبال

یہ دونوں خط "نقیب" میں شائع نہیں ہوئے بلکہ ایک اور رسالہ "نیرنگ" یا "نیرنگستان" میں طبع ہوئے۔ جو سعید اللہ خاں عیش کی زیر ادارت شائع ہونا شروع ہوا تھا اور ان کی زندگی کے ساتھ ہی ۱۹۲۳ء میں ختم ہو گیا۔ اس سے پہلے وہ ماہنامہ "تہذیب" نکال چکے تھے۔ گلزار نسیم پر چکبست و شرر میں جو مباحثہ چلا اور اس میں جن جن رسالوں نے حصہ لیا ان میں سے ایک یہ بھی تھا۔ جن لوگوں کو یہ معرکہ یاد ہے انہیں تہذیب بھی یاد ہوگا۔ جو ستمبر ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۷ء تک چلا اور ۱۹۰۸ء میں اس کی جگہ "نیرنگ" نے لے لی۔ عیش کے بعد ان کے بیٹے عزیز اللہ خاں نے ۱۹۲۵ء میں مرحوم "نیرنگ" کو پھر زندہ کیا اور عشرت رحمانی کے تعاون سے اسے ۱۹۲۹ء کے آخر تک رام پور سے شائع کرتے رہے۔ جنوری ۱۹۳۰ء سے یہ رسالہ دلی چلا گیا اور عشرت رحمانی اس کے باقاعدہ ایڈیٹر ہو گئے۔ ۱۹۳۴ء تک اس کا یہی نام رہا۔ لیکن ۱۹۳۵ء میں "نیرنگ" سے "نیرنگستان" ہو گیا۔ کم سے کم ۱۹۳۶ء تک نیرنگ کا یہ نیا روپ چلتا رہا۔ غالباً یہ ۱۹۳۶ء ہی میں ختم ہو گیا۔ اوپر وحید احمد کے نام جن خطوط کا حوالہ دیا گیا ہے۔ ان میں سے آخری دو "نیرنگستان" ہی سے لئے گئے ہیں۔ جو اس کے ۱۹۳۵ء کے سالنامہ میں شائع ہوئے تھے۔ یہ دونوں خط اور دو اور جن کا ذکر ہم ابھی کریں گے، متن کی حد تک اس سے پہلے "اقبال نامہ" (جلد اول) مرتبہ عطاء اللہ میں آ چکے ہیں۔ لیکن غلطی سے مکتوب الیہ عشرت رحمانی کو قرار دیا گیا ہے جس سے متن اپنے مطالب میں کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ اصل مکتوب الیہ کی نشان دہی کے لئے یہ صراحت از بس ضروری ہے

جس سے ان خطوط کا حقیقی پس منظر واضح ہو جاتا ہے۔ عشرت صاحب کے بارے میں اس لئے مغالطہ ہوا کہ انہوں نے ان خطوط کو اپنے رسالے میں پہلی بار چھاپا تھا۔

ملک و ملت کی بیداری کے باب میں اقبال کے کلام نے جو اہم کردار ادا کیا ہے، اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ اس وقت کی سیاسی فضا، خلوت و جلوت اور جلسہ و جلوس میں ہر کہیں اقبال کا چرچا تھا اور اس مغنی آتش نفس نے قوم کے تن مردہ میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ وحید احمد کے نام آخری دو خطوط سے جن کو یہاں پیش کیا جا رہا ہے، اقبال کے فیضان ہی کا سوال ابھرتا ہے۔ اور ان کے فکر و خیال پر روشنی پڑتی ہے۔ یعنی یہ کہ وہ جو کچھ کر رہے تھے پیمبرانہ ذوق و شوق اور جوش و خروش ہی سے کر رہے تھے۔ اور وہ حقیقی معنوں میں ؎

در دیدۂ معنی نگراں حضرت اقبال
پیغمبرئے کرد و پیمبر نتواں گفت

کے مصداق تھے۔ اگرچہ اس کار خیر میں داد و تحسین سے بالکل بے نیاز تھے۔ اگر انہیں کوئی غرض تھی تو صرف فکر تعمیر آشیاں سے اور ان کے دل و دماغ میں تمام تر یہی احساس کار فرما تھا کہ:

نغمہ کجا و من کجا، ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

بہر حال اقبال کو بیداریٔ ہندوستان کی تاریخ میں جو حیثیت حاصل ہے، اس کے پیش نظر یہ خط دلچسپی سے خالی نہیں:۔

لاہور، ۳۰ر اگست ۱۹۲۱ء

مخدومی

تبدیل ہوا کے لئے شملہ چلا گیا تھا مگر وہاں جاتے ہی طبیعت بگڑ گئی۔ چار پانچ روز کے بعد واپس آ گیا اب خدا کے فضل سے کسی قدر اچھا ہوں۔

آپ کا حسن ظن میری نسبت بہت بڑھ گیا ہے۔ حقیقت میں، میں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کی نسبت دنیائے شاعری میں کچھ بھی نہیں، اور نہ کبھی میں نے SERIOUSLY اس طرف توجہ کی ہے۔ بہر حال، آپ کی عنایت کا شکر گزار ہوں۔ باقی رہا یہ امر کہ موجودہ بیداری کا سہرا میرے سر پر ہے یا ہونا چاہئے، اس کے متعلق کیا عرض کروں مقصود تو بیداری سے تھا، اگر بیداریٔ ہندوستان کی تاریخ میں میرا نام تک بھی نہ آئے تو مجھے قطعاً اس کا ملال نہیں۔ لیکن آپ کے اس ریمارک سے مجھے تعجب ہوا۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ اس بات کا شاید کسی کو احساس نہیں۔ مولوی ابوالکلام آزاد کے تذکرہ کا دیباچہ لکھنے والے بزرگ۔ نے جن الفاظ میں محمد علی، شوکت علی، اور میری طرف اشارہ کیا ہے، ان سے میرے اس خیال کو اور تقویت ہو گئی ہے۔ لیکن اگر کسی کو بھی اس کا احساس نہ ہو تو مجھے اس کا رنج نہیں، کیونکہ اس معاملے میں خدا کے فضل و کرم سے بالکل بے غرض ہوں۔

معلوم نہیں کونسا شعر آپ کے پاس امانت ہے۔ بہتر ہے چھاپ دیجئے۔

مخلص

محمد اقبال (۱۹۲۱ء)

بعینہٖ یہی بات سید سلیمان ندوی مرحوم کے نام ایک خط (اقبال نامہ ۱۷/۱۱۰/۱ مورخہ ۱۰ر نومبر ۱۹۱۹ء) میں کہی گئی ہے۔ مولانا ابوالکلام کے تذکرہ کی اشاعت کو اس وقت ایک مہینہ ہوا ہوگا جب وحید احمد کے نام خط میں اس کا ذکر چھڑا۔ اس کے دیباچہ نگار مرزا فضل الدین احمد نے لکھا تھا:۔

الہلال کا سب سے بڑا کارنامہ جو ہمیشہ تاریخ ہند میں یادگار رہے گا، وہ پائیدار مذہبی انقلاب ہے جو یکایک مسلمانوں میں اس کی دعوتِ حق سے پیدا ہو گیا.... تعلیمیافتہ جماعت میں فدائے قوم محمد علی اور مسٹر شوکت علی خاں، اور ہمارے قومی شاعر ڈاکٹر اقبال کا ذکر کر دینا کافی ہے ان دونوں اسلام پرستوں کو مذہب کی راہ اس نے دکھلائی..... ڈاکٹر اقبال کا مذہبی عقائد میں پچھلا حال جو کچھ سنا ہے اس کے مقابلے میں اب ان کی فارسی مثنویاں دیکھتے ہیں تو سخت حیرت ہوتی ہے۔ 'اسرار خودی' اور 'رموز بیخودی' فی الحقیقت الہلال ہی کی صدائے بازگشت ہیں۔ (تذکرہ۔ اشاعت اول/ ر۔ ز)

اور یہ آخری نقش اس لئے اہم ہے کہ ہم منظوم کلام

سے باہر منشور تحریر میں اقبال کے بعض بنیادی خیالات کا تذکرہ پاتے ہیں۔ اقبال بار بار کہتے ہیں کہ:

بگاڑا ہے تجیز ملت و آئین نے قوموں کو

اور یہ کہ:

نسل، قومیت، کلیسا، خواجگی، تثلیث، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

جیسا کہ ہم جانتے ہیں، اقبال ملکی قومیت اور وطنیت (بحیثیت سیاسی تصوّر) کے سخت خلاف تھے۔ جس کا شدید احساس انہیں مغرب میں ہوا تھا۔ اس خط میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور آخر میں دوسروں پر جس اثر کا ذکر کیا ہے، اس کا اندازہ قارئین پر موقوف ہے۔ یہ خط حسب ذیل ہے:۔

لاہور، ۷ ستمبر ۱۹۲۱ء

مخدومی۔ السلام علیکم

آپ کا والا نامہ ملا، جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔

میرا خیال تھا کہ آپ کے پاس میرا کوئی اور شعر ہوگا۔ اس شعر میں کیا رکھا ہے۔ اگر آپ کو مضمون لکھنے کی زحمت گوارا ہی کرنا ہے تو ایک رباعی فارسی حاضر کرتا ہوں، اس پر لکھیے، اور اس شعر کو نہ چھاپیے اور اس پر مضمون لکھنے کا خیال ترک کیجیے۔

وہ رباعی مندرجہ ذیل ہے:

تو اے کودک منش خود را ادب کن
مسلماں زادہ ترک نسب کن
برنگ احمر و خون و رگ و پوست
عرب نازد اگر ترک عرب کن

اس زمانے میں سب سے بڑا دشمن اسلام اور اسلامیوں کا نسلی امتیاز اور ملکی قومیت کا خیال ہے پندرہ[1] برس ہوئے، جب میں نے پہلے پہل اس کا احساس کیا۔ اس وقت میں یورپ میں تھا۔ اور اس احساس نے میرے خیالات میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی آب و ہوا نے مجھے مسلمان کر دیا۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ کبھی فرصت ہوئی تو اپنے قلب کی تمام سرگزشت قلمبند کروں گا۔ جس سے مجھے یقین (ہے) بہت لوگوں کو فائدہ ہوگا۔ اس دن سے جب یہ احساس مجھے ہوا، آج تک برابر اپنی تحریروں میں یہ ہی خیال میرا مطمح نظر رہا ہے۔ معلوم نہیں میری تحریروں نے اور لوگوں پر اثر کیا یا نہیں کیا۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اس خیال نے میری زندگی پر حیرت انگیز اثر کیا ہے۔

زیادہ کیا عرض کروں امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص

محمد اقبال

۱۹۲۱ء

یہ تھی جوئے کہستاں کی دوسری موج۔ اور کچھ اسی پر موقوف نہیں۔ یہ جوئے کہستاں ہے تو ایسی کتنی ہی دیدہ و نادیدہ موجیں اور بھی ہوں گی جو وقتاً فوقتاً بروئے کار آتی رہیں گی؎

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

---

[1] پہلے 'تیرہ' لکھا پھر اسے کاٹ کے پندرہ کر دیا۔ (عکس تحریر)

نغمہ گر

شبیر افضل جعفری

لمِ منظوم کو اسلام کا عنوان کیا

تو نے اقبالؒ مسلماں کو مسلمان کیا

ست و سرشارِ محبت کے ترانے دیکر

بزمِ تاریخ میں جمہور کو یک جان کیا

نگ مٹّی کو دیا بلبلِ عرفاں کا الاپ

بے زباں قوم کو نغمہ گرِ قرآن کیا

رزِ فرہاد کو بخشی دلِ زندہ کی بہار

مجمرِ آہ کو ملہار سے گلدان کیا

ہدِ بے روح کو تعلیم کئے عشق و خلوص

دیدۂ قلب کو انساں کا نگہبان کیا

ل دے دے کے دھڑکتے ہوئے ارمانوں کا

بسمِل ارض کو رقّاصِ فلک شان کیا

از افلاک کے برسا دئے انسانوں کے

ریت کے ذرّوں کو تاروں کا زباں دان کیا

پاک اقلیم کا ایّام کو نعرہ دے کر

مسئلۂ شیخ و برہمن کا بھی آسان کیا

یخ

جیلانی کامران

امسال شدید برفباری کتنے ہی شاعروں کے لئے فیضان کا باعث ہوئی ہے۔ یہ نظم بھی اسی سلسلہ ہی کی ایک کڑی ہے۔ (مدیر)

جسے کبھی تم نے یخ کہا تھا اُسے میں چونتیس سال سے ڈھونڈتا

ہوں، تم نے

مجھے کہا تھا وہ سرد پانی کی آنچ ہے یا سفید شیشہ سا ہے جو پانی

پہ جم چکا ہے۔

ہوا جسے اپنے ساتھ چشموں پہ، ساحلوں پر

کبھی دلوں پر بکھیرتی ہے!

تو میں نے سارے شباب کے دن تلاش میں کھو دئے! سمندر پہ، ساحلوں کے

اُداس چشموں پہ میں نے سردی کے بعد دیکھا تو یخ کے بدلے

وہی سمندر تھا، سارے ساحل وہی تھے، چشموں کا گرم پانی

اُسی طرح تھا!

تو — کون تم تھیں؟ کہ جب سے میں نے تمہارے رستے کی ایک آہٹ

سنی ہے، سردی کے تلخ موسم کی کاٹ دیکھی ہے یخ کے معنی

سمجھ لئے ہیں — مگر جو سمجھا ہے یہ ہے، ہوتا تو اور ہوتا —

میں — دل نہ ہوتا!

غزل

احمد ندیمؔ قاسمی

ہر ذہن میں منزل کا تصور تھا ہوائی
اپنے قدم اٹھے تو زمانے کی بن آئی

اندازِ نظر کی ہے سب اعجاز نمائی
رنگت ہے سلگتے ہوئے صحرا کی حنائی

آوارہ نگاہی بھی اک اندازِ وفا ہے
ہر حُسن، ترے حُسن کی ہے جلوہ نمائی

شب کو تو ذرا مشعلِ رخسار کی لَو دے
دن کو تو مرے سائے نے کی راہ نمائی

طے کر بھی سکوں گا کہ نہیں۔ کون بتائے
پھیلا ہوا تجھ تک ہے مرا دشتِ جدائی

ہر نقشِ قدم، گلشنِ فردا کی کلی ہے
صحراؤں کی رونق ہے مری آبلہ پائی

سچ ہے کہ جہاں تابعِ آئینِ خدا ہے
ویرانۂ دل پر ہے مگر میری خدائی

دامن مرا تر ہے، مگر اے داورِ محشر
اک دردِ محبت ہے مری نیک کمائی

اشکوں سے جو بچ نکلی ہے، شعروں میں ڈھلی ہے
جو بات مری خلوتِ دل میں نہ سمائی

بنگلا افسانہ:

"ہم اپنی وضع کیوں بدلیں"؟

عبدالغفار چودھری
مترجمہ: احمد سعدی

منھ زور ہونے کی وجہ سے سبھی لوگ اُسے کم کُم کہتے تھے اور اس نام کے بارے میں مختار صاحب کی بیگم سے لے کر سررشتہ دار کی بیوی اور ریٹائرڈ منصف صاحب کی نواسی تک کی ایک ہی رائے تھی۔

مختار صاحب کی بیگم کو بڑا تلخ تجربہ ہوا تھا۔ ایک دن وہ زردہ پان چباتی ہوئی سررشتہ دار کی بیوی سے ملنے آرہی تھیں کہ راستے میں اس سے ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے کہا "کیا بات ہے ری کم کُم۔ دیکھتی ہوں کہ اب تو بہت خوبصورت ہو گئی ہے۔" مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب کم کُم نے اپنے خوبصورت ہونٹ پھیلا کر جواب دیا "صرف اوروں کی ہی نہیں تمہاری بھی نظر پڑ گئی ہے خالہ۔ اب اس محلے سے میرا دانہ پانی اٹھ گیا ہے شاید۔"

مختار صاحب کی بیگم حشمت بانو نے حیرت سے بھنویں تان کر سررشتہ دار کی بیوی، آمین بی بی کی طرف دیکھا "سن رہی ہو بہن اس بدھی بچی کی باتیں! اس عمر میں تو ہم لوگوں کے منھ سے بھاپ تک نہ نکلتی تھی۔"

"ذات اور خاندان کی بات ہے" آمین بی بی نے کہا "خیر چھوڑو، کیا فائدہ، زمانہ بہت خراب ہے۔"

اور منصف صاحب کی نواسی کو اس سے زیادہ تلخ تجربہ ہوا تھا۔ الکلیمہ عمر میں کم کم سے تقریباً چار سال بڑی تھی۔ اس کی شکل و صورت معمولی سی تھی، اسلئے روپ کی کمی روپیہ سے پوری کر کے اس کی شادی کسی نہ کسی طرح ہو گئی تھی اور اب وہ تین بچیوں کی ماں تھی۔ مگر اس کی بچیاں ماں سے زیادہ ماموں سے مانوس تھیں۔ ایک دن ان بچیوں کے ماموں نے کم کم کو دیکھ کر اپنی تینوں بھانجیوں کو بلایا اور پوچھا "آکو، پاکو، ناکو، وہ کون ہے رے؟"

الکلیمہ نے جواب دیا "واہ تم اسے نہیں پہچانتے؟ یہ اپنے ہیڈ کیرانی کی لڑکی ہے۔ کم کم۔" الکلیمہ ہیڈ کلرک نہیں کہتی تھی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس طرح کیرانی بھی افسر معلوم ہونے لگتا ہے۔

ماموں نے اتنے ہی پر بس نہیں کیا۔ انھوں نے پوچھا "کچھ پڑھی لکھی بھی ہے؟"

"میٹرک کا امتحان دیا تھا، زیادہ نہیں پڑھ سکی۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ باپ غریب ہے۔"

ماموں نے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں پوچھا، کیونکہ وہ خود میٹرک کے دروازہ تک بھی نہیں پہنچے تھے۔

الکلیمہ نے مسکراتے ہوئے کہا: "اس کے لئے پریشان ہونے کی کیا ضرورت کہنے سے اس کا باپ فوراً راضی ہو جائے گا۔"

اور دوسرے دن جب الکلیمہ کی اس سے ملاقات ہوئی تو وہ آگے بڑھ کر "ارے کم کم تھوڑی دیر بیٹھو نا۔ لوگ جھوٹ نہیں کہتے رے سچ مچ تو بہت خوبصورت ہو گئی ہے، میرا تو دیکھ کر جی للچا اٹھتا ہے۔"

کم کم اٹھ کھڑی ہوئی "تمہارا ہی یا اور کسی کا بھی؟"

الکلیمہ مسکراتے ہوئے زینے سے نیچے اتر آئی "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

کم کم نے اب کے اپنی خوبصورت بھنویں چڑھا کر کہا "مجھے کیسے معلوم نہ ہو؟ راہ چلتے جب کوئی آوارہ مزاج آدمی ہوسناک نگاہوں سے دیکھتا ہے تو کیسے معلوم نہ ہوگا!"

الکلیمہ کی مسکراہٹ غائب ہو گئی، اس نے جھنجھلا کر پوچھا "کیا بولی، میرا بھائی آوارہ اور لچا ہے!"

کم کم پھر چلنے لگی "جب تم خود ہی پہچان گئی ہو، تو پھر زیادہ بات مت بڑھاؤ۔"

کم کم سے محلے کے نوجوان لڑکے بھی خوف کھاتے تھے۔

اس محلے میں ایک تفریحی کلب تھا جس کا سیکرٹری رزاق تھا، نیلی آنکھوں، بال اور سرخ و سپید رنگ۔ ان کی وجہ سے اُسے خود بھی اپنی صورت پر ناز تھا۔ محلے میں منچلے اور مسخرے لڑکوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ وہ ان کا سردار تھا۔ ہر روز شام کے وقت جب تمام لڑکے کلب میں تاش یا کیرم کھیلنے میں محو ہوتے وہ الماری سے ایک تصویروں والا رسالہ نکال لیتا اور بیٹھا دیکھتا رہتا۔ اس روز بھی وہ رسالہ کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ اس نے ورق الٹتے ہوئے بڑی بے پروائی سے کہا

"سرشتہ دار کی لڑکی کی وجہ سے میں بڑی پریشانی میں پڑ گیا ہوں۔"

اس کی باتیں سنکر اس کے دوست قریب سرک آئے۔ ستار نے پوچھا۔

"کیوں، کیا ہوا؟"

"مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ مجھے ایسی رحم طلب نظروں سے دیکھتی ہے کہ اس پر رحم آجاتا ہے۔"

اس کے دوستوں کے سینے میں رشک کی آگ سلگ اٹھی، لیکن کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس جیسی صورت کس کی تھی؟ ستار نے کہا: "سنا ہے بڑی خوبصورت ہے"

رزاق زور سے ہنس پڑا: "ہونے سے کیا ہوتا ہے، اس محلہ میں کوئی ایک ہی خوبصورت لڑکی ہے کیا! میں کتنی لڑکیوں کو خوش رکھ سکتا ہوں، یہی تو اس دن۔۔۔"

اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر رزاق ایک خوبصورت تصویر کو غور سے دیکھنے لگا۔

اس کے دوستوں نے اشتیاق ظاہر کرتے ہوئے پوچھا: "کیا ہوا تھا اس دن؟"

رزاق ہنسنے لگا: "سنکر ہی رہ جاؤ گے، اس محلہ کے کنٹریکٹر کی لڑکی کو تم پہچانتے ہو؟"

"وہ لکھ پتی باپ کی خوبصورت بیٹی جو جونیر کیمبرج میں پڑھتی ہے؟"

رزاق نے بے پروائی سے اس کی طرف دیکھا: "ہاں، ہاں وہی۔ اس نے مجھے خط لکھا تھا، یقین کرو گے؟"

سبھی لڑکے یقین کرنے اور نہ کرنے کی حالت میں تھوڑی دیر خاموش رہے۔ یقین کرنے میں رشک کا زہر بھرا ہوا تھا۔ رزاق آپ ہی آپ کہنے لگا: "لیکن ہاں، انگریزی بہت اچھی لکھتی ہے۔ زبان بڑی صاف اور سلجھی ہوئی ہے۔"

ستار نے رشک سے بے قابو ہو کر پوچھا: "تم سمجھ لیتے ہو؟"

یہ رزاق پر ایک بھرپور وار تھا، کیونکہ وہ دو مرتبہ امتحان دے کر بھی بی۔ اے پاس نہ کر سکا تھا۔ مگر رزاق بڑی بے پروائی سے مسکرایا: "کیا کہتے ہو۔ میں ہمیشہ انگریزی ڈرامے اور ناول پڑھتا رہا ہوں۔ کبھی تم نے میرے ہاتھ میں بنگالی کتاب دیکھی ہے؟"

تھوڑی دیر تک اسی طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر ستار نے اس سے باتوں ہی باتوں میں پوچھا: "کم کم کو پہچانتے ہو؟"

"کون کم کم؟" رزاق نے دل ہی دل میں اس لڑکی کو پہچاننے کی کوشش کی۔

ستار نے حیرت سے پوچھا: "نہیں پہچانتے، کیا کہتے ہو؟ ارے وہ تو اس محلہ کی اندر وشی ہے۔ اسے دیکھ کر تو رشی منی اپنی تپسیا بھول جاتے ہیں، لیکن اس کا باپ بڑا بے تکا آدمی ہے۔"

رزاق کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی: "ارے وہ بائرن کمپنی کے بڑے صاحب کے مکان کے پاس جس لڑکی کا گھر ہے، اس کا باپ شاید اسی کمپنی میں ہیڈ کلرک ہے۔"

ستار نے خوش ہو کر کہا: "تم نے ٹھیک سمجھا، بڑی تک چڑھی ہے۔ اس سے تو بات کرتے بھی ڈر لگتا ہے۔ لیکن اگر بھائی تم اسے کانٹے میں پھنسا سکو تو میں سمجھوں گا واقعی اس زمانے کے ہیرو ہو۔"

رزاق نے ہنستے ہوئے کہا: "تم پہلے ہی سے مجھے ڈرا رہے ہو۔ وہ کانٹے میں پھنسنے والی مچھلی نہیں، پھر بھی دیکھتے رہو، دو دن میں کیا ہوتا ہے۔"

اس واقعے کے چند ہی دن بعد کلب میں "ری یونین" کا جلسہ تھا۔ رنگارنگ پروگرام کے بعد صدارتی تقریر ہو رہی تھی۔ رزاق پنڈال کے باہر کھڑا ہوا اپنے دوستوں کو کوئی نئی کہانی سنا رہا تھا۔ اسی وقت لڑکیوں کی سیٹ سے چند لڑکیاں اٹھ کر باہر آگئیں۔ ستار نے اپنی آنکھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا: "کم کم!"

رزاق نے سگریٹ کا دھواں اگلتے ہوئے کہا: "ارے جا بھی۔ لڑکیوں کو اتنا گھبراتا کیوں ہے؟"

کم کم قریب آ کر کسی کو ڈھونڈنے لگی۔ پھر اس نے پوچھا: "رزاق صاحب یہاں ہیں؟"

رزاق اسمارٹ بن کر کھڑا ہو گیا۔

ستار نے کہا: "یہ یہاں کھڑے ہیں۔"

کم کم بڑے دلفریب انداز سے مسکرائی: "آپ کا خط مل گیا ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ مجھے دیکھے بغیر آپ کو ایک پل بھی چین نہیں پڑتا۔ اسی لئے آج میں خود چل کر آئی ہوں۔ دیکھئے گا، آیئے۔"

اس کے جواب میں رزاق کی قوتِ گویائی جیسے سلب ہو گئی۔ وہ بُری طرح گھبرا گیا اور بیوقوفوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

اس کے دوستوں نے جب اس کا یہ حال دیکھا تو وہ سب یکبارگی بے ساختگی کے ساتھ زور سے ہنس پڑے۔

پورے محلے میں بائرن کمپنی کے بڑے صاحب کی بیوی ہی ایسی تھیں جو کم کم کے ساتھ محبت سے پیش آتی تھیں۔ ان کا مذاق بھی کافی ستھرا تھا۔ کتابیں کا تو وہ بہت کم بہا کرتی تھیں مگر اچھی کتابیں خریدنے کا انھیں بے حد شوق تھا اور اس سے بھی زیادہ گپیں مارنے میں انھیں لطف آتا تھا۔ اسی لئے کم کم ان کے یہاں اکثر جاتی تھی اور انھیں خالہ اماں کہتی تھی۔ ہیڈ کلرک کی لڑکی تھی پھر بھی رضیہ بانو اس سے بڑی خوش خلقی سے پیش آتی تھیں اور اس کی چھوٹی موٹی شرارت بھی برداشت کر لیتی تھیں۔

لیکن اس دن جب وہ حسبِ معمول ان کے یہاں آئی تو دروازہ کے پاس جا کر یکایک ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ دروازہ کے عین بیچ، دونوں کواڑوں پر ہا

رکھے ہوئے بائیس تیئیس برس کا ایک نوجوان کھڑا تھا۔ اس کے گھونگھریالے بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے اور وہ استری کی ہوئی قمیص اور میلا پائجامہ پہنے ہوئے تھا۔ آنکھوں پر پتلے فریم کی عینک تھی اور وہ اس کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کے لئے واپس جانا بھی مشکل تھا اور دروازے سے کمرے میں داخل ہونے کا کوئی راستہ بھی نہ تھا۔

"راستہ چھوڑ یئے" کم کم نے دھیرے سے کہا۔

"ایں؟" نوجوان نے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھا اور شیشے کے اندر اس کی آنکھوں کی دونوں نیلی پتلیاں جیسے ساکت ہو کر اس پر مرکوز ہو گئیں۔

کم کم کچھ سوچ کر آگے بڑھ آئی اور بولی "آپ کی دو آنکھیں تو پہلے ہی سے ہیں، اوپر سے دو آنکھیں اور بھی لگائی ہیں۔ اس پر بھی اگر دل نہیں بھرتا تو کہیئے کمرے میں آ بیٹھوں؟"

نوجوان نے جیسے اب کے اس کی بات سُن لی۔ اس نے چونک کر راستہ چھوڑ دیا اور کہا: "آشون" (آیئے)

کم کم کمرے میں داخل ہو گئی اور چلتے چلتے بولی: "راستہ میں آتے جاتے ہر روز بہت سے کوتوں کی نگاہوں کے سامنے سے مجھے گزرنا پڑتا ہے جس طرح میں ان کا کوئی خیال نہیں کرتی اسی طرح آپ کا بھی نہیں کروں گی۔"

اس کی بات نوجوان کی سمجھ میں آئی یا نہیں، اس کے چہرے پر خون کی سرخی پھیلی یا نہیں، یہ دیکھنے کے لئے رکے بغیر وہ سیدھی اندر چلی گئی۔

رضیہ بانو عورتوں کے کسی مصور رسالہ کی ورق گردانی کر رہی تھی اور کھانا پکانے کا کوئی نیا طریقہ دل ہی دل میں یاد کر رہی تھیں کہ کم کم ان کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ رضیہ بانو نے مسکرا کر رسالہ سے نگاہیں ہٹاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا: "کی رے کم کم؟" (کیا ہے کم کم)

لیکن کم کم کے ہونٹوں پر حسبِ معمول مسکراہٹ نہ دیکھ کر انھیں حیرت ہوئی۔

"تمہارے گھر میں وہ کون ہے خالہ اماں"؟ اس نے پوچھا۔

"کس کے بارے میں پوچھ رہی ہے؟" رضیہ بانو نے بھنویں سکیڑ کر کہا۔ پھر وہ خود ہی اپنی غلطی محسوس کر کے ہنس پڑیں۔ "اوہو، آنو کی بات کر رہی ہے! وہ میرا خالہ زاد بھائی ہے امین۔ یہاں گھومنے آیا ہے۔"

کم کم نے کہا: "سچ کہتی ہو؟"

"سچ کہہ رہی ہوں، کیا مطلب؟" رضیہ بانو نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا: "اس کے لئے میں تم سے جھوٹ کیوں بولوں گی۔ میں نے تم سے کبھی کوئی جھوٹ بولا ہے؟"

کم کم مسکرائی "نہیں۔ اس لئے تو ڈر معلوم ہو رہا ہے کہ شاید تم جھوٹ ہی بول رہی ہو، ورنہ مجھے یقین نہیں آتا کہ آنو یا امین صاحب تمہارے بھائی ہیں۔"

"کیوں کوئی بات ہوئی ہے کیا؟" رضیہ بانو نے متفکر ہو کر پوچھا۔

کم کم نے سر ہلایا: "نہیں کوئی بات نہیں۔ لیکن تم سے میری ایک درخواست ہے کہ وہ شریف آدمی جتنے دن یہاں رہیں، مجھے مت بلانا۔"

اتنا کہہ کر وہ جس طرح آہستہ قدموں سے آئی تھی اسی طرح واپس چلی گئی۔

اس کے ایک ہفتہ بعد ایک شام بہت سخت آندھی اور بارش آئی۔ چیت کی آندھی کے ساتھ موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ اور ایسا معلوم ہونے لگا جیسے کسی نے اپنے خونی پنجے سے آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہو اور پھر اچانک راستے اور تمام گھروں کی بجلی بتیاں گل ہو گئیں۔ رضیہ بانو کوئی جاسوسی ناول پڑھنے میں محو تھیں۔ یکایک انھیں یاد آیا۔ وہ زور سے چیخیں: "آنو، آنو!"

امین شام سے پہلے ہی پارک میں ٹہلنے گیا ہوا تھا۔ وہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ اس کے ساتھ جو نوکر گیا تھا اسے بلا کر رضیہ بانو نے پوچھا تو اس نے جواب دیا "صاحب نے کہا تھا، تم جاؤ۔ تھوڑی ہی دور تو گھر ہے۔ میں خود آ جاؤں گا۔"

رضیہ بانو نے روتی آواز میں کہا: "ابھی جا کمبخت۔ دیکھ وہ کہاں رک گیا ہے۔ خدا نہ کرے۔۔۔۔" یکایک زور سے بجلی کڑکی اور ان کی آواز اس کی کڑک میں گم ہو گئی۔

حنیف نے کہا: "آندھی ذرا کم ہونے دیجئے اماں، تب جاؤں گا۔"

رضیہ بانو نے کہا: "نہیں۔"

ہوا کا زور اس وقت تک کم ہو گیا تھا، لیکن بارش اب بھی اس زور شور سے ہو رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا آسمان پگھل کر گر رہا ہو۔ بائرن کمپنی کے بڑے صاحب کے مکان کے قریب ہی تھوڑی سی خالی زمین تھی جس میں اب چھوٹی چھوٹی بہت سی دکانیں بن گئی تھیں۔ اس کے بعد ہی کم کم کا دو منزلہ ٹین کا مکان تھا۔ سامنے لان کی طرح تھوڑی سی زمین تھی، جس میں ساگ سبزی لگی ہوئی تھی۔ شہر کے اس علاقہ کا آخری مکان یہی تھا۔ اور اس کے بعد میونسپل پارک۔

ڈھونڈتے ڈھونڈتے پریشان ہو کر حنیف نے کم کم کے دروازہ پر آکر کنڈی کھٹکھٹائی۔ کون جانے آندھی کے وقت بھاگ کر اسی مکان میں چلے گئے ہوں۔ قریب کوئی دوسرا گھر بھی تو نہیں۔ کنڈی کھٹکھٹانے کی آواز سنکر کم کم نے جنگلے سے باہر سر نکالا: "کیا رے حنیف، اس بارش میں؟"

"امین صاحب کا کہیں پتہ نہیں ہے آپا۔ شام سے پہلے ہی پارک میں گھومنے گئے تھے۔"

کم کم کھلکھلا کر ہنس پڑی: "تمہارے آمین صاحب کیا دودھ پیتے بچے ہیں کہ یتیم بچے ہیں کہ
یتیت ہو کر کھو جائیں گے۔ آندھی پانی میں کہیں رک گئے ہوں گے۔ بارش رکتے ہی
جائیں گے۔"

حنیف کے چہرہ پر افسردہ مسکراہٹ پھیل گئی: "کھو جانے کا ڈر نہیں ہے آپا۔
ان کی آنکھیں ہوتیں تو پھر کیا ڈر تھا۔"

"کی بولی!" (کیا کہا!)

حنیف راستے پر کھڑے ہو کر بولا: "کیا تم نہیں جانتیں! نئے صاحب اندھے
ہیں۔ ان کی دونوں آنکھیں پتھر کی ہیں۔" اتنا کہہ کر حنیف تاریکی میں گم ہو گیا۔

اس وقت آندھی اور بارش ختم ہو چکی تھی اور پانی سے دھوئے ہوئے
آسمان پر ان گنت ستارے، اندھیرے میں دریا کے بیچ کشتیوں کے شامیانے میں
جلتی ہوئی بتیوں کی طرح جھلملا رہے تھے۔ رضیہ بانو دودھ کا گلاس لئے ہوئے کمرے
میں داخل ہوئیں تو انہوں نے دیکھا کہ آمین کے سر پر بندھی ہوئی پٹی سے خون رس
رہا تھا۔ وہ گلاس میز پر رکھ کر آگے بڑھنے ہی والی تھیں کہ یکایک پیچھے سے ان کے
کان میں آواز آئی: "خالہ اماں!"

پیچھے مڑ کر رضیہ بانو دھیرے سے مسکرائیں: "تو بھی آ گئی!"

کم کم قریب آ کر کھڑی ہو گئی: "کہاں ملے؟"

"پارک کے قریب ہی کسی چیز سے ٹکرا کر سر پھوڑ آیا ہے۔ آنکھوں سے تو
دکھائی نہیں دیتا۔ آندھی بارش نہ ہوتی تو کسی طرح راستہ ٹٹولتا ہوا واپس آ جاتا۔
اب دیکھو میں کتنی پریشانی میں پڑ گئی ہوں۔ بھلا میں پٹی باندھنا کیا جانوں۔"

کم کم نے کہا: "تم جاؤ، کھانے کا انتظام کرو۔ پٹی میں ٹھیک کر دیتی ہوں۔"

رضیہ بانو چینی اور چمچے کی تلاش میں دوسرے کمرے میں چلی گئیں اور
کم کم آگے بڑھ آئی۔ آمین سویا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں، سر پر پٹی بندھی
ہوئی تھی اور چہرہ تکلیف کی شدت سے سیاہ ہو گیا تھا۔ کم کم چند لمحے کچھ سوچتی رہی،
پھر اس نے اپنے حواس درست کر کے جھجک دور کی اور دھیرے سے اپنا ہاتھ پٹی پر
رکھ دیا۔

سر پر ہاتھ کا لمس محسوس کر کے آمین چونک اٹھا: "کے، آپا؟" (کون ہے آپا؟)

"نا، آمی" (کوئی نہیں، میں ہوں)۔ کم کم ذرا پرے سرک گئی۔

"تم کے؟" آمین کی نیم وا آنکھیں کھل کر پھیل گئیں اور اندھیرے میں اس کی
آنکھوں کی دونوں ساکت پتلیاں کچھ ڈھونڈنے لگیں۔

"آمی کم کم۔" کم کم نے بغیر کسی جھجک کے جواب دیا۔

آمین گھبرا کر بستر پر اٹھ بیٹھا۔ اور جلدی سے بولا: "آپ کو کچھ کرنے کی ضرورت
نہیں۔ میں خود پٹی ٹھیک کر لیتا ہوں۔" میں وہ اپنے ہاتھ سے پٹی درست کرنے لگا۔

کم کم نے اسے روکتے ہوئے کہا: "آپ کا ہلنا ڈولنا منع ہے، کچھ روز چپ
چاپ پڑے رہیے۔"

ایک ہفتہ تک کم کم کی یہ حالت رہی کہ کسی کام میں اس کا جی ہی نہ لگتا۔ ذرا سی
بھی مہلت ملتی تو بھاگی چلی آتی اور ٹھیک وقت پر آمین کو کھلاتی پلاتی، پٹی بدل کر
باندھ دیتی اور رضیہ بانو اطمینان سے جاسوسی ناول پڑھنے میں مشغول ہو جاتیں۔

یہ بات محلہ والوں سے چھپی نہ رہی۔ امین بی بی نے کہا: "میں نے جو ذات اور
خاندان کی بات کہی تھی، وہ غلط نہیں ہوئی۔"

حشمت بی بی بولیں: "اسے اپنی خوبصورتی پر کتنا ناز تھا کہ زمین پر پاؤں ہی
نہیں رکھتی تھی۔ اور اب ـ ـ ـ ـ"

الطیفہ بولی: "میرا بھائی تو آوارہ لچا تھا، لیکن اب کہاں جا کر پھنسی ہے۔ ایک
اندھے کے ساتھ!"

اور ایک دن یہ باتیں رضیہ بانو کے کانوں تک بھی پہنچ گئیں۔ اس دن
جاسوسی ناول پڑھنے میں ان کا دل نہ لگا۔ وہ اٹھ کر آ ہی رہی تھیں کہ آمین کے کمرے
سے کم کم نکلی۔ رضیہ بانو نے کہا: "شون:" (سنو)

کم کم کھڑی ہو گئی۔ رضیہ بانو کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔ پھر انہوں نے کم کم کی
طرف دیکھا۔ وہ منہ چھپائے ہنس رہی تھی۔ انہوں نے کہا: "محلہ میں کیا کیا باتیں ہو رہی
ہیں، جانتی ہو؟"

"جانتی ہوں۔" کم کم نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"چھی چھی۔ یہ لوگ کتنے تنگدل ہیں۔ کتنا غلط شبہ کر رہے ہیں۔" رضیہ بانو
نے جیسے دل ہی دل میں اس کی تصدیق کر دی۔

کم کم نے انھیں ٹوکتے ہوئے کہا: "تم سے کس نے کہا کہ ان کا شبہ غلط ہے؟"

"غلط نہیں؟" رضیہ بانو یوں چونک اٹھیں۔ جیسے اچانک انھیں ٹھوکر لگی ہو۔

"نا" کم کم نے سنجیدگی سے کہا اور آہستہ آہستہ زینہ سے نیچے اتر گئی۔

وہ دو دن تک گھر سے باہر نہیں نکلی۔ تیسرے دن شام کے وقت اپنے
کمرے میں لیٹی ہوئی وہ آسمان کا روپ تک رہی تھی۔ جنوب مغربی کونے میں سیاہ اور
شمال مشرقی کونے میں سفید بادل گھر آئے تھے۔ ٹھیک آسمان کی طرح اسے اپنے دل کا
بھی احساس محسوس ہو رہا تھا۔ یکایک ہوائیں چلیں اور بادلوں کو اڑا دیا۔ اب بارش کا
کوئی امکان نہ تھا۔ آسمان دھیرے دھیرے کھلتا جا رہا تھا۔ کم کم نے نہ جانے کیا سوچا کہ
اٹھ کر بیٹھ گئی۔ جب وہ گھر سے باہر نکلی تو دیکھا ایک سنسان جگہ پر دیودار کے پیڑ
سے ٹیک لگائے آمین کھڑا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔

(باقی صفحہ ۵۰ پر)

ڈرامہ:

شرمات

انور عنایت اللہ

افراد

نسرین: ایک شوخ حسین لڑکی عمر تقریباً انیس سال

نجمہ: عمر تقریباً پچیس سال۔

محمود: ایک ادیب۔ عمر تقریباً تیس سال

(پردہ محمود کے ڈرائینگ روم میں اٹھتا ہے۔ خاصا کشادہ کمرہ۔ سامنے دو دروازے اور ایک بڑی کھڑکی۔ ایک دروازہ دائیں طرف جو اس فلیٹ کا صدر دروازہ ہے۔ جو تماشائیوں کے مقابل بائیں طرف ہے، ڈرائینگ روم کو فلیٹ کے بقیہ حصے سے ملاتا ہے۔ اس کمرہ میں ہر طرف کتابوں سے بھری الماریاں ہیں۔ ایک طرف میز جس پر دو ٹائپ رائٹر رکھے ہیں۔ ایک نیا دوسرا پرانا۔ میز پر بہت سے کاغذات بے ترتیبی سے پھیلے ہوئے۔ قریب ہی تپائی پر ٹیلیفون پر کئی رسالے۔ کمرہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی ادیب کا کمرہ ہے جو ڈرائینگ روم کے علاوہ لائبریری کا بھی کام دیتا ہے۔ پردہ اٹھنے پر نجمہ نظر آتی ہے جیسے بےچینی سے ٹہل رہی ہے۔ ناک نقشہ اچھا، صحت اور جسم قدرے فربہی کی طرف مائل۔ ساڑی پہنے شام کا وقت۔ وہ بار بار دستی گھڑی میں وقت دیکھتی ہے چہرے پر ناگواری کے آثار۔ یکایک ٹھٹک جاتی، ایک مسودہ اٹھا کر صوفے پر بیٹھ جاتی اور پڑھنے لگتی ہے ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے تو وہ بیزاری سے اٹھ کر ریسیور اٹھاتی ہے۔)

نجمہ: (انگریزی میں) ۱۹۷۷ ہیرسگی؟ جی نہیں، وہ اب تک نہیں آئے۔ آپ نے پہلے بھی فون کیا تھا نا۔ جی ہاں میں خود گھنٹہ بھر سے منتظر ہوں۔ جناب کا نام؟ ڈاکٹر شمسی؟ بہت بہتر، کہہ دوں گی۔ جی ہاں (طنزاً) اگر وہ تشریف لے آئے تو (ریسیور رکھ دیتی ہے۔ یکایک دائیں دروازہ سے محمود داخل ہوتا ہے۔ وہ تیزی سے اسٹیج پر آتا ہے۔ ہانپ رہا ہے۔ اس وقت وہ سوٹ میں ہے۔ نجمہ اسے غصہ سے گھورتی ہے)

محمود: (اندر آتے ہوئے) معاف کرنا نجمی! خاصی دیر ہوگئی۔

نجمہ: (خشک لہجے میں) کوئی بات نہیں (اٹھتے ہوئے) بس میں جا ہی رہی تھی۔

محمود: (قریب جاکر) میں نے نکل بھاگنے کی بہت کوشش کی، لیکن صدر نے اٹھنے ہی نہیں دیا۔ جیسے ہی موقع ملا میں بھاگ نکلا۔ بڑی تیزی سے ایک سو بیس سیڑھیاں طے کی ہیں۔ دیکھو اب تک سانس پھولی ہوئی ہے۔ تم بیٹھتی کیوں نہیں!

نجمہ: (خشک لہجے میں) گھنٹہ بھر سے بیٹھی ہوئی تو ہوں۔

محمود: (فوراً) مجھے تاخیر کی وجہ سے گھبراہٹ تو ہو رہی تھی مگر اطمینان تھا کہ تمہارے لئے اپنا تازہ افسانہ چھوڑ گیا ہوں۔ پڑھا تم نے؟

نجمہ: جی ہاں۔ ابھی ابھی دوسری بار شروع کیا تھا۔ تم اور دس منٹ نہ آتے تو ختم ہو جاتا۔

محمود: (ہنستے ہوئے) یعنی اتنا مختصر ہے؟ صرف دس منٹ! میرا خیال ہے آئندہ کسی ناول کا مسودہ چھوڑ جاؤں گا۔ پھر اطمینان سے باہر رہ سکتا ہوں۔ اب بیٹھ بھی جاؤ نجمی۔ (وہ اسے زبردستی بٹھاتا ہے اور پھر خود قریب صوفے پر بیٹھ جاتا ہے)

محمود: بخدا میرا وہاں مطلق جی نہ لگا۔ ہر لمحہ یہی سوچتا رہا تم یہاں

منتظر ہوگی۔ (یکایک گھڑی دیکھ کر) اوہ! سات بج گئے؟
بادلوں کی وجہ سے پتہ ہی نہ چلا۔

نجمہ:۔ غالباً تم نے کسی اور کو بھی وقت دے رکھا ہے۔

محمود:۔ ہاں ہاں، لیکن ابھی نہیں۔ رات کو ساڑھے دس بجے۔

نجمہ:۔ ڈاکٹر شمسی کو تو نہیں؟ ان کا کئی بار فون آچکا ہے کہ رہ مجھے ملنا ضروری ہے۔ تم نے ملنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

محمود:۔ سلیم شمسی کا؟ اُف خدایا! اب یاد آیا۔ اس نے چائے پر بلایا تھا۔

نجمہ:۔ (فوراً) اور جناب محمود رضی صاحب! آپ نے مجھے چائے پر بلایا تھا اور پھر خود اس ادبی جلسے میں چلے گئے۔ جانے گئے بھی تھے یا نہیں۔ اب تم میری سادگی سے بڑا غلط فائدہ اٹھانے لگے ہو مودی!

محمود:۔ (حیرت سے) یعنی اب تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں رہا؟

نجمہ:۔ یہ بتاؤ نسرین تمہارے پیچھے کیوں پڑی ہے؟

محمود:۔ نسرین؟

نجمہ:۔ جی ہاں، شام سے تین بار فون کر چکی ہے۔ ہر بار اس نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ میں تمہارے یہاں کیوں موجود ہوں۔

محمود:۔ غالباً کوئی نیا جھگڑا شروع ہوگیا ہوگا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے۔ میں سلیم اور نسرین دونوں کا عزیز دوست ہوں۔ دونوں مجھے بڑا مانتے ہیں۔ جب بھی دونوں لڑتے ہیں مجھے صلح صفائی کرانی پڑتی ہے۔ ان کی شادی جلد ہو جائے تو میرا پیچھا چھوٹے۔ اطمینان رکھو نجمی مجھے نوعمر جذباتی لڑکیاں مطلق پسند نہیں۔ مجھے تو حسین، باوقار، سنجیدہ ذہنی طور پر پختہ عورتیں پسند ہیں۔ لے دے کے ایک ہی تو لڑکی (ایسی ہے جس سے میں متاثر ہوں۔ (ہاتھ میں ہاتھ لیتا ہے)

نجمہ:۔ (متاثر ہو کر) تمہاری ان لچھے دار باتوں ہی سے تو مجھے ڈر لگتا ہے اپنی فطری سادگی کی وجہ سے بہت بھلاووں میں رہی ہوں۔ نہ جانے کیوں اب بھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے میری یہ محبت بھی ایک بھلاوا ہی ثابت ہوگی۔ (اپنا ہاتھ چھڑا کر اٹھتی ہے) آج نسرین کی باتوں سے پتہ چلا تم دونوں بڑے بے تکلف دوست ہو۔

محمود:۔ بے تکلف دوست؟ (عین اس وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔ نجمہ کے چہرہ پر فوراً ناگواری کے آثار پیدا ہوتے ہیں)

نجمہ:۔ لیجئے آپ کی عزیز دوست نے آپ کو پھر یاد کیا ہے (میز پر سے اپنا پرس اٹھا لیتی ہے۔ محمود ریسیور اٹھاتا ہے) میں جا رہی ہوں۔

محمود:۔ محمود ہیر (ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر فوراً) خدا کے لئے ٹھہرو نجمی! (ہاتھ ہٹا کر) جی ہاں، محمود۔ اوہ سلیم! بھئی معاف کرنا آج تمہارے یہاں پہنچ نہیں سکا۔ خیریت تو ہے نا؟ کیا کہا، نہیں؟ بھئی بڑی جذباتی لڑکی ہے۔ (گھڑی دیکھ کر) اس وقت میرے پاس کچھ لوگ ہیں۔ اچھا بابا، ساڑھے آٹھ کے بعد آجانا۔ خدا حافظ! (نجمہ منہ پھلائے کھڑی ہے)

محمود:۔ (ریسیور رکھ کر جلدی سے) سلیم شمسی تھا۔ کہہ رہا تھا آج پھر لڑائی ہوگئی۔ نسرین نے شادی سے انکار کر دیا ہے۔ برا حال ہے اس کا۔ بیچارہ نسرین پر بری طرح لٹو ہے۔

نجمہ:۔ اور نسرین جناب پر لٹو ہے!

محمود:۔ (فوراً) خدا کے لئے یہ باتیں چھوڑو نجمی! تمہیں آخر کب یقین آئے گا کہ میں صرف تمہیں دیوانہ وار چاہتا ہوں۔

نجمہ:۔ خوب جانتی ہوں (ٹھنڈی سانس لے کر تماشائیوں کی طرف مڑتی ہے اور ذرا سا آگے بڑھتی ہے) انہیں آجکل جن چیزوں کی شدید ضرورت ہے وہ اتفاق سے میرے پاس ہیں۔ فطری سادگی، ناتجربہ کاری اور بے انتہا دولت۔ کبھی کبھی تو سوچتی ہوں اگر میں اتنی دولتمند نہ ہوتی تو کیا تم میری طرف نگاہ اٹھا کر بھی دیکھتے؟

محمود:۔ اب تم میرے ساتھ زیادتی کر رہی ہو۔

نجمہ:۔ (مڑ کر) زیادتی؟ نہیں مودی، بدقسمتی سے میں جتنی سادہ لوح ہوں اتنی ہی حساس بھی ہوں۔ میں سب کچھ سمجھتی ہوں۔ آخر نسرین تم میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہی ہے؟ ڈاکٹر شمسی سے منگنی کے بعد بھی وہ تمہارا کیوں پیچھا کر رہی ہے؟ اور اب تو اس نے شادی سے انکار ہی کر دیا ہے۔ (یکایک ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے تو وہ خشک لہجے میں کہتی ہے) یہ لو، وہی گھنٹی بجے جا رہی ہے۔ (محمود ہچکچاتا ہے۔ نجمہ آگے بڑھ کر

(ریسیور اٹھاتی ہے اور محمود کو دے دیتی ہے)

محمود :۔ ہیلو، او وہ تم؟ (مڑ کر نجمہ کو دیکھتا ہے۔ نجمہ کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ہے) خیریت تو ہے؟ ہاں ہاں مس حسینہ یہیں ہیں۔ دراصل وہ مجھے لینے آئی ہیں۔ ان کے والد صاحب نے فوراً بلایا ہے۔ (نجمہ والد کے ذکر پر چونکتی ہے) ہاں بھئی۔ بس میں جا رہا ہوں اس لئے آج ملاقات نہیں ہو سکتی۔ بھئی کہہ دیا نا آج نہیں۔ یعنی تم، ہیلو؟ ــــ ہیلو؟ (ٹیلیفون کھٹ کھٹاتا ہے) ہیلو؟ (جھنجلا کر) کاٹ دیا۔ (ریسیور رکھ دیتا ہے) عجیب احمق ہے)

نجمہ :۔ تو وہ آ رہی ہیں یہاں؟

محمود :۔ ہاں، میں نے روکنے کی کوشش کی لیکن یوں لگا جیسے وہ فوراً ملنا چاہتی ہے۔ عجیب مصیبت ہے۔

نجمہ :۔ وہ ڈاکٹر سلیم شمسی بھی تو آ رہے ہیں؟ بڑا ملاپ ہو رہا ہے آج!

محمود :۔ ان دونوں نے تو میرا دم ناک میں کر رکھا ہے۔ نسرین کو سلیم سے بہتر شوہر مل ہی نہیں سکتا۔ اس قدر اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ اتنا دولت مند۔ ان بیگم صاحبہ کے پاس ہے کیا سوائے شکل وصورت کے؟

نجمہ :۔ (فوراً) بڑی خوبصورت ہے وہ۔ ہے نا؟

محمود :۔ (اسی رو میں) ہاں ہاں، بڑی پیاری شکل ہے۔ (یکایک اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے تو رک جاتا ہے) ارے ہم نے یہ کیا فضول سی باتیں شروع کر دیں؟ (گھڑی دیکھ کر) ساڑھے سات بجے ہیں۔ اگر تم پورے گھنٹہ بھر بعد مجھے کیسینو میں ملو تو کیسا رہے؟ ساتھ کھانا کھائیں گے (نجمہ بھی فوراً گھڑی دیکھتی ہے)

نجمہ :۔ اگر تم مجھے یہاں سے ٹالنا چاہتے ہو تو!

محمود :۔ (فوراً) خدا کے لئے نجمی! میں خود یہاں سے جان بچا کر بھاگ رہا ہوں۔ دونوں کو یہاں چھوڑ دوں گا تاکہ آپ ہی نسلٹ لیں۔ مجھ پر بھروسہ کرو نجمی، میں وعدہ کرتا ہوں آج وقت پر پہنچ جاؤں گا۔ (نجمہ غور سے اسے دیکھ رہی ہے)

نجمہ :۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) خدا حافظ! (کچھ سوچ کر مڑتی ہے) مودی!

محمود :۔ ہاں نجمی۔

نجمہ :۔ سوچ رہی تھی۔ مہینے کی آخری تاریخیں ہیں حسب معمول تمہارا ہاتھ خالی ہوگا۔

محمود :۔ (فوراً) ہاں ہے تو۔ آج جیب میں ٹیکسی کے بھی پیسے نہیں تھے۔ اسی لئے دیر ہوگئی۔ بس میں آیا تھا۔

نجمہ :۔ (پرس کھولتے ہوئے) اس وقت نقدی نہیں ہے۔ چیک لکھے دیتی ہوں۔ رات کو تم میرے مہمان ہوگے (چیک کاٹ کر اس کے حوالے کرتی ہے اور دائیں دروازے سے چلی جاتی ہے۔ اس کے جانے کے بعد محمود چیک پڑھتا ہے)

محمود :۔ (آپ ہی آپ خوشی سے) یو آر اے ڈارلنگ نجمی! دو سو روپے! (چیک کو ہونٹوں سے لگاتا ہے اور پھر جیب میں احتیاط سے رکھ لیتا ہے۔ میز تک جاتا ہے اور جھک کر وہ مسودہ پڑھنے لگتا ہے جو نئے ٹائپ رائٹر پر لگا ہوا ہے۔ چند لمحوں کے بعد بیٹھ جاتا ہے اور ٹائپ کرنے لگتا ہے۔ اتنے میں صدر دروازہ کی گھنٹی بجتی ہے تو وہ سر اٹھا کر دیکھتا ہے۔ پردہ ہٹا کر نسرین اسٹیج پر آتی ہے۔)

نسرین :۔ (اندر آ کر) آ سکتی ہوں؟ آداب بجالاتی ہوں۔ (بڑی بے تکلفی سے آگے بڑھتی ہے اور ادھر ادھر دیکھنے لگتی ہے جیسے اسے کسی چیز کی تلاش ہو۔ چہرے سے نوعمر لگتی ہے۔ بے حد حسین اس وقت شلوار قمیض میں ہے۔ اسے دیکھ کر محمود اٹھتا ہے)

محمود :۔ میں نے تمہیں منع کیا تھا نسرین ــــ اور ادھر ادھر کیا دیکھ رہی ہو؟

نسرین : آپ کی مس حسینہ کو (قریب آ کر رازدارانہ لہجے میں) اندر کمرہ میں تو نہیں چھپا دیا نہیں؟

محمود :۔ (پریشان کر) نسرین!

نسرین :۔ اچھا بابا خفا نہ ہوں (پرس میز پر رکھتی ہے اور صوفے پر بڑی بے تکلفی سے بیٹھ جاتی ہے) مجھے آپ سے فوراً ملنا ضروری تھا جناب، اسی لئے چلی آئی۔

محمود :۔ (بیزاری سے) شام سے ہر ایک یہی کہتا چلا آ رہا ہے۔ یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ مجھے روزانہ اپنی روزی کمانی پڑتی ہے مگر

آج یہ افسانہ مکمل نہ ہوا تو کل پیسے نہیں ملیں گے۔ (وہ دوبارہ میز تک جاتا ہے اور ٹائپ شروع کر دیتا ہے۔ نسرین کو یہ بات بری لگتی ہے۔ وہ اٹھتی ہے، محمود کے قریب جاتی ہے اور اس کے پیچھے کھڑی ہو کر، جھک کر پڑھنے لگتی ہے)

نسرین :۔ خوب! تو رومانی افسانہ لکھا جا رہا ہے۔ (ٹائپ رائٹر کو ہاتھ سے چھو کر) بڑا اچھا ٹائپ رائٹر ہے، بالکل نیا (اپنے ہاتھ سے اس کے بالوں میں کنگھی کرنے لگتی ہے) بڑے ٹھاٹھ ہیں جناب کے۔ ایک طرف انگریزی کا ٹائپ رائٹر، دوسری طرف اردو کا۔ کب خریدا یہ نیا ٹائپ رائٹر؟

محمود :۔ تحفتاً ملا ہے۔

نسرین :۔ خوب! آپ کی مس حسین نے دیا ہوگا۔

محمود :۔ (جل کر) جی ہاں، آپ کو اعتراض ہے؟

نسرین :۔ (فوراً) جی نہیں۔ (وہ ہاتھ پشت پر باندھے ٹہلنے لگتی ہے) فی الحال کوئی اعتراض نہیں۔ آئندہ ہو سکتا ہے۔

محمود :۔ (اٹھتے ہوئے) کیا مطلب؟

نسرین :۔ (مڑ کر) اتنے بھولے تو نہ بنئے۔ شادی کے بعد مجھے اعتراض ہو سکتا ہے!

محمود :۔ شادی؟ پھر دورہ پڑا تم پر؟

نسرین :۔ اب مزید آپ اپنے آپ پر ظلم نہیں کر سکتے محمود رضی صاحب! آپ مجھے گھور گھور کر کیا دیکھ رہے ہیں؟ کب تک دل کی بات دل ہی میں رہے گی مودی؟ (آگے بڑھتی ہے اور اس کے دونوں شانے تھام کر غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہے) کہتے کیوں نہیں کہ تمہیں مجھ سے والہانہ محبت ہے؟ میں دس سال سے یہ الفاظ سننے کے لئے بے چین ہوں۔

(یوں لگتا ہے جیسے محمود بھی اس کے قرب سے کہیں کھو گیا ہے۔ لیکن پھر فوراً ہوش میں آ جاتا ہے اور اپنے دائیں ہاتھ سے اس کے دونوں ہاتھ ہٹا دیتا ہے)

محمود :۔ (آہستہ سے) یہ کیا پاگل پن ہے نسرین؟ اگر سلیم کو پتہ چل گیا تو؟

نسرین :۔ پھر غیروں کا ذکر؟ (وہ کب تک صرف دوسروں ہی کا خیال کرتے رہو گے مودی؟

محمود :۔ یہ پاگل پن چھوڑو نسرین تمہیں سلیم سے بہتر شوہر مل ہی نہیں سکتا۔ اتنا ذہین، نیک، دولتمند۔

نسرین :۔ (فوراً) اور اتنا بور۔ مجھے تو تم سے محبت ہے مودی تمہیں اپنے فن کی خاطر مجھ سے شادی کرنی ہی ہوگی۔ شادی کے بعد ہم دونوں مل کر دن رات محنت کریں گے اور چین کی زندگی بسر کریں گے۔ جب تک تمہاری یہ کشمکش جاری رہے گی تمہارا فن زندہ رہے گا۔ لیکن جوں ہی تمہیں دنیا بھر کی آسائشیں مل جائیں گی، تمہارا فن مر جائے گا۔ نجمہ شادی کے بعد تمہیں آسائش دے سکتی ہے اور میں تمہیں صرف زندگی کے مسائل! بتاؤ کسے قبول کرتے ہو تم؟

(محمود اس کی باتوں سے خاصا متاثر نظر آتا ہے)

محمود :۔ کہہ لیا تم نے جو کچھ کہنا تھا؟ (وہ صوفے پر بیٹھ جاتا ہے، جیب سے سگریٹ کیس نکال کر ایک سگریٹ چنتا ہے اور ہونٹوں سے لگاتا ہے۔ تپائی پر سے لائٹر اٹھاتا ہے)

نسرین :۔ ہاں، میں سلیم سے پیچھا چھڑا کر تمہارے پاس تمام باتیں طے کرنے آئی ہوں۔ چلو، امی تمہاری منتظر ہیں۔

(امی کے ذکر پر محمود بری طرح سے چونکتا ہے۔ سگریٹ سلگائے بغیر فوراً کہتا ہے)

محمود :۔ امی؟ کیا کہہ رہی ہو تم؟

نسرین :۔ یہی کہ آپ ابھی میرے ساتھ چلئے۔ اس مسئلے پر وہ فوراً آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔

محمود :۔ (جھنجھلا کر اٹھتے ہوئے) تم ہوش میں تو ہو؟ تم نے ان سے کیا کہہ دیا؟

نسرین :۔ یہی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیوانہ وار چاہتے ہیں اور تم فوراً مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو۔

محمود :۔ (غصہ سے) غضب خدا کا! کیا بکواس ہے یہ نسرین؟ تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا؟

نسرین :۔ سلیم کو ٹھکرا دینے کی امی کو کوئی نہ کوئی معقول وجہ تو بتانی ہی تھی۔ سب سے بہتر مجھے یہی نظر آئی!

محمود :۔ (قریب جا کر) تمہیں کیا ہو گیا ہے نسرین؟ (اس کا ہاتھ تھام کر) یہاں آؤ میرے ساتھ۔ (اسے ایک صوفے پر بٹھاتا ہے)

بیٹھ جاؤ (خود اسی صوفے پر بیٹھ جاتا ہے اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے) تمہاری عمر کیا ہے بھلا؟

نسرین :- یہی کوئی انیس سال۔

محمود :- اور میری؟

نسرین :- پچیس چھبیس ہو گی۔

محمود :- بنو نہیں۔ اکتیس سال۔

نسرین :- شوہر کو بیوی سے ہمیشہ گیارہ بارہ سال بڑا ہونا چاہیئے۔

محمود :- ذرا یہ تو سوچو۔ آج سے بارہ سال بعد ـــ

نسرین :- (فوراً) میں اکتیس سال کی ہو جاؤں گی۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں مودی، میں اس وقت بھی اتنی ہی بھلی نظر آؤں گی۔

محمود :- اور میں تینتالیس سال کا ہوں گا، میری چندیا صاف ہو گی اور چہرہ پر جھریاں ہوں گی۔

نسرین :- (لقمہ دیتے ہوئے) خدا کی قسم! (بچوں کی طرح خوشی سے ہاتھ ملتے ہوئے) بڑے گریس فل لگو گے۔ چلو مودی، امی سے مل آئیں۔ وہ کھانے پر انتظار کر رہی ہوں گی۔ میں نے کہا تھا ہم سب ساتھ کھانا کھائیں گے۔ (وہ اٹھتی ہے اور اس کا ہاتھ تھام لیتی ہے)

محمود :- (ہاتھ جھٹک کر) یعنی میری باتوں کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوا؟ یہ جان کر بھی نہیں کہ میں نجمہ کو چاہتا ہوں؟ میں شادی نجمہ ہی سے کروں گا نسرین!

نسرین :- پھر اس چڑیل کا نام لیا!۔ وہ عیارہ جو تمہیں اپنی دولت سے خرید رہی ہے!

محمود :- ہاں، میں اپنی مرضی سے یہ سودا کر رہا ہوں (وہ اٹھتا ہے اور جیب سے چیک نکال کر اس کے حوالے کرتا ہے) تمہیں غالباً یہ نہیں معلوم کہ پچھلے سال بھر سے میں نجمہ کا ہی نمک کھا رہا ہوں۔ ہر ماہ وہ مجھے دو سو روپے خرچ کے لئے دیتی ہے۔ اس فلیٹ کا کرایہ وہ دیتی ہے۔ یہ تمام فرنیچر اسی کا ہے۔ یہ قیمتی سوٹ دیکھ رہی ہو؟ یہ اس نے مجھے سالگرہ پر دیا تھا۔ اس کی موٹر ہر وقت میرے قبضے میں رہتی ہے۔ اور تم؟ ــ تمہاری تنخواہ صرف دو سو روپے ہے۔ تمہاری ماں بیوہ ہے شادی کے بعد بھی غالباً وہ تمہارے یعنی ہمارے ہی ساتھ رہیں گی۔ ایک طرف اتنا کچھ اور دوسری طرف ــ بڑی محنت، اور فن کی بات؟ نسرین یہ سب ڈھکوسلا ہے۔ پیٹ خالی ہو تو نہ فن کی تخلیق ہو سکتی ہے اور نہ انسان خوشگوار خواب ہی دیکھ سکتا ہے۔ بھوک میں تو خواب بھی بھیانک ہی نظر آتے ہیں۔ فن کو پنپنے کے لئے صاف ستھری زیادہ زندگی کی آسائشوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرا مشورہ مانو، تھوڑی دیر میں سلیم یہاں آ رہا ہے۔ مجھے میری راہ پر چھوڑ دو اور فوراً سلیم سے ملاپ کر لو۔ تم میرے ساتھ کبھی خوش نہیں رہ سکتیں۔

نسرین :- (آہستہ سے) سلیم آ رہا ہے؟ (کچھ سوچتی ہے)

محمود :- ہاں، چلو اٹھو اندر جا کر منہ ہاتھ دھو لو۔ (گھڑی دیکھ کر) میں پندرہ منٹ اور ٹھہر سکتا ہوں نیچے کے ہوٹل سے کافی لے آتا ہوں۔ دونوں ساتھ کافی پئیں گے، ہنسیں گے، بولیں گے اور پھر میں چلا جاؤں گا۔ جب سلیم آئے تو اس سے فوراً صلح کر لینا، سمجھیں؟

(نسرین کھوئی کھوئی سی خاموش بیٹھی ہے۔ محمود میز کے پاس سے تھرماس اٹھاتا ہے اور دائیں دروازہ سے باہر چلا جاتا ہے۔ اس کے چلے جانے پر نسرین اٹھتی ہے، دریچے تک جا کر باہر دیکھتی ہے اور پھر ٹیلیفون کے پاس آ کر ایک نمبر ملاتی ہے)

نسرین :- ہیلو، مجھے ڈاکٹر سلیم قسمتی سے بات کرنی ہے۔ دوسرے کمرہ میں ہیں؟ تو دیکھئے انہیں ایک ضروری پیغام دے دیجئے گا۔ جی ہاں، کہیئے گا مس نجمہ حسین نے محمود رضی صاحب کے ہاں سے فون کیا تھا۔ محمود صاحب کی دادی کا انتقال ہو گیا ہے اور وہ فوراً ٹنڈو آدم جا رہے ہیں۔ اسی وقت کوئی ہفتہ بھر بعد واپس آئیں گے۔ جی ہاں، بس۔ شکریہ۔

(ریسیور رکھ کر تماشائیوں کی طرف مڑتی ہے۔ چہرہ پر مسکراہٹ ہے۔ گھڑی دیکھتی ہے اور تیزی سے بائیں دروازے سے فلیٹ کے اندر چلی جاتی ہے۔ چند لمحے اسٹیج خالی رہتا ہے۔ پھر دائیں دروازہ کا پردہ ہٹا کر نجمہ داخل ہوتی ہے۔ وہ کمرہ خالی دیکھ کر رک جاتی ہے۔ پھر آواز دیتی ہے)

نجمہ :- مودی؟ کہاں ہو تم؟ ساڑھے آٹھ بج رہے ہیں بھئی! (جب کوئی جواب نہیں ملتا تو وہ دریچہ تک جاتی ہے اور

باہر دیکھنے لگتی ہے۔ عین اس وقت بائیں دروازے سے نسرین اسٹیج پر آتی ہے۔ وہ نجمہ کو دیکھ کر رک جاتی ہے اور پھر کچھ سوچ کر دبے پاؤں لوٹ جاتی ہے۔ چونکہ نجمہ کی پشت اس طرف تھی اس لئے اُسے پتہ ہی نہیں چلتا کہ نسرین آئی بھی اور اندر چلی بھی گئی۔ چند لمحوں کے بعد محمود ہاتھ میں تھرماس لئے ہوئے آتا ہے۔ وہ نجمہ کو نہیں دیکھتا۔ سیدھا بائیں دروازہ کے پاس جاتا ہے اور آواز دیتا ہے)

محمود :۔ نسرین! کافی آگئی ہے۔ تم دو پیالیاں لیتی آنا۔

(یہ کہتے ہوئے وہ مڑتا ہے تو نجمہ پر نظر پڑتی ہے)

نجمہ :۔ (غصہ سے) ادھر سے گذر رہی تھی۔ یہاں روشنی دیکھی تو سوچا تمہیں ساتھ ہی لیتی چلوں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہاں نسرین بیگم کی خاطر تواضع ہو رہی ہے۔ (محمود تھرماس میز پر رکھ دیتا ہے)

محمود :۔ نہ۔ وہ۔ دراصل ابھی وقت تھا۔ نسرین کے ساتھ بڑی جھک جھک کرنی پڑی تب کہیں جا کر وہ سلیم سے ملاپ پر راضی ہوئی ہے۔ وہ اب آ ہی رہا ہوگا۔ یہ کافی میں ان دونوں ہی کے لئے لایا تھا۔

نجمہ :۔ اس وقت محترمہ اندر کیا کر رہی ہیں؟

محمود :۔ منہ ہاتھ دھو رہی ہوں گی۔

نجمہ :۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں۔ (تیزی سے اندر چلی جاتی ہے۔ محمود جیب سے سگریٹ کیس نکال کر ایک سگریٹ چنتا ہے اور پھر سلگاتا ہے۔ عین اس وقت نجمہ غصہ سے بل کھاتی ہوئی اسٹیج پر واپس آتی ہے)

محمود :۔ تیار ہوگئی وہ؟

نجمہ :۔ (غصہ سے) جی۔ وہ تو پلنگ پر آرام فرما رہی ہیں!

محمود :۔ (حیرت سے) کیا کہا؟

نجمہ :۔ جی ہاں۔ میں نے اٹھانا چاہا تو فرمایا، تم اتنی جلدی لوٹ آئے پیارے! اس احمق عورت کو کہاں چھوڑا؟

محمود :۔ (حیرت سے) کیا کہہ رہی ہو؟ ابھی پانچ منٹ پہلے وہ یہیں اس صوفے پر بیٹھی تھی (جھنجھلا کر اندر جانے کے لئے آگے بڑھتا ہے)

نجمہ :۔ (فوراً) اب آپ زحمت نہ کیجئے۔ انہیں آرام کرنے دیجئے۔ کل صبح بتا دیجئے گا کہ وہ احمق عورت دفع ہو چکی ہے۔ ہمیشہ کے لئے۔ اب آپ دونوں کا راستہ صاف ہے۔

(تیزی سے مڑتی ہے اور دائیں دروازے سے باہر چلی جاتی ہے)

محمود :۔ (گھبرا کر) خدا کے لئے نجمی!

وہ بھی تیزی سے اس کے پیچھے دوڑتا ہے۔ چند لمحے اسٹیج خالی رہتا ہے۔ پھر بائیں دروازہ کا پردہ ہٹا کر نسرین جھانکتی ہے اور میدان خالی دیکھ کر دبے پاؤں اسٹیج پر آتی ہے، اِدھر اُدھر دیکھتی ہے، یکایک اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ پیدا ہوتی ہے اور وہ بڑی بے تکلفی سے صوفے پر بیٹھ کر ایک رسالہ اٹھاتی ہے اور پڑھنے لگتی ہے۔ پردہ گرتا ہے ٭

طنز و مزاح:

چائے کا زمانہ

سعید احمد رفیق

بچو۔ آج ہم زمانہ ماقبل تاریخ کے آخری دور کے متعلق کچھ پڑھیں گے۔ اس دور کو چائے کا زمانہ کہتے ہیں۔ یہ دور مشین کے بعد شروع ہوا اور اس طرح شروع ہوا کہ جب تک انسان دائرہ تہذیب میں داخل نہ ہوا اس زمانے نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ زمانہ ماقبل تاریخ میں انسان کھانے پینے کا بہت رسیا تھا۔ شروع میں کھانے کا اور بعد میں پینے کا۔ ہر وقت کھانا۔ کھانے کے بعد بلکہ ساتھ ساتھ پینا اور پینے کے بعد پھر کھانا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں انسانی زندگی کے صرف دو مقاصد تھے۔ کھانا اور پینا۔ کھانے کے متعلق ہم پہلے پڑھ چکے ہیں کہ پتھر کے زمانے میں یہ نیم وحشی انسان گھاس پات کھاتا تھا۔ دھات کے زمانے میں اس نے جانوروں کو کھانا شروع کیا اور شجاعت کے زمانے میں ایک دوسرے کو پھر مشین کا زمانہ آیا۔ مشین نے پہلے احساسات مروت کو کچلا اور پھر انسان کو۔ انسانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی نے مشین کو اپنے مشن میں کامیاب نہ ہونے دیا۔ ورنہ اس زمانے میں مشین ہی مشین ہوتی اور انسان ختم ہو جاتا۔ مشین جتنے انسان ختم کرتی انسان اس سے بھی زیادہ بچے پیدا کر دیتا۔ نہ مشین ہاری اور نہ انسان۔

اسی کشمکش میں تاریخ کا نیا دور شروع ہوا جسے ہم "چائے کا زمانہ" کہتے ہیں۔ اس سے پہلے کھانے کا زمانہ تھا۔ اب پینے کا دور آیا۔ اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ کھانے کے زمانے میں پینے کا دستور نہ تھا اور پینے کے اس زمانے میں کھانا ختم ہو گیا۔ کھانا اب بھی باقی رہا لیکن برائے نام۔ کھانے کے زمانے میں پینا بھی تو نسبتاً کم ہی تھا نا! اور وہ پینا بھی تھا تو کیا؟ — پانی۔ پانی بھی کوئی چیز ہوئی پینے کی۔ نہ رنگ نہ بو نہ ذائقہ۔ انسان کا دل اس بے رنگ و بو شے سے جلد ہی بھر گیا۔ دودھ اور شربت بھی اسے زیادہ پسند نہ آئے۔ انگور کی معصومیت سے معصیت کا شربت تیار کیا گیا۔ شاعروں نے اس کے نغمے گائے اور انسان نے اپنے آپ کو اس میں غرق کر دیا۔ افسوس! اس زمانے کا تمام ادب تلف ہو چکا ہے ورنہ آپ دیکھتے کہ دخترِ رز کی تعریف میں شاعروں نے کیا کچھ نہیں کہا۔ مصوری، نقاشی اور بت تراشی کے جو نمونے ہمیں ملے ہیں وہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ اس زمانے کے فنکار کے اعصاب پر صرف دو چیزیں سوار تھیں۔ عورت اور شراب۔ اولیت کسے حاصل تھی، اس کے متعلق فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ جن لوگوں کو پینے کے لئے شراب میسّر نہ تھی، اور تھی تو پیٹ بھر کر نہ ملتی تھی، انہوں نے پینے کے لئے اور بہت سی چیزیں ایجاد کر لی تھیں۔ سوڈا، پاکولا، کریم رولز، کافی وغیرہ وغیرہ۔ دخترِ رز ان کے ساتھ بھی چلتی تھی اور علیحدہ بھی۔ بہرحال یہ خیال رکھئے کہ زمانہ ماقبل تاریخ کی تہذیب میں — اگر اس زمانے میں کوئی تہذیب تھی تو — شراب کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ مشین کے زمانے کو اگر شراب کا زمانہ کہا جائے تو چنداں مضائقہ نہیں۔

لیجئے میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ کہہ یہ رہا تھا کہ اس دور کے بعد بلکہ اس کے ساتھ ساتھ چائے کا زمانہ شروع ہو گیا۔ میں صحیح طور پر یہ بتانے سے قاصر ہوں کہ چائے کا زمانہ کب سے شروع ہوا اور کب تک رہا۔ ماضی کے دبیز پردوں کے باعث یہ حقیقت ہم سے پوشیدہ ہے۔ بہرحال یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ زمانہ ماقبل تاریخ کا غالباً یہ آخری دور تھا۔ تاریخ داں اس بات پر متفق ہیں کہ چائے کے دور تک انسان تہذیب و تمدن سے کوسوں دور تھا اور اس کے بعد ہی وہ دائرۂ تہذیب میں داخل ہو سکا۔ چائے اور تہذیب و تمدن کے اس تضاد پر آجکل کافی تحقیق ہو رہی ہے۔ لیکن ابھی تک یہ بات واضح نہیں ہو سکی کہ چائے میں وہ کونسی کشش تھی کہ انسان تہذیب و تمدن سے زیادہ اسے پسند کرتا تھا اور تہذیب و تمدن سے صرف اس لئے متنفر تھا کہ نہ معلوم چائے کی نسبت اس کا کیا رویہ ہو۔ اس زمانے میں انسان چائے پیتا تھا اور زندہ رہتا تھا۔ زندہ رہتا تھا اور چائے پیتا تھا۔ چائے پینے کے ساتھ ساتھ کچھ اور بھی کام کرتا تھا۔ لیکن میں پہلے آپ کو چائے کے متعلق کچھ بتا دوں پھر ان مختلف کاموں

کے متعلق کچھ عرض کروں گا۔

پینے کو تو اس زمانے میں ہر شخص چائے پیتا تھا لیکن بعض چائے کو پیتے تھے اور بعض کو چائے پیتی تھی۔ صبح تا شام چائے۔ ہر وقت چائے ہر جگہ چائے۔ یہ حضرات "چائے برائے چائے" کے قائل تھے۔ خالص چائے پیتے تھے، نہ شکر نہ دودھ۔ صرف چائے کا پانی۔ دودھ دور سے دکھاتے تھے اور شکر پاس نہ آنے دیتے تھے۔ معمولی پینے والے کیتلیوں کے حساب سے پیتے تھے اور زیادہ پینے والے دیگچیوں اور دیگچوں کے حساب سے۔ شرط لگا لگا کر پیتے تھے اور پی پی کر شرط لگاتے تھے اور پیتے پیتے شہید تک ہوجاتے تھے! ان کے متعلق اخبارات میں خبریں شائع ہوتی تھیں۔ قصیدے (چائے کے) اور مرثیے (چائے پینے والوں کے) لکھے جاتے تھے۔ یادگاریں قائم کی جاتی تھیں۔ عوام ان پر فخر کرتے تھے اور خود ریکارڈ توڑنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے، اور اکثر کامیاب بھی ہوجاتے تھے۔ آنکھ کے اندھے اپنے آپ پیتے اور گانٹھ کے پورے صرف اپنوں کو پلاتے، غیر ہمیشہ محروم رہتے۔ چائے خالی بھی پی جاتی تھی اور لوازمات کے ساتھ بھی مثلاً کیک، پیسٹری، پھل، میوہ۔ لیکن جب چائے کے ساتھ دال بھی بٹتی تھی تو لطف دوبالا ہوجاتا تھا۔ ویسے ایسی نوبت ذرا کم ہی آتی ہوگی۔ ہاں چائے کے ساتھ سگرٹ ضرور چلتی تھی۔ ایک ہاتھ میں سگرٹ اور دوسرے میں چائے کی پیالی۔ اور چائے کے بعد پانی۔ یہ تھی دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ چائے۔

یوں تو اس زمانے میں ہر ہر گھر میں چائے بنتی تھی، ہر وقت بنتی تھی، ہر ہر شخص پیتا تھا کسی سے ملنے اس کے گھر جائیے، دفتر تشریف لے جائیے، بازار میں مل جائیے کسی دکان پر ملاقات ہوجائے۔ یا سر راہ۔ کوئی وقت ہو کوئی جگہ ہو۔ ہر وقت چائے، ہر جگہ چائے۔ غم ہو خوشی ہو۔ موت ہو شادی ہو۔ دعوت ہو نہ ہو، دوستی ہو دشمنی ہو۔ کچھ ہو یا کچھ بھی نہ ہو، بہرحال چائے ضرور ہو۔ الیکشن تو جیتے ہی چائے کے زور پر جاتے تھے۔ جتنی زوردار چائے، اتنی ہی یقینی کامیابی۔ اور کامیابی کے بعد پھر تو عزت، شہرت، دولت وغیرہ سب کچھ حاصل۔ لیکن ان سب کا مقصد چائے اور صرف چائے تھا۔ تاکہ چائے ملے، بہت ملے۔ ذرا تیز اور بھاری چائے ملے پہلے دوسروں کو چائے پلاتے تھے اور بعد میں خود پیتے تھے اور مع سود در سود پیتے تھے۔ اور ایسی چائے پیتے تھے کہ نسلاً بعد نسلٍ مزید چائے کی ضرورت باقی نہ رہتی تھی۔ ہاں، تو میں کہہ رہا تھا کہ اس زمانے میں ہر ہر گھر چائے بنتی تھی لیکن چائے کے خاص مراکز ریستوراں اور کیفے کہلاتے تھے۔ ان میں جس اہتمام سے چائے تیار کی جاتی تھی، افسوس اس کے متعلق تاحال مفصل معلومات حاصل نہیں ہوسکی ہیں، بہرحال وہ اہتمام تھا قابلِ رشک۔ بعض لوگ بلا کا ذہن رسا رکھتے تھے اور جدت پسندی میں ان کا کوئی جواب نہ تھا۔ آخر سائنس کی ترقی کا زمانہ تھا اور ایٹم کی دریافت اور سیاروں کی مہ و زہرہ و مشتری تک پرواز نے خواص تو خواص، عوام کے ذہنوں کے پٹ بھی پوری طرح کھول دئے تھے۔ اسلئے وہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے کیسے رہ سکتے تھے۔ نت نئی ایجادیں کرتے جن کا ہم ان سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ انسان تصور بھی نہیں کرسکتے۔ کبھی گول مرچوں میں پپیتے کے بیج ملا دیتے۔ کبھی آٹے میں بالو۔ کبھی گھی میں ایسا تیل کہ سینکڑوں لوگ فالج کا شکار ہوجائیں۔ کبھی گوشت کے ساتھ موٹی موٹی ہڈیاں، چھیچھڑے وغیرہ۔ چنانچہ جس طرح پان کے لئے عجیب قوام تیار کئے جاتے تھے۔ اسی طرح چائے کا بھی ایک انوکھا قوام تیار ہوا یعنی گائے کے گوبر کو سکھا کر چائے میں شامل کیا گیا تاکہ یہ قند مکرر بن جائے۔ اس ایجاد کے کیا کہنے یہ عجوبات کی خدا کی قسم لاجواب کی۔ خاص طور پر چھوٹے ریستوراں، جن کے نام بڑے بڑے ہوتے تھے اور چائے دانیاں اور پیالیاں چھوٹی چھوٹی، اس معاملے میں سب سے آگے تھے۔ وہ اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ صرف وہ پتی استعمال کی جائے جو زیادہ سے زیادہ تین اور کم از کم پانچ مرتبہ پہلے استعمال کی جاچکی ہو تاکہ اس میں کسی قسم کے کوئی جراثیم باقی نہ رہ جائیں۔

اس احتیاط کی چنداں ضرورت تو نہ تھی کیونکہ اس زمانے کے لوگ جراثیم سے زیادہ بھوت پریت اور شاعروں سے ڈرتے تھے۔ اتنی چھوٹی سی چیز — جرم، بھلا اس سے کیا ڈرنا۔ ڈریں تو کم از کم کسی بڑی چیز سے تو ڈریں۔ بھوت سے پریت سے، شاعر سے۔ شاعروں سے ڈرنے میں تو انہیں مورد الزام قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس زمانے میں غالباً ان کے کلام سنانے کے مرض کا علاج دریافت نہ ہوا تھا۔

اس زمانے میں عجیب عجیب مخلوق تھی جو اس وقت نیست و نابود ہوچکی ہے۔ لیکن ان میں جو مخلوق عجیب ترین تھی آج میں اس کے متعلق کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ اس کا نام تھا فنکار۔ یہ اس زمانے کے انسانوں کی ایک نوع تھی لیکن غالباً عام انسانوں سے ارتقائی منازل میں خاصی پیچھے۔ اس کی ظاہر شکل و صورت عام انسانوں سے کچھ کچھ ملتی جلتی تھی لیکن اس کی ہیئت کذائی کچھ اس قسم کی تھی کہ یہ نوع دوسرے انسانوں سے

ف پہچان لی جاتی تھی۔ بڑے بڑے بال، آنکھوں پر دبیز شیشوں کا چشمہ، ہاتھ میں سگریٹ،
لا کالر، گریبان چاک، دامن تار تار، ہر وقت کھوئے کھوئے سے۔ یہ
لوق عام طور پر فضا میں پرواز کرتی تھی، زمین پر گاہے گاہے اترتی تھی۔
ں نوع کا ہر فرد اپنے آپ کو استاد سمجھتا تھا اور باقی سب کو طفلِ مکتب۔
ندگی اور اس کے فرائض سے بے نیاز یہ صرف فن کی تخلیق میں ہمہ تن مشغول
ہتے تھے۔ کوئی شعر کہہ رہا ہے اور کوئی افسانہ لکھ رہا ہے۔ ایک صاحب
ش بنا رہے ہیں اور دوسرے حضرت گنگنا رہے ہیں۔ لکڑی، پتھر اور مختلف
م کی دھاتوں تک کو تو نہ چھوڑا ان فنکاروں نے۔

ان استادوں کے بھی ایک استاد تھے جو نقاد کہلاتے تھے۔
ور سے دیکھنے میں یہ بھی انسان اور فنکار معلوم ہوتے تھے۔ اپنے آپ کو
علم اور فن کا ماہر سمجھتے تھے۔ فنکار، نقاد سے ڈرتے تھے اور عوام فنکار سے۔
سی شریف آدمی کو نقاد یا شاعر وغیرہ کچھ کہہ دینا اس زمانے کی سب سے
ی گالی سمجھی جاتی تھی۔ لیکن یہ حضرات اس بات پر خوش تھے کہ انہیں
ئی کچھ دیتا ہی تو ہے، لیتا تو نہیں۔ ویسے ان حضرات کے پاس کوئی ایسی
رآمد چیز ہوتی ہی نہ تھی جو کوئی ان سے لے سکتا۔ ان کا محبوب مشغلہ چوری
ما۔ مشرق والے مغرب والوں کی چوری کرتے تھے اور مغرب والے
ینان کی۔ ہر فنکار اس بات کی پوری کوشش کرتا تھا کہ اس کا کہا کوئی نہ
سمجھے اور جو شخص اس میں جتنا کامیاب ہوتا تھا وہ اتنا ہی بڑا فنکار سمجھا
جاتا تھا۔

شعرا اور ان کے بھائی اُدبا بڑے بڑے ناموں والے چھوٹے
چھوٹے کیفوں میں بیٹھ کر تخلیق کا کام کیا کرتے تھے۔ تعریفوں اور گالیوں
سے پیٹ بھرتے تھے اور مفت چائے کا انتظار کرتے تھے۔ لیکن مشاعرہ
میں خوب خوب چائے چلتی تھی۔ شاعر شعر بھی سناتے تھے اور چائے سگریٹ
بھی پلاتے تھے۔ چائے کے لالچ کے بغیر کون اتنا بے وقوف ہوگا جو شعر بھی
سُنے اور داد بھی دے۔ داد تو دی جا سکتی ہے لیکن شعر تو نہیں سنا جا سکتا۔
تنقیدی محفلوں میں بھی چائے کا خوب دور چلتا تھا۔ چائے کے بغیر
تنقید صرف تنقیص ہوتی تھی اور چائے کے ساتھ تعریف۔ تنقید نہ چائے
کے ساتھ ہوتی تھی نہ چائے کے بغیر۔ چائے جتنی بھاری ہوتی تھی تعریف
اتنی ہی زیادہ اور وزنی۔ لیکن نقاد، خدا اس سے بچائے! وہ تو چائے
تک کا ذکر بھی نہ کرتے تھے۔ چائے پیتے تھے اور لاحول پڑھتے تھے لیکن شاعر
افسانہ نویس کے منہ پر نہیں صرف پیٹھ پیچھے۔ پیٹھ پیچھے تو وہ بادشاہ تک کو بُرا بھلا کہتے
تھے۔ بھلا بالکل نہیں، صرف بُرا ہی بُرا۔ لیکن عام طور پر چائے کو حلال کرنے
کا خیال رکھا ہی جاتا تھا۔ تنقید کو تعریف یا تنقیص بنانے میں دوستی اور
دشمنی کے عناصر بھی کارفرما ہوتے تھے۔ یہ دوستی اور دشمنی ذاتی مخاصمت
پر بھی مبنی ہوتی تھی اور گروپ اور پارٹی کی بنیادوں پر بھی۔ تعریف دوستوں
کی ہوتی تھی، چاہے ان کی پیش کردہ چیز اس لائق ہو یا نہ ہو۔ اور تنقیص
دوسروں کی۔ خواہ ان کی چیز کتنی ہی اعلیٰ اور ارفع کیوں نہ ہو۔ تنقید کا سب سے
بڑا اصول یہ تھا کہ کس نے کہا۔ یہ کوئی نہ دیکھتا تھا کہ کیا کہا اور کس طرح کہا۔
ہم نے یا ہمارے گروپ کے آدمی نے کہا تو خوب خوب، واہ واہ، ماشاءاللہ
مکرر۔ قلم توڑ دیا۔ اور مخالف نے کہا تو لاحول ولا۔ بکواس، مغز ماخوردو
حلق خود بریدہ۔ قلم ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ بعض مرتبہ سر بھی پھوٹ جاتے
تھے جس خوش قسمت کے ساتھ ایسا واقعہ پیش آجائے وہ شہیدِ فن کہلاتا
تھا اور عزت کا مستحق ٹھہرتا تھا۔

ایک بات اور بھی ہے۔ جب تک کوئی شاعر، ادیب یا فن کار
زندہ رہتا یہ لوگ اس کو خاطر میں نہ لاتے۔ لیکن جونہی اسکی آنکھیں بند
ہوتیں۔ خواہ وہ دم ٹوٹتے وقت پانی کی جگہ کوئی اور ہی شے صرف میں لاتا،
یہ لوگ اس کی خوب ہوا باندھتے اور اس کی بوالعجبیوں ہی کو اسکی عظمت کا
سبب گردانتے۔ وہ اس کو ہیرو بنانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے۔
اور ہر سال اس زور شور سے اس کا یوم مناتے کہ ان کے سامنے بڑے
بڑے بزرگوں کے عرس ہیچ ہو جاتے۔

آپ کہیں گے چائے اور اس تنقید، تعریف، تنقیص اور شعر و
ادب کا کیا تعلق۔ معلوم نہیں ان کا آپس میں کیا تعلق تھا اور کس قسم کا،
بہرحال تعلق ضرور تھا۔ بغیر چائے اور سگریٹ کے تخلیق ممکن تھی نہ
تحقیق۔ نہ تنقید ہو سکتی تھی نہ تعریف۔ جو شخص جتنی زیادہ چائے اور
سگریٹ پیتا تھا اتنا ہی بڑا فن کار سمجھا جاتا تھا۔ دوسرے اسے بڑا سمجھیں
یا نہ سمجھیں وہ خود اپنے آپ کو بہت بڑا، بہت ہی بڑا فنکار سمجھنے لگتا تھا۔
اور اگر وہ دوسروں کو بھی چائے سگریٹ پلا سکے تو پھر تو اس کی عظمت
میں شک و شبہ کی گنجائش ہی نہ رہتی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ اس زمانے میں اور بھی طرح طرح کی مخلوق
تھی۔ مگر سب سے زیادہ عجیب مخلوق جو تھی وہ یہی شاعر، ادیب، فن کار،
نقاد اور مزاح نگار ہی تھے۔ اس لئے ہماری دلچسپی سب سے زیادہ
انہی میں ہے۔ چلئے اس بہانے بزرگوں کی فاتحہ ہی سہی۔ چائے نہیں تو

(باقی صفحہ ۹۴ پر)

"ہوتا ہے جادہ پیما"

(بنیادی جمہوریتوں کا اثر)

ظفر اقبال

ہمارے دیہات میں زندگی کی وضع صدہا سال سے قریب قریب ایک جیسی ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر یہ اندازہ لگانے کی کوشش صریحاً کچھ جسارت بے جا معلوم ہوگی کہ بنیادی جمہوریتوں نے ہماری دیہی زندگی پر کیا اثر ڈالا ہے۔ کیونکہ ابھی ان کو قائم ہوئے بمشکل ایک ہی سال گزرا ہے۔ لیکن اس بناء پر اس سوال کو گلدستۂ طاق نسیاں بنانا ممکن نہیں کیونکہ آج ہم جن بڑے بڑے کاموں سے دوچار ہیں ان میں سے ایک ترقیٔ دیہات بھی ہے۔

ترقیٔ دیہات کی یہ اہمیت کاشتکار کے ساتھ نہ تو کسی جذباتی لگاؤ کی وجہ سے ہے، نہ اس لئے کہ دیہات کی دنیا بڑی سہانی ہوتی ہے اور فلسفی لوگ یہاں کی سیدھی سادی زندگی کو بہت پسند کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ۸۵ فیصد عوام دیہات میں آباد ہیں۔ اور ان کا ذریعۂ معاش بالواسطہ یا بلا واسطہ زراعت ہی ہے۔ اس لئے اگر ہمیں ترقی کرنا ہے تو ہم ان ۸۵ فیصد عوام کو ساتھ لئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے۔ دیہی معاشرہ کی اقتصادی اور سماجی ترقی بہرحال لازمی ہے۔ لیکن اگر ہم دیہی معاشرہ کو سماجی اور اقتصادی حیثیت سے ترقی دینے کی کوششوں میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں۔ اور ان ۸۵ فیصد عوام کو ترقی کرنے میں مدد دینا چاہتے ہیں تو ہمارے لئے دیہی معاشرہ کی نوعیت کا واضح شعور از بس ضروری ہے ساتھ ہی یہ بھی جاننا لازم ہے کہ ترقی دیہات کے سلسلہ میں جو کوششیں اس سے پہلے کی گئیں وہ کیوں ناکام ثابت ہوئیں۔

یہاں چند لمحے اس بات پر صرف کرنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ انگریزوں سے پہلے دیہات کی کیفیت کیا تھی۔ اور پھر مختصراً یہ بیان کیا جائے کہ ان کے بعد اس سلسلہ میں کیا کچھ بروئے کار آیا۔

۱۸۲۲ء میں انگریزی گورنر جنرل سر جارج مٹکاف نے اپنے ایک بیان میں جس کا اکثر حوالہ دیا جاتا ہے ہندوستان کی دیہی زندگی کا ایک بہت ہی پر لطف اور دلچسپ نقشہ پیش کیا ہے۔ اس نے کہا تھا:۔

"دیہی معاشرے کیا ہیں، چھوٹی چھوٹی جمہوریتیں ہیں جن میں وہ سب کچھ پایا جاتا ہے جس کی انہیں ضرورت ہو۔ جہاں اور سب چیزیں آتی ہیں، گزر جاتی ہیں۔ وہاں وہ ہمیشہ باقی رہتے ہیں۔ یہی دیہی معاشروں کا بھائی چارہ ہے جو اور سب باتوں سے زیادہ ان کے محفوظ رہنے کا باعث ہوا ہے — خواہ کتنے ہی انقلاب، کتنی ہی تبدیلیاں کیوں نہ آئیں اور ان کے سر سے گزر جائیں۔"

اگر ہم اس کے اس بیان پر غور سے نظر ڈالیں تو اس سے دو اہم نکات پیدا ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ دیہی معاشرہ اپنا انتظام آپ کرنے کا اہل تھا۔ اور دوسرے یہ بڑی حد تک خود کفیل ہوتے ہوئے الگ تھلگ رہ سکتا تھا۔

جب انگریزوں کے تحت ایک مؤثر مرکزی حکومت قائم ہوئی تو دیہات میں اپنا انتظام آپ کرنے کے سلسلہ کو سخت صدمہ پہنچا اور اپنے معاملات آپ سر انجام دینے کے بجائے لوگ اپنے مسائل کو حل کرنے کے لئے روز بروز زیادہ تر بیرونی حکام کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھنے لگے۔ پھر بھی دیہات کی الگ تھلگ حیثیت ختم نہ ہوئی اور لوگوں کے طرز زندگی میں کچھ زیادہ فرق نہ آیا۔ دیہات بدستور خود کفیل رہے۔ اس لئے یہاں کے لوگ بڑی حد تک قدامت پسند ہی رہے۔ تبدیلیوں کے شدت سے خلاف، اگرچہ وہ ان سے بالکل بیگانہ بھی نہ رہ سکے۔

انگریزوں نے اپنے زمانہ میں دیہات کی معاشری زندگی

میں نئی روح پھونکنے کی کچھ کوششیں کیں۔ اور دیہی معاشروں میں کسی نہ کسی قسم کی لوکل سلف گورنمنٹ داخل کرنے کے تجربے بھی کئے۔ ان کے علاوہ بعض جگہ ایسے پروگرام بھی شروع کئے گئے جنہیں دیہی تعمیرِ نو کے کام کہا جاسکتا ہے۔ مگر ان دونوں کوششوں کی قسمت میں ناکامی لکھی تھی۔

جہاں تک دیہات کا تعلق ہے لوکل سلف گورنمنٹ ان میں اس لئے جڑ نہ پکڑ سکی کہ یہ تمام تر انتظامی حکام کے زیرِ نگیں تھے۔ ان حالات میں نہ تو کوئی ذمہ داری کا احساس پیدا ہونے کی توقع کی جاسکتی تھی اور نہ خود سے کوئی اقدام کرنے کی۔ جہاں تک دیہی تعمیرِ نو کی کوششوں کا تعلق ہے یہ سب جدا جدا تھیں اور بالعموم کسی ایسے افسر کے والہانہ ذوق و شوق پر منحصر ہوتی تھیں جسے اس کام کی خاص لگن ہو۔ ایسے شخص کو اپنے کام کے ساتھ جو لگاؤ ہوتا تھا اس سے بلا شبہ تھوڑی بہت ترقی ضرور ہو جاتی تھی لیکن جونہی اس کی نمایاں شخصیت وہاں سے پرے ہٹ جاتی۔ فضا پر پھر دیہی سناٹا چھا جاتا۔ لہٰذا یہ منصوبے کبھی بھی قومی پیمانے پر کسی منظم و مربوط پلان کا جزو نہ بن سکے۔

بنیادی جمہوریتوں کی اسکیم میں ان دونوں خرابیوں سے بچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اول، اس میں اس بنیادی تہہ پر بہت بڑا اعتماد کیا گیا ہے جو کہ دیہی ترقی کی ذمہ دار ہے۔ اس سے دیہی کارپردازوں میں اپنی اہمیت کا شدید احساس پیدا ہو گیا ہے۔ اس پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کے لئے قومی پیمانے پر ایک تعلیمی مہم شروع کی گئی ہے۔ جس میں صدر پاکستان نے خود نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ لوگوں کو یہ بات ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ یہ ملک ان کا اپنا ہی ملک ہے اور حکومت ان کی اپنی ہی حکومت۔ اس لئے ہر طبقہ کی بہبود ان کی اپنی کوشش ہی پر منحصر ہے۔ دوسرے، ترقیٔ دیہات کے مسئلہ کو نہایت سنجیدگی سے قومی پیمانے پر حکومت کے کل کام کے لازمی جزو کی حیثیت سے نہ کہ علیحدہ ذیلی پروگرام کی حیثیت سے حل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

اس ضمن میں بنیادی جمہوریتوں کی اسکیم کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں دیہی علاقوں کے لئے کارگزار لوکل سلف گورنمنٹ پر زور دیا گیا ہے۔ ان کونسلوں کے چیئرمینوں کے لئے بالائی سطح کی کونسلوں میں نشستوں کا بندوبست کر کے نہ صرف ان کے منصب بلکہ خود ان کونسلوں کی اہمیت بھی دوبالا کر دی گئی ہے۔ بنابریں جہاں سابقہ کوششیں ان مقامات میں اقدام و قیادت کی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لا سکیں وہاں یہ کامیاب ثابت ہوگی۔

یہ تو ہوئی نظریہ کی بات۔ عملی طور پر، ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۹ء کو بنیادی جمہوریتوں کا قانون نافذ ہونے سے لے کر اب تک صرف ۱۴ مہینے ہی گزرے ہیں۔ ان کا بیشتر حصہ انتخابات کی تنظیم، ان کے انعقاد اور بنیادی جمہوریتوں کی مختلف منزلیں مرتب کرنے پر صرف ہوا۔ چونکہ اس سارے نظام کا ایک مربوط کل کی حیثیت سے تصور کیا گیا ہے۔ اس لئے یہ درجہ بدرجہ کونسلیں اُس وقت تک مؤثر طور پر کارروائی شروع نہیں کر سکتی تھیں جب تک ان کا سارا ہیولیٰ تیار نہ ہو جائے۔ علاوہ بریں ضروری قواعد و ضوابط تیار کرنے کے لئے بھی کچھ وقت درکار تھا۔ کیونکہ ان کے بغیر ان اداروں کے عملی طور پر کار پیرا ہونے کا امکان نہ تھا۔ اب یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے اور کوئی چھ سات ماہ سے بنیادی جمہوریتیں زور و شور سے سرگرمِ کار ہیں۔

یہ مدت حقیقتہً یہ اندازہ لگانے کے لئے ناکافی ہے کہ بنیادی جمہوریتوں نے ہمارے دیہات پر کیا اثر ڈالا ہے۔ تاہم دونوں صوبوں سے جو اطلاعات موصول ہو رہی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ادارے کافی ترقی کر رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیہی معاشرہ نے جو نئے کارپرداز پیدا کر دیئے ہیں ان اداروں نے ان میں ترقی اور اجتماعی خدمت کی ایک عام لگن پیدا کر دی ہے، ایک چنگاری روشن کر دی ہے۔ اس سے پہلے کبھی اتنی سرگرمی اور خود کو بہتر بنانے کا جذبہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ اور یہ ادارے اجتماعی خدمت کے لئے بڑی تیزی سے حرکی اور مؤثر بنتے چلے جا رہے ہیں۔

تمام مقامی کونسلیں خود کو اجتماعی اور ترقیاتی کام کے لئے بڑی تندہی سے وقف کر رہی ہیں۔ زیادہ تر "اپنی مدد آپ" کے اصول پر یا دوسرے اداروں کے ساتھ تعاون کی شکل میں۔

مغربی پاکستان میں اب تک جن باتوں پر زیادہ تر توجہ دی گئی ہے۔ وہ ہیں سڑکوں کی تعمیر، نہروں سے کیچڑ کی نکاسی، نالوں کو چوڑا کرنا، بنجر اراضی کو زیر کاشت لانا، صحت کے مراکز اور

اسکولوں کی تعمیر۔ غرض اس طرح اجتماعی خدمت اور خدمتِ عامہ کا سارا تصور ایک نہایت قوی اور مفید معاشری خدمت کے طور پر سامنے آگیا ہے۔

معاشری خدمت کے اس نئے احساس کی مثالوں میں سب سے نمایاں، قابلِ فخر حیثیت سرگودھا کی ایک مخیر خاتون کو حاصل ہے جس نے اپنا ایک مرکز صحت کے لئے ۱۲۵ ایکڑ زمین عطا کی ہے۔ یونین کونسل کے چیرمین نے بھی اس مقصد کے لئے ۱۵ ایکڑ زمین عنایت کی ہے۔ راولپنڈی ڈویژن کے چھ اور سکھر کی ۱۸ کونسلوں کے چیرمینوں نے اپنے اعزازیئے اجتماعی مقاصد کے لئے نذر کئے ہیں۔

مشرقی پاکستان میں بھی یونین کونسلوں کی سرگرمیوں کی کیفیت ایسی ہی ہے۔ ان کونسلوں نے سڑکوں اور چھوٹے چھوٹے پل بنانے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ بعض جگہ سیلابوں کی روک تھام کے لئے بند باندھے گئے ہیں اور کاشت کے لئے زمینیں بحال کی گئی ہیں۔ یونین کونسلوں کے ممبر چھوٹے چھوٹے جھگڑوں کو نمٹانے میں بھی سرگرمی سے حصہ لے رہے ہیں۔ تاکہ خواہ مخواہ فضول مقدمہ بازی تک نوبت نہ پہنچے جو ان لوگوں کے لئے بڑی گراں بھی ثابت ہوتی ہے۔

اسی طرح یونین کونسلیں پودوں کی حفاظت، جانوروں کے امراض کی روک تھام اور کاشت کاری کے بہتر طریقوں کی حوصلہ افزائی میں بھی سرگرمی سے حصہ لے رہی ہیں۔ جیسا کہ اس جائزے سے، جو لازماً بہت مختصر اور کچھ سرسری سا ہے، بخوبی ظاہر ہے۔ جو تصویر ہمارے سامنے آتی ہے وہ لوگوں کے اپنی زندگی کو معاشری و اقتصادی دونوں حیثیتوں سے اپنی ہی جدوجہد سے بہتر بنانے میں بڑی تندہی اور بڑے ذوق و شوق سے دلچسپی لینے کی تصویر ہیں۔

غرض کوئی بھی معیار پیشِ نظر رکھا جائے اس کی رو سے یہ آغاز واقعی بہت شاندار ہے۔ اور ان اداروں کے مستقبل اور خود ہمارے مستقبل کے لئے، پر اُمید ہونے کی عمدہ بشارت ٭ (ترجمہ) (بہ تشکر یہ ریڈیو پاکستان، راولپنڈی)

★

سرودِ رفتہ : بقیہ صفحہ ۱۵

اور میرے ہاتھ چومتے لگا۔ باقی تمام دوکانداروں کو مجھ سے ملایا اور وہ سب لوگ میرے گرد حلقہ باندھ کر "ماشاءاللہ ماشاءاللہ" کہنے لگے اور میری غرضِ سفر معلوم کر کے دعائیں دینے لگے۔ یا یوں کہئے کہ وہ چار منٹ کے لئے وہ تجارت کی پستی سے ابھر کر اسلامی اخوت کی بلندی پر جا پہنچے۔

تھوڑی دیر کے بعد مصری نوجوانوں کا ایک نہایت خوبصورت گروہ جہاز کی سیر کے لئے آیا۔ میں نے جب نظر اٹھا کر دیکھا تو ان کے چہرے اس قدر مانوس معلوم ہوتے تھے کہ مجھے ایک سیکنڈ کے لئے علی گڑھ کالج کے ڈیپوٹیشن کا شبہ ہوا۔ یہ لوگ جہاز کے ایک کنارے پہ کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔ اور میں بھی در معقولات ان میں جا گھسا۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ان میں سے ایک نوجوان ایسی خوبصورت عربی بولتا تھا جیسے حریری کا کوئی مقام پڑھ رہا ہو۔

آخر مسلمانوں کے اس گروہ کو چھوڑ کر ہمارا جہاز رخصت ہوا اور آہستہ آہستہ سوئز کنال میں داخل ہوا۔ یہ کنال جسے ایک فرانسیسی انجنیر نے تعمیر کیا تھا۔ دنیا کے عجائبات میں سے ایک ہے۔ کنال کیا ہے؟ عرب اور افریقہ کی جدائی ہے اور مشرق و مغرب کا اتحاد ہے۔ دنیا کی روحانی زندگی پر مہاتما بدھ نے بھی اس قدر اثر نہیں کیا جسقدر اس مغربی دماغ نے زمانۂ حال کی تجارت پر اثر کیا ہے۔ کسی شاعر کا قلم اور کسی سنگ تراش کا ہنر اس شخص کے تخیل کی داد نہیں دے سکتا جس نے اقوامِ عالم میں اس تجارتی تنیز کی بنیاد رکھی جس نے حال کی دنیا کی تہذیب و تمدن کو اور سے کچھ اور کر دیا۔ بعض بعض جگہ تو یہ کنال ایسی تنگ ہے کہ دو جہاز مشکل سے اس میں گذر سکتے ہیں اور کسی کسی جگہ ایسا بھی ہے کہ اگر کوئی غنیم چاہے کہ رات بھر میں اسے مٹی سے پُر کر دے تو آسانی سے کر سکتا ہے۔ سینکڑوں آدمی ہر وقت کام کرتے رہتے ہیں، جب ٹھیک رہتا ہے اور اس بات کا ہمیشہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ دونوں جانب سے جو ریگ ہوا سے اڑ کر اس میں گرتی رہتی ہے اس کا انتظام ہوتا رہے۔ کنارے پر جو مزدور کام کرتے ہیں بعض نہایت شریر ہوتے ہیں ...... الخ" (محمد اقبال)

"شہاب ثاقب"

(نواب سید محمد معروف بہ "مولانا آزاد")

سید اختر حسن

نواب سید محمد حسن کا مولد شہر ڈھاکہ تھا، مشرقی بنگال کے ایک سربرآوردہ خاندان کے رکن تھے۔ آپ کے مورث اعلیٰ، امیر اشرف علی اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر میں ایران سے ہندوستان آکر مشرقی بنگال میں بس گئے تھے۔ نواب سید محمد اپنے عنفوان شباب میں کلکتہ چلے آئے اور یہاں اپنے خسر، نواب بہادر عبداللطیف سی۔ آئی۔ ای کی صلاح سے اسپیشل سب رجسٹرار کے عہدہ پر مامور ہوئے اور رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہوئے انسپکٹر جنرل آف رجسٹریشن بنگال، بہار اور اڑیسہ کے عہدۂ جلیلہ پر پہنچ کر پنشن یاب ہوئے۔ ان کی خدمات کے صلہ میں حکومت نے انہیں پہلے خان بہادر، پھر نواب، اور آخر میں آئی۔ ایس۔ او کا خطاب عطا کیا۔ وہ میرے جد امجد تھے اور مجھے بچپن ہی سے چاہتے تھے۔ میری ابتدائی تعلیم و تربیت انہیں کے زیرِ عاطفت ہوئی۔

وہ اپنے زمانے کے ایک بے نظیر فرد تھے۔ سرکاری ملازمت کی بندشوں کے باوجود انہوں نے ایک فرضی نام "مولانا آزاد" کے تحت پینتیس (۳۵) سال ہندوستان کے اردو اخبارات میں بڑی کامیابی سے انشاء پردازی کی اور عرصہ تک لکھنؤ کے اخبار "اودھ پنچ" کے مشہور نامہ نگار رہے۔ ان کے مضامین کا ایک مجموعہ موسوم بہ "خیالاتِ آزاد" پہلی بار ۱۸۸۷ء اور دوسری بار ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے لئے اردو نثر نگاری میں ایک نئی اور بالکل نرالی راہ نکالی تھی جو سارے ہندوستان میں مقبول ہوئی۔ ان کے مضامین کے عنوان عجیب ہوا کرتے تھے مثلاً مولانا آزاد کی نئی روشنی کی ڈکشنری۔ پرانی روشنی کی ڈکشنری، نئی روشنی کا نامہ و پیام۔ مہذب نامہ و پیام۔ اخلاق آموز نامہ و پیام۔ تہذیب آموز نامہ و پیام۔ سعادت فرجام نامہ و پیام۔ حسرت انجام نامہ و پیام۔ خارستان کا ڈنر (DINNER)۔ اشتہار مسرت بار۔ ستایش نیچر حسن کا مالیخولیا۔ روئدادِ اجلاس خجال کونسل بادشاہ نصب امراض۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان کی تصانیف میں ذیل کی کتابیں مشہور رہیں :

(۱) خیالات آزاد (مذکورۂ بالا)

(۲) "نوابی دربار" جو غالباً اردو زبان میں مغربی مصنفوں کی طرز کا پہلا ڈراما اور نوابی درباروں کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

(۳)۔ سوانح عمری مولانا آزاد (مطبوعہ ۱۸۹۱ء) "جس میں شوخ مصنف نے مولانا آزاد کی آڑ میں نئی روشنی کے چلتے پرزوں کے خوب خوب پرزے اڑائے ہیں۔

(۴) " لوفر کلب" (مطبوعہ ۱۹۱۰ء) یعنی ایک ذی ہمت، پُر خوغا، خوددار، ہونہار۔ اور ہر قسم کی مشکلات سے ڈھٹائی اور بے رعبی سے دل آور انہ مقابلہ کرنے والی سراپا عزت جماعت کے سالانہ ڈنر کی روئداد جس کو قومی اصلاح قومی رفاہ اور قومی ترقی کی غرض سے خاص رپورٹر اودھ پنچ نے یوروپین کوشش اور جاں فشانی سے مہیا کیا۔"

مولانا آزاد کو لوگ کبھی کبھی صرف آزاد کہہ کر غلط فہمی پیدا کر دیتے ہیں کیونکہ ان کے منجھلے بھائی (جو اپنے زمانے میں ہندوستان کے ایک مشہور فارسی شاعر تھے) آزاد تخلص کرتے تھے اور ہندوستان کے دیگر شعراء، مورخین اور ادیبوں میں "آزاد" کا لقب اور تخلص اکثر پایا جاتا ہے۔ اگرچہ مولانا آزاد ایک نثر نگار کی حیثیت رکھتے تھے اور شاعری ان کا فن نہ تھا پھر بھی انہوں نے اپنے اخی معظم سید محمود آزاد کی صحبت بابرکت میں فن شاعری و عروض و قوافی میں کامل استعداد حاصل کی تھی۔ اس بات کا پتہ اس وقت چلا جب ۱۹۱۵ء میں آپ نے ۴۴ اشعار کی ایک نہایت دلچسپ اور نصیحت خیز نظم "لیڈر نامہ" کے عنوان سے لکھی۔ اور ایک فرضی نام " شہاب ثاقب " کے تحت اس کو شائع کیا۔ تب اُس زمانہ کے لیڈروں نے وہ نظم پڑھی اور اس کو اپنے اعمال و خصائل کا آئینہ پایا تو اُن میں سخت کھلبلی مچی اور انہوں نے پولیس کمشنر کلکتہ سے درخواست کی کر

اس نظم کے مصنف پر" ازالۂ حیثیتِ عرفی" کے الزام میں فوجداری مقدمہ چلایا جائے۔ انگریز پولیس کمشنر نے فوراً مالکِ مطبع، قاضی ابوالظفر مولا بخش صاحب المتخلص بہ رضوان، کو بلایا اور ان سے" لیڈر نامہ" کے مصنف کا نام طلب کیا۔ مالکِ مطبع نے کہا کہ شاعر نے اپنا نام بوجوہ صیغۂ راز میں رکھا ہے، اس لئے وہ اُس کا نام ظاہر نہیں کر سکتے۔ مگر نظم میں کوئی بات قابلِ اعتراض نہیں۔ اور نہ اس نظم کے ذریعہ کسی فرد کا" ازالۂ حیثیت عرفی" ممکن ہے۔ پولیس کمشنر نے اس نظم کا انگریزی میں ترجمہ کرایا کر اس کا بغور مطالعہ کیا۔ اور مالک مطبع کے دعوے کو صحیح قرار دیا۔ اس سلسلہ میں مولانا آزاد کا ایک فقرہ مجھے یاد آتا ہے۔ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ" میرے مضامین قانون کے فلٹر (FILTER) میں چھنے ہوئے ہوتے ہیں۔" ناظرین کی دلچسپی کے لئے وہ نظم بعنوان" لیڈر نامہ" ذیل میں درج کی جاتی ہے:۔

عجب جادو اثر اور دلربا ہے نام لیڈر کا
بہت دلچسپ اور عقدہ کشا ہے کام لیڈر کا

تلاش نفع قومی میں قدم جب یہ اٹھاتا ہے
پڑے ہے منزل مقصود پہ ہر گام لیڈر کا

ہمیشہ مفت کی ہیں دعوتیں اُس کے لئے حاضر
بھلا دیکھو تو کیا فرخندہ ہے فرجام لیڈر کا

ہے دن کو رہنمائے قوم یا قومی کے نعرے ہیں
تو لکچر شب کو سنتا ہے کوئی گلفام لیڈر کا

گلے میں ہار ہے پھولوں کے گلدستے ہیں ہاتھوں میں
یہ اعزاز و نشاں پبلک میں ہے خوش نام لیڈر کا

پلیڈر گو نہ ہو ہمزاد لیڈر پر یہ ظاہر ہے
وہ 'پی' کے سر کے کٹنے سے بنا ہمنام لیڈر کا

بہت کچھ گانٹھ کا کھو کر بنا فرزانہ ہے آخر
الیکشن میں ہوا اکثر یہی انجام لیڈر کا

دیانت سے کرے انجام جب اپنے فرائض کو
تب ہی سدّ راہ بن سکتا ہے خاص و عام لیڈر کا

رعایا کی بہی خواہی شہنشہ کی رضا جوئی،
یہی ہے مقصدِ اصلی ہر اک خوش نام لیڈر کا

اطاعت اور محبت شہ کی پھیلانا رعایا میں
مرے نزدیک ہے سب سے مقدم کام لیڈر کا

دیانت اور امانت سے کرو گر خدمتِ ملکی
رعایا کو حصارِ عافیت ہو نام لیڈر کا

تمہاری نیتوں میں کوئی خود غرضی نہ شامل ہو
اگر منظور ہے کرنا تمہیں کچھ کام لیڈر کا

علوم مشرقی سے مطلقاً جب تم ہو ناواقف
مسلمانوں میں پھر کیونکر کرو گے کام لیڈر کا

تمہارا علم ہے محدود انگریزی کتابوں میں
مسلمانوں میں کس منہ سے ہو لیتے نام لیڈر کا

ہزاروں کے سروں کو دم کے دم میں مونڈ ڈالا ہے
ہے قومی بار بر قومی لقب خود کام لیڈر کا

کیا کرتا ہے وہ ہذیاں سرائی نام لکچر ہے
بہت ایذا رساں ہے بانگِ بے ہنگام لیڈر کا

کبھی غیبت کبھی سازش کبھی فتنہ کبھی چغلی
یہی ہے مفسدانہ شغل نافرجام لیڈر کا

بکے سے ہے حالت بحراں میں لاؤ لیگ کا چندہ
معاذ اللہ کیا زرکش ہے یہ سرسام لیڈر کا

رفاہِ ملک و ملت میں کوئی دیتا نہیں چندہ
ہمیشہ سے چلا آتا ہے یہ الزام لیڈر کا

نہ نوابی ملی اس کو نہ کونسل کا بنا ممبر
نتیجہ ہے یہ سارا شامتِ ایام لیڈر کا

کبھی شملہ کبھی دہلی کبھی لکھنؤ کبھی ڈھاکہ
نہیں دم لینے دیتا بختِ نافرجام لیڈر کا

ہوس سے لیڈری کے کون سا سر آج خالی ہے
میاں جمّن بھی کرنا چاہتے ہیں کام لیڈر کا

پلیڈر سے ہے مشتق لفظ لیڈر شک نہیں اس میں
اسی سے ہو گیا قومی وکالت کام لیڈر کا

ڈنر اور لنچ کھا کھا کر بنی بگڑی ہوئی صحت
بحمد اللہ کہ چہرہ ہو گیا گلفام لیڈر کا

خطاب و خلعت و تمغہ سند سرپیچ اور خنجر
مقرر ہے یہ سب سرکار سے انعام لیڈر کا

دغا منزل فریب آباد میں اک قصرِ عالی ہے
پتہ بتلائے دیتے ہیں تمہیں بد نام لیڈر کا

سلام روستایاں بے غرض ہرگز نمی باشد
بہت ڈرتے ہوئے لیتے ہیں ہم پر نام لیڈر کا

ہوئی ہیں جلوہ افگن بیگماتیں جب سے پبلک میں
پریزادوں کا گلدستہ بنا ہے بام لیڈر کا

کیا بعضوں نے چندہ چٹ، لیا بعضوں نے رہ ووٹ
مٹایا ہے انھیں باتوں نے ننگ و نام لیڈر کا

حصولِ مقصدِ ذاتی کا بُرقع حُبِّ قومی ہے
بگڑ جائے نہ کیوں بن بن کے سارا کام لیڈر کا

حکومت اور رعایا میں یہ ثالث بن کے بیٹھا ہے
الٰہی خیر ہو مشکل بہت ہے کام لیڈر کا

نکالو کُل کمینوں مفسدوں کو کیمپ سے اپنے
اہم سب کام سے یہ کام ہے خوشنام لیڈر کا

سفینہ قوم کا اب آپڑا گردابِ آفت میں
لگا دے پار ہمت سے یہی ہے کام لیڈر کا

جتانے میں تم اپنا رنگ اچھوں کو نہ گالی دو
یہ کم ظرفوں کا شیوہ ہے نہیں یہ کام لیڈر کا

ضرورت مرغ زریں کی نہ دیوانے شغالوں کی
کہ ان دونوں سے بگڑا ہے برابر کام لیڈر کا

فدائی قوم کے ہنگامہ آرائی نہیں کرتے
ملا کرتا ہے بے مانگے انہیں انعام لیڈر کا

بڑے پختہ سے پختہ آدمی بھی اس میں پھنستا ہے
بہت پُر پیچ ہوتا ہے سیاسی دام لیڈر کا

ایلکشن میں لگی ٹھوکر گرا وہ منہ کے بل آخر
یہی ہے کیفرِ کردار ہر خود کام لیڈر کا

دعا سے بڑھ کے ہم کو گالیاں تھیں نازو چھین کی
کہیں اب اس سے خوشتر ہے ہمیں دُشنام لیڈر کا

خیالاتِ تمدن کی یہیں ہوتی ہے شُست و شو
کُتب خانہ وکیلوں کا بنا حمام لیڈر کا

کبھی کونسل میں لڑتا ہے کبھی پُولیس سے بھڑتا ہے
کبھی شامت سے ہوتا جیل ہے انجام لیڈر کا

سمجھتا سرکشی اور سخت گوئی کو ہے آزادی
جھنکائے گا کنوئیں آخر خیالِ خام لیڈر کا

دو رنگی پالیسی کی اُس کی بھائی ہے بہت اسکو
مقلد یوں ہوا کیا ابلقِ ایام لیڈر کا

ہوا اچھا تصرف مصرعِ استاد میں ثاقب
بہ از رستم جہاں میں ہے عزیز و نام لیڈر کا

★

اقبال وجودیوں کے درمیان ـ بقیہ صفحہ ۱۴

اہر نکلنے کی کوشش ضرور کی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ ان کے نزدیک وجود فکر خالص کے سوچنے کا عمل ہی نہیں بلکہ وہ آزادانہ طور پر موجود ہے۔ ایک کھلے ہوئے امکان کی مانند جس کا دروازہ کبھی انسان پر بند نہیں ہوتا۔ اور یہی عالمِ امکاں جسے اقبال نے ممکنات کی دنیا کہا ہے، انسان کو ہمیشہ آواز دیتی رہتی ہے اور اقبال بھی اس چیز پر ایمان رکھتا ہے جسے ہائیڈگر نے "امکان کی خاموش قوت" کہا ہے۔ کیونکہ یہ زندگی اور خودی کے آزاد تخلیقی عمل کے تسلسل کو ٹوٹنے نہیں دیتی۔ بقول اقبال:

زندہ جاں را عالمِ امکاں خوش است
مردہ دل را عالمِ اعیاں خوش است

اور یہی وجودیت ہے ٭

سالانہ نمائشِ نقّاشی، ڈھاکہ

بی، کے، جہانگیر

ڈھاکہ میں آرٹس انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ہر سال جو نمائش ہوتی ہے وہ رنگوں اور خاکوں کی شکل میں اہلِ ذوق کے لئے حقیقۃً جنت نگاہ ثابت ہوتی ہے۔ یہ وہ ادارہ ہے جس نے زین العابدین جیسے استاد کی سربراہی میں بعض ایسے فن کار پیدا کئے ہیں جنھوں نے فن کی دنیا میں اپنا نام و مقام پیدا کر لیا ہے اور جو اب بھی بعض ہونہار فن کاروں کے تخلیقی جوہروں کو نشو و نما دے رہا ہے۔ اس درسگاہ نے ابھی تک ایسے بزرگانہ ادارہ کی حیثیت اختیار نہیں کی جہاں کی ہر بات کو وضع داری کے سانچے میں ڈھل جانا پڑتا ہے۔ میرے خیال میں کسی ادارہ کا بزرگ نہ ہونا اس کے زندہ ہونے کی دلیل ہے۔

آرٹس انسٹی ٹیوٹ ایک ایسا گہوارۂ فن ہے جہاں تخلیقی حیثیت سے تنوع ہی تنوع دکھائی دیتا ہے۔ وہ تنوع جس کی ہمیں اشد ضرورت ہے۔ کیونکہ یہی وہ چیز ہے جس سے جسارت آمیز رویہ پیدا ہوتا ہے۔ شکر ہے ہمارے یہاں اب بھی ایک ایسا ادارہ موجود ہے جس نے ذوقِ تلاش کو برقرار رکھا ہے۔ مگر تلاش کس غرض سے؟ اس کا جواب بہت آسان ہے۔ اس غرض سے کہ ہم میں ایک روایت کا احساس پیدا کیا جائے۔ ایک ایسی قبول کی صلاحیت رکھنے والی ثقافت کی روایت جو اثر پذیر بھی ہے اور متحرک بھی۔ اگر ہم اپنی روزمرہ زندگی پر نظر ڈالیں تو اس کے شب و روز بالکل بے رنگ اور سپاٹ دکھائی دیں گے۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ہم اپنے اردگرد کی چیزوں اور شکلوں پر کسی گہرے جذبے سے نظر ڈالیں۔ اور نہ ہم ایسی قابل قدر باتوں سے شناسا ہونے کی زحمت گوارا کرنا چاہتے ہیں جن میں کسی فوری فائدہ کا امکان نظر نہ آئے۔ آرٹس انسٹی ٹیوٹ کی سالانہ نمائش ہمیں یہ دعوت دیتی ہے کہ ہم زندگی کو بے کیف و رنگ پیرایہ میں دیکھنے کے بجائے باذوق نگاہوں سے دیکھیں۔

اس نمائش میں متنوع قسم کے ۲۴۷ فن پارے پیش کئے گئے تھے۔ روغنی و آب رنگی، قلم و سیاہی اور کوئلے سے بنے ہوئے کندہ کاری اور لیتھوگرافک۔ چونکہ اس نمائش میں درسگاہ کے سابق طلبہ نے بھی حصہ لیا، اس لئے اس کا دامن اور بھی وسیع ہو گیا اور دلکشی بھی دوبالا ہو گئی۔ جہاں تک اساتذہ اور سابق طلبہ کا تعلق ہے، ان سے لوگ پہلے ہی روشناس ہیں۔ اس لئے یہی مناسب ہے کہ ابھرتے ہوئے نوخیز ہونہار نقاشوں پر زیادہ توجہ دی جائے اور ان کا تذکرہ زیادہ تفصیل سے کیا جائے۔

ایک لحاظ سے یہ کہنا صحیح ہے کہ اس درسگاہ کی سالانہ نمائش بڑی مکتبی قسم کی ہوتی ہے۔ کیونکہ خاکہ کشی اور نقاشی کے اکثر نمونے بڑے ہی رسمی ہیں۔ ان سے نومشقی جھلکتی ہے۔ موقلم میں لرزش ہے اور توازن صحیح نہیں۔ بات یہ ہے کہ کوئی درسگاہ صرف نقاشی کا ڈھنگ سکھاتی ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ نقاشی کے شاہکار پیدا کرنے کا بھی ذمہ لیتی ہے۔ اس کا کام تو بس داغ بیل ڈالنا ہے۔ اور اس میں اس کی کامیابی مضمر ہے۔ ہر نمائش گویا فن کاروں کے ایک خاص حلقہ کے لئے تقریبِ تعارف ہوتی ہے۔ ان کی صلاحتیں ان کو ابھار کر سامنے لے آتی ہیں اور ان نمائشوں سے ہم ان کے کسی وقت امتیاز حاصل کرنے کی توقع کر سکتے ہیں لہٰذا اس سال بھی وہی پرانی روش اختیار کرتے ہوئے ادارہ نے بعض ایسے نقاش پیش کئے ہیں جن سے آگے چل کر فن کار بننے کی امید بندھتی ہے۔ چنانچہ اشیش کمار سین گپتا (سال سوم) ہاشم خان (سال سوم) پرانیش کمار منڈل (سال سوم) سرنجن دت (سال سوم) ابوالمنصور احمد (سال سوم) رنجیت نیوگی (سال دوم) محمد رفیق (سال اول) اور نور جہاں (سال اول) ایسے نقاش ہیں جو دوسروں سے ممیز ہوتے ہوئے زیادہ توجہ کے مستحق ہیں۔

ان میں سے بعض نام ان لوگوں کے لئے مانوس ہیں جو مشرقی پاکستان میں فن کی رفتار کا مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ ان میں سے اشیش، ہاشم، پرانیش، سرنجن اور منصور سب کے سب "تاثراتی" مشرب کے دلدادہ ہیں۔ ادریہ

هنر و فن کا خلدزار

آرٹس انسٹی ٹیوٹ ڈھاکہ کی سالانہ نمائش نقاشی

سروجنی
(نقاش : ا

چند دل آویز نمونے

محنت کے دھنی
(نقاش : منصور)

بات کچھ ناگزیر ہے۔ اسلئے کہ اس مشرب کی تکنیک کے مطابق وہ جو کچھ مشاہدہ کرتے ہیں اس کے کسی خاص پہلو ہی پر زور دیتے ہیں۔ ان کا مشاہدۂ فطرت تمام تر آنکھوں ہی تک پہنچ کر رہ جاتا ہے۔ ان سے آگے بڑھ کر لوحِ دماغ پر مرتسم نہیں ہوتا۔ وہ اس کے لئے بہت ہی کڑی خود شناسی کی ضرورت ہے۔ یہ لوگ فی الحال تاثریت کو پلیٹ پر منتقل کرنے میں مصروف ہیں۔ ان میں سے اشفیش نے اپنے ذریعۂ اظہار پر قدرت پیدا کرلی ہے اور اس کے موقلم کی جنبشوں سے پورا اعتماد جھلکتا جھلکتا ہے۔ آبرنگی تصاویر میں اس نے دھوپ کی صحیح شدت اور فضا کے ٹھوس پن کو پالیا ہے۔ فطرت کی ٹھیک ٹھیک کیفیت، نرم نرم نیلے نیلے بادل، ہوا کے درختوں کی ٹہنیوں میں چلنے سے ان کی چمک دمک انہوں نے اس کے لئے موقلم میں ایک جھلملاتی سی اضطراری جنبش پیدا کردی ہے۔ اس کا وہ نقش دیکھیے "سروجنی" اس کی ملائم وضع کتنی پرکشش ہے۔ اس کو دیکھتے ہی تن بدن میں ایک ارتعاش سا محسوس ہوتا ہے۔ اس نقش کے علاوہ اسکے چند اور نقوش — "چھوٹو کترا" — "ایک گلی" اور "بنائی" بھی قابل ذکر ہیں۔

منصور قدرت کو اور ہی نظر سے دیکھتا ہے۔ اسے یہ شوق ہے کہ وہ تمام بصری پوری قدرت کو پردۂ تصویر پر لے آئے۔ اس کی نظر میں کل اہم نہیں۔ وہ جزئیات پر اس قدر توجہ دیتا ہے کہ اس کے تصور میں خلل پیدا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور اس وجہ سے نقش کا توازن درہم برہم ہوجاتا ہے۔ اس کے نقوش "محنت کے دھنی" "ہارولی گھاٹ" اور "بنی" ایک طرف اسکے اپنے ذریعۂ اظہار پر قدرت ظاہر کرتے ہیں تو دوسری طرف توازن کا فقدان۔

پرمابیش ایسے برجستہ لمحوں کی تلاش میں رہتا ہے جنہیں وہ اپنی آنکھوں سے بھانپ کر ایک عینی مشاہدہ کے طور پر پیش کرسکے تاکہ وہ بالآخر فطرت کی وضع و ہیئت میں ایک رسیلی نغمگی پیدا کرسکے۔ وہ اس قدر حساس واقع ہوا ہے کہ وہ مانوس چیزوں کو بھانپنے سے قاصر ہے۔ جیسا کہ اسکے نقوش "آبگینہ" اور "شواری گھاٹ" سے پتہ چلتا ہے۔ اس کی قلم کاری میرے لئے بڑی ہی مسحور کن ہے۔ (نقوش نمبر ۲۰۷، ۲۰۸ - ۲۰۴) اسے اپنے قلم کی جنبشوں پر اعتماد ہے۔ میرا خیال ہے، وہ خطوط میں زیادہ خط محسوس کرتا ہے۔ اس کی خاکہ کشی بڑی صحیح ہے۔ آشم میں ترتیب کا شعور تو ہے لیکن رنگوں کی گھلاوٹ بڑی مایوس کن ہے۔ ملاحظہ ہوں اس کے نقوش "بازار" اور "دہری پرچھائیں" "سرجن" کو آب رنگی کے بجائے "پینٹ ملاش" تکنیک پر زیادہ قدرت ہے۔ جیسا کہ اس کے نقش "بوڑھی گنگا کے کنارے بان" سے ظاہر ہے۔

قاضی انور، رنجیت نیوگی اور محمد رفیق تینوں سال دوم کے طلبہ ہیں۔ رنجیت کی نقاشی بڑی دل آویز ہے۔ اس کی خاکہ کشی بڑی جچی تلی بنتی چلی جارہی ہے لیکن اس میں کچھ نسائی ملائمت سی دکھائی دیتی ہے۔ قاضی انور کا قلم و سیاہی سے بنا ہوا نقش "کشتی" اس کی صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے۔ کشتی اور اس کا پانی پر پڑتا ہوا سایہ، ان سے بڑے گمبھیر، بڑے گہرے رشتے پیدا ہوئے ہیں۔ اس کی خاکہ کشی میں زین العابدین کا انداز ہے۔ شدید اور متحرک۔

رفیق کا نقش "بھکاری" کسی بھکاری کی خستہ حالی کا ہو بہو عکس ہے۔ ایک نومشق کی حیثیت سے اس کی آب رنگی پیرایہ پر قدرت قابلِ تحسین ہے۔ انور جہاں (سال اول) کا کوئلہ سے بنا ہوا ایک قطع فن قابلِ لحاظ ہے۔ انسانی چہرے مہرے کا مطالعہ سطحی سہی، نقالی سہی۔ پھر بھی زیادہ گہرائیوں میں جانے کی کوشش ظاہر کرتا ہے۔

درسگاہ کے کمرشل شعبے کی پیداوار مایوس کن ہے۔ اس نوع کے جو چند در چند نقوش پیش کئے گئے ہیں، ان میں سے ایک سابق طالب علم عبد المبتذر (؟) کا نقش "پوسٹر ڈیزائن" اور امان اللہ خاں کا بنا ہوا "سرورق" جاذبِ توجہ ہیں۔ اس شعبہ کے پیش کردہ فن پارے نہ تو شاندار ہیں نہ ان میں کوئی شوخی پائی جاتی ہے۔ سب کے سب سستے معمولی بلکہ عامیانہ ہیں۔

اساتذہ اور سابق طلبہ کے فن پارے ناقدانہ طور پر توجہ ہی نہیں تجسس بھی چاہتے ہیں۔ اور جس نہج پر انہوں نے ترقی کی ہے اس کو سمجھنے کے لئے ذوقِ تحقیق کا مطالعہ بھی کرتے ہیں۔

دیوداس چکرورتی کے تین نقوش ہیں۔ دو روغنی اور ایک ٹمپرا۔ افتادِ طبع کے لحاظ سے وہ بدستور "مابعد التاثراتی" تکنیک اور نفسیاتی رومانویت میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس لئے وہ ایک مخصوص فضا پیدا کرنے میں منفرد ہے۔ وہ وطن کی بھکی بھکی یادیں، جو اکھڑے اکھڑے احساسات کے باعث فریاد کی لے بن جاتی ہیں اس کا نیلا رنگ، اس کے احساس لاشعور کی عکاسی کرتا اور اس جس مقصد کو ابھارتا ہے۔ جس کا دامن عجیب و غریب تصور یہ

بلکہ بیان سے وابستہ ہے۔ وہ دو نرم اور گول گول سی برہنہ اشکال (ریتی یاد) وسیع، گہرے نیلگوں رنگ کے پردے میں رس بس گئی ہیں اور اس طرح ایک لمحہ کو نسوانی المیہ کی ابدی تمثیل بنا دیتی ہیں۔

قاضی عبدالروف جذبات و تخیل کی طرف سے بے پروا ہے۔ وہ مانوس چیزوں کی نقاشی کرتا ہے۔ اس لئے جو اسلوب وہ پیدا کرتا ہے بہت مانوس ہے، محکم نہیں۔ صاف و صریح طور پر نارمل۔

عبدالباسط بھی غنائیت کے بہاؤ میں بہتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے اس کا موقلم بڑا حساس ہے اور اس کی آنکھیں نہایت تیز ہیں۔ وہ فطرت کی وضع و ہیئت کو ایک نیم تجریدی عمل کے ساتھ آمیز کرنا چاہتا ہے۔ اس کوشش کو "تنہائی" میں بڑے اہتمام سے جلوہ گر کیا گیا ہے۔ بعض اوقات وہ کچھ تشریح کرنا چاہتا ہے لیکن شروع میں اس کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اور ایما و اشارہ کا تانا بانا پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ اور اس طرح ایک نیم اقلیدسی طرح مرتب کرتا ہے۔ اس طرح ایما و اشارہ کے تانے بانے کے لئے نیم اقلیدسی طرح مرتب کرنے کا عمل تذبذب سے خالی نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو نقش بہ عنوان "ایک خاموش جلوس"

قمر الحسن کم جسارت آمیز ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اور اس کا انداز محض اتفاق۔ وہ اب بھی لوگوں کے بھانت بھانت اوضاع الگ الگ کرنے میں لطف محسوس کرتا ہے اور اس طرح اپنی تصاویر میں "گمبھیرتا" پیدا کرتا ہے۔ منظر نگاری میں اس کی روش آزاد ہے اور اسے موجوں کے گریزاں ٹکڑے لیتے اتار چڑھاؤ سے گہری رغبت ہے۔

انوارالحق کے دو نقوش اس کے اپنے انداز ارتقاء پر ایک جھلملاتے ہوئے تبصرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

عبدالرزاق نہ تو کسی بات پر جز بز ہے اور نہ اپنے انداز میں جارحانہ ہے۔ اس کے اسلوب سے چکا چوند پیدا کرنے والی اور گھیر لینے والی روشنی کی پُراسرار کیفیت پنہاں ہے۔ ملاحظہ ہو اس کا نقش "ایک چہرہ"۔

مصطفیٰ علی ہمارے ملک میں واحد تربیت یافتہ سفالی فن کار ہے۔ اس کی سفالی مجسمہ تراشی (نقش: فکر) یا چینی کا بڑا پیالہ ایک شدید ذاتی ٹیڑھا پن ظاہر کرتا ہے جو عبارت آرائی کے لٹکے سے ملتا جلتا ہے۔

غرض آرٹس انسٹی ٹیوٹ نے اپنے دامن میں شدید جذباتی، اور غیر ضروری حد تک جارحانہ، رویئے فراہم کئے ہیں۔ اور یوں ماضی و مستقبل دونوں کے ساتھ وابستگی کے چند در چند سلسلے مرتب و متعین کر دیئے ہیں۔

غزل

سلیم احمد

سلیم نفع نہ کچھ تم کو نقدِ جاں سے اٹھا
کہ مال کام کا جتنا تھا سب دکاں سے اٹھا

تجھے تو بن کہے معلوم ہے نگاہِ کرم
تو رسمِ پرسشِ غم کو بھی درمیاں سے اٹھا

برا لگا مرے ساقی کو ذکرِ تشنہ لبی
کہ یہ سوال مری بزم میں کہاں سے اٹھا

نگاہِ ناز بھی تھی مسکرانے والوں میں
عجیب لطف غرضِ غم کی داستاں سے اٹھا

سلیم راہِ وفا نقشِ پا کو ترسے گی
اب اعتبار اگر میرِ کارواں سے اٹھا

قمر جمیل

درد کو دینِ سخن جانتے ہیں
ہم کہ آرائشِ فن جانتے ہیں

ایک پردہ ہے بیاباں کے قریب
جس کو دیوارِ چمن جانتے ہیں

یہ ستاروں میں بھٹکتی ہوئی رات
ہم اسے اپنی تھکن جانتے ہیں

چاند چلتا ہے تو سودائی بھی
سفرِ جادہ شکن جانتے ہیں

جس جگہ بیٹھ کے روتی ہے بہار
ہم اسے شاخِ چمن جانتے ہیں

چاندنی جن کو جگاتی ہے جمیل
وہی کانٹوں کی چبھن جانتے ہیں

غزل

احسان ملک

زمیں پر جہاں تیرگی رہ گئی
وہیں آبرو نور کی رہ گئی

افق پر کھڑی ہے سویروں کی پو
مری آنکھ پر جو نمی رہ گئی

دئے جل بجھے ہیں گلوں کے جہاں
وہیں خار پہ روشنی رہ گئی

ہر اک پھول کے رنگ کے دشت میں
ہماری صدا گونجتی رہ گئی

جہاں سو گیا چشمِ پُر نم لئے
ستاروں کی محفل جمی رہ گئی

خنک اس قدر ہے سماں دہر کا
چمن میں صبا کانپتی رہ گئی

چٹانوں سے ٹکرائی تھی بازگشت
صدا کا نشاں خامشی رہ گئی

جہاں سے بھی گزرے ہیں اہلِ ہنر
قدم در قدم روشنی رہ گئی

نبھے گی ہماری بھی عُریاں تنی
جو خاروں سے گل کی بنی رہ گئی

نئے دور میں ہے ہر اک شے نئی
نئے آدمی کی کمی رہ گئی

وہ پہلی سی گرمی دلوں میں کہاں
نہ باتوں میں وہ چاشنی رہ گئی

بس اک دل لگی دلبری آج ہے
فقط کھیل تک عاشقی رہ گئی

نمو عشق کی رہ گئی خار تک
فقط پھول تک دلبری رہ گئی

کڑی دھوپ ہے زندگی ہم نفس
اُمیدوں کی چھاؤں گھنی رہ گئی

پرتو روہیلہ

طلب کی بے نام عاجزی ہے الم کی موہوم بے کسی ہے
کہ جو فضاؤں میں دھیرے دھیرے سلگ سلگ کر بھڑک رہی ہے
مچلتے شعلوں کی ہر لپٹ کو میں اس کا آنچل سمجھ رہا ہوں
نظر کی کچھ ایسی بیخودی ہے خرد کی کچھ ایسی گمرہی ہے
یہیں کہیں تپتے رہگزاروں میں اس کا ساتھی بچھڑ گیا ہے
حیات صحرائے وقت میں اب بگولے بن بن کے گھومتی ہے
چہار جانب سیاہیوں کے مہیب سائے لپک رہے ہیں
سحر کی چھاتی پہ شب کی ناگن بھی مست ہو ہو کے لوٹتی ہے
فشارِ غم سے جگر کے خوں کا ہر ایک قطرہ نکل چکا ہے
گھٹی فضاؤں کے چوُر شانوں پہ زندگانی سسک رہی ہے
بڑا زمانہ ہوا ہے اُس خوفناک طوفان کو آئے لیکن
نگار خانے میں رنگ و بو کے کوئی صدا اب بھی گونجتی ہے
محال ہے دو گھڑی بھی ایسی اندھیری راتوں میں سانس لینا
نہ تیرے عارض کی روشنی ہے نہ تیرے سینے کی چاندنی ہے
دیارِ ہستی میں ہم تو ایسے لٹے ہیں کوئی لٹا نہ ہوگا
حقیقتوں نے ہمارے آدرش کی حقیقت بھی چھین لی ہے
مری تمنا کا نشہ کچھ اس طرح سے ٹوٹا ہے آج پرتو
کہ جیسے یکدم کسی حسیں کی حسین انگڑائی ٹوٹتی ہے

★

چائے کا زمانہ ـــــ بقیہ ص ۳۷

۔ کے تصور ہی سے سہی۔ بے شک یادگار زمانہ تھے یہ لوگ اتم لوچھے گے
ائے کی ایسی ہی گرم بازاری تھی تو اس کا بازار سرد کیسے ٹرا یعنی لوگوں
بائے پینے کی عادت چھوٹی کیسے۔ یہاں تک کہ لوگ چائے کا نام
بھول گئے۔ یہ زمانہ دوراندیش اور بیدار مغز انسانوں سے خالی نہ
۔ خوش قسمتی سے ایک ایسی حکومت برسر اقتدار آئی جس نے تمام
بیوں کی روک تھام شروع کی۔ اس نے کہ چائے جیسی موذی شے
مانوں کو گھن کی طرح کھائے جا رہی ہے۔ اسلئے اس نے عیب ے
طرح "عیبِ چائے" کی ایک اصلاحی مہم شروع کی۔ بات معقول تھی۔ اسلئے اس نے
کے دلوں میں گھر کر لیا۔ آہستہ آہستہ ہوٹلوں، ریستورانوں کی گہما گہمی کم ہونے
۔ یہاں تک کہ وہ بالکل ختم ہو گئی۔ اور چرچا جیب نشینی و چائے
ئی" کے ہنگامے قصۂ پارینہ بن گئے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج کسی کو چائے
م تک معلوم نہیں اور آثار قدیمہ سے ماہرین بڑی چھان بین سے اس

پتی کا سراغ لگا سکے ہیں۔

پیریڈ ختم ہونے والا ہے۔ باقی سبق کل۔ ہاں اب کچھ سوالات
بتاؤ تاکہ تم اس سبق کو بھول نہ جاؤ اور چائے اور فن کی بلاؤں سے محفوظ رہو۔

سوالات

۱۔ چائے کے زمانے میں سب سے عجیب مخلوق کونسی تھی۔ کیا اس سے زیادہ عجیب و غریب شے تم نے کہیں دیکھی ہے؟ دوسروں سے پوچھ کر اس کا حال بتاؤ۔

۲۔ اگر کوئی شاعر تمہیں سر راہ مل جائے تو اس سے کس طرح پیچھا چھڑاؤ گے۔ مختلف داؤ پیچ لکھو۔

۳۔ اگر حادثاتِ زمانہ تمہیں فنکار بنا دیں تو اپنے آپ کو بچانے کے لئے خودکشی کا کونسا طریقہ پسند کرو گے؟ کیا چائے پینے سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ جواب اس طرح دو کہ کوئی نہ سمجھ سکے:

ہم اپنی وضع کیوں بدلیں؟ — بقیہ صہ ۲۸

"آپ!" اس نے پوچھا۔

ایبن چونک اٹھا۔ پھر اس نے کہا: "آپ کا گھر شاید قریب ہی ہے۔ میرا یہی خیال تھا۔"

"آیئے، بیٹھئے گا" کم کم نے اسے دعوت دی۔

ایبن نے جلدی سے کہا: "نہیں نہیں میں نہیں بیٹھوں گا۔ نکل جا رہا ہوں۔ اسی لئے سوچا آپ سے مل لوں۔ آپ تو پھر آئیں ہی نہیں۔"

کم کم فوراً کوئی جواب نہ دے سکی۔ چند لمحوں کے بعد بولی: "شاید اسی لئے آپ اکیلے ہی گھر سے نکل آئے ہیں۔ آپ کی ہمت تو کم نہیں۔ چلئے، میں آپ کو چھوڑ آؤں۔"

ایبن مسکرایا۔ "نہیں میں خود ہی چلا جاؤں گا۔ اچھا تو جا رہا ہوں۔" دونوں ہاتھ پھیلا کر سمت ٹٹولتے ہوئے وہ آگے بڑھ گیا۔ چار قدم آگے اور دو قدم پیچھے ہٹتے بڑھتے ہوئے وہ اپنے دونوں ہات بار بار یوں پھیلا رہا تھا جیسے کسی کو ڈھونڈھ رہا ہو۔

کم کم تھوڑی دیر کھڑی کھڑی اسے دیکھتی رہی اور ابھی ایبن زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔ اس وقت پارک کے ایک گوشے میں بہت سے لڑکوں کے ساتھ تفریحی کلب کا ہیرو، رزاق بیٹھا ہوا خوش گپیوں میں مشغول تھا۔

چند لمحے بعد کم کم نے اپنی جھجک پر قابو پا لیا۔ اس کے قریب جا کر بولی: "میرا ہات تھام لو۔"

ایبن نے اپنی بے نور آنکھیں پھیلا کر اس کی طرف یوں دیکھا۔ جیسے وہ بہت گہرے اندھیرے میں گم ہو گیا ہو۔

"میرا ہات تھام لو۔" کم کم نے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔

ایبن نے بے چارگی کے انداز میں اپنا ہات آگے بڑھا دیا۔ اس کے ہات کے جلنے پھلنے لمس سے وہ کانپ اٹھی۔ ان دونوں کو دیکھ کر رزاق اور اس کے ساتھیوں نے زور سے قہقہہ لگایا۔

"کون لوگ ہیں؟" ایبن نے خفگی سے پوچھا۔

"راہ گیر ہیں۔ چلو ہم لوگ چلیں۔"

سیاہ بادل چھٹ چکے تھے اور اس وقت نیلے آسمان پر جیسے کسی نے چاروں طرف شرخ رنگ بکھیر دیا تھا۔ شام کا سرمئی اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا اور اس اندھیرے میں ایبن کے ہات کو اپنی مٹھی میں دبائے ہوئے کم کم آگے بڑھنے لگی ✽

فن اور فطرت — بقیہ صہ ۹

قوت ارادی یا جنوں کو بھی دخل ہے: مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر۔

یہ عنصر جو اُن کے جذبۂ آزادی کا غماز ہے ایک مخصوص تاریخی حالت کا پروردہ ہے جس کی طرف کہ اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اس پر انہوں نے زور اس قدر زیادہ کیوں دیا کہ اگر آئینۂ فطرت ہاتھ سے چھوٹتا نہیں تو وہ ان کی بنیادی توجہ کا مرکز بھی نہ بنا رہا۔ اس کی اخلاقی ذمہ داری سرسید اور حالی کے اس فلسفے پر عائد ہوتی ہے کہ:

"زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز"

پاکستان میں اعشاری سکے

نئے اعشاری نظام میں صفر کا مقام

بے قیمت
یا
بیش قیمت

آنے	پائی	۳	۶	۹
۰	۰۰۰	۲	۳	۵
۱	۶	۸	۹	۱۱
۲	۱۲	۱۴	۱۶	۱۷
۳	۱۹	۲۰	۲۲	۲۳
۴	۲۵	۲۷	۲۸	۳۰
۵	۳۱	۳۳	۳۴	۳۶
۶	۳۷	۳۹	۴۱	۴۲
۷	۴۴	۴۵	۴۷	۴۸
۸	۵۰	۵۲	۵۳	۵۵
۹	۵۶	۵۸	۵۹	۶۱
۱۰	۶۲	۶۴	۶۶	۶۷
۱۱	۶۹	۷۰	۷۲	۷۳
۱۲	۷۵	۷۷	۷۸	۸۰
۱۳	۸۱	۸۳	۸۴	۸۶
۱۴	۸۷	۸۹	۹۱	۹۲
۱۵	۹۴	۹۵	۹۷	۹۸
۱۶	۱۰۰	۰۰۰	۰۰۰	۰۰۰

مثال :- ایک آنہ تین پائی = آٹھ نئے پیسے

یکم جنوری ۱۹۶۱ء کے بعد سے پاکستانی کرنسی کی دونوں اکائیوں (روپے اور پیسے) کو اعشاریہ کے ۲ دو درجوں تک لکھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک روپیہ چار پیسوں کو ۱٫۰۴ لکھنا چاہیئے۔ نہ کہ ۱٫۴۔ اسی طرح ۲۵ روپے اور ۵۰ پیسوں کو ۲۵٫۵ نہیں بلکہ ۲۵٫۵۰ لکھنا درست ہے۔ آپ بھی اس کا خیال رکھیں۔

تبادلہ کا حسابی نقشہ :- اس نقشے کو روزمرہ استعمال کے لئے کاٹ لیجئے

رقم میں صفر احتیاط سے لگایئے

جاری کردہ: وزارت مالیات حکومت پاکستان

B.F.P

united 6/4.

مصباح الحق

(فلسفئہ زمان و مکان کا ایک تصور)

' مجھے تکتے تکتے جنوں ہو گیا ،، - یہ تو ہوئی
ر،، کی بات - جسے چاند یا چاند کی کسی طلسمی
ت کو دیکھ کر جنوں ہو گیا تھا - لیکن ہماری بات
ہ اور ٹھہری - چو حریف آفتابم ہمہ ز آفتاب
بم - پچھلے دنوں یہ خبر کیا پڑھی کہ امریکہ
ایک ایسا راکٹ چھوڑا جو زمین کے مدار سے
کر فضاؤں کو چیرتا ہوا سورج کے گرد گھومنے
تو ہمارا بھی سر گھومتا ہوا معلوم ہونے لگا -
ہماری حالت بھی جنوں کے تھوڑی ہی ورے
گئی یعنی لگے جوہری قوت اور خلائی سفر کے
اق ہر طرح کی معلومات اکھٹی کرنے اور
نک، راکٹ، عام مزائل - ''آئی سی - بی - ایم ،،-
م اور خدا جانے کیا کیا کچھ، سب کے متعلق
بھی کتاب، رسالہ، پرزہ ہاتھ آئے اسے بے تحاشا

خرید خرید کر ڈھیر پر ڈھیر لگاتے رہے - اس خیال سے کہ شاید اگلے سورج کے گرد گھومنے والے سیارے کے پہلے سوار ہمیں ہوں گے - اور جوں جوں مہینے کے دن بیتتے گئے — اور یہ مارچ ہی کا مہینہ تو تھا جو ہمارے یہاں بہار کے ساتھ جنوں کا زمانہ ہے — اور انگریزی میں بھی '' مارچ کے مہینے کے خرگوش کی طرح دیوانہ ،، کی کہاوت مشہور ہے - ہمارا جنوں بھی راکٹ کی تیزرفتاری کے ساتھ بڑھتا گیا - یہاں تک کہ جب مارچ اپنی انتہا کو پہنچ گیا تو اس جنوں نے بھی آخری حدوں کو چھو لیا - مارچ نہ سہی اپریل ہی سہی — اس کا آخر اس کا اول - آخر یہ بھی تو بہار اور بہار کے ساتھ بہک جانے کا زمانہ ہے - اور سچ پوچھئے تو حال ہی میں جونہی '' القارعہ ،، کی ایک مبہوت کن تشریح پڑھی ،

ہمارے سمند شوق، یعنی جنون کو اور بھی تازیانہ لگا۔ اب جو جنوں نے اپنے طور دکھانے شروع کئے تو کچھ نہ پوچھئے - جو بھی پوتھی، پستک، صحیفہ نظر آیا اس پر بڑھ بڑھ کر لپکنے لگے - خوارق عادت، طلسمات، نیرنگ، حاضرات، فلکیات ہمارا اوڑھنا بچھونا بن گئے - یہی نہیں بلکہ ہمارے ایک مخترع الدماغ دوست نے ایک نہایت دبیز قسم کے دفاعی رسالے میں ایٹم، ایٹمی بم، ان کے انشقاق و انفجار کے بارے میں جو بھی بھاری بھرکم، دندناتے، گھن گرج سے بھرپور، کڑاکے دار قسم کے محیرالعقول لغات و تراکیب اور اصطلاحات عجیبہ و غریبہ اپنے ذہن کے خبر نہیں کن کن بعید، دور افتادہ اور ناقابل دسترس گوشوں سے کرید کرید اور سمیٹ سمیٹ کر جمع کی تھیں، ان کو نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر ان پر دیوانہ وار جھپٹ جھپٹ پڑے - جب جنوں کی ہڑبونگ کچھ دم ہوتی اور قطب نما کچھ ہوش کی طرف رخ کرتا تو فضا اور زمان و مکان کی گتھیاں سلجھانے لگ جاتے - کبھی یونان کے قدیم فلاسفہ، ٹائمئیس، زینو - اور ریاضی داں، اقلیدس کے سکونی تصورات کی طرف رجوع کرتے - بالکل استاد ''ذوق،، کے انداز میں جنھوں نے اپنے ایک قصیدۂ غرا میں، جبریہ قدریہ، الہی طبیعی اور خبر نہیں کن کن انواع و اقسام کے فلاسفہ اور علوم کا تذکرہ کیا ہے - کبھی علمائے اسلام — اشاعرہ، معتزلہ وغیرہ سے رجوع ہوتے - اشاعرہ جنھوں نے ''کوانٹم،، سے ملتا جلتا تصور پیش کیا تھا اور فضا میں سالمات ھی سالمات پیدا کرکے ''چھلانگ،، کے تصور سے حرکت کی گتھی اس طرح سلجھانے کی کوشش کی تھی کہ حضرت زینو بھی ششدر رہ گئے - اور ''پلانک'' اور ''بوھر'' بھی سکتے میں آگئے - ادھر ابن حزم نے زمان و مکان مسلسل سے اشاعرہ کا جو ناطقہ بند کیا اس پر لوٹ لوٹ گئے کہ کیا جدید ریاضی دانوں ''کانتور'' اور ''ویرشٹر'' پر پیشقدمی کی - شاعر و عارف بھی اس دوڑ میں پیچھے نہ رہے - ''عراقی'' نے مادی و غیر مادی اجسام کے لئے فضا کی کیا خوب طبقہ بندی کی ہے - مگر یہاں بھی یونانی سکونیت کے برعکس فضا کے سلسلۂ لامحدود اور حرکیاتی خواص ھی کا نقش ابھارا گیا - باقی رہے جدید حکمائے مغرب تو ''دیکارٹ'' نے خالی خولی فضا کو کیسے آباد کرکے ایک خارجی و حقیقی چیز تصور کیا - اور نیوٹن کی تو بات ھی کیا ہے - میکانیات کا پیغمبر جس نے عالمگیر ساکن ایتھر، مطلق فضا، مطلق قوت، مطلق زمان و مکان کا طلسم باندھا - نیوٹن سے جو ہٹے تو مجذوب فرنگی، ''نٹشے'' کی طرف جانکلے - مکان داخلی ہے اور زمان ایک لامتناہی حقیقی عمل - ادھر کائنات لا فنا ہے اس لئے اس کی خاصیت دائمی تکرار - یا پھر آئن سٹائن جس نے زمان و مکان کو یک جان دو قالب بنا کر دریا کوزے میں بند کردیا - اور

قوت، مادہ، ہیئت، کمیت، کیفیت سب کو سائینس

کا شعبدہ بنا ڈالا - یا برگساں - '' دوران خالص،، کا نقیب جس کے نزدیک تغیر و حرکت ہی سب کچھ ہے اور اس سے زمان کا احساس ہوتا ہے -

ظاہر ہے کہ آخری تان تو بہر حال حکیم ملت اقبال رح ہی پر ٹوٹتی جنہوں نے زمان و مکان کو '' بتان و ہم و گماں ،، قرار دے کر پارہ پارہ کیا اور مادہ و روح کو ایک ہی چیز کے دو بہروپ قرار دے کر '' خودی ،، کو ہر قید و بند سے آزاد کر دیا - ایسے کہ وہ ہر طرح کے حیرت انگیز اور افوق التصور کھیل کھیل سکے - ادھر ہمارے ذوق تجسس نے زمان و مکان کے ایک اور شعبدہ گر کی طرف بھی راہ پیدا کرلی جس نے سلسلہ در سلسلہ زمان اور سلسلہ در سلسلہ کائنات کی نشاندھی کر کے ایسا '' کھل سم سم ،، پڑھا کہ ہر طرف نیرنگ و افسوں کے دروازے ہی دروازے کھل گئے - اب ایسے میں انسان کو نہ بھی بھٹکنا ہو تو بھٹک جائے اور جنوں کی ساری حدیں بھی پار کرنا ہوں تو کر جائے - اور ہم تو آخر انسان ضعیف البنیان تھے - اور وہ سائنسی کرشمہ و کرامات اور رومان پرست، ایچ - جی ویلز بھی تو ہمیں میں سے تھا - اس کی '' ٹائم مشین ،، بھی برابر ہمارے ذہن میں پورے زناٹے سے کھڑکھڑا رہی تھی - ایسے میں جوہری توانائی اور مزائلوں کا ایک مبسوط و جامع دائرۃ المعارف '' سپاک نماک جدید ،، جو نظر پڑا تو رہی سہی کسر بھی پوری ہوگئی - کھانا پینا یہاں تک کہ سونا تک بھول گئے - ہم تھے اور دن رات یہ کتاب کھلی ہوئی نظروں کے سامنے -

بے شمار پرزوں کی نقل و حرکت سے ایک بے پناہ جھنجھناہٹ محسوس ہونے لگی - اسلئے ہم ہوش یا جنوں کے عالم میں، خبر نہیں کہاں کے کہاں نکل گئے (آخر اصلی '' سپاک نماک '' کے ہیرو بھی تو کچھ ایسے ہی آزاد اور مست و بے خبر تھے) - صرف اتنا معلوم ہے - جیسے ہم ایک جیتا جاگتا مزائل یا راکٹ بن گئے - پہلے تو من پر تن کا تھوڑا سا

گردش بے مقام سا!

بوجھ لگا لیکن جیسے جیسے رفتار جنوں بڑھتی گئی یہ بالکل ہلکا پھول بنتا گیا - اور پھر جیسے من ہی من باقی رہ گیا - بلا کا تیز لچکیلا - پل میں ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر —— مگر ٹھہرئیے، ہم تو ایک دم بہت آگے نکل گئے - اصل میں سب کچھ سہجے سہجے ہوا - پہلے تو قفس عنصری تھا اور ہم - یعنی بالکل پا بہ گل - نہ چھت سے پرے نہ دیواروں سے آدھر دیکھ سکتے - پھر خوب ھچکولے لگے - جیسے مشین تھرتھرا رہی ہو - روح جسم کو جھٹک کر پر تولنے کو تیار، - یکا یک دھماکے کی آواز اور نہ کوئی چھت تھی نہ دیوار- بلکہ کھلی فضا اور — میرے خدا!

کوپڑ جیسی وضع ۔ دونوں بازو تیزی سے گھومتے
مگر ایسے جیسے پھولے ہوئے بالکل ہلکے پھلکے
بھرے غبارے ۔ زمین سے دو تین سو گز
۔ ایسے کہ کیماڑی ، کلفٹن ، کورنگی سب ایکدم
نے ۔ نیچے کابک ھی کابک ۔ آدمیوں کی قطار جیسے

شتئے ھی بالشتئے ۔ جانے کونسی آٹومیٹک گھنڈی
خت گھوم گئی ۔ راکٹ بنانے والے پہلے ھی
سب موقعوں پر دھکیلنے والی مزید قوت کا بندوبست
دیتے ھیں ۔ کہ ''رفتار فرار'' ایک سے دس
گئی ۔ اور اپنے ارد گرد جسم عنصری یوں لگا
سے کوئی بڑی ھی باریک پرت کا نا معلوم سا
ل ۔ اب جو مزائل یعنی ہم ایک انجانی، ان
بھی سی شہر ۔ زناٹے کے ساتھ اونچے خوبصورت
یرھال کے اوپر سے گذرے تو پتہ ھی نہ چلا کہ
نے کیا ہے ۔ نہ رنگ نہ روپ نہ نقشہ ۔ یہیں
سوس ہوا گویا کسی بحر کی چھوٹی سی بھوری
ڈگمگا رھی ہے ۔ حیران کہ یہ ساکن سیار
سے ہوگیا ۔ ہم اپنا مزائل ہونا تو بھولے ھی ہوئے
۔اور اپنے پہ اوروں کا گمان کرنے لگے۔وہ اونچے
چے درخت ، نفیس فوارے اور گھاس تو کیا نظر
۔ بس ایک ہموار سا بھوسلا تختہ نظر آیا ۔ اور

بچوں کی تفریح کیلئے کبھی کبھار زور شور سے جو
بینڈ باجے بجتے ہیں اور کان پڑی آواز سنائی نہیں
دیتی ، ایک تو مزائیل کا غراٹا ، اس پر بلا کی
تیزی ۔ بس ایک چرچراتی سی آواز سنائی دی ۔ نہ
گرج نہ کھرج ۔ نہ بینڈ کی گت کی جھنکار ۔ میں نے
کہا یا الہی یہ ماجرا کیا ہے؟ اونچی اونچی
عمارتیں سب برابر ۔ جیسے ''آغادیر'' کا ملبہ ! ۔ نہ رنگ
نہ ڈیل ڈول میں کوئی فرق ۔ آن کی آن میں کہاں
سے کہاں جا پہنچے ۔ اور یوں لگا جیسے نیچے ایک
چمکتا ہوا موتی پڑا ہو ۔ میرے خدا ! اتنے لمبے چوڑے
سمندر کی یہ کیفیت ! اوپر دیکھیں تو کسی کا یہ
بہت یاد آجائے ۔ گویا کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے ۔
بلکہ یہ ہوا کہ زمیں زمیں رھی نہ آسماں آسماں ۔
زمیں کا ہموار تختہ عین مین آسمان لگا ۔ بلکہ شک
ہوا کہ زمین آسمان ہیں بھی یا نہیں ۔ اپنا یہ حال
جیسے مزائل کا وزن ھی نہیں اور ہم یونہی
بے بس ادھر ادھر لوٹ رہے ہیں جیسے ایک فلم میں
ان ہوائی جہازوں کے سوار جو خلا میں پہنچ کر
بے وزن ہو جاتے ہیں ۔ اوپر نیچے، ادھر ادھر نہ کوئی
کشش نہ قوت ۔ جبھی تو سائینسدانوں نے تین چار
نہیں کتنی ھی ابعاد بنا ڈالی ہیں ۔ کچھ عجب
نہیں جو کسی سائینسی کرشمے سے آپ اسے میکسول
کانٹر کشن کہہ لیجئے یا کچھ اور ۔ دوسروں کی نظر میں
خود مزائل کی لمبائی بھی بدل جائے ۔ تھوڑی دیر پہلے
کوئی چیز ۔۔ شاید یہ ہوائی جہاز ہو ۔۔ چار پانچ سو میل
کی رفتار سے نیچے گزر رھی تھی ۔ مگر وہ یوں لگی
جیسے فضا پر کوئی نقطہ سا جما ہو ۔ اور پھر تو یہ
ہوا کہ زناٹے سے گزرتا ہوا آفتابی راکٹ بھی ساکن
سا نظر آیا ۔ اور ایک روشن نقطے سے ۔۔ راکٹ کے
قیاس پر یہ سورج ھی ہوگا ۔۔ جو روشنی یا برقی

مقناطیسی رو کی شکل میں تمام اکناف عالم میں ایک دھارا سا جھرتا نظر آتا ہے ۔ ایک بجھا بجھا سا ٹیڑھا میڑھا دھاگا معلوم ہوا ۔ لیجئے اور بھی عجیب کرشمہ یعنی ترقی معکوس — بعد میں واقع ہونے والی باتیں پہلے اور پہلے ہونے والی بعد میں !! معلول پہلے، علت اس کے بعد ۔ اول تو سیدھے، ٹیڑھے، دائیں بائیں میں کوئی پہچان نہ رہی اور ہوتی بھی تو سیدھی چیز گول اور گول چیز سیدھی، اینڈی بینڈی لگتی ۔ جاندار اور بے جان میں بھی کوئی تمیز نہ رہی ۔ ہر کہیں یوں لگتا جیسے سب کچھ میرے ہی جیسا ہو ۔ قوت ہی قوت، یعنی وہی جسے سائینسدان ''ایکشن'' کہتے ہیں ۔ ایک طرف رخ ہو تو کچھ اور کیفیت دوسری طرف ہو تو کبھی ٹھوس، کبھی جامد، کبھی رواں دواں کبھی ساکن ۔ حضرت آئن سٹائن ہی نے تو یہ استادی کی ہے کہ کم کو کیف بنا ڈالا اور مادہ کو توانائی ۔ طلسمات ہی طلسمات !

لیجئے اب مزائیل کہیں زہرہ، مشتری، عطارد وغیرہ کی مضافاتی بستیوں میں ہے ۔ پہلے تو ان کا الگ الگ ٹھکانہ تھا — میں بھی سائینس اور فلسفہ کی بھول بھلیاں میں کہاں کھو گیا ۔ میں، ایک زندہ مزائیل، شیکسپیر کی اس روح سیار' پک کی طرح جہاں تہاں ہر کہیں آزاد' مطلق العنان پھر رہا ہوں ۔ اور میں نے نور سے بھی زیادہ تیزرفتاری اور قوت جذب و ہضم سے زمان و مکان کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے ۔ یہ، وقت، یہ فضا مجھ سے باہر کہاں ۔ یہ تو مجھی میں ہیں ۔ یہ دن، یہ رات ہیں کہاں ؟ محض فرضی باتیں ۔ محض سہولت کی خاطر من گھڑت ڈھکوسلے ۔ اصل زمانہ، خالص دوران تو سارے جہان کے درد کی طرح ہمارے ہی دل میں ہے ۔ دل یعنی وجدان ایک عاقل انا ۔ نہیں نہیں یہ تو اپنی صلاحیتوں اور تخلیقی سرگرمیوں ہی کا دوسرا نام ہے ۔ یہ گھڑیوں پلوں کا زمانہ ۔ ہم سے باہر ہے ہی کیا ؟ یہ تو ہمارے کارکن انا کا ڈھکوسلہ ہے اور بس ۔ اب اگر شروع سے لے کر تمام اناؤں کو جمع کر لیا جائے جو ابتدا سے لے کر اب تک سارے موجودات اور کائنات سے عبارت ہیں، تو یہ ایسی تخلیقی سرگرمیوں کا سلسلہ یا عجوبہ نہیں تو اور کیا ہے ؟ لہذا حقیقی زمان ایک مسلسل تخلیقی عمل قرار پاتا ہے ۔ ایسے میں وہ جبر کہاں رہا جس کا جبریہ زور شور سے ڈھنڈورہ پیٹتے تھے ۔ یہاں تو اختیار ہی اختیار ہے ۔ اضافیت ہی کا تو کہنا ہے کہ ''سیار فیلڈیں'' زیادہ حقیقی ہیں ۔ ایسے میں یوں لگتا ہے جیسے میں ہی میں ہوں ۔ باقی ہر چیز یونہی وہم ہے، قیاس ہے، اعتبار ہے ۔ کوئی آڑے آئے تو گمان بھی ہو کہ میرے سوا کوئی اور بھی ہے ۔ پورا پورا قابو، قوت، اختیار ۔ نہ کوئی پہلے نہ بعد ۔ نہ آگے نہ پیچھے ۔ سب چیزیں' سب حالتیں میرا ہی پرتو ! وہ کیا کہا تھا کس نے ۔ شاید وہ اقبال ہی تھے ۔ خودی ۔ ہاں یہی ۔ ہونا، جیون ۔ یہ ہیں تو پھر کیا نہیں ۔ ان کو کوئی کیا گھیرے گا ۔ نہ وقت نہ جگہ ۔ جوہر ہی جوہر ۔ اور یہ جوہر جب چاہے، جہاں چاہے اپنا اثر دکھائے ۔ سب کچھ جوہروں ہی کا تو کرشمہ ہے ۔ بیج کو جب بھی بو دیا جائے وہ پروان چڑھنے لگے ۔ اس کا وقت، اس کا مقام خود اس ہی میں تو ہے ۔ جب زمان مکان ہی نہ رہے تو باقی کیا رہا ۔ ہم ہی ہم، قوت ہی قوت ۔

ہ ایک دانائے راز نے کیا کہا تھا :

زجنگ دی و فردا رستہ ام بے منت امشب
تو ایں معنی کجا یابی کہ ہستی درزماں بینی
کسی اور نے زمان کے ساتھہ مکان کا جامہ بھی

پارہ پارہ کردیا ہے۔

دو گیتی ازاں جو نمے بیش نیست
ازل تا ابد یک دمے بیش نیست

جبھی تو حکیم مطلق نے کہا ہے کہ ما امرنا الاواحدہ کلمح البصر (ہمارا حکم ایک تھا - آنکھہ کے پلکارے کی طرح تیز) - ہاں اسی ''روح کے طیارے میں،، کہنے والے نے آنکھہ جھپکنے کو ''آنکھہ کے پلکارے میں'' بھی تو کہا ہے - اور پھر وہ کیا کہتے ہیں — انٹروپی (ناکارگی میں ترقی) اس سے جہاں جبر کا لزوم ہے وہاں یہ بھی تو ہے کہ موجودہ لمحہ سے قبل جو ہونا تھا وہ ہو چکا جو ترتیب ہونی تھی وہ ہوچکی - آگے تو میدان خالی ہے - ہم چاہیں تو آئندہ ترتیبوں کا نقشہ بدل ڈالیں - یہی تو وہ حقیقی تقدیر ہے جسے یار لوگوں نے کچھہ کا کچھہ بنا دیا ہے - وہ زماں جو ایک عضوی کل ہے - کہنے کو مجبور لیکن در حقیقت آزاد ، با اختیار -

اب جاننے کو تو اتنا ہی کافی ہے - ہم ایڈنگٹن ، وائٹ ہیڈ ، سرجیمز جینز کی ان توجیہوں میں کیا الجھیں جن سے انہوں نے ناکارگی کے بڑھتے ہوئے انتشار اور اتفاقیہ پن کی بناء پر وقت کی سمت اور روانی کا تعین کیا ہے یا ڈبلیو جے ڈن کے ساتھہ وقتوں کے سلسلے پر سلسلے پیدا کر کے ان میں بقا — ایک نئی قسم کی بقا — کا راز تلاش کریں - اور پھر ڈن بھی تو یہی کہتا ہے کہ جہاں ایک سیار فیلڈ — اسے ریڈیو کی بار سمجھہ لیں — کسی چیز کے عالمی خط — ریڈیو پر مختلف اسٹیشن — کو قطع کرتی ہے - وہی ''خودی'' ہے - اور یہ خودی وقت کا ایک سلسلہ ختم ہونے پر دوسرے سلسلے میں جا نکلتی ہے - وہی بات کہ ''تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں - ،،

استغفراللہ ! یہ میرے انجن، میرے ذہن میں بلا کا شور کیسا؟ گرم رفتاری کا خمیازہ - چلئے اس جنوں کو ہوش کی طرف لائیں - یہ کوئی چاند سورج کا مزائیل تو نہیں کہ اسے واپس نہ لا سکوں - اور وہ بھی آناً فاناً — یہ رہا وہی تیرہ خاکداں، اسکے جانے پہچانے تیور -

جب رفتار اتنی تیز ہو تو ہم کسی چیز کو دیکھیں گے کیا ، پرکھیں گے کیا - شاید یہی ہماری کم رفتاری، ٹھوس ہونے اور ٹھوس چیزوں سے لگاؤ رکھنے کا راز ہو - اسکے بغیر نہ گرفت ہے نہ تجزیہ - زیادہ توانائیاں اور رفتاریں برداشت کیسے ہوں گی؟ - پھر وہی سپاک نماک جدید - اب تو یہ لطیف مزائیل ، ٹھوس مادہ ، اسکے اوضاع و اطوار اور جمود کی طرف آگیا - وہی دیواریں، وہی محدود فضا — سپوتنک اور ایٹمی توانائی کی کتاب میری چھاتی پر کھلی ہوئی - میں بھی آج جانے کیسے کیسے خواب دیکھتا رہا ہوں - کسی دیوانے کے خواب - وہی بات — حکیم نکتہ‌داں ما جنوں کرد — یہ بھی اچھا ہے کہ اپریل کی پہلی صبح یوں اپنے ہی کو بنانے کی پر لطف کوشش سے طلوع ہوئی *

جلد ۱۴ — مئی ۱۹۶۱ء — شمارہ ۵

ماہِ نو

مدیر: رفیق خاور — نائب مدیر: ظفر قریشی

سالانہ چندہ: ۵ روپے ۵۰ پیسہ — ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳، کراچی — فی کاپی: ۵۰ پیسہ

جشنِ فریدؒ

دورِ نو میں ملک کی ہر جہتی ترقی کے کسی بھی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے ـــــ اور یہ تو شاید پہلی بار ہوا ہے کہ اربابِ اختیار نے علم، ادب، فن اور ثقافت کو وہ التفات عطا کیا جو اس سے قبل کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ کیونکہ اس دور کے اربابِ نظر نے احیائے ملت کے لئے جو تعمیری نصبُ العین اپنے سامنے رکھے ہیں ان میں ادب و ثقافت کی توسیع اور تعارف و تحسین کو بھی ایک اہم مقام حاصل ہے۔ چنانچہ اس باب میں ان کی، بالخصوص سربراہِ مملکت، کی طرف سے ہر اس سرگرمی سے عملی دلچسپی و تعاون کا اظہار ہوتا ہے جو ہماری ثقافت کی دریافتِ نو اور تعمیرِ ملت کے وسیع تر مفہوم میں اس کی اقدار سے استفادہ کا موجب بن سکے۔

اس سلسلۂ کار کی ایک کڑی وہ ثقافتی اجتماع تھا جو "جشنِ فریدؒ" کے عنوان سے پچھلے دنوں ملتان میں "ادارہ تعمیرِ نو" کے تعاون سے وہاں کی "بزمِ ثقافت" نے ترتیب دیا تھا۔

اس موقع پر خواجہ غلام فریدؒ جیسے عارفِ حق کے فکر و فن اور ان کی تعلیمات پر مختلف اربابِ نظر نے روشنی ڈالی اور اس بات پر بھی غور کیا گیا کہ ملک کے مسائل کے حل اور عوام کی بیداری کے کاموں میں ان کے پیغام کو عام کرنے کے کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔ تعمیرِ ملک اور وحدتِ پاکستان کے تصوّر کو قریب تر لانے میں ان کی تعلیمات کو ہم کس طرح اپنے لئے ایک قندیلِ راہ نما بنا سکتے ہیں۔

اس دو روزہ جشن کی تقریبات کے سلسلے میں خود صدرِ مملکت نے اپنی دلچسپی کا اظہار درمے، سخنے، ہر طرح فرمایا جس سے ایک بار پھر ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ انہیں ثقافتی اقدار کی تحسین و توسیع سے کس قدر گہری دلچسپی ہے۔

اس موقع پر صدرِ مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے خواجہ غلام فریدؒ کے فکر و فن کے سلسلے میں جو پیغام جشن کے لئے دیا یہاں نذرِ قارئین کیا جاتا ہے:۔

مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ "ادارۂ تعمیرِ نو" کے تعاون سے "بزمِ ثقافت" "جشنِ فریدؒ" منا رہی ہے۔ خواجہ فریدؒ نے علم و دانش کے جو خزینے ہمیں عطا کئے ہیں ہم سب کی نظر میں ان کی انتہائی قدر و منزلت ہے۔ امید ہے کہ یہ جشن خواجہ فریدؒ کی شاعری اور فلسفہ کی تعلیمات کو عوام تک پہنچانے میں مد ثابت ہوگا۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں

★
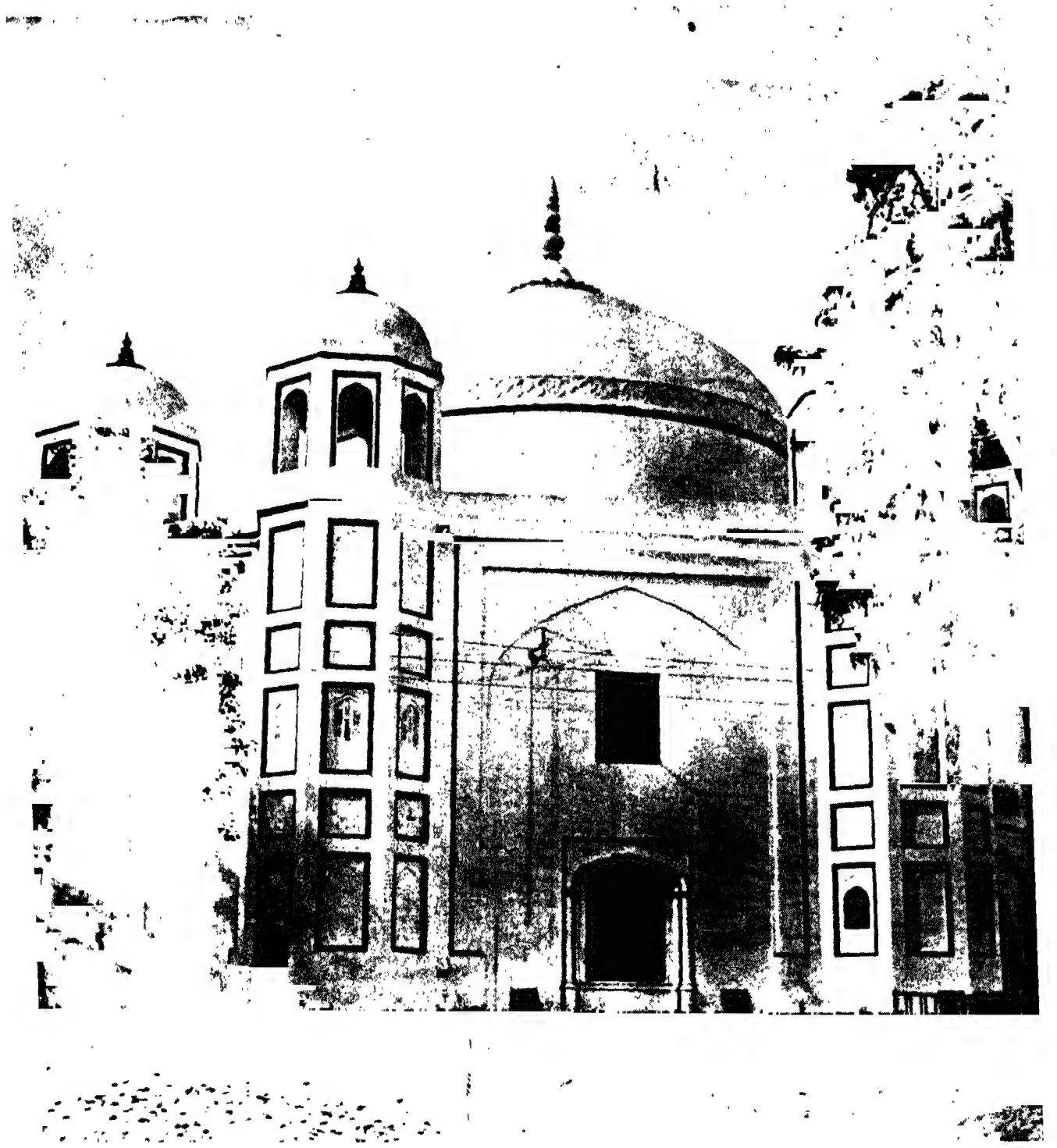
تو زمیں پر اور پہنائے فلک تیرا وطن

خواجہ غلام فرید رح بہاولپوری کا روضہ مبارک (مٹھن کوٹ) ضلع ڈیرہ غازی خان
کستان کے اس محبوب و ہردلعزیز عارف و شاعر کا یوم حال ہی میں بڑے اہتمام سے ملتان میں منایا گیا
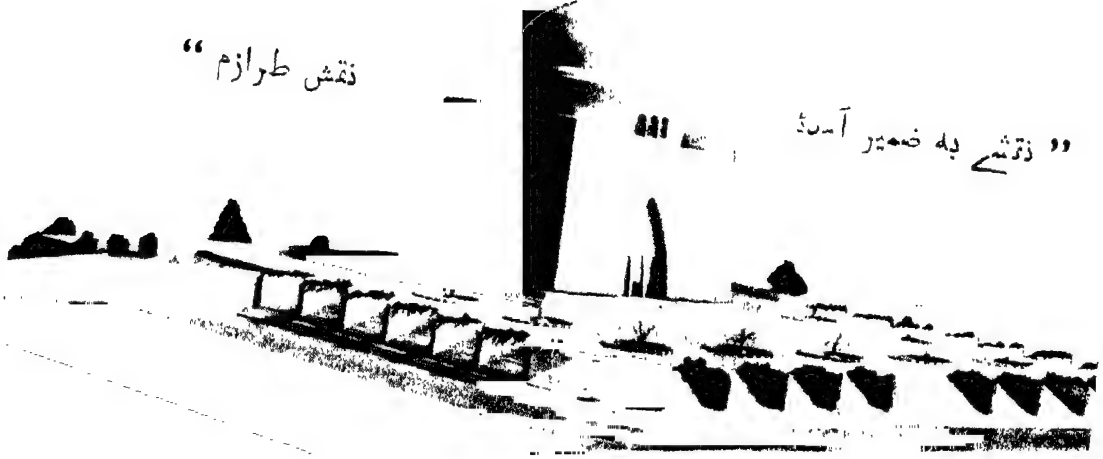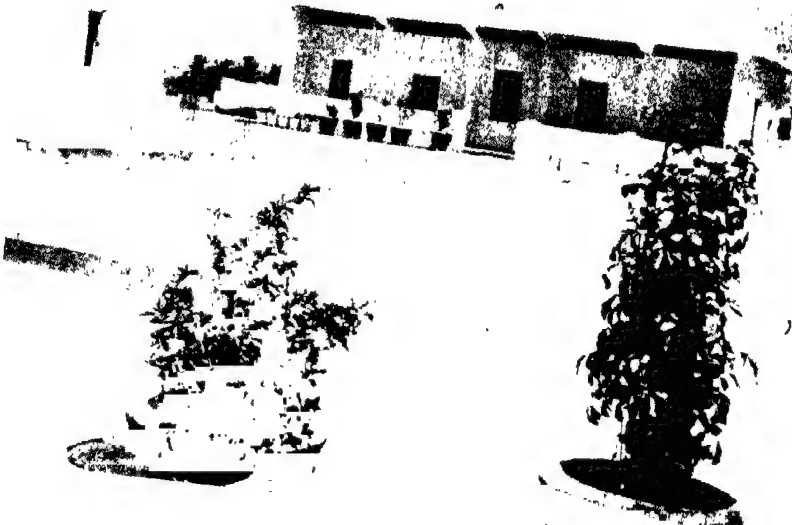
نورِ صحرا

(خواجہ غلام فریدؒ)

ممتاز احمد سومرو

اس کے وطن میں گلاب نہیں تھے، خارِ مغیلاں تھے۔ اس کا وطن سرو سمن سے عاری تھا، وہ مینا و جام کی سرزمین نہ تھی، پیاسی تونس کی ماری، چٹختی، سوکھی زمین تھی، اس کی زمین ریگ زارِ محض تھی ——— روہی ——— لق و دق صحرا، بے برگ و گیاہ میدان، خشک بنجر میدان، بھیانک ٹیلے۔ پُرہول سماں، گرم ہوا، دوزخی تمازت، بگولے، زندگی کی سختیاں، صعوبتیں ——— مگر یہاں کے لوگ بے ریا، بے لوث، سادہ، زندگی کی صعوبتوں اور کڑیوں کو خندہ پیشانی سے جھیلنے والے جیالے تومند انسان تھے جو جغرافیائی ماحول کی دکھ بھری زندگی سے منہ موڑنا نہ جانتے تھے۔

اس نے اسی ماحول میں آنکھ کھولی، تصوّف کے گہوارہ میں پلا، درویشانہ بے نیازی اور فقر و غنا کی دولتِ بیدار سے مالامال یہ صوفیٔ صافی، یہ شاعر روہی، یہ حکیم عوام نہ صاحبِ سیف تھا نہ صاحب سریر، مگر لاکھوں انسانوں کی اقلیم قلب اس نے جیت لی تھی اور آج بھی اس کا سکہ ان کے دلوں پر رواں ہے ——— یہ قوت و قدرت، یہ تاثیر و توانائی اسے اپنی روحانی عظمت سے ملی جس کا ایک مظہر اس کی پیاری دلنشین شاعری بھی ہے۔ اس نے اپنے پیارے عوام کی مادری بولی میں بہت کچھ کہا ہے۔ زیادہ تاثیر کافیوں کے طفیل پیدا ہوئی یہ کافیاں (قافیئے) وجدان، معرفت وحدت الوجود کے تصوّر، عوام دوستی اور خلق پرستی کے رس سے لبریز ہیں، ان میں سوز ہے ساز ہے تیانہ ہے، نیش ہے، قلب کا گداز ہے عقل و دانش کے گوہر ہیں، راہ نمائی کے اشارے ہیں۔ عربی و فارسی کے نفیس و بجل وسیلہ کو چھوڑ کر اس نے اپنی زبان کو ہی زیادہ تر وسیلۂ زبان بنایا ہر چند کہ عربی، فارسی، اردو اور دوسری کئی زبانوں اور بولیوں پر قدرت تامہ رکھتا تھا ——— یہ اس کی عوام سے گہری دلچسپی کا ثبوت ہے۔ فریدؒ کے قلب سے جو بھی نکلتا افراد کے دلوں تک براہ راست پہنچ جاتا، یہ بات مقامی رنگ و آہنگ کے بغیر نہ پیدا ہو سکتی۔ اس نے جو تمثالِ خوبی ہیں دکھائے ان کے خد و خال جانے پہچانے تھے اور اردگرد نظر آتے تھے، کہیں کوئی سستی ہے کہیں کوئی سوہنی ہے۔ کوئی تھلوچڑ لڑکی ہے ——— وہی عام منڈہار رنگیں جو معنویت کے لباس میں اور بھی جمیل و جالب نظر ہو گئی ہیں۔

اسے غم سے کوئی نسبت نہیں مگر محرومیٔ حیات کی تلخیوں سے نظر نہیں چراتا بلکہ نشاط اور لطف کے عارضی لمحوں کی بے ثباتی سے ہمیں آگاہ کرتا ہے، خود شناسی و خود آگاہی کا سبق دیتا ہے، عزم و ہمت اور امید و یقین کا سہارا دیکر ایک ایسا عصائے موسوی مہیا کر دیتا ہے جس کی ضرب سے بہت سے طلسم ہائے سامری ٹوٹ جاتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا اس کا غم رجائیت آشنا ہے۔ وہ امید اور حوصلہ کا نقیب ہے، وہ ضعفِ قلب نہیں پیدا کرنا چاہتا بلکہ اشاروں اشاروں میں امنگ اور نئے ولولے پیدا کر دیتا ہے اور اس کا تاثر بقائے دوام کا امین بن جاتا ہے۔

اسے اپنے صحرائی ماحول سے جو دلچسپی ہے اس کا ایک پیکر یوں نظر آتا ہے :—

اے روہی یار ملاوڑی وے   شالا ہوئے ہر دم ساوڑی وے
ونج پیسوں لسّی گاوڑی دے   گھن اپنے سوہنے سائیں کنوں

(میرا ریگستان پیارا، ملنسار اور خلیق ہے خدا کرے ہمیشہ آباد رہے۔ ہم جا کر اپنے محبوب سے گائے کے دودھ کی لسّی پئیں گے)

امید و رجا کا پیغام یوں دلوں کو سہارا دیتا ہے :—

تھیاں سرسبز فریدیاں جھوکاں   تھیوں سبز تھیاں دل سوکاں
بختیں وا اگ ولائی یار ——— !   سٹ گھت فخر وڈائی یار !

(فریدؒ کی بستیاں پھر سرسبز شاد آباد ہو گئیں، سوکھے پودے پھر سے ہرے بھرے ہو گئے کیونکہ خوش بختی نے اس کی طرف باگیں موڑ دی ہیں ——— (مگر اے یار) فخر و تکبر سب چھوڑ دے۔)

ایک لفظ کا بہت ہی پُرمعنی استعمال دیکھئے ماحول کا کس قدر صحیح عکاس اور مقامی رنگ کا حامل ہے :۔

بادِ شمالی لُڑ کے لُڑ کے   بارش رِم جھم ٹپ کے ٹپ کے

اکھیاں پھڑکن لوں لوں مُرکے ٹھہرگے گوشے ماں دے

(شمال کی ہوا "ترک ترک" کر چل رہی ہے، بارش دھیرے دھیرے ہو رہی ہے۔ خوشی کے اس عالم میں آنکھیں پھڑک رہی ہیں۔ بدن کا رُواں رُواں شگفتگی و راحت کا احساس کر رہا ہے ایسے میں دل جگر کا ہر ہر گوشہ ٹھنڈک محسوس کر رہا ہے۔)

منظر کشی اور محاکات بھی دلنشیں، مصوّرا ورنگارنگ ہیں مثلاً ان کی یہ مشہور کافی :۔

آ چنڑوں مل یار دے پیلوؤں پکیاں نی دے
کئی بگڑیاں کئی ساویاں پیلیاں کئی بھوریاں کئی پھکڑیاں نیلیاں
کئی ڈیون آن نال برابر کئی گھن آدن ڈیڈھے کر کر
کئی ویچن بازار ! تلیاں تکیاں نی دے
کئی دھپ وچ چندیاں رہندیاں کئی گھن چھاں چھپیرے بہندیاں
کئی چن چن پیاں ہار ہٹیاں تھکیاں نی دے
پیلو چندیں بوچھن لیراں چولا دی تھیاں لیر کتیراں
گلڑے کرن پچار ! سنگیاں سکیاں نی دے

(پیلو پک چکے ہیں، آؤ مل کر چنیں۔ پیلو رنگا رنگ ہیں، سفید، پیلے، نیلے، ہرے، بھورے۔ کئی دھوپ میں بھی چن رہی ہیں، بہت سی سایوں میں پناہ لینے پر مجبور ہیں اور کچھ چنتے چنتے تھک گئی ہیں۔ پیلو چنتے چنتے دوپٹہ جھیر جھیر ہو گیا، کسی کی قمیص بھی، جس پہ بعض سہیلیاں اس پر باتیں بنا رہی ہیں)۔

صحرائی برسات کا ایک منظر یادِ محبوب کا نقیب بن کر آتا ہے :۔

کھمنیں کھمن فرید جھوکاں یار توں اکھیں نیر ہنجو کر برسات دسّن
لکھ لکھ دھاں نہاں اٹھم جوں جوں ڈسم جھڑی

(بجلی کوندتی ہے تو اے فرید، مجھے دیارِ محبوب کی یاد آتی ہے۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی نہریں برسات بن کر برستی ہیں، جوں جوں جھڑی نظر آتی ہے، دل میں لاکھوں ہوکیں اٹھتی ہیں)۔ بادل اور بجلی کے استعارے سے حسن و عشق کے باہمی تاثر کو اس بلیغ اشارہ میں سمویا ہے :۔

بدلے دردوں رودن بجلی اکھ مارے مسکا دے

(بادل تو درد کے مارے روتے ہیں اور بجلی آنکھ مار کر مسکراتی ہے)

صحرائی ماحول کی تکلیف کو اس طرح لطف و راحت کا آمرا دیا ہے :۔

ہن پتھر سیج پھلاں دی ہے دھوڑی تول گلاں دی

شب باد صبا من بھاندی تا صبح جھلیندی پکھے

ان کی شاعری میں عشق و محبت کا تذکرہ ہے اور کیفیت غم کا بیان ہے۔ اور فارسی کے برعکس انہوں نے عورت کو عاشق اور مرد کو اس کا محبت گردانا ہے اور پھر عورت ہی کی زبان سے درد و فراق کی کہانی سنائی ہے اس کی وجہ سے اس درد کا اپیل بڑا قدرتی اور مؤثر بن گیا ہے۔ محرم راز جب غم کی کہانی سنتا ہی نہیں تو دل کا دکھ سلگ سلگ کر ایک شعلہ بن جاتا ہے اور وہ بے اختیار پکار اٹھتے ہیں :

کیا حال سناواں دل دا کوئی محرمِ راز نہ مل دا

دل کا حال کسے سناؤں کوئی محرم راز ہی نہیں۔ ایک جگہ سوز کا اظہار یوں ہوا ہے: "گذر گیا ڈینہہ سارا سنگار کریندی دا" (سنگار کرتے کرتے سارا دن ہی گزر گیا، مگر دوست نہ آیا) اس میں انتظار کی شدت اور دیدار سے محرومی کا تذکرہ کسی حرماں نصیب کے دل کی پکار بن گئی ہے۔ زندگی کو فانی جانتے ہوئے بھی وہ اس کے روپ سروپ سے متأثر ہیں :

"کجلہ مارو دیداں بھالے سرخی مسک عم ٹالے
لوے بینسر تے کنٹھالے سبھجوں پھکے کھاندے ہن"

خواجہ فریدؒ نے سرائیکی کے علاوہ سندھی اور اردو میں بھی اپنے تصوّرات و محسوسات کو پیش کیا ہے۔ اردو کلام کا ایک نمونہ ان کے تصور ہمہ اوست کا غماز ہے :

بت کے ہر ناز کو میں رازِ خدا کا سمجھا
اس کے دشنام کو اعجازِ مسیحا سمجھا
میں نے کعبے کو بھی بت خانہ کا نقشا سمجھا
اپنے لبّیک کو ناقوسِ کلیسا سمجھا
میں نے ہر قطرہ کو دریا سے زیادہ سمجھا
ذرّے کے نور کو خورشید سے بالا سمجھا
مے پرستی میں مرے دل کی ترقی دیکھو
خُمِ گردوں کو اک ادنیٰ سا پیالا سمجھا
عشق بازی میں مرا مرتبہ ایسا ہے فرید
قیس بھی مجھ کو گرو، آپ کو چیلا سمجھا

غرض خواجہ فریدؒ کے شعری کمالات کو کسی عنوان سے

(باقی صفحہ ۶۰ پر)

کافیاں

حضرت خواجہ غلام فریدؒ بہاولپوری

مترجمہ: حشمت فضلی

مل ماہیوال اب مل ماہیوال

ہر دل میں ہے تیرا خیال

روزِ ازل سے ظلم کی ماری   قسمت نے بھی کی نہ یاری

نے ماں باپ نے پوچھا حال

فکرِ فراق اور آہ وزاری   پریت لگا کر ہمت ہاری

وصل نظر آتا ہے محال

چیختی ہوں آہیں بھرتی ہوں   روتی ہوں گھل گھل مرتی ہوں

عشق انوکھا ہے جنجال

طاقت، حکم اور حسن کے نخرے   عشق میں ہار سنگھار سے گزرے

ساتھ ہیں رنج و غم فی الحال

عشوے غمزے ناز نزاکت   ختم ہوئے سب عیش و عشرت

اپنا حصہ غم کا جال

اپنے پرائے دشمن سارے   بیکس جان کے ہر اک مارے

عشق کی ایسی الٹی چال

یار فرید نہ صحن میں آیا   جوبن کو بیکار گنوایا

دانت گرے ہوئے بگلے بال

مترجمہ: ارشاد احمد ارشد

بولا[1] بینسر کسکی خاطر پہنوں میں ہو کر مسرور

ہار سنگار ہے جسکی خاطر وہی کرے جب نامنظو

ماتھے ٹیکا، نینوں کجلا، لب پہ لالی مستی کی

کس کے لئے یوں بن سنوروں میں ہے مرا محبوب تو د

عشق نے پگلی کر چھوڑا ہے، آگ میں لپٹ رواں روا

جیسے ہر اک بال کی جڑ میں چھپا ہوا ہو اک ناسو

عجز و نیاز ہے پونجی اپنی، قبلہ اسکی راہ کی دھول

حسن ازل کی چال سے لیکن ٹپکے ہے سب ناز و غرو

سکھیاں سیج بچھا کر بیٹھیں، چوڑا ڈالے باہوں میں

سب محبوب کو گلے لگائیں، اک میں ہی بیٹھی مہجور

وادیٔ ایمن تھل کی راہیں جہاں چلے وہ شترسوا

اس صحرا کے کنکر ٹیلے میری نظر میں جلوۂ طور

جاہل ملا ماریں پیٹیں، سمجھ نہ پائیں راز نہاں

ان کا بھی کیا دوش، بچارے خود بے بس ہیں اور معذو

ملاؤں کا وعظ سنیں کیا، خالی خولی خشک سپاٹ

اپنا دین ایمان ہے پیارے ابن العربی کا دستو

عاشق تو دیوانہ ہے، کیا اسکو خوف ملامت کا

کہہ سبحانی، بول اناالحق، بن بسطامی یا منصو

حسن پرستی عین عبادت، شاہد مستی خوش بختی

جس کو تم کہتے ہو "غیبت" اپنے لئے ہے محض "حضور"

ریت فرید کی الٹی ساری، صوم صلوٰۃ سے عاری ہے

مسجد میں گمنام سہی وہ، میخانے میں ہے مشہور

[1] زیورات

تنقید: علم و فن

محمد احسن فاروقی

تنقید کو ایک فلسفی نے شروع کیا تھا اور یہ ہمیشہ علم کی تابع رہی۔ اصل میں فن کو علمی زبان میں ادا کر دینے کا نام تنقید ہے۔ تنقید نگار یہی کرتے آئے ہیں اور ان کے دور میں جو علم سب سے زیادہ رائج تھا اس سے فنی تشریح میں مدد لیتے رہے ہیں۔ عموماً ان کے دو کام رہے: ایک اصول سازی اور دوسرا کسی تصنیف یا فرد پر رائے زنی۔ ارسطو کا فلسفہ منطقی تھا اور اس کی رہیں ہیں جو تنقید کبھی کی جاتی رہی وہ تمام تر منطقی ہی تھی۔ جس طرح منطق میں فارم کی بڑی اہمیت تھی، بحث کرنے یا نتائج نکالنے کے لئے وہ تمام فارم کام میں لائے جاتے تھے جو سلوجزم کے ماتحت آ جاتے ہیں۔ اسی طرح ادب میں بھی فارم ہی اہم ٹھہرا۔ کومیڈی، ٹریجڈی، لرک، پاسٹورل وغیرہ آئیڈیل فارم ملنے لگے۔ ان کی تراکیب کو بھی آئیڈیل ٹھہرایا گیا اور انہی کے مطابق کسی نئی تصنیف کو جانچا گیا، یہ عمل اٹھارویں صدی تک جاری رہا۔ سترھویں صدی کے وسط میں ڈرائڈن نے ڈرامہ کی بابت ارسطو کے اصولوں سے ہٹ کر انگریزی ڈراموں کے عمل کو اہمیت دی مگر انگریزی ڈرامہ کو بھی اس نے ایک فارم ہی مانا اور اس کے اصولوں کا بھی ایک ضابطہ بنایا۔ غرض یہ کہ وہ تنقید کو منطق کے دائرے سے نہ نکال سکا۔ اس کی شیکسپیئر اور بن جانسن پر تنقید کو پڑھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان لوگوں کے فن کی تعریف یعنی "ڈیفنس" کر رہا ہے۔ یہ چیز کبھی ختم نہیں ہوئی اور آج بھی نقاد کافی حد تک ارسطو کے منطقی طریقہ کا پیرو ہے۔ اور نقاد وہی اچھا ہوتا ہے جو منطق سے بھی کما حقہٗ واقف ہو۔

مگر انیسویں صدی سے منطق کی جگہ مابعد الطبیعات اور ارسطو کی جگہ جرمن فلسفیوں نے لے لی۔ لیسنگ، گوئٹے اور کولرج نے ادب کو بھی مابعد الطبیعاتی طور پر واضح کرنا شروع کیا۔ شاعری کیا ہے؟ شاعر کیا ہے؟ زندگی کیا ہے؟ شاعر کو زندگی سے کیا تعلق ہونا چاہئے؟ زبان اور زندگی میں کیا تعلق ہے؟ شاعری کی زبان کیا ہونی چاہئے؟ ہر فرد کو اپنی زبان الگ بنانے کا کہاں تک اختیار ہے؟ اس قسم کے سوالوں کے جواب کو تنقید کہا گیا۔ نقاد کا فرض یہ ٹھہرا کہ وہ شاعروں اور شاعری سے الہامی تعلق پیدا کرے۔ یہاں تک کہ اس کا ایک ذوق پیدا ہو جائے اور پھر اس ذوق کے مطابق وہ شاعروں اور تصانیف کو جانچے۔ کولرج نے جانچ پرکھ کو اس منزل تک پہنچایا مگر میتھو آرنلڈ نے اس کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ بھی کہا کہ نقاد نئے اصول وضع کرے۔ چنانچہ اس نے کافی تعداد اصولوں کی بنائی اور ان کے مطابق ادب کو جانچا حالانکہ اس کی کچھ تنقیدیں خود اس کے اصولوں کی شکست کی مثالیں ہیں۔ اب بھی عام تنقید میں منطق کے ساتھ مابعد الطبیعات کو شامل کر لیا جاتا ہے اور اچھے نقاد منطقی اور مابعد الطبیعاتی دونوں ہوتے ہیں۔

مگر انیسویں صدی کے وسط میں سائنس کا دور آیا اور ہر شعبۂ علم پر حاوی کیا گیا۔ جون اسٹوارٹ مِل نے ارسطو کی منطق کو ختم کر کے ایک جدید سائنسی منطق کی بنیاد رکھی۔ مابعد الطبیعات کو بھی سائنس بنا دیا گیا اور کہا گیا کہ تنقید کو بھی ایک سائنس ہونا چاہئے۔ فرانسیسی نقاد، سانت بیو کو اس تصور کا امام کہنا چاہئے۔ اس نے کہا کسی مصنف کو سمجھنے کے لئے اس کی شخصیت کی سائنسی تحلیل ضروری ہے۔ لہٰذا نقاد کا پہلا کام یہ ہوا کہ وہ مصنف کی سوانح کو اچھی طرح پڑھے تاکہ اس کی شخصیت کی تشکیل سے واقف ہو جائے اور اس کی تصنیف اس کی قدرتی پیداوار نظر آئے۔ سانت بیو نے کہا "ایک دن آئے گا جب کہ اخلاقی کرشموں کا سائنس قائم ہو جائے گا۔ اور جب انسانی ذہن کی اقسام مقرر ہو جائیں گی اس وقت صحیح نتائج نکالے جا سکیں گے۔"

تین نے اس سے بھی آگے قدم اٹھایا۔ اس نے انسان کے مطالعہ کو تنقید کے لئے ضروری سمجھا۔ اس نے بتایا کہ ہر مصنف اپنی قوم، اپنے طبقہ اور اپنے دور کی پیداوار ہوتا ہے اور اس طرح تنقید سوشل سائنس کا ایک شعبہ ہو گئی۔ مولٹن نے تنقید کو مِل کی منطق بنانے کی کوشش کی۔ اس نے کہا کہ تنقید کو "انڈکٹو سائنس" ہونا چاہئے۔ جیسے علم نباتات

وں کے کرشموں کا مطالعہ کرکے ان کے وجود کے قانون دریافت کرتا ہے
ہے معاشیات تجارت کے اصول بناتا ہے، اسی طرح ایک سائنس ہو سکتا
ہ جو ادبی پیداوار کا مطالعہ کرے۔ مولٹن نے اس سائنس کا سب سے
ر اصول یہ بتایا کہ "ادب کی تشریح سائنسی نظریہ کی طرح ہوتی ہے۔
ں کی حقیقت اسی قدر مکمل ہوتی جاتی ہے جس قدر وہ ادبی کارناموں
وضاحت کر سکے"۔ "کسی ٹکڑے کے معنی وہ ہوں گے جو الفاظ کے مطلب
ے قریب تر آتے ہیں۔ کسی کردار کا تاثر وہ ہوگا جو "الفاظ اور اثرات سے
اتر جا کر ہر اس چیز کو اپنے میں شامل کرے جو کسی فرد کی نمائندگی کرتی ہے"۔
لٹن نے کچھ اور اصول بھی بنائے جن میں پہلا یہ تھا کہ تنقید کا سائنس
صناف کے امتیاز کا کام کرتا ہے۔ دوسرا یہ کہ فن فطرت کا ایک حصہ
ہے اور تیسرا یہ کہ ادب بھی ارتقا کرنے والی چیز ہے۔ وہ کہتا ہے: "ادب
کے اثرات کا جائزہ لیا جائے۔ رائے دینا بالکل ضروری نہیں ہے۔
رائے زنی نے تنقید کو کئی صدیوں سے غلط راہ پر لگا رکھا ہے۔ استقرائی
تنقید ادب کا بالکل علمی جائزہ لیتی ہے۔ وہ فن کے اصولوں کو فن کار کے
عمل میں تلاش کرتی ہے۔ فن کو بھی ایک ارتقا پذیر چیز مانتی ہے جو ہر مصنف
اور ہر مدرسہ کے ساتھ ایک نئے فارم کو وجود میں لاتا ہے۔ ہر فارم کو
ان مخصوص حالات کے مطابق دیکھتا ہے اور ایک فارم پر دوسرے
فارم کے اصول عائد نہیں ہونے دیتا"۔ سائنسی تنقید کی مولٹن سے
زیادہ زوردار حمایت کسی نے نہیں کی۔ مگر روبرٹسن نے اس کی مخالفت
کی اور یہ ثابت کیا کہ یہ طریقہ ادب سے مصنف کی شخصیت کو خارج
کر دیتا ہے۔ روبرٹسن نے رائے زنی کو بھی تنقید کا اہم فرض ٹھہرایا۔ اس
نے ربط و توافق پر سب سے زیادہ زور دیا اور تنقید کا فرض یہ بتایا کہ وہ
ان تمام اسباب کا جائزہ لے جو پڑھنے والوں، تصانیف اور مصنف
سے تعلق رکھتے ہیں اور رائے زنی میں مدد دیتے ہیں۔ نقادوں نے
روبرٹسن کے نظریے سے استفادہ کیا۔ چنانچہ کئی تنقیدوں میں مولٹن
اور روبرٹسن کے نظریات کا اثر نمایاں ہے۔ مگر تنقید کا سائنس انیسویں
صدی کے ساتھ ختم ہو گیا۔

بیسویں صدی کا ایک نہایت وسیع علم نفسیات ہے۔ روبرٹسن
کی آرا سے یہ پتہ لگتا ہے۔ وہ تنقید کی بنیاد نفسیات پر رکھنا چاہتا ہے۔
تنقیدی سائنس کو طرز ادا اور تاثرات سے سروکار تھا۔ مگر نفسیاتی تحلیل
نے اپنی اصطلاحیں "شکش"، "دباؤ" وغیرہ۔ ادبی کارناموں کی

تشریح میں استعمال کرنا شروع کر دیں۔ اس سلسلے میں آئی، اے،
رچرڈز تنقید کے نظریہ کو دو ستونوں پر کھڑا کرنا چاہتا ہے۔ قدریں اور
ابلاغ۔ وہ کہتا ہے کہ شاعری کی کامیابی اس میں ہے کہ اس کے ذریعہ
قاری شاعر کے ذہن تک پہنچ جائے۔ اس کا نام ہے "ابلاغ"۔ کسی نظم
کی قیمت یہ ہے کہ وہ کس شدت سے یہ کام انجام دیتی ہے۔ قدر کے
سمجھانے میں وہ بہت وقت صرف کرتا ہے اور تنقید کو نفسیات سے
ملا دیتا ہے۔ ذہن اعصاب کا گچھا ہے۔ اس میں تجسس کا جوہر ہے
اور جو چیز اس تجسس کو تسکین دے وہ قابل قدر ہے۔ ذہن کی سب سے
قابل قدر کیفیت وہ ہے جب کہ سب سے زیادہ تسکین حاصل ہو اور کہیں
کسی قسم کی کشمکش، تشنگی یا رکاوٹ باقی نہ رہے۔ اس کیفیت کو بھی اس نے
اور زیادہ واضح کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ محض سنسنی قابل قدر چیز نہیں
بلکہ کامل تسکین کے لئے محرکات کا منظم ہونا ضروری ہے۔ تنقید کے
بارے میں وہ کہتا ہے: "کسی مکمل تنقیدی رائے میں جو یہ بتاتی ہے کہ
تجربہ قابل قدر ہے اور ایک پیچیدہ موضوع کی صفات سے پیدا ہوتا ہے
وہ حصہ جو قدر سے تعلق رکھتا ہے، اس کو ہم تنقیدی حصہ کہیں گے اور
جو موضوع کو بیان کرتا ہے اسے تکنیکی کہیں گے۔ تنقیدی رائے نفسیاتی
راؤں کی شاخ ہوتی ہے"۔ یہاں ایک قسم کا ابہام پیدا ہوتا ہے۔ تنقیدی
رائے اور مکمل تنقیدی رائے کا فرق سمجھ میں نہیں آتا۔ رچرڈز ادب کو
نفسیات کی شاخ بتاتا ہے۔ اپنی تصنیف "سائنس اینڈ پوئٹری" میں وہ
سائنس کو نفسیاتی طور پر شاعری کا متضاد ثابت کرتا ہے۔ بعد میں وہ بہت
کچھ سائنسی تنقید کا مخالف ہو گیا پھر بھی اس کی تصانیف سائنسی تنقید
کے سلسلہ میں ایک اہم مقام ضرور رکھتی ہیں۔

پہلی جنگ عظیم نے تو خیر تھوڑا بہت ہی سائنس اور ادب کے
باہمی تعلق کے عقیدے کو توڑا، مگر دوسری جنگ عظیم نے تو اس سے ادبی
بُعد پیدا کر دیا۔ سائنس پر عقیدہ روس میں اب بھی موجود ہے۔ اشتراکی
تنقید ادب کو سوشل سائنس کی شاخ قرار دیتی ہے۔ اور ادبی کارناموں کو
سوشل حالات کا نتیجہ ثابت کرتی ہے۔ انگریزی میں کاڈویل کی کتاب اس
سلسلے میں سب سے اہم ہے۔ اس کا ابتدائی حصہ جس میں شاعری کا سوشل
کے اندر دخل دکھایا گیا ہے آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا۔ مگر جہاں سے
انگریزی شاعری کو طبقاتی کشمکش کا نتیجہ دکھانا شروع کیا گیا ہے وہاں
سے کتاب دلچسپ ہو جاتی ہے۔ یہ تنقید سائنسی تو ہو جاتی ہے مگر

بی نہیں رہتی۔ لیکن کا مالسٹائے پر مضمون ادبی تنقید اور اشتراکی
ید کو اُلجھا دیتا ہے جبکہ اس میں ہم یہ پڑھتے ہیں کہ ٹالسٹائے بہت
فن کار تھا مگر وہ عوام کے انقلاب کو نہ سمجھ سکا۔ محسوس ہوتا ہے
عوام کے انقلاب یا سوشل حالات کو سمجھنے اور فن کاری سے کوئی تعلق
ہیں۔ اردو میں بھی کچھ لوگوں نے اشتراکی تنقید پر چلنے کی مثال پیش کی
وہ محض بچوں کا کھیل بن کر رہ گئی کیونکہ اس پر عمل کرنے والوں میں وہ
بلیغ علم نہیں ہے جو سوشل سائنس کے رجحانات کو سمجھنے کے لئے ضروری
ہے۔ یہ لوگ سطحیت یا ابہام کا شکار ہو کر رہ گئے۔

تنقید کو سائنس بنانے کی کوشش ناکام رہی اور ناکام ہی گی
اور دوسری جنگ عظیم کے بعد تو خود سائنس ہی علیحدہ ہوتا رہا مگر
اس کوشش نے تنقید نگاری، یا یوں کہئے، تنقید نگار کو بڑا فائدہ
ضرور پہنچایا۔ ادب پر تحقیق نے بہت سی معلومات فراہم کیں جو ادیبوں
اور ان کے کارناموں کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ سانت بیو کی کوشش
اہم ہے کیونکہ اگر اس کو ضرورت سے زیادہ اہمیت نہ دی جائے تو
یہ پرانے شعرا کو سمجھنے میں کافی مدد دیتی ہے۔ اسی طرح ٹیمن، مولٹن
اور روبرٹس کی کوششیں بھی اپنی اپنی حد تک ادب کو سمجھنے میں مدد
ضرور ہوتی ہیں۔ اصل میں نقاد کا کام جدید دور میں بہت ہی مشکل
ہو گیا ہے۔ اسے منطق جاننا چاہئے، اسے مابعد الطبیعات جاننا
چاہئے، اسے سائنس کے طریقوں اور نظریوں سے بخوبی واقف
ہونا چاہئے اور آخر میں نفسیات سے بھی آگاہی ضروری ہے جتنا زیادہ
وہ ان علوم کے بنیادی اصولوں سے واقف ہوگا اتنا ہی تنقید نگاری
میں کمال حاصل کر سکے گا۔ اس کی توضیح قابلِ قدر ہوگی۔ اس کی رائیں
غیر جانب دار ہوں گی۔ اس وقت نقاد بھی ٹولیوں میں بٹ گئے ہیں۔
کوئی مارکسی ہے، کوئی سائنسی، کوئی نفسیاتی۔ ایک عالم نقاد کی
کوشش یہ ہونی چاہئے کہ وہ ہر طریقہ سے فائدہ اٹھائے۔ اور
کسی ایک کا غلام ہو کر نہ رہ جائے۔ ظاہر ہے کہ کسی شاعر کو اچھی طرح
جانے بغیر اس پر رائے دینا کتنا غلط ہوگا۔ اس کے ماحول کو سمجھے
بغیر رائے دینا بھی غلط ہوگا۔ سب سے اچھی تنقید انہی اصولوں پر
مبنی ہو سکتی ہے جو خود مصنف کے پیشِ نظر تھے اور جن پر اس کی تصنیف
کی بنیاد ہے۔ ظاہر ہے کہ ناول کو غزل کے اصولوں سے جانچنا غلط ہے
مصنف کی ہستی کو اس کے کارناموں سے الگ کرنا سعی لاحاصل ہے

طبقاتی کشمکش بھی زندگی کی ایک اہم حقیقت ہے اور اس نے بھی
شخصیتوں اور ان کے کارناموں پر اثر کیا ہے۔ یہ بھی ماننا پڑے گا
کہ جدید علم النفس تنقید میں بڑا مفید ثابت ہوا ہے۔ مگر اس کو اس
درجہ اہمیت دینا جتنا کہ رچرڈز یا ہربرٹ ریڈ نے ورڈسورتھ پر
اپنی کتاب میں دی ہے، نظریات کی غلامی اور حقیقتِ ادب سے دور
ہو جانے کی مثال ہے۔ پہلے زمانے میں ادب کو سمجھنے ہی کے لئے
بیان و بدیع اور عروض کے علوم مرتب ہوئے تھے۔ یہ منطق کو ادب
پر عائد کرنے کی کوششوں میں سے ایک تھی۔ اسی طرح جدید دور میں
جتنے بھی علوم پیدا ہوئے ہیں ان سب کو وقتاً فوقتاً ادب پر عائد کیا
گیا ہے۔ بیان و عروض کا علم جیسے شاعری کو سمجھنے اور سمجھانے کے
لئے مفید ہے، ویسے ہی یہ دوسرے علوم بھی تنقید نگاری کے لئے مفید
ہیں۔ مگر ادب ان سب سے بالاتر ہے۔ ادب کے لئے بھی ہم وہی کچھ
کہہ سکتے ہیں جو اکبر نے مذہب کے لئے کہا تھا:

مذہب کبھی سائنس کو سجدہ نہ کرے گا
بندے جو اُڑیں بھی تو خدا ہو نہیں سکتے

ادب ایک وجدانی چیز ہے اور ادبی تنقید بھی وجدان کا
اظہار ہے۔ فن کار زندگی کے کرشمے دیکھ کر کیف میں آجاتا ہے اور
اس کیف کو کسی مخصوص ذریعہ سے ادا کرتا ہے۔ اس طرح ایک
فن پارہ وجود میں آتا ہے جو کیف کی پیداوار ہونے کی بنا پر کیف
پیدا کرنے والا بھی ہوتا ہے۔ اس کیف میں آکر فن کار خود یا دوسرا
فن کار جو کچھ رقم کرتا ہے وہ تنقید ہے، یہ بھی فن ہے۔ اس کا
موادِ زندگی نہیں بلکہ زندگی کی تخلیق ہوتی ہے۔ کوئی بڑا شاعر
ایسا نہیں گزرا جو اپنی تخلیق کے کیف میں آکر اس پر بھی کچھ نہ
کہہ گیا ہو۔ ہومر سے لے کر آج تک ہر قوم اور ہر ملک کے شاعر
نے اپنی تخلیق کی نوعیت کے کیف میں آکر کوئی ایسی بات ضرور
کہہ رہی ہے جو اس پر بہترین تنقید مانی گئی ہے۔ اگر ایسی تمام
باتوں کو جمع کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب بن جائے گی۔ پھر کوئی
شاعر ایسا نہ نکلے گا جس نے اپنے کسی معصر یا سابقہ شاعر کی بابت
کوئی سچے کی بات نہ کہی ہو اور جو ہمیں اس شاعر پر بہترین تنقید معلوم
ہو۔ یہ فن تنقید کی بنیاد ہے۔ یہ کسی فن کار نے اپنے فن کی بابت یا
کسی دوسرے کے فن کی بابت اظہار ہوتا ہے۔ مگر نقاد کے دائرے میں

پورے طور پر آنے کے لئے فن کار کو باقاعدہ فن کے اصول اور فن کاروں پر مفصل طریقہ سے نثر میں اظہار کی بھی ضرورت ہے۔ اس لئے تنقید کے فن کو پورے طور پر برتنے کے لئے علم کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ کلاسیکی شاعر جب اپنے فن کی بابت تنقیدی چیزیں پیش کرنے آیا تو اسے منطق سے مدد لینی پڑی۔ اگر ہم ڈرائڈن کی تنقیدوں کو پڑھیں تو ہم دیکھیں گے کہ وہ ارسطو کی منطق پر مبنی ہیں۔ اسی طرح گوئٹے اور کولرج جب اپنے فن پر تنقید کرتے ہیں تو انہیں مابعد الطبیعات کا سہارا لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ میتھو آرنلڈ یا سانت بیو کی تنقید سائنس کے اثر سے لبریز ہوتی ہے۔ جدید دور میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی تنقید پر نفسیات کا اثر ظاہر ہے۔ غرض تنقید کرنے کے لئے فنکار کو اپنے نظریہ اور اپنے اصولوں کو محض ادا کرنا ہی نہیں بلکہ ان کو واضح کرنا بھی ہوتا ہے۔

مگر تنقیدی فن کار کی نوعیت ہی الگ ہے۔ وہ مبصر حیات ضرور ہوتا ہے اور فن کے کرشمے کو بھی حیات کا جزو سمجھ کر دیکھتا ہے سائنسی نقاد بھی فن کو زندگی کا ایک حصہ سمجھتا ہے مگر فن کار اس کا مطالعہ سائنسی طور پر نہیں کرتا۔ اسے علم کی ضرورت ہوتی ہے اور علم اس کی رائے کو بدلتا ہے جیسے کہ ملٹن کے عالموں نے ٹی۔ ایس ایلیٹ کی ملٹن پر رائے کو بدل ہی دیا ہے۔ مگر فن کار کا علم کیف اور الہام پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ شعر کو پڑھتے ہی اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں شعر لے جانا چاہتا ہے۔ نفسیات کا سائنس داں کسی فرد کے تمام حالات دریافت کرتا ہے، تحلیل کرتا ہے، نتائج نکالتا ہے، تب اس فرد کی ہستی تعمیر کر پاتا ہے۔ مگر نفسیات کا فن کار ایک ہی جھلک سے اس کی شخصیت کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے اور فوراً ہی اس کو تخلیق کر دیتا ہے۔ اس طرح ناقد فن کار کسی فن پارے سے مس ہوتے ہی یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک اور ہی عالم میں پہنچ گیا ہے اور اس عالم سے جو کچھ وہ کہتا ہے وہ تخلیقی تنقید ہوتی ہے۔

تنقیدی فن کار کی مثال ولیم ہیزلٹ ہے۔ وہ مبصر حیات ہے۔ زندگی کے کیف میں گم۔ ادب بھی اس کی زندگی کا ایک کرشمہ ہے۔ وہ مناظر قدرت کو دیکھتا ہوا چلا جاتا ہے۔ کولرج سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ کولرج کی بات چیت مناظر قدرت کو بدل دیتی ہے۔ وہ سیر کرتا ہوا ایک مقام پر پہنچتا ہے۔ یہاں ایک منظر فیلڈنگ کی یاد دلاتا ہے اور وہ اس کی "جوزف اینڈریوز" اور "ٹوم جونس" پر تبصرہ کر ڈالتا ہے۔ کتابوں یا ادب پاروں سے محبت اس کی زندگی سے محبت کا ایک حصہ ہے وہ مداری کو تماشا کرتے دیکھتا ہے اور اسے فن مضمون نگاری کے اصول یاد آتے ہیں۔ وہ دونوں کا مقابلہ کرنے لگتا ہے۔ زندگی پر مضمون لکھتا ہے، زندہ جاوید تصانیف کی جگہ لے لیتی ہے۔ تصانیف اور مصنفین پر مضمون لکھتا ہے تو اس کا ان سے عشق جوش مارتا دکھائی دیتا ہے مضمون ایک غنائی نظم بن جاتا ہے۔ تنقید بھی ایک قسم کا عشق ہے۔ عاشق محبوب کے خد و خال کو دیکھ رہا ہے۔ اسے خوبیوں کے ساتھ خامیاں بھی دکھائی دے رہی ہیں۔ وہ گل بے خار میں عقیدہ نہیں رکھتا۔ خامیوں کو بھی بیان کرتا جاتا ہے۔ مگر عشق اس سے بالاتر ہے۔ خامیاں عشق میں کوئی کمی نہیں پیدا کرتیں۔ وہ محبوب کا نقشہ غلو کے ساتھ نہیں بلکہ تنقید کے ساتھ کھینچتا ہے۔ محبوب کی مدح نہیں کی جاتی بلکہ اس کا کردار بنایا جاتا ہے۔ مگر جوشِ محبت میں کس طرح کمی نہیں آتی۔ تنقیدی عشق کی امتیازی صفت یہ ہے کہ وہ شدید جذبہ سے ملتی جلتی بلکہ صحیح جذبہ پر مبنی ہوتا ہے۔ وہی جذبہ جو کسی ناول نگار کو ایک واقعہ سن کر قصہ بنانے پر مجبور کرتا ہے، جو کسی شاعر کو ایک حسین چیز دیکھ کر نظم لکھنے پر مجبور کرتا ہے، وہی ایک نقاد کو کسی تصنیف سے متاثر کر کے تنقید لکھواتا ہے۔ فنکار نقاد کسی تصنیف کو پڑھ کر اس پر تنقید کرنے کے لئے اتنا ہی مجبور ہو جاتا ہے جتنا کہ مصنف تصنیف کرنے پر مجبور رہتا۔ وہ اپنے تاثرات کا اسی طرح اظہار کرتا ہے جیسے کہ مصنف وہ تصنیف کے فن کو اپنے طور پر یعنی فن تنقید کے ذریعہ پھر سے تخلیق کرتا ہے۔ تنقید بھی ایک نئی تخلیق ہو جاتی ہے۔

تنقیدی فن کار میں انفرادی نظر ضروری ہے۔ وہ اپنی محبوب تصنیف یا اپنے محبوب مصنف پر ایک اپنی سی بات کہتا ہے نہ وہ غالب کی بابت معلومات کے ڈھیر لگاتا ہے اور نہ غالب کو مارکسی یا نفسیاتی نظریہ سے جانچتا ہے بلکہ غالب سے اس کا زندگی بھر ربط رہا ہے۔ غالب اس کے ہر برے وقت کام آیا ہے۔ غالب نے اسے رنج میں تسکین دی ہے، فکر میں مسائل حل کئے ہیں

(باقی صفحہ ۵۹ پر)

مزار قائد اعظمؒ

خواب سے حقیقت

صہبا اختر

میں اپنے قائد کے مقبرے کی خیالی تصویر دیکھتا ہوں
میں اپنے اس خوابِ آرزو کو ہزار تعبیر دیکھتا ہوں

مرے تصوّر کے روز و شب سے ہزار طوفانِ رنگ گزرے
کبھی نگاہوں سے سورج اُبھرے کبھی خیالوں میں چاند اترے

مری نگاہوں نے شہرِ دل میں . . .
کبھی یہ دیکھا کہ دامنِ خاک پر شعاعی کنول کھلا ہے
کبھی یہ دیکھا کہ ایک رقصِ مہ و ستارہ چھڑا ہوا ہے
کبھی یہ دیکھا کہ ایک مینار روشنی کا ابھر رہا ہے
کبھی یہ دیکھا کہ ایک سیلابِ نور دل سے گزر رہا ہے

مری نگاہوں نے شہرِ دل میں . . .
کبھی یہ دیکھا کہ تاج اُبھارا ہے پھر محبت کے آنسوؤں نے
کبھی یہ دیکھا محل تراشا ہے عہدِ حاضر کے آذروں نے
کبھی یہ دیکھا چراغِ بے دُود سطحِ شفاف پر جلا ہے
کبھی یہ دیکھا کہ ایک ارژنگ سینۂ سنگ پر کھُلا ہے

زمین کی خوبصورتی کو یہ حسن جس دن نصیب ہوگا
شگفتِ گلہائے مرمریں کا سماں بھی کتنا عجیب ہوگا

میں اپنے قائد کی روح سے شرمسار اے دل نہیں رہوں گا
میں اپنے ہر خواب کو حقیقت کے روپ میں جلد دیکھ لوں گا

اُبھرتا ہوا خواب!

ظفر منصور

قائداعظم محمد علی جناح کا مقبرہ جس کا سنگ بنیاد صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے ۳۱ جولائی ۱۹۶۰ء کو اپنے دست مبارک سے نصب کیا تھا، آج سے دو سال بعد پایۂ تکمیل کو پہنچ کر ایک منفرد تعمیر اور پاکستان بھر میں اپنی قسم کا واحد، مہتم بالشان یادگار ثابت ہوگا۔ ایک تصور، ایک تصویر — اور سب سے بڑھ کر ایک ملت کے دیرینہ خوابوں کی تعبیر۔ وہ مبارک ہستی جس نے پاکستان کا خواب دیکھا تھا اور اس کو روشناسِ تعبیر بھی کیا تھا۔ وہ جس نے ایک ملت کے خواب آرزو کو حقیقت بنا دیا تھا۔ اس کے شایانِ شان مقبرہ کی تعمیر — تاج محل کی طرح پھر ایک خوابِ مرمریں کسی فردِ واحد کی ذاتی محبت کا مظہر نہیں بلکہ اپنے ہی بابائے ملت — محبوب، ہر دلعزیز قائد — کے لئے ساری قوم کی والہانہ محبت و عقیدت کا آئینہ دار۔ ایک زندۂ جاوید یادگار۔

سورج سے بہت دُور، بہت دُور، بہت دُور

اس خاک کی گہرائی سے نیچے کہیں نیچے

اک خواب بنے گا

زہرہ کے شبستاں سے لپکتی ہوئی تانیں

برجیس کے برجوں سے کلس اور ہوائیں

مریخ کے کھیتوں میں لہکتی ہوئی بالیں

اک خواب بنے گا

بننے کو ہے، — یہ بن بھی چکا ہے!

(رفیق خاور)

یہ مقبرہ نہ صرف قائداعظمؒ جیسے محسن اعظم کی عظیم الشان خدمات کے اعتراف میں ایک خراجِ دائمی، عقیدت اور احساسِ تشکر کی زندہ و باقی علامت ہوگا بلکہ فن تعمیر کا بھی ایک بے نظیر نمونہ ہوگا۔ اس قدر پرکشش کہ لوگ اسے دیکھنے کے لئے دور دور سے کشاں کشاں چلے آئیں گے۔

مجوزہ عمارت — نفیس، نستعلیق، خوش وضع، ذوقِ لطیف کی مظہر، بلندیٔ تصور کی امیں — کیا ہے۔ فن تعمیر کی محسوس و مرئی اکملیت اور شعر و نغمہ، لطافتِ ذوق کی اثیری لطافتوں کا ایک خوشگوار مجموعہ۔ ذوقِ تعمیر کا یہ پیکرِ اعجاز نشاں نہ صرف قائداعظم کے ذاتی اوصاف گراں مایہ کا عکاس ہوگا۔ بلکہ اس سے کچھ ایسا وجد آفریں اثر طاری ہوگا گویا تمام فنونِ لطیفہ کی حسن کاریاں اس میں جمع ہوگئی ہیں۔ قائداعظم کی اس لافانی و غیر فانی یادگار کی خصوصیت خاصہ اس کے دیدہ ور نقش طراز مسٹر بیجی، سی، مرچنٹ کے فن تعمیر سے متعلق بنیادی تصورات کے ساتھ ہم آہنگ ہے جو مجوزہ مقبرہ کو ایک تجریدی قسم کا مجسمہ یا یوں کہیے تعمیر کی شکل میں تمثیل خیال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک مقبرہ یونہی مادی ساز و سامان یعنی سنگ و خشت کو چن چن کر ایک عمارت کھڑی کر دینے کا نام نہیں بلکہ یہ تو اس انسان کی شبیہ، اس کی سیرت کا مطالعہ، اس کی شخصیت کا آئینہ ہے جس کی یاد کو ہم سامانِ تعمیر اور رعنائی سے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دینا چاہتے ہیں۔ قائداعظم کے مجوزہ مقبرہ میں یہ خصوصیت بدرجۂ اتم جلوہ گر ہوگی۔

یہ مقبرہ واقعی ایک یادگار عمارت ہوگی، اپنے دامن میں شان و شوکت کے ان گنت پہلو اور سامانِ صد ہزار لطافت لئے ہوئے جس میں کیا قدیم کیا جدید ندرت کاریاں بڑی ہی نفاست سے شیر و شکر ہوں گی اور جس میں اسلامی فن تعمیر کے روایتی تصورات، وضع و ہیئت کے جدید تصورات سے نہایت خوش آئند طور پر ہمکنار ہوں گے۔ اس کا حد نظر تک پھیلا ہوا وسیع و کشادہ منظر اپنے اندر ایک مبہوت کن

کیفیت لئے ہوئے ہوگا اور ایک سحر آفریں عالم جذب وکیف بھی۔ سرتاپا جنت نگاہ، ایک سحر، ایک خواب۔ تمام تر مغنیِ آتش نفس، غالب کے ان الفاظ کا مصداق کہ،

سیمیائی و بہشت عملی را مانی!

یقیناً یہ خواب نہیں تو شاعرِ رومان، اختر شیرانی کے الفاظ میں خواب نما، سیماب نما اور تلازمات کے اس لطیف سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے مہتاب نما ضرور ہوگی، اور ہم اسے تاج کی طرح اس کے متعلق بھی کہہ سکتے ہیں کہ:

یک نظر آئیں گو ہر نابے نگر
وایں بنا در زیرِ مہتابے نگر
مرمرش ز آبِ رواں گردندہ تر
یک دم آنجا از دیدہ پائندہ تر
عشقِ مرداں سرِّ خود را گفتہ است
سنگ را بانوکِ مژگاں سفتہ است
عشقِ مرداں پاک و رنگیں چوں بہشت
می کشاید نغمہ ہا از سنگ و خشت
حسن را ہم پردہ در ہم پردہ دار
ہمت او آنسوئے گردوں گزشت
از جہانِ چند و چوں بیروں گزشت
دلبری با قاہری جادوگری است
دلبری با قاہری پیغمبری است

اور پھر فنونِ لطیفۂ آزاد مرداں کے تحت حکیمِ ملت نے فنِ تعمیر کے متعلق جو فرمایا ہے اس کو دہراتے ہوئے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ:

سنگ ہا با سنگہا پیوستہ اند
روزگارے را بہ آنے بستہ اند
نقش سوئے نقش گر می آورد
از ضمیر او خبر می آورد
ہمت مردانہ و طبعِ بلند
در دلِ سنگ ایں دو لعلِ ارجمند

مقبرہ کی تعمیر پہ ایک کروڑ روپے کی لاگت آئے گی۔ اس کا رقبہ پلاٹ کے لحاظ سے ۴۰۰ × ۴۰۰ فٹ ہوگا۔ عمارت ایسی کرسی پر اٹھائی جائیگی جو اس کے ۲۰۰ فٹ لمبے اور ۱۲۰ فٹ چوڑے چبوترے کا جزو ہوگی گنبد کا ذرا کرسی سے ۰۰ فٹ اونچا ہوگا اور خود گنبد کم و بیش ایک نیم کرہ جس کا قطر ۲۰ فٹ ہوگا۔

مقبرہ کی مجوزہ جائے وقوع کی سمت بڑھتے وقت پہلی چیز جو ہمیں متوجہ کرے گی وہ کاریں کھڑی کرنے کی جگہ ہوگی۔ اس کا انداز اس لئے نرالا ہوگا کہ ایسی جگہوں میں جو یکسانیت اور روکھائی عام طور پر پائی جاتی ہے اسے تھوڑے تھوڑے فاصلے پہ آگے کی طرف بڑھے ہوئے پشتوں سے دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یوں بھی کاریں پارک کرنے کی اس جگہ کو خوش آیند بنانے کے لئے پشتوں کے اوپر اور موٹریں پارک کرنے کی اس ساری جگہ کے ساتھ ساتھ پھولوں کی بہت ہی خوبصورت کیاریاں بنانے کے لئے جگہ چھوڑ دی گئی ہے۔

مقبرہ کے بالکل ہی قریب جا پہنچیں تو صدر دروازہ پر نازک، مگر فضا میں دور دور تک پہنچتے ہوئے اونچے اونچے مخروطی چوٹیوں کے ستون نظر آئیں گے جن سے کچھ ایسا معلوم ہوگا جیسے یہ سنگین ستون نہیں بلکہ سنتری ہیں جو کسی مہتم بالشان شاہی ایوان کے دروازہ پر کھڑے پہرہ دے رہے ہیں۔ ان بلند و بالا ستونوں سے پرے سیڑھیوں کے قطار در قطار سلسلے نظر پڑیں گے، دو رویہ درختوں کی چھاؤں میں سے ہوتے ہوئے دوہرے راستے۔ جن سے زائرین عین مقبرہ تک پہنچ سکیں گے۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک اور خوش آیند منظر بھی نگاہوں کے سامنے آئے گا۔ راستہ کے دونوں طرف بے شمار فوارے چھوٹ رہے ہوں گے اونچے اونچے مخروط نما سایہ دار درختوں کی چھاؤں میں بڑے ہی البیلے پن سے جھاگ اچھالتے ہوئے فوارے ہی فوارے اور جھرنے ہی جھرنے آنکھوں کو بہت ہی سہانا سماں پیش کریں گے۔ یہ سیدھا راستہ نظم و ضبط کے اس احساس کی علامت ہوگا جن پر قائد اعظم عمر بھر زور دیتے رہے۔

تھوڑی دور آگے ایک اونچا چبوترہ ہوگا جس سے قائد اعظمؒ کی تمکنت اور بلند منشی کا ظاہر کرنا مقصود ہے۔ مقبرہ کی دیواریں بڑی بھاری ہوں گی جس سے قائد اعظم کی مضبوطیٔ کردار نمایاں ہوگی۔ دیواروں پر نکیلی محرابیں باریکی، نفاست پسندی اور خوش ذوقی کی آئینہ دار ہوں گی جو قائد اعظم کا طرۂ امتیاز اور ان کے کردار کی نمایاں خصوصیت تھی۔ دیواروں پر سنگ مرمر کی چوکور سلیں اس طرح جڑی جائیں گی کہ ایک اٹھان و خیزش کیفیت پیدا ہو۔ یہ مخصوص طرح اس لئے اختیار کی جائے گی کہ اس سے قائد اعظم کے

ی سیاسی زندگی میں چند در چند مشکلات کا بے محابا سامنا کر کے ان پر غالب
ے کا احساس پیدا ہو اور ان کے کردار کی مضبوطی، ان کی ناقابلِ تسخیر قوت
اری اور بلند ہمتی بھی ظاہر ہو۔

حسنِ اتفاق سے چند کا تو کانڈ کے مقام پر جو مردان سے ۳۰ میل
ور واقع ہے بہت ہی عمدہ قسم کا سنگ مرمر دستیاب ہوا ہے جس سے
قبرہ تعمیر کیا جائے گا۔ اس پتھر کے نمونے اس غرض سے جرمنی بھیجے گئے
یا کہ مضبوطی، ساخت اور پائیداری کے لحاظ سے ان کا معائنہ کیا جائے۔
یال کیا جاتا ہے کہ یہ سنگ مرمر خاصیت میں اتنا ہی عمدہ ہے جتنا مکرانا،
قع راجپوتانہ کا وہ پتھر جو تاج محل کی تعمیر میں استعمال کیا گیا تھا۔

ساری کی ساری عمارت اس انداز سے بنائی جا رہی ہے کہ یہ شدید
ے شدید آفاتِ ارضی و سماوی اور زلزلوں کا مقابلہ کر سکے۔ اس کی نیو بھری
گئی ہے اور بنیادیں اس طرح مضبوط بنائی گئی ہیں کہ ۵۰ فٹ گہری
دائی کرنے کے بعد لوہے کی سلاخیں بچھا کر ان میں کنکریٹ بھر اگیا ہے۔
اد کی چوڑائی ۴ فٹ ہے۔ بنیادی حصے کی تعمیر کا کام ہنوز جاری ہے
ر چھ ماہ کے اندر اندر مکمل ہو جائے گا۔ بڑی ہی احتیاط برتی جا رہی ہے
ر چھوٹے سے چھوٹا کام بھی انتہائی اکمیت سے کیا جائے، یہاں تک
مقبرہ تک لے جانے والی چو طرفہ سیڑھیوں کے نسبتاً چھوٹے کام کا اہتمام بھی
بڑی باقاعدگی اور سوچ بچار سے کیا جا رہا ہے۔ سیڑھیوں کا انداز ایسا
شکوہ ہوگا جیسا کہ بڑے بڑے عظیم الشان محلات کی سیڑھیوں کا ہوتا ہے۔
کی شان و شوکت برج دار فصیلوں سے دوبالا کی جائے گی۔ جو سیڑھیوں
ساتھ ساتھ جگہ جگہ بنائی جائیں گی۔ مقبرہ کی ۱۳۰ فٹ اونچی بیرونی
یواروں پر قرآن مجید کی چیدہ چیدہ آیات چھوٹی چھوٹی مربع و مستطیل
لوں پر کندہ کی جائیں گی۔ اس کی دوگونہ اہمیت ہے۔ اول، بڑے
ے بلاکوں کا خالص جدید انداز سے بکثرت استعمال فنِ تعمیر کا مطالعہ
نے والوں کے لئے خاص دلکشی رکھتا ہے۔ دوسرے، سفالیں ٹائلوں
مزین دروازے ڈیزائن اور فنونِ لطیفہ کے شائقین کے لئے زبردست
یاتی کشش رکھتے ہیں۔ دیواریں ہشت پہل ہوں گی اور ان کی
اسبت سے ٹائلوں کی وضع بھی یہی ہوگی۔ دروازوں کے اوپر جالی
یلوں کی راہ سے جو دھوپ چھن چھن کر اندر آتی ہے وہ فرش پر بڑے
اویز اور چمکتے دمکتے نقش پیدا کرے گی۔ ایسے نقش کہ جیسے جیسے باہر
ورج اپنی جگہ بدلتا چلا جائے گا یہ بھی برابر بدلتے چلے جائیں گے۔
ات کے وقت مخفی روشنیوں کا ایسا بندوبست کیا جائے گا جن سے مقبرہ
نقشہ نور بنا رہے۔

یہ عمارت جو اسلامی فنِ تعمیر کی روایتی خصوصیات کے مطابق
بنائی جائے گی، اس کے چاروں طرف شہ نشینیں ہوں گی۔ اسی سطح پر
بنی ہوئی جہاں گنبد ہشت پہلو دیواروں پر استوار ہوگا۔ ان شہ نشینوں
تک پہنچنے کے لئے آٹھ میں سے چار دیواروں میں زینے بنائے جائیں گے
جو پائیں جاتے ہوئے مزار والے تہہ خانے تک پہنچائیں گے۔

دالان کے وسط میں مقبرہ کا اہم ترین حصہ ہوگا یعنی
قائداعظمؒ کا مزار ــــ اصلی قبر یہاں نہیں ہوگی بلکہ محض تعویذ ہوگا
اور اصل مزار جس میں ہمارے قائداعظم ابدی نیند سو رہے ہیں
اس کے عین نیچے تہہ خانے میں ہوگا۔ عظیم الشان گنبد کے
بیچوں بیچ مزار کے ٹھیک اوپر تانبے کی زنجیر سے ایک بڑی قندیل
آویزاں ہوگی۔ یہ اس روش کے مطابق ہے جو مسلمان سلاطین
کی بنائی ہوئی اکثر یادگار عمارت میں ملحوظ رکھی جاتی ہے۔

مقبرہ تک پہنچنے کے دو راستے ہوں گے۔ ایک صدر
دروازہ سے قطار در قطار سیڑھیوں کے ذریعہ اور دوسرا
بائیں جانب سے۔ یہ دوسرا راستہ ڈھلوان ہوگا اور اس پر موٹر گاڑیاں
چلائی جا سکیں گی۔

جیسا کہ پاکستان کی اسلامی عمارات میں دستور ہے مقبرہ کے
اردگرد تیس ایکڑ کے رقبے پر پھیلا ہوا ایک خوش نما باغ بھی ہوگا
جس میں وسیع تختے، فوارے، خیاباں، پھولوں سے لہکتی
کیاریاں اور ذیلی عمارتیں بھی ہوں گی جن کا اسلامی فن تعمیر کے ساتھ
پوری پوری مطابقت پیدا کرنے کے لئے التزام کیا جائے گا۔

مقبرہ کی مجموعی ہیئتِ اسلامی طرزِ تعمیر کی آئینہ دار ہوگی
لیکن عملاً اس کی تکمیل جدید طریقوں کے مطابق ہوگی۔ مقبرہ کے ۵۷
سالہ نقش طراز، مسٹر یحییٰ مرچنٹ، جو اسے تاج محل کی سی سادگی
اور خوبصورتی کے ساتھ بنانے کی امید رکھتے ہیں، ایک تجربہ کار اور
مسلم الثبوت استاد ہیں۔ ایک مستند ماہر تعمیرات جو برصغیر کی مشہور
درسگاہِ فنون ہے۔ جے جے اسکول آف آرٹس اینڈ آرکیٹیکچر میں پروفیسری
کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ انہیں قائداعظم کے مشیرِ عمارت ہونے کا
بھی فخر حاصل رہا ہے اس لئے امید ہے کہ ان کے تصور اور خواب کی
تعبیر عمارت کا پیکر اختیار کرنے کے بعد فن تعمیر کا ایک بے مثال اور
ابدی نمونہ ہوگی۔

مشرقی پاکستان،

کنول کنڈ

جعفر طاہر

کنارے کنارے چلا جا رہا ہوں   نئی زندگی چار سو پا رہا ہوں
یہ لہریں یہ ان کے نرالے ترانے   سہانے سُروں کے مقدس خزانے
یہ لہریں جو تلوار بھی آئینہ بھی   "نورے چند رانی" ستی موئینا بھی
یہ لہریں دکھاتی ہیں کیا کیا تماشہ   سناتی ہیں قاضی کا بھی "بارہ ماشہ"
یہ قاضی کی دولت ہے دولت ہماری   ہے قاضی کی عزت سے عزت ہماری
یہ لہریں یہ ٹھاکر قریشی کے دفتر   یہ تحفہ یہ "سیف الملوک" اور "سکندر"
گگن کی طرح موجۂ "ہفت پیکر"   یہ "پدماوتی" جائسی کی طرح پر
کئی نام ان کے کئی کام ان کے   ہزاروں ہی جلوے بہر گام ان کے
ادھر ایک ننھی سی کھیتی بھی دیکھو   یہ "مسلم ساہتیہ سمیتی" بھی دیکھو
سنو آج "سید الاول" کی بولی   یہ ساتوں کی بولی یہ راتوں کی بولی
یہ بولی ہے نذرل سے آتش بیاں کی   مشرف کی اور کیقباد جواں کی
یہ لہریں سناتی ہیں "شیشہ شکوہا"   سناتا ہوں میں ان کو "آشم کا دوہا"
وہ کہتی ہیں آؤ کوی بیٹھ جاؤ   کوئی تیر کے دیس کا گیت گاؤ

ڈھولا ٹریا ونیدا میں بیٹی چنتڑ دی بھٹی
تیری سوہنڑی صورت میری جندڑی لٹی
سیتو تتڑی مٹھی

ڈھولا ٹریا ونیدا

ڈھولا ٹریا ونیدا میں پئی ویلاں پٹھی
ڈھولا ناشر کرے میں وی نسیم رُٹھی
میں وی ٹہا دھمی پھٹی

ڈھولا ٹریا ونیدا...........

ڈھولا ٹریا ونیدا میں پئی رکھدی پچھٹی
ڈھولے مڑکے جیوں تکیا میں ہس کے اٹھی
سیو دلڑی کٹھی

ڈھولا ٹریا ونیدا.........

ڈھولا زمیاں دا راجہ میں چن دی گھٹی
ڈھولا آپے آیا میری سوہنہ دی ٹرٹی
میں تاں چوری کُٹی

ڈھولا ٹریا ونیدا...........

ڈھولا ٹریا ونیدا بیٹھی منگدی دعائیں
شالا خیر ہووی، ڈھولا وطناں تے آئیں
شالا ملیس چھٹی

ڈھولا ٹریا ونیدا...........

گیت سنگیت کی ہنس ہنس کے ابھرتی لہریں
رقص کرتی ہوئی گنگ گیر کنارے پریاں
ڈولتے جسم پہ سپنوں کے نکھرتے بجرے
سانوری باہنوں کی جھنکار پہ گاتے گجرے
پھول جوڑوں میں سجائے ہوئے سجرے سجرے
ناچتے نینوں میں گجراج ہے منڈل باندھے
ناگ جس طرح کنول کنڈ پہ کنڈل کاڑھے
پیلے ہونٹوں پہ ہنسی جیسے کسی وادی میں
حوریں سرگوشیاں کرتی ہوں خدا کے بارے

یہ کمر مار کے چلتی ہوئی دوشیزائیں
یہ لٹک چال، گگن کھیل، کھڑی لہرائیں
اور گماں ہو کہ سمے ناچ رہا ہے مادھو!
گہری لالی سے دہن لعل کا چھلا گویا
بات جس طرح خدا سوچ کے خوش ہوتا ہو
بال جس طرح کسی روح کی بھیانک راتیں
تہ بہ تہ، حلقہ بحلقہ، یمِ جولاں پیچاں
جس طرح سایوں میں گھلتے ہوئے لاکھوں سائے
جس طرح موت کی بڑھتی ہوئی لہریں، ہائے
کشتیاں، کتنے بھنور جال، یہ مانجھی بھائی
بالا باغ سے گاتی ہوئی خوشبو آئی
لڑکیاں، بالے، دکاں دار، کوی متوالے
ہائے یہ شہر یہ اس شہر کے رہنے والے

ڈھکنی سے اک شہر ڈھکا اور ڈھاکہ جسکا نام
سیس نوائے سورج راجہ روج کرے پرنام
محل دومحلے جگمگ جگمگ امرتی کا مان
باڑی، باغ، بغیچے پگ پگ سپریوں کے استھان
ہرے بھرے بانسوں کے جنگل پریم شوالے لاکھ
ملکر گائیں ان رمنوں میں ساون اور بیساکھ
یہ شوبھا یہ جوبن یہ رچنا یہ روپ سروپ
چپ کی چھاؤں شیتل ٹھنڈی ہنسی کنواری دھوپ
چکر مکر لہرائیں، ناچیں، ساگر ناچ سدا
دھن تاگے دھن دھن دھن ناتو کتاسے بکتا
ہنس ہنس کر وسے پھل جیا رہیں مگن سنیں حیوان
طوطا، مینا، بکری، بلی، گھوڑا، ہرن، ہنساں (SWAN)

رات کو ران میں سوئی چبھوئیں اور سجائیں سیج
گنگا جل کے چھینٹے ماریں، ملے انوکھا تیج
جادو چھڑیاں، بس کی پڑیاں، تریا ترس کی بات
جھیل کنارے، چندا تارے، پیا ملن کی رات
دان میں دیں پردیسیوں کو جیون کی سندرتا
آنکھ ملا کر تک چھپ جائیں، کون لگائے چھوت
ہر صورت پدما کی مورت کوئی میں نہ کھوٹ
منوا للک للک لہکارے، نجریں ہوں ہلوٹ
جسم سوار تھہ، جنک ستا سیتاؤں کے بھاگ
اوپر اوپر پانی پانی اندر اندر آگ
یہ پروا کی میٹھی تانیں، بادل بہتے خواب
پاؤں دھریں تو دھرتی ساری عود، عبیر، گلاب
گاتی گلیاں، ہنستے ہاٹ، مہکتے سندر باٹ
یہ دریا کا پاٹ، چمکتا چاند، چھلکتے گھاٹ
ڈھولے جھومیں ڈامبر وباجیں، کلمہ، حمد، اذان
گنگا جل میں بامن بتریاں آن کریں اشنان
چاند سے ملکر ہولی کھیلیں، گائیں راگ بسنت
روپ ندھان، پدم پرتاپ، منوہر مکھ، جسونت
جس البیلی نار کو دیکھو وہ لالوں کی لال
تن پھولوں کی گٹھڑی، بھیگے بال، بھڑکتے گال
کون کوی ہے جو نہیں لیوے ان کی خاطر جوگ
لیکن میرا سیَن سے میرا جی والا سنجوگ
یہ ڈھاکہ ہے ڈھاکہ دیکھو اسکے دوار ہزار
اس کی بادن گلیاں بالو اور ترپن بازار

★

بطنِ گیتی سے ابھرا نیا آفتاب

گوہر اقبال خورمیرٹھی

کتنی گہری تھیں راتوں کی پرچھائیاں — شرق سے غرب تک ظلمتِ بیکراں
رنگِ وحشت بہ ہر گوشۂ کائنات — ہر طرف اِک امنڈتا ہوا سا دھواں
بادلوں میں بھڑکتی ہوئی ناگنیں — لالہ و گل سے بوندیں لہو کی رواں
منزلیں گم بھٹکتے ہوئے راہبر — ایک غارتگری کا رواں کارواں
سانس سہمی ہوئی دل سسکتے ہوئے — خون تارِ نظر، زندگی نوحہ خواں

حکمراں تھا یہی دورِ ظلمت گری
آن کی آن میں جاگ اٹھی روشنی

از فلک تا زمیں آگیا انقلاب — اِک حسیں انقلاب ایک روشن شباب
ظلمتوں کی ردا پارہ پارہ ہوئی — جلوۂ نو بڑھا، کامراں، کامیاب
آسماں پر ستارے سمٹتے گئے — بطنِ گیتی سے ابھرا نیا آفتاب
ایک اعجازِ نو اور بہ اندازِ نو — انقلاب، انقلاب انقلاب انقلاب

اب نو اندازِ لیل و نہار اور ہیں
ظلمت و نور کے اب نئے طور ہیں

رات ہے اب سکونِ جمالِ نظر — ایک زرکار چادر لئے دوش پر
جگمگاتے کنول ہر طرف خندہ زن — مسکراتے مہ و نجم گرمِ سفر
صبحِ تاباں میں رنگِ فروغِ عمل — لالہ زارِ افق میں جہانِ دگر
موج در موج کرنیں رواں شادماں — ہر کرن کے جھروکے میں رقصِ سحر

دل کش و دل ربا، دلفریب و حسیں
دورِ عظمت نشاں، نورِ روشن جبیں

صبحِ نو، زرفشاں و سراپا نگار — لائی اپنے جلو میں فروزاں بہار
غنچے غنچے کے ہونٹوں پہ رنگیں چمک — پتے پتے کے سینے پہ کرنوں کے ہار
آج دھرتی نے کیا روپ دھارا نیا — جوت جاگی نرالی، انوکھا نکھار

سبزۂ و گل پہ رقصاں معطر صبا — چھم چھا چھم ندی گائے پائل ملا

نکھری نکھری فضا ہر طرف ضو ہی ضو

اک تجلی رواں ایک رخشندہ رو

صبحِ نو، یہ بہ سمن ہر پری وش دلہن — کس ادا سے دکھانے چلی ہے پھبن

رخ پہ تازہ گلابوں کی رعنائیاں — اور دمکتی جبیں پر دہکتے سمن

سبز آنچل میں شبنم کے خنداں گہر — زلف در زلف الماس جلوہ فگن

مسکراتی لجاتی، لٹاتی ہوئی — نکہت و نور و نغمہ چمن در چمن

بہ چمن در چمن نکہت و نغمگی

تازگی جھوم اٹھی، جھوم اٹھی زندگی

دشت و صحرا میں جلوے بکھرنے لگے — ذرے ذرے کے تیور سنورنے لگے

وادی وادی ضیاء بیز بارش ہوئی — خلد ساماں نظارے نکھرنے لگے

کوہ تا کوہ کرنوں کی محفل سجی — آبشاروں سے نغمے ابھرنے لگے

دامنِ کوہ سے تا شعورِ نظر — قافلے تابشوں کے گذرنے لگے

گنگناتی ہواؤں کی چنچل اُمنگ

سیل در سیل جوئے رواں کی ترنگ

شاخ در شاخ صد رنگ کلیاں جواں — جیسے کومل چھبیلی سجل ناریاں

شبنمی سبزہ و گل روش در روش — طائرِ خوش روا شادماں نغمہ خواں

زمزمے، چہچہے، حوصلے، ولولے — حسرتیں، آرزوئیں، امیدیں جواں

رقص ہی رقص ہے رنگ ہی رنگ ہے — شوخ گلہائے تر جھومتی ڈالیاں

ساقیٔ دلربا مست ذریں شباب

بزمِ ہستی میں جھومی صدائے رباب

اب ہیں آزادیوں کے زمانے نئے — نظمِ گلشن نیا آشیانے نئے

شرق تا غرب عظمت نشاں دورِ نو — شانِ علم و ہنر کے خزانے نئے

دیدہ حسنِ نظر تابِ انجم و ہلال — باعثِ راحتِ دل ترانے نئے

طرز بدلے گئے داستاں گوئی کے — اب حکایت نئی ہے فسانے نئے

مسکراؤ کہ دل کی کلی کھل گئی

گیت گاؤ کہ پھر زندگی مل گئی

مہر نگار

قاضی نذرالاسلام
بنگلا سے اخذ و ترتیب : سعید صدیقی
اردو ترجمہ : وحید قیصر ندوی

جہلم ندی کے اس پار، سایہ دار درختوں کے نیچے غسل کرنے کے بعد گلشن اپنے سر اور کمر پر گھڑے رکھے چلی آ رہی ہے۔ پنجاب کی دیہاتی دوشیزہ کا لباس۔ فیروزی رنگ کا دوپٹہ۔

دور سے گانے کی آواز۔

گوری دھیرے چلو
گگری چھلک ناہیں جائے
سر پہ گگری، کمر پہ گھڑا
پتلی کمریا توری بل کھا نہ جائے
کہیں ٹوٹ ہی نہ جائے
گوری دھیرے چلو

گلشن یوسف کے پاس سے گزر رہی ہے۔ یوسف کے ہاتھ میں ایک بانسری ہے۔ وہ علاقہ سرحد کا ایک خوبصورت جوان ہے۔ جب گلشن اس کے قریب پہنچتی ہے تو وہ اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

یوسف :۔ دھیرے، ذرا دھیرے چلو۔ گھڑے کے بوجھ سے تمہارا نازک جسم کچی ٹہنی کی طرح جھک گیا ہے۔ ذرا دھیرے چلو۔

گلشن :۔ (بناوٹی غصے سے) تم ابھی تک یہاں بیٹھے ہو۔ ہٹو، مجھے جانے دو۔

یوسف :۔ ذرا رکو، سنو۔ ایک بات، صرف ایک۔ سن لو تو چلی جانا۔

گلشن :۔ (بناوٹی غصے سے) آخر تم چاہتے کیا ہو؟

یوسف :۔ تم میری ہو۔

گلشن :۔ (تعجب سے) میں تمہاری ہوں؟!

یوسف :۔ ہاں تم میری ہو، ورنہ اتنی وسیع دنیا میں صرف تمہیں کو اپنا سمجھ کر میں نے کس طرح پہچان لیا؟ آخر کیوں؟

گلشن :۔ تم نے پہچان لیا!

یوسف :۔ ہاں میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم کو نہیں پہچانوں گا؟ تمہارے حسن کی صرف ایک جھلک دیکھنے کے لئے جانے کتنی ہی راتیں آنکھوں ہی آنکھوں میں گزار دی ہیں۔ کب تمہارے پائل کی جھنکار سے اندھیرا کانپ اٹھے گا۔ تم مجھے خوابوں کی اس دنیا میں کب لے جاؤ گی جہاں کمخواب کی اوڑھنی اوڑھے اور ریشمی پیشواز پہنے ہوئے خوابوں کی ملکہ سے شہزادہ یوسف کی ملاقات ہوگی۔ میں اس لمحے کے انتظار میں ہوں۔ تمہارے انتظار میں مہر نگار!

گلشن :۔ (تعجب سے) مہر نگار؟

یوسف :۔ کیا میرا انتظار ختم نہیں ہوگا؟

(گلشن بڑھنا چاہتی ہے)

یوسف :۔ کہاں چلیں؟ میری بات کا جواب تو دو۔ میرے خوابوں کی رانی! کیا تم میرے لئے ہمیشہ ایک سپنا ہی بنی رہوگی؟

(جاتے جاتے ٹھہر جاتی ہے)

گلشن :۔ تم پاگل تو نہیں ہو؟

یوسف :۔ ہاں میں پاگل ہوں مہر، لیکن کیوں! صرف تم کو پانے کی آرزو نے میرا گھر بار چھڑایا، مجھے پاگل بنا دیا۔ بولو، بولو، صرف ایک بار بولو کہ تم میری ہو۔

گلشن :۔ (جذباتی انداز میں) ہاں میں تمہاری ہوں۔

(گلشن پھر آگے بڑھتی ہے۔ یوسف اس کے پیچھے ہے)

یوسف :۔ مہر نگار!

(گلشن مڑ کر دیکھتی ہے اور بناوٹی غصے سے کہتی ہے)۔

گلشن :۔ ہر جگہ اس طرح نہ پکارا کرو

سحر و افسوں کا دیار

مشرقی پاکستان
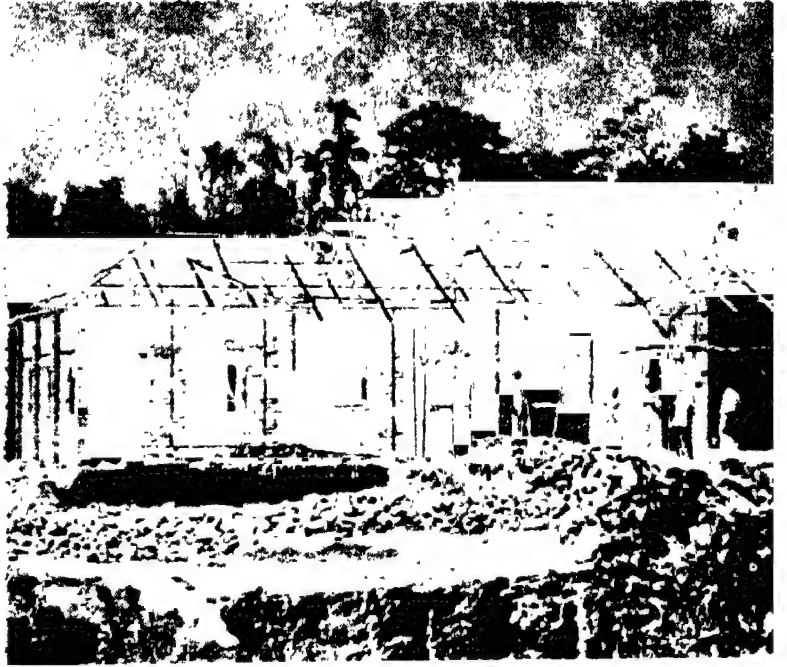
ترقی کی راهیں : ایک سڑک جو یونین کونسل نے "بنا" (مشرقی پاکستان) اور جو بنیادی جمہوریتوں کے ذریعہ ترقی کی نمایاں علامت ہے

نمایاں : ترقیاتی کارکنوں اور دیہاتیوں کی سعی و کوشش سے ایک اسکول کی تعمیر (چھتک، ضلع سلہٹ)

طلسم نظارہ :

کمہ" قبیلے کا هرا بهرا
ی علاقه (چاٹگام)
ب هر چیز کی افراط هے

یوسف :۔ تم تو روٹھ گئیں؟

گلشن :۔ کیوں نہیں؟ بھلا لوگ کیا کہیں گے۔

یوسف :۔ (اپنے آپ سے) سچ ہے! آئندہ اس طرح نہیں پکاروں گا۔ ہرگز نہیں پکاروں گا۔

گلشن :۔ ہاں، مت اس طرح پکارنا۔ چلو ہٹو۔ میرا راستہ چھوڑ دو۔

یوسف :۔ اچھا تو میں چلا۔ لو یہ تمہارا راستہ چھوڑ دیا ہے۔

(گلشن کے راستے سے ہٹ جاتا ہے اور وہ اپنے گھر کی طرف چل پڑتی ہے۔ اسٹیج کی روشنی مدھم ہو جاتی ہے سورج ڈوبنے کا منظر پس منظر میں انند بھیروی کا سُر سنائی دے رہا ہے۔ یوسف سوتا نظر آتا ہے۔ گلشن دبے پاؤں آکر یوسف کے سرہانے بیٹھ جاتی ہے اور اس کے سر پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتی ہے)

گلشن :۔ یوسف! (یوسف کی آنکھ کھل جاتی ہے)

یوسف :۔ تم آگئیں مہر۔ مہرنگار؟

گلشن :۔ ہاں یوسف میں آگئی۔

یوسف :۔ کیا میرا خواب حقیقت بن گیا مہرنگار؟

گلشن :۔ میرا نام مہرنگار تمہیں کس نے بتایا؟

یوسف :۔ کسی نے بھی نہیں۔ میں خود اسے جان گیا، میرا دل جانتا ہے تم ہی مہر ہو۔ تم ہی مہرنگار ہو۔

گلشن :۔ تم مجھے اس نام سے کیوں پکارتے ہو؟ مہرنگار، کون ہے وہ مہرنگار؟

یوسف :۔ تم تو وہ نہیں ہو؟ تم مہرنگار نہیں ہو؟

(گلشن کا چہرہ پیلا پڑ جاتا ہے)

گلشن :۔ یوسف!

یوسف :۔ نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم وہی ہو، بالکل وہی میری مہرنگار، وہی چہرہ وہی آنکھیں وہی بھنویں وہی وہی آواز۔ نہیں نہیں مجھے فریب نہ دو۔ تم وہی ہو۔ تم ہی میری مہرنگار ہو۔

گلشن :۔ اچھا یہ تو بتاؤ، تم نے مہرنگار کو کہاں دیکھا تھا؟

یوسف :۔ کیوں؟ میں نے اسے خواب میں دیکھا ہے۔

گلشن :۔ (خوشی سے) اچھا! یہ بات ہے..... یوسف! تم مجھے شاعر معلوم ہوتے ہو یا مصوّر۔

یوسف :۔ تصویر مجھے اچھی لگتی ہے، مگر میں مصور نہیں ہوں۔ شعر کہتا ہوں مگر شاعر نہیں۔

گلشن :۔ تم شعروں میں کیا کہتے ہو؟

یوسف :۔ محبت کی باتیں۔

گلشن :۔ کس کی محبت؟

یوسف :۔ محبت، تمہارے سوا کس کی، مہرنگار؟

گلشن :۔ کب سے شعر کہنے لگے ہو؟

یوسف :۔ جب سے تم کو اپنے خوابوں میں دیکھا۔

گلشن :۔ اوہ! صرف شاعری کرتے ہو۔ اور اس کے سوا؟

یوسف :۔ استاد سے گانا بھی سیکھتا ہوں.....

گلشن :۔ گانا! سناؤ گے؟!

یوسف :۔ ضرور میں بھی گاؤں گا مگر تم بھی گاؤ! اپنے نغموں سے جہلم کے اس پار، سبزہ زار میں ایک چھوٹی سی جنت بنائیں گے ہم اور تم مل کر۔

گلشن :۔ دن اور کس طرح کٹتے ہیں؟

یوسف :۔ اور، ان راستوں پر، یہ — (بانسری دکھاتا ہے) شغل ہے

گلشن :۔ اوہ! بانسری بھی!

یوسف :۔ ہاں اس بانسری کے سُروں کے سہارے اپنے خوابوں کی شہزادی کو منزل منزل، دیس دیس، سبزہ زاروں میں اونچے اونچے ٹیلوں پر دشت و بیاباں میں بے چینی سے ڈھونڈتا پھرتا ہوں۔

گلشن :۔ (تعجب سے) منزل منزل؟ دیس دیس؟ کیا تم یہاں کے نہیں ہو؟ یہاں مسافر ہو، اجنبی؟

یوسف :۔ ہاں۔

گلشن :۔ تو تم پردیسی ہو؟ کہاں سے آئے؟

یوسف :۔ نام سنا ہوگا۔ وزیرستان کا میری نس نس میں وہاں کے جیالے سورماؤں کا خون بہہ رہا ہے۔ مگر کہرے سے ڈھکے ہوئے پہاڑ بھی مجھے نہیں روک سکے مہر۔ بقرو کے کھلے ہوئے گلاب کی طرح چہرہ، مخمور نرگسی آنکھیں، مجھے کہاں کہاں لئے پھریں۔ اور آج میں یہاں ہوں، جہلم کے کنارے۔

گلشن :۔ تم پردیسی؟

یوسف :۔ ہاں مہر۔ میں پردیسی ہوں۔

(گلشن روانہ ہو جاتی ہے اور یوسف پھر آواز دیتا ہے)

یوسف :۔ مہر نگار!

گلشن :۔ (مڑ کر دیکھتے ہوئے، پیار کے لہجہ میں) نہیں۔ نہیں، مجھے اس طرح نہ پکارو، مجھے آواز نہ دو۔

یوسف :۔ کیوں مہر، کیوں؟

گلشن :۔ تم پردیسی ہو، اور...... اور...... میں تمہاری مہر نہیں ہوں۔ میں مہر نہیں ہوں۔ تمہاری مہر نہ جانے کون ہے!۔

(گلشن پھر چل پڑتی ہے اور یوسف اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہے)

یوسف :۔ مہر نگار۔ مہر!

(اسٹیج پر اندھیرا)

دوسرا سین

(خواب کا منظر)

یوسف :۔ کون؟ تم کون ہو؟

خاتون :۔ یوسف، تم نے مجھے نہیں پہچانا؟ میں تو تمہاری مہر نگار ہوں۔

یوسف :۔ (تعجب سے) مہر نگار؟

خاتون :۔ ہاں، مہر نگار دیکھو دریا پر چاند جھلمل کر رہا ہے۔ وہیں بیٹھ کر بین بجاتی ہوں۔

یوسف :۔ مہر نگار بہت عرصہ بعد آئیں۔

خاتون :۔ تمہاری بانسری کے درد بھرے نغمے مجھے یہاں لے آئے بانسری کے نغموں میں تم مجھی کو تو پکارتے تھے اپنے گیتوں میں مجھی کو تو چاہتے تھے۔

یوسف :۔ ہاں اپنے گیتوں میں، اپنے نغموں میں تمہیں کو میں نے بلایا، تمہیں کو چاہا۔ لیکن تم نے مجھے کس طرح پہچانا؟

خاتون :۔ واہ! میں نے تمہیں کس طرح پہچان لیا؟ اس پیاری ہوا میں میں کہاں رواں دواں نہ رہی۔ کل شام کو ادھر سے گذرتے ہوئے بھی میں نے سنا تم بانسری کے نغموں میں مجھے آواز دے رہے تھے۔ اسی نغمے کو سنتی آئی ہوں۔

یوسف :۔ زندگی کی بہار میں کیا اور لوگ بھی تم کو اسی طرح سے بلاتے ہیں؟ کیا تم سب سے اسی طرح ملنے چلی آتی ہو؟

خاتون :۔ تمہاری طرح جو کسی آن جانے محبوب کے لئے رونے رو اپنی جان نثار کر دیتے ہیں میں صرف انہی کو جلوہ دکھا رہی ہوں، یوسف!

یوسف :۔ مہر نگار!

خاتون :۔ رنجیدہ نہ ہو، مجھے غور سے دیکھو۔ میں تمہاری ہو۔ صرف تمہاری۔ میرا روپ، میرا حسن، میرا جسم، میرا دل، میری روح، میری ہستی سب کچھ صرف تمہارے لئے۔ صرف تمہارے لئے۔

یوسف :۔ مہر، مہر نگار!

(صبح: پس منظر میں بھیروی کا راگ چھڑتا ہے)

خاتون :۔ پرندے جاگ اٹھے ہیں۔ آسمان کا رنگین کھیل شروع ہو گیا، یوسف اب میں چلی۔

یوسف :۔ جاؤ گی، کیا پھر ملاقات نہ ہو گی؟

خاتون :۔ ڈوبتے ہوئے سورج کے احمریں لالہ گوں سایوں میں ہم پھر ملیں گے۔

یوسف :۔ لالہ گوں سایوں میں؟

(اسٹیج پر اندھیرا)

خاتون :۔ اب ہمارا ملنا دور تک پھیلے ہوئے آسمان کی گود میں ہوگا ایک ایسی رنگین صبح کو جب بانسری کے الوداعی نغمے سے آنسوؤں کی جھڑی بندھ جائے گی۔ اب میں جاؤں۔ ... یوسف الوداع!

(اسٹیج پر اندھیرا چھا جاتا ہے گلشن چلی جاتی ہے۔ یوسف کی آواز بلند ہوتی ہے)

یوسف :۔ مہر نگار، مہر نگار (بیہوش ہو کر گر جاتا ہے)

(آہستہ آہستہ اسٹیج پر روشنی تیز ہوتی ہے)

یوسف :۔ خواب، حسین خواب! سب کچھ سپنا۔ کیا میرا یہ خواب کبھی حقیقت نہیں بنے گا، پروردگار؟

(گلشن اسٹیج پر آتی ہے)

ن :۔ اٹھو یوسف

ف :۔ کون؟ تم؟ تم واپس آگئیں؟

ن :۔ صبح تو کب کی ہو چکی۔ سینے پر بانسری رکھے رکھے ساری رات بتا دی۔

ف :۔ مہر، کیا تم بتا سکتی ہو صبح کا خواب سچا ہوتا ہے یا نہیں؟

ن :۔ کیوں، کیا ہوا؟

ف :۔ ابھی ذرا دیر پہلے میرے خواب میں تم ہی تو یہ کہہ گئی تھیں کہ ہم پھر ملیں گے اور تم واپس آؤ گی۔ بہت جلد آؤ گی۔

ن :۔ میں ـــــ میں نے خواب میں تم سے یہ بات کہی تھی؟

ف :۔ ہاں ہاں تم نے۔ تم نے مہر نگار، تم نے کہا تھا کہ ہماری محبت نامراد نہ رہے گی۔ تم نے کہا تھا......

ن :۔ یوسف!

ف :۔ ہاں تم نے کہا تھا کہ تم میری ہو، صرف میری!

ن :۔ پردیسی!

ف :۔ اور ہاں تم نے یہ بھی تو کہا تھا کہ ہم کسی رنگین صبح کو ملیں گے، مہر تو کیا خواب واقعی سچا ہے؟

ن :۔ تمہیں بھول ہوئی یوسف!

ف :۔ نہیں، نہیں مجھ سے بھول نہیں ہو سکتی۔ مہر،

ن :۔ یہ تمہاری بھول ہے۔ میں تمہاری مہر نگار نہیں ہوں۔ میں گلشن ہوں۔

ف :۔ تم گلشن ہو؟ تم مہر نگار نہیں، گلشن ہو؟

ن :۔ ہاں میں گلشن ہوں۔

ف :۔ نہیں نہیں۔ یہ جھوٹ ہے، تم مجھے فریب دے رہی ہو۔

ن :۔ یہ فریب نہیں ہے یوسف۔ میں تم سے سچ کہہ رہی ہوں میں تو گلشن ہوں۔

ف :۔ خیر ہونے دو، اس سے کیا ہوتا ہے۔ تم وہی ہو وہی ـــ میرے خوابوں کی تعبیر جسے میں زندگی بھر چاہتا رہا ہوں۔ تم میری ہو۔

ن :۔ یوسف!

ف :۔ ہاں تم میری ہو۔ میری نگار۔ میں تم کو اسی نام سے پکاروں گا۔ مہر، مہر نگار

گلشن :۔ تم مجھے اس طرح نہ پکارو۔ مجھ سے اتنا پیار نہ کرو پردیسی۔ تمہارے اس پریم کو میں برداشت نہیں کر سکتی۔ میں تمہاری محبت کے قابل نہیں ہوں، یوسف! (روتے روتے گر پڑتی ہے)

یوسف :۔ تم رو رہی ہو؟ تمہاری آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہہ رہا ہے کیوں تمہیں کیا ہو گیا؟

گلشن :۔ یوسف......

یوسف :۔ مہر۔

گلشن :۔ تم مجھ سے محبت کرتے ہو نا؟

یوسف :۔ مہر؟

گلشن :۔ میں جانتی ہوں تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ اس لئے میں تم سے ایک بھیک مانگتی ہوں، دو گے؟

یوسف :۔ میں کیا نہیں دے دوں گا۔

گلشن :۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ انکار نہ کرو گے تمہیں مجھ سے محبت جو ہے۔

یوسف :۔ تم کیا چاہتی ہو مہر؟

گلشن :۔ اپنا پیار واپس لے لو۔ مجھ سے پیار نہ کرو۔ بولو تم مجھے نہیں چاہو گے؟

یوسف :۔ مہر

گلشن :۔ بولو، وعدہ کرو۔ مجھے بھول جاؤ گے نا!

یوسف :۔ کیوں؟ کیوں، مہر، کیوں؟

گلشن :۔ جو چیز پاک ہے، خوبصورت ہے اس پہ ناپاک اور بدصورت چیز کا سایہ ڈال کر نجس کرنا گناہ ہے، بہت بڑا گناہ۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی، یوسف۔

یوسف :۔ گلشن میں تمہاری بات سمجھ نہ سکا،

گلشن :۔ تمہارا پیار، تمہاری محبت جنت کی طرح پاک ہے۔ میں اس پر اپنی نجاست اور پاپ کا سایہ ڈالنا نہیں چاہتی۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔

یوسف :۔ مہر، مہر نگار!

گلشن :۔ تم مجھے اس نام سے جتنا بھی پکارو میں جانتی ہوں کہ میں مہر نہیں ہوں، میں گلشن ہوں۔ میں...... میں...... تو شہر کی مشہور ـــ کی بیٹی ہوں۔

یوسف :۔ نہیں، نہیں تم گلشن نہیں ہو۔ تم مہرنگار ہو، میری مہرنگار!

گلشن :۔ میں نجس ہوں، ساری زندگی ماں کے گناہوں کا بوجھ سر پہ لئے پھرتی رہی ہوں۔

یوسف :۔ مگر تم تو ناپاک نہیں ہو، تم بے گناہ ہو۔ تم پاک ہو مہر۔

گلشن :۔ میں مہر نہیں ہوں، میں گلشن ہوں، گلشن۔ میری نس نس میں گناہوں کا ناپاک لہو دوڑ رہا ہے۔ یہ خون سرخ نہیں ہے۔ میری ماں کے گناہوں کی سیاہی نے اس خون کو سیاہ کر دیا ہے۔ کاٹ کر دیکھ سکتے ہو۔

یوسف :۔ مگر تم مجرم تو نہیں۔ تم بے گناہ ہو۔ تمہاری محبت پاک ہے۔

گلشن :۔ ہاں، شاید تم سچ کہہ رہے ہو۔ آج ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میری محبت پاک ہے، اس پر نجاست کا سایہ نہیں پڑا۔ اس زندگی میں بے شمار آدمی میرے سامنے قیمتی تحفے لے کر آئے لیکن میں کسی دن بھی اس طرح نہیں روئی۔ کسی اور کی پکار پر میں اس طرح بے اختیار ہو کر آگے نہیں بڑھی۔

یوسف :۔ مہر!

گلشن :۔ تم نے جب یہ کہا کہ تم میری ہو تو میرے جسم کا رواں رواں بول پڑا کہ ہاں میں تمہاری ہی ہوں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری محبت واقعی سچی ہے۔

یوسف :۔ تمہاری محبت میری زندگی کا واحد سہارا ہے۔ اس سہارے کو مت توڑو۔ ایک بار صرف ایک بار ماضی کو بے رحمی سے ٹھکرا دو، میرے قریب آکر سر اونچا کر کے کھڑی ہو جاؤ اور بلند آواز سے کہو، اس دنیا میں ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی دیوار کھڑی نہیں کی جا سکتی۔ بولو، بولو مہر۔

گلشن :۔ میں جس سے پیار کرتی ہوں، اس کی کیسے توہین کر سکتی ہوں! اس محبت میں کالک نہیں لگا سکتی۔

یوسف :۔ مہر!

گلشن :۔ یہ جو میں تم کو پا کر بھی کھو رہی ہوں، تو اس لئے کہ میں نے تم کو اپنے جی جان سے چاہا ہے۔ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے یوسف! صرف تمہارے لئے، تمہاری پاک محبت کی وجہ سے آج اپنے آپ کو مٹا کر تمہارے راستے سے الگ ہو رہی ہوں، مجھے اس سے مت روکو۔

(بات کرتے کرتے گر پڑتی ہے۔ یوسف اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیتا ہے)

یوسف :۔ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے مہر؟ یہ کیا؟ آنکھیں، چہرہ سب کا سب نیلا کیوں پڑ گیا؟

گلشن :۔ (کراہتے ہوئے) معاف کر دو یوسف، تمہارے راستے سے ہٹنے کے لئے، تمہاری پاک محبت کو نجاست سے بچانے کے لئے میں نے زہر کا گھونٹ پی لیا ہے۔

یوسف :۔ زہر کا گھونٹ! مہر مگر تم نے ایسا کیوں کیا، صرف اپنا خیال کیا، میرا خیال نہ آیا؟ میرا پیار، میری محبت مہر؟

گلشن :۔ میں نے جو پا لیا ہے، اس سے میرا پاپی جیون آج لبریز ہے۔ یوسف۔ اور میں جانتی ہوں کہ مجھے نہ پا کر بھی تم ہمیشہ کیلئے میرے ہو۔ پھر بھی ہم دونوں کو جدا ہونا ہی پڑے گا!

یوسف :۔ مہرنگار، میری مہر۔ تم نے یہ کیا کیا؟

گلشن :۔ میرا وقت پورا ہو گیا تھا، اپنی ناپاک سانسوں سے میں تمہاری پاک محبت کو نجس نہیں کر سکتی تھی۔ الوداع! یوسف، الوداع

یوسف :۔ مہر!!

گلشن :۔ اب اس دنیا میں ہمارا ملنا نہیں ہو سکتا۔ اب ہماری ملاقات اس جگہ ہو گی جہاں لامحدود آسمان اور دریا ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے ہیں ...... اور میری تم سے ایک آخری درخواست ہے۔ میرے اس بے روح جسم کو جہلم کے پار دفن کر دینا۔ میں نے ناپاک کوکھ سے جنم لیا تھا تو تم اس پر نفرت کا اظہار نہ کرنا۔ میں ناپاک ہوں یا نہیں مجھے معلوم نہیں مگر میرے دل میں پاک محبت بسی ہوئی تھی۔ اگر کبھی تمہارا اس طرف آنا ہو تو مجھے یاد کر کے آنسو مت بہانا۔ پہلے ہی کی طرح اگر ہو سکے تو ایک ہی لمحے کے لئے یہاں آکر ذرا ٹھہر جانا اور یہاں کھڑے ہو کر اپنی بانسری کا وہی روح پرور نغمہ بلند کرنا۔ اس بدقسمت کو یاد کر کے اس کی قبر پر دو پھول چڑھا دینا، الوداع! الوداع!

(یوسف کی گود میں گلشن کا سر ڈھلک جاتا ہے اور اس کی روح پرواز کر جاتی ہے)

(باقی صفحہ ۹۰ پر)

پنجابی لوک کہانی:

"صبر دی پکھی"

شفیع عقیل

اگلے وقتوں کی بات ہے کسی ملک میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس کی چھ بیٹیاں تھیں مگر بیٹے سے وہ اب تک محروم تھا۔ سے اس بات کا بڑا دکھ تھا۔ اس کی تمنا تھی کہ خدا اسے ایک بیٹا دے واس کے بعد اس کی سلطنت کا انتظام سنبھال سکے اور اس کا نام بی زندہ رکھے لیکن جب بھی اس کے ہاں کوئی اولاد ہوتی، وہ بیٹی ہی ہوتی ور اس طرح چھ بچوں کا باپ ہونے کے باوجود اب تک بیٹے جیسی نعمت سے اس کا دامن خالی تھا۔ اس نے بہت دعائیں مانگیں۔ فقیروں، رویشوں کے پاس گیا، ضرورت مندوں اور محتاجوں کو دل کھول کر خیراتیں بھی دیں۔ مگر پھر بھی اس کی دلی تمنا پوری نہ ہوئی تو اس نے حکم دیا کہ:

"اگر اس دفعہ بھی ملکہ کے ہاں لڑکی پیدا ہو تو اسے اسی وقت قتل کر دیا جائے!"

بادشاہ کا حکم تھا۔ اسے کون ٹال سکتا تھا۔ اس نے دایہ کو بلا کر کہا، "اگر اس بار بھی ملکہ کے لڑکی پیدا ہوئی تو اسے پیدا ہوتے ہی قتل کر دینا۔ اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو تمہیں کولھو میں زندہ پلوا دیا جائے گا۔" دایہ نے سر جھکا کر عرض کیا: "حضور کا حکم سر آنکھوں پر۔"

جب ملکہ کو یہ معلوم ہوا تو وہ بہت گھبرائی۔ وہ بیچاری بھلا کیا کر سکتی تھی۔ قدرت کے کاموں میں کون دخل دے سکتا تھا۔؟ مگر وہ بادشاہ کے غصے سے بھی واقف تھی اور یہ جانتی تھی کہ بادشاہ نے جو کہا ہے وہ پورا کر کے رہے گا۔ جوں جوں ولادت کے دن قریب آ رہے تھے اس کی پریشانی اور فکر میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں ڈر رہی تھی کہ اگر اس بار لڑکی پیدا ہوئی تو کیا ہوگا۔؟ اور کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ اس بار بھی اس کے ہاں لڑکی ہی پیدا ہوئی۔ لیکن لڑکی اس قدر خوبصورت تھی کہ تھوڑی دیر کے لئے دایہ بھی دنگ رہ گئی۔ اس نے زندگی بھر اتنی خوبصورت بچی نہیں دیکھی تھی۔ اس کا دل نہ چاہا کہ اس قدر خوبصورت اور پیاری بچی کو قتل کر دے، مگر پھر اسے خیال آیا، اگر میں نے لڑکی کو قتل نہ کیا تو بادشاہ مجھے کولھو میں زندہ پلوا دے گا۔ اور یہ سوچ کر اور دل کڑا کر کے لڑکی کو قتل کرنے کے لئے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ لڑکی اسے دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑی! جونہی وہ ہنسی اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے چند پھول جھڑ کر نیچے گر پڑے۔ یہ دیکھ کر دایہ بڑی حیران ہوئی اس نے آج تک ایسا عجیب و غریب واقعہ نہ دیکھا تھا۔ اس نے جلدی سے ملکہ کو بچی دکھائی۔ بچی ملکہ کو بھی دیکھ کر ہنسنے لگی۔ اور پہلے کی طرح اس کے منہ سے چند پھول جھڑ کر نیچے گر پڑے۔ ملکہ بھی یہ دیکھ کر بڑی حیران ہوئی اس کی ممتا جاگ اٹھی اور اس نے دایہ کو بہت سا انعام دیکر اسے اپنے ساتھ ملا لیا۔ اور کہا کہ وہ بادشاہ سے کہہ دے کہ لڑکی قتل کر دیا گیا ہے۔ دایہ اس بات پر راضی ہو گئی اور اس نے چند کپڑے بکرے کے خون میں بھگو کر بادشاہ کو دکھا دیئے اور یہ ظاہر کیا کہ لڑکی کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ملکہ نے ایسا انتظام بھی کیا تھا کہ شہزادی کو محل کے تہہ خانے میں پہنچا دیا گیا جہاں وہ دایہ کی نگرانی میں پلنے لگی۔ اور کسی کو اصل بات کی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

دن گزرتے گئے۔ شہزادی ذرا بڑی ہوئی اور جب اس نے چلنے کے لئے پہلا قدم اٹھایا تو یہ دیکھ کر ملکہ اور دایہ کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ شہزادی کے دائیں پاؤں کے نیچے سے سونے اور بائیں پاؤں کے نیچے سے چاندی کی اینٹ نکلتی۔ اس عجیب و غریب بات نے ان کو اور بھی تعجب میں ڈال دیا۔ اب شہزادی جب چلتی تو اس کے دونوں پاؤں کے نیچے سے سونے اور چاندی کی اینٹیں نکلتیں اور جب وہ ہنستی تو اس کے منہ سے پھول جھڑتے۔ ملکہ یہ اینٹیں اور پھول دیکھ دیکھ کر بڑی خوش ہوتی لیکن اس کی یہ خوشی صرف اسی تک محدود تھی۔ وہ اس کا اظہار کسی پر نہ کر سکتی تھی کہ مبادا بادشاہ کو پتہ چل جائے اور شہزادی کے ساتھ اس کی جان بھی جائے۔ یہی سوچ کر اس نے اپنی خوشی سینے میں دبا

رکھی تھی اور کسی اچھے وقت کے انتظار میں تھی۔

جب شہزادی بڑی ہو گئی تو وہ تنہائی میں گھبرانے لگی۔ تہہ خانے میں پڑے پڑے اس کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے ملکہ سے کہا:

"ماں! میں اکیلے میں گھبراتی ہوں۔ میرے لئے ایک علیحدہ محل بنوا دیا جائے!"

اور ملکہ نے اسی طرح کیا۔ اس نے بادشاہ کے علم کے بغیر ایک چھوٹا سا محل بنوا دیا جس میں شہزادی رہنے لگی، اس کے لئے کنیزیں اور باندیاں مقرر کر دی گئیں جنہیں زر و جواہر دیکر اس بات پر راضی کر لیا گیا کہ وہ بادشاہ کو اس بات کی خبر نہیں ہونے دیں گی کہ شہزادی ابھی زندہ ہے۔ اسی محل میں چند کمرے ایسے بھی بنوا دیئے گئے جن میں شہزادی کے پاؤں تلے سے نکلنے والی سونے چاندی کی اینٹیں اور منہ سے جھڑنے والے پھول جمع ہوتے رہتے۔ غرض اس طرح شہزادی اب اس محل میں رہنے لگی اور عنفوان شباب کو پہنچی۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک دفعہ ملک میں قحط پڑ گیا قحط کی وجہ سے لوگ دانے دانے کو محتاج ہو گئے اور سارے ملک میں کہرام مچ گیا۔ بادشاہ نے قحط پر قابو پانے کے لئے شاہی خزانے سے دولت خرچ کرنا شروع کر دی۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آیا جب شاہی خزانے خالی ہو گئے۔ اب بادشاہ بہت پریشان تھا۔ سلطنت کا کاروبار چلانے کے لئے دولت کی ضرورت تھی اور دولت ختم ہو چکی تھی۔ بادشاہ کو ڈر تھا کہ کہیں سلطنت ہاتھ سے نہ چلی جائے۔ وہ دن رات سوچتا اور ہر وقت اس غم میں گھلتا رہتا کہ اب کیا کرے۔؟ دولت کہاں سے لائے! ایک روز رات کے وقت بادشاہ اسی فکر میں ڈوبا ہوا کچھ اداس بیٹھا تھا کہ ملکہ نے اس سے پوچھا:

"میں کئی روز سے دیکھ رہی ہوں کہ حضور کچھ پریشان سے نظر آتے ہیں۔ اگر گستاخی نہ ہو تو کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ ایسی کونسی پریشانی ہے جس کی وجہ سے آپ فکرمند رہتے ہیں۔؟"

بادشاہ نے پہلے تو بات کو ٹالنا چاہا مگر جب ملکہ نے زیادہ اصرار کیا تو اس نے اسے سب کچھ بتا دیا کہ شاہی خزانے خالی ہو چکے ہیں اور سلطنت کا کاروبار چلانے کے لئے دولت کی ضرورت ہے۔ اگر دولت نہ مل سکی تو اس بات کا ڈر ہے کہ کہیں ملک میں بغاوت نہ ہو جائے اور سلطنت ہاتھ سے نہ جاتی رہے۔ اسی فکر میں میں دن رات پریشان رہتا ہوں مگر دولت حاصل کرنے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔ ملکہ بادشاہ کی بات سن کر عجب طرح کے کشمکش و پیچ میں پڑ گئی۔ وہ اس کی مدد تو کر سکتی تھی۔ اسے دولت بھی دے سکتی تھی۔ مگر بتائے کیونکر کہ یہ دولت کس طرح فراہم ہوئی ہے۔ وہ سوچنے لگی اگر نہیں بتاتی تو بادشاہت جانے کا ڈر ہے آخر کچھ دیر سوچ بچار کے بعد وہ بادشاہ سے کہنے لگی:

"عالم پناہ! اگر جاں بخشی ہو تو کچھ عرض کروں؟"

بادشاہ بڑا متعجب ہوا کہ اس میں جاں بخشی کی کیا بات ہے۔ بولا "ہاں کہو۔ کیا بات ہے۔؟" ملکہ بولی: "میں آپ کی پریشانی دور کر سکتی ہوں۔ آپ کو دولت بھی دے سکتی ہوں لیکن اس کے لئے پہلے آپ مجھے جان بخشی کا قول دیں؟" یہ بات بادشاہ کے لئے اور بھی حیران کرنے والی تھی۔ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ ملکہ کے پاس اتنی دولت کہاں سے آ سکتی ہے جس سے سلطنت کا کاروبار چل سکے۔ اس نے جان بخشی کا قول دیتے ہوئے کہا: "ہم تمہیں جان بخشی کا عہد دیتے ہیں۔ اب کہو کیا بات ہے"

ملکہ بولی: "حضور! میرے پاس سونے چاندی کی بے شمار اینٹیں ہیں!"

"سونے چاندی کی اینٹیں۔؟" بادشاہ نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا "جی ہاں!" ملکہ نے جواب دیا۔ "مگر وہ تمہارے پاس کہاں سے آئیں۔؟" بادشاہ نے اسی حیرانی سے پوچھا اور اس کے جواب میں ملکہ نے بتایا: "جہاں پناہ! چھوٹی شہزادی، جسے آپ نے پیدا ہوتے ہی قتل کر دینے کا حکم دے دیا تھا۔ ہم نے اسے قتل نہیں کیا تھا۔ وہ جب چلتی ہے تو اس کے دائیں پاؤں کے نیچے سے سونے کی اور بائیں پاؤں کے نیچے سے چاندی کی اینٹ نکلتی ہے۔ اور جب وہ ہنستی ہے تو اس کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ میں نے سونے چاندی کی یہی بے شمار اینٹیں محل میں جمع کر رکھی ہیں۔"

بادشاہ کو ملکہ کی بات کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے دل میں سوچا۔ کسی انسان کے پاؤں تلے سے سونے چاندی کی اینٹیں کیسے برآمد ہو سکتی ہیں اور ہنسنے میں منہ سے پھول کیونکر جھڑ سکتے ہیں! اس نے ملکہ کی طرف حیرانی سے دیکھتے ہوئے کہا:

"مگر یہ ہو کیسے سکتا ہے۔؟"

اس پر ملکہ کہنے لگی: "اگر حضور اجازت دیں تو اسی وقت

شہزادی کو خدمت عالی میں پیش کیا جائے۔ تاکہ یہ سب کچھ حضور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں؟"

بادشاہ نے فوراً اجازت دیدی۔ اسی وقت شہزادی کو پیش کیا گیا۔ اور پھر بادشاہ نے خود دیکھا کہ جب شہزادی چلتی ہے تو واقعی اس کے پاؤں تلے سے سونے چاندی کی اینٹیں نکلتی ہیں اور جب اس نے ہنس کر بادشاہ کو سلام کیا تو اس کے منہ سے چند پھول بھی جھڑ کر فرش پر گر پڑے۔ ملکہ نے جو کچھ کہا تھا وہ سب، لفظ بہ لفظ، صحیح تھا۔ بادشاہ بہت خوش ہوا لیکن وہ اپنے کئے پر شرمندہ بھی تھا، اس نے اسی بیٹی کے قتل کا حکم دیا تھا جو آج اس کی سلطنت کو بچانے کا سبب بن گئی تھی۔ اس نے ملکہ اور شہزادی سے اپنی غلطی کی معافی مانگی۔ اور اس کے خزانے پھر دولت سے لبریز ہو گئے۔

اب بادشاہ چھوٹی شہزادی سے بے انتہا محبت کرنے لگا تھا اور اس سے اس کی دوسری چھ بہنیں بہت جلنے لگیں۔ وہ سب اس سے حسد کرنے لگی تھیں۔ یہ دیکھ کر بادشاہ نے چھوٹی شہزادی کے لئے ایک الگ محل تعمیر کرا دیا تاکہ دوسری بہنیں اسے تنگ نہ کر سکیں مگر اس سے بھی بڑی بہنوں کا جلاپا نہ گھٹا بلکہ اور بڑھ گیا اور وہ اس سے بہت زیادہ حسد کرنے لگیں۔

ایک بار ایسا ہوا کہ بادشاہ کسی دوسرے ملک میں جانے لگا۔ وہ باری باری اپنی تمام بیٹیوں کے پاس گیا اور ان سے پوچھا کہ دوسرے ملک سے ان کے لئے کیا تحفہ لائے۔ کسی شہزادی نے کچھ بتایا اور کسی نے کچھ۔ اتفاق کی بات کہ اس وقت بادشاہ کے پاس وقت کم تھا وہ سب سے چھوٹی شہزادی کے پاس خود نہ جا سکا۔ اس نے ایک کنیز کو بھیجا اور کہا جاؤ چھوٹی شہزادی سے پوچھ کر آؤ کہ تمہارے لئے دوسرے ملک سے سرکار کیا سوغات لے کر آئیں؟ جب کنیز چھوٹی شہزادی کے پاس گئی تو وہ اس وقت خدا کی یاد میں مصروف تھی۔ کنیز نے جب اسے بادشاہ کا پیغام دیا تو اس نے کہا: "صبر کرو!" شہزادی نے 'صبر کرو'، اسلئے کہا تھا کہ جب وہ اپنی عبادت سے فارغ ہو جائے گی تو بات کرے گی مگر یہ کنیز بھی بیوقوف۔ اس نے سمجھا، شاید شہزادی یہ کہہ رہی ہے کہ اس کے لئے بادشاہ صبر لیتے آئیں۔ چنانچہ وہ بادشاہ کے پاس آئی اور کہنے لگی:

"حضور! چھوٹی شہزادی نے کہا ہے کہ میرے لئے صبر لیتے آئیں۔"

بادشاہ اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ اور جب وہ کچھ عرصہ بعد واپس آیا تو سب کے پسندیدہ تحفے ان کو بلا کر دیئے اور چھوٹی شہزادی کے لئے ایک ڈبہ دیا اور کہنے لگا:

"یہ صبر ہے۔ یہ چھوٹی شہزادی کے لئے ہے!"

کنیز جب وہ ڈبہ لیکر چھوٹی شہزادی کے پاس گئی تو شہزادی کو یہ دیکھ کر انتہائی افسوس ہوا کہ تمام شہزادیوں کے لئے تو بادشاہ قیمتی قیمتی تحفے لائے ہیں مگر اس کے لئے صرف ایک ڈبہ آیا۔ اس نے کنیز سے وہ ڈبہ لیکر محل میں ایک طرف پھینک دیا اور چپ ہو گئی۔ کئی دن گزر گئے۔ شہزادی اس ڈبہ کو جو بادشاہ اس کے لئے لایا تھا بھول چکی تھی۔ ایک روز وہ محل میں بیٹھی تھی کہ اسے گرمی محسوس ہوئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا تو اس وقت وہاں کوئی کنیز بھی موجود نہ تھی۔ وہ خود ہی اٹھ کر پنکھا ڈھونڈنے لگی۔ اور جب اسے پنکھا نہ مل سکا تو اچانک اس کی نظر ایک کونے میں پڑے ہوئے اس ڈبہ پر پڑی جو بادشاہ اس کے لئے لایا تھا۔ اس نے سوچا، ڈبے کے ڈھکنے سے ہی پنکھے کا کام لیلوں اور کسی کام نہ آسکا تو پنکھا تو بن ہی جائے گا۔ چنانچہ اس نے وہ ڈبہ اٹھایا اور جونہی اس کا ڈھکنا اٹھایا، تو کیا دیکھتی ہے کہ اس میں ایک نہایت خوبصورت پنکھا رکھا ہوا ہے۔ یہ دیکھ کر شہزادی بہت خوش ہوئی۔ اس نے جلدی سے ڈبہ میں سے پنکھا نکالا اور جھلنے لگی پنکھا ہلانے کی دیر تھی کہ اس نے دیکھا، اس کے سامنے ایک انتہائی خوبصورت بانکا نوجوان شہزادہ کھڑا تھا۔ اسقدر حسین نوجوان آج تک نہ دیکھا تھا۔ مگر یہ عجیب و غریب واقعہ رونما ہونے پر شہزادی ڈر کر بیہوش ہو گئی۔ شہزادہ جلدی سے آگے بڑھا اور اس نے شہزادی کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیئے اور ہوش میں لانے کی تدبیر کی اور شہزادی سے کہا:

"شہزادی! مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں بھی ایک ملک کا شہزادہ ہوں اور تمہارے پنکھا جھلنے کی وجہ سے یہاں آیا ہوں!"

شہزادی حیران پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی تو یہ صبر پنکھا ہے۔ اور اس کے ہلنے سے ہی میں یہاں آیا ہوں!"

شہزادے کے اتنا کہنے سے شہزادی کا خوف دور ہوا اور پھر دونوں بیٹھ کر آپس میں باتیں کرنے لگے۔ اس کے بعد یہ ہوا

شہزادی جب تنہا ہوتی، وہ روزانہ ڈبے میں سے پنکھا نکال کر ہلاتی اور شہزادہ پلک جھپکتے آن موجود ہوتا۔ اور وہ گھنٹوں بیٹھے باتیں کیا کرتے۔ اور جب اسے واپس جانا ہوتا تو شہزادی پھر پنکھا ہلاتی اور شہزادہ غائب ہو کر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا۔ اس طرح ان کی ملاقاتیں روزانہ ہونے لگیں وہ پہروں اکٹھے بیٹھتے یہاں تک کہ ہوتے ہوتے ان دونوں میں پیار ہو گیا۔ اور دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر جینے لگے۔

دن گزرتے رہے اور ان کی محبت برابر بڑھتی رہی انہوں نے بہت کوشش کی کہ ان کی محبت کا حال کسی کو نہ معلوم ہو مگر ان کا پیار چھپا نہ رہ سکا۔ محل کی کئی کنیزوں کو اس بات کی خبر ہو گئی کہ اس طرح شہزادی ایک شہزادے سے محبت کرتی ہے اور وہ دونوں روزانہ ملتے ہیں یہ خبر کنیزوں سے ہوتی ہوئی اس کی بڑی بہنوں کے کانوں تک جا پہنچی۔ وہ تو پہلے ہی اس سے جلتی تھیں۔ انہوں نے جب سنا کہ اس طرح ایک نہایت حسین و جمیل شہزادہ چھوٹی شہزادی کے بس میں ہے تو وہ اور بھی جلنے لگیں۔ اور آپس میں مشورے کرنے لگیں کہ کسی طرح شہزادے اور شہزادی کو ایک دوسرے سے فرنٹ کر کے آپس میں ان کی جدائی کرا دی جائے چنانچہ انہوں نے ایک ترکیب سوچی اور حیلوں بہانوں سے چھوٹی شہزادی سے بہت گھل مل گئیں۔ شہزادی نے دل میں سوچا بہنیں ہیں۔ ہو سکتا ہے ان کے دل میں میرے پیار کے لئے جگہ نکل آئی ہو۔ وہ بھی ان میں گھل مل گئی۔ ادھر بڑی بہنوں نے جب دیکھا کہ اب چھوٹی شہزادی ان پر اعتماد کرنے لگی ہے تو ایک روز وہ سب کی سب اس سے کہنے لگیں:

"بنو! ہمیں بھی اپنا شہزادہ دکھاؤ۔ ہم بھی دیکھیں وہ کتنا خوبصورت ہے؟" اس پر شہزادی نے ان سے کہا: کل ضرور دکھاؤں گی۔ مگر تم سب وعدہ کرو کہ کسی اور کو نہیں بتاؤ گی؟۔

سب بہنوں نے وعدہ کیا: "ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں کہ ہم کسی کو نہیں بتائیں گے۔"

اور پھر دوسرے روز سب بہنیں چھوٹی شہزادی سے کہنے لگیں:

"ہم تمہارے شہزادے کے لئے اپنے ہاتھوں سے بستر بچھائیں گے!"

چھوٹی شہزادی بہت خوش تھی کہ اس کی بہنیں اس سے بہت محبت کرنے لگی ہیں اور اس کے شہزادے کے لئے خود ہی بستر بچھا رہی ہیں مگر اسے کیا معلوم کہ اس کی بہنیں پیار کے پردے میں دشمنی کے بیج بو رہی ہیں۔ چنانچہ جب وہ شہزادے کے لئے بستر بچھانے لگیں تو انہوں نے کانچ کے چھوٹے چھوٹے بے شمار ٹکڑے بستر میں اس طرح بچھا دیئے کہ اوپری نظر سے دیکھو تو پتہ نہ چلتا تھا۔ انہوں نے کانچ کے ٹکڑے بچھا کر ان پر ایک مہین سی چادر بھی بچھا دی اور شہزادی سے کہا:

"ہم نے شہزادے کے لئے بستر تیار کر دیا ہے۔ اب تم اپنے شہزادے کو بلاؤ۔!"

یہ سن کر چھوٹی شہزادی نے ڈبہ نکالا اور اس میں سے پنکھا نکال کر ہلایا۔ اس کے پنکھا ہلانے کی دیر تھی کہ پلک جھپکتے شہزادہ سامنے آن موجود ہوا۔ جونہی بڑی بہنوں نے شہزادے کو دیکھا، ان کے سینے دھک سے رہ گئے۔ اس قدر حسین و جمیل شہزادہ۔! ان کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ چھوٹی شہزادی کا شہزادہ اتنا خوبصورت ہو گا۔ پس وہ چھوٹی شہزادی سے اور بھی زیادہ جلنے لگیں کچھ دیر تک تو وہ ان دونوں سے باتیں کرتی رہیں، پھر شہزادے سے کہا "اب ہمیں اجازت دیں اور خود اس بستر پر آرام کریں"۔ مگر جب وہ بستر پر لیٹا تو کانچ کے ٹکڑے اس کے جسم میں گھس گئے اس کا سارا جسم لہولہان ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی شہزادہ غائب بھی ہو گیا شہزادی حیران تھی۔ اس نے جلدی سے پنکھا ہلایا لیکن شہزادہ نہ آیا وہ تو زخمی ہو چکا تھا۔ شہزادی سمجھ گئی کہ اس کی بہنوں نے اس کے ساتھ دھوکہ کیا ہے اور انہوں نے شہزادے کو زخمی کر دیا ہے اب وہ روزانہ پنکھا ہلاتی۔ بہت کوشش کرتی مگر شہزادہ نہ آتا اس کی جدائی میں رو رو کر شہزادی کا برا حال ہو گیا۔ اب نہ اس کے منہ سے پھول جھڑتے تھے اور نہ چلتے میں پاؤں تلے سے سونے چاندی کی اینٹیں نکلتی تھیں۔ سب حیران تھے لیکن کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آتا کہ ماجرا کیا ہے۔ آخر شہزادی نے کہا:

"میں شہزادے کو خود ڈھونڈوں گی اور اپنی بہنوں کی طرف سے معافی مانگوں گی!"

بہنوں نے اسے بہت سمجھایا کہ: "تجھے شہزادے کا ملک تک نہیں معلوم۔ پھر تو اسے کیسے ڈھونڈے گی؟" مگر وہ کہنے لگی،

"میں شہزادے کو ضرور ڈھونڈوں گی۔ میں اسے تلاش کر کے رہوں گی۔"

اور پھر۔ ایک روز رات کو اس نے مردانہ لباس پہنا، چپکے سے محلوں سے نکلی اور رات کی رات شہر سے نکل کر جنگل کو روانہ ہو گئی۔ شہزادی کئی دن تک پیدل چلتی رہی۔ دن رات چلتی رہی۔ جب بھوک لگتی تو جنگل کے پھل پھلاری توڑ کر کھا لیتی اور ادھر ادھر سے پانی پی کر پھر آگے چل دیتی۔ مگر اسے تو یہ تک معلوم نہ تھا کہ جانا کس طرف ہے اور جا کس طرف رہی ہے۔ آخر ایک روز چلتے چلتے وہ تھک کر نڈھال ہو گئی۔ چلتے چلتے اس کے نازک پاؤں میں چھالے پڑ چکے تھے اور اس کا پھول سا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ وہ ایک درخت کی گھنی چھاؤں دیکھ کر بیٹھ گئی اور بیٹھے بیٹھے تکان سے اس پر غنودگی طاری ہو گئی۔ اسی درخت پر ایک طوطا اور مینا بیٹھے ہوئے تھے۔ مینا طوطے سے کہنے لگی: "اے طوطے! کوئی بات سنا تاکہ کچھ وقت کٹ جائے۔" طوطا بولا:

"اس وقت تو تم ہی کچھ کہو؟" اس پر مینا نے کہا: "میں کیا کہوں۔ مجھے تو اس لڑکی پر رحم آ رہا ہے جو اس وقت مردانہ لباس میں پیڑ کے نیچے اونگھ رہی ہے۔ یہ ایک ملک کی شہزادی ہے اور اس کی بہنوں کی دشمنی کی وجہ سے اس کا شہزادہ اس سے بچھڑ گیا ہے۔ اب یہ اپنے شہزادے کو ڈھونڈنے نکلی ہے۔"

اتنا کہہ کر مینا نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا: "یہ بیچاری یہاں ماری ماری پھر رہی ہے اور شہزادہ اپنے ملک میں زخمی پڑا تڑپ رہا ہے۔" یہ سن کر طوطا بولا:

"اس میں فکر کی کیا بات ہے۔ اگر یہ ہماری بیٹ اکٹھی کر لے اور انہیں پیس کر شہزادے کے زخموں پر لگا دے تو وہ اچھا ہو سکتا ہے۔!"

جواب میں مینا کہنے لگی: "مگر یہ بیچاری شہزادے تک پہنچے کیسے؟ اس کو تو راستہ تک معلوم نہیں؟" طوطا بولا: "یہ کیا مشکل ہے۔ یہ شہزادے کے ملک کا نام تو جانتی ہی ہے۔ وہ یہاں سے قریب ہے۔ اگر یہ مغرب کی طرف سیدھی چلتی جائے تو شہزادے کے شہر پہنچ جائے گی۔" یہ باتیں کر کے طوطا اور مینا اڑ گئے اور ان کے جاتے ہی شہزادی جلدی سے اٹھی اس نے ساری بات سن لی تھی۔ اس نے درخت کے نیچے سے تھوڑی سی بیٹ جمع کی اور مغرب کی طرف سیدھی روانہ ہو گئی۔ کئی روز کے سفر کے بعد جوں توں کر کے شہزادی اپنے شہزادے کے ملک میں جا پہنچی۔ جب وہ شہزادے کے شہر میں پہنچی تو اس نے لوگوں سے سنا کہ شہزادہ بہت بری طرح زخمی ہے۔

لیکن اس کے علاج کرنے والے کے لئے شرط یہ ہے کہ اگر وہ شہزادے کو اچھا نہ کر سکا تو اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ اور اس طرح اب تک کئی حکیموں کے سر قلم کئے جا چکے ہیں۔ شہزادی نے ادھر ادھر سے ضروری معلومات حاصل کیں اور پھر جا کر محل کے باہر رکھے ہوئے نقارے پر چوٹ لگا دی۔ شاہی خادم اسی وقت اسے بادشاہ کے پاس لے گئے۔ اس وقت وہ مردانہ لباس میں تھی اس لئے کوئی پہچان نہ سکتا تھا کہ یہ عورت ہے۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا: "تم کون ہو۔ اور کیا چاہتے ہو۔؟" اس نے جواب دیا: "جہاں پناہ! میں ایک طبیب ہوں اور شہزادے کا علاج کرنے آیا ہوں۔" بادشاہ مایوسی سے بولا: "شہزادے کے علاج میں بڑے بڑے نامور طبیب ناکام ہو چکے ہیں۔ تم بھلا کیا کرو گے؟" مگر شہزادی نے کہا: "عالی جاہ! میں ضرور شہزادے کو اچھا کر دوں گا اللہ کے حکم سے!" اس پر بادشاہ کہنے لگا: "اچھا جاؤ تمہیں اجازت ہے۔ شہزادے کا علاج کرو۔ مگر یہ یاد رہے کہ اگر تم سے شہزادہ اچھا نہ ہو سکا تو تمہارا سر قلم کر دیا جائے گا۔؟" شہزادی بولی:

"مجھے یہ شرط منظور ہے۔" شہزادی نے بادشاہ سے ایک ماہ کی مہلت مانگی اور کہا: "مجھے شہزادے کے پاس پہنچا دیا جائے!" شاہی خادم اسے اسی وقت شہزادے کے پاس لے گئے۔ اور شہزادی نے طبیب کے بھیس میں شہزادے کا علاج شروع کر دیا۔ وہ روزانہ طوطے کے بتائے ہوئے طریقہ پر پیسی ہوئی بیٹیں شہزادے کے زخموں پر لگاتی رہی اور شہزادے کے زخم روز بروز بھرنے لگے۔ شہزادی اس وقت طبیب کے بھیس میں تھی اس لئے شہزادہ بھی اسے نہ پہچان سکا۔ اور اسے طبیب ہی سمجھتا رہا۔

چند ہی روز میں شہزادے کے تمام زخم بھر گئے اور وہ بالکل اچھا ہو گیا۔ بادشاہ کو جب شہزادے کی صحت کی اطلاع دی گئی تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے اسی وقت حکم دیا کہ: "اس طبیب کو دربار میں پیش کیا جائے جس نے شہزادے کے زخم اچھے کئے ہیں ہم اسے کچھ انعام دینا چاہتے ہیں۔؟" جب شہزادی طبیب کے بھیس میں دربار میں پیش ہوئی تو بادشاہ خوش ہو کر بولا: "حکیم صاحب ہم آپ سے بہت خوش ہیں فرمایئے کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

شہزادی نے بادشاہ کے قریب بیٹھے ہوئے شہزادے پر ایک نظر ڈالی اور بولی: "حضور خدا کا اور آپ کا دیا بہت کچھ ہے۔ شہزادہ

اچھا ہوگیا، مجھے اور کچھ نہیں چاہیئے!"

اس پر بادشاہ نے کہا: "نہیں تم کچھ مانگو۔ جو تمہارا جی چاہے مانگو۔ ہم تمہاری ہر فرمائش پوری کریں گے؟"

اس پر شہزادی نے پھر وہی بات دوہرائی:

"خدا کا آپ کا دیا بہت کچھ ہے شہزادہ اچھا ہوگیا، مجھے اب اور کچھ نہیں چاہیئے!"

اس پر بادشاہ بولا:

"دیکھو، یہ تیسری اور آخری بار ہے۔ مانگ لو جو کچھ مانگنا ہے؟"

اس کے جواب میں شہزادی نے کہا:

"عالی جاہ! پہلے مجھے قول دیں؟"

بادشاہ خوش تھا۔ اس نے کہا:

"ہم تمہیں بچن دیتے ہیں کہ تمہاری ہر مانگ پوری کریں گے۔ مانگو کیا مانگتے ہو؟"

شہزادی نے بادشاہ سے عہد تو لے ہی لیا تھا۔ اس نے بادشاہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے شہزادے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "حضور! اگر آپ کچھ دینا ہی چاہتے ہیں تو مجھے شہزادہ عنایت کر دیں؟"

بادشاہ بڑا پریشان ہوا مگر وہ قول دے چکا تھا۔ ادھر شہزادہ بھی اپنی جگہ حیران بیٹھا اس عجیب و غریب طبیب کو دیکھ رہا تھا جو اسے مانگ رہا تھا۔ تمام دربار سناٹے میں آگیا کہ آخر اس عجیب مانگ کا مطلب کیا ہے۔ درباری ایک دوسرے کی طرف حیران نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

شہزادی بھی بھانپتی رہی۔ وہ چند قدم اور آگے بڑھی اور اس کے بعد اس نے اپنا مردانہ لباس اتار دیا۔ اور پھر بادشاہ یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا کہ جسے وہ طبیب سمجھ رہا تھا، دراصل وہ تو ایک حسین و جمیل شہزادی تھی۔ شہزادے نے شہزادی کو دیکھا، تو وہ بھی اچنبھے میں آگیا۔ وہ اب تک اسے نہیں پہچان سکا تھا۔ اس وقت دربار میں ہر شخص مبہوت یہ سارا ماجرا دیکھ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر شہزادی نے بادشاہ سے عرض کیا:

"میں حضور کو اور زیادہ حیران نہیں کرنا چاہتی۔ جہاں پناہ میں بھی ایک ملک کی شہزادی ہوں۔ میں شہزادے سے محبت کرتی ہوں اس کی جدائی برداشت نہ کرتے ہوئے اپنے ملک سے نکلی تھی بھوکی پیاسی شہزادے کو تلاش کرتی رہی۔ میں جنگلوں میں ماری ماری پھرتی رہی کہ اس طرح ایک درخت پر ایک طوطا اور ایک مینا کی گفتگو سنی، جب وہ اڑ گئے تو میں ان کی بیٹیں لیکر ان کے بتائے ہوئے راستہ پر چلتے چلتے یہاں تک پہنچ گئی۔ یہاں آکر میں نے شہزادے کا علاج کیا۔ اور اب میں آپ کے سامنے ہوں!" شہزادی کی کہانی سن کر بادشاہ بہت خوش ہوا۔ اس نے شہزادی کو اپنے ساتھ بٹھایا۔ اور اسی وقت اس کے باپ کے پاس اطلاع کرنے کے لئے ایلچی بھیج دیئے۔ اس کے بعد شہزادے اور شہزادی کی شادی کر دی گئی — اس بات کو صدیاں گزر چکی ہیں مگر کہتے ہیں آج بھی اگر طوطا اور مینا کہیں اکٹھے ہو جائیں تو وہ آپس میں اسی شہزادی کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔

لیکن ان کو ابھی تک اس بات کا پتہ نہیں چل سکا کہ شہزادی کو اس کا شہزادہ ملا ہے — یا نہیں! ٭

•

کسی ترقی پذیر ملک کی سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ اس کے پاس ایک ایسا دستور ہو جو ملکی استحکام کو یقینی بنا سکے اور انتظامیہ د پارلمان کے دائرہ کار کی پوری طرح وضاحت کرتا ہو، ورنہ حکومت کی مشینری ٹوٹ جائے گی ....

•

پاکستان میں برطانوی پارلمانی نظام جمہوریت ناکام ہوگیا۔ یہاں صدارتی طرز حکومت ہی استحکام کا موجب ہو سکتا ہے .....

— فیلڈ مارشل محمد ایوب خان

فکاھیہ:

"راز جواب راز نہیں!"

(میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں؟)

سید باقر علیم

میں افسانہ اتوار کے دن لکھا کرتا ہوں۔ ایک تو اتوار بڑا نیک دن ہے۔ دوسرے اس دن بظاہر فرصت ہوتی ہے۔ ایک ہفتہ پہلے سے اپنی متوقع شدید معروفیت کا اظہار کر دیتا ہوں — دوستوں، قرض خواہوں، ہمسایوں، بیوی بچوں، عارتیاً چیزیں مانگنے والوں اور دفتر کے سپرنٹنڈنٹوں سے۔ مدعا یہ ہوتا ہے کہ صرف اس دن مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ صبح سویرے اٹھتا ہوں۔ قلم دوات، کاپی سنبھال کر لکھنے کی میز پر جا بیٹھتا ہوں۔ مجھے افسانہ کے موضوع کے بارے میں کبھی کوئی الجھن نہیں ہوتی۔ عام غزل گو شعراء کی طرح اپنے ہر ہر لحظے کے تجربات تحت الشعور کے تہ خانے میں بھرتا رہتا ہوں۔ بوقتِ ضرورت بس ایک قافیہ ڈھونڈنے کی سعی کرنی پڑتی ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ قافیہ ہے میرے تجربات میں، ایک کا اسمِ گرامی، ادھر زبان پر بارِ خدایا ایک نام آیا۔ اُدھر میرا ذہن نچے تلے ، بنے بنائے افسانے کے تصور کو چومنے لگتا ہے یعنی سنورا سنورا افسانہ انگڑائیاں لینے لگتا ہے۔ افسانے کے موضوع کے لحاظ سے مجھے اپنے لباس میں ذرا سی تبدیلی کرنی پڑتی ہے۔ دیہاتی افسانے کے لئے ہتمد اور کھُلا کرتہ۔ عشقیہ افسانے کے لئے کوٹ پتلون۔ اور جاسوسی افسانہ لکھتے وقت میں اچکن اور چوڑی دار پاجامہ پہنتا ہوں۔ میں اس دن شیو نہیں کرتا۔ منہ ہاتھ نہیں دھوتا —— کھانا بھی نہیں کھاتا۔ افسانہ شروع کرتے وقت میرے ذہن میں مختصر مختصر افسانے کا پلاٹ ہوتا ہے۔ لکھتے لکھتے مختصر افسانے کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور ختم ہونے تک وہ افسانہ طویل مختصر افسانے سے بھی دو تہائی لمبا ہو جاتا ہے!

میں سمجھتا ہوں کہ میں اس طرح کی جنرل باتیں کرنے کی بجائے اگر اپنے کسی ایک افسانے کی رپورٹ پیش کر دوں تو بات واضح کرنے میں مجھے سہولت رہے گی۔

میرے اس افسانے کا عنوان تھا "بیل کا شملہ" میں نے مناسب حال لباس زیبِ تن کیا۔ اور افسانہ لکھنا شروع کر دیا۔ ابھی آغاز ادھورا ہی تھا کہ حویلی کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کوئی نوٹس نہ لینا چاہا۔ مگر یہ دستک فوراً تمام اخلاقی حدود پھاندنے لگی۔ میرا خیال تھا دودھ والا ہوگا۔ اُس کو آئندہ اتوار کو دیر سے آنے کی فہمائش کر دوں گا۔ اٹھ کر کھڑکی میں سے جھانکا۔ دروازے کے سامنے میرے ایک ہم پیشہ کھڑے تھے اور بہت مضطرب معلوم ہوتے تھے۔ میں نے احتیاط سے نہیں جھانکا تھا۔ اس لئے وہ بھی مجھے دیکھ لینے میں کامیاب ہو گئے! میں نے کھڑکی سے زیادہ دیر تک اُن سے گفتگو جاری رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ محلے والوں کے "خوابِ اتوار" سے بیدار ہو جانے کا شدید خطرہ تھا۔ کمبل اوڑھ کر نیچے بیٹھک میں آگیا۔ آج میں دیہاتی افسانہ لکھ رہا تھا۔ میری یونیفارم دیکھ کر خصوصاً بہت دیر قربان ہوتے رہے۔ تہمد کے آسان اور ریڈی میڈ ہونے پر تقریر کرتے رہے۔ رسمی گفتگو کے بعد میں نے اُن سے اس منہ اندھیرے آنے کی وجہ پوچھی۔ معلوم ہوا کہ آپ سیر کو نکلے تھے۔ صرف اتوار کو سیر کرتے ہیں۔ واپسی پر مجھے ہیلو کرنے چلے آئے تھے کوئی دو گھنٹے بیٹھے رہے۔ پھر اُن سے نہ رہا گیا۔ آمدند بر سرِ مطلب میں نے دو تین دن پہلے مذاق مذاق میں، کہیں یہ کہہ دیا تھا کہ میں نوکری سے استعفیٰ دینے والا ہوں پروموشن کے مقاصد کے لئے میرے فوراً بعد ان صاحب کا نمبر ہے۔ اسی فکر میں رات بھر نہیں سوئے اور علی الصبح قدم رنجہ فرمانے کی یہی وجہ تھی۔ کافی دیر تک میرے استعفیٰ کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ اور یہ داستان کوئی ایک گھنٹے اور جاری رہتی مگر میں نے انہیں اپنے ہاتھ میں لیا ہوا قلم دکھا کر کہا۔ "استعفیٰ کا ڈرافٹ تیار کر رہا تھا"۔ نسخہ مجرب ثابت ہوا۔ وہ اسی وقت اٹھ کر چلے گئے۔

واپس آیا تو ذہن سے ہیرو غائب تھا۔ اور جب کبھی حاضر ہوتا تو اُن صاحب کی شکل وصورت میں آمودار ہوتا۔ میں نے ان کے تختی پن کو ہیرو کی شکل وشباہت میں تھوڑی سی جگہ دی تو جا کر معاملہ درست ہوا۔ پھر ذرا طبیعت رواں ہوئی۔ مگر اس وقت تک گھر کے سب لوگ جاگ چکے تھے۔ میں نے کھڑکیاں بند کریں مگر روشندانوں سے گھر کی رونق، چھن چھن کر آنے لگی تھی۔ ہیرو کی کردار نگاری بڑے زوروں پر تھی، کہ میرے کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور میرے تینوں بچے آگے پیچھے ایک لائن میں اچھی اچھی پوشاکیں زیب تن کئے بوریاں چمکائے آ وارد ہوئے۔ میں نے مارے غصے کے قلم میز پر پھینک دیا۔

"سویرے سویرے کیا ہوا ہے تم لوگوں کو؟"

"ابّاجان۔ امّی کہتی ہیں، بازار نہیں جائیں گے؟۔ ہمارے موزے پھٹ گئے ہیں۔" بڑی لڑکی نے اس وفد کی ترجمانی کی۔

"موزے پھٹ گئے ہیں۔ تینوں کے موزے پھٹ گئے ہیں؟ ننھے کو تو ابھی ٹھیک ٹھیک چلنا بھی نہیں آتا۔" میں نے اپنے غصے کو بحث کا روپ دے کر کہا۔ پھر فوراً ہی خیال آگیا۔ بچوں سے غصہ مناسب نہیں ہوتا، لہجے میں دنیا بھر کی مٹھاس بھری اور کہا:

"دیکھو بیٹیو! اور بیٹو! اس وقت تو دکانیں بند ہوں گی جب بازار کھلنے کا وقت ہوگا۔ یعنی ٹھیک دس بجے میں تم کو لے چلوں گا۔ مگر اُس وقت ریڈیو پاکستان سے بچوں کا پروگرام ہوتا ہے، ویسے تم جیسا چاہو —— ؟"

"ہم بازار نہیں جائیں گے، ہم بازار نہیں جائیں گے، بچوں کا پروگرام سنیں گے۔" میرے بچے یہ کورس گاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے، اور میں اپنی حاضر دماغی کی داد دینے کے بعد پھر افسانے کی طرف متوجہ ہوا۔ اس وقت مجھے سوجھا، کہ اگر میرے ہیرو کے بھی "عیال واطفال" ہوجائیں تو اس کی حالت اور قابلِ رحم ہوجائے گی۔ سو میں نے وہ پیراگراف یکسر ختم کردیا جس میں ہیرو کا کنوارپن سجا پڑا تھا۔ اس ضروری ترمیم میں کوئی آدھ گھنٹہ لگ گیا۔ اس طرف سے اطمینان ہوگیا تو قلم پھر میرے ہاتھ میں تھا اور میں تیز تیز لکھنے لگا۔ بچوں کو ٹالتے وقت مجھ سے ایک غلطی ہوگئی تھی۔ مجھے وقت کا اندازہ نہیں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ دس بجنے میں ابھی بہت سی دیر ہوگی۔ مگر ہوا یہ کہ تھوڑی ہی دیر میں میرے تینوں بچے اپنے عام لباس میں ملبوس مع محلے بھر کے دوستوں، اور سہیلیوں کے آ پہنچے۔ سوچ بچار فضول تھی۔ اتنے بہت سے لوگ دیکھ کر میرا ذہن ویسے بھی جواب دے جاتا ہے۔ ریڈیو میرے کمرے سے جانے میں کئی خدشات تھے۔ میں نے ریڈیو اور کمرہ بچوں کے حوالے کیا۔ کاپی قلم۔ میز سے اٹھا کر باہر دھوپ میں آ بیٹھا۔ لکھنا چاہتا ہوں مگر ذہن میں دنیا بھر کے بچے گھسے ہوئے ہیں اور نکلنے کا نام نہیں لیتے۔ ان کو نکالنے میں کامیاب ہوجاتا ہوں تو ہیرو کے بہت سے بچے پہنچ جاتے ہیں۔ میں نے اُکتا کر کاپی بند کردی۔ اور کرسی چھوڑ کر کھڑا ہوگیا۔ نومبر کی سنہری دھوپ لوریاں دینے لگی۔ میں کھڑا کھڑا اونگھنے لگا۔ عفت کمرے سے نکلی اُس نے مجھے اس قدر فارغ البال دیکھا تو پھر کمرے میں چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کے ایک ہاتھ میں تھیلا تھا اور دوسرے میں پانچ روپے کا نوٹ۔ دونوں ہاتھ میری طرف بڑھا کر بولی:

"ذرا گوشت لادیجئے۔"

"گوشت! کیوں؟ اب تک کون لاتا رہا ہے؟" میرے افسانے کے غصے کو نکاس کا یہ راستہ نظر آیا۔

"آپ عجیب باتیں کرتے ہیں۔ پہلے تو میں محلے کے کسی بچے سے منگا لیتی ہوں۔ وہ تو مجبوری کی بات ہے۔ اور وہ گوشت بھی اچھا نہیں لاتے۔ قصاب جو کچھ کاغذ میں لپیٹ دیتا ہے لے آتے ہیں...."

افسانے کے ادھورا رہ جانے کی وجہ سے جو اضطراب سا پیدا ہوگیا تھا۔ میں اُس کو دُور کرنے کے لئے بازار جانے پر رضامند ہوگیا۔ قصاب کی دکان پر بہت بھیڑ تھی۔ آخر کوئی گھنٹہ بھر کے صبر آزما دور کے بعد میری باری آئی۔ اس وقت دوکانوں میں، سری، پائے، یا بلیوں کے خوالوں، کے لئے چھیچھڑے رہ گئے تھے۔ میں سری پائے ہی تھیلے میں ڈلوا کر لوٹ آیا۔ مناسب گوشت نہ ہونے کی وجہ سے آج ہمارے گھر کھانا ناقابلِ برداشت ہوگا۔ مگر قصاب کی دکان پر زیادہ دیر رُکنے کی وجہ سے میرے افسانے کو بہت فائدہ پہنچا۔ قصاب کے چھرے

ڈکے، اُس کی آستینوں۔ چہرے۔ ہاتھوں پر خون یہ سب چیزیں
برے افسانے میں در آئیں تو رقیب (افسانہ) کا کردار لو بھیانک
بنانے میں مجھے بہت مل گئی۔

قصاب کی دکان سے گھر تک کی مسافت تقریباً بھاگ کر
طے کی۔ سودا عفت کی گود میں پھینکا۔ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا اور
بلدی جلدی لکھنے لگا۔ میں رقیب کی نئی شکل وصورت کو بھولنے
کا خدشہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ رقیب کی تصویر مکمل ہو گئی۔
گے بڑھنے کے لئے میں نے سوچنا شروع کیا۔ قلم میرے منہ
یں تھا۔ اور آنکھیں سیڑھیوں کے دروازے پر لگی تھیں۔ کچھ سوچ
نہیں پایا تھا کہ سیڑھیوں سے چڑھتی جمعدارنی نظر آگئی۔ سر پر ٹوکرا،
ہاتھ میں جھاڑو، گاڑھی بُکّل ماری ہوئی۔ مجھے بڑا غصہ آیا۔ ظاہر
ہے کہ اب صحن میں بیٹھ کر افسانہ لکھنا ناممکن ہو جائے گا۔

"جمعدارنی تم اتنی دیر سے کیوں آتی ہو..." میں نے اپنے
غصے کا اظہار تو کرنا ہی تھا۔ بروقت یہی سوال سُوجھ سکا۔

"بابو جی! آج ہی دیر ہو گئی ہے۔ اتوار تھا نا۔ میں چرچ چلی گئی
تھی" اس نے لجاجت سے کہا۔

اب آپ ہی بتائیں خدا کے ایسے عبادت گزار بندوں کے
آگے غصہ کہاں تک چلتا ہے۔ میں نے کاپی سنبھالی۔ میز اٹھائی اور
واپس کمرے میں آ گیا۔ ریڈیو پاکستان کا بچوں کا پروگرام کب کا ختم ہو چکا
تھا۔ بچے کہیں سے نشر ہوتے ہوئے گانے سن رہے تھے۔ اور
خبریں سننے کے انتظار میں تھے۔ بچوں کو بھگایا۔ دروازے، کھڑکیاں
بند کیں۔ اور لکھنے کے لئے بیٹھ گیا۔ مگر جمعدارنی کے فضول قصے نے
ذہن کو بھی صاف کر دیا تھا۔ کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ میں بدقت ہیرو
کو حاضر کرتا اور ساتھ ہی جھاڑو تھامے جمعدارنی آ ڈٹتی اور جانے کا
نام نہ لیتی۔ بات پلاٹ سے قطعاً متعلق نہیں تھی مگر میں نے کھینچ
گھسیٹ کر جمعدارنی کو افسانے میں داخل کر ہی لیا تب جا کر کہیں اس
سے گلو خلاصی ہوئی۔ مجھے جمعدارنی کی وجہ سے پلاٹ اچھا خاصا بدلنا پڑا۔

ضروری کاٹ چھانٹ کر کے آگے بڑھنے کی تیاری کر رہا
تھا۔ کہ میرا دروازہ زور سے بجا اور پھر ایک زنانہ ہاتھ نے کواڑوں
کے درمیان کی کشادہ درز سے گھس کر، کنڈی کھول دی۔ میرے
دونوں بیٹے کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے پیچھے عفت
آستینیں چڑھائے ہوئے تھی۔ ایک ہاتھ میں صابن، ایک ہاتھ میں
جھاواں۔ سر پہ تولیہ۔ بچے عجیب عجیب نظر آ رہے تھے۔ عفت
نے میری مدد کی۔ بتایا کہ ابھی ابھی بال کٹوا کر آ رہے ہیں۔ ہمارے
گھر میں غسل خانہ کوئی نہیں، میرا کمرہ ذرا بڑا ہے۔ مالکِ مکان نے
ایک کمرے کو یہ حیثیت دے رکھی ہے۔ پہلے تو میں نے بچوں اور
اس ناہنجار حجام کو کوسا۔ پھر عفت سے دو دو ہاتھ کیے۔ بالآخر کاپی
قلم دوات سنبھال کر بیٹھک میں جانے لگا۔

"آپ کھانا نہیں کھائیں گے؟ تین بج رہے ہیں۔"

"نہیں۔ میں چھ بجے کھاؤں گا۔" میں نے غصے سے کہا۔

"میرے اللہ آپ یہ لکھ کیا رہے ہیں۔"

"اپنی سسرال خط لکھ رہا ہوں۔" میں نے چلتے چلتے کہا۔

حیرت ہے، عفت نے سچ جانا۔ اور پھر مجھے شام کے
سات بجے تک کھانے کے لئے نہ پوچھا۔

میں عام طور پر بیٹھک میں بیٹھ کر لکھنے پڑھنے کا کام نہیں
کرتا۔ کھڑکی کھلی دیکھ کر کوئی نہ کوئی ملنے والا آ جاتا ہے اور بڑی
پریشانی ہوتی ہے۔ مگر آج میں نے تین سے چار بجے تک بڑے
تسلی بخش طور پر کام کیا۔ اور کوئی ملنے والا ادھر نہ پھٹکا۔ ہماری
بیٹھک کے عین سامنے ایک میونسپل کمشنر نے پچھلے الیکشنوں سے
پہلے ایک نلکہ لگوا دیا تھا، محلے کے ووٹ پھانسنے کے لئے۔ چار بجتے
ہی وہ نلکہ کھل گیا۔ سارے محلے کی عورتیں وہاں جمع ہو گئیں۔ میں کچھ
دیر تو بالٹیوں ڈولوں کی موسیقی سے پریشان ہوا۔ مگر تھوڑی دیر
کے بعد وہاں ایک ایسی داستان شروع ہو گئی، جو بڑی دلچسپ
تھی۔ یہ داستان ہمارے محلے کے ایک شخص کی تھی۔ یہ شخص تین چار
مہینے ہوئے اپنے گاؤں سے بھاگ کر آیا تھا۔ سچ پوچھیے تو میں
اسی کردار کو اپنے افسانے میں پیش کر رہا تھا۔ میں نے لکھنا ترک
کر دیا اور دروازے کے ساتھ لگ کر عورتوں کی باتیں سننے لگا۔
عورتیں آتی جاتی رہیں۔ مگر داستان کا تسلسل بڑی زنانہ چابکدستی
سے نہ ٹوٹنے دیا گیا۔ کوئی چھ بجے کا عمل ہو گا کہ اس شخص کی بہنیں
نلکہ پر آئیں۔ ان کے پہنچتے ہی داستان ختم ہو گئی، اور ایک
ہیبتناک جنگ کا آغاز ہوا۔ پہلے تو زباں درازی کی مشق
ہوتی رہی۔ پھر دست درازی شروع ہو گئی۔ کوئی پندرہ منٹ

(باقی ص۵۵ پر)

غزل

جلیل قدوائی

مہرباں مجھ پہ ہے وہ جو ستم ایجاد بھی ہے
دل مرا اس لئے بے شاد بھی، ناشاد بھی ہے

تیرا پیمانِ وفا جو کبھی پورا نہ ہوا
آج تک یاد ہے مجھکو، تجھے کچھ یاد بھی ہے؟

میرے دل کو ترے ملنے کی لگن کافی ہے
تیرا پابند ترے قرب سے آزاد بھی ہے!

آہ کرنے کے سوا کچھ نہیں آتا مجھکو
ہے یہی شکر مرا اور یہی فریاد بھی ہے

لگ گئی آج ٹھکانے وہ ترے کوچہ میں
غم نہیں اس کا مری خاک جو برباد بھی ہے!

سیکڑوں غم ہیں زمانہ کے مرے دل میں جلیل
سب پہ چھائی ہوئی اک ان کی مگر یاد بھی ہے!

★

طلعت اشارت

دل و نظر کی تمناؤں کو قرار آئے
تم آسکو تو خزاؤں میں بھی بہار آئے

بیانِ الفتِ زنداں بیانِ راہِ وف
انہیں صداؤں میں ہم زندگی گزار آ

سنبھل سنبھل کے زمانے کے ہر تلاطم سے
سفینۂ دلِ ناداں کو پار اتار آئے

جھکی نظر کو اٹھانا تو کوئی بات نہیں
نظر اٹھا کے جھکا لو تو اعتبار آ

کوئی حدود ہیں اہلِ جنوں نگاہوں میں
کہ سنگ و خشت اٹھاتے ہوئے بہار آئے

تمہاری دید نے سب غم بھلا دیئے ور
ہمیں تو ہیں جو چمن سے بھی لیکے خار آ

وہ بدگماں ہیں رہ و رسمِ محرمانہ سے
جنہیں دلوں کی لئے شمع ہم پکار آئے

جہاں پہ ساتھ نہیں دے سکا کوئی رہ
وہاں پہ نقشِ قدم کو ترے ابھار آ

★

غزل

ناصر شہزاد

گلشنِ شوق سے یہ کس کی صدا آتی ہے
چاکِ دل سے مجھے خوشبوئے حنا آتی ہے

جل بجھے آتشِ دوراں سے مہکتے جنگل
شہر میں خاک بہ سر بادِ صبا آتی ہے

تم نے مڑ کر مجھے دیکھا ہے کہ رُت بدلی ہے
رینگتے لمحوں سے آوازِ درا آتی ہے

آدمی وقت کی الجھن سے نکلتا ہی نہیں
زندگی دہر میں زنجیر بہ پا آتی ہے

جھجھاتے ہیں درختوں پہ بہاریں پتے
دف بجاتی ہوئی راہوں میں ہوا آتی ہے

شاخِ ہستی سے ترے غم کے بچھڑتے سائے
جیسے اُمڈی ہوئی گھنگھور گھٹا آتی ہے

ہر قدم بندشِ تعیّن میں ہے پھر بھی اے دوست
ہر نگہ جا کے تجھے ہات لگا آتی ہے

پھول چن دیتی ہے ایک ایک پلک اپنا ناصر
رنگ برساتی ہوئی شام بھی کیا آتی ہے

افضل حسین اظہر

فسانہ ہائے دلِ زار کیا کہے کوئی
کمالِ بے رخیٔ یار کیا کہے کوئی

ہوائے منزلِ گل کتنی جانفزا ہے مگر
فضائے رہگذرِ خار کیا کہے کوئی

کبھی کبھی تو سکوں میں بھی اضطراب ملا
خود اپنا دل ہے فسوں کار کیا کہے کوئی

اسیرِ غم کو ہے افسانۂ حیات عزیز
نہ تم سنو تو سرِ دار کیا کہے کوئی

ہمیں تو غم ہی میں آسودگی نظر آئی
جو ہو یہ حال تو غمخوار کیا کہے کوئی

سکونِ یاس کے صحرا میں گم ہے راہِ یقیں
اب انتظار بھی ہے بار کیا کہے کوئی

ہمیں تو مرحلۂ آرزو میں اے اظہر
کہاں کہاں نہ ہوئی ہار کیا کہے کوئی

"ترکستان ندارد"*

آغا محمد اشرف

اکتوبر ۱۹۶۰ء کے "ماہ نو" میں میں نے ڈاکٹر محمد صادق صاحب کے مضمون "آزاد کا سفر ایران" (ماہِ نو، جنوری ۱۹۵۸ء) پر تبصرہ کیا تھا، اور ان کی مندرجہ ذیل غلطیوں کی طرف توجہ دلائی تھی:

(۱) آزاد نے ایران کا سفر دو مرتبہ نہیں بلکہ صرف ایک بار ۱۸۸۵ء میں کیا تھا۔

(۲) ۱۸۶۵ء میں انگریزی حکومت کے ایما پر آزاد ایک سیاسی مشن کے ساتھ ترکستان گئے تھے۔

(۳) اس سیاسی مشن کے لیڈر گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر لائٹنر نہیں تھے، بلکہ اس کی قیادت پنڈت من پھول نے کی تھی، آزاد اور پشاور کے منشی فیض بخش ان کے معاون تھے، چوتھا شخص کرم چند سندر رام سنار، پنڈت من پھول کے ملازم کی حیثیت سے ان کے ساتھ گیا تھا۔

(۴) آزاد نے ۱۸۸۵ء میں ایران کا سفر صرف ادبی اور علمی مقاصد کے پیش نظر کیا تھا، اور ڈاکٹر صادق کا یہ دعویٰ کہ "مولانا کے سفرِ ایران کا محرک شوقِ تحقیق و تجسس نہ تھا۔ . . . بلکہ ایک سیاسی مشن تھا" نہ صرف غلط بیانی ہے بلکہ آزاد کے ادبی کارناموں سے صریحاً بے انصافی بھی ہے۔

میں نے اپنے تبصرے میں متعدد اسناد پیش کرنے کے بعد لکھا تھا کہ ایران اور ترکستان دو الگ الگ ملک ہیں اور آج تک (ڈاکٹر صادق کے سوا) کسی نے ترکستان کو ایران نہیں کہا۔ دسمبر ۱۹۶۰ء کے "ماہِ نو" میں ڈاکٹر صادق نے اپنی غلطی کا اعتراف ان دلچسپ الفاظ میں کیا ہے:

> "میں نے اپنی دانست میں اس کا عنوان "آزاد کا سفر ترکستان و ایران" تجویز کیا تھا۔ رسالہ دیکھنے پر آپ (مدیر) کو لکھا کہ لفظ "ترکستان" کیونکر رہ گیا۔ آپ نے لکھا کہ مسودہ میں ایران لکھا ہے۔ ترکستان ندارد! بہرحال اس کا عنوان "آزاد کا سفر ترکستان و ایران" ہے۔ . . .؟"

ڈاکٹر صادق کی اس توجیہہ کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی یہ سوال اپنی جگہ پر باقی رہتا ہے کہ صاحبِ مضمون کے احتجاج کے باوجود مدیر "ماہِ نو" نے اتنی صریح غلطی کی رسالے کی قریب ترین اشاعت میں تصحیح کیوں نہ کی[1] دنیا بھر کے ادبی اور علمی جریدوں میں اس قسم کی تصریحات آئے دن چھپتی رہتی ہیں، اور ان اعترافات کو صحافت کی روایات کے بموجب عیب نہیں بلکہ خوبی سمجھا جاتا ہے لیکن مدیر ماہ نو، ڈاکٹر صادق کے خط لکھنے کے باوجود خاموش رہے اور جب میں نے اس کوتاہی کی طرف توجہ دلائی تو ارشاد فرمایا:

> "اسے ہماری فروگذاشت سمجھئے، مضمون کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے ہمیں عنوان میں تصحیح کرنی چاہیے تھی اور آغا صاحب کو بھی. . . .؟" ("ماہِ نو" دسمبر ۱۹۶۰ء)

لیجئے یک نہ شد دو شد! ایک تو مدیر نے اپنا فرض منصبی ادا نہیں کیا، دوسرے انہیں اصرار ہے کہ اگر کسی مضمون کے عنوان یا متن میں کوئی غلطی رہ جائے تو ماہ نو کے قارئین کا فرض ہے کہ مضمون کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے اسے خود درست کر لیا کریں[2]۔ یہ کیا معنی کہ قارئین خود سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور بے کار بیٹھے بیٹھے صاحبِ مضمون پر اعتراض جڑ دیتے ہیں!

مگر ستم ظریفی یہ ہوئی کہ ڈاکٹر صادق کا زیر بحث مضمون جنوری ۱۹۵۸ء کے پرچے میں چھپا، غالباً اس کے چند روز بعد اس کے عنوان کے متعلق مدیر

---

[1] یہ سوال آغا صاحب کے مضمون کی اشاعت کے بعد پیدا ہوا۔ (مدیر)

[2] مدیر نے مختلف سنین کے حوالے دے کر یہ بات بھی مجھے یاد دلائی ہے کہ ڈاکٹر صادق نے آزاد کے متعلق اس وقت تحقیق شروع کی تھی جبکہ میں طفل مکتب تھا۔ سبحان اللہ! کیا نکتہ نکالا ہے۔ اور صاحبِ مضمون سے اپنے "علاقۂ خاص" کا ثبوت دے کر گواہ کی چستی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اگر بقولِ مدیر تحقیق کے معاملے میں بزرگی اور خوردی کو ہی معیار مانا جاتا تو آج تک زمین کو کوئی گول نہ مانتا۔ اور تحقیق و جستجو کے تمام راستے بند ہو جاتے۔

---

* یہ مضمون اس سلسلے کی آخری کڑی ہے۔ اس کے بعد اس موضوع پر کوئی مضمون یا مراسلہ شائع نہیں کیا جائے گا۔ (مدیر)

اور ڈاکٹر صادق میں خط و کتابت ہوئی ہوگی اور مدیر نے "ترکستان ندارد" والا جواب دیا ہوگا۔ اس واقعہ کے پورے ڈھائی برس بعد "ماہِ نو" کی جولائی ۶۰ء کی اشاعت میں ڈاکٹر صادق ہی کا آزاد پر ایک اور مضمون شائع ہوا اور مرغے کی پھر وہی ایک ٹانگ رہی۔ یعنی مدیرِ ڈاکٹر صادق کے مضمونِ زیرِ بحث کی نوعیت کو بھول گئے، عنوان کے متعلق ڈاکٹر صادق نے جو احتجاج کیا تھا، وہ بھی مدیر کو یاد نہ رہا، "ترکستان ندارد" والی بات بھی مدیر کے ذہن سے اتر گئی۔ اور اپنے تعارفی نوٹ میں ایک بار پھر فتویٰ صادر فرمایا کہ،

"آزاد کے سفرِ ایران کا مقصد سیر و سیاحت نہ تھا، سیاست تھا۔"

خدا جانے ڈاکٹر صادق اور مدیرِ "ماہِ نو" دونوں کو لفظ ترکستان سے ایسا بیر کیوں ہے کہ ہر مرتبہ باوجود کوشش کے ایران اور ترکستان میں تمیز نہیں کر سکتے!

چنانچہ زیرِ بحث مضمون کے عنوان کی غلطی تسلیم کرنے کے باوجود ڈاکٹر صادق کی تشفی نہیں ہوئی۔ غالباً ان خاتون کا یہ کہنا کہ "آپ کے خلاف ایک زوردار مضمون شائع ہوا ہے۔" انہیں بار بار پریشان کرتا رہا۔ اور اب معاملہ کٹ حجتی اور کج بحثی پر جا پہنچا۔ میرے اعتراضات کے جواب میں ڈاکٹر صادق کا سارا خط پڑھ جائیے (جو ماہِ نو کی دسمبر ۶۰ء کی اشاعت کے پانچ صفحوں پر چھپا ہے) اس کا خلاصہ یہی نکلتا ہے کہ بہت اچھا! اگر میں نے ایران اور ترکستان میں تمیز نہیں کی تو کیا ہوا۔ اس غلطی میں اور لوگ بھی تو میرے شریک ہیں۔ مجھے یقین ہے، ڈاکٹر صادق نے اپنے شاگردوں کو یہ سبق دیا ہوگا کہ غلطی کا اعادہ خواہ کتنی بار کیا جائے، اور غلطی خواہ کسی سے بھی ہو، غلطی ہمیشہ غلطی ہی رہتی ہے۔

جوشِ بحث میں ڈاکٹر صادق نے یہاں تک لکھ دیا کہ "اگر ایران سے مراد مشرقی اور شمالی ایران کے کچھ حصے بھی ہو سکتے ہیں تو مولانا دو دفعہ ایران تشریف لے گئے" لیکن ان حصوں کی تفصیل یا تشریح انہوں نے نہیں بتائی کہ آزاد ایران میں کہاں کہاں گئے تھے۔ شاید اس مرتبہ پھر جغرافیہ دانی نے ڈاکٹر صادق کا ساتھ نہیں دیا۔ اگر جواب لکھتے وقت یہ کالج کی لائبریری سے افغانستان، ایران اور ترکستان کے نقشے منگا کر اپنے سامنے رکھ لیتے تو یہ فقرے ان کے قلم سے ہرگز نہ نکلتے۔ سخندانِ فارس میں بلخ تک پہنچنے کا ذکر آزاد نے خود کیا ہے[1]۔ اس کے بعد آزاد کی منزلِ مقصود ترکستان کا وہ علاقہ تھا کہ جہاں ۱۸۶۵ء میں روسی فوج کشی کر رہے تھے، کابل سے بخارا جانے والے قافلے صدیوں سے تاشقرغان (خلم) کے راستے سفر کرتے چلے آئے تھے، انڈیا آفس رپورٹ کے مطابق کابل سے پنڈت من پھول اور آزاد اور باقی کے دونو ساتھی ایک قافلے کے ہمراہ تاشقرغان (خلم) آئے تھے، اس زمانے میں تاشقرغان قافلوں کا بہت بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا کہ جہاں مغرب، مشرق، شمال اور جنوب سے آ کر راستے ملتے تھے، تاشقرغان (خلم) سے ۱۲ نومبر ۱۸۶۵ء کو پنڈت من پھول اور کرم چند سنار تو قندز کے راستے بدخشاں چلے گئے اور آزاد اور فیض بخش نے بلخ کی راہ سے بخارا کا رخ کیا۔ انیسویں صدی کے کسی وسطِ ایشیا کے نقشے پر دیکھ لیجیے، بلخ سے ترکستان جانے والا راستہ شمال کی جانب آمو دریا (دریائے جیحوں) کو عبور کرتا، قرشی سے گذرتا، ڈھائی سو میل کی مسافت طے کرنے کے بعد بخارا جا پہنچتا ہے۔ آزاد کے کاغذات میں ان کے اپنے ہاتھ کا کھینچا ہوا ایک نقشہ بھی ملا ہے، جس میں کابل، بخارا، سمرقند اور ترکستان کے ان تمام علاقوں کی تفصیل موجود ہے کہ جہاں انہیں جانے کی ہدایت کی گئی تھی۔

ڈاکٹر صادق کو اصرار ہے کہ آزاد نے شمالی اور مشرقی ایران کے علاقوں کا سفر بھی کیا تھا۔ بلخ سے قریب ترین ایرانی سرحد کا فاصلہ تین سو میل سے زیادہ ہے، اگر بفرضِ محال آزاد کا ایرانی سرحد تک جانا تسلیم کر لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ پہلے آزاد نے بلخ سے ایران کی سرحد تک ۳ سو میل کا طولانی سفر کیا اور وہاں سے پھر تین سو میل کی منزل طے کر کے بخارا پہنچے، گویا صرف ایران کی سرحد کو ہاتھ لگانے کے لئے آزاد نے چھ سو میل کی خطرناک مسافت اختیار کی، حالانکہ بلخ سے بخارا کا سیدھا راستہ صرف ڈھائی سو میل کا تھا، ڈاکٹر صادق کے اس قیاس کو کوئی تسلیم نہیں کر سکتا۔

یہاں ایک اور بات بھی یاد رکھنی ضروری ہے کہ جس وقت یہ سیاسی مشن ترکستان گیا ہے، انگریزوں کے ایران سے دوستانہ تعلقات استوار ہو چکے تھے، اور برطانیہ کے سفیر اور ایلچی ایران کے ہر حصے میں بیٹھے پل پل کی خبریں لندن اور کلکتے بھیج رہے تھے۔ ایسی صورت میں مشن کے کسی ممبر کا ایران بھیجنا وقت کا ضائع کرنا تھا۔ انگریزوں کو صرف مشرقی ترکستان میں روسی فوجوں کی نقل و حرکت سے دلچسپی تھی، امیر بخارا نے مغربی باشندوں اور سیاحوں کا ترکستان میں چونکہ داخلہ ممنوع قرار دیا تھا، اسلئے مشن کے ممبروں کو حکومتِ ہند نے صرف ترکستان اور بدخشاں جانے کی ہدایات دی تھیں۔ اس بیان کی تصدیق اس سوانامے سے بھی ہوتی ہے کہ جس کا

---

[1] سخندانِ فارس، لاہور ایڈیشن ۱۹۵۵ء صفحہ ۶۳

مسودہ ڈاکٹر صادق نے اپنے زیرِ بحث مضمون کے ساتھ شائع کیا ہے۔

اس بارے میں سب سے بڑی شہادت وہ رپورٹ ہے کہ جسے گورنر جنرل، لارڈ جان لارنس نے ایک مراسلے کے ساتھ ۹ جولائی ۱۸۶۶ء کو شملہ سے وزیرِ ہند، رائٹ آنریبل سر اسٹافرڈ نارتھ کوٹ کے نام لندن بھیجا تھا (لارڈ لارنس کا خط اور رپورٹ حال ہی میں انڈیا آفس لائبریری سے مجھے ملی ہے، اور اس کا مائکروفلم میرے پاس محفوظ ہے) ملاحظہ فرمائیے، انڈیا آفس رپورٹ اس موقعہ پر کیا کہتی ہے، ؎۱

"یہ جماعت ایک ہی قافلے کے ساتھ تاشقرغان پہنچی اور پھر اس کے افراد منتشر ہو گئے، پنڈت من پھول اور کرم چند سنار بدخشاں روانہ ہو گئے، اور باقی کے ساتھیوں (آزاد اور فیض بخش) نے بخارا کا رُخ کیا۔"

بخارا اور ایرانی سرحدیں بعد المشرقین ہے، اسلئے بخارا کا رخ کرنے سے مطلب ایرانی سرحد پر جانا نہیں ہو سکتا۔ اگر مشن کا کوئی ممبر ایران تک گیا تھا، تو رپورٹ میں اسے چھپانے کی کیا ضرورت تھی، صاف طور سے لکھ دیا جاتا کہ فلاں ممبر ایران ہوتا ہوا بخارا گیا تھا، اب بتائیے کہ انڈیا آفس رپورٹ کو درست مانا جائے یا ڈاکٹر صادق کے "معتبر ذرائع" کو؟ ؎۲

ڈاکٹر صادق کے یہ معتبر ذرائع کیا ہیں؟ انہوں نے اپنی معلومات کا ذریعہ مولوی خلیل الرحمٰن کے ایک خط اور آغا طاہر مرحوم کی تحریر کو قرار دیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی مولوی خلیل الرحمٰن کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ (آزاد) اس معاملے میں اتنے محتاط تھے کہ انہوں نے ان (مشن کی تفصیلات) کا ذکر اپنی اہلیہ تک سے نہ کیا ہوگا (ماہِ نو، جنوری ۱۹۵۸ء)۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر احتیاط کا یہ عالم تھا تو مولوی خلیل الرحمٰن کو سفر کی تفصیل کیسے معلوم ہوئی اور یہ بات انہوں نے کیسے معلوم کی کہ آزاد ایران بھی گئے تھے، رہا آغا طاہر کا معاملہ، انہوں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ سفر ترکستان کے حالات میں نے آزاد کی زبانی سنے تھے، اور یہ ممکن بھی نہیں تھا۔ کیونکہ آغا طاہر نے جب ہوش سنبھالا ہے تو آزاد کی دماغی صحت جواب دے چکی تھی، واقعہ یہ ہے کہ اس مشن کی تفصیلات کا کسی کو علم نہیں تھا، اور اس کے متعلق ہر شخص صرف قیاس آرائی سے کام لے رہا تھا۔ حد یہ ہے کہ خود ڈاکٹر صادق کو بھی مشن کی روانگی کی تاریخ کا یقین نہیں تھا چنانچہ زیرِ بحث مضمون میں انہوں نے "غالباً ۱۸۶۵ء میں" لکھ کر اس بات کا ثبوت دیا ہے۔ اور آغا طاہر کے نزدیک تو اس سفر کی ابتداء ۱۸۶۷ء میں ہوئی تھی۔ (ڈاکٹر صادق نے مکتوباتِ آزاد سے آغا طاہر کی عبارت نقل کی ہے)

سب سے زیادہ تعجب اس امر پر ہوتا ہے کہ بقول ڈاکٹر صادق انہوں نے وہ "نادر" ؎۱ سوالنامہ تو شائع کر دیا جو آزاد کو حکومت نے سیاسی مشن پر جاتے وقت دیا تھا، مگر اس سے نتیجہ یہ عجیب و غریب نکالا:

> "اس مسودے سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوتی
> ہے کہ مولانا کے سفرِ ایران کا محرک شوقِ تحقیق و تجسس
> نہ تھا، جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے، بلکہ
> ایک سیاسی مشن تھا۔" (ماہِ نو جنوری ۱۹۵۸ء)

سوالنامہ پڑھنے کے بعد اگر کوئی بات قطعی طور سے ثابت ہوتی ہے تو یہ کہ:

(۱) سوالنامے میں ایران کا کہیں ذکر تک نہیں آیا۔ بار بار بخارا، کوکند، بدخشاں، کاشغر، یارقند، اور ختن اور روس کا ذکر آیا ہے

(۲) آزاد اور مشن کے دوسرے ممبروں کو حکومت نے ترکستان جا کر روسی فوج کی نقل و حرکت معلوم کرنے کی ہدایت کی ہے۔

؎۱ ۱۹۵۸ء میں جبکہ میں آزاد کے سفرِ ترکستان کے متعلق اپنی کتاب کا مواد جمع کر رہا تھا تو ڈاکٹر صادق سے ملنے، اپنے ایک دوست کے ساتھ انکے مکان پر گیا تھا دورانِ گفتگو میں نے ان سے دریافت کیا تھا کہ سوالنامے کا مسودہ آپ کے پاس کیسے پہنچا، کیونکہ یہ مسودہ تو آزاد کے خاص کاغذات کے ساتھ آزاد منزل لاہور میں مقفل تھا۔ مگر میرے اصرار کے باوجود ڈاکٹر صادق نے مسودے کا بھید نہیں کھولا، اس گفتگو کا اعتراف ڈاکٹر صادق نے "ماہِ نو" دسمبر ۱۹۶۰ء کے پرچے میں بھی کیا ہے۔

؎۱ آزاد کے سفرِ ترکستان کے مفصل حالات اور انڈیا آفس رپورٹ کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو، میری کتاب "انیسویں صدی میں وسطِ ایشیا کی سیاحت" مطبوعہ ہمدرد اکیڈمی، نیو ٹاؤن کراچی۔ ؎۲ بخارا سے آزاد سمرقند، خجند اور دریائے آرس کے کنارے چم کنت تک، اس علاقے میں گئے تھے کہ جہاں روسی فوجیں حملے کر رہی تھیں۔ فیض بخش نے بھی اسی علاقے کا علیحدہ سفر کیا تھا مگر وہ چم کنت نہیں گئے تھے۔ ۷-۸ مہینے مشرقی ترکستان میں پھرنے کے بعد آزاد اور فیض بخش، بدخشاں کے پایۂ تخت فیض آباد میں پنڈت من پھول سے جا ملے، جو کئی مہینے سے وہاں بیٹھے ان کا انتظار کر رہے تھے فیض آباد سے یہ جماعت پامیر کے فلک بوس کوہستانی سلسلے کو عبور کرتی، کافرستان، چترال اور دیر کے راستے، نومبر ۱۸۶۶ء کو پشاور واپس پہنچ گئی۔ اسلئے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ترکستان سے واپسی کے وقت آزاد ایران گئے ہوں گے۔

(۳) ڈاکٹر صادق ترکستان کو غلطی سے ایران سمجھ رہے ہیں۔ اور اب اپنی خفت مٹانے کے لئے آزاد کو زبردستی مشرقی اور شمالی ایران تک بھیجنا چاہتے ہیں۔

(۴) ترکستان کے مشن کی غایت یقیناً سیاسی تھی، اور آج تک کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ آزاد نے ترکستان کا سفر علمی تحقیق کے لئے کیا تھا۔

خارجی شہادتوں کے بعد ڈاکٹر صادق نے داخلی شہادت کے طور پر سخندانِ فارس کے متعدد اور طویل اقتباسات دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سخندانِ فارس کا مسودہ آزاد نے سیاسی مشن سے واپسی پر تیار کیا تھا اور چونکہ ان اقتباسات میں بار بار ایران کا ذکر آیا ہے اسلئے آزاد اس وقت ایران کا سفر کر چکے تھے۔

ملاحظہ کیجئے آزاد خود اس بارے میں کیا فرماتے ہیں :

"سخندانِ فارس مدت سے پھٹے پرانے کپڑوں میں پڑا سوتا تھا، یہاں تک کہ کل سے پرسوں اور مہینوں سے برسوں گذر گئے، جب بندۂ آزاد ایران سے آیا، تو ہم زبانی کے جذبوں نے زور کیا، مصلحت نے کہا اس وقت اُدھر کے خیالات تازے ہیں، سب سے پہلے اسے پورا کرنا چاہئے، ناچار نظرثانی کی۔ . . . ." (تمہید سخندانِ فارس، ۵ اگست ۱۸۸۰ء)

آزاد کی اس تمہید سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ سخندانِ فارس میں جہاں کہیں ایران کے موسموں، ایرانیوں کی طرزِ معاشرت اور ایرانی شہروں کا ذکر آیا ہے، یہ سب نتیجہ ہے آزاد کے سفرِ ایران کا جو انہوں نے ۱۸۸۵ء میں کیا تھا، اور سخندانِ فارس کے مسودے میں یہ تمام اضافے نظرثانی کے وقت کئے گئے تھے۔ ڈاکٹر صادق کو بھی اس کا اعتراف ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں :-

"اوپر کے بیانات میں چند ایسے ہیں جنہیں آزاد نے مسودہ میں سفرِ ایران کے بعد بڑھایا ہے لیکن بیشتر ۱۸۷۲ء والے مسودہ میں ہو بہو موجود ہیں"

وہ "بیشتر" بیانات کونسے ہیں جو ہو بہو ۱۸۷۲ء والے مسودے میں موجود ہیں، ان کی تفصیل کے متعلق ڈاکٹر صادق خاموش نظر آتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صادق کے سامنے آزاد کی لکھی ہوئی تمہید موجود تھی، اور انہیں علم تھا کہ سخندانِ فارس کے مسودے پر آزاد نے نظرثانی کے بعد متعدد اضافے کئے ہیں، لیکن اس کے باوجود انہوں نے متعدد اقتباسات نقل کر ڈالے۔ ان اقتباسات میں شیراز کی بلبل، ایران کے حماموں، بازاروں اور شہروں کا ذکر کیا گیا ہے، اور اگر انہیں "سیرِ ایران" سے ملا کر پڑھا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ تمام تاثرات سیاحتِ ایران کے ہیں، سفرِ ترکستان سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔ ڈاکٹر صادق کے اس بیان پر صرف اسی صورت میں سنجیدگی سے غور کیا جا سکتا تھا، کہ سخندانِ فارس کے رفاہِ عام پریس کے پہلے ایڈیشن سے اقتباسات دیتے اور پھر بعد کے ایڈیشن سے ان کا تقابل کر کے ثابت کرتے کہ پہلے ایڈیشن میں بھی ایران کی سیاحت کا ذکر موجود ہے۔ مگر اس قسم کے تقابل سے انہوں نے دانستہ طور پر پہلو تہی کی ہے۔ صرف اتنا لکھا ہے کہ میں نے آغا باقر کے پاس سخندانِ فارس کا مسودہ دیکھا تھا، اس میں بھی ہر جگہ ایران کا ذکر موجود ہے۔ مسودہ تو ڈاکٹر صاحب نے ضرور دیکھا ہوگا۔ مگر اس سے نتیجہ حسبِ معمول انہوں نے غلط اخذ کیا، اگر سخندانِ فارس کے مسودے میں ایران کا ذکر نہ ہوتا تو ڈاکٹر صاحب کو تعجب کرنا چاہئے تھا، کیونکہ یہ وہی مسودہ ہے کہ جسے آزاد نے سیاحتِ ایران کے بعد 'تمہید کے مطابق' متعدد اضافوں کے ساتھ مکمل کیا تھا۔

ڈاکٹر صادق نے سخندانِ فارس سے پہلا اقتباس یہ نقل کیا ہے:

"پھر ایران تک گیا، موبدوں اور دستوروں سے ملا۔"

خدا جانے اقتباس کی عبارت انہوں نے یہیں کیوں ختم کر دی، حالانکہ آزاد نے اگلا فقرہ یوں لکھا ہے :

"ایک برس وہاں رہا"

غالباً ایک برس ایران میں رہنے کی مدت، ڈاکٹر صادق کی دلیل کا پردہ چاک کر رہی تھی، اسلئے "لاتقربوا الصلوٰۃ" کی طرح انہوں نے بھی ادھورا بیان نقل کر دیا۔ آزاد کے تینوں فقرے ملا کر پڑھئے، صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کا اضافہ مسودے میں سیاحتِ ایران کے بعد ہوا تھا، جبکہ آزاد ایک سال ایران رہے تھے، اور شیراز، اصفہان، نیز اور طہران میں موبدوں اور دستوروں سے ملے تھے، "سیرِ ایران" پڑھنے کے بعد ڈاکٹر صادق کو اس تفصیل سے بخوبی واقف ہونا چاہئے تھا۔

آخری سوال یہ رہ جاتا ہے کہ مشن کے لیڈر پنڈت من پھول تھے یا ڈاکٹر لائٹنر۔ اس معاملے میں ڈاکٹر صادق کو اپنے "معتبر ذرائع" پر اصرار

ہے اور بار بار لکھتے ہیں کہ مشن کی قیادت لائٹنر نے کی تھی، لیکن انڈیا آفس رپورٹ میں مشن کے لیڈر کے متعلق کچھ اور لکھا ہے،

"پنڈت من پھول، ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر اور سکریٹریٹ کے میر منشی نے جو کئی سال سے وسطِ ایشیا اور مشرقی ترکستان کی تجارت، معدنی وسائل اور تاریخ کے متعلق صحیح معلومات جمع کرنے میں مصروف ہیں، تین ہمراہیوں کے ساتھ برطانوی سرحد کے اُس پار جا کر حتی المقدور حالات فراہم کرنے کے لئے اپنی خدمات رضاکارانہ طور پر پیش کیں۔"

رپورٹ میں مشن کے چاروں ممبروں کا تعارف کرانے کے بعد لکھا ہے:

"پنڈت من پھول نے بھائی دیوان سنگھ کا نام اختیار کیا اور ایک ہندو مہاجن کے روپ میں روانہ ہوئے، کرم چند (سنار) ان کے ملازم کی طرح ساتھ ہوا، منشی فیض بخش کا نام غلام ربانی تجویز ہوا اور یہ ایک تاجر بنے، محمد حسین (آزاد) ایک مسلمان طالب علم کی حیثیت سے (مہم میں شریک ہوئے)۔"

رپورٹ میں اس کے بعد ہر جگہ آزاد کا ذکر بہاء الدین کے نام سے ملتا ہے۔ کیونکہ ترکستان کا سفر انہوں نے اسی نام سے کیا تھا۔

ترکستان سے واپسی پر پنڈت من پھول نے مشن کے متعلق ایک مفصل رپورٹ تیار کی تھی، یہ بھی انڈیا آفس لائبریری کے کاغذات میں شامل ہے۔ اس میں پنڈت من پھول نے مہم پر روانہ ہونے کا حال یوں بیان کیا ہے:

"اوائل اگست ۱۸۶۵ء میں میں مری سے روانہ ہوا۔ مجھے سرکاری ہدایات یہ ملی تھیں کہ میں خود تو بدخشاں جاؤں اور میرے نائبین غلام ربانی (فیض بخش) اور بہاء الدین (آزاد) بخارا اور ختن جا کر ہز ایکسیلینسی وائسرائے (لارڈ لارنس) کے حکم کے مطابق وسطِ ایشیا میں روسی کارروائیوں کا حال معلوم کریں۔ (حکومتِ پنجاب کے) سکریٹری نے مجھے امیر کابل، شیر علی خاں اور میر بدخشاں کے نام تعارفی چٹھیاں دی تھیں...."

ساری رپورٹ پڑھ جائیے۔ ڈاکٹر لائٹنر ندارد!

اس بات کا فیصلہ میں قارئین پر چھوڑتا ہوں کہ انڈیا آفس کی رپورٹ کو زیادہ دقیع سمجھا جائے گا یا ڈاکٹر صادق کے "معتبر ذرائع" اور سنی سنائی روایات کو کہ جنکی بنیاد پر انہوں نے آزاد کے سفرِ ترکستان کے متعلق قیاس آرائیوں کی ہوائیاں اُڑائی ہیں۔

●

پُرانے نظام کو پھر رائج کرنا پرلے درجے کی حماقت ہوگی۔ اس لئے ایک ایسا نظام مرتب کیا جائے گا جو ملک کو استحکام عطا کر سکے۔ پارلمانی طرزِ حکومت اس جگہ کامیاب ہو سکتی ہے۔ جہاں مستحکم سیاسی جماعتیں موجود ہوں اور ایک بھاری اکثریت پر اثر رکھنے کے باعث اپنے ملک کو کوئی مستحکم حکومت دے سکیں۔ پاکستان میں پارلمانی طرزِ حکومت کا انجام یہ دکھائی دیتا ہے کہ مخلوط حکومتوں کا ایک سلسلہ جاری رہے۔ مگر ایسی حکومتیں کبھی بھی مضبوط حکومتیں ثابت نہیں ہوئیں، اصلاحات اور تعمیرِ قومی کے مشکل مسائل سے نبٹنے کے قطعی ناقابل۔ اب مثلاً ملک میں زرعی اصلاحات کے معاملہ ہی کو لیجئے۔ مغربی پاکستان میں ہم نے سات ہزار سے زائد بارسوخ زمینداروں کو ان کی ۲۵ لاکھ ایکڑ زمینوں سے محروم کر دیا۔ اب فرمائیے کسی پارلمانی نظامِ حکومت کے تحت قائم شدہ کوئی حکومت۔ مخلوط حکومتوں کا تو کہنا ہی کیا۔ یہ سب کچھ کر سکتی تھی؟

—— فیلڈ مارشل محمد ایوب خان

تعارف:

وزیرستان

محمد شفیع صابر

سابق صوبہ سرحد کی قبائلی سیاست، بلکہ برصغیر ہند و پاکستان کے سرحدی مسائل میں جو اہمیت وزیرستان کو حاصل رہی ہے، شاید ہی کسی اور علاقے کو نصیب ہوئی ہو۔ کوئی حربہ ایسا نہیں جو انگریزوں نے اپنے عہد میں وزیرستان کو مطیع کرنے کے لئے نہ آزمایا ہو۔ یہاں تک کہ بمبار ہوائی جہازوں اور توپ و تفنگ سے مسلح چالیس چالیس ہزار سپاہی بیک وقت وزیرستان کے آزاد قبائل کے خلاف بھیجے گئے اور کروڑوں روپیہ ان جنگوں میں تباہ ہوا، لیکن انہیں اپنے عزائم میں کامیابی نہ ہوئی۔ ان بے وجہ اخراجات کے خلاف ملک بھر کے اخباروں اور سیاسی رہنماؤں نے پورا پورا احتجاج کیا۔ بار بار اسمبلی کے ایوان میں اس مشکل سے نجات پانے کی تدبیریں سوچی گئیں۔ مگر قبائلی مسئلہ نہ حل ہونا تھا نہ ہوا۔ مگر آج وہی وزیرستان ہے اور وہی آزاد قبائل ہیں جو پاکستان کی شمال مغربی سرحد کے پاسبان بنے ہوئے ہیں۔ وہاں کی چھاؤنیوں سے پاکستانی افواج بھی ہٹالی گئی ہیں۔ اس کے باوجود ہر طرف امن و امان ہے اور وزیری اپنے دوسرے پاکستانی بھائیوں کے ساتھ ہنسی خوشی رہتے ہوئے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ کیوں؟ صرف تالیف قلوب سے۔ جو کام بموں سے نہ ہو سکا وہ باہمی اخوت نے کر دکھایا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اسلام کے احسانات جتاتے ہوئے کہا ہے۔ "وہ دن یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے لیکن ہم نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال کر بھائی بھائی بنا دیا۔ حالانکہ تم دنیا بھر کے خزانے بھی لٹا دیتے تو ایسا کبھی نہ ہو سکتا۔" یہ ارشادِ الٰہی آج وزیرستان پر کتنا صادق آتا ہے۔

وزیرستان کا رقبہ پانچ ہزار مربع میل کے لگ بھگ ہے اور یہ ٹل (ضلع کوہاٹ) سے لے کر درہ گومل تک شمالاً جنوباً تقریباً سو میل لمبا اور ڈیورینڈ لائن سے لے کر بنوں اور ڈیرہ کے اضلاع کی حدود تک تقریباً ساٹھ میل چوڑا ہے۔ وزیرستان اونچے پہاڑوں، خشک چٹانوں، بے آب و گیاہ وادیوں کا ایک خطہ ہے جو شکل و صورت میں ایک بے قاعدہ متوازی الاضلاع ہے۔ اس سطح مرتفع کے مغرب میں پانچ ہزار سے دس ہزار فٹ بلند وہ پہاڑ ہیں جو دریائے سندھ کے معاونوں اور دریائے ہلمند کے معاونوں کے درمیان حد فاصل ہیں۔ جہاں خیبر، مہمند اور مالاکنڈ کے قبائلی علاقے وادئ پشاور کے گرد ایک فصیل بنے کھڑے ہیں، وہاں وزیرستان کا علاقہ بنوں، کوہاٹ اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے لئے ایک حفاظتی دیوار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں ٹوچی اور گومل کے مشہور درے بھی ہیں۔ جہاں درہ ٹوچی، بنوں سے افغانستان کے علاقے برمل جانے والے راستے پر واقع ہے۔ وہاں درۂ گومل ڈیرہ جات سے بنوں جانے کا واحد ذریعہ ہے۔ یہ وہ درے ہیں جن کی راہ سے ہر سال افغانی پاوندے قافلوں کی صورت میں پاکستان کے مختلف شہروں میں آتے جاتے ہیں اور لاکھوں روپیوں کا لین دین کرتے ہیں۔ انہی دروں کی راہ سے محمود غزنوی اور دوسرے صاحبانِ سیف گزر کر ملتان اور ہندوستان کے دوسرے شہروں کی طرف بڑھے تھے۔

وزیرستان کے حدودِ اربعہ یہ ہیں: مغرب اور شمال مغرب میں افغانستان، جنوب میں ڈیورینڈ لائن اور بلوچستان، شمال مشرق اور مشرق میں علی الترتیب، کوہاٹ، بنوں اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے پاکستانی علاقے۔ شمال میں بنوں سے تیس میل اوپر دریائے کرم وزیرستان کو ضلع کوہاٹ اور کرم ایجنسی سے جدا کرتا ہے تو مغرب میں کوہ سلیمان کا پہاڑی سلسلہ دوتک افغانستان اور وزیرستا

کے درمیان ایک دیوار بنا کھڑا ہے۔ تختِ سلیمان اور "ابتا سوکئی"
اس پہاڑ کی مشہور چوٹیاں ہیں جو، بالترتیب، سمندر کی سطح سے گیارہ
ہزار ایک سو اور گیارہ ہزار سو تین سو فٹ بلند ہیں۔ تختِ سلیمان کے
نواح میں ایک مشہور زیارت گاہ بھی ہے۔

کیسر گڑھ یہاں کا ایک اور مشہور سلسلہ ہے جو کوہِ سلیمان
ہی کی ایک شاخ ہے۔ شمال میں وزیرستان کی دو اور مشہور چوٹیاں
ہیں ـــ شیخ حیدر اور پیر غل۔ یہ بھی تقریباً گیارہ ہزار فٹ بلند
ہیں۔ شیخ حیدر کی چوٹی سے شمال میں کوہِ سفید کی برفانی چوٹیاں
یوں دکھائی دیتی ہیں جیسے کوئی سنتری سفید پگڑی باندھے ایڑیاں
اٹھائے، ٹوچی اور گومل کے درّوں کی پاسبانی کر رہا ہو۔ پیر غل
سے نہ صرف تختِ سلیمان اور کیسر گڑھ کے سلسلہ کی "البتا سوکئی"
نامی چوٹیاں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ بلکہ مغرب میں غزنی کے پہاڑوں
کا دھندلا سا نظارہ بھی دیکھنے والے کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیتا
ہے۔ ہر چوٹی کے ساتھ کوئی نہ کوئی مقدس روایت بھی وابستہ ہو گئی
ہے اور یہاں کے سادہ طبیعت باشندوں میں یہ اعتقاد عام ہے
کہ مشہور دینی رہنما ان چوٹیوں پر جا کر عبادت و ریاضت میں معروف
رہا کرتے تھے۔

ٹوچی اور گومل کے درّے اور اطراف و جوانب کو جاتے
ہوئے کئی راستے وزیرستان کی بڑھتی ہوئی اہمیت کا باعث ہیں
اور ان کی حفاظت سے پاکستان کی مغربی سرحدوں کو مستحکم بنایا
جا سکتا ہے۔

وزیرستان اس لئے بھی جاذبِ توجہ ہے کہ اس کے چاروں
طرف اونچے اونچے پہاڑ ہیں اور درمیان میں میدان۔ گویا ایک طشتری
ہے جو کناروں پر تو اونچی ہے اور سنٹر میں چپٹی۔ یہی وجہ ہے کہ
شروع شروع میں انگریزوں کو وزیرستان کی تسخیر کی مہم میں شدید
مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

وزیرستان میں چار بڑی قومیں آباد ہیں۔ وزیر درویش خیل،
محسود، داوڑ اور بھٹنی۔ ان میں سے وزیر اور محسود دونوں نسلاً
وزیری ہیں۔ اس لئے وزیرستان کو اس کا نام انہی دو قوموں سے
ملا ہے۔ اب "وزیر" کا لفظ صرف درویش خیل سے ہی منسوب
ہو کر رہ گیا ہے۔ وزیر عموماً دو حصوں میں منقسم ہیں عثمان زئی اور احمد زئی

پیداوار کی کمی کے باعث جہاں وزیرستان کے لوگ
خانہ بدوشی کرنے پر مجبور ہیں، وہاں محنت و مشقت اور خطرہ
سے بھری زندگی نے ان میں ایسی خصوصیات پیدا کر دی ہیں کہ
وہ دنیا کے بہترین لڑاکوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ایک وزیر یا محسود
کئی کئی دن کھائے پیئے بغیر پہاڑی مورچوں پر ڈٹا رہتا ہے۔
نہ اسے یہ فکر ہوتی ہے کہ اس کی فصلیں اجڑ جائیں گی نہ یہ پرواہ
ہے کہ اس کا گھر بار تباہ ہو جائے گا۔ انگریزوں نے وزیریوں کو
دنیا بھر میں بہترین گوریلا لڑاکے قرار دیا ہے۔ سالہا سال انگریز
کے منظم لشکروں سے ٹکر لیتے لیتے قبائلی لوگ لڑائی کے فن میں
ماہر ہو گئے ہیں۔ وہ دشمن لشکر کی نقل و حرکت پر کڑی نگرانی رکھتے
ہیں۔ چرواہوں کے لباس میں بھیڑیں چراتے دشمن کے کیمپ
اور چوکیوں تک جا پہنچتے ہیں اور اس کی تعداد اور طاقت کا
پورا اندازہ لگانے کے بعد واپس آ کر لڑائی کی تیاریوں میں مشغول
ہو جاتے ہیں ـــ کئی بار تو انہوں نے انگریزی کیمپوں پر ایسے
آناً فاناً حملے کئے ہیں کہ خود انگریز حیران و ششدر رہ گئے۔ دور
دراز چوکیوں پر قبضہ کر لینا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے قبضہ
کرتے ہی اُن کے ہاتھ جس چیز پر اٹھتے ہیں وہ ولایتی ساخت کی
بندوقیں، مشین گنیں اور کارتوس ہوتے ہیں۔ آج وزیرستان
میں ہر شخص کے پاس اعلیٰ ساخت کی ولایتی بندوق موجود ہے

وزیرستان میں کچھ ایسے دستور بھی ہیں جن کے باعث
وزیری اندرونی مناقشات اور خانہ جنگیوں سے آزاد ہیں مثلاً
وہ خون کا بدلہ خون سے لینے پر اصرار نہیں کرتے اور یوں بھی
صرف قاتل ہی کو سزا دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس کے خاندان
خیل اور قبیلے سے کوئی تعرض نہیں کیا جاتا۔ ان کے ہاں سزائے
جرمانہ کا بھی رواج ہے۔ اگر قاتل خوں بہا ادا کر دے تو پھر اس
سے کوئی خصومت باقی نہیں رہتی۔

وزیرستان کے لوگوں میں اتفاق و اتحاد کی ایک اور
وجہ یہ ہے کہ ان پر بڑے بڑے خوانین، ملکوں، مولویوں اور
پیروں کا اثر اتنا نہیں جتنا دوسرے علاقوں میں پایا جاتا ہے
ہر بہادر نوجوان تھوڑی سی جد و جہد کر کے "ملک" یعنی
سردارِ قبیلہ بن سکتا ہے۔ خصوصاً محسود تو یہاں تک کہہ

پسند واقع ہوئے ہیں کہ بعض اوقات اپنے "ملکوں" کی بات
تک نہیں مانتے۔ نہ ان میں موروثی ملکوں کا نام ہی ہے۔ جو شخص
بڑھ چڑھ کر بہادری دکھائے بس وہی "ملک" اور وہی سردار
ہے۔ ہر بالغ کو جرگے میں رائے دینے کا برابر حق ہے۔ بلکہ
دوسرے قبائلی خطوں کے برعکس یہاں نوجوان طبقہ کی رائے ہمیشہ
غالب رہی ہے۔ اس لئے سچی جمہوریت کی جتنی مثالیں وزیرستان
میں ملتی ہیں شاید ہی کہیں اور ملیں۔ ہر شخص اپنی رائے کے اظہار
میں آزاد ہے اور اسے "جرگے" میں وہی حیثیت حاصل ہوتی ہے
جو بڑے سے بڑے "ملک" یا "خان" کو حاصل ہو۔

ان قبائل نے قیام پاکستان کی جدوجہد میں نمایاں حصہ
لیا بلکہ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد جب کشمیر کے ڈوگروں
اور دوسرے لوگوں نے مسلمانان کشمیر پر زندگی دوبھر کردی اور ان پر ظلم و ستم
انتہا کو پہنچ گیا تو اپنے دوسرے سرحدی بھائیوں کی طرح وزیرستان
کے مجاہد قبائلی بھی چپکے تماشہ نہ دیکھ سکے بلکہ وزیری اور محسود ہزاروں
کی تعداد میں کشمیر کے محاذ پر پہنچے اور بے انتہا قربانیاں دے کر
ثابت کردیا کہ وہ کسی بھی قوت کو محض فوجی طاقت کے سہارے
کشمیر پر قابض نہ ہونے دیں گے۔ کشمیری مسلمانوں نے بھی اپنے
قبائلی بھائیوں کے تعاون کا دلی شکریہ ادا کیا اور ان کی امداد کے
اعتراف میں سینکڑوں مجاہد وزیریوں اور محسودوں کو قابل قدر
خطابات عطا کئے۔ آج بھی یہ مجاہد بے تابی سے ادارۂ اقوام
متحدہ کے فیصلے پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ اور ان کے ولولوں میں
وہی جذبہ، جوش کارفرما ہے۔

کوہ سلیمان کی اونچی چوٹیوں پر دیودار، چیڑ اور صنوبر کے
سدابہار جنگلات ہیں۔ اور دواؤں میں کام آنے والی جڑی بوٹیاں
اور خودرو پھلوں کی بھی افراط ہے۔ بنوں، ٹانک، جنڈولہ اور ڈیرہ
وغیرہ کے شہروں میں انہی پہاڑی علاقوں سے جلانے کی لکڑی بھی
پہنچتی ہے۔ لکڑی کا کوئلہ بھی وزیرستان کی ایک تجارتی چیز ہے۔
اونچے پہاڑوں پر اخروٹ اور چلغوزہ کے پیڑ بھی بکثرت ہیں۔
حال ہی میں علاقہ سرحد کے محکمہ زراعت نے بھی اپنی توجہ قبائلی
خطوں پر مبذول کی ہے اور ہر ممکن کوشش کی جارہی ہے کہ
وزیرستان میں زراعت ترقی کرے اور یہاں کے لوگ ہر لحاظ
سے خود کفیل ہوکر فارغ البالی سے زندگی بسر کرسکیں۔

حالیہ تحقیقات اور جائزوں سے پتہ چلا ہے کہ وزیرستان
معدنیات کی دولت سے بھی مالا مال ہے چنانچہ یہاں کی پہاڑیوں
میں مکین اور توبرڑہ کے نواحی علاقے سے کافی مقدار میں لوہا
برآمد کیا جاتا ہے۔ جس سے توے اور دوسری چیزیں بنا کر کابل
اور ہرات کی منڈیوں میں بیچی جاتی ہیں۔ یہاں کا کچا لوہا کالا باغ
بھی جاتا ہے۔ چنانچہ کالا باغ کے بنے ہوئے توے اور کڑاہیاں
سارے علاقے میں مشہور ہیں۔ یہاں ہر سال اندازاً بیس ہزار روپے
کا لوہا نکالا جاتا ہے، جسے سائنسی طریقوں سے بہتر بنادیا جائے
تو اس کے زیادہ مقدار میں برآمد ہونے کے امکانات ہیں۔ کئی
حصوں میں شیشہ بنانے کی ریت، میگنیز اور تانبا بھی موجود ہے
ممکن ہے مزید تحقیق سے شاید ان پہاڑوں کے سینے سے اور
بھی کئی اہم چیزیں دستیاب ہوں۔

بھیڑ بکریاں اور مویشی پالنے کی وجہ سے خام کھالیں
اور اون بھی حاصل ہوتا ہے۔ پہاڑی بکریوں کا اون تو
خاص طور پر بہت عمدہ ہوتا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانے
کے لئے حکومت پاکستان نے بنوں کے قریب اونی کپڑا بنانے
کا ایک کارخانہ بھی قائم کردیا ہے۔ جس سے نواحی علاقہ کے
لوگوں کے روزگار کی ایک اچھی صورت نکل آئی ہے۔ بنوں میں
اون کی درجہ بندی کے لئے حکومت کی طرف سے ایک ماہر
مقرر ہے اور ۵۰ قبائلی باشندوں کو اس کام کی تربیت دی
جارہی ہے۔

قبائلی علاقوں میں گھریلو صنعتوں کو فروغ دینے کے
لئے ایک بورڈ بھی قائم کردیا گیا ہے۔ جس نے حکومت سے سفارش
کی ہے کہ بیس ہزار روپیہ ان اشخاص کو قرض دیا جائے جو ایسی
صنعتوں کی ترقی میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ چنانچہ اب ہر جگہ موزوں
صنعتیں فروغ پارہی ہیں۔ وزیرستان میں میران شاہ، ٹانک
وانا کے مقام پر دستی کھڈیوں کے کارخانے قائم کئے گئے
اور عنقریب دوسرے مقامات پر بھی کھڈیاں لگادی جائیں گی
تاکہ سوتی کپڑے کے سلسلے میں یہ لوگ اپنی ضروریات پوری کرنے
کے قابل ہوجائیں۔ کانٹری گرام اور میران شاہ میں دھان

کا کام کرنے اور دوآنا اور رنگنے میں لکڑی کی مختلف چیزیں بنانے کے مرکز بھی کھولے گئے ہیں؟ اور قائد اعظمؒ کے ارشاد کے مطابق زندگی کے ہر شعبہ میں قبائلیوں کو خود کفیل اور خوشحال بنایا جارہا ہے۔

وزیرستان کے قبائلی علاقے اور بنوں کے ضلع میں آبپاشی کی ایک اسکیم زیرِ غور ہے جس پر دو کروڑ روپے خرچ کئے جائیں گے۔ اس اسکیم کے تحت ٹانک زام اور دریائے گومل پر بند باندھ کر پانی جمع کیا جائے گا جو خشک موسم میں آبپاشی کے کام آئے گا۔ اس سلسلہ میں سب سے مشکل معاملہ محسود قبائل کا تھا۔ کیونکہ ان کی زمینیں بہت زیادہ بنجر اور ویران تھیں مگر حکومت نے اس مشکل کو یوں حل کر لیا ہے کہ ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں دس ہزار ایکڑ اراضی حاصل کر کے محسود قبائل کو وہاں بسایا جارہا ہے۔ تھل نیز سابق ریاست بہاولپور اور غلام محمد بیراج کی اراضی پر بھی محسودوں کی آبادکاری کا اہتمام کیا گیا ہے۔ حکومت کی ان مساعی کے نتیجہ میں اب محسود بھی ایک آسودہ و خوش حال زندگی بسر کر سکیں گے۔

وزیرستان اور کرم ایجنسی کے جنگلات کی ترقی، اور دیکھ بھال کی طرف بھی پوری توجہ دی جارہی ہے۔ چنانچہ سابق صوبۂ سرحد کی حکومت پچاس قبائلی باشندوں کو جنگلات کے فن میں مہارت حاصل کرنے کے لئے تربیت دے رہی ہے۔ نیز تیراہ، وزیرستان اور کرم میں شجرکاری کے لئے سیب ناشپاتی اور اخروٹ کے ہزاروں پیڑ محکمۂ زراعت کی طرف سے مہیا کئے گئے ہیں۔ اسی طرح جنگلاتی پیداوار مثلاً گوند، لاکھ، گندہ بیروزہ، شہد وغیرہ کی پیداوار کو بڑھانے کی بھی کوششیں کی جارہی ہیں۔ یہ سب چیزیں قبائلی لوگوں کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کا باعث بن رہی ہیں۔ قبائلی علاقہ میں جہاں جہاں شہتوت کے پیڑ پائے جاتے ہیں وہاں ریشم کے کیڑے پالنے اور ریشم حاصل کرنے کے انتظامات بھی کر دیئے گئے ہیں۔ اور یہ تجویز بھی زیرِ غور ہے کہ قبائلی علاقے میں اسلحہ سازی کی صنعت کو فروغ دیا جائے۔ اور اس کام کے لئے ضروری مشینیں اور سامان فراہم کیا جائے تاکہ یہ صنعت معقول طریقے پر ترقی کر سکے۔

قیامِ پاکستان کے بعد سب سے زیادہ توجہ اہلِ قبائل کی تعلیمی حالت کو بہتر بنانے پر دی گئی ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے سارے قبائلی علاقے میں صرف ۵۶ مدرسہ تھے اور وہ بھی برائے نام۔ نہ ان میں اچھے استاد تھے نہ اچھی عمارتیں۔ مگر قیامِ پاکستان کے بعد بالعموم اور دورِ انقلاب کے بعد بالخصوص تعلیمی ترقی کی رفتار تیز تر کر دی گئی ہے۔ مدارس کی تعداد تقریباً چوگنی ہو چکی ہے۔ تعلیم بالغاں کے مراکز ان کے علاوہ ہیں مستقبل قریب میں ایک سو مزید پرائمری اسکول کھولنے کی منظوری دی جا چکی ہے۔ حکومت لاکھوں روپیہ قبائلی علاقوں کی تعلیمی ترقی پر صرف کر رہی ہے۔ تقریباً ہر قبائلی قصبہ میں ایک ہائی اسکول کھولا جارہا ہے۔ ان میں سے اکثر اسکولوں کے ساتھ رہائشی ہوسٹل بھی بنائے جائیں گے۔ ایک بڑی رقم وظیفوں اور تعلیمی امداد کے طور پر صرف کی جارہی ہے۔ ۹۰ وظیفے ان قبائلی طلباء کو دئے گئے ہیں جو ڈاکٹری، انجینیری، زراعت، جنگلات کی دیکھ بھال اور اقتصادیات کی اعلیٰ تعلیم و تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ یہ تمام امور قبائل کے روشن مستقبل کے آئینہ دار ہیں۔

عوام کی صحت کو بہتر بنانے اور امراض کے استیصال کے لئے جہاں ہر ایجنسی میں گشتی شفاخانے کام کر رہے ہیں وہاں اکثر اہم مقامات پر مستقل شفاخانے اور ڈسپنسریاں بھی قائم کر دی گئی ہیں تاکہ وہ ان علاقوں کے رہنے والوں کی زیادہ سے زیادہ خدمت انجام دے سکیں۔ علاوہ ازیں سبھی اعلیٰ ہسپتالوں میں قبائلیوں کو وہی سہولتیں میسر ہیں جو دوسرے پاکستانیوں کو حاصل ہیں۔

پاکستانی فوج میں بھی اب قبائلی علاقوں کے جوانانِ تیغ بند کی شمولیت کا یہی عالم ہے۔ کیونکہ انہیں تعلیم، عمر اور دیگر شرائطِ ملازمت میں بہت سی خصوصی مراعات دی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج پڑھے لکھے وزیری، محسود اور دوسرے قبائلی پاکستان بھر میں اعلیٰ کلیدی اسامیوں پر فائز ہیں۔ اور تعلیم کے ساتھ ساتھ ملازمتوں میں ان کا تناسب اور بھی بڑھتا جائیگا۔

(باقی صفحہ ۱۵ پر)

تعلیم:

روشنیوں کا انعکاس

ایوان میں خالص علمی ماحول تھا۔ ایک تکلف، سنجیدگی، خاموشی، کبھی کبھی کچھ سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ، یا کسی کا تبسم جو مجھے دور سے دکھائی دے جاتا۔ غرض ایک خالص علمی ماحول تھا اور وہاں سنجیدگی و وقار کا ہونا قدرتی بھی تھا کیونکہ یہ کوئی "ورائٹی شو" نہیں تھا، بلکہ جنوب مشرقی ایشیا اور چند دیگر ممالک کے سربراہانِ جامعات و مبصرین کا اجتماع تھا جو پچھلے دنوں کراچی میں منعقد ہوا۔ کراچی یونیورسٹی اس اجتماع کی میزبان تھی۔ یہ ایک تعلیمی و ثقافتی کانفرنس تھی۔ یہاں ایسے لوگ تھے جو علم و دانش کی روشنی پھیلاتے ہیں۔ اس علمی اجتماع کا مقصد یہ تھا کہ دنیا کے اس خطہ میں علم، تعلیم اور زندگی کے مسائلِ حاضرہ پر غور کریں، بالخصوص ممالکِ جنوب مشرقی ایشیا کے سامنے جو تعلیمی مسائل اور دورِ حاضرہ کے معاملات علم و ثقافت ہیں، ان پر غور کیا جائے۔ زیادہ تر اس بات پر نظر ڈالنی تھی کہ سائنس کے اس دورِ ترقی و تسخیرِ عالم میں روحانی اقدار کا مقام کیا ہے اور ان میں کس طرح سنجوگ پیدا کیا جا سکتا ہے تاکہ روحِ انسانی، ضمیرِ آدم اپنے آپ کو پا سکے۔ بالخصوص اس خطہ میں جو ہمیشہ سے گہوارہ علم و دانش ہی نہیں سرچشمہ روحانیات بھی رہا ہے۔

اس کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ نئی تانتی کے انسان کے لئے علم و حکمت کی نئی راہوں کی دریافت کی جائے اور ان کے ماضی کے ورثہ کو ان کی زندگیوں میں سمویا جائے۔

اس اجتماع میں دس ممالک کے چالیس نمائندے شریک ہوئے۔ پاکستان بھی شریک تھا۔ اس کے وفد میں ۱۳ اراکین تھے جس کی سربراہی خود مشیرِ تعلیم پاکستان، جناب ایس۔ ایم شریف جیسے ماہرِ تعلیمات کر رہے تھے۔ اس اجتماع کی میزبان چونکہ جامعہ کراچی تھی اس لئے ہمارے لئے اس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی تھی بالخصوص اس وجہ سے کہ آج خود چانسلر کراچی یونیورسٹی فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں، اس اجتماع سے خطاب کرنے تشریف لا رہے تھے۔

نظارہ بڑا موثر تھا۔ ایک دلنشیں، پُرسکون، سنجیدہ فضا۔ جملہ مندوبین سیاہ تعلیمی عباؤں میں ملبوس ایک مرتب جلوس کی شکل میں داخلِ ایوان ہوئے تو ہم سب کی نظریں اس طرف لگ گئیں جلوس کے آخری سرے پر مجھے خود صدر ایوب کا پُر وقار چہرہ نظر آنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ وقار و تمکنت کا پیکر بنے تشریف لا رہے تھے تعلیمی گاؤن اُن پر کیسا سج رہا تھا! میں یہ دیکھ کر پہلے بھی حیران ہوا ہوں اور آج بھی میرا تاثر یہی تھا کہ شاید جامہ زیبی اسی کا نام ہے۔ ان کو فیلڈ مارشل کی بارعب وردی میں دیکھو، پٹھان سردار کے علاقائی لباس، کُلّہ و شلوار، میں نظر آئیں، عمدہ سوٹ زیبِ تن ہو یا عید کی مناسبت سے ایک نفیس سی شیروانی نظر گیر ہو، ایک باوقار پیکر ہر جگہ توجہ کا محور و مرکز بن جاتا ہے۔ میرے ذہن میں خیالات کے یہ مرغولے بنتے اور رقص کرتے رہے۔ یکایک کانفرنس کی کارروائی شروع ہو گئی۔ سب صدر کی افتتاحی تقریر کے نکات سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہو گئے۔ بعض اشارات تو اب تک میرے ذہن میں گونج رہے ہیں مثلاً صدر مملکت نے ابتدا ہی میں فرمایا کہ،

> جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک کو آزادی اور اپنی رفتارِ طبع کے مطابق زندگی کو ترتیب دینے کا حق حال ہی میں حاصل ہوا ہے . . . . ہر جگہ ترقی کے حوصلہ افزا آثار نظر آنے لگے ہیں اور دنیا کے اس حصے میں معاشری و اقتصادی ترقی کے ایسے مرحلے پر ہماری جامعات پر بلاشبہ بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ انہیں نہ صرف ماضی کی عظیم روایات کو سامنے رکھنا ہے بلکہ مستقبل کے تقاضوں کے مطابق علم و حکمت کی روشنی بھی پھیلانی ہے۔ انہیں ایشیا کی ترقی اور اس کی جملہ تحریکوں کی رہنمائی کرنی اور تیز رو زمانہ کا ساتھ بھی دینا ہے۔

ان اہم ابتدائی تأثرات کے اظہار کے بعد انہوں نے اس بات پر روشنی ڈالی کہ ایک اعلیٰ اور سائنسی نظامِ تعلیم صرف علم کی

ترویج اور تحقیق و تدقیق کی ترقی تک ہی محدود نہیں ہوتا بلکہ اس کا مقصد اس سے کہیں بڑا، کہیں گہرا اور کہیں گیرا ہوتا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ ان یونی ورسٹیوں کا کام ہے:

انسانی معاشرہ کو ہم آہنگ اور حرکی بنانا۔ ایک ایسے معاشرہ کو وجود میں لانا جو نہ صرف اپنے ہر فرد کی مادی ضروریات کو پورا کرے انسان کی مادی و معاشرتی ضروریات کو پورا کرے بلکہ ان کی روحانی اقدار میں بھی توازن پیدا کرے۔

اس سلسلہ میں دنیا کے موجودہ بحران فکر و عمل پر گفتگو ناگزیر تھی۔ چنانچہ یہ ارشادات خاص طور پر چسپ حال ہیں کہ:

سائنسی قوتوں اور روحانی قدروں کے مابین تصادم متوازن عدم توازن کا نتیجہ ہے۔ میرے خیال میں ایک اعلیٰ نظامِ حیات اور اس کی بنیاد یعنی اعلیٰ معاشرتی تعلیم کو یقیناً اس بحران پر عبور حاصل کر لینا چاہیئے تاکہ علم و حکمت کے ساتھ ساتھ روحِ انسانی کو بھی بچایا جا سکے —— یہ دونوں ایک دوسرے کی محافظ ثابت ہو سکتی ہیں۔

بحران کا اثر جس طرح اور جگہ محسوس ہو رہا ہے اسی طرح خود پاکستان بھی اس سے دوچار ہے اور عملاً اس سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ اسی لئے صدرِ مملکت نے فرمایا کہ جب ہم نے اس ملک میں اصلاح و انقلاب معاشرہ کا کام شروع کیا تو سب سے پہلے اس اہمیت پر زور دیا کہ تعلیم کا مقام کیا ہے اور اسے کس طرح آہنگِ نو بخشا جائے۔ ہمارے سامنے صرف مسئلہ تعلیم ہی نہ تھا بلکہ معاشرتی و اقتصادی زندگی کے جملہ مسائل معیشت و معاشرت کے امور، اقتصادی معاملات، ترقی تجارت، فروغِ زراعت، دفاع، عالمی تعلقات اور اسی نوع کی دیگر باتیں تھیں اور بہت سے شعبوں میں اصلاح و تجدید کی ضرورت تھی مگر یہ سب ایک دوسرے سے اس طرح باہم پیوست ہیں کہ کسی ایک مقصد یا مسئلہ کو الگ کر کے نہیں نبٹا جا سکتا۔

بنابریں جو نتیجہ اخذ ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ:

تعلیم ہی ان تمام مسائل کے حل کی کلید ہے اس لئے میں نے اسے اولیں ترجیح کا مستحق سمجھا۔ اسی غرض سے ماہرینِ تعلیم کا کمیشن مقرر کیا گیا...... کمیشن کی سفارشات نے ملک کے تعلیمی نظام کے احیاء کے سلسلے میں میری رہنمائی کی... آغاز اچھا ہوا ہے...... اور مجھے امید ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام جلد ہی ایسے ذہین، مخلص، محب وطن افراد، مرد و زن، کو پیدا کرے گا جو موجودہ زندگی کے چیلنج کا مقابلہ دلیری اور کامیابی کے ساتھ کر سکیں گے۔

تعلیم کی اہمیت اور زندگی کو بنانے، سنوارنے، مکمل کرنے کے باب میں جہاں اس کے کردار پر روشنی ڈالی گئی وہاں علم و دانش کے گہوارں —— یونی ورسٹیوں —— کے مقاصد و مسائل پر بھی ایک نظر ڈالی گئی اور اس حقیقت کی نشان دہی کی گئی کہ جدید ترقی کے اس دور میں صحیح رہنمائی کے لئے ہم اپنی جامعات کی طرف دیکھ سکتے ہیں جو اس سلسلے میں بڑی مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ جہاں تک جنوب مشرقی ایشیا کی یونی ورسٹیوں کے سربراہوں کی اس کانفرنس کا تعلق ہے۔ اگر یہ موجودہ خلا کو پُر کرنے اور ہماری معاشرتی، معاشی اور ذہنی و روحانی ضروریات کو پورا کرنے میں ممد بن سکی تو یہ اس خطے کے مستقبل اور ترقی کے باب میں نہایت اہم خدمت ہوگی۔

میں نے دیکھا کہ صدرِ پاکستان کے ان گرانقدر خیالات نے مندوبین کے ذہنوں پر خاطر خواہ اثر کیا اور ان کے چہرے اُن پر غور کرتے ہوئے دکھائی دیئے —— ممکن ہے وہ بھی اُن ہی خطوط پر سوچ رہے ہوں جن کی توضیح اجمالاً ان کے خطبۂ افتتاحیہ میں نظر آتی تھی۔

اس کے بعد کئی اور اہم تقریریں بھی ہوئیں جن میں خود ہمارے وزیر تعلیم جناب حبیب الرحمان کی تقریر بھی تھی۔ انہوں نے کانفرنس کی اہمیت اور اس حصہ عالم میں امن و ترقی کے دَور پر زور دیا۔ سیٹو کے سکرٹری جنرل مسٹر پوٹ سین نے اتفاق سے اپنی آمد اچانک منسوخ کر دی تھی اس لئے ان کی تقریر کانفرنس کے ڈپٹی ڈائریکٹر نے پڑھ کر سنائی جس میں اس امر پر خصوصی نظر ڈالی گئی تھی کہ جدید معاشرہ میں یونی ورسٹیاں کیا اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔

تقریریں سننے کے دوران میں نے ایک نظر پروگرام پر بھی ڈالی جس سے اندازہ ہوا کہ یہ کانفرنس کن اہم امور پر غور کرنے کے لئے منعقد ہوئی ہے۔ مثلاً بعض باتیں یہ تھیں: جنوب مشرقی ایشیا کے علاقے میں واقع جامعات کا باہمی ربط، طلبہ کا تبادلہ، اطلاعات کی فراہمی، تعلیمی و ثقافتی نوعیت کے سفروں کی سہولت، ڈگریوں اور ڈپلوموں کی

باہمی برابری کا مسئلہ اور سب سے بڑھ کر یہ بات کہ معاشرہ میں صحیح قسم کی قیادت پیدا کرنے کے بارے میں ہماری درسگاہیں اپنے نوخیز طلبہ و طالبات میں کیا اوصاف ظاہری و باطنی پیدا کریں۔ اس کانفرنس کے سامنے جو پروگرام تھا اس میں اس علاقے کے لسانی مسائل بھی تھے۔ نیز نصاب ہائے تعلیم اور درسیات پر غور و فکر۔ غرض علمی، تعلیمی اور ثقافتی نوعیت کے ان تمام ہمہ گیر مسائل پر نظر ڈالی گئی جو اس وقت ہماری نئی پود کو درپیش ہیں اور جن کے صحیح حل پر ان ممالک کی موجودہ و آئندہ نسلوں کی بہبود کا انحصار ہے۔

یہ امر بے حد قابلِ مسرت ہے کہ کانفرنس اپنی جگہ کافی نمائندہ تھی یعنی یہ کہ جنوب مشرقی ایشیا کے رکن ممالک کے علاوہ آسٹریلیا، فرانس، لاؤس، نیوزی لینڈ، فلپائن، تھائی لینڈ، برطانیہ، امریکہ اور ویت نام کے نمائندے بھی آئے تھے۔ اقوامِ متحدہ کے مبصرین بھی کانفرنس میں موجود تھے۔

کانفرنس کا اجلاس آٹھ دن رہا اور مجھے یقین ہے کہ اس کی قراردادوں پر خاطر خواہ عمل ہوگا اور اس حصۂ عالم کی تعلیمی و ثقافتی ضرورتوں اور اصلاحِ معاشرہ کے ضمن میں اس وسیلے سے بہت کچھ کام ہو سکے گا ÷ (ا۔ق)

"وزیرستان" بقیہ صـ۴۸

سب سے بڑھ کر خوشی کا مقام یہ ہے کہ خود قبائلی بھی حکومتِ پاکستان کی ان کوششوں کو سراہتے اور ان کا اعتراف کرتے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ پاکستان نے ان کی ترقی کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ اور آئندہ بھی ان کی بہتری کے لئے کوئی کسر نہ اٹھا رکھے گا۔

نومبر ۱۸۹۳ء میں جو ڈیورنڈ معاہدہ طے پایا اس سے افغانستان اور ہندوستان میں ایک مستقل حد بندی عمل میں آئی۔ اس کی رو سے صرف برمل کا ضلع کابلی عملداری میں رہا۔ باقی سارے وزیرستان پر اس کا کوئی حق و اختیار نہ رہا۔ انگریزوں کی حکمتِ عملی سے امان اللہ خاں کے بجائے نادر خاں تخت نشین ہوئے۔ ان کے بعد تخت ان کے بیٹے ظاہر شاہ نے سنبھالا اور اس طرح اہلِ افغانستان پر مطلق العنانی اور شخصی حکومت کے پنجے مضبوط ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ آج افغانی اپنے جابر و قاہر حکمرانوں سے بیزار ہیں، اور ڈیورنڈ لائن سے ادھر آسودہ و خوش حال قبائلی کو رشک کی نظر سے دیکھتے ہیں ÷

"رازجو اب راز نہیں" بقیہ صـ۴۷

تک بالٹیاں۔ گھڑے اور جوتیاں اچھلتی رہیں۔ بہرحال فیصلہ تو کرنا ہی تھا۔

یہ جنگ ختم ہوئی تو میں بھی بیٹھک چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس ملکہ کانفرنس نے مجھے بہت نئے نئے خیالات سجھا دیئے تھے میں کوئی سات بجے تک مسلسل لکھتا چلا گیا۔ اب میں افسانے کے عروج کے قریب آ گیا تھا۔ میں نے افسانے کے اس حصے پر غور کرنے کے لئے سر اٹھایا۔ کہ دروازہ کھلا اور عفت نمودار ہوئی۔

"آپ نے خط ختم نہیں کیا ابھی، کھانا کھا لیجئے"

میں پتہ نہیں کیا کہنا چاہتا تھا۔ اس افسانوی عروج کے وقت عفت کی مداخلت نے آگ لگا دی تھی غصہ طاری ہو چکا تھا میرے منہ سے نکل گیا

"کیا پکا ہے؟"

"مسور کی دال"

"مسور کی دال، اتوار کو بھی مسور کی دال۔ اور وہ گوشت کیا ہوا جو میں لایا تھا۔" افسانے کا درد شدید صورت اختیار کر گیا۔

"آپ گوشت کہاں لائے تھے۔ وہ تو سری پائے تھے"

"سری پائے گوشت نہیں ہوتے! کسی سبزی کے ٹکڑے ہوتے ہیں" عفت نے میرے غصے کا عروج بھانپ لیا۔ اُس نے اپنا لہجہ بہت نرم کر لیا۔

"ٹھیک ہے جی سری پائے بھی گوشت ہی ہوتے ہیں۔ میں صحن میں سری صاف کرنے بیٹھی تھی۔ کسی کام کے لئے اندر گئی تو اُسے آپ کا لاڈلا جیک گھسیٹ کر لے گیا"

"اور پائے؟" میں بدستور غصہ میں تھا۔

"اور پائے میں نے غصے میں کُتے کو مارنے میں صَرف کر دیئے" عفت یہ کہہ کر کھانا لینے چلی گئی۔ مگر میرے افسانے کا عروج بہت نزدیک کر گئی۔ میں اب تک ہر قسم کی رکاوٹوں کی وجہ سے بیزار ہو چلا تھا۔ افسانے سے، اس فن سے، اپنے آپ سے جلدی جلدی میں نے کاپی کھولی۔ عروج کے چار چھ فقرے بغیر سوچے سمجھے گھسیٹے اور عفت کے کھانا لانے تک افسانہ ختم کر دیا۔ بڑی ذہنی کوفت رہی تھی کرسی پر اکڑوں بیٹھ بیٹھ کر جسم بھی دکھنے لگا تھا۔ میں نڈھال سا ہو کر کرسی پہ دراز ہو گیا۔ پھر شاید سو گیا ہو سکتا ہے نڈھال ہو گیا ہوں یا غشی طاری ہو گئی تھی۔ بہرحال واقعہ یہ ہے کہ جب میں ہوش میں آیا تو سوموار کی صبح کی اذان ہو چکی تھی اور میز پر سجے ہوئے کھانے پر ایک مکھی بھنبھنا رہی تھی÷

ولے بخیر گذشت !

انور عنایت اللہ

"ارے سنتی ہو، کہاں ہو بھئی؟" میاں حامد حسین خان نے کمرہ میں آتے ہی آواز دی۔

"خدا خیر کرے، آج آپ اس وقت کیسے آ گئے؟" بیوی بیچاری حواس باختہ دوڑی ہوئی آئیں۔ پچھلے پچیس برس میں میاں صاحب کبھی اس طرح بے وقت گھر نہیں آئے تھے۔ وہ صبح سویرے اپنے آفس جاتے تو رات گئے تھکے ہارے واپس آتے۔

"آج جی کچھ ٹھیک نہیں ہے، بیگم" کہتے ہوئے وہ بیٹھ گئے۔ ہاتھ میں آج کا تازہ اخبار تھا۔ حسب معمول عینک ناک کی پھننگ پر آرہی تھی اور ہونٹ میں ہاتھ کانپ رہے تھے جس سے اخبار بھی پتہ کی طرح ہل رہا تھا۔ کہنے لگے: "آج طبیعت بہت جھنجلائی ہوئی ہے، سروری بیگم، یعنی اب تو شادی کا بھی راشن ہونے لگا! — میرا مطلب ہے کہ شادی پر بھی کنٹرول —! یہ دیکھو، اب شادیوں پر پابندی لگ گئی ہے —" یہ کہکر انہوں نے اخبار بیوی کے حوالے کر دیا۔ عائلی قوانین کے سلسلے میں خبریں کئی دن سے آرہی تھیں۔ ان کی بھنک تو خان صاحب کے کان میں پڑ ہی چکی تھی مگر ان کو خیال تھا کہ شاید یہ پابندی ابھی نہ لگے کیونکہ ان کے خیال میں یہ لوگوں کی اپنی مرضی کا معاملہ تھا اور مشروط اجازت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شاید وہ آزاد تھے۔ مگر انہیں یہ دیکھکر بڑا افسوس ہوا کہ یہ بھی پابندی لگ گئی اور شادیاں ہی نہیں اور طلاق، خلع، ورثہ وغیرہ کی بھی اصلاح ہو رہی ہے۔ ان کی یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے فائدہ کیا ہوا؟ وہ ابھی اس "مسئلہ" کو سمجھا نہیں سکے تھے۔ سردست الجھنے اور جھنجلانے پر تلے بیٹھے تھے۔

حامد حسین خان کی شخصیت بھی عجیب باغ و بہار تھی۔ ان کا شمار کراچی کے بہت بڑے تاجروں میں ہوتا تھا۔ شہر کے کئی چھوٹے کارخانے اور دو تین اخبار بھی ان کی ملکیت میں تھے۔ اکتوبر کے انقلاب سے پہلے وہ ہر سال فریضۂ حج کو جایا کرتے تھے اور اپنی تینوں بیگمات کو بھی ساتھ لے جاتے تھے تاکہ انہیں سونے میں پیلا کر کے لاسکیں۔ یعنی ہم خرما و ہم ثواب !

ان کی عمر پچاس کے قریب تھی لیکن صحت بہت اچھی تھی اور وہ پابند صوم و صلوٰۃ بھی تھے۔ زمانے کے تقاضوں سے بھی خوب واقف تھے۔ خود مڈل پاس تھے لیکن اپنے تمام بچوں کو انہوں نے انگریزی اسکولوں میں تعلیم دلوائی تھی۔ اب تو ماشاء اللہ ان کے پورے گیارہ بچے تھے۔ دو بیٹیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ بڑا بیٹا ڈاکٹر تھا اور ابھی پچھلے ہی سال لندن سے ایک عدد ڈگری، ایک فرنگی بیوی، اور ایک گول مٹول سا بیٹا لے کر واپس آیا تھا۔ ان کے سب سے چھوٹے صاحبزادہ کی عمر صرف نو مہینے تھی اور گھر کی بڑی بوڑھیوں نے پیشینگوئی کر دی تھی کہ ماشاء اللہ — بلکہ چشم بد دور — ان کی چھوٹی بیگم کا پاؤں ایک بار پھر بھاری تھا !

چھوٹی بیگم ایک سابق ریاست کی رہنے والی تھیں اور کسی ایسے رئیس کی صاحبزادی تھیں جو کبھی اچھا وقت دیکھ چکے تھے۔ "رئیس" اپنی مالی پریشانیوں کو دور کرنے کے لئے اکثر کراچی کا دورہ کیا کرتے تھے۔ ایک دعوت میں میاں صاحب سے ان کی ملاقات ہو گئی۔ راہ و رسم بڑھ گئی تو انہوں نے از راہ کرم رئیس کی "پریشانیاں" کم کرنے کے نیک ارادے سے یہ سوچا کہ ان کے ہاں رشتہ کر لیا جائے۔ پیغام دیا گیا اور ان لوگوں نے "مجبوراً" قبول کر لیا۔ رشتہ کی رعایت سے رئیس کی ہر طرح دلجوئی کی گئی اور ان کے لئے وہیں، ان کے ہی شہر میں، میاں صاحب کی کمپنی کی ایک برانچ بھی کھول دی گئی اور رئیس اس کے منیجر مقرر کر دئیے گئے اور اس طرح ان کا گھر چھوٹی بیگم کی آمد سے منور ہو گیا۔

اور منجھلی بیگم کی شادی اب سے صرف دو سال پہلے ہی تو ہوئی تھی۔ بڑی دھوم دھام سے بیاہ رچایا گیا

تھا ۔ یہ خاتون ملک کے ایک دور دراز شہر سے تعلق رکھتی تھیں اور کراچی میں اپنے بھائی کے ساتھ رہتی تھیں، یہ صاحب میاں حامد حسین خاں کے ہاں منشی تھے ۔ انہیں غریب آدمی پر ترس کھانے کی عادت تھی ہی اس لئے انھیں بھی اپنا نائب، اور ڈھاکہ کی برانچ کا منیجر، بنا کر ترقی دے دی گئی ۔ اور اس خیال سے کہ لوگ اس غریب پروری کو کسی اور جذبہ پر محمول نہ کریں انہوں نے اس منشی کو بھی اپنے رشتےداروں میں شامل کرنے کا فیصلہ کر ھی لیا اور اس طرح یہ منجھلی بیگم صاحبہ تشریف لائی تھیں ۔

اس دوران میں ان کی بڑی بیگم، سروری زمانی، نے سب کچھ بڑے صبر کے ساتھ برداشت کیا تھا ۔ ان کی شادی حامد حسین خاں سے اس وقت ہوئی تھی جب وہ صرف تیرہ سال کی تھیں اور ان کے میاں کی چاندنی چوک میں ایک چھوٹی سی دکان تھی' ایک معمولی سا بساطخانہ ۔ در اصل خدا نے انہیں جو ترقی دی وہ یا دستان آنے کے بعد ھی۔ بڑی بیگم کو تعلیم گھر پر ملی تھی، کچھ میاں کی دینی تلقینات سے اس میں اضافہ ہوا ۔ انہوں نے اس بات پر خاص زور دیا کہ اللہ کی نیک بندیوں کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ صرف اطاعت خاوند کے اصول کو ہر وقت سامنے رکھیں ۔ ان کی جو مرضی ہو اسے مردوں کی آزادی سمجھیں اور کبھی اس پر معترض نہ ہوں ۔ چنانچہ جب میاں نے دوسری شادی کی تیاریاں شروع کیں تو وہ بیچاری تڑپ کر رہ گئیں مگر اطاعت گذار و فرمانبردار نیک بی بی کی طرح دل مسوس کر رہ گئیں ۔ ایسے نازک معاملوں میں بھلا ان کو عورت ذات ہوتے ہوئے کیا بولنے کا حق حاصل تھا ۔ اور جب انہوں نے ادھر ادھر اور نظر ڈالی تو سینکڑوں اطاعت گذار عورتوں کو یہ زہر کا گھونٹ پیتے دیکھا اور پھر انہیں یہ خبر سننے پر بھی کچھ تعجب نہ ہوا کہ میاں صاحب نے رنگپور میں بھی ایک شاخ قائم کر دی ہے ۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کی کاروباری شاخیں یونہی قائم نہیں ہو جاتیں بلکہ کسی غریب کی '' پرورش '' کا سامان ہوتی ہیں اور جب انہیں معلوم ہوا کہ ایک غریب مسرفی یا دستانی بھائی کو کلرک سے ترقی دیکر گودام انسپکٹر بنا دیا گیا ہے، تو انہیں کچھ بھی تعجب نہ ہوا ۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اس غریب پروری کو زیادہ مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے کی بھی سوچ رہے ہوں اور رشتہ کی کوئی سبیل پیدا کرنے کی فکر میں ہوں ۔ کیونکہ انہوں نے سنا تھا کہ گاڑھی بھر آشنائی سے رائی بھر رشتہ زیادہ وزنی ہوتا ہے —!

بہر کیف، آج مسئلہ عجب تھا ۔ جب وہ ناشتہ کرنے کے بعد دفتر پہونچے تو وہاں ہر ایک کی زبان پر عائلی قوانین کا چرچا سنا ۔ ہوشمند لوگ بہت خوش تھے کہ خواتین کو ان کا حق مل گیا ۔ وارثوں کو جو '' محجوب الارث '' کر دیا گیا تھا ان کا حق بحال ہو گیا اور نا انصافیاں دور ہو گئیں ۔ خدا نے جو حق اور آزادی مسلمان عورت اور یتامیٰ کو دی تھی اس حق کو حقدار تک پہنچا دیا گیا ہے ۔ جو لوگ غلط تصوروں کا شکار تھے انہیں آج روشنی نظر آ رہی تھی اور حق کو پہچاننے والے آج خوش تھے کہ سلب حقوق کا سلسلہ ختم ہوا ۔ جو لوگ اپنی سادہ مزاجی کے باعث ان حقوق کو حقوق ہی نہ سمجھتے تھے وہ بھی کچھ کچھ سوچنے لگے تھے کہ ان کا غائب اور گم کیا ہے ۔ یوں میاں حامد حسین نے کل رات ہی رنگپور کے برانچ منیجر کو شادی کی گفت و شنید کے لئے بڑا تفصیلی خط لکھا تھا ۔

آج دفتر میں ان کا مطلق جی نہ لگا ۔ انہیں رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا کہ ہر طرح کے کنٹرول تو ان جیسے ملک التجار قسم کے لوگوں کیلئے ایک سوہان روح بنے ہوئے تھے ہی، نفع کمانے کی چھوٹ تو ختم کر ہی دی تھی اب آدمی گھر جا کر دو دو، تین تین، چار چار، سو تو میں بیٹھ اٹھ کر اپنا غم غلط کر لیا کرتا تھا، سو اس پر بھی لیا ۔ کمال ہے ! اور میاں حامد حسین تو یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ عورتوں کو نکاح، طلاق، خلع وغیرہ کے معاملہ میں کہاں سے اختیارات مل گئے ۔ انہوں نے تو آجتک اپنے بزرگوں تک سے ایسی آزادی، حق و [illegible] کی بات نہیں سنی تھی ۔ ہاں میاں یہ چودھویں صدی ہے دیکھکر وہ خاموش ہو گئے ۔ مگر بڑی بیگم آج بہت خوش تھیں ۔ ان کی چھوٹی بیٹی، رابعہ، نے ان کو عائلی قوانین کی ساری باتیں اخبار میں پڑھ پڑھ کر سنائی اور سمجھائی تھیں ۔ انہیں یہ بات سنکر بڑی خوشی ہوئی کہ مردوں کی بیجا آزادی — کہ جب جی چاہا ذرا سی بات پر طلاق دے دی — بلکہ بے بات دے دی — خلع وغیرہ [illegible] آن کا ناک بھوں چڑھانا — بیٹیوں کو شرعی حق وراثت دینے کیلئے طرح طرح کی حیلہ سازیاں کرنا ان کی آجتک سمجھ میں نہ آتا تھا — اور '' اطاعت شوہر '' جو ان کی عادت ثانیہ بن چکی تھی انہیں اب تک بند رکھنے پر مجبور کرتی تھی ۔ مگر آج وہ بہت خوش تھیں ۔

رابعہ نے اس سال ہی بی ۔ اے میں داخلہ لیا تھا ۔ سمجھدار تھی ۔ اسلامیات بھی اس کا مضمون تھا ۔ تاریخ

اسلام بھی اس کی نظر میں تھی اور اپنی عمر کے لحاظ سے ان چیزوں کو جتنا جان سکتی تھی وہ اس کی نگاہ میں تھیں اور دین کی سادگی اور حقوق نسواں کے باب میں اسے دین کی سادہ روح کو سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی تھی - وہ کہنے لگی کہ لوگوں نے بعض حالات کے تحت دی ہوئی اجازت کو ایک طرح کا اذن عام سمجھ لیا ہے - اب ہم لوگوں کو سمجھنا چاہئیے کہ عورتوں کے جو حقوق اللہ نے دئیے ہیں وہ انہیں واپس کر دیں - اپنی دولت اور ہوس سے نانا، دادا، کی عمر کے لوگوں کو نوعمر لڑکیوں کی زندگی برباد کرنے سے اب باز آ جانا چاہئے - اس کا وقت آگیا ہے - وہ کہنے لگی کہ اللہ نے مسلمان عورت کو جو حق دئے تھے اور زمانہ کے ہاتھوں وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہے تھے، اب انہیں مل جائیں گے - وہ بہت خوش تھی -

سمجھدار بیٹی کی باتیں سنکر سروری بیگم خوش تو بہت ہوئیں مگر میاں کے ڈر کے مارے چپ رہیں - اس وقت بھی میاں صاحب نے انہیں اخبار دیا تو وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں اسے پڑھتی تو رہیں مگر کوئی رائے زنی نہ کی - میاں جھنجلا رہے تھے - بلکہ کڑھ رہے تھے کہ غریبا پروری کا ایک آدھ سال بعد، موقع آنا رہتا تھا، وہ بھی گیا - صبر دل پر صبر کی سل رکھ کر ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے اور دل کی بھڑاس نکالنے کیلئے ساجد حسین رازی کو ٹیلیفون کر کے بلا لیا -

انہیں تو اس بات کا افسوس تھا کہ تینوں بیویاں جاہل تھیں - بچے نئی روشنی میں پلے بڑھے تھے، اس لئے ان کی نظر میں باغی تھے - یہ فرنگی تعلیم سب کا ستیاناس کردیتی ہے - اور بیٹا تو فرنگن کا گویا غلام ہی بن گیا تھا - دو بیٹیاں سسرال میں تھیں - گھر میں جو لڑکیاں تھیں سب کی سب اس قانون کو عین حق اور مبنی برانصاف سمجھتی تھیں اور آپس میں بحث کرتیں، اور جب ان کی بیویاں خود ان کی زبان سے میاں صاحب نے سنیں تو دل میں سمجھ گئے کہ بس اب قیامت کے آثار پیدا ہوچکے ہیں —!

رازی صاحب کسی اخبار کے ایڈیٹر تھے اور ان کے بچپن کے دوست بھی، اس لئے بڑی بے تکلفی بھی تھی - جب وہ تھوڑی دیر میں میاں صاحب کے ہاں پہنچے تو میاں صاحب ان پر برس پڑے - کہنے لگے : ،، ارے بھئی یہ کیا غضب ہو رہا ہے - کیا اب شادی کے لئے بھی لیسنس،، لینا پڑیگا ؟ اور یہ تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ ان باتوں کو اچھا کہہ رہے ہو، خوب ہوا دے رہے ہو ؟— کچھ خوف خدا بھی ہے ،،

،،خوف خدا تو آپ کو ہونا چاہئیے کہ اللہ کے دئیے ہوئے حقوق میں حائل ہونے ہو ،، - رازی نے جل کر کہا - مگر جب میاں صاحب نے عادت کے موافق انہیں دو چار موٹی موٹی گالیاں دیں تو رازی نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی - زمانہ کے تقاضے سمجھائے ' شرع کی روح سمجھائی ' اللہ کے دئیے ہوئے حقوق پر گفتگو کی ' قوم کے ناواقفوں کی بےبصری پر روشنی ڈالی، مگر میاں صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے - پرانے خیالوں کی جڑیں دور تک پھیلی ہوئی ہوئی ہیں، اسلئے اصلاح ذرا دیر سے ہوتی ہے - رازی کو ایک پینترا سوجھا ، اور برونت سوجھا، کہنے لگا :

،،حامد بھائی، معاف کرنا ایک اطلاع دینی تو بھول ہی گیا - بڑی بری خبر ہے - کل سبن لاہور سے آیا ہے - کہتا تھا حسین میاں دوسری شادی کرنے پر تلے ہوئے ہیں،،
داماد کے بارے میں یہ خبر سنکر میاں حامد حسین کا پارہ ایکدم چڑھ گیا— کہنے لگے :

،، کیا کہا.......احمد حسین دوسری شادی کر رہا ہے ! اس نٹ یونجئیے کی یہ مجال ! خدا کی قسم گولی ماردوں گا ، ذلیل ! کمینہ ! آخر حامدہ میں کیا کمی نظر آئی ہے اسے ، دوسری شادی کا خبط کیوں سوار ہے ؟ اللہ کے خوف سے نہیں ڈرتا ؟،، اس کے بعد گالیوں کا ایک آبشار تھا جو ان کے منہ سے داماد کے حق میں بہہ نکلا - رازی چلایا ،، ارے ! ارے ! خدا کے لئے حامد بھائی بات تو سن لیجئیے - خواہ مخواہ اس پر خفا ہو رہے ہیں - آخر وہ بھی مرد ہے - اگر کرلیگا تو کونسا گناہ ہوگا - کسی غریب لڑکی پر ترس آ گیا ہوگا - کرلینے دو - حامدہ کو یا اور کسی کو معترض ہونے کا بھلا کیا حق ہے ؟ ،،

،،ابے ! یہ حق وق کا سوال نہیں ہے - خواہ مخواہ کی بات ہے - شرع سے کھیلتا ہے - اللہ کا حکم اس معاملہ میں بڑا سخت ہے — لوگ سمجھتے ہی نہیں اور اپنی خواہشوں کو چھپانے کیلئے آڑ لیتے ہیں،، میاں صاحب کا جلال عروج پر تھا - چونکہ داماد لاہور میں تھا اس لئے غائبانہ دشنام طرازی پر اکتفا کرنا پڑا مگر جب اس سے بھی جی کی بھڑاس نہ نکلی تو فوراً ٹرنک کال بک کی اور کراچی کے ایک بیرسٹر سے بھی مشورہ کرنے کی ٹھانی کہ دوسری

ی اس طرح کرنے سے حسین کو کسطرح قانوناً روکا جا سکتا ہے۔ جب ان پر کوئی ذاتی چوٹ پڑتی تو ن کا سہارا لینے کی انہیں فوراً سوجھا کرتی تھی —

رازی یہ سب کارروائی چپ چاپ بیٹھا دیکھتا رہا ہ بقول شخصے ''تفریح لیتا رہا۔'' وہ سوچ رہا تھا کہ ں صاحب ذرا غصہ تھوک دیں تو کوئی ڈھنگ کی ت ہو۔

میاں حامد حسین خان نے بیٹھے بیٹھے ایک اور سگرٹ لگایا اور مٹھی بند کرکے زور سے کش لیکر اخبار کو ر ہزارویں مرتبہ کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ ایک ف سرخی جو نظر پڑی تو اچھل پڑے اور بےساختہ لا کر بولے :

''.......مگر وہ ذلیل دوسری شادی کر کیسے سکتا ؟ میں اسے تباہ کردوں گا، رازی تم......میرا مطلب وہ......اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ یہ نہیں ہ عائلی قانون اب آ چکا ہے۔ اب کوئی ایسی ت کرے گا تو اسے مزا چکھا دیا جائے گا۔ وہ ہلا میری بیٹی کی زندگی کو تباہ کرسکتا ہے؟''

ممکن ہے وہ اپنے بے قصور داماد کو کچھ اور لوائیں سناتے مگر رازی نے یہ دیکھکر کہ پانی سر سے زر چکا ہے کہنا شروع کیا '' خدا کے لئے بھائی حامد ......ذرا ٹھہرئیے تو، میری بھی تو سن لیجئیے......''

''جی بیشک آپ کا خیال ٹھیک ہے۔ اب حسین میاں کیا کوئی بھی پاکستانی مسلمان شرع کی اس مشروط و محدود اجازت سے نا جائز فائدہ نہ اٹھا سکیگا۔ من مانی لافیں، ذرا ذرا سی بات پر طلاقوں کی دھمکیاں دیکر ورتوں کو کچلنا، سوتنوں کو حق نہ دینا........ ب سب ختم ہیں۔ ان لوگوں کے حقوق معاشرہ کے نظام ، بہتری اور انصاف کے اصول ہی پر تو بنائے گئے ہے۔ اب ہم ان حقوق کو ان کے حقداروں تک پہنچا کر اب دارین حاصل کرسکینگے۔ بھلا سوچئے تو کیا ماری ملکی، معاشرتی اور معاشی حالت ایسی ہے کہ شادیوں پر شادیاں کرتے چلے جائیں، گھروں کو دوزخ کا نمونہ بنادیں، ملک کو بےضرورت بچوں سے پاٹ دیں، روزی کے وسائل بڑھانے کیلئے تو ہاتھ پیر ماریں نہیں اور آبادی بڑھاتے چلے جائیں۔ گھروں میں ہر وقت کا فضیحتی رہے۔ آجکل کے عہد میں بالخصوص، بلکہ میں تو کہوں گا کہ بعض مستثنیٰ مثالوں کی بات چھوڑ کر، دو بیویوں میں صحیح صحیح عدل قائم کرنے کیلئے کونسا مائی کا لال اپنے آپ کو مکلف پاتا ہے؟ ذرا سامنے تو آئے! - چار شادیوں کا تو خیر ذکر ہی فضول ہے.........اچھا ہوا شادی کے اس خود ساختہ نظام میں اصلاح کی گئی...........اور میاں حامد میں تو تم سے محض مذاق کررہا تھا'' - رازی نے پھر تفصیل سے سمجھایا کہ وہ مذاق ہی تھا مگر ذرا گہرا اور معنی‌خیز۔

''کیا کہا............ مذاق؟ کیا مطلب...؟'' میاں صاحب گرج کر بولے۔ ''جی ہاں، محض اور صرف مذاق۔ یعنی خدا نہ کرے جو حامدہ بی بی پر سوت آئے حسین میاں تو بہت سمجھدار آدمی ہیں۔ انہیں اپنی بیوی سے کسی طرح کا شکوہ یا شکایت نہیں۔ بھلا وہ کیوں دوسری شادی کا عذاب مول لینے لگے!''

پہلے تو خان صاحب رازی کو غصے سے گھورتے رہے۔ معلوم ہوتا تھا اسے کچا ہی کھا جائیں گے۔ پھر یکایک ان کے چہرے کی رنگت بدلی اور ڈاڑھی کھجاتے ہوئے قہقہہ لگا کر بول پڑے ''اونے رازی، رازی کے بچے، تیری موت میرے ہاتھوں لکھی ہے! چل، پہلے لاہور کی ٹرنک کال کینسل کر، پھر میری طرف سے ایک اور ٹرنک کال بک کر ......رنگپور کیلئے........... برانچ منیجر سے کچھ کہنا ہے.............مطلب یہ کہ وہ جو ایک پرائیوٹ خط اسے ذرا تفصیل سے میں نے لکھا تھا، محض مذاق تھا۔ بہتر ہے کہ اسے ملتے ہی چاک کردے ۔ ......بیشک یہ غلطی پہلے سرزد ہو چکی ہے مگر جب بھی میرے ہوش کی آنکھیں کھل جائیں، غنیمت ہے۔ اللہ کی دی ہوئی آزادی اور حقوق کا صحیح مفہوم اب میری بھی سمجھ میں آنے لگا ہے۔ اچھا خیر، یار چھوڑو اس قصے کو۔ کوئی اور خبر سناؤ!''

* * *

ہماری ڈاک

ذیل کا خط دراصل کسی اور کا خط تھا جو حسنِ اتفاق سے
ہمارا بھی بن گیا ہے اور اب — آپ کا بھی! (ادارہ)

• جناب محمد شفیع صابر صاحب (پشاور)

• ماہ نو، کراچی کی اشاعت جنوری ۱۹۶۱ء میں آپ کا مضمون وادی کرم پر چھپا ہے بلاشبہ بہت قابل قدر ہے۔ آپ نے قارئین کے مطالعہ کے لئے جو حقائق و کوائف پیش کئے ہیں وہ بہت جامع اور معلومات سے لبریز ہیں۔ بالخصوص خود ملکی سیاحوں کے لئے مگر صفحہ ۴۴۔ پیرا ۵ میں آپ نے جو تحریر فرمایا ہے کہ اس وادی کو اہل پاکستان سے بھی متعارف کرایا جائے اور اس غرض سے ایک ادارۂ ترقی سیاحت قائم کیا جائے، حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ کیونکہ اس نوع کا ادارہ پہلے ہی سے قائم ہے۔ (سابق) حکومت سرحد نے یہ ادارہ — "ٹورسٹ بیورو" — ۱۹۵۲ء میں قائم کر دیا تھا۔ تاکہ پشاور ریجن، بہ شمول وادی کرم کے قابل دید مقامات کو سیاحوں کے لئے مقبول و جاذب توجہ بنایا جا سکے۔ اب یہ ادارہ حکومت مغربی پاکستان کے زیر اہتمام کام کرتا ہے اور ایک مکمل و باقاعدہ سرکاری شعبہ ہے جو نہ صرف ملکی سیاحوں، بلکہ غیر ملکی سیاحوں کی بھی خدمت کرتا ہے۔ مثلاً یہ کہ پاڑا چنار کے مقام کو مقبول بنایا گیا ہے اور وہ اب کافی غیر ملکی سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ ٹورسٹ بیورو کی طرف سے ان کے قیام اور سفر کے لئے جملہ سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں — اس طرح خود ملکی سیاحوں کو بھی اس دلکش وادی کی سیر کرنے کے لئے آمادہ کیا جاتا ہے مثلاً یہ کہ یونیورسٹی کے جملہ شعبوں کے طلبہ کی ہمت افزائی کی گئی کہ وہ بھی اس وادی کی سیر کریں۔ بہرکیف اب ہم بلا خوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس وادی کو سیاحوں کی آمد و رفت کے لئے جاذب توجہ بنانے میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی ہے اور ہماری ساعی رائیگاں نہیں گئی ہیں۔

اس موقع پر میں ایک اور بات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراتا ہوں پچھلے سال ستمبر میں نواب زادہ شیر افضل خاں صاحب (سی ایس پی) ڈویژنل کمشنر، پشاور ڈویژن کے زیر صدارت، ڈویژنل ٹورسٹ ایڈوائزری کمیٹی پشاور کا اجلاس منعقد ہوا تھا جس میں اس بات پر غور کیا گیا کہ وادی کرم میں سیاحوں کی آمد و رفت کے سلسلے میں اور کیا سہولتیں بہم پہنچائی جا سکتی ہیں۔ فیصلہ کیا گیا کہ پشاور اور پاڑا چنار کے درمیان ایک براہ راست آنے جانے والی سرکاری ٹرانسپورٹ کا اہتمام کیا جائے۔ اس سلسلہ میں اب جملہ انتظامات مکمل ہو چکے ہیں اور عنقریب اس بات کا اعلان کر دیا جائے گا کہ پشاور اور پاڑا چنار کے درمیان براہ راست بسیں چلنی شروع ہو گئی ہیں۔

آپ نے صفحہ ۴۳ پیرا ۶ پر یہ تحریر فرمایا کہ کرم گڑھی اسکیم پر ایک کروڑ روپیہ صرف ہوگا۔ جہاں تک میرا علم ہے اب اس کا تخمینہ تین کروڑ سے متجاوز ہو چکا ہے۔ صفحہ ۴۴ پر آپ نے وادی کرم کے چار قدرتی عطیات کا ذکر کیا ہے جن میں سے تین کا ذکر ہے اور چوتھے کا ذکر سہو کتابت سے رہ گیا ہے۔

بہر حال یہ چند سطور آپ کے مطالعہ کے لئے پیش کرتا ہوا امید ہے ناگوارِ خاطر نہ ہوں گی کیونکہ میں نے محسوس کیا کہ باہمی مفاد کے پیش نظر ان کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا میرا فرض ہے۔

(ترجمہ) ایس، آئی، اے، مظہر
(ڈائرکٹر ٹورسٹ بیورو پشاور)

پنڈی تو مجھے پاکستان کے سب شہروں سے زیادہ پسند۔ دوسرے نمبر پر نوشہرہ مکران دونوں کے ملٹری علاقے پسند آ۔ آپ کی سیر (ملاحظہ ہو مضمون بہ عنوان "میرے خوابوں کا شہر، راولپنڈی" مطبوعہ "ماہ نو" اگست ۱۹۵۹ء) اسی لئے پسند آئی کہ اس میں پنڈی کا ذکر خیر ہے۔ آپ ایک جگہ لکھتے ہیں "لال کرتی۔ یہ نام پتہ نہیں کیوں رکھا گیا لال کرتی ہر چھاؤنی میں ایک بازار کا نام ہے۔ سپاٹو، ڈگشائی،

لاہور، پنڈی، نوشہرہ۔ ایک دن میں نے باجی سے پوچھا تھا کہ "لال کرتی" کی وجہ تسمیہ کیا ہے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ ایک فوج ہوتی تھی جس کی وردی میں لال کوٹ ہوتا تھا۔ اس میں زیادہ تر ہندوستانی ہوتے۔ انہیں چھاؤنیوں کے عام حصوں میں بھی رکھ دیا جاتا یعنی بارکوں کے علاوہ بھی وہ رہتے۔ اور جن بازاروں میں وہ رہے ان کا نام لال کرتی پڑ گیا یعنی لال کوٹ والے فوجی جوانوں کا علاقہ۔ یہ بھی سنا ہے کہ ان فوجی جوانوں میں بینڈ بجانے والوں کی اکثریت تھی۔ بینڈ بجانے والے ہندوستانی تھے۔

رفعت شفیع

(ڈسکہ، سیالکوٹ)

کل ہی آپ کو خط لکھ چکا ہوں۔ آج عزیز ملک صاحب نے مجھ کو بتایا کہ حسب وعدہ وہ بھی آپ کو خط لکھ چکے ہیں جس میں امام بری شاہ لطیف سے متعلق وہ تمام روایت انہوں نے لکھدی ہے، اتفاق کی بات کہ کل شام ہی مجھے نور پور شاہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک قہوہ خانے میں چائے پیتے ہوئے ہوٹل کے ان پڑھ مالک سے میں نے اس روایت کا تذکرہ چھیڑ دیا تو اس نے بھی اسی روایت کی تصدیق کی۔ ہاں اس نے یہ کہا کہ بچھڑا نہیں، دیو تھا جو سرکار کی عبادات میں خلل ڈالتا تھا اور سرکار نے اس کو چٹان بنا دیا۔ لیکن روایت کو جس طرح عزیز ملک نے بیان کیا ہے، وہ زیادہ معروف ہے۔

کل اس علاقے' اسلام آباد کی تھوڑی سی جھلک نے دل پر عجیب اثر چھوڑا۔ راولپنڈی سے مری روڈ پہ مری کی طرف نکلتے ہی سٹیلائٹ ٹاؤن کی نئی وضع کی خوبصورت دلکش آبادی ہے۔ پھر چند میل کے فاصلے پر راول کا مشہور مقام جہاں کورنگ نالہ پر ایک چھوٹا سا آبشار ہے اور جہاں آجکل ایک کافی بڑا ڈیم تعمیر کیا جا رہا ہے۔ پک نک وغیرہ کے لئے یہ ایک مرغوب و محبوب تفریح گاہ ہے۔ جہاں برسات کی چھٹیوں میں آم پارٹیوں، کے جلسے اکثر رہتے ہیں۔ ذرا آگے جا کر ایک پتلی سی سڑک نور پور شاہاں کی طرف مڑ گئی ہے۔ جو پھر آگے سید پور سے ہوتی ہوئی جو لوکاٹوں کے باغات کے لئے مشہور ہے، راولپنڈی سے آن ملی ہے۔ نور پور اور سید پور یہ دونوں مقامات اپنے شیریں چشموں، اور سرسبز تنگ وادیوں کے علاقے ہیں جن کے عقب میں ایک شاداب پہاڑ سایہ فگن ہے۔ میں مدت کے بعد اس طرف گیا تو حسنِ فطرت کے اس سدا بہار آغوش میں روح و دل نے ایک عجیب تسکین ا[ور] لذت محسوس کی۔

آپ کو یہ دوسرا خط لکھنے کی تقریب کچھ تو نور پور شاہاں کی د[...] سے پیدا ہوئی۔ اور کچھ اس غزل کے سلسلے میں جو میں نے کل آپ ک[و] بھیجی ہے۔ اس میں ایک شعر کے مصرع اولیٰ کے سلسلہ میں کچھ التبا[س] سا ہو رہا ہے۔ شعر یوں ہے:

چشمِ آہو کو جلا دیتا ہے صحراؤں کا درد
غم بہت حالات میں، خوشیاں بہت جذبات میں

دراصل اس شعر کا پہلا مصرع کئی صورتوں میں، میرے ذہن میں آیا تھ[ا] مثلاً:

(۱) کچھ بھی ہو، جینے کا یہ انداز خوش آیا مجھے
(۲) زندگی کی آنچ سے روشن ہے پھولوں کی ردا
(۳) ریگِ صحرا گرم تر، رقصِ غزالاں تیز تر —— وغیرہ

ان میں سے میرے ایک سخن شناس دوست نے "چشمِ آہو" والے مصر[ع کو] زیادہ پسند کیا لیکن اب ایک دوسرے نکتہ فہم دوست نے کہا ہے ک[ہ] ان کے نزدیک — "کچھ بھی ہو جینے کا یہ انداز خوش آیا مجھے" — زیاد[ہ] پسند ہے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ اس میں صفائی اور تاثر زیادہ ہے۔ حالانکہ خود میرے نزدیک اس میں منطقی جواز کا عنصر بہت مدھم ہے سراسر وجدانی و ذوقی ہے۔ بہرحال میں اس کا فیصلہ آپ پر چھوڑتا [ہوں] جو مناسب و موزوں سمجھیں کریں۔ والسلام

آپ کا

(ضمیر جعفری)

●

مَاہِ نو کی ترقی اشاعت میں حصہ لیکر پاکستانی ادب و ثقافت سے اپنی عملی دلچسپی کا ثبوت دیجئے

"تنقید: علم وفن" بقیہ صـ ۱۵

خوشی میں ہنسایا ہے۔ اس کی زندگی میں ہر ہر قدم پر غالب اس کے ساتھ رہا ہے۔ اور اب وہ جو غالب پر لکھ رہا ہے تو غالب سے تعلق کے ایسے پہلو لا رہا ہے جو کسی کو معلوم ہی نہ تھے۔ غالب کی شاعری کو ایک نئی زندگی ملتی جا رہی ہے۔ غالب اپنی شاعری میں ایک ہستی، ایک انفرادیت نمایاں کرتا ہے۔ اس کا چاہنے والا نقاد اس کی اس ہستی کی تصویر اپنی طرح پر بنا رہا ہے۔ اس کے فقرے، جملے، پیرے، غرض پورا مضمون غالب کے فن کو نئے طریقے پر زندہ کرتا چلا جاتا ہے۔ تنقیدی فن کار کی خوبی اسی میں ہے کہ اس نے کتنے نگتے ہوئے فقرے اور جملے بنائے۔ اس کا دوام ان فقروں اور جملوں کی قدر وقیمت میں ہے۔ حالی نے غالب کو "حیوان ظریف" کہہ دیا۔ اس فقرے سے غالب ایک عجیب نوعیت سے زندہ ہو کر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ غالب کی ہستی پر جتنا بھی غور کیجئے اس فقرے کی موزونیت دل میں جگہ کرتی جاتی ہے۔ یہ فنِ تنقید کا کمال ہے۔ یہاں پہنچ کر نقاد ہر علم سے بالاتر ہو جاتا ہے اور پورا فن کار بن جاتا ہے۔ ارسطو سے لے کر آج تک تمام نقادوں کو دیکھ ڈالیئے ان کے یہاں علمی حصہ جو کچھ بھی تھا وہ زمانہ کے ساتھ ختم ہو چکا مگر فنی حصہ اب تک زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ فن تنقید کی جان یہی ہے۔ اور اسی کی بنا پر پرسٹلے کا ایک مختصر مضمون تاریخ ناول نگاری پر ضخیم کتابوں سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ شیلی پر بلا مبالغہ سینکڑوں ہی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ مگر سب مل کر فرانسس ٹامسن کے ایک مختصر سے مضمون کی برابری نہیں کر سکتیں۔

اس لازمی درجۂ فن کاری سے آگے بڑھ کر ایک اور درجہ آتا ہے جبکہ نقاد بڑا فن کار ہو جاتا ہے۔ وہ کسی صنف ادب کو نئی صورت دے دیتا ہے اور پھر اس صورت کی وضاحت کرتا ہے۔ اپنے فن کے نئے اصول بنا کر فن تنقید کو بھی نئے اصولوں پر لگاتا ہے۔ کولرج نے ایک نئی طرح کی شاعری کی۔ لوگوں کو یہ عجیب معلوم ہوئی۔ اس کو سمجھانے کے لئے اس نے "بیوگرافیا" لکھ ڈالی۔ یہ اس کی شاعری یا ورڈسورتھ کی شاعری ہی کو نہیں سمجھاتی بلکہ آئندہ شاعری کو پرکھنے کے لئے ایک نئی نظر ایک نیا طریقہ، ایک نیا اصول فکر بھی دیتی ہے۔ پھر کولرج اسی نظر سے تمام سابقہ شاعروں پر تنقید کر جاتا ہے۔ وہ سب نئے طریقے پر زندہ ہو جاتے ہیں۔ کولرج کی تنقید ایک نئے مذاق کی بنیاد ہی نہیں رکھتی۔ بلکہ پوری عمارت کھڑی کر دیتی ہے۔ پوری قوم اس تحریک سے متاثر ہوتی ہے۔ سخن کا ایک نیا مذاق وجود میں آتا ہے جو پوری صدی کے لئے مشعل راہ ہوتا ہے اور اگر بعد میں میتھو آرنلڈ یا ٹی۔ ایس ایلیٹ کے اثر سے اس میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہی ہیں تو کولرج اپنی جگہ پر اہم ہی رہتا ہے۔ ہمارے یہاں حالی، باوجود نقائص کے، اسی درجہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ انہوں نے پہلے نیچرل شاعری کی، پھر ایک مقدمہ میں اس کو واضح کیا۔ اس مقدمہ نے جس طرح ہماری تنقیدی نظر بدلی اس کا اثر ہم آج بھی محسوس کر رہے ہیں۔ مگر حالی کے بعد کوئی بھی ایسا نہ ہوا جو فن تنقید کا عامل نظر آتا ہے۔ ہمارے یہاں تنقید اور لوگوں کا کام ہے اور فن کاری دوسرے لوگوں کا۔ تنقید کے علمی نظریوں کو منشیوں کی طرح برت کر لوگ تنقید نگار ہو جاتے ہیں۔ حالی کے بعد کوئی بھی ایسا فرد دکھائی نہیں دیتا جس کا کوئی فقرہ، کوئی جملہ یا کوئی مضمون اپنے موضوع سے ناقدانہ محبت کا اظہار بن کر زندۂ جاوید ہو گیا ہو۔

اس وقت ایک آواز سنائی دیتی ہے "ادب زوال پذیر ہے۔ تشکیل نو ہونا چاہیئے۔ یہ نقاد کا فرض ہے" اس آواز کو سن کر یوں لگتا ہے جیسے کوئی کہہ رہا ہو۔ "لینا پکڑنا جانے نہ پائے!" فن کرنے کی بدیا ہے پہلے کچھ پیدا کیجئے۔ پھر اس پر تنقید کیجئے۔ تشکیلِ نو آپ سے آپ ہو جائے گی۔

اس عالم سے ہم اسی وقت نکل سکتے ہیں جبکہ ہر فن کار اپنے فن پر تنقید کرے اور اپنے جیسے فن کاروں پر تنقید کرے۔ محض تنقید نگاروں کو کوئی خاص اہمیت نہ دی جائے اگر وہ علم میں اضافہ کرتے ہیں تو اسے مانا جا سکتا ہے۔ اگر وہ ٹکڑے یا پرچے جمع کر کے محض چٹنے بٹے لڑاتے ہیں تو وہ بے کار ہے۔ اگر مصنف خود اپنی تصنیف پر تنقید کرے تو اسے خودستائی سمجھا جاتا ہے ضروری نہیں کہ یہ خودستائی ہو۔ ممکن ہے وہ فن کاری کے سلسلے

میں کچھ ایسے راز بتا رہا ہو جن کو سمجھنا ضروری ہے۔ ٹی۔ ایس ایلیٹ کے تنقیدی شاہکاروں میں اس کا ایک طویل مضمون " پوئٹری اینڈ ڈرامہ" ہے۔ اس میں اس نے زیادہ تر اپنے شاعرانہ ڈراموں ہی کا حال لکھا ہے اور ان میں وہ جو کچھ کرنا چاہتا تھا اس کا تذکرہ کیا ہے۔ یورپ کے کسی ملک کا کوئی بڑا ادیب نظر نہیں آتا جو اپنے فن کی بابت اور اپنی مخصوص تصانیف کی بابت کچھ نہ کچھ کہہ نہ گیا ہو۔ اگر ہمارے مشہور ادیب خود اپنے فن پر تنقید کریں تو یہ فنِ تنقید کو بڑھانے کے لئے بڑا اہم قدم ہوگا۔

" مہر نگار" بقیہ صـ ۲۸

(دریا کی لہروں سے رونے کی سی آواز بلند ہوتی ہے)

یوسف: مہر نگار، مہر نگار!......

(صدائے بازگشت)

(دور سے گانے کی آواز)

"اگر میں باغباں ہوتا تو گلشن کو لٹا دیتا
پکڑ کر دستِ بلبل کو چمن سے جا ملا دیتا"

" نور صحرا" بقیہ صـ ۱

پرکھیں ان میں قلب کا گدازِ عشق کی کیفیت محسوس ہوتی اور عوام کے دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ ان کے فلسفۂ حیات کا نچوڑ یہ ہے کہ دنیا بے ثبات ہے، راحتِ دنیا آنی جانی شے ہے۔ تکبّر کی جگہ انکساری اور انسان دوستی کا مسلک ہی ہمیں وہ تسکینِ دل و جاں عطا کر سکتا ہے جو ہمیں آلام و مصائب کو جھیلتے ہوئے بھی جینا سکھاتا اور مبارزتِ حیات میں کامران رکھ سکتا ہے۔

جلد ۱۴ — ماہِ نو — شمارہ ۶

جون ۱۹۶۱ء

مدیر: رفیق خاور — نائب مدیر: ظفر قریشی

سالانہ چندہ: ۵ روپے ۵۰ پیسہ

شائع کردہ: ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳، کراچی

فی کاپی: ۵۰ پیسہ

آزاد نظم کے سُراغ میں

ضمیر علی بدایونی

دیگر اصنافِ سخن کی طرح آزاد نظم کو سمجھنے کے لئے بھی یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کا آغاز کیسے ہوا۔ اس مضمون میں مغرب کی حد تک اس امر کے بارے میں تحقیق کی گئی ہے۔ اگلے شمارہ میں مشرق یعنی اردو میں اس کے فروغ پر روشنی ڈالی جائے گی۔ (مدیر)

۱۸۸۷ء میں جب آزاد نظم گو شاعر لاموریک اپنا ڈرامہ "ہوہن گرن" اینٹن تھیٹر میں پیش کر رہا تھا تو راستوں پر یارپیٹ کا اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا تھا کیونکہ پولیس نے اس ڈرامے کے کھیلے جانے کو ممنوع قرار دیا تھا لیکن عام لوگ اور شائقین اس کے کھیلے جانے پر مُصر تھے اور لاموریک کو سمبولسٹ شاعر سمجھ کر انہوں نے اس کی حمایت میں اربابِ اقتدار تک سے ٹکر لے لی تھی۔ بادی النظر میں یہ واقعہ بہت معمولی اور غیر اہم دکھائی دیتا ہے، لیکن آزاد نظم کے ماخذ کا سراغ لگانے میں ہماری بڑی مدد کرتا ہے۔ کم از کم اس واقعہ سے اس کا تو بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ تمام شعراء جو سمبولسٹ تحریک سے وابستہ تھے کسی نہ کسی طرح آزاد نظم کی ہیئت اپنانے پر مجبور ہو گئے۔ گستاؤ کاحن کی نظر میں تو آزاد نظم کوئی اختراع نہ تھی، بلکہ ایک منطقی ضرورت تھی جو اشاریت یعنی سمبولزم کے فوراً بعد پیدا ہوئی۔ انیسویں صدی کے اواخر میں فرانس میں جو ہیئتی تجربات ہوئے انہوں نے پوری دنیا کے ادب کو متأثر کیا۔ وہ اثرات آج بھی ہر زبان کے ادب میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔ سمبولزم نے ہیئت کے تجربات اور اس کے امکانات کا ایک نیا دروازہ کھول دیا تھا۔ ان امکانات میں سے ایک آزاد نظم کا تجربہ بھی تھا جو بقول گستاؤ کاحن سمبولزم کے ارتقاء کا نقطۂ عروج تھا۔ گستاؤ کاحن کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے جن سے آزاد نظم کا آغاز منسوب کیا جاتا ہے۔ ایک تقریب کے موقع پر اسے "فرانسیسی شاعری کا آزادی دہندہ" کا خطاب دیا گیا تھا لیکن جس طرح آزاد نظم کے اساسی لوازمات کا مسئلہ اب تک طے نہیں ہو سکا ہے اسی طرح اس کے آغاز کے مسئلہ پر بھی اس قدر رائیں موجود ہیں کہ وہ کسی ایک ماخذ اور ایک بانی تک رہنمائی نہیں کرتیں۔ کسی نے بادلیر کی منثور نظموں کو اس کا ماخذ قرار دیا۔ کسی نے ورلین کی "(UN VERS BIEN)" کو آزاد نظم کے معنی پہنائے۔ کسی نے امریکی شاعر والٹ وہٹ مین کے اثرات کا نتیجہ اور کسی نے میلارمے کے فنی نظریات کا ثمر قرار دیا۔

بادلیر کی منثور نظمیں آہنگ سے خالی نہیں۔ میلارمے نے بھی اسکی تقلید میں کئی منثور نظمیں لکھیں جن میں PAUVEENFANT PÂLE اور MA PIPE بہت کامیاب شمار کی جاتی ہیں۔ ایک قدرے طویل دیباچہ اس نے آہنگ خیز (SYMPHONIC) نثر میں تحریر کیا تھا۔ یہ اس نے بادلیر ہی کے زیرِ اثر کیا تھا لیکن ایک فاضل نقاد "ارنست رینےموں" کے نزدیک بادلیر وہ پہلا فرانسیسی نہیں تھا جس نے منثور نظمیں لکھیں بلکہ وہ پہلا فرانسیسی تھا جس نے اس کا فارمولا پیش کیا۔ بہرحال آزاد نظمیں خواہ سمبولسٹوں کی پیداوار کیوں نہ ہوں ان کی ابتدا بادلیر ہی کی منثور نظموں سے ہوتی ہے۔ ممکن ہے ارنست رینےموں کا یہ قول صحیح ہو اور منثور نظمیں بادلیر کے علاوہ کسی اور شاعر نے لکھی ہوں لیکن چونکہ بادلیر ہی وہ پہلا شخص تھا جس نے اس کا فارمولا پیش کیا اس لئے بادلیر کے علاوہ اور کسی شخص کو آزاد نظم کا اولیں سرچشمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہیئت کا سانچہ سب سے پہلے بادلیر ہی کے تجربات کے نتیجہ میں بدلا۔

آزاد نظم کے بانیوں میں کاحن، موریس، میری کرنسکا، لافورگ اور رداں لو کے نام لئے جاتے ہیں۔ گستاؤ کاحن کے قول کے مطابق اس نے سب سے پہلے سمبولسٹوں کے رسالہ "لاووگ" کے شمارہ بابت ۱۸۸۶ء میں اپنی آزاد نظموں کو پہلی بار شائع کیا۔ برخلاف اس کے میڈم میری کرنسکا، جسے ادبی حلقوں میں "پولینڈ کی ملکہ" کے نام سے پکارا جاتا تھا، کے متعلق کہا جاتا ہے کہ "چیٹ نور" میں ۱۸۸۲ء اور ۱۸۸۳ء کے درمیان سب سے پہلے اس کی آزاد نظمیں اشاعت پذیر ہوئیں۔ لافورگ کی نظموں کا ایک قابلِ قدر حصہ آزاد نظموں پر مشتمل

اور اسی سال ان کی اشاعت ہوئی۔ بقول سوپر ویلیے، لافورگ کی آزاد نظمیں کاہن کی اور کرنسکا کی نظموں سے پہلے شائع ہوئیں اور کاہن کو تو وہ سرے سے شاعر ہی تسلیم نہیں کرتا۔ چنانچہ لکھتا ہے "اس مسئلہ پر بڑی قیاس آرائیاں کی گئی ہیں کہ لافورگ یا گستاؤ کاہن نے فرانس میں سب سے پہلے آزاد نظم کا آغاز کیا۔ میرے لئے تو سرے سے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مجھے پتہ نہیں کہ کاہن ایک شاعر ہے۔ میرے خیال میں وہ نہیں ہے۔ اسی لئے اس کی شاعری سے مجھے دلچسپی نہیں اور یہ سرے سے موجود ہی نہیں۔ لیکن لافورگ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہے گا ایک شاعر کی حیثیت سے۔ خواہ وہ غلطی ہی کیوں نہ کرتا ہو۔"

کاہن کے قول کے مطابق لافورگ کی اختراع نفسیاتی اور اس کے آہنگ سے متعلق تھی۔ اور جیسا کہ اس دور کے ایک صف اول شعار نقاد دوژاراں نے کہا ہے 'لافورگ اور کاہن دونوں آزادانہ طور پر اپنی جداگانہ راہوں سے آزاد نظم تک پہنچے لیکن دوژاراں کے نزدیک ان دونوں کا پیش رو رآں بو تھا جس کی نظم "میرین" سمبولسٹوں کے رسالہ "لاووگ" کے شمارہ بابت ۲۹ مئی ۱۸۸۶ء میں شائع ہوئی۔ اس نظم کو دوژاراں سب سے پہلی آزاد نظم کے نام سے پکارتا ہے جس کا اردو ترجمہ یہ ہے:۔

"چاندی اور تانبے کے رتھ
سیمیں آہنی جہاز کسی سفینے کا
جھاگ اچھالو
کانٹے دار درختوں کی شاخوں کو اٹھاؤ
بنجر حصّوں کا بہنا
جزر کا زور سے کھینچنا کشتی کو
دائرہ کی صورت میں مشرق کی سمت بڑھو
صحرا کے ستونوں کی جانب
دریا کے بند کے ستونوں کی جانب
جس کے گوشوں کے سامنے روشنی کے گرداب ہیں
ناقابل پڑنے والے۔"

یہ سب سے پہلی آزاد نظم ہے اس میں آہنگ موجود ہے۔ لیکن روایتی بحر کی پابندی ہی نہیں۔ رسالہ کے مضامین کی ترتیب سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے مدیروں نے اسے[۱] نثر سمجھ کر شائع کیا تھا اور وہ اس سے بے خبر تھے کہ یہ نظم ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے پہلے آزاد نظمیں شائع ہو چکی ہوتیں تو رآں بو کی اس آزاد نظم کو نثر سمجھ کر شائع نہ کیا جاتا۔ یہ نظم نئی شاعری کا سرچشمہ ہے اور اس سے شعری ہیئت کے اس تجربہ کا آغاز ہوتا ہے جس کی مثال دنیائے ادب میں موجود نہیں، مصرعوں کا ایک دوسرے میں مدغم ہونا (ENJAMPEMENT) موضوع کا بے روک بہاؤ الفاظ کا صحیح و مناسب انتخاب (جو پابند نظم میں کسی حد تک مشکل ہے اور رآں بو کا وہ اسلوب جو اس ہی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ ان تمام خوبیوں نے مل کر رآں بو کی اس نظم کو اس کی اچھی اور کامیاب نظموں میں شامل کر دیا ہے۔

رآں بو کی ایک دوسری نظم "مُوومنٹ" بھی آزاد ہیئت میں لکھی گئی ہے۔ گستاؤ کاہن نے گو رآں بو کی پیش قدمی اور اولیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے بلکہ ایک انٹرویو کے دوران اس نے کہا تھا کہ رآں بو کا تو سرے سے آزاد نظم سے کوئی تعلق ہی نہیں، لیکن بیشتر محققین رآں بو کے حق میں ہیں اور شواہد سے بھی یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ رآں بو کے علاوہ کسی اور شخص کی آزاد نظمیں "لاووگ" میں شائع نہیں ہوئیں۔ میری کرنسکا کی نظمیں، نثر زیادہ اور نظمیں کم ہیں ان میں آہنگ کا فقدان بھی ہے۔ اگر مورئیس کا یہ بیان صحیح ہے کہ اس نے ۱۸۷۲ء میں اپنی آزاد نظمیں کاہن کے پاس بغرض اشاعت روانہ کی تھیں تو اولیت کا سہرا مورئیس کے سر ہے۔ لیکن نہ تو وہ نظمیں رآں بو کی نظموں سے پہلے شائع ہوئیں اور نہ کاہن کے علاوہ کسی اور شخص کو اس کا علم تھا۔ کاہن کے نزدیک مورئیس کا یہ بیان سراسر غلط اور گمراہ کن ہے۔ اس لئے رآں بو کے علاوہ اور کسی شاعر نے سب سے پہلے آزاد نظمیں نہیں کہیں بنا بریں آزاد نظم کے آغاز کا سہرا رآں بو کے ہی سر ہے

میلارمے اور اس کے فاضل شاگرد، والیری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے آزاد نظمیں نہیں کہیں۔ یہ بیان والیری کی حد تک تو صحیح ہے لیکن میلارمے نئی ہیئت کا حامی تھا۔ اس کی تائید ان الفاظ

---

[۱] ہمارے یہاں آج بھی آزاد نظم کو بعض لوگ نثر ہی سمجھتے ہیں یہ توارد دلچسپی سے خالی نہیں۔ (مدیر)

ملتی ہوتی ہے جو اس نے جولی ہورے سے انٹرویو کے دوران کہے تھے۔

"زبان میں جہاں بھی آہنگ ہے، وہیں شعر ہے۔ بجز اخبارات کے اشتہاری صفحات اور اعلان ناموں کے۔ نثر میں بھی اشعار ہیں۔ اور بعض اوقات قابلِ تعریف بھی اور آہنگ کی تمام صورتوں میں۔۔۔۔ جہاں بھی اسلوب پیدا کرنے کی جد وجہد ہے وہیں شاعری ہے" میلارمے کی وہ اسرار زا اور ساکت نظم "پانسے پھینکنا" جس میں شاعر نے اظہار و بیان کی بجائے خموشی و سکوت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، آزاد نظم کی ہئیت میں لکھی گئی ہے۔ میلارمے کی اس نظم کے متعلق کچھ کہنا قریب قریب ناممکن ہے کیونکہ آج تک کوئی اس کے معموں کا حل پیش کرنے کی جرأت نہیں کر سکا۔ فنی گنز ویک کے معمے بھی اس کے سامنے بازیچۂ اطفال معلوم ہوتے ہیں۔ یہ نظم اس کا شاہکار ہے۔ میلارمے نے اس نظم میں آزاد ہئیت استعمال کر کے آزاد نظم کے لئے وجہ جواز پیدا کر دی۔ بلکہ بعض نقادوں کی رائے کے مطابق اس میں سب سے زیادہ آزادانہ ہئیت استعمال کی گئی ہے۔ اپنی اس نظم کے دیباچہ میں وہ لکھتا ہے:

"آیئے ہم اسے صاف طور پر تسلیم کر لیں کہ تجربہ ہمارے عین مطابق، غیر متوقع اور انفرادیت کی تلاش و جد وجہد ہے اور ہمارے دور کا پسندیدہ ہے۔ اور وہ تجربہ آزاد نظم کی ہئیت اور منثور نظم کا ہے"۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ خود ہئیت کے نئی امکانات پر غور کرتا رہا تھا اور اس نے اس تجربہ کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا۔ اس نظم میں اس نے اسی ہئیت کو استعمال کیا ہے۔ اس کے کچھ حصّے ملاحظہ ہوں:

"SOIT
QUE
l'ABIME
BLANCHI
ETALE
FURIEUX
SOUS UNE INCLINAISON"

(ہو یہ) وہ گہرائی، اجالا ہوا دکھاتا ہے، تند و تیز، ایک میلان کے تحت" "پانسے پھینکنا" کی حرکت، فکر ہی حرکت ہے۔ اسی مرکزی خیال کی روشنی میں پوری نظم کو دیکھنا چاہئے۔ اس کا ایک اور حصّہ ملاحظہ ہو۔

کچھ نہیں
قابلِ یاد بحران کا
یا تھا
وہ واقعہ جو انسان کے ہر فضول نتیجہ کی نظر میں اتمام یافتہ ہے
وہ رونما ہو گا
ایک معمولی بلندی عدم کی بوچھاڑ کر رہی ہے
لیکن وہ مقام
ایک طرح کی ہلکی لہریلی صدا، گویا کہ خالی عمل کے انتشار کے لئے
ناگہانی طور پر وہ اگر نہیں ہے
اپنی سیمیا سے
اس کی بنیاد رکھی ہو گی
تباہی و بربادی
سمندری کناروں کے پانیوں میں
خلا کا
جس میں ساری حقیقت تحلیل ہوتی ہے۔

علامتوں کی اس پُراسرار فضا میں شاعر کے مقصد کو تلاش کرنا سعیٔ لاحاصل ہے۔ البتہ اس کی ہئیت ہمارے پیش نظر ہے جس میں روایتی بحر کی پابندی نہیں اور جیسا کہ میلارمے نے کہا ہے اس نظم کی ہئیت نہ آزاد نظم کی ہے اور نہ منثور نظم کی بلکہ ان دونوں کے اتحاد سے ایک نئی ہئیت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو آزاد نظم اور منثور نظم دونوں کا احاطہ کرتی ہے۔ میلارمے کے نزدیک شعر نویسی کی پرانی ہئیت ایک خاص مقصد کے لئے موزوں ہے لیکن خالص تخیلی اور ذہنی موضوعات کے لئے غیر موزوں ہے۔ اس کے نزدیک پابند نظم کا تو سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اصل چیز

PRISMATIC SUBDIVISION OF IDEA

یعنی موضوع کی منشوری تحتی تقسیم ہے۔ یہاں آئیڈیا کو اس نے "تفہیم" کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ موضوع کی منشوری تحتی تقسیم جس طرح پابند نظم میں ہو سکتی ہے اسی طرح بلکہ کسی قدر

طور پر آزاد نظم میں ممکن ہے۔ اس سے یہ بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ میلارمے نے نئی ابھرتی ہوئی تحریکات کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا۔ ایک بار اس نے اپنے دوست جولی ہورے سے کہا تھا کہ قومی جھنڈے کی مانند قومی آہنگ کو بھی منفرد و مخصوص ہونا چاہیئے۔ اسی دور کے ایک خط میں اس نے گستاؤ کاحن کو نئی ہیئت کے متعلق لکھا تھا:

"UNEAVENTURE INDUIE" (ایک غیر معمولی تجربہ) اور "UN DELICIEX AFFRANCHISSEMENT" (ایک خوشگوار رستگاری و آزادی)

اس کے علاوہ وہ پارنیسین اِزم اور سمبولزم کے درمیان ہیئت کا مطلق انقطاع چاہتا تھا۔ آزاد نظم کی ہیئت نے اس کی اس خواہش و ضرورت کو بھی پورا کیا۔ قومی آہنگ کے استعمال نے جو بے کیفی پیدا کر دی تھی اس کی بھی نئی ہیئت نے تلافی کر دی۔ اور یہ بھی کہ سخن کہیں زیادہ "زیر لبی" ہو گیا جو میلارمے کی خواہش تھی۔ پرانی شاعری کی ہیئت مطلق، ناقابلِ تبدیل اور یکتا نہ تھی۔ وہ صرف لفظوں کو اس طرح جوڑنے کا ایک یقینی ذریعہ تھی کہ وہ شاعری میں تبدیل ہو جائیں۔ اس سے زیادہ اس کی اور کوئی مفید خصوصیات نہ تھیں۔ نئی ہیئت اپنے ساتھ نیا آہنگ، نیا ولولہ اور نیا کیف لائی اور اس کی مطلقیت و یکتائی نے اسے تمام دنیا کی زبانوں کی شاعری سے ممتاز و منفرد کر دیا۔ اور میلارمے کے نزدیک یہی اس کی سب سے بڑی خوبی تھی۔ پال والیری نے بے شک آزاد نظمیں نہیں کہیں لیکن جو شخص اسٹاک ایکسچینج کی بے ہنگم صداؤں کو نغمہ بار محسوس کر سکتا تھا وہ آزاد نظم کو کیسے بے آہنگ و غیر شاعرانہ محسوس کر سکتا ہے؟

نظریاتی اعتبار سے آزاد نظم گو شعراء ایک ایسے ذریعۂ اظہار کی تلاش میں تھے جو ایک طرف تو پرانی ہیئت کا بہتر بدل ثابت ہو اور دوسری طرف ان کے غیر محدود "آزادی" کے نصب العین کی طرف بڑھانے میں مدد کرے۔ کاحن کے نزدیک ہر بڑے شاعر کا آہنگ ذاتی ہوتا ہے۔ اور بحر بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ ایک آہنگ کا انتخاب ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اصل چیز آہنگ ہے نہ کہ بحر۔ نئی ہیئت میں غیر ضروری فراوانی نہیں ہوتی۔ مصرعے اپنی طوالت کا تعین خود کرتے ہیں؛ خواہ طویل ہوں یا مختصر۔ اور بند جملۂ واحد کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ گستاؤ کاحن اور دوسرے آزاد نظم گو شعراء کے نزدیک نئی ہیئت کے اصول فرانسیسی آہنگ سے کامل ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں اور فرانسیسی آہنگ کی فطرت سے نئی ہیئت پیدا ہوتی ہے۔ یہ نئے اصول دراصل نئے نہیں بلکہ ہمیشہ سے فرانسیسی آہنگ پر حاوی رہے ہیں۔ کاحن نے راسین کے اس شعر میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کا بھی آہنگ منفرد و ذاتی تھا۔ اس نے اس کی تقطیع یوں کی ہے:

OUI JE VIENS/ DANS SON TEMPL/
EADORER / l' E TENSAL /
JE VIENS / SELONI' USAGE /
ANTIQU E ET SOLENNEL/

یعنی راسین نے اس میں بشرام CAESURA کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی ہے اور اسی طرح تمام کلاسیکل اساتذہ نے کوشش کی ہے۔ اس کے نزدیک راسین کا یہ شعر اور دوسرے اشعار بھی ارکان کی تعداد پر قائم نہیں ہیں بلکہ آزاد ذاتی آہنگ وحدتیں اس کی اساس ہیں۔ کاحن کی نظر میں جدید شاعر کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ روایتی بحروں کی پابندی سے گریز کرے اور اس آہنگ کے لئے جد و جہد کرے جن کو ابھی تک پہچانا نہیں گیا ہے۔ اس سے فرانسیسی شاعری کی وہ ثروت مندی پھر واپس آسکتی جو پارنیسین ازم کی روایت پرستی اور واقعیت نگاری سے مجروح ہوئی اور جو فرانسیسی کلاسیکل ادب کا سرمایۂ امتیاز تھی۔

گستاؤ کاحن کو کسی طور پر بھی فرانسیسی ادب کے عظیم شعراء میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وجہ ویل گریفاں نے یہ بتائی ہے کہ اس میں فنی استعداد کی کمی ہے اور اس کی آزاد نظمیں بھی فرانسیسی بجائے بائیبل کے اسلوب کے شعوری یا غیر شعوری تتبع کا نتیجہ ہیں۔ آزاد نظم گو شعراء میں لافورگ کے علاوہ اور کوئی شاعر ایسا نہیں جس کا شمار عظیم فرانسیسی شاعروں میں کیا جا سکے۔ اس کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں جن کو بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ نظر آتی ہے کہ آزاد نظم گو شعراء نے محتاط جدت پسندی کا ثبوت

(باقی صفحہ ۶۲ پر)

ادب اور معاشرہ

ایم ۔ عبد الماجد

یہ موضوع خاصا بحث انگیز ہے ۔ اس لئے قارئین کو اس پہ اظہار خیال کی دعوت دی جاتی ہے ۔ (مدیر)

ادب اور معاشرہ میں تفریق کا بیج انگریزی ادب میں ملکۂ وکٹوریہ کے عہد میں بویا گیا ۔ فرانسیسی میں اس سے پیشتر ہی یہ تفریق پیدا ہو چکی تھی ۔ فلابیئر، ایڈگر ایلن پو اور والٹر پیٹر تینوں اس نظریئے کے حامی تھے کہ ضروری نہیں ادب برائے زندگی یا معاشرہ ہو ۔ بلکہ ادب بذات خود ایک وجود رکھتا ہے جو تنقید کی اصطلاح میں "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" کے نام سے معروف ہے ۔ ہمارے یہاں ادب برائے معاشرہ یا زندگی کا نظریہ سب سے پہلے حالی نے اپنے "مقدمہ شعر و شاعری" میں پیش کیا تھا ۔

ان میں سے کونسا نظریہ صحیح ہے اور کونسا غلط، اس کے لئے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ تخلیق فن کا محرک کیا ہوتا ہے ۔ فن کار اپنے ماحول سے اثر پذیر بھی ہوتے ہیں ۔ فنکار کی شخصیت اور معاشرے یا ماحول کے اثرات کافی حد تک یہ بتا دیتے ہیں کہ اس نے جو کچھ لکھا کیوں لکھا اور اس کے علاوہ کوئی دوسری قسم کی چیز کیوں نہ تخلیق کی ۔ مثلاً اقبال میں غالب کا انداز کیوں نہیں آیا اور غالب نے اقبال کا سا رنگ کیوں نہ اختیار کیا ۔ اس کے لئے ہم معاشرہ یا دورِ غلامی کے ناگزیر اثر اور اسی قسم کی کوئی اور وجہ آسانی سے تلاش کر سکتے ہیں ۔ لیکن اس کے باوجود انسانی ذہن اتنی مفرد چیز نہیں کہ اس پر جو بھی اندرونی اثرات طاری ہوں، ان کا تجزیہ کر کے بتایا جا سکے کہ کوئی خاص فن کیوں وجود میں آیا ۔ بہ الفاظ دیگر تخلیق فن کے عوامل اتنے پیچیدہ ہوتے ہیں کہ کوئی اور تو در کنار خود فنکار بھی اس کی ماہیت یا مخرج پر کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا ۔ مثلاً عہد وکٹوریہ میں جبکہ مادی قدریں صنعتی ترقی کی وجہ سے اخلاقی و روحانی اقدار پر غالب آ چکی تھیں، مختلف فنکاروں نے ان کے خلاف بغاوت کی تھی جن میں کارلائل اور رسکن پیش پیش تھے ۔ وہ شعوری طور پر اخلاقی اقدار کے علمبردار بن گئے ۔ تاہم بعض ایسے فنکار بھی تھے جنہیں مادی قدروں سے نفرت تو تھی مگر انہوں نے ان سے گریز کی ایک اور صورت پیدا کر لی تھی یعنی انہوں نے "فن برائے فن" کا نظریہ اختیار کر لیا تھا جس کی زیریں لہروں میں وہی نفرت تھی جو میتھیو آرنلڈ وغیرہ کے ہاں پائی جاتی تھی بغرض فنکار ماحول کے اثرات قبول تو کرتا ہے مگر وہ اس کی اپنی شخصیت ہی میں جذب ہو کر نکلتے ہیں ۔ وہ اپنے فن میں بالکل اپنی ہی شبیہ پیش کرتا

ادب کی پیدائش کی اولین بنیادی وجہ، بگمانِ غالب انسانی معاشرے میں زندگی سے فرار کا جذبہ ہی تھا ۔ صدہا سال پیشتر جبکہ زندگی انسان کے لئے دشوار تھی، وہ آسودہ زندگی کا جویا تھا ۔ جو اسے میسر نہ تھی اسی لئے اس نے مافوق الفطرت کہانیاں لکھنا شروع کر دیں جن میں ایک نئی خیالی دنیا نظر آتی تھی ۔ دنیائے حقیقت سے بالکل مختلف ۔ وہ اپنے آپ کو اس نئی دنیا کا باسی سمجھ کر خوش ہو جاتا تھا یعنی زندگی کے گوناگوں مسائل و مصائب سے نجات حاصل کرنے کے لئے وہ ایک ایسی دنیا تخلیق کرتا تھا جس کی سطح اس کی روزمرہ کی زندگی سے بہت بلند ہوتی تھی ۔ آج بھی انسان زندگی کی کاوشوں میں پھنسا ہوا انسان چند لمحے کوئی دلچسپ سی کتاب اس لئے پڑھنے لگتا ہے کہ وہ مکروہات دنیوی سے تھوڑی دیر کے لئے ہی فرار حاصل کر کے ایک ذہنی سکون حاصل کر لے ۔ گویا وہ ایک ایسی تفریح کی تلاش کرتا ہے جو عملی زندگی میں میسر نہ ہو ادب قاری کے لئے "تلاشِ مسرت" کا ایک راستہ ہے ۔ بلکہ فنکار کو بھی مسرت و سکون سے ہمکنار کرتا ہے ۔ کیونکہ تخلیق فن سے پیشتر، جیسا کہ سکاٹ جیمز کہتا ہے، فن کار اپنے ذہن میں ایک گھنا ڈراؤنا اور خطرناک جنگل دیکھتا ہے ۔ وہ چاہتا ہے کہ اس جنگل سے نکل کر، یا کوئی راہ فرار تلاش کر کے ایک محفوظ مقام پر ذہن کو پہنچا دے ۔ اور وہ اس جنگل کی کانٹا

جھاڑیاں کاٹتا کاٹتا ایک راستہ بنالیتا ہے جو کہ اسے ایک محفوظ مقام پر پہنچا دیتا ہے۔ یہی اس کے فن کی تخلیق ہوتی ہے۔ جس کا مقصد خواہ کچھ بھی ہو، وہ سکون اور مسرت کا پیغام اس کے لئے ضرور لاتا ہے۔"

اب دیکھنا یہ ہے کہ مسرت کی بہتر طریقے سے تحصیل کس ادب میں ہوسکتی ہے۔ ادب برائے ادب یا ادب برائے معاشرہ و زندگی سے ظاہر ہے کہ ادیب اور قاری چونکہ کسی معاشرہ کے ہی افراد ہوتے ہیں، اس لئے اگر فنکار اپنے فن میں معاشرے کے زخموں کو نمایاں کرتا ہے تو وہ بجائے مسرت کے تکلیف کا موجب ہوتا ہے۔ اگر وہ یہ چاہتا ہے کہ مسرت دے اور حاصل کرے، تو اس کے لئے بہتر ہوگا کہ وہ زخموں کی طرف بھی توجہ دلائے۔ لیکن چونکہ انسانی تخلیق میں افادیت کا پہلو ضرور ہوتا ہے، یعنی انسان ایسا کام نہیں کرتا جو بیکار محض ہو، اس لئے فنکار معاشرہ کے زخموں سے بیگانہ بھی نہیں رہ سکتا اگر وہ ان زخموں کے متعلق شعوری طور پر کچھ بھی نہ لکھے تب بھی اس کے ذہن میں ان کی چبھن ضرور موجود ہوگی۔ اور جس فن کی وہ تخلیق کرے گا اس میں زخموں کے درد و کرب کا کسی نہ کسی طریقہ سے اظہار آ ہی جائے گا خواہ وہ زخم کتنے ہی گہرے اور گھناؤنے کیوں نہ ہوں۔ فنکار اُن کو کتنا ہی چھپانے کی کوشش کیوں نہ کرے، ان کا کرب کسی نہ کسی طرح اس کے ذہن میں ہلچل پیدا کرنے کا موجب ضرور ہوگا۔ یہ تسلیم اگر ادب کا محض برائے زندگی یا معاشرہ ہونا کوئی چیز نہیں۔ بلکہ وہ سرے سے ادب ہی نہیں۔ وہ تو صرف ایک کڑوی کسیلی دوا ہے جس کو مریض سونگھ کر پھینک دیتا ہے۔ ادب کا صحیح منصب تو یہ ہے کہ وہ دوا بھی ہو اور اتنی شیریں کہ مریض اس کو پیئے بغیر نہ رہ سکے یعنی بیک وقت تفریح بھی اور علاج بھی۔

بعض مفکروں اور نقادوں کی رائے میں ادب کا مقصد محض لطف مسرت نہیں بلکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جو انسان میں عمل کی تحریک پیدا کرتی ہے۔ یہ ہے ادب برائے زندگی کا تصوّر۔ لیکن ایسا ادب جو عملی تحریک نہ بھی پیدا کرے اور صرف مسرت کا باعث ہی ہو، وہ بھی بذات خود ایک تحریک ہے اور اپنے تأثرات ہر ذہن پر چھوڑتا اور اس کو متحرک کرتا ہے۔

یہاں سے ادب مختلف خانوں میں بٹ جاتا ہے۔" ادب برائے اخلاق"، " ادب برائے سیاست"، ادب برائے منادی"، "ادب برائے فلسفہ"، "ادب برائے انقلاب" وغیرہ۔ مثلاً روسو اور والٹیر وغیرہ کا ادب جو انقلاب فرانس کا محرک ہوا، دراصل ان تمام چیزوں کا خمیر فن کار کے اپنے ذہن، اس کے بنیادی تجربات اور ان کے ساتھ عمل و ردِ عمل پر مبنی ہوتا ہے۔

خواہ فن کار کتنی بھی کوشش کرے وہ بیرونی اثرات سے نجات نہیں پا سکتا اور اپنی مکمل شخصیت کی مہر اپنے ادب پر ثبت نہیں کرسکتا۔ اس میں بیرونی آمیزشیں ناگزیر ہیں۔

فن کار کی تخلیق فن سے پہلے ذہنی کشمکش تو پیچھے بیان کی جا چکی ہے لیکن اس کے طریق کار پر غور کرنا ابھی باقی ہے۔ یہ طریق کار مختلف ہو سکتے ہیں۔ ان کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ فن کار زندگی کا مشاہدہ کرتا ہے کوئی خاص واقعہ اس کے ذہن میں ہیجان پیدا کرتا ہے جو اس کو اپنے محسوسات کی وجہ کے باعث ایک ایسے شدید عالم میں پہنچا دیتا ہے جہاں اس کو طلب ہو۔ کے لئے صرف ایک فلیتے کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ بعینہٖ اپنے محسوسات کو لفظی شکل دے دیتا ہے۔ وہ کوئی فلسفہ، کوئی درسِ اخلاق کوئی زندگی کے اسباق ان سے نہیں تراشتا۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ تجربہ بذاتِ خود ... ہے۔ اس لئے وہ اپنے فن میں تجربے کا نچوڑ اور فلسفہ پیش نہیں کرتا۔ یہ فن "ادب برائے ادب" کے زیادہ نزدیک ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف ایک دوسرا فنکار تجربات حاصل کرتا ہے، زندگی کا مشاہدہ کرتا ہے، واقعات سے اثر پذیر ہوتا ہے، اور انہیں اپنے ذہن میں پرورش دیتا ہے۔ حتیٰ کہ تخلیق فن کا ارادہ لے کر ان تجربات و واقعات کی آمیزش سے ایک نیا مواد اپنے ذہن میں تیار کرتا ہے۔ جو فلسفہ سے قریب تر ہے۔ اور اسے الفاظ کا جامہ پہناتا ہے۔ یہ ادب یا فن برائے معاشرہ یا زندگی ہے۔ اور شعوری ادب ظاہر ہے کہ شعوری ادب غیر شعوری ادب سے کمتر ہے۔ اسی غیر شعوری ادبی تخلیق کے لئے شیکسپیر کو دنیا آج تک ایک بے مثال جوہر قابل تسلیم کرتی ہے۔

ادب اصل میں نہ تو برائے زندگی ہے اور نہ محض برائے ادب۔ پہلے برائے فن کار ہوتا ہے وہ فن کی تخلیق اپنے ذہنی سکون اور ذاتی مسرت کی وجہ سے کرتا ہے۔ اور ادب کی تخلیق کر کے ایک قسم کا بوجھ اپنے سر سے اُتار دیتا ہے۔

ادب برائے ادب کے متعلق تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ادب ہی ہوگا کیونکہ اس میں کیف و نشاط کا عنصر لازمی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ادب برائے معاشرہ بھی ادب ہی ہو۔ ادب کے لئے افادیت سے بھرپور ہونا لازمی نہیں کیونکہ ادب کا تعلق زیادہ تر ذہنی اور روحانی خوشیوں سے ہے۔ اگر افادیت درکار ہو تو وہ سائنس ہمیں بہت زیادہ اور بہتر دے سکتی ہے۔ یوں افادیت مذہبی فلسفے میں اور بھی زیادہ ہوتی ہے لیکن ادب کہاں اور مذہب کہاں؟ دونوں میں بُعدُ المشرقین ہے۔ آج تک کسی نے مذہب کو ادب تسلیم نہیں کیا۔

صدائے بازگشت

("اقبال وجودیوں کے درمیان")

"ماہ نو" کے شمارہ بابت اپریل ۱۹۶۱ء میں "اقبال وجودیوں کے درمیان" کے عنوان سے ہمارے ایک نوجوان ادیب، جناب ضمیر علی بدایونی، کا ایک مضمون شائع ہوا تھا، جس میں حکیم مشرق علامہ اقبالؒ اور ان جدید حکمائے مغرب کے فکر میں مماثلت کی حد تک پہنچی ہوئی مشابہت کی نشان دہی کی گئی تھی، جو وجودیئین (EXISTENTIALISTS) کے نام سے مشہور رہیں۔ "ماہ نو" کو یہ شرف حاصل ہے کہ یہ موضوع سب سے پہلے اس ہی میں چھیڑا گیا اور اس اہم حقیقت کی طرف بطور خاص توجہ دلائی گئی جس سے کئی امور پر روشنی پڑی۔ یہ کہ حکیم مشرقؒ اور موجودئیں مغرب کے تصورِ انسانی میں کتنا عنصر مشترک ہے اور اقبال نے خودی، جہد اور ستیزہ کاریٔ حیات پر جو زور دیا ہے، وجودیت اس کے ساتھ کہاں کہاں ہم آہنگ ہے اور ان کی آرا کو اس مکتبۂ فکر کے نظریات سے کن کن پہلوؤں پر سبقت حاصل ہے۔

اس مضمون کی اشاعت کے جلد ہی بعد ایک تائیدی گونج دیارِ فرنگ سے سنائی دی۔ واشنگٹن کے "اسلامی مرکز" میں اقبال کی ۲۳ ویں برسی منانے کے لئے ایک علمی اجتماع ہوا جس میں اقوام متحدہ کی سیکرٹریٹ کے ناظم اور فاضلِ اقبالیات، مسٹر ولیم جارڈن نے ایک تقریر کی جس میں اقبال کو وجودی مفکرین کا پیشرو ظاہر کیا گیا۔ گویا "ماہ نو" نے جو پہلی کرن اس سمت ڈالی تھی انہوں نے بھی اقبال کو اس سے ملتی جلتی روشنی میں دیکھا اور ہمارے مضمون نگار کے فکر و رائے سے ہم آہنگی ظاہر کی۔ بہر کیف ہمیں مسرت ہے کہ "ماہ نو" میں اس موضوع کا آغاز پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اور مغربی اقبال شناس بھی انہی خطوط پر سوچ رہے تھے جن پر ہمارے دوست نے طرحِ فکر ڈال کر سبقت کا فخر حاصل کیا۔

جس خبر پر یہ سطور مبنی ہیں اس میں کہا گیا ہے کہ:-

"اقبال کی شاعری جس میں انسانی شخصیت کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ موجودہ وجودی تحریروں کی پیشرو ہے۔ اقبال اسلام کے وجودی فلسفی شاعر تھے۔ یورپ کے مصنف جو "وجودی" کہلاتے ہیں، ان میں اور اقبال میں یہ نظریہ مشترک ہے کہ انسان کی خودی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔" (ادارہ)

"بیرس رسنا"

آج ہماری زندگی بے رس ہے کیونکہ مشرقی پاکستان کا مایۂ ناز جواں سال ادیب اور ڈرامہ نگار، عبدالستار، جو ادبی حلقوں میں "بیرس رسنا" کے حسین القاب سے معروف تھا ہم میں موجود نہیں۔ اس نے بہت جلد اس چمن میں آشیاں باندھ لیا جہاں باغِ ہستی کے سب عنادل ہم نفس ہیں۔

خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود

تاہم قبل اس کے کہ موت اس کی زندگی کا چراغ گل کر دے، اس نے ایک ایسا دیپ کنول جلایا جسے طوفان حوادث کے پُرآشوب جھونکے کبھی بجھا نہیں سکتے۔ اور ہم شعر و ادب کے پروانوں کے لئے یہی سامان تسلی کافی ہے۔ اور یہ بھی کہ قوم نے اس جوہرِ قابل کی قدردانی کی۔ چنانچہ وہ ان دو اولیں بنگالی ادیبوں میں سے تھا جنہیں آدم جی کا ادبی انعام حاصل ہونے شرف نصیب ہوا۔ "ماہ نو" نے تھوڑا ہی عرصہ ہوا یوم پاکستان کے موقع پر اپنے شمارۂ خصوصی بابت مارچ ۱۹۶۱ء میں یونس احمر کے قلم سے ان کی اس معرکہ آرا تصنیف کی تلخیص و ترجمہ پیش کیا تھا جس پر انہیں اس انعام کا شرف حاصل ہوا تھا۔

ہمیں مسرت ہے کہ ہم اس باکمال ادیب کو مغربی پاکستان سے روشناس کرانے کی ناچیز خدمت انجام دے سکے۔ (ادارہ)

انشائیہ:

میٹھی باتیں

سیّد امجد علی

شہد و شکر، قند و مصری، چینی اور شیرینی — کتنی مٹھاس ہے ان الفاظ میں! شیریں بیانی اور رطب اللسانی گویا ان پر ختم ہے۔ یہ نہ ہوں تو یوں سمجھئے کہ زندگی پھیکی ہے۔ چائے اور شربت کا تو کہنا ہی کیا۔ ان کا بیوپار تو ٹھنڈا ہو گا سو ہو گا۔ خود حسن کی گرمیٔ بازار اور عشق کی گرمیٔ گفتار بھی ختم ہو جائے گی، کیونکہ ہر چیز بغیر قند و شکر کے پھیکی ہے۔ "قند پارسی" اور "لبِ لعل شکر خا" میں مٹھاس ہے تو اسی نسبت سے عاشقوں کی طرف سے مولانا جامی فرماتے ہیں ؎

تا لبِ شیریں نہ کردی چوں شکر — عاشقاں را ہم نہ شد پُر خوں جگر

شاعروں کا یہ حال ہے کہ جب ہونٹوں کی تعریف میں قلم توڑنے پر آتے ہیں تو بقول حافظ بس اتنا کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ،

عتابِ لبِ لعل ترا قند توان گفت

بات فارسی تک ہی محدود نہیں ہے۔ نہایت ٹھیٹ دیسی قسم کے عشق میں بھی ذکر اسی مٹھاس کا چھڑتا ہے۔ بقول آتش ؎

لبِ شیریں سے اک میٹھا نہ نکلا
لئے ہم نے ہزار دل نیشکر مول

بالکل دیہاتی منظر معلوم ہوتا ہے۔ جیسے حضرتِ آتش[1] کسی کھیت کی منڈیر پر بیٹھے گنے کو زور لگا کر منہ سے چھیل رہے ہوں اور خوب شوں شوں کر کے گنڈیریاں چوس رہے ہوں! اگر آپ کے خیال میں یہ کوئی غیر شاعرانہ حرکت ہے تو خود آتش کا یہ خیال نہ تھا۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

پیری میں جب سکی جو نہ دوٹی تو یاد آئی — دانتوں سے کھولنی گرہ نیشکر مجھے

اور آتش ہی پر کیا منحصر ہے۔ بقول منیرؔ لاہوری گنے کھانے کا منظر ہی یہ ہے؛

بہ دندانش بود دائم سر و کار — جہانش از بنِ دندان بردکار
بتاں چوں لعلِ خنداں می کشایند — گرہ ہائش بہ دنداں می کشایند

چلیئے گنے کی بات نہیں کرتے، مصری کی سہی۔ جوش کے اس قطعہ میں ہی مبالغہ آمیز تعریف کے لئے مصری آڑے آئی؛

مسکرا کر اس نے جیسے بات کی — ہونٹ پر چٹکائی بیلے کی کلی
اور زباں سے جو چھوا اندکا گال — منہ میں گھولی جیسے مصری کی ڈلی۔

غرض میٹھی چیزوں کی نسبت سے ہر چیز میٹھی ہے۔ خود مٹھاس کے لفظ میں کتنی مٹھاس ہے۔ کہ اس سے بیسیوں قسم کی خوبیوں کو بیان کیا جاتا ہے۔ ہر اچھی چیز گویا میٹھی ہے۔ باتیں دل پسند ہیں تو میٹھی ہیں۔ نغمہ سُریلا ہے تو میٹھا ہے۔ نیند آرام دہ ہے تو میٹھی ہے۔ حتیٰ کہ اگر گوارا ہے تو درد بھی میٹھا ہے اور چُھری بھی میٹھی ہو سکتی ہے۔ اسی طرح فارسی ترکیبوں میں شکر[2] قند اور شکر خواب، لبِ شیریں اور کلامِ شیریں، جانِ شیریں اور اوقاتِ شیریں وغیرہ مختلف قسم کی خوبیوں کو اس بلیغ لفظ سے ادا کیا جاتا ہے۔ کثیف اور مادی اشیاء کے وصف سے لے کر لطیف ترین کیفیات تک۔ اب اس سے زیادہ لطیف کیفیت کیا ہوگی جو ابو طالب کلیم نے شیرینی کے ذریعے ادا کی ہے؛

شیرینیٔ تبسم ہر غنچہ را مپرس — در شیرِ صبح خندۂ گلہا شکر گذاشت

جس طرح لفظ مٹھاس سے مختلف خوبیاں ادا ہوتی ہیں، اسی طرح خود مٹھائی سے متعدد جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ کوئی خوشی ہو یا شادی بیاہ، امتحان میں کامیابی یا سفر سے واپسی، مٹھائی بانٹ کر ہی اس کا اظہار ہوتا ہے۔ پھر ہر قسم کی عقیدت کے اظہار کے لئے مٹھائی ہی پیش کی جاتی ہے۔ اگلے بزرگوں کی نذر نیاز کے لئے، استاد کی شاگردی اختیار کرنے کے لئے،

---

[1] معلوم ہوتا ہے آتش کو پھلوں کے ساتھ خاص مناسبت تھی۔ چنانچہ ان کے یہاں سیب بھی، انار، نیشکر وغیرہ کا ذکر بار بار آتا ہے۔ (مدیر)

[2] مولانا شبلیؒ نے "شعر العجم" میں اہلِ ایران اور ان کی زبان کی شکر پسندی کا بالتفصیل تذکرہ کیا ہے۔ (مدیر)

دوستوں سے محبت ظاہر کرنے کے لئے، خاص طور کر کسی کام کی ابتدا کو مبارک بنانے کے لئے مٹھائی کی تقسیم ہی بہترین سمجھی جاتی ہے حد یہ ہے کہ مکان کی بنیاد رکھنے، شادی کی بات ٹھہرنے، بچے کی تعلیم شروع کرنے، غرض بہت سے سماجی موقعوں پر بھی شیرینی کام دیتی ہے۔

یوں تو بعض خوش قسمت آدمیوں کی زبان میٹھی ہوتی ہے لیکن مٹھائی کی خود بھی ایک زبان ہے۔ اور طرح طرح کی مٹھائیاں اس زبان کے الفاظ ہیں جن سے الگ الگ باتیں ادا ہوتی ہیں۔ اندرسے برسات کی چیز ہیں گزک (یا گجک) اور حلوا سوہن جاڑے کی، پیٹھے کی مٹھائی اور بہرے گھیے کا لچھا گرمیوں کی کیفیت لئے ہوئے ہے۔ بالوشاہی تو ایک دم شادیوں کی یاد دلاتی ہے!

اگر ہر مٹھائی کا کوئی مطلب نہیں تو کیا ہوا۔ مطلب تو مٹھائی سے ہے کہ مٹھائی مطلب سے[1]! یہ تو رشوت کہلائے گی۔ شکر ہے کہ رشوت دینے کے لئے مٹھائی اتنی رائج نہیں ہوئی جتنی پھلوں کی "ڈالیاں" خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ ذکر تھا مٹھائیوں اور ان کی زبان کا۔ تو پھر وہی کہنا پڑتا ہے کہ مٹھاس کی زبان آپ مانئے یا نہ مانئے، لیکن زبان کی مٹھاس تو ماننی ہی پڑے گی۔ میری مراد اس وقت حقیقی مٹھاس سے نہیں بلکہ مجازی مٹھاس سے ہے۔ آپ "قند پارسی" کو لاکھ گھولے جائیے، چائے کی پیالی تو میٹھی ہوگی نہیں جب تک قندِ کیو یا قندِ مردان[2] نہ ڈالئے۔ البتہ فارسی زبان قند کی نسبت سے میٹھی ہے اور ریختہ کو "شیر و شکر آمیختہ" کہا جاتا ہے۔

اس پر بھی بعض حضرات مٹھائی کے مخالف ہیں۔ بچّوں کو میں "من حیث القوم" پہلے درجے کا "جنتی" سمجھتا ہوں۔ لیکن مٹھائی کے معاملے میں ان کے ذوقِ سلیم کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیا والہانہ جذبہ ہے! خواہ کھانے کو ملے یا نہ ملے، تن پر کپڑا ہو یا نہ ہو، ننگ دھڑنگ پھر رہے ہیں مگر مٹھائی مل جائے تو نہال ہیں۔ گویا دو جہان مل گئے۔ اب ظلم یہ دیکھئے کہ جب بڑوں نے خود کو اس نعمت سے محروم پایا تو بچوں کے خلاف ایک سازش شروع کر دی۔ "ارے صاحب نہایت خراب چیز ہے۔ لعنت بھیجئے۔ صحت خراب کرتی ہے۔ بیماریاں پھیلاتی ہے۔ دانتوں میں کیڑا لگتا ہے۔" وغیرہ وغیرہ

وہ تو خیریت ہوئی کہ ہربرٹ اسپنسر جیسے مرد نکتہ داں نے بچّوں کی حمایت میں قلم اٹھایا اور سائنس کی رو سے ثابت کیا کہ بچّوں کے لئے تو شکر نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ اس سے ان میں کو دپھاند کی طاقت آتی ہے۔ اب معلوم ہوا کہ مٹھاس کی خواہش بچوں میں قدرتی بات ہے۔

اور راز اُلٹا کفر یا کفرانِ نعمت کیا کروں۔ بزرگانِ دین میں سے کسی نے اس مسئلہ میں حرفِ آخر اس خوبی سے کہہ دیا ہے کہ آگے کچھ کہنے کی گنجائش ہی باقی نہ رہی۔ فرماتے ہیں: "اَلْاِیْمَانُ حُلْوَۃٌ وَالمومن یحب الحلوی" (ایمان مٹھاس ہے اور جو مومن ہے وہ مٹھاس کو محبوب رکھتا ہے)

ترکِ دنیا میں لوگوں نے غلو کی ایک شکل یہ بھی اختیار کی کہ جائز لذات کو بھی اپنے اوپر حرام کر لیا۔ چنانچہ امام حسن بصریؒ کے زمانے میں ایک صوفی منش عالم نے عہد کر لیا کہ میں آئندہ حلوہ نہ کھاؤں گا۔ اس لئے کہ میں اس نعمتِ عظمےٰ کا کما حقہٗ شکر ادا نہیں کر سکتا۔ جب امام ممدوح نے یہ سنا تو مسکرا کر فرمایا۔ "یہ شخص احمق ہے۔ کیا یہ اپنے آپ کو اس قابل سمجھتا ہے کہ ٹھنڈا پانی پی کر ہی اللہ کا پورا پورا شکر ادا کر سکے؟"

اولیاء اللہ کا تو یہ کمال رہا ہے کہ مانع شیرینی ہونے کے بجائے صانع شیرینی تھے۔ چنانچہ حضرت فریدالدین گنج شکرؒ جن کا مزار دریائے ستلج کے کنارے پاک پٹن میں ہے، تزکیۂ نفس کے اس درجے پر پہنچ گئے تھے کہ جو کچھ بھی منہ میں رکھتے تھے شکر میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ چنانچہ آپ کی بابت کہا گیا ہے ؎

سنگ در دستِ او گہر گردد
زہر در کامِ او شکر گردد

آپ ہی کی ذاتِ بابرکات کا طفیل تھا کہ تیمور لنگ نے ۱۴۰۰ء کے قریب جب گرد و پیش کے علاقے کو تباہ و غارت کیا تو پاک پٹن کے لوگوں کی جاں بخشی کر دی۔ جیسے سکندرِ اعظم نے تھیبز کے باشندوں کو شاعرِ پاک نفس پنڈار کی خاطر معاف کر دیا تھا۔

غرض مٹھاس کی مخالفت نہ سائنس کی رو سے اور نہ دینی لحاظ سے صحیح ہے۔ ہاں اگر مصلحتاً کوئی اس سے محروم رہ کر تلخیٔ دوراں کا اپنے کو عادی کرنا چاہے تو بات اور ہے ؎

اسی باعث تو دایہ طفل کو افیون دیتی ہے
کہ تا ہو جائے لذت آشنا تلخیٔ دوراں سے

[1] دراصل "نُقل" کے معنوں میں تھا۔ چنانچہ غالب فرماتے ہیں: "بادۂ ما گزک نخواست" ہمارے یہاں معنی کے ساتھ تو اس کی نوعیت بھی بدل گئی۔ بہر حال مطلب تو مٹھائی سے ہے نہ کہ مٹھائی کے مطلب سے! (مدیر)

[2] قندِ پاکستان کیوں نہیں؟ اب تو یہ بھی ان کی حریف ہے اور کتنے ہی کارخانوں میں وسیع پیمانہ پر تیار کی جاتی ہے۔ (مدیر)

یہ دلیل بھی میں ناقص سمجھتا ہوں کیونکہ تلخی دوراں تو بہر حال اپنا رنگ جمائیگی ہی۔ مگر سوال اس کے ازالے کا ہے کسی نے کہا ہے:

"گر غم خوریم خوش نبود، بہ کہ مے خوریم"

جسے بہ الفاظِ دیگر کسی نے یوں کہا ہے ؎

وقت سے پہلے نہ یوں غم کھائیے

اب تو صاحب آپ "چم چم" کھائیے

مٹھاس کے مخالفوں کا علاج یہ ہے کہ انہیں عمدہ قسم کی مٹھائی کی کسی دکان کے سامنے لے جاکر کھڑا کر دیجیے۔ ابھی رالیں ٹپکنے لگتی ہیں۔ اگر وتی کے گھنٹے والے حلوائی کی دکان یہاں نہیں تو کیا غم ہے، پاکستان نے اس کے کیا کیا نعم البدل نہ دے دئے۔ بلکہ کراچی نے تو شیرینی بنانے اور سجانے کو کمال پر پہنچا دیا ہے۔ جگہ جگہ بارونق دکانیں پیدا ہو گئیں۔ عروس البلاد کراچی نے انہیں رونق دی اور انہوں نے ہمارے اس سابقہ دار الخلافے کو چار چاند لگائے۔ یہاں کیا کیا خوانہائے لغما سجے ہوئے ہیں۔ برفی کی رنگ برنگی منڈیریں اونچی اونچی چنی ہوئی گویا واقعی قصرِ شیریں۔ رس گلے اور رس ملائی ہیں جیسے موتیا کے پھول۔ گلاب جامن میں اگر پھل اور پھول کی خوبیوں کا اجتماع ہے تو پستے کی لوز گویا ایک سبز و شاداب مٹھائی کا میوہ ہے۔ امرتیوں میں اگر امرت بھرا ہوا ہے تو لڈو موتیوں سے چور ہیں۔ پیڑی کا حلوہ سوہن گویا نقرئی تھالیاں ہیں اور حبشی حلوا سوہن میں تو مٹھائی کمال کو پہنچ گئی ہے۔ گھی، دودھ، شکر مع ایک خاص جزو یعنی سمنک — نیا پھوٹا ہوا گیہوں — کہ جس میں نوخیز روئیدگی کے باعث ایک خاص تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ اس کا بنانا جاڑے کے موسم کی گھریلو تقریبوں میں سے ایک تھا۔ تھالوں میں گیہوں بوئے جاتے اور سمنک تیار کی جاتی تھی صحن میں بڑے سے کھلے چولھے پر ایک کڑھاؤ چڑھایا جاتا۔ ارد گرد پیڑھیوں پر عورت، مرد، بچے بیٹھ جاتے۔ اور باری باری کفگیروں سے دودھ اور سمنک چلاتے رہتے۔ ہلکی آنچ میں گھنٹوں جاکر دودھ سوکھتا ہے پھر بھی گھی ڈالا جاتا ہے جتنا زیادہ گھی کھپا تا کسی کو آتا ہو اتنی ہی خوبی کی بات سمجھی جاتی تھی۔ جوزا اور جوتری کی بھینی اور سوندھی خوشبو سے تو بہار آجاتی ہے۔ رفتہ رفتہ تار پڑنے لگتا ہے؟ قوام صحیح ہوتا ہے، دانہ پڑتا جاتا ہے، آگ بجھنے کو ہے، دھواں پھیل رہا ہے، ایک سماں بندھ رہا ہے!

اِدھر تار پڑتا ہے، اُدھر خیالات کا جال پھیلتا ہے۔ اِدھر گمان اُترنے کو ہے، اُدھر خیالات کا نزول ہے۔ صرف صاحبِ ذوق حضرات رہیں۔ باقی کو اجازت ہے۔ اسرار و رموز کھل رہے ہیں۔ پردے اٹھ رہے ہیں۔ سب دنیا مٹھاس کا ایک کرشمہ نظر آتی ہے۔ انسان کی زندگی کیا ہے؟ ایک جسم کے سہارے قائم جسمِ انسان اور حیوان کا خود نباتات کے سہارے زندہ۔ نباتات کیا ہے؟ تمام تر ایک شکر کا کارخانہ۔ کارخانہ کیا حیرت خانہ۔ ہر پودا ہوا اور پانی کو ملا کر روشنی کی مدد سے شکر بنا رہا ہے۔ اس کی ساخت میں جو تین خاص اجزا پائے جاتے ہیں وہ تینوں شکر کی مختلف شکلیں ہیں یعنی خود شکر، نشاستہ (اسٹارچ) اور "سلولوز"۔ آخری دو اجزا سائنس کی زبان میں "پالی سکرائیڈس" کہلاتے ہیں قندِ مرکب بلکہ قندِ مکرر۔ ان میں سے ہر ایک کا تجزیہ کیا جائے تو آخر میں پھر وہی شکر برآمد! لکڑی کے ذرّوں میں مٹھاس ہے، کاغذ میں کپڑے میں، ہر نباتاتی چیز میں۔ اور مٹھاس کا منبع و ماخذ صرف نباتات ہے۔ سوائے اس شکر کے جو دودھ میں پائی جاتی ہے۔

نہ صرف ہر پھول میں مٹھاس ہے۔ بلکہ ہر پتے، ہر ٹہنی میں شیرینی ہے۔ روٹی کیا ہے؟ تین چوتھائی شکر یعنی کاربوہائیڈریٹ، اور باقی پانی۔ آلو کیا ہے؟ ایک چوتھائی شکر، باقی پانی۔ کوئلے تک میں مٹھاس ہے۔ بشرطیکہ کوئی ڈھونڈھنے والا ہو۔ چنانچہ کولتار میں سے ایک طرح کی شکر نکالی جاتی ہے۔ اور شکر بھی کیسی، گنے کی شکر سے تین سو گنا زیادہ میٹھی! اس "سیکرین" کی ایک چٹکی بھی ٹب بھر پانی میں ڈال دیں تو شربت بن جاتا ہے اور پھر اس کے ہضم کرنے میں جسم پر کوئی بار نہیں پڑتا — ذیابیطس کے مریضوں کے لئے بہت بڑی نعمت۔ یہ الگ بات ہے کہ کیمیاوی طور پر یہ سرے سے شکر ہے ہی نہیں اور نہ اس میں کوئی غذائیت ہی ہے۔

تو شکر خورے کو ہر جگہ شکر مل ہی جاتی ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ شکر خوری کس قدر ضروری اور لازمی ہے۔ انسان کے خون میں شکر ہر وقت موجود ہونی چاہئے، نہ ہو تو اس کا نتیجہ موت! اور شکر بھی ایک مقررہ مقدار میں، نہ کم نہ بیش۔ یعنی ہزار میں ایک حصہ۔ اگر ضرورت سے زیادہ شکر ہوگی تو جگر میں جمع ہوتی چلی جائے گی، اور پھر زیادہ ہوگی تو چربی بن جائیگی۔ اس سے بھی زیادہ ہوگی تو جسم سے خارج کرنی پڑے گی ورنہ زہر کا حکم رکھے گی۔ ایک ہی چیز کبھی امرت کبھی زہر!

مگر آخر اس کی اتنی ضرورت کیوں؟ شکر صحیح معنوں میں جسم کا

لے ایک مشہور بنگالی مٹھائی۔ (مدیر)

ایندھن ہے۔ دوسری غذائیں اور کام بھی آتی ہیں یعنی جسم کو بنانے میں۔ لیکن شکر صرف جسم کو چلانے کے کام آتی ہے۔ پٹھوں کے کھچنے سے اعضا کی حرکت شکر ہی کی بدولت ہے۔ اور اگر عمل کی حرکت ہے تو شکر، یہ گویا ایسے ہے جیسے موٹر میں پٹرول۔ تھکان سے آدمی بے حال ہو رہا ہو، ایک ذرا سی شکر یا گلوکوز گھول کے دیجئے۔ فوراً تازہ دم ہو جائے گا۔ اکثر پہاڑوں پر دیکھا گیا ہے کہ وہاں کے باشندے بڑے بڑے بوجھ اٹھائے چڑھتے چلے جاتے ہیں۔ جب بالکل تھک کر چور ہو جائیں تو ایک ذرا رک کر گڑ کی ڈلی منہ میں ڈال لیتے ہیں، اور پھر —— یہ جا، وہ جا!

اس کی وجہ کیا ہے؟ غذاؤں میں شکر ہی ایک ایسی چیز ہے جو فوراً جزوِ بدن بن جاتی ہے۔ جو سادی یا مفرد شکر میٹھے پھلوں اور شہد میں پائی جاتی ہے، اس کو ہضم کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ آنتوں میں جا کر جسم میں فوراً جذب ہو جاتی ہے۔ اور چونکہ اس میں خاص بات یہ ہے کہ یہ پوری طرح پانی میں گھل جاتی ہے اس لئے خون کے ذریعہ جسم کے ہر ایک حصے میں جہاں جہاں ضرورت ہو پہنچ جاتی ہے۔ مرکب شکر جیسے گنے کی شکر، بھی بہت جلد اور آسانی سے مفرد شکر میں تبدیل ہو کر خون میں داخل ہو جاتی ہے۔ چونکہ یہ آنتوں میں بہت کم دیر رہتی ہے اس لئے اس کے جسم میں اور غذاؤں کی طرح سڑنے کا اندیشہ بھی نہیں ہے۔ اور چونکہ یہ تمام تر جسم میں جذب ہو جاتی ہے اس لئے اس کا کوئی فضلہ بھی نہیں بنتا۔

اس سے زیادہ شکر کی کیا تعریف کی جائے کہ روٹی بھی جسم میں جب ہی قبول کی جاتی ہے کہ وہ شکر میں تبدیل ہو جائے۔ روٹی میں جو نشاستہ ہوتا ہے وہ تحلیل ہو کر اپنے اجزا یعنی شکر کے ذروں میں تبدیل ہو جاتا ہے، اور پھر جسم میں جذب ہوتا ہے اب فرمائیے شکر کی مخالفت کوئی کیا کرے گا؟

کتنے تعجب کی بات ہے کہ شکر کے خواص اور فوائد سے تو انسان[1] ہمیشہ سے بہرہ مند ہے لیکن اس کے ذائقے سے لطف اندوز ہونے کا اس کو صرف سو دو سو سال سے ہی موقع ملا ہے۔ جنوبی ایشیا میں تو گنے کی شکر کوئی دو ہزار سال سے ملتی ہے لیکن باقی دنیا میں یہ نعمت عام نہیں تھی حالانکہ انسان کی نسلی زندگی میں دو ہزار سال تو بہت تھوڑا سا عرصہ ہے۔

اس سے پہلے کتنی ہزار لاکھ سال تک انسان کے پاس اگر خالص مٹھاس تھی تو وہ صرف شہد تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ کبھی اتنی فراوانی سے دستیاب نہیں ہو سکتا تھا جتنی شکر۔ تاہم سنا ہے کہ مصر میں اب سے پانچ ہزار سال پہلے بھی شہد کی مکھیاں پالنے کا رواج تھا۔ گو شہد کمیاب تھا لیکن اس کے عجیب و غریب فوائد کے سب معتقد تھے۔ چنانچہ انجیل اور قرآن مجید دونوں میں اس کی تعریف آئی ہے۔ انجیل کی کتاب "ضرب الامثال" کے باب ۲۴ آیت ۱۳ میں آیا ہے: "اے فرزند شہد کھایا کرو کہ یہ ایک اعلیٰ غذا ہے۔" آیت قرآنی یہ ہے: "فیہ شفاء للناس" (اس میں شفا ہے انسانوں کے لئے)۔ قدیم ہندوستان اور یونان کے حکماء نے بھی اس کی بہت تعریف کی ہے۔ مثلاً حکیم یونان ڈیاسکوریڈس (پہلی صدی عیسوی) اور ہندوستان کے سسروتا (چوتھی صدی ق م) نے۔

نوع انسان کا کتنا بڑا محسن تھا وہ شخص جس نے گنے سے شکر بنانے کا طریقہ دریافت کیا۔ چوتھی صدی قبل مسیح میں جب سکندر نے اس علاقے پر حملہ کیا جو اب پاکستان ہے، تو اس کے ہمرکاب مؤرخین نے لکھا تھا کہ یونانی یہ دیکھ کر سخت حیران ہوئے کہ یہاں ایک ایسا شہد ہوتا ہے جو مکھیاں نہیں بلکہ آدمی ایک پودے سے بناتے ہیں —— یہ گنے کے رس سے بنا ہوا معمولی گڑ تھا!

لیکن ہم نے کہانی کو بیچ سے سنانا شروع کر دیا۔ شکر بنانے سے پہلے گنے کی کاشت کرنا بھی تو ایک کارنامہ تھا، جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آخر گنا بھی ہمیشہ سے اسی حالت میں تھوڑی اگتا رہا ہے۔ خودرو جنگلی حالت میں تو یہ ایک طرح کا سرکنڈہ ہی ہوگا۔ اور علم نباتات کی زبان میں اب بھی اسے ایک قسم کی "گھاس" ہی کہا جاتا ہے۔ برصغیر میں اس پودے کا اصل وطن بہار اور اودھ کا علاقہ سمجھا جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ وہیں سے یہ باقی دنیا میں پھیلا۔ ہزارہا لاکھوں برس پہلے کسی "ہوشیار وحشی" نے جنگل کی کسی چٹان پر بیٹھے ہوئے شکر کا ایک سرکنڈہ توڑا ہوگا اور بے خیالی میں اسے چبانے لگا ہوگا۔ اس کے شیریں ذائقے نے ضرور اسے چونکا دیا ہوگا اور اس نے اپنے ساتھیوں میں بھی خبر کو پھیلا دیا ہوگا کہ ایک گھاس ہے جس میں شہد بھرا ہوا ہے۔ جب رفتہ رفتہ انسان کاشت کا علم سیکھ گیا ہوگا تو گنے کے بھی اچھے اچھے پودے اس نے چن کر لگائے ہوں گے۔ اور یوں ایک اعلیٰ نسل کا گنا برسوں میں تیار ہوا ہوگا۔

ایران میں تو اسلام کی آمد سے کچھ عرصہ بعد ہی شکر کی کاشت کا

---

[1] شاعروں کی بات ہی نرالی ہے۔ غالب نے اس کی بھی صورت پیدا کر لی ہے فرماتے ہیں:

کیا کروں بیماریٔ غم سے فراغت کا بیاں
جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا (مدیر)

سلسلہ شروع ہوگیا تھا اور جلد ہی شکر سازی نے بھی اتنی ترقی کرلی کہ ایرانی اہلِ ہند پر سبقت لے گئے۔ اب سمجھ میں آتا ہے کہ "قند پارسی" کیوں اس خطے سے مخصوص ہوا۔ ایران سے گنے کی کاشت وادیٔ دجلہ و فرات میں پھیلی اور شام اور مصر تک پہنچی۔ عرب حکما نے بھی شکر کو استعمال کر کے دیکھا اور ان میں یہ خیال رائج ہوگیا کہ یہ پھیپھڑوں کے لئے مفید ہے۔ چنانچہ طبی فوائد حاصل کرنے کے لئے انہوں نے اس کو صاف کرنے کے طریقے دریافت کرنے شروع کئے۔ وہ اعلیٰ درجے کی شکر جسے ہم "مصری" کہتے ہیں، مصر ہی کا تحفہ ہے، جیسا کہ خود اس کا نام ہمیں بتا رہا ہے۔ ادھر عرب تاجروں نے دسویں صدی عیسوی میں شکر کی تجارت بڑے پیمانہ پر شروع کر دی اور دنیا کے دور دراز ملکوں میں اسے پہنچا کر لوگوں کو اس کی چاٹ لگا دی۔ جو ان کے لئے کامیابی کا دروازہ بن گئی۔ عربوں نے اس سے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ گیارہویں، بارہویں اور تیرہویں صدی میں جنگ پر آنے والے یورپ کے عیسائیوں کو جنگی تلخیوں کے ساتھ اگر کوئی شیرینی ملی تو یہی شیرینی تھی جو مسلمانوں کے طفیل پروان چڑھی تھی۔ اور انہوں نے قبرص کے جزیرے میں گنے کی کاشت شروع کرا دی۔ چین کے مشہور منگول بادشاہ "کبلائی خاں" نے بھی تیرہویں صدی میں مصر سے عربوں کو بلا کر شکر بنانے کے طریقے چینیوں کو سکھوائے۔ پرتگال کے بادشاہ "ہنری جہاز راں" نے جب مسلمانوں کو اندلس میں گنے کی کاشت کرتے دیکھا تو پندرھویں صدی میں اپنے ملک کے نزدیک "مدیرا" کے جزیروں میں گنے کی کاشت شروع کروائی اور بعد میں اپنے مقبوضہ ملک "برازیل" میں بھی اس کو رائج کر دیا۔ اسپین نے سولھویں صدی کے شروع میں اسے غرب الہند کے جزیروں میں کاشت کرایا، خاص کر کیوبا اور پورٹو ریکو میں۔ انگریزوں نے اسے جمیکا کے جزیرے اور فرانسیسیوں نے مارٹینک میں فروغ دیا لیکن شروع شروع یعنی سولھویں اور سترھویں صدی میں برازیل سب سے زیادہ کامیاب رہا۔ اور شمالی و مغربی یورپ کی ضروریات یہی پورا کرتا رہا۔ پھر انیسویں صدی کے شروع میں جب نپولین کو ہرانے کے بعد فرانس کے بہت سے امریکی مقبوضات انگریزوں کے ہاتھ لگ گئے تو گنے کی کاشت کرنے والا بہت بڑا علاقہ بھی ان کے قبضے میں آگیا۔ ادھر اسی زمانے میں ہندوستان میں بھی بہت سے علاقے ان کے تصرف میں آ چکے تھے۔ چنانچہ ہند اور غرب الہند دونوں کی شکر کی پیداوار کے بھی مالک بن گئے۔ اور اس طرح دنیا میں شکر کی تجارت ان کے ہاتھ آگئی۔ بیسویں صدی میں دنیا کے اور بہت سے علاقوں میں شکر کی کاشت پھیلی، خاص کر جاوا میں ہالینڈ والوں نے اسے اتنی کامیابی سے چلایا کہ جاوا کی شکر دنیا بھر میں عام ہوگئی۔ اب سوائے یورپ کے پانچوں براعظموں میں نیشکر کی کاشت ہوتی ہے، لیکن سب سے زیادہ پیداوار برصغیر پاک و ہند ہی میں ہے۔ اس کے بعد کیوبا اور جاوا ہیں۔

شکر کی تجارت بھی ایک دلچسپ داستان ہے۔ پہلے تو یہ عربوں کے قبضے میں رہی جو دسویں صدی سے اس میں بہت حصہ لیتے رہے۔ پھر کوئی تیرہویں صدی میں اٹلی کے شہر "وینس" کے تاجروں نے یورپ کو شکر بہم پہنچانے کا کام اپنے ہاتھ میں لیا۔ چودھویں صدی میں انہوں نے وینس کو شکر سازی کی صنعت کا مرکز بنا دیا۔ اور اس فن کو بہت فروغ ہوا۔ یہاں خام شکر درآمد کر کے اعلیٰ درجے کی صاف شکر تیار کی جاتی تھی۔ لیکن عرب ممالک کی خام شکر اور شام کی لذیذ اور نادر مٹھائیاں پھر بھی بڑے پیمانے پر وینس کے سوداگر درآمد کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ ہالینڈ، انگلستان، جرمنی اور فرانس میں بھی شکر سازی کے کارخانے بن گئے۔ اور انہوں نے بھی شکر کی تجارت میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ لیکن سولھویں صدی کے آخر تک انگریز اس میدان میں چھا چکے تھے۔ اور لندن شکر کی تجارت کا مرکز بن گیا تھا۔ اٹھارویں صدی کے آخر تک شکر کی کاشت بھی تمام تر ان ہی کے قبضے میں آگئی۔ چنانچہ جب نپولین سے جنگ چھڑی تو انگریزوں کو نقصان پہنچانے کے لئے فرانس نے جہاں گولہ بارود تیار کیا وہاں شکر بھی بڑے پیمانے پر تیار کی تاکہ اس طرح انگریز یورپ میں اپنی شکر نہ بیچ سکیں۔ فرانس میں گنے کی کاشت تو ہو نہیں سکتی تھی۔ مگر دانایانِ فرنگ نے اس کے بنانے کا ایک اور طریقہ نکالا۔ سنہ ۱۷۵۰ء میں ایک جرمن سائنس داں، "مارگراف"، نے چقندر سے شکر بنا کر دکھائی اور سنہ ۱۸۰۰ء میں اس کے ایک شاگرد نے چقندر سے شکر بنانے کا ایک کارخانہ بھی جرمنی میں قائم کر دیا۔ نپولین نے مارچ ۱۸۱۱ء میں حکم صادر کیا کہ اس دریافت سے فائدہ اٹھایا جائے۔ چنانچہ فی الفور سرکاری زمینوں پر بڑے پیمانے پر چقندر کی کاشت شروع کر دی گئی۔ اور دو سال کے اندر اندر فرانس میں شکر سازی کے ساڑھے تین سو کارخانے قائم ہو گئے۔ اور ستر لاکھ پونڈ شکر تیار کر دی گئی۔

اس اقدام سے انگریزوں کو زبردست نقصان ہوا۔ لیکن جب سنہ ۱۸۱۵ء میں انہوں نے نیپولین کے دورِ حکومت کو ہی ختم کر دیا۔ تو فرانس کا یہ دورِ شیریں بھی ختم ہوگیا یعنی شکر سازی کی صنعت بھی ختم ہوگئی۔ ایک طرف انگریزوں اور دوسری طرف بعض با اثر فرانسیسیوں کا دباؤ، جن کا غرب الہند کے جزیروں میں شکر کا کاروبار تھا چقندر سے شکر بنانے کی صنعت کو روک دینے کے لئے کافی تھا۔ مگر ایک فرانس ہی پر کیا منحصر ہے۔ یورپ کا ہر ملک شکر کا خواہاں تھا۔ اور گنے کے نہ ہوتے ہوئے جب ان کو چقندر کے ذریعے، گھر کے گھر میں شکر بنانے کا طریقہ معلوم ہوگیا تو انہیں کون روک سکتا تھا۔ چنانچہ پچاس سال کے اندر اندر تمام یورپ حتیٰ کہ خود انگلستان میں بھی چقندر کی کاشت ہونے لگی۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں حکومت انگلستان نے اس کی اہمیت کو تسلیم کر کے اس صنعت کی سرپرستی شروع کی پچھلی جنگِ عظیم میں اس کی یہ دور اندیشی کام آئی۔ چونکہ اس زمانے میں اشیائے خوردنی کا باہر سے انگلستان لانا ایک بڑی مہم بن چکا تھا اسلئے چقندر کی شکر انگلستان کے آڑے آئی۔ اور دورانِ جنگ میں ملک کی تمام تر ضروریات کو اسی نے پورا کیا۔

ان ترقیات سے عام آدمی کو یہ فائدہ ہوا کہ دنیا میں شکر کا رواج عام ہوگیا اور قیمت بھی کم ہونے لگی۔ یہاں تک سنہ ۱۸۸۴ء میں یہ اتنی کم ہوگئی کہ شکر ساز ممالک ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوگئے۔ ایک طرف غرب الہند کے نیشکر بونے والے تھے تو دوسری طرف ہندوستان اور رجاوا کے۔ پھر ایک طرف نیشکر بونے والے تھے تو دوسری طرف یورپ کے چقندر بونے اور شکر بنانے والے۔ ان کے جھگڑوں پر تو ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

اب ایک واقعہ بھی سن لیجئے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس کس طرح شکر کا اثر امورِ سلطنت پر طاری و ساری ہوا جب انگریزوں کا قبضہ مشرق میں ہندوستان پر اور مغرب میں جزائر غرب الہند پر ہوگیا اور یہ دونوں ہی "شکر کی کانیں" تھیں تو دونوں کے تجارتی حلقوں میں رسہ کشی شروع ہوگئی۔ غرب الہند میں چونکہ خود انگریز جا کر شکر کی کاشت کر رہے تھے، (جس کے لئے وہ حبشی غلاموں کو کام میں لاتے تھے) اس لئے ہندوستان کے شکر کے کاشتکاروں کا فائدہ ظاہر ہے، ان کی نظر میں بہت ہی کم تھا۔ چنانچہ لندن کی منڈی میں جہاں سے تمام دنیا میں شکر تقسیم کی جاتی تھی ہندوستان کی شکر کو کم کرنے اور غرب الہند کی شکر کو فائدہ پہنچانے کے لئے انگریزوں نے ہندوستانی شکر پر ایک زبردست محصول لگا دیا۔ جو اصل قیمت سے دوگنا تھا۔ اس پر بڑے بڑے مذاکرات ہوئے اور ایک انگریز مدبر ٹکر نے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں میں سے تھا، سنہ ۱۸۲۸ء میں ایک معرکہ آرا خط تحریر کیا جس کی چند سطور یہاں نقل ہیں۔ امید ہے یہ دلچسپی سے خالی نہ ہوں گی:

"یہ واضح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ہندوستان اپنا سالانہ خرچ انگلستان کو ادا کر سکتا ہے تو صرف اپنی پیداوار کے ذریعہ ہی۔ اور اگر یہ پیداوار مناسب قیمتوں پر فروخت کرنے کیلئے درآمد نہ کی گئی تو یہ خراج اس مقدار میں تحصیل نہیں کیا جا سکے گا۔ میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ میری نظر میں شکر ہی ہندوستان کی سب سے گرانمایہ برآمد ہے۔ لیکن موجودہ قیمت پر جو انگلستان میں ملتی ہے اس کو درآمد نہیں کیا جا سکے گا۔ اگر اس کی درآمد بند ہوگئی تو میرے خیال میں کوئی دوسری شے اس کی جگہ نہیں لے سکتی۔ لہٰذا میری دانست میں سب سے بڑا احسان جو انگلستان کی پارلیمنٹ ہندوستان اور ایسٹ انڈیا کمپنی دونوں پر کر سکتی ہے وہ یہ ہے کہ شکر کی درآمد کو، جہاں تک ہو سکے، بڑھنے کا موقع دے۔"

انسان نے شکر سازی میں زبردست ترقی کی ہے اور طرح طرح سے اسے مصفا کیا۔ پھر بھی اس کے کارخانوں کا خام مال قدرت ہی مہیا کرتی ہے۔ شکر سازِ حقیقی وہی ہے۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ شکر صرف نباتات سے حاصل ہوتی ہے۔ اور حیوانی اشیاء میں صرف دودھ میں پائی جاتی ہے۔ نباتات کس طرح شکر بناتے ہیں، یہ بھی قدرت کا ایک کرشمہ ہے۔ تمام حیوانات سانس کے ساتھ ایک گیس باہر نکالتے ہیں جو کاربن ڈائی آکسائڈ کہلاتی ہے نباتات اس گیس یا اس کو جو پہلے سے ہی کسی قدر ہوا میں موجود ہے، اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں۔ یہ عمل ان مسامات کے ذریعے ہوتا ہے جو پتوں کی نچلی طرف ہوتے ہیں، دھوپ میں جب یہ گیس پانی کے ساتھ ملتی ہے تو پتوں کا سبز رنگ کسی عجیب و غریب طریقے سے ان دونوں کا ایک مرکب بنا دیتا ہے۔ جو اسی وجہ سے کاربوہائی ڈریٹ کہلاتا ہے یعنی کاربن اور پانی۔ یہ جز پودوں میں تین شکلیں

اختیار کرتا ہے۔ کچھ تو پودے کے جسم کا ڈھانچہ بنانے کے لئے سیلولوز کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ (مثلاً پتوں کے اندر جو جال ہوتا ہے) کچھ نشاستہ بن کر پودے میں جمع ہو جاتا ہے۔ اور کچھ پہلے نشاستہ بن کر، پھر شکر میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ اور رس بن کر پودے کے ہر رگ و ریشے میں پہنچ جاتا ہے۔ جہاں اس کو پھل پھول بنانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ سب سے چھوٹا ذرہ شکر کا ہوتا ہے۔ نشاستہ اسی کا مرکب ہے اور وہ بڑا ذرہ ہوتا ہے۔ سلولوز اور بھی بڑا مرکب ہے۔

خود شکر بھی قدرتی حالت میں دو طرح پائی جاتی ہے۔ ایک بالکل مفرد یعنی گلوکوز اور فرکٹوز اور گیلکٹوز کی شکل میں۔ دوسری مرکب جس میں انہیں تین میں سے کوئی دو جز ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ بالکل مفرد شکر بہت سے میٹھے پھلوں اور شہد میں پائی جاتی ہے۔ لیکن حیوانی جسم میں یہ صلاحیت ہے کہ خواہ سلولوز ہو یا اسٹارچ یا مرکب شکر، ان سب کو مفرد شکر میں تبدیل کر سکتا ہے۔ انسان سلولوز کو تو تحلیل نہیں کر سکتا (مثلاً سخت گھاس پھوس، لکڑی یا سبزیوں کے اندر کے ریشے) لیکن نشاستے اور مرکب شکر کو وہ مفرد شکر میں تبدیل کر کے بخوبی ہضم کر لیتا ہے۔

پودوں میں یہ تبدیلی یعنی نشاستے سے شکر اور شکر سے نشاستہ ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً چقندر میں پہلے پتے نشاستہ بناتے ہیں اور خود پودے کو بڑا ہونے کے لئے غذا مہیا کرتے ہیں۔ اور جڑ میں نشاستہ جمع بھی کرتے ہیں۔ پھر سردیوں کے موسم میں جو نشاستہ جڑ میں ہوتا ہے وہ شکر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اگر اگلی گرمیوں تک جڑ کو زمین میں رہنے دیا جائے تو پھر یہی شکر پھل، پتے اور بیج میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

اسی طرح بعض کچے پھلوں اور ترکاریوں میں بھی شکر زیادہ ہوتی ہے اور نشاستہ کم۔ مثلاً میٹھی مکئی یا میٹھے مٹر کے دانوں میں جو پکنے پر نشاستے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اور اپنی مٹھاس زائل کر دیتے ہیں۔ اور بعض میں کچی حالت میں نشاستہ زیادہ ہوتا ہے۔ جیسے سیب، امرود، کیلا۔ لیکن پکنے پر یہ شکر میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

قدرت کے اس رازِ سربستہ کو جس کی رو سے یہ تبدیلی ظہور میں آتی ہے، انسان نے آخر پا لیا۔ اور اس نے خود سلولوز یا نشاستے کو کیمیاوی طور پر تحلیل کر کے شکر بنانے کا طریقہ نکال لیا ہے۔ غالباً سب سے پہلا شخص جس نے یہ کارنامہ کر دکھایا ایک روسی سائنس داں، کرِخاف تھا جس نے ۱۸۱۱ء میں نشاستے کو شکر میں تبدیل کر دیا۔ اس سے بھی بڑھ کر سلولوز سے شکر بنانے کا کام بکانٹ نے ۱۸۱۹ء میں کیا۔ بعد میں جرمن سائنس دانوں نے اس عمل کو اور بھی سہل اور مؤثر بنانے کے طریقے دریافت کئے ۔۔۔ عرصے تک اس کی طرف کسی نے کوئی خاص توجہ نہ کی، اس لئے کہ ۱۸۶۰ء کے بعد سے خود شکر نہایت سستی دستیاب ہوتی رہی، لیکن ۱۹۳۳ء میں جرمنی نے جب فوجی مصلحتوں کی بنا پر ہر چیز میں خود کفیل ہونے کی کوشش شروع کی تو ایک کارخانہ لکڑی تک سے شکر بنانے کا قائم کر دیا جس کا خاص مقصد یہ تھا کہ مویشیوں کو سستی شکر کھلا کر چربی زیادہ پیدا کی جائے جس کی جرمنی میں بہت قلت تھی۔ پھر انسانی استعمال کے لئے گلوکوز بھی بنایا جانے لگا۔ اور گلوکوز سے گلیسرین، جو ایک طرح کا خمیر کردہ شکر ہوتا ہے اور کریم وغیرہ بنانے کے کام آتا ہے۔ اب جو گلوکوز بازار میں ملتی ہے وہ تمام تر آلو یا لکڑی سے بنی ہوئی ہوتی ہے۔ اور اکثر انگریزی مٹھائیوں میں بھی اس لکڑی کی گلوکوز کو استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ گنے کی شکر سے مٹھائی ایسی بندھی ہوئی اور سخت نہیں بنائی جا سکتی۔ اقبال نے انسان کے کمالات بیان کرتے ہوئے سچ کہا تھا ؎

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

★

خوابوں کا خواب!

(مقبرۂ قائدِ اعظم، ایک تصور)

شہاب رفعت

دھیرے دھیرے چپکے چپکے ابھرے آن بآن
اک خوابِ ذی شان
ایک ڈھلکتا ایک جھلکتا، ایک روپہلا خواب
اک خوابوں کا خواب!
کہساروں سے جھوم کے اٹھے اک برّاق سحاب
لہراتا گھونگھٹوں کا بادل، ڈولتا اجیاروں کا بیڑا
جھولتا لَو کرنوں کا جھولا، جھومتا کاہکشاں کا جھالا
لحظہ لحظہ لمحہ لمحہ نکھرے، جوت جگائے
رہ رہ کر دھندلے گوشوں میں دیپ ہی دیپ جلائے
چاند نگر کے ساحر ڈھالیں پیکرِ سیم ناب
نیل گگن پر آن کے پھیلے جیسے کوئی عظیم شہاب
نور کے دریا کے سینے پر جیسے مست حباب
کونپل کونپل روشنیوں کے جگمگ شیشے کے چھتنار
جل کے بجائے دھرتی کے سینے سے ابھرتا نیر کنول
کھل سِم سِم سے کھلتے جائیں چھپے خزانوں کے سو باب

ابھرے نازک نازک ڈنڈی سر پہ لئے دوشیزہ کلی
لمحہ لمحہ ہولے ہولے منہ کھولے
سوندھا جادو پر تولے
دودھیا دودھیا کومل کومل سیمیں پر پھیلائے پری
پتی پتی لوحِ سیمیں پاک آیات کے نقش و نگار
چاندی کے ورقوں پر کیسے سحر ہوا ہے مینا کار
نکھری نکھری ترشی ترشی کامنی کامنی گڑیا سی
بہرِ دعا جوڑے ہوئے اپنے گورے گورے چمپئی ہات
ترشے ترشے خواب کے پہلو، ہر پہلو سانچے میں ڈھلا
قندیلیں پہلو در پہلو، چکیلی ہی چکیلی
اندر باہر روشنیوں ہی روشنیوں کا میلہ سا
جھلملیوں ہی جھلملیوں کی آنکھ مچولی کا نقشہ
فانوسِ بلوریں روشن مینائی دیواروں پر
رقص کریں نورانی پریاں جن کے شوخ اشاروں پہ
خواب آئینہ، خواب ہی عکس اور خواب ہی خواب تماشائی!

موئن جو دڑو

جاوید یوسف زئی

میرا ماضی، مری ہستی کا موئن جو داڑو
تو اسے دیکھ کے ممکن ہے فسردہ بھی نہ ہو
لوگ آتے ہیں فقط ذوق کی تسکیں کے لئے
ذوقِ نظارہ سے ممکن نہیں انساں کو نجات
یہ بھی اک تلخ حقیقت ہے مرے دوست کہ آج
یہ کھنڈر، کل جو تھا اک قصرِ نگارینِ جہاں
آج مرحوم تمناؤں کا گورستاں ہے!

لوگ آتے ہیں یہاں ذوقِ تجسّس لے کر
اور کچھ دیر نظارہ کر کے
—— اپنی راہوں پہ چلے جاتے ہیں
کس کو احساس ہے اس خاک کے ہر ذرّے میں
دلِ حسّاس کے زخموں کا لہو شامل ہے!
ہر طرف پھیلی ہوئی گہری سی تاریکی میں
آرزوؤں کی حنا، جذبوں کی ضو شامل ہے!!

لوگ کہتے ہیں کہ جو وقت کٹ چکا بیت چکا
بات جو بیت چکی، بیت چکی ختم ہوئی!
دل یہ کہتا ہے، مرا زخم ابھی بھر نہ سکا!!
بات جو بیت چکی، دل میں کھٹکتی ہے ابھی!

اور احساس ہیں کانٹوں کی طرح چبھتے ہیں
کسی مہتاب سے چہرے کے دلِ آویز نقوش!!
یہ گزرتا ہوا لمحہ ہے اک آزاد پرند
برق رفتاری سے اُڑتا ہی چلا جاتا ہے!
ایک موہوم حقیقت ہے، حقیقت ہی سہی
اک بدلتی ہوئی شے جس کا نہ ادراک ہوا

اور گزرا ہوا لمحہ ہے گرفتارِ قفس!
یاد کے پردے پہ ابھرا ہوا اک نقشِ دوام
اک اٹل ٹھوس حقیقت کہ نہ بدلے گی کبھی
ایک تاریخ جو ہر لمحۂ ساکت میں ہے قید
"وقت لافانی" "عدمِ وقت" کی حالت کا شعور

ایسے ہی وقت سے ماضی مرا تشکیل ہوا
اسکو تخریب بھی کہہ سکتے ہیں کہنے والے
گر تو آیا ہے یہاں ذوقِ نظارہ لے کر
میں بھی تاریخ کے بوسیدہ ورق الٹوں گا
تاکہ کھنڈروں سے تجھے شہر کا ادراک ملے
اور مٹی کے ہر اک ذرے سے
دلِ حسّاس کے زخموں کا لہو پھوٹ بہے!

ماہ رانی

شیر افضل جعفری

میرے گاؤں کی ماہ[1] رانی کی
سادگی پر کبوتری صدقے

پوٹے پوٹے خموش ہونٹوں پر
میٹھی باتوں کی رس بھری صدقے

جھلملاتے انار دانوں کے
سو دل و جان سے گری صدقے

اُڑتے آنچل کی سُرخ ململ پر
سانولے قاف کی پری صدقے

مُکھ پہ قربان کھیت کی دولت
دل پہ صحرا کی بے زری صدقے

رُوپلے[2] نرم نرم قدموں پر
ریت کی ریشمیں دری صدقے

بھولی بھالی کو دیکھ کر اکثر
ہرنیاں بھی کہیں "اری صدقے!"

اس کے ماحول کی اُداسی پر
مُسکراتی ہوئی مری صدقے

اس کے ٹوٹے مکاں پہ شام و سحر
حسنِ فطرت کی بے گھری صدقے

---

[1] مہرانی [2] نرم نرم

تنہائی

نصیر حیدر

چاندنی چھٹکی ستاروں کی بڑھی تنہائی
چٹکیاں لیتی ہوئی دل میں چھپی تنہائی

دامنِ کوہ میں آوارہ بھٹکتا بادل
سینۂ سنگ کی دھواں دیتی ہوئی تنہائی

شمع کے گرد پتنگوں کا یہ جھرمٹ شبِ غم
شامِ امید کی تاروں سے بھری تنہائی

سرخوشی، غم کی چٹختی ہوئی کلیاں دل میں
سیج کے پھولوں کی خوشبو سے لدی تنہائی

صبحدم ملگجی آنکھوں کے پپوٹوں کی طرح
درد کرتی ہوئی خوابوں میں گھلی تنہائی

نکہتیں باد کی مانند رواں ہیں ہر سو
مثلِ گل گلشنِ شب میں ہے کھلی تنہائی

صبح کے سائے میں پگھلی ہوئی اک شمع سی رات
بزمِ آغوش تری اور مری تنہائی

چہل کرتی ہے رگِ جاں سے تمنا کی طرح
درد کے ساتھ شبِ وصل بڑھی تنہائی

قومی ترانہ

امین الرحمٰن

بحریۂ پاکستان کا بینڈ شہنشاہ ایران کی آمد پاکستان کے موقع پر پہلی بار ہمارا قومی ترانہ بجا رہا تھا۔ جسے شہنشاہ بڑی محویت کے عالم میں سن رہے تھے۔ اس وقت ایک دبلا پتلا، زرد رو شخص بھی، جس نے اس ترانے کی دھن مرتب کی تھی، بحریہ کے بینڈ کو اپنی دھن بجاتے دیکھ رہا تھا۔ قسمت کو یہ منظور نہ تھا کہ یہ استادِ فن جس نے پاکستان کے "عارضی" قومی ترانے کی دھن موزوں کی تھی، اپنی اس عظیم الشان کامیابی کو اپنی زندگی میں کامراں دیکھ سکتا تھا۔

۵ فروری ۵۳ء کو حرکتِ قلب بند ہو جانے سے اس استادِ فن کا اچانک انتقال ہو گیا۔ اس کے انتقال کے گیارہ مہینے بعد مرکزی کابینہ کے ایک پورے اجلاس میں متفقہ طور پر اس نغمہ نگار کی مرتب کی ہوئی دھن کو منظور کر لیا گیا یہی آج پاکستان کا قومی ترانہ ہے۔

یہ دبلا پتلا زرد رو شخص، احمد جی چاگلا تھا۔ پاکستان کے قومی ترانے کی دھن موزوں کرنے والا نغمہ نگار۔

دنیا کے تقریباً کئی ملکوں کے قومی ترانے بڑے ڈرامائی حالات میں موزوں ہو گئے ہیں۔ جس کی ایک مشہور مثال فرانس کا قومی ترانہ "مارسلیز" ہے جو انقلاب فرانس کے پُر آشوب زمانے کی یادگار ہے۔ پاکستان کا قومی ترانہ جن حالات میں موزوں کیا گیا، انہیں پُر آشوب تو نہیں کہا جا سکتا، مگر ہنگامی ضرور تھے۔ ۱۹۵۰ء کے اوائل میں ایران کے جواں سال حکمراں رضا شاہ پہلوی شہنشاہ ایران، حکومت کی دعوت پر پاکستان کے سرکاری دورے پر تشریف لائے۔ شہنشاہ ایران کے استقبال کی تقریب پر رواج اور آداب کے لحاظ سے ضروری تھا کہ معزز مہمان کا استقبال پاکستان کے قومی ترانے سے کیا جائے۔ چنانچہ سرکاری طور پر پاکستان کے قومی ترانے کی ضرورت شدید طور پر محسوس کی گئی۔ لیکن ابھی پاکستان کے لئے کوئی قومی ترانہ تجویز نہ ہوا تھا۔ وقت بڑا تنگ تھا۔ اور قومی ترانے کی ضرورت تھی۔ ہنگامی و وقتی بھی، اور مستقل بھی۔ ہنگامی اس لئے کہ ایک خاص موقع کے لئے قومی ترانے کی ضرورت فوراً محسوس ہوئی۔ مستقل اس لئے کہ ایک بار قومی ترانے کا انتخاب کر لینے کے بعد اسے بدلنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ اس لئے کافی غور و تعمق کی ضرورت تھی۔ چنانچہ قومی ترانہ انتخاب کرنے والی سرکاری کمیٹی کے ارکان کے لئے یہ مسئلہ بڑی پیچیدگی پیش کر رہا تھا، بالخصوص اس وجہ سے کہ وقت بڑا تنگ تھا اور بظاہر پاکستان میں اس اہم کام کو سرانجام دینے کے لئے کوئی موزوں فرد دکھائی نہ دیتا تھا۔ لیکن اس موقع پر ارباب اختیار نے بڑے تدبر کا ثبوت دیا۔ اور ایک ایسے فنکار کو اس کام کے لئے چنا کہ نگہ انتخاب کی داد دینی پڑتی ہے۔ یوں تو مغربی ملکوں میں ایک سے ایک بڑا نغمہ نگار موجود ہے جسے اگر پاکستان کے قومی ترانے کی دھن موزوں کرنے کا کام تفویض کیا جاتا تو وہ اس کام کو نہایت احسن طریق سے انجام دیتا۔ لیکن اس سے ہمارے قومی ترانے کے ساتھ ہمیشہ کے لئے ایک غیر ملکی ماہرِ فن کا نام وابستہ ہو جاتا جو ہماری قومی خودداری کے خلاف ہوتا۔ حسنِ انتخاب یہی تھا کہ اس اہم کام کے لئے ایک پاکستانی نغمہ نگار ہی کا انتخاب کیا جاتا۔

احمد جی چاگلا اس سے پہلے ہمارے پڑھے لکھے موسیقی داں طبقہ میں ایک ماہر موسیقی کی حیثیت سے غیر معروف نہ تھے۔ شاید پاکستان میں ان سے زیادہ کلاسیکی موسیقی جاننے والے اہلِ فن موجود ہوں گے۔ لیکن احمد جی چاگلا برعظیم کی کلاسیکی موسیقی کے اسرار رموز سمجھنے کے علاوہ مغربی موسیقی کی تکنیک، اور نظریہ اور عمل سب سے مناسب حد تک واقف تھے۔ آپ کو انگلستان کی مشہور درس گاہِ موسیقی "ٹری نیٹی کالج آف میوزک" میں انگلستان کے مشہور ماہرِ موسیقی نواز سر ہنری وُڈ کی نگرانی میں کچھ عرصہ

مغربی موسیقی کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع بھی ملا تھا۔ اور پاکستان کے قومی ترانے کی موسیقی موزوں کرنے کے لئے ایک ایسے ہی شخص کی ضرورت تھی جو بیک وقت مشرق اور مغرب دونوں کی موسیقی کی باریکیوں کو ایک ماہر کی حیثیت سے جانتا ہو۔

اس تنگ وقت میں جناب چاگلا نے صحت کی خرابی کے باوجود شب و روز محنتِ شاقہ سے کام کیا۔ اور آخر کار پاکستان کے قومی ترانے کے لئے ایک مناسب دھن مرتب کر ہی لی۔ اور شاہی مہمان کی آمد سے بہت پہلے پاکستان کا قومی ترانہ بن چکا تھا۔ اس سارے عرصے میں جس کی مدت دو قلیل ہفتے سے زیادہ نہ تھی۔ احمد جی چاگلا نے ایک ایسی دھن موزوں کی جو وطن و ملت کے اعلیٰ عزائم و آرزوؤں کی ایک بولتی ہوئی تمثیل ہے۔ جب شہنشاہِ ایران پاکستان تشریف لائے تو ہمارے بحریہ کے بینڈ نے اس ترانے کو شہنشاہِ ایران کے استقبال کے موقع پر بجایا۔ جو اسے سن کر بہت متاثر ہوئے۔

پاکستان کے قومی ترانے کی خصوصیات اور اس کی تکنیکی باریکیوں کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے قومی ترانے کا وہ مفہوم سمجھ لیا جائے جو اس اصطلاح سے بین الاقوامی طور پر مراد لیا جاتا ہے۔ ویسے قومی ترانے کی اصطلاح پاکستانی عوام کے لئے نئی نہیں ہے۔ غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف برعظیم کے مسلمانوں نے بیسویں صدی کے آغاز ہی سے جو سیاسی جدوجہد شروع کردی تھی اس سے قوم کے حساس شاعر بیگانہ نہیں رہ سکتے تھے چنانچہ اس صدی کے ربع اول میں بعض نہایت ہی اعلیٰ پائے کے شعرا نے قوم کو بیدار کرنے کے لئے ملی ترانے کے عنوان سے نظمیں لکھی تھی۔ اس ضمن میں علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں کا ذکر خاص طور پر موزوں ہے۔ اقبال کا ترانہ: "چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا" یا "چشتی نے جس زمیں میں وحدت کا گیت گایا" برعظیم کی تقسیم کے وقت تک مسلمان رضا کاروں اور طالب علموں کا ایک بہت ہی مقبول ترانہ تھا۔ اسی طرح مولانا ظفر علی خاں نے سیاسیات کے ہنگامی تقاضوں کی پذیرائی میں کئی قومی ترانے لکھے تھے، جو مسلمانوں کے سیاسی اجتماعات، جلسوں اور جلوسوں وغیرہ میں اکثر گائے جاتے تھے۔ لیکن ان قومی ترانوں کی اہمیت برعظیم کے مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کے ایک خاص دور کی مخصوص ضرورتوں سے متعلق تھی۔ حصول پاکستان کے بعد قوم کو "سرکاری" طور پر ایک ایسے قومی ترانے کی ضرورت تھی جو مستقل طور پر ایک آزاد قوم کے اعلیٰ عزائم اور جذباتِ حب الوطنی کا اظہار نغمہ و شعر کے ایک پر تاثیر قالب میں، خاص تڑپ خاص ولولے کے ذریعہ کر سکے۔

ظاہر ہے اس مقصد کے لئے اگر ایک طرف ایک غیر معمولی فطین نغمہ نگار کی ضرورت تھی جس کا کام قومی ترانے کی سادہ او مؤثر دھن موزوں کرنا تھا تو دوسری طرف ایک ایسے نغز گو شاعر کے ذوقِ نغمہ کی بھی ضرورت تھی جو قومی ترانے کی دھن پر پورے اترنے والے مترنم مگر ولولہ انگیز بول، لکھ سکے۔

اس عہد میں کسی آزاد ملک کے لئے قومی ترانے کی ضرورت ناگزیر ہے۔ مگر اس مقصد کے لئے جس قسم کے قومی ترانے کی ضرورت ہوتی ہے اس کا تصور سراسر مغربی ہے۔ کیونکہ ایشیائی ملکوں کے، برخلاف ہر مغربی ملک کا اپنا ایک قومی ترانہ موجود ہے۔ لیکن گزشتہ سو برس کے اندر ایشیا کے اکثر آزاد ملکوں نے بھی اپنے اپنے ملک کے مخصوص مطمح نظر کے تحت اپنے لئے قومی ترانوں کی دھنیں مغربی موسیقی کے اصولوں پر موزوں کی ہیں۔ مثال کے طور پر ترکی کا "استقلال مارچ" یا عراق کا "شاہی سلامی" جو مارچ کی دھن میں موزوں کئے گئے ہیں۔ اسی طرح جدید چین کا قومی ترانہ بھی ہئیت کے اعتبار سے مغربی ہے۔

اگر آپ کو دنیا کے مختلف ملکوں کے قومی ترانے سننے کا اتفاق ہوا ہو تو آپ محسوس کریں گے کہ قومی ترانوں کی موسیقی کا ایک، اپنا اسلوب یا "انگ" ہوتا ہے۔ ان کے آغاز کے سُر عام طور پر ایک، خاص دھیمی لے میں بجائے جاتے ہیں جس میں بعض اوقات تیزی بھی پیدا کی جاتی ہے۔ جو بتدریج بڑھتی ہے یا بعض قومی ترانے ایک خاص تیزلے کے اتار چڑھاؤ ہی سے شروع ہو جاتے ہیں۔ اکثر قومی ترانے مارچ کی دھنوں میں مارچ کی مخصوص تالوں میں موزوں کئے جاتے ہیں۔ جیسے جمہوریہ ترکی کا "استقلال مارچ" یا عراق کا ترانہ ـــ "شاہی سلامی"۔ قومی ترانوں کی دھنیں اکثر سادہ عام فہم ہوتی ہیں۔ تاکہ لوگوں کی زبان پر آسانی سے رواں ہو جائیں۔ مثلاً برطانیہ کا قومی ترانہ "گاڈ سیو دی کنگ" (خدا بادشاہ کو سلامت رکھے) نہایت آسان دھن میں موزوں کیا گیا ہے بعض ملکوں کے قومی

ترانے محض دھن ہی پر مشتمل ہوتے ہیں یعنی ان کے بول ہوتے ہی نہیں۔ مثلاً ترکی کا "استقلال مارچ" یا عراق کا ترانہ "شاہی سلامی"۔ لیکن زیادہ تر ملکوں کے قومی ترانوں کے بول بھی ہوتے ہیں۔ جو ایک لحاظ سے ضروری بھی ہیں۔ کیونکہ خالی دھن خواہ کتنی ہی مؤثر، ولولہ انگیز اور موسیقی کے لحاظ سے کتنی ہی اعلیٰ پائے کی کیوں نہ ہو آسانی سے عوام کے ذہن نشیں نہیں ہو سکتی۔ الفاظ کی مدد سے عوام اپنے ملک کے قومی ترانے کی روح سے زیادہ بہتر طریقہ سے آشنا ہو جاتے ہیں۔ اور اُن کے دل میں اپنے ترانہ کی عزت و محبت پیدا ہو جاتی ہے۔

بعض ملکوں میں قومی ترانے کے بول پہلے سے موجود تھے لیکن کوئی موزوں دھن موجود نہ تھی ان ملکوں میں قومی ترانے کی دھن بعد میں موزوں کی گئی۔ مثلاً جاپان کے قومی ترانے کے بول نویں صدی عیسوی سے رائج تھے لیکن دھن محلِ نظر تھی۔ چنانچہ جدید جاپان کے قومی شعور نے اپنے قومی ترانے کی دھن ۱۸۸۰ء میں نئے سرے سے موزوں کرائی۔ قومی ترانوں کے سلسلے میں ایک اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ کبھی کسی قومی ترانے کی دھن نہایت اعلیٰ ہوتی ہے۔ لیکن بول نہایت گھٹیا ہوتے ہیں کبھی بول نہایت اعلیٰ ہوتے ہیں۔ لیکن دھن بڑی معمولی ہوتی ہے۔ لیکن بعض قومی مجبوریوں اور تقاضوں کی وجہ سے اس قومی ترانہ کو جو ایک بار رائج ہو جائے۔ بجنسہٖ برقرار رکھنا ہی پڑتا ہے۔

اکثر قومی ترانوں کے بول اور دھنیں نامعلوم شاعروں اور موسیقاروں کی موزوں کردہ ہوتی ہیں۔ اور ان کی حیثیت لوک گیتوں جیسی ہوتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے گویا قوم کے اجتماعی شاعرانہ شعور نے انہیں جنم دیا ہے۔ لیکن اکثر ملکوں کے قومی ترانے بعض نہایت مشہور نغمہ نگاروں کی فنی تخلیق کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ مثلاً امپیریل آسٹریا کے قومی ترانے کی دھن مشہور جرمن نغمہ نگار ہائڈن نے ۱۷۹۷ء میں موزوں کی تھی جسے اب بھی قومی ترانوں کی موسیقی کے مخصوص انگ کا ایک نہایت اعلیٰ نمونہ سمجھا جاتا ہے۔

قومی ترانوں کی موسیقی کی بعض اپنی خصوصیات ہوتی ہیں جنکی بناء پر اسے کسی دوسرے پارہ موسیقی سے ممیز کیا جاتا ہے۔ قومی ترانے کی موسیقی نہ تو نغمہ نگار کے داخلی رجحان کو ظاہر کرتی ہے اور نہ اسکے انفرادی مزاج ہی کو۔ یعنی اس میں نہ تو نغمہ نگار کی ذہنی داخلیت ہی کا اظہار ہوتا ہے اور نہ اس کی انفرادیت کا۔ قومی ترانوں کی موسیقی کا ایک اپنا الگ انگ ہوتا ہے جس سے یہ موسیقی دوسری غنائی بندشوں سے پہچانی جاتی ہے۔ قومی ترانوں کی موسیقی، ہمیشہ کسی قوم کے عزائم کا اظہار کرتی ہے۔ اس کی دھن میں کسی قوم کی روح اور مزاج سموئے ہوتے ہیں۔ اگرچہ پاکستان کے قومی ترانے کی دھن نغمہ نگاری کے مغربی اصولوں کے مطابق موزوں کی گئی ہے لیکن پھر بھی یہ دھن ہمیں حیرت انگیز طور پر اپنی قومی روح اور مزاج سے قریب تر معلوم ہوتی ہے اور اب جبکہ اسے رائج ہوئے پانچ سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے اور اس کی دھن میں بول بھی موزوں ہو چکے ہیں ہمارے عوام اس کی موسیقی اور اس کی تال دونوں ہی کو پسند کرنے لگے ہیں اور اب یہ ان کے کانوں کو اجنبی یا غیر مانوس محسوس نہیں ہوتی۔ زیادہ تر مشرقی ملکوں کے قومی ترانوں کی دھنیں مغربی نغمہ نگاروں کی موزوں کی ہوئی ہیں۔ یہ فخر پاکستان ہی کو حاصل ہے کہ اس کے قومی ترانے کی دھن کی موسیقی اس سرزمین کے ایک ماہرِ فن کی موزوں کی ہوئی ہے جو اپنی قوم کی روح اور مزاج سے اچھی طرح واقف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسکی موسیقی کو مغربی نغمہ نگاری کے اصولوں پر مبنی ہونے کے باوجود ہمارے قومی احساس نے بخوبی قبول کر لیا ہے۔

پاکستان کے قومی ترانے کی دھن جس ہیئت میں لکھی گئی ہے اسے مغربی موسیقی کی اصطلاح میں ہیئتِ ثلاثی کہتے ہیں یعنی وہ ہیئت جو تین حصوں یا چالوں پر مشتمل ہوتی ہے' علاماتی طور پر اس ہیئت کو ا ب ا سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ ا کو اگر استھائی سمجھا جائے اور ب کو انترا تو اس دھن کی ہیئت ہماری موسیقی کے لحاظ سے "استھائی انترا استھائی" پر مشتمل ہوگی۔ ہمارے قومی ترانے کی ہیئت کا حصہ اول یعنی استھائی مغربی موسیقی کے اس "ٹھاٹھ" میں لکھی گئی ہے جو ہمارے ہاں شدھ بلاول کا ٹھاٹھ ہے۔ اور جسے مغربی موسیقی میں MAJOR MODE کہتے ہیں۔

حصہ دوم یا انترا جس ٹھاٹھ میں لکھا گیا ہے اس کے صحیح مترادف ہمارے ہاں کوئی ٹھاٹھ نہیں۔ اگر شدھ بلاول میں، جو پیانو کے سفید پردوں پر بجایا جا سکتا ہے، گندھار دھیوت اور نکھاد کے سر کو کومل

کر دیا جائے تو البتہ وہ ٹھاٹھ بن جائے گا جس میں ہمارے قومی ترانے کی موسیقی کا حصہ دوم لکھا گیا ہے ۔ اسے مغربی موسیقی میں MINOR MODE کہتے ہیں۔ قومی ترانے کا حصہ سوم پہلے حصہ کی بجنسہٖ تکرار ہے۔ قومی ترانے کی ان تینوں حصوں میں نغمہ نگار نے بڑی احتیاط سے توازن پیدا کیا ہے اور شدھ بلاول کے ٹھاٹھ کا کڑا پن جو ماسوائے مدھم کے تیور سروں کے استعمال سے پیدا ہوتا ہے دوسرے حصے کی موسیقی میں کومل گندھار کے استعمال سے دور کر دیا ہے ۔ اور دونوں حصوں کی موسیقی کے درمیان ایک خاص وقفۂ سکون دے دیا ہے ۔ اس وقفۂ سکون سے نغمہ نگار نے نہ صرف اپنے لئے بڑی آسانی پیدا کر لی ہے بلکہ اس سے دھن بھی پیچیدہ ہونے سے بچ گئی ورنہ بغیر وقفۂ سکون کے کومل گندھار کے استعمال سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہونے کا احتمال تھا جسے وہی لوگ جان سکتے ہیں جو مغربی موسیقی کے فن نغمہ نگاری سے عملاً آگاہ ہوں ، اور اس کی تکنیک کی باریکیوں کو بھی جانتے ہوں۔

پاکستان کے قومی ترانے کی دھن کی موسیقی میں آمد اور بیساختگی بہت ہے یعنی ایک قدرتی بہاؤ ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے نغمہ نگار نے نغمہ نگاری کے ایک سادہ بنیادی اصول سے کام لیا ہے. یعنی خوبصورت نغمے کی بڑھت یا تو "اسکیل" کے سروں کو درجہ بدرجہ استعمال کرنے سے ہوتی ہے یا پھر درمیان میں ایک، یا ایک سے زیادہ سروں کو چھوڑتے چلے جاتے ہیں۔ پہلی قسم کی بڑھت کی مثال سا رے گا ما یا پا دھا نی سا ہے ۔ اسے سروں کی متصل حرکت کہتے ہیں۔ دوسری قسم کی بڑھت کی مثال سا، گا، رے، ما، پا، رے، سا ہے۔ اسے سروں کی منفصل حرکت کہتے ہیں۔ دنیا کی ساری موسیقی سروں کی انہیں دو قسم کی حرکات سے پیدا ہوتی ہے۔ پاکستان کے قومی ترانے میں ان دونوں قسموں کی حرکات موجود ہیں ہمارے نغمہ نگار نے قومی ترانے کی دھن میں ایسے سروں کو بہت استعمال کیا ہے جن کے درمیان چار نیم سروں کا فاصلہ ہوتا ہے ۔ مثلاً کھرج سے گندھار تیور جسے "سوم بزرگ" کہا جاتا ہے ۔ پاکستان کے قومی ترانے کی دھن میں ایک قابل غور بات یہ ہے کہ نغمہ نگار نے کوئی ایسا سُر استعمال نہیں کیا جس سے تنافر پیدا ہونے کا احتمال ہو سکتا تھا ۔

ماہر نغمہ نگار اپنی بندشوں میں ایسے سُر بڑے التزام سے استعمال کرتے ہیں جو تنافر پیدا کرتے ہیں اور پھر ان کی بڑے سلیقے سے "اصلاح" کرتے ہیں اور اس طرح ماہرین فن سے داد حاصل کرتے ہیں لیکن تنافر پیدا کرنے والے سُروں کی اصلاح کا عمل اکثر اوقات بڑی پیچیدگیاں پیدا کر دیتا ہے اس لئے ہمارے نغمہ نگار نے ان سُروں کے استعمال سے احتراز ہی کیا ہے ۔ تاکہ قومی ترانے کی دھن سادہ ، اور سہل رہے۔ اور ایک مبتدی بھی اس کا گانا بجانا جلد سے جلد سیکھ لے ۔

پاکستان کے قومی ترانے کی دھن بہت مختصر ہے اس کا کل دورانیہ ایک منٹ اور بیس سکنڈ ہے لیکن ہمارے نغمہ نگار کو اس دھن کے بجانے کے لئے بینڈ کے مختلف سازوں کے انتخاب اور ان کی ترتیب طے کرنے میں خاصی محنت کرنی پڑی تھی۔ جسے مغربی موسیقی کی اصطلاح میں سازکاری کہتے ہیں۔ مغربی ملکوں میں سازوں کی ترتیب اور سازکاری ایک جدا ہی فن ہے اور اس کے بھی اپنے ماہر ہوتے ہیں ۔ ہمارے قومی ترانے میں سازکاری کا کام خود نغمہ نگار ہی کو اپنے ذمہ لینا پڑا تھا چنانچہ احمد جی چھاگلا نے اکیس سازوں کے لئے دھن کے مخصوص ٹکڑے مرتب کئے جو بہت ہی طویل طویل، دقیق اور ریاض طلب کام تھا۔ آپ نے اس دھن کے لئے جو ساز منتخب کئے ان میں ولایتی طرز کی بانسری ، پکولو، کلارنٹ ، اوبو، آلٹو، بیکو فون، کارنٹ ، ٹرمپٹ ، ہارن، سلائیڈ ٹرومبون، بیس ٹرومبون ، یوفونیم ، بے سون ، بیس اور ولایتی طرز کے ڈھول شامل رکھے ، اس طرح قومی ترانے کی دھن کو صحیح صحیح بجانے کے لئے جس بینڈ کی ضرورت ٹھہری اس میں کم سے کم اڑتیس ساز تھے جس میں بعض ایک ہی قسم کے کئی ساز تھے ، ویسے بینڈ میں سب سے زیادہ کلارنٹ کا ہی استعمال کیا گیا ۔ سازوں کی اس ترتیب سے جو جو بینڈ مرتب ہوگا وہ صحیح معنوں میں نغمہ نگار کی عین منشا کے مطابق قومی ترانے کی دھن کی پُرجوش اور ولولہ انگیز موسیقی کا بہترین مظہر ثابت ہوگا ۔

ہمارے قومی ترانے کی موسیقی بڑی سادہ و مؤثر ہے اور ساتھ ہی بڑی پُرجوش اور ولولہ انگیز بھی ۔ اسے سننے کے بعد یقیناً ایک نئی نئی آزاد قوم کے اعلیٰ عزائم اور بلند نصب العین کا احساس ہوتا ہے ۔ قومی ترانے کی موسیقی میں تڑپ ، ولولہ اور جوش پیدا کرنے کے لئے نغمہ نگار نے دھن کے سُروں کے صوتی زیر و بم پر خاص توجہ دی ہے ۔ سروں کو جس قوت سے بجایا جاتا ہے اس کی شدت ، کمی یا بیشی کو موسیقی کی تحریر میں خاص علامات یا مختصر حروف سے ظاہر کیا جاتا ہے ، اسے مغربی موسیقی

ی اصطلاح میں "حرکیات" کہتے ہیں جو درداصل ریاضی سے مستعار لی ہوئی
یک اصطلاح ہے جس طرح ریاضیات کے ایک شعبے کے طور پر حرکیات میں
رکت کرتے ہوئے اجسام کی قوتوں کی شدت اور توانائی سے بحث
ہوتی ہے ویسے ہی موسیقی میں اصطلاحی طور پر "حرکیات" سے سُر دں کو ادا
رنے وقت جو قوت درکار ہوتی ہے۔ اس کی کمی، یا بیشی یعنی "شدت"
رادلی جاتی ہے۔ چاگلانے اپنی دُھن کے لئے حرکیاتی علامتوں سے بڑا
ام لیا ہے ہمارے قومی ترانے کی دُھن میں شاید ہی کوئی ایسا سُر یا سروں
ی تان ہو جس کے ادا کرنے کے لئے نغمہ نگار نے کوئی نہ کوئی حرکیاتی علامت
حرف متعین نہ کیا ہو جس کا نتیجہ یہ ہے کہ سازوں پر ہر سُر ایک خاص
رت سے بجایا جاتا ہے جس سے دُھن کے تاثر میں ایک خاص شدت
پیدا ہو جاتی ہے۔ قومی ترانے کی دُھن کے بعض سُر بہت اونچے بجائے
اتے ہیں بعض سُر ذرا کم اونچے، بعض سُر ایک دوسرے میں تحلیل ہوتے
پلے جاتے ہیں بعض سُر الگ الگ پہچانے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح دُھن
ں مکمل سکون کے کچھ وقفے بھی آتے ہیں جو دُھن کی پُر جوش اور ولولہ انگیز
وسیقی کی عمومی کیفیت میں ایک قسم کا ڈرامائی ٹھہراؤ پیدا کرنے کا کام
یتے ہیں۔ اور مجموعی تاثر میں اضافہ کا باعث بن جاتے ہیں۔

اپنی دھن کی موسیقی کے مانند پاکستان کے قومی ترانے کا آہنگ
یعنی تال اور لَے بھی قابلِ غور ہے کیونکہ اسی آہنگ کے ذریعہ قومی ترانے
ی دھن کی صُوری خصوصیات، یعنی توازن، تجسیم و تشکیل اور لہجہ پیدا
ہوا ہے۔ اور دھن کی موسیقی میں عروج اور سکون کے مقام پیدا ہوتے ہیں۔
چونکہ قومی ترانے کا آہنگ سراسر مغربی ہے اس لئے اس کی تال کو اپنی کلاسیکی
وسیقی کی تالوں میں ظاہر کرنا کچھ مشکل سی بات ہے۔ مغربی موسیقی کی یہ تال
چار ضربوں کے توا تر سے جس میں ہر پہلی ضرب پر دوسری تین ضربوں کے مقابلے
میں نسبتۃً زیادہ زور دیا جاتا ہے، پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح چار چار ضربوں کے
ٹکڑے بنتے چلے جاتے ہیں۔ انہیں اگر ہم "رکن" کا نام دیں، اور اگر ہر ضرب
کا دوران ایک ماترا ہو تو ایک رکن میں چار ماترے ہوں گے جن میں سے ہر
پہلے ماترے پر دوسروں کی بہ نسبت زیادہ زور ہوگا جس سے ہر رکن
کے آغاز کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ یہ معلوم ہی نہ ہو سکتا کہ ایک
رکن کب شروع ہوا اور کب ختم ہوا۔ قومی ترانے کے تینوں حصے آٹھ آٹھ
ارکان پر مشتمل ہیں اور کل قومی ترانہ چوبیس ارکان پر مشتمل ہے۔ ہمارے
اں دو تالیں ایسی ہیں جن میں چار چار ضربیں استعمال ہوتی ہیں۔ تین

تال اور کہروا تال۔ اس لحاظ سے ہمارے قومی ترانے کی تال کا آہنگ
تین تال اور کہروا تال کے مترادف ہے۔ لیکن چال میں فرق ہے کیونکہ
مغربی موسیقی کی تالوں میں "سم" نہیں ہوتا۔ اور سم کی موجودگی یا غیر موجودگی
سے تال کی چال میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قومی ترانے کی
دھن کو "سرگم" میں لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ مگر پاکستان کے قومی
ترانے کی خوبیوں اور باریکیوں کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی
دھن کو مغربی طریقۂ املا میں منتقل کر کے سرگم میں لکھا جائے۔ کیونکہ ہمارے
ہاں راگوں اور موسیقی کی دوسری بندشوں کو سرگم ہی کے ذریعہ لکھا
جاتا ہے۔ لیکن اس کے لئے ہمارے ہاں کوئی معیاری طریقہ نہیں
ہے۔ مختلف مصنفوں نے اپنی سہولت کی غرض سے اپنے
طور پر راگوں اور دھنوں کو لکھنے کے کچھ الگ الگ طریقے اختیار کیے
ہیں ان تمام طریقوں میں حرفوں کا استعمال زیادہ اور علامتوں کا کم
ہے۔ "معارف نغمات" کے مصنف نے راگوں کی بندشوں کو لکھنے کا
اردو میں جو طریقہ پنڈت بھاتکھنڈے سے مستعار لیکر لکھا ہے، عام طور
پر وہی طریقہ اردو میں بھی رائج ہے لیکن یہ طریقہ بڑا محدود ہے۔ اور
مغربی موسیقی کی کسی دھن کو اس طریقے سے لکھنا بڑا مشکل ہے۔ البتہ
ایک فرانسیسی مصنف موسیو آلیں دانیئیلو نے برِعظیم کی کلاسیکی موسیقی
پر جو کتاب لکھی ہے اس میں انہوں نے راگوں کی بندشوں کو لکھنے کا
ایک نسبتہً زیادہ جامع اور آسان طریقہ دکھایا ہے۔ اس طریقہ میں
تھوڑی سی ترمیم کر کے میں اسی کے ذریعہ پاکستان کے قومی ترانے کی
دھن کو سرگم میں لکھنے کی ایک کوشش اس طرح پیش کرتا ہوں:-

(۱) ہر سُر کو سرگم کے طریقے میں پورا پورا لکھا جائے مثلاً:
سا - رے - گا - وغیرہ -

(۲) مدھ سپتک کے سُر ویسے ہی لکھے جائیں: سا، رے، گا
وغیرہ - تار سپتک کے سروں کے اوپر ایک خط ہوگا۔ جیسے۔ سا،
رے، گا وغیرہ - مندر سپتک کے سروں کے نیچے خط ہوگا
جیسے سا، رے، گا وغیرہ۔

(۳) ماترے کو سروں کے دوران کی اکائی مان کر ایک افقی
لکیر کے ذریعے ظاہر کیا جائے مثلاً: گا - اس کا مطلب یہ ہے
کہ گا یا ما کے سُر کا دوران ایک ماترے کے برابر ہے چنانچہ کسی
سُر کا ماتروں میں جتنا دوران ہوگا اس کے آگے اتنی ہی افقی لکیریں

ہوں گی اور اوپر ایک نقطہ پڑا ہوگا، بنا دی جائیں گی جیسے ایک سُر کا دو ماتروں میں دوران یوں ظاہر ہوگا:

۴۔ نیم ماترے کے سر اس علامت کے ذریعے ظاہر کئے جائیں گے۔ ـــ مثلاً گا کا مطلب یہ ہے کہ گا کے سُر کا دوران نیم ماترے کے برابر ہے، نیم ماترے کے ایک سے زیادہ سروں کو اس طرح اکٹھا لکھا جائے گا۔ مثلاً:

ما گا رے سا

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر سر کا دوران نیم ماترہ ہے۔ اور کل تان کا دوران دو ماترے کے برابر ہے۔

۵۔ دو نیم ماترے یعنی ¼ ماترے کے سر اس علامت کے ذریعہ ظاہر کئے جائیں گے ـــ مثلاً گا کا مطلب یہ ہے کہ سُر کا دوران ¼ ماترے کے برابر ہے۔ دو نیم ماترے کے ایک سے زیادہ سروں کو اس طرح اکٹھا لکھا جائے گا:

ما گا رے سا

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر سر کا دوران ¼ ماترے کے برابر ہے اور کل تان کا دوران ایک ماترے کے برابر ہے۔

اس طریقے سے دو یا دو سے زیادہ سروں کو کسور میں تقسیم کرنا بھی ممکن ہے مثلاً اگر ایک سر ½ ماترے کا ہے اور دوسرا ¼ ماترے کا تو وہ بڑی آسانی سے ظاہر کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً

ما گا

یہاں درمیانی افقی لکیر جس پر کوئی سُر نہیں لکھا گیا اور جس پر ایک نقطہ پڑا ہے یہ ظاہر کرتی ہے کہ گا کے سُر کا دوران مزید ¼ ماترے کا ہے۔

۶۔ ماترے کے مختلف مجموعوں کو دو لمبی افقی لکیروں کے ذریعے ظاہر کیا جائے گا، اور ان دو لکیروں کے اندر کی موسیقی کو رکن کہا جائے گا۔

۷۔ سکون کے وقفوں کو بھی مندرجہ بالا طریقے سے ظاہر کیا جائے گا۔ مثلاً: ـ ایک ماترے کے سکون کو محض ایک افقی لکیر کے ذریعے جس پر کوئی نقطہ نہیں ہوگا، ظاہر کیا جائے گا۔ جیسے ا ـ

ان تمام ہدایات کو ذہن نشین کر لینے کے بعد آپ کے لئے ترانے کی دھن کو سرگرم کے ذریعہ سمجھنا مشکل نہ ہوگا جو مضمون کے آخر میں دی گئی ہے۔ پاکستان کے قومی ترانے کی دھن کے سرگم کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ حصۂ اول یا سوم کی بعض تانیں مثلاً:

سا گا ما پا دھا ما پا

یا سا نی دھا پا ما گا ×

یا پا ما گا ما گا رے سا

ہمارے راگ شدھ بلاول ہی کی تانیں ہیں۔ اور قومی ترانے کے حصۂ اول کو مغربی موسیقی کے (MAJOR MODE) میں موزوں کرنے سے نغمہ نگار کے پیشِ نظر یقیناً یہ بات ہوگی کہ اس سے پاکستان کے لوگوں کو اپنے ہاں کے ایک مشہور راگ کی جھلک دکھائی دے اور قومی ترانے کی دھن کی موسیقی ایک مغربی ٹھاٹھ میں لکھی جانے کے باوجود پاکستانی عوام کے ذوقِ نغمہ کو اجنبی محسوس نہ ہو۔

حصۂ دوم کی موسیقی جس مغربی ٹھاٹھ (MINOR MODE) میں موزوں کی گئی ہے۔ اس کے مترادف ہمارے ہاں کوئی ٹھاٹھ نہیں ہے۔ اس ٹھاٹھ کو یوں لکھا جا سکتا ہے:-

سا رے گا ما پا دھا نی سا

اگر اس ٹھاٹھ میں نکھاد تیور کی جگہ نکھاد کومل کا سُر رکھ دیا جائے تو یہ ہمارا اساوری ٹھاٹھ بن جائے گا۔ قومی ترانے کے حصۂ دوم میں گندھار کومل کے ساتھ گندھار تیور بھی استعمال ہوا ہے۔ ہمارے ہاں جے جے ونتی راگ میں دونوں گندھار اور دونوں نکھاد استعمال ہوتے ہیں۔ اس لئے قومی ترانے کے حصۂ دوم کی بعض تانوں میں کہیں تو اساوری راگ کی جھلک دکھائی دیتی ہے اور کہیں جے جے ونتی کی۔ شاید اسی وجہ سے حصۂ دوم کی موسیقی بھی ہمارے کانوں کو اجنبی محسوس نہیں ہوتی خاص کر یہ تان:

سا رے ما گا رے نی سا (پاک سرزمین کا نظام)

یا رے گا رے سا رے نی سا (پائندہ تابندہ باد)

ہمارے نغمہ نگار نے مغربی موسیقی کے جن دو ٹھاٹھوں سے قومی ترانے کی دھن موزوں کی ہے ان کا انتخاب بڑا سوچا سمجھا ہوا دکھائی دیتا ہے کیونکہ ان ٹھاٹھوں میں موزوں کی ہوئی موسیقی ہمیں اپنے ہاں کی موسیقی کے بہت قریب دکھائی دیتی ہے۔ اور اس میں ہمیں

قومی ترانہ کی دھن

"شاد باد منزل مراد!"

قومی ترانہ :

جس کی دھن دلوں میں حب وطن کے تار چھیڑتی اور الفاظ پاکستان کی خدمت و عظمت کا جذبہ تازہ کرتے ہیں

دھن کی پہلی مشق

جس میں بحریۂ پاکستان کے بینڈ اور طلبہ و طالبات نے حصہ لیا

(دائیں طرف، دوسرے)، دھن کے خالق: احمد جی، چھاگلا

جامعۂ پشاور

جامعۂ پنجاب
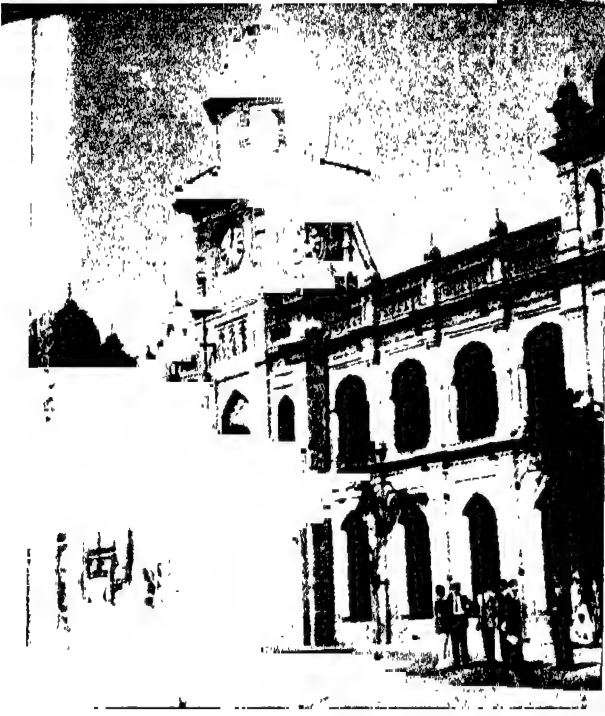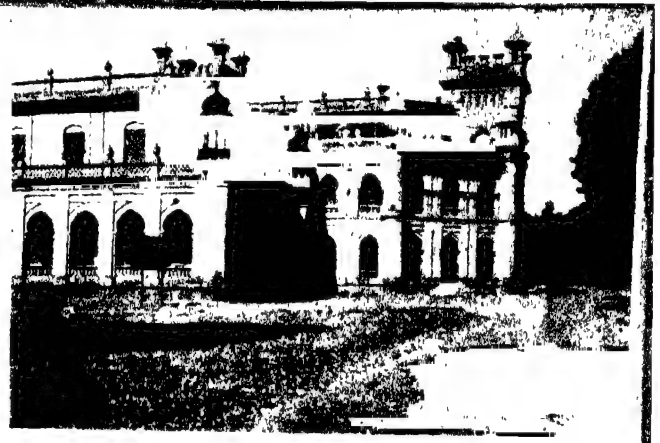
علم و عمل
کے گہوارے
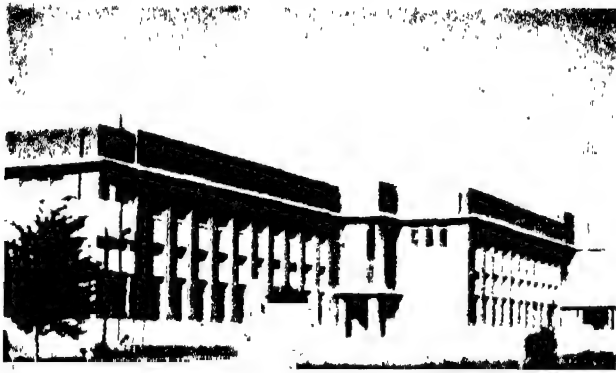
دور نو میں نظام تعلیم کی ترقی و اصلاح پر خصوصی توجہ صرف کی گئی ہے اور "قومی تعلیمی کمیشن" کی سفارشات کو جلد از جلد عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے

نونہالان وطن قوم کا عزیز ترین سرمایہ ہیں اور ان کی صحیح روحانی، ذہنی اور عملی تربیت پر ملک کے مستقبل کا انحصار ہے

جامعۂ ڈھاکہ

طالبات میں سائنس کی تعلیم سے بڑھتی ہوئی دلچسپی

اجنبیت کم سے کم محسوس ہوتی ہے۔ جو لوگ قومی ترانے کی موسیقی کو سراسر مغربی سمجھتے ہیں وہ محض اپنی ناواقفیت کے باعث ایسا کہتے ہیں کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ احمد جی چاگلا نے بڑے سلیقے سے مغربی اور پاکستانی انگ کو ایک دوسرے میں سمونے کی کوشش کی ہے اور اس فطین نغمہ نگار کی یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

ہمارے قومی ترانے میں آہنگ کی بڑی خوبیاں ہیں اور ہمارے نغمہ نگار نے اس معاملے میں بھی بڑی سوجھ بوجھ سے کام لیا ہے۔ مغربی انگ میں مرتب کی ہوئی کسی دھن پر پورے اترنے والے اردو کے بول لکھنا تقریباً ناممکن سی بات ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہے کہ بحرِ ہزج مثمن یا بحرِ رمل میں انگریزی کی کوئی نظم لکھی جائے۔ اگرچہ ہمارے قومی ترانے کی دھن پہلے تیار ہوئی تھی اور بول بعد میں تحریر ہوئے لیکن چاگلا کو اس بات کا پہلے ہی احساس تھا کہ زود یا بدیر اس کی موزوں کی ہوئی دھن پر پاکستان ہی کی قومی زبان میں بول لکھے جائیں گے۔ اور پاکستان کی قومی زبان کے لفظوں کا آہنگ مغربی زبانوں کے لفظوں کے آہنگ سے بالکل مختلف ہوتا ہے اس لئے ہمارے نغمہ نگار کے سامنے پہلے ہی یہ مسئلہ تھا کہ قومی ترانے کے آہنگ کو کس طرح پاکستانی سماعت کے لئے قابلِ قبول بنایا جائے اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے چاگلا نے اپنی دھن میں کئی جگہ دو دو سُر ایسے استعمال کئے ہیں جن میں سے ایک کا دوران ۱½ ماترا ہے اور دوسرے کا ½ ماترا۔ ۱½ اور ½ ماترے کے دوران کے سروں کو یکے بعد دیگرے استعمال کرنے سے وہ مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے کیونکہ "سرزمین"، "حسین" اور "سایۂ خدائے ذوالجلال" کے الفاظ اور ترکیبیں اسی دوران کے سُروں پر موزوں ہو سکتی تھیں۔ مغربی موسیقی میں اسے "سکاچ ہاپ" (SCOTCH HOP) کہتے ہیں سارے قومی ترانے میں چاگلا نے "سکاچ ہاپ" تقریباً سولہ مرتبہ استعمال کیا ہے۔ اس آہنگ کو مغربی نغمہ نگار بڑی احتیاط سے استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ اس سے ان کی موسیقی کے انگ میں فرق آجاتا ہے لیکن چاگلا کے لئے اس کا استعمال ناگزیر تھا۔

(باقی صفحہ ۵۹ پر)

مجھے یقین ہے کہ آئین کمیشن کی سفارشات میرے اس فرضِ عین کی ادائیگی میں معاون ہوگی کہ اپنے عوام کے لئے ایک ایسا آئین مرتب کر کے دے سکوں جو ان کے لئے استحکام اور امن و راحت کا باعث ہو۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں اور اس کی ذات سے امید کرتا ہوں، کہ وہ مجھے ایسی روشنی اور ہدایت دے گا کہ اس فریضہ سے بہمہ وجوہ عہدہ برآ ہو سکوں۔

اس رپورٹ کے موصول ہونے کے بعد ہماری تاریخ کا ایک مہتم بالشان دور شروع ہوتا ہے۔ اگر ہم تاریخ کو بننا چاہتے ہیں، جیسا کہ تہیہ کر چکے ہیں، تو ہمیں سوجھ بوجھ اور جرأت سے کام لینا ہوگا۔ نیز یہ کہ ہم فروعات اور علاقہ دارانہ باتوں سے قطعی بلند ہو جائیں۔

اب تک عوام پورے یقین کے ساتھ جس طرح میری استعانت کرتے رہے ہیں، امید ہے آئندہ بھی جاری رہے گی اور میں اپنی طرف سے بصمیم قلب ان سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ مشترک مقصد کے حصول میں اپنی پوری کوششیں صرف کرتا رہوں گا۔

——— فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں

★

ڈرامہ:

گزرگاہِ خیال

آغا ناصر

- بیگم سلمان — ایک ضعیف خاتون
- شاہدہ — ان کی نوجوان لڑکی
- ارشد — اس کا چھوٹا بھائی
- شیریں — شاہدہ کی خالہ زاد بہن
- ضیا — ایک نوجوان، ان کا دور کا رشتہ دار
- اجنبی — ایک نوجوان

منظر

بیگم سلمان کے گھر میں۔ ڈرائینگ روم۔ کمرہ جدید قسم کے فرنیچر سے آراستہ درمیان میں صوفہ سیٹ، جس پر شاہدہ شیریں، ضیا اور بیگم سلمان بیٹھے ہیں۔ دیوار پر مختلف قسم کی تصاویر۔ صرف سامنے والی دیوار بالکل خالی۔

کمرے کی مشرقی اور مغربی دیواروں میں دروازے، جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک دروازہ باہر جانے کے لئے ہے اور دوسرا گھر کے اندر جانے کے واسطے۔

سامنے والی دیوار میں ایک کھڑکی ہے جس کے شیشوں سے بجلی کی چمک دکھائی دیتی ہے اور پس منظر میں بارش اور گرج کے صوتی اثرات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ موسلا دھار بارش بھی ہو رہی ہے۔

پردہ اٹھتا ہے تو ڈرامے کے سارے کردار کمرے میں موجود ہیں۔ شاہدہ اور شیریں چلغوزے کھا رہی ہیں۔ ضیا آتشدان کے بالکل قریب بیٹھا آگ تاپ رہا ہے بیگم سلمان اونی شال اوڑھے بیٹھی ہیں۔

ضیا :۔ یہ ارشد کہاں گیا ارشد۔ ابھی تک تاش لیکر نہیں آیا۔

شیریں :۔ آتا ہی ہوگا — اور پھر تاش کھیلنا ایسا کونسا ضروری ہے!

ضیا :۔ واہ — یہ بھی اچھی کہی تم نے — جب باہر اتنی بارش ہو رہی ہو — سردی کا یہ حال ہو — اور آتشدان میں آگ خوب جل رہی ہو تو پھر تاش کھیلنا اتنا ہی ضروری ہے۔ جناب، جتنا ...... معاف کرنا اس وقت کوئی اچھی سی مثال نہیں سوجھ رہی —

شاہدہ :۔ جتنا امریکہ سے واپس آکر ہم غریبوں پر رعب ڈالنا!

(دونوں ہنستی ہیں)

ضیا :۔ یہ خواہ مخواہ کا طنز ہے — کیوں آنٹی؟ بھلا میں نے کبھی کسی پر امریکہ کا رعب ڈالنے کی کوشش کی ہے —؟ یہ اور بات ہے کہ — (کنکھیوں سے شیریں کو دیکھتے ہوئے) لوگ خود ہی مجھ سے مرعوب ہو جائیں!

شیریں :۔ کیوں شاہدہ — جب کسی کو اپنے متعلق اس قدر خوش فہمیاں ہو جائیں اور نتیجہ میں وہ عقل و ہوش کا دامن بھی چھوڑ بیٹھے تو پھر کیا کیا جائے؟

شاہدہ :۔ پھر بس ایک ہی علاج ہے۔

ضیا :۔ وہ کیا؟

شاہدہ :۔ وہ یہ کہ اگر وہ امریکہ سے آیا ہے تو اسے پھر واپس امریکہ بھیج دیا جائے!

(ارشد اندر جانے والے دروازہ سے داخل ہوتا ہے۔ عمر تقریباً چودہ برس)

ارشد :۔ (صوفے کے بازو پر بیٹھتے ہوئے) نہیں ملتے۔ ہر جگہ ڈھونڈ لیا — اس روز باجی نے پیکٹ مجھ سے لیا تھا۔

شاہدہ :۔ کیوں جھوٹ بول رہے ہو۔ میں کبھی تاش کھیلتی ہوں ۔؟

ارشد :۔ تو پھر شیریں آپا نے لیا ہوگا۔

ضیا :۔ کسی نے بھی لیا ۔ مطلب تو یہ ہے کہ فی الحال کہیں سے نہیں مل سکتے تاش ۔ اچھی خاصی خوبصورت رات کا ستیاناس ہوگیا (ذرا سوچ کر) اچھا تو پھر کچھ اور سلسلہ شروع کیا جائے کیوں آنٹی ؟

بیگم :۔ میں کیا جانوں ؟

ضیا :۔ آپ آج کچھ چپ چپ سی ہیں آنٹی ۔

شاہدہ :۔ ہاں ۔ کیا بات ہے امی !

بیگم سلمان :۔ کچھ بھی نہیں ۔ بس تمہارا خیال ہے ۔

شیریں :۔ نہیں خالہ جی ۔ کچھ نہ کچھ ہے ضرور ۔

ارشد :۔ مجھے معلوم ہے ۔ (سب اسی کی طرف دیکھتے ہیں) جب بادل آتے ہیں، موسلا دھار بارش ہوتی ہے، اور بجلی زور زور سے چمکتی ہے تو امی ہمیشہ اداس ہو جاتی ہیں ۔ انہیں بھیا یاد آتے ہیں ۔

شاہدہ :۔ (آہ بھر کر) بھیا !!

شیریں :۔ شاہدہ ۔ !

ضیا :۔ اوہ ۔ واقعی کس قدر المناک موت تھی شاہد کی ۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ جہاں اس کی موٹر سائیکل کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا وہاں سڑک پر مدتوں اس کے خون کا دھبہ نہ مٹ سکا تھا ۔ اُف !

ارشد :۔ ہاں ۔ میں نے دیکھا تھا ۔ میں نے بھیا کو بھی دیکھا تھا ان کا چہرہ بالکل کچل گیا تھا ۔ چہرہ اسقدر بدہیئت ہوگیا تھا ۔ کہ کوئی پہچان ......

بیگم سلمان :۔ ارشد ۔ ! (سسکیاں بھرنے لگتی ہے)

ضیا :۔ ایسی باتیں نہ کرو ارشد جن سے آنٹی کو تکلیف پہنچتی ہو گذرے ہوئے المناک لمحوں کا ذکر کرنا کوئی عقل کی بات ہے ۔

ارشد ؟ (تھوڑی دیر خاموشی)

شیریں :۔ اور چلغوزے نہیں ہیں، شاہدہ ؟

شاہدہ :۔ ختم ہوگئے ۔ اور لے لو ۔ میرے کمرے میں کارنس پر کچھ رکھے ہیں ۔

شیریں :۔ تم اٹھا لاؤ ارشد ۔

ارشد :۔ واہ جی واہ ۔ میں اسی کام کے لئے رہ گیا ہوں ۔ کبھی تاش تلاش کرنا پھروں کبھی بیگم صاحبہ کو چلغوزے اٹھا کر دوں ۔ اوں ہوں ۔ میں نہیں اٹھ سکتا اب ۔

ضیا :۔ شاباش ۔ اب بات ہوئی نا ۔ اب معلوم ہوگا ان خاتون کو کہ سردی میں آتشدان کے قریب سے اٹھ کر جانا کس قدر تکلیف دہ ہوتا ہے ۔ ویسے سچ کہتا ہوں، شیریں ۔ تھوڑی دیر کے لئے سردی میں جانے کے بعد جب واپس آؤ گی بہت اچھا لگے گا ۔ آتشدان کی آگ کا لطف تو یہی ہے ۔

شیریں :۔ تو پھر آپ ہی حاصل کر لیں ذرا یہ لطف ! (ہنستی ہے)

ضیا :۔ جی نہیں شکریہ ۔ بیگم سلمان کی طرف دیکھ کر) آنٹی تو اسقدر چپ چپ ہیں کہ کسی بات پر ہنسی تک نہیں ۔ اچھا ٹھہریئے ۔ میں ایک بہت مزیدار کہانی سناتا ہوں ۔ آپ بھی سنئے ۔ آنٹی بڑی دلچسپ کہانی ہے ۔ بالکل سچی کہانی ۔

ارشد :۔ ہاں شروع کیجئے آپ ۔

ضیا :۔ یہ واقعہ امریکہ میں میرے ایک دوست پر گذرا تھا ۔ ہوا یوں کہ ایک رات وہ اور اس کے کچھ اور رشتہ دار اپنے کمرے میں بیٹھے تھے کہ اس کا باپ آگیا اور وہ سب اس بڈھے کو اسطرح اپنے سامنے دیکھ کر ایکدم چیخ پڑے ! ۔ جانتے ہو کیوں ؟

شاہدہ :۔ کیوں ؟

ضیاء :۔ اس لئے کہ وہ بڈھا دو سال پہلے مر چکا تھا اور انہوں نے خود اسے اپنے ہاتھ سے قبر میں دفنا دیا تھا !

بیگم سلمان :۔ یعنی مر چکا تھا ؟

ضیا :۔ جی ہاں آنٹی بالکل ! ۔ اور اب مردہ زندہ ہوگیا اور اپنے اسی گھر میں آگیا جہاں سے دو سال قبل اس کا جنازہ نکلا تھا ! کمال ہے !

ارشد :۔ مگر کیسے !

ضیا :۔ ہاں یہی تو وہ دلچسپ کہانی ہے ۔

شیریں :۔ ذرا ایک منٹ ٹھہر جایئے ۔ میں شاہدہ کے کمرے سے چلغوزے تو لے آؤں ۔

(اٹھ کر جانے لگتی ہے)

بیگم :۔ ذرا جلدی سے آجاؤ۔ قصہ مزے کا معلوم ہوتا ہے۔
شیریں :۔ بس ابھی آئی ــــ دو منٹ میں۔

(شیریں اندر جانے والے دروازے کے قریب پہنچتی ہے کہ اچانک اسٹیج پر اندھیرا ہو جاتا ہے)

شاہدہ :۔ اوہ۔ معلوم ہوتا ہے بجلی چلی گئی۔
ضیا :۔ ابھی لوٹ آؤ شیریں۔ اندھیرے میں تم چلغوزے نہیں ڈھونڈ سکتیں۔

(چند لمحے اندھیرا رہتا ہے۔ جب روشنی واپس آتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ سارے کردار اپنی اپنی نشستوں پر موجود ہیں اور ایک نوجوان لانبا کوٹ پہنے اور کانوں سے مفلر لپیٹے ان کے سامنے کھڑا ہے۔ اس کا چہرہ تقریباً چھپا ہوا ہے۔ مفلر اس انداز سے لپیٹا ہے کہ صرف آنکھیں اور ماتھا نظر آرہا ہے)

اجنبی :۔ اگر اجازت ہو تو میں بھی بیٹھ جاؤں۔

(سب حیرت سے اسے دیکھ رہے ہیں)

ضیا :۔ آپ کون ہیں؟
شیریں :۔ یہاں کیسے آئے؟
ارشد :۔ اندر آئے کس وقت؟
شاہدہ :۔ آئے کدھر سے؟
اجنبی :۔ (مسکرا کر) میں نے ایک سوال کیا۔ اس کا کوئی جواب نہ ملا ــــ اور اب ایک ساتھ اتنے آدمی مجھ سے سوال کر رہے ہیں۔ اکیلا ان سب کا جواب کیسے دوں؟
ضیا :۔ (سختی سے) تم کون ہو؟
اجنبی :۔ ناراض نہ ہوں ــــ میں ایک مسافر ہوں۔ بارش بہت تیز تھی۔ میری موٹر سائیکل بگڑ گئی۔ سڑک پر سے گذر رہا تھا۔ سوچا چند لمحے کسی سائبان کے نیچے گزار لوں۔ تو یہاں چلا آیا۔ آپ کو اعتراض ہو تو واپس چلا جاؤں۔
بیگم سلطان :۔ بیٹھ جائیے۔
اجنبی :۔ شکریہ ــــ آپ سب مجھ سے خوفزدہ کیوں ہیں۔ میں بھی آپ ہی کی طرح کا ایک انسان ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں آپ میں سے نہیں ہوں۔
ضیا :۔ کیا مطلب؟
اجنبی :۔ (بیٹھتے ہوئے) ویسے کچھ بھی نہیں ــــ میرا مطلب صرف یہ تھا کہ آپ کے لئے میں اجنبی ہوں اس لئے آپ کی باتوں میں مخل ہو رہا ہوں۔ لیکن کیا کیا جائے بعض اوقات مجبوریاں ہی کچھ ایسی ہوتی ہیں کہ دخل دینا پڑتا ہے۔
شاہدہ :۔ مگر آپ کہاں سے آئے ہیں؟
اجنبی :۔ بہت دور سے۔
اجنبی :۔ بہت دور سے۔
شاہدہ :۔ یعنی پھر بھی؟
اجنبی :۔ مجھے جگہ کا نام بتانے کی اجازت نہیں ہے۔
ضیا :۔ آپ کوئی جاسوس ہیں؟
اجنبی :۔ نہیں ــــ (ہنستا ہے) یہ خیال آپ کو کیوں ہوا؟!
ضیا :۔ آپ کی پُراسرار باتوں سے۔ آپ بغیر اجازت اس طرح غیر گھر میں گھس آئے۔
اجنبی :۔ (زیرلب) غیر گھر!
ضیا :۔ اور اب نہ آپ اپنا نام بتاتے ہیں نہ اپنے شہر کا۔
اجنبی :۔ نام میں کیا رکھا ہے۔ آپ لوگ مجھے جس نام سے بھی چاہیں یاد کرلیں۔ (کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے) ایسے موسم میں یہ کمرہ کس قدر آرام دہ ہے۔ تصویریں بڑی عمدہ ہیں ــــ اس سامنے والی دیوار پر بھی ایک تصویر ہونا چاہیے۔
شیریں :۔ سامنے والی دیوار پر؟
ارشد :۔ سامنے والی دیوار پر ایک تصویر تھی۔
اجنبی :۔ پھر کیا ہوئی ــــ؟ ٹوٹ گئی؟
ارشد :۔ نہیں ہم نے اتار کر رکھ دی ــــ
اجنبی :۔ کیوں؟
ارشد :۔ وہ ہمارے بھیّا کی تصویر تھی۔ بھیّا مر گئے ــــ
اجنبی :۔ اور آپ لوگوں نے ان کی تصویر اتار دی؟
شاہدہ :۔ اسے دیکھ کر ہم لوگ ہر وقت روتے تھے ہمیں ہر وقت وہ یاد آتے تھے۔
ضیا :۔ یہ ذکر نہ کرو۔ آنٹی کو اس بات سے دکھ ہوتا ہے۔
اجنبی :۔ معاف کیجئے گا مجھے علم نہ تھا۔ تو آپ ان کے بھائی

نہیں ہیں؟

شیریں :۔ نہیں ۔ یہ ان کے بھائی نہیں ہیں۔

شاہدہ :۔ یہ شیریں ہیں ۔ میری کزن اور (ضیا کی طرف اشارہ کرکے) ان کی منگیتر۔

اجنبی :۔ بہت خوب ۔ اور یہ؟

شاہدہ :۔ یہ میرا چھوٹا بھائی ہے ۔ ارشد ۔ میرے ایک بڑے بھائی بھی تھے جو آج سے دو سال پہلے موٹر سائیکل کے ایکسیڈنٹ ......

اجنبی :۔ ذکر نہ کیجئے ۔ آپ کی امی کو دکھ ہوتا ہے۔

بیگم سلمان :۔ نہیں ۔ مجھے سکون ملتا ہے۔

اجنبی :۔ بہت خوب ۔ یہ حادثہ کب ہوا تھا؟

شاہدہ :۔ آج سے تقریباً دو سال پہلے۔

اجنبی :۔ انہیں دنوں میں؟ کیا تاریخ تھی؟

شاہدہ :۔ شاید دسمبر کا مہینہ تھا۔

شیریں :۔ نہیں جنوری کی سات تاریخ تھی غالباً ۔

ارشد :۔ سات نہیں نو تھی۔

شاہدہ :۔ کچھ یاد نہیں رہا ٹھیک سے۔

ضیا :۔ میں پچھلے سال کب واپس آیا تھا امریکہ سے؟

شیریں :۔ دسمبر کی ۲۲ کو

ضیا :۔ بس اس کے پورے پندرہ دن بعد پہلی برسی منائی گئی تھی شاہد کی ۔ مجھے یاد ہے۔

اجنبی :۔ میں اسے جانتا تھا؟

بیگم سلمان :۔ (اشتیاق سے) شاہد کو؟

اجنبی :۔ ہاں ۔ اس روز وہ مجھ سے مل کر ہی واپس آ رہا تھا ۔ جب بڑی سڑک پر اس کی موٹر سائیکل ٹرک سے ٹکرائی ۔ وہ میرا بہت پیارا دوست تھا۔

ارشد :۔ لیکن آپ کبھی بھیا کے ساتھ ہمارے گھر نہیں آئے ۔

اجنبی :۔ وہ خود میرے گھر آیا کرتا تھا۔

شاہدہ :۔ آپ کا گھر کہاں ہے؟

اجنبی :۔ اب تو کہیں بھی نہیں ہے پہلے تھا ۔!

شیریں :۔ پہلے؟ مگر کب؟

اجنبی :۔ دو سال پہلے۔

شاہدہ :۔ پھر ۔ آپ نے وہ گھر چھوڑ دیا؟

اجنبی :۔ ہاں میں دوسری جگہ چلا گیا ۔ وہ گھر چھوڑ دیا میں نے ۔ اور دو سال بعد واپس اسی گھر میں گیا تو وہ گھر بدل چکا تھا۔

شیریں :۔ بدل چکا تھا؟

اجنبی :۔ ہاں ۔ گھر کا سارا سامان ۔ در و دیوار ۔ خاندان کے افراد ۔ میری ایک منگیتر تھی۔

شاہدہ :۔ (شیریں سے) کوئی عشقیہ کہانی معلوم ہوتی ہے

اجنبی :۔ نہیں ۔ آپ کو مایوسی ہوگی ۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے ۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ میری غیر موجودگی میں میری منگیتر کی منگنی کسی اور سے ہو گئی۔

شیریں :۔ کس قدر ظلم ہے یہ؟

اجنبی :۔ اور جب میں اپنے گھر میں داخل ہوا تو میرے بھائی اور میری بہن تک نے مجھے نہیں پہچانا، ہے نا تعجب کی بات!

شاہدہ :۔ بھائی اور بہن نے بھی!

اجنبی :۔ ہاں ۔ وہ مجھے بالکل فراموش کر چکے تھے انہیں یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ میں کب ان کے پاس سے گیا تھا ۔ صرف میری ماں کی تنہا ذات تھی جو مجھے پہچان سکی۔

ارشد :۔ اوہ! کس قدر افسوس ناک ہے ۔

ضیا :۔ آپ نے انہیں اپنا چہرہ دکھایا ہی نہیں ہوگا ۔ اور اسی طرح کی الٹی سیدھی باتیں ان سے کی ہوں گی ۔ پھر وہ آخر پہچانتے کس طرح ۔

اجنبی :۔ یہ بھی ٹھیک ہے ۔ لیکن میں جان بوجھ کر اپنا چہرہ کسی کو نہیں دکھاتا ۔ اس لئے لوگ میرا چہرہ دیکھ کر ڈر جاتے ہیں

ضیا :۔ کیوں؟

اجنبی :۔ بہت ہیبتناک چہرہ ہے میرا ۔ دیکھیں گے آپ لوگ

(سب خاموش ہیں)

بیگم سلمان :۔ ۔ ہاں

اجنبی :۔ (شیریں سے) آپ یہاں سے چلی جائیں ۔ آپ بہت دل معلوم ہوتی ہیں شاید آپ میرا چہرہ نہ دیکھ سکیں

(شیریں بغیر کچھ کہے اٹھ کر جانے لگتی ہے۔ جب تک وہ اندر جانے والے دروازے تک پہنچتی ہے۔ اجنبی اپنے چہرے سے مفلر ہٹا چکا ہے۔ وہ بڑا بد ہیئت ہے۔ سب اسے دیکھ کر ایک دم چیخ پڑتے ہیں۔ "شاہد" "بھیا"۔
اسٹیج پر اچانک اندھیرا ہو جاتا ہے)

ضیا :۔ ابھی نہ جاؤ شیریں۔
(ایکدم پھر روشنی ہو جاتی ہے۔ شیریں دروازہ کے پاس کھڑی ہے۔ سارے کردار اپنی اپنی نشستوں پر موجود ہیں۔ صرف اجنبی غائب ہے)

ضیا :۔ اب لے آؤ جلدی سے جا کر چلغوزے۔ ورنہ میں کہانی سنانا شروع کر دوں گا۔

شیریں :۔ کس قدر بے صبر ہو۔ ابھی آتی ہوں دو منٹ میں — کہانی شروع نہ کرنا ابھی (وہ باہر نکل جاتی ہے)

شاہدہ :۔ (بیگم سلمان کی طرف دیکھتے ہوئے جو بالکل ساکت بیٹھی ہیں) امّی!

ضیا :۔ آپ کو کیا ہوا ہے آنٹی۔

بیگم سلمان :۔ (تجسس سے) وہ کہاں گیا؟

سب :۔ کون؟؟

بیگم سلمان :۔ شاہد ——— !

شاہدہ اور ارشد :۔ — بھیا؟

ضیا :۔ شاہد؟ — آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں آنٹی — !

بیگم سلمان :۔ وہ ابھی یہاں تھا۔

:۔ یہاں؟؟

بیگم سلمان :۔ ہاں۔ ابھی وہ آیا تھا۔ وہ اس سامنے والے صوفے پر بیٹھا ہم سب سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ یہاں تھا — اس صوفہ پر۔

:۔ آپ کو کیا ہوا ہے آنٹی — کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ یہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔

:۔ صرف ایک منٹ کے لئے بجلی چلی گئی تھی۔

:۔ شاید آپ اندھیرے میں ڈر گئیں امّی!

:۔ آپ کو یاد نہیں امّی میں اپنے ایک دوست کی کہانی سنا رہا تھا کہ شیریں نے کہا تھا میں چلغوزے لے آؤں وہ جانے کے لئے اٹھی ہی تھی کہ روشنی چلی گئی اور صرف اتنی دیر کے لئے کہ وہ واپس آ کر اپنے صوفے پر بیٹھنا ہی چاہتی تھی کہ پھر روشنی واپس آ گئی اور وہ چلغوزے لینے چلی گئی۔

شاہدہ :۔ امی کو اندھیرے میں کوئی ایسا خیال آ گیا جس سے وہ سہم گئیں۔

ارشد :۔ آپ کہانی شروع کیجئے ضیا بھیا۔ امّی کا دل بہلے گا — لو وہ شیریں آپا بھی آ گئیں۔

شیریں :۔ (داخل ہوتے ہوئے) شروع تو نہیں کی ابھی کہانی — ارے آپ کو کیا ہوا ہے خالہ جی۔ آپ کا چہرہ بالکل پیلا پڑ گیا ہے۔

بیگم سلمان :۔ کچھ بھی — نہیں — کچھ نہیں۔ تم کہانی شروع کرو۔

ضیا :۔ ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ وہ سب اس مُردہ کو دیکھ کر ڈر گئے اور اس مردہ آدمی نے کہا — "ہم مر کر کہیں اور نہیں جاتے اپنے ہی گھر کے دروازوں کے سامنے بھٹکتے رہتے ہیں —" اور پھر وہ بڈھا اٹھ کھڑا ہوا۔ اور ہوا میں تحلیل ہو گیا! — جب وہ آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو گیا تو سب اس واقعہ کو بھول گئے، سوائے میرے دوست کے — جو اس بوڑھے کا اکلوتا بیٹا تھا۔

(خاموشی)

ارشد شیریں :۔ (بیک وقت) اس کا کیا مطلب ہوا؟

بیگم سلمان :۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ شاہد ابھی یہاں آیا تھا۔ یہ میرا وہم یا خیال نہ تھا وہ سچ مچ شاہد ہی تھا — میرا شاہد! میرا بچہ! — میرا ..... لال!

(بیگم سلمان روتے ہوئے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیتی ہیں۔ سارے کردار بڑی ہمدردی سے انہیں دیکھ رہے ہیں۔

پردہ آہستہ آہستہ گر جاتا ہے ———

بنگلہ افسانہ

"آٹھ تولے سونا!"

عبدالغفار چودھری
مترجمہ: احمد سعدی

دونوں میں یوں تو بہت دنوں سے جھگڑا اچل رہا تھا، مگر ابھی تھوڑے دنوں سے، جب سے ان کی ساس کا انتقال ہوا تھا، یہ جھگڑا اور بھی بڑھ گیا تھا۔

بڑی بہو شریفہ کا کہنا تھا کہ اس کی ساس نے مرتے وقت اپنے زیورات بکس چپ چاپ اپنی چھوٹی بہو کو دے دیا تھا، گو کہ مرتے وقت اس بڑھیا کے ہوش و حواس ٹھکانے نہیں تھے، لیکن کیا چھوٹی بہو کو یہ مناسب تھا کہ وہ بڑی بہو کے حق کو یوں غصب کر بیٹھے!

چھوٹی بہو، 'مشتری'، اس شکایت کا کوئی جواب نہیں دیتی تھی۔ چونکہ ساس کے مرتے وقت وہی رات دن اس کے قریب رہتی تھی اور اس طرح خدمت گزاری اور دیکھ بھال کا اسے زیادہ موقع ملا تھا۔ اور ساس کے مرنے کے فوراً بعد بھی آنچل سے اپنی آنکھوں کو صاف کر کے اسی نے گھر کی تمام ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں۔ ساس بھی اپنے چھوٹے بیٹے کی بہو کو بہت زیادہ چاہتی تھی، لیکن چھوٹی بہو ساس کے مرنے کے بعد نہ تو چیخ چیخ کر روئی اور نہ کسی آدمی کے سامنے اپنی آنکھوں سے آنسو ہی بہائے۔ بڑی بُری سی بات تھی، لیکن جو بوڑھیاں چھوٹی بہو کے خلاف نہیں تھیں، انھوں نے ہمدردی جتاتے ہوئے کہا تھا ــــ "آہ! بچاری غم کے مارے پتھر بن گئی ہے۔"

اُس کے جواب میں بڑی بہو کے ساتھ میکے سے آئی ہوئی باندی سہاگی نے اپنے لب و لہجہ میں تیزی و تلخی پیدا کرتے ہوئے سب کی طرف دیکھ کر کہا تھا، "غم سے پتھر بن گئی ہے! چھوٹی بہو کے پاس دل ہے کہاں؟ اس کا دل تو پتھر ہے پتھر۔"

چھوٹی بہو نے اس کا بھی کوئی جواب نہ دیا تھا۔ اور اس کی اسی خاموشی نے بڑی بہو کے شک کو اور بڑھا دیا تھا، اس کے نتیجے میں دو دن کے بعد ہی بڑے بھائی یٰسین، چھوٹے بھائی کے کمرے میں آئے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد انہوں نے کہا ــــ "کو تھا ٹا کی شوق رے۔" (ارے کیا یہ سچ ہے؟)

"کون کو تھا؟" (کیا بات سچ ہے!) یوسف نے پوچھا۔

"امّاں مرتے وقت بے ہوشی کے عالم میں اپنے زیورات چھوٹی بہو کو دے گئی ہیں؟"

"اگر دے گئی ہیں تو میں کیا کروں؟" یوسف نے کہا۔

یٰسین اپنی آواز میں محبت کا رس ٹپکا کر بولے ــــ "ایسی بات نہ کرو، تم کیا کوئی غیر ہو؟ لے لو، جو بھی زیورات ہیں لے لو، مگر برادری میں چھوٹی بہو کے نام پر کوئی بات نہ اٹھے اس لئے کہہ رہا تھا۔"

"بولو کی، کی کو تھا اٹھبے؟" (آپ کہہ کیا رہے ہیں؟ کیا بات پیدا ہو گئی؟) یوسف نے حیرت سے پوچھا۔

اس کی سادگی پر یٰسین پھر ہنسا اور کہنے لگا ــــ "ہو گی کیا معنی، ہو چکی ہے۔ لوگ ابھی سے چہ میگوئیاں کر رہے ہیں کہ چھوٹی بہو نے ساس کی نقدی اور اس کے زیورات کے لئے ہی اس کی خدمت گزاری کا ڈھونگ رچایا تھا۔ جوں ہی میرے کانوں میں پڑی، میں دوڑا ہوا تمہارے پاس آیا۔ گھر کے کسی بھی آدمی کے متعلق اس قسم کی ذلیل بات کہی جائے تو تم اسے برداشت کر لوگے، مجھ سے تو برداشت نہیں ہوتی۔"

یوسف تھوڑی دیر تک خاموش رہا، پھر بولا ــــ "اماں کے پاس کتنی نقدی تھی، کیا کیا زیورات تھے یا نہیں تھے، یہ کیا تمہیں لوگوں کو ہے؟"

"ہاں علم تو ہے، مگر جو کچھ انہوں نے بتایا تھا وہ یہی تھا کہ ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ لیکن عورت کمزور ہوتی ہے خواہ وہ تمہاری ماں کی ہو یا دلّی کی شہزادی رضیہ کی ہو۔ بڑی پیچیدا رــــ نہیں، نہیں کر کے بھی انہوں

ان کیا کچھ جمع کر رکھا تھا۔ اس کا پتہ لگانا میرے اور تمہارے بس کی
ت تو نہیں"۔

" لیکن بھابی؟ ان کو تو جاننا چاہئے تھا" یوسف نے
یرے سے کہا۔

یٰسین ہنسا ــــ" اسے تو بہت کچھ جاننا چاہئے تھا،
ن وہ تو پانچ بچوں کی ماں ہے، اس عمر میں اسے گہنے زیور کی
یدگی کہاں؟ اسے شوق بھی کب ہے؟ تم سمجھ رہے ہو کہ تمہاری بھابی
مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے، ارے نہیں، انہوں نے جب یہ
سنی تو کہا، وہ لوگ لینا چاہتے ہیں تو لے لیں، اس کے لئے میں
تکرار کرنا نہیں چاہتی، مشتری میری چھوٹی بہن ہے، کوئی
نہیں!"

یوسف خاموش ہو گیا، اس کی طرف گھورتے ہوئے یٰسین
ے لہجے میں مسکراتے ہوئے بولا ــــ" تو پھر آج ہی کال فرازی
ے دوں، کیا کہتے ہو؟ اس کے سامنے کل ہی بکس....."

یوسف نے فوراً قطع کلام کر کے پوچھا ــــ" کیشر یا کشور؟
ر کا بکس؟)

یٰسین نے بیزاری ظاہر کرتے ہوئے کہا ــــ" ایک ہی بات
کہہ لو، گٹھری کہو، پوٹلی کہو، جو کچھ بھی ہو، فرازی آئے تو
سامنے بانٹ لینا، پھر لوگ اس کا چرچا نہیں کریں گے"!

یوسف تھوڑی دیر خاموش رہا پھر دھیرے سے بولا ــــ" لیکن
ہلے چھوٹی بہو سے بھی تو پوچھنا ہوگا، اُسے سچ مچ کچھ ملا
نہیں، ورنہ خواہ مخواہ ثالث بلا کر....."

یٰسین نے زور سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا ــــ" بات
نتے ہو؟ جس طرح ہوا نہ چلے تو دریا میں لہریں پیدا
، اسی طرح اگر کچھ نہ ہوتا تو لوگوں میں اس کا چرچا بھی
لئے میں کہہ رہا تھا کہ اگر ہم دونوں بھائی مل کر حل
دیتے تو خواہ مخواہ یہ سب جھگڑا نہ ہوتا۔ پھر بھی
ہو تو ٹھیک ہی ہے، چھوٹی بہو سے پوچھ کر
ہوگا تو فرازی کو کل بلا لوں گا" اتنا کہہ کر تختہ
لفڑاؤں سے ٹھک ٹھک کی آواز پیدا کرتے
نیچے اُتر گیا۔

اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی شریفہ نے پوچھا۔
"کیا بنا؟"

یٰسین ہنسا ــــ" کیا تم سمجھتی ہو کہ وہ آسانی سے
قبول کرے گا؟ مگر ہاں، چارہ ڈال آیا ہوں"۔

" کیسا چارہ؟"

" تم کو ابھی کیا بتاؤں، کام بن جائے تو سننا"۔

شریفہ تھوڑی دیر تک خاموش رہی، پھر ٹھنڈی سانس
لے کر بولی ــــ" تمہاری چھوٹی بہو اپنے خاندان کی لڑکی نہیں ہے"

یٰسین نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ــــ" چپ رہو
چپ رہو، اسی کمرے سے ملا ہوا ان کا کمرہ ہے۔ وہ لوگ
سن لیں گے"۔

شریفہ نے جھنجھلا کر کہا ــــ" سنا کریں، میں کیا غلط
کہہ رہی ہوں؟ یہ بات تو سبھی جانتے ہیں، مشتری ہمارے خاندان
کی لڑکی نہیں ہے۔ مالی حالت خراب ہو گئی تو تم نے ایسے خاندان
میں جا کر رشتہ کیا ہے....."

یٰسین نے اُسے چپ کراتے ہوئے دھمکی آمیز لہجہ میں
کہا ــــ" تم چپ رہو، پہلے زیور مل جانے دو، اس کے بعد
جتنا جی چاہے چیختی رہنا"!

شریفہ خاموش ہو گئی۔

بادر کے پنکھ کی طرح سیاہ رات کا سایہ پورے گاؤں
پر پھیلا ہوا تھا، لالٹین کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی میں مشتری بستر
پر لیٹی ہوئی گل بکاؤلی کا قصہ پڑھ رہی تھی، یکایک وہ کچھ
سوچ کر اٹھ بیٹھی اور بستر سے اتر کر دروازے کا پٹ بھیڑ دیا اور
غور سے کان لگا کر سننے لگی کہ آس پاس کسی کی آواز تو سنائی
نہیں دے رہی ہے، یوسف کمرے میں نہیں تھا ــــ وہ
ملک پور ہاٹ گیا ہوا تھا۔ اسی لئے ہر طرح سے اطمینان کر لینے
کے بعد اس نے ٹین کے ایک بڑے سے بکس کو کھولا ــــ
پہلے اس کے اندر سے سرمہ دانی، عطر کی شیشی، پھولدار
کنارے والی پرانی ساڑیاں نکلیں، پھر اس کی شادی میں
ملی ہوئی دو ساڑیاں، اور دوسرے کپڑے اور دو چار چھوٹی
موٹی چیزوں کے ساتھ اپنے گہنے نکالے جو بہت معمولی تھے۔

پھر آئینہ، کنگھی اور آلتا[1] نکال کر اس نے ایک طرف ہٹا کر رکھ دیا۔ اس کے بعد اس نے بکس کے ایک دم نیچے سے بہت سے کپڑوں میں لپٹی ہوئی چھوٹی سی ایک زردہ کی ڈبیہ نکالی، جس کے بیچ کا حصہ ابھرا ہوا تھا، ابھرے ہوئے حصہ کو دباتے ہی ڈبیہ دو حصوں میں بٹ کر کھل جاتی تھی، لیکن بند کرنے کے بعد پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ وہ پتلی سی لکیر کہاں پر ہے، ڈبیہ کے ایک طرف ایک کھدی ہوئی تصویر تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی رقص کرتی ہوئی پری اس ڈبیہ میں مقید کر دی گئی ہو۔

مشتری دیر تک ڈبیہ کو الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی، بڑی خوبصورت ڈبیہ تھی، کتنے تولے سونا ہوگا اس میں؟ اس نے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ یہ ہنگامہ ختم ہو جائے تو وہ کسی سنار کو بلا کر دکھائے گی، جو کچھ بھی ہو مگر وہ اس ڈبیہ کو تڑوا کر کوئی دوسری چیز نہیں بنوائے گی۔ ساس مرتے وقت خود اپنے ہاتھ سے اسے یہ ڈبیہ دے گئی تھی۔ اور کہا تھا ــــ "یہ میری یادگار ہے، اسے حفاظت سے میری نشانی سمجھ کر رکھنا"۔

اس کی ساس نے کتنی مرتبہ اسے اس ڈبیہ کی کہانی سنائی تھی، ان کے شوہر یعنی مشتری کے سسر کو پان کھانے کا بہت شوق تھا۔ ایک دفعہ وہ حج کر کے واپس آ رہے تھے تو بمبئی میں یہ ڈبیہ خریدی تھی، قوام کی شیشی کے ساتھ وہ اس میں زردہ بھی رکھتے تھے۔

مشتری دیر تک ڈبیہ کو الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی، اس کے بعد وہ اسے بند کر کے بکس میں رکھنے ہی والی تھی کہ بھڑا ہوا دروازہ کھل گیا اور سبزی بھری ہوئی ٹوکری کمرے میں رکھتے ہوئے یوسف نے پوچھا ــــ " او ٹا کی؟" (کیا ہے وہ؟)

" اماں نے دیا تھا۔ ان کے زردہ رکھنے کی ڈبیہ ہے"۔

"یوسف نے لالٹین کی دھیمی روشنی میں اسے تھوڑی دیر تک الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر دھیرے سے کہا۔ "پیتل کی ہے۔ اوپر سے سونے کا ملمع کیا ہوا ہے، اور بھی کچھ ملا؟"

" نا "

"چھی، چھی پیتل کی اس ڈبیہ کے ہے۔ اس ڈبیہ کی بات تم نے پہلے کیوں کہ تمہیں کچھ بھی نہیں ملا ہے"۔

مشتری نے جواب دینے کی

یوسف نے چوکی کے نیچے سے

چبوترے پر بیٹھ کر پاؤں دھونے کے بعد بھیگے ہوئے انگوچھے سے اپنا بچھا کر بیٹھ گیا، مشتری بھی پنکھا لے کر بیٹھ گئی۔

یوسف لالٹین کی مدھم روشنی کے مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھتا ر نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا؟

" آج بتانے ہی کے لئے خیال تھا سونے کی ہے"۔

یوسف ہنسنے لگا ــــ "چھی ہو کر تم سونا بھی نہیں پہچانتیں؟"

" سکدار تو نیچ خاندان ہوتا

" ان کے گھر کی لڑکیوں نے کبھی سونا

اگر میں تعلقدار خاندان کی لڑکی

یوسف نے دانتوں تلے

کیا کہہ رہی ہو تم، میں نے کبھی تم

میں ایسی ویسی کوئی بات کہی ہے

مشتری نے دھیرے سے

لیکن جو کہنے والے ہیں، وہ برابر

خاندان کی لڑکی، تمہاری بھابی، یہ

لئے میں نے سوچا ....." مشتر

ہی چھوڑ کر خاموش ہو گئی۔

یوسف تھوڑی دیر چپ

پچھواڑے آم کے باغ میں زور

اٹھے۔ یوسف نے پوچھا ــــ

بتی، بتاؤ نا۔

---

[1]: مہندی کی جگہ ایک سرخ قسم کا رنگ جو پیروں کو لگاتے ہیں (مدیر)

ان کیا کچھ جمع کر رکھا ہے نظروں سے ایک بار شوہر کی طرف اور پھر
ت تو نہیں"۔ ہرہ کی طرف دیکھا، کہنے لگی ـــ" میں اگر
" لیکن بھابی؟ ہوں تو کیا ہوا، لیکن وہ لڑکی ـــ وہ
میرے سے کہا۔ کی ہے، اس لئے میں نے سوچا تھا، اس
یسین ہنسا ہنس گی، جب وہ جوان ہوگی۔۔؟ مشتری
ن وہ تو پانچ بچوں کی، اس کا چہرہ یکایک محبت، فخر اور ممتا
بدگی کہاں؟ اسے شو۔
مجھے تمہارے پاس بازار جانے کے راستے پر تلسی سنار کے ساتھ
سنی تو کہا، وہ لوگ لبسی کی ایک آنکھ چھوٹی تھی اور ناک کا
انکار کرنا نہیں چاہتا لاک تھا اتنا ہی مریل بھی تھا۔ ملک پور
نہیں!" نام سے مشہور تھا۔ یوسف کو دیکھتے ہی
یوسف خاموش یا ـــ" آداب چھوٹو میاں، کے موں
ے لہجے میں مسکرا ـ آداب، مزاج کیسے ہیں؟
ے دول کیا کہتے ہو ہاں جا رہے ہو؟"
یوسف نے فوراً کوئی جواب نہ دیا، مگر قریب آ کر سرگوشی
ہر کا بکس؟) ب بلا رہے ہیں، بتایئے؟
یسین نے بیزاری سے پوچھا ـ "کس لئے؟"
کہہ لو، گٹھری کہو، ہیں ہنسا اور کہنے لگا ـــ" مثل مشہور
سامنے بانٹ لینا، پیام آتا ہے۔ تین پشت تک کے رشتہ دار
یوسف تھوڑی دیر، اتنا بھی اعتبار نہیں کرتے چھوٹے میاں"
بلے چھوٹی بہو سے بات نہیں سمجھ سکا، اور بولا ـــ" تم
نہیں، ورنہ خواہ مخواہ سمجھ سکا۔"
یسین نے زور سے ہنس پڑا، اور بولا ـــ" جو بات ملک پور
نتے ہو، جس طرح اشارے سے سمجھ جاتے ہیں وہ
اسی طرح اگر کہیے۔ چھوٹے میاں مجھے تو حیرت ہے"۔
لئے میں کہہ رہا کھائی سے کہا ـــ" فضول بات چھوڑ
دیتے تو خواہ مخو
ہو تو ٹھیک، کو دھوکہ دے سکتا ہوں چھوٹے میاں"۔
ہو گا تو فرازی" یہ بات کسی کو بھی معلوم نہ ہو گی، اس
لڑاؤں سے!
نیچے اتر گیا۔ اٹھانے کا رواج (مدیر)

کے علاوہ جو میری روزی کا ذریعہ ہے، اس کے متعلق ادھر ادھر میں بات پھیلا سکتا ہوں بھلا؟"

یوسف کو یکایک خیال آگیا، اس نے کہا ـــ" ادھوا تم بھی وہ افواہ سن چکے ہو کہ میری ماں کا تمام زیور مجھے مل گیا ہے۔ یہی بات ہے نا؟"

اس دفعہ تلسی نے حیران ہو کر کہا ـــ" افواہ کیوں ہوگی، سبھی لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ سچ ہے"۔ اس کے بعد اس نے اپنی آواز اور بھی دھیمی کر کے کہا ـــ" پھر بھی میں سمجھ رہا ہوں جیسا زمانہ آگیا ہے کہ سونے کی بات پانچ آدمیوں کو جلدی بتانے کی نہیں ہوتی ہے، لیکن مجھے تو بلانا ہی پڑے گا چھوٹو میاں"۔

یوسف نے کہا ـــ" اچھی بات ہے، جب ضرورت پڑے گی تو بلالوں گا، اب مجھے جانے دو"۔

تلسی کچھ چپ ہو گیا، گلا صاف کرتے ہوئے بولا ـ" میرے دل کو بڑی تکلیف پہنچی ہے چھوٹو میاں، بڑے میاں بھی مجھے اتنا بے بھروسہ نہیں سمجھتے۔ اسی دن انہوں نے دو اشرفی تڑانے کے لئے دی تھی، مگر میں نے یہ بات کسی کو بتائی ہے؟ میں نے آپ تک کو نہیں بتایا؟"

" کیا کہہ رہے ہو" یوسف نے حیرت سے پوچھا ـــ
" اشرفی؟"

" ہاں، سونے کی مہریں تھیں، شاید اکبر بادشاہ کے زمانے کی تھیں"۔

یوسف بازار جانے کی بجائے تیزی سے گھر کی طرف لوٹ گیا۔

یسین کے کمرے کے قریب سے گزرتے وقت کامل فرازی نے آواز دے کر اسے بلا لیا ـــ" بابا یوسف"

یوسف لمحہ بھر کے لئے رک گیا، اور بولا ـــ" اس وقت ذرا فرصت نہیں ہے چچا، پھر کسی وقت ملوں گا"۔

فرازی ہنسنے لگے ـــ" دنیا، دنیا"۔ پھر بولے ـ" میں اپنے کسی کام سے نہیں بلا رہا ہوں۔ تمہاری اماں کے متعلق ایک بات کہنے کے لئے بلا رہا ہوں"۔

یوسف بڑے بھائی کی دہلیز پر آگیا۔ یسین فرازی کے

لئے چلم میں تمباکو سجا رہے تھے، چھوٹے بھائی کو دیکھ کر انھوں نے ایک پیڑھی اس کی طرف سرکا دی۔

فرازی نے کہا ــــ شاید تم سوچتے ہو گے کہ چیزوں کی تقسیم کے لئے لیسین نے مجھے بلا بھیجا ہے، نہیں بیٹے نہیں، میں اپنی غرض سے آیا ہوں، لیسین کو پہلے ہی بتا چکا ہوں، تم بھی سن لو۔"

یوسف نے کہا ــــ " اچھی بات ہے، کہئے۔"

لیسین میاں نے حقہ پر چلم رکھ کر نے فرازی کی طرف بڑھا دی ــــ " لیجئے۔"

فرازی پہلا کش لیتے ہی کھانسنے لگے، پھر بولے ــــ" کل رات ایک عجب خواب دیکھا بیٹے، وتر کی نماز ختم کر کے مصلے پر بیٹھا ہوا وظیفہ پڑھ رہا تھا کہ تکان غالب آگئی اور میں وہیں لیٹ گیا اور میری آنکھ لگ گئی۔ مجھے کچھ پتہ ہی نہ چلا کہ کب سو گیا۔ دیکھا کہ تمہاری ماں میرے سامنے کھڑی ہے۔ اس نیک بندی کے سارے بدن سے یوں نور پھوٹ رہا تھا جیسے بجلی چمک رہی ہو، انہوں نے کہا ــــ بھائی جان، میں تمہارے ہی پاس آئی ہوں، اس وقت میں بڑی مصیبت میں ہوں، میں خود اپنے لڑکوں کے پاس جاتی، لیکن دیکھتی ہوں کہ وہ لوگ دنیا داری کے جھمیلوں میں پھنس کر مجھے بھول گئے ہیں۔ میں جانتی ہوں دنیا کی محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔ لیکن انہوں نے اب تک میرا حق ادا نہیں کیا۔ اسی لئے قبر میں ہر طرح کا آرام ہونے کے باوجود چین نہیں مل رہا ہے۔ میں بڑی شرمندہ ہوں میرے لڑکوں سے کہہ دو کہ وہ میرے نام پر سب لوگوں کو کھانا کھلائیں۔ خاص طور پر یوسف سے یہ بات ضرور کہنا۔ کیونکہ اسی پر میرا حق زیادہ ہے۔"

اتنا کہہ کر فرازی رک گئے، حقہ کی نے سرکا کر کھانسے اور اور پھر کھانستے کھانستے بولے ــــ " میں پوچھنے ہی والا تھا کہ خاص طور پر یوسف کے اوپر تمہارا حق زیادہ کیوں ہے بہن ! لیکن اتنے میں میری آنکھ کھل گئی۔ اور میری نظر کھلے ہوئے جنگلے سے آسمان کی طرف اٹھ گئی۔ آسمان پر ایک بڑا سا ستارہ جگمگا رہا تھا، آہا ! کتنی تیز روشنی تھی اس کی، شاید تم میرے کہنے پر یقین نہ کرو، یکایک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا سارا کمرہ مشک و عنبر کی خوشبو سے بھر گیا۔"

لیسین اتنی دیر تک اپنی آنکھ
کے چپ ہوتے ہی انہوں نے جلدی سے
یوسف تھوڑی دیر خاموش ر
نے ہم لوگوں کو یہ بات بتا دی، یہ بہت
گنہگار بنتا، اب میں بھی نہیں چھپاؤں
چھوٹی بہو نے بتایا تھا کہ مرتے وقت ماں
گئی ہیں۔ خواب میں شاید اسی کے بار
لیسین نے اس کی بات کاٹ
ڈبیہ ؟"
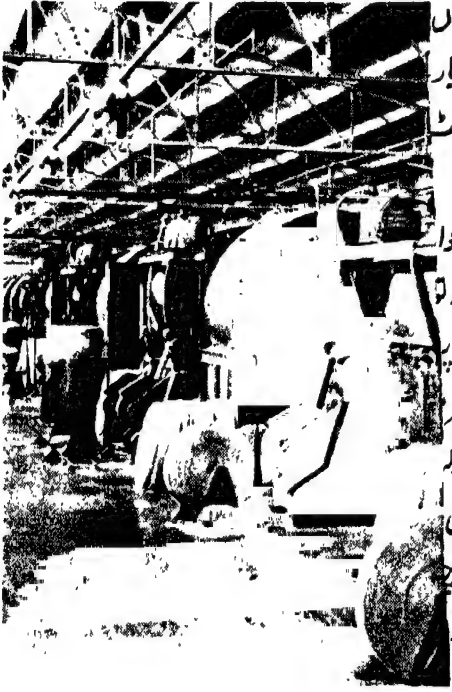
یوسف نے ہنستے ہوئے جوا
بہو نے تو یہی بتایا تھا، تقریباً آٹھ تو
فرازی اپنی سفید ڈاڑھی پر
سے مسکرائے ــــ " خواب کی تعبیر
یوسف نے چلم کی آگ کو کر
تو میری حالت جانتے ہو چچا۔ بس
روز کھاتا ہوں، وہ ڈبیہ ماں کی چ
میں اسے بیچ کر ماں کے نام پر لوگو
کر دوں ؟"

" نہیں " لیسین نے فوراً
ہو سکتا، وہ موئی ماں کی نشانی ہے
اور اکیلی یادگار ہے۔ میں جب تک
بیچ سکتا "

فرازی نے حقہ کا کش لے
لیسین تھوڑی دیر تک
یکایک کھڑا ہو گیا۔ اور روہانسے
ماں جنت میں ہے، پھر بھی نہ ج
وہ اپنے لڑکوں کے پاس خواب
آئیں۔ ہم دونوں بھائی ہیں، اا
پانچ دس آدمیوں کو بلا کر ان
کھلا سکتے ؟"

ال کیا کچھ جمع کر رکھا تھا سے اُن کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا ۔۔۔ "یہ کی ہے
ت تو نہیں"۔
" لیکن بھابی ؟ اپنی آنکھیں صاف کیں اور بھرائی ہوئی آواز
وہ ڈبیہ چھوٹی بہو کے پاس ہی رہے، ویسے
یرے سے کہا۔ ہے کہ ساس اور سسر کی استعمال کی ہوئی چیزیں
یسین ہنسا ں، لیکن مشتری کے پاس ہے تو وہ میرے
ن وہ تو پانچ بچوں کی م چاہتا ہوں کہ وہ چیز ہمیشہ اس کے پاس
بدگی کہاں ؟ اسے شو ل بے حرمتی نہ ہو، میں قرض یا اُدھار لے کر
مجھے تمہارے پاس بھی ے ہی لوگوں کو کھانا کھلا دوں گا۔"
سنی تو کہا، وہ لوگ لیں ی کے منہ سے نکلا۔
انکار کرنا نہیں چاہئے اور کہنے لگا ۔۔۔ "میں بھی خاندان کی
نہیں !" ھوٹی بہو سے کہوں گا کہ وہ کل ہی ڈبیہ
یوسف خاموش
ے لہجے میں مسکرا ہا جیسے کہنا چاہتا تھا" نہیں نہیں، اس کی
ے دوں، کیا کہتے ہو اسے کچھ نہ بولا۔ فرازی نے دونوں کو اپنے
یوسف نے فوراً دیکھو کتنی آسانی سے تمام جھگڑا ختم ہو گیا۔
ہر کا بکس ؟)
یسین نے بیزاری دولت، سونا چاندی کتنے دن کام آتا
کہہ لو، گٹھڑی کہو، ف انصاف اور عقیدہ ہی کام دے گا۔
سامنے بانٹ لینا، پھر کہا ہے :
یوسف تھوڑی دیر ں سرا سے ایک دن، اول فنا ! آخر فنا !
ہلے چھوٹی بہو سے ، یوسف نے مشتری سے یہ بات کہی
نہیں، ورنہ خواہ مخوا ہ نا، کچھ بھی ہو، میں وہ ڈبیہ نہیں
یسین نے زور سے ، میں بڑی بہو سے ہار نہیں مانوں گی۔
تے ہو، جس طرح ہاں ہے" یوسف نے کہا ۔۔۔ "یہ تو
، اسی طرح اگر کچھ
لئے میں کہہ رہا
دیتے تو خواہ مخو سے مسکراتے ہوئے منہ بگاڑ کر
ہو تو ٹھیک، یں چلی ہیں، تم صرف ایک چال چلو گی
ہو گا تو فرازی
لڑاؤں سے کے بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گئی ۔۔۔ "کہاں سی
نیچے اُتر گیا۔

یوسف ہنسنے لگا ۔۔۔ "تلسی سنار کو جانتی ہو ؟ یوں سمجھ کہ وہ بڑی بہو کا خاص آدمی ہے، کل یکایک میرے گلے پڑ گیا، کہنے لگا، بھیا نے اُسے دو اشرفی تڑانے کے لئے دی تھیں، اس کے معنی جانتی ہو ؟"

"نہیں" مشتری نے جواب دیا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ان کی چال سمجھ رہی ہو ؟" یوسف نے کہا ۔۔۔ "اس طرح دو اشرفی تڑانے کی جھوٹی خبر مجھ تک پہنچائی وہ میرے دل کا حال معلوم کرنا چاہتی تھیں، دوسری چال خود بڑے بھائی نے چلی ہے، انہوں نے کامل فرازی کو بلا کر ایک جھوٹے خواب کا قصہ سنا کر دباؤ ڈالا کہ ماں کے نام پہ لوگوں کو کھانا کھلایا جائے، اگر میں کہتا کہ کھلاؤں گا، تو فوراً سارے گاؤں میں یہ بات پھیل جاتی کہ سکر آر خاندان کے داماد کے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آگیا ؟ اور نہیں کہتا تو بھی رہائی نہ ملتی، کامل فرازی سبھوں سے کہتے پھرتے کہ اتنے زیورات ہتھیانے کے بعد بھی چھوٹے لڑکے نے ماں کے نام پر دو چار پیسے خرچ کرنا قبول نہ کیا، اس لئے ایک پتھر سے دو چڑیوں کا شکار کر آیا ہوں، سنو گی کیسے ؟"

یوسف نے مشتری کے کان کے پاس منہ لے جا کر کچھ کہا۔ اس کی بات سن کر مشتری کا رنگ فق ہو گیا۔ شوہر کے پاس سے تقریباً ہٹ کر اس نے آہستہ سے پوچھا ۔۔۔ "لیکن اگر بڑی بہو پہچان گئیں کہ وہ سونا نہیں، پیتل ہے تو ؟"

یوسف زور سے ہنس پڑا ۔۔۔ "پھر میں یقین کر لوں گا کہ وہ واقعی تعلقدار خاندان کی لڑکی ہیں !"

باہر کھڑکی[1] اور اندر کمرے میں تقریباً بیس مولویوں اور چند رشتہ داروں کو یسین میاں نے کھانے کی دعوت دی تھی، دعوت دیتے وقت گاؤں کے تقریباً ہر آدمی سے انھوں نے ہاتھ جوڑ جوڑ کر کہا تھا، آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اب ہمارے حالات پہلے جیسے نہیں رہے، دھان کا کھیل گروی رکھ کر کسی طرح یہ دعوت کھلا رہا ہوں، اسی لئے تمام لوگوں کو دعوت نہیں دے سکتا، امید

باقی صفحہ ۴۴ پر

[1] : بیٹھک (مدیر)

زندگی اور قوموں کے تین اہم سرمائے -
یہاں ان کی صنعتوں کے فروغ کے لئے دور نو
ترقی نظر آ رہی ہے

کمائی بھی ہیں اور رعنائی بھی ہیں

گُل جی : ایک شبیہ نگار

کچھ عرصہ سے ایک مصوّر کا نام حلقہ ہائے فن میں کافی نمایاں نظر آ رہا ہے۔ گلُ جی جس نے حال ہی میں صدر پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں، کی ایک اچھوتی تصویر بنا کر قابلِ رشک امتیاز حاصل کیا ہے۔ کلاہ گوشۂ دہقاں بہ آفتاب رسید۔

نوجوان ہونے کے باوجود پختہ کار گل جی ایک ایسا مصوّر ہے جس کو نقاشی کے ساتھ شروع ہی سے گہرا لگاؤ رہا ہے۔ خصوصاً اس کی وہ شکل جس کو شبیہہ نگاری کہتے ہیں اور جس کے لئے مخصوص صلاحیتیں درکار ہیں۔ اس کے لئے اُس نادر چیز کی ضرورت ہے۔ جس کو وہبی ذوق کہتے ہیں۔ اور جو خاص خاص افراد ہی کو میسر آتا ہے لگاتار مشق اس فطری جوہر کو جلا دیتی ہے اور انسان ترقی کرتے کرتے استادِ فن کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ گل جی کے لئے بھی مسلسل ریاض سونے پر سہاگہ ثابت ہوا ہے۔

شبیہہ نگاری محض، خدوخال ہی کو نمایاں کرنے کا نام نہیں۔ یہ اس سے کہیں گہری چیز ہے۔ اس کے لئے خدوخال سے بڑھ کر دل و دماغ اور ظاہر سے گزر کر باطن پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ صرف اس ہی طرح فن میں گہرائی بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ اور گیرائی بھی۔ لہذا شبیہہ نگار کے لئے ضروری ہے کہ انسانی شکل و صورت کے ساتھ اس کی فطرت کا رازداں بھی ہو۔ تاکہ وہ سیرت کو صورت سے نمایاں کر سکے۔

یہ شیکسپیئر ہی تو تھا۔ "رازداں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا" کا مصداق — جس نے انسان کے حیرت آفریں ہونے پر حیرانی کا اظہار کیا تھا۔ اور یہ بالکل بجا ہے۔ انسانی فطرت کی اتھاہ گہرائیوں میں کیا کچھ پنہاں نہیں! ایک نقاش کی نظر جب انسانی ضمیر کی انجانی لہروں کو بھانپ کر چہروں پر نمایاں کرتی ہے تو اس کی قلم کاریوں

میں کیا کچھ دلچسپی پیدا نہیں ہوتی۔ ا
نئے، انوکھے پہلو جھلکتے ہیں
متوالوں کو بے اختیار لبھا لیتے ہیں۔
کے خدوخال، انسانی جسموں کی مصو
ہے۔ انسان کا حلیہ پیش کر دینا ہی
کامل شبیہہ نگار وہ ہے جو نقوش
بھی نقاش کو اس فنی عمل سے کام
ہیں۔ یعنی ہر طرح کے نقوش کی بھر مار
نقوش سے انسانی چہرے، انسانی
کہ جو نقش سامنے آئے وہ پُر معنی
چیزوں کو سامنے لائے جن سے مط
حشو و زوائد سے پاک ہو۔ ظاہر
گڈمڈ علامات و نشانات ہوتے ہیں:
حجابات اور ماحول کا دبیز پردہ پڑا
پردے کو پرے ہٹا کر اصلی کیف
تو جیسا کہ ماہرین نفسیات ہمیں
اور ظاہری پردوں کی تہہ میں کہ
کی نظر اس حقیقی انسان کو بھانپ
سے ہمارے سامنے لے آتی ہے۔
ایک صحیفہ ہے۔ جسے جتنا بھی
آشکار ہوتی جاتی ہیں۔ اور ہم ان
بھی اپنے اندر بصیرت کی ایک
کی طرح وسیع اور ایسے کہ ہر
کسی بھی انسانی چہرے پر نظ

علم و حکمت کا سفر

ریشمہ : اسم باسمی

کا ہلکا سا خم، کمان ابرو کی ہلکی سی جنبش
سے کم ہے کا جادو۔ یہ سب اپنے اندر
۔ تصور، احساس، گہرائی جیسے الفاظ
ب۔ جیسے کوئی ماہرِ فن اپنے موقلم کی
سے نقش میں بھی سمو دیتا ہے۔ یہاں تو
ہے نقش ہی منہ سے بولتا ہے اور
تیے جاگتے انسان میں بھی نہیں ہوتی۔
نازک ہے۔ شیشہ گری سے بھی نازک تر
نگاری میں بھی غیر ضروری باتوں کو
زکرنا پڑتی ہے۔ یہ فن کار کی بصارت
رت سبھی کا امتحان ہے۔ یعنی اس کی

بیعت پائی ہے جو شبیہہ نگاری کے
بت کا دلدادہ ہے۔ اس لئے اسے
۔ انسانوں کے چہروں تک تو رسائی
ئی مشکل ہے۔ ہر انسان اپنی شخصیت
ب تک اس خول، اس آہنی پردے
یا جائے، ہم اصلی انسان تک نہیں
۔ جیسے شاعر کی نظر درکار ہے۔ جو
بلائے۔ گل جی کچھ ایسی ہی قوت سے
ل چاک کر کے انسان کے حقیقی
نہیں موقلم کی جنبشوں سے اجاگر
ماحب نظری، دیدہ وری، اور
ان کی ظاہری وضع پر نہیں جاتا۔ اس
ن لئے اس کے بنائے ہوئے پیکروں
ایک فرحت افزا تازگی، ایک کیف

ئے جنس سے لگاؤ ہو وہ ہمیشہ ان
ں دنیا میں چلتے پھرتے انسانوں
میں کھتا اور نہ ان سے دوستی بن
موندھتا پھرتا ہے۔ اس لئے

وہ انسانوں کی تلاش میں جا بجا گھومتا پھرا ہے۔ اس نے انسانی چہروں کا مطالعہ کیا ہے۔ کسی عظیم الشان شہر کے گلی کوچوں کی طرح اس کے لئے "انسانوں کے جنگل" "اوراق مصور" ہیں۔ اس لئے اسے جہاں بھی کوئی شکل نظر آتی ہے ـــ وہ اسے موقلم کی گرفت میں لانے کے لئے بے تاب ہو جاتا ہے۔ اس کا کاشانۂ فن ایسے خاکوں سے لبریز ہے۔ مگر ان تمام خاکوں کی بنیادی حیثیت یہی ہے کہ صورت کے پردے میں سیرت جلوہ گر ہوتی ہے۔ بادشاہ ہوں یا فقیر، وہ ان کے کرّ و فر اور چیتھڑے دور کر کے اصلی انسانوں کو پیش کرتا ہے۔ ملمع، تصنع، زوائد سب دور۔ صرف ان کی تہہ میں کھویا ہوا حقیقی انسان باقی رہ جاتا ہے۔ اس میں بصیرت تو کام کرتی ہی ہے۔ لیکن پیشکش کا اہتمام بھی کچھ کم بلیغ نہیں ہوتا۔ اور گل جی کا موقلم اس میں طاق ہے۔ جو ایک طلسمی چھڑی کی طرح نئے نئے، بوقلموں جادو جگاتا جاتا ہے۔

گل جی کی طبیعت قیدِ مقامی کی پابند نہیں۔ وہ ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست۔ بلکہ ملک ابنائے جنس ماست کا قائل ہے۔ اسی لئے اس نے جا بجا اپنے اسٹوڈیو قائم کئے ہیں، جا بجا گیا ہے، اپنا کمال دکھایا ہے، لوگوں کو اپنا گرویدہ بنایا ہے۔ اور جہاں بھی گیا ہے اپنے فن کے پرستار پیدا کر لئے ہیں، اس کا موقلم ہر کہیں کامیابی سے ہمکنار ہوا ہے۔

اس نے اپنی دلکش، دلآویز تصاویر کی خبر نہیں کتنی نمائشیں برپا کی ہیں۔ وآرسک (پاکستان) میں، سٹاک ہالم (سویڈن) میں، اور اوٹاوا (کینیڈا) میں۔ ہر جگہ شائقین فن نے اس کے مرقعات کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اخبارات و رسائل نے زور و شور سے چرچا کیا، تنقید کی، داد دی۔ یہ کامیابی کوئی معمولی کامیابی نہیں۔

یوں تو گل جی نے بے شمار شبیہیں اور پیکر بنائے ہیں۔ اور ان کا تعلق سوسائٹی کے ہر طبقہ سے ہے۔ فقیرانِ خاک نشیں اور غریب کسانوں سے لے کر باوقار امیروں، اور سرداروں تک۔ اہلِ وطن سے لے کر اجنبیوں تک۔ لیکن اس کے بعض نقوش خاص طور پر قابلِ قدر ہیں۔ مثلاً ایک ہنستے ہوئے کسان کا نقش۔ غریبانہ وضع، غریبانہ لباس، مفلوک الحال ہاری۔ دنیائے ظلم و ستم کا ستایا۔ گردش روزگار کا مارا ہوا۔ لیکن اس کا دل زندہ ہے۔

توانا ہے۔ وہ دنیا سے ہار ماننے والا نہیں۔ اس کے چہرے پر بشاشت ہے، مسکراہٹ ہے۔ اور اس کو دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ وہ پیکار حیات میں آخر کار جیت ہی کر رہے گا۔ وہ ان سنگدل انسانوں پر غلبہ پا کر ہی رہے گا جو اسے صدیوں سے پائمال کرنے پر تلے ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں ہمارے یہاں جو انقلاب ہوا ہے اس نے ہمارے غریب کسانوں، مزارعوں اور ہاریوں کے اس یقین، اس اعتماد، اس بشاشت اور مسکراہٹ کی لاج رکھ ہی لی ہے۔ اس طرح مصور نے ایک ابدی حقیقت کو ابدی روپ عطا کر دیا ہے۔

ایسے ہی ایک دہقانی عورتوں کا نقش بھی ہے۔ وہ دھرتی کی بیٹیاں جن کو دھرتی کے بیٹوں کی طرح زمانے نے ہمیشہ پائمال ہی کیا ہے۔ مصور نے ان کو بھی ایسے پیش کیا ہے جیسے دھرتی کی لاڈلی شہزادیاں ہوں۔ کیونکہ ان کے دل بھی زندہ ہیں اور ان کے چہروں پر بھی ایک لازوال ناقابل بیان، پُر اسرار مسکراہٹ ہے۔ جیسے وہ مونا لزا نہیں مگر مونا لزا سے کچھ کم بھی نہیں۔

گل جی کے یہاں غریبوں اور امیروں میں کوئی فاصلہ نہیں۔ وہ ایک "فنی ہمہ اوست" کا قائل ہے۔ اس لئے اس کا موقلم ایک ہی جست میں غریب کسانوں اور ان کے گھروندوں سے بڑے بڑے امراء و رؤسا کے ایوانوں تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کا تازہ ترین شاہکار ہز ہائی نس آغا کریم کی تصویر اس کی شاہد ہے۔ جس کا عمل بہت ہی نفیس ہے۔ اس سے کچھ پہلے مری میں اسے یہ عظیم تر شرف بھی حاصل ہوا ہے کہ اس نے چند ہی گریز پا لمحات میں ہمارے ہر دلعزیز صدر، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی تصویر تیار کی جو صدر پاکستان کی ایک خیال انگیز تصویر ہے۔

سچ پوچھئے تو گل جی کی کامیابی اس کی اَن تھک سعی و کوشش اور عزم و استقلال کا ثمر ہے۔ اس کی قوت ارادی میں کبھی فرق نہیں آیا۔ وہ اپنے فن کی تکمیل میں برابر کوشاں رہا ہے۔ اکثر ایسا ہوا کہ یکایک اس کے ذہن میں کسی فن پارے کا تصور پیدا ہوا جس نے اسے خلوت گزیں ہونے پر مجبور کر دیا۔ وہ مہینوں روپوش رہا اور جب باہر نکلا تو —— اپنی بغل میں کوئی بہت عمدہ شاہکار دبائے ہوئے۔ اس وقت اس کی حالت دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ بال پریشان، کپڑے رنگ روغن کے دھبوں سے داغدار، آستینیں اوپر چڑھی ہوئیں۔ غرضیکہ ساری ہیئت گویا پکار پکار کر کہہ رہی ہو کہ یہ انسان اپنی شکل
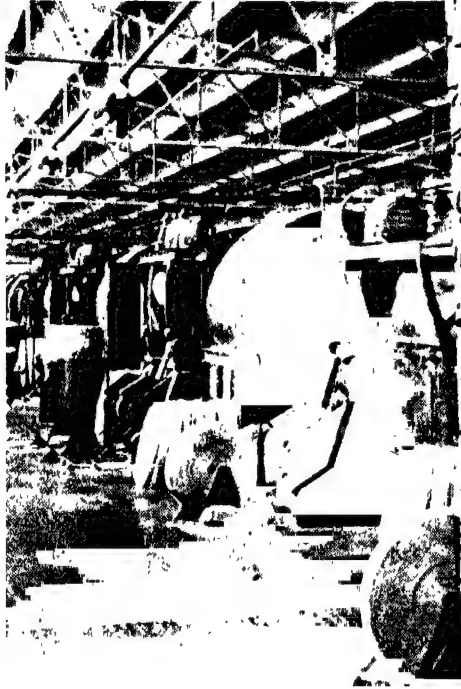
وصورت اور ذاتی راحت و آرام تک
اور ارادوں میں کھویا ہوا ہے۔ اس ...
کے نور سے چمکتی نظر آتی ہیں۔

گل جی کے فن نے ترقی کی ...
شروع میں اس نے جو چیزیں بنائیں، ...
ضرور تھا کہ منزل کی طرف جو بھی قدم ا...
خلوص اس کو صحیح راستے پر لئے جار...
اعتبار سے تکمیلِ فن قریب تر آر...
اور صحت و پختگی بڑھتی جا رہی تھی۔ گ...
بہتر گشد زاول" کا مصداق بنتا جا...

گل جی کا ایک ہی نصب ال...
کی طرف اصلاح و تجربہ کے راستے سے...
خوب تر کی طرف اقدام کرتا چلا جائے ...
کی پروا نہ تھی۔ بس نک سے سک تک ...
اصل دھن ہوتی تھی۔ جو بھی ہیئت د...
مکمل اور ہمیشہ حیات کا ایک جمیل ع...
کی طرح سڈول اور سجل۔ رنگوں ...
جامہ تصویر پر تناسب کا نکھار ...
ردائے لطیف میں آنکھ مچولی سی ک...
ایسے نقش بنانا چاہتا ہے جن ...
ہو۔ محض جسمانی حرکت و عمل ہی نہ...
باب میں بھی گل جی کی یہ روش ر...
تھیں نہیں جاتا بلکہ ناہموار روغنی ...
چلا جاتا ہے۔ جو ناظر کی نگاہوں کے ...
دیتے ہیں، ایک دوسرے میں گ...
مقصود ہوتا ہے کہ زندگی کی دھ...
اجالے کن کن روپوں سے گزر کے ...
بڑھ جاتی ہے۔ اس کے رنگ روش...
جس سے اس کا لطیف ذوق او...
نقوش میں ایک دمک، ایک د...
گل جی کی زندگی تمام

: زندگی اور قوموں کے بہن اہم سرمائے۔ یہاں ان کی صنعتوں کے فروغ کے لئے دور نو ... ترقی نظر آ رہی ہے

: کمانی بھی ہیں اور دعائیں بھی ہیں

: جام و حکمت کے سفیر

ریشہ : اسم بامسمیٰ

لوئی واسطہ نہیں پڑا۔ وہ ایک ایسا
پرکھڑا ہوا ہے۔ بچپن پشاور میں
شوق تھا۔ مگر سروسامان ندارد۔
ہیں سدراہ تھی۔ اس لئے کسی فنی
ل نہ کرسکا۔ مگر جوہر قابل کو اس کی
ن حوادث مکتب۔ اس کے لئے
مبیرت رہنما اور مشاہدہ استاد کامل
ورفن کو جلادی۔ روزی کمانا، کام
شوق کو سرد کرنے کے لئے کافی تھے۔
ی کو کبھی سرد نہیں پڑنے دیا۔ اور
ٹھایا۔ پاکستان میں بھی اور پاکستان
ے انجام دہی کے لئے جانا پڑا۔ مگر

فن بڑی ہی حسد کیش محبوبہ ہے۔ جو شرکت غیر کو کبھی برداشت نہیں کرتی اور یہی چاہتی ہے کہ انسان اسی کا ہو رہے۔ اور تن من دھن سب اس پر نچھاور کردے۔ تب کہیں جاکر وہ مسکراتی ہے۔ گل جی نے بھی محبوبۂ فن کو اسی طرح رام کیا۔ اور وہ اب آکر مسکرائی ہے۔ اور نحوست و ادبار کا سایہ جو ہمیشہ ہی خانۂ انوری کی تلاش کرتا رہتا ہے، آخر کار اس کے سر سے ٹل گیا ہے۔ خوش حالی نے اس کا گھر دیکھ لیا ہے اور اس کے پرانے خواب شرمندۂ تعبیر ہوئے ہیں۔ اب وہ نقش نگاری پر پوری پوری توجہ دے سکتا ہے۔ اور یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ اس کا نخلِ فن نئے نئے شگوفے لارہا ہے۔ اس کا عمل پختگی کی حدوں کا چھوتا ہوا بہتر مستقبل کی نوید دیتا ہے ٭

٭ "آٹھ تولے سونا" : بقیہ صفحہ ۴۰

ے میں اسی بات کو لیسین میاں نے
ج کل کیسا زمانہ آگیا ہے کہ دل چاہتے
نظام کرنا ممکن نہیں ہے اور پڑی
نتے ہی ہیں، ایسے وقت میں اگر
ہ ایک بار متجسس نگاہوں سے دیکھا
ہے اور جب انہیں یقین ہوگیا
ں لے کر کہا۔ "ایسے وقت میں
ہات نہ تھی۔ خیر، جب میں بڑا بھائی
بوجھ کر اپنی بات ادھوری ہی

باہر کے تمام لوگوں کو کھانا کھلایا جاچکا تھا۔
روں طرف پھیلی ہوئی ہلکی سیاہی
ب لوگ ایک ایک کرکے جانے لگے
ا بہانہ بنا کر اپنے کمرے میں چلی آئی
آکر کھڑا ہوگیا اور اس نے آواز دی۔

ے دہلیز پر آکر کھڑی ہوگئیں اور ادھر

ادھر دیکھتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔۔۔ "کتنے تولے ہے؟"

تلسی ہنسنے لگا۔۔۔ "کتنے تولے ہے؟ کیا مطلب؟ ارے وہ تو ملمع چڑھا ہوا پیتل ہے، آپ پہچان نہ سکیں، چھی، چھی، چھی۔"

شریفہ چند لمحوں تک حیرت زدہ چپ چاپ کھڑی رہی، پھر بھاگتی ہوئی آئی اور لیسین میاں کی جائے نماز پر پچھاڑ کر گری، لیسین میاں مغرب کی قضا نماز پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے پوچھا، "کی ہولو؟" (کیا ہوا؟)

شریفہ مایوسی اور بیچارگی کے لہجہ میں تقریباً چیختی ہوئی بولی۔۔۔ "نیچ ذات کی اس لڑکی نے مجھے پھر دھوکا دیا۔ یہ سونا نہیں پیتل ہے، اوپر سے سونے کا ملمع چڑھایا ہوا ہے، اوگو تو کھون تو بی کینو ایکبار دیکھلے نا؟" (تمہیں اسے ایک دفعہ دیکھ لینا تھا!)

لیسین میاں نے فوراً اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور دھیرے سے بولے۔۔۔ "چپ رہو بڑی بہو، اتنی زور سے چیخ کر مت بولو، تعلقدار خاندان کی لڑکی ہوکر تم سونا نہیں پہچانتیں، یہ بات اگر لوگوں نے سن لی تو کیا کہیں گے؟"

اتنا کہہ کر وہ بڑے اطمینان سے عشاء کی نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوگئے ٭

پٹ سن، کاغذ اور چائے : زندگی اور قوموں کے تین اہم سرمائے -

مشرقی پاکستان ان کا گہوارہ ہے جہاں ان کی صنعتوں کے فروغ کے لئے دور نو میں خصوصی ترقی نظر آ رہی ہے

یہ چیزیں ہمارے لئے زر مبادلہ کماتی بھی ہیں اور بچاتی بھی ہیں

چائے سازی کا ایک منظر

کاغذ : علم و حکمت کا سفیر
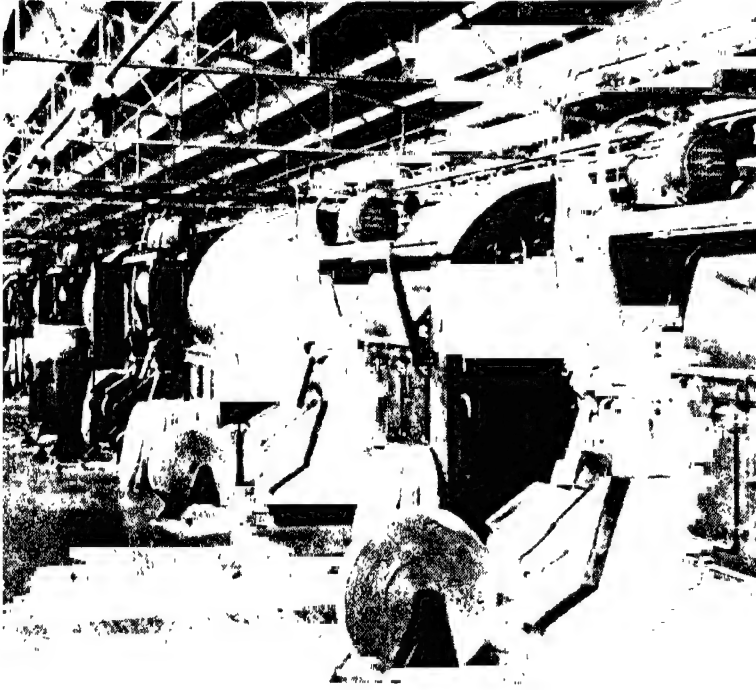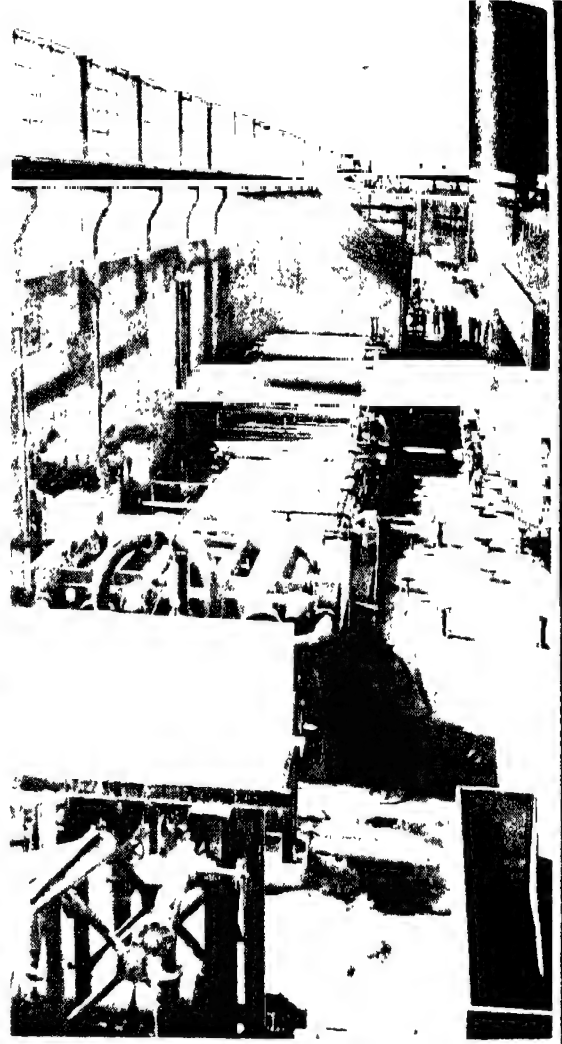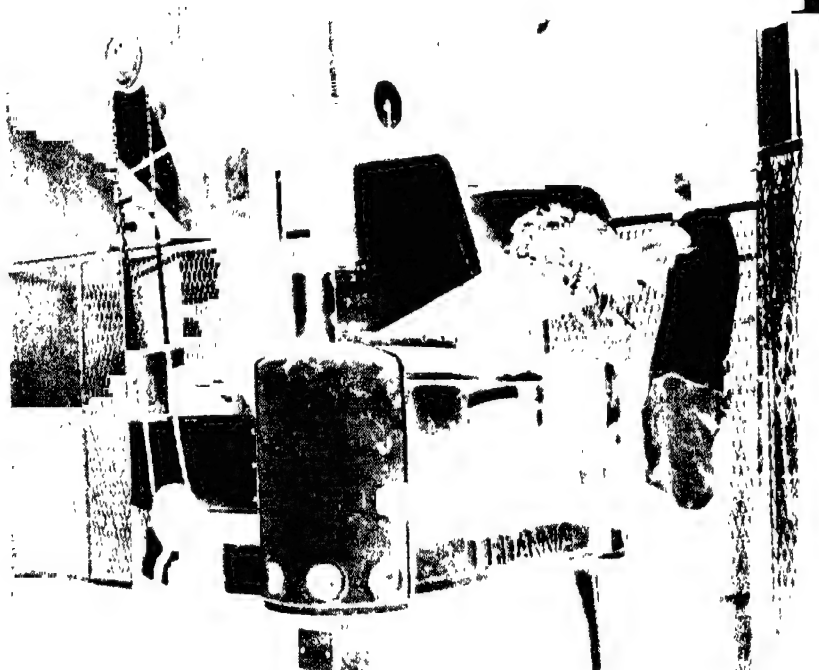
سنہری ریشہ : اسم بامسمیٰ

یہ دشت و جبل

آزاد منش انسانوں کی جولاں‌گاہیں
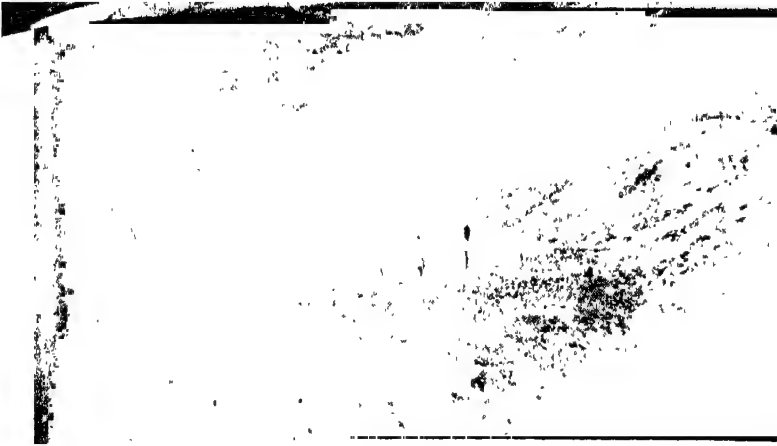
فیاض فطرت

آزاد قبائلی

روح جمہوریت: اخوت،
مساوات، مشورہ، کی
عملی تفسیر —— جرگہ

غزل

شیدا گجراتی

جنونِ عشق کی روداد مختصر تو نہیں
شکستِ جام زوالِ دل و نظر تو نہیں

مذاقِ جلوہ سلامت ہزار ہا جلوے
نگاہِ شوق کا شیرازہ دربدر تو نہیں

یہ اور بات سزاوارِ امتحاں ٹھہرے
ہمارے حالِ زبوں سے وہ بے خبر تو نہیں

خطا معاف ترے بام و در کی پہنائی
بقدرِ وسعتِ اندازۂ نظر تو نہیں

قدم قدم پہ قدم ڈگمگائے جاتے ہیں
یہ رہگزار کہیں اس کی رہگذر تو نہیں

جبینِ شوق میں سجدے مچل رہے ہیں مگر
ہر ایک سجدہ سزاوارِ سنگِ در تو نہیں

بجز خلوصِ دل و جاں بجز جنونِ وفا
رہِ طلب میں کوئی اور راہبر تو نہیں

نگارِ وقت کے تیور بدلتے رہتے ہیں
اِدھر جو حال ہے اب وہ کہیں اُدھر تو نہیں

جمالِ شاہدِ گل دلربا سہی شیدا
مآلِ شوق بعنوانِ چشمِ تر تو نہیں

محمود جعفری

خود جن کی آنکھ ہی میں شعلۂ نظر نہیں
ان کے لئے امید کی کوئی سحر نہیں

ہم رہروانِ راہِ محبت کدھر کو جائیں
دشتِ جنوں میں دل سا کوئی راہبر نہیں

اے دوست تیرا قرب میسّر تھا جب ہمیں
وہ رات دن نہیں ہیں وہ شام و سحر نہیں

نے تجھ سے رابطہ ہے نہ دنیا کی کچھ خبر
اب اس مقام پر ہیں کہ اپنی خبر نہیں

ڈھونڈا تو خود سمٹ کے چلی آئیں منزلیں
دیکھا تو دور تک بھی کوئی رہگذر نہیں

ہم نے ہر ایک دشت کو گلزار کر دیا
ہم سا جہانِ شوق میں آشفتہ سر نہیں

از خود ہمارے نام سے منسوب ہو گئے
وہ حادثات جن کی ہمیں بھی خبر نہیں

یہ اور بات ہے کہ بدل جائیں روز و شب
محمود زندگی میں غموں سے مفر نہیں

جوہری توانائی

(پاکستان میں ترویج و ترقی)

علی ناصر زیدی

اب سے ٹھیک پندرہ سال پہلے اگست ۱۹۴۵ء میں جاپان کے دو اہم شہروں، ہیروشیما اور ناگاساکی پر اٹیم بم گرائے گئے تو دنیا ایک نئے ہتھیار ایک نئی قوت سے آگاہ ہوئی۔ ابھی ان دھماکوں کی یاد لوگوں کے ذہن سے محو نہیں ہونے پائی تھی کہ یہ خوش آئند خبریں سننے میں آنے لگیں کہ یہ نئی قوت یعنی جوہری توانائی اب انسان کی فلاح و بہبود کیلئے استعمال کی جائے گی۔

گذشتہ پندرہ سال کے عرصے میں اس میدان میں بڑی تیزی سے ترقی ہوئی ہے اور اب کسی ملک یا قوم کی عظمت و قوت کا اندازہ لگانا ہو تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کے پاس اٹیمی سائنس پر تجربے کرنے کیلئے کتنے سائنسداں موجود ہیں کتنے تحقیقاتی مرکز ہیں، کتنے ری ایکٹر ہیں، کتنے اٹیمی راکٹ اور دوسرے ہتھیار ہیں۔ بغرض اس وقت چاروں طرف اٹیم کی دھوم مچی ہوئی ہے اور ایک دوڑ ہے جس میں ہر ملک حصہ لینا چاہتا ہے ورنہ اس کی بقا خطرے میں پڑ جائیگی۔

پاکستان ایک نیا ملک ہے پھر بھی ہم نے اپنی بساط بھر اس اہم مسئلے کی طرف بھی توجہ دی ہے۔ آپ سب نے "پاکستان اٹیومک انرجی کمیشن" کا نام سنا ہوگا اور اخباروں میں اس کی کارروائیوں کے متعلق کبھی کبھی کچھ خبریں بھی پڑھی ہوں گی۔ پاکستان میں جوہری توانائی کی ترویج و ترقی کا کام اسی ادارے کے سپرد ہے۔ اب اس کے سربراہ ڈاکٹر آئی۔ ایچ عثمانی ہیں۔

متعدد تجربات نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ جوہری توانائی نہ صرف صنعتی قوت پیدا کرنے بلکہ فصلوں کو بہتر بنانے، غذائی اشیا کو جراثیم سے پاک کرنے اور مدت تک محفوظ رکھنے، سرطان جیسے موذی امراض کا علاج کرنے اور مویشیوں کی نسلوں کو بہتر بنانے کے لئے استعمال کی جاسکتی ہے اب جبکہ دنیا کا تیل، کوئلہ اور گیس تیزی سے ختم ہو رہے ہیں، ہمیں مستقبل قریب میں ہی جوہری توانائی کو استعمال کرنا پڑے گا۔ اس کے بغیر چارہ نہیں۔

"پاکستان اٹیومک انرجی کمیشن" میں ایسے ماہرین شامل ہیں جنہیں ان تمام حقائق کا صحیح اندازہ ہے لیکن ہمارے یہاں ایسے سائنس داں بالکل نہیں تھے جو اٹیمی تجربہ گاہیں قائم کرسکتے اور ان میں تحقیقات کرسکتے۔ کسی یونیورسٹی یا کالج کی تجربہ گاہ میں بھی ان تحقیقات کا کوئی انتظام نہ تھا کیونکہ یہ ایک نئی سائنس ہے لہذا کمیشن نے سب سے پہلے کچھ محنتی سائنس دانوں کا انتخاب کرکے انہیں انگلستان، امریکہ اور کنیڈا وغیرہ بھیجا تاکہ وہ اٹیمی توانائی کے متعلق ضروری تربیت حاصل کرسکیں۔

تمام ترقی یافتہ ملکوں میں اس وقت جوہری توانائی پر تیزی سے کام ہو رہا ہے اور وہ اپنے اپنے سائنس دانوں کو تربیت دینے میں مصروف ہیں۔ ان کی تجربہ گاہوں اور تربیتی اداروں میں اتنی جگہ یا گنجائش نہیں ہے کہ وہ دوسرے ملکوں کے سائنس دانوں کو کثیر تعداد میں داخل کرسکیں تاہم ہم ان دوست ممالک کے شکر گذار ہیں جنہوں نے پاکستانی سائنس دانوں کو داخلے دیئے اور ان کی تربیت کا انتظام کیا۔

یہ تربیت آئی سی۔ اے کولمبو پلان، انٹرنیشنل اٹیومک انرجی کمیشن اور فیلوشپ پروگرام کے تحت ممکن ہوسکی کئی سائنس داں باہر سے تربیت حاصل کرکے واپس آچکے ہیں بہت سے زیر تعلیم ہیں اور ابھی مزید کچھ عرصے تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

آپ نے کچھ عرصہ قبل اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ عنقریب راولپنڈی اور ڈھاکہ میں ایک ایک ری ایکٹر قائم کیا جائے گا۔ ری ایکٹر دراصل ایک مشین ہے جس کے بغیر نہ تو اٹیمی توانائی پر تحقیقات ہوسکتی ہے، نہ تجربات اور نہ اٹیمی توانائی ہی پیدا کی جاسکتی ہے۔ ہماری سب سے بڑی ضرورت تحقیقات ہے۔ ہم اپنے بہت سے پاکستانی عملے کو اس نئی سائنس کی تربیت دینا چاہتے ہیں یہ سب کچھ ری ایکٹر کے بغیر ممکن نہیں ہوسکتا یہی وجہ ہے کہ کمیشن جلد از جلد ری ایکٹر قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

آپ نے تابکاری اور ریڈیو آئی سوٹوپ وغیرہ اصطلاحات کا نام ضرور سنا ہوگا۔ یہ سب اسی سائنس سے تعلق رکھتی ہیں۔ تابکاری سے مراد وہ غیر مرئی قسم کی شعاعیں ہوتی ہیں جو بعض دھاتوں سے خود بخود

پھوٹتی رہتی ہیں۔ مثلاً ریڈیم سے جو کافی طویل عرصے سے سرطان کے علاج میں استعمال ہو رہی ہے۔ دراصل یہی مہلک شعاعیں سرطان کے جراثیم کو ہلاک کر کے مریض کو حیاتِ نو بخشتی ہیں۔

ایٹم بم کے سلسلے میں ایک اور تابکار دھات کا نام سننے میں آیا جسے یورینیم کہتے ہیں۔ لوگ سونے کو بھول گئے اور اپنے اپنے ملک میں یورینیم تلاش کرنے لگے کیونکہ اسکے ایٹم سے جوہری توانائی کثیر مقدار میں حاصل ہوتی ہے۔ ایٹم نہایت مختصر ذرہ ہوتا ہے لیکن اس کے اندر اور بھی چھوٹے ذرات پائے گئے ہیں۔ ان چھوٹے ذرات کی تعداد کو کم یا زیادہ کر کے سائنس داں اسی قبیل کی دوسری دھاتیں حاصل کرتے ہیں جنہیں "آئی سوٹوپ" کہتے ہیں۔ اردو میں انہیں "ہم جا" کہہ لیجئے۔ گویا آئی سوٹوپ میں بھی تابکاری [illegible]

اس تما[illegible]

نے اپنے ری ایکٹر[illegible] آئی سوٹوپ بھی تیار کر رہے [illegible] کش نیز غذائی اشیا کی حفا[illegible] دوسرے ممالک انہیں خرید[illegible] آئی سوٹوپ درآمد کرنے کی ضر[illegible]

اس [illegible] پاکستان کے دوسرے بڑے ہسپتالوں [illegible] کی جا رہی ہیں۔ انہیں باہر سے حاصل کیا جا[illegible] شعاعیں پھوٹتی ہیں اس لئے ان کے استعمال میں [illegible] کی ضرورت پڑتی ہے۔ صرف تربیت یافتہ ڈاکٹر ہی انہیں استعمال کر سکتے ہیں۔ "اٹومک انرجی کمیشن" نے اپنے انتظامات کے تحت کچھ ڈاکٹروں کو یہ تربیت دلائی ہے۔ اور مزید ڈاکٹروں کو باہر بھیجنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

جب ہمارے پاس ایسے ڈاکٹر کافی تعداد میں موجود ہوں گے اور آئی سوٹوپ بھی فراہم ہونے لگیں گی تو مغربی و مشرقی پاکستان میں کم از کم چار پانچ ایسے مرکز کھول دیئے جائیں گے جہاں سرطان اور رسولیوں کے مریضوں کا علاج ہو سکے گا۔ یہ مرکز لاہور، ملتان، کراچی، ڈھاکہ اور چاٹگانگ کے ہسپتالوں سے متعلق ہوں گے۔

پاکستان بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے اور ہمیں ایسی تمام ایجادات سے گہری دلچسپی ہے جو ہماری فصلوں کو بہتر بنا سکیں یا ہم قسم کے پیدا کر سکیں۔ ہماری غذائی اشیا کو ضائع ہونے سے بچا سکیں ریڈیو آئی سوٹوپ جہاں صحت اور صنعت وحرفت میں کام آتی ہیں وہاں انہیں زراعت میں بھی منفعت بخش طور پر استعمال کیا جا رہا ہے وہ بیجوں کو مدت تک محفوظ رکھ سکتی ہیں کیونکہ وہ جراثیم کش خصوصیات کی حامل ہوتی ہیں۔ تجربات شاہد ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے ریفریجریشن یا خنک سازی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ وہ جس غذائی شے پر مرکوز کر دی جاتی ہیں وہ طویل مدت تک گلنے سڑنے سے محفوظ ہو جاتی ہے۔

ہمیں اس قسم کے تمام کاموں کے لئے ماہرین کی ضرورت ہے جنہیں مناسب تربیت دلائی جا رہی ہے ملک میں جلد ہی دو ایسے زرعی مرکز کھول دیئے جائیں گے جہاں ریڈیو آئی سوٹوپ کو مندرجہ بالا مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے گا۔ یہ مرکز [illegible] کے زرعی کالجوں سے ملحق ہوں گے جیسے جیسے [illegible] اور ضروری ساز و سامان میں اضافہ ہوتا جائے گا ویسے [illegible] میں اس قسم کے مزید مرکز کھلتے رہیں گے۔

یوں تو مادے کے ہر ایٹم میں جوہری تو[illegible] لیکن بعض ایٹم دوسرے ایٹموں کے مقابلے میں زیادہ پیچیدہ [illegible] زیادہ پیچیدہ ہوگا اس سے اتنی ہی زیادہ ایٹمی توانائی خارج ہو[illegible] بہت زیادہ پیچیدہ ہوتا ہے اسی لئے جوہری توانائی کے سلسلے [illegible] مانگ بڑھ رہی ہے۔ اس کے معدنی ذخائر دنیا کے بہت سے ممالک میں پائے جاتے ہیں لیکن اسے کافی کاوش کے بعد ہی خام مادے سے حاصل کیا جاتا ہے۔

چونکہ ہر ملک ایٹمی توانائی پر تحقیقات کرنا چاہتا ہے اس لئے وہ اپنے یورینیم کو محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ ہمیں یورینیم کی درآمد میں دشواریاں پیش آئیں گی اور بڑی ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے ملک میں یورینیم کے ذخائر تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ کچھ عرصہ قبل یہ خبر سننے میں آئی تھی کہ مغربی پاکستان کے ضلع ہزارہ اور قریبی پہاڑیوں میں یورینیم موجود ہے۔ اسے تلاش کرنے کی ذمہ داری براہِ راست تو جیولوجیکل سروے آف پاکستان پر عائد ہوتی ہے لیکن ہم سب شہریوں کا بھی فرض ہے کہ اس کام میں اس کا ہاتھ بٹائیں۔

ہم میں سے بہت سے لوگ پہاڑوں پر چڑھنے کوہستانی وادیوں کی سیر کرنے اور باہر گھومنے پھرنے کا شوق رکھتے ہیں۔ اگر وہ چٹانوں کے

(باقی صفحہ ۵۱ پر)

پاک ڈائز اینڈ کیمیکلز لمیٹڈ کے تیار کردہ پختہ

[illegible] رنگ

روز بروز زیادہ مقبول ہو رہے ہیں

ایکس فیکٹری قیمتیں (فی لانگ ٹن)

۱۔ سلفر بلیک پاک ایکسٹرا کنسنٹریٹڈ گرینز ——— ۲۹۹۶/۰۰ روپے
۲۔ کالوریڈ پاک ایکسٹرا کنسنٹریٹڈ ——— ۱۳۵۰۰/۰۰ روپے
۳۔ پاک ڈائرکٹ گرین-بی ——— ۱۰۳۲۶/۳۰ روپے
۴۔ پاک ڈائرکٹ بلو بی-ایس ——— ۸۹۶۰/۰۰ روپے
۵۔ پاک ڈائرکٹ بلیک۔ ای پی۔ کنسنٹریٹڈ ——— ۱۰۹۷۶/۰۰ روپے

پاک ڈائز اینڈ کیمیکلز لمیٹڈ
داؤد خیل

مینیجنگ ایجنٹس:- پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

سلطانیٔ جمہور

(نظام جرگہ اور بنیادی جمہوریت)

ابھی چند دن کی بات ہے کہ پاکستان کے بطلِ آہنی فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے فرمایا تھا کہ مسلمانوں کو جمہوریت کا سبق سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ جمہوریت کی اساس ——— اخوت اور مساوات ——— تو ان کے دین کی روح ہے اور ان کی حیاتِ ملی میں ہمیشہ سے رچی بسی ہوئی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی جگہ طریقۂ کار میں فرق ہو اور کسی وقت، یا مقام کے لحاظ سے نہج جمہوریت میں تبدیلی کرنا ناگزیر ہو جائے مگر جو چیز برقرار رہنی چاہئے وہ جمہوریت کی اصل روح ہے۔ اب مثلاً پاکستان میں برطانوی طرزِ جمہوریت کا تجربہ ناکام ہو چکا ہے، یہاں ایسا ہی طرزِ جمہوریت کامیاب ہو سکتا ہے جس کی جڑیں خود عوام میں پیوست ہوں یعنی وہ طریقۂ نظم ونسق اور نظامِ دستور جس کو وہ سمجھ بھی سکیں اور چلا بھی سکیں۔ یہ چیز وہی ہو سکتی ہے جو یہاں کے حالات کے مطابق ہو اور ان کے مزاج اور احوال وظروف سے مطابقت رکھتی ہو۔ اس تصور کو بروئے کار لانے کے لئے ہی بنیادی جمہوریت کے نظریہ کو عملی جامہ پہنایا گیا ہے اور اسے عوام نے جس جوشِ تائید کے ساتھ اپنایا اور سراہا ہے اس سے ملک کے روشن مستقبل کی نوید ملتی ہے۔

بہرکیف یہ واقعہ ہے کہ مسلمان شروع ہی سے جمہوریت کی روح سے آشنا اور اس کے عملی پہلو سے آگاہ رہے ہیں۔ یہ ان کے نظامِ معیشت میں رواں دواں ہے، اور روحِ مساوات واخوت ان کے قومی کردار کا جزو ہے۔ اس کا سب سے بڑا محرک یہ فرمانِ قدسی ہے: "اور آپس میں مشورہ کیا کرو۔" ان کے معاملات ومسائلِ دین ودنیوی میں یہ جذبۂ باہمی اور سیمِ شوریٰ ہمہ وقت موجود رہتی ہے اور دوسری ملل کے مقابلہ پر ان کے ہاں اتحادِ خیال وعمل اور یگانگت کا رنگ سب سے زیادہ غالب نظر آتا ہے۔

برِّصغیر میں جہاں آزاد منش انسانوں کا سب سے بڑا اجتماع رہا ہے وہ آزاد قبائل کے علاقے ہیں جہاں ہمارے پختون بھائی اپنی قدیم روایاتِ آزادی وحریت کے امین بنے ہوئے ہیں اور ان میں بعض رسوم و روایات اس وقت کے کسی بھی متوازی طریقِ جمہوریت کے مقابلہ پر فخریہ طور پر پیش کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً ان کا جرگہ سسٹم ہے جو اپنی جگہ اس قدر محکم، جید اور مؤثر ہے کہ کسی معیار پر جانچیں اس کی فضیلت نُمایاں نظر آئے گی۔ اس کی روح آزادی ہے، رشتہ اخوت ہے اور اطاعت و تسلیم ورضا ہے۔

اگر جرگہ سسٹم کی تاریخ پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ یہ بھی اتنا ہی قدیم ہے جتنے قدیم خود یہ قبائل ہیں۔ اس سسٹم سے متعارف ہونے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہم ان لوگوں سے بھی کچھ واقفیت حاصل کرلیں جن کے ہاں یہ رواج قدیم سے چلا آتا ہے۔ جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، اس نظام کا گہوارہ ہمارے ملک کے وہ علاقے ہیں جنہیں آزاد قبائل کا وطن کہا جاتا ہے۔ یہاں قدیم سے بہت سے قبائل بسے ہوئے ہیں۔ اس وقت ان میں چند قابلِ ذکر قبائل یہ ہیں: مہمند، اتمان خیل، سالارزئی، شنواری، ماموں، وزیری، محسود، بھٹانی، داوڑ، اورکزئی، آفریدی وغیرہ۔

افاغنہ ہمیشہ سے کوہی زندگی کے عادی رہے ہیں۔ اس لئے انہوں نے جب ان مقامات کو اپنا مامن بنایا تو اپنے مزاج کے موافق جملہ عواملِ فطرت بھی پائے اور وہ میدانی علاقوں کی زندگی کی طرف مائل نہ ہوئے بلکہ یہیں جگہ جگہ اپنی بستیاں بنا کر رہنے لگے اور اپنے قبیلوں کی رعایت سے یہ مقامات مشہور ہو گئے۔ یہاں پہلی اہمیت خاندان اور قبیلہ کو ہے، اس نظام میں باہمی محبت واخوت کا جذبہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ لوگ بیرونی مداخلت کو پسند نہیں کرتے اور خود ہی اپنے مسائل طے کرتے ہیں۔ ان میں جو معمر و بزرگِ خاندان ہوتے ہیں ان کی عزت اور ادب واحترام بہت زیادہ ہوتا ہے۔ یہ بزرگ "سپین گرے" (سفید ریش) یا "مشران" (بزرگانِ کہن سال)

کہلاتے ہیں اور ہر فردِ قبیلہ کا اخلاقی فرض ہوتا ہے کہ وہ ان کی عزت و توقیر کریں اور ان کے احکام و مشورہ کے مطابق عمل کریں، جن کا تجربہ زندگی نوجوانوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔

قبیلہ کے نزاعی معاملات ان بزرگوں کی مجلس ہی میں طے پاتے ہیں۔ اگر کسی دوسرے قبیلے سے نزاع ہو تو اسے بھی مجلس شوریٰ میں لایا جاتا ہے۔ سب مل کر ایک جگہ بیٹھتے ہیں۔ اس اجتماع کو "جرگہ" کہا جاتا ہے۔ جرگہ کے انتخاب کے لئے کوئی تحریری آئین موجود نہیں ہے بلکہ غیر تحریری آئین کی روایات کے مطابق قدیم دستور پر اس کی بنیاد ہوتی ہے۔ یہاں آزادیٔ رائے کا بہت احترام کیا جاتا ہے، جس پر آج کل کی دنیا میں اس قدر نعرہ دیا جاتا ہے۔ اس کا سادہ، عملی اور مؤثر نمونہ اگر دیکھنا ہو تو ان قبائلی بھائیوں کی زندگی اور ان کے نظامِ معیشت کو دیکھئے۔ یہاں ہر چھوٹے بڑے کی رائے کو وقعت دی جاتی ہے۔ ہر ایک کو بولنے کا حق ہے اور اس کی گفتار کو سنا اور سمجھا جاتا ہے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بزرگوں کی رائے کو نوجوان قبول نہیں کرتے۔ ایک طرف فیصلہ کن بات نہیں ہو سکتی تو بحث و نظر کا سلسلہ کئی کئی روز تک چلتا رہتا ہے تا آنکہ دونوں فریق ایک دوسرے کو قائل کر دیتے ہیں جب تک یہ نوبت نہ آ جائے جرگہ برخاست نہیں ہوتا اور علی العموم کوئی نہ کوئی فیصلہ ہو ہی جاتا ہے۔ اور اگر بفرضِ محال، ایسا نہ بھی ہوا تو دونوں فریقوں کو آزادیٔ عمل کی گنجائش دے دی جاتی ہے جس طرح بزرگوں کو "مشران" کہا جاتا ہے، اس طرح نوجوانوں کو جو شوریٰ میں شریک ہوں "کشران" کہا جاتا ہے۔ اگر، فرض کیجئے۔ مدافعت و حفاظت کا معاملہ درپیش ہے اور بیرونی حملہ کا خطرہ محسوس ہوتا ہے تو اس معاملہ میں مشران اپنا فیصلہ سنا دیتے ہیں۔ اس کے بعد کشران کو پوری آزادی ہوتی ہے کہ وہ جس روش کو چاہیں اختیار کریں اس کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر مدافعت کے موقع پر ایک فریق نبرد آزما ہے تو دوسری جماعت گفتگوئے مصالحت کے لئے آزاد رہتی ہے اور حتی الامکان مسئلہ طے کر دیا جاتا ہے۔ جملہ معاملات و مسائل میں جرگہ کا فیصلہ آخری اور حتمی سمجھا جاتا ہے اور اس کی تعمیل سے انکار نہیں کیا جاتا۔

گو ان قبائل کے رسوم اور دستورِ معیشت کا کوئی مقررہ تحریری قانون نہیں ہے مگر اس کے باوجود ان میں یکجہتی اور اخوت کا جذبہ اس قدر قوی ہوتا ہے کہ بندھن ٹوٹنے نہیں پاتا۔ حلِ مسائل کے سلسلے میں شریعتِ اسلامیہ سے رجوع کیا جاتا ہے اور اس کی حجت و دلیل فیصلہ کن عنصر ثابت ہوتی ہے۔ یہ جرگے ایک طرح سے عدالتِ مجاز بھی ہوتے ہیں اور قانونِ ملک کے مطابق فیصلے صادر کرتے ہیں۔ نیز "امر بالمعروف" پر عمل کرایا جاتا ہے۔ تبلیغِ دین کو بالخصوص نظر میں رکھا جاتا ہے۔ اگر جرگہ کے فیصلوں کی کوئی توہین کرے تو اس کا سماجی بائیکاٹ کر دیا جاتا ہے بلکہ جلاوطنی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اول تو سماجی بائیکاٹ ہی کافی مؤثر حربہ ثابت ہوتا ہے، ورنہ زیادہ سخت سزائیں دی جاتی ہیں۔ اس طرح جرگہ کا بھرم برقرار رہتا ہے اور اس نظام کا تار و پود بکھرنے نہیں پاتا۔ معتقد راشخاص میں علما و مشائخ کو خصوصی احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

اگر ہم جانبِ بلوچستان نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ یہاں کے قبائل میں جرگہ کا رواج خانِ قلات، خان نصیر خانِ اعظم کے عہد میں شروع ہوا جن کا عہد حکومت ۱۷۴۱ء سے ۱۷۹۵ء تک رہا۔ یہ جو عام طور پر مشہور ہے کہ یہاں سے پہلے انگریز ایجنٹ گورنر جنرل سر رابرٹ سنڈیمن نے جرگہ کا رواج چلایا تھا، تاریخی اعتبار سے غلط ہے خان نصیر خان خود ایک اعلیٰ مدبر اور آزمودہ جرنیل تھا جس نے احمد شاہ ابدالی کے ساتھ مل کر پانی پت کی تیسری لڑائی (۱۷۶۱ء) میں مرہٹوں کے خلاف دادِ شجاعت دی تھی اور جب وہ میدانِ جنگ سے واپس آئے تو ملک کے نظم و نسق کو بہتر بنانے کے لئے کئی اصلاحات رائج کیں۔ مثلاً انہوں نے یہ کیا کہ ضلع ڈیرہ غازی خاں سے بحیرۂ عرب تک کی قبائلی آبادیوں کو ایک وفاق میں تبدیل کر دیا جس کے سربراہ وہ خود تھے۔ اس وفاق میں بلوچ، براہوی، جاٹ اور دیہوار وغیرہ بہت سے قبائل بھی شریک ہو گئے تھے۔ خان نصیر خاں نے انہیں محبت و اخوت کے رشتہ میں منسلک کیا اور نظم و نسق کے معاملات میں ان کو شریک کر کے ذمہ داریاں سونپ دیں۔ اس سلسلے میں خود خانِ اعظم مجالس شوریٰ مرتب کرتا تھا جس میں قبیلوں کے بزرگ اور نمائندے شریک ہوتے اور انہیں اپنے اپنے علاقوں کے کام سپرد کئے جاتے تھے۔ ان بزرگوں کے اپنے اپنے مشاورتی اجلاس بھی ہوتے رہتے تھے اور اندرونی معاملات قبائل کو ان جرگوں میں طے کیا جاتا تھا۔ انگریزوں کے زمانے میں اس قسم کے مشاورتی اور مصالحتی جرگوں کو "شاہی جرگہ" کہا

خطاب دیا گیا تھا مگر جب مملکت خداداد پاکستان وجود میں آئی تو انگریز دور [illegible] کا یہ لفظ "شاہی" ترک کر دیا گیا۔ اب ہر ضلع یا ڈویژن میں [illegible] اپنا جرگہ یا مجلس شوریٰ ہے۔

بلوچستان میں سبی کا علاقہ آزاد قبائل کا خصوصی گہوارہ ہے۔ جہاں کے قبائل کا ذکر "آئینِ اکبری" میں بھی آیا ہے، اس وقت بھی یہ مقام قلمرو اکبر میں شامل تھا اور صوبۂ ملتان کا جزو تھا۔ اس وقت اس کی آمدنی موجودہ سکہ میں ۹۶۷،۳۴۹ روپے تھی۔

جس وقت ۱۹۴۸ء میں قائد اعظمؒ سبی تشریف لائے تو انہوں نے ایک عظیم الشان جرگہ سے بھی خطاب کیا تھا، وہ پہلے سربراہ مملکت تھے جنہوں نے اس جرگہ کو اتنی اہمیت دی اور ضلع سبی کے جرگہ کو اپنی تشریف آوری سے نوازا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مملکت پاکستان کے ساتھ ان غیور آزاد قبائل کا رشتہ اور بھی مضبوط [illegible] برقرار ہے۔

گذشتہ سال شہرۂ آفاق مورخ پروفیسر آرنلڈ ٹوائن بی کوئٹہ تشریف لائے تو ان کی توجہ اس امر کی طرف دلائی گئی کہ جرگہ سسٹم اور بنیادی جمہوریتوں کے اداروں میں، جو موجودہ حکومت کی مساعی کا فیض ہے، کہاں تک مماثلت ہے اور اس سلسلہ میں ان کی رائے کیا ہے، تو انہوں نے یہ الفاظ فرمائے تھے:-

"بنیادی جمہوریتیں قبائلی جرگوں سے ہی پیدا ہوئی ہیں، اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ بنیادی جمہوریتوں کے ادارے جرگوں کی ہی مرتّمہ ہیئت ہیں، تو غلط نہ ہوگا۔"

جرگہ سسٹم کو پنچایت سسٹم کا مماثل بھی نہیں سمجھنا چاہیئے کیونکہ پنچایت کے پاس عدالتی اختیارات مدغم ہیں اور قبائل کے اندرونی مسائل و معاملات جو روزمرہ پیش آتے ہیں ان جرگوں کے ذریعے ہی طے ہوتے رہتے ہیں۔

بلوچستان میں "سردار"، بزرگان قبیلہ اور وہ حضرات جنہیں اصطلاحاً "معتبر" کہا جاتا ہے، جرگہ کے رکن سمجھے جاتے ہیں۔ جرگہ کے کسی رکن کی وفات کے بعد اس کا بیٹا اس رکنیت کا اہل سمجھا جاتا ہے اور اس بات کی سفارش پولیٹیکل ایجنٹ سے کی جاتی ہے۔ رکنیت کے لئے صرف صحیح الفہم آدمی ہونا کافی ہے، اگر اس میں اعلیٰ تعلیم و تربیت کے بھی جوہر موجود ہوں تو بڑی خوبی کی بات سمجھی جاتی ہے۔

یہاں جرگہ کے فیصلوں کو مجسٹریٹوں کی تصدیق کے لئے بھی پیش کیا جاتا ہے، مگر وہ ان فیصلوں میں مداخلت نہیں کرتے، اگر کبھی ضرورت پڑتی ہے تو کسی مسئلہ کو پھر جرگہ میں مزید غور و توجہ کے لئے بھیج دیا جاتا ہے۔ اگر اس کے بعد بھی جرگہ کا فیصلہ وہی رہا جو پہلے تھا، تو اسے بدلا نہیں جاتا۔

مختصر یہ کہ روحِ آزادی اور نظام جمہوریت کو برقرار رکھنے میں ان جرگوں نے تاریخ کے ہر دور میں بڑا مفید کام کیا ہے۔ اور اب جبکہ فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی مساعیٔ پُرخلوص نے بنیادی جمہوریتوں کے اداروں کو ملک کے ہر ہر گوشے میں قائم و مستحکم کر دیا ہے، ان جرگوں کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔

جوہری توانائی : —— بقیہ صفحہ ۴۷

ابتدائی واقفیت حاصل کر لیں اور ایک سادہ آلہ گیگر کاؤنٹر اپنے ساتھ رکھیں تو وہ تابکار عناصر کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ گیگر کاؤنٹر کی اندرونی ساخت زیادہ پیچیدہ نہیں ہوتی اور نہ اسے سمجھنے ہی کی کوئی خاص ضرورت ہے۔ یہ آلہ تابکار شعاعوں سے فوراً متاثر ہوتا ہے اور استعمال کرنے والے کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں کوئی تابکار دھات موجود ہے یا نہیں۔ پاکستان کے بعض حصوں میں کچھ معدنی کانیں موجود ہیں بہت ممکن ہے کہ ان کے نزدیک ہی تابکاری دھاتوں کے ذخائر بھی چھپے ہوں لیکن یہ ضروری نہیں ہے۔ ان دھاتوں کا پتہ لگانا ایک دلچسپ کام ہونے کے علاوہ منفعت بخش بھی ہے اور موجودہ تقاضوں کے پیش نظر ایک قومی خدمت بھی۔ ہمارے اسکاؤٹوں کو پہاڑوں اور گھومنے پھرنے والے حضرات کا یہ خوش آئند فرض ہے کہ وہ اس خدمت کو انجام دیں۔

لندن
جنیوا
روم
بیروت
تہران
کراچی

PIA

707

پی-آئی-اے- ترقی کی راہ پر

پی- آئی- اے بوئنگ ۷۰۷ انٹرکانٹیننٹل کے کمانڈر دنیا کے پہلے غیر امریکی پائلٹ ہیں جو فیڈرل ایوی ایشن ایجنسی امریکہ کے سند یافتہ ہیں۔
نہایت قلیل عرصہ میں پی۔ آئی۔ اے کی سروس کا معیار اتنا بلند ہوگیا ہے کہ تجربہ کار بین الاقوامی مسافر بھی اس کی تعریف کرتے ہیں۔
پی۔ آئی۔ اے۔ کی دن دُونی رات چوگنی ترقی کی وجہ صرف ہماری کارگزاری ہی نہیں ہے بلکہ اس میں آپ کا تعاون بدرجہ اتم شامل ہے اور ہم آپ دونوں کے لئے یہ باعث فخر کارنامہ ہے۔

پاکستان انٹرنیشنل ایرلائنز

تفصیلات اپنے سفری ایجنٹ یا پی۔ آئی۔ اے، مکلب روڈ۔ کراچی سے دریافت فرمایئے۔ ٹیلیفون نمبر ۵۱۰۰۹۱/ دس لائنیں
کارگو کا دفتر:- سیفی ہاؤس کچہری روڈ۔ کراچی۔ ٹیلیفون نمبر ۵۱۰۰۳۵۵۱/ تین لائنیں۔

فکاهیه :

"کھیتوں کو دے لو پانی ...!"

اختر رشدی

"میں کہتی ہوں، آپ کس پر برس رہے تھے؟"

"برستا کس پر - وهی صاجزادے بلند اقبال ! ناک میں دم کر رکھا ہے ان لوگوں نے - غضب خدا کا امتحان کے دن آپہنچے اور تعلیم سے غفلت کا یه حال ہے که ابھی جو باهر سے آیا تو کیا دیکھتا هوں میرے قدموں کی آهٹ پاتے ہی، جھٹ، کیمسٹری کی کتاب اوپر رکھ لی ، نیچے دیکھا تو " نقاب پوش ڈاکو ،، — !

،،خیر ! خیر ! جانے دیجئے - میں خود اسے سمجھادونگی بیشک یه ناول پڑھنے کا زمانه نہیں ہے ،،

" اس عمر میں بھی آدمی کو اتنا شعور تو هونا هی چاهئے که کس مصنف کو پڑھے - کیسا ادب پڑھے - لغو مطالعه سے بھلا کیا حاصل هوتا ہے ان لوگوں کو -

"هاں یه بات تو صحیح ہے" -

"وهی تو میں رو رها هوں که ان لڑکوں نے اپنا کیا هدڑا بنا رکھا ہے - لباس دیکھو تو وه لغو - حو ہے ٹیڈی بوائے بنا پھر رها ہے - کمره دیکھو تو فلمسٹار کے کمره کا گمان هو ! - ذرا صاحبزادے کے بال دیکھئے - نکٹائیوں کی قطار کتابوں کی قطار سے لمبی نظر آتی ہے - یه تو حال ہے ان لوگوں کا - میں جھوٹ تھوڑی کہه رها هوں - آؤ میرے ساتھ آکر جاوید کا کمره خود چلکر دیکھ لو ——،،

(وقفه)

اکبر : "یه دیکھئے - لتا منگیشکر کے گانے زبانی یاد کئے جارہے ہیں ——! دیکھئے هاتھ میں "سٹوری گانے،، کی کتاب ہے یا نہیں—— !،،

رفیه : " غضب کر رکھا ہے تم نے، جاوید، نالائق کہیں کے ! ،،

اکبر : "اور یه،، "جین،، کب سلوائی تم نے ؟

جاوید : "اباجی میری نہیں ہے ، صغیر کی ہے - اس نے سلوائی تھی مگر جب سے پرنسپل نے منع کیا ہے کوئی لڑکا پہن کر نہیں جاتا——،،

اکبر : کیا خیال ہے کوئی بڑا معقول لباس ہے یه؟،،

جاوید : (دبی زبان سے) مجھے تو کوئی خاص عیب نظر نہیں آتا - اخلاقی نقطئہ نظر سے دیکھئے تو ستر پوش بھی ہے "

اکبر : ارے میاں ! ستر پوشی سے کیا مطلب ! - سوال تو موزونیت کا ہے - "جین" پہنکر پڑھنے کے لئے جانا کوئی معقول حرکت ہے -

رقیہ : "ہاں یہ تو بالکل قاعدہ کی بات ہے - اور پھر پرانی مثل سناؤں، آدمی کھائے من بھاتا ، مگر پہنے جگ بھاتا "-

جاوید : "مگر اب تو اس کا فیشن ہوگیا ہے، امی "

اکبر : "اس فیشن کی وبا ہی کا تو میں بھی رونا رو رہا ہوں - دوسروں کی کوئی اچھی بات تو ہم سیکھتے نہیں ، بری باتیں فوراً لپک لیتے ہیں"-

جاوید : "میرا خیال ہے امی ، ناول بینی میں کچھ وقت ہی کٹ جاتا ہے - اس سے تو بہتر ہے کہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ مل کر مظاہروں کی ہلڑ بازی میں شریک ہوں - ایجیٹیشن میں شریک ہو کر ———"

رقیہ : نا ، بھیا ، ٹھیک ہے - تم ہرگز ایسے قصوں میں نہ پڑنا - نا ، بیٹا - اگر خدا نہ کرے تجھے کچھ ہو گیا ، گرفتار ہوگیا ، یا کچھ اور ہو گیا ———"

اکبر : اجی جو جیسا کریگا ، بھریگا - سر پھٹوائیں گے ، جیل جائیں گے اور کیا کریں گے ؟

جاوید : لوگ کہتے ہیں کہ کامک پڑھنے سے معلومات بڑھتی ہے -

اکبر : خاک بڑھتی ہے - ان میں کیا ہوتا ہے - لغو قصے - مہمل کارٹون - فضول لطیفے اور ہیجان انگیز کہانیاں ، تصویریں ، یا کچھ اور بھی ہوتا ہے - میں نے ابھی برسوں کہا تھا کہ یہ جو تعلیمی کمیشن کی رپورٹ کا خلاصہ چھپا ہے اسے پڑھنا اور پڑھکر مجھے اپنے نقطئہ نظر سے رائے دینا - آپ نے ایسا کیا -

جاوید : جی ہاں -

اکبر : شکر ہے ! کوئی کام کی چیز پڑھی تو - اچھا ، پھر کیا سمجھا؟

جاوید : کئی باتوں کی - میرا مطلب ہے سفارشوں کی - اہمیت مجھ پر واضح نہیں ہے -

اکبر : مثلاً ؟

جاوید : مثلاً یہ کہ آئندہ جامعات میں داخلہ پر حدبندیاں قائم کردی گئی ہیں - میری رائے میں یہ تعلیم کا "راشن" ہے -

اکبر : خیر تمہاری بات تھوڑی دیر کے لئے مان لیتا ہوں ، راشن ہی سہی - مگر راشن غلط تو نہیں ہوتا کوئی اصول اس کے پیچھے ہوتا ہے - پھر ان پابندیوں کے خلاف آپ کیا کہنا چاہتے ہیں - مثلاً یہی کہ کورس تین سال کا کردیا - بہت اچھا کیا - اب رہ گیا یہ سوال کہ دسویں جماعت پر روک قائم کردی جائے گی کہ آگے جو پڑھے پہلے اپنی صلاحیت کا ثبوت دے - ہر اہم معاملہ میں "اسکریننگ" کرنا اچھا ہوتا ہے اس میں تو اور بھی ضروری ہے -

جاوید : وہ کیوں ؟

اکبر : وہ یوں کہ ہر طالبعلم کا اپنا اپنا رجحان ہوتا ہے -

ہم خرما و ہم ثواب : پڑھو بھی اور سیکھو بھی

بہتوں کے ذہن نہیں چلتے - کسی کے حالات اجازت نہیں دیتے - کسی کا رجحان کچھ ہے اور تعلیم کچھ حاصل کرنا ہے - چنانچہ جامعات میں بھیڑ ہے کہ جمع ہوتی چلی جاتی ہے - لڑکیوں کو ستانا، اور اگر تنبیہہ کی جائے تو غرانا، بس یہ سیکھا آپ نے اور کیا سیکھا ہے ؟ جس نے میٹرک کا پاسپورٹ مرمر کر حاصل کرلیا سیدھا کالج پہنچ گیا - امتحانوں کے نتیجے دیکھ لیجئے کیسے آتے ہیں -

جاوید : ہم کیا کریں استاد پڑھاتے ہی نہیں -

اکبر : کسی حد تک یہ بات مان لیتا ہوں - اسٹاف ناکافی ہے - مجھے بھی یہ ہے - ساز و سامان مکمل نہیں، ٹھیک ہے - مگر اتنی بڑی بھیڑ، بلکہ بقول شخصے "مجمع ناجائز" کو سنبھالنے کے لئے کتنا بھی اسٹاف ہو، عمارتیں ہوں، معیار تعلیم و تدریس جبتک ٹھیک نہ ہو اچھے نتائج پیدا نہیں کر سکتا -

جاوید : اور یہ امتحانات کا طریقہ ؟

اکبر : وہ تو خیر بدل ہی جائیگا - سفارش مان لی گئی ہے اور ابتدائی طور پر کام بھی شروع کردیا گیا ہے کہ ۲۰ فی صد مارک کلاس کے کام پر دئیے جائینگے اور سوالات کا ڈھب بھی بدلیگا - میرے کہنے کا مطلب تو یہ ہے کہ اب جامعاتی تعلیم کا ڈھانچہ ہی بدل جائے گا -

جاوید : شاید اب ہم جیسے لوگ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکینگے - اعلی تعلیم مہنگی اتنی کردی گئی ہے -

اکبر : غلط خیال ہے تمہارا - صرف اتنا ہوگا کہ وہی پڑھ سکیں گے جنہیں پڑھنا ہے اور جو پڑھائی سے کچھ لابھ بھی اٹھا سکینگے - اس میں امیر، غریب، متوسط، کسی کا خیال نہ کیا جائے گا - صرف میلان اور صلاحیت دیکھی جائے گی - رہ گیا مہنگا کردینے کا سوال، تو وہ میں مان لیتا ہوں - مگر ساتھ ہی یہ بھی تو سوچو کہ اگر بہتر، اعلی، اور معیاری تعلیم حاصل کرنی ہے تو وہ سستے داموں کیسے حاصل ہوسکتی ہے ؟ - ذرا حساب لگا کر سمجھادو ـــــ ساری دنیا ہی مہنگائی کا شکار ہے اس وقت ـــــ تو پاکستان کیسے بچ سکتا ہے ؟ کیوں، کیا خیال ہے تمہارا ؟ کیا ایسی ڈگری جو اب ملتی ہے کس مصرف کی ہے ؟

رقیہ : میں نے تو سنا ہے کہ یہاں کی ڈگری وگری باہر والے مانتے ہی نہیں "

اکبر : کیسے . مان لیں - معیار تعلیم واقعی گھٹا ہوا ہے - وہ لوگ تو تب ہی کسی درسگاہ میں داخلہ دیتے ہیں جب صلاحیت اور رجحان دیکھ لیتے ہیں -

رقیہ : اچھا تو جو لڑکے داخلہ نہ پاسکینگے وہ کیا ڈنڈے بجاتے پھرینگے؟

اکبر : نہیں، نہیں، ڈنڈے کیوں بجاتے پھریں گے - کسی ٹیکنیکل کام میں لگ سکتے ہیں - رات کو پڑھ کر، دن کو کام کرکے، پڑھائی، تربیت، سب کچھ حاصل کرسکتے ہیں - ضرورت صرف محنت اور لگن کی ہے - اور پھر یہ کوئی ضروری تو نہیں کہ ہر ایک کے ماتھے پر "ایم - اے" "بی اے" کی ڈگری چپکی ہوئی ہو - اتنی کاغذی ڈگریاں کس کام آئیں اور کتنی آئینگی؟ -

جاوید : ہاں اباجی، یہ تو میں بھی مانتا ہوں کہ بہت لڑکے بلا وجہ کالجوں میں داخلہ لے لیتے ہیں - ان کی تعلیمی لیاقت ان سے یہی کہتی ہے کہ اب کوئی اور کام سیکھیں -

رقیہ : خیر وہ تو چلو مان لیا میں نے ۔ مگر یہ تین تین سال کا کورس کیوں نگوڑوں نے کر دیا ؟"

اکبر : لو بھئی سنا تم نے، جاوید ، تمہاری امی کی بھی وہی بات ہے کہ ساری داستان سن لی اور پھر بھی پتہ نہ چلا کہ زلیخا عورت تھی یا مرد! ۔

جاوید : امی، ہاں، بات تو ٹھیک ہے ۔ اب لیاقت کو بڑھانے کا پورا موقع مل سکیگا اور پھر ۲۵ فیصد نمبر کلاس کے کام پر ملینگے ۔ یہ بھی بالکل ٹھیک ہوا ۔ لڑکوں کے رزلٹ خراب آتے تھے، اس کے لئے یہ کیا گیا ہے ۔ اب اعلیٰ تعلیم کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے ۔ یعنی میٹرک کے معیار تک پڑھنے کے بعد ہی دیکھا جائیگا کہ جامعاتی تعلیم کے لئے کوئی شخص موزوں ہے یا نہیں ۔ جو موزوں ہوں گے انہیں روکا نہیں جائیگا، اور جو نا موزوں ہوں گے انہیں دوسروں کے لئے راہ صاف کرنی پڑیگی ۔ قاعدہ کی بات ہے ۔ اب تعلیم صحیح معنوں میں کسی ڈھرے پر پڑیگی اور، میاں، یہ بھی اس حکومت کے زمانے میں ہو گیا، ورنہ اس سے پہلے تک تو وہی نظام تعلیم جو حضور لارڈ میکالے اور سرکار لارڈ ولزلی بہادر کا عطا کیا ہوا تھا وہی ہمارے سر منڈھا ہوا تھا اور نہ جانے کبتک منڈھا رہتا ؟ ۔

جاوید : جی ہاں، نئی تعلیمی رد و بدل سے ایک بات تو ضرور ہو جائیگی کہ جس کو کوئی ہنر، کوئی ٹکنیکل کام، کوئی خاص ادبی یا سائنٹفک درجہ اختصاص حاصل کرنا ہوگا وہی جامعات میں جاکر کچھ پاسکیگا ۔ باقی حضرات اپنی سیٹوں پر تشریف رکھیں گے !"

اکبر : بھئی خوب کہا! شاباش! ۔ اب تم نے کچھ سمجھ کی بات کی ہے ۔

رقیہ : میں کہتی ہوں کہ آج باتوں ہی سے پیٹ بھرنا ہے یا کچھ کھانے وغیرہ کا بھی خیال ہے ۔ کب کا ٹھنڈا ہو رہا ہے ۔

اکبر : ارے بھئی ! ہاں — وہ تو میں اپنے لیکچر کی دھن میں بھول ہی گیا ۔ مگر ویسے پوچھتا ہوں، کیا خاص چیز پکی ہے ؟

رقیہ : کباب ہیں ۔

اکبر : آپ کے اپنے ——؟

رقیہ : توبہ ! میرے کباب کیوں ہوتے ۔ مچھلی کے —!

اکبر : ہاں ، ہاں ، وہی تو میرا بھی مطلب ہے ، کہ آپ کے اپنے ہاتھ کے کباب ۔ جو ہوتے ہیں بڑے مزے کے ۔ آؤ، جاوید، کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے !

* * *

جلد ۱۴ ماہِ نو شمارہ ۷

جولائی ۱۹۶۱ء

مدیر : ظفر قریشی

سالانہ چندہ : ۵ روپے ۵۰ پیسہ

شائع کردہ : ادارۂ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس ۱۸۳ - کراچی

فی کاپی : ۵۰ پیسہ

"میرا پیام اور ہے"

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان

امسال عیدالاضحیٰ کے موقع پر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، صدر پاکستان نے قوم کے نام جو پیغام نشر فرمایا وہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اور اس قابل ہے کہ اس پر بار بار غور کیا جائے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جس طرح آج سے کوئی سو سال پہلے، اپنے زمانہ کے مخصوص حالات کے تحت سرسید علیہ الرحمۃ نے نشاۃ اولیٰ کا آغاز کیا تھا، اسی طرح صدر پاکستان ایک نشاۃ الثانیہ کی داغ بیل ڈال رہے ہیں جس کا دائرہ بوجوہ وسیع تر معلوم ہوتا ہے اور نتائج اور بھی دور رس۔ وہ معاشرہ کے باطن میں انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں جس سے خارج میں خود بخود انقلاب پیدا ہونا لازم ہے۔ سرسید ہی کی طرح وہ بھی جدید نئے تقاضوں کو اور عالمی ماحول کے پیشِ نظر عقل و خرد کو شمع راہ بنانے اور علم و حکمت سے حیاتِ تازہ پیدا کرنے کے خواہاں ہیں جو تمام تر تعمیر و ترقی کا جہان ہو۔ عیدالاضحیٰ کی تقریب سعید پر جو تقریر کی گئی اس میں جدید تقاضوں کی طرف اعتنا پر زور دیا گیا ہے اور عقل، سائنس، ٹکنالوجی کی ترویج و ترقی کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ اور مذہب کے روایتی مردہ، بے جان اور بے اثر پہلو کی بجائے اس کے حقیقی، زندہ، حرکیاتی، حیات افروز پہلو کو اپنانے کی تاکید کی گئی ہے جو موجودہ شدید کشمکشِ حیات کے زمانے میں شرطِ زندگی بھی ہے اور شرطِ بقا بھی (ادارہ)

عیدالاضحیٰ کا مبارک دن اس عظیم الشان قربانی کی یادگار ہے جو محض اللہ کی راہ میں، اس کی خوشنودی کے لئے، مکمل بے غرضی کے ساتھ پیش کی گئی تھی۔

اگر مسلمانوں نے اس جذبہ کی صحیح روح پر عمل کیا ہوتا تو آج دنیا میں ان کی حالت کچھ اور ہوتی۔ لیکن قربانی کی رسم تو باقی رہ گئی اور اس کے پیچھے جو ابراہیمی روح تھی وہ روایات میں کھو گئی۔

یہ حال صرف قربانی کی رسم ہی کا نہیں ہوا بلکہ اسلام کے بہت سے دوسرے سنہری اصولوں کا بھی یہی حشر ہوا ہے۔ صدیوں سے ہم نے مذہب کو علمی زیادہ اور عملی کم بنا رکھا ہے۔ علم میں بھی ہم نے مذہب کی روح کو روایات میں جکڑ کر ماضی کا قیدی بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے کے اکثر لوگ کتابی اسلام سے تو ضرور کچھ نہ کچھ واقف ہیں لیکن مذہب کے اس پہلو سے بہت دور ہیں جو زندگی کا لازمی حصہ ہونا چاہئے۔

بڑھتی ہوئی تعلیم اور ترقی کے اس زمانے میں زندگی کی رفتار بے حد تیز ہو گئی ہے اور انسان کا ذہن بہت سی ان حدود سے آزاد ہو گیا ہے جو بے علمی یا کم علمی کی وجہ سے قائم تھیں۔ آج کا ذہن صرف اسی بات کو قبول کرے گا جو سائنس اور علم کے اس عجیب و غریب دور میں اسے مطمئن کر سکے۔ اگر ہم نے مذہب کو ماضی کی چار دیواری میں قید رکھا تو یہ خطرہ ہے کہ حال و مستقبل کے بہت سے لوگ لادینی کا شکار ہو جائیں گے۔

عزیز ہم وطنو! ہم لوگ اس بات پر فخر کرنے کے عادی ہیں کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس میں ہر زمانے اور ہر جائز ترقی کا ساتھ دینے کی صلاحیت موجود ہے۔ لیکن یہ دعویٰ صرف بیان کر دینے ہی سے ثابت نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کو عملی طور پر بھی ثابت کر کے دکھائیں۔

اس مقصد کے لئے دو باتیں بہت لازمی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم اسلام کے اصولوں کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کریں اور دوسرے یہ کہ اپنے زمانے اور ماحول کی روشنی میں ان پر عمل کرنے کی نئی نئی راہیں تلاش کریں۔

جہاں تک اسلام کے اصولوں کا تعلق ہے، انہیں خود

اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں وضاحت سے بیان فرمادیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اگرچہ قرآن شریف تبرک کے طور پر پڑھا اور پڑھایا تو ضرور جاتا ہے لیکن اس کو سمجھنے کی زیادہ کوشش نہیں کی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے عقائد اور عمل میں ایک بہت بڑی خلیج حائل ہوگئی ہے۔

اصول خواہ وہ دینی ہوں یا دنیاوی، اس لئے نہیں بنائے جاتے کہ ان کو بت بناکر ان کی پوجا کی جائے۔ اصول تو صرف اس لئے بنتے ہیں کہ ان پر صحیح طور پر عمل کیا جائے۔ اصول اپنی جگہ بنیادی ہوتے ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں آیا کرتی۔ لیکن اصولوں پر چلنے کے انداز ہر زمانے اور ہر ماحول کے مطابق ترقی کرتے رہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو علم اور عمل الگ الگ راہوں پر چلنے لگتے ہیں اور ان میں کوئی رابطہ قائم نہیں رہ سکتا۔

مثال کے طور پر جب بجلی پیدا کرنے کا اصول ایجاد ہوا تو پہلے پہلے جو شخص بجلی کو ہاتھ لگاتا تھا اسے صرف جھٹکے لگتے تھے۔ پھر جیسے جیسے انسان کا علم بڑھتا گیا ویسے ویسے بجلی کو استعمال کرنے کے نئے نئے طریقے بھی نکلتے گئے چنانچہ آج اسی بجلی سے روشنی پیدا ہوتی ہے، پنکھے چلتے ہیں، وائرلیس اور ٹیلی ویژن کی لہریں پھیلتی ہیں اور بڑے بڑے طاقت والے ہوائی جہاز اڑتے ہیں۔ ان سب ترقیوں کے باوجود بجلی کی حقیقت اور اس کو بنانے کے بنیادی اصول اپنی جگہ قائم ہیں اور ان میں کسی قسم کا بھی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔

کچھ ایسا ہی حال روحانی دنیا کا ہے۔ اسلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے اصول ازلی اور ابدی ہیں اور ان پر ہر زمانہ اپنے تقاضوں کے مطابق چل سکتا ہے۔ سنت، حدیث اور فقہ سب اسی بات کا ثبوت ہیں۔ یہ سب ہمارے لئے روشنی کے مینار ہیں جو ہمیں بتاتے ہیں کہ کس زمانے میں اور کن کن حالات میں خدا کے احکام پر کس کس طرح عمل کیا گیا۔

عزیز ہم وطنو! روشنی کے مینار رہنمائی کے لئے ہوتے ہیں، جمود کے لئے نہیں۔ جمود تو تاریکی میں بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ ترقی کا راز تو یہ ہے کہ ہم اسلام کے بنیادی اصولوں کو اچھی طرح سمجھیں۔ ان پر ثابت قدم رہیں اور پھر ماضی کو مشعل راہ بناکر حال اور مستقبل کی دنیا میں عمل کی نئی نئی راہیں تلاش کریں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو اسلام تو اپنی جگہ سلامت رہے گا لیکن مسلمان دنیا اور آخرت کی زندگی میں بہت پیچھے رہ جائ[یں گے]۔ یہ ایک بہت بڑا ظلم ہوگا کیونکہ اسلام فقط اپنی ذات کے لئے زندہ ر[ہنے] نہیں آیا بلکہ مسلمانوں کو سربلندی کے ساتھ زندہ رکھنے آیا ہے۔ اس [دنیا] میں بھی اور دوسری دنیا میں بھی۔

ایک اور ضروری بات جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ [ہے] کہ اسلام کی جتنی ضرورت پاکستان کو ہے اتنی کسی اور کو نہیں۔ اگر خدانخو[استہ] دنیا کے دوسرے ملک اسلام سے دور بھی ہو جائیں تو آخرت کا حا[ل] اللہ ہی بہتر جانتا ہے، کم از کم اس دنیا میں ان کی قومیت اپنی جگہ ق[ائم] اور سلامت رہے گی۔ پاکستان کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ہما[را] ملک اسلام کے نام پر بنا ہے اور صرف اسی نام پر یہ زندہ بھی رہ سک[تا] ہے۔ اسلام کے علاوہ ہماری قومیت اور سالمیت کی اور کوئی بنیاد ن[ہیں]۔ یہ بنیاد صرف تصور اور نظریہ پر نہیں بلکہ عمل پر قائم رہ سکتی ہے جیسے جیسے ہمارے ایمان اور عمل میں ہم آہنگی بڑھتی جائے گی ویسے ہی پاکستان کا [استحکام] مضبوط ہوتا جائے گا۔ لیکن اگر ہمارے ایمان اور عمل میں تضاد پید[ا] ہوتا گیا تو شدید خطرہ ہے کہ پاکستان کا وجود بھی کھوکھلا ہو کر منتشر [ہونے] لگے گا۔ لہٰذا اگر روحانی اور اخلاقی مقاصد کے لئے نہیں تو کم از کم قومی بقا اور سلامتی کے لئے ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی چ[ارہ] نہیں کہ ہم اسلام کا دامن مضبوطی سے پکڑ کر رکھیں اور اس پر سچا[ئی اور] خلوص سے عمل کریں۔

اسلام کا دامن مضبوطی سے تھامنے کا بہترین ذریعہ یہ ہے [کہ] ہم قرآن کریم کو زیادہ سے زیادہ پڑھیں، اس کی حکمت اور احکام [پر] غور کریں اور پھر اپنے نئے اور پرانے علم کی روشنی میں وہ راستے تلاش کریں جن پر چل کر ہم آجکل کی دنیا میں ہر لحاظ سے اچھے مسلمان اور اچھے انس[ان] بن کر رہ سکیں۔

عزیز ہم وطنو! میں آپ سے پرزور اپیل کرتا ہوں کہ اس مقصد [کو] پورا کرنے کے لئے آپ اپنے علم اور عمل کی ساری صلاحیتوں کو پورے طور [پر] کام میں لائیں۔ اس کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ جہاں جہاں کسی سر[کاری،] غیر سرکاری یا ذاتی مجلس یا تقریب میں قرآن شریف کی تلاوت کی جائ[ے] وہاں ان آیات کا آسان اور عام فہم ترجمہ بھی ضرور سنایا جائے اور پھر اس بات پر روشنی ڈالی جائے کہ ان آیات میں جو جو احکام یا اصول بیان ہو[ئے] ہیں، آج کل کی زندگی میں ان پر کس طرح عمل کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ صرف

ذاتی یا انفرادی طور پر ہی نہیں بلکہ ایک منظم تحریک کے طور پر جلد از جلد شروع ہونا چاہیئے تاکہ ہم اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تعمیل کر سکیں جس میں بار بار یہ تاکید کی گئی ہے کہ قرآن شریف کی آیات پر غور و فکر کرو تاکہ ان کی حکمت اور بصیرت کا نور حاصل کر سکو۔ اس سلسلہ میں عوام کے نمائندہ ادارے مثلاً بنیادی جمہوریتوں کی مختلف کونسلیں، کارپوریشنیں، میونسپل کمیٹیاں وغیرہ بہت بڑا کام کر سکتی ہیں۔ میں ان سب سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ باضابطہ پروگرام بنا کر، وسیع پیمانہ پر اس تحریک کو شروع کریں تاکہ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے علاوہ ہر گاؤں، ہر گلی، ہر محلہ میں قرآن پاک کے درس جاری ہو جائیں۔ جن میں قرآن پاک کی تعلیم اور اس پر عمل کرنے کے طریقوں پر خاص طور سے زور دیا جائے۔ جہالت اور گمراہی کے خلاف یہ ایک ایسا جہاد ہے جس میں ہر مسلمان کو ایک جانباز سپاہی کی طرح شامل ہونا چاہیئے۔ خاص طور پر اس طبقہ کو بھی اس طرف توجہ دینی چاہیئے جو تعلیم یافتہ اور مہذب ہے اور جسے ہم INTELLIGENTSIA کے نام سے پکارتے ہیں۔ تاکہ مذہب کو ایک دقیانوسی چیز سمجھ کر اس کا مذاق اڑانے کا فیشن ختم ہو جائے اور یہ طبقہ پاکستان کی آزادی اور نصب العین کی حفاظت اور رہنمائی کر سکے۔ اگر ہم نے غفلت سے کام لیا اور خدا کی بتائی ہوئی صراط مستقیم کی صحیح طور پر تلاش نہ کی تو مجھے ڈر ہے کہ ہمارا روحانی، اخلاقی، مادی اور قومی وجود بے اندازہ خطرہ میں پڑ جائیگا۔

میری درخواست ہے کہ آپ میری اپیل پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں۔ خدا آپ کا مددگار ہو۔

پاکستان پائندہ باد!

★

★

ہم مسلمان ہیں۔ جمہوریت کے بنیادی اصول، مساوات اور اخوت، ہمارے مذہب کے بنیادی اصول ہیں ہم نسلی تعصبات سے پاک ہیں۔ جمہوریت کی روح کوئی ایسی چیز نہیں جو ہمارے لئے نئی ہو اور جسے ہمیں سیکھنے کی ضرورت ہو۔ ہمیں جس چیز کے سیکھنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ جمہوریت کا کونسا طریقہ ہمارے لئے موزوں ہے۔ اس وجہ سے ہمارے بارے میں بعض اوقات غلط فہمیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ اصل چیز جمہوریت ہے یعنی جمہوریت کا اصول اور اس کی تعلیم نہ کہ کوئی مخصوص طریقہ یا نظام جمہوریت۔ جو شے برقرار رہنی چاہیئے وہ اس کی اصل روح ہے۔ فی الحقیقت ہم کوئی ایسا جمہوری نظام اپنے ملک میں جاری کرنا نہیں چاہتے جس کے تحت کوئی ایسی پارلیمنٹ جس کی جڑیں خود ہمارے عوام کے دلوں میں پیوست نہ ہوں، منتخب ہو کر آجائے ۞

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان

★

"زرِ داغِ دل"

(ایک کتاب ایک جائزہ)

ریاض احمد

یہ زیر نظر تصنیف کا پہلا بے لاگ اور مبصرانہ جائزہ ہے جس میں اس کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تبصرہ کے سیر حاصل ہونے کے باوجود بعض دقیق پہلو معرض بحث میں نہیں آئے۔ اور بعض آراء سے اختلاف کی گنجائش بھی ہے۔ بنا بریں جناب رفیق خاور اگلے شمارہ میں اس موضوع پر مزید روشنی ڈالیں گے ——— ادارہ

عبدالعزیز خالد کی طویل نظموں کا مجموعہ "زرِ داغِ دل" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ مجموعہ کئی اعتبار سے جاذبِ توجہ ہے۔ ان صوری خوبیوں سے قطع نظر جن کے لئے "مکتبۂ شعور" یقیناً قابلِ مبارک باد ہے، اس مجموعہ کے متعلق سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس میں مصنف نے صرف طویل نظموں کو ہی شامل کیا ہے کسی نظم کی طوالت یا اختصار بجائے خود کسی اہمیت کی حامل ہو یا نہ ہو، لیکن جدید اردو نظم کی مختصر تاریخ کو مدنظر رکھا جائے تو طویل نظموں کی اشاعت یقیناً اس امر کی شاہد ہے کہ آج سے پندرہ بیس برس پیشتر جس روایت نے جنم لیا تھا وہ مسلسل ارتقاء پذیر ہے۔ غزل کے مقابلہ میں نظم کی ترویج کے محرکات میں سب سے اہم تسلسل تھا لیکن ۱۸۷۴ء کے بعد تقریباً ۱۹۴۰ء تک یہ تصور پوری طرح ہمارے سامنے نہ آسکا۔ اس تسلسل پر مثنوی، قصیدے، اور ترجیع بند وغیرہ (جو قدیم مسلسل نظم کی نمائندگی کرتے تھے) کی چھاپ بدستور قائم رہی۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ خیال کی بنیادی اکائی کا ارتقاء اور پھیلاؤ قدیم نظم میں مفقود تھا۔ قصہ کا تسلسل یا ایک ہی موضوع کی مختلف کیفیات کے سلسلوں کو احاطہ کرنے کی کوشش کے مقابلے میں جدید نظم نے یہ احساس دلایا کہ ایک بنیادی خیال کو جس طرح ایک شعر میں پابند کیا جا سکتا ہے، اسی طرح اس خیال کو، اس کے جملہ تلازمات کے ساتھ ایک نظم میں بھی پابند کیا جا سکتا ہے۔ ابتداء میں اس خیال کو نسبتاً اختصار کے ساتھ ہی پیش کرنے کی سعی کی جاتی رہی ہے۔ چنانچہ جدید نظم کے بیشتر مجموعے مختصر نظموں پر ہی مشتمل ہیں۔

طویل نظم کے حق میں رجحان آزادی کے بعد ہی نمو پذیر ہوا ہے۔ راشد، یوسف ظفر، مختار صدیقی، قیوم نظر اور ضیا جالندھری کی طویل نظموں کے علاوہ ان کے بعد آنے والے شعراء میں سے رضی ترمذی بخصوص قابلِ ذکر ہے۔ جس کے منظوم ڈرامے، تمثیل نگاری اور شاعری دونوں کے اعتبار سے قابلِ قدر ہیں۔ اور اسی لحاظ سے عبدالعزیز خالد کی طویل نظموں کا مجموعہ دیکھ کر یقیناً خوشی ہوتی ہے کہ اردو نظم کی رفتار کسی ایک مقام پر تھم نہیں گئی۔

طویل نظم کا مطالعہ بہر حال نسبتاً زیادہ توجہ اور محنت کا تقاضا کرتا ہے۔ ہماری مشکل اس سلسلہ میں یہ بھی ہے کہ ہم نظم اور شعر میں طوالت کو برداشت کرنے کے بالعموم عادی نہیں ہیں۔ ہماری محبوب صنفِ سخن غزل تھی۔ اس کے بعد یہ مقام جدید نظم کو حاصل ہوا جس کا سرمایہ مختصر نظموں پر ہی مشتمل ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ مختصر نظم میں تاثر کی اکائی جس آسانی سے بس میں آجاتی ہے، وہ طویل نظم میں تخلیق کی حالت میں ممکن ہے نہ مطالعہ کے وقت۔ ویسے بھی مختصر نظم میں تاثر کی شدت، اور طرفگی و ندرت کو پالینا نسبتاً آسان ہے۔ اس کے برعکس طویل نظم میں اس سے قطع نظر کہ زبان و بیان کے ایک معیار کو برقرار رکھنا مشکل ہوتا ہے، نظم کے تار و پود میں مسلسل اور یکساں طور پر جذبے کی شدت اور زاویۂ نظر کے اچھوتے پن کو برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔ طویل نظم میں نسبتاً کمزور اور غیر دلچسپ ٹکڑوں کا در آنا کم و بیش لازمی ہے۔ تاہم مختصر نظم کی کیفیت کچھ ایسی ہے جیسے زندگی کے غم اور مسرت سے کسی نے چند لمحے چرا لئے ہوں۔ ان کی حلاوت اور شیرینی شاید اسی باعث زیادہ محسوس ہونے لگتی ہے۔ لیکن طویل نظم جس تعمیر، ارتقائی عمل اور مسلسل توجہ کا تقاضا کرتی ہے، اس کی مثال کچھ ایسی ہے جیسے کوئی پوری زندگی کو ساتھ لے کر نکلے اور

ظاہر ہے کہ زندگی میں یکسانیت کی تلاش عبث ہے۔ پست و بلند، تلخ و شیریں، سبھی کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اور اسی سبب طویل نظم۔ خصوصاً طویل نظم کے مجموعے ــــ کے متعلق ایک نظر میں کوئی خوشگوار تاثر قائم نہیں ہونے پاتا۔ توجہ اور محنت سے مطالعہ کے بعد البتہ اس کا حسن کچھ نظر آنے لگتا ہے۔ زیرِ نظر مجموعے کے متعلق بھی یہ بات درست ہے۔ تاہم ان نظموں میں فکر و نظر کی گہرائی، زبان و بیان کا حسن، شکوہ اور ان سب سے بڑھ کر، ایک تعمیری قوت کی موجودگی، اکثر و بیشتر محسوس ہوتی ہے اگرچہ یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ ان میں تکنیک کی یکسانیت نے انہیں کسی قدر بوجھل بھی بنا دیا ہے۔ اور وہ نازک فنی تال میل جو رضی ترمذی کے ڈراموں یا ضیا جالندھری کی نظم میں ملتا ہے، یہاں مفقود ہے۔

مصنف کے قول کے مطابق ان نظموں کی بنیادی کہانی مغربی مصنفین کے ہاں سے اخذ کی گئی ہے۔ البتہ اس کے بیان میں مصنف نے اپنے مزاج، وجدان اور شعور کو راہبر بنایا ہے۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ ان نظموں کے بنیادی خیال، فلسفہ یا فکری پہلو سے گریز کر کے صرف ان نظموں کے اندازِ پیشکش پر توجہ مرکوز کی جائے۔

جہاں تک کہانی کے مفہوم کا تعلق ہے، ان نظموں کے مطالعہ سے اس کی وضاحت نہیں ہوتی۔ کہانی سے مراد غالباً واقعات کی ترتیب ہوا کرتی ہے لیکن اکثر نظموں میں کچھ اتنے واقعات بھی نہیں ہیں جن سے کہانی کے پلاٹ کا تصور پیدا ہو سکے۔ اکثر و بیشتر نظموں میں ایک داخلی کشمکش کا ذکر ہے۔ لیکن اس داخلی کشمکش سے خارجی طور پر کچھ ایسے تصادم رونما نہیں ہوتے جنہیں ڈرامے کے پلاٹ پر محمول کیا جا سکے۔ ان نظموں میں قصے کی گنجائش تو کہیں بھی نہیں ہے البتہ بنیادی کشمکش سے ڈرامہ تخلیق ہو سکتا تھا۔ مثلاً شمعون اور دلیلہ کا قصہ ہمارے لئے اجنبی نہیں ہے۔ لیکن اس قصے کا آغاز اس مقام سے کیا گیا ہے جہاں شمعون بصارت کھو چکا ہے۔ اور اپنی حالت پر نوحہ کناں ہے۔ اس کے بعد کے واقعات کو بھی کنایتاً ہی ظاہر کیا گیا ہے۔ مثلاً جب شمعون اہلِ غازہ کی طرب گاہ کے ستون منہدم کر دیتا ہے تو اس منظر کا بیان نہیں ہے۔ بلکہ صرف اسے ایک راوی کی زبان سے ایک خبر کی صورت میں ظاہر کیا گیا ہے۔ اور وہ خبر بھی محض اتنی کہ شمعونِ جگر دار نے سقف و بام کو اہلِ غازہ پر گرا دیا اور خود بھی نیچے دب کر شہید ہو گیا۔

چنانچہ ان نظموں میں کہانی کا عنصر برائے نام ہی ہے۔ اور ڈرامے کی پوری کیفیت بھی پیدا نہیں ہوتی۔

مصنف نے ان نظموں کے لئے تمثیلی کا لفظ اختیار کیا ہے۔ لیکن سوئے اتفاق سے "تمثیلی" کا مفہوم اردو تنقید میں ابھی متعین نہیں ہو سکا۔ ایک طرف تو تمثیلی (ALLEGORICAL) کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور دوسری طرف ہم ڈرامے کے لئے بھی "تمثیل" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ نظموں کے مطالعے کے بعد یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی نوعیت پہلے معنوں میں تمثیلی نہیں ہے۔ بلکہ تمثیلی کا لفظ ان کی ہیئت کی رعایت سے اختیار کیا گیا ہے۔ ان تمام نظموں میں مصنف کا انداز یہ ہے کہ ہر نظم میں چند کردار ہیں جن کی زبان سے مختلف خیالات اور جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ محض اس اہتمام سے ڈراما پیدا نہیں ہو سکتا۔ زیادہ سے زیادہ ان نظموں کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ مکالمات ہیں۔ اور مکالمات بھی (REFLECTIVE) یعنی بعض کردار اخذ کر لئے ہیں۔ جو گویا بزبانِ حال بعض حقائق کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس اعتبار سے ان نظموں میں شاید (ALLEGORY) کا شائبہ پیدا بھی ہو جائے۔ لیکن ہر نظم میں کردار ایسے معروف اور تاریخی نہیں جن کی واردات کے حوالے سے تمثیل کی توضیح کی جا سکے۔ "سوزِ ناتمام"۔ "آتشِ گل"۔ "طوفانِ نوح"۔ "محدِ سنگ جستہ" وغیرہ میں آدم، حوا، ہابیل، قابیل، قیس، لیلیٰ، نوح اور اُن کے فرزند، مانی، شمعون، دلیلہ وغیرہ ہمارے لئے غیر معروف نہیں ہیں لیکن دوسری نظموں کے کردار اس تشخص سے محروم ہیں جو ان کرداروں کو حاصل ہے۔ بعض جگہ نام ضرور اس طرح کے اختیار کئے گئے ہیں جن میں معنوی رمزیت موجود ہے مثلاً "پردۂ حائل" میں "نومرد"۔ "نازاد" وغیرہ۔ دوسرے مقامات پر ناموں کی معنوی تخصیص بھی وضاحت سے سامنے نہیں آتی۔ چنانچہ تمثیل میں حقیقت کی جو دو نہیں ہیش نظر رکھی جاتی ہیں وہ ان نظموں میں موجود نہیں۔ چنانچہ دوسری صورت یہی تھی کہ مکالمات ڈرامے کا اندازِ گفتگو اختیار کر لیتے۔ لیکن بعض نظموں کو چھوڑ کر، ان مکالموں کی طوالت ان کا (REFLETIVE) اسلوب اور کم و بیش کتابی انداز، انہیں زیادہ سے زیادہ خود کلامی کے قریب لانے میں کامیاب ہو سکا ہے۔ آخری نظم "مشتِ غبار" میں البتہ کسی قدر ڈرامے کے عمل اور مکالمہ کا رنگ نمایاں ہو گیا ہے۔

شاید مکالموں کے اس انداز کے باعث اکثر مقامات پر نظموں میں کچھ الجھاؤ بھی پیدا ہو گیا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ مختلف کرداروں کے باہمی تعلقات پوری طرح نمایاں نہیں ہو سکے مثلاً "جہانِ نو" میں صبحینہ اور حاجب کے کردار تو کچھ کھلتے ہیں لیکن آذر، شعلہ آب پیک نور وغیرہ کی موجودگی کا جواز اور اہمیت سمجھ میں نہیں آتی۔ اسی طرح "پردۂ حائل" میں لبادہ، جو غالباً جھوٹے تشخص کی علامت ہے، بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اس لبادہ کا جھوٹا پن، اور اُسے چھوڑ کر "نومرد" کو کیا فضیلت حاصل ہوتی ہے؟ یہ الجھن بدستور قائم رہتی ہے۔ "بازارِ حیات" میں یہ الجھاؤ غالباً سب سے زیادہ ہے۔ اس نظم میں صرف مانی کا کردار سمجھ میں آتا ہے۔ اس کی کشمکش کا حال کچھ کھلتا ہے۔ لیکن آسمار، مرجانہ وغیرہ کی کشمکش ایک گتھی بن کر رہ گئی ہے۔ "رقصِ شرر" میں کہانی سیدھی سادی ہے اور اس قسم کی الجھن کا احساس نہیں ہوتا۔ لیکن اس میں بعض مقامات کچھ اس طرح کمزوری اور تخفیف کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں کہ تاثر کمزور ہو جاتا ہے۔ مثلاً اس نظم میں یہ مقام بڑا ڈرامائی ہے کہ شہاب انجم کا عاشق ہے اور جب نغمہ سے انجم کے لئے سوال کرتا ہے تو نغمہ اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتی ہے کہ وہ خود اس کا طالب ہے۔ لیکن یہ فریب کیونکر پیدا ہوا، نظم کے تار و پود میں اس کا جواز موجود نہیں۔ بس یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہمیں یہ فرض کر لینا چاہئے کہ ایسا ہو گیا ہے اس کے فوراً ہی بعد یہ فریب شکستہ ہو جاتا ہے۔ اور نغمہ عالمِ غیظ و غضب میں عاشق و معشوق کو چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ اس مقام پر نظم کو ایک تہنیت کے بند پر ختم کر دیا گیا ہے۔ ذہن میں یہ سوال بار بار اُبھرتا ہے کہ آخر اس تصادم کا انجام کیا ہوا؟ دراصل جس مقام پر اس نظم کو ختم کیا گیا ہے وہ اس کا نقطۂ عروج نہیں ہے بلکہ تصادم کی پہلی منزل ہے۔ یہ کچھ اس نظم تک ہی محدود نہیں بعض دوسرے موقعوں پر بھی وہ مقامات جو کہانی کو ایک نیا موڑ دیتے ہیں اور ڈرامائی عمل کے اعتبار سے اہم ہیں، کمزور رہ گئے ہیں۔ "سوزِ ناتمام" میں قابیل کے کردار کو ایک غیر مطمئن اور متفکرانہ طبیعت والے شخص کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن جب قابیل "نذر" کے قبول نہ ہونے پر یک بیک ہابیل کو قتل کر دیتا ہے تو وہاں اشتعال کے لئے مناسب جواز موجود نہیں ہے۔

اس سلسلے میں شاید ایک اور امر کا ذکر بھی ضروری ہو۔ اور وہ یہ کہ بعض نظموں میں تاریخی تواتر کو بُری طرح دھچکا لگتا ہے۔ اس کی ایک مثال تو ہمیں "فریبِ ہستی" میں نظر آتی ہے، جہاں باعور خالد، اقبال، میر، اور غالب کا ذکر کرتا ہے اور پھر تاثیر اور جگر کو اپنے مصاحبین کے طور پر طلب کرتا ہے۔ وہ فریبِ نظر جو باعور کو عہدِ عتیق کا ایک انسان بنا کر پیش کرنے سے قائم ہوا تھا وہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اور پھر یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ تاثیر و جگر ہی کیوں ہوں! کوئی بھی اور شاعر ہو سکتا تھا۔ اسی طرح ایک دوسرے مقام پر لتا اور مدھوبالا وغیرہ کا ذکر ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اگر عہدِ حاضر کی ان شخصیتوں کے ذکر سے مقصود یہ تھا کہ ان کے معروف کردار ہمارے لئے تمثیل کے گہرے اسرار و رموز کو سمجھنے میں ممد و معاون ثابت ہونگے تو پھر "فریبِ ہستی" میں ہیلن کی جگہ بھی کوئی اور فتنۂ دوراں ہو سکتی تھی۔

الجھاؤ کی بعض صورتوں کا تعلق زبان و بیان سے بھی ہے۔ ان نظموں میں شاعر نے خاصی مغلق اور پُر تکلف زبان استعمال کی ہے۔ لیکن اس کے سلیقے نے اکثر مقامات پر اسے عیب نہیں بننے دیا۔ ایسے مواقع کچھ کم نہیں ہیں۔ جہاں بیان میں جوش، ولولہ، اور شکوہ بہت حد تک اسی زبان کا مرہونِ منت ہے۔ بالعموم زبان سلجھی ہوئی اور خوش آئند ہے۔ زبانِ شعر کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافے کی یہ کوشش بھلی ہی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس خوبی کے باعث بعض مقامات پر جو لغزشیں ہوئی ہیں وہ کھٹکنے لگتی ہیں۔ مثلاً یہ حصہ دیکھئے:۔

کیا تو نغمہ کو بتائے گا۔ مجھے انجم سے
اس سے جو صاحبِ اورنگ کی بنتِ عم ہے
دعویٔ عشق ہے۔ مجھ کو مری منصف ملکہ
میں جو ہوں تیری حکومت کا وزیرِ مختار
جس کے اعزاز میں ہے جشنِ چراغاں برپا
جس کی پرکارِ تدبر ہے محیطِ آفاق
جس اولوالعزم کی فرزانگی و ہمت کے
تیری اقلیم کئی کے در و دیوار گواہ
دے مجھے میرے شب و روز کی خدمت کا صلہ

اس سارے بند میں نیا فقرہ یوں بنتا ہے: کیا تو نغمہ کو بتائے گا مجھے انجم سے دعویٔ عشق ہے۔ مجھ کو مری منصف ملکہ۔ دے مجھے شب و روز کی خدمت کا صلہ۔ اس کے علاوہ ذیلی جملوں میں بھی کئی جگہ گڑبڑ ہے۔

مثلاً کیا تو نغمہ کو بتانے گا؟ - کہ تجھے انجم سے دعویٰ عشق ہے" باکی جگہ انگریزی کے اسلوب کے پیش نظر "مجھے انجم سے دعویٰ عشق ہے،
تیری اقلیم کئی کے درو دیوار گواہ میں ـــ "ہیں" کا حذف بھی یہاں کھٹکتا ہے۔

اوپر جو ٹکڑا پیش کیا گیا ہے اسے پورے مصرعوں کی صورت میں لکھا گیا ہے ۔لیکن دوسرے مقامات پر شاعر نے اسے روا رکھا ہے کہ مصرعوں میں حسب ضرورت تخفیف کر لی جائے ۔ یا ایک ہی مصرع کو توڑ کر دو یا تین سطروں میں لکھ لیا جائے - اس بند میں اس اصول کو ملحوظ رکھا جاتا تو مستحسن تھا - اس سے تفہیم میں سہولت پیدا ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ زبان کے استعمال میں بھی بعض جگہ بے احتیاطی ہو گئی ہے مثلاً :

آپ کیوں ہوگئیں غیظ و غضب سے برہم
اس کے احسان مودّت سے گراں بار تھی میں
اخترِ شامِ غریباں ہو کہ یا نجمِ سحر
ہے یہ تصویر اسی حسنِ نوازش کا ثبوت

(یہاں اعتراف کا محل تھا)

خود فروشی کی نوامیس سے غداری کی
اعتراف اس کے محاسن کی برومندی کا
ایک توحید کے فرزند کو توفیق نہیں
بارِ احساں سے مرے گردن و بازو خم ہیں

(بازو خم ہونا محلِ نظر ہے)

جہاں تک ان نظموں کی عروضی ساخت کا تعلق ہے ایک نکتہ قابل غور ہے۔ جس کی توضیح مصنف نے خود ہی کر دی ہے۔ ان نظموں میں قاری کو اکثر و بیشتر جھٹکے سے محسوس ہوئے ہوں گے ۔ اور اس نے جابجا آہنگ کو بظاہر ٹوٹتا ہوا سا پایا ہوگا علمائے عروض کے نزدیک یہ مسئلہ مسلم ہے کہ جہاں تین حرکتیں پے درپے واقع ہوں وہاں درمیانی حرکت کو، یعنی حرفِ اوسط کو ساکن کیا جا سکتا ہے ۔ اسے اصطلاح میں "تسکینِ اوسط" کہتے ہیں (فعلاتن کی عین کو ساکن کرنے سے مفعولن - متفاعلن ساکن کرنے سے متفعلن ۔ مفاعلتن کا ل ساکن کرنے سے مفاعیلن)۔اس زحاف کے استعمال پر کوئی پابندی نہیں، بشرطِ ضرورت ہر بحر میں، ہر جگہ، اس کو بے تکلف کام میں لایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ زحاف کے اس استعمال سے بعض دلچسپ صورتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ نظم آزاد میں ہم نے مصرعوں کی تخفیف یا مکالمے کی صورت میں مصرعوں کو توڑ کر لکھنے کا تجربہ پہلے بھی کیا ہے - اور چند مثالیں ہیں ایسی بھی مل جائیں گی جہاں ایک سے زائد بحور کے ارکان کو ایک ہی بند میں کامیابی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ یا ایک نظم کے دو بندوں میں مختلف بحوریں اختیار کی ہیں ۔لیکن زحافات کے استعمال کی طرف بالعموم توجہ نہیں دی گئی - اس کی ایک وجہ غالباً یہ ہو کہ علم عروض سے فی زمانہ گہری واقفیت شعرا کو نہیں ہے ۔جتنی اساتذہ کو ہوا کرتی تھی - اس علم کے ماہر اب ہم میں بہت کم رہ گئے ہیں۔ اور کلاسیکی کتابوں کے علاوہ جدید تنقیدی کتابوں میں بھی اس علم پر موزوں مباحث موجود ہیں۔ پرانی کتابوں سے کسی بھی علم کو حاصل کرنے کے لئے قدم قدم پر استاد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ۔چنانچہ آج کا شاعر تقطیع کے بنیادی مسائل سے واقفیت کے بعد مزید تلاش و جستجو کو لاحاصل سمجھ کر ترک ہی کر دیتا ہے - اردو میں عروضی ڈھانچے کے تغیر و تبدّل کا احساس عظمت اللہ سے لے کر آج تک بدستور موجود ہے - لیکن اس ضمن میں معدودے چند کوششوں کے علاوہ کوئی مستقل اور گہری علمی بحث نہیں ملتی ۔عظمت اللہ نے بھی اس مصیبت سے چھٹکارے کا سہل علاج یہی خیال کیا تھا کہ پنگل کو اپنا لیا جائے ۔عملی طور پر جدید نظم گوؤں نے متعدد تجربات کئے ہیں - ان تجربات سے بحث کا یہ موقع نہیں۔ لیکن اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ زحاف کے اصول کو سمجھ کر استعمال کرنے کی کوئی کوشش ہمارے پیش نظر نہیں ہے ۔صرف حفیظ نے ایک نظم میں جسے اس نے پنجابی آہنگ پر منضبط کرنے کی کوشش کی تھی ۔صدر اور ابتدا میں زحاف کو استعمال کیا ہے (جی نڈھال ہے زقت یا رمیں)۔

زیرِ نظر مجموعے میں مصنف نے صرف دو بحریں استعمال کی ہیں۔

(۱) بحرِ مجتث مثمن مخبون ـــ مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن
(۲) بحرِ رمل مثمن مخبون ـــ فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

عروض و ضرب میں فعلن کی مقصور، محذوف، مرفوع، مشعث صورتیں یعنی فعلان، فیلان، فِعِلن، فِعلن اور اول الذکر بحر میں فعل یا فعل وغیرہ بھی جائز ہیں ۔ دوسری بحر میں صدر و ابتدا میں سالم و مخبون یعنی فاعلاتن اور فعلاتن کا اجتماع جائز ہے - اس کے علاوہ اساتذہ نے حشو میں فاعلاتن کا استعمال بھی جائز رکھا ہے اور تسکین اوسط کے اصول کے تحت فعلاتن دونوں بحروں میں

مفعولن سے بدل سکتا ہے۔ اس زحاف کی شاخیں اساتذہ کے ہاں موجود ضرور ہیں لیکن خال خال اور ابتدائی اساتذہ کو چھوڑ کر بعد میں تو یوں نظر آتا ہے کہ محض عروض دانی کے ادعا کی تسکین کے لئے اساتذہ نے اس بناء پر معرکوں کے بازار گرم کئے۔ اس کی ایک مثال دورِ حاضر میں یاسؔ یگانہ اور ثاقبؔ لکھنوی کا معرکہ ہے۔ جہاں یاسؔ نے بحر منسرح میں چند شعر زحاف کے اصول کے تحت کہہ کر شعراء کو تقطیع کی دعوت دی اور پھر ان کی لغزشوں پر تبصرہ کیا۔

بحر مجتث میں یہ زحاف محض ایک مقام پر یعنی حشوِ اول میں واقع ہو سکتا ہے جس سے فعلاتن مفعولن سے بدل دیا جاتا ہے۔ اس کی مثالیں فارسی اور اردو دونوں میں جگہ جگہ موجود ہیں ۔۔۔ مثلاً:

کسی کو ہر / گز اپنا / نہ جانیو / اے شادؔ
مفاعلن مفعولن مفاعلن فعلان

کہ دشمن / جاں ہوتا / ہے بھائی بھا / ئی کا
مفاعلن مفعولن مفاعلن فعلن

کسی کا جا / ہ و ثروت / نظر نہیں / آتا
خراب ہو جیو خانہ یہ خود نمائی کا
مفاعلن فعِلاتن مفاعلن فعلن

بنا سمجھ / کے خمِ زلف عنبریں کا تو
اثر کرے نہ کہیں زہرِ مار رشتے میں
خدا سلا / مت رکھے / بتوں کی ٹھو / کر کو
کہ یہ جگا / تی ہے سوئے / ہوئے مقدر کو
چلے چلو / دل آگا / ہ کے اشا / رے پر
مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن

محال و ممکن سب اس / کے اختیا / ر میں ہے
مفاعلن فعولن مفاعلن فعِلن

بحرِ رمل میں البتہ یہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں ہے۔ اس بحر میں زحاف کی مندرجہ ذیل صورتیں ممکن ہیں:

۱۔ صدر و ابتدا میں سالم اور مخبون کا اجتماع یعنی فاعلاتن اور فعِلاتن۔ یہ عام طور پر رائج ہے۔

۲۔ حشو میں بعض اوقات فاعلاتن لے آتے ہیں۔ یہ اردو میں رائج نہیں ہے، فارسی میں بھی ایک آدھ ہی مثال مل سکے گی۔

۳۔ فعلاتن کو ہر جگہ تسکینِ اوسط سے فعولن سے بدل سکتے ہیں۔ فارسی میں اس کی مثالیں استادوں کے ہاں مل جاتی ہیں۔ اردو میں بہت کم مثالیں نظر آتی ہیں:۔

کیا فقط ان / کے نچھاور / کے لئے لے / انشا؟
اپنی مٹھی / میں ہر اک غنچہ زر بستہ ہے
فاعلاتن فعلاتن مفعولن فعلن

اس پہ راضی ہو تو قرآن اٹھا لاؤں میں
رکھ تو اسے مصحف رو ہاتھ قسم کھاؤں میں
مفعولن
(امانت)

فارسی میں نسبتاً زیادہ مثالیں نظر آتی ہیں اور صدر و ابتدا اور حشو میں حسبِ ضرورت زحاف لے آتے ہیں لیکن اس ضمن میں جن چند مثالوں سے بالعموم استفادہ کیا جاتا ہے ان میں یہ زحاف صرف ایک رکن تک محدود رہا ہے۔ یہ نہیں ہوا ہے کہ ایک مصرع میں ایک سے زیادہ مقامات پر فعلاتن کو مفعولن سے بدل دیا گیا ہو۔ تاہم اصول جس طرح بیان ہوا ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ایک کی قید لازم نہیں۔ دراصل زحاف عروض کا ایک ایسا مسئلہ ہے کہ اس کی مدد سے ہماری بیشتر مشکلات حل ہو سکتی ہیں۔ اور اس سخت گیری سے جس سے ہم نجات کے خواہش مند ہیں اصول و ضوابط کی حدود کے اندر رہ کر آزادی حاصل کی جا سکتی ہے۔ زیرِ نظر مجموعے میں اس کی بعض دلچسپ مثالیں نظر آتی ہیں۔ جن کا احاطہ کرنا تو یہاں مقصود نہیں، البتہ چند مثالیں قابلِ توجہ ضرور ہیں۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے، بحر مجتث میں یہ زحاف صرف ایک مقام پر یعنی رکنِ دوم (فعلاتن) پر واقع ہو سکتا ہے۔ جس سے اس کی صورت مفعولن سے بدل جاتی ہے۔ بعض مقامات پر مصنف نے اس زحاف کا استعمال بڑی چابکدستی سے کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ حرکت کو سکون سے بدل دینے سے مصرع ایک ٹھہراؤ کا تقاضا کرے گا۔ اور جہاں پر ٹھہراؤ معنوی کیفیت سے ہم آہنگ ہو وہاں لطف سے

خالی نہ ہوگا۔ مثلاً یہ بند دیکھئے:

تمہارے مرنے کے بعد وہ وفا پیشہ
بجائے کلبۂ احزاں میں رونے دھونے کے
کسی دمن کسی عذرا کسی قلوپطرہ
کسی لتا کسی گیتا کسی مدھو بالا
کسی بھی نرگس شہلا پہ شیفتہ ہو کر
غم محبت کی داستاں سنائے گا

پہلے اور آخری مصرع میں زحاف واقع ہوا ہے۔ لیکن درمیان کے مصرعوں میں وزن پورا ہے۔ پڑھتے وقت پہلے مصرع میں زحاف کے باعث ایک دھیما پن پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسے کوئی سوچ سوچ کر کچھ کہہ رہا ہو۔ بعد کے مصرعوں میں وزن کے پورا ہونے سے ایک روانی آگئی ہے۔ بہاؤ کی یہ تیزی اُس شدتِ تاثر میں معاون ہے جسے تکرار کے ذریعے اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کے بعد جب فقرہ مکمل ہوا ہے تو پھر ایک ٹھہراؤ ہے۔ جیسے مقرر اپنے حاصل شدہ نتیجہ کو ٹھہر ٹھہر کر بیان کر رہا ہو کہ وہ سننے والے کے دل کی گہرائی میں اُتر جائے۔ اسی طرح بعض جگہ جہاں یہ زحاف متواتر مصرعوں میں واقع ہوا ہے۔ اس سے وزن میں ایک خوشگوار تبدیلی پیدا ہوگئی ہے جو ہر لحاظ سے مستحسن ہے۔

خرام آہو کا زمزمہ عنادل کا
خروش آب جُو کا سکوت ساحل کا
طلسم رنگ و بو کا فسون شمائل کا
صبا کی سرمستی اضطراب بادل کا
نمود تاروں کی جلوہ ماہِ کامل کا
یہ اہتمام مدارات دیدہ و دل کا
ہے شان پاک خدا لا الہ الا اللہ

ترجیع کے مصرع سے پہلے وزن کی تبدیلی یقیناً خوش آئند ہے۔ اور اس کی انشائیہ کیفیت سے ہم آہنگ ہے۔

جہاں تک بحر رمل کا تعلق ہے۔ اس میں مصنف نے زحاف کا بکثرت استعمال کیا ہے۔ ان مثالوں سے تو ظاہر ہے کہ یہاں بحث کی ضرورت نہیں جن میں صدر و ابتدا یا حشو میں کسی ایک مقام پر فعلاتن کو مفعولن سے بدلا گیا ہے کیونکہ اس کی مثالیں اردو فارسی میں محدود ہیں۔ البتہ اس قسم کی مثالیں ضرور بحث طلب ہیں جن میں یہ زحاف ایک سے زیادہ جگہوں پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس بات کا فیصلہ یقیناً آج کے شعراء اور اصحاب ذوق کے ہاتھ میں ہے کہ اس زحاف پر کسی حد تک پابندی ضروری ہے یا نہیں، زیر نظر کتاب میں مصنف نے تسکین اوسط کے اصول کو صرف ایک رکن تک محدود نہیں رکھا۔ ایسی مثالیں عام ہیں۔ جہاں ایک سے زائد مقامات پر زحاف استعمال ہوا ہے۔

مثال کے طور پر:-

ہنگام رستا خیز ہے آنکھیں کھولو
حالیجا ہا میں تو فقط اک باندی ہوں
مفعولن مفعولن فعلاتن فعلن
حا لوزا دے اجڑے کیسے رستے بستے
فاعلاتن مفعولن مفعولن فعلن

بات یہیں تک نہیں رک جاتی بلکہ اس سے آگے بڑھ کر بعض جگہ مصنف نے سارے مصرع میں ایک جگہ بھی رکن اصلی کا التزام نہیں کیا۔

سلمان اس استدعا کو دہراتا ہے۔

با ہر خطرہ کے بادل منڈلاتے ہیں
لیکن درا / دانہ تم / ٹھہرو
مفعولن مفعولن مفعولن
خوش اقبالی کا مژ / دہ لے کر / واپس
تب دردا / نہ کی خاطر / ہی رک جا / ؤ
بولو تم / کو ہم سے / کیا صدمہ / پہنچا
مفعولن مفعولن مفعولن فعلن
با ہر خطرہ کے با / دل منڈلا / تے ہیں

آخری دو مصرعوں میں اس امر کا امکان ہے کہ ان کی تقطیع یوں کی جائے:

بولو تم کو — ہم سے کیا صد — مہ پہنچا
فعلاتن فاعلاتن مفعولن

اس سے قطع نظر کہ رکن اول میں واؤ بری طرح گرتی ہے رکن ثانی میں فاعلاتن سالم آئے گا۔ اور عروض میں بجائے فعلا

یا فعلان کے مفعولن آتا ہے جو وزن اصلی سے بقدر ایک سبب زائد ہے۔ دوسرے، تیسرے اور چوتھے مصرعے میں اگر دوسرے رکن میں فعلاتن کی صورت قائم کی جائے تو تقطیع یوں ہوگی:

باہر خلا / ء کے بادل / منڈلا / تے ہیں

مفعولن فعلاتن مفعولن فع

خوش اقبا / لی کا مژدہ / لے کر دا / ر پس

ہر حال یہ صورتیں متنازعہ فیہ ہیں اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہمارے شعرا کی حسِ نغمہ و توازن اسے شرفِ قبولیت بخشتی ہے یا نہیں۔ روضی اعتبار سے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ مصرع مفعولن سہ بار اور فعلن ایک بار پر مشتمل ہو تو کیا یہ وزن بحر نقارب یا متدارک شمار نہیں ہوگا۔

اس کے علاوہ ان نظموں میں ایسی مثالوں کی بھی کمی نہیں ہاں ارکان بحر میں کمی بیشی سے کام لیا گیا ہے۔ یہ مثالیں دیکھئے:

شیروں کی جولانگہ رمنہ غزالوں کا بنی

شعلہ شعلہ شبنم شبنم تفتیدہ گداز

لے مصرع کی تقطیع یوں ہوگی:

شیروں کی جولاں گہ رمنہ غزالوں کا بنی

مفعولن مفعولن فع فعلاتن فعلن

س زائد فع سے چھٹکارا پانے کی صرف یہ صورت ہے کہ "شیروں کی" ں "وں" کو ساقط قرار دیا جائے (جو اپنی جگہ خود محلِ نظر ہے) اور تقطیع اس طرح کی جائے:

شیروں کی جو / لانگہ رمنہ غزالوں / کا بنی

فاعلاتن مفعولن فعلاتن فعلن

ی حال دوسرے مصرع کا بھی ہے، یعنی کہ "شعلہ" جہاں پہلی دفعہ یا ہے وہاں اس کی "ہ" ساقط قرار دی جائے۔ اسی قسم کی ب مثال یہ مصرع ہے۔ ؎

پھر بھی خاموش رہے تو / کفرانِ / نعمت ہے

ہاں رکنِ ثالث کے بعد ایک فع زائد ہے۔

اسی طرح یہ مصرع ہے: ؎

ان عشق بازوں کو پیماں کا پاس ہے کتنا

اور رکنِ اول کے پہلے جزو میں "ع" بھی تقطیع سے خارج ہے۔

اور مصرع دیکھئے جس میں ایک رکن عروض میں کم ہے۔ ؎

تم پہ آئینہ ہے کیفیتِ قلبِ تپاں

اس مصرع کی تقطیع بھی ایک عجب مشکل پیدا کرتی ہے:

اور اس سایۂ صرصر آوارہ سے

اگر "صرصر آوارہ" میں فکِ اضافت کو جائز سمجھا جائے تو آخر میں صرف فع رہ جاتا ہے۔ اور اگر اضافت وزن میں محسوب ہے تو رکنِ دوم بجائے فعلاتن کے صرف فعلن رہ جاتا ہے۔

مصرع کے رکنِ اول میں بعض جگہ مفعولن کی بجائے مفعولاتن استعمال کیا گیا ہے۔ ؎

رب الارباب نے بھیجا ہے مجھے تیری طرف

واضح الفاظ میں کہدو آخر

اوروں کی خاطرِ آزاد کو آزردۂ غم

کرتا ہوں نذرِ حضورِ ابلیس

یا پھر یوں ہے کہ "اوروں" میں "وں" دونوں تقطیع سے گر جاتے ہیں اور "کرتا ہوں" میں الف دبتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دونوں صورتیں مستحسن نہیں۔

ہو سکتا ہے کہ یہاں یہ سوال اٹھایا جائے کہ تقطیع میں حروف گرنے کی اس قسم کی مثالیں تو بہت عام ہیں، تو پھر یہاں ان پر گرفت کی آخر کیا وجہ ہے۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اصول بہر حال اصول ہے اور اس کا پاس لازم ہے۔ دوسرے یہ کہ جہاں حروف گرتے ہیں یا دب کر نکلتے ہیں، وہاں ناگوار محسوس ہوتے ہیں۔ اور تیسرے یہ کہ جب زحافات کی سہولتیں اتنی آزادی کے ساتھ عام طور پر لائی جائیں تو پھر مصرع میں دوسرے عیوب یا کمی بیشی کے لئے بہت کم جواز باقی رہ جاتا ہے چنانچہ ان نظموں میں ان کی موجودگی بری طرح کھٹکتی ہے۔ اس کے علاوہ بعض مثالیں ایسی بھی ہیں جنہیں عجز بیان کہا جا سکتا ہے اور وہ بھی اس وجہ سے زیادہ قابلِ گرفت نظر آنے لگتی ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ "زیرِ داغِ دل" کی نظموں کے متعلق جن خیالات کو اوپر پیش کیا گیا ہے ان سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ تبصرہ میں

باقی صفحہ ۵۱ پر

آزاد نظم کے سراغ میں

(۲)

رفیق خاور

اس شمارہ سے جناب رفیق خاور "ماہ نو" کے نگراں کی حیثیت سے ہمارے ادب، فکر و فن، نقد و نظر اور حیات ملیہ پر ایک سلسلۂ مضامین شروع کر رہے ہیں جس کی مختلف کڑیاں وقتاً فوقتاً آپ کے سامنے آتی رہیں گی۔ یہ مضمون اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ (ادارہ)

اردو میں آزاد شاعری کا آغاز کہیں دھندلکوں میں کھویا ہوا ہے۔ اور یہ اس لئے اور بھی عجیب ہے کہ اس کا آغاز نسبتاً حال ہی میں ہوا ہے۔ جبکہ ہمارے عہد کا ہر ہر پہلو، ہر ہر واقعہ ہماری نگاہوں کے سامنے ہے اور دھندلکوں کی بجائے ہر طرف روشنی ہی روشنی ہے۔ "ماہ نو" کے پچھلے شمارے میں ضمیر علی بدایونی صاحب نے بڑی ہی کد و کاوش کے ساتھ یورپ میں آزاد شاعری کی ابتداء کا سراغ لگایا ہے یہاں تک کہ اس صنف کے اولیں شاعر اور اولیں نظم کی نشان دہی بھی کی ہے۔ اب وقت ہے کہ ہم اپنی شاعری کی طرف رجوع کر کے اس صنف کے باوا آدم اور اس کی شعری کاوشوں کا پتہ چلائیں۔

اس صنف سخن کے ہمارے یہاں کتنے ہی نام ہیں۔ بے قافیہ یا غیر مقفیٰ شاعری، غیر پابند شاعری، نظم معرا، آزاد نظم، نظم رواں، بلینک ورس، فری ورس، ورس لبر۔ خبر نہیں یہ اس کی ہر دلعزیزی، محبوبیت یا حسن عالم فریب کا نتیجہ ہے۔ بسیار شیوہ ہست بتاں را کہ نام نیست ــــ یا ایک غیر واضح مطلق کو واضح تعین کی حدود میں لانے کی کوشش کا۔ یا پھر کسی انوکھی چیز کی تشخیص اور اس کو اسم و عرف سے روشناس کرنے کی سعی۔ بہر حال اس خواب کے سلسلہ میں کثرت تعبیر دلچسپی سے خالی نہیں۔

جہاں تک وزن کا تعلق ہے، بحث بہت پرانی ہے علم البیان میں وزن حقیقی و غیر حقیقی کا بہت کچھ تذکرہ ملتا ہے۔ اور یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ جہاں شاعری میں بالعموم پابند وزن ہی کام آتا ہے وہاں اس کے برعکس ایک بنیادی قسم کا آزاد آہنگ بھی موجود ہے۔ اور جس طرح نفس شعر آزاد ہے اسی طرح وزن حقیقی بھی قید و بند سے آزاد ہے۔ چنانچہ اس قسم کے وزن کی مثالیں بھی دی گئی ہیں۔ مولوی عبد الرحمٰن مرحوم کی "مرآۃ الشعر" میں اس کا تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے۔

بعض نے اس سلسلہ میں نثر مرجز و غیر مرجز کا ذکر بھی کیا ہے اور کہا ہے کہ اگر پابند وزن ہی سے آزادی مقصود ہے تو ان نثروں کی شکل پر آزاد شاعری ہمارے یہاں مدت ہائے مدید سے موجود ہے اور ہم یونہی اس یوسف گم گشتہ کی تلاش مغرب کے بازاروں میں کرتے رہے ہیں۔ یہ قول بوالعجبی بلکہ ستم ظریفی سے خالی نہیں کیونکہ اس سے ان ارباب دانش کی نفس معاملہ سے بنیادی لاعلمی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ نثریں بہر حال نثر ہیں نظم نہیں ہیں۔ اور اپنی ظاہرا آزادی کے باوجود، جو در حقیقت کوئی آزادی نہیں بلکہ پابند شاعری سے بھی زیادہ جکڑ بند کی شکار ہے، نظم آزاد سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں۔ آزاد شاعری کچھ بھی ہو آزاد بھی ہے اور شاعری بھی ہے۔ اس کا بنیادی وصف لازم لوچ ہے، لچک سیال پن ہے۔ بے روک ٹوک روانی ہے۔ اور ان اقسام نثر میں پابندی ہی پابندی ہے۔ آزاد شاعری جس بات سے بچنا چاہتی ہے، یہ نثریں اس کا التزام کرتی ہیں یعنی معین وقفوں پر رہ رہ کر رکاوٹ اور میکانیت جس سے مضمون ادا نہیں ہوتا بلکہ بند ہو جاتا ہے۔ اپنے دور کی شاعری کی طرح ان کا تعلق بھی ایک پابند وضع زمانے سے تھا۔ موجودہ زمانے کی برق رفتاری اور لوچ لچک نے ان کو چھوا نہ تھا۔ اور نہ چھو ہی سکتی تھی۔ خواہ ہم تیز رفتاری کے ادب و فن پر ناگزیر اثر کو تسلیم کریں یا نہ کریں تاہم یہ حقیقت ہے کہ نثر کا تصور بے حد میکانکی تھا اور ادائے مضمون پر

جو بے ساختہ بہاؤ ہونا چاہیئے ان نثروں میں اس کے بالکل برعکس کیفیت تھی

اس سے ایک بات بخوبی ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ دیگر جدید اصناف سخن کی طرح آزاد نظم بھی اُس دور نو کی پیداوار ہے جس کا ظہور اقوام مغرب کی آمد سے ہوا۔ یہ درحقیقت جدید نظم ہی کی ایک شاخ ہے اس لئے اس کے اسباب و علل اور محرکات بھی وہی ہیں۔ جن حالات نے جدید نظم کو جنم دیا وہی آزاد نظم کے معرض وجود میں آنے کا باعث بھی ہوئے۔ جیسے مغربی اثرات نے ہمیں مغربی شاعری کی طرف متوجہ کیا اسی طرح جملہ مغربی اصناف سخن کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہونے کی ترغیب بھی دلائی۔ دور اول کے نظم گو شعرا نے جس طرح مغربی شاعری کی وضع، اس کے موضوعات اور مضامین کو اپنایا، اسی طرح آزاد شاعری کو بھی ایک سوغات تصور کیا۔ چنانچہ ایک نہیں کئی شاعروں نے اس کے نمونے پیش کئے مگر محض بطور تفنن۔ اس وقت قدیم شاعری ہی فضا میں رسی بسی اور لوگوں کے دل دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ اور نظم آزاد اس سے اس قدر دور تھی کہ اس کا مقبول ہونا بہت دشوار تھا۔ زیادہ سے زیادہ جدید وضع کی پابند شاعری ہی رائج ہو سکتی تھی اور وہ ہوئی۔ آزاد نظم کے اکا دکا نمونے محض اس لئے پیش کئے گئے کہ مغربی اصناف سخن میں سے ایک یہ بھی ہے۔ اور بظاہر سب سے انوکھی۔ چنانچہ حالی نے اس کا صرف ایک نمونہ پیش کرنے پر اکتفا کیا۔ جو محض قافیہ و ردیف نہ ہونے کے اعتبار سے آزاد ہے۔ روانی اور لچک کی بنیادی خصوصیتیں جو اس صنف کا لازمہ ہیں اس میں مفقود ہیں۔ یہی کیفیت اسمٰعیل میرٹھی کی کاوشوں میں بھی نظر آتی ہے۔ یہ دونوں — اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ — بے قافیہ اور آزاد شاعری کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں اس لئے ان کی آزاد نظمیں آزاد ہوتے ہوئے بھی آزاد نہیں ہیں۔ آزاد نے حسن و عشق سے آزاد ہوتے ہوئے قافیہ و ردیف کی قید سے بھی آزاد ہونے کی کوشش کی، جس کی یادگار جغرافیہ (ایک پہیلی) ہے۔ اور حسب معمول آزاد نے یہ پہیلی اٹھکیلیاں لے لے کر بڑے مزے سے بیان کی ہے جس سے مضمون کی ادائیگی میں ایک قدرتی بہاؤ اور بیساختہ پن پیدا ہو گیا ہے۔ یہ خصوصیت اسے حقیقی آزاد نظم کے قریب لے جاتی ہے مگر صرف لے جانے ہی کی حد تک۔ کیونکہ پہیلی اور اس کی مختصر بحر کی رسائی کہاں تک ہو گی۔ آزاد نظم سے جو اعلیٰ مقاصد اور تصورات وابستہ ہیں وہ کسی سرسری نظم سے پورے نہیں ہو سکتے۔

آزاد نظم کو اپنانے کی ایک کوشش دہلی سے کہیں دور حیدرآباد (دکن) میں نظر آتی ہے۔ حالی، اسمٰعیل اور آزاد جیسے معروف شعرا کے سلسلہ سے کہیں الگ۔ اسکی وجہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس زمانے میں جس طرح ہماری زندگی کے ہر شعبہ پر مغرب ہی مغرب چھایا ہوا تھا وہ اسکے ہر ہر پہلو سے نمایاں ہے۔ اور برسر اقتدار قوم کے عروج و اقبال کے ساتھ اسکے مشاہیر ادب اور اقسام تصنیف کا غلغلہ بلند ہونا بھی لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں برصغیر کے درو دیوار اور علمی و ادبی حلقوں کی فضا انگریزی ادیبوں، ان کی تصانیف، اسالیب بیان اور اصناف نظم و نثر ہی سے گونج رہی تھی۔ اور پھر شیکسپیر اور ملٹن سے زیادہ بلند آوازہ انشا پرداز اور کون ہوں گے، انگلستان کے دو ممتاز ترین، شہرۂ آفاق قلم کار، جن کی منفرد شخصیتیں اور انگریزی قوم و ادب لازم و ملزوم خیال کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا ان کے ڈراموں اور تصانیف کے ساتھ ساتھ ان کی مخصوص صنف، بلینک ورس کا تذکرہ خصوصیت سے ہوتا۔ برصغیر میں مقیم اہل انگلستان انہیں فخریہ طور پر ایسے انشا پردازوں کی حیثیت سے پیش کرتے جن کی کوئی مثال نہیں۔ اور ان کے مغرب سے متاثر مقامی ہمنوا بھی ان کی زور شور سے تائید کرتے۔ تاکہ ہمارے ادب میں بھی ویسی ہی وقیع کیفیت پیدا ہو جائے اور ہم بھی ایسے ہی عظیم الشان انشا پردازوں پر ناز کر سکیں۔ اکبر الہ آبادی نے اس شدید اثر پذیری ہی کا عکس پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ جب میں نے ایک شیدائے مغرب کو کسی مشرقی بزرگ کا کلام سنایا تو:

فرفر وہ سنانے لگے نظم ملٹن

"کارنامۂ سروری" کے مصنف سرور الملک کو بھی جو مدت تک حیدرآباد دکن میں وزارت کے عہدہ پر فائز رہے، انگلستان کے ایک فاضل مدرس سے اس قسم کی آرا سننے کا اتفاق ہوا اور یہ کہ مشرق میں نہ تو شیکسپیئر جیسا کوئی ڈرامہ نگار پیدا ہوا ہے اور نہ بلینک ورس جیسی تصنیف ہی موجود ہے۔ یہ سرور الملک کے لئے ایک تازیانہ ثابت ہوا اور انہوں نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اردو زبان اس قسم کے ڈرامے اور مسلسل نظمیں پیش کرنے کی اہل ہے، ایک ڈرامہ لکھ مارا۔ یہ ڈرامہ بعد میں ضائع ہو گیا۔ اس سلسلہ میں بنیادی چیز بلینک ورس کا صحیح تصور تھی۔ جس سے وہ قطعاً معذور رہے ہیں۔ اس قدر مختصر بحر جس میں مضمون یا بیان کے پھیلاؤ اور جولانیٔ فکر کے لئے مرے سے

کوئی گنجائش ہی نہیں۔ اور پھر آہنگ میں تشنگی اور میکانیت۔ یہ بلینک ورس نہیں بلکہ اس کا عین الٹ ہے۔ لہٰذا اگر اس تحدی آمیز انداز میں لکھا ہوا ڈرامہ محفوظ بھی رہ جاتا تو بھی ان کی سعی بالکل رائیگاں ثابت ہوتی۔

شاید ان کوششوں کا سلسلہ یہیں ختم ہو جاتا۔ اگر اردو کے اسکاٹ، مولانا عبدالحلیم شررؔ مرحوم شاعر نہ ہونے کے باوجود اس صنف کا بیڑا نہ اٹھاتے۔ خبر نہیں سرور الملک کی طرح انہیں اس بات کی تحریک کیسے ہوئی۔ شاید اسکاٹ کی "لیڈی آف دی لیک" کے انداز میں انہوں نے ناول لکھنا شروع کیا تو مکالموں کی ضرورت بھی پیش آئی۔ کیونکہ بعض موقعوں پر ناول اور ڈرامہ کے ڈانڈے آپس میں مل جاتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے یہاں کے "ہیر رانجھا" کو دیکھ لیجئے۔ داستان وارث شاہ بیان کرتا ہے لیکن ہیر، رانجھا، سہتی جوگی وغیرہ جا بجا اپنی زبان ہی سے گفتگو کرتے ہیں۔ جو سر تا سر ڈرامہ ہے۔ شررؔ بھی غالباً بلینک ورس میں لکھنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کی کوشش کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ یہ بلینک ورس نہیں فری ورس ہے۔ یعنی اس کے مصرعے یکساں نہیں بلکہ چھوٹے بڑے ہیں۔ مکالموں یا تقریروں میں تسلسل اور بے ساختہ بہاؤ از خود پیدا ہو جاتا ہے۔ گو یہ ماننا پڑے گا کہ اس نوع لچک میں لکھنے والے کی طبیعت کو بھی خاصہ دخل ہوتا ہے۔ جیسا کہ بعد کی بعض میکانکی کوششوں سے ظاہر ہے۔ بہر حال بیان کا تقاضا ہو یا مصنف کا وہبی احساس، ان کی بدولت بعض مصرعے خاصے رواں دواں، آپس میں ملے جلے بلکہ گھلے ملے ہیں۔ اور آہنگ میں بھی کافی تسلسل نمایاں ہے۔ اس لئے وہ اس قسم کی فری ورس کی بخوبی نمائندگی کرتے ہیں جو محض بیانیہ یا ڈرامائی ہو، فکری و غنائیہ نہ ہو۔ جیسی کہ فری ورس عموماً ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے شررؔ کی حیثیت ایک پیشوا کی ہے۔ ان کی نظم بھی ویسی ہی ہے جیسی نثر ہے۔ صاف سیدھی سلیس، نہ اتار نہ چڑھاؤ، نہ زیر نہ بم، یکساں۔ نہ احساسات کی اتھاہ گہرائی نہ تخیل کی بے پناہ اڑان۔ نہ آہنگ کی شدت نہ بیان کا شکوہ۔ نہ رچاؤ نہ گمبھیرتا۔ لہٰذا شیکسپیئر اور ملٹن قدرتی طور پر بہت دور رہ جاتے ہیں۔ اور اردو بلینک ورس سے محروم۔

اور اس کے بعد ایک طویل خلا، ایک طویل سناٹا۔ ادب کے نغمہ زار سے کوئی آزاد، کوئی اسمٰعیل، کوئی حالی یا شررؔ نہ اٹھا۔ علامہ اقبال بھی آئے اور اپنی دھن میں غزلخواں چلے گئے۔ یہاں تک کہ اس صدی کی دوسری دہائی بھی آخری مرحلے طے کرنے لگی۔ اس

دوران میں مغربی ادب کا مطالعہ، اس کا اثر اور تتبع کتنا ہی آگے بڑھ چکا تھا۔ اور پہلے سے کہیں زیادہ شعور و آگہی بھی جو اور آگے چلیں گے دم لے کر کی متقاضی ہو یعنی یہ خواہش پیدا کرے کہ پہلے سے زیادہ ذہنی پس منظر کے ساتھ زیادہ وقوف اور زیادہ اہتمام سے تجربے کئے جائیں۔ چنانچہ دوسری دہائی میں اس نئی پخت و پز کے آثار نئی کسمساہٹوں میں نمایاں ہونے شروع ہوئے۔ اس کی واضح جھلک عظمت اللہ خاں کی سرگرمیوں اور دلچسپیوں میں دکھائی دیتی ہے۔ عظمت اللہ جس نے بعض مغربی شعرا بالخصوص ورڈزورتھ کو بقدر ذوق خوب کھنگالا تھا۔ اور ایسے عمل کا سراغ پایا تھا یعنی مغربی شاعری کے بعض تیور، بعض اصناف، عروضی پیچ و خم، رنگ روپ۔ بالخصوص، بلینک ورس ایک ایسی صنف تھی جس نے اسے اپنی منفرد نوعیت سے مسحور کر لیا۔ ادھر وہ ہندی کا بھی کم رسیا نہ تھا کمزوری کی حد تک۔ جو برائی بن کر رہ گئی۔ ہندی سے اتنا گہرا لگاؤ اور پھر پنگل سے بیگانگی۔ یہ ناممکن تھا۔ چنانچہ عظمت اللہ کی فنی و عروضی سوچ بچار بڑی حد تک انگریزی اور ہندی ہی کے ضمن میں رہی۔ اس نے ان دونوں کی شاعری اور عروض کو اردو اور اردو کو ان میں سمونا چاہا۔ اگر یہ کوشش دونوں کے مکمل شعور اور پوری جان کاری کے ساتھ ہوتی تو شاید وہ اپنی کوشش میں کامیاب ثابت ہوتے لیکن بظاہر یہ ایک قبل از وقت اور ادھوری کوشش تھی۔ اس لئے ناکام رہی۔ پھر بھی اس کے بعض پہلو بہت خیال انگیز اور توجہ طلب ہیں اور عروض و فن کی گتھیوں کو سلجھانے اور نئے نئے قدم اٹھانے میں ہماری کافی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ ہمیں فکر یقیناً اسی نہج پر کرنی چاہیئے جس پر عظمت اللہ نے کی تھی۔ لیکن گہرے دقیق و بسیط مطالعہ اور تحقیق سے کام لے کر۔ انگریزی اور ہندی کے پیچھے بھاگتے بھاگتے عظمت اللہ کو نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ اور وہ بیچ میں نہ ادھر کا رہا نہ ادھر کا رہا۔ تاہم نظم آزاد کے سلسلے میں اس نے جو کچھ کیا وہ قابلِ لحاظ ضرور ہے۔ اور اس کے تجربے بھی خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ نظم آزاد اور نظم معرا میں سیال پن کا جو بنیادی تصور ہے بلکہ بلند پایہ پابند شاعری میں جس سیال آہنگ کا تقاضا کیا جاتا ہے۔ وہ اس سے بخوبی آگاہ تھا۔ ہماری مہم تمام تر جامد ہیئت کے خلاف

۲- اور جدید شاعری کا ایک نہایت اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنے عروض میں سیال پن کیسے پیدا کریں۔ عظمت کو مناسب وقفوں پر ٹھہراؤ، مصرعوں میں توقف (بشرام)، بیان و معنی کے مصرع بہ مصرع یا بلکہ مستقل سے بہاؤ (ان ژامبان) میکانیت سے احتراز اور آہنگ کے لداؤ کا احساس تھا چنانچہ وہ انگریزی کے نمونے پر سانیٹ میں بھی ان خصوصیتوں کا اہتمام کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

وہ حسن دلآویز جس سے کہ انساں کی ہستی
میں پیدا ہو، دیوانہ وار ایک طوفان مستی
جنوں کا رہے جس پہ سایہ کہ جس پر برستی

اس کی ترتیب ہے ا (چھ بار) اور ب ج ب ج د د۔ پہلا مصرع ہستی پر ختم نہیں ہوا، جس کے باعث دوسرا مصرع 'میں پیدا ہو' سے شروع ہوتا ہے۔

بلینک ورس کے سلسلے میں انگریزی عروض کو من و عن رائج کرنے کی کوشش کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہ اس نمونے سے ظاہر ہے:

کوی کی آنکھ نشے میں گھومتی
کَ وِی کِ آنکھ نَ شے مِ گھو مَ تی الخ

بے قافیہ نظم کا ایک اور نمونہ یہ ہے:۔

نہ کہئے کہ ننھا سا ہے واقعہ
اسے آپ ننھا کہیں کس لئے
بڑا واقعہ آپ کہتے ہیں جس کو

نظم آزاد کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ شاعری ہو اور نثر سے ممیز ہو۔ پہلے نمونے میں اس کی کوئی علامت نہیں۔ دوسرے شاعری کے کسی بھی نمونے کی طرح اس میں نمایاں آہنگ پایا جائے۔ اس میں آہنگ ذرا بھی نہیں کھلتا کیونکہ اس کی ضرب نمایاں نہیں۔ ۳۱؎ نمونے میں صرف چھوٹے چھوٹے ہجا یعنی لگھو اور گرو جمع کر دیئے ہیں اگر ہمیں پہلے ہی سے جتا دیا جائے تو ہم اسے بالکل نثر کی طرح پڑھیں گے ویسے جو بحر اس سے بن سکتی ہے۔ مفاعلن مفاعلن (بحر ہزج مقبوض) اس میں خاصی لچک ہے اور اس سے حقیقتہً بہت کچھ تنوع پیدا کیا جا سکتا ہے جیسا کہ بعد کے تجربوں سے ظاہر ہے۔ رہا تاکید (ACCENT) کا سوال تو وہ خود انگریزی میں بیحد پیچیدہ اور مختلف فیہ ہے۔ چہ جائیکہ ہم اس کا اردو میں بدل پیدا کریں اور

وہ بھی یونہی چھوٹی بڑی آوازوں کو سپاٹ طور پر یکجا کر کے جیسا کہ عظمت نے کیا ہے۔

کم و بیش اسی زمانہ میں یا اس سے کچھ دیر بعد شیکسپیئر کے بعض ڈراموں ــــ ہیملٹ اور میکبتھ کو آزاد نظم میں لانے کی کوشش کی گئی۔ یہ بلینک ورس کو اپنانے کی ایک اور کوشش تھی اور زیادہ حوصلہ مندانہ لیکن اس سے بھی بات نہ بنی۔ کیونکہ ترجمہ لفظی ہوتے ہوئے محض نظم ہی رہا اور تشنۂ آہنگ بھی۔ مترجم کا قلم شیکسپیئر کی روح اور نفسِ شعر تک رسائی نہ پیدا کر سکا۔ اس لئے یہ کوشش بھی بے ثمر ثابت ہوئی۔

یہ ساری کوششیں جستہ جستہ تھیں اور ایسی ہی ایک کوشش منصور احمد مرحوم مدیر "ادبی دنیا" نے بھی کی۔ یہ ایک چھوٹی سی بے قافیہ نظم تھی، جس میں کوئی نمایاں بات نہ تھی۔ حالی اور آزاد وغیرہ کی طرح محض ایک ضمنی کوشش۔ صرف اتنا ہے کہ یہ دوسری دہائی کے آخری ایک دو سالوں میں شائع ہوئی جبکہ لاہور میں آزاد شاعری کی تحریک منظر عام پر آنے ہی والی تھی۔ اس نظم میں اس تحریک کی آمد کی کوئی علامت نہ تھی۔ ہمارے یہاں آزاد شاعری بہ حیثیت ایک باقاعدہ تحریک کے تیسری دہائی کی پیداوار ہے اور اس تحریک کے نتیجہ میں جو تجربے ہوئے اور بروئے کار آئے صرف انہی کو حقیقی معنوں میں نظم آزاد قرار دیا جا سکتا ہے۔ سابقہ نمونوں کی تہہ میں کوئی گہرا احساس یا تحریک کار فرما نہ تھی۔ اس لئے ان کی حیثیت محض برائے نام ہے اور تیسری دہائی سے پہلے کی حد تک یہ تلاش و تحقیق بالکل بیکار ہے کہ سب سے پہلے آزاد نظم کس نے لکھی۔ لہٰذا ہماری توجہ تمام تر اس دور کی طرف منتقل ہوتی ہے جس میں آزاد شاعری کا باقاعدہ طور پر آغاز ہوا اور اس نے ایک مستقل صنف اور نظریہ کی حیثیت اختیار کر لی جس نے اردو شاعری میں نمایاں حیثیت پیدا کر لی ہے اور اس کے ساتھ ایک مستقبل، ایک تاریخ بھی۔ یہ ایک مستقل داستان ہے جو مستقل نشست چاہتی ہے۔ اس لئے ہم اس کی مفصل کیفیت ایک اور سیر حاصل مضمون میں پیش کریں گے ــ

نے گردید کوتہ رشتۂ معنی رہا کردم
حکایت بود بے پایاں بہ خاموشی ادا کردم

پات سنہرے

(شالامار: ایک تصور)

آنسہ شہاب

سنہرا تھال بجا زرد زرد پتوں کا
یہ کیسی چوٹ تھی دستِ نقیب موج ہوا؟
غضب کی چوٹ کہ ہر ذرّہ گونج گونج اٹھا
خیال و خواب ہی جانیں کوئی یہ جانے کیا
وہ طمطراق، وہ اک غلغلہ، وہ ہنگامہ!
چھناکا۔ ٹوٹا ہو برسوں کا جیسے سنّاٹا!
صدا وہ بڑھتی ہوئی دھیرے دھیرے گھٹتی ہوئی
وہ پھیل پھیل کے اک سنسنی سمٹتی ہوئی
وہ دور دور پہنچ کر فضا میں گم ہوتی
نکل کے خم سے پری پھر اسیرِ خم ہوتی
گمک کہ تان جو دھیمی سی مینڈ بنتی گئی
وہ جاگتی ہوئی جھنکار نیند بنتی گئی!
گماں گماں وہ تصوّر، جہاں جہاں تصویر
عیاں عیاں سے وہ خواب اور نہاں نہاں تعبیر
وہ تھرتھراتے ہیولے، وہ گہرا گہرا طلسم
سنہرے تھال، سنہری صدا، سنہرا طلسم،
"گیا وہ موسمِ گل جس کا راز دار ہوں میں
نہ پائمال کریں مجھ کو زائرانِ چمن
انہی کے شاخِ نشیمن کی یادگار ہوں میں"

خزاں کے جسم میں جاں پڑ گئی بہاروں کی
نظر میں جھوم گئی مستیاں چناروں کی

رسی بسی ہوئی مستی وہ کوہساروں کی
فضا میں پھیل گئیں بولیاں ہزاروں کی
چہکتی بولتی وہ ٹولیاں نگاروں کی
خیال و خواب میں وہ جنّتیں اشاروں کی
وہ تانیں مرمریں تختوں پہ آبشاروں کی
وہ شائیں نقرئی لہروں پہ ماہ پاروں کی
کچھ اک انارکلی، سنگتیں اناروں کی
گلوں میں شوخ اناروں کے دھوم ہاروں کی
چمکتے پھولوں کی وہ سیج سیج تاروں کی
وہ مورچھل سی ادا سبز شاخساروں کی
وہ چھوٹتے ہوئے فوارے جھلملاتے سبو
وہ موتی موتی ڈھلی بوند بوند کا جادو
وہ جوتی جوتی رچے انگ انگ کا فرخو
وہ سیوتی سیوتی بسے رنگ رنگ کے مہ رو
وہ تختہ تختہ بہاراں، وہ رستہ رستہ جنوں
وہ سرو سرو چراغاں، روش روش وہ فسوں
وہ شامیانۂ مرمر کشادہ بارہ دری
ہوائیں آتی ہیں جس میں سدا تھرکتی ہوئی
وہ نہر چاندی کی اک کہکشاں سرکتی ہوئی
صبا کی چال سے ہر گام پر سنکتی ہوئی
وہ جل پہ آئینے ہی آئینے چمکتے ہوئے
بلور خانے میں جام و سبو چھلکتے ہوئے

جلوس تخت پہ مرمر کے تاجداروں کا
برنگ مہر سماں تاج کے کناروں کا
ہما فروش شعاعیں جھومر چنور رقصاں
ہما بدوش ضیائیں سحر سحر قریاں
وہ دبدبہ، وہ تجمل، جلال و جاہ و حشم
حریف فر فریدوں، سہیم سطوتِ جم
کھبیں تو کھبتے چلے جائیں دل میں نقشِ جمال
بڑھیں تو بڑھتے چلے جائیں کیف ہائے خیال
وہ گرد و پیش تب و تاب سبزہ سیارہ
نظر فروزِ تمتّع شاہ ہزارہا آرہ
وہ غسل خانہ مرمر، وہ طاق طاق فسوں
نگاہِ شوق کی خاطر ہر اک رواق جنوں
جو چشم وا پہ یہ نظارے ضو فشاں ہو جائیں
تو رانگ انگ کے جادو جنوں نشاں ہو جائیں
وہ جلوے ہفتِ نظر صد بہشت نظارہ
ز فرق تا بہ قدم صد کرشمہ آوارہ
فسونِ فطرت و اعجاز زندگی یک جا
کمالِ حیرت و انگیز ساحری یک جا

سنہرے تھال بجے کیسے حال آئے گئے
دل و دماغ میں کیا کیا خیال آئے گئے!

★

رحمان باباؒ

عبداللہ جان آسیر

سابق صوبہ سرحد کا علاقہ، جہاں مختلف پٹھان قبائل آباد ہیں، ہمیشہ سے بیرونی حملوں اور اندرونی چپقلشوں کا آماجگاہ بنا رہا ہے۔ کبھی سکندر اعظم یونان سے چل کر اس علاقے کو روندتا ہوا آگے بڑھتا ہے تو کبھی غوریوں اور محمود غزنوی کے نقاروں کی گونج یہاں سنائی دیتی ہے۔ بابر، نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی نے بھی اسی راستے ہندوستان کو فتح کیا۔ اور جب مغرب کی طرف سے حملے بند ہوئے تو مشرق کی طرف سے اس علاقے پر یلغاریں شروع ہوئیں۔ اکبر اعظم سے لے کر اورنگ زیب عالمگیر کے عہدِ حکومت تک مغلیہ افواج اس علاقے میں مصروفِ پیکار رہیں۔ اسکے بعد سکھوں اور انگریزوں کی باری آئی۔ سید احمد شاہؒ بریلوی اور شاہ اسماعیل شہیدؒ نے اپنے تحریک جہاد کے لئے اسی علاقے کو منتخب کیا۔ یہی وہ علاقہ ہے جہاں انسانی زندگی ہر وقت خطرے میں رہی۔ اسی لئے یہاں کے رہنے والے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے جنگجویانہ صفات کے حامل رہے۔ اور ہر موقع پر اپنی بہادری کے وہ کمالات کر دکھائے کہ ساری دنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔

لیکن پٹھان اگر ایک طرف رزم کا دلدادہ ہے۔ تو دوسری طرف بزم کا بھی شیدائی ہے۔ شام ہوئی، کھانا کھایا، اور "حجرہ"[1] میں لوگ جمع ہوئے۔ ایک نے رباب اٹھایا، دوسرے نے گھڑا سنبھالا، تیسرے نے تالی بجانی شروع کی، اور چوتھے نے کان پر ہاتھ رکھ کر بلند آواز سے "یا قربان" کی صدا لگائی۔ اور پھر جو ٹپہ کی آمد شروع ہوئی تو ایسا معلوم ہونے لگا کہ مجلس میں شریک ہر نوجوان پیدائشی شاعر ہے۔ اتنے میں ایک کونے سے آواز آئی "یارا رباعی شہ" (یارا! رباعی شروع کرو) پشتو میں غزل کو رباعی کہتے ہیں۔ ساز مدھم ہوئے۔ گھڑے والے نے ہاتھ روکا۔ رباب والا آہستہ آہستہ زیر پر شہبازنیعنی مضراب پھیرنے لگا۔ اور ایک نے رباعی شروع کی۔

په ښه خوئے له بد خواهانو بے پروا یم — میں اپنی اچھی خو کی وجہ سے دشمن سے بے پروا ہوں
په نرمئے لکه اوبه داور دسزا یم — میری نرمی انکے لئے ایسی سزا ہے جیسے آگ کیلئے پانی
هر چا ته په خپل شکل څرګندیږم — میں کسی کو اسی کی شکل میں نظر آتا ہوں
آئینه غوندے بے روئیه بے ریا یم — میں آئینہ کی طرح کی رعایت نہیں کرتا، کسی کو دھوکا نہیں دیتا ہوں
غنچے په څیر ببسل ژبو خاموشه — غنچے کی طرح سو زبانیں رکھتے ہوئے خاموش ہوں
لکه بوئے هسے په پټه خوله ګویا یم — اور خوشبو کی طرح منہ بند رکھتے ہوئے بھی گویا ہوں
په ژړا مے خپل یار دیدن حاصل کړو — میں نے رونے کی برکت سے اپنے دوست کا دیدار حاصل کیا[1]۔
د شبنم په څیر د ګل سره یکتا یم — اور شبنم کی طرح پھول کا ہم نشین ہوں۔
دراز عمر مے حاصل شو د راستیه — میں نے سچائی کی وجہ سے لمبی عمر پائی ہے
لکه سرو ولاړ مدام تر و تازه یم — اور میں سرو کی طرح ہمیشہ تر و تازہ ہوں
که چا لار د عاشقئے ده ورکه کړے — اگر کسی سے عاشقی کا راستہ گم ہو گیا ہو
زه رحمان د ګمراهانو رهنما یم — تو میں رحمان گمراہوں کا راہنما ہوں

عرفی نے تو صرف اتنا ہی کہا تھا کہ ؎

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال
صد سال مے تواں بہ تمنا گریستن

لیکن رحمان بابا کا رونا ایسا ہے کہ اسے رونے کی برکت سے دوست کا دیدار حاصل ہے۔ یہاں دوست سے مراد ذات باری ہے۔ جو خود کہتا ہے کہ جو کوئی میرے سامنے عجز و زاری کرے گا۔ میں اس کی آواز سنوں گا۔ عرفی کا شعر عشق مجازی کا ترجمان ہے لیکن رحمان بابا کا عشق کچھ اور ہی ہے۔

پٹھانوں کے علاقے میں کوئی مجلس ہو، کوئی محفل ہو۔ رحمان بابا کی رباعیاں ضرور سنی اور سنائی جائیں گی اس وقت جبکہ پشتو شاعری ترقی کی طرف گامزن ہے پرانے زمانے کے گمنام شعراء کے دواوین طبع ہو رہے ہیں۔ اور خوشحال خان خٹک کو پشتو شاعری کا باوا آدم تسلیم

---

[1] حجرہ پشتو میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو پنجابی میں دھرے کو حاصل ہے۔

[1] اور اگر دونوں ایک جیسے ہوں۔ مجازی بھی اور حقیقی بھی؟ (مدیر)

کیا جاتا ہے رحمان بابا کی منفرد حیثیت اپنے مقام پر ایک عظیم چٹان کی طرح قایم ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ آج تک پٹھانوں میں خوشحال خاں کے کلام کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی "جو دیوان رحمان بابا کو ہے یا رہی ہے۔ اور آئندہ بھی رہے گی "منتخبات خوشحال خان خٹک" مطبوعہ پشتو اکیڈیمی پشاور کے دیباچہ میں سید انوار الحق صاحب نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے "خوشحال خان خٹک پشتون عوام کے علاوہ بیرونی دنیا میں بھی زیادہ تر ایک شاعر کی حیثیت سے ہی جانا پہچانا جاتا ہے۔ اور وہ بھی رحمان بابا سے زیادہ نہیں"

رحمان بابا خوشحال خان خٹک کا ہمعصر تھا۔ خوشحال خاں کا زمانہ ۱۰۲۲ھ سے ۱۱۰۰ھ تک بیان کیا جاتا ہے۔ اور رحمان بابا ۱۰۴۲ھ سے ۱۱۱۸ھ تک زندہ رہے۔ گویا رحمان بابا کی پیدائش کے وقت خوشحال خاں کی عمر بیس برس کی تھی اور وہ خوشحال خاں کی وفات کے بعد قریباً اٹھارہ سال تک زندہ رہے۔ خوشحال خان خٹک کے زمانے میں موضع تنگی کے مولوی احمد صاحب نے ایک مشاعرے کا انتظام کیا تھا۔ اس میں خوشحال خاں کے علاوہ عبدالقادر خان، صاحبزادہ محمدی صدر خان۔ اشرف خان ہجری۔ عثمان۔ غفور، عبدل اور معزاللہ نے شرکت کی تھی۔ عبدالقادر خان، صدر خان اور اشرف خان ہجری خوشحال خاں کے بیٹے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس مشاعرے کے وقت رحمان بابا کی عمر بھی کافی ہوگی۔ لیکن حیرانی ہے کہ اس زمانے کے اتنے بڑے مشاعرہ میں رحمان بابا نے شرکت نہیں کی۔ اس کی اور کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ رحمان بابا ایک گوشہ نشین درویش تھے چنانچہ ایک جگہ خود فرماتے ہیں۔

نہ شی دخانانو دملنگو [illegible] کلی (امیروں اور غریبوں کی دوستی نہیں ہو سکتی
چرتہ عزیز خان چرتہ ملنگ عبدالرحمان کہاں عزیز خان جیسا خان۔ اور کہاں عبدالرحمان جیسا ملنگ)

لیکن گوشہ نشینی کے باوجود رحمان بابا کی زبان سے نکلا ہوا ہر شعر آناً فاناً عوام میں مشہور ہو جاتا۔ اس کے برعکس اس کے ہمعصروں کو ایسی مقبولیت کبھی نصیب نہ ہو سکی۔

رحمان بابا کی شاعری کی نمایاں خصوصیت ہے اس میں تصوف کا گہرا امتزاج۔ تین چار صدی قبل ایشیائے کوچک میں صرف اسی شاعری کو قبولیت حاصل ہوتی رہی جس میں تصوف کی باریکیوں کو بیان کیا گیا ہو تھا۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی، سچل سرمست، بابا فرید، وارث شاہ اور بلھے شاہ کی شاعری اسی وجہ سے مقبول عام ہوئی۔ صوفی شعراء دنیائے شاعری کی رونق ہوتے ہیں۔ کیونکہ جو کیف و سرور اور جذب و مستی صوفیانہ شاعری میں ہوتی ہے۔ وہ دوسری شاعری میں نہیں ہوتی۔

رحمان بابا کے ہمعصر شعرا میں کسی کو بھی وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جو رحمان بابا کو حاصل ہے۔ معزاللہ رحمان بابا کا ایک ہمعصر شاعر تھا۔ "پٹانہ شعرا" مصنفہ عبدالحی حبیبی کے بموجب معزاللہ ۱۱۰۰ھ میں زندہ تھا۔ ہمیش خلیل کی تحقیق کے مطابق ان کے کئی اشعار میں رحمان بابا سے توارد ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً رحمان بابا کہتے ہیں:۔

زہ پیژنم پہ اصل کبن خاکی شے (میں جانتا ہوں۔ تمہاری اصلیت مٹی ہے۔
ځان بہ خوشنے پہ کوتہ لہ ترا۔ کب تک انگلی سے اپنے آپ سے مٹی صاف کرو گے)

اور معزاللہ کہتے ہیں:۔

چہ صبا بہ پرے انبار شی تو دے خاورے (کل اس پر منوں مٹی پڑ جائے گی۔
نن چہ ځان ځنی لہ خاورو بیروما جو آج اپنے آپ سے رومال کے ذریعہ مٹی ہٹا کرتا ہے)

رحمان بابا کہتے ہیں:۔

ھغہ ناوے چہ پہ ځان مبنائستہ نہ وی (دولہن خود حسین نہ ہو۔
خوک بہ ئے څہ کا ندے بنائست دمور او نیا اس کی ماں یا دادی کی خوبصورتی کو کوئی کیا کرے گا)

معزاللہ کا شعر ہے:۔

کہ دِ نہ وی نیک عمل پخپلہ کړے (اگر تم نے خود کوئی نیک عمل نہیں کیا ہے
غرہ مہ شہ پہ عمل د مورا و پلار تو اپنے ماں یا باپ کے نیک عمل پر غرور مت کرو)

اس قسم کے اور بھی سینکڑوں اشعار ہیں۔ لیکن معزاللہ کے اشعار کی مقبولیت تو ایک طرف، اب سے کچھ عرصہ قبل تک اِن کا نام بھی کسی کو معلوم نہیں تھا۔ اسی طرح حافظ صاحب الپوری اور عبدالعظیم بابا کا کلام بھی صوفیانہ ہے۔ لیکن "دیوان رحمان بابا" کے سامنے ان کا چراغ بھی ماند ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ صوفیانہ کلام ہمیشہ پسند کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ الفاظ کی بندش، محاورہ کی چاشنی اور روزمرہ کی حلاوت بھی کلام کی پسندیدگی کا باعث ہوتی ہے۔

رحمان بابا کے ہاں کسی چیز کی کمی نہیں۔ یہ سادہ اور روزمرہ کی سلیس زبان میں مشکل سے مشکل مسئلہ کو نہایت آسان پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ آخری عمر تک لہو و لعب میں پھنسے ہوئے انسان کو کہتے ہیں:۔

مار چہ سور رے لرہ ورشی آخر نیغ شی (سانپ بھی بل کے پاس پہنچ کر سیدھا ہو جاتا ہے۔
تہ دگور غاړے لہ ورغلے سم نہ شوے لیکن تم قبر کے کنارے پہنچ کر بھی سیدھے نہیں ہوئے)

پیر و مرشد کی ضرورت کو یوں بیان فرماتے ہیں:-

بے رہبادہ رسیدہ و یار تہ گران وی | (بغیر درمیانی وسیلے کے دوست تک پہنچنا مشکل ہے۔
پہ کوڅہ د مہرویانو رہبر بویہ | حسینوں کی گلی میں جانے کے لئے ایک راہبر ضروری ہے
بے مرشد څوک خبر د مرید اخلی | بغیر مرشد کے مرید کی خبر کون لیتا ہے۔
غوښہ پیټی د فرزندانو پدر بویہ | اولاد کا غم صرف باپ ہی کو ہوتا ہے)

ہرزہ سرائی سے نغمۂ رباب بدرجہا بہتر ہے:-

تر دې پوچ گفتگو چہ زہ یې اورم | اس پوچ گفتگو سے جسے میں سن رہا ہوں۔
پہ نغمہ پہ ترانہ د رباب خوښ یم | رباب کے نغمے سننا مجھے پسند ہے۔

غربت اور لاچاری کو کس عجیب انداز میں پیش کیا ہے:-

مفلسانو سرہ ھیڅ کوھستان دے | غریبوں کے لئے تو وہ علاقہ بالکل کوہستان ہی ہے
کہ تمام عمر یې کور وی پہ بازار کښ | چاہے ان کا گھر ہمیشہ بازار کے بیچوں بیچ ہی کیوں نہ ہو

غرض ان کے کلام میں ہر طبقے کے افراد کی تسکین ذوق کا سامان موجود ہے۔ ان کے اشعار اگر ایک طرف مسجدوں میں درس و تبلیغ کا ذریعہ ہیں۔ تو دوسری طرف حجروں میں ساز و آواز کی محفلیں بھی اس سے گرمائی جاتی ہیں۔ ایک طرف اگر ایک رند بدمست اس شعر کو مزے لے لے کر گاتا ہے:

چہ تر څنګ مې دلبر پہ لاس کښې جام دے | آج جبکہ میرا محبوب میرے بغل میں اور میرے ہاتھ میں
نن او د ټول د زمانے زما غلام دے | جام شراب ہے تو زمانے کا بادشاہ بھی میرا غلام ہے۔

تو دوسری طرف واعظ منبر پر جھوم جھوم کر پڑھتا ہے۔

پہ دنیا کښ کہ څہ کار دے خو د دین دے | دنیا میں اگر کوئی اچھا کام ہے۔ تو وہ دین کا ہے
د دې کار پہ کوونکو آفرین دے | اور ایسے کام کرنے والے پر آفرین ہے۔

لیکن اس کے ساتھ رحمان بابا دنیادار انسان کو بھی تسلی دیتے ہیں:-

ښہ دہ ښہ دہ دا دنیا | یہ دنیا اچھی ہے۔ کیونکہ آخرت کا توشہ
چہ توښہ دہ د عقبا | یہی ہے۔
د دنیا پہ بازار کیږی | اس دنیا کے بازار میں اگلے جہان کا سودا
د ھغہ جہان سودا | ہوتا ہے۔
پہ دنیا کښ بدی نیشتہ | دنیا (دولت) میں کوئی برائی نہیں۔ اگر تو
کہ بدی نہ وی لہ تا | اسے برا استعمال نہ کرے۔
پہ دنیا کښ لوے حکمت دے | یہ دنیا حکمتوں سے بھری پڑی ہے۔ لیکن اسکو
پرے پوھیږی حکما | صرف حکیم لوگ ہی سمجھتے ہیں۔

شعر کہنے والے بہت ہو سکتے ہیں۔ لیکن حقیقی شاعر بہت کم ہوئے ہیں۔ قلم اور کاغذ لیکر گھنٹوں ایک ایک ردیف اور قافیہ کی تلاش میں پریشان رہ کر شعر کہنا کوئی شاعری نہیں۔ شاعر بنتا نہیں، پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ رحمان بابا بھی پیدائشی شاعر تھے لیکن اپنی زندگی میں مختلف آزمائشوں سے گذرنا پڑا۔ پھر کہیں جا کر ان کے جوہرِ طبع نے نشوونما پائی۔ بے شک

اہلِ معنی کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

رحمان بابا کا پورا نام عبدالرحمان تھا۔ والد کا نام عبدالستار تھا۔ پشاور سے تین میل دور آپ ۱۰۴۴ھ میں ایک چھوٹے سے گاؤں بہادر کلی میں پیدا ہوئے۔ والد مالی لحاظ سے بہت غریب تھے۔ ایک دفعہ وہ انہیں اپنے ایک عالم فاضل دوست، مولانا محمد یوسف کے پاس لے گئے۔ آپ نے مولانا سے نہایت معصومانہ طور پر یہ سوال پوچھا، اتنی بڑی کائنات بنا کر، اتنے انسان پیدا کر کے، ان کی ذمہ داری کا عظیم بوجھ اٹھا کر اللہ تعالےٰ کو کیا فائدہ حاصل ہوا؟ اس کمسنی میں مولانا محمد یوسف نے آپ کا یہ سوال سن کر آپ کو گلے سے لگایا۔ اور بے ساختہ جواب دیا۔

"ستار کے عظیم بیٹے، میں تمہیں سب کچھ سمجھانے کی
سعی کروں گا"

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ مولانا یوسف نے آپ کے پوشیدہ جوہر کو محسوس کیا۔ اور اپنے آغوشِ تربیت میں لے کر اس جوہر کو ایسی جلا دی کہ آج تک اسکی تابناکی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

مولانا سے فارغ التحصیل ہونیکے بعد تعلیم ہی کے سلسلے میں کچھ عرصہ کوہاٹ میں بھی مقیم رہے۔ اور جب واپس آئے تو ایک کامل درویش اور صوفی بن چکے تھے۔ علم تصوف ہی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ گاؤں سے باہر ایک جھونپڑا بنا کر رہنے لگے۔ ان کا سارا اثاثہ ایک رباب تھا۔ وہ رباب کے شغل میں اپنے آپ کو بھول جاتے۔ اور پہروں بے خودی کا عالم طاری رہتا۔ عقیدت مندوں کا ایک مجمع ہر وقت ان کے گرد جمع رہتا۔ گاؤں کے لوگوں کو ان کی یہ ہر دلعزیزی ایک آنکھ نہ بھائی۔ اسلئے یہ مجبور ہو کر پشاور کے قریب ہزارخانی نام گاؤں چلے آئے۔ اور اپنی بقیہ زندگی یہیں گذار دی۔ اور یہیں ۱۱۱۸ھ میں وفات پائی۔ ان کا مزار گاؤں کے بالکل متصل ہے۔ اور ہمیشہ بہار کے موسم میں اس پر ایک میلہ ہوتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد خصوصاً موجودہ دور میں جو ذہنی بیداری پیدا ہوئی ہے۔ اس نے شاعر کے جادواں نغمے کو مقبول سے مقبول تر بنا دیا ہے اور سابق صوبہ سرحد کے بڑھتے ہوئے ذوق و شوق نے جہاں اس سرزمین میں ان کا

غلغلہ بیش از بیش بلند کر دیا ہے وہاں ان کی ساحرانہ شخصیت کا چرچا پاکستان کے گوشے گوشے میں پھیلا دیا ہے۔ چنانچہ اس سال پشاور میں ان کا جس اہتمام سے عرس منایا گیا وہ اپنی مثال آپ ہے کیونکہ اس میں پاکستان کے گوشے گوشے سے نامور ادبا و شعرا جوق در جوق تشریف لا کر شریک ہوئے۔

انگریزوں کا دورِ حکومت تو کیا اس سے بہت پہلے مغلوں کے دورِ حکومت سے لے کر پاکستان بن جانے تک پٹھان موردِ عتاب رہے۔ اس علاقہ کا نام "سرزمین بے آئین" رکھا گیا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ غلط اور جھوٹی روایتیں مشہور کروا کر انہیں بر کوچک کے دیگر مسلمان بھائیوں سے علیحدہ رکھا گیا۔ جھوٹی کہانیاں مشہور کر کے انہیں جاہل اور خونخوار ظاہر کیا گیا۔ ان حالات میں پشتو زبان کو سمجھنے اور جاننے کا کسی کو خیال تک نہیں آیا۔ ورنہ کم از کم اس برِ کوچک کے مسلمان تو رحمان بابا کے کلام سے بہت پہلے واقف ہو جاتے۔ ہماری موجودہ حکومت کا بھلا ہو جس نے علاقائی زبانوں کو پھلنے پھولنے اور پھیلنے کے مواقع بہم پہنچائے۔ بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ رحمان بابا جیسی نازک خیالی بہت کم شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ وہ پشتو کے حافظِ شیراز ہیں۔ انہوں نے پشتو رباعیوں (یعنی غزلوں) کے ذریعے اپنے جذبات پیش کئے ہیں اور زندگی کے ہر پہلو پر نہایت ناقدانہ انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ حمدِ باری میں چند شعر ملاحظہ ہوں:

گوره چې څوک کردګار دې دې رب څما — دیکھئے میرا رب وہ خالقِ مخلوقات ہے
چه صاحبِ د کل اختیار دې دې رب څما — جو تمام عالم کا مختارِ کل ہے۔
هغه بزرګواران چې څوک دې واني — جتنے بزرگ یا جتنی بڑی ہستیاں جن کا نام کسی کو معلوم ہے
تر هغو بزرګوار دې دې رب څما — ان سب ہی سے میرا رب بڑا ہے۔
له نیستۍ ئې هستي صورت پیدا کړو — جس نے نیستی سے ہستی کی صورت پیدا کی
هسې رنګ پروردګار دې دې رب څما — میرا رب وہی مخلوقات کا پالنے والا ہے
هیڅ تغیر تبدل نه لري رحمان — جو کچھ تغیر و تبدل نہیں رکھتا۔
تل تر تله برقرار دې دې رب څما — رحمان میرا رب وہی ہے جو ہمیشہ سے ایک ہے

اسی طرح خدمتِ خلق کے متعلق رحمان بابا کے چند شعر ملاحظہ ہوں:-

پس له مرګه که سر غواړې چې شنه کړه — اگر تم موت کے بعد زندگی چاہتے ہو تو کھاس کی طرح مرکر خشک و لاغر ہونے کے بعد سر کے ساتھ
په څېر کړې سر بیا نو دې مرغزار شه — سے سرسبز و شاداب ہو جاؤ۔
لاس په لاس که د خپل کار دې دې روا غواړې — اگر چاہتے ہو کہ تمہارا کام جلدی ہو جائے
لا مخکې له ځان وړاندې د بل په کار شه — کام سے پہلے دوسروں کے کام کرو۔
که دې ویره شي د خپلې درماندګۍ — اگر تم ڈرتے ہو کہ کل بڑھاپے کے وقت
د درماندو دستګیرې ته خبردار شه — ہو جاؤ گے (اور دوسروں کی امداد کی تم کو ضرورت ہوگی) تو خبردار ہو جاؤ۔ آج تم ان کی طرح امداد کرو۔
بې له خدایه د هیچا منت بار مه شه — بجز خدا کے کسی کا احسان مت اٹھاؤ
په وچ کاڼي باندې ونه د کهسار شه — (ایسی زندگی بسر کرو) جیسے کہ پہاڑ کے درخت پتھروں میں ترو تازہ رہتے ہیں۔

انہوں نے تو معشوق کے ساتھ محبت کی انتہا کر دی ہے۔ کہتے ہیں:-

که مینه ئې په خپل یار باندې رښتیا — اگر تم اپنے دوست پر واقعی عاشق
او ار هغه کړه اول دین پس دنیا — ہو تو دین و دنیا دونوں کو ترک کر دو۔

اسی لئے رحمان بابا اپنی زندگی کے آخری دور میں بالکل مجذوب ہو کر رہ گئے تھے۔ نہ انہیں دین کی خبر تھی نہ دنیا کی۔ اسی لئے اس زمانے کے بعض عالم ان کے خلاف ہو گئے تھے۔ لیکن وہ رحمان جسے اپنے زمانے میں لوگ پتھر مارتے تھے، اپنے کلام کی وجہ سے آج تمام لوگوں کے دلوں میں گھر کئے ہوئے ہے۔ فنا کا ہاتھ انہیں چھو نہیں سکا۔ اور وہ ابھی زندۂ جاوید ہیں۔

* * *

شاعرِ شیریں نوا

(رحمان باباؒ)

ناھید نوا

دنیا کے ہنگامے اور افراتفری کبھی ختم نہیں ہوتی لیکن یہ بھی ہے کہ جیسا جیسا پُر آشوب زمانہ ہو ویسی ہی بڑی بڑی شخصیتیں بھی پیدا کرتا ہے۔ جو بے اعتدالی کے شکار انسانوں کو اعتدال اور بے راہ رووں کو صحیح راہ پر لے آتے ہیں۔ تاریخ نے اپنے آپ کو اس لحاظ سے اس قدر دہرایا ہے کہ ہمیں کوئی اچنبہ نہیں ہوتا جب ہم سابق صوبۂ سرحد کی سنگلاخ سرزمین میں دریائے باڑا کے کنارے پھر اسی ڈرامہ کو سامنے پیش ہوتے دیکھتے ہیں جس کا ہیرو ایک بزرگ، ایک صوفی، ایک شاعر رحمان بابا ہے۔ اور آج تین سو سال گزر جانے پر بھی وہی مقام ہے، وہی اسٹیج ہے۔ اور اسی ڈرامائی انداز کے ساتھ اس بزرگ کا عرس بھی منایا گیا ہے۔ ایسے کہ اسٹیج بظاہر اٹک کی لوہ در کوہ اور بہار در بہار وادی ہوتے ہوئے تمام پاکستان پر پھیل گیا ہے۔ اور خوش حال خاں خٹک، رحمان بابا کی دنیا۔ اس کے مکیں رآدی، مہران اور پدما کی دنیا اور اسکے مکینوں سے شیر و شکر ہو گئے ہیں۔

سیاسی بدنظمی، معاشرتی خرابی، روحانی انحطاط اور ہوا و ہوس فسق و فجور کے غلبہ نے اس جلیل القدر ہستی کو جنم دیا جو آج اپنی مرز بوم کا شاعر جادو بیاں ہوتے ہوئے تمام ملک کا شاعر ہے اور اس کا کلام ان کا پیغام ہم سب کا مہتم بالشان، مایۂ ناز اور زندۂ جاوید ورثہ ہے۔

رحمان بابا کی یہ مقبولیت، یہ ہر دلعزیزی بلا وجہ نہیں۔ وہ اپنی زندگی میں بھی عوام کا شاعر تھا اور وفات کے بعد بھی اور زیادہ عوام ہی کا شاعر ہے۔ اس لئے عوام جہاں کہیں ہوں اسے اپنا ہی سمجھتے ہیں۔ اس میں اپنی ہی روح کا عکس پاتے ہیں۔ ایک فقیر گوشہ نشیں، دنیا کے شور و شر سے دور اپنی فقیرانہ کٹیا میں بیٹھا شعر کہتا ہے۔ اور دنیا کو اپنا فیض پہنچاتا ہے۔ رات رات بھر بیداری تاکہ وہ خود رنج و تعب اٹھا کر ایسے مقام تک پہنچے کہ اس کی ذات دوسروں کے لئے مفید بن سکے۔ اس کے منہ سے جو الہامی بول نکلتے ہیں اس کی بہن انہیں کاغذ قلم لے کر لکھتی جاتی ہے۔ اس کی جان و دل کی ساتھی ایک شاعر مست کیف کے رباب کے سوا اور کون ہو سکتی ہے؟ وہی جس کی دھن پر وہ نغمہ سرا ہوتا ہے۔ جو بول اس کے ہونٹ گنگناتے ہیں وہی اس رباب کے تاروں سے بھی کنمناتے کنمناتے ابھرتے پھوٹتے چلے آتے ہیں۔ اس کے ترانے دوسروں کو بھی مست بنا دیتے ہیں اور اس کی الہامی ترنگ کے ساتھ وہ بھی جانے کس عالم میں پہنچ جاتے ہیں ایک عالم علوی جو عالم سفلی سے کہیں دور اور پاکیزہ ہے جس سے روحانیت کے سرچشمے پھوٹتے اور اپنے گیت سے سب کو سرشار کئے دیتے ہیں۔ آج اس پیکرِ شعریت کے زمزمے ایک دیوان کی شکل میں بند ہیں۔ اور جو چاہے ان سے وہی جیتی جاگتی آواز وہی طنطنۂ رباب سن سکتے ہیں۔

ویسے ہمیں رحمان بابا کے اصلی نام عبد الرحمٰن اور باپ کے نام عبد الستار کے سوا اس کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں۔ اگر ہے تو طرح طرح کی گنجلک روایات ہیں۔ جن کے سہارے ہم کچھ کہیں بھی تو کیا۔ لوگ تو اسے مجذوب کہتے تھے۔ شاعر اور فقیر مجذوب ہی تو ہوتے ہیں۔ جو دور افق پر نظر جمائے جانے کیا کیا رویا دیکھتے رہتے ہیں۔ رحمان بابا بھی انہی میں سے ایک تھا۔ تصوف کا رسیا، عرفان کا دلدادہ، روحانیت کا پرستار۔ ایک انسان، ایک صاحبِ دل۔ رسم و رہِ عالم سے بیزار اور مشاہدات حق سے سرشار۔ کہنے کو ہم نے تین سو سال کہہ دیا۔ مگر یہ بھی کچھ ایسا قطعی نہیں اور یہ بھی کہ وہ حقیقتہً کہاں پیدا ہوا۔ ویسے اس کی جائے پیدائش پشاور سے تین میل دور ایک گاؤں بہادر کلی بتایا جاتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ مزار پُر انوار ہزار خوانی کے گرد و نواح میں ہے۔ اس پر اہلِ نظر نے قیاسات کا طومار لگا دیا ہے۔ جس سے حقیقت اور بھی روایات کی تہہ میں دب کر رہ گئی ہے۔ ایسے لوگ یوں بھی مکان و زمان کی قید سے آزاد ہوتے ہیں۔ پھر کیا ضرورت ہے کہ ہم خواہ مخواہ ان کو طلسم زمان و مکان میں اسیر کرنے کی کوشش کریں۔ وہ تو محبت کا بندۂ فرماں ہے۔ اور اخلاق کا ثناخواں اطل و کرشناخ۔

باقی صفحہ ۔۔ پر

سُر سسئی

(چند شہ پارے)

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ
مترجمہ: عاصمہ حسین

جن کے من میں لگن نہ ہو پیارے
اتنے اندیشے، وسوسے دل میں
ہے ہوس ہی ہوس بھری دل میں
کون، ہاں کون بھوک پیاس سہے

کب وہ جائیں گی ناریاں تھل میں
تھک کے رہ جائیں گی وہ اک پل میں
نفس ہی نفس جاں پہ چھایا ہے
یوں کسی نے عروج پایا ہے

وہی اس راہ پر چلے اے دل
دوسرا اس کا ساتھ دے گا کیا

جو ہو تیار جان دینے کو
جس کو سُکھ سیج کی تمنا ہو

درد سے جن کے جان و دل ہیں فگار
جان جوکھوں میں ڈالنے والے

ساتھ میرے وہ یار کو ڈھونڈیں
سنگ میرے پہاڑوں میں گھومیں

جن کے سیّاں براجے ہیں گھر میں
میں نہ جاؤں گی، میں نہ جاؤں گی

لوٹ جائیں وہ ناریاں گھر کو
میرا پیارا نہ ساتھ جب تک ہو

چاہے کیسی ہی مجھ پہ بن جائے
ان پہاڑوں سے لوٹنا، یہ بات

میں پہاڑوں کی خاک چھانوں گی
میں نہ مانوں گی میں نہ مانوں گی!

مرے دشمن یہ ظالم اونٹ والے
پلٹ جاؤ پلٹ جاؤ خدارا!

کھٹکتے ہیں یہ دل میں خار بن کر
وہ جن کے اپنے اپنے گھر ہیں شوہر

سنا ہے یہ برہ ایسی بلا ہے

کہ دل ڈرتا ہے پرچھائیں سے اسکی

مگر من میں الاؤ پریت کا ہو — تو ناریں کوہ و صحرا میں پھریں گی

بچن پورا کرا اپنا میرے پیارے — بچن ڈھنڈر میں جو تو نے دیا تھا
مرے ساجن، مرے پیارے، مری جان! — کہ میں بے دست و پا ہوں، بے سہارا

نہیں، پہلے بچن پورا کروں میں — میں اپنا قول پورا کر دکھاؤں
پھر اپنے قول کو پورا کرے گا — مرا ساجن مرا دلدار پنّوں

دلا! مت بھول ہرگز جو بچن سے — اکیلے میں سگوں نے کی تھیں باتیں
سو تو اے میری جاں ہرگز نہ سونا — نہ کھو جانا کہیں تم غفلتوں میں

وہ ٹیلے، گھاٹیاں، پربت پہ پربت — گزر جن سے ہوا اس کارواں کا
بھلا پیش آئے گی تو اُن سے کیسے — جہاں پاؤں پڑا اس جانِ جاں کا؟

بہت بھنبھور میں چرچے ہیں اس کے — وہ لوٹ آئیگی کیا، لوٹ آئے گی کیا؟
وہ پیکر جس میں کوئی جاں نہیں ہے — وہ جس سے چھِن گیا محبوب اس کا!

مری ماں، اے مری ماں، اے مری ماں! — نہ آؤں لوٹ کر اور پھر مروں میں
تمنّا ہے کہ لوٹ آنے سے پہلے — جہانِ آخرت کو چل بسوں میں

پیا کے واسطے میں دُکھ اُٹھاتی — چلی جاؤں بیاباں در بیاباں
خبر کیا یونہی اس کے آستاں تک — پہنچ جاؤں کہیں افتاں و خیزاں

•

کہو تو وہ ماتم میں بجائیں کسی کے کیوں بیکا رچّاتی!
ان کو تڑی کیا پیٹر پرائی جن کی نہ پھوٹی کبھی بوائی
جیسے میرے من کو دکھ ہے ویسے ان کے من کو کہاں
وہ تو یونہی دکھلاوے ہی سے بیٹھے سوگ مناتے ہیں

محض بناوٹ، محض نمائش اسی سے اشک بہلتے ہیں
میری ہمدردی سے ان کے لب پہ کہاں آہیں آئیں
جاؤ سہیلیو، جاؤ بتاؤ، جس کو بجوگ کے تیر لگیں
اس لڑکی کا، اس بالی کا دل ہو سُکھی تو کیسے ہو
ہاں ہاں وہ بدقسمت جس کا جیون ہو دکھ سے بھاری
سکھیو، میری پیاری سکھیو! پیا بنا مرا من ہے نراس
من ہے اُداس اُداس مرا اور جیون ہے بیمار
سَو میں سے ایک بھی حال بتاؤں اپنا اگر میں پھر کیا ہو
گنگ ہوں بن کے وحشی درندے، پربت پارہ پارہ ہوں
پیڑ جلیں اپنی ہی چتا پر، گھاس کی اک پتی نہ ہرے!
میں کیسے روؤں پی کے لئے جب رونے کے طور نہ جانوں سکھی
یونہی ہاتھ اٹھائے اٹھائے رہوں، مرے ہاتھ، ہے جن میں خاک بھری
جو پریت اگن میں جل جائیں انھیں بن میں کھیتیاں ہری بھری
انہیں جا کر پریت سندیس پہنچا جو میں حق کی تلاش میں کھوئے ہوئے
ہاں بھینگی آنکھ کو تین دکھیں جہاں ایک ہی ایک کا روپ بسے
ہاں دوئی کو چھوڑ دے، چھوڑ بھی دے، بس ایک کی ہو جا تن من سے
اے بھینگی آنکھ کی بڑھیا تو ہے مکر و ریا کی متوالی
بن تیرے رہے گا وہ کیسے، یہ کہہ تو ترا دلگیر رہی
وہ جو چھوڑ کے جائیں پگلی تجھے، نہ تو اُن سے جدا ہو، مان مری
جیسے سارھی کے ساتھ رہے پلو، یونہی ساتھ پتی کے نبھائے جا
چاہے جھڑکیں تجھے، چاہے ماریں تجھے، تو سیاں کے گُن گائے جا
یہ سنگ بھلا ہے، مانگ لے۔ نت جھولی کو پھیلائے جا

•

من کا روگ نہیں جاتے جاتے جائے
سسی اپنی کے بس میں گھلے
غرق تھی تن من سے پنّوں کی وہ چاہت میں
رچا تھا پنّوں ہی رت[۱] میں

[۱] خون

عرفان کی راہوں پر
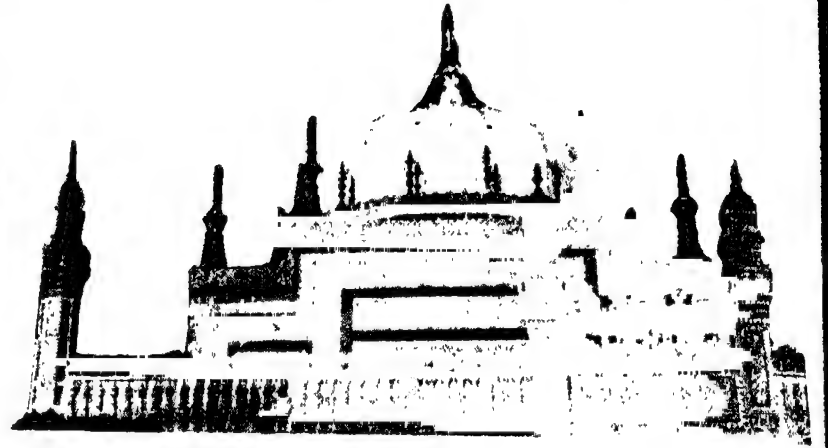
شاہ عبداللطیف بھٹائی رح

...نی و مغربی پاکستان کی اکثر سرایا بصیرت ہستیوں کی طرح غیر فانی اقدار —
...، محبت، اخوت اور انسانیت کا علمبردار جس کی وادئی مہران ہر سال
ذوق و شوق سے یاد تازہ کرتی ہے: زندہ دارد مرد را آثار مرد

روشنی ... مینار اور مسجد لطیف کے دیوانوں کا ہجو...

آ رل مل چلیئے یار

...یع و اعلیٰ قدریں جو پاکستان میں ہر کہیں مقبول اور سرمایۂ حیات ہیں،
...ان شوق کو لوؤں کی لپٹ، باد صرصر کے طوفان اور صعوبات سفر سے
...دا دور دور سے "منزل لطیف" کی طرف کشاں کشاں لئے آتی ہیں

عرفان و بصیرت کا سنگم
آئینہ در آئینہ در و بام — جو ایک مجلیٰ روحانیت کے آئ...
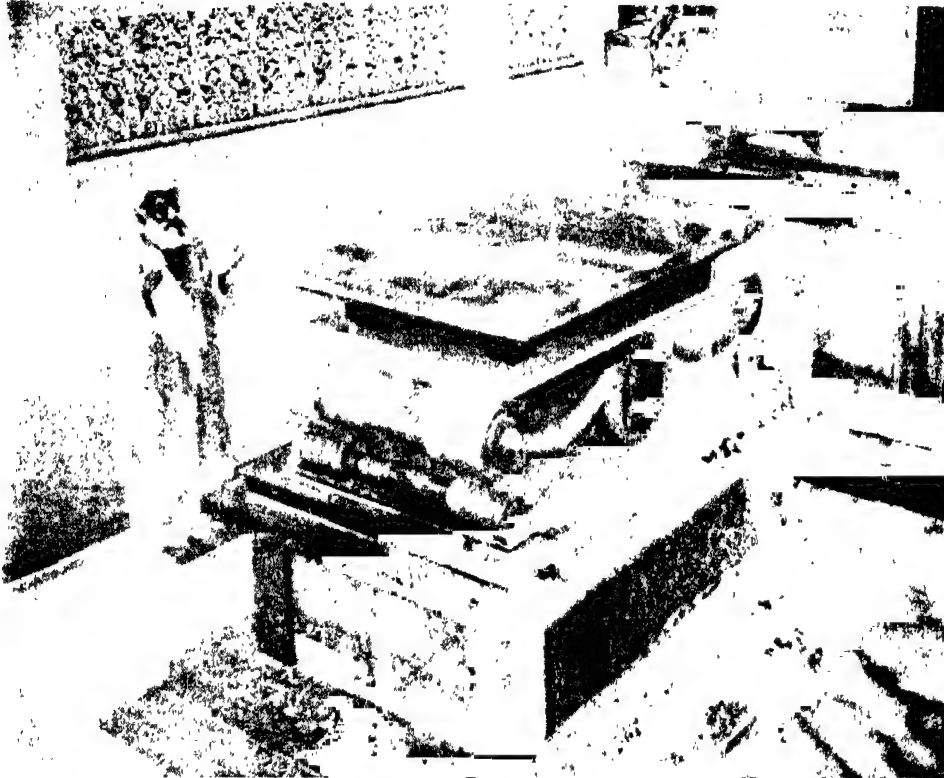
پیاسے ارمانوں کو کہیں پہنچا نہ سکی
پگ کو دور بڑھا نہ سکی
پانی پریت کا غٹ غٹ کامنی پیتی جائے
پینا دکھ کو اور بڑھائے
دکھ اس پیاس کا جس سے ہردے اس کا پھنکے
دم دم اور بھی جلن بڑھے
دیکھ تو مورکھ جھونپڑے اُن کے ندی کنارے
مریں وہ پھر بھی پیاس کے مارے
جان سے بھی نزدیک ہیں ساجن پیارے مرے
پھر بھی ہوں اوجھل انکی نظر سے
یہ تو حقیقت ہے وہ جانیں یا نہیں جانیں
لبوں پہ شکووں کی گرد نہیں
ہاں تو سسی ایسے ہی بن بن ماری ماری
پھرتی رہی نسدن بیچاری
جن کے من پیاسے ہیں ان کا حال نہ پوچھو
بڑھے جلن جتنا بھی پیو

★

ظاہر کا چلنا کیا چلنا، ہے من سے چلنا شرطِ سفر
گر من سے چلیں پی دور نہیں، ہر سمت وہی وہ آئے نظر
ہاں دل ہی سے جا، ہاں دل ہی سے جا، پریتم کی طرف جو جانا ہے
مت گھوم ان جلتے پہاڑوں میں کیوں ان کی سمت روانہ ہے
من ہی میں تھی، من ہی میں پائی، میں نے نگریا ساجن کی
یہی کیچ کی پہاڑی نگری تھی، اے بھولی! میرے ساجن کی
اپنے من سے، اپنے من سے ہاں اپنے پیا کے دوارے جا
اس بودے تن کو چھوڑ بھی دے اور جیوٹ من کے سہارے جا
جو جانتے تھے من کی شکتی وہ پی کے دوارے جا پہنچے
جو من کا دیپ جلاتے تھے وہ انت کنارے جا پہنچے

سرمارُئی

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ
ترجمہ: پیکر واسطی

قبل ازیں ہمارے یہاں اسی فن پارہ کے دو ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک لطف اللہ بدوی کا اور دوسرا ابن انشاء کے قلم سے۔ ان سب کا اپنا اپنا انداز ہے جن کا موازنہ دلچسپی سے خالی نہیں اور سب میں شاہ لطیفؒ کے مخصوص انداز کے ساتھ خمارِ چشم ساقی بھی شامل ہے۔ (مدیر)

سُن کر لبِ الست سے حرفِ بربکم
تب سے چراغِ عشق فروزاں کئے ہوئے

تھا معدنِ علم میں ابھی گو عنصرِ وجود
تب بھی اسیرِ گیسوئے وارفتگی تھی میں
تجھ سے یہ التماس ہے اے سومرو امیر
کیوں ہے یہ قید و بند کا ساماں مرے لئے
تن آ چکا فریبِ امارت کے داؤں میں

جاگی جو روح کُن نیکوں کی پکار پر
گُل بن کے سوزِ عشق کے شعلے بھڑک گئے
تب سے میں دل میں سوزِ محبت لئے ہوئے

کُن کی صدا بکھیر گئی فرشِ کائنات
دھرتی پہ مسکرا کے کھلے زندگی کے پھول
چٹکا رہا ہے تب سے مرے دل کی ہر کلی
میں ماردی ہوں رابطہ غیب بستہ ہوں

یہ کائنات نیند سے جاگی نہ تھی ابھی
روشن جبیں تھی میری محبت کے نور سے
پیراہنِ وجود مزین کئے ہوئے

روحیں تھیں سحرِ نعرۂ قالو بلیٰ میں گم
ہوں زندگی سے وعدہ و پیماں کئے ہوئے

چپ چپ تھا سازِ کُن نیکوں کا ابھی سرود
قلبِ عدم میں رہ کے دمِ زندگی تھی میں
پھینکے ہیں مجھ پہ کس لئے وہم و گماں کے تیر
آراستہ ہے گوشۂ زنداں مرے لئے
کیا روح آسکے گی سلاسل کی چھاؤں میں؟

آئی ہر ایک گلبنِ ارماں بہار پر
چہکی وہ عندلیب کہ غنچے چٹک گئے
ہوں زندگی کی اصل حقیقت لئے ہوئے

بہرِ سجود سر کو جھکائے بڑھی حیات
ہر اک طرف تھا بلا! رشِ الوار کا نزول
وہ میرا کھیت وہ مری آنکھوں کی روشنی
بہنوا میں ہی نوکشتہ حب الست ہوں

تھی خواب ناشنیدہ لگا ہوئے زندگی
بیخود تھی میں کسی کی نظر کے سرور سے
آئی ہوں دل کو عشق کا مخزن کئے ہوئے

اس دن کہ تھی نہ جسم کے سانچے میں زندگی
ایک ایک سانس بولئے وفا میں بسی ہوئی

برپا ہوئی نہ تھی ابھی تاروں کی انجمن
تھی لذتِ گناہ نہ کچھ طاعتِ ثواب
اس دم بھی ماروی تھی محبت سے ہمکنار
جامِ شرابخانۂ وحدت پئے ہوئے

آیا ہے میرے سامنے تقدیر کا لکھا
لائی ہے قید خانۂ شاہی میں زندگی
اس میں نہیں غرورِ حکومت کی کچھ خطا
وہ دن نصیب لائے کہ دیکھوں میں اپنا گھر

تاریکیوں کا راج ہے آتا نہیں نظر
کرتی ہوں یاد عہدِ خداوندِ خشک و تر
یارب مجھے زیارتِ روئے حبیب ہو
صبحِ وطن کی روشنی آئے نگاہ میں

ہے یہ مقولہ عربی ہر زبان پر
یوں فصلِ گل میں آگ لگی آشیانے میں
گو دامِ آہنی میں ہے جکڑا ہوا بدن
تکیہ ہے مجھ کو قادرِ مطلق کی ذات پر

آیا نہیں تھا قالبِ خاکی میں آدم
تھی کھیت کی لگن مرے دل کو لگی ہوئی

نہ پنکھ تھے چکور کے نہ چاند کی پھبن
بکھری ہوئی تھی ساغرِ توحید کی شراب
تھے جس پہ رازِ عالمِ مخفی سب آشکار
تھی میری روح جو ہر اک ہستی لئے ہوئے

زنداں ہے آدمی کے لئے بختِ نارسا
سب کچھ ہے کلکِ کاتبِ قدرت کی دلکشی
پنہوار یوں کو میرے اماں میں رکھے خدا
جاؤں میں قید خانۂ ستمر کو چھوڑ کر

باندھے ہیں کس کے دستِ مقدر نے ہاتھ
"میں ہوں رگِ گلو سے بھی بڑھ کر قریب تر"
اس قید و بندِ ظلم سے چھٹنا نصیب ہو
کھو جاؤں میں ملیر کی شام و پگاہ میں

ہے قیدِ آب و دانہ سلاسل سے سخت تر
لے آئی عاقبت کی کشش قید خانے میں
دل سے نہیں ہے دور وہ عہدِ گلشنِ وطن
اک دن رکھوں گی پاؤں زمینِ ملیر پر

خاکہ:

بھٹائی گھوٹ

انور سعید گیلانی

کتنے ہی عاشقوں کی طرح جن کی محبت کی کہانیاں وادیٔ مہران کے ہر دلعزیز عارف شاعر، عبداللطیف بھٹائی رحمہ نے اپنے انداز میں پیش کی ہیں، ان کی اپنی کہانی بھی محبت ہی کی کہانی ہے جس کے پیچ و خم بہت ہی دلچسپ ہیں، افتاد میں بھی اور انجام بھی۔ اس دلچسپ رومانوی کہانی کو جس کے تیور لعینہٖ عوامی کہانیوں کے ہیں "بھٹائی گھوٹ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یعنی "بھٹ کا دولہا"۔ اس کی دلچسپی کے پیش نظر ہم اس کا خاکہ ذیل میں پیش کرتے ہیں۔ —— (ادارہ)

مہران کے پیارے، بھٹ کے دولہا، شاہ لطیف کو کون نہیں جانتا؟ جسے اس دھرتی کا بچہ بچہ "لال لطیف" کے نام سے یاد کرتا ہے چہیتوں کا چہیتا، پہلے ایک سید گھرانے کا نورِ نظر اور اب ساری قوم کا چشم و چراغ۔ بھلا محمدؐ کی آل اور اس کی ہر کہیں عزت و احترام نہ ہو؟

اور پھر مہران کی وادی میں، جسے کبھی سندھ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، اس لئے شاہ صاحب کا گھرانہ بھی بڑی ہی عزت و توقیر کی نظر سے دیکھا جاتا تھا وہ خود تو کیا، لوگ تو ان کا سایہ بھی دیکھ لیتے تو اسے چوم چوم لیتے۔ "لال لطیف" کی طرح ان کے دادا بھی بہت بڑے بزرگ اور بڑے شاعر تھے، ان کا نام تھا شاہ عبدالکریم بلڑی والے۔ باپ شاہ حبیب، اپنے علاقے میں سادات کے سردار اور سربراہ۔ عام لوگ بھی جو یہیں کی مٹی سے اُگے، یہیں پھلے پھولے۔ اور بڑے بڑے امراء و رؤسا بھی جو زیادہ تر باہر سے فاتح بن کر آئے تھے اور ہمیشہ کے لئے یہیں آباد ہو گئے، چھوٹے بڑے سبھی ایک جگہ رہتے تھے اور جیون ندی اپنی پرانی چال کے ساتھ اونچی نیچی بہتی چلی جا رہی تھی۔

سادات کی برکت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے؟ انکی دوا، ان کی دعا کے امیر غریب، چھوٹے بڑے سب قائل اور دل سے خواہاں۔ اس لئے جب کوئی بیمار پڑتا تو دم درود، دعا کے لئے سادات ہی کو یاد کیا جاتا، اور کچھ عجب نہیں کہ انکی روحانیت کے فیض سے بیمار سنبھل جاتے اور مرنے والے بھی بستر سے اٹھ بیٹھتے۔

ایک ایسا ہی حسن اتفاق شاہ صاحب کی زندگی میں بھی پیدا ہو گیا۔ ترکوں کا ایک مشہور قبیلہ، ارغون ہے جس کا ایران کی تاریخ میں بھی بڑا چرچا سنائی دیتا ہے، اس کی ایک شاخ تھی جو مرزا کہلاتی تھی۔ ان دنوں یہ اس علاقے میں نواب تھے اور ہر جگہ انہی کا طوطی بول رہا تھا۔ یہ لوگ کون تھے؟ چنگیز خاں جیسے نامی گرامی فاتح کی اولاد۔ خود بھی نہایت شجاع اور عالی دماغ۔ جیسا ہر عالی نسب، عالی جاہ ہوا ہی کرتا ہے۔ ان کا کوٹ "جو کوٹری مغل" کہلاتا تھا، کہیں اس علاقے کے قریب ہی واقع تھا جہاں ان کے روحانی مرشد، شاہ عبدالکریم کا خاندان آباد تھا۔ مرزا مغل بیگ، خاندان مرزا کا ایک نہایت ہی باوقار فرد اور رکنِ رکین تھا۔ اس کی صاحبزادی، سیدہ بیگم (شاید اس کا نام ہی اس کی خاندانی سادات سے وابستگی کا پرتو لئے ہوئے تھا) بیمار پڑ گئی۔ اس لئے شاہ صاحب کے والد شاہ حبیب کو فوراً بلایا گیا کہ وہ اس کے لئے دعا کریں۔ وہ کچھ ایسے کام میں الجھے ہوئے تھے کہ ان کے لئے جانا محال تھا۔ اس لئے انہوں نے اپنی جگہ اپنے نورِ نظر، لطیف کو بھیج دیا —— ایک نوخیز جوان جس کی رگ و پے میں جوانی کا گرم اور تیز خون دوڑ رہا تھا۔ اب زندگی کا کھیل کہئے یا تقدیر، اسے خود ہی رومان کی راہ پر لئے جا رہی تھی۔

عام دستور کے مطابق دیگر شرفا کی طرح خاندانِ مرزا میں بھی پردہ کا رواج تھا اور بہت سخت۔ مگر جہاں روحانی پیشواؤں کی بات ہو وہاں پردہ کا کیا سوال؟ سادات معمر ہوں یا جوان، ان کی حیثیت تو بزرگوں کی سی تھی۔ اس لئے انہیں گھروں کے اندرونی حصہ میں بھی جانے کی اجازت تھی۔ اتنا بڑا اعزاز صرف سادات ہی کو نصیب تھا۔ بیگمات پردہ

کے لیے سجادریا پھلاری سے اپنا بدن یا دوپٹے سے چہرہ ڈھانپ
لیتیں۔ مغل بیگ کی بیٹی چندرے آفتاب چندرے ماہتاب اپنے
حسن وجمال کے لئے مشہور تھی۔ ادھر یہ پیکرِ حسن و زیبائی اور اُدھر
لطیف ایک پیکرِ شباب! خبر نہیں قدرت کو آتش و حسن کی اس یکجائی
سے کیا منظور تھا۔

ان حالات میں جو کچھ ہو سکتا تھا وہی ہوا۔ لطیف سراپا
شعلہ، سراپا ہیجان۔ اس حسنِ آتشیں کو دیکھ کر بھڑک اٹھا، اس نے
اس نازک سیم تن لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اس کی طبیعت قابو
میں نہ رہی اور وہ بے اختیار بول اٹھا:

"جنھن جی آگر سید ھت ہِ تنھن کی لھر نہ کو لوڈو"

(جس کی انگلی سید کے ہاتھ میں ہو، اسے موج و تلاطم سے کیا خطرہ)

اب سندھی ہو یا ہمارے ہاں کی کوئی اور زبان ـــ کسی لڑکی
کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لینے کے معنی ایک ہی ہیں۔ گو یا وہ اس
ہی کی ہو گئی۔ کوئی اس سے بڑھی بات بھلا اور کیا کہہ سکتا تھا!
اور پھر مرزا اُن کا خاص خاندان گرامی بھلا وہ ایسی بات پر کیوں
نہ تلملا اُٹھتے۔ مگر وہ ساتھ ہی بڑے خلیق بھی تو تھے اور سمجھ دار بھی۔
انہوں نے دل میں کہا۔ اس وقت کچھ کہنا سننا ٹھیک نہیں۔
یونہی بدنامی ہو گی، پھر دیکھا جائے گا۔ مگر یہ توہین ان کے
دل میں برابر کھٹکتی رہی کہ ایک معمولی سید زادہ چنگیز خاں کے
عظیم الشان خانوادہ کی لڑکی کے بارے میں ایسی جرأت کرے۔
ان کی غیرت اس بات کو کبھی گوارا نہیں کر سکتی تھی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کہاں تو اس خاندان کے لوگ
سادات کی بڑی تعظیم کرتے تھے اور کہاں بُری طرح پیش آنے
لگے۔ یہاں تک کہ ان کے ایما سے مرزا ہی نہیں بلکہ عام لوگ
بھی ان کی کھلم کھلا بے عزتی کرنے لگے۔ آخر کار نوبت یہاں تک
پہنچی کہ کوئی سید بھی مرزاؤں کے گھر کے پاس سے اپنی توہین کرائے
بغیر نہ گزر سکتا اور بیچارے سیدوں کو بالآخر اس جگہ کو چھوڑنے
ہی میں عافیت ـــ رہنے کے لئے یہی بہتر تھا کہ وہ اس مقام
کو چھوڑ کر تھوڑا دور اور شمال کی طرف آباد ہو جائیں۔
چنانچہ انہوں نے اپنے لئے ایک ڈیرہ بنا لیا۔

بیچارہ لطیف ـــ اس وقت اس کی عمر کل بیس سال
تھی اُدھر اسے عشق نے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ ناکامی کا احساس محبت
کا گھونٹا ہوا جوالا مکھی بن کر اس کی بے چین طبیعت میں ایک
بے پناہ ہیجان، ایک زبردست آشفتگی پیدا ہوئی۔ وہ کئی
کئی دن اردگرد کے صحرائی علاقوں اور ویران بیابانوں میں
اپنے حسین چہرے پر کرب و اضطراب، اداسی اور حرماں
نصیبی کی علامات لئے گھومتا پھرتا رہتا۔ آخر دل کی لگی کسی طرح
تو چین پاتی۔ یہ آگ کسی طرح تو بجھتی۔ اسی لئے دل کی لگی کو بجھانے
کے لئے اس نے طرح طرح کے شعر کہنے شروع کئے جن میں
اپنے دل کی رانی کا کبھی سورج کبھی چاند اور کبھی ستاروں سے
مقابلہ کرتا اور ظاہر ہے جیت کس کی ہوتی۔

ہوتے ہوتے اس شوریدگیٔ دل نے ایسا رنگ
اختیار کیا کہ وہ صحرا میں بیٹھے بیٹھے غش کھا جاتا۔ کہتے ہیں
ایک دفعہ وہ اتنی دیر بیہوش رہا کہ آندھی سے ریت اُڑ
اُڑ کر اس کے اوپر پڑتی رہی اور وہ تقریباً اس کے نیچے
دب گیا۔ خوش قسمتی سے اس کے والد بروقت پہنچ گئے اور
انہوں نے اس کو بچا لیا۔

بعض اوقات جذبے کی شدت اس حد تک بڑھ
جاتی کہ وہ بالکل یاس کا شکار بن جاتا ـ ایک دن لطیف
حسبِ معمول ایسے گئے کہ واپس نہ لوٹے۔ لوگ اِدھر اُدھر
تلاش میں دوڑے مگر ان کا کہیں بھی پتہ نہ چلا بعد میں
معلوم ہوا کہ گانے والے بنجاروں کی کوئی ٹولی آئی تھی۔
شاہ صاحب انہی جیسے جوگیا کپڑے پہن ان کے ساتھ
نکل گئے۔

اس طرح شاہ صاحب کی زندگی میں ایک نیا دور
شروع ہوا ـــ جہاں گردی کا دور اور وہ جگہ جگہ پھر پھر کر
عوامی کہانیوں کا ذخیرہ جمع کرنے لگے۔ ساتھ ہی موسیقی کا
شوق بھی پیدا ہو گیا اور وہ ہمہ تن اس کی تحصیل میں کھو گئے۔
بنجارے گویوں کے ساتھ وہ سندھ کی ہر ہر زیارت
پر پہنچے مگر جہاں بھی گئے ان کا لوک کہانیوں اور عشقیہ قصوں
کے جمع کرنے کا شوق ساتھ رہا۔ وہ چلتے پھرتے کابل، قندھار
تک جا پہنچے اور واپسی پر دوبارہ ہنگلاج بھی گئے۔ طبیعت تو

آزادی ہی ساتھی فقیروں کے بعض ظاہری طور طریقوں سے انحراف کیا۔ بعض پرانوں سے اَن بن ہو گئی۔ اور وہ ان سے الگ ہو کر اپنی راہ چلنے لگے۔ کچھ مکران کا سفر کرتے ہوئے وہ لس بیلہ کے راستے سابق سندھ کے جنوب مغرب کے ساحلی علاقہ میں پہنچے اور غریب مچھیروں میں رہنا سہنا شروع کیا۔ کراچی سے ٹھٹھ گئے جہاں ان بڑے بڑے بااثر مذہبی سربراہوں کا زور تھا جو "مخدوم" کہلاتے ہیں۔

راستہ میں ایک بڑا ہی عجیب واقعہ پیش آیا۔ چلتے چلتے انہیں پہاڑیوں میں کسی کی بڑی دردبھری لے میں گیت گانے کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز ایک غار کی طرف سے آ رہی تھی۔ جا کر دیکھا کوئی شخص ان ہی کے اشعار بڑی پُرسوز اور دردناک لے میں گا رہا تھا۔ اس سے پوچھا تم کون ہو؟ اس نے کہا شتربان۔ جب میرا کاروان ہالا کے پاس سے گزر رہا تھا۔ اور یہ جگہ شاہ لطیف کی اپنی بستی کے پاس تھی۔ تو اس نے یہ گیت سنا تھا۔ پہلے ہی بیت نے اس پر ایسا گہرا اثر کیا کہ وہ اپنے اونٹوں اور کارواں، سب کو چھوڑ کر صحرا میں اسی گیت کو گاتا پھرتا ہے۔ یہ بیت شاہ صاحب کی "سرسسّی" ہی کا وجد انگیز بیت تھا۔ جس میں سسّی کے ہونٹوں پر یہ بول تھے:

"میں اپنے ہوت، پنّوں کو ڈھونڈنے اکیلی ہی جاؤں گی۔"

لطیف خود صاحب درد تھے اس لئے اس شخص کا درد اور اندرونی کرب خوب جانتے تھے۔ انہوں نے اس سے پوچھا کیا تم اس سے اگلا بیت بھی سننا چاہتے ہو؟ شتربان نے بڑا اشتیاق ظاہر کیا۔ تو لطیف بولے، سنو:

"راستے میں بڑے ہی دشوار گزار پہاڑ ہیں اور نیزوں کی طرح تیکھی تیکھی چٹانیں۔"

یہ سن کر وہ شخص تقریباً بیہوش ہو گیا اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے التماس کی کہ یہ سارا بند پورا کر دو۔ لطیف نے ایسا ہی کیا:

"مگر میری تکلیفیں، میری تمنا، ہمیشہ میرے محبوب کی طول طویل تلاش میں میری وفادار ساتھی رہے گی۔"

یہ اشعار اس شخص کی طاقتِ برداشت سے کہیں زیادہ تھے۔ وہ غش کھا کر گر پڑا۔ یہ دیکھ کر لطیف بہت پریشان ہوئے جھک کر اسے چھوا مگر وہ غریب تو واصل بحق ہو چکا تھا۔

لطیف نے اس کو وہیں سپردِ خاک کر دیا۔

بنا کردند خوش رسمے بہ خاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

پھر کیا ہوا، سنئے۔ واقعات نے کیسے کروٹ بدلی۔ گھوم کر تین سال گھومنے پھرنے کے بعد لطیف ٹھٹھہ پہنچے جہاں ان کی مخدوم معین سے ملاقات ہوئی۔ ہوتے ہوتے وہ ایک دوسرے کے بڑے ہی گہرے دوست بن گئے۔ معین جانتا تھا کہ بیٹے کی اچانک جدائی سے باپ کا کیا حال ہوا تھا اور کس طرح تڑپ تڑپ کر دن رات یہ دعا کرتا تھا کہ ان کا فرزند دلبند واپس لوٹ آئے۔ انہوں نے کہا اب یہی بہتر ہے کہ یہ یوسف گم گشتہ پھر اپنے گھر اپنے یعقوب کے پاس پہنچ جائے۔ اب ان کا مزاج، ان کی دنیا ہی اور ہو چکی تھی۔ نہ وہ جوش نہ خروش، نہ لاابالیانہ پن۔ سو جس طرح ایک دن اچانک غائب ہوئے تھے اسی طرح گھر جا بھی پہنچے۔ اور پھر واقعات نے اس سے بھی زیادہ عجیب پلٹا کھایا۔ لطیف کی کہانی واقعی ایک پریم کہانی بن گئی۔ ابھی انہیں واپس ہوئے زیادہ دیر نہیں گذری تھی کہ مسلح ڈاکوؤں نے دولت کے نشے سے سرشار مرزاؤں کے قلعہ پر ہلہ بول دیا۔ اور ان کا سارا مال و دولت لوٹ کر لے گئے۔

یہ لوگ کسی مہم پر گئے ہوئے تھے۔ واپس آ کر بدلہ لینے کی ٹھانی اور مبین ان لیڈروں کے ٹھکانوں پر حملہ کرنے کے لئے چل پڑے۔ شاہ لطیف اب وہ پہلے شاہ لطیف نہ تھے۔ ان زبردستوں کے ہاتھوں زیردست سادات پر جو گزری تھی اور جو بدسلوکی انہوں نے روا رکھی تھی، وہ اس کو بھلا چکے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس آڑے وقت میں اپنی اور اپنے خاندان کی مدد پیش کی مگر مغل بیگ کی وہی آن باقی تھی۔ بھلا وہ ان کی مدد کیسے گوارا کر سکتا تھا۔ اس نے اسکو بڑی نفرت سے ٹھکرا دیا۔ غرض مرزا تن تنہا لڑائی کے لئے روانہ ہوئے اور بہت بری طرح شکست کھائی۔ ان کے اکثر آدمی مارے گئے۔ عورتوں نے اس کو سادات کی بددعا کا نتیجہ سمجھا۔ جن کے ساتھ مرزاؤں نے ایسا برا سلوک کیا تھا۔ چنانچہ اس کی تلافی کے لئے انہوں نے لطیف کو مغل بیگ کی اصل صاحبزادی سیدہ بیگم کا رشتہ پیش کیا اور اس کے نام کی مناسبت یوں

باقی صفحہ [illegible] پر

افسانہ:

"... رخ ہوا کا"

حمید کاشمیری

جب اچانک ایک مریض نے اٹھ کر کمرے کی بتی بجھا دی تو میں یوں کانپ گیا جیسے کسی نے مجھے قبر میں زندہ اتار دیا ہو۔ تاہم سڑک کی روشنی اب بھی کھڑکی سے اندر آ رہی تھی اور میرے عزیز کا چہرہ بدستور صاف طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ بہت گوری رنگت بھرے بھرے ہونٹ۔ اوپر کے ہونٹ پر پسینے کے قطروں کی جھالر سی پڑی ہوئی ــــ ناک بہت خوبصورت ستواں اور نتھنوں میں غالباً بخار کی وجہ سے ہلکی ہلکی سی کپکپی۔ بیخودی کے عالم میں اس نے دائیں آنکھ کو ایک آدھ بار کھول کے بند کیا تھا۔ اس کی یہ آنکھ کچھ بادامی اور کچھ بیضوی شکل کی تھی جس میں سمندر کا سا عمق اور شبنم کی سی تازگی تھی، اور اس کی بائیں آنکھ...

بائیں آنکھ کے تصور ہی سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میرے ایک دوست نے اس کی آنکھوں کو دیکھ کر کہا تھا کہ اس کی آنکھیں بہت خطرناک ہیں۔ یہ لڑکا کسی وقت میں گرل ہنٹر ہو گا۔ مگر دونوں ہی باتیں الٹی ثابت ہوئیں اس کی آنکھوں کی خوبصورتی اس ہی کے لئے خطرہ بن گئی۔ محلے کے چند "ٹیڈی بوائز" نے جو ایئرگن سے نشانہ بازی کر رہے تھے اس کی آنکھ پھوڑ دی، اور اب وہ گرل ہنٹر تو کیا ہو گا خود ہی ہنٹ ہو گیا تھا۔ زندگی بھر کے لئے۔ اب لوگ اس کے عجیب عجیب نام رکھیں گے۔ اس کا تمسخر اڑائیں گے۔ اور ممکن ہے وہ رات دن سیاہ چشمہ لگائے اپنی ایک آنکھ کے عیب اور دونوں آنکھوں کے فرق کو چھپاتا پھرے گا۔

میں ٹکٹکی باندھے کھڑکی سے چھن چھن کر اندر آتی ہوئی روشنی میں اس کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھ پر بھیانک سی سفید پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اور میں اس کے پہلو میں یوں بیٹھا تھا۔ جیسے تھوڑی دیر میں مجھے پھانسی پر لٹکایا جانے والا ہو۔ مجھے یہ تمام رات اس کی تیمارداری میں جاگ کر گزارنی تھی۔ کیونکہ ڈاکٹر نے ہدایت دی تھی کہ یہ بے احتیاطی سے کروٹ نہ بدلے۔ ورنہ اگر آنکھ دب گئی اور زخم کھل گئے تو بینائی کے رہے سہے امکانات بھی ختم ہو جائیں گے۔ میں چوکس ہو کر اس کے پاس بیٹھا اس کی ہر حرکت کی نگرانی کرتا رہا۔ اگرچہ اسے بیہوشی کی کوئی دوا دے دی گئی تھی مگر وہ بیخودی کے عالم میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد دبی دبی سسکیاں لیتا تھا جن میں اس کے تاریک مستقبل کی دردبھری داستان مخفی تھی۔

میرے تمام جسم میں جیسے کسی نے سوئیاں سی چبھو دیں۔ اور ایک رات جو مجھے آنکھوں میں کاٹنی تھی ایک برس کی لمبی مدت معلوم ہو رہی تھی اور میں نے اس سے پہلے کبھی ایک دن بھی ہسپتال میں نہیں گزارا تھا۔ وارڈ بوائے نے شام ہی سے میری پریشانی کا اندازہ کر لیا تھا اور اس لئے اس نے ازراہِ ہمدردی مشورہ دیا تھا کہ میں اپنے مریض کے برابر والے پندرہ نمبر خالی بیڈ پر سو جاؤں جس کے مریض کو آج ہی ہسپتال سے چھٹی دی گئی تھی۔ میری سہولت کے لئے اس نے پندرہ نمبر کا بستر بھی تبدیل کر دیا تھا لیکن ہسپتال کے بیڈ پر بھلی چنگی حالت میں سونے کا تصور اس وقت کسی اور تکلیف دہ احساس سے کم نہ تھا، اس احساس کی شدت اور تکلیف کو بھی گوارا کر لیتا، اور اچھی بری رات اس بیڈ پر گزارنا کوئی ایسا مشکل بھی نہیں تھا، مگر میں نیند کے معاملے کچھ بڑا ہی خوش نصیب سمجھا جاتا ہوں۔ چارپائی پر لیٹتے ہی مجھے یوں نیند آ جاتی ہے جیسے نیند نہ ہوئی کوئی عینک ہوئی جسے جیب سے نکال کر آنکھوں پر لگا لیا۔ اور نیند کی اسی عینک کو آج کی رات توڑ دینا میرے اختیار میں نہیں معلوم ہوتا تھا۔ مجھے خطرہ معلوم ہو رہا تھا کہ اگر میں سو گیا تو میرا عزیز میری غفلت کا شکار ہو جائے گا جس کی آنکھ پر پٹی بندھی ہے اور پٹی کے اندر اس کے مستقبل کی ننھی سی کرن پوشیدہ ہے جو ایک غلط کروٹ سے تاریکی کے خندق میں گم ہو سکتی ہے۔ لہٰذا میں نے تمام رات اپنے عزیز کے برابر بنچ پر بیٹھ کر گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت کم و بیش وارڈ کے سب ہی مریض یا تو سو گئے تھے یا جاگ رہے ہوں گے

لیکن ایک سناٹے کا عالم طاری تھا۔ یہ سناٹا غالباً اس گولی کی بدولت تھا جو تھوڑی دیر پہلے وارڈ بوائے نے ایک ایک سب کو کھلادی تھی۔ بنچ پر اکڑوں بیٹھ کر میں نے ایک یاس بھری نگاہ اس کے جسم پر ڈالی اور اس بدبخت ٹیڈی بوائے کے متعلق سوچنے لگا اور سوچتے سوچتے انتقامی جذبے کا ایک طوفان میرے سینے میں امڈ آیا۔ میری مٹھیاں بھنچ گئیں۔ اور دانت آپس میں جڑ گئے۔ میں تصور کی ایک تیز رفتار اڑان پر ٹیڈی بوائے کی تلاش میں نکل پڑا اور دیوانہ وار شہر کے گلی کوچے کھنگالتا پھرا اور آخر کار اسے ڈھونڈ نکالا بلکہ اسے اغوا کر کے شہر سے باہر دور سنسان ویران ٹیلوں کے درمیان لے گیا۔ جہاں وہ چیختا چلاتا رہا۔ ہاتھ جوڑ جوڑ کر معافی مانگتا رہا وہ بہت تڑپا، سہا ہوا تھا اور التجائیں کئے جا رہا تھا۔ اس نے واسطے دیئے قسمیں کھائیں مگر میں نے ایک نہ سنی اور ایک خونخوار ہاتھ بھر کا چاقو مار کے اس کی آنکھ پھوڑ دی۔ مجھے ایک لمحے کے لئے تسکین ضرور ملی مگر دوسرے ہی لمحے جیسے وہی چاقو کسی نے میرے سینے میں اتار دیا تھا۔ اور میں شدتِ درد سے تڑپ کر رہ گیا۔ اور میری آنکھوں سے غالباً آنسو بہہ نکلے!

"آپ رو رہے ہیں"؟ میرے کان میں دھیمی سی آواز آئی۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ میرے سامنے بارہ نمبر مریض کھڑا تھا جس نے غالباً میری پریشانی کو بھانپ لیا تھا۔ اور بستر سے اٹھ کر میرے قریب آ گیا تھا۔ "آپ روتے کیوں ہیں، خیر ہوگی، فکر نہ کریں جو اللہ کو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔ میری آنکھ کو دیکھئے اور پچاسوں مریض ہیں اس وارڈ میں۔" وہ ہمدردانہ طریقے سے کہتا ہوا میرے قریب بنچ پر بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی میں یوں چوکس ہو گیا جیسے اس کا جسم کانٹے دار ہو۔ مجھے اپنی جیب میں پڑے ہوئے پانچسو روپوں کی فکر دامن گیر ہو گئی۔ میں نے اس کی ہمدردی کا کوئی اثر قبول نہیں کیا اور اپنے قریب سے اٹھانے کے لئے موزوں ترین الفاظ سوچنے لگا۔ یہاں اس مریض کا ریکارڈ بہت خراب تھا اسے ہسپتال کے اسٹاف کے علاوہ مریض بھی نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس بات کا اندازہ مجھے سرِ شام ہی ہو گیا تھا میرے عزیز کے ہسپتال میں داخل ہوتے ہی بارہ نمبر مریض سب سے پہلے میرے پاس آیا تھا۔ حادثے کی وجہ پوچھی تھی۔ ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ اور تمام خدمات پیش کر دی تھیں۔ ظاہر ہے کہ میں کسی مریض سے کیا خدمت لے سکتا تھا۔ مجھے اس کے جذبۂ ہمدردی اور خلوص نے متاثر ضرور کیا تھا لیکن یہ اثر ہسپتال کے دیگر مریضوں کے رویئے سے تھوڑی دیر بعد خود بخود زائل ہو گیا تھا کیونکہ آٹھ نمبر مریض جسے سب "حاجی حاجی" کہتے تھے، بارہ نمبر کے جاتے ہی فوراً میرے پاس آیا تھا اور اس نے سرگوشی کے انداز میں مجھ سے کہا تھا:

"صاحب! اس بارہ نمبر سے خبردار رہیئے۔ یہ بہت بڑا چور ہے، بدمعاش ہے۔ اس کی آنکھ پر جو زخم ہے وہ بھی چوری کی نشانی ہے۔ چوری کر کے بھاگ رہا تھا کہیں دیوار کی کیل لگ گئی۔ ہسپتال میں آکر بھی یہی دھندا شروع کر دیا ہے۔ ڈاکٹر اور نرسوں کی کتنی چیزیں گم ہوئی ہیں۔ آئے دن مریضوں کی بھی چوریاں ہوتی رہتی ہیں۔ باہر سے آنے والوں کی بھی چیزیں گم ہو جاتی ہیں۔ یہ سب اس کی کارستانی ہے کتنی دفعہ تلاشی بھی ہوئی مگر پکڑا نہیں جاتا۔ بہت چالاک ہے۔"

آٹھ نمبر حاجی نے اسی قسم کے اور بھی کتنے ہی قصے بارہ نمبر کے متعلق بتائے تھے اور اس کے علاوہ دیگر مریضوں نے بھی جو چلنے پھرنے کے قابل تھے اسکے متعلق کوئی نہ کوئی ایسا انکشاف ضرور کیا تھا جس سے بارہ نمبر چور اور بدمعاش ظاہر ہو۔ لیکن میں نے ان تمام باتوں کا اسوقت کچھ زیادہ اثر اس لئے قبول نہیں کیا تھا کہ مجھے اپنے عزیز کی فکر زیادہ تھی اور روپوں کی کم۔ مگر اب جب کہ رات سر پر تھی۔ اور میرا عزیز بیخود سویا ہوا تھا تو مجھے روپوں کی بھی فکر دامن گیر ہو گئی تھی۔ جو میری کل کائنات تھے اور جن کی میں اس طرح نمائش کر چکا تھا کہ کچھ کاغذ نکالتے وقت پوری گڈی جیب سے باہر نکل آئی تھی۔ اور جسے بارہ نمبر نے ایک نگاہ ہی میں بھانپ لیا تھا۔ اب ہمدردی جتلاتے ہوئے چوری کی فکر میں تھا۔

"آپ بہت پریشان معلوم ہوتے ہیں، آپ آرام کیجئے میں آپکے مریض کی نگرانی کر لوں گا" وہ مزید ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

"آپ کی ہمدردی کی کوئی ضرورت نہیں آپ اپنے بیڈ پر چلے جائیے۔ میں اپنے مریض کو خود ہی دیکھ لوں گا۔" میں نے رکھائی سے جواب دیا۔ اگرچہ میں نے محسوس کیا کہ وہ اتنے سخت جواب کا سزاوار نہ تھا۔ تاہم مجھے اس سے نجات حاصل کر کے اپنے روپوں کو خطرے سے باہر نکالنا تھا اور ایسا درشت لہجہ اختیار کرنا ہی پڑا۔ وہ میرا جواب سنتے ہی اٹھ کر چلا گیا مگر کہتے ہیں چور چوری سے جائے مگر ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ جاتے جاتے مڑ کر کہنے لگا:-

"پھر بھی اگر میری ضرورت پڑے تو بے تکلف جگا دیں۔"

"اچھا، اچھا دیکھا جائے گا۔" میں نے سر سے بلا ٹالی۔ وہ واپس جا کر کمرے میں اپنے بارہ نمبر بیڈ میں دبک گیا۔ فوراً ہی آٹھ نمبر والے حاجی کے بیڈ میں کچھ حرکت سی ہوئی اور وہ سائے کی طرح سرکتا ہوا میرے پاس آ گیا۔ اپنی آنکھ پر لگے ہوئے کپڑے کو درست کیا۔ ہلکی ہلکی تاریکی میں بارہ نمبر بیڈ کی طرف کچھ اس انداز سے دیکھا جیسے دور بین سے دیکھ رہا ہو پھر میری طرف جھک کر چپکے چپکے کہنے لگا۔

"صاحب یہ کیا کہہ رہا تھا"

"کچھ نہیں اپنی ہمدردی ظاہر کر رہا تھا"

"بچ کے رہنا اس سے۔ میں نے آگاہ کر دیا ہے" اس نے جیسے خطرے کی گھنٹی بجا دی ہو۔ وہ سرکتا ہوا پھر واپس اپنے بیڈ پر چلا گیا۔ اور میں دیوانہ وار ادھر ادھر بستروں پر پڑے ہوئے مریضوں کو دیکھنے لگا جو اپنی آنکھوں پر پٹیاں باندھے مردہ لاشوں کی طرح بے حس و حرکت پڑے تھے۔ بارہ نمبر سے میں اب بھی خائف تھا اس لئے کہ اس کی گردن ایک دو مرتبہ تکیے سے اوپر بلند ہوئی تھی جیسے وہ مجھے تاک رہا ہو۔ لیکن نیم تاریکی میں اس کے چہرے کے تاثرات کا پتہ نہیں چلتا تھا، میں نے اس کی طرف سے اپنی توجہ ہٹالی اور اپنے عزیز کی طرف دھیان دینے لگا۔ وہ بدستور غشی کی حالت میں تھا۔ لب آہستہ آہستہ لرز رہے تھے اور نتھنوں میں بخار کی وجہ سے معمولی سی کپکپی بھی تھی۔ اور اس کا میرے پاس فوری طور پر کوئی علاج نہ تھا۔ ڈاکٹر کو صبح آنا تھا اور نرس معائنہ کر کے جا چکی تھی۔ ہلکی ہلکی تاریکی میں پورا وارڈ قبرستان معلوم ہو رہا تھا اور مجھے اپنے متعلق یہ احساس ہونے لگا تھا کہ جیسے میں ایک مردہ ہوں لاش ہوں یا پھر قریب المرگ مریض۔ میرے جسم کے ایک ایک جوڑ میں درد محسوس ہو رہا تھا۔ ویسے بھی جب سے اپنے عزیز کے زخمی ہونے کے بعد دن بھر بہت بھاگ دوڑ کی تھی جس کا نتیجہ اب تکان اور نقاہت کی شکل میں ظاہر ہو رہا تھا اور میرے اعضا قطعی جواب دے رہے تھے۔ میں نے ایک نگاہ پھر اپنے عزیز پر ڈالی اور ذرا کمر سیدھی کرنے کے لئے اس کے برابر والے خالی پلنگ پر دراز ہونا چاہا مگر اس خیال سے کہ کچھ دیر سستا کر اٹھ جاؤں گا اور باقی تمام رات اس کی دیکھ بھال میں گذار دوں گا۔ میں نے کوٹ اپنی نگاہ کے سامنے دیوار پر ٹانگ دیا جس کی اندر والی جیب میں پانسو روپے کی رقم رکھی تھی بھر برابر والے خالی پلنگ کے تکیے کو ذرا اونچا کیا اور ٹانگیں کھول کر لیٹ گیا۔ لیٹے لیٹے کچھ دیر بعد مجھے جھپکی سی آئی لیکن چونکہ میں بیدار کا تہیہ کر چکا تھا لہٰذا اپنی قوت ارادی کے سہارے فوراً قابو پا لیا۔ اور آنکھوں کو ایک دو دفعہ ملا اور پھر کھول دیں۔ مگر تھوڑی دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ غنودگی میری بیداری کے خلاف مسلسل سازش کر رہی تھی۔ میں نے پھر اپنے حواس پر خمار اور بیخودی کے کچھ پردے سے چھائے دیکھے میرے پپوٹے بوجھل ہو گئے اور پلکیں بند ہو گئیں۔ میں نے آخری دفعہ کچھ نیم بیخودی کے عالم میں آنکھوں کو کھولنے کی جدوجہد کرتے ہوئے اپنی دم توڑتی بیداری کو سنبھالا دینے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اور جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ نیند کے معاملے میں میں بہت ہی خوش نصیب آدمی سمجھا جاتا ہوں جو کہ آج کی رات میری بدقسمتی بن گئی تھی۔ نیند نے مجھے جیسے کسی اڑن کھٹولے پر بٹھا کر ہسپتال کی مدقوق چار دیواری سے باہر نکال لیا تھا۔ اور دور کہیں فردوس وش، پُرسکون وادیوں میں چھوڑ آئی تھی جہاں میں رات بھر گہرے اور سرد آگیں پانیوں میں غوطے لگاتا رہا تھا۔

جب میری آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ کسی کی باتوں کی آواز میرے کان میں پڑی تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ دیکھا تو وہی بارہ نمبر مریض میرے عزیز کے پائینتی بیٹھا تھا۔ ذہن کو ایک ساتھ کئی دھچکے لگے۔ ایک تو ساری رات سو کر گذار دی تھی اور ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے عزیز کی خبر نہ لے سکا جس کی خاطر ہسپتال میں رات بسر کی تھی۔ پھر بارہ نمبر مریض کو اس کے بستر پر بیٹھے دیکھ کر اور دہشت ہونے لگی اور دھیان جیب میں رکھی ہوئی رقم کی طرف چلا گیا جس کے محفوظ ہونے کی اب کوئی امید باقی نہ رہی تھی۔ بہرحال میں اپنے عزیز سے سخت شرمندہ تھا کہ رات جس کے قریب رہ کر بھی دور گذاری ہے۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس پر کیا بیت گئی ہو گی۔ میں نے اٹھتے ہی اس سے معذرت کی۔ اس کی نبض دیکھی آنکھ کی پٹی کا جائزہ لیا۔ اور اس کے منہ سے اطمینان کے دو بول سننے کے لئے اسے دھیمے دھیمے لہجے میں پکارنے لگا۔

"اس وقت اسے نہ چھیڑیئے، بہتر ہے آرام کرنے دیجئے" بارہ نمبر جو ابھی تک اس کی پائینتی ہی بیٹھا تھا۔ بیچ میں بول اٹھا۔ اس کی یہ مداخلت میرے لئے ناقابل برداشت ہو گئی میں نے درشت لہجے میں کہا،

"آپ اٹھ جائیے درمیان میں سے اور اپنا کام کیجئے میں آپ سے

بہتر سمجھتا ہوں۔"

"بہتر ہے اٹھ جاتا ہوں" وہ پلنگ سے نیچے اتر آیا اور اپنے بیڈ کی طرف چلا گیا۔ میں بیتابی کے عالم میں کوٹ کی طرف لپکا اور اندر والی جیب کا جائزہ لینے لگا جہاں میرے پانسو روپے پڑے تھے، میں نے خلاف توقع روپوں کی گرمی کو وہاں محسوس کر کے انگلیوں کی پوروں پر گن لیا۔ میری جان میں جان آئی جلدی سے کوٹ پہن لیا اور مطمئن سا ہو کر اپنے عزیز کے برابر بیٹھ گیا۔

"آپ نے سخت غلطی کی ہے" میرے عزیز کی نحیف سی آواز میرے کان میں پہنچی۔

"میں سخت شرمندہ ہوں" میں نے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔" میں ہرگز سونا نہیں چاہتا تھا یونہی لیٹے لیٹے آنکھ لگ گئی تھی۔"

"یہ بات نہیں ہے" وہ کچھ کراہتے ہوئے بولا" اس مریض کو آپ نے کیوں ڈانٹا ہے۔ وہ تو تمام رات میری خدمت کرتا رہا ہے۔ مجھے بہت سخت تکلیف ہو گئی تھی۔ وہی ڈاکٹر کو بلا کر لایا تھا۔ دودھ اسی نے گرم کر کے دیا تھا چائے بنا کر دی۔ پیشاب خود کروایا۔ اور تمام رات تلوے ملتا رہا۔" اس نے کہتے کہتے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور خاموش ہو گیا، میں بھی خاموش ہو گیا لیکن میرا جی چاہ رہا تھا کہ ایک زور کی فلک شگاف چیخ ماروں۔ بارہ نمبر مریض جو کچھ دیر پہلے ایک بے قیمت اور حقیر سا رائی کا دانہ معلوم ہوتا تھا اب پہاڑ بن کر میرے دل و دماغ پر حاوی ہو گیا تھا۔ میرا احساس جرم و ندامت لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ ذہنی اذیت میرے لئے عذاب جاں بن گئی۔ میں نے اسی باہمی کشمکش، اسی خلجان میں ۱۲ نمبر بیڈ پر ایک بھرپور نظر ڈالی اور یوں محسوس کرنے لگا جیسے میرے قدم دھیرے دھیرے اس کی جانب بڑھ رہے ہوں اور ان کے ساتھ شاید ہاتھ بھی بڑھتے ہی چلے جا رہے ہوں۔ جانے کس احساس، کس خیال کے تحت۔ میں سوچ اور عمل کے دھاروں میں بہتا ہی گیا۔ بہتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ شاید یہ دونوں آپس میں مل گئے، کہیں اس کے پاؤں کے قریب ہی۔ اور میں نے محسوس کیا میرا ہاتھ آگے بڑھا ہوا ہے۔ مگر وہ تو ساری رات جاگتے رہنے کی وجہ سے گہری نیند میں کھو گیا تھا۔ مجھ سے، ساری دنیا سے بے خبر!

آہنگ

انجم اعظمی

آج تا حد نظر ارض و سما پر ہے محیط
ایک نادیدہ تبسم، اک خیال
جس کی آہٹ پر کھلے ہیں نام خوابوں کے دریچے ذہن میں
اور دل و جاں میں اٹھی ہے موج رنگ
گلشن ناآفریدہ کی شبیہہ
ڈھونڈھتی ہے رنگ و بو کی بزم میں اپنا قیام
جس کے بدلے مل رہا ہے یہ شراب غم کا جام

غم کی لذت کتنی بے پایاں ہے، جیسے دشت میں
دوپہر کے وقت ہر جانب سرابوں کا جہاں
بے کنار و بے کراں
اور خوشی جو دور افتادہ تصور کے سوا کچھ بھی نہیں
جذبۂ تعمیر میں پنہاں تو تھی
حسرت تعمیر میں گم ہو گئی

شوق بے چارہ پھرا کرتا ہے آوارہ ابھی
غم کی لذت، حسرت تعمیر کی دنیا لئے
جیسے میخانے کے دروازے پہ دستک دے کوئی
تشنگیٔ بادہ و صہبا لئے
یا شفق کی اوٹ سے دوشیزۂ صبح بہار
مسکرائے ہاتھ میں پیمانۂ فردا لئے

غزل

سیّد ضمیر جعفری

اشک میں تھرّائے ہم یا برق میں لہرائے ہم
زندگی تیرے لئے کچھ روشنی لے آئے ہم

سنگ سے بالیدگی، صحرا سے دریا لائے ہم
آخر اے تسکینِ روح و دل کہاں تک آئے ہم

بے نیازی، خود فراموشی، خودی، بیگانگی
کیسے کیسے اجنبی رستوں سے اُن تک آئے ہم

ہر خموشی کو صدا، ہر درد کو آواز دی
کتنے ویرانوں کا دل روشن تھا ہم سے ہائے ہم

دوش و فردا کی کشاکش میں ترے غم کا جمال
اک ستارہ تھا کہ جس کے ساتھ چلتے آئے ہم

شعر میں بھی اپنے طرزِ زندگانی کی طرح
راہِ آساں و ہجومِ عام سے کترائے ہم

سیّد آلِ احمد

رس میں ڈوبی انکھڑیوں سے جب ملاقاتیں ہوئیں
نیم بیداری کے عالم میں عجب باتیں ہوئیں

ایک لمحہ پہلے آنکھوں میں کوئی آنسو نہ تھا
لمحہ بھر کے بعد جانے کتنی برساتیں ہوئیں

دل کے گہرے جنگلوں میں سو گئی یادوں کی دھوپ
خامشی کی دھول میں گم کس قدر راتیں ہوئیں

رات کی رانی کی خوشبو کن مہک شانوں پہ تھی
بے خودی کی جھیل میں جذبات سے گھاتیں ہوئیں

آ گئی جب ڈوبتے سانسوں سے سانسوں کی مہک
جسم و جاں کے درمیاں کیا کیا مناجاتیں ہوئیں

ڈوب جائیں گے کسی دن ہم سکوتِ شام میں
بھول جائیں گے کہ تجھ سے بھی ملاقاتیں ہوئیں

اک نشاطِ درد ہی احمدؔ ہمیں حاصل رہا
چاندنی راتیں ہوئیں یا غم کی برساتیں ہوئیں

غزل

مشفق خواجہ

ہجر کی تیرہ و تار راہوں میں ہم یوں تصور کی شمعیں جلاتے رہے
تیری یادیں تو تھیں ہی شریکِ سفر خود کو بھی ہم بہت یاد آتے رہے

میں حوادث گہہ دہر میں عمر بھر مثلِ آئینہ حیرت سراپا رہا
جلوے میرے لئے ہی پریشاں ہوئے اور مجھ سے ہی دامن بچاتے رہے

کون تھا جو مرے ذہن کے آئینے میں خود اپنے ہی جلوے کبھی دیکھتا
میں سرِ راہ کچھ سوچتا ہی رہا، لوگ آتے رہے، لوگ جاتے رہے

رہ نوردانِ راہ جنوں کے لئے تپتے صحراؤں کا نام ہے زندگی
وہ تری یاد کے سلسلے ہی تو تھے راہ میں جو خیاباں سے آتے رہے

نجدِ احساس میں گردبادِ جنوں بے کراں خامشی چھوڑ کر چل دیا!
خود وہ اپنی صداؤں میں گم ہو گئے جو تجھے زندگی بھر بلاتے رہے

یوں کسی سے تخاطب کا موقع ملا ہم پہ خود اپنا مفہوم واضح نہ تھا
جانے کیا راز تھا جو بیاں کر گئے، جانے کیا بات تھی جو چھپاتے رہے

عشقِ یک طرفہ ہے یا مسافر کوئی جس کو توفیقِ منزل شناسی نہیں
ہم نہ جانے کسے یاد کرتے رہے، ہم نہ جانے کسے یاد آتے رہے

آنے والی خوشی کا تصور ہمیشہ حریفِ غمِ دہر بنتا رہا
زندگی کو ترے درد کا روپ دے کر بہر حال ہم مسکراتے رہے

وقت کی آندھیاں لاکھ سرکش سہی ہر کشی کچھ انہیں کا تو حصہ نہیں
جن چراغوں کو جلنا تھا جلتے رہے، رہگذر رہگذر جگمگاتے رہے

اے رفیقانِ راہِ وفا، کچھ تو سوچو ذرا حاصلِ رہ نوردی ہے کیا
چند اَن دیکھے سائے جو دشتِ طلب میں سدا اپنی جانب بلاتے رہے

شاہد عشقی

بادِ بہار لاکھ روش ناشناس ہو
کچھ تو گلوں کے چاک گریباں کا پاس ہو

محسوس یوں ہوا ہے بڑھا جب بھی دردِ دل
جیسے تمہارا ہاتھ مرے دل کے پاس ہو

ہر شخص آشنا ہے، پر اتنا نہیں کوئی
جو مجھ سے آ کے پوچھے کہ تم کیوں اداس ہو

کچھ روز سے ہمارا بھی لگنے لگا ہے دل
یوں، جیسے زندگی ترے ملنے کی آس ہو

ہم دل زدوں پہ وسعتِ صحرا بھی تنگ ہے
لیکن تمہارا شہر بھی شاید ہی راس ہو

ہر چند دل فریب ہے مومن تری بہشت
میری ہی آرزو کا کوئی انعکاس ہو

عشقی تمہیں کہو کوئی کیوں کر غزل کہے
جب تک نہ مہوشوں سے کوئی ربطِ خاص[1] ہو

---

[1] مقطع میں "خاص" کا قافیہ صوتی اعتبار سے باندھا گیا ہے۔
(ش۔ع)

ایک نوخیز ستارہ ٹوٹا!

محمد مقصد علی

زندگی انساں کی ہے مانندِ مرغِ خوشنوا　　　شاخِ گل پر آ کے بیٹھا، چہچہایا، اُڑ گیا!

ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا، مشرقی پاکستان کے افق پر یکایک چکا چوند پیدا کرتا ہوا ایک روشن ستارہ ابھرا تھا، جو طلوع ہوتے ہی غروب ہو گیا — عبدالستار — ایک اور جواں مرگ ایڈونیس جس کی یاد میں ہم سب نوحہ کناں ہیں۔ بقول غالب:

دردیغا کہ کام ولب از کار ماند　　　سخن ہائے ناگفتہ بسیار ماند

"بیر شہارشنا"۔ تولسی زبان — یہ اس کا اپنا ہی اختیار کیا ہوا لقب تھا، مگر آج وہ تشنہ کام نہیں، ہم ہیں، اور یہ اسی کا ایک تشنہ کام ہمزبان و ہم وطن ہے جس نے یہ مضمون اس کی یاد میں ہمارے لئے بطورِ خاص لکھا ہے اور ہم اسے بڑی مسرت کے ساتھ پیش کر رہے ہیں کیونکہ فاضل مضمون نگار کو بنگلہ کے ساتھ اردو سے بھی گہرا شغف ہے۔ چنانچہ حال ہی میں "جشنِ زریں" (ملتان) کے موقع پر اس نے اردو میں تقریر کی۔ جو پاکستان کے دونوں بازوؤں کی مکمل صوتی وہم آہنگی کی نہایت خوش آیند علامت اور ہماری ملکی و قومی سالمیت کی بہترین نوید ہے ÷ (ادارہ)

★

گرد بھرے پتھ کے ہم راہی
ایک ہی دن کا ساتھ ہمارا
ہر دم دھیان میں سکھ کی باتیں
دکھ کے بنا پر کچھ بھی نہ پائیں!
ایک پہیلی جیون اپنا
بوجھنا چاہیں، پر کیا بوجھیں
کبھی نہ پائیں اس کا کنارہ
دل میں رہیں سب دل کی امنگیں
موت کے گھاٹ پر اک اک کر کے
ٹوٹ پھوٹ کے سب رہ جائیں!

یہ چند پُرسوز اور پُر درد اشعار بنگلہ کی ایک تازہ کتاب "کبی دا" کے پہلے ہی صفحہ پر تحریر ہیں۔ یہ کتاب ہمارے "دردویش کوی" (باغی شاعر) نذرالاسلام — کی زندگی سے تعلق رکھتی ہے، جو تین ایکٹ کا ایک ڈرامہ ہے — ایک ٹریجیڈی۔ جسے ہمارے ڈرامہ نگار نے ایک خاص رنگ میں ڈوب کر لکھا ہے۔ یہ اشعار کس کے ہیں؟ اس کی صراحت نہیں کی گئی۔ لیکن چونکہ دادین میں لکھے گئے ہیں اس لئے یہی سمجھنا چاہئے کہ یہ اشعار بھی مصنف کے اپنے ہی لکھے ہوئے ہیں۔ ان کا ڈرامہ کے موضوع سے بھی کوئی واضح تعلق نہیں۔ شاید کچھ اسی قسم کا اشارہ کرنا مراد تھا جو آجکل کے ایک فلمی گیت کے بولوں میں بھی اکثر سنا گیا ہے:

جیون کے سفر میں راہی
ملتے ہیں بچھڑ جانے کو

غالباً شاعر یہ بھی کہنا چاہتا تھا کہ جیسے ناساز حالات نے نذرالاسلام کو عملی حیثیت سے بے ثمر بنا دیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے — اور اس طرح ہم لوگوں کے کتنے ہی خواب شرمندۂ تعبیر رہ جاتے ہیں۔ یہ بات بڑی افسوسناک ہے اور عجب اتفاق ہے کہ یہ خود اس جواں مرگ ادیب پر صادق آتی ہے۔ یہ اسی کا ایک دردناک نوحہ ہے جس نے یہ ٹریجیڈی تحریر کی۔ یہ اسی طرح اس کے حسبِ حال ہے جس طرح شیلے کے وہ اشعار جن میں اس نے کشتی کے ٹوٹنے اور اہلِ کشتی کے ڈوبنے کا منظر پیش کیا تھا۔ نذرالاسلام کی ٹریجیڈی لکھنے والا خود اپنی ٹریجیڈی سے کس قدر بے خبر یا — باخبر تھا!

ہمارے ادبی افق خصوصاً بنگلا ادب کے افق پر وہ ایک نیا ستارہ تھا۔ جسے دیکھ کر یہ امید بندھتی تھی کہ وہ آگے چل کر جانے کیا آب و تاب پیدا کرے۔ مگر افسوس! موت کا آہستہ آہستہ، چپکے چپکے بڑھنے والا بھیانک ہاتھ، آگے بڑھا اور اسے اچک کر لے گیا!! اس وقت اس کی عمر کل ۴۱ سال تھی۔ اس سے زیادہ دلدوز سانحہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ ہمارے ادب پر یہ افسوسناک حادثہ ۱۔ اپریل ۱۹۶۱ء کو گذرا۔ معمولی سی علالت — اور پھر اس کی بے وقت موت نے ہمارے اور اس کے درمیان ایک چلمن ڈال دی — ایک دبیز پردہ حائل کر دیا!

اس دور جانے والے راہی نے یہ اشعار اپنی قبل از وقت موت کا سایہ دیکھ کر تو نہیں لکھے تھے؟ کیا یہ لاشعور کی سفاکی نہیں ہے؟ مگر کون کہہ سکتا ہے کہ مرنے والے کی نگاہیں مستقبل کے کن پردوں کو چاک کر کے کیا کچھ دیکھ چکی تھیں۔

عبدالستار کومیلا کے پاس ہی ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ بڑا ہی غریب گھرانہ تھا مگر بہت معزز۔ طالب علمی کا زمانہ ایسا کٹا کہ دوسروں کو پڑھا پڑھا کر گذارہ کیا اور اس طرح اسکول پھر کالج تک اپنی راہ بناتا چلا گیا۔ تعلیم اس کٹھن طریقہ سے حاصل کر چکا تو پھر کومیلا سے ڈھاکہ چلا آیا۔ یہاں بھی پڑھتا رہا۔ بنگلا زبان و ادب میں ڈھاکہ یونیورسٹی سے ایم اے کی سند بھی حاصل کر لی۔ پڑھنا ختم ہوا تو معلمی سے مدد معاش تلاش کی اور چاٹگام کالج میں درس دینے لگا۔ وفات کے وقت تک وہ اس کالج میں لیکچرار تھا۔ کئی سال سے وہ بڑی محنت اور کاوش سے نذرالاسلام کے حالات زندگی اور افادات کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس گہرے مطالعہ کا نتیجہ تھا وہ عظیم ڈرامہ "کبی دا" (شاعر بھائی) جسے لکھنے کا اس نے بیڑا اٹھایا۔ اصل میں اسے اس کا سرمایۂ حیات تصور کرنا چاہیئے۔ اس تصنیف نے اسے آدمجی کے ادبی انعام (۱۹۶۰ء بنگلا) کا مستحق قرار دیا۔ مرحوم نے ایک اور ڈرامہ بھی تحریر کیا تھا — "پرمیتھیس عہد بہ عہد"۔ یہ عنقریب شائع ہونے والا تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی تصانیف زیر تکمیل تھیں کہ عمر گریز پا نے مہلت نہ دی۔ اپنے ہی الفاظ میں اسے اپنی تمام تمناؤں اور آدرشوں کو پورا کئے بغیر ہی موت سے ہمکنار ہونا پڑا۔

یہ ستارہ ٹوٹ گیا مگر اب بھی ہمارے افق پر اس کی دمک باقی ہے، اپنا ڈرامہ "کبی دا" وہ ہمارے پاس چھوڑ گیا ہے۔

اس ڈرامہ کو آدمجی انعامات کے منصفین نے اُن بنگلا تصانیف میں جو ۱۹۵۵ء کے بعد لکھی گئیں، بہترین بنگالی تخلیق قرار دیا — جب یہ خبر مشہور ہوئی تو عجب گومگو کا عالم ہوا۔ کیونکہ کسی شخص نے "عبدالستار" کا نام تک نہ سنا تھا۔ شاید کبھی کبھار اس کا کوئی مضمون کسی رسالہ میں چھپ گیا ہو۔ مگر اس کی کوئی ایسی نمایاں خصوصیت یا امتیاز نہ تھا جو لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا۔ پھر یہ بھی تھا کہ "کبی دا" اس کی واحد مطبوعہ تصنیف تھی اور آدمجی ادبی انعام کے اعلان سے پہلے بازار میں نہیں پہنچی تھی۔ اس لئے کسی کو نہ مصنف کا ٹھیک طرح علم تھا نہ کتاب کا ہی کچھ اور چھور معلوم تھا۔ اس لئے قدرتی طور پر لوگوں کو یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوئی کہ ایک ایسا شخص اس وقیع انعام کا مستحق قرار دیا جائے جس کا کسی نے زیادہ چرچا بھی نہ سنا تھا۔ کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ "کبی دا" کوئی ایسی اہم کتاب نہ تھی اور منصفین نے اپنے فیصلے میں شاید رعایت سے کام لیا؟

مگر اب اس بارے میں تمام شکوک اور شبہے دور ہو چکے ہیں۔ رعایت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ مصنف کوئی معروف ادیب نہ تھا اور کتاب مقابلہ کے لئے "بے رش رشنا" (تونسی زبان) کے نام سے پیش کی گئی تھی، اس "بے رش رشنا" کو بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس لئے اگر بے لاگ فیصلہ ہو سکتا تھا تو خود کتاب ہی پر ہو سکتا تھا۔ معلوم ہوا ہے کہ اس کتاب کی عمدگی کے بارے میں تمام منصف متفق الرائے تھے۔ یہ بات کہ مصنف غیر معروف ہے، ان کے فیصلہ پر اثر انداز نہیں ہوئی۔ اس لئے کتاب آزمائش کے مرحلۂ دشوار سے بڑی کامیابی کے ساتھ گذر گئی۔ خواہ اس کا مصنف ادبی حلقوں میں ممتاز یا معروف تھا یا نہیں، ارباب نظر کو اس کے مطالعہ کرنے اور اس کو اپنے نقطۂ نگاہ سے جانچنے پرکھنے کا پورا پورا موقع مل چکا تھا۔ یہ درست ہے کہ اس کے متعلق مختلف رائیں ظاہر کی گئی ہیں اور بعض رائیں کافی خلاف اور ملامت آفریں تک ہیں، مگر ان میں سے اکثر آراء کی بنیاد محض وہ تعصب ہے جو لوگوں کو اس کی طرف سے تھا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اتنا اہم انعام ایسے مصنف کو ہرگز نہیں ملنا چاہیئے جس کا نہ نام بڑا ہے نہ کام!

میں نے یہ ڈرامہ بہت غور سے پڑھا ہے۔ میری رائے میں مصنف نے واقعی ایک بڑا کٹھن کام سرانجام دیا ہے — نذرالاسلام جیسے باغی شاعر کی زندگی کو ڈرامہ کی شکل میں پیش کرتے

کے لئے بڑے حوصلے اور عزم و ہمت کی ضرورت تھی۔ یہ کام اس لئے اور بھی دشوار بن جاتا ہے کہ اس کا ہیرو، نذرل، ابھی ہم میں موجود ہے اور اس کا موجودہ نسل خصوصاً ادیبوں اور جہان وطن پر زبردست اثر ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ دوسرے کوئی ۳۵ کروڑ بھی جو اس سورج کے گرد سیاروں کی طرح گھومتے پھرتے ہیں۔ برصغیر کے کتنے ہی سیاست داں، ماہرین اقتصادیات، سماجیات کے متعلق مختلف نظریات کے حامی۔ جن کے ادب، سیاسیات اور معاشیات کے باب میں بڑے متنوع روپ ہیں۔ سارے کا سارا پلاٹ جو صرف پیچ در پیچ اور گتھم گتھا سیاسی دھاروں کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے۔ اس کا تانا بانا تیار کرنا بھی اچھے سے اچھے مصنف کے لئے کار دے دارد کا مصداق ہے اس لئے یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ گو مصنف کو اس سلسلہ میں زیادہ مشق اور تجربہ نہ تھا پھر بھی اس نے اپنی قوت فیصلہ اور زور تخیل کی بنا پر نذرل کی زندگی سے مناسب واقعات چن کر اور ان کی شیرازہ بندی کر کے یہ مہم بڑی کامیابی سے سر کی۔ ڈرامہ میں جو بھی جزئیات لائے گئے ہیں ان کا انتخاب بہت عمدہ ہے اور بڑی چابکدستی سے انہیں ترتیب دیا گیا ہے۔ نذرل کا کردار ایک مفکر کوی، اپنے زمانہ کے ہیرو اور محبت کئے جانے کے لائق فرد کی حیثیت سے بڑی ہی خوش اسلوبی سے ابھرتا ہے۔ اس کی پہلی شادی کی ناکامی، پہلے بیٹے کی موت، مستقل آمدنی نہ ہونے کے باعث کنبہ کی شدید غریبی اور ازدواجی زندگی میں کشمکش، مفلوج بیوی کا وبال، مفلسی میں یار واحباب کی پہلوتہی اور کنارہ کشی، ان سب کو اس طرح خوبی کے ساتھ جمع کر کے دکھایا گیا ہے کہ معلوم ہو یہ تھے وہ اسباب جن کے کارن نذرل کا سکونِ دل برباد ہو گیا۔ ایک عظیم شخصیت کی شاندار زندگی غارت ہو کر رہ گئی اور وہ اس تباہ کن افتاد سے کبھی نہ ابھر سکا، وہ اس مقام عروج تک نہ پہنچ سکا جس کی صلاحیتیں اس میں بیحد موجود تھیں۔ وہ گہرا، بڑی اونچی، ٹیڑھی سیدھی گھاٹی سے، اس لئے یہ ٹریجیڈی — ایک سنگین مگر حقیقی ٹریجیڈی رونما ہوئی۔

جہاں تک فن — اسٹیج اور مکالمہ — کا تعلق ہے مصنف نے واقعی بڑی ہی قابل تعریف لیاقت کا ثبوت دیا ہے۔ "کبی" دا یونانی المیوں کے نمونے پر لکھی گئی ہے۔ اس میں جگہ جگہ گیت اور نظمیں بھی ہیں جو تماشائیوں کو نفسِ موضوع اور اس کی اہمیت کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتی ہیں۔ مکالمے بڑے صاف اور رواں ہیں۔ اور کرداروں کے لئے بالکل برجستہ، برمحل۔ ان سے ہر ہر فرد قصہ کا کردار ڈرامے میں اسکے رول اور حیثیت کے مطابق واضح ہوتا جاتا ہے۔ مکالموں کے متعلق سب قارئین کو اتفاق ہوگا کہ وہ بڑی عمدہ بنگلا میں لکھے گئے ہیں۔ اکثر مقامات پر اسلوب بیان، خصوصاً ہیرو کے مکالموں میں نذرل کے اپنے انداز سے ملتا جلتا ہے۔ مصنف نے ڈرامے کی روح اور کرداروں کے مطابق صحیح فن پیدا کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کھیل نذرل اور اس کی تخلیقات کو لوگوں سے روشناس کرانے میں بڑی مدد دے گا۔ جو اس کی تحریری کاوشوں کو پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے لیکن اسٹیج پر اس کے کمالات دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ اور اب تو یہ واقعی ہنگامہ زا کراچی میں اسٹیج پر دکھایا بھی جا چکا ہے۔

اگر آغاز یہ تھا تو انجام کیا ہونا تھا؟ جو کچھ ابھی عرض کیا گیا اس سے ظاہر ہے کہ اگر پاکستان کا یہ ہونہار نونہال چند سال اور جی جاتا تو وہ ہمیں اور بھی بڑے انمول جواہر پارے دے سکتا۔ اسکی جوانمرگی سے بنگلا زبان و ادب، اور اس کے ساتھ تمام پاکستان کا بڑا ہی ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔

مرنے والا آج ہمیں اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ یاد آتا ہے اور آتا رہیگا۔ موت نے اس کی چاہت اور بھی بڑھا دی ہے۔ وہ ایک ایسا انسان تھا جسے ہر کوئی چاہے گا۔ نہایت ہی خاموش، اور خوش نفس ہونٹوں پر بیشتر ایک مسکراہٹ کھیلتی ہوئی۔

جب وہ اس سال جنوری کے پہلے ہفتہ آدمجی انعام لینے کے لئے (جسے صدر پاکستان بہ نفس نفیس دیگر قومی اعزازات کی تقریب میں عطا کر رہے تھے) کراچی آیا تو مجھے بھی اس سے ملنے اور جاننے کا موقع ملا۔ اتنا بڑا اعزاز حاصل ہونے پر بھی اس میں گھمنڈ کا شائبہ تک نہ تھا۔ بلکہ وہ سراپا انکسار تھا — بات چیت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ ہمارے ادب کے بارے میں بہت عمدہ رائے رکھتا تھا۔ وہ اس کی بے حد قدر و منزلت کرتا تھا۔ اسے اپنے مطالعہ کی تنگ دامانی اور ادب میں نمایاں مقام نہ ہونے کا پورا احساس تھا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ اس کی حیثیت تو محض ایک نو آموز کی ہے، بہت اچھا ہوتا اگر یہ اعزاز کسی ممتاز ادیب کو حاصل ہوتا جس نے ایک عمر علم و ادب کی خدمت کی ہو۔ اس عجز و انکسار سے صاف ظاہر ہے

(باقی صفحہ ۵۱ پر)

قومی گیت : ایک کیف، ایک نغمہ

یونس احمر

گیت اصناف شاعری کی وہ حسین اور نازک صنف ہے جس میں دلوں کی دھڑکنیں سموئی ہوتی ہیں اور جذبات واحساسات کے شعلے پرورش پاتے ہیں۔ لے میں قدرتی بہاؤ، بول بڑے ہی مترنم اور موثر، موسیقی حیات بخش اور پُرسکون۔ غنائیت اس درجے کہ دل اس کی طرف بے ساختہ کھنچنے لگے۔

قومی گیت بھی گیتوں کی ایک قسم ہے۔ ہماری زبان میں قومی گیت بے شمار لکھے گئے ہیں۔ جن دنوں برّصغیر میں غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف مسلمان صف آرا ہو رہے تھے اور ان کے دلوں میں غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لئے آزادی کی قندیلیں روشن ہو رہی تھیں اُن دنوں قوم کے بیدار اور حساس شاعروں نے کافی قومی گیت اور ملّی ترانے لکھے۔ ان گیتوں میں غلامی سے نفرت کا جذبہ پیدا کیا گیا تھا اور جہدِ آزادی میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔ ان میں اُن مسلمان بہادروں کے کارنامے بیان کئے گئے تھے جن کے آہنی بازوؤں نے پے در پے فتوحات حاصل کی تھیں۔ اس ضمن میں علامہ اقبالؒ کے ترانہ "چین وعرب ہمارا ہندوستاں ہمارا" کا ذکر لازم ہے جو عرصہ تک برّصغیر کے مسلمانوں کے دلوں کو گرماتا اور روحوں کو تڑپاتا رہا۔ اس میں مسلمانوں کو ان کی تاریخ کے اُس دورِ زرّیں کی جھلک دکھائی گئی تھی۔ جب وہ جذبۂ آزادی سے سرشار تھے اور کامرانی ان کے قدم چوم رہی تھی۔ مولانا ظفر علی خاں نے بھی تحریکِ خلافت کے موقع پر اور اس کے بعد بھی بے شمار قومی گیت لکھے۔ ان کے قومی گیت یا ترانے اس حد تک مقبول ہوئے کہ ہر سیاسی جلسہ کی کارروائی سے پہلے ضرور گائے جاتے۔ اسی طرح نذرؔ الاسلام نے بنگالی مسلمانوں کے دلوں میں اپنے قومی گیتوں سے آزادی کی لگن پیدا کی۔ ان سارے قومی گیتوں یا ترانوں میں الفاظ کی گھن گرج، زبان کی شعلہ فشانی اور دلوں میں سوزِ وطن وملت پیدا کرنے کا عنصر بہت کافی ہوتا تھا۔ گو آہنگ یا نغمگی کا زیادہ خیال نہ رکھا جاتا۔

اب جبکہ وہ دورِ غلامی ختم ہو چکا ہے اور ہم ایک آزاد قوم ہیں۔ اور آزاد شہریوں کی حیثیت سے سانس لے رہے ہیں، ہمیں ایسے گیتوں کی ضرورت ہے جن میں اپنے ملک سے محبّت کا درس ہو، جن میں ایک آزاد قوم کے بلند عزائم اور جذبات حب الوطنی کا اظہار ہو، جو ہمیں اپنی تاریخ پر فخر کرنا سکھائیں۔ جن میں اس بات کا بھی اظہار ہو کہ ہم اپنے اسلاف کے کارناموں پر کیسے ناز کر سکتے ہیں۔ دنیا کی ہر زندہ اور ترقی یافتہ قوم کے اپنے گیت ہیں۔ جن میں ان کے عزائم اور عالی حوصلگی کی اُڑان ہے۔ اُن میں ان کا وہ جذبۂ دروں ہے جو انہیں ایثار و قربانی پر ابھارتا ہے۔ ان کے اندر روشن مستقبل کی چمک دمک ہے۔ ہمارے گیت بھی ایسے ہونے چاہئیں جو پاکستانی عوام کو اتحّاد، استقلال، حوصلہ مندی اور ایثار پر ابھاریں۔ جو ان احساسات کو بیدار کر سکیں جو ہمیں قومی مقاصد کے حصول میں نظم وضبط سے کام لینے کا درس ہو۔

ہم طوفان حوادث سے گزر کر ایک نئے دور میں داخل ہو چکے ہیں۔ ہمارے سروں پر غیر ملکی استعمار کی ننگی تلواریں اب نہیں لٹک رہیں۔ ہم جس بے یقینی اور یاس ونومیدی کی ابر آلود فضا میں سانس لے رہے تھے اب وہ باقی نہیں رہی۔ اب ہمارا اپنا ملک ہے اپنی حکومت ہے۔ ہم دنیا کی دیگر آزاد، زندہ اور ترقی یافتہ قوموں کی طرح باوقار ہیں۔ ہماری ایک تاریخ ہے۔ ہمیں اس پر فخر ہے۔ ہمارے اسلاف نے ہمارے لئے بہت کچھ چھوڑا ہے جس پر ہم کو ناز ہے۔ ہم اپنے روشن مستقبل پر یقین رکھتے ہیں۔ ہمارے دلوں میں اپنے ملک سے محبت کرنے کا بے پایاں جذبہ بھی ہے۔ لہٰذا ہمارے قومی گیت بھی ان احساسات سے مملو ہونے چاہئیں۔ یاس پرستی، شکست خوردگی اور کلبیت

کا دور ختم ہو گیا۔ ہمیں اپنے قومی گیتوں میں ایسے احساسات و افکار کو سمونا چاہئے، جو ان امور سے نفرت دلائیں، کیونکہ یاس پسندی زندگی کا منفی پہلو ہے اور ایک زندہ و توانا قوم کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے۔

ان اوصاف کے علاوہ قومی گیت کی زبان سہل اور سیدھی سادی ہونی چاہیئے تاکہ ان پڑھ اور کم پڑھے لکھے لوگ بھی انہیں سمجھ سکیں۔ ہمارے ملک میں ۸۵ فیصد لوگ ان پڑھ ہیں۔ اس لئے ایسی زبان میں گیت لکھنا جو ان کے فہم و ادراک سے باہر ہوں، بیکار ہے۔ ایسے گیت کے لئے جو عوام کے دلوں کو اپنی طرف کھینچ لے اور اس کے بول اُن کے ذہنوں میں محفوظ ہو جائیں، سہل زبان کا استعمال اشد ضروری ہے۔ اس میں آہنگ بھی ہوتا ہے اور غنائیت بھی۔ ایسا گیت بہت جلد عوام میں مقبول ہو جاتا ہے اور تعمیرِ ملت میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔

سہل اور عام فہم زبان کے استعمال کے علاوہ گیت ایسے ہونے چاہئیں جو بزمیہ اور رزمیہ یا سیدھی سادی دھنوں کے سانچے میں بھی ڈھل سکیں۔ قومی گیتوں کی اپنی الگ اور مخصوص دھن ہوتی ہے یہ دھن قوموں کا مزاج ظاہر کرتی ہے۔ دنیا کی ہر قوم کا مزاج یکساں نہیں ہوتا اس لئے قومی گیتوں کی دھنیں بھی ایک سی نہیں ہوتیں۔ لہٰذا قومی گیت لکھتے وقت قوم کے مزاج کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

گیت لکھتے وقت ہمیں اپنی تاریخ اور جغرافیائی حدود سے بھی آگاہی ہونی چاہئے۔ ہمارا ملک دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان، مگر دوری کے باوجود قرب ہے اور دونوں کا تعلق گوشت اور ناخن کا تعلق ہے۔ دونوں ایک جان دو قالب کا مصداق ہیں۔ ان کی بنیادی آوازیں ایک ہیں، تصورات ایک ہیں، اس لئے وہ متجانس ہیں مذہب اور عرفان و ایمان ان کو ایک ہی رشتے میں منسلک کر دیتے ہیں۔ ایک کی خوشی دوسرے کی خوشی ہے، ایک کا دکھ دوسرے کا دکھ۔ مشرقی پاکستان میں طوفان اور سیلاب کی صورت میں جو حادثے نمودار ہوتے ہیں ان کو دیکھ کر مغربی پاکستان کے ہر فرد کا دل تڑپ اٹھتا ہے اور وہ ہر طرح ان کی مدد کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح مغربی پاکستان میں اگر کوئی آفت نازل ہوتی ہے تو مشرقی پاکستان کے دل سے آہ نکلتی ہے۔ قومی گیت لکھتے وقت ان باتوں کو بھی سامنے رکھنا لازم ہے اور ہمیں مسرت ہے کہ دونوں بازوؤں میں شاعر اس کا پورا پورا حق ادا کر رہے ہیں۔ حال کے علاوہ ہمیں ماضی کی تاریخ سے بھی کما حقہٗ آگاہ ہونا چاہئے۔ ہماری تاریخ تیرہ سو سال پرانی ہے۔ اس مدت میں ہم مختلف دوروں سے گزرے ہیں۔ ہم نے پہاڑوں کے سینوں کو چیرا اور سمندروں کو کھنگالا ہے۔ ہم نے بڑی بڑی جنگیں لڑیں، اور فتحیاب ہوئے۔ ہمارے یہاں آہنی عزم رکھنے والے مجاہد اور کوہ گراں سے ٹکر لینے والے جانباز پیدا ہوئے ہیں۔ ہم نے علم و حکمت کے میدانوں میں بھی ناموری حاصل کی۔ عدل و مساوات ہمارا ایمان اور بخشش و عطا ہمیشہ شیوہ رہا۔ یہ خصوصیات ہمیں یاد رہنی چاہئیں اور مستقبل کے لئے مشعل راہ بننی چاہئیں۔

ہر قومی نغمہ نگار کے لئے ان چیزوں پر قادر ہونا لازمی ہے، (الف) زبان (ب) موسیقی (ج) تاریخی ماحول (د) ملت کے مزاج سے شناسائی۔

قومی گیتوں کے لئے بول بڑے ہی مترنم، ولولہ انگیز اور مؤثر ہونے چاہئیں جن کو سن کر ایک نئی قوم کے بلند عزائم کا پتہ چل سکے اور ان کی موسیقی کے زیر و بم میں ایسی تڑپ ہو کر سامعین کے دل فوراً قبول کر لیں۔ اچھے گیتوں کے لئے جچے تلے اور آہنگ سے پُر الفاظ کا ہونا ضروری ہے ایسے الفاظ میں شدت بھی ہوتی ہے اور موسیقی بھی۔ وہ گیت زیادہ کامیاب ہوں گے جن کے بول بھی اچھے ہوں اور دھن بھی اچھی ہو غرضیکہ قومی نغمہ نگار کو اور باتوں کے علاوہ اچھے بول اور اچھی دُھن کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔

ہمیں آج ایسے گیتوں کی خاص طور پر ضرورت ہے۔ افراد قوم میں جوش و ولولہ پیدا کرنے اور ان کو ترقی کی منزلوں تک پہنچانے کے لئے ایسے گیتوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا گیت کے سبک، سجل بول ہمارے جذباتِ خفتہ کو بیدار کر سکتے ہیں۔ ان کی کیف آور دھنیں ہمارے دلوں کو گرما سکتی ہیں۔ یہ گیت در اصل ایسا آئینہ ہیں جس میں ہم بیک وقت ماضی، حال اور مستقبل کو دیکھ سکتے ہیں اور اب جب کہ ہماری انقلابی حکومت نے ہمیں ولولۂ تازہ اور فضائے تازہ عطا کر دی ہے ہمارے قومی نوا پردازوں کی نوائیں اور بھی خوش آہنگ اور بلند آہنگ ہونی چاہئیں۔ ہماری نئی فضا ہمارے لئے ایک مستقل مہمیز ہے اور ہمیں یقین ہے کہ شعرا اس قومی میدان میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کریں گے۔ ان کے نغموں سے تعمیر آشیاں کا شوق بھی نمایاں ہوگا۔ اور ہمارے قومی گیت واقعی اپنے اندر ایک نیا کیف، ایک نئی نغمگی لئے ہوئے ہوں گے ●

وہ مٹتے ہوئے نقش ابھرنے لگے!

مشینی کھلونے اور گڑیاں اہل ذوق کے لئے تسلی نہیں ہوسکتیں—" مجھ کو تو خانہ ساز کے احساس کے تحت ہنر و فن کے شیدائی اد یہاں کی کشیدہ کاری کی ہوئی پیاری کاسنی ذہنی گڑیوں کی طرف رجوع کر رہے

ہم سب، چھوٹے بڑے شروع ہی سے خواب دیکھتے رہے ہیں - اور گڑیاں ان خوابوں کا سب سے پہلا، بڑا ہی سہانا روپ ہیں - جو خواب ہی نہیں بلکہ حقیقت بھی ہیں - زرکار ہی نہیں زر آفریں بھی!

ہم بھی ہو کھڑے ہیں راہوں میں

سراپا زر: گڑیوں کی زرق برق پوشاکیں نہ گڑیاں محض سنہری کاریگری ہی نہیں بلکہ دساور سے سنہری دام لانے کا ذریعہ بھی ہیں

دلہن کا جہیز و بردار ساز و سامان — سہاگ ہی سہاگ

"شاعرِ شیریں نوا" — بقیہ صفحہ ۲۵

اس نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ نہ خلیل ہے نہ داؤدزئی، نہ مہمند۔ اور اگر وہ آج زندہ ہوتا تو اسی شد و مد سے یہ کہہ دیتا کہ وہ نہ پختون ہے، نہ پنجابی نہ سندھی، نہ بنگالی، اور اس طرح اپنے ہم وطنوں کو قیدِ مقامی اور قیدِ نسل و رنگ سے آزاد رہنے کا نہایت حیات افروز اور بصیرت افروز پیغام دیتا۔ جس کی اُس وقت بھی ضرورت تھی اور آج بھی ہے۔

محبت کی زبان غزل کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔ ہم ایشائیوں کی محبوب غزل ہی جسے پشتو میں رباعی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بہرحال اس کا غمزۂ جانانہ اور شیوۂ ترکانہ تو وہی ہے۔

به هر رنگے که خواهی جامه می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم

اس غزل کے پردے میں وہ اپنے احساسات کی ترجمانی بھی کرتا ہے اور اپنے گرد و پیش رہنے سہنے، چلنے پھرنے والے عوام کی بھی۔ بندۂ عشق اور بندۂ تصوف ہونے کی وجہ سے جو برصغیر کے مسلمانوں کا سرمایۂ مشترک ہیں، وہ ایک محکم رشتہ اتحاد پیدا کر لیتا ہے۔ جو اس کی جنم بھوم کے موجودہ مکینوں کو بھی ایسے ہی رشتۂ محکم میں منسلک کر دیتے ہیں۔ وہ ہمیں فروعات اور سطحی، ظاہری امور و امتیازات سے پرے لے جا کر زیادہ بلند معاملات میں یک جاں، ایک دل اور یک روح بنا دیتا ہے۔ منزلِ حق و صداقت کی طرف گام زن ہونے اور اس تک رسائی پیدا کرنے میں تمام راہی ایک ہو جاتے ہیں۔ وحدتِ حق اور وحدتِ انسانی ایک ہی مضمون ہے۔ جس سے شورشِ اقوام مٹ جاتی ہے۔

ایک بات تو رحمان بابا نے بڑی کام کی کہی ہے۔ وہ کہتا ہے اگر فقیر اس آنگن میں نہ در آئے جو اس کا نہیں ہے، تو کتا کیوں دخل در معقولات کرے؟ آج قبائلی علاقہ کے آنگن میں کچھ ایسی ہی کیفیت ہے۔ اس لئے وہ جو در آنے پر آمادہ ہے۔ اپنے ہی ہم زبان شاعر کی انمول نصیحت پر غور اور عمل کرے۔ تو اس کے لئے کیا کچھ سودمند ثابت نہیں ہوگا۔

بلاشبہ اگر آج ہم اپنے اندر کوئی نیا رحمان بابا نہیں پیدا کر سکتے تو کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم اس رحمان بابا کی بصیرت افروز تعلیم سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ جس کا نسخہ پہلے بھی شفا بخش ثابت ہوا ہے۔ اور اب بھی حیات افروز ثابت ہو سکتا ہے۔

غزل

اخترؔ انصاری اکبرآبادی

کیا گلوں کا تذکرہ یادِ خار تک نہیں
ہاں سرورِ تھا کبھی اب خمار تک نہیں

دشمنوں کی گفتگو کیا سنوں کہ اب مجھے
دوستوں کی بات کا اعتبار تک نہیں

اور بھی مقام ہیں جانفروز و گلفشاں
زندگی کا سلسلہ صرف دار تک نہیں

اے غرورِ حسن دیکھ عشق کی بلندیاں
جبر کی حدیں مرے اختیار تک نہیں

جانِ آرزو مرا اب ہے میرے سامنے
ماہِ نو مری طرف بار بار تک نہیں

اخترؔ آج عشق ہے بامراد و کامیاب
دل میں اس نگار کے اب غبار تک نہیں

ثقافت:

کامنی مورتیں

بیگم شائستہ اکرام اللہ

کامنی مورتیں — گڑیاں، ہم سب کا خواب ہیں۔ سہانا، چہیتا، رومانوی، خواہ ہم چھوٹے ہوں یا بڑے۔ اور بچوں کی تو ساری دنیا یہی ہیں۔ انہی کے روپ میں ان کے ننھے منے ذہن زندگی کے گوناگوں خواب دیکھنا شروع کرتے ہیں۔ کبھی براتیں، کبھی میلے، کبھی طرح طرح کے چرند پرند۔ اُسی شاعر یا طفلِ صغیر، ورڈزورتھ، کی طرح جس نے بچوں کو "انسان کا باپ" کہا ہے۔ بڑے ہو کر بھی ہماری ان کامنی مورتوں میں دلچسپی باقی رہتی ہے اور یہ دلچسپ مضمون جسے بچوں ہی سے قریب ایک اور ہستی، ایک خاتون نے لکھا ہے اور جسے ہم اردو کے سانچے میں ڈھال کر پیش کر رہے ہیں، اس کا بیّن ثبوت ہے۔ ہم تو کیا اہلِ مغرب بھی ہماری ان گڑیوں کو بے حد پسند کرتے ہیں اور انہیں بڑے شوق سے خرید خرید کر سوغات کے طور پر گھر لے جاتے ہیں۔ "بی ڈالی" لیتے اور "ڈالر" دیتے ہیں۔ گویا یہ پیاری پیاری ننھی منی جانیں اپنے ساتھ بیرونی زرمبادلہ جیسی انمول چیز بھی لاتی ہیں۔ شاید یہ بات اس مضمون کو اور بھی دلچسپ بنا دے اور ساتھ ہی اس صنعت میں اور بھی دلچسپی پیدا کر دے — (ادارہ)

گڑیاں — بچوں کا دل بہلاوا۔ ان کے جانے پہچانے کھلونے۔ ان کا رواج جانے کب سے ہے۔ اس وقت سے جب سے انسان ہے، بچے ہیں اس لئے یہ انسان کے سب سے پرانے مشغلوں یا رواجوں میں سے ہے، آپ اسے کچھ بھی کہہ لیجئے۔ پھر لطف یہ ہے کہ مہذب قومیں ہی نہیں وحشی قومیں بھی ان کی اسی طرح دلدادہ رہی ہیں۔ چنانچہ اگر ہم اُس بھاری بھرکم کتاب کی طرف رجوع کریں جسے عالم لوگ "دائرۃ المعارف" کہتے ہیں تو معلوم ہوگا کہ مصری، یونانی، رومن۔ ان ننھی منی کامنی چیزوں کے کس قدر شوقین تھے۔

بچے تو خیر ان کے متوالے ہیں ہی۔ یہ ان کی من بھاتی چیز ٹھہری اس لئے ان کی ایجاد کا سہرا انہی کے سر ہے۔ ان کے سب سے پرانے نمونوں پر نظر ڈالیں۔ بس لکڑیوں یا پھلیوں کے دو کراس الٹے سیدھے جوڑے اور وہ دلچسپ چیز بن گئی جسے ہم گڑیا یا پتلا کہتے ہیں، یا پھر ان کا ڈھانچ ہی سہی۔ شروع شروع میں جب بہت ہی پرانا زمانہ تھا اور لوگ نرے وحشی تھے، تو قدرتی طور پر یہ ننھی منی پتلیاں، پتلے۔ گڈے۔ گڑیاں ان کی نظر میں بڑی مذہبی چیز تھیں۔ اس لئے وہ بچوں کے کھلونے تو یکسو رہے، بڑوں کے لئے بھی کام کی چیز بن گئے۔ کیونکہ وہ ان سے شگون لیتے۔ کونسی چیز اچھی ہوگی کونسی بُری۔ کونسی مبارک کونسی منحوس، یا پھر اور کچھ نہیں تو بلاؤں اور مصیبتوں کو دور رکھنے ہی کی سبیل پیدا کی جائے خواہ وہ کتنی ہی موہوم اور خیالی کیوں نہ ہوں۔ یہ بات سب سے زیادہ "نئی دنیا" کے باسی "سرخ ہندیوں" اور افریقہ کے حبشیوں میں پائی جاتی ہے۔ لیکن اگر ہم اس سے دوسری طرف مشرق بعید، جاپان، کوریا، میں جا نکلیں، تو وہاں بھی یہی حال ہے۔ ان میں ایک بڑی دلچسپ بات یہ تھی کہ گڑیاں دلہنوں کو جہیز میں دی جاتی تھیں۔ جس کا ہم آج تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں کے لوگ خیال کرتے تھے کہ اس طرح دلہن کی ساری بلائیں ٹل جائیں گی اور اس آسانی سے! جاپان میں تو گڑیوں کا جادو یہاں تک پہنچ گیا تھا کہ جن عورتوں کو بچوں کا ارمان ہوتا وہ انہیں بڑی بڑی درگاہوں پہ بھینٹ چڑھاتیں۔ اس خیال سے کہ شاید دیوی دیوتا اس پیاری پیاری من موہنی بھینٹ سے پسیج جائیں، اور اُن پر کرم کی نظر فرمائیں۔ اس دلچسپ جزیرے کی ہر بات دلچسپ ہے۔ یہاں بعض نہایت ہی خوبصورت قسم کی گڑیاں تیار ہوتی تھیں جنہیں "شاہی گڑیاں" کہتے تھے۔ ان کا نام ہی ظاہر کرتا ہے

کہ وہ کیا ہوں گی اور ان کی آن بان، ٹھاٹھ باٹ کس قدر ہوگا۔ یہ گڑیاں جاپان میں بہت مقبول تھیں۔ مگر اُن کا مقصد کھیل نہ تھا سجاوٹ تھا۔ اور سچ پوچھئے تو یہ ہیں بھی سجاوٹ اور نمائش کی چیز۔

عیسائیوں کی دنیا حضرت عیسیٰ، بی بی مریم اور ننھے منّے مسیح کی دنیا ہے اور پھر ان کے بڑے بڑے بزرگ، اولیا، پیر فقیر — مورتیں ہی مورتیں — ان کی دنیائے خیال انہی سے آباد تھی۔ اس لئے ان کو گڑیوں سے بہت ہی لگاؤ تھا۔ شروع شروع میں وہ انہیں سینٹ سینٹ کر بچوں کی پرورش گاہ میں رکھتے تھے۔ بعد میں ان کی دو قسمیں ہوگئیں۔ کچھ سچ مچ کی گڑیاں یعنی کھیلنے کی دنیادی چیزیں اور دوسری مذہبی۔ چنانچہ میلوں ٹھیلوں میں یہ دونوں سجا سجا کر رکھی جاتیں اور لوگ انہیں بڑے ہی شوق سے خریدتے۔ میں نے میونخ اور بویریا کے عجائب گھروں میں ان پرورش گاہوں کے نمونے دیکھے جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے کتنے دلچسپ، کتنے پیارے کہ انسان انہیں پہروں کھڑا دیکھتا رہے۔

پروٹسٹنٹ فرقہ کے عیسائیوں نے پرورش گاہوں کے بجائے گڑیا گھر بنانے شروع کئے جن کا جادو ابسن جیسے ڈرامہ نگار کے ایک مشہور ڈرامے میں بولتا نظر آتا ہے۔ چنانچہ ٹائرول اور ہالینڈ کی پوشاکوں والی گڑیاں بنانے میں خوب چرچا ہوا۔ بعد میں گڑیاں بنانے کا فیشن عام ہوگیا۔ اور خواتین نے انہیں زیبائش و آرائش کی چیزوں کے طور پر جمع کرنا شروع کر دیا۔

مسلمانوں میں گڑیوں کا شوق کچھ کم نہیں رہا۔ ان کے یہاں گڑیوں کا رواج آنحضرت صلعم کے زمانہ ہی سے موجود ہے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کیونکہ ہم مسلمانوں میں مورتیں مورتیاں بنانا حرام ہے لیکن شاید گڑیا گڈوں کا معاملہ کچھ اور رہے اور ان کے بنانے پر کوئی پابندی نہیں رہی کیونکہ حضرت بی بی عائشہؓ خود گڑیوں سے کھیلا کرتی تھیں۔

گڑیوں کا ایک پہلو اور بھی ہے — سینا پرونا سکھانا۔ چنانچہ اس برصغیر میں اس سے یہ کام بھی لیا گیا۔ لڑکیاں بالیاں گڑیوں سے کھیلتی ہی نہیں بلکہ بناتی بھی ہیں اور بناتے بناتے سینا پرونا اور ایسے دوسرے کام بھی سیکھ جاتی ہیں۔ جب لڑکی چھ سات سال کی ہو جاتی تو اسے ایک گڑیا دے دی جاتی اور وہ اس کی پوشاک بنانا شروع کر دیتی اور اس میں کتنے ہی کام نکل آتے مثلاً کپڑے کاٹنا، سینا اور بیل بوٹے پھول وغیرہ کاڑھنا۔ جب گڑیا بن جاتی تو اس کی شادی بیاہ کیسے نہ رچایا جاتا اور اس موقع پر اس کے گن اوگن بھی بیان کئے جاتے۔ اس لئے سب لڑکیاں کوشش کرتیں کہ اس کی گڑیا اور سب سہیلیوں کی گڑیوں سے اچھی ہو اور سب اس کی تعریف کریں پھر لڑکیاں، چینی، چاندی اور پیتل کے برتن وغیرہ بھی جمع کرتی تھیں جیسے سچ مچ مائیں بیٹیوں کا جہیز اور بری تیار کر رہی ہوں۔ ان سب باتوں پر سال بھر لگ جاتا اور جب سب کچھ تیار ہو چکتا تو گڑیا کی شادی اپنی سب سے چہیتی سہیلی کے گڈے سے رچانے کا بندوبست کیا جاتا۔ یہ محض کھیل نہیں ہوتا تھا بلکہ اس میں سچ مچ بیاہ شادی کی ساری رسمیں ریتیں بڑی ریجھ سے منائی جاتیں اس لئے کہ لڑکی پہلے ہی سے سب کچھ سیکھ جائے۔ اس زمانہ کی زندگی آپ جانیں، رسموں ریتوں ہی کا دوسرا نام تھی۔ ان کا ہماری زندگی میں بہت بڑا حصہ تھا اور شادی ہی نہیں دوسرے تہواروں اور تقریبوں کی بھی یہی دھوم دھام ہوتی اور ان میں بھی گڑیاں پیش پیش ہوتی تھیں مثلاً عید، بقرعید، شب برات، محرم جن میں ایک ایک بات کا دھیان رکھا جاتا اور لڑکیاں ہر طرح کے پکوان، زردہ، متنجن، قورمہ، پلاؤ، بریانی سب کچھ اپنے ہاتھوں سے تیار کرتیں۔ اس قسم کے پکانے ریندھنے کا نام تھا "ہنڈکلیا" اور اس کا مقصد یہی کہ لڑکیوں بالیوں کو پکانے ریندھنے کا گن سکھا دیا جائے اور وہ یونہی پھوہڑ نہ رہ جائیں۔

یہ نہ سمجھئے کہ اس طرح گڑیوں گڈوں سے کھیل کھیل کے بہانے لڑکیوں کا سب کچھ سیکھ جانا محض اتفاق تھا بلکہ ان کی توجہ اس طرف باقاعدہ طور پر دلائی جاتی اور ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی جیسا کہ "مرأۃ العروس" (۱۸۶۹ء) کے کردار اصغری خانم سے ظاہر ہے۔ وہ بے نظیر ناول جس میں ڈاکٹر نذیر احمد نے واقعی قلم توڑ دئے ہیں۔ اس ناول میں ایک جگہ اصغری اپنا پڑھانے سکھانے کا طریقہ یوں بیان کرتی ہے :—

"جب صفیہ گڑیوں کے گھر دیکھ چکی تو اصغری نے کہا کہ لڑکیوں کے سب کھیلوں میں مجھ کو گڑیوں کا کھیل بہت پسند ہے۔ اس کے ذریعے لڑکیاں سینا پرونا، کپڑوں کی قطع اور گھر کا بندوبست، ہر طرح کی تقریبات کی راہ و رسم سے واقفیت حاصل کرتی ہیں۔ میں انہیں کھیل کی باتوں میں کام کی باتیں سکھاتی ہوں۔ ہنڈکلیوں میں لڑکیاں ہر ایک طرح کے کھانے کی ترکیب سیکھتی ہیں۔ مصالحے کے اندازے، نمک کی اٹکل،

ذائقہ کی شناخت اور باس کی پہچان ان کو آتی ہے۔"

اُن دنوں گڑیاں کپڑے لتّے کی دھجیوں اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو جوڑ جوڑ کر ہاتھ سے بنائی جاتی تھیں۔ چہرہ مہرہ اور آنکھ ناک کان منہ وغیرہ سوئی دھاگے سے اتنے خوبصورت کہ معلوم ہو چہرہ پر کسی استاد نے مُو قلم سے نقاشی کی ہوئی ہے۔ ایسی گڑیا کو "کشیدہ کی گڑیا" کہتے تھے۔ آج کل تو شاید ہی کہیں دکھائی دیتی ہو۔ میں نے کچھ عرصہ ہوا گڑیوں کی ایک نمائش کے لئے جس کا میں نے اہتمام کیا تھا ایسی نفیس گڑیوں کا ایک جوڑا بنانے کی کوشش کی۔ اس پر پورا ایک سال لگا دیا اور کتنی بار گڑیاں بنا بنا کر پھینک دیں اور آخر ایک ایسا عمدہ جوڑا بنا ہی ڈالا جیسا کہ میرا دل چاہتا تھا۔

اور گڑیاں ہی نہیں ہمارے یہاں لڑکیاں، بیگمیں اور بھی سارا ساز سامان بناتی تھیں۔ مثلاً جوتے، پنکھے، پنکھیاں، زیورات، زیور کے صندوقچے، صندوقچیاں، آئینہ، آرسی وغیرہ۔ سچی چاندی تو کہاں سے آتی، پنّی تو ہمارے ہاں عام ہے، وہی لے لی جاتی اور کچھ گتّے کے ٹکڑے۔ خوب کتر بیونت کر کے ایسی جگمگ جگمگ کرتی چیزیں تیار کی جاتیں کہ آنکھیں چکا چوند ہو جائیں جو دیکھتا عش عش کر اٹھتا۔ بخدا! یہ گھر کی بنائی ہوئی چیزیں کتنی نفیس، کتنی پُرکار ہوتی تھیں۔ اس کے لئے ڈاکٹر نذیر احمد ہی کی ایک اور کتاب "بنات النعش" کے چند فقرے سنئے۔ اصغری کے مدرسے کا سب سے روشن ستارہ تھی محمودہ۔ وہ ایک نئی لڑکی حسن آرا کو اپنا گڑیا گھر دکھاتی ہے اور کہتی ہے:-

"محمودہ کی گڑیاں سر سے پاؤں تک اپنے ہاتھوں کی کاڑھی بنائی ہوئی تھیں۔ محمودہ نے تیلیوں اور پنّی کا نہایت خوبصورت خوش قطع مکان خود بنایا تھا۔ حسن آرا، محمودہ سے حیران ہو کر پوچھتی تھی اے، ہے! یہ ننھا سا کامدار بٹوا بھی تمہیں نے سیا ہے۔ اچھی۔ سچ کہنا پلنگ کے تکئے تمہیں نے بنائے ہیں۔ اس دھانی جوڑے میں مسالہ ہمارے یہاں کا ٹکا ہوا نہیں لگتا۔ اس جمپی کا کرتا تو ضرور استانی جی نے قطع کر دیا ہوگا بھلا سب تو سب یہ پٹّا پٹّی کے کپڑے کہاں سے سلے۔ یہ گنگا جمنی تاروں بھلا وہ پتہ کس نے دیا۔ بلکہ ہوباف ہیں۔ غضب کے ازار بند ہیں۔ لے ملا اور ستارہ ابرک کے جھاڑ، کاغذ کے پنکھے، ابرک کی دریاں ابھی دیکھو۔ تیلیوں کی چلمنیں۔ مرکنڈوں کے کھمبے، غرض محمودہ کی گڑیاں دیکھ کر حسن آرا ایسی حیرت زدہ ہوگئی تھی کہ متعجب ہو ہو کر محمودہ ہی کو دکھاتی تھی۔ محمودہ نے حسن آرا کے تمام تر تعجب کا یہی جواب دیا کہ سب کچھ میرا ہی کیا دھرا ہے اور میرا ہی سیا پرویا ہے اور کچھ بڑی بات نہیں۔ اگر آپ دو مہینے بھی سینے پرونے میں لگا لیں تو اس سے بہتر بنا سکتی ہیں۔ مجھ کو تو گڑیوں کا شوق بھی نہیں۔ استانی جی جب کوئی نیا کام سکھاتی ہیں تو پہلے گڑیوں پر ہاتھ صاف کرتی ہوں بس جو کچھ آپ نے دیکھا میری شروع شروع کی مشق ہے۔"

اب جبکہ سینے پرونے کا فن بہت گھٹ گیا ہے (شاید اس لئے کہ ایسی گڑیوں کا فیشن نہیں رہا) کم ہی مائیں ہوں گی، لڑکیوں کا تو کہنا ہی کیا، جو ایسا سینے پرونے کا نفیس کام کر سکیں جو چھوٹے چھوٹے کپڑے تیار کرنے کے لئے ضروری ہے۔ پھر بھی ڈھونڈے سے ایسی بڑی بوڑھیاں مل ہی جاتی ہیں جو اس قسم کا بہت ہی پیارا کام کر سکتی ہیں اور محض پنّی اور ماچس کی ڈبیوں سے ایسے ایسے جادو جگا سکتی ہیں کہ سبحان اللہ۔ اور پھر چھوٹے چھوٹے جڑاؤ زیور، گوٹے پر چھوٹے چھوٹے موتی اور لال، ہرے، سبز پوت ٹانک کر۔ اس قسم کا زیور جو ہمارے یہاں آج بھی عام بنتا ہے، یورپ میں بڑا عجوبہ تصور کیا جائے گا اور لوگ اس پر پیسہ تو کیا جان و دل نچھاور کرنے کو تیار رہیں گے۔ اس لئے کہ یہ چھوٹے چھوٹے نگینے بالکل سچے موتی معلوم دیتے ہیں۔

گڑیوں سے کھیلنے کا شوق دیکھ کر ہمارے کاریگروں نے چھوٹے چھوٹے کھلونے بنانے شروع کر دیئے۔ جب میں چھوٹی سی بچی ہی تھی تو پیتل تانبے کی ننھی منّی ہنڈیاں، ڈھکنی، بازار سے عام ملتے تھے۔ یوں ہی معمولی سی گھٹیا چیزیں نہیں بلکہ بہت عمدہ بنے ہوئے۔ پکی مٹی کے برتن بھی بڑے ہی خوبصورت بنائے جاتے تھے۔ ان کو خوب مانجھ کر یا لیپ پوت کر سندر سجل بنا دیا جاتا تھا۔ اور پھر کتنے سستے! جب چاہو مل جاتے۔ تیوہاروں یا میلوں پر جو چیزیں ملتیں ان کی خوبصورتی اور جادوگری کے کیا کہنے۔ پھر لال پکی مٹی ــــ ہنڈولں کے برتن بھی ہوتے جو اتنے عام نہ تھے۔ کبھی سیاہ روغن سے چم چم کرتے ہوئے اور کبھی پیلے، لال، ہرے رنگ روغن سے آراستہ پیراستہ مجھے یاد

سے ایک دفعہ مجھے ان برتنوں کا ایک پورا سٹ ملا تھا جن پر بڑا ہی دلکش کام کیا ہوا تھا۔

پاندان، خاصدان، عطردان — یہ تو ہمارے یہاں کی خاص چیزیں تھیں۔ جن کے بغیر کوئی گھر حقیقی معنوں میں گھر ہی نہ ہوتا۔ یہ اور اسی قسم کی دوسری چیزیں پیتل کی بھی ملتیں اور سچی چاندی کی بھی۔ یہ باتیں کچھ ہمارے ملک کے مغربی بازو ہی سے مخصوص نہیں، مشرقی بازو جہاں کے لوگ، ان کا رہن سہن، ان کا ذوق دوسرے بازو کا پورا پورا جواب ہے اس شغف میں ذرا بھی پیچھے نہیں۔ مشرقی پاکستان تو بیت اور رہان کا گھر ہے۔ وہاں ان چیزوں کی چھوٹی چھوٹی نفیس ٹوکریاں، صوپ یعنی دھان پھٹکنے کا چھاج، خوانچے بنانے کا رواج تھا۔ لیکن اب تو بڑوں کے ساتھ بچوں کا بھی مذاق کچھ اور ہو گیا ہے۔ اس لئے یہ سیدھے سادے کھلونے آج کہاں؟! اور تو اور چکوٹی بیلن یا چکلا بیلن جیسی معمولی چیز بھی بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ حالانکہ جب میرا بچپن کا زمانہ تھا تو ایسی درجنوں چیزیں ہر بازار میں بڑے ہی دلفریب رنگوں سے آراستہ پیراستہ ملتی تھیں۔

صرف یہی نہیں افسوس ہے ہاتھوں سے بنائے ہوئے کئی خوشنما دلفریب کھلونے یا تو بالکل ہی ناپید ہو گئے ہیں یا مشکل ہی سے ہاتھ آتے ہیں، مثلاً طرح طرح کے پیشوں، حرفوں کے لوگ — درزی دھوبی، مالی۔ اس خوبی سے بنے ہوئے کہ نک سے سک تک درست، یعنی ان پر سچ مچ کے درزی، دھوبی ہونے کا شبہ ہو۔ اور پھل، اور ترکاریاں بھی تو اپنے سارے رنگوں روپوں کے ساتھ ملتی تھیں اور لکڑی کے گھوڑے۔ گائیں، بکریاں۔ کوّے طوطے جن میں ظاہر ہے وہ صفائی، وہ ڈھلائی تو نہ تھی جو مشین سے بنی ہوئی چیزوں میں ہوتی ہے لیکن سبھاؤ ضرور تھا۔ ایک اپنا ہی سبھاؤ یا اپنا ہی جوبن۔ لیکن اب تو مشینوں کے بنے ہوئے دساوری پلاسٹک، چینی وغیرہ کے کھلونوں کی ایسی بھرمار ہوئی ہے کہ خدا کی پناہ۔ بھلا ہمارے عام لوگوں کے ہاتھ سے بنے ہوئے سیدھے سادے کھلونے ان کے مقابلے کی تاب کیا لا سکتے ہیں۔ اس لئے وہ بڑی تیزی سے ناپید ہوتے جا رہے ہیں!

جب میں نے گڑیوں کی اس نمائش کا بندوبست کیا جس کا اوپر ذکر آیا ہے تو میرا ایک [illegible] یہ بھی تھا کہ دیکھے کسی زمانہ میں ہمارے یہاں ایسی ایسی عمدہ چیزیں بھی تھیں اور یہ نفیس صنعت یہ دل و نظر، یہ ذوق و فن کو جلا دینے والا مشغلہ اپنے پورے معیار پر تھا۔ مجھے اس نمائش میں جو کامیابی ہوئی وہ میری توقعات سے کہیں بالا تھی۔ اس لئے میں سوچتی ہوں کہ اگر — "پھر کہیں سے اس کو پیدا کر" — والی بات ہو جائے اور کسی طرح پھر ہاتھ سے بنی ہوئی گڑیوں اور کھلونوں میں دلچسپی پیدا ہو جائے تو کیا اچھا ہو۔ کم از کم میں تو اس سے بہت خوش ہوں گی۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ آجکل پاکستان میں بڑی ہی خوبصورت گڑیاں بن بھی رہی ہیں۔ پرانی کشیدہ سے بنائی ہوئی گڑیاں تو نہیں پھر بھی یہ ہاتھ سے بنی ہوئی تو ہیں۔ پاکستان کے مختلف حصوں کی پوشاکیں زیب تن کئے ہوئے۔ ایسی گڑیاں جو عام لوگوں، مالنوں کنجڑوں، بساطیوں، سپیروں، وغیرہ کو بعینہٖ ان کے مخصوص لباس میں پیش کرتی ہیں۔ واقعی بڑی خوبصورت اور لباس سر سے پاؤں تک بالکل ٹھیک۔

ممکن ہے بعض لوگ گڑیوں میں دلچسپی [illegible] کریں تو بچوں کے فضول مشغلے ہیں اور بس۔ لیکن کسی [illegible] اور متمدن ہونے کا اندازہ صرف بڑی بڑی چیزوں [illegible] نہیں کیا جاتا، بلکہ اس سلسلہ میں چھوٹی سی چھوٹی بات [illegible] رکھتی ہے۔ اور یہ بات کہ ہم گڑیوں سے کھیلنے پر بھی اس انداز سے گوہرافشانی کرتے ہیں، ظاہر کرتا ہے کہ ہماری سوسائٹی کا مذاق کہاں پہنچ چکا ہے۔

ٹیپ کے بند کے طور پر میں یہاں بہار کے — افسوس آج بہار کہاں اور ہم کہاں جب کہ ہمارا اپنا کشمیر بھی ہمارا نہیں رہا — کے ایک معروف شاعر، شہباز کی ایک بڑی ہی دلپذیر نظم پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتی جس سے ہماری تہذیب کی تمام نفاستوں اور پرکاریوں کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں [illegible] زمانے کی ایک [illegible] کی زندگی اور [illegible] کے ضمن میں اس عمدگی سے پیش کرتی ہے کہ باید و شاید:

لیٹی ہے مسہری پہ تو کس شان سے گڑیا
کس لطف سے زلفوں کی گھٹا سر پہ ہے چھائی
جھمکائے ہوئے بجلی [illegible] کان سے گڑیا

کمخواب کے ٹکڑوں سے ہے یہ گھر میں بنائی
منگوائی نہیں ہم نے یہ دکان سے گڑیا
چھوٹا سا کوئی خط ہو اگر دوست کو لکھنا
لکھ لیتی ہے اللہ کے احسان سے گڑیا
از بر ہے اسے فقہ زبانی ہیں احادیث
آگاہ ہے ہر سورۂ قرآن سے گڑیا
دکھلاتی ہے ہر وقت پکانے کے سلیقے
ہر قسم کے کھانوں سے بھرے خوان سے گڑیا
آئے جو ملاقات کو کوئی تو تواضع
کرتی ہے سدا عطر سے اور پان سے گڑیا
انگنائی میں گڈا جو کوئی غیر کھڑا ہو
آتی نہیں غیرت سے یہ دالان سے گڑیا
گر غور سے دیکھیں تو ہیں سب خوبیاں موجود
شہباز کبھی کم نہیں انسان سے گڑیا

"بھٹائی گھوٹ" —— بقیہ ص ۳۲

عجیب اور پُر اسرار طور پر پوری ہوئی۔

اس طرح محبت آخر کار کامیاب ثابت ہوئی۔ محبت جو کسی مشکل کو مشکل نہیں جانتی اور شکست سے نا آشنا ہے۔ جو آخر کار اپنے جذبہ و جوش اور جد و جہد کی بدولت منزل مقصود سے ہمکنار ہو کر رہتی ہے یہی وجہ ہے کہ شاہ لطیف کا محبوب مجازی ہو یا حقیقی، ان کا نغمہ تمام تر عشق و محبت کا ہی نغمہ ہے اور وہ خود تمام عشق و محبت ہی کے شاعر ہیں ●

"ماہ نو" کی ترقیٔ اشاعت میں حصہ لے کر پاکستانی ادب و ثقافت سے اپنی عملی دلچسپی کا ثبوت دیجئے۔

زیرِ داغِ دل بقیہ ص۱۵

ان کے عیوب ہی کو پیش نظر رکھا گیا ہے، یا یہ کہ نظموں کا یہ مجموعہ سرتاسر ناقص ہے۔ لیکن جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے یہ مجموعہ کئی لحاظ سے اہم ہے جس میں سب سے پہلی بات یہی ہے کہ یہ طویل نظموں کا پہلا مجموعہ ہے۔ عروضی تجربوں کا جو سلسلہ یہاں شروع کیا گیا ہے وہ بھی بہر حال مستحسن اور قابل توجہ ہے۔ لیکن جدید نظم کو سہل انگاری اور فن سے ناآشنائی کی بدولت گزشتہ برسوں میں زوال آمادگی کی جن منزلوں سے گزرنا پڑا ہے، اس کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ ہم اپنا محاسبہ زیادہ سختی سے کریں۔ اور جدید شعرا کو اس امر کا شدت کے ساتھ احساس دلائیں کہ جدید نظم معنوی اور خارجی دونوں اعتبارات سے ایک مشکل فن ہے۔ وزن میں کمی بیشی محض سہولت کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ ایک اصول کے تابع ہے اور یہ اصول معنوی آہنگ سے ہمنوائی ہے۔ اسی طرح زبان و بیان میں معمولی فروگذاشت بھی درگذر کی سزاوار نہیں۔ اور جہاں عروض میں کوئی نیا تجربہ ہو اس کے اصول و قواعد کی سختی سے پابندی کی ضرورت ہے ورنہ ہم بے راہ روی کا شکار ہو کر رہ جائیں گے اور جدید نظم وہ مقام حاصل نہ کر سکے گی جس کی وہ مستحق ہے ؟

"ایک نوخیز ستارہ ٹوٹا" ـــــ بقیہ ص۴۲

کہ بیش از بیش ترقی اور بلند سے بلند تر مقام کی طرف اقدام کا راستہ اس کے لئے بند نہ تھا۔ اور خبر نہیں اس کی خداداد قابلیت اسے کہاں پہنچا دیتی مگر افسوس! قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ ہمارا ادب یقیناً اس کی بے وقت وفات سے کتنے ہی متوقع گرانقدر شاہکاروں سے محروم ہو گیا ہے۔ خدا اس کی جگائی ہوئی جوت کو ہمیشہ روشن رکھے اور ادب کی اس "میراتھون دوڑ" میں اس نے جو مشعل ایک مقام پر چھوڑ دی ہے ہمیں اس کو اس مقام سے آگے لے جانے کی ہمت دے!

"ماہِ نو" کے لئے

غیر طلبیدہ مضامین

- غیر طلبیدہ مضامین نظم و نثر صرف اس حالت میں واپس کئے جائیں گے جب کہ ان کے ساتھ ڈاک کے مناسب ٹکٹ روانہ کئے گئے ہوں۔
- مسترد مضامین کے سلسلے میں غیر ضروری خط و کتابت کرنے سے ادارہ کو معذور سمجھا جائے۔
- ادارہ ڈاک میں کسی مسودے کے گم ہو جانے کا ذمہ دار نہیں۔
- مرسلہ مضامین نظم و نثر کی نقول اپنے پاس رکھئے۔

(ادارہ ماہِ نو کراچی)

ہندوستان کے خریداروں کی سہولت کے لئے

ہندوستان میں جن حضرات کو ادارۂ مطبوعات پاکستان کراچی کی کتابیں، رسائل اور دیگر مطبوعات مطلوب ہوں وہ براہ راست حسب ذیل پتہ سے منگا سکتے ہیں۔ استفسارات بھی اسی پتہ پر کئے جا سکتے ہیں۔ یہ انتظام ہندوستان کے خریداروں کی سہولت کے لئے کیا گیا ہے۔ پتہ:

"ادارۂ مطبوعات پاکستان"۔ معرفت پاکستان ہائی کمیشن، شیر شاہ میس روڈ۔ نئی دہلی (بھارت)

•

ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی۔ پاکستان

تصوریہ:

"... تیرا فسانہ کیا!"

مصباح الحق
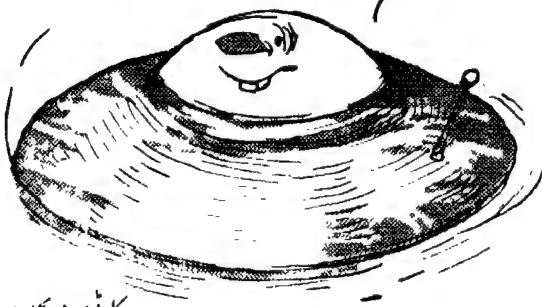
کارٹون: ریحان

کرۂ انتخاب مریخ کے ساکنو!

یہ خاکسار کرۂ فضیلت مآب مریخ کا پہلا زمینی مسافر، جسے آپ نے بکمال ذرہ‌نوازی "زمیں باد" کا لقب عطا کیا ہے، آپ کا بے حد ممنون ہے کہ آپ نے اس مجلس خاص کا اہتمام کیا ہے تاکہ میں آپ کے سامنے تیرہ خاکدان زمین کے حالات و مشاہدات بیان کروں۔ بلا شبہہ یہ ہمارے یگانۂ روزگار، ذردۂ کائنات، قبئہ علم و فضل، ناف عالم، مریخ ہی کی عدیم‌النظیر حکمت عملی کا نتیجہ ہے کہ میرے جسم مادی نے یک جنبش‌چشم غیرمادی شکل اختیار کر لی۔ اور میرا وجود مافوق‌الجوہر توانائی کی بدولت ایک اڑن طشتری کا روپ دھار کر اپنے دور دراز سفر پر روانہ ہوگیا۔ منزل پر پہنچ کر معمورۂ خاک کی خوب سیر کی جو ہمارے بعد واحد کرۂ آباد، مسکن حیات اور گہوارۂ تہذیب ہے۔ اگر اس کرہ کو کرۂ شکست و ریخت قرار دیں تو بیجا نہ ہوگا۔ چنانچہ خلائے بسیط سے اسکی فضائے تاریک میں داخل ہوتے ہی ہر طرف شکست و ریخت ہی کا بازار گرم دیکھا۔ جس کے باعث نت نئی مملکتیں ہی مملکتیں ظہور میں آ رہی ہیں۔

ابھی کوئی تیرہ سال ہوئے ایک قطعہ، جو ایشیا کہلاتا ہے، اسکا ایک حصہ، برصغیر ہندوستان، دو حصوں میں بٹ گیا۔ اور یہ طرفہ ماجرا دیکھنے میں آیا کہ ایک نئی مملکت ظہور میں آئی جس کا ایک حصہ برصغیر کے نچلے حصہ میں ہے اور دوسرا اوپر۔ ایک مشرقی پاکستان کہلاتا ہے اور دوسرا مغربی۔ اور دونوں میں تقریباً دو ہزار میل کا فاصلہ۔ یہ بڑی انوکھی بات تھی۔ اس لئے جی میں آئی پہلے اسی کی سیر کروں۔ چنانچہ آج کی صحبت میں جو کچھ یہاں دیکھا اور عجیب لگا اسے بیان کرنے پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔

جس دن اس اڑن طشتری، جس سے میرا وجود عبارت ہے، کا گزر اس سر زمین سے ہوا، اس دن ان کا سب سے بڑا تہوار منایا جا رہا تھا۔ اس سے پہلے ایک ایسا ہی تہوار منایا جا چکا تھا۔ جسے یہ لوگ میٹھی عید کہتے ہیں۔ یہ دوسری عید، بقرعید تھی۔ بقر کے معنی اس زبان میں جسے ایک ملت کے لوگ، جو خود کو "ملت بیضا" یعنی روشن ملت کہتے ہیں، گائے، کے ہیں۔ مگر میں تو اس کو بکرا عید ہی سمجھا۔ کیونکہ ہزارہا لوگوں نے ایک دوسرے کے مقابلے پر بولیاں دے دے کر بڑی بڑی قیمتوں پر بکرے خریدے تھے، قربانی کے لئے۔ مقصد تو خیر اچھا ہی ہے مگر جس طرح بے تحاشا بکروں پر بکرا کٹ رہا

"صیاد ہیں مردان ہنر پیشہ کہ نخچیر!؟"

تھا، ان غریبوں کے انجر پنجر بکھیرے جا رہے تھے اور ان کے اندرونی کل پرزے باہر آ رہے تھے، خوب روغن

آلود ! اس سے گلی کوچوں میں بڑا گھناؤنا منظر دکھائی دیا - طبیعت مکدر ہوگئی - بعض نے ہمسایوں کا گھر خالی دیکھا تو اس کار ثواب کے لئے اسی کو منتخب کر لیا - تاکہ ثواب تو خود انہیں پہنچے اور باقی سب کچھ دوسروں کو ! یہ بھی تو ایثار ہی ہے - میں نے دو تین دن بعد ہی لوگوں کو گوشت کی دکان پر جاتے دیکھا تو انہیں یہ جواب ملا کہ گوشت اب کہاں - سرے سے بکرے ہی ندارد ! اب ان کی نسل چلے تو بات بنے -

آگے چل کر ہزاروں کی تعداد میں جو غریب غربا دور دور سے گھربار چھوڑ کر ہجرت کر کے آئے ہوئے ہیں ، ان کی گھاس پھونس کی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیاں دکھائی دیں - اپنے یہاں کے آئینہ کی طرح صاف و شفاف گلی کوچوں کے برعکس عجیب وحشت کا عالم دکھائی دیا - اور ہر طرف چوبچوں ، گندگی کے ڈھیروں ، غلیظ پانی کی روانی و ارزانی کی کیا کمی ہے کہ اس میں اور بھی اضافہ ہو - مگر وہاں تو ہر شخص زیادہ گندگی پھیلانے کی کوشش کرتا ہے - حد ہے کہ بڑی بڑی موذی بیماریوں، تپ دق، میعادی تپ ، تپ محرقہ وغیرہ کے جو جراثیم فضا اور انسانوں کے حلق میں بالعموم بہت کم پائے جاتے ہیں ، وہ یہاں اس کثرت سے ہیں کہ کسی وقت بھی کوئی مہلک وبا پھیل کر ہزاروں کو موت کے گھاٹ اتار سکتی ہے -

ایک بڑا سا پتہ ہوتا ہے جس کو "پان" کہتے ہیں - لوگ اسکو بھیڑ بکریوں کی طرح کھاتے چباتے اور سرخ سرخ سی پیک ہر جگہ اسطرح پھینکتے پھرتے ہیں کہ در و دیوار سے کوچہ و بازار تک خون ہی خون اور لالہ زار ہی لالہ زار معلوم دیتے ہیں - یہ بات فیشن میں داخل ہے - اور لوگ سرعام تھوکنے پر فخر کرتے ہیں ، چاہے اس سے طرح طرح کی بیماریاں ہی کیوں نہ پھیلیں -

کبھی مزے میں آگئے تو کوئی "پان" اڑا گئے:

تہواروں ہی سے ملتی جلتی ایک چیز اور بھی ہے - آپ کو اس سے ضرور دلچسپی ہوگی کیونکہ یہ شادی بیاہ کا جلوس ہوتی ہے - جتنا بڑا آدمی ہو اتنی ہی بڑی برات - اسکے ساتھ ایک ایک، دو دو بلکہ تین تین تک رنگ برنگے بینڈ ہوتے ہیں - ان جلسوں پر روپیہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے - تا کہ براتیوں کو خوب قورمہ پلاؤ کھلایا جائے - لوگ اس نمود ونمائش پر جان دیتے ہیں - یہاں تک کہ بعض کا تو رواں رواں قرضے میں بندھ جاتا ہے - اور وہ عمر بھر اس سے نجات نہیں پا سکتے - شادی کے لئے ایک چیز بڑی ضروری ہے — جہیز- یہ بھی زیادہ تر فیشن کی بات ہے - مطلب یہ کہ داماد خسر سے بڑے مال دولت، جائداد وغیرہ کی توقع بلکہ ان کا مطالبہ کرتا ہے - قہر درویش برجان درویش - دلہن کے ماں باپ کو جان جامہ بیچ کر سب کچھ دینا پڑتا ہے - اس لئے یہ لوگ بیٹی کو عذاب خیال کرتے ہیں - ادھر بیٹی والے بھی جواباً لمبے چوڑے مہر لکھواتے ہیں - یعنی دولھا میاں دلہن کو بہت بھاری رقم دے - لطف یہ کہ بسا اوقات یہ مہر محض دکھاوے کی خاطر ہوتا ہے - ایک لاکھ دو لاکھ یا پھر ۱۱ ہزار روپے ۱۱ آنے ۱۱ پائی- یعنی دیا کچھ نہیں جاتا- صرف لکھ دیا جاتا ہے - عام طور پر مہر شوہر کے لئے وبال بن جاتا ہے - اورعورت کے لئے زبردست ہتھیار یا کم از کم ہر وقت طعنوں مہنوں کا سامان جس سے آخر کار ان بن پیدا ہوتی ہے - اور نوبت طلاق تک پہنچتی ہے - وہی بات: چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی؟ - اس کا ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ لڑکے لڑکیوں کی آسان سی سیدھی سادی شادی میں بڑی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اور جہاں بعض لڑکیوں کو کبھی بر نہیں ملتا وہاں بعض لڑکوں کو بیوی نہیں ملتی - اگر عورتوں کو مہر دینا ہی ہے تو ایسا ہونا چاہئیے کہ وہ مل سکے اور ان کے لئے فائدہ مند ہو - اور شوہر بھی بخوبی ادا کر سکے - بعض جگہ تو عجب دستور دیکھا - وہاں لڑکیوں کے دام وصول کئے جاتے ہیں -

منگنی شادیاں ہوں یا کوئی اور خوشی مثلاً بچے کی پیدائش، عقیقہ اور ختنہ پر لوگ بڑھ چڑھ کر روپیہ خرچ کرتے ہیں تاکہ ان کا نام ہو - بھانڈ، بھگتئے ، ہیجڑے ، طوائفیں ، گویئے دور دور سے بھاری بھاری رقموں پر بلائے جاتے ہیں اور زور شور سے بیل پڑتی ہے - اگر ایسا نہ کیا جائے تو ناک کٹ جاتی ہے -

یہ لوگ ایک ہی شادی پر قناعت نہیں کرتے - بلکہ مذہب کی آڑ میں چار چار شادیاں کرتے ہیں حالانکہ وہ ان سے انصاف نہیں کرسکتے - اسطرح گھر میں بھی

جوتیوں میں دال بٹتی ہے اور ہروقت دانتا کل کل رہتی ہے ، معاشرہ میں الگ طرح طرح کے فتور پیدا ہوتے ہیں - کثرت ازدواج کا لازمی ثمر کثرت اولاد ہے جس سے کنبہ بھی گراں بار اور ملک و معاشرہ بھی گراں بار ہوتا ہے - اور عورتوں کا تو پوچھنا ہی کیا - وہی بات :

توڑا کمر شاخ کو کثرت نے ثمر کی
دنیا میں گراں بارئی اولاد غضب ہے

بیچاری قسم قسم کی بیماریوں اور تکلیفوں کا شکار ہوکر بےوقت مر کھپ جاتی ہیں - نئی حکومت جس کو کام کاج سنبھالے تین ہی سال ہوئے ہیں ، بڑی سمجھدار ہے - اس نے ایسے عائلی قوانین جاری کئے ہیں کہ " دین بھی ایمان بھی ایک " کی طرح بیوی بھی ایک ہی ہو - اور جب بیویاں زیادہ نہ ہوں گی تو بچے زیادہ کیسے ہوں گے - نہ رہے بانس نہ بجے بنسری - اور پھر خاندانی منصوبہ‌بندی کی تحریک الگ ہے - اب اگر لگے ہاتھوں بچوں پر بھی ٹیکس لگ جائے تو کیا کہنے -
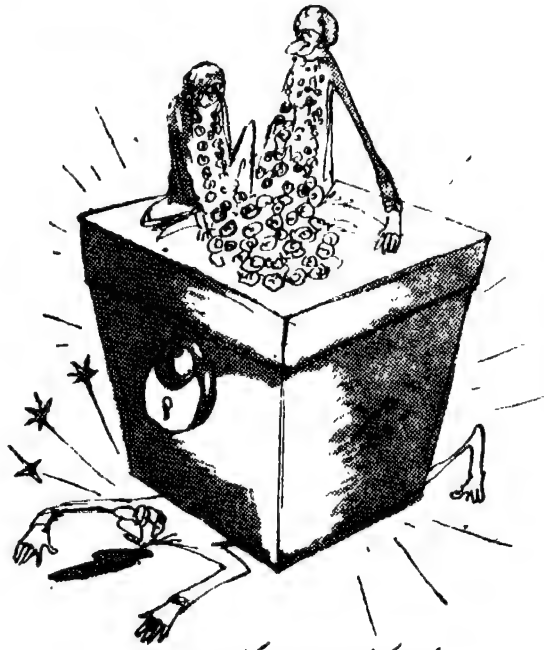
بعض لوگوں میں بیواؤں اور مطلقہ عورتوں کے شادی کرنے کو بہت برا سمجھا جاتا ہے - خاص طور پر کم گنتی کی جاتی میں جیسے ہندو کہتے ہیں - ان ہی میں بعض نیچ ذات لوگوں میں یہ رواج بھی سنا ہے کہ بعض عورتوں کے ایک سے زیادہ شوہر ہوتے ہیں !

شادی بیاہ کے سلسلہ میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اپنی ذات، گوت یا برادری کے اندر ہی رشتے ناطے ہوتے ہیں - اس سے یوں بھی دشواریاں پیدا ہوتی اور بعض بیماریاں بھی پیدا ہوتی جارہی ہیں - بعض جگہ عجیب بےجوڑ قسم کی شادیاں ہوتی ہیں - ایک بھائی بہن کی شادی دوسرے کنبے کے بہن بھائی سے ہو جاتی ہے - اور ایک جوڑے میں ان بن ہوئی تو دوسرے میں بھی کھٹ پٹ لازمی ہے - اور دونوں گھرانے تباہ - بعض خدا کے بندے ایسے بھی ہیں جو طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے عورتوں اور یتیموں کو ان کے حقوق سے محروم رکھتے ہیں -

بعض لوگ شادی بیاہ کی طرح کفن دفن ، سویم چہلم وغیرہ پر بھی بےتحاشا خرچ کرتے ہیں اور اپنی یا مردہ کی عاقبت توکیا سنواریں گے اپنی حالت تباہ کر لیتے ہیں -

ایک چیز گھر گھر گلی گلی عام پائی - اور ایسی کہ انسان اس سے بھنا اٹھے - پناہ بخدا ! بھکاری ہی بھکاری - کم بخت جان ہی کو آجاتے ہیں - صبح دیکھو تو :

" پیٹ کی خاطر سرے جاتے ہیں گا گا کر فقیر "

اور شام دیکھو تو :

" اک عذاب جاں بنے جاتے ہیں آ آ کر فقیر "

مرد عورتیں بچے - بھکاری ہی بھکاری - اپاہج ہوں یا صحیح سالم، ہٹے کٹے، کام نہ کاج - بس مانگنے ہی پر ادھار کھائے، کمر باندھے بیٹھے ہیں اور لوگ ہیں کہ ثواب کمانے کی خاطر بڑھ بڑھ کر بھیک دیتے ہیں - اور ان کو اور بھی بھیک مانگنے کی ترغیب دلاتے ہیں - سنا ہے ان کا قلع قمع کرنے کی تدبیریں کی جارہی ہیں - خدا انہیں راس لائے اور یہاں پر گداگری ایسی غائب ہو جائے جیسے گدھے کے سر سے سینگ -

* جو اوج ایک کا ہے دوسرے کی پستی ہے! *

بعض لوگوں میں جوا کھیلنے اور بازی لگانے کی عادت بھی ہے - اڈے بنا رکھے ہیں اور مشکل سے ہتے چڑھتے ہیں - یہ تو خیر ایسی بات ہے جس کا اکا دکا ہی شکار ہوتے ہیں لیکن بددیانتی، چور بازاری وغیرہ تو چکی کے پاٹوں کی طرح سب کو دلے جاتی ہے - اسکی روک‌تھام کے بتھیرے جتن کئے گئے ہیں مگر جب ایک دفعہ بری عادت پڑ جائے تو چھڑائے نہیں چھوٹتی - بدقماشوں نے بددیانتی ، ملاوٹ ، دھوکہ بازی ، چور بازاری ، ناجائز درآمد وغیرہ کے خدا جانے کیا کیا ڈھنگ اختیار کئے ہیں کہ بیچارے شہری گھن کی طرح پس پس جاتے ہیں - وہاں کے ایک افسانہ نویس نے درست کہا ہے کہ زہر تک میں تو ملاوٹ ہوتی ہے !

معاشرتی برائیاں کہاں نہیں ہیں - ہم بھی اتنا آگے ہونے کے باوجود ان پر بمشکل قابو پاسکے ہیں - پھر بھی چوری چھپے کیا نہیں ہوتا - اور وہاں تو ابھی نظم و ضبط کے لحاظ سے روز اول ہی سمجھنا چاہئیے - کیا کہوں، نابکار لوگ عورتوں اور لڑکیوں کا بیوپار بھی کرتے ہیں - ان کو بھکا کر یا اغوا کرکے بیجا فائدہ اٹھاتے ہیں - ان کی بھی مٹی خوار اور اپنی بھی - کمبخت ان سے ہر طرح فائدہ اٹھاتے ہیں - پابندی لگا دی گئی ہے تو گلی گلی کوچہ کوچہ بازار کھول دئیے گئے ہیں - اور زہر دور یا کم ہونا تو کیا اور بھی پھیلتا ہے - اب جو تدبیریں ہو رہی ہیں شاید ان سے حالات سدھر جائیں - کم از کم اتنا تو ہو کہ فتنہ قابو میں رہے - اور برے چلن کے مرد عورتیں کھل نہ کھیلیں -

اور یہ کمائی چرس ، بھنگ، افیون ، کوکین ، خالص اسپرٹ پر صرف ہو جاتی ہے -

کم گنتی کے لوگوں میں یہ عجیب بات دیکھی کہ دوسروں کے ساتھ کھانا پینا تو کجا ان سے دامن بچا بچا کر گزرتے ہیں - بعض لوگ تو ان کے نزدیک ناپاک ، پلید ، اچھوت ہیں - جن سے جو چیز چھو جائے بھرشٹ ہو جاتی ہے -

اتنا غنیمت ہے کہ اس ملک میں کئی لوگ بڑے روشن خیال ہیں - اور ان پر حکومت بھی روشن خیال لوگ ہی کر رہے ہیں جو عوام کو نیچے سے اوپر لے جانے کی سرتوڑ کوشش کرر ہے ہیں - جن دنوں میں زمین پر تھا بعض لوگ مصنوعی سیارچوں کے ذریعہ چاند ، زھرہ اور---

کہاں سے کہاں !

اور ہاں ایک تیسری جنس بھی تو ہے - جونہی کسی کے ہاں بچہ ہو' اس جنس کے افراد گانے بجانے ناچنے کے لئے آ پہنچتے ہیں - اور دوسروں کی کمائی پر پلتے پھلتے پھولتے ہیں -

بعض لوگ بچوں کو اغوا کر کے انہیں اپاھج بنا کر نازیبا اغراض کے لئے کام میں لاتے ہیں - ادھر بعض بگڑے ہوئے بچے چوری چکاری ، جیب تراشی جیسے جرائم کرتے ہیں - اخلاق بگاڑنے والی فلمیں ، ناول اور رسالے وغیرہ اور بھی بگاڑنے کا سامان ہیں -

بعض زیارت گاہوں پر گزر ہوا - یہاں بھی لوگ نازیبا کارروائیوں سے باز نہیں رہتے - جھوٹے پیر فقیر ، مجاور ، سادہ لوح لوگوں کو لوٹتے اور دھوکہ دیتے ہیں

اے واہ، سبحان اللہ ! --- مریخ --- تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے - ایں خیال است و محال است و جنوں ! ابھی تو وہ ہم سے ہزارھا سال پیچھے ہیں - بھلا انہیں فوق الجوھر کے کرشمے کیا معلوم - کہ انسان کے مادی جسم کو غیرمادی بنا کر تخت رواں کی صورت میں زھرہ ، مریخ تو کیا کائنات کے جس ستارے میں بھی چاھیں پہنچا دیں - مادی کمالات سے پہلے تو روحانی کمالات ضروری ہیں - یعنی انسانی فطرت کو پست سے بلند کرنا اور برائیوں کو اس حد تک دور کردینا کہ انسان خود بخود بلندیوں کی طرف پرواز کرنے لگے - فی الحال تو میں خاکدان سفلی کی مخلوق سے یہی کہوں گا کہ :

تو کار زمیں را نکو ساختی
کہ با آسماں نیز پرداختی ؟

جلد ۱۴ ماہِ نو شمارہ ۸

اگست ۱۹۶۱ء

مدیر: ظفر قریشی

چندہ سالانہ:	شائع کردہ:	فی کاپی
۵ روپے ۵۰ پیسہ	ادارۂ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی	۵۰ پیسہ

سازِ تمنّا سوزِ طلب

رئیس امروہوی

منظرِ عہدِ بہاراں، عالمِ صبحِ بہار!
جلوہ ریز و جلوہ پاش و جلوہ پوش و جلوہ کار

اللہ اللہ! یہ نظارہ اے جمالِ منتظر
اللہ اللہ! یہ تجلّی اے نگاہِ انتظار!

حُسن کی آمیز شیں دیکھ اے جہانِ رنگ و بُو
رنگ و بو کی سازشیں دیکھ اے عروسِ غنچہ زار!

عالمِ تازہ بہ تازہ ہر نفس پر منکشف
کائنات نو بہ نو ہر اک نظر پر آشکار

ہائے وہ صد برگ شاخیں شاخِ آہوئے ختن
ہائے وہ صد رنگ کلیاں نافۂ مشکِ تتار

زائرینِ شہرِ گل۔ وہ کارواں در کارواں
کاروانِ گل بداماں۔ وہ قطار اندر قطار

اے سحر! اے جلوۂ حُسنِ عذارِ مہ رخاں
اے شفق! اے منظرِ گل گونۂ رخسارِ یار!

موجۂ بادِ صبا۔ نیرنگ و نیرنگ آفریں
عطر انفاسِ شمیم، افسوں گر و افسانہ کار

خاک بھی سرمایۂ دامن، بہ فیضِ گلستاں
خار بھی نوبادۂ گلشن۔ بہ حُسنِ اعتبار

کشت زارِ دیدہ میں دیدار کی نشو و نما
آئینے کی کھیتیوں میں فصلِ جلوہ کی بہار

اے جمالِ شاہدِ صبح اپنے جلووں کو جِلا
اے نوائے طائرِ وقت اپنے نغمی کو پکار

آج اے سلمائے سنبل اپنی زلفوں کو جھٹک
آج اے عذرائے غنچہ اپنے عارض کو نکھار

آج اے جانِ بہاراں جامۂ رنگیں پہن
آج اے روحِ گلستاں، شاہدِ گل کو سنوار

جھوم اے گوہر فشاں بادل! ابطارِ گلستاں
ناچ اے رقص آفریں بھونرے! ابروئے شاخسار

کوک اے کوئل کہ سنّاٹا طبیعت پر ہے بوجھ
بول اے بلبل کہ خاموشی سماعت پر ہے بار

حبس میں عہدِ طلب گزرا چل اے بادِ سحر!
خشک سالی میں برس گزرے، برس ابرِ بہار

نیند میں صدیاں کٹیں بیدار اے عمرِ رواں
جادۂ ویراں میں جگ بیتے اٹھ اے غزلِ سوار

روشنیٔ طبع کی روشن گری سے لکھ دیکھ
مطلعِ نو، جس سے شانِ مطلعِ نور آشکار

کون ہے یہ خلوتِ فکر و نظر میں جلوہ باز؟
حدِ نظارہ سے اوجھل، چشمِ دل پر آشکار!

خودنمائی یہ کہ آدابِ حیا کا پردہ در
پردہ داری یہ کہ اسرارِ وفا کا پردہ دار

دل رُبائی یہ کہ با وصفِ توجہ سو گریز
دلنوازی یہ کہ با وصفِ تغافل لاکھ پیار

با وفا اتنا کہ پیمانِ جفا پر کاربند
پاسِ عہد ایسا کہ اقرارِ ستم پر استوار

نرم خُو اتنا کہ اہلِ درد پر سو سو کرم
سخت دل ایسا کہ دامِ زلف میں ہر دل شکار

نازنیں جس طرح شبنم، دلنشیں جیسے نسیم
تیز رَو جس طرح بجلی، مست رَو جیسے خمار

صبحِ گلشن کا ترنم، شامِ صحرا کا سکوت
عہدِ سرما کی لطافت، فصلِ گرما کا وقار

دوپہر کی دھوپ کی شورش، سویرے کا سکوں
روشنی کی خود پسندی، چاندنی کا انکسار

وہ بدل آگاہِ خاطر، وہ بہ لب شکر فشاں
وہ بہ زلف آشوبِ دوراں وہ بہ رخ آئینہ کار

وہ بہ قامت شاخِ لرزاں وہ بہ قد سروِ رواں
وہ بہ تن اک جوئے سیمیں وہ بجاں اک جوئبار

لہجۂ ناز آفریں میں مجھ سے فرمانے لگا
وہ بتِ نوخیز و نو رس، تازہ فکر و تازہ کار

زندگی، تجدیدِ اقدارِ کہن میں غرق ہے
اے بہ طرزِ نو، جہانِ کہنہ کے ماتم گسار!

عالمِ تازہ کی تشکیلِ جدید اک معجزہ
معجزہ ایسا کہ جس پر سحرِ عیسیٰ نثار

اک نئی ملّت کا آغاز اک نئی دنیا کا جشن
اک نئی دنیا کی پیدائش بہ عزمِ کامگار

اک تجلّی زارِ تازہ، اک شبابِ رنگ رنگ
اک نیا عہدِ جوانی، اک نئی فصلِ بہار

اک نیا منظر، نیا جلوہ، نیا طرزِ نگاہ
اک نئی محفل، نئی رونق، نئے نقش و نگار

اک نئی تاریخِ انساں اک نیا جغرافیہ
اک نئی ترتیبِ عالم، اک نئی تشکیلِ کار

اک نیا سازِ تمنّا، اک نیا سوزِ طلب
اک نئی صہبائے رنگیں، اک نیا رنگِ خمار

اک نیا لشکر، نیا قائد، نیا میدانِ جنگ
اک نیا پرچم، نیا نعرہ، نیا میدانِ کار

اک نیا صانع، نئی صنعت، نئی صنعت گری
اک نیا جذبہ، نیا قصہ، نیا قصہ نگار

سوزِ خیبر شکن

بشیر فاروقی

گل و یاسمن پر نکھار آ گیا — گلستاں میں عہدِ بہار آ گیا
صبا آ گئی مسکراتی ہوئی — ترانے مسرت کے گاتی ہوئی
ہوئے مطربانِ چمن نغمہ زن — ہوئے غرقِ مستی گل و نسترن
طیورِ گلستاں چہکنے لگے — گل و غنچہ سارے مہکنے لگے
بہاروں کے گیسو سنور ہی گئے — خزاں دیدہ چہرے نکھر ہی گئے
وہ کافر نظر کافرہ آ گئی — وہ ساحر ادا ساحرہ آ گئی
جسے کہئے محبوبۂ لالہ زار — جسے کہئے دوشیزۂ نو بہار

سویرا ہوا وہ اندھیرے گئے
گئے شامِ ظلمت کے ڈیرے گئے

پلا ساقیا پھر شرابِ الست — کہ آئی ہے سلمائے چودہ اگست
عطا کر ہمیں پھر مئے لالہ فام — کہ خالی ہیں مدت سے رندوں کے جام
وہ مے جو حوادث کا رُخ موڑ دے — جو مینائے وہم گماں توڑ دے
وہ مے جس کا نشہ فسوں ریز ہو — وہ مے جس کی مستی جنوں خیز ہو
یقین و خلوص و اخوت کی مے — شعور و وقار و صداقت کی مے
ادائے بلالؓ جو بخشے ہمیں — نگاہِ غزالیؒ جو بخشے ہمیں
عطا جو کرے قلب عثمانؓ کا — جو بخشے ہمیں جذب سلمانؓ کا
ابوبکرؓ کی جو فراست بھی دے — جو فاروقِ اعظمؓ کی غیرت بھی دے

ملے جس سے اسلاف کا بانکپن
دلوں کو جو دے سوزِ خیبر شکن

جو قلب کلیما نہ بخشے ہمیں — جو فکرِ حکیما نہ بخشے ہمیں
عطا کر ہمیں ساقیا وہ جنوں — جو بخشے ہمیں پھر وہ سوزِ دروں
جنوں کیا ہے تسلیم و صبر و رضا — جنوں کیا ہے عشقِ رسولِ خدا
جنوں تیغ زن ہے جنوں صف شکن — جنوں بت شکن ہے جنوں کوہکن
فقیری میں کرتا ہے شاہی جنوں — ہے راہِ توکل کا راہی جنوں
جنوں نام ہے زورِ حیدرؓ کا بھی — جنوں نام ہے عشق بوذرؓ کا بھی
جنوں آدمیت میں پنہاں بھی ہے — جنوں مرکزیت میں رقصاں بھی ہے
جنوں نے کیا دشت و دریا کو زیر — جنوں نے کیا ساری دنیا کو زیر
جنوں صبرِ ایوبؑ کا نام ہے — جنوں عشقِ محبوب کا نام ہے
لیاقت کا حسنِ لیاقت جنوں — وہ قائد کی حکمت فراست جنوں

جنوں عشق کا دوسرا نام ہے
جنوں ہی محمدؐ کا پیغام ہے

جنوں بن کے آیا ہے عیسےٰؑ کبھی — جنوں بن کے آیا ہے موسیٰؑ کبھی
یہ فرعون کے گیت گاتا نہیں — سکندر کو خاطر میں لاتا نہیں
عطا ساقیا کر وہ عشقِ نجف — عطا کر وہی سوز و سازِ سلف
لہو شوق سے دیں چمن کے لئے — کہ سر تک کٹا دیں وطن کے لئے
وہ خالد سا جانبازِ دیں بخش دے — وہ طارق کا سوزِ یقیں بخش دے

ہمیں عشق آقائے لولاک دے
ہمیں الفتِ کشورِ پاک دے

"جاوداں پیہم رواں پیہم دواں"

(اقبال سے یوم استقلال تک)

اگر ہماری نشاۃ الثانیہ کے عوامل اور مالہ وماعلیہ کا سراغ لگاتے وقت ہمارے ذہن بار بار عظیم وعہد آفریں شخصیت — علامہ اقبالؒ — کی طرف رجوع کریں جس نے اس مہتم بالشان تحریک کو سب سے زیادہ حرکت، توانائی اور سمت ورخ عطا کیا تو اس کے فیضان کا لازمی اعتراف ہوگا۔ بیشک ہم ان کا تصور کئی حیثیتوں سے کر سکتے ہیں۔ ایک شاعر، ایک فلسفی، ایک مرد نکتہ داں، ایک مصلح، ایک مسیحائے قوم لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی اس قدر جامع ومانع اور واضح نہیں ہو سکتا کہ اسے فوری طمانیت کے ساتھ اس ہمہ گیر شخصیت کا آئینہ دار قرار دیا جا سکے۔ تاہم اگر یہ کہا جائے کہ یہ ہستی دانا وبینا و توانا ہماری نشاۃ الثانیہ کی روح رواں اس کا نفسِ ناطقہ تھی تو اس سے اسکے تشخص کو نمایاں کرنے کا حق کافی حد تک ادا ہو جاتا ہے۔ ہماری حیات نو کا عظیم ترین نقیب۔ اس سے ہمارے ذہن میں اقبال کی وہ تصویر آ جاتی ہے جس میں ان کے کلام، ان کے پیام، ان کے افکار کے تمام عناصر ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ اور پھر اُن کا سلسلہ اس طرح جاری ہوتا ہے کہ یہ درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے تمام پاکستان تک پہنچتا ہے۔ جو ہماری نشاۃ الثانیہ اقبال کے حیات آفریں افکار کا لازمی نتیجہ ہے۔

نشاۃ الثانیہ وہ عظیم ذہنی اور روحانی بیداری ہے جس کے آثار انیسویں صدی کے نصف اول کے اواخر سے اُبھرنے لگے تھے اور جو نصف ثانی میں ایک پرزور تحریک کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ یوں تو ہمارا ذہنی و روحانی انحطاط سترہویں صدی ہی میں شروع ہو چکا تھا اور انتشار و اختلال سے وہ تمام آثار موجود تھے جنہوں نے اٹھارویں صدی میں اُٹھ کر تمام اسلامی زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا لیکن سترھویں صدی میں عالمگیرؒ کی زبردست شخصیت نے اُن کو اُبھرنے نہ دیا تھا۔ اس کے بعد تاریکیوں کی ایک طویل شام ہماری زندگی کے افق پر چھا گئی۔ انحطاط کی یہ دلخراش داستان اس قابل نہیں کہ اسے دُہرایا جائے۔ اس کا نمایاں عکس ہمیں اس دور کی شعری وادبی پیداوار میں دکھائی دیتا ہے جو بڑی حد تک پستی کی حدوں کو چھوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس زمانے میں جس طرح انگریزوں کا عروج ہمارے ادبار کا پیغام لایا اسی طرح انگریزی علوم نے ہمیں ابھرنے کی راہ بھی دکھائی اور اس پھیلی ہوئی ظلمت میں شعاع امید بھی عطا کی۔ سرسیدؒ جنہوں نے اسلامیانِ ہند کے ذہن اور روح کی گہرائیوں میں چراغاں کیا۔ اور یہ سوچنے پر مائل کیا کہ نئے نظام میں اسلامی تہذیب کی اصل روح کو کس طرح برقرار رکھتے ہوئے مغربی دانش وحکمت سے کسب نمو کیا جائے۔ اور قومی پستی کو بلندی میں تبدیل کیا جائے۔ سرسید کے سوز دروں نے دوسرے بیدار مغز اسلامی ذہنوں کو بھی متاثر کیا جن کے نور بصیرت اور تابانیٔ کردار سے ہر جہتی جمود وتنزل کی ظلمتیں چھٹنی شروع ہو گئیں۔ اور ہماری تیز قدم بیداری آگے ہی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ ایک اور خضر راہ نے ایک اور دلیل راہ کو پیغام نمود دیا۔ سرسید اور ان کے رفقائے کار کی تابانیاں شعر و فن اور فکر ونظر کے ایک مستقل جلوہ زار میں ظاہر ہوئیں جسکے متعلق ایک صاحب نظر نے بجا کہا ہے:

عہدِ حاضر خانۂ اقبال گشت
واحدے کز صد ہزاراں بر گذشت

وہ شاندار، تازہ، حیات افروز روایت جو مجاہدین قوم نے ہمیں دی تھیں اقبال نے اس کی روحانی سطح پر شاعرانہ اور مفکرانہ انداز میں فلسفیانہ صورت گری کی۔ اور اس کی توسیع وترقی اور تہذیب وتربیت پر اپنے دل و دماغ کی بہترین قوتیں صرف کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس شاعر آتش نوا کی آواز برصغیر کے طول وعرض میں ہماری بیداری کا باعث ہوئی۔ وہ بیداری جس نے قائدِ اعظمؒ کی بے پناہ سیاسی خطابت کے ساتھ ایک محرک آرا غوغائے رستاخیز کی شکل اختیار کر لی۔ اور ہم آزادی کے اس بام بلند تک پہنچ گئے جس پر آفتاب عالمتاب کی تابانیاں نثار ہوتی ہیں۔ اور ہمیں آزادی ہی نہیں استقلال کے جلوہ ہائے بے پایاں بھی قطار اندر قطار دکھائی دیتے ہیں۔

اس موقع پر جبکہ اگست کا مہینہ ہماری قومی زندگی کے ایک تابناک واقعہ کی یاد تازہ کر رہا ہے، اقبال کی طرف بازگشت ناگزیر ہے۔ ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے شعر و ادب کا دامن محض بے کار لذّت پرستی سے چھڑا کر صحت مند حیات آرائی سے وابستہ کیا۔ پہلے شاعری نگینہ سازی تھی یعنی محض کاریگری، اب وہ حقیقی معنوں میں فن اور زندگی بن گئی۔ غالب کو جو ہماری تہذیب میں عہدِ قدیم اور عہدِ جدید کے سنگم پر کھڑے تھے۔ نئی زندگی اور شعر کے تقاضوں کا احساس ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود وہ کسی بھرپور تحریک کو جنم نہ دے سکے۔ سر سید اور حالی نے اس میدان میں بھی ہمیں نیا راستہ دکھایا۔ اور اقبالؒ اس راستے پر چل کر اسکے تمام امکانات و حدود پر محیط ہو گئے۔ وہ جانتے تھے اور انہوں نے اپنے اس علم کو عام بھی کیا کہ شعر محض چند خوبصورت الفاظ کو موزوں کرنے یا نزاکت معنی پیدا کرنے کا نام نہیں۔ وہ شعر کے عظیم مقصد اور شاعر کے اعلیٰ منصب اور اس کی شدید ذمہ داریوں کا پورا احساس رکھتے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ شعر کو شاعرانہ حدود میں رکھتے ہوئے اس عظیم معنویت کا حامل کر دیا جائے جو تمام شعرا کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔

اقبال کا طرۂ امتیاز یہ تھا کہ انہوں نے اپنے ملی مقاصد، اپنی قوم کی ذہنی و روحانی کیفیت کو موضوعِ سخن بنایا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ جانے وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے — یہ ایک نفس دو نفس مثلِ شرر کیا
جس سے دلِ دریا میں تلاطم نہیں ہوتا — اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا

اور آخر میں اس گہری فنی مقصدیت کا اظہار کیا ہے جو نورِ دیدہ و دل اور فروغِ ذہن و روح سے عبارت ہے:

شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیامِ کائنات۔ اسی طرح اقبال کا پیغام تمام تر پیغامِ حیات ہی ہے۔ انہوں نے ہمارے تصورِ حیات، تصورِ مذہب، اور مغرب سے متعلق ہمارے اندازِ نظر اور ردِّ عمل، ہمارے تصور اور نظریۂ تاریخ وغیرہ کو بھی اسی گہرائی کے ساتھ متاثر کیا ہے، انہیں نئے معانی دئے ہیں اور نئی وسعتیں بخشی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہماری نشاۃ الثانیہ کی سب سے اہم اور سب سے بھرپور شخصیت ہیں۔ اس اہمیت اور جامعیت کے ساتھ انہوں نے ہماری تہذیب کے تمام مظاہر فکری و عملی، ذہنی و روحانی کو جانچا اور اسلام کی اخلاقی اقدار کی روشنی میں ہمارے مزاجِ اخلاق اور کردار کی تشکیلِ نو کی کوشش کی اور ہمارے لئے راہِ عمل متعین کی۔ اتنے اعتبارات ہیں جنکی وجہ سے وہ ہمارے یہاں ایک حیات بخش قوت بن کر آئے اور یہ قوت وہ ہے جس کا اثر آج ہی نہیں مدت ہائے مدید تک قائم رہے گا جب تک نوعِ انسانی کو ایک فعال و پائدار مقصدیت کی ضرورت رہے گی۔ پاکستان اس ارفع و اعلیٰ مقصدیت کی عملی تعبیر ہے جس کے نتائج موجودہ دورِ انقلاب میں خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہو چکے ہیں اور کچھ نمایاں ہو رہے ہیں اور جن کا سلسلہ یقیناً اسی سرعت اور تیز رفتاری کے ساتھ جاری رہے گا:

★

ہمیں پاکستان کو ایک جمہوری ملک کی حیثیت سے چلانا ہے۔ اس لئے لوگوں کو چاہئے کہ وہ اپنے اندر جمہوری جذبہ پیدا کریں تاکہ ملک کو جمہوری خطوط پر چلایا جا سکے۔ تمام صحیح الفکر لوگوں کو چاہئے کہ وہ ملک میں ایسے اداروں کی تشکیل کریں جو موجودہ حالات کے لئے موزوں ہو سکیں۔ بنیادی جمہوریت کے مقصد اور فلسفے پر غور کیجئے اور لوگوں کو بتائیے کہ ان اداروں کا مقصد یہ ہے کہ حکومت کو، جو اُن کی اپنی ہی حکومت ہے، عوام سے قریب تر لایا جائے۔

موجودہ حکومت ایسے ادارے وجود میں لانا چاہتی ہے جو جمہوریت کو، اس کے وسیع تر مفہوم میں، قائم کرنے کے لئے ممد ثابت ہو سکیں۔

میں سوچ رہا ہوں کہ لوگوں کا وہ بوجھ جو اُن پر صدیوں سے پڑا ہوا ہے، کس طرح کم کیا جائے۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان

آزاد نظم کے سراغ میں ۔ ۲

(پس منظر)

رفیق خاور

پہلی جنگ عظیم کے بعد انسانی تاریخ وشعور نے جو کروٹ لی وہ ہمارے سامنے ہے۔ ہر قسم کے بند ھنوں سے رہائی جو پہلے مغرب کی نشاۃ الثانیہ سے ظہور میں آئی تھی اور جسے صنعتی انقلاب نے اور بھی ہوا دی تھی، پہلی جنگ عظیم کے بعد ایک قدم اور آگے بڑھی اور دیکھتے ہی دیکھتے کہیں کی کہیں پہنچ گئی جس سے وکٹوریہ، ایڈورڈ ہفتم اور جارج پنجم کا زمانہ واضح طور پر قدیم معلوم ہوتا ہے۔ اس کی نمایاں خصوصیت وضعداری اور پابندی تھی۔ نئے دور نے ہر اعتبار سے زندگی کی ہر روایت کو خیرباد کہہ دی اور انسانی ذہن جیسے تمام قیود سے آزاد ہو کر بڑی تیزی کے ساتھ نئے رجحان پیدا کرنے لگا۔ زندگی کی روش اس قدر بدل گئی کہ ہر طرف ایک نیا عالم اور نئی سے نئی سرگرمیاں دکھائی دینے لگیں۔ سائنس کی غیر معمولی ترقی، مشینی دور کا پوری شدت سے آغاز، فضائی پرواز، برقیات، جن کا سلسلہ بڑھتے بڑھتے بالآخر جوہری توانائی تک جا پہنچا، پرانے نظام کی شکست وریخت سے صنعتی نظام کا ظہور، آن گنت ایجادات ومصنوعات، یہ اور دیگر عوامل ایسے تھے جنہوں نے فکر وعمل کے لئے نئے نئے محرکات پیدا کئے اور تاروں کی گردش کچھ ایسی تیز ہو گئی کہ ہم انسانوں کے جہاں کو دگرگوں ہونا ہی پڑا اور اس کے ساتھ وہ غوغائے رستاخیز بھی پیدا ہوا جس میں انتشار کے ساتھ ساتھ ترتیب نو کی نئی نئی کوششیں بھی نظر آتی ہیں۔ چنانچہ ایک طرف بالشوزم، اشتراکیت اور اشتمالیت جیسی اجتماعی تحریکیں ہیں جن کی نوعیت خارجی ومادی ہے تو دوسری طرف جدید نفسیات فرائیڈ، یونگ، ایڈلر وغیرہ کے ساتھ آناً فاناً طوفانی رفتار سے تمام دنیا پر چھا جاتے ہیں ان ہی دونوں صنعتی ونفسیاتی انقلاب ـــــ کا شاخسانہ، عائلی وجنسی مسائل بھی تھے جن کے سیل تندرو نے تمام روایتی بند توڑ پھوڑ کر رکھ دیئے۔ مجموعی نتیجہ بہرحال روایت کے خلاف بغاوت ہی رہا اور بغاوت کے معنی آزادی کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں خواہ وہ نراج کی حد تک ہی کیوں نہ پہنچ جائے۔

آں سیل سبک سیر م ہر بند شکستم من ۔ اور ظاہر ہے کہ اس سیل بے زنہار میں مذہبی، اخلاقی یا روحانی قدریں بھی کیسے سلامت رہ سکتی تھیں؟ ادب وفن کی اقدار کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ افتاد ہی کچھ ایسی تھی کہ ہر چیز کا بدلنا ناگزیر تھا۔

دریں حالات فکر وفن میں وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ آزادی، اور آزادی، اور آزادی۔ مروجہ باتوں سے گریز۔ ایک تو عام رجحان کا ہمہ گیر اثر، اس پر جدید نفسی نظریئے جنہوں نے شعور کی ٹھوس، سراپا شہود دنیا کو پاش پاش کر کے لاشعور اور تحت الشعور کی سیمیائی خواب نما، موہوم، غیب، پرچھائیں در پرچھائیں دنیا کا تصور پیش کیا۔ سمند ناز پر ایک اور تازیانہ لگاتے ہوئے اور ذہن اس نفسیاتی تصوف میں کھو گئے۔ کہاں شعور کے تحت خیالوں کے مربوط سلسلے اور کہاں زیر نفسی دنیا کی گم سم، اہلی گہلی، اپنی ہی رو میں بہنے والی لامتناہی کیفیتیں، متوالی، لاابالی۔ تلازمۂ خیال نے عنان کار ربط کی جگہ آن میں کچھ آن میں کچھ نیرنگیوں کے حوالے کر دی۔ خود سائنس نے بھی ایک بھری پری، ٹھوس محسوس دنیا کی بجائے بریڈلے جیسے فلسفیوں کی طرح ایک ہیولائی دنیا کی تائید کی۔ اس عالم میں یا آزاد بہاؤ پیدا ہو سکتا تھا یا ہر قدم رنگ بدلتی ہوئی جنوں جولانی جو کسی وقت کوئی بھی صورت اختیار کر سکتی تھی۔

فکر وفن کی حساس دنیا ایسے اثرات سے غیر متاثر نہیں رہ سکتی۔ دیگر عوامل سے قطع نظر رفتار بجائے خود ایک ایسی چیز ہے جو غیر محسوس طور پر زندگی کی تمام سرگرمیوں کو متاثر کئے جاتی ہے، بعینہ ایک زنجیری عمل کی طرح مشینوں کی تیز رفتاری نے ہمارے فکر واحساس پر براہ راست اثر ڈالنے کے علاوہ بالواسطہ غیر شعوری طور پر ہمارے فکر وعمل پر کیا کچھ اثر نہیں ڈالا ظاہر ہے کہ ان حالات نے پہلی جنگ عظیم کے بعد نہ فکر، نہ ادب، نہ فن، وہی رہ سکتے تھے جو اس سے پہلے تھے اور ہم ان کا موازنہ کریں تو ان میں زمین آسمان کا فرق دکھائی دے گا۔ مثلاً رابرٹ برجز جان میسفیلڈ، رابرٹ برجز اپنی نسبتاً جدید وضع کے باوجود صاف اگلے وقتوں کے لوگ معلوم ہوتے ہیں جیسے ان کی دنیا ہی اور ہو،

اور وہ اس پابندیٔ وضع کی حدود سے باہر نہیں نکل سکتے۔ یہ درست ہے کہ رفتار کے مخفی اثر کا استدلال کسی قدر مخدوش ہے۔ آخر آزاد شاعری بلینک ورس کی شکل میں اس سے کہیں پہلے وجود میں آ چکی تھی، اور برابر رائج رہی، تاہم اتنا تسلیم کرنا پڑے گا کہ زندگی وقتاً فوقتاً سمٹتی بھی ہے اور پھیلتی بھی ہے، کبھی خاص خاص نظاموں اور حلقوں کی پابند اور کبھی ان کی حدود سے نکل کر وسیع تر دائرہ پیدا کرتی ہوئی۔ اس دوران میں تیز رفتاری کے وہ آثار ظہور میں آتے ہیں جو ہر زنجیری عمل کے لئے لازم ہیں اور فکر و خیال، ادب و فن پر نمایاں اثر طاری کرتے ہیں۔ غالباً آج سے پہلے بھی اس قسم کے موثرات تھے جو شعر و ادب میں کلاسیت، ٹکسال پن اور سکہ بندی کی بجائے رومانیت، رنگا رنگی (صوری و معنوی) اور حل و گداز کا باعث ہوئے اور بلینک ورس ان ہی کی شرمندۂ احسان ہو۔

بنابریں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ایک سراپا رفتار دور نے زندگی اور اس کے گوناگوں مظاہر — فکری، علمی، ادبی، فنی، ثقافتی، عمرانی، پر وسیع اور دور رس، انقلاب آفریں اثر ڈالا اور اس کے ساتھ جو دیگر عوامل پیدا ہوئے۔ اجتماعی و نفسیاتی۔ انہوں نے مل جل کر ایک ایسی فضا پیدا کر دی جو شعر، ادب، فن، تصویریں بالعموم انقلاب کی حد تک وسیع تغیرات کی متقاضی بھی ہو سکتی تھی اور ان کا باعث بھی یعنی ان کو سابقہ طرز و روش اور مرکز و محور سے ہٹنے کے لئے میدان مہیا کر سکتی تھی کسی اور سبب کی بجائے ورس لبرے (VERSE LIBRE) یا آزاد نظم کے ظہور کو اس فضا اور اس کے عوامل ہی سے وابستہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو جہاں پابند شاعری ایک مخصوص نظام کی پیداوار معلوم ہوتی ہے اور اسی سے مناسبت رکھتی ہے۔ تمام تر پابند وضع۔ وہاں آزاد نظم اس متحرک، تغیر پذیر، سیال و گداز ماحول ہی کی پیداوار معلوم ہوتی ہے اور اسی کی روشنی میں قابلِ فہم بھی ہے جو دورِ جدید میں رونما ہوا، کہنہ آہنگ مسلسل کی بجائے جدید، متحرک آہنگ کا آئینہ دار۔ یہ شاعروں کے ذہن میں کسی خوامخواہ اپج کا نتیجہ نہیں۔ اسے عمرانی اسباب و علل کا نتیجہ قرار دینا کہیں زیادہ معقول ہوگا، جیسا کہ ہر مطالعہ میں ہونا چاہئے، بہ نسبت اس کے کہ اسے آوارہ ذہن کی آوارہ، بے تکی پرواز قرار دیا جائے۔ شاعر، ادیب، فنکار اپنے ماحول کا رنگ اور رخ دیکھ کر اپنے من کی گہرائیوں میں ڈوب جایا کرتے ہیں اور نئی نئی باتوں کا سراغ لگایا کرتے ہیں بظاہر آزاد نظم ہی نہیں، ادب و فن کے تمام جدید مظاہر کا سراغ بھی گرد و پیش کی فضا کے اس ہمہ رس، ہمہ گیر اثر ہی میں ملتا ہے۔

آزاد نظم کے سلسلے میں ہمارے یہاں جو کچھ ہوا وہ بھی کچھ ایسے ہی حالات کا نتیجہ ہے۔ مغرب نے آتے ہی ہم پر پوری شدت سے اثر انداز ہونا شروع کر دیا تھا اور ہماری تمام جدید زندگی اسی کے انقلاب آفریں اثر ہی کا نتیجہ ہے۔ جہاں تک علم و ادب کا تعلق ہے یہ ایک امر واقعہ ہے جس کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں۔ پہلی جنگ عظیم سے قبل مغرب کے اثرات کتنے ہی شدید کیوں نہ رہے ہوں ان کا دائرہ ایک حد تک ہی محدود تھا۔ خود مغرب میں بھی رفتار اتنی طوفان خیز نہ تھی۔ اس لئے ہم نے جو اثرات قبول کئے وہ اس رفتار ہی کے مطابق تھے چنانچہ منجملہ دیگر مغربی اصنافِ نظم و نثر کے ہم نے اس شعری صنف کے اثرات بھی محسوس کئے جو رفتار آزادی کے سانچے سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ تہذیبی اثرات یوں بھی اپنی زاد بوم سے پرے دیگر حوالی میں اتنے زود اثر نہیں ہوتے۔ ہمیں اس کے لئے کسی ٹوئن بی کی وسیع و بسیط توضیحات کی ضرورت نہیں کہ اثرات اپنے مسقط الراس سے دیگر مقامات تک کافی دیر سے پہنچتے ہیں۔ ایسا ہونا لازم و ناگزیر ہے۔ لہٰذا پہلی جنگ عظیم کے بعد مغرب میں جو کچھ ہوا اس کے سلسلۂ اثر کی لہریں مشرق میں پہنچتے پہنچتے ہی پہنچیں۔ وہاں کی تحریکات کو بروئے کار آنے اور انتہائی شدت پیدا کرنے میں قدرتی طور پر ایک دہائی لینی پڑی — بیسویں صدی کی دوسری دہائی۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں بے شمار تحریکیں ابھریں اور پروان چڑھیں اور پھر ہوتے ہوتے ان کے اثرات خود دورِ جدید کی تیزیٔ رفتار کے راست اثرات سے ملکِ مشرق میں بھی پہنچے اور طاری ہونے لگے۔

لہٰذا یہ زمانہ بحث و جرح کا زمانہ تھا۔ وہ زمانہ جب ہم مغرب کے نئے اثرات کو جذب کر رہے تھے اور یہ عملی صورت میں نمودار نہیں ہو سکے تھے۔ ہمارا پرانا دورِ فکر و نظر ختم ہو چکا تھا۔ علامہ اقبال ہمارے رابرٹ برجز تھے۔ قدیم و جدید دور کی سرحد پر ایک سنگِ میل۔ نیم پابند، نیم آزاد دور کے آخری مہتم بالشان مظہر۔ پرانی نسل کو جو کرنا تھا کر چکی تھی، جن جن باتوں کا حق ادا کرنا تھا ادا کر چکی تھی۔ اب ایک نئی نسل اور نئی فضا کی تیاری کا زمانہ تھا۔ اقبال کے بعد کا دور جس کا آغاز ان کے حینِ حیات ہی میں ہو چکا تھا۔ دورِ ماضی، دورِ روایت، قرونِ وسطیٰ سے دورِ نو اور دورِ مغرب کی طرف، روز افزوں جدیدیت کی طرف۔ چنانچہ اقبال کی زندگی ہی میں فکر و فن کی نئی فضا ابھرنے لگ گئی تھی، شعر و ادب

کے نئے افق جھلکنے لگے تھے۔ جوشؔ اپنی سیاسی و معاشی ہنگامہ پسندی، اخترؔ شیرانی اپنی رومانیت، حفیظؔ اپنی غنائیت اور مقامی فضا اور منٹو اپنی جنسی دہشت پسندی کے ساتھ۔ اگر ہم خود کو زیادہ نمایاں ہستیوں تک ہی محدود رکھیں۔ نئی روح کی واضح علامات تھے۔ رومانیت کیا ہے؟ قیدوبند کا پرافشاں ہونا، نظم و ضبط کے بندھن سے اُچھل کر بیکراں ہونا، ایک سعئ آزادی۔ اخترؔ شیرانی کی بدویت اسی کی آئینہ بردار ہے اور منٹو — اس نے وہی حربہ اختیار کیا جو منچلے نوجوان رسوم و قیود کو پار لگانے کے لئے اختیار کیا کرتے ہیں۔ اس نے ان لوگوں کی صفوں میں کھلبلی پیدا کرنے کے لئے جو پرانے طور طریق اور عقیدوں کے پرستار ہوں، جنس اور اخلاق جیسے سنسنی خیز موضوعات پر تہلکہ پیدا کر دینے والی چیزیں لکھیں جن کے متعلق انسانی معاشرہ ہمیشہ بے حد حساس رہا ہے۔ یہی بات "انگارے" میں بھی نظر آتی ہے۔ اجتماعی نظریہ (جس کی سب سے نمایاں صورت سرخ تصور ہے) ترقی پسند تحریک میں سابقہ رومانیت کا جانشین ثابت ہوا، یعنی اس کی بدولت مقصدیت، افادیت اور شعر و ادب برائے پیغام و فلسفہ کا سلسلہ ایک اور شکل میں جاری رہا۔ اس کے دوسرے سرے پر فرائیڈ اور اس کے ہم مشربوں کے نفسیاتی نظریئے جنہیں آیت و حدیث کا درجہ حاصل ہو چکا تھا، ہر انسان کے دل و دماغ پر اس طرح چھائے ہوئے تھے کہ شعر و ادب میں تحلیلِ نفسی، نرگسیت، ایڈی پس الجھاؤ، لبیڈو، اِڈ، احساسِ کمتری و کہتری، دروں بینی و برون بینی وغیرہ کا سیلاب آگیا اور نظم و نثر کی ہر صنف میں نفسیاتی ژرف نگاہی اور باریک سے باریک جزئیات کی توضیح و تشریح تبحرِ علمی کا طرّہ امتیاز بن گئے۔ تجزیۂ نفس کا ایک بہت ہی مرغوب میدان جنسیات ہے۔ اس لئے ایک وقت ہر چھوٹے بڑے افسانہ نگار کا موضوع نفسیات کی بھول بھلیوں اور جنسیات کی موشگافیوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ان سے قطع نظر ایک اور آزاد، وسیع المشربی کا رجحان بھی تھا حقیقی معنوں میں آفاقی جس میں کسی خاص عقیدے یا نظریئے میں گھر جانے یا اس کی رو میں بہہ جانے کی بجائے سلامتِ فکر کا پہلو غالب تھا اور ہر گونہ خیالات سے اثر پذیر ہو کر وہ جدید ذوق اور ذہنیت پیدا کی جاتی تھی جسے "روشن خیالی" کہتے ہیں۔ اگرچہ یہ رجحان ایک مختصر طبقہ ہی تک محدود تھا اور ہے لیکن اس کی موجودگی اس فضا کا نہایت اہم عنصر تھی۔ سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود نہ ہوتے ہوئے وارستۂ ہر مذہب جس کی عکاسی اس شعر سے ہوتی ہے ؎

ان مسلکوں سے دور نظاموں سے دور تر
مشرب ہے اک مری نظرِ انتخاب میں

اس روشن خیالی اور وسیع النظری کو دورِ جدید کا بہترین حاصل سمجھنا چاہئے۔ یہ جدید عالمی اثرات ہر کہیں بروئے کار آئے، کہیں کم کہیں زیادہ۔ ابتداءً ان کا ظہور علیگڈھ میں ہوا تھا۔ لیکن وہاں دین و دنیا کا تناسب تقریباً یکساں تھا۔ جلد ہی اقبالؔ اور دیگر اہلِ فکر۔ سر عبدالقادر، مولانا ظفر علی خاں، عبدالمجید سالک وغیرہ کے زیرِ اثر "نئی روشنی" کا مرکز لاہور قرار پایا جہاں مخزن، ہمایوں، نیرنگِ خیال، ادبی دنیا، شاہکار، زمیندار اور انقلاب جیسے رسائل و جرائد اور سلسلہ در سلسلہ ادیب و صحافی ظہور پذیر ہو کر ایک روشن سے روشن تر فضا پیدا کرتے گئے جس سے روز بروز ایک اور ہی نکھرتا ہوا روپ ابھرتا چلا جا رہا تھا۔ دین و دنیا، قدامت و جدیدیت، روایت و بغاوت، پابندی و آزادی کے تناسب کو اور بھی روشن خیالی کی سمت میں تبدیل کرتے ہوئے۔ بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائیاں اس روز افزوں رجحان کا خاص الخاص زمانہ تھیں جبکہ اذہان بڑی تیزی سے بدلتے جا رہے تھے۔ اقبالؔ سے اثر پذیر ہوتے ہوئے اس کے قریب بھی اور نئے میلانات کے باعث اس سے پرے ہٹتے ہوئے بھی۔ یہ نئی رو مسلمانوں کی حد تک اُردو ہی کی معیت میں ابھری تھی اور اسی کو نمود دیتے ہوئے آگے بڑھی۔ یہ دور اُردو کے غیر معمولی فروغ کا دور تھا اور لاہور خصوصیت سے اس کا مقامِ نمود۔ اس حقیقتِ نفس الامری کا اعتراف کرتے ہوئے اس دور کے ایک شاعر نے کہا تھا:

مرکزِ زبانِ اردو کا لاہور ہوگیا

اور یہ اس نظم میں کہا گیا تھا جو یو۔ پی کے ایک شاعر نے ان دنوں لاہور کے نت نئے عظیم الشان مشاعروں، ادیبوں کی ہنگامہ آرائیوں، علمی و ادبی اداروں کی کثرت اور ادبی مجالس کی سرگرمیوں کو دیکھ کر پڑھی تھی۔ اس زمانہ کے پنجاب میں تمام قومیں اسی طرح اپنے طور پر سرگرمِ کار تھیں اور ان سے اس نئی فضا کی تعمیر میں مدد مل رہی تھی جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ لاہور میں اس فضا کی تعمیر اُن قدیم درسگاہوں کے ذریعہ ہی ممکن تھی۔ جو مدت سے اس کی تعلیمی و ذہنی نشو و نما کی کفیل تھیں۔ گورنمنٹ کالج، ایف۔ سی کالج، اسلامیہ کالج، ان میں ایف سی کالج، اپنی خصوصی وضع کے باعث زیادہ ایک تعلیمی ادارہ ہی رہا ہے۔ اسلامیہ کالج کو دوسرا علیگڈھ سمجھ لیجئے۔ دین و دنیا کے اعتبار سے وہی برزخ کی کیفیت کسی

نئی تحریک یا مشرب کا خالق یا علمبردار نہیں اور نہ منبع و مخرج، تاہم بقدرِ ذوق ان میں شریک اور نئی فضا کے اثر کو برابر قبول کرتا ہوا، گورنمنٹ کالج۔ ڈاکٹر اقبال، آرنلڈ اور شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد پر نازکناں ادارہ۔ اس کی حیثیت مختلف تھی۔ اس کی مخصوص وضع آزادی آمیز، تعلیمی اور ادبی و ثقافتی سرگرمیوں اور بے باکی سے قدم اٹھانے کے لئے موزوں تھی کیونکہ اس میں خالص علمی و ادبی ذوق ہی فروغ پا سکتا تھا کسی مخالف رجحان، کسی حریف سے دست و گریباں ہوئے بغیر۔ لہٰذا یہ ادارہ نئی تحریکات کو جنم دینے اور نئے ذوق کی پرورش کے لئے سازگار تھا۔ چنانچہ اس نے شروع ہی سے ادب و فن کی ایک مخصوص روایت قائم کر دی جس کی عکاسی، اپنی محدود بساط کے مطابق، مختصر پیمانہ پر ہی سہی، رسالہ "راوی" کرتا تھا۔ جسے نئے نئے جوہروں کو نمود اور جلا دینے ہی میں نہیں بلکہ ہمارے ادب کی نشو و نما میں بھی خاصا دخل رہا ہے اور ہمیں اپنے ادب کی تاریخ کو مرتب کرتے ہوئے لامحالہ اس کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ آج بھی اس کے سابقہ شماروں پر نظر ڈالی جائے۔ ابتدائی دور کے بعد جس کی معروف ترین شخصیت سید امتیاز علی تاج ہیں ـــــ تو اس میں نئے شعور، نئے ذوق اور نئے رجحان کی نہایت واضح علامات دکھائی دیں گی۔ اور یہ امور، ظاہر ہے، گزارشِ احوالِ واقعی ہی کے طور پر بیان کئے جا رہے ہیں۔ ان ہی شماروں میں وہ شستہ و رفتہ مزاح بھی دکھائی دے گا جس کا مایۂ ناز نمونہ پطرس بخاری کا مزاح ہے جو اس ادارہ کے ایک رکن رکین تھے ـــــ دانش یار بھی اور دانش آموز بھی۔ اور صرف پطرس ہی نہیں میاں سر فضل حسین، ڈاکٹر اقبال، سید امتیاز علی تاج، غالباً چوہدری شہاب الدین (جنہوں نے مسدسِ حالی کا پنجابی میں نہایت عمدہ ترجمہ کیا) شیخ محمد اکرام، ن۔ م۔ راشد، فیض احمد فیض، ڈاکٹر محمد صادق، ڈاکٹر خالد، سید فیاض محمود، سید محمد جعفری، آغا عبد الحمید، جلال الدین اکبر، الطاف گوہر، ضیا جالندھری، مظفر علی سید۔ اور اگر ان بڑے بڑے ناموں میں ایک چھوٹا نام کچھ اضافہ کر سکے تو راقم الحروف بھی ـــــ اسی کے دامنِ تربیت سے وابستہ رہے اگرچہ ان میں سے بعض کسی نہ کسی حیثیت سے اسلامیہ کالج کے ساتھ بھی وابستہ رہے ہیں (میں خود ابتداءً اسلامیہ کالج کا طالب علم تھا) اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس ادارہ نے بھی ان قابل جوہروں کی نشو و نما اور اس وجہ سے ادب و فن کی ترویج و ترقی اور تحریکِ جدید میں کم حصہ نہیں لیا۔

فیض رسانی کے اعتبار سے تمام ماد رانِ علمی کی حیثیت یکساں ہے اور وہ برابر قدر و منزلت کی مستحق ہیں لیکن بوجوہ بعض دوسروں پر فضیلت بھی رکھتی ہیں اور یہی خصوصیت گورنمنٹ کالج کی بھی ہے۔ یہ امرِ واقعہ ہے کہ آزاد شاعری کے بانی مبانی اور بڑے بڑے نمائندے اسی ادارہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس کے ضرور کوئی اسباب ہوں گے جو اسے اس لحاظ سے امتیاز بخشتے ہیں۔ یہ اسباب کیا ہیں؟ سب سے پہلے ہمیں اس مخصوص وضع، اس فضا کو پیش نظر رکھنا ہوگا جو ہماری توجیہات کے مطابق اس کو جدید ترین ذوق اور رجحانات سے مکمل طور پر ہم آہنگ کرتے ہیں اور جن سے لامحالہ ادب و فن کے تازہ ترین مظاہر کی نمود کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ آزاد نظم ایک بہت ہی جدید وضع کی چیز ہے اور یہ کسی نہایت جدید وضع کے ادارہ ہی سے رونما ہو سکتی تھی۔ اس استدلال سے قطع نظر معاملہ تمام تر شواہد کا ہے جن کی علامات کہیں دوسری دہائی کے وسط میں دکھائی دینے لگتی ہیں یعنی وہ زمانہ جب پہلی جنگ عظیم کو ختم ہوئے اتنا عرصہ گذر چکا تھا کہ جدید ترین مغربی اثرات مشرق میں پہنچ جائیں اور وہ پود جسے نئے اثرات قبول کر کے نئی تحریک میں حصہ لینا تھا، کالج میں پہنچ چکی تھی۔ راقم الحروف نے ۱۹۲۶ء میں بی۔ اے کلاس میں داخلہ لیا۔ ن۔ م۔ راشد کوئی تین سال بعد پہنچے۔ ڈاکٹر خالد اس سے بہت پہلے ۱۹۲۳ء میں ایم۔ اے پاس کر چکے تھے۔ انہوں نے اپنے عہد کے ذوقی اثرات قبول کئے اور یہی ان کو ہیئت کے بعض جدید تجربوں کی طرف لے گئے۔ وہ قدرتی طور پر ان اثرات میں شریک نہیں ہو سکتے تھے جو بعد کی پود کے حصہ میں آئے۔ ان اثرات کا بدل کچھ تو انہیں ذہنی ارتقا، اور وہبی ذوق، کچھ کلاسیکی موسیقی سے شغف جس کا تذکرہ انہوں نے اپنے مجموعۂ کلام "سرودِ نو" کے پیش لفظ میں کیا ہے، اور کچھ قیامِ انگلستان کے دوران میں بلاواسطہ اثرات سے ہاتھ آیا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ؛

> "یہاں (لندن) میں مشہور شاعر ڈی۔ جی روزیٹی اور ان کی بہن کرسٹینا کے عزیز ڈبلیو روزیٹی بطور سکریٹری کے کام کر رہے تھے۔ آپ مشہور شاعر ولیم موریس کے بھی عزیز تھے۔ ان کی اور

برٹن کی وساطت سے میرا انگلستان کے ادبی
حلقوں میں آنا جانا ہو گیا اور وہاں کے جدید
شعراء، مصنفین اور نقادانِ فن سے میری
راہ و رسم ہو گئی اور اس طرح مجھے انگریزی کے
جدید رجحانات اور ورس لبرے (شعر آزاد)
کے مطالعہ کا نہ صرف موقع ملا بلکہ ان کے متعلق
تمام بحث آرائیوں میں بھی شریک ہوا۔"

خالد ۲۴ء میں انگلستان گئے اور دو تین سال لگاتار بے قافیہ نظمیں ارسال کرتے رہے جو بعد میں رسائل میں شائع بھی ہوئیں (یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ وہ میرے بڑے بھائی ہیں) غالباً ۱۹۳۳ء میں ایک رسالہ "ہماری دنیا" میری ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا۔ بعض نظمیں اس میں بھی شائع ہوئیں۔ کافی عرصہ بعد میراجی سے میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ وہ اس رسالہ کے ذریعہ مجھے پہلے ہی جانتے ہیں اور ڈاکٹر خالد کی نظمیں ان کی نظر سے گذرتی رہی ہیں جو انہیں آزاد شاعری کی طرف مائل کرنے کا باعث ہوئیں۔ ممکن ہے انہوں نے کہیں اور بھی اس کا ذکر کیا ہو۔ چند سال بعد جب آزاد نظم کا زور بڑھا اس میں میراجی کی شخصیت اور کلام پر جارحانہ تنقید کو خاص دخل تھا کیونکہ دو اصحاب، آغا بیدار بخت اور ان کے دست راست و حلیفِ خاص، عاشق محمود یا محمد عاشق نے میراجی کی نظموں کی پیروڈیوں کے ذریعہ اس کی تضحیک و تمسخر کو اپنا شعار بنا لیا تھا) اور کئی لوگ اس کے خلاف میدان میں اتر آئے۔ (جن میں سے ایک ڈاکٹر عندلیب[1] شادانی بھی تھے گو رفتارِ زمانہ کا ساتھ دیتے ہوئے اب وہ بھی آزاد نظمیں لکھنے لگ گئے ہیں) تو ساغر نظامی نے ۱۹۴۲ء میں اپنے رسالہ "ایشیا" میں ایک مبسوط مضمون لکھا تھا جس میں انہوں نے یہ کہتے ہوئے کہ آستانِ غیر پر سجدہ ریزی بہرحال معیوب ہے خواہ وہ سجدہ آستانۂ عجم پر ہو" یا انگلستان کے

گیبٹ پر" یہ بھی کہا تھا کہ انہوں نے سب سے پہلے آزاد نظم ڈاکٹر خالد کی زبانی فیروزپور کے ایک مشاعرہ میں سنی تھی۔ یہ ۱۹۲۷ء یا ۱۹۲۸ء کی بات ہے۔ اس سلسلہ میں صاحب موصوف کو غلط فہمی ہوئی ہے ڈاکٹر خالد نے انگلستان جانے سے پہلے کوئی آزاد نظم نہیں لکھی۔ جو نظمیں انہوں نے قبل ازیں لکھی تھیں وہ بہت آزاد قسم کی پابند نظمیں تھیں جن میں قافیے کسی معین ترتیب سے نہیں آتے یعنی ان کا التزام نہیں کیا جاتا۔ قافیے آئیں یا نہ آئیں مثلاً "نیند"۔ "طائر مستور"۔ "ہمالیہ پر صبح کا ایک منظر" وغیرہ۔ مجھے ان نظموں کے اشعار یاد نہیں رہے لیکن "طائر مستور" کے ایک بند کی کیفیت کچھ اس طرح تھی:

چھوٹا سا ہے اک گھونسلا۔ میں نے بنا رکھا ہوا۔ ننھا سا پھولوں سے سجا
جو طائر دل کے لئے۔ کچھ کمتر از محمل نہیں
کس نے مجھے چونکا دیا کس نے مجھے تڑپا دیا
اک طائر مستور کے۔ جذبات نامعلوم نے

"نیند" کی ہیئت اس سے زیادہ بے قافیہ یا قافیہ اندر آزاد ہے جس پر بادی النظر میں آزاد نظم کا شبہ ہو سکتا ہے۔ ساغر نظامی نے یہی یا اسی قسم کی کوئی اور نظم سنی ہوگی۔ خود راشد اور کئی دوسرے شاعروں کی نظموں میں بھی بعض اوقات قافیہ آتا ہے اور بعض اوقات نہیں آتا اگرچہ ان میں با قافیہ مصرعوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔

یہ درست ہے کہ ڈاکٹر خالد کی ذہنی افتاد شروع ہی سے اس آزادی کی طرف مائل تھی جو اظہار خیال کے لئے آزاد نظم کا تقاضا کرتی ہے اور بالآخر انہوں نے اپنے ہی طور پر اس منزل کو پا بھی لیا مگر اس کولمبس نے اپنی دریافت کا چرچا نہ کیا اور نہ اس کے لئے کوئی پرچارک ہی پیدا کئے جو عموماً دوسروں کے لئے شہرت اور قبول عام کی مہم سر کیا کرتے ہیں۔ صرف "اردو شاعری کا منظر اتم" کے عنوان سے "راوی" میں ان کی اولیت اور امتیاز تسلیم کرتا ہوا ایک مضمون شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ایک اور آواز تھی جو حقیقت سے باخبر ہونے کے باوجود اٹھ نہ سکی۔ مجید لاہوری کی آواز جنہوں نے اس معاملہ کا ایک نجی گفتگو میں تذکرہ کیا تھا اور اس پر کچھ کہنا چاہتے تھے اسلئے کہ وہ بھی واقعات کے عینی ناظر رہے تھے۔ لیکن ان کی آواز کو موت نے خاموش کر دیا!

ڈاکٹر خالد کا مجموعہ کبھی وقت پر شائع نہ ہوا اور ہوا بھی تو قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں جب "ماورا" کو شائع ہوئے

(باقی صفحہ ۵۸ پر)

---

[1] ان کا ایک مبسوط مضمون "نیرنگ خیال" کے کسی شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد جناب غلام احمد پرویز کا اسی رسالہ میں ڈاکٹر خالد کی آزاد شاعری پر سیر حاصل مضمون شائع ہوا۔ (ا۔خ)

خیالوں کے دھارے

(ادب و معاشرہ)

ضمیر علی بدایونی

ادب و معاشرہ پر اظہارِ خیال کی جو دعوت ہم نے جون ۱۹۶۱ء کے شمارہ میں دی تھی اس کے جواب میں یہ پُرمغز، بسیط اور پُراز معلومات مقالہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس کے باوجود "شاید بہ گفتیم و دل خالی نشد" کی کیفیت باقی ہے۔ (ادارہ)

سارتر نے کہا ہے کہ ہم نہ معصومیت سے بول سکتے ہیں اور نہ لکھ سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف مارٹن ہائیڈگر نے ہولڈرلن کی زبانی شاعری کو سب سے معصومانہ مشغلہ قرار دیا ہے۔ کیونکہ شاعری حقیقت پر اثر انداز نہیں ہوتی اور اس کی تبدیلی میں کوئی حصہ نہیں لیتی۔ یہ کھیل کے بے ضرر اور معصومانہ پردہ میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ نام دینے کا پہلا عمل ہے اور اپنے نام دینے کے عمل سے یہ ہستی کو قائم کرتی ہے۔ گو سارتر کے نزدیک بھی ادب کی بنیادی غرض و غایت تاریک اور بے نام اشیاء کو نام دینا اور روشن کرنا ہے لیکن سارتر کے نزدیک ادیب یہ سب کچھ معصومیت کے ساتھ نہیں کرسکتا۔ ہمارا ہر داخلی و خارجی عمل معاشرہ پر اثر انداز ہوتا ہے بقول مولانا آزاد زندگی ایک آئینہ خانہ ہے۔ یہاں ایک آئینہ کا عکس سارے آئینوں میں پڑنے لگتا ہے۔ ہائیڈگر اور سارتر ایک ہی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود اپنے فنی نظریات میں دوسرے سے بالکل مختلف بلکہ اسی فاصلہ پر کھڑے ہوئے ہیں جس پر بودلیر اور تالستائی کھڑے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ کوئی ایسی بات تو نہیں جسے سن کر تعجب کا اظہار کیا جائے۔ کیونکہ جب سے فن و ادب کی اساسی غرض و غایت کا مسئلہ اٹھا ہے، مفکرین کسی قطعی فیصلہ تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ افلاطون نے اپنی ریاست سے شاعروں کو خارج کر دیا۔ لیکن آج ہائیڈگر شاعری کو انسانی وجود کی اساس قرار دیتا ہے۔ اگر شاعری نہ ہو تو انسانی وجود میں کوئی معنی باقی نہیں رہتے۔ شاعری سے گریز انسانی فطرت سے گریز ہے جیسے نیتشے نے زرتشت کی زبانی کہا ہے کہ تمام شاعر جھوٹ بولتے ہیں لیکن زرتشت خود شاعر ہے۔ افلاطون کے علاوہ ہیگل، مارکس اور زمانۂ حال کے بعض مفکرین شاعری کو انسانی معاشرہ کے لئے سودمند خیال نہیں کرتے اور تو اور تالستائی نے شیکسپیر کے ڈراموں کو مخرب اخلاق قرار دیا۔ لیکن اس قسم کے اعتراضات کی تہہ میں صرف ایک مفروضہ کام کر رہا ہے اور وہ یہ کہ فن کی آزادانہ حیثیت کچھ بھی نہیں۔ یہ کسی اخلاقی و معاشرتی مقصد کو حاصل کرنے کا ایک دلنشیں ذریعہ ہے۔ برخلاف اس کے بودلیر، گوتیر، فلوبیر اور زمانۂ حال کے بیشتر دانشور فن کی قطعاً آزاد اور مطلق حیثیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک یہ کسی اخلاقی، سیاسی اور سماجی مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بلکہ مقصود بالذات ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ادب واقعی کوئی سماجی منصب رکھتا ہے؟ اسے معاشرہ کے لئے کس حد تک مفید ہونا چاہئے۔ اور کیا ادب کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس میں افادیت کا عنصر موجود ہو؟ یا بقول کروچے یہ ایک آزاد تخلیقی عمل ہے جس کا کوئی اخلاقی مقصد اور افادی پہلو نہیں۔ یہ مسئلہ اس قدر آسان نہیں کہ بیساختہ کہہ دیا جائے؛

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

سازِ سخن کو بہانہ بنانا ممکن ہے کیٹس اور سعدی کے دور میں تو ممکن ہے مناسب رہا ہو۔ لیکن آج کل اس دور میں اس کی جگہ نثر نے لے لی ہے۔ کافکا، فاکنر اور جیمس جوائس کی نثر نے نہیں بلکہ مارٹن بوبر اور سر سید کی نثر نے۔ ادب پہلا ادب ہے۔ اس کے بعد اس سے دوسرے مقاصد حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ یہ کوئی فلسفیانہ، سیاسی اور اخلاقی مشغلہ نہیں، بلکہ

بقول فیڈلر یہ کاملاً حقیقی اور مطلق آنا دذہنی عمل ہے۔ اس لئے ہم فنکار کو یہ الزام نہیں دے سکتے کہ اس نے معاشرہ کی صحت و بقا کے لئے کوئی اقدام نہیں کیا۔ انسان کی حیثیت سے تو ہم اس سے اس کا محاسبہ کر سکتے ہیں کہ اس نے اپنی سماجی ذمہ داری کو پورا نہیں کیا لیکن اس کی فنکارانہ حیثیت سے ہم اس قسم کا کوئی مطالبہ یا محاسبہ نہیں کر سکتے۔ اس امر پر سارتر جیسا مقصد پرست بھی متفق ہے۔ اس کے نزدیک ہم کسی شاعر کو اس وجہ سے بُرا بھلا نہیں کہہ سکتے کہ وہ ایک شاعر کی حیثیت سے اپنی انسانی ذمہ داری کو پورا نہیں کرتا۔ ہم اسے زیادہ سے زیادہ یہ الزام دے سکتے ہیں کہ وہ محض شاعر ہے اور اسے اپنی سماجی ذمہ داری کا ایک انسان ہونے کی حیثیت سے کوئی احساس نہیں لیکن ہمیں اس سے اس قسم کا محاسبہ کرنے کا حق حاصل نہیں کہ اس نے شاعر ہونے کی حیثیت سے سماجی معاملہ میں عملی حصہ کیوں نہیں لیا یا کسی تعمیری تحریک میں کیوں شامل نہیں ہوا۔ ایک اچھا شاعر ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ایک پاک باز انسان اور ایک اچھا معلمِ اخلاق بھی ہو۔ بائرن اور بودلیر کی بداعمالیوں نے ان کی ذات کو یقیناً نقصان پہنچایا لیکن ان کا فن آج بھی عظیم ہے۔ ہم غالب کے اس شعر کو اس لئے ناپسند نہیں کر سکتے کہ وہ جوا کھیلتے تھے اور شراب پیتے تھے:

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

کیونکہ شاعری بقول ہائیڈگر عمل کی سنجیدگی سے احتراز کرتی ہے۔ یہاں ہم فیصلے نہیں کرتے جن سے جرم یا گناہ پیدا ہو۔ یہ آزادانہ طور پر اپنے تخیلات کی دنیا خود تخلیق کرتی ہے۔ اور اپنی خیالی دنیا ہی میں مستغرق رہتی ہے۔ شاعری خواب کی مانند ہے، حقیقت نہیں۔ یہ لفظوں کا کھیل ہے۔ عمل کی سنجیدگی نہیں۔ یہ اپنی ناامیدی کو سیاہ بادل بنا دیتا ہے جس طرح پہاڑ کے ساتھ وادی لگی رہتی ہے اسی طرح شاعری کے ساتھ کھیل۔ جو اس لئے معصومانہ ہوتا ہے کہ یہ کھیل محض گفتگو ہوتا ہے اور محض گفتگو سے زیادہ بے ضرر اور کیا چیز ہو سکتی ہے۔ یہ منتشر و بے معنی کائنات میں نظم و معنی کی روح پھونکتا ہے۔ یہ اشیاء کو ثبات بخشنے کا عمل ہے بقول ہولڈرلن جسے باقی رہنا چاہئے وہ ایک فرض اور خدمت کے طور پر شاعروں کے حوالہ کر دیا گیا ہے۔ جسے یٹیس نے اس طرح کہا ہے:

"اس تغیر پذیر دنیا میں الفاظ ہی حقیقی عطیات ہیں۔"

ادب اور شاعری کا میدان چونکہ زبان ہے اس لئے پورے ادب کو ہم زبان کے جوہر کو سمجھنے کے بعد ہی سمجھ سکتے ہیں۔ زبان متعلق پاژاں کہتا ہے۔ "میرے چاروں طرف زبان ہے"۔ یہی بات وٹگنسٹائن نے کہی ہے۔ وہ کہتا ہے زبان کے حدود میری دنیا کے حدود ہیں۔ گویا بقول ہائیڈگر جہاں زبان ہے وہیں ہماری دنیا انسانی دنیا عبارت ہے۔ زبان کی دنیا سے۔ اگر زبان نہ ہو تو ہمارے لئے دنیا نہ ہو۔ یعنی کچھ بھی نہ ہو۔ ہر چیز نام[1] پا لینے کے بعد اشیاء کے حلقہ سے نکل کر انسانی شعور و واقفیت کے دائرہ میں آجاتی ہے اس طرح اشیاء قلب ماہیت کے بعد الفاظ میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ تمام اشیاء مصروفِ پیکار رہیں لیکن انسانی وجود میں داخل ہونے کے بعد اشیاء نہیں ٹکراتیں، بلکہ الفاظ ٹکرانے لگتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو زبان فطرت کا سب سے خطرناک عطیہ ہے جو انسان کو دیا گیا ہے۔ بقول ہائیڈگر زمین سے انسان کی وابستگی اس حقیقت پر مشتمل ہے کہ وہ جملہ اشیا میں وارث و آگہی کوش ہے۔ یہ تمام اشیاء مصروف پیکار رہیں۔ لیکن جو چیز اشیاء کو تصادم سے دور رکھتی ہے اور ان کو ایک سلسلہ میں جوڑ دیتی ہے اسے ہولڈرلن نے "قربت" کے نام سے پکارا ہے۔ اس "قربت" سے وابستگی کا اقرار ایک دنیا کی تخلیق اور اس کے عروج سے اور اسی طرح ایک دنیا کی تباہ کاری و زوال سے ہوتا ہے اور یہ سب کچھ زبان کے رشتے سے ہوتا ہے۔ حقیقت کو تباہ کر دینے کے بعد فنکار کے پاس کیا باقی رہ جاتا ہے۔ یہ صرف زبان ہے جو اس کے پاس باقی رہ جاتی ہے۔ گویا الفاظ یعنی حقیقت کی منقلب شکلیں۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں بقول شیکسپیئر شاعر کائنات کے سامنے آئینہ رکھ دیتا ہے اور بقول سارتر جب ہم اس آئینہ میں "کود" پڑتے ہیں تو ہر چیز بدلی ہوئی پاتے ہیں۔ ہر چیز بات کرنے لگتی ہے۔ فطرت کے بے معنی نغمے

---

[1] قرآن مجید میں پہلے ہی یہ کہا گیا ہے کہ "وعلّم آدم الاسماء" اسی بناء پر ہمارے یہاں "حروفیوں" کا ایک مستقل فرقہ رہا ہے۔ مرزا بیدل نے بھی مت جھگی حروف کے متعلق اسی قسم کا تصور پیش کیا تھا۔ مرنقش ہائے رنگ رنگ (ڈاکٹر ابواللیث صدیقی) "ماہِ نو" نومبر ۱۹۵۵ء) ادارہ
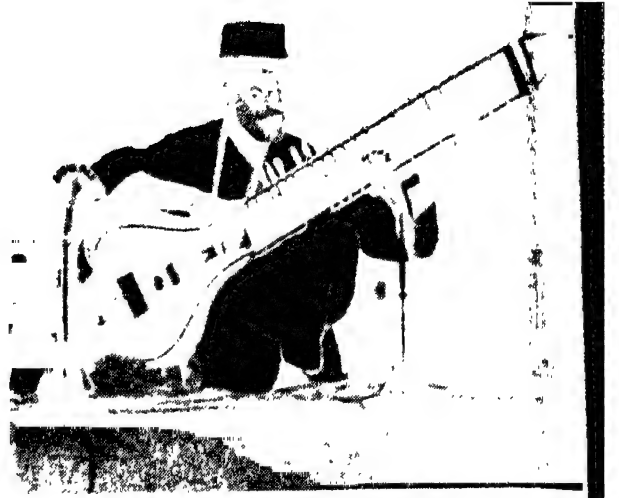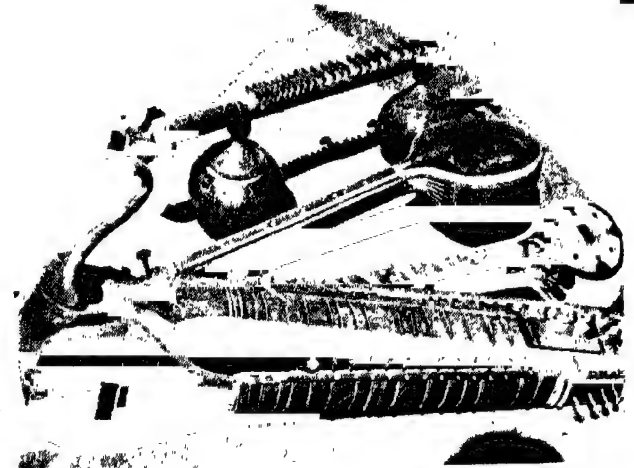
معنی پا لیتے ہیں۔ گویا زبان کائنات کے طویل اور گہرے سکوت کا ٹوٹ جانا ہے۔ جیسے پال کلے نے اس طرح کہا ہے کہ فن مرئی کی عکاسی نہیں کرتا بلکہ یہ فطرت کو مرئی بناتا ہے۔ اسی لئے شاعری کو ہائیڈگر نے INAUGRUL NAMING کہہ کر پکارا۔

اس میں شک نہیں کہ علم، ادب کے مقابلے میں ہمیں کہیں زیادہ عملی فائدہ پہنچاتا ہے۔ لیکن کیا علم خود زبان کا ایک ادنیٰ مظہر اور ذیلی شاخ نہیں جس میں اشیاء اپنے جمالیاتی رشتے کھو کر ریاضیاتی رشتوں میں منسلک ہو جاتی ہیں؟ پال والیری نے بڑی کھوج اور کاوش کے بعد ریاضیات کو بھی زبان ہی کی ایک شاخ ثابت کیا ہے۔ لیکن زبان کو سب سے پہلے کون ممکن بناتا ہے۔ بقول ہائیڈگر شاعر زبان کو سب سے پہلے ممکن بناتا ہے۔ شاعری تاریخی انسانوں کی قدیم زبان ہے۔ اطالوی مفکر گمباتستا ویچو کے نزدیک بھی انسانوں کی قدیم ترین زبان شاعری ہے۔ الفاظ اپنی پہلی اور خالص شکل میں صرف شاعری میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ہم سب وہی بولتے ہیں جو شاعر بولتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ادب انسانی معاشرہ پر بڑے عمیق اثرات ڈالتا ہے۔ اگر زبان نہ ہو تو معاشرہ کا وجود بھی ناممکن ہو جائے کیونکہ بقول پروست اگر زبان نہ ہو تو دنیا کا سارا نظام ہی درہم برہم ہو جائے۔ اس لئے معاشرہ بغیر زبان کے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کیونکہ یہ اظہارِ خیال کی وحدت کی اساس پر قائم ہے۔ اور زبان شاعری یا ادب کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی۔ ناقدوں کا یہ کہنا کہ اگر دانتے نہ ہوتا تو آج اطالوی زبان نہ ہوتی' بالکل صحیح ہے۔

ادب ہمیں خالص عملی فائدہ بھی پہنچاتا ہے اور وہ ایک نوع کی مسرت ہے جو مسرت کے جملہ احساسات سے مختلف ہوتی ہے۔ ادب ہی ایک ایسی چیز ہے جو ہم کم سے کم کاوش اور مزاحمت کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسٹارٹ مل کو ورڈز ورتھ کے علاوہ اور کوئی خودکشی سے بچا نہ سکا اور ہائیڈگر نے ہولڈرلن کی منظومات کے علاوہ ساری کتابیں اپنی لائبریری سے نکال پھینکیں۔ اور نپولین شاعر ہو گیا۔ کتنے ہی گذارنے کے ناقابل لمحات گوئٹے، دانتے، شیکسپیئر اور میر و غالب کے سہارے گذار دیئے جاتے ہیں۔ آج بھی لوگ فلوبیر، تالستائی اور پروست کو پڑھ کر زندہ رہنے کے لئے توانائی حاصل کرتے ہیں۔ گو بودلیر کا یہ کہنا کہ انسان بغیر روٹی کے تو تین دن رہ سکتا ہے، بغیر شاعری کے ایک منٹ بھی نہیں، آج ہمیں کسی قدر مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ انسان فطرت کی دی ہوئی مسرتوں پر قانع نہیں ہو سکتا وہ خالص انسانی مسرت بھی چاہتا ہے جو اس کی اپنی مسرت ہو اور جس میں فطرت اس کی شریک نہ ہو۔ یہ مسرت صرف ادب بہم پہنچاتا ہے جو بقول آوسکر وائلڈ ہمیں واقعی طور پر زندہ رہنے کے ذلیل خطرات سے بچا لیتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ادب عوامل فطرت پر قابو پانے کا کوئی راستہ نہیں بتاتا۔ اس لحاظ سے طبعی شر اور انسانی بیماریں وہ انسان کی کوئی مدد نہیں کرتا۔ بقول سارتر دنیا کی حسین ترین کتاب بھی ایک بچے کو اذیت سے نہیں بچا سکتی۔ ادب زیادہ سے زیادہ سماجی برائیوں کی روک تھام کر سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ جو کام ہم غیر شعوری سطح پر کرتے ہیں۔ ادب انہیں شعور و احساس میں لاتا ہے۔ ہم بغیر ادب کے اپنے اعمال کے مثبت و منفی اثرات سے واقف نہیں ہوتے۔ جیسا کہ کارل جیسپرس نے کہا ہے: "فن ہمیں جس طرح کائنات کو دکھاتا ہے ہم اسی طرح دیکھتے ہیں" یہ اعمال کو حسن و قبح کی انتہائی شکل میں پیش کرتا ہے۔ جب فن اس قدر اثر و نفوذ کا حامل ہے۔ جس کے بغیر کائنات ہمارے سامنے غیر مرئی رہتی ہے۔ تو ادیب پر ایک زبردست ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ وہ ہمارے اعمال کے تاریک گوشوں کو ہم پر روشن کر سکتا ہے۔ اور اس طرح ہمیں خود شعوری عطا کر سکتا ہے اور اس ممکنات کی دنیا میں جبکہ ہر قدم پر انسان کو آزادانہ انتخاب سے کام لینا پڑتا ہے۔ صحیح امکانات کے انتخاب کے لئے خود شعوری بے حد اہم ہے۔ یہ ہمیں صحیح راہ کے انتخاب میں مدد کرتی ہے۔ اس طرح ادب ہمیں اس آزار سے بھی کسی حد تک بچا لیتا ہے جسے وجودیوں نے انتخاب کا کرب کہا ہے۔ اس کرب سے بچنے کا کوئی راستہ ہی نہیں کیونکہ اخلاقیات کا کوئی اصول ہمیں صحیح فیصلہ تک نہیں پہنچا سکتا۔ کیونکہ بقول سارتر پہلے اقدار موجود ہی نہیں ہیں۔ ہمیں خود اقدار کی تخلیق کرنی پڑتی ہے۔ اور یہ کام ایک حد تک ادب انجام دیتا ہے۔

جس کسی نے کہا ہے بہت درست کہا ہے کہ وہ کونسا بھوت ہے جسے فنکار حسین نہ بنا دے۔ اس میں شک نہیں کہ مذہب اور اخلاقیات

کا کوئی اصول فنکار پر یہ پابندی عاید نہیں کرسکتا کہ وہ بھوت یا شیطان کو حسین بنا کر پیش نہ کرے۔ کیونکہ تخلیقی عمل کے دوران فنکار کو نتائج سے سروکار نہیں ہوتا۔ ملٹن نے "فردوسِ گم شدہ" کی تخلیق کے دوران میں یہ نہیں سوچا تھا کہ کائنات کی منفی قوتیں مثبت قوتوں سے زیادہ حسین و دلفریب ہوگئی ہیں۔ شیطان اس کا سب سے زیادہ دلچسپ و دلفریب کردار ہے منٹو، ڈی۔ ایچ لارنس اور موپاساں کے مجرم کردار انعام لے بھاگتے ہیں۔ اور تو اور اقبال کے سامنے ملٹن کی مثال موجود تھی۔ پھر بھی یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکے[1] کہ

جس کی نومیدی سے ہو سوزِ درونِ کائنات
اس کے حق میں تقنطوا اچھا ہے یا لاتقنطو

اس لئے تالستائی کا شیکسپیر کے ڈراموں کو مخربِ اخلاق قرار دینا درست نہیں۔ کیونکہ جب ایک ادب پارہ وجود میں آجاتا ہے تو وہ کسی ایک مقصد و مطلب کا اظہار نہیں کرتا بلکہ ہر شخص اپنی صلاحیت و ذوق کے مطابق اس سے الگ مفہوم لے سکتا ہے۔ پال والیری اپنی شاہکار نظم "سمندر کے کنارے قبرستان" پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ کہ جب کوئی تصنیف شائع ہو جاتی ہے تو وہ ایک قسم کا آلہ بن جاتی ہے جسے ہر شخص اپنے انداز میں اور اپنی صلاحیتوں کے مطابق استعمال کرتا ہے۔ یہ بات یقینی نہیں کہ جس شخص نے اس کی تخلیق کی ہے وہ اس کا بہتر طور پر استعمال کرتا ہے۔ اگر وہ یہ جانتا ہے کہ اسے کیا کرنا تھا تو اس کا یہ علم اسے یہ دیکھنے سے ہمیشہ باز رکھے گا جو کچھ وہ کر چکا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ قارئین کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ مصنف کے شعوری مقصد تک پہنچ جائیں، اس لئے یہ سوال اٹھانا کہ ادب مخربِ اخلاق ہو سکتا ہے یا نہیں سرے سے غلط ہے۔ اعلیٰ ادب کبھی بھی بداخلاقی کی تعلیم نہیں دے سکتا۔ اسی لئے ایک دانشمند نے کہا تھا کہ "فن اخلاق سے زیادہ اخلاقی ہے" خود تالستائی کے فن کا وہ حصہ عظیم ہے جو کسی اخلاقی دباؤ سے مجبور ہو کر نہیں لکھا گیا۔ جیمس جوائس کا "یولیسس" جب شائع ہوا تھا تو ایک عرصۂ دراز تک اسے مخربِ اخلاق قرار دیا گیا لیکن آج اس کا شمار دنیا کے عظیم ترین ناولوں میں ہوتا ہے۔ اس لئے ادیب کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ زبان کے حدود سے باہر نکلنے کی کوشش کرے۔ اور اس کے امکانات کو وجود میں لائے۔ زیادہ سے زیادہ اور سب سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ زبان کے امکانات کو شاعر یا ادیب اپنے انتخابی عمل سے بھی وجود میں لا سکتا ہے۔ اس انتخابی عمل کے متعلق سارتر لکھتا ہے "ادب کا کام یہ ہے کہ جو کام بے سوچے سمجھے اور بے دھیانی سے کئے جاتے ہیں، اور جنہیں غالباً کبھی خاطر میں نہیں لایا جاتا انہیں وہ اس کیفیت سے نکال کر دھیان اور خارجیت کی سطح پر لائے۔ مجھے معلوم ہے کہ جب میں بولتا ہوں تو کوئی نہ کوئی تبدیلی پیدا کرتا ہوں۔ اگر منشا تبدیلی پیدا کرنا نہ ہو تو میرے لئے بولنا محال ہو جائے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ میں محض باتیں کرنے کی غرض سے باتیں کرنے لگوں۔ لیکن بات کرنے کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ کوئی تبدیلی پیدا کی جائے اور اس تبدیلی کا احساس ہے"۔ سارتر کا یہ کہنا مکمل طور پر درست نہیں۔ وہ وجودی تحلیل نفسی کی مدد سے بودلیر کی بے راہ روی کا تو محاسبہ کر سکتا ہے (جیسا کہ اس نے کیا ہے) لیکن وہ اس کے فن سے کسی قسم کا کوئی محاسبہ نہیں کر سکتا۔ وہ ادب کے سماجی منصب کو مذہب و اخلاقیات کے سماجی منصب میں ضم کر دیتا ہے۔ گو تبدیلی پیدا کرنے سے سارتر کا مقصود یہ نہیں ہے کہ پورے ادب کو "مسدسِ حالی" اور تالستائی کی اخلاقی کہانیاں بنا دیا جائے۔ بلکہ اس کی مراد یہ

---

[1] ملٹن اور اقبال کے ابلیس کے بارے میں ایک شدید مغالطہ پایا جاتا ہے۔ ملٹن نے ابلیس کو اس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کیا تھا کہ وہ بالآخر اسے حضرتِ مسیح کے سامنے نیچا دکھائے۔ وہ ابلیس برائے ابلیس اور ابلیسیت برائے ابلیسیت کا قائل نہ تھا اور اس نے ہرگز شیطان کو ایک فی نفسہٖ عظیم و اعلیٰ ہستی یا کردار کے طور پر پیش نہیں کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ ملٹن کی مکمل مطلوبہ حقیقت کو پیشِ نظر نہ رکھتے ہوئے سطح بین ناظر اسے مقصود بالذات خیال کریں۔ اسی طرح اقبال تمام تر الٰہیت کا قائل ہے اور ابلیس کو ایک حرکت پیدا کرنے والا لازمی عنصر خیال کرتا ہے۔ ابلیس اللہ کا مدمقابل نہیں بلکہ ملائکہ کا حریف ہے۔ جن میں سوزِ حیات موجود نہیں ——— (ادارہ)

ہے کہ ادیب اظہار محض پر اکتفا نہ کرے بلکہ ایک ادبی کارنامہ ایک عملی فعل کی حیثیت بھی رکھے۔ اس میں شک نہیں* کہ ادیب کو چاہئے کہ وہ اپنے ادب سے معاشرہ پر منفی اثرات نہ ڈالے جیسا کہ ہارڈی اور فانی نے کیا۔ ادب کو رجعت و یاس کی دعوت نہیں دینا چاہئے بلکہ جیسا کہ سارتر نے کہا ہے۔ آرٹ کا کام موت پر نہیں زندگی پر غور و فکر کرنا ہے۔ اگر ادب زندگی کی بقا، ارتقار پر مثبت اثرات نہیں ڈالتا تو انسانوں کے لئے اس کی کوئی عملی افادیت نہیں۔ لیکن کیا اچھا ادب** ہمیں اقدار کا ایک واضح تصور نہیں عطا کرتا۔ اچھا ادب بجائے خود انسانی ذہن پر مثبت اثرات ڈالتا ہے۔ اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ فنکار شعوری طور پر اپنے فن میں کسی غیر فنی مقصد کو شامل کرلے۔ یہی وجہ ہے کہ سارتر ایک فنکار کی حیثیت سے کافکا، جیمس جوائس اور پروست کی برابری نہیں کرتا۔ بلکہ کامیو اس سے بڑا فنکار ہے۔ اس میں بہت کم شبہ کیا جا سکتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس کی ذمہ داری سب انسانوں پر ہے۔ اور ادیب بھی چونکہ تاریخ کے عمل میں گرفتار ہے۔ اس لئے وہ اس ذمہ داری سے دامن نہیں بچا سکتا۔ جس طرح والتیر، روسو اور زولا نے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کیا۔ اگر اس کے عہد میں ناانصافی، ظلم و تشدد موجود ہو اور اگر وہ اس کے خلاف آواز نہیں اٹھاتا تو آئندہ نسلوں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اس سے سخت سے سخت محاسبہ کریں۔ لیکن اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنے فن کو اس کا ذریعہ بنائے۔ وہ اپنے فن کے ذریعہ سے انہیں روشن کر سکتا ہے۔ لیکن کسی خاص نظریہ کی تبلیغ نہیں کر سکتا کیونکہ روشن اور مرئی بنانا تو فن کی بنیادی غرض و غایت ہے۔ لیکن تبلیغ کرنا فن کا ہرگز مقصود نہیں۔ وہ معاشرہ کی بیماریوں کے لئے شفا کے نسخے نہیں لکھ سکتا۔ وہ بس انہیں روشن کر سکتا ہے۔ شعور و احساس کے عالم میں لا سکتا ہے۔ ادیب انسان دوست تو ہو سکتا ہے لیکن شراب نوشی کے خلاف پرچار کرنے والا واعظ نہیں ہو سکتا۔

اسے چاہئے کہ وہ انسانوں کو ایسی سطح پر لے آئے جہاں وہ آزاد ہوں اور جہاں انہیں جو چیزیں دکھائی جائیں انہیں وہ بدل سکیں۔ لیکن وہ واعظوں کی مانند لوگوں کو اخلاقیات کے کسی فرسودہ مجموعہ کا پابند بننے کی دعوت نہیں دے سکتا وہ فیصلے نہیں نہیں کر سکتا۔ وہ اخلاقیات کا کوئی ضابطہ نہیں تیار کر سکتا۔ ایک سچے ادیب کا کام یہ ہونا چاہئے کہ وہ ان باتوں کو روشن کر کے ہٹ جائے جو ابھی تک لاعلمی و تاریکی میں ہیں اور لوگوں کو آزادانہ انتخاب کے مرحلہ پر بالکل آزاد چھوڑ دے تاکہ وہ آزادانہ عمل پیدا کر سکیں اور عمال کی تخلیقی فعالیت کا سلسلہ نہ ٹوٹنے پائے۔ ادیب کو چاہئے کہ وہ انسانوں کی آزادی پر اثر انداز ہونے کی کوشش نہ کرے۔ اور اگر وہ انسانوں کے آزاد انتخاب پر اثر انداز ہوتا ہے تو وہ ادب تخلیق نہیں کرتا بلکہ فیصلے کرتا ہے جن سے جرم و گناہ پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح جو کچھ ہوگا اس کی ذمہ داری ادیب پر ہوگی۔ اس طرح ادب سے زیادہ خطرناک اور کوئی مشغلہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ انسان کے آزاد انتخاب کو کسی فیصلہ کا تابع کر دینا بجائے خود جرم ہے۔ اور اس طرح ادب، ادب کی حیثیت سے باقی نہیں رہتا۔ وہ مذہب کی ایک ذیلی شاخ ہو جاتا ہے اور اس کا سماجی منصب بھی مذہب کے سماجی منصب میں ضم ہو جاتا ہے۔ عظیم ادب نے ہمیشہ مذہب، فلسفہ اور اخلاقیات میں ضم ہونے کے خلاف مزاحمت کی ہے۔ اس کا الگ ایک سماجی منصب ہوتا ہے۔ مذہب ہم پر اخلاقی بندشیں عاید کرتا ہے۔ اور فلسفہ فریب حواس سے بچا لیتا ہے۔ لیکن فن ہم پر نہ تو اخلاقی بندشیں عاید کرتا ہے اور نہ مظاہر فطرت کا تجزیہ ہی کرتا ہے۔ وہ تو فطرت کی تخلیق کرتا ہے اور اس میں نظم و آہنگ کی روح پھونکتا ہے جسے ایلیٹ نے آہنگ کے لئے جد و جہد کہا ہے۔ کیونکہ فطرت منتشر و بے ربط ہے۔ ادب و فن کا بنیادی مقصد فطرت کو انتشار و بے ربطی سے بچانا ہے۔ سارتر نے کہا ہے ادیبوں کا جرم یہ ہے کہ وہ عرصہ تک فن برائے فن کے قائل رہے لیکن ادب کی بنیادی و آزادانہ حیثیت کو مجروح کرنا کیا کسی جرم و بد دیانتی سے کم ہے؟ جس طرح تاریخ فلوبیر، بودلیر اور والٹر پیٹر سے محاسبہ کر سکتی ہے اسی طرح فن بھی حالی، سارتر اور اقبال سے محاسبہ کر سکتا ہے۔

* سوال اچھے ادب کا نہیں بلکہ محض ادب کا ہے۔ کیا سوفوکلیز، امراء القیس، قاآنی اور مومن کی فاسقانہ و اوباشانہ شاعری، شاعری نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ (ادارہ)

** دونوں پر اس رائے کا اطلاق مشتبہ ہے۔ اگر فن اخلاق سے آزاد ہے تو پھر وہ اثرات سے آزاد کیوں نہیں؟ سوال تو تاثر کی ادائیگی کا ہے، خواہ وہ کچھ بھی ہو۔ صاف الفاظ میں یہ کیوں نہ تسلیم کیا جائے کہ ادب محض آرٹ ہے۔ اور اس کا مقصود کچھ بھی ہو سکتا ہے ——— (ادارہ)

اجنبی ؟

جیلانی کامران

وہ ننھی سی لڑکی، جو باغوں کی خوشبو میں ہے، اجنبی ہے
زمیں اس کے چاروں طرف اپنا چہرہ جھکائے اُسے دیکھتی ہے۔
وہ ۔ اب نرم مٹی کے پہلو سے جھانکے گی، مٹی کے چہرے
وہ مٹی کے چہرے پہ اپنا، طلوع ہونے والے دنوں کا
پتہ انگلیوں سے لکھے گی۔ وہ ہم سب پڑھیں گے!

مگر ہم نے جو کچھ پڑھا ہے وہ مطلب سے عاری ہے۔ اس نے لکھا ہے
میں اپنے وطن میں بہت دیر کے بعد لوٹی ہوں، میرا
زمیں سے جو رشتہ ہے وہ ذرّے ذرّے کا سورج سے رشتہ ہے
یعنی میں لمحوں کی جادوگری ہوں۔

مگر میں کہاں تک اُسے اتنی دوری سے دیکھوں؛
وہ مٹی کے چھاپے سے باہر نکل کر مجھے دیکھتی ہے۔
کبھی مجھ سے کہتی ہے پانی کے قطرے میں جو کچھ چھپا ہے
وہ آنسو کا قطرہ ہے۔ صحرا میں جیسے
پُرانے زمانے کے گلشن دبے ہیں!

یہ سب دیکھ کر اپنے قدموں سے کہتا ہوں ۔ تم میری قسمت ہو،
میں اس پہ لکھا ہوا نقش نامہ ہوں۔ ساحل سے ساحل
ممالک ممالک جو چرچے ہوا کی زبانی سبھی سن رہے ہیں
وہ مٹی کا نوحہ ہے۔ ننھی سی لڑکی کے ہونٹوں کا گانا ہے
میں سن رہا ہوں!

بنتِ مہتاب

انجم اعظمی

بنت مہتاب اِدھر ایک نظر دیکھ تو لے
کیا عجب ہے کہ یہ سوئی ہوئی رات
لے کے انگڑائی ابھی جاگ اٹھے

کیا ترے وصل کا امکان نہیں ہے کوئی؛
تیری سانسوں کی مہک، یہ ترے دل کی دھڑکن
یہ ترے پیار کی لذت، یہ ترے جسم کی آنچ
تیری قربت کا تصوّر ہی بڑا پیارا ہے

زلف بکھرائے ہوئے شانوں پہ اس طرح سے آ
جیسے پورب سے اٹھی ہو کوئی بدمست گھٹا
گر نہ ممکن ہو کسی طور بھی ملنا اپنا
چہرہ دکھلا تو سہی اوڑھ کے خوابوں کی رِدا

یہ وہ منزل ہے جہاں پر نہ صنم ہے نہ خدا
حرف سارے ہی غلط ہیں تری چاہت کے سوا
تو کبھی چونک اٹھے، مرے سینے میں وہ درد اٹھے!

افسانہ:

پہاڑوں کا راز

ابوسعید قریشی

گلگت کے ایک دور افتادہ ڈاک بنگلے میں مجھے عباس کی باتیں پھر یاد آگئیں۔ اس نے زندگی کو کبھی ایک قہقہے سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ بڑی سی بڑی بات کو سادگی سے کہہ جانا! پھر خود ہی ایک بھرپور قہقہے سے اس کا تعاقب کرنا اس کی طبیعت کا جزو ہے۔ ایک روز کہنے لگا یہ کائنات بھی شاید کسی کا قہقہہ ہی ہے جو فضائے بسیط میں گونج رہا ہے! لیکن اتنی خوبصورت بات کہنے کے بعد اس نے داد کا موقع بھی نہ دیا۔ اور بے تحاشہ قہقہے لگانے لگا۔

اس کی آواز پھر میرے کانوں میں گونج اٹھی۔ اور اس اداس فضا میں جہاں بے رحم پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں گویا میرے کندھوں پر رکھی ہوئی تھیں۔ اور میرا لہو سرد کئے دے رہی تھیں میرے بدن میں گرمی کی لہر دوڑ گئی۔ بوڑھے گلگتی کی آواز سے مجھے عباس کی فرمائشیں یاد آگئیں جو بانی کی روٹی سے لے کر کوٹ کی سفید پٹی تک ایک لمبی چوڑی فہرست تھی۔ اب تک صرف پٹی کا انتظام ہو سکا تھا۔ اور یہ آواز جو میں نے ابھی ابھی سنی تھی۔ اس کے مالک کی بوری میں شاید وہ سبھی چیزیں موجود تھیں۔

پستہ، چلغوزہ، زیرہ، زعفران، نافہ.....

معاً ہوا تیز ہو گئی۔ اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ایک ایک مسام میں برف کا انجکشن لگ رہا ہے۔ میں نے اپنا چغہ جسے ابھی تک میں نے کرسی کی پشت پر ڈال رکھا تھا، اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لیا۔ لیکن یہ دیکھ کر مجھے تعجب ہوا کہ بوڑھا گلگتی بس ایک صدری اور شلوار قمیص پہنے ہوئے تھا۔ یہی نہیں اس کے گریبان کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے اپنا بازو پرکار کی طرح گھماتے ہوئے کہا: یہ پہاڑ، یہ برف یہ ہوا۔ تمہیں سردی نہیں لگتی بابا؟

وہ ہنسا۔ اور اس کی آنکھوں کے کونوں سے نکلتا ہوا جھریوں کا ایک جال اس کی کنپٹیوں کی طرف پھیل گیا جیسے برف کے آئینے میں سورج کا عکس جو مجھے ابھی ابھی بوڑھے کی شکل و شباہت میں نظر آیا تھا، ٹوٹے آئینے کی تہوں سے کرن کرن بکھر گیا تھا۔

سردی! — اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ادھر ہوتی ہے، اندر! باہر نہیں ہوتی ہے پہاڑوں سے نہیں آتی — سلاجیت کھاؤ ٹھیک ہو جاؤ گے حلفیہ خالص! اس نے کچھ نہایت ہی اشتہاری قسم کی بات کہی تھی۔ لیکن مجھے عباس کی دی ہوئی فہرست سے ایک اور فرمائش کٹتی ہوئی نظر آئی۔ اس کے علاوہ گلگتی کی آواز نے مجھے پھر اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

اس کو ہم نے خود حاصل کیا ہے!....

اس نے اپنے ہاتھ میرے سامنے پھیلا دیئے۔ ان کو دیکھ کر اس کے بارے میں جو خیال میرے ذہن میں آیا تھا دور ہو گیا۔ ایسے مضبوط اور اتنے بڑے ہاتھ میں نے نہیں دیکھے تھے۔ لیکن اس کے قد قامت کے حساب سے وہ اسی کے ہاتھ تھے۔ اگر وہ چھوٹے ہوتے تو غیر فطری معلوم ہوتے۔ دراصل وہ برآمدے کے نیچے کھڑا تھا اور اس کی آمد کے وقت میں اپنے خیالات میں اسقدر محو تھا کہ یہ بھی نہ دیکھ سکا کہ اس کا قد کوئی ساڑھے چھ فٹ سے کیا کم ہو گا۔

دراصل میرا ٹرانزسٹر سیٹ خاموش ہو گیا تھا۔ مجھے رات اور وہاں رکنا تھا۔ اور یہ سوچ کر مجھے ہول آ رہا تھا میرا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں رہا جس کا میں عادی ہو چکا ہوں۔ تنہائی کے احساس نے مجھے قلقی بنا دیا۔ اور میں سوچنے لگا کہ کیا تہذیب اور بربریت کے درمیان محض ایک ٹرانزسٹر کا فاصلہ ہے۔ ایک ذرا سی رو نہ گزری تو سناٹا! اس کے ساتھ ہی خیال آیا کہ شہر کے شور سے اکتا کر

میں سنانے کی آرزو کیا کرتا ہوں لیکن اب کہ وہ سنانا مجھے میسر ہے میں شور کے لئے بے تاب ہو رہا ہوں۔ آخر مجھے چاہیے کیا؟ عین اس وقت مجھے بوڑھے گلگتی کی آواز سنائی دی تھی:

کشمش، بادام، اخروٹ، سلاجیت!....

اس کی آستینیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس کے بازوؤں اور سینے پر ننھے منے سفید گھنگھریالے بالوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ اور اسکی ٹوپی کے نیچے جیسے چاند کی بڑھیا اپنے بال کھولے بیٹھی تھی۔

اس کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی یکایک غائب ہوگئی۔ اور کنپٹیوں پر پھیلی ہوئی شعاعیں سمٹ کر اس کی آنکھوں میں اکٹھی ہوگئیں۔ کرچیاں بن گئیں جو میری روح میں چبھی جا رہی تھیں۔ میں سمجھ گیا۔

کیا دیکھ رہے ہو؟ اس نے کہا۔ اس کا لہجہ کسی نکیلی چٹان کی طرح تیز اور سخت تھا۔ اس کی آواز برفانی ہوا کی طرح میرے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی۔

شاید وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ میں اس کے لباس کا مذاق اڑا رہا ہوں۔ شاید اس کو میرا گھورنا اچھا نہیں لگا تھا۔ میں نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ میں یہ دیکھ رہا ہوں بابا کہ تمہاری صحت ماشاءاللہ کتنی اچھی ہے۔ اور ایک میں ہوں — میں نے اپنے اوپر اداس متانت طاری کر لی۔

سورج پر جو گہن سا چھا گیا تھا، ہٹ گیا۔ اس نے ایک پرزور قہقہہ لگایا اور اپنی ہتھیلی پر چٹکی لیتے ہوئے کہا! دیکھو!

دو زرد دھبوں کے درمیان ایک انگارہ سا دہکا اور دیکھتے دیکھتے پوری ہتھیلی پر پھیل گیا۔

سلاجیت، سب سلاجیت! ۔ اس نے کہا۔ اور پھر ہنسا۔ اس کے منہ میں اپنے دانت تھے لیکن میرے منہ میں؟

اور مجھے دندان ساز کے مطب کی ساری اذیت یاد آگئی۔ اور تیز ہوا کے باوجود اپنے گرد خلا کا احساس ہوا جس سے نجات حاصل کرنے کے لئے میں نے پوچھا کہ یہ چیز کیا ہوتی ہے۔ یہ سلاجیت؟

دھوپ کیا ہوتی ہے؟ اس نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا۔

میں اس کی بات سے بوکھلا گیا۔ یہ جواب تھا یا سوال؟۔

میں سوچنے لگا کہ شاید میں نے اپنے انجانے پن میں اس سے کوئی ایسا سوال کر دیا ہے جو مجھے نہیں کرنا چاہیے تھا جس کا جواب وہ نہیں دینا چاہتا۔ میں معذرت کے لئے موزوں لفظ ڈھونڈنے لگا۔ لیکن اس کی نگاہیں وقت کے پار۔ پہاڑوں سے ادھر دیکھنے لگیں۔

یہ ان پہاڑوں کا دانہ ہے۔ اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ کوہستان کے اس طرف، جدھر قطب ستارہ ہے۔ اور اُدھر جس طرف قبلہ ہے کہیں ان پہاڑوں کے پیچھے، افق کے ساتھ ساتھ ایک قوم ہوا کرتی تھی جس کے قبیلے مشرق کے صحراؤں سے لے کر مغرب کی وادیوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ چھوٹی چھوٹی ٹیڑھی آنکھیں، رخسارے ابھرے ہوئے۔ رنگ آب و ہوا کے مطابق کسی قبیلے کا سرخ کسی کا گندمی، اور کسی کا زرد لیکن غارتگری میں سب برابر۔ وہ گردوباد کی طرح اٹھتے اور ہزارہا فرسنگ تک تباہی اور بربادی پھیلاتے ہوئے چلے جاتے۔

تم نے ہمارے ان پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں دیکھی ہیں۔ وادیاں نہیں دیکھیں۔ وادیوں میں جب برفیں پگھل جاتی ہیں تو ان کے نیچے سے سرخ، زرد، سبز، سنہری اور عنابی پھول نکلتے ہیں جن کی خوشبوئیں راہگیروں کو مدہوش کر دیتی ہیں۔ ان وادیوں میں پھل ہوتے ہیں۔ سیب اور خوبانیاں جو ہاتھ کی گرمی سے پگھل جائیں۔ انگور جن کے بیج نہیں ہوتے۔ یہاں کی ریت سے سونے کے ذرے برآمد ہوتے ہیں۔ لیکن سونے کے ذروں کو ہماری عوامی کہانیوں میں شرارے اور فتنہ و فساد کا باعث کہا جاتا ہے۔ اس لئے وہ ہماری ندیوں میں پڑے جگمگاتے ہیں۔ ہماری عورتیں صرف پھولوں کے زیور پہنتی ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ جو سونے کا زیور پہنے گا قیامت کے دن اس کو وہی زیور آگ میں دہکا کر پہنا دیئے جائیں گے۔

ہاں تو ان وادیوں میں جب بہار آتی ہے تو جشن نوروز منایا جاتا ہے۔ اس روز آس پاس کی بھی وادیوں کے لوگ اس وادی کا رخ کرتے ہیں جس کو ہماری زبان میں زمرد کا پیالہ کہتے ہیں۔ اس تقریب پر قول و قرار کے قصے ہوتے ہوں۔ آپس میں پیمانِ وفا باندھے جاتے ہیں۔ چوگان اور رسہ زوری کے مقابلے ہوتے ہیں۔

جشن کا سب سے اہم دن وہ ہوتا جب حسینۂ کوہسار کا انتخاب کیا جاتا۔ مقابلوں میں اول آنے والا نوجوان اس کو سرخ

پھولوں کا تاج پیش کرتا اور وہ ہمیشہ کے لئے اس کی ہو جاتی۔ اور اس کے دوسرے چاہنے والے نوجوان کے ہاتھ پر بیعت کرتے اور وہ ایک سال کے لئے قوم کا سردار چنا جاتا۔

جب بہار آتی ہے تو ہواؤں کا رخ بدل جاتا۔ اور ان وادیوں کی خوشبوؤں کو پہاڑوں سے اُدھر دروں کے پار لے جاتی جہاں بادگرد قبیلوں کے گروہ پھیلے ہوئے تھے۔ ان خوشبوؤں میں حسینۂ کوہسار کی خوشبو بھی شامل ہوتی۔ خوشبوؤں سے درندوں کی اشتہا بیدار ہوجاتی۔ اور وہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح اِدھر کا رخ کرتے۔ اور ہر سال برفیں پگھلنے کے بعد یہاں کی فضائیں ان کی آمد سے پہلے ہی بو سے بوجھل ہو جاتیں کیونکہ اس دوران ہوائیں پھر اپنا رخ بدل لیتیں۔

یہاں کے باشندوں کو گردباد قوم کی بو سے پتہ چل جاتا کہ وہ آرہے ہیں۔ وادیاں طبل کی آواز سے گونج اٹھتیں۔ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو نیچے غاروں میں بھیج دیا جاتا۔ اور نوجوان پتھروں سے جھولیاں بھرے، لاٹھیاں لئے دروں میں اکھٹے ہو جاتے۔

یہ اس زمانہ کی بات ہے جب ہم لوگ لوہے کے استعمال سے ناواقف تھے۔ قدرت مہربان تھی۔ کھیتی باڑی کا کام بھی ہوا اور بارش ہی کرتے تھے۔ گندم، آٹے اور راشن کا جھنجھٹ نہیں تھا۔ لوگ پھل اور گوشت کھاتے تھے۔ پرندوں کا گوشت جن کی افراط کا اب بھی یہ عالم ہے کہ دوشیزائیں کھیتوں میں اپنی چتریاں پھیلا کر ہشکارا بھرتی ہیں تو خوابیدہ فضائیں بھی پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے جاگ اٹھتی ہیں اور فصلوں میں ہوا کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اور یوں پرندوں کا شکار کیا جاتا ہے۔

لیکن میں کہہ رہا تھا کہ یہاں کے باشندے گردباد درندوں کی بو پاکر گھروں سے نکل آتے اور دروں پر ڈھلوانوں اور چوٹیوں پر مورچے جما لیتے۔

اس معرکے میں ان کا سب سے اہم سب سے مقدس فریضہ، حسینۂ کوہسار کی حفاظت ہوتا۔ وہ اس جنگ کی روح رواں ہوتی۔ اس کا شوہر اس جنگ میں سب سے آگے ہوتا۔ اور وہ خود سفید گھوڑے پہ سوار، سرخ پھولوں کا تاج پہنے، چنار کی شاخ لہراتی ہوئی، مجاہدوں کا دل بڑھاتی۔ اگر کوئی درندہ اسکے قریب پہنچنے میں کامیاب ہوتا دکھائی دیتا تو وہ پتھر کے خنجر سے جو اس کی کمر میں ہوتا، اپنے دل میں اتار لیتی اور عروس بہار کا لقب پاتی۔

شاعر اس کی عفت اور بہادری کے گیت گاتے۔ اور سرما کی طویل راتوں میں مٹنے والوں کے لئے حرارت کا سامان مہیا ہوتا۔ ان دوشیزاؤں کی غیرت مندی کی کہانیاں آج بھی ہماری لوریوں کا جزو ہیں۔ اور ایسی کوئی مثال ہمیں نہیں ملتی جس میں کوئی حسینۂ کوہسار درندوں کے ہاتھ آئی ہو۔

یہ جنگ اس وقت شروع ہوتی جب سورج اس برف پوش چوٹی سے طلوع ہو رہا ہوتا۔ اور دن بھر جاری رہتی۔ اور کوہستان اور اس کی وادیاں حملہ آوروں کی چیخوں اور حسینۂ کوہسار کے محافظ مجاہدوں کے نعروں سے گونج اٹھتیں اور پہاڑوں کی ڈھلوانوں پہ برف کی سلیں لڑھکنے لگتیں۔ اور جب تک ایک فدائی بھی زندہ ہوتا کوئی درندہ حسینہ کے دامن تک کو نہ چھو سکتا چہ جائے کہ اس کے مقدس بدن کو ہاتھ لگا سکے۔

سہ پہر کو معرکہ اور تیز ہو جاتا۔ کیونکہ جیسے جیسے دن ڈھلتا حملہ آوروں کی بینائی کم ہونا شروع ہو جاتی اور وہ پیچھے ہٹنا شروع کر دیتے تاکہ دن ڈوبنے سے پہلے دروں کے اُدھر اپنی کمین گاہوں میں پہنچ جائیں۔ اور جب شام ہوتی تو پہاڑ شہیدوں کے لہو سے لالہ رنگ نظر آتے۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی لالی انہیں اور بھی بھڑکا دیتی۔

لیکن درندوں کے خون کو قبول کرنے سے یہاں کی مٹی انکار کر دیتی۔ اور وہ پھسلتا ہوا ادھر کھڈوں میں گر جاتا۔ اور ان کی لاشیں جنگلی جانوروں کی خوراک بنتیں۔

یہ ان پہاڑوں کا راز ہے جس کو یہ اَن گنت صدیوں سے آنے والی نسلوں کے لئے آہستہ آہستہ اپنی زبان میں دوہراتے ہیں۔ جب برفیں پگھلتی ہیں تو یہ راز اس تریاق کی صورت میں چٹانوں کی تہوں سے برآمد ہوتا ہے۔ شہیدوں کے خون کی حدت سے پہاڑوں کے رگوں میں سونا چاندی، لوہا اور تانبا پگھل کر سلاجیت بن جاتے ہیں!

مجھ کو محسوس ہوا کہ میں فضائی سفر کے دور سے نکل کر وقت کی تسخیر کے دور میں پہنچ چکا ہوں۔ اور وہ بوڑھا گلگتی اس داستان کا عینی شاہد ہے۔ میں نے پوچھا: تمہاری کیا عمر ہو گی بابا؟

وہ ہنسا، اور پھر اسکی نظریں پہاڑوں کی جانب اٹھ گئیں جیسے کہہ رہا ہو کہ ان پہاڑوں کی کیا عمر ہو گی!

افسانہ:

"صبحدم کوئی اگر"

محمد عمر میمن

ابھی ابھی سورج ڈوبا تھا اور ایک پگھلی پگھلی سی ارغوانی روشنی ہری بیلوں، لمبے زرد پتوں اور سوکھی ہوئی مٹی سے کھیل رہی تھی۔

اور روح کا وہ سدا مہکتا ہوا تازہ تازہ زخم۔۔۔ انہوں نے کبھی اسے چھونے کی ہمت تک نہ کی۔ ہاں، کم از کم ایک دوسرے کی موجودگی میں تو انہوں نے اسے چھونے، اسے محسوس کرنے سے احتراز کیا۔

کتنی ہی بار اس نے چاہا بھی تھا ان زخموں کو کرید دے، لیکن ہر بار بیکس لڑکی کے چہرے پر پھیلی غم انگیز دھند نے اسے باز رکھا۔ وہ کبھی بھی ایسا نہ کر سکا اور کتنی ہی بار یوں بھی ہوا، وہ احمق، پاگل سی ضدی، سرکش لڑکی، جس کے قرب میں ایک کیفیت کا احساس ہوتا، یوں بیٹھے بیٹھے از خود رفتہ سی ہو کر، ماحول سے بے خبر اس اجنبی کے خیال میں گم ہو گئی تو اس سے اتنا بھی نہ ہوا کہ وہ اسے اپنی دنیا میں ہی کھینچ لاتا، اس کو خواب سے جھنجھوڑ کر بیدار کرنے کی سکت اس میں نہ تھی!

وہ دونوں آتشدان کے نزدیک بیٹھے ہیں جس میں لکڑیاں چیخ چیخ کر راکھ ہو رہی ہیں۔ لکڑیاں تک جلتی ہیں تو اپنی چیخ سے آس پاس کے لوگوں کو اپنے درد سے آگاہ کر دیتی ہیں، لیکن اس کا دل تو اتنی خاموشی، اتنی آہستگی سے ٹوٹا ہے کہ کوئی آواز تک نہیں ہوئی۔ وہ کچھ بُن رہی ہے اور وہ اخبار کے مطالعے میں غرق ہے۔ اچانک اس نے بُننا بند کر کے دور خلاؤں میں بے مقصد گھورنا شروع کر دیا، جیسے یکلخت کوئی بھولی بسری کہانی یاد آ گئی ہو۔ وہاں، خلاؤں میں کوئی محبوب چہرا جھانک رہا ہو، کوئی محبوب چہرہ جھانک رہا ہو، کوئی محبوب چہرہ اس کی یادوں کے دریچوں میں مسکراتے ہوئے ڈولنے لگا ہو، لیکن وہ کیسے یوں مسلسل ٹکٹکی باندھے گھورے جا رہی ہے؟ کیا پھر وہی مانوس گہری رنگت کے بالوں اور سخت چمکیلی آنکھوں والا اجنبی، لوگوں کے اژدھام میں سے نکل کر یوں چپکے سے سامنے آ گیا ہے کہ اسے دیکھے بغیر چارہ ہی نہیں؟ کیا وہ اسے کبھی بھی نہ بھول سکے گی؟ نہیں، شاید نہیں۔ وہ اس کی دنیا سے کبھی روپوش نہ ہو سکے گا، کبھی بھی نہیں! وہ ان دریچوں کو بند کرنا ہی بھول گئی ہے جہاں سے اس کی یاد کے نکل آنے کا احتمال ہے، اور اب اٹھ کر انہیں بند کر دینے کی اس میں ہمت نہیں۔ ذہن میں ایک پراسرار شخصیت کا ہیولیٰ ابھر کر اب بھی ناچ رہا۔۔ہے۔

وہ۔۔۔ جو برسوں پہلے بڑی آہستگی سے دبے پاؤں، غیر محسوس طریقے پر، اس کی زندگی میں داخل ہوا تھا۔ وہ، وہ، اس کی یادوں کے ایوانوں میں چپکے سے نکل آنے سے باز نہیں رہ سکے گا۔ وہ وقت شاید کبھی بھی نہ آ سکے جب وہ دونوں اپنی دنیا میں تنہا رہ سکیں۔ یہ تیسرا آدمی پہلے ہی سے ہمیشہ وہاں موجود ہو گا۔ اپنی اسی مبہم سی مسکراہٹ کے ساتھ اور وہ، ۔۔۔ وقت کی محرابوں تلے نیم دیوانی آشفتہ سر، سرگرداں ہی رہے گی۔ وہ کبھی بھی اس کی یاد کو اپنے دامن سے نہ جھٹک سکے گی۔

اور یہ۔۔۔ جو اس کے جسم، اس کی روح، یہ بھی جانتا ہے وہ اجنبی ہے۔ یوں ہی بلا اجازت اس کے تصورات، اس کی دنیا میں گھس آیا ہے۔ لیکن وہ اسے یہ ہرگز نہیں بتائے گی، اپنی روح کا ایک حصہ، اپنی زیست کے چند لمحات وہ پہلے ہی، بہت پہلے ہی مرہونِ کر چکی ہے۔ ایک راز! وہ اس کے لئے بہت کچھ ہے، سب کچھ ہے۔۔۔ اور یہ۔۔۔!

وہ یکلخت چونک کر اپنی دنیا میں آ گئی ہے، اور اب اس کی جانب بڑی غیر یقینی کیفیت، گہرے شدید اضطراب اور شک سے دیکھ رہی ہے۔ کہیں اس نے ان سوگوار آنکھوں کی دھند کے عقب میں جھانک کر اس کا راز تو نہیں پا لیا ہے، روح کی بے کلی تو نہیں محسوس کر لی ہے؟ نہیں، وہ تو اخبار میں گم ہے۔ یکلخت وہ سر اٹھاتا ہے تو دونوں کی نظریں مل جاتی ہیں۔ وہ مسکرا دی ہے، ایک مسکراہٹ اپنے جذبات کو چھپانے کے لئے اس کے لبوں پر مچل اٹھی ہے۔ اور پھر پسندیدہ، چاہے گئے نرم پھول آپ ہی آپ مرجھا گئے ہیں۔ جھلس کر رہ گئے ہیں۔

محبوب چہرہ! وہ تو کب کا جا چکا۔ وہ کہیں بھی نہیں، اس کی وجیہہ شخصیت کے سائے دیرہوئی ڈول کر معدوم ہو چکے ہیں اور اب تو زندگی کی مہیب تنہائیاں اور بے پہول ریگ زار اس کے آگے آگے تا حدِ نگاہ منہ پھاڑے کھڑے ہیں۔

اور کتنی ہی بار یوں بھی ہوا ہے کہ اس نے سوچا ہے، شاید یہ اس کی سب سے بڑی غلطی تھی کہ اس نے اس سے شادی کی، ایک ایسی لڑکی سے جس کے تصور میں کسی اور کا پیکر ہے، پیکر جسے وہ دیوانگی کی حد تک پوجتی ہے۔ شاید وہ اسے کبھی بھی نہ بھلا سکے گی، کبھی بھی نہیں!

یہ احمق گڑیا لڑکی! آخر وہ کیوں اسے اتنی دیوانگی سے پسند کرتا ہے، اس کی یادوں کی ڈولتی چلمن تلے جو عکس ہے۔ وہ اس کا تو نہیں! اور یہ جان کر بھی کہ وہ کسی دوسرے کو اس قدر والہانہ انداز میں چاہتی ہے۔ اس نے کیوں ——؟ وہ دوسرا تو اس کے لئے سب کچھ ہے، اس کی زیست کا حاصل، اس کی روح کی تکمیل! شاید ماضی اس کے لئے کبھی نہ مرے گا۔ جب بھی تنہائیاں آئیں گی، وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان راہوں پر نکل پڑے گی۔ جو اس کی یاد سے معمور ہیں، مہک رہی ہیں۔ جب بھی ساون کی پہلی پھوار پڑے گی تو سوندھی سوندھی نم خوشبو کے ہمراہ یہ پھوار روح اور احساس پر چھائی ہوئی گرد کی تہوں کو دھو دے گی اور کچھ اس طرح کہ نیچے کے کلبلاتے ہوئے کچے پکے مہکتے تازہ زخم اوپر آجائیں گے۔ شاید وہ تمام عمر بڑی نرمی سے، خاموشی سے آہستگی اور سکون سے پوجے ہی جائے گی۔ وہ اسے آج تک والہانہ چاہتی آئی ہے۔ لیکن آج تک اپنی چاہت کو کبھی اس پر ظاہر نہیں کیا ہے۔ "بے چاری دکھیا لڑکی! میں اسے الزام کیوں دوں" شاید اس لئے کہ وہ مجبور ہے اور ایسے سوگوار لمحات میں جب درد کے قافلے اس پر اور بھی گراں ہو جاتے، وہ اسے اور بھی شدت سے چاہنے لگتا۔

کیا یہ سب کبھی سچ بھی ہو سکتا ہے؟ ہاں! یہ سب؟ —— اس کا چہرہ لاش کی طرح بے روح اور سپید پڑ گیا ہے اور دل اندر ہی اندر بڑی شدت سے کانپا ہے! اور، اور، —— مگر، وہ تو ابھی بہت کم عمر، اور خوبصورت تھا۔ اور وہ اسے بے حد چاہتی تھی، ہاں اب اسے اعتراف کر ہی لینا چاہیئے، مگر اب اس اعتراف سے کیا ہوتا ہے، بعد از وقت! اس نے بہت جلدی کی، کاش وہ لمحہ بھر اور ٹھہر جاتا۔ وقت تو اس کی پہنچ سے اتنی دور نکل گیا ہے کہ وہ تمام عمر دوڑ کر بھی اسے نہیں پا سکتی، اور راہ کی گرد بھی پر سکون ہو کر راستوں پر جم گئی ہے اس طرح کہ قدموں کے نشان تک مٹ گئے ہیں، وہ جائے بھی تو کس سمت جائے..... اس کا دل جلنے لگا، ایک خلش جس سے اس کی روح مضطرب ہو کر رہ گئی۔

اور، اور، وہ تو روئے زمین پر سب سے اہم، سب سے خوبصورت انسان تھا، بے پناہ ذہین اور پر وقار!

اور اس نے تو بڑی لاپروائی سے ایک بار شانوں کو جھٹکتے ہوئے اس سے کہا تھا جیسے صدیوں پہلے:

"مگر بتاؤ تو سہی، آخر میں تمہاری کیسے ہو سکتی ہوں، تم مجھ سے محض تین سال ہی بڑے ہو، اور پھر ہم باہم ٹھیک سے رہ بھی نہ سکیں گے، تم، تم جانتے ہو۔"

یہ سب اس نے بڑی لاپروائی سے کہا، یوں جیسے دنیا میں وہ اسے ایک حقیر کیڑے سے بھی کم، لائق اعتنا سمجھتی ہے، جیسے انسانوں کے اس سیلِ رواں میں، وہ بھی ایک انسان ہے، محض انسان اور بس! مگر اب تو اس کی زندگی میں درد کی سرحدیں بڑی دور تک پھیل چکی تھیں۔ تاحدِ نگاہ، اور چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا، دو قدم بھی تو وہ چل نہیں سکتی! اور، وہ پھول جنہیں اس نے کبھی دیوانگی کی حد تک چاہا تھا۔ اس کے سامنے سوکھے پڑے تھے، جن کی سوکھی ننگی منتشر پتیوں سے اس کے غرور، بیجا فخر اور تکبر کی لاشیں چپٹی، لپٹی پڑی تھیں۔ اور اس کی زندگی میں وہ کونسا ایسا لمحہ تھا جس میں اس نے اسے فراموش کر دیا تھا۔ جس میں اس کی روح نے شدت سے اس کی تمنا نہ کی تھی۔ وہ یاد کرتی تو تھک جاتی۔ اس نے پھر کوشش کر ڈالی۔ لیکن وہ اس شدت سے چاہے گئے، تمنا کئے گئے محبوب چہرہ کو نہ دیکھ سکی، وہ تو کب کا جا چکا تھا، اس نے بہت جلدی کی، اور اب تو چاروں طرف دبیز اندھیارا اور گہری دھند تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔

"تو میں نے کب سے اس کی پرستش شروع کی تھی؟" —— اسے یاد نہ آسکا، یہ تو جنم جنم کی بات تھی، وہ تو جیسے صدیوں سے اس کی منتظر تھی اور جب وہ آیا تو اسے اس کو پہچاننے میں شمہ برابر بھی دقت نہ ہوئی بس نسوانی غرور میں وہ اس سے دور دور رہی۔ برسوں پہلے وہ اس سے ملی تھی۔ جب زندگی علم ہی علم تھی، عشق نہ تھی۔ وہ زینہ پر کھڑی تھی اور وہ نیچے، نیلے سوٹ میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس نے کچھ کہا تو اس نے اسے گھور کر دیکھا، بڑی تمکنت اور غرور سے، اور سرک گئی۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوا؟ ہم کب ایک دوسرے کو پہچاننے لگے؟ نہیں، وہ

درمیانی کڑیوں کو نہ ملا سکی۔ اور پھر وہ جا رہا تھا، اسے چھوڑ کر، اس کے قدیم، خوبصورت شہر کو چھوڑ کر، دونوں نے ایک دوسرے کو الوداع کہی۔ وہ اپنے گھر کے پورٹیکو کی بڑی سی محراب کے نیچے یوں ہی گم سم سی کھڑی تھی، جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو، جیسے یہ سب کیسے سچ ہو سکتا ہے۔

اور پھر وہ اس سے رخصت کی اجازت چاہ رہا تھا۔ "میں اتنا ضرور کہوں گا، تم ساری عمر اپنے آئیڈیل کی تلاش میں سرگرداں رہو گی لیکن وہ ضخیم کتابوں کی جلدوں ہی میں مستور رہے، عملی دنیا میں کبھی قدم نہیں رکھتا۔ میں کچھ ایسا بُرا بھی نہیں، اب یہ اور بات ہے کہ مجھ میں انسانیت کی عظمت کی نسبت کمزوریاں زیادہ نمایاں ہیں۔ اچھا، رخصت، خدا حافظ۔"

اور پھر پورٹیکو سے گیٹ تک نیم دائرے کی شکل میں جاتی ہوئی سرخ سرخ بجری والی سڑک پر اس کے جاتے قدموں کی آہٹ بتدریج مدھم اور مدھم ہوتی گئی وہ جا رہا ہے، وہ جا رہا ہے، شاید پھر نہ آئے۔ وہ اس کا جذبۂ سپردگی! ہلکی ہلکی آرزو، ایک جھنجھوڑی ہوئی روح کی نرمی اور سکون، پہلی محبت کی پگھلتی ہوئی تب و تاب! گلابی گلابی خمیدہ ہونٹوں کے حساس کناروں پر دبی ہوئی کسمساتی ہوئی خواہشیں، اب بھی وقت ہے، اب بھی وقت، بعد میں پچھتاوے ہی پچھتاوے ―― وہ کب تک یونہی گم سم، کھوئی کھوئی سی ستون کے سہارے پورٹیکو کی بڑی سی محراب کے نیچے کھڑی رہی، پھر اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو ریت کا ہر ہر ذرہ اجنبی کے قدموں کے دباؤ کا منکر تھا جیسے ابھی چند لمحے پہلے کچھ ہوا ہی نہیں، یہاں اس سرخ بجری والے راستے سے کوئی جھنجھوڑی ہوئی بیکل روح گزری ہی نہیں ہے "شاید، وہ ہمیشہ کے لئے جا چکا ہے، اب کبھی لوٹ کر ہی نہ آئے، ممکن ہے، بہت ممکن ہے۔" یا خدا، تنہائی کا یہ کیسا احساس ہے؟ اکتاہٹ! اضمحلال جیسے ایک مسلسل انتظار ہو ایک بیزار کن تھکن، ایک مجہول سی جھنجھلاہٹ، ایک لامتناہی سستی غبار کی طرح روح پہ چھاتی جا رہی ہو۔ یہ کس غیر مرئی وجود کس بے نام ہستی کس شخصیت کا انتظار ہے؟

اس نے ہلکی سی آہ بھری، "آہ! یہ کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں، محض حماقت، نری بے وقوفی، خبط!" مگر اسے پھر بھی سکون محسوس نہ ہوا۔ اس کا دل ایک پر ہول خلا کے احساس سے جل اٹھا۔

پھر کتنی ہی مرتبہ یوں بھی ہوا، اس نے اپنی بے چین روح کو دلاسا دینے کی کوشش کی، مگر گرد کے نیچے سے وہ گدگداتا ہوا زخم سطح پر آ کر چمکنے لگا۔ تازہ بہ تازہ، ―― ہر آتے اجالے اور جلتے اندھیرے کے ساتھ اس کی گہرائی بڑھتی گئی، وہ کبھی نہ مندمل ہو سکا۔ "اوہ، مجھے یقین ہے۔ میں اسے جلد ہی بھلا دوں گی، پلک جھپکتے ہی۔" لیکن لانبی پلکیں کتنی ہی بار جھپکیں، ―― اور وقت دبے پاؤں، کتنی سرعت سے پورٹیکو کی محراب کے نیچے سے نکل گیا۔ وہ اسے آج بھی یاد ہے۔ وہ مبہم سی مسکراہٹ، وجیہ شخصیت، اس کا دل ان تیز تیز الجھی الجھی سانسوں کی میٹھی میٹھی حرارت، نرمی اور ملائمیت کو نہ بھول سکا جو جاتے وقت بڑے ہولے سے اس کے چہرے سے مس ہوئی تھیں۔ سانسیں جو اتنی قریب تھیں اس کے ―― اور پھر وہ گھونگھریالی لٹوں کے گہری رنگت والے ہالے میں گھرے ہوئے زرد چہرے میں کالی، خاموش، سوگوار نیم وا آنکھیں ―― اس کے جاتے قدموں کی بوجھل آہٹ ―― وہ انہیں کیسے بھول سکتی ہے۔ اس کی یادوں میں اجنبی کے مسکرانے کی تصویر سب سے زیادہ روشن تھی، مبہم سی مسکراہٹ! جب رخساروں میں کسی داخلی سرخوشی کے خمار اور دباؤ سے مبہم سے گڑھے پڑ جاتے ―― وہ اسے نہ بھول سکی اس کی روح اپنی تمام تر شدت سے اسے چاہے گئی۔ اور آگ ―― من مندر کے سب سے مخفی طاقچے میں اب بھی مدھم مدھم فروزاں تھی!

"اور تم، میرے دل! ہاں، تم انتہائی احمق اور بھولے بھالے ہو۔ ہو نا؟" ―― کسی کی چاہت میں مدھم مدھم جلتے ہوئے اپنے دل سے اس نے کہا۔ "دیکھو نا، محض تم جیسا ہی ایک بھولا بھالا بے وقوف دل یونہی بلا مقصد جل سکتا ہے، عقلمند تو کبھی ایسی فاش غلطیاں نہیں کرتے۔" وہ ہولے سے ہنس دی ―― پھر دیوانہ وار قہقہے لگانے لگی ڈرائنگ روم کی پوری فضا مرتعش ہو گئی مینٹل پیس پر پڑے بدھ کے مجسمے نے جو صدیوں سے اسی روائتی سوچ میں سر جھکائے پلوٹھی مارے بیٹھا تھا، بڑی ناگواری سے اسے دیکھا۔ "تم کون ہو میری خلوتوں میں مخل ہونے والی" لیکن یہ قہقہہ تو ان آنسوؤں سے بھی زیادہ غم انگیز تھا ―― "بے وقوف لڑکی! میری تنہائیوں کو کیوں مجروح کرتی ہے، دیکھ، میں تجھ جیسے مغموم لوگوں کی مکتی ہی کے لئے تو یوں مگن ہوں۔" وہ مجسمے کو دیکھ کر یکلخت سہم گئی۔

پھر کتنی بار اس نے اس کا نام کاغذ کی چھوٹی چھوٹی پرچیوں پر لکھا تھا۔ پھر انہیں ریزہ ریزہ کر کے آتشدان میں جھونک دیا تھا۔

"بہتر ہے جل ہی جاؤ" ―― آخر اس سب حماقت کا فائدہ ہی کیا ہے۔"

اور اسے خط لکھنے کی خواہش نے اسے کیسے کیسے مجبور کیا تھا ہاں ایک خط، محض ایک رسمی خط نہیں بلکہ صحیح معنوں میں خط! ایک شکست خوردہ اپنی ہی آگ میں جلتی ہوئی جھنجھوڑی ہوئی روح، کی سپردگی کا امین، ایک خط: "پیارے!" اور پھر وہ کاغذ کو چندی چندی کر دیتی۔ اگلی دفعہ وہ اسے محض اس کا نام لے کر مخاطب کرتی۔ اور آگے، "میں نے کتنی ہی بار تمہیں یاد کیا ہے، میں گن بھی نہیں سکتی"۔ لیکن اس کے باوجود — دل کی بات دل ہی میں رہ گئی، خط کبھی ختم نہ ہو سکا۔

اور جب اس کا پہلا خط ملا تو اسے اپنے دل میں ایک میٹھی سنسنی کا احساس ہوا بالکل جیسے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں قطرہ قطرہ شہد ٹپک رہا ہو۔ چہرے سے کنوارے پن کے زہد سے کوئی نرم نرم اور نسوانی دمک سی چھلکنے لگی۔ پھر خط آتے ہی گئے لیکن جواب دینا ایک مرحلہ تھا!

اور، وہ ہزاروں آدمی جن سے وہ ملتی، — ہنہ! وہ سب کے سب اس کے مقابلے میں کتنے حقیر اور گھٹیا تھے۔ وہ ہمیشہ اسے دوسروں کے مقابلے میں لا کھڑا کرتی اور پھر ایک بلند مقام پر رکھ کر اسے ہولے ہولے پوجتی — زندگی، اف زندگی! کتنی اندوہ ناک تھی "میں زندگی سے کبھی بھی مطمئن نہ ہو سکوں گی" شاید، کبھی بھی نہیں! وہ اسے نہ بھول سکی، اس وقت بھی جب وہ دوسروں کے ہمراہ ہوتی، دھند کے پیچھے سے وہی دو گہری رنگت والی آنکھیں جھانک رہی ہوتیں، ذہنی طور پر وہ ہمیشہ اس کے ساتھ تھی .... یہ کیسی وارفتگی تھی، والہانہ، کیسا جنون تھا، ناپیدا کنار؟

"اور میں تم سے محبت کا دعویٰ تو کبھی بھی نہ کروں گی، کبھی بھی نہیں، ہاں، اعتراف میں کیا رکھا ہے، میرے جذبات — وہ جو کچھ بھی ہیں مگر کھوکھلے نہیں۔ میں تم سے شاید کبھی بھی شادی نہ کر سکوں تم دوسروں کی نظروں میں کبھی بھی میرے نہ ہو سکو گے لیکن میرا دل تمہیں اچھی طرح پہچانتا ہے۔ ارے۔ اتنی سختی سے تو مجھے نہ گھورو، شکست خوردگی کا احساس دلانے والی نظروں سے، مجھے اپنی آنکھوں میں تو جھانک لینے دو! ہاں تم میرے ہو، کیا نہیں؟ میں نے وقت کی کمان کے نیچے آشفتہ سر، صدیوں تک تمہارا انتظار کیا ہے۔ پھر تم آ گئے، اور میرا یہ دور دور رہنا، سمجھتے کیوں نہیں، ہر لڑکی اپنے غرور کے سائے میں پلتی ہے اور میں تو تم سے .... پھر تم چلے گئے اور رخصت ہوتے وقت وہ تمہارا جذبۂ سپردگی، اُف ہلکی ہلکی آرزو، ایک جھنجھوڑی ہوئی روح کی نرمی اور سکون پہلی محبت کی پگھلتی ہوئی تب و تاب۔ تم اب کہاں ہو؟ کہاں ہو؟ میں پاگل تھی پاگل، خدارا لوٹ آؤ۔ میری طرف تو دیکھو، کیا تم مجھے نہ چاہتے تھے؟"

یہ وارفتگی، پاگل لڑکی، یہ کس سے باتیں کر رہی تھی — وہ کہاں ہے؟

خدا — اتنی بھری پری دنیا میں یہ کیوں اپنے کو اتنا تنہا محسوس کر رہی ہے؟ کیا بات ہے؟ اس نے کیا گم کر دیا ہے؟ اور کیا کچھ گم کر دینے کو باقی رہ گیا ہے؟ سب کچھ تو لٹ چکا ہے! اپنے بیجا غرور کے نشے میں دھت، کچلی ہوئی لاش، — وہ کیا کچھ سوچ رہی تھی۔ وہاں بیٹھے بیٹھے جہاں سامنے میز پر گلدان میں پھول یوں ہی بے ترتیبی سے پڑے تھے۔

"اور یہ عجیب غیر معلوم جگہ ہے۔ جہاں شناسا چہرے نہیں، سب اجنبی ہیں، اپنے احساس کے خاکستری سائے، جو بے مقصد ایک دوسرے کے پیچھے ڈولتے رہتے ہیں۔ ایسے مسافر، جو آوارہ بلا مقصد چکراتے پھر رہے ہیں اور منزلیں کہیں چھپی بیٹھی ہیں۔ ایک مہیب ریگ زار تاحد نگاہ پھیلا ہوا ہے۔ یہ میرا کمرہ تو نہیں، یہ میرا گھر بھی تو نہیں جس کے پورٹیکو کی محراب کے سائے میں غرور نے سب کچھ ہارا ہے، زندگی لٹائی ہے۔ اپنی ہی لاش کو روندا ہے۔ میں اپنے کمرے کی تنہا مانوس فضا میں چلی جانا چاہتی ہوں، جہاں مجھے سکون تو ملے گا۔ پھر میں تمام کواڑ بند کر کے اپنے بستر پر بیٹھوں گی اور پھر وہاں اندھیرے میں جی بھر کے روؤں گی .... میں یہاں کیسے پہنچی ہوں! یہاں تو شدت سے میرا دم گھٹ رہا ہے"۔

اور کتنی ہی بار اس نے اپنے دل سے کہا تھا دنیا کس قدر حسین ہے، خوبصورت، دل فریب، اور پھر یہی سب اس نے اس کے سامنے بھی کہہ دیا تھا۔

"اوہ، نہیں، تمہیں سخت غلط فہمی ہو گئی ہے۔ یہ اس لئے کہ ابھی تم نے اسے دیکھا تک نہیں، تم، تم، ایک منہ بند کلی ہو۔ ایک معصوم بچی ہو"۔ اور اس نے یوں جواب دیا تھا تو وہ بڑی تیز اور ادا سے بولی تھی:

"حضرت اس زعم میں نہ رہئے گا، ٹھیک ہے، آپ مجھ سے محض تین سال ہی تو بڑے ہیں"۔ تو وہ اپنی اسی مبہم سی مسکراہٹ

کیساتھ بولا تھا — "تب تو مجھے ضرور بتاؤ — تم اپنی دنیا میں کیا خوبصورتی اور کشش پاتی ہو؟"۔

"ارے — واہ یہاں تو اتنا بہت سا حسن ہے! یہاں حسین پھول ہیں، چمکتے ہوئے ستارے ہیں، اور راتیں ہیں جب چاند مدھم سروں میں سرگوشیاں کرتا ہے۔ اور تنہا خواب آور نیلے چشمے ہیں، اور بڑی ہم آہنگی سے رواں سیمیں ندیاں ہیں اور، اور، اور یہ اس لئے حسین ہے کہ تم یہاں ہو۔" اسے محسوس ہوا، اس نے یہ سب کہاں کہا تھا، یہ سب تو آج تک اس کے دل میں اظہار کے لئے تڑپ رہا ہے۔ اے کاش، اس نے یہ سب کہا ہوتا۔ وہ اسے کب ادا کر سکی ہے۔ اس نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا، وہ محض خاموشی سے اسے گھورے گئی تھی، اور وہ یوں ہی مسکراتا رہا تھا۔

"یہاں پھول کہاں ہیں، صرف خلا ہی خار ہیں، اور تم بہت ہی امید پرست ہو اور کچھ نہیں۔"

"اور تم شاید قنوطی — ہوں! ہونا!" اس نے جوابی حملہ کر دیا۔ لیکن اب اس کا وہ قنوطی کہاں تھا؟ اور وہ پیلی رنگت والا اجنبی جس کی آنکھیں بےحد چمکیلی اور گہری تھیں اور جس کے بال خشک الجھے الجھے سے تھے، بہت دیر ہوئی جا چکا تھا۔ لبوں پر امیدوں کے مدفن لئے کبھی نہ آنے کے لئے — "میں تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں اور یہ دنیا جو کبھی بہت حسین تھی اب تمہارے بغیر بےحد سونی ہو گئی ہے اب یہ بالکل بھی حسین نہیں۔ وہ پھول جنہیں دیوانگی کی حد تک میں نے چاہا تھا کب کے مرجھا گئے ہیں خدارا آ جاؤ، اور پھر میں تمہیں بتاؤں گی کہ چاہت کیا ہے"۔

اور پھر انہیں اپنی اپنی دنیاؤں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو کر الگ الگ رہنا تھا۔

"تم مجھے کتنے عزیز ہو؟ ہاں میں نے تمہارے سامنے کبھی اس کا اقرار نہیں کیا ہے۔ مگر اب میں اس کا اعتراف کئے بنا نہیں رہ سکتی۔ میں اب تمہیں اپنا ہر راز، اپنی روح کا ہر گوشہ دکھا دینا چاہتی ہوں۔ میں تمہیں اپنی زیست کا ہر ہر لمحہ دکھاؤں گی۔ ہاں، میں تمہیں یقین دلاتی ہوں ہر ہر لمحہ میری یادوں کے اہرام میں محفوظ ہے۔ صرف تم لوٹ آؤ اور میں تم پر منکشف کر دوں گی کہ تنہا تم ہی وہ تھے جسے میں آج تک پوجتی رہی ہوں۔ خدارا ماضی کو بالکل فراموش کر دو، بھول جاؤ ان یادوں کو جن میں میں نے تمہیں دکھ دیا تھا۔ تمہارے احساسات اور جذبات مجروح کئے تھے صرف اسی قدر یاد رکھو کہ میں اب تمہیں دیوانہ وار چاہتی ہوں، تم اب میری زندگی کی واحد تمنا ہو بلکہ میری زندگی ہو — ہاں مجھے اعتراف ہے"۔

اور کتنی ہی بار ہاں، اس نے اجنبی کو دکھ پہنچایا تھا، اس کے جذبات سے کھیلی تھی اس کے احساسات کو مجروح کیا تھا۔ اور وہ اجنبی — اس نے ہمیشہ، ہنستے کھیلتے بڑی خندہ پیشانی سے اس کی ستم ظریفیوں کو یوں جھیل لیا تھا، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، وہ کس قدر پاگل تھی بےوقوف لڑکی اور وہ تو اپنے غرور کا اظہار تھا۔ کیسے کیسے وہ اس سے اپنی لاپرواہی لاتعلقی کا اظہار کرتی تھی، عدم اعتماد جیسے یہ کوئی بہت ہی معمولی بات ہو، جیسے وہ انسانوں کے اس عظیم سیل رواں میں محض ایک انسان ہو اور بس! اب تو اسے یاد بھی نہ رہا تھا، اس نے ہمیشہ اپنے کو بہت زیادہ مصروف ظاہر کیا۔ جیسے اسے دوسروں سے فرصت ہی نہ تھی جو اس سے ملتی، ملتفت ہوتی اور توجہ کرتی، اس کی شخصیت، وہاں کونسا ایسا عنصر تھا جس پر ارتکاز کیا جا سکے۔ اور وہ آدمی — بڑے صبر و تحمل سے اسے محض گھورے ہی گیا۔ آخر ایک روز تو وہ اس کے جذبات پر چھا جائے گا۔ اس نے اس کی اس اوپر جو اندر بری طرح اس کا دل مسوس رہی تھی، اسے کچھ بھی نہ کہا۔ وہ بس صرف چند ثانیئے یوں دکھاوے کی مصروفیت میں اسے منہمک پا کر اسے گھورتا اور پھر دبے قدموں ان رہ گزاروں سے کترا کر نکل جاتا جہاں اس کے ملنے کا احتمال ہو۔ بس شاید دو ایک بار ہی وہ اس قدر کہہ سکا تھا،

"محسوس ہوتا ہے بڑی پرانی ملاقات ہے"۔

"ہاں" — اس نے یوں ہی لاپرواہی سے سر ہلا دیا اور سوچا۔

"یہ گہری آنکھوں والا — اُف میں کس قدر اس سے اپنا دامن بچانا چاہتی ہوں"۔ لیکن وہ یہ بھی تو جانتی تھی، وہ اسے اپنے دل کی تمام گہرائیوں کے ساتھ چاہتی ہے۔

اور پھر وہ اجنبی زمین و آسمان کے تمام فاصلے عبور کر کے اتنی دور چلا گیا کہ عقب میں قدموں کا ایک بھی نشان نہ بچا۔

وہ اپنے کام میں منہمک تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، پھر بجتی ہی گئی، حتیٰ کہ وہ بڑی بےدلی سے اٹھا اور کال رسیو کی۔ ایک پرانا دوست دوسرے سرے سے بول رہا تھا۔ اس کا چہرہ راکھ کی طرح سفید پڑ گیا۔

اس نے بھی یہ خبر سن لی ہو گی، بےچاری پاگل لڑکی! میں جانتا ہوں یہ اس کے لئے کیا معنی رکھتی ہے۔ کتنی اہم ہے اس کے لئے۔

وہ بڑے پُراضطراب، تیز قدموں سے گھر کی طرف چل پڑا
وہ ڈرائنگ روم میں ایک صوفے میں دھنسی پڑی تھی۔ ساکت، گم سم، حیران وہ کیا سوچ رہی تھی، بے قرار، اور وہ تو اس قدر خوبصورت اور جوان تھا! ایک لفافہ ماتمی سیاہ حاشیہ، اس کی گود میں۔ اس کے قدم لڑکھڑا گئے، اور میز پر گلدان میں پھول یوں ہی بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ اس کا چہرہ احساسات سے قطعی عاری، بالکل سپاٹ تھا جیسے وہ شعور اور احساس کی تمام سرحدیں عبور کر کے ایک ایسی کیفیت میں سانس لے رہی تھی جہاں محض سانسیں ہی زندگی کا احساس اور حرارت قائم رکھتی ہیں۔ اس کی آنکھیں بہت بوجھل لیکن خشک تھیں۔ وہ باوجود بڑی کوشش کے ان میں ایک سیال حرارت نہ پاسکا۔ اور سیاہ حاشیہ والا لفافہ۔ مرجھائے ہوئے پھول، یاخدا! یہ روتی کیوں نہیں، وہ اس پہ تقریباً جھک گیا۔

"یہ میں ہوں میں، تم مجھے پہچانتی کیوں نہیں۔ اور تم جانتی ہو، وہ اب — تمہیں بھول کر۔ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔
"کون" وہ بمشکل اتنا کہہ سکی۔ اس کی بات اس کے دل میں بھالے کی طرح دور تک پیوست ہو گئی۔
"بھولی پگلی — وہ، جسے تم —"
کوئی چیز اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی۔ وہ لرزہ براندام ہو گئی، چہرے پر گھبراہٹ اور خوف کے اثرات امڈ آئے اور آنسو، آنسو قطار اندر قطار بہہ نکلے۔

اس نے دھیمے سے اپنا بازو اس کے شانوں پر رکھ دیا۔ وہ سسکیاں لے رہی تھی، اس کا پورا جسم خزاں کی تند و تیز ہواؤں میں چکراتے آوارہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ سیاہ حاشیہ والا لفافہ اس کی گود سے لڑھک کر قالین پر جا پڑا وہ — اتنا حسین، اتنا ذہین، اتنا کم عمر۔ اس نے تو اسے خدا حافظ بھی نہ کہا، ایک ٹوٹا ہوا سا لفظ "الوداع"! اور اب وہ ہمیشہ کے لئے جا چکا ہے۔ دور بہت دور وہ اب کبھی نہیں لوٹے گا۔ دھند کے پیچھے سے دو گہری رنگت والی نگاہیں مسکرا رہی ہیں تم نے تو مجھے اپنایا تک نہیں۔ بے مانگے بے چاہے کوئی جی کر کیا کرے گا! اور وہ زندگی کے اس درد کو جس کی سرحدیں بہت دور تک پھیل گئی ہیں یونہی سینے سے لگائے سسکتی رہے گی، اس کی معیت میں بھی! زیست کے ہنگاموں میں بھی! کاش اس نے اس پر اپنی محبت ظاہر کر دی ہوتی! — اور اب تو طویل پچھتاوے ہی رہ گئے ہیں اور ایک روح — جو یوں ہی مدھم مدھم جل جل کر فنا ہو گئی۔
شام کی پگھلی پگھلی ارغوانی روشنی بھی رات کے سیاہ سناٹوں میں کھو گئی ہے!

پری کنڈ : —— بقیہ صفحہ ۴۴

قلب کی طرح مصفا ہوتا ہے۔ لوگ دور دور سے جاتے ہیں کیونکہ اس میں واقعی لوگوں کے لئے شفا ہوتی ہے۔ یہ شئے شہری ماحول میں نایاب ہے۔ مجھے خود تو استعمال کرنے کا کوئی موقع نہیں ملا مگر میں نے یہاں کے گھی کی بھی بڑی تعریف سنی ہے۔ کھالیں۔ زیرہ اور مقامی زعفران اور یہاں کی چند دستی مصنوعات الگ ہیں غرض آپ کے سامنے انتخاب کا بڑا وسیع میدان ہے اور یہاں سے آپ بہت کچھ لیجا سکتے ہیں۔ مگر سب سے عزیز شئے جو آپ یہاں سے لے کر جائیں گے وہ شاید اس رومانی جھیل کی یاد اور اس سرزمین سحر و طلسم کے رد یا ئے صادقہ ہوں گے! ٭

"ماہِ نو" کے لئے

غیر طلبیدہ مضامین

- غیر طلبیدہ مضامین نظم و نثر صرف اس حالت میں واپس کئے جائیں گے جب کہ ان کے ساتھ ڈاک کے مناسب ٹکٹ روانہ کئے گئے ہوں۔
- مسترد مضامین کے سلسلے میں غیر ضروری خط و کتابت کرنے سے ادارہ کو معذور سمجھا جائے۔
- ادارہ ڈاک میں کسی مسودے کے گم ہو جانے کا ذمہ دار نہیں۔
- مرسلہ مضامین نظم و نثر کی نقول اپنے پاس رکھئے۔

(ادارۂ "ماہِ نو" کراچی)

بنگلا افسانہ:

پھر ایک بار

عبدالغفار چودھری
مترجم: احمد سعدی

رات بھر جاگ کر بیوی سے جھگڑا کرنا، مسکلہ کی بات تو خیر ہے ہی نہیں، مگر یہ کوئی اچھی بات بھی نہیں۔ اسی لئے آخر کار کلام نے اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے کہا "اچھی بات ہے، پھر اسٹیج پر آ جاؤ۔ جو بہتر سمجھو وہ کرو، مگر مجھے زیادہ پریشان نہ کرو، اب ذرا سونے دو"

منورا نے طنزیہ لہجہ میں کہا "میں تو جب بھی بات کرتی ہوں تم پریشان ہونے لگتے ہو، اگر کوئی دوسری بیوی ہوتی"

کلام نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

منورا نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ بولی "قسمت کی بات ہے، میری قسمت ہی ایسی ہے"

ان دونوں میں جب کبھی کوئی معمولی سی جھڑپ بھی ہوتی تو منورا کی تان ہمیشہ اسی جملے پر آ کر ٹوٹتی تھی اور یہی بات کلام کے لئے ناقابلِ برداشت ہوتی تھی۔ پھر بھی وہ ہمیشہ خاموش ہی رہتا تھا۔ مگر آج وہ خاموش نہ رہ سکا۔ کروٹ بدل کر اس نے آہستگی سے کہا "میرے ساتھ شادی کر کے تم خوش نہیں ہو، یہ میں جانتا ہوں۔ لیکن یہ تمہاری قسمت کا نہیں، میرا قصور ہے۔ سچ پوچھو تو ایک طرح میں نے تم سے زبردستی شادی کی ہے، ورنہ میں کیا تمہارے لائق شوہر ہوں؟"

اس کی بات سن کر منورا کا غصہ اور بھی بڑھ گیا۔ اور جب اسے غصہ آتا تھا تو وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتی تھی۔ یہ اس کی بچپن کی عادت تھی۔ اس نے کہا "لائق ہو یا نہیں، اس بات کو کیا تم خود نہیں سمجھتے سولہ سال کی عمر میں تمہارے ساتھ میری شادی ہوئی تھی، اس وقت تو میں نے دنیا کو آنکھ بھر کر دیکھا بھی نہیں تھا، میرے دل میں پسندیدہ اور ناپسندیدہ کا کوئی احساس پیدا نہیں ہوا تھا، ورنہ ....."

اور اس سے پہلے کہ منورا اپنا آخری جملہ پورا کرتی، کلام نے اس کی بات کاٹ کر خود ہی اس کا جملہ پورا کر دیا "ورنہ آج تمہیں ایک غریب کلرک کے گھر نہ آنا پڑتا، آج تم کسی تین منزلہ عمارت میں رہتیں، تمہارا شوہر کوئی افسر ہوتا اور تم کلب کی پارٹیوں اور تھیٹر کی تقریبوں میں رنگین تتلی کی طرح اڑتی پھرتیں!"

منورا نے مزید بات بڑھانا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے ایک بار پھر ٹھنڈی سانس لی اور خاموش ہو گئی۔

باہر کہیں ٹن ٹن کا شور مچاتا ہوا فائر بریگیڈ کا انجن تیزی سے گذر گیا۔ شاید کہیں آگ لگ گئی تھی۔ رات تاریک تھی اور راستے میں بجلی کے کھمبوں پر لگے ہوئے قمقمے جیسے اس دبیز تاریکی کو دور کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یکایک ہوا کا ایک جھونکا کمرے میں آیا اور چارپائی پر تنی ہوئی مچھر دانی زور زور سے ہلنے لگی۔ ساتھ ہی دیوار پر بیٹھی ہوئی ایک چھپکلی زور سے بولی "ٹک ٹک"۔

اندھیرے میں تکیہ کے نیچے سے کلام نے ٹٹول کر دیا سلائی اور سگریٹ کا ڈبہ نکالا۔ اس کے بعد وہ جونہی سگریٹ سلگانے لگا، یکایک دبی ہوئی ایک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی: "اس قسم کی واہیات چیز پینا ہے تو باہر جاؤ۔ اس کی بو سے میرا سر چکرانے لگتا ہے"

کلام جانتا تھا کہ یہ بات سو فیصدی غلط ہے، کیونکہ شادی کے بعد اس دو سال کے عرصے میں اس نے کم از کم دو سو سگریٹ بستر پر سوتے ہوئے پھونک ڈالا ہوگا اور اب بھی جس دن کوئی جھڑپ نہیں ہوتی تھی، وہ کوئی اعتراض نہیں کرتی تھی۔

کلام زور سے ہنس پڑا "تم ابھی تک سوئی نہیں؟"

"نا"

"کیا ابھی تک غصہ میں ہو؟"

"نہیں، میں غصہ کیوں کرنے لگی۔ مگر میں تمہاری یاد رکھنے کی بلاق والی محبوبہ نہیں ہوں کہ گانا بھی گا کر آؤ گے تو کہہ دوں گی تمہارے

منہ سے خوشبو آرہی ہے۔

کلام نے شادی کے بعد ہی یہ محسوس کر لیا تھا کہ محبوبہ کی کہانی منورا کو سنا کر اس نے اچھا نہیں کیا، لیکن اب ہو بھی کیا سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آج بھی اسے یہ طنز خاموشی سے برداشت کر لینا پڑا۔ مگر منورا نے اتنے ہی پہ اکتفا نہیں کیا، وہ بولتی گئی ـــ "اگر آج میری جگہ تمہاری وہ محبوبہ ہوتی تو شاید تم زیادہ خوش رہتے، گھر میں جب تمہارے دوست آتے تو وہ چائے اور ناشتہ سے ان کی تواضع کرنے کی بجائے گھونگھٹ نکال کر کمرے میں چھپ رہتی، رات کے وقت تمہارے ہاتھ پاؤں دباتی، سر میں مالش کرتی اور ہر سال ایک بچے کا اضافہ کرتی جاتی، تمہارے لئے شاید وہی بہتر تھا، کیا کہتے ہو؟"

کلام نے محسوس کیا کہ اس کی موجودگی میں اب منورا کا خاموش رہنا ممکن تھا، اس لئے سگریٹ سلگا کر وہ بستر سے نیچے اتر آیا اور پھر دروازہ کھول کر باہر برآمدہ میں نکل آیا۔ دروازہ کھولتے ہی ٹھنڈی ہوا سے کمرہ بھر گیا۔ اس نے جلدی سے دروازہ بھیڑ دیا اور برآمدہ میں موندھا بچھا کر خاموشی کے ساتھ اس پر بیٹھ کر سگریٹ کے کش لینے لگا۔

باہر سنسناتی ہوئی ہوائیں یوں شور مچا رہی تھیں جیسے اندھیرے میں درختوں کی ڈالیوں سے اپنا سر ٹکرا کر سسکیاں بھر رہی ہوں ٹھیک اسی طرح جس طرح محبوبہ روتی تھی۔ اب محبوبہ کی صورت اس کے ذہن میں دھندلا سی گئی تھی، مگر اس کی سسکیاں اسے اب بھی یاد تھیں۔ محبوبہ جب روتی تھی تو اس کی ناک میں بلاق ہلنے لگتا تھا، وہ اپنے ہونٹ پھیلا کر آنسوؤں سے اپنا تمام چہرہ تر کر لیتی تھی اور زور زور سے سسکیاں لینے لگتی تھی۔ روتے روتے یکایک وہ اپنی زبان باہر نکالتی اور زبان کی نوک سے گالوں پر بہتے ہوئے نمکین آنسوؤں کا مزہ چکھ کر دوبارہ اسی شدت سے سسکیاں بھر کر رونے لگتی تھی۔ روتے روتے وہ اتنی بے سدھ ہو جاتی تھی کہ اس کی ناک سے پانی بہنے لگتا تھا اور اس کا تمام چہرہ اس حد تک سوج جاتا کہ اس کی حالت قابلِ رحم ہو جاتی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ کلام اسے زیادہ دنوں تک برداشت نہ کر سکا مگر اس میں نہ تو کلام کا کوئی قصور تھا اور نہ ہی محبوبہ کا۔ سارا قصور محبوبہ کے باپ کا تھا۔ اس نے یوں تو اچھی طرح دیکھ بھال کر اپنی لڑکی کے لئے شوہر کا انتخاب کیا تھا، اچھا خاندان تھا، زمین تھی، جائداد تھی اور لڑکا اسکول میں پڑھ رہا تھا، مگر کلام کے والد کی خواہش تھی کہ یہ لڑکا میٹرک پاس کرنے کے بعد پھر وہ گاؤں ہی میں رہ کر زمین، جائداد اور اپنے کاروبار کی دیکھ بھال کرے، مگر ہونے والے سسر نے کہا "نہیں، میری دس پانچ لڑکیاں تو ہیں نہیں، ایک ہی لڑکی ہے۔ داماد جج یا بیرسٹر بھلے نہ ہو۔ لیکن اسے کم از کم بی۔اے پاس ضرور ہونا چاہیئے، پڑھائی کا خرچ میں دوں گا، اس کے علاوہ بن ماں کی بچی ہے، بڑی ہی کمزور دل ہے، بات بات پر رونے لگتی ہے، ذرا اسے سمجھ بوجھ آجائے۔ اگر ابھی شادی کر دی گئی تو آپ ہی لوگوں کو تکلیف ہوگی۔"

اور پھر محبوبہ کے باپ کی خواہش کے مطابق کلام کو شہر آنا پڑا۔ مگر شہر آنے کے بعد اس کی نگاہ ہی بدل گئی۔ پہلے اسے محبوبہ کی ناک میں جھولتا ہوا بلاق اچھا معلوم ہوتا تھا اور اس کا چہرہ نگاہوں میں ابھرتے ہی اس کا دل بے چین ہو اٹھتا تھا، بہت سارے یادوں کے چراغ جل اٹھتے تھے، مگر آہستہ آہستہ یہ یادوں کے چراغ بجھتے چلے گئے اور اس کے بعد ایک دن کلام کو ایسا محسوس ہوا جیسے محبوبہ کی سسکیاں اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہیں۔ وہ خوبصورت ہے، مگر نگاہوں پر بار گزرتی ہے۔ وہ بدصورت ہرگز نہیں، مگر اس کی عادتیں بہت بری ہیں اور ان ہی دنوں اس کی زندگی میں منورا در آئی تھی۔

جہاں تک اسے یاد پڑتا تھا، وہ سیلاب زدگان کی امداد کے سلسلے میں ہونے والا ایک رنگا رنگ پروگرام دیکھنے گیا ہوا تھا۔ پروگرام شروع ہو چکا تھا، اسٹیج پر رنگین قمقمے جل رہے تھے اور مائک پر اعلان ہو رہا تھا: اب مس منورا خانم اپنا رقص پیش کریں گی۔ پھر اسٹیج کا پردہ جس پر اژدھے کی تصویر بنی ہوئی تھی، دو حصوں میں ہٹ کر اوپر اٹھ گیا اور اسٹیج پر کنول کے پھول کی شکل میں ایک لڑکی اپنی جگہ پر بالکل ساکت کھڑی نظر آئی۔ اسے دیکھ کر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی لڑکی نہ ہو بلکہ سچ مچ کنول کا پھول ہی ہو۔ اتنے میں یکایک موسیقی بجنے لگی، لڑکی نے آہستہ آہستہ کھلتے ہوئے کنول کی طرح آنکھیں کھول کر دیکھا، اس کی عمر چودہ یا پندرہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ سرخ، نیلی، سبز، زرد اور رنگین روشنیوں کے گھیرے میں کھڑی ہوئی اس لڑکی کو دیکھ کر کلام کی آنکھیں جیسے جلنے لگیں، اتنے میں عقب سے گانے کی آواز ابھرنے لگی:

"چاندنی چھٹکی ہوئی ہے
ہوا کا باغ جھک رہا ہے
ایسے میں تو مجھ سے دور نہ رہ میرے محبوب؟"

اس گیت کے ساتھ ہی ایک بار گھنگھرو چھنکا اور کنول کے پھول کی طرح غیر متحرک دوشیزہ کا جسم کتنی ہی لہریں پیدا کرتا ہوا، قوسِ قزح بکھیرتا ہوا اسٹیج پر رقص کرنے لگا۔

کلام دیر تک بڑی محویت کے عالم میں رقص دیکھتا رہا، اور رقص ختم ہونے کے بعد سب سے پہلے زور زور سے تالیاں پیٹنے لگا۔ اس کے سامنے کی سیٹ پر ایک معمر شخص بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس نے پوچھا "آپ کو رقص پسند آیا؟"

کلام کا چہرہ مسرت سے کھل اٹھا۔ اس نے کہا "بہت شاندار تھا"

معمر شخص نے ایک سگریٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ "لیجئے پیجئے"

اتنی دیر میں کلام کے حواس درست ہو چکے تھے۔ اس نے اجنبی کی اس پیش کش پر قدرے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "نہیں، نہیں، اس کی کیا ضرورت ہے"

معمر شخص ہنسا۔ "آپ سوچتے ہوں گے، یہ غریب بوڑھا شاید اپنے پیسے سے خرید کر مجھے سگریٹ پلا رہا ہے۔ ارے نہیں نہیں، یہ سگریٹ اس رنگا رنگ پروگرام پیش کرنے والوں کے پیسے کا ہے۔ میں اتنی دیر تک اندر بیٹھا ہوا تھا، پھر یکایک خیال آیا کہ ذرا چل کر لڑکی کا رقص دیکھوں، اس خیال سے آپ کے پاس آکر بیٹھ گیا، مگر آپ اسوقت رقص دیکھنے میں اس قدر محو تھے کہ آپ کو کچھ پتہ ہی نہ چلا"

اس وقت اسٹیج پر ایک سن رسیدہ عورت ٹیگور کا گیت گا رہی تھی۔ "مجھ سے ملنے تم کب آ رہے ہو؟" کلام نے بیزاری سے نظر گھما کر معمر شخص کی طرف دیکھا۔ "آپ اتنی دیر تک اسٹیج پر تھے؟ وہ کیسے؟"

معمر شخص فخریہ انداز میں ہنسا۔ "میری لڑکی رقص کرے اور میں اسٹیج پر نہ جا سکوں، یہ آپ کیا کہتے ہیں؟ صرف اسٹیج پر جانا ہی کیا میری خدمت کے لئے وہ تو والنٹیر مامور ہیں، جانتے ہیں؟"

کلام نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، اس کا تمام چہرہ پسینہ سے بھرا ہوا تھا جسم پر ایک میلا سا کوٹ تھا جو گلے تک بند تھا اور شیو بھی کافی بڑھا ہوا تھا۔

معمر شخص ہنسا۔ "سمجھا، آپ کو یقین نہیں آتا کہ منورا میری ہی لڑکی ہے۔ ٹھہرئے، فنکشن ختم ہونے دیجئے، میں اپنی لڑکی ہی سے نہیں، اس کے استاد سے بھی آپ کو ملاؤں گا۔" اتنا کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بڑے پروقار انداز میں اسٹیج کی طرف چلا گیا۔

کلام اگر چاہتا تو معمر شخص کو بڑی آسانی سے کچھ دیر اور روک سکتا تھا، مگر اس وقت اس کے ذہن میں بہت سارے رنگین پھول کھل رہے تھے۔ پروگرام ختم ہونے کے بعد وہ عقب کے دروازہ پر آ کر کھڑا ہو گیا، باہر فنکاروں کے لئے ٹیکسیاں کھڑی تھیں، انہیں میں سے کسی ایک پر بیٹھنے کے لئے منورا کا باپ جا رہا تھا کہ یکایک اس کی نظر کلام پر پڑی اور وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ بولا "اوہو، دیکھئے تو مجھ سے کتنی بڑی غلطی ہو رہی تھی، میں تو اپنا وعدہ بالکل ہی بھول گیا تھا"

کلام خفیف سا ہو کر مسکرانے لگا۔ "نہیں، کوئی بات نہیں میں بھی دراصل اسی طرف سے گھر جا رہا تھا"

معمر شخص نے اس کی بات ان سنی کرتے ہوئے آواز دی۔

"مونو، مونو!"

منورا نے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا تو معمر شخص نے کہا "ضمیر کو ساتھ لے کر ذرا ادھر تو آؤ بیٹی"

ضمیر دوسری ٹیکسی میں بیٹھ چکا تھا۔ وہ ٹیکسی سے باہر نکلا سلیقے سے سنوارے ہوئے سر کے بال، چہرے پر عورتوں جیسا میک اپ، جسم پر چست پائجامہ اور صدری، دور سے دیکھنے میں وہ بالکل لڑکیوں کی طرح دکھائی دیتا تھا، یہی منورا کا استاد تھا۔

معمر شخص نے سبھوں کا ایک دوسرے سے تعارف کرانے کے بعد ایک زوردار قہقہہ لگایا، پھر بولا "سمجھے بابا ضمیر، یہ تو اس بات کا یقین ہی کرنے کو تیار نہ تھے کہ منورا میری لڑکی ہے"

منورا نے اپنی شرمندگی چھپانے کے لئے اپنا خوبصورت چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ "جاؤ بابا تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو"

معمر شخص نے اسی طرح ہنستے ہوئے کہا "میں نے کوئی غلط بات نہیں کہی، مگر اس میں ان کا بھی کوئی قصور نہیں ہے، بدیسی فرم میں کلرکی کرنے والے کسی آدمی کی لڑکی رقص پیش کرے، اسٹیج پر اپنے فن کا مظاہرہ کرے، یہ بات تو واقعی ایسی ہے کہ یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا"

کلام نے شرمندہ ہو کر کہا۔ "لیکن میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا"

اتنے میں ضمیر نے اسے مزید پریشانی سے بچا لیا، اس نے پوچھا۔
آپ کو مونو کا رقص کیسا معلوم ہوا کلام صاحب؟
"بہت شاندار تھا"۔ بات کا موضوع بدلتے ہی کلام نے اطمینان کی سانس لی۔

"پھر کبھی ہم لوگوں کے محلے میں آئیے نا آپ کو ذرا دور پڑے گا، پھر بھی اگر آپ آئیں گے تو خوش ہوں گے۔ جاگرتی کلب کے لڑکوں نے ایک ڈرامہ اسٹیج کرنے کا انتظام کیا ہے۔ مونو اس میں ہیروئن کا رول ادا کر رہی ہے اور شاید آپ کو معلوم نہیں، مونو جتنا اچھا رقص کرتی ہے اس سے کہیں اچھی اداکاری کرتی ہے۔"

منورا نے اتنی دیر میں پہلی بار احتجاج کیا "چھی، چھی میک اپ کے ساتھ اس لباس میں سڑک پر کھڑے ہو کر تم نے یہ کیا قصہ چھیڑ دیا ہے ضمیر بھائی؟" پھر اس نے کلام سے مخاطب ہو کر کہا: "آپ ان کی باتوں کا ذرا بھی یقین نہ کیجئے گا، ذرا سی بات کو بڑھا چڑھا کر بتانا ان کی پرانی عادت ہے۔"

"اچھی بات ہے، پھر آپ خود ہی آکر دیکھ لیجئے گا" ضمیر نے کہا "میں نے حقیقت بیان کی ہے یا رنگ آمیزی کی ہے، لیجئے یہ ہے میرے کلب کا پتہ۔" ضمیر نے ایک چھپا ہوا کارڈ کلام کی طرف بڑھا دیا۔ "نرنداپل پار کر کے تھوڑی دور آگے جانے کے بعد دائیں طرف آپ کو ایک گلی ملے گی، اسی میں دو مکانوں کے بعد ہی ہم لوگوں کا کلب ہے۔"

"دیکھئے ضرور آئیے گا" منورا کے باپ نے بھی دعوت دی۔

کلام نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اس کے ساتھ ہی اس کے خیالوں کا سلسلہ منتشر ہو گیا، یادوں کی سسکیاں رک گئیں، اس نے سگریٹ کا جلتا ہوا آخری ٹکڑا پھینک دیا اور بستر پر آکر لیٹ رہا۔ اس نے جو کچھ سوچا تھا، وہ ٹھیک نکلا۔ منورا گہری نیند میں مدہوش تھی۔

اس نے دھیرے سے اسے پکارا۔ "مونو!"

منورا نے کوئی جواب نہیں دیا، کلام نے بڑے پیار سے اسکے بالوں کو سہلایا، منورا کے جسم میں ہلکی سی جنبش ہوئی، پھر وہ سو گئی۔ کلام نے دوسرا سگریٹ سلگایا۔ نہیں، آج شاید اسے نیند نہیں آئے گی، سگریٹ کی آگ اس کی ناک کے پاس چمک رہی تھی اور ہوا کے تیز جھونکے سے مچھردانی پھر ہلنے لگی تھی۔ اس نے ایک بار پھر منورا کی طرف دیکھا۔

بچی ہے۔ بالکل بچی! منورا کی عقل اب بھی کسی چھوٹی سی بچی سے زیادہ نہیں لیکن اسی منورا نے جاگرتی کلب کے اسٹیج پر کتنی شاندار اداکاری کی تھی۔ کلام تو جیسے اپنے وجود کو بھلا بیٹھا تھا۔ فراق کا اضطراب، ملاقات کی خوشی اور وصال کے حسین احساسات کو اس نے اس خوبی کے ساتھ اپنے چہرے کے تاثرات سے ظاہر کیا تھا کہ اس چھوٹی سی عمر میں ہی اس نے ایک تجربہ کار حسینہ کی طرح زندگی کے مختلف روپوں کو حقیقت کا رنگ دے دیا تھا۔

کلام اسی سلسلے میں مبارکباد دینے اس کے گھر گیا تھا اور منورا کے باپ نے اس کا پُرجوش خیر مقدم کیا تھا۔ اس کے بعد ہی کلام کی زندگی کا نیا باب شروع ہوا۔ اور ابھی چھ ماہ بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ ایک دن احمد صاحب نے اس سے پوچھا "میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں بابا، مانو گے؟"

کلام نے نیازمندانہ لہجہ میں جواب دیا "فرمائیے۔"

"مونو کے لئے مجھے ایک اچھا لڑکا تلاش کر دو جو تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہو۔ اور میری لڑکی کا ہم مزاج اور ہم خیال۔"

کلام نے حیرت سے پوچھا: "ابھی تو مونو کی عمر بہت کم ہے اس عمر میں اس کی شادی کر کے آپ اس کی زندگی برباد کرنا چاہتے ہیں۔ ابھی اسے کچھ اور تعلیم حاصل کرنے دیجئے۔"

"احمد صاحب نے غمگین مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔
"اگر وہ پڑھتی ہوتی تو پھر کوئی بات ہی نہ تھی۔ اس کی تعلیم تو پانچویں جماعت کے بعد ہی ختم ہو گئی تھی۔ آپ جو کچھ دیکھ رہے ہیں وہ محض کتابوں کے مطالعہ کی وجہ سے ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" کلام نے حیرت سے کہا۔

احمد صاحب نے اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہاں یہی بات ہے۔ شروع میں اس کی تعلیم کا خرچ میں پورا نہ کر سکا تھا لیکن اسکے بعد جب اس قابل ہوا تو پڑھنے سے اس کا دل اچاٹ ہو چکا تھا۔ وہ تعلیم چھوڑ کر گھر بیٹھ چکی تھی کہ اسی درمیان جاگرتی کلب کے کسی پروگرام میں ضمیر کی نظر اس پر پڑی اور اس نے ایک دن مجھ سے کہا۔ آپ نے کبھی مونو کے جسمانی تناسب پر غور کیا ہے چچا؟ یہ تو بہترین رقاصہ ہو سکتی ہے اور اس کی آواز اتنی پیاری اور میٹھی ہے کہ بہترین مغنیہ بن سکتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر آپ اسے گانے اور رقص کی تعلیم دلائیں۔"

پہلے تو میں اس پر رضامند نہ ہوا۔ سوچا، مسلمان گھرانے کی لڑکی ہے کہیں میری بدنامی نہ ہو۔ لیکن بعد میں غور کیا تو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ اب زمانہ بدل چکا ہے۔ پھر میرے قریب ہی جج صاحب کے مکان میں میوزک اسکول کھل گیا اور جج صاحب کی لڑکیوں نے نہ صرف باضابطہ رقص کی تعلیم حاصل کی بلکہ میوزک پروگرام میں حصہ بھی لیا۔ آخر میں نے یہ بھی فیصلہ کر لیا کہ میری جھجک بیکار ہے۔ لڑکیوں کو فن رقص اور موسیقی ضرور سیکھنا چاہیئے۔ اور پھر میں نے ضمیر کو بلا کر اس بات کی اجازت دیدی۔

ضمیر کا نام سن کر کلام کو یاد آیا کہ دو دن قبل ہی سینما میں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ایک لڑکی کو ساتھ لئے سینما ہال سے باہر نکل رہا تھا۔ اس نے لڑکی کو دیکھ کر یہ سمجھا کہ وہ ضرور منوّرا ہوگی، مگر قریب پہنچنے پر اسے معلوم ہوا یہ اس کی غلطی تھی۔ وہ منورا نہیں کوئی دوسری لڑکی تھی۔ ضمیر نے اسے دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا تھا: "مائی نیو الوِنشن، بوگرا کی للیتا بھدرا ہیں۔ جاگرتی کلب کے آئندہ پروگرام میں اپنا رقص پیش کریں گی۔ اگر موقع ملے تو ضرور آئیے گا۔"

تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد اس نے پوچھا۔ "ضمیر صاحب آجکل ادھر نہیں آتے؟"

احمد صاحب کے چہرے پر غمگین مسکراہٹ پھیل گئی ــــ "وہ فنکار ہے۔ فنکاروں کا مزاج بھونرے کی طرح ہوتا ہے، اس کی بات چھوڑ دیا۔"

سگریٹ جلتے جلتے کلام کی انگلیوں تک پہنچ گیا تھا۔ اس کو پھینکنے کے بعد اس نے سوچا، رات بہت زیادہ بیت چکی ہے۔ اب اسے سو جانا چاہیئے۔ فضول خیالوں کی دنیا میں بھٹکنے سے کوئی فائدہ نہیں، اب تو منوّرا اس کی ہو چکی ہے اور اس کے قریب ہی سوئی ہوئی ہے۔ محبوبہ اس کی زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکل چکی ہے۔ اسکے اس اقدام پر محبوبہ کے باپ نے خفا ہو کر روپیہ بھیجنا بند کر دیا تھا۔ مگر اس نے اس کی کوئی پروا نہ کی تھی، تعلیم یافتہ نوجوان کو حالات سنوارنے دیر ہی کتنی لگتی ہے۔

گہری نیند میں سوئے سوئے منوّرا یکایک زور سے ہنس پڑی۔ کلام نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے پوچھا "کیا سوچ رہے ہو؟ محبوبہ کے بارے میں؟"

کلام نے متعجب ہو کر پوچھا۔ "تم سوئی نہیں تھیں؟"

"نا" منوّرا نے جواب دیا" میں دیکھ رہی تھی تم نیند میں سوئے ہوئے آدمی کو کس طرح پیار کرتے ہو؟"

کلام مسکرایا۔ "ضمیر نے ٹھیک ہی کہا تھا، واقعی بڑی لاجواب اداکاری ہوتی ہے تمہاری۔ مجھے ذرا سا شبہ بھی نہ ہوا کہ تم جاگی ہوئی ہو۔"

منوّرا تھوڑی دیر خاموش رہی، پھر سنجیدگی سے بولی "آج میں نے ایک خواب دیکھا ہے، کیا دیکھا ہے، سنو گے؟"

"سناؤ"

"میں نے دیکھا کہ ہمارے محلے کی وہ بیوہ ہندو لڑکی کمودنی کرشن کی تصویر کے سامنے۔ نہیں میں غلط کہہ گئی۔ کرشن کی مورتی کے سامنے کھڑی ہے۔ میں نے پوچھا "یہاں کیا کر رہی ہو کمود؟" اس نے جواب دیا: دیوتا کو بھوگ دے رہی ہوں، میں نے حیرت سے پوچھا، لیکن تمہارے ہاتھ میں نہ تو تھالی ہے، نہ پھل ہے، نہ مٹھائی ہے پھر کس چیز کا بھوگ دے رہی ہو؟" اس نے جواب دیا "یہ وہ بھوگ نہیں ہے بہن۔ یہ میری محبت کا نذرانہ ہے میری جوانی کا نذرانہ۔ میں آج اپنا سب کچھ دیوتا کے قدموں پر ڈالے دے رہی ہوں۔"

کلام نے کہا "یہ تم کیا کہہ رہی ہو، کمودنے اتنی باتیں سیکھ لی ہیں؟"

منوّرا نے قدرے خفگی سے کہا "آہا، تم بھی نرے بدھو ہو۔ خواب کی باتیں بھی کہیں سچی ہوتی ہیں۔ سنو، میں نے پھر اس سے پوچھا "کمود تم تو اتنی کم عمری میں بیوہ ہوئی ہو کہ تمہارا نذرانہ قبول کرنے کے لئے ابھی بہت سے زندہ دیوتا تیار ہو جائیں گے"۔ یہ تم کیا کر رہی ہو؟ ایک پتھر کی مورتی کو اپنے جسم اور اپنی محبت کا نذرانہ پیش کر رہی ہو۔ کیا وہ اسے قبول کر سکتا ہے؟ کمود نے جواب دیا "جو قبول نہیں کرتا، اسی کے سامنے نذرانہ پیش کر کے لوگ زیادہ خوش ہوتے ہیں۔"

"پھر کیا ہوا؟" کلام نے پوچھا

"پھر؟ میری نیند ٹوٹ گئی، دیکھا کہ تم میرے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیر رہے تھے، میں نے سمجھا، شاید تم بھی مجھ سے اپنا نذرانہ وصول کرنے آئے ہو۔"

اتنا کہہ کر منوّرا نے کلام کے سینے میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ پھر دھیرے سے بولی "واقعی تم نرے بدھو ہو، اسی لئے تو تمہارے لئے میرے دل میں اتنی ممتا اور اتنی محبت ہے، ورنہ ..."

منوّرا نے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر ایک ٹھنڈی سانس لی

اور خاموش ہو گئی۔

کلام تھوڑی دیر تک اس کے بالوں میں اپنی انگلیوں سے شانہ کرتا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا" میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں منور۔ وعدہ کرو کہ سچ بتاؤ گی؟"

"بولو"

شادی کے بعد میں نے کتنی ہی مرتبہ تم سے کہا تھا کہ تم نے جو کچھ سیکھا ہے، اسے بھلا نہ دو۔ رقص اور اداکاری دونوں ہی بہت بڑے آرٹ ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے تمہیں رقص کرنے کے لئے زور نہیں دیا، لیکن اداکاری کی مشق جاری رکھنے کو برابر کہتا رہا، مگر تم نے میری بات کبھی نہ مانی، تم نے ہمیشہ خفگی سے جواب دیا' چھی چھی، گھریلو بیوی ہو کر مجھے میک اپ کر کے اسٹیج پر آنے کے لئے کہتے ہو، شرم نہیں آتی؟ لیکن آج اتنے دنوں بعد یکایک تم اسٹیج پر کیوں اترنا چاہتی ہو! تمہیں یکایک پھر اس کا شوق کیسے ہوا؟ اور صرف شوق ہی نہیں، اس کیلئے ضد پکڑ کر تم نے مجھ سے جھگڑا کیوں کیا؟"

منورا نے کلام کے چوڑے سینے میں اپنا چہرہ چھپا کر کہا "کیا بتا دوں؟"

"بتاؤ"

تھوڑی دیر تک منورا کچھ سوچتی رہی، پھر آہستگی سے بولی "سنا ہے جاگرتی کلب کے ڈرامہ میں نئی ہیروئن کام کر رہی ہے، اللیتا بعد ما، جو ضمیر کی نئی دریافت ہے، ہال میں تل دھرنے کو بھی جگہ باقی نہیں رہتی، اسی لئے ......"

یکایک منورا خاموش ہو گئی اور جب اس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا تو کلام نے دیکھا اس کے چہرے پر ایک اضطرابی لہر تھی۔

منورا مسکرائی۔ "اسی لئے صرف ایک روز کے لئے، صرف ایک رات کے لئے میں اسٹیج پر جانا چاہتی ہوں، میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ واقعی میں ضمیر سے ہار گئی ہوں یا آج بھی جیت میری ہی ہے"

کلام نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا ضمیر کے ساتھ تمہاری لڑائی ہوئی تھی؟"

منورا نے جواب دیا —— "نا"

★

ہماری موسیقی۔ بعض اہم مسائل

انور عنایت اللہ

کسی بھی ترقی یافتہ قوم کی ثقافتی زندگی میں موسیقی کو نہایت مؤثر فن قرار دیا گیا ہے۔ شاید اسی لئے فنونِ لطیفہ میں اسے سب سے اس قدر اونچا درجہ ملا ہے۔ چونکہ اس کا تعلق صرف حسِ سمع سے ہے اسلئے اسے ہمیشہ ایک دشوار اور نازک فن سمجھا گیا۔

ہماری موسیقی بڑی قدیم ہے اور اس پر مسلمان موسیقاروں کے بڑے احسانات ہیں۔ یہ ایک مسلسل عمل ہے، ایک مسلسل روایت جو ہم تک پہنچی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی ابتدا ہمارے یہاں راج درباروں میں ہوئی لیکن ساتھ ہی یہ بھی صحیح ہے کہ اس نے عوام کے درمیان، ان ہی کی آغوش میں، پرورش پائی۔ کلاسیکی موسیقی کی مشکل تکنیک اور اس کی فنی پابندیاں عوام نے آسانی سے قبول نہیں کیں۔ اس طرح ٹھمری، دادروں اور پھر غزلوں اور گیتوں کا رواج ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ عوام ہی کی آغوش میں لوک گیتوں کا ایک بہت بڑا خزانہ صدیوں سے پروان چڑھتا رہا۔ یہ ایسے گیت تھے جن میں ان کے جذبات اور احساسات تھے۔ ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کا والہانہ اظہار تھا۔ اس لئے یہ صنف ان سے بہت قریب رہی اور انہیں ہمیشہ بے حد عزیز رہی۔

برصغیر کی آزادی سے پہلے موسیقی، خاص طور پر کلاسیکی موسیقی زیادہ تر رجواڑوں اور مٹھی بھر رئیسوں کی میراث بن کر رہ گئی تھی لیکن قیام پاکستان کے بعد ہمیں پہلی بار اسے عوام تک پہنچانے اور اسے ان میں مقبول کرنے کا خیال آیا۔ اس کی بڑی معقول وجہ ہے۔ کوئی بھی فن اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا جب تک اس کی جڑیں عوام اور ان کے ماحول میں پیوست نہ ہوں۔ جب تک کوئی فن عوام میں مقبول نہیں ہوتا اس وقت تک اس کی بقا اور ترقی یقینی نہیں ہوتی۔ اسی لئے ہمارے یہاں ۱۹۴۷ء کے بعد اس سلسلے میں بعض حوصلہ افزا کوششیں ہو رہی ہیں۔

آج ہمارے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہی ہے کہ ہماری کلاسیکی موسیقی کو کس طرح عوام میں مقبول کیا جائے اور اسے کس طرح زمانے کی ناقدر شناسی کے بے رحم ہاتھوں سے محفوظ رکھا جائے۔ بدقسمتی سے دنیا کے دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کے برخلاف ہمارے یہاں موسیقی کو لکھنے کا رواج اب تک نہ ہو سکا۔ بیشتر یہ علم سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا۔ اگر کچھ لکھا بھی گیا تو صرف راگوں کا روپ سروپ۔ اس میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ پرانی کتابیں دستبردِ زمانہ سے بچ نہ سکیں۔ آج بھی وہی سماجی و قیاسی اصول کارفرما ہیں۔ امیر خسرو کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی موسیقی کے تین دفتر لکھے تھے۔ مگر آج صرف ان کا ذکر ہی باقی رہ گیا ہے۔ پچھلے پندرہ بیس برس میں ہماری موسیقی کو لکھ کر پیش کئے جانے کے سلسلے میں کئی تجاویز پیش کی جاتی رہی ہیں۔ ایک سے زیادہ ماہرین نے مغربی موسیقی کی طرز پر اسٹاف نوٹیشن کو اپنانے کی کوشش بھی کی ہے لیکن ہماری موسیقی کا مزاج کچھ ایسا ہے، اس کی باریکیاں ایسی ہیں کہ مغربی طرز کی "نوٹیشن" کا سہارا لے کر اسے نہ کامیابی سے لکھا ہی جا سکتا ہے اور نہ اس کی تمام سرتیوں اور دیگر نزاکتوں کو مکمل طور پر حوالۂ قرطاس ہی کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر تانوں کو نوٹیشن کے ذریعے پیش کرنے کا مسئلہ بہت ہی ٹیڑھا ہے۔

ظاہر ہے ان حالات میں اس مسئلہ کا واحد حل ایک ایسا طریقہ ہے جو ظاہری طور پر مغربی طرز کے اسٹاف نوٹیشن سے مشابہ ہو، اس میں اس کی تمام سہولتیں مضمر ہوں لیکن ساتھ ہی یہ ہماری موسیقی کے مزاج کے موافق ہو۔ اس میں اس کی تمام نزاکتوں کو مدغم کرنے اور کاغذ پر ان کے واضح طور سے اظہار کی پوری صلاحیت ہو۔ بعض حلقوں میں اس پر کام ہو رہا ہے۔ فی الحال یہی کہا جا سکتا ہے کہ جب تک یہ مشکل مسئلہ کامیابی سے حل نہیں ہوتا۔ اس وقت تک نہ ہماری کلاسیکی موسیقی ہی محفوظ ہو سکتی ہے اور نہ اسے عوام الناس کے علاوہ بیرونی دنیا کے شائقین تک آسانی سے پہنچایا جا سکتا ہے۔

گراموفون اور پھر ریڈیو کی ایجاد سے پہلے بڑے موسیقاروں کی آواز اور ان کے علم کی حفاظت کا مسئلہ بھی خاصا ٹیڑھا تھا لیکن اس سلسلے

میں اب حالات کافی حوصلہ افزا ہیں۔ ریڈیو نے تو ہماری موسیقی کے میدان کو وسیع سے وسیع تر کر دیا ہے اور ٹیپ ریکارڈوں کی آمد سے ہر بڑے فنکار کی آواز کو برس ہا برس تک بڑی آسانی سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ دنیا کے اکثر ترقی یافتہ ملکوں میں مقامی حکومتوں کے زیرِ اہتمام ایسے فنی ادارے کام کر رہے ہیں جن کے ذمے بڑے موسیقاروں کی آواز اور ان کی لکھی ہوئی موسیقی کی حفاظت ہے۔ ان اداروں کی مدد سے آج سے سو سال کے بعد بھی آج کے بڑے موسیقاروں کی آواز سنی جا سکتی ہے۔ نیز ان ہی کی موجودگی سے کسی بھی دور کی تخلیق شدہ موسیقی کے ضائع ہو جانے کے امکانات باقی نہیں رہتے۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں لے دے کے ریڈیو پاکستان ہی ایک ایسا ثقافتی ادارہ ہے جو اپنی بساط کے مطابق بہت سی اہم خدمات انجام دے رہا ہے۔ مثلاً یہ کہ قیامِ پاکستان کے بعد ہمارے تقریباً تمام بڑے فنکاروں کی آوازیں اور ان کا فن ریڈیو پاکستان کے پاس محفوظ ہے۔ لیکن یہ کام جس بڑے پیمانے پر جس منظم طریقے سے ہونا چاہیئے، نہیں ہو رہا ہے۔ ریڈیو پاکستان کے پاس نہ اتنے وسائل ہیں اور نہ اتنی سہولتیں، ٹیپ ریکارڈوں کو حفاظت سے رکھنے کے لئے ایسے ایئر کنڈیشنڈ کمروں کی ضرورت ہے جو گرد سے محفوظ ہوں۔ اسکے ساتھ ہی ان کی مکمل فہرست تیار کی جانی بھی ضروری ہے۔ صرف اساتذہ کے نام اور صنفِ موسیقی کے بارے میں مختصر تفصیلات سے کام نہیں چلے گا۔ باقاعدہ فہرست میں اس سے زیادہ بہت کچھ ہونا چاہیئے۔ اس قسم کا باضابطہ کام ایک ایسا ادارہ کر سکتا ہے جو نیشنل کونسل آف میوزک یا کسی اور ادارے کے تحت ہو، جس کے وسائل صرف اسی کام کے لئے وقف ہوں۔ آج پاکستان میں اس قسم کے ادارے کی بڑی شدید ضرورت ہے۔

خیال کے بولوں کا مسئلہ بھی ایسا ہے جس پر فوری توجہ ضروری ہے۔ ہمارے راگوں کے پرانے بول اکثر مشکل ہندی میں ہیں۔ بہت سوں کے بول ایسے ہیں کہ ہم ان سے محظوظ ہو ہی نہیں سکتے۔ مثلاً میاں تان سین کی ایک مشہور دھرپد ملک بھیروں کے بول ملاحظہ ہوں:

"سگھن بن چھائیو دُرم بیلی مادھو بھون
اتی پرکاش بدن بمل کُسُم رنگ لائیو"

(چاروں طرف جنگل ہرے بھرے ہیں اور مدھو بن طرح طرح کی بیلوں اور رنگین پھولوں سے روشن ہو رہا ہے) ظاہر ہے اس قسم کے بولوں کی وجہ سے ہماری کلاسیکی موسیقی کا بیشتر حصہ عوام کی سمجھ سے باہر رہتا ہے۔ چونکہ یہ بول سینہ بہ سینہ ہم تک آئے ہیں اور انہیں ہم تک پہنچانے میں ایک ایسے طبقے کا ہاتھ ہے جس کی اکثریت علم کی دولت سے محروم رہی، غالباً اسی لئے اکثر بولوں اور راگوں کے موڈ میں تضاد نظر آتا ہے۔ مثلاً راگ کا موڈ تو بے حد غمگین ہے لیکن اس کے بول یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہر طرف خوشیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس قسم کے بے معنی بولوں کی تبدیلی بے حد ضروری ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ سب سے پہلے تمام اساتذہ کے باندھے ہوئے بول جمع کئے جائیں۔ یہ دیکھا جائے کہ ان میں کس حد تک من مانی تبدیلیوں کی جھلک ملتی ہے۔ بدقسمتی سے ایسی مستند کتابیں بھی اب ناپید ہیں جن میں راگ راگنیوں اور ان کی خصوصیات، چالیں اور لکشن گیت وغیرہ درج تھے۔ ایسے پرانے لوگ بڑی تیزی سے عنقا ہو رہے ہیں جنہیں پرانے خیالوں کے پورے بول یاد ہوں۔ ان تفصیلات کی روشنی میں خیال کے مستند بول جمع کرنے کا کام اور زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ اس کے بعد ہمیں بڑی سنجیدگی سے بولوں کو عام فہم کرنے کی کوشش پر بھی غور کرنا ہے۔ جب تک ایسے بڑے شعراء، جو موسیقی سے بھی اچھی طرح واقف ہوں، یہ کام اپنے ہاتھوں میں نہیں لیتے، اس مسئلہ کا کوئی معقول حل نظر نہیں آتا۔

حال ہی میں موسیقی کی ایک اچھی اور مفید کتاب شائع ہوئی ہے۔ "راگ دریا" جس میں ایک سو ایک خیالوں کے نئے اور اچھے بول باندھے گئے ہیں۔ اس کے مصنف سید ذوالفقار علی بخاری ہیں جن کے باندھے ہوئے بول اکثر ریڈیو پر سنائی دیتے ہیں۔ بولوں کی تبدیلی کے سلسلے میں بڑے پیمانے پر یہ پہلی کوشش ہے جو کامیاب ہے۔

اور تو اور ہمارے یہاں بدقسمتی سے ایسی کوئی مستند تصنیف بھی موجود نہیں جس میں حضرت امیر خسرو سے لے کر استاد بندو خاں، روشن آرا بیگم اور نزاکت علی سلامت علی تک تمام بڑے موسیقاروں کے صحیح تفصیلی حالاتِ زندگی ہوں۔ اُن کے فن پر تنقید تو در کنار، بہت سے فنکار ایسے ہیں جن کے بارے میں کوشش کے باوجود چند سطروں سے زیادہ مواد نہیں ملتا۔ یہ نام بس ایک افسانہ کی سی حیثیت اختیار کر کے رہ گئے ہیں۔ اگر فنونِ لطیفہ سے ہماری دلچسپی کا یہی عالم رہا تو بہت ممکن ہے آج سے دس بیس سال بعد لوگوں کو یہ بھی یاد نہیں رہے گا کہ استاد قادر بخش اور استاد نذیر خاں کون تھے۔ اس سلسلے میں بڑے پیمانے پر تمام موسیقاروں کے مکمل تفصیلات

جمع کرنے کی بڑی ضرورت ہے۔

جب کبھی ہم فنِ موسیقی کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے سامنے اس کی اعلیٰ اور ارفع صورت ہوتی ہے۔ ہماری کلاسیکی موسیقی بلاشبہ فن کی اعلیٰ مثال ہے۔ اس کے ساتھ ٹریجیڈی یہ رہی ہے کہ اسے شروع ہی سے تعلیم یافتہ طبقے نے اچھوت سمجھا۔ ظاہر ہے اسے مجبوراً چند مخصوص طبقوں کی آغوش میں پناہ ملی۔ یہ وہ لوگ تھے جو تعلیم یافتہ نہیں تھے، جو راگوں کی روح کو سمجھنے کے بجائے ان کی ظاہری صورت پر جان دیتے تھے۔ گانے والوں کے مختلف گھرانوں میں اختلافات کی وجہ سے ہر موسیقار اس کوشش میں لگا رہا کہ کسی نہ کسی طرح راگوں کو ثقیل سے ثقیل تر بنا کر پیش کیا جائے۔ اس کوشش کے بعد راگوں کے بولوں اور ادائیگی کی ٹکنیک نے بتدریج ایسی شکل اختیار کر لی جو عوام کی سمجھ سے قطعی طور پر بالاتر تھی۔ گانے کو اس قدر بھیانک روپ دیا گیا کہ لوگ اس سے دور بھاگنے لگے۔ عوام کو کسی بھی راگ کی گرامر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو ایسی چیز سننے کے خواہاں تھے جو کانوں کو بھلی معلوم دے۔ بدقسمتی سے اب تک اس کی بہت کم کوشش کی گئی کہ راگوں کو ان کے اصلی روپ میں کچھ اس پیارے انداز سے پیش کیا جائے کہ عام سننے والے بھی اس سے محظوظ ہوں۔ یہ کام ریڈیو کے علاوہ ہماری فلمیں بھی بڑی کامیابی سے کر سکتی ہیں۔ اس کا ایک موثر طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ ریڈیو کے علاوہ ملک کے دیگر ثقافتی ادارے کلاسیکی موسیقی کو مقبول عام کرنے کی خاطر، اس کی پیچیدہ ٹکنیک کی وضاحت شروع کر دیں۔ مثلاً موسیقی کی تعلیم کو بڑے پیمانے پر رواج دیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ہماری یونیورسٹیاں اور دیگر تعلیمی ادارے بیش بہا خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں موسیقی کو مناسب جگہ دی جا سکتی ہے۔ خاص طور پر طالبات کے لئے موسیقی کا ایک پرچہ لازمی قرار دیا جانا چاہئے۔

پاکستان کا علاقہ صدیوں سے بڑی اعلیٰ عوامی موسیقی کا گہوارہ رہا ہے۔ یہ موسیقی ہمیشہ مقبول عام رہی ہے۔ اسی لئے یہاں کے لوک گیت عوام سے بے حد قریب ہیں۔ نت نئی طرز کی شہری موسیقی کی مقبولیت کی وجہ سے آج یہ صنف خطرہ میں پڑ گئی ہے۔ لوک موسیقی لکھی نہیں جاتی۔ یہ بھی سینہ بہ سینہ ارتقائی منزلیں طے کرتی ہے۔ اب تک اسے منظم طریقے پر جمع کرنے کی کسی نے بڑے پیمانے پر کوشش نہیں کی۔ ریڈیو پاکستان نے اس سلسلے میں بھی تھوڑا بہت کام کیا ہے۔ لیکن یہ کام ایسا ہے کہ ریڈیو کے کسی اسٹوڈیو میں بیٹھ کر کامیابی سے نہیں ہو سکتا۔ ضرورت یہ ہے کہ ثقافتی ادارے اپنے نمائندے ملک کے گوشے گوشے میں بھیجیں۔ یہ لوگ ہر علاقے کا بڑا تفصیلی دورہ کریں، گاؤں گاؤں نگری نگری پھریں، وہاں کے قدیم باشندوں سے تبادلۂ خیال کریں، مقامی لوک موسیقاروں سے ان کے مخصوص نغمے سنیں، وہیں ان کے ریکارڈ تیار کریں، ان کے بول جمع کریں اور ان عوامی گیتوں کے بارے میں جہاں تک ممکن ہو سکے مکمل تفصیلات حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ بیٹری کے سفری ہلکے ٹیپ ریکارڈوں کی ایجاد سے یہ کام بڑا آسان ہو گیا ہے۔ اس کی طرف فوری توجہ دئے جانے کی ضرورت ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ملک کی اعلیٰ موسیقی کو آج سب سے بڑا خطرہ فلمی موسیقی کی طرف سے لاحق ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ریڈیو کے بارے میں بھی اسی قسم کے خدشات کا اظہار کیا جاتا تھا۔ ہماری رائے میں کسی بھی نئے میڈیم کی ایجاد سے آرٹ کی کسی بھی صنف کو نقصان نہیں پہنچ سکتا بشرطیکہ اس میڈیم کی باگ ڈور تعلیم یافتہ لوگوں کے ہاتھوں میں ہو۔ بدقسمتی سے آج ہماری فلمی صنعت میں ایسے رجحان نظر آتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستانی فلمی موسیقار لاعلمی میں مغرب کی اندھی تقلید کو فن کی معراج سمجھ بیٹھے ہیں۔ مغربی موسیقی کے اثرات کو قبول کرنا یا اپنی موسیقی کو تجربے کے طور پر کسی حد تک غیر ملکی موسیقی کی ڈگر پر چلانے کی کوشش بری نہیں۔ لیکن ہماری فلموں میں جس قسم کی مغربی موسیقی کی نقالی ہو رہی ہے، وہ سرے سے غلط ہے۔ مثلاً "راک اینڈ رول" اور "جیز" کو مغرب میں کبھی اعلیٰ موسیقی کا رتبہ نہیں دیا گیا۔ ہمارے یہاں اسی قسم کی گھٹیا مغربی موسیقی کے چربے دھڑلے سے پیش کئے جا رہے ہیں۔ اس خطرناک رجحان کا سدباب ضروری ہے۔ اس کا ایک موثر طریقہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ فلموں کے لئے بھی ہم لوک گیتوں اور کلاسیکی موسیقی ہی کا سہارا لیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ کلاسیکی موسیقی اور لوک گیت ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں کیونکہ دونوں اصناف کی جڑیں ہمارے اپنے ماحول اور خطۂ زمین میں پیوست ہیں۔ اگر ان اصناف کو صحیح اور مقبول عام طریقہ سے پیش کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس سے عوام محظوظ نہ ہوں۔ اور پھر ہمارے سامنے ایک ایسی موسیقی کے ارتقاء کا بھی تو مسئلہ ہے جسے ہم پاکستانی موسیقی کہہ سکیں۔ یہ موسیقی کلاسیکی اور مقامی لوک موسیقی کے حسین امتزاج ہی سے پروان چڑھ سکتی ہے۔ ریڈیو ہی کی طرح ہماری فلمیں بھی اس سلسلے میں بیش بہا خدمات انجام دے سکتی ہیں۔ پچھلے چند سال میں پاکستانی

فلموں میں بعض ایسے تجربے کامیاب ہو چکے ہیں جن سے ہمارے اس بیان کو تقویت پہنچتی ہے مثلاً خورشید انور نے انتظار، زہرِ عشق، کوئل وغیرہ میں بعض بڑے کامیاب تجربے کئے۔ انہوں نے ایک سے زیادہ گانوں کی دُھنیں خالص راگ راگنیوں میں باندھیں۔ اس کے باوجود عوام میں یہ نغمے بے حد مقبول ہوئے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قصور ہماری کلاسیکی موسیقی کا نہیں بلکہ اسے پیش کرنے کے غلط طریقے کا ہے جس کی وجہ سے عوام اس سے دور ہوتے گئے۔ کلاسیکی موسیقی کو ان غلط روایتوں سے پاک کرنے کی بڑی ضرورت ہے۔

اچھی اور بُری موسیقی کو پرکھنے کے لئے اچھے ذوق کی ضرورت ہے۔ اچھا ذوق صرف اسی وقت نشو و نما پاتا ہے جب عوام کو اچھی موسیقی سننے کے زیادہ سے مواقع ملیں اور انہیں زیادہ سے زیادہ سہولتیں حاصل ہوں۔ بدقسمتی سے لے دے کے ہمارے یہاں ریڈیو اور فلم ہی ایسے دو ذریعے ہیں جو عوام کے لئے ذہنی تفریح مہیا کرتے ہیں۔ ان دونوں میں صرف ریڈیو ہی سے ہمیشہ صحت مند معقول موسیقی نشر ہوتی ہے لیکن ملک میں ریڈیو رکھنے والے لوگوں کی تعداد بڑی حوصلہ شکن ہے اور یہ امید کرنا صحیح نہ ہوگا کہ بہت جلد گھر گھر ریڈیو سیٹ ہونگے اور ملک کا بچہ بچہ ان کے ذریعے اچھی موسیقی سے لطف اندوز ہو سکے گا۔ اس صورت میں صرف فلمیں ہی باقی رہ جاتی ہیں۔ یہ ہمارے یہاں ہمیشہ تجارتی تقاضوں کے تحت پیش کی جاتی رہی ہیں۔ اس لئے یہ امید کرنا کہ ان کے ذریعے عوام کا ذوق ترقی کر سکے گا، غلط ہوگا۔ اس کا علاج یہی ہو سکتا ہے کہ حکومت کی طرف سے اس عبوری دور میں احتساب کیا جائے۔ اس کا بطور خاص خیال رکھا جائے۔ کہ گھٹیا، لچر دُھنیں اور عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے والے بول کسی طرح بھی پردہ سیمیں پر پیش نہ ہوں۔ نیز یہ کہ کسی قسم کی بھی نقالی کی مطلق اجازت نہ دی جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ حکومت اور ملک کے تمام ثقافتی اداروں کو چاہئے کہ وہ وقتاً فوقتاً ایسے جلسوں کا انتظام کریں جن میں ملک کے تمام بڑے موسیقار حصہ لیں۔ ان جلسوں کی شرح ٹکٹ اتنی کم ہو کہ معمولی سے معمولی حیثیت کا شخص بھی آسانی سے ان میں شرکت کر سکے۔ جب عوام کو اچھی اور معقول موسیقی سننے اور اس سے آسانی سے لطف اندوز ہونے کے مواقع زیادہ سے زیادہ ملنے لگیں گے تو آپ ہی آپ ان کا ذوق بہتر ہو جائے گا۔ یہ بذات خود اعلیٰ قسم کی موسیقی کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

آجکل ہمارے موسیقاروں کا طبقہ مالی طور پر خاصا پریشان نظر آتا ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے ان کی سرپرستی کے لئے رجواڑے تھے۔ لیکن آزادی کے بعد یہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں ختم ہوگئیں۔ ان کے ساتھ ہی موسیقاروں نے ان کی سرپرستی بھی کھو دی۔ ملک میں لے دے کے ریڈیو ہی رہ گیا ہے جو حتی الامکان ان کی سرپرستی کرتا ہے۔ ریڈیو کے وسائل بھی محدود ہیں۔ اس لئے ہم سب کی طرف سے موسیقاروں کی ہر ممکن طریقے سے حوصلہ افزائی ضروری ہوگئی ہے۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے پُرامن انقلاب کے بعد پہلی بار ہمارے یہاں بڑے موسیقاروں کو ان کی اعلیٰ خدمات کے لئے حکومت کی طرف سے تمغے اور انعامات دئے جانے لگے ہیں۔ یہ ایک فال نیک ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت کی طرح دوسرے ثقافتی ادارے اور اہلِ ثروت ایسے مناسب قدم اٹھائیں کہ ہمارے موسیقار مالی مشکلات سے نجات حاصل کر لیں۔ جب تک یہ نہ ہوگا اس وقت تک موسیقی کی نشو و نما مناسب طریقے پر نہ ہو سکے گی اور اس کا مستقبل غیر یقینی رہے گا۔

اس عظیم فن لطیف کی بقا کی خاطر ضروری ہے کہ ہم ان مسائل پر بڑی سنجیدگی سے غور کریں اور ان کے مناسب حل تلاش کرنے کی کوشش کریں۔

★

غزل

جعفر طاہر

خدا شناس نہ مانو نہ دادرس جانو
بڑا ستم ہے کہ تم سب کو بوالہوس جانو

حقیرِ جان کے ملیئے نہ زیر دستوں سے
کسی شرف کو نہ بالائے دسترس جانو

دوائے بے پروبالی، علاجِ تنگ دلی
چمن چمن کو مگر تم قفس قفس جانو

جیو تو ایک بھی دن ہے بہت زمانے میں
وگرنہ عمرِ مسیح و خضر عبث جانو

گزرنے لمحے کی پلکوں پہ سینکڑوں صدیاں
جہاں جہاں کو نقابِ نفس نفس جانو

سمے کے دھارے پہ ٹھہرا ہے کون ٹھہرے گا
پہاڑ جن کو سمجھتے ہو خار و خس جانو

نہیں کہ ذرے کو صحرا سمجھ کے بیٹھ رہو
نہیں کہ چاند پہ جا کر بسو تو بس جانو

قلندروں کی طرح دشتِ لامکاں میں پھرو
یہ سائبانِ فلک سایۂ مگس جانو

ترس ترس کے جو گذرے تو وہ جوانی کیا
گھٹا کی طرح نہ اٹھو نہ تم برس جانو

یہ زندگی یہ دمِ نوش و نیش کیا کہنے
مگر وہ تم کہ جو تریاک دو نہ ڈس جانو

یہاں پہ بکتے ہیں یوسف سے لوگ بھی سستے
جو قدرداں ہو کوئی ایک بھی تو دس جانو

کہاں کا ہجر کہاں کا وصال وہم و خیال
طلسمِ عذر و طلب۔ سحرِ پیش و پس جانو

وہ شخص جو تم سے بیگانہ وار ملتا ہے
فریبِ جاں کی قسم اس کو ہم نفس جانو

غبارِ دشت سے نکلے گا کارواں طاہر
مری غزل کو تو آوازۂ جرس جانو

غزل

شکیب جلالی

اس خاکداں میں ابتک باقی ہیں کچھ شرارے
دامن بچا کے گذرو یادوں کی رہگزر سے

ہر ہر قدم پہ آنکھیں تھیں فرش راہ لیکن
وہ روشنی کا ہالہ اترا نہ بام پر سے

کیوں جادۂ وفا پر مشعل بکف کھڑے ہو
اس سیلِ تیرگی میں نکلے گا کون گھر سے

کس دشت کی صدا ہو اتنا مجھے بتا دو
ہر سو بچھے ہیں رستے آؤں تو میں کدھر سے

اجڑا ہوا مکاں ہے یہ دل جہاں پہ ہر شب
پرچھائیاں لپٹ کر روتی ہیں بام و در سے

★

منزل مراد

(مغربی بازو)

سب ایک ہی منزل کے راہی
(سابق صوبۂ سرحد)

دیول تا برناں ۔ قطار اندر قطار
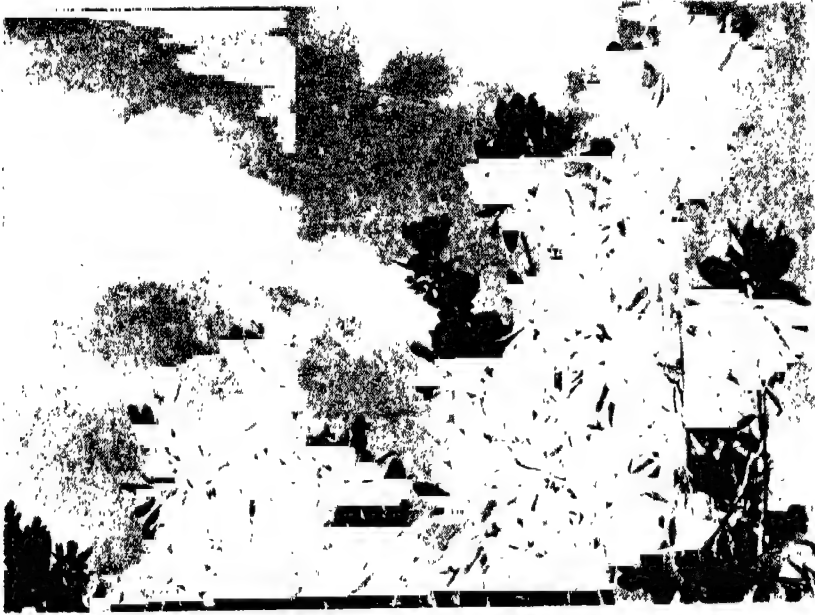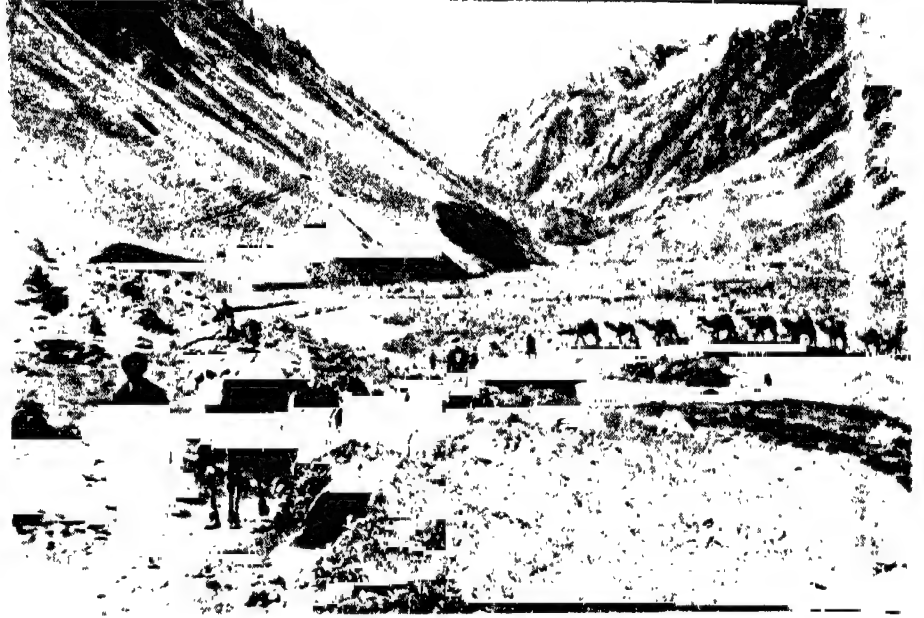
تا خطۂ کشمیر اجالے ہی اجالے

بری کلہ — سور ننکھیوں کا جلوس!

سندر بن کی سوغات : بیش بہا تجارتی اور دوسری لکڑی دریا در دور دور پہنچتی ہے

تحمل کی سعادہ کاری :
گھنے جنگلوں میں دریائی
راستوں سے محفوظ سفر کی دلیل

نشیمن بہار

(سندر بن : مشرقی پاکستان)

موج سوار — یعنی کشتی کا بےآواز سفر!

سبز پری
کا
جل درپن
(سرسبز درختوں
کے جھرمٹ میں
قدرتی جھیل)

غزل

شبیر افضل جعفری

اللہ اللہ جعفری کی ماہیا آرائیاں
کھل رہی ہیں پھول نگر گاؤں میں رسوائیاں

ہائے یہ سرو قیامت کے بہاریں امتزاج
پھوٹتی ہیں جنگلی باہوں سے کنول انگڑائیاں

مخملیں سی آتشیں سی پیاری پیاری لال لال
پاک ناریں ہیں کہ دیپک راگ کی پرچھائیاں

دلھنوں کے مسکراتے بھاگ لینے کے لئے
دے رہا ہے چاند کرنوں کی روپہلی سائیاں

کتنی سندر، کیسی کومل، کیا پری اندام ہیں؟
یہ چہکتی ہرنیاں، یہ راگنی کی جائیاں

★

غزل

حشمت فضلی

شجرِ غم کی ابھی چھاؤں گھنی ہے یارو
روح پر چادرِ آلام تنی ہے یارو

وقت کا فیصلہ کیا ہوگا یہ کس کو معلوم
غمِ جاناں غمِ دوراں میں ٹھنی ہے یارو

کتنے اصنام تصور میں تراشے ہم نے
شیشۂ دل ہے کہ ہیرے کی کنی ہے یارو

ہم نے کب بادۂ گل رنگ سے توبہ کی ہے
ہم پہ کیوں تہمت خاطر شکنی ہے یارو

جو سرِ بزم چھلک اٹھی وہ صہبائے غزل
دامنِ فکر میں سو بار چھنی ہے یارو

دل میں یادوں کے مہکنے کا یہ عالم جیسے
صحنِ گلشن میں فضائے سمنی ہے یارو

شہر در شہر پھرے پھر بھی وطن یاد رہا
یہ بھی اک شانِ غریب الوطنی ہے یارو

ماہ نو، کراچی، اگست ۱۹۷۱ء

رپورتاژ:

پری کنڈ

(ناران: وادی "سیف الملوک" میں چند لمحے)

اختر رشدی

میرے لئے یہ کہنا زیادہ مشکل ہے کہ "جھیل سیف الملوک" زیادہ رومانی ہے یا اس کا قصہ۔ بہرحال یہ تو یقین ہے کہ اس قصہ کی وابستگی سے جھیل کی الف لیلوی فضا میں اضافہ ضرور ہوا ہے۔ آپ میرے ساتھ توسنِ خیال پر سوار ہو کر چلئے۔ راہ میں وہ قصہ بھی سناتا چلوں گا۔ یوں "سیف الملوک" کا قصہ تو آپ نے پہلے بھی سنا ہوگا مگر ان طلسمی کہانیوں کا یہ اثر کبھی نہ جائے گا کہ بار بار سننے پر بھی جی نہیں بھرتا۔ اس لئے گاہے گاہے باز خواں ـــــ کے مصداق میں اس سیر میں حکایت کا لطف بھی شامل کر دیتا ہوں تاکہ راستہ کٹ جائے اور معلوم بھی نہ ہو کہ ہم نے اتنا دور کا سفر کتنی جلدی طے کر لیا۔

کہتے ہیں کہ پرانے زمانے میں دلی کا ایک شہزادہ تھا سیف الملوک نام۔ ایک رات اس نے خواب میں ایک شہزادی کو دیکھا جس کا نام بدیع الجمال تھا۔ خواب تو ختم ہوا مگر سیف الملوک کی راحت کے لمحے غارت ہو گئے اور وہ دن رات اس شہزادی کے حصول میں سرگرداں رہنے لگا جب آشفتگی بہت بڑھی تو اس نے اپنے دربار کے ایک نجومی سے دل کا حال کہا اور پوچھا کہ خواب میں دکھائی دینے والی اس نازنین بدیع الجمال سے کس طرح ملا جا سکتا ہے۔ نجومی نے شہزادہ کا زائچہ بنا کر دیکھا اور کہنے لگا اگر تم جانبِ شمال پہاڑوں کی طرف چلے جاؤ تو وہاں تمہارا گوہرِ مقصود ہاتھ آسکتا ہے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ سیف الملوک دربدر کی خاک چھانتا چھانتا اس مقام پر پہنچ ہی گیا جہاں آجکل ناران کی بستی ہے، میں آج اس بستی کی طرف ہی آپ کو لئے جا رہا ہوں ـــــ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا ـــــ ہاں وہ قصہ۔ تو صاحب، مقام حیرت ہے کہ وہ شہزادہ جب اس مقام پر پہنچا تو ایک عجیب پُرفضا مقام آباد پایا کہتے ہیں ناران اس وقت ایک کافی بڑا شہر تھا۔ سیف الملوک یہاں رہنے لگا اور بدیع الجمال کی تلاش جاری رکھی۔ یہاں کے لوگوں میں یہ قصہ مشہور تھا ـــــ بلکہ اب تک سادہ مزاج لوگ اس قصے کو صحیح سمجھتے ہیں ـــــ کہ ہر بارہ سال کے بعد یہاں کی جھیل پر پریوں کی ایک شہزادی اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ کے ساتھ آتی ہے اور نہا کر چلی جاتی ہے۔ یہ تختِ رواں پر بیٹھ کر آتی ہے اور ساری پریاں اس تخت کے پایوں سے چمٹی رہتی ہیں اور اُڑتی رہتی ہیں! سیف الملوک کے لئے اتنی بشارت کافی تھی وہ کئی سال اس جھیل کے کنارے پڑا رہا۔ آخر ایک دن اس کی مراد بر آئی۔ آسمان پر سخت گڑگڑاہٹ ہوئی اور بدیع الجمال پری اپنے اُڑن کھٹولے پر اُڑتی اس جھیل پر آ پہنچی۔ شہزادہ کسی چھپنے کی جگہ پر جا بیٹھا اور وہاں سے اس طلسمات کا نظارہ کرنے لگا۔ کہنے والا کہتا ہے کہ سب پریوں نے اپنے اپنے کپڑے اتار کنارہ پر رکھ دئے اور نہانے لگیں۔ سیف الملوک نے بدیع الجمال کے کپڑے چپکے سے چرا لئے اور ایک طرف دبک کر بیٹھ گیا۔ دوسری پریاں تو اپنے اپنے کپڑے پہن کر اُڑ گئیں مگر بدیع الجمال بے بس ہو کر وہیں پانی میں رہ گئی! اس کے بعد سیف الملوک اس سے ملنے آیا محبت بڑھی اور بالآخر دونوں کی شادی ہو گئی۔ اب قصہ یوں ہے کہ اس بدیع الجمال پر ایک دیو بھی عاشق تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ سیف الملوک اور بدیع الجمال کی شادی ہو گئی ہے تو اس نے غصے میں آکر اس جھیل کا ایک کنارہ اپنی ٹھوکر سے توڑ ڈالا اور پانی ایک سیل ناہنجار کی طرح بہہ نکلا جس سے پوری وادی ناران غرقاب ہو گئی۔ اور ان دونوں نے ایک پہاڑی پر چڑھ کر پناہ لی۔

لیجئے یہ سرکٹ ہاؤس آگیا۔ قصہ تو آپ نے سن ہی لیا۔ اب میں اس دیو کا وہ مسکن بھی بتا دوں جہاں وہ رہتا تھا۔ وہ جو سامنے ایک ٹیلہ سا نظر آرہا ہے، وہاں کسی وقت میں ایک غار تھا۔ دیو اسی میں رہتا تھا مگر اس کے پیدا کئے ہوئے سیلاب نے سب کچھ غارت کر دیا۔ صرف یہی ٹیلہ رہ گیا ہے اور آج لوگ اس جھیل کو دلی کے شہزادے "سیف الملوک" کے نام سے ہی منسوب کرتے ہیں۔

قصہ کس حد تک اس مقام کی طلسمی فضا جس قدر بھرپور ہے اتنی ہی فطرت کی فیاضی بھی اپنی جگہ ایک خالص الف لیلوی روپ لئے ہوئے ہے اور دل یوں چاہتا ہے کہ اس قصے کو سچ ہی جان لیا جائے۔

جیسا کہ میں نے شروع ہی میں کہہ دیا تھا آپ نے یہ اچھا کیا کہ جیپ کا انتظام کر لیا۔ وادیٔ کاغان کی اس سڑک پر جیپ میں جانے کا لطف ہے۔ تیز رفتار، ہلکی پھلکی اور پہاڑی سرزمین پر پسی روانی و سہولت سے چلنے میں شاید ہی جبال کے اُشن گھوڑے کی طرح صبا رفتار ہے!

ہاں، یہ آپ نے صحیح کہا کہ سیر اور سیاحت کا لطف پیدل چلنے میں زیادہ ہے۔ اور یہ بھی تسلیم کہ سیاحت کے لئے اصل چیز ذوقِ تماشا ہے، حوصلہ اور ہمت جادہ پیمائی ہے، مگر بعض اوقات مادی وسائل بھی ناگزیر ہو جاتے ہیں۔ اب آپ نظر ڈالئے۔ یہ خطِ ایاغ کی طرح مدور سلسلۂ کوہ ہر وقت برف کی سفید چادر میں ملبوس رہتا ہے۔ جون، جولائی، اگست، ستمبر میں ذرا برف پگھلتی ہے مگر برف کے تودے پھسل پھسل کر پہاڑی راستوں کو ناقابلِ عبور بنا دیتے ہیں۔ یوں اب جیپ کے لئے اس سڑک کو بہت صحیح کر دیا گیا ہے اور آپ کو اتر کر جیپ کو دھکا لگانا یا برف کے تودوں کو کاٹنا نہیں پڑے گا! اس کا انتظام برابر ہوتا رہتا ہے اور اب دورِ نو میں تو سیاحوں، خاص کر "ڈالر کیف" سیاحوں کے دم قدم کی خیر منانے کے لئے، کہ وہ ہمارے مہمان ہیں، اور کاغان دیلی کا شہرہ سن کر یہاں تک پہنچے ہیں، انتظام بہت عمدہ ہو گیا ہے۔ صفائی بہت ہے اور سڑک معیاری بن چکی ہے۔

آپ اس قدر بے چین کیوں ہیں جھیل دیکھنے کے لئے؟ شاید قصّے کے طلسماتی کیف نے آپ کے شوق کو اور بھی مہمیز دی ہے۔ تو لیجئے سامنے دیکھئے وہ نقرئی پیالہ سا کیا جھلکتا نظر آ رہا ہے۔ یہی سیف الملوک جھیل ہے۔ ناران چلیں گے ـــ مگر ذرا دم لے کر ـــ کچھ زیادہ دور تو نہیں ہے یہی کوئی تین چار میل ہوگا۔ پہلے اس پری کنڈ کو تو دیکھئے۔ سامان سب جیپ میں ہی رکھئے بس اپنا شوق پورا کرنے کے لئے مچھلی پکڑنے کا سامان اتار لیجئے۔ آپ کو یہاں ٹراؤٹ مچھلی ـــ اگر مقدر کے تیز ہیں ـــ ضرور ملے گی۔ میں ایک دفعہ یہاں آیا تھا تو لوگ کہتے تھے تیس تیس پونڈ وزنی مجرب ٹراؤٹ تک یہاں پکڑی گئی ہے۔ لوگ اس جھیل کے پانی میں ٹراؤٹ کا شکار کرنے کے لئے خاص طور پر آتے ہیں۔ ویسے ذاتی طور پر میں مچھلی کے شکار کو نیوتیوں کا شغل ہی کہتا ہوں جسے رعایتِ لفظی کے طور پر جھک مارنا بھی کہہ سکتے ہیں اور یوں جھک مچھلی کہتے ہیں! مگر آپ ناراض نہ ہوں آپ کی پکڑی ہوئی مچھلی کھا لوں گا تو اپنے الفاظ (آپ کی حد تک) واپس لے لوں گا۔

لیجئے صاحب، اب تو آپ اسے سوتے جاگتے کا سا قصہ نہیں کہیں گے۔ اس آبِ مصفّا کی صحت افزا خوبیوں کو تو ذرا چھو دیجئے صرف پانی کا جمال ہی دیکھئے۔ سطحِ آب پر چلمنی شیشہ کا گمان ہوتا ہے یا نہیں۔ لوگ واقعی صحیح کہتے ہیں کہ جھیل سیف الملوک وادیٔ کاغان کی انگشتری میں زمرّدیں نگینہ ہے۔

سیف الملوک سے ناران کوئی چار میل ہے۔ کیا یہاں کے اس پورے محیط کا سکوت، خامشی اور اعصابی تناؤ کو ختم کر دینے والا سکون پریوں کی سرزمین کا دھوکہ نہیں دیتا۔ جہاں راحت ہی راحت اور سکون ہی سکون ہوتا ہے۔ خیر صاحب، شہروں کے شور شغب، ہنگامے، ہوا، گرد غبار، دھوئیں اور علائق زندگی سے دکھی انسانوں کو راحتِ فردوس اگر کہیں میسر آ سکتی ہے اور ایسے کم خرچ پر، تو شاید وہ یہی جگہ ہے۔

اپنا خیال ہے کہ شام سے پہلے پہلے ہم بستی میں پہنچ جائیں۔ چلئے سامان سنبھالئے۔ جیپ اسٹارٹ کیجئے۔ لیجئے ناران نظر آنے لگا۔ یہ پہاڑی ڈھلوانیں گلپوش و قلمکار ہیں، جیسے فطرت نے حقِ میزبانی ادا کرنے کے لئے ہم جیسے جہاں گشتوں کے لئے قالینیں بچھا دی ہوں۔ آپ نے صحیح کہا کہ پوری فضا مستی اور رعنائیٔ فطرت سے لبریز ہے۔ یہ وجد کرتے پیڑ، یہ رنگ برنگی موسیقار چڑیاں جو ابھی آپ کے سر پر سے اڑتی ہوئی گئی ہیں جھیل سیف الملوک کے موتی جیسے مصفّا پانی میں نہا کر نکلی ہیں ـــ کہیں یہ وہی پریاں تو نہیں جو بدرِ جمال کے ساتھ مل کر نہایا کرتی تھیں؟

خیر یہ تو قصّے کی بات تھی، مجاز کا روپ تھا، اب حقیقت کی طرف آئیے۔ آپ کو یاد دلا دوں آج ۱۴ اگست ہے۔ وہ مبارک دن جو استقلالِ پاکستان کی یاد دلوں میں تازہ کرنے اور ولولۂ حریت و حبِ وطن کو ہر دم قائم رکھنے کی دعوت دیتا ہے۔ مسلم ہندوستان کی جنگِ آزادی کا آغاز یوں تو اور بھی پہلے ہو چکا تھا مگر سن ستاون کا واقعہ ہماری تاریخ کا ایسا سنگِ میل ہے جس سے ہم کاروانِ حریت کے سفر کا منزل بہ منزل تعین کر سکتے ہیں۔ جب سن ستاون کے ہنگامے برصغیر کے گوشے گوشے میں شروع ہوئے تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ سرحد کے حریت پرست، اور سدا کے حریت پرست، جیالے غیور انسانوں کو استقلالِ وطن کی آگ اپنے آپ میں نہ لپیٹ لیتی۔ اس مقام سے جہاں آپ کھڑے ہیں اور ناران کہلاتا ہے، کچھ ہی فاصلہ پر وہ جگہ آ جاتی ہے جہاں اس وقت ہوتی (مردان) میں ۵۵ ویں دیسی پیدل فوج تعینات تھی۔ اس نے اسی مقام سے ـــ اور عجب اتفاق ہے اس ہی جولائی اگست کے درمیانی حصۂ سال میں

جبکہ پاکستان وجود میں آیا ــــــ غیرملکی اقتدار کے خلاف حریت کا نعرہ بلند کیا۔ اپنی بے سروسامانی اور بے مائیگی کے باوجود آتشِ حریت سے سوزاں سینے آگے کر دئے اور غیروں کی حکومت کو سرزمینِ وطن سے نکالنے کے لئے سچے مومنوں کی طرح بے تیغ بھی لڑنا شروع کر دیا ــــــ ان کی ہزیمت جسمانی تھی اور غیرمتوقع نہ تھی ــ مگر ہماری تاریخ کے اوراق میں ان سعید روحوں کے تذکرہ کو خاص مقام حاصل ہے، جنہوں نے پوری وادئی کاغان میں ایک ہلچل ڈال دی تھی۔ وہ پلٹن مارچ کرتی ہوئی سوات اور کوہستان تک پہنچ گئی۔ ان شہیدوں کی سعید روحوں کو آج ۱۴ اگست کے دن سلامِ عقیدت پیش کرنا ہر محبِ وطن کا فرض ہے جنہوں نے راہِ آزادی کی راہ نمائی کی اور ملت نے اس سو سال میں منزل بمنزل آگے قدم بڑھا کر وہ مبارک دن پالیا جسے ۱۴ اگست اور یومِ استقلال کے نام سے ہم ہر سال مناتے ہیں۔

چونکہ اس مقام کی تاریخی اہمیت بھی ہے اس لئے ہمیں ان روحوں کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے اس جگہ کوئی یادگار قائم کرنی چاہئے۔ بلکہ بالاکوٹ میں بھی ایک ملی مرکز بنانا چاہئے کیونکہ بالاکوٹ سے یہ ۹۸ میل دور ہی تو ہے اور آپ جانتے ہیں کہ احیائے ملت کے دورِ بزرگ داعی، عملی قائد اور مجاہد، حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ (۱۸۳۰ء) کے مزارات وہیں بالاکوٹ میں ہیں اور اگر ایک طرف ہماری تاریخِ حریت کے ڈانڈے پلاسی کے میدان اور سرنگا پٹم کے ساحل سے ملے ہوئے ہیں تو شمال میں اس جہادِ حریت و تحریکِ احیا کے ڈانڈے بالاکوٹ سے بھی ملے ہوئے ہیں اور پھر ہماری تاریخ کے ان زریں اوراق کے ساتھ عہدِ نو کے اوراق مرتب بھی تو اس کا کتنا نفیس تکملہ ثابت ہوئے کہ اسی سرزمین پر اسلام آباد کی داغ بیل پڑی ہے۔ اسی محیط میں ہمارا نیا مینوسواد تعمیر ہوگا اور اسلامیانِ دیارِ پاک کے استحکام و جلال کا ابدی نشان ہوگا۔ یہ اس دور کے روشن کارناموں اور اپنی تاریخ کے اماکن و مساکن سے وابستگی کا بڑا ہمت افزا پہلو ہے جسے سوچ سوچ کر میں فخر و سرور سے جھوم اٹھتا ہوں۔ ہمارے سفرِ حریت کا آغاز جس نقطہ سے ہوا تکملہ بھی اس کے نزدیک ہی منصۂ شہود پر آ رہا ہے۔

آپ نے غور کیا یہاں ناران میں کوئی لمبی چوڑی بستی نہیں ہے۔ یہ اور بھی اچھا ہے ورنہ پھر وہی شہری ماحول ہو جاتا اور اس کا تند اور سمع خراش آہنگ سکون و سکوت کو مجروح کر دیتا۔ یوں گرمیاں شروع ہوتے ہی حرکت اور گہما گہمی کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں اور بہت سے سرکاری محکموں کے کیمپ آفس یہاں کھل جاتے ہیں۔ ادھر کالجوں میں گرمیوں کی تعطیلات ہوتی ہیں تو نوجوانوں کو سیر و سیاحت کی سوجھتی ہے اور وہ بھی ادھر کا ہی رخ کرتے ہیں۔ خاص کر وہ جنہیں کوہ پیمائی کا ولولہ ہوتا ہے یا وہ جنہیں برف اور فطرت کے مناظر سے لطف اندوز ہونے یا کوہی علاقوں میں پیدل سفر کی راحت آمیز صعوبات کا تجربہ کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ پکنک کے شائقین بھی یہاں اکثر آتے ہیں" جھیل سیف الملوک" یا ناران کے قلہ ہائے کوہ کی تلیٹی میں اپنے کیمپ جاتے ہیں۔ اس قسم کے سیاحوں کے لئے" یوتھ ہوسٹلز ایسوسی ایشن" کے پڑاؤ، سرکاری ڈاک بنگلے اور دیگر رہائشی سہولتیں مہیا ہیں۔ یہ جو لمبی سی سڑک ہم طے کرکے آئے ہیں کوئی سو میل لمبی ہے اور کاغان روڈ کہلاتی ہے۔ یہ بالاکوٹ سے بابوسر درہ تک آپ کو پہنچا دیتی ہے۔ جھیل سیف الملوک کے نزدیک آپ نے جو نالہ بہتا دیکھا تھا اسے یہاں والے "ناران کٹھہ" کہتے ہیں۔ یہ کافی بڑا نالہ ہے اور اس کی تیز رفتاری تو آپ نے اپنی آنکھ سے دیکھ لی۔ سرکٹ ہاؤس میں پانی اسی نالہ سے لیا جاتا ہے اور بڑا خوش ذائقہ اور مسکن ہوتا ہے۔ کٹھہ کے کنارے کنارے کوئی آدھ میل تک محکمۂ جنگلات نے ایک نرسری فارم بھی قائم کیا ہے جس میں یہاں کے نباتاتی عجائبات دیکھنے میں آتے ہیں گھنی چھاؤں اور ہریاول میں یہ فارم بڑا ہی پُرسکون محسوس ہوتا ہے اور جو لوگ تھک ہار چکے ہوں ان کے سستانے کے لئے بہترین مقام ہے۔

ہاں خوب یاد دلایا، آپ نے یہاں سے جب واپس جائیں گے تو خالی ہاتھ تو نہیں جائیں گے، یہاں کی کوئی سوغات بھی تو لیکر جائیں تاکہ لوگوں کو یقین آجائے کہ ہم کاغان تک جا چکے ہیں اور ناران کے تحفے ہمارے بکسوں میں بند ہیں۔ بالاکوٹ کے بعد اس نواح کی دوسری منڈی یہی ناران ہے اور اپنے سیزن میں یہاں کافی کاروبار ہو جاتا ہے۔ اب کاغان کے پہاڑی بکرے اور ان کے اون کو ساری دنیا جان چکی ہے اور اس اون کو ہم باہر بھیج کر کافی زرمبادلہ بھی کما لیتے ہیں۔ یوں سوغات کی خاطر ان مقامی کاریگروں کے بنائے ہوئے کمبل واقعی بڑے عمدہ ہوتے ہیں۔ قدرتی پیداوار میں اخروٹ ــــ اور اس کی وہ مشہور لکڑی جو یہاں کے لوگ ہی خوب بنانا جانتے ہیں اور تحفۃً دور دور جاتی ہے ــــ پھر یہاں کا عسلِ خالص اپنے پاکیزہ ماحول اور اپنے نکھیوں کے

(باقی صفحہ ۲۹ پر)

سدابہار

اقبال فاطمہ

زمین کا سینہ چیر کر پہاڑ نکل سکتے ہیں، پہاڑوں سے چشمے پھوٹ سکتے ہیں مگر سندر بن ۔۔۔ اس نے تو دریاؤں کی چھاتی روند کر اپنے وجود کا اعلان کیا، اس بیباکی اور شان کے ساتھ کہ آج تک دریا کی لہریں اسکو خراجِ عقیدت پیش کرتی ہیں، بیش بہا خزانہ اس پر نچھاور کرتی ہیں اور شاید رہتی دنیا تک ایسا ہی کرتی رہیں۔ کیوں؟۔ منشائے قدرت، جس کے پورے ہونے کے طریقے نرالے ہوتے ہیں۔ کیا عجب وہ رفتہ رفتہ کسی دن صنعتی عجائبات کا گہوارہ بن جائے اور یہی تقاضائے فطرت ہو۔

ماہرینِ ارضیات اس کے معرضِ وجود میں آنے کے اسباب طرح طرح سے بیان کرتے ہیں۔ اور شاید وہ ٹھیک ہی کہتے ہوں لیکن یہاں کی فضاؤں میں جیسے کوئی پُراسرار طریقے پر سرگوشیاں کر رہا ہو:
"خبردار! یہ جل پری کا مسکن ہے، آہستہ قدم رکھو!" اور پھر ... کچھ بھی نہیں! ہو سکتا ہے یہ جل پری کا ہی مسکن ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس جل پری نے بچوں کی کہانیوں والی سبز پری کا روپ دھار لیا ہو یا شاید خود سبز پری کا مشرقی پاکستان کے حسین دریاؤں پر گذر ہوا اور وہ مستقبل کی بشارت دینے کے لئے یہاں اتر پڑی اور پھر ــ یہ جگہ اس کو اتنی پسند آگئی کہ اس نے یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ اب اس کی حکمرانی کھلنا میں ۲۳۰۰ مربع میل کے رقبہ پر ہے جس کو "سندر بن" کہتے ہیں۔ اس قدر وسیع اور خوبصورت راجدھانی، اور ایسا تختِ طاؤس سے ملتا جلتا سبز سنگھاسن! کیف ہی کیف، رنگ ہی رنگ۔ جسے دیکھ کر ہر انسان دم بخود ہو جاتا ہے۔

سندر بن کا تقریباً اتنا ہی بڑا حصہ بھارت میں بھی ہے لیکن وہاں تو بس خزاؤں کے ڈیرے تھے اور یہی بہاریں جہاں ہمیشہ کھیلتی رہتی ہیں وہ تو سندر بن کا پاکستانی علاقہ ہی ہے۔ اس حسین اور گھنے جنگل کے محافظ بڑے خوفناک اور مہیب شیر ہیں جن کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں معصوم ہرن اور چیتل بھی ہیں جنہیں گزند پہنچانے کا خیال تک انسانیت کیلئے باعثِ ننگ ہے۔ خشکی کے اور جانوروں کے علاوہ دریائی جانور بھی ہیں۔ شکاریوں کی دلچسپی کے بڑے بڑے سامان۔ لیکن، وائے حسرت! وہ صرف للچائی نظروں سے ہی انہیں دیکھ سکتے ہیں، ان پر گولی نہیں چلا سکتے۔ کیونکہ اس علاقہ میں شکار کھیلنا ممنوع ہے اور ایک خاص افسر محض اس لئے تعینات کیا گیا ہے کہ وہ کسی کو سندر بن میں شکار کے لئے نہ گھسنے دے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو غالباً سندر بن کی اس دولت کو لوگوں کا دستِ غارت گر مدت ہوئی لوٹ چکا ہوتا۔

ان حسین جنگلات کے اونچے اونچے، فلک بوس درخت ــــ ان گنت بے پایاں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ان کی سلامتی کی ضامن کوئی ہستی ہے۔ ان دیکھی، انسان کے وہم و گمان سے بالاتر ــ دریاؤں کی آغوش میں پل کر جوان ہونے والے سندر بن کا محافظ اس زمین کا کوئی انسان ہرگز نہیں ہو سکتا۔ حادثاتِ زمانہ اسکے پائے استقامت کو جنبش نہیں دے سکتے۔ بدترین موسم بھی اس کے وجود کے لئے خطرہ نہیں بن سکتا۔ اس کی لازوال دولت اس کے درخت ہیں ــ اور ان درختوں کی لکڑی۔ قسم قسم کے درخت، قسم قسم کی لکڑی! تحقیق و جستجو کے ساتھ ان کے رازہائے سربستہ منکشف ہوتے جاتے ہیں۔ عمارتی لکڑی کی فراوانی تو حیرت انگیز ہے ہی لیکن اس کے علاوہ ایک ایسے مخصوص درخت کی لکڑی کا انکشاف اور بھی حیرت انگیز ہے جس میں حوادث کے مقابلہ کی بے پناہ صلاحیت ہے۔ خواہ خشکی و تری کی شوریت ہی ہو، یا طوفانوں کا جوش و خروش کسی کا بھی اس کے خلاف کوئی بس نہیں چلتا۔ اس کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے۔ اس کے گتھے ہوئے، ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ریشے انسانوں کو اتحاد کا درس دیتے ہیں۔ "دیکھو ہمارے طاقتور دشمن بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے" اور ظاہر ہے کہ پاکستان میں ہوتے

ان کا رو نے سخن زیادہ تر ہمیں سے ہے جن کا دامن دریا پاک سے وابستہ ہے۔

جتنا، پسور اور ان کی لاتعداد دوسری شاخیں سندربن کو اپنے جلو میں لئے ہوئے ہیں۔ اگر اس دیوی کے یہ پجاری نہ ہوتے تو مادی دنیا سے اس کا رشتہ قائم ہونا بہت مشکل تھا۔ ایک زمانہ ایسا بھی گذرا کہ چھوٹی چھوٹی کشتیوں کے علاوہ یہاں تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ یہاں کے گھنے جنگل سونا اگل سکتے تھے مگر ان سے سونا اگلوانے کا راز کسی کو معلوم نہ تھا۔ دشواریوں کے باعث لوگوں نے ادھر توجہ نہ دی۔ آج ان جنگلات کے چھپے ہوئے خزانوں کا راز فاش ہو چکا ہے۔ بڑے بڑے جہاز یہاں پہنچنے لگے ہیں۔ چالنا ―― ہماری نئی بندرگاہ سے جس کو ترقی دینے کے لئے آج کیا کچھ نہیں کیا جا رہا۔

آنے جانے والے جہاز ادھر ہی سے ہو کر گذرتے ہیں۔ یہی دریائی راہیں، مخصوص نمونہ کی کشتیوں کے ذریعہ، طے کر کے سندربن کی لکڑی ساحلوں تک پہنچتی ہے اور دنیا کے بازاروں میں جاتی ہے جہاں قدر شناس نگاہیں اسے پرکھتی ہیں اور اس کی شان یہی ہے کہ اسے ہر کہیں بڑے ہی شوق سے اور اچھے داموں خریدا جائے۔ آفرین ہے ان پودوں پر جنہوں نے اسے جنم دیا!

ماہرین جنگلات حال ہی میں ادھر متوجہ ہوئے ہیں ورنہ آزادی سے پہلے تو اس قدرتی وسیلے کی طرف کسی نے کوئی توجہ ہی نہ کی تھی۔ لوگ صرف "سندری" سے واقف تھے اور اسی کو سندربن کی کل کائنات سمجھتے تھے۔ آزادی کے بعد اقتصادی و صنعتی امکانات کا جائزہ لیا گیا، ایسے نقشے تیار کئے گئے جن پر ان جنگلات کے وسائل کام میں لانے کا دارومدار ہے۔ یہاں کے درختوں کے متعلق ابھی تک تحقیقات مکمل نہیں ہوئی ہے۔ جانے ان تحقیقات کے مکمل ہونے پر اور کیا رازہائے نہاں آشکار ہوں جو ہماری قومی دولت میں بیش بہا اضافہ کریں۔

سندربن جنگل نہیں سونے کی کان ہے۔ اگر مناسب انتظام ہو جائے تو رہتی دنیا تک یہ جنگلات سونا اگلتے رہیں گے۔ عمارتی لکڑی، جلانے کی لکڑی، صنعت سازی میں کام آنے والا خام مادہ اور دوسری جنگلی پیداوار اس قدر کثرت سے ہے کہ اس میں کمی کا تصور تک کرنا گناہ ہے۔ جینوا نامی لکڑی کاغذ اور دیا سلائی کی ڈبیاں بنانے میں کام آتی ہے۔ نفیس و نازک وہ کاغذ جس پر الفاظ کے ہیرے جواہر بکھیرے جاتے ہیں اور طرح طرح کی قومی خدمات سرانجام پاتی ہیں۔ اور لکڑی۔ اس سے کیسی کیسی خوبصورت ڈبیاں بن بن کر آتی ہیں جن کو دیکھ کر نگاہیں ہی نہیں دل بھی جھوم جھوم اٹھتے ہیں ―― اور اپنے وطن پہ ناز کرتے ہیں۔ اسی لکڑی کے باعث کھلنا میں کاغذ سازی کا کارخانہ کھولا گیا جو روزانہ ڈیڑھ سو ٹن اخباری کاغذ بناتا ہے۔ اتنا کاغذ پاکستان کی ضرورت سے زائد ہے۔ اسی لئے فاضل کاغذ دوسرے ممالک کو برآمد کیا جاتا ہے ―― ہماری قومی دولت میں ایک اور اہم اضافہ ―― اگر کاغذ بنانے میں کام آنے والے اس خام مادہ کا انتظام اور زیادہ باقاعدہ ہو جائے تو تین سو ٹن کاغذ یومیہ بن سکتا ہے۔ کھلنا کے گرد و نواح میں دیا سلائی کے بھی متعدد کارخانے دن رات کام کر رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان کی اقتصادی خوش حالی کا انحصار صنعت پر ہے اور یہ جنگلات اس کے فروغ کا ایک قدرتی ذریعہ ہیں۔

سندربن کے دریاؤں میں ماہی گیری کا منظر کتنا رومان انگیز ہے! یہاں کے بہت سے لوگوں کا تو ذریعۂ معاش ہی یہ ہے۔ اس صنعت کی دیکھ بھال بھی محکمۂ جنگلات ہی کے سپرد ہے۔ اس کا فائدہ؟ گذشتہ سال ہی کی بات ہے کہ صوبائی حکومت کو ماہی گیری کے ذریعہ ۷۶ ہزار روپیہ حق مالکانہ کے طور پر ہاتھ آیا۔ کیا ایسی صنعت کے فروغ سے کوئی خسارہ ہو سکتا ہے؟ یہ جنگلات کس قدر سحر آفریں ہیں یہ ان غیر ملکی سیاحوں سے پوچھئے جو یہاں گھومنے پھرنے آتے ہیں ―― یہاں پہنچ کر تو وہی کیفیت ہو جاتی ہے کہ

نظارہ کو تو جنبشِ مژگاں بھی بار ہے
نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

اور جہاں سبز پریوں کے بیک وقت طلسمی یا رومانوی حقیقی حسنِ جہاں آرا کی سحر آفرینی کا تعلق ہو وہاں یہ یک گونہ بیخودی کی کیفیت کیسے نہیں پیدا ہوگی۔

جیسے جیسے سندربن کی شہرت ہو رہی ہے سیاح جوق در جوق امڈے چلے آ رہے ہیں۔ ان کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ فطرت کا حسین شاہکار معمورۂ حسن جنت آباد ―― جل پری یا سبز پری کا مسکن ―― سدابہار سندربن ―― کون جانے وہ ایک دن مشرقی پاکستان کے باشندوں کی قسمت ہی بدل دے ؎

ماہِ نو میں مضامین کی اشاعت سے متعلق شرائط

(۱) ماہِ نو میں شائع شدہ مضامین کا معاوضہ پیش کیا جائے گا۔

(۲) مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان ماہِ نو کے معیار کا خیال رکھیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔ ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینا ضروری ہیں۔

(۳) ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔

(۴) مضمون کے ناقابلِ اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

(۵) ایڈیٹر کو مسودات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

(۶) مضامین صاف اور خوشخط کاغذ کے ایک طرف تحریر کئے جائیں اور مکمل صاف پتہ درج کیا جائے۔

(ادارہ)

جانِ حال شانِ استقبال

(میزانیہ کا جائزہ)

اے اے، ایم شہاب الدین

دورِ انقلاب کے میزانیے پاکستان کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ بالخصوص اس سال کا میزانیہ جسے بجا طور پر عوام کا میزانیہ کہا گیا ہے کیونکہ اس کا مقصد عوام ہی کی آسودگی و خوشحالی ہے۔ یہ "جانِ حال ہے" اس لئے کہ اس کا تعلق حال ہی سے ہے۔ اور "شانِ استقلال" بھی کیونکہ ہمارے روشن مستقبل کا انحصار اسی پر ہے۔ ان حقائق کے پیش نظر اس مہتم بالشان میزانیہ کا مندرجہ ذیل جائزہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ (ادارہ)

ایک عمدہ، خوش اسلوبی سے مرتب کیا ہوا میزانیہ کسی قومی معیشت کی کامیابی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس لئے قومی میزانیہ محض آمدنی اور خرچ کا تخمینہ ہی نہیں ہوتا۔ اس کا ایک بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قومی معیشت کو مضبوط بنیاد پر قائم کیا جائے اور پھر اس پر ایک پائیدار عمارت تعمیر کی جائے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ہمارے وزیر مالیات جناب محمد شعیب نے اس سال ۳۰ جون کو راولپنڈی میں جو میزانیہ پیش کیا ہے وہ موجودہ حکومت کی اقتصادی پالیسی کے مضبوط و مستحکم ہونے کی بین علامت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے قومی میزانیہ کی صنعت کاروں، بیوپاریوں، اقتصادی ماہرین اور سب سے بڑھ کر عوام نے جی کھول کر تعریف کی ہے۔

ہمارے وزیر مالیات نے ۳۰ جون کو جس میزانیہ کا اعلان کیا وہ ایک اقتصادی ماہر کی گہری بصیرت اور وسیع لیاقت کا لشان امتیاز لئے ہوئے ہے۔ اس کے مطابق مد اخل اندازاً ۲۱۵ کروڑ ۵۳ لاکھ روپے اور مخارج ۱۹ کروڑ ۹۰ لاکھ روپے ہیں جس سے ۲۳ کروڑ ۶۳ لاکھ روپے کی رقم فاضل رہتی ہے اور طرہ یہ کہ مداخل میں یہ اضافہ اس طرح نہیں ہوا کہ نئے ٹیکس لگائے جائیں یا پرانے ٹیکسوں کو بڑھایا جائے۔ اس کے برعکس صنعتوں کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ اس میں فراخدلانہ درآمدی پالیسی اختیار کی گئی ہے اور کتنی ہی اشیا کے صرف پر سے ڈیوٹی اور بکری ٹیکس ہٹا دیئے گئے۔

اس میزانیہ کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ترقیاتی پروگراموں کے لئے زیادہ رقم متعین کی گئی ہے۔ اور مشرقی پاکستان میں ایسے پروگراموں پر خاص زور دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس سال ترقیاتی امور پر اخراجات بڑھ کر ۱۲۲ کروڑ روپے بن گئے ہیں۔ ان میں سے ۶۲ کروڑ مشرقی پاکستان اور ۶۰ کروڑ مغربی پاکستان کے لئے مقرر ہوئے ہیں۔ حکومت مشرقی پاکستان نے بھی اس صوبہ میں ترقیاتی مقاصد کے لئے ۶ کروڑ روپے کی رقم متعین کی ہے۔ مشرقی پاکستان میں ترقیاتی پروگراموں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس مد پر اخراجات ۲۵ فیصد بڑھ گئے ہیں۔ بڑی شدید کوشش کی گئی ہے کہ مرکزی و صوبائی میزانیوں میں جس یکجہتی پروگراموں کا اہتمام کیا گیا ہے ان سے مالیات میں زیادہ نظم و ضبط، ترقیاتی امور میں زیادہ تیز رفتاری اور قومی زندگی کے ہر شعبہ میں نئے مواقع پیدا کئے جائیں۔ آئیے ہم اس میزانیہ کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالیں۔

اس سال کا مرکزی میزانیہ انقلابی حکومت کی اس تمام اقتصادی ترقی کا جو اس وقت تک ظہور میں آئی ہے اور اس کے کل ہر جہتی پروگراموں کا صحیح عکس پیش کرتا ہے۔ ہماری اقتصادی ترقی کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم دورِ انقلاب سے پہلے کے حالات کی طرف اشارہ کریں۔ اس کے وقت ہماری قومی معیشت بہت ہی دگرگوں ہوتی جا رہی تھی اور یہ متعدد بیماریوں کا شکار تھی۔ اگر ایک طرف افراطِ زر تھا تو دوسری طرف بیرونی زرِ مبادلہ کی شدید کمی واقع ہو رہی تھی۔ اس صورتِ حال کا سب سے بڑا سبب اس زمانہ کی حکومتوں میں دور اندیشی کا فقدان

اور سستے طریقوں سے شیخی بگھارنے اور نام و نمود کی تمنا تھی۔ اس لئے اپنے اقدام کے آئندہ مالی نتائج کو پیشِ نظر رکھے بغیر وہ ترقیاتی سرگرمیوں کی رفتار کو بڑھانے کے مقصد کے لئے جس کے وہ مدعی تھے اندھادھند نوٹ جاری کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ جنوری ۱۹۵۷ء سے لیکر ستمبر ۱۹۵۸ء تک ۱۴۷ کروڑ روپے کی مالیت کے نوٹ جاری کئے گئے۔ اس طرزِ عمل سے جو نہایت ہی خراب اثرات طاری ہوئے وہ محتاجِ بیان نہیں۔

لہٰذا وزیرِ مالیات جناب محمد شعیب نے ۶۰-۱۹۵۹ء کا میزانیہ پیش کرتے وقت قومی معیشت کو اس صورتِ حال سے نجات دلانے کے لئے کئی مالی تدابیر اختیار کیں۔ مثلاً میزانیہ کے بڑے بڑے مقاصد تھے ـــــ افراطِ زر کی روک تھام، بیرونی زرمبادلہ میں اضافہ اور "اپنی بساط کے مطابق گذارا کرو" کی پالیسی اختیار کرتے ہوئے میزانیہ میں توازن پیدا کرنا ـــــ اس سے ایک ہی سال کے اندر اندر عمدہ نتائج رونما ہوئے اور ۶۱-۱۹۶۰ء کے میزانیہ سے پتہ چلا کہ جو باتیں افراطِ زر پیدا کرتی ہیں ان سے دامن بچا لیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ بیرونی زرِمبادلہ کے تحفظات جو ۱۹۵۸ء میں ۷۳ کروڑ روپے تھے ڈھائی سال کے عرصہ میں بڑھ کر ۱۴۳ کروڑ روپے بن گئے۔ بیرونی زرِمبادلہ میں اس اضافہ نے حکومت کو یہ موقع دیا کہ وہ اپنی درآمدی پالیسی کو زیادہ فراخدلانہ بنائے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے زرِمبادلہ کے تحفظات کم ہو کر جون ۱۹۶۱ء میں ۱۲۶ کروڑ روپے پر آ رہے۔

جیسا کہ پہلے ہی واضح کیا جا چکا ہے موجودہ میزانیہ کے جملہ مقاصد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہماری قومی معیشت کو افراطِ زر کے چکر سے نجات دلائی جائے اور ہماری اقتصادی ترقی کی رفتار تیز تر کر دی جائے۔

ہماری انقلابی حکومت کی اقتصادی پالیسی کا سب سے بڑا مطمحِ نظر یہی رہا ہے۔ چنانچہ اس جانب اقدام کا آغاز پہلے ہی میزانیہ میں کر دیا گیا تھا۔ یہی دور رس نتائج رکھنے والی پالیسی اس سال کا میزانیہ تیار کرنے میں بھی اختیار کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ حکومت نے اس سال کے میزانیہ میں کوئی نیا ٹیکس شامل نہ کرنے میں بڑی دوراندیشی کا ثبوت دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عوام نے بلا تامل حکومت کو اس فراخدلانہ روش پر مبارکباد دی ہے اور صرف مرکزی میزانیہ ہی نہیں بلکہ ریلوے اور صوبائی میزانیے بھی اس طرح پیش کئے گئے ہیں کہ نہ کوئی نیا ٹیکس عائد کیا گیا ہے اور نہ پرانے ٹیکس ہی بڑھائے گئے ہیں۔ حق یہ ہے کہ یہ پہلی بار ہے جب ہمارے یہاں میزانیہ کسی نئے ٹیکس کے بغیر پیش کیا گیا ہے جس کا جناب محمد شعیب کو بجا طور پر فخر حاصل ہے۔

صرف یہی نہیں کہ میزانیہ میں کوئی نیا ٹیکس عائد نہیں کیا گیا بلکہ ساتھ ہی متعدد اشیائے صرف اور کچے مال پر ٹیکس اور ڈیوٹیاں منسوخ کر دی گئی ہیں۔ جب ہی اس میزانیہ کو عوام کا میزانیہ کہا جاتا ہے۔ اور بجا طور پر کیونکہ اس کا بڑا مقصد عوام ہی کو آرام و آسائش مہیا کرنا ہے۔ بائیسکلوں، سلائی کی مشینوں، لالٹینوں، دستی پمپوں وغیرہ جیسی چیزوں پر سے جو عوام ہی کے کام آتی ہیں بکری ٹیکس ہٹا دئے گئے ہیں۔ بچوں کی غذاؤں پر ڈیوٹی ۵۰ فیصد سے ۲۰ فیصد کر دی گئی ہے جس سے مشرقی پاکستان کو خاص طور پر فائدہ پہنچے گا۔ اس کے علاوہ مشرقی پاکستان میں جو نمک تیار ہوتا ہے اس پر سے تمام ڈیوٹیاں ہٹا دی گئی ہیں۔ مشرقی پاکستان کے نمک تیار کرنے والے مدت سے تقاضہ کرتے رہے ہیں کہ ان ڈیوٹیوں کو ہٹا دیا جائے لیکن قبل ازیں کسی حکومت نے بھی اس پر توجہ نہ دی تھی۔ اس لئے ان کو ہٹانے کیلئے مشرقی پاکستان کے لوگ حکومت کے بہت ہی ممنون ہیں۔

یہاں تک ہم نے براہ راست ٹیکسوں کا ذکر کیا ہے۔ حکومت نے بالواسطہ ٹیکسوں کے بارے میں بڑی دانشمندی کا ثبوت دیا ہے۔ اس سلسلے میں اس کی پالیسی ایک طرف عوام کو بچت کی طرف مائل کرے گی اور دوسری طرف تعمیری کام اختیار کرنے میں ان کی حوصلہ افزائی کرے گی۔ اس مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے میزانیہ میں کم معاش اور متوسط طبقہ کے لوگوں کے لئے تعمیرِ مکانات کی کچھ سہولتیں پیش کی گئی ہیں۔ ٹیکس میں رعایتوں کا دائرہ بھی وسیع کر دیا گیا ہے تاکہ لمبی میعاد کی بچت کے لئے بیمۂ زندگی کو مقبول بنایا جائے۔

مرکزی میزانیہ کا رفاہ عامہ کی طرف رجحان حکومت کی اس فراخدلانہ درآمدی پالیسی سے جس کا اس نے اس سال کے جولائی تا دسمبر کے عرصہ جہاز رانی کے سلسلہ میں اعلان کیا ہے اور بھی واضح ہو گیا ہے۔ عام کھلے لائسنسوں میں ۹۴ چیزیں شامل کی گئی ہیں اور تمام صنعتوں کو یقین دلایا گیا ہے کہ انہیں خام مال مہیا کیا جائے گا جس کی انہیں ضرورت پیش آئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ حکومت تمام اشیائے صرف

کی کمی پر قابو پانے اور قیمتیں کم کرنے کا پکا ارادہ رکھتی ہے۔ تاکہ عوام ان مراعات سے وہ فائدہ اٹھا سکیں جو حکومت ان کو پہنچانا چاہتی ہے۔

بالآخر وزیر مالیات جناب شعیب نے میزانیہ سے متعلق جو تنبیہ کی ہے میں اس کی طرف بھی اشارہ کر دینا چاہتا ہوں۔ انہوں نے فرمایا کہ اقتصادی ترقی کا راستہ بڑا ہی کٹھن ہے۔ اس میں کئی خطرناک پیچ و خم آتے ہیں جن کے باعث رفتار ترقی میں کمی بیشی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس لئے ہمیں بڑی احتیاط سے قدم بڑھانا ہوگا۔ ہمیں حصولِ ترقی کے لئے اپنی قوتوں اور وسائل کو کام میں لانا ہوگا۔ گو سفر طویل ہے مگر اس کی دشواریوں سے ہمارے قدم رکنے نہیں چاہئیں۔ کیونکہ یہی وقت ہے جب ہمیں تیزی سے آگے بڑھنا چاہیئے۔

میزانیہ

۱۹۶۱-۶۲ء

(ایک نظر میں)

آمدنی — ۲ ارب ۱۵ کروڑ ۳۵ لاکھ

آمدنی کی مد میں خرچ — ایک ارب ۹۱ کروڑ ۷۰ لاکھ

آمدنی میں کل بچت — ۲۳ کروڑ ۶۳ لاکھ

سرمائے کی مد میں خرچ — ۲ ارب ۷۹ کروڑ ۹۳ لاکھ

ٹیکسوں کی تجاویز سے آمدنی میں کمی — ایک کروڑ ۱۲ لاکھ

اصل مجموعی بچت — ایک کروڑ ۶۰ لاکھ

* * *

★

انقلاب پاکستان

احسن علوی

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں تاریخ پاکستان کا ایک نیا اور روشن ورق الٹا گیا اور ملک اپنے صحیح مؤقف کو پہچان گیا۔

یہ کتاب اس عظیم الشان، خاموش اور دُور رس انقلاب کی تفسیر و تاریخ ہے۔

اس میں فاضل مصنف نے فلسفۂ انقلاب پر گفتگو کرتے ہوئے انقلابِ پاکستان کے اسباب اور اس کے اصلاحی اقدامات کی بڑی جامع کیفیت پیش کی ہے جس سے اس کی روح کو سمجھنے اور مستقبل کی راہیں متعین کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔

یہ کتاب عام قارئین، مدارس کی لائبریریوں اور قومی اداروں کیلئے بہت مفید ثابت ہوگی۔

متعدد تصاویر، نفیس کتابت و طباعت

قیمت ایک روپیہ ۵۰ پیسہ

(علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ:

ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

" شمار کرتا ہوں دانہ دانہ "

قاضی یوسف حسین

میں تو شہری ہوں ۔ مجھے کیا معلوم زراعت کیا ہوتی ہے ۔ اور اس کے مسئلے کیا ہیں ۔ بزرگوں کی زبانی صرف اتنا سن رکھا ہے کہ آتم کھیتی مدھ بیوپار ۔ اگر کوئی یہ پوچھ بیٹھے کہ گیہوں کا پودا کتنا اونچا ہوتا ہے اور پٹ سن کس قسم کی بیل ہے ، تو ساید بغلیں جھانکنے لگوں ۔ وہی بات جو مارک ٹوین کی ایک کہانی میں ہوئی تھی ۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ کسی دیہی اخبار کا ایڈیٹر چھٹی پر چلا گیا ۔ اور وہ قلمدان ،، ادارت کسی میرے جیسے اناڑی شہری کے ہاتھ آگیا ۔ جھٹ لکھ ڈالا کہ روئی آک کے گالوں سے حاصل ہوتی ہے ۔ کدو برگد کی چوٹی پر لگتا ہے ، پٹ سن چیڑ کی ،، ہری سوئیوں ،، کی طرح بعض اونچے اونچے پہاڑی درختوں کے بڑے بڑے پتوں سے ہاتھ آتی ہے ۔
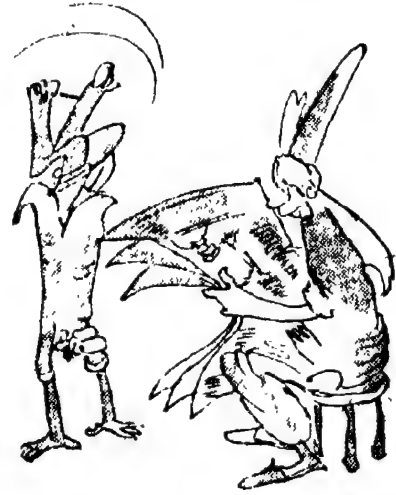
ماھنامہ " الٹی دھرتی "

اور چقندر بیلوں کی جوڑی لگاکر زمین سے کھینچ کر نکالا جاتا ہے ! پھر کیا تھا ' دوسرے ہی دن دفتر کے سامنے یہ لٹھ لئے ہوئے ، واہی تباہی بکتے ، ایڈیٹر کی سو پشتوں کو پنتے ہوئے غضبناک دیہاتیوں کی بھیڑ لگ گئی جو اس کی بری طرح مرمت کرنے پر تلے ہوئے تھے ۔ اور ان حضرت نے اپنی خیریت اسی میں دیکھی کہ دفتر کے چور دروازے سے بھاگ نکلیں ! اور حق یہ ہے کہ ہم

کارٹون : ریحانہ

شہری ، جنہوں نے نہ کبھی گاؤں کی شکل دیکھی ، نہ کھیتوں کا ، کھیتی باڑی کرنا جانیں ۔ یہ تو ہے کہ جب بادشاہ بحر ، ہم طالب علم بھی تو ذرا اونچے درجے کے تو ہمیں ایک عینک پہننی پڑتی ہے ، جو ہمیں معاشیات کے گر سکھاتے تھے ، لیکن انہوں نے اس ان دیکھی ، ان جانی چیز ، زراعت ، کی بھی کچھ باتیں بتا دی تھیں ۔ جنہیں ہم نے ہونہار شاگردوں کی طرح پلے باندھ لیا تھا ۔ سو کھیتی باڑی کے جو ارتھ بھید ہم نے اس کچی عمر میں پالئے تھے وہی غنیمت سمجھئے ۔ چنانچہ حال ہی میں اخباروں اور ان جیسے جاگتے اخباروں رسالوں کی زبانی ، جنہیں انسان کہتے ہیں ، " زراعت شماری ۔ زراعت شماری " کی گردان سنی تو ہکا بکا رہ گئے کہ یہ کونسی " شماری " ہے ؟ آج کل کے ترقی یافتہ زمانہ میں بے خبر ہونا بھی تو گناہ ہے اور سچ پوچھئے تو کبھی اس سے بڑا نقصان بھی ہوتا ہے ۔ چنانچہ اسی بے خبری کے باعث ہمیں "انعامی بانڈوں" کا حال بھی بڑی دیر سے معلوم ہوا اور ہم بھلا انعام نہ پانے کے باعث ہاتھ ملتے رہ گئے ۔ ہم نے سوچا یہ بھی کوئی ایسی ہی انعام والی بات نہ ہو ۔ اس لئے جو بھی ملتا اس سے پوچھتے : " بھئی یہ زراعت شماری کیا ہوتی ہے ؟ " جہاں تک " شماریوں" کا تعلق ہے ہمیں صرف مردم شماری کا علم تھا ۔ کیونکہ اس کا سلسلہ مدتوں سے چلا آتا ہے ۔ اور اس شمار میں ہم بھی مردم ہی کے ذیل میں آتے ہیں ۔ اسکے بعد جب " کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں " کی ہدایت پر عمل تھا تو چندے اختر شماری سے بھی سروکار رہا ہے ! ۔ اور ہمیں داد دینی چاہئیے کہ کیا مجال جو ایک بھی اختر گننے سے رہ گیا ہو ۔ یہاں تک کہ ہم نے جوش شمار میں ہندوستان سے لیکر پاکستان تک سارے ہی اختر گن ڈالے ۔

پھر ایک چیز " رائے شماری " چل پڑی ۔ جس میں یار لوگوں نے ہمیں بھی گھسیٹا اور پھر ہم نے انہیں گھسیٹا ۔ اور اس کھینچا تانی میں پہنچے کہیں بھی نہیں ! شمار میں نہ ہم آئے نہ وہ آئے ۔ اب جو زراعت شماری کا چرچا ہوا تو ہم حسب معمول باز نہ رہ سکے اور اس کسانی علم کو جاننے کے لئے میاں آزاد کی طرح سیلانی

تو تھے ہی ، انجن کی طرح چل نکلے ۔ حیران تھے کہ زراعت شماری آجکل کی کوئی نئی ترکیب ہے۔ با تجرید کی انوکھی مثال۔ شاید اسی طرح ہر آبند و روند سے پوچھتے گچھتے رہتے ۔ اگر حسن اتفاق سے ایک خضر راہ نہ مل جاتے، جنہوں نے واقعی زراعت کا شمار کر دکھایا، اور ایسا ہونا لازم بھی تھا ۔ "خضر" اور ہرباول کا چولی دامن کا ساتھ ٹھہرا ۔ اور یہ حضرت اسی ہرے بھرے محکمے سے تعلق رکھتے تھے ۔ انہوں نے اس "شماری" کی وہ وہ اونچ نیچ بتائی کہ ہم اپنے گیان سے دوسروں کے کان کترنے لگے ۔ اور بڑے بڑوں کی سٹی گم کردی ۔ چنانچہ دو دو ہاتھ آپ سے بھی کرتا ہوں ۔ اور اس اندیشے کے بغیر کہ آپ بھی ان کسانوں کی طرح ہڑبونگ مچادیں گے جن کا مارک ٹوین کی "لائبریری آف ہیومر" میں ذکر کیا گیا ہے۔ خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے !

آمدم برسر مطلب ۔ اس خضر راہ کا بھلا ہو جس نے مجھے یہ راز بتایا کہ زراعت شماری بھی اسی سلسلہ ہی کی ایک کڑی ہے۔ اور نہایت اہم کڑی ۔ دلی ہو یا کوئی اور شہر وہاں تو بےشک یہی سوال ہے۔ "کھائیں گے کیا؟" گاؤں یا کھیتوں میں تو اور ہی بات ہے۔ "اگائیں گے کیا؟" اور اگانا بھی کوئی ایسی بےتکی چیز تو نہیں کہ دانے لئے اور جیسی بھی زمین ہوئی۔ بنجر، ریتیلی، سیم زدہ، پتھریلی اس میں آنکھیں بند کرکے ادھر ادھر دانے بکھیر دئیے ۔ اس کے لئے تو بہت کچھ جاننا، بہت کچھ دیکھنا، بہت کچھ سوچنا، سمجھنا پڑتا ہے۔ دانے کیسے ہیں؟ اچھے یا برے؟ زمین کیسی ہے؟ ۔ زمین میں ہل کیسے چلانا چاہئیے ۔ پودوں کا کس طرح دھیان رکھنا چاہئیے ۔ بوائی کیسے ہو؟ کب اور کس طرح پانی دینا چاہئیے؟ وغیرہ وغیرہ ۔ اور ہمارا زمانہ تو آپ جانیں سائنس کا زمانہ ہے۔ ترقی کا زمانہ ۔ دوسری قومیں کاشتکاری کے فن میں خبر نہیں کہاں سے کہاں جا پہنچی ہیں ۔ اس لئے ہمیں ان کی طرح نئے نئے وسائل، نئے نئے سائنسی طریقوں سے کام لینا پڑے گا تاکہ ہم اپنی پیداوار کو بڑھائیں اور اسے بہتر بھی بنائیں ۔ اس کے لئے ہر طرح کی معلومات ضروری ہیں ۔ مثلاً مغربی پاکستان کے کتنے رقبے میں گندم بوئی جاتی ہے ؟ کتنے میں روئی ، کتنے میں نیشکر ہے ؟ بڑی بڑی فصلیں کیا ہیں ؟ ۔ ان کے موسم کیا ہیں ؟ ۔ غرض کیا کیا جاننا ضروری نہیں ہوتا ۔

غرض دیکھئے ، اب یہ پانی چلا ۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ آزادی کے بعد ہمارا ملک کیسی کیسی مشکلات کا شکار رہا ۔ پہلے مہاجرین آئے اور جوق در جوق آئے ۔ فوج ظفر موج کی بجائے "فوج شکست موج" کی طرح ! مدتوں انہیں کے مسئلے سے نبٹتے رہے ۔ پھر سیاست گردی کا دور آیا ۔ خدا وہ وقت نہ دکھائے! شکر ہے انقلاب نے یہ اندھیر گردی تو ختم کردی اور ہماری انقلابی حکومت نے زندگی کے ہر شعبہ میں کایا پلٹ دینے کا تہیہ کیا ۔ ہمارے ملک میں زراعت نمبر ایک ہے یعنی اور سب باتوں سے بڑھ چڑھ کر ۔ اس لئے سب سے پہلے زرعی اصلاحات ہی کا بیڑا اٹھایا گیا ۔ اور ایسے کہ باید و شاید ۔ صدیوں پرانے جاگیرداری نظام کا ایک ہی ضرب کلیمی نے خاتمہ کرڈالا ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہماری سیاسی، معاشرتی، اقتصادی حالت اس طرح دگرگوں رہتی ۔

ایک دن میں گھومتے پھرتے ایک مدرسے میں جانکلا ۔ اس میں ایک چیز بہت پسند آئی ۔ اس کے ایک کمرے کی دیوار پر بڑا سا تختہ لگا تھا ۔ جس پر مغربی پاکستان کا طبعی نقشہ بنایا گیا تھا ۔ ریتیلی جگہوں پر سریش سے ریت چپکا دی گئی تھی ۔ جہاں جہاں دریا گذرتے ہیں ان کے کنارے کنارے چاول دکھیرے گئے تھے ، جہاں روئی اگتی ہے وہاں روئی کا پھول لگا دیا گیا تھا ۔ دریاؤں کو نیلی نیلی رگوں کی طرح دکھایا گیا تھا۔ پہاڑوں کے لئے چھوٹے چھوٹے نیلے نیلے رنگے ہوئے پتھر لگائے گئے تھے ۔ اس نقشہ کو دیکھتے ہی سب کچھ معلوم ہو جاتا تھا ۔ زراعت شماری کا مدعا بھی یہی کچھ ہے ۔ لیکن زیادہ تفصیل، زیادہ وضاحت کے ساتھ ۔ تاکہ زراعت کے متعلق تمام چیزوں — زمینوں، فصلوں، انسانوں، آب و ہوا، طبعی حالات، وغیرہ کی کیفیت ٹھیک ٹھیک معلوم ہو جائے ۔ اور ہم جو بھی قدم اٹھائیں وہ نتائج کا صحیح اندازہ کرکے اٹھائیں ۔ تاکہ ہماری تدابیر بہدف ثابت ہوں ۔

ہمیں ضلع‌وار یا چک وار معلومات درکار ہوں، ہم افتادہ زمینوں کا حال معلوم کرنا چاہیں، باغاتی رقبہ کا پتہ چلانا چاہیں، نہری، چاہی ، بارانی زمینوں کا علم حاصل کرنا چاہیں تو ہمارے پاس کوئی معقول اور صحیح اعداد و شمار نہیں ہیں جن پر بھروسہ کرکے آئندہ کے لئے تدبیر کی جائے ۔ مدت کی بات ہے عالمی ادارۂ زراعت نے ہمیں کہا تھا کہ ہر دس سال کے بعد ملک میں زراعت شماری کی جائے ۔ مگر ہم نے اس پر بڑی نیم دلی سے کام لیا ۔ خیر اس سے کام کی داغ بیل تو پڑ گئی ۔ لیکن ملکی اکھاڑ پچھاڑ نے اس کو بھی اکھاڑ پچھاڑ دیا ۔ ۱۹۵۶ء میں ایک کل پاکستان زرعی کانفرنس ہوئی ۔ اس نے بھی زور دیا کہ ملک میں ایک مکمل زراعتی جائزہ ازبس ضروری ہے ۔ اس کے بغیر ہم بالکل بے دست و پا رہیں گے ۔ ہماری پیداوار گھٹتی اور خراب ہوتی چلی جائے گی ۔ جو اس ترقی کے زمانہ میں ہمارے لئے اور بھی برا ہے ۔ اتنا بھی غنیمت ہے کہ جیسے تیسے زراعت شماری کا ایک ادارہ قائم کر دیا گیا ۔ جس نے کام کی بنیاد رکھ دی ۔

اس طرح جو سب سے بڑا سوال تھا وہ جوں کا توں رہا ۔ یہ کہ زراعتی نظام میں بھی تبدیلیاں کی جائیں ۔ دور انقلاب میں اس پر پوری سنجیدگی سے عمل سروع ہوگیا یعنی زرعی اصلاحات نافذ کردی گئیں اور ان کی مدد کے لئے ۱۹۶۰ء میں ہماری پہلی باقاعدہ زراعت شماری بھی مکمل کرلی گئی ۔ یہ دونوں کام ہمارے لئے بیحد مسرت کا باعث ہیں ۔

زرعی اصلاحات کا پہلا اور سب سے بڑا نتیجہ تو یہی نکلا کہ جاگیرداری کا قلع قمع ہوگیا ۔ اور ہمارے یہاں سے یہ پرانے تسمہ پا دور ہوگئے ۔ خس کم جہاں پاک ۔ زمینوں کی غلط، غیر منصفانہ، غیر معاشی تقسیم بھی ختم ہوگئی اور ایسے حالات پیدا ہوگئے جن سے زراعت میں زیادہ سے زیادہ سرمایہ لگانے کی گنجائش پیدا ہو اور لوگ خود بخود اراضی پر سرمایہ لگانے کی طرف رجوع کریں ۔ ایک بہت بڑی خرابی تھی بےدخلیاں ۔ یونہی بلا وجہ، جب بھی زمیندار یا جاگیردار کے من میں سمایا اس نے مزارع یا ہاری کو نکال باہر کیا ۔ بےدخلیوں کو روک دینے سے مزارع کو حقوق کاشت کا اطمینان ہوا اور وہ دھن کی امید میں تن من سے کام کرنے لگا ۔ پھر اگر ایک طرف بڑی بڑی اراضی کو کم کردیا گیا تو دوسری طرف کاشت کے رقبے بھی بڑھا دئیے گئے ۔ اور وہ جو زمین کے بٹ بٹ کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بننے سے زمینوں کی درگت بنتی چلی جا رہی تھی، وہ رک گئی ۔ گویا وہ صورت پیدا ہوگئی جسے ''اشتمال اراضی،، کہتے ہیں ۔ خدا ان اصلاحوں کا بھلا

پری شیشے میں !
(فریم میں جڑا ہوا پودا)

ذرا سوچئے آج کل کے زمانہ میں وہ پرانے دقیانوسی قسم کے پٹوار کھاتے کیا کام آئیں گے ۔ ان پر کیا بھروسہ کیا جاسکتا ہے ۔ جب کہ ہم جانتے ہیں کہ بڑے بڑے زمینداروں نے پٹواریوں کو دے دلا اور کھلا پلا کر کیا کیا الٹے سیدھے نہیں کرائے تھے ۔ داخل خارج کی یہ بدعنوانیاں کسے معلوم نہیں ۔ پھر یہ بھی ہے کہ اگر

کرے۔ ان سے ہم زرعی ترقی کے صحیح راستے پر پڑ گئے ہیں۔ لیکن ان سے بہترین فائدہ جبھی حاصل ہوسکتا ہے کہ زراعت کی نئی طرح تنظیم کی جائے، صحیح اعداد و شمار فراہم کئے جائیں، نئے حقائق دریافت کئے جائیں - ہم ہتھیلی پر سرسوں جمانے سے تو رہے۔ زرعی ترقی کے لئے بڑی لمبی مدت درکار ہوتی ہے، جبھی کچھ دیرپا نتائج پیدا ہوسکتے ہیں - لہذا ہم گھوم پھر کر ایک ہی بات پر آ رہتے ہیں - جائزہ - بسیط جائزہ - زراعت شماری میں بھی جائزہ لیا گیا - جس کی بدولت ماہرین زراعت اس نتیجے پر پہنچے کہ بڑی بڑی زرعی املاک واقعی ٹھیک نہیں ہیں - اور جو لوگ زمینوں پر طفیلی حیثیت سے لگے ہوئے جونک کی طرح خون چوس رہے ہیں ان کا سلسلہ بند ہو جانا چاہئے - تاکہ کاشت کا پھل صرف انہی کو مل سکے جو محنت کرتے ہیں یعنی بچولیا مفادات ختم ہو جائیں - مالکان اراضی اور مزارعوں کے ساتھ برابر کا انصاف کیا جائے اور ان کے حقوق کا تحفظ اور اطمینان کرایا جائے تاکہ وہ جان و دل سے زمینوں پر کام کرسکیں - جہاں تک ممکن ہو چھوٹی چھوٹی زمینیں ختم کرکے اشتمال اراضی سے کاشت کے بڑے بڑے قطعے پیدا کئے جائیں، بکار آمد اراضی کی بہتر درجہ بندی کی جائے تاکہ وہ اقتصادی طور پر مفید بن سکیں - نیز گذارہ کی زمینوں کا معیار بھی اونچا کیا جائے -

اس کے ساتھ مزارعین اور ہاریوں کا شمار بھی ہو - ان کے حالات کا جائزہ بھی لیا جائے - کیونکہ یہی لوگ تو ہماری ریڑھ کی ہڈی ہیں، خصوصا نظام زراعت کی - اور انہی پر ہماری زرعی پیداوار کی فراوانی، عمدگی اور قومی خوشی حالی کا دارو مدار ہے - یہ زراعت شماری ہی تھی جس سے پتہ چلا کہ مزارعین اور ہاریوں کی تعداد کتنی ہے جن کے پاس اپنی زمینیں نہیں ہیں، خود کاشت رقبے کتنے ہیں - اور مزارعوں کے ذریعہ کتنی زمین بوائی جاتی ہے - اس طرح ہم ہر بات کا جواب دے سکتے ہیں اور ہمیں اندھیرے میں ٹاسک ٹوئیے مارنے کی ضرورت نہیں رہتی - فرض کیجئے اصلاحات اراضی کمیشن کے سامنے یہ بسیط جائزہ ہوتا تو اسے کس قدر آسانی رہتی - اس جائزہ نے اس قسم کے آئندہ اقدامات کیلئے راستہ صاف کر دیا ہے اور غور و فکر اور تحقیقات کے لئے ایک معقول، سائینٹفک لائحۂ عمل بہم پہنچا دیا ہے - اس سے طریق کار میں بھی حقیقت پسندی اور صحت و درستی پیدا ہوگئی ہے - اس وقت ہمارے ماہرین کے سامنے زراعت کے جملہ عناصر سے متعلق ہر طرح کی مکمل و مفصل معلومات موجود ہیں جن کی بناء پر حکمی انداز سے کام شروع ہوچکا ہے اور اس کے عمدہ نتائج بتدریج آشکار ہوں گے - بلا شبہہ ہم مستقبل میں جب ہی خود مکتفی ہوسکتے ہیں کہ ان اعداد و شمار اور کوائف و حقائق سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں، ان سے صحیح رہنمائی حاصل کریں، اور ان پروگراموں کو بروئے کار لائیں جو نئے دور میں ملک کے لئے وضع کئے جارہے ہیں - اصل مطلب تو یہی ہے کہ ملک میں زراعت اور سکنت اراضی کو اقتصادی طور پر مفید و نفع بخش بنایا جائے -

چونکہ ہماری معیشت اور خوش حالی کا دارومدار سب سے زیادہ زراعت پر ہے اسلئے ہمیں قدرتی طور پر ان صنعتوں کو فروغ دینا چاہئے جو زراعت کو ترقی دیں - یعنی زراعت کی امدادی صنعتیں - زراعت شماری کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ ہم ان صنعتوں کی ترویج کے ساتھ ساتھ اپنی درآمدی برآمدی پالیسی بھی مرتب کررہے ہیں -

زراعت شماری کا سب سے اہم فائدہ یہ ہے کہ ہم نے اپنی منزل مقصود کو پہچان لیا ہے - اور حقائق و معلومات کی روشنی میں اس کی طرف بڑی تیزی، مستعدی، باخبری، اور دلجمعی کے ساتھ قدم بڑھا سکتے ہیں - دوسرے لفظوں میں اب ہم اس قابل ہوگئے ہیں کہ درست طور پر زرعی منصوبہ بندی کرسکیں، اپنی زرعی ترقی کے سلسلہ میں صحیح قدم اٹھائیں اور صحیح پالیسی وضع کریں - اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اصلاحات اراضی کے کام کو اب ان راہوں پر معین اور مستحکم طریقہ سے چلایا جاسکے گا جو جمہوریت کی حقیقی روح ہے - اور اپنے دامن میں ملک کی آئندہ خوشی حالی کی نوید جانفزا لئے ہوئے ہے *

وہ چمک اٹھا افق

جلوہ در جلوہ تجلّی در تجلّی

۲۷ اکتوبر

کا

انقلابِ عظیم: مطلع قوم پر یک طلوعِ آفتاب
اور تجلیاتِ بے پایاں کا ہجوم

ماہِ نو

کا

شمارۂ خاص: جشنِ انقلاب کی تقریب پر
تیسرا شمارۂ خصوصی

یک جہان آب و تاب

ان حیرت آفریں تابانیوں کو دامن میں لئے ہوئے جو بیش از بیش نظر افروز ہیں

یہ شمارۂ خصوصی ان دونوں

آفتاب و ماہتاب کی تابانیوں

کا چکا چوند پیدا کر دینے والا دستۂ نور ہے

جس میں دیارِ پاک کے بہترین جوہروں

کے روشن ترین برق پاروں ـــ اور

ملک و قوم کے گوناگوں درخشاں پہلوؤں کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے

علم، ادب، فن، ثقافت کے بہترین جواہر پارے تعمیر، ترقی،

تجدید، اقدام کے تاحدِ نظر تابناک سنگِ میل آئینہ تحریریں:

شانِ حال، جانِ استقبال ـــ کی ـــ تابندہ و پائندہ تصویر

جوہرِ قابل: مزید جواہر پاروں سے اس براق آئینہ کو اور بھی جلا دیجئے۔

مشتہرین: فی الفور اشتہارات بک کرا کے اس نادر موقع سے اپنے کاروبار کو فروغ دیجئے،

ضخامت: ۱۳۶ صفحات: ہم رنگین تصاویر۔ متعدد سادہ تصاویر۔ **قیمت:** صرف ایک روپیہ پچیس پیسہ۔

ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

آزاد نظم کے سراغ میں۔۲۔ ——— بقیہ صفحہ ۱۱

مدت گذر چکی تھی اور لوگ آزاد نظم کو آزاد شاعری کے اس اولیں مجموعہ ہی کے ذریعہ جانتے تھے اور قدرتی طور پر اس کے مصنف کو آزاد شاعری کی اولیں آواز سمجھنے کے خوگر ہو گئے تھے۔ یہی "مدتے ایں مثنوی تاخیر شد"۔ (اگرچہ یہ مثنوی نہیں بلکہ مثنوی کی حریف آزاد نظم تھی) تھی جس کا سبب علمی و ادبی حلقے آج بھی تھوڑی حد تک ڈاکٹر خالد کی اس میدان میں پیش قدمی سے بے خبر ہیں۔ ان حالات میں اعرابی ترکستان تک پہنچا بھی تو کیسے؟ اس کا نتیجہ یہی ہوا کہ ؂

یاران تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے!

ماہِ نو

جلد ۱۴ — شمارہ ۹

ستمبر ۱۹۶۱ء

مدیر: ظفر قریشی

چندہ سالانہ: ۵ روپے ۵۰ پیسہ

شائع کردہ: ادارۂ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

فی کاپی ۵۰ پیسہ

انجمن تنہا

(بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کی وفات پر چند تاثرات)

شہاب رفعت

مرگ و حیاتِ انسانی کا وہی قدیم افسانہ تو ہے
تاخت و تاراجِ ہستی کا مشغلۂ روزانہ تو ہے
دستِ فنا کی وحشی دستک جاری خانہ بخانہ تو ہے
دنیا پہلے بھی تھی ویرانہ اب بھی ایک ویرانہ تو ہے
وہی ہے ترکشِ تیر وہی صیاد کا زیست نشانہ تو ہے
وہی ہے شمع کی لو کا خنجر وہی تنِ پروانہ تو ہے
وہی ہے میتِ برگِ گل کی وہی ہوا کا شانہ تو ہے
قاصدِ ملکِ عدم کی آمد ہر صف میں ورانہ تو ہے
وہی ہیں چالیں وہی شبیخوں وہی ستیز شبانہ تو ہے
وہی دلیریٔ آزاداں ہے وہی نبرد یگانہ تو ہے
وہی ہیں مرحب، وہی ہیں عنتر وہی رجز شیرانہ تو ہے
رنگا رنگ ہوں موت کے حیلے انکی روش ترکانہ تو ہے
کل تک جو موجود تھا ہم میں آج وہی بیگانہ تو ہے
چھوڑ کے انجمنِ ہستی کو تنہا دور روانہ تو ہے
پہلے تھا آزادانہ مسلک اب بھی آزادانہ تو ہے

ہاں لیکن جب بزمِ جہاں سے اُسکے چشم و چراغ سدھاریں
کیسے نہ اُنکے غم کے مارے پروانے رہ رہ کے پکاریں:

ساری محفل سرد مگر اک گرم نفس دیوانہ تو تھا
اک مہجورِ وطن کی خاطر مدِ نظر کاشانہ تو تھا
دُرد ہی دُرد تھی تہہ میں لیکن گردش میں پیمانہ تو تھا
دُور بہت ہی دُور حقیقت اک جیتا افسانہ تو تھا
ایک چہیتی بستی بسانے کے لئے اک ویرانہ تو تھا
بےحس نادانوں کے جہاں میں اِک باحس فرزانہ تو تھا
تھے تو چلنے جاگتے بازو جدّ و جہد کا شانہ تو تھا
کاروبارِ شوق کی خاطر باقی ایک بہانہ تو تھا
دل میں ولولۂ بےپایاں لب پر ایک ترانہ تو تھا
وحشی دہشت ناک سمندر اس کا کوئی کرانہ تو تھا
اک مے باقی، کہنہ ساقی، مژدۂ کیفِ شبانہ تو تھا
بام و در میخانہ نہیں تھے شانۂ میخانہ تو تھا
بے مے و ساغر بے خم و مینا ولولۂ رندانہ تو تھا
جلوۂ جاناں آنکھ سے پنہاں سحرِ رخِ جانانہ تو تھا
اک درویش بے سروساماں عزم مگر شاہانہ تو تھا
خانہ خواب و خیال سراسر لیکن صاحبِ خانہ تو تھا

"سارا چمن ماتم میں ہے"

عاصمہ حسین

(یہ نظم بابائے اردو، ڈاکٹر مولوی عبدالحق (مرحوم) کی وفات کی خبر سن کر القا ہوئی اور ان کے سوگ میں پیش کی جاتی ہے)

اب آنسوؤں کا سیلاب بہے اور آہوں کے طوفاں چھا جائیں
اب کالے کالے بادلوں کی گھنگھور گھٹائیں لہرائیں
اب سورج کالا سورج ہو اور چاند مسلسل گہنائیں
اب کرن کرن ہو تارِ سیہ اور اجلی دھوپیں کجلائیں
صبحوں کا سنہری روپ ڈھلے اور کہرے کجرا پھیلائیں
ہر جانب سائے ہی سائے اور دھرتی پر چھائیں
پھنکارتے ناگ اندھیرے کے بل کھا کھا کر پھن پھیلائیں
تن تن کے بگولے رقص کریں، بڑھ بڑھ کر آندھیاں بولائیں
اب رونی رونی فضائیں ہوں، اور سونی سونی دنیائیں
کھو جائے دھنک کا سب جادو، رنگوں کی دھاریاں سنولائیں
کوئی شام ڈھلے دیپک نہ جلے اور کلیاں صبح نہ مسکائیں
اب کریں خزائیں من مانی، ہر پھول پہ شعلے برسائیں
دل دل کی کلی کملا جائے، من من کی کونپلیں مرجھائیں

اب آنسوؤں کا سیلاب بہا اور آہوں کے طوفاں چھائے
اب غم کے بادل ٹوٹ پڑے اور زہر کے دھارے برسائے
سب دنیا سونی سونی سی، ہر اور ہیں سائے ہی سائے
سانسیں ہیں اوبھی اوبھی سی، ہر سانس سے دل بیٹھا جائے
باتیں ہیں تو الجھی الجھی سی، اب بات لبوں پر کیا آئے
راتیں ہوں کہ دن اک بےچینی، جی بیٹھے ہی بیٹھے گھبرائے
ٹیسیں ہی ٹیسیں من سے اٹھیں، رگ رگ میں نشتر تیرائے
چرکوں پر چرکے ایسے لگے آنکھوں میں لہو بھر بھر لائے
نس نس اک کرب کی لہر اٹھی، رہ رہ کے جو تن من تڑپائے
رگ رگ میں چبھن تیکھی تیکھی، جیسے کوئی ناگن ڈس جائے

اُف اُف یہ عالم کرب و بلا، یہ درد کی شدت اے وائے
اب گھاؤ ہی گھاؤ ہیں سینے میں، کیا مرہم سے کوئی سکھ پائے

یہ دنیا بھی کیا دنیا ہے، ہر گام اجل، ہر آن فنا
رکھا ہے ہوا کی اور دیا، اِس آن بجھا اُس آن بجھا
کیا جانئے کس دم آ جائے تو اس کی بجھانے کو جھونکا
اک موجِ ہوا، اک موجِ جفا، اک موجِ قضا، اک موجِ فنا
چھوٹے سے دیئے کی بات ہی کیا، اس مہرے کی اوقات ہی کیا
اک دستِ قضا نے چال چلی اور پٹا یکایک یہ مہرا
کب تک یہ دیا جلتا جائے، کیا اس کی سکت، کیا اس کی بقا
جیون کا یہ نقطہ چھوٹا سا، اک جھلمل کرتا پر کالہ
کب تک یہ چمک، کب تک یہ دمک، کب تک یہ میلی روشنی کا
یہ بلبلہ جوت کا بہتا ہوا، یہ شعبدۂ فانوس نما
لو دیکھتے دیکھتے ٹوٹ گیا، لو چلتے چلتے منجمد ہوا
اس نیو پر کیا تعمیر کرے کوئی شیش محل امید دل کا

یہ زور فنا تسلیم مگر یہ زور، ابد تاثیر نہیں
صیادِ قضا کے ہاتھوں میں یہ کون کہے شمشیر نہیں
لیکن ہے برش ہی مات اس کی، جان اس سے نقش پذیر نہیں
ہے جیت میں پنہاں ہار اس کی، انت اس کا بجز تحقیر نہیں
تقدیر کے گھر میں سب کچھ ہے صرف ایک ہی شے تقدیر نہیں
بجھ جائے فنا کی موج سے جو وہ ہستی کی تنویر نہیں
مٹ جائے قضا کے ہاتھوں سے وہ جیون کی تصویر نہیں
تسخیرِ عیاں تسخیر تو ہے، یہ تا بہ ابد تسخیر نہیں

یہ ظاہر کی تعزیر بجا، باطن کی مگر تعزیر نہیں
یہ صبح کو کرنا شامِ سیہ لانا کوئی جوئے شیر نہیں
مٹ جائے ہوا کے جھونکے سے یہ نور کی وہ تعمیر نہیں
روشن ہے نہاں میں بجھ کے دِیا، یہ خواب فنا تعبیر نہیں

شانِ ابدیت پیدا ہو جن سے، ہیں وہ جوہر لاثانی
وہ دل ہے کہ جس سے ہوتی ہے تعمیرِ حیات لافانی
اک روشنیوں کی روشنی ہے سامانِ بقائے انسانی
اک دیئے کے اندر اور دِیا اک نور کہ نورِ وجدانی
وہ لو کہ ہے لَو سے بالاتر، اک تاب کہ تابِ فوقانی
اک جذبہ کہ دل میں جاگ اٹھے، اک ولولہ۔ شعلۂ پنہانی
اک عزمِ جواں اک شورِ جنوں، تحریکِ دروں کی جولانی
اک آتشِ شوق کا ہنگامہ، اک جوشِ عظیم کی طغیانی
بجھتے ہی دیئے کے اور دِیا، اک اور ہی اس کی تابانی
دم ایک مسیحِ پنہاں کا، اک ہستیٔ تازہ کا بانی
باقی ہو کہ فانی روحِ بشر، اس رنگ میں روح نہیں آنی

پھر کیوں اشکوں کا سیل بہے؟ کیوں اٹھیں آہوں کے طوفاں؟
کیوں دل پہ غموں کا بارِ گراں؟ پھر کیوں نہ ہو منزلِ غم آساں؟
کیوں لب ہوں ہمارے نوحہ کناں؟ کیوں آنکھ ہو غم سے اشک فشاں؟
کیوں ہو نمناک سرِ مژگاں؟ کیوں ہو لَلہ قضا پہ خندہ زناں؟
پلکوں پہ جو آنسو لرزاں ہیں بن جائیں ستاروں کی لڑیاں
پھر کاوشِ سود و زیاں کیسی؟ کیا تذکرۂ پیدا و نہاں؟
مر کر ہے توانا اور بھی جاں، وہ جاں کہ ہے جانِ زندہ دلاں
دیکھو تو برابر آنکھوں میں وہی برقِ نفس ہے شعلہ فشاں

وہی صاعقے ہیں، وہی کوندے ہیں، وہی شعلوں پہ شعلے گرم زباں
وہی بول، ہنسی، وہی چہچہے ہیں، وہی چھوٹ رہی ہیں پھلجھڑیاں
وہی نخلِ قلم کی شادابی، وہی شاخ بہ شاخ گلِ خنداں
وہی موجِ خیال کی جولانی، وہی سطر بہ سطر دُرِ تاباں
وہی لطفِ سخن، وہی سحرِ بیاں، وہی دل روشن، وہی کفِ رخشاں
وہی معجزہ ہائے سینائی، وہی کشف و کراماتِ سحباں
سچ پوچھو تو یوں بھی جاری ہے اوقات کا سلسلہ بے پایاں
اک لامتناہی سلسلہ ہے اک سلسلۂ بے حد و کراں
اک وقت کے پیچھے وقتِ دگر، اک دہر کے پیچھے دہرِ دواں
نئے وقت، خواص و صفات نئے، اک تازہ جہاں، نئے کون و مکاں
اک وقت گیا، اک وقت آیا، گو سچ اس سے ہے اس میں نقلِ زماں
جو حجاب اس میں تو ظہور اس میں، مٹ مٹ کے عیاں، رک رک کے رواں
تخئیل کی یہ رعنائی ہے، اک شعبدۂ پیدا پنہاں
جو چیز بھی پیدا ہو جائے رہتی ہے ابد تک جلوہ کناں
ہستی کا نہ تار کبھی ٹوٹے، رکتی نہیں سیرِ روحِ رواں
عنصر ہوں وہ یا ہوں سبزہ و گل، یا وحش و طیر ہوں یا انساں
پتی جو ذرا سی گر جائے ہوتی ہی نہیں بے نام و نشاں
موجود سدا موجود رہیں تا جملہ نہایاتِ دوراں
تحلیل ہے ماضیؔ حاضر میں، ہر چیز بہ ہیئت جسم و جاں
دراصل بہار دائم ہے اور یونہی برائے نام خزاں
پیدائشِ ہر موجود کٹھن، مٹنے کا نہیں کوئی امکاں
اک ظرف لامحدود جہاں، یکجا ہیں یہاں سب خورد و کلاں
اک راہ کہ راہِ پیچاں ہے، اس رہ پہ رواں افتاں خیزاں
اس راہ میں گو تخریب بھی ہے تعمیر کے بھی ہیں سب عنواں
پھر کیوں ہو سلیماں سرگرداں؟ پھر کیوں ہو ملکِ سبا ویراں؟

---

[1] "سیریلزم" کے مشہور جدید نظریئے کی طرف اشارہ ہے
[2] ناکارگی (ENTROPY) کے نظریئے کی روشنی میں جو جدید سائنس کا ایک معروف نظریہ ہے۔

★

”شمع روشن بجھ گئی اور انجمن ماتم میں ہے!“

بابائے اردو، ڈاکٹر مولوی عبدالحق (مرحوم) : ۱۸۷۰ء — ۱۹۶۱ء

شانہ بہ شانہ صف بہ صف

ابوالاثر حفیظ

وحدتِ جمہور کے یہ روز و شب یہ ماہ و سال
اک حیاتِ نو ہے زیرِ پرچمِ نجم و ہلال

شاد باد اے ارضِ پاکستان اے پیارے وطن
اے ہماری غیرتِ ملّی کے گہوارے وطن

ہم غلامی کے لئے مجبور تھے تیرے بغیر
بتکدے میں تھے، خدا سے دور تھے تیرے بغیر

کھو چکی تھی زندگی آزاد ملّت کا مقام
شودریت مل رہی تھی اور ذلّت کا مقام

ایک دودِ آہ مظلومی کے سینے سے اُٹھا
ساتھ ہی اک ابرِ رحمت بھی مدینے سے اٹھا

رایتِ اسلام اُبھرا کفر کا سایا گیا
نورِ جاں کو نار سے آزاد فرمایا گیا

چند گنتی کے مجاہد قائدِ اعظم کے ساتھ
خون کے دریا سے نکلے ہمیں پرچم کے ساتھ

ذوقِ وحدت کثرتِ اُمّت کو حاصل ہو گیا
قطرہ دریا بن گیا۔ موجوں سے واصل ہو گیا

تو ہے ملّت کے لئے احسانِ داور اے وطن
مال۔ جان۔ اولاد سب تجھ پر نچھاور اے وطن

چشمِ بد سے تیری جانب کوئی دیکھے، کیا مجال
ہم تو اپنی انگلیوں سے اسکی آنکھیں لیں نکال

ملک و ملّت کی حفاظت جوشِ ایمانی کے ساتھ
یہ شرف ملتا نہیں انساں کو آسانی کے ساتھ

اے وطن۔ دیکھ اپنے فرزندانِ ملّت کی طرف
بڑھ رہے ہیں آج سب شانہ بہ شانہ صف بہ صف

گھاٹیاں طے ہو رہی ہیں منزلِ مطلوب کی
ہر قدم مشکل کشا ہے رہبریِ ایّوب کی

ستارۂ صبح

قائد اعظمؒ نے مسلمانانِ ہند کے نصب العین اور سیاسی امنگوں کو ایک معین شکل، مقصدیت اور سمت عطا کی۔

سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد مسلمانانِ برِصغیر ابتری، انتشار اور تباہی کا شکار ہو چکے تھے، وہ تاریکی میں گھر چکے تھے۔ انیسویں صدی میں سرسیدؒ کے ہاتھوں جو شمع روشن ہوئی تھی، بیسویں صدی کے وسط میں اسے قائد اعظمؒ نے اپنے ہاتھوں میں لے کر ہمیں راہ دکھائی اور ایک منتشر ابنوہ کو منظم قوم بنا دیا۔

خلفائے راشدہ کے عہد کے بعد کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ کسی فردِ واحد نے اتنے زبردست طوفانِ حوادث کا مقابلہ کرنے کے بعد اپنے بھائیوں کے لئے اتنا کچھ حاصل کرلیا ہو۔

مگر پاکستان کا قیام ان کے میدانِ عمل میں صرف پہلا قدم تھا۔ پاکستان قائم ہونے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد خود انہوں نے اس باب میں فرمایا تھا کہ "اپنے لئے ایک مملکت کا قیام صرف وسیلہ تھا، ایک نصب العین کے حصول کا۔ ہمارا تصور تو یہ تھا کہ ایک ایسی مملکت کو وجود میں لائیں جو ہمارے قومی مزاج اور ثقافت کی آئینہ دار ہو۔"

اب ہمارا شرف اسی میں ہے کہ اُن کے نصب العین اور ہدایات کے مطابق اس مملکت کی تعمیر کا کام تازہ تر ولولۂ عمل کے ساتھ شروع کریں۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان

نشانِ عزمِ عالی شان

(قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ)

سید ضمیر جعفری

ارضِ پاکستان کی طرح قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ بھی ہماری ساری قوم کے عزمِ عالی شان کا نشان ہیں۔ ہمارے محبوب بانیٔ ملت، ایک پیکرِ آب و گل، ایک زندہ انسان کی حیثیت سے ذاتی و ملی عزمِ عالی شان کا نشان تھے، اور اب ایک زندۂ جاوید انسان کی شکل میں بھی بدستور اس عزم کا غیر فانی نشان ہیں۔ اپنی زندگی میں وہ ایک فردِ بشر تھے، لیکن اب وہ ایک مثال ہیں، ایک کارفرما قوت، ایک زبردست حرکیاتی اثر، ایک دائمی سرچشمۂ انقلاب۔ اور یہی نشان یہی قوت، یہی اثر، یہی انقلاب ہے، جو آج بھی ان کی دلچسپی و اہمیت کو برقرار رکھتا ہے۔ ہمیں ہر انقلاب کے بعد، انقلابِ تازہ تر پر آمادہ کرتا ہے۔ اور اس طرح ہماری حیاتِ ملیہ میں ایک متحرک عنصر، ایک رواں دواں کیفیت پیدا کرتا ہے۔
اگر ہم آج اتنا عرصہ گذر جانے کے باوجود، ان کی طرف رجوع کرتے ہیں، تو اس کا سبب کوئی کورانہ رجال پرستی نہیں، بلکہ حرکت، زندگی، انقلاب ہی کا وجدانی احساس ہے، جو ان کی ذاتِ گرامی سے تازہ بتاز نو بہ نو فیضان حاصل کرنے کی یاد دلاتا ہے۔ وہی تپش و حرارت کا احساس جو ایک براق و آتشیں وجود کے ساتھ مَس کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔

اور پھر۔ اس قرب میں وہ پروانوں جیسی خام گرمجوشی نہیں، بلکہ دھیما دھیما سوز ہے، جیسے ہم کسی شوریدگی یا وارفتگی کے جذبۂ بے اختیار کے تحت نہیں، جس میں سنجیدگی کو کم ہی دخل ہوتا ہے، بلکہ شعور کے ٹھہرے ٹھہرے معتدل احساس کے ساتھ اس کی شخصیت کی طرف رخ کرتے ہیں۔ تاکہ اس کا حقیقی، حیات افروز جوہر اخذ کریں۔ وہی جو ہمیں بیش از بیش شدت کے ساتھ ان کی انقلابی روح سے روشناس کراتا ہے۔

میرے خیال میں اب یہی روش مناسب بھی ہے کہ بانیٔ ملت کے اس متحرک پہلو پر زور دیا جائے۔ ان کے حالات و سوانح بڑی حد تک ہمارے سامنے آ چکے ہیں اور وہ ہمارے لئے ہر اعتبار سے درسِ بصیرت ہیں، اس حد تک دانش و حکمت کا ذریعہ، ایک بیدار مغز مدبر و سیاست داں کی زندگی ہمارے لئے دلچسپی اور رہنمائی کا باعث ہو سکتی ہے۔ مگر جس انسان کی فطرت میں انقلاب کا آتشیں مادہ پنہاں ہو اور ہر وقت اپنے قریب آنے والوں کو ہنگامہ آفرینی پر آمادہ کرے، وہ ہر دور میں تمام انسانوں کے لئے مستقل اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی فطرت کے کیمیاوی جوہر ہمارے لئے نقل و حرکت اور انقلاب آرائی کی مستقل دعوت ہیں۔

انقلابی فطرت کی نمایاں خصوصیت یہ ہوتی ہے، کہ وہ جامد نہیں ہوتی۔ وہ کسی نقطے یا مقام پر پہونچ کر رک نہیں جاتی۔ فاؤسٹ نے ابلیس کے ساتھ یہی عہد و پیمان کیا تھا کہ اگر میں کسی رنگین لمحہ کی رعنائیوں سے مسحور ہو کر یہ کہہ دوں کہ تو ٹھہر جا، تو میری روح تمہاری ملکیت ہوگی ــ ایسی فطرت کبھی زنگ آلود نہیں ہو سکتی۔ اس میں حرکت ودوانی کا عنصر برابر کارفرما رہتا ہے۔ اور جیسے جیسے حالات بدلتے اور نئے نئے تقاضے رونما ہوتے ہیں، اس کے نئے نئے پہلو نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔

ہم اس میں نئی نئی قدروں کا سراغ پاتے ہیں بعینہٖ خلائی سیارچوں کی طرح جن میں ایک مقام تک پہنچنے کے بعد کوئی نیا شتابہ نئی حرکت پیدا کرتا ہے اور اسے اور بھی تیزی اور بھی شدت کے ساتھ، بلند سے بلند تر مدارج طے کرنے کی

تحریک دلاتا ہے۔ قائد اعظم کی شخصیت کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ انہوں نے اپنے حینِ حیات میں عزمِ عالیشان کی نشاندہی کی۔ ان کی شخصیت کا دوسرا اور زیادہ اہم پہلو یہ ہے کہ وہ برابر نئے نئے عزائم عالیشان کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ اور قوم کو نئی نئی کامیابیوں کی راہیں دکھا رہے ہیں۔ ان کی مجاہدانہ فطرت بدستور زندہ ہے، اور ہمیشہ زندہ رہے گی ــ

اس کی بیّن علامت ہمیں اپنے موجودہ انقلاب ہی میں دکھائی دیتی ہے، جس میں بابائے ملّت کا جذبہ وجوش اور فہم وتدبر دونوں کام آئے۔ حالات اس سے زیادہ تشویشناک صورت اور کیا اختیار کر سکتے تھے۔ وہ افرادِ ملّت میں قربِ فرق آمیز اور ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی، اس کا نتیجہ ہر اعتبار سے خوفناک تھا۔ ہمارا نوزائیدہ ملک ان گوناگوں خرابیوں کا شکار ہو کر بڑی تیزی سے تباہی و بربادی کی طرف بڑھا جا رہا تھا لیکن عین وقت پر بابائے ملّت کی توانا روح ایک نئے سربراہِ قوم کی شکل میں نمودار ہوئی تاریخ نے خود کو دہراتے ہوئے ایک انقلاب تازہ کی شکل اختیار کی اور ہم گذشتہ تین ایک سال میں دیکھ ہی چکے ہیں کہ اس انقلاب کی بدولت ہماری قومی زندگی میں کیا کیا معجزات بروئے کار آئے ہیں۔ ہماری ملّت کی افسردہ رگ و پے میں کیسے خونِ حیات دوڑ رہا ہے، اور ہم پھر ایک نئے جوش و خروش کے ساتھ، کس طرح، ہنگامہ زارِ ہستی میں صبا رفتار ہو گئے ہیں، اور صرف یہی نہیں، انقلاب کا زور ختم نہیں ہوا، بلکہ برابر بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ اس نے ایک پرزور تحریک کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ایک اور نشاۃ الثانیہ، ایک تعمیری جذبہ، ایک تخلیقی شعور، یہ نئی تحریک روحانی بھی ہے اور مادی بھی۔ وہی جس کو بانیٔ انقلاب فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں، بار بار جوہری دور کا آہنگ قرار دیتے ہیں۔ اور اسلام کی حقیقی روح کو اپناتے ہوئے، دین و دنیا دونوں کو فروغ دینے پر اصرار کرتے ہیں، کیونکہ یہی دونوں باتیں پہلے بھی اسلام کے عظیم الشان عروج و ترقی کا باعث ہوئیں۔ اور اب بھی اسلام اور پیروانِ اسلام کے عروج و ارتقائے مسلسل کی ضامن ہیں۔ مزید برآں یہ جدید تحریک اور بھی انقلاب کی نوید دیتی ہے۔ کیونکہ جب بھی حالات نامساعد صورت اختیار کریں گے، بابائے ملّت کی روح پھر نمایاں ہوگی اور جمود کو حرکت میں تبدیل کر دے گی۔ ہماری ملّی بقا کی اس سے زیادہ خوش آیند علامت اور کیا ہو سکتی ہے۔

بندۂ مومن کی بہترین تعریف یہی ہے کہ وہ فولاد کی طرح سخت اور آبریشم کی طرح نرم ہو۔ ہمارے بابائے ملّت بعینہٖ اس کا مصداق تھے۔ وہ کسی پہاڑ کی بلندیوں پر اگنے والے شاہ بلوط کی طرح بلند و توانا تھے اور سخت بھی، وہ شاہ بلوط جو لچکنا اور جھکنا نہیں جانتا اور یہی اس کی قوت اور مضبوطی کی علامت ہے۔

آج ہمیں ان امور کی مثالیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں جن میں قائد اعظمؒ "یکتائے روزگار" تھے۔ ان کے کارہائے نمایاں ہم سب کے سامنے ہیں۔ ضرورت ان کی طرف محض بار بار بازگشت کی نہیں، بلکہ ان کو عملاً اختیار کرنے اور شمعِ راہ بنانے کی ہے۔ اب جب کہ ایک اور قائدِ ملّت نے ہمیں اس کا دوبارہ ثبوت بہم پہنچا دیا ہے ہمیں لازم ہے کہ ہم بھی ان کی ہدایت کے تحت اپنے اپنے ظرف اور صلاحیت کے مطابق قائد اعظمؒ بنیں۔ اگر ہماری قوم میں ایسے بلند آہنگ، بلند مشرب، بلند کردار، اور سنجیدہ و بیدار مغز انسانوں کی اکثریت ہو جائے، اور حکیم ملّتؒ نے تمام نوعِ انسان کی رہنمائی کے لئے کچھ ایسے ہی انسانوں کی اکثریت کا تصور کیا تھا، تو ہم بآسانی ہر مرحلۂ دشوار سے گذر جائیں گے اور ہر کڑی سے کڑی مہم کو بھی بآسانی سر کر سکیں گے۔ خدا کرے ہماری ملّت اس احسن ترین صورتِ حال سے روشناس ہو۔

★

میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات صرف اُس اسوۂ حسنہ پر چلنے میں ہے جس کا راستہ شارعِ اسلام نے ہمیں بتایا۔ ہمیں چاہیئے کہ اپنی جمہوریت کی بنیاد یں صحیح معنوں میں اسلامی تصورات اور اصولوں پر استوار کریں۔

(قائد اعظمؒ)

آزاد نظم کے سراغ میں*

(۳)

رفیق خاور

یہ مضمون حقائق و شواہد پر مبنی ہے۔ اس لئے اگر کوئی صاحب حالات پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے مجھ سے اختلاف کریں تو مجھے بڑی مسرت ہوگی۔ کیونکہ مدعا تمام تر تلاش حقیقت ہی ہے۔ (ر۔خ)

اب نئی پود کی طرف آئیے جو اپنے ہی طور پر ایک اور طرف سے اس منزل کی طرف گام زن ہوئی۔ یہ پود مشترکہ اثرات کے تحت پروان چڑھی۔ اس زمانہ میں گورنمنٹ کالج کے ایک پروفیسر، مدن گوپال سنگھ نے انگریزی شاعری کا ایک بہت عمدہ انتخاب شائع کیا تھا جو بی، اے کے نصاب میں شامل تھا۔ اس میں زیادہ تر انیسویں صدی کے رومانوی شاعروں کا کلام تھا اور چند نظمیں رابرٹ برِوک کی بھی تھیں۔ یہ انتخاب ایک صاحب ذوق مشرقی نے اپنے ہم مزاج مشرقی طلباء کے لئے کیا تھا۔ اسلئے یہ بے حد شگفتہ اور ذوق افروز تھا۔ اور بہت مقبول ہوا۔ اس کی تمہید میں انگریزی شاعری کا ایسے پیرایہ میں تعارف کرایا گیا تھا جو دل میں گھر کر جائے اور نوجوان قارئین کے دلوں پر مستقل اثر چھوڑ دے۔ اس مجموعہ میں غالباً چند سانیٹ بھی تھے اور براؤننگ کی دو ڈرامائی نظمیں بھی جو اپنی انوکھی وضع کے باعث ایک خاص کیف رکھتی تھیں۔ ان نظموں کے نام یہ تھے "ایولائین ہوپ" "لاسٹ رائیڈ ٹو گیدر" اور "وَن ورڈ مور"۔ آخری نظم کا آہنگ بہت عجیب ہے اور ذہن کو نئی نہج پر سوچنے کی ترغیب دلاتا ہے تاکہ ہم بھی ایسی ہی انوکھی بحریں اور آہنگ تلاش کریں۔ ان دنوں ایم، اے (انگریزی) کے نصاب میں براؤننگ کی نظمیں شامل تھیں جن سے اس اثر میں اور بھی اضافہ ہوا۔ چنانچہ میں نے براؤننگ کی نظم (GRAMMARIAN'S FUNERAL) کا منظوم ترجمہ کیا۔ اس نظم کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کا نرالا آہنگ ہے۔ عام آہنگ کی بجائے گا تھک وضع کا تیکھا ٹیڑھا میڑھا آہنگ جس کی صدائے بازگشت ترجمہ سے بھی ظاہر ہے:۔

لے چلو اس کو نواز کو پر گاتے ہوئے — لے چلو — لے چلو اے دوستو!
اس نغت داں کے جسد پر پھول برساتے ہوئے — تا لحد — تا بہ ایوانِ ابد

اس سے ظاہر ہے کہ نوجوانوں کو نئے آہنگوں کی ترغیب کس قدر شدید تھی۔

مدن گوپال سنگھ کے مرتبہ انتخاب کے دو تین سال بعد اس کی جگہ ایک اور انتخاب شامل نصاب ہوا جو ہم سب کی نظر سے گذرا۔ یہ بھی گورنمنٹ کالج ہی کے رئیس شعبۂ انگریزی، مسٹر ایرک ڈکنسن[1] نے تیار کیا تھا۔ اس کی تمہید محض تعارف ہی نہ تھی بلکہ اس میں قارئین کو نفس شاعری اور اس کی صناعانہ سحر کاریوں سے روشناس کرانے کی بھی کوشش کی گئی تھی۔ اور اس کے ایمائی، محاکاتی اور جمالیاتی پہلوؤں کو خصوصیت سے اجاگر کیا گیا تھا۔ آخر میں جو نوٹ شامل تھے ان سے شعری ذوق کو جلا دینے میں اور بھی مدد ملتی تھی۔ درسیات، خصوصاً مغربی وضع کی تنقید سے ذہنی و ذوقی تربیت اس پر مستزاد تھی۔ چنانچہ کالج کی متعدد ادبی مجلسوں میں مقالے پڑھنے اور بحث و مباحثہ کا بازار گرم رہتا تھا۔ انگریزی کے اساتذہ۔ پروفیسر لینگ ہارن[1]، پروفیسر فرتھ، پروفیسر بخاری، مرزا محمد سعید (جن سے مجھے ایم۔ اے میں خصوصیت سے شرف تلمذ حاصل رہا

---

* اس مقالہ پر کسی ہے مضمون نگار کے اپنی طرف اتنا کا گمان ہو غالباً یہ قرینِ انصاف نہ ہوگا کیونکہ مضمون میں امور واقعہ ہی پر انحصار کیا گیا ہے۔ سخن گسترانہ بات اگر کہیں آگئی ہے تو اسے زیبِ داستاں ہی سمجھنا چاہئے یعنی غالب ادائے خاص کے ساتھ نکتہ سرا ہوا ہے اور بس۔
اگر کوئی صاحب مضمون نگار کے کسی بیان یا رائے سے اختلاف رکھتے ہوں تو اس کے اظہار کے لئے "ماہِ نو" کے صفحات ہر وقت حاضر ہیں۔ (مدیر)

[1] یہ دونوں انگریز اساتذہ عموماً کہا کرتے تھے کہ ان کا اردو ادب کی تاریخ میں ضرور تذکرہ ہوگا کیونکہ انہوں نے اپنے طلباء میں ایک خاص ذوق اور شعور پیدا کیا ہے۔ ان کا یہ دعویٰ صحیح ثابت ہوا ہے۔

ان بحثوں میں شامل ہوتے اور طلباء کے ذہن کو جلا دینے کی کوشش کرتے۔ کچھ تعلیم کی مخصوص نوعیت، جس میں تمام تر علوم جدیدہ اور روشن خیال آفاقیت پر زور تھا اور کچھ ان سرگرمیوں کے باعث طلباء کے ذوق و شعور میں کچھ ایسا نکھار پیدا ہوگیا تھا گویا یہ گورنمنٹ کالج نہ ہو کیمبرج ہو۔ ڈکنسن کے انتخاب میں ایک بے قافیہ نظم بھی شامل تھی۔ جو ہم پابند شاعری کے عادی نوجوانوں کو بڑی انوکھی معلوم ہوتی تھی۔ اور اسے دیکھ کر ہماری طبیعت بھی گدگداتی تھی کہ ہم بھی ایسی ہی نظمیں لکھیں۔ اس کے ساتھ ہی شیکسپیر کا اثر بھی تھا جو ساحری سے کسی طرح کم نہ تھا۔ کیونکہ اس کے ڈرامے ہمارے لئے ایک نئی چیز تھے۔ ایک حیرت آفریں انکشاف۔ اس ساحرِ فن سے ہمارا تعارف "جولیس سیزر" کے ذریعہ ہوا جو بوجوہ شیکسپیر کے ڈراموں میں غیر معمولی کشش رکھتا ہے۔ اور پڑھنے والوں کے دل و دماغ پر چھایا جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر ایم، اے (انگریزی) میں شیکسپیر کی معروف ٹریجڈیاں اور کومیڈیاں شامل تھیں۔ ایک ایسا اتھاہ کنڈ جس میں انسان پاؤں رکھے تو آگے، اور آگے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ گہرا اور گہرا ڈوبتا ہی چلا جاتا ہے۔

ان توضیحات کے بعد یہ بتانے کی ضرورت نہیں رہتی کہ اس زمانے میں ہم نوجوانوں کے چھوٹے چھوٹے ذہن کیا سوچ رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ فضا بعض نئی، تازہ تر اصناف کی نمود کے لئے بالکل تیار تھی۔ پہلے سے کہیں زیادہ مختلف طور پر کیونکہ ان کے محرکات ماحول میں رچے ہوئے تھے۔ اور اذہان کا رخ انہی کی طرف تھا، ساری فضا ایک نئے میلان سے بھرپور تھی۔ اور عین ممکن تھا کہ کوئی نئی صنف کسی وقت بھی معرضِ اظہار میں آجائے۔ یہ روشن، حرکی اور آزاد فضا آزاد شاعری کے لئے خاص طور پر موزوں تھی۔ کوئی بھی اس صنف کی جوت جگا سکتا تھا۔ اور کسی قسم کی اوّلیت کا دعویٰ کئے بغیر، یا یہ کہ کوئی ان کے سر اس کی ترویج کا سہرا باندھے جس نے بھی اس کی طرف رجوع کیا بطور خود کیا خواہ اس کی اپنی کوشش یا اسباب اسے یکساں شہرت دلانے میں کامیاب ثابت ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں کیسی سلسلہ کا باوا آدم کون تھا؟ کس نے سب سے پہلے کوئی بات کی؟ یہ چیٹک سب کو ہوتی ہے۔ لیکن جس فضا کی اوپر تشریح کی گئی ہے، اس میں پہلے یا بعد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ آج بھی یہ سوال زیرِ بحث ہے کہ میر و مرزا کے دور میں سب سے پہلے زبان و شاعری کی اصلاح و تجدید کا بیڑا کس نے اٹھایا۔ کیا وہ میر تھے یا سودا، یا قائم چاندپوری، سب کے سب اس کے دعویدار ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اوّلیت کا شرف ان سب کو حاصل ہے۔ یہ سب ایک ہی ناؤ کے سوار تھے، سب روحِ عصر کے مظہر، اس کی زبان، اس کے ترجمان۔ انہوں نے اپنے اپنے طور پر گردوپیش کے اثرات کو قبول کرتے ہوئے الگ الگ اس کام کا آغاز کیا بعینہٖ یہی کیفیت ہمارے اپنے دور میں بھی آزاد شاعری کے سلسلہ میں پیدا ہوئی۔ چنانچہ پروفیسر اختر انصاری نے اپنی خود نوشت ڈائری میں رسالہ "داستان" (لاہور) کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر خالد، راشد، اور راقم الحروف کا بالتفصیل تذکرہ کیا ہے اور استفسار کیا ہے کہ ان حالات میں آزاد نظم کی ترویج کس سے منسوب کی جائے۔

ن۔م۔ راشد (نذر محمد راشد) جو دو تین سال مجھ سے جونیر تھے اور ان دنوں اپنے ماموں، وحید گیلانی کی مناسبت سے خود کو راشد وحیدی کہتے تھے۔ (چنانچہ نسیم رضوانی۔ بعدہٗ ڈاکٹر باقر۔ نے اپنے تذکرۂ جدید شعرا میں جو انہی دنوں مرتب ہوا تھا، ان کی دو نظمیں اسی نام سے پیش کی تھیں۔ کالج میں آئے تو وہ یا غزل کہتے تھے یا بند لکھتے تھے۔ یعنی تین چار باقافیہ مصرعے اور ان کے بعد ٹیپ کا مصرع، جو ظاہر ہے روشِ عام تھی اور بڑی میکانکی روش۔ چنانچہ ان کی ایک ابتدائی نظم تھی:—

میں تیری یاد میں رہتا ہوں رات بھر بیدار

اسکے بعد دو اور ہم قافیہ مصرعے، اور پھر

تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لئے!

اس کی یار لوگوں نے یوں پیروڈی بنائی تھی:—

میں تیری یاد میں گنتا ہوں رات بھر تارے ....

انگارے .... لارے ......

تو میری چھت کو عطا کر ستوں خدا کے لئے!

(پیروڈی بھی خالص گورنمنٹ کالج کی پیداوار ہے۔ اور اس کا سلسلہ بہت دور جاتا ہے۔ پطرس اور دوسروں تک۔ خود مجھے اس کی ترویج میں خاصا دخل رہا) راشد نے اسی قسم کی طویل و مختصر بہت سی نظمیں لکھیں جن میں سے بعض "خیالستان" "بہارستان" یا "رومان" میں بھی شائع ہوئیں ("رومان" کا نام راقم الحروف ہی نے تجویز کیا تھا)۔ اس کے بعد وہ

سانیٹ کی طرف رجوع ہوئے جس کے دو نمونے "راوی" میں چھپے اور "ماورا" میں بھی شائع ہوئے۔ سانیٹ نویسی کا سبب کچھ تو انگریزی نصاب کے ذریعہ اس صنف سے شناسائی تھی، کچھ راشد کا ایسی میکانکی اصناف سے لگاؤ، اور کچھ یہ کہ انہی دنوں ایک شاعر ہنسراج کے کچھ سانیٹ "راوی" کے حصۂ انگریزی میں شائع ہوئے تھے جن میں سے ایک کا ترجمہ کالج ہی کے کسی شاعر نے کیا اور اگلی بار حصۂ اردو میں شائع ہوا۔ اس کے پہلے دو مصرعے یہ تھے:۔

فرصتِ لمحہ کاش اتنی بڑھے
پل سے دن، دن سے سال ہو جائے

راشد نے اپنے پہلے سانیٹ (جس کا عنوان "زندگی" تھا) کے ساتھ فٹ نوٹ میں "چودک" لکھا تھا۔ کیونکہ اس میں چودہ مصرع ہوتے ہیں۔ راشد کو اختر شیرانی کے ساتھ گہری عقیدت تھی۔ اسی لئے انہوں نے اپنی ایک غزل کے مقطع میں (جس کے پہلے مصرع کو میں قیاساً پیش کرنے کے لئے معذرت خواہ ہوں) "شاعرِ رومان" کے متعلق کہا تھا کہ:

راشد جو مجھ کو ایک نظر بھر کے دیکھ لیں
وہ اوج ہو کہ اوجِ ثریا کہیں جسے

اختر شیرانی بالطبع ہیئت پرست تھے، جیسا کہ میں نے مدت ہوئی اپنے ایک مضمون مطبوعہ "ادبی دنیا" میں بالتفصیل واضح کیا تھا۔ اسلئے وہ گویا اس صنف کے لئے چشم براہ تھے۔ اور انہوں نے اس کثرت سے سانیٹ لکھے کہ یہ صنف قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی کے دعوائے اولیت کے باوجود، جو انہوں نے ایک نجی گفتگو میں کیا تھا، آج تک انہی سے منسوب کی جاتی ہے۔ اس لئے کہ اس صنف کے ظہور کا پس منظر نگاہوں سے پوشیدہ رہا ہے۔ ایسے ہی غالباً یہ بھی معلوم نہیں کہ "ڈرامائی واحد کلامیاں" کیا ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر خالد نے انہیں "تنہا کلامی" کہا ہے۔ اگر یہ درست ہے تو پھر "سالِلوکی" کو کیا کہیں گے ؟) "ڈرامائی مانولاگ" کا یہ ترجمہ جو راشد ہی کی اپج کا نتیجہ ہے، ان کی ایک نظم، یا شاید مضمون مطبوعہ "راوی" میں فٹ نوٹ کے طور پر شائع ہوا تھا۔ اس سے براؤننگ کے اس غیر معمولی اثر کا پتہ چلتا ہے جو اسی زمانے کی تمام پود پر تھا اور ان دوسرے اثرات کی تائید بھی ہوتی ہے جن کی اوپر تشریح کی گئی ہے۔ اگر براؤننگ کی واحد کلامیوں کا اثر موجود تھا تو فری ورس اور بلینک ورس کا اثر بھی لازم ہے۔ اور شدید تر اثر۔ مزید یہ کہ راشد کی شاعری تب سے غنائیہ نہیں رہی بلکہ زیادہ تر ڈرامائی ہے۔ وہ اب بھی زیادہ تر "ڈرامائی واحد کلامیاں" ہی پیش کر رہے ہیں۔ اور پھر ایک پُر لطف بات اور۔ راشد بدل جانے کے باوجود بدل نہیں سکے۔ وہ کڑی قسم کی پابند ہیئت کا ذوق لے کر آئے تھے جو "بندات" اور سانیٹوں میں ظاہر ہوا۔ یہ ذوق ان کی طبیعت میں اس قدر راسخ ہو چکا تھا کہ ان کی آزاد شاعری میں بھی برقرار رہا۔ یعنی وہ آزاد ہونے کے باوجود پابند معلوم ہوتے ہیں۔ اور جو لوچ لچک، بے ساختگی، عناں گسیختگی آزاد شاعری میں ہونی چاہیے، وہ اس میں بڑی حد تک نایاب ہے (یہ تجریدی وضع "ماورا" سے بھی ظاہر ہے۔ جس کے مقابلے میں "اُس پار" کو راشد کچھ ایسا وقیع خیال نہیں کرتے) جناب مسعود حسین رضوی نے عظمت اللہ مرحوم کی "سریلے بول" کے مقدمہ میں راشد کے چند اشعار کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ وار بھرپور ہے چاہے ہم مانیں یا نہ مانیں۔ وہ اشعار یہ ہیں:

تو مرے عشق سے مایوس نہ ہو
کہ مرا عہدِ وفا ہے ابدی
تو مری شمع ہے میں سایہ ترا
زندہ جب تک ہوں کہ سینے میں تری روشنی ہے

حقیقت یہ ہے کہ ان میں وار بھرپور نہیں۔ اسلئے کہ پہلے تین مصرعے برابر لمبائی کے، الگ الگ سے مصرعے ہیں جو نہ ایک دوسرے کا آہنگ دوبالا کرتے ہیں اور نہ معنی و احساس میں شدت پیدا کرتے ہیں۔ وہ محض سپاٹ بیان ہیں۔ چوتھا مصرع بقدر فاعلاتن بڑھتا ہے لیکن آہنگ، معنی یا احساس کسی میں بھی اضافہ نہیں کرتا۔ اسی کو عام طور پر میکانیت کہا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر بیان کی وضع اقلیدسی ہے، اس میں ریاضی کا تعین زیادہ ہے اور ایمائیت عنقا،

ہر چند سبکدست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

یہ رگِ جاں میں پیوست گھٹن (جسے آج کل کے ناقد غالباً تحت الشعور کہیں گے) بعض اوقات بڑی شدت سے نمایاں ہو جاتی ہے۔ اس کی ایک عالی مثال وہ نظم ہے جو انہوں نے عرصہ ہوا حلقۂ ارباب ذوق، کراچی میں پڑھی تھی! "اے وطن اے جان"! اس میں وہ تین بار کہتے ہیں۔

میں نے یہ سیکھا ریاضی سے ادب بہتر بھی ہے برتر بھی ہے

ہم ریاضی اور ادب کو بھول کر
پھر ریاضی اور ادب کے ربط باہم کی طلب ہے روبرو

مگر حق یہ ہے کہ وہ ریاضی کو کبھی نہیں بھولے۔ وہ بیان و معنی میں ریاضی اور ادب کا ربط برابر ملحوظ یعنی روبہ در رکھتے ہیں جس کے باعث ان کی شاعری پر خطا طی کا گمان ہوتا ہے۔ وہ فن جس میں حسن کاری تمام تر حروف کی نوک پلک اور رعنائی و زیبائی پر مرکوز ہوتی ہے۔ اس لئے اس میں وہ پھیلاؤ نہیں پیدا ہوتا جو یک جہاں ایماد اشارہ ـــ جسے ایبر کرامبی نے "ان کینٹیشن" کہا ہے ـــ کا حامل ہو۔ ذہنی حیثیت سے بھی راشد کا رابطہ روحانی و وجدانی پچھلے دور ہی سے ہے۔ کیونکہ ان کا مشرب بدستور حکیمانہ ہے اور وہ زندگی پر ان معنوں میں تبصرہ کے قائل ہیں کہ شاعری میں مسائل ہی زیر بحث لائے جائیں۔ اور ان کو لغوی دلالت سے قریب بدیہی دلالت کی حامل علامات ہی سے ادا کیا جائے۔ مثلاً پیلہ ریشم۔ سلیمان۔ سبا وغیرہ جن کا ریاضی سے رابطہ ظاہر ہے۔

میں قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ یہ سب باتیں یادداشت ہی کے سہارے بیان کی جا رہی ہیں ـــ لیکن میرا خیال ہے "راوی" میں ۱۹۲۸ء یا ۱۹۲۹ء میں کچھ ایسی نظمیں شائع ہوئی تھیں جن کے مصرعے باقافیہ ہوتے ہوئے چھوٹے بڑے تھے۔ یہ آزاد شاعری کی طرف بڑھتے ہوئے میلان ہی کا نتیجہ تھا۔[1]

۳۲-۱۹۳۱ء میں جب ن۔ م۔ راشد "راوی" کے ایڈیٹر تھے فیض بھی سامنے آئے۔ چنانچہ نومبر ۱۹۳۱ء میں ان کی نظم "خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو" شائع ہوئی تھی۔ جون ۳۴-۱۹۳۳ء میں آغا عبدالحمید کی ایک آزاد نظم بعنوان "شکایت" شائع ہوئی۔

ترا وہ
حسن سے مجبور کر جانا
کہ میں
سرشار راتوں کی جوانی کو
حسین دردوں کی
لذت میں گھلا ڈالوں
ستاروں کی پریشان چھاؤں میں
برباد رہنے دوں
وہ گم نالے
جو بے آواز اٹھتے ہیں

یہ بات خاص اہمیت رکھتی ہے کیونکہ آغا صاحب کو شعر گوئی سے برائے نام ہی مَس رہا ہے۔ اور انہوں نے شاعری تو کیا پریم چند یا رسم الخط پر ایک آدھ مضمون کے علاوہ نثر میں بھی کم ہی کاوش کی ہے۔ اگرچہ انہیں شعر و ادب کا اچھا خاصا ذوق ضرور رہا ہے۔ ایسے شخص کے آزاد نظم لکھنے سے ظاہر ہے کہ آزاد شاعری کالج کی فضا میں کس قدر رسی بسی ہوئی تھی۔ اور میں نے اوپر جو کچھ کہا ہے وہ ایک عینی شاہد ہی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایسے فرد کی حیثیت سے کہا ہے جو خود ان سرگرمیوں میں شریک رہا اور ایک پُرجوش مبلغ کی طرح ان کو سمت و رُخ اور فروغ عطا کرنے میں شدت سے کوشاں رہا۔ ۳۴-۱۹۳۳ء بلکہ غالباً ۱۹۳۸ء تک جب راشد کی دو مشہور نظمیں "ادبی دنیا" میں شائع ہوئیں اور جن سے دنیائے ادب میں ہمہمہ پیدا ہوا، اس کی غالباً کوئی نظم کسی معروف رسالہ میں شائع نہیں ہوئی۔ اس لئے دوسرے شاعروں کا ان کے ذریعہ آزاد نظم سے روشناس ہونا خارج از بحث ہے۔ فری ورس کے ذوق و شوق کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہو گا کہ مئی۔ جون ۱۹۳۴ء میں "راوی" کے حصۂ پنجابی میں بھی "آوارہ" کے قلم سے "موجاں پنجاب دیاں" کے عنوان سے ایک آزاد نظم شائع ہوئی۔ ایسی ہی ایک اور نظم "قادری قدرت" تھی جو ایک اور پنجابی شاعر، گیانی نے لکھی۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس وقت تک یہ صنف خاصی مقبول ہو چکی تھی۔ اس سال جنوری ۱۹۳۴ء میں فیض کی بے قافیہ نظم "مجھے دے دے رسیلے ہونٹ معصومانہ پیشانی" شائع ہوئی۔ جو براؤننگ ہی کی ایک نظم کا ترجمہ ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ آزاد شاعری کے سلسلہ میں راشد کی حیثیت امام فن یا بانی مبانی کی نہیں۔ لوگ اس صنف میں آگے بھی بہت کچھ لکھ چکے تھے۔ ہاں کالج کے حلقہ سے نکل کر آزاد نظم جب ایک وسیع تر حلقہ میں آئی۔ اور یہ ان کی دو تین نظموں کی اشاعت سے ہوا۔ تو باہر کے

---

[1] اس کے بعد جو معلومات پیش کی گئی ہیں وہ میری فرمائش پر جناب جیلانی کامران نے "راوی" سے فراہم کر کے حق شاگردی ادا کیا ہے۔ (د۔ خ)

(اس سلسلۂ تلمذ میں اور بھی کئی نام آتے ہیں ـــ عبدالعزیز خالد، سید رضی ترمذی، ناصر کاظمی، جعفر طاہر وغیرہ (مدیر)

لوگوں کے لئے یہ اچنبھے کی چیز تھی اور غیر معمولی کشش کی حامل بھی۔ کیونکہ انہیں پہلی بار "سکہ بند" شاعری سے گریز کی صورت نظر آئی۔ خیالات اور بیان کے تیور بھی نئے اور سرسری رومانیت کے حامل تھے۔ "آ مری جان دریچے کے قریب"۔ "اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے" اور سب سے زیادہ خوابوں کے جدید نفسیاتی نظریئے سے بھی دانشور طبقہ کے اذہان سے کھیلا گیا تھا۔ جن میں یہ خیال رسا بسا ہوا تھا۔ وہ پہلا شاعر تھا جس کی آزاد نظموں کا مجموعہ اردو میں شائع ہوا اور جس میں اقبال کے تصوّراتی رنگ میں زندگی اور اس کے مسائل سے اعتنا کیا گیا تھا۔ اس لئے اس کی آواز نئی ہوتے ہوئے مانوس اور آسانی سے قابلِ فہم اور قابلِ قبول بھی تھی۔ اس کے ذریعہ قارئین آزاد نظم سے ایک نمایاں شکل میں روشناس ہوئے۔ جو پابند شاعری، خصوصاً غزل پر ایک شدید حملہ تھی۔ اس لئے اس کا چرچا ہونا لازم تھا۔ نئی صنف کے پرچار کی حیثیت سے "ماورا" کا اختصاص ہمیشہ رہے گا۔ کیونکہ اس نے آزاد نظم کا نقش پوری طرح بٹھا دیا اور اسے اردو کی ایک مسلم صنف کی حیثیت عطا کر دی۔ اس میں راشد کے حلقۂ احباب کی کوششیں بھی شامل رہیں۔ جو اس وقت دنیائے ادب میں نمو حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور تاثیر، فیض اور کرشن چندر سب باہم چار یک ایک دوسرے کے تعاون سے قبولِ عام کی راہیں ہموار کر رہے تھے۔ ایسے کہ جو اوج ایک کا ہے.... کے تقاضے بھی ملحوظ رہیں۔ یہ حلقہ جس طرح دنیائے ادب و صحافت، ریڈیو اور دوسری جنگِ عظیم میں دفتری و ملکی شعبوں پر بھی چھا گیا اور اپنے تابعین کے ذریعہ اب تک اہم حلقوں پر متصرف ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ صرف ستواتر کر دینا اور ضروری ہے کہ ان ادبی مہم کوشوں کی صف میں پرانے پہلے سورما۔ پطرس، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت اور ابوالاثر حفیظ بھی شامل تھے۔ بعد میں جب امرتسر میں ایم۔ اے۔ او کالج قائم ہوا، جس کے سربراہ تاثیر اور فیض تھے تو نہ صرف لاہور کے نمونے پر جدید شعر و ادب کا ایک نیا مرکز قائم ہوا بلکہ اس حلقہ کا سلسلہ اور آگے بڑھا۔

جس گروہ کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے اس میں ابتداءً راشد اور راقم الحروف ہی شامل تھے۔ دوسرے لوگ بعد میں آئے۔ چنانچہ میری آزاد نظم سے وابستگی بھی اسی فضا ہی کا نتیجہ تھی اور قدرتی طور پر اس صنف میں میری کاوشوں کا آغاز بھی اسی زمانہ میں ہوا۔ ہیملٹ کا ڈراما ہیملٹ کے بغیر مکمل ہونا معلوم، اس لئے ذاتی تذکرے سے گریز کے باوجود اس حقیقت کو نمایاں کرنا ہی پڑتا ہے۔ رسالہ "ہماری دنیا" (۳۳-۱۹۳۲ء) میں میری اپنی آزاد نظمیں شائع ہوئیں۔ یہ رسالہ میری ہی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔

"ادبِ لطیف" کے افسانہ نمبر میں جو غالباً ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا تھا میرا ایک طویل بیلڈ "رود جمنا کے کنارے بن میں" شائع ہوا تھا جس کی ہیئت اس ٹیپ کے مصرعے کے باوجود آزاد تھی۔ اس "شاہکار" میں جو ان دنوں علامہ تاجور نجیب آبادی مرحوم کی زیرِ ادارت شائع ہوتا تھا، ایک مبسوط تحسین آمیز مضمون بھی چھپا تھا۔ ایک کتاب "گیاندھی نامہ" میں جو غالباً ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی تھی، اور ظاہر ہے اس سے بہت پہلے تصنیف ہوئی ہوگی، راون کے سروں کی پانچ چھ صفحات پر مشتمل "بلینک ورس" میں تقریریں ہیں۔ اتنی ابتدائی نظمیں ظاہر ہے کسی کے اثر کا نتیجہ نہیں ہو سکتیں۔ ہاشمی بکڈپو لاہور کی شائع کردہ کتاب "قلوپطرہ" میں میری ایک طویل آزاد نظم شامل تھی۔ یہ کتاب تیسری دہائی میں ہی شائع ہوئی۔ اسی زمانہ میں ہاشمی بکڈپو نے ڈرامہ "شاہجہاں" بھی شائع کیا جس میں پھر ایک آزاد نظم موجود ہے۔

قصۂ زلفِ بتاں یہیں اور آگے بڑھیں تو بلینک ورس ہے جس کی نوعیت، غرض و غایت اور لوازمات کے متعلق ہمارے یہاں اب تک لاعلمی ہے۔ ہر زبان میں ایسی بحر یا بحروں، صنف یا اصناف کی ضرورت ہوتی ہے جو خاص مقاصد کے لئے موزوں ہوں، مثلاً ڈرامہ، رزمیہ، بیان، خطابت۔ ظاہر ہے کہ عام بحریں رزمیہ کے لئے موزوں نہیں ہو سکتیں اور نہ طویل بیان یا تقریر کے لئے۔ ایسے ہی ڈرامہ میں بے تکلف مکالمہ اور تقریر کی ضرورت بنیادی ہے۔ اور یہ دونوں باتیں اس طرح ادا ہونی چاہئیں کہ ان میں متانت و سطوت بھی برقرار رہے اور آزادی بھی۔ انگریزی بلینک ورس کا مابہ الامتیاز یہی ہے۔ وہ شعریت سے پوری طرح مملو ہوتے ہوئے نثر کی طرح سیال بھی ہے۔ ہم اسے جس سانچے میں بھی ڈھالنا چاہیں یہ ڈھل جاتی ہے۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ جذبات کی عکاسی کے لئے شاعری ہی موزوں ہے۔ اور پھر ڈرامہ جیسی صنف کے لئے جس کا سروکار تمام تر جذبات سے ہے۔ لیکن ڈرامہ زندگی کی

عکاسی بھی کرتا ہے۔ اس لئے مکالمہ یا تقریر ایسی ہونی چاہیئے کہ وہ اصلیت کا وثوق پیدا کرے۔ جیسے کوئی حقیقی کردار فی الحقیقت بول رہا ہو۔ اگر اس کے حقیقی ہونے پر ذرا بھی شبہ گذرے گا تو اس کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ لہٰذا بحر زیادہ سے زیادہ لچکیلی اور ہیئت زیادہ سے زیادہ سیال ہونی چاہیئے۔ یعنی نہ اس میں ارکانوں کی ضرب نمایاں ہو اور نہ مصرعے آخر میں جا کر رک جائیں۔ آہنگ مخفی ہو نہ کہ نمایاں۔ اور پھر بندش میں ایسی سہولتیں ہونی چاہئیں کہ ارکان کی تعداد میں کمی بیشی بھی ہو سکے اور ان میں ردوبدل بھی۔ جیسے ہمارے یہاں مختصر پیمانے پر زحافات میں ہوتا ہے اور جس کی مثال عبدالعزیز خالد کی "تسکین اوسط" میں نظر آتی ہے (اثر لکھنوی اس کے لئے کوئی اور ادق سا نام تجویز کرتے ہیں) یا پھر مصرعوں کو پھیلایا اور سکیڑا بھی جا سکے۔ علاوہ بریں بحر کو یکساں بھی ہونا چاہیئے تاکہ اس سے نظم و ضبط اور وقار نمایاں ہو۔ چھوٹے بڑے مصرعے ثقاہت کے منافی ہیں اور غنائیت ہی کے لئے موزوں۔ دوسرے بلینک ورس اور فری ورس میں کوئی ما بہ الامتیاز بھی لازم ہے۔

ظاہر ہے کہ ان تمام مقاصد کے لئے نہ تو بہت ہی چھوٹی بحر موزوں ہو سکتی ہے نہ زیادہ لمبی۔ اب یہ فنی جوہر پر موقوف ہے کہ ہم کس حد تک ایسا ذریعۂ اظہار پیدا کرنے میں کامیاب ثابت ہوتے ہیں۔ انگریزی میں "آئی ایمبک" نامی پنج رکنی بحر ان تمام مقاصد کے لئے خاصی موزوں ثابت ہوئی ہے۔ دوسری یکساں وزن کی بے قافیہ نظمیں بلینک ورس نہیں کہلاتیں اور نہ اصولاً انہیں بلینک ورس تسلیم کرنا چاہیئے۔ لہٰذا سرور الملک نے شیکسپیئر کے جواب میں جو بلینک ورس پیش کی تھی اس پر کسی طرح اس صنف کا اطلاق نہیں ہو سکتا بلکہ یہ محض تک بندی ہے۔ اس کا نمونہ یہ ہے :-

کل ہم پانی بھرنے گئے تھے
باغ میں ہم کو ترک ملا
وہ آگے بڑھے ہم پیچھے ہٹے
پھر اس نے کہا ہم چپکے رہے
جب سندر نے مکھ گھونگٹ کاڑا
ترک نے اپنے دل کو سنبھالا
روتا رہا وہ گھر کو پھرے ہم

اسی طرح عظمت اللہ نے "پپا پائپرز" کے جس ترجمہ کو بلینک ورس کہا ہے وہ قطعاً بلینک ورس نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو :-

نہ کہیئے کہ ننھا سا ہے واقعہ
اسے آپ ننھا کہیں کس لئے
بڑا واقعہ آپ کہتے ہیں جس کو
تو کیا اس کے ہوتے گذرنے کے کارن
اٹھانا پڑا دکھ کسی کو زیادہ

اس میں بھی دو مصرعے چھوٹے ہیں اور تین بڑے۔ یہی کیفیت ان تمام نظموں کی ہے جو بلینک ورس کی مثال کے طور پر پیش کی گئی ہیں۔ بے شک یہ ضروری نہیں کہ ان مقاصد کے لئے جو بحر یا صنف اختیار کی جائے وہ بعینہٖ انگریزی کا نمونہ ہو۔ اگر ہم اس کا اپنی زبان کی صلاحیت کے مطابق کوئی یکساں یا غیر یکساں بدل پیدا کر سکیں تو زہے قسمت! لیکن اول تو ہم ایسا کر نہیں سکتے اور جو کوششیں اس سلسلہ میں ہوئی ہیں وہ ذرا بھی تنقید کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ اور دوسرے جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے، غیر یکساں آزاد شاعری میں ثقاہت کا فقدان پایا جاتا ہے۔ مثنوی کو رزمیہ یا بیان کے لئے برتنے پر بنیادی اعتراض یہ ہے کہ اس کے ہر مصرعے کے آخر میں توقف ہوگا جس سے میکانیت پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ میرے فاضل دوست شان الحق حقی نے "انٹونی کلوپٹرا" کا جو ترجمہ کیا ہے اپنے محاسن کے باوجود مثنوی ہے، ڈرامہ نہیں۔ اور یوں لگتا ہے جیسے شیکسپیئر نے میر حسن کا روپ دھار لیا ہو۔ حیدرآباد دکن میں عابد نواز جنگ نے شیکسپیئر کے ڈراموں، ہیملٹ اور میکبتھ کو اردو میں منتقل کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ ایسی نظم ہے جس میں اصل کی ہر اعتبار سے روح مفقود ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ خاصا کٹھن ہے اور اسے بڑی احتیاط اور سوجھ بوجھ کے ساتھ، مسلسل تجربوں ہی سے حل کیا جا سکتا ہے۔ کیا خبر کب کسی جوہر قابل کا وجدان صحیح راستے پر پڑ جائے اور وہ کوئی موزوں بحر اور صنف دریافت کرے۔ راقم الحروف کی توجہ اوائل عمر ہی سے اس مسئلے پر مرکوز رہی ہے چنانچہ اس قسم کی ایک کوشش کا تذکرہ پیچھے کیا جا چکا ہے۔ مرآون کے دس سروں میں سے پہلا سر یوں گویا ہوتا ہے :-

اب آنکھیں بند کر لو | رات کی ہیبت فزا ظلمت
رخ دنیا پہ چھاتی ہے | ملائک طائر بسمل

کی صورت گرنے والے ہیں زمیں پر سرنگوں ہو کر
کہ میرا سرا مہیب و شعلہ وش سر آتش کا سر ہے!!

اس میں اول، بحر ہزج کی نمایاں ضربوں کو حتی الامکان دبانے اور ایک مسلسل آہنگ میں سمو دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ جملوں میں حسب موقع ٹھہراؤ ہے۔ مصرع آخر میں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ عبارت، نفس مضمون اور آہنگ سب دوسرے مصرع یا مصرعوں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ بعض مصرعے حرف اضافت یا جار سے دفعتہً شروع ہوتے ہیں، جو ہمارا دستور نہیں ہے۔ یہ خصوصیت سے راقم الحروف کی اپج تھی جس پر شروع شروع میں بہت لے دے بھی ہوئی لیکن بعد میں خود معترضین نے بھی اس کو اپنایا اور اب یہ بات عام ہو چکی ہے۔

اس دوران میں جو بحریں آزمائی گئیں اور جو نتائج حاصل ہوئے ان کا تذکرہ میں پھر کبھی کروں گا کیونکہ یہ تجربہ و تحقیق کا ایک علاحدہ باب ہیں۔ اور اردو میں مستقل حیثیت بھی رکھتے ہیں اور منفرد بھی ہیں۔ بحر حال کو ڈرامہ کے لئے آزمانے کی کوششیں مدتوں جاری رہیں۔ اور اب بھی ان کا سلسلہ جاری ہے۔ چنانچہ ان کے کتنے ہی نمونے "ماہ نو" اور دیگر رسائل کے ذریعہ سامنے آ چکے ہیں۔ بلینک ورس میں اردو کا اولین ڈرامہ "جہانِ نو" کوئی تیس برس پہلے حلقۂ ارباب ذوق، لاہور میں پڑھا گیا تھا جس کا تذکرہ اس کی روئداد میں محفوظ ہے۔ اس کے بعد حلقے ہی میں دو اور منظوم ڈرامے بھی پڑھے گئے۔ اور ہوتے ہوتے ان کی تعداد پچیس کے لگ بھگ پہنچ گئی۔ یہ اور میری متعدد تصانیف فرقہ وارانہ فسادات کی نذر ہو گئیں۔ منظوم ڈراموں (جن میں پانچ چھ سو آزاد نظمیں بھی تھیں) میں سے ایک "آئی رُت تو اپھولن کی" ماہنامہ "شاہکار" کے "بہار نمبر" (۱۹۴۷ء) میں شائع ہوا۔ "زندہ رود" اسی طرح کا ایک اور ڈرامہ ہے۔ جو "ماہِ نو" بابت ستمبر ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اب بھی ان ڈراموں اور تجربوں کا سلسلہ جاری ہے۔

سعدی نے تو یہی کہا ہے کہ دو بادشاہ ایک اقلیم میں نہیں سما سکتے، جس طرح دو تلواریں ایک نیام میں نہیں سما سکتیں، لیکن حق یہ ہے کہ دو چیزیں شاعری اور تنقید اور نظم و نثر بھی ایک جگہ نہیں سما سکتیں۔ اگر ایک سمائے گی تو دوسری نہیں سما سکے گی۔ یہی میرے سلسلے میں بھی ہوا ہے۔ میرا چرچا زیادہ تر نقاد کی حیثیت سے ہوا۔ چنانچہ میری پہلی تصنیف "خاقانی ہند" ہی تھی۔ اس کے بعد دوسری کتاب جس کا چرچا ہوا، "اقبال اور اس کا پیغام" تھی جس کے متعلق مولانا عبد المالک آروی نے اپنی تصنیف "اقبال کی شاعری" میں اقبال پر اہم و مستند کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ "یہ مختصر سی کتاب کہنے کو تو اقبال کی شاعری اور فلسفہ پر ایک انتقادی حیثیت رکھتی ہے لیکن شروع سے آخر تک آپ اسے پڑھ لیں تو آپ کو مصنف کے ادبی ذوق اور بدلیعۂ انشا کا بھی اعتراف کرنا پڑے گا۔۔۔ کتاب کی زبان بے حد شگفتہ اور عبارت میں بہت زور اور روانی ہے۔ اور اقبال کے افکار و احساسات کے تمام گوشوں پر مجمل تنقید کی گئی ہے"۔

اس سے کہیں پہلے کنہیا لال کپور نے جو ڈرامہ "غالب جدید شعرا کی محفل میں" کے عنوان سے لکھا تھا، اس میں "رفیق خوگر" کو اسی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ جس کا قلم آزاد نظم کی تنقیدی مہم کے لئے وقف تھا۔ اور ایام شباب کی پوری شوریدہ سری کے ساتھ جو قدرتی طور پر اپنے ساتھ مخصوص ردعمل یا خمیازہ بھی لائی۔ یہ لے ممکن ہے زیادہ طویل ہو گئی ہو لیکن اس سے اتنا ظاہر ہے کہ آزاد شاعری کے متعلق کوئی آخری رائے اسی صورت میں قائم کی جا سکتی ہے جب اس سے متعلق تمام افراد کی جملہ کاوشیں سامنے آ جائیں۔ اور ان کی شخصیتیں اور کام اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ پوری طرح اجاگر ہو جائیں۔ یہ وقت ابھی تک نہیں آیا اور شاید اس میں ابھی کافی دیر لگے۔

قیام پاکستان کے بعد آزاد نظم کچھ اور آگے بڑھی ہے۔ عبدالعزیز خالد ڈراموں کے لئے بلینک ورس میں برابر تجربے کئے جا رہا ہے۔ اور اس سلسلہ میں خاصا بد نام بھی ہو چکا ہے۔ اور اس کے ساتھ "تسکین اوسط" بھی جس کا ارباب نکتہ داں میں کافی چرچا ہوا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں اب مرے راز داں اور بھی ہیں، یعنی بلینک ورس کا "مسئلہ" اب بعض اذہان میں سما چکا ہے اور وہ اسے حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اس کے علاوہ آزاد نظم نے ایک اور روپ بھی دھارا ہے۔ "اسپیکنگ ورس" یعنی ایسی نظم جو گفتگو کی وضع لئے ہوئے ہو۔ بہت ہی رواں دواں، بے تکلف قسم کی نظم جو ایک بڑے کھلے قسم کے آہنگ کے ساتھ نثر کی طرح کافی ڈھیلی ڈھالی ہو۔ مغرب کی ایک اور اپج جس کا نمونہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے یہاں نظر آتا ہے۔ رضی ترمذی، جیلانی

کامران اور راقم الحروف (ملاحظہ ہو ترجمہ "ویسٹ لینڈ" مطبوعہ ماہنامہ "ادب" کراچی) کے ذریعہ یہ صنف بھی اردو میں فروغ پا چکی ہے۔

ادھر ہاپکنس کا "جستہ آہنگ" (SPRUNG RHYTHM) کا تجربہ بھی ایک نئی چیز ہے۔ جس کے کچھ نمونے اردو میں لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگرچہ یہ چیز ایسی ہے کہ اس کا اردو میں من و عن منتقل ہونا ناممکن ہے۔ اس لئے کہ انگریزی عروض کی بنیاد (ACCENT) پر ہے۔ عزیز احمد نے ناول نگار ہونے کے باوجود سمبولسٹ شاعری کا تصور پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ ساری باتیں آزاد نظم کے سلسلہ کو بہت دور لے گئی ہیں اور موضوع میں اس قدر وسعت پیدا کر دیتی ہیں کہ ان پر سرِ دست گفتگو کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ چنانچہ میرآجی جیسی اہم شخصیت پر بھی کچھ نہیں کہا جا سکا۔ تاہم جو کچھ کہا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ آزاد نظم کسی اتفاق، عجز، تقلیدِ محض یا اپج کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک خاص فضا کی پیداوار ہے جو نسبتہً جدید تر حالات میں پیدا ہوئی تھی اور برابر موجود ہے۔ یہ صنف اب ہمارے ادب، ہماری روایت کا جز بن چکی ہے۔ اُسی طرح جس طرح غزل اور دیگر اصنافِ سخن۔ اس کا حال بھی ہے اور مستقبل بھی۔ چونکہ یہ ایک فضا کی پیداوار تھی، اس لئے اس کا شعور مختلف اذہان میں خود بخود ابھرا اور یہی مناسب ہوگا کہ اس کی داغ بیل رکھنے والے شعرا کو فرداً فرداً اس کے آغاز و ترویج کا حقدار سمجھا جائے۔ کسی فردِ واحد کو میرِ کارواں قرار دینے کی خواہش شاید روشناس تسکین نہ ہو سکے اور نہ وہ قرینِ مصلحت ہی ہے۔

آخر میں یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ محض کسی صنف کے آغاز سے اس کا صحیح تصوّر اور پیشکش بدرجہا زیادہ اہمیت رکھتی ہے خصوصاً نظم معرّا میں جس کی بنیادی شرط صرف قافیہ و ردیف سے آزادی ہی نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ اہم خصوصیات ہیں۔ شاعر کی دشواریاں قافیہ و ردیف کو ترک کرنے کے بعد پیدا ہوتی ہیں جن سے عہدہ برآ ہونا نہایت دشوار ہے۔ اگر اسے اس صنف کے تقاضوں، اس کے لوازمات کا صحیح شعور نہ ہو تو اُس سے کہیں بدتر اور شدید تر میکانیت پیدا ہو جائیگی جو پابند شاعری میں پیدا ہوتی ہے اور جس سے وہ دامن بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لحاظ سے اُن عناصرِ اربعہ کی آزاد نظم کا مطالعہ جو اس صنف کی ترویج سے بالخصوص وابستہ رہے، دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوگا کہ آزاد نظم کوئی یکساں، معیّن یا مستقل چیز نہیں کہ اس کی صرف ایک ہی وضع، ایک ہی نمونہ ہو۔ یعنی چھوٹے بڑے یا برابر مصرعے۔ بلکہ اس مشترک خصوصیت کی تہہ میں نشست و ترتیب، دروبست، لب و لہجہ، لوچ لچک، اندازِ تصوّر وغیرہ میں بے انتہا فرق پایا جاتا ہے جس سے تقریباً ہر ممتاز شاعر کی آزاد نظم ایک اور ہی چیز معلوم ہوتی ہے۔ ڈاکٹر خالد، راشد، میرآجی، راقم الحروف، سب کا اپنا اپنا منفرد انداز ہے جس پر اپنے سوا اور کسی کی چھاپ نہیں اور نہ کسی سے اثر پذیری کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ یہاں پر چراغ خود بخود جلتا ہے، کسی اور چراغ سے جلایا نہیں جاتا۔ لہٰذا آغاز کا سہرا کسی کے سر باندھنا شوق کی حد تک صحیح مگر عملاً شوق نارسا ہی رہے گا۔

بابائے اردو کے انتقال سے ہم علم و ادب کے ایک سچے پرستار سے محروم ہو گئے ہیں جو اپنے مقصد کے حصول کے لئے ایک چٹان کی طرح جما رہا۔ مرحوم مولوی صاحب برصغیر کی پوری ایک صدی کی مسلم ثقافت کی نشانی تھے۔ ہمارے درمیان سے اُن کا اُٹھ جانا ایک عظیم ادارہ کا ختم ہو جانا ہے۔

ذاتی طور پر میں محسوس کرتا ہوں کہ میں ایک قابلِ احترام دوست سے محروم ہو گیا۔ اپنے مقصد سے انہیں جو گہرا لگاؤ تھا میں ہمیشہ اس سے فیض حاصل کرتا رہا ہوں۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں

"مظہرِ نورِ خدا"

(حضرت داتا گنج بخشؒ)

شاہ محمد عبدالغنی نیازی

فاضل مضمون نگار کی تصنیف "قرآنی تصوف اور اقبالؒ" اسلامیات و اقبالیات میں ایک اہم اضافہ ہے جس پر ہم اگلے شمارہ میں نظر ڈالیں گے۔ اس مضمون کو، جو کسی قدر ترمیم کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے، اس سلسلے کی ایک کڑی تصور کرنا چاہئے۔ (ادارہ)

یہ نکتہ میں نے سیکھا ابوالحسن سے

کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے

خبر نہیں اس میں علامہ اقبالؒ کا اشارہ کس بوالحسن کی طرف ہے۔ اگر یہ بزرگ حضرت شیخ ابوالحسن علی ہجویری لاہوری ہوں تو کچھ عجب نہیں کیونکہ اقبال نے اور بھی کئی جگہ اس عارف کامل کا تذکرہ کیا ہے اور وہ لاہور کو دیارِ پیر سنجر ہی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جہاں انہیں درمان دردِ ناشکیبائی میسر آتا ہے۔ اس لئے کہ ان کی نظر میں اس شہر کی نسبت اسی جلیل القدر ولی اللہ ہی سے ہے جن کی شان اقدس میں خواجۂ خواجگاں سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ نے وہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے جو تمام اہلِ حال کی لوحِ دل پر منقش ہو گئے ہیں:

گنج بخش ہر دو عالم مظہرِ نورِ خدا

ناقصاں را پیرِ کامل، کاملاں را رہنما

ایک ایسی یکتائے روزگار ہستی کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلیں اور ہمیشہ کے لئے صفحۂ زمانہ پر ثبت نہ ہو جائیں! یہی وجہ ہے کہ وہ پیرِ کامل جو خواجۂ اجمیرؒ[1] ایسے کامل کے لئے رہنما ثابت ہوا، اور جس کے مزار اقدس پر انہوں نے چلہ کھینچا تھا۔ اسی وقت سے "گنج بخش" ہی کے نام سے معروف ہے اور وہ بزرگ جو فیضِ روحانی و وجدانی کے باعث گنج بخش کے القاب سے ملقب ہوا اُسے "داتا" ہی کا لقب زیبا ہے — اسی لئے عام و خاص کی زبان پر ان کا نام محض "گنج بخش" نہیں بلکہ "داتا گنج بخش" ہے اور ان کا مزار مرجعِ عوام ہوتے ہوئے "داتا کا دربار" کہلاتا ہے۔ یہاں صرف ایک احتیاط ضروری ہے۔ یہ کہ گنج بخش کو ظاہری معنوں پر محمول کرنا غلطی ہوگا جیسا کہ عام طور پر سمجھ لیا گیا ہے چنانچہ خلقِ خدا جوق در جوق ان کے مزار پر اسی غرض سے حاضر ہوتی ہے اور مرادیں مانگتی ہے لیکن خواجہ اجمیریؒ نے تو انہیں روحانی حیثیت سے "گنج بخش" کہا تھا اور "کشف المحجوب" کے مصنف کے لئے یہی فیضِ معنوی شایانِ شان ہے۔ وہ دنیائے عرفان کے تاجدار تھے اس لئے ان کا دربار بھی ایک روحانی پیشوا ہی کا دربار تھا۔

معنوی حقائق سے ناواقفیت، ظاہر پرستی، تنگ نظری، خود رائی، نفسانیت، احساس کمتری، اور خود اپنے شاندار امتیازات خصوصی کو مٹا کر اغیار کی بے روح نقالی، ایسے امراض ہیں جن کے باعث ملتِ اسلامیہ ہی کا شیرازہ منتشر نہیں ہوا بلکہ غور سے دیکھا جائے تو ان امراض نے ساری دنیائے انسانیت کو ہمیشہ مبتلائے آلام رکھا ہے۔ ان ذہنی و قلبی عوارض کے علاوہ ہماری آرام پسندی (جس میں ہم تسخیرِ ہند کے بعد مبتلا ہوئے) نے ہمیں ایسا غافل کر دیا کہ ہم پُرفن چالاک مغربی اقوام کی ریشہ دوانیوں کا بہ آسانی شکار ہو گئے۔ ہمارے سطحی علوم جنہیں ہم عرصۂ دراز سے حاصل کر رہے ہیں، اور ہماری سیاسی و اقتصادی مشکلات نے، جو زمانۂ حال کی بین الاقوامی سیاسی و معاشی پیچیدگیوں کا نتیجہ ہیں، برعظیم پاک و ہند میں ہماری قومی تباہی کی تکمیل کر دی، ہمارے دینی مزاج کے تار و پود بکھیر دئے، ہمارے معاشرے کے اسلامی خد و خال مٹا دئے، ہماری فکر و نظر کے پیمانے بدل دئے، ہماری اسلامی امتیازی خصوصیات کو خاک میں ملا دیا، اور ہماری حقیقی دولت جو خدا و رسولؐ کی نظر میں محبوب ہے یعنی اشدّ حبّاً للہ کے رنگ کی اسلامی زندگی، ہم سے چھین لی اور ہمیں غیروں کی نقالی کو اصل مقصدِ حیات سمجھنے پر مجبور کر دیا۔ بالفاظ دیگر ہماری گذشتہ چند صدیوں کی غفلت نے ہماری روح وجدانی ہم سے چھین لی اور ہمیں اس خیال پر قانع کر دیا کہ ہمارا جسدِ بے جان ہی حقیقت میں جاندار ہے۔

یہاں روح سے ہماری مراد وہی اسلامی خصوصیات ہیں جو ہمارے پُرعظمت ماضی کے آئینے میں جھلک رہی ہیں اور جن کی

[1] خواجہ معین الدین چشتیؒ

عمل تصویر امت محمدی کے صالحین و صادقین کے علم و فضل، ان کے عمل و کردار اور ان کی سیرتِ حسنہ ہی کے آئینوں میں نظر آتی ہے۔ اسے شخص پرستی کہنا بھی وہی اغیار کی بے روح نقالی ہے جس نے اس حقیقت کو ہمارے دل و دماغ سے محو کر دیا ہے کہ جو قوم اپنے درخشاں ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کر لیتی ہے وہ جلد تباہ ہو جاتی ہے۔ اسی لئے اقبال نے پیرنجر کی زبانی کہا تھا کہ ؎ شکایت تجھ سے ہے اے تارکِ آئینِ آبائی اور یہ کہ ؎

نرا اے قیس کیونکر ہو گیا سوزِ دروں ٹھنڈا
کہ لیلیٰ میں تو باقی ہیں وہی اندازِ لیلائی

ہم اپنے بزرگوں کے حالات میں اپنا گم شدہ خزانہ تلاش کرتے ہیں، ان کے اصولوں کی روشنی میں اپنی زندگی کی اصلاح کرتے اور ان کے علم و عمل کے آئینوں میں روحِ اسلام کا نظارہ کر کے اپنی منزلِ حیات کا تعین کرتے ہیں۔ کیونکہ اسلام اور اسلامی زندگی کے معنی دیگر اقوامِ عالم کی غیر مشروط نقالی نہیں بلکہ توحید و رسالت اور اسلامی ثقافت کے میدانوں میں ان کی رہنمائی ہے۔ اگر ہم مسلمان ہی ملتِ اسلامیہ کے امتیازی نشانات کو اپنے علم و عمل سے نمایاں نہ کر سکے تو کنتم خیر امۃ کی سند کب اور کس طرح شرمندۂ معنی ہو سکتی ہے۔

ہر باخبر کو اس امر کا اعتراف ہے کہ ہندوستان و پاکستان میں فقرا و مشائخ اسلام ہی نے اسلام کی معنوی شوکت و عظمت قائم کی اور اسے اپنی عملی تبلیغ سے اس برِعظیم میں استوار و برقرار رکھا۔ اس لئے ان کے حالات کا تذکرہ تاریخِ ہند و پاکستان کا انتہائی اہم حصہ ہے۔ نہ کہ صرف بادشاہوں اور حکمرانوں کی لڑائیوں اور رحانہ جنگیوں کی داستان۔ اسلام ایک مخصوص مزاج اور ایک خاص قسم کا اخلاقی و روحانی نظام قائم کرنے کے لئے دنیا میں آیا ہے جس کا خلاصۂ مقصد یہ ہے کہ تمام انسانی برادری منشاءِ الٰہی کے تابع رہ کر ایک طرف تو جتنی چاہے مادی ترقی کرے اور باہمی طور پر امن و مساوات کی زندگی بسر کرے، اور دوسری طرف ارتقاءِ روحانی حاصل کر کے مقربِ الٰہی بن جائے۔ صلحائے امت نے ہمیشہ اسی کی تبلیغ کی ہے اور افرادِ امت کو غلط راہ پر چلنے سے روکا ہے۔

بزرگانِ دین کے دلچسپ اور سبق آموز حالات اور ان کے علم و عمل اور سیرتِ حسنہ میں زندگی کے نہایت بیش قیمت بنیادی اصول مل جاتے ہیں، جن پر عمل کر کے آج بھی اسلامی معاشرہ کی خاطر خواہ اصلاح ہو سکتی ہے۔ وہی حقیقت جسے آج ہمارے بیدار مغز سیاسی رہنما فیلڈ مارشل محمد ایوب خان بھی بہ اندازِ دگر ذہن نشین کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حضرت داتا گنج بخش لاہوری کی کتاب کشف المحجوب اور ان کی عملی داستانِ زندگی دونوں تقریباً ایک ہزار سال سے ملتِ اسلامیہ کی اصلاح کا سامان پیش کر رہی ہیں۔ لیکن بہت کم ایسے خوش قسمت افراد ہیں جو ان خزانوں سے خاطر خواہ استفادہ کرتے ہوں۔ بہر حال "گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را" پر عمل کیا جائے تو افرادِ بشر یقیناً فیض سے محروم نہ رہیں گے۔

آج حضرت داتا گنج بخش لاہوریؒ کی تعلیمات و خدمات کو سمجھنے اور ان کے نظریات کی بنیادوں پر اپنی انفرادی و اجتماعی کوششوں کی عمارت کھڑی کرنے کی اشد ضرورت ہے تاکہ موجودہ دور کی ترقیوں کے ساتھ ساتھ ہماری زندگیوں میں بنیادی اسلامی رنگ بھی جھلکتا رہے یہی صورت اسلام اور ملتِ اسلامیہ کی صحیح شوکت و عظمت کی ضامن ہو سکتی ہے نہ کہ اقوامِ مغرب کی کورانہ تقلید یا اسلام کی من مانی توضیح۔

زباں سے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
قوموں کی تقدیر وہ مردِ درویش
جس نے نہ ڈھونڈی سلطاں کی درگاہ

حضرت شیخ ابوالحسن علی ہجویریؒ غالباً ۴۰۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں ہجویر اور جلاب میں قیام رہا، جو مضافاتِ غزنی میں دو گاؤں ہیں۔ اس لئے ہجویری و جلابی کہلاتے ہیں۔ زندگی کا آخری حصہ لاہور میں گذرا یہیں ۴۶۵ھ میں انتقال فرمایا اور مدفون ہوئے۔ اس لئے لاہوری مشہور ہیں۔ نسباً آپ سید حسنیؓ ہیں۔

یہ پیرِ کامل اپنے مرشد شیخ ابوالفضل بن حسن ختلیؒ کے حکم سے دینی و روحانی تبلیغ کے لئے وطنِ مالوف کو خیرباد کہہ کر لاہور میں ہمیشہ کیلئے مقیم ہو گئے۔ وہ اپنی بیش بہا تصنیف کشف المحجوب میں ایک جگہ فرماتے ہیں "میری کتابیں غزنی میں رہ گئی تھیں اور میں ہندوستان کے شہر لاہور میں، کہ مضافاتِ ملتان سے ہے، ناجنسوں کے درمیان گرفتار رہتا"۔

اس طرح تبلیغِ دین و روحانیت کے لئے اپنے مرشد کے حکم سے ترکِ وطن کرنا، کفرستان میں تبلیغی مرکز قائم کرنا۔ ناجنسوں میں گرفتار رہ کر آج سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے کے ہندوستان میں نورِ اسلام پھیلانا۔ آخری دم تک یہی فریضہ انجام دیتے رہنا اور بالآخر پردیس میں ہی

انتقال کرکے مدفون ہونا، حضرت داتا صاحبؒ کا ایسا زریں عملی کارنامہ ہے جسے مثالی کہنا چاہیئے اور جس کی تقلید ہر مبلغ اسلام اور تمام تبلیغی انجمنوں اور اداروں کو کرنا چاہیئے۔

فقرائے اسلام کے تبلیغی نظام میں مرکزیت (مرشد کی ذات) اس سے والہانہ محبت، اطاعت، برداشت مصائب صرف خدا کی خوشنودی کے لئے، تنظیم یعنی نصاب تعلیم کا مرکز کے تابع رہنا، ضبط و نظم یعنی محبت کی بنیاد پر مرکز کی پرخلوص اطاعت، اور عملی تربیت گاہوں یعنی خانقاہوں کا قیام جن میں مسجد، مدرسہ اور دارالاقامہ، سب کچھ ہوتا تھا نہایت اہم، منظم اور فعال عناصر کی حیثیت رکھتے تھے۔

داتا صاحبؒ کے حالات، ان کی تصانیف، اور ان کی خانقاہ میں اس نظام تبلیغ کی زندہ شہادتیں موجود ہیں۔ مذکورہ نظام اور صاحب خانقاہ کی دینی، روحانی اور عملی شخصیت ہی ان کی کامیابی کے خاص اسباب تھے۔

حضرت داتا صاحبؒ کی ظاہری استعداد علمی کی تفصیل کہیں نہیں ملتی لیکن بقول مولانا عبدالماجد دریا بادی کشف المحجوب خود اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ اس کا مصنف علم باطن کے علاوہ علوم ظاہری پر بھی وسیع نظر رکھتا ہے بعض تذکروں میں اجمالاً صرف اتنا ہے کہ جامع بود میان علوم ظاہر و باطن۔ اور اتنا تو یقیناً صحیح معلوم ہوتا ہے۔

کشف المحجوب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے علوم ظاہری و باطنی حاصل کرنے کے لئے اس زمانہ میں جبکہ سفر کی سہولتیں نہ تھیں، تمام اسلامی ممالک کا سفر کیا اور تقریباً تین سو اساتذہ سے استفادہ کیا جن کا ذکر وہ بڑی محبت اور تعظیم سے کرتے ہیں۔

طریقت اور روحانیت میں مرشد حضرت ابوالفضل محمد بن حسن ختلیؒ تھے جن کی فرمانبرداری وہ آخر دم تک کرتے رہے۔ اور جا بجا ان کا ذکر نہایت شاندار الفاظ میں کیا ہے۔

داتا صاحب کا ارشاد ہے کہ "ظاہر بغیر امتزاج باطن کے منافقت ہے اور باطن بغیر شمول ظاہر کے زندقہ شریعت کا ظاہر بلا باطن نقص اور باطن بلا ظاہر ہوس ہے۔" علم حقیقت کے تین رکن بتاتے ہیں ایک علم ذات خداوندی، توحید و نفی تشبیہ، دوسرے علم صفات و احکام خداوندی، تیسرے علم افعال و حکمت افعالِ خداوندی۔ علم شریعت کے لئے بھی تین رکن ہیں۔ ایک کتاب، دوسرے سنت، تیسرے اجماع امت۔ ان الفاظ سے علوم ظاہری و باطنی کی باہمی نسبت اور اہمیت ظاہر ہے۔ اور قوم کے لئے اِن میں بے شمار ہدایتیں پوشیدہ ہیں۔

داتا گنج بخش سلسلۂ جنیدیہؒ میں منسلک تھے اس سلسلے کے تصوف و طریقت کے ماخذ کیا ہیں؟ خود حضرت سید الطائفہ جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں "ہم نے تصوف کو قیل وقال کے ذریعہ سے حاصل نہیں کیا ہے بلکہ گرسنگی، ترکِ دنیا اور ترکِ مرغوبات و مالوفات سے حاصل کیا ہے (یہاں ترکِ دنیا سے مراد وہی "ترکِ ہوسِ دنیا ہے اور ترکِ ثانی سے مراد تزکیۂ نفس) ہمارا سارا طریقہ کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ کا پابند ہے۔ جو شخص کلامِ الٰہی اور حدیث رسولؐ کا عالم نہیں اس کی تقلید طریقت کے باب میں درست نہیں۔ اس لئے کہ ہمارے اس سارے علم (سلوک) کا ماخذ قرآن و حدیث ہے"

اس کا ثبوت نہ صرف حضرت داتا صاحبؒ کی تصنیف بلکہ عملی زندگی کے ہر اقدام سے ملتا ہے۔ اسلامی تصوف کو قرآن و سنت سے ماخوذ نہ سمجھنے والوں کے لئے ان بزرگانِ سلف کے اقوال سے زیادہ اور کس کی سند اہم ہو سکتی ہے۔ اسی لئے علامہ اقبالؒ ان بزرگوں کے مسلک کو "جمال" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اس کی حفاظت کے لئے قوت اور سیاسی اقتدار کو ضروری سمجھتے ہیں:

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنیدؒ و بایزیدؒ تیرا جمال بے نقاب

حضرت داتا صاحبؒ کی تصانیف میں سے اب صرف کشف المحجوب باقی ہے اور ان کے تمام حالات اسی سے ماخوذ ہیں۔ یہ کتاب فارسی میں اسلامی تصوف اور صوفیائے متقدمین کے حالات میں پہلی مستند کتاب ہے۔ جو برعظیم ہند و پاکستان میں لکھی گئی ہے۔ لاہور سے اس کا ترجمہ مولوی فیروز الدین صاحب کے قلم سے

اردو میں شائع ہو چکا ہے۔ یورپ میں بھی اصل کتاب اور اس کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ تصنیف اسلامی فقر و تصوف اکابر قدماء مثلاً اصحاب صفہؓ، خلفائے راشدینؓ بلکہ خود حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم، اہلِ بیت اطہارؓ، اکابر اسلام، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے مسلکِ فقر و تصوف کے بیان میں اعلیٰ ترین سند کا درجہ رکھتی ہے۔

اس کتاب کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے محققانہ و مجتہدانہ انداز سے اپنے ذاتی تجربات، مجاہدات اور مکاشفات قلمبند کئے ہیں۔ اس کے علاوہ مباحث سلوک پر رد و قدح بھی کی ہے جس سے غلط عقائد کی تردید ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے "کشف المحجوب" کی حیثیت ایک مستند محققانہ تصنیف کی ہے۔

کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلا تاریخی و تنقیدی ہے اور دوسرے میں عملی مسائل سلوک کی تشریح کی گئی ہے۔ پہلے حصے یعنی علم ظاہری و باطنی کی باہمی نسبت اور فقر و تصوف کے ماخذ پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

دوسرے حصے میں گیارہ حجابات قرار دے کر ایک ایک حجاب اٹھایا گیا ہے۔ اور اہم عملی مسائل تصوف کی توضیح کی گئی ہے۔ مثلاً معرفتِ الٰہی، توحید، ایمان، طہارت و توبہ، صلوٰۃ و زکوٰۃ، سماع وغیرہ۔ ان موضوعات سے متعلق ظاہری احکام نہیں بلکہ ان کی حقیقت اور معنویت بتائی گئی ہے۔ ہر باب میں کئی کئی فصلیں ہیں اور ہر فصل میں مختلف فرقوں کے عقائد پر محاکمہ کیا گیا ہے۔ حضرت ہجویریؒ کے خیال میں معرفت علم اور عقل سے حاصل نہیں ہوتی۔ ورنہ ہر عالم و عاقل عارف ہوتا۔ یہ محض اللہ کی عنایت ہے۔

فرماتے ہیں کہ جب سالک کو توحید کا علم بدرجۂ اتم حاصل ہو جاتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ خدا ایک ہے، جو فصل اور وصل کو قبول نہیں کرتا کیونکہ فصل و وصل دو وجودوں کا متقاضی ہے، وہ قدیم ہے، محدود نہیں یکین نہیں جس کے لئے مکان ہو۔ عرض نہیں جس کے لئے جوہر ہو۔ وہ کوئی طبع نہیں کہ اس کے لئے حرکت و سکون ہو، وہ کوئی روح نہیں کہ اس کے لئے بدن ہو۔ وہ قوت اور حال نہیں کہ اور چیزوں کی جنس ہو۔ اس کی ذات و صفات میں کوئی تغیر نہیں وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک طہارت کا تعلق ہے وہ ظاہری بھی ہے باطنی بھی۔ طہارتِ ظاہر سے مراد بدن اور کپڑوں کا پاک ہونا ہے جس کے بغیر نماز درست نہیں۔ اور طہارتِ باطن سے مراد دل کا پاک ہونا ہے۔ جس کے بغیر معرفت حاصل نہیں ہو سکتی۔

توبہ کیا ہے باطن کی طہارت۔ اس کی تین شرطیں ہیں (۱) خدا کے حکم کی مخالفت پر افسوس (۲) یہ مخالفت فوراً ترک کر دی گئی ہو (۳) اس کی طرف لوٹنے کا خیال بھی نہ آئے۔ اس کے علاوہ توبہ کی اقسام اور ندامت وغیرہ پر طویل بحثیں ہیں۔ نماز ظاہری نہیں بلکہ حقیقی کا بلیغ تصور ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے کہ جسم عالم ناسوت میں ہو اور روح عالم ملکوت میں۔ اسی طرح روزہ، حج، زکوٰۃ، آداب سالک اور سماع کی حقیقت اور شعائر کی بجاآوری کی ضروری شرطیں بیان کی گئی ہیں۔

ان مختصر حقائق و بصائر سے ظاہر ہے کہ حضرت داتا صاحب قدس سرہ العزیز واقعی "گنج بخش ہر دو عالم" ہیں۔ ان کے مقرب الٰہی ہونے کا زبردست ثبوت یہ ہے کہ آج تک لاکھوں قرآن پاک کی تلاوت کا ثواب ان کی روح پاک کو ایصال کیا جا چکا ہے اور روزانہ یہی سلسلہ جاری ہے۔ ان کی روح پر فتوح سے اکتساب فیض کرنا تو خاص اہلیت رکھنے والے مردان خدا کا حصہ ہے۔ تاہم عام انسانوں کے انفرادی و اجتماعی امراض دور کرنے کے لئے ان کے علم و عمل، ان کی حیات آفریں تصنیف کشف المحجوب، ان کی محنت و مشقت، ان کے تجربات و مجاہدات اور ان کی سیرت حسنہ میں بے شمار مجرب نسخے موجود ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ ہم خلوص کے ساتھ ان کا استعمال کریں۔ ضدی مریض کو طبیب حاذق کی ذات بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی بلکہ اس کی خود رائی اس کی ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے۔ ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ ہماری تمام مشکلات کا سرچشمہ ہمارے امراض قلب ہیں اور ان کا علاج داتا صاحبؒ جیسے روحانی طبیبوں ہی کے پاس مل سکتا ہے۔ اسی لئے علامہ اقبالؒ نے بھی ان کے زمرہ میں شریک ہونے کی یوں دعا کی ہے:

عطا اسلاف کا سوز دروں کر
شریک زمرۂ لایحزنون کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

★

افسانہ:

اندیشہ ہائے دور و دراز

عنایت اللہ

میں بھٹکا ہوا راہی ہوں، راہوں میں آ کھڑا ہوتا ہوں۔

اور تم کہتے ہو میں آوارہ ہوں۔

میں اس گھر سے بھاگا ہوا ہوں جہاں مجھ جیسے سات بچے میری ہی طرح ماں کے پیار اور باپ کی شفقت کی تلاش میں پاگل ہو رہے ہیں۔ وہ اپنے ماں باپ کے جیتے جی یتیم ہو گئے ہیں لیکن میں اپنے سات بہن بھائیوں میں سب سے بڑا یتیم ہوں۔ وہ دور مجھ پر آسیب کی طرح سوار ہو گیا ہے۔ کیا سہانا دور تھا وہ جب میں ماں باپ کا اکلوتا بچہ تھا۔ گھر بھر میں اپنی بادشاہی تھی۔ ماں گود سے اتارتی تھی تو باپ کندھے سے لگا لیتا تھا۔ کھلونوں کا انبار لگا رہتا تھا۔ میں ان کھلونوں کو توڑ پھوڑ دیتا تھا جس طرح آج میری اُمنگیں ایک ایک کر کے مسلی جا رہی ہیں۔ باپ نئے کھلونے لا دیا کرتا تھا۔ میری ہر فرمائش اور ہر ضد بلا تاخیر پوری ہوتی تھی۔

چھ برس تک میں اکلوتا ہی رہا اور زندگی ماں کی گود کی راحت میں اٹھکھیلیاں کرتی رہی۔ ماں کے ریشمی کپڑوں کے ملائم ملائم حس میں کوئی ایسی راحت تھی جیسے میں بادل کے سفید ٹکڑے پر اڑا جا رہا ہوں۔ ماں جب لوری گنگناتی تھی تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے رات بھر کی جاگی ہوئی کوئی پری کہکشاں پہ دھیمے سروں میں آسمانوں کا گیت الاپ رہی ہو۔ اور میں اس الاپ کے ہلوروں میں گہری نیند سو جاتا۔

اس نیند کا خمار آج بھی میرے ذہن پر طاری ہے۔ اس راگ کا الاپ آج بھی میرے ذہن کے ہو حق ویرانے میں گونج رہا ہے۔ ماں کے ریشمی کپڑے اور اس کا آغوش آج بھی مجھے بے خود کئے ہوئے ہے۔ اس خمار، اس گونج اور اس احساس نے میرے کردار کی کڑیاں توڑ پھوڑ ڈالی ہیں۔

میں ماں کی گود کو ہی دنیا، اس کے لمبے لمبے بالوں کی ملائمت اور اس کے وجود کی بھینی بھینی بو کو ہی زندگی سمجھے بیٹھا تھا۔ چھٹے برس میں ماں میرے گال اپنے سینے سے لگاتی تھی تو میری رگ رگ میں ایک برق سی کوند جاتی تھی۔

اور پھر ایک روز اچانک اس گود میں ایک اور بچہ آ لیٹا۔ ننھا منا، گوشت کا لوتھڑا، جو مجھے بڑا ہی پیارا لگا۔ وہ تو جیتا جاگتا کھلونا تھا جسے چابی دینے کی ضرورت ہی نہیں تھی! لیکن چند ہی روز بعد مجھے علم ہوا کہ وہ گود مجھ سے ہمیشہ کے لئے چھن گئی ہے جسے میں سارا جہاں سمجھے بیٹھا تھا۔ مجھ سے ماں کا آغوش چھن گیا، لوریوں کا رُخ بدل گیا اور جن بادلوں پر میں فضا کی وسعتوں میں اڑتا رہتا تھا وہ پگھل گئے اور میں زمین پہ آ رہا۔ میں رویا، چلایا، کپڑے پھاڑے، راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر ماں کے پاس سونے کی ضد کی لیکن ماں نے ڈانٹ دیا اور باپ نے اپنے پاس سلا لیا۔

میں ڈیڑھ برس اپنی کھوئی ہوئی بادشاہی پہ جھپٹتا رہا کہ ایک اور بچہ اس کنبہ میں آ گیا۔ مجھ سے باپ کا پیار بھی چھن گیا اور زندگی ٹیڑھا سا سوال بن کے رہ گئی۔ پہلے پیار تقسیم ہوا تھا اب کھلونے بھی بٹ گئے۔ جب چوتھا بچہ ہمارے گروہ میں آیا تو یہ پیار بھی غائب، کھلونے بھی غائب۔ ماں باپ کا یہ حال کہ گھر میں موجود ہوتے ہوئے بھی غیر حاضر معلوم ہوتے تھے۔ ہنستے مسکراتے گھر سے مسکراہٹیں ہی غائب ہو گئیں۔

میں سکول جاتا تھا تو وہاں طبیعت نہیں لگتی تھی، گھر بھاگ آنے کو جی چاہتا تھا۔ گھر ہوتا تھا تو دل اُٹھا اُٹھ کے باہر کو بھاگتا تھا۔ ماں باپ کی تو شکل و صورت ہی بدل گئی تھی — غور سے دیکھنے سے بھی پہچانے نہ جاتے تھے۔ بات بات پہ غصہ اور ڈانٹ ڈپٹ کے سوا انہیں کوئی بات ہی نہ سوجھتی۔ دو بھائی اور تین بہنیں گھر میں "فرقہ وارانہ" فساد بپا کئے رکھتی تھیں۔ ہر دوسرے چوتھے روز ایک دو برتن ٹوٹتے تھے۔ بچے ان برسوں پرانے کھلونوں پر لڑتے جھگڑتے رہتے تھے جن کے ساتھ کسی وقت میں کھیلا تھا اور جو میں نے توڑ کر پھینک دئے تھے۔

میں اس وقت نویں جماعت میں پڑھتا تھا جب ایک اور

بھائی کا اضافہ ہو گیا۔ گھر میں رہا سہا سکون بھی غائب ہو گیا۔ یہی غنیمت تھی
کہ گھر میں مالی تنگی نہیں تھی۔ کچھ باپ کی تنخواہ، کچھ زمینوں کی آمدنی، دو مکان
کرایہ پر چڑھے ہوئے تھے ورنہ گھر میں فاقوں تک نوبت پہنچ جاتی۔

میں چھ بہن بھائیوں کو دیکھ کر جل اٹھتا تھا۔ یہی تھا وہ ہجوم جس
نے مجھ سے ماں کی گود اور تمام تر پیار چھین لیا تھا۔ میری عمر آگے بڑھ رہی
تھی اور میں بچپن کی دلدل میں دھنسا ہوا تھا۔ وقت جس قدر تیزی
سے آگے بڑھتا تھا ذہن اس سے کہیں زیادہ سرعت سے پیچھے کو بھاگ
جاتا تھا جہاں سحر انگیز لوریاں تھیں، ماں کی باہیں اور اس کے وجود
کا گرم گرم احساس تھا۔ اتنا احساس تو مجھے بھی ہو چکا تھا کہ میری ماں کی
جوانی کو، اس کے جسم کی تپش اور مسکراہٹوں کو ان بچوں نے دودھ کی
راہ چوس لیا تھا۔ وہ جوان سال عورت عمر کے پینتیسویں سال ہی ساٹھ
سالہ بڑھیا بن گئی تھی۔

میری تقریباً ہر روز پٹائی ہوتی تھی کیونکہ میں کسی نہ کسی بہن
بھائی کو پیٹ ڈالتا تھا۔ ماں باپ اور بہن بھائی مجھ سے تنگ آ چکے
تھے۔ کہتے تھے کہ میں بہت بدتمیز ہو گیا ہوں لیکن میرے سینے میں آگ
سی جل رہی تھی۔ ایسی آگ جو صرف پیار کے چھینٹوں سے ہی ٹھنڈی
ہو سکتی ہے، پٹائی سے تو اور زیادہ بھڑکتی ہے۔

ایک رات میں سو نہ سکا۔ قریب ہی سرگوشیوں کی آواز
آ رہی تھی۔

"بڑے نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے۔"

"آپ ہی کے بے جا لاڈ نے بگاڑا ہے۔"

"تم نے بھی نہ سوچا کہ اور بچے پیدا ہوں گے سارا پیار ایک ہی
کو نہ دے دوں۔"

"میں نے تیسرے بچے کے بعد کہا تھا کہ بس اب اور بچے
نہیں چاہئیں مگر آپ ...."

"انسان کو کارخانۂ قدرت میں بھلا کیا دخل ہے۔" میرے
والد کی منمناتی ہوئی آواز تھی۔

ماں کہہ رہی تھی "صدیوں پرانے خیال! ذرا گھر کی حالت کو تو
دیکھئے۔"

"آئے دن اخباروں، رسالوں اور کتابوں میں چرچا ہو رہا ہے
کہ خاندان کا حد سے سوا بڑھنا اب پورے ملک کو لے ڈوبے گا۔ ملک کی
قوم کا خیال کریں۔ مذہب کو کیا اعتراض اس میں ـــ"

باپ کے پاس سوائے ایک سرد آہوں کے کوئی جواب نہ تھا
اور ماں سرگوشیوں میں بولے جا رہی تھی ـــ "ذرا سوچئے کہ گھر میں
روپے پیسے کی تنگی نہیں لیکن ہمارے سات بچوں میں سے ایک بھی نہیں
جس کی تعلیم و تربیت ڈھنگ سے ہو رہی ہو۔ تمام کے تمام آوارہ اور
بیہودہ بنتے جا رہے ہیں۔ لڑکیاں ہیں کہ اسی عمر میں ایکٹریسوں کی نقال
بنتی جا رہی ہیں۔ کس کس کی طرف توجہ دیں۔ اچھے سے اچھا کپڑا پہناتے
ہیں جو وہ دو روز میں لڑ جھگڑ کے پھاڑ ڈالتے ہیں۔ کھانے پہ اودھم، سکول
میں لڑائیاں، کسی کے گھر جاؤ تو شرمندگی، فحش گالیاں بکتے ہیں، سوسائٹی
میں تو اپنا وقار ہی ختم ہو گیا ہے۔ میری صحت دیکھو اسی عمر میں کمر میں درد رہنے
لگا ہے۔ بال سفید ہو گئے ہیں۔ تیسرے بچے کے بعد سوچا تھا کہ آمدنی زیادہ
ہونے لگی ہے۔ ایک دو مکان چڑھا دیں گے جو ان کے کام آئیں گے۔ انہیں
اچھی تعلیم دلوائیں گے اور ان کے مستقبل کی سوچیں گے۔ اب سوچ لو۔
پیسہ آتا ہے اور اس لشکر کے پیٹ کی نذر ہو جاتا ہے۔ تھرڈ کلاس سکولوں میں
پڑھنے جاتے ہیں جہاں گالی گلوچ کے سوا کچھ نہیں سیکھتے۔ کہاں آپ کے
وہ خواب کہ گاڑی خریدیں گے اور کہاں یہ حال کہ سائیکل خریدنے سے
رہے ......" ماں کی سرگوشیاں روندھیا گئیں۔ ہچکی سی لے کے بولی۔
"بڑے بچے کو کتنے پیار سے پالا تھا۔ اب اس کا یہ حال ہے کہ سارا سارا دن
گھر سے غائب رہتا ہے۔ گھر آتا ہے تو اسے مار اُسے پیٹ، یہ توڑ وہ چھین۔"

"وہ تو پرابلم بچہ ہے۔" باپ نے فلسفیانہ لہجے میں کہا "پہلے بچے کا
یہی حال ہوتا ہے۔ لاشعوری طور پر وہ کھویا ہوا پیار ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ اسکی
عمر آگے بڑھ جاتی ہے اور دماغ پیچھے رہ جاتا ہے۔ ایسے بچے میں جنسی
بے راہ روی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ لاشعوری مطالبوں اور تقاضوں
کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے اور زندگی کی راہوں سے ہٹ کر سکون
تلاش کرتا ہے۔"

ماں کا لہجہ ترش ہو چکا تھا "یہ فلسفے، نفسیات وغیرہ کے قصے
آپ کیا لے بیٹھے، مسئلے باتوں سے تو حل نہیں ہوتے اور اگر فلسفہ ہی بگھارنا
تھا تو کئی برس پہلے بیدار ہونا چاہئے تھا۔"

باپ نے طویل آہ بھری اور ماں کی سرگوشیاں اس آہ میں تحلیل
ہو گئیں۔

مجھے ان فلسفوں سے کوئی غرض نہیں۔ یہ فلسفے میرے کسی

کام نہیں آسکتے۔ میں تو ایک ہی حقیقت سے آگاہ ہوں کہ ایک تشنگی سی ہے جو نہ جانے کتنی ہی محرومیوں نے مل جل کر میرے سینے میں بھر دی ہے۔ یہ تشنگی میری روح کو بھی اور ضمیر کو بھی ڈستی رہتی ہے۔ رگ رگ میں ایسا زہر بھر گیا ہے کہ صبح وشام، دن رات بے چین کئے رکھتا ہے۔ زندگی کا وہ موڑ کس قدر ہیبت ناک تھا جب لڑکپن جوانی کی گود میں آگرا تھا لیکن اس گود میں وہ سکون نہیں تھا جس کی تلاش میں میں سرگرداں تھا۔ زندگی کے حقائق منہ کھولے سامنے کھڑے تھے۔ جذبات اور احساسات میں انجانی سی تفصیلات کا اضافہ ہو رہا تھا۔ گلے ہے تلخ سی شیرینی محسوس کرتا تھا۔ ایسے میں تشنگی اور زیادہ تلخ ہو جاتی تھی اور میں اس گھر سے بھاگ جانا چاہتا تھا، جہاں مجھے پیار ملا تھا اور جہاں میرے پیار پر ایک ہجوم جھپٹ پڑا تھا۔ اس ہجوم نے ماں بھی چھین لی، باپ بھی، کھلونے بھی، سکون بھی اور میری بادشاہی بھی۔

باپ کو تو یہ معلوم ہے کہ مجھ جیسا بچہ لاشعوری مطالبوں اور تقاضوں کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے اور زندگی کی راہ سے ہٹ کر سکون تلاش کرتا ہے۔ لیکن اسے یہ معلوم نہیں کہ میری ذات میں یہ زہر بھرنے کا ذمہ دار وہ خود ہی ہے اور اس کا علم اسکے عمل کی لغزشوں کی کی تلافی نہیں کر سکتا۔ اُسے یہ بھی معلوم نہیں کہ میں کبھی کا عام راہ سے ہٹ کر سکون کی تلاش میں گھوم رہا ہوں۔ دو برس ہوئے میرے ایک دوست نے مجھے چھوٹا سا ایک ناول دکھایا تھا۔ میں نے پڑھا تو بڑا لطف محسوس ہوا۔ بڑی لذیذ کہانی تھی۔ لڑائی مار کٹائی۔ عشق و محبت سے بھرپور کہانی۔ ہر باب میں برائم اور پستول، جنسی اختلاط اور ایسی باتوں کی کہانی۔ کہانی کیا تھی الفاظ کے پردوں میں عورت ناچ رہی تھی۔ میں نے یہ پردے ہٹا کر یہ رقص بہت قریب سے دیکھا۔ طرز بیاں کی لذت نے ایسا قرار دیا جیسے سینہ کا الاؤ دم بھر کو بجھ گیا ہو۔ رات کی تنہائی میں میں نے ناول کے کرداروں کو اپنے سامنے وہی ڈرامہ کھیلتے دیکھا اور میں نے اپنے آپ کو ہیرو کے روپ میں دیکھا۔ ڈرامے کے کردار روز بروز میرے تصوروں میں نکھرتے چلے گئے اور میں حسن و عشق اور مار دھاڑ کی اس کہانی کا ہیرو بن گیا۔

پھر میرے دوست نے مجھے ایک اور ناول دیا اور چند بالتصویر کہانیاں بھی جو کہیں زیادہ پُرلذت اور تشدد سے بھرپور تھیں۔ "پُراسرار حسینہ" اور "دلبر ڈاکو" نے تو مجھ پر نشہ سا طاری کر دیا۔ دوست نے مجھے بتایا کہ شہر میں جگہ جگہ پرائیویٹ لائبریریاں کھلی ہوئی ہیں جہاں یہ ناول کرایہ پر مل سکتے ہیں۔ میں نے ان لائبریریوں کا سراغ لگایا اور گھر سے پیسے چرا کر ناول پڑھنے لگا۔ ان ناولوں کی وساطت سے کئی لڑکے میرے دوست بن گئے جو میری طرح اس لٹریچر کے شیدائی تھے پھر ہم نے فلموں کی طرف رُخ کیا۔ میں نے پہلی بار گھٹیا درجے کے ایک سینما ہال میں رعایتی ٹکٹ پر ایک انگریزی سٹنٹ فلم دیکھی تو دل مارے مسرت کے اُچھلنے لگا۔ اظہاریت کی ایک اور راہ کھل گئی۔ جذبات کا بند ٹوٹ گیا۔ اس فلم میں کردار قدم قدم پر گھونسے چلاتے تھے یا ایک دوسرے کو چومتے تھے۔ اردو فلموں نے ہمیں عشق و محبت کے مکالمے سکھا دیئے اور میں حقائق سے بھاگ کر تصوروں میں جا پناہ گزیں ہوا۔ آپ کہتے ہیں یہ تصورات تخریبی ہیں۔ ہوتے رہیں۔ مجھے تو سکون چاہیئے جہاں کہیں مل جائے۔

جرم و جنس کی ان مخش کہانیوں اور فلموں میں کچھ ایسی بات ہے جو ہم پیار کے متلاشی بچوں پر اثر انداز ہوتی ہے لیکن ہم اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتے۔ میں صرف اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ پیار کی محرومی نے میری ذات میں جو خلا پیدا کر دیا تھا وہ پُر ہونے لگا۔ خلا تو پُر ہو گیا لیکن ایک اور آگ بھڑک اٹھی جس کی لپیٹ میں صرف میں ہی نہیں میرا ہر دوست آیا ہوا تھا —— ہر وہ دوست جن کے والدین کنبہ میں بچوں کی تعداد کو معقول حد میں رکھنے کے سوال پر بپھر جاتے تھے۔ ایسے والدین جو اس انبوہ کو پیار، محبت اور تعلیم و تربیت دینے سے معذور ہوتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے گھر سے باہر ہی رہیں تو بھلے۔ چنانچہ بچے گلیوں میں گالیاں بکتے، لڑتے جھگڑتے، بیڑیاں سگریٹ پیتے بچوں میں جا کر پناہ لیتے ہیں یا گھر سے پیسے چرا کر مخش ناول پڑھتے ہیں اور گھٹیا درجے کی فلمیں دیکھتے ہیں۔

یہاں میں ایک بات کہنے سے ذرہ بھر نہ چوکوں گا کہ حکومت نے کہا تھا کہ زیادہ اناج اُگاؤ لیکن ہمارے بزرگوں نے الٹا ہی اثر لیا یعنی زیادہ سے زیادہ کھانے والے دنیا میں لے آئے اور لئے ہی چلے جا رہے ہیں۔

کہتے ہیں کہ بچھو کی مادہ جونہی بچے جنتی ہے تو بچے ماں کے جسم کے ساتھ چپک کر اس کا تمام زہر اور خون چوس لیتے ہیں ماں مرجاتی ہے اور بچے انسانوں کے ڈنک مارنے کے لئے زندہ رہتے

ہیں۔ ناگن کے متعلق مشہور ہے کہ انڈوں سے بچے نکلتے ہیں تو وہ انہیں لپک لپک کر کھانا شروع کر دیتی ہے۔ اس کے ننانوے بچوں میں سے چند ایک ہی زندہ رہتے ہیں۔ سوچتا ہوں کہ ہم انسانوں کے گھروں میں بچھوؤں اور سانپوں والے ہی مظاہرے ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں میرا یہ احساس آپ کی منطق پر پورا اترتا ہے یا نہیں؟

میں اور میرے ایک درجن دوست (اور ایسے سینکڑوں ہزاروں لڑکے اور لڑکیاں) بچھوؤں کے ہی بچے ہیں جو ماں کو کھا لیتے ہیں یا وہ سانپ جو ماں کی زد سے بچ گئے ہیں۔ ہم میں زہر بھرا ہوا ہے جو ہمیں ہی ڈس رہا ہے۔ یہ زہر محرومیوں کا مرکب ہے ــــــ پیار کی محرومی، تربیت کی محرومی، گھریلو فضا میں سکون اور اطمینان کی محرومی ــــــ اور ان محرومیوں کے ساتھ ماں باپ کے ماتھوں پر غصّے اور چڑچڑے پن کی شکنیں، چہروں پر کثرتِ اولاد کے تاسف اور نتائج کے تاثرات۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں نے مار دھاڑ اور جنسی اشتعال سے بھرپور ناولوں اور فلموں میں منزل کی بُو پائی۔ منزل پہ پہنچے تو منزل کو جلتا ہوا پایا۔ اس کے شعلوں نے مجھے بھی لپیٹ میں لے لیا۔ سکون اور پیار کی تلاش میں بھٹکا ہوا راہی اور بھی بھٹک گیا لیکن اس آگ کی تپش میں میں نے ایک قرار سا بھی پایا۔ ان شعلوں کی جلن کو ان ہی کی تپش نے سہلا لیا۔ انہی شعلوں کی لرزتی روشنی میں چند اور راہیں نظر آئیں لیکن ان راہوں پہ اکیلے چلنا محال نظر آیا۔ کسی ساتھی کی شدید ضرورت تھی۔ خدا خوش رکھے ان ناشروں اور فلمسازوں کو جنہوں نے مجھے ہمسفر بھی مہیا کر دئیے اور خدا خوش ہی رکھے ان ماں باپ کو بھی جنہوں نے ہمیں ہر بندھن سے آزاد کر دیا اور گھر کو بچوں سے بھر کر بھول ہی گئے کہ ان کا کوئی بچہ یا بچے خود فریبی اور تخریبی رجحانات و تصوّرات کی بھول بھلیوں میں کھو گئے ہیں۔

دو سال سے ہم آٹھ دس لڑکوں نے ایک گروہ بنایا ہوا ہے۔ ہم جرم و جاسوسی کے گھٹیا ناولوں اور سنسنی خیز فلموں کا ریہرسل کیا کرتے ہیں۔ سنسان گلیوں اور باغوں میں جا کر ہم ان کے ہیروؤں کی نقل اتارا کرتے ہیں اور ہم ایسے کردار بن جاتے ہیں جو صحیح معنوں میں "ہیرو" ہوتے ہیں، ایسے ہیرو جن کی راہ میں مذہب، معاشرت اور قانون حائل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ہم جس لڑکی پہ نگاہ رکھ لیتے ہیں اُسے پا کے ہی دم لیتے ہیں! ہم کالئیاں بھی چرا لیتے ہیں۔ اکیلی دُکیلی لڑکی کو روک کر اس حد تک پریشان کرتے ہیں کہ ہمیں خود بھی شرم آنے لگتی ہے۔ ہم ایک دوسرے کے رقیب بن کر لڑائی بھی کرتے ہیں۔ بالکل ناولوں اور فلموں کے کرداروں کی طرح۔ اور ہمارے والدین کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ہم کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ وہ تو ہم سے کثرتِ اولاد کی وجہ سے اکتائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہم جتنی دیر باہر رہتے ہیں وہ اتنی دیر سُکھ سے رہتے ہیں۔

ہمارے گروہ میں ہم ہی جیسی لڑکیاں بھی ہیں۔ ہماری طرح کی نوعمر اور نوجوان لڑکیاں ــــــ بھٹکی ہوئی، فریب خوردہ لڑکیاں، ہم انہیں "سویٹی" کے شیریں نام سے یاد کرتے ہیں اور ہم ان کے "ڈارلنگ" ہوتے ہیں۔ مثلاً عشرت میری سویٹی ہے۔ اس کے ساتھ سینما ہال میں ملاقات ہوئی تھی۔ نویں جماعت میں پڑھتی تھی اور اکیلی سینما دیکھنے جایا کرتی تھی۔ اس کے پچاس سالہ بوڑھے باپ نے چار سال ہوئے ایک جواں سال لڑکی سے بیاہ رچا لیا ہے جس کے بطن سے اب دو بچے ہیں۔ عشرت کی عمر اس وقت سترہ برس ہے۔ سوتیلی ماں کی جوانی نے اس کے باپ کے بڑھاپے کو پہلے پا بجولاں کیا پھر اس کی بے نور آنکھوں پہ پٹی باندھی اور اسے ایسا مسحور کیا کہ وہ بھول ہی گیا کہ اس کی ایک بیٹی بھی ہے جس کا لڑکپن جوانی کی دہلیز پہ کھڑا دستک دے رہا ہے اور پٹ کھل رہے ہیں۔ عشرت کے لئے گھر کا ماحول زنداں سے بدتر ہو گیا۔ ماں کا پیار تو قبر میں جا سویا تھا باپ جیتے جی مر گیا اور وہ میری راہ میں آ گئی۔ تلاش سکون کی جویا عشرت۔ ہم زندگی کے دوراہے پر ملے اور ایک دوسرے کے ہو گئے۔ وہ دماغ میں محرومی اور زبان پہ فلمی گانے لئے میرے ساتھ بھٹکتی رہی۔

بھٹکے ہوئے دو راہی جو ملے تو مل کے بھٹک گئے۔ شام کا دھندلکا گہرا ہو رہا تھا کہ ہم دونوں بہت دور نکل گئے۔ ہم راوی کے کنارے چلے ہی جا رہے تھے۔ رات کے سکوت میں راوی کا جل ترنگ تیر رہا تھا۔ عشرت چلتے چلتے رک گئی، جیسے چلتے چلتے نڈھال ہو گئی ہو۔ اسکے ملائم ملائم بالوں سے بھینی بھینی بُو آ رہی تھی مجھے یوں لگا جیسے میں ماں کی گود میں جا گرا ہوں!۔ وہی لمس، وہی قرار، وہی سحر آگیں بُو جو کبھی ماں کے وجود میں مجھے محسوس ہوتی تھی۔ ہم دونوں وہیں بیٹھ گئے۔ جیسے گھونسلے سے گرے ہوئے چڑیا کے بچے کو کسی نے اٹھا کر پھر گھونسلے میں رکھ دیا ہو۔

راوی کی روانی وہی لوری گنگنانے لگی جس کی تان پر میں نے زندگی کے چھ برس گذارے تھے۔ پھر اندھیرا چھا گیا تھا، گھُپ اندھیرا، اور اس اندھیرے میں ایک ہجوم بچھوؤں کی طرح رینگتا اور میری راحت کو ڈستا رہا۔

راوی کے کنارے، رات کا اندھیرا گہرا، پرسکون تھا بھٹکے ہوئے دو بچے شہر کے شور سے دور، گھروں کی تلخیوں اور ہنگاموں سے بھاگے ہوئے، خنک ریت پر پڑے تھے۔ دو بھٹکے ہوئے راہی جو منزل کی تلاش میں تھے۔

لمحات کا کارواں لوٹ کے چل پڑا۔

جانے عشرت کیا کہتی رہی اور جانے میں کیا کہتا رہا۔ اسی قدر یاد ہے کہ ہم کہتے رہے، سنتے رہے، سناتے رہے ــــ

"تم نے وہ انگریزی پکچر دیکھی تھی جس میں ہیرو اور ہیروئن ندی کنارے اسی طرح ملتے ہیں؟"

عشرت کے اس فقرے نے سکوت کا طلسم توڑ ڈالا۔ اور ہم خیالوں ہی خیالوں میں راوی کے کنارے سے ایک ہی جست میں کچھ پولیس کے اندھیرے میں جا گرے اور پھر یوں لگا جیسے آندھیاں سی چل رہی ہوں۔ پھر بگولے اُٹھے۔ راوی کی ہلکی ہلکی لہروں کا ترنم طغیانی بن کر غرانے لگا۔ اور ہم دونوں بھول کی سمت چل پڑے، مگر یکایک میرے سینے کے اندر سے ایک دیوتا نے اُٹھ کے راہ روک لی۔ آوازیں سی سنائی دیں ــــ "رک جاؤ، لوٹ جاؤ۔ یہ منزل نہیں، یہ راہ بھی نہیں، ان اُلجھی ہوئی راہوں سے دور رہو۔ نکل نہ سکو گے۔ سینوں میں جلتے ہوئے الاؤ بجھ جائیں گے۔ تم نے پیار پا لیا ہے، تم نے منزل پالی ہے۔ جاؤ، جاؤ، اس پیار کو بچاؤ، اسے اپنے زہر سے بچاؤ۔ تم خود ہی اسے ڈس رہے ہو۔ یہاں دیوتا بھی بھٹک گئے ہیں۔ بھٹکے ہوئے راہی قدم سنبھال کر رکھو۔"

پھر یہ آوازیں ایک سرگوشی میں سمٹ آئیں ــــ "ڈارلنگ تم مجھے خواب تو نہیں دکھا رہے؟ دھوکہ تو نہیں دے رہے؟" ــــ اور میں چونک پڑا۔ عشرت نے مجھے چونکا دیا اور میرے اپنے ہی کسی جذبے نے مجھے جھنجھوڑ کے جگا دیا تھا ــــ اور ہم شہر کی طرف چل پڑے۔

اس بات کو آج ایک برس ہو چلا ہے۔ اور ہم منزل کھو بیٹھے ہیں ــــ ہم منزل کھو بیٹھے ہیں اور ہم بھٹکے ہوئے راہی تھے۔

عشرت اب وہ عشرت نہیں رہی جو ایک برس پہلے تھی مگر میں بھی تو وہ نہیں رہا۔ لیکن ہم دونوں اسی میں خوش ہیں کہ ہم وہ نہیں رہے۔ ہم نے اپنی ہی منزل کو اپنی ہی آگ سے جلا ڈالا ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ عشرت کی شادی کی باتیں ہو رہی ہیں لیکن وہ بیک وقت تین لڑکوں سے شادی کے وعدے کر چکی ہے جن میں سے ایک میں بھی ہوں اور میں بیک وقت چار لڑکیوں کا "ڈارلنگ" ہوں! ہم ایک دوسرے کے ساتھ فلموں اور جرم و جنس کے ناولوں کی طرح لڑتے بھی ہیں اور ہم بالکل بھٹکے ہوئے ہیں اور کسی بات کی پروا نہیں کرتے۔

ایک روز میرے ایک دوست نے مجھے رازدارانہ لہجے میں کہا ــــ "تمہاری چھوٹی بہن کیفے میں جاتی ہے۔ مگر مجھے اس اطلاع سے کوئی دلچسپی نہ تھی، آخر عشرت بھی تو کوئی بہن ہے ــــ میرا مطلب ہے کہ میں پورے طور پر بھٹکا ہوا ہوں۔ اس بیہودہ پن پر بعض اوقات دو چار جوتے بھی پڑ جاتے ہیں۔ اور اس طرح بھی مجھے قرار سا آجاتا ہے۔

میرا دل منزل منزل بھٹک رہا ہے۔

میں بھٹکا ہوا ہوں ــــ بے راہ، گمراہ، گم گشتہ،

چند روز ہوئے میرا باپ میری ماں سے کہہ رہا تھا "سوسائٹی میں ایک اور قباحت پیدا ہو گئی ہے جنہیں بدقمار کہوں کیا کہوں حکومت کو چاہئے کہ ان آوارہ چھوکروں کو گرفتار کرے لڑکیوں کا آزادی سے گھومنا پھرنا ہی محال ہو گیا ہے"

پرسوں رات باپ نے ایک آہ بھری۔ ہمیں کچھ سوچنا پڑیگا کہ قوم میں بچوں کی تعداد کس طرح ڈھنگ میں رکھی جائے۔

کل صبح میری ماں کے ہاں ایک اور بچہ پیدا ہوا ہے۔

ایک اور بھٹکا ہوا راہی!

★

اساتذہ کی محفل

مفتاح الدین ظفر

جب میں نجمی کے یہاں پہنچا تو شوکت، نادر، امتیاز اور شریف سب ہی موجود تھے۔ گرما گرم بحث ہو رہی تھی۔ موضوع زیر بحث تھا "لیڈر شپ کورس" جو محکمۂ توسیع تعلیم کے زیر اہتمام حال ہی میں کراچی میں منعقد ہوا تھا اور جس میں شمولیت کے بعد نجمی صاحب بالکل تازہ وارد تھے۔

آپ کو شاید معلوم ہو نجمی حیدر آباد ڈویژن میں ایک ضلع کی تعلیم کا نگراں ہے۔ وہ قیام پاکستان کے فوراً بعد بی۔ ٹی کی ٹریننگ لے کر کسی اسکول میں سائنس اور ریاضی کا استاد بن گیا تھا اور ترقی کرتے کرتے اب ایک گزیٹیڈ افسر تھا۔ وہ اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی بڑا محنتی اور ستا مشہور تھا اور ملازمت میں آنے کے بعد تو اس نے محکمۂ تعلیم کے ہر افسر کی نگاہ میں وہ وقار حاصل کر لیا تھا جو ایک فرض شناس اور اعلیٰ کردار استاد کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ وہ کہا کرتا ہے کہ معاشرہ میں استاد کا منصب نہایت بلند اور ارفع ہے۔ وہ اپنے طور طریقوں سے، اپنی رفتار اور گفتار سے اپنی افتادِ طبع اور بلند اخلاق سے، معاشرہ کے لئے باعث فخر ہوتا ہے اور طلبار کے واسطے ایک قابل تقلید مثال۔ وہ کہتا ہے کہ استاد اگر اپنے فرائض کی ادائیگی سے غفلت برتتا ہے، تو مجرم ہے۔ ایک ایسا مجرم جسے آئندہ نسلیں کبھی بھی معاف نہیں کر سکتیں۔ اور جو معاشرہ کے لئے باعث ننگ ہوتا ہے! وہ وقت کا سختی کے ساتھ پابند ہے۔ جب وہ گھر سے دفتر جانے کے لئے نکلتا ہے تو بقول شخصے لوگ اپنی اپنی گھڑیاں ملا لیتے ہیں! حقیقت بھی یہ ہے کہ ایک آدھ منٹ کا فرق کبھی ہو جائے تو ہو جائے ورنہ ممکن نہیں کہ اس کی پابندیٔ اوقات میں ذرا سا بھی فرق آ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف معاشرہ میں بلکہ اپنے افسروں کی نظر میں بھی، وہ ایک بلند شخصیت کا مالک سمجھا جاتا ہے اور لوگ اس کی ہر بات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ خود اس کے طلبا اور رفقائے کار بھی اس کی بے انتہا عزت کرتے ہیں۔

شوکت کا تعارف بھی کرا دوں، وہ بھی ایک لائق نوجوان ہے اور ایک مقامی کالج میں اقتصادیات کا لیکچرر۔ اس کے تبحر علمی کے سب معترف ہیں لیکن وہ ہر وقت ایک ہی چکر میں پھنسا نظر آتا ہے یعنی یہ کہ کسی نہ کسی طرح چھلانگ لگا کر "سی، ایس، پی" یا "پی، ایس، پی" افسر بن جائے۔ وہ ہمہ وقت مطالعہ میں مصروف رہتا ہے اور جب وہ بی۔ اے کے لڑکوں کو اپنے دلپسند موضوع پر لیکچر دیتا ہے تو پوری کلاس جھوم جھوم جاتی ہے۔ طلبار اس کے لیکچروں کا بے چینی کے ساتھ انتظار کرتے ہیں اور کسی صورت میں بھی یہ گوارا نہیں کرتے کہ ایک پیریڈ بھی ناغا کر دیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے سبق یا لیکچر کی "بھرپور" تیاری کر کے آتا ہے اور مختلف ماہرین اقتصادیات کی کتب سے استفادہ کرنے کے بعد اپنا لیکچر طلبار کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور اس طرح خراج عقیدت و تحسین حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

نادر سے آپ کا تعارف شاید اس سے پہلے کبھی نہ ہوا ہو۔ اس لئے کچھ عرض کر دوں۔ یہ کراچی میں نووارد ہے۔ طبیعت کا شریف اور فرض شناس نوجوان۔ مگر اس کے سر میں خدا معلوم کیوں "سودے بازی" کا خبط سما گیا ہے اور وہ "جتنے پیسے دو۔ اتنا کام لو" کے اصول پر سختی کے ساتھ کاربند رہنا چاہتا ہے۔ بعض آدمی ذرا کاروباری طبیعت کے ہوتے ہیں۔ یہ بھی اس زمرہ میں شامل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب بی۔ اے، بی۔ ٹی کرنے کے بعد بھی مجھے اتنے پیسے نہیں ملتے جن سے میں ایک باوقار زندگی بسر کر سکوں تو میں کیوں اپنی جانِ عزیز کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑوں اور ضرورت سے زیادہ کام کروں! یہی وجہ ہے کہ اسے بس اپنے کام سے کام رہتا ہے اور وہ مدرسہ کے ہر زائد از نصاب مشغلہ سے بیزاری برتتا ہے۔ اور پڑھانے لکھانے کے علاوہ ہر کام کو دردِ سر اور عذابِ جان سمجھتا ہے۔ اس طرح نجمی اور نادر کی طبیعتوں میں کسی حد تک یکسانیت ہوتے ہوئے بھی دونوں کے کردار میں

ایک ایسا بُعد ہے جو اکثر روحانی اور دنیاوی طبائع میں پایا جاتا ہے۔

امتیاز اور شریف کے متعلق بھی لگے ہاتھوں کچھ عرض کر دوں۔ ان دونوں نوجوانوں نے محکمۂ تعلیم کی ملازمت صرف اس لئے اختیار کی تھی کہ ان کی کسی اور محکمہ میں کھپت نہ ہو سکی تھی۔ ان کو اپنے کارِ منصبی سے نہ کوئی لگاؤ تھا اور نہ کسی قسم کی دلچسپی تھی۔ وہ تو صرف "وقت گزاری" کے قائل تھے۔ ان کا کوئی اصول تھا اور نہ کوئی مسلک۔ سوائے اس کے کہ افرانِ متعلقہ، خصوصاً صدر مدرس کی خوشامد کرنا تاکہ وہ ان کے بارے میں کوئی خراب رائے محکمہ کو نہ لکھ بھیجیں۔

لیجئے اب میں ہی رہ گیا ــــ اپنے متعلق میں کیا عرض کروں؟ انسان دوسروں کے لئے تو آئینہ ہوتا ہے لیکن خود اپنے خط و خال کو اپنے ہی آئینہ میں نہیں دیکھ سکتا۔ پھر بھی دوسروں سے سنی سنائی باتوں پر آپ یقین کریں تو عرض کروں کہ میں ذرا "بد دماغ" سا واقع ہوا ہوں۔ اور جب کوئی بات اپنی مرضی کے خلاف دیکھتا ہوں تو مجھ پر جھنجلاہٹ سی سوار ہو جاتی ہے۔ پہلے میں نرمی سے اپنا موقف سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن میری یہ نرمی دھیرے دھیرے سختی میں تبدیل ہوتی جاتی ہے اور پھر ذرا سے بہانے پر میں بپھر جاتا ہوں اور میرے حریف کو راہِ فرار اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اب یہ کیفیت میرے کردار کی خوبی ہے یا خرابی اس کا فیصلہ کرنا ایک اضافی بات ہے۔ میرے متعلق لوگوں کا خیال ہے کہ میں بھی اپنے فرائضِ منصبی بڑی دیانت داری سے سر انجام دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ معلمی کو ہمیشہ سے اپنے لئے باعثِ افتخار سمجھتا رہا ہوں۔

تجمّی کی گفتگو فلسفیانہ انداز سے شروع ہوئی: "آپ یہ نہ کہیں کہ لیڈر شپ کورس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ استاد ہمیشہ ایک طالب علم کا کردار ادا کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے ہر ہر لمحہ میں اپنی دولتِ علم میں اضافہ کرتا ہے۔ علم کے لئے اس کی تشنگی کسی لمحہ کم نہیں ہوتی۔ جس طرح ایک فنکار اپنے فن کی آراستگی میں ہمہ تن معروف رہتا ہے اور اس کی کوشش ہر دم یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے فن کو پختہ سے پختہ تر بنا دے۔ اسی طرح ایک معلم اپنے فن میں کمال کو پہنچنے کے لئے صبح و شام کوشاں رہتا ہے۔

وہ کتابوں سے، عملی تجربوں سے، مشاہدوں سے، زیادہ پختہ کار معلموں سے مشورہ کر کے بلکہ غیر ملکی ماہرینِ تعلیم کے تجربوں سے بھی فائدہ اٹھا کر بہت کچھ سیکھتا ہے اور اس طرح .....

نادر بیچ میں بول پڑا: "تجمّی صاحب یہ غیر ملکی ماہرینِ تعلیم والی بات ذرا تشریح طلب ہے! میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ایک غیر ملکی، ماہرِ تعلیم جس کو ہمارے ملک کے حالات سے، ہماری مالی مشکلات سے، ہماری ... اور روایتی اقدار سے مطلق کوئی واقفیت نہیں کس طرح تعلیمی مسائل میں ہماری صحیح رہنمائی کر سکتا ہے!"

"اور پھر یہ بھی تو سوچنا چاہئے۔" امتیاز بولا۔ "کہ غیر ملکی حالات کا اپنے ملک کے حالات سے مقابلہ کرنا کہاں تک مناسب ہے"۔

تجمّی نے اسی متانت اور سنجیدگی سے سمجھایا "یہ ضرور ہے کہ مغربی ممالک آج ہمارے مقابلے میں زندگی کی دوڑ میں بہت آگے نکل چکے ہیں لیکن یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ ان کی یہ ترقی وقت کے ساتھ ساتھ ہی ہوئی ہے۔ اور ان کو بھی ایسی ہی الجھنوں اور پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا ہے جن کا سامنا آج ہمیں کرنا پڑ رہا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ تہذیب و تمدن کے اعتبار سے کوئی قوم کتنی ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو تعلیم اور فنِ تدریس کے بنیادی اصول ہر جگہ ایک ہی رہتے ہیں۔ بچہ ہر جگہ بچہ ہی ہے۔ اس کی فطرت ہر جگہ ایک سی ہے۔ اس کے مسائل ہر ملک اور ہر آب و ہوا میں ایک ہی ہیں۔ پھر اس کو مناسب طریقہ سے تعلیم دینے کے "لوازمات" بھی ہر جگہ یکساں ہی ہیں۔ اس کے علاوہ استادوں کے مسائل بھی سب جگہ ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ تو ایسی صورت میں غیر ملکی ماہرین کی رہنمائی کافی حد تک مفید ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ ہم تعصب اور تنگدلی کی بجائے رواداری اور فراخ دلی کے ساتھ ان کی باتوں کو سنیں اور سمجھیں اور اپنے ملکی اور ملی مسائل کے پیشِ نظر ان کو اپنائیں ــــ"

"معاف کیجئے جناب ــــ" شریف نے بھی بولنا شروع کر دیا۔ کیا جناب یہ بتلانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے کہ اس لیڈر شپ کورس سے جہاں کئی غیر ملکی ماہرینِ تعلیم کی خدمات میسر تھیں جناب کس حد تک مستفید ہوئے ہیں؟"

تجمّی نے اس طنزیہ جملہ کا وار خوش مزاجی سے سہتے ہوئے جواب دیا: "پہلے تو آپ یہی سمجھ لیں کہ یہ لیڈر شپ کورس اُن عام کورسوں سے مختلف تھا۔ جن کو ریفریشر کورس کہتے ہیں۔ ریفریشر کورس میں آپ کے موجودہ علم کی گویا از سرِ نو تنظیم کی جاتی ہے اور اس میں ضرورت کے مطابق اضافہ بھی کیا جاتا ہے۔ لیکن لیڈر شپ کورس میں اپنے ماتحتوں کی رہنمائی کی نئی نئی راہیں ڈھونڈی جاتی ہیں اور غور و فکر کے نئے زاویے تلاش کئے جاتے ہیں۔ اس کورس میں انتظامیہ تعلیم کے پرانے اور فرسودہ

طریقِ کار کی بجائے نئے تقاضوں کے مطابق جمہوری طریقوں کی اہمیت واضح کی جاتی ہے اور بعض چیدہ چیدہ مسائل پر غور وخوض اور بحث مباحثہ کے بعد انتظامی امور میں جمہوری اصولوں کے مطابق خود کام کرنے یا کسی کام کو پایۂ تکمیل کو پہنچانے کا لائحۂ عمل تیار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ جہاں تک تعلیمی مسائل اور درس وتدریس کی الجھنوں کو جمہوری طریقوں سے حل کرنے کا تعلق ہے میں نے اس لیڈرشپ کورس سے کافی فائدہ حاصل کیا ہے۔ اب آیا جناب کی سمجھ میں۔۔؟!"

شوکت نے کہا۔ "پچھلے سال ارشد بھائی نے بھی اسی لیڈرشپ کورس میں شرکت کی تھی۔ مجھے بھی اس سے اتفاق ہے کہ یہ کورس جمہوری طریقوں کی اہمیت واضح کرتے ہیں۔ اور طریقِ کار کا ایک نیا اندازِ فکر پیش کرتے ہیں۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ کیا ہم ان طریقوں کو اپنے مدرسوں میں اور اپنے انتظامی معاملات میں بروئے کار لا بھی سکتے ہیں؟"

نادر کو اس رائے سے اختلاف تھا۔ "ہمارے ملک و معاشرے کے حالات مغرب کے حالات سے کافی مختلف ہیں۔ پھر ہم ان جمہوری طریقوں کو اپنے ملک میں کس طرح کام میں لا سکتے ہیں؟"

امتیاز کو بھی جمہوریت کے مسئلے پر کچھ بولنے کا موقع ہاتھ آیا۔ کہنے لگا۔ "ہمارے ملک میں تو مغربی طرز کی جمہوریت کا پہلے ہی جنازہ نکل چکا ہے۔ اسی وجہ سے موجودہ حکومت کو قوم کی باگ ڈور سنبھالنی پڑی۔ اب "جمہوریت" اور "جمہوری" طریقوں کا ڈھونگ کیسا؟

شریف نے لقمہ دیا۔ "اور مغربی جمہوریت کی ناکامی کی وجہ سے صدرِ مملکت نے بنیادی جمہوریتوں کا نظام ملک کو دیا جو برطانیہ یا امریکہ کی جمہوریت سے بالکل مختلف ہے۔"

نجمی نے بڑی متانت سے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "بھئی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ آپ حضرات ملکی جمہوریت اور تعلیم میں جمہوری طریقوں کی بات کو باہم خلط ملط کر رہے ہیں۔ ملکی جمہوریت کے معنی عموماً 'عام انتخابات'، پارلیمان'، عوام کی رائے'، ایک پارٹی کا شکست کھانا، دوسری کا برسرِاقتدار آنا، وغیرہ باتوں سے لئے جاتے ہیں۔ لیکن جب ہم تعلیم میں جمہوری طریقوں کا ذکر کرتے ہیں تو اس کا مطلب صرف اتنا ہوتا ہے کہ انتظامی معاملات میں یا درس وتدریس کے دوران میں ایک ضابطہ کے اندر اندر فکر و عمل کی آزادی سے کس طرح کام لیں اور جو کام آپس کے صلاح مشورے سے احسن طریقے پر پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا ہو اسے استبداد یا عہدے کے رعب داب اور خوف وہراس کے اثرات سے پورا کرانے کی کوشش کہاں تک کام میں معاون ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کچھ بھی نہیں۔"

نادر کو کچھ تامل تھا: "معاف کیجئے۔ یہی بات یعنی 'آزادیٔ فکر وعمل' ذرا وضاحت طلب ہے۔"

نجمی نے کہا۔ "ابھی آپ کی سمجھ میں آجائے گی، ایک مثال دیتا ہوں، فرض کیجئے، اسکول کا ٹائم ٹیبل مرتب کرنا ہے۔ ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ ہیڈ ماسٹر خود ایک ٹائم ٹیبل مرتب کر دے یا کروا دے اور جس استاد کو جو مضمون اور جو جماعت چاہے دیدے۔ خواہ استاد بعد میں چیختے ہی کیوں نہ رہ جائیں ــــ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اسٹاف میٹنگ میں ٹائم ٹیبل پر غور کر لیا جائے اور آپس کی بات چیت اور بحث وتمحیص کے بعد تقسیم اوقات اور تقسیم کار کے متعلق چند اصولی اور کچھ جزئی باتیں طے کر لی جائیں۔ اور پھر ٹائم ٹیبل تیار کرنے کے بعد دوبارہ اسٹاف میٹنگ میں ہی اس کو زیرِ بحث لایا جائے تاکہ آخر میں جو چیز بھی تیار ہو اسے پورے اسٹاف کی حمایت حاصل ہو اور کسی استاد کو کسی طرح کی شکایت کا موقع نہ رہے۔"

"لیکن ــــ" امتیاز نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"ذرا ٹھہریئے۔ مجھے پہلے اپنی بات ختم کر لینے دیجئے۔" نجمی نے امتیاز کو خاموش کرتے ہوئے کہا۔ "میں ایک اور مثال سے اپنا موقف سمجھانا چاہتا ہوں۔ فرض کیجئے، اسکول اور معاشرہ کے سامنے ایک مسئلہ یہ ہے کہ طلبا کے اخلاق وکردار اور ان میں نظم وضبط کو درست کیا جائے اور اُن کو بے راہ روی سے روکا جائے۔ اس مسئلہ کا ایک حل تو یہ ہو سکتا ہے کہ ہیڈ ماسٹر یا پرنسپل، ایک نادرشاہی حکم جاری کر دے جو کچھ اس قسم کا ہو کہ ــــ

> "دیکھنے میں آیا ہے کہ اکثر طلبا جھوٹ بولتے ہیں، دوسروں کی چیزیں اٹھا لے جاتے ہیں، غیبت اور عیب جوئی کرتے ہیں۔ اپنا کام وقت پر نہیں کرتے۔ مدرسہ میں دیر سے آتے ہیں اور جلد بھاگ جانے کی کوشش کرتے ہیں، معاشرے کے منافی اور ملک دشمن سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں۔۔۔۔ وغیرہ۔ آج سے میں نے کسی طالب علم کو اس قسم کی کوئی حرکت کرتے پایا تو اسے

عبرت ناک سزا دی جائے گی۔"
یا اور اسی قسم کا آرڈر نکال دے۔ یہ طریق کار نہ صرف غیر نفسیاتی ہوگا، بلکہ استبداد کی ایک بڑی ذلیل مثال بھی ہوگا۔ اس قسم کے احکام شاید طلبا میں خوف وہراس تو پیدا کرسکیں لیکن ان کو صحیح راستے پر گامزن کرنے میں بُری طرح ناکام رہتے ہیں اور وہ بری باتیں جن کو دور کرنا مقصود ہوتا ہے چپکے چپکے نشوونما پاتی رہتی ہیں اور اچھی قدریں طلبا کے وجود سے دھیرے دھیرے غائب ہوتی رہتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبا کا کردار بجائے بہتر بننے کے پست سے پست تر ہوتا چلا جاتا ہے۔"

"اس کے برخلاف ....."

"قطع کلام معاف۔" نادر نے کچھ بے چینی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپس کی گفت وشنید اور صلاح مشورہ یا بحث تمحیص کے بعد بچوں کے کردار کی تربیت کا کوئی پروگرام بنایا جائے۔ اور اس کے مطابق کام کیا جائے تو اس کے نتائج دور رس اور دیرپا ہوسکتے ہیں!"

"جزاک اللہ" نجمی نے خوش ہو کر کہا۔ "آپ نے میرا نکتہ سمجھ لیا۔ یہی در اصل جمہوریت کے معنی ہیں۔ طلبا کے اخلاق کی تربیت اور اُن کے کردار کی تعمیر کے لئے اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں ہوسکتا کہ پہلے اساتذہ مل بیٹھ کر طلبا کی اخلاقی قدروں اور ان کے کردار کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیں اور یہ معلوم کریں کہ کن مناسب اقدامات سے ان میں وہ اچھی عادتیں پیدا کرانے میں کامیاب ہوسکیں گے اور بری عادتوں کا قلع قمع کرسکیں گے۔"

شوکت نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ طلبا کو بحث ومباحثہ اور غور وفکر میں شامل کرلیا جائے۔"

نجمی نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں میری دوسری بات یہی تھی۔ جو میں کہنے ہی والا تھا۔ اساتذہ کے باہمی غور وفکر کے بعد چند اہم فیصلے ــــ بلکہ بہتر ہے کہ اسکول کے سینئر طلبا کو چھوٹے چھوٹے گروپوں میں بانٹ کر اساتذہ کی نگرانی میں ان کو موقع دیا جائے کہ وہ چند اہم مسائل پر آپس میں گفتگو کریں اور بحث ومباحثہ کے بعد اپنی متفقہ رائے کو قلمبند کریں۔ آخر میں سب گروپ یکجا ہو کر اپنے اپنے فیصلے سب کے سامنے پیش کردیں اور پھر ان ہی فیصلوں کے مطابق تمام اساتذہ اور طلبا عمل در آمد شروع کردیں۔"

شریف نے کچھ بے چینی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "معاف کیجئے گا۔ ابھی آپ کی بات کچھ تشنہ سی ہے۔"

نجمی نے سمجھایا۔ "دیکھئے میرا مطلب یہ ہے کہ پہلے تو اسٹاف میٹنگ میں چند سوالات مرتب کرلئے جائیں اور پھر طلبا چھوٹے چھوٹے گروپوں میں تقسیم ہو کر ان سوالات پر غور کریں اور ان کے جوابات متفقہ طور پر قلمبند کرلیں۔ آخر میں سب طلبا ایک بڑے گروپ میں اکٹھے ہو کر اپنے اپنے فیصلے سب کو سنا دیں اور ان فیصلوں پر بحث کرنے کے بعد چند قطعی اور آخری فیصلے مرتب کرلئے جائیں اور کام شروع کردیا جائے۔"

"مثلاً ــــ؟" امتیاز نے چپکے سے لقمہ دیا۔

"مثلاً" ــــ نجمی نے کہا۔ "یہ کہ مجلس اساتذہ میں کچھ اس قسم کے سوالات مرتب کئے جائیں:۔

۱۔ آپ کے خیال میں طلبا کے اخلاق وکردار میں کون کون سی خامیاں ہیں؟
۲۔ آپ طلبا میں سچائی کی عادت ڈالنے کے لئے کیا تجاویز پیش کرسکتے ہیں؟
۳۔ کیا آپ کے خیال میں طالب علم کو تعلیم کے علاوہ اور باتوں کی طرف بھی توجہ مبذول کرنی چاہئے۔ کچھ وجوہ بتائیے۔
۴۔ فرض کیجئے کہ کوئی طالب علم کسی جماعت میں شامل ہوجاتا ہے جو تخریب پسند اور ملک دشمن ہے۔ آپ اس کو کس طرح راہِ راست پر لائیں گے؟.... وغیرہ۔

اب ان سوالات کو آٹھ آٹھ دس دس سینئر طلبا کے گروپوں کو باقاعدہ لکھ کر دے دیا جائے۔ ہر گروپ اپنا ایک صدر اور ایک سکریٹری چن لے۔ پھر سب گروپ الگ الگ کمروں میں بیٹھ جائیں۔ اور ہر سوال پر بحث کریں۔ ان جلسوں میں استاد صاحبان بھی "مبصروں" اور "مشیروں" کی حیثیت سے شریک رہیں اور موقع بہ موقع مناسب طریقوں سے ہر گروپ کو غیر شعوری طور پر اس طرح بے راہ روی سے روکتے رہیں کہ طلبا کو اس بات کا احساس تک نہ ہو۔ کہ ان کے فیصلے استادوں کی رائے کے تابع ہیں۔ اس طرح ہر گروپ غور وفکر اور باہمی جمع وقدح کے بعد سوالات زیر بحث کے جوابات متفقہ طور پر لکھ لیں۔ پھر جلسۂ عام ہو جس میں سب گروپ شرکت

کریں اوران جوابوں کو دُہرا یا جائے ۔ اور اس کے بعد بحث و مباحثہ کرکے آخری متفقہ جوابات لکھ لئے جائیں جو مطلوبہ نتائج کے حصول کے لئے ایک مربوط لائحہ عمل مرتب کرنے میں مدد دیں گے"۔

نادر نے اصل موضوعِ سخن سے انحراف کرتے ہوئے کہا "میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ طلبا پر ملک دشمنی کا الزام لگا دینا کہاں تک درست ہے"

"دیکھئے۔ آپ موضوع زیر بحث سے الگ ہٹ رہے ہیں"۔ نجمی نے کہا۔ "لیکن یہ سوال واقعی بڑی اہمیت رکھتا ہے" پھر (میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا،) آپ سے کہوں گا کہ اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں"۔

میں اب تک ایک خاموش سامع کی طرح اس دلچسپ بحث سے لطف لے رہا تھا۔ نجمی کے اس اچانک اور غیر متوقع 'حملے' سے کچھ گھبرا سا گیا۔ بہر حال تھوڑا سا کھنکارنے اور گلا صاف کرنے کے بعد عرض کیا کہ "بات یہ ہے، نادر صاحب، کہ حقیقتاً آپ کو یا مجھے یا کسی اور صاحب کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ کسی طالب علم پر ملک دشمنی یا تخریبی عمل کا الزام لگا دیں۔ لیکن جب طلبا انفرادی یا اجتماعی طور پر ایسے مشاغل میں حصہ لیتے ہیں جو صریح طور پر ملکی اور ملی مفادات کے منافی ہوں تو پھر یہی کہنا پڑتا ہے کہ وطن عزیز کے یہ نونہال غلط راستے پر چل رہے ہیں۔ اور ملک دشمن طاقتوں کے اشاروں پر ناچ رہے ہیں"۔

اشرف نے کہا۔ "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ملک و ملت کے منفی مفادات کا خیال ہی ایک سرے سے غلط فہمیوں پر مبنی ہو"۔

"ہاں! اس کا بھی بہت کچھ امکان ہو سکتا ہے۔ لیکن غلط فہمیاں کا ازالہ مزید تخریبی کارروائیوں یا باغیانہ طرز عمل سے نہیں ہو سکتا۔ اس سے معاملات بجائے سلجھنے کے الجھتے چلے جاتے ہیں ردِعمل ہی تخریبی کارروائیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جو جوہری توانائی کی طرح اپنی شدت اور طاقت میں بڑھتا رہتا ہے اور وطن دشمن عناصر کو مزہ لینے اور ہنسی اڑانے، بلکہ اپنے مذموم ارادوں کو تقویت پہنچانے کا مواد ملتا رہتا ہے ـــــ"

"لیکن اس کا موقع ہی کیوں دیا جائے کہ یہ سلسلہ شروع ہو"۔ امتیاز نے بڑے حکیمانہ انداز میں کہا۔

اب مجھ پر جھنجھلاہٹ سوار ہو چکی تھی اور میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ نجمی نے مجھے روک دیا کہنے لگا "یہ ٹھیک ہے کہ ہمیں اس کا موقع ہرگز نہ دینا چاہئے جس سے معاملات بجائے سلجھنے کے الجھتے چلے جائیں لیکن رونا تو اس بات کا ہے کہ ہمارے قول و فعل میں اکثر بڑا تضاد رہتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہمارے ملک کی تو یہ انتہائی بدنصیبی ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی معاشرتی جماعت میں بھی خیالات کی ہم آہنگی نہیں پائی جاتی ۔ ہماری حالت یہ ہے کہ ایک شخص ایک راہ پر چل رہا ہے تو دوسرا دوسری راہ پر۔ ایک شخص کچھ کہتا ہے، دوسرا کچھ۔ ایک کے سوچنے اور سمجھنے کا طریقہ صحیح خطوط پر ہے تو دوسرے کا طریقہ غلط خطوط پر ـــــ اس ساری افراتفری اور بے راہ روی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم، قومی کاموں کو تو چھوڑیئے، خود اپنی فلاح و بہبود کے کاموں کو بھی سر انجام دینے کے لئے متفقہ طور پر سوچ سمجھ کر سر انجام دینے میں ناکام رہتے ہیں۔ آپ سب حضرات میرے اس مشاہدے کی تصدیق کریں گے کہ ہمارے یہاں تو یہ عالم ہے کہ 'گھر' جیسے ننھے سے معاشرہ میں بھی خیالات کی ہم آہنگی میسر نہیں ہوتی۔ اگر باپ اپنے لڑکے کو کوئی نصیحت کرتا ہے تو ماں اس کے سب کئے کرائے پر پانی پھیر دیتی ہے ۔ اور چپکے چپکے اپنے ہونہار فرزند کے غیر پختہ دماغ کی پیداوار کو پروان چڑھنے میں مدد دیتی رہتی ہے ۔ اگر بھائی بے راہ روی کا شکار ہوتا ہے اور ماں باپ دونوں اس کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کرتے ہیں تو بہنیں اپنے لاڈلے بھائی کی پشت پناہی کرتی رہتی ہیں اور ماں باپ کے بالغ اور عاقل فیصلوں کے خلاف بغاوت کے منصوبے بناتی رہتی ہیں ایسی صورت میں یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے کہ بغیر ایک اجتماعی جد و جہد کے ہم غلط راستے پر پڑے ہوئے نوجوانوں کو راہِ راست پر لا سکیں"۔

شریف نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب نوجوان طبقہ میں بے راہ روی کے آثار نمایاں ہوں تو ہم سب کا یعنی والدین، احباب، اعزا، معاشرے کے عاقل اور بالغ اشخاص، اور اگر وہ نوجوان طلبا ہوں تو ان کے استادوں اور پرنسپل صاحبان کا یہ فرض ہونا چاہئے کہ سب مل کر ایسا طریق کار اختیار کریں جس سے غلط کار نوجوان اپنی اصلاح کر سکیں ـــــ؟"

نجمی نے بیتابی سے کہا۔ "ہاں! آپ صحیح سمجھے، خدا معلوم گزشتہ غیر ملکی حکومت کے اثرات ابھی تک ہمارے دماغوں کو ماؤف کئے ہوئے ہیں یا کیا بات ہے۔ ہم زندگی کی صحیح قدروں کو سوچنے سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ پچھلی غلامانہ ذہنیت اس درجہ ہمارے

(باقی صفحہ ۴۹ پر)

خاکہ:

کل کی بات

اشرف صبوحی

"میاں قربان جاؤں" دلّی میں پیدا ہوئے۔ وہیں چھوٹے سے بڑے، سیانے سے دیوانے ہوئے۔ وہیں کے گلی کوچوں میں رمنا تھا۔ اسی شہر میں مرے لیکن نام کی کسی کو خبر نہیں۔ حالات پہ ایسے پردے بھی کم پڑتے ہیں۔ شروع سے تو بے آپے نہ تھے۔ پڑھا لکھا۔ یاروں میں بیٹھے اٹھے۔ والدہ نہی والد تھیں۔ رشتے کنبے کے لوگ بھی ہوں گے۔ سنا ہے شادی بھی ہو گئی تھی۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اصلی نام کوئی کیوں نہیں جانتا۔ جس سے پوچھا اس نے یہی کہا کہ میاں قربان جاؤں کا نام؟ بھئی سنا نہیں۔ عجیب راز تھا کہ آج تک راز ہی رہا۔

ہمیں ان کا بچپن یاد ہے۔ غیر معمولی شریر تھے۔ صورت شکل تو خیر واجبی ہی سی تھی مگر ہمیشہ بنے ٹھنے رہتے۔ فیطون لگی ہوئی گول ٹوپی۔ سامدانی کا انگرکھا۔ اس پر نیمہ آستین۔ چوڑیدار پاجامہ۔ کرتے میں سونے کے ملمع کئے ہوئے چاندی کے بٹن۔ انگلیوں میں دو تین چھلّے انگوٹھیاں۔ میلے ٹھیلوں بسنتوں میں جانے کا بہت شوق تھا۔ گاتے خوب تھے۔ کہتے ہیں کوئی لڑی شہزادوں میں بھی ان کی ملتی تھی۔ ماں کی طرف سے یا باپ کی طرف سے یہ آج تک نہ کھلا۔

انٹرنس کا ہم نے امتحان دیا ہے تو میاں بھی ہمارے ساتھ تھے۔ خاصے بھلے چنگے آدمیوں کی جون میں۔ ہمارا اتفاق سے حیدرآباد جانا ہو گیا۔ دو برس کے بعد وہاں سے جو آنا ہوا تو ایک دن دیکھتے کیا ہیں کہ ایک لمبا تڑنگا جوان، تہمد باندھے۔ بدن سے ننگا کچھ بکتا ہوا تیز تیز قدم مارتا چلا جا رہا ہے۔ لڑکوں کے غول غول ساتھ ہیں۔ ایک صاحب سے ہم نے پوچھا "آپ کی تعریف؟ بھائی جی مجذوب تو مر گئے۔ پنکھے والے حافظ جی بھی نہیں رہے۔ اللہ ہو بھی دفن ہو چکے۔ یہ کون ذات شریف پیدا ہوئے؟" جواب ملا۔ "میاں قربان جاؤں" ہیں

"قربان جاؤں کیا معنی؟"

"یہ آپ معلوم کیجئے"

"آخر؟"

"آخر کیا۔ بیچارے کا دل الٹ گیا ہے"

ہم اور کیا پوچھتے اور کوئی کیا بتاتا۔ بات آئی گئی ہوئی۔

مہینہ بھر کے قریب گذر گیا۔ اتفاق سے ایک روز جو ہم قدم شریف گئے تو وہاں ایک شخص کو گھاس پر لوٹتے اور طرح طرح کی بولیاں بولتے دیکھا۔ ہمیں کیا کوئی ہوگا۔ پاس سے جو گزرے تو آواز آئی "قربان جاؤں لڑکے بہت ستا رہے ہیں انہیں ذرا ہشت تو کر دو" ہم نے پہلے تو کچھ خیال نہ کیا آگے بڑھے چلے گئے۔ پھر یاد آیا کہ وہی دیوانہ دل الٹا یا مجذوب تو نہیں جو اس دن بازار میں ملا تھا اور جسے لوگ میاں قربان جاؤں کہہ رہے تھے۔ جاتے جاتے پلٹے اور ان کے قریب پہنچ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ لوٹتے لوٹتے اٹھ بیٹھے اور ایک قہقہہ لگا کر بولے "قربان جاؤں کیا دیکھتے ہو۔ ننگا ہوں ننگا لنگے زیر لنگے بالا۔ نے غم دزد نے غم کالا۔ لونڈے اس لنگوٹی کے بھی دشمن ہیں۔ ذرا ہشت نہیں کر دیتے یا میں خود ہی۔"

"لڑکے ہیں کہاں؟"

"عینک لگا کر بھی نہیں سوجھتا۔ قربان جاؤں ابھی تو رات بھی نہیں ہوئی۔ کیا آنکھوں میں اندھیرا ہے؟"

"مگر کوئی ہو تو سہی، جب ہی تو سوجھے"

میاں زور سے ہنسے "قربان جاؤں۔ آنکھوں کے آگے ناک سوجھے کیا خاک!"

ہم غور کر رہے تھے کہ یہ صورت تو دیکھی ہوئی ہے اور آواز بھی سنی ہوئی سی، مگر یاد نہیں آتا تھا۔

وہ میری طرف گھورتے ہوئے بولے "تم بھی میری لنگوٹی کی تاک میں معلوم ہوتے ہو کہ کھلے اور لے بھاگو۔ قربان جاؤں لڑکوں سے بچے تو لے جانا۔

میاں یہ صورت تو کچھ جانی پہچانی ہوئی سی ہے۔

"قربان جاؤں کس کی؟"

"تمہاری"

یہ سنکر انہوں نے ہاتھ پر ہاتھ پھیلا اور قہقہہ لگا کر بولے: "ابھی اندھے تھے ابھی بینا ہو گئے۔ قربان جاؤں جان پہچان بن کر میری لنگوٹی بھی لوٹ لینا چاہتے ہو لڑکوں لو۔ اسے ایک دمڑی بھی نہ دینا۔" غرض اسی طرح کی بہکی بہکی باتیں اور حرکتیں کرتے رہے۔

اب ہمیں یاد آیا کہ یہ تو وہی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ کون؟ وہی جو کبھی ہمارے ساتھ پڑھتے تھے۔ کیا نام تھا؟ بہتیرا حافظہ پر زور دیا۔ یاد ہی نہیں آیا۔ دل میں چار برس پہلے کی ساری شکلیں پھرنے لگیں۔ وہی لمبوترا چہرہ۔ وہی بڑی بڑی آنکھیں۔ وہی آواز وہی ہنسی کا طرز مگر نام کی طرف سے دماغ کا خانہ خالی۔

"میاں آپ رہتے کہاں ہیں؟"

"جہاں اللہ رکھے۔ کیوں؟ قربان جاؤں تمہارا مطلب کیا ہے؟"

"کبھی عربک اسکول میں پڑھتے تھے؟"

اس پر ہنس دیئے اور بولے: "تنتنی بجتی رہی تن تن تنن ـــ فاعلاتن فاعلاتن فاعلن"

"یار پہچان لیا۔ تم وہی ہو!"

"وہی کون؟"

"جو ہمارے ساتھ پڑھتے تھے۔ تمہارا نام یاد نہیں آتا۔"

"نہ اللہ نے چاہا تو یاد آئے گا۔ اماں یاد ابھول گئے تو تم کس گنتی میں ہو۔"

"ہو تو وہی نا؟"

"وہی کون؟"

"نام لو۔"

"اللہ، پنجتن پاک، قربان جاؤں ان میں سے بوجھ لو۔"

غرض بالکل ہی بہکے ہوئے تھے اس لئے کسی معقول سوال جواب کا موقع نہ تھا مگر خیر پھر بھی پوچھا "آپ مجھے پہچانتے بھی؟"

"اپنے ہی کو نہیں پہچانتا تو تمہیں کیا پہچانوں گا۔"

"وہ کالے پہاڑ پر سیندیاں اور باڈے پر جھاڑی بوٹی کے بیر کھانے جانا یاد ہے؟"

"سو نٹوں میں نہو جیسے الجھنا۔ رمن راموراما بجنا"

بھئی یہ کیا حال بنایا ہے؟

ماضی سے پوچھو ـ قربان جاؤں جو ماضی میں الجھا ہوا ہے اس کا حال کیا؟

"بات تو کلنٹے کی کہتے ہو۔ مگر میں پوچھتا ہوں اس حالت میں تم خوش ہو؟"

اس پر کچھ بڑبڑائے: "خوش نہ ہوتے تو تمہاری طرح کپڑوں میں گرفتار ہوتے؟"

"مجھے بڑا افسوس ہے کہ ایک پرانا دوست اتنے دن بعد ملا اور اس رنگ میں!"

اس پر ہنس دیئے اور کہنے لگے: "تمہاری قسمت میں افسوس کرنا ہو تو میرا کیا بس! قربان جاؤں۔ تم لوگ افسوس اور شادمانی کا فلسفہ ہی نہیں جانتے۔ جذبات کی بیڑیاں اور ماحول کا قیدخانہ ہی تمہاری دنیا ہے جو ان چیزوں سے آزاد ہو جائے اس پر تم افسوس کرتے ہو۔"

"سچ کہتے ہو۔ دیوانہ باش تا غم تو دیگراں خورند۔"

"اچھا میری لنگوٹی کو تو ہاتھ لگاؤ نہیں۔ قربان جاؤں یہ کھل گئی تو یاد رکھنا دنیا کا شیرازہ بکھر جائے گا۔" اس پر مجھے ہنسی آگئی۔ کہا: "بندھی ہوئی کب ہے؟ یار گزرتی تو بڑے مزے میں ہو گی۔ کیا نظر آتا ہے کچھ سناؤ تو۔"

"ہر ذرہ میں صحرا ہے ہر قطرے میں دریا ہے
اک قطرہ کی کیا ہستی اک ذرہ کا کیا کہنا

قربان جاؤں بڑے کوئی ہمہ لڑکوں کو ہشت کہدو گے تو کیا حرج ہو گا۔"

غرضکہ اسی طرح دو باتیں معقول کرتے تو چار بے معنی بڑی دیر ہو گئی۔ رات ہونے کو آئی۔ ایک دفعہ ہی ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ تہمد کسا اور روانہ ہو گئے۔ ہم پیچھے چلے تو پتھر اٹھایا۔ "ماردوں قربان جاؤں سر لال ہو جائے گا۔ کپڑے اتار کر پھینکنے پڑیں گے۔ میری لنگوٹی پر ہاتھ ڈالنا آسان نہ سمجھنا۔" یہ فقرے انہوں نے کچھ اس طرح کہے کہ ہم ڈر گئے۔ خدا کے بھید خدا ہی جانے۔ کہتے ہیں کہ مجذوب سے الجھنا نہیں چاہیئے۔ وہ اپنا جیسا بنا لیتا ہے۔ اگر سچ مچ کے مجذوب تھے تو ڈرنا تھا بھی واجبی۔

میاں قربان جاؤں چند قدم تو نظر آئے پھر غائب ہو گئے۔ سارے راستے اور رات بھر یہی انہی کا خیال رہا کہ ماں باپ نے کیسی کیسی

سائنس—اور سائنس

"گفت حکمت را خدا خیر کثیر"

ئنس اور ٹکنالوجی آج کی نہایت اہم ضرورت:
در پاکستان کی خصوصی توجہ کا مرکز و محور

بہار—اور بہار

"گلشن کا بندوبست برنگ دگر ہے آج"

ہانگیر پارک، کراچی: نئے اہتمام سے آراستہ
س کا صدر پاکستان ہی نے افتتاح کیا اور اسی میں
البان کراچی کی طرف سے جشن و چراغ قوم کا
شاندار استقبالیہ

اخوت — اور اخوت

"اخوت کی فراوانی، محبت کی جہانگیری"

سر زمین مجاہدین — تیونس کو تسلیم کرنے میں
پاکستان کی پیشقدمی: صدر پاکستان کی طرف سے
نو طلوع دولت اسلامی کے سفیر خاص، جناب حبیب شطہ
کا پرتپاک خیر مقدم

آرزوؤں کے ساتھ پالا ہوگا۔ کیا کیا توقعات ہوں گی اللہ میاں بھی بڑے بے نیاز ہیں۔ بیچارے کا دل ہی الٹ دیا۔ پڑھا لکھا سب خاک میں مل گیا۔ کسی کی نظر پڑ گئی۔ کوئی دحشت بھی نہ کسی قسم کی لٹک۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ دیوانے ہیں یا کچھ اور۔ لیکن باتیں تو بالکل بے تکی نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے نشے میں کوئی اچھا لائق آدمی بہکنے لگتا ہے۔ بہر حال اگر دماغ خراب ہوگیا ہے تو افسوس اور اگر مجذوب ہوگئے ہیں تو سبحان اللہ پھر تو صاحب مدّت کہنا چاہیئے۔ بائیس خواجہ کی چوکھٹ ہے یہاں ایک دربان کی ضرورت بھی تھی۔

اس واقعہ کے بعد کوئی بیس سال تک دہلی سے باہر رہنے کا اتفاق ہوا۔ دہاں کبھی بھولے سے بھی میاں قربان جاؤں کا خیال تک نہ آیا۔ گھر پہنچنے کے بعد یہ حالت ہوئی کہ کنبہ بڑا اور آمدنی کم۔ قاعدہ ہے کہ جب ہاتھ پاؤں کی طاقت سے کام نہیں نکلتا تو دماغ اللہ والوں کی طرف دوڑتا ہے۔ خیال ہوا کہ کسی عامل کامل کا دامن پکڑا جائے۔ چنانچہ ایک روز بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ میاں قربان جاؤں کے متعلق تو کسی سے پوچھو۔ اگر واقعی ان کے دماغ میں فتور نہیں تھا اور کسی روحانی جذبے کی بات تھی تو دس بیس سال میں چودہ طبق روشن ہوگئے ہوں گے۔ انہی کے آگے کیوں نہ رونا روؤں۔

چنانچہ ہم نے مختلف احباب سے میاں قربان جاؤں کو دریافت کیا۔ کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ۔ آخر ایک صاحب نے کہا کہ بھئی اب ان کا پہلا سا رنگ نہیں رہا۔ برسوں سے وہ گھوڑ دوڑ بند ہے۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ سالک مجذوب کا درجہ مل گیا۔ ہم تو جانیں ہوش میں کمی آگئی ہے۔ دنوں شہر میں نہیں آتے۔ فیروز شاہ کے کوٹلے میں دریا کی طرف ایک جگہ پڑے رہتے ہیں اکثر خاموش۔ اور جب کبھی بہر کھل جاتا ہے۔ باتیں کرنے پر آتے ہیں تو اللہ دے اور بندہ لے۔ کبھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی ہیں کبھی پروفیسر ــــ

ہمیں ٹھکانہ تو معلوم ہوگیا تھا۔ دوسرے دن صبح ہی میاں کو جا پکڑا ننگے سر گلے میں لٹھے کا کرتہ۔ غرارے دار پاجامہ لبی ڈاڑھی۔ آدھی سفید آدھی سیاہ۔ پتھروں کا ڈھیر سامنے تھا نیچی گردن کئے کبھی انہیں ایک قطار میں کھڑا کرتے اور کبھی ہاتھ مار کر گرا دیتے۔

ہم نے نزدیک پہنچکر کہا "میاں یہ کیا ہو رہا ہے؟"
میاں نے نگاہ اٹھائی۔ آنکھیں سرخ تھیں اور غور سے ہماری طرف دیکھا۔

"میاں لڑکے تو اب نہیں ستاتے۔؟"

"ہشت، قربان جاؤں۔ لڑکے اب جوان ہوگئے۔ انہوں نے لنگوٹی میں پھاگ کھیلنا چھوڑ دیا۔"

"بھئی اب تو نام بتا دو۔"

"دوست مسمّی ہی نہیں تو اسم کیا۔ قربان جاؤں۔ ظالم نے اپنی یاد کے سوا سب کچھ بھلا دیا۔"

"بیس اکیس سال کے بعد دیکھا ہے۔ میاں بڈھے ہوگئے۔"

"قربان جاؤں اوپر کے چولے میں ذرا جھرس آگئے ہیں تم اسے بڑھاپا کہتے ہو۔ اسے لعنت اے پھٹے سے منہ جس صورت کو میاں پسند کریں جس روپ میں وہ بلائیں۔ اس کو کس کی مجال ہے جو بڑھاپا کہے"۔

اس بات پر میں کچھ سہم گیا اور کہا "میاں میں نے تو ایک رسمی بات کہی تھی تم تو آنکھیں نکالنے لگے۔"

"یہ نوبت تو پہنچ گئی۔ اور اب بھی رسمی باتیں تم نے چھوڑی نہیں۔ قربان جاؤں انہی رسمیات نے بِس بوئے ہیں۔ دنیا جھوٹی مکار دغا باز بھان متی کا پٹارہ ہوگئی۔ کہو نوکری چھوٹ گئی۔ فرعون سے بندے بن گئے۔

"ہاں میاں۔ بڑی تنگی سے گزر ہوتی ہے"۔

"پھر میرے پاس کیا رکھا ہے۔ لنگوٹی تھی وہ اتر گئی۔ یہ کرتہ پاجامہ ہے تو تم اتار لو۔"

"تمہاری لنگوٹی میرے کس کام کی تھی اور اس کرتے پاجامے سے میرا کیا بھلا ہوگا۔ مجھے تو کچھ اور دو۔"

میاں پر گانے کا موڈ طاری ہوگیا: "سارے پنچھی مل کے پکارے دینے والا داتا ہے۔ قربان جاؤں۔ تم طالب دنیا ہو اور میں تارک الدنیا۔ کسی ایسے کے پاس جاؤ جس نے دنیا کا ٹھیکہ لے رکھا ہو۔"

"اچھا کوئی خدا رسیدہ بزرگ" درویش کامل انسان ہی بتاؤ جس کی صورت دیکھ کر قلب کو اطمینان ہو اور اس اضطراب میں کمی آئے۔"

"اپنے نقطۂ نگاہ سے بتاؤں یا تمہارے؟"

"میرا نقطۂ نگاہ کیا۔ تمہارے علم میں جو بہتر آدمی ہو وہ بتاؤ"

"کیا تم نے غریب بال بچوں والے خانہ دار لوگوں کو دیکھا ہے؟ نہیں دیکھا تو آنکھیں کھولو اور دیکھو۔ یہ سب انسان ہیں۔ ٹاکم ٹوک

انسان! قربان جاؤں اگر تم کو ایک دن یا ایک رات ان کے ساتھ رہنے۔ ان کی محبت میں سانس لینے کا اتفاق ہوتا تو انسان کی تلاش میں یہ سرگردانی نہ اٹھانی پڑتی۔ اپنی عمر کا ایک حصہ ناممکن الوجود انسان نما فرشتوں کی جستجو میں نہ کھوتے۔ جاؤ ان کی بظاہر شکستہ حالی کا معنی پرست نگاہوں سے مطالعہ کرو۔ ان کے بال بچوں کی پیشانیوں کو بوسے دو۔ ان کے ہاتھ پاؤں پر محبت کے پھول چڑھاؤ اور اگر کسی خدا رسیدہ انسان کی جستجو ہے تو ان کی مسرتوں کو بڑھاؤ۔ تمہارے سارے دلدر پار ہو جائیں گے اور تم بھی انسان بن جاؤ گے۔"

اتنا سنتے ہی ہمارے خیالات سُن ہو کر رہ گئے۔ جتنی امیدیں تھیں تار تار ہو کر رہ گئیں اور ہم میاں قربان جاؤں کا بڑی حسرت سے منہ دیکھنے لگے۔

مگر میاں اس وقت جوش میں آچکے تھے کڑک کر بولے:

"کیوں، انسانوں سے بھاگتا ہے اور پھر انسان کی تلاش! قربان جاؤں انسان کون ہے؟ قدرت کا زندہ! ایک گرہستی۔ اپنی محنتوں کا پھل دوسروں کو کھلانے والا۔ ایک مالی جو اپنے پھولوں سے دوسروں کے دماغ معطر اور دوسروں کی مجلس سجاتا ہے۔ اپنی جبینِ نیاز کو ان کے آگے جھکا۔ مزدوروں سے صبر و شکر اور قناعت کا سبق لے۔ چند روز کی بات ہے۔ تیرے اندر خود وہ چیز پیدا ہو جائے گی جسے تو ڈھونڈ رہا ہے۔ قربان جاؤں آئندہ مجھے دق نہ کرنا۔ میں نے تمہیں وہ بات بتا دی ہے جس پر تم نے عمل کیا تو جیتے جی کوئی مشکل پیش نہیں آ سکتی اور مرتے بھی تو کفر کا اندیشہ نہیں۔ تم مسلمان ہی رہو گے اور مسلمان بھی انسان بن کر۔ اسلام علیکم۔ قربان جاؤں۔ خدا حافظ۔"

اس کے بعد ہم میاں قربان جاؤں سے نہیں ملے۔ کیونکہ ان کی باتیں کچھ ناگوار سی گذری تھیں۔ دنیا کا دستور بھی یہی ہے کہ جس کی باتیں اپنے مطلب کی نہیں ہوتیں اسے دل الٹا اور پاگل کہنے لگتے ہیں۔ تھوڑے دن کے بعد سنا اور ان الفاظ میں سنا کہ میاں قربان جاؤں کا وصال ہو گیا۔ اور ان کا جنازہ "فرشتے" اٹھا کر لے گئے۔ یہ افواہیں تو ہمارے لئے کہاں تک قابلِ یقین ہو سکتی تھیں آپ ہی سمجھ لیجئے۔ لیکن حقیقت میں آج تک نہیں کھلا کہ کس طرح مرے کس نے دفن کیا۔ کہاں دفن ہوئے اور دفن و کفن کے وقت کیا صورت رہی۔ غالب کا یہ شعر ان پر صادق تھا ؎

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

غرضکہ جس طرح ان کی زندگی ایک معمہ تھی اسی طرح ان کا مرنا بھی اچنبا ہی رہا۔ بہرحال وہ مر گئے یا بقول لوگوں کے "پردہ کر گئے" اور ہمیں مرنا ہے ایمان کی پوچھتے ہو تو جو باتیں انہوں نے کہی تھیں وہی پیش آ رہی ہیں اور اگر کچھ دن اور زندہ رہے تو باقی پیشین گوئی بھی سچ ہو کر رہے گی۔

مشرقی پاکستان:

"سرودِ رفتہ باز آید کہ نہ آید"

(ڈھاکہ میں اردو ڈرامہ اور اسٹیج — ایک بازگشت)

عشرت رحمانی

وہ زبان جسے مشرقی پاکستان کے لوگ پیار اور عزت کے باعث "بنی کی جبان" (بنی کی زبان) کے نام سے یاد کرتے ہیں برسوں بول چال ہی نہیں بلکہ علم و ادب کے لئے بھی برتی گئی ہے۔ اور اگر علم و ادب کو پڑھے لکھوں کی چیز سمجھا جائے تو کھیل تماشوں اور تھیٹروں کے لئے بھی جو بالکل عام لوگوں کی چیزیں ہیں، ایسے ہی ذوق و شوق سے برتی گئی ہے جتنی خود بنگلا۔ بالخصوص بوڑھی گنگا کے شاد آباد کناروں پر وہ جو سہانا، پیارا پیارا شہر ہے۔ ڈھاکہ۔ مشرقی پاکستان کی روح و رواں۔ پہلے بھی اور اب بھی اس کا دارالحکومت رہا ہے۔ اس نے اردو زبان، اردو ادب اور علوم و فنون کی ترویج و ترقی میں کیا کچھ حصہ نہیں لیا۔ وہ حصہ جو رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔ ہماری اور مشرقی پاکستان کی تاریخ کا وہ شاندار باب جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلہ میں اردو ڈرامہ اور اسٹیج کی ترقی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

ڈھاکہ کا یہ دور ڈرامے کی تاریخ میں بجائے خود ایک اہم کڑی ہے۔ لکھنؤ میں "اندر سبھا" کے ساتھ جس دور کا آغاز ہوا ڈھاکہ نے اسے آگے بڑھایا۔ چنانچہ یہ امر واقعہ ہے کہ شہر نگاراں، لکھنؤ میں جس سال — ۱۸۵۲ء — میں ناٹک "اندر سبھا" لکھا گیا اسی وقت ڈھاکہ میں "ناگر سبھا" نامی پہلا اردو کھیل لکھا اور کھیلا گیا۔ یہ ڈرامائی توارد بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس کے بعد ڈرامہ کا دامن پارسی اسٹیج کے ساتھ ایسا بندھا کہ اس کا سلسلہ برس ہا برس جاری رہا۔ یہ وہ رشتہ تھا جس نے اس تاریخی سلسلہ کو مربوط و مضبوط بنانے میں بڑی خدمت انجام دی، ورنہ ۵۳-۱۸۵۲ء کے بعد ۱۸۶۲ء تک، جب کہ بمبئی میں اردو ڈرامے کا آغاز ہوا، دس سال کی مدت ایک طویل خلا ثابت ہوتی اور شاید پارسی اسٹیج کو آراستہ کرنے کیلئے نئے سرے سے فکر و کاوش کرنا پڑتی، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ پارسی تھیٹر کو اپنے دور میں جو سہولتیں اور ترقی کے سامان میسر آئے وہ مال و دولت کی موجودگی کے باوجود ممکن نہ ہو سکتے۔ کیونکہ اہلِ ذوق پارسیوں نے اردو اسٹیج کی بنیاد گجراتی ڈراموں کے اردو ترجموں اور چند طبعزاد ڈراموں پر رکھی، تاہم ۱۸۵۲ء سے لے کر ۱۸۶۲ء تک ڈھاکہ میں مسلسل نئے ڈرامے لکھے اور اسٹیج کئے جاتے رہے۔

اس کے کچھ عرصے بعد پارسیوں نے ڈھاکہ کی اسٹیج کی دھوم دھام کا حال سن کر وہاں سے ڈرامہ نویسوں کو طلب کرنا شروع کر دیا جو اپنے ساتھ ڈھاکہ اسٹیج کے لئے لکھے اور اسٹیج کئے ہوئے ڈرامے لے کر بمبئی پہنچ گئے۔ اس وجہ سے ڈھاکہ اسٹیج کو ان کی جگہ نئے ڈرامہ نویس مل گئے اور گذشتہ ڈرامے بھی اسٹیج ہوتے رہے۔ لیکن پارسی تھیٹر کو ان قدیم ڈراموں سے ایک بڑا فائدہ پہنچا اور وہ یہ کہ معمولی تبدیلیوں کے ساتھ وہ انہیں اسٹیج کرنے کے قابل ہی نہیں ہو گیا بلکہ ان پارسی سیٹھوں نے جو اردو ادب کا ذوق رکھتے تھے ڈھاکہ اسٹیج کے بعض ڈرامانویسوں کا تلمذ بھی اختیار کر لیا اور اس طرح اپنے ترجمہ کئے ہوئے ڈراموں کی ان سے صحت بھی کرانے لگے۔ نیز بمبئی کے ان شعرا کو جو اودھ، روہیلکھنڈ، لکھنؤ، بریلی، میرٹھ اور رامپور وغیرہ سے وہاں جا کر تلاش معاش کے لئے مقیم ہو گئے تھے، ڈرامہ نویسی کی طرف متوجہ کرتے اور ڈرامے تیار کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ یہ لوگ "منشی" کہلاتے تھے۔ یہاں تک کہ احسن لکھنوی اور سید عباس علی جیسے مستند شاعر و ادیب بھی ڈرامانویس بن کر تھیٹر کی دنیا میں "منشی احسن" اور "منشی عباس" کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ غرض بمبئی کے ابتدائی دور میں "منشیوں" کو ڈرامانویسی سکھانے میں بھی ڈھاکہ سے آئے ہوئے ڈرامانگاروں کا

بٹنا ہاتھ تھا۔ لہٰذا پارسی تھیٹر مشرقی بنگال کا خوشہ چیں بنا۔

اگرچہ ڈھاکہ کے ڈراموں میں کوئی خاص قابلِ ذکر خصوصیت یا کمالِ فن نظر نہیں آتا پھر بھی اس عہد کے مذاق اور تقاضوں کو پورا کرنے میں ان کا بڑا حصہ تھا۔

ڈھاکہ اسٹیج کا کچھ حال مجھے اپنے قیام ڈھاکہ کے دوران اس زمانہ کے ایک معمر ایکٹر کی زبانی بھی معلوم ہوا جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ ڈرامے زیادہ تر نوٹنکی کے انداز میں پیش کئے جاتے تھے یعنی پھلواری میں سے راوی بولتا اور قصہ بیان کرتا چلا جاتا تھا اور متعلقہ کردار اسٹیج پر آکر اپنا پارٹ جو زیادہ تر منظوم ہوتا تھا، بولنا شروع کر دیتا تھا۔ جن صاحب کا میں نے ذکر کیا وہ خود بھی اوائل عمر سے اسٹیج سے متعلق رہے تھے اور ان کے چچا بھی اس وقت کے نامور ایکٹر مانے جاتے تھے۔

اس طرزِ پیشکش کا ایک ڈرامہ "سرلا" تھا جس کا ایک مطبوعہ نسخہ مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس کے دیباچہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ پہلے کلکتہ میں طبع ہوا۔ اس کے بعد کانپور کے مطبع سلیمانی نے اسے چھاپا اس کے سرورق پر یہ عبارت دکھائی دیتی ہے:

"سرلا — عرف طلسم بنگال" دوسری عبارت یہ بتاتی ہے:-

"بنگالی ڈرامہ - سرلا — موسوم بہ طلسم بنگال"۔ نیچے ایک تشریحی سطر ہے کہ یہ ڈرامہ "زن مرید کا اعمال نامہ" ہے۔ اس کے لکھنے والے کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے: "از تصنیفاتِ شاعر نکتہ ایجاد مصنف کتب کثیر التعداد منشی رام سہائے تمنّا"۔

قصہ کا لب لباب صرف اس قدر ہے کہ ڈھاکہ میں دو بھائی رہتے تھے۔ بڑا بھائی مرحوم باپ کی دولت و جائداد پر قابض تھا۔ دونوں بھائیوں میں ملاپ تھا مگر بڑے بھائی کی بیوی اپنے دیور اور دیورانی سے جلتی تھی اور آخر کار ان دونوں کو گھر سے نکال کر رہی۔ چھوٹی بیوی کو دق ہو گئی میاں نوکری کرنے کلکتہ بھی چلا گیا وہ اپنی بیوی سرلا کو خط، پارسل اور زیور کلکتہ سے بھیجتا رہا۔ جیٹھانی یہ سارا مال ہضم کرتی رہی۔ بالآخر بھانڈا پھوٹ گیا اور وہ گرفتار ہو گئی۔ سرلا یعنی چھوٹی بہو اور اس کا بچہ مر جاتا ہے۔ چھوٹا بھائی خاندان کی عزت کی خاطر دائر کردہ مقدمہ واپس لے لیتا ہے اور بڑا بھائی اپنی چالاک و عیّار بیوی کے کرتوتوں سے شرمندہ ہوتا ہے۔

ڈرامہ حسب معمول منظوم ہے اور شاعری کا دلچسپ نمونہ اس کی چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں:

یہ ڈرامہ طرفہ افسانہ ہے نصیحتوں کا خزانہ ہے
یہ خوبیوں میں یگانہ ہے تو مفید صاحب خانہ ہے
لئے زلفِ شعر پہ شانہ ہے یہ لبِ سخن ترانہ ہے
جہاں سحر مکر و بہانہ ہے وہاں دنگ عقل زمانہ ہے

•

پڑھ لو ذرا عزیز و یہ پُر اثر کہانی
دُکھڑا ذرا اس کو سمجھو ہے امر نکتہ دانی
کیوں کر نہ دل شکن ہو انجام زن مریدی
مردوں کو ہو گئی ہے تلخ اس سے زندگانی

ایک مقام پر جب سرلا کا آخری وقت ہے اور اس کا شوہر کلکتہ سے دریافت حال کے لئے آتا ہے تو اپنی بیوی سے اس شعر کے ذریعے شکایت کرتا ہے:

میں نے خط بھیجے کئی بار تمہیں، زر بھیجا
پارچہ بھیجا، پلندے میں بھی زیور بھیجا

اس پر سرلا حیران ہو کر جواب میں کہتی ہے:

زر و زیور کا نشاں کیا مجھے خط تک نہ ملا
کیوں جی! ہے کیا یہی اس سچی محبت کا صلا

بڑا بھائی جب اپنی بیوی کے کرتوتوں سے آگاہ ہو جاتا ہے تو آہ و زاری کرتے ہوئے اس طرح پچھتاتا ہے:

پڑا پالا یہ کس کم بخت عورت سے، دو ہائی ہے
نہ دولت ہے نہ عزت ہے، نہ بھاوج ہے نہ بھائی ہے
ہوائے زن مریدی نے دکھلائے مجھ کو کیسا چکر
کہ اٹھتے بیٹھتے اب بیوی صاحب سے لڑائی ہے
تجارت ہو گئی غارت تردد سے نہیں فرصت
ہوا دنیا میں منہ کالا عجب ذلت اٹھائی ہے

غرض پورا ڈرامہ اسی طرح منظوم چلا گیا ہے جس سے اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ آج سے سو سال پہلے بھی ڈھاکہ میں اردو کا اچھا خاصا مذاق پایا جاتا تھا اور ایسی سلیس با محاورہ زبان کا خوب چلن تھا۔

ڈھاکہ میں یہ خصوصیت اب بھی پائی جاتی ہے کہ وہاں عوام

(باقی صفحہ ۵۵ پر)

غزل

جلیل قدوائی

شعلۂ عشق رہے، خاک بہ سر ہو نہ سکے
ہم کسی شوخ کے منظورِ نظر ہو نہ سکے

آہ کرنے کا مزہ کیا ہے بتا تو اے دوست
آہ کا جب کہ ترے دل پہ اثر ہو نہ سکے

خاص گر بات نہیں کچھ تو بھلا کیا معنیٰ؟
سب پہ ہو اُن کی نظر، مجھ پہ نظر ہو نہ سکے

عشق میں تیرے غمِ ہر دو جہاں سے فارغ
ہم نے چاہا تھا کہ ہو جائیں مگر ہو نہ سکے

ہجر کی شب کو وہ کیوں کر نہ قیامت سمجھے
بے ترے ایک بھی پل جس سے بسر ہو نہ سکے

ہائے وہ دل جسے ہنسنے کے سوا کام نہ ہو
وائے وہ آنکھ جو بھولے سے بھی تر ہو نہ سکے

پردۂ دل میں چھپایا تو ہے اس بُت کو جلیل
دل کی دھڑکن کی ترے اُس کو خبر ہو نہ سکے!

عبداللہ خاور

ہوائے شب میں تری کمسنی کی خوشبو ہے
نظر میں عارض و لب ہے جمالِ گیسو ہے

یہ مرمریں سا بدن، چاندنی کی ہے تجسیم
شعاعِ مہ تری انگڑائیوں کا جادو ہے

ہوائے اُنس سے مہکی ہوئی ہے شامِ حیات
نفس نفس کرمِ بے کراں سے مملو ہے

قرینِ چشمِ تمنّا ہے پیکرِ رنگین
نظارہ لمسِ حسیں کا لطیف پہلو ہے

وہ برگِ لب پہ ہے آہنگ مسکرانے کا
جبینِ شوق سے محوِ کلامِ گیسو ہے

بڑھا ہے شعلۂ رُخ، مقدمِ نظر کے لئے
سفیرِ حسرت و ارماں ہے یا کہ آنسو ہے

یہ التفات — توجہ کا یہ حسیں جادو
نہ جانے شانِ تلوّن ہے یا تری خُو ہے

عجب کہ یوں ہے قرینِ دل و نظر خاور
طرارہ بھرنے میں جو ہم خرامِ آہو ہے

غزل

احسان ملک

پھول کو خار کا ہمسر دیکھے
ہر رگِ گل میں جو نشتر دیکھے

آنکھ نے رات کو گن کر تارے
صبح کے لاکھ پیمبر دیکھے

درمیاں رسم کا دریا ٹھہرا
تجھ کو دیکھے کوئی، کیونکر دیکھے؟

رہروِ صبح چمن سے کہئے
زیرِ گل دشنہ و خنجر دیکھے

عشق نے دید میں تیری حائل
اشک کے سات سمندر دیکھے

نشترِ غم سے جو دل خون ہوا
آنکھ نے رنگ کے ساغر دیکھے

کل جہاں دیکھے تھے برفوں کے فلک
آج واں آگ کے شہپر دیکھے

تم نے ظلمت ہی کو دیکھا، ہم نے
رات بھر تارے منور دیکھے

اس قدر تیرہ ہوا شب کا فلک
بن گئے مہر جو اختر دیکھے

طاہر احمد

شبِ فراق کی تاریکیاں گھٹائیں گے
نظر کو آتشِ رخسار سے جلائیں گے

تمہارا نام جو بھولے سے یاد کر بیٹھیں
تمہاری یاد کے عنوان جگمگائیں گے

ترے خیال کو دل سے بھلا دیا لیکن
ترے خیال کی دنیا نئی بسائیں گے

شفق کا رنگ، گلوں کی قبا، خرامِ صبا
جدھر وہ جائیں گے مستی بکھیر جائیں گے

تمہارے بام سے ہو کر چمن میں دھوپ اُتری
گلاب و لالہ و سوسن نکھار پائیں گے

یہ سر پھرے، یہ ستم کش، یہ تیرے دیوانے
غرورِ گردشِ افلاک کب مٹائیں گے

دیارِ حسنِ تمنا کہ لٹ گیا کب کا
چلو! کہ پھر سے اسی شہر کو بسائیں گے

شفق کی آگ سے احمر دہک اٹھیں شاخیں
چمن سے کنجِ قفس تک شرار جائیں گے

سفید پٹّی

(ایک علامت، ایک حقیقت)

اختر رُشدی

"ہر فرقہ کے لوگوں کو پاکستان کا شہری سمجھا جائے گا اور ان
کے حقوق و مراعات اور ذمہ داریاں مساوی ہوں گی۔
اقلیتوں کی حفاظت کی جائے گی اور وہ امن میں رہیں گی۔"
(قائدِ اعظمؒ)

محض پٹّی ہی نہیں بلکہ سفید پٹّی، یہ ہمارے قومی پرچم کا ایک نمایاں طرّۂ امتیاز ہے۔ ایک بنیادی چیز۔ سبز پٹّی سے کچھ کم چوڑی ہی سہی لیکن اس سے کم اہم نہیں، بلکہ یہ تو اس کا جزو ہے اور جزو لاینفک۔ ہمارے مذہب نے ہمیں جو کچھ سکھایا ہے اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اقلیتیں ہمیں عزیز ہیں۔ وہ ہماری ایک مقدس امانت ہیں۔ پہلے بھی ہم ان کے ساتھ پوری رواداری سے پیش آتے رہے اور آج بھی اس مایۂ ناز روایت پر کاربند ہیں۔ ہماری اقلیتیں ــــ عیسائی، پارسی، ہندو، بدھ، سب کا چَین، آرام، آسودگی، خوش حالی، بے کھٹکے زندگی، آزادی، اس کی واضح علامت ہیں۔ ان کا مذہب، ان کے عقائد، ان کے طور طریق، رسمیں، ریتیں، سب ایسے محفوظ ہیں گویا وہ کسی پرائے دیس میں نہیں بلکہ اپنے ہی دیس میں آباد ہوں اور ہم اپنے قومی پرچم کو مخاطب کرتے ہوئے بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ:

"بستے ہیں ترے سایہ میں سب شیخ و برہمن"

ہماری اقلیتوں میں سے ایک بودھی بھی ہیں۔ کہاں یہ لوگ اور کہاں مسلمان۔ دونوں میں ہر لحاظ سے زمین آسمان کا فرق لیکن ہمارے یہاں کی رواداری اور فراخ دلی دیکھئے کہ یہ لوگ جیسے بھی ان کا جی چاہے، زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور جہاں کہیں وہ نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں وہ خود ہی محفوظ نہیں بلکہ ان کی قدیم تاریخ کے آثار بھی محفوظ نظر آتے ہیں۔ یوں تو بودھوں کا دم قدم برِصغیر میں کہاں نہیں رہا اور ان کے آثار اس خطہ میں کہاں نہیں پائے جاتے، لیکن پاکستان میں جابجا ان کے اتنے آثار دکھائی دیتے ہیں گویا یہ بودھوں کا اپنا ہی گھر، اپنا ہی گہوارہ ہو اور ان کا ورثہ پاکستان کا اپنا ورثہ ہو۔

دیکھنے میں اور فی الحقیقت بھی بدھ مت اور اسلام میں بیحد فرق سہی مگر ایک بات ہے جو ان دونوں مذہبوں کے پیروؤں کو ایک ساتھ لاکھڑا کرتی ہے۔ ہم میں سے کسے یاد نہیں کہ بدھ مت نے دنیا میں کیا کردار ادا کیا ہے۔ یہ انسان کا مذہب، عوام کا مذہب اور نجات کا مذہب تھا۔ اس کا وار سب سے زیادہ ایک ہی چیز پر تھا۔ برہمنیت، سنگدل برہمنیت جس نے اس زمانے میں بھی انسانی زندگی اور عوام، خصوصاً اچھوتوں کو بھی بری طرح دبا رکھا تھا اور آج بھی ویسے ہی ان پر سوار ہیں۔ بدھ مت عوام، عوام، کے نعرے بلند کرتا ہوا میدان میں آیا اور ہر انسان کو اس کا چھنا ہوا حق دلوا کر چھوڑا۔ اسلام بھی تمام تر ایسی ہی مساوات کا حامی ہے۔ وہ کسی بڑے کسی پردھت، کسی رئیس، کسی اونچے یا نیچے طبقہ کو تسلیم نہیں کرتا۔ راہیں مختلف سہی لیکن منزل، سب انسانوں کی برابری، ان کی بھلائی ــــ ایک ہی ہے۔ اس لئے اگر بودھیوں کو پاکستان کی ہوا راس آئی ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ جو بات آج ہوئی ہے، وہ اس سے پہلے بھی ہو چکی ہے یعنی بسے بسائے لوگوں کو اپنے گھر بار چھوڑ کر کہیں اور گھر بسانا پڑا ہے چنانچہ جب بودھ مت کو ہندوستان سے دیس نکالا ملا تو اس نے اُن شمالی علاقوں کی طرف بڑھنا شروع کیا جو آج کل مغربی پاکستان میں شامل ہیں۔ اگر ہم اسلام آباد سے آگے بڑھتے جائیں اور

خیبر تک، بلکہ اس سے آگے کاشغر اور یارقند کی طرف نکل جائیں جیسا کہ سر آرل سٹین جیسے نامور ماہر آثار قدیمہ نے کیا تھا، تو ہمیں جا بجا بودھوں کے آثار ملیں گے۔ کیونکہ یہ سارا علاقہ ان کی تہذیب اور تمدن کا ایک شاندار گہوارہ اور مرکز و محور بن چکا تھا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ مہاتما بودھ خود یا تو اپنے دیس، مگدھ (بہار) اور اتر پردیش (یوپی) کے بعض علاقوں سے باہر نہیں نکلے مگر ان کا پیغام شمالی ہند میں اتنی دور دور پہنچا اور یہ کون نہیں جانتا کہ بدھ اور بُت میں کیا کچھ ربط نہیں۔ بلکہ بُت کو بدھ ہی کی بدلی ہوئی صورت خیال کیا جاتا ہے کیونکہ بودھی، گوتم بدھ شاکیہ مُنی کو طرح طرح کی مورتیوں کی شکل میں پیش کرنے کے بڑے ہی شوقین تھے اور جہاں جہاں ان کے قدم پہنچے وہاں وہاں بے شمار مورتیاں ہی مورتیاں ملتی ہیں فنی حیثیت سے بڑی ہی نفیس اور نادر ـــــ اور وہ علاقہ جسے گندھارا کہتے ہیں، ان کے لئے اتنا مشہور ہے کہ بودھی فن اور یہ علاقہ لازم و ملزوم خیال کئے جاتے ہیں۔ اور یہ علاقہ ہمارے اپنے سابق صوبۂ سرحد کے سوا اور کون سا ہے؟

ایک اتفاق، جسے حسن اتفاق کہنا چاہیئے، یہ ہوا کہ سکندر اعظم کے ساتھ ایک اور قوم مشرق میں آپہنچی جو بودھیوں ہی کی طرح اصنام خیالی نہیں بلکہ اصنام حقیقی تراشنے کی دلدادہ تھی۔ ان کے آنے سے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک آملے اور مغرب کا سرا مشرق سے مل گیا۔ اور ایک قوم کے آذر دوسری قوم کے آذروں سے مل گئے۔ گندھارا آرٹ میں ان دونوں کے فن کی لہریں آپس میں گھلی ملی نظر آتی ہیں۔ حسن باطن، حسن ظاہر کے ساتھ گلے ملتا ہوا اور دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ایک بلندی سے دوسری بلندی کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے ہمارے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات کیا ہوگی کہ یہ فن ہمارے ہی ملک میں صدہا برس پہلے نمو پذیر ہوا اور اتنے وسیع علاقے میں اس کے اتنے کثیر اور مہتم بالشان آثار ملتے ہیں کہ ہم ان پر ناز کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ حقیقت ہے کہ پورے برصغیر میں بودھوں کے اتنے آثار نہیں پائے جاتے جتنے ہمارے یہاں۔ حالانکہ ہمارا مختصر سا علاقہ کہاں اور اس کا وسیع و عریض علاقہ کہاں۔ لہذا چین و جاپان کا "حرم" اگر کہیں ہے تو وہ زیادہ تر پاکستان ہی میں ہے۔

مدتیں گزریں جب مشہور چینی سیاح، فاہیان برصغیر میں آیا ہے تو وہ ایک عقیدت مند یاتری کی طرح ملک کے گوشے گوشے میں گھومتا پھرا اور جگہ جگہ کی زیارت کی۔ اس کے بیان سے صاف صاف پتہ چلتا ہے کہ بدھ مذہب کی جنم بھوم، کپلاوستو (بہار) برہمنی دور کی یورشوں کی نذر ہو چکی تھی۔ بودھیوں کا مقدس مقام بھی ایک ویرانہ بن چکا تھا۔ اس کے برعکس جب وہ شمال مغربی علاقے کی طرف آیا تو یہاں بدھ مت کی جوت جا بجا روشن دکھائی دی۔ ہزاروں بھکشو پہاڑی خانقاہوں میں دھیان گیان میں گم رہتے، بدھ مت اٹک ہی نہیں مہران تک بھی پہنچ چکا تھا، یعنی اس دھرتی میں جسے لوگ سینکڑوں برس سے سندھ کہتے چلے آئے ہیں۔ یہاں ساتویں صدی تک اس کو راج پاٹ بھی نصیب رہا۔ مگر اس زمانہ میں چچ نامی ایک چالاک برہمن نے بودھ مذہب کا خاتمہ کر دیا اور اسی کے لڑکے، داہر نے حجاج بن یوسف سے لڑائی مول لے کر محمد بن قاسم کے حملہ کی وجوہ پیدا کیں۔

مغربی پاکستان کا علاقہ وہ ہے جس میں بدھ مت ہی نہیں علم اور فن کی جوت بھی پوری طرح جگی رہی ہے۔

ٹیکسلا کی یونیورسٹی کے کھنڈر آج بھی اس کی عظمت کی گواہی دیتے ہیں۔ نجاری، بت گری، سنگ تراشی بلکہ جہاز سازی ایسے فنون تھے جن پر بجا ناز کیا جا سکتا ہے۔ ہمارا شمال مغربی علاقہ بودھوں کے آثار سے بھرا پڑا ہے۔ ان کے استوپ یعنی گول چھتی ہوئی خانقاہیں، پہاڑی گپھائیں اور سنگرام جا بجا موجود ہیں۔ گلگت تک میں ایک عمودی پہاڑی پر بدھ کی تصویر کھدی ہوئی ملی ہے۔ یہ جگہ سطح سمندر سے ۵ ہزار فٹ بلند ہے۔ حکومت پاکستان کا محکمۂ آثار قدیمہ ان آثاروں کا کھوج لگاتا رہتا ہے۔ جس سے کتنے ہی ثقافتی نوادر برآمد ہو چکے ہیں۔ ابھی ابھی وادیٔ سوات میں جو کھدائی ہوئی ہے اس سے ان انمول جواہر پاروں کا بھرپور خزانہ ہاتھ آیا ہے۔

مشرقی پاکستان میں بدھ مت کے پیرو اس وقت ہندوستان سے بھی زیادہ ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں جو کھدائیاں مینامتی میں ہوئیں ان سے بودھی آثار کا ایک طویل سلسلہ ملا ہے جو گیارہ میل تک پھیلا ہوا ہے۔ ۱۹۶۰ء کی مردم شماری کے مطابق اس وقت مشرقی پاکستان میں ۳۱۶,۰۰۰ بودھی موجود ہیں۔ جو

(باقی صفحہ ۴۹ پر)

آتما کی گونج

صہبا اختر

میں کسی جنم کے ستوپ پر اک اتھاہ سوچ میں ڈوب کر ہوا اپنے آپ سے بے خبر
مرے ساتھ مڑنے لگی زمیں مرے ساتھ اڑنے لگے نگر ہوئے بیتے جگ مرے ہمسفر
میں سکوتِ مرگِ تمام میں کسی آبشار کی نغمگی کی طرح بکھرتا چلا گیا
میں کسی چٹان کے غار میں شبِ ماہتاب کی روشنی کی طرح اترتا چلا گیا
مرے اردگرد اڑے قرن ہیں نہ جانے کتنے جنم اُدھر کی زمیں پہ محوِ خرام تھا
ابھی دو قدم ہی چلا تھا میں کہ کسی شگوفۂ خواب نے یہ کہا کہ آ مرے پاس آ
کوئی بات چھیڑ دے پیار کی بڑی چپ ہے رات یہ دھیان کی کہیں روشنی نہیں گیان کی
مرے جسم تیرے کھنڈر میں کیا سبھی مٹ گئی ہیں نشانیاں مری آتما کے مکان کی
ترے من کی آگ کو کیا ہوا تری آنکھ سنگ کی آنکھ ہے تجھے کچھ نظر نہیں آ رہا
یہیں بدھ کے چرنوں میں جھوم کر مری طرح جوشِ نشاط میں کیا رقص تو نے بھی بارہا
ذرا من کی لو سے لگا لگن ذرا دیکھ غور سے جانِ من یہاں دیپ دیپ میں پریم اگن
اسی چہرہ زار کی صورتیں اسی مشک زار کی نکہتیں ہیں رواں دواں سرِ ہر چمن
یہ ہزار گیتوں کا آشرم جہاں پریم داسیاں دمبدم تھیں خرامِ نغمہ قدم قدم
جہاں چاندنی تھی پونم پونم جہاں تال تال تھے سم پہ سم جہاں ناچتا تھا صنم صنم
وہ جہاں سفید کنول کھلے جہاں جھیل جھیل مقابلے ہوئے روشنی کی اڑان کے
جہاں جھومتی تھی فضا فضا جہاں تو نے دیکھے گھٹا گھٹا کھنچے بان اِندر کمان کے

جہاں رات رات مسعائیں تھیں، جہاں بات بات کتھائیں تھیں، جہاں ساتھ ساتھ شعاعیں تھیں
جہاں رنگ رنگ فضائیں تھیں، جہاں سنگ سنگ صدائیں تھیں، جہاں جلترنگ ہوائیں تھیں
جہاں بھوک پا گئی بھوگ سب، جہاں ختم ہو گئے سوگ سب، جہاں انت ہو گئے روگ سب
جہاں نغمگی بھی سکوت بھی، جہاں روشنی بھی ہے سائے بھی، ہے یہی وہ جنّتِ نیم شب

نہ مونجو دارو نہ ساکیہ، ارے تو نے سب کو بھلا دیا، تجھے کچھ بھی یاد نہیں رہا
وہ ہزار راگوں کی وِدّیا، وہ جنم جنم کی تپسیا، تجھے کچھ بھی یاد نہیں رہا
تجھے کچھ بھی یاد نہیں رہا تو یہ کہہ پکار پکار کر، مجھے رنگ دے اُسی رنگ میں
میں پناہ ڈھونڈتا ہوں بدھ تری بیں پناہ ڈھونڈتا ہوں دھرم میں، میں پناہ ڈھونڈتا ہوں سنگھ میں[1]

[1] یہاں پرارتھنا کے اصل بول جوں کے توں پیش کر دیئے گئے ہیں۔ اگر اس میں بول سُر تال سے ایک آدھ ماترا باہر ہو جائیں تو کیا حرج ہے! کوئی بھی تو کبھی کبھی پناہ ڈھونڈتا ہے — (مدیر)

میری برابر یہ کوشش رہی ہے کہ ہمارا آئین ہمارے کردار اور حالات کے مطابق ہو، اسے لوگ آسانی سے سمجھ سکیں اور چلا سکیں اور جس پر غیر ضروری خرچ بھی نہ ہو۔ آئین کا سادہ اور عام فہم ہونا بڑا ضروری ہے تاکہ خود غرض لوگ اسے ناپسندیدہ اور وطن دوستی کے منافی مقاصد کے لئے استعمال نہ کر سکیں۔ اس کے علاوہ ہمارے آئین میں ایسی روح کا ہونا بھی لازمی ہے جس کی مدد سے ہم اپنے تصورات اور اعمال کو اسلام کے سانچے میں ڈھال سکیں۔

اس قسم کا آئین مرتب کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے مگر مجھے امید ہے کہ خدا کے فضل و کرم سے ہماری یہ کوششیں بہت جلد کامیاب ہوں گی۔ انشاءاللہ ؂

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان

تیز ترک گامزن

احمد رفیع

سلاطین مغلیہ کی آنکھوں کا تارا، لاہور، صدہا سال سے قدیم تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ یہیں شاہجہاں کی محبوب تفریح گاہ اور حسن و دلکشی کا لازوال شاہکار شالیمار ہے، یہیں کی فضا حضرت داتا گنج بخش اور دوسرے صوفیائے کرام نے اپنے دل کی روشنی سے منور کی اور اسی خطۂ زمین پر حضرت میاں میرؒ اور بہادر خاں کے تاریخی مقبرے ہیں جن پر فنِ تاریخ جس قدر ناز کرے کم ہے۔

آج اسی تاریخی شہر کا جنوبی حصہ نئی زندگی کی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا ہے اور اس کی نوبلی نہر کی آغوش میں یہ نئی زندگی پروان چڑھ رہی ہے۔ امرتسر کے پل پر سے ایک طائرانہ نظر ڈالئے۔ شمالی جانب اس مقام تک جہاں پگھلی ہوئی چاندی کے چشمے یا نقرئی تحریر کی طرح صاف اور روشن نہر بل کھا کر جھکتی ہے۔ یہاں سے مغربی علاقہ یوں آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے جیسے پردۂ سیمیں پر لحظہ بہ لحظہ، دمبدم دمبدم بدلتے ہوئے دلکش مناظر —— نہری پانی کی سبک رفتاری، سرسبز و شاداب درخت قطار اندر قطار، لہلہاتے ہوئے کھیت، سبزہ زار۔ اور۔ جا بجا فاصلوں پر تاریخی یادگاریں جو اپنے شاندار ماضی کا افسانہ دہرا رہی ہیں، جدید وضع کی عمارتیں —— رہائشی، تعلیمی اور تربیتی —— یہ سب اس راہ سے گزرنے والوں کی چشم بینا کے لئے ایک تجربہ ہیں —— رومانوی بھی اور حقیقی بھی —— ملک میں شاید ہی کوئی اور ایسا حصہ ہو جو مسلسل اتنی دور تک قدرتی مناظر کی حسن و دلکشی اور تاریخی و تعمیری شان و شوکت کا اتنا حسین امتزاج پیش کر سکے۔ تخئیل کی بلند پروازیوں کو اس سے زیادہ کہیں اور کھلی فضا نہیں مل سکتی جہاں حال کے آئینہ میں پراسرار ماضی اس طرح جھانک رہا ہو کہ شاندار مستقبل کے خط و خال صاف نظر آئیں۔

لاہور کے حسن کو دل محسوس کرتا ہے مگر عقل کی نگاہیں اس سے آگے کچھ اور ڈھونڈھتی ہیں۔ آج چاند پر پہنچنے کی خیالی باتیں حقیقت سے ہمکنار ہیں اور اس مادی ترقی کے دور میں اگر کوئی زندہ حقیقت ہے تو وہ سائنس، وقت کا اہم تقاضا اور اس دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی گزارنے کا راز۔ سائنس اور اس کے تربیتی و تحقیقاتی ادارے، تجربہ گاہیں اور فنی و صنعتی مراکز۔ ملک و قوم کی آئندہ ترقی کے یہی راستے ہیں۔ دل و دماغ کے باہمی سمجھوتے کی اگر کوئی بنیاد ہو سکتی ہے تو وہ صرف رومان انگیز ماحول میں ایسی خوبصورت عمارتیں جن کے اندر ہماری عملی زندگی رقص کناں ہو اور لاہور کے ادارے اس کے پوری طرح آئینہ دار ہیں۔ بازیابیٔ اراضی کا ڈائرکٹریٹ، مغربی پاکستان ریلوے کا مشہور کارخانہ، گورنمنٹ انجینئرنگ اور ٹکنالوجی کالج، پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کی آبپاشی کی ورکشاپ، مرکزی حکومت کا ٹکنیکل ٹریننگ سنٹر، صنعتی و ترقیاتی مراکز اور دوسرے لاتعداد ادارے یہ سب مل جل کر ایک ہی مقصد کے حصول کے لئے سرگرم عمل ہیں اور یہ مقصد ہے زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی کفالت اور ترقی یافتہ قوموں کی صف میں ممتاز مقام حاصل کرنا۔ تمام ادارے خواہ مرکزی حکومت سے تعلق رکھتے ہوں یا صوبائی حکومت سے کُل پاکستان بنیاد پر کام کر رہے ہیں۔

مغربی پاکستان ریلوے فیکٹری اپنی نوعیت کے اعتبار سے غیر منقسم ہندوستان میں بہت اہمیت رکھتی تھی اور آج تو ایشیا بھر میں اس کا مد مقابل کوئی ریلوے کارخانہ ہی نہیں ہے۔ ۱۸۶۷ء میں یہ کارخانہ قائم کیا گیا۔ اگرچہ باہر کی طرف سے اس میں آج تک کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی لیکن اس کے اندر بہت کچھ بدل گیا ہے۔ جدید آلات اور مشینوں سے پوری طرح آراستہ ہے۔ اس میں تقریباً پندرہ ہزار ملازمین کام کرتے ہیں۔ تقسیم ہند سے قبل تو ان کی تعداد اس سے کہیں کم تھی۔ یہاں کوئلے اور تیل سے چلنے والے انجن، مسافر اور مال گاڑی کے ڈبے دن رات بنتے سنورتے رہتے ہیں۔ ملازمین کے لئے ہر قسم کی سہولتیں ہیں۔

آنے جانے اور وقت سے کام پر پہنچنے کا خاص بندوبست ہے ۔

ریلوے ہی سے متعلق کیمیکل اور دھاتیں صاف کرنے کی ایک تجربہ گاہ بھی ہے جہاں تیل، پانی، کوئلہ، دھاتیں اور ان کے مرکبات وغیرہ کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔ حال ہی میں ایک اور ادارہ جاپان ریلوے کے تحقیقاتی ادارے کی نہج پر مستقل حیثیت رکھنے والے مسائل کے متعلق چھان بین کرنے کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ اس میں سگنلنگ، تعمیر و تشکیل، مرمت، ویلڈنگ اور اسی طرح کے دوسرے فنی مسائل اور کام کے متعلق جانچ پڑتال کی تمام سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ یہ فیکٹری پوری جد و جہد کر رہی ہے کہ ریلوے کے نظام کو مثالی بنا دے۔ اس کی مصروفیات بڑھتی ہی جا رہی ہیں اور وہ بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کی راہیں طے کر رہی ہے ۔

مرکزی حکومت کا ٹیکنیکل ٹریننگ سنٹر اس علاقہ میں بڑا اہم ادارہ ہے۔ اس میں ہر قسم کی فنی تربیت دی جاتی ہے۔ ریڈیو، بڑھئی کے کام۔ جھلائی اور اسی طرح کے چند اور فنون کی تربیت کا انتظام موجود ہے۔ ابتدائی فنی تربیت کا اس سے بہتر کسی اور ادارہ میں معقول بندوبست نہیں ہے۔ ماہرین فن اساتذہ بڑے ذوق شوق سے اپنے شاگردوں کو کام سکھانے میں مصروف رہتے ہیں۔

اس علاقہ میں بازیابی اراضی کے ڈائرکٹریٹ کو حکومت کے ایک دانشمندانہ اقدام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس ادارہ کا قیام ۱۹۴۵ء میں صوبائی حکومت کے ایک فرمان کے مطابق عمل میں آیا اور اس وقت سے وہ برابر تھور (شوریت) اور سیم کے خطرناک حملوں کی روک تھام کی جد و جہد کرتا رہتا ہے۔ یہ مرض گھن کی طرح ہماری زرخیز زمینوں کو کھائے جا رہے ہیں۔ مٹی اور پانی کے متعلق تحقیقات، ان کے نمونوں کی جانچ پڑتال اور ان سے متعلق مواد کی فراہمی وغیرہ کے منصوبوں کی توثیق اسی ڈائرکٹریٹ کا کام ہے ۔

پاکستان میں انجینیرنگ کالج اور بھی ہیں مگر لاہور کا گورنمنٹ انجینیرنگ اور ٹکنالوجی کالج بڑی اہم حیثیت کا حامل ہے۔ یہ کالج سب سے قدیم ہے اور یہاں سازو سامان بھی مقابلتاً سب سے اچھا ہے۔ یہ ادارہ ۱۹۲۳ء میں قائم ہوا۔ پہلے یہاں صرف میکنیکل، الکٹریکل اور سول انجینیرنگ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ لیکن اب اس میں معدنی اور کیمیکل انجینیرنگ کی تعلیم و تربیت بھی ہونے لگی ہے۔

اس کالج کا ایک اپنا کتب خانہ بھی ہے جس میں فن کے متعلق تمام ضروری کتابیں موجود ہیں۔ یہاں جدید وضع کی ایک ورک شاپ اور تجربہ گاہ بھی ہے۔ اس فنی ادارے کو عوام میں جتنی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی شاید اس سے زیادہ کسی اور کو نصیب نہ ہوئی ہوگی۔

سائنسی اور صنعتی تحقیقاتی کونسل کی علاقائی تجربہ گاہیں ہماری صنعتی ترقی کے میدان میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان تجربہ گاہوں کی تعمیر کا پہلا مرحلہ ختم ہو چکا ہے اور اب عملی تحقیقات اور تجارتی نقطۂ نظر پر زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔ اس کی زیادہ تر توجہ اس قسم کے مسائل حل کرنے کی طرف ہے کہ کس حد تک کفایت کے ساتھ ہماری چیزیں درآمدی مال کا بدل بن سکتی ہیں اور کون صنعتیں ایسی ہیں جو ہمارے خام لوہے، گندھک اور دوسری معدنی پیداوار سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا کر قائم کی جا سکتی ہیں۔ غرض تمام ذرائع پر عملی حیثیت سے غور و خوض کیا جا رہا ہے۔ ایک سے زیادہ تجربہ گاہیں باہم مل کر غذا اور شیشہ وغیرہ کی پیداوار پر تحقیقات میں مصروف ہیں۔

مغربی پاکستان کی علاقائی تجربہ گاہوں کے علاوہ وزارت صنعت کی بھی صنعتی و ترقیاتی مرکز اور تجربہ گاہیں ہیں جو لاہور میں کل پاکستان بنیاد پر کام میں مصروف ہیں۔ اس ادارے نے اپنے قیام کے بعد بہت سے صنعتی اور دوسرے پیچیدہ مسائل حل کئے ہیں۔ جن میں ایک بادامی باغ کی فاؤنڈری کا معاملہ بھی تھا۔ دو شفٹ میں کام کرنے اور کثیر مصارف کے باوجود فاؤنڈری کی پیداوار غیر تسلی بخش تھی مگر اس ادارے کی تجاویز اور سفارشات سے اس ادارے کی ساری مشکلات حل ہو گئیں۔ ایسی ہی خدمات کے پیش نظر اس ادارہ کو مزید ترقی دی جا رہی ہے ۔

یہاں صرف چند مخصوص فنی اداروں کا ہی ذکر کیا گیا ہے ورنہ لاہور میں ایسے ادارے اور بھی ہیں۔ ملک کے دوسرے حصوں میں تو ان کی تعداد کہیں زیادہ ہے جن میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ یہی ادارے ہمارے شاندار مستقبل کے ضامن ہیں اور انہیں کے سہارے ہم اقوام عالم کی صف میں وہ جگہ حاصل کر سکتے ہیں۔ جو صحیح معنوں میں ہمارے شایانِ شان ہے۔ نہر لاہور کے دونوں کنارے کس قدر قابل رشک ہیں جو اپنے دامن میں ایسے ایسے گہر ہائے تابدار لئے ہیں جن کی ایک ہلکی سی جھلک بھی آنکھوں کو خیرہ کئے دے رہی ہے اور ہمارے مستقبل کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جس کے قوی تر امکانات اس عہدِ نو میں اور بھی روشن ہو چکے ہیں۔

اساتذہ کی محفل بقیہ صفحہ ۳۴

اوپر مسلط ہے کہ پرانے زمانے کے غلاموں کی طرح ہم ہر کام کرنے کے لئے کسی کے حکم کے منتظر رہتے ہیں اور اس کا تو تصور بھی نہیں کرتے کہ ہماری اپنی بھی ذمہ داریاں ہیں اور ہمیں بھی اپنی دماغی قوتوں کو کام میں لاکر کچھ سوچنا اور سمجھنا چاہئے ـــــ ہاں اگر ہم کچھ سوچنے یا سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو کچھ ان خطوط پر کہ بغیر محنت کے ہم دولت کس طرح کمائیں یا افسروں کی خوشنودیٔ مزاج کے لئے ہم کون سے ناجائز حربے استعمال کریں۔ یا ہمارے بچے بغیر مناسب تربیت حاصل کئے کس طرح معاشرے میں اونچا مقام حاصل کریں یا حکومت سے کس طرح زیادہ سے زیادہ منفعت حاصل کریں۔ یا کوئی شخص ملک دشمنی، چور بازاری یا ذخیرہ اندوزی کے جرم میں گرفتار ہوجائے تو اسے کس طرح قانون کے پنجے سے چھٹکارا دلوائیں! ـــــ وغیرہ۔ آپ خود سوچئے کہ ہم اور آپ کہاں تک اپنے اپنے فرائضِ منصبی ٹھیک طور پر سرانجام دینے کا صحیح تصور رکھتے ہیں۔ معاف کیجئے ہمارا تو یہ حال ہے کہ خواہ مردہ جنت میں جائے یا دوزخ میں، ہمیں تو اپنے حلوے مانڈے سے کام! ہم تو پہلی کی پہلی اپنی تنخواہ کھری کرنے کے قائل ہیں اور بس۔ اگر کسی وقت ہم سے باز پرس ہوئی تو فوراً پہلو بچانے کے بیسیوں داؤں پیچ استعمال کرتے ہیں اور محاسبے سے صاف بچ جاتے ہیں۔ یہ ہے ہمارا طرزِ عمل۔ ہمارا جو قوم کے معمار کہلاتے ہیں! تو دوسروں کا تو خدا ہی حافظ ہے۔"

میں نجمی کے پُرخلوص جوش سے بہت متاثر ہوا اور ایسا محسوس ہوا کہ اور سب بھی اس کی دولوک باتوں سے کچھ شرمسار اور کچھ "خود اپنی نگاہ میں مجرم" ہو رہے ہیں۔ وقت کافی ہوچکا تھا اور بحث بھی طویل بلکہ بے قابو ہوتی جارہی تھی، اس لئے میں نے بطور میزبان یہ سلسلۂ گفتگو ختم کرنے کی درخواست کرتے ہوئے کہا۔ "نجمی صاحب، آپ جو کچھ کہتے ہیں وہ درست ہے، ہمارا اخلاقی انحطاط جب تک ختم نہیں ہوجائے گا۔ اور ہم اپنے اندر اعلیٰ اخلاق اور اعلیٰ سیرت کی قدریں نہ پیدا کرلیں گے۔ من حیث القوم پست ہی رہیں گے۔ اس لئے ہمارا یعنی بچوں کو پڑھانے اور ان کی سیرت کی تکمیل کرنے والے طبقے کا خصوصاً یہ فرض ہونا چاہئے کہ پہلے ہم اپنی اصلاح کریں اور پھر اپنے بچوں اور اپنے طلبا کے سامنے 'نمونہ' بن کر ان کے اعلیٰ کردار کی داغ بیل ڈالیں۔ مگر یہ بحث اب کافی ــــ"

"ہاں یہ تو ہے" ــــ سب نے ہم آواز ہوکر کہا۔

"اچھا اب ہم لوگ رخصت ہوں"۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ میرے ساتھ ہی سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور یہ دلچسپ نشست بہت دنوں تک ہمیں یاد رہی ❊

"سفید پٹی" بقیہ صفحہ ۲۲

زیادہ تر چاٹگام، پٹیرا، اور باقر گنج کے مشرقی حصے میں آباد ہیں۔ چاٹگام کے کوہستانی علاقے میں چکما نامی قبیلہ بودھ مت کا پیرو ہے۔ جب قائداعظمؒ اس نواح میں گئے تو ان کے سردار نے ان کی خدمت میں پہنچ کر خراجِ عقیدت پیش کیا اور اپنی وطن دوستی و ملکی وفاداری کا یقین دلایا۔ کاکس بازار اور اراکان میں بھی بہت سے پاکستانی بودھ آباد ہیں۔ چکما قبیلہ کے علاوہ مونگ اور بھوموتنگ نامی قبیلے بھی ہیں جو بودھ مت کے پیرو ہیں۔ کاکس بازار اور چاٹگام کے پہاڑی علاقوں میں مونگھوں کا بنایا ہوا معبد بہت بڑی زیارت گاہ مانا جاتا ہے اور سارے بنگال کے بودھ اس معبد اور دیگر مقدس بودھی مقامات کی یاترا کرنے جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انہیں دوسری اقلیتوں کی طرح پوری پوری آزادی ہے۔ چلنے پھرنے، رہنے سہنے عبادت کرنے رسمیں ریتیں ادا کرنے یہاں تک کہ اپنے مذہب کی تبلیغ تک کرنے کی آزادی۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ پاکستان کے زیرِ سایہ سب کو حقیقی معنوں میں آزادی میسر ہے اور ہمارے قومی پرچم کی "سفید پٹی" بیک وقت علامت بھی ہے اور حقیقت بھی ❊

بابائے اردو مرحوم

رسالہ پریس میں زیرِ طباعت تھا کہ بابائے اردو کے انتقال کی خبر موصول ہوئی۔

چونکہ مرحوم کا شمار ہمارے خاصانِ ادب میں تھا اس لئے ان کا تفصیلی تذکرہ اگلے شمارہ میں کیا جائے گا جو ہمارا انقلابِ اکتوبر سے متعلق شمارۂ خصوصی ہوگا۔

(ادارہ)

پاکستان کے دلچسپ مقامات

مغربی پاکستان کا تاریخی شہر

ٹھٹہ

ٹھٹہ پاکستان کے نہایت قدیم شہروں میں سے ہے۔ اور کئی زبردست مملکتوں کا دارالخلافہ رہ چکا ہے۔ ایک زمانے میں یہ بہت بڑا تعلیمی، ثقافتی اور تجارتی مرکز تھا۔ جہاں دنیا کے مختلف حصّوں سے طالب علم اور تاجر آیا کرتے تھے۔ اب یہ ایک چھوٹا سا شہر اور اپنے ضلع کا صدر مقام ہے۔ لیکن اُس کے تاریخی آثار، مقبرے اور مسجدیں، اب بھی سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز ہیں۔

ٹھٹہ کے چھوٹے سے شہر میں بھی ڈاک خانے کے سیونگ بنک کا انتظام موجود ہے جس سے یہاں کے باشندے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

ڈاک خانے کے ۷ ہزار ۵ سو سے زائد دفاتر میں بچت کھاتہ کھولنے کا انتظام موجود ہے، جو ملک کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں۔

آپ پاکستان میں جہاں کہیں بھی جائیں

ڈاک خانے کا سیونگ بینک

آپ کی خدمت کے لئے موجود ہے

منافع ۲½ فیصدی سے ۴½ فیصدی تک، انکم ٹیکس معاف

PASS BOOK

United DFP 761

دورِ مئے خوشگوار

عارف حجازی

ہر ملک کے لئے سلامتی اور امن و راحت ترقی کا ایک لازمی عنصر ہے اور نوزائیدہ مملکتوں کے لئے تو بالخصوص ان عناصر کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ایشیا میں کئی ملکوں کو آزادی نصیب ہوئی اور انہیں اپنی آزادی کے تحفظ کے علاوہ تعمیر و ترقی، بالخصوص اقتصادی بحالی کے مسائل سے بھی واسطہ پڑا۔ مگر ان ممالک کی سلامتی کو خطرہ میں ڈالنے والے چند عناصر بھی ساتھ ساتھ کام کر رہے تھے۔ یہ جانے پہچانے لوگ اپنے مخصوص شوخ رنگ کی وجہ سے ہر جگہ روشناس تھے اور اپنی تخریبی کارروائیوں میں لگے ہوئے تھے۔ بلکہ بعض جگہ ان کی لسّانی، چرب زبانی اور ریشہ دوانیوں کا جال اس طرح کامیاب ہوگیا کہ کئی ملکوں میں قائم شدہ آئینی حکومتوں کا تختہ ہی اُلٹ گیا۔ یہ خطرہ جب بڑھنے لگا تو جنوب ایشیا کے ممالک نے اپنا ایک دفاعی ادارہ قائم کیا جو جنوب مشرقی معاہدہ کا ادارہ کہلاتا ہے اور مختصراً "سیٹو" کے عنوان سے معروف ہے۔ اس کا مقصد محض اور صرف، باہمی تحفظ و دفاع ہے۔ تحفظ سے مراد یہ ہے کہ ان ممالک کی سالمیت کو جب عسکری نوعیت کا خطرہ لاحق ہو تو وہ اپنی آزادی کو بچانے کے لئے ایک سیسہ پلائی دیوار بن جائیں اور ان شوخ رنگ عناصر کو فوجی غلبہ کا موقع نہ دیا جائے۔ دورانِ امن ان ممالک کو جس اقتصادی امداد اور ثقافتی و تعلیمی امور میں جس رہنمائی، اعانت اور دستگیری کی باہمی ضرورت ہے، اس کے مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ اس دفاعی معاہدہ کے رکن ممالک کو، دیگر جمہوریت پسند ممالک کی بھی حمایت اور تائید حاصل ہے اور وہ ایک۔ دوسرے کے ہمیشہ حلیف، دکھ درد میں شریک اور دوست ہیں، نہ صرف دامے درمے بلکہ قدمے اور سخنے بھی۔ اگرچہ یہ معاہدہ ۱۹۵۴ء میں وجود میں آیا تھا مگر جب ہی سے وہ جنوب مشرقی ایشیا میں امن و دفاع کا ایک حصار بن چکا ہے۔ اس میں آٹھ ہم خیال ممالک علم شریک ہیں اور دیگر جمہوریت پرست ممالک بھی اس کے بنیادی تصوّرات کے مؤید ہیں۔ اس ادارے نے رکن ممالک کے عوام کا دفاعی تحفظ اور امن و راحت کا قیام و حصول ممکن بنا دیا ہے اور ساتھ ہی ان کی اقتصادی و سماجی ترقی و بہبود کے مسائل کو بھی کامیاب طریقے سے حل کرنا شروع کر دیا ہے۔ ان مقاصد کے حصول میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی ہے اور امید ہے کہ رکن ممالک کی یہ جماعت اس معاہدے کے بنیادی اصول اور نصب العین کے تحت ایک دوسرے کے تعاون سے بہت کچھ حاصل کر سکیں گے۔ اس ادارہ کے رکن ممالک یہ ہیں۔ امریکہ، برطانیہ، تھائی لینڈ، فلپائن، پاکستان، نیوزی لینڈ، فرانس اور آسٹریلیا۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا اس ادارہ کی تخلیق کا اصل مقصد عسکری و اجتماعی دفاع ہے۔ رکن ممالک کو لادین عناصر کے حملوں سے بچانا چونکہ اوّلین مقصد ہے اس لئے ادارہ نے عسکری مشیروں کی ایک جماعت قائم کی ہے جو دفاع کے جملہ امور کا ہر وقت جائزہ لیتے رہتے ہیں اور جن رکن ملکوں کو مسلح امداد و اعانت کی ضرورت ہو، اس کا اہتمام کرتے ہیں، ان کے اسلحہ اور سامان دفاع کی تنظیم نو کرتے ہیں، نیز جدید ترین تربیت کا انتظام بھی کرتے ہیں تاکہ عسکری منصوبہ بندی کے سلسلے میں کوئی کسر نہ باقی رہ جائے۔ اس سلسلے میں کئی جنگی مشقیں بھی رکن ممالک کے علاقوں میں کی گئی ہیں، جن میں پاکستان بھی شامل ہے۔ تھائی لینڈ کے علاوہ پاکستان سے بھی عسکری افسران فرانس کے دفاعی اسکولوں میں تربیت حاصل کر چکے ہیں۔ اسی طرح دوسرے ملکوں میں بھی پاکستانی افسرانِ دفاع کو حربی تربیت دی گئی ہے۔ غرض "سیٹو" کا نصب العین یہ ہے کہ "زیادہ سے زیادہ تعاون سے زیادہ سے زیادہ سلامتی حاصل ہوتی ہے" اور اسی نصب العین کے حصول کے سلسلے میں یہ ادارہ ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔

اس ادارہ میں شریک ہونے کا ایک بڑا مقصد اقتصادی دو

تعاون بھی ہے نیز تکنیکی امداد سے بھی اس مقصد کو حاصل کیا جاتا ہے اور ماہرین معاشیات کی سفارشوں پر ہر رکن ملک کی ضرورتوں کا خیال رکھا جاتا ہے نیز منصوبہ بندی اور تحفظ اقتصاد کے ذرائع تلاش کئے جاتے ہیں۔
اس بات پر بالخصوص زور دیا جاتا ہے کہ دفاعی منصوبہ بندی سے پیدا ہونے والے اقتصادی مسائل سے کس طرح نبٹا جائے۔ ہنرمند فرد وروں کے مسائل کو بھی سامنے رکھا جاتا ہے جس کے لئے ادارہ کا ایک مستقل شعبہ کام کرتا رہتا ہے۔ معاہدہ کے تحت تکنیکی امداد و تعاون کا سلسلہ کافی دراز ہے۔ خود پاکستان بھی اس سے استفادہ کرتا ہے مثلاً واہ کی عسکری فیکٹری میں کام سکھانے والے دو آسٹریلوی ماہرین اور بہت سا ساز و سامان دیا گیا۔ ایک پاکستانی ماہر آسٹریلیا میں جا کر مزید تربیت حاصل کر رہا ہے۔ اور پروگرام یہ ہے کہ تکنیکی امور کی تربیت کے لئے مزید نو پاکستانی کارکنوں کو منظور کیا جائے گا۔ امریکہ نے ۶۵۰،۰۰۰ ڈالر کی رقم اس تکنیکی امداد و تعاون کے لئے مخصوص کی ہے۔ یہ تربیت بارہ جدید ترین کاموں کے سلسلے میں دی جائے گی۔
کراچی اور ڈھاکہ میں جو تربیتی سہولتیں اس وقت موجود ہیں، ان کو اس امداد سے مزید تقویت دی جائے گی۔ تکنیکی امداد کے علاوہ درس و تدریس کے شعبے میں بھی مزید تربیت کا اہتمام کیا گیا ہے جس کے لئے بنکاک کے نزدیک ایک مرکزی تربیت گاہ اساتذہ قائم کی گئی ہے۔ "سیٹو گریجویٹ اسکول آف انجینیرنگ" بھی اپنی جگہ ایک بڑا مفید ادارہ ہے جو رکن ممالک کو اعلیٰ تکنیکی امداد دیتا ہے۔
گرم ملکوں میں ہیضے کی وبا اکثر پھوٹ پڑتی ہے، خاص کر مرطوب اور چاول خور علاقوں میں۔ اس کی روک تھام کے لئے سیٹو کے ادارۂ صحت نے بہت سی علمی تحقیق کی ہے اور اس سلسلے میں خود ہمارے ہاں ڈھاکہ میں ایک معمل قائم کیا جا رہا ہے۔
اس معاہدہ کے دفاعی، اقتصادی اور تکنیکی عزائم و مقاصد کی طرح اس کا ایک اور اہم پہلو رکن ممالک کی ثقافت کا تحفظ ہے۔ کیونکہ معلوم عناصر کا حملہ اس پر بھی ہوتا ہے اور وہ اپنے ہی رنگ میں اسے بھی رنگ دینا چاہتے ہیں حالانکہ ہر خطۂ ارض کی اپنی اپنی ثقافتی روایات اس دنیا کی رنگا رنگی میں اضافہ کرنے کا موجب ہوتی ہیں اور مقامی ثقافت کے آثار و مظاہر کو برقرار رکھنا بڑی زبردست انسانی خدمت و سرگرمی ہے۔ علم و دانش کا فروغ ثقافتی لین دین اور ایک دوسرے کی روایات کا احترام و تعارف اس ادارہ کے نزدیک بہت ضروری چیز ہے۔ ثقافتی مقاصد کے حصول کے سلسلے میں معاہدہ کے بعد ہی سے عمل ہو رہا ہے۔ مثلاً آسٹریلیا اور ایشیا کے طلبہ کی انجمنیں قائم کی گئی ہیں تاکہ یہ نوجوان ایک دوسرے سے بہتر تعارف حاصل کریں اور ثقافتی امور میں ایک دوسرے کو سمجھنے کی مساعی میں زیادہ سے زیادہ شریک ہو سکیں۔ پاکستان، تھائی لینڈ اور فلپائن نے بھی ثقافتی تبادلہ کے پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ برطانیہ نے سنگاپور اور سلایا جا کر وہاں کی ثقافتی و تعلیمی زندگی کے معائنہ، جائزے اور مطالعہ کی ہمت افزائی کی ہے۔
امریکہ نے بھی رکن ممالک کے علاقوں کے لئے دانشوروں، اساتذہ اور طلبہ کے باہمی تبادلہ کے پروگراموں کے لئے خطیر رقمی امداد بہم پہنچائی ہے۔ ادارہ نے بڑا مقصد یہ سامنے رکھا ہے کہ رکن ممالک ایک دوسرے سے ثقافتی تعارف حاصل کرنے میں زیادہ سے زیادہ قریب آتے جائیں اور اس راہ میں جو مشکلات حائل ہوں ان کو دور کیا جائے، جو قومی ثقافتیں جا بجا موجود ہیں ان کا تحفظ کیا جائے بلکہ ان کو مالا مال کرنے کے لئے طرح طرح کے طریقے اختیار کئے جائیں۔ سائنسی تحقیقات کے مواقع، تکنیکی ترقی اور باہمی نصب العین کا فروغ بھی اس ذیل میں آتا ہے۔ ان تمام مساعی کا مقصد یہ ہے کہ عوام اپنی ثقافت کے جاندار اور شاندار پہلوؤں سے آگاہ رہیں۔ انہیں ترقی دیں، فروغ دیں اور دوسری ثقافتوں سے براہ راست تعارف پیدا کر کے تقابلی مطالعہ کریں تاکہ دنیا کا باہمی تعاون اور اتفاق و اتحاد ذہنی پیدا ہو سکے اور وہ دنیا سے جنگ و جدال کے بھیانک سایوں کو دور کرنے میں مدد دے سکے۔
ادارہ کی ثقافتی سرگرمیوں کے سلسلے میں کئی پروگراموں پر عمل کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے مئی ۵۸ء میں ایک ثقافتی گول میز کانفرنس منعقد ہوئی جس میں کئی اہم مقالات پڑھے گئے۔ ۵۸ء ہی سے ریسرچ فیلوشپ یعنی تحقیقی کام کے لئے علمی وظائف جاری کئے گئے۔ ان وظیفوں کے حصول کے لئے کوئی چار سو دانشوروں نے درخواستیں بھیجی تھیں۔ اسی طرح کے وظائف کا ایک سلسلہ ۵۹-۱۹۵۸ء میں اور تیسرا سلسلہ ۶۰-۱۹۵۹ء میں شروع کیا گیا۔ پہلے وظیفہ یافتگان میں سے تین پروفیسر اس وقت پاکستان، فلپائن اور تھائی لینڈ میں اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

اس ادارہ کی طرف سے حال ہی میں ایک اور ثقافتی سرگرمی کا آغاز ہوا ہے اور وہ سفری لیکچرار ہیں۔ اس سلسلے میں رکن ملک کے سربرآوردہ عوامی لیڈر، اہلِ قلم، صحافی، تخلیقی فنکار اور دوسرے دانشوروں کو کسی رکن ملک میں لیکچر دینے کے لئے مدعو کیا جاتا ہے۔ یہ صاحب اپنے ملک میں واپس آنے کے بعد اپنے تاثرات و مشاہداتِ سفر اور لیکچر کے اہم نکات مرتب مقالہ کی شکل میں شائع کرتے ہیں تاکہ دوسرے لوگ بھی اس سے استفادہ کر سکیں۔

گریجویٹ ہونے کے بعد مزید تعلیم کے لئے وظیفے دینے کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے تاکہ رکن ممالک کی کسی یونیورسٹی سے ایسے طلبہ دوسری ایشیائی یونیورسٹی میں جاکر اپنی تعلیم و تربیت کی توسیع و تکمیل کر سکیں۔ اسی طرح ہر رکن ملک کے لئے اندرونی تعلیمی وظائف بھی جاری کئے گئے ہیں جو دو سال سے مل رہے ہیں ۔ طلبہ میں ان وظائف کے حصول کے لئے خصوصی ذوق پایا جاتا ہے۔

تعلیمی سرگرمیوں ہی کے سلسلے میں رکن ممالک کی یونیورسٹیوں کے سربراہوں کی ایک کانفرنس پاکستان میں بھی منعقد ہوئی تھی۔ (کراچی۔ جنوری ۱۹۶۱ء) اس کانفرنس کی کارروائی کا افتتاح خود صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے کیا تھا۔ کسی معاشرہ کی تہذیب و تکمیل کے سلسلے میں جامعاتِ تعلیم کا منصب کیا ہونا چاہئے، اس کے ضمن میں انہوں نے فرمایا تھا کہ :-

> ان جامعات کا کام یہ ہے کہ وہ انسانی معاشرہ کو ہم آہنگ و حرکی بنائے اور ایک ایسے معاشرہ کو وجود میں لائے جو نہ صرف اپنے ہر فرد کی مادّی ضروریات کو پورا کرے، انسان کی مادّی و معاشرتی ضروریات کو پورا کرے ___ بلکہ اُن کی روحانی اقدار میں بھی توازن پیدا کرے۔

تعلیمی اور تحقیقاتی سرگرمیوں کے علاوہ اس ادارہ کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ چند در چند ثقافتی سرگرمیوں میں شرکت و معاونت کرتا رہے۔ چنانچہ تھائی لینڈ میں جب آٹھویں قومی سائنس کانفرنس و نمائش منعقد ہوئی تو اس ادارہ نے بھی اس میں حصہ لیا۔

اسی طرح پاکستان کی ادبی سرگرمیوں سے بھی وہ رابطہ قائم رکھتا ہے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی عربی، فارسی اور اردو کی قدیم تصنیفات و تالیفات کی ایک مبسوط فہرست مرتب کر رہی ہے۔ اس ادارہ نے اس کی کافی مالی امداد کی ہے اور حال میں اس رقمی عطیہ میں اضافہ بھی کیا گیا ہے۔

غرض یہ ادارہ دفاعی، تکنیکی، فنی اور تعلیمی امور کے میدانوں کے علاوہ خالص ادبی و ثقافتی مصروفیات میں بھی گہری دلچسپی رکھتا ہے اور اپنی مفید عوام سرگرمیوں کے باعث واقعی اپنی ذات سے ایک انجمن ہے اور بڑی ہی فعال و کارگذار، جو جنوب مشرقی ایشیا کی دفاعی، علمی و ثقافتی زندگی میں ایک اہم کردار ادا کر رہی ہے ؛

"سرودِ رفتہ باز آید کہ نہ آید" — بقیہ ص ۴۲

میں بنگلہ کے ساتھ ساتھ اردو دوستی کا جذبہ بھی موجود ہے اور آزادی کے بعد سے تو اردو کے ادیبوں، اور شاعروں کے براہِ راست مطالعہ کی وہاں ایک باقاعدہ لہر پیدا ہو چکی ہے۔ مثلاً اگر اُدھر اقبال کے تراجم سے بنگلہ داں حضرات روشناس ہو رہے ہیں اور ڈپٹی نذیر احمد کی تصنیفات اور غلام عباس کی کہانیاں بنگلہ میں آ رہی ہیں تو ادھر مرحوم کیقباد، کوی جسیم الدین، بے نظیر احمد، بیر فن رشنا" اور سب سے بڑھ کر قاضی نذر الاسلام کے اسرافیلی آہنگ سے اور بھی زیادہ قریب آ چکے ہیں۔ اور اس علمی، ادبی، ذہنی اور ثقافتی لین دین کا سلسلہ کچھ اس طرح بڑھتا چلا جا رہا ہے کہ پدما کی لہریں سندھ کی لہروں سے آ ملی ہیں بہت کچھ لیتی بہت کچھ دیتی ہوئی۔ ادھر بھی جاننے اور سمجھنے کی امنگ بڑھتی چلی جا رہی ہے اور ادھر بھی۔ اور جیسے سرودِ رفتہ کی گونج ہم نے ڈھاکہ کی اسٹیج کی شکل میں سنی ہے، ویسے ہی اس دمبدم بڑھتے ہوئے آہنگ کی گونج بھی سن سکتے ہیں جو دونوں بازوؤں کے ملاپ سے پیدا ہو رہا ہے اور آگے چل کر اور بھی زور شور سے پیدا ہونے والا ہے۔ ہم سب ابھی سے اس نئے آہنگ کے لئے گوش بر آواز ہیں ؛

آپ کی محفل

یہ محفل ہر ماہ بلا التزام منعقد ہوا کرے گی۔ اور اس میں
شرکت کیلئے یارانِ نکتہ داں کو صلائے عام ہے۔ (مدیر)

ایک افسانہ بعنوان "بھٹکے ہوئے راہی" پیشِ خدمت ہے۔
میرے سامنے ایک مقصد ہے۔ معاشرتی برائیوں کی توضیح۔ یہ کہانی
تین معاشرتی برائیوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ بیجا افزائشِ نسل، جرم و
جاسوسی کی کہانیاں اور فحش ناول اور فلمیں جن کی ہمارے یہاں
بھرمار ہے۔ کثرتِ اولاد کا نتیجہ ہے بچوں سے غفلت۔ اور ان سب
قباحتوں کی پیداوار "ٹیڈی بوائے"۔ میں نے تمام تر ذمہ داری
والدین پر ڈالی ہے اور یہ بھی حقیقت کہ جو قباحت اٹھتی ہے وہ
گھر ہی سے اٹھتی ہے۔" (عنایت اللہ)

اس شمارہ میں اپنا افسانہ پنہاں لیجے جس میں یہ
سب اندیشہ ہائے دور و دراز پیش کئے گئے ہیں۔ آخر
بھٹکے ہوؤں کو بھٹکا ہوا کیوں کہا جائے؟ ہمارا مطلب
عنوان اور فن کی حد تک ہے۔ سمجھنے والے یوں بھی
سمجھ ہی جائیں گے اور بھٹکے ہوئے رسوا بھی نہ ہوں گے
مقصدیت میں کوئی برائی نہیں۔ ہر تخلیق میں کوئی
نہ کوئی مقصد ہی ہوتا ہے۔ سوال پیشکش کا ہے کہ یہ
یہ مقصد کس طرح سمویا جاتا ہے۔ اگر بات کھل جائے تو
مقصد حل نہیں ہوتا بلکہ فوت ہو جاتا ہے۔ مقصد
بجائے خود فنی حیثیت سے قابلِ اعتنا نہیں۔ دیکھئے
دوسرے یعنی قارئین اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔

(مدیر)

"آپ نے "ماہ نو" اگست سے دسمبر ۱۹۵۶ء تک پانچ
قسطوں میں جناب ابوالجلال ندوی کا مضمون "سندھی تحریر" شائع
کیا تھا۔ اس محققانہ مقالہ میں مصنف نے جو تاریخ بیان کی ہے وہ
بے شک ستائش کے لائق ہے۔ انہوں نے پانچویں، یا چوتھی قسط میں
لکھا ہے کہ "میں اپنے تخیے کے مطابق مضمون دوں گا" کیا آپ نے ان
ایسا کوئی اور مضمون شائع کیا ہے؟"

(ام۔ ایس، شیخ)

مولانا ابوالجلال ندوی صاحب نے مذکورہ بالا مضمون
کے علاوہ سندھ اور بلوچستان کے قدیم ثقافتی و تاریخی
آثار و شواہد، بالخصوص، ماضی کے نقوش پر اور بھی کئی
گرانقدر مضامین ماہ نو میں لکھے ہیں یعنی "نقوشِ صحرا"
(اکتوبر ۱۹۵۸ء) "پیکرانِ بے سخن" (مارچ ۱۹۵۰ء) "سندھ
نام کی بستیاں" (مارچ ۱۹۵۹ء) "بلوچی ظروف پر نقوش" (جون
۱۹۶۰ء) "اور سندھی ظروف پر نقوش" (مارچ ۱۹۶۱ء)

(مدیر)

"فروری ۱۹۶۱ء میں اپنی غزل دیکھ کر تسلیم کرنا پڑا کہ ماہ نو صرف
چند مخصوص ادیبوں اور شاعروں کے لئے ہی نہیں بلکہ مجھ جیسے شہری
بھی اس میں شرکت کر سکتے ہیں!"

(ایاز صدیقی۔ ملتان چھاؤنی)

ماہ نو آپ سب کا رسالہ ہے اور اس میں ہر ایک
شرکت کر سکتا ہے۔ بلکہ ہم سب کو دعوت دیتے ہیں
کہ اپنے دل میں کسی بدگمانی کو راہ دیئے بغیر اس
رسالہ کے ذریعہ حیاتِ طیبہ کے ہر شعبہ کو ترقی
دینے میں حصہ لیں۔ "ماہ نو" اس مقصد کے لئے ایک
موزوں و مناسب میدان مہیا کرتا ہے اور اس سے
فائدہ اٹھانا آپ کا کام ہے۔ ہماری کوشش ہمیشہ
یہی رہی ہے کہ ہر جوہرِ قابل کا خیر مقدم کیا جائے
تاکہ بہترین جوہر، بہترین نتائج پیدا کر سکیں۔

(مدیر)

سے بھی چابکدستی نمایاں ہے۔ بعض ظاہری پیش کش کی کوتاہیوں سے قطع نظر مصنف اور ناشر دونوں کی کوشش قابلِ تحسین ہے۔ (د۔ا)

زن زر زمین

مصنف، شفیق بریلوی
قیمت۔ چار روپے
صفحات ۳۳۶
ناشر، مکتبہ "خاتون پاکستان" پوسٹ بکس ۱۹۹، کراچی۔

یہ تین ز کا مسئلہ جو مندرجہ بالا عنوان میں مضمر ہے یوں بھی اپنی بوقلمونیوں کی وجہ سے جاذب توجہ رہا ہے۔ پھر اس افسانہ کہن کو مدیرۂ "خاتون پاکستان" نے ناول کے پیرائے میں اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔ جناب شفیق بریلوی ہمارے ادبی حلقوں میں کئی حیثیتوں سے معروف ہیں۔ ان کا ہر سوخرام قلم اور اس سے زیادہ ہر سوخرام طبیعت ادب کی مختلف اصناف میں جولانی دکھا چکی ہے اور اہلِ نظر نے بقدر ذوق اسکی کی داد بھی دی ہے۔ یہ ناول ادب و فن کے ساتھ ساتھ رومانوی کیف و رنگ سے بھی آراستہ ہے۔ اور خلوص اور عمق فکر کا آئینہ دار ہے۔ زندگی کی جزئیات پر بدرجۂ احسن حاوی۔ یوں تو ناول اس لحاظ سے اسم بامسمیٰ ہے کہ اس میں زن، زر، زمین کی روایتی جاذبیتیں موجود ہیں۔ اس کی شستہ و رفتہ زبان و بیان، شاعرانہ لطافت احساسات کی دھیمی دھیمی آنچ کا دلکش انداز خصوصاً قابل داد ہیں جو اس میں شروع سے آخر تک جلوہ گر ہیں۔ فنی اعتبار سے اس کی خصوصیت خاصہ اور ما بہ الامتیاز یہ ہے کہ کردار خلا میں نہیں بلکہ پاکستان کی جیتی جاگتی سرزمین اور قومی فضا میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اسی لئے ناول عام ڈگر سے ہٹ کر ہے اور اپنی پاکیزگی کی وجہ سے امتیازی درجہ رکھتا ہے۔ بنابریں امید ہے کہ اس کو مختلف حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائیگا صاف ستھری کتابت و طباعت اور خوبصورت سہ رنگا گرد پوش۔

(ر۔خ)

نقد و نظر

ایک شہر ہزار داستان

مصنف: عنایت اللہ
ناشر: رانا فیروز رشید
صفحات: ۲۴۵ قیمت چار روپے
ملنے کا پتہ: شمشاد نیوز ایجنسی رائل پارک۔ لاہور۔

زندگی میں بہت سی ایسی تلخیاں ہیں جو ہمارے معاشرے میں ناسور کی شکل اختیار کر چکی ہیں۔ ان تلخیوں کا احساس اور ان پر روشنی ڈالنے کا رجحان اردو ادیبوں میں کچھ عرصے سے پیدا ہو چکا ہے۔ زیر نظر کتاب میں مجرمانہ ذہنیت کا جائزہ لے کر یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان اپنے ماحول اور لاشعور کا کس قدر تابع ہوتا ہے۔ اس کے اعمال و افکار کتنے ہی نفرت انگیز کیوں نہ ہو اپنا ایک مخصوص پس منظر رکھتے ہیں۔ اس مختصر ناول کے واقعات اس تاریک زمانہ کی یاد دلاتے ہیں جب شہر میں جرائم کی رفتار اپنے عروج پر تھی اور اسباب و علل عام نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔ واقعی ایک شہر تھا اور ہزار داستانیں، طرح طرح کے جرائم اور طرح طرح کے مجرم۔ اور اس کی تہ میں وہی ناکامیاں، محرومیاں، نفسیاتی الجھنیں اور مجبوریاں جن کی شکلیں مختلف جرائم پیشہ لوگوں کے یہاں مختلف تھیں۔

حالات و واقعات کا شکار اور اپنے ماحول کی پیداوار "حیدا" ناول کا مرکزی کردار ہے۔ اس کے دماغ پر وقت کے ہتھوڑے پڑتے رہے۔ اس کے لاشعور میں نئے نئے ہنگامے جنم لیتے رہے اور وہ خود فراموشی پر خود شناسی کا دھوکہ کھاتا چلا گیا۔ تاہم حادثات سے ٹکرا کر اس کی ذات پاش پاش نہیں ہوئی۔ خود آگہی دبائے نہ دبی۔ بابا، ناز اور تاز کے بچے نے اس کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور آخر کار نفسیات کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے کے بعد اس کے دل کی گہرائیوں سے وہ روشنی پھوٹ پڑی جس کو دیکھ کر وہ چونک اٹھا۔

کہانی کا پلاٹ اچھا ہے۔ فن، مشاہدہ اور حقائق کے امتزاج

اُردو کلاسکی ادب :

اردو ادب کا کلاسکی سرمایہ کئی پہلوؤں سے قابل لحاظ ہے۔ اس سے ہمارے ماضی کی تہذیبی، تاریخی اور مجلسی و معاشرتی اقدار و روایات کی نشاندہی ہوتی ہے اور ان میں سے جن کے آثار اب

باقی نہیں رہے ہیں اور جن کی جھلکیاں اب ادب و انشا ہی میں محفوظ ہیں، ان سے پوری پوری آگاہی کے لئے قدیم ادب کا مطالعہ اور متن سے شناسائی بہت ضروری ہے۔ مثلاً بعض الفاظ جو متروک ہو گئے۔ تہذیب کے بعض آثار جو صرف زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں، اگر ہم انہیں سمجھنا چاہیں تو ان ادب پاروں سے رجوع کئے بغیر چارہ نہیں۔

یہ امر باعث مسرت ہے کہ چند علمی و ادبی اداروں، اور بعض ناشرین نے بھی، اس طرف توجہ کی ہے اور کئی اہم پرانی کتابیں نئی تہذیب و ترتیب کے ساتھ چھاپی ہیں۔ بعض ایسی کتابیں جو کبھی سرسری طور پر چھاپ دی گئی تھیں یا جن کی طباعت موجودہ ذوق کے لئے موزوں نہ تھی اب پھر منظر پر لائی گئی ہیں۔ اسی طرح بعض نئی پرانی مشہور کتابوں کے کم قیمت عوامی ایڈیشنوں کا بھی سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ یہ سب باتیں اگر خوش ذوقی سے تکمیل کے مراحل طے کرنے کے بعد کی جائیں تو یہ ہمارے ادب کی ترقی و ترویج کے سلسلے میں بڑی مفید خدمت ہوگی۔ ہر قسم کے پرانے رطب و یابس کو چھاپ دینا تجارتی مصالح کے اعتبار سے شاید نفع بخش ہو مگر ادبی و علمی نقطۂ نظر سے چنداں وقیع نہیں ہوگا۔ اس لئے ہمارے وہ ادارے جو سنجیدہ و شستہ ادب کی ترویج و اشاعت کے لئے قائم ہیں یا کئے گئے ہیں اس طرف توجہ کریں تو اور بھی بہتر ہوگا۔ مجلس ترقی ادب لاہور نے ایسی کئی کلاسکی کتابوں کے نئے ایڈیشن شائع کئے ہیں جو نایاب تھیں یا کم یاب اور نامکمل۔ اس ادارہ سے حال ہی میں جو مطبوعات ہمیں موصول ہوئی ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) مسافران لندن	(۴) حیات سعدی
(۲) ابن الوقت	(۵) رسوم ہند
(۳) قصص ہند	(۶) وکرم اروسی

ان کتابوں کی اشاعت اپنی جگہ ایک اہم ادبی کام ہے اور پیشکش بھی بہت عمدہ۔ جس سے امید بندھتی ہے کہ اردو کی چند دیگر اہم کتابیں مجلس یا دیگر اداروں کی کاوش سے سامنے آجائیں گی۔

ان کتابوں پر تفصیلی نظر ڈالنا سردست ممکن نہیں اس لئے اجمالاً یہاں صرف اتنا ہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ یہ سب قابل مطالعہ ہیں۔ ان کے مقدمات، حواشی اور دیگر محاسن انہیں وقیع بنانے میں ممد ثابت ہوئے ہیں۔ ان کے مصنف اور مترجم ہماری تاریخ اور ادب کے معروف لوگ ہیں، اور ان کے رشحات کو بہت سلیقے سے پیش کیا گیا ہے۔ کلاسکی ادب کو روشناس کرانے کے لئے اگر مقدمات زیادہ جامع اور تفصیلی ہوں تو ان کی افادیت اور بھی بڑھ جائے گی۔ مگر یہ کتابیں جس کاغذ پر چھاپی گئی ہیں وہ ذوق نظر کی آسودگی کے لئے کافی نہیں۔ بہتر کاغذ کا استعمال نہ صرف اُن کی افادیت و اہمیت میں مزید اضافہ کا باعث ہوگا بلکہ وہ عرصہ تک محفوظ بھی رہ سکیں گی۔ ان کتابوں کو اردو نسخ ٹائپ میں چھاپا گیا ہے جو ٹائپ کے رواج کے لئے ایک اور خوش آئند اقدام ہے۔ (ظ۔ق)

اسلامی نظمیں

از محمد شفیع الدین نیّر
ناشر: شرکت تعلیمات۔ راولپنڈی
قیمت ۷۵ پیسے

پتہ: شرکت تعلیمات۔ بابر بازار۔ راولپنڈی

مسلمان بچوں کے لئے اخلاقی نظموں کا یہ مختصر مجموعہ ۶۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ خود مصنف کو اعتراف ہے ان نظموں میں شاعرانہ باریکیاں نہیں ہیں سیدھی سادی زبان میں اسلامی تعلیم، مساوات اور اخوت وغیرہ پر چھوٹی چھوٹی نظمیں ہیں جن کو بچے آسانی سے سمجھ کر ذہن نشین کر سکتے ہیں۔ ابتدائی درجوں کے طلباء کے لئے کتاب مفید ہے۔ (ع۔ا)

★

ریویو کے لئے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے
(ادارہ)

"ماہِ نو" میں مضامین کی اشاعت سے متعلق شرائط

(۱) "ماہِ نو" میں شائع شدہ مضامین کا معاوضہ پیش کیا جائے گا۔

(۲) مقالات، مضامین، غزلیں، نظمیں، افسانے، ڈرامے وغیرہ بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان "ماہِ نو" کے معیار کو خیال میں رکھیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔

(۳) ترجمہ، یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف اور ماخذ کا مکمل حوالہ دینا ضروری ہے۔

(۴) ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔

(۵) مضمون کے ناقابلِ اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

(۶) ایڈیٹر مسودات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

(۷) مضامین صاف اور خوشخط، کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

(۸) اپنا نام اور ڈاک کا مکمل پتہ صاف صاف تحریر کیجئے۔

(ادارہ)

جلد ۱۴ — ماہ نو — شمارہ ۱۰
مدیر: ظفر قریشی — اشاعت خاص اکتوبر ۱۹۶۱ء

سرورق:

شاخ ہائے رنگ رنگ

رنگین نقش:

زبیدہ آغا

سالانہ چندہ
پانچ روپے ۵۰ پیسہ

شائع کردہ
ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳، کراچی

قیمت خاص نمبر
ایک روپیہ ۲۵ پیسہ

REVISED PRICE
RS........ ....

غنائیہ:

"آمدِ سحر سے نِدا"

رفیق خاور

اس نظم میں سورج کو رباب تصور کیا گیا ہے جس کی کرنیں تار ہیں۔ جس طرح روشنی کے رنگ یا لہریں سات ہیں، اسی طرح سُر بھی سات ہیں۔ اور سورج کے رباب میں دونوں موجود۔ ضیا بھی اور ندا بھی۔ دھنک بھی اور سپتک بھی۔ اسی لئے اس نظم میں رنگوں اور سُروں کی تمثیل کے دوہرے روپ میں یہ دونوں چیزیں گھلی ملی نظر آتی ہیں۔ اور مرکب ہیئت کے ساتھ ساتھ مرکب تکنیک بھی پیدا کرتی ہیں: شعاعیہ بھی اور غنائیہ بھی۔ جلوۂ کائنات بھی اور نغمۂ انقلاب بھی۔

پردہ اٹھنے پر ایک سنگین جامد کودِ بے ندا، ایک گمبھیر گھنگھور سناٹا۔ اور پھر جلوے ہی جلوے، نغمے ہی نغمے، بڑھتے بڑھتے ایک بھرپور، مکمل آہنگ نور و نغمہ پہ منتہی۔

کھٹ راگ:

یہ پھیلی پھیلی چاروں کھونٹ سیہ گھنگھور گھٹاؤں کی صورت اندھیاری
پاتال سے آکاش تلک گھیروں پر گھیرے ڈالے پربت بھاری بھاری
تاریک گھٹاؤں سے اُٹھ اُٹھ کر پھیلتے پھیلتے بڑھتے جائیں کالے میگھ جٹا دھاری
سیسے ہی سیسے کی اک لمبی چوڑی فصیل اونچی کا لک ماری
جگت جگت اور جگ جگ کی اندھیاریوں سے مل جل کے بنی اک رات غضب کاری
یہ ٹھٹ پر ٹھٹ اور غول پہ غول اور کوٹ پہ کوٹ بھُجنگے دیووں کے
یہ کنڈل مارے ٹوپ پہ ٹوپ اور گوٹ پہ گوٹ سیہ دل اژدروں کے
یہ ڈیرے ہی ڈیرے پھیلے ہوئے خفاش نما، اُکھڑ اور ان گھڑ غولوں کے
یہ دل بادل چھائے ہوئے جانے کب کے بھاری بھرکم ٹھوس اور ٹھس سناٹوں کے
قرنوں سے اٹل، صدیوں سے اچل منڈپ ہی منڈپ گھپ سنگین امادوں کے

وادی:

کوئی کھونٹ ہو۔ کوئی اور ہو
نت اپنا راج۔ نت اپنا راج
ہم دیری ناگ۔ سدا امر کے دوار سجا پھن کا تاج
اسے کون اٹھائے۔ اسے کون اڑائے
کوئی کل کہ آج
وہی بھاری بھاری سر۔ وہی ٹھوس ٹھوس راگ۔ وہی آبنوسی تاج
گھر گھر، نگر نگر پہ چھائے
بے سدھ بنائے
یہی اپنا کاج
وہی پھن کا تاج۔ سدا اپنا راج

سمووادی:

یہ گھٹا، یہ گھور منڈپ، یہ سیہ طناب خیمہ
یہ سیاہ تانا بانا۔ یہ سدا تنا رہے گا

انووادی:

کالے کالے سیاہ دھاگے۔ کیا ہوں گے جو اُجلے تار جاگے؟

ندا:

ہم تار ہیں تار جگمگاتے ہر خیمہ میں آگ سی لگاتے
جگمگ اک جوت امر جگاتے
ہم تار ہیں تار ہیں سنہری جیسے کوئی بربطِ ہوائی
بجے آپ ہی آپ، گنگنائے:
تنا تن، تنا تنا تن ذرے ذرے میں ایک سن سن[1]
دھیمی دھیمی نوائیں گم سم کن من... کن من... کن من
وہی مُرکیاں گگن گگن سگگی وہی گٹکڑیاں ہنگن ہنگن

[1] اکمل سُر جو کسی راگ کے سُروں سے میل نہیں کھاتا۔

وہی تیز اگن بڑھتی بڑھتی   اک چھن چھن اک دھن دھن
کرن کرن روشن اکتارہ   ایک انوپ چھا چھم درپن
دمتا دمتا جھلکتا افسوں   بہکاتا بہکاتا جوبن
یہ دھوپ سروپ دھنک سپنک   پل پل چھن چھن بس اک چھن چھن
سارے گا، ما پا دھا، نی سا   بجتا ہوا تار بہ تار اگن
اک سلگن سینے سینے میں   پہلو پہلو میں اک تڑپن

ہر دم یہی دُھن یہی دُھن یہی دُھن:

اک آگ، اک آگ، اک آگ لگائے چلیں
اک راگ، اک راگ، اک راگ ہی گائے چلیں
اک راگ جو چھن سے نکلے دل کے تاروں سے
جیسے کوئی بجلی لپکے ابر کناروں سے
اک آگ، اک اُتم آگ تڑپ کر نکلے راگ کے پہلو سے
اک پراتم جوت جو چندھیاتی ہوئی لپکے ناگ کے پہلو سے
سُر سات اور سات ہی تار سنہری کرنوں کے
جادو جو جگائیں اپنے ساز سے قرنوں کے

سُارج

میں کرن، سنہری کرن، غضب کی چھبن کٹیلی البیلی
میں کرن کنواری، کرن سنہری پری، دھنک سے مرسنگ کھیلی
مرا ہلکا سنہری تار بجے ہولے ہولے، چپکے چپکے
نت نیا لوچ، نئی بول تان، نئی میٹھ مہین
کہیں چھیڑے الاپ، کہیں تیز بڑھت کہیں توڑے حسین
دھن ترکت دھن، دھن ترکت دھن، دھن ترکت دھن
میں کرن، میں گائن متواری، گن گاؤں جوت ہی کے نس دن
میں کرن، میں پارس پتھر، پل چھن میں بناؤں رات کو دن
ہر روز نگر پرانبر کی اک سندر دیپ جلاؤں
مری عید یہی ہے دھرتی کو نت نیا سروپ دکھاؤں

دیپانیہ:

میں ہرے دیس کی جائی   نس نس میں موج سمائی

ہیں رگیں کہ جھومتی لہریں   کب ایک ڈگر پہ ٹھہریں
رگ رگ ہے راگ جنم سے   یہی اپنے بھاگ جنم سے
جاگوں تو کلا جگاؤں   کیا کیا نہیں روپ اٹھاؤں
خود جیوں جلاؤں سب کو   خود چلوں چلاؤں سب کو
وہ راگ سناجاتی ہوں   ہر دل میں سما جاتی ہوں
وہ تان اڑا جاتی ہوں   دیوانہ بنا جاتی ہوں
طنبور کا تار حریری   ہے گویا ہار عبیری
میں روپ ہی روپ اگاؤں   سب جگ کو ہرا بناؤں

گازریں

میں ہوں ناطورۂ برق پا   شعلہ رخسار، کافر ادا
شاہد شوخ زرتار نام   صبح تا شام زرکار کام
اک زمانے کی سرتاج میں   اپنی دنیا کی زرتاج میں
تیز، طرار محشر خرام   جس کے پیکر میں تاب دوام
مغبچہ وار آتش بجام   شعلہ اندام یاقوت خام
یہ گلابی گلابی عذار   قرمزی آفتابی لویں
یہ شہابی شہابی جبیں   یہ ربابی ربابی لٹیں
کندنی بال شعلہ فشاں   کندنی چہرہ کندن میاں
کندنی سینہ کندن کنار   سب بدن کندنی آبشار
میرا کندن ہی کندن لباس   میرے من میں یہی دل کی پیاس
رشک ناہید آتش نوا   ایسا زرّیں ہے نغمہ مرا
میرے نغمات کی تھرتھری   جیسے ہیرے کی انگشتری
وہ سنہری دوپٹے کی شان   جیسے انڈی ہو سونے کی کان
لہر در لہر آنچل کے بل   جیسے لہرائے سونے کا جل
پریت کی آگ میں جو جلے   کیوں نہ تن اس کا شعلہ بنے
تن سراسر زرِ دہ دہی[۲]   من ہے سو معجزہ جوہری
دل کی اگنی بنی راگنی   یہ زباں تھی سو شعلہ بنی
کوئی رت ہو یہی ہے چلن   کوئی موسم، یہی ہے چلن

مائینہ:

مری نازک کلیا میں لوچ ہے   میرے انگ انگ میں کیا ہی کھنچ ہے
دل میں بہکے سے پریمی کی موج ہے   اور جیون پہ کلا کی سوچ ہے

---

[۱] ان سب ناموں میں کوئی نہ کوئی ہُنر کوئی نہ کوئی رنگ پنہاں ہے۔ جیسے ضائع و بدائع کی اصطلاح میں تجنیس کہتے ہیں۔ مثلاً دھانیکہ: دھا اور دھانی۔

[۲] دس میں سے دس۔ یعنی سو فیصد خالص

میرے نینوں میں پنگھٹ بھرے ہوئے
من میں نہروں کے اَن بک دریے کھلے

دل میں بڑھتی ہوئی ایک بیکلی ایک مستانہ وش موج ادھر ادھر
ایک رِستی ہوئی شوخ گُن کلی ایک بہکی ہوئی گائکی مدھر

پائیل:

چاروں کھونٹ ہے میرا راج، ہزاروں اور ہے میرا لہرا
میرے ہاتھ میں کندنی کنگن، میرے سر پر جوت کا سہرا
چاروں اور مری بانی کی، ایسی مدھر مدھر گونجار
جیسے باج رہا ہو اک مستانی نار کا پریم اکتار
پھوٹ رہے ہیں نغمے تن سے، لوٹ رہے ہیں شعلے من سے
چھوٹ رہی ہیں پھلجھڑیاں ہی پھلجھڑیاں کیا نیل گگن سے
کنول کٹورا جیسے مکھ سے، لو دے اٹھی کیسی جوالا
سر سے پاتک جہاں بھی دیکھوں، نور کی مالا، نور کا ہالہ

دھانیکو:

اور ہی تار ہیں اور رہی تار
مری اور بہار ہے اور بہار
مری تان ہی اور ہے چال ہی اور مری گت ہی اور ہے چال ہی اور
مری لے ہی اور ہے حال ہی اور
اک دھانی دھار، اک دھانی تار
میں گیت سنگیت کی رانی مری گٹکڑیوں میں کہانی
مری رگ رگ پانی پانی لہروں کی مست روانی
جب جوت کا ساز اوشا چھیڑے
دُھن جونپوری کی میری
مرا جیون ایک ترانہ مری کلا ہے جوت پھریری
پاپن اندھیاری بیرن مری جنم کرم کی چیری

نیلاب:

آنکھ سے جاری نیر ہی نیر جیسے گگن کمان سے تیر
آبی آبی گھر آنگن نیل کا تن اور نیل کا من
سب سے میرا روپ انوپ پھیلی سب جگ دوب ہی دوب
کھیلوں سدا لہروں کے سنگ تن اور من کا ایک ہی رنگ
نینوں میں نیلم ہی نیلم نیل ہی تال اور نیل ہی سم

انکھڑی انکھڑی جھیل ہی جھیل جھلم جھلم بہتا نیل
نیلا ہٹ کا اک دھارا نیلم نیلم اکتارہ
نیل ہی نیل کی موج پہ موج جن میں ڈوبے فوج پہ فوج
تیزہ منش فرعونوں کی جن کی زرہیں فولادی

ساتِ سہیلیاں اک جیسی
سب کی سج دھج شان نئی

سب کے دل میں نئی لگن سب کے دل میں بھری اگن
سات سروں کا اک سنگیت ان سب کی اک سانجھی ریت
سب اک ساتھ آواز اٹھائیں انترہ استھائی بن جائیں
ان سب کا سمپورن راگ راگ میں آگ اور آگ میں راگ
کب یہ راگ ابھرا ہے سات سروں کا لہرا ہے
تار مندھر سپتک مل جائیں ملا جلا سنگیت بنائیں
مشترمیل کا رنگ نیا معجزہ مشرق مغرب کا
رل مل کر اک سنگ بنیں یعنی اک آہنگ بنیں
ایک ہے سات اور سات ہیں ایک ان ساتوں کی بات ہے ایک
آگ میں اندھیارے کو سموئیں سارے کہساروں کو ڈبوئیں

اندھیاروں کے یہ کہسار
اُتر پچھم، آر اور پار

پھر البیلی جوت جگی دھرتی گیت ہی گیت بنی
ساتوں لہریں کرن کرن ساتوں سُر کن من کن من
ایک کرن میں ساتوں رنگ جن کے روپ سے آنکھیں دنگ
ایک ہی تار میں ساتوں سُر اک سرگم میں سارے گُر

اندھیارے کافور ہوئے
پتھر طور ہی طور ہوئے

پھیلا سب جگ نور ہی نور بجنے لگے نوریں طنبور
صبح ہزاراں روپ جگی بربط صد ہا تار بجی
نغمۂ صد ہا چنگ اٹھا راگ ہزاراں رنگ اٹھا
نغمہ صبح رہائی کا نغمہ ساری خدائی کا
آزادی ہی آزادی تازہ وادی سموادی

---

[1] مخلوط سنگیت جس میں اوپر نیچے کی سپتکوں کی سنگت ہو۔ جو مغرب کی تالیفی موسیقی کی بنیادی خصوصیت ہے۔

کرنوں نے اپنے ساز اٹھائے
ساز صد آواز اٹھائے
ساز بلند آواز حیات
ساز شکست لات و منات
زور سے یوں آہنگ اٹھا
شور بسا مردنگ اٹھا؛

سنگیت چکر:

یہ ناز وطن، یہ صبح چمن۔ یہ صبح عنایات ذوالمنن
ہر تار کرن، نغموں کا برن۔ تناتن تن تن تناتن تن تن

آسا میں مری لے اٹھتی ہے۔ دھیمی لو دیتی لال برن
میں کرن کنواری، پری سنہری، جوبن میرا پرن پرن
مرے سنگھ کے اکتارے کا نغمہ پیش ہے صبح بہار چمن:

رنگاں رنگاں یہ دنیا۔ پہنے ہوئے رخت حریری
پھیلی ہوں فضا میں جیسے۔ پر دار شعاعیں چھیلی
جس ڈگر نگر کو جاؤں۔ نت ہر اروپ جگاؤں

گاؤں گیت اس فسوں کار کا۔ روپ جو سب سنسار کا
تن پہ پرتو کسی اور کا۔ من پہ جادو کسی اور کا
راگ ہی اب مرا اور ہے۔ اور ہی اس کا اب طور ہے

مادھن سے پرے جانی ہوگی۔ اس سے سُر مل کے اور تان ہوگی

پانچوں حسوں میں میت سمائے۔ اور ہی دل کا حال بنائے
پریت اک اور ہی ریت سکھلائے بسنگت سنگت گھل مل جائے

دھاروں وہ روپ جو من کو ہرے، چت چور سکل جگ کا
اب روئیں روئیں میں اوشا ہے، کچھ ایسا رنگ چڑھا

کیا رنگ رنگ کے دیپ جلے۔ کیا سُر سے سُروں کا میل ہوا
مرے سنگ کلا کی متوالی۔ اب سمے ہے تیری جھولے کا

لاثانی یہ ٹیپ کا سُر سنگیت میں چوٹی کا عنصر
ایک کرن اور ایک نوا۔ اس سے نہیں کچھ اور سوا
سنگت کی معراج ہے یہ۔ ہر سرگم کی لاج ہے یہ
آخری نغموں کی جھنکار۔ گونج اس کی ہر حد سے پار
جلوہ و نغمہ ہم آہنگ
کامل اور بھرپور آہنگ:

اے صبحوں کی صبح سہانی!
کبھی نہ دیکھے تھے جو جلوے، تیرے جلو میں آئے
کبھی نہ دیکھے تھے جو اجالے وہ تری بو میں آئے
کبھی نہ آئے تھے جو نغمے۔ وہ تیرے ساتھ آئے
کبھی نہ پائے تھے جو موتی۔ وہ تجھ سے ہاتھ آئے
کہیں نہ تھی جو سندر جیوتی۔ وہ ہے تری آنکھوں میں
کہیں نہیں جو کومل سیوتی۔ وہ ہیں ترے گالوں میں
خوابوں کی تعبیر رومانی!
آب نہ تھی جو کون و مکاں میں۔ وہ ترے مکھڑے میں ہے
تاب نہ تھی جو کہیں جہاں میں۔ وہ ترے چہرے میں ہے
روپ ہی روپ سراپا تیرا۔ دھوپ ہی دھوپ ہے تن من
سورج سورج چمک دمک۔ اور رنگ ہے چندن چندن
پیاری پیاری صورت تیری۔ مورت چینی چینی
تیرے بال سنہرا جادو۔ خوشبو بھینی بھینی
رگ رگ نس نس خون ہی خون اور جیون پور دن پور دن
چمکیلی چوٹی سے ضیائیں۔ بہتی جھرنوں جھرنوں
رخ سے پھوٹتی کرنیں کرنیں جادو چلمن چلمن
جیسے جھڑیاں نور ہی نور کی بدلیاں ساون ساون
چومیں نگاہیں تیرے پاؤں آہٹ جن کی جادو
رسی بسی ہے ان پاؤں میں کن پھولوں کی خوشبو؟
ایسی سج دھج، ایسا تجمل، ایسی شان جلالی

باقی ص ۱۲۷ پر

جادہ و منزل

سیّد فیضی

فضاؤں پر ابھی چھائی ہوئی تھی تیرہ شبی!
نظر نظر میں تھا دم، نفس نفس میں خروش
سلگ رہا تھا کہیں دُور محشرِ خاموش
گری وہ برقِ خس و خار کو جلا ہی گئی
اک ایسا شعلۂ عریاں نظر فروز ہوا
وطن کے جذبۂ غیرت پہ چوٹ آ ہی گئی
یقین و عزم کے پیکر عتاب اگلنے لگے
عمل کے سانچوں میں ذہنوں کے خواب ڈھلنے لگے
مرے وطن کے محافظ، یہ پیکرانِ وفا!
نشے میں جوشِ شہادت کے جھومنے والے
عروسِ تیغ کو بڑھ بڑھ کے چومنے والے
زمانہ جن کو عطا کر نظام کہتا ہے
(یہ سر پھرا جنہیں اپنا سلام کہتا ہے)
مری نظر میں وطن دوست ہیں یہ اہلِ جنوں
انہی جیالوں نے بخشا وہ ذوقِ آزادی
کہ زندگی کے تقاضوں کا آسرا لیکر
ہم اپنے جادہ و منزل سے روشناس ہوئے

۲۷ اکتوبر

شیر افضل جعفری

تلواروں کی جھنکاروں میں
بلبل کے نغموں کا جوبن

زنجیروں کے گھور لبوں پر
پازیبوں کی مست چھنا چھن

لوہے کی سیخوں سے چھلکیں
پھولوں کے سہروں کے درشن

بجلی کے تھرکار میں چہکے
اوتاروں کے دل کی دھڑکن

جلتے ٹہنوں کی باہوں میں
جھولے ڈال کے جھولتا ساون

صحرا کے آغوش میں جیسے
پاک چناروں کا سندر بن

جیون کی بن باس فضا میں
بھٹکے بے یاروں کا ساجن

پگھلے تانبے کی لہروں پہ
چلبل، رل مل، جھلمل کندن

جیٹھ کی ظالم دھوپ بھا میں
رقصاں تا، لہراتا پھاگن

دیس کے تیور لئے ماتھے پہ
ہنستے مستقبل کا چندن

جائزہ:

"فصلِ بہار ایں چنیں"

رفیق خاور

روز بروز پائندہ تر، تابندہ تر۔ ہمارا انقلاب اب تاریخ کا ایک مستقل جزو بن چکا ہے۔ ایک خاموش انقلاب جس نے رونما ہوتے ہی تا ابد دوام کا نقش ثبت کر دیا۔ ایک ایسی مہم ہے جس کو بوجہ احسن انجام دینا بظاہر بعید از امکان معلوم ہوتا تھا۔ لیکن یہ دشوار ترین مہم اس قدر آسانی سے سر ہوگئی کہ اس کا وہم و گمان میں بھی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس خوش اسلوبی سے کہ کوئی بھی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ سب اس غیر معمولی خلوص اور جذبہ و جوش کا نتیجہ ہے جو بانیانِ انقلاب کے دل میں کارفرما تھا اور بدستور ایک مستقل احساس کے طور پر ان کے دلوں میں موجزن ہے ؏

وادیٔ عشق بسے دور و دراز است ولے

طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

عہدِ حاضر میں ہماری نظروں کے سامنے جو متعدد انقلاب دوسرے ملکوں میں پے در پے برپا ہوئے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا انقلاب ہر اعتبار سے ایک مثالی انقلاب ہے۔ بیشک واقعاتِ زندگی کے سینے سے ابھرتے ہیں اور بہت ہی حیرت انگیز واقعات، لیکن وہ سطحِ دریا پر ابھرنے والے بلبلوں کی طرح آناً فاناً ناپید بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہماری تاریخ کا مہتم بالشان واقعہ ان سیماب پا واقعات سے مستثنیٰ تھا اور بہر عنوان مستقلاً برقرار رہنے کے لئے رونما ہوا تھا۔ اس کی ہستی پر نہیں بادِ تغیر کا اثر۔ اس لئے کہ یہ حقیقی معنوں میں انقلاب تھا۔ جمہور قوم کی بے تاب تمناؤں کا آئینہ دار۔ اس کے محرکات نہایت اہم و طبعی تھے جن میں ملک و قوم کی محض فلاح و بہبود ہی نہیں استحکام اور بقا بھی مضمر تھی۔ یہ پہلے بھی انقلاب تھا اور اب بھی خالصتاً انقلاب ہی ہے۔ کیونکہ اس کا مدعا ایک اور صرف ایک تھا — قوم کی تطہیر، اس کی تشکیل و تعمیر نو۔ تاکہ وہ صحیح معنوں میں زندہ و متحرک بن کر میدانِ حیات میں صبا رفتار ہو۔ بلاشبہ جس طرح ہمارے انقلاب نے ہر نشیب و فراز کو ہموار کیا ہے۔ وہ ہمارے لئے باعثِ مسرت بھی ہے اور باعثِ فخر بھی۔ اس لئے آج جب یہ انقلاب تیسرے سال سے گزر کر چوتھے سال میں قدم رکھ رہا ہے۔ ہمارا سر فخر سے بلند ہے۔ ہم اپنے اندر ایک ہمہ گیر تیقن، ایک مضبوط اعتماد پاتے ہیں کہ ہماری قیادت جاندار ہے مستعد ہے، بیدار مغز ہے۔ خصوصاً ہمارے امیرِ کارواں، صدرِ پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان جو بڑی حد تک ہمارے فائز المرام ہونے کا سببِ اولیٰ ہیں، بلکہ کارواں بھی۔ اب وہ خستہ و درماندہ کارواں نہیں بلکہ ایک زندہ، فعال، سراپا حرکت، تیز رفتار افراد پر مشتمل ہے۔ جن کے دل و دماغ روشن ہیں اور ان کے سینے میں ایک نہ مٹنے والی لگن ہے۔

کچھ عجب نہیں کہ یہ کارواں اور اس کے سالار کہیں راستے کے پیچ و خم میں کھو کر رہ جاتے۔ لیکن ان کا سوزِ دروں، ان کا ذوق و شوق شروع ہی سے منزلِ مقصود تک پہنچ جانے کا ضامن تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس رہگذر پر تا حدِ نگاہ سنگِ میل ہی سنگِ میل نظر آتے ہیں۔ اور ان کے ارد گرد کشت و نخیل کا ہجوم اور خیابان خیابان ارم کی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ ایک باغ و بہار عالم جس کے نظارہ سے نگاہیں فردوس بداماں ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔

یہ سنگِ میل اس قدر معروف ہیں کہ ان کے اسم و عرف تعارف سے بے نیاز ہیں۔ مثلاً دوسرا پنجسالہ منصوبہ، اپنے پیشرو پنج سالہ منصوبے سے کہیں زیادہ کثیر المقاصد تاکہ اس میں جن سرگرمیوں اور منصوبوں کو یہ محیط ہے۔ وہ بدرجہا زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوں۔ اور جیسا کہ حالیہ مجموعی جائزہ سے معلوم ہوا ہے۔ اس میں معتدبہ کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔ یعنی یہ محض کاغذی

منصوبہ ہی نہ تھا بلکہ اُن میں سے کافی مقاصد فی الواقع حاصل ہو چکے ہیں۔ جو اس میں پیشِ نظر رکھے گئے تھے۔ اس پنج سالہ منصوبہ میں کیا کچھ شامل نہیں۔ اس کو مرتب کرنے میں تعمیر و ترقی کے کیا کیا متنوع پہلو مدِنظر نہیں رکھے گئے اور کیا کیا تیاریاں نہیں ہوئیں۔

دوسرا بہت بڑے اور دور رس نتائج پیدا کرنے والا قدم تھا — بنیادی جمہوریتوں کا قیام جو دنیا بھر میں اپنی قسم کا واحد تجربہ ہے۔ اور جس کو پاکستان سے باہر بھی بعض قومیں آزمانا چاہتی ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے قومی مزاج، مخصوص حالات، دیرینہ روایات اور ملکی تقاضوں کے مطابق مناسب قسم کی جمہوریت اختیار کریں جو زیادہ گراں اور پُر تکلف بھی نہ ہو اور زندگی کے معاملات میں فی الحقیقت زیادہ سے زیادہ کارآمد ثابت ہو۔ یہ ملکی نظام معاشرہ کی تہہ سے ابھرتے ہوئے منزل بہ منزل ایک مخروطی وضع اختیار کرے۔ آخری منزل قوم کے بہترین دل و دماغ رکھنے والے سربراہوں پر مشتمل ہو جو اس کی صحیح طور پر قیادت بھی کر سکیں اور خدمت بھی۔

اسی طرح ایک ایسا دستور العمل لازم ہے جو حقیقی جمہوریت کے اس تجربے کے ساتھ مطابقت رکھتے ہوئے ملی مزاج اور تقاضوں کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہو۔ یہ امر وجہ مسرت ہے کہ دستور کمیشن نے شبانہ روز کے انہماک اور جد و جہد کے بعد ایسے جامع اور ہمہ صفت موصوف دستور کا خاکہ تیار کر لیا ہے اور ہم سب کے لئے نوید مسرت ہے کہ انقلاب کے فوراً بعد یہ مثالی دستورِ نو قوم کو ایک ہدیۂ بے بہا کے طور پر پیش کیا جائے گا۔ اس طرح جب مارشل لا اپنا مقصد پورا کر لے گا تو دستور پر مبنی حکومت بروئے کار آجائے گی اور ہم کہہ سکیں گے کہ:

ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

اس محل پہ اصلاحات اراضی کا تذکرہ شاید تحصیل حاصل معلوم ہو کیونکہ ہمارے معاشرہ کے اس انقلاب عظیم کا پہلے ہی بہت کچھ چرچا ہو چکا ہے اور اس کے کایا پلٹ دینے والے اثرات کافی حد تک بروئے کار آچکے ہیں۔ یہ اصلاحات ہر انسان کو اس کا صحیح حق دلائیں گے اور مساوات پیدا کریں گے۔ اچھے شہری، اچھی قوم۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی طرح انکار ممکن نہیں۔ تاریخ نے بار بار اس کا ثبوت دیا ہے۔ ممکن ہے قوموں کی

صلاحیتیں الگ الگ ہوں۔ لیکن ان کی ترقی، اصل اصول، ان کی بنیادی شرط ایک ہی ہے یہ کہ ان کے مزاج، ان کے نظام میں صالحیت کا عنصر ہو۔ انفرادی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے۔ وہ بیک وقت سلیم الفطرت اور نشو و نما کے جوہروں سے بہرہ ور ہوں۔ بالفاظ دیگر ان کی خودی ایک ارفع و اعلیٰ نمو پذیر خودی ہو۔ اسی لئے انقلاب کی ساری مہم ایک ہی امر پر مرکوز ہے۔ معاشرہ کی خرابیوں کا استیصال۔ فرد ہے تو اس کے دل و دماغ کو روشن کرنے کے علاوہ اس کے ضمیر کو بھی پاک و صاف بنایا جائے۔ اور جماعت ہے تو وہ بھی نظم و ضبط کی خوگر اور راہِ راست پر گامزن ہو۔ اس خیال کی بنا پر حال ہی میں معاشری برائیوں کے استیصال کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا ہے۔ جس کا مقصد چن چن کر تمام برائیوں کو واضح کرنا اور ان کو دور کرنے کی تدابیر پیش کرنا ہے۔

معاشرہ کی اصلاح و درستی اس کے بہترین اثرات کو قبول کرنے کی تمہید ہے۔ اور یہ اثرات عمدہ تعلیم ہی سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اسی لئے منجملہ دیگر امور کے دانشورانِ انقلاب کے اولیں اقدامات میں سے ایک تعلیم اور اس کے نظام کی بدرجۂ احسن تہذیب و ترقی تھی۔ چنانچہ قومی تعلیم کے کمیشن نے جو بہترین ملکی و غیر ملکی اراکین پر مشتمل تھا۔ پوری پوری چھان بین کے بعد اپنی سفارشات پیش کیں۔ جن سے نظامِ تعلیم اور اس کی روح رواں یکسر بدل گئی ہے۔ پہلے تعلیم کا مقصد حکامِ غیر کی غلامی اور حکم برداری کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ تاکہ حکومت کی مشینری کو چلانے کے لئے بے جان کل پرزے تیار کئے جائیں۔ اب تعلیم کا مقصد بہترین کارکن، بہترین دل و دماغ رکھنے والے قائد پیدا کرنا ہے۔ اور نظامِ تعلیم کا مقصد و مدعا تمام تر روشن ضمیر، روشن دماغ اربابِ فکر و عمل پیدا کرنا۔ جو اپنے ماحول کے جملہ مقامی و آفاقی تقاضوں کو سمجھیں اور رفتارِ زمانہ کے ساتھ ہی نہ چلیں بلکہ خود آگے بڑھتے ہوئے اسے بھی آگے بڑھانے کی کوشش کریں۔

ہماری جدید تعلیم کا طرۂ امتیاز ہوگا کردار کی تعمیر۔ ایسا کردار جو مذہب کی حقیقی نمو کوش روح میں ڈوبا ہوا ہونے کے علاوہ علوم جدیدہ کی حقیقت پسند اور بصیرت افروز

معلومات سے مالا مال ہو اور اس دوگونہ اکتساب فیض کے باعث زندہ، توانا اور متحرک ہو۔ کیشن نے بڑی وسیع النظری سے کام لیتے ہوئے جلال کے ساتھ جمال اور حقیقت کے ساتھ حسن پر بھی زور دیا ہے۔ تاکہ انسانی فطرت کا کوئی اہم پہلو تشنۂ نمو نہ رہے۔ ایک وقت تھا جب فنون لطیفہ کو انسانی فطرت کی احسن نمو کے منافی بلکہ اس کے لئے غایت درجہ مضرت رساں سمجھا جاتا تھا۔ اب اس حقیقت کا احساس عام ہو چکا ہے کہ جمال انسانی فطرت کا ایک لازمی اور نہایت اہم جزء ہے۔ اور اس کو نظر انداز کرنا خطرناک نتائج سے خالی نہیں اس لئے ادب و فن کو فطرت انسانی کی تربیت اور نشو و نما میں ہی بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اسی لئے جہاں کھیل کود اور سیر و تفریح کو جسمانی حیثیت سے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ وہاں ادب اور ہنر و فن کو ذہنی و نفسیاتی حیثیت سے لازم قرار دیا گیا ہے۔ اور ہمارے تعلیمی اداروں میں ان کو وہ مقام دیا گیا ہے جو موزوں و مناسب ہے۔ اور اس کے ساتھ درسگاہوں میں ہی نہیں بلکہ عام زندگی میں بھی وہ آزادی روا رکھی گئی ہے۔ جو ادب و فن کی طبعی نشو و نما کے لئے ضروری ہے۔

بہتر ہے کہ اہل فن محسوس کریں کہ وہ فکر و عمل میں آزاد ہیں۔ ان پر کسی طرح کی دار و گیر نہیں۔ اگر انہیں ذرا بھی یہ احساس ہوگا کہ ان کے سر پر کوئی کابوس مسلط ہے تو وہ اپنے سے قاصر رہیں گے۔ وہ کوئی اچھوتی بات سوچنے سے معذور رہیں گے۔ ان کے فیضان کے سوتے بند ہو جائیں گے۔ ہر آزادہ روی میں تھوڑی بہت بے راہ روی بھی ہوتی ہے۔ اور اس میں کوئی ہرج نہیں۔ کیونکہ اس سے نئی راہیں آشکار ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے ادیب اور فن کار وہ آزادی محسوس کر رہے ہیں جو انہوں نے پہلے کبھی نہیں کی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ بعض رسالوں اور کتابوں میں ادیبوں نے ایسی آزادی سے کام نہیں لیا کہ قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نظر آئے۔ اس کی مثالیں اکثر اہل نظر کے سامنے ہیں۔ تعجب اس پر نہیں کہ ایسا ہوا ہے۔ تعجب اور فخر کی بات یہ ہے کہ اس پر کوئی گرفت نہیں کی گئی۔ اگرچہ اخلاق و سیاست کی دنیا میں ایسی بے باکیاں قبل ازیں دار نہیں تو طوق و سلاسل سے کبھی دور نہیں رہیں۔

اس ہی رواداری کا ایک خوشگوار نتیجہ یہ ہے کہ وطن دوستی کے ساتھ آفاقی قدروں کے ضمن میں سوچنے پر بھی کوئی قدغن نہیں۔ بلکہ جدید علوم و فنون اور فکر و خیال پر جو زور دیا جا رہا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنے وطن و قوم کے حدود میں رہتے ہوئے بھی وسیع النظری اور روشن خیالی پیدا کریں۔ جو انسان کو آزاد فکر کی طرف لے جاتے ہیں۔ اور وابستۂ مقام ہوتے ہوئے بھی آفاقی بنا دیتے ہیں۔ آج ہمارے کتنے ہی ادیب اور فن کار ہیں جو اس عالمی رجحان کی طرف مائل اور آفاقی ذہنیت سے سرشار ہیں۔ پچھلے سال کے جائزہ میں اس نئے رجحان کی نشان دہی کی گئی تھی۔ کیونکہ اس کی اچھی خاصی نمایاں جھلکیاں دکھائی دینے لگ گئی تھیں دور انقلاب کی بڑھتی ہوئی آزاد فضا نے اس رجحان کو اور بھی نمایاں کر دیا ہے۔ اور کتنے ہی ادیبوں کی تحریریں روز افزوں عالمی فضا کا پرتو لئے ہوئے ہیں۔ آثار یہی ہیں کہ شرق و مغرب کے امتزاج پر مبنی یہ روز بروز زیادہ جامع ہوتا ہوا عالمی رجحان مسلسل ترقی کرتا چلا جائے گا۔ اور ہم اس سے وسیع تر نتائج کی توقع کر سکتے ہیں۔

افسانوں کی حد تک اس عالمی کیفیت کا نقطۂ عروج "سورج بھی تماشائی" میں نظر آتا ہے۔ انور کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ بقلم "خالص انور" جس کا افسانہ کبھی محض افسانہ نہیں ہوتا۔ ایک کہانی۔ اس کے یہاں اہمیت خاکے کی نہیں بلکہ اس میں ہے کہ اس میں کیا کیا رنگ بھرے گئے ہیں۔ کیسے کیسے رنگ اور کس کس طرح۔ وہ ان خاکوں میں کیا کیا باتیں، کیا کیا تیور پیدا کرتا ہے۔ گویا افسانہ نہ ہو "کوفی ہاؤس" میں بے تکلف گفتگو ہو۔ جس میں ہر ہر لفظ، ہر ہر بات محل بھی رکھتی ہے اور معنی بھی۔ اور اس کا افسانہ کے تصور، اس کے پلاٹ سے گہرا تعلق ہو۔ اس کا افسانہ شخصیت کا دوسرا نام ہے۔ وہ اس لئے نہیں لکھتا کہ وہ افسانہ نویسی کا فن جانتا ہے یا کسی مقصدیت و افادیت کا قائل ہے۔ اس میں انوکھی بات افسانہ کا بلند تصور ہے۔ اور موضوع کی پیشکش میں استادی۔ واقعی استادی کیونکہ شطرنج کے کھیل کی طرح اس کی چالیں صاف دکھائی دیتی ہیں اور بازی پر اثر ڈالتی ہیں۔ افسانہ ہو یا کوئی اور صنف سخن اس میں محض فن کے علاوہ اور بھی عنصر ہوتے ہیں جو اہم قدروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انور میں یہ قدریں بہت ہی کثیر اور متنوع ہیں۔ اور بسیط مطالعہ چاہتی ہیں۔ اس کا سب سے تیز نشتر طنز ہے۔ جو تھوڑ

(باقی صفحہ [illegible] پر)

"دیدن دگر آموز"

جیسا کہ حکیم ملت" نے کہا ہے زندگی ایک آزاد قوت ہے، اس کا کوئی معین رخ نہیں اور نہ کوئی مستقل لائحۂ فکر و عمل مقرر کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا در مع الدار کیف دارا کے مصداق ہمیں وہی روش اختیار کرنی چاہئے جو حالات کے مطابق ہو۔ بنا بریں ہمارے دیدۂ بینائے قوم، صدر پاکستان نے حال ہی میں ہماری بین الاقوامی پالیسی کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ حقیقت افروز ہوتے ہوئے ہمارے لئے من حیث القوم قابل غور ہے۔ اور کچھ ان ہی کی زبان سے "سرگزشت عہد گل را از نظیری شنو"

(ادارہ)

ہماری خارجہ پالیسی کیا ہے؟ اس کے متعلق موٹی موٹی باتیں کیا ہیں؟ آج میں ان کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ سچ یہ ہے کہ کسی ملک کی خارجہ پالیسی اس کی اندرونی پالیسی ہی کی صدائے بازگشت! اسی کا پرتو ہوتی ہے۔ اس کی معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی پالیسیوں پر مبنی۔ میں کہتا ہوں اندرونی حیثیت سے ہمارا مطمحِ نظر۔ اور سب سے بڑا مطمحِ نظر یہی ہے کہ پاکستان ایک ہو۔ اس کی نظریاتی بنیاد ایک ہو۔ ہم اس کی سالمیت کو یقینی بنا دیں۔ اور پھر اس کی اصلاح کا بیڑا اٹھائیں، اس تعمیرِ نو کا کام انجام دیں۔ غرض اگر ہم سارے معاملہ کو چند ہی الفاظ میں ادا کر دینا چاہیں تو یہی تین باتیں بنتی ہیں جن سے ہماری حکومت کا سروکار ہونا چاہئے۔ اور ہمارا یعنی اہلِ پاکستان کا بھی۔

جہاں تک فکر و نظر میں یکجہتی کا تعلق ہے، ظاہر ہے کہ وہ ایک اور صرف ایک ہی ہو سکتی ہے۔ یعنی یہ کہ ہم پاکستانیوں کی زندگی تمام تر اسلامی طرزِ زندگی ہی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہو۔ کیونکہ پاکستان اسی بنا ہی پر تو وجود میں آیا تھا اور یہی واحد بنیاد ہے جس سے یہ نوزائیدہ مملکت برقرار رہ سکتی ہے اور ترقی کرتے کرتے مضبوط و توانا بھی بن سکتی ہے۔

یہ کہہ دینا تو بڑا آسان ہے لیکن اسے عملی جامہ پہنانا بے انتہا دشوار ہے۔ اپنی زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھالنا تو ایک سلسلۂ جاریہ ہے جو کہیں مدتوں میں جا کر صورت پذیر ہوتا ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں کہ بس کُن کہا اور فیکون ہو گیا۔ اس کے لئے تو دن پہ دن اور راتوں پر راتیں توجہ کرنی پڑتی ہے۔ اور ایک منظم ادارے کی ضرورت ہے جو برابر اس کا دھیان دلاتا رہے۔ امید ہے ہمارا دستور اس کا پورا پورا خیال رکھے گا۔ فی الحال میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ اس بڑے ہی مشکل مطمحِ نظر کو عملی صورت عطا کرنے کے لئے بڑی ہی پرخلوص اور دیانتدارانہ کوشش کی جائے گی۔

یہ تو ہوئی اندرون ملک کی بات۔ جہاں تک بیرونی رسم و راہ کا تعلق ہے ہمیں قدرتی طور پر اسلامی ممالک کے ساتھ گہرا انس بھی ہے اور لگاؤ بھی۔ آج ستاروں کی گردش واقعی تیز ہے اور دنیا ہماری آنکھوں کے سامنے دگرگوں ہوتی جا رہی ہے۔ ایشیا اور افریقہ کے جو ملک پہلے آزاد نہ تھے ان میں ایک زبردست ہلچل نظر آ رہی ہے۔ اور اسلامی ممالک میں بھی بے انتہا غوغائے رستاخیز سنائی دے رہا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک بات ہمارے ذہن میں بالکل واضح ہونی چاہئے۔ یہ کہ دوسرے مسلم ممالک میں جو ہنگامے برپا ہیں وہ بڑی حد تک نسلی ہیں یا لسانی۔ قبضہ و ملکیت کے بارے میں ہیں یا ملوکیت اور استعمار کے خلاف۔ ان کا مذہب سے بہت کم تعلق ہے۔ اس لئے مجھے یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ جب ہم دوسرے اسلامی ملکوں سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ صرف کسی اصول پر کلی اتفاق کریں تو ہمیں بڑی ہی مایوسی ہوتی ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ ہماری اپنی غلطی ہے کیونکہ ہم صورت حالات کو نہ درست طور پر سمجھتے ہیں نہ ان کا صحیح محاکمہ ہی کرتے ہیں۔

ہم لوگوں کو اُس وقت بھی سمجھنے میں غلطی ہوتی ہے جب ہمارے نقطۂ نظر سے اعتنا نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ دوسری مسلمان قوموں کے اپنے اپنے مسئلے ہیں۔ کچھ استعماری طاقتوں کے سلسلہ میں اور کچھ آپس کے۔ اسی لئے پاکستان ان پر کوئی فیصلہ کن اثر ڈالنے سے قاصر ہے۔ بعض وقت اسلامی ملکوں کے تقاضے، ان کی التماسیں نسلی ہوتی ہیں۔ لیکن جب اس قسم کا کوئی ہنگامہ برپا ہوتا ہے اور قومیت کا جذبہ انتہائی تند و تیز صورت میں چھا جاتا ہے تو عقل کی پیش نہیں جاتی۔ دماغ ایک طرف ہو جاتا ہے۔ اور دل دوسری طرف۔ ایسے میں کوئی کسی کو مشورہ بھی دے تو کیا اور متنبہ بھی کرے تو کیا۔

بعض اوقات دوسرے اسلامی ملک ہمیں اس لئے بھی سمجھ نہیں پاتے کہ اُن کے جھگڑے آپس ہی میں ہوتے ہیں یا سابقہ طاقتوں سے۔ ہمارا اپنی سابقہ حکمراں قوم سے، انگریزوں سے ایسا کوئی جھگڑا نہیں۔ وہ ہمارے دوست ہیں۔

ہمارا جھگڑا تو صرف اپنے ہی براعظم ایشیا کی قریبی ہمسایہ طاقت سے ہے۔ اور اسی سے ہمارے اور دوسری اسلامی قوتوں کے نقطۂ نظر میں فرق آن پڑتا ہے۔ جب وہ افریقیشیائی اتحاد، افریقیشیائی موقف وغیرہ کا راگ الاپتے ہیں اور ہم بعض اوقات ان کے ہمنوا نہیں بن سکتے۔ تو وہ ہمیں ٹھیک طرح سمجھ نہیں پاتے کہ ہم ایسا کیوں کرتے ہیں۔ اس لئے کہ جس قسم کے دباؤ ہم پر ہیں ان پر نہیں ہیں۔

اس کے علاوہ ہمارے خلاف کچھ حسد بھی ہے۔ اس لئے کہ شروع شروع میں جب پاکستان قائم ہوا تو بہت سے لوگ یہ شیخی بگھارنے لگے کہ ہمارا ملک سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اور پھر اب بعض خدا کے بندوں کے دماغ میں لیڈری کا کیڑا بھی کلبلا رہا ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ ہمارا ملک خاصا لمبا چوڑا ہے اور اس کے مسئلے بھی ایسے ہی لمبے چوڑے ہیں۔ اس لئے دوسروں کا لیڈر بننے کا خبط محض بیہودگی ہے اور بس۔ سیدالقوم خادم الناس۔ لہٰذا اگر آپ چاہتے ہیں کہ دوسروں کے قائد بنیں تو اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ ان کی خدمت کریں۔

بعض اوقات جب ہم یہ محسوس کریں کہ دوسرے اسلامی ملک کسی بات کو اس نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتے جس سے ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ان کے حالات ہمارے حالات سے مختلف ہیں۔ عالمگیر اخوت اور اسلامی اخوت کے تصورات تو اسی وقت پروان چڑھ سکتے ہیں جب کہ اسلامی ممالک کے عوام تعلیمی حیثیت سے کافی ترقی یافتہ ہو جائیں۔ جب تک یہ صورتِ حال نہ پیدا ہو جائے، اہلِ پاکستان کے لئے سخت ناعاقبت اندیشی ہوگی کہ وہ حالات کو درست طور پر نہ سمجھیں اور اس سے زیادہ توقع دل میں لئے رہیں جتنی کہ حالات اجازت دیتے ہیں۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم نے ہر موقع پر اپنے اسلامی بھائیوں کی پوری پوری اخلاقی اور دوسری حمایت بھی جو ممکن ہو سکتی تھی، کی ہے۔ ہم عام طور پر یہی چاہتے ہیں کہ ان کی بھلائی ہو۔ وہ زیادہ طاقتور بنیں اور ان کے باہمی مسئلے سلجھ جائیں۔

لیکن ایک بات سب پاکستانیوں پر پوری طرح واضح ہونی چاہیئے۔ یہ کہ ہم اس حد سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ کسی بھی فریق کی طرفداری ہمارے لئے تباہ کن بھی ہوگی اور بیکار بھی۔ ہمیں ان ملکوں کے اندرونی مسئلوں میں نہیں الجھنا چاہیئے۔

آج ہم اس بات پر تیار ہیں کہ ان کے اخلاقی، اور بڑی حد تک برحق مطالبوں کا جائزہ لیں، مگر ان کے اندرونی مسئلوں سے بڑی سختی کے ساتھ دور رہی ہیں۔ اس پالیسی کی بدولت ہم نے اسلامی ملکوں کو اپنا اچھا خاصا دوست بنا لیا ہے۔ ان میں سے بعض ہمارے بڑی شدت سے حلیف ہیں۔ اسی طرح عرب ممالک کی طرح بعض ایسے ممالک بھی ہیں جن کے ساتھ ہمارے تعلقات بڑے خوشگوار ہیں۔ اور میری دانست میں یہ سلسلہ یونہی جاری رہنا چاہیئے۔

جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے میں برابر کہتا رہا ہوں کہ اس کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے اور یقین جانئے ایک نہ ایک دن کچھ سمجھدار آدمی بیٹھ کر اسے ضرور حل کرنے کی کوشش کریں گے، تو پھر اسے کل پر کیوں ڈالا جائے، آج ہی کیوں نہ حل کیا جائے؟ اس سے دونوں ملکوں کے لوگ بے اندازہ مصیبتوں سے بچ جائیں گے۔ میں نے

اس بارے میں سرتوڑ کوشش کی ہے۔ مگر ہندوستان کے وزیراعظم کو اس بات پر آمادہ نہیں کر سکا۔ اگر ہم چاہیں تو عوام کشمیر، پاکستان اور ہندوستان سب کے مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی نہ کوئی معقول حل تلاش کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ حل کوئی نہ کوئی مفاہمت ہی ہو سکتا ہے۔ کسی کے لئے بھی سو فیصد تسلی بخش نہیں۔ مسٹر نہرو کا فیصلہ پر راضی نہ ہونا ہندوستان اور پاکستان دونوں کے لئے بڑا مایوس کن ہے۔ کیونکہ ہمیں آپس میں صلح صفائی سے رہنا چاہئے۔

ہمارے متعلق کہا گیا ہے کہ ہماری حکومت فوجی ہے۔ اس لئے وہ جو کچھ سوچتی ہے جنگی نہج پر سوچتی ہے۔ جہاں تک پاکستان کے کوئی جارحانہ قدم اٹھانے کا سوال ہے۔ یہ سوال اظہر من الشمس ہے کہ ہمیں چاہے جتنی بھی فوجی امداد دی گئی ہو، ہماری طاقت ہندوستان کی طاقت کا صرف ایک تہائی ہے۔ ایسے میں لڑائی کا سوال — این خیال است و محال است و جنوں — کا مصداق ہے۔ اور ہمارے لئے خودکشی کے مترادف ہوگا۔ بیشک ہماری حکومت فوجی ہے لیکن سراپا تواضع، بڑی معقولیت پسند اور تعاون کوش۔ ہماری طرف تو ساری گفتگو اس بات پر رہی ہے کہ دونوں ملکوں میں امن رہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ ہندوستان میں بھی کئی لوگ ہیں جو یہی چاہتے ہیں لیکن جب ہمارے سامنے لائحہ عمل کی سد سکندری کھڑی ہو جائے تو پھر کیا کیا جائے۔

رہا عالمی تحفظ تو اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ آج دو عظیم حریفانِ پنجہ فگن — روس اور امریکہ — میں زبردست کشمکش جاری ہے۔ موجودہ زمانے میں جنگِ عظیم کے معنی ہیں۔ نیست و نابود ہو جانا۔ پاکستان، خصوصاً مغربی پاکستان، اس لحاظ سے بڑے ہی نازک مقام پر واقع ہے۔ اگر اس کے گردوپیش کے حصوں میں جنگ چھڑ جاتے تو ہم کسی طرح اس سے دور نہیں رہ سکتے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہمارے لئے اس معاملہ میں غیر جانبدار رہنا ناممکن ہے۔ یہی بنیادی حقیقت ہمارے دفاعی معاہدوں۔ سیٹو اور سنٹو — کی رازدار ہے۔ ان باہمی تعلقات کے پیش نظر امریکہ واقعی ہمارا بہت اچھا دوست ثابت ہوا ہے۔ اس نے اقتصادی حیثیت سے ہماری امکان بھر اعانت کی ہے۔ اگر وہ بعض سیاسی امور میں ہماری پوری پوری مدد نہیں کر سکا تو ظاہر ہے اس میں اس کی مجبوریاں سدراہ ہیں۔ سیاست کیا ہے؟ بڑی برائیوں کے مقابلے میں چھوٹی برائیوں کا چناؤ۔ اس لئے ہم کسی مثالی حل کی توقع ہی کیوں کریں؟ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ اگر ہمارے دوست کوئی ایسی بات کریں جس سے ہمارے دفاع کو نقصان پہنچے یا ہماری فوجی وسیاسی ذمہ داریاں بڑھ جائیں تو ہمیں حق ہے کہ ان کی توجہ ان کی طرف مبذول کرائیں۔

بعض اوقات ایشیا برائے ایشیا کا نعرہ بھی بلند کیا جاتا ہے۔ یہ بےحد خطرناک ہے۔ اس لئے کہ چین، انڈونیشیا، پاکستان اور ہندوستان میں آبادی بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اب یہاں کی قومیں اور تو کہیں جا نہیں سکتیں کیونکہ مغربی قومیں سب براعظموں میں اپنی جگہ بڑی مضبوط ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ایشیا کے چھوٹے ملکوں کو یہ حق نہ دیا جائے کہ وہ دوسروں کی مدد سے خود کو محفوظ رکھیں۔

آج ہمارے لئے عالمی پس منظر کے بغیر سوچنا یا قدم اٹھانا محال ہے۔ اس لئے اگر ہم اپنے لئے امن چاہتے ہیں تو ہمیں موجودہ عالمی فضا ہی کے ضمن میں سوچنا ہوگا۔ جنگ سے امن عالم کی تدبیریں بار بار ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ اس لئے اب اقوام متحدہ ہی پوری طرح طاقتور ہو جائے۔ اور اس کے بعد مناسب ذرائع بھی ہوں تو عالمی نظم وضبط اور امن وامان قائم رہ سکتا ہے۔ لیکن واللہ اعلم۔ ہم ایسا نظم وضبط قائم کر بھی سکیں گے یا نہیں۔ جو کچھ ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک طرف اشتراکی بلاک ہو اور دوسری طرف غیر اشتراکی۔ جیسا کہ یورپ کی "مشترکہ مارکیٹ" کے نظام میں دکھائی دیتا ہے۔ میرا خیال ہے رفتہ رفتہ کناڈا اور امریکہ بھی اس میں شامل ہو جائیں گے۔ مگر اس نظام کی کامیابی اس ہی پر موقوف ہے کہ امریکہ اس سلسلہ میں کوئی مثبت قدم اٹھائے۔

جہاں تک جوہری ہتھیاروں کو ترک کرنے کا سوال ہے۔ اوّل اس کا تا حال جو حشر ہوا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ اور اگر یہ کوششیں کامیاب بھی ہو جائیں تو بھی جنگ کے دور ہونے کا امکان نہیں۔ کیونکہ یہ انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ آج سائنس اس قدر تیزی سے ترقی

(باقی ص۱۲۱ پر)

مومن، کراچی ۲ اکتوبر ۱۹۶۱ء

مشہدِ عشّاق

(رہگذارِ بالاکوٹ میں)

عبداللہ خاور

بصد نیاز شہیدوں کی انجمن کو سلام
بصد خلوص غریبانِ بے وطن کو سلام

فروغِ جذبۂ سرشارِ حریّت یہ درود
دلِ شہید کی اس شمعِ ضوفگن کو سلام

وہ "بیتِ حرب" سے ہجرت کی جراُتِ اوّل!
کیا ہے جس نے مجاہد کے بانکپن کو سلام

نکال دی رگِ خارا سے جوئے شیرِ حیات
امینِ ضربتِ بازوئے کوہکن کو سلام

شکوہ و عظمتِ کہسار سجدہ ریز ہے یوں
کہ جیسے کرتی ہے ابروئے تیغ زن کو سلام

ہیں جس علم کا پھریرا چنار و سرو و سمن
اسی علم کے جلالِ عدو شکن کو سلام

وفا پہ مٹ گئے، شمعِ وفا کے پروانے
نظر فروز ستاروں کی انجمن کو سلام

نظر کے سامنے ہے آہ مشہدِ عشّاق!
شفق طرازئ خونِ دلِ چمن کو سلام

قبائے گل بھی شہیدوں پہ رشک کرتی ہے
رہِ حیات کے ہر لالہ پیرہن کو سلام

خزاں میں بھی گل و لالہ کا ہے ہجوم یہاں
بہار کرتی ہے بوئے گل و سمن کو سلام

اسی فضا کو ملا لمسِ بالِ جبرائیلؑ —
فرشتے لائے ہیں عزلت کا انجمن کو سلام

امیرِ مملکتِ دین، سیّدِ والاؒ —
ترے خلوص، ترے جذبۂ وطن کو سلام

تجلّیاں ہیں ترے عزمِ بے نہایت کی
جبینِ کوہ کے اجلالِ پُر شکن کو سلام

ہِزَبرِ بیشۂ قہر و جلال — اسمٰعیل
شہیدِ راہِ وفا، تیرے بانکپن کو سلام

نیاز عشق کی خوابیدہ جراُتوں پہ درود
سرِ نیاز کے انجامِ بے کفن کو سلام

مقلّدینِ عمرؓ پہ ہزار بار درود
مجاہدین کی ابروئے پُر شکن کو سلام

دلِ شہید کا سوزِ دوام پیدا ہو
نوائے بلبلِ شوریدہ کا چمن کو سلام

وہ "جامِ شرع"[1] وہ "سندانِ عشق" مل جائے
عطائے ساقئ سرمستئ کہن کو سلام!

نثارِ مشہدِ عشّاق پر دلِ خاور
شعاعِ مہر کا پھولوں کی انجمن کو سلام!

---

[1] درکفے جامِ شریعت، درکفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نہ داند جام و سنداں باختن

عہدِ اکبر شاہ میں جہدِ آزادی

خان رشید

برّصغیر کی جدوجہدِ آزادی کی تاریخ میں ایسے کئی موڑ آئے جب بیم و رجا کی کشمکش میں مبتلا عوام نے پُر امید ہو کر قربانیوں سے گریز نہ کیا لیکن ان کے اپنے تذبذب اور بے یقینی نے انہیں ناکامی سے دوچار کیا۔ فطرت کے خارجی عوامل میں ایک انقلابی تبدیلی اندرونی سیرت میں تبدیلی کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔ لیکن ایک ایسے زمانہ میں جب کہ اقوام کا مذاق ہی بگڑ چکا ہو سیرت اور کردار کی پختگی کی تلاش سعیٔ لاحاصل کے علاوہ کچھ اور نہیں۔ افراد پھر بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں مگر ان کی کوششیں ایک زوال آمادہ قوم کی تقدیر شاذ ہی بدل پاتی ہیں۔ ارتقار کی راہیں اگر مسدود ہو چکی ہوں تو رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے اسی مناسبت سے طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب اگر علمبردارانِ انقلاب اتنی طاقت نہ فراہم کر سکیں تو تصادم کے بعد خود ان کی شکست ناگزیر ہوتی ہے۔ ایسی شکستیں اور ایسی ناکامیاں بھی دور رس اور نتیجہ خیز ضرور ہوتی ہیں۔ ایک کامیاب انقلابی کی طرح ضربِ کلیمی ان کا نصیب نہ ہو مگر حسینی صبر سے انہیں کوئی محروم نہیں رکھ سکتا۔ قصۂ فرعون و کلیم ان کا مقدر نہ ہو مگر معرکۂ حسینؓ و یزید انہیں کے دم سے قائم ہے۔ طلسم سامری دونوں صورتوں میں ٹوٹتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ حسینؓ، موسیٰ کی طرح اپنی کوششوں کا پھل اپنی زندگی میں نہیں دیکھ پاتے۔ قوموں کی تاریخ کلیمی پر ناز کرتی ہے تاہم حسینیؓ بھی کچھ کم باعث افتخار نہیں —— یہ وہ سنگ میل ہے جہاں پہنچ کر جبر و تشدد اپنی انتہا کو پہنچ جاتے ہیں۔ ایسی انتہا جس کے بعد تشدد میں انحطاط لازمی ہوتا ہے۔ یہی فطرت کا قانون ہے اور زمانہ اسی طرح ارتقار کرتا ہے۔ 'حسینی' دراصل جمود و تعطل کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ ایک ایسا اعلان جنگ جو بجائے خود ایک خوش آیند مستقبل کا نقیب ہی نہیں امین بھی ہے۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی تاریخ میں ٹیپو شہید جیسی عظیم المرتبت ہستیوں کے علاوہ بے شمار چھوٹے موٹے انقلابی بھی پیدا ہوتے رہے۔ ان کی عظمت کلیمی نہ بن سکی مگر حسینی آن بان ان سے کوئی نہ چھین سکا۔ جو حسینیت کے اعلیٰ مدارج تک پہنچے وہ ٹیپو شہید اور اسمٰعیل شہید بن کر سامنے آئے اور جو ان مدارج تک نہ پہنچے ان کے کوئی نام بھی نہیں جانتا مگر ان کی خدمات اور قربانیوں کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ اور مبارک ہیں ایسی ہستیاں جنہوں نے اس مقصد کی خاطر کہ قوم شاہراہِ ارتقار پر گامزن ہو سکے اپنی جانیں دینے سے بھی گریز نہیں کیا۔

$\frac{۱۲۲۱ھ}{۱۸۰۶ء}$ میں شاہ عالم کا انتقال ہوا اور ان کے بیٹے معین الدین اکبر شاہ ثانی حکمراں ہوئے۔ یہ نام کے بادشاہ تھے۔ اور انگریزوں کے روز افزوں اقتدار کا یہ عالم تھا کہ اکبر شاہ کے صاحبزادے مرزا جہانگیر پر انہوں نے اس جرم کی پاداش میں مقدمہ چلایا اور شہزادے کو الٰہ آباد میں قید کی سزا دی کہ اس نے انگریز ریذیڈنٹ پر طپنچہ سے فائر کر دیا تھا۔ صرف یہ واقعہ بادشاہ کی مجبوری کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ $\frac{۱۲۲۴ھ}{۱۸۰۹ء}$ میں بدنصیب شہزادہ قید خانے ہی میں انتقال کر گیا۔ ملک میں ہر طرف افراتفری تھی۔ ہندوستانی عامل اور ارباب حل و عقد سیاسی جوڑ توڑ اور ایک دوسرے کی جڑیں کاٹنے میں مشغول تھے۔ پورے ملک میں انتشار اور بدنظمی کا دور دورہ تھا۔ یک جہتی اور اتحاد ناپید تھے۔ انگریزوں نے ہندوستان میں اپنا تسلط جمانے کے لئے اپنی سیاست اور سازشوں سے اس انتشار کو مزید ہوا دی نتیجہ یہ ہوا کہ فرقہ وارانہ اختلافات اور طبقاتی کشمکش نے بھی وہ زور پکڑا کہ عوام کی زندگی اجیرن ہو گئی۔ اندرون ملک خانہ جنگیوں اور بعض بیرونی حملہ آوروں نے سلطنت مغلیہ کی رہی سہی آبرو بھی لوٹ لی تھی۔ مرہٹوں کا زور توڑا جا چکا تھا لیکن سکھ انگریزوں کی پشت پناہی پر عروج پکڑ رہے تھے۔ افغانستان میں بھی خانہ جنگی شروع ہو چکی تھی۔ اور وہی رنجیت سنگھ جس نے زماں شاہ ابدالی کے حکم سے لاہور کی گورنری اور راجگی کا خطاب پایا تھا انگریزوں کے بھڑکانے پر زماں شاہ سے باغی ہو گیا۔

دریائے بلھار : سنگلاخ چٹانوں میں زندگی کی جوئے سبز

جوار بالا کوٹ : سفاف جھیل ، ایوب نیشنل پارک ، اسلام آباد

وادیٔ کاغان : دور برے برفپوش سمٹس پہاڑیاں

خطۂ جنت نظیر : نوجوانوں کے لئے بھی "نظر و خبر" کا مقام جس پر ہمارے قومی تعلیمی کمیشن نے خاص زور دیا ہے

نیا پل : دونو میں تعمیر و ترقی کی تیز رفتار مہم کی علامت

کاغان کی وادیٔ بہاریں

مشہد بالا کوٹ

وہ وادیٔ خونیں بہار جسے سید احمد شہید بریلوی رح اور شاہ اسماعیل شہید رح جیسے مجاھدین اعظم کی آخری آرام گاہ ہونے کا شرف حاصل ہے

۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء میں اس نے مظفر خاں والیٔ ملتان پر حملہ کر دیا۔ جس نے بڑی پامردی سے ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۸ء تک مقابلہ کیا۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد بالآخر ملتان پر سکھوں کا قبضہ ہو گیا۔

اسی زمانہ میں شکست خوردہ مرہٹوں، روہیلوں اور پٹھانوں نے مل جل کر ایک بے قاعدہ فوج بنائی۔ ان کے سردار چیتو، واصل، اور کریم تھے۔ ایک اور سردار امباجی مرہٹہ بھی تھا۔ یہ لوگ تاریخ میں 'پنڈاروں' کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ انگریزوں نے انہیں غارتگر لٹیروں کی ایک ٹولی قرار دیا۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی کرنل میڈوز ٹیلر نے کہیں کہیں ان کی اصل حیثیت کو بے نقاب کیا ہے۔ نیز ناگپور کے ریکارڈ آفس میں 'پنڈاروں' اور 'ٹھگوں' کے مقدمات سے متعلق جو فائلیں ہیں ان کے بارے میں عجیب و غریب انکشافات کرتی ہیں۔ جس طرح جاگیرداری اور زمینداری کے خاتمے پر بے عمل اور خوگر عیش جاگیردار، اقتصادی بدحالی کے طفیل ڈکیتی اور رہزنی کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں کہ بدلے ہوئے حالات سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے اسی طرح سپاہی پیشہ افراد عساکر و افواج سے بے دخلی کے بعد اقتصادی تباہی کا شکار ہو کر مرنے مارنے سے نہیں گھبراتے۔ اور اگر ان میں تھوڑی بہت تنظیم بھی پیدا ہو جائے تو حکمرانوں کے اقتدار کی راہ میں سب سے بڑا روڑا ثابت ہوتے ہیں۔ 'پنڈارے'، ایسے ہی فوجیوں کی ایک جماعت تھی یہ جماعت کچھ تو اس وجہ سے منظم نہ ہو سکی کہ بگڑے ہوئے معاشرے میں ہر شخص فلاں ابن فلاں تھا اور ہر شخص اپنا حکم چلانا چاہتا تھا اور کچھ اس وجہ سے کہ ان کے درمیان کوئی بیدار مغز شخصیت نہ تھی جو انھیں قابو میں رکھتی۔ چیتو کی زندگی میں یہ جمعیت پراگندہ نہ ہو سکی لیکن شومیٔ تقدیر کہ تھوڑے ہی عرصے میں آسیر گڈھ کے جنگلوں میں ایک شیر نے چیتو، کو پھاڑ کھایا۔ اور ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء تک پنڈاروں کا مکمل استیصال ہو گیا۔

مرہٹوں اور روہیلوں کو تباہ کرنے کے بعد انگریزوں نے ان کے بچے کھچے سپاہیوں پر اعتماد نہ کرتے ہوئے اور ان کا زور توڑنے کے لئے انھیں فوجی خدمات نہ سونپیں اور یہ طبقہ فاقہ کشی کی نوبت کو پہنچ گیا تھا۔ اور اس طرح ایک مشترک مقصد اس تنظیم کا سبب بنا۔ چیتو اپنے آپ کو سندھیا راجہ کا جرنیل کہتا تھا۔ پنڈاروں کا اصل مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کو انگریزی اقتدار سے نجات دلائی جائے۔

اس مقصد کے حصول کے لئے چیتو نے اندرون ملک ریاستوں اور رجواڑوں کو بھی اپنا شریک بنانے کی کوشش کی اور باقاعدہ ایک منصوبہ تیار کیا۔ لیکن جو طریقہ کار اختیار کیا وہ انتہائی نامناسب تھا۔ اس کا خیال تھا کہ لوٹ مار اور غارتگری سے انگریز ملکی دولت اور رسد سے محروم رہیں گے۔ اس لئے اس نے وسطی ہند اور دکن کے شمالی اضلاع میں تاخت و تاراج شروع کر دی۔ اس طرح یہ فائدہ تو ضرور ہوا کہ انگریزوں کی بے شمار چوکیاں تباہ ہو گئیں اور نظم و نسق کی راہ میں مشکلات بڑھ گئیں لیکن 'پنڈاروں' کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ان کی غارتگری نے انھیں اہل ملک کی ہمدردی سے محروم کر دیا۔ اور وہ ان سے خائف اور بدظن ہو کر ان کے دشمن ہو گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ 'پنڈارے'، بہت جلد تباہ کر دیئے گئے۔ کریم نے ضلع بستی میں جاگیر کے عوض انگریزوں کی اطاعت قبول کر لی اور واصل خودکشی کر کے مر گیا۔ یہ عجیب افراتفری کا دور تھا۔ پورے ہندوستان میں نظم و نسق مفلوج ہو چکا تھا۔ بگڑے ہوئے حالات اور غیر یقینی مستقبل نے عدم اعتمادی کی ایک ایسی فضا پیدا کر دی جس میں ہر شخص جائز و ناجائز طریقوں سے دولت سمیٹنے پر تل گیا۔ ایسی ہی مذموم کوششیں اجتماعیت اختیار کر کے 'ٹھگی' قسم کی تنظیموں کا باعث بنیں۔ اور امیر علی ٹھگ جیسے افسانوی کردار منظر عام پر آئے جنھوں نے اپنی خفیہ جماعتوں کی وجہ سے قریب قریب پورے وسطی ہند اور دکن میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ اس تنظیم کو سیاست سے دور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔ ٹھگوں نے ملکی طاقت کو زبردست نقصان پہنچایا۔ انگریزوں نے بمشکل تمام اس لعنت کو ختم کیا اور اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستانیوں پر یہ ان کا بڑا احسان ہے حالانکہ اس کا سبب خود ان کا اپنا اقتدار تھا۔

اودھ میں ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء میں سعادت علی خاں کا انتقال ہوا۔ اب انگریزوں نے غازی الدین حیدر کو مسند نشین وزارت کیا اور سلطنت دلّی کی مرکزیت پر ضرب لگانے کے لئے اسے اکسایا کہ نیابت کا جوا اتار پھینکے اور اپنی خود مختار بادشاہت کا اعلان کر دے۔ دلّی سے اہل اودھ کی دیرینہ رقابت بھی انجام کار رنگ لائے بغیر نہ رہی اور ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۸ء میں غازی الدین حیدر نے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا ؎

پئے سال ہمایونِ جلوسش
بگو تاریخ کہ "ظل اللہ گردید"
۱۲۳۴ھ

معتمد الدولہ وزیر ہوئے ؎

گردید وزیرِ اعظمش ضغیم جنگ
کو است بمضمار فراست فارس
تاریخ سعید کرد تاریخ تحریر
'شہ اسکندر وزیر ارسطا طالس'

۱۲۳۴ھ

مگر یہ ایسے سکندر وارسطو تھے کہ جہانبانی اور فراست سے دور کا لگاؤ بھی نہ تھا۔ لقب شاہی تسلیم کرنے کے معاوضہ میں انگریزوں کی بن آئی اور انہوں نے بادشاہ ماننے سے پہلے سعادت علی خاں کی محنت سے جمع کی ہوئی دو کروڑ کی رقم جس کی فراہمی میں سعادت علی خاں 'کنجوس' بھی کہلوائے، ہتھیالی۔ اور سکندر وارسطو کو ذرا تکلف نہ ہوا۔ غازی الدین حیدر کا نیابت دلی سے آزاد ہونا وہ سنگ میل ہے جہاں سے دلی اور لکھنؤ کے معاشرے بین طور پر اپنی اپنی راہیں علیحدہ علیحدہ اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ اختلاف عقائد، ثقافت، شعروادب، آداب معاشرت اور رسوم ورواج ہر جگہ پر نمایاں ہے۔ اہل لکھنؤ دہلوی روایات سے منحرف اور دہلویت کا مذاق اڑانے لگے اور اس میں یہاں تک غلو برتا گیا کہ دلی کی خوبیوں سے صرف اس لئے احتراز کیا کہ وہ دہلوی تھیں۔ شعروادب میں اس کے نمایاں نقوش اس بات کے بھی غماز ہیں کہ مقاصد اور راہیں اس حد تک جدا ہو چکی تھیں کہ ایک دوسرے سے کوئی ہمدردی باقی نہ رہی بلکہ ایک پر کوئی افتاد پڑتی تو دوسرا خوش ہوتا۔

شاہی کی خوشی میں غازی الدین حیدر نے 'حاتم دوراں' بن کر خوب گھر لٹایا اور کمپنی اور اس کے اہلکاروں کے گھر بھرتے رہے۔ دولت کی فراوانی اور عوام کی عیش پرستی نے دل کھول کے جشن منایا۔ معاشرے اور تمدن کی رہی سہی دہلوی روایات سے بھی نجات ملی۔ اس معاشرے میں مفکر طبقہ کے نقیبان انقلاب بھی جنہیں شعراء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے شاذ ہی یہ سوچ سکے کہ ؎

ہندوستاں میں دولت وحشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی
(مصحفی)

ــــــ ورنہ عموماً الفاظ کے طوطا مینا بناتے رہے۔ شاعرانہ چٹکلوں، ہجو و قصیدہ اور معاملہ بندی میں منہمک رہے۔ نبض دوراں ٹٹولنا ان انگلیوں کے بس کا روگ نہ تھا جو زلف وکاکل سے کھیلنے کی خوگر ہو چکی تھیں۔ حسن کی دعوت نظارہ نے اودھ کو ایسا مسحور کیا کہ تقدیر کی بدلی ہوئی نگاہوں کو کوئی نہ دیکھ سکا۔ ہر طرف رنگ رلیوں اور عیش ونشاط کا دور دورہ تھا اور انگریز اپنے مقاصد حکمرانی کی خاطر اس رجحان کو اور ہوا دے رہے تھے تاکہ تدبر کی رہی سہی رمق بھی خوابیدگیٔ نشاط سے سر نہ اٹھا سکے۔

اب اودھ انگریزوں کی مٹھی میں تھا۔ اس لئے انگریزوں نے اطمینان سے پنجاب میں رنجیت سنگھ کو اکسایا اور اس نے مزید ہاتھ پیر پھیلائے۔ ۱۲۳۵ھ/۱۸۱۹ء میں رنجیت سنگھ نے وہاں کے افغان والیوں کو بے دخل کر کے کشمیر پر اپنا قبضہ کر لیا۔ نیز دلی کے مغربی علاقوں تک ہاتھ صاف کیا۔

دلی ہر طرف سے ناامید ہو گئی۔ اور ان حالات کی بنا پر جب اقتصادی بدحالی اور عام ہوئی تو اہل کمال کی ایک بڑی تعداد افلاس اور فاقہ کشی کا شکار ہوئی۔ طبقۂ شعراء کے وہ افراد جو صرف داد ودہش پر زندہ تھے بری طرح متاثر ہوئے۔ بڑے بڑے دلی پرست اپنا بوریا بستر سنبھال کر پہلے ہی ہجرت کر چکے تھے۔ جو باقی بچے وہ بھی موقع پاتے ہی دوسرے آستانوں کی طرف رجوع ہوئے جن میں اتنا مقدور نہ تھا وہ تقدیر کا ماتم کرنے کے لئے وہیں رہ گئے۔ دلی اور نواح دلی میں کہرام مچ گیا۔ آئے دن کے انقلابات اور سیاسی انتشار نے ایسی معاشی بدحالی کو جنم دیا کہ نظیر (م۔ ۱۸۳۰ء) جیسے قہقہہ پرداز انِ چمن بھی یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ ؎

کوڑی کے سب جہان میں نقش ونگین ہیں
کوڑی نہیں تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

بقول رسکن کے سوسائٹی میں تقسیم زر کی مثال ایسی ہی ہے جیسے رگوں میں خون ــــ جسم کے جس حصہ کو خون نہ ملے وہ ہر اعتبار سے مفلوج ہو جاتا ہے۔

ــــ اور تجربہ، نظیر سے بھی یہی کہلواتا ہے کہ ؎

جب مفلسی ہوئی تو شرافت کہاں رہی؟
وہ قدر ذات کی وہ نجابت کہاں رہی؟
کپڑے پھٹے تو لوگوں میں عزت کہاں رہی؟
تعظیم اور تواضع کی بابت کہاں رہی؟
مجلس کی جوتیوں پہ بٹھاتی ہے مفلسی

دنیا میں لے کے شاہ سے اے یارو تا فقیر
خالق نہ مفلسی میں کسی کو کرے اسیر
اشراف کو بناتی ہے اک آن میں حقیر
کیا کیا میں مفلسی کی خرابی کہوں نظیر
وہ جانے جس کے دل کو جلاتی ہے مفلسی

بے زری نے زر کی اہمیت کا شدید احساس پیدا کر دیا تھا ؎

دنیا میں کون ہے جو نہیں مبتلائے زر
جتنے ہیں سب کے دل میں بھری ہے ہوائے زر
آنکھوں میں دل میں جان میں سینہ میں جائے زر
ہم کو بھی کچھ تلاش نہیں ہے سوائے زر
جو ہے سو ہو رہا ہے سدا مبتلائے زر
ہر اک یہی پکارے ہے دن رات ہائے زر

کتنے تو زر کو نقش و طلسمات کہتے ہیں
اور کتنے زر کو کشف و کرامات کہتے ہیں
کتنے خدا کی عین عنایات کہتے ہیں
کتنے اسی کو قاضیٔ حاجات کہتے ہیں
جو ہے سو ہو رہا ہے سدا مبتلائے زر
ہر ایک یہی پکارے ہے دن رات ہائے زر

غرضیکہ یہ اقتصادی بدحالی ان سیاسی انقلابات کا لازمی نتیجہ تھی جن کی تباہ کاری نے بستیوں کو ویران کر دیا تھا اور بہاروں کو خزاں میں بدل دیا تھا۔ قہقہے، آہ و فریاد میں بدلے اور نغمے نوحے بن گئے۔ دولت کی غیر مساوی تقسیم نے اخلاقی قدروں پر کاری ضرب لگائی۔ معیار بدل گئے۔ اہل ہنر کا کوئی قدردان نہ رہا۔

نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ؎

جو ہیں نجیب نسب کے وہ بندے چیلے ہیں
کمینے اپنی بڑی ذات کے نوسیلے ہیں
جو باز شکرے ہیں پاپڑ کھڑے وہ بیلے ہیں
لگھڑ تو مر گئے الو شکار کھیلے ہیں
غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشا ہے
(منتخب نظیر مطبوعہ مطبع حیدری بمبئی ۱۳۰۸ھ)

ایک یہ وقت بھی تھا کہ ؎

وہ عظیم الشان مکاں دیتی تھیں جن کی رفعتیں
ہنس کے طاق آسماں کو طاق ابرو سے جواب
ان میں تھے وہ صاحب ثروت جنہیں کہتی تھی خلق
کیقباد و قیصر و کیخسرو و افراسیاب
مہر وش، بہرام صولت، بدر قدر و چرخ رخش
مشتری ہمت ثریا بارگہ، کیواں جناب

لیکن انقلاب آیا تو یہ حال ہو گیا کہ ؎

یا تو وہ ہنگامۂ تنشیط تھا یا دفعتاً
کر دیا ایسا کچھ اس دور فلک نے انقلاب
وہ تو سب جاتے رہے دم میں حباب آسا مگر
رہ گئے عبرت زدہ وہ قصر و ویران خراب
خواب کہئے اس تماشے کو نظیر اب یا خیال
کچھ کہا جاتا نہیں واللہ اعلم بالصواب
(کلیات نظیر)

اسی زمانے میں سکھوں کے حوصلے اتنے بڑھے کہ انہوں نے شمالی ہند اور دوآبے میں بھی اپنی چیرہ دستیاں شروع کیں۔ افاغنہ کا زور ٹوٹ چکا تھا اس لئے انگریزوں نے اب سکھوں کی بیخ کنی کو ضروری سمجھا تاکہ ان کی بڑھتی ہوئی طاقت خود انگریزی اقتدار کی راہ میں خطرہ نہ بن سکے۔ ساتھ ہی مسلمانوں کی رہی سہی طاقت کا خاتمہ بھی مقصود تھا اس لئے خود نہ الجھے بلکہ مسلمانوں کو سکھوں سے بھڑا دیا۔ شمالی ہند اور دوآبہ کے مسلمانوں نے سید احمد شہیدؒ بریلوی کی تحریک پر سکھوں کے خلاف جہاد کر دیا۔ سیدؒ صاحب کا مقصد دراصل یہ تھا کہ اس طرح مسلمانوں کو منظم کر کے پہلے سکھوں سے نبٹیں اور پھر انگریزوں کی خبر لی جائے۔ اور انگریز

اس تحریک کی پشت پناہی کر رہے تھے صرف اس لئے کہ اس طرح ملکی طاقت آپس میں ٹکرا کر تباہ ہو جائیں گی اور جو باقی بچے گا اسے وہ بآسانی دبالیں گے۔

سیّد صاحب نومبر ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۶ء میں بریلی میں پیدا ہوئے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ عسکری تنظیم کے بغیر مسلمان اپنا کھویا ہوا اقتدار کبھی نہ حاصل کرسکیں گے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ نے احیائے دین کے جو بیج بوئے تھے وہ آہستہ آہستہ برگ و بار پیدا کر رہے تھے۔ ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۸ء میں سیّد صاحب، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں دلی پہنچے اور وہاں ان سے سلسلۂ نقشبندیہ کی برکتیں حاصل کرتے رہے۔ دو سال بعد ۱۲۲۴ھ/۱۸۱۰ء میں امیر خاں روہیلہ کے لشکر میں شامل ہو گئے جو ہلکر کے حلیف کی حیثیت سے راجپوتانے میں مصروفِ جدال تھا۔ ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۶ء میں سیّد صاحب دلّی آئے جہاں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے ایما پر مولانا عبدالحیؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ بھی سیّد صاحب کے مرید ہو گئے۔ جن کی جادو بیانی نے بہت جلد اطراف و نواح کے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنا حلقہ بگوش کرلیا۔ اس زمانے میں ہندو اثرات دین میں اس حد تک دخیل ہو گئے تھے کہ بدعتیں اور فسق و فجور دین کا جزو سمجھے جانے لگے تھے۔ پیر پرستی اور مزار پرستی عام تھی۔ اس اعتبار سے اودھ کی حالت زیادہ خراب تھی لیکن دکن اور نواحِ دہلی بھی اس سے محفوظ نہ تھے۔ شادی اور غمی کی ہندوانہ رسوم اور ٹونے ٹوٹکوں کی مشرکانہ روایات مسلمانوں میں عام ہو رہی تھیں۔ ہندو سماج کے اثر سے بیوہ کا نکاح بھی مسلمانوں میں بہت بڑا عیب سمجھا جانے لگا تھا۔ سیّد صاحب نے اپنے طریقۂ محمدیہ کی اشاعت سے ایسی باتوں کی شدید مخالفت کی۔ خود اپنی ایک بیوہ خالہ کا نکاح کرواکے مثال قائم کی۔ انہوں نے اور ان کے رفقاء نے دوآبہ کے علاقے کے کئی سفر کئے اور اس طرح کی بدعات کی حتی المقدور بیخ کنی کی۔

مولانا ولایت علی عظیم آبادی نے جنہوں نے امارت ترک کرکے سید صاحب کی رفاقت پر کمر باندھی تھی اسی زمانہ میں اپنا قطعۂ "ردِ شرک" نظم کیا ؎

فرمود رسول آشکارا   من نیز برادرم شمارا
من مشکل خود نمی کشائم   بر غیر مرا کجاست مارا
طاقت بنود سوائے ایزد   درویش و فقیر و اولیا را
اے مومن پاک اے مسلماں   می خواستی گر رہ رضا را
قرآن و حدیث را بہ سر نہ   بگذار کلام ماسوا را

(بحوالۂ تاریخ مسلمانانِ پاک و ہند ص ۳۰۸)

لکھنؤ جو غازی الدین حیدر کے دور میں عشرت سامانیوں اور ہندوانہ رسم و رواج کا گڑھ بنا ہوا تھا وہاں بھی سید صاحب کے رفقاء گئے اور ہزارہا عوام نے ان کے ہاتھ پر بدعات سے توبہ کی۔ اس زمانے میں فرنگی استیلا سے سفرِ حج کے لئے سمندر کی راہ مخدوش تھی اور عرب میں بدوؤں کی رہزنی اور غارتگری کا خطرہ تھا۔ اس لئے ہندوستانی مسلمانوں نے حج قریب قریب ترک کر دیا تھا۔ ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۰ء میں اس خوف کو دور کرنے کے لئے سیّد صاحب اور ان کے بے شمار رفقاء نے سفرِ حج کیا۔ اسی طرح سیّد صاحب نے جاگیرداری کے پروردہ حسب و نسب کے بت توڑے اور اسلامی اخوت اور مساوات کو عام کیا۔ ان مجاہدانہ سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ان کی اسلحہ بندی اور عسکری تنظیم کی تحریک جاری رہی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۳ء میں آپ دلّی واپس آئے۔ اسی سال حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا انتقال ہو گیا ؎

انتخاب نسخۂ دین مولوی عبدالعزیزؒ
بے عدیل و بے نظیر و بے ؟ و بے مثال
دستِ بیدادِ اجل سے بے سر و پا ہو گئے
فقر و دین، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل
۱۲۳۹ھ

(کلیاتِ مومن ص ۱۹۶ مطبوعہ نولکشور ۱۲۵۰ھ)

انہوں نے بدعات کی بیخ کنی میں اتنی شدت اختیار کی کہ بہت سے لوگ ان سے بدظن ہو گئے۔ تاہم صاحب "تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت" کے مطابق وہ وہابی نہیں تھے (ص ۲۸۹)۔ بہرحال غالباً شاہ عبدالعزیزؒ کے انتقال کے بعد کوئی ان کا رہنما نہ رہا۔ اس لئے کہ اسی کے بعد ان کا مجاہدانہ جوش بے لگام ہو گیا۔ سیّد صاحب کے اعلیٰ اخلاق اور رواداری نے اس تحریک کو بڑی تقویت پہنچائی۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ اس افراتفری میں اجتماعی تنظیم کی یہ کوشش انتہائی مستحسن تھی۔ ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء میں سکھوں کے قدم پشاور اور پنجاب میں مضبوط ہو چکے تھے، اور چند فرانسیسی افسروں

نے بھی سکھوں کا شریک ہو کر ان کے توپ خانے کو مضبوط کر دیا تھا، اسی زمانہ میں سکھوں کے استیلا اور چیرہ دستیوں سے مجبور ہو کر سیّد صاحب نے ان کے خلاف جہاد کا اعلان کیا۔ حلقہ بگوشوں کی ایک بڑی تعداد تھی جو سیّد صاحب کے اشارے پر جانیں قربان کرنے کے لئے تیار تھی۔ اس دورِ انتشار میں دل گرفتہ مسلمان اس نئی تحریک کو اپنی نجات و بہبود کا ذریعہ تصوّر کرتے تھے۔ یہاں تک کہ سیّد صاحب کو مہدیٔ موعود سمجھا جانے لگا تھا۔ مومنؔ جو دل سے سید صاحب کے مداح تھے اپنے قطعۂ جہادیہ میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں ؎

وہ کون امام جہان و جہانیاں احمدؔ

کہ محض مقتدیٔ سنت پیمبر ہے

زمیں کو مہرِ فلک سے نہ کیوں ہو دعوئے نور

کہ اس کا رایت اقبال سایہ گستر ہے

زبس کہ کام نہیں ہے اسے سوائے جہاد

جو کوئی اس سے مقابل ہے سو وہ کافر ہے

وہ شاہ مملکت دیں کہ جس کا سال خروج

"امامِ برحقِ مہدی نشاں علی فرہے" ص۱۹۶

۱۲۴۲ھ

سید صاحب کی کوئی باقاعدہ فوج نہ تھی مگر مجاہدین میں جوش اور ولولہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔ سکھوں سے پہلا معرکہ ۲۱ر دسمبر ۱۸۲۶ء (۱۲۴۲ھ) کو پیش آیا۔ مسلمان ظفریاب ہوئے۔ اور سیّد احمد صاحب کی شہرت اور مقبولیت آگ کی طرح پھیل گئی۔ حاسدوں کے کلیجے پر سانپ لوٹ گئے۔ جاگیرداری عصبیت میں خود مسلمان عمائد کی ایک بڑی تعداد جو اپنی چودھراہٹ کو ختم ہوتا نہ دیکھ سکتی تھی، سیّد صاحب کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئی۔ مولوی فضلِ حق خیرآبادی جیسے بزرگ بھی جو اس سے پہلے شاہ اسمٰعیل کی تقریروں پر پابندی لگوانے کی کوشش کر چکے تھے۔ اس فتح پر اور برافروختہ ہوئے۔ عقائد اور اعتقادات کی چھوٹے موٹے اختلافات پر کفر کے فتوے صادر کرنا معمولی سی بات ہو گئی۔ یہ اختلافات اتنے بڑھ چکے تھے کہ غالبؔ جیسے شعرا بھی جو نقیبِ انقلاب بننے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ امتناع لنظیر،

خاتم النبین جیسے مباحثوں میں الجھ گئے۔ مومنؔ جنہوں نے اس جہاد کے باقاعدہ آغاز پر یوں تاریخ کہی تھی کہ ؎

چو سید احمد امام زماں و اہل زماں

کرے ملاحدہ بے دین سے ارادۂ جنگ

تو کیوں نہ صفحۂ عالم پہ لکھے سالِ وغا

"خروج مہدی کفار سوز کلک تفنگ"

۱۲۴۲ھ

مومنؔ انہیں مناقشوں سے بیزار ہو کر سیّد صاحب کی حمایت میں کہتے ہیں ؎

یہ چند منافق سراپا بدعت

ہے کفر و ضلال و فسق جن کی طینت

بتلاتے ہیں بدعتی امام حق کو

گویا کہ جہاد ہے خلاف سنت ص۲۰۷

شمالی ہند کے علما اس طرح انحطاط کا شکار تھے۔ لیکن ملک کے دوسرے گوشے بھی اس وبا سے محفوظ نہ تھے بعض جگہوں کے بڑے بڑے سردار سیّد صاحب کی رفاقت کے ظاہری اقرار کے باوجود درپردہ سکھوں سے مل گئے یہاں بھی بعض عناصر کا ہاتھ تھا۔ رنجیت سنگھ نے انگریزوں کا حربہ استعمال کیا اور آپس کی رقابتوں سے فائدہ اٹھا کر خود افغان قبائل کو ایک دوسرے سے بھڑا دیا مقامی لوگوں سے مدد کی امید نہ رہی پھر بھی سیّد صاحب ثابت قدمی سے جمے رہے۔ ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ء سے ۱۲۴۵ھ/۱۸۲۹ء تک بہت سے معرکے پیش آئے۔ خود غرضیوں اور نفسی نفسی کی وجہ سے سیّد صاحب کو خاصی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اودھ کے لوگ ۔ علی الخصوص اہل لکھنؤ سیّد صاحب کی پریشانیوں پر بڑے خوش ہوتے تھے۔ ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ء میں لکھنؤ میں غازی الدین حیدر کا انتقال ہوا ؎

از وفات جناب شاہِ زمن

گوئیا عالمے ہلاک شدہ

گشت تاریخ مصرع اوستاد

"اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

۱۲۴۳ھ

(ناسخؔ)

اب نصیر الدین محمد علی شاہ بادشاہ ہوئے۔ انہیں بادشاہ بنانے کے صلہ میں انگریزوں نے اودھ کی افواج اور محاصل پر بھی قبضہ کر لیا۔ بساطِ ہند پر شطرنج کے دو بادشاہ ایک دوسرے کے مقابل موجود تھے اور انگریز اپنی سیاسی مہرہ بازیوں سے دل بہلا رہے تھے۔ تاہم عوام کی بیداری سے غافل نہ تھے۔

دکن بھی عقائد کے اختلافات کی بنا پر تحریکِ جہاد کا حامی نہ تھا۔ ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۷ء میں نظامِ دکن آصف جاہ کا انتقال ہوا ؎

دلا نواب آصف جاہ مغفور
ازیں دارِ فنا شد ہائے افسوس
ندا آمد پئے تاریخ از غیب
"دکن تاریک شد" اے وائے افسوس

۱۲۴۴ھ

اودھ اور دکن کے عوام انگریزی لوٹ کھسوٹ سے بیزار ہو چکے تھے۔ وہاں بھی تحریکِ جہاد کے حامی نظر آنے لگے۔ اور یہ احساس عام ہوا کہ یہ تحریک دراصل تحریکِ آزادی ہے۔ اس کے شواہد اس زمانہ کی دونوں جگہ کی شاعری میں بھی جستہ جستہ مل جاتے ہیں۔ تاہم مخالفین کی تعداد پھر بھی زیادہ تھی۔ شعرائے دلّی میں مومن نے اس تحریک میں نمایاں حصّہ لیا۔ اس سلسلہ میں ان کی مثنوی جہاد کے چند اشعار درج ذیل ہیں ؎

زہے سید احمد قبولِ خدا — سرِ آستانِ رسولِ خدا
نکو گوہری کا نہ پوچھو شرف — علیؓ و حسینؓ و حسنؓ کا خلف
رہے حشر تک زندہ وہ نیک ذات — ہے کفار کی موت اس کی حیات
خدا نے مجاہد بنایا اسے — سرِ قتلِ کفار لایا اسے
ہوا مجتمع لشکرِ اسلام کا — اگر ہو سکے وقت ہے کام کا
امامِ زمانہ کی یاری کرو — خدا کے لئے جاں نثاری کرو
عجب وقت ہے یہ جو ہمت کرو — حیاتِ ابد ہے گر اس دم مرو

انہیں اپنے پیچھے رہ جانے کا افسوس ہے ؎

کرم کر نکال اب یہاں سے مجھے — ملادے امامِ زماں سے مجھے
یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں — مری جاں فدا ہو تری راہ میں

میں گنجِ شہیداں میں مسرور ہوں
اسی فوج کے ساتھ محشور ہوں

اسی تحریکِ جہاد کے طفیل بے شمار نظمیں اور مثنویاں لکھی گئیں۔ جنھوں نے مسلمانوں میں حریت کی ایک نئی روح پھونک دی یہی وہ تحریک تھی جس کے اثر سے ۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۷ء میں ایک مرتبہ پھر حصولِ آزادی کے لئے جان کی بازی لگائی گئی۔ بہرحال مولوی لیاقت اللہ کے ذیل کے چند اشعار بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہیں ؎

واسطے دیں کے لڑنا نہ پئے طمعِ بلاد
اہلِ اسلام اسے شرع میں کہتے ہیں جہاد
فرض ہے تم پہ مسلمانو، جہادِ کفار
اس کا سامان کرو جلد اگر ہو دیں دار
دینِ اسلام بہت سست ہوا جاتا ہے
غلبۂ کفر سے اسلام مٹا جاتا ہے
دوستو جب تمہیں مرنا ہی مقدر ٹھہرا
پھر تو بہتر ہے کہ جاں دیجئے در راہِ خدا
سیکڑوں جنگ میں جاتے ہیں تو پھر آتے ہیں
سیکڑوں گھر میں بھی رہتے ہیں تو مر جاتے ہیں

علماء کو دعوتِ جہد و عمل کی اس طرح تلقین کی ہے: ؎

حضرتِ مولوی اب طاق میں رکھ دیجیے کتاب
لیجئے تلوار کو میداں کو چل دیجیے شتاب
وقت جانبازی ہے تقریروں کو اب بس چھانٹو
غیرِ شمشیر کسی سمت کو دل مت بانٹو

آخر میں یہ دعا ہے ؎

اے خداوندِ سماوات و زمین ربِّ عباد
اب مسلمانوں کو دے جلد سے توفیقِ جہاد
ہند کو اس طرح اسلام سے بھر دے اے شاہ
کہ نہ آوے کوئی آواز جز اللہ اللہ

مگر مسلمانوں نے اس تحریک سے پوری ہمدردی نہ برتی اور انجامِ کار سیّد صاحب کی انقلابی کوششوں پر پانی پھر گیا۔ اسی زمانہ میں سیّد صاحب نے اپنی دیرینہ سختی کے ساتھ لوگوں کی دختر کشی کی رسم کو مردود قرار دیا اور رہے سہے لوگ بھی ان سے باغی ہو گئے۔ ان کے بے شمار رفقار

باقی صـ ۱۲۱ پر

آفتاب جاوداں تاب

زندگی سرتاسر عمل ہے۔ اس میں ہر وقت انقلاب ہے۔ گردشِ ارض کی طرح حیاتِ انسانی بھی ہمہ وقت تغیر و تبدل کے عمل سے گزرتی رہتی ہے۔ آج دنیا میں جو انقلابات آئے ہیں کیا اب سے بیس برس پہلے کوئی ان کی پیشنگوئی بھی کر سکتا تھا؟ آج انسان کائنات میں چھلانگ لگا چکا ہے۔

ذی فہم اور صاحب بصیرت لوگوں کا فرض ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اُصولوں کو سمجھیں اور ان کو زندگی میں اس طرح برتیں کہ ایک فعّال اور روشن خیال معاشرہ وجود میں آسکے، ایسا معاشرہ جو دورِ حاضر کے تقاضوں کا چیلنج قبول کر سکے۔ جو لوگ اس بات کو پا گئے وہ فلاح و ترقی کی راہوں پر بہت آگے بڑھ جائیں گے مگر جو ایسا نہ کر سکے جن کی نگاہیں مستقبل پر نہیں ہیں، وہ جو اپنے ذہنوں سے کام نہیں لیتے، اُن کی حالت کبھی نہ بدل سکے گی۔ قانونِ قدرت اٹل ہے۔

پاکستان اس لئے وجود میں آیا تھا کہ ہم اپنی اسلامی انفرادیت کو ہاتھ سے دیئے بغیر زندگی گذار سکیں اور زمانہ کے ساتھ بھی چل سکیں۔ پس اگر مسلمانوں نے اس دور کا ساتھ دینے سے انکار کیا تو وہ ایک بار پھر غلام ہو جائیں گے۔ ہم نے دو سو سال کی غلامی کے بعد آزادی حاصل کی ہے، لیکن اگر موجودہ عہد کی غلامی کا شکار ہو گئے تو پھر اس سے نجات ممکن نہیں ہے۔

ہزاروں لوگ قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کے فلسفے سے متاثر ہوتے ہیں اور اپنے ذہنوں کے مطابق مطلب لیتے ہیں۔ میں خود بھی آیاتِ قرآنی کے حسن و شوکت سے بے حد متاثر ہوں، قرآن کا فلسفہ انسان کے دل میں گہرا اُتر جاتا ہے، بلکہ سارا وجود ہی اس سے متاثر ہوتا ہے۔

حضورِ مقبولؐ نے ہمیں دو اہم سبق دیئے ہیں۔ وحدت اور اخوت۔ وحدتِ الٰہی کا تصور دوسرے انبیاء بھی تلقین کر چکے تھے جیسے حضرت عیسیٰؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت اسماعیلؑ اور خود حضورؐ نے فرمایا تھا کہ پہلے انبیاء جو تلقین کر چکے ہیں میں بھی اس کی تصدیق و تلقین کرتا ہوں۔ اخوت انسانی کا تصور وحدت الٰہی کے سرچشمہ سے ہی پھوٹتا ہے۔ کیونکہ اگر سب انسانوں کا خدا ایک ہے تو لازمی بات ہے کہ کل بنی نوع انسان ایک برادری بن جاتی ہے۔ اس لئے خدا کی نظر میں اور خود انسانوں کی نظر میں، ہم سب برابر ہیں۔ اس تلقین پر عمل کرنے سے اعلیٰ اخلاقی و روحانی اقدار پیدا ہو سکتی ہیں اور ہم میں سیرت کی پاکیزگی آسکتی ہے۔

ہم اس ملک کو اسی لئے وجود میں لائے تھے کہ اسلامی اُصولوں کا جذبہ بیدار ہو سکے۔ مگر افسوس کہ آدمی آدمی کے درمیان مساوات کے تصور پر عمل نہیں ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ممالک اسلام اس وقت کمزور اور یورپ بہت طاقتور ہے۔

حضورِ مقبولؐ بہت ہی خلیق و حلیم ہستی تھے۔ اکثر کفار ان پر ظلم بھی کرتے اور انہیں خدا کا رسُول ماننے سے انکار کرتے اور کہا کرتے کہ اگر تمہیں قربتِ الٰہی حاصل ہے تو معجزے کر کے دکھاؤ، پھر ہم ایمان لے آئیں گے۔ مگر حضورؐ ہمیشہ یہ فرماتے کہ میں تمہارے ہی جیسا ایک فانی انسان ہوں، فرق صرف یہ ہے کہ میں پیغام ربانی کا امین و رسول ہوں ــــ حضورؐ کی تعلیم یہ تھی کہ کوئی انسان کسی انسان کا غلام نہ رہے، صرف اصولوں کی غلامی کرے ــــ انہوں نے صدیوں پُرانی یہ روایت کہ انسان انسان کی پوجا کرے، بالکل ختم کر ڈالی۔

مختصر یہ کہ حضورؐ انسانِ کامل تھے اور ہمیں چاہیئے کہ ان کی زندگی کو، ان کے اسوۂ حیات کو، اپنے لئے رہنما بنائیں۔

ــــ فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں

★

کلامِ حق

تصنیف: روشن یزدانی
ترجمہ: عاصمہ حسین

کوی رو‌شن یزدانی کی منظوم سیرتِ نبویؐ "خاتم النبیین" کو گذشتہ سال آدمجی ادبی انعام (برائے بنگلا) کا مستحق قرار دیا گیا تھا۔ اس طویل نظم کا یہ اقتباس جو نزولِ وحی کی کیفیت پر محیط اور جناب محمد حسین کے انگریزی ترجمہ پر مبنی ہے، یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ (ادارہ)

حق جلوہ گر ز طرزِ بیانِ محمدؐ است
آرے کلامِ حق بہ زبانِ محمدؐ است
آئینہ دار پرتوِ مہر است آفتاب
شانِ حق آشکار ز شانِ محمدؐ است

غالب

دن یونہی گذرتے چلے گئے
دنیا کے لبھا لینے کے چلن
بڑھتے ہی گئے۔ بڑھتے ہی گئے
کتنی ہی حواس کی عشرتیں ہیں
ان سب کے تھے موقعے محمدؐ کو
لیکن نہ ہوئے تھے وہ پیدا
ان مادّی راحتوں کی خاطر
وہ اس دنیا میں آئے تھے
کسی اور بڑے مقصد کے لئے
اک مقصد ارفع اور اعلیٰ
کام انسانوں کی خدمت کے
کچھ اور بھی ان کو جاننا تھا
جو کچھ کہ وہ اب تک جانتے تھے
وہ ان کے لئے ناکافی تھا
کچھ اور بھی ان کو دیکھنا تھا
جو کچھ کہ اب تک دیکھا تھا
وہ تھوڑا، بالکل تھوڑا تھا

ان کو تو سبھی کچھ جاننا تھا
اور خود کو جاننا "میں کیا ہوں
وہ روح جو مجھ میں بولتی ہے"
یہ سب تھے محمدؐ کے دل میں
ہر وقت انہی کا دھیان انہیں
کوئی حد تھی نہ ایسے خیالوں کی
ہر وقت انہیں میں محو رہیں
دن رات وہی اک محویت
تنہائی سے دل کو رغبت ہے
کچھ اور بھی گہری فکر ان کی
جب جائیں کہیں تو ٹھہریں نہیں
گھر آئیں تو دل یونہی سرگرداں
سوئیں تو نیند نہیں آتی
کبھی غور اور فکر تمام نہ ہوں
اور ہر دم اک آواز آئے
آواز عجیب و غریب بہت
آتی ہے کہاں سے یہ؟ اور کیوں؟
کچھ ان کو نہیں ہے اس کی خبر
گمبھیر صدا ہے بڑی کوئی
بی بی نے یہی محسوس کیا
کچھ حال عجب ہے حضرتؐ کا
کوئی درد انوکھا دل میں ہے

دن رات وہی بے چینی ہے
اور دل کی کچھ ایسی حالت ہے
ہو جائے گا یہ پارہ پارہ
بی بی ہر وقت پریشاں ہے
کیا ہو گیا ان کو بات ہے کیا؟
وہ پیار سے ان کو پوچھتی ہیں:
"کہئے تو یہ کیسی کاوش ہے
کیا سوچتے ہیں کیوں چپ چپ ہیں"
وہ ہنس کے کہتے ہیں، بی بی
ہیں سوچنے کی باتیں کتنی
ہیں میرے دل میں بند سبھی
پر کھولنے کو کنجی ہی نہیں
کچھ ڈر سا ہے دل میں جانے کیوں
کچھ سوچنے پر مجبور رہوں میں
گویا یکسر مسحور رہوں میں
کوئی رات کا بھٹکا راہی ہوا
جیسے ہر جانب آوارہ
اس طرح کئی دن بیت گئے
پھر ہو گئیں باتیں کچھ روشن
شب بیت گئی اور صبح ہوئی
شک دور ہوئے دھیرے دھیرے
اور بھول بھٹک بھی ختم ہوئی

ہر روز تفکّر بڑھتا گیا
اک سحر کا گویا عالم تھا!
چلتے ہوئے خواب ہی خواب دیکھیں
سوتے میں اٹھ کر چلتے پھریں
دل نے کئی رشتے اَن دیکھے
پیدا کئے۔ تنہائی سے لگن!
تنہائی سے دل کا بوجھ اترے
جب آنکھیں بند ہوں اک دنیا
اَن دیکھی صاف نظر آئے
تب غارِ حرا کو جانے لگے
اک فکر میں پیہم کھوئے ہوئے
اسی طور سے ان پر دِن بیتے
کبھی گھر کو خیالوں میں گم سُم
بی بی کے پاس پلٹ آنا
وہ دل میں یہی سمجھتی ہے
ہنگامِ نزدِلِ وحیُ خدا
اب آ پہنچا۔ اب آ پہنچا
کہتی ہیں کہ دل مضبوط رکھو
اور حوصلہ خوب بلند رہے
اور غور کریں یہ کون ہے جو
نے پُر اسرار بجاتا ہے
کہتیں کہ یہ دُھن۔ یہ غیبی دُھن
دل کو ہر چیز کے بندھن سے
آخر کو رہا کر ڈالے گی
ہے شاد خدیجہ، شاد بہت
ہمت ہے بڑی بلند اس کی
پھولی نہ سمائے خوشیوں سے
جب شوہر فکر کو جاتا ہے
وہ کھانا بنا کر دیتی ہے
یوں بیتتے ہیں کچھ اور بھی دن
بی بی بنت سوچ میں اُن کی گم

اور بیٹھی دنوں کو گنتی ہے
رکھتی ہے کھجوریں سینت کے وہ
جب آئیں کھجوریں پیش کرے
بڑے چاؤ سے خدمت کرتی ہے
جب پھر جانے کا وقت آئے
وہ نان پکا کر دیتی ہے
سب کھانے پینے کا سامان
یہ کہتی ہوئی رخصت کرتی
"جاؤ۔ تم پر ہو رحمتِ حق"
یونہی اُن کا وقت گذرتا ہے
یونہی دن اور رات محمدؐ کے
بالآخر وہ وقت آ ہی گیا
دل دھیرے دھیرے کھلنے لگا
وقت آیا کہ ہو رویا پورا
وہ وقت آیا جب سنیں سدا
وہ دل کے تاروں کا نغمہ
ہو دن یا رات، جگے، سوتے،
کھیتوں میں تنِ تنہا گھومیں
نت سُنیں کسی کو بلاتے ہوئے
دھرتی ہو کہ پیڑ ہوں ہر ہر شے
ان ہی کو مخاطب کرتی ہوئی
"یا مرسلِ حق! یا مرسلِ حق
تجھ پہ ہو سلام احمدؐ! احمدؐ!"
رستے میں یکایک چلتے ہوئے
سُنتے ہیں پکارتے "یا احمدؐ!"
بس اس کے سوا کچھ اور نہیں
بھونچکا، پلٹ کر جب دیکھیں
کوئی بھی نہیں۔ بس سناٹا
بے جان سا ہر سو پھیلا ہوا
وہ ڈر سے گئے جلدی جلدی
گھر پاس خدیجہ کے آئے

وہ بولیں "صدا سے ڈرنا کیا
وہ تم کو بلائے تو بولو
گر نام پکارے تم بھی معاً
لبیک کہو۔ جو کچھ وہ کہے
سنتے جاؤ، سنتے جاؤ"
دل بڑھا بہت ان باتوں سے
اک تال پرانے میں جیسے
یکلخت نیا جل آجائے
پھر گذرے دن اور ماہ کئی
نئے تجربے نئے مشاہدے تھے
ان سب سے پائی دل نے جِلا
نئے خوابوں سے دل سرشار ہوا
کبھی غیبی آوازیں آئیں
کبھی کچھ اَن جانے جلووں کی
تابانی آنکھ کو چُندھیاتی
دِل جس سے مصفا ہو جاتا
وہ سوچتے ہیں ایسے جلوے
آئے ہیں کہاں سے حیرت زا

اک دن یہ تجلّی کیا آئی
دھرتی سے گردوں تک چھائی
یکلخت کوئی اس روشنی میں
اک پیکرِ نور نظر آیا
اور ان کو پکار کے یوں بولا
"اے احمدؐ! تم کو بشارت ہو
تم نبیؐ، حبیبِؐ خدا ہو تم
تم پر اللہ کی رحمت ہو!"

اس طرح امیدوں کی شمعیں
دھیرے دھیرے لَو دے اٹھیں
اک سال کے بعد آیا رمضاں

پھر لیکے پیامِ فکر و نظر
اس بار حرا میں ساتھ اُنکے
بی بی بھی گئیں وہ جانِ وفا
یہ کہتے ہوئے میں چاہتی ہوں
مجھ کو بھی ساتھ ہی لیتے چلیں،
جو آپ کریں وہ میں بھی کروں
ہر بات مجھے بھی سکھلا دیں"
وہ دونوں حرا میں ساتھ گئے
کیا سارا مہینہ وہیں بسر
دن رات تفکّر کرنے میں

اک روز جب آدھی رات گئے
آنحضرتؐ غار میں سے نکلے
اور اس کے آگے ٹھیر گئے
واں سامنے کوئی چیز نہ تھی
انسان نہ حیوان طائر بھی
نے نام و نشاں تک بستی کا
کیا جانیں کہاں خلاؤں سے
آواز اک کانوں میں آئی
وہ فوراً غار میں لوٹ آئے
اور کہی یہ بات خدیجہ سے
بولیں وہؓ "یہ صاف بشارت ہے
اپنے لئے فال مبارک ہے
جاؤ اور غور سے اس کو سنو
دیکھیں یہ صدا کیا کہتی ہے"
حضرتؐ اس جا پھر جا ٹھہرے
اور دیکھا ایک عجیب سماں
انوار کا ایک ہیولیٰ تھا
پاؤں تھے زمیں پر سر بالا
تا چرخِ معلّٰی پہنچا ہوا
چندھیا تے جلوؤں کا پیکر

از سر تا پا اک موجِ ضیا
اک ہاتھ تھا پورب اک اُتّر
اور دو دو ہے سے اُجلے جامے میں
وہ پیکرِ تاباں یوں بولا:
"یا حضرت تم پہ سلام سدا
حضرت کی طلب ہے ایسی جگہ
جہاں تنہائی کا عالم ہو"
پھر کتنے دنوں کے بعد انہیں
رستے میں یکایک دو پیکر
انوارِ تجلّی سر تا سر
گھر آتے ہوئے دو چار ہوئے
میکائل اِدھر جبریل اُدھر
تسلیم بجا لائے دونوں
اور جُھک جُھک کر آداب کئے
دونوں نے ادب سے تھام لیا
اور ان کا سینہ چاک کیا
کچھ چیز تھی جو باہر پھینکی
اور دل کو دھویا زمزم سے
مبہوت کھڑے تھے آنحضرتؐ
لیکن نہ ذرا بھی درد ہوا
دونوں نے دل کو سی بھی دیا
پھر بھی نہیں مطلق درد ہوا
پھر فرشِ زمیں پر مُنہ کے بل
حضرتؐ کو لٹا کر شانوں پر
کی مُہرِ نبوّت ثبت، جو تھی
اک "یارِ خاص" کی ملکیت
جو دیکھ لے اس کو ایک نظر
وہ راہِ راست کو پا جائے،
اس دل کی صفائی نے ان کو
ہر آلائش سے پاک کیا
جس سے وہ ہوا ہلکا پھلکا

تنزیلِ وحیٔ الٰہی کے
شایانِ شان کیا اُن کو
تھا شرحِ صدر، عمل ایسا
کئے جس نے تیز حواس اُنکے
ہر چیز کو ترت قبول کریں
سمجھیں اور جانیں پہچانیں
اور اس طرح نوعِ انساں کو
لے جائیں سیدھے رستے پر

ایک اور بھی سال یونہی گذرا
اور ماہ ربیع الاوّل میں
تنِ تنہا فکر میں کھوئے تھے
وہیں غارِ حرا میں آنحضرتؐ
تھی جب گئی آدھی رات گذر
یکلخت یہ خواب میں کیا دیکھا
جیسے کہ سحر کا عالم ہو
وہ اٹھے وضو کرنے کے لئے
اس غار سے باہر رکھا قدم
ناگاہ کسی نے، صلِّ علیٰ!
نام ان کا لیکے پکارا انہیں
وہ سر سے پا تک کانپ اُٹھے
دیکھا تو وہاں پر کوئی نہ تھا
پھر آئی "محمدؐ" ۔ وہی صدا
آنحضرتؐ نے مُڑ کر دیکھا
لیکن کچھ بھی نہ دکھائی دیا
پھر تیسری بار آئی وہ صدا
"اے احمد! اے محبوبِ خدا
تم پر اللہ کی رحمت ہو"!
تب یکدم پیکرِ نور و ضیا
ہوا سامنے اُن کے جلوہ نما
پیکر بھی، لباس بھی نورانی

باقی ص۱۱۰ پر

ہمارا رسم الخط

وقار عظیم

رسم الخط پر گفتگو کرنا ہمارے لئے کوئی نئی بات نہیں۔ ہم ڈیڑھ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر سوچ بچار اور بحث و تمحیص کر رہے ہیں اور اس ڈیڑھ سو برس کی طویل مدت میں اس مسئلے پر سوچنے اور گفتگو کرتے وقت ہمارا نقطۂ نظر بدلتا رہا ہے۔ گفتگو جس طرح کے سیاسی اور معاشرتی ماحول میں ہوئی ہے اس نے سوچنے اور گفتگو کرنے کے انداز میں فرق پیدا کیا ہے لیکن ہر حال میں گفتگو کرنے والوں نے کم از کم ایک بات کو ضرور پیش نظر اور ملحوظ رکھا ہے اور وہ یہ کہ جب ایک طرح کے رسم الخط کو دوسری طرح کے رسم الخط کے مقابلے میں فائق اور برتر ثابت کریں تو منطقی استدلال کو اپنا رہنما بنائیں اور جو شخص ایک رسم الخط کے حق میں کچھ کہہ رہا ہے اسے احمق یا دیوانہ نہ سمجھیں لیکن اردو کے مروجہ رسم الخط اور رومی رسم الخط کی لڑائی آج کل اس طرح نہیں لڑی جا رہی۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ اس مرتبہ اس گفتگو نے باقاعدہ لڑائی کا رنگ اختیار کر لیا ہے، اور دوسری یہ کہ اس لڑائی میں ایک رسم الخط کے حامی دوسرے رسم الخط کے حامی کو احمق سمجھنے پر اصرار کرتے ہیں۔ خصوصیت سے ان لوگوں کو جو مروجہ رسم الخط کے حق میں ہیں اور اسے چھوڑ کر رومن رسم الخط اختیار کرنے پر تیار نہیں ہیں قدامت پسند اور "جذباتی" کہا جاتا ہے یوں جیسے قدامت پسند اور جذباتی ہونا کوئی عیب کی بات ہے اور جو جذباتی ہے وہ منطقی فکر سے عاری اور بے بہرہ ہے۔ حالانکہ سچ پوچھئے تو ایسا نہیں۔ میرے نزدیک تو جذباتی اور منطقی ہونے میں لازمی تضاد نہیں بلکہ اکثر اوقات کسی چیز سے ہماری گہری جذباتی وابستگی منطقی فکر و استدلال ہی کا نتیجہ ہوتی ہے، گو کبھی کبھی ہمیں اس کا واضح احساس نہیں ہوتا کہ ہم نے جس چیز کو جذباتی طور پر اپنایا ہے، ذہن ہمارے علم کے بغیر اس کے حق میں دلیلیں مہیا کرنے میں مصروف رہا ہے اور ہماری جذباتی وابستگی حقیقت میں اسی غیر محسوس استدلال کی پیدا کی ہوئی ہے۔

یہ تمہید میں نے اس لئے نہیں باندھی کہ اردو کے مروجہ رسم الخط کے متعلق کوئی قدامت پسندانہ یا جذباتی بات کہنے کے لئے راستہ ہموار کرنا یا جواز پیدا کرنا چاہتا ہوں بلکہ اس کے برخلاف مقصد یہ ہے کہ رسم الخط کے موجودہ مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر غیر جانب دارانہ انداز میں نظر ڈال کر کسی ایسے نتیجے پر پہنچنا مقصود ہے جو اہل منطق کے لئے بھی قابل قبول ہو اور جب میں یہ عرض کرتا ہوں کہ اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالی جائے تو واضح طور پر یہ بات میرے سامنے ہے کہ رسم الخط کا مسئلہ اس لحاظ سے بڑا پھیلا ہوا اور ہمہ گیر ہے کہ اس کا تعلق براہ راست ہمارے دینی، تہذیبی، معاشرتی اور قومی عقائد و تصورات اور ہماری زندگی کے افادی، تعلیمی اور علمی و فنی پہلوؤں سے ہے اور ہم رسم الخط کے مسئلے پر غور کرتے ہوئے ان میں سے کسی کی طرف سے چشم پوشی کر کے کسی منصفانہ نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔

دینی نقطۂ نظر سے دیکھئے تو مروجہ رسم الخط کی اہمیت ہمارے نزدیک دوگونہ ہے۔ اول تو یہ کہ ہماری زبان کا رسم الخط وہی ہے جو قرآن کریم کا ہے اور دوسرے یہ کہ دینی علوم کا وہ کثیر سرمایہ جس کی مدد سے ہم دین کے حقائق و مسائل کو سمجھتے اور اس کے دقیق رموز و اسرار تک رسائی حاصل کرتے ہیں اردو فارسی اور عربی کے ان ہزاروں مطبوعہ اور مخطوطہ رسالوں اور کتابوں میں محفوظ ہے جن کا رسم الخط ہمارا مروجہ رسم الخط ہے، اور اس بنا پر اس رسم الخط کے ساتھ ہمارا رشتہ نہ صرف تقدس و احترام کا ہے بلکہ اس کی نوعیت خالصتاً علمی اور افادی بھی ہے اور اس سے علیحدگی اختیار کر کے ہم نہ صرف اس روحانی نسبت سے بے تعلق ہو جائیں گے جو کسی دین کے پیروؤں کو ان کے دینی اساس سے قریب رکھنے کے لئے لازمی ہے بلکہ ہمارے لئے اس فکری رہنمائی کے سارے دروازے

بھی بند ہو جائیں گے جن میں داخل ہو کر ہم اپنے عقائد میں استواری اور استحکام پیدا کرتے ہیں اور جن میں داخل ہوئے بغیر ہمارے عقائد کی اساس عقلی اور منطقی کم اور جذباتی زیادہ ہوتی ہے۔ ہمارے عقائد کی ایک سطح روحانی ہے اور یقیناً یہی سطح دینی عقیدے کی جان ہے لیکن اس روحانی تعلق کو عقلی اور منطقی استدلال سے مستحکم بنانا بھی دینداری کا ایک ایسا تقاضا ہے جس سے عقیدے کی روح میں قوت، استواری اور استحکام پیدا ہوتا ہے اور اس لئے اسے ترک کرنا ہرگز دانش مندی نہیں اور جب یہ دانش مندی نہیں تو اس رسم الخط کا ترک کرنا بھی یقیناً دانش مندی نہیں جس کے وسیلے سے یہ روحانی سرمایہ اور اس روحانی سرمائے کی عقلی توجیہ کرنے والا فکری خزینہ ہم تک پہنچا ہے۔

مروجہ رسم الخط کی دوسری اہمیت تہذیبی ہے۔ ادب کے متعلق اس کلیے سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ وہ کسی قوم کے ماضی کی ایک ایسی امانت اور ایک ایسا ورثہ ہے جو نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا ہوا آئندہ نسلوں تک پہنچتا ہے۔ ادب کے مختلف اصناف کو ادیب اور شاعر جن افکار، تصورات اور خیالات کے اظہار کا وسیلہ بناتے ہیں وہ حقیقت میں قوم کی تہذیبی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا عکس ہوتے ہیں۔ ہر ادب کی الگ الگ زبانیں اور ان زبانوں کے مختلف رسم الخط ہیں اور مدتوں کے ربط و تعلق کے بعد زبان اور رسم الخط میں اتنا قریبی رشتہ ہو جاتا ہے وہ ایک دوسرے میں اس طرح جذب و حل ہو جاتے ہیں کہ دونوں کا یہ تعلق لازم و ملزوم کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے جس طرح بعض خاص خیالات ہیں کہ وہ ایک خاص زبان میں جتنی خوبی سے ادا ہوتے ہیں دوسری میں ادا نہیں ہوتے اسی طرح بعض الفاظ ہیں کہ ایک خاص رسم الخط کا سانچا ہی ان کے لئے سب سے زیادہ موزوں اور مناسب ہوتا ہے اور اس طرح گویا تہذیب کا ماضی اور اس کی روایت، ادب اور اس کی روایت کا سرمایہ، زبان اور رسم الخط سب ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں کہ ان کے مربوط رہنے میں حسن اور توازن ہے اور ان کے بے ربط اور بے تعلق ہو جانے میں انتشار اور اختلال۔ اس لئے جب کوئی اس رسم الخط کو بدل کر اس کی جگہ کسی دوسرے رسم الخط کو رواج دینے کا سوال اٹھاتا ہے تو یہ مسئلہ محض رسم الخط بدلنے کا مسئلہ نہیں بلکہ قوم کے پورے ادبی سرمائے اور یوں بالواسطہ پوری تہذیبی روایت میں انتشار اور اختلال پیدا کرنے کا مسئلہ بن جاتا ہے جو

"جذباتی" ہونے کے باوجود منطق کے صغریٰ اور کبریٰ کی بنیادوں پر قائم ہے۔

موجودہ رسم الخط کی دینی اور تہذیبی اہمیت تسلیم کر لی جائے تو اس کی قومی اہمیت خود بخود مسلم ہو جاتی ہے، اس لئے کہ قوم جن مختلف عناصر کا مجموعہ اور مرکب ہے، دین اور تہذیب کا مقام اس میں سب سے اونچا ہے لیکن دینی اور تہذیبی نقطۂ نظر سے الگ ہٹ کر رسم الخط کے بعض پہلو ایسے بھی ہیں جن کا تعلق قومی زندگی کی وحدت اور زندگی کے مختلف شعبوں میں اس کی آئندہ ترقی سے بہت قریبی اور بہت گہرا ہے۔ تعلیمی لحاظ سے ہمارے ملک کا شمار پس ماندہ ملکوں میں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہماری موجودہ حکومت نے قومی فلاح و بہبود کے جن منصوبوں کو نسبتاً زیادہ اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے ان میں سے ایک تعلیم بھی ہے اور تعلیمی زندگی کے دو پہلو ہیں جن کی طرف خصوصیت سے زیادہ توجہ بھی کی جا رہی ہے اور عملی اعتبار سے ان پر زور بھی دیا جا رہا ہے۔ ایک یہ کہ تعلیم کو بالغوں میں زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے اور انہیں اس کے حصول کی زیادہ سے زیادہ سہولتیں دی جائیں اور دوسرے یہ کہ بچوں کو تعلیم کے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل ہوں کہ وہ اپنی طبیعتوں کی افتاد اور مناسبت کے اعتبار سے تعلیم کو زندگی کا ایک دلچسپ اور بامعنی مشغلہ سمجھ کر اختیار کریں اور اس طرح اپنے آپ کو پاکستان کا بہترین شہری بنائیں۔ ہماری قومی زندگی کے اس اہم مسئلے اور رسم الخط کے مسئلے میں بڑا گہرا تعلق ہے۔

ہمارے ان بالغ اور ناخواندہ عوام میں سے جنہیں ہم تعلیم دینا چاہتے ہیں بہت سے ایسے ہیں جو کلام پاک کی تلاوت کرتے ہیں اور اس طرح اس رسم الخط کو ترک کر کے اگر ہم کوئی اور رسم الخط مثلاً رومن رسم الخط اختیار کریں تو بالغ عوام کو اس رسم الخط کے علاوہ جسے وہ مذہبی تعلق کی بنا پر سیکھتے ہیں ایک اور نامانوس رسم الخط سیکھنا پڑے گا اور یوں تعلیم حاصل کرنے کا ضروری کام ان کے لئے دشوار اور بعض صورتوں میں، ان کی مصروفیتوں کی وجہ سے، ناممکن بن جائے گا۔ مسلمان بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں بھی یہی پہلو ہمارے سامنے آتا ہے۔ جو رسم الخط بہ یک وقت ان کی دینی اور دنیوی دونوں طرح کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرے، ظاہر ہے کہ تعلیم کی ابتدائی منزلوں کو ان کے لئے آسان تر بنائے گا۔ جہاں تک بچوں کی تعلیم کا تعلق ہے (اور اس کا

اطلاق خاصی حد تک تعلیم بالغان پر بھی ہوتا ہے) ہمارے مروجہ رسم الخط میں لفظوں کے اشتقاق اور مشابہت کے اصول کی موجودگی اسے تعلیمی حیثیت سے زیادہ آسانی سے قابل الحصول اور فنی اعتبار سے زیادہ جاذب نظر اور دلکش بناتی ہے۔ مثلاً نظر، ناظر، منظور، انتظار، منتظر وغیرہ میں "ن ظ ر" مادہ کی موجودگی استاد کو یہ سہولت بہم پہنچاتی ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو ان لفظوں کا معنوی تعلق سمجھا سکے اور ان کے ذوق تجسس کو ابھار کر زبان کے مطالعے کو ان کے لئے ایک دلچسپ اور پُرانبساط مشغلہ بنا سکے۔ حروف کی کشش اور ان کے دائرے اور ایک خاص حد تک ان میں یکسانی (جیسے ب پ ت ٹ ث اور پھر ج چ ح خ وغیرہ میں) اس کا وہ پہلو ہے جس میں تعلیمی افادیت کے ساتھ ساتھ جاذبیت اور دلکشی بھی موجود ہے۔

قومی نقطہ نظر سے مروجہ رسم الخط کی اہمیت ایک اور بنا پر بھی واضح اور مسلّم ہے۔ اردو کے علاوہ، جو مغربی پاکستان میں ہماری قومی زبان ہے، مغربی پاکستان کی سب قابل ذکر اور اہم علاقائی زبانیں (سندھی پشتو اور پنجابی) اسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں اور یوں تہذیبی اعتبار سے مختلف زبانیں بولنے والوں کے درمیان یک جہتی کا وہ مشترک ذریعہ ہیں جو ہماری ملی وحدت کی روح اور اساس ہے۔

ہر قوم کی ایک زندگی وہ ہے جو ہر قوم اپنے جغرافیائی حدود میں رہ کر بسر کرتی ہے اور اس زندگی کے ضابطے اور اصول انہیں جغرافیائی حدود کی ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق مرتب کئے جاتے ہیں لیکن ہر زمانے میں قوموں کے لئے ضروری ہے کہ دوسری قوموں کے ساتھ سیاسی روابط قائم کریں (اور یہ بات آج کی دنیا میں اور بھی اہم بن گئی ہے) سیاسی روابط میں استحکام اور استواری کے یوں تو بے شمار اسباب ہیں لیکن جن روابط کی بنیاد دینی عقائد اور تہذیبی شعار کی یکسانی پر ہو ان میں تعلق کی نوعیت مادی کم اور روحانی زیادہ ہو جاتی ہے اور یہ روحانی رشتہ قوموں کی سیاست میں ایک فکری اشتراک قائم کر کے اسے زیادہ مضبوط بنا دیتا ہے۔ ہمارا موجودہ رسم الخط تمام دنیائے اسلام (مصر، عراق، عرب، ایران) سے ہمارے دینی، تہذیبی اور سیاسی ربط ضبط پیدا کرنے اور قائم رکھنے کا ذریعہ رہا ہے اور اب بھی ہے اور اس طرح سیاسی نقطہ نظر سے بھی اس کی اہمیت مسلّم ہے۔

وہ لوگ جو رومن رسم الخط کے حامی ہیں اور مروجہ رسم الخط کے حامیوں کو "جذباتی" کہہ کر ان کے دلائل کو حقیر اور بے بنیاد ثابت کرنا چاہتے ہیں اس رسم الخط کے خلاف دو تین حربے استعمال کرتے اور رومن رسم الخط کے حق میں بعض جواز سامنے لاتے ہیں۔ موجودہ رسم الخط پر ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ حروف و اصوات کی گوناگوں پیچیدگیوں کی وجہ سے تعلیمی ترقی کے راستے میں حائل ہے۔ اسے اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں اخباروں، رسالوں اور کتابوں کی اشاعت کی رفتار دھیمی رہی ہے اور یہ چیز ملک کی عام ذہنی ترقی کے راستے میں بڑی رکاوٹ ہے۔ ہم جب تک اس قدیم اور فرسودہ رسم الخط کو نہیں چھوڑتے ٹائپ کی مشینوں سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اس اعتراض کے مختلف پہلوؤں کو سامنے رکھا جائے تو اس بات کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس رسم الخط کے اختیار کرنے میں بعض عملی دشواریاں ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ یہ دشواریاں کس رسم الخط میں نہیں۔ خود رومن رسم الخط بھی دشواریوں سے خالی نہیں۔ ان کی نوعیت خواہ مختلف ہو۔ اور دوسری بات یہ کہ تجربہ ایسی چیز ہے جو ہر دشواری پر فتح پاتا ہے اور اس کا ثبوت وہ ترقی ہے جو پچھلے چند برسوں میں ہم نے رسم الخط کو بہتر بنانے اور اسے زندگی کی نئی ضروریات کے سانچے میں ڈھالنے کے سلسلے میں کی ہے۔ مصر اور ایران میں جو بے شمار کتابیں ٹائپ میں چھپ رہی ہیں ان سے قطع نظر خود ہمارے ملک میں اردو میں وافر تعداد میں اور پشتو سندھی اور پنجابی میں کمتر مقدار میں طباعت و اشاعت کا جو کام ہوا ہے اس نے ہمیں نئے نئے سبق سکھلائے ہیں اور جو چیزیں اب تک ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھی جاتی تھیں ان پر ایک ایک کر کے قابو پایا جا رہا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب ہم اشاعت کا پورا کاروبار سائنٹیفک انداز پر اور سستے داموں میں کر سکیں گے اور اعتراض کے جو کانٹے اب تک لوگوں کی آنکھوں میں کھٹکتے ہیں وہ ایک ایک کر کے ختم ہو جائیں گے۔

رومن رسم الخط کے حق میں یہ بات بڑے زور و شور سے کہی جاتی ہے کہ بعض دوسرے ملکوں نے (خصوصاً ترکی نے) پرانا رسم الخط چھوڑ کر رومن رسم الخط کو اپنایا ہے۔ ہمیں یہاں ان سیاسی اسباب سے بحث نہیں جن کی بنا پر ترکی نے ایسا کیا لیکن یہ سوال کرنے کا حق تو ہر ایک کو ہے کہ رومن رسم الخط اختیار کر کے ترکی کو ملا کیا؟

باقی ص۱۱۰ پر

قومی ادب

انجم اعظمی

پاکستان ایک نوزائیدہ ملک ہے اس کی تعمیر و ترقی کا سوال جب اٹھتا ہے تو قومی ادب کا مسئلہ بھی سامنے آتا ہے اور یہ جاننا ضروری ہو جاتا ہے کہ قومی ادب کیا ہے اس کے حدود کیا ہیں۔ ادب بحیثیت مجموعی فلسفہ اور تاریخ کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے قومی ادب بھی بہر حال ادب ہی کا ایک نام ہے لہٰذا اس کی تخلیق میں بھی اس امتزاج کا ہاتھ ہے۔ لیکن مجھے فی الحال نہ تو اس کی جمالیاتی قدروں سے بحث ہے اور نہ تخلیقی عمل سے۔ البتہ یہ بات ہر قسم کے ادب کے بارے میں حرف بہ حرف صحیح ہے کہ اس میں انسانی معاشرے کے اندرونی رشتوں کے خدوخال ضرور نمایاں ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص انسان کے ذہنی اور روحانی ارتقار کو سمجھنا چاہتا ہے تو اس کے لئے ادب اور آرٹ کا مطالعہ ناگزیر ہوگا ورنہ اس کا علم نامکمل رہ جائے گا۔ وہ انسانی نفسیات کی باریکیوں، مختلف دور کے انسانوں کے ذہنی ردعمل اور مختلف قوموں کے مزاج کو نہ سمجھ سکے گا اور نہ تو مختلف تہذیبوں کے مافی الضمیر کو پا سکے گا۔ یہیں یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ادب جو روحانی تسکین اور مسرت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے زندگی کا سب سے بڑا نباض انسانی جدوجہد کا مورخ، بنتی ہوئی سماجی قدروں کا آئینہ دار اور مستقبل کا معمار بھی ہے کوئی بھی ادیب ہو چاہے وہ خالص جمالیاتی تجربے ہی کیوں نہ کر رہا ہو اپنی آرزوؤں اور خوابوں سے دامن نہیں چھڑا سکتا اور نہ ماضی کی روایات سے بے تعلق ہو سکتا ہے۔ وہ اگر ماضی کو پسند نہیں کرے گا تو ناپسند کرے گا اور اس کی بنیاد کسی نہ کسی منطق پر ہوگی۔ اسی لئے ہر صورت میں وہ نئے امکانات کو جنم دیتا ہے جو ادب کی افادیت کے ضامن ہیں۔ اسی وجہ سے قومی زندگی میں ادب کو بھی ایک اہم مقام حاصل ہے اور قومی ادب کی تشکیل و ترویج ہر قوم کے فرائض میں شامل ہے۔

قومی ادب ایک قوم کے مخصوص مزاج کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس قوم کے لوگوں کے عادات و اطوار، جمالیاتی و حسی کیفیات، ان کی تہذیبی زندگی، ان کی فکر اور ان کے مذاق سے عبارت ہوتا ہے مختلف ادیبوں اور شاعروں کے یہاں قومی زندگی کے ادراک کی مختلف سطحیں، غور و فکر کی سمت مختلف بلکہ بعض صورتوں میں متضاد تو ہو سکتی ہے لیکن بحیثیت مجموعی ان کا ادب ان امتیازی خصوصیات کا حامل ہوگا جو ایک قوم کے ادب کو دنیا کی دوسری قوموں کے ادب سے الگ کرتی ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ادب کا قومی کردار بین الاقوامی یا آفاقی اقدار کی نفی کے مترادف ہے اور صرف قومی تعصبات کو ہوا دیتا ہے۔ ادب بھی اگر یہی کام کرنے لگے تو پھر ادب اور صحافت میں فرق کیا رہ جائے گا؟ ادب کی تخلیق بہر حال ایک پیچیدہ عمل ہے۔ یہ قومی مزاج اور آفاقی اقدار کی ہم آہنگی سے وجود میں آتا ہے۔ ابھی تک یہ سننے میں نہیں آیا کہ کسی قوم کی تہذیب غیر متحرک ہے اور اس قوم کے لوگوں کی حسی کیفیات جامد و ساکت ہیں۔ بلکہ یہ مزاج بدلتا رہتا ہے۔ حسی کیفیات میں برابر تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اور خارجی عوامل کے بدل جانے سے داخلی ردعمل ایک نئی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس ارتقائی عمل کی تفسیر میں ادب زندگی کی بنیادی قدروں کا سہارا لیتا ہے جو اپنے نفس کے اعتبار سے آفاقی ہوتی ہیں۔ سچ پوچھئے تو ادب کا خمیر ان آفاقی اقدار ہی سے اٹھتا ہے جن کے بغیر کسی قسم کے ادب کا تصور ممکن نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم اقبال کی شاعری کو سامنے رکھیں تو ہمیں

اندازہ ہوگا کہ وہ ہماری قومی میراث ہونے کے باوجود اتنی محدود نہیں ہے کہ اس ملک کی جغرافیائی حدود سے باہر اپنے معنی کھو دیتی ہو۔ اقبال کا شمار بیسویں صدی کے دنیا کے بہت بڑے شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ اگر ہمارے قومی مزاج اور قومی نصب العین کا شاعر ہے تو ساتھ ہی ساتھ اس کی شاعری آفاقی بھی ہے۔ اس کے پیغام سے چین اور برما کا کوئی شخص اختلاف تو کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے آفاقی ہونے سے انکار نہیں کر سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہاں آفاقیت کے مفہوم کی تھوڑی سی تشریح ضروری ہے۔ بعض لوگ صرف اس بات کو آفاقی سمجھتے ہیں جسے ساری دنیا مان لے۔ یہ لوگ شعوری یا غیر شعوری طور پر جرمنی کے مشہور فلسفی کانٹ کے ہمنوا ہیں۔ اس اعتبار سے شاید ایٹم بم کے علاوہ کوئی دوسری آفاقی چیز نہیں مل سکتی جس کا نام لیتے ہی آج تیسری جنگ کی قیامت کا ہیبت ناک سماں ہر شخص کی نگاہوں کے سامنے ناچنے لگتا ہے۔ لیکن آفاقیت کا یہ تصور بالکل غلط ہے۔ ادب میں آفاقیت کا تعلق زندگی کی بنیادی اقدار سے بہت گہرا ہے۔ اور بنیادی اقدار کے بارے میں جو اختلاف رائے دانشوروں کے یہاں ملتا ہے وہ بھی سب پر ظاہر ہے۔ ایسی صورت میں اگر کسی شاعر نے اقدار کی بحث چھیڑی ہے اور اس کی فکری سطح اس حد تک بلند ہے کہ اس کے تخلیق کردہ ادب میں اقدار کا کوئی نہ کوئی تصور ملتا ہے تو چاہے کوئی اس سے اتفاق کرے یا نہ کرے وہ آفاقی شاعر ہوگا۔ باہر کے ادیبوں کے علاوہ خود ہماری قوم کے ادیبوں اور شاعروں کو اقبال کی عظمت کے احساس کے باوجود بعض جمالیاتی، ادبی اور فنی اقدار سے اختلاف ہو سکتا ہے بلکہ سو فیصدی ہے ورنہ ادب میں نئے تجربے کیوں کئے جاتے اور نئی راہیں نکالنے کی کوشش کیوں کی جاتی۔ لیکن اقبال کے آفاقی ہونے پر یہ اختلاف اثر انداز نہیں ہوتا۔ اور اقبال ہی پر کیا منحصر ہے۔ دنیا کے کسی بڑے شاعر کو لے لیجئے۔ شیکسپیئر انگلستان کا سب سے بڑا قومی شاعر ہے لیکن اس کی شاعری ساری دنیا کو اتنی ہی عزیز ہے جتنی خود انگلستان کے لوگوں کو۔ دوسرے لفظوں میں اس کی شاعری کا قومی مزاج اس کی آفاقیت کی راہ میں حائل نہیں ہے۔ ہومر قدیم یونان کا شاعر تھا جس کی تہذیب نے اس کے رزمیے کو جنم دیا۔ وہ تہذیب دنیا میں باقی نہ رہی وہ یونان بھی نہ رہا لیکن آج اس کی شاعری تاریخ کے صفحات سے نکل کر زندہ و پائندہ ہے۔ کیا کوئی شاعر فردوسی اور ہومر سے بھی زیادہ قومی خصوصیات کا حامل ہے۔ فردوسی پر تو باقاعدہ وطن پرستی کا الزام رکھا گیا ہے وہ عربوں کے اثرات سے سخت نفرت کرتا تھا لیکن دنیا کی شاعری میں اس کو جو مقام حاصل ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات بھی نہیں ہے۔ ممکن ہے کچھ لوگ کہیں کہ یہ دراصل ان کی شاعری کا جمالیاتی پہلو ہے جو اب بھی کشش رکھتا ہے۔ اس سے انکار ممکن نہیں لیکن زبان و بیان کے جمالیاتی پہلوؤں پر گفتگو کرتے وقت یہ نہ بھولنا چاہئے کہ دوسری زبانوں کے ادب کی جمالیات سے لطف اندوز ہونے میں دل سے زیادہ ہمارا ذہن کام آتا ہے۔ ہومر اردو کا شاعر نہیں تھا۔ یونانی شاعری کی جمالیاتی اقدار کو پرکھنا ہمارے لئے آسان نہیں ہے اس کے استعارے، تشبیہات، کنائے کو ہم کس طرح سمجھیں گے۔ اگر ان کے پیچھے شاعر کے ذہن کا ایک مکمل دائرہ عمل نہ ہوتا جو تاریخ کے ایک مخصوص دور اور ایک قوم کی زندگی سے پیوستہ ہو کر ہمارے لئے قابل فہم ہو جاتا ہے تو اس کی شاعری کی جمالیاتی قدروں کا تعین صرف زبان کے اعجاز کے بل بوتے پر کم از کم ہمارے لئے ناممکن تھا۔ ہومر کی شخصیت درمیان میں آ کر اپنے واسطے سے اپنی شاعری کے مفہوم کو اجاگر کرتی ہے۔ اس کی اور ہماری شاعری کی جمالیات میں قدر مشترک انسانی ذہن کا وہ عمل ہے جو تخیل کہلاتا ہے اور دنیا کے کسی بڑے شاعر کا تخیل اتنا سپاٹ اور بے رنگ نہیں ہو سکتا کہ وہ صرف جمالیاتی ہو کر رہ جائے۔ جمالیاتی ہونا تو اس کی تقدیر ہے۔ یہی وہ نقطۂ امتیاز ہے جو آرٹ کو فلسفہ اور تاریخ سے الگ کرتا ہے لیکن فلسفہ کی طرح آرٹ کے لئے بھی ابلاغ کی سطح پر ابھرنا ضروری ہے جہاں پہنچ کر وہ پیچیدہ عناصر کا نہایت خوبصورت مرکب ہوتا ہے جس کے اجزائے ترکیبی صرف انسانی صفات میں تلاش کئے جا سکتے ہیں جن کا دوسرا نام آفاقیت ہے یہ آفاقیت ہومر، فردوسی، شیکسپیئر اور اقبال میں یکساں طور پر موجود تھی اور رہے گی البتہ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر "قومی" ادب کی اصطلاح کی کیا ضرورت ہے۔ آفاقی ادب کا نام کافی ہے۔ لیکن یہ سوال ایک غلط فہمی کی بنا پر پیدا

ہوتا ہے۔ اگر اس کا ازالہ ہو جائے تو وہ تشنگی مٹ جائے گی جو اس سوال کے بعد ذہن میں پیدا ہوتی ہے۔ آفاقی ادب دراصل کوئی اصطلاح نہیں ہے اردو یا کسی اور زبان میں اگر یہ استعمال ہوتی ہے تو اس کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا کہ ہر قوم کے لٹریچر کا کوئی نہ کوئی حصہ آفاقی بھی ہوتا ہے اور ہر جاندار ادب میں آفاقیت کے عناصر موجود ہوتے ہیں ورنہ قومی ادب کی اصطلاح اپنی جگہ بالکل درست ہے۔ دنیا کی کسی زبان کا ادب ہو وہ پہلے قومی ہوتا ہے اس کے بعد آفاقی یا کچھ اور ہوتا ہے۔ چونکہ ہر ادب کسی نہ کسی زبان میں تخلیق ہوتا ہے۔ اور ہر زبان ایک مخصوص جغرافیائی ماحول اور تاریخی پس منظر میں پروان چڑھتی ہے، اپنا ایک مخصوص کلچر رکھتی ہے اور مقامی زندگی سے تشبیہات، استعارات، کنایے اور تمثیلات کو جنم دیتی ہے اس لئے اس زبان کا ادب لازمی طور پر اس علاقے کی تہذیب کا نمائندہ بھی ہوتا ہے جہاں وہ بولی اور سمجھی جاتی ہے اردو پاکستان کی ایک قومی زبان ہے۔ ملک کے مشرقی اور مغربی دونوں ہی حصوں میں اس کے بولنے، سمجھنے اور لکھنے والے بھی موجود ہیں۔ اس زبان کے ادیب جو کچھ لکھتے ہیں اس کا پس منظر پاکستان کا ماحول ہوتا ہے۔ ادب کو چاہے کوئی زندگی کے مشاہدے اور مطالعہ کا نتیجہ سمجھے یا شخصیت کا ردِعمل گردانے یا استعارے اور کنایے کا خوبصورت استعمال، ہر حالت میں اردو کا ادیب مجبور ہے کہ وہ اپنے ادب کی تخلیق اپنے ملک کی مٹی سے ہی کرے۔ اگر وہ آفاقی ادب پیدا کر رہا ہے جب بھی اس میں اسی کے ملک کے پھولوں کی خوشبو رچی بسی ہو گی۔ سندھی، بنگالی، پنجابی، بلوچی اور پشتو اس ملک کے مختلف علاقوں میں بولی جاتی ہیں۔ جو اپنی عمل داری سے باہر نہیں سمجھی جاتیں مگر پھر بھی ان میں جن ادیبوں نے ادب و شعر کی تخلیق کی ہے انہوں نے مقامی زندگی سے متاثر ہو کر ہی لکھا ہے لیکن سندھی کے عبداللطیف بھٹائی، پنجابی کے وارث شاہ اور پشتو کے خوشحال خان خٹک کی عظمت سے کون انکار کر سکتا ہے جنہیں آج بین الاقوامی شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ ان کی شاعری میں آفاقی قدریں ضرور ملتی ہیں لیکن ان کا تعلق اگر اپنی زبان اور کلچر سے بہت گہرا نہ ہوتا اور ان کی شاعری کا خمیر یہاں کی مٹی سے نہ اٹھتا تو ان کے یہاں نہ آفاقیت ملتی اور نہ وہ اپنے دیس میں مقبولیت اور شہرت ہی حاصل کر سکتے۔ یہ شاعر پہلے اپنی قوم کے شاعر ہیں قوم کے دل میں اپنی جگہ بناتے ہیں، اسی کے گیت گاتے ہیں، اسی کے مزاج کو اپناتے اور نکھارتے ہیں، اس کے بعد کہیں ان کے ادب میں وہ زندگی پیدا ہوتی ہے جو انہیں ہمیشہ زندہ رکھتی ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ آفاقیت ادب کا ایک رجحان ہے جو کسی ادب کو بڑا بناتا ہے ورنہ ادب خلاء میں تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بہرصورت کسی ملک، قوم، تاریخی ماحول، تہذیب اور زبان کے چھپے ہوئے امکانات ہی سے متعلق ہوتا ہے۔ اسی بناء پر ہمارے ملک میں قومی ادب کی تخلیق کا سوال اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ ہم نے ابھی حال ہی میں ایک نیا ملک بنایا ہے جس کی عمر صرف چودہ سال ہے، ابھی ہم اس کی نشوونما اور ترقی کے ابتدائی دور سے گزر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں قومی ادب کی تخلیق اس ملک کی بنیادوں کو مضبوط بنانے میں بے حد کارآمد ثابت ہو گی۔ ہمیں اپنی روایات کو سمجھنا اور ماضی کے ورثہ کو کھنگال کر بہترین اقدار کو اپنانا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام ادیبوں ہی کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ سائنس اور عمرانیات کی ترقی ملک کے لئے بہت ضروری ہے لیکن بکھرے ہوئے معاشرے کی تنظیم اگر نہ ہوئی اور سماجی قدروں کا شعور ہم میں پیدا نہ ہو سکا تو عمرانیات اور سائنس کی ترقی کے امکانات کم ہو جائیں گے۔ اسی لئے سائنس کے اس دور میں بھی ادب کی تخلیق کا مسلسل جاری رہنا ہماری قومی زندگی کی بقاء کے لئے بہت ضروری ہے۔ اس سے انحراف قومی ترقی سے انحراف کے مترادف ہو گا۔ ممکن ہے بعض لوگ مجھ سے کلی طور پر اتفاق نہ کریں اور یہ کہیں کہ ادب پر اتنی بڑی ذمہ داری ڈالنا کسی طرح مناسب نہیں ہے لیکن کم از کم اس بات سے شاید ہی کوئی اختلاف کرے کہ ادب صرف تفریح کے لئے نہیں ہوتا۔ ادب کا خالص جمالیاتی پہلو ہی تہذیب نفس کا اتنا اہم رول ادا کرتا ہے کہ ادب کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا پڑتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ادب کی تخلیق کے پیچھے بیشتر ادیبوں کو کسمپرسی کی زندگی گزارنی

پڑتی ہے ادیب بن کر وہ ایک گھاٹے کا سودا کرتے ہیں۔ لیکن وہ اپنی انفرادی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے اگر ادب کو چھوڑ کر کوئی اور پیشہ اختیار کرلیں تو ہماری قومی زندگی کا اتنا بڑا نقصان ہوگا جس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ادیب معاشرے کا کوئی کاہل، غبی یا بیوقوف فرد نہیں ہوتا۔ اس کا ذہن فعال ہوتا ہے۔ وہ ادب کی تخلیق اپنے گہرے شعور کی بنا پر کرتا ہے۔ اس کا تعلق ملک کی ترقی، سائنسی و عمرانی علوم کے فروغ اور معاشرے کی بہتری سے بہت گہرا ہوتا ہے کیسی قوم کی زندگی کا سب سے بڑا نقاد ایک سچا ادیب ہی ہوتا ہے۔ اسی لئے قومی ادب کا مسئلہ اپنے دو رخ رکھتا ہے۔ ایک طرف ادیب پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ بہتر سے بہتر ادب کی تخلیق میں کوشاں رہے اور دوسری طرف معاشرہ کو ادیبوں سے بے نیازی برتنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اسے چاہئے کہ ادیبوں کو وہ سہولتیں اور مواقع بھی بہم پہنچائے جو اچھے اور معیاری ادب کی تخلیق میں ممد ثابت ہوں۔ یہاں لگے ہاتھوں ایک بات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں تاکہ ادیبوں کو معاشرے کی جانب سے جو خطرہ ہر وقت لگا رہتا ہے اس کے دور ہونے کی کوئی شکل پیدا ہو۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ادیبوں سے بیجا مطالبات شروع کردیئے جاتے ہیں جن کا پورا کرنا ایک ادیب کے فرائض میں داخل نہیں ہوتا۔ مثلاً کسی ادیب سے یہ مطالبہ کردیا جائے کہ چاول کی بوری پر نظم لکھے ورنہ اُسے ادیب نہ سمجھا جائے گا۔ ایسی صورت میں معاشرہ ادیب کے ساتھ ناانصافی کرتا ہے۔ ادب کی تخلیق تجزیہ و تحلیل کے ایک مسلسل عمل سے گزرنے کے بعد ہی ممکن ہے جس کے لئے کوئی خاص مدت ادب میں متعین نہیں ہے۔ یہ ادیبوں کی اپنی ذات پر منحصر ہے کہ ان میں سے کون کس موضوع کو کب اور کس طور پر ادب میں پیش کرتا ہے۔ ادیب کا بنیادی کام اپنی شخصیت کی تعمیر کرنا ہے جو موضوع کے انتخاب اور اس کے آہنگ میں کارفرما ہوتی ہے۔ اسی لئے مختلف ادیبوں کے دائرہ عمل میں آنے والے موضوعات ایک دوسرے سے جدا، ان کی فکر کی سطحیں مختلف اور ان کا آہنگ منفرد ہوتا ہے۔ یہ فیصلہ صرف ادیب ہی کرسکتا ہے کہ اُسے کیا لکھنا ہے۔ ادیب کیا لکھے؟ کب لکھے؟ اور کس طرح لکھے؟ ایسے سوالات کوئی دوسرا شخص نہیں کرسکتا۔ البتہ کوئی شخص ادب کی ماہیت سے اگر واقف ہے تو وہ ایک ادیب کو رائے ضرور دے سکتا ہے جسے قبول کرنے یا نہ کرنے کا پورا اختیار اس ادیب کو ہی حاصل ہے۔ دراصل فوری ضرورت پوری کرنے کی ذمہ داری ادب کے بجائے صحافت سے تعلق رکھتی ہے جو لوگ اخبارات اور رسائل کا مطالعہ کرتے ہیں انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ صحافت اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی پوری کوشش کرتی ہے۔ اور آئے دن کے چھوٹے چھوٹے مسائل پر نظمیں، افسانے، ڈرامے اور مضامین بے شمار تعداد میں لکھے ہی جاتے ہیں لیکن انہیں ادب میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا بالکل امکان ہے کہ کسی ہنگامی صورت حال یا کسی بہت ہی معمولی واقعے سے کوئی ادیب متاثر ہو کر کوئی بڑا خوبصورت ادب پارہ پیش کردے لیکن اس کا طریق کار ظاہر ہے کہ ایک صحافی سے الگ ہوگا جس کا اندازہ اس کی تحریر پڑھ کر ہی لگایا جاسکتا ہے۔ کم و بیش ہر ادیب ملک کی اجتماعی فکر کا علمبردار ہوتا ہے اور اپنی کسی تخلیق میں اس سے کٹنے نہیں پاتا۔ اس کے یہاں معمولی موضوعات میں بھی معنی کی کئی تہیں ہوتی ہیں جن کے کھلنے پر ایک نظام فکر سامنے آتا ہے جو ادیب کے گہرے شعور کی غمازی کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو صحافت کے وجود میں آنے کے بعد دنیا میں ادب کی کوئی ضرورت ہی باقی نہ رہتی۔ ایک ادیب سچائی کے علاوہ ادب کے لئے کوئی دوسرا معیار قائم نہیں کرتا لیکن صحافت اتنے بڑے معیار کو اپنا کر کبھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس لئے وہ ملک کی عملی سیاست کے ساتھ ساتھ قدم اٹھاتی ہے۔ ادیب کبھی کبھی اپنے ملک میں ایک بہتر معاشرے کی آرزو لے کر بظاہر معاشرے سے بیگانہ بھی ہوسکتا ہے اور صرف ایک مطمع نظر اور ایک نصب العین کے سہارے اپنے تخلیقی عمل کو جاری رکھے گا۔ لیکن کوئی صحافی ایسا نہیں کرسکتا ورنہ وہ ادیب بن جائے گا اور

صحافی کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا جائے گا۔ اس لئے ادیبوں کو اتنی آزادی دینی چاہیئے کہ وہ اپنے شعور کے مطابق قومی ادب کی تخلیق میں حصہ لیں اور معاشرہ قومی ادب کے نام پر ان سے کوئی غلط مطالبہ نہ کرے۔

قومی ادب کے سلسلے میں ایک سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ اگر ہماری قومی زندگی کے بارے میں کسی دوسرے ملک کا کوئی ادیب لکھ رہا ہے (مثلاً بعض انگریز مصنفوں نے برصغیر ہند و پاک کی زندگی کو اپنی تحریروں میں جگہ بھی دی ہے۔) تو آیا اس کی تخلیقات کو ہم قومی ادب میں شامل کریں گے یا نہیں؟ یہ عین ممکن ہے کہ اس کی تخلیقات ہمارے معاشرے کے لئے مفید ہوں لیکن اگر اس ادیب کی تحریروں کا گہرا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر اپنے ملک کا ایک مخلص ادیب تھا، یا ہے۔ اور اس کی ہر تخلیق اس کے ملک کے قومی ادب کا ہی ایک حصہ ہے اور وہ ہمیشہ اپنی زبان اور اپنی تہذیب ہی کا ادیب رہے گا۔ اس کے احساسات، جذبات، اور شعور کی کونپلیں اس کے ملک کی مٹی ہی سے پھوٹیں گی۔ البتہ ہم اسے ایک انسان دوست ادیب کی حیثیت سے ضرور یاد رکھیں گے اور اس کا پورا پورا احترام بھی کریں گے لیکن ہم پر غیر ملکوں کے ان ادیبوں کا بھی احترام لازم ہے جنھوں نے ہمارے ملک کی بابت براہ راست کبھی کچھ نہیں لکھا۔ ان کی تحریروں کے مطالعے سے ہمارے اندر قلب و نظر کی وسعت اور فکر کی گہرائی پیدا ہوئی ہے اسی لئے قومی ادب کی تخلیق کی جد و جہد کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ ہم دنیا کے ادب سے استفادہ کرنا چھوڑ دیں ورنہ اس سے سب سے بڑا نقصان خود ہمارے قومی ادب اور معاشرے کو ہی پہنچے گا جن کے ارتقار میں دنیا کی ہر تہذیب اور ہر ادب کا ہاتھ ہوتا ہے۔ قومی ادب کو اگر صحیح معنی میں آگے بڑھانا ہے تو عالمی ادب سے زیادہ استفادہ اور ملک کی روایات کا اپنے ادب میں مکمل رچاؤ دونوں لازمی عناصر ہیں۔ جو لوگ، جدید ادب کا باقاعدگی سے مطالعہ کر رہے ہیں انہیں اس کا احساس ہوگا کہ ہمارے ادیب اس جد و جہد میں پوری تندہی سے مصروف ہیں۔ اور وہ دن دور نہیں جب اس نوزائیدہ ملک کا نیا قومی ادب دنیا کے ادب میں ایک اونچا مقام حاصل کرے گا جس کا آغاز ہو چکا ہے ٭

○

لمحات کا افسوں

عظیم قریشی

کوئی سمجھائے یہ لمحات کا افسوں کیا ہے؟
کروٹیں لیتا ہے کیوں دل میں نشاطِ رفتہ
زندگی پھول کا اک خوابِ پریشاں تو نہیں
کبھی جو گیت کا غمناک تسلسل بن کر
دل میں در آتا ہے
جو ایک ستارہ بن کر
بہجت و نور کا پرکیف شرارہ بن کر
روحِ گمنام تجسس کا ترانہ بن کر
دفت کی کرنوں کا معصوم فسانہ بن کر
تلملاتا ہے، تڑپتا ہے مچلتا ہے کبھی
ایک بچے کی طرح خود ہی بہلتا ہے کبھی!

جدید افسانہ، جدید فن

ضمیر علی بدایونی

ایک طالب علم کا والہانہ ذوق و شوق لئے ہوئے اس مضمون کا جواں سال مصنف نئے نئے اجنبی دیوتاؤں کی تلاش میں دور دور، اجنبی دیسوں کی طرف نکل جاتا ہے۔ خصوصاً فرانس اور 'وجودیوں' کی طرف۔ یہ دورے اپنے ساتھ کوئی کام کی باتیں لے آئیں، تو بے فائدہ نہیں۔ کیونکہ اس سے نئے ذہنی افق آشکار ہوتے ہیں اور اپنے ساتھ نئی بصیرتیں اور نئی نئی کوششیں لاتے ہیں ـــــ (ادارہ)

ایک دانشور نے کہا تھا "چونکہ تخیل نے کائنات کی تخلیق کی ہے اس لئے یہ تخیل ہی ہے جو کائنات پر حکمرانی کر رہا ہے"۔ لیکن خدا، جیسا کہ سارتر نے کہا ہے، فنکار نہیں ہے۔ اسی لئے کائنات کی ہر چیز مسلسل بہہ رہی ہے اور عدم کے پردوں میں روپوش ہو رہی ہے۔ فطرت کی کوئی چیز بھی تو باقی نہیں رہتی، ہر شے نمودار ہو رہی ہے اور روپوش ہو رہی ہے اور انسان اس مکھی کی مانند جو کسی نقاش کے برش میں پھنس گئی ہو، اس بے مقصد تماشہ کو حیرت و یاس کی نظروں سے دیکھتا رہا اور اس پر افسوس بھی کرتا رہا کہ فطرت گو حسین ہے لیکن گریزپا اور اس کی ہر چیز وقت کے پُراسرار استمرار میں جذب ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن انسان چونکہ قرب، حضور اور فراوانی ہے اس لئے وہ فطرت کے گریزپا جلوؤں اور معنی سے عاری نغموں پر قناعت نہ کر سکا۔ فطرت سے انسان کی اس بیزاری نے ہی فن کو جنم دیا جو ایک طرف فطرت کو ثبات بخشتا ہے اور دوسری طرف اس میں اضافہ کرتا ہے۔ اس لئے فن بیک وقت ثبات بخشنے اور اضافہ کرنے کا عمل ہے جیسے ہولڈرلن نے اس طرح کہا ہے کہ آسمان کی ہر شے تیزی سے گذرتی چلی جا رہی ہے، لیکن جس چیز کو باقی رہنا چاہیئے وہ ایک فرض اور خدمت کے طور پر شاعروں کے حوالے کر دیا گیا ہے۔

اس لئے فن کو فطرت کی عکاسی نہیں کہا جا سکتا بلکہ بقول پال کلے، فنکار سب سے پہلے فطرت کو الوداع کہتا ہے۔ یہ فطرت میں دوام و ثبات کا ہیجان برپا کر دیتا ہے۔ اس کی قلب ماہیت کر دیتا ہے۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ فن اساسی طور پر قلب ماہیت کا عمل ہے اور اس کے جملہ مظاہر بھی فطرت ہی کی قلب ماہیت ہیں۔ لہٰذا کہانی میں بھی اشیاء کو پیش نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس میں بھی علامتوں ہی کا استعمال ہونا چاہیئے۔ لیکن جملہ اصناف ادب میں کہانی کی صنف ہی سب سے زیادہ زود فہم واقع ہوئی ہے کیونکہ یہ قاری کی کوشش تفہیم سے کم سے کم مزاحمت کرتی ہے۔ اس میں حقیقی دنیا کے عناصر موجود ہوتے ہیں اور لوگ جو حقیقی دنیا کے ہی باسی ہیں اسے بہت آسانی سے قبول کر لیتے ہیں۔ جبھی کہانی کے فن کو غیر خالص فن کہا جاتا ہے۔ پال والیری کے نزدیک تو ناول کا فن سرے سے جمالیاتی ذریعۂ اظہار ہی نہیں، بلکہ وہ غلط ذریعہ اظہار ہے۔ چنانچہ اس نے ناول کی دنیا اور شعری دنیا کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "شعری کائنات اپنے ہی حدود میں محدود اور مکمل ہے۔ یہ آخری اغراض اور زبان کے حوادث کا خالص نظام ہے لیکن ناول کی کائنات، حقیقی کائنات سے منسلک ہے"۔

والیری کے نزدیک ناول میں زندگی کی غیر ضروری تفصیلات ہوتی ہیں اور یہ صرف ناگزیر کو نہیں سمیٹتا۔ ناول پر والیری کا اعتراض بنیادی طور پر صحیح ہے کیونکہ یہ فن کی اساس یعنی "علامتی زبان" پر تعمیر نہیں ہوتا اور حقیقی دنیا سے اس کا رشتہ باقی رہتا ہے۔ اس لئے اسے شاعری کی مانند علیحدہ وجود کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ مگر والیری ناول کے جدید فن سے آشنا نہ تھا جسے بلاشبہ علامتوں

کا جنگل نہ کہا جا سکتا ہے۔ ناول کا جدید فن علامتوں کے استعمال میں جملہ اصناف ادب سے آگے نکل گیا ہے۔ جیمس جوائس نے تو واضح طور پر لکھا ہے کہ "فنی گنز ویک" لکھنے سے اس کا مقصد میلارمے کے ابہام کو شکست دینا تھا۔ یہی حال کافکا اور ولیم فاکنر کا ہے۔ ان تین عظیم فن کاروں کے یہاں جدید فنِ ناول نویسی کے اصول مکمل طور پر موجود ہیں۔ اور جدید فن عبارت ہے کافکا، فاکنر اور جیمس جوائس سے۔ لیکن ان تینوں ادیبوں کے حصّہ میں وہ مقبولیت نہیں آئی جو ناول نویسوں کو ہمیشہ حاصل رہی ہے آج بھی تامس مان، کافکا سے زیادہ مقبول ہے۔ فورسٹر، جیمس جوائس سے زیادہ پڑھا جاتا ہے اور ارنسٹ ہیمنگوے، ولیم فاکنر سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ ان کی نگارشات محض دلچسپی کے طور پر نہیں پڑھی جا سکتیں بلکہ ان کا مطالعہ ایک ریاض کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ قاری کی کوششِ تفہیم سے مکمل مدافعت کرتی ہیں۔ ہیئت اور تکنیک کے ارتقاء کی ایک بہت بڑی تاریخ یہاں آکر ختم ہو جاتی ہے۔ اور ان کی خوبیوں کو سراہنے کے لئے اس پوری طویل تاریخ ادب سے واقف ہونا ضروری ہے۔ جس سے ان کا فن ابھرا بھی ہے اور اس سلسلہ کو مکمل بھی کرتا ہے۔ کیونکہ جدید فن عبارت ہے ان تین فنکاروں کے عجیب و غریب تجربات سے۔ جدید فن کو سمجھنے کے لئے ہمیں ان تین عظیم ناول نگاروں کی تحریروں کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔

آیئے ہم سب سے پہلے جیمس جوائس کی دنیا پر نظر ڈالیں جو بیک وقت میلارمے۔ والیری روایت کا پیدا کردہ بھی تھا اور اس کا فاتح بھی۔ وہ حقیقی دنیا کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا بلکہ اس کا خام مواد زبان ہے۔ اور وہ صرف زبان کی لامحدود فضاؤں میں پرواز کرتا ہے۔ ایذرا پاؤنڈ نے لکھا ہے کہ جیمس جوائس کا فن وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں فلوبیر کا فن ختم ہو جاتا ہے۔ فلوبیر نے سب سے پہلے ناول کے تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش کی اور اسے ایک خالص فنی تخلیق کی حیثیت دی بلکہ وہ کہانی کے فن کو اعلیٰ ترفن (HIGHER ART) ہی خیال کرتا رہا۔ جدید ناول نگاری کا فن فلوبیر کا دیا ہوا ہے۔ اگر فلوبیر نہ ہوتا تو آج جیمس جوائس، پروست، ولیم فاکنر کی تکنیک اس قدر ندرت (ODDITY) کی حامل نہیں ہوتی۔ پروست کے تجربات تو تقریباً فلوبیر کے بغیر ناممکن تھے جیمس جوائس کا فن، پروست ہی کے تجربات کی تکمیل ہے۔ اور اس ارتقائی عمل کا نقطۂ عروج ہے جو فلوبیر اور پروست کے فن میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسی لئے ایذرا پاؤنڈ نے لکھا ہے کہ سب انسانوں کو مل کر جیمس جوائس کی تعریف کرنی چاہئے۔ آرنلڈ بینٹ نے یولیسیس کے متعلق لکھا ہے: "اس سے بہتر چیز کبھی میری نظر سے نہیں گزری اور مجھے اس میں شبہ ہے کہ میں ایسی ہی چیز پڑھوں"۔

جیمس جوائس کی زبان علامتی ہے۔ ایک شہر پُراسرار طریقہ سے ایک کائنات کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ بلکہ ایک دکان، ایک شراب خانہ کائنات کے مثبت حصّوں کی نمائندگی کرتا ہے اور یولیسیس کے چوبیس گھنٹے اور فنی گنز ویک کی ایک رات پورے وقت کے استمرار کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ یہ پوری کہانی صرف ڈبلن شہر کے ارد گرد گھومتی ہے۔ زبان و مکاں کی وحدت بھی اس کی ایک نمایاں خوبی ہے۔ اس کائنات صغریٰ (MICROCOSM) میں پوری کائنات کبریٰ (MACROCOSM) سمٹ آئی ہے۔ "یولیسیس" صرف ایک دن کی داستان ہے لیکن اس ایک دن میں کیا کیا رونما نہیں ہوتا؟ مسٹر بلوم اور مسز بلوم کے پردے میں اس نے پوری انسانی زندگی اور اس کی وسعتوں کو ظاہر کر دیا ہے۔ انسانی نفسیات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو "یولیسیس" میں روشن و مرئی شکل میں موجود نہ ہو۔ "یولیسیس" ایک ایسا سمندر ہے جس میں سارے انسان ذروں کی مانند بہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اور جیمس جوائس عظیم خدا کی مانند اپنی تخلیق کی تجلی میں گم ہے۔ وہ "یولیسیس" کے ہر صفحہ پر ہر سطر بلکہ ہر لفظ میں موجود ہے لیکن امامی تواں کر اشارت باو کنند۔ اس طرح جیمس جوائس نے اپنے نظریۂ فن کو "یولیسیس" میں عملی شکل دی ہے۔ اسی لئے اس کی اس تخلیق کو مکمل شعوری تخلیق کی حیثیت حاصل ہے۔ والیری کے نزدیک شعوری تخلیق ہی صرف تخلیق ہے۔

لیکن اس ناول میں سب سے اہم چیز شعور کی رو (STREAM OF CONSCIOUSNESS) کی تکنیک کا استعمال ہے۔ نقاشی میں پکاسو نے اس طریقِ کار کو استعمال کیا ہے اور ادب میں جیمس جوائس نے۔ اس سے مراد ذہن کی وہ غیر منتظم

افسون نور (قندیلیں)　　　انور جلال شمزہ

اور ناہموار رَو ہے۔ جو مختلف یادوں کے سہارے بہتی رہتی ہے۔ ادب میں فرد کے شعور کی رو کی ہو بہو لفظی نقل کی جاتی ہے۔ اسے متحرک تصویر کی فلموں سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے۔ اس کے بہت سے نام ہیں۔ اَن کہی خود کلامی (UNSPOKENSOLILOQUY) یا ساکت تنہا کلامی (SILENT MONOLOGUE)۔ لیکن خود کلامی کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ شیکسپیئر نے ہیملیٹ میں اس کا ستعمال کیا ہے۔ فرانسیسی میں اسے "MONOLOGUEINTERIER" کہا جاتا ہے۔ اور بقول ایک فرانسیسی ناول نگار اور نقاد وا لیری لاربو کے، اس تکنیک کو سب سے پہلے ایک فرانسیسی ادیب، ایدور دوژاراں نے اپنی کہانی "LES LAURIERS SONT COUPES" میں استعمال کیا تھا جو ۱۸۸۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کہانی کو والیری لاربو نے، ۳۰ سال کے بعد دوبارہ شائع کیا اور اس کے دیباچہ میں لکھا ہے :۔

"میں نے ۱۹۲۰ء میں 'یولیسیس' کے کچھ حصّہ کو پڑھا جو "لٹل ریویو" میں شائع ہوا تھا اور کچھ ہی دنوں بعد مجھے جیمس جوائس سے 'یولیسیس' کے متعلق تفصیلی بات چیت کا بارہا موقع ملا۔ اس وقت وہ اس کے آخری حصے کو مکمل کر رہا تھا۔ ایک دن اس نے مجھے بتلایا کہ اندرونی خود کلامی پہلے ہی ایک بیان کی مسلسل صورت کے طور پر استعمال کی جاچکی تھی۔ ایدور دوژاراں کی ایک کہانی (LESLAURIERS SONT COUPES) میں جو "یولیسیس" کی اشاعت سے تیس سال پہلے شائع ہوچکی تھی۔ اس وقت سمبولسٹ تحریک اپنے نقطۂ عروج پر تھی۔ مجھے صرف کتاب کا عنوان معلوم تھا اور میری نسل کے بیشتر ادیبوں کو اس کا علم نہ تھا...... جیمس جوائس نے مجھ سے کہا کہ "LES HAURIERS SONTCOUPES" میں قاری پہلی ہی سطر سے خود کو ہیرو کے ذہن میں جیسیدہ محسوس کرتا ہے اور یہ اس کے خیالات کی مسلسل تہیں کھولتا ہے اور حسن کی جگہ معمولی خارجی بیان لے لیتا ہے۔ یہ ہمارے سامنے اس کے اعمال و تجربات کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔ میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ اس کہانی کو پڑھیں۔"

والیری لاربو کے اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ جیمس جوائس کا اس تکنیک کے ستعمال سے یہ مقصود تھا کہ ذہن کے اندرونی عمل کو وہ اپنے فن میں اس طرح پیش کرے کہ قاری کی قبولیت کا تسلسل نہ ٹوٹنے پائے۔ اور کردار کامل طور پر روشن و مرئی ہو کر اس کے سامنے آجائے۔ "یولیسیس" کے آخری حصّہ میں جو چالیس صفحات پر مشتمل ہے، مسز بلوم کی اندرونی خود کلامی کی لفظوں میں جو تصویر کھینچی ہے وہ انتہائی حیرت انگیز اور جیمس جوائس کے ذہن کی عظمت کا پورا ثبوت ہے۔ مسز بلوم کا یہ طویل مونولاگ بغیر اوقاف کے جاری رہتا ہے۔ جب مسٹر بلوم تفصیلی طور پر اس کو دن بھر کے کارناموں کی روداد اپنی واپسی پر سنا چکتا ہے تو مسز بلوم سونے کی تیاری کرتی ہے۔ اس وقت وہ ذہنی اور جسمانی دونوں اعتبار سے کرب میں مبتلا ہوتی ہے۔ سونے کی ناکام کوشش کرتی ہے لیکن خیالات کی مسلسل یلغار اسے سونے سے باز رکھتی ہے۔ وہ بستر میں کروٹیں بدلتی رہتی ہے اور رات اسی اضطراب میں گزر جاتی ہے۔ مسٹر بلوم بڑا محتاط آدمی ہے۔ وہ فوریکا سے اپنی ملاقات کے متعلق کچھ نہیں اسے بتلاتا لیکن مسز بلوم اس قسم کے جذباتی معاملات کو سمجھنے کے لئے ایک وجدانی حس یا خلقی حس رکھتی ہے۔ اس کا شوہر اس سے بستر ہی پر ناشتہ مانگتا ہے۔ اور وہ سوچتی ہے کہ وہ بیمار ہے لیکن اس پر تعجب بھی کرتی ہے اور دل ہی دل میں کہتی ہے کہ اگر وہ بیمار ہے تو اسے ہسپتال چلا جانا چاہئے کیونکہ بیمار انسان وبالِ جان ہوتا ہے۔ یہاں وہ اس طرح اندرونی خود کلامی کرتی ہے :۔

"THEYRE SO WEAK AND PULING WHEN THE YRE SICK THEY WANT A WOMAN TO GET WELL IF HIS NOSE BLEEDS YOUD THINK IT WAS O TRAGIC AND THAT DYINGLOOKING ONE OFF THE SOUTH CIRCULAR WHEN HE SPRAINED HIS FOOT AT THE CHOIR PARTY AT THE SUGARLOAF MOUNTAIN THE DAY IWORE THAT DRESS MISS STACK BRINGING HIM FLOWERS THE WORST OLD ONES SHE COULD FIND AT THE BOTTOM OF THE BASKET ANYTHING AT ALL TO GET INTO A MAN'S BEDROOM WITH HER OLD

MAIDS VOICE TRYING TO IMAGINE HE WAS DYING ON ACCOUNT OF HER TO NEVER SEE THY FACE AGAIN THOUGH HE LOOKED MORE LIKE A MAN WITH HIS BEARD A BIT GROWN IN THE BED FATHER WAS THE SOME BESIDES I HATE BANDAGING AND DOSING WHEN HE CUT HIS TOE WITH THE RAZOR PARING HIS CORNS AFRAID HED GET BLOOD POISONING BUT IF IT WAS A THING I WAS SICK THEN WED SEE WHAT ATTENTION ONLY OF COURSE THE WOMAN HIDES IT NOT TO GIVE ALL THE TROUBLE THEY DO"

وہ خیال کرتی ہے کہ اس عورت سے اس کی مڈبھیڑ اچانک نہیں ہوئی ہے بلکہ وہ اراداً تاًاس سے ملا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ عورت کی نفسیات کو جیمس جوائس سے زیادہ قریب ہو کر کسی نے نہیں دیکھا لیکن اس کی یہ تکنیک جہاں ندرت و امتیاز کی حامل ہے وہاں دوسری طرف اس پر کڑی تنقیدی نظر بھی ڈالی گئی ہے۔ اس پر سب سے بڑا اعتراض تو یہ ہو سکتا ہے، جو ہمیں فلسفیانہ حدود میں لے جاتا ہے، کہ ہم صرف لفظوں کے ذریعہ نہیں سوچتے لیکن بعض محققین کے نزدیک "بغیر زبان کے خیال ناممکن ہے"۔ مگر یہ سب مفروضات ہیں۔ اس پر دوسرا اعتراض پروفیسر کرتیس نے یہ کیا ہے کہ یہ اندرونی خود کلامی لفظوں کے اجزا سے مرکب ہے۔ لیکن یہ بے معنی ہیں جب تک کہ انہیں کسی خارجی سیاق و سباق سے مربوط نہ کر دیا جائے۔ بہر حال اس پر ایک اعتراض یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم ایک سطح پر نہیں سوچتے لیکن مسز بلوم کے خیالات ایک ہی خط پر دوڑتے رہتے ہیں۔ اور یہ چیز خلافِ واقعہ ہے۔ فرائڈ نے بھی انسان کی ذہنی زندگی کو ایک مسلسل خود کلامی قرار دیا ہے اور انسان کی حیثیت اس میں چونکہ انفعالی ہوتی ہے، اس لئے یہ خود کلامی بغیر رکے جاری رہتی ہے۔ اور مختلف تلازمے اس کی اعانت کرتے رہتے ہیں لیکن یہ تکنیک فنکارانہ کم، علمی و تجزیاتی زیادہ ہے۔ اسی لئے اس ساکت مونولوگ کی لفظی تصویر کو عورت کی نفسیات پر ایک علمی مقالہ کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ اور وجودی تحلیل نفسی اس اندرونی خود کلامی کے جبر کو بھی رد کرتی ہے۔ یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ غیر منسلک لفظ کو داخلی وحدت کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے۔ پھر یہی نہیں بلکہ فرائڈ، رونگ، ایڈلر وغیرہ نے انسانی نفس کو جس شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اس کی صحت بھی مشتبہ ہی ہے۔ وجودیوں کے جدید ترین تصورِ انسان کی روشنی میں تو فرائڈ کا "فطری انسان" قطعاً مہمل و غلط نظر آتا ہے۔ کیونکہ سارتر کے نزدیک انسان اِڈ نہیں ایگو ہے، لاشعور کا نام ہے۔ اور جیمس جوائس کی تکنیک کی اساس یعنی انسانی لاشعور کا جبر قطعی باطل قرار پاتا ہے۔ درحقیقت یہ پوری بحث ہی غلط و بے معنی ہے۔ ایک فنی تخلیق کو علمی معیاروں پر جانچنا ہی غلط ہے۔ لیکن جب فنکار علم کو خود اپنے فن کی اساس کے طور پر استعمال کر رہا ہو تو پھر کیا کرے کوئی؟ اور ہمیں یہ قبول کرنے میں تامل بھی نہیں ہونا چاہئے کہ جیمس جوائس ہیلارمے کا فاتح ہونے کے باوجود والیری کے اعتراض کی زد سے نہیں بچ سکا۔ یہ غلطی سب سے پہلے زولا نے کی۔ جس نے ناول کے صفحات کو تشریحی میز کی حیثیت دے دی اور فنکار کے ذہن کو تحلیلی تجربوں کا معمل بنا دیا۔ اس میں شک نہیں کہ فنکار میں نفسیاتی بصیرت اور فلسفیانہ ژرف بینی ہونا ضروری ہے۔ لیکن ان تمام چیزوں کو اسے اپنے فن سے باہر رکھنا چاہئے۔ کیونکہ فن کوئی فلسفیانہ یا علمی مشغلہ نہیں بلکہ انتہائی بے غرض مشغلہ ہے۔ اس کی معصومیت اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب اس پر پرتوِ غیر پڑنے لگتا ہے۔

اب جہاں تک جیمس جوائس کی "فنی گنز ویک" کا تعلق ہے یہ کتاب اپنی انفرادیت اور نوعیت کے اعتبار سے دنیا کی تمام کتابوں سے ممتاز و عجیب نظر آتی ہے۔ اس میں لفظوں کی شکست و ساخت سے نئی نئی ترکیبیں بنائی گئی ہیں۔ اور وقت کی ایک غیر محدود مدت کے لئے یہ کتاب "ناقابل فتح" ہے۔ یہ پوری کتاب صرف ایک رات کی داستان ہے۔ نقادوں کی ایک بڑی تعداد نے اس کے تمام رشتوں اور رازہائے پنہاں کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے لیکن ان تمام کوششوں کے بعد بھی اس

کے لمبے چوڑے فقروں کی عجیب الخلقت ساخت کے اجزائے ترکیبی کا سراغ نہیں ملتا ہے۔ اور اس کا ایک طویل حصہ اب بھی ابہام کی گہری تاریکی میں مستور ہے۔ بغیر تفصیلی تشریح کے، بقول ایلیٹ، یہ کتاب ایک خوبصورت لغویت معلوم ہونے لگتی ہے۔ "یولیسیس" میں جو اسلوب جوائس نے پیدا کرنے کی کوشش کی تھی وہ "فنی گنز ویک" میں آکر مکمل ہو جاتا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کی کتاب سے فن کو اساسی اعتبار سے کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ اس سوال کا جواب دینا کارے دارد کا مصداق ہے۔ اس کا سلسلہ ہمیں میلارمے، اور ویلیری نظریۂ فن کی طرف لے جاتا ہے۔ جن کے نزدیک الفاظ موت بمنزلہ فتح ہیں لیکن جب قاری ان الفاظ کو فتح کر لیتا ہے تو فنکار مر جاتا ہے اس لئے کہ ابہام فن کی روح ہے۔ جس کے بغیر فن مردہ ہے یہ سوال ہمیں پھر ما بعد الطبیعات کی طرف لے جاتا ہے۔ اگر فن محض اظہار ہے تو کس چیز کا اظہار ہے؟ ظاہر ہے کچھ نہ کچھ کہنے کی ضرورت ہی ہمیں مختلف اظہار کے ذریعوں کی طرف لے جاتی ہے۔ فن محض ذریعۂ اظہار کے ساتھ کھیلنا سہی، لیکن کھیل کبھی بے مقصد نہیں ہوتا۔ فن محض خواب سہی لیکن خواب بے معنی نہیں ہوتے۔ فن مرئی اور روشن کرنے کا عمل سہی لیکن کوئی چیز اگر موجود نہیں تو پھر آخر کیا چیز مرئی اور روشن ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے، ظاہر ہے وادی پہاڑ کے ساتھ ہی لگی رہتی ہے۔ اگر پہاڑ ہو تو اس کا وجود بھی باقی نہیں رہتا۔ اس لئے فنی کائنات کو محض ابہام کی پُراسرار و تاریک کائنات نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ ایسی کائنات ہونا چاہئے جہاں اشیاء روشن و مرئی حالت میں موجود ہوتی ہیں اور ایک مخصوص لے میں گنگناتی ہیں۔

اس کے علاوہ جیمس جوائس کا ابہام خالص فنی ابہام بھی نہیں جو میلارمے اور ویلیری کا ابہام ہے بلکہ بعض اوقات اس نے انتہائی غلط طریق کار سے کام لیا ہے۔ سیموئیل بیکٹ نے جو "فنی گنز ویک" کا املا لکھا کرتا تھا، ایک واقعہ بیان کیا ہے جس سے اس کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ جوائس کا اس کتاب کے لکھنے سے مقصد یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ اس کتاب کے رشتوں کو منتشر کر دیا جائے۔ ایک دن سیموئیل بیکیٹ اس کتاب کا املا لکھ رہا تھا کہ کسی نے دروازہ پر دستک دی۔ جوائس نے فوراً کہا "اندر آجاؤ" سیموئیل بیکیٹ نے دروازہ پر کی دستک کو نہیں سنا اور جوائس کے اس بیان کو بھی شامل متن کر لیا۔ بعد میں جب وہ نظرِ ثانی کر رہا تھا تو اس نے جوائس سے دریافت کیا یہ "اندر آؤ" کیا چیز ہے۔ اور اس عبارت میں قطعی غیر موزوں معلوم ہو رہا ہے۔ اس پر جوائس نے اسے صحیح صورتِ حال سے آگاہ کیا لیکن اس کے باوجود "اندر آجاؤ" کو عبارت میں سے نکالنے سے منع کر دیا یہ واقعہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اس کتاب کے لکھنے سے جوائس کا مقصد ایک بے معنی سی خواہش تھی جو میلارمے اور نعوذ باللہ! قرآن مجید کی معجزانہ قوت بیان کو غلط طریقے سے شکست دینی تھی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پوری کتاب بے معنی الفاظ کا ایک ناگوار سلسلہ ہے۔ اس کے برخلاف جوائس بہت بڑا فنکار ہے۔ اور بغیر کسی تذبذب یا مبالغہ کے خوف کے اسے جینیس کہا جا سکتا ہے۔ اس کے فن میں انسانی قوتِ اظہار بے حد طاقتور نظر آتی ہے۔ اور زبان کی حدود بھی وسیع ہوتی نظر آتی ہیں۔ لیکن جہاں ایک طرف اس نے ہئیتی تجربوں کی ایک نئی راہ کھول دی ہے۔ وہاں غلط رجحان کو بھی ہوا دی ہے۔ اور نئے لکھنے والوں کے لئے وہ اپنی فنکارانہ عظمت، تکنیکی ندرت اور بے پایاں قوتِ اظہار کے باوجود ایک مستقل خطرہ ہے۔

★

○

ہماری کوشش یہ ہے کہ پاکستان کا آئین ایسا بنے جس کے تحت ہم ترقی کر سکیں، اپنی حالت سدھار سکیں، قوم کی تعمیر و تنظیم ہو، ہم میں اتحاد و اتفاق ہو، اور ہم مسلمان بھی رہیں۔ یہ بات کہدینا تو بہت آسان ہے مگر اُس پر عمل اتنا آسان نہیں، مگر ضرورت ہے کہ ہم جو کام بھی کریں اس کی بنیاد حسنِ نیت پہ ہو۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو صراطِ مستقیم پا جائیں گے۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں

مشرقی پاکستان: اردو شاعری کے آئینہ میں

انور سعید گیلانی

ڈھاکہ۔ بنگالہ، کبھی ہم ان کا نام یوں لیا کرتے تھے جیسے پتہ نہیں دنیا کے کس دور و دراز گوشے میں ہیں، جہاں تک پہنچنا گویا خواب و خیال کی بات ہے۔ اسی لئے بڑوں کی زبانی اکثر سنا کرتے تھے کبھی ڈھاکہ کی کبھی بنگالہ کی۔ یعنی بعید از قیاس، بعید از امکان، یا دور ہوا باتیں لیکن اب معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ قیام پاکستان سے صورتِ حال ہی دگرگوں ہو گئی ہے۔ اب تو ڈھاکہ بنگالہ ہم سے کہیں دور نہیں، پاس ہی ہیں۔ دو قدم کے فاصلے جیسے کراچی، جیسے لاہور، جیسے پشاور۔ وہ تو ہمارے اپنے ملک ہی کا حصہ ہیں۔ کیا ہوا جو وہ مغربی بازو سے ۱۱۰۰ میل دور ہیں۔ اور ان کے مابین کوئی کوریڈور یا گلیاری نہیں۔ نگاہ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار۔ یہی وجہ ہے کہ اب سحر بنگالہ ہمارا اپنا یعنی مغربی پاکستان کا سحر بھی بن گیا ہے۔ اس کی تر و تازہ سرزمین، اسکے جنگل، اسکے پہاڑ، اس کے دریا، اس کے باشندے سب ہمارے اپنے ہی ہیں۔ ہمارا اپنا گوشت پوست یہی وجہ ہے کہ اب وہاں کے لوگ یہاں کے گن گاتے ہیں اور یہاں کے لوگ وہاں کے۔ وہاں کے گاؤک ہمارے گیت گاتے ہیں اور یہاں کے مغنی وہاں کے، وہاں کے کوی اپنی کوتاؤں میں یہاں کے نغمے سناتے ہیں اور یہاں کے شاعر ادیب اپنے فن پاروں میں مشرقی پاکستان کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس کی رنگا رنگ کی تصویریں کھینچتے ہیں۔ اور اب تو ہوتے ہوتے نظم و نثر کے یہ شہ پارے اتنے ہو گئے ہیں کہ ان سے ایک شاندار گلدستہ، تصویروں کا ایک بھرپور مرقع تیار ہو سکے۔ جس یگانگت کا ایک پہلو ہماری "اتحادی موسیقی" ہے۔ اس کا دوسرا پہلو وہ نیا ادب ہے جس میں مغربی و مشرقی پاکستان ایک دوسرے کی جھلکیاں پیش کرنے میں بازی لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اسلئے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے ایک جنت خیال، ایک رومانوی دنیا کے تحیر بن گئے ہیں۔ جو سراپا ذوق و شوق بن کر شعر و ادب کے آئینے میں منعکس ہوتے ہیں۔

یہ امر باعث مسرت ہے کہ ہماری شاعری میں جہاں بھی مشرقی پاکستان کی جھلکیاں ہوتی ہیں وہ بہت ہی رنگین ہیں۔ اسلئے نہیں کہ وہ اس باغ و بہار سرزمین کی مہکتی رنگینیوں کا عکس پیش کرتی ہیں۔ بلکہ شعری حیثیت سے بھی ان چمن در چمن رنگین عکسوں کے سلسلہ میں ایک شاعر پیش پیش ہے۔ جعفر طاہر اور اس میں کلام نہیں کہ وہ یہ رنگین کردار ادا کرنے کے لئے بڑی ہی رنگین صلاحیتیں بھی رکھتا ہے۔ جس طرح اس کا کینواس وسیع ہے اسی طرح اس کا کلام سمین تخیل بھی وسیع ہے اور زبان و بیان کا وہ طلسمی محدب شیشہ بھی جو ان رنگین عکسوں کو اپنی پرکار گرفت میں لاتا ہے۔ ایک شاعر کی حیثیت سے اس کا وصف خصوصی اور مابہ الامتیاز یہی ہے۔ وہ خارجی لطافتوں کا ماہر مرقع نگار ہے۔ اور ان کی نقاشی کے لئے اس کے پاس صد ہا رنگوں سے معمور کلر بکس ہے اور ایسا ذخیرۂ الفاظ، ایسے ذرائع بیان جن کی مثال کم ہی دستیاب ہوتی ہے۔ وہ اپنے دور کا قاآنی ہے اور اسی طرح قادر الکلام بھی۔ جب کبھی وہ بنگال پر قلم اٹھاتا ہے۔ اور اس نے بارہا ایسا کیا ہے۔ ماہ نو کی حد تک متعدد نظموں میں جو ایک سے بڑھ کر ایک فنکارانہ حیثیت رکھتی ہیں، "لہو ترنگ"، "سگن روپ"، "کنول کنڈ"۔ تو اس کا کلام خود سحر بنگال بلکہ اس کا حریف بن جاتا ہے اور ایک نشہ ریز کیفیت پیدا کرتا ہے، اس سحر کا آغاز نظموں کے شگفتہ و رنگین عنوانات ہی سے ہوتا ہے۔ وہ طلسمی دریچے جو مشرقی پاکستان کے حسن منظر کو آشکار کرنے کے لئے آئینہ تصویر نما ہیں۔ مثلاً "لہو ترنگ" کیا ہے۔ شہید بنگالہ، سراج الدولہ کا دلدوز المیہ جس کے خون سے خود اس کے عزیزوں اور قوم کے خود غرض لوگوں نے ہولی کھیلی۔ اور اس کے نتیجہ میں بالآخر قوم کے خون کی ندیاں بھی بہے بغیر نہ رہ سکیں؛ مگر شہیدوں کا خون آخر میں رنگ لایا اور اس سے ایک آزاد ملک، آزاد قوم کی بنیاد پڑی۔ چنانچہ نظم کے آخر میں دور انقلاب کا شاندار منظر دکھائی دیتا ہے۔

خالص شعری اور فنی حیثیت سے "پنچم کے بعد" "سگن روپ" اور "کنول کنڈ" ہماری شاعری میں ایسی افق بوس بلندیوں کی خبر دیتی ہیں جو

عالمی شاعری کی فلک رس بلندیوں کی حریف معلوم ہوتی ہیں۔ یہ فن پارے دراصل ایک وسیع تعمیر کے اجزا ہیں۔ "ہفت کشور" جس میں سات پسندیدہ خطوں کو فرداً فرداً شعری رنگ آمیزیوں اور قلمکاریوں کا جامہ تصویر بنایا گیا ہے۔ اور اس مرقع نگاری کے میدان میں جعفر طاہر کے کم ہی حریف ہیں۔ ہر شاعر کسی ایک بات ہی میں فرد ہوتا ہے۔ جو ممکن ہے کبھی اس کی کمزوری بھی بن جائے۔ جعفر طاہر کا جوہر خاص مرقع کشی ہے۔ وہ خارجی مناظر اور واضح ولائح کوائف کا شاعر ہے اور اس کے لئے اس نے جہاں معلومات کا "دائرۃ المعارف" کے پھیلنے پر ذخیرہ فراہم کیا ہے وہاں قاموس کے پیمانے پر الفاظ کا حیرت انگیز سرمایہ بھی بہم پہنچایا ہے اور ان سب پر حاوی، ایک جہاں گیر دخیل جس کے لئے زمین و آسمان کی تمام وسعتیں تنگ ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان تمام عناصر کی آمیزش سے جو چیز تیار ہوگی وہ کیا ہوگی۔ جعفر طاہر کی شاعری اسی کا شاندار مرقع ہے۔ اس سے کسی داخلی، کسی انفعالی مصوری کی توقع بے سود ہے اور نہ ہر شاعر سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ میر یا غالب ہو۔ بعض خالص انشا پرداز بھی تو ہوتے ہیں۔ جعفر طاہر کی دنیا عشرتِ حواس ہی کی دنیا ہے۔ ایک دوسرا ایپیقورس جو حواس کی تلچھٹ تک میں بے پایاں لذت محسوس کرتا ہے۔ لہٰذا وہ حسی کیف و رنگ اور لطف و رعنائی کی پرچھائیں تک نہیں چھوڑتا۔ اور باریک ترین جزئیات اپنے موقلم کی باریک نوک سے اجاگر کر دیتا ہے۔ مثلاً "پنچم کے بعد" (ماہ نو ستمبر ۱۹۶۰ء) کو ملاحظہ فرمایئے جس میں نظم کا جادو عنوان ہی سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا تعارف یوں کرایا گیا تھا: "چہار درویش کے بعد ہمارا مغنی آتش نفس سات اور کشوروں کے نغمے ترتیب دے رہا ہے۔ صد سرگم، سمپورن۔ یہ نغمہ کشور ششم کا ابتدائیہ ہے جس کا روپ الوپ ہم میں سے کس کے ذہن میں رچا بسا ہوا نہیں؟ اس الاپ میں مغربی پاکستان کے البیلے کوی نے سندر بن کے سندر دیس کا سماں اس کی سندر بھاشا میں کھینچا ہے۔"

یہ حرف بہ حرف صحیح ہے پنچم کے بعد قدرتی طور پر ششم ہی ہی ہو سکتا ہے۔ اور یہ کشور ششم ہی ہے۔ سنگیت کے تلازمے 'الاپ' کی برجستگی ظاہر ہے۔ جعفر طاہر اس لحاظ سے ہمارے تمام شاعروں میں منفرد ہے کہ وہ پلک جھپکنے میں آن جانی سے آن جانی زبان کو جان لیتا ہے۔ چنانچہ وہ ہنگری کی زبان بھی اسی طرح بے تکلفی سے برتتا ہے جس طرح کشمیری پوٹھوہاری۔ پنجابی۔ ملتانی۔ ہندی وغیرہ۔ اور یہ دنوں ہی کی بات ہے کہ وہ بنگلا کو بھی اسی طرح برتنے لگا ہے جیسے شاید خود بنگالی بھی نہیں برت پائے! اور ساتھ ہی اس نے جس طرح پنچم کے بعد اور اس کے بعد کی نظموں میں مشرقی پاکستان کی زندگی اور فضا کے نقشے پیش کئے ہیں ان کی مثال بنگلا کوتا میں بھی دکھائی نہیں دیتی:

رینگتے ناگ، جواں شیر، یہ وحشی چیتے!
سر جھکائے ہوئے ہاتھی کہیں پانی پیتے
دامنی جیسے کوئی چلبلی الھڑ ناری — بجلی
تیلیاں توڑ کے چلمن کی ہنسے جاتی ہو
ہائے ساتی کا نے آنکھوں میں لگایا کاجل

اور اس خوبصورت رنگ ہی رنگ تصور کا جواب تو شاید ہی کہیں دکھائی دے:

"میری دھرتی تو نئی بیٹھی ہے دلہن جس کو
بیاہنے آیا ہے ساون کا رنگیلا راجہ
رنگ میں ڈوب کے آئے ہیں براتی سارے
مونگئے، دھانے پیٹے ہیں سروں سے بادر — بادل
سبز ڈولی کوئی کاندھے نیا جائے دیکھو — لیا
پیچھے پیچھے کوئی دیتا چلا جاتا ہے دُھنی — براتیں پکارنے والا نقیب
"بولو مومن اللہ اکبر
بولو مومن اللہ اکبر
بولو مومن یا نبی، اللہ اکبر
یا رسولؐ اللہ!"

مختار صدیقی کی آوازوں کی پلٹتی گونج اس مدھر سنگیت کے رنگ رس کو اور بھی دوبالا کر دیتی ہے۔ دیکھئے کوی مغربی پاکستان کا ہوتے ہوئے بنگلا بھاشا میں کیا رس گھولتا ہے:

"نیشتھے جائیو، پھولو بنے ہے بھومرا
نیشتھے جائیو پھولو بنے
جالائے چندیر دباتی
جیگے رو روشارا راتی گو

کوئیمبو کتھا سشیشر دشتے، ہے بھومرا

صرف اسی نظم کو لیا جائے تو اس کے متعلق کہنے کو ایک دنیا ہے۔ "سگن روپ" (ماہ نو دسمبر ۱۹۶۰ء) میں لے کچھ اور آگے بڑھتی ہے۔ الاپ کے بعد بڑھت، کوی بھومرا لے کے رس سے مست ہو کر کیا رنگ دکھاتا ہے:-

نیلمیں رنے۔ جھکتے ہوئے بن، مست فضائیں، یہ سگن روپ، گاتی ہوئی دھوپ
تال، تالاب، کنول، کنڈ، بھرے جھنڈ، گھٹا، دھرتی کا پربھاؤ یہ البیلا سروپ
شال میں شالی کے لپٹے ہوئے فردوس، جنوں زار یہ پٹ سن کی ردائیں زرتار
ناریاں، سانوریاں، کامنیاں، جن کے بھرے جوڑوں پہ تقدیر کے پیچاک نثار
کوئی سنتھال کی دوشیزۂ خود سر ہے تو سلہٹ پہ ابھرتا ہوا سورج کوئی
کتنی آکاس مکھی دیویاں، شبھ نام چرن کملیاں، گنج گامنیاں، نندر روئی
ہائے یہ تال یہ توڑے یہ تڑپ کون نرت کار یہ گت ناچتی ہے
ناتو ان میں سے گلا کیا جو کہے کون یہ نادان گمت ناچتی ہے

اور اس کے بعد خالص جعفر طاہری چیز جو اسی کا حصہ ہے اور صرف وہی اس کے گر جانتا ہے:-

ہا یہ بنگال کا ناچ
میری دھرتی کے مدوسال کا ناچ
اُر دھنگ روپ
جیسے چھاؤں دھوپ
نرکھت الوپ
بھجے جگ توبھوپ
کر ڈمک ڈمک گتی ڈامرو باجے
تا ڈھاتا ڈھاتا ڈھا

"کنول کنڈ" میں کوی بنگلا دیش کے اور بھی نت نئے گیت روپ اجاگر کرتا ہے اور ہمارے سامنے اس کے اڑتے ہوئے بادلوں کی پرچھائیوں پر پرچھائیاں یا ہوا کی موجوں سے پدما اور بوڑھی گنگا کی سطح پر ان گنت نرت کار آکاس مکھی شبھ نام چرن کملی، گنج گامنی، نندر روئی لہروں پر لہریں کیا کیا البیلی مدھر گتوں پر ناچتی ہیں۔

مشرقی پاکستان نے جس طرح مغربی پاکستان کے شاعروں کو مسحور کرنا شروع کر دیا تھا اس کی جھلک ہمیں قیام پاکستان کے جلد ہی بعد دکھائی دینے لگی تھی۔ چنانچہ محمود اکبر آبادی کی نظم "مشرقی بنگال کا ملاح" پرانے رنگ میں اس کی ایک پُر لطف مثال ہے۔ اس کے ایک دو بند ملاحظہ ہوں جو موجودہ طوفانوں کے پیش نظر خاص معنی رکھتے ہیں۔ لوگوں کی جواں ہمتی ہی نہیں بلکہ ان کے سربراہوں کی جواں ہمتی پیش نظر تھی:-

وہ ہمارے میگھنا، پدما، کے طغیاں، الاماں
جن کی پہنائی سے، حیرت میں ہے، بحرِ بے کراں
جن کی موجوں سے، ازل کا جوش ہے اب تک عیاں
ان کے طوفاں، لے چکے، سو بار، تیرا امتحاں
تجھ پہ جب بپتا پڑی ہے، اور گھرایا ہے تو
کامرانِ امتحاں سے، سرخ رو، آیا ہے تو
دونوں جانب پاٹ کے کھیت اور وہ دھانی مرغزار
وہ یکایک، ابر گھر آنے سے، منظر کا سنگھار
نرم سایہ اور زیرِ ابر، دریا کا نکھار
تو نے جو دیکھا ہے، مجھ کو بھی دکھا دے ایک بار
وہ تحیر، وہ سکوں، لیکن کہاں سے لاؤں گا
تیری نظروں کا فسوں، لیکن کہاں سے لاؤں گا

ایسے ہی شاعر کے تصور نے مشرقی پاکستان کے ایک دلآویز منظر کا عکس بھی پیش کیا ہے۔ "بوڑھی گنگا کے کنارے شفق کا منظر"۔ وہ کہتا ہے:-

ابر کی کروٹوں میں رنگ، رنگ کی سلوٹوں میں رنگ
ہر خم نو میں طرفہ رنگ، عالم نو سے عقل دنگ
احمر و زعفرانی و زرد و کبود و سرمئی
اخضر و ارغوانی و نیلی و بنفشئی

اور ان بے شمار رنگوں میں ایک رنگ یہ بھی ہے:-

جو رو وطن سے چھوٹ کر قصر ارم کی راہ لی
دُختِ مہاجرِ غریب، تو نے یہاں پناہ لی!

اس شاعر کو بنگال کے حسن جادو نے مسحور کیا ہے وہ شنیدہ زیادہ دیدہ پر مبنی ہے۔ اسی لئے اس میں تخیل کے ساتھ ساتھ واقعیت کا رنگ بھی چوکھا ہے۔ ایک سحر زدہ انسان کی طرح وہ اس کی طرف بار بار رجوع بھی کرتا ہے۔ "مشکیں دوشیزہ کا نغمہ اور پاٹ کا

گیت"۔ غالباً اس کی بہترین چیز ہے۔ یہ نظم واقعی بہت ڈوب کر لکھی گئی ہے:۔

زمیں میری ہے میں بنگال کی گمنام دختر ہوں
مجھے عسرت نے پالا ہے جمالِ ناتمہ پرور ہوں
نہ خضرا ہوں، نہ صحرا ہوں، نہ میں پریوں کی ہمسر ہوں
فسونِ جانفشانی ہوں، تن آزاری کی خوگر ہوں
جسے اب تک نگاہوں نے نہیں پرکھا، وہ جوہر ہوں
نہ ڈالا میری گردن میں کسی نے ہار سونے کا
یہ لو میں نے اگایا ہے زمیں سے تار سونے کا
جدھر نظریں اٹھاؤں پنکھیوں کی چہل ہے ہرسو
مرے اڑتے کھلونے ہیں، پلو نٹے، کوکلا تیہو
پپیہے کی وہ پیہم پی کہاں، کوئل کی وہ کوکو
فضا طوطوں سے پُر اور ڈالیوں پران گنت لیچو
مجھے مدہوش سا رکھتی ہے پکے مور کی خوشبو

انہیں خوشنواؤں میں ایک اور خوشنوا بھی شامل ہے۔ صہبا اختر جیسا ہی زرکار تخیل رکھتا ہے۔ اس چھوٹی سی نظم "پاتال" سے قطع نظر جس میں اس نے مشرقی پاکستان کے بعض پہلوؤں کے علاوہ زین العابدین کی ایک تصویر "موگھ قبیلے کی لڑکی" کا تذکرہ بھی کیا ہے، اس نے ایک طویل نظم "ملکۂ برشگال" بھی لکھی ہے۔ جسے مشرقی بازو کی برکھا کا سراپا کہنا چاہیئے۔ ایک جیتی جاگتی تمثیل۔ اسی کے پس منظر میں حالیہ طوفانوں کا کس بل بھی ہے جو نظم میں اور بھی گہرائی، پہنائی اور گمبھیرتا پیدا کر دیتا ہے۔ صنف قدیم ہونے کے باوجود رنگ و آہنگ اور تصور بالکل جدید ہے:۔

اک عالم برق و آب دیکھا ۔۔۔ کل رات عجیب خواب دیکھا
اڈھے ہوئے چار سو فضائیں ۔۔۔ ظلمت کی ہزار ہا ردائیں
جنگل کی دھاڑتی ہوائیں ۔۔۔ صحرا سے اٹھی ہوئی بلائیں
یکبار گھری ہوئی گھٹائیں ۔۔۔ ہر سمت بلا کی شائیں شائیں
پانی وہ برس رہا تھا چھاجوں ۔۔۔ بیزار تھی روح جس کے ہاتھوں
ایسے میں کڑک کر ایک بجلی ۔۔۔ یوں صحن میں میرے جھم سے اتری

اک پل میں دل و نظر کو روندا
نس نس میں اتر گیا وہ کوندا!

طوفان کا نقشہ کس قدر زوردار یعنی طوفانی ہے:

اب موت کا راگ ہے چھما چھم ۔۔۔ ہر سمت چھڑا ہوا ہے ماتم
اک وحشتِ مرگ زاد ہرسو ۔۔۔ ہے ہلۂ برق و باد ہرسو
پانی نے ادھر کسے شکنجے ۔۔۔ بجلی نے ادھر چھبوئے پنجے!

تُن تو نے اٹھائے ہیں وہ طوفاں
ملّاح بچے نہ جن سے دہقاں

انہی نغمہ دروں میں ایک جمیل الدین عالی بھی ہیں جس نے دوہوں کے درپن میں مشرقی پاکستان کی بڑی اچھوتی اور من بھاتی جھلکیاں پیش کی ہیں۔ اس مختصر پیمانے پر تصویر کشی کے برعکس رفیق خاور زیادہ وسیع کینوا اس پر مرقع کشی کرنے والے یگانہ روزوں میں شامل ہے۔ چنانچہ عرصہ ہوا اس نے اپنی طویل نظم "سرود باقی" میں پاکستان کے مختلف حصوں کا نقشہ ان کی سب سے نمائندہ چیزوں کے ضمن میں پیش کیا تھا اور مشرقی پاکستان کی سب سے نمایاں چیز آبِ رواں سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے! یہ مرقع بہت طویل ہے اس لیئے اس کو بجنسہ پڑھا جائے تبھی اس کا صحیح کیف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مشرقی پاکستان کے دریاؤں کی بے اندازہ لمبائی کو پیش نظر رکھتے ہوئے نظم کو بھی قصداً طویل بنایا گیا ہے اور یہ آبِ رواں کی لہکتی چہکتی بولی میں مشرقی پاکستان کی زندگی ہی نہیں سمو دی گئی بلکہ تازہ ترین ترقیات کی طرف نہایت بلیغ اشارے بھی ہیں (ملاحظہ ہو ماہِ نو خاص نمبر بابت اگست ۱۹۵۵ء)۔

اردو شاعری نے جہاں چند ہی سال کے مختصر عرصہ میں مشرقی پاکستان کے اس قدر گوناگوں، لطیف اور اچھوتے پہلوؤں کا احاطہ کر لیا ہے وہ اس کے لئے باعثِ ناز ہے اور ہمارے دیس کے اس حصّہ کو قریب تر لانے اور مانوس کرانے میں بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے۔ لیکن اس عکاسی کے علاوہ خود بنگلا ادب کے بھی کتنے ہی شہ پارے ہیں جو اردو شاعری کے دامن میں جگہ پا چکے ہیں۔ ان کی کیفیت جداگانہ ہے اور الگ تعارف کی متقاضی۔ مشرقی پاکستان کی جس شعری عکاسی کا یہاں سرسری تعارف کرایا گیا ہے اگر اس کا ٹیپ کا بند کوئی چیز ہو سکتی ہے تو وہ اُس کوی ہی کے یہ اشعار ہیں جس نے شروع شروع میں اس گیت کا الاپ پیش کیا ہے:

(باقی صفحہ ۱۲۳ پر)

مغربی پاکستان بنگلا کے آئینہ میں

یونس احمد

"مغربی پاکستان کی دوشیزاؤں کے نرم و نازک گلے سے چکی پیستے وقت سریلے نغموں کا جو آبشار پھوٹتا ہے، وہ دور دراز مشرقی پاکستان کی اوکھلیوں کے ترنم کے ساتھ گھل مل کر جامدانی آنچلوں کا روپ دھار رہا ہے کشمیری شالوں کے رنگ برنگ شامیانوں کے سائے میں تربوز کی قاشوں کے رنگ میں جو غزلیں ڈھلتی ہیں ان کی شیریں لہریں دور مشرقی پاکستان سے جا جا کر ٹکرا رہی ہیں۔ ہم مشرقی پاکستان کے گل بوٹوں سے مزین سوزن کاری کے شاہکاروں پر دور دور تک پھیلے ہوئے دھان کے کھیتوں کی ہریالی کا تحفہ لے کر آتے ہیں۔ آم اور کٹھل کے گھنیرے سایوں میں کسانوں کی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں میں پروان چڑھنے والی سادہ اور بے لوث محبت، اور سرسوں کے کھیتوں میں ارغوانی مٹر کے پھولوں سے سجی ہوئی رنگین کہانیوں کی روپ مالا لے کر آئے ہیں۔" (کوی جسیم الدین: اقتباس خطبۂ صدارت پاکستان رائٹرز کنونشن کراچی)

پاکستان کے دونوں بازوؤں کے درمیان ہم آہنگی و مفاہمت پیدا کرنے کے لئے سیاسی اعتبار سے جو کچھ ہوا وہ تو ہوا ہی ہے لیکن ادبی و تہذیبی لحاظ سے بھی کم کوششیں نہیں کی گئیں۔ اس سلسلے میں ادیبوں کی کوششیں قابل ستائش ہیں۔ انہوں نے افسانوں، نظموں اور ترجموں کے ذریعے ایک بازو کے طرز معاشرت، اس کی تہذیب، اس کی زبان اس کے خیالات و تصورات کو دوسرے بازو کے لوگوں تک پہنچایا۔ مغربی پاکستان کے عوام مشرقی پاکستان سے واقف ہوئے اور مشرقی پاکستان کے عوام مغربی پاکستان سے۔ یہ کام پاکستان بننے کے بعد ہی سے شروع ہو چکا تھا اور جب سے اب تک برابر جاری ہے۔ ادیب و صحافی ایک بازو سے دوسرے بازو کا دورہ کرتے ہیں اور اپنی آنکھوں سے وہاں کی زندگی کا بھرپور مطالعہ کرتے ہیں اور اس طرح ان کے دلوں میں جذبۂ حب الوطنی تیز تر ہوتا ہے اور وہ مسرت سے پکار اٹھتے ہیں: "اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے"۔ جس طرح آج مغربی پاکستان میں جسیم الدین، غلام مصطفےٰ، بے نظیر احمد، فرخ احمد، صوفیہ کمال، ابوالکلام شمس الدین، ولی اللہ اور شوکت عثمان معروف ہیں اس طرح مشرقی پاکستان کا بنگلا اد علامہ اقبال، حفیظ جالندھری، فیض احمد فیض، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی، منٹو، شوکت صدیقی، شفیق الرحمٰن، ابراہیم جلیس، ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کی تخلیقات کے ترجموں سے مالا مال ہو رہا ہے۔ اس طرح نہ صرف ہمارا ادب اردو اور بنگلا کے گنجہائے گرانمایہ سے اپنا دامن بھر رہا ہے بلکہ دونوں زبانوں کے جاننے والے ایک دوسرے کی تخلیقات سے واقف ہو رہے ہیں۔ جسیم الدین اب مغربی پاکستان کے لئے اجنبی نہیں رہے۔ اردو داں طبقہ ان سے اچھی طرح روشناس ہو چکا ہے۔ اس طرح مشرقی پاکستان میں فیض انجان نہیں ہیں۔ وہ جب بھی مشرقی پاکستان جاتے ہیں ان کے اعزاز میں مشاعرے ہوتے ہیں اور بنگلا ادیب و شاعر ان کے کلام سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

اسی طرح ہمارے وہ ادیب و شاعر جو پاکستان کے دونوں بازوؤں کا دورہ کرتے ہیں، اپنے تاثرات بھی قلمبند کرتے ہیں ان کے تاثرات کا مطالعہ کر کے ہمیں بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس ڈھنگ اور نہج سے سوچ رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان کے بہت سے ادیب و شاعر مغربی پاکستان کا دورہ کر چکے ہیں۔ ان میں سے بعض نے دلچسپ

انداز میں اپنے تاثرات پیش بھی کئے ہیں۔ ابراہیم خاں مشرقی پاکستان کے جانے پہچانے مزاح نگار ہیں۔ انہوں نے بے شمار چھوٹے چھوٹے مزاحیہ افسانے لکھے ہیں اور ان کا موضوع زیادہ تر مغربی پاکستان رہا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ انہوں نے پاکستان کے اس بازو کا نہ صرف دور دور تک دورہ کیا ہے بلکہ یہاں کی زندگی کا ہر پہلو ان کی ژرف بیں نگاہوں میں محفوظ ہے۔ ان کا عظیم ترین کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے بنگلا ادب کو مغربی پاکستان کی زندگی سے روشناس کرایا ہے۔

گذشتہ سال ماہِ نو (بنگلا) میں ان کا دلچسپ سفرنامہ شائع بھی ہوا ہے، عنوان ہے "سندھو ربھتے"۔ اس سفرنامے میں نہ صرف انہوں نے سندھ کی پرانی عظمت و تہذیب کو اجاگر کیا ہے بلکہ اس کے زبان و ادب کے گوہر پاروں سے بنگالی عوام کی معلومات میں اضافہ بھی کیا ہے۔ اس سفرنامے کے چند اقتباسات یہاں پیش کئے جاتے ہیں تاکہ ابراہیم خاں کے خیالات کا اردو داں طبقہ کو بھی علم ہو سکے۔

"ٹھٹھہ اس سے پہلے بھی آ چکا ہوں لیکن تب اور اب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کل جہاں دور دور تک کھلا اور کشادہ میدان نظر آتا تھا آج وہاں نئے نئے مکان دیکھے۔ آبادی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ نئی نئی صنعتیں ابھر رہی ہیں۔ پہلے یہاں مشرقی پاکستان کا ایک ہی فرد آباد تھا آج یہ تعداد بڑھ کر چالیس تک پہنچ چکی ہے۔ یہ لوگ کم سرمایہ کا کاروبار کرتے ہیں اور سندھی زبان بھی بولنے لگے ہیں۔"

"حیدرآباد سے روانہ ہونے کے بعد سب سے پہلی منزل غزوہ میں کی۔ اس نام سے ظاہر ہوتا تھا کہ ماضی میں کبھی یہاں جنگیں ہوئی ہیں۔ ماضی میں جنگ کا ہونا کوئی انہونی بات نہ تھی۔ ملک کے مختلف علاقے اس آگ کی لپیٹ میں آتے رہتے تھے۔ آج انسان اپنی تاریخ کو فراموش کر چکا ہے لیکن داستانوں، حکایتوں اور لوک سنگیتوں میں غزووں میں غازیوں کی جنگوں کی یادیں اب بھی محفوظ ہیں۔"

میراں شاہ نے مجھ سے کہا۔ "کچھ دن پہلے مشرقی پاکستان کے تقریباً ایک سو کاشتکار غزوہ سے چند میل کے فاصلے پر آ کر بس چکے ہیں اور انہوں نے کاشتکاری بھی شروع کر دی ہے۔ میں بہت خوش ہوا..... غزوہ میں کئی سندھیوں سے تعارف ہوا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں مشرقی پاکستان کا مسلمان ہوں اور ان کے حالات معلوم کرنے کے لئے اتنے دور دراز کا سفر طے کر کے آیا ہوں تو ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ انہوں نے گرم جوشی سے مصافحے کئے اور ہاتھوں کو بوسہ دیا۔"

"غزوہ سے ہم بلڑی آ گئے۔ یہاں سندھ کے عظیم صوفی شاعر، شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے پردادا شاہ عبدالکریم کا مزار ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ شاہ عبدالکریم اس علاقہ کے بہت بڑے ولی گذرے ہیں۔ کچھ لوگوں نے تو یہ بھی کہا کہ شاہ عبدالکریم ہی نے سب سے پہلے سندھی زبان میں تصوف پر شاعری کی ہے..... اس مزار سے کچھ پرے شاہ عبداللطیف نے اپنے ایام جوانی میں چلہ کشی کی تھی۔"

"میں یہاں کے ہاریوں سے بھی ملا اور ان سے باتیں کیں۔ ان کی بستیوں میں گیا مگر ان کی ناگفتہ بہ حالت کو دیکھ کر بڑا دکھ ہوا۔ ان کے دلوں کی تمنائیں ہمیشہ اندر ہی اندر گھٹتی رہیں۔ زمینداروں کے ظلم و ستم کے خوف سے وہ زبانیں نہیں کھول سکتے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ انقلابی حکومت کے قیام کے بعد سے ان کی حالت میں تبدیلی آ رہی ہے ورنہ ان کا مستقبل ہمیشہ اندھیر ہی رہتا۔"

ابراہیم خاں نے افسانوی رنگ میں ایک اور سفرنامہ بھی تحریر کیا ہے — "ہاچی۔ ٹھٹھہ۔ مکلی"۔ آغاز اس طرح ہوتا ہے:

"۲۰ اکتوبر ۱۹۵۴ء کی بات ہے۔ طارق نامی ایک نوجوان مجھ سے ملنے سمرسیٹ ہاؤس آیا۔ جب اس نے اپنا تعارف کرایا تو میں پہچان گیا۔ وہ کراچی میں وکالت کرتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "تم اپنے سندھی موکلوں سے کس زبان میں گفتگو کرتے ہو؟"

"سندھی سیکھ لی ہے۔"

"وہ کیسے"

"پرائیوٹ ٹیوٹر مل گئی ہے مجھے!"

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں نے ایک سندھی لڑکی سے شادی کر لی ہے!"

"بہت خوب!" میں نے جواب دیا۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ سندھی کھانا بھی ہضم ہو جاتا ہے؟"

"سندھی کھانے تو بیحد لذیذ ہوتے ہیں۔ مچھلیاں پکانا تو کوئی ان سے سیکھے۔"

"جب مجھے معلوم ہوا کہ ٹھٹھہ میں ایک بنگالی نے مستقل قیام کر لیا ہے اور اپنا ذاتی مکان بھی بنا لیا ہے تو مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ اس کا نام معین اللہ ہے۔ میں اس سے ملنے گیا۔ عمر کوئی چالیس

کے قریب ہوگی۔ اس کا وطن کبھی سلہٹ تھا۔ جہاز میں کام کرتا تھا۔ ایشیا، یورپ اور امریکہ کے بیشتر شہر گھوم آیا ہے۔ تقسیم ملک کے وقت وہ بمبئی میں تھا وہاں سے کراچی آگیا۔ بعد میں ٹھٹھہ میں سکونت اختیار کرلی۔ ہوٹل کھولا اور یہیں کا ہو رہا۔ وہ بہت خوش ہے۔ سندھیوں کے اخلاق کا مداح ہے۔ سب اس سے محبت کرتے ہیں۔ وہ یہاں عین اللہ بنگالی کے نام سے مشہور ہے۔ فرصت کے اوقات میں بحث و مباحثہ کے لئے یہاں کے سندھی احباب اس کے گھر میں جمع ہوتے ہیں۔"

ابراہیم خاں کے علاوہ اشرف الزماں نے بھی مغربی پاکستان پر افسانے اور سفر نامے لکھ چکے ہیں۔ اشرف الزماں بنگال کے افسانہ نگاروں میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بہت سے افسانے اردو میں منتقل ہوچکے ہیں۔ وہ جب ملازمت کے سلسلے میں پشاور میں تھا یہاں کے "قصہ خوانی بازار" کے گرد و پیش سے وہ بیحد متاثر ہوا۔ چنانچہ "قصہ خوانی بازار" کے عنوان سے اس نے اپنے تاثرات دلچسپ انداز میں بیان بھی کئے ہیں۔ چند اقتباس ملاحظہ ہوں،

"قصہ خوانی بازار" سچ مچ جیسے افسانوں اور داستانوں کا بازار ہے۔ الف لیلیٰ میں جن شہروں کا ذکر ہے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان میں سے کسی ایک شہر کی جھلک یہاں بھی ہے۔ جاڑوں میں جب اونچے اونچے پہاڑوں کے دامن برف سے ڈھک جاتے ہیں تو سوداگران اونٹوں پر سوار اسی بازار میں سامان لاکر فروخت کرتے ہیں۔ وسط ایشیا افغانستان دیر، سوات، چترال غرضیکہ مختلف مقامات سے طرح طرح کے لوگ اس بازار میں جمع ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے پھلوں کی دوکانیں دکھائی دیں گی۔ یہاں بیک وقت جتنے قسم کے پھل دستیاب ہیں اتنے ہمارے صوبے میں شاید ہی ملتے ہوں۔ پھلوں کے علاوہ پہاڑی علاقوں کے پشمینی کپڑے بھی اس بازار میں بکتے ہیں۔ چترال اور سوات کے کپڑوں کے علاوہ کابلی چپلوں کی بھی کھپت آتی ہے۔ میرے خیال میں "قصہ خوانی بازار" میں سب سے زیادہ چپل کی فروخت ہی سے آمدنی ہوتی ہے۔"

"قصہ خوانی بازار میں کابلی، چترالی، کافرستانی، بلوچی، پشاوری سب ہی نظر آتے ہیں۔ ان کی زبانیں مختلف، پوشاک مختلف، طور طریقے مختلف ہوتے ہیں۔"

"یہاں سرائیں اور ہوٹل بھی بکثرت ہیں۔ جاڑوں کا موسم آتا ہے تو سرائوں میں سبز چائے کی مانگ بڑھ جاتی ہے۔ سبز چائے میں دودھ نہیں ڈالا جاتا۔ الائچی کے دانے ڈال دیئے جاتے ہیں۔ یہاں کی مرغوب غذا ہے موٹی موٹی روٹی اور کباب۔ اور پھر کھانے کے بعد حقے کا کش!"

"قدیم زمانے میں جب آس پاس کے مقامات سے سوداگروں کا قافلہ یہاں رکتا تھا اور بہت سے سوداگر آپس میں ملتے تھے تو اپنے اپنے گاؤں اور بستیوں کی کہانیاں بیان کرنا شروع کر دیتے تھے۔ اسی مناسبت سے اس بازار کا نام غالباً قصہ خوانی بازار پڑ گیا۔ اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ رات کے وقت جب ساری دکانیں بند ہو جاتی ہیں اور چاروں طرف سناٹا ہو جاتا ہے تو پھر حسن و عشق اور جن اور پری کی داستانیں شروع ہو جاتی ہیں بعض سوداگر تو کہانی کی کوئی کتاب کھول کر پڑھنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی یہ سلسلہ اتنا دراز ہو جاتا ہے کہ مشرق کی سمت اجالا پھیلنے لگتا ہے۔ پھر بھی ان کا انہماک ختم نہیں ہوتا۔"

جسیم الدین مشرقی پاکستان کا اس وقت سب سے بڑا شاعر ہے۔ اس نے اپنے گیتوں سے دیہاتوں کی فضاؤں میں ان گنت قوس و قزح بکھیرے۔ اس نے گاؤں کی البیلی اور کامنی ناریوں کے گھونگھٹ میں چھپے ہوئے روپ کو دیکھا اور پھر اس روپ کو اس نے جادوماں بنا دیا۔ اس کے دل میں بیک وقت پاکستان کے دونوں بازوؤں کی دھڑکنیں سمائی ہوئی ہیں۔ پاکستان رائٹرز کنونشن کے موقع پر اس نے جو خطبۂ صدارت پڑھا تھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغربی پاکستان کے بارے میں اس کے خیالات کیا ہیں۔ اس نے کہا تھا:

"اس وقت مجھے مشرقی پاکستان کے دریائے پدما، جمنا، میگھنا دھلیشوری، مدھومتی اور سیتا لکھیا کے خوشگوار تموج سے تخلیق شدہ بھٹیالی گیتوں کے ساتھ ساتھ جہلم، بیاس اور سندھ کے کنارے بسنے والے کاشتکاروں کی جھونپڑیوں سے اٹھتے ہوئے گیتوں کی گنگناہٹوں کا ایک حسین امتزاج نظر آ رہا ہے ......"

جس طرح مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان کے مہوا، کاجل ریکھا، آئینہ بی بی، بھیلوا اور دوسری لوک کہانیوں سے روشناس ہو چکا ہے اسی طرح مشرقی پاکستان بھی سسی پنوں، مومل رانو، ہیر رانجھا جیسی رومانی داستانوں سے لاعلم نہیں۔ ترجمے نے اس کام کو اور زیادہ وسعت دی ہے۔ اردو افسانے نہ صرف بنگالی میں منتقل ہوئے بلکہ کئی ناول بھی بنگلا میں ترجمہ ہو کر مقبول

ہو چکے ہیں۔ اس طرح اردو شاعروں کے کلام بھی وقتاً فوقتاً منتقل ہوتے رہتے ہیں اور ادارۂ مطبوعات پاکستان (کراچی) نے چند سال پہلے اردو کے منتخب افسانوں کے بنگلا تراجم کا مجموعہ شائع کیا۔ اس میں سعادت حسن منٹو، غلام عباس، قدرت اللہ شہاب، قرۃ العین حیدر، احمد علی، ابوالفضل صدیقی، ممتاز مفتی، ممتاز شیریں اور محمود ہاشمی کے افسانے شامل ہیں۔ اس مجموعے کو مشرقی پاکستان میں خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اطہر رحمٰن اور نعیم البصیر نے بھی اردو کے منتخب افسانوں کے تراجم کا مجموعہ دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ ان تراجم سے کم از کم اتنا فائدہ تو ہوا ہے کہ مشرقی پاکستان کا ادبی حلقہ مغربی پاکستان کے رجحان کو سمجھ چکا ہے۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ افسانے ہماری تہذیبی زندگی میں بہت حد تک اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور پھر افسانوں میں تو فرد اور قوم کے خیالات و احساسات کا پرتو ہوا کرتا ہے۔ منٹو مشرقی پاکستان میں بہت مقبول ہے۔ اس کی نشتر زنی نے بنگلا ادب کو ایک آہنگ دیا ہے۔ اس کی بے باکی بنگال کی طبیعت کے عین مطابق ہے یہی وجہ ہے کہ منٹو کی تحریر کی جھلک بہت حد تک بنگال کے نوجوان افسانہ نگار علاء الدین الآزاد کے یہاں ملتی ہے۔ منٹو کے علاوہ غلام عباس کے افسانے بھی بنگلا میں ترجمہ ہو کر مقبول عام ہو چکے ہیں خصوصاً ان کے "آنندی" اور "اودرکوٹ" کو بہت پسند کیا گیا۔ جاڑے کی چاندنی" کے بیشتر افسانے جس میں سے کئی ایک ماہ نو اردو میں پہلے چھپ چکے تھے اب بنگلا میں منتقل ہو چکے ہیں ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کے بھی ادھر کئی افسانے بنگلا میں ترجمہ ہوئے ہیں۔ اردو افسانوں کو بڑی تیزی سے بنگلا میں منتقل کرنے کا کام ہو رہا ہے لیکن اردو ناولوں کی طرف (سوائے "توبۃ النصوح" کے غالباً ابھی تک زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔

اقبال کی "رموز بیخودی" کے ترجمے کے علاوہ "شکوہ و جواب شکوہ" کا ترجمہ بہت پہلے کیا جا چکا ہے۔ بانگ درا اور بال جبریل کے بھی بہت سے ترجمے ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ یہ خدمت "ماہ نو" بنگلا بحسن و خوبی انجام دے رہا ہے۔ ہر ماہ اقبالؒ کے کلام کے لئے ایک صفحہ وقف رہتا ہے۔ حالی کی مسدس کا ترجمہ بھی مختلف دوروں میں مختلف لوگوں نے کیا ہے۔ مسدس حالی بنگال میں "شکوہ و جواب شکوہ" کی طرح بیحد مقبول ہے۔ جب مسلمان آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے اس وقت مسدس حالی اور "شکوہ و جواب شکوہ" کے بنگالی ترجمے تقریباً ہر جلسے میں پڑھے جاتے تھے۔ جن سے بنگالی مسلمانوں کے دلوں میں نئی امنگیں بیدار ہوتی تھیں اور وہ اپنے اندر نئے ولولے اور حوصلے پاتے تھے۔ غالب کی چند غزلوں اور فیض کی نظموں کے بنگلا ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔

غرضیکہ پاکستان کے دونوں بازوؤں میں ایک ہزار میل کا فاصلہ برائے نام رہ گیا ہے۔ ہم تمدنی اور ذہنی اعتبار سے ایک دوسرے کے بہت قریب آچکے ہیں۔ ایک کا دکھ دوسرے کا دکھ ہے۔ ایک کی خوشی دوسرے کی خوشی ہے۔ مغرب اور مشرق کے فاصلے کو کم کرنے اور اجنبیت کو دور کرنے کے سلسلے میں اردو اور بنگلا کے شاعر و ادیب نے عظیم اور گراں بہا خدمت انجام دی ہے۔ اگر یہ ادیب و شاعر ملک کے دونوں حصوں میں جاکر وہاں کی تہذیب و معاشرت، وہاں کی زبان وہاں کے ادب کا مطالعہ نہ کرتے اور پھر اپنی تخلیقات عوام تک نہ پہنچاتے تو یہ ہم آہنگی اور مفاہمت جو آج نظر آرہی ہے نظر نہ آتی۔ ترجمے نے بھی اس کام کو اور آگے بڑھایا ہے۔ ترجمے ہی کے ذریعے مشرقی پاکستان کے بنگلا بولنے والے اقبالؒ کو پہچان سکے، حالی کا مطالعہ کر سکے۔ غالب اور فیض کو پا سکے۔ ترجمے ہی کی مدد سے اردو کے شاہکار افسانوں کو بنگلا داں عوام تک پہنچایا گیا اور اب وہ منٹو، غلام عباس شوکت صدیقی، احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ، خدیجہ، قرۃ العین حیدر دوسرے لکھنے والوں اچھی طرح پہچان گئے ہیں۔ اردو ادب بنگال میں اپنی جگہ پا چکا ہے اور امید ہے کہ اس ادب کی مانگ برابر بڑھتی ہی جائے گی۔

خدا - مفرد یا مرکّب

سیّد قدرت نقوی

حیات انسانی کی اقدار تغیّر پذیر ہیں اور یہی تغیّر، ترقی و تنزّل کا سبب ہوتا ہے۔ گردش زمانہ کے سبب کبھی کوئی قدر تنزل کا شکار ہو کر ختم ہو جاتی ہے۔ اور کبھی ترقی کے مدارج طے کرتی ہوئی بام عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ پھر ہر قدر کے شعبہ ہائے مختلف میں یہی اصول جاری و ساری نظر آتا ہے۔ ایک قدر کے مختلف شعبوں میں سے بعض باقی رہ جاتے ہیں اور بعض فنا ہو جاتے ہیں۔ فنا ہو جانے والوں کی جگہ انسانی تجربہ پُر کرتا رہتا ہے اور اس کا نعم البدل تلاش کر لیتا ہے جس میں زیادہ افادیت مقصود ہوتی ہے۔ انہی تجربات پر تہذیب، تمدن اور ثقافت کی عمارت قائم ہوتی ہے، جس قوم کے افراد نے زیادہ تجربات کئے ہوں اس کی تہذیب، تمدن اور ثقافت زیادہ ترقی یافتہ ہوتی ہے۔ یہ تجربات عملِ تعلیم و تقلید کے ذریعہ ایک قوم سے دوسری قوم اور ایک ملک سے دوسرے ملک تک پہنچتے رہتے ہیں۔ ہر نئی جگہ ان تجربات کی ہیئت، مزاج اور عمل میں اس قوم اور ملک کے مطابق تبدیلی ہو جایا کرتی ہے۔

انسان کی تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی اقدار میں زبان ایک ایسی قدرِ مشترک و منفرد ہے کہ ان میں شامل ہوتے ہوئے بھی ان سے الگ تھلگ رہتی ہے اور ان سب کی ایک حد تک بہت بڑی آئینہ دار بھی ہے۔ زبان کے زوال و ارتقا میں قوم و ملک کے زوال و ارتقا کی داستانیں پوشیدہ ملتی ہیں۔ اگر ایک لفظ کے لسانی تغیّر و تبدل، ترقی و تنزل، رواج و ترک کا سراغ لگایا جائے تو وہ اپنے ہر عہد کی ایک تاریخ پیش کر دیتا ہے۔

اس کائنات کا ذرّہ ذرّہ حرکت کے زیر اثر ہے اور اسی حرکت پر زوال و ارتقا کا انحصار ہے۔ ہر زبان کے الفاظ بھی حرکت کے زیرِ اثر زوال و ارتقا کے پابند ہیں۔ دیکھئے انسان نے تجربہ کیا، گنّے کے رس میں چاول ڈال کر کھیر پکائی۔ کسی نے "رس کی کھیر" کہا، کسی نے "رس چاول" کہہ دیا۔ "رس کی کھیر" لسانی اصول کے ماتحت رواں دواں رہا، لیکن "رس چاول" کہنے میں۔ زبان کو ٹھوکر کھانا پڑتی تھی، تجربہ نے ساتھ دیا، "چ" کو ساقط کر کے نہایت شستہ اور رواں لفظ "رساول" زبانوں پر جاری ہو گیا اور ایسا گھلا ملا کہ اب مرکب کا تصور بھی نہیں ہو پاتا۔ "انوکھا" کون کہہ سکتا ہے کہ مفرد نہیں ہے، لیکن ذرا غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ یہ "انوکھا" "ان دیکھا" (اَن دیکھا) تھا۔ لسانی تغیّر نے درمیان میں سے "ی" کو اڑا دیا اور انوکھا بنا دیا!

بعض الفاظ ایسے ہیں کہ جو اپنی قدامت کے لحاظ سے زمانۂ قبل تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں، اور جن کے متعلق صحیح طور سے نہیں کہا جا سکتا، کہ ان کا استعمال کس زمانہ سے ہے۔ ان میں لہجہ، املا اور معنی میں تغیّر بھی ہوتا رہا ہے تب کہیں جا کر آج مروّجہ صورت میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ ان کا سکہ قدیم سے لے کر آج تک چلتا رہا اور نہ معلوم کب تک چلتا رہے گا۔

اہل الرائے کے نزدیک "اردو" لشکری زبان ہے جس طرح کسی لشکر میں مختلف قوموں، قبیلوں اور علاقوں کے افراد شریک ہو کر آپس میں گھل مل جاتے ہیں۔ اسی طرح "اردو" میں بھی مختلف زبانوں کے الفاظ ایسے گھلے ملے اور رچے بسے کہ آج وہ اسی زبان کے بن گئے ہیں۔ اس زبان میں ان کا اپنا مقام ہے، خواہ وہ اصل زبان کے مطابق ہو یا اس سے مختلف۔ بعض میں لہجہ، املا اور معنی کے اعتبار سے بڑی اہم تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ مثلاً "تیار" جس میں املا اور معنی کی تبدیلی نہایت واضح ہے۔ اس عربی الاصل لفظ کا املا "طیار" طائے حطّی سے تھا یعنی بہت اُڑنے والا۔ باز داروں کے ذریعہ فارسی میں مستعد اور آمادہ کے معنی میں استعمال ہوا۔ وہیں سے اردو میں آیا۔

"خدا" بہت ہی قدیم لفظ ہے۔ تقریباً آٹھ ہزار سال سے زبان زدِ خاص و عام ہے۔ لغت نویسوں سے اس کے معنی اور تشریح میں کچھ لغزشیں ہوئی ہیں۔ جہاں قیاس سے کام لیا ہے ٹھوکر کھائی ہے۔ تمام

---

[1] خدا معلوم! (مدیر)

منظر: حسن محتاج بیاں ہے کہ نہیں؟

دنیا کی محفلوں میں

پاکستان کے جوہر قابل اپنے اپنے وطن ہی میں نام پیدا کرنے پر مطمئن نہیں بلکہ اس کا نام روشن کرنے اور ساری دنیا میں آب و تاب پیدا کرنے کے بھی خواہاں ہیں۔

انور جلال شمزہ اور اس کے ہم دوش نادرے ہنر دستے نمونہ از خروارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

گلدستۂ خودرو!

پھول، پتے، گلدان ... سب ہی کچھ
مگر جاں ہے کہ نہیں؟

رہ و رسم آشنائی: (مغرب)
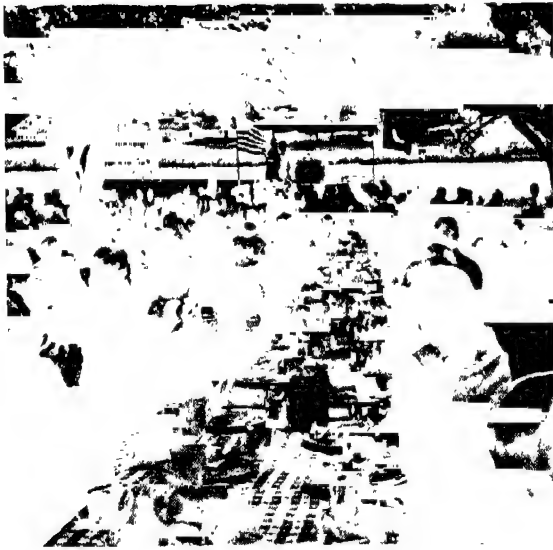
امریکہ کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں مسائل حاضرہ اور موقف پاکستان کی مدبرانہ توضیح

نائب صدر امریکہ، مسٹر جانسن کی طرف سے اپنے وطن
ٹیکساس میں باربیکیو ظہرانہ

(دائیں سے بائیں طرف): مسٹر کینیڈی صدر امریکہ، بیگم اورنگزیب (صاحبزادی صدر ایوب)، مسز کینیڈی، اور صدر پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان

نمائندگان صحافت سے خطاب، جس کو ایک منفرد نوعیت کی تقریر تسلیم کیا گیا
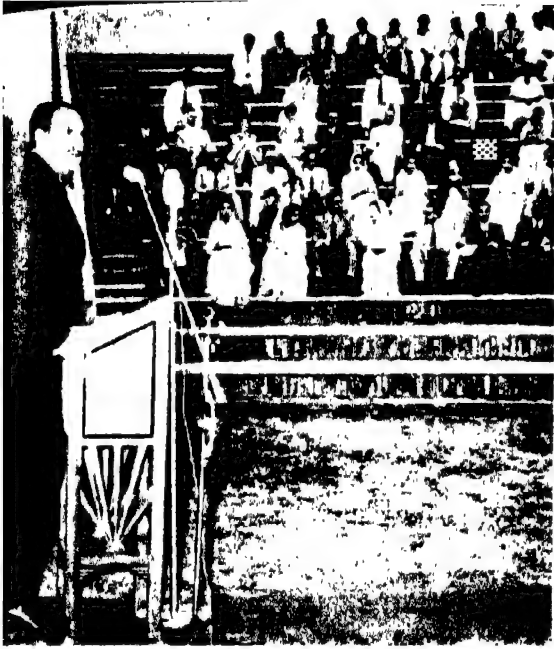
"قیاس کن زگلستان من بہار مرا"

مشرقی و مغربی پاکستان میں فنون لطیفہ کے نغمہ گر فروغ و ترقی کی جھلک اسٹیج کی شکل میں -

دھاکہ میں آج بھی اسٹیج اور ڈرامہ کا وہی ذوق و شوق ہے جو کل تھا اور اس کے گونا گوں مظاہرے اس کی زندگی کا لازمی جز اور شبانہ روز کی سرگرمیوں میں شامل ہیں -

اسی ذوق و شوق کی صدائے بازگشت - مغربی پاکستان میں کھلے تھیٹر کا افتتاح : صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان

راولپنڈی کی کھلی فضا کے لئے کھلے تھیٹر کا قیام مغربی پاکستان میں اسٹیج و ڈرامہ سے روزافزوں شغف کی ایک خوش آئند علامت ہے اور صدر پاکستان کے ہاتھوں اس کا افتتاح اس کے لئے موجب برکت۔

"عبداللہ کا کارخانہ" (ایک تمثیل)"

باھی
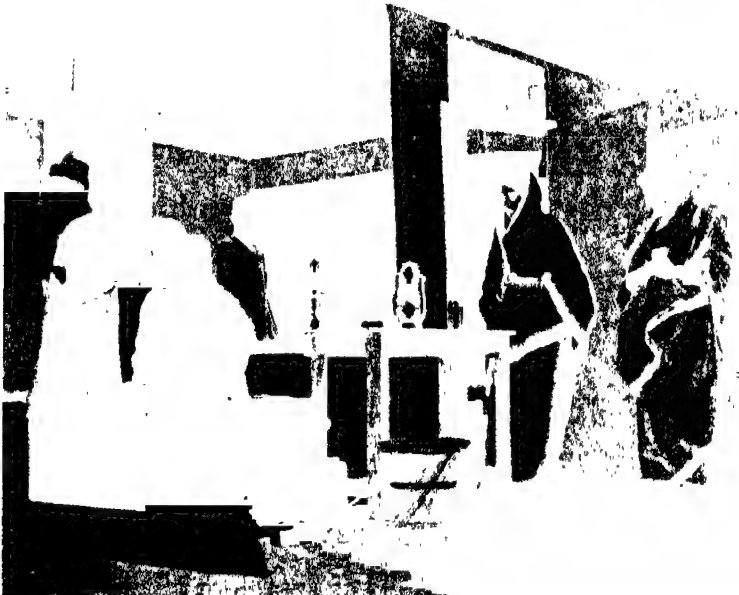
باھی پیر :

ایک اور ڈرامہ کا سین

لغت نویس اس کے حسب ذیل معنی اور تشریح میں متفق نظر آتے ہیں :۔

(۱) اللہ، ذات واجب الوجود (۲) صاحب، آقا، حاکم۔

تشریح :۔ بحالت مفرد بجز ذات باری تعالیٰ کسی دوسری ذات کے لئے استعمال نہیں ہوتا، لیکن کسی اسم کے ساتھ بحالت مضاف معنی ۲ میں استعمال ہوتا ہے جیسے کدخدا، ناخدا، ناکتخدا وغیرہ[1]

لیکن جو حضرات ان معنی اور تشریح سے آگے چل کر قیاس سے کام لیتے ہیں، سخت ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ "غیاث اللغات"، "سراج اللغات"، "فرہنگ عامرہ"، "لغات کشوری"، "فیروز اللغات" وغیرہ میں اس کو "خود" اور "آ" (صیغۂ امر از آمدن) سے مرکب بتایا ہے یعنی خود آنے والا۔ (اسم فاعل ترکیبی[2])۔ ابتدا میں کسی نے یہ قیاس آرائی کی اور بعد والے اس کی کورانہ تقلید کرتے رہے۔ بقول صاحب "غیاث اللغات"، خان آرزو نے "سراج اللغات" میں علامہ دوانی اور امام فخر الدین رازیؒ سے یہ معنی منسوب کئے ہیں[3]۔ گویا اس قیاس آرائی کا سلسلہ ان بزرگوں تک پہنچتا ہے۔ اگرچہ بعض لغت نویسوں نے اس کو مرکب لکھنے سے پرہیز کیا ہے۔ صاحب "جامع اللغات" و صاحب "فرہنگ نظام" نے اس کو مرکب تو نہیں لکھا لیکن مرکب ہونے کی تردید بھی نہیں کی۔ اور صاحب "فرہنگِ نظام" نے تشریح میں کچھ ایسی باتیں بیان کر دی ہیں جو دیگر لغت نویسوں کے بیانات کو تقویت پہنچاتی ہیں۔ لکھتے ہیں :۔

"در عصر اوستائی ذات واجب الوجود را لغہ ([illegible]) و آہورہ ([illegible]) و مزدہ ([illegible]) می گفتند و در عصر ساسانی آہرمزدہ و خدای ([illegible]) و در فارسی اسلامی علاوہ بر الٰہ عربی خدای پہلوی ہم استعمال شد۔ ریشۂ لفظ خدا در اوستا خو ([illegible]) است بمعنی بخودی خود (واجب الوجود) کہ مخلوق دیگری نیست و در سنسکریت سوتہ (स्वत) بہمان معنی است۔ سو (स्व) کہ یک حرف مرکب در سنسکریت است در اوستا و فارسی بہ حرف خ تبدیل میشود[4]"

مؤلف فرہنگ نظام نے خدا کا ماخذ "خو" ([illegible]) قرار دینے میں لغزش کی ہے۔ اس کا ماخذ "خوتای" ([illegible]) ہے۔ جس کے معنی بادشاہ بزرگ (شہنشاہ) ہیں۔ ابتدا میں یہ لفظ بادشاہ کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ سنسکرت کے حرفِ مرکب، "سو" (स्व) کی حقیقت یہ ہے کہ بخلاف اردو، موجودہ فارسی، عربی وغیرہ، سنسکرت اور قدیم فارسی (اوستا و پہلوی) میں بعض لفظ حرف ساکن سے شروع ہوتے ہیں۔ سنسکرت اور اس کے زیر اثر زبانوں میں، جن کا رسم الخط بھی سنسکرت سے ماخوذ ہے۔ یہ اصول رائج ہے کہ ابتدائی حرف ساکن کو نصف لکھتے ہیں جیسے بیاج (ब्याज) یعنی سود۔ اسی طرح قدیم فارسی میں بھی بہت سے الفاظ حرف ساکن سے شروع ہوتے تھے۔ ان کے بعد حرفِ علت استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ملک الشعراء بہار نے لفظ خورشید و خدا کے متعلق لکھا ہے :۔

"در عہد فردوسی "خورشید" کہ ما بروزن "پرسید" ادا میسازیم۔ "خُوَرشیذ" بفتح خا و واو معدولہ و قسمت متمم "شیذ" را مابین شاذ و شید بفتح شین و با ذال معجمہ تلفظ میکردہ اند "خدای" را کہ ما بروزن "شما" ادا مینمائیم در زبان فردوسی "خُوَذای" بواو معدولہ بہ زبان می آوردہ اند[5]"

غالباً مؤلف فرہنگ نظام "خوتای" کو "خو" لکھ گئے ہیں۔ سنسکرت کا سو (स्व) اور اوستا کا خو ([illegible]) باہم متبادل ہو سکتے ہیں۔ لیکن "خوتای" کے معنی واجب الوجود قدیم فارسی (پہلوی یا اوستا) میں نہیں ہیں۔ ملک الشعراء بہار نے سبک شناسی میں کئی جگہ اس کی تصریح کی ہے کہ اس کے معنی بادشاہ کے ہیں۔ علاوہ ازیں قدیم پہلوی کتب میں بمعنی بادشاہ بزرگ (شہنشاہ) استعمال ہوتا رہا ہے۔ "ہفت خدائی۔ اصطلاح کتب سنت پہلوی است یعنی ہفت پادشاہی و نام آن چنین است ...... پادشاہی اند ہاک تازی و فراسیاک تور را در حساب نمی گیرند و نیز در کتب پہلوی عبارت (سہ خذائیہ = سہ خدائی) از برائے مدت پادشاہی اردشیر (بہمن) پسر سفندات (اسفندیار) و دارا و دارای داراپان مستعمل است و اشکانیان را باصطلاح خود کتک خوتای = کدخدا می نامیدہ اند۔ نہ "خوتای = خدای" بمعنی بادشاہ بزرگ (بندھش، شہرہای ایران و غیرہ)[6]" اور کتک خوتای = کدخدا بمعنی حاکم شہر استعمال ہوتا تھا۔ مثال از کارنامۂ اردشیر بابکاں :

"پت کارنامکی ارتخشتر ی پاپکاں آنیتوں پنشت استات کو پس

---

[1] غیاث اللغات ص۱۸۹ فرہنگ عامرہ ص۱۹۶، لغات کشوری ص۱۶۱، فیروز اللغات ص۳۹۴، فرہنگ نظام ص۵۲۵، جامع اللغات جلد دوم ص— [2] غیاث اللغات ص۱۸۹ [3] فرہنگ نظام جلد دوم ص۵۲۵ [5] سبک شناسی جلد اول ص۱۹۳ [6] سبک شناسی جلد اول ص۸ (حاشیہ)

پیج مرگ الکساندری اُرومیک اَیرانِ شتر د۔ ۲۴۰ کتنک خوتای بوذ[1]

(یعنی کارنامہ اردشیر بابکاں میں اس طرح لکھا ہے کہ سکندر رومی کے مرنے کے بعد ایران میں ۲۴۰ فرمانروا ہوئے ہیں)۔

اقتباسات بالا سے یہ بات واضح ہوئی کہ پہلوی میں اس کا تلفظ "خوتای" (سے ۵ سے) ہے۔ حسب قاعدہ ت، ذ سے بدل گئی اور ذال حسب دستور لسانی دال ابجد بن گئی۔ دال اور ذال معجمہ کا مسئلہ فارسی میں بڑا گنجلک ہے۔ علامہ محقق طوسیؒ نے اس مسئلہ کا یہ حل پیش کیا ہے :-

"آنانکہ بپارسی سخن می رانند؛ در معرض دال ذال را نشناسند
ماقبل دے ار ساکن جز "وائے" بود؛ دال است وگرنہ ذال معجم خوانند"

یعنی دال اور ذال معجم کی یہ پہچان ہے کہ اس سے پہلے اگر حرف ساکن حروف علت (ا۔ و۔ ی) کے علاوہ ہو تو دال ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ہو تو ذال، نیز اگر حرف متحرک کے بعد واقع ہو تو بھی ذال ہو گی چنانچہ قدیم زمانہ میں یہی املا رائج تھا۔ قدیم مخطوطات میں یہ التزام برقرار رہا۔ حروف تہجی پہلوی میں ذال کا وجود نہیں لیکن حروف تہجی اوستا میں ذال معجم موجود تھی[2]۔ تاہم بعض کتب پہلوی میں دال اور ذال کی تمیز میں اصول مذکورہ کی پیروی پائی جاتی ہے :

"چیذکُ نَہندرچ ی فرخُوذکیشاں"[3]

یعنی چیدہ اندرز فرخود کیشاں (منتخب نصائح بزرگاں و حکما پیش از زرتشت)

قدیم فارسی املا کی مثال کے لئے تاریخ بلعمی سے یہ اقتباس پیش کیا جاتا ہے :-

"گفتا ایں را بزنداں اندر ہمی دار بتنگ تر جای، تا خذای ایشاں را بدست من باز آرذ۔۔۔ خذای عزوجل داذ بپدر یزدان ازوی بستانذ۔۔۔ خذای اورا عقوبت کنذ۔۔۔۔۔ و من اومیذوارم کی اگر خذای مرا نیرو دھذ تا آں کار بکنم"[4]۔ خذای = خدای، آرذ = آرد، داذ = داد، بستانذ = بستاند، کنذ = کند، اومیذوار = امیدوار، دھذ = دہد میں وہی اصول مذکورہ بالا جاری ہوا ہے اور یہ عمل پانچویں صدی ہجری تک بالالتزام پایا جاتا ہے۔ اس زمانہ کے مخطوطات میں دال اور ذال کی تمیز باقی رکھی گئی ہے۔ اس کے بعد استعمال میں فرق آتا گیا اور آخر میں شاہ عباس اول کے زمانہ سے دال و ذال میں کوئی فرق نہ رہا۔

"ت" کا تبدل ذال معجمہ سے بہت زیادہ ہوا ہے یعنی پہلوی میں اگر ت سے ماقبل حروف علت کے علاوہ کوئی اور حرف ساکن ہے تو دال ورنہ ذال معجمہ سے ت بدل گئی ہے۔ الفاظ ذیل ملاحظہ ہوں :-

اوستا	پہلوی	فارسی قدیم	موجودہ فارسی
ثرَ اِتئونَ	فریتون	فریذون	فریدون
خرَ تُو	خرت	خرَذ	خرد
ہُوَرَ خشَیتَہ	خورشیت	خورشیذ	خورشید[5]

پہلوی کے ان الفاظ کی ت حسب قاعدہ تبدیل ہو کر ذال معجم کی شکل میں لکھی جاتی تھی اور الفاظ ذیل کی ت حسب قاعدہ دال میں تبدیل ہوئی۔ پتیاک = پیدا، پرورتن = پروردن، زرتشت = زردشت، ارتہ شیر = اردشیر[6]۔ مؤلف برہان قاطع نے بھی ت کی تبدیلی دال سے بیان کی ہے۔ مثال تنبورہ سے دنبورہ دی ہے۔ غرض خوتای، خوذای ہوا اور پھر خدای خدا رائج ہوا۔

اوستا میں "خوتای" کی مثالیں بہت ہیں: خوتای نامک = خدای نامہ = شاہنامہ۔ آخر زمانہ میں بعض افراد کا نام بھی پایا جاتا ہے۔ عہد ساسانی کے قاضیوں کا ذکر کتاب "ماتیکان ہزار داتستان" میں کیا گیا ہے۔ ان میں ایک کا نام "خوتای بوذ دبیر" لکھا ہے۔ نیز طبری نے امرائے فارس کے جو القاب لکھے ہیں ان میں "در دان خداہ، بخار اخداہ، چغان خداہ" قسم کے القاب پائے جاتے ہیں جن کا ترجمہ حاکم یا فرمانروا کیا جا سکتا ہے۔

جدید فارسی میں دیوتا کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے :-

"باید دانست کہ کوہ آتش فشاں کہ بزبان ہای اروپائی ولکان نامیدہ می شود (کہ از کلمہ ولکانوس کہ اسم خدای آتش و فلزات است ماخوذ است) و قدمای یونان گمان می کردند کہ ایں رب النوع ہم دکورہ خود در زیر ایں کوہ ہا گزاشتہ و میدمد و ایں آتش از آں جہت بلندی شود"[7]

لفظ خدا بعض لاحقوں کے ساتھ بہ تبدیل معنی استعمال ہوتا رہا ہے۔ جن میں سے بعض متروک ہو چکے ہیں اور بعض رائج ہیں۔ ان میں

---

[1] سبک شناسی جلد اول ص۲۲۳ [2] سبک شناسی جلد اول ص۱۷۹ [3] سبک شناسی جلد اول ص۱۲۲ دمتون پہلوی انگلسار یا طبع بمبئی ص۱۴۱ [4] سبک شناسی جلد دوم ص۱۳ و خزینہ ادب الف اے کورس پنجاب یونیورسٹی [5] سبک شناسی جلد اول از صفحہ ۲۰۱ تا صفحہ ۲۳۰ [6] دستور ادب ص۸۵ ماخوذ از بدنامہ کاوہ" (نسخہ قدیم)

سب سے زیادہ خداوند و خواجہ مستعمل ہیں۔ خداوند میں "وند" علامت تشبیہ ہے کیونکہ ایران میں رواج اسلام کے بعد، لفظ خدا بجائے اللہ استعمال ہونے لگا، اس لئے "خدا" کو بمعنی بادشاہ استعمال کرنے میں کراہیت محسوس ہوئی۔ حالانکہ "خوتای" پہلوی جو خدا کا ماخذ ہے بادشاہ، صاحب، آقا، مدیر، حاکم اور کبھی کبھی فرشتہ کے معنی میں جیسے "ماہ خدای و دریتہ خدای" استعمال ہوتا رہا ہے۔ "وند" لگاکر بادشاہ کے لئے استعمال کرنے لگے، اسی طرح خواجہ میں علامت تصغیر، یزہ، یجہ، یچہ لگائی گئی، خدایچہ بحالت تخفیف خواجہ ہوگیا یعنی خدائی کوچک (چھوٹا بادشاہ)۔ اسی طرح خداوند میں عمل تخفیف ہوتا رہا اور "خاوند" خوند، خواند کا استعمال جاری رہا جیسے لقب سلاطین آل عثمان، خوندکار (خداوندگار)، میرخواند و خاوندشاہ وغیرہ۔[۱] بادشاہان مصر کے لقب خدیو میں بھی یہی عمل جاری نظر آتا ہے کہ خدائی میں واؤ تصغیر کا اضافہ کیا گیا۔ "خدایو" ہوا اور پھر خدیو بن گیا۔ اسی طرح ہمارے یہاں لفظ "خاوند" بمعنی شوہر بھی خداوند کی مخفف صورت ہے خدایگان بمعنی بادشاہ میں گان علامت نسبت ہے۔ یہ علامت کثیر الاستعمال ہے مہرگاں، دہگاں (دہقان) وغیرہ : غالب :

من خداوند خویشتن گویم — عقل گوید خدایگان منست

واضح رہے کہ فارسی میں مختلف علاقوں کے باشندوں کے تلفظ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ "کُرد" خ ساکن واؤ مفتوح سے تلفظ کرتے ہیں۔ "بختیاریاں" خ مفتوح سے، "طبرستانیاں" خ مکسور سے، باقی تمام مقامات پر خ مضموم سے تلفظ ہوتا ہے یعنی "خوتای = خوَدا، خَدا، خِدا، خُدا۔ اردو میں خ مضموم ہی سے اس کا تلفظ ہوتا ہے۔

اردو میں "خدا" دکھنی اردو سے لے کر موجودہ دور تک اللہ کے معنی میں مستعمل ہے۔ اردو نثر میں قدیم ترین کتاب "معراج العاشقین" مصنفہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز المتوفی ۸۲۵ھ ہے۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں :۔

"حضرت (محمدؐ) دودھ پئے، ہور عرض کئے، اے میرے خدا ہیں دودھ کو قبول کیا اور"[۲]

ادبی اعتبار سے قدیم ترین کتاب "سب رس" تصنیف ملا وجہی ہے اس میں نثر و نظم دونوں میں استعمال موجود ہے :[۳]

کسے ہے جو خدا کی صفت کی عبارت — ہر ایک بال کوں گر سو ہزار جب آدے (زبان)

نثر میں متعدد مقامات پر استعمال ہوا ہے مثلاً :۔

"علیؓ خدا کوں بھایا، رسولؐ کوں بھایا، محمدؐ نبی، علیؓ ولی، نبوت خدا کی پیشوائی، ولایت محبوبی اور استغنائی"[۳]

ملا وجہی کے ہم عصر ملا غواصی کے یہاں بھی یہی استعمال موجود ہے[۴] :

میرا دعاتوں با خدایا قبول کر — روں روں کوں میں (روئیں روئیں) دعا بدل اسکے نیا کر

دکھنی اردو میں عربی و فارسی الفاظ کے املا میں بڑے تصرفات پائے جاتے ہیں مثلاً اعلیٰ، عالی کو آلا، آلی۔ تقاضہ کو تقاضا۔ زیادتی کو زیاستی۔ تسبیح کو تسبی۔ دعویٰ کو داوا نفع کو نفا لکھا جاتا تھا چنانچہ لفظ خدا میں بھی املائی تصرف پایا جاتا ہے۔ خدا کو موجودہ کا ہم قافیہ نظم کیا ہے۔ "چھسر بار" مصنفہ سید علی اکبر کے منظوم دیباچہ میں یہ شعر پایا جاتا ہے[۵] :

اللہ صاحب آپ خودا ہے — ہر جاگا میں موجودا ہے

غالب کے زمانہ تک لفظ خدا و خداوند کے استعمال میں تمیز کی جاتی رہی ہے۔ مثلاً میر مہدی مجروح کو لکھا ہے[۶] :

"خدا کا بندہ ہوں، علیؓ کا غلام، میرا خدا کریم، میرا خداوند سخی، علیؓ دارم چہ غم دارم"

امین الدین خاں کو علائی کی تحریک پر ایک غزل لکھ کر بھیجی ہے اس میں یہ شعر ہے[۷] :

تم ہو بت پھر تمہیں پندار خدائی کیوں ہے — تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

یہ امتیاز استعمال تاحال باقی و جاری ہے لیکن بعض حضرات نے "خداوند" بمعنی خدا بھی استعمال کیا ہے۔ فارسی میں ملک الشعراء بہار نے متعدد جگہ استعمال کیا ہے :۔

"ناگفتہ نشود کہ خداوند، حلقوم و زبان و ریہ ہر کس را طوری آفریدہ است کہ گریز از آں میسر نیست"[۸]

اردو میں مرزا دبیر اور علامہ اقبال کے کلام میں مطلق خداوند بمعنی خدا کا

---

[۱] سبک شناسی جلد اول ص ۱۸۳ (حاشیہ) [۲] ماخوذ از اردوئے قدیم [۳] سب رس حمد و نعت و منقبت [۴] اردو نامہ شمارہ ۱ ص ۵۵ [۵] اردو نامہ شمارہ ۱ ص ۵۰ [۶] اردوئے معلی کانپور ص ۲۱۱ و خطوط غالب لاہور ص ۲۹۵۔ [۷] اردوئے معلی ص ۲۹۲۔ خطوط غالب ص ۵۰ [۸] سبک شناسی جلد اول ص ۲

(باقی ص ۱۲۸ پر)

پاکستان (سندھ)

سُرمایا

جعفر طاہر

"... لیجئے "ہفت کشور" سے ایک حصہ ارسال خدمت ہے۔ امید ہے آپ کو پسند آئے گا اور یار لوگ لطف اندوز بھی ہوں گے۔ "سُرمایا" کیا ہے۔ یہ آپ ہی جانیں، میں نے بہر حال لکھنا تھی، سو لکھی، یارانِ طریقت سے پوچھیں بھی سہی۔"

(جعفر طاہر)

یہ سندھ ہے
جھیل منچھر کے دیدہ و دل کا نور
برفانی چوٹیوں کا جمالِ عریاں
یہ تازہ رُوئی بہارِ بستاں
یہ دشتبانی جوابِ ترکاں
یہ خوش خرامی غزالِ صحرا
یہ استواری شکوہِ دانش ورانِ مشرق
یہ سنگلاخِ شکایت و درد، کوثرِ التفاتِ خنداں
یہ جس کی آغوش میں ہزاروں نقوشِ تہذیبِ رفتگاں کے
یہ جس کے تٹ پر تھرکتی صدیوں کے بنتے مٹتے ہوئے کئی ملگجے ہیولے
موئنجو ڈارو! موئنجو ڈارو!
یہ خاتمِ ایزدی کا ٹوٹا ہوا نگینہ
ہمارے اجداد کی ہے میراث
یہ کھنڈر وہ ہیں جن سے نیروئے دل عبارت ہے، سندھ کا طاس
ہمنوا نیل و نیتوا کا
صراحیاں، روغنی پیالے
نشاطِ رفتہ کے ترجماں، محفلِ پری شب کے نوحہ خواں
ننھے ننھے منکوں کے سہ لڑے ہار، چوڑیاں، بالیاں، بوٹے
یہ ہیکلیں، بجتِ دلبراں کی نشانیاں مجھ کو چومنے دو

صنمگہِ دلبری کے ان پیکروں کے ہمراہ جھومنے دو
مجھے بھٹکنے دو ان، ہیولوں کی وادیوں میں
مجھے بگولوں کے ساتھ مل مل کے رفتگاں کو پکارنے دو
ابھرتی پرچھائیوں کے ہمراہ گھومنے دو
دُکھوں کے جھولے میں جھولنے دو

یادگارِ عظمتِ اسلاف یہ ویرانہ ہے
دل جو روتا ہے تو رونے دو کہ دل دیوانہ ہے
موت کی پرچھائیاں منڈلا رہی ہیں چارسُو
یہ خرابہ خواب گاہِ ہمتِ مردانہ ہے
ایک سناٹا کہ دہراتا ہے کوئی داستاں
یہ ہوا میں نالۂ خاکسترِ پروانہ ہے
گل کدے، حمام، ایواں، سیرگاہیں، حوض، تال
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ ہے
اب نہ وہ آتش کدے باقی نہ وہ سوز و نوا
اب نصیبوں میں کہاں وہ جلوۂ جانانہ ہے
ہیں زیارت کردنی صدکشتۂ شمشیر یاں
یہ کوئی سروِ رواں ہے وہ کوئی سلطانہ ہے
ہائے یہ گنجِ شہیداں، آہ یہ لاشوں کے ڈھیر
میں ہوں، اہلِ دل کا ماتم ہے، جہاں بیگانہ ہے

اور اب سامنے پھیلی ہوئی کتنی راہیں
جس طرح کاکلِ خمدار غبار آلودہ
کوئی نغمہ نہ کوئی مطربِ مرغولہ نوا
پھیلتا بڑھتا ہوا چاروں طرف دشتِ ندا
راہواروں پہ مگر کون اُڑے آتے ہیں
کون کہتا ہے کہ "بیٹی ابھی آیا پہنچا"

یہ جگر دار، سجیلے عربی شاہسوار
ایک اٹھارہ برس کا ہے مجاہد سالار
شفقستانِ شہادت بنی شامِ صحرا
ڈھل گئی رات، وہ آتی ہے سحر، بسم اللہ!

آج صحرا ہے کہ اک نور کا بہتا دریا
تیرتے پھرتے ہیں گردوں پہ سنہری بادل
رات پہنے ہوئے ہے پیرہنِ صبحِ ازل
رنگ کیا لایا ہے خونِ شہدا دیکھو تو
اک شرارہ بھی تو بت خانہ کے پتھر میں نہیں
کون سا پھول ہے جو باغِ مقدر میں نہیں
ندیاں آہوئے جستہ کی طرح آوارہ
چشمِ مشتاق یہ کیا دیکھتی ہے نظارہ
کوئی سُر مطربِ مرغولہ نوا بہرِ خدا
کوئی الغوزہ بجا، چھیڑ کوئی اکتارہ

سُر بلٹائی

سسّی: سسی نوں سِٹے ریت دے جیویں موسٹے لوں کوہ طور
ٹھک نہ ماسئے کیچے دے راہوں تے میں ولیاں کچ ضرور
کرساں بچ وی بلوچ دی مینوں کعبہ نامنظور
لال لطیف اج کرم کریسی و بنجے مرساں ہوت حضور

سیّد: یہ کون شہزادِ ذی حشم ہے؟
یہ کون بانوئے محترم ہے؟
وفا کی راہوں میں پا برہنہ!
یہ کون، یہ کون خوش قدم ہے؟

سسّی: خان پنل دے اٹھاں دے میں تاں پیر چمیندی وتاں
ٹبیاں تے چڑھ کوکاں ماراں میرا خان سنڑیں سد متاں
ہجر کٹاری، پھٹ ہن کاری، واہندیاں کھل وچ رتاں
لال لطیف اج کرم کریسی بھانویں کھوٹ کیتا ہے جتاں

سیّد: "اے کچھ کے باسیو آجاؤ
اس بے چاری کو بہلاؤ
کچھ چارۂ وحشت فرماؤ
تسکین کا مژدہ پہنچاؤ"

سسّی: بنڑ کریال ددی کرلاواں مولا وچ کھلاں دے
قدم قدم تے دیواں سجدے گھِن گھِن ناں سجناں دے
سیر تُوں کجلی ڈاڑھی گھلی میٹ گئے پیر اٹھاں دے
لال لطیف اج کرم کریسی میلے ہوسن سیکچے گیاں دے

سیّد: کھو گئی صحرا میں آری کی سواری ہائے ہائے
کھو گئے کن وادیوں میں وہ مہاری ہائے ہائے
سیج پر صحرا کی سسّی سو گئی ہے دوستو
اب نہ جاگے گی کبھی یہ غم کی ماری ہائے ہائے

سُرمایا

اک ملکوتی نغمے کا سرگم سنتا ہوں دیو بھون سے
سُر تریائیں سَم کنیائیں ناچ رہی ہیں الھڑ پن سے
ہنستی ناریں یہ چلہاریں لاڈ کرت ہیں من موہن سے
چھینا جھپٹی نوچا کھوچی کیا گھبرائیں کھل گنجن سے
رنگ اڑائیں ساون گائیں ہنس ہنس نرت کریں سلجن سے
ہونٹھ گلابی، نین شرابی، من میں لہریں رت بندھن سے
لیکن اک البیلی بانکی نار الگ بیٹھی سکھین سے
سوچ رہی ہے ابنر چھوڑے ناطہ جوڑے جگ جیون سے
لو اٹھی وہ نیچے اتری تارا پتھ سے رتناسن سے
جیسے بادِ بہاری شرما کر باہر نکلے گلشن سے
روح رسولوں کے پیکر سے جیسے خوشبو پھول کے تن سے
جیسے جیوتی دیپ سے نکلے موتی لوٹ چلے معدن سے
سورج میگھ محل سے نکلے جیسے چھوٹے چاند گہن سے
اک البیلا شاعر جیسے روٹھ چلا ہو صبح وطن سے
یوں چپکے چپکے یہ سندر ناری اتری روپ گگن سے
او پھر صدیاں بیت گئیں محروم رہی دھرتی درشن سے
نور ظہور کا شوق چرایا جنم لیا پھر سُندر بن سے
پدما کی لہروں سے ابھری پیت بڑھائی گنگ و جمن سے
گنج کنول کیلوں میں کھیلی روپ سروپ لیا پٹ سن سے
نوک جوانی کی یوں نکلی چونک پڑی دھرتی سپنن سے
ہیر سے بھی مل کر بیٹھا ہوں برسوں ساتھ رہا پکن سے
لیکن یہ پُر موہی جس نے جنم لیا امرت منتھن سے
کرشن کی بنسی نازک پیکر نغمے پھوٹیں صاف بدن سے
قد قامت کی بات نہ پوچھو کیا کھیلو گے دار و رسن سے
ابرو دل میں تیر ترازو، آنکھ ملا دیکھو چتون سے

"رنگِ گُل و بوئے گُل"[1]

اے۔ ڈی۔ اظہر کے نام:

انجمن ترقی اُردو پاکستان،
اُردو روڈ، کراچی ۱

۲۳۔ اپریل ۱۹۶۱ء

شفیقی و کرم فرما سلمہ اللہ تعالیٰ

کل آپ کا عنایت نامہ ملا۔ آپ نے میری ناچیز تحریر کا اس قدر خیال فرمایا۔ حیران ہوں کہ آپ کا شکریہ کیوں کر ادا کروں۔ میرے جو چند عنایت فرماتھے وہ اب نہیں رہے اور اب ایک دو جو پُرانے ملاقاتی ہیں وہ بہت طوطا چشم نکلے۔ آپ کا خط پڑھ کر مجھے معلوم ہوا کہ پاکستان ابھی اچھوں سے خالی نہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و عافیت کے ساتھ خوش و خرم رکھے۔ میں خود حاضر ہوتا لیکن علالت کی وجہ سے قاصر رہا۔ آپ کی رسم الخط والی نظم کا انتظار ہے۔ اقبال کی برسی پر آپ کی نظم بہت خوب ہے۔ آپ نے اظہارِ خیال کا جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ مجھے بہت پسند آیا۔ مشارٌ الیہ نے پڑھی تو ضرور ہوگی۔ اس کے دل پر کیا گزری ہوگی۔

جب سے میری آنکھ کا آپریشن ہوا ہے میں لکھنے پڑھنے سے کسی قدر معذور ہو گیا ہوں۔ خط وغیرہ پڑھوا کر سن لیتا ہوں اور جواب لکھوا دیتا ہوں۔ دوسری آنکھ بھی متاثر ہے اس کا آپریشن ہونیوالا ہے۔ یہ خط میں نے اپنے قلم سے لکھا ہے۔ اٹکل سے لکھ لیتا ہوں۔ اگر کوئی سقم یا بے ترتیبی نظر آئے تو معاف فرما دیجئے گا۔

نیاز مند
عبدالحق

بخدمت گرامی اے۔ ڈی۔ اظہر صاحب،
چیف اکاؤنٹنٹ پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی۔ کراچی۔

بنام سہیل عظیم آبادی[2]:

انجمن ترقی اُردو پاکستان، اُردو روڈ، کراچی ۱

۱۲۔ مئی ۱۹۶۱ء

کمرہ نمبر ۱۳۔ اسپیشل وارڈ۔ جناح اسپتال

عزیزم سلمہٗ۔ آپ کا خط مجھے پہنچ گیا تھا۔ علالت کی وجہ سے تاخیر ہوئی۔ "اُردو ئے معلّیٰ"[3] کا اشتہار پڑھا تھا اور ایک دو رسالوں میں اس پر تبصرہ بھی نظر سے گزرا۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ یہ خطوط جو تعداد میں پانسو سے زائد تھے، مولوی محمد امین صاحب زبیری مرحوم کے پاس تھے اور زیادہ تر انہیں کے نام تھے، وہ انتقال سے پہلے خطوط کا پلندا سید ہاشمی فرید آبادی صاحب کو دے گئے تھے۔ جب میری نود سالہ سالگرہ کا چرچا ہوا تو سید صاحب کو بھی اس کا شوق چرّایا۔ انہوں نے اور جلیل قدوائی نے مل کر جوبلی منانے کی تجویز کی۔ مجھے جب اس کا علم ہوا تو میں نے سید ہاشمی صاحب سے کہا کہ "یہ کام آپ کے کرنے کا نہیں، اس خیال کو ترک کر دیجئے۔ میری رسوائی میں جو کمی رہ گئی ہے، کیا آپ اُسے پورا کرنا چاہتے ہیں"۔ اس کا انہوں نے بہت بُرا مانا اور جوبلی کی تیاری کرتے رہے۔ بعض اہل علم سے میرے متعلق مضامین بھی لکھوائے۔ یہ خطوط بھی جوبلی کے سلسلے میں پیش کئے جانے والے تھے لیکن چند روز کے بعد ان دونوں میں اَن بن ہو گئی اور جوبلی کی ہنڈیا چوراہے پر پھوٹی۔ جگ ہنسائی ہوئی، خوب رسوائی ہوئی۔ میں نے جو کہا تھا وہی ہوا۔ یہ خط ہاشمی صاحب کے قبضے میں تھے۔ انہوں نے اپنے بھائی کو جو کتابوں کی تجارت کرتے ہیں، اشاعت کے لئے دیدیئے۔ مجھے معلوم ہوا تو میں نے ان کو سختی سے لکھا کہ یہ میرے نجی خطوط ہیں، بازار اور گلی کوچے میں بیچنے کے

---

[1] مولوی صاحب (مرحوم) کی زبان پر وفات سے قبل میرؔ کا یہ شعر تھا؛
رنگِ گل و بوئے گل ہوتے ہیں ہوا دونوں ؛ کیا قافلہ جاتا ہے گر تم بھی چلا چاہو

[2] سہیل عظیم آبادی صاحب نے مولوی صاحب کے خطوط کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا اور اس کو چھاپنے کی اجازت طلب کی تھی۔ یہ خط اسی کے جواب میں لکھا گیا تھا۔

[3] مولوی صاحب کے خطوط کا مجموعہ۔

لئے نہیں۔ جو شخص دن میں دس دس بارہ بارہ خط لکھتا رہا ہو، اس کے خطوں میں کیا خوبی اور ادبی حسن ہو سکتا ہے۔ ان کی اشاعت سے روپیہ کمانا، کاتب کو رسوا کرنا ہے۔ مگر اس کا ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اب میں آپ کو کس منہ سے منع کر سکتا ہوں۔ آپ بھی اپنا شوق پورا کر لیجئے۔ مگر اتنی احتیاط کے ساتھ ضرور کیجئے گا کہ اگر کسی خط سے کسی شخص کی دل آزاری ہوتی ہو تو اسے شائع نہ کیجئے۔ میں آج کل علیل ہوں اور یہاں کے مشہور مرکزی جناح اسپتال میں داخل ہو گیا ہوں۔ یہاں کے علاج سے فائدہ ہے۔

عبدالحق

رفیق خاور[1] کے نام:

کل پاکستان انجمن ترقی اردو
اردو روڈ۔ کراچی

حوالہ نمبر ______
مورخہ ۲۴ جون ۱۹۵۹ء

مکرمی رفیق خاور صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ

میں نے آپ کا مضمون "اردو ادب کی تشکیل نو" پڑھا۔ خوب لکھا ہے۔ آپ کی نظر قدیم اور جدید اردو ادب پر بہت گہری ہے۔ آپ نے مقدمۂ حالی کی اہمیت، افادیت اور اس کے انقلاب انگیز اثر کو جانچنے کے بعد اس سلسلۂ انتقاد کو آگے بڑھانے کے متعلق جو بات اٹھائی ہے وہ نہایت معقول، مفید اور قابل توجہ ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر مجھے خوشی ہوئی ہے۔ میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ اردو کی قسمت اب آپ ہی جیسے وسیع النظر اور پرخلوص اہل قلم کے ہاتھ میں ہے۔

ملک

[1] "اردو ادب کی تشکیل نو": یہ مضمون "ماہِ نو" کی اشاعت جون ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا تھا جس پر انجمن کے اخبار "قومی زبان" میں پاک و ہند کے کتنے ہی نامور اہل الرائے نے اظہار خیالات کیا۔ اور یہ سلسلہ تقریباً ڈیڑھ سال تک جاری رہا۔ (مدیر)

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے نام:

انجمن ترقی اردو پاکستان، اردو روڈ۔ کراچی

۱۳ مئی ۱۹۶۱ء

کمرہ نمبر ۱۳۔ اسپشل وارڈ، جناح اسپتال

معظم و مکرم جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب زاد مجدکم

مجھے اس سے بے حد مسرت ہوئی کہ آپ نے کراچی یونیورسٹی کے عہدۂ وائس چانسلری کو قبول کر لیا۔ وہ لوگ جنہوں نے اس عہدے کیلئے آپ کا انتخاب کیا ہے قابل مبارکباد ہیں۔ آپ یونیورسٹیوں کے حالات اور مسائل سے جس قدر واقف ہیں، دوسرا کوئی شخص نہیں۔ اس لئے توقع ہے کہ یہ یونیورسٹی جو ابھی تک پریشان حالی میں مبتلا تھی، اپنے فرائض بوجہ احسن انجام دے سکے گی۔ امید ہے کہ آپ یونیورسٹی کے الجھے ہوئے معاملات کو دردمندی اور ہمدردی سے حل کرنے کی بیش بیش کوشش فرمائیں گے۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ آپ دوسرے مسائل کے ساتھ اپنی قومی زبان کو فراموش نہ کریں گے۔ میں خود حاضر ہو کر آپ کو مبارکباد دیتا لیکن علالت کی وجہ سے قاصر رہا۔

نیازمند عبدالحق

محمد منظور احمد مدیر "مجلس" حیدر آباد دکن کے نام:

انجمن ترقی اُردو پاکستان، اُردو روڈ۔ کراچی ملہ

۵۔ اپریل ۱۹۶۱ء

مکرمی و عزیزی محمد منظور صاحب سلمہٗ

"مجلس" کا "عبدالحق نمبر" کئی روز ہوئے مجھے پہونچ گیا تھا۔ پڑھ کر سنا۔ اگر یہ نہ سمجھا جائے کہ میں اس پردے میں اپنی تعریف کر رہا ہوں تو مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ آپ نے اس نمبر کے ترتیب دینے اور مضامین فراہم کرنے میں جو غیر معمولی محنت کی ہے وہ بہت قابل تعریف ہے۔ اس میں آپ کا خلوص اور محبت بھی شامل ہے۔ یہاں یہ نمبر بہت پسند کیا گیا۔ بعض اصحاب کو تعجب ہوا کہ ایسے اچھے مضامین کیوں کر فراہم کر لئے۔

سجاد مرزا صاحب نے اپنے مضمون کا عنوان[۱] بہت خوب تجویز کیا ہے۔ مجھے بہت پسند آیا۔ غلام ربانی نے بعض باتیں لکھی ہیں جو میں بالکل بھول چکا تھا۔ ایک دو تو اب بھی یاد نہ آئیں۔ یہ انہوں نے کہاں سے اور کیوں کر حاصل کیں۔ اس نمبر کے اکثر مضامین محنت سے اور شوق سے لکھے گئے ہیں۔

آپ نے چند پرچے زائد بھیجنے کے لئے لکھا تھا اگر ممکن ہو تو بھیج دیجئے۔ بعض صاحبوں کا تقاضا ہے۔ ایک کتب خانہ کو بھی دینا چاہتا ہوں۔

خیر طلب

عبدالحق

[۱] "اُردو کا زخمی سپاہی"

"بابائے اردو مولوی عبدالحق"

خط طغریٰ میں یہ ڈیزائن ایک سیزدہ سالہ ہونہار طالب علم سرتاج شاہد حسین (ٹیکنیکل ہائی اسکول کراچی) کی شوخیٔ فکر ہے۔

★

از کمالِ دلسوزی شمیم صہبائی (متھراوی)

۱۳ ـ ۸۱

بابائے اردو کی آخری پاکیزہ آرامگاہ

دلگداز حادثۂ انتقالِ عبدالحق

۱۳ ـ ۸۱

صدر ایوانِ انجمن ترقیٔ اردو پاکستان

۱۹ ـ عیسوی ـ ۶۱

سوم ربیع اول محبوب سنہ تیرہ سو اکیاسی

۱۳ ـ ۸۱

مطابق سولہ اگست، موجودہ سنہ ایک ہزار نو سو اکسٹھ عیسوی

۱۹ ـ عیسوی ـ ۶۱

بیتم چہار شنبہ بوقت لازم نو بجے صبح

۱۳ ـ ۸۱

وہ کیوں نہ مالکِ خلدِ ابد ہوں بعد مرگ

۱۳ ـ ۸۱

کٹی بخلد ادب زندگیٔ عبدالحق

۱۳ ـ ۸۱

کہا شمیم حزیں: سالِ رنج ہاتف نے

۱۳ ـ ۸۱

"ہوئے خبیرارم مولویٔ عبدالحق"

۱۳ ـ ۸۱

"چراغِ انجمن افروز"

آمنہ صدیقی

اگرچہ ان الفاظ میں اقبال کے پیشِ نظر ایک اور چشم و چراغِ محفل تھا، لیکن "انجمن افروز" عمومی و خصوصی، دونوں اعتبار سے، بابائے اُردو مولوی عبدالحق مرحوم سے زیادہ اور کون ہو سکتا ہے، جن کی ذات بجائے خود انجمن در انجمن اور چراغ در چراغ تھی؟ اس مقالہ میں اس چراغِ انجمن کے چند در چند پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ سب پہلو قابلِ لحاظ ہیں، مگر مولوی صاحب درحقیقت اپنے اصل رنگ میں اسی وقت آتے تھے جب وہ جلال میں ہوں، جب کوئی ان کے احساس کو جگا دے، انہیں بھڑکا دے ——— خاص کر اردو کے بارے میں ؎

تب دیکھئے اندازِ گل افشانیٔ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے!

اس جوش و خروش کے عالم میں ان کے منہ سے پھول بھی جھڑتے تھے اور طنز کے تند و تیز تیر بھی چھوٹتے تھے جن کی نشتریت بے پناہ تھی۔ تصویر کا یہ رخ ——— تیکھا پن ——— بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا دوسرا رخ ——— سنجیدگی۔ (ر۔ خ)

★

اُردو زبان کی تاریخ میں ۱۸۶۹ء کی بڑی اہمیت ہے۔ اسی سال اُردو دنیا کو ایک ایسے فنکار کی دائمی مفارقت سے دوچار ہونا پڑا جس نے اردو ادب میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیا، اور اسی سال ایک ایسا "لسانی مجاہد" پیدا ہوا جس نے اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لئے تقریباً پون صدی تک ایسی کوشش کی کہ جس کی مثال دنیا کی شاید ہی کسی زبان میں مل سکے گویا ۱۸۶۹ء میں جس عظیم فن کار نے دہلی میں آنکھیں بند کیں اس نے ہاپوڑ میں ایک اور جدید ہستی میں دوبارہ جنم لیا۔ غالب اور مولوی عبدالحق تاپنے کارناموں کے اعتبار سے اگرچہ الگ الگ ادبی شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں لیکن مزاج کے اعتبار سے ان دونوں میں بڑی یکسانیت ہے۔ دونوں زندگی بھر "خوب سے خوب تر" کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ اور یہی وہ قدرِ مشترک ہے جو ان دونوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کرتی ہے۔ مولوی عبدالحق کے ذکر سے ایک غالب ہی کیا بہت سے ادبی مشاہیر (سرسید، حالی، نذیر احمد وغیرہ) کا خیال ذہن میں آجاتا ہے۔ اسی لئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کی وفات ایک فرد کا نہیں ایک عظیم الشان ادبی دور کا خاتمہ ہے۔

دنیا کی کسی زبان کی تاریخ میں، کسی عہد میں بھی کوئی ایسی شخصیت پیدا نہیں ہوئی کہ جس نے تمام زندگی (اور وہ بھی ایک طویل زندگی) اس زبان کی خاطر معرکہ آرائیوں میں صرف کر دی ہو۔ یہ فخر صرف اُردو ہی کو حاصل ہے کہ اسے عبدالحق جیسا سپاہی میسر ہوا جس نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس زبان کی ترویج و اشاعت کے لئے وقف کر دیا۔ اس پیرِ جواں ہمت نے اس مقصد کے لئے کبھی اپنوں کی جفائیں سہیں اور کبھی غیروں کے ستم، مخالفتوں کے ایسے ایسے خارزاروں میں قدم رکھا کہ جہاں رہ نوردی کی داد ملی بھی تو آبلہ ہائے پا سے، مگر اس جواں ہمت اور عظیم انسان کے پائے استقلال میں ذرا سی بھی لغزش پیدا نہ ہوئی اور وہ حریفوں کو پیچھے چھوڑ کر مردانہ وار آگے بڑھتا چلا گیا۔ "عبدالحق" اور "اُردو" مترادف نہیں مرادف الفاظ ہیں، اُردو کا عبدالحق کے بغیر اور عبدالحق کا اُردو کے بغیر تصور کرنا محال ہے۔

مولوی عبدالحق کی شخصیت بڑی پہلودار ہے۔ انہوں نے اُردو زبان و ادب کی خدمت مختلف طریقوں سے کی۔ کبھی وہ اس زبان کے سپاہی بن کر مخالفت کے مختلف محاذوں پر لڑتے رہے۔ کبھی وہ اس کے

سفیرین کے گھر گھر اس کا پیغام پہنچاتے رہے۔ کبھی انہوں نے خطابت کے سہارے دلوں کو گرمایا اور کبھی انشأ پردازی کے بل پر ذہنوں کو جلا بخشی۔ زبان کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے قواعد، صرف و نحو اور لغات کی طرف توجہ کی تعلیمی ضروریات کے لئے نصابی کتابیں تیار کیں اور کروائیں۔ قدیم ادبی سرمائے کو گمنامی سے نکال کر دنیائے ادب کے سامنے پیش کیا۔ تحقیق و تنقید کی راہوں پر نئے نئے چراغ جلائے۔ قوم کو زبان سے دلچسپی لینے کا ڈھنگ سکھایا۔ علم کی عام اشاعت کے وسائل کو وسعت دی۔ الغرض وہ سب کیا جو ایک عظیم ثقافتی رہنما کو کرنا چاہیئے۔

مولوی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ "انجمن ترقی اردو" ہے اگرچہ وہ اس کے بانی نہیں ہیں لیکن اس انجمن کی بقا اور ترقی انہی کی مرہونِ منت ہے۔ اردو زبان کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال موجود نہیں ہے کہ کسی ادارے نے کامل ساٹھ سال تک زبان و ادب کی ترویج کے لئے کام کیا ہو۔ اس انجمن سے ہند و پاکستان کے بیشتر مشاہیر اہلِ قلم وابستہ رہے ہیں اور اس طرح اس کو جو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ایسے پُر آشوب زمانے میں جبکہ مخالفوں نے اردو کو ہر طرح سے ختم کرنے کے منصوبے باندھے، انجمن ان کے ارادوں کی تکمیل کے راستے میں اس طرح جمی رہی جیسے ایک چھوٹی سی ندی کے سامنے کوہ ہمالیہ۔ حریفوں کے ہر وار کو انجمن نے ناکام بنا دیا اور یہ انجمن کی ایسی کامیابی ہے جو اردو تاریخ میں سنہری حروف سے لکھی جائے گی۔

انجمن اُردو کے دفاع کے لئے ہی سرگرم کار نہیں رہی بلکہ اس زبان کی ترویج و اشاعت کے لئے بھی اس نے اہم کارنامے انجام دیئے۔ اس سلسلے میں پہلا کام تو یہ کیا گیا کہ ہندوستان کے ہر حصے میں انجمن کی شاخیں قائم کر کے ان کی نگرانی میں اردو مکتب اور کتب خانے کھولے گئے۔ اس ذریعہ سے بہت سے ناخواندہ لوگوں نے اردو زبان سیکھی اور بعض ایسے علاقوں میں اُردو کو پہنچایا گیا کہ جہاں اس سے لوگ بہت کم واقف تھے۔

کسی زبان کے ترقی یافتہ ہونے کا اندازہ دو باتوں سے کیا جاتا ہے۔ ایک یہ کہ اس کا ادبی سرمایہ مقدار و معیار دونوں کے اعتبار سے اعلا درجے کا ہو۔ دوسرے یہ کہ اس میں مختلف علوم و فنون پر کافی کتابیں ہوں۔ اردو زبان کے ساتھ یہ مصیبت تھی کہ اس کے دامن میں سب کچھ تھا لیکن نظروں سے اوجھل تھا۔ تمام ادبی سرمایہ مخطوطات کی شکل میں تھا۔ انجمن نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اہم ادبی کتابوں کو مرتب کروا کے شائع کیا۔ اس وجہ سے بہت سی اہم اور نادر کتابیں منظرِ عام پر آئیں اور اس طرح معلوم ہوا کہ اردو زبان ہندوستان کی دوسری علاقائی زبانوں کی طرح کم مایہ نہیں ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انجمن کے اس اقدام کی وجہ سے اردو ادب اور زبان کی تاریخ میں نمایاں تبدیلی ہوئی۔ پہلے تو سمجھا جاتا تھا کہ اردو گزشتہ ایک دو صدیوں میں پھلی پھولی، لیکن اب یہ تسلیم کیا گیا کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں اردو اس مدت سے بہت پہلے مروج ہو چکی تھی۔

انجمن نے ہر طرح اور ہر انداز سے اُردو کی خدمت کی۔ اُردو کے لئے اتنا کام کسی ادارے نے نہیں کیا لیکن ان سب کاموں کے پس پردہ جو شخصیت کارفرما رہی وہ مولوی عبدالحق ہی کی شخصیت تھی۔ مولوی عبدالحق نے اپنے تمام وسائل انجمن کی نذر کر دیئے۔ ان کی تمام توانائیاں، ان کا تمام سرمایہ، ان کی راتوں کی نیند، ان کی صبحوں کا آرام۔ غرض ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اور ان کے سرمایہ کا ایک ایک حبہ انجمن کی نذر ہو گیا۔

انجمن ترقی اردو در اصل مولوی عبدالحق ہی کی ذات کا پرتو ہے۔ انہوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ شخصیتیں ادارے بناتی ہیں نہ کہ ادارے شخصیتوں کو۔ اگر مولوی صاحب انجمن کو اپنے ہاتھ میں نہ لیتے تو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ اس کا یہ شعبہ بھی ختم ہو جاتا اور خدا جانے اُردو کو مخالفوں کے کیا کیا ستم سہنے پڑتے۔

ادبی دنیا میں بابائے اُردو کو سب سے زیادہ مقبولیت ان کی "مقدمہ نگاری" سے حاصل ہوئی۔ کسی کتاب پر مقدمہ یا دیباچہ لکھنا کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں۔ قابلِ اعتراض بات تو یہ ہے کہ ان مقدمے یا دیباچے کو مصنف یا کتاب کا اشتہار بنا دیا جاتا ہے۔ مقدمہ نگار اگر متعلقہ کتاب کے موضوع پر خود اپنے خیالات پیش کرے یا بعض ایسے امور کی طرف توجہ دلائے جن تک مصنف کی نظر نہیں گئی تو یقیناً اس کا مقدمہ کام کی چیز بن سکتا ہے۔ مولوی عبدالحق کی مقدمہ نگاری اسی اجمال کی تفصیل ہے۔ انہوں نے اپنے مقدموں کو قصیدہ گوئی یا مناقب خوانی کی کھتونی نہیں بنایا۔ ان کے مقدمات کی علمی و ادبی حیثیت بعض اوقات اصل کتاب سے بڑھ جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے تحقیقی و تنقیدی سرمائے میں ان کے مقدمے ایک مستقل اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مولوی صاحب کی مقدمہ نگاری کا آغاز بیسویں صدی کی ابتدا

سے ہوتا ہے۔ ان کا پہلا مقدمہ شاید کتاب "جنگ روس و جاپان" پر تھا۔ جو ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ اُن کا آخری مقدمہ "جدید اُردو لغات" پر ہے جو رسالہ "اُردو"، (جنوری۔ اپریل ۱۹۵۹ء) میں شائع ہوا ہے۔ گویا مولوی صاحب کی مقدمہ نگاری کی داستان پورے ساٹھ برسوں کے عرصے پر محیط ہوئی ہے۔ اس دوران میں انہوں نے تقریباً پچاس مقدمے لکھے۔ یہ مقدمات اپنے موضوعات کے اعتبار سے گوناگوں خصوصیات کے حامل ہیں۔ ان کے مقدموں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں تلاش و تحقیق کے ساتھ ساتھ غور و فکر کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ اور وہ کتاب، مصنف اور موضوع کے بارے میں صرف وہی باتیں کہتے ہیں کہ جو عام نگاہوں سے اوجھل ہوتی ہیں۔

مولوی صاحب کے مقدمات کی ایک اور خصوصیت ایسی ہے۔ جس کی افادیت اپنی مثال آپ ہے یعنی وہ اپنے مقدموں میں موضوع کتاب کی پوری تاریخ بیان کر جاتے ہیں۔ اور یہ تاریخ، قاری کو اصل کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے میں بڑی مدد دیتی ہے۔ اس سلسلے میں ان کے دو مقدمے بڑے معرکے کے ہیں۔ ایک "قواعد اردو" کا اور دوسرا "جدید اُردو لغات" کا۔ پہلے مقدمے میں انہوں نے بڑی تفصیل سے یہ بتایا ہے کہ اُردو زبان کی قواعد کی کتابیں کس زمانے سے لکھی جاتی رہی ہیں۔ اور پھر ہر کتاب اور اُس کے مصنف کے بارے میں بیش بہا معلومات فراہم کی ہیں۔ اسی طرح "جدید اُردو لغات" کے مقدمے میں تمام لغات کا تاریخی جائزہ لیا ہے اور ان کی خوبیوں اور خامیوں سے بحث کی ہے۔ یہ دونوں مقدمے بجائے خود مستقل تصانیف کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مولوی صاحب کے مقدمے علم و ادب کی بعض ایسی راہوں سے متعارف کرواتے ہیں کہ جہاں سے بہت کم لوگ گزرے ہیں۔ ان کی تحقیق بعض ایسے حقائق کو بے نقاب کرتی ہے کہ جن کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ان کی تنقید ادب پاروں کی قدر و قیمت اس طرح متعین کرتی ہے کہ ان کی دیانت داری پر ان کا بڑے سے بڑا حریف بھی شک نہیں کر سکتا۔ ان مقدمات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کا مطالعہ نہایت وسیع ہے اور علم کا کوئی شعبہ ان کی دسترس سے باہر نہیں۔

مقدمات کے بعد مولوی صاحب کے خطبات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے خطبات کی حیثیت مستقل مضامین کی سی ہے کیونکہ یہ نہایت محنت و کاوش کا نتیجہ ہیں۔ ہر خطبہ اپنی علیحدہ انفرادیت رکھتا ہے اور اپنی جگہ ایک مستقل تصنیف ہے۔ یہ خطبات ایک ہی مرکزی خیال کے گرد گھومتے ہیں۔ اور وہ مرکزی خیال "اردو" ہے۔ ان خطبوں میں اُردو زبان کی تاریخ، اس کے لسانی ارتقاء اور عہد بہ عہد تبدیلیوں کا سراغ لگایا گیا ہے۔ علمی و ادبی اداروں کی کاوشوں کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ اردو زبان کی ترقی اور ترویج و اشاعت کے لئے قابل عمل تجویزیں بنائی گئی ہیں۔ اردو زبان سے متعلق شاید ہی کوئی مسئلہ ہو جس پر مولوی صاحب نے روشنی نہ ڈالی ہو۔ گویا یہ خطبات اردو زبان کا انسائیکلو پیڈیا ہیں۔

ان خطبات کی بنیادی اہمیت یہ ہے کہ ان میں عام لسانی مسائل اور اُردو زبان سے متعلق مباحث کو چھیڑا گیا ہے۔ اور بہت سے متنازعہ فیہ مسائل کو خوش اسلوبی سے سلجھایا گیا ہے۔ زبان کیا ہے؟ قومی زبان کسے کہتے ہیں؟ لفظ کیا ہے؟ لفظ و معانی کا باہمی ربط کیونکر قائم ہوتا ہے؟ مخلوط زبان کیا ہے؟ اردو مخلوط زبان کیوں ہے؟ اُردو کا خمیر کن عناصر سے مرکب ہے؟ اردو میں ہندی، فارسی اور عربی عناصر کس حد تک ہیں؟ اُردو میں نظم و نثر کا رواج کب ہوا؟ اردو نے ہندوستان کے کن کن مقامات پر پرورش پائی؟ کن کن لوگوں اور اداروں نے اس کی ترویج و اشاعت میں حصہ لیا؟ مختلف ادوار میں اس زبان کی صورت کیا تھی؟ مقامی تعصب زبان کی ترقی کی راہ میں کس حد تک حارج ہوتا ہے؟ زبان کی صحت کا معیار کیا ہے؟ اردو میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ کس طرح حل کرنا چاہیئے؟ یہ اور اس قسم کے دوسرے بہت سے سوالوں کے تشفی بخش جوابات ان خطبوں میں ملتے ہیں۔

مولوی صاحب نے لسانی مسائل پر کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی لیکن ان خطبات کی وجہ سے ان کا شمار صف اول کے ماہرین لسانیات میں ہوتا ہے۔ مولوی صاحب نے لسانی مسائل کو حل کرنے میں جو دادِ تحقیق دی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مثال کے طور پر بہار اردو کانفرنس کا خطبۂ صدارت دیکھیئے۔ اس میں دوسری بہت سی باتوں کے علاوہ اس مسئلہ پر بھی لکھا ہے کہ مختلف ادوار میں اردو کو کن کن ناموں سے موسوم کیا گیا۔ اس موضوع پر انہوں نے بمشکل تین صفحے لکھے ہیں لیکن ان تین صفحوں میں ہی انہوں نے پوری ایک داستان بیان کر دی ہے جو تحقیق کا اعلا نمونہ ہے۔

ان خطبات میں مولوی صاحب کی اُردو دوست شخصیت پوری

طرح روشن نظر آتی ہے۔ مجھے تو ان خطبوں میں وہی سچائی اور وہی خلوص نظر آتا ہے جو ایک اچھی خود نوشت سوانح عمری کا خاصہ ہے۔ مولوی صاحب نے جن مختلف زاویوں سے اُردو کی فضیلت ثابت کی ہے، جن مختلف طریقوں سے اُردو کے مخالفوں کو شکست دی ہے اس کی تمام روداد ان خطبوں میں مل جائے گی۔ اور یہ روداد ایسی ہی ہے جیسے کوئی اپنی داستان لکھ رہا ہو۔ اگرچہ یہ لفظ "میں" ان خطبوں میں بہت کم آیا ہے، اس کے باوجود مجھے اصرار ہے کہ یہ خطبات مولوی صاحب کی خود نوشت سوانح عمری ہی نہیں بلکہ ان کے "اعتراف" ہیں۔ انھوں نے اپنی ذات کو اُردو میں ضم کر کے "من و تو" کا فرق مٹا دیا ہے۔

مولوی صاحب کو شخصیت نگار کی حیثیت سے بھی ایک بلند مقام حاصل ہے۔ اُردو زبان میں شخصی خاکہ نگاری کی روایت کچھ زیادہ قدیم نہیں ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں کے ہاں کچھ اشارے ملتے ہیں۔ لیکن وہ خاکہ نگاری کے ضمن میں نہیں آتے۔ اس قسم کی سب سے پہلی مثالیں "آبِ حیات" میں ملتی ہیں۔ مولانا آزاد نے بڑی چابکدستی سے ایسی تصویریں بنائی ہیں جو اُردو ادب میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ آزاد نے ذوق کا جو تذکرہ لکھا ہے، وہ اردو خاکہ نویسی میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ آزاد کی تصانیف کے علاوہ بعض اور کتابوں میں بھی ضمنی طور پر شخصیت نگاری پائی جاتی ہے۔ لیکن اس کی کوئی مستقل حیثیت نہیں۔ اس صنف کو اُردو میں صحیح طور پر متعارف کرنے کا سہرا مولوی عبدالحق کے سر ہے۔ انہوں نے بیسویں صدی کے آغاز ہی سے مختلف لوگوں کے حالات مضامین کی صورت میں لکھنے شروع کر دیئے جب ان مضامین کی تعداد اچھی خاصی ہو گئی تو انہیں کتابی شکل میں "چند ہم عصر" کے نام سے یک جا کر دیا گیا۔ یہ کتاب اردو کے سوانحی ادب میں اُونچا مقام رکھتی ہے۔

مولوی صاحب نے صرف ان لوگوں کی سیرت پر قلم اُٹھایا ہے جن سے وہ ذاتی طور پر واقف تھے۔ جس شخصیت کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اپنی جگہ اس قدر مکمل ہے کہ اس میں کمی بیشی کی مطلق گنجائش نہیں۔ موضوع کی تصویر بڑی وضاحت کے ساتھ پڑھنے والوں کے سامنے آتی ہے بعض لوگوں (مثلاً سرسید اور حالی) کے حالات لکھتے ہوئے اگرچہ عقیدت مندی کا اظہار بھی جا بجا ہوتا ہے۔ لیکن کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ مولوی صاحب کی عقیدت موضوع کی تصویر کشی میں حائل ہو رہی ہے۔

مولوی صاحب کی شخصیت نگاری کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے صرف ایسے ہی لوگوں پر قلم اٹھایا ہے کہ جن کی زندگی کسی نہ کسی اعتبار سے قابلِ تقلید ہو سکتی ہے۔ مگر انہوں نے ان خاکوں سے اخلاقی درس دینے کا کام نہیں لیا۔ ان کے موضوعات میں ہر طرح کے لوگ ملتے ہیں۔ سرسید اور حالی جیسے بڑے ادیب بھی ہیں۔ عماد الملک اور محسن الملک جیسے مدبر بھی۔ حسرت موہانی اور وحیدالدین سلیم جیسے شاعر و سخن فہم بھی اور نام دیو مالی اور نور خاں جیسے عام معمولی انسان بھی۔ مولوی صاحب نے اپنے موضوع کے انتخاب کا معیار انسانیت کو قرار دیا ہے، نہ کہ دنیاوی شہرت کو۔

"چند ہم عصر" جہاں دوسروں کی داستان ہے، وہیں اس میں خود نوشت سوانح عمری کا رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ مولوی صاحب کی شخصیت کے بہت سے پہلو ان خاکوں سے بے نقاب ہوتے ہیں۔ ان کے سوانح نگار کے لئے بنیادی مواد اس کتاب سے مل سکتا ہے۔ مولوی صاحب کے ذہنی رجحانات کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ ان کی زندگی کے مختلف واقعات کا مشاہدہ بھی اسی دریچہ سے ہو سکتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جن لوگوں کی زندگیوں کو مولوی صاحب نے اپنا موضوع بنایا ہے ان کی کوئی نہ کوئی خصوصیت خود مولوی صاحب میں بھی موجود تھی۔ وہ سرسید کی طرح ثقافتی رہنما تھے، حالی کی طرح سادگی پسند تھے۔ محمد علی جوہر کی طرح جذباتی تھے، میرن صاحب کی طرح وضعدار تھے اور نام دیو مالی کی طرح کام سے عشق رکھتے تھے۔

مولوی صاحب نے اردو ادب کو شخصی مرقع نگاری کا سلیقہ سکھایا ہے، انسانوں کو سمجھنے کا انداز دیا ہے، شخصیتوں کا مطالعہ کرنے کی راہ سجھائی ہے یہ مرقعے زندگی کو اس کے اصلی روپ میں پیش کرتے ہیں۔ ان سے زندگی حاصل کرنے کے فن کی نزاکتوں کا پتہ چلتا ہے اور نشیب و فرازِ زمانہ سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ ملتا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ مرقعے اُردو کے سوانحی ادب کی آبرو ہیں۔

زبان کا عشق مولوی صاحب کو ہر میدان میں لے گیا اور ہر جگہ ان کی طبع کی جولانیوں نے نئے نئے راستے [illegible] ۔ وہ ایک ماہرِ لسانیات تھے اور کئی زبانیں جانتے تھے اور اردو زبان کی تو ایک ایک ادا سے واقف تھے۔ لغت نگاری سے ان کا انہماک شروع سے تھا اور ہند و پاکستان میں (اپنے دور میں) صرف وہی اس فن کے ماہر تھے۔ انگریزی لغت کی تیاری

میں اگرچہ انہیں اہلِ علم کی ایک پوری جماعت کا تعاون حاصل رہا لیکن
کام کا بڑا حصہ انہیں کی کوششوں ہی کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح انہوں
نے ایک اُردو لغت بھی تیار کی جو ابھی شائع نہیں ہوئی۔ زبان کے قواعد
سے متعلق ان کی دو کتابیں ہیں ایک صرف ونحو اردو اور دوسری قواعدِ اُردو۔
ثانی الذکر کتاب اپنے موضوع پر درجہ استناد رکھتی ہے اس سے پہلے بھی اور
اس کے بعد بھی اردو میں قواعد کی بہت سی کتابیں لکھی گئیں لیکن جو مقبولیت
اس کو حاصل ہوئی وہ کسی دوسری کتاب کو حاصل نہیں ہوئی۔

مولوی صاحب کے تنقیدی وتحقیقی کارناموں پر نظر ڈالی جائے
تو وہ صفِ اول کے نقاد و محقق نظر آتے ہیں۔ ان کی تحقیق کا بہترین نمونہ
دو کتابیں ہیں (۱) "اُردو کی نشوونما میں صوفیاء کرام کا کام"۔ (۲) "ملک الشعراء
بیجاپور ملّا نصرتی"۔ اس کے علاوہ قدیم اردو ادب کے متعلق بہت سے
مضامین رسالہ "اردو" میں شائع ہو چکے ہیں۔

تحقیق اور تنقید کا بہت گہرا تعلق ہے۔ تحقیقی مزاج کے بغیر
نقاد اور تنقیدی شعور کے بغیر محقق بننا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔
ایک نقاد کے لئے محقق ہونا اور محقق کے لئے نقاد ہونا ضروری ہے ورنہ
محقق کو یہ معلوم نہ ہوسکے گا کہ کونسا موضوع اس قابل ہے کہ اس کے
بارے میں تحقیق کرنی چاہیئے اور نقاد یہ نہ جان سکے گا کہ جس موضوع پر
وہ اپنے خیالات ظاہر کر رہا ہے اس کی صحیح نوعیت کیا ہے۔

مولوی صاحب محقق بھی ہیں اور نقاد بھی لیکن پہلی خصوصیت
کچھ اس درجہ نمایاں ہے کہ دوسری خصوصیت دب گئی ہے۔ بات یہ ہے
کہ مولوی صاحب کے تنقیدی کارنامے پوری طرح سامنے نہیں آتے۔
رسالہ "اُردو" میں جو مضمون شائع ہوئے وہ ابھی کتابی شکل میں
مرتب نہیں ہوئے۔ اس وجہ سے وہ نگاہوں سے اوجھل ہیں لیکن جب
یہ کتابی شکل میں سامنے آئیں گے تو مولوی صاحب کو ایک بڑے محقق
کے ساتھ ساتھ ایک بڑا نقاد بھی ماننا پڑے گا۔

مولوی صاحب نے ادب اور تنقید کے بنیادی مسائل پر کوئی
مستقل کتاب نہیں لکھی۔ اس بارے میں انہوں نے مختلف تحریروں میں
ضمنی طور پر اظہارِ خیال کیا ہے جس کو پیشِ نظر رکھ کر ایک باشعور قاری
مولوی صاحب کے ادبی نظریات کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔

مولوی صاحب ادب کو زندگی سے علیحدہ کوئی چیز نہیں سمجھتے۔
ان کے نزدیک ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ اچھا ادب وہی ہے جو زندگی کے
خط وخال کی عکاسی کرے۔ اس خیال کا اظہار انہوں نے جابجا اپنی
تحریروں میں کیا ہے۔

"ادب زندگی کا جزو ہے، ہماری تہذیب اور تمدن کا آئینہ
ہے۔ جیسے ہماری زندگی کے حالات ہوں گے ویسا ہی ہمارا ادب ہوگا"
(خطبات صفحہ ۸۶)

"ادب کی بنیاد زندگی پر قائم ہے اور اگر یہ نہیں تو وہ ایک لچر
سی کہانی ہے"۔ (خطبات صفحہ ۳۹)

ادب کو وہ معاشرے کا عکاس سمجھتے ہیں۔ حالی کی طرح وہ بھی
اس خیال کے پوری طرح حامی ہیں کہ ہر عہد کا ادب اپنے گرد وپیش کے
حالات سے متاثر ہوتا ہے۔ ایک جگہ شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے
لکھتے ہیں: "ملک کی شاعری اس کے تمدن کے تابع ہوتی ہے جو سوسائٹی
جس رنگ میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے اس کی جھلک اس کی نظم ونثر میں
آجاتی ہے"۔ (مقدمات حصہ دوم صفحہ ۴۶)

مولوی صاحب کے ذہنی رجحانات کی تشکیل وتعمیر میں سرسیّد
کی عقلیت پسندی اور حالی کی حقیقت بیانی کا بہت حصہ ہے۔ وہ ان
دونوں عہد آفریں شخصیتوں سے بہت متاثر ہوئے، خاص طور پر ادب
کے معاملہ میں وہ حالی سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ حالی کی طرح وہ ادب
سے اصلاح کا کام لینے اور اسے زندگی کی جدوجہد میں برابر کا شریک
رکھنے کے قائل ہیں اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے قدیم ادب پر
قانع ہوجانے کو مناسب نہیں سمجھتے اور جانتے ہیں کہ موجودہ ادب کو زمانے
کے ساتھ ساتھ چلنا چاہیئے اور پرانے ادب میں جو باتیں معیوب ہیں
ان کو ترک کردینا چاہیئے۔ انہوں نے جب بھی کسی موضوع پر قلم اٹھایا ہے
اس کا حق ادا کردیا ہے۔ کسی فنکار کے بارے میں لکھتے ہوئے وہ اس کی
زندگی کے حالات، اس کے مزاج کی خصوصیات اور اس کے زمانے
کے واقعات کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ وہ سماجی اور سیاسی تحریکات پر گہری نظر
رکھتے ہیں لیکن اس سلسلے میں وہ آجکل کے نقادوں کی طرح سیاسی اور
سماجی حالات کو تمام جزئیات کے ساتھ اس طرح بیان نہیں کرتے کہ اصل
موضوع کی اہمیت ہی ختم ہوجائے۔ آجکل کے بعض نقاد جب کسی فنکار
پر لکھتے ہیں تو اس کے سالِ پیدائش سے لیکر سالِ وفات تک کے تمام
تاریخی واقعات پوری تفصیل کے ساتھ بیان کردیتے ہیں۔ جن کا براہِ راست
فنکار کی زندگی اور فن سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ادبی تنقید میں سیاسی حالات

کو بطور پس منظر کے اس حد تک بیان کرنا چاہیئے کہ ان کے وہ اثرات واضح ہوجائیں جو فنکار کی شخصیت نے قبول کئے اور جن کے تحت اس کے ذہنی رجحانات کی تشکیل ہوئی۔ مولوی صاحب کا نظریہ بھی یہی ہے۔ وہ عملی تنقید میں سیاسی و معاشری حالات کو اس طور پر بیان کرتے ہیں کہ فنکار کی سیرت اور اس کے فن کا مطالعہ کرنے میں بڑی آسانی پیدا ہوجاتی ہے۔ "مقدمہ انتخاب کلام میر" اس کی بہترین مثال ہے۔ انھوں نے میر کے شعری محرکات کا تجزیہ بڑی خوبی سے کیا ہے اور دکھایا ہے کہ زمانے کے حالات نے میر کی شخصیت اور فن پر کیا اثر ڈالا۔

مولوی صاحب کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ انہوں نے عالمی ادب سے پوری طرح استفادہ کیا تھا۔ صرف اُردو ہی نہیں بلکہ مشرق و مغرب کی کتنی زبانوں کے ادبیات پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ ادبیات کے علاوہ دیگر سماجی علوم سے بھی بخوبی آشنا تھے مختلف ادبی، علمی، عمرانی، سیاسی تحریکات اور رجحانات سے ان کی آشنائی قابل رشک تھی۔ ان سب خصوصیات نے ان کی عملی تنقید کو بہت متوازن بنادیا ہے۔ وہ صرف خوبیوں یا خامیوں سے ہی سروکار نہیں رکھتے بلکہ ادب پارے کا تجزیہ اس انداز سے کرتے ہیں کہ اس کی خوبیاں اور خامیاں خودبخود واضح ہوجاتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض جگہ وہ تحسین و تعریف کرتے ہوئے مبالغے کی حد تک جاپہنچتے ہیں لیکن ایسے مقام بہت کم ہیں اور انھیں بآسانی نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔

مولوی صاحب کو اردو زبان سے جو خاص دلچسپی تھی۔ اس کی وجہ سے وہ تنقید کرتے ہوئے فن پارے کی زبان پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اگر زبان و بیان کی غلطیاں نظر آتی تھیں تو ان کا اظہار ضرور کرتے تھے اور اگر کوئی قابل تعریف پہلو ہوتا تھا تو اس کو بھی بیان کردیتے تھے لیکن ان کی ساری تنقید زبان و بیان تک ہی محدود نہیں ہوتی تھی۔

مولوی صاحب کی تنقید صحیح معنوں میں سائنٹفک تنقید ہے۔ موضوع کے ہر پہلو پر وہ اس انداز سے روشنی ڈالتے ہیں کہ پڑھنے والے کو کہیں تشنگی محسوس نہیں ہوتی۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حالی کے بعد اگر کسی نے اُردو میں تنقید کی روایت کو آگے بڑھایا ہے تو وہ مولوی عبدالحق ہیں۔ حالی نے صرف بنیاد ڈالی تھی لیکن مولوی صاحب نے اسی بنیاد پر عظیم الشان عمارت کھڑی کردی۔ مولوی صاحب کا یہ کارنامہ ہماری ادبی تاریخ کا روشن ترین باب ہے۔ اردو میں تبصرہ نگاری کو ایک باقاعدہ فن کا درجہ مولوی صاحب ہی نے دیا ہے۔ مولوی صاحب کی تبصرہ نگاری کا باقاعدگی سے آغاز رسالہ "اردو" کے اجرا سے ہوتا ہے۔ اس رسالے میں انھوں نے بے شمار کتابوں اور رسالوں وغیرہ پر تبصرے لکھے، جن کے ایک دو انتخابات شائع ہوچکے ہیں۔ مولوی صاحب کی تبصرہ نگاری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کتاب پڑھ کر تبصرہ لکھتے تھے (یہ بات میں نے اس لئے لکھی ہے کہ اردو کے ننانوے فیصدی تبصرہ نگار کتاب پڑھے بغیر ہی اس کی خوبیوں اور خامیوں پر بحث کرتے ہیں) کتاب کی خوبیوں اور خامیوں پر وہ تفصیلی بحث تو نہیں کرتے مگر ایسے اشارے ضرور کرتے ہیں جن سے کتاب کی خصوصیات کو سمجھنے میں مدد ملے۔ اُن کی تبصرہ نگاری کا پہلا اصول یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے زیر تبصرہ کتاب میں اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کیا گیا ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں وہ سخت گیر واقع ہوئے ہیں۔ اگر کوئی کتاب اپنے موضوع کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی تو وہ بڑی سختی سے اس کا محاسبہ کرتے ہیں بلکہ اسے نشانۂ تضحیک بنانے سے بھی نہیں چوکتے۔

مولوی صاحب نے اپنی تبصرہ نگاری کو کبھی ادبی بددیانتی سے آلودہ نہیں کیا یعنی انہوں نے نہ تو کبھی کسی کتاب پر متعصبانہ نقطۂ نظر سے کچھ لکھا اور نہ کبھی ایسی کتاب ہی پر تبصرہ کیا جس کے موضوع سے اُن کو واقفیت نہ ہو۔ ان دو خصوصیات کی وجہ سے اُن کی تبصرہ نگاری نے اردو تنقید میں ایک ایسی روایت کی بنیاد رکھی ہے جو نہایت ہی صحت مند اور مستحسن ہے۔ کسی خراب سے خراب کتاب میں بھی انھیں کوئی کام کی بات نظر آجاتی ہے تو وہ اس کو ضرور سراہتے ہیں۔ اور اگر کسی کتاب میں کوئی ایسا مسئلہ آجاتا ہے جس پر وہ خود کو تبصرہ کرنے کا اہل نہیں سمجھتے تو فوراً اس کا اعتراف کرلیتے ہیں۔

مولوی صاحب کے اسلوب کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ان کی انفرادیت کی تشکیل میں جن ذہنی رجحانات نے حصہ لیا ہے۔ اُن کی نوعیت کیا ہے۔ مولوی صاحب نے ایک ایسے دور میں آنکھ کھولی جب سرسید کی عقلیت پسندی کی تحریک اپنے شباب پر تھی۔ عبارت آرائی، قافیہ پیمائی اور تصنع سے بھرپور تحریروں کا رواج اُٹھ چکا تھا۔ ہر بات صاف اور سیدھے انداز سے کہی جانے لگی تھی۔ مولوی صاحب سرسید سے اور پھر مولانا حالی سے بہت متاثر ہوئے۔ نہ صرف یہ کہ ان دونوں کے خیالات انھوں نے اپنائے بلکہ ان کا طرزِ تحریر

(باقی صفحہ ۱۲۳ پر)

غزل

ضمیر آظہر

صیاد تھے، نہ صید تھے، کوئی کمیں نہ تھی
دُنیا نمودِ عشق سے پہلے حسیں نہ تھی

ہنگامہ ہائے شوق کا کچھ تذکرہ نہ تھا
تکرارِ امتیازِ مئے وانگبیں نہ تھی

تخلیقِ حُسن ــ حُسن کا ہی معجزہ تو ہے
سمجھے تھے ہم بہار ــ بہار آفریں نہ تھی

محسوس جوں ہی درد کی لذّت ہوئی ہمیں
دل میں ہمارے کوئی خلش جاگزیں نہ تھی

دنیا نے آپ ہی اسے رنگیں بنا دیا
رنگینئ حیات وگرنہ کہیں نہ تھی

گذرے ترے فراق میں ہم اس دیار سے
صرف آسمان ہی تھا جہاں پر زمیں نہ تھی

ڈھونڈا اسے وفا کے لقب سے پکار کر
آہٹ مگر ضمیرؔ وفا کی کہیں نہ تھی

انجم رومانی

اے دل! عجب ہے کیا اگر آفت رسیدہ ہوں
باشندۂ جہانِ خرو آفریدہ ہوں

ہے ان کو ناگوار مرا یہ مقام بھی
حلقے میں اہلِ غم کے اگر برگزیدہ ہوں

دل وہ بلا کہ شورِ قیامت کرے بپا
خوابِ خیال میں بھی اگر آرمیدہ ہوں

رکھتا ہوں اختیار بھی، لیکن بقدرِ جبر
ہوں طائرِ خیال مگر پر بریدہ ہوں

آب و ہوائے دہر نہ راس آئی آج تک
ہر چند گرم و سردِ زمانہ چشیدہ ہوں

لَے میں فغانِ نیم شبی کا اثر سہی
میں نغمہ خوانِ جلوۂ صبحِ دمیدہ ہوں

نشّے میں رنگ کے نہ رہا یہ بھی امتیاز
شبنم ہے چشمِ گل میں کہ خود آبدیدہ ہوں

ہے اور بھی کوئی مہ و انجم میں اہلِ درد
یا میں ہی کائنات میں اک دل گزیدہ ہوں

★

غزل

نصیر حیدر

ہوائیں چاند کے قدموں پہ سر رگڑتی ہیں
ترے خیال کی پرچھائیاں سی پڑتی ہیں

مٹی ہوئی ورق رنگ رنگ پر دل کے
ابھر ابھر کے کئی صورتیں بگڑتی ہیں

نشاط رفتہ کی گلکاریوں سے مہکی ہوئی
تصورات کی بیلیں دروں پہ چڑھتی ہیں

لرزتے جاتے ہیں پردے دریچۂ دل کے
صدائیں سی ہیں دبے پاؤں آگے بڑھتی ہیں

کبھی کی بھولی ہوئی ساعتیں، تمنائیں
حریم وقت کے دیوار و در سے لڑتی ہیں

نکل گئی ہیں جو گھڑیاں سواد باد سے بھی
پلٹ کے آتی ہیں دامانِ دل پکڑتی ہیں

اختر احسن

جس قدر شامیں ترے شمس و قمر میں ہوں گی
اس قدر صبحیں ترے ذوق و نظر میں ہوں گی

رتجگا چہرہ لئے آئے گا سورج جس دم
صورتیں رات کی سب دیدۂ تر میں ہوں گی

نرمیاں صبح کی رہ رہ کے تڑپ جائیں گی
سرخیاں رات کی سب قلب و نظر میں ہوں گی

یاد کے دشت میں آوازوں کی رنگیں موجیں
درد کے ساحلوں پر سیر و سفر میں ہوں گی

درد سوچے گا کبھی منزل شب کی باتیں
تلخیاں تاروں کی شبنم کے اثر میں ہوں گی

کن مچلتی ہوئی راہوں سے گزرنا ہوگا
صورتیں کونسی آئندہ سفر میں ہوں گی

*

ڈرامہ

بیٹی والے

اصغر بٹ

(وقت پچھلا پہر۔ متوسط گھرانے کا ڈرائنگ روم۔ فرش پر دری بچھی۔ آتش دان پر دو مراد آبادی گلدان۔ کاغذ کے پھولوں سے آراستہ۔ آتشدان کے اوپر کسی سگریٹ کمپنی کا اشتہاری کیلنڈر جس پر ایک مغربی حسینہ ہاتھ میں سلگتا ہوا سگریٹ لئے بے حد بشاش نظر آتی ہے۔ بائیں جانب کونے میں لکڑی کے اسٹول پر بجلی کا پنکھا کمرے میں چھ آرام کرسیاں دو سامنے کے رخ، دو دائیں جانب اور دو بائیں جانب درمیان میں پرانی وضع کی ایک گول میز ذرا فاصلے پر دو تپائیاں اور بھی، ایک دائیں جانب ایک بائیں جانب۔ ایک دروازہ آتشدان کے برابر بائیں جانب گھر کے اندر کھلتا ہوا۔ دروازے پر سبز رنگ کا سادا سا پردہ۔ بیرونی دروازہ پرجو دائیں دیوار میں ہے۔ ایک پیک۔ سامنے کی کرسیوں میں سے ایک پر ایک ادھیڑ عمر آدمی شلوار قمیض پہنے، عینک لگائے، درمیانی گول میز پر چند فائیلیں رکھے ان کا مطالعہ کر رہا ہے۔ دو فائیلیں میز کے ساتھ ہی نیچے دری پر رکھی ہوئی ہیں۔ شکل سے دفتری بابو لگتا ہے۔

(پردہ اٹھتا ہے تو مرد ہاتھ میں پنسل لئے فائیل پر نشان لگا رہا ہے پچھلے دروازے کے پردے کو حرکت ہوتی ہے اور تقریباً پینتیس برس کی عورت داخل ہوتی ہے۔ اس نے بال پیچھے کی طرف کھینچ کے ان کا جوڑا بنا رکھا ہے۔ ریشمی پھولدار قمیض سفید لٹھے کی شلوار پہن رکھی ہے جسم ذرا بھاری، حرکات میں تیزی)۔

عورت۔ میں نے کہا اب تو چھ بج گئے۔

مرد:۔ (بدستور فائیلوں میں کھویا ہوا) ہوں!

عورت:۔ اور ان لوگوں نے پانچ بجے آنے کو کہا تھا۔

مرد:۔ ہوں!۔

عورت:۔ میں نے کہا چھوڑیں ان موئی فائیلوں کو اب۔

مرد:۔ (بغیر نظریں اٹھائے) تو کیا کروں؟

عورت:۔ آپ کو تو کچھ فکر ہی نہیں ہے۔

مرد:۔ فکر کرنے سے کیا ہوگا؟

عورت:۔ آپ کو ان فائیلوں سے فرصت ہو تو کوئی آپ سے بات بھی کرے
(دائیں جانب کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

مرد:۔ تم بات کرو، میں سن تو رہا ہوں۔

عورت:۔ کیا خاک سن رہے ہیں۔ "ہوں۔ ہاں۔ ہوں!" کھل کے انسان بات تھوڑے ہی کر سکتا ہے ایسے میں۔ آپ یہ بتائیں کہ یہ کام دفتر میں نہیں ہو سکتا کیا۔ آخر اسے گھر میں لانے کی ضرورت کیا ہے؟

مرد:۔ سنو بیگم! تم حکومت کے کاموں میں نہیں بولا کرو۔

عورت:۔ واہ حکومت ہمارے ہی گھر سے تو چل رہی گویا۔ حکیم صاحب کا لڑکا بھی تو دفتر میں کام کرتا ہے ہم نے تو نہیں دیکھا ایک روز بھی کام گھر پر لے کر آیا ہو۔

مرد:۔ تو رہ جائے گا ایل۔ ڈی۔ سی کا ایل۔ ڈی۔ سی۔

عورت:۔ جانے کیا اِٹ بِٹ اِٹ بِٹ کئے چلے جا رہے ہیں۔

مرد:۔ (بزرگانہ مسکراہٹ سے) میں نے کہا کلرک ہی رہ جائے گا بچارا۔

عورت:۔ اور آپ کو تو وہ گویا اشٹنٹ ہی بنا دیں گے۔

مرد:۔ (ذرا برافروختہ) ہم کئی بار تم سے کہہ چکے ہیں کہ ہم سپرنٹنڈنٹ ہیں اور کئی اسسٹنٹ ہمارے انڈر میں کام کرتے ہیں۔

عورت:۔ ہماری جانے بلا۔ ہمارے ابا تو ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ اشٹنٹ بڑا افسر ہوتا ہے۔

مرد:۔ (پیشانی پر بل ڈالے) اشٹنٹ: (پھر قہقہہ لگا کر) ارے اسسٹنٹ کمشنر۔ بیٹی بھی جاہل اور باپ بھی جاہل۔

عورت:۔ (ذرا غصے سے) جب رشتہ مانگنے جوتیاں چٹخاتے آئے تھے اس وقت کہا ہوتا نا جاہل کسی کو۔ میرے باوا تو پھر بھی سکتر تھے۔ آپکے باوا نے کونسی ایم۔ اے۔ بی۔ اے کر لی تھی؟

ھ د :۔ (حالات بگڑتے دیکھ کر فائیلوں میں پناہ لیتا ہے) تو ہم کونسی بحث لے بیٹھیں۔ جاؤ، مجھے ذرا کام کرنے دو۔

عورت: (غصے سے) نہیں کریں گے کام آپ؟ کونسی موٹی تنخواہ بڑھ جائیگی۔ گھر کے لاکھوں بکھیڑے ہیں۔ ہائیں غضب خدا کا۔ لوگوں کے ہاں مرد بھی ہوتے ہیں۔ بیٹھ کر کوئی صلاح مشورہ بھی دیتے ہیں۔ یہاں کہ ان کو اپنی قلم گھسائی سے ہی فرصت نہیں۔ توبہ!

ھ د :۔ (صلح جویانہ) تمہیں بتا چکا ہوں کہ میرا نام ترقی کے لئے گیا ہوا ہے۔ اگر اس موقع پر افسر ناراض ہو گیا تو سارے کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔

عورت: ترقی؟ آپ ہی تو کہہ رہے تھے کہ تنخواہ نہیں بڑھنے کی۔ تو وہ موئی ترقی کیسی؟

ھ د :۔ اب تمہیں حکومت اور سلطنت کے کام کیا سمجھائیں۔ بس یوں سمجھ لو کہ ہم گزیٹیڈ افسر ہو جائیں گے۔

عورت: گزے۔ گزے ..... (کوشش کر کے چھوڑ دیتی ہے) کیسے موئے الٹے سیدھے نام رکھ دئے ہیں آجکل کے لوگوں نے پہلے تو سیدھے سیدھے۔ سکتر، ڈپٹی اور لاٹ صاحب تین افسر ہوتے تھے۔ اب یہ گزیرے لو اور آدھ گزے لو۔!

ھ د : گزیٹیڈ (لفظ "ٹڈ" کو واضح طور پر دہراتا ہے)۔

عورت: لعنت بھیجتی ہوں ان ٹڈے ٹڈیوں پر۔ جب پیسے نہیں بڑھیں گے تو مشکل نام رکھ لینے سے پیٹ بھر جائے گا کیا؟

ھ د :۔ (ہمت ہار کر فائیل بند کر دیتا ہے اور عینک اتار کر ہاتھ میں تھام لیتا ہے) اچھا لو ہم چھوڑ دیتے ہیں کام۔ اب بولو۔

عورت: ۔ (میاں کو ہتھیار ڈالتے دیکھ کر نرم ہو جاتی ہے) میں کب کہتی ہوں کہ آپ کام نہ کریں۔ سو دفعہ کریں۔ لیکن کسی وقت ہماری بھی تو سنیں۔ آخر لڑکی کا معاملہ ہے۔

ھ د : ہاں ہاں بولو بولو۔ ہم سن رہے ہیں۔

عورت: ہائیں اے اور سنو۔ مجھے کوئی رام کہتا تھوڑے ہی کہنا ہے۔ اب بتائیں کریں کیا؟

ھ د : گھبرانے کی بات نہیں۔ آ جائیں گے وہ لوگ۔

عورت: خاک آجائیں گے۔!

ھ د : عورتوں کے لئے گھنٹہ دو گھنٹہ دیر کر دینا کوئی بڑی بات بھی نہیں۔

عورت: ہم بھی تو آخر گھر سے نکلتے ہیں۔ اتنی دیر ہم سے تو نہیں ہوئی کبھی۔

ھ د : توبہ کر دیگم! چھ گھنٹے تو تم جوتی ڈھونڈنے میں لگا دیا کرتی ہو۔

عورت: اے غضب کرتے ہیں آپ! ہو گئی برسوں میں ایک بار دیر، یونہی ذری سی اور آپ تو گویا میری سوت بن کر بیٹھ گئے۔

ھ د : اچھا بھئی جانے دو۔ میں کہہ رہا تھا کہ ان کے نہ آنے کی وجہ بھی تو آخر کوئی ہو۔!

عورت: وجہ۔؟ وجہ کوئی نئی ہوگی! وہی وجہ ہے جو ہمیشہ سے رہی ہے۔ یعنی دیکھنے کو بکتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ اور پھر جو نکلے ہیں تو انہیں یا زمین کھا گئی یا آسمان اٹھا کر لے گیا۔

ھ د : میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ لڑکی کو سامنے نہیں آنے دینا۔

عورت: اے لو!۔ وہ کہیں ہیں لڑکی دکھاؤ تو ہم کیا کہیں جاؤ ہوا کھاؤ بھلا ایسے بھی کبھی رشتے ناطے ہوتے ہیں؟ جب کوئی لڑکی دیکھنے آئے گا تو وہ دیکھ کے ہی جائے گا۔

ھ د : (اٹھ کر ٹہلتا ہے) بھئی اگر لڑکی اچھی نہ ہو تو کوئی ترکیب لڑانی پڑتی ہے۔

عورت: ۔ ایسی بھی نہیں کہ خدانخواستہ کوئی لنگڑی کانی ہو۔ اچھی ہے۔ اچھوں میں اچھی ہے۔ گورا رنگ۔ اچھا جسم۔ مڈل تک پڑھی ہوئی۔ ہمیں تو باوا نے سکول کی شکل تک نہیں دکھائی تھی یہ چھوٹی بیٹی ان کی لاڈلی تھی اس لئے......

ھ د : (رک کر) میں نہیں کہتا کہ وہ بدصورت ہے۔ لیکن جب بیسیوں لوگ دیکھنے کے لئے آ چکے ہیں تو آخر کہیں سے سوال بھی تو آنا چاہئے تھا۔ لڑکی کی عمر پچیس برس تو ہو گئی۔

عورت: ۔ کوئی ایک بات ہو تو کچھ حل سوچیں۔ کوئی کہتا ہے لڑکی یتیم ہے۔ کوئی کہتا ہے جہیز کم ہے۔ کوئی کہتا ہے ناک چپٹی ہے۔ کوئی کہتا ہے آنکھیں چھوٹی ہیں۔ اس بچاری میں دنیا بھر کے کیڑے ڈالنے کو تو سب حاضر ہیں۔ کوئی ان سے نہیں کہتا کہ سکتر علم دین کی بیٹی ہے۔ پچیس برس کی ہے تو کیا ہوا۔ آخر ایک زمانے میں ہمارے گھر کا بھی نام تھا۔ بڑے باپ کی بیٹی ہے۔ اور میں بھی تو

دنیامیں کوئی ہوں۔ میری چھوٹی بہن ہے۔

ھ د : آجکل نام کو کون پوچھتا ہے۔ ؟ بڑے بڑے ڈپٹیوں کی بیٹیاں بیٹھی رہ جاتی ہیں۔ اور یہ تو پھر بھی سینٹری انسپکٹر کی بیٹی ہے۔

عورت : ہوتا آج ہمارا باپ زندہ تو آپ کو دکھا دیتی کہ کیسے گھگھیائے ہوئے لگے رہتے ہیں قطاروں ہیں۔

ھ د : (دوبارہ کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اور فائیلیں سمیٹتا ہے) خیر ایسی بھی تکلیف نہیں ہے انہیں کہ باوا کی شکل دیکھتے ہی شیر سے بلی ہو جائیں۔

عورت : آپ نے تو خود دیکھی ہے ان کی حکومت، شہر کے پچاس مہتروں میں سے تیس تو ہماری گلی کی صفائی میں ہی لگے رہتے تھے اور مچھر مار تیل کے کنستر ہمارے ہاں پانی کی طرح لڑھکائے جاتے تھے۔

ھ د : (فائیلیں باندھ کر اٹھتا ہے) انہیں قیمتی خدمات کی بدولت تو برخاست ہوئے ناآخر۔

عورت : اے ہے آپ کو کیا ہو گیا ہے آج پنجے جھاڑ کر ہمارے باوا کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔

ھ د : میں تو آپ کی بات کا جواب دے رہا ہوں۔

عورت : یہ اچھا جواب ہے گود میں بیٹھے داڑھی نوچ لی اور کہا یہ جواب ہے۔ پھر اگر یاد دلاتی ہوں کہ آپ کے باوا کی پرچون کی دکان تھی اور میونسپلٹی میں ان کا چالان ہمارے باوا نے جا کر چھڑایا تھا تو آگ لگ جاتی ہے۔

ھ د : اس بات پر تو مجھے کبھی آگ نہیں لگتی۔ اگر میرے باوا اس چالان کے سلسلے میں میونسپلٹی کے چکر نہیں کاٹتے تو آپ کے باوا سے ملاقات کیسے ہوتی اور اگر ہمارے باوا اور آپ کے باوا کی ملاقات نہیں ہوتی تو ہمیں یہ چاند ایسی دلہن کیسے ملتی۔ (آ کر پیار سے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتا ہے)۔

عورت : (ذرا ہٹ کر) ہٹئے۔ شرم کیجئے۔ اتنے لوگ سن رہے ہیں۔

ھ د : آخر ہم بھی تو ایک روز لڑکی دیکھنے گئے تھے۔

عورت : (زیرِ مسرت) اب تو بھول بھی گئیں ساری باتیں۔ ہائے اللہ مجھے کتنی شرم آئی تھی!

ھ د : ہماری اماں نے آ کر کہا لڑکی ایسی ہے کہ بس لاکھوں میں ایک۔

ایک ایک آنکھ ہے کہ نجری آم جتنی بڑی۔

عورت : خیر میرے لئے تو اتنے رشتے آئے کہ باوا کو دہلیز پہ لوہے کی پتریاں چڑھانی پڑیں۔ لکڑی گھس گئی تھی۔ دو ڈپٹی ایک ٹیوا لکھا ایک کچا قانونگو۔ ایک نقل نویس۔ بچارے کہتے تھے جو چاہے لکھوا لو، لڑکی ہم یہی لیں گے۔ خیر جہاں کا دانہ پانی ہو وہیں انسان پہنچتا ہے۔ آپ کے باوا کی طبیعت ہمارے باوا سے مل گئی۔ اور ہمارے باوا تھے ایسے کہ کوئی دل کو بھا جائے پھر اس کے لئے جان دینے کو تیار ہو جاتے تھے۔

ھ د : (پھر سامنے آ کر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) بس ایک دفعہ ضیہ کا رشتہ ہو جانے دو۔ ہم بھی یہی کہیں گے کہ ہمارے دل کو وہ لوگ بھا گئے تھے۔

عورت : اے ہے تو میں جھوٹ کہہ رہی تھی کیا؟

ھ د : تم تو ہر بات پہ بگڑنے لگتی ہو۔

عورت : آپ بات ہی ایسی کرتے ہیں۔ اچھا۔ اب وقت کیا ہو گیا ہوگا؟

ھ د : (کلائی کی گھڑی دیکھ کر) سوا چھے۔

عورت : اب اگر آ بھی گئے تو سموسے تو ستیاناس ہو چکے ہیں۔ وہ تو گرم گرم ہی کھائے جائیں تو مزا دیتے ہیں۔

ھ د : دوبارہ گرم کر لینا۔

عورت : پانچ بجے گرم کئے۔ سوا پانچ بجے کئے۔ ساڑھے پانچ بجے کئے۔ اب تو موئے جل کر کوئلہ ہو گئے ہیں اب کیا گرم کروں گی۔ سوا روپے پر فاتحہ پڑھ کر بیٹھ گئی ہوں۔

ھ د : میں پھر کہتا ہوں کہ تم نے لڑکی دکھا کر گڑبڑ کر دی۔ ورنہ یہ اسامی پکی تھی۔

عورت : پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ میں نے ان سے کہا کہ لڑکی کو کیا دیکھئے گا۔ میری بہن ہے۔ مجھے دیکھ لو۔ مجھ سے بھی اچھی ہے۔ لیکن وہ تھے کہ "نہیں ہم دیکھیں گے" پھر آخر گئی۔ جہیز کے جوڑوں سے ہلکا جوڑا نکال کر پہنایا۔ لیمپ میں دیکھا تو سوا سو کا بلب لگا ہوا تھا۔ وہ اتارا اس کی جگہ پانچ کا بلب لگایا۔ لیمپ نیچے رکھا کہ ہاتھ پاؤں پر روشنی پڑے، چہرا نظر نہ آئے۔ اب اور کیا کرتی۔!

ھ د : (سوچتے ہوئے) ہاں کارروائی تو ساری ٹھیک تھی معلوم

نہیں چوک کہاں ہوئی؟

عورت: یہ موا آپ کا جو دوست ہے...

مرد: نامدار۔

عورت: وہی نامراد۔ دو کوڑی کام کا نہیں۔ اس نے بات ہی پکّی نہیں کی۔

مرد: اب بات اور کیسے پکّی ہو سکتی ہے۔ بوڑھا آدمی ہے۔ ہمارے دفتر میں اس کی عمر کٹ گئی ہے۔ اور انور ان کے سامنے چوں نہیں کر سکتا۔

عورت: اب تو ایسا لگتا ہے کہ ایک چوں کیا۔ وہ چوں چوں چوں چوں ہی کئے چلا جا رہا ہے۔

مرد: بھلی مانس تم سمجھتی نہیں۔ نامدار صاحب ہمارے دفتر کے خزانچی ہیں اور خزانچی سے ہر چھوٹے بڑے آدمی کو کام رہتا ہے۔

عورت: تو انور کو بھی اس سے کام رہتا ہے کیا؟

مرد: انور کو تو نہیں لیکن انور کے صاحب کو رہتا ہے۔

عورت: تو انور کے صاحب کو کیا کام ہوگا۔ وہ پیسے والے ہونگے۔

مرد: اب یہ مت پوچھو۔ ہزار روپیہ تنخواہ تو ہے لیکن موٹر، کوٹھی، نوکر، چاکر، اور پھر سب خرچوں کا ایک خرچ بیوی ہے۔

عورت: اسے ہے آپ مردوں کو تو کوئی ایسی بیماری ہے کہ دوسری عورت تو پری لگتی ہے لیکن بیوی ہو تو ڈائن۔

مرد: یہ اب تم نے فلسفے کی بات کہہ دی اور ہم لوگوں نے فلسفہ پڑھا نہیں۔ ہمارے استاد نے تو کہا تھا کہ بیٹا اگر تم نے پی۔ یو۔ سی۔ اور ایف۔ آر کا مطلب سمجھ لیا تو دنیا کے سارے سربستہ راز سمجھ لئے۔ خیر تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ انور کا صاحب نامدار صاحب کی مٹھی میں ہے۔ مہینے کی پندرہ تاریخ ہوتی ہے تو انور کے صاحب نامدار صاحب کی مٹھی کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ نامدار صاحب نے تو انور کو رکھوایا ہی تھا۔

عورت: اگر نامدار صاحب نے اسے رکھوایا تھا اور نامدار صاحب نے کہا کہ میرے دوست محمد حسین کی سالی جیسی لڑکی دُنیا کے تختے پر نہیں ملے گی تو پھر میں آپ سے پوچھتی ہوں کہ انور کی ڈ کٹنی ماں اور لنگوڑی بہن کہاں مر کر دفن ہو گئی ہیں۔ پانچ بجے کہا تھا آنے کو تو پہنچی کیوں نہیں؟ بیٹیوں کی شادی کرنے لگتی ہیں تو دل کے دورے پڑنے لگتے ہیں۔ اس روز آئی تھی تو غش آگیا تھا کٹنی کو۔ اب آپ ہی بتائیے کہ بیٹا شادی کرے گا یا نہیں کرے گا۔

مرد: یہ سوال ذرا مشکل ہے۔

(دروازے پر دستک)

مرد: (ایک دم اُچھل کر) لو وہ آ گئے۔

رفائیلیں بغل میں دبائے اندرونی دروازے سے نکل جاتا ہے۔ عورت جلدی جلدی دوپٹے سے پسینہ پونچھتی ہے۔ قمیض کے شکن درست کرتی ہے۔ اور چہرے پر ایک وسیع مسکراہٹ پھیلا کر دائیں جانب دروازے کی طرف بڑھتی ہے اور چک اٹھاتی ہے)

باہر سے دوسری عورت کی آواز: السلام علیکم

عورت: آں۔ آپ ہیں۔؟ وعلیکم السلام (باوجود کوشش کے اپنی ناامیدی کو نہیں دبا سکی۔) آئیے۔ اندر آئیے نا۔

باہر سے عورت کی آواز: ابھی آتی ہوں۔ ذرا منور کے ہاں سے ہو آؤں۔

عورت: کیوں۔ وہاں کیا ہے؟

دوسری عورت: اس کا بیٹا میٹرک میں پاس ہوا ہے۔ مبارکباد دے آؤں۔ سوچا آپ کے ہاں بھی جھانکتی چلوں۔ اگر آپ گھر پر ہی ہوں تو واپسی پر کچھ بیٹھوں۔

عورت: ہاں، ہاں۔ ضرور آئیے۔

دوسری عورت: ابھی آتی ہوں۔ پانچ منٹ میں۔ خدا حافظ!

عورت: خدا حافظ!

(چک سے ہٹ کر آتی ہے اور آ کر سامنے کی ایک کرسی پر دھڑام سے بیٹھ جاتی ہے۔ لمبی آہ بھرتی ہے اور آواز دیتی ہے)

عورت: میں نے کہا... سنتے ہو..... میں نے کہا۔

اندر سے مرد کی آواز: کیوں؟

عورت: میں نے کہا آ جائیے۔ کوئی نہیں ہے۔

(مرد پچھلے دروازے سے دوبارہ داخل ہوتا ہے)

مرد: تو کون تھا؟

عورت: جیری کی ماں۔

مرد: اوفو! میں سمجھا کہ انور کے گھر والے ہیں۔ تو چلی گئی پھر؟

عورت: پڑوس میں گئی ہے۔ ابھی آتی ہے لوٹ کر۔

ھ د : چلو اچھا ہے تمہارا جی بہل جائے گا۔ تمہاری تو بڑی سہیلی ہے۔

عورت : سہیلی ؟ سہیلی وہیلی کیا۔ ہماری بیٹیاں سہیلی ہیں۔ ان کی بیٹی ہمارے ہاں کبھی کھیلنے کو آجاتی ہے اور ماں اسے لینے کو آتی ہے تو تھوڑی بہت بات ہو جاتی ہے۔

ھ د : تھوڑی بہت! میں نے دیکھا گھنٹوں گلے شکوے چلتے ہیں کہ تم مہینہ بھر سے نہیں آئیں۔ اور عید کا چاند ہو گئیں۔ اور یہ کہ اور بیٹھئے نا ذرا دیر۔ اور فجو حلوائی سے جلیبیاں منگوائی جا رہی ہیں اور چائے چل رہی ہے۔ (کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

عورت : اے توبہ! آپ ہی کے گھر کی نیک نامی کے لئے کرتی ہوں۔ ہم بھی بیٹیوں والے ہیں۔ کل کلاں کو دوست لوگ ہی کام آئیں گے۔ رشتے دار کوئی نہیں پوچھتا۔

ھ د : تمہیں ابھی سے بیٹیوں کی فکر کیا پڑ گئی۔ ابھی تو ایک پانچ سال کی ہے، دوسری تین سال کی ہے۔ ابھی تو ایک عمر پڑی۔

عورت : عمر یونہی گذر بھی جاتی ہے۔

ھ د : اچھا میں نے تو یونہی کہہ دیا تھا۔ بھئی تمہاری سہیلی ہے تو پھر ہم کون بولنے والے بیچ میں۔

عورت : میں نے کب کہا ہے کہ میری سہیلی ہے۔ مجھے تو سخت بری لگتی ہے۔

ھ د : بری لگتی ہے۔؟

عورت : اُس کے بات کرنے کا انداز مجھے زہر لگتا ہے۔ اپنے گھر والوں کی تعریف کرنے لگے گی تو آسمان پر چڑھا دے گی بس ایسا لگتا ہے کہ اس دنیا میں اگر کوئی لائق لوگ ہیں تو اس کے گھر والے۔ ہم لوگ تو اُن کے پاؤں کی جوتی بھی نہیں۔

ھ د : خیر اپنے گھر والوں کی تو سب ہی تعریف کرتے ہیں۔

عورت : واہ! پندرہ برس ہو گئے ہماری شادی کو۔ آج تک کبھی ایک مرتبہ بھی سنا ہے کہ اپنے گھر والوں کی تعریف کی ہو۔ حالانکہ ہم کریں تو کوئی بات بھی ہے۔ ہمارے دادا سکتر تھے۔ اور ایک دنیا پہ اُن کی حکومت تھی۔

ھ د : بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے اپنی ہر چیز کی تعریف کرتے ہیں۔

عورت : ہمیں تو بہت برا لگتا ہے۔ اپنے منہ میاں مٹھو۔ کہ ہمارے میاں نے یہ کمال کر دیا اور ہمارے بچے ایسے تمیز والے ہیں اور اُسکے لڑکے اسلم کو تو دیکھا ہے آپ نے کبھی آجاتا ہے تو گھر میں ایک چیخ پکار مچ جاتی ہے۔ اس کو مار اس کی چیز چھین۔

ھ د : اس لڑکے کو تو گھر میں گھسنے نہیں دینا چاہئے۔ تمہاری سہیلی کا بیٹا ہے اسلئے چپ ہو رہتا ہوں۔

عورت : مجھے بھی اس سے چڑ ہے۔ لیکن پھر سوچتی ہوں کہ سنا ہے پڑھائی میں اچھا ہے اگر لائق ہو گیا تو آخر ہمارے گھر میں بھی بیٹیاں ہیں۔

ھ د : لاحول ولا قوۃ۔ یہاں پل کی خبر نہیں اور تم سوچ رہی ہو برسوں کی باتیں۔ ایسی پھوہڑ ماں ہے تو اس کا بیٹا کیا نکلے گا۔

عورت : پھوہڑ سی پھوہڑ۔ اُسے تو کپڑے پہننے تک کا سلیقہ نہیں۔ لیکن خیر بڑوں کے ہاں اچھے۔ اور یوں تو اسلم میں مار دھاڑ کی بڑی بری عادت ہے لیکن ہماری سکینہ سے اسے بڑا لگاؤ ہے۔

ھ د : ارے چھوڑو بھی اس قصے کو۔ (کلائی پر وقت دیکھ کر) اب انور کے گھر والے کیا آئیں گے اس وقت۔

عورت : اور جمیری کی ماں آ رہی ہے۔

ھ د : تو۔ ؟

عورت : میں اللہ ماری اس سے کہہ چکی ہوں کہ رضیہ کا رشتہ ہو گیا ہے۔

ھ د : ہیں یہ تم نے کیسے کہہ دیا ؟

عورت : یہ بھی آپکا قصور ہے۔

ھ د : میرا قصور۔؟ وہ کیسے۔؟

عورت : آپ ہی نے تو کہا تھا کہ بات پکی ہے۔

ھ د : لو اور سنو۔ جب رشتہ ہوا نہیں تو بات منہ سے کیسے نکال دی۔

عورت : بس۔ وہ کہہ رہی تھی کہ میری بیٹی کے لئے بڑے بڑے افسروں کے رشتے آ رہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ یہ کہے گی ہماری لڑکی میں کوئی نقص ہے جبھی رشتہ نہیں ہو رہا۔ بس غصے میں آکر کر دی بات میں نے۔

ھ د : تو ایسی ڈینگ نہیں مارنی چاہئے تھی تاکہ بعد میں شرمندگی ہو۔

عورت : آپ نہیں سمجھتے۔ میں جب اس کی باتیں سنتی ہوں تو میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ بس یہی جی چاہتا ہے وہ کہے کہ ہم نے کوٹھی خریدی ہے تو میں کہوں ہم نے شہر خریدا ہے۔ وہ کہے کہ میں نے نیکلیس بنوائی ہے تو میں کہوں کہ میں نے سونے کا برقعہ بنوایا ہے۔ وہ کہے کہ میں ناچنا جانتی ہوں تو میں کہوں کہ میں اڑنا جانتی ہوں۔

مرد : سمجھ گیا۔ اس بیماری کو کمزوریٔ دماغ کہتے ہیں۔

عورت : آپ کچھ بھی کہیں۔ ناک پہ مکھی بیٹھنے ہم کبھی نہیں دیں گے۔

مرد : چاہے ناک ہی کٹ جائے۔

عورت : ناک کٹے میرے دشمنوں کی۔ میری ناک کیوں کٹنے لگی خدانخواستہ۔

(دروازے پر کھٹکا ہوتا ہے)

لو میرے خیال میں وہ آگئی۔ آپ ذرا اندر چلے جائیں۔

مرد : مجھے اندر قید ہو کر بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں اتنے میں گلی میں نکلتا ہوں شاید میر صاحب سے ملاقات ہو جائے۔

عورت : اچھا۔

مرد : (دائیں جانب چلتے ہوئے آہستہ سے) اور تم اس سے جلدی چھٹکارا حاصل کرنا۔

عورت : ہاں۔ ہاں آپ نکلئے تو۔

(مرد دائیں جانب سے نکل جاتا ہے۔ عورت بھی اسکے پیچھے پیچھے جا کر چک ہٹاتی ہے)

عورت : آئیے نا اندر — آئیے۔

(برقعے میں لپٹی ہوئی ایک دبلی پتلی ادھیڑ عمر عورت داخل ہوتی ہے۔ کمرے میں داخل ہو کر برقع اتارتی ہے۔ واقعی اسے کپڑے پہننے کا سلیقہ نہیں۔ قمیض ڈھیلی ڈھالی ہے اور ایک مٹے ہوئے جامنی رنگ کی شلوار ہے۔ رنگ گندمی۔ دُبلے چہرے پر ناک سامنے کو نکلی ہوئی اور پھر اس پر عینک۔ شکل سے کسی پرائمری اسکول کی استانی لگتی ہے)۔

دوسری عورت : گئی تھی وہ لوگ گھر پر نہیں تھے۔

عورت : میں بھی سوچ رہی تھی کہ اتنی جلدی کیسے پلٹ آئیں۔ کہاں گئے ہیں وہ۔

دوسری عورت : نوکر کہہ رہا تھا لڑکے کے پاس ہونے کی خوشی میں پکنک منانے باہر چلے گئے ہیں۔

عورت : بیٹھئے۔ آپ بیٹھ ہی نہیں رہیں — ہائے کتنی پیاری قمیض ہے۔

(قریب آ کر جبیرن کی ماں کی قمیض اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھتی ہے)

دوسری عورت : جبیری کے ابا کہہ رہے تھے کہ سارے بازار میں بس ایک ہی قمیض کا ٹکڑا ملا ہے۔

عورت : ہاں لوگ ہاتھوں ہاتھ لے گئے ہوں گے۔

دوسری عورت : جبیری کے ابا کہہ رہے تھے کہ مل میں سے بن کے ہی اتنا سا نکلا تھا۔ اسکے بعد انہوں نے بنایا ہی نہیں۔

(لمبی سانس لیکر بائیں جانب کرسی پہ بیٹھ جاتی ہے)

عورت : آپ کیا پئیں گی۔ شربت یا چائے۔

دوسری عورت : نہیں کچھ نہیں۔ گھر سے ابھی پی کر آ رہی ہوں۔

عورت : تو ایک پیالی اور سہی۔

دوسری عورت : اصل میں آج جبیری کے ابا بازار سے بہت سا حلوہ سوہن تُلوا لائے تھے۔ جب چیز خریدتے ہیں تو بھی اندھا دھند خریدتے ہیں۔ میں تو مٹھائی کی شوقین نہیں ہوں، لیکن سوچا ذرا چکھ لوں۔ واقعی ایسا حلوہ میں نے کبھی نہیں کھایا۔ خالق نے ضرور خاص طور پر ان کے لئے بنایا ہوگا۔ بس تو طبیعت سیر سی ہو گئی ہے۔ آپ بھی بیٹھ جائیے نا۔

عورت : (بیٹھتے ہوئے) ہم نے بھی آرڈر دے کر سموسے بنوائے تھے۔ لیکن خیر آپ کا جی نہیں چاہ رہا تو پھر سہی۔

دوسری عورت : ہاں سموسے ہیں۔ سموسوں کی اور بات ہے۔ نمکین چیز کھا لیتی ہوں۔

عورت : ابھی لاتی ہوں گرم کر کے۔ (اٹھتی ہے)

دوسری عورت : بیٹھئے جلدی کیا ہے؟

عورت : (بیٹھتے ہوئے) اسلم کو نہیں لائیں ساتھ؟

دوسری عورت : میں نے کہا تھا چلو۔ اپنی کتابوں سے چپٹا بیٹھا تھا۔ کہنے لگا نہیں امی آپ جائیے۔ میرا خیال ہے شرماتا ہے۔

عورت : بڑا اچھا بچہ ہے۔

دوسری عورت : میں تو کہتی ہوں کہ خدا کے لئے ہنسا کھیلا کرو لیکن اسکی عادت ہی نہیں۔ مجال ہے کبھی شرارت کرے یا شور ہی مچائے۔

عورت : میری سکینہ کو بھی تو یہی اللہ کی مار ہے۔ چپ چاپ بیٹھی اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ اس کی استانی نے کہا تھا کہ اسے دو جماعت اکٹھی ترقی دیتے ہیں۔ اسکے ابا نے منع کر دیا۔

دوسری عورت : ہائے تو بچاری کو بڑھنے دیا ہوتا۔

عورت : نہیں وہ بولے کہ بچہ سال بہ سال ہی بڑھے تو اس کی بنیاد پکی ہوتی ہے۔ ہمیں کونسی نوکری کرانی ہے۔

دوسری عورت : سچ کہا ہے۔ میری زہرہ ہے نا وہ کہہ رہی کہ میں بی اے کروں گی لیکن اس کے والد کہتے ہیں نہیں۔

عورت : ہائے کیوں - وہ تو اس سال بی - اے کا امتحان دینے والی ہے -

دوسری عورت : اصل میں لڑکے والے دسمبر میں شادی چاہ رہے ہیں اور امتحان ہے اپریل میں -

عورت : تو اس کا رشتہ ہو گیا کیا ؟

دوسری عورت : ابھی ایک ہفتہ ہوا بات پکی ہو گئی ہے -

عورت : آپ نے ذکر ہی نہیں کیا - ہائے بتایا تو ہوتا -

دوسری عورت : اصل میں منگنی اور نکاح ایک ساتھ کر رہے ہیں - آپ کے ہاں بھی بلاوا آئے گا -

عورت : اللہ مبارک کرے ! بڑی خوشی ہوئی -

دوسری عورت : میں تو پریشان ہو گئی ہوں - لڑکی کی عمر ہی کیا ہے -

عورت : اچھا ہے بہن ، لڑکیاں اپنے گھر ہی چلی جائیں تو اچھا ہوتا ہے - بڑی ذمہ داری ہے - خدا نے آپ کی یہ ذمہ داری پوری کی -

دوسری عورت : سچ کہتی ہیں - اور ایک لحاظ سے اچھا ہی ہے - اتنے لوگ آ رہے تھے رشتہ مانگنے کہ میں تو پریشان ہو گئی تھی -

عورت : تو لڑکا کیا کام کرتا ہے ماشاء اللہ ؟

دوسری عورت : آڑھت کی دکان ہے - بڑے امیر لوگ ہیں - اسلم کے والد کہتے ہیں کہ نوکری والوں میں کیا رکھا ہے - سوکھی تنخواہ کیا چیز ہوتی ہے ؟ -

عورت : بالکل ٹھیک کہا ہے آپ نے - ہم نے بھی یہی سوچ کر رضیہ کے لئے جہاں رشتہ کیا تھا چھوڑ دیا -

دوسری عورت : ہائیں ! چھوڑ دیا - ؟

عورت : وہ آپ کو بتایا تھا نا اس روز کہ سکینہ کے ابا کے دفتر میں ایک لڑکا ہے - انہوں نے پوچھ پوچھ کر ہمارا ناک میں دم کر رکھا تھا - میں نے تنگ آ کر ہاں کر دی - پھر سوچا کہ رضیہ کا بنے گا کیا - سٹینوگرافر کی تنخواہ ہی کیا ہوتی ہے اور پھر جلدی بھی نہیں ہے - لڑکی چھوٹی ہے - مجھ سے دس برس چھوٹی ہے یہ سمجھ لیجئے -

دوسری عورت : آپ کی عمر کیا ہو گی اس وقت ؟

عورت : میں تو اپنی عمر سے پہلے بوڑھی لگنے لگی ہوں - ویسے اب کے چاند پچیس برس کی ہو جاؤں گی -

دوسری عورت : نہیں آپ تو ماشاء اللہ جوان لگتی ہیں - بوڑھے تو ہم لگتے ہیں -

عورت : تو آپ بھی کیا بوڑھی ہیں - مجھ سے کوئی ایک آدھ سال ہی بڑی ہوں گی -

دوسری عورت : جب سے بچے جوان ہو گئے ہیں ہم تو اپنی عمر کا ذکر ہی نہیں کرتے - کوئی کس کس کو بتاتا پھرے کہ ہماری شادی تیرہ برس کی عمر میں ہو گئی تھی -

عورت : اجی گولی ماریئے دنیا کو - اپنے دل میں تو ہمیں پتہ ہی ہے کہ ہماری عمر کیا ہے -

دوسری عورت : تو اس حساب سے آپ کی چھوٹی بہن پندرہ برس کی ہو گی - ہاں یہ تو کوئی زیادہ عمر نہیں ہے -

عورت : معلوم نہیں لوگ اپنی عمر کیوں غلط بتلاتے ہیں - ہم سے تو قرآن پر قسم لے لیجئے جو کبھی یہ بات لوگوں سے چھپائی ہو -

دوسری عورت : یونہی عورتوں کو خدا کی مار ہے - نمازیں پڑھیں گی - روزے رکھیں گی لیکن عمر پوچھو تو جھوٹ ہی بولیں گی ! اب اس منور ہی کو لو - بیٹے نے میٹرک پاس کیا ہے اور کہتی ہیں کہ میں بیس برس کی ہوں -

عورت : لوگوں کے دل میں تو خدا کا خوف نہیں رہا -

دوسری عورت : مجھے خود ایسی عورتوں سے نفرت ہے - منور تو ایسی ایسی باتیں کرتی ہے کہ غصے سے خون کھول جاتا ہے -

عورت : اچھا ؟ میں اسے ایک ہی دفعہ ملی ہوں - زیادہ نہیں جانتی -

دوسری عورت : اتنی ڈینگیں مارے گی ، اتنی ڈینگیں مارے گی کہ جی چاہے گا اُٹھ کر بھاگ جائیں - بس اُس جیسا کوئی حسین نہیں ہے - اسکے بچوں جیسا کوئی لائق نہیں اور اس کے میاں جیسا کوئی امیر نہیں ہم لوگ ٹھہرے فقیر -

عورت : میرا تو ایسی عورت سے ملنے کو بالکل جی نہ چاہتا - معلوم نہیں آپ کیسے مل لیتی ہیں -

دوسری عورت : سوچتی ہوں آدمی آدمی کے کام آتا ہے - آخر ہم بھی بیٹیوں والے ہیں -

عورت : تو اس کا کوئی بیٹا جوان بھی ہے ؟

دوسری عورت : نہیں سب سے بڑا تو یہی ہے جس نے میٹرک پاس کیا ہے - لیکن ہمارے ہاں کبھی کبھی آتا ہے اور مجھ سے بڑی محبت کرتا ہے - "خالہ جی خالہ جی" کہتے کہتے بچارے کا منہ سوکھتا ہے -

عورت : ہاں بہن بروں کے ہاں اچھے -

دوسری عورت: اور بہن خدا لگتی کہوں تو آجکل ماں باپ کو دیکھ کر کون رشتہ کرتا ہے۔ بس لڑکا دیکھتے ہیں۔

عورت: یہ تو سچ ہے۔

دوسری عورت: میری چھوٹی بیٹی ہے نا جیری، ذرا حساب میں کمزور ہے۔ میں بھی کہتی ہوں کہ وہ اُسے حساب پڑھاتا ہے تو پڑھا دیا کرے۔ دونوں بچے ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں۔

عورت: اب زمانے کی ہوا بدل رہی ہے۔ اب تو لڑکے کی مرضی سے شادی ہوتی ہے۔ ماں باپ کو کون پوچھتا ہے۔

دوسری عورت: اب میرا اسلم ہے کہ اپنی خالہ کی لڑکی پر جان چھڑکتا ہے۔ میں بھی سوچتی ہوں کہ بہن ہی بیٹی لے آؤں، غیروں کے ہاں شادی کرنے سے خرابی ہی ہوتی ہے۔

عورت: (سرد مہری سے) اللہ ان بچوں کو زندگی دے۔ ہم تو یہی دعا مانگتے ہیں۔ جہاں جی چاہے ان کا شادی کریں۔ جی چاہے رشتہ داروں میں کریں، جی چاہے باہر کریں۔

(باہر سے دروازے پر کھٹکا)

عورت: (اُٹھ کر) کون ہے؟

باہر سے اس کے میاں کی آواز: میں ہوں۔!

عورت: (چِک کے پاس جاکر جھانکتی ہے) کیا کوئی چیز چاہیئے آپ کو؟

مرد: نہیں ابھی ابھی نامدار صاحب آئے تھے۔ لڑکے والوں کی طرف سے انگوٹھی دے گئے ہیں۔ مبارک ہو!

عورت: (ایکدم بشاش) آپ کو بھی مبارک ہو۔ لڑکے کی ماں کیوں نہیں آئی؟

مرد: اچانک بیمار ہو گئی۔ میں ذرا نامدار صاحب کو گلی کی نکڑ تک چھوڑ آؤں۔ آتا ہوں۔

عورت: اچھا جلدی آجائیے۔ پھر آپ سے کچھ مشورہ بھی کرنا ہے۔

(چِک سے انگوٹھی کی ڈبیا لئے ہوئے پلٹتی ہے)

دوسری عورت: بہن مبارک ہو!

عورت: آپ کو بھی مبارک ہو!

دوسری عورت: یہ رضیہ کے رشتے کی بات ہو رہی تھی نا؟

عورت: جی ہاں۔ اللہ نے اپنا فضل کیا ہے۔ اور یہ کام بھی ہو گیا۔

(انگوٹھی کی ڈبیا کھولتی ہے)

دوسری عورت: دیکھیں انگوٹھی۔

عورت: سکینہ کے ابا کہہ رہے تھے کہ اصلی ہیرے کی ہے۔

دوسری عورت: کتنے کی ہوگی؟

عورت: ہزار روپے کی تو ہوگی۔ (برابر بیٹھ جاتی ہے)

دوسری عورت: اب تو کوئی ہزاروں میں ایک ہوتا ہے جو اصلی ہیرے کی انگوٹھی دیتا ہے۔ ہمارے زمانے میں تو سارا زیور ہیرے، زمرد، نیلم کا ہوتا تھا۔ مجھے ماں باپ نے تین سیٹ دئے تھے (ہاتھ میں انگوٹھی لے کر دیکھتی ہے) واقعی اصلی ہیرے کی ہے۔

عورت: (انگوٹھی کو لیکر ڈبیا میں بند کرتی ہے) اللہ رضیہ کے نصیب کرے!

دوسری عورت: آمین! لڑکے کی ماں کیوں نہیں آئی؟

عورت: اس کا دل کچھ کمزور ہے۔ اُسے پھر دورہ پڑا ہے۔ لڑکی دیکھنے کے لئے آئی تھی تو یہاں بھی اسی طرح دل کا دورہ پڑا تھا۔ رضیہ بچاری نے بڑی خدمت کی۔ سکینہ کے ابا جا کر ڈاکٹر کو لائے۔ بس اس دن سے وہ بچارے ہمارے نام کا کلمہ پڑھتے ہیں۔

دوسری عورت: ہاں بہن آپ کی محبّت تو غیروں کو اپنا کر لیتی ہے۔

عورت: اصلی بات دل کی سچائی ہوتی ہے۔ اب آپ آتی ہیں تو میں دل سے خوش ہوتی ہوں اس لئے آپ کو بھی اچھا لگتا ہے۔

دوسری عورت: دنیا میں خلوص بڑی چیز ہے۔ ہاں یہ تو میں نے پوچھا ہی نہیں کہ لڑکا ماشاءاللہ کیا کرتا ہے۔

عورت: بہت کھاتے پیتے لوگ ہیں۔

دوسری عورت: تو کوئی کاروبار ہے اُن کا؟

عورت: نہیں لڑکا تو ان کے دفتر میں ملازم ہے۔ لیکن ملازمت تو بس شوقیہ ہے۔ ورنہ ماں باپ کے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔

دوسری عورت: (سوچتے ہوئے) ایک اسی دفتر کا لڑکا تھا جس کا رشتہ آپ نے چھوڑ دیا تھا۔ یہ تو اور ہوگا؟

عورت: نہیں وہی ہے۔

دوسری عورت: وہی ہے؟

عورت: (پُرمسرت) ہم نے تو چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اب لڑکے والے مجبور کر رہے ہیں تو سکینہ کے ابا ہاں کر آئے۔ ایک ہی دفتر میں دشمنی بھی تو مول نہیں لی جا سکتی۔ نوکری کا معاملہ ہے۔

دوسری عورت: لیکن آپ تو کہہ رہی تھیں کہ لڑکا سٹینوگرافر ہے۔

باقی ص۱۰۹ پر

سانہ :

پردے

رفعت شفیع

بٹیلانٹا !

آج میں تم سے مخاطب ہوں، ہاں تم سے، مدتیں گزریں
لے اپنے راہ میں پڑے ہوئے سونے کے تین سیب اٹھانے میں
بی شرط ہار دی تھی۔

تم چونک سی اٹھی ہو۔ اور میں تو اس وقت ہی چونک سا
ٹھا تھا جب تم نے کسی ڈھکی چھپی روح کو پسند کرنے کی بجائے
نے کے سیب اٹھا لئے تھے۔ میں نے چاہا بھی کہ بڑھ کر تمہارے
تھ جھٹک دوں، تمہیں سمجھاؤں، مگر اس روز تو یوں بھی تم ہی گھر
ر کا موضوع بنی ہوئی تھیں۔ برآمدے میں سب بیٹھے تھے۔ ربعیہ
نے مسکرا کر کہا تھا۔" ہائے! خالہ کو دیکھا ہے۔ کس طرح پھر رہی
ں سارے میں۔

"ہوں، کڑک مرغی کی طرح۔ جیسے زبردستی اٹھا کر کسی شریر بچے
نے صحن میں پھینک دیا ہو۔ پھوپھو بیچاری بھی تو انڈوں کے تصور
ں میں پلنگ پر بیٹھی تھی اب تک"۔ روبینہ نے کہا۔

" بیچارہ جالی"۔ یہ شاید ثریا نے ہمدردی کی تھی۔

" ارے جانے دو۔ جالی بھیا کو کیا کمی ہے کوئی۔ مگر یہ
دنری ایپیلانٹا نکلیں"۔

" ایپیلانٹا ... ــ ؟؟"

" ہاں ہاں۔ تم سب نے وہ یونانی کہانی نہیں پڑھی ناں"۔
بینا نے کہنا شروع کیا۔

" وہ یونانی لڑکی تھی اس قدر تیز رفتار کہ اس کا مقابل اور
انی ملک بھر میں نہ تھا۔ اس نے شادی کی شرط یہ رکھی تھی جو کوئی تیز
رفتاری میں اس سے بڑھ جائے گا، اُسی سے شادی کرے گی۔
س وقت کے بیکار شہزادے آئے اور شکست کھا گئے۔ بہت سے
تیز رفتار اُسے جیتنے آئے مگر ہار گئے۔ مگر پھر ہپومینز آیا۔ اس نے

چالاکی کی۔ مقابلہ شروع ہوا تو وہ بھاگتے میں سونے کے تین سیب تھوڑے
فاصلے فاصلے پر پھینک گیا۔ ایپیلانٹا انہیں اٹھانے کو باری باری
رکی۔ ہپومینز منزل پر پہنچ گیا"۔

" ہماری دیدی نے بھی ... سونے سے ہی شکست کھائی
ہے ناں؟"

" ایپیلانٹا! تم سچ کہتی ہو۔ روبینہ پیاری! (جیسے میری روح
نے پوری طرح بینا کی اس مثال کو تسلیم کر لیا) میں مسکراتا ہوا اٹھا
اور چپکے سے باہر نکل آیا۔ اس وقت میں بینا سے یہ بھی نہ پوچھ
سکا۔ یہ تو بتا دو۔ کیا وہ سیب قطعی سونے کے تھے یا ان پر صرف
خول چڑھا تھا۔ مگر وقت نے میرے سامنے باری باری ان کے خول
اتار دیئے ہیں۔ ایپیلانٹا۔ اور میں تمہاری روح کی گہرائی تک میں جھانک
آیا ہوں۔

تمہاری زندگی میں ہپومینز کے آنے سے قبل کئی ایک نے
تم سے اپنی زندگی وابستہ کرنے کے خواب دیکھے تھے۔ تمہاری پسند نے
بھی تو ہم میں سے بہتوں کو اسی خوش فہمی میں مبتلا کر دیا تھا کہ تم بس
"مجھے" ہی چاہتی ہو۔ تم گھرانے کی سب لڑکیوں میں بیٹھ کر اپنے خوابوں
کے شہزادے کا یوں ذکر چھیڑتیں۔
وہ سیاہ رنگ کے گھنگھریالے بالوں کا چوڑی پیشانی مردانہ
رنگ۔

مردانہ رنگ" ثمانہ جھٹ سے ٹوکتی۔
ہاں ہاں بھئی، مردانہ یعنی کہ قدرے سنولایا ہوا۔ نہیں بس، وہ
کیا کہتے ہیں قدرے صاف ... اور ..."

" تو گندم گوں کہو نا دیدی جس نے حضرت آدم سے جنت
چھڑوائی تھی، وہی تم سے میکہ چھڑائے گا۔ سکینہ پھوپھو کا جالی"۔
روبینہ کی اس وضاحت پر قہقہہ پھوٹ بہتا۔ اور تم ڈھیٹ بنی

اس پسند کو اور بھی رنگین کئے چلی جاتیں اپنے خیال سنا سنا کر۔

"ہاں ہاں، ادب نواز، خوش اخلاق، باوقار شخصیت ہنوش پوش"۔ اور یقین مانو جب تمہاری زبان پر ہیوتینیز کا نام آیا تو سب کے ذہن چیخ سے اٹھے تھے۔ تم نے کیا پسند کرلیا؟ کیسے پسند کرلیا؟ وہ گہرے سانولے رنگ کا بھدا سا شخص جس میں کوئی وقار، کوئی شخصیت نہ تھی۔ میری اماں تمہیں پیدائش سے گود لئے بیٹھی تھیں۔ آج وہ بھی میری طرح پریشان سی تھیں۔ مگر بھلا ہو بینا کا اس نے ایٹیلانٹا کی کہانی سنا کر سب کو مطمئن کردیا تھا۔ میرا جی بہت دفعہ چاہا کہ میں تمہارے سامنے اس بھیڑیئے سبب کا خول اتار کر دکھاؤں کہ بڑا فراڈ ہے جس کی دولت میں ہو پسینہ کی محنت نہیں بلکہ چور بازاری کے کیڑے بھرے پڑے تھے، جس کے روپے کے سوتے ایمانداری کے کاروبار سے نہیں، بلکہ اسمگلنگ کے سمندر سے پھوٹتے تھے۔ مگر تم اُن دنوں کچھ سننے، کچھ جاننے کے موڈ میں ہی کب رہتی تھیں۔ تمہیں ہر روز کی پارٹیوں دعوتوں سے فرصت ہی کب تھی کہ تم ادگرد دیکھتیں۔ ہاں اب تم دوسروں پر طنز اور چوٹیں غضب کی کیا کرتی تھیں جو تم ایسی اونچی بیگمات کے چڑھاوے میں جاتی ہیں۔ شاید سب سے پہلی چوٹ تم نے اپنی شادی کے تیسرے چوتھے روز مجھ ہی پر کی تھی۔ گہرے طاؤسی رنگ کے زرتار لباس میں تم سب سے ملتی پھر رہی تھیں کہ مجھے دیکھتے ہی بولیں۔

"جالی سنا ہے کہ تم نے میری شادی پر بہت کام کیا تھا۔ میں تو سمجھی تھی بس تم اس روز بھی کہیں خبریں ہی سونگھتے پھر رہے ہو گے"۔

ایٹیلانٹا! اس سے قبل جب میں نے جرنلزم میں داخلہ لیا تھا تو تم خاص طور پر مبارک کہنے آئی تھیں۔ تم نے کہا تھا۔ جرنلزم کرکے تم ایک بڑے سے ادارے میں شامل ہو جانا۔ پھر ہم مل کر ایک علٰحدہ ادبی رسالہ نکال لیں گے۔ مگر آج، تم میری صحافت پر ہی چوٹ کرگئیں۔ ابھی تو تم اپنے دولت مند خاوند کے پاس دو تین شب ہی گزار کے آئی تھیں۔ میں نے مسکرا کر تمہیں جواب دیا تھا:۔

"باہر خبریں کیا لینا تھیں۔ تمہاری شادی ہی کی خبر کو بھی تو اپنے روزنامہ میں شائع کروانا تھا ــــ۔ اس کے بعد میں بہت کم تمہارے سامنے آیا۔ تمہاری مصروفیات کی خبریں مجھے مینا اور ثمانہ سے ملتی رہتی تھیں۔ بینا ہی نے ایک دن خبر دی تھی کہ تم اپنے خاوند کے ساتھ تفریحاً غیر ممالک کو جا رہی ہو چند ماہ کے لئے۔ تمہیں الوداع کہنے کے لئے سب عزیز و اقارب ہوائی اڈے پر پہنچ چکے تھے جب میں گیا۔ میں نے اپنی سائیکل کو تالا لگایا اور جلد جلد قدم اٹھاتا اُدھر سے گزرا تم نے چہک کر کہا تھا:۔

"مجھے امید تھی کہ تم ضرور آؤ گے جالی"!

تو کیا تم لوگ اسی جہاز سے اور آج ہی جا رہے ہو؟ مجھے تو پتہ نہیں تھا۔ میں تو یہاں دو ایک خبروں کے سلسلہ میں آیا تھا"۔ میں ہیوتینیز سے ہاتھ ملا کر آفس کی جانب آگیا۔ ایٹیلانٹا اور آفس کی عقبی دیوار سے لگا تمہارے جہاز کے اوجھل ہونے تک اُسے دیکھتا رہا۔ اور بھلا مجھے کیا کام تھا وہاں؟ اس کے بعد کئی مواقع ایسے آئے کہ میرا تمہارا سامنا ہوگیا۔ مگر یوں جیسے بہت سی باتیں میرے ہونٹوں میں دبی رہیں اور بہت سی باتیں تمہاری پلکوں سے جھانکتی رہیں۔ میری روح تڑپ اٹھتی۔ یہ تمہاری پلکوں سے اب کون لگا بیٹھا ہے جو صاف چھپتا بھی نہیں سامنے آتا بھی نہیں۔ سامنے آنے کا وقت تو تیزی سے نکل گیا۔ مگر پھر یہ جھلکیاں کیسی؟" میں ہر بات سے چونک اٹھتا، مسکراتا اور بھول جاتا (حالانکہ یہ غلط ہے، میں بھولنے کی کوشش کرتا ضرور تھا۔ مگر ایک بات بھی آج تک بھول نہیں سکا ہوں ایٹیلانٹا)۔ یہ تم نے تنک کر اپنے ہونٹ کیوں سکوڑ لئے ہیں ایٹیلانٹا! کیا تمہیں یہ نام نہیں پسند آیا؟ کیوں بھلا؟ میں بینا کا کیسے شکریہ ادا کروں جس نے تمہیں یہ نام دے کر تمہاری ذات کو میرے لئے مرنے سے بچا لیا۔ ورنہ مدتیں گزریں ....

سرما کی وہ سانولی سی شام مجھے کئی بار یاد آئی ہے۔ میں کمرے کے دروازے سب کھڑکیاں بند کئے شہزاد کو کمبل میں لپیٹ کر گود میں لئے بیٹھا تھا۔ وہ ابھی ابھی خسرہ کے چنگل سے نکلا تھا اور ذرا سردی کی لپیٹ میں آیا ہوا تھا۔ میں اپنے ہاتھوں کے عکس سے دیوار پر خرگوش اور چوہے بنا بنا کر اُسے بہلا رہا تھا۔ دروازہ کھلا، اور سیونتھ ہیون کی خوشبو سے بھی قبل تم اندر داخل ہوئیں۔

"سچی مجھے تو کسی نے بتایا ہی نہیں کہ شہزاد بیمار رہے۔ آج بینا سے پتہ لگا۔ اچھا تو اب کیا حال ہے مُنّے؟" شہزاد تمہاری آمد کو اپنے دل بہلاوے میں حارج دیکھ کر منہ بسورنے لگا۔ میں نے اُسے بہلانے کو ایک ہاتھ سے پھر دیوار پر چوہے کا عکس بنایا۔

"بچّے تو خوب بہلا لیتے ہو جالی! اور پھر یوں سایوں سے؟" تم نے قریب پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں، اس لئے کہ میں خود بھی بچوں کی طرح انہی سایوں سے بہل گیا ہوں ناں"۔ جانے یہ لاشعور کی کونسی چیخ تھی جو اُس دن یوں ہونٹوں سے نکل گئی۔ اور جس نے تمہارے چلمن کی تیلیاں بھی توڑ کر رکھ دیں۔ ناصرہ کے چائے تیار کرلانے کے وقفہ میں تم نے بتایا تھا، تمہیں اپنے ہنیو نیز سے کئی اختلافات ہوگئے ہیں۔ وہ اکثر کراچی رہتا ہے۔ لاہور رہے بھی تو اس کی کمپنی اتنی اچھی نہیں۔ وہ سب لوگ عیاش ہیں جو سمجھتے ہیں کہ بیویاں صرف روپیہ چاہتی ہیں۔ انہیں تو ریشمی لباس ہی دے کر بہلا لیا جاتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ بیوی کہیں نہیں جائے گی مگر وہ تیزی سے بوڑھے ہورہے ہیں، اور اپنی من مانی کرتے ہیں۔ بغیر کام کے رات بھر باہر بھی رہتے ہیں۔

میرے احساس کو زبردست دھکا لگا۔ ہائے! کیا تمہارے سامنے سیبوں کا چھلکا اترنے لگا؟

تمہارے جانے کے بعد رات بھر میرا کمرہ تمہارے سینٹ سے مہکارہا اور میں تمہاری پلکوں کے چلمن کی ٹوٹی تیلیاں چھپائے دیر تک ناصرہ سے محبت بھری باتیں کر کے اپنے شعور کو جھوٹی تسلیاں دیتا رہا۔

رفتہ رفتہ تمہارے سیبوں کے چھلکے اترنے لگے۔ چور بازاری ختم کرنے کی مہم جب چلی تو تمہارا ہنیو نیز اس کی زد میں آگیا۔ اُن دنوں میں روزنامے کا ایڈیٹر تھا۔ ہاں تو ہنیو نیز پکڑا گیا۔ سب لوگ اُس روز تمہاری طرف گئے۔ میں جانتا ہوں۔ اس روز بھی تمہاری چلمن کی اوٹ سے کوئی چھپتا سامنے آتا رہا ہوگا۔ تمہارے اداس چہرے کے خنک اور خشک ہونٹوں پر ایک فقرہ رہ رہ کر مچلتا ہوگا۔

"مجھے تمہارا انتظار تھا جالی! مجھے امید تھی کہ تم ضرور آؤ گے"۔

مگر میں چپ چاپ اپنے آفس چلا گیا۔ دوپہر کو روبینہ نے فون پر کہا دیدی کہتی ہیں ان کے لئے کچھ کیجئے گا.... پھر شام اسی کا فون آیا۔

"جالی بھیا! دیدی کو اس وقت آپ پر بہت امید ہے۔ وہ کہتی ہیں جلال ضرور کچھ نہ کچھ کرسکتا ہے۔ اُن کا مطلب ہے اپنے اخبار میں کوئی ایسی بات لکھیئے کہ..."

— کہ ہنیو نیز بے قصور لگنے لگے۔ اور اسے معصوم ظاہر کرے۔ اس کے کاروبار کا سیب پھر اسی طرح چمکنے لگے... یہ ناممکن ہے بینا پگلی! تم صحافت کی ذمہ داری جانتی ہوئی، پھر بھی مجھے مجبور کررہی ہو؟...

"تو پھر دیدی کو خود آن کر سمجھائیے گا جالی بھیا۔ انہیں تمہارا شدید—"

—"ہاں، انتظار ہوگا۔ مگر اس وقت مجھے ریڈیو اسٹیشن جانا ہے ایک پروگرام کے سلسلہ میں"۔

میں تمہیں پریشان دیکھنا نہیں چاہتا ہوں ایٹیلانشا! ہنیو نیز کی شخصیت اور بزنس کے سیب سب کے سامنے آچکے تھے۔ اُس کا سارا کاروبار سمٹ سمٹا کر تمہارے نام کے ایک کارخانے تک محدود ہوچکا تھا۔ تمہارا خیال تھا۔ اب پُرامن زندگی بسر ہوسکے گی۔ مگر مجھے ہمیشہ فکر رہا۔

اُنہی دنوں میری دو کتابیں مارکیٹ میں آکر مقبول ہورہی تھیں اور میں ایک ادبی ماہنامے کا مدیر تھا۔ تم نے میری ایک کتاب پر مجھے مبارک کہی تھی۔ تم بڑی خوش تھیں اور تم میرے جریدے کا تازہ شمارہ دیکھ کر اُس پر تنقید کررہی تھیں۔ میرے ذہن میں موجودہ عائلی کمیشن کی رپورٹ گھوم گئی۔ اور میں نے فون رکھ دیا۔

آج ناصرہ جب سے تمہیں مل کر آئی ہے، مردوں سے سخت بیزار ہے۔ سب سے زیادہ تو اُس نے اُس دولت کو کوسا ہے جو مردوں کو دوسری شادی کرنے پر اکساتی ہے۔ میں جانتا ہوں تمہیں یہ خبر مری میں ملی تھی کہ ہنیو نیز تمہارا ہی نہیں گزشتہ چار برس سے وہ کراچی میں دوسری شادی رچا چکا ہے۔ تم سچی تھیں، تمہیں اس کے کراچی جانے پر ہمیشہ ڈر رہتا تھا۔ تم اکثر اس کے ساتھ گئیں بھی مگر ہوٹل میں رہ کر آگئیں۔ ہنیو نیز نے دوسری بیوی کے نام ہی کاروبار کے حصے لے رکھے تھے۔ اب عائلی کمیشن کی رپورٹ دیکھتے ہی وہ اپنی دوسری بیوی کو لے کر یہاں پہنچ گیا۔ خاندان بھر میں آگ سی پھوٹ آئی۔ تم مری کی خنک ہواؤں سے جلتی ہوئی لاہور پہنچ گئیں۔ جہاں تمہارا گھر دو حصوں میں بٹ چکا تھا۔ میرا ذاتی خیال ہے ہنیو نیز نے یہ دوسرا نکاح اب کیا ہے۔ پہلے اس نے اُسے یوں ہی رکھا ہوا تھا۔ مجھے یہ خبر تو بہت دیر سے ہوئی ملی تھی۔ اور سرما کی اُس شام جب تم نے کراچی کا ذکر کیا تھا تو مجھے اس خبر کی صداقت پر کوئی شک نہ رہا تھا۔ ایٹیلانشا! مجھے تم سے گہری ہمدردی ہے۔ سب تمہارے

گھر افسوس کے لئے آئے ہیں۔ مگر میں ہمیشہ کی طرح آج بھی چپ چاپ گھر میں بیٹھا ہوں۔ ناصرہ تم سے زبانی ہمدردی کر کے تمہاری باتیں مجھے سنا سنا کر اب تھک کر سو چکی ہے۔ میرے سامنے تمہاری زندگی اور تمہاری ہاری ہوئی شرط کے سارے چھلکے سارے بیج بکھرے پڑے ہیں۔ اور تمہاری چلمن سے جھانک کر کوئی کہتا ہوا سنائی دیتا ہے:-

"جانی! جب تم یہ سب کچھ جانتے تھے تو پھر مجھے کیوں نہ بتا دیا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ تم مردوں یا سب انسانوں کی دو دو جیبیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو نظر آتی ہے۔ دوسری وہ جو اندر چھپی ہوتی ہے۔

مگر تم نے یہ کیا... تم نے کبھی اپنے آپ کو مجھ سے چھپائے رکھا، جانی! کیا کر دیا تم نے؟"

مگر میں اسی طرح مطمئن اور چپ چاپ سا بیٹھا ہوں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ کیونکہ میں مدت سے اسی مقام پر چپ چاپ بیٹھا ہوں۔ جب سے میں نے ہپوزیز کے مقابلے میں شکست کھائی ہے۔ میں یہاں ہی بیٹھا ہوں۔ آج جب تمہارے سامنے کے تینوں سیب چھل چکے ہیں مجھے سخت صدمہ ہوا ہے۔ میں اپنی شکست بھول سا گیا ہوں۔ ایڈیلانتا! ہاں سچی محبتیں بھی کبھی مرتی ہیں۔ اور مجھے تم سے آج بھی بڑی محبت ہے زائرہ!"

✦

افسانہ:

کافر

احسان ملک

داآدل خاں بلوچ کا بیل سوہنا فطرت کی جمالی اور جلالی صفات کا ایک حسین توازن تھا جیسے برف کا بلند و بالا کوہسار! رنگ عصمت مریم کی طرح سفید، روئیں بالائی کی طرح ملائم، بدن پکے بادام کی طرح چست اور تنا ہوا، گردن بلوط کے تنے کی طرح بھاری، کوہان جیسے پہاڑ پر قلعہ، سرگیں آنکھوں کے کنول کٹورے شب تاریک کی مانند سیاہ جو اندھیرے میں جلتے چراغ بن جاتے، خوبصورتی سے بل کھائے ہوئے سینگ جیسے پھن اٹھائے کالے ناگ، گہرے قرمزی رنگ کی تھوتھنی کے مسام بکھرے بکھرے، گہرے گہرے، جیسے بے چھوئی ملائم ریت پر برسات کی پہلی بوندیں لمبی مخروطی دم میں بالوں کا گچھا گھور کالا، مگر دیئے کی طرح لو دیتا چم چم چمکتا ہوا۔

جب کبھی داآدل سوہنے کو لئے باہر نکلتا تو اپنے دلبر کی اٹھان اور اس کی مست متوالی چال دیکھ کر ایک بے پناہ جذبے کی سرمستی سے مخمور ہو جاتا اور اس کے پیروں میں بندھے گھنگھروؤں کی چھن من چھن من تال پر لہک لہک کر بہک بہک کر متوالے بدمست شرابی کی طرح رقص کرنے لگتا۔ ساری بستی کے بچے خوشی سے تالیاں بجاتے چلتے۔ اور بستی کی کنواریاں کھڑکیوں اور روزنوں سے انہیں دیکھنے لگتیں۔

شام کے وقت جب وہ سوہنے کو بستی کے چشمے پر نہلا رہا ہوتا تو اس کے گرد بلوچیوں کے ٹھٹھ لگ جاتے۔ تب داآدل، سوہنے کی ایک ایک عادت، ایک ایک صفت کو حدیثِ دلبر کی طرح بیان کرتا اور اس کے مزاج کی باریک تفسیریں کرنے لگتا "میرا سوہنا عاشق خدا ہے۔ ذرا دیکھو تو اس کے سینگ بل کھا کر مسجد کی محراب بن گئے ہیں۔ اس کا ماتھا منبر ہے اور کان مینارے سوہنا نمازی ہے غازی۔" ایسے میں وہ بے حد جذباتی ہو جاتا اور آہ بھر کے اپنی ارمانوں بھری آواز میں کہتا "اور اگر خدا چاندی کے اس پہاڑ میں پارہ بھر کے اور اس کی اداؤں میں بجلیاں قید کر کے داآدل کو تحفہ نہ بخشتا تو جانے وہ کس قدر بدنصیب انسان ہوتا۔ تب تو واللہ داآدل کی زندگی ببول کے جنگل کی طرح ویران ہوتی۔ وہ کبھی فخر سے سینہ پھلا کر نہ چلتا۔ نہ گوٹے دار سرخ صدری پہنتا نہ زری دار کلاہ ماتھے پر ترچھی کر کے جاتا، سو گز کی سرداری شلوار سلواتا، نہ اتنے تاڑیے تلے دار جوتا بنواتا۔ اس کے بڑے بڑے گل مچھے زیتون کے تیل سے سدا ہی عاری رہتے۔ — سوہنا انمول ہے جیسے محبوب کا دل! اور میرا عشق سچا ہے۔ جیسے معصوم دوشیزہ کی آنکھ!

چاندنی راتوں میں جب داآدل معمول کے مطابق صبح کاذب کے وقت جاگتا تو اس چاندی کے پتلے کو سونے میں ڈھلا ہوا دیکھ کر اس کے حسن سے مسحور ہو جاتا، جنون و مستی کی لہر میں حق حق کا نعرہ لگاتا اور اس کے آگے جیسے سر بسجود ہو جاتا۔ ایسے میں اس کی سنگ شکن آواز آس پاس کی وادیوں میں سات سات بار گونجتی اور جب وہ سر اٹھاتا تو وادیاں خاموش ہو جاتیں اور اس کی آنکھیں اشکوں کے ساز پر نغمہ سرا۔ تب آس پاس چھائی ہوئی خاموش آواز بن جاتی اور داآدل کے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ مل کر حق حق کی صدا دینے لگتی۔

داآدل خود بھی بڑا دیدار و جوان تھا ان سنگلاخ پہاڑیوں کی آبادیوں میں جہاں بادام پستے کے گھنے درختوں کی چھاؤں میں بہنے والے چشموں کا پانی انگور کے رس کی طرح میٹھا تھا، داآدل اور سوہنا چاند اور چکور کی طرح مشہور تھے۔

بلوچوں کی یہ بستی جہاں بادام اور پستے کے گھنے درختوں کی چھاؤں میں بہنے والے چشموں کا پانی انگور کے رس کی طرح میٹھا تھا

اور جہاں داول اور سوہنا چاند اور چکور کی طرح مشہور تھے۔ "زردینا" کہلاتی تھی۔ یہاں کے لوگ جفاکش، جری اور صاف دل تھے۔ ان کی آنکھوں میں حیا تھی، دلوں میں ایمان۔ صبر و قناعت ان کا مسلک تھا۔ زردینا کے معصوم اور نوخیز بلوچ زادے سارا دن قرآن پڑھتے، جوان کاشتکاری کرتے، باغیچے لگاتے، بندوقیں خنجر، اور تلواریں بناتے اور فرصت کے اوقات میں نشانہ بازی سے جی بہلاتے۔ بڈھے شب زندہ دار تھے اور فرشتہ سیرت۔ زردینا میں پیالے ایسا بڑا سرخ گلاب کثرت سے پیدا ہوتا تھا، اور بادام بستی کے سارے کنکروں سے بھی زیادہ۔ ہر گھر انگور کی بیلوں کی ٹھنڈک سے محصور تھا۔ شہتوت اور خوبانی کے درختوں کا شمار نہیں تھا۔ یہاں کی مکی حسنِ زلیخا کی طرح مشہور تھی۔ ہر سال جب بستی کے باہر والے میدان میں میلہ لگتا تو بادام، مکی، خشک گلاب اور خشک میوے کے اونچے اونچے ڈھیر پہاڑوں کا نقشہ کھینچتے۔

بستی زردینا کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی گڑھی تھی جہاں ایک سردار پرانے قلعے میں رہتا تھا۔ چیچک زدہ چہرہ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں تنگ پیشانی، ٹھگنا قد، چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں، علاقے کے کئی چشموں پر اس کا قبضہ تھا۔ ان چشموں پر آبیانہ وصول کر کے وہ اپنے خزانے بھرا کرتا۔ لوگ اسے پانی کا تاجر کہتے تھے۔ داول سے اس کی دشمنی اور رقابت ضرب المثل بن کر خلق کی زبان پر تھی۔ وہ داول سے اس کا سوہنا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ داول کسی طرح قابو نہ آیا تو اس نے چوری چھپے اس کی کھڑی کھیتیوں کو آگ لگوا دی اور اسکے پھل دار درخت آروں اور کلہاڑوں سے کٹوا کر ڈھیر کر دئے۔ لیکن بستی زردینا داول کے دل کی دھڑکن بن گئی اور سوہنا اس کے بلوچوں کی حمیت کا نشان! تب سردار استم خاں نے دور دور سے نامی سارق بلوائے، وہ کہ جو بڑے بڑے منہ زور سرمست اور سرکش گھوڑوں کو بھیڑ کے بے ضرر بچوں کی طرح اٹھائے جانے میں شہرت یافتہ تھے، اور جنھوں نے بڑے بڑے سرداروں کے قلعوں پر کمندیں پھینکی تھیں، داول کے پتھروں اور کچی مٹی کے گھروندے سے ناکام لوٹے۔ دو مشہور سارق سوہنے کے سینگوں سے ہلاک ہو چکے تھے۔ ایک پکڑا گیا تھا جس کا منہ کالا کر کے داول نے سردار استم خاں کی گڑھی کی سرحد پر چھوڑ دیا تھا۔ اب سردار اپنے کھوئے ہوئے وقار کو واپس لانے کے لئے پہلے سے بھی زیادہ ہاتھ پیر مارنے لگا۔

ایک روز شام کے وقت جب داول سوہنے کو چشمے پر نہلا رہا تھا اور چشمے پر کھڑے جوانوں کے ہجوم سے بدستور سوہنے کی توصیف و ثنا میں مشغول، اس کی نظر دور پہاڑیوں پر جا پڑی۔ اس کی طبیعت منغض ہو گئی۔ وہ دور پہاڑی پر اشارہ کر کے بولا "دیکھو دیکھو سردار استم خاں پھر آ رہا ہے۔ کم بخت...... بھلا تم ہی بتاؤ یارو! سوہنے کی یہ سنہری ڈور اس کے مردار ہاتھوں میں بھلا کہاں سجے گی؟ حسن تو عاشق کی ملکیت ہوتا ہے۔ دنیا میں سب دھاندلی چل سکتی ہے، عشق پر تو کسی کا زور بھی نہیں چلتا۔ یہ.... سوختہ نفر کے اس رمز کو کیا جانے؟" اس نے ایک سرد آہ بھری اور بستی کے بوڑھے شب زندہ داروں کے نام لے کر شکایت سے لبریز ہو گیا جو داول کو مشرک اور کافر سمجھتے تھے۔ کیونکہ وہ شوق و مستی میں سوہنے کو سجدے کرتا تھا۔ اتنے میں سردار اپنے دو گماشتوں کے ساتھ خراماں خراماں چلتا بالکل اس کے سامنے آ گیا۔ بھیڑ چھٹ گئی۔ سردار نے دو بدو آ کر سوہنے پر اس طرح للچائی نظریں ڈالیں گویا کسی کے گھر میں بلا اجازت گھسا جاتا ہو۔ اب داول کی نظر گماشتوں کے ہاتھوں میں چمڑے کی بھاری تھیلیوں کی طرف پڑی اور اس سے پہلے کہ سردار کچھ کہے وہ درشتی سے بولا "یہ مصر کا بازار نہیں ہے سردار! اپنی بے مصرف دولت کہیں اور لے جاؤ۔ تمہارے پاس بہت پانی ہے، میں جانتا ہوں۔ تمہارے خوبانی اور انگور کے باغیچوں کی دھاک دور دور تک ہے۔ تم ہماری بستی کے پاس ہی ایک مضبوط قلعے میں رہتے ہو۔ ٹھیک ہے۔ اور یہ چشمہ جہاں اب سوہنا کھڑا ہے تمہارا ہے۔ سب مجھے معلوم ہے۔ لیکن سردار دولت بہت ہو گئی ہے تو اللہ میاں سے چاند ستارے خرید لو۔ سوہنے کے بدلے اگر تم اپنا دل بھی نکال کر دیدو گے تو میں اس کالے دل کو چیل کوؤں کے آگے ڈال دوں گا۔" سردار نے خجلت زدہ ہو کر مجمع پر ایک چلتی ہوئی نگاہ ڈالی اور ڈوبتے سورج کی روشنی میں جوانوں کے کاندھوں پر لٹکے ہتھیاروں کی چمک دیکھ کر چپکے سے واپس چلے جانے کا ارادہ کر لیا۔ ابھی وہ چار

قدم گیا ہوگا کہ جوانوں کے ایک زوردار جھٹکے نے اس کا پسینہ چھڑوا دیا۔ اس نے فقط ایک مرتبہ پیچھے مڑ کر ان سب کو سانپ کی سی زہریلی نظروں سے دیکھا اور چپکے سے آگے کھسک گیا۔

رات گئے تک بستی میں اس واقعہ کا چرچا ہوتا رہا۔ شعلوں کی روشنی میں جگہ جگہ جوانوں کی منڈلیاں دائرے بنائے پتھر کی چھوٹی چلموں والے حقوں پر کش لگا کر داآدل کی جرأت کا چرچا کرتی رہیں۔ نسوار کی ڈبیوں سے چٹکیاں بھر بھر کے ہونٹوں تلے رکھی جاتی رہیں۔ اور شام کے واقع پر تبادلۂ خیالات ہوا کیا۔ آج داآدل نے ان سب کی نفرت کو سردار کے منہ پر کالک کی طرح مل دیا تھا۔

اور پھر صبح سویرے ہی یہ خبر بستی میں آگ کی طرح پھیل گئی کہ چشمہ سوکھ پڑا ہے۔ بستی کی کنواریوں کی ٹولیاں سر نہوڑائے خالی گاگریں لئے چشمے سے مایوس اور ماتم کناں واپس آ رہی تھیں۔ بستی والوں نے آس پاس کے ٹیلوں پر چڑھ کے دیکھا، راتوں رات چشمے کا رخ موڑ کے اسے بستی کی سرحد سے دور گھاٹیوں اور چٹانوں پر آوارہ چھوڑ دیا گیا تھا۔ ان کا محبوب نازک بدن معصوم چشمہ پتھروں سے آبشار بن کر گر رہا تھا، اونچے نیچے رستوں پر ٹکرا کر بلک رہا تھا۔ چار ہی دنوں میں بستی کی سب کھیتیاں کملا کر زمین سے لگ گئیں، پودوں نے مرجھا کر سر ڈال دئے، سارا گاؤں مویشیوں کی کربناک آوازوں سے بلبلانے لگا۔

آخرکار داآدل نے بے بس اور مجبور ہو کر اعلان کیا کہ اگر سردار استم خاں بستی کو اس کا چشمہ واپس دیدے، تو وہ اسی برس کے میلے میں سوہنے کو زیادہ سے زیادہ قیمت دینے والے کے سپرد کر دے گا، ورنہ چشمے کی ملکیت کا فیصلہ دو قبیلوں کے مشترک خون سے لکھا جائے گا! استم خاں کے لئے بستی زردینا کے جوانوں کی بندوقوں کو خاموش کرنا، علاقائی سرداروں کو اپنی دولت و سطوت کی جھلک دکھا دینے سے کہیں زیادہ مشکل تھا۔ چنانچہ بستی کی معصوم دوشیزاؤں کا روپہلا محبوب ان کو واپس دیدیا گیا۔

دور دور تک کی آبادیوں میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ اطراف و جوار کے تمام مالدار سردار سوہنے کا مول ڈالنے کے لئے میدان میں آ گئے۔

زرعی سال ختم ہوا، فصل کٹ گئی۔ خشک پھل اور سوکھے گلاب ڈھیروں میں لگا دیئے گئے تو ہر بستی نے دھوم دھام سے میلے کی تیاری شروع کی۔ کاشتکار اجناس کی خرید و فروخت کے منصوبے بنانے لگے۔ غلے اور پھل کو بیچانے اور ڈھونے کے انتظام میں منہمک ہوئے۔ گلہ بانوں نے چیدہ چیدہ جانور چھانٹے، اور انہیں بنانے سنوارنے میں ہمہ تن مشغول ہو گئے۔ اونٹوں کے بال تراش کر ان پر قینچی سے خوبصورت نقش و نگار بنائے گئے، بھیڑوں کی اون اتاری گئی، دنبوں کو مہندی لگی اور گھوڑوں کے ایال سنوارے گئے۔ مرغ، تیتر اور بٹیر پالیوں میں لڑائی کے لئے تیار ہوئے۔ ہر بستی نے سانڈنیوں کی دوڑ، نیزہ بازی، شہسواری، زور آزمائی اور نشانہ بازی کے لئے اپنے اپنے جوان منتخب کئے۔ شرطوں کے اندازے لگائے اور مقررہ تاریخ پر میلے میں آن براجے۔

بستی زردینا سے کچھ دور پہاڑیوں سے گھرے لق و دق میدان میں دور دور تک خیمے لگ گئے اور آس پاس کی وادیاں انسانوں اور مویشیوں کی ملی جلی آوازوں سے گونجنے لگیں۔ ایک طرف مویشیوں کے لئے باڑے بن گئے، خونخوار کتے ان کی حفاظت کرنے لگے۔ دوسری طرف دکانیں سج گئیں۔ تیسری جانب غلے کے انبار لگ گئے۔ نان بائیوں نے گز گز بھر کے سرخ نان لگائے، ایسے کہ دیکھ لیں تو کبھی بھوک نہ مٹے۔ آہن گروں نے ہتھیار سجائے جس سے بزدلوں کے دل بھی جرأت و ہمت سے معمور ہوں۔ ایک طرف آگ پر چھ چھ سات سات بکرے سالم بھن رہے تھے۔ چھنا چھن تھوے کی پیالیاں کھنک رہی تھیں، نسوار بک رہی تھی، بلوچی حقے گڑگڑا رہے تھے۔ جوان بلوچ، کہیں چاندی کے گہنے خریدتے تھے تو کہیں موسیقی کے ساز۔ ادھر بھیڑوں کے گلے بک رہے تھے، ادھر شیشے، قالینوں اور اون کے ڈھیر۔ بازیگر طرح طرح کے تماشے دکھلا رہے تھے۔ رقاص اور موسیقی نواز جگہ جگہ ٹولیاں بنا کر لوگوں کا جی بہلا رہے تھے اور میلہ طربیہ شہنائی اور نوخیز رقاص نوجوان لڑکوں کے گھنگروؤں کی صدا سے گونج رہا تھا۔

میدان کے عین وسط میں میلے کی رونق، سوہنا جن سنہری کے ایک مضبوط تھم کے ساتھ بندھا تھا۔ وہ بے حد مستی اور جوش کے عالم میں تھا۔ اس کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی تھی۔ آنکھیں شعلہ زن تھیں۔ وہ غصے کے ساتھ بار بار سر زمین پر پٹختا۔ اور اپنے گرد اکٹھے ہو گئی بھیڑ کو

دیکھ کر خوفناک آوازیں نکالتا۔ دور نزدیک سے آئے ہوئے بلوچ گھنٹوں کھڑے اسے دیکھ دیکھ کر عش عش کیا کرتے۔ لاکھوں کو سوائے سوہنے کے بلوچوں کے پاس بات کے لئے اور کوئی موضوع نہ رہتا۔ ساری فضا ایک استفسار، ایک انتظار سے بھری تھی۔ سوہنا اب کس کے ناموس کی زینت ہوگا؟

اور جب اجناس غلے کے انبار اٹھ گئے، بھیڑوں، اونٹوں اور مویشیوں نے اپنے اپنے مالک بدل لئے، اور ان خچروں پر لد کے دساور پہنچ گئی، چیدہ چیدہ جانور اپنی انتہائی قیمت پا چکے، بٹیروں، تیتروں، مرغوں نے پالیاں مارلیں، شرطیں جیتی اور ہاری جاچکیں طرح طرح کے مقابلوں میں پرانے نام مٹ کر نئے نام پیدا ہوچکے تو جشن کے آخری روز اب کی برس کے سب سے اہم سوال کا طے ہونا قرار پایا۔ فطرت کا شاہکار سوہنا کس بلوچ کا سہرا بنے گا؟ اس مقصد کے لئے صبح سویرے ہی ایک اونچے چبوترے پر مسند لگا دی گئی جہاں علاقے کے تین سفید ریش بزرگ تصویر بنے منتخب ہوکر بیٹھے۔ چبوترے کے سامنے سوہنا ایک تھم سے بندھا اپنے آپ کو رسیوں کی بندش سے آزاد کرنے کی کوشش میں ہمہ تن مشغول نظر آتا تھا۔ اس تھم کے اوپر داول کی دستار لہرا رہی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ اس نے اپنا خاندانی وقار، عزت اور ناموس رہن رکھ دیا ہے اور اب وہ کسی عظیم الشان کارنامے کے بغیر یہ دستار زندگی بھر کبھی سر پہ نہ رکھ سکے گا۔ چبوترے کے دائیں طرف سرداروں اور بولی دینے والے تونگروں کے خیمے ڈیرے تھے۔ گرد اگرد علاقے بھر کی بلوچی بستیوں کے جوان ہتھیار سجائے کھڑے تھے بندوقیں بھری ہوئی تھیں، خنجر آبدار تھے، اور نیزوں کے سرے صبح کی روشنی میں ہیروں کی طرح چمک رہے تھے۔ بلوچیوں کے دل بیقراری سے دھڑک رہے تھے۔ اور فضا ایک تکلیف دہ تجسس و اضطراب سے بھاری تھی۔

یکایک طبل پر چوٹ پڑی اور میلے کے بڈھے نقارچی نے اپنے مخصوص طرز بیان اور طرز ادا میں پہلے تو بلوچوں کو چاندا و رچکور سوہنے اور داول کی کہانی سنائی۔ پھر رمزیہ انداز میں سردار استم خاں کی ہٹ کا ذکر کیا اور پھر اشاروں کنایوں میں عشق و ہوس کی ازلی جنگ کا ذکر چھیڑ کے بلوچوں کو بتایا گیا کہ آج نظر خریدار کی آزمائش ہے۔ ایک عاشق کا محبوب نظر حرص، ہوس اور انتقام کے ہاتھ میں چلا گیا تو اس میں حسن نظر کی رسوائی ہے۔

صبح سے لے کر شام تک سوہنے کو چاندی کے مول تولا جاتا رہا، ہر قبیلے کے سردار نے اپنی ہمت و استطاعت سے بڑھ بڑھ کے بولیاں دیں۔ جب علاقے کے تمام تونگر اپنی اپنی بانیاں بول چکے اور شام دھیرے دھیرے آنچل کی آخری کرنیں سمیٹنے لگی تو سارے میدان پر انتہائی تجسس کا عالم چھا گیا۔ تماشائی دلوں میں وسوسے اور تذبذب لئے استم خاں کے خیمے کی طرف دیکھنے لگے۔ استم خاں میدان میں آئے گا یا سوہنے کا ہیروں کے برابر مول دیکھ کر کھسک جائے گا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سردار استم خاں کے خیمے کا پردہ اٹھا اور وہ ہاتھ میں تلوار لئے متفخرانہ چلتا، رقص کرتا ہوا میدان میں در آیا۔ اس کے ساتھ دو آدمی تھے جو ایک تین پہیوں والی گاڑی پر چمڑے کی کھلی تھیلیوں میں بے انداز دولت بھرے اس کے ساتھ ساتھ چلے آ رہے تھے۔ استم خاں نے یہ اہتمام علاقے کے سب سرداروں کو مرعوب کرنے کے لئے کیا تھا۔ وہ زرق برق لباس زیب تن کئے ہوئے تھا۔ اور اس کے ہر عضو سے نخوت، حقارت طنز اور تفاخر عیاں تھا۔ وہ ایک ایسی کمان بن گیا تھا جس سے ہر لحظہ نفرت کے زہریلے تیر نکل نکل کر تماشائیوں کے دلوں میں پیوست ہو رہے تھے۔ اس کے خیمے کے پیچھے اس کا پورا قبیلہ بندوقوں اور ہتھیاروں سے مسلح کھڑا تھا۔

اس طرح اینڈتا، رقص کرتا۔ سردار استم خاں سوہنے کے مقابل آگیا اور بآواز بلند قبائلی انداز میں اپنے قبیلے کی دولت سطوت بہادری اور جرأت کے کارنامے دہرانے لگا۔ اپنی دوستی کو بے پایاں رحمت اور دشمنی کو قہر خدا بتلایا اور اس تمہید کے بعد ایک ایک کر کے ہر قبیلے کے سردار کو مسابقے اور مقابلے کی دعوت دی لیکن ہر سردار اپنا آخری داؤں کھیل چکا تھا۔ سوہنے کی قیمت اب آسمان سے باتیں کر رہی تھی۔ انہوں نے جو دیوار استم خاں کے سد باب کے لئے بنائی تھی اب وہ خود اس کو عبور کرنے سے قاصر تھے۔ ہر طرف خاموشی اور سکون پاکر استم خاں حقارت سے مسکرایا اور انتہائی تفاخر سے اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر سوہنے کی آخری بولی پر گرہ لگائی۔ ہر تماشائی کے دل پر اس کی دولت کی دھاک جم گئی۔ پھر وہ فاتحانہ انداز میں چک پھیریاں لیتا تلوار لہراتا سوہنے کے قریب آگیا اور پینترا بدل کر تلوار سونت لی۔ اب سارا مجمع پتھر بن گیا۔ استم خاں نے طنز و حقارت

باقی صفحہ ۱۱۸ پر

ڈرامہ:

نئی منزلیں

آغا ناصر

کردار

- ★ کرنل۔ عمر تقریباً ۶۰ سال
- ★ نرگس۔ اس کی نوجوان بیٹی
- ★ نجمی۔ نرگس کی سہیلی
- ★ انور۔ ایک نوجوان
- ★ زہرہ۔ انور کی ماں

پہلا منظر

ایک کشادہ کمرہ جو وضع قطع اور فرنیچر کے رکھ رکھاؤ سے ڈرائنگ روم معلوم ہوتا ہے۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر سبز رنگ کے ریشمی پردے۔ دیواریں مصوری کے اعلیٰ شاہکاروں سے آراستہ۔ ایک کونے میں ریڈیوگرام۔ سامنے والے کونے میں ایک خوبصورت بک شیلف میں موٹی موٹی جلدوں والی بہت سی کتابیں۔ سرخ رنگ کے ایرانی قالین پر پڑا قیمتی صوفہ سٹ۔ ساتھ ہی دائیں بائیں بید کی بنی ہوئی گول کرسیاں ہیں۔

پردہ اٹھتا ہے۔ نرگس درمیان والے صوفے پر لیٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ اپنے دونوں ہاتھ سر کے نیچے اور سر صوفے کے دستے پر لٹکا ہوا۔

(نجمی ریڈیوگرام کے قریب کھڑی ہے۔ ریڈیو چل رہا ہے اس وقت مغربی موسیقی کی کوئی بہت ہی دلکش رومانی "سمفنی" نشر ہو رہی ہے)

نرگس :۔ نجمی

نجمی :۔ (جو موسیقی سننے میں محو ہے) ہوں!

نرگس :۔ اب بند بھی کرو اسے۔

نجمی :۔ بس ایک منٹ!

(چند لمحے خاموشی)

نرگس :۔ نہ معلوم تمہارا ایک منٹ کتنے گھنٹوں کا ہوتا ہے؟

(پھر خاموشی)

او نجمی کی بچی!

(نرگس اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے)

تُو اس طرح نہیں مانے گی۔ میں جانتی ہوں۔

نجمی :۔ اچھا بابا، اچھا! (ریڈیو بند کر کے صوفے کی طرف بڑھتی ہے) لو بس اب تو خوش ہو گئیں نا؟

نرگس :۔ تم بھی تو حد ہی کر دیتی ہو۔ صبح سے ریڈیو سنتے سنتے بور ہو گئی۔

نجمی :۔ تو پھر اور کیا کروں؟ تم تو بن گئی ہو بالکل پتھر کا بت۔ تمہارے سامنے خاموش کب تک بیٹھی رہوں۔

نرگس :۔ (خفگی سے) تو تم مجھ سے بور ہونے لگی ہو۔

نجمی :۔ نہیں تو۔ لیکن تم خود ہی انصاف سے کہو۔ یہ طریقہ جو تم نے اختیار کر لیا آخر اس سے حاصل؟

نرگس :۔ تو پھر میں کیا کروں؟

نجمی :۔ تم اپنے ابا سے بات کرو۔ ان سے کہو ایک نوجوان ہے، میرے لئے موزوں، اس کی آنکھیں نیلی اور بال بھورے ہیں۔ جب مسکراتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک ساتھ بہت سے پھول کھل اٹھے ہوں۔

نرگس :۔ نجمی!

نجمی :- (اسی صوفے کے دستے پر بیٹھ جاتی ہے) اس میں خفا ہونے کی کونسی بات ہے؟ یہی کچھ ہوتا ہے۔ سب کے ساتھ یہی ہوتا آیا ہے محبت کرنا کوئی جرم تو نہیں؟

نرگس :- لیکن مجھے معلوم نہیں میں اس سے محبت کرتی ہوں یا نہیں۔

نجمی :- تم اس کے متعلق سوچتی تو ہو؟

نرگس :- ہاں۔ نہیں کبھی کبھی سوچتی ہوں۔ مگر نہیں میں اس کے متعلق سوچنا چاہتی ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ سوچوں لیکن سوچ نہیں سکتی۔

نجمی :- کیا تمہارا دل یہ بھی چاہتا ہے کہ وہ تمہارے پاس موجود ہو؟

نرگس :- (کھوئے ہوئے انداز میں) میں یقین سے نہیں کہہ سکتی جب وہ میرے ساتھ ہوتا ہے تو میں دعائیں مانگتی رہتی ہوں کہ یہ ساتھ کبھی ختم نہ ہو۔ وقت ٹھہر جائے اور یہ ننھا سا لمحہ پھیل کر اتنا طویل ہو جائے کہ میری عمر اسی ایک لمحہ میں ختم ہو جائے۔ مگر جب وہ مجھ سے دور ہوتا ہے تو۔ تب بھی مجھے اچھا لگتا ہے۔ اس سے دور رہ کر میں ایک عجیب کیف محسوس کرتی ہوں ایک بڑی میٹھی سی چبھن ــ درد کی خمار آگیں لہر۔ اور میں مدہوش ہو جاتی ہوں ــ (ایک دم چونک کر) مجھے معلوم نہیں میں کیا کہہ رہی ہوں نہ جانے کیا ہو گیا ہے مجھے۔ میں پاگل ہو جاؤں گی نجمی! مجھے بتاؤ یہ سب کیا ہے؟

نجمی :- محبت!

نرگس :- محبت؟

نجمی :- ہاں محبت ایسا جذبہ ہے جو آندھی کی طرح اٹھتا ہے۔ اور اس کے غبار میں ہر چیز چھپ جاتی ہے۔ کچھ نظر نہیں آتا۔ اور فہم و فراست، سچائی اور روایتوں کے تناور درخت جو بھی اس آندھی کے راستے میں آتے ہیں وہ انہیں جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیتی ہے۔

نرگس :- اور جب یہ آندھی اترتی ہے؟

نرگس :- اور جب یہ آندھی اترتی ہے؟

نجمی :- تو اپنے پیچھے گرتی ہوئی دیواریں، شکستہ عمارتیں اور ٹنڈ منڈ درخت چھوڑ جاتی ہے۔

نرگس :- تم تو مجھے ڈرا رہی ہو نجمی؟

نجمی :- نہیں نہیں، تم نے ابھی پوری بات کہاں سنی ہے۔ پھر بہار آتی ہے درختوں پر نئی کونپلیں نکلتی ہیں، نئے پھول کھلتے ہیں اور فضائیں مہک جاتی ہیں۔

نرگس :- تم نے کسی سے محبت کی ہے نجمی؟

نجمی :- ہاں! (لہجہ سے سوگواری ٹپکتی ہے) میں نے محبت کی، مگر میں ہار گئی اور بھول گئی۔

نرگس :- (متاثر ہو کر) ہار گئی!

نجمی :- لیکن ہر کوئی نہیں ہارتا۔ میری ہار کسی کی جیت بھی تو تھی محبت کے کھیل میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب بادل برستے ہیں تو کچھ دیواریں بہہ جاتی ہیں، کچھ سوکھے پیڑ ہرے ہو جاتے ہیں۔
(ٹھنڈی سانس لے کر) ایسا ہی کچھ ہوتا ہے نرگس

نرگس :- لیکن میں کیا کروں؟ میری سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں

نجمی :- انور کیا کہتا ہے؟

نرگس :- کچھ بھی نہیں ہم نے کبھی اس موضوع پہ بات ہی نہیں کی۔

نجمی :- اس نے کبھی تم سے یہ نہیں کہا کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے؟

نرگس :- نہیں اور نہ میں نے ہی۔

نجمی :- تو پھر تم دونوں ضرور ایک دوسرے کو چاہتے ہو تمہیں شادی کر لینی چاہیئے (اٹھ کھڑی ہوتی ہے)

نرگس :- تم جا کہاں رہی ہو؟

نجمی :- کہیں جانا ہے پھر آؤں گی (جانے لگتی ہے)
کل کالج تو آ رہی ہو نا؟

نرگس :- (اٹھ جاتی ہے) شاید میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔

نجمی :- (ہنس کر) انور بھی آئیں گے۔ کل سائیکولوجی کا پیپر دینا

نرگس :۔ (مسکرا کر) تم بڑی وہ ہو!

نجمی :۔ اچھا، ٹا ٹا!

(ہنستی ہوئی دروازے سے باہر نکل جاتی ہے۔ چند ساعتیں گذرتی ہیں۔ نرگس پھر صوفے پر آکر بیٹھ جاتی ہے جیسے کسی سوچ میں گم ہو باہر کے دروازے سے نرگس کے ابی داخل ہوتے ہیں)

کرنل :۔ تو تم یہاں ہو۔

نرگس :۔ (احتراماً اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ آیئے ابی!

کرنل :۔ باہر شام ڈھل رہی ہے۔ میں دیر سے لان میں بیٹھا تھا۔ پھر مجھے تنہائی بری طرح ستانے لگی۔ میں نے اکیلے ہی بیلے کے پھول توڑے۔ یہ دیکھو (رومال اس کی طرف بڑھا دیتا ہے جس میں بہت سے سفید پھول ہیں) پھر دیر تک تمہارا انتظار کرتا رہا مگر تم نہیں آئیں۔ پھر تنہائی مجھے بہت ستانے لگی۔ دل گھبرانے لگا کہ معلوم نہیں میری بیٹی کی طبیعت کیسی ہے۔ تمہیں دیکھنے اندر چلا آیا۔

ٹھیک ہو نا بیٹی؟

نرگس :۔ بالکل اچھی ہوں ابی۔ نجمی آگئی تھی اس لئے یہاں بیٹھی رہی۔

کرنل :۔ (ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) اچھی لڑکی ہے وہ مگر جانے کیوں مجھے ہمیشہ اس کی آنکھوں میں کچھ عجیب تشنگی سی دکھائی دیتی ہے جیسے وہ کوئی بہت بڑا غم چھپائے ہوئے ہو۔

نرگس :۔ (کسی سوچ میں گم ہو جاتی ہے) غم۔

کرنل :۔ کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔ کوئی نہیں جان سکتا۔ انسان اپنے دل میں کیسے کیسے غم چھپائے ہوئے ہے۔ مگر آنکھیں کہہ دیتی ہیں۔

نرگس :۔ آنکھیں!

کرنل :۔ جسم ایک مکان ہے جس میں روح رہتی ہے اور آنکھیں اس مکان کے دریچے ہیں۔ اگر کوئی ان دریچوں سے اندر جھانکے تو وہ بہت کچھ دیکھ سکتا ہے۔

نرگس :۔ (بے جانے بوجھے اپنی آنکھیں ہتھیلیوں سے ملنے لگتی ہے)

آپ بھی کیسی عجیب باتیں کرتے ہیں، ابی!

کرنل :۔ بوڑھا ہو گیا ہوں نا۔ میری باتیں واقعی تمہارے لئے عجیب ہوں گی۔ شاید یہ تمہاری سمجھ میں بھی نہ آتی ہوں۔ لیکن تجربہ بڑی دولت ہے، بیٹی! گزرتی ہوئی عمر کے ساتھ انسان بہت کچھ سیکھتا ہے۔ کچھ ایسی باتیں بھی جو مثلاً یہ کہ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ پچھلے چند روز سے تم بڑی مضطرب ہو تو شاید تم میرا مذاق اڑاؤ۔ لیکن میں پھر بھی یہی کہوں گا کہ میں سچا ہوں۔

نرگس :۔ (پریشان سی ہو کر) ابی!

کرنل :۔ میں جانتا ہوں بیٹی! یہ تمہارا راز ہے۔ کوئی ایسا راز جو تم مجھ سے بھی پوشیدہ رکھنا چاہتی ہو۔ میں ضد بھی کروں تو شاید تم مجھے نہ بتاؤ گی۔

نرگس :۔ ابی! ایسی باتیں نہ کیجئے۔

کرنل :۔ تمہیں دکھ ہوتا ہے۔

نرگس :۔ مجھے اس بات سے تکلیف پہنچتی ہے کہ آپ ناحق مجھ پر شک کر رہے ہیں۔

کرنل :۔ نہیں میری بچی! ایسا نہ سمجھو۔ شاید کوئی باپ اپنی بیٹی سے ایسی باتیں نہیں کر سکتا، لیکن میں صرف تمہارا باپ ہی نہیں ہوں۔ تمہارا دوست بھی ہوں۔ جب تم چھوٹی سی تھیں تو تمہاری ماں مر گئی۔ وہ مر گئی اور تم زندہ ہو گئیں۔ میرا ایک سہارا ٹوٹ گیا لیکن ساتھ ہی زندگی گزارنے کے لئے ایک اور سہارا مل گیا۔ تم نہیں جانتی، میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔

نرگس :۔ جانتی ہوں ابی۔

کرنل :۔ پھر اسی محبت سے مجبور ہو کر صرف اس خیال سے کہ تمہاری پرورش مناسب طریقے سے ہو سکے، میں نے دوسری شادی کر لی۔

نرگس :۔ مجھے معلوم ہے ابی۔ آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟

کرنل :۔ (بغیر توجہ دیئے) لیکن چند ہی برسوں بعد مجھے اپنی نئی بیوی سے علیحدگی اختیار کرنا پڑی۔ اور اس علیحدگی کا سبب بھی تم ہی تھیں۔ میری نئی بیوی ایک بیوہ عورت

تھی، اس کے ایک بچہ تھا اور وہ تم سے زیادہ اس بچہ سے پیار کرتی تھی۔

نرگس :۔ ابّی!

کرنل :۔ مجھے آج تک یاد ہے۔ تم صرف تین سال کی تھیں اس وقت ایک دن تمہاری اس سے لڑائی ہو گئی، تمہاری سوتیلی ماں نے اپنے بیٹے کا ساتھ دیا اور بس میں نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔

نرگس :۔ لیکن آپ مجھے یہ سب کچھ آج کیوں بتا رہے ہیں ابّی۔

کرنل :۔ صرف اس لئے میری بچی کہ آج مجھے تنہائی کا احساس بہت ستا رہا ہے۔ جانے کیوں آج میں خود کو اکیلا اکیلا محسوس کر رہا ہوں کہیں کسی نے تمہیں مجھ سے چھین تو نہیں لیا نرگس۔

نرگس :۔ (سسکیاں لیتے ہوئے کرنل کے گھٹنوں پر سر رکھ دیتی ہے)
مجھے آپ سے کون چھین سکتا ہے ابّی؟ آپ ایسا سوچنے لگے ہیں۔ آخر کیوں؟ کیوں ابّی؟

کرنل :۔ مجھے ڈر لگتا ہے!

نرگس :۔ ڈر؟ کس سے؟ مجھ سے، ابّی؟ آپ کے دل میں ایسے وہم آخر کیوں آنے لگے۔ ایسی بات آپ نے کیوں سوچی؟ یہ آپ سے کس نے کہا؟

کرنل :۔ تمہاری آنکھوں نے!

نرگس :۔ ابّی! (بلک بلک کر رونے لگتی ہے)۔

کرنل :۔ روتے نہیں ہیں بیٹی! مجھے بتاؤ، میں تمہارا دوست ہوں۔ میں نے ایک شفیق ماں کی طرح تمہیں پالا ہے۔ ایک پیار کرنے والے ساتھی کی طرح تمہارے ساتھ کھیلا ہوں۔ ایک سمجھدار باپ کی طرح تمہاری تربیت کی ہے۔ میں تمہارے رازوں کا امین بننے کا بھی اہل ہوں، بیٹی! مجھے بتاؤ مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ

(خاموشی)

تمہیں کسی سے محبت ہو گئی ہے، ہو گئی ہے نا؟

(خاموشی)

مجھے بتاؤ کون ہے وہ؟ میں تمہاری مدد کروں گا۔ میں نے زندگی کی ہر منزل میں تمہارا ساتھ دیا ہے۔ اب بھی میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ مجھ سے کہہ دو۔

نرگس :۔ ابّی! (سسکیاں لیتی رہتی ہے)

کرنل :۔ تو تم مجھے نہیں بتانا چاہتیں؟

نرگس :۔ (دبے ہوئے لہجے میں): آپ نجمی سے مل لیجئے گا ابّی!

کرنل :۔ نجمی سے؟

اوہ۔ ہاں۔ ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔ میں سمجھ گیا۔ میں جان گیا، ٹھیک ہے۔ میں نجمی سے مل لوں گا۔ وہ مجھے بتائے گی۔ تم نے اسے بتا دیا ہو گا۔
ٹھیک بھی ہے۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا۔ ایک نوجوان لڑکی ایک بوڑھے مرد کو اپنا رازدار کس طرح بنا سکتی ہے۔

(اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے)

نرگس :۔ ابّی!

کرنل :۔ ٹھیک ہے، میں نجمی سے مل لوں گا۔ میں اس سے دریافت کر لوں گا۔ تم نہیں کہہ سکتیں چونکہ تم تو مجھے صرف اپنا باپ ہی سمجھتی ہو نا۔

(جانے لگتا ہے)

میں سب کچھ کرنے کے بعد صرف باپ ہی رہا! جیسے سب ہوتے ہیں، جیسے ہر جوان لڑکی کا ایک باپ ہوتا ہے یا جیسے ہر بوڑھے باپ کے کوئی بیٹی ہوتی ہے، بالکل اسی طرح۔ دوسروں میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ کوئی فرق نہیں!

(باہر نکل جاتا ہے۔ نرگس چند لمحے ساکت کھڑی رہتی ہے پھر صوفے پر گر کر بے اختیار رونے لگتی ہے)

نرگس :۔ ابّی! میرے پیارے ابی جان!!

(پردہ)

دوسرا منظر

(وہی کمرہ۔ وہی فرنیچر۔ پچھلے منظر کی نسبت زیادہ آراستہ۔ تازہ پھولوں کے چند گلدستوں کا اضافہ جب پردہ اٹھتا ہے تو نرگس صوفے کی پشت کی جانب نظر آتی ہے۔)

نجمی :۔ مجھے نہ روکو۔ اب جانے دو نرگس۔

نرگس :۔ فضول باتیں نہ کرو۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ تم چلی جاؤ۔ اور میں اکیلی رہ جاؤں؟

نجمی :۔ (شرارت سے) اکیلی کیوں؟ ابھی تو انور جو آتے ہوں گے۔

نرگس :۔ اسی لئے تو کہتی ہوں۔ تمہارا یہاں ہونا بہت ضروری ہے۔

نجمی :۔ آخر کیوں؟

نرگس :۔ انور سے باتیں کون کرے گا؟ وہ یہاں آکر بور نہیں ہو جائیں گے اگر تم نہ ہوئیں؟

نجمی :۔ تم جو ہو۔ تمہاری موجودگی میں انور بور کس طرح ہو سکتے ہیں؟ اور پھر تمہارے ابی.....

نرگس :۔ یہی تو میں کہتی ہوں۔ ابی کی موجودگی میں ان سے کیا باتیں کر سکتی ہوں۔

نجمی :۔ خدا جانے تم کس قسم کی لڑکی ہو! ایک تمہارے ابی ہیں جو تمہارا اس قدر خیال کرتے ہیں، جو تمہیں اپنے آپ سے اس قدر قریب سمجھتے ہیں کہ جیسے تمہاری اور ان کی روح ایک ہی ہو۔ اور ایک تم ہو جو اپنے ابی سے اسی طرح غیریت برتتی ہو۔ ایسے پرہیز کرتی ہو گویا.....

نرگس :۔ نجمی!

نجمی :۔ میں سچ کہہ رہی ہوں نرگس۔ اس روز جب میں نے تمہارے ابی سے بات کی تو مجھے احساس ہوا کہ تمہارا یہ رویہ ان کے لئے کس قدر تکلیف دہ ہے۔ جانتی ہو انہوں نے مجھ سے کیا کہا تھا؟

نرگس :۔ کیا کہا تھا؟

نجمی :۔ انہوں نے کہا۔ نرگس مجھے صرف باپ سمجھتی ہے مجھے جس نے اس کے لئے دنیا کی ہر شے کو تج دیا، جس نے اپنی روح کی گہرائیوں میں اس سے محبت کی۔ جس کے غم اور خوشیوں کے جذبے کو میں نے اپنے دل میں اس طرح محسوس کیا جیسے وہ میرے اپنے غم اور میری اپنی خوشیاں ہوں اس نے جسے میں نے اپنا سب کچھ دے دیا مجھے صرف اپنا باپ ہی سمجھا، جیسے ہر لڑکا ایک باپ ہوتا ہے۔

نرگس :۔ میری سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں نجمی! بعض اوقات تو ابی کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ خدا جانے وہ کیا چاہتے ہیں۔

نجمی :۔ وہ یہی چاہتے ہیں کہ تم ان کو صرف اپنا باپ ہی نہ سمجھو۔ اپنا دوست بھی جانو۔ اپنا رازدار بھی سمجھو۔

نرگس :۔ رازدار؟

نجمی :۔ تم ان سے باتیں نہ چھپایا کرو۔ انہیں یہ پسند نہیں ہے۔

نرگس :۔ تم جا رہی ہو؟ (اٹھ کھڑی ہوتی ہے)

نجمی :۔ ہاں، میرا خیال ہے مجھے جانا ہی چاہیئے۔ انور اب آتے ہی ہوں گے۔

نرگس :۔ مگر وہ اب تک آئے کیوں نہیں؟

(باہر قدموں کی چاپ)

نجمی :۔ شاید آ گئے!

(کرنل نمودار ہوتا ہے)

نرگس :۔ یہ تو ابی ہیں۔

کرنل :۔ (ہنستے ہوئے) تو تمہارا مہمان ابھی تک نہیں آیا۔

نجمی :۔ شاید آتے ہی ہوں۔

کرنل :۔ میں تمہاری گفتگو میں مخل تو نہیں ہوا لڑکی؟

نرگس :۔ نہیں نہیں۔ آئیے نا، ابی!

نجمی :۔ میں تو یوں بھی اب جانے ہی والی تھی۔

کرنل :۔ کیوں؟

نجمی :۔ مجھے کہیں جانا ہے۔ بڑی دیر ہو گئی ہے۔

کرنل :۔ اور تمہارا مہمان؟

نجمی :۔ (مسکرا کر) وہ میرا مہمان تو نہیں ہے۔ آپ کا ہے!

کرنل :۔ (ہنس کر) شریر!

نجمی :۔ اچھا تو میں چلتی ہوں، نرگس۔ خدا حافظ!

کرنل :۔ نرگس: خدا حافظ!

(نجمی دروازہ سے باہر نکل جاتی ہے)

کرنل :۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔ مجھے بہت پسند ہے۔

نرگس :۔ جی!

کرنل :۔ تمہیں بہت چاہتی ہے۔
نرگس :۔ جی!
کرنل :۔ بہت چپ چپ ہو تم۔
نرگس :۔ (گھبرا کر) نہیں تو!
کرنل :۔ انور ابھی تک نہیں آئے۔ اسے ہمارا پتہ ٹھیک طرح معلوم ہے نا؟
نرگس :۔ جی بجی نے بتا دیا تھا۔
کرنل :۔ تم سے ملاقات نہیں ہوئی؟
نرگس :۔ ہوئی تھی!

(باہر قدموں کی چاپ)
آ گئے شاید!

کرنل :۔ ٹھہرو، میں دیکھتا ہوں۔
(دروازہ کی طرف جا کر کواڑ کھولتا ہے۔ انور داخل ہوتا ہے)
انور :۔ آداب!
کرنل :۔ جیتے رہو! آؤ ادھر آ جاؤ۔
(صوفے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ نرگس شرمائی اور گھبرائی سی درمیانی صوفے کے پاس کھڑی ہے)
بیٹھ جاؤ نا۔
انور :۔ جی شکریہ!
(انور بیٹھ جاتا ہے۔ سامنے کے صوفے پر کرنل بیٹھ جاتا ہے،
(نرگس سے) آپ بھی تشریف رکھئے نا۔
نرگس :۔ (بیٹھتے ہوئے) جی۔ !
انور :۔ مجھے ذرا دیر ہو گئی۔ آپ کو انتظار کرنا پڑا ہو گا۔
کرنل :۔ (ہنستے ہوئے) ہوں! ہم ابھی یہی سوچ رہے تھے کہ کہیں تمہیں مکان تلاش کرنے میں دقت نہ ہوئی ہو۔
انور :۔ جی نہیں مکان تو۔ (اچانک رک کر) مکان تو بہت آسانی سے مل گیا۔
کرنل :۔ تم اب چائے لے آؤ بیٹی! پھر اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔
(نرگس باہر چلی جاتی ہے)

میں نے تمہیں خاص طور پر اس لئے بلایا ہے بیٹے کہ تم سے مل لوں۔
انور :۔ جی!
کرنل :۔ میں سمجھتا ہوں ایسے موقع پر انسان کچھ عجیب سا محسوس کرتا ہے۔ کچھ بہت پابند، بندھا بندھا سا، سنبھل سنبھل کر باتیں کرتا ہے۔ سوچ کر جواب دیتا ہے۔ اور کچھ اس قدر مضحکہ خیز سا بن کر رہ جاتا ہے کہ اگر بعد میں سوچے تو خود ہی اپنی حالت پر بے ساختہ ہنسی آ جائے۔
انور :۔ (جو کچھ نروس سا ہو گیا ہے) بے ..... شک!
کرنل :۔ میں عام آدمیوں سے ذرا مختلف ہوں۔ مجھے تصنع سے نفرت ہے۔ میں نے تمہیں اس لئے نہیں بلایا جس طرح عام لڑکیوں کے باپ نوجوان لڑکوں کو اپنے گھر بلاتے ہیں اور ان سے گفتگو کرتے ہیں تاکہ اپنی بیٹی کے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکیں۔ ایسا نہیں ہے انور!
انور :۔ جی، میں کچھ سمجھا نہیں۔
کرنل :۔ میں نے تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ تم سے پوچھوں کیا تم نرگس سے محبت کرتے ہو؟ (ایسی ہی محبت جیسی میں نے کی؟
انور :۔ میں نرگس کو خوش رکھوں گا۔ مجھے اس کا یقین ہے، محبت کچھ ایسی چیز ہے۔ ایک ایسا جذبہ ہے جس کا اظہار الفاظ میں نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے نرگس سے سنا ہے، نرگس کی سہیلیوں سے سنا ہے آپ نرگس سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ اتنی محبت کہ شاید کسی باپ نے اپنی بیٹی سے نہ کی ہو۔ مجھے اس کا علم ہے۔
کرنل :۔ (ہنستا ہے) تم میری بات غلط سمجھے میں نرگس سے اپنی محبت کا ذکر نہیں کر رہا تھا۔
انور :۔ جی؟
کرنل :۔ بلکہ شاید تمہیں تعجب ہو گا اگر میں کہوں کہ میں نے کبھی نرگس سے محبت کی ہی نہیں۔

حریف کشمیر، وادئی کاغان: رنگین نقش: سبز خورسید

وہ وادئی جنت نما جو کشمیر کی رعنائیوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے صدہا جہاں گرد اہل‌سوق کو گلگشت کی دعوت دیتی ہے

انور : میں سمجھ نہیں سکا۔

کرنل : (سانس لے کر) میں نے نرگس سے کبھی محبت نہیں کی۔ یہ سچ ہے بیٹے میں نے نرگس کی ماں سے محبت کی تھی۔ ایسی محبت جو وقت کی قید سے آزاد ہے، جو زندگی اور موت سے ماورا ہے۔ وہ مرگئی لیکن میری محبت زندہ رہی، میں نے نرگس کے روپ میں اسے پالیا اور میں نرگس کی صورت میں اس کی ماں سے محبت کرتا رہا۔ اس کی موت کے بعد بھی وہ محبت زندہ رہی۔

انور : کتنے عجیب ہیں آپ!

کرنل : نرگس بالکل بچہ تھی جب اس کی ماں مرگئی میں نے محض اس خیال سے کہ نرگس کی پرورش صحیح طریقے سے ہوسکے دوسری شادی کرلی۔ نرگس کی سوتیلی ماں بڑی سمجھدار تھی۔ وہ بیوہ تھی، اور اس کے ایک بچہ تھا۔ وہ بڑی دانشمند خاتون تھی لیکن ہمیں علیحدگی اختیار کرنا پڑی!

انور : علیحدگی اختیار کرنا پڑی! کیوں؟

کرنل : وہ اپنے بچے سے محبت کرتی تھی، ایسی ہی محبت جیسی ہر ماں کرتی ہے۔ یا شاید اسے بھی میری طرح اپنے بچہ کے روپ میں اس کے مرے ہوئے باپ کی قربت نصیب تھی۔ میں کہہ نہیں سکتا کیا تھا۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ ہم دونوں اپنے بچوں ہی کی وجہ سے یکجا ہوئے تھے اور پھر انہیں کی وجہ سے ایک دوسرے سے الگ ہوگئے۔

انور : آپ نے اس کو طلاق دے دی؟

کرنل : ہم نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ایک روز اس کے بچہ اور میری بچی میں کسی بات پر لڑائی ہوگئی۔ اس نے اپنے بیٹے کی طرفداری کی اور میں نے نرگس کی۔ اور بس پھر ہم دونوں نے بڑے ٹھنڈے دل سے یہ فیصلہ کرلیا کہ ہمارا علیحدہ ہوجانا ہی مناسب ہے۔ وہ اپنے بچہ کو لیکر کہیں چلی گئی اور میں نرگس کے ساتھ وہ شہر چھوڑ کر یہاں آگیا۔ پھر ہم کبھی نہیں ملے! (بڑے غم ناک انداز میں) لیکن اب مجھے رہ رہ کر یہ خیال آتا ہے کہ میں نے غلطی کی۔ اور شاید اس نے بھی!

(تھوڑی دیر خاموشی رہتی ہے۔ کرنل سر جھکائے بیٹھا ہے)

انور : مجھے افسوس ہے آپ کو مجھ سے ایسی گفتگو کرنا پڑی جس نے آپ کو افسردہ کردیا۔

کرنل : (قابو پاتے ہوئے) نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے ...... ارے میں تو بھول ہی گیا مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔

انور : آپ نے مجھ سے پوچھا تھا کیا تم نرگس سے ایسی ہی محبت کروگے جیسی میں نے کی تھی؟ اب میں آپ کے ہر سوال کا جواب دے سکتا ہوں۔ اب میرا جواب "ہاں" ہے۔

کرنل : (غمناک مسکراہٹ) مجھے معلوم ہے مجھے یقین تھا تم اس سے محبت کرتے ہو مجھے اس روز احساس ہوگیا تھا جب نرگس نے مجھ سے دوری اختیار کی تھی۔ ہمارے جسم کا کوئی حصہ اگر کاٹ لیا جائے تو درد ہوتا ہے نا؟ میں نے بھی وہی درد محسوس کیا تھا۔ اور نرگس سے پوچھا تھا۔ بتاؤ وہ کون ہے وہ جس نے تمہیں مجھ سے چھین لیا ہے؟

انور : آپ ......

کرنل : برا نہ ماننا بیٹے! ایسا ہوتا ہے۔ میں بہت صاف گو ہوں۔ میں تمہیں بتاؤں ابتدا میں میں تم سے حسد کرنے لگا تھا۔ بے جانے بوجھے تمہیں اپنا رقیب سمجھنے لگا تھا لیکن بعد میں مجھے احساس ہوا — مجھے احساس ہوگیا۔ اور اب تمہیں دیکھا۔ اور اب سچ مانو میں تمہیں پسند کرنے لگا ہوں۔ تم بہت نیک ہو۔

(نرگس چائے کی ٹرے لئے داخل ہوتی ہے)

نرگس کے لئے ہر لحاظ سے موزوں ہو۔ آؤ بیٹی!

(نرگس درمیانی میز پر چائے کی ٹرے رکھ دیتی ہے اور بنانے میں مصروف ہو جاتی ہے)

انور : آپ نے بہت تکلف سے کام لیا۔

نرگس : جی نہیں اس میں تکلف کیا ہے۔

کرنل :۔ تمہارے گھرانے میں کون کون بزرگ ہیں؟ میرا مطلب ہے تمہارے والد یا ......

انور :۔ جی نہیں میرے والد حیات نہیں صرف میری والدہ ہیں بس کل خاندان یہی ہے۔ میں اور میری والدہ۔

کرنل :۔ انہیں کبھی یہاں لاؤ۔

انور :۔ ضرور۔ میں نے ان سے ذکر کیا تھا۔ وہ خود ان سے ملنے کی بہت متمنی ہیں۔

(نرگس چاء کی پیالیاں انور اور کرنل کی طرف بڑھاتی ہے اور پھر کھانے کی دوسری چیزوں کی پلیٹیں باری باری ان کے سامنے کرتی جاتی ہے)

کرنل :۔ میں نے سنا ہے تم شعر بھی کہتے ہو۔

انور :۔ (ہنسکر) جی نہیں۔ انہوں نے یونہی مذاق کیا ہوگا آپ سے۔

کرنل :۔ اس نے تو مجھ سے نہیں کہا۔ نجمی کہتی تھی۔

نرگس :۔ بہت اچھے شعر کہتے ہیں ابّی۔ ابھی حال ہی میں جو کالج میں مشاعرہ ہوا تھا، اس میں انہوں نے ......

انور :۔ وہ بس یونہی تک بندی سی تھی۔

نرگس :۔ اچھے خاصے شعروں کو تک بندی کہہ رہے ہیں ایسا بھی کیا تکلف۔

کرنل :۔ (ہنستے ہوئے) خیر جو بھی سہی۔ ہم ضرور سنیں گے۔ (چاء کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے)

نرگس :۔ میرا خیال ہے باہر کیوں نہ چلا جائے ابّی۔ دھوپ ڈھل گئی ہے۔

کرنل :۔ ہاں ہاں۔ باہر لان میں بیٹھیں گے۔ (کھڑا ہو جاتا ہے)

ہمارا باغیچہ بہت خوبصورت ہے۔ قسم قسم کے پھول ہیں وہاں۔ آؤ۔

(کرنل آگے بڑھ کر دروازہ سے باہر نکل جاتا ہے)

(نرگس شرارت سے انور کو دیکھتی ہے)

انور :۔ بڑی عجیب ہو تم بھی! خواہ مخواہ۔ اب بھلا میں کیا سناؤں۔

نرگس :۔ اجی زیادہ تکلف اچھا نہیں ہوتا شاعر صاحب! وہ نظم سنا دیجئے گا:

"تمہارے شہر میں ہو کر بھی تم سے دور ہوں میں"

(دونوں ہنستے ہیں۔ پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

تیسرا منظر

(وہی کمرہ۔ وہی فرنیچر۔ پردہ اٹھتا ہے انور، نرگس اور زہرہ صوفوں پر نظر آتے ہیں تینوں کسی بات پر زور زور سے ہنس رہے ہیں)۔

انور :۔ دیکھا ناامّی! آپ کو مجھ سے ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ میں مبالغہ سے کام لیتا ہوں۔ مگر آج تو آپ بھی قائل ہو ئی ہی گئی نا۔ نرگس کے معاملہ میں میں نے مبالغہ کی بجائے ...... مبالغہ کی بجائے بھئی مبالغہ کا الٹ کیا ہوتا ہے؟

نرگس :۔ مغالطہ! (تینوں ہنستے ہیں)

انور :۔ سچ ہے ناامّی؟ ہے نا نرگس بہت خوبصورت؟

زہرہ :۔ ہاں بالکل چینی کی گڑیا کی طرح۔

انور :۔ سچ! اُف امّی یعنی آپ نے تو میرے الفاظ چھین لئے۔ دیکھا نرگس، میں نہ کہتا تھا میری امّی بھی شاعر ہیں شاعر!

زہرہ :۔ اچھا اب تو خاموش رہ لڑکے۔ مجھے باتیں کر دے۔

انور :۔ ان سے کیا باتیں کر و گی امّی؟ باتیں کرنے کے لئے تو ان کے ابّی بہت ہیں۔ میرا مطلب ہے .....

زہرہ :۔ ہیں کہاں تمہارے ابّی نرگس؟

نرگس :۔ بس آتے ہی ہوں گے۔ جانے انہیں دیر کیوں ہو گئی۔ جاتے وقت کہہ گئے تھے کہ میں ان لوگوں کے آنے سے پہلے ہی واپس لوٹ آؤں گا۔

زہرہ :۔ اور تمہیں اپنی امی یاد نہیں ہیں نرگس؟

نرگس :۔ امی؟ نہیں تو۔ میں بہت چھوٹی تھی جب وہ فوت ہو گئی تھی۔ مجھے تو دوسری امّی بھی یاد نہیں۔

زہرہ :۔ دوسری امّی؟

انور :۔ ہاں امّی! نرگس کے ابّی نے اپنی پہلی بیوی کی وفات کے

بعد دوسری شادی کرلی تھی لیکن نباہ نہ ہو سکا اور انہوں
نے اپنی نئی بیوی سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اور جانتی ہیں
امی کس وجہ سے ؟

زہرہ :۔ (جو بڑی محویت سے سن رہی ہے) کس وجہ سے ؟

انور :۔ نرگس کی وجہ سے ؟

زہرہ :۔ نرگس کی وجہ سے ....؟

انور :۔ ہاں، بڑے عجیب سے ہیں ان کے ابی۔ اتنے پیارے
کہ کیا بتاؤں۔ جب وہ باتیں کرتے ہیں نا تو بس جی چاہتا
ہے وہ اسی طرح بولتے رہیں۔ آہستہ آہستہ بولتے ہیں
اور ایسے نرم نرم میٹھے میٹھے الفاظ ہوتے ہیں کہ ....

نرگس :۔ (جو اپنے ابی کی تعریف سے بہت خوش ہے) میں ابی کی
تصویر دکھاؤں آپ کو امی؟ (اٹھ کھڑی ہوتی ہے)

زہرہ :۔ (اس کی خوشی کو محسوس کرتے ہوئے) ہاں ہاں دکھاؤ۔

نرگس :۔ (الماری کی طرف جاتی ہے اور الماری کھول کر تصویر
نکالتی ہے) بڑی پرانی تصویر ہے امی! کوئی اٹھارہ
سال پرانی۔ میں ان کی گود میں بیٹھی ہوں۔ بالکل ننھی سی۔
(نرگس تصویر لیکر آتی ہے)

زہرہ :۔ (آہستہ سے) اٹھارہ سال پرانی ــ اٹھارہ سال

نرگس :۔ (تصویر بڑھاتی ہے) یہ دیکھئے۔
(زہرہ تصویر ہاتھ میں لے کر اس کی طرف دیکھتی ہے)

زہرہ :۔ یہ ...... یہ ......

(زہرہ کا چہرہ ایکدم زرد پڑ جاتا ہے۔ وہ جلدی سے تصویر
کو میز پر رکھ دیتی ہے)

انور :۔ امی؟ ارے آپ کو کیا ہوا امی؟

نرگس :۔ امی!

زہرہ :۔ (قابو پاتے ہوئے) نہیں نہیں، کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔
مجھے کوئی یاد آ گیا۔

نرگس :۔ ابی کی تصویر دیکھ کر؟

زہرہ :۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) نہیں، تمہاری تصویر دیکھ کر۔
.... انور ...... میرا دل گھبرا رہا ہے بیٹے!

انور :۔ امی!

نرگس :۔ آپ لیٹ جائیے امی!

زہرہ :۔ نہیں نہیں، میں ذرا باہر جانا چاہتی ہوں۔ میرا دل گھبرا
رہا ہے۔ میں کھلی ہوا میں جانا چاہتی ہوں۔

نرگس :۔ آئیے لان پر چلیں۔ انور چلو امی کو لان پر لے چلیں۔
(دونوں اٹھ کر زہرہ کو اٹھاتے ہیں۔ وہ کھوئی کھوئی
سی اٹھ بیٹھتی ہے)

انور :۔ چلئے امی!

زہرہ :۔ نہیں۔ مجھے راستہ بتا دو۔ میں تنہائی چاہتی ہوں۔
تم یہیں بیٹھو۔

انور :۔ نہیں امی نہیں۔

زہرہ :۔ مجھ سے بحث نہ کرو انور۔ جو میں کہتی ہوں وہی کرو۔
آؤ بیٹی مجھے باہر کا راستہ بتا دو۔

نرگس :۔ (باہر جانے والے دروازہ کی طرف زہرہ کے
ساتھ بڑھتی ہے) وہ سامنے لان ہے امی۔

انور :۔ مگر امی

زہرہ :۔ بس بس تم دونوں یہیں بیٹھو۔ میں ٹھیک ہوں۔
میں ابھی آ جاؤں گی۔ پریشان نہ ہو۔ (باہر چلی
جاتی ہے)

(انور اور نرگس خاموش خاموش سے صوفے پر
بیٹھ جاتے ہیں)

نرگس :۔ جانے انہیں کیا ہو گیا؟

انور :۔ معلوم نہیں۔ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا تھا۔

نرگس :۔ میری تصویر دیکھ کر انہیں کوئی یاد آ سکتا ہے۔

انور :۔ خدا جانے کون ہے وہ جس کی یاد نے امی کو اس قدر
بےچین کر دیا۔

(دوسرے دروازہ سے کرنل داخل ہوتا ہے)
آداب عرض!

کرنل :۔ اوہ معاف کرنا مجھے دیر ہو گئی۔ (آگے بڑھ کر
صوفے پر بیٹھتے ہوئے)
تمہاری امی نہیں آئیں انور؟

انور :۔ امی ...

نرگس ۔ آتی ہیں ۔ باہر لان پر ہیں ۔

کرنل ۔ باہر لان پر تنہا ۔ اور تم دونوں یہاں بیٹھے ہو ۔ اتنی خود غرضی بھی اچھی نہیں ہوتی بچو!

نرگس ۔ نہیں نہیں ابی ۔ وہ یہاں تھیں ہمارے ساتھ ۔ پھر ایک دم ان کی طبیعت خراب ہو گئی ۔

کرنل ۔ طبیعت خراب ہو گئی؟

انور ۔ ہاں، نرگس نے انہیں! یہ تصویر دکھائی (میز سے تصویر اٹھا کر دکھاتا ہے)

نرگس ۔ اور تصویر دیکھ کر انہیں کوئی یاد آ گیا ۔

کرنل ۔ (ہاتھ میں تصویر لے لیتا ہے) کوئی یاد آ گیا — کون؟

(زہرا باہر والے دروازہ سے نمودار ہوتی ہے)

اوہ!

انور ۔ اوہ ۔ امی (فریم کرنل کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے ۔ تصویر ایک چھناکے سے ٹوٹ جاتی ہے)

نرگس ۔ آئیے امی ۔

انور ۔ اب کیسی طبیعت ہے؟

زہرہ ۔ ٹھیک ہوں ۔

انور ۔ (کرنل کی طرف اشارہ کرکے جو بالکل ساکت اپنی جگہ بیٹھا ہے) یہ نرگس کے ابی ہیں امی ،

زہرہ ۔ آداب

کرنل ۔ آپ بیٹھ جائیے نا ۔ (زہرہ بیٹھ جاتی ہے) اب طبیعت کیسی ہے آپ کی؟

زہرہ ۔ ٹھیک ہوں ۔

انور ۔ کیا ہو گیا تھا تمہیں امی؟

کرنل ۔ کبھی کبھی یادیں بڑی تکلیف دیتی ہیں تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا بیٹے ۔ تم ابھی جوان ہو کہ تمہاری یادیں ابھی کمسن ہیں ۔ جب انسان بوڑھا ہو جاتا ہے تو یادیں جوان ہو جاتی ہیں اور تم جانتے ہو کہ جوانی اور بڑھاپا کبھی آرام سے ایک ساتھ نہیں رہ سکتے ۔ جوان یادیں بوڑھی روح کو دکھ پہنچاتی رہی ہیں ۔

انور ۔ دیکھا امی ۔ میں کہتا تھا نا ابی کی باتیں بڑی مسحور کن ہوتی ہیں ۔

زہرہ ۔ ہاں ۔

نرگس ۔ آپ لیٹ جائیے نا امی ۔

زہرہ ۔ نہیں بیٹی ۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں ۔ تم فکر نہ کرو

کرنل ۔ بچو ۔ تم اب جاؤ ۔ ہمیں کچھ باتیں کرنا ہیں ۔ (معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ) کچھ ایسی باتیں جو ہم تمہاری موجودگی میں نہیں کر سکتے ۔

(انور مسکراتا ہے اور نرگس شرما جاتی ہے ۔ وہ دونوں اٹھ کر باہر لان کی طرف والے دروازے سے چلے جاتے ہیں ۔ تھوڑی دیر خاموشی رہتی ہے)

کرنل ۔ تو یہ تم ہو زہرہ اور یہ تمہارا بیٹا ہے انور ۔

زہرہ ۔ (جو کچھ دم بخود سی بیٹھی ہے) ہاں ۔

کرنل ۔ کون جانتا تھا کہ ہم پھر مل سکیں گے ۔ کتنے برس بیت گئے ہمیں ایک دوسرے سے جدا ہوئے؟

زہرہ ۔ اٹھارہ سال ۔

کرنل ۔ ہاں اٹھارہ سال کی طویل مدت کے بعد ہم پھر مل گئے کتنی عجیب ہے یہ ملاقات — اور زہرہ ایک بات اور بھی بہت عجیب ہے ۔ وہ جن کی وجہ سے ہم نے علیحدگی اختیار کی تھی آج انہیں کی وجہ سے ہم ایک دوسرے سے پھر مل گئے ہیں ۔ یاد ہے وہ دن ۔

زہرہ ۔ ہاں مجھے یاد ہے ۔ بھلایا کیسے جا سکتا ہے ۔ مجھے سب کچھ یاد ہے ۔ لیکن اب ان یادوں کا ذکر نہ کرو افضل — !

کرنل ۔ افضل — ایک بار پھر کہو — پھر سے کہو زہرہ (جذباتی ہو کر) کتنی مٹھاس ہے ۔ کس قدر اپنایت ہے ۔ اس لہجہ میں ۔ اس آواز میں ۔ کتنی طویل مدت کے بعد کسی نے مجھے میرا نام لیکر پکارا ہے ۔ میرا اپنا نام مجھے اجنبی سا لگتا ہے ۔ غیر مانوس ۔ اور کبھی کبھی تو مجھے ایسا گمان ہوتا تھا زہرہ جیسے میں اپنا نام

بھول گیا ہوں۔ پھر سے کہو زہرہ۔ زہرہ!

زہرہ ۔ افضل۔ بچوں کی طرح جذباتی نہ بنو۔

(باہر سے انور اور نرگس کے قہقہے سنائی دیتے ہیں)

کرنل ۔ وہ ہنس رہے ہیں۔ وہ جنہوں نے ہمارے قہقہوں کو موت کی نیند سلا دیا جن کے لئے ہم نے دنیا کے سارے رشتوں کو توڑ دیا۔

زہرہ ۔ لیکن اس میں ان کا کوئی قصور نہیں۔

کرنل ۔ ہاں۔ قصوروار تو میں ہوں۔ میں نے معصوم بچوں کی لڑائی کو اہمیت دی اور یہ نہ سمجھا کہ وہ بچے ہیں معصوم ہیں۔ جس طرح لڑتے ہیں اسی طرح من بھی جاتے ہیں۔

(چند لمحوں کی خاموشی)

زہرہ ۔ تم نے کبھی مجھے یاد کیا افضل؟

کرنل ۔ ہاں۔ جب سے میں اکیلا ہوں ہر گھڑی تمہیں یاد کرتا رہتا ہوں۔

زہرہ ۔ تم نے مجھے تلاش نہیں کیا۔

کرنل ۔ بہت دیر ہو گئی تھی زہرہ۔۔ اور پھر اب مجھ میں تمہیں تلاش کرنے کی سکت بھی تو نہ تھی۔ اور میں شرمندہ بھی تھا۔

زہرہ ۔ تم مجھ سے مل کر خوش ہوئے۔

کرنل ۔ ہاں۔ بہت۔ بہت زیادہ خوش۔ اور یہ خوشی کچھ ایسی معصوم سی ہے جیسی بچوں کو ہوتی ہے کسی ایسے بچے کو جس کے ساتھ کوئی کھیلنے والا نہ ہو اور پھر اچانک ایک روز اسے ایک ساتھی مل جائے۔

زہرہ ۔ صرف گھڑی بھر کے لئے۔

کرنل ۔ نہیں نہیں ایسا نہ کہو زہرہ۔۔ (خاموشی) زہرہ۔

زہرہ ۔ ہوں۔

کرنل ۔ میں تم سے کچھ مانگنے والا ہوں۔ بتاؤ دو گی۔۔ انکار تو نہیں کرو گی۔

زہرہ ۔ (آنسو ضبط کرتے ہوئے) تم جو مانگنا چاہتے ہو افضل وہ میرا نہیں ہے۔ اسے تمہاری بیٹی پہلے ہی مجھ سے چھین چکی ہے۔

کرنل ۔ تم غلط سمجھیں زہرہ۔۔ میں انور کی بات نہیں کر رہا ہوں میں کچھ اور مانگنے والا تھا۔

زہرہ ۔ کیا؟

کرنل ۔ تمہارا ساتھ۔

زہرہ ۔ نہیں نہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے افضل۔ بہت دیر ہو گئی۔ وقت بہت آگے نکل چکا ہے۔ گذرے دنوں کی طرف مڑ کر نہ دیکھو۔ جو ساتھ چھوٹ گیا چھوٹ گیا۔۔ ٹوٹے ہوئے رشتہ جن کے درمیان سسکتے، بلکتے اور تپتے ہوئے اٹھارہ برسوں کا فاصلہ ہو اس طرح نہیں جڑ سکتے، افضل۔

کرنل ۔ ایسا نہ کہو زہرہ۔۔ غلطی ہم دونوں ہی کی تھی۔ ہم اپنی ان محبتوں کے جنون میں جو ہم نے کبھی کیں بالکل اندھے ہو رہے تھے ہم نے گذری ہوئی محبتوں کی دھن میں آنے والے زمانے کا بھی کوئی خیال نہ کیا۔ لیکن اس وقت مجھے تنہائی کے اس درد کا احساس نہ تھا زہرہ ورنہ ہرگز ایسا نہ کرتا۔

زہرہ ۔ مگر جو کچھ ہو چکا اسے مٹایا نہیں جا سکتا، افضل۔

کرنل ۔ دھوکا ہوا مجھے میری محبت نے دھوکا دیا زہرہ، وہ جس کے لئے میں نے تم سے علیحدگی اختیار کی جس کی پرورش میں میں نے اپنی ساری عمر گنوا دی، وہ جب جوان ہوئی تو مجھے معلوم ہوا وہ میری نہیں ہے۔ اسے پال پوس کر میں نے کسی اور کے لئے جوان کیا ہے میں نے اس لئے اس کی پرورش کی ہے کہ وہ کسی اور سے محبت کرے۔

زہرہ ۔ افضل۔

کرنل ۔ اور یہی مناسب ہے زہرہ۔ یہی ہونا چاہیئے۔ بوڑھی روح جوان جسم کا ساتھ نہیں دے سکتی۔۔ یہ ناممکن ہے۔ وہ جس کے لئے میں نے اٹھارہ برس گزارے۔ ماضی کو بھول کر تمہیں بھول کر۔ خود کو بھول کر۔ جب وہ جوان ہوئی تو ایک لمحہ آیا اور میری برسوں کی اس محنت کو چرا کر لے گیا۔۔ اور

میں تنہا رہ گیا۔ بالکل تنہا۔
(خاموشی)
تم خاموش ہو زہرہ — کچھ اپنی باتیں بھی کرو —
کچھ اپنے حالات بھی۔

زہرہ :- میں کیا کہوں — میرے الفاظ تمہاری زبان ادا کر رہی ہے۔ تمہاری ہی نہیں میری کہانی بھی ہے افضل۔

کرنل :- قسمت نے ہمیں پھر ایک موقع دیا ہے۔

زہرہ :- بہت دیر ہو گئی، افضل — کارواں گزر گیا صرف غبار رہے۔

کرنل :- نہیں ایسا نہ سمجھو — ایسا نہ سمجھو زہرہ — یہ وقت جو آنے والا ہے جو آ گیا ہے بڑا سست رفتار ہے۔ عمر کے آخری حصہ کے یہ لمحات اگر تنہائی میں بسر ہوں تو بڑے طویل ہو جاتے ہیں زہرہ — ایک ایک لمحہ ایک ایک صدی بن جاتا ہے اور پھر ان سسکتے ہوئے لمحات میں ان رینگتی ہوئی صدیوں میں یادیں چیونٹیوں کی طرح جسم سے چمٹ جاتی ہیں۔ زخم رستے رہتے ہیں۔ درد بڑھتے جاتے ہیں اور زندگی ختم نہیں ہوتی — تنہائی دنیا کی سب سے عبرتناک سزا ہوتی ہے زہرہ —

زہرہ :- تنہائی یا احساسِ تنہائی؟

کرنل :- ہاں — شاید احساسِ تنہائی — سب احساس ہی کے تو کھیل ہیں زہرہ۔ تمہیں تنہائی کا احساس نہیں ہوتا — !

زہرہ :- (سسکیاں لے کر روتے لگتی ہے)

کرنل :- آؤ زہرہ۔ ہم ایک ہو جائیں۔ میری مسرتیں اور میرے غم۔ تمہاری مسکراہٹیں اور تمہارے آنسو۔ وہ محبتیں جو ہم نے اوروں سے کیں اور وہ غم جو ہم نے ایک دوسرے سے حاصل کئے — آؤ ہم ان کو ایک کر دیں — تاکہ تنہائی کا یہ احساس دور ہو جائے۔ ہم عمر کی آخری منزلیں ایک ساتھ طے کریں گے، زہرہ۔

(باہر سے قہقہوں کی آواز آتی ہے)
سنو۔ وہ ہنس رہے ہیں۔ دو جوان جسم — دو جوان روحیں۔ وہ ہنس رہے ہیں۔ چونکہ وہ ساتھ ہیں ہم بھی مسکرائیں گے — ہم بھی ہنسیں گے — آؤ چلو۔ باہر شام بہت حسین ہے۔

زہرہ :- (اٹھتی ہے) کیا ہم انہیں بتا دیں؟ بچوں کو؟

کرنل :- (مسکراتے ہوئے کھڑا ہو جاتا ہے) ہاں۔ ہم انہیں بتا دیں گے میں ان سے کہوں گا ”بچو! ہم نے تمہیں ساتھ زندگی گزارنے کی اجازت دیدی — اور اب تم سے یہی اجازت مانگنے آئے ہیں۔ — کیا تمہیں منظور ہے؟

(دونوں باہر والے دروازے سے نکل جاتے ہیں پردہ آہستہ آہستہ گر جاتا ہے)

★

F

آپ پی۔آئی۔اے
سے سفر کرنا پسند
کرتے ہیں، کیونکہ

آپ
جانتے ہیں کہ ......

- ہر جہاز اشبک رو، اور تیز رفتار ہوتی ہے اور اس کے علاوہ آپ کے آرام کے لئے انفرادی توجہ دی جاتی ہے۔
- ہوائی سفر سے روپیہ کی کفایت اور وقت کی بچت ہوتی ہے، اور گرد اور تپش سے چھٹکارا حاصل ہوتا ہے۔
- ہر پرواز پر فرسٹ کلاس، اور ٹورسٹ کلاس نشستیں اور مشروبات کا مکمل انتظام ہے

یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ لوگ پی۔آئی۔اے سے سفر کرنا پسند کرتے ہیں۔

PIA

پاکستان انٹرنیشنل ائیر لائنز

تفصیلات اپنے سفری ایجنٹ یا پی۔آئی۔اے، کلب روڈ۔ کراچی سے دریافت فرمائیے ٹیلیفون ۵۱۰۶۱/دس لائنیں
کارگو کا دفتر، بسینی ہاؤس۔ کچہری روڈ۔ کراچی۔ ٹیلیفون ۳۸۵۵۱/تین لائنیں

کاوش:

"سب کے لئے"

رفعت جاوید

ایڈیٹر صاحب

اس مضمون کو بے تکلف چھاپ دیجئے
کیونکہ یہ سب کے لئے ہے اور پھر اگرچہ نیا لکھنے والا ہوں
لیکن لوگ کہتے ہیں کہ

پختہ کاری کا رنگ ظاہر ہے
گرچہ تھے ابتدائے مشقِ سخن

رفعت جاوید
پبلک اسکول کراچی

ہمارا یہ سب سے کم سن لکھنے والا پہلے بھی آپ کے سامنے آچکا ہے۔ پچھلی بار اس نے ہمارے جوانان تیغ بند کے کارنامے بڑے ہی دلچسپ پیرائے میں بیان کئے تھے۔ اب کے اس نے ایک اور قومی چیز چنی ہے۔ ایسی کہانیاں جو بچوں کو "بڑا" بنا دیتی ہیں۔ یعنی ان کا کردار۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز، جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے، 'سب کے لئے' ہے۔ ساری کہانیاں آپ اسی نام کی کتاب میں پائیں گے جسے تاج کمپنی لمیٹڈ، کراچی نے چھاپا ہے۔
بچے — 'ہونہار بروا' نے آخر میں بڑی پتے کی بات کہی ہے۔ اس کی 'پختہ کاری' میں شک نہیں۔
اسی لئے ہم اس ننھی منی تحریر کو "بے تکلف" چھاپ رہے ہیں۔ (ادارہ)

پھر کچھ کہنے کو جی چاہتا ہے۔ اور کیسے نہ کہوں۔ روز روز نہ سہی سال کے سال ہی سہی۔ اور وہ بھی اس وقت جب کہ خدا کی برکت سے ہماری قوم کے دن پلٹ گئے تھے اور وہ انقلاب رونما ہوا تھا جس کی یاد ہم آج اس خوشی سے مناتے ہیں۔ اور پھر اب میں کافی لکھ پڑھ بھی گیا ہوں۔ اور خود یعنی بقلم خود کچھ الٹا سیدھا لکھ لیتا ہوں۔ الٹا میں اور سیدھا — میرے استاد یا ایڈیٹر صاحب۔
بات وہی ہے جو سب کے لئے ہو۔ مثلاً انقلاب ہی کو لیجئے — یہ اس لئے ہوا کہ یہ ہم سب کے لئے تھا۔ اور اسی لئے ہم اس انقلاب کے بانی فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، صدر پاکستان کو اس اچھائی سے یاد کرتے ہیں کہ انقلاب سے لے کر اب تک ان کا جو کام ہے وہ ہم سب کے لئے ہے۔ ان کی تقریریں، ملک کے اندر دورے، ملک کے باہر دورے، غرضیکہ کیا کچھ نہیں اور ان کے ساتھ ہمارے وطن کے سپاہی، ہمارے فوجی جوان، وہ بھی تو جو کچھ کرتے ہیں ہم سب ہی کے لئے کرتے ہیں۔ اسی لئے پچھلی بار میں نے پاکستانی بہادروں کے سنہرے کارنامے ہی بیان کئے تھے۔ اور اب پھر وہی "سب کے لئے"۔

اس لئے نہیں کہ وہ یونہی سب کے لئے ہے۔ بلکہ سچ مچ سب کے لئے ہے۔ یوں بھی اور یوں بھی۔ اس لئے کہ اس کا نام ہی "سب کے لئے" ہے۔ اب تک تو میرا خیال ہے سب ہی سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ کیا ہے۔ کوئی بوجھ پہیلی — کوئی کتاب۔ ہاں آپ ٹھیک سمجھے یا میں نے ہی بتا دیا۔ یہ کہانیاں ہیں کہانیاں۔ بڑی دلچسپ، منّی منّی، پیاری پیاری، کراری کراری کہانیاں، سب بچوں کے لئے، نہیں نہیں چھوٹوں بڑوں سب کے لئے۔ معاف کیجئے بڑے بھی تو سب بچے ہی ہیں۔ وہ بھی تو ساری عمر کچھ نہ کچھ سیکھتے ہی رہتے ہیں۔ اور کہانیوں کی حد تک تو سب ہی بچے ہیں۔ اس لئے یہ کہانیاں واقعی سب کے لئے ہی ہیں۔ ہمارے محبوب صدر پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کے لئے بھی جنہوں نے اپنے ملک کے ایک ہونہار ادیب کی ان نصیحت آموز یا سبق آموز کہانیوں کا اپنے نام منسوب کیا جانا بڑی خندہ پیشانی سے قبول کیا ہے۔ دیکھا لکھنے والے نے کتنی بڑی استادی کی ہے۔ کیا نام چنا ہے۔ جو سب کو مقبول ہو۔ اور ان کے ساتھ یہ کہانیاں بھی۔

تو یہ کہانیاں صدر پاکستان کی ہیں۔ یہ کہانیاں آپ کی ہیں۔ یہ کہانیاں میری ہیں۔ پھر مجھے، آپ کو، ہم سب کو ان سے دلچسپی کیوں نہ ہو؟

کہانیاں تو میں دن رات پڑھتا ہوں۔ بے اندازہ۔ آپ ان کے نام سن سن کر گھبرا نہ جائیں تو — لیجئے مشتے نمونہ از خروارے:

بی۔ اے پاس چوہا — کالا دیو — کالا چور — موت کی آواز — پرستان کے چور — یمن کا جادوگر — ظالم بادشاہ — شہزادی زہریلا کیلا (حصہ اول۔ دوم) موت کا پنجرہ — غریب پرور شہزادہ۔ ٹارزن اور مصنوعی دیو — میٹھی کہانیاں (گڑ انبہ۔ گرم حلوہ۔ کھجور وغیرہ) علی بابا چالیس چور — کیا بتاؤں مجھے یہ بہادری کی کہانیاں۔ جادو کی کہانیاں۔ جن پریوں کی کہانیاں، بہت پسند ہیں۔ بس ان کو پڑھ کر دماغ خبر نہیں کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ اس پتنگ کی طرح جیسے زور شور سے ڈور پلائی جا رہی ہو۔ اور پھر واپس آنے کا نام نہیں لیتی۔ ان کے مقابلے میں ایسی کہانیوں جیسے "سب کے لئے" میں وہ جادو تو نہیں۔ لیکن ان سے کچھ پلے تو پڑتا ہے۔ ہماری ٹیچر ایسی ہی کہانیاں تو سناتی ہیں۔ اور ریڈیو پر بھی کسی ہوشیار خرگوش، کسی سست کچھوے کی کہانیاں بھی آتی ہی رہتی ہیں۔ کہانی کی کہانی اور سبق کا سبق۔ آپ کا جی چاہے تو انہیں صرف کہانی کے لئے پڑھ لیجئے۔ یا پھر سبق کے لئے۔ کیا ہوا جو زبان ٹھیٹھ کہانی کی زبان نہیں ذرا لوجھل بوجھل۔ ذرا بھاری بھاری۔ اس لئے کہ وہ نرا چھلکا ہی نہیں ہوتیں۔ ان میں یہ موٹا موٹا گودا بھی ہوتا ہے۔ مانا پھلوں کے برعکس کہانیوں میں مزے کی چیز چھلکا ہی ہوتی ہے اور شاید ہم انہیں اسی لئے ہی پڑھتے ہیں۔ مگر ان کے بھلاوے میں کبھی کبھی دانت گودے پر بھی جا ہی پڑتے ہیں۔ اس لئے ان کے پڑھنے یعنی کھا لینے میں کیا ہرج ہے۔ چھلکا الگ اور گودا الگ۔ یا پھر کبھی کبھی دانت الگ۔ خدا نہ کرے ایسا ہو!

خیر مطلب کی بات یعنی گودے کی طرف آئیے۔ اچھا ہو اگر نمبر دیئے جائیں۔ سب سے زیادہ نمبر تو میں "چچا لمبو" کو دوں گا۔ کلاس روم میں شہد کی مکھی کیا گھسی کہرام مچ گیا۔ سب لڑکے لڑکیاں بھاگ نکلیں۔ میز کرسیاں اوپر نیچے دھڑام دھڑام۔ مگر یہ چچا لمبو تھے نا لمبو۔ یہ لمبا سا ہاتھ مارا اور مکھی کو مٹھی میں قابو کر لیا۔ جبھی تو ان کا نام یار لوگوں نے 'شہد کی مکھی' رکھ دیا۔ اور یاسمین بھی ایک ہی نٹ کھٹ تھی۔ چچا لمبو کو کیا کیا لوہے کے چنے چبوائے اور کنویں جھنکائے کہ چھٹی کا دودھ یاد آ گیا۔ چچا نے اس کو کار میں قید تو کر دیا مگر تھے نہ لمبو۔ عقل تھی ٹخنوں میں۔ چابی کار ہی میں بھول گئے۔ اور خوب بہانہ کیا کہ چابی موری میں پھینک دی۔ اور چچا ہیں کہ لمبے لمبے ہاتھوں سے نالی کے گندے کالے پانی میں لانبی لانبی انگلیاں پھیر رہے ہیں۔ چابی تو خدا خدا کر کے مل ہی گئی لیکن سزا بھی خوب ملی۔ تین دفعہ چچا لمبو۔ چچا لمبو کہنا پڑا۔ اور سچ پوچھئے تو ڈرامے کا کمال اس وقت ہوا جب کہ چچا لمبو کو شہد کی مکھیوں کا اتنا لمبا ہار پہنایا گیا۔ لیکن اچھا ہوا سب نے پیار محبت سے ایک دوسرے کو خوش کر دیا۔ دل مل گئے قدم مل گئے۔ یہ تو ہے مگر کہانی تو بس شرارت تک ہی مزا دیتی ہے۔ بھائی عبید الحق صاحب عرف رشید جمال صاحب۔ آپ لاکھ کھینچ تان کر سبق نکالئے۔ مگر یہ تو زبردستی ہوئی۔ اور ہاں گھر جا کر دیں یا زفعل، کی جگہ 'فیل' لکھئے۔ ایسے ہی 'سوچنے' کی جگہ 'سوچ نے'۔ 'نامید' کی جگہ 'ناامید' 'میدان کارزار' کی جگہ 'امیدان'

کا زار۔ 'ڈال دیں تھیں' کی جگہ 'ڈال دی تھیں'۔ اسامت کی جگہ اصامت، 'اکرتیں تھیں' کی جگہ 'کرتی تھیں'۔ 'بے گم' کی جگہ 'بیگم'، لکھئے۔ آخری درستی بڑی ضروری ہے۔ ورنہ آپ جانیں اور آپ کی "بے گم" صاحبہ، ہائیں! اتنے بڑے اور ....

خیر جانے دیا۔" انوکھا بیمار" کے لئے۔ آپ ہوتے ہیں۔ وہ تو 'ہتنیانہ محبت' تھی۔ ہاتھیانہ نہیں۔ مگر اسی سے ہدح کا کلیجہ، خوب ٹھنڈا ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کو کیا سوجھی کہ لگے ہتنی کا علاج کرنے۔ اب اگر ہتنی کو ان سے پیار ہوگیا اور وہ لگی سونڈھ سے اپنی محبت جتانے تو اس میں اس کا کیا قصور۔ خیر ڈاکٹر صاحب نے بھی خوب کیا۔ درخت کے گدے کو پکڑ کر لٹک گئے۔ اور نیند کی گولیاں کھلا دیں۔ جان بچی لاکھوں پائے۔

سچ کہئے وہ چاندی کا قلم کس نے دیا تھا؟ تھے نہ ابا جو فرشتہ بن کر آگئے تھے۔ مانگا بھی تو کیا۔ چاندی کا قلم۔ وہ کیا کرتا تھا۔ کوئی ٹافی کا ڈبہ یا ٹنٹے گن مانگتے تو بات تھی۔ شرمیلا لڑکا اور بنجت لڑکا۔ ہیں تو مزے کی کہانیاں۔ چٹوورے منی سے خوب ہوئی کہ چوہے دان میں روٹی کا ٹکڑا ابھی نہ چھوڑا جس پر چوہے مار کر دوا لگی تھی۔ خوب مزا آیا۔ لگا تھو تھو کرنے۔ بگڑے ہوؤں کا علاج ہو تو ایسا۔ 'چچالمبو' اور 'انوکھا بیمار' کو تو میں ضرور دس میں دس نمبر دوں گا۔ مگر ابا نے جس طرح گاؤں سر پہ اٹھالیا اس کا بھی جواب نہیں۔ بڑے بوڑھوں کی یہی ادائیں ہوتی ہیں۔ شہر بھر کی برف جمع کرلی۔ اگر میرا بس چلے تو ان بوڑھوں کو خوب چھیڑوں مگر ڈرتا ہوں آپ کوئی لیکچر نہ پلانا شروع کر دیں اور بات ہوتے ہوتے جناب صدر تک نہ پہنچا دیں۔

ہمنام نامور کی ستم ظریفی بھی خوب ہے۔ کرے بیٹا بھگتے باپ۔ انہوں نے بھی خوب کیا۔ وہ چاندی کی موٹھ والا ڈنڈا لے کر اٹھے اور بھائی رشید جمال لگے دروازے سے بھاگنے۔ اچھا ہوا جو رات "بے مروت چوہوں نے اس قدر کا ٹاکراف توبہ بھلی۔

سچ تو یہ ہے کہ ساری مزے مزے کی باتیں پہلے ہی کہہ چکی ہیں۔ پہلے پہلے آتی ہیں۔ وہی چچا لمبو یا انوکھا بیمار۔ پھر نہ جانے یہ بوڑھے ٹھڈوں کی باتیں کہاں سے آگئیں۔ مسٹر اور مسز حمید تو خاک بھی سمجھ میں نہیں آیا کیا بات ہوئی۔ شاید بڑا ہو کر سمجھ میں آجائے۔ مگر بھئی دانتوں کا ڈاکٹر بھی تو ـــ خیر اس سے کچھ مزا تو آتا ہے۔ بیلا کی امی بھی عجیب ہے کیا باتیں کرتی ہے۔" کیا اچھا لڑکا ہے۔ سڑے گلے دانتوں کا بیوپار کرتا ہے۔ ناک پکڑے دم نکلتا ہے ....." اور پھر بھی .... اب ان بڑی بوڑھیوں کا کیا کہا جائے۔ مزا تو ان بڑے میاں کی بات کا آیا۔" کل میں نے اس بڑھاپے میں ایک عدد بکری کی ہڈی دانت سے توڑ ڈالی۔"

سچ تو یہ ہے یہ سب بڑھاپے وڑھاپے کی باتوں میں تو میں گول ہی رہا۔ پھر بھی امی کی سالگرہ سے کیسے جی خوش نہ ہو۔ مگر بچاری امی! ان کی سالگرہ انہوں نے تو کیا دوسروں ہی نے منائی۔ پکنک دوسرے کرتے پھریں اور وہ پلنگ پر ہی پڑی رہیں۔ یہ بڑا اچھا ہوا کہ ہم سب نے مل کر وہ نظم پڑھی جس کو ابا نے ہماری طرف سے امی کی شان میں لکھا تھا۔ مگر کہاں کی امی، کہاں کے ابا، اور کہاں کے ہم یہ تو کوئی اور امی ہیں۔ کسی دوسرے کی۔ میں بھی کیسے بہک گیا۔ یا بھائی رشید نے بہکا دیا۔ یہی تو کمال ہے۔ فن ہے۔ سر چڑھ کر جھوٹ! پھر بھی اس جھوٹ میں ایک لطف ہے۔ میرے لئے ہی نہیں، سب کے لئے۔

اچھا میں نے پڑھا، خوش ہوا۔ اور شاید کچھ سیکھا بھی۔ اگر یہ نرالی کہانیاں سچ مچ ہمیں وہ کچھ بنا دیں جو ـــ اور کسی کا نام کیا لیں۔ ہمارے صدر جیسے ہیں تو پھر کیا چاہیئے۔ جنہوں نے واقعی پاکستان کی بنیادوں کو سیسہ پلائی ہوئی دیواروں کی طرح مضبوط بنا دیا ہے۔ کیا اچھا ہو اگر میری، آپ کی سب کی زندگی سب کے لئے ہو! آمین ثم آمین!!

★

"فصل بہار ایں چنیں" بقیہ صفحہ ۱۵

کی تہیں کاٹتی چلی جاتی ہے۔ برنارڈ شا کو پڑھتے پڑھتے وہ خود بھی ایک طرح کا برنارڈ شا بن گیا ہے۔ اور اس سے وہ آفاقیت پیدا ہوتی ہے جو اسے ممیز کرتی ہے نتیجہ محض سال بھر کے افسانوں کا حاصل ہی نہیں بلکہ ایک افسانوی سنگ میل۔

شاعری بھی اپنے تازہ نواؤں سے خالی نہیں اگر ایک طرف ملکی حیثیت سے مشرق و مغرب اور ان کے مختلف علاقے آپس میں آمیز ہو رہے ہیں اور ایک نئی پاکستانی ثقافت ابھر رہی ہے تو دوسری طرف آفاقی حیثیت سے بھی شرق و غرب کا امتزاج برابر رو بہ ترقی ہے۔ راشد کی "اے مرے صحرانورد پیر دل" کا موضوع تمام تر آفاقی ہے۔ اسی طرح "مرگِ اسرافیل" کو بیک وقت آفاقی بھی کہا جا سکتا ہے اور مقامی بھی۔ بہرحال جس بنیادی مسئلہ کو اس نظم میں چھیڑا گیا ہے۔ اسے آفاقی ہی کہنا چاہئے۔ آج کی ہنگامہ درہنگامہ دنیا میں کوئی حساس انسان بین الاقوامی معاملات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لئے مقدم ہے کہ ہمارے شاعر بھی کبھی ہنگری کبھی افریقہ، کبھی ایشیا کے مسائل سے متاثر ہوں اور ان پیرایوں میں جو ہم خود سوچ سکتے ہیں یا دوسروں سے حاصل کر سکتے ہیں، پیش کریں۔ یہ نئے زمان و مکان میں پرورش پاتے ہوئے رجحانات برابر بال پرواز پیدا کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ممکن ہے شعر و سخن یا تنقید کی رفتار اس لحاظ سے فی الحال زیادہ تیز نہ ہو لیکن فکر و فن کے پرانے مسائل کو نئے انداز سے پرکھنے کا میلان ضرور دکھائی دیتا ہے۔ پچھلے ایک دو سالوں میں یوسف سلیم چشتی نے فکر اقبال اور تصوف کے بعض پہلوؤں کو روشِ عام سے ہٹ کر دیکھنے کی کوشش کی ہے اور جن حقائق پر روشنی ڈالی ہے وہ قابل توجہ ہیں اس قسم کی ایک اور کوشش "قرآنی تصوف اور اقبال" میں دکھائی دیتی ہے۔ بادی النظر میں اقبال کا تصور خودی اور فلسفۂ عمل انہی کے فکرِ تازہ کی پیداوار معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے اکثر ناقدین ان کے افکار کو حکمائے سلف خصوصاً اہلِ تصوف کے خیالات سے بالکل الگ بلکہ ان کے خلاف شدید ردعمل کا نتیجہ خیال کرتے ہیں۔ یہ ایک شدید مغالطہ ہے۔ دراصل اقبال کے افکار بزرگان سلف ہی کے افکار پر مبنی ہیں اور انہی سے قریبی مشابہت رکھتے ہیں فرق زیادہ تر اصطلاحات کی حد تک ہے۔ اگر ہم ان اصطلاحات سے گزر کر معانی بین السطور کو ملحوظ رکھیں تو اقبال اور صوفیا کے تصورات اور نقطۂ نظر میں مغایرت نہیں بلکہ ہم آہنگی دکھائی دے گی۔ زیر نظر کتاب میں دونوں کے مشترک عناصر کو بخوبی واضح کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس کے بعد بھی بعض مسائل کے بارے میں الجھنیں باقی رہ جاتی ہیں جو دیگر اہل الرائے کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہوئے سلسلۂ فکر و نظر کو اور بھی آگے بڑھانے کی تحریک دلاتی ہیں۔

بہرحال یہ نئے ملکی، معاشری، ثقافتی اور ذہنی رجحانات ایک زندہ قوم کے بیدار مغز، نمو پذیر اور ترقی کوش ہونے کی یقینی علامات ہیں۔ اور اگر ابھی سے ہماری ارض وطن کی فصل بہار کی کیفیت یہ ہے تو آئندہ چند سالوں میں جب موجودہ اقدامات کے نتائج زیادہ وضاحت و شدت سے بروئے کار آجائیں گے، ہم اس کی بہار تازہ تر کی رنگینیوں اور رعنائیوں کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔

"بعد از مرگ زاد!"

جمیل نقوی

یہ نظم بھی "بعد از مرگ زاد" کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ یہ اس وقت موصول ہوئی جب کہ "بابائے اردو نمبر" جملہ نگارشیں کتابت ہو کر پریس کو بھیج دی گئی تھیں۔ اس لئے یہ ان سے الگ شائع کی جا رہی ہے۔ (ادارہ)

ادب کے نام پہ قائم ہیں حلقہ ہائے نہنگ
زباں کے پردۂ زرکار میں چھپے ہیں پلنگ
یہ اہلِ علم یہ، اُردو زباں کے شیدائی
بڑے خلوص سے لڑتے ہیں اقتدار کی جنگ
زباں کا زور دکھاتے ہیں اس طرح جیسے
کوئی حریفِ مخالف پہ پھینکتا ہے خدنگ
مرے بزرگ، مرے رہنما، مرے محسن
قسم خدا کی گوارا نہ تھا تجھے یہ ننگ
تمام عمر اسی فکر میں رہا غلطاں
کوئی سبیل کہ چھٹ جائے فطرتوں سے یہ زنگ
ضمیرِ عصر سے کچھ یوں ستیزہ کار رہا
کہ جیسے شعلۂ مضطر میانِ تیشہ و سنگ
ترا بیاں تھا دلِ قوم کی دکھی آواز
ترا سکوت حریفِ سیاستِ افرنگ
ترے خیال کی رنگینیوں کے محور پر
سمٹ کے آئے ہر اک سمت سے نئے آہنگ
ترے قلم کی روانی، تری زبان کا لوچ
کہ ہر حرف حرف شگفتہ ہے، سطر سطر اُمنگ
مقدماتِ فلاطوں مقدمات ترے
کہ پیش کرتے ہیں تحقیق و جستجو کے ڈھنگ

تری نگاہ کی معصومیت کے پرتو سے
عیاں ہے چہرۂ اردو سے اعتدال کا رنگ
تری حیات تھی حسنِ عمل کی راہنما
تری ممات نئی زندگی کی ایک ترنگ

زمانہ تیری صداقت کا گو رہا شاکی
مگر کبھی نہ زمانہ کی تو نے پروا کی
ادب میں حق و صداقت کی لاج تھی تجھ سے
ترے مزاج کا جوہر تھی تیری بے باکی
تری خودی میں تھے اسرارِ بیخودی پنہاں
ترے جنوں سے گریزاں خرد کی چالاکی
وہ تیرا عزم مصمم وہ تیرا جوشِ عمل
دلیلِ عظمتِ کردارِ آدمِ خاکی
خود اپنا خونِ جگر صرفِ سوزِ غم کر کے
خلوصِ درد کی نادر مثال پیدا کی
ترے خلوص کی شدت سے پارہ پارہ تھا
طلسمِ مستئ اندیشہ ہائے افلاکی
لسانِ عصر تھا تو بھی مثالِ سرسید
جہاں سے اٹھ گیا دے کر نوید فردا کی

★

شمزہ

محمد عمر میمن

پچھلے چند سالوں، خصوصاً دورِ انقلاب میں جس طرح ثقافت اور فن نے دیکھتے ہی دیکھتے کتنی منزلیں طے کرلی ہیں اور فن کاروں کو جس طرح موقع ملاہے کہ وہ اپنے وطن پاکستان سے دور جاکر آفاقی اثرات سے استفادہ کریں اس کا بین ثبوت شمزہ جیسے فن کاروں میں دکھائی دیتا ہے۔

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
(ادارہ)

انسان نے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے بالعموم فنونِ لطیفہ کی آغوش میں پناہ لی ہے۔ کوئی حزن و ملال، مسرت و انبساط، وقتی اضمحلال، لمحاتی خوشی کو شعر میں مجسم کر دیتا ہے تو کوئی کاندھے پہ ایزل لٹکائے دور، بہتے چشموں کی طرف نکل جاتا ہے جہاں اسکا سیاہ کے نٹ منٹ پیسٹر اسے اپنے کرب، تنہائی اور حزن کی بہترین علامات نظر آتے ہیں یا اگر مہتاب سی نازک اندام کوئی دوشیزہ اسے "سنہرے پانی میں چاندی سے پاؤں لٹکائے اپنے میں گم نظر آجاتی ہے تو وہ اس جلوۂ حسن سے اپنے اندر پیدا ہونے والی سرخوشی کو کینوس، رنگ، اور روغن کی دنیا میں محفوظ کرلیتا ہے۔ اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ حزن و مسرت کی یہی تحریک اعضائے انسانی کی ہلچل میں اپنا اظہار پاتی ہے جسے ہم رقص کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

یہ اظہار کے چند بنیادی رخ تھے۔ ابتداء گویا یہیں سے ہوئی۔ پھر ذرا آگے بڑھیئے تو ہر رخ کئی کئی شاخوں پر منقسم ہوتا محسوس ہوگا۔ یہاں سے اس میں لطافت، باریکی اور حسن جنم لیتے ہیں مثلاً پھر شعر کی کئی اصناف بن جاتی ہیں جنکی قیود میں محدود ہو کر جذبۂ انسانی اظہار پاتا ہے۔ رقص کی کئی قسمیں بن جاتی ہیں اور فنِ تصویر کشی میں کبھی باریک کبھی موٹے خطوط کا سہارا لیا جاتا ہے تو کبھی مخصوص فضا کے قیام کے لئے خاص رنگوں کا آہنگ پسندیدہ ہوتا ہے۔

اس رخ کا ایک بہت ہی جدید پہلو وہی ہے جسے ہم "تجریدی آرٹ" کہتے ہیں اور ابھی تک اس میں تجربات ہو رہے ہیں۔

ہمارے ملک میں دیگر فنون کی طرح فن تصویر کشی کو بھی خاصی اہمیت حاصل ہے اس کے فروغ کے لئے حکومت نے بہت کچھ کیا ہے اور ملک میں فن کاروں کی ایک قابل ذکر تعداد موجود ہے۔

فن کاروں کی اس لمبی چوڑی پریڈ میں ایک دور افتادہ مرے پرانور جلال شمزہ کھڑا نظر آتا ہے یہیں دیکھنا ہے، اس فنکار نے فنونِ لطیفہ کے اس اظہار کو جسے ہم اور آپ آرٹ کہتے ہیں کس منزل تک پہنچایا ہے وہ بزم میں رہ کر بھی سب سے یگانہ، اور منفرد ہے۔ شمزہ کے فن میں اس کا دورۂ انگلستان ایک اہم موڑ کی اہمیت رکھتا ہے یہیں سے اس جانے پہچانے فنکار نے فرسودہ، پامال راہوں کو خیرباد کہہ کر اپنے لئے نئی منفرد راہوں کا تعین کیا۔

اس سے قبل دیگر فنکاروں کی طرح شمزہ کا فن بھی مغربی طرزِ مصوری میں مشرقی موضوعات کی نقالی سے آگے نہ بڑھ سکا تھا۔ لیکن بہت جلد ہی شمزہ کو اس کی بے ثباتی، خرابی اور کھوکھلے پن کا اندازہ ہوگیا۔ ان دنوں تجریدی اظہاریت کا دور دورہ تھا لیکن اس کی وقتی چکاچوند شمزہ کی چشم بینا کو نہ دھندلا سکی اور وہ اس سے ہٹ کر ایک ایسے اچھوتے طرز کی تلاش میں شب و روز سرگرداں رہنے لگا جو کم از کم اس کا اپنا تو ہو، اور جس میں اس کے مشرق کی روایات اور اقدار کا عکس بھی ہو۔ وہ اپنے انگریز نژاد اساتذۂ فن میں صرف پال کلی سے ہی متاثر ہو سکا اس لئے کہ تنہا پال کلی ہی ایسا تھا جسے اسلامی آرٹ میں اور سب سے زیادہ خاص فنی دلچسپی تھی وہ مغرب کے ان مستثنیٰ فن کاروں میں سے تھا جو مشرق اور اس کی زندگی سے بہت ہی قریب آئے۔ اس نے کبھی ٹیونس کبھی مصر پر نظر تو ڈالی لیکن انہیں ہمیشہ ایک مغربی انسان ہی کی آنکھوں سے دیکھا۔

یعنی بات مشرق کی مگر زبان اور محاورہ مغرب کا۔ جسے ہمارے یہاں چھاپہ کہتے ہیں۔ اسے ایک طرح کا امتزاج ہی سمجھئے۔ اور اس میں جو دقتیں پیدا ہوتی ہیں وہ بے شمار ہیں۔ سب سے بڑی دقت تو یہی مشرق و مغرب کا باہمی فاصلہ اور مشرقیوں اور مغربیوں کی طبیعت اور تصور میں بعد المشرقین ہے۔ ایک مشرقی یا مغربی بڑی دشواری ہی سے دوسرے نصف کرہ کو سمجھ اور اپنا سکتا ہے۔ بالعموم سطحی و سرسری نقالی ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے جس کی رسائی کسی طرح بھی تہہ یا پاتال تک نہیں ہو سکتی۔ اقبال نے بالکل درست کہا ہے:

اگر بہ سینۂ ایں کائنات در نروی
نگاہ را بہ تماشا گذاشتن ستم است

اور یہی بات فن پر بھی صادق آتی ہے۔

ہمارے فن کاروں میں — اور شمزہ نقاشی اور گرافک فنون دونوں میں دسترس رکھتا ہے۔ انور جلال ہی ہے، (جو مصوری کی دنیا میں شمزہ کے نام سے معروف ہے) جس نے اس حکمت عملی اور شعور سے کام لے کر مشرق و مغرب کے تصور اور روشوں میں امتزاج پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور کامیاب ثابت ہوا ہے۔ جیسے وہ اپنے استاد، کلی کا مشرقی روپ ہو اور اگر روپ کہنے میں ہرج ہے تو پھر اسے مدِ مقابل کہہ لیجئے۔ کوئی دوسرا فنکار ہوتا تو پاس مرحوم کی طرح کہیں دو راہے پر دہ جاتا یا بھٹک جاتا لیکن جس ہوشیاری، چابکدستی، فنکارانہ مہارت اور سب سے زیادہ، بصیرت کے ساتھ شمزہ نے یہ عمل کیا ہے وہ اس جیسا صاحبِ نظر اور صاحبِ ذوق فنکار ہی کر سکتا تھا۔ اس کا امتیاز یہی ہے کہ اس نے اپنے یہاں کے مغل آرٹ کی روایات کو پال کلی کے جدید رویے کے ساتھ ضم کرکے نبھایا ہے۔ جو واقعی داد و تحسین کے لائق ہے اور اس میں اس کی مشرق سے مغرب کو کچھ عرصہ کے لئے ہجرت اور کچھ عرصہ قیام کو بھی کافی دخل ہے۔ ورنہ دور بیٹھے ہوئے مغرب اور اس کی فضا کو سمجھنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ شمزہ اپنے ساتھ ایک دیدۂ بینا اور ذوقِ تلاش لے کر گیا تھا۔ اور ان دونوں نے اس کی خوب رہنمائی کی ظاہر ہے کہ مغرب کی فنی و تعلیمی فضا اسے لندن ہی میں میسر آئی جہاں اہلِ فن اور ایک استاد کا زندہ اثر بھی اسے میسر آیا جس طرح حکیمِ ملتؒ کو لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی یاد رہے اسی طرح شمزہ کو بھی اپنی مشرقیت اور مشرقی فضا، اس کی روایات فراموش نہ ہوئیں۔ اس کے دلِ زندہ اور نگاہِ بینا نے ان دونوں کا ایک حسین آمیزہ تیار کیا جسے ہم اس کے فن کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ آمیزہ شمزہ کی اپنی "مساوات" ہے۔ کوئی اور فنکار یہ آمیزش اپنے ہی مزاج اور ذوق کے مطابق کرے گا۔

مغربی فن کے صفِ اول کے شاہکاروں کے مشاہدے نے شمزہ کے اندر خود اپنے مشرقی آرٹ کے احیا کی روح پھونک دی۔ ردِ عمل کے طور پر شمزہ خود اپنی ثقافت، اقدار اور روایات کو اپنے خونِ جگر سے رنگ کر بے جھجک منظرِ عام پر لانے کے درپے ہو گیا اور ایک وقت وہ آیا جب اسے محسوس ہوا کہ وہ اب تک محض نقالی ہی کر رہا ہے، اسے جس چیز کی تلاش تھی وہ خود اس کے اندر موجود ہے اور اس کی جڑیں بہت دور تک اس کی سرشت، اس کی روح اور فطرت میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ؎

جو سوچیں ٹک تو وہ مطلوب ہم ہی نکلے میرؔ
خراب پھرتے تھے جس کی طلب میں مدت سے!

اول اور آخر وہ مشرقی ہی ہے، اور رہے گا۔ اس سے کج ادائی، پہلوتہی بے وقت کی راگنی سے زیادہ کچھ نہیں......

اپنی فطرت میں مخفی و مستور ان خزانوں کو پیش کرنے کے اعتبار سے وہ اپنے معاصرین میں پیش پیش ہے۔ شاید وہ اپنے ملک میں ایک نئے دبستاں کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ثابت ہوا اور اس کا راز غالباً اسی بات میں مضمر ہے کہ اس نے اور سب سے زیادہ حالیہ رنگ میں واقعی دادِ فن دی ہے۔

شمزہ کے فن پر پال کلی کے اثر کا جائزہ لیتے ہوئے لندن کا ایک مشہور و معروف نقاد یوں رقمطراز ہے "شمزہ کی ذہانت نے مغربی آرٹ کو اسی حد تک اپنایا ہے جہاں تک وہ مشرق کا ساتھ دے سکتا ہے یا جہاں تک اس کے ڈانڈے مشرق سے جاملتے ہیں... یعنی پال کلی اور اس کے فن کا مطالعہ۔ شمزہ نے گہرا مطالعہ کیا ہے اور اپنی ہیئتوں پر کلی کے اثر کو آزما کر ایک نئے مکتبِ اظہار کی داغ بیل ڈالی ہے۔ اس کی تصویروں میں جہاں خلا کو پر کرنے کے لئے گنگناتے ہوئے خوشنما مشرقی نمونے

ہیں وہاں شانہ بہ شانہ مغربی آرٹ کی جھلکیاں بھی نظر آجاتی ہیں۔ اسکی تصویریں محض نمونے یا طرحیں ہی نہیں بلکہ تمثیلات ہیں اور ان کی اشکال جن میں رنگ آمیزی کی گئی ہو یا نہیں، کینوس کی سطح کو ایک پراسرار طلسماتی زندگی سے بھر دیتی ہیں۔"

کبھی کبھی شمزہ اپنی مخصوص "پنہاں علامات" اور عربی خطاطی اور رومن حروف B اور D کو ایک مخصوص انداز میں منقلب یا الٹ پھیر کر ان سے بہترین اظہار کا کام لیتا ہے۔ لیکن یہ راز آزادانہ خطاطی میں مضمر نہیں اور نہ جاپانی تجریدی خطاطوں کو دیکھ کر ہی اس کا کچھ سراغ مل سکتا ہے۔ اس لئے کہ شمزہ کی علامات، بجائے مجرد ہونے کے بڑی حد تک مرتب، منظم منضبط اور حقیقت پر مبنی ہوتی ہیں۔ اس حقیقت سے مراد وہ حقیقت نہیں جسے ہم اور آپ "فطرت میں اشیاء کے اظہار" سے تعبیر کرتے ہیں برخلاف اس کے "وہ" جو مبہم ہے اور مخصوص رازوں کی طرف نشاندہی کرتی ہے اور ان رازوں کو گھیرے ہوئے معانی کی دھند اور سایوں پر مدھم سی روشنی ڈالتی ہے لیکن ان کو بالکل ہی عیاں نہیں کر دیتی، انہیں دھند میں ڈوبا رہنے دیتی ہے، یا بالفاظ دیگر یوں کہہ لیا جائے کہ ہزاروں مہین پردوں کی اوٹ سے اشیا اور ان کی ماہیت کو جھانک لینے کی ترغیب دیتی۔

اشیاء کے اذہانِ انسانی میں آتے ہی معانی کے سیاق وسباق کی ایک دنیا کھل جاتی ہے اور اس میں ایک مخصوص زندگی۔ خود اپنی زندگی کروٹیں لینے لگتی ہے۔ یہی سب خود کلی کا بھی فن تھا لیکن بہر حال وہ مغربی تھا اور اشیاء کے مشاہدے کے لئے اس کے پاس وہ آنکھ تھی جس کا مغربی اقدار سے متاثر ہونا لازمی تھا لیکن شمزہ کا زاویۂ نظر ایرانی اور مغلیہ ہے۔

انہی انہی پراسرار علامات، مبہم رموز اور کنایوں میں شمزہ ان تمام چیزوں اور ان تمام تجربات کو بیان کرتا ہے۔ جن کے حصول کے عقب میں اس کی برسوں کی عرق ریزی اور مسلسل محنت کارفرما ہے۔

مستفاد: "کنٹمپوریری آرٹس ان پاکستان" (کراچی)

★

غزل

عبدالرؤف عروج

آشفتگیٔ غم سے مری جاں پہ بنی ہے
کہتے ہیں زمانے کا مزاج اہرمنی ہے

دنیا کو کب اندازۂ شیریں سخنی ہے
یہ پھول کی پتی نہیں ہیرے کی کنی ہے

راتوں کی خنک اوس میں کھلتی ہوئی کلیو
کانٹوں کو بھی احساسِ گلستاں شکنی ہے

اس درجہ دلآویز و طربناک کہاں تھی
یہ روشنیٔ مہ ترے دامن کی چھنی ہے

ہم بھی تو شگفتِ گل و لالہ کے امیں تھے
ہم سے بھی تو منسوب بہاراں سخنی ہے

پھر خود کو اسی خواب کی بستی میں گنواؤ
پیوست دل و جاں غم دوراں کی انی ہے

لَو دیتے ہوئے حسن کا وہ خطِ شعاعی
شاید مرے خوابوں کی ستارہ بدنی ہے

وہ گیت جو آنکھوں نے کہا دل نے لکھا تھا
دنیا اسی اک گیت کے سرگم سے بنی ہے

دم توڑ گئی گو نجتے خوابوں کی رفاقت
کس راہ پہ احساسِ غریب الوطنی ہے

وہ تیرا عروج اک ہدفِ فکرِ معیشت
پھر درپئے آزارِ زمانہ شکنی ہے

"سُرمایا" بقیہ صـ۵۹

سینہ نور سفینہ اس کا مانگ بھری پاؤ چندن سے
مارگئی یہ پاکستانی چمپا رانی بان مدن سے
ہم سیلانی شاعر ٹھہرے مست ہوئے صہبائے سخن سے
یہ واقف ہر ملت کے ایک ایک صحیفے اور شاسن سے
واقف سارے طور، طریقے، مشق، ریاضت ہر سادھن سے
تین زبانوں تین زمینوں تین زمانوں کے بندھن سے
روپ سبھا کے پروانے آئیں ڈھاکے، دلی، لندن سے
تینوں لوک پجاری اس کے یہ بیگانہ ماو مَن سے
پریم کی مدرا چھل چھل چھلکے امرت جل برسے نینن سے
یہ میری دھرتی ہے دیکھو دل روشن اس کے جوبن سے
تین سُروں کی تان انوکھی داد طلب ہے اہلِ فن سے
جعفر طاہر عشق ہمیں ہے کہنے کو سندھی جوبن سے
سُرمایا سرمایہ اپنا سُرمایا سمجھو گنین سے

★

"بیٹی والے" بقیہ صـ۷۸

عورت: وہی تو لیکن بس شوقیہ ہے۔ اس کے گھر والے رضیہ کے نام اپنی کوٹھی لکھ کر دیں گے۔

دوسری عورت: ہاں بہن کچھ لکھوا ضرور لینا۔

عورت: وہ تو پہلے ہوگا۔ جب اتنی منت خوشامد سے رشتہ لیا ہے تو خود ہی لکھ کر دیں گے۔ (دروازہ پر کھٹکھٹ)

عورت: کون ہے؟

باہر سے میاں کی آواز: میں ہوں۔

دوسری عورت: (برقعہ اٹھا کر) اچھا بہن میں چلتی ہوں۔ دیر ہو رہی ہے۔

عورت: (بے دلی سے) بیٹھیے نا۔ آپ تو آتی ہی کب ہیں؟

دوسری عورت: نہیں انشاءاللہ آؤں گی جلدی ہی۔ (برقعہ پہن کر) اچھا خدا حافظ!

عورت: خدا حافظ! (چک تک چھوڑنے جاتی ہے۔ جیسے ہی وہ باہر نکلتی ہے مرد داخل ہوتا ہے)

عورت: اور کیا کہا نامدار صاحب نے؟

مرد: وہ یہ کہہ رہے تھے کہ لڑکے والے حق مہر لکھ کر نہیں دیں گے۔

عورت: پھر ـــ؟

مرد: میں نے کہا ٹھیک ہے۔ ہمیں اعتبار ہے۔

عورت: ہاں جی لعنت بھیجیے حق مہر پہ۔ ہم کوئی لڑکی کو بیچ تھوڑے ہی رہے ہیں۔ بس میاں بیوی خوش رہیں، ہم تو یہی چاہتے ہیں۔

مرد: رضیہ کہاں ہے؟

عورت: ہائے میں مر گئی۔ رضیہ کو تو بتایا ہی نہیں ـــ (آواز دیتی ہے) رضیہ! اے رضیہ!.... (پردہ)

"کلام حق" بقیہ صـ۷

نورانی تاج اور رہیرے بھی
رومال حریریں ہاتھوں میں
باریک نفیس ابریشم کا
ہونٹوں پہ تبسم لا کے کہا
"یا حضرت آپ پہ رحمت ہو
میں لیکے بشارت آیا ہوں
آپ اس کو سماعت فرمائیں
اس دور کے آپ پیمبر ہیں
جبریلؑ ہوں میں جبریلِ امیں
یہ پڑھئے حضورؐ "اقرأ بِاسمِ"
یہ آپ کا دل وا کر دے گا"
جبریلؑ نے دستِ مبارک سے
رومالِ حریریں کو کھولا
اور سامنے اس کو پیش کیا
"اُمّی ہوں" آنحضرتؐ نے کہا
جبریلؑ نے تب ان کو بھینچا
پھر بولے "پڑھو" اقرأ، اقرأ!

پھر بولے حضورؐ "انا اُمّی"
جبریلؑ نے سینہ سینہ سے
اور دل کو دل سے میل دیا
حضرت جبریلؑ کے بھینچنے سے
تھے یکسر غرق پسینے میں
ہوئی ان کی چشمِ مبارک وا
اور سینے کے اندر دل بھی کھلا
وہ پڑھنے لگا "اقرأ بِاسمِ"
اور پڑھ لیا سارا سی پارہ
جبریلؑ آداب بجا لا کر
رخصت ہوئے اور پھر آنحضرتؐ
گھر آئے، بخار سے تپتے ہوئے
آتے ہی خدیجہؓ سے یہ کہا
"تھامو مجھے آ کے سہارا دو
مجھے آج بہت ہی خوف آیا"
جھٹ دوڑ کے بی بی آگے بڑھیں
اور آنحضرتؐ کو تھام لیا

جس طرح کبوتر کانپتا ہو
یونہی آنحضرتؐ بھی کانپتے تھے
بڑی دیر توجہ، شفقت سے
وہ کپکپی وہ ڈر دور ہوا
تب بی بی خدیجہؓ نے پوچھا
"کیا بات ہے؟ تھوڑی دیر یہاں
گھر ہی میں حضورؐ آرام کریں"
سب حال بتایا حضرتؐ نے
سنتے ہی خدیجہؓ شاد ہوئیں
بولیں "جو خدشے، خطرے تھے
اب خیر سے سارے دور ہوئے
اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں
حضرتؐ ہیں رسول اللہ برحق
وہ پہلے نبی موسیٰؑ عیسیٰؑ
یہی ان پہ بعینہٖ گذرا تھا"

★

"ہمارا رسم الخط" بقیہ صـ۳۱

نقصان البتہ اتنے ہیں کہ انہیں ساری دنیا کے علاوہ ترک بھی محسوس کرتے ہیں۔ اس نئے رسم الخط نے صدیوں کی تہذیب سے ان کا رشتہ جس طرح توڑا ہے اور دینی زندگی پر جو ضرب لگائی ہے اس کی تلافی معلوم نہیں ترک کبھی کر سکیں گے یا نہیں۔ ایک دوسرے کی مثال لے کر اپنے استدلال کو قوی بنانے وقت نہ جانے مصر، ایران اور افغانستان کی مثالیں ان لوگوں کے سامنے کیوں نہیں آتیں جہاں اب بھی یہی رسم الخط علم و فن کی اشاعت اور ترقی کا مؤثر ذریعہ ثابت ہوا ہے اور نہ جانے چین اور جاپان کی مثالوں کو ایسے موقعوں پر ان کی منطق کیوں قابلِ اعتنا نہیں سمجھتی جہاں رومن رسم الخط اختیار نہ کرنے کے باوجود علم و فن کی ترقی کے راستے میں کوئی روڑا نہیں اٹکا۔ میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ بے شک ہمارے مروجہ رسم الخط میں بعض ایسی خامیاں ہیں جو اصلاح طلب ہیں اور جن کی اصلاح آہستہ آہستہ ہو بھی رہی ہے لیکن دینی، تہذیبی، قومی، علمی اور فنی پہلوؤں کے علاوہ خالص افادی نقطہ نظر سے بھی مروجہ رسم الخط کے استعمال میں وقت اور جگہ کی جو بچت ہے وہ بجائے خود اس کے حق میں ایک بہت بڑی سفارش ہے۔ لیکن یہ ساری باتیں اس صورت میں تو یقیناً اہم ہیں کہ انہیں غور و فکر کی کسوٹی پر کس کر صحیح نتیجے نکالنے کی کوشش کی جائے یہ نہ ہو تو پھر یہ سوچنا پڑیگا کہ "جذباتی" حقیقت میں کون ہے اور منطق کی طرف سے آنکھیں کس نے بند کی ہیں ـــ نسخ کی پرانی ڈگر پر چلنے والوں نے یا رومن رسم الخط کے انقلاب پسند علم برداروں نے؟!"

پاکستان: امریکہ میں!

انور ساجد

اپنے عکس کو آئینے میں دیکھ کر کون خوش نہیں ہوتا۔ اور پھر ایسے آئینہ میں کہ خود بھی شفاف ہو اور اس قدر روشن، قدِ آدم عکس پیش کرے۔ کچھ ایسی ہی دلفریب اُپج کا احساس اس نمائش کو دیکھ کر ہوا جو تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہمارے جدت پسند مغربی دوستوں۔ اہلِ امریکہ نے پیش کی تھی۔ اور آپ جانیں یہ مغرب کے لوگ مشرق کو رومانوی نظر سے دیکھتے بھی ہیں اور پیش بھی کرتے ہیں۔ عمر خیام کی مثال ہمارے سامنے ہی ہے کہ اسے اور اس کی رباعیات کو پیش کرنے میں کیا کیا اُپج نہیں دکھائی گئی۔ سابق سندھ کے کلاسکی آرٹ یعنی پاکستانی ثقافت ہی کو اس نمائش میں جس انداز سے پیش کیا گیا وہ واقعی دیکھنے اور داد دینے کے لائق تھا۔ قدِ آدم یعنی زندگی ہی کے پیمانے پر مرقع۔ اس کا اہتمام بڑے ہی عمدہ موقع پر ہوا۔ یومِ پاکستان۔ جسے ہمارے ملی احساسات کے ساتھ نسبتِ خاص ہے۔ اور اس طرح اس پیشکش کا لطف دوبالا ہوا۔ صرف یہی نہیں، ان فن کے پرستاروں نے ہماری ثقافت کا یہ دلپذیر، جیتا جاگتا نقشہ، جسے چلتی پھرتی، بولتی چالتی فلم کہنا چاہیئے، جوں کا توں اٹھا کر اپنے دیس بھیج دیا ہے اور وہاں ہزاروں آدمی روزانہ پاکستان آئے بغیر اس کے ایک خطہ، اس کے رہن سہن، اس کی زندگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

بلاشبہ یہ ایک ایسی اچھوتی اور باسلیقہ پیشکش ہے جسے نظم و ترتیب کا بہت ہی عمدہ نمونہ قرار دینا بیجا نہ ہوگا۔ یہ جانتے ہوئے کہ آج کل کا زمانہ ایک دوسرے کو جاننے کا زمانہ ہے اور کوئی تہذیب جتنی ہی ہم سے دور ہو اتنی ہی دلچسپ نظر آتی ہے۔ جیسے ہم سیر بین سے کوئی چیز دیکھ رہے ہوں۔ اور پھر ہنر تو ہنر ہی ہے۔ کون ہے جو اس کے کسی بھی نمونے سے دلچسپی محسوس نہ کرے۔ جو لوگ ولایت جاتے ہیں وہ ایک خاتون، مادام تساڈ کے عجائب گھر کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکے۔ جس نے ہر ہر قوم کی ایک علیحدہ گیلیری بنا رکھی ہے۔ اور اس میں اس کی زمین، اس کے لوگوں، چرند پرند وغیرہ ہر چیز کو اپنے اصلی رنگ روپ میں سجا رکھا ہے۔ کچھ ایسی ہی دلچسپی ہے جس کی بنا پر امریکہ والوں نے ایشیا کا ایک ایوان واشنگٹن میں قائم کر رکھا ہے۔ اب آپ اسے ایوانِ عام کہہ لیجئے یا دیوانِ خاص جس میں اس کے ہنر، اس کی ثقافت، اس کی زندگی، ہر چیز کے نمونے موجود ہیں۔ اس ایوان میں ابھی ابھی ایک مستقل گوشہ پاکستان کے لئے بھی وقف کیا گیا ہے۔ چنانچہ شاید اسی بنا پر کہ یہاں کا قدیم ترین گہوارۂ تہذیب سندھ تھا۔ اور مغربی پاکستان کی حد تک اس کا تصور کرتے ہوئے سب سے پہلے ذہن وادیٔ سندھ ہی کی طرف جاتا ہے۔ اس ایوان میں بھی پہل اس ہی سے کی گئی ہے۔ فرض کیجئے کسی آدمی کو علی بابا کی کہانی کے درزی کی طرح آنکھوں پر پٹی باندھ کر امریکہ لے جایا جائے، اور ایوان کے اس حصے کے سامنے پٹی کھول کر کھڑا کر دیا جائے تو وہ سچ مچ خیال کرے گا کہ وہ سابق سندھ میں آ

کے کسی شہر میں ہے۔ حیدر آباد یا ٹھٹہ کے تاریخی شہر یا پھر ہالہ مٹی کاری یعنی رنگا رنگ شہر جہاں عورتیں ہوں یا ساز و سامان رنگوں میں طلسم ہوتے ہیں۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ اس شخص کو گھر آنگن، گلی کوچے سب میں ہو بہو سندھ ہی کے کسی شہر، قصبے یا گاؤں ہی کا نقشہ نظر آئے گا۔ اور یہ طلسم اس وقت تک دور نہیں ہو گا جب تک برانگن پردہ تا معلوم گرد کہ یاراں دیگرے رامے پرستند کے مصداق اصل حقیقت سے پردہ نہ اٹھ جائے۔

کسی اور کا تو کیا مذکور خود مجھے اس ایوان کے اس حصہ کو دیکھنے کا موقع ملا۔ وہاں نہیں بلکہ یہاں۔ تو میں حیران رہ گیا کہ میرے سامنے ایک اور وادی مہران موجود ہے۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ اینکہ می بینم بہ بیداری ست یا رب یا بخواب؟ — کیا یہ حقیقی وادی مہران ہے یا اس کی شبیہہ۔ یہ سب عالم تصویر ہے یا تصور؟ اگر یہ شبیہہ یا مورت تھی تو بلاشبہ کوئی جادوگر اصلی کراچی کو کسی طلسمی قالین پر یہاں اڑا لایا ہو گا۔ یا یہ کسی حیرت انگیز سائنسی کرشمے سے — کیونکہ آج کل کے زمانہ میں سائنس اور سائنسدانوں سے کچھ بھی بعید نہیں۔ اسی جادوگر کی طرح جو الہ دین کے محل کو اڑا کر کہیں کا کہیں لے گیا تھا، یہاں لے آیا ہو مگر ذرا چھوٹے پیمانے پر۔ سب سے بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ اب ہمارے یہاں کی پرانی دنیا دوش صبا یا سینۂ بحر پر "نئی دنیا" میں پہنچ جائے گی۔ اور وہاں کے لوگ وادئ مہران اور اس کی قدیم و عظیم الشان ثقافت کی جھلکیاں دیکھ دیکھ کر حیران ہوں گے۔

دراصل اس قسم کی جان پہچان پر جس سے قومیں دوسری قوموں سے کچھ لیتی کچھ دیتی ہیں اس نمائش کی حد تک قرب باہمی کا ذریعہ پیدا کرنے کا سہرا ایک امریکی ثقافتی انجمن کے سر ہے جو وقتاً فوقتاً ایسی نمائشوں اور تقریبوں کا اہتمام کرتی رہتی ہے۔ اسی کے کارکنوں کو یہ خیال آیا کہ سابقہ سندھ کے فنون کی ایک نمائش کی ترتیب دی جائے جس میں ہر چیز اپنی اصلی حالت میں، اپنے حقیقی خد و خال کے ساتھ پیش کی گئی ہو۔ یہ کام بڑا سلیقہ اور بڑا سلجھا ہوا ذوق چاہتا ہے۔ اس کے لئے تو کوئی خاتون ہی موزوں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ گھریلو زندگی کو پیش کرنے اور چیزوں کو قرینہ سے رکھنے کا سلیقہ صنف نازک ہی کا حصہ ہے۔

اتفاق سے ایک امریکی خاتون ایسی تھیں جو ہماری ثقافت کو جاننا بھی چاہتی تھیں اور انہیں مادام ٹسوورٹ کی طرح ایسے تہذیبی گرد یا گھر آراستہ کرنے کا شوق بھی تھا۔ یہ خاتون تھیں، مسز فریڈرک اینگ بلنگ۔ اس وقت وہ اپنے شوہر کے ساتھ پاکستان ہی میں تھیں۔ وہ کوئی پانچ مہینے شہر شہر، قصبہ قصبہ اور گاؤں گاؤں گھومتی پھرتی رہیں۔ اور دل میں غیر معمولی لگن لئے ہوئے جنوبی وادئ مہران کا گوشہ گوشہ چھان مارا۔ یہ مغرب والے دھن کے پکے ہوتے ہیں۔ جو بات دل میں ٹھان لی وہ کر ہی کے رہتے ہیں۔ چنانچہ زیریں سندھ کا کوئی مقام نہ تھا جو اس خاتون نے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہو۔ اس نے ہر بات کو ایک فن کار کی نظر سے دیکھا اور دل میں سمو لیا۔ اور پھر جیسے کوئی فن کار اپنے جگر لخت لخت کو جمع کرتا ہے اس طرح اس نے بھی جگہ جگہ سے سمٹی ہوئی چیزیں ترتیب دیں۔ بلاشبہ ان کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ — ایں کار از زناں آید و زن ہا چنیں کنند اور انہیں کے وہی ذوق و شعور کے ساتھ پیش بھی کیا۔

یہ تجربہ ایک بڑی ہی عمدہ کوشش ہے جس نے ایسی اور کوششوں کے لئے راستہ ہموار کر دیا ہے۔ اس نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے امریکی سفیر نے بالکل بجا کہا تھا کہ وہ ایک بڑی ہی نرالی قسم کی پیشکش ہے کیونکہ اس کے بعد پاکستان کا ایک حصہ باندھ لپیٹ کر امریکہ بھیج دیا جائے گا اور وہاں کا حصہ بن جائے گا یعنی سابق سندھ کو اب ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں بھی دیکھا جا سکے گا۔

جن لوگوں نے اس نمائش کو دیکھا ہے وہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس تمثیل میں اور اصلی زندگی یعنی افسانہ و حقیقت میں سر مو فرق نہیں۔ زیریں سندھ کی ٹھنڈی ٹھنڈی صبحیں مشہور رہیں۔ کون ہے جو کسی ایسی صبح وہاں کے کسی شہر کسی گاؤں کے گلی کوچوں میں جا نکلا ہو اور اس نے لوگوں کو گھر گھر قرآن مجید کی تلاوت کرتے نہ دیکھا ہو۔ یہ بات تو پاکستان میں ہر کہیں دکھائی دے گی۔ اس کا نقشہ نمائش میں یوں پیش کیا گیا تھا کہ ایک بڑی سی رحل پر قرآن مجید رکھا ہے۔ پاس ایک خاتون جھوم جھوم کر تلاوت کر رہی ہے۔ وہ سچ مچ کی خاتون ہے یا اس کی شبیہہ؟ ہم آپ شاید دیکھ کر بھی فیصلہ نہ کر سکیں جس کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے نقل کو اصل کر دکھائے

ماں: گھر گرہستی کا نمونہ : سب کے لئے کھانا رندھنے میں مصروف

بچہ: گلی ڈنڈا کھیلنے کی لگن ، مگر کسی وقت بھی ہل جوتی سنبھالنے کے لئے تیار۔

ساری وادی گوش برآواز :

صبح ہوتے ہی گھر گھر قرآن مجید کی تلاوت ، اس لئے کہ :

> گر تو می خواہی مسلماں زیستن
> نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

عروس البلاد ، کراچی سے "ایوان با آسمان" (واشنگٹن) تک : چند اہل ذوق — "پاکستانی ، امریکی ادارۂ ثقافت" کے اراکین کی سوجھی فکر نے پچھلے دنوں ایک اچھوتے خیال کو جنم دیا۔ سارے سندھ کے دیہی رہن سہن کا ہو بہو عکس۔ ایک دل آویز نمائش کی شکل میں جس کے ختم ہونے پر پاکستان کا یہ جگر گوشہ "ایوان با آسمان" کی زینت بننے کے لئے واشنگٹن بھیج دیا گیا۔ جہاں ہزارہا پرشوق نگاہیں "مہران" کی دیرینہ تہذیب کا رنگ روپ بالمشافہ دیکھ سکتی ہیں۔

اکتارہ: یہ اور لال لطیف رح کی جھومتی کافیاں دن بھر کھیتی باڑی کرنے کے بعد دل بہلاوے کا سامان ہیں
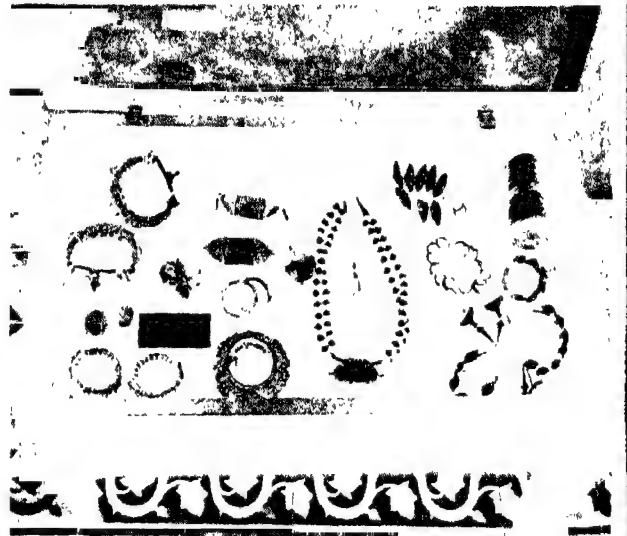
سونے پر سہاگہ: سانولی سلونی ناریوں کے سنہرے روپہلے زیور : "ہم اوج طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہیں"

استوار تر بنیاد

دی جمہور بیں ایک اچھوتا تجربہ ہیں تاکہ ہمارے معاشرہ اور
م ملی کی بنیاد ایسی اسلامی جمہوریت پر رکھی جائے جو ہمارے
ج اور ضروریات کے مطابق ہو اور قوم کے رگ و پے میں ایک نئی
ح پھونک دے۔ اس تجربہ سے بہترین توقعات وابستہ ہیں اور یہ زندہ و
انا ادارہ جس طرح ابھی سے قومی تعمیر و ترقی کے سلسلے میں ملک
ھر گوشے میں قابل قدر خدمات انجام دے رہا ہے اس سے قوی امید
کہ یہ آئندہ قومی تعمیر و ترقی کے سلسلے میں نہایت اہم کردار
کرے گا جس سے قوم و وطن کی بنیاد استوار تر ہو گی۔

مغربی پاکستان
دور وادیٔ کاغان میں

بنیادی جمہوریتوں کی ملاک کے بعد لوگوں
میں بھی روز افزوں مقبولیت۔
عوام و خواص کی طرف سے خیر مقدم

وادیٔ بولان
ایک عمدہ مثال

"اپنی مدد آپ" کے اصول پر پندرہ ہزار
روپے کی لاگت سے شاندار ذخیرۂ آب کی
جس پر آدھا خرچ بنیادی جمہوریتوں
اراکین نے خود برداشت کیا۔
(موضع ولی آباد، کوئٹہ ڈویژن)

شرقی پاکستان
وش عمل

تین میل لمبا پشتہ جس نے پندرہ ہزار
کھے زمین پر اگی ہوئی فصل کو تباہی
سے بچا لیا (دریائے ککری (اجیر پور،
ضلع کومیلا)

اس خاتون کا ذوق و شوق، اس کی محویت دیکھنے کے لائق ہے۔ وہ بھرپور لگن جو کوئی مسلمان عورت یا مرد ہی قرآن پڑھنے میں محسوس کر سکتا ہے۔ یہ قدآدم پیکر دیکھنے کے لائق تھا۔ اور سارا منظر بڑا ہی روح پرور، بڑا ہی وجد انگیز۔

یہ تو تھی بسم اللہ۔ اس کے بعد سندھ کے باسیوں کی زندگی اور گھر گرہستی کا پورا پورا نقشہ۔ ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی۔ سانچ سندھ ہو یا پنجاب۔ یہاں کی زندگی زیادہ تر کسانوں ہی کی زندگی ہے۔ وہی دودھ دہی اور مال مویشیوں کی دنیا جس کی بنا پر جالندھر کے ایک شاعر نے ٹھیٹھ دیہاتی تصور میں ڈوب کر یہاں کی مٹیاروں کی گوری گوری باہنوں کو مکھن کی پالی باہنیں کہا ہے۔ اور وہ ضمیر افضل جعفری کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ اس سیدھی سادی دیہاتی زندگی میں گھر گھر بلونیاں ایک جادو کا سماں پیش کرتی ہیں اور گھر گرہستیاں صحیح صحیح جادوگرنیاں معلوم ہوتی ہیں۔ پھر چولھا۔ انگنا ہانڈی کبھی سادہ کبھی روغنی۔ جن کے لئے جگہ جگہ چاک لگے ہوتے ہیں اور کمہار جادوگروں کی طرح خوبصورت سڈول برتنوں پر برتن حسن کے سانچے میں ڈھالتے چلے جاتے ہیں۔ اور مہران کی بڑی وادی نے تو سوہنی کمہارن کا سحر آفریں رومان بھی پیدا کر دیا جس پر شاہ بھٹائیؒ کا شاہکار "سُر سوہنی" مبنی ہے۔

یہ خوبصورت سجل ہانڈیاں شاید ہالہ کے حسن کاروں کی کاریگری ہیں۔ یہ چولھا، ہنڈیاں رستے بستے شاد آباد گھروں کی نشانیاں ہیں۔ دیہات کے باسیوں کا سیدھا سادھا شعور اور جگہ کو برتنے یا بچانے کی ترکیب دیکھنی ہو تو دلان کے گھروں کی دیواروں پر نظر ڈالئے۔ اوپر نیچے برتنوں سے آراستہ۔ جیسے کوئی دلہن سولہ سنگھار کئے یا قوم و وطن کی راہ میں جان کی بازی لگا دینے والا کوئی منچلا سپاہی چار آئینہ لگائے، ہر قسم کے ہتھیاروں سے لیس۔ یہ برتن، یہ کفگیر، توا، کڑھائی، کیسی بہار دیتے ہیں۔ مگر یہاں کی وہ چیز جسے دیکھتے ہی ہم پکار اٹھتے ہیں "سندھ سندھ" وہ ہے پنگھوڑا یعنی گہوارہ، بڑے آدمیوں کا پنگھوڑا یا جھولا۔ جسے مرد عورت سب بڑے شوق سے جھولتے ہیں۔ یہ بڑا بھاری بھرکم ہی سہی مگر جھولنے میں بھی تو تخت رواں سے کم نہیں۔

پھر وہ گھر کی دوسری چیزیں ہو بہو وہی ساز و سامان۔ خراد کے کام کے نفیس نمونے زیورات۔ نمدہ۔ اور ان سب کے درمیان عورتوں کا دوسر تاج۔ ان کا گھر والا سائیں گھوڑے کی زین اور تلوار پر دستی کام۔ یہ سب ایسی چیزیں ہیں جو ایک دفعہ دیکھ کر بھلائے نہیں بھولتیں اور ایک عظیم ثقافت، عظیم روایات کا نقش دلوں پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہو جاتا ہے۔

یہ رہا اکتارہ اور یہ گھڑے جنہیں یہاں منڈلی کہتے ہیں۔ یہ خاموشی ہی میں اپنا افسانہ سنا رہے ہیں جسے راگ رنگ کہتے ہیں۔ واقعی یہ راگ بھی ہیں اور رنگ بھی اور جب یہ دونوں فوج میں آ جائیں تو وہ سماں بندھتا ہے کہ کیا کہنے۔ شاہ بھٹائیؒ کی سالگرہ پر جو ہر سال بھٹ شاہ میں منائی جاتی ہے، آپ نے سہانا سماں دیکھا ہی ہوگا۔

آپ کہیں گے ایک ہی گھر میں اتنا سارا ساز و سامان؟ مگر آپ بھول رہے ہیں۔ یہ تو ایک نمونہ کا گھر ہے جو یہ بتاتا ہے کہ سندھی گھروں میں عموماً کیا کچھ ہوتا ہے۔ یہ گھر کیسے ہوتے ہیں۔ کیسے لگتے ہیں۔ لوگوں کا رہن سہن کیا ہے۔ یہ تو یہاں فن کا کھیل ہے۔ اور بڑی خوش اسلوبی سے جوڑ جوڑ کر بنایا گیا ہے۔ مانا ہر گھر میں اکتارہ نہیں ہوتا۔ مگر یہ دل بہلاوے کی چیز قدرتی طور پر کہیں نہیں ہونی چاہیئے۔ اور اکثر گھروں میں پائی بھی جاتی ہے۔

گھر کا نقشہ جیسا تھا آپ دیکھ چکے۔ اس سے، باہر دور پرے ہرے بھرے کھیتوں میں لوگ باگ۔ کسان، ہاری۔ مال مویشی لے کر صبح سویرے کھیتوں کی طرف چل نکلتے ہیں۔ کبھی ہل جوتنے، کبھی پانی دینے، کبھی نلائی کرنے، کبھی فصلیں کاٹنے، کبھی کھلیان کرنے، کبھی دوری چلانے، کوئی ایک کام دھندہ ہے۔ اتنی بات ماننی پڑے گی۔ یہ لوگ بلا کے محنتی ہیں۔ جی لگا کر کام کرتے ہیں۔ اپنے اور اپنی قوم کے لئے اناج اگاتے ہیں۔ اور اب تو شام کو فالتو وقت میں بڑے بوڑھے تک تعلیم بالغان کے درس میں بھی شریک ہونے لگے ہیں تاکہ وہ زیادہ غلہ اگاؤ کی مہم کو کامیاب بنا سکیں اور زراعت کے ترقی یافتہ سائنسی طریقے اختیار کریں جن کا ساز و سامان انہیں حکومت مہیا کر رہی ہے۔

جب مرد گھر سے باہر یوں لہو پسینہ ایک کر رہے ہوں

تو عورتیں گھر میں بیکار کیسے رہ سکتی ہیں۔ وہ بھی ایک ہی جان مار رہی ہیں۔ اور گھر کے لئے واقعی جان مارتی ہیں۔ کھانا پکانا تو خیر ہنڈیا چولہے ہی سے ظاہر ہو چکا ہے۔ اور بلونی بھی اپنا جادو دکھا چکی اور دودھ کے چھلکنے کی پر لطف راگنی سے ملتی جلتی آواز آپ سن چکے۔ وارث شاہ کی "ٹیاں تو دھالہ دے وچ مدھانیاں نی" (دودھ میں بلو۔ یاں پڑی ہوئی ہیں) کو یاد کیجئے۔ اور یہ سماں اپنی آنکھوں سے دیکھئے۔ ہماری زرعی معیشت کا مسحور کن نقشہ۔

ہوتے ہوتے دن کچھ بڑھا اور چکی کی گھمر گھمر شروع ہو گئی جسم کو تندرست اور چست و چاق رکھنے کی بہت ہی عمدہ تدبیر۔ دوپہر ہوئی گھر گرہستنیں کرلکیاں بالیاں ٹولیاں بنا بنا کر بیٹھ گئیں۔ ہر طرف پھلکاریاں ہی پھلکاریاں اور اجرق ہی اجرق۔ شاید یہ ازرق کی نشانی ہو۔ ان کے لباس میں بھی ایک بات ہے۔ وادیٔ مہران کے مرد عورتیں، خاص کر یہاں کے لوگ پھول دار رنگین کپڑوں کے بے حد شوقین ہوتے ہیں۔ پٹیوں یا پھول پتیوں کے رنگین کپڑے ان کا مرغوب پہناوا ہیں۔ سابق پنجاب میں دیکھے بھلے بھورے رنگ کے پھولدار کپڑوں کو سوسی کہتے ہیں۔ شاید اجرق اس جیسا ہی کپڑا ہو۔ جس کا نام شیراز کے قریب ایک قدیم شہر سوسہ کی یادگار ہو جہاں ایسا کپڑا کبھی تیار ہوتا تھا یا وہاں کی رئیس میں یہاں بنایا جاتا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب!

غرض دوپہر کو یہ سبھائیں جمتی ہیں۔ عورتیں ادھر ادھر سے جمع ہو ہو کر آتیں اور بیٹھتیں گپیں ہانکنے جن میں دنیا بھر کے قصے کہانیاں ہوتی ہیں اور طرح طرح کے قصے طے بھی ہوتے ہیں۔ مگر یہ محض گپیں ہی نہیں ہوتیں زبان کے ساتھ ساتھ ہاتھوں کی انگلیاں بھی چلتی جاتی ہیں۔ کوئی نہ کوئی کپڑا سلتا جاتا ہے یا بخیے ادھیڑے جاتے ہیں۔ اسی دوران میں یہاں کی خاص چیز رلّی بھی تیار ہوتی ہے۔ پیوند ہی پیوند، گویا ہزار جامہ۔ یہ ایک چادر ہوتی ہے۔ رنگ برنگے کپڑوں کو جوڑ جوڑ کر تیار کی ہوئی۔ مگر بڑی خوبصورت ایسی نفیس ترتیب اور ذوق کے ساتھ سوزنی کی طرح تیار کی ہوئی کہ انسان دیکھتے ہی عش عش کر اٹھے۔ جب یہ چیز جادو بھرے ہاتھوں سے تیار ہو جاتی ہے جسے یہاں کے لوگ بڑے چاؤ سے اوڑھتے ہیں تو نظر کے سامنے ایک سدا بہار تختۂ گل لہرا جاتا ہے۔ اور ہم بے اختیار بول اٹھتے ہیں کہ ؎

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
نظارہ ز جنبیدنِ مژگاں گلہ دارد

ذرا اس عورت کی رنگ برنگی پوشاک کو دیکھئے، سر سے پاؤں تک پٹیوں ہی پٹیوں سے تیار کی ہوئی۔ بڑی ہی طرحدار۔ ساڑی یا غرارے کی طرح گول گول، گھومتی بل کھاتی یا لہراتی نہیں بلکہ سیدھی سیدھی ترچھی ترچھی جیسے کوئی سیدھے خطوط کا کونے دار تجریدی نقش۔ یا زیبرا کی دھاریاں یہ ہے تو دلق مرقع مگر مرقع زیادہ اور دلق کم۔ آخر وہ عورت ہی تھی نا۔ مسز ہنگ اسمائٹ اس نے اپنی سندھی بہنوں کو نک سے سک تک درست پیش کرنے میں بڑی مہارت دکھائی ہے۔

گھر سے باہر بھی بعینہٖ یہی نقشہ۔ لڑکے بالے گھر اور گلی کوچوں میں ساجھی چیز ہیں۔ دونوں کو ایک دوسرے سے ملاتے۔ لڑکا کا لباس اور وضع قطع ہیں گویا ماں کا بدلا ہوا روپ ہے۔ مگر سچ پوچھئے تو گلی ڈنڈا کے سن سے کچھ آگے۔ شاید وہ کسی جفاکش دہقان کے سپوت کی طرح گلی ڈنڈا کے بجائے ہل اور دوری یعنی بیلوں کی جوڑی سنبھالنے کے سن تک پہنچ چکا ہے یا فن کار نے اسے اس سن تک پہنچا دیا ہے۔

دوپہر کے بعد شام تھوڑی دیر تھکن اتارنے کے لئے راگ رنگ۔ اور پھر نیند میٹھی پیاری نیند۔ اس کے لئے بھی کوئی رنگین ہی چیز

ہو تو لطف آئے وادیٔ مہران کے باسیوں کی زندگی رنگ ہی رنگ ہے۔ چنانچہ مینڈی بھی ایک موجۂ رنگ ہے۔ جن پلنگوں پر یہ لوگ سوتے ہیں اس میں دھنک کے شاید ساتوں رنگ ہی تو اپنی بہار دکھاتے ہیں۔ شوخ گہرے لال نیلے کالے سبز زرد خاکی۔ کونسا رنگ ہے جسے ان کے رنگین یعنی رنگین پایوں پر روغن کی شکل میں نہیں برتا جاتا۔ ایسا کہ اگر اسے گھر میں بھی لو آگ نہیں ہوتا۔ اور آنکھوں میں کھب کھب جاتا ہے۔ یہ پلنگ رنگوں کے شہر، ہالا ہی میں تیار ہوتے ہیں۔ اور وہاں کی خاص چیز یا سوغات بھی یہی ہیں۔ ایسی رنگین چیز کے پاس رلّی جیسی رنگ برنگی چیز ہی بہار دیتی ہے۔ کون ہے جو رنگ روپ کے ان شہ پاروں سے مسحور نہ ہو:

ایسے دلکش ثقافتی مظاہرہ کے لئے جن کا اہتمام پاکستان اور امریکہ دونوں کے باذوق افراد نے باہم مل کر کیا۔ اس میں ہماری طرف سے ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ، میر غلام علی تالپور، جناب ممتاز حسن، جج فیروز خاں نانا، بیگم نانا جیسے دلدادگان فن شریک تھے اور کئی دوسرے فن کاروں کے علاوہ کراچی کے ایک نوجوان فن کار بشیر کوثر، نے اسکیچ تیار کرنے میں خصوصیت سے حصہ لیا۔

کام بھی ایسا ہی موزوں ہونا چاہیئے تھا۔ اور امریکی سفیر متعینہ پاکستان نے اسے "پاکستان، امریکہ میں"، کہہ کر اس کا واقعی حق ادا کر دیا۔ جو اس لئے اور بھی موزوں تھا کہ اس نے نمائش کا سازوسامان، جیسا کہ پیچھے بیان کیا جا چکا ہے، "ایوانِ پاکستان" کی زینت و آرائش کے لئے امریکہ بھیج دیا گیا۔ اور اب وہاں لاکھوں آدمی جو ان چیزوں کو بڑے شوق سے دیکھنے آئیں گے۔ ہمارے ملک کے ایک حصے کی تہذیب، یہاں کے لوگوں کی فنی مہارت۔ اعلیٰ ذوق اور سادہ دیہی زندگی کی جھلکیوں سے اس طرح لطف اندوز ہو سکیں گے گویا وہ انہیں براہِ راست پاکستان ہی میں دیکھ رہے ہوں۔ اس طرح ہمارا ملک اس "نئی دنیا" میں محض ایک نام ہی نہ ہوگا بلکہ ایک سچ مچ کی بڑی ہی رنگین چیز ہوگا۔ اس تہذیب کا نظر فریب مرقع جو پانچ ہزار سال سے برابر پروان چڑھتی اور ہر عہد میں نیا رنگ روپ اختیار کرتی رہی ہے۔ اور آج بھی اس کے بڑے ہی جاندار نمونے دور دور تک جنت نگاہ ثابت ہو رہے ہیں۔

★

اقوام متحدہ:

روشنی کی طرف

فضل حق قریشی

پچھلے پندرہ سالوں کی طرح اس دفعہ بھی ۲۴ اکتوبر کو اقوام متحدہ کی سالگرہ منائی جائے گی جو اس عالمگیر برادری کی سولھویں سالگرہ ہوگی۔ یہ محض جشن منانے کا موقع یا صرف اظہارِ مسرت کی تقریب ہی نہیں ہے بلکہ اس روز دنیا کی وہ قومیں جو اس برادری میں شامل ہیں، اپنے اس عہد و پیمان کی نئے سرے سے توثیق کرتی ہیں جو انہوں نے ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء سے نافذ ہونے والے چارٹر کو قبول کرتے وقت کیا تھا۔ "یوم اقوامِ متحدہ" اس لحاظ سے ایک منفرد تقریب ہے کہ اس میں دنیا کے بیشتر ملکوں میں بسنے والی بہت سی قومیں بیک وقت حصہ لیتی ہیں۔ ہر قوم اپنے اپنے انداز میں اس دن کی یاد تازہ کرتی ہے۔ لیکن ایک بات مشترک ہے اور وہ یہ کہ چارٹر میں درج شدہ اغراض و مقاصد سے اپنی عقیدت اور وابستگی اور ان پر کاربند رہنے کا وعدہ دہرایا جاتا ہے۔

شروع میں اس کے اراکین کی تعداد موجودہ اراکین کی تعداد سے تقریباً نصف تھی۔ پچاس کے ہندسے میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ پچھلے سال کے وسط میں تعداد ۸۲ تھی جو سال ختم ہونے سے پہلے ننانوے ہوگئی۔ اور یہ حقیقت ہے۔ اور جیسا کہ خود اس عالمگیر برادری کے سکریٹری جنرل ہامرشیلڈ نے اپنی اس دفعہ کی سالانہ رپورٹ میں مالی پریشانیوں اور بعض سیاسی الجھنوں کا ذکر بھی کیا ہے اس ننانوے کے پھیر میں آنے کے بعد سے بظاہر ناقابل حل مسائل کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا ہے۔ اگر بعض ممبر ملک اپنی ذمہ داریوں کو پوری طرح محسوس کر کے اپنی واجب الادا رقوم بھیج دیں اور صحیح معنوں میں دستِ تعاون بڑھائیں تو بھاری بوجھ کے ہلکا ہو جانے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔

اقوام متحدہ کی ان مالی پریشانیوں سے قطع نظر دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس زمانے میں خاص طور پر روشنی طبع جانِ حزیں کے لئے بلائے ناگہانی ثابت ہو رہی ہے۔ سائنس کی ترقی جو بنی نوعِ انسان کیلئے مفید ہونی چاہیے تھی، موجب پریشانی بنتی جا رہی ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کی جن ہولناکیوں نے جھاڑو کی بکھری ہوئی تیلیوں کو ایک بندھن میں باندھ دینے کی طرح منتشر قوموں کو یک جہتی کا نصب العین دینے کے لئے عالمی برادری بنانے پر مجبور کیا تھا' وہ ایک بار پھر شدت کے ساتھ اپنا رنگ جمانے کے لئے آمادہ ہیں ان کا تدارک کسی ایک قوم کی تنہا کوششوں سے ممکن نہیں بلکہ سب قوموں کو مل جل کر اور بیک وقت امن و عافیت کی منزل میں قدم بڑھانا پڑے گا۔

اقوام متحدہ کی مالی حالت کے ذکر کے بعد یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس کی سیاسی سرگرمیاں بھی زیر نظر لائی جائیں۔ اب مثلاً یہ کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ ایک طرف قیام امن کو نصب العین قرار دینے والی عالمی انجمن کا اس سال کا بجٹ تقریباً سات کروڑ تیس لاکھ ڈالر کا بنتا ہے مگر اس رقم کے جمع ہونے کے بھی لالے پڑ جاتے ہیں اور دوسری طرف ساری دنیا مجموعی طور پر لام بندی پر جو کثیر دولت ضائع کر رہی ہے۔ اس کا اوسط بتیس کروڑ ڈالر روزانہ آتا ہے۔ ایک سال نہیں، اگر ایک ماہ کا بھی یہ بیکار خرچ بچا کر دنیا سے بھوک بیماری اور غربت و جہالت کو دور کرنے کی سرگرمیوں پر صرف کر دیا جائے اور آئندہ کے لئے جنگ آزمائی کے منصوبوں سے احتراز کیا جائے تو دنیا کی بہت سی مشکلات حل ہو جائیں اور امن عالم ایک حقیقت بن جائے۔

پچھلے سولہ سال میں اقوامِ متحدہ نے دنیا کے مختلف حصوں سے مسلح تصادموں کو ختم کرانے میں بڑی مدد کی ہے۔ ان میں فلسطین، انڈونیشیا، کوریا اور نہر سوئز کی لڑائیاں اور حال میں کونگو کے تنازعات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جس طرح کوریا کی لڑائی میں دنیا کی بہت سی امن پسند قوموں نے مالی اعانت کے علاوہ فوجی

دیتے اور سامان سے مدد کی تھی، اسی طرح کونگو کے محاذ پر بھی اقوام متحدہ کے زیر پرچم کئی قوموں کے فوجی، قیام امن کی خاطر جنگ کر رہے ہیں۔ بڑے ملکوں کے درمیان تخفیف اسلحہ کا مسئلہ کسی طرح حل ہو جائے تو چھوٹے چھوٹے مقامات پر بھی کسی چپقلش کا امکان باقی نہ رہے۔ کونگو کا تصفیہ طے کرنے کیلئے اقوام متحدہ نے اپنے تمام ذرائع سے کام لیا ہے اور بے پناہ روپیہ بھی خرچ کیا جا رہا ہے لیکن اس کے باوجود اس کے سالانہ مصارف اتنے بھی نہیں ہیں کہ وہ موجودہ لام بندی کے نصف دن کے اخراجات کے برابر رکھے جا سکیں۔

ان تمام تصادموں میں پاکستان نے حسب مقدور و مطابق ضرورت حصہ لیا ہے اور جو کارہائے نمایاں اس نے انجام دیئے، ان کا اعتراف بھی کیا گیا ہے۔ الجزائر کی جمہوری حکومت کو تسلیم کر کے اس نے جس حق پسندی کا ثبوت دیا، اسے نہ صرف اہلِ الجزائر نے بلکہ تمام شمالی افریقہ کے باشندوں نے اور انہوں نے بھی جو اس براعظم سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے، بنظر پسندیدگی دیکھا ہے۔ اس نے اقوام متحدہ کے چارٹر پر عمل کرتے ہوئے مسمندر پار تک اپنا دستِ تعاون بڑھایا اور بہت سے تصفیوں میں جو طے ہو گئے، اس کا نام بھی فخر کے ساتھ لیا گیا لیکن لطف یہ ہے کہ جس قضیے سے اسکا سروکار ہے۔ اور وہ محتاج بیان نہیں۔ اس کے تصفیہ میں وہ ایسے ہی تعاون سے محروم ہے۔ اس تمام سلسلے میں اس کو بہت سے ملکوں سے شکوہ ہے۔

جنوبی افریقہ کے نسلی امتیازات کا مسئلہ اگرچہ کافی دیرینہ ہو گیا ہے لیکن جب بھی اقوام متحدہ کے زیر ایوان بحث میں آتا ہے، پاکستان وہاں کے ہند پاکستانی نژاد لوگوں کے وقار کے لئے اپنے خیالات اور عملی جد و جہد سے رائے عامہ کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتا۔

اقوام متحدہ کے دائرۂ عمل میں رہتے ہوئے ایشیا اور افریقہ کے ملکوں نے جو اپنا علیحدہ گروپ بنایا ہے، اس کا سہرا بھی پاکستان ہی کے سر ہے۔ اب تک وہ اس گروپ کا ایک سرگرم رکن رہا ہے اور اس کی قیادت بھی کی ہے۔ اس گروپ کے خلوص اور اس کے جائز مطالبات کا اعتراف ان ملکوں نے بھی کیا ہے جو اس میں شامل نہیں ہیں۔ اقوام متحدہ کے ننانوے ممبر ملکوں میں اس گروپ اور اس کے حامیوں نے اکثریت حاصل کر لی ہے۔ اس کا تازہ ترین ثبوت یہ ہے کہ ان کے ایما پر جنرل اسمبلی کا خصوصی اجلاس طلب کیا گیا جس نے بزرٹا کے قضیے پر تبادلۂ خیالات کیا۔ اب اگر اسمبلی کے کسی فیصلے کو نہ مان کر کوئی ملک اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہے تو اس کا علاج عالمی انجمن کے پاس کیا ہو سکتا ہے جبکہ اسے صرف اخلاقی دباؤ ڈالنے کا اختیار ہی حاصل ہے۔ وہ زبردستی کسی سے کوئی طے شدہ فیصلہ منوا نہیں سکتی۔

سرزمین چین کو اقوام متحدہ کا رکن بنانے کے لئے یوں تو اور ملکوں نے بھی اس سوال کی حمایت کی ہے لیکن وکالت جس شدومد کے ساتھ پاکستان کر رہا ہے، اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ اگرچہ اس طرفداری سے بہتوں کی ناراضگی کا اندیشہ بھی لاحق ہو سکتا ہے مگر پاکستان نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ انصاف اور حق کی خاطر ایسی کسی ناراضگی کی پروا نہیں کرتا۔ اصلی بات یہ ہے کہ اگر الفاظ میں کافی وزن موجود ہو تو کسی بیان میں سے ان کو نظر انداز کر دینا ممکن نہیں ہوتا۔ صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے سرکاری دورۂ امریکہ کے موقع پر اس موقف کی ایسے پُرزور الفاظ میں حمایت کی تھی کہ کسی گوشے سے بھی اس کی مخالفت نہ ہوئی اور اس وقت سے حکومتِ پاکستان نے تہیہ کر لیا کہ جب بھی یہ مسئلہ اسمبلی میں زیر غور آیا، پاکستان اس ضمن میں محض ایک خاموش تماشائی کی حیثیت سے نہیں رہے گا۔

غرض ان جیسے اور بہت سے سیاسی معاملات میں پورے خلوص کے ساتھ حصہ لے کر پاکستان نے اقوام متحدہ کے اصولوں اور اغراض و مقاصد کی تعمیل کا ثبوت پیش کر دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی دوسرے امور مثلاً اقتصادی اور معاشرتی ترقی کے میدانِ عمل میں بھی وہ دوسروں سے پیچھے نہیں رہا ہے۔ فنی امداد کے توسیعی پروگرام کا مقصد کم ترقی یافتہ ملکوں کی طرح مدد کرنا ہے کہ وہ آئندہ ترقی کی راہ میں خود آگے بڑھ سکیں۔ اس منزل میں امداد پانے والوں کو خود بھی سرمایہ لگانا اور اپنے عملے کو تربیت دینا پڑتا ہے۔

جہاں تک مالی تعاون کا تعلق ہے، اقوام متحدہ کے دوسرے اعضا اور ادارے مثلاً خاص فنڈ، عالمی بنک، بین الاقوامی مالیاتی فنڈ اور بین الاقوامی انجمنِ ترقیات اپنا اپنا فرض انجام دیتے ہیں۔ لیکن خود کوئی ملک اپنا سرمایہ لگانا نہ چاہتا ہو یا بتاتے ہوئے

راستوں پر چلنے کے لئے آمادہ نظر آتا ہو تو ان اداروں کے دروازے اس کے لئے مشکل ہی سے کھلتے ہیں۔ مگر پاکستان نے اپنے ہر ترقیاتی منصوبے میں بین الاقوامی امداد لینے کے ساتھ ساتھ قومی سرمایہ جمع کرنے کے ذرائع نکالے اور ان پر عمل کیا۔ چنانچہ کاغذ، سیمنٹ اور شکر کے کارخانے، ڈی ڈی ٹی اور پنسلین کی فیکٹریاں، خشک دودھ کی ڈیریاں، برقی قوت اور گیس کی پائپ لائن وغیرہ اسی امداد باہمی اور بین الاقوامی تعاون کے جذبے کا ظہور ہیں۔

معاشرے کی بہتری کے لئے انسانی حقوق کا فروغ، جرائم کی روک تھام اور خلاف ورزی کرنے والوں کی اصلاح ضروری ہے۔ ان امور کے سلسلے میں اقوامِ متحدہ کے کمیشنوں نے جو فیصلے کئے، ان کی تکمیل میں بھی پاکستان کا ہاتھ رہا ہے۔ حیثیتِ نسواں سے متعلق کمیشن کی صدارت پاکستانی خواتین نے کئی بار کی ہے اور اپنے اثر و رسوخ سے مفید مطلب تجاویز کو منظور کرانے میں حصہ لیا۔

عالمی یوم اطفال منانے میں، جو حقوق اطفال کے منشور کو مقبول بنانے کا اچھا ذریعہ ہے، پاکستان نے ہمیشہ ذوق و شوق سے حصہ لیا ہے کیونکہ اس نے محسوس کیا ہے کہ نئی پود کی فلاح و بہبود پر ہر ملک کے مستقبل کا انحصار ہوتا ہے۔

اقوامِ متحدہ کا بچوں کا فنڈ جو عرفِ عام میں "یونی سیف" کہلاتا ہے، ماؤں اور بچوں کی فلاح و بہبود کے لئے ایسی خدمات انجام دیتا ہے جن سے ان کے بنیادی حقوق یعنی عمدہ غذا حاصل کرنے اور بیماریوں سے نجات پانے کے ذرائع میسر آسکیں۔ اس مقصد کے لئے یونی سیف نے تمام ضرورت مند ملکوں میں زچگی اور فلاحِ اطفال کے مرکز قائم کرائے۔ اس کے اخراجات کا انحصار رضاکارانہ طور پر جمع کئے ہوئے چندوں یا دوسرے ذرائع پر ہے۔ دوسرے ذرائع میں تہنیتی کارڈوں کی فروخت بھی شامل ہے جو کرسمس، نئے سال اور دوسرے موقعوں پر جاری کئے جاتے ہیں۔ ان کارڈوں کے ڈیزائن دنیا بھر کے مشہور فنکار بنا کر بھیجتے ہیں۔ اس سال یونی سیف کے جو تہنیتی کارڈ فروخت کئے جا رہے ہیں، ان میں پاکستان کے نامور نقاش عبدالرحمٰن چغتائی کا ایک نمونہ شامل ہے۔

ان سب باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اقوامِ متحدہ محض سیاسی گتھیوں کو سلجھانے کا ایک مرکز ہی نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسا ادارۂ عمل

(باقی ص ۱۲۱ پر)

"کافر" بقیہ ص ۸۹

سے داآدل کی طرف دیکھا اور بولا "میں ایک بت شکن ہوں۔ بت پرستوں کے بت توڑتا ہوں"۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی ہیبت و سطوت کا مظاہرہ کرنے کے لئے سوتیلے کی گردن پر پوری قوت سے تلوار اٹھائی۔ "ٹھہرو" دفعتاً داآدل کی جگر خراش آواز ہوا میں بلند ہوئی آس پاس کی وادیاں اس گونج سے تھرا اٹھیں، تماشائی کانپ گئے، سردار کے ہاتھوں میں تلوار جھول گئی، وہ ٹھٹک کر رہ گیا داآدل کے مضبوط ہاتھوں میں خنجر آبدار کی چمک آسمان میں بجلی کی طرح لہرائی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی دونوں آنکھیں اس کے ہاتھوں میں آ رہیں۔ اس کا چہرہ خون سے سرخ ہو گیا۔ وہ یہ تحفہ اپنے ہاتھ میں رکھے چار قدم آگے بڑھ آیا اور زہرخند ہو کر ہاتھ کو آگے بڑھا دیا۔ "او بت شکن لے مرے بت کو میری آنکھوں سے دیکھ۔ یہ بت ہے، یا خداوندِ لایزال کے ازلی جمال کا پرتو؟"

سارے جلسے پر ایک بے پناہ حیرت ایک ہیبتناک کیفیت طاری ہو گئی۔ بلوچوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، خاموشی نے ایک بھیانک وحشتناک اور دلدوز صورت اختیار کر لی۔ داآدل کے ہاتھ پر اس کی دو آنکھیں دھری تھیں۔ اس کا چہرہ خون سے سرخ تھا اور وہ برابر آگے بڑھ رہا تھا۔ سردار استم خاں کا ستا ہوا چہرہ مسخ شدہ لاش کی طرح نیلا اور زرد پڑ گیا تھا وہ بے جان چیزوں کی طرح ساکت دھرا تھا۔

داآدل اپنی نظر کا نذرانہ ہاتھ پر رکھے میدان کے وسط میں آ گیا، اپنا دوسرا ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کے جرأت و ہمت سے للکارا ـــ "کائناتِ پروردگار میں کوئی مرد خدا میرے بت کی اس سے بڑی قیمت پیش کرتا ہو تو میدان میں آئے"۔ داآدل کی للکار کے جواب میں کوئی آواز نہیں آئی، سارے میدان میں قبر کا سا سکوت چھا گیا تھا۔ انسان پتھر بن گئے۔ تماشائیوں کا سانس چلتے چلتے ٹھہر گیا اور آس پاس کے شجر و حجر تک حیران نظر آنے لگے۔

یکایک چبوترے پر بیٹھے ہوئے تین بزرگوں میں سے سب سے عمر رسیدہ شخص اٹھا اور اعلان کیا کہ فتح داآدل کی ہوئی۔ اس مقابلہ میں اب ساری دنیا کی دولت ایک ٹھیکرا ہے۔ سردار استم خاں میدان سے باہر نکل جائے۔ یہ فیصلہ سن کر سارا میدان "اللہ اکبر اللہ اکبر" کے نعروں سے گونج اٹھا اور آس پاس کی ساری وادیاں آوازوں کے سمندر میں ڈوب گئیں۔

اس میں جیت ہی جیت ہے

زندگی کا بیمہ کوئی جوا نہیں بلکہ اس میں آپ کیلئے یقینی فائدے ہیں۔
آپ جو رقم بیمہ کی قسطوں میں دیتے ہیں وہ سب کی سب مع منافع آپکو
یقینی طور پر واپس مل جاتی ہے۔ آپ کے بال بچوں کے مستقبل کا تحفظ ایک
علیحدہ فائدہ ہے جو آپ حاصل کرسکتے ہیں۔

پوسٹ آفس نے اب ایک نئی پالیسی جاری کی ہے
جس کے لئے طبی معائنہ کی شرط نہیں،
اس نئی پالیسی کے تحت آپ
پانچ ہزار روپے تک کا بیمہ
کرا سکتے ہیں۔

تفصیلات کیلئے کسی ڈاک خانے سے رجوع کیجئے

پوسٹل لائف انشورنس

قسطیں کم۔ منافع زیادہ۔

gop 780

united

"دیدن دگر آموز" بقیہ صہ ۱۸

کرچکا ہے کہ اس نے انسان کو صدیوں پیچھے ڈال دیا ہے۔ اس کا سماجی شعور سائنسی شعور سے صدہا سال پیچھے ہے۔ یہ ایک زبردست خلیج ہے جسے پاٹنا از بس مشکل ہے۔ میں تو بہت کچھ سوچ بچار کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ انسان کی نادانی کی کوئی انتہا نہیں۔ خدا نے انسان کو جو سب سے بڑا قوی ہتھیار دیا ہے وہ عقل و فہم ہے۔ لیکن یہی چیز ہے جسے وہ کبھی استعمال نہیں کرتا۔ آیئے ہم آپ دعا کریں کہ ہماری حقیقت پسندانہ سوچ بچار ترقی کرتے کرتے آخر کار سائنسی سوچ بچار سے جا ملے گی۔ اور ہم انسانوں کی زندگی میں توازن پیدا کردے گی۔ مگر جب تک ایسا نہ ہو جائے نہ تو دنیا میں امن و امان قائم ہوگا اور نہ ہم ان اندیشوں سے رہائی پاسکیں گے جو فی زمانہ ہمارے سر پر سوار ہیں۔ اگر یہ صورت حال جاری رہے تو پاکستان کو کیا کرنا چاہئے؟ میری رائے میں ہماری پالیسی یہ ہونی چاہئے کہ اقوام متحدہ کے ذریعہ قیام امن کو یقینی بنائیں اور ایسے دوست تلاش کرتے رہیں جو ہمارے ملک کی سالمیت اور استحکام میں دلچسپی رکھتے ہوں۔

(تلخیص)

"روشنی کی طرف" بقیہ صہ ۱۱۸

بھی ہے جس میں رہ کر دنیا کی سب چھوٹی بڑی قومیں اپنے اپنے معیار زندگی کو بلند کرنے اور اسے ایک دوسرے کے برابر لانے میں یکساں مواقع حاصل کرسکتی ہیں۔

لہٰذا "یوم اقوام متحدہ" ایک علامت بھی ہے اور ایک آزمائش بھی یہ علامت ہے ان ملکوں کے اشتراک عمل کی جو دنیا کی یکساں بھلائی کے لئے کوشاں ہیں اور آزمائش یہ کہ اس اشتراک کو کیوں کر اس حد تک مؤثر بنایا جائے کہ اس کے باعث دنیا کا امن، اس کی سلامتی و خوشحالی کا خواب جلد از جلد شرمندہ تعبیر ہو سکے۔

"عہد اکبر شاہ میں جہد آزادی" بقیہ صہ ۲۶

شہید کردیئے گئے۔ غرض انہیں غداریوں اور سازشوں کے درمیان ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء میں وادی کاغان کے مقام بالاکوٹ میں وہ فیصلہ کن معرکہ پیش آیا جس میں سید صاحبؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ مردانہ وار لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ اور یہ تحریک ختم ہوگئی۔

نفاق اور افراتفری کا یہ عالم تھا کہ دہلی میں خود مسلمانوں کے مخالف گروہ نے علانیہ خوشیاں منائیں۔ اور جامع مسجد دہلی میں ان کے مارے جانے کی خوشی میں مٹھائی بانٹی گئی! شاہ نصیر جیسے متین شاعر نے بھی بربنائے مخالفت خوش ہو کر قصیدہ کہا: ؎

کلام اللہ کی صورت ہوا دل ان کا سیپارہ
نہ یاد آئی حدیث ان کو نہ کوئی نصِ قرآنی

مولانا ولایت علی عظیم آبادی نے عسکریت کو ختم کروایا۔ اور جب مقلد اور غیر مقلد، آمین اور رفع یدین کے جھگڑے بہت بڑھ گئے تو انگریزوں نے انہیں روکا کہ اب انہیں ان کی ضرورت نہ تھی۔ قوم کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ اور انگریزوں کی مزاحمت کرنے والی کوئی تنظیم باقی نہ تھی۔ اب غلاموں سے کام لے کر ملکی دولت لوٹنی تھی اس لئے اس طرح کے جھگڑے مناسب نہ تھے۔

بہرحال تحریک جہاد ہندوستانی مسلمانوں کی تنظیم کی پہلی کوشش تھی جو عوامی احساس کی ترجمان کہی جاسکتی ہے۔ یہ تحریک صرف اس وجہ سے ناکام رہی کہ زوال نے یک جہتی اور اتحاد کو پارہ پارہ کردیا تھا۔ سید احمد بریلویؒ اور شاہ اسمٰعیلؒ اس انتشار کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیئے گئے۔ بظاہر وہ ناکام ہوئے لیکن اپنی بے لوث خدمات سے تنظیم اور آزادی کی جو روح پھونک گئے وہ رنگ لائے بغیر نہ رہ سکی۔

چراغ انجمن افروز: — بقیہ صفحہ ۶۸

سے بھی متاثر ہوئے۔ ان دونوں کی سادگی اور سادہ بیانی کا اثر مولوی صاحب کے اسلوب کی بنیادی خصوصیت ہے۔ سر سید کا اسلوب اگرچہ بہت صاف و آسان ہے لیکن اس میں کہیں کہیں "اکھڑ پن" پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سر سید کے ہاں "ادبیت" کی حیثیت ثانوی ہے اور مقصدیت کو اولیت حاصل ہے۔ ان پر اصلاح کا خیال اس حد تک طاری تھا کہ وہ تحریر کی خوبیوں یا خامیوں کی پروا نہیں کرتے تھے۔ مولانا حالی کا اسلوب سر سید سے قدرے بہتر ہے۔ بہر حال یہ مسلّم ہے کہ حالی کا اسلوب بے داغ ہے لیکن وہ شبلی کے اسلوب کی طرح رنگین بھی نہیں۔ یہ فرق طبیعتوں اور شخصیتوں کے باہمی اختلاف کی وجہ سے پیدا ہوا۔

مولوی عبدالحق نے حالی اور سر سید سے "سادگی" اور "سادہ بیانی" لی لیکن ان کا اسلوب صرف ان ہی دو عناصر سے عبارت نہیں ہے۔ ان کے ہاں ایک تیسری خصوصیت بھی پائی جاتی ہے جسے "رنگینی" کہا جاتا ہے اور یہ خصوصیت انھیں شبلی سے ملی ہے۔ مولوی صاحب نے اپنی تحریروں میں کبھی کوئی ایسا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا کہ جہاں شبلی کو "مطعون" کیا جا سکے لیکن اس کے باوجود میرا خیال ہے کہ وہ اسلوب کے معاملے میں شبلی سے اتنے ہی متاثر ہیں جتنا حالی اور سر سید سے۔ (واضح ہے کہ مولوی عبدالحق مدرسۃ العلوم علی گڈھ میں شبلی کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ حالی اور سر سید سے ان کے تعلقات کی نوعیت مختلف ہے۔ شاگرد کا استاد سے متاثر ہونا ایک لازمی امر ہے اور اس سے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ مولوی صاحب شعوری یا غیر شعوری طور پر شبلی کے انداز تحریر سے متاثر ہوئے) گویا مولوی صاحب کے اسلوب بیان کی تین خصوصیات ہیں۔ سادگی، سادہ بیانی اور رنگینی۔ سادگی سے مراد یہ ہے کہ عبارت آرائی اور دیگر تصنّعات سے اجتناب کیا جائے۔ سادہ بیانی یہ ہے کہ جو کچھ کہا جائے وہ دو ٹوک انداز سے کہا جائے۔ موضوع کی مناسبت سے کہا جائے۔ اور پیچیدگی اور الجھاؤ سے دامن بچایا جائے۔ رنگینی کا مطلب یہ ہے کہ نثر میں وہ لطافت پیدا کی جائے جو "ادبی حسن" کہلاتی ہے۔ یہ تینوں خصوصیات جس عمدگی اور خوش اسلوبی سے مولوی عبدالحق کی تحریروں میں پائی جاتی ہیں اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔

مولوی صاحب لفظوں کے بہت بڑے مزاج داں تھے۔ وہ جس جگہ جو لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ اس جگہ کے لئے وضع ہوا ہے۔ اس سلسلے میں وہ کبھی نہیں دیکھتے تھے کہ یہ لفظ کس زبان سے اُردو میں آیا ہے بلکہ صرف یہ دیکھتے تھے کہ جس مقصد کے لئے یہ لفظ اُردو میں آیا ہے وہ پورا ہوتا ہے کہ نہیں۔ ان کی نثر ابوالکلام آزاد کی طرح صرف عربی اور فارسی لفظوں کی محتاج نہیں، بلکہ وہ ہندی لفظوں کو بھی بڑی خوبی سے استعمال کرتے ہیں۔ غریب سے غریب لفظ بھی ان کی نثر میں آکر بڑا مانوس دکھائی دیتا ہے۔

مولوی صاحب بڑے بڑے جملوں کے عادی نہیں تھے۔ وہ چھوٹے چھوٹے مربوط جملوں سے بڑی متوازن نثر لکھتے تھے۔ چھوٹے جملے لکھنے سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ خیال کو دوسروں تک پہنچنے میں بڑی آسانی ہو جاتی ہے۔ ان کی نثر کو حسین بنانے میں نادر و خوبصورت تشبیہات کو بھی بہت دخل ہے۔ ان کی تحریر میں تشبیہیں محض لطافت بیان کے لئے نہیں ہوتیں بلکہ ان سے مفہوم کی وضاحت کا کام لیا جاتا ہے۔

غرض مولوی صاحب کا اسلوب بڑا باغ و بہار ہے۔ ان کا ایک ایک لفظ پڑھنے والے کے دل میں گھر کر لیتا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے یہ بات بالکل صحیح لکھی ہے کہ "مولوی صاحب کا اسلوب اردو کے بنیادی اسالیب میں سے ہے۔" میں اس پر صرف اس قدر اضافہ چاہوں گی کہ صرف اسی اسلوب سے اُردو زبان کی صلاحیتوں اور وسعتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے +

مشرقی پاکستان، اردو شاعری کے آئینہ میں — باقی صفحہ ۵۲

یہ لہریں، یہ ان کے نرالے ترانے	سہانے سُروں کے مقدس خزانے
یہ لہریں جو تلوار بھی آئینہ بھی	"لورے چندرانی" "ستی موتنا" بھی
یہ لہریں دکھاتی ہیں کیا کیا تماشہ	سناتی ہیں قاضی کا بھی "بارہ ماشہ"
یہ قاضی کی دولت ہے دولت ہماری	ہے قاضی کی عزت سے عزت ہماری
یہ لہریں یہ ٹھاکر قریشی کے دفتر	یہ تحفہ یہ "سیف الملوک" اور "سکندر"
"گلن" کی طرح موجۂ "ہفت پیکر"	یہ "پدماتی" جائسی کی طرح پر
ادھر ایک ننھی سی کھیتی بھی دیکھو	یہ "مسلم ساہتیہ سیتی" بھی دیکھو
سنو آج سیّد الاوّل کی بولی	یہ ساتوں کی بولی یہ راتوں کی بولی
یہ بولی ہے نذرل سے آتش بیاں کی	مشرف کی اور کیقباد جواں کی
یہ لہریں سناتی ہیں "شیشہ شکوہا"	سناتا ہوں میں ان کو ہاشم کا دوہا

....

ڈھکلی سے اک شہر ڈھکا اور ڈھاکہ جس کا نام
سپس نو اسے سورج راجہ روح کرے پرنام

کچھ مشرق کچھ مغرب

(اسٹیج ڈرامہ)

سید ناصر بغدادی

ادھر کوئی دو سال سے گوناگوں ترقیاتی پروگراموں کی ایک ملک گیر تحریک چل نکلی ہے۔ اس کے عملی مظاہر میں جہاں ایک طرف دکانیں گرم کپڑوں اور ان دواؤں سے بھری پڑی دکھائی دیتی ہیں جنہیں پہلے رگِ حیات کو رواں دواں رکھنے کے لئے بلیک سے خریدنا پڑتا تھا وہاں ہماری نگاہیں ان منصوبوں سے بھی دوچار ہوتی ہیں جو تمام تر ملکی ثقافت، ادب اور فنون کی بقا کی صحیح نمائندگی اور فروغ کے لئے باندھے گئے تھے اور جن میں سے بعض پایۂ تکمیل کو پہنچ بھی چکے ہیں۔

کراچی میں "آرٹس کونسل" کی خوبصورت عمارت ہماری قومی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے یہی حیثیت "پاکستان رائٹرز گلڈ" کو علم و ادب کے سلسلے میں حاصل ہے۔ اس سلسلے کی تیسری اور بہت اہم کڑی آپ کی اچھی اچھی پکچروں پر صدر کی طرف سے سالانہ "ایوارڈ" میں دکھائی دے گی۔ ان کے بعد تھیٹر ہی باقی رہ جاتا تھا۔ سو نئے دارالحکومت میں — کیونکہ راولپنڈی ہو یا اسلام آباد — ایک ہی بات سمجھنی چاہیئے کھلی فضا کے تھیٹر کا قیام اس کمی کو پورا کرتے ہوئے اس سنہری زنجیر کا سلسلہ اور بھی آگے بڑھا دیتا ہے۔ یہ سب پاکستان کی ثقافت اور ادب کے عروج اور اس کی ترقی کی بڑی روشن مثالیں ہیں جو نہ صرف وقت کے تقاضوں کو پورا کرتی بلکہ ملک کو دیگر ترقی یافتہ ممالک کے شانہ بشانہ چلنے کا اہل بھی بناتی ہیں۔

کھلی فضا میں تھیٹر کا قیام ایوب نیشنل پارک (پنڈی) میں خود بخود ایک علاماتی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور اس سے قومی تصور کو بلند تر فضاؤں میں گرم پرواز ہونے کی کیا کچھ تحریک نہیں ملتی۔ مشرقی پاکستان تو خیر شروع ہی سے فنونِ لطیفہ کا گہوارہ چلا آتا ہے، مغربی پاکستان میں اس قسم کا تھیٹر اپنی نوعیت کی پہلی چیز ہے اور پھر اسے بنایا بھی بڑے سلیقے اور فراخ دلی سے گیا ہے کیونکہ اس میں بیک وقت کوئی ڈیڑھ ہزار تماشائی بیٹھ کر پیشکش سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ نگارخانوں کی گھٹی ہوئی فضا کے مقابلہ پر کھلی فضا، اور وہ بھی ایسے علاقے کی جو اپنی آب و ہوا کے لئے مشہور ہے، صحت مند بھی ہے اور باعث فرحت بھی۔ اسٹیج اتنا فراخ — ۵۰ فٹ لمبا، ۳۴ فٹ چوڑا۔ ہو بہو پردۂ سیمیں کا سینما سکوپ معلوم دیتا ہے۔ اور اس سے تخیل خود بخود ایک وسیع فضا میں ہلکورے لیتا دکھائی دیتا ہے۔

دوسرے ملکوں میں، خصوصاً مغرب میں، کھلی فضا کے تھیٹر ہی تھیٹر دیکھتے ہوئے اکثر رشک ہوتا تھا اور دل میں ایک تمنا کروٹیں لینے لگتی تھی کہ اے کاش! ہمارے یہاں بھی ایسا ہو۔ ہم بھی اپنی نظروں کے مقابل کھلی فضا کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیکروں کے مشاہدے سے لطف اندوز ہوں اور فضا کی دلفریبی سے ان نظارہ ہائے جمیل کی شدت دوچند ہو جائے۔ اب یہ تمنا کوئی سودائے خام نہیں رہی۔ اس خواب نے حقیقت کا روپ دھار لیا ہے اور بہت ہی سہانا روپ ایسے کہ غالب کا "رقصِ پری پیکراں بر بساط" اور "غوغائے رامشگران و رباط" انہی کے الفاظ میں "بہشتِ عملی" بن کر نگاہوں کے سامنے آ گیا ہو۔

ڈرامہ۔ یہ ہمارے ادب کا ایک ٹیڑھا "مسئلہ" ہے۔ اس لئے کہ اس کی بساط محدود ہے۔ افسانہ اور ناول کا گھیر یا ہیر پھیر اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اس لئے یہ دونوں قابل فخر بھی ہیں اور قابل رشک بھی۔ مگر ڈرامے۔ یہ تو

بس خال خال ہی نظر آتے ہیں پچھڑوں کو الگ کر لیا جائے تو خالص ڈراموں کے لئے ہمارے دلوں میں وہ لگن نہیں پیدا ہوتی کہ ہم انہیں پورے ذوق و شوق سے اپنائیں اور ان میں ڈوب جائیں۔ کوئی ڈرامہ کبھی کبھار شاید بس ایسے ہی نظر آجاتا ہے جیسے ابر آلود رات میں کہیں بادل کی دستبرد سے بچ کر کوئی تارہ۔

پھر ان ڈراموں کو اسٹیج کرنا بھی کارے دارد! انہیں لکھا اس طرح جاتا ہے کہ یہ اور سب کچھ ہوں، ڈرامے نہ ہوں یعنی اسٹیج سے کوسوں دور!، ڈرامہ نما۔ صرف کاغذ کی اسٹیج پر جلوہ گر ہوں تو ہوں۔ جیسے کوئی افسانہ، کوئی تجریدی نظم، کوئی ماورائی کہانی یا کوئی نقش بدیوار کیلنڈر یہ زندگی کی بات نہ ہوئی جو ڈرامہ کو حقیقتاً ہونا چاہیئے۔ بلکہ خشک، میکانکی سی چیز۔ ابھی چند ہی دن کی بات ہے کسی ستم ظریف نے کانگو کی ایک مشہور شخصیت کے قتل سے متاثر، یا یوں کہیئے ملہم، ہو کر، ایک ڈرامہ لکھ مارا۔ جس میں مکالمے تقریباً ندارد اور اداکار آٹے میں نمک کے برابر تھے! لیکن مناظر سے متعلق ہدایات رقم کرنے میں صفحے کے صفحے سیاہ کر دئے گئے تھے۔ اب کہئے اسے اسٹیج کیا جائے تو کیسے؟ اور پھر ڈرامہ کیا ہوگا۔ "تہمیں مکتب" نہ سہی اسٹیج ہی سہی اداکاری اور اداکاروں کا قصہ تو تمام ہو ہی جائے گا!

اب کھلی فضا میں تھیٹر — اسے کھلا تھیٹر ہی کیوں نہ کہا جائے — قائم ہونے سے امید ہے — اور کچھ عجب نہیں کہ اس درجہ واقعیت کی فضا پیدا ہونے سے جیسی کہ قدیم یونان میں ہوتی تھی۔ — ذہنی و ڈرامائی فضا بھی کھل جائے اور جد و جہد کا رخ اسٹیج کئے جانے والے ڈراموں کی طرف پھر جائے اور ثقافت کا یہ اہم شعبہ جو عرصہ سے عدم التفات کا شکار رہے، خواب گراں سے بیدار ہو۔

انسانی فطرت ہمیشہ تنوع کی جویا رہی ہے۔ ہماری وہ لطیف حس جو تفریح کے لئے اداکاری کی مشتاق و متلاشی ہے عرصہ سے پردۂ سیمیں پر متحرک سائے دیکھ دیکھ کر بوجھل ہو گئی ہے۔ وہ اس بات کی خواہشمند تھی کہ پردہ میں جنبش ہو اور آنے والا لمحہ اسے اپنے اندر کچھ اس طرح سمیٹ لے کہ پردہ کے ادھر سے جیتے جاگتے، زندگی کی حرارت سے معمور کردار نکل آئیں۔ یہ خواہش اب کھلے تھیٹر کے قیام سے پوری ہو گئی ہے۔ اپنے ساتھ ایسے ہی چند رچند

تھیٹروں کی لو بدلئے ہوئے۔ جیسا کہ صدر پاکستان نے اس تھیٹر کا افتتاح کرتے ہوئے بہ نفسِ نفیس فرمایا۔

بہت اچھا ہے کہ حکومت ثقافتی سرگرمیوں کے فروغ کے لئے اپنی جانب سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کر رہی — مغربی پاکستان ہو یا مشرقی، ان دونوں کی حیثیت اس لحاظ سے یکساں ہی ہے۔

مشرقی پاکستان میں اسٹیج و ڈرامہ کی مقبولیت کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ وہاں تو یہ چیز پہلے ہی مقبول ہے ہر سال اچھے اچھے ڈراموں کی کثیر تعداد بڑی ہی خوش اسلوبی، خوش سلیقگی اور جانفشانی سے اسٹیج کی جاتی ہے۔ ان میں کتنے ہی خاصے معروف ہیں۔ مثلاً اردو ڈراموں سے قطع نظر، "ڈرامہ سرکل" کی پیشکش "ماہی پیر"۔ "منرو اتھیٹرز" کی "گنیر بادھو" اور "پاتھر شیشے"۔ "کرسٹی سنگشاد" کی "دونی ہار" اور "چارو کلا سنساد" کی "اسمگلر"۔ ان کے علاوہ "عبداللہ کا کارخانہ" اور "من جیز ایچھے ڈاکے" جیسے مشہور ڈرامے یونیورسٹی کے مختلف ہالوں میں پیش کئے گئے۔ مشرقی پاکستان کے کچھ اضلاع مثلاً رنگپور، چاٹگام، وغیرہ میں بھی اسی قسم کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ سید ولی اللہ کا ڈرامہ "ماہی پیر" جو مقصود الصالحین کی زیر ہدایت پیش کیا گیا تھا۔ پی۔ ای۔ این کا انعام یافتہ ڈرامہ ہے۔ جس کی بنیاد انسانی نفسیات پر رکھی گئی ہے۔ ہدایت کار نے اسے پیش کرنے میں نہایت جانفشانی سے کام لیا۔ اس سے قبل وہ "رکتا کرابی" نامی ڈرامے کو نہایت فنکارانہ مہارت سے پیش کر کے کافی نام پیدا کر چکا ہے۔ اس میں بھی تماشائی کی دلچسپی کو شروع سے آخر تک نہایت چابکدستی سے قائم رکھا گیا ہے۔

"گنیر بادھو" کوی جسیم الدین جیسے نامور ڈرامہ نگار کا لکھا ہوا ہے۔ اس کی ہدایت کاری کے فرائض ایس ایم حبیب الرحمن نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دئے حبیب الرحمن اور سہراب حسین دونوں نے مل کر بڑی یکجہتی سے اپنے اپنے کردار ادا کئے ہیں "پاتھر شیشے" روایتی انداز کا سیدھا سادا کھیل ہے لیکن نرائن چکرورتی کی فنکارانہ ہدایت کاری نے اسے کافی مقبول بنا دیا ہے۔ "دنی ہار" علی منصور کا ڈرامہ ہے جو اس سے پہلے دو نہایت کامیاب ڈرامے "بوبامنوش" اور "پورو باری" لکھ چکا ہے۔ "دنی ہار" جوں جوں تکمیل کی طرف بڑھتا ہے اس کی

خوبصورتی نکھرتی چلی جاتی ہے۔ قاضی خلیق کی اداکاری اپنے معراج پر ہے۔ یہاں تک کہ بعض انتہائی جذباتی مناظر میں بھی اداکاری کی قدرتی وضع متزلزل نہیں ہوتی۔

انیس چودھری کی "من چترا" طلبا نے سلیم اللہ ہال میں پیش کی۔ اس کا موضوع نامساعد حالات میں زندگی سے محبت کئے جانا اور خود اعتمادی کے سہارے آگے بڑھنا ہے۔ بعینہٖ ایسی چیز جس کی آجکل پاکستان میں ضرورت ہے۔

کہانی ایک اسکول ماسٹر کے گرد گھومتی ہے۔ اس کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب اسکول ماسٹر اپنی ملازمت کھو چکا ہے۔ تمام ڈرامائی عنصر ان مناظر میں مرتکز ہو گئے ہیں جن میں وہ اپنی مضبوط خود اعتمادی سے ارد گرد پھیلے ہوئے ہمت شکن حالات کا منہ توڑ جواب دیتا ہے۔ نجم الہدیٰ نے اسکول ماسٹر کا کردار بڑی کامیابی سے نبھایا ہے۔ عبدالجلیل، احسن علی اور شمس الزماں اپنی جگہ خاصے کامیاب رہے ہیں۔

شوکت عثمان کے ماخوذ ڈرامے "عبداللہ کا کارخانہ" کو اقبال ہال میں پیش کیا گیا۔ اس میں انسان کی ایجاد خاص ــ "مشینی انسان" کے ہاتھوں انسانیت کی تباہی پر بحث کی گئی ہے۔ ہیروئن کا کردار ادا کرنے میں ذلالہ ہاشم، ریڈیو کی منفرد صداکار نے ایک بار پھر اپنی خداداد صلاحیت کا لوہا منوایا۔ عنایت پیر ہیرو کی حیثیت سے بہت کامیاب رہا۔

"پیچھو ڈاکے" ایک چھوٹا سا ڈرامہ ہے جس کا مواد ایک افسانے سے حاصل کیا گیا ہے۔ کہانی قدرے غیر حقیقی ہے لیکن بعض مناظر بہت خوب پیش کئے گئے ہیں۔

"پرا بیش نشد" ان گنے چنے ڈراموں میں سے ہے جو ملک میں ڈرامے کے فروغ کی تحریک کے سلسلے میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔

رنگپور عرصہ سے اپنی ڈرامائی سرگرمیوں کے لئے مشہور رہے۔ یہاں کی "نٹیا سماج" کی پیشکش "پرتی تینیر پالٹے" میں ہدایت کاری کے فرائض ایک ہونہار اداکار تینتو میاں نے انجام دئے۔ جس مہارت سے ڈرامہ میں یہ حیران کن کیفیت پیدا کی گئی ہے کہ "اب کیا ہوگا ـــ اب کیا ہوگا"۔ اور یوں ڈرامہ کی حرکت کو نقطۂ عروج تک پہنچایا گیا ہے، وہ مدتوں یاد رہے گا۔ یعقوب، حبیب، اسلام، اقبال اور مقبول نے اس میں اداکاری کی مثال قائم کردی ہے۔

یہ ہے ڈرامہ کی حد تک مغربی و مشرقی پاکستان کی ثقافتی سرگرمیوں کا ایک مختصر جائزہ ــ جس گرمجوشی سے حکومت ثقافتی و ادبی سرگرمیوں کے فروغ کے لئے کوشاں ہے اس کو دیکھ کر ایک بہتر مستقبل کی پیشگوئی کی جاسکتی ہے۔ امید ہے کہ جلد ہی مشرقی پاکستان میں حسب ضرورت اچھے اور جدید ساز و سامان سے آراستہ تھیٹروں کا قیام عمل میں آجائے گا جس سے یہاں کے باکمال جوہروں کو مظاہرۂ فن کیلئے بہتر سے بہتر مواقع ملتے رہیں گے ؛

"آمد سحر ندا" بقیہ ص ۱۱۱

ایک ہی پیکر میں پنہاں ہے سوا فسونِ خیالی
یہ تاب و تب لاثانی!

لوٹ پلٹ کر جب دن آئیں دیکھیں تری بہاریں
رنگ رنگ کے جلوے کوندیں بھانت بھانت چہکاریں
روشنیاں ہی روشنیاں، جھرمٹ جھرمٹ پروانے
نور کے میخانوں میں چھلکتے پیمانے پیمانے

رنگ ہی رنگ دھنک کے جادو، سپتک سپتک گانے
تتلیاں جن کی دیوانی اور پنچھی سب مستانے
روشنیوں کے پنہاں جادو سماں بنائیں کیا کیا
برقِ نظر سے دل کو مہروں یاد دلائیں کیا کیا
بھولی بسری کہانی!
اے صبحوں کی صبح سہانی!!

*

خدا - مفرد یا مرکب : ——— بقیہ صفحہ ۵۵

بقیہ صفحہ ۵۵

استعمال ملتا ہے۔ ممکن ہے کہ دیگر حضرات نے بھی استعمال کیا ہو۔ دبیرہ

جاری ہوا یہ حکمِ خداوندِ محترم — ہاں قدسیو! علم کی درستی کرو بہم

اور علامہ اقبال نے لکھا ہے :

خدائی اہتمامِ خشک و تر ہے — خداوندا! خدائی دردِ سر ہے
مگر یہ بندگی استغفر اللہ — یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

نیز : ع ۔ مقامِ بندگی دیگر مقامِ عاشقی دیگر — مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

البتہ بحالت مرکب بطور مضاف بمعنی خدا (مالک) عام استعمال ہے جیسے خداوندِ دوجہاں۔ خداوندِ عالم وغیرہ۔ علامہ اقبال :

دعا یہ کر کہ خداوندِ آسمان و زمیں — کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو
(التجائے مسافر)

میر درد :

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کی رقم کا — حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا

غرض "خدا" مرکب نہیں، مفرد ہے۔ اوستا میں خوتای، پہلوی میں خذا اور فارسی میں خدا ہے۔ اولاً بمعنی بادشاہ بزرگ، حاکم، صاحب، آقا استعمال ہوا۔ اسلام کے زیرِ اثر اور غالباً تصوف کے رواج کے ساتھ یہ لفظ اللہ (ذاتِ واجب الوجود) کے لئے استعمال کیا گیا۔ بادشاہ و امرا کے لئے "خداوند و خواجہ" استعمال کئے گئے جو لفظ خدا سے ماخوذ ہیں۔ اردو میں "خدا، خداوند، خواجہ، خاوند کا استعمال اب تک پایا جاتا ہے۔ لفظ خواجہ سردارانِ ملک و قبائل کے علاوہ بڑے بڑے سوداگروں کے لئے بھی استعمال ہوتا تھا۔ موجودہ لفظ "خوجہ" اسی "خواجہ" کی مخفف صورت ہے اور "خواجہ سرا" کی مخفف شکل "خسرا" اور عامی تلفظ "کھسرا" ہے جو مخنث (ہیجڑا) کے لئے استعمال ہوتا ہے کیونکہ شاہی محل سرا کی نگرانی اور انتظام ان کے سپرد ہوا کرتا تھا۔ فارسی میں تنہا خواجہ بمعنی مخنث کے معنی میں استعمال ہوتا ہے: "من میگویم خواجہ ام تو میگوئی چند تا بچہ داری"[1]

اردو میں بہرحالت مذکر استعمال ہوتا ہے۔ اس سے تانیث نہیں آتی : غالب :

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا — ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ
سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب — خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہئے!

[1] مؤلف فرہنگ نظام نے خواجہ کو سنسکرت لفظ شاس سے ماخوذ بتانے میں غلطی کی ہے کیونکہ یہ لفظ عہدِ اسلامی کی پیداوار ہے۔ اس زمانہ میں سنسکرت کا اثر انداز ہونا ثابت نہیں ہے۔ صحیح یہی ہے کہ خدا سے ماخوذ ہے۔ فرہنگ نظام جلد دوم ص ۵۰۱

"ماہِ نو"

کے لئے غیر طلبیدہ مضامین

— غیر طلبیدہ مضامین نظم و نثر صرف اس حالت میں واپس کئے جائیں گے جب کہ ان کے ساتھ ڈاک کے مناسب ٹکٹ روانہ کئے گئے ہوں۔

— مسترد مضامین کے سلسلے میں غیر ضروری خط و کتابت کرنے سے ادارہ کو معذور سمجھا جائے۔

— ایک ہفتہ تک اطلاع موصول نہ ہونے پر مرسلہ مضمون کو ناقابلِ اشاعت تصور کیا جائے۔

— ادارہ ڈاک میں کسی مسودہ کے گم ہو جانے کا ذمہ دار نہیں۔

(ادارہ)

★

جلد ۱۴ — شمارہ ۱۱

ماہِ نو

مدیر: ظفر قریشی — نومبر ۱۹۶۱ء

سالانہ چندہ: پانچ روپے ۵۰ پیسہ — شائع کردہ: ادارۂ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۱۸۳۔ کراچی — فی کاپی: ۵۰ پیسہ

سرشار کی الف لیلہ

انتظار حسین

"الف لیلہ" کو اردو مترجموں نے خام مال کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس کا سیدھا سچا ترجمہ ملنا دشوار ہے۔ کبھی ذاتی افتاد کے تحت، کبھی وقت کے رجحانات کے زیر اثر، اس کی کہانیوں کو اپنا رنگ دیا گیا، اور اردو میں منتقل کر لیا گیا۔ جو کتابیں ہر زمانے میں پڑھی جاتی ہیں ان کے ساتھ یہ واقعہ گذرنا قدرتی سی بات ہے۔ شاید انہیں ہر زمانے میں پڑھے جانے کی عزت بھی اس وجہ سے حاصل ہوتی ہے کہ ان میں معنی کی مختلف سطحیں ہوتی ہیں۔ ہر نیا عہد اپنے مزاج کے مطابق معنی کی نئی سطح دریافت کرتا ہے اور اسے ایک نئی کتاب کے طور پر پڑھتا ہے۔ "الف لیلہ" میں معنی کی اتنی مختلف سطحیں، اور اتنے الگ الگ رنگ موجود ہیں کہ اسے کم و بیش متضاد زاویوں سے پڑھنا بھی ممکن ہے۔ مثلاً اُسے بادشاہوں اور امیرزادوں کی داستان کے طور پر بھی پڑھا جا سکتا ہے اور عام لوگوں کی کہانی سمجھ کر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ اس میں مافوق الفطرت اور اسرار کا رنگ تو ہے ہی مگر اسے حقیقت نگاری کی مثال بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

اس نقطۂ نظر سے سرشار کی "الف لیلہ" مخصوص طور پر دلچسپی کا سامان رکھتی ہے۔ سرشار کی "الف لیلہ" دوسرے ترجموں سے یوں بھی مختلف ہونی چاہئے کہ وہ خود ایک تخلیقی آدمی تھے۔ آدمی محض مترجم ہو تو کتاب کو جوں کا توں ترجمہ میں منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر تخلیقی آدمی کے کچھ اپنے رجحانات بھی ہوتے ہیں۔ کبھی شعوری طور پر، کبھی غیر شعوری طور پر وہ رجحانات اس کے ترجمہ میں راہ پا جاتے ہیں۔ سرشار افسانہ نگار تھے۔ "الف لیلہ" کا ترجمہ غیر جانبدارانہ شاید ان کے لئے ممکن نہیں تھا اور جب شاعر یا افسانہ نگار کسی شاہ پارے کا ترجمہ کرتا ہے تو اسکی زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ترجمہ کے ساتھ توجیہہ و تفسیر بھی ہوتا ہے۔ اور اس طرح ترجمہ کے ساتھ کتاب کے ایک نئے معنی کھلتے ہیں۔ ویسے یہ بھی ممکن ہے کہ ایسے مترجم کے ہاتھوں کتاب کے معنی ہی بدل جائیں۔ سرشار کی "الف لیلہ" کو دیکھ کر تو کچھ ایسا گمان ہوتا ہے۔

سرشار کی "الف لیلہ" پر بات کرنے سے پہلے خود "الف لیلہ" کے بارے میں ایک بات سمجھ لینے کی ضرورت ہے۔ اس کتاب میں کرداروں کی دو الگ الگ برادریاں نظر آتی ہیں اور حقیقت کو سمجھنے اور گرفت میں لانے کے دو الگ الگ طریق کار۔ کرداروں کی ایک برادری میں بادشاہ، شہزادے وزیر زادے، امیر کبیر اور سوداگر شامل ہیں۔ دوسری برادری میں تیلی تنبولی، بھٹیارے، لکڑہارے، نائی، حمال، نانبائی قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ حقیقت کو درک کرنے کا ایک طریق کار تخیلی ہے۔ دوسرا طریق کار خارجی حقیقت کے بیان کے راستے سے حقیقت تک پہنچنا ہے۔

ان دونوں صورتوں کے امتزاج سے ہی "الف لیلہ" عبارت ہے۔ مگر سرشار اس امتزاج کو قائم رہنے دینے کے قائل نظر نہیں آتے۔ انہوں نے ایک صورت کو قبول کیا ہے اور دوسری صورت کو رد کر دیا ہے۔ اسلئے ان کے یہاں "الف لیلہ" ادھوری صورت میں نظر آتی ہے۔

سرشار نے "الف لیلہ" کو ترجمہ نہیں کیا ہے۔ بلکہ کتاب کے آخر میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ انہوں نے "بکمال فصاحت و بلاغت انگریزی و عربی "الف لیلہ" سے ترجمہ کر کے ناول کے ڈھنگ پر تحریر کیا ہے۔" ناول کے ڈھنگ پر تحریر کرنے کی کیفیت یہ ہے کہ انہوں نے جو کہانیاں مناسب سمجھی ہیں اردو میں منتقل کی ہیں مگر اس طرح کہ طویل طویل کہانیاں ان کے یہاں چند صفحوں میں سما گئی ہیں۔ سرشار نے کونسی کہانیاں اردو میں منتقل کرنی مناسب سمجھی ہیں، اس سوال پر شاید یوں غور کرنا غلط ہو کہ "الف لیلہ" کی کونسی کہانیاں زیادہ اہم ہیں۔ ایسی کتابوں کے انتخاب میں بھی اکثر یوں ہوتا ہے کہ ہر دور اپنے مزاج اور رجحان کے مطابق اسے قبول کرتا ہے۔ تخلیقی افسانہ نگار

کی حیثیت سے اپنا خاص مزاج رکھتے تھے۔ سرشار جس زمانے میں پیدا ہوئے تھے اس کے بھی کچھ تعصبات تھے۔ وہ ایک چھوٹی چھوٹی قسم کی عقلیت پسندی کا زمانہ تھا۔ سر سید احمد خاں اس کے بہت بڑے علمبردار تھے اور سرشار ان کی اصلاحی تحریک کے بڑے قائل تھے۔ ایسی صورت میں جن دیو پری والی کہانیاں ان کے تخیل کے لئے مہمیز نہیں بن سکتی تھیں۔ انہوں نے ایسی کہانیوں کو اپنی کتاب میں جگہ تو دی ہے لیکن تحیر اور اسرار کی جو فضا ان کہانیوں کی جان ہے وہ ان کے یہاں زیادہ زور نہیں باندھتی۔ تحیر اور اسرار "الف لیلہ" کے نمایاں رنگوں میں سے ایک رنگ ہے۔ اس رنگ کو سرشار پوری طرح نبھا نہیں سکے۔

اور "الف لیلہ" کی "گرم" عورتیں ان کے یہاں اس حد تک "گرم" نظر نہیں آتیں تو اس کا باعث بھی اس زمانے کے اصلاحی رجحان اور ملکہ وکٹوریہ کے انگلستان سے درآمدہ اخلاقیات کو سمجھنا چاہئے! بس جو حال 'فسانۂ آزاد' کی عورتوں کا ہے، وہی حال "الف لیلہ" کی عورتوں کا ہوگیا ہے۔

"مافوق الفطرت" اور "غیر معمولی" کا جادو سرشار نہیں جگا سکتے لیکن معمولی اور روزمرہ کی زندگی سے نبٹنا وہ خوب جانتے ہیں۔ ایسی کہانیوں میں جہاں زندگی معمول پر چلتی نظر آتی ہے اور عام آدمی اس میں حصہ لیتا دکھائی دیتا ہے، سرشار خوب چمکتے ہیں۔ شاہانِ اولوالعزم، ان کے بلند محلات اور عالیشان دربار۔ ان سے سرشار مانوس نہیں ہیں۔ مگر نائی، درزی، موچی، مچھیرے، یہ سرشار کی دنیا کے لوگ ہیں۔ ان کے طور اطوار سے، ان کی حماقتوں اور کمزوریوں سے، ان کی چالاکیوں اور مکاریوں سے وہ خوب آشنا ہیں۔ "الف لیلہ" کی دنیا میں جہاں یہ طبقہ آباد ہے اس کا نقشہ انہوں نے بہت کامیابی سے کھینچا ہے۔ بکبک کبڑا اور معروف موچی "الف لیلہ" کے وہ کردار ہیں جو سرشار کے لئے ان کے اپنے کردار بن جاتے ہیں۔ یہ خوجی کی برادری کے لوگ ہیں۔ ان کی حماقت اور سادگی سرشار پر خوب ظاہر ہے۔

"الف لیلہ" کے بے آباد جزیروں اور بیکراں سمندروں میں سرشار کو خفقان ہوتا ہے۔ سندباد جہازی کی مہمات کو وہ کتنی عجلت سے بیان کر کے ختم کر دیتے ہیں مگر حجام برادران کے قصے وہ مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ معروف موچی کی داستان بھی انہوں نے اسی ذوق و شوق سے لکھی ہے۔ ایسے قصوں میں ان کا مزاحیہ انداز بیان اپنا رنگ دکھاتا ہے اور انہیں پڑھنے میں قاری کو وہی لطف آتا ہے جو 'فسانۂ آزاد' میں لے چکا ہے۔ سرشار شہزادیوں کے کمرۂ عروسی میں زیادہ نہیں ٹھہر سکتے انہیں شب وصل اور محبت کی سرگوشیوں کے بیان سے زیادہ میاں بیوی کی جوتم پیزار اور عاشق و معشوق کی گالم گلوچ میں مزہ آتا ہے۔ عاشق و معشوق میں جہاں جہاں یہ رشتہ پیدا ہوا ہے سرشار نے بڑی کامیابی سے اسے پیش کیا ہے۔

"الف لیلہ" ایک ہفت رنگ داستان ہے۔ وہ تو ایک دنیا ہے جس میں ایک خلقت جمع ہے۔ سرشار برٹن نہیں ہیں کہ اس پوری دنیا کو اس کے اصل رنگ میں دکھانے کی کوشش کریں اور خود پیچھے رہیں۔ تخلیقی آدمی کے ساتھ گھپلا یہی ہوتا ہے کہ اسے پیام رساں بنایا جائے تو پیام جوں کا توں نہیں پہنچاتا۔ وہ اپنی آواز اس میں شامل کر دیتا ہے۔ سرشار برٹن کی طرح پیچھے نہیں رہتے۔ وہ آگے آگئے ہیں اور "الف لیلہ" کی دنیا میں داخل ہوگئے ہیں۔ جو شہر، جو محلہ، جو گلی انہیں پسند آئی ہے، جس گلی کے لوگ انہیں بھا گئے ہیں، اس گلی کو اپنے شہر کی گلی اور ان لوگوں کو اپنے شہر کے لوگ سمجھ کر ان کا تذکرہ لکھ ڈالا ہے۔ محلات، اجنبی جزیرے، وسیع صحرا اور بیکراں سمندر، ان کی اپنی گلی نہیں ہیں۔ ان کے قصے انہوں نے فاصلہ پر کھڑے ہو کر سنائے ہیں۔

کچھ اسی قسم کا فرق ان کے طرز تحریر میں بھی نظر آتا ہے۔ "الف لیلہ" کی پُرتکلف زندگی کے بیان کے لئے انہوں نے پُرتکلف انداز بیان ہی اختیار کیا ہے اور مرصع اور مقفّٰی زبان لکھنے کی کوشش کی ہے۔ یوں یہ زبان لکھنے کی کوشش وہ "فسانۂ آزاد" میں بھی فرما چکے ہیں۔ مگر یہ ان کی اپنی زبان نہیں ہے۔ اس پُرتکلف زبان کو وہ بے تکلفی سے نہیں لکھ سکتے اور اسلئے وہ اس طرز تحریر والے داستان نگاروں سے اس رنگ میں دبتے نظر آتے ہیں۔ لیکن جا بجا وہ اس پُرتکلف زبان کو بالائے طاق رکھ کر اپنی زبان پر آجاتے ہیں اور یہاں ان کا قلم جادو جگاتا ہے۔ جہاں جہاں انہوں نے اپنے محاورے اور روزمرّہ والے طرز تحریر کو اختیار کیا ہے، بیان بھی بہت اچھا ہوگیا ہے اور کرداروں میں بھی جان پڑگئی ہے۔

★

گنجینۂ معنی کا طلسم

سید قدرت نقوی

الفاظ بھی گنجینۂ معنی کا طلسم ہوتے ہیں، اگر اس گنجینہ کا سراغ لگانے کی کوشش کی جائے جو ان میں پنہاں ہوتا ہے۔ یہ حق اس مضمون میں، جو "ترقی اردو بورڈ" کراچی، کے نمونۂ لغات اردو پر بے لاگ محققانہ تبصرہ ہے، ادا کیا گیا ہے تاکہ ادارۂ مذکور کو اس اہم تالیف کے معیاری و مستند بنانے میں مدد ملے۔ (ادارہ)

نشاط و عیش کی سرمستیاں معاذاللہ
حقیقت اور فسانہ میں امتیاز نہیں

مقامِ شکر ہے کہ ہماری موجودہ انقلابی حکومت ادب و فن کی ترقی میں گہری دلچسپی لے رہی ہے۔ سابقہ حکومتوں کے مقابلہ میں اس کا یہ کارنامہ قابلِ ستائش ہے۔ ہمیں یہ چاہئے کہ ہم صرف تعریف و تشکر ہی پر اکتفا نہ کریں بلکہ حکومت کی اس دلچسپی سے کماحقہٗ فائدہ اٹھانے کی کوشش بھی کریں۔ حکومت کسی کام کی تکمیل کا بیڑا اٹھا سکتی ہے، اس کو مکمل بھی کرا دیتی ہے، لیکن کام کی تکمیل کی خوبی کا سہرا جہاں حکومت کے سر بندھتا ہے، وہاں پایۂ تکمیل تک پہنچانے والی ہستیاں بھی لائقِ تحسین ہوتی ہیں۔ حکومت کے علاوہ دراصل کام کو مکمل کرنے والوں ہی کا نام باقی رہتا ہے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ جو ذمہ داری ہمارے سپرد ہے اس کو بخوبی انجام دیں۔

حکومت نے منجملہ دیگر اداروں کے اردو کی ترقی کے لئے ایک "بورڈ" قائم کیا جس میں ایسے مسلّمہ اہل الرائے ہیں، جن کا احترام سب کے دل میں ہے۔ بورڈ تین سال سے تدوینِ لغت کے کام میں مشغول ہے۔ عوام اور حکومت کو توقع ہے کہ وہ ایک ایسا جامع لغت مرتب کر کے پیش کرے گا جو زبان کے تمام شعبوں پر محیط ہوگا۔

سالِ گزشتہ مئی ۶۰ء، کے "ماہ نو" میں حرفِ الف کا لغوی نمونہ بورڈ کے سیکریٹری نے پیش کیا تھا۔ جس پر میں نے سرسری نظر ڈالی تھی۔ یہ تبصرہ "ماہ نو" ہی کے شمارہ "اگست ۶۰ء" میں شائع ہوا تھا۔ اب بورڈ نے اپنے رسالہ "اردو نامہ" کا ایک ضمیمہ بطور نمونۂ لغاتِ اردو شائع کیا ہے۔ جو اس کے خاکے، نقشِ اوّل یا پیش خیمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی اشاعت کا مدّعا یہ ہے کہ اس نمونہ کے بارے میں رائے عامہ معلوم ہو اور اس سے پورا پورا استفادہ کیا جائے تاکہ جو نقشِ کامل معرضِ اظہار میں آئے وہ ہر لحاظ سے قابلِ قدر، جامع اور ہمہ صفت موصوف ہو اور اس سے اردو زبان و ادب کی ایک نہایت اہم بنیادی ضرورت پوری ہو جائے۔ بالفاظِ دیگر اس نمونہ کی اشاعت اجتماعی اشتراکِ عمل کی ایک نہایت مستحسن صورت ہے اور جس جذبہ سے اس کو پیش کیا گیا ہے اس سے کام لیتے ہوئے ہمارا بھی یہ فرض ہے کہ اپنے معروضات کی شکل میں نہایت خلوص سے اپنی خدمات پیش کریں اور اس قومی کام میں انتہائی ذوق و شوق سے حصّہ لیں۔ لہٰذا سطورِ ذیل میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ اسی جذبہ کے تحت کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قدر عظیم کام میں فروگذاشتیں ناگزیر ہیں۔

اس نمونہ میں کل تہتّر الفاظ کے معنی درج کئے گئے ہیں اور انتالیس ضمنی مرکّبات و محاورات ہیں۔ سب سے پہلے اصولِ تدوینِ لغت کے متعلق چند باتیں عرض کی جاتی ہیں:

۱۔ ہر لفظ کے محلِّ استعمال کے لئے دو یا سوم سے مثال بیحد ضروری ہے، اگر دو یا سوم سے مثال نہ مل سکے، تو دیکھا جائے کہ وہ لفظ زبان کے موجودہ مزاج کے مطابق ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو اس کو "شاذ"، لکھا جائے اور اگر نہیں ہے تو "متروک"۔

۲۔ ایسے الفاظ کو جو دورِ اوّل میں مستعمل تھے اور دورِ دوم و سوم میں ان کا استعمال نظر نہیں آتا مگر وہ زبان کے موجودہ مزاج

کے مطابق ہیں ورنہ نہیں موجودہ دور میں استعمال بھی کیا جا سکتا ہے نہیں "شاذ" و "غریب" لکھا جائے۔ مثلاً لکھن ہار (لکھنے والا) نازنگر (نازنین)

۳۔ اگر دورِ سوم میں کوئی لفظ استعمال کیا گیا ہے اور اسے قبولیتِ عامّہ حاصل نہیں ہوئی تو اس کو بھی "شاذ" لکھا جائے۔

۴۔ اگر دورِ سوم سے مثال میسر نہ آئے تو مرتبین توضیحِ مطلب کے لئے اپنی طرف سے مثال ضرور لکھیں۔

۵۔ قدیم دکنی اردو سے جو الفاظ مثال کے طور پر پیش کئے جائیں، ان کی ممکن ہو تو موجودہ مروجہ املا تحت اللفظ لکھی جائے اور قدیم مشکل الفاظ کے معنی قوسین میں یا تحت اللفظ لکھے جائیں تاکہ مطلب بھی سمجھا جا سکے۔

۶۔ ہر لفظ کے عدد بحسابِ جمل لکھ دئے جائیں تو بہتر ہے اس سلسلے میں الف ممدودہ (آ) ہمزہ، ہائے مختفی اور ت بصورت (ۃ) کے اعداد کی تعین کرنی ضروری ہے۔ اس لئے اگر آگے چل کر تلفظ میں فرق پیدا ہوا ہو، تو اس کا پتہ چل جائے گا۔

۷۔ تلفظ کی صحت کے لئے اعراب کے علاوہ ہم وزن معروف لفظ بھی لکھ دیا جائے تو بہتر ہے جیسے: "اصغر" بروزن "اکبر" "اکثر"

۸۔ تذکیر و تانیث، واحد و جمع، ہر لفظ کے ساتھ لکھی جائے، نیز تنوین سے معنی میں جو فرق واقع ہوتا ہے، اس کو بھی ظاہر کیا جائے۔ یا تنوین والے لفظ کو الگ لفظ قرار دیا جائے جیسے: "نسلاً، اصلاً، اصولاً" وغیرہ۔

۹۔ جس لفظ کو مذکر یا مؤنث لکھا جائے اس کی مثال بھی ایسی تلاش کرنی چاہئے جس میں لفظ اسی حیثیت سے استعمال کیا گیا ہو

۱۰۔ تلاشِ امثلہ کے سلسلے میں جن حضرات کو مستند قرار دیا ہے ان کی تمام تصانیف کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔

۱۱۔ جہاں لفظ کسی فن وغیرہ سے متعلق ہو، اس فن کے نام کے ساتھ لفظ "اصطلاح" بھی لکھا جائے اور محلِ استعمال بھی درج ہو۔

۱۲۔ مصادر کے ساتھ اُن کے مشتقاتِ فعلی و اسمی بھی لکھے جائیں۔ ان کی ترتیب مقرر کر دی جائے تاکہ مشتقات کے نام ہر بار نہ لکھے جائیں (ماضی، مضارع، امر، اسمِ حاصلِ مصدر، اسمِ فاعل، اسمِ مفعولی، اسمِ حالیہ وغیرہ۔ جیسے: لکھا۔ لکھے۔ لکھ لکھائی۔ لکھنے والا، لکھا ہوا، لکھتا ہوا، (وغیرہ) تاکہ لغات میں مناسب حد تک گرامر کے اہم پہلو بھی پیشِ نظر رہیں۔

۱۳۔ ہر لفظ کے ساتھ وہ مصادر بھی لکھے جائیں جن کے ساتھ ترکیب دے کر اس کو استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ اصول نمونہ میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ایسے ہی اور اصول بھی ہیں جن سے بالفعل صرفِ نظر کیا جاتا ہے۔

ادارہ کا یہ کارنامہ تو یقیناً قابلِ ستائش ہے کہ اس نے معنی کی تعین اور امثلہ کی تلاش میں سعیٔ بلیغ کی ہے۔ حتی الوسع الفاظ کے مادّے اور مآخذ بھی ڈھونڈ نکالے ہیں۔ الفاظ کا تدریجی ارتقا بھی ملحوظ رکھا ہے۔ یہ تمام امور نہایت محنت اور تن دہی چاہتے ہیں۔ فردِ واحد کے بس کا یہ کام نہیں ہے۔ لیکن اس طرح کے کام کے لئے ایک لگن چاہئے۔ خدا کرے کہ ادارہ میں کام کرنے والوں میں یہ لگن موجود ہو اور کام احسن طور پر انجام پا جائے۔

اصولاً نمونہ میں ضبط شدہ الفاظ کے معنی کو مکمل تصور کیا گیا ہے۔ اگر ادارہ نے عمداً نامکمل الفاظ پیش کئے ہیں تو اس سے مغالطہ لازم ہے۔

"اب ۱۔ اب" کے معنی ۲ کی شکل ثانی ("موجودہ زمانے میں، زمانۂ حال میں، ماضی یا مستقبل کے مقابل") کی مثال معنی کی وضاحت نہیں کرتی۔ اس سلسلہ میں انیس و غالب کے کلام سے لاتعداد مثالیں مل سکتی تھیں۔ غالب کے ان شعروں میں علی الترتیب ماضی اور مستقبل کے مقابل کا مفہوم پایا جاتا ہے:۔

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

معنی ۳ کی شکل ثانی (اس نوبت پر، اس مرحلہ پر) کی مثال دوسرے دور کی ہے۔ تیسرے دور سے کوئی مثال پیش نہیں کی جو انتہائی ضروری تھی، یہ اشعار مثال کے لئے پیش ہیں:۔

ہے تم کو اب بھی نہ بنے بات کہ ان کو
انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے

غالب

راحت کے دن گذر گئے فصل اور ہے
اب یوں بسر کرو جو تیموں کا طور ہے
(انیس)

معنی ملا [بہت جلد، ترت، جھٹ پٹ (ذ ابھی کے معنی میں) کی جو مثال تیسرے دور سے دی ہے، اس سے بہتر یہ ہے:

اس شیر پر نہ ہوگی کوئی فوج فتحیاب
بس اب بنائے عالم امکاں ہوئی خراب (انیس)

معنی ۵ (حکم، دھمکی، تنبیہہ، ترغیب، التماس وغیرہ کے موقع پر جملہ انشائیہ میں "ظرفیت باقی نہیں رہتی اور موقع کے لحاظ سے معنی لئے جاتے ہیں) کی اس وضاحت میں "ظرفیت باقی نہیں رہتی" کا جملہ بہت خوب ہے۔ اب جہاں بھی ہوگا اس میں ظرفیت پائی جائیگی مرتبین کی پیش کردہ ہر مثال میں ظرفیت تمام و کمال موجود ہے مثلاً۔

گردن میں ہاتھ ڈال کے حضرت نے یہ کہا
لو اب اٹھالو تیغ و سپر تم پہ میں فدا

اس شعر میں "اب" اس وقت کے بعد مستقبل کے لئے استعمال ہوا ہے۔
وقس علیٰ ہذا

وضاحت میں یہ جملہ "موقع کے لحاظ سے معنی لئے جاتے ہیں" ہر پہلو سے اس لئے تشنہ ہے کہ مثالوں میں اب کے معنی متعین نہیں کئے گئے۔ تاکہ معلوم ہو جاتا کہ "اب" کے اس موقع پر کیا معنی ہیں۔ قوسین میں وضاحت کی جائے۔

تشریح میں مرتبین کے نزدیک "اب" قدیم پرتگالی لفظ ہے حالانکہ یہ پراکرت کا لفظ ہے۔

مرتبین نے "اب" کے سلسلہ میں حسب ذیل امور کو ملحوظ نہیں رکھا:

(۱) "اب" (عربی) بمعنی باپ، بزرگ۔ اردو میں "جد و عم" کے ساتھ ترکیب پاکر استعمال ہوتا ہے، تنہا استعمال نہیں ہوتا:
زید کے آب و جد کا حال معلوم نہیں مگر خود شریف انسان ہے۔
"تمہارے اب و عم مع الخیر جاگیر کو روانہ ہوگئے"
(خطوط غالب ص۱۰ طبع ثانی)

(۲) کبھی "اب" کا الف شعر کی تقطیع کرتے وقت ساقط ہو جاتا ہے اور اس کو اصول عروض میں جائز مانا گیا ہے:

بس اب بگڑنے پہ کیا شرمندگی جانے دو ملا جاؤ
قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہیں کیوں ہم نہ کہتے تھے (غالب)

اس شعر میں "بس اب" پڑھنے اور تقطیع کرتے وقت "بسب" ہو جائے گا۔

(۳) تشریح و معنی کی یہ صورت بھی ممکن ہو سکتی ہے:

(الف) جب کے مقابل، (صدور فعل کے بعد مستقبل میں نتیجہ و اثر کے اظہار کے لئے):

گھر جب بنالیا ترے در پر کہے بغیر
جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر (غالب)

"جب یہ کام کر ہی لیا تو اب ڈرنے سے کیا حاصل! جب ساتھی نہ رہے تو اب جینے کا کیا لطف"

(ب) جب سے ماقبل زمانۂ حال کے لئے:

خوش ہوں گا تم اب دل پہ اگر جبر کرو گی
مر جاؤں گا جب میں تو نہ کیا صبر کرو گی (انیس)

(۴) "اب" کے بحساب جمل تین عدد ہوتے ہیں۔

(۵) رہتک حصار وغیرہ کے جہلا "اِب" (بالف مکسور) استعمال کرتے ہیں۔

"اب اب کرکے" محاورہ لکھا گیا ہے۔ جس کے کوئی معنی متعین نہیں کئے گئے۔ غالباً "جامع اللغات" میں بھی یہ محاورہ درج ہے۔ دراصل یہ محاورہ عورتوں سے متعلق ہے۔ جو پانی پت میں زیادہ اور دیگر علاقوں میں کم استعمال ہوتا تھا۔ میری بوڑھیوں نے بتایا کہ ان کے بچپن میں کوئی کوئی عورت استعمال کرتی تھی اور وہ بھی غیر مہذب خاندان والی۔ اب بالکل متروک ہے۔ "فی الحال کچھ دنوں سے" اس کا مفہوم ہے۔ یہ مفہوم لکھ کر اس کو متروک لکھا جائے۔ "اب کے"، یہ مرکب درج کرنے سے پہلے "اب کا" کی طرف بھی غور فرما لیتے تو مناسب تھا۔ کیونکہ "کا" علامت اضافت ہے "کے"، "کا" کی حالت مغیرہ یا جمع کی صورت ہے۔ اسی طرح "اب کی" کا ذکر بھی ہونا چاہئے

۱؎ اس سے یہ قائم ہوگا کہ لفظ کے کتنا نشے عروض سے جا ملیں گے۔ دیکھیے اس اصل کے اطلاق میں "اب" کی تخصیص نہیں۔
بہ تنگی طرف سے مقتضی صاحب کو معذور ماصد ہے اور بس "اب" فی الحقیقت "لب" ہو جائے گا۔ (مدیر)

۲؎ بعض اہل لغت نے بھی اس طرح تجویز کی ہے۔ اصلاً یہ امر تحقیق طلب ہے۔ (ادارہ)

بحالت تانیث ہے۔ "اب کے" کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ الف نوعیت کے دو معنی لکھے ہیں اور اس کو بلا ترکیب اضافی لکھا گیا ہے۔ جو سراسر سہو ہے۔ اس کو ترکیب اضافی بحذف مضاف یا مضاف مقدر لکھنا چاہیے کیونکہ ہر مثال میں مضاف محذوف یا مقدر ہے۔ تلاش امثلہ میں کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی۔ پیش کردہ امثلہ:

شاخوں پہ نہیں پھول یہ تختوں پہ ہیں پریاں
دیوانو! بہار آئی نئے رنگ سے اب کے
اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

میں "اب کے" یعنی اب کے برس ہے۔ برس مقدر ہے جو حذف کر دیا گیا ہے اور متبادر ذہنی ہے۔ اس سلسلہ میں بہتر مثالیں مل سکتی تھیں جو مرتبین کے مقرر کردہ مفہوم کو بھی واضح کر سکتیں اور بلا ترکیب اضافی بھی ہوتیں۔ مثلاً:

(۱) اس دفعہ، اس مرتبہ، اس بار:

بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں
پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے (غالبؔ)

"حال میرا تباہ ہوتے ہوتے اب یہ نوبت پہنچی کہ اب کے تنخواہ میں سے [illegible] بچے" (مکاتیب غالبؔ ۸۳ طبع پنجم)

"یہ صحبت (قلعہ معلی کے مشاعرے) خود چند روزہ ہے کیا معلوم اب کے نہ ہو اور اب کے ہو تو آئندہ نہ ہو"[1] (اردوئے معلی ص۲۲۴ مطبوعہ کانپور ص۱۵۴ مطبوعہ لاہور)

(۲) آئندہ، اگلی بار، پھر:

"انشاء اللہ تعالیٰ اب کے جو خط تم کو لکھوں گا، اس کا مضمون یہی ہوگا، خاطر عاطر جمع رہے (خطوط غالبؔ ۱۰۷)

مرتبین "اب کے سے" کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟ "اب کے سے لاہور گیا تو ضرور ملوں گا" اکثر سنا ہے۔

ب نوعیت کے تین معنی بیان ہوئے ہیں جس میں ۱ و ۲ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر دونوں کو ایک جگہ لکھا جائے تو امثلہ میں بھی تسلسل اور ارتباط قائم ہو جائے۔ تشریح میں تحریر ہے:

["بصورت واحد" "کے" "کا" کی ظرفی حالت ہے۔ "سے" سنسکرت [illegible] سے ماخوذ ہے]

اس سلسلہ میں گزارش ہے کہ مثالوں میں ترکیب اضافی پائی جاتی ہے۔ مضاف کے مقدر ہو جانے سے اضافت ختم نہیں ہو جاتی۔ اب رہی یہ بحث کہ میں نے جو مثالیں بلا ترکیب اضافی کی پیش کی ہیں، ان کو کیا کہا جائیگا۔ یہ بحث "کے" سے متعلق ہوگی جس کو "کے" کی ردیف میں بیان کرنا چاہیے تھا۔ "کے" "کا" کی مغیرہ یا جمع کی حالت کے علاوہ کبھی استعمال کرتے ہیں جو صرف تزئین و الحاق کا کام دیتا ہے، جیسے "اگر بار موحدہ کے معنی معیت کے لیں"۔ یہاں "کے" ربط و الحاق کلام کے لئے ہے، یہ اردو روزمرہ ہے۔ "اب کے جو خط تم کو لکھوں گا" میں "کے" صرف تزئین کلام کے لئے ہے۔ ورنہ "کے" نہ لکھا جائے تو بھی مفہوم ادا ہو جاتا ہے "اب جو خط تم کو لکھوں گا" میں "اب" سے بھی وہی مفہوم پیدا ہوتا ہے جو "اب کے" سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح مثال اول سے بھی حذف کر کے مطلب حاصل کر سکتے ہیں: "اگر باء موحدہ کے معنی معیت لیں"۔ پس یہ "کے" تزئین و الحاق کے لئے ہے "کے" ظرفیت کے لئے نظر سے نہیں گزرا۔ یہاں تو اضافت کے لئے بھی نہیں ہے "کے" بجائے "کر" (فعل) "کے" اضافت کی علامت، یا تزئین و ربط کلام کے لئے آیا کرتا ہے۔

"سے" سنسکرت اسے [illegible] سے ماخوذ ہے" کا سراغ مجھے نہ مل سکا۔ اگر یہ علامت ظرفی کے لئے ہے تو اسکی مثال اور نظیر کم از کم اردو میں نظر سے نہیں گزری۔ قاعدۂ کلیہ اردو یہ ہے کہ الف بحالت مغیرہ و جمع یائے مجہول سے بدل جایا کرتا ہے جیسے لڑکا سے لڑکے وغیرہ۔

"اب کا" وہ تمام امور جو "اب کے" سے متعلق ہیں ان کا تعلق دراصل اس سے ہے کیونکہ "کا" کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ عام بول چال ہے "کل گندم کا بھاؤ سترہ روپے من تھا اب کا بھاؤ معلوم نہیں (اضافی) کل جب میں عیادت کو گیا تھا مریض کا حال کچھ بہتر تھا، اب کا معلوم نہیں (مضاف مقدر) اگر باء موحدہ کا مطلب معیت کا لیں (تزئین کلام)"

"اب کی" حالت تانیث کو بھی اسی کے تحت بیان کرنا چاہیے:

کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال
کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار (غالبؔ)

---

[1] خطوط غالبؔ ص۱۵۱ یعنی "اب کے ہو" کی جگہ "اب ہی ہو" غلط چھپا ہے۔

[2] خطوط غالب ص۱۲۲

کرلے نہ پاپ صنف سے شور رضوان تمام

اب کی بہار کا یونہی گزرا برس تمام (نسخۂ حمیدیہ ۱۰)

تم کہو تم نے کہا وہ توکل کی حالت تھی، اب کی سنائو!

ابتر: اس لفظ کے معنی ۱۔ (آوارہ، بدچلن، بیشمار) کو متروک لکھا جانا چاہیے کیونکہ "ابتر" آجکل ان معنی میں استعمال نہیں کرتے معنی ۲۔ کی تشریح میں کنجفہ کے ساتھ اصطلاح کا لفظ بھی لکھا جائے نیز تشریح کا جملۂ اوّل اس طرح ہو: "بے میر کی بازی ابتر" کیونکہ اسی طرح استعمال کرتے ہیں بلکہ تاش کی بازی میں "بلا ترپ بازی ابتر" استعمال کیا جاتا ہے یعنی تقسیم غلط ہے دوبارہ تقسیم ہو۔ معنی نمبر۵ میں بھی عروض کے ساتھ لفظ اصطلاح لکھ جائے اور وضاحت کی جائے کہ بحر متقارب کے آخری رکن میں واقع ہوتا ہے، بحرِ متقارب ابتر کہتے ہیں "فعولن فعولن فعولن فع" (بتر فعولن سے وتد کو خارج کرنا "لن" رہ گیا، اسکی جگہ فع استعمال ہوا)۔

"ابتر" کے حسب ذیل معنی بھی مدنظر نہیں رکھے گئے ہیں:

۱۔ مقطوع النسل، بے اولاد، (ترجمۂ قرآن) کفار نبی کریم کو "ابتر" یعنی مقطوع النسل کہا کرتے تھے۔ لہٰذا خدا نے فرمایا کہ اے رسولؐ بیشک تیرا دشمن ابتر ہے"۔ اگرچہ یہ معنی عربی ہیں لیکن اردو کی جامعیت کے پیش نظر اسکی صراحت بے جا نہ ہوگی۔

(۲) بے ترتیب، بے تنظیم، ترتیب و تنظیم کا قائم نہ رہنا:

"اس بہادر نے ایسا حملہ کیا کہ فوج ابتر ہو گئی، صفیں ٹوٹ گئیں، میمنہ، میسرہ اور قلب کا امتیاز جاتا رہا"۔

(۳) نزع کی حالت، قریب مرگ ہونا:

دیکھتے ہی دیکھتے مریض کی حالت ابتر ہو گئی، اور ملکِ بقا کو سدھا گیا۔

(۴) پریشان حال:

آجکل وہ بہت ابتر ہے، نہ کھانے کو روٹی نہ پہننے کو کپڑا۔

ابتری: ابتر ہی کے ذیل میں ابتری کو بھی بیان کرنا چاہیے جیسے ابد کے ساتھ ابدی کو بیان کیا گیا ہے۔ ابتری کو بدنظمی، بے ترتیبی اور انتشار کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے:

"اس خبر سے سارے ملک میں ابتری پھیل گئی، مقرر نے جب یہ بات کہی جلسہ میں ایسی ابتری پھیلی کہ بلوہ ہوتے ہوتے رک گیا"۔

ع: فوجوں میں ابتری تھی کہیں، یہ بھی کہیں (انیس)

کبھی کبھی مفلسی و ناداری کے معنی بھی لے لئے جاتے ہیں: "بیچارا آج کل تہی ابتری کی حالت میں زندگی بسر کر رہا ہے"۔

ابد: اس لفظ کے سب معنی ہیں مذکر تا ایک ... بیان ہوئے ہیں۔ معنی ۱۔ زمانہ جس کی انتہا نہ ہو (ازل کی ضد) مثال میں دو شعر ہیں۔ ایک میر کا دوسرا اقبال کا، لیکن مثال کے طور پر کوئی شعر ایسا نہیں ہے جس میں ابد مذکر نظم کیا گیا ہو جبکہ اسکی ضرورت تھی تاکہ مذکر استعمال کا پتہ چل جاتا۔ اگر یہ امر ملحوظ رکھا جاتا تو مثال دشوار نہ تھی مثلاً یہ شعر:

مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا

خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے

ب حرز کے معنی نمبر ۲ [(تصوف) مرتبۂ ذات باری] میں اصطلاح کا ذکر نہیں کیا گیا، اور کوئی مثال پیش نہیں کی گئی، تاکہ محل استعمال کا پتہ چل جاتا اگر "خدا ازل سے ہے ابد تک رہے گا" مرتبین کے مقرر کردہ مفہوم کی مثال ہو سکتی ہے تو یہ معنی تصوف سے مخصوص نہیں، عام ہیں۔

ابداً: ابد ہی کو بھی ابد کے ذیل میں بیان کرنا چاہیے: تا ابد ہمیشہ ہمیشہ:

نسبتِ نام سے اس کے ہے یہ رتبہ کہ رہے

ابداً پشت فلک خم شدۂ ناز زمیں (غالب)

ابد الآباد: ۔ الف معنی (دوام، ہمیشگی، غیر منقطع مدت، جاودانی زمانہ، ابد کی تاکید کے طور پر) کی مثال "وہ ابدالآباد کی خاطر یہاں سے وہاں جانے کیا بار ہے"۔ سب رس از ملا وجہی سے دی گئی ہے۔ قدیم دکنی اردو کے غیر رائج الفاظ کے معنی تحت اللفظ لکھے جائیں تاکہ مفہوم واضح ہو جائے "خاطر" کے معنی اس کے نیچے یا قوسین میں لکھے جائیں۔

ابد الدھر: کو بھی بیان کیا جانا چاہیے تھا کیونکہ فارسی کا یہ شعر بطور ضرب المثل استعمال ہوتا ہے: ہمیشہ ہمیشہ۔

ہر کس کہ نداند و بداند کہ بداند

در جہل مرکب ابدالدھر بماند

اردو میں غالباً یہ شاذ و غریب ہے۔

ابداً مؤبّداً، (بمعنی ہمیشہ ہمیشہ، ہرگز ہرگز، کبھی بھی) کو کیوں ترک کیا جائے؟ مثال:

"اب مدۃ العمر ابداً مؤبداً حضرت کو کوئی غم نہ ہو" (مکاتیب غالب)

ابدی: تشریح میں ابدی کی "ی" کو مشدد ظاہر کیا گیا ہے۔

عربی میں بشکل "ی" مشدد ہے لیکن اردو میں مشدد نہیں ہے۔ اس کی تصریح کر دی جائے۔

ابدیت: ابدی کے ساتھ ابدیت کو بیان نہیں کیا گیا۔ اسکو بھی لکھا جائے "ابدی ہونا" (معنی) [ابد + ی (نسبت) + ت (مصدر) (تشریح) مثال: "خدا کی ذات کے متعلق ازلیت و ابدیت کی بحث کرنے میں زمان و مکان سے ماورا سوچنا پڑتا ہے"

ابر: اس لفظ کے معنی ۲، ۳ میں اصطلاح کی وضاحت نہیں کی گئی، مثالیں بھی نہیں دی گئیں۔ مرکبات میں ابر بہار، بہاراں مذکور اور ابر بہاری معدوم ہے۔ دور سوم سے مثالیں نہیں دی گئیں: ابر بہار اور ابر بہاری کی مثال میں غالب کے یہ شعر ہیں:

باغ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل
ابر بہار خمکدہ کس کے دماغ کا

ہے مجھے ابر بہاری کا برس کر کھلنا
روتے روتے غم فرقت میں فنا ہو جانا

مرکبات میں "ابر تر، ابر تنک، ابر دریا بار، ابر رحمت، ابر سیاہ، ابر باراں، ابر بہار، ابر بہاراں، ابر بہمن، ابر سپر، کی مثالیں دور سوم سے پیش نہیں کی گئیں، بعض کی مثالیں علی الترتیب پیش کر رہا ہوں:

ابر تر: بجلی بھی ابر تر بھی خزاں بھی بہار بھی
تلوار بھی چھری بھی سپر بھی کٹار بھی (انیس)

ابر تنک: "رات کو خوب مینہ برسا ہے صبح کو تھم گیا ہے ہوا سرد چل رہی ہے ابر تنک چھا رہا ہے" (خطوط غالب ص۱۰)

ابر دریا بار: دھوئیں سے آگ کے اک ابر دریا بار ہو پیدا
اسد حیدری ہیں تو سے اگر ہوئے دو چار آتش (نسخۂ حمیدیہ ۸۸)

ابر رحمت: ابر رحمت کی طرف جا، یہ صدا دیتے ہیں
سب ترے دامن دولت کا پتہ دیتے ہیں (انیس)

ابر سیاہ: دشمنِ حسرت عاشق ہے رگ ابر سیاہ
جس نے برباد کیا ریشۂ چندیں شب تار (نسخۂ حمیدیہ ۲۹۴)

مرتبین نے "ابر نیساں، ابر کرم، ابر قطرہ زن، ابر غلیظ، ابر گہر بار، ابر شام، ابر غم، ابر سا وغیرہ مرکبات کو بیان نہیں کیا: امثلہ:

ابر نیساں یہ تنک بخشی شبنم کب تک
میرے کہسار کے لالے ہیں تہی جام ابھی (اقبال)

ہیں ابر کرم، آپ کرم کیجئے بابا
سایہ کہیں مل جائے تو دم لیجئے بابا (انیس)

بجلی کسی جگہ تو کہیں ابر قطرہ زن
بن بن کے آتے جاتے تھیں طاؤس کا چلن (انیس)

ع: رن میں جو گھرا ابر غلیظ اہل ستم کا (انیس)

رخ پہ دولہا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگ ابر گہر بار سراسر سہرا (غالب)

اے ابر شام چاند ہمارا ہے کس طرف
اے عارض کربلا وہ سدھارا ہے کس طرف (انیس)

ابر سا دل پہ چھایا ہے
زندگی غم کا سایہ ہے (نامعلوم)

ابر غم چھٹ جائے بہہ نکلیں جو آنسو آنکھ سے
ہے دھواں سا دل پہ میرے ہجر میں چھایا ہوا (نامعلوم)

ان کے علاوہ اور بھی مرکبات ہیں مثلاً ابر تیغ، دھواں دھار ابر، ابر (دھوندن کار) وغیرہ۔

ابری: ابر کے ساتھ "ابری" کا ذکر بھی ہونا چاہئے: وہ کاغذ جس پر مختلف رنگوں سے لہریا نقوش بنائے گئے ہوں، ایک مخصوص رنگین منقش کاغذ جو کتابوں وغیرہ کی جلدوں پہ آرائش کے لئے لگایا جاتا ہے: "تمہاری کتاب کی جلد پر صرف ابری لگانی باقی ہے۔"

ابرام: بمعنی تقاضا کی مثال میں اگر غالب کا یہ شعر دیا جائے تو بہتر ہو:

ہے قہر گر اب بھی نہ بنے بات کہ ان کو
انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے

ابھی: (الف) کے ضمن میں معنی ۲، ۳ کے لئے دور سوم سے کوئی مثال نہیں دی گئی: امثلہ درج ذیل ہیں:

معنی ۲ (فی الحال، اس وقت، سردست) کے لئے غالب اور اقبال کے یہاں کافی مثالیں ہیں: غالب

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو

جاں ہے بہائے بوسہ دلے کیوں کہے ابھی
غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

معنی ۳ (زیادہ دیر پہلے، حال ہی میں): غالب

لو تم ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا

گویا ابھی سنی نہیں آواز صور کی

ع : باتیں یہ ابھی تھیں کہ شہ بحر و بر آئے (انیس)

معنی ۲ کے لئے یہ مثال بہتر ہے، (ذرا دیر بعد) غالب :

ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو

آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

نمونہ میں درج شدہ معنی کے علاوہ اس معنی کو بھی ملحوظ رکھا جائے :

(زمانہ ماضی میں صدور و وقوعِ فعل سے قبل یعنی اس وقت)

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا

میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا (غالب)

عروسِ شب کی زلفیں تھیں ابھی نا آشنا خم سے

ستارے آسماں کے بے خبر تھے لذتِ رم سے (اقبال)

(ب) معنی (ہنوز، اب تک) کے لئے اقبال کی ایک غزل مطبوعہ بانگِ درا ص ۲۱۸ جس کی ردیف ہی "ابھی" ہے، خاص طور سے ملحوظ رکھی جائے۔ اس کا مقطع بالخصوص اس معنی کے اظہار کے لئے بہتر ہے :

خبر اقبال کی لائی ہے گلستاں سے نسیم

نو گرفتار پھڑکتا ہے تہِ دام ابھی

ابھی ابھی : ابھی کی تکرار کو بھی بیان کرنا چاہئے، معنی : اسی آن، فوراً کچھ دیر نہیں ہوئی :

احسان کب گیا ہے ؟ ابھی ابھی گیا ہے !۔ ابھی ابھی دم توڑا ہے۔ ابھی ابھی لے آؤ !

اَپَج : (یا جی کی تفصیل) بجز لکھنؤ اور کہیں استعمال نہیں ہوتا۔ وہاں بھی ثقہ حضرات اس کو نہیں بولتے۔ لہٰذا اسکو شاذ اور غریب لکھنا چاہئے۔ اور لکھنؤ کے استعمال کی تصریح کرنی چاہئے۔

اُپَج : دورِ جدید میں اس کا استعمال انگریزی اثر کے تحت بمعنی ORIGINAL اور کبھی کبھی بمعنی (INNOVATION) عام ہو گیا ہے۔ اور اس کی ضرورت بھی ہے۔ خصوصاً اور تخلیقی کے معنوں میں۔ اسے رواجِ قدیم کے مقابلے میں رواجِ جدید اور مستند سمجھنا چاہئے بعض، مثلاً ڈاکٹر خالد نے "اپج" بمعنی ہیکل بھی استعمال کیا ہے تیکر اپج تحقیق نے "دسترو دئو"

اپچس : اس لفظ کو شاذ اور غریب لکھ دینا چاہئے۔

اپچنا اور اپچھنا : ان دونوں کو متروک لکھنا چاہئے۔ دورِ سوم میں مستعمل نہیں ہیں بلکہ بعض علاقوں میں اپجنا کی جگہ ابجنا (الفا) استعمال ہوتا ہے۔ پ، ج کے ساتھ ثقالت پیدا کرتی ہے، اس لئے اس کو ب سے بدل کر بولنے لگے۔ دیہات میں اکثر بولا جاتا ہے۔ جیسے بچ ابھی تک نہیں ابجا۔ اگنے کے علاوہ، جسم کی کسی غلیظ مادہ کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے دانے کثرت سے ظاہر ہو جانے کے معنی میں بھی استعمال کرتے ہیں جیسا کہ سارا بدن ابجا پڑا ہے۔ اپچنا متروک اور ابجنا استعمال جہلا یا دیہاتی لکھا جائے۔

اپنے : اس لفظ کے سلسلہ میں سب سے پہلے یہ مسئلہ زیر بحث آئے گا کہ یہ لفظ بنیادی نہیں ہے بلکہ "اپنا" ضمیر اضافی کی حالت جمع یا مغیرہ ہے پس اصولاً "اپنا" کو بیان کرنا چاہئے اور اسی کے ضمن میں "اپنی" حالت تانیث اور "اپنے" حالت جمع یا مغیرہ کو بیان کیا جائے۔ نہ معلوم مرتبین اس اصول کو کیوں نظر انداز کر دیا۔

الف معنی ۱ (اپنا کی جمع کے لئے دورِ سوم سے مرتبین نے کوئی مثال پیش نہیں کی ہے۔ حالانکہ یہ اتنا کثیر الاستعمال لفظ ہے کہ ایک نہیں سینکڑوں مثالیں موجود ہیں ؛ غالب :

خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ

کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے

معنی ۱ ۔ (اپنا کی مغیرہ حالت) اس کے لئے بھی کوئی مثال دورِ سوم سے مرتبین کو نہ مل سکی، حالانکہ ہر شاعر کے کلام میں اس کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں ؛

ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ

یا رب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا (غالب)

قمری اپنے لباس نو میں بیگانہ سا لگتا تھا

نہ تھا واقف ابھی گردش کے آئین مسلم سے (اقبال)

ب معنی ۲ (ساتھی، رفیق، عزیز اقارب، پرائے کی ضد) کے لئے بھی دورِ سوم سے کوئی مثال نہیں لکھی گئی، حالانکہ حالی کی مسدس کا یہ مصرع زبان زد خاص و عام ہے : "وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا" اس کے علاوہ بھی بہت سی مثالیں مل سکتی تھیں ؛

"عیاذاً باللہ ! وہ لوگ دیوان خانہ میں سے آئیں جا تھیں اپنے بیگانے کو پہچانا تیاں نظر آئیں۔" (خطوطِ غالب ص ۱۹)

"جب اپنے ہی اپنے نہ رہے تو غیروں کی کیا شکایت۔" عام مستعمل ہے۔

معنی ۳ (تزئینِ کلام کے لئے خود یا آپ کے معنی میں مستعمل) دورِ

سوم سے کوئی مثال نہیں دی گئی۔ مثالوں میں جہاں مستعمل کیا گیا ہے یہ استعمال اب متروک ہے۔ اسی طرح کسی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔

(۱) اپنا کے ذیل میں "اپنا" بھی آتی ہے جس کے معنی رشتہ دار، دوست وغیرہ کے آتے ہیں۔ آئیں:

غم ہمیں اپنوں کے ہیں کیوں نکر نہ کریں بالالتماس
ان کو روؤں گا میں جب تک کہ جیوں گا واللہ
غیروں سے نہ ملے تو کوئی بات نہیں ہے
اپنوں سے مگر چاہئے یوں کھنچ کے نہ رہنا (اقبال)

"اپنوں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا، غیروں کا تو ذکر ہی کیا" عام استعمال ہے۔

(۲) "اپنے آپ" بمعنی خود، اپنی ذات، اپنا وجود، کو بھی بیان کرنا چاہئے

اقبال:

ڈھونڈھتا پھرتا ہوں اے اقبال اپنے آپ کو
آپ ہی گویا مسافر آپ ہی منزل ہوں میں

(۳) اور "اپنے آپ" بمعنی خود بخود، آپ سے آپ، بھی استعمال ہوتا ہے "وہ اپنے آپ، بغیر بلائے چلا آیا"۔

(۴) "اپنا" "اپنی" کے متعلق بھی امور بالا بیان کئے جائیں۔ یہ دونوں بھی تمام مذکورہ معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ طوالت کی وجہ سے کل امثلہ بیان نہیں کی گئیں صرف ایک دو مثالیں پیش ہیں: "اپنا کہا یہ آپ بھیں" "اپنا مارے، سایہ میں ڈالے" "اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے" وغیرہ

(۵) "اپنا سا منہ لے کر رہ جانا" : شرمندہ ہو جانا۔ عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ غالب:

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

تشریح: [اپن مسے (علامت جمع یا اعراب)] لکھی گئی ہے جو درست نہیں کیونکہ دراصل لفظ "اپ" ہے جس کی اشباعی شکل آپ بنی ہے۔ نا، نی، نے، اضافت کی علامتیں ہیں۔ قدیم دکنی اردو میں "اپ" کی یہ مختلف شکلیں (اپس، اپن، اپیں، آپیں، اپے، اپنے، آپ) پائی جاتی ہیں جن میں بنیادی لفظ "اپ" موجود ہے۔ اسرار التوحید، معرفت السلوک، شرح مرغوب القلوب، سب رس، پھول بن، کلیات غواصی میں ہزاروں مثالیں مل سکتی ہیں:

اپسے لیل جیسن کیں، نظر کوئی نہ آئے تیوں
اسے پہلے جگ میں آپ جیسیں دستوں کیا (غواصی)

"آپے بھلے تو عالم بھلا۔ اپنا سر لیے پھوٹیا۔ اپنا کیا اپنے پاوے" (سب رس)
اللہ صاحب آپ خود اہے
ہر جاگا میں موجود اہے (پھول بن)

اس شعر میں آپ سما ہی نہیں سکتا۔

"اپن" دراصل ضمیر ہے جس کے ساتھ علامت اضافت کا، کی، کے بھی استعمال ہو سکتی ہے۔ "یہ اپن کا کام نہیں۔ اپن کی بات کوئی نہیں سنتا۔ اپن کے پاس دولت کہاں؟" دکن، بمبئی اور یوپی (لکھنؤ، فیض آباد، کانپور وغیرہ) میں اپن کا استعمال عام ہے۔ بلکہ ہم اور تم کے ساتھ بھی اسی طرح "ن" اضافہ کر کے ہمن اور تمن استعمال کرتے ہیں: "ہمن کا بھات کھائے گیو" (تم ہمارے چاول کھا گئے) "تمن کی جات کون نہیں جانت ہے" (تمہاری ذات کون نہیں جانتا) ان سب کے ساتھ "نے" علامت فاعل اور "کو" علامت مفعول بھی استعمال ہو سکتی ہے۔ غرض اگر اپن کو مادہ قرار دیا جائے تو علامت اضافت "ا، ی، ے" کو ماننا پڑے گا لیکن چلا ہل قواعد کا یہ کلیہ کہ "نا، نی، نے" علامات اضافت ہیں کو غلط قرار دینا پڑے گا۔ جس کی تخفیف کے لئے کوئی ثبوت نظر نہیں آتا۔ قدیم دکنی اردو میں تو ہنا، تمنا بھی پایا جاتا ہے "تمنا یاد کرے گا اپنا دل شاد کریگا" (سب رس)
اس کو کیا کہا جائے گا؟

"پن" بطور لاحقہ برائے حاصل مصدر بھی استعمال ہوتا ہے۔ اب بھی لڑکپن، بچپن، چھٹپن، بانکپن وغیرہ رائج ہیں۔ قدیم دکنی اردو میں "پن" بمعنی خودی، غرور مستعمل ہوتا رہا ہے:

جب میں پن تے گزریا تب باتے میں کنھار نپڑیا
خودی سے بات کنارے پہنچا (پھول بن)

"اپ پن" بمبئی والوں کی زبان سے اکثر سنا گیا ہے۔ غرض اپن کو مادہ قرار دینے کا کوئی مناسب پہلو نظر نہیں آتا۔ اراکین ترقی اردو بورڈ امور مذکورہ بالا کو پیش نظر رکھتے ہوئے غور فرمائیں۔ میرے نزدیک [اپ + نا (نی نے)] ہونا چاہئے۔

اپنیت: الف معنی (فقیر، سادھو وغیرہ) میں متروک اور ب معنی (اصطلاح موسیقی) میں غریب لکھا جائے اور مثال بھی لکھی جائے۔

اپنا: متروک ہے لیکن اس کی تصغیر اپنی اور اپنا اثر رائج ہیں جن کو بیان نہیں کیا گیا، ان دونوں کا اندراج ضروری ہے۔

اُجالا معنی ۱۲ کی مثال دو درسوم سے نہیں دی گئی، حالانکہ کافی مثالیں مل سکتی تھیں، الف، ب معنی کی دونوں صورتوں کے لئے استشہاد ہیں۔
[(الف) رونق، زینت]۔

ہ — ایسا بیٹا جسے اٹھا کے پرسس پالا ہے

گھر سے جاتا ہے وہی گھر کا جو اجالا ہے (انیس)
(اجیالا)

[(ب) نور بصیرت روحانی]

بے لوث محبت ہو بے باک صداقت ہو

سینوں میں اجالا کر دل صورت مینا دے (اقبال)

مرتبین نے امور ذیل کو ملحوظ نہیں رکھا ہے:

(۱) اجالا، ماضی از اجالنا (زیورات وغیرہ کا میل دور کر کے چمکانا) "سنار نے زیور ابھی تک نہیں اجالا" عام استعمال ہے۔ اجلانا (لازم) اجالنا (متعدی بالواسطہ)، اجلوانا (متعدی المتعدی) عام طور پر استعمال ہوتے ہیں غالباً ڈپٹی نذیر احمد کی "مراۃ العروس" میں کسی جگہ ان میں سے ایک استعمال ہوا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اجالنا سے اجالا، حاصل مصدر بنکر نور اور روشنی کے معنی میں رائج ہو گیا ہو۔ امر کے بعد الف لگا کر حاصل مصدر بنا لیتے ہیں۔ جیسے سنبھال سے سنبھالا، نکال سے نکالا، لپک سے لپکا۔ کوند سے کوندا وغیرہ۔ اجالا کرنا (صفا یا کرنا) کے معنی میں اجالا حاصل مصدر ہی ہے" مگر اجالا" میں اجالا بطور اسم فاعل استعمال ہوا ہے اجال امر کے بعد الف فاعلیت کا ہے یعنی گھر کو چمکانے والا، اور مرادی معنی زینت و رونق کے لے لئے گئے۔

(۲) اجالا کا ایک تلفظ" اجارا" بھی ہے جو اجیالا کی ابدالی شکل ہے کہ "لام" ہندی میں" رے" سے بدل جایا کرتا ہے: باؤلا سے باورا۔ بدلیا سے بدریا اس تبدیلی کی بین مثالیں ہیں۔

(۳) معنی ۱۲ الف کی مثال" روپ بہو تیج آلا" قدیم دکنی اردو ہے جس کے سمجھنے والے اب بہت ہی کم ہیں۔ ایسے تمام جملوں یا لفظوں کی تشریح ہونی چاہیئے۔ یا تو تحت اللفظ میں ترجمہ لکھا جائے یا قوسین میں لکھ دیا جائے "روپ بہو تیج آلا (روپ بہت ہی اعلیٰ) تاکہ مثال کو بھی سمجھ لیا جائے، ورنہ اس لغات کے سمجھنے کے لئے ایک اور لغات درکار ہوگی۔ کہیں ڈھنڈو پاڑ مندوالا معاملہ نہ ہو جائے۔

اچپل، اچپلی، ان دونوں کو غریب یا متروک لکھنا تھا کیونکہ اب مستعمل نہیں ہیں۔ اصولاً اچپل کے بعد اچپلا لکھنا چاہیئے تھا۔

اداس: اس لفظ کے الف معنی میں" لاپروائی" اور تشریح میں "لاپروا" کے الفاظ محل نظر ہیں۔ کیونکہ "لا" حرف نفی عربی کا ہے۔ فارسی اور ہندی الفاظ کے ساتھ اس کا الحاق مناسب خیال نہیں کیا گیا۔ ثقہ حضرات "بے پروائی" اور "بے پروا" استعمال کرتے ہیں۔

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک

کیا مزہ ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک (غالب)

غالب نے اپنے کسی خط میں بھی اس مسئلہ پر خاطر خواہ روشنی ڈالی ہے۔ میرے خیال میں "بے پروائی" اور "بے پروا" کے استعمال کو ترجیح دینی چاہیئے۔

ب معنی ۲۳ (بیزار، اچاٹ، روگرداں) کی مثال دور سوم سے نہیں دی گئی۔ یہ جستجو میں کوتاہی معلوم دیتی ہے: (انیس):

غمگیں ہوں مردہ دل ہوں، حزیں ہوں، اداس ہوں

دم توڑ دو تم ہے غضب اور میں نہ پاس ہوں

اداسا: اس لفظ کو متروک لکھنا چاہیئے۔ دور سوم میں اس کا استعمال نہیں پایا جاتا۔

اداسی: مرتبین نے "اداس" اور "اداسا" کے ساتھ "اداسی" کو نظر انداز کر دیا ہے (بے رونقی، غمگینی، سنسان ہونا، سونا پن، بیزاری وغیرہ کے معنی میں مستعمل ہے):

خدام کھڑے پیٹتے ہیں قبر نبی کے

روضہ پہ اداسی ہے رسول عربی کے (انیس)

تجھ پہ برساتا ہے شبنم دیدۂ گریاں مرا

ہے نہاں تیری اداسی میں دلِ ویراں مرا (اقبال)

بلکہ جذبات کی کمی یا ختم ہو جانے کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں: "نسیمہ کی شادی کی خبر سے اس کے ارمانوں (جذبات) پر اداسی چھا گئی۔"

اداسی کے ایک اصطلاحی معنی بھی سننے میں آئے ہیں جو تحقیق طلب ہیں یعنی "ایام ماہواری" ——— سنا ہے کہ شوہر سے مقاربت پر معذوری ظاہر کرنے کے لئے عورتیں بوجہ پردہ داری دحیا، اس طرح بولتی ہیں "آجکل اداسی چھائی ہوئی ہے۔" ....

ادھر: اس لفظ کے معنی کو جن دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے وہ کسی حیثیت سے بھی درست نہیں ہیں کیونکہ الف کو اسم مذکر اور ب کو مفعول لکھا گیا ہے۔ اسم اور مذکر تو ایک حد تک درست لیکن مفعول معنی چہ؟ یہ تو کہا نہیں جا سکتا کہ مرتبین مفعول کو بھی نہیں جانتے لیکن اُدھر اسم مفعول تو ہے نہیں، اور اگر جملہ میں بطور مفعول مراد ہے تو یہ تخصیص اُدھر ہی کو حاصل نہیں۔ جملہ میں تو ہر اسم بطور مفعول استعمال ہو سکتا ہے۔ اُدھر کو ہم بطور فاعل بھی استعمال کر سکتے ہیں جیسے سامان رکھنے میں اسکے اِدھر اُدھر نے پریشان کر دیا" یا "تمہارے اِدھر اُدھر، اُدھر اِدھر ہونے آ کر

مجھے نیچے گرا دیا۔"

انتہائی تعجب انگیز امر یہ ہے کہ "ادھر" کو بطور ظرف نہیں لکھا گیا جو اس کا اصلی مقام اور حقیقی درجہ ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ بطور ظرف اس کے معنی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا: الف ظرف زمان، ب ظرف مکان۔ اور پھر معنی الف ۱ (مقررہ مدت یا معلوم وقت کے بعد) اور ب معنی ۲ (ان دنوں، اس زمانے میں) اور ۳ (کسی وقت سے پہلے مقررہ ساعت یا مدت سے قبل) کو بطور ظرف زمان پیش کیا جاتا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔

الف معنی ۱ (طرف، سمت، جانب، اُدر) کو قدیم لکھا ہے متروک بھی لکھنا چاہئے۔ معنی ۲ (مقررہ مُدت یا معلوم وقت کے بعد) کی مثال واضح نہیں ہے۔ اگر اساتذہ کے یہاں مثال نہیں ملی تھی تو ادارہ اپنی طرف سے پیش کر سکتا تھا۔ مثلاً وہ دس بجے آنے کے لئے کہہ گیا تھا اِدھر گیارہ بھی بج گئے۔ اور نہیں آیا۔"

ب۔ معنی ۲ (اس علاقے میں، اس دیس میں، اس ولایت میں) کے لئے دو رسوم سے مثال پیش نہیں کی گئی۔ ورنہ انیس کے یہاں کافی مثالیں مل سکتی تھیں: انیس:

پوچھیں جو دوستانِ مدینہ مری خبر
کہہ دیجئے نہ آئیں گے اب وہ کبھی اِدھر

معنی ۵ (ہماری طرف، میری طرف) کے لئے داغ کا یہ مشہور شعر مناسب ہے:

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

مرتبین نے "اِدھر" کے حسب ذیل مفہوم کو نظر انداز کر دیا ہے:

(۱) کسی امر کے وقوع ہوتے ہی، جونہی (ظرف زماں)
"اِدھر بارات پہنچی اور نکاح ہوا، ہماری طرف سے کچھ دیر نہیں۔"

(۲) جس وقت، جس گھڑی:
اِدھر پان بجے، اُدھر ہم روانہ ہوئے۔

(۳) اِدھر اُدھر: بمعنی جہاں تہاں، یہاں وہاں (ظرف مکان)

آب رواں سے منہ نہ اٹھاتے تھے جانور
جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر اِدھر اُدھر (انیس)

یہ کہہ کے بیاری بیٹی سے، دیکھا اِدھر اُدھر
پوچھا کدھر ہیں بانوئے ناشاد و نوحہ گر (انیس)

اراقت: "اراخت" کو دکنی تلفظ لکھنا چاہئے تھا اور تصریح کرنی چاہئے تھی کہ دکنی میں قاف کا تلفظ "خ" کیا جاتا ہے۔ معنی ۱ (بہانا، اخراج) لغوی حیثیت سے گو درست ہیں لیکن مثال (بعد اراقتِ بول بے تکلف نیند آجاتی ہے) میں اراقت کے معنی بہنا، نکلنا، خارج ہونا ہیں یعنی پیشاب کرنا (اراقتِ بول) سے مراد ہے۔

ارتھی: اس لفظ کا استعمال، بننا، بنانا، اٹھنا، اٹھانا، ہنا، بہانا، نکلنا، نکالنا کے ساتھ لکھنا چاہئے تھا۔

اسباب: اس لفظ کے معنی (الف) بطور واحد (ساز و سامان، جہیز، بست، اثاثہ) کی مثال میں دو رسوم سے انیس کا یہ شعر پیش کیا جا سکتا ہے:

یہ گھر کا سب اسباب گیا کس لئے باہر
نہ فرش نہ ہے مسند فرزند پیمبر

مرتبین نے ب معنی کے ضمن میں اسباب بطور جمع بمعنی ساز و سامان کو نظر انداز کر دیا ہے حالانکہ اس کی مثالیں بھی مل سکتی تھیں: غالب:

تیرے در کے لئے اسباب نثار آمادہ
خاکیوں کو جو خدا نے دیئے جان و دل و دیں

اسی طرح اسباب بمعنی حالات پر ان کی نظر نہیں گئی:

"میاں تم جانتے ہو کہ میں عازم رامپور تھا۔ اسباب مساعد ہو گئے۔ بشرط حیات جمعہ کو روانہ ہوں گا" (خطوط غالب ص۹۹)

کن کن مصادر کے ساتھ یہ لفظ عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے، نہیں لکھا گیا۔ مثلاً اسباب باندھنا، باندھنا بندھوانا، اٹھانا، اٹھوانا وغیرہ۔ محاورات بھی نہیں لکھے۔ "اسباب میں اسباب، ایک چنگ ایک رباب۔"

اسرار: اس لفظ کے معنی ۲ (راز کی باتیں) کی مثال دو رسوم کے لئے اقبال کا یہ شعر لکھ دیا جائے تو بہتر ہے:

حفظ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا
رازداں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا

اسی لفظ کے ضمن میں، "اسرار خودی" "اسرار و رموز" (تصانیف اقبال) اسرار غیب، اسرار نہاں کا ذکر بھی ضروری ہے۔

اِسرار: بمعنی راز، غیب کی باتیں اب استعمال نہیں کرتے بھوت پریت کے معنی میں بہت کم استعمال ہوتا ہے۔ غریب لکھا جائے۔

اِشفاق: وہ رسوم میں متروک ہے اصولاً اشفاق کے بعد درج ہو۔

اَشفاق: بمعنی عنایات داغ کے یہاں مزید برتا گیا ہے مگر اب استعمال نہیں کرتے، اس کو شاذ لکھا جائے۔ بطور اسم علم کثیر الاستعمال ہے۔ اس کی وضاحت کی جائے مثلاً: محمد اشفاق، اشفاق احمد اشفاق حیدر، اشفاق حسین وغیرہ۔ اصولاً اشفاق سے پہلے درج ہو۔

اصابع، اصاغر: کو غریب و شاذ لکھا جائے۔

اصالت: معنی ۲ میں امثلہ کی ترتیب اصولاً درست نہیں۔ انیس مقدم ہیں جان صاحب مؤخر۔ نیز شعر کو نثر پر ترجیح دینی چاہیے۔

اصدق: یہ لفظ بلحاظ ترتیب اصدار کے بعد لکھا جاتا۔ مثال معنی کی وضاحت نہیں کرتی، ادارہ اپنی طرف سے مثال لکھ سکتا تھا:

"خداوند عالم نے فرمایا ہے اور وہ اصدق الصادقین ہے"

اس کی ہر بات حق ہے۔

اصدار: کو شاذ لکھنا چاہیے۔

اَصداف[1]: مرتبین نے اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔ جمع صدف کی، یعنی سیپیاں۔

اِصطکاک: اصطلاح سے پہلے یہ لفظ لکھا جائے اس کو بھی شاذ لکھا جائے۔ معنی: رگڑ، وہ آواز جو سخت چیزوں کی رگڑ سے پیدا ہو۔ (ع۔ صَکّ۔ مادہ صَکَّ) مثال: غالب:

دل کو اظہارِ سخن، انداز فتح الباب ہے
یاں صریرِ خامہ غیر از اصطکاکِ در نہیں

(نسخہ سعیدیہ ص ۱۲۷)

اصطلاح: معنی ۱ (وہ لفظ جس کے کوئی خاص معنی کسی علم یا فن کے ماہروں نے یا کسی جماعت نے مقرر کر لئے ہوں)۔ اس تعریف میں یہ جملہ بڑھا دیا جائے "مگر وہ لفظ اپنے لغوی مفہوم کو بھی لئے ہوئے ہوتا ہے" مثال بھی لکھنی ضروری ہے: جیسے "نسخہ" وہ پرچہ جس پر حکیم یا ڈاکٹر مریض کے لئے دوا تجویز کر کے لکھتے ہیں۔ مجوزہ دوائیں۔

معنی ۲ (ایسا لفظ یا رمز کی بات جسے دوسرے نہ سمجھ سکیں) میں اصطلاح متروک ہے۔ اصطلاحاً کو بھی بیان کیا جائے:

"میں نے یہ لفظ اصطلاحاً استعمال کیا ہے۔"

اصطلاحات: اصطلاح کی جمع بیان نہیں کی گئی حالانکہ کثیر الاستعمال ہے۔ غالب:

اصطلاحات اسیران تغافل مت پوچھ
جو گرہ آپ نہ کھولی اسے مشکل باندھا

(نسخہ حمیدیہ ص ۸)

اسی طرح اصطلاحیں: اصطلاح کی جمع بقاعدۂ اردو بیان کی جائے۔ مثال:

"کوئی سوچ سوچ کر علمی اصطلاحیں بیان کرتا ہے۔"
(حیاتِ جاوید)

اصغر: اس کی تانیث "صغریٰ" لکھی ہے جو عربی املا ہے۔ صغرا اردو املا کو بھی لکھنا تھا۔ نیز اردو تانیث اصغری بھی لکھی جائے جو بطور اسم علم کثیر الاستعمال ہے۔

اصفہان: اس کا تلفظ "صفاہاں، صفہاں" بھی مستعمل ہے۔ غالب:

گردِ رہ سرمہ کشِ دیدۂ اربابِ یقیں
نقشِ ہر گام دو عالم صفہاں زیرِ نگیں

(نسخہ حمیدیہ ص ۲۰۵)

نیز خرا صفہاں، ہوا صفہاں نصف جہاں وغیرہ۔

اصفہانی: غالب کے کلام میں اس کی عمدہ مثال ہے۔

بگمانِ قطعِ زحمت نہ دوچار خامشی ہو
کہ زبانِ سرمہ آلود نہیں تیغِ اصفہانی

(نسخۂ حمیدیہ ص ۱۹۲)

اس کا تلفظ "صفاہانی" بھی کیا جاتا ہے۔ غالب:

وا کیا ہرگز نہ میرا عقدۂ تارِ نفس
ناخنِ بریدہ ہے تیغِ صفاہانی مجھے

(نسخۂ حمیدیہ ص ۹۳)

اصفہان کا تلفظ بکسر الف ہی درست ہے۔ اکثر بفتح الف (اَصفہان) استعمال کرتے ہیں۔ پہلوی یا قدیم فارسی میں "اِسپہان"

---

[1] (اردو میں کوئی مثال ہو ادارہ)

اسپاہان" تھا۔ اَوِستا میں "اِسپَاذ" تھا، پہلوی میں بھی یہی تلفظ رہا۔ فارسی دری میں، ذال، ہائے ہوز سے بدل گئی اور "الف" ابتدا سے ساقط ہو کر "سپاہ" بنا۔ حسب ضرورت درمیانی الف کو بھی ساقط کر کے "سپہ" استعمال کرتے ہیں۔ عربوں کے دخل اور عربی کے نفوذ سے "س" "ص" سے بدل گیا۔

اَصل: اس لفظ کے ایک معنی کی طرف مرتبین نے توجہ نہیں کی۔ غالب کے یہاں بمعنی "مدعا، منشا" نظم ہوا ہے:

پیدا نہیں ہے اصل تگ و تاز جستجو
مانند موج آب زبانِ بریدہ ہوں

(نسخۂ حمیدیہ ص۱۲۲)

اَصُلاً: معنی ۱ (مطلق، بالکل، ذرہ بھر، نام کو، قطعی) کی مثال کے لئے مرتبین نے دور سوم سے کوئی شعر تلاش نہیں کیا۔ غالب، انیس، اقبال کے یہاں مثالیں مل سکتی ہیں: انیس:

ذکرِ غمِ عباس بھی اصلاً نہیں کرتے
حیرت سے نظر جانب دریا نہیں کرتے

اصلاً: اس لفظ کو اصل کے ضمن میں بیان کرنا تھا ورنہ اصلا کے بعد بیان کیا جاتا۔ معنی: ازروئے اصل:

"جو اصلاً سیّد ہوگا وہ شریف بھی ہوگا۔"

اصلاح: معنی ۱ (خرابی دور کرنا، بے راہ روی سے نکلنا، درستی) کی مثال غالب کے کلام سے یہ پیش کی جا سکتی تھی:

تیری دانش مری اصلاح مفاسد کی رہین
تیری بخشش میرے انجاح مقاصد کی کفیل

معنی ۹ [(سیاسیات) انتظام، نظم و نسق کی درستی یا ترقی کا اقدام] کی مثال کے لئے اقبال کا یہ شعر اچھا ہے:

مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

اصلاح سنگی: اصطلاح ہے لیکن اس کی مثال پیش نہیں کی۔

اصلاحات: [(سیاسیات) پس ماندہ لوگوں کو آئینی حقوق دینا، اور ان کی ترقی کے اقدامات] کی مثال مرتبین نے ایسی دی ہے جس کا مفہوم واضح نہیں ہے یہ صرف "پس ماندہ لوگوں" کی تخصیص نہیں بلکہ ملکی معاشرتی مسائل کی ترقی و درستی کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں:

"زرعی اصلاحات پاکستان کی انقلابی حکومت کا بہت بڑا کارنامہ ہے"۔ "آج کل تعلیمی اصلاحات کا بہت چرچا ہے"۔

اصلاحات جمع اصلاح، سیاسیات کے علاوہ اصلاح کے دیگر معنی میں مستعمل ہے جن کی طرف اشارہ کرنا چاہیئے تھا:

"ہماری دی ہوئیں اصلاحات کو غور سے پڑھ لیا کرو اور ان پر کاربند رہا کرو"۔ "مطبع میں کاپیاں جانچی جا چکی تھیں۔ اصلاحات سنگی کا سلسلہ جاری تھا کہ فسادات کی آگ بھڑک اٹھی"۔

اصلاحی: معنی ۱ [(سیاسیات) ترقی و تعمیر کے کاموں سے منسوب، آئینی حقوق سے نسبت رکھنے والا] کی مثال مبہم ہے۔ واضح مثال دینی تھی مثلاً "حکومت پاکستان نے تعلیم کے لئے جو اصلاحی اقدامات کئے ہیں عوام ان سے مطمئن ہیں"۔

اصلح: آج کل مستعمل نہیں، متروک نہیں تو شاذ[1] لکھا جائے۔

اصلی: اصل کے مختلف معنی سے اس کے معنی بھی مطابقت رکھتے ہیں۔ معنی ۲ (۱)، (حقیقی، واقعی اور معنی ۵ (طبعی، فطری، قدیمی) کی مثال کے لئے انیس کا یہ شعر بہت عمدہ ہے:

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعف پیری نے
چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

مرتبین نے بعض معنی کو نظر انداز کر دیا ہے:

(۱) تصنیف یا تحریر کا اولین نسخہ یا مسودہ، دستاویز:

"لیکن خدا کے واسطے کہیں غصہ میں آ کر "عطائے تو بہ لقائے تو" کہہ کر اصلی خطوط نہ بھیج دینا") (خطوط غالب ص۴۲)

(۲) بے میل، خالص جس میں کوئی کھوٹ نہ ہو؟

یہ گھی اصلی ہے، ذرا بھی میل نہیں ہے۔ "انقلابی حکومت کی برکت ہے کہ ہر چیز اصلی ملتی ہے، ورنہ پہلے ہر چیز میں ملاوٹ ہوتی تھی"۔

اصلیت: معنی ۱ (واقعیت، حقیقت) کی مثال نثر سے دی گئی ہے۔ نظم میں اقبال کا یہ شعر مل سکتا تھا:

[1] اتنا شاذ بھی نہیں۔ مثلاً "بقائے اصلح یعنی SURVIVAL OF THE FITTEST)۔ (مدیر)

(باقی صفحہ ۵۹ پر)

معذرت

صہبا اختر

مدت کے بعد آؤ ادھر بھی تو جانِ من
یکبارگی نہ سامنے آنا کہ دیر سے
تنہائیوں کی رات میں کھویا ہوا ہوں میں
چونکا نہ دینا پھر مجھے چہرے کی دھوپ سے
بے خوابیوں کی سیج پہ سویا ہوا ہوں میں

شاید نہ روشنیوں کی میں تاب لا سکوں
تم سامنے بھی ہو تو نہ آنکھیں اٹھا سکوں

مدت کے بعد آؤ ادھر بھی تو جانِ من
بزم فسون و خواب میں طاق خیال سے
مت گل شدہ نشاط کی شمعیں اٹھانا
تنہائی کے سکوتِ مسلسل کے شور سے
میں بہرا ہو چکا ہوں مجھے مت پکارنا

شاید کہ میں جواب نہ دوں تم گلا کرو
اپنی طرح مجھے بھی کہیں سنگدل کہو
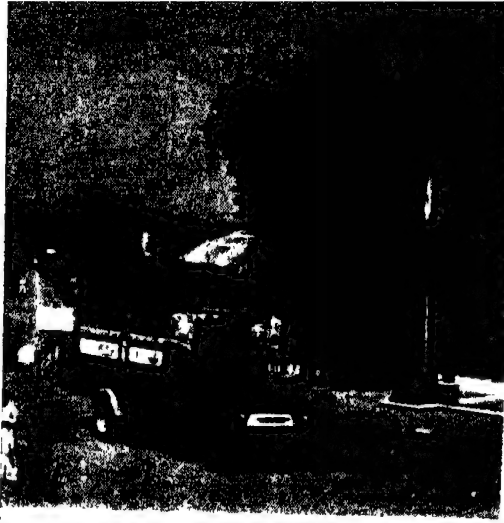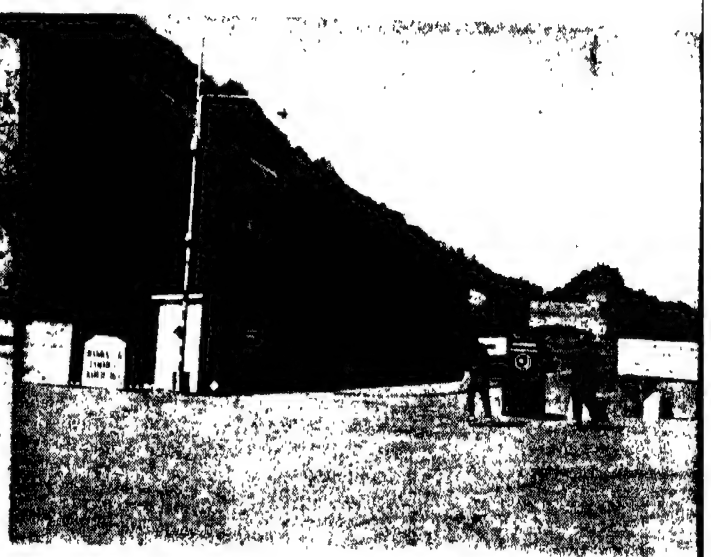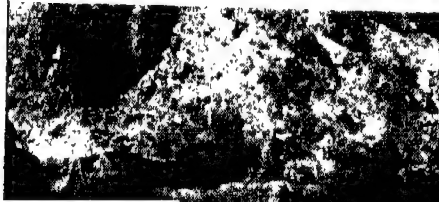
ں میں بچوں اور بچیوں کا مارچ پاسٹ : لفٹننٹ جنرل برکی (وزیر صحت ، عمال و معاشری بہبود) سلامی لے رہے ہیں

مستقبل کے معمار

بچے مستقبل کے معمار ہیں اور کوئی ترقی پذیر
اپنے بچوں کی صحت ، توانائی اور ترقی و بہبود
مسائل سے بے خبر یا بے تعلق نہیں رہ سکتی ۔ اسی
" یوم اطفال " ساری دنیا میں بڑے جوش و خروش
منایا جاتا ہے ۔ پاکستان میں بھی یہ دن بڑے دو
شوق سے منایا جاتا ہے ۔

ں اہل فن کی آزمائش : قومی اعزاز کے لئے
ارباب نظر کی مجلس

ی : بچے ہوں یا چنبیلی کا پھول — دونوں
ی قومی علامت ہیں (ڈیزائن : حنیف قریشی)

ب ایٹ ہوم : جس میں بڑے بھی کچھ دیر
کے لئے بچے بن گئے اور بڑے
شوق سے غبارے اڑانے لگے !

جزیرۂ گلپوش

ریاض انور

ہم لوگ ترے شہر میں آوارہ و رسوا
پھرتے ہیں ترے درد کو سینے سے لگائے
ہونٹوں پہ تبسّم کی سلگتی ہوئی کرنیں
آنکھوں میں چھلکتے ہوئے اشکوں کو سجائے

ہر شام ترے شہر میں اک جشنِ چراغاں
ہر صبح ترے شہر میں ہنستی ہوئی آئے
ہر گام ترے عارضِ گلگوں کے اجالے
ہر سمت ترے گیسوئے شب رنگ کے سائے

گلیوں میں چھنکتی ہوئی پازیب کا جادو
اڑتے ہوئے صد رنگ دوپٹوں کی بہاریں
ڈوبی ہوئی خود اپنی جوانی کے نشے میں
سڑکوں پہ مچلتی ہوئی ہنستی ہوئی ناریں

لب ہیں کہ تراشی ہوئی یاقوت کی قاشیں
سینے ہیں کہ مہکے ہوئے شاداب سویرے
باہوں میں لچکتی ہوئی شاخوں کا ترنم
پلکوں میں لرزتے ہوئے بے داغ اندھیرے

ہر کنجِ چمن سمٹی ہوئی قوس و قزح ہے
ہر گل میں ترے جامۂ رنگیں کی دمک ہے
ہر راہگذر بکھری ہوئی کاہکشاں ہے
ہر موجِ صبا میں تیرے سانسوں کی مہک ہے

یہ شہر ترا سپنوں کا گل پوش جزیرہ
یہ ہنستے ہوئے لوگ، یہ خوشبو، یہ چراغاں
ہم لوگ مگر مہر بلب چاک گریباں
پھرتے ہیں ترے درد کو سینے سے لگائے
آنکھوں میں کئی خواب کئی دیپ جلائے

فکاہیہ:

شریکِ غالب

فیاض علی خاں

غرض یہ کہ جب ہم دونوں نے ایک رات یہ طے کر لیا کہ مشترک تجارت کریں گے تو دوسرے ہی دن میں فلائنگ کلب سے آفس پہنچا اور سیکرٹری سے کہا میری فلائنگ ٹریننگ کے جتنے اخراجات اس وقت تک ہوئے ہیں انہیں منہا کر کے باقی رقم واپس کر دیں۔ یہ سن کر انہیں تعجب ہوا اور کہنے لگے "کیوں کیا بات ہو گئی، ابھی چند ہفتوں میں آپ SOLO پر جانے والے تھے"۔

"جی ہاں، بجا فرمایا مگر کچھ ایسی ہی بات پیش آگئی ہے۔ اب جہاز کی کپتانی کے بجائے سر میں کچھ اور ہی سودا سمایا ہے"۔

"آپ اپنی رقم جب چاہیں لے سکتے ہیں لیکن میری پرسنل رائے یہ ہے کہ آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لیں تو بہتر ہے"۔

"آپ کا فرمانا بالکل درست۔ مجھے خود اپنے اس دلچسپ، ہوائی اور اعلیٰ کیریئر کے چھوڑ دینے کا بڑا افسوس ہے۔ بہرحال میں اپنے مستقبل سے مطمئن ہوں"۔

"آپ اپنے حالات کو بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ خیر کل آپ درخواست دے دیجئے۔ آپ کو رقم واپس مل جائے گی"۔

دوسرے ہی دن میں نے رقم واپس لے لی اور اپنے محترم دوست کے حوالے کر دی تاکہ وہ اپنی زمین پر ہوٹل کی تعمیر شروع کر دیں۔ چنانچہ چند ہی مہینوں کی شبانہ روز کوششوں کے بعد تعمیر مکمل ہو گئی۔ فرنیچر، کروکری، اور دیگر آرائشات ہوٹل کے لئے خرید لی گئیں۔ راشن کارڈ بھی بن گیا۔ ملازمین کا بندوبست پہلے ہی کر لیا گیا تھا۔ اب صرف انتظار اس بات کا تھا کہ درمیانی رات گزرے اور صبحِ افتتاح طلوع ہو۔ شام ہی سے پہلے ہم نے تمام چیزوں اور تیاریوں کا تفصیلی جائزہ لیا اور ملازمین کو ان کے متعلقہ فرائض سمجھا دیئے۔ جب ان ضروری امور سے فرصت ملی تو میں نے اپنے محترم دوست سے پرائیویٹ گفتگو میں ان کی گذشتہ چند وعدہ خلافیوں کے متعلق شکایت کی اور کہا آئندہ اس قسم کی شکایتوں کا موقع نہ آئے۔ اور جو خصوصی شکایت میں نے ان سے کی اس کی مختصر تفصیل یہ ہے:۔

جب میرے دوست نے کئی دفعہ اپنے بڑے بھائی کی شکایتیں میرے سامنے کی تھیں اور واضح طور پر بتایا تھا کہ محض ان کی وجہ سے انہیں قبل ازیں بیسیوں نقصانات برداشت کرنا پڑے، اس لئے میں نے بوقتِ عہد و پیمان بطورِ خاص اس بات پر زور دیا تھا کہ ہمارے اس مشترکہ کاروبار میں وہ قطعی مداخلت نہ کریں اور ساتھ ساتھ اس بات کا اطمینان بھی دلایا کہ جب تک ان کے بھائی صاحب برسرِ روزگار نہیں ہو جاتے اس وقت تک ان کی مدد و خدمت کرنا ہم اپنا فرضِ اولین سمجھیں اور یہ بھی کہا کہ اپنے منافع سے ان کی خدمت کرنا میں بھی اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھوں گا۔ منجملہ دیگر عہد و پیمان کے، جو تمام کے تمام زبانی تھے، ایک خاص وعدہ یہ تھا کہ صاحب موصوف ہمارے معاملات میں، خواہ وہ انفرادی حیثیت رکھتے ہوں یا اجتماعی، قطعاً دخل انداز نہ ہوں گے۔ برعکس اس کے ہوا یہ کہ ابتدائے تعمیر سے انتہائے تعمیر تک وہ صاحب محل بے محل مداخلت کرتے رہے۔ ایک دن تو انہوں نے اپنی تاجرانہ سیاست کا وہ کمال دکھایا کہ ہم انگشت بدنداں رہ گئے۔ یعنی ہوا یہ کہ الیکٹرک کارپوریشن میں برقی سپلائی کے لئے جو درخواست انہوں نے دی اس میں بجائے اس کے کہ ہمارا نام، ہوٹل کے مالک کی حیثیت سے دیتے انہوں نے یہ بہتر سمجھا کہ اپنا ہی نام نامی دے دیں! ان کی اس حکمت طرازی کا جب میں نے اپنے محترم دوست کے سامنے تذکرہ کیا اور اس پر کچھ تبصرہ بھی کیا تو انہوں نے ازراہِ دوست نوازی مجھ پر سطحی ذہنیت رکھنے

کاالزام لگادیا اور منطق یوں پیش کی کہ اگر وہ محض اپنے نام سے خوش ہوجاتے ہیں تو اس میں کیا مضائقہ ہے۔ جب کہ سارے کاربار کے ہم ہی دونوں مالک و مختار رہیں۔ مجھے ان کی اس دلیل میں کوئی دوررس پالیسی منڈلاتی نظر آئی لیکن میں نے مراسم رواداری کو ملحوظ رکھتے ہوئے خاموشی اختیار کی۔ ہاں شبِ افتتاح کو تاکیداً یہ ضرور کہا کہ اب آئندہ مجھے کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ ملے تو اشتراکِ عمل اور دوستی کے لئے بہتر رہے گا۔ اس طرح وہ رات ہمارے جدید و قدیم مگر زبانی شرائط اور وعدوں کو لئے ہوئے گزر گئی اور صبح مسعود آپہنچی اور کاروبار بہ صد شانِ انتظام جاری ہوگئے۔

قبل اس کے کہ داستانِ سوداگری سناؤں چند گھریلو باتیں گوش گزار کردی جائیں تو مناسب ہے جو ان شب ہائے عہد و پیماں سے پہلے میرے اور میرے اراکینِ خاندان کے درمیان اس وقت ہوئیں جب میں نے قطعی فیصلہ کرلیا کہ اسی دھرتی کا جس پر شب و روز قدم چپکے رہتے ہیں، سوداگر بن جاؤں۔

کئی ہفتے پہلے جب میں نے اپنی اس ذہنی قلابازی کا ذکر اپنے بھائی صاحب، بھابی صاحبہ اور دیگر خاندانی بہنوں کے سامنے کیا تو انہیں حیرت کم ہوئی، افسوس زیادہ۔ حیرت میں کمی اس لئے ہوئی کہ میری ایسی اچانک حماقتوں سے وہ بچپن سے واقف تھیں، افسوس زیادہ اس لئے کہ وہ مجھے سوداگر کے بجائے جہاز کا کپتان دیکھنا زیادہ پسند کرتی تھیں لیکن ایک آزاد زندگی سے میری والہانہ عقیدت اور میرے ہم رنگ و ہم خیال ساتھی کی شرکت اور میری ضد کی عادت کے سامنے کسی کی بات نہ چلی۔ تاہم انہوں نے از راہِ محبت و ہمدردی بلکہ مجبوری یہ نصیحت ضرور کی کہ تجارت شروع کرنے سے پہلے ضروری دستاویزات مکمل کرلی جائیں۔ دستاویزات کا نام سنتے ہی میں آگ بگولہ ہوگیا۔ دیکھئے اس میں شک نہیں کہ قانونی کارروائی تاجرانہ نقطۂ نظر سے ایک اصولی چیز سہی لیکن میں اپنے دوست کے ساتھ اس قسم کی قانونی بندش پسند نہیں کرتا کیونکہ ایسا خیال بے اعتباری اور احترامِ دوستی کے منافی ہے۔ جس شدت سے میں انہیں یقین دلانے کی کوشش کرتا اسی شدت سے، بلکہ شدت مزید سے ان کا اصرار جاری رہتا کہ دوستی اپنی جگہ قائم رہنی چاہئے اور تجارت اپنی جگہ۔ لیکن ان کا یہ بے جان اور بے رنگ فارمولا مجھے پسند نہ آیا۔ مزید حجت کرنے کے بجائے میں خاموش ہو رہا۔ کیونکہ میں اچھی طرح محسوس کر رہا تھا کہ تحفظِ حقوق کے بارے میں شک کرنا توہینِ دوستی کے مماثل ہے اور پھر ایسے دوست کی دوستی جس کے نظریاتی کردار کی چمک میرے قلب و نظر میں اُجالے پھیلاتی رہی ہے، بھلا میں کیسے تسکینِ حقوق کی خاطر توہینِ محبت گوارہ کرلیتا۔ اس لئے میں اپنے فیصلے پر قائم رہا۔

دوسرے دن میں نے پچھلی رات کی تمام بحث و تمحیص کا خلاصہ اپنے محترم دوست کو سنا دیا مگر اظہارِ شرافت کے الزام سے بچتے ہوئے۔ اور ترمیم عہد و پیمان۔ کے سلسلے میں میں نے ایک بات یہ بھی کہی کہ سنا ہے پچھلے زمانے کے لوگ اپنے سرِ اقدس کے گیسوئے مبارک کو رہن رکھ کر ہزاروں لاکھوں روپے ادھار لیتے اور جب تک مقررہ رقم ادا کرکے اپنی امانتِ لطیف و مقدس واپس نہ لے لیتے چین کی نیند نہ سوتے۔ یہ مثال سناتے ہوئے میں نے اپنے دوست سے کہا شرافت نفسی کے سنبھالنے کے لئے جس گیسوئے مبارک کی ضرورت انہیں درپیش تھی آیئے آج ہم اور آپ اِس لطیف سہارے کو بھی خارج کردیں۔ ہم دونوں اپنے اپنے ضمیر کے سامنے وعدہ و عہد کریں میں کہوں اور آپ سنیں اور آپ کہیں میں سنوں بس یہی آپ کی اور ہماری قانونی دستاویز ہوگی اور کافی۔

بس اس سماعی اور نظریاتی دستاویزی تکمیل کے بعد جس کے مقدس گواہ ہمارے قلب و ضمیر کے سوا کوئی نہ تھا وہ سب باتیں عمل پذیر ہوتیں جن کا ذکر کردیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ صبح بھی آگئی جب کاروبار شروع ہونا تھا اور دن بھر کی مصروفیتوں کے بعد جب نصف شب کے قریب ہوٹل بند ہو رہا تھا میرے محترم دوست کے برادر موصوف نے ساری نقد آمدنی اپنے ہینڈ بیگ میں ڈالی اور گھر کی طرف چل دیئے۔ جب وہ جا چکے تو میں نے اپنے دوست کی نیت معلوم کرتے ہوئے پوچھا:

"کیوں جناب اگر آپ کے بھائی صاحب ہی اس دن بھر کی کمائی کے مالک و مختار رہیں تو پھر انہیں کیوں نہ ورکنگ پارٹنر بنالیا جائے"۔ اس پر ان کا برجستہ جواب میرے لئے "شافی" تھا۔

" بعض وقت آپ کی تنگ دلی پر مجھے بڑا افسوس ہوتا ہے اگر ایک شخص برائے نام کیش لے جائے اور صبح لا کر دے دے تو اس میں کیا فرق آجاتا ہے؟"

" مگر یار سوال یہ ہے کہ آپ کے بھائی صاحب کوئی طفلِ مکتب تو ہیں نہیں جنہیں روپیوں کی جھنکار اور کرنسی نوٹوں کی سرسراہٹ سے خوشی محسوس ہوتی ہو۔ یا تو آپ صاف صاف مجھے بتا دیں کہ اپنے بھائی کے ہاتھوں آپ مجبور ہیں تو پھر آپ کی اس صاف گوئی کے بعد میں بھی بخوشی اس انجام کے لئے ذہنی طور پر تیار رہوں گا جس کے آپ کو متعدد تجربے ہو چکے ہیں یا پھر اگر ہم دونوں کے مفاد کا آپ کو خیال ہے تو پھر کل سے آپ کے بھائی صاحب کاؤنٹر کے قریب پھٹکنے بھی نہ پائیں گے۔"

" عجیب انسان ہیں آپ بھی! مانا کہ وہ مجھ سے عمر میں بڑے ہیں لیکن ان کا دل معصوم بچوں کے دل سے بڑھ کر نہیں۔ اگر وہ اتنی ذرا سی بات میں خوش ہو جاتے ہیں تو آپ کو بلند حوصلے سے کام لینا چاہئے۔ ابھی ان سے کئی کام لینے ہیں۔ چند دنوں تک اسی طرح کام چلنے دیجئے وقت آنے پر میں خود ان کو اس معاملہ سے بےتعلق کر دوں گا۔"

" تو پھر اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ اپنے بھائی کو دھوکے میں رکھنا چاہتے ہیں۔"

" آپ ان باتوں کو مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ یہ سب اضافی باتیں ہیں اصل چیز تو کاروبار ہے جس کے متعلق سب کو علم ہے کہ اس میں صرف آپ اور میں شریک ہیں۔"

بہرکیف یہ شکایت بھی آئی گئی ہو گئی۔ رات گزر گئی صبح ہوئی اور حسبِ دستور کاروبار شروع ہو گیا۔ مگر دوسرا دن ایک اور دلچسپ اضافہ کے ساتھ شروع ہوا اور وہ یہ کہ ان کے گھر کا ملازم آیا اور گھر کے خرچ کے نام سے دس روپے لے گیا اور تجارت ختم ہونے تک بلا ناغہ یہ صرفِ خانگی ان کے گھر پہنچتا رہا۔ اسی ملازم کی دوسری ڈیوٹی یہ بھی تھی کہ دن بھر میں کئی دفعہ ہوٹل کی تیار کی ہوئی چیزیں اور بیکری کی خورد و نوش کی چیزیں گھر لے جائے یہ سلسلہ اس قدر طویل اور مسلسل رہتا کہ اکثر مستقل گاہکوں اور دیگر دوست احباب کی نظروں میں یہ بات کھٹکنے لگی۔ چنانچہ ایک دن جب ایک صاحب سے نہ رہا گیا تو یہ جملہ ہوا میں سنائی دیا:

" کیوں صاحب یہ باورچی خانہ کیوں نہ ان کے گھر ہی منتقل کر دیا جائے؟"

کاروبار کا ایک مہینہ گزر گیا۔ اور فطری طور پر میں اس بات کا منتظر تھا کہ میرے دوست مجھے منافع کی رقم ادا کر دیں۔ لیکن مہینے کی دس بارہ تاریخ تک میرا انتظار صرف انتظار رہا اور بالآخر میرا یہ انتظار خوش فہمی میں تبدیل ہو گیا۔ میں نے یہ خیال کیا کہ چونکہ میرے محترم دوست میری لاابالی فطرت اور فضول خرچی کی عادت سے واقف ہیں اس لئے محض اس خیال سے کہ میں بے جا پیسے خرچ نہ کر دوں میرے منافع کی رقم غالباً اپنی رقم کے ساتھ بنک میں علیحدہ جمع کر دا رہے ہوں گے اور جب مجھے واقعی ضرورت پیش آئے گی تو حسبِ ضرورت مجھے رقم مل جائے گی۔ اس خوش فہمی سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ مجھے اپنی تمام بدگمانیوں سے نجات مل گئی اور ہم سوداگری کا مزا لوٹتے رہے۔ اس موقع پر ایک بات اور آپ کو بتا دوں۔ پانچ چھ مہینے تک ان دونوں بھائیوں نے کاروبار سنبھالا اور میں نے اس پورے عرصہ میں کاؤنٹر کی صورت تک نہ دیکھی جہاں ہماری تجارت کی ضرب و تقسیم ہوتی رہتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے تجارت کی ابجد تک معلوم نہ تھی۔ اس لئے خیال تھا کہ رفتہ رفتہ جب لین دین کے بارے میں کچھ علم ہو جائے گا تو پھر میں بھی عملی طور پر سوداگری کا لطف اٹھانے لگوں گا ابھی میں ناتجربہ کار ہوں۔

چند مہینے بعد ایک رات کو جب کہ ہوٹل گاہکوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا تو میں نے اپنے محترم دوست سے سرگوشی میں پوچھا:

" کہئے بزنس کا کیا حال ہے؟"

جواب ملا۔ " بڑے مزے میں چل رہا ہے۔"

اس جواب سے مجھے کچھ سکون اور طمانیت محسوس ہوئی لیکن دوسرے ہی دن میرے دوست نے بغیر کسی استفسار کے

بتایا کہ انہوں نے محض میری دل داری اور ہمت افزائی کی خاطر گزشتہ رات وہ بات کہی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہوٹل میں گھاٹا ہو رہا ہے۔ اس پر میں نے کچھ جل کر کہا:

"بڑی خوشی کی بات ہے! آپ اپنے بھائی صاحب کو ورلفٹ دیجئے تاکہ آپ کی اور میری تباہی کے مکمل سامان بلد از جلد فراہم ہو سکیں"۔

یہ سن کر انہوں نے اپنے ہونٹ ذرا لٹکاتے ہوئے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور فرمایا:

"کیا بتاؤں بھئی خدا گواہ ہے بڑا بے بس ہو گیا ہوں"۔

اس بات کو بھی کئی دن گزر گئے۔ تجارت چلتی رہی اور رفتہ رفتہ ہم زیر تربیت سوداگر کاؤنٹر پر بھی نمودار ہونے لگے اور تجارت کے نشیب و فراز کا اندازہ کرنے لگے۔ چند ہفتوں کی نشست کے بعد مال سپلائی کرنے والے عموماً اس وقت آنے لگے جب کاؤنٹر پر میری ڈیوٹی ہوتی اور واجب الوصول رقوم مجھ سے لے جاتے اور میں ان کا اندراج کر لیتا۔ اس ضمن میں میرے معزز قارئین یہ بات یاد رکھیں کہ اس عرصہ میں مجھے ایک حبّہ سیاہ بھی اپنے نفع کے نام سے نہیں ملا۔ اور ہر رات میرے دوست کے برادر مکرم حسب عادتِ قدیم ساری کیش لے جاتے رہے۔ اور میں اسی خوش فہمی میں مبتلا رہا کہ خسارے کا جوڑ کر میرے دوست نے کیا تھا وہ شاید کسی دور رس مصلحت پر مبنی ہو کیونکہ میں صاف یہ دیکھ رہا تھا کہ اس بیوپار میں از سر تا بہ قدم چاندی ہی چاندی ہے اور اس خیال میں مگن رہتا کہ ایک بڑے بھائی یا کم از کم ایک انتہائی ہمدرد دوست کی حیثیت سے میرے محترم دوست میرے علم میں لائے بغیر میرے منافع کی ساری رقم ماہ بہ ماہ بینک میں جمع کروا رہے ہوں گے۔ اور بہ وقت ضرورت مجھے مل جائے گی۔

آپ یقین جانیں کہ میری اس خوش فہمی میں غلط بیانی تو بڑی چیز ہے مبالغہ بھی رائی برابر نہیں!

اس طرح کئی مہینے گزر گئے تو ایک شام اتفاق سے میرے ایک دوست تشریف لائے اور پکچر چلنے کو کہا۔ میں نے فوراً کاؤنٹر اپنے دوست کے حوالے کیا۔ منہ ہاتھ دھوئے کپڑے بدلے اور اپنے محترم دوست سے پکچر کے لئے پیسے مانگے۔ اس کے فی البدیہہ جواب میں انہوں نے کاؤنٹر کی دراز کھینچی اور کہا اب صرف اتنے روپے پڑے ہیں۔ اب دودھ والا آئے گا۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ کیا دوں اور آپ کو پکچر کی سوجھی ہے"۔

میں نے کہا۔ "کیا آپ اپنے اس جواب کی اہمیت کا اندازہ کر رہے ہیں"۔

"بہت اچھی طرح"۔

"آپ کو ایسا جواب دینے سے پہلے شاید کچھ سوچ لینا چاہئے تھا"۔

"سوچ تو بہت لیا"۔

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؛ آپ کچھ سمجھ بھی رہے ہیں کہ کیا کہہ رہے ہیں"؟

اس کے بعد انہوں نے جو جواب دیا اسے ملائم الفاظ میں بکواس کہا جا سکتا ہے۔ مزید سوال کرنا یا بحث کرنا گویا اپنی عزت کو مجروح کرنا تھا اس لئے میں خاموش رہا اور اپنے دوست کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

دوست داری کے ضمن میں ایک دوسرا شاہکار معرکہ اور عرض کر دوں۔

ایک دفعہ میں بیمار ہو گیا اور اتفاق کہ ڈبل نمونیا تھا۔ اگر صرف سنگل نمونیا ہوتا تو خیر ایک بات بھی تھی۔ ایک بے مروت میزبان کی طرح رسوم مہمان نوازی ادا کرنے کے بجائے اسے حیلے بہانے سے ٹال بھی دیتا مگر اس کی "دوہری" حیثیت سے میں مرعوب ہو گیا اور بستر پر لیٹنے کے لئے مجبور ہو گیا۔ جب میرے دوست کو اطلاع پہنچی تو خیر تیسرے دن مزاج پرسی کے لئے قدم رنجہ ہوئے اور رسم دنیا ادا کر کے رخصت ہو گئے۔ اس ملاقات کے تیسرے دن میں نے اپنے ملازم کے ذریعہ ایک پرچی بھجوائی جس کے جواب میں عنایت خسروانہ سے کام لیتے ہوئے انہوں نے دس عدد چونیاں جس کے نصف پانچ عدد اٹھنیاں ہوتی ہیں مجھ بندۂ عاجز اور سہیم و شریک کاروبار کو موصول ہوگئیں۔ زبانی یہ پیام بھی آیا کہ کاؤنٹر میں اس وقت کیش موجود نہ تھا۔ ورنہ میرا خیال تھا کہ شاید ایک اور چونی کا اضافہ ہو جاتا!۔ میرے محترم

دوست کو اچھی طرح معلوم تھا کہ دودھ کے لئے روزانہ اوسطاً پانچ سات روپے درکار تھے۔ اس بات کا علم ہوتے ہوئے جس عالی ظرفی کا مظاہرہ انہوں نے کیا میرے لئے قطعی ناقابلِ برداشت تھا اس لئے ان چونیوں کے بوجھ کو بہ شکریہ تمام واپس کر دیا۔ اس کے بعد خدا کا شکر ادا کیا کہ ابھی خیر سے میں غیر شادی شدہ ہوں اگر یہ میرا شوقِ سوداگری خدانخواستہ ایسی حالت میں جاگتا کہ کسی معزز خاتون کا شوہر ہوتا اور چند فرزندانِ دلبند کا پدرِ محترم بھی تو پھر بقول غالب گھر پر بجز دشت سامانی کے کچھ اور نہ ہوتا۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کو میری داستان سے دلچسپی ہو گئی ہے اس لئے اپنے محترم شریک کار کی کاروباری سیاست کے چند اور معرکے پیش کر دیتا ہوں تاکہ سند رہیں اور آپ جیسے احباب کے لئے بوقت ضرورت کام آئیں۔

رات کے بارہ بجے ہوں گے کہ ہوٹل کے سامنے ایک "ماسٹر بیوک" آکر ٹھہری۔ اور تین حضرات اندر تشریف لائے اور صرف تلے ہوئے گوشت اور چند سینڈوچ کھانے کا آرڈر دیا۔ جب وہ تناول سے فارغ ہو چکے تو بیرا میرے پاس آیا اور میں نے چھ روپے بارہ آنے کا میمو بنا دیا۔ میرے دوست فوراً کاؤنٹر پر آئے اور ایک دوسرا میمو مکمل دس روپے کا فوراً بنا دیا اور بیرے کے ہاتھ میں تھما دیا۔ جب صاحبان موصوف رقم دینے کے بعد جا چکے تو میں نے اس ارجنٹ بلیک مارکٹنگ پر اعتراض کیا جس پر آپ نے نہایت ماہرانہ انداز میں فرمایا کہ جیسا گاہک آئے اسی طرح اس کا میمو بنانا چاہئے میں نے اس حکمت عملی کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ اگر کوئی غریب گاہک آجائے تو کیا آپ اس کی جیب کے ہلکے وزن کو ملحوظِ خاطر رکھیں گے؟ اس اختلاف "سیاست" پر ایک سخن گسترانہ قسم کا فساد ہوا اور یہ بات بھی ختم ہو گئی۔

کسی مہینے کی آخری تاریخ تھی۔ میرے شریک کار اپنی صراحی دار گردن اور تقدس مآب چہرہ کو اونی مفلر میں چھپائے رات کا آخری شو دیکھنے کے لئے اسی اہتمام کے ساتھ چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں اپنے کاروبار میں مصروف رہا۔ نصف شب پر جب ہوٹل بند کر دیا گیا تو میں نے تمام ملازمین کی تنخواہیں مع باقیات علیحدہ علیحدہ نکال کر رکھ لیں تاکہ جب سب لوگ اپنے متعلقہ کاموں سے فارغ ہو جائیں تو ان کو رقوم تقسیم کر دی جائیں۔ یہ سلسلہ ہونے ہی والا تھا کہ حضرت والا تشریف لے آئے۔ کاؤنٹر پر روپیوں کی فوجِ ظفر موج اٹینشن حالت میں جو دیکھی تو پوچھنے لگے کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ میں نے کہا ملازمین کی تنخواہیں مع باقیات ادا کرنے کا دن ہے۔

فرمایا۔ "یہ خوب پالیسی ہے آپ کی؟ اس طرح تو کاروبار نہ چل سکیں گے جناب! اگر ملازمین کی تنخواہیں روک کر نہ رکھی جائیں تو کوئی ملازم آپ کے پاس مستقلاً نہ رہ سکے گا۔ پھر بتایئے ملازموں کے لئے آپ کہاں کہاں مارے مارے پھریں گے؟"

"اچھا یہ بات ہے، اے حامیٔ حقوق العباد، اور اے میرے بندہ پرور دوست، آپ اس اصول کے اکثر قصیدے گایا کرتے تھے کہ "مزدور کو اس کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دو"۔ تو کیا محض دوسروں کو سنانے کے لئے آپ یہ نصیحت کیا کرتے تھے یا اپنے لئے بھی قابل عمل سمجھتے ہیں؟"

"بھئی یہ تو بڑی مشکل ہے کہ آپ سے قدم قدم پہ اختلاف پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اس طرح تو کاروبار نہ چل سکے گا۔ یہ تجارت ہے جناب تجارت۔ وہ کاروبار ہی کیا جس میں منفعت اور فائدہ پیش نظر نہ رکھا جائے"

میں نے بحث و تکرار کرنے کے بجائے ذرا سخت انداز میں کہا کہ "لوگ اظہارِ تقدس کو دھوکہ کی ٹٹی نہ بنائیں تو دنیا کیسی سُکھی دنیا ہو جائے"۔

ایک دفعہ کا ذکر سنیئے۔ دودھ والے کے سینتالیس روپے باقی تھے جس میں سے آپ نے ازراہِ تجارت سات روپے ادا فرمائے اور اس اکائی کے عدد سات کو بلا لحاظِ تکلف و بہ قلم خود دہائی کا عدد سترہ بنا دیا!

یہ تو ایک ادنیٰ درجے کی نکتہ رسی تھی! اب حسنِ شراکت کی ایک اور نفیس مثال عرض کرتا ہوں اس کے بعد سوداگری کے تجربہ کا انجام پیش کر کے رخصت چاہوں گا"

حضرت نے اچانک یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ ہوٹل کو

سخت خسارہ ہو رہا ہے۔ لیکن انہیں یہ نہ معلوم ہو سکا کہ یہ خسارہ کس کی شفٹ میں ہوتا ہے اس لئے آپ نے یہ حکمتِ عملی تجویز کی کہ جب کوئی کاؤنٹر پر آئے تو سارے ہوٹل کا جائزہ لے۔ اس تفصیلی جائزے میں جو چیزیں شریک کی جاتیں وہ یہ ہوتیں۔ باورچی خانے میں موجودہ اسٹاک بہ شمول تیار شدہ اشیا و مقدار۔ شوکیس میں بیکری کی تمام اشیائے خوردنی کا فرداً فرداً شمار، بسکٹ کے پیکٹوں، ٹینوں اور مشروبات کی بوتلوں کی تعداد وغیرہ۔ عجیب حسنِ اتفاق کہ جب مجھ سے جائزہ لیا جاتا تو بڑے اطمینان سے آٹھ دس روپے کے خسارے کے امکانات میری نظروں کے سامنے ناچنے لگتے۔ اس پر بجائے نادم و پشیماں ہونے کے میں اپنے دوستِ محترم کی لطیف فریب کاریوں کا امتحانی نگاہوں سے خاموش جائزہ لیا کرتا اور خاموش ہو رہتا۔ منجملہ دیگر نفسیاتی داروں کے یہ ایک انتہائی خطرناک اور مہلک وار تھا جو میں برداشت کر گیا۔ اور ہر روز توہین دوستی کو اپنی قوتِ برداشت کے آخری نقطے تک لے جاتا رہا۔ یہ زخم ہرے ہی تھے کہ دوسرا وار کیا گیا۔ وہ یہ کہ صبح سے شام تک کے میرے اور ان کے اخراجاتِ طعام کی فہرست تیار کی جاتی اور صرف اطلاعاً میری خدمتِ عالی میں یہ عرض کیا جاتا کہ جملہ ڈھائی روپے ہوئے ہیں اور میرے جملہ ساڑھے آٹھ روپے چار آنے پختہ!

یہاں ایک بات کہہ دینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ میں نے ابتدا میں یہ بات کہی تھی کہ ہوٹل میں کھانے کا انتظام کاروبار کی سنجیدگی اور متانت کے خلاف ہے۔ بلکہ بہ عادتِ قدیم اس کا گھر پر ہی انتظام ٹھیک رہے گا۔ لیکن گزشتہ کئی مہینوں سے ناقابلِ برداشت اصرار کر کے مجھے بھی مجبور کیا گیا کہ میں بھی ان کے ساتھ شریکِ طعام رہوں۔

ایک رات چند مقدس چہرے جو میرے دوست کے دوست ہم ذوق ہوں گے بہ خشوع و خضوع "ہمارے ہوٹل کی زینت بڑھانے تشریف لائے۔ میں اس وقت کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا تھا جب یہ تمام پاکیزہ صورت لوگ میز پر بیٹھ گئے اور میرے دوستِ محترم بھی شریک ہو گئے تو اس موقع پر میرے دل میں ایک شرارت نے کروٹ لی۔ چونکہ کاروباری وقت ختم ہو چکا تھا اس لئے میں نے کاؤنٹر چھوڑ دیا اور اس پاکیزہ گروہ کے درمیان جا بیٹھا۔ باتوں باتوں میں ان تمام بزرگانِ علم و دانش سے اجازت لے کر میں نے اپنے کاروبار سے متعلق بھی ہر وہ واقعہ جس کو میں نے اپنی دانست میں غیر سنجیدہ اور غیر اصولی پایا من و عن پیش کر دیا۔ میں نے اسی تفصیل میں ابتدائے کاروبار سے اس رات تک کی ہر بات ان بزرگوں کو سنا دی یعنی یہ بھی کہ عہد و پیماں کے خلاف ان کے بھائی صاحب کی شرکت اور ان کے کارنامے تک۔ علی الحساب روزانہ دس روپے گھریلو خرچ اشیائے خوردنی کی بے ہنگم سپلائی، مہینے کے ختم ہونے پر مجھے میرے منافع کا انتظار اور میری خوش فہمی — میرے کیچڑ جانے کی فرمائش۔ میرے بسترِ علالت پر سکۂ مختصر کی بوچھاڑ ماسٹر ہیوک کے گاہک — ملازمین کی تنخواہیں — سات کا ستر بنانا — خسارے کا پروپیگنڈا اور خسارے کے تدارک کا مجرب علاج — اخراجاتِ طعام کی دیانت داری سے بھرپور فہرست۔ غرض تمام حقائق بلا خوفِ تردید میں نے ان تمام حضرات کے سامنے پیش کر دیئے۔ اور میں نے اپنے محترم دوست کو کلیتہً آزادی اور اجازت دیدی کہ میرے بیانات و شکایات میں جہاں کہیں آمیزش، مبالغہ آمیزی یا کذب بیانی پائیں فوراً مجھے ٹوک کر اس کی تصحیح فرمالیں۔ چنانچہ ان تمام صاحبان میں سے ہر ایک نے از روئے تحقیقِ حق مختلف قسم کی جرح و قدح ہم دونوں پر کی، اور جب تمام شکایتیں مبنی بر صداقت پائی گئیں اور میرے محترم دوست کو کسی شکایت پر جرأتِ انکار ہو سکی اور نہ جسارتِ تردید، تو ان تمام حضرات نے متفقہ طور پر ان کے کارناموں کو بہت نازیبا اور غلط قرار دیا۔ آخر یہ حضرت ایسے بوکھلائے کہ کوئی جواب نہ بن پڑا اور یہ کہہ کر محفل چھوڑ کر چلے گئے "کہ آپ لوگ ہوتے کون ہیں جو میرے افعال کی چھان بین کریں۔ میں خدا کا ناچیز بندہ ہوں میں صرف اپنے خدا کے سامنے اپنے اعمال کا جواب دہ ہوں اور میں اسی سے ڈرتا ہوں میری تذلیل کرنے والے آپ لوگ ہوتے کون ہیں؟" اس الٹی منطق سے بھرپور جواب کو سن کر ایک صاحب سے جب رہا نہ گیا تو برجستہ انہوں نے کہا کہ گناہ کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کا تعلق راست خدا سے ہوتا ہے اور ایک وہ جو بندوں کا بندوں سے ہوتا ہے جب تک متعلقہ بندہ معاف نہ کرے خدا بھی عفو و رحم نہیں کرتا۔

حقوق العباد کے غصب کی بڑی وعید آئی ہے وغیرہ۔

اس جملے کے پورا ہونے سے پہلے ہی میرے محترم دوست ہوٹل کی سرحد سے پار، رات کی تاریکیوں میں، گم ہو چکے تھے۔

یہ تمام حامیانِ انصاف میرے محترم دوست کے قلبی اور روحانی دوست تھے۔ جب میں اپنا قضیہ ان کے سامنے پیش کرنے کا ارادہ کر رہا تھا تو شروع میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ بھی میرے محترم دوست کی طرح ہوں گے مگر آپ یقین جانیئے کہ میں نے محض تفنن اور دل الوقتی کی خاطر یا زیادہ سے زیادہ ان زاویہ ہائے نگاہ کا جائزہ لینے کی نیت سے اپنی داستانِ سوداگری، ان کی خدمت میں پیش کی تھی اور مجھے یہ یقین تھا کہ یہ حضرات بھلا میری کیا تائید کریں گے۔ لیکن مجھے ان کے ضمیر اور زبان کے توازن اور ہم آہنگی کو دیکھ کر حیرت کی انتہا نہ رہی اور میں اپنی کج فہمی پر خلوصِ دل سے نادم و شرمسار رہا۔ ان اصحاب کی مداخلت سے مجھے جو فوری فائدہ پہنچا وہ یہ تھا کہ دوسرے ہی دن ان میں سے ایک صاحب نے میری دو عدد دستی گھڑیاں ان سے واپس دلوا دیں جن کے بارے میں میرے محترم نے مجھے یقین دلایا تھا کہ اتفاقیہ طور پر ان سے گم ہو گئی تھیں لیکن جیسے جیسے ان کا نفس میرے سامنے بے نقاب ہوتا گیا ویسے ویسے میرے شک بھی بڑھتے گئے اور مجھے ان گھڑیوں کے سلسلے میں بھی یقین ہو گیا تھا کہ میرے محترم دوست کے کسی آہنی صندوق کے گوشہ میں ٹک ٹک کرتے کرتے خاموش ہو گئی ہوں گی۔ چنانچہ میرا یقین آمیز قیاس صحیح نکلا اور میری دونوں گھڑیاں قیدِ خیانت سے آزاد ہو گئیں! الحمدللہ!

انصاف کی رات کے دو چار دن بعد ہی ان حضرات میں سے دو تین صاحبوں کی مجھ سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے شکایت کی کہ جب آپ کا دوست ایسا فریب کار ہے تو آپ نے اس کی فریب پروری کر کے انہیں کیوں اخلاقی نقصان پہنچایا۔ میں نے مختصراً کہا کہ چونکہ میں اس حیاتِ ارضی میں "علت" اور "معلول" کا سختی سے قائل ہوں اور اس پر غیر متزلزل یقین رکھتا ہوں اس لئے میری زندگی میں جب کبھی کسی ناخوشگوار افتاد آ جاتی ہے تو اس کو اپنے عہدِ ماضی کے کسی فعل کی صدائے بازگشت سمجھتا ہوں۔ اسی طرح میرے دوستِ محترم کی بد سلوکی، فریب، اور نقصان رسانی کو بھی میں اپنے کسی سابقہ عمل کا ردِ عمل سمجھتا ہوں ایک دوسرے اہم خیال میری زندگی میں یہ بھی موجود رہتا ہے اور وہ یہ کہ کسی آنے والی برائی کی مدافعت نہ کی جائے ممکن ہے اس بھیانک تاریکی میں کوئی جوہرِ درخشاں پنہاں ہو۔ میری دانستہ خاموشیوں کی تیسری وجہ یہ بھی تھی کہ میں اپنی حق تلفیوں کے ازالہ اور انسداد کے لئے حرفِ شکایت زبان پر لانے کے بجائے چاہتا یہ تھا کہ کسی موقع پر ان کا ضمیر آپ اپیل کرے اور میرے دوست اپنے آپ پر خود پشیمان ہوں لیکن شومیٔ قسمت کہ جیسے جیسے میرے ان نظریات کے سائے میں میری خاموشیاں بڑھتی گئیں ویسے ویسے ان کی مشق سیاست بھی تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔

اتنا کہنے کے بعد مجھے ایک اور بات یاد آئی جو میں نے ان صاحبان سے کہی اور وہ یہ کہ مجھے انتہائی معتبر ذریعہ سے پتہ چلا ہے کہ میرے محترم دوست نے اپنے بھائی صاحب کو کسی کاروبار کے لئے دو ہزار روپے بطور اڈوانس بھی دئے ہیں۔ ان دونوں کے اس لین دین کی مجھے تو کیا میرے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی۔ البتہ میں نے اپنے دوست کے حسن نیت کا مزید امتحان لینے کی غرض سے کہا کہ کل شام تک مجھے ایک گرم سوٹ کے لئے کچھ روپے چاہئیں۔ اس کا جواب جس شانِ بے اعتنائی بلکہ بہ اندازِ ناصحانہ دیا گیا اس کو مزہ آ گیا۔ فرمایا "ہوٹل کو نقصان برابر ہو رہا ہے اور آپ کو گرم سوٹ کی سوجھ رہی ہے!"

سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے میں نے ان کو یہ بتایا کہ آجکل جب میرے محترم دوست اپنے گھر جاتے ہیں اور ان کے لئے کوئی معقول رقم طلب کی جاتی ہے یا کوئی قیمتی فرمائش ان کے سامنے پیش کی جاتی ہے تو اپنے افرادِ خاندان کے سامنے ایک صادق القول اور صادق العمل انسان کی طرح فرماتے ہیں کہ اگر آپ لوگ اس طرح مسلسل رقم مانگتے رہے تو اپنے ساجھی کو کیا دوں گا؟ حالانکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ اس شریکِ کار کے ہاتھ کئی ماہ گذر جانے کے باوجود ابھی تک کاروبار کے نفع سے دس کا ایک نوٹ بھی نہ ملا تھا۔

بہرکیف مجھے اس کی چنداں فکر اس لئے [illegible] تھی کہ غیر شادی شدہ تھا اور وہ عیال دار۔ جو ذمہ داریاں ان پر عائد تھیں ان سے میں ابھی زیر بار نہ ہوا تھا ورنہ اور عذاب میں گرفتار رہوتا۔

ان تمام واقعات کو بن کر نیک نفس حضرات اس قدر متاثر ہوئے کہ میرے محترم دوست کو نہ صرف پیرانِ پارسا کی جماعت سے بالکل خارج کر دیا بلکہ ایک طرح مکمل معاشری بائیکاٹ بھی کر دیا اور یوں ان کی دوستی استوار ہوتی گئی۔

اب اس داستانِ سوداگری کا آخری باب بھی سن لیجیے۔

شب و روز ایک ساتھ رہنے سہنے، کھانے پینے کی وجہ سے یہ میرے دوست میرے اس قدر مزاج داں ہوگئے تھے کہ میری کسی بشری کمزوری کو نکال لیتے تھے کر وقت ضرورت اپنی مقصد براری بھی کر لیتے۔ چنانچہ انہوں نے اب علی الاعلان بدسلوکیوں اور فریب کاریوں کی تعداد اور رفتار تیز کر دی۔ ان حملوں سے کبھی میری حمیت مجروح ہوتی تو کبھی خودداری متاثر ہوتی کبھی میں انکے افلاسِ ذہنی سے متاثر ہوتا تو کبھی اپنے ذہنی خسارے پہ مایوس ہوتا مگر جب تابِ ضبط نہ رہی تو میں نے خیال کیا کہ اس پیچ در پیچ ماحول سے فرار اختیار کر لوں اور خانہ نشین ہو جاؤں تاکہ ذہن کو کچھ سکون مل سکے۔

گھر پر بیٹھے بیٹھے جب سات آٹھ دن گذر گئے تو ایک صبح یکایک خیال آیا کہ ہوٹل میں میری عدم موجودگی سے ممکن ہے کہ کوئی اور شگوفہ کھلے اس لئے گھر سے چل نکلا۔ راستے میں ایک اور خیال ہوا کہ چند قریبی دوستوں کو بھی بٹھا کر معاملات کا تصفیہ کر لیا جائے تو بہتر ہے تاکہ مالی اور ذہنی سکون حاصل ہو سکے۔

انہی خیالات میں گرفتار میں ہوٹل پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں کی دنیا ہی بدل چکی ہے۔ ہوٹل کے اندرونی حصے کا حدود اربعہ بدلا ہوا تھا۔ ہر چیز کی جغرافیائی حیثیت بدلی ہوئی تھی۔ اس نئے ماحول کو دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا اور تھوڑی دیر میں سب کچھ سمجھ میں آگیا۔ سمجھ میں یہ آیا کہ یہ ہوٹل اب میرا نہیں ہے! کچھ دیر تامل کرنے کے بعد خیال آیا کہ میری گاہک کی حیثیت تو بہرحال محفوظ ہے۔ چنانچہ اندر جا کر ایک پیالی سکوکش کا آرڈر دیا اور سگریٹ جلائی تھوڑی دیر وہاں گم رہنے کے بعد میں نے ایک بات دل میں ٹھان لی اور وہاں سے چل نکلا۔ شام کو اپنے محترم دوست کے "دولت خانہ" پر حاضری دی۔ ایک شانِ تمکنت کے ساتھ میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ "ساری پریشانیوں کا میں نے حل نکال لیا ہے یعنی یہ کہ میں نے ہوٹل ٹھیکہ پر دیدیا ہے" اس خبر پر میں نے اطمنان کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "چلئے ٹھیک ہوا" ایک تو پریشانیوں سے نجات مل گئی دوسرے یہ کہ گھر بیٹھے کچھ آمدنی کا ذریعہ ہو گیا" اتنا سنتے ہی اپنے مخصوص ماہرانہ انداز میں کہنے لگے "آمدنی کا ابھی سے کیا ذکر۔ سر پہ قرض کا جو بوجھ ہے اس کو ہلکا کرتے کرتے تو مہینے گزر جائیں گے"

"پھر آپ نے پرانی سیاسی مشق شروع کر دی!"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ شاید آپ کو اپنی فریب کاریوں سے ابھی پوری تسکین نہیں ہوئی اس لئے ایک آخری بھرپور وار سے اپنے آپ کو محفوظ اور مطمئن کرنا چاہتے ہیں"

"دیکھئے آپ اپنی حدود سے تجاوز کر رہے ہیں"

"اس کے جواب میں اگر میں یہ کہوں کہ نہ صرف آج، بلکہ کئی ماہ پہلے، محدود و غیر محدود، ساری بندشوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جرمِ تجاوز کے آپ مرتکب ہوئے ہیں، تو پھر آپ کیا جواب دے سکیں گے؟"

"خیر میں اس بحث میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ آپ جو چاہیں سمجھ لیں، جو چاہیں کر لیں"

"کیا آپ اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ گفتگو کے نتائج کا اندازہ کر رہے ہیں؟"

"کیا خوب! مگر آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"سب سے پہلے تو یہ چاہتا ہوں کہ آپ اپنے ذہن کی اس سطح پر آ جائیں جہاں سے آپ ایک دوست سے گفتگو کر سکیں۔ آپ کا یہ انداز مجھے قطعاً پسند نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ آپ شرکت ختم کرنے کے سلسلے میں دوستانہ طریق پر گفتگو کر سکتے ہیں"

"جب تک قرض سے سبکدوشی نہیں ہو جائے گی میں اس وقت تک کسی مسئلہ پر گفتگو کرنا نہیں چاہتا اور یہ تمام نقصانات محض آپ کی وجہ

سے ہوئے ہیں۔ غنیمت جانئے کہ اس قرض کی ادائیگی کی پریشانیوں سے آپ کو بچا تا رہا ہوں۔"

"سنئے اور کافی سنجیدگی سے سنئے۔ ایسی آپ کی کرم فرمائیوں اور نوازشات سے میں بہت کچھ سرفراز ہو چکا ہوں۔ اب آپ ان عنایات کو کسی اور کے لئے مخصوص کرلیں تو بہتر ہے۔ فی الحال آپ میرا حساب اصولی طور پر ختم کر دیجئے ورنہ یاد رکھئے اگر آپ نے میری باتیں نہیں مانیں تو آپ کے سارے کارنامے خود بخود طشت از بام ہو جائیں گے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ آپ اس موقع کا پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ اور صلح جویانہ پالیسی اختیار کریں۔"

مگر آپ میرے کون سے کارنامے طشت از بام کریں گے؟ آپ کس کو دھمکی دے رہے ہیں؟" اور اس طرح آپ کو میری تذلیل کرنے کا کوئی حق نہیں۔"

"حق تو نہ میں پہلے سمجھتا تھا نہ اب سمجھتا ہوں لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ آپ خود مجھے اس حق سے نواز رہے ہیں۔"

"اچھا آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔ میں بے کار بحث کرنے کا عادی نہیں ہوں۔"

"اچھا تو آپ اس گفتگو کو بیکار بحث پر محمول کرتے ہیں؟ اگر یہ بیکار ہی ہے تو دو چار دن بعد آپ بامقصد بحث کے لئے بھی تیار ہو جائیے۔"

اتنا کہنے کے بعد میں انہی کے ایک ہمدرد و دمساز کے گھر پہنچا اور ان سے کہا کہ آپ اپنی سہولت کے لحاظ سے کوئی تاریخ اور وقت ایسا عنایت فرمائیں کہ آپ ہی کے دولت خانے پر ایک ثالثی بورڈ کے ذریعے ہم دونوں کی ترکِ شراکت کا فیصلہ کیا جا سکے۔ میری یہ تجویز سن کر صاحب موصوف نے ازراہِ عنایت چار ہی دن بعد کی تاریخ اور وقت دے دیا۔

وہاں سے ہو کر میں اپنے دوست کے گھر آیا اور ان کو یہ ساری تفصیل بتا دی۔ انہیں کلیتہً آزادی بھی دیدی کہ مجوزہ بورڈ کے اراکین کا انتخاب بھی وہی کرلیں۔ چنانچہ مقررہ دن اور وقت پر میں پہنچ گیا۔ چند حضرات پہلے ہی سے تشریف لا چکے تھے۔ اور ان میں میرے محترم دوست بھی جلوہ فرما تھے۔ چند حضرات بعد میں تشریف لائے۔ بعض پہلے سے آشنا تھے بعض بالکل اجنبی۔

کچھ دیر کے صلاح مشورے کے بعد چند اراکین نے ایک صاحب کو تو صدر نشین منتخب کیا۔ یہ صاحب کسی ریاست میں پولیس کے ڈی۔ ایس۔ پی رہ چکے تھے۔ جب یہ کاروانِ عدل و انصاف کا غذ اور قلم سے لیس ہو گیا تو جناب صدر نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں اپنی شکایات و مطالبات پیش کروں۔ اس پر میں نے کہا کہ حاضرینِ محفل میں سے اسی فیصد ایسے ہیں جنہیں ان تمام باتوں کا پہلے ہی بخوبی علم ہے۔ اور چونکہ مجھے ان تمام کے ذہنِ رسا اور احساسِ عدل پر کافی اعتماد ہے اور اس بات کا بھی مجھے یقین ہے کہ جو کچھ بھی کیا جائے گا وہ نفس واقعہ کو پیشِ نظر رکھ کر اور از روئے انصاف کیا جائے گا اس لئے جو بھی فیصلہ ہو گا میں بہ رضا و رغبت قبول کر لوں گا۔

میری یہ تمام باتیں لفظ بہ لفظ نوٹ کر لی گئیں۔ پھر میرے محترم دوست سے بھی کچھ پوچھا گیا تو انہوں نے بھی میرے الفاظ اپنے لئے دہرائے۔ چند منٹ بعد ہم دونوں سے کہا گیا کہ دوسرے دن تصفیے کی نقول ہم دونوں تک الگ الگ پہنچا دی جائیں گی۔

اس دن چھ سات گھنٹے میٹنگ ہوتی رہی اور دوسرے دن مژدہ جانفزا بدستِ نامہ بر یہ صادر ہوا۔

مسمی فلاں ابن فلاں کو حکم دیا جاتا ہے کہ مسمی زید ولد بکر کو بہ سلسلہ ترکِ شراکت اصل رقم کا پانچواں حصہ بالاقساط، ماہ بہ ماہ ادا کرتا رہے۔ رقم مذکورہ کے تشخص کرنے میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ ترکِ شراکت خسارۂ تجارت کے بعد عمل میں آ رہا ہے۔"

یہ تھا فیصلے کا ملخص جو ثالثی بورڈ نے ہمارے قضیے میں کیا۔ جس طرح درویش کا قہر خود درویش پر ہوتا ہے سوداگر کا غصہ بھی سوداگر پر ہی ہوتا ہے اس لئے میں بھلا کیا قیل و قال کر سکتا تھا۔ اگر ثالثی بورڈ کی اس ہدایت کا کہ اپنی شکایات و مطالبات مکمل طور پر پیش کروں، پورا فائدہ اٹھاتا اور [illegible] اجازت

باقی صفحہ پر

بنگلا افسانہ

صبحِ کاذب

عبدالغفار چوہدری
مترجمہ: احمد سعدی

میری یہ دیرینہ خواہش تھی کہ اس سے متعلق کوئی کہانی لکھوں اور یہ صرف میری خواہش ہی نہ تھی بلکہ اس کے پیچھے ایک خاص جذبہ کارفرما تھا۔ میں کتنے ہی دنوں تک اس کی تصویر ہاتھ میں لے کر سوچتا رہا۔ من کتنا دل فریب چہرے کی ملاحت کتنی جاذب نظر، ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ سان لگی ہوئی چھری کی دھار کی طرح تیز، جس کی کاٹ سے کتنے ہی دنوں تک میرا دل لہو لہان رہا ہے، پھر بھی اپنے رستے ہوئے زخم کا درد دبا کر میں نے اسے دعا دی ہے۔ تم خوش رہو، پھاگن کے جھڑتے ہوئے پتے کا درد تم کیا سمجھو گی؛ ساحل سمندر پر چلتی ہوئی ہواؤں میں تم کنول کے پھول کی طرح سورج کا ستارہو، اس کی جھنکار گونجتی رہے، نغمے بکھرتے رہیں۔ دن بھر رات بھر یہ سلسلہ چلتا رہے۔ جس دن یہ مجرا ختم ہوگا، اس دن زندگی بھی ختم ہو جائے گی؛ شاخ جوانی سے ٹوٹ کر گرنے والے شیولی کے پھول کی طرح رات کی شبنم سے تمہارے چہرے پر چھائی ہوئی ملاحت کی چاندنی ڈھل جائے گی، لیکن تمہارا یہ جلتا حسن پھر بھی باقی رہے گا جو آج میرے ہاتھ قید ہے، واقعی تمہارا حسن کتنا سنگدل، کتنا قاتل ہے!

تصویر بات نہیں کرتی، جانتا ہوں۔ لیکن میں کہانی نہ لکھ سکا، روز تھوڑا سا لکھ کر سوچتا جیسا لکھنا چاہتا تھا ویسا نہیں لکھا جا رہا اور کاغذ پھاڑ کر ہری ہری دوب پر بکھیر دیتا۔ اس کے نام کو ریزہ ریزہ کر کے ہوا میں اچھال دیتا۔ پھر بھی وہ مسکراتی رہتی۔ بے جان مسکراہٹ نہیں بلکہ ساون کے گھنے سیاہ بادل کے پیچھے چمکنے والی بجلی کی تیز دھار کی طرح۔ راجہ کہتا تھا، اس کی مسکراہٹ بڑی حسین ہے؛ اور میں؟ لیکن میں جانتا ہوں، راجہ نے طوفانی رات میں کبھی بجلی کو تڑپتے نہیں دیکھا ہے۔ راجہ کا آبائی محل کسی قلعہ کی طرح تھا۔ چاروں طرف بڑے بڑے کھڈے کھود کر چار دیواری کھڑی کی گئی تھی۔ کسی زمانے میں وہ بارہ زمینداروں کے سردار تھے۔ اس کے بعد کارنوالس کی مہربانی سے ان میں مزید زمینداریاں ملی تھیں۔ لوگ انہیں راجہ کہتے تھے اور اسی مناسبت سے ان کا محل "راج محل" کہلاتا تھا۔ میر عرفان اس خاندان کی بارھویں پشت میں تھا۔ راجہ سے میری کالج کی ملاقات تھی۔ جسم پر چنی ہوئی پنجابی[1] ہوتی جس کے دونوں مونڈھوں پر زری کی بیل ہوتی، آنکھوں پر پتلے فریم اور نیلے رنگ کے چوڑے لینسز کی عینک لگا کر راجہ اپنی کار میں کالج آیا کرتے، کار خود چلاتے تھے۔

ایک دن انہوں نے مجھ سے پوچھا "سنا ہے تم شاعری بھی کرتے ہو؟"

"کرتا تو ہوں"۔

"کسی دن مجھے اپنی کوئی نظم سناؤ؟"

"بہت خوب"

اس دن رمنا میں دھوپ کا دائرہ آہستہ آہستہ سمٹ رہا تھا اور آسمان پر سورج کا رنگ بتدریج گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ راجہ نے جھیل کے کنارے جا کر اپنی کار کو بریک لگا دیا۔ پر سکوت جھیل کا پانی دیکیسال کار کی پرچھائیں میں چمکنے لگا۔ راجہ نے اپنے گھٹنے پر گھٹنا رکھ کر مجھ سے کہا "سناؤ"

موسم واقعی شاعری ہی کرنے کا تھا، سرپر سایہ کیے ہوئے درختوں کے پتوں سے بہار کا رنگ پھوٹ رہا تھا اور ماحول سے متاثر ہو کر میری آواز آہستہ آہستہ بلند ہوتی جا رہی تھی:

"اس کی آنکھوں میں آرزوؤں کے پھول کھلے، ان

[1] کہاں سے کہاں۔ مغربی پاکستان کی چیز مشرقی پاکستان میں۔ خاص وضع کا ڈھیلا کرتہ جسے "پنجابی" کہتے ہیں۔ (مدیر)

پھولوں کی خوشبو سے مسحور ہو کر جنت کے پیڑ پر بیٹھی ہوئی ایک چڑیا آئی اور ڈالی آواز میں آبِ کوثر کا رس ٹپکا کر شاخِ گل کو نہلا گئی۔ اس چڑیا کے پالنے والے نے سونے کی روشنی سے آرزوؤں کا ایک مقدس انسان بنایا اور شام ہوتے ہی ایک خوبصورت نازک اندام لڑکی ہر روز وہاں آکر چراغ جلانے لگی اور بڑی دیر تک وہ ٹکٹکی باندھے اسے یوں دیکھتی رہتی کہ اس کے درد کی شدت اس کی آنکھوں سے عیاں ہو جاتی۔"

راجہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "اس کے بعد؟"

"اس کے بعد؟ میری کہانی ختم ہو جاتی ہے۔"

راجہ گیٹار بجانے لگا، راجہ نے کہا۔ "تمہاری شاعری میری سمجھ میں نہیں آتی، لیکن اس گیٹار کی زبان تم بھی سمجھ سکو گے۔ میں تھوڑا بہت بجانا جانتا ہوں، سنو گے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس وقت آسمان پر سفید بگلے کے پر جیسے بادل تیزی سے ایک طرف بھاگے جا رہے تھے، اس کے نیچے سبز، سرمئی اور زرد رنگ میں بھاگن جھلک رہا تھا اور موسم بہار کے آنسو جیسے شہد کی بوند بن کر ٹپک رہے تھے۔

راجہ نے گیٹار بجانا بند کر دیا اور مجھ سے پوچھا۔ "تم کسی سے محبت کرتے ہو؟"

"کرتا ہوں"

"کس سے؟"

اس وقت رمنا جھیل پر ڈوبتے ہوئے سورج پر میرے دل کی تمام سرخی سمٹ آئی تھی، تصویر جانتی ہے کہ میں نے کس کا نام بتایا تھا۔ ڈھاکہ میں اتنے تمام علاقوں کی بات چھوڑ کر راجہ نے ایک دن اچانک مجھ سے صرف یہ پوچھا "سات روضہ کہاں ہے؟"

میں اس کا جواب نہیں دے سکتا تھا، میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

سیگون روڈ اور رقلر روڈ سے گزر کر سڑک بل کھاتی ہوئی سنٹرل جیل تک چلی گئی تھی، اس کے بعد ترا ہا تھا، سات روضہ کے موڑ پہ آکر میں رکشا سے اتر گیا، پتلی سی گلی تھی۔ راستے پر اینٹوں کا فرش تھا۔ اس کے بعد ہی خاکستری رنگ کا مکان تھا، مکان خاکستری نہیں تھا کبھی شاید اس پر سفید پلستر کیا گیا تھا، مگر اب تمام پلستر اکھڑ گیا تھا، اور ریت اینٹ دھوپ اور پانی میں خاکستری رنگ اختیار کر چکی تھی۔

سیڑھی کے سامنے ہی مٹی کے تیل کی لالٹین والا کھمبا تھا، کنڈی کھٹکھٹاتے ہی دروازہ کھل گیا۔ "کون ہے؟" آواز آئی۔

"میں ہوں"

"ارے، تم ہو، آؤ"

چھوٹا سا مطالعہ کا کمرہ تھا جس میں ایک طرف ایک کرسی اور میز تھی، بید کا ایک بک شیلف تھا، دیوار پہ ایک کلنڈر ٹنگا ہوا تھا اور ایک طرف کپڑے پر کشیدہ کیا ہوا ایک شعر فریم میں جڑا ہوا آویزاں تھا:

"میں سکھ کے دنوں میں بھی تمہیں پہچان لوں گی غم کی
کالی راتوں میں اگر ساری دنیا بے وفا ہو جائے میں
پھر بھی تمہیں دھوکہ نہیں دے سکتی۔"

نیچے کشیدہ کاڑھنے والی کا نام "نہار" لکھا ہوا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "آج تم اتنی خاموش کیوں ہو؟"

"بابا کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔"

"کیا ہوا ہے؟"

"بخار آ گیا ہے۔"

ماں زندہ نہیں تھیں اس لئے اب اکیلے نہار ہی کو گھر کی دیکھ بھال کرنی پڑتی تھی۔

میں نے پوچھا۔ "تمہاری کنڈر گارٹن اسکول کی نوکری کا کیا بنا؟"

"نہیں ملی"

"پھر، تمہیں کالج کی اور چھوٹے بھائی کے امتحان کی فیس دینی ہی ہوگی؟"

نہار مسکرائی اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھوں میں ساون کی بدلیاں سمٹ آئی ہوں، اس نے کہا۔ "میں نے فکر کرنا چھوڑ دیا ہے"

"لیکن فکر کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے جو تم اس سے نجات

پا جاؤگی۔" میں نے جیب سے کچھ روپے نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا "اسے رکھ لو، جب تمہاری نوکری لگ جائے گی لوٹا دینا۔"

نہار چند لمحوں تک خاموش رہی، اس کے بعد دھیرے سے بولی ۔ "تم مجھ سے اتنی محبت کیوں کرتے ہو، بتا سکتے ہو؟"

میں نے کہا "لوگ کیوں محبت کرتے ہیں، اس کا جواب آج تک کوئی بھی دے سکا ہے؟!"

نہار اسی طرح کچھ دیر خاموش رہی، پھر بولی ۔ "یہ گلی بھی کتنی تنگ ہے، کتنی گھٹی ہوئی اور تاریک ہے، تم یہاں پہلی بار سورج کی روشنی لے کر آئے ہو، میں نے تمہارے ہی ذریعہ پہلی بار آزادی پائی ہے، میں تمہیں کبھی نہ بھلا سکوں گی۔"

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے راجہ کہیں قریب ہی گیٹار بجا رہا ہو اور اس کی میٹھی آواز فضا میں نشہ سا بکھیر رہی ہو۔

لیکن آج مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دنیا میں سچ اور جھوٹ کے درمیان بہت معمولی سا فرق ہے۔ سچ عیاں ہے اور جھوٹ چھپا ہوا ہے۔ فریب کی گہری دبیز چادر کی طرح۔ اسی لئے اس دن اس کی زبان سے ایک کبھی نہ بھولنے والی بات سن کر میں خوشی سے جھوم اٹھا۔ میں نے راجہ کے گیٹار کی جھنکار میں خوابوں کی ایک دنیا دریافت کی تھی، لیکن وہ فریب بھی دیر تک کہاں قائم رہا؟

چھ ماہ بعد ایک دن راجہ نے مجھ سے کہا۔ "میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے خوش ہو کر پوچھا ۔ "کہاں، کس سے؟"

"یہیں، کلاس کی ایک لڑکی سے، تم تو اسے جانتے ہو۔"

"کیا نام ہے اس کا؟"

"نہار۔"

جیسے میرے جسم کا سارا خون لمحہ بھر کے لئے منجمد ہو گیا ۔ میرے حواس جاتے رہے۔ میں نے پوچھا "تم نے سات روضہ کب دریافت کیا؟"

"چار ماہ قبل" تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد راجہ نے کہا "مجھے سب کچھ معلوم ہے، میں تمہیں دکھ پہنچانا نہیں چاہتا تھا، لیکن .... یہ دیکھو" راجہ نے جیب سے ایک سفید لفافہ نکالا، اس میں ایک ننھا سا خط تھا جس پر اس نے اپنی خوبصورت تحریر میں راجہ کو عزیز از جان، راجہ کے القاب سے مخاطب کیا تھا، میں نے راجہ سے کچھ زیادہ نہیں پوچھا، اس دن مجھے پھاگن کا تمام رنگ پھیکا پھیکا نظر آ رہا تھا۔

آج بھی کہانی لکھتے وقت یہی محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے میرا دل زور زور سے دھڑک رہا ہو۔ چیت کے جھڑتے ہوئے پتے کا درد کوئی نہیں سمجھے گا، میں جانتا ہوں، پھر بھی کہانی لکھتے وقت اس مغرور متکبر تصویر کی طرف دیکھ کر سوچتا ہوں مگر آج اس کہانی کو دہرانے سے فائدہ کیا۔

سات سال کے طویل عرصہ کے بعد ایک دن اچانک میں کیوں اس بلند چہار دیواری سے گھرے ہوئے قلعہ نما محل کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا، یہ مجھے خود بھی معلوم نہیں، بڑے دروازہ کے سامنے جاتے ہی میں نے دیکھا موم کی گڑیا کی طرح نازک ایک خوبصورت بچہ کھڑا تھا، اس کی عمر پانچ سال سے زیادہ نہ تھی۔ وہ کسی کو بلا رہا تھا ۔ "اوناتو، ناتو ادھر آؤ نا۔"

ایک معمر شخص، قدرے جھکا ہوا تیزی سے آیا اور مجھے دیکھتے ہی اس نے حیرت سے پوچھا "تو ۔ جی ۔ کے ۔ آپ کون ہیں؟"

میں نے کہا ۔ "مجھے نہیں پہچانتے اخلاق چچا، میں ہوں جعفر۔"

اس نے ناک پر جھولتی ہوئی عینک کو درست کیا اور دھوپ ۔ بلکہ بہت دور ۔ پھیلی ہوئی ماضی کی یاد کی روشنی ۔ اس کی عینک کے شیشے پر جھلملا اٹھی۔ اس کی ڈاڑھی چند لمحے ہوا میں ہلتی رہی پھر نہار کے بابا نے مجھے پہچان لیا، بولے ۔ "آؤ ۔ بابا جعفر، آؤ۔ یہ میرا ناتی نواسہ ہے، بڑا شریر ہے۔"

میں نے پوچھا ۔ "عرفان کہاں ہے، اس کا باپ؟"

اخلاق بابا تھوڑی دیر تک خاموش نگاہوں سے میری طرف دیکھتے رہے۔ صبح کی تیز دھوپ اب بھی ان کی عینک کے شیشے میں آنکھ مچولی کھیل رہی تھی وہ کچھ سوچتے رہے، پھر آہستہ سے بولے ۔ "یہیں ہے، تم اسے خود ہی دیکھ لوگے۔"

بچہ اس وقت میرے بالکل قریب آ کر تک کر کھڑا ہو گیا تھا، ترشے ہوئے سر کے بال، خوبصورت چہرہ، بائیں گال پر ایک تل اسے دیکھتے ہی ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میر عرفان پانچ سال کے بچے کے قالب میں ڈھل کر میرے سامنے آ کھڑا ہوا ہو۔

اس نے اپنی توتلی زبان میں مجھ سے پوچھا: "تم کون ہو؟"

"چچا" میں نے جواب دیا۔

بچے نے نفی میں سر ہلایا ۔ "نہیں، جھوٹ ہے، تم تو میرے چچا ہو۔"

اخلاق بابا نے ہنستے ہوئے کہا: "پاگل، بڑی بات" پھر مجھ سے بولے ۔ "آؤ آؤ جعفر، اندر چلو۔"

ہم دونوں بیٹھوں کے بنے ہوئے راستے پر چلنے لگے جو آدھا ادھڑ چکا تھا۔ چلتے چلتے میں نے پوچھا۔ "رونو کا ماموں آج کل کہاں ہے؟"

اخلاق صاحب نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا۔ "رونو کا ماموں! او ہو، میرے بڑے لڑکے کے بارے میں پوچھ رہے ہو؟ وہ تو یورپ گیا ہوا ہے، دو سال بعد واپس آئے گا۔"

"اور آپ؟"

"میں" اخلاق صاحب ہنسے، ان کی ہنسی بڑی غمگین اور پژمردہ تھی ۔ "میرا رہنا نہ رہنا برابر ہے، عرفان کی طبیعت خراب ہونے کے بعد سے یہیں ہوں، زمینداری تو اب رہی نہیں، مگر زمین جائداد اب بھی کافی ہے، اس کی دیکھ بھال کون کرتا؟"

عرفان کی طبیعت خراب ہے؟ ان کی بات سن کر مجھے دل ہی دل میں سخت حیرت ہوئی، سات روضہ کی تاریک گلی سے نکل کر اخلاق صاحب کا لڑکا یورپ چلا گیا تھا، لیکن مجھے کچھ حیرت نہ ہوئی، اتنے بڑے محل میں اخلاق صاحب کو دیکھ کر بھی مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی، مگر عرفان؟ اتنے خوبصورت جسم، اتنی اچھی تندرستی کے باوجود اسے کون سی بیماری ہو گئی؟ میں نے پوچھا۔ "عرفان کیا بیمار ہے چچا؟"

اخلاق صاحب نے ٹھنڈی سانس لی، بولے ۔ "وہ تقریباً پاگل ہو گیا ہے۔"

"پاگل ہو گیا ہے؟" میں جیسے گنگ ہو کر رہ گیا۔ پھر میں نے پوچھا: "اس سے ایک بار میری ملاقات نہیں ہو سکتی چچا؟"

اخلاق صاحب نے چاروں طرف دیکھ کر سہمے ہوئے لہجے میں جواب دیا: "نہیں، نہیں، ابھی نہیں بابا۔"

دوپہر کا کھانا کھا کر میں کچہری محل ہی میں سو گیا یکایک ایک بھیانک سی چیخ سن کر میری آنکھ کھل گئی کوئی بہت زور سے کرخت آواز سے چیخ رہا تھا۔ "تیغ سنگھ صاحب، ہاں میری بندوق لاؤ!"

دیکھا تو دروازہ کے سامنے میر عرفان کھڑا تھا۔ سر کے بال بے ترتیب اور الجھے ہوئے تھے، شیو کافی بڑھا ہوا تھا اور جسم پر میلی ہوئی سفید پنجابی کا دامن پھٹ کر ایک طرف جھول رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ پھر چیخ پڑا۔ "تیغ سنگھ!"

میں تقریباً بھاگ کر اس کے قریب پہنچا اور آواز دی: "عرفان!"

اس نے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور کہا: "او ہ یو، واٹ اے وَنڈرفل، اب مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

پھر وہ کھڑا کھڑا اپنے ناخن کاٹنے لگا۔

میں اخلاق صاحب سے سن چکا تھا کہ عرفان کبھی کبھی بھلا چنگا بھی ہو جاتا تھا۔ نہار سے باتیں کرتا تھا، بچے کو پیار کرتا، مگر اچانک وحشت طاری ہو جاتی، بہتیرا علاج معالجہ ہو چکا تھا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

عرفان کی آنکھوں کی سرخی اس وقت تک ماند پڑ چکی تھی ۔ میں نے دھیرے سے اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔ "چلو، مجھے گیٹار سناؤ گے؟"

عرفان آگے بڑھا، گھاس سے ڈھکے ہوئے چبوترے کو چھوڑ کر محل کے اندرونی دروازہ کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھ سے کہا۔ "آؤ۔" سکڑا سمٹا، بستر پر دونوں پاؤں اوپر اٹھا کر بیٹھ گیا، گیٹار کو بچوں کی طرح پیار کے ساتھ اپنی گود میں رکھ کر مجھ سے پوچھنے لگا۔

"کوئی نئی نظم؟"

"نہیں بھئی!" میں نے جواب دیا۔

راجہ نے مزید کچھ نہیں پوچھا اور گیٹار بجانے لگے۔ بار بار سُر کٹ جاتا تھا اور آواز بے سُری ہو جاتی تھی، پھر بھی راجہ دیر تک بجاتا رہا۔ بڑی دیر تک مسلسل بجانے کے بعد راجہ نے گیٹار ایک طرف رکھ دیا اور مجھ سے کہا۔ "جانتے ہو، نہا اب بھی تم سے محبت کرتی ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

راجہ کی آنکھوں کے حلقے پھیل گئے۔ اس نے سرگوشی کے

لہجہ میں کہا۔ "جانتے ہو، دونو کے بڑے ہونے کے بعد نہار ہر روز کیا کرتی تھی؟ وہ بچے کو گود میں لے کر ہر روز تمہاری تصویر کے سامنے کھڑی ہو جاتی تھی، دیر تک ٹکٹکی لگائے دیکھتی رہتی، اس کے بعد کہتی۔

"روتو، یہ تمہارے چچا ہیں، تم بھی بڑے ہو کر اپنے چچا کی طرح ہو گے۔ ویسے ہی قابل، ویسے ہی نیک دل اور ویسے ہی ....."

راجہ یکایک رک گیا، میں نے دیکھا اس کی آنکھیں پھر سرخ ہو رہی تھیں، کہنے لگا۔ "اوہو، سمجھا تم اتنے دنوں بعد اسی لئے پھر آ دھمکے ہو تم نے سمجھا ہے، میں پاگل ہو گیا ہوں، کیوں؟ بدمعاش میں تجھے گولی مار دوں گا، جس طرح تیری تصویر کو گولی مار دی تھی اور ایک ہی گولی میں چور چور ہو گئی تھی۔ (NO MERCY) تیغ سنگھ، صوبے خاں"۔

اس کی خوفناک چیخیں دیر تک گونجتی رہیں، میں نے حیرت سے دیکھا، اسی وقت کمرے کا عقبی دروازہ کھلا اور نہار آ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے سات سال کے طویل عرصہ کے بعد نہار کو دیکھا تھا۔ اب وہ قدرے موٹی ہو گئی تھی، مگر اس کے چہرے پر اب بھی وہی جانی پہچانی زہریلی سرخی تھی۔ اس نے سلک کی ساڑی کا جھومتا ہوا آنچل کندھے پر ڈال لیا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں ایک تصویر تھی۔ اس نے دھیرے سے کہا۔ "بھیا، تم جھوٹ کیوں بول رہے ہو۔ تصویر کو تم نے گولی نہیں ماری۔ یہ ہے وہ تصویر۔ اس تصویر کو تم نے توڑ کر کیوں نہ پھینک دیا۔ مجھے اسی بات کا غصہ ہے، اب میں خود اسے توڑ دوں گی"۔

اس نے زور سے تصویر کو زمین پر پٹک دیا۔ میری ہی تصویر تھی، بہت دنوں پہلے عرفان کو دی تھی، شادی سے پہلے ہی یہ تصویر کی طرف دیکھ کر راجہ چیخا۔ "تیغ سنگھ" تیغ سنگھ اب ان کے یہاں نہیں تھا، یہ بات راجہ بھول گیا تھا۔ نہار سامنے آ گئی۔ اس نے ہائی ہیل کا سینڈل پہن رکھا تھا، اس نے بایاں پاؤں تصویر پر رکھ دیا اور آہستہ سے بولی۔ "اتنا کیوں چیخ رہے ہو، اس کو توڑنے کے لئے بھی کہیں بندوق کی ضرورت پڑتی ہے، یہ دیکھو"۔

ہلکے سے بوجھ تلے پہلے شیشہ ٹوٹا، پھر فریم اور اس کے بعد تصویر بھی تڑمڑ کر رہ گئی مگر نہار پھر بھی نہ رکی، اس نے اپنا دایاں پاؤں بھی تصویر پر رکھ دیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے چیخ کر بولی۔

"تم یہاں کس لئے آئے ہو؟ میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گی، تم نے سمجھا کیا ہے، تیغ سنگھ، صوبے خاں"۔

راجہ یکایک زور سے قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا، میں حیران و ششدر کھڑا تھا۔ "خدا نہ کرے، نہار بھی پاگل ہو گئی کیا؟"

شام کی ہوائیں درختوں کے پتوں سے ٹکرا کر جیسے گیٹار بجا رہی تھیں، میں نے بارہ زمینداروں کے ایک زمیندار کے محل سے راستہ کی طرف اپنے قدم بڑھائے۔ یہاں سے بس اسٹینڈ کوئی پاؤ میل تھا اور شہر پچاس میل دور، اس کے بعد وہی پرانی زندگی تھی۔ بس اتنا ہی سا تو فرق تھا، شاید اسی لئے فاصلہ کو طے کرنے میں مجھے سات سال لگ گئے تھے۔ اب میں اپنی زندگی میں یہاں پھر کبھی نہیں آؤں گا۔

آسمان پر ہلکے گلابی رنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ دور افق کی سمت قطار باندھے ہوئے بہت سارے بگلے اڑے چلے جا رہے تھے، ایسا لگتا تھا، جیسے آج شام کے یہ مسافر دوسری شام کبھی لوٹ کر یہاں نہیں آئیں گے۔ اتنے میں بس کا ہارن بج اٹھا۔

اخلاق صاحب کے ساتھ روتو بھی مجھے رخصت کرنے آیا۔ اس نے اپنی چھوٹی سی بند مٹھی بلند کر کے کہا۔ "چچا، پھر آنا"۔

"اگر نہ آؤں؟" میں نے پوچھا

روتو لمحہ بھر خاموش رہا، پھر سر جھلا کر بولا۔ "ماں روئے گی"۔

"تم تو نہیں روؤ گے؟"

"نہیں"۔

اور اس کی وجہ سے ہی میں اور بھی یہ کہانی نہ لکھ سکا۔

★

پاکستان کی روح رواں ——— بلند کردار انسان

بہترین لوگ ——— بہترین ملک

پاک دیس ——— پاک انسان

دنیا یا پاک ——— مرد ان پاک

فرد کی آبرو جماعت، جماعت کی آبرو فرد

غزل

تابش دہلوی

جانے کیا دیکھ کے آج آئے ہیں میخانے سے
آنکھ میخوار ہٹاتے نہیں پیمانے سے

ساقیا ہم یہ اثر لائے ہیں میخانے سے
آنکھ اٹھاتے ہی چھلک جاتے ہیں پیمانے سے

دل سے جاتا ہی نہیں گیسوئے جاناں کا خیال
ہے تعلق ابھی زنجیر کو دیوانے سے

حسن کی انجمن آرائی کا عالم توبہ
بزم میں شمع جلائی گئی پروانے سے

دل شکستہ نہیں شائستۂ الطاف و کرم
مے پلاتے نہیں ٹوٹے ہوئے پیمانے سے

کم سے کم قسمتِ پیمانہ مئے ناب تو ہے
گردشیں مانگ لیں ہم بھی کسی میخانے سے

جوشِ وحشت بھی ہوا مانعِ وحشت کیا کیا
دشت، زنداں نظر آیا کسی دیوانے سے

کیا کوئی عہدِ وفا ٹوٹ گیا ہے تابش
خیر تو ہے جو نظر آئے ہو بیگانے سے

مشتاق مبارک

یہ خرد کی سطح بینی کہیں عام ہو نہ جائے
سرِ بزمِ ناز غرقِ مہ و جام ہو نہ جائے

ترے لطفِ بیکراں سے مرے دل کو یہ گماں ہے
یہ ترا سکوتِ پیہم ہی پیام ہو نہ جائے

یہی سلسلہ رہا جو تری بے نیازیوں کا
مری صبحِ آرزو کی کہیں شام ہو نہ جائے

نہ کرو خیالِ پیماں، رہو مجھ سے تم گریزاں
مرے نام سے تمہارا کہیں نام ہو نہ جائے

سرِ صحنِ گلستاں بھی مرا دل دھڑک رہا ہے
یہ بساطِ رنگ و بو ہی کہیں دام ہو نہ جائے

ہے انہی کی داستاں ہی مری ہر غزل میں رقصاں
انہیں یاد کیوں مبارک یہ کلام ہو نہ جائے

★

غزلیں

اختر انصاری اکبرآبادی

اک طرف رہ گئی دنیا تو کنارے کی طرح
عشق کا جوش ہے طوفان کے دھارے کی طرح

یوں تری یاد نے روشن کیا ماحول مرا
برق سی کوند گئی تیرے اشارے کی طرح

آ کہ اے دوست کہیں ڈوب نہ جائیں نبضیں
راہ تکتا ہوں تری صبح کے تارے کی طرح

کیا خبر حال ہو کیا عشرتِ امروز کے بعد
رقص کرتی ہوئی دنیا ہے شرارے کی طرح

غرق کر دے نہ کہیں ہوش کو طوفانِ شباب
جوشِ انفاس ہے موجوں کے طرارے کی طرح

اے سہارے کی امیدوں میں سسکنے والو
کون دیتا ہے سہارا بھی سہارے کی طرح

آتش و رنگ سے کیا کھیل رہے ہو اختر
ہر شگوفہ ہے ضیا بار شرارے کی طرح

طاہر احمد

عروسِ لالۂ صبحِ بہار دیکھیں گے
طلوعِ جلوۂ رخسارِ یار دیکھیں گے

فرازِ دار سے دیکھیں کہ کوئے یار سے ہم
غرورِ کج کلہی شرمسار دیکھیں گے

کچھ اور دن کہ ہمیں بیقرار دیکھے تو
مگر وہ دن کہ تجھے بیقرار دیکھیں گے

وہ آ رہے ہیں سرِ بام لو مبارک ہو!
چمن میں رنگ، گلوں میں نکھار دیکھیں گے

کسی کی زلف کی ظلمت میں جل کے دم لیں گے
کسی کا پیرہن زرنگار دیکھیں گے

خزاں کی زرد ادا سی کچھ اور دیر کی ہے
چمن سے تابہ چمن پھر شرار دیکھیں گے

مہک رہی ہیں امیدیں وہ رات دور نہیں
کہ تیری زلف حسیں تا کنار دیکھیں گے

چلو کہ شہرِ تمنا میں چل کے ہم احمر
کہیں پہ سایۂ ابرِ بہار دیکھیں گے

آزاد کشمیر کے پہاڑی لوک گیت

سلیم خان گمی

ہر علاقے کے لوک گیت، اُس علاقے کے جغرافیائی حالات، طبعی کوائف، اور تہذیبی روایات کے امین ہوتے ہیں۔ آزاد کشمیر سرسبز پہاڑوں، پُر شور چشموں، گنگناتے آبشاروں، گھنے گہرے جنگلوں، لہلہاتی فصلوں اور بندگان آزاد کے نعرہ ہائے پُر خروش کی سرزمین ہے۔ اگرچہ ریاست جموں و کشمیر کا ایک بڑا علاقہ ابھی تک پابہ زنجیر ہے۔ اور وادیٔ کشمیر کے یہ جواں ہمت، حریت پسند، جیالے اپنی آزادی کے لئے بیتاب و کوشاں ہیں۔ اُدھر آزاد ریاست جموں و کشمیر کے بلند ہمت، سادہ دل کاشتکار، چرواہے اور تاجر اجتماعی کوشش سے سینۂ ارض پر تاریخ کندہ کر رہے ہیں۔ کھلوں، کھیتوں، چراگاہوں، جنگلوں اور پہاڑوں میں کام کرتے ہوئے وہ گیت سنگیت کے موتی بھی بکھیرتے رہتے ہیں۔ یہ جانے بوجھے وہ مغربی موسیقار بیتھوون کے اس قول پر یقین رکھتے ہیں کہ فنون لطیفہ کی تخلیق کا سرچشمہ خدا ہے۔

اگر ہم آزاد کشمیر کے لوک گیتوں کا مطالعہ کریں تو ان میں کئی باتیں (جو ان کے موضوعات ہیں) ذہن میں آتی ہیں۔ مثلاً ماں کی ممتا، بہن کا پیار، بھائی کی شہ زوری، محبوب کے حسین خد و خال، فراق کی تلخی، موت کا غم، زندگی کی رعنائی، معصوم بچوں کی مسرتوں کے سدا بہار پھول، گلوں کے حسین مکھڑے، پرندوں کی میٹھی بولیاں، ہواؤں کی سرسراہٹ، پہاڑوں کا وقار، جھرنوں اور آبشاروں کا ترنم، لہلہاتی فصلوں کی ہریاول اور آزادی پسندوں کے نعرہ ہائے فلک بوس۔ غرضیکہ ان میں ہر منظر، ہر کیفیت اور ہر احساس کے نمائندہ رنگ، گھلے ملے نظر آتے ہیں۔ میں یہاں چند نمائندہ لوک گیتوں کا ذکر اور ان کا رنگ آہنگ پیش کرتا ہوں۔

"قینچی" ایک گیت ہوتا ہے۔ یہ دراصل کشمیر کے جنگل یعنی نیلم کی وادی کے چراگاہوں کا مقبول گیت ہے۔ چرواہے اس المیہ لوک گیت کو بھیڑ بکریاں اور دوسرے مویشی چراتے ہوئے بڑی پُرسوز لَے میں گاتے ہیں۔ جدائی کا گیت "قینچی" چاہنے والے اور چلے جانے والے کے ازلی فراق کی کہانی بیان کرتا ہے۔ یعنی "قینچی" قطع وصل کی علامت ہے۔ اس کہانی کے مطابق وادیٔ نیلم کے جنگل میں ایک معصوم دوشیزہ بھیڑ بکریاں چرایا کرتی تھی۔ اُسے حسن فطرت سے پیار تھا اور وہ خود بھی حسن فطرت کا ایک مکمل نمونہ تھی۔ اسی جنگل میں لکڑی کے سوداگر آئے اور انہوں نے جنگل میں ایک جگہ ڈیرہ جما لیا۔ لکڑی کی اس فرم میں ایک شخص (جسے منشی کہا جاتا اور جو فرم کا حساب کتاب کیا کرتا تھا) ایسا بھی تھا جسے لڑکی سے پیار ہو گیا۔ وہ دونوں جنگل کے اونچے خاموش پیڑوں کی ٹھنڈی تاریکی میں ملتے اور ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بِتا دینے کا عہد کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے اُن کے پیار اور ملاپ کے بارے میں جنگل کے سرکاری پاسبان بہت کچھ جان گئے تھے۔ جب بات چلی تو دور دور تک نکل گئی۔ لڑکی کے والدین نے لڑکی کو گھر میں مقید کرا دیا اور "منشی" اپنے پیار کو نہ پا سکا۔ روایت ہے کہ لڑکی اپنے محبوب "منشی" کی جدائی میں جو گیت گاتی تھی وہ "قینچی" کہلائے کیونکہ جدائی کی قینچی نے اُن کے درمیان ازلی فراق کی ناقابل عبور دیوار کھڑی کر دی تھی۔

وادیٔ نیلم کے علاوہ "قینچی" کا یہ المیہ لوک گیت ضلع ہزارہ اور وادیٔ کاغان میں بھی گایا جاتا ہے۔ الفاظ ہیں:

۱: لگی قینچی ولادی تے دل ڈاہڈا تنگ اے
گولی ماراں رلکھیاں کی، اللہ ڈاڈے تنگ اے
لگی قینچی ولادی ...

(میرے (معصوم) دل کو جدائی کی قینچی کاٹ رہی

ہے۔ یہی باعث ہے کہ میرا دل بےچین ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ میں (جنگل کے) محاسبوں کو جان سے مار ڈالوں۔ میں خدا پر بھروسہ کرتی ہوں۔ کیونکہ وہی ہمارا ساتھی ہے)

درشی دے بناں وچ چھکدی آں آری
ڈاہڈا ارمان اسے، مِل جاندی واری
لگی قینچی ولادی ــ!

(درشی کے جنگل میں میں آری سے درخت کاٹ رہی ہوں۔ میرے دل میں تیری دید کی آرزو ہے۔ میرے محبوب آخری بار تو مجھ سے آ کر مل جا!)

اُڈیاں دو کونجاں گیاں ماہی والے رستے
اوہ گھر اُجڑے جیہڑے عمراں دے وسدے
لگی قینچی ولادی ــ!

(دو کونجیں اُڑی ہیں اور اُنہوں نے پہاڑ کی چوٹی کا اونچا راستہ لیا ہے۔ ایک مدت سے دل کے نہاں خانے بسے ہوئے تھے مگر آج وہ اجڑ گئے)

اُچیا درختا تو ڑا کے سوہنا گھیرا
تیری ایس چھاواں تلے منشی دا ڈیرہ
لگی قینچی ولادی ــ!

(اے اونچے درخت تو کتنا پھیلا ہوا ہے! اور تیرا یہ پھیلاؤ مجھے بے حد خوبصورت لگتا ہے کیونکہ تیری چھاؤں کے نیچے میرا محبوب آرام کیا کرتا تھا)

اُچا چا ہڑا بنگلہ چو میری لاواں آلے
جُھل ماڑیا منشی، اللہ دے حوالے
لگی قینچی ولادی ــ!

(میں ایک خوبصورت بنگلہ بناتی ہوں اور اس کے چاروں اور روشندان لگواتی ہوں۔ اے میرے محبوب تو اب چلا جا۔ میں تجھے خدا کے حوالے کرتی ہوں)۔

بساکھ: "بساکھ" موسم بہار کا گیت ہے۔ جب غنچے چٹکتے ہیں اور پھول کھلتے ہیں تو آزاد کشمیر کے چھوا سے "بساکھ" گاتے ہیں۔ اس گیت میں وہ اپنے ماں باپ محبوب کو یاد کرتے ہیں۔ اس کی جدائی میں آہیں بھرتے ہیں اور وصل کی آرزو اور اُمید کا اظہار کرتے ہیں۔ معصوم دوشیزاؤں کو والدین کی شفقت یاد آتی ہے۔ بیاہتا لڑکیاں بھائیوں اور بابل کے گھر آنگن کو دل میں بساتی ہیں۔ مغرور اور ستم پیشہ محبوب کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے کہ زندگی کے دن چار ہیں۔ اس لئے اِن دنوں کو مل بیٹھ کر گزارنا چاہئے۔ گویا اس اکیلے گیت میں بہت سے محسوسات ملتے ہیں:

۱: آیا بساکھ چڑی رنگ رنگ بولے
جیا ماڑا اتی بابا وطناں کی جھولے
سجنا! کدے جیندا مِل جا!

(بہار کا موسم آ گیا ہے۔ پرندے قسم قسم اور رنگ رنگ کی بولیاں بول رہے ہیں، میرا دل اپنے ماں باپ کے وطن کو جانے کے لئے پکار رہا ہے، میرے محبوب! زندگی میں کبھی تو آ کے مِل جا!)

۲: آیا بساکھ اللہ کہیا نشانی
ساوے نیلے تلڑے ٹھنڈے اُومے پانی
سجنا! کدے جیندا مل جا!

(بہار کا موسم آ گیا ہے۔ یہ موسم خدا کی طاقت کی نشانی ہے۔ ہر طرف سبزہ لہک رہا ہے اور ٹھنڈے پانی کے چشمے پھوٹ بہے ہیں۔ میرے محبوب! زندگی میں کبھی تو آ کے مِل جا!)

۳: آیا بساکھ ہاڑیاں لگ رہے چروڑے
جھلیا جھولا موتو والے پے گئے وچھوڑے
سجنا! کدے جیندا مل جا!

(بہار کا موسم آ گیا ہے۔ خوبانی کے درختوں پر کچا پھل لگ رہا ہے۔ موت کے طوفان نے ہمارے درمیان جدائی کی طویل رات لا کھڑی کی ہے۔ میرے محبوب! زندگی میں کبھی تو آ کے مِل جا!)

۴: آیا بساکھ ہل بڑھے نے ہالیاں
ماں کراون ربا ویراں بھیناں والیاں
سجنا کدے جیندا مل جا!

(بہار کا موسم آ گیا ہے۔ کسان ہل چلانے کے لئے تیار ہیں۔ بچوں کی مائیں اور بھائیوں کی بہنیں فخر سے

سربلند کھتی ہیں (لیکن میرا کوئی نہیں ہے اے میرے
محبوب! زندگی میں کبھی تو آ کے مل جا!)

ضلع مظفر آباد اور ضلع پونچھ کے درمیان ایک پہاڑ گنگا چوٹی کے نام سے موسوم ہے۔ اس پہاڑ کی بلندی گیارہ ہزار فٹ کے قریب ہے۔ گرمی کے موسم میں زمیندار لوگ کھانے پینے کی اشیاء اور مال مویشی لے کر اس پہاڑ پر چلے جاتے ہیں جسے مقامی بولی میں "بہک پر جانا" کہتے ہیں۔ سردیوں میں گنگا چوٹی پر سخت سردی پڑتی ہے اس لئے موسم سرما میں زمیندار گرم علاقوں کی طرف آجاتے ہیں۔

"چن" گنگا چوٹی کے علاقے کا فراقیہ لوک گیت ہے۔ روایت ہے کہ گنگا چوٹی کی ڈھلوانوں پر ایک نوجوان چرواہا اور دوشیزہ بھیڑ بکریاں چرایا کرتے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں جب پہلی جنگِ عظیم کا آغاز ہوا تو نوجوان چرواہے کو کسبِ معاش کی خاطر فوج میں بھرتی ہونا پڑا۔ اس کی محبوبہ خوش تھی کہ اُس کا محبوب محاذِ جنگ پر گیا ہے تو بہت سی دولت سمیٹ کر لائے گا اور کپتان بن کر آئے گا۔ لیکن معصوم دل دوشیزہ کی آرزو پوری نہ ہوئی۔ بہادر چرواہا میدانِ جنگ میں ہلاک ہوگیا۔ جب اُس کی موت کی اطلاع گنگا چوٹی کی ترائی میں نغمہ سرا دوشیزہ کو ملی تو وہ صدمے کی تاب نہ لا کر پاگل ہوگئی۔ اُس کے نغمے نوحے بن گئے۔ یہی نوحے "چن" کہلاتے ہیں۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ گیت کے ہر بول میں "چن" (چاند۔محبوب) کو مخاطب کیا جاتا ہے:

۱: چناں ماڑیا! بناں دے وچ بولدی اے ٹوٹر
نکا جیہا چن ماڑا بسترے وچ لوکر
ہائے پردیسیا چناں کیہڑے دیس ایں؟
(میرے چاند محبوب! جنگل میں قمری کی پکار سنائی دے رہی ہے۔ میرا کمسن محبوب بستر میں نوکر ہے۔ اے میرے پردیسی محبوب! تو کس دیس میں ہے!)

۲: چناں دی نشانی ماڑی بینی سنگ گجرا
اک گھڑا بھریا دُوا بھراں سجرا
ہائے پردیسیا چناں! کیہڑے دیس ایں!
(میری کلائی کا گجرا میرے محبوب کی نشانی ہے۔ ایک گھڑا تو پانی سے بھرا ہوا ہے اور دوسرا میں بھر رہی ہوں۔ اے میرے پردیسی محبوب تو کس دیس میں ہے!)

۳: چناں ماڑیا میندڑا دے لے نی میدان
اگے اگے منشی تے پچھے کپتان
ہائے پردیسیا چناں کیہڑے دیس ایں!
(میندڑا کے خوبصورت علاقے کا میدان وسیع و عریض ہے، اس میدان میں سے ایک کپتان اور منشی کا ایک گروہ گزر رہے ہیں (اور مجھے تیری یاد دلاتے ہیں) اے میرے پردیسی محبوب۔ تو کس دیس میں ہے)

۴: چناں ماڑیا بناں دے وچ بولدی اے کاگنی
سکھاں والی ستی اے تے دکھاں والی جاگنی
ہائے پردیسیا چناں کیہڑے دیس ایں!
(میرے محبوب جنگل میں کوّی کائیں کائیں کر رہی ہے اے میرے محبوب، جسے سکھ ہو وہ تو سوتی ہے اور جسے دکھ ہو وہ ہمیشہ جاگتی ہے۔ اے میرے محبوب تو کس دیس میں ہے!)

گوری: اس لوک گیت میں "گوری" (محبوبہ) سے خطاب ہوتا ہے۔ اس کے حسنِ دل فریب کو سراہا جاتا ہے اور اس کے قرب کی تمنا کی جاتی ہے:

گل سُن جانئیاں بانکیئے گورییئے
مُکی گیاں اج چھٹیاں گورییئے
دلے دیاں گلاں ماڑے دلے وچ رہیاں
دلے دیاں گلاں سُنی جانئیاں گورییئے
پار توی مگی تیریاں اڈیکاں
چانی راتیں ملی جانئیاں گورییئے
تکی تکی راہ تیرا تھکی رہیاں اکھیاں
ملے نی وچھوڑے ٹٹی اکھیاں گورییئے

(اے بانکی چال والی سجل محبوبہ! میری ایک بات سن کر جانا اے بانکی چال والی سجل محبوبہ! آج میری چھٹیاں
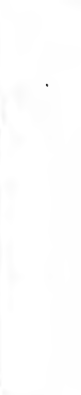
پاکستان اور اقوام متحدہ

تعاون کے معجزے

پاکستان — اقوام متحدہ کا حلیف — تمام اقوام عالم اور
عالمی اداروں سے خوشگوار روابط کا خواہاں اور
اقوام متحدہ سے افادہ و استفادہ کے اصول پر تعاون کرنے
میں پیش پیش ہے۔

سابق سندھ میں ہزاروں ایکڑ صحرائی زمین کو جدید
مشینوں کی مدد سے قابل کاشت بنانے کی مہم۔
بین الاقوامی ادارۂ عمال کے ماہرین : مقامی لوگوں کو
جدید مشینوں کے استعمال کی ہدایت۔

ک و زراعت کے
ذ سے مستونگ
علاقے میں تازہ
فراہمی : مقامی
کے تعاون سے
م۔

گدو بیر

آبپاشی کا منص
۱۹۶۲ء تک
ہو جائیگا او
۰۰۰،۵۰۰،
زمین سیراب

ختم ہوگئی ہیں! (واحد) میرے دل کی تمنائیں میرے دل میں مستور رہی ہیں۔ (رُعبِ حسن کے باعث میں اُن کا اظہار نہیں کر پایا) ندی کے اُس پار مجھے تیرا انتظار ہوگا۔ چاندنی رات ہوگی آکر مِل جانا۔ تیری راہ تک تک کر میری آنکھیں تھک گئیں (مگر تو نہ آئی) اے میری بانکی چال والی سجل محبوبہ۔ جدائی طویل تھی اس لئے میں خود تجھے ملنے چلا آیا۔)

لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے ؏

عشق اول در دلِ معشوق پیدا می شود

بعض اوقات پہاڑوں اور آبشاروں کے دل فریب مناظر میں پرورش پانے والی پہاڑی محبوبہ اپنے چاہنے والے کی چاہت میں تڑپ اٹھتی ہے اور رفاقت کے چند لمحوں کی بھیک اِن الفاظ میں مانگتی ہے:

اج دی راتیں رہو ماڑے گدّیا

اج دی راتیں رہو۔ !

چھلڑو دی دینی آں بکرو دی دینی آں

ڈیوڑھیا دینی آں رسو ماڑے گدّیا

اج دی راتیں رہو۔!

چٹیاں نی چادراں، پلنگ نواری

پھُلاں دے سرہاندڑو، رنگ نسواری

نمی نمی آئے خوشبو ماڑے گدّیا

اج دی راتیں رہو۔!

کری کری گلاں ماڑا من نہیں رجدا

نویں ایں نکو جند، انگ انگ بھجدا

کچی کچی نیندرے سواں ماڑے گدّیا

اج دی راتیں رہو۔!

(میرے محبوب! تُو آج کی رات میرے پاس آرام کر! صرف آج کی رات! میرے محبوب! اگر تجھے بکریوں بھیڑوں اور میمنوں سے پیار ہے تو میں تجھے وہ بھی لا دیتی ہوں۔ میں تجھے اپنی خاص ڈیوڑھی میں اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاؤں گی۔ صرف آج کی رات میرے پاس آرام کر۔ میرے محبوب! میں تیرے لئے نواری پلنگ بچھاؤں گی جس پر سفید چادریں ہوں گی، سرہانے پھولوں سے مزیّن ہوگا اور اس کا رنگ نسواری ہوگا۔ اس سرہانے سے ہلکی ہلکی میٹھی میٹھی خوشبو آئے گی۔ میرے محبوب! صرف آج کی رات میرے پاس آرام کر! میرے محبوب! میرا دل چاہتا ہے تیرے ساتھ ساری رات باتیں کرتی رہوں، پیار کی باتیں میری جوانی تو دیکھو! یہ بالکل نئی ہے۔ اور اسے تیرے بنا کسی نے نہیں دیکھا۔ میرے انگ انگ میں پیار کی سرشاری ہے! میں آنند مند ہوں کہ تو میرے پیار کی میٹھی نیند کے مزے لے۔ میرے محبوب! صرف آج کی رات میرے پاس آرام کر!)

کلی: "گوری" سے ملتا جلتا گیت "کلی" ہے۔ "کلی" میں محبوبہ کے حسن جہاں سوز کو خراجِ تحسین ادا کیا جاتا ہے اور اس کی قربت اور وصل کی آرزو کی جاتی ہے۔ گوری اور کلی کی محبوباؤں میں صرف عمر کا فرق ہے۔ گوری کی محبوبہ اپنے حسن کا شعور اور ادراک رکھتی ہے اس لئے قدرے مغرور اور خود پسند ہے۔ لیکن "کلی" کی محبوبہ کمسن معصوم اور بھولی بھالی ہے۔ اُسے اپنے حسن جہاں تاب کا احساس نہیں اس لئے وہ خود پسند یا متکبر نہیں ہے۔ کلی کی محبوبہ کا حسن روحانی بالیدگی کا باعث بنتا ہے جب کہ گوری کی محبوبہ کا حسنِ جسم و جاں میں جذبات کا ایک عظیم طوفان بپا کر دیتا ہے ؎

کلیئے چنبے دیئے

ساڈے گراں دل آ

کلیئے چنبے دیئے

(اے چنبہ کی کلی۔ کبھی تو ہمارے گاؤں کی طرف آؤ (تاکہ اس کا بخت بیدار ہو)

ڈینو: ایک خودرو جنگلی پھول ہے جو موسم بہار میں بہار دیتا ہے۔ لوک گیت "ڈینو" خوشی اور انبساط کا گیت ہے جو لڑکیاں بالیاں کورس میں گاتی ہیں۔ تقریب ہمیشہ پر مسرت ہوتی ہیں۔ سہیلیاں اکٹھی ہو جاتی ہیں اور مستی گاتی ہیں۔

ماڑے چھنے آلے ڈوگے بکا ڈینو کھلیا

ماڑی پیڑگی اسے اکھ

ہوئے مہندی آلے ہتھ

پئی بجدی اسے شنکھ

هوئیاں لکھ توں لکھ
ساڈے چھنے آے ڈوگے نِکا ڈینو کھلّیا

(ہمارے گھر کی دیوار کے ساتھ جو کھیت ہے اُس میں خودرو جنگلی پھول ڈینو کھلا ہے! میری آنکھ اختلاج جنبش میں ہے (محبوب کے ملنے کا نیک شگون ہے) میرے ہاتھوں میں مہندی رچی ہے۔ (میری شادی ہو گئی ہے) میری نتھ "ناک کا زیور) ناچ رہی ہے۔ (دل کی آرزوؤں کے رقص کا بیرونی اظہار) میں تشکاتھی۔ اب میری قدر و قیمت ایک لاکھ ہے! ہمارے گھر کی دیوار کے ساتھ جو کھیت ہے اُس میں خود رو جنگلی پھول ڈینو کھل رہا ہے)

لوک گیت ڈینو کا یہ ٹکڑا علامتی اظہاریت کا بھرپور اور مکمل نمونہ ہے۔ شادی شدہ لڑکی جو بات براہ راست نہیں کہہ پاتی خارجی اور معروضی علامتوں کے توسط سے کہہ دیتی ہے اور سہیلیوں کے اِس طعنہ سے بچ جاتی ہے کہ لو دیکھو اس بے حیا کا تو آنکھ کا پانی مرگیا ہے!

ڈبّی: "ڈبی" شادی بیاہ کا گیت ہے۔ یہ گیت پنجابی لوک گیت "شِٹنی" سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ شِٹنی کی طرح ڈبّی میں بھی شوخی، خندہ اور چھیڑ چھاڑ کے مضمون باندھے جاتے ہیں۔ براتیوں کو دِق کیا جاتا ہے اور انہیں یہ گیت گا کر استہزا کا ہدف بنایا جاتا ہے۔

بیلُواَ: "بیلُواَ" رقص گیت ہے اور جشن بہار منانے کے لئے گایا جاتا ہے۔ پہاڑی میں ایسے بہت سے گیت ہیں جن کا تعلق رقص سے ہے۔ بیلُواَ گیت کا نام نہیں لیکن اس لفظ کے بار بار دُہرائے جانے سے اکثر لوگ اُن گیتوں کو بیلُواَ گیت کا نام دیتے ہیں جن کا تعلق رقص سے ہو۔ مسرت، شوخی، طرّاری اور دل لگی ان گیتوں کے موضوع ہیں۔ بعض اوقات یہ گیت گھریلو اور سماجی تنقید کا فریضہ بھی ادا کرتے ہیں اور شکایات کا دفتر کھول دیتے ہیں۔ غزل کی طرح ذیل کے گیت میں بھی مضامین کا تنوع اور اختلاف نمایاں طور پر نظر آتا ہے:

۱: ہلا بیلُوا او۔ ہلا بیلوا
بیلُوا ماڑا رُستی رُستی جاندا بلّیا
ہلا بیلُوا او۔ ہلا بیلُوا

۲: دُوریں دوریں جاندا، مڑا بنسری بجاندا
کولیں کیّاں رنّاں بھرمندا بلّیا
ہلا بیلُواَ او، ہلا بیلُواَ

۳: چُلّے نہیں اگ، گھڑولے نہیں پانی
کُتّے گئی گھرے دی مجھانی بلّیا
ہلا بیلُواَ او، ہلا بیلُواَ

۴: کھانے کی نہیں دیندا مڑا لانے کی نہیں دیندا
لوکیں کی گلاندا "جندماڑی" بلّیا
ہلا بیلُواَ او، ہلا بیلُواَ

۵: چِٹّے چِٹّے دندے تیرے دندے پُردواری
لوکیں کہندے نی او ضلعداری بلّیا
ہلا بیلُواَ او، ہلا بیلُواَ

۶: کنکے دی روٹی بھرا دل بھری موتی
چاہے کنے گھول گھول کھانی بلّیا
ہلا بیلُواَ او، ہلا بیلُوا

۷: کودا پرانا ساڈے انگ نہیں چھُوانا
انگ ساڈا موتیاں دا دانہ بلّیا
ہلا بیلُواَ او، ہلا بیلُواَ

(۱) اے میرے ساتھی، اے میرے ساتھی۔ میرا محبوب روٹھ کر جا رہا ہے۔ (اسے منا کر لاؤ)

(۲) اے میرے ساتھی، میرا محبوب مجھ سے دور جا رہا ہے اور بنسری بجا کر گاؤں کی دوسری عورتوں کو خوش کر رہا ہے (بڑی افسوس ناک بات ہے)

(۳) اے میرے ساتھی، چولھے میں آگ نہیں اور گھڑے میں پانی نہیں۔ گھر میں "بیگم" بھی نہیں ہے (گھر کا مالک تو ہفت ہزاری ہونے کا دعویٰ کر رہا تھا)

(۴) اے میرے ساتھی! میرا شوہر مجھے نہ کھانے کے لئے روٹی دیتا ہے اور نہ پہننے کے لئے کپڑا، اور ستم یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے مجھے "میری رُوح" کہہ کر پکارتا ہے۔ سچ دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا۔

(۵) اے میرے ساتھی۔ تیرے سفید دانتوں کے درمیان

خاصا فاصلہ ہے۔ لوگ تمہارے دانتوں کو "منلعدلہ کی علامت" کہتے ہیں۔ (معلوم نہیں تنقیص کے طور پر یا تحسین کے طور پر)

(۶) اے میرے ساتھی! گندم کی روٹی بےشک بہت موٹی ہے لیکن میں جالے میں گھول کر مزے سے کھاؤں گی۔ (دودھ دار کے دشوار گزار علاقوں میں سبز جالے نعمت سے کم نہیں)

(۷) اے میرے ساتھی، گزشتہ برس کا پرانا کورا (ایک ناقص جنس) تو میرے جسم کے کسی عضو سے نہ چھونا چاہیئے کیونکہ میرے جسم کا ہر عضو موتی سے کم نہیں ہے۔ (خود ستائی کا مفہوم ناقص ترجمہ میں پوری طرح ادا نہیں ہوسکا)

وار: پنجابی لفظ "وار" جنگ اور دوڑ دھوپ کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ ادبی تنقید میں وار رزمیہ نظم (EPIC) کو کہا جاتا ہے۔ وار میں جنگ کی تیاری، جنگ کے کوائف، جنگ میں حصہ لینے والوں کی سیرت و کردار اور جوش و ہمت کے تذکرے ملتے ہیں۔ پہاڑی میں سب سے معروف نظم شمس خاں کی ہے۔ شمس خاں آزادی پسند سرفروش تھا جس نے ڈوگرہ راجہ رنبیر سنگھ سے ٹکر لی۔ اگر اس کے ساتھی فریب سے کام نہ لیتے تو شاید وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتا۔ وہ ڈوگرہ راجہ کے خلاف لڑتا ہوا اپنوں کی تیغ ستم کا شکار ہوگیا۔ ذیل میں شمس خاں کی وار سے ایک بند دیا جاتا ہے:

۱: سُنیا دے مہاراج خفگی بہتی ساری آئی
چڑھیا دیوان دھنّو پنج سو فوجاں دا ہمراہی

۲: جا پہنچیا بچ میدان اس نظر چا بٹائی

۳: توں ایں دیوان دھنو تے میں ہاں شمس دے شپاہی
ماراں گا تلوار گلاں کرے تے کل خدائی
میں ماراں تلوار تیرے پیچھے دیوان اڈائی"

۴: نٹھا دیوان دھنّو تے چھوڑیا چھیڑیوں بن لائی
جا پہنچیا وچ جموں اس دتی لے دہائی

(۱) مہاراج نے شمس خاں کے نعرۂ جہاد کے بارے میں

سنا تو اُسے بہت غصہ آیا۔ اس نے اپنے وزیر دھنو کو بالنسو فوجی دے کر شمس خاں کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔

(۲) دیوان دھنو میدان جنگ میں پہنچا اور اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ (اُسے شمس خاں نظر پڑا)

(۳) شمس خاں نے دیوان دھنو کو للکارا، "دھنو! اگر تو وزیر ہے تو شمس خاں سپاہی ہے۔ میں اپنی تلوار سے وہ کام لوں گا کہ ایک دنیا ششدر رہ جائے گی۔ میں اپنی تلوار سے تیرے جسم کو روئی کے گالوں کی طرح اڑا کر رکھ دوں گا۔"

(۴) دیوان دھنو نے شمس خاں کی للکار سنی تو راہ فرار اختیار کی اور وہ چھیڑتے نامی گاؤں سے بھی دُور نکل گیا اور آخر کار جموں پہنچا جہاں جاکر اس نے شمس خاں کی بہادری اور دہشت کے قصے بہ آواز بلند بیان کئے۔"

اہل کشمیر کے سرفروش شمس خاں کی بہادری اور جرأت کا یہ پرانا قصہ اب بھی لوگوں کو یاد ہے اور وہ قریہ قریہ بستی بستی گھومنے والے عوامی نواکاروں سے اسے بڑی دلچسپی سے سنتے ہیں۔ ۴۸-۱۹۴۷ء میں جب اہل کشمیر نے ڈوگرہ شاہی کے خلاف شجاعت و شہامت کے کارنامے سرانجام دیئے تو قومی ترانے اور واریں معرض تخلیق میں آئیں۔ یہ قومی ترانے اور رزمیہ نظمیں اب بھی تحریک آزادی اور حصولِ کشمیر کے جذبۂ عمل کو ابھارتی ہیں۔

آزاد کشمیر میں سیف الملوک، سی حرفی، ماہیا اور ڈھولو بھی گائے جاتے ہیں اور بے حد پسند کئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ لوک گیت مغربی پاکستان کے مختلف علاقوں میں بھی رائج ہیں اور یہی علاقے اِن گیتوں کی اصل جنم بھومی ہیں۔ مغربی پاکستان کے عوامی نغمات کی آزاد کشمیر میں مقبولیت کی وجہ آزاد کشمیر ریڈیو ہے۔ جس کی معاونت سے اس عوامی ورثہ کی تہذیب اشاعت اور ترتیب کا عمل آسان اور تیز ہوگیا ہے۔

ستارۂ کہن ــ طلوعِ نو

قلات ڈویژن کا نیا صدر مقام ــ خضدار

عمر عامر

بلوچستان اور سرحد کا علاقہ انگریزوں کے دور میں بے توجہی کا شکار رہا اور اس کے ساتھ یہاں کے باشندے بھی ملوکیت کی روایتی سرد مہری و سنگدلی کے شکار رہے۔ قبائلی علاقے پر تو اجنبی کے دستِ غارت گر کی خاص عنایت تھی، لیکن قیام پاکستان، بالخصوص انقلابی حکومت کے ساتھ اس تمام علاقے اور اس کے باشندوں کی قسمت کا ستارہ جاگ اٹھا ہے۔ اور ان کے حالات میں زمین آسمان کا فرق پیدا ہو چکا ہے۔ قلات ڈویژن کی تاریخ میں جو نیا ورق الٹ گیا ہے اور پے در پے اصلاحات کے سلسلے کی آخری کڑی کے طور پر خضدار کو صدر مقام بنانے کا جو قدم اٹھایا گیا ہے وہ نہ صرف اس کی عظمتِ رفتہ کو بحال کرتا ہے بلکہ حکومت کی روز افزوں، بیش از بیش، توجہ کی بین علامت بھی ہے۔

ذیل کے مضمون میں خضدار کی تاریخی حیثیت کے ساتھ ساتھ اس حقیقت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ (مدیر)

۲۶ ستمبر کو مغربی پاکستان کے گورنر، ملک امیر محمد خان نے خضدار میں قلات ڈویژن کے نئے ہیڈ کوارٹر کا سنگ بنیاد رکھا اور اس طرح خضدار کی تعمیر نو کا آغاز ہوا۔ یہ خبر اہم ضرور ہے لیکن اس کی حقیقی اہمیت اس علاقے کی قدیم تاریخ کا طالب علم ہی سمجھ سکتا ہے جس کی نظر قدیم خضدار کے عروج و زوال پر ہو۔ پہلی صدی ہجری کے اواخر میں اس کی تعمیر نو کا آغاز ہوا تھا۔ اس وقت بھی اس کا سنگِ بنیاد ایک مسلمان گورنر ہی کے ہاتھوں رکھا گیا تھا۔ آج خضدار میں تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔

خضدار نے بے شمار انقلاب دیکھے، اس کے در و دیوار پر اہل نمن کے چھینٹوں سے گل بوٹے بھی بنے، حملہ آوروں کے گھوڑوں ٹاپوں نے کئی بار اسے پائمال و ویران بھی کیا، عرب مسلمانوں نے اسے اس کے گرد و نواح میں چمن بندیاں کیں، اس کے گلی کوچوں کو سنوارا۔ شہر کو عظمتیں، رونقیں بخشیں، رعنائیاں عطا کیں۔ مگر زمانے کی گردش کسی شے کو ایک حال پر نہیں رہنے دیتی۔ انقلاباتِ زمانہ نے خضدار کی رونقیں چھین لیں، اس کے پر عظمت ماضی پر پردے پڑتے گئے، دس گیارہ صدیوں تک خاک کی تہیں اس کے روشن ماضی پر جمتی رہیں۔ شاندار محلات کھنڈر بنتے رہے۔ باغ اور چمن اجڑ گئے، مٹی پتھر کے ڈھیر، ٹوٹے ہوئے برتنوں کے ٹکڑے، تراشی ہوئی چٹانیں اور بے آب و گیاہ میدانوں میں تاحدِ نظر پھیلے ہوئے کھنڈرات خضدار کے تابناک ماضی کی یادگار رہ گئے ہیں جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا۔ تاریخ پھر کروٹ لے رہی ہے خضدار کے روشن مستقبل کا سنگِ بنیاد پھر ایک مسلمان گورنر کے ہاتھوں رکھا جا رہا ہے۔ عظمت و عروج کی منزلیں خضدار کا بے چینی کے ساتھ انتظار کر رہی ہیں۔

خضدار قلات سے لسبیلہ جانے والی سڑک پر قلات سے کوئی ایک سو دس میل دور ایک قصبہ ہے۔ وہاں کے باشندوں کو محسوس ہو یا نہ ہو مگر دور سے آنے والے سیاح کو انسانوں کی اس آبادی میں ہر قدم پر ویرانیاں ہی جھلکتی نظر آتی ہیں۔ گرد و نواح کے میدانوں اور پہاڑوں پر قصبے کی کچی اور نیم پختہ سڑکوں پر، میر خداداد کے تعمیر کردہ بلند و بالا قلعہ کے بام و در پر، مکانوں حتیٰ کہ انسانوں کے ہنستے مسکراتے چہروں پر بھی مسکراہٹوں کی تہوں اور قہقہوں کی کھنک میں ویرانیاں ہی شامل نظر آتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ماحول اور انسان غیر شعوری طور پر خضدار

کے ماضی کی تباہی پر افسردہ و ماتم کناں ہیں۔

تاریخوں اور قدیم تحریروں میں خضدار کا نام دوسری صدی ہجری سے بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ تاریخ کے صفحات پر اس نام کو لانے کا سہرا عرب مورخین کے سر ہے۔ انہوں نے اس کا ذکر اس علاقے کے ممتاز اور اہم شہر کی حیثیت سے کیا ہے۔ ان بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کی آمد یعنی پہلی صدی ہجری سے قبل بھی خضدار ایک بارونق اور اہم شہر تھا۔

یونانی مورخ اسٹرابو کا بیان ہے کہ سکندر اعظم اپنی فوج کا بھاری سامان اپنے ایک فوجی افسر کریٹراس (KRATERAS) کے ساتھ بھیجا اور اسے حکم دیا کہ وہ ہند کے راستے جائے اور ایران میں سکندر سے جا ملے۔ اسٹرابو کہتا ہے کہ اس سفر میں کریٹراس کو کوارین (CHOARENE) کے علاقے سے گزرنا پڑا تھا۔ ایتھریا ناکا یہ ضلع سندھ سے ملحق تھا سر ٹی ہولڈرچ کا خیال ہے کہ کریٹراس درۂ مولا سے ہوکر گزرا تھا۔ اس صورت میں کوارین خضدار ہی کا علاقہ ہو سکتا ہے۔ بہرحال خضدار کی قدامت اور اہمیت بعض یونانی کتبوں وغیرہ سے بھی ظاہر ہوتی ہے جو اس علاقے میں پائے گئے ہیں مسلمانوں کی آمد سے قبل سندھ سے سیستان تک کے علاقے پر ایک ہندو خاندان حکمراں تھا "رائے" خاندان کے دور اقتدار میں ملتان سے درۂ مولا کے راستے قندھار اور مکران تک تجارتی شاہراہیں موجود تھیں۔ ان شاہراہوں کا نقطۂ اتصال خضدار تھا اس لئے بہت بڑی تجارتی منڈی ہونے کے علاوہ فوجی حیثیت سے بھی یہ بڑی اہمیت کا مالک تھا۔

پہلی صدی ہجری میں مکران پر عرب مسلمانوں نے اسلامی پرچم لہرایا۔ امیر معاویہ کے زمانے میں مکران کا گورنر سنان ابن سلمہ بن محالق الزملی تھا۔ سنان نے مکران میں کئی شہر آباد کئے تھے اور اس علاقے میں اسلامی حکومت کی توسیع کے لئے ملحقہ علاقوں پر فوج کشی کی ۔ اس نے لوقان اور کیکان کے علاقوں پر اسلامی تسلط قائم کیا مسلمان مورخین نے لوقان کا مرکزی شہر لوقان بتایا ہے گویا اس عہد میں قلات کے وسطی علاقے یعنی جھالاوان کو لوقان کہتے تھے۔ بعض مؤرخین نے اس علاقے کو توران یا توبران بھی لکھا ہے مثلاً کتاب "مسالک والممالک" کا مصنف لکھتا ہے۔ توران کے ممتاز اور اہم شہر کرکنان اور قصدار ہیں۔

ایلیٹ نے اپنے ترجمے میں لکھا ہے "خضدار بڑا شہر ہے، کئی قصبے اور دیہات اس سے ملحق ہیں۔ معین بن احمد گورنر ہے خطبہ خلیفہ کے نام کا پڑھا جاتا ہے۔ گورنر کا قیام قریبی شہر کعبہ کنعاں میں رہتا ہے۔" الادریسی نے بھی لکھا ہے کہ توران کا خاص شہر قصدار ہے۔ قصدار کے قریب ایک شہر کا ہر مؤرخ نے ذکر کیا ہے، کسی نے کعبہ کنعان لکھا ہے کسی نے کیکان اور کسی نے کرکنان۔

کرکنان کے ذکر میں بیان کیا جاتا ہے کہ عمران بن موسیٰ گورنر مکران، نے کرکنان پر حملہ کر کے جاٹوں کو ان کی سرکشی کی سزا دی اور وہاں ایک شہر "البیضہ" کے نام سے آباد کیا۔ البیضہ میں مسلمانوں کی فوجی چھاؤنی قائم کی گئی۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ عمران نے شہر کرکنان کو فتح کیا تو مسلمانوں کی اس یورش سے اصل شہر بڑی حد تک ویران اور تباہ ہوگیا۔ شہر سے متصل میدان میں مسلمان فوجوں کے سفید خیموں کا ایک شہر سا آباد ہوگیا۔ شہر کے تاجروں نے مسلمان فوجوں کے کیمپ میں اپنی دکانیں کھول لیں۔ اس طرح ایک نیا شہر وجود میں آگیا۔ سفید خیموں کی مناسبت سے اس شہر کا نام ہی "البیضہ" رکھ دیا گیا۔ بعد میں یہاں فوجی بارکیں تعمیر ہوئیں۔ عالیشان مکانات تعمیر ہوئے جن کے کھنڈرات آج بھی موجود ہیں۔ قدیم کرکنان کو آج کل نال کہتے ہیں۔

سنان ابن سلمہ، گورنر مکران جو خضدار میں بڑی بیدردی کے ساتھ قتل کیا گیا تھا، ایک عرب شاعر نے اس کا مرثیہ لکھا جس کے کچھ اشعار البلاذری نے اپنی کتاب میں نقل کئے ہیں، مرثیے کے دوسرے شعر میں شاعر کہتا ہے: "کتنا حسین اور دلکش شہر ہے۔ خضدار اور کتنے شیریں ہیں وہاں کے انگور"۔ مسلمانوں کے زیر نگیں آنے کے بعد خضدار کو حسن و دلکشی اور وسعت نصیب ہوئی تھی۔ اس کے نواحی بے آب و گیاہ میدانوں میں لشکر اسلام کی بارکیں تعمیر ہوئیں۔ اس طرح اس علاقے کی دوسری چھاؤنی خضدار میں تعمیر ہوئی۔ آبادی کے اعتبار سے شہر کے تین حصے تھے۔ چھاؤنی سے متصل علاقے میں گورنر، اعلیٰ فوجی افسروں اور ممتاز

مقامی قبائلی سرداروں کے مکانات تھے۔ اس کے بعد انتظامی محکموں میں کام کرنے والوں کے مکانات اور انتظامی دفاتر تھے۔ اور چھاؤنی کی بالکل مخالف سمت شہر کے آخری حصے میں چھوٹے طبقہ کے لوگوں اور پیشہ وروں کے محلے تھے۔ پہاڑی چشموں کے پانی کو پختہ سنگین حوضوں میں محفوظ کر کے پینے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ ان تمام ترقیاتی کاموں کے باوصف عرب مسلمان خضدار کے مقامی باشندوں کے دلوں کو مسخر نہ کر سکے۔ وہ ہر گورنر کی تبدیلی پر مسلمانوں سے قوت آزمائی کے لئے کھڑے ہو جاتے جس زمانے میں ابوالاشعث گورنر مقرر ہوئے اس وقت بھی خضدار کے لوگوں نے پرچم بغاوت بلند کیا۔ ابوالاشعث نے اُن کی قوت کو کچل دیا اور ایک بار پھر خضدار پر عرب تسلط کو مستحکم کر دیا۔ اس چپقلش کے بعد عرب گورنر اور سپہ سالار فوج خضدار پر ہمیشہ کڑی نظر رکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ذرا سی غفلت اور نرمی مقامی لوگوں کو سازش اور بغاوت کا موقع فراہم کر دے گی۔ نظم و نسق اور قیام امن میں انتہائی سختی کے ساتھ ساتھ مسلمان گورنر انصاف وعدل، مروت و رواداری کو کبھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ بے شمار مقامی خاندانوں نے مذہب اسلام قبول کر لیا۔

دسویں صدی عیسوی میں ابن حوقل اس علاقے میں آیا۔ اس زمانے میں گورنر ایک عرب، عیسیٰ ابن مدان تھا۔ اور وہ کنیز (موجودہ کیچ) میں رہتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ عرب گورنروں نے خضدار سے اپنا مستقر ہٹا لیا تھا مگر اس وقت بھی خضدار بہت بڑا تجارتی مرکز اور فوجی چھاؤنی تھی۔

عربوں کے زوال کے بعد اس علاقے پر صفاریوں، دیلمیوں، غزنویوں، سلجوقیوں اور منگولوں کا یکے بعد دیگرے تسلط ہوتا رہا۔ صفاریوں کے تسلط سے خضدار کا دورِ انحطاط شروع ہو گیا۔ پھر بھی تجارتی اور فوجی حیثیت سے اس شہر کی اہمیت مسلمہ تھی۔ "طبقات ناصری" میں ہے کہ خضدار پر محمود غزنوی کا اقتدار تھا اور غزنویوں کے دور میں خضدار تجارت اور فوجی اعتبار سے اہم شہر تھا۔ ۱۰۵۲ء میں آخری غزنوی حکمران کو قتل کر دیا گیا۔ ۱۱۹۱ء تک سلجوقیوں کا اقتدار رہا مگر خضدار کے باشندوں کو جب بھی موقع ملا انہوں نے غلامی کا طوق گلے سے اُتار پھینکنے کی جد و جہد کی۔

۱۱۹۱ء میں غزنویوں کے زیر اقتدار علاقوں کے ساتھ یہ علاقے بھی غزنویوں کے قبضے میں آ گئے۔ شہاب الدین محمد غوری کے بعد ہندوستان میں خاندان غلامان کی حکمرانی کا دور شروع ہو گیا۔ ۱۲۲۵ء میں شمس الدین التمش کا اقتدار خضدار میں تسلیم کیا گیا۔ التمش کے دور کے بعد سے خضدار کی تباہی اور ویرانی کا دور شروع ہوتا ہے۔ چنگیز خاں کی تباہ کاریوں سے یہ علاقہ بھی نہ بچا۔ اُس زمانے میں یہاں کا حکمران ایک مقامی سردار بہرام خان تھا جسے شکست دے کر منگولوں نے اپنے ایک سردار ملک چپ کو سریر حکمرانی پر بٹھا لیا۔ یہ شخص نہایت آوارہ مزاج، ظالم اور بدکار تھا۔ خضدار کے عوام عرب مسلمانوں کا انصاف و عدل، مروت و رواداری، پاکبازی، اور راست بازی دیکھ چکے تھے۔ وہ ملک چپ کی بدکاریوں اور ظلم و ستم کو کب برداشت کر سکتے تھے۔ آخر وہ خضدار کے لوگوں ہی کے ہاتھوں کیفر کردار کو پہنچا۔

پھر ۱۳۸۴ء میں تیمور کے بیٹے، مہران شاہ، نے خضدار پر فوج کشی کی اور لوٹ مار کرتا، قتل و غارت گری پھیلاتا گزرتا چلا گیا۔ مہران شاہ کی تباہ کاریوں کے صدموں سے خضدار سنبھلا بھی نہ تھا کہ ۱۵۱۷ء میں شاہ بیگ ارغون سبی کو فتح کرنے کے بعد زہری کے حاکم کو سزا دینے آ گیا۔ وہ درۂ مولا سے آیا اور پورے علاقہ کو پامال اور برباد کرتا چلا گیا۔ سترھویں صدی میں براہوئی سردار، میر احمد اول نے بغاوت کی اور خضدار پر اپنا تسلط قائم کیا۔ اس طرح خضدار پر براہوئی قوانین کے تسلط و اقتدار کا آغاز ہوا۔ یہی میر احمد اول قلات کے احمد زئی حکمرانوں کا جدِ اعلیٰ تھا۔ ۱۸۷۵ء میں والیٔ قلات، میر خدا داد خان، نے خضدار میں مٹی کا ایک عظیم الشان قلعہ تعمیر کیا جو آج بھی موجود ہے۔ یہاں قلعہ بنانے کی اس لئے ضرورت پیش آئی کہ اس زمانے میں میر خداداد خان جام سبیلا سے برسرِ پیکار تھا اور خضدار اس مقصد کے لئے بہترین اور موزوں ترین فوجی کیمپ تھا۔ اس کے بعد سے خضدار میں خان قلات کا نائب رہنے لگا۔

پاکستان میں ریاست قلات کے الحاق سے خضدار بھی پاکستان میں آ گیا لیکن یہ وہ خضدار نہ تھا جو عرب مسلمانوں کے دورِ اقتدار میں اس علاقے کا اہم ترین شہر تسلیم کیا گیا تھا۔ چودہ سو

صدی ہجری کے خضدار کو دیکھ کر کوئی شخص تیسری چوتھی صدی ہجری کے خضدار کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن قدرت پھر ایک بار اس شہر پر مہربان ہوئی۔ حکومت مغربی پاکستان نے خضدار کو قلات ڈویژن کا انتظامی مرکز بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے کے ساتھ ہی خضدار کی قسمت کا ستارہ چمک اٹھنے کا وقت آ گیا۔ انتظامیہ قلات کے دفاتر اور عملے کے رہائشی مکانات کی تعمیر شروع ہو گئی۔ ایک ہزار سال کے بعد خضدار کی قسمت میں پھر انقلاب آ رہا ہے۔ انقلاب تو اس شہر نے بے شمار دیکھے ہیں اور عروج و زوال، آرائش و تباہی سے کئی بار آشنا ہوا لیکن آثار بتاتے ہیں کہ اب جو انقلاب آ رہا ہے وہ بہت دیرپا ثابت ہوگا۔ اب خضدار پر خضدار کے لوگوں کی حکومت ہے، اس لئے اب وہ خود بھی اس کی عظمت رفتہ اور حسن و دلکشی کو واپس لانے کی کوشش کریں گے اور خضدار ایک بار پھر قلات کا اہم ترین شہر بن جائے گا۔

اس سیر حاصل مضمون میں ایک اہم بات بیان ہونے سے رہ گئی ہے۔ یہ کہ فارسی کی مشہور شاعرہ، رابعہ قصداری کا وطن مالوف بھی یہی شہر تھا۔ جو ملکی و سیاسی حیثیت سے ممتاز ہونے کے علاوہ تہذیبی و ثقافتی حیثیت سے بھی نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ حافظ محمود شیرانی مرحوم نے اپنی تصنیف "پنجاب میں اردو" میں اس کا تفصیلاً تذکرہ کیا ہے ——— (مدیر)

•

عالمی یومِ اطفال:

سب جگ چمکے تارے

آفتابِ صبح کا پرچم فضا میں کھل چکا تھا ہر طرف نور ہی نور تھا دور مدِ نظر تک کائنات نور کے اس اتھاہ سمندر میں ڈوبی ہوئی تھی ہر شے سراپا حرکت۔ زندگی کو قرار کہاں۔ دن کے اجالے کے ساتھ انسانوں کا ایک سیلاب بھی امڈ پڑا کھچا کھچ بھری ہوئی بسیں ادھر سے ادھر دوڑنے لگیں۔ مل کے مزدور، دفتر کے بابو، افسر کمپنیوں کے ملازمین۔ سب کے سب ایک ہی صف میں —— بس اسٹاپ پر کھڑے تھے۔ کوئی قوت تھی۔ شاید فرض کی کشش۔ جو انہیں اپنی طرف کھینچ رہی تھی، اور وہ کھنچے ہی جا رہے تھے۔ بے بس بے اختیار مگر یہ لوگ ان کا تو نقشہ ہی کچھ اور تھا۔ ہاتھ خالی نہ بغل میں کتابیں، نہ بستوں کا کہیں نشان پھر بھی مگن، دلوں میں نئی نئی امنگوں کا طوفان بے پایاں لئے، سب سے آگے نکل جانے کی کوشش میں مصروف۔ "ذرا سننا تو پڑھائی نہیں ہو گی؟"! بات سنے تو کون۔ آج تو ان کا دن تھا۔ ۲ / اکتوبر کو پڑھائی کیسی — بچوں کا عالمی دن، ان کے دلچسپ کرتبوں، مظاہروں اور والدین میں بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کا شعور بیدار کرنے کا دن۔

ننھی منی کلیاں، نو رستہ چمن کی زینت انہیں سے ہے۔ باغبان ان سے بے اعتنائی برتے تو پھر چمن کہاں، اس سے تو خود رو جنگل بہتر۔ آج کے بے بس منے میں کل کے جوانِ رعنا کی پوری آب و تاب موجود ہے بشرطیکہ اسے سنوارا جائے اور صحیح سانچے میں ڈھال کر اس کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کیا جائے۔ آج جب وہ کھلکھلاتا ہے یا اس کی پیشانیٔ نازک پہ گرہ پڑتی ہے تو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی لیکن کل اس کی اسی ہنسی سے دنیا باغ و بہار بھی بن سکتی ہے اور اس کی یہی چین جبیں اوراق عالم پرشکن بھی۔ انہیں بچوں میں اتاترک، قائدِ اعظم، سرسید اور اقبال بھی ہوئے اور انہیں میں ہٹلر، مسولینی، جعفر اور صادق بھی۔ عظیم شخصیتیں ماں کے پیٹ سے عظیم نہیں پیدا ہوتیں۔ صحیح پرورش و پرداخت اور ماحول ہی انہیں عظیم بناتا ہے۔ یہی بچے مستقبل کے معمار، قوم ملک کے چشم و چراغ اور اپنے وطن کی دولت لازوال ہیں۔ ان میں اثر قبول کرنے کی زبردست صلاحیت ہوتی ہے۔ کچی لکڑی کی طرح جدھر چاہو اور جیسے چاہو موڑ دو۔ بچہ کو اچھی راہ پر چلایا جائے تو وہ ایک ایسے معاشرے کو جنم دے گا جس کا انسانیت مدتوں سے خواب دیکھتی چلی آ رہی ہے۔ بری راہ دیکھ لے تو ملک و قوم اور معاشرے سب ہی کے لئے عظیم خطرہ بن جائے گا۔ اسی لئے دنیا کے تمام ملک بچوں کے "عالمی دن" کے نام سے ہر سال تقریب مناتے ہیں۔ اس کا مقصد ہے عوام میں بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کا شعور بیدار کرنا اور ایک ایسا آزاد ماحول پیدا کرنا جس میں ان کی ذہنی نشو و نما ہو اور ان کا کردار قومی و روحانی اقدار کے سانچوں میں ڈھل سکے۔ اس طرح کے معاشرے کے بغیر دنیا پر چھائے ہوئے تاریکیوں کے بادل کبھی نہیں چھٹیں گے، انسانیت ہمیشہ کراہتی رہے گی اور اس کا کوئی درماں نہ ہو سکے گا۔

ہر ملک مستقبل کے اس معاشرے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ پاکستان میں بھی اسی معاشرے کو جنم دینے کے عہد کی ہر سال تجدید کی جاتی ہے۔ ۲ / اکتوبر کی تقریب کا یہی مقصد تھا۔ ڈھاکہ، راولپنڈی لاہور۔ سب ہی جگہ ایک گہما گہمی اور جوش و خروش نظر آ رہا تھا —— ریلوے اسٹیڈیم کراچی کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ "شمشیر و سناں" کے ساتھ "طاؤس و رباب" کی کیفیت بھی وہیں دیکھنے میں آئی "پریوں" کے رقص کے ساتھ مجاہدوں کا نعرۂ بیباک "جواں تیار ہو جا" سے فضا گونج رہی تھی۔

تماشائیوں کا جم غفیر تھا۔ دفعتاً مجمع میں حرکت ہوئی اور ایک پُر وقار شخصیت ہلکے نیلے رنگ کا لباس پہنے

آہستہ آہستہ ڈائس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یہ تھے لفٹیننٹ جنرل آبرکی صحت اور معاشری بہبود کے وزیر۔ خندہ پیشانی سے مجمع کے پرتپاک خیر مقدم کا جواب ہاتھ کی جنبش سے دے رہے تھے لیجئے وہ سلامی کے چبوترے پر پہنچ گئے۔ پریڈ نے منظم طریقہ پر سلامی دی اور اسی وقت رنگ برنگ کے غبارے فضا میں لہرانے لگے جن پر بچوں کے عالمی دن کی تہنیت لکھی تھی۔ لڑکوں اور لڑکیوں کا مارچ پاسٹ شروع ہوگیا تھا۔ ان کی ہر جنبش اور ہر قدم سے استقلال، اولوالعزمی اور نظم وضبط کا ثبوت مل رہا تھا یہ قدم ملا کر چلنے کی مشق انہیں آئندہ زندگی میں اپنے وطن اور دنیا کے امن پسند عناصر کے ساتھ ہمقدم رہنے کا سبق دے رہی تھی۔ ذرا دیکھیے گورنمنٹ بوائیز سکنڈری اسکول جہانگیر روڈ ۳ کے بچوں کی یہ ہنرمندی، یہ نظم وترتیب کہ وہ اپنے مہمان خصوصی کو دیکھ کر قواعد کرتے کرتے اس انداز میں ساکت کھڑے ہوگئے کہ WELCOME کے الفاظ ابھر آئے۔ ابھی لوگوں کی حیرت دور بھی نہ ہوئی تھی کہ جامعہ تعلیم ملی پرائمری اسکول کے بچوں نے ایک نیا ہی شگوفہ چھوڑا۔ یہ لیزمی قواعد کا مظاہرہ تھا یعنی لکڑی کے جھنجھنے بجا بجا کر مجمع کو لبھانے کی ترکیب۔

ان کی فنکارانہ قواعد کا منظر ابھی نظروں سے اوجھل ہی ہوا تھا کہ ایک اور منظر سامنے آیا۔ بالکل نیا اور اچھوتا منظر۔ دف نوازی کی تمام دلکشی اپنے جلو میں لئے ہوئے گورنمنٹ گرلز سکنڈری اسکول کلیٹن روڈ کی بچیاں۔ طرح طرح کے رنگین لباس پہنے، نازک نازک رنگ برنگی تتلیوں کی طرح ہواہیں لہرانے لگیں۔ ڈپری شق کے نام سے ان کا یہ رقص بڑا ہی دلکش تھا۔ موسیقی کی دھن پر انہوں نے چھوٹی چھوٹی رنگین لکڑیاں بجا بجا کر وہ سماں باندھا کہ رنگ ونغمہ کے سوا کسی کو دوسرا کوئی احساس ہی باقی نہ رہا۔ اور لوگ اس وقت چونکے جب "ہیپی ڈیل سکنڈری اسکول" کے بچوں نے اپنے جوش وخروش کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ ابھی بچے ہی ہیں مگر ترنگ یہ کہ "تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جوان ہوئے ہیں"۔ لیکن یہ کوئی بیجا زعم بھی نہیں۔ یہی مسلم قوم کی روایت رہی ہے۔ معصوم بچے بڑی پیاری لے میں یہ ترانہ گا رہے تھے اور اسی ترانے کی دھن پر ان کی قواعد سے بوڑھوں کے عزم بھی جوان ہونے لگے۔

لیجئے! ایک اور دلکش تال سر پہ بچیوں کی قواعد دیکھئے۔ گورنمنٹ گرلز سکنڈری اسکول ناظم آباد نمبر ۲ کی بچیاں دمشا ید بجلیاں کوند رہی تھیں ان کے جسم میں، کیسی معصومیت کے ساتھ اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ اس قواعد کے ختم ہوتے ہی ایک ایسا منظر آنکھوں کے سامنے آیا کہ ہر شخص سوچنے لگا "من نمی بینم ....." "پریوں" کے جھرمٹ کے جھرمٹ بے تحاشا میدان میں اترتے چلے آرہے تھے، سفید سفید، نازک نازک پر پھڑپھڑاتی ہوئی "پریاں" اپنی ملکہ کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے چاند ستاروں کے جھرمٹ ہیں زمین پر آگیا ہو۔ کشمیر کے لئے "فردوس بر روئے زمیں" کی بات بہت مشہور ہے لیکن اگر یہی بات کہنے والا ان ننھی منی بچیوں کا رقص دیکھ لیتا تو "پرستاں برخطۂ ایں زمیں است" کا حکم لگائے بغیر نہ رہتا۔ یہ بچیاں گورنمنٹ گرلز سکنڈری اسکول پی۔ اے۔ ایف ڈرگ روڈ کے "پرستان" سے بچوں کے عالمی دن میں شرکت کے لئے آئی تھیں۔ ان کے اس پیارے ناچ پر تماشائیوں کے دل جھوم جھوم اٹھے۔

پریوں کے لطیف رقص سے ہنوز طبیعتیں سیر نہ ہوئی تھیں کہ وہ پھر سے اڑ گئیں۔ پرستان کی مخلوق تھیں نا! اسی لئے اپنے مسکن کی طرف لوٹ گئیں۔ اس سے پہلے کہ کسی بے کیفی کا احساس ہوتا پی۔ ڈی۔ ایس پارسی پرائمری اسکول کے چھوٹے چھوٹے بچوں نے اپنے فن کے مظاہرہ سے لوگوں کی توجہ مبذول کرلی۔ وہ بھولے بھالے انداز میں ناچ ناچ کر قواعد کرتے رہے اور بس ایک لوک دھن پر ان کے فن کا فیصلہ ٹھہرا تھا۔

لوک دھن پر بچوں کی قواعد سے ابھی فضا معمور ہی تھی کہ دفعتاً "حبشی" میدان میں پھاند پڑے، اچھلتے کودتے، دندناتے شور مچاتے ارے! آپ تو سہم گئے انہیں دیکھ کر۔ یہ تو بچے ہیں بچے، گورنمنٹ بوائیز سکنڈری اسکول ناظم آباد اور ۲ کے لڑکے حبشیوں کے بھیس میں انہیں کا ناچ ناچ رہے تھے۔ زولو ڈانس۔ حبشیوں کا یہ ناچ کتنا ڈراؤنا، کیسا ہیبتناک تھا۔

انہوں نے ایک ریچھ مار کر بچوں کے عالمی دن کا جشن منایا کتنی ڈراما ئی بات ؟

حبشیوں کی ہیبت ابھی تک آپ پر طاری ہے - اسے دُور کیجئے - آپ بھی کس وہم میں پڑ گئے - دیکھئے یہ بچیاں، ہماری اپنی بچیاں، کیسی نڈر ہیں، کیسی دلیر حبشیوں کے وحشیانہ ناچ سے ذرا بھی تو خوفزدہ نہیں ہوئیں - کس آن بان کے ساتھ مجاہدوں کا ترانہ "جوان تیار ہو جا . . . . " گاتی ہوئی مجاہد مارچ کا مظاہرہ پیش کر رہی ہیں - اس مظاہرہ سے لوگوں میں نیا جوش، نیا ولولہ پیدا ہو گیا، بالکل ایسی ہی کیفیت "جو تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں" سے پیدا ہو چکی تھی -

بچوں کے ان مظاہروں کی آخری کڑی "سندھ مدرسہ" کے لڑکوں کا مظاہرہ - اس کے بعد ایک نغمۂ جانفزا نے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا جسے سنتے ہی لوگ سروقد کھڑے ہو گئے، بصد تعظیم، خاموشی اور ارض پاک کی حرمت پہ کٹ مرنے کا ایک عزم عالیشان طوفان عظیم کی طرح ان کے دل میں اُمڈنے لگا - "شاد باد! منزلِ مراد!"

شریکِ غالب — باقی صفحہ ۳۰

ملتی تو خسارہ اور اسباب خسارہ کی نوعیت بھی پوچھتا - اور یہ پوچھتا کہ فرداً فرداً بورڈ کا ہر رکن عدل اور اپنے ضمیر کی قسم کھا کر یہ بتائے کہ میرے غیاب میں میرے ان محترم دوست نے چپکے چپکے ہر رکن کے آستانے پر اس سلسلہ میں کیوں حاضری دی، منتیں کیں اور اپنی معصومیتِ جرم کا اظہار کیا اور کس طرح ان تمام کی آزادیٔ فکر کو اپنی گریہ و زاری سے مفلوج کیا - پھر میں یہ بھی پوچھتا کہ دوسرے فریق کی عدم موجودگی میں انہوں نے اس بات کو کس طرح عدل و انصاف کے نام پر گوارہ کر لیا کہ تصویر کا ایک ہی رخ دیکھ کر نفس معاملہ پر فیصلہ صادر کر دیں اور وہاں یہ بھی پوچھتا کہ اعلیٰ اقدارِ زندگی کی توہین کرنے والے مجرم سے ہمدردی کرنا کونسا آئین و انصاف ہے — مگر یہ کچھ بھی نہ کر سکا اور سوچتا ہی رہ گیا ؂

آپ کی محفل

مجھے کتنا دکھ ہے کہ اتنی دیر سے جواب لکھ رہی ہوں اور وہ بھی معافی نامہ۔ میں نے بعض گھریلو مصروفیتوں کی وجہ سے ایک سطر بھی نہیں لکھی۔ جیسے ہی کچھ لکھا آپ کی خدمت میں پیش کردوں گی۔ (ہاجرہ مسرور)

شکریہ۔ "ماہِ نو" آپ ہی کا رسالہ ہے اور آپ جیسے معاونین کی توجہ اور تعاون کا تہہ دل سے خواہاں۔ آپ کی کہانی کے لئے چشم براہ ہوں۔ (مدیر)

او میاں دلّی والے[1]۔ خاور اور تمہارا مشترکہ خط ملا۔ لیکن وہی افسانے کی فرمائش! کبھی کاروباری بات کے علاوہ بھی خیر پوچھ لیا کرو تو کیا بگڑ جائے۔ یہاں مکان نہ ملنے کی اذیت میں گرفتار ہیں اور آپ کو افسانوں کی پڑی ہے۔ غالبؔ اور میرؔ کی تو صرف چھت ہی ٹپکتی تھی۔ یہاں بارش کا ایک چھینٹا پڑنے کی دیر ہوتی ہے اور سڑک کا پانی ایک ایک فٹ گھر کے کمروں میں بہنے لگتا ہے اور اگر تمہیں اب تک یاد ہے کہ جزیرہ کیا ہوتا ہے، تو گھر جزیرہ بن جاتا ہے۔ گھر کے باہر گھٹنوں پانی! — لیکن تمہاری بلا سے۔ تمہیں تو افسانہ چاہئے۔

اس کا مطلب[2] یہ نہیں کہ لکھنا ترک کر دیا۔ افسانہ تو ایک ہوا تھا لیکن اس کو . . . . کے لئے بھیج[3] دیا۔ تمہارے مطلب کی کوئی چیز لکھوں گا تو ضرور بھیجوں گا۔ خاطر جمع رکھو۔ اور ہاں پہلے افسانے کا معاوضہ ابھی تک نہیں ملا[4]۔ ذرا منیم جی کی گھنٹی بجاؤ اور لوا لپسی ڈاک معاوضہ بھیجو۔ تو مُشؔ حسب معمول ادھار کھا رہی ہے۔ اور دیکھو ایک زمانے میں تم بھی تو ریڈیو کے لئے لکھا کرتے تھے۔ کوئی ہلکی پھلکی چیز۔ ڈرامہ، فیچر، بھجواؤ۔ خاور کے خط کا جواب میرے ذمے ہے۔ فرصت کا انتظار ہے۔ شاہد صاحب۔ (جناب شاہد احمد دہلوی مدیر ساقی۔ مدیر) — سے ملنا ہو تو سلام عرض کر دینا۔

(ابو سعید قریشی)

محترمی خاور صاحب!

جولائی اور ستمبر کے "ماہِ نو" میں "آزاد نظم کے سراغ میں" کے عنوان سے آپ کے مضامین میں نے بڑی دلچسپی سے پڑھے۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے یہ مضامین لکھ کر نہ صرف عام قارئین پہ بلکہ اُردو شاعری کے موجودہ نقادوں اور آئندہ مورخوں پہ بھی بڑا احسان کیا ہے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ اُردو آزاد نظم جس کی عمر جمعہ جمعہ آٹھ دن کے مصداق ہے اس کی ابتدا اور ارتقا ہماری لاعلمی کے دھندلکوں میں گم ہے۔ اُردو میں آزاد نظم کے متعلق عام تاثر یہی ہے کہ اس کے بانی مبانی راشدؔ اور میراجیؔ ہیں۔ بہرحال اب آپ کے مضامین سے آزاد نظم کے معاملے میں راشد کی حیثیت واضح ہو گئی اور اس صنف کی تدریج وترقی میں خود آپ کا جو حصہ رہا ہے وہ بھی اردو ادب کے طالب علموں کے سامنے آگیا۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس باب میں آپ نے میراجیؔ کی کارگزاریوں کا تذکرہ بالکل نہیں کیا۔ علاوہ ازیں بعض مقامات پر آپ نے ضرورت سے زیادہ اختصار سے کام لیا۔ مثلاً 'اسپیکنگ ورس' کے سلسلے میں۔ اس کی وضاحت کے لئے

---

[5]: علاج: خاندانی منصوبہ بندی ورنہ فاقہ مستی!

(مدیر)

---

[1]: مراد مدیر "ماہِ نو"

[2]: "یا تو صاف انکار ہو یا وصل کا اقرار ہو
آپ کی الجھی ہوئی باتوں سے گھبراتا ہوں میں"

[3]: پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا!

[4]: حسابِ دوستاں در دل! (مدیر)

ان نظموں کے عنوانات بتا دیتے تو بہتر ہوتا جو اردو شعرا نے لکھی ہیں۔اسی طرح "جستہ آہنگ" کے باب میں بھی آپ بہت سرسری گزر گئے۔ آپ کا یہ جملہ مجھے مبہم معلوم ہوا کہ "مغرب کی ایک اور اپج جس کا نمونہ ایلیٹ کے یہاں نظر آتا ہے۔ رضی، جیلانی اور راقم الحروف کے ذریعہ یہ صنف بھی اردو میں فروغ پا چکی ہے۔" کیا اس جملے میں آپ کا اشارہ اسپیکنگ ورس کی طرف ہے یا کسی اور صنف کی طرف۔ اگر کسی اور صنف کی طرف ہے تو اس کا نام؟

"ویسٹ لینڈ" کا جو ترجمہ آپ نے "ادب" کراچی میں شائع کیا تھا وہ میری نظر سے نہیں گذرا۔ اسے حاصل کرنے کی کوئی صورت آپ کی نظر میں ہو تو بتلائیے۔

میری بڑی آرزو ہے کہ آپ اردو کی جدید شاعری کا خصوصاً نظم آزاد اور نظم معرا سے متعلق مضامین کا سلسلہ جاری رکھیں۔ ابھی آزاد شاعری کے بہت سے پہلو آپ جیسے واقفِ فن کی تشریح کے محتاج ہیں۔ مثلاً اس وقت تک اردو میں فنی اعتبار سے بہترین آزاد نظمیں اور معرا نظمیں کن شاعروں نے کہی ہیں۔ وہ کون سی نظمیں ہیں۔ ان نظموں کی انفرادی خوبیاں کیا ہیں۔ اردو کی آزاد نظم میں علامتی شاعری کا بانی کون ہے۔ ہمارے یہاں علامتی شاعری کن مرحلوں سے گزری اور گزر رہی ہے۔ اردو میں اس کی ترقی کے امکانات کس حد تک ہیں۔ علامتی شاعری کا مطالعہ کس طرح کرنا چاہیئے۔ اردو میں بہترین علامتی شاعری کے نمونوں کی تشریح و تنقید۔

میرا عقیدہ ہے کہ جب تک اردو کے نقاد اس قسم کے مبادیاتی کام سے گریز کرتے رہیں گے آزاد شاعری اور علامتی شاعری اردو میں نہ زیادہ مقبول ہو سکے گی نہ زیادہ فروغ پا سکے گی۔

"سات رنگ" میں راشد کی شاعری پر آفتاب احمد کا ایک طویل مضمون شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے راشد کی تکنیک پر بہت کچھ لکھا ہے اور اس کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس مضمون کو پڑھتے وقت مجھے پروفیسر کلیم الدین احمد کا وہ مضمون یاد آگیا جو برسوں پہلے "سویرا" میں شائع ہوا تھا اور جس میں انہوں نے مثالوں سے ثابت کیا تھا کہ راشد اور میراجی نظم آزاد کی تکنیک پر عبور نہیں رکھتے جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ دونوں کی نظموں کے بعض حصے غیر ضروری ہوتے ہیں۔ اگر انہیں نکال دیا جائے تو نظم بہتر ہو جاتی ہے۔ اگر کلیم صاحب اور آفتاب صاحب کے مضامین آپ کی نظر سے گزرے ہوں تو یہ بتلائیے کہ کلیم صاحب کی تنقید قابلِ اعتبار ہے یا آفتاب صاحب کی تعریف۔

(نظیر صدیقی)

ایک دم اتنے سوالات! ایک ہی خط یا مضمون میں ان کے جواب سے عہدہ برآ ہوں تو کیسے؟ آپ بھول گئے کہ جولائی اور ستمبر کے درمیان ایک اور مہینہ بھی ہے اور اس میں بھی اس ہی سلسلے کی ایک اور کڑی بھی تھی۔ آزاد نظم پر قلم اٹھانے سے تشنگانِ شوق کی تسکین ہی مقصود تھی اور مجھے مسرت ہے کہ ادبی حلقوں نے اس کاوش کا اس ہی انداز سے خیر مقدم کیا ہے۔ بیشک میرا اشارہ "اسپیکنگ ورس" ہی کی طرف تھا۔ یہ، "جستہ آہنگ" اور دیگر امور جن کا آپ نے ذکر کیا ہے، زیر بحث موضوع "آزاد نظم کے سراغ" — سے خارج ہیں اور اگر ان پر گفتگو کی جاتی تو میں اصل بحث سے دور رہ جاتا۔ لہٰذا ان پر الگ ہی روشنی ڈالی جا سکتی ہے جس کا حق کسی آئندہ شمارے میں ادا کیا جائے گا۔ میراجی کی کارگزاریوں میں کلام نہیں مگر ان کا تعلق آزاد نظم کے آغاز سے نہیں بلکہ ترویج سے ہے۔ آپ نے بعینہٖ وہ سوالات پوچھے ہیں جو آج ہر ذہین و حساس قاری کو پوچھنے چاہئیں اور جن کا جواب دیئے بغیر ہم کسی طرح آگے نہیں بڑھ سکتے۔ میرا مدعا بعینہٖ یہ احساس پیدا کرنا تھا کہ آزاد یا علامتی شاعری ہی نہیں، جب تک ہم اس قسم کے مبادیاتی کام سے گریز کرتے رہیں گے، ہمارا ادب کسی اعتبار سے بھی ترقی نہیں کر سکتا اور یہی اس کی موجودہ "نیم رفتاری" کا باعث ہے۔ میں تو سب کو دعوت دوں گا کہ کسی نہ کسی طرح اس کو گرم رفتاری میں تبدیل کر دیں۔

راشد اور میراجی کے متعلق مجھے بہت کچھ کہنا ہے

اور اب جبکہ آپ نے فرمائش کر دی ہے تو ضرور کچھ لکھنا ہی پڑے گا ؎

میں کون اور ریختہ، ہاں اس سے مدعا
جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

آپ کے انشائیوں کے بارے میں بھی کچھ عرض کروں گا۔ شہرت ہی کی خاطر سہی! ممنون ہوں کہ آپ اس پر میرے ہی قلم سے تبصرہ چاہتے ہیں۔ (رفیق خاور)

محترم رفیق خاور صاحب: "ماہِ نو" ستمبر ۶۱ء میں آپ کے مضمون "آزاد نظم کے سراغ میں" کی تیسری قسط کا مطالعہ کیا۔ بے حد معلومات افزا تحقیق ہے۔ ہر موقع پر تنقید کا حق بھی ادا کیا گیا ہے۔ ص۲۱ کالم ۱ سطر ۱۷ میں درج ہے کہ "انگریزی عروض کی بنیاد ACCENT پر ہے"۔ براہ کرم "ماہِ نو" کے کسی آئندہ شمارہ میں انگریزی عروض کی بنیاد کی کچھ تشریح فرمائیں۔ بہتر ہو کہ عربی عروض اور سنسکرت عروض کی بنیادیں بھی متوازی طور پر دکھائی جائیں۔ اگر "ماہِ نو" کے صفحات اس بار کے متحمل نہ ہوں تو کم از کم راقم الحروف سائل کو ضرور کسی قدر تفصیل کے ساتھ انگریزی عروض کی بنیاد سے متعلق آگاہی بخشیں۔ شکر گزار ہوں گا۔ عربی عروض اور سنسکرت چھند سے واجبی سی واقفیت بندہ کو حاصل ہے۔ تقابلی مطالعہ سے شاید کوئی قدرِ مشترک انگریزی (مغربی) اوزان و بحور اور ایشائی عروض میں دریافت ہو سکے اور انسانیت ہم آہنگ نظر آئے۔

ص۲۶ پر "آتما کی گونج" (نظم صہبا اختر، مدیر) کا آخری بول کچھ وزنی کا شکار ہو گیا ہے۔ معناً بھی بودھ دھرم کے کلمہ کا مفہوم کما حقہٗ پورا نہیں ہوتا ع

"میں پناہ لیتا ہوں بدھ کی، میں پناہ لیتا ہوں دھرم کی، میں پناہ لیتا ہوں سنگھ کی"

صحیح الوزن مصرع ہے؟ — در اصل "پناہ" بھی "شرن" کا صحیح مترادف نہیں ہے اور ہندی لفظوں کی طرح "شرن" ہی استعمال کیا جاتا ہے۔

(صوفی فقیر محمد۔ نور پور تھل۔ سرگودھا)

یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ ہمارے باذوق پڑھنے والوں نے آزاد نظم کے سراغ کی اس کہانی میں اتنی دلچسپی لی۔ ایسے رجحانات ہمارے ادب کی وسعت، رنگا رنگی اور نشو و نما کے لئے فالِ نیک ہیں۔

انگریزی عروض بھرپور شرح چاہتا ہے اور اس کے لئے بسیط مقالہ ہی موزوں ہو سکتا ہے۔ اہل الرائے اگر اس گفتگو میں شریک ہونا چاہیں تو اپنے خیالات اور معلومات سے "ماہِ نو" کی دعوت کو قبول کریں۔ رفیق خاور صاحب، نگراں "ماہِ نو"، چونکہ اس کے محرم راز ہیں اور انہی نے اس باب پر دستک بھی دی ہے، اس لئے وہی در باز کرنے کی بھی زحمت فرمائیں، تو احسن ہو گا۔

صہبا اختر صاحب کی نظم کے جس مصرع کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے، فاضل نگراں کی نظر پہلے ہی اس پر پڑ گئی تھی اور انہوں نے اس کی طرف بڑے ہی لطیف پیرائے میں اشارہ بھی کر دیا تھا اور شاعر کو بھی اس کا علم تھا۔ مگر، جیسا کہ فٹ نوٹ میں عرض کر دیا گیا تھا، کبھی کبھی شاعر بھی تو پناہ ڈھونڈتا ہے۔ ہمارے عروض کی سخت گیری ہے بھی تو ایسی کہ شاعروں کو اس سے پناہ ڈھونڈے بغیر چارہ نہیں۔ ویسے شعری آزادی کی حدود ایک علٰحدہ مبحث ہے اور کافی بسط و شرح کا محتاج۔ امید ہے، خاور صاحب کے ہاتھوں اس موضوع پر بھی قلم اٹھائیں گے۔

"پناہ" کے لفظ سے "شرن" کا پورا مفہوم ادا نہیں ہوتا — ٹھیک۔ اگر یہ شبد اس کیبد میں آ سکتا تو کوی کو "پناہ" ڈھونڈنے کی نوبت ہی نہ آتی!

(مدیر)

★

— پاکستان آپ کا گھر ہے، اس گھر کو خوب سے خوب تر بنائیے۔
— بامقصد زندگی — بامصرف زندگی
— زیست بے مصرف — عذاب دوام
— مایوسی کفر ہے۔
— کام زیادہ کیجئے، باتیں کم

نقد و نظر

ترقی کی نئی راہیں :
مرتبہ : ایس۔ ایم۔ حیدر۔
ناشر: اکیڈمی برائے ترقی دیہات۔
یونیورسٹی ٹاؤن۔ پشاور

سابق سرحد کے پشاور جیسے اہم مقام سے اس کتاب کی اشاعت ایک نہایت خوش آیند علامت اور اس غیر معمولی توجہ کی آئینہ دار ہے جو دورِ انقلاب میں خصوصاً اس علاقے اور اس کے گرد و نواح کے قبائل پر مبذول کی جا رہی ہے اور جس کے باعث یہاں پر ہر جگہ اپنے وطن، پاکستان کے لئے جذبہ و جوش پایا جاتا ہے۔

یہ کتاب وقت کی ایک بڑی اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ بنیادی جمہوریتوں کے قیام کے بعد عوامی نمائندوں کو یہ جاننے کی بڑی ضرورت تھی کہ اجتماعی ترقی کیا ہے۔ اس کے پروگرام کیا ہونے چاہئیں اور عوام کے اجتماعی کارکن کہاں، کیا کام کر سکتے ہیں اور انہیں اپنے آپ کو کس طرح منظم کر کے لوگوں کی ضرورتیں، مشکلات اور مسائل سمجھنے چاہئیں تاکہ تدبیرِ منزل آسان ہو سکے۔ اسی تقاضے کے پیشِ نظر ترقیٔ دیہات کی اس اکیڈمی نے ضلع لاڑکانہ کی دعوت پر اجتماعی کارکنوں کی تربیت کا ایک پروگرام مرتب کیا جس کے مطابق گذشتہ مئی بہت مفید کام ہوا۔ اس تربیتی پروگرام کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور امید ہے کہ دوسری جگہوں پر بھی ایسے ہی پروگرام مرتب کئے جائیں گے۔ لاڑکانہ کے اجتماع میں کن امور و مسائل میں تربیت دی گئی، یہ کتاب اس کی مفصل روداد ہے۔ جو سلیقہ، وضاحت، اور تفصیل کے ساتھ امور و موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ مثلاً یہ کہ اجتماعی ترقی کا فلسفہ کیا شے ہے۔ طریقِ کار کیا ہونا چاہیئے۔ ہمارے کم استعداد اور کم استطاعت افرادِ قوم کو اوپر اٹھانے کے لئے مقامی حالات، و مسائل کے اعتبار سے کیا کرنا چاہیئے۔ عوامی جمہوریتوں کے علاوہ اور جو حضرات و خواتین اجتماعی کارکنوں کی حیثیت سے آگے بڑھ کر خدمت الناس میں شریک ہونا چاہتے ہیں ان کے لئے بھی یہ پروگرام نہایت مفید ثابت ہو چکا ہے۔ اس کے تربیت یافتہ کارکنوں کو بہت سی چیزوں کی نظری و عملی تعلیم حاصل ہو جاتی ہے۔ مثلاً ان پروگراموں میں بتایا گیا کہ پاکستان کا نصب العین کیا ہے۔ معاشری مسئلے کیا ہیں اور ایک اسلامی معاشرہ میں انسدادِ اشتراکیت کی کیا تدابیر کی جائیں۔ پچھلی قیادت کی خامیاں کیا تھیں۔ انقلابی حکومت نے کس طرح ملک کی قسمت بدلی ہے۔ حاکم و محکوم کیوں کر قریب تر لائے جا سکتے ہیں۔ وغیرہ۔

اس کتاب کا مطالعہ تمام عوام دوستوں، اجتماعی کارکنوں اور محبّ وطن پاکستانیوں کو کرنا چاہیئے کیونکہ یہ ان کو بتائے گی کہ ترقی کی ان راہوں پر، جو ہمارے سامنے سراسر کھلی ہیں کس طرح تیز گامی کے ساتھ آگے بڑھا جا سکتا ہے۔ (ن۔ ق)

غالب :
تصنیف : ڈاکٹر خورشید الاسلام
ناشر: انجمن ترقیٔ اردو (ہند) علی گڑھ
صفحات : ۲۸۴
قیمت : چھ روپے

کسی عظیم شاعر نے اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی زمانے میں جو کچھ کیا اس کی حیثیت کیا ہے، یہ موضوع خاصا دلچسپ ہوتا ہے اور غالب جیسے شاعر کے سلسلے میں تو یہ اور بھی دلچسپ ہے۔ نسخۂ حمیدیہ اور بعض دوسرے نوادر کی اشاعت کے بعد اس کے مطالعہ کی ضرورت زیادہ محسوس ہوئی۔ زیرِ نظر کتاب کا موضوع یہی پہلو ہے۔ اس میں ان اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے جو غالب کی ابتدائی شاعری میں کام کر رہے تھے۔ انہیں اثرات کے تحت وہ شوکت، اسیر، بیدل، غنی، ناصر اور ناسخ کے اسالیب

سے گذر کر اس مقام تک پہنچے جہاں ان کی اپنی انفرادیت اور مخصوص رنگ نے بصد رعنائی جنم لیا۔ غالب کی ذہنی نشوونما سمجھنے کے لئے ان اثرات کے حوالے سے غالب کے ابتدائی کلام کا مطالعہ لازمی ہے اور اس میں شک نہیں کہ فاضل مصنف کی تحقیق و جستجو اور کاوش سے اگر یہ کمی پوری نہیں ہوئی تو کم از کم اسے پورا کرنے کی راہوں کا تعین ضرور ہو گیا ہے۔

مصنف کے نقطۂ نظر سے ہر جگہ اتفاق کرنا مشکل ہے۔ لیکن اس سے اختلاف جزوی ہی ہو سکتا ہے، اصل موضوع سے نہیں۔ مثلاً میر کے رنگ کے جن اشعار کا حوالہ دیا گیا ہے ان میں میر سے زیادہ خود غالب کا اپنا مخصوص رنگ و آہنگ نمایاں ہے:

شلاً: "آغوشِ گل کشودہ برائے وداع ہے
اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے"

یہ بات بھی تاریخی اعتبار سے مشکوک ہے کہ اورنگزیب نے دیوانِ حافظ کی تعلیم مدرسوں میں ممنوع قرار دیدی تھی۔ بہرحال مجموعی حیثیت سے مصنف کی کاوش قابلِ تحسین ہے (و۔ا)

خیال پارے:
تصنیف: ڈاکٹر وزیر آغا
ناشر: اکادمی پنجاب، ٹرسٹ۔ لاہور
قیمت: ڈیڑھ روپیہ

شہرت کی خاطر:
تصنیف: نظیر صدیقی
ناشر: پاک کتاب گھر۔ ڈھاکہ
قیمت: تین روپے پچاس پیسہ

یہ دونوں کتابیں نثر کی اس صنف سے تعلق رکھتی ہیں جس کے لئے "انشائیہ" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ انگریزی میں سنجیدہ اور ہلکے پھلکے دونوں قسم کے مضامین کو ESSAY ہی کہا جاتا ہے۔ تاہم "انشائیہ" کا اطلاق ہلکے پھلکے مضامین پر ہی زیادہ ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر اس کا مقصد قارئین کو مسرت پہنچانا ہوتا ہے۔ اور اس میں تنقید یا تبصرے کو نہیں بلکہ شخصی ردِ عمل یا تاثرات کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔

اردو میں اس صنف کی جھلکیاں انیسویں صدی سے ہی نظر آتی ہیں تاہم مستقل طور پر انشائیہ لکھنے والوں کی تعداد اس دور میں بڑھی ہے۔

سرسید اور حالی نے اپنے دور آخر میں انشائیوں کی ابتدا کی۔ مولانا محمد حسین آزاد ان لوگوں کے سرخیل تھے اور سچ پوچھئے تو ان کے انشائیے وضع و کیف میں سب سے زیادہ انگریزی کے انشائیوں سے قریب ہیں۔ سرسید، شرر، سجاد حسین، یلدرم اور خواجہ حسن نظامی وغیرہ کے یہاں بعض جگہ یہ رنگ ملتا ہے، لیکن ہلکا۔ فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس، میاں عبدالعزیز فلک پیما، شوکت تھانوی، منٹو اور امجد حسین وغیرہ کے یہاں یہ رنگ زیادہ شوخ ہے۔ اردو میں انشائیہ کی روایت کس حد تک پروان چڑھی اس کے بارے میں ابھی کوئی فیصلہ کرنا قبل از وقت ہے، البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج اس سے دلچسپی رکھنے والوں اور اسے فروغ دینے کی کوشش کرنے والوں کی تعداد کافی بڑھ رہی ہے۔

زیرِ نظر دونوں کتابیں انشائیہ کی اچھی مثالیں ہیں اور ان کے مصنفین انشائیہ کے متعلق ایک واضح تصور بھی رکھتے ہیں۔ اور وزیر آغا کی تحریریں "پگ ڈنڈی"۔ "بے ترتیبی"۔ "ڈلو یا مجھ کو ہونے نے"۔ "بارش کے بعد"۔ "اجنبی دیار میں" خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ "شہرت کی خاطر" میں "نظیر صدیقی مرحوم"۔ "پدرم فقیر بود"۔ "آپ سے ملئے"۔ "امتحان گاہ"۔ "شادی"۔ "بیسویں صدی" اور "شہرت کی خاطر" خاصے دلچسپ ہیں۔ ان میں سے بیشتر میں وہ خصوصیات موجود ہیں جو ایک اچھے انشائیہ میں لازماً ہونی چاہئیں۔ یعنی غیر رسمی طریقِ کار، مزاح کی چاشنی، طنز کے ہلکے ہلکے چرکے، اکتسابِ علم کی لگن، تخیل کی کارفرمائی، تازگیٔ بیان اور اختصار و ایجاز۔ اور سب سے بڑھ کر وہ کیفیت جس سے قارئین خود کو مصنف کے حلقۂ احباب میں محسوب اور اس کے ساتھ سوچنے اور محسوس کرنے لگیں۔ اس خصوص میں یہ دونوں کتابیں ممتاز نظر آتی ہیں۔

کاغذ ان دونوں کتابوں کا اچھا مگر لکھائی چھپائی بہت ناقص ہے۔ آئندہ اشاعت میں اس نقص کو دور کیا جا سکتا ہے۔

(و۔ا)

★

تذکرۂ شاعرات پاکستان :

تصنیف : شفیق بریلوی
مدیر "خاتون پاکستان" کراچی
ضخامت : ۲۴۰ صفحات
۲۰ عدد تصاویر
قیمت : ۵ روپے
کتابت وطباعت : عمدہ
گرد پوش : دیدہ زیب

شفیق بریلوی کا ہر سُبک خرام قلم ہمارے قومی ادب کو کئی اہم تصانیف دے چکا ہے جیسے "دخترانِ حرم" اور "زن، زر، زمین" (ناول) جو ہماری قومی روح کی آئینہ دار ہیں۔ زیرِ نظر کتاب، "تذکرۂ شاعرات پاکستان" بھی ایک اہم علمی وادبی خدمت ہے۔ تذکرہ میں ایجاز بھی ہے اور جامعیت بھی۔ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کی اڑتالیس ممتاز شاعرات کا یہ تذکرہ تعارف بھی ہے اور کلام کے چیدہ نمونوں کا ایک دستۂ گل بھی۔ شاعرات کی تصاویر نے کتاب کو وقیع اور تاریخی اعتبار سے بھی۔ ایک عمدہ مرقع بنا دیا ہے۔ اردو میں شعراء کے تذکرے تو کافی ملتے ہیں ممتاز شاعرات کا مربوط و وقیع تذکرہ سنجیدگی کے ساتھ مرتب کرنے کی کوشش بہت کم کی گئی ہے۔ آج جبکہ ہماری خواتین زندگی کے ہر شعبے میں اپنی ذہنی صلاحیتوں کا ثبوت دے رہی ہیں یہ بڑا ضروری تھا کہ ان کی شعری و فکری کاوشوں کو بھی ملک کے سامنے لایا جائے۔ یہ کتاب اس ضمن میں بہت اچھی کوشش ہے۔

کتاب کے شروع میں حضرت ابو الاثر حفیظ، حضرت جوش ملیح آبادی اور حضرت نیاز فتحپوری کے کلماتِ تحسین وتعارف بھی شامل ہیں۔ مثلاً نیاز فتحپوری نے اس کو "طرحِ بہاریانہ" قرار دیا ہے تو جوش ملیح آبادی کی نظر میں یہ "پیکر نمائی" ہے۔ حفیظ نے اُس محنت وکاوش کی داد دی ہے جو صاحبِ تصنیف کو شاعرات کے حالات جمع کرنے اور ترتیب وتہذیب کے مراحل طے کرنے میں کرنی پڑی ہوگی۔

ایسا سیر حاصل مرقع اور اس میں عاصمہ حسین علیمی منفرد شاعرہ کا تذکرہ ندارد! شاید ترتیب وتکمیلِ مشمولات میں عجلت اس کا باعث ہوئی ہو۔ امید ہے طبعِ ثانی میں اس کی کماحقہٗ تلافی کر دی جائے گی۔

بہرکیف یہ تذکرہ خواتین، عام قارئین اور اُردو ادب کی رفتارِ ترقی سے باخبر رہنے والے جملہ حضرات کے لئے ایک عمدہ سبدِ گل ہے۔ (ظ - ق)

★

اُردو اور افغان : ایک اہم رشتہ

سابق صوبۂ سرحد اور قبائلی علاقہ کا اپنے وطن، پاکستان، کی طرح اس کی مقبول وہردلعزیز زبان، اُردو کے ساتھ بھی بڑا گہرا رشتہ ہے۔ ایک ایسا مضبوط پیوند جو کسی طرح ٹوٹ نہیں سکتا اور جو سرحدی علاقے کے ساکنوں میں دوسرے پاکستانی علاقوں میں رہنے والوں کے ساتھ خود بخود اپنائیت اور یگانگت کا احساس پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان دونوں کی رگیں کس طرح ایک دوسرے میں پیوست اور باہمدگر مربوط ہیں، اس کا ثبوت ہمیں جناب امتیاز علی عرشی جیسے دور افتادہ مصنف کے "حاجی خیل" بن جانے میں دکھائی دیتا ہے۔ اس سے علاقۂ سرحد اور برصغیر، خصوصاً مغربی پاکستان، کے ربطِ باہمی کا جو پہلو نمایاں ہوتا ہے وہ بے حد دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی اور اس قابل کہ اس کا بھرپور تعارف کرایا جائے۔

اگلے شمارہ میں ہم اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کریں گے۔ (ادارہ)

گنجینۂ معنی کا طلسم :— بقیہ صہ ۱۹

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے

اقبال کا حسب ذیل شعر جس میں اصلیت کا مفہوم، مرکز، مسکن، مقام، پیدا ہوتا ہے۔ مرتبین کے لئے دعوت فکر ہے :

اپنی اصلیت پہ قائم تھا تو جمعیت بھی تھی
چھوڑ کر گل کو پریشاں کاروانِ بُو ہوا

اصم : (بہرا پن) آج کل متروک ہے، اس لئے وضاحت کی جائے۔

اصناف : (جمع صنف کی) اسناد میں ترتیب غلط ہو گئی ہے۔ انشا، مقدم ہیں، حالی مؤخر۔

اصول : اس لفظ کے مرکبات میں "اصول دین" دیا گیا ہے۔ جس کے معنی (اللہ رسول اور قیامت پر ایمان رکھنا) لکھے ہیں۔ مرتبین نے یہاں فقۂ اہل سنت اور شیعہ فقہ کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھا۔ اس کی تشریح اس طرح کرنی چاہیئے۔ "اللہ رسول اور قیامت پر ایمان رکھنا (فقہ اہل سنت)۔ توحید، عدل، نبوت، امامت اور قیامت پر ایمان رکھنا (شیعہ فقہ)" یا صرف یہ لکھا جائے "کسی بھی مذہب کا بنیادی عقیدہ یا طریقہ"۔

مثال میں دور سوم کو نظر انداز کر دیا ہے اس دور سے بھی مثال مل سکتی تھی : اقبال :

مشرق میں اصول دین بن جاتے ہیں
مغرب میں مگر مشین بن جاتے ہیں

اصولی : معنی ۱ (اصول کا پابند) کی کوئی مثال نہیں دی گئی کیونکہ اشخاص کے لئے زیادہ تر با اصول استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے اس معنی میں مثال ملنی دشوار ہے البتہ معنی کی وضاحت کے لئے اپنی طرف سے مثال دی جا سکتی تھی۔ مثلاً "قائد اعظم ایک اصولی انسان تھے، قاعدے قانون کی خلاف ورزی کو برا سمجھتے تھے"۔

اصیل : معنی ۱ (ملازمہ، خادمہ جو زر خرید نہ ہو) کی مثال واضح نہیں۔ یہ مثال بہتر ہے : غالب۔
"مجھے یاد ہے کہ میرے لڑکپن میں ایک اصیل ہمارے ہاں نوکر رہی تھی"۔ (خطوط غالب صہ ۵۴۴)

اصیل کے معنی لڑائی کا مرغ اور اچھی نسل کا جانور، بالخصوص گھوڑا تو لکھے گئے ہیں لیکن ایک قسم کا شکاری کتا بھی اصیل کہلاتا ہے۔ جو دوڑنے میں تیز، جسامت میں پتلا، بالخصوص خرگوش اور ہرن کے شکار کے لئے نہایت موزوں، عموماً زردی مائل سرخ رنگ کا ہوتا ہے، جس کا ذکر نہیں کیا گیا۔

★

— میں آئین سازی کے کام میں اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید کی دعا کرتا ہوں۔

— ہر طرح کی وفاداریاں قومی وفاداری کے تابع ہونی چاہئیں کیونکہ اسی میں ہمارے استحکام اور سلامتی و قوت کا راز مضمر ہے۔

— مجھے امید ہے کہ نیا آئین ملک کی سلامتی و خوشحالی اور قوم کی سربلندی کی بنیاد فراہم کرے گا۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان

"ماہِ نو"

میں

مضامین کی اشاعت سے متعلق شرائط

۱۔ "ماہِ نو" میں شائع شدہ مضامین کا معاوضہ پیش کیا جائے گا۔

۲۔ مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان "ماہِ نو" کے معیار کا خیال رکھیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔

۳۔ ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینا ضروری ہیں۔

۴۔ ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔

۵۔ مضمون کے ناقابلِ اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

۶۔ ایڈیٹر مسودات میں ترمیم و تنسیخ کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

۷۔ مضامین صاف اور خوشخط، کاغذ کے ایک طرف تحریر کئے جائیں۔

۸۔ پتہ بہت صاف اور مکمل درج کیجئے۔

(ادارہ)

جلد ۱۴ — شمارہ ۱۲

ماہِ نو

مدیر: ظفر قریشی — دسمبر ۱۹۶۱ء

سرورق: "آفتاب بالتوارت بالحجاب"
(آفتابِ زندگی نظروں سے پنہاں ہوگیا)
قائد اعظم محمد علی جناحؒ
(حکیمِ ملت، علامہ اقبالؒ کے ایک مصرعِ لطیف کی روشنی میں)

سالانہ چندہ: پانچ روپے ۵۰ پیسہ

شائع کردہ: ادارۂ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

فی کاپی: ۵۰ پیسہ

بازگشت

شہاب رفعت

آج گزرے ہیں مہ و سال کئی
کتنے ایام جدائی کہ ہیں پھر عینِ وصال!
دور اُس دھندلے اُفق سے کہ عدم اور وجود
خود ہی ملتے ہیں جہاں خود ہی جدا ہوتے ہیں
تجھ کو آئے ہوئے اس پار ہیں گزری کتنی صبحیں شامیں
آتی رہتی ہیں نوا ہائے مسلسل آہنگ:

تیرے لئے بیتابِ دوام
روز وداع سے صبح اور شام
کشورِ پاک کے خاص اور عام
روح تھا تو اور جسم عوام

کاش وہی دن لوٹ آئیں
تجھ سا قائد پھر پائیں
چاند ہی چاند چمک جائیں
تارے ہی تارے مسکائیں

چاند ہو اور بھی تابندہ
تارا اور بھی رخشندہ
ملت اور بھی ہو زندہ
ملک ابد تک پائندہ

. . . .

دور ہوتے ہوئے کچھ دور نہیں
جبرِ تقدیر سے مجبور نہیں
قرب سے اپنوں کے معذور نہیں
اسی دھندلے سے اُفق کے اُس پار
میری نظریں ابھی مشرق، ابھی مغرب کے جہانوں میں ہیں

ان کے میدانوں میں، کہساروں میں پیدا کر دیا
ان کے افسونِ تماشا کو ترستی شب و روز

نونہالانِ چمن ہی کی بقا، نشو و نما
ان کی شادابیٔ رنگ
ان کی سیرابیٔ کیف
ان کی گلرنگ ردائیں مرا فردوسِ نگاہ
اب بھی میرے سحر و شام وہی
بادۂ پاک وہی جام وہی
اب بھی ان کے لئے پیغام وہی:

مایۂ زیست ہے جانِ آزاد
دل آزاد جہان آزاد
حیف! وہ مردمِ جمہور فریب
جن کا ہے شیوہ و دستور فریب
گرچہ ہر چال ہے پرکاران کی
جیت آخر کو بنے ہاران کی
جہدِ آزادی ہے طوفانِ بلا
حفظِ آزادی ہے اس سے بھی سوا
کیا کٹھن منزلِ آزادی ہے
شش جہت عالمِ بربادی ہے
گھر دھنواں دھار ہیں تا حدِ نگاہ
خستہ و زار ہیں تا حدِ نگاہ
خار ہی خار ہیں تا حدِ نگاہ
دار ہی دار ہیں تا حدِ نگاہ
تیر و تلوار ہیں تا حدِ نگاہ
ہر طرف موجۂ خوں جاری ہے

منزلِ شوق بہت بھاری ہے
عزم بالجزم کا یہ معجزہ تھا
ہم کو یہ گوہرِ مقصود ملا
اور پھر ہمتِ عالی اپنی
گرمِ جاں جہدِ مثالی اپنی
ایک ہی جذبہ و آہنگ اپنا
ایک ہی ولولۂ جنگ اپنا
شرق تا غرب تھا اک رنگ اپنا

بعد کو راہ وہی گام وہی
جذبۂ پاک کے ہنگام وہی
نتھے سیاست کے چلن عام وہی
مبتلائے ہوسِ خام وہی
چپے چپے پہ بچھے دام وہی
پردۂ جہر میں عیاری تھی
پردہ اور پردہ بھی زنگاری تھا
سادگی میں وہی ہشیاری تھی
راہزن شیوۂ مکاری تھا

ہاں مگر اب وہ سمے بیت چکے
سائے جو اُبھرے تھے نابود ہوئے
اب تو ہے چار طرف عالمِ نور
بکھرے تا حدِ نظر طور ہی طور
اک قیادت کے تہِ سایہ کو جو
نور ہی نور ہے از سر تا پا
خود مری شانِ قیادت کی مثیل
اب ہیں ملت کے لئے کام نئے
جذبۂ پاک کے ہنگام نئے
اور بھی چمکے ستارے کا جمال
اور بالیدہ و رخشندہ ہلال
اور پائندہ و تابندہ جلال

"نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ کارزار"

(قائد اعظمؒ: ایک بے لاگ تبصرہ)

لارڈ پیتھک لارنس

"مرنے والوں کے لبوں پر سچائی ہوتی ہے" ٹینی سن کا یہ قول لارڈ پیتھک لارنس آنجہانی کے اس خراجِ عقیدت پر صادق آتا ہے جو انہوں نے گذشتہ سال اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے "پاکستان سوسائٹی لندن" (جس کے وہ ایک نائب صدر تھے) کے ایک اجلاس میں جو قائد اعظمؒ کے یوم پیدائش کے موقع پر منعقد ہوا تھا، پیش کیا تھا۔ انہی کی ایک اور تقریر جو سوسائٹی کے قائد اعظم سے متعلق گذشتہ اجلاس میں کی گئی تھی، "ماہ نو" کے شمارہ (مارچ ۱۹۶۰ء) میں پیش کی جا چکی ہے۔ ان دونوں تقریروں میں تمام تر معروضی روش اختیار کرتے ہوئے قائد اعظمؒ کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ان کی شخصیت و کردار کے بڑے ہی بے لاگ محاکمے پر مشتمل ہے۔ اسلئے یہ حقیقت سے بے حد قریب بھی ہے۔ دوسری تقریر کے اہم حصے ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں (ادارہ)

آج سے ساڑھے بارہ سال اُدھر مجھے کیبنٹ مشن کے سربراہ کی حیثیت سے ہندوستان جانے کا اتفاق ہوا تھا اور قدرتی طور پر کئی بار مسٹر جناح سے ملنے کا موقع ملا۔ اب ساڑھے گیارہ سال گذر چکے ہیں جبکہ دولتِ مشترکہ کا وہ اہم حصہ جسے پاکستان کہتے ہیں، وجود میں آیا۔

دراصل یہ مسٹر جناح ہی تھے جنہوں نے اپنی غیر معمولی حکمتِ عملی اور اولوالعزمی سے اپنی قوم کو یہ مقام عطا کیا اور اس کے وطن کو آزادی سے ہمکنار کیا۔ پھر اُن ہی کی ذاتِ گرامی تھی جس نے اس کی ایک آزاد قوم کی حیثیت سے ابتدائی زمانے میں سربراہی کی۔ ظاہر ہے کہ یہ زمانہ لازماً بڑا ہی کٹھن زمانہ تھا جب کہ وہ تمام گوناگوں مسائل درپیش ہوتے ہیں جن سے کسی نوزائیدہ قوم کو ضرور بالضرور دوچار ہونا پڑتا ہے۔

بنا بریں اس کے بعد جو سال آئے، میں ان کے دوران قدرتی طور پر پاکستان کے حالات کو بڑی ہی گہری دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ ابھی ایک سال سے کچھ تھوڑا اوپر وقت ہوا — گذشتہ سال آپ کی سوسائٹی کے جلسے سے تھوڑا عرصہ پہلے جو شمالی لندن میں منعقد ہوا تھا — مجھے یہ موقع ملا تھا —— پاکستان کے انتہا درجہ دلچسپ دورہ کا بے حد مسرت انگیز موقع —— اور جتنا عرصہ میرا وہاں قیام رہا، میں نے صرف اس مادی ترقی ہی کا مشاہدہ نہیں کیا جو اس وقت ملک میں بروئے کار آ رہی تھی، بلکہ مجھے ملک کے کتنے ہی سربرآوردہ افراد سے ملنے اور ان کے خیالات —— مستقبل سے متعلق اہم خیالات —— کو معلوم کرنے کا موقع بھی ملا۔

مسٹر جناح کے ساتھ میری دوستی کا سلسلہ اس سے کہیں دور جاتا ہے۔ سب سے پہلے اس وقت جبکہ مجھے تیس سال سے زائد عرصہ ہوا ہندوستان جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ میرا خیال ہے میرا یہ کہنا درست ہے کہ اس وقت مسٹر جناح انڈین نیشنل کانگریس کے اس لئے رکن تھے کہ ان کے عقیدہ میں اس جماعت کے تحت ہندوستان کی ایک متحدہ حکومت قائم ہو سکتی ہے جس میں مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کو نہ صرف یکساں حیثیت حاصل ہو بلکہ ان کا درجہ بھی مساوی ہو۔

مگر کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ تجربہ نے انہیں اس سے بالکل مختلف رائے قائم کرنے پر مجبور کر دیا۔ اب وہ اس بات کے قائل ہو گئے تھے کہ متحدہ ہند میں مسلمانوں کو کبھی بھی مساوی حیثیت یا مواقع حاصل نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ ایک اقلیت ہیں اور وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ وہ ہمیشہ ایک اقلیت ہی رہیں گے۔ بدیں وجہ ان کے مواقع بھی ہمیشہ محدود رہیں گے اور انہیں مساوی درجہ پانے کا موقع فراہم نہیں کیا جائے گا۔

آج یہ بحث چھیڑنے کی ضرورت نہیں کہ ان کی یہ رائے صحیح تھی یا غلط۔ انہوں نے یہ رائے اختیار کی اور اس پر دلیری، مضبوطی اور دیانت کے ساتھ قائم رہے۔ اور اس کے بعد پاکستان یعنی پاکستان کا نصب العین پہلی دفعہ واضح طور پر روشناس ہوا۔ اس سے پہلے تو اس کا نام تک معلوم

نہ تھا اور یہ قائد اعظم کی اوّلین شاندار کامیابیوں میں سے ایک تھی کہ انہوں نے پاکستان کا تصور پیدا کیا۔ اور یہ تصور پیدا کرنے کے بعد وہ انتہائی جوش وخروش اور عزمِ صمیم کے ساتھ اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے جدوجہد کرتے رہے یہاں تک کہ انہوں نے اس کو روشناسِ تکمیل کر کے ہی دم لیا۔

اس میں شک نہیں کہ قائد اعظم زبردست ذہنی صلاحیتوں سے بہرہ ور تھے اور اس کے ساتھ وہ ایسے جادو بیان مقرر بھی تھے کہ سب کو اپنا قائل اور گرویدہ بنا لیتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی زبردست قوتِ تقریر کو اس زور شور سے استعمال کیا کہ جو بات پہلے محض ایک تصوّر کی حیثیت رکھتی تھی اسے بالآخر حقیقت نفس الامری بنا کر چھوڑا۔ وہ نہ صرف ان صلاحیتوں سے بہرہ ور تھے بلکہ میں نے ان کی ذات میں ایک انسان پایا ــــ نہایت پختہ ارادے کا مالک، وعدے کا پکا ــــ جو ایک بار کوئی عہد کر لیتا تو اس پر ہمیشہ قائم رہتا اور اگر وہ یہ محسوس کرتا کہ کوئی شخص جس کے ساتھ وہ کوئی معاملہ طے کر رہے ہیں، اپنے عہد پر قائم نہیں رہا، تو ان کا ردِّ عمل بڑا سخت ہوتا تھا۔

بیشک مزاج کے وہ بڑے کڑے تھے۔ وہ تمام انسان ہیں ان لوگوں کی مخالف آراء کے باوجود جن کے ساتھ ان کا واسطہ پڑا، کوئی مہتم بالشان انقلاب برپا کرنا پڑے۔ ایک نئی قسم کا آئینی انقلاب ــــ وہ ایسے ہی مزاج کے انسان ہوتے ہیں۔ ہمارے اپنے ملک ــــ برطانیہ، میں آلیور کرامویل کو دیکھ لیجئے۔ ونسٹن چرچل کو دیکھ لیجئے، امریکہ میں جارج واشنگٹن اور دنیا کے دیگر حصّوں ــــ یورپ، ایشیا، افریقہ میں ایسے کڑے عزم و ارادہ کے انسان گذرے ہیں جنہوں نے جس بات کا ارادہ کر لیا اسے پورا کر کے دکھایا۔ لیکن اگر کوئی انسان مقصد میں راست اور عہد کا پابند ہو، تو یہ کڑا پن اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں بلکہ کامیابی کا لازمی جزو بن جاتا ہے۔

جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں، میں اس ساڑھے گیارہ سال پاکستان کے حالات کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ پچھلے سال بھی میری نظر اس کے حالات پر رہی، جو اس کے لئے بڑا ہی کٹھن سال تھا اور میں آخر میں یہی کہوں گا: مجھے یقین ہے کہ اگر مسٹر جناح آج زندہ ہوتے تو ان کا اس عظیم ملک، پاکستان، کے تمام لوگوں کے لئے یہی پیغام ہوتا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ شانہ بہ شانہ کھڑے رہیں، اس مصمم ارادے کے ساتھ کہ وہ اپنے عظیم ملک کی روایات، نیز دولتِ مشترکہ برطانیہ کی روایات کو برقرار رکھیں، تو وہ ان تمام مشکلات کا سامنا کر سکیں گے جن سے وہ دوچار ہیں اور اپنے ملک کو نہ صرف ایسے انسانوں کا عظیم حصار، ایک محکم حصار، بنائیں گے جو اپنی آزادیٔ کامل کو پانے اور تقدیر کو بنانے کا عزم بالجزم کئے ہوئے ہے۔ بلکہ مہذب دنیا میں وہ عظیم طاقت بھی ثابت ہوگا جس کے مسٹر جناح ــــ ان کے بابائے ملّت ــــ ہمیشہ متمنّی رہے ٭

ہمارے ملک میں انشاءاللہ صرف وہی لوگ برسرِ اقتدار آئیں گے جو خدا ترس، دیانت دار اور خدمتِ وطن کے جذبہ سے سرشار ہوں۔ ایسے لوگ جن میں اپنے وطن اور نوعِ انسان کی محبت کا جذبہ موجزن ہو، وہ جن کے قدم دیانت کی راہ پر کبھی نہیں ڈگمگائیں گے۔ جن کی بے لوث خدمت اور کام کی انتھک صلاحیت آزمائی جا چکی ہوگی ــــ اب صرف ایسے ہی اشخاص قیادت کے مستحق سمجھے جائیں گے

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان

ایوان دولت

بینک دولت پاکستان دراصل دولت پاکستان کی بدیہی علامت ہے جس پر دو عظیم ہستیوں کا مبارک سایہ ہے، بانئی پاکستان، قائد اعظم رح (تاسیس ۱۹۴۸ء) اور صدر پاکستان، (تکمیل نئی عمارت: افتتاح: ۱۹۶۱ء) -

عظیم سنگ میل' عظیم مظہر: مالی صلاحیت، مستحکم نظام زر، ترقی یافتہ بنکاری، کاروباری ساکھ -

زریں تعمیر: بہ صرف دو کروڑ روپے

نقش جمیل: فن تعمیر اور ذوق آرائش کا منفرد نمونہ

کلید زر یا کلید سیم؟ نقرئی کلید سے صدر دروازہ کی قفل کشائی

''ایوان دولت'' کے افتتاح کے لئے شاہی پیش قدمی

جدید ترین حساب کاری
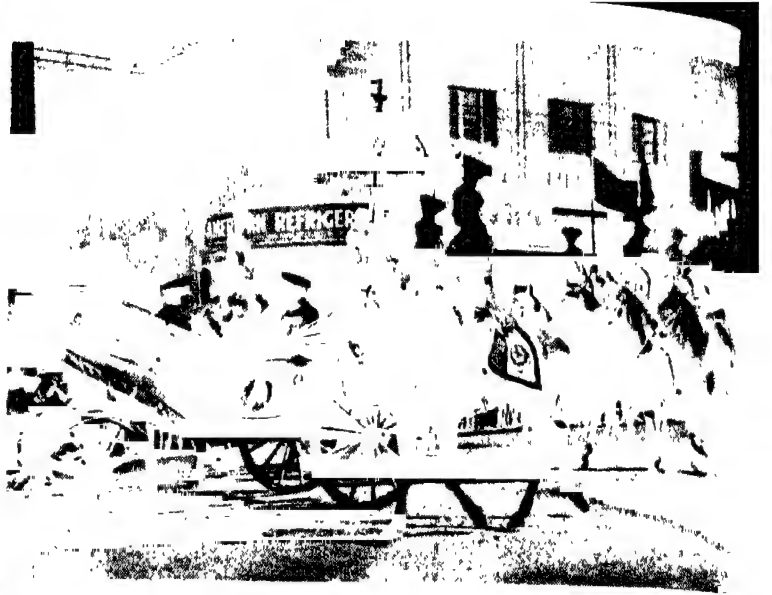
حرف زریں: ''وزیٹرز بک'' پر پہلی تحریر

چالیس ملکوں کے نمائندگان اور مہمانان خصوصی
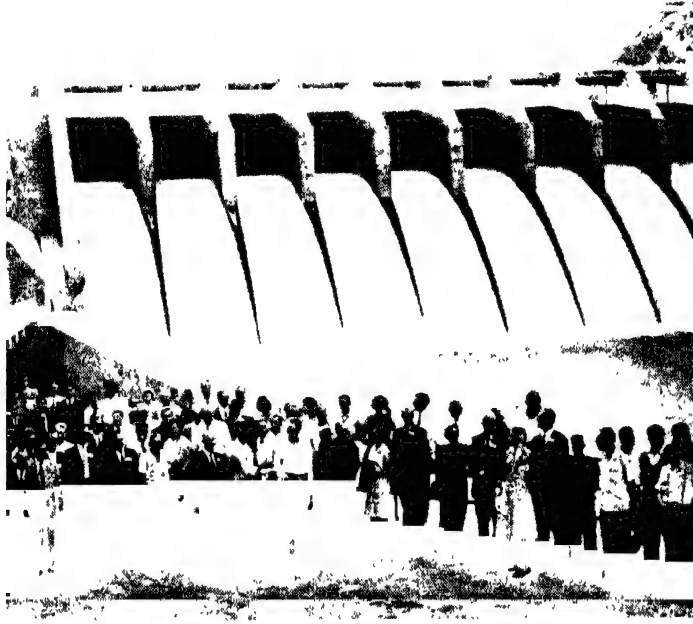
یک آہنگ و یک اندیش

بابائے ملت، محمد علی جناحؒ اور بانیٔ انقلاب، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کے فکر و عمل کے خطوط کس حد تک متوازی اور "یکے بین و یکے گوئے و یک اندیش" کے مصداق ہیں، اس کا اندازہ ان ارشادات سے بھی کیا جا سکتا ہے جن میں ان دونوں جلیل القدر سربراہانِ قوم نے پاکستان، اس کے نصب العین، اس کے مقاصد نیز حیات اور اس کے مطالبہ و مسائل کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی ابتدا بھی ایک ہی نقطہ سے ہوتی ہے۔ اسلام ــــ اور انتہا بھی ایک ہی نقطہ پر ــــ متحرک زندگی، مسلسل ارتقا، حقیقت پسندی، جو اسلام کی حقیقی روح اور تعلیم کے لازمی نتائج ہیں۔ اس لئے دونوں کا مطمحِ نظر زندگی کو جدید تقاضوں سے ہمکنار کرتے ہوئے ایک نئے سانچے میں ڈھالنا ہے اور بس۔ اس متوازی آہنگ اور متوازی خطوط کا پہلو بہ پہلو مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ ذیل میں ان عہد آفریں شخصیتوں کے جو ارشادات درج ہیں وہ اسی غرض سے ترتیب دئے گئے ہیں۔ (ادارہ)۔

پیش آہنگ:

وہ نصب العین جو قائد اعظمؒ کی موت اور زندگی سب کچھ تھا، اسے ایک لفظ میں پیش کیا جا سکتا ہے، پاکستان۔ انہوں نے بڑی بے باکی اور اس استقامت سے جو حصولِ مقصد سے منہ نہیں موڑتی، پاکستان کے تصور کو ایک حقیقت بنا دیا، اور جب پاکستان حاصل ہو گیا تو اپنی ساری قوت سے اسے مضبوط، پائیدار اور مستحکم بنانے پر صرف کر دی۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں

بابائے ملتؒ:   بانیٔ انقلاب:

بنائے پاکستان:

اپنے لئے ایک مملکت قائم کرنا صرف یہی ہمارا مقصد نہ تھا، بلکہ ایک وسیلہ تھا حصولِ مقصد کا۔ ہمارا نصب العین تو یہ تھا کہ ایک ایسی مملکت کے مالک ہوں جہاں ہم اپنی روایات اور ثقافتی اقدار کے مطابق ترقی کر سکیں ــــ جہاں اسلامی عدل و مساوات کو آزادی کے ساتھ بروئے کار لانے کے پورے مواقع حاصل ہوں۔

قیامِ پاکستان کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ایک ایسا وطن مہیا ہو جائے جس میں ہم اسلامی وضعِ حیات کے مطابق رہ سکیں اور اپنی زندگی کی تشکیل کر سکیں۔ اسلامی طرزِ زیست کے بغیر پاکستان محض ایک ویرانہ ہوگا اور بس۔

اتحادِ پاکستان:

پاکستان جیسی نوزائیدہ مملکت کے لئے جس کے دو حصے ہوں،

یہ بات نہ بھولئے کہ جغرافیائی حیثیت سے دور ہونے کے باوجود

۔۔۔ وہ بھی کافی فاصلہ پر۔ آپس کا اتحاد، یک جہتی نہ صرف اس کی ترقی کے لئے بلکہ بقا کے لئے بھی انتہائی ضروری ہے۔ پاکستان در اصل مسلمانوں کے اتحاد کا مظہر ہے، اور اسے ایسا ہی ہونا چاہئے۔ سچے مسلمانوں کی حیثیت سے آپ کا فرض ہے کہ جی جان سے اس کی حفاظت و پاسبانی کریں۔

مشرقی اور مغربی پاکستان ایک ہی ملک اور ایک ہی قوم ہیں۔ ہماری وحدت کا انحصار کسی بھی مادی قدر پر نہیں بلکہ ایک مشترک روحانی بنیاد پر ہے۔ مادی روابط تو کمزور بھی پڑ سکتے ہیں اور ٹوٹ بھی جاتے ہیں مگر دنیا کی کوئی طاقت روحانی رشتے کو ضرر نہیں پہنچا سکتی۔

اسلامی جمہوریت:

ہمیں چاہئے کہ اپنی جمہوریت کی بنیادیں صحیح معنوں میں اسلامی تصورات اور اصولوں پر رکھیں۔

اسلامی آئین میں ایسی روح کا ہونا لازمی ہے جس کی مدد سے ہم اپنے تصورات اور اعمال کو اسلام کے سانچے میں ڈھال سکیں۔

آزادیٔ رائے:

اپنے ووٹ کو ذاتی مفاد کے حصول کی خاطر بیکار نہ ڈالئے بلکہ اپنے ووٹ کو قوم کی ایک امانت سمجھئے۔

اپنے نمائندے آزادانہ مرضی سے منتخب کریں مگر جس آدمی کو بھی چنیں وہ ایسا ہو جو نیک ہو، اچھا ہو اور اس کی دیانت پر بھروسہ بھی کیا جاسکے۔

امن و ترقی:

•

بینک کاری ہمارے نوجوانوں کے لئے ایک ایسا نیا اور وسیع میدان کھول دے گا جہاں انہیں اپنی ذہانت اور قابلیت دکھانے کا پورا پورا موقع ملے گا۔ مجھے یقین ہے کہ بینک کاری کی تربیت کے سلسلے میں جو سہولتیں دی جائیں گی ان سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہمارے نوجوان بڑی تعداد میں آگے بڑھیں گے۔ اس طرح وہ نہ صرف اپنے آپ کو فائدہ پہنچائیں گے بلکہ اپنے ملک کو خوشحال بنانے میں بھی حصہ لیں گے۔

(افتتاح بینک دولت پاکستان)

(۱۹۴۸ء)

•

ہم نے اپنی زندگی اور کام کے ہر شعبے میں اصلاح و تعمیر کی عظیم ذمہ داری قبول کی ہے

بینک دولت پاکستان کی یہ نئی عمارت ملک اور اس ادارہ کے مالی استحکام کی ایک علامت ہے۔

یہ بینک ملک کی اقتصادی ترقی کے لئے ایک مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے مسلسل اقتصادی ترقی و فروغ کے لئے سازگار ماحول پیدا کیا اور مستحکم نظام زر ملک کو دیا۔ بینک ان فعال اداروں کی بھی ایک جھلک ہے جنہیں جفاکش عوام نے اپنے خون پسینہ سے تعمیر کیا ہے۔

میری دلی دعا ہے کہ وہ تخریبی قوتیں عقل و ہوش کی حدود میں رہیں جو اس وقت خوفناک رفتار کے ساتھ دنیا میں اکٹھی ہو رہی ہیں۔ میری دلی دعا ہے کہ انسانیت اٹیمی قوت کی ہلاکت خیزیوں سے بالکل محفوظ و مامون رہے۔

(افتتاح نئی عمارت بینک دولتِ پاکستان)

(۱۹۶۱ء)

اردو اور افغان

ظفر قریشی

جس طرح ایران اور اس کی زبان، فارسی کا برصغیر پاک و ہند، خصوصاً مغربی پاکستان، کے ساتھ بہت قدیم، قریبی اور گہرا رشتہ رہا ہے، اسی طرح پختون علاقہ، پختون زبان اور ان سب سے بڑھ کر خود پختون لوگوں کا، جو کوئی ہمسایہ یا باہر کے لوگ نہیں بلکہ گھر کے لوگ ہیں۔ ہمارے ملک کے زیریں حصہ، خصوصاً مغربی پاکستان کے ساتھ بہت پرانا، بہت گہرا اور بہت مضبوط رشتہ اور گھال میل رہا ہے، جو آج بھی ان میں ایسا ہی قرب اور ویسی ہی یکجائی پیدا کرتا ہے جیسے وہ یک جان یک قالب ہوں۔ ایک ہی مضمون جیسے ایک کا رشتہ دوسرے سے ہو۔ ایک قدرتی میلان، ایک قدرتی جھکاؤ — سندھ کی وادئ کبیر کے مختلف حصوں کا آپس میں قدرتی ربط وضبط۔ اٹک کے اس پار کی دنیا کا رُخ کابل کے اُس پار کی دنیا کی طرف نہیں بلکہ مغربی پاکستان کی طرف ہے۔ یہ حقیقت ان کی تاریخ میں بھی نمایاں ہے اور دونوں خطوں کی نمائندہ زبانوں، پشتو اور اردو میں بھی کچھ عجب نہیں کہ ان دونوں کا رشتہ ماں بیٹیوں کا رشتہ ہو۔ سوء اتفاق سے حالات نے اس حقیقت پہ صدہا سال پردہ ڈالے رکھا اور ہم نہ یہاں کے باشندوں کے ربط باہمی کو سمجھ سکے — یہ کہ یک دل و یک روح در نشو و نما بودیم ما۔ بلکہ بدستور یک دل و یک روح ہیں اور رہیں گے — اور نہ ان کی زبانوں کے دیرینہ تعلق اور داد و ستد سے آگاہ ہو سکے۔ حالانکہ ہماری نسلوں اور ہماری زبانوں میں اس کی واضح شہادتیں موجود ہیں اب وقت ہے کہ ہم اپنی آنکھیں کھول کر ان شواہد پر نظر ڈالیں۔ اور پختونوں، اور مغربی پاکستان کی مختلف قوموں کے ساتھ ساتھ پشتو اور اردو کی خویشی و قربت میں بھی مشترکہ قدروں کا سراغ لگائیں۔

آغا حیدر حسن دہلوی (مرحوم) جن کی عمر کا بڑا حصہ حیدرآباد (دکن) میں گزرا تھا دلی کی قدیم معاشرت، بیگماتی زبان اور رسم آداب و رسوم کے بہت اچھے محرم اور شارح تھے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ پس پردہ علی گڑھ سے چھپ چکا ہے۔ ان کے کسی مضمون میں یہ فقرہ میری نظر سے گزرا تھا کہ سید احمد شہید بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید کے جہادوں کے بعد جب لوگ واپس آئے تو ان کے ساتھ ان کی خواتین بھی تھیں۔ بہت سی دلی والیاں جو ان مجاہدین کے ساتھ دلی واپس آئیں تو وہ خوب پشتو بولتی تھیں۔

اس وقت میں نے اس بات پر زیادہ دھیان نہ دیا تھا۔ مگر یہ بھولی بسری بات پھر یاد آ گئی جب پچھلے دنوں معروف محقق، مولانا امتیاز علی عرشی کی کتاب "اردو اور افغان" مطالعہ سے گزری۔ کیا یہ بات اس ضمن میں قدرتی مناسبت لئے ہوئے نہیں کہ برصغیر کے زیریں حصہ کے ایک اردو مصنف کی کتاب جامعہ پشاور کی پشتو اکیڈمی نے شائع کی ہے اور یوں ۱۹۶۰ء نے برسوں پرانے نقوش کو اجاگر کر کے اُن رشتوں کو نمایاں کیا ہے جو شمال کی جانب سے پختونوں کی برصغیر میں آمد سے دسویں گیارھویں صدی عیسوی میں ابھرنے شروع ہوئے تھے!

بے شک روہیل کھنڈ سرزمین ہند پر افاغنہ کی آخری بستی ہے۔ یوں افاغنہ کا ہندوستان میں ورود سلطان محمود غزنوی کے والد، امیر سبکتگین کے وقت سے برابر ہوتا رہا ہے۔ اِس وقت ہند میں ان کی مشہور بستیاں رامپور، آنولہ، مراد آباد، بریلی، شاہجہانپور، فرخ آباد، ٹونک، جاورہ، بھوپال وغیرہ ہیں۔ غوریوں اور لودھیوں نے دلی پر عرصہ تک حکومت کی ہے۔ سلاطین، فاتحین اور اہل سیف کے علاوہ اہل قلم، اہل علم، درویش، تاجر، طلبہ اور عام لوگ بھی کسی نہ کسی حیثیت اور روپ میں برابر وارد ہند ہوتے رہے ہیں۔ اس لئے قدرتی بات ہے کہ انہوں نے یہاں کی زبان، تمدن، ثقافت اور فکر و فن، غرض ہر چیز پر اثر ڈالا ہوگا۔ کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ

ہزاروں لاکھوں انسان یہاں آکر بس گئے ہوں اور انہوں نے کوئی لسانی و ثقافتی چھاپ نہ لگائی ہو۔ یہاں گفتگو صرف اس باب میں ہے کہ افاغنہ نے اُردو کی بناوٹ میں کیا حصّہ لیا۔

اُردو کی ابتدا کا سراغ لگانے کے سلسلے میں کئی اہم تحقیقی کاموں کو نظر کے سامنے رکھنا چاہیئے۔ لیکن اس ضمن میں چند کا ذکر یہاں موزوں ہوگا۔ مثلاً :

گریرسن کا "لسانیاتی جائزہ ہند" (۱۹۱۶)۔ اس میں اُردو کی ابتدا اور ہند آریائی لسانیات کے کئی گوشوں سے پردہ اٹھایا گیا ہے، بعض قیاسات کی تصحیح کی گئی ہے اور کچھ نئی باتیں بھی کہی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ کھڑی بولی ایک مستقل حیثیت کی مالک تھی۔ اور وہی اُردو کی ماں تھی مگر اُس کا یہ خیال بداہتاً غلط ہے کہ کھڑی بولی برج اور پنجابی کا ملغوبہ ہے یا اس میں اُن کا امتزاج پایا جاتا ہے۔

۱۹۱۶ء کی اس آواز کے بعد ۱۹۲۸ء تک سناٹا نظر آتا ہے۔ تا آنکہ پروفیسر محمود شیرانی نے "پنجاب میں اردو" تحریر کی (وہ بھی ٹونک کے ایک پختون تھے اور پنجاب یونیورسٹی میں استاد)۔ اس کے بعد ۱۹۳۲ء میں ڈاکٹر محی الدین زور کی "ہندوستانی لسانیات" منظر عام پر آئی۔ اسی طرح ڈاکٹر مسعود حسین اور دیگر اہلِ تحقیق و ادب کے کارنامے سامنے آتے رہے ہیں۔ جن کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

پروفیسر شیرانی کا خیال یہ تھا کہ نواحِ دہلی کی تمام بولیاں مسلمانوں کی فتحِ دہلی (۱۱۹۳ء) کے بعد ارتقار پذیر ہوئیں۔ اس لئے جو مسلمان پنجاب کی جانب سے ہجرت کر کے وہاں پہنچے ہوں گے وہ اپنے ساتھ کوئی زبان بھی لے گئے ہوں گے اور مقامی بولیوں پر اثر ڈالا ہوگا۔ لیکن اہلِ سیف اور طالع آزماؤں کے ساتھ لاہور سے کسی ایسی بڑی ہجرت کا سراغ نہیں ملتا یعنی یہ کہ ایسی کوئی ہجرت نہ ہوئی تھی جیسی دلّی تا دولت آباد کی ہجرت تھی یا پھر ۱۹۴۷ء میں اب ظہور میں آئی۔ اس لئے بعض نے اس رائے پر بھی شبہ ظاہر کیا ہے کہ صرف اہلِ سیف و فاتحین کے لاؤ لشکر نے زبان کے پھیلاؤ میں کوئی بڑا حصّہ لیا ہو۔ کیونکہ زبانیں لشکروں کی آمد اور رفت سے بنتی نہیں شروع ہو جاتیں۔

بہر حال اس نظریہ کے بعد پروفیسر ژول بلوک کی تحقیقات اورنٹیل اسٹڈیز (لندن) میں ۱۹۲۸ء سے چھپنی شروع ہوئیں۔ ڈاکٹر زور نے دکنی اور پنجابی کے تال میل یا گھال میل کا ذکر سنایا۔ غرض اس قسم کے بہت سے کام تو ہوتے رہے مگر کسی محقق نے بھی سنجیدگی کے ساتھ ایسی کوئی وقیع تحقیق نہیں کی یا رسالہ مرتب کی جس سے اردو کی بناوٹ میں افاغنہ کے حصّہ کو واضح کیا گیا ہو۔ حالانکہ اٹک پار سے آنے والے ان گروہوں نے اس ایک ہزار سال میں ضرور اپنا اثر اردو پر چھوڑا ہوگا۔

" اردو افغان" میں اس بحث پر بڑی تفصیل کے ساتھ مدلل گفتگو کی گئی ہے ــــ اب یہ اور بات ہے کہ ہمیں بعض جگہ ان سے اختلاف ہو، تاہم زیادہ تر باتیں خدا لگتی معلوم ہوتی ہیں۔ اور زبان کے معاملہ میں دلّی کے ڈانڈے تیراہ (سرحد) سے ملتے ہوئے نظر آتے ہیں، بلکہ اس سے بھی بہت آگے۔

مولانا عرشی نے اپنی تحقیقات میں زیادہ تر رامپوری الفاظ اور محاوروں سے استفادہ کیا ہے اور ان سے ہی حجّت و سند کا کام لیا ہے۔ یہ قدرتی بات ہے۔ کیونکہ پٹھانوں کی بستیوں میں روہیل کھنڈ اور اس میں بھی رامپور گل سرسبد کی حیثیت رکھتا ہے ویسے بھی شمالی ہند میں مسلمانوں کی بول چال، چال ڈھال وغیرہ کا مقابلہ کرتے وقت روہیل کھنڈی مسلمانوں کا حال دیکھیں تو ان کا اپنا ہی ایک طور نظر آئے گا۔ ان کے خصائل و اطوار، انتہائی مزاج، لہجہ، رہن سہن اور عقابی تیور ممتاز نظر آئیں گے جو ان کے پختون الاصل ہونے کی طرف اشارہ ہیں۔

روہیل کھنڈی زبان کے بعض الفاظ اور محاروں کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں۔ مثلاً :۔

رامپور میں " اختہ" بمعنی مبتلا ہو جانا، یا فریفتہ ہو جانا، بولتے ہیں۔ جیسے : " میں مصیبت میں اختہ ہوں" یا " وہ تو اس پر اختہ ہے"۔ وغیرہ۔ یہ پشتو "آختہ" ہے۔ اسی طرح اور بہت سے لفظ ہیں۔ مائیوں یا مانجھے کی رسم دلّی۔ رامپور وغیرہ میں عام ہے یہ بھی پٹھانوں سے آئی ہے۔ دلّی میں لڑکیوں کی زلفیں ایک خاص طرح سے گوندھنے۔ کو "مینڈھیاں باندھنا" کہتے ہیں۔ پنجابی میں اس کو

میڈیاں" کہتے ہیں۔ یہ بھی خالص پٹھانی آرائش گیسو ہے۔ سروں پر
چٹے رکھنے کا رواج جہلم سے جمنا تک کسی وقت عام تھا۔ یہ بھی اٹک پار
سے یہاں پہنچا ہے۔ اس لئے میرا گمان یہ ہے کہ جب مینڈھیاں باندھنے
کا رواج یہاں تک پہنچا ہے تو کوئی لفظ بھی اس کے ساتھ آیا ہوگا۔ وہ
معلوم نہیں مگر ایک اور لفظ " اوربل " ضرور ہے جو انشا کے زمانے
میں بھی اہل دھلی کی زبان پر تھا، یعنی وہ " اربل" کھولنے کا محاورہ
رکھتے تھے مگر معنی مجازی تھے۔ " پاڑو" پشتو میں سانپ کا منتر جاننے
والے کو کہتے ہیں۔ رامپور میں سیانے کو جو علیت جتائے طنزاً " پاڑو"
کہا جاتا ہے ـــــ " آپ تو بڑے پاڑو ہیں"۔

ایک پشتو لفظ ہے" پرکٹا" جس کے معنی ہیں وہ لڑکا جس
کا باپ مر چکا ہو اور اس کی ماں دوسرا نکاح کر لے۔ تو یہ لڑکا دوسرے
باپ کا پرکٹا کہلائے گا۔ مولانا کہتے ہیں کہ اس کے لئے اردو میں
کوئی لفظ نہیں۔ میرے خیال میں " گیلڑ" ایک لفظ ضرور موجود ہے۔
(گیل = ساتھ۔ لڑ = لڑکا) یہ گنواری لفظ ہے مگر زبان زد عام ضرور ہے
پنجابی میں ایسی اولاد کو " پچھ لگ" کہتے ہیں۔

پشتو میں بلی کو بلانے کے لئے " پش پش" کہتے ہیں۔ یہ " پشیے"
اور " پشی" سے مشتق آوازیں ہیں۔ دلّی والے پش پش کرتے ہیں۔ مگر
اسے " پھس پھس" بنا لیا ہے بلکہ محاورہ بنایا ہے " ہاتھ کی بلی چھوڑ
کر پھس پھس کرنا"۔ (اسی آواز کو انگریزی کی " PUSS " اور " PUSSY "
میں بھی تلاش کیجئے) پنجابی میں بھی " پیشو" بلی کے لئے عام ہے اور
اس کو بلانے کے لئے " پیش پیش" یا " پش پش" کہتے ہیں۔

" پوس" پشتو میں احمق و نادان کو کہتے ہیں۔ روہیل کھنڈ میں
" پوسا" یا " پوسا جی" بھولے بھالے شخص کے لئے مستعمل ہے۔
اردو میں " بڈھا پھوس" یا " بڈھا پھونس" بھی بولا جاتا ہے سفید
بالوں اور پھوس (پھونس) کو پیری سے نسبت ہے یا پشتو کے
" پوس" سے ؛ یہ بات غور طلب ہے، کیونکہ عمر طبعی کو پہنچنے والے
عقل کی کمی کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ چنانچہ اردو کے ایک اور محاورہ
سے اس کا اشارہ ملتا ہے ـــــ یعنی " سترا بہترا" (۷۰ سالہ
آدمی بہکا ہوا ہوتا ہے)۔

پشتو لفظ ہے خور (بہن) اس کی جمع ہے " خورے"
مولانا کا خیال ہے کہ رامپور والیاں " اوئی خوارسے" (اے بہن)
بولتی ہیں تو یہ بھی پشتو ہی کا اثر ہے۔ یہ صحیح ہے مگر کیا خور کو فارسی
کی خواہر کا روپ نہیں سمجھا جا سکتا ؟

پشتو میں پردہ " پڑدہ" ہے مرد " مڑد" اور ورد " وڑد"
ہے۔ رامپور میں بھی یہی " ڑ"[1] عرصہ تک زبان زد رہی مگر اب " ڑ"
" ر" سے بدل چکی ہے " مرد" کو شاید تحقیراً یا بطور اسم تصغیر، دلّی
والیاں " مردوا" بھی کہتی ہیں۔ میں سوچتا ہوں " ر" کی یہ آواز
اور بات بات پر " اوئی" کہنا کس بات کی غمازی کرتے ہیں " اوئی"
کو " اوے" " وی" اور " وی دُمی" سے کیا نسبت ہے ؟
غور کیجئے۔

" پیزوان" ناک کی نتھ ہے۔ رامپور میں مستورات بولتی
ہیں " تم نے تو اس کو میری ناک کا پیزوان بنا لیا" یعنی بار بار کسی
بات کا دہرانا یا چیز کا مانگنا۔ پشتو کا " پیغور" (طعن و تشنیع) رامپور
میں " طعن پیغور" یا " طعنے پیغورے" ہے۔ فارسی میں " پیغارہ"
یہی معنی رکھتا ہے (غالب: " دکانِ ہر بت پیغارہ جو زنجیر رسوائی")
ماتھے کو پشتو میں " تندے" کہتے ہیں روہیل کھنڈ میں کھوپڑی
کو " تندہی" کہتے ہیں)۔ تمبل پشتو میں عربی " دف" کا مترادف ہے۔
جس کے معنی طبل کے ہیں۔ یہ پٹھانوں کا قومی ساز ہے جس پر
چار بیت گائے جاتے ہیں۔ روہیل کھنڈ، بھوپال، اور ٹونک
وغیرہ افغانی بستیوں میں یہ لفظ پٹھانوں کے ساتھ آیا۔ اور یہاں
یہ ساز اب بھی بجایا جاتا ہے۔

ننھے بچے کو پشتو میں " تنکے" کہتے ہیں۔ رامپور میں،
عورتیں طنزاً کہتی ہیں۔ " جی ہاں، تم ہو بھی تنکئی یا ننھی تنکئی
جو اتنی بات بھی نہیں سمجھتیں"۔ خبر نہیں " تنک" یا اردو کے
" تنکے" سے اس کا کوئی تعلق ہے یا نہیں۔ ؟

دلّی میں عورتیں " تورا" بمعنی طنطنہ اور غصہ بولتی
ہیں۔ پشتو میں یہ " تور" (بہ واؤ مجہول) ہے یعنی اندھیرا

---

[1] : " ڑ" سفر کرتا ہوا لاہور اور پھر وہاں سے رامپور پہنچا ہے
رفیق خاور صاحب (نگران ماہ نو) نے لکھ دیا ہے کہ خاص
لاہور کے لوگ اب بھی ر کو ڑ ہی بولتے ہیں۔ اور لاہور کو
پرانے تلفظ لہور کے مطابق " لہوڑ" ہی کہتے ہیں۔ (ط۔ق)

خوف و دہشت، بہتان۔ دونوں لفظوں کے معنوں اور بناوٹ میں باہمی یہی دین کا ایک رنگ دیکھئے۔

"قلب میں جسم کے اس داغ کو جو بوجہ سودا و بیت پیدا ہو جاتے "چتّہ" کہتے ہیں۔ (چتّہ "بہتان" بھی ہوتا ہے اور اس میں بھی داغ والزام کا شائبہ نظر آتا ہے) پشتو میں یہی لفظ "چپّہ" یا "چپے" ہے بمعنی وہی دفورِ غم سے پیدا ہونے والے داغ۔

میں نے دلّی والیوں کو کہتے سنا ہے "غڑاپ سے مٹکے میں ہاتھ ڈال دیا"۔ اس کی اصلیت کا کچھ پتہ نہ تھا مگر اب معلوم ہوا کہ یہ بھی پشتو کی دین ہے۔ پانی میں ڈوبنے یا غرق ہونے کی آواز وہاں "غڑاوپ" ہے!

"امام" اردو میں تسبیح کے سب سے بڑے دانے کو بھی کہتے ہیں مگر ایرانی فارسی میں یہ معنی نہیں[1]۔ مگر پشتو میں ضرور ہیں اس لئے معلوم ہوا کہ سبحہ شماری کے "امام" خالص پختون الاصل ہیں۔

"اوہی" یا "اوئی" ہماری عورتوں کی عام بول چال یا تکیۂ کلام ہے۔ مگر صرف مسلمان عورتوں کی حد تک۔ اس لئے یہ ضرور ادھر ہی سے آیا ہوگا۔ ہندی میں اس کی اصل تلاش کرنا عبث ہے۔ پنجاب میں مرد اور عورتیں دونوں ہی، لہجہ کے تغیّر کے ساتھ، انہیں بولتے ہیں۔ مگر آگے بڑھیئے تو پشتونی علاقے میں اس لفظ کی جڑیں نظر آئیں گی۔

پشتو میں "گڈی" یا "کنکرے" (پتنگ) کے لئے "بادہوا" کا لفظ مروج ہے۔ اردو میں بے سرو پا بات کے لئے "بادہوائی" بولتے ہیں۔ دونوں کا بے بنیاد ہونا ظاہر ہے۔ محاورتاً انگریزی میں "کائیٹ فلائنگ" بادہوائی کے محل پر بولا جاتا ہے۔

میری والدہ (مرحومہ) بولتی تھیں "تم تو میرے حلق کے داروغہ ہو گئے ہو"۔ یہی بات رامپور والیاں اس طرح کہتی ہیں "تم تو میرے حلق کے دمدانچی ہو"۔ یہ لفظ بھی فارسی الاصل نہیں، اس لئے سوائے پشتو کے اور کس کا دَین ہو سکتا ہے؟ مولانا عرشی نے ایک اور لفظ "برہنڈ" کو بھی پشتو میں تلاش کیا ہے۔ جس کے معنی ننگا یا بے شرم ہیں۔ مگر لکھنؤ میں گڑبڑ مچانے کو کہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ "بھنڈ" سے مشتق ہے کیونکہ "بھنڈ" ہندی میں خراب و برباد کر دینے کے معنی میں آتا ہے۔ دلّی میں میرے بچپن تک بچوں کا عام محاورہ تھا۔ "اس نے آکر ہمارا کھیل "بھنڈا" کر دیا"۔ شیشے کی گولیاں کھیلنے میں جب دو گولیاں ٹکرا کر "بِل" میں آن گریں تو یہ تصادم بھی "بھنڈ ہونا" کہلاتا ہے ــــ اب ایک سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ اگر یہ "بھنڈ" سے رشتہ نہیں رکھتا تو "برہم" (درہم برہم) سے کوئی رشتہ رکھتا ہے!)

"بعضا" کے بارے میں مولانا نے لکھا ہے "بعضا آدمی" اردو میں مستعمل ہے۔ اور عورت کے لئے "بعضے عورت" کہا جاتا ہے۔ مگر میرا خیال ہے ہمارے ہاں دلّی میں "بعضی عورت" ہی بولا جاتا تھا۔ لیکن کس قدر تعجب کی بات ہے پشتو میں بعض۔ بعضا۔ اور بعضے تینوں ہی شکلیں موجود ہیں۔ شاید دلّی پر افاغنہ کے طویل اثرات نے یہ تینوں لفظ اردو کو دے دیئے ہوں۔

ایک عجیب لفظ ہے "بگلولو"۔ مولانا کہتے ہیں کہ دلّی والے اسے بطور گالی برتتے ہیں۔ پلاٹس اسے "بگلے کے بچے" کے معنوں میں بتاتا ہے۔ مگر پشتو میں یہ وہی چیز ہے۔ جسے ہم لوگ "ہوّا" کہتے ہیں یعنی وہ عورت جو ڈراؤنا بھیس بدل کر بچوں کو ڈرائے۔ لال قلعہ اور دلّی میں اب تک صرف "لولو" بولا جاتا ہے۔ یعنی چڑانے یا غصّہ دلانے کے لئے ایک حرفِ تحقیر تھا (لال قلعے کے اس انگریز قلعدار کا واقعہ دیکھئے جسے سلاطین زادوں نے "لولو ہے بے!" کہہ کر چھیڑا تھا اور اُس نے طمنچہ نکال لیا تھا! اور پھر بہادر شاہ سے بھی جا کر شکایت کی تھی۔ یہ واقعہ غدر سے ایک سال پہلے کا بیان کیا جاتا ہے۔ اور لاہوری دروازے کے دمدمے کے عین سامنے ہوا تھا۔)

"پراچہ" کو مولانا نے پشتو لفظ بتایا ہے یعنی بزاز۔ مگر میرا خیال ہے یہ پشتو، پنجابی اور اردو میں یکساں موجود ہے۔ ہندو بزازوں کو پراچہ نہیں کہتے۔ پراچہ صرف مسلمان پارچہ فروش ہیں، بلکہ ایک قوم ہے جن کا آبائی پیشہ پارچہ فروشی ہے۔ یہ لوگ لاہور۔ دلّی۔ لکھنؤ وغیرہ میں بکثرت آباد ہیں[2]۔

---

[1] غالباً امام ہندی فارسی ہے اور اس کا رواج استعارۃً ہوا یعنی تسبیح کے دانوں کا "امام"۔ غالب کہتے ہیں:
"چوں امام سبحہ بیروں از شمار افتادہ ام" (مدیر)

[2] راولپنڈی میں پراچے عام ہیں اور ایک محلہ بھی ان کے نام سے منسوب ہے۔

"پستہ قد" کو امیر مینائی "پست قد" کا بگاڑ بتلاتے ہیں۔ مگر پشتو والوں کا یہ دعویٰ زیادہ صحیح ہے کہ انہوں نے "ہ" (ہائے ہوز) پر ختم ہونے والے الفاظ کو تانیث کا درجہ دیا ہے۔ (یہ قاعدہ عربی) اور یہ بھی ان ہی میں سے ہے مگر اردو والوں نے پست قد عورت اور مرد دونوں کے لئے اسے استعمال کرنا شروع کر دیا۔

"پلنگ" فارسی کا لفظ نہیں۔ ہندی کا بھی نہیں۔ صرف مسلمان گھروں میں برتا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ آیا کہاں سے؟ میرا خیال ہے کہ جہاں سے "پیالی" آئی ہے وہیں سے آیا ہے کیونکہ "پیالہ" کو "پیالی" (پیالئی : پشتو) بنانا افاغنہ کی ہی خاص کاریگری ہے۔ مگر اردو والوں کو اس پر "تاؤ کھانے" کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ "تاؤ کھانا" بھی پختونی "تاؤ خوڑل" (تاؤ کھانا) ہے! اسی طرح "تکرار کرنا" بھی پشتو ہے۔ "تکرار کول"۔ گو تکرار کی اصل عربی ہے۔ مگر زبانی ردّ و کد میں بھی ایک بات بار بار دہرائی جاتی ہے ذرا اچھا خاصا جھگڑا ہو جاتا ہے۔

"ٹس سے مس" نہ ہونا محاورۂ اردو ہے۔ مگر آیا ہے ملک پار سے کیونکہ وہاں کند ذہن اور افسردہ و بے حس آدمی کو "ٹس مس" کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں "ٹھس" بھی ایسے ہی آدمی کو کہتے ہیں جو سست ہو۔ "ٹھس" کو "ٹھسّے" میں بھی پہچانئے۔ بس کو غرورِ حسن کی ایک تصویر یا کیفیت کہہ سکتے ہیں۔ "مس" کو "مانس" یا "مانش" (آدمی) میں تلاش کیجئے ۔ اب غور کیجئے :۔

ٹس مس (ٹھس مانش یا سست و کاہل وجود آدمی)۔

لفظ "مانس"، "مانش" کو بھی آریائی اور کیلٹی زبانوں میں جھلکتا دیکھئے ۔ "مان" (جرمن) "مین" (انگریزی، وغیرہ) پھر یہی سنسکرت میں "منش" ہے تو سندھی میں "مانڑو" ہے)۔

"جاگیر" اور "جاگیر دار" بھی فارسی الاصل نہیں اس لئے ازراہ افغان حکمرانوں کے ساتھ وارد ہند ہونے والے الفاظ میں شامل کیجئے۔ ایران میں دونوں کا وجود نہیں۔

لفظ "جرّار" بمعنی "دلیر" فارسی میں مستعمل نہیں "لشکرِ جرار" بے شک ہے مگر دلیری کے مفہوم میں نہیں بلکہ لمبی لین ڈوری والے لشکر کے لئے ہے لیکن دلیر کے معنی میں جرّار کا لفظ پشتو والوں ہی کا تصرف ہے۔ خود میں نے صدر پاکستان کے منہ سے یہ لفظ ایک جلسۂ عام میں سنا تھا۔ جس میں وہ اپنے بچپن میں قرآن شریف کی تعلیم حاصل کرنے کا ذکر کر رہے تھے اور اس سلسلے میں کہنے لگے کہ میرے والد بڑے جرّار آدمی تھے" وغیرہ۔ ممکن ہے "جری" نے "جرّار" کی صورت اختیار کی ہو۔ یا اس کا عربی لفظ "جر" (کھینچنا) سے کچھ رشتہ ہو۔

"جمال گوٹہ" مشہور دوا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ لفظ "گوٹا" پشتو ہے کیونکہ پشتو میں حب یا گولی یا دانہ کو "گوٹہ" کہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ سنسکرت "گٹکا" (گولی) سے ماخوذ ہے۔ اسی سے گٹلی بنا ہے۔ اردو میں گٹہ چھوٹے کنکر یا ٹھیکری کو بھی کہتے ہیں اس ٹھیکری کو جو چلم میں تمباکو کے نیچے رکھی جائے۔ مجازاً پستہ قد، بھی گٹہ کہلاتا ہے۔

"گوٹہ" بھوپال، رامپور، لکھنؤ، اور دہلی میں سپاری، بریاں دھنیئے، مغزیات وغیرہ کے ایک ملغوبے کو بھی کہتے ہیں جو پان کی جگہ کھایا جاتا ہے۔ گٹکہ پان کا ایک مرکب بھی ہے۔ یاد رہے کہ یہ سب چیزیں وہیں زیادہ بنتی اور بولی جاتی ہیں۔ جہاں افاغنہ اس وقت بھی زیادہ آباد ہیں۔ محرم میں گوٹہ کا رواج خاص طور پر زیادہ ہوتا تھا کیونکہ پان خوری نہیں ہو سکتی۔ اسی گوٹہ کو خاص قسم کی شیشے کی "جامدانیوں" میں بھر کر بطور تحفہ بھی بھیجا جاتا ہے۔

لفظ "جنبہ" داری بمعنی جانبداری اردو اور پشتو میں یکساں طور و تلفظ کے ساتھ موجود ہے۔ اس کی اصل "جنب" یا "جنبہ" ہے۔ یعنی پہلو۔ (اس سے "جنبیہ" بنا یعنی وہ چھری جو پہلو میں چھپا کر رکھی جاتی ہے۔ بر خلاف "پیش قبض" جو سامنے کمر بند یا پٹکے میں اڑسا جاتا تھا۔ (حیدر آباد، دکن میں چاؤشوں کا معروف ہتھیار یہی "جنبیہ" تھا۔ رام پور میں چاقو سازی کی صنعت اوج پر ہے۔ کیوں؟)

"چپڑ قناتی" تو آپ نے دیکھے ہی ہوں گے آئیے۔ اس کی بھی تحقیق کر لیں۔ میرے خیال میں چپڑ یا چپڑ چپڑ تو چاٹنے کی آواز ہے اور "قنات" پشتو میں مٹھائی کے لئے بولا جاتا ہے۔ تو چاپلوسی اور خوشامدی کے لئے ایک لفظ بنا "چپڑ قناتی"، بالکل اسی طرح جس طرح "لب چش" تھا یعنی زلہ ربا۔ مراد و مجاز میں معنی وہی رہے۔ یعنی "لب چش"، "لب چشنا" پھر بگڑ کر "لب جھنا"

اور "بسترِ چھٹا" بھی بنا۔ اب لفظ قنات کی تحقیق رہی۔ "قنات" کو اگر جمع تصور کر لیا جائے تو صرف "قن" رہ جاتا ہے۔ ممکن ہے کثرتِ استعمال یا سہولتِ گفتار میں "قند" کی دال نوشِ جاں ہوگئی ہو! قند = عربی۔ "کین" اور "کینڈی" مٹھائی = انگریزی) "کھانڈ"[1] اردو، پنجابی وغیرہ)۔ ان سب کا سرچشمہ ایک ہی معلوم ہوتا ہے۔ (اس وقت بھی مردان (سابق صوبۂ سرحد) میں ایشیاء کا سب سے بڑا کارخانہ شکر سازی موجود ہے اور پشاوری گڑ اور گنا تو اپنے رس اور پاکیزہ شیرینی کی وجہ سے دور دور مشہور ہے)۔

"خال خال" فارسی میں بمعنی شاذ یا کہیں کہیں کے معنوں میں نہیں بولا جاتا۔ مگر پشتو اور اردو میں بعینہٖ یکساں ہے۔ اسے بھی پشتو کا مال سمجھنا چاہیئے۔

مولانا نے صحیح ارشاد فرمایا کہ "خ" کے ساتھ ڑ یا ڈ یا ٹ کا استعمال پشتو کا اثر ہے مثلاً ٹٹ خار۔ چرخ چوں۔ چٹاخ پٹاخ۔ وغیرہ الفاظ میں خ کے ساتھ ایسی آوازوں کا اجتماع جو ترکی وفارسی میں نہیں ہیں، سب پشتو کا اثر کہلائے گی۔

اب لفظ "جُورا" کو لیجئے جو "جورو" کا مصغر ہے — انشاء اللہ خان انشاء کی شہادت ہے کہ یہ لفظ دہلی کے افغانوں کی مخصوص اصطلاح ہے۔ دلی، رامپور وغیرہ میں اب بھی رائج ہے گو یہ رواج اب کم ہوگیا ہے۔ (الفاظ اپنا چلن اور معنی بدلتے ہی رہتے ہیں۔ جیسے عربی فارسی، میں خصم، دشمن یا مدمقابل تھا۔ پشتو اور اردو میں شوہر ہوگیا۔ اسی طرح غور کیجئے کہ سن ستاون سے پہلے "رنڈی" صرف عام عورت تھی (لال قلعے کی جھلکیاں" ناصر نذیر فراق دہلوی) "ایک دن وہ رنڈی پھر مجھ سے ملنے آئی" (بزبان ملکہ زمانی بیگم) ۔ اب رنڈی کا لفظ طوائف کے لئے برتا جانے لگا۔ معلوم نہیں کیوں؟ ۔ اسی طرح سینکڑوں لفظ خاص خاص کوائف یا اشیاء سے متعلق ہو کر مخصوص معنیٰ کے حامل ہو جاتے ہیں جیسے "قرطاسِ ابیض"۔ "گول میز" (کانفرنس) "بلوٹک"۔ "ہنسرڈ" "HANSARD" "درنجف"، "زمزمی"، وغیرہ)۔ بعض شہروں کی روایات بھی محاورہ عطا کرتی ہیں مثلاً دلی ہی کے بعض محاورے اب کم سننے میں آتے ہیں اس لئے یہاں لکھ دیتا ہوں تاکہ سند رہیں اور بوقت ضرورت کام آئیں: جیسے شرمنہی صاحب جان سبزہ کا تکیہ، بادشاہ زادوں کا تعزیہ، قطب صاحب کی خنجویاں بچھرا پلٹن، "یتیم کی چوٹی" وغیرہ۔

"سادہ سُودہ" میں "سُودہ" خالص پشتو لفظ ہے جس کے معنی بھی سادہ ہی کے ہیں اسے "سیدھا" کا بھی پر تو کہا جا سکتا ہے۔

کُرتہ افغانیوں میں بہت کافی پہنا جاتا ہے۔ اُن کا لباس پنجاب کی راہ سے دلّی تک پہنچا اور وہاں سے یوپی کے اضلاع کی طرف اس کا کوچ ہوا۔ جب یہ لباس بنگالہ تک پہنچا تو اس ڈھیلے ڈھالے پیراہن کو "پنجابی" کا خطاب ملا! — اس کا قماش (کپڑا) اور تراش، ایرانی الاصل نہیں کیونکہ وہاں یہ پیراہن ہے یا قمیص ہے اس کا مصغر "کُرتی" ہے۔ انگیہ کرتی بھی اسی کا روپ ہے۔ "انگیہ" انگ (بدن) کی ایک خاص پوشش ہوگیا۔ "انگ رکھا" (محافظ بدن، لباس) "انگرکھا" ہوگیا۔ پہلے مستورات کا ایک لباس انگیہ کُرتی بھی تھا۔ وہ "مُحرم" کو انگیہ نہیں کہتی تھیں بلکہ "چھوٹا کپڑا" ہی کہتی تھیں۔ اگر کسی مختصر جامہ یا پارچہ کو کوئی آدمی "چھوٹا کپڑا" کہہ دیتا تو دلّی میں اسے صاف گنوار مان لیا جاتا تھا!) اسی طرح قدیم اطبائے دہلی سوائے فزرجہ کے کسی اور دوا کے لئے "استعمال" کرنے کا لفظ نہیں بولتے تھے۔ یہ بھی ان کی اداتھی اور لفظ کے مخصوص "استعمال" سے پردہ مراد تھا۔ دواؤں کے یونانی گھولوے کو "ٹھنڈائی" بھی دلّی والوں کی زبان پر تھا کیونکہ اکثر وہ دوا برائے تبرید ہی ہوتی تھی۔ یوں "ٹھنڈائی" بھنگ کا مشروب بھی ہے۔

دلّی میں مرغیوں کو بھگانے کے لئے عورتیں بولتی تھیں: "کُڑی کُڑی"! معلوم ہوا کہ یہ لفظ بھی پشتو ہے۔ کیونکہ وہاں "کُڑکہ" کڑک مرغی کو کہتے ہیں اور "کڑکڑی" "کڑک" مرغی کی کڑکڑ کی آواز ہے۔

اردو میں غ اور ٹ وغیرہ کا اجماع بھی پشتو ہی کا اثر ہے مثلاً۔ غپ شپ، غٹرغوں، غٹاغٹ یا غٹ غٹ۔ غچ [illegible] غچلی، غنڈہ وغیرہ۔ مگر غپ یا گپ کے بارے میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ گپ سنسکرت کا گلپ ہے۔ گلپ سے مراد کہانی، قصہ،

---

[1] ملاحظہ ہو سید احمد علی صاحب کا مضمون "میٹھی باتیں" (مطبوعہ "ماہِ نو" جون ۱۹۶۱ء)

حدیثِ دیگراں یا گندی ری ہوئی بات وغیرہ کے ہیں۔ غور کیجئے یہی لفظ پنجابی میں "گل" (یا "گل بات") کی شکل میں وارد ہوا ہے — یہی سندھی میں "گالہہ" ہے۔

"غنڈہ" پشتو لفظ ہے اور گولی خاص کر افیم کے آنٹے کے لئے مستعمل ہے۔ دکن میں یہی لفظ گٹھہ کاغذ کا پلندا) بن گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ گٹھ یا تو "گٹھا" (گھانس وغیرہ) سے لیا گیا ہے یا "گٹھ" (اجماع) سے ہے۔ یہی گڈی، گڈ (کاغذوں کا مجموعہ یا مٹھا) بنا ہے۔ گڈی (اسم تصغیر)۔ دلّی میں گیند جیسے گول مٹول آدمی کو "غنڈہ" بھی کہتے ہیں۔ اگر غ کو گ سے بدل کر گٹھ بنایا گیا ہے تو کئی گول چیزیں اس ذیل میں آجاتی ہیں جیسے تاگے کا موٹا ریل REEL جس گول چرخی پر چڑھا ہو گِٹا (تصغیر گِٹی) کہلاتا ہے بہت سے لفظ اصطلاحی معنوں میں عجیب مفہوم پیدا کرتے ہیں جیسے "ٹھیکرے کا رشتہ" اور "توے کا ہنسنا" یا لفظ "چغل"۔

پشتو کا ایک لفظ ہے "کلما" جس کے معنی آنت یا انتڑی ہے۔ "فرہنگ آصفیہ" میں اسے "دُلمہ" کا مرادف بتایا گیا ہے۔ خود پشتو میں بھی قیمہ بھری آنت کے لئے مستعمل ہے مگر میری دانست میں "دُلمہ" کھانا اور لفظ دونوں ترکی ہیں۔ دُلمہ صرف قیمہ بھری آنتیں (انگریزی — SAUSAGE) ہی نہیں ہوتیں بلکہ بہت سی ترکاریوں کا بھی دلمہ بنتا ہے مثلاً کریلا، بیگن، وغیرہ۔ "کلما" پر غور کرتے وقت لفظ "امعا" پر بھی نظر رکھنی چاہیئے۔ کیونکہ وہ بھی آنت ہے۔ صوتی اور معنوی تلازمے غور طلب ہیں۔

"کل کلاں" اردو کا عام لفظ ہے۔ اس کا پہلا جزو تو خیر خالص اردو ہے مگر سوال یہ ہے کہ کلاں کہاں سے آیا۔ سنیئے یہ بھی پشتو کا اثر ہے۔ وہاں بولتے ہیں:۔ "کلَہ، کلَہ" جس کے معنی ہیں کبھی نہ کبھی، جب تک، کسی نہ کسی وقت۔

کونڈا اور کونڈی بھی اردو کے عام لفظ ہیں۔ بعض جگہ اسے "کنڈیلی" اور "کنڈالی" بھی بولتے ہیں۔ مولانا کی تحقیق میں یہ پشتو لفظ "کنڈولے" ہے۔ میرے خیال میں یہ "کنڈ" (تالاب) سے نکلا ہے۔ صوتی اور معنوی پیر تو صاف ظاہر ہے ایک محلِ آب ہے، دوسرا ظرفِ آب، اور دونوں مدوّر۔

"گڈمڈ" پشتو میں "گڈوڈ" ہے۔ اس میں "وڈ" محض تابع مہمل ہے۔ "گڑبڑ" کو گھٹ بڑھ "اسے نہیں" گڈمڈ" (اختلاط) کے رشتے سے دیکھنا چاہیئے۔ لفظ "گرگا" کے بارے میں مولانا کا خیال ہے کہ وہ دہلی میں چیلا یا شاگرد ہے اور لکھنؤ میں بدکار و بدوضع کے معنی میں ہے۔ پشتو میں یہ "گرگے" ہے جو اردو میں "گرگا" بن گیا ہے لیکن برے معنوں میں ہی برتا جاتا ہے۔ (مکاری کا مفہوم "گرگ" سے رشتہ رکھتا ہے نہ کہ گرگے سے۔ گرگ کے ساتھ مکاری کا مفہوم ہمیشہ مراد رہا ہے۔ دیکھئے "گرگ باراں دیدہ" اور "گرگ آشتی" (مولانا محمد حسین آزاد: ایران کے چار موسم)

لفظ "گنڈیری" پشتو میں "گنڈھیری" ہے۔ ممکن ہے اس کی اصل ہندی ہو کیونکہ وہاں "گنڈا" پور یا ٹکڑا ہے۔ خاص کر گرہ دار جزو یا اس کی شکل کی کوئی اور شے۔ خرِ دار کو بھی گنڈہ کہا جاتا تھا۔ گنڈہ گرہ دار تاگہ بطور حرز، نیز دیکھئے "گنڈے دار" یعنی ایک زیچ کر کے، چھوڑ چھوڑ کر کا مفہوم اس ہی سے نکالا گیا ہے۔ بہرنوع۔ خلل۔ رخنہ، اور فصل و حصص کا مفہوم اس سے جدا نہیں ہوتا۔

"لپ جھپ" اردو ہے۔ پشتو میں یہی "لاپ تاپ" ہے۔ دلّی والیاں "لپڑ تپڑ" (جلدی جلدی) بھی بولتی ہیں۔ "لت پت" کا بھی یہی حال ہے۔ "لت" تو لات ہے ہی۔ پت کیا چیز ہے؟ خیر، پشتو میں "لت پت کول" عام روزمرہ ہے۔

دلّی اور یوپی کی زنانہ بولی میں "مبارکی" دینا عام ہے۔ ظاہر ہے کہ "مبارکی" فارسی کا لفظ تو ہے نہیں۔ اس لئے پشتو ہی میں اس کا بھی سراغ لگانا چاہیئے۔ چنانچہ وہاں ہمیں "مبارکی ورکول" مبارک باد دینا) موجود ہے۔

پشتو میں "مرغی" نر ہے اور "مرغہ" مادہ ہے۔ اسے فارسی کے "مرغ" (پرندے) کوئی علاقہ نہیں۔ ہم نے یہ مرغا اور مرغی پختونوں سے لی ہے۔

"مہین" باریک آٹا یا آواز ہے۔ عربی میں "کمزور" کے معنی میں ہے۔ پشتو میں بھی صرف باریک سوتی کپڑا ہے کمزوری اور ناتوانی بہرحال مراداً مفہوم ہے اس لفظ کے

سلسلے میں لفظ "ویں" پر بھی نظر رکھتی چاہئے جس سے "ہینا" (کرمود) بتایا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کی "ہ" یا "و" "ج" سے بھی بدلی ہے اور وہ "جھینا" ہوگیا ہے۔ اور اطرافِ بمبئی، گجرات وغیرہ میں چھوٹے، کمزور، جھینا ناتواں کے لئے عام لفظ ہے۔ اُردو میں بوسیدہ و تار تار کپڑے کو "جھننا" کپڑا کہا جاتا ہے۔ بوسیدگی و کہنگی کے لئے انہیں اطراف کے لفظ "جڑنا" یا "جھونا" پر بھی غور کیجئے، مثلاً پہلانے کے لئے جُونا یا جھونا کراچی وغیرہ میں عام ہے۔ ژولیدہ بالوں کو دلّی والیاں "جُونا سے بال" کہا کرتی تھیں، کیوں؟ پھر بالوں کا جُونا بھی ہوتا ہے۔ غرض پھانے پن، تار تار، اور ناتواں و بوسیدہ کا تصوّر ضرور موجود ہے۔

لفظ میاں ہندی نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ صرف مسلمانوں کے لئے مستعمل ہے (شاذ غیر مسلموں کے لئے بطور لقب کسی جگہ برتا جاتا ہو) فارسی، ترکی و عربی میں اس لفظ کا وجود ہی نہیں اس لئے لامحالہ ہمیں اس لفظ کے لئے بھی پشتو کی طرف دیکھنا پڑیگا۔ وہاں یہ لفظ موجود ہے۔ مگر صرف "میا" ہے۔ اسی طرح لفظ "لالا" ہے جو شمال مغربِ برصغیر میں "بڑے بھائی" کے مفہوم میں ہے۔ یا حرفِ تکریم کے طور پر بولا جاتا ہے مگر ہندوستان کے اضلاع یوپی، دہلی وغیرہ میں صرف چند ہندو اقوام کے لئے مختص ہے۔ ممکن ہے افاغنہ نے اپنے آپ کو میاں کہا ہو اور انہیں لالہ کا خطاب دے کر دلداری کی ہو۔ (رامپور میں "لالہ" مسلمانوں میں بھی عام تھا)۔

"یاخدایا" میں حرفِ ندا کی تکرار پشتو کے "یا خدائی" کی آواز بازگشت ہے۔ گو اردو میں ثقاہت کی زبان پر نہیں۔ مگر سنا آپ نے ضرور ہوگا۔ عوام الفاظ کی بڑی حفاظت کرتے ہیں، مثلاً "کنے" (پاس) (جو پنجابی میں "کول" ہوگیا) متروک قرار پایا مگر دلّی میں اب تک عوام بولتے رہے۔ بلکہ بولتے ہیں۔ یوں دلّی دکنی وغیرہ کے ہاں یہ لفظ عام ہے۔ اسی طرح لفظ "کَنْ" بمعنی طاقت و توانائی اب متروک ہوگیا۔ حالانکہ دلّی میں شرفا کی زبان پر نہ سہی مگر بہت سے عوام کی زبان پر تھا۔

"یارانہ" اور "دوستانہ" بمعنی دوستی و آشنائی فارسی میں موجود نہیں۔ ہاں افغان ان معنوں میں ضرور استعمال کرتے ہیں۔ ہم نے یہ لفظ اپنی دوستوں سے لیا ہے، اس کا بڑا ثبوت یہی ہے کہ جہاں افغانی نسل کے لوگ زیادہ آباد ہیں یہ لفظ بھی وہیں زیادہ بولے جاتے ہیں۔

غرض الفاظ کی فہرست تو کافی لمبی چوڑی ہے اور مولانا کی تحقیق و نگاہ کی داد نہیں دی جاسکتی، مگر ان صفحات میں سب پر گفتگو بھی نہیں کی جاسکتی اور نہ سب الفاظ اور ان کی لم بحث انگیز ہی ہے۔ لیکن یہاں الفاظ کے ساتھ کچھ پختونی کہاوتیں بھی درج کر دی جائیں تو بہتر ہوگا۔ پشتو اور اردو کی چند مشترک کہاوتیں یہاں بیان کی جاتی ہیں:۔

۱۔ "دیکھو اونٹ کس کل بیٹھتا ہے"۔ گورو چہ اوبن پہ کوم اړخ خملی

اونٹ ہی کا ایک اور محاورہ ہے "اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی؟" اوبنَ اوبنَ، څہ دِ سم شو پاتی سُوخہ

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اردو میں اونٹ پر اچھے خاصے محاورے کہاں سے آئے جب کہ اردو کے گہوارے دوآبۂ گنگ جمن میں یہ حیوان اتنا عام نہیں!

۲۔ "بیکار سے بیگار بھلی"۔ لہ وزگارے نہ بیگار ښہ دے۔

۳۔ "تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے"۔ پشتو میں اس کی گونج ہے "پرق (یاتپ) لہ دوارہ لاسہ خیژی"

۴۔ گدھے کو باپ بنانا اور کام نکال لینا:۔

"خر پلار کرہ، حاجت پو بار کرہ"۔

۵۔ "چراغ تلے اندھیرا"۔ دَدِیوے دَ کونے لاندِ تیارہ وِی۔

۶۔ "دودھ کا جلا چھاج کو پھونک پھونک کر پیتا ہے"۔

(پشتو) پہ شودو سوی وہ، ماستو لہ ہم پو کلی

۷۔ "جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں" "چہ غوریزی، نہ وریزی"

۸۔ "یہ منہ کا نوالہ نہیں" دَخولے نوری خونہ دہ

یہ کہنا تو قطعی زبردستی ہوگا کہ پشتو والے یہ محاورے یا ضرب الامثال ہم سے لے جاکر اپنے ہاں بولنے لگے کیونکہ صاف ظاہر ہے کہ نقل آبادی کی ایک ہزار سالہ روایت پہاڑوں سے میدانوں کی طرف ہوتی رہی ہے۔ نہ کہ اس کے برعکس؛ بلکہ راورٹی کے قول کے مطابق اب تو افغانستان اور اس کے نواح میں بھی بعض افغان قبائل کا سراغ نہیں ملتا، اگر ملتا ہے تو برصغیر کے شمال یا مغربی اطراف میں۔

باقی ص۵۲ پر

"نقشِ سلیمانی"

(قدیم سندھی رسم خط کی روشنی میں)

ابوالجلال ندوی

عام طور پر خیال کر لیا گیا ہے وادی سندھ کا رسم خط اپنا کوئی وارث چھوڑے بغیر عالم فنا کو سدھار گیا تھا۔ اس خیال کے غلط ہونے کی ایک دلیل "نقشِ سلیمانی" بھی ہے۔ سات نقوش کی ایک تحریر کی بابت یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ایک اسم الٰہی، اور ایک مقدس حرز ہے، اور اشخاص و اشیاء کو ہر بلا سے محفوظ رکھنے والا نقش ہے۔ اس کو نہ معلوم کیوں "نقشِ سلیمانی" کا نام دے دیا گیا۔

۱۹۴۹ء یا ۱۹۵۰ء میں علی گڈھ کالج کی زیارت نصیب ہوئی، مولینا عبدالعزیز میمن کی بدولت کتب خانہ علی گڈھ کے بعض نوادر بھی دیکھے۔ ایک قلمی نسخۂ قاموس کے سرورق پر حسب ذیل نقوش بھی نظر آئے :-

6 Ψ IIII ⊟ ⌐○ Π ✡
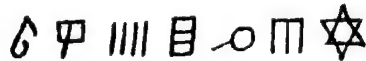
نقش سلیمانی اسی کا نام ہے۔ اس کے پہلے نقش کے ماسوا باقی چھوں نقوش سندھی مہروں پر آپ کو ملیں گے۔ شاید کسی مہر پر پہلا نقش بھی مل جائے۔ یہ نقوش اصحابِ حرز و عزائم کے نزدیک جو مطلب یا آواز ادا کرتے ہوں ضرور نہیں کہ سندھی مہروں پر بھی وہی مطلب یا آواز ادا کرتے ہوں لیکن ان نقوش کا سندھی مہروں پر ہو بہو ملنا ایک ایسی بات ہے جس سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔

چونکہ یہ نقوش سندھی قدیم کے نقوش ہیں اس لئے علی گڈھ سے مدراس لوٹنے کے بعد مجھے دعا تعویذ کی کتابوں کی تلاش ہوئی تاکہ ان نقوش کے معانی بالتلفظ معلوم کر سکوں۔ ایک دوست نے "مجربات الشیخ" احمد الدیربی مطبوعہ مصر ۱۹۲۶ء عطا کی۔ جناب غلام محمود صاحب بن رحمۃ اللہ (جام بازار۔ مدراس) نے شیخ شہاب احمد بن عبداللطیف الشرجی الحنفی کی کتاب "الفوائد والصلات والعوائد" مخطوطہ ۱۲۵۰ھ عطا فرمائی۔ دیربی اور شرجی دونوں بزرگوں سے میں ناواقف ہوں اور ان کی بابت تحقیق بھی ضروری نہیں خیال کی۔

دیربی نے اس نقش کو اشکالِ سبعہ کا مجموعہ بتایا ہے لیکن ناسخ نے ساتویں نقش کو چھوڑ دیا ہے اور اس کو یوں نقل کیا ہے :

✡ ااام H IIII ـــــہ

اس کے بارے میں چند اشعار نقل کئے ہیں جن کو امیر المومنین حضرت علیؓ ابن ابی طالب کی طرف منسوب کیا ہے لیکن اشعار کی زبان اسے کسی ایسے ہندی نژاد علیؓ بن ابی طالب کے اشعار بتاتی ہے جو عربی سے کافی آشنا نہ تھا۔ وہ اشعار حسب ذیل ہیں :

ثَلٰثَ عِصِیٍّ صُفِّفَتْ بَعْدَ خَاتَمٍ   عَلٰی رَاسِهَا مِثْلُ السِّنَانِ الْمُقَوَّمِ

خاتم کے بعد تین چھڑ، ان پر سیدھے کئے ہوں، نیزہ جیسا نقش

وَمِیْمٌ طَمِیْسٌ اَبْتَرٌ ثُمَّ سُلَّمٌ   اِلٰی کُلِّ مَا مُوْلٍ وَلَیْسَ بِسُلَّمٍ

اور مٹی ہوئی دُم بریدہ میم پھر ایک سیڑھی ہر آرزو تک (پہنچانے والی، مگر سیڑھی نہیں

وَاَرْبَعَۃٌ مِثْلُ الْاَنَامِلِ صُفِّفَتْ   تُشِیْرُ اِلَی الْخَیْرَاتِ مِنْ غَیْرِ مِعْصَمٍ

اور چار انگلیاں ایک قطار میں   کلائی کے بغیر نیکیوں کی طرف اشارہ کرنیوالی

وَهَاءُ شَقِيقٍ ثُمَّ وَاوٌ مُقَوَّسٌ ۔۔۔ كَأُنْبُوبِ حَجَّامٍ وَلَيْسَ بِمِحْجَمِ

اور دو چشمی "ھ" پھر قوس نما واؤ ۔۔۔ جیسے حجام کی سینگی مگر سینگی نہیں

الشرجی نے ان نقوش کے بارے میں ایک روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:-

وَهٰذَا الْاِسْمُ وَجَدْتُهٗ عَلٰى هٰذِهِ الصُّوْرَةِ بِخَطِّ جَمَاعَةٍ مِنَ الْعُلَمَاءِ الْمُعْتَبَرِيْنَ نَفَعَ اللّٰهُ بِهِمْ

اور اس اسم کو معتبر عالموں کی ایک جماعت کے خط میں مجھے یوں مکتوب ملا ہے:-

✡ ااا ٥ ▯ IIII ⴼ ٯ

وَبَعْدَ هٰذِهِ الْاَسْمَاءِ هٰذِهِ الْاَبْيَاتُ

اور ان اسماء کے بعد یہ اشعار ملے ہیں:-

الشرجی نے بھی منقولہ بالا اشعار نقل کئے ہیں، لیکن "السِّنَان المقوّم" کی جگہ "السنام المقدّم" لکھا ہے۔ جس کے معنے ہیں اگلی کوہان۔ اگر یہی روایت صحیح ہے تو نقش دوم کو " ⋂ " ایسا ہونا چاہئے لیکن نقش کو " ااا " یوں نقل کیا ہے:-

واؤ مقوس کی بجائے الشرجی کی روایت میں واوٌ منکّسٌ (الٹا واؤ) ہے۔ اس روایت کے مطابق نقش سابع کو نسخۂ قاموس کے مطابق " ٯ " ایسا ہونا چاہئے۔ الشرجی نے ان چار اشعار پر ایک مزید شعر کا بھی اضافہ کیا ہے:- ؎

فَمِنْ اَحْرُفِ التَّوْرَاةِ فِيْهِنَّ اَرْبَعٌ ۔۔۔ وَاَحْرُفِ اِنْجِيْلِ عِيْسَى بْنِ مَرْيَمِ

(ان میں چار حروف توراۃ و انجیل کے حروف ہیں)

توراۃ اور انجیل کی زبان اور رسم خط کو عبرانی خیال کیا جاتا ہے۔ ان نقوش ✡ ، ااا اور IIII کا عبرانی رسم خط سے کوئی علاقہ نہیں۔

میم کی معروف عربی صورت ایسی ٥ ہوتی ہے۔ دُم کٹی میم کی صورت ○ ایسی ہونی چاہئے۔ اور یہ حجری عبرانی کا، جس کو فنیقی کہا جاتا ہے، حرف عین ہے۔

سُلّم کی شکلیں ایسی H ، ⌸ ، اور ⌸ ایسی ہو سکتی ہیں اور یہ حجری عبرانی میں حرف ح کے رموز ہیں۔ نقش کی صحیح تر صورت ⌸ ایسی ہونی چاہئے۔ وجہ ترجیح آگے بیان کی گئی ہے۔

ھاء شقیق کی صورت ⴼ حرف قاف کی ایک فنیقی شکل ⴼ سے ملتی ہے۔ واؤ منکّس ٯ کی شکل کو قرطاسی عبرانی کے حرف ح سے مشابہت ہے جو طائے حطی کا رمز ہے۔ ان تشریحات کے بعد نقش سلیمانی کی ٹھیک صورت یوں ہوئی:-

✡ ااا ○ ⌸ IIII ⴼ ٯ

الدیربی نے ان نقوش کی بابت جو اشعار نقل کئے ہیں ان میں یہ بھی ہیں کہ ؎

فَهٰذَا هُوَ الْاِسْمُ الْمُعَظَّمُ قَدْرُهٗ ۔۔۔ فَاِنْ كُنْتَ لَمْ تَعْلَمْهُ فَاَعْلَمِ

یہ بڑی قدر و منزلت والا اسم ہے ۔۔۔ تجھے نہیں معلوم تو اب معلوم کر لے

فَيَا حَامِلَ الْاِسْمِ الْعَظِيْمِ بِهٖ اكْتَفِ ۔۔۔ لِتَنْجُ مِنَ الْاٰفَاتِ حَقًّا وَتَسْلَمِ

(اے اسم اعظم کے حامل اس پر اکتفا کر تاکہ تو ہر آفت سے مامون رہے)

الشرجی کی روایت کے مطابق شاعر نے کہا ہے:-

فَيَا حَامِلَ الْاِسْمِ الَّذِيْ جَلَّ قَدْرُهٗ ۔۔۔ تَوَقَّ بِهٖ كُلَّ الْمَكَارِهِ تَسْلَمِ

تو اے اسم اعظم کے حامل اس کے ذریعہ ہر مکروہ سے بچ تو سلامت رہے گا

بلیو نز، کراچی ۱۱ دسمبر ۱۹۶۱ء

فَذَالِکَ اِسْمُ اللہِ جَلَّ جَلَالَہٗ   اِلیٰ کُلِّ مَخْلُوْقٍ فَصِیْحٍ وَّ اَعْجَمٖ

کیونکہ یہ خدا کا اسم اعظم ہے فصیح اور غیر فصیح ہر شخص کے واسطے

شاعر کے نزدیک یہ سات نقوش خدا کا اسم اعظم ہیں اور ہر چیز اور ہر شخص کو یہ اسم اعظم ہر بلا سے محفوظ رکھتا ہے، اسی تصور کی بنا پر اس کو تعویذ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

الدیربی کے بیان کے مطابق اہلِ علم نے اس کا یہ مطلب بتایا کہ خدا نے فرمایا۔

(۱) میں ہوں اللہ جو واحد ہے، بادشاہ ہے، زندہ ہے۔

(۲) میں ہوں اللہ جس کی تسبیح۔ سائے اور پرچھائیں کرتی ہے۔

(۳) میں ہوں اللہ جو صانع ہے اور تھکتا نہیں۔

(۴) میں ہوں اللہ، جس کی مثیل کوئی شئی نہیں۔

(۵) میں ہوں اللہ، سننے والا، دیکھنے والا، ہر جاندار کا خالق۔

معلوم نہیں کہ یہ مطلب ان سات نقوش کا کیسے ہوگیا کہ اہلِ علم نے کس دلیل سے یہ مطلب سمجھ لیا۔ الشرجی نے اس نقش کی بابت حسب ذیل روایت نقل کی ہے:- کہ

> حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مدینہ میں ایک شخص تھا جس کو ابوذکر کہا جاتا تھا۔ یہ شخص بچھو کا زہر جھاڑتا تھا اور خدا کے حکم سے بہتوں کو فائدہ ہوتا تھا۔ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابوذکر، ذرا اپنا منتر تو سناؤ، انہوں نے سنایا:-
>
> شجه فرسبه ملحه بحر قفقطا
>
> حضرت رسول خدا نے فرمایا کہ اس میں کوئی قباحت نہیں یہ تو چند عہد ہیں جو حضرت نوح علیہ السلام نے ان سے لئے تھے۔

یہ روایت قطعاً ناقابلِ تسلیم ہے۔ منتر کی صورت تحریر پر نقطوں کی بدنظمی سے ناقابل فہم ہے لیکن ان پر نقطے لگا کر جن بامعنی عبارتوں کی شکل میں پڑھا جاسکتا ہے ان میں سے کوئی عبارت اس بات کی تصدیق نہیں کرسکتی کہ یہ چند باتوں کے عہد ہیں جو حضرت نوح نے اپنے ماننے والوں سے لئے تھے۔ اس روایت کے بعد الشرجی نے لکھا ہے کہ،

> علما کی ایک جماعت کا بیان ہے کہ خود[1] حضرت رسول خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) منتر پھو نکتے تھے★۔ ان علماء میں سے ایک الشیخ شمس الجزری ہیں۔ انھوں نے طبرانی کی معجم اوسط کے حوالے سے یہ بات اپنی کتاب عدۃ الحصن الحصین میں لکھی ہے بعض علما کہتے ہیں کہ اس اسم پر تین بار (سَلَامٌ عَلیٰ نُوْحٍ فِی الْعٰلَمِیْنَ) کا اضافہ کرنا چاہئے۔

★ نعوذ باللہ

اس کے بعد الشرجی نے ذکر کیا ہے کہ میں نے اس اسم کو کئی عالموں کی تحریر میں یوں مکتوب دیکھا ہے الخ

یہ روایت اگرچہ بحیثیت حدیث مرفوع مستوجب رد و انکار ہے، مگر اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس تحریر کو کبھی یوں بھی پڑھا گیا تھا۔

6   ꟼ   IIII   ☰   ٥   ╥╥   ✡

شجه فرسبه ملحه بحر تفقطا

---

[1] نقلِ کفر کفر نباشد۔ (مدیر)

نقش پنجم کی قرأت بحر صات ہے۔ اس کو ⌇⌇⌇⌇ کی بدلی صورت خیال کیا جا سکتا ہے۔ لہروں کی شکل کو بحر (سمندر یا دریا) پڑھنا بے جا نہیں۔
Ψ فنیقی قاف ہے۔ ∆ کو عبرانی ט ط سے مشابہت ہے، اسلئے چھٹے اور ساتویں نقش کو قفط یا قفطا پڑھنا جائز ہے۔ قفطا ارضِ مصر یا ارضِ مصر کے ایک خاص مقام coptos کا نام ہے۔ بحر قفط سے دریائے مصر یعنی نیل یا بحر متوسط مراد ہو سکتا ہے۔
نقش اول ✡ ستارہ کی شکل ہے۔ ستاروں کی بابت قرآن میں ہے۔ کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ۔ ہر ایک اپنے اپنے مدار پر تیرتا ہے۔ ستارہ کی شکل کو سَبَحَتْ یا سَبَحَتْ پڑھنا خلافِ قیاس نہیں۔

پانچ لفظوں کی اس عبارت کے تین لفظ معلوم ہو گئے۔ اسلئے باقی دو لفظوں کو ان کے مطابق ہی ہونا چاہئے۔
ااا کو ⌇⌇⌇ لہروں پر کشتی کی صورت سے ماخوذ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب کشتی ہو سکتا ہے۔ قارب جس کی جمع قوارب ہے۔ اس چھوٹی ناؤ کو کہتے ہیں جو بڑے جہازوں پر اسلئے ہوتی ہے کہ جب جہاز بندرگاہ تک سمندر کے اتھلے ہونے کی وجہ سے نہ جا سکے تو مسافر اس کشتی کے ذریعہ ساحل تک یا ساحل سے جہاز تک جا سکیں۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی قُرَیبۃ بھی قارب کا مرادف رہا ہو۔
o چونکہ حرف عین ہے، اسلئے o ▤ کو معلّمہ کی بجائے عَلَجَّۃ (عن لُجّۃ) پڑھنا چاہئے۔ ⌸ پر ▤ کو ہم نے اس لئے ترجیح دی ہے کہ ⌸ کو لجہ نہیں پڑھا جا سکتا۔ ▤ کو چھٹے میں لہروں کی شکل ≋ کا بدل قرار دیا جا سکتا ہے جو کھٹے میں لہروں کی صورت مصری رسم خط میں، سمندر، جھیل، اور پھیلے تالاب کا رمز ہے۔ لجّہ دریا یا سمندر کے اس مقام کو کہتے ہیں جہاں بہت گہرائی اور بہت پانی ہو۔ اس کا ترجمہ عمل کے مطابق ہم منجدھار کر سکتے ہیں۔ اس تحریر کو نقش سلیمانی، اسم اعظم، بچھو کا منتر، اور نہ معلوم کیا کیا باور کر لیا گیا۔ لیکن یہ نہ منتر ہے نہ اسم اعظم اور نہ نقش سلیمانی، بلکہ یہ ایک خبر ہے، سبحت قریبۃ عن لجۃ بحر قفط پار کر گئی چھوٹی کشتی منجدھار کو بحرِ مصر کے

ترجمہ مجربات دیربی مطبوعہ نولکشور ۱۳۲۲ھ میں اس نقش کی بابت حضرت ذوالنون مصریؒ کا قول منقول ہے کہ "میں نے اس کو کسی کشتی میں نہیں داخل کیا جو غرق ہوئی ہو" صفحہ ۱۵۱ اس قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ "ذوالنون مصریؒ" نے اس تحریر کو کشتی کے متعلق خیال کیا تھا۔ لیکن دعا تعویذ والوں نے اس کو ہر بلا کے رد کا منتر بنا دیا۔ اس کی تقدیس کے لئے اس کو "نقش سلیمانی" کا لقب دے دیا اور ایک روایت وضع کر کے خود لسانِ نبوّت پر اس منتر کی عظمت رکھ دی۔ اس پر ہمارے یورپی اہل علم مسکرائیں گے لیکن ع : ایں گناہے است کہ در شہر شما نیز کنند۔

سندھی نوشتوں کو جو مہروں پر ملے ہیں سمجھے بغیر بہتوں نے ان کو جنتر منتر فرض کر لیا ہے۔ جانوروں کو، جن کی تصویروں کے ساتھ تحریریں ہیں، قدمائے سندھ کے دیوتا مان لیا ہے، قیاسوں کے انبار پر انبار جمع کر کے قدمائے سندھ کے عقیدہ، مذہب، رسم و رواج اور تاریخ گھڑ دی ہے۔ مہروں نے جن لوگوں کو اَدیوا (کسی دیوتا کے نہ ماننے والے) بتایا ہے ان کو سہدیوا (دیوتاؤں کے پجاری) بنا دیا ہے۔ ان علمائے مغرب کی خیال بندیوں کو ریسرچ اور تحقیق انیق باور کرنے والوں کو خبر نہیں کہ ✡ ⌸o ▤ ΨIIII ∆ کو اسم اعظم بچھو کا منتر اور ہر بلا سے بچانے والا حرز قرار دینے والے نادانوں نے وہی کام کیا تھا جو ♡" II ⌂ ⊔ Y ⊓ ⊓ کو پڑھے بغیر ایک منتر اور جس جانور کی تصویر کے ساتھ یہ تحریر ہے اسے دیوتا کا روپ قرار دینے والے مغربی محققوں نے کیا ہے۔ لیکن ان کی خوش بختی ہے کہ ان کے جہل مرکب کو ہم میں سے بہتیرے تحقیق و تدقیق کی معراج سمجھتے ہیں!۔

اس نقش کے اشکال سبعہ میں سے چھ شکلیں ⌸، o، ▤، IIII، Ψ اور ∆ سندھی مہروں پر ملتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ سندھی مہروں پر بھی ان کا وہی مطلب اور وہی تلفظ ہو جو اس قرأت کے مطابق ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ زمانہ کی طوالت نے ان نقوش کے معانی اور تلفظ بدل دئیے ہوں یا منقول بالا قرأت اسی طرح محض وہمی اور خیالی افسانہ ہو جس طرح ان سات نقوش کو نقش سلیمانی اور ہر بلا سے بچانے والا تعویذ سمجھنا محض وہمی ہے۔ لیکن اس حرز کے نقوش کا ہو بہو سندھی مہروں پر ملنا اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ سندھی رسم خط کے نقوش اپنی یادگاریں چھوڑے بغیر ماضی کے دھندلکوں میں زمین کے سینہ اور بڑی بڑی عمارتوں کے ملبے میں صدیوں تک کے لئے مدفون نہیں ہو گئے تھے بلکہ بہتیرے نقوش اس رسم خط کے مدتوں رائج رہے، لیکن اپنی اصلی قدر و قیمت سے بیگانہ ہو کر ان نقوش کی بیگانگی کے باوجود ان سے سندھی قدیم کے فہم میں مدد مل سکتی ہے۔
فرض کر دیجئے علی گڈھ کے نسخہ قاموس کا نقش عراق میں کسی مہر پر ملتا تو یقیناً اس کو ہڑپا یا موئنجو دڑو کا نوشتہ خیال کیا جاتا!

طنز:

نظرِ ثانی کے بعد

ابنِ انشا

شکوہ: ایڈیٹر صاحب: "نظرِ ثانی کے بعد" آپ کی برادری کے کچھ لوگوں، خدائی فوجدار قسم کے ایڈیٹروں پر طنز ہے۔ ایڈیٹروں پر بھی نہیں اس قسم کے اداروں پر بھی۔ جن اداروں میں یہ باتیں نہیں ہوتیں ان کے بھلا ننے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ جہاں ہوتی ہیں ان سے معافی خواہ ہوں۔ کسی قسم کی مماثلت محض اتفاقی ہوگی کیونکہ یہ طبعزاد چیز نہیں، ایک غیر ملکی طنزیے کا اردو ترجمہ یا چربہ ہے۔ (ا۔ا)

جوابِ شکوہ: نئے دور کی برکتیں ہیں کہ فنکاروں کو اب سننے ہی نہیں والے اور دورے بھی دادل رہی ہے۔ مگر اس غریب شہرِ ادب — مدیر — کو تو بس یہی طمانیت حاصل تھی کہ اپنے روایتی "عصائے شاہی" بکوشل کو اندھے کیوپڈ کے تیر کی طرح جس طرح چاہا گھما دیا۔ سو انشا جی کو یہ بھی اکھر رہا ہے!

اس طنز کا روئے سخن ہماری ہی طرف نہ ہو جائے اس لئے "نظرِ ثانی کے بعد" نظرِ ثانی کے بغیر ہی شائع کیا جا رہا ہے۔ گو ملال ضرور ہے، کیونکہ: اور تو یاں کچھ نہ تھا ہاں فقط اک کاٹنا[1] (مدیر)

ایک مضمون نگار ایڈیٹر "قومی ادب" کے دفتر میں داخل ہوتا ہے۔ ڈرتے ڈرتے جھجکتے جھجکتے۔

"جی۔ معاف فرمائیے گا مجھے علامہ استاد جگت پوری سے ملنا ہے جو "قومی ادب" کے ایڈیٹر ہیں۔

ایڈیٹر: آئیے تشریف لائیے۔ اسم شریف؟ مضمون نگار (م) جی میرا نام الہ دین ہے۔ چراغ تخلص کرتا ہوں۔ شاعری ورثے میں ملی ہے۔ ادب گھٹی میں پڑا ہے۔ میرے نکڑ دادا کے نکڑ دادا شیر شاہ سوری کے زمانے میں اصفہان جنت نشان سے آئے تھے۔ میری والدہ کی خالہ کے پھوپھا سسر شاداں تا شاد لپوری بھی صاحبِ دیوان شاعر تھے۔

ایڈیٹر (ا)، آپ کیا لکھتے ہیں۔

م۔ جی ایک افسانہ لایا ہوں۔ بالکل اچھوتا موضوع ہے آپ دیکھیں گے تو .....

ا۔ خوب چھوڑ جائیے افسانہ۔ اس کے ساتھ ٹکٹ لگا جوابی لفافہ ضرور ہونا چاہیے۔ آپ کو چھ مہینے کے اندر اندر اپنی رائے سے مطلع کر دوں گا۔

م۔ (لجاجت سے) جی اگر گستاخی نہ ہو تو عرض کروں کہ چھوٹا سا تو افسانہ ہے۔ آپ ابھی سن لیں اور اپنی رائے مجھے بتا دیں۔ بس تین چار منٹ کی بات ہے۔ آپ اجازت دیں تو۔

ا۔ (گھڑی دیکھتے ہوئے) اچھا خیر پڑھیئے۔ کیا عنوان ہے۔

م۔ جی عنوان بھی اچھوتا رکھا ہے میں نے۔ "کارِ خیر"۔ اس کا عنوان "بہادر اللہ دتا" بھی ہو سکتا تھا لیکن وہ پرانے فیشن کا ہے۔

ا۔ اچھا اچھا پڑھیئے۔

م۔ (پڑھتا ہے):

"رات کے تین بجے ہوں گے ہر کوئی خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔ کہیں کوئی روشنی نظر نہ آ رہی تھی، یکایک اونچے مکان کی چوتھی منزل سے آگ کی لپٹیں اٹھیں۔ پھر کسی کے چلانے کی آواز آئی۔ "آگ۔ آگ۔ بچاؤ۔ بچاؤ"۔ معلوم ہوتا تھا کوئی لاپرواکرایہ دار انگیٹھی بجھائے بغیر سو گیا تھا۔ اس کی چنگاری کپڑوں پر پڑی اور آگ بھڑک اٹھی۔ اب وہ شخص غریب آگے آگے تھا اور آگ پیچھے پیچھے۔ دفعتہً آگ بجھانے والے

---

[1] اور تو یاں کچھ نہ تھا، ہاں فقط اک دیکھنا۔ (مدیر)

انجن کا گھگھو سنائی دیا۔ فائر مین اللہ دتا جو منجھلی عمر اور گٹھے ہوئے جسم کا بڑی بڑی کالی مونچھوں والا جہلم کی طرف کا سابق سپاہی تھا دروازے کے سامنے رکا تھوڑی دیر سوچا پھر ڈرا آتا چھا کرے میں گھس گیا اور اس حواس باختہ شخص کو شعلوں میں سے نکال لایا۔ اب اس نے شست باندھ کر پانی کا تریڑا دیا اور آگ بجھ گئی۔ آگ بجھانے کے دستے کا جمعدار پیرا اللہ بخش آگے بڑھا اور بولا۔ "آفرین ہے تیری بہادری پر۔ محکمے کو تجھ سے یہی توقع تھی"۔ اس کے بعد مسکرا کر بولا۔ ذرا دیکھنا تمہاری دہنی مونچھ جل رہی ہے۔ بہادر اللہ دتا بھی مسکرایا اور پانی کا ایک تریڑا اپنی دہنی مونچھ پر بھی دیا۔

دور مشرق میں سپیدۂ سحری نمودار ہو رہا تھا۔"

ا ۔ افسانہ برا نہیں۔ عنوان کیا بتایا تھا؟ "کارخیر"؟ یہ بھی اس میں چھپا ہوتا ہے تاہم بعض جگہ نظر ثانی کی ضرورت پڑے گی۔ ایسی اچھی کہانی میں کوئی عیب رہ جائے، یہ افسوس کی بات ہوگی۔ ذرا شروع سے پڑھیئے، دیکھیں اس کا کیا ہو سکتا ہے۔

م ۔ سنئے:

"رات کے تین بجے ہوں گے۔ ہر کوئی خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔"

ا ۔ (سر ہلاتے ہوئے) یہ تو نہیں چلے گا۔ "ہر کوئی" کا مطلب ہے پولیس والے بھی سو رہے تھے یعنی اپنی ڈیوٹی سے غافل تھے ..... تا تا یہ ٹھیک نہیں۔ لوگ سمجھیں گے اس ملک میں چوکی پہرے کا انتظام ٹھیک نہیں ... اسے بدل کر یوں کر دیجئے،

"رات کے تین بجے ہوں گے۔ کوئی آدمی خواب خرگوش کے مزے نہیں لوٹ رہا تھا۔"

م ۔ (نیم احتجاجی لہجے میں) یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ رات کا منظر ہے۔ ایسے میں تو لوگ سو ہی رہے ہوتے ہیں۔

ا ۔ ہاں۔ آپ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔ اچھا تو یوں سہی۔

"شہر میں ہر کوئی خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا لیکن ہوشیار اور چوکس تھا۔"

م ۔ (منمناتے ہوئے) جی کیا فرمایا؟ سو رہا تھا اور چوکس بھی تھا؟

ا ۔ ہاں یہ بھی کچھ بے معنی سی بات ہو گئی۔ اچھا یوں تو کر سکتے ہیں۔

"کچھ لوگ خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ کچھ ہوشیار اور چوکس تھے۔" .... چلئے آگے چلئے۔

م ۔ (کھنکارتے ہوئے) "..... کہیں کوئی روشنی نظر نہ آ رہی تھی۔"

ا ۔ (رکتے ہوئے) کیا مطلب آپ کا۔ کیا ہمارے ملک میں ایسے بلب بنتے ہیں کہ جل کے نہیں دیتے۔

م ۔ جی نہیں یہ بات نہیں۔ رات میں بلب بجھا دیئے جاتے ہیں۔

ا ۔ عزیز من۔ سب لوگ اتنے سمجھدار نہیں ہوتے کہ یہ نکتہ سمجھ جائیں۔ بہت سے تو یہ سمجھیں گے کہ ہمارے ہاں بلب ناقص بنتے ہیں۔ میری مانو تو اسے کاٹ ہی دو۔ اگر بلب جل نہیں رہے تھے تو ان کے ذکر سے فائدہ؟

م ۔ (کسمساتے ہوئے آگے پڑھتا ہے):-

"یکایک ایک اونچے مکان کی چوتھی منزل سے آگ کی لپٹیں اٹھیں۔ پھر کسی کے چلانے کی آواز آئی۔

"آگ آگ ۔ بچاؤ ۔ بچاؤ۔"

ا ۔ گویا بھگدڑ مچ گئی ۔

م ۔ جی ہاں ۔

ا ۔ گویا ہم اپنے پرچے میں اس بات کو شہرت دیں کہ ہمارے عوام میں ذرا سی بات پر بھگدڑ مچ جاتی ہے یعنی وہ اوسان کھو بیٹھتے ہیں ...... نہ صاحب ۔ یہ نہیں چلے گا ۔ یہ "قومی ادب" کا دفتر ہے "سرخ آفتاب" کا نہیں ۔

م ۔ جی یہ تو محض افسانہ ہے ۔ ایک تخلیقی کوشش۔ میں بس آگ کا منظر بیان کر رہا تھا ۔

ا ۔ آپ اس میں ایک مطمئن مزاج اور اپنے فرائض سے باخبر شہری کی بجائے ایک ایسا کردار لاتے ہیں جس کے

محض ذرا سی بات پر شخص مکان کو آگ لگ جانے سے، ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ میں آپ کی جگہ ہوتا تو بچاؤ بچاؤ کی بجائے اس کردار سے کوئی ایسی بات کہلواتا جو قومی تقاضوں کے زیادہ مطابق ہوتی۔

م ۔ مثلاً ۔ !

ا ۔ مثلاً وہ کہہ سکتا تھا۔

(جی ایسی آگیں بہت دیکھی ہوئی ہیں۔ ابھی بجھا دیتے ہیں)۔

بلکہ اس کو کہنا چاہیے۔

"آگ واگ کچھ بھی نہیں۔ تخریب پسندوں کا پراپیگنڈا ہے"

م ۔ دمری ہوئی آوازمیں، جی آگ تو بہر حال لگی تھی۔

ا ۔ ہم جب کہتے ہیں "آگ واگ کچھ بھی نہیں" تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہے بھی تو ہم کیا پروا کرتے ہیں۔ دلاوروں کے آگے آگ کی کیا ہستی ہے، بقول شاعر،

اولوالعزمان دانشمند جب کرنے پہ آتے ہیں
سمندر چیرتے ہیں کوہ سے دریا بہاتے ہیں

م ۔ خیر آپ کے کہنے سے کر لیتا ہوں لیکن اس سے بات نہیں بنتی

ا ۔ بنتی کیوں نہیں۔ آپ آگے چلئے۔ آخر اس شخص کو اس بری طرح چلانے کی کیا ضرورت ہے۔

م ۔ (آگے پڑھتے ہوئے)،

معلوم ہوتا تھا کوئی لاوا کرایہ دار انگیٹھی بجھائے بغیر سو گیا تھا۔ اس کی چنگاری کپڑوں پر پڑی اور بھڑک اٹھی۔"

ا ۔ کیا کرایہ دار؟

م ۔ لاپروا

ا ۔ اول تو لاپروا کی ترکیب ہی غلط ہے۔ لا عربی کا پروا فارسی کا۔ یا شاید ہندی کا۔ خیر اسے بھی جانے دیجئے آجکل سبھی غلط زبان لکھتے ہیں۔ لیکن لاپروائی اور غفلت کی ہم اپنے پرچے کے صفحات میں تشہیر کریں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اور یہ آپ نے کیا لکھ دیا کہ شخص مذکور انگیٹھی بجھائے بغیر سو گیا تھا۔ آپ ہمارے پڑھنے والوں کے سامنے ایک غلط مثال پیش کر رہے ہیں تاکہ وہ بھی ایسی ہی غفلت کریں۔

م ۔ (معذرتاً) جی۔ خدا گواہ ہے میں نے اس نیت سے نہیں لکھا۔ انگیٹھی کا ذکر اس لئے کیا کہ اس کے بغیر آگ نہ لگتی۔

ا ۔ چلئے مان لیا۔ آگ نہ لگتی۔ اس سے کیا نقصان ہوتا؟

م ۔ نقصان کچھ نہ ہوتا بلکہ نہ لگتی تو اچھا تھا۔

ا ۔ اب آئے نہ راہ پر۔ تو پھر یونہی لکھو بھی۔ انگیٹھی کا ذکر بالکل اڑا دو۔ آگ کے ذکر کی بھی ضرورت نہ رہے گی۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ اچھا اب آگے پڑھیے بیچ کا حصہ چھوڑ کر سیدھے فائرمین کے کردار پر آجاؤ۔

م ۔ "..... فائرمین اللہ دتا جو منجھلی عمر اور گٹھے ہوئے جسم کا بڑی بڑی کالی مونچھوں والا جہلم کی طرف کا سابق فوجی تھا....."

ا ۔ خوب۔ بہت خوب لکھا ہے آپ نے۔ ہمارا وطن بھی جہلم کے ضلع میں ہے۔ وہاں کے لوگ ہوتے ہی بہادر ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم میں پندرھویں پنجاب رجمنٹ.....

م ۔ (بات کاٹ کر پڑھنا جاری رکھتا ہے)....

"دروازے کے سامنے رکا۔ تھوڑی دیر سوچتا رہا...."

ا ۔ ہیں! سوچتا رہا؟ نہیں نہیں۔ فائرمین کو سوچتے مت دکھایئے۔ اس کا کام تو بس آگ بجھانا ہے۔

م ۔ اس سے کہانی میں زور پیدا ہوتا ہے۔

ا ۔ کہانی میں زور پیدا ہو گیا تو کیا۔ اس سے فائرمین کی تو کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ پھر دوسری بات یہ کہ جب ہم نے آگ کا ذکر حذف کر دیا تو فائرمین کے ذکر کی کیا حاجت ہے

م ۔ لیکن پھر فائرمین اللہ دتا اور جمعدار اولاد بخش کے مکالمے کا موقع کیسے پیدا ہوگا۔

ا ۔ یہ مکالمے تو آپ ان کے دفتر میں بھی دکھا سکتے ہیں۔

م ۔ (پڑھتا ہے) ۔ "آگ بجھانے والے دستے کا جمعدار پیرا ولاد بخش آگے بڑھا اور بولا۔ آفرین ہے تیری بہادری پر، تجھ سے یہی توقع تھی۔ اس کے بعد مسکرا کر بولا۔ ذرا دیکھنا، تمہاری دہنی مونچھ جل رہی ہے بہادر اللہ دتا بھی مسکرایا اور پانی کا ایک تریڑا اپنی دہنی مونچھ پر بھی دیا۔ وہ واقعی یہ

سپیدۂ سحری نمودار ہو رہا تھا۔"

ا ۔ کیا یہ ذکر بہت ضروری ہے ؟

م ۔ کس چیز کا ذکر ؟

ا ۔ جلتی ہوئی مونچھ کا ؛

م ۔ یہ تو میں نے اپنے افسانے میں مزاح پیدا کرنے کیلئے ڈالا ہے ۔ اپنے فرض کی ادائیگی میں اس شخص کا ایسا انہماک دکھایا گیا ہے کہ اسے اپنی مونچھ کے جلنے تک کی خبر نہیں ۔

ا ۔ میری مانیئے تو آپ اس ذکر کو خارج ہی رکھئے ۔ جب ہم نے آگ کا ذکر حذف کر دیا ۔ جب مکان ہی کو آگ نہیں لگی تو مونچھ کو لگانے کی کیا ضرورت ہے ؟

م ۔ (پہلو بدل کر) مزاح کا عنصر !

ا ۔ وہ تو ویسے بھی رہے گا ۔ لوگ کب ہنستے ہیں ؛ جب ان کو کوئی پریشانی نہ ہو ۔ کیا آگ کا ذکر نکال دینے سے پریشانی رفع نہیں ہو جاتی ؟ ضرور ہو جاتی ہے لہذا ہر شخص خوش ہوگا ، ہر شخص خود بخود ہنسے گا ۔ اچھا اب شروع سے سنا دو کہ کہانی کی کیا صورت ہے ۔

م ۔ جی سنئے ؛

"رات کے تین بجے ہوں گے کچھ لوگ خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے ، کچھ ہشیار اور چوکس تھے ۔ یکایک ایک مکان کی چوتھی منزل سے کوئی پکارا ۔ "آگ واگ کچھ بھی نہیں لگی ۔ تخریب پسندوں کا پراپیگنڈا ہے " فائرمین اللہ دتا منجھلی عمر اور گٹھے ہوئے جسم کا جہلم کی طرف کا سابق فوجی تھا ۔ آگ بجھانے والے دستے کا جمعدار پیر اولاد بخش آگے بڑھ کر اس سے بولا ۔ آفرین ہے تیری بہادری پر ۔ مجھے تجھ سے یہی توقع تھی ۔ اللہ دتا مسکرایا اور پانی کا تریڑا اپنی دہکتی مونچھ پر دیا ۔

دور افق پر سپیدۂ سحری نمودار ہو رہا تھا ۔"

ا ۔ اب بات بنی نا ؟ اب افسانہ بے نقص ہے اور ماہنامہ "قومی ادب" اسے آب و تاب سے چھاپے گا ۔ نہیں شکریے کی ضرورت نہیں ۔ "قومی ادب" کا مقصد ہی نئے لکھنے

نئے تجربے

ترتیل

رفیق خاور

ترتیل ایک نئی صنف ہے ۔ پابند بھی اور آزاد بھی جس میں بیک وقت غزل اور آزاد نظم دونوں کی وضع ، رنگ روپ اور کیف پایا جاتا ہے ۔ اس کا پہلا نمونہ رفیق خاور ہی کی ایک طویل نظم "جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا" مطبوعہ "ماہِ نو" شمارہ اگست ۱۹۶۱ء کے آخری فنی پارے میں پیش کیا گیا تھا ۔ "نئی زندگی آ رہی ہے" ۔

بہار ہواؤں ، گھٹا برساتی اداؤں کو کس شان سے تازگی عطا کر رہی ہے ۔۔۔ نئے اگلے شمارے میں جستہ آہنگ کے نامور بانی جی ۔ ایم ۔ ہاپکنس کی نظم FALCON ۔۔۔ کو اردو میں پیش کیا جائیگا تاکہ ہماری شاعری نئے جدید تجربات سے بھی روشناس ہو سکے ۔ (مدیر)

اب روح میں اک لہر آئی

اب میرے دل کی دنیا میں اک ایسی چیز سمائی

اک ہنستا کھیلتا جادو ہے نس نس سہلاتا افسوں ہے

نوخیز نشوں کی انگڑائی !

یا کچھ بھی نہ تھا یا سب کچھ ہے

اک پل پل بڑھتی مستی نے کچھ ایسی چیز پلائی

دل اور طرح سے دھڑکتا ہے ، جان اور طرح جی اٹھی ہے

ہے تن میں نئی برنائی

دنیا کا اجالا اور ہوا

آنکھوں میں ، دل میں ، روح و رواں میں اور جوالا کلپائی

دل اور ہوا ، جان اور ہوئی ، ہوش اور ہوئے ، طور اور ہوئے

ہستی نے اور طرح پائی

رگ رگ سے دوشیزہ رس کے طوفانی سوتے پھوٹ پڑے

اب میں ہوں اور اک پھیلتی پھیلتی بڑھتی ہوئی گہرائی

جھن جھن یوں دل کے تار بجے اور راگنی ان کے سنگ اٹھی

جیسے طنبور کے تاروں کی سنگت میں بجے شہنائی

دل بھرا بھرا ہے بھرا بھرا ، پرانا ہی لوہے کا شانہ

حیران ہوں یہ لو کیسے آئی

اک طیارہ جو اپنے زور سے اٹھنے پہ ہو آمادہ

اک چھوٹی ہوئی ہوائی

یہ روشنی کیسے جاگ اٹھی ، ہر سمت اجالا کیسے ہوا

افق، کراچی، دسمبر ۱۹۶۱ء

ڈرامہ

آخری تاجدار

عنایت اللہ

مقام: پاکستوونیس کا دارالحکومت کراچینا

کردار

لائسندروس : تاجدار

ماحیڈرانوویش : ملکہ

عدل دیوی

قانون دیوتا

باپ دیوتا

ہرکولیس

مظلیس : ایک غریب بڑھیا

تلاش : بڑھیا کا خاوند

قائیدیمیس : راہب

کورس: اے دیوتا نژاد لائسندروس، تاجداروں کے تاجدار، پاکستوونیس کے شہنشاہ، ماہ و نجم کے خالق، سات زمین، سات آسمان، سات سمندر پر تیرا راج ہے۔ تو نے قانون بنائے تو نے قانون توڑے۔ تیری عظمت کا ثبوت آٹھ کروڑ انسان ہیں جنہیں تو نے بھوکا مارا۔ پیاسا رکھا۔ ان کی دولت اور عزت ملیامیٹ کر دی، پر تیری مہرتاب پیشانی پر بل نہ آیا۔ وہ آٹھ کروڑ اور تو اکیلا۔ کس کی ہمت ہے، تیرے ایوانوں کے سائے تک پہنچے اور فریاد کرے؟ جو وہائیں عرش کے کنگروں کو ہاتھ لگتی ہیں وہ تیرے محلات کا ہالہ پیمانہ کر سکیں۔ تیری فتح مندی کے پھریرے آٹھ کروڑ لاشوں پر سایہ کرتے ہیں۔ ان بے گور و کفن لاشوں پہ گندی ہوئی تیرے گھوڑوں کی ٹاپیں، اور تیری پری جمال ملکہ ماحیڈرانوویش کا حسن بے مثال ہے جب کہ بلند پکارتا ہے کہ تو دیوتا زیوس کے بیٹے مینولوس کا سپوت ہے۔ تو دیوتا البیمیس کا ہمزاد ہے۔ تیرے مقدس باپ کا دھڑ بیل کا اور چہرہ انسان کا تھا۔ اس کے سر پر سینگ تھے۔ تیری کھوپڑی پر سینگ نہیں پر کھوپڑی کے اندر سینگوں والوں کا مغز ہے۔

تیرے دامن میں بجلیوں نے پرورش پائی۔ تیری بجلیوں نے بستے رستے گھروندے بھسم کر ڈالے۔ تو بزدل نہیں نڈر ہے۔ تو نے اپنی رعایا سیلابوں میں بہا ڈالی اور اڑن کھٹولے پر چڑھ کر ڈوبتی مخلوق کا تماشہ کیا۔ کون ہے جو تیرے سامنے آنکھ اٹھائے۔ تیری نگاہ آتشیں نے دشمنوں کے زرہ بکتر توڑ ڈالے۔ تو نے نلکوں کا پانی بند کر کے انسان کو انسان سے لڑا دیا۔ پانی کی ایک بوند کی خاطر خون کے سو سو قطرے ٹپک گئے۔ یہ تیری عظیم الشان فتح ہے۔ تو نے انسان کو وزیر بنایا بیٹھ کرایا۔ اور چند روز بعد انہیں آپس میں ٹکرا کر انہی کے ہتھیاروں سے مروا دیا۔ تیرے آسمانوں پر کئی ستارے چمکے اور ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے۔ تو اور تیری ملکہ نے آسمان کی بساط پر ستاروں سے شطرنج کھیلی۔

دیوتا نژاد لائسندروس! عدل دیوی آ رہی ہے۔ اوہ! خون بہہ رہا ہے۔ عدل دیوی زخمی ہو گئی ہے۔ بال وبر نوچے ہوئے ہیں۔

(دربار میں عدل دیوی داخل ہوتی ہے۔ شانہ سے خون ٹپک رہا ہے۔ بال وبر بکھرے ہوئے)

لائسندروس: کیا ہوا عدل دیوی؟ تیرا خون کیوں بہہ رہا ہے؟

عدل دیوی: دیوتاؤں کے دیوتا! تاجداروں کے تاجدار! عالی ہمت! عالی پندار! آپ نے مجھے ایک مقدس فرض سونپ کر

یہ قوت دی کہ جو روپ چاہو دھار کر رعایا کی خبرگیری
کرتی رہوں اور جو رعایا کے جان و مال اور
عزت و آبرو پہ ہاتھ ڈالے اسے پاتال کی عمیق
تہوں میں بند کر دوں۔

لائسندروس:۔ بے شک ہم نے تجھے یہ قوت دی۔ بتا ہوا کیا ہے؟

عدل دیوی:۔ تاجدار ارض و سما! میں رات عورت کے بھیس
میں شہر میں نکلی تو دو آدمیوں نے میرا منہ بند کر کے
مجھے دبوچ لیا اور اٹھا لے گئے۔

لائسندروس:۔ کہاں لے گئے؟ کون تھے وہ؟

عدل دیوی:۔ نہ جانے کون تھے۔ مجھے ابوالہول کی بھول بھلیوں
میں لے گئے جہاں سینکڑوں ہزاروں لڑکیاں
ناچ رہی تھیں۔ سینکڑوں ہزاروں مرد داد عیش
دے رہے تھے۔ وہاں گناہ کا دور دورہ تھا۔
ایک نے مجھے بدی پر مجبور کرنا چاہا۔ میں نے انکار
کیا تو ایک کمرے میں قید کر دیا اور میں ضعیف بڑھیا
کا روپ دھار کر وہاں سے نکل آئی۔

ان بھول بھلیوں کے باہر میں نے ایک
عمر رسیدہ عورت کو بیٹھے آہ و زاری کرتے دیکھا۔
اس کے تن پر کپڑا نہ تھا۔ بازوؤں اور گھٹنوں سے
ستر پوشی کر رہی تھی۔ سردی میں ٹھٹھر رہی تھی۔ میں نے
پوچھا تو کون ہے۔ وہ بولی۔ "میرا نام مفلیس ہے
اور میرے خاوند کا نام 'قلاش سنگ تراش' ہے۔
ہم غریب اور بھوکے ننگے ہیں ہماری سینکڑوں
ہزاروں بچیاں اور بچے ان اندھی بھول بھلیوں میں
کھو گئے ہیں۔"

میں نے پوچھا یہ سب کیسے ہوا؟ تو اس نے
آہ بھر کے کہا: "دھن دیوی نے میرے جگر کے
ٹکڑے مجھ سے نوچ لئے۔ میرا خاوند جھونپڑے میں
پڑا دم توڑ رہا ہے۔"

میں نے پوچھا کہاں ہے تمہارا جھونپڑا؟ تو
اس نے کہا: "میرا جھونپڑا بارش کے گدلے پانی میں
ڈوب رہا ہے۔ اب تک میرے پیارے قلاش کی
لاش مٹیالے پانی میں تیر رہی ہوگی اور اس کی ٹھہری
ہوئی آنکھیں تاجدار پاکستونیس شہنشاہ
لائسندروس کی راہ دیکھ رہی ہوں گی۔ تاجدار اور
اس کے وزیر ہر چاند کی پہلی کو کہا کرتے ہیں کہ ہم تجھے
اس گھاس پھونس کے جھونپڑے سے نکال کر سنگ و
خشت کے خوشنما مکان میں بسائیں گے۔ ہم اپنے دیس کو
اس دیس کے لئے خیرباد کہہ کر جانے کیا امیدیں
لے کے آئے تھے۔ میرے خاوند قلاش سنگ تراش
نے 'امید' کا ایک حسین مجسمہ تراش کر شہنشاہ کے
حضور پیش کیا تھا جو شاہی ایوان کے سامنے ابھی تک
نصب ہے۔ ہم میاں بیوی شاہی وعدوں پر زندہ
رہے اور بوڑھے ہو گئے۔"

اے دیوتا نژاد لائسندروس! وہ بوڑھی
عورت جس کا نام مفلیس ہے بہت روئی۔ اس نے
ہچکیاں لے کے کہا کہ تاجدار جھوٹا ہے، ظالم ہے۔
اس نے اپنے وعدوں کا گلا گھونٹ دیا ہے۔

لائسندروس:۔ (غصے میں) کیا تو سچ کہہ رہی ہے عدل دیوی
کہ قلاش کی بیوی مفلیس نے ہمیں جھوٹا کہا؟

عدل دیوی:۔ میرا تقدس مجھے جھوٹ بولنے پہ آمادہ نہیں کر سکتا۔

لائسندروس:۔ تو نے اس ناہنجار بڑھیا کو زندہ درگور کیوں
نہ کر دیا؟

کورس:

کیا وہ سیاہ رو بدزبان کم ذات بڑھیا جس کا نام مفلیس
ہے ابھی زندہ ہے؟ کیا اس پر ارضی دیوتاؤں کا قہر نازل
نہیں ہوا؟ کیا اس کا خاوند جس کا نام قلاش ہے کھانستے
کھانستے مر نہیں گیا؟ تاجدار پاکستونیس کی توہین پر دیوتا
زیوس نے اس کے جھونپڑے کو بجلی سے بھسم نہیں کیا
ابھی؟

ایڈی پس نے اپنی لغزش پہ تاسف کیا تو اپنی
آنکھیں نکال دی تھیں اور اس کی بیوی نے جو اس کی

تھی جو کشش کرائی تھی۔ کیا ایک بے بس، مجبور اور کمزور بڑھیا کی عزت پاکستروڈیس کے خدا کو برا کہہ کر بھی چین اطمینان سے جی رہی ہے؟

عدل دیوی:۔ اس کا چین اطمینان کبھی کا چھن چکا۔ اس کی داستانِ رنج والم نے مجھے بھی بے چین کر ڈالا۔ وہ حق بات کہتی ہے۔ اس سے دلیس چھٹا، پھر پیاسی تڑپی۔ جب آسمان نے پانی برسایا تو اس کا جھونپڑا ڈوب گیا۔ کسی نے اسے کیچڑ پانی سے نہ نکالا۔ اس کے بچے خوشنما بھول بھلیوں میں کھو گئے۔ اب اس کی بچیاں دمن دیوی اور پاپ دیوتا کی دہلیز پر ننگے ناچ ناچتی ہیں۔ بازاروں میں اناج گراں ہے۔ کپڑا ناپید ہے۔ کالے تاجروں نے مفلیس اور قلاش کی اولاد کا خون نچوڑ کر دمن دیوی کے معبد میں چھڑک دیا ہے۔ رعایا کے معصوم بچوں کو پاپ دیوتا کی قربان گاہ پر قربان کیا جا رہا ہے۔

بڑھیا کی آہ وزاری مجھ سے برداشت نہ ہوئی اور میں اپنے اصل روپ میں پھر بھول بھلیوں میں جا گھسی۔ میں نے اس گناہ آلود بستی کے آقاؤں کو للکارا۔ انہیں گناہ سے روکا اور کہا۔ اے گناہگارو! اے مجرمو! اے بدکردارو! تم نے دمن دیوی کے آستانوں کو آباد رکھنے کی خاطر مفلیس اور قلاش کے جھونپڑے ویران کر ڈالے۔ تم نے عورت کو ننگا کر ڈالا۔ میں عدل دیوی قانون دیوتا کی ہاندی تمہیں کیفرِ کردار تک پہنچاؤں گی۔"

میں ابھی کہہ پائی تھی کہ اس بستی میں ایک قہقہہ گونجا۔ نفرت وحقارت سے لبریز قہقہہ۔ طنز کے زہر میں بجھا ہوا قہقہہ۔ ایک نے کہا: "تجھے یہاں کس نے بھیجا؟" میں نے کہا: "دیوتاؤں کے دیوتا۔ لائسندروس تاجدار عالی مرتبت نے مجھے ہرکولیس کی قوت اور ایڈیپس کا شعور دیا ہے کہ بدکرداروں کو کیفرِ کردار تک پہنچاؤں اور بڑھیا مفلیس اور اس کے خاوند قلاش کے بیٹے بیٹیوں اور آل اولاد کو تم سے محفوظ رکھوں تاکہ تم انہیں پاپ دیوتا اور دمن دیوی کی قربان گاہ پر قربان نہ کر سکو۔"

ایک آدمی آگے بڑھا۔ اس نے کہا: "تو بھول رہی ہے دیوی! ہم شہنشاہ لائسندروس کے پجاری ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ شہنشاہ کوہِ اولمپس کی چوٹی پر رہتا ہے جہاں آسمانوں کا قہر نہیں پہنچ سکتا۔ جہاں سیلاب اور زلزلے نہیں پہنچ سکتے۔ وہاں کسی دشمن کی تلوار نہیں پہنچ سکتی۔ بادشاہ سلامت کے محل تک جو اولمپس کی بلندی پر ایستادہ ہے کوئی بدشگون آواز نہیں پہنچ سکتی۔ وہاں تک مفلیس اور قلاش کی آہ وزاری بھی نہیں پہنچ سکتی۔ قلاش کی حیثیت ہی کیا ہے؟ اس نے عمر بھر میں پتھر کا صرف ایک بت تراشا اور اس کا نام امید رکھا اور عمر بھر اسی کو پوجتا رہا۔"

میں نے کہا: "میں مفلیس اور قلاش کی آہ وزاری وہاں تک پہنچاؤں گی۔ میں اولمپس کی بلندیوں کو زلزلے کی طرح ہلا کے رکھ دوں گی۔ لائسندروس ان فریادوں کو سنے گا اور دمن دیوی۔ پاپ دیوتا اور اس کے پجاریوں کو پاتال کے بے رحم دیوتاؤں کے حوالے کر دیگا۔"

ایک اور قہقہہ بلند ہوا۔ کسی نے کہا: "تجھے معلوم نہیں عدل دیوی! تاجدار کے ایوانوں کی بلندی ہماری پستی کی بدولت قائم ہے۔ اولمپس کے محافظ ہم ہیں۔ تو جھونپڑوں کی حفاظت کی خاطر اولمپس کی رفعتوں کو مسمار نہ کر سکے گی۔"

دوسرے نے کہا: "سن دیوی! وہ دن بیت گئے جب تیرا اور تیرے خاوند قانون دیوتا کا بول بالا تھا۔ اب ہمارا دور دورہ ہے۔ ہم لائسندروس کے وفادار ہیں۔ اس کے محلات کی بنیادیں ہمارے گناہوں سے استوار ہیں۔ ہم جرائم پیشہ لوگ شہنشاہِ پاکستروڈیس سے الگ ہو جائیں تو اس کے محلات ریت کے گھروندوں کی طرح ملیامیٹ ہو جائیں۔ اس کا جاہ وجلال ہم سے قائم ہے اور ہم اس سے پائندہ ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے محافظ ہیں۔ ہم اس کے دشمنوں کے جلسے جلوسوں کو تہس نہس کر دیتے ہیں۔ اس کے مخالفوں کے خلاف جھوٹا اور بے بنیاد پروپیگنڈا کرتے ہیں۔

اگر ہم لوگ - ہم بدخصلت اور گناہگار لوگ - اس کا
ساتھ نہ دیں تو وہ ایک دن بھی زندہ نہ رہے - تاجدار
پاکستو وینس نے ہمیں انعام میں تیری قوت اور تیرے
خاوند قانون دیوتا کا بہت سارا حصہ دے دیا ہے
اور دمشق دیوی کو ہمارا غلام بنا دیا ہے - ہم پاپ دیوتا
کے پجاری ہیں اور پاپ دیوتا شہنشاہ پاکستو وینس کا
گہرا دوست ہے۔"

اے پاکستو وینس کے شہنشاہ! میں ان سے الجھ گئی
تو پاپ دیوتا نکل آیا اور اس نے مجھے لہولہان کر دیا میرے
بال دیر نوچ ڈالے۔

لائسندروس :- (مسکرا کر) عدل دیوی! پاپ دیوتا میرا جگری دوست
ہے - میرے محلات کا معمار بھی وہی ہے اور محافظ بھی
وہی - دمشق دیوی اس کی محبوبہ ہے اور اس کی بن بیاہی
بیوی - میں نے ہی اولمپس کی خوشنما چوٹی پر دونوں کا رشتہ
جوڑا تھا - پاپ دیوتا کو میں نے ہی قوت دی تھی تاکہ تیرے
شوہر قانون دیوتا کے مقابلے میں سربلند رہے -

عدل دیوی :- کیا تاجدار ارض و سما لائسندروس ایسی بھیانک لغزش
کر سکتا ہے؟

لائسندروس :- اپنے تخت و تاج کی خاطر ہم سب کچھ کر سکتے ہیں -
تو اور تیرا خاوند میری کیا حفاظت کریں گے! پاپ دیوتا
کے جانباز پجاری میرے تخت و تاج کے بہی خواہ اور
محافظ ہیں - میری بھوکی ننگی رعایا، ٹریمیا مقلیس اور تلاش
سنگ تراش کی مرلی اور اور مجھے دشمنوں سے بچا نہ سکے گی -

کورس :-

دیوتا زاد لائسندروس کی زبان کا اگلا ہوا بول ہمارے
لیے قانون ہے - ہمارا تاجدار یونان کے خداؤں کا منظورِ
نظر اور بالا دست ہے - پاکستو وینس کے باشندے
تیرے عبادت گزار ہیں - برق و رعد کا خالق دیوتا تیرے
قدموں میں سر رکھتا ہے - کراچینا کے ساحل سے ٹکرا کر
پاش پاش ہونے والی سمندری موجیں تیرے گیت
گاتی ہیں -

پاپ دیوتا کے سامنے قانون دیوتا کی کیا مجال ہے
تو نے اچھا کیا جو پاپ دیوتا کو سرفراز کیا - اولمپس کی دیوتاؤں
کی سلامتی اسی میں ہے -

عدل دیوی :- کیا یہ درست ہے تاجدار ارض و سما! کہ آپ کو مجھ سے
پہلی سی محبت نہیں رہی؟

لائسندروس :- کیوں نہیں؟ مجھے تم سے محبت ہے - تو حسین ہے
لیکن .....

(ملکہ ماھیڈرا غصے میں داخل ہوتی ہے)

ماھیڈرا :- کیا کہا تاجدار؟ آپ کو کس سے محبت ہے؟

لائسندروس :- عدل دیوی سے!

ماھیڈرا :- عدل دیوی سے! آپ مجھے فریب دے رہے ہیں
(درد سے ٹکتی ہے) آپ نے مجھ سے بھی کہا تھا مجھے تم سے
محبت ہے - اب اس آوارہ سی دیوی کو پوجنے لگے -

کورس :-

ملکہ پاکستو وینس سچ کہتی ہے - ملکہ کا حسن لازوال ہے -
رعد کا خالق دیوتا زیوس ملکہ ماھیڈرا پہ دل و جان
سے فدا ہو گیا تھا اور ملکہ کو سنہری بدلیوں کی رتھ پہ بٹھا کر
کہکشاں کی راہ ان گھٹاؤں کے پرکیف محلات میں لے گیا
تھا جو بجلیوں کی چمک سے منور ہیں - ہماری ملکہ دیوتاؤں
کے دلوں کی ملکہ ہے - ملکہ ماھیڈرا کے حسن و جمال میں
خارستان کی گل پوش وادیوں کی رعنائی ہے -

ماھیڈرا :- میں نے آپ کی خاطر اپنے وطن کو خیر باد کہا - اس وقت
آپ بادشاہ نہیں تھے معمولی سے ایلچی تھے -

لائسندروس :- مجھے اس کا احساس ہے ماھیڈرا! مجھے تم سے
محبت ہے -

ماھیڈرا :- پھر اس فریبی عورت سے آپ کا واسطہ؟

لائسندروس :- کچھ نہیں - میں اسے سمجھا رہا تھا کہ تیری قوت
محض دکھاوا ہے - اب مجھے تیری اور تیرے خاوند
کی ضرورت نہیں رہی -

ماھیڈرا :- پھر اسے نظروں سے دور کیوں نہیں کرتے؟
اسے قید میں کیوں نہیں ڈال دیتے؟

کورس:

قید کر دو دیوتا شزادہ لائسندروس! عدل دیوی کو بھی۔ اسکے خاوند قانون دیوتا کو بھی۔ یہ ملکہ کی خواہش ہے اور ملکہ کی خواہش پاکستوونیس کے باشندوں کا خون دے کر پوری کی جائے۔ آٹھ کروڑ انسانوں کو ملکہ کی خواہشات پر قربان کر دو۔

لائسندروس :- عدل دیوی اور قانون دیوتا کو قید میں ڈال دو۔

(محافظ عدل دیوی کو گھسیٹ کر لے جاتے ہیں ملکہ تاجدار کا ہاتھ چوم لیتی ہے)

ماھیسٹرا :- میری جانی آپ بہ خدا شہنشاہِ پاکستوونیس! قانون دیوتا نے اپنی بیوی سے مل کر میری بہت ہی خواہشیں مسل ڈالی تھیں۔

کورس -

یہ کون آرہا ہے؟ یہ کیوں آرہا ہے؟ بوڑھا راہب۔ یونان کے خداؤں کا منہ چڑھا نابینا راہب لاٹھی کے سہارے چلا آرہا ہے۔

(راہب داخل ہوتا ہے)

راہب :- پاکستوونیس کے خداؤں کے خدا! تیری خدائی کی قسم! میں اندھا ہوں۔ کچھ نظر نہیں آتا۔ صرف سنتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں۔ غور سے سن تاجدار! تیری حکمرانی کی بھلائی کی بات بتانے آیا ہوں۔ خداؤں نے مجھے پیش گوئی کی قوت عطا کی ہے۔ میں غیبی سی آواز سن رہا ہوں۔ معلوم نہیں یہ آوازیں کس کی ہیں اور کہاں سے آتی ہیں۔ لگتا ہے خوفناک پرندوں کی پھڑپھڑاہٹ میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ میں نے اپنی چھنگلی کے خون کا ایک قطرہ قربان گاہ کی آگ میں پھینکا۔ نہ شعلہ اٹھا نہ لو۔ یہ شگون اچھا نہیں تاجدار! میرے خون کا قطرہ دھوئیں کا مرغولہ بن کر دیوتا ہرکولیس کے مسکن کی طرف اڑ گیا۔ پھر میں نے ایسی بو سونگھی جیسے لاشیں ہیبت آگ میں جل رہی ہوں۔ آگ کے شعلوں نے میری آنکھوں کو دم بھر کے لئے بینائی دی

تو میں نے دیکھا کہ آگ کے دھوئیں میں سے زہریلے چمگادڑ اڑ کر نکل رہے تھے۔ غیبی سی آواز آئی۔ یہ رعایا کی آہیں اور فریادیں ہیں۔ یہ ان کی لاشوں کی آخری ہچکیاں ہیں"۔

دیوتا شزادہ لائسندروس! میرے علم نے کبھی فریب نہیں دیا۔ آتش مقدس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ ابھی چمگادڑوں کے یہ غول اچھا شگون نہیں۔ یہ غول ہرکولیس کے مسکن کی طرف جا رہے ہیں۔ اگر ہرکولیس بیدار ہو گیا تو آسمانوں کو تہہ و بالا کر ڈالے گا اور تیرے اولمپس کے سربلند ایوانوں کو تحت الثریٰ میں دفن کر دے گا۔

میں تیری بھلائی کی بات کرتا ہوں لائسندروس! رعایا کی فریادوں نے جس تاجدار کو ڈس لیا وہ بے گور و کفن مرا۔ اسے گدھ اور کتے کھا گئے۔

لائسندروس :- معزز بزرگ! تیری بزرگی سر آنکھوں پر لیکن تیری باتوں میں میری بھلائی کم اور تیری خودستائی زیادہ ہے۔

راہب :- میری آواز غیب کی آواز ہے۔

لائسندروس :- اور مجھے تیری آواز پہ ذرہ بھر بھروسہ نہیں۔ تو خداؤں کا خوشامدی ہے۔

راہب :- میں کسی کا خوشامدی نہیں۔ تجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں!

لائسندروس :- کیا ہو تم؟

راہب :- سن لائسندروس! آ تجھے اپنی حقیقت بتا دوں۔ میرا نام قائید کیتیس ہے۔ یہ ملک جسے تم پاکستوونیس کہتے ہو میری تخلیق ہے۔ اسی کی بدولت لوگ مجھے ابھی تک قائید کیتیس اعظم کہتے ہیں۔ یہاں کے باشندوں پر غیر ملکیوں کی حکمرانی تھی۔ میں نے باشندوں کو آزاد کیا۔ میں ابھی ان باشندوں کو آباد بھی نہ کر پایا تھا کہ آسمان کی ایک غیبی قوت نے مجھے واپس بلا لیا۔ اب میری روح راہب کے روپ میں بھٹکتی پھر رہی ہے کیونکہ جن باشندوں کو میں آباد نہ کر پایا تھا وہ صرف اجڑے ہی نہیں گئے بلکہ تجھ جیسے حکمرانوں کی ہوس

حکمرانی کا شکار ہو گئے ہیں۔ تیرے امیر و زیر من مانی کر رہے ہیں۔ وہ رعایا کے خون سے رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ ملک میں بھوک اور گناہ کا دور دورہ ہے۔

اور سن لاکسندروس! فطرت کا ہاتھ تجھ سے دو انتقام لینے کو بڑھ رہا ہے۔ ایک عدل دیوی اور اس کے خاوند قانون دیوتا کا انتقام جنہیں تو نے قید میں ڈال دیا ہے۔ دوسرا اس ابلیسیت کا انتقام جس کے رحم و کرم پر تو نے اپنی رعایا کو پھینک دیا ہے۔ آہ دیکھ! کالی گھٹائیں چھا گئی ہیں۔ تم اب اس فیصلے کو بدل نہیں سکو گے۔ فطرت کے قانون کو دیوتاؤں نے کبھی نہیں بدلا نہ بدل سکے ہیں۔ تمہاری ایک بدی سے ایک ہزار چڑیلوں نے جنم لیا۔ یہ چڑیلیں تیری ہی تخلیق ہیں جواب تیرے ایوانوں کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ باہر نکل کے دیکھ تیرے ہاتھوں ستائی ہوئی رعایا کی آہ و فغاں خونخوار چمگادڑوں اور چڑیلوں کے روپ میں تیرے جسم کو چھلنی کرنے کو آ رہی ہے۔ تم اب ان کے ڈنک سے بچ نہ سکو گے۔ تیرے آستانوں اور تیری قربان گاہوں پر اب تیرا ہی خون چڑھایا جائے گا۔ اگن دیو کا رتھ آسمان کا ایک چکر پورا کرے گا تو تیرے ایوان لرزنے لگیں گے۔ تو دیوتاؤں کو پکارے گا پر کوئی بھی تیری دستگیری کو نہ آئے گا۔

لاکسندروس:۔ مقدس راہب! تیری زبان سیاہ ہے ..... (گھبرا کر) ..... کہاں ہو تم؟ کدھر غائب ہو گئے۔ نابینا راہب کہاں چلا گیا؟

کورس:۔

قائیدیمیس! قائیدیمیس اعظم! پاکستونیس کا نجات دہندہ اس قدر خوفناک پیش گوئی کر کے ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ لاکسندروس! عالی مرتبت و عالی پندار! غیب کی آواز اور رعایا کی پکار دو خوفناک حقیقتیں ہیں۔ دو پتھر — جن میں دیوتا بھی دانوں کی طرح پس جاتے ہیں — یہ غیب کی آواز تھی۔ یہ مقدس روح کی آواز تھی۔ عدل دیوی اور قانون دیوتا کو آزاد کر دے شہنشاہ! کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ سسک سسک کے مر جائیں، ان کی سسکیاں طوفان بن کر کوہ اولمپس کو بنیادوں سے اکھاڑ پھینکیں گی۔

لاکسندروس:۔ نہیں! انہیں میں نے قید میں ڈالا ہے، میرا فیصلہ اٹل ہے۔

کورس:۔

دیوتا زاد شہنشاہ! وہ سامنے دیکھ۔ تیرے باغیچے میں نصب کیا ہوا پتھر کا بت۔ ہاں وہ ننگی عورت کا بے جان مجسمہ۔ جسے فلاں سنگ تراش نے تراشا تھا اور تیرے حضور پیش کیا تھا۔ سنگ تراش کا کمالِ فن — ایک عورت کا بت، سر جھکائے ہوئے۔ اس نے اس کا نام 'امید' رکھا تھا تو نے کہا تھا — "امید سوچ میں بیٹھی ہے سر جھکائے ہوئے" دیکھ بادشاہ سلامت! بت نے سر اٹھا دیا ہے پتھر میں حرکت ہو رہی ہے۔ امید، سر اٹھا رہی ہے۔ زندہ ہو رہی ہے۔ قائیدیمیس کی روح مقدس پتھر میں جان ڈال گئی ہے۔

لاکسندروس:۔ (گھبرا کر) یہ لرزہ کیسا؟ تم نے محسوس کیا؟ وہ بت اٹھا دو۔ سمندر میں پھینک دو۔

کورس:۔

کوہ اولمپس ہل رہا ہے۔ ایوانوں کی بنیادیں کانپ رہی ہیں۔

قربانی دو۔ لاکسندروس! قربانی دو۔

کیسی قربانی؟ کس کی قربانی؟

اپنی۔ اپنے تخت و تاج کی۔ شہنشاہیت کو بھینٹ چڑھا دو۔

وہ کون آ رہا ہے؟

ہرکولیس ..... ہرکولیس۔

اگن دیو کا رتھ ایک چکر پورا کر چکا ہے۔

(ہنگامہ۔ شور۔ طوفان)

ہرکولیس ..... ہرکولیس۔

قائیدیمیس اعظم نے اپنی روح ہرکولیس کو دے دی۔

خداؤں نے ایک خدا کے حضور دم توڑ دیا ہے۔

ہرکولیس ایوانوں کی طرف آ رہا ہے ..... پھنکار رہا ہے

.... اس کی آنکھوں سے آگ برس رہی ہے۔ اور اس کے پیچھے وہ ہجوم کیسا؟ وہ کون لوگ ہیں؟

تیری رعایا۔

لائسندروس:۔ میری رعایا؟ کیا میری رعایا میرے ایوانوں میں گھسی آ رہی ہے؟ گستاخ رعایا۔ بھوکی ننگی رعایا میرے باغوں کے سبزے کو پامال کرتی آ رہی ہے! بلاؤ۔ میری فوجوں کو بلاؤ۔ ایلچی کہاں گئے؟ میرا کمانڈر کہاں گیا؟ میرے دیوتاؤں کو بلاؤ۔ باپ دیوتا۔ دھن دیوی۔ بچاؤ۔ میرے ایوانوں کو بچاؤ۔!

کورس:

اب اپنی فوجوں کے کمانڈر کو مت بلاؤ۔ وہ ہرکولیس کی روح میں تحلیل ہو گیا۔ وہ قائید میس اعظم کی روح مقدس کا جز بن گیا ہے۔ وہ اب ہرکولیس کے روپ میں قائید میس کا عظیم پیغام اور عظیم عزم لے کر آ رہا ہے۔ تیرے ایوانوں میں شگاف پڑ گئے ہیں۔ پاتال کے دروازے کھل گئے ہیں۔ ابوالہول کی بھول بھلیاں آزاد ہو گئی ہیں۔ باپ دیوتا اور دھن دیوی سمندر میں ڈوب مری ہے۔ عدل دیوی اور قانون دیوتا آزاد ہو گئے ہیں۔

وہ دیکھ ٹرمیا مغلیس اور قلاش چلے آ رہے ہیں۔ وہ خوش ہیں۔ ان کا نجات دہندہ پیش پیش ہے۔ وہ دیکھ! امید کا مجسمہ رقص کر رہا ہے ــــ دیوانے کا رقص مستی و شادمانی کی دیوانگی۔

ہم بھی تیرا ساتھ چھوڑتے ہیں۔ تو نے ہمیں فریب دیا۔ ہم نے تمہیں فریب دیا۔ آج فریب کاروں پر موت نے پردہ ڈال دیا ہے۔

پاتال کی تہوں میں جھانکو۔ وہاں کون سرگوشیاں کر رہا ہے۔
لائسندروس اور ماھیڈرا زوئیں۔

(پاتال کی تہہ میں)

لائسندروس:۔ باپ دیوتا نے دھوکہ دے دیا۔

ماھیڈرا:۔ ہم نے اپنے آپ کو دھوکہ دیا۔

لائسندروس:۔ اب کہاں چلیں؟

ماھیڈرا:۔ دیوتاؤں کے پاس۔

لائسندروس:۔ کون دیوتا؟ وہ تو میری اپنی تخلیق تھے۔ میری اپنی تخلیق نے مجھے تحت الثریٰ میں قید کر دیا۔

ماھیڈرا:۔ کسی اور دیس چلیں؟

لائسندروس:۔ کون سے دیس؟

ماھیڈرا:۔ جہاں ہماری ہوس ہمارے تعاقب میں نہ آ سکے۔

لائسندروس:۔ یہ آوازیں کیسی؟ سن رہی ہو ماھیڈرا؟ یہ دھما کے اور دھماچوکڑی؟

ماھیڈرا:۔ ہماری رعایا خوشیاں منا رہی ہے۔ ہماری شکست پر ناچ رہی ہے۔ اور کس قدر ہیبت کس قدر اندھیرا۔ یہ رات کس قدر ہیبت ناک ہے یہ کیسی رات ہے؟

لائسندروس:۔ یہ دسویں مہینے کی ستائیسویں رات ہے۔ میرا ہاتھ تھام لو ماھیڈرا! میں ڈر رہا ہوں۔ میرے گناہ مجھے ڈرا رہے ہیں۔

ماھیڈرا:۔ افسوس! ہم نے حقیقت کو بہت دیر سے دیکھا!

رپورتاژ:

خراماں خراماں ارم...

طاہر اصغر

جیسے ہی یونیورسٹی کے امتحان ختم ہوئے اپنے دل میں وہی ہر سال انگڑائی لینے والی آرزو پھر مچلنے لگی — کاش ہم تعطیل کا عرصہ کراچی کی گرفت سے آزاد ہوکر دیس کے کسی پر امن، ان دیکھے پہاڑی مقام پر گزار سکیں لیکن شاید ہماری آرزوئیں بعض اوقات اتنی چھوٹی ہوتی ہیں کہ ہم ان کو خاطر میں نہیں لاتے اور مستقبل کے کسی خوشگوار سنہرے دن کے کلینڈر پر ٹانگ دیتے ہیں۔ اور پھر کراچی والوں کے لئے کچھ کراچی سے لنگا کمبل والا معاملہ ہے — یعنی ہم تو کمبل کو چھوڑ دیں کمبل ہم کو نہیں چھوڑ تا۔ چھوٹی چھوٹی، نت نئی ہنگامی مصروفیتوں کا نہ ختم ہونے والا چکر اور پھر اگر تنگیٔ داماں نہ ہو تو تنگیٔ دست وجیب بھی اس حصار سے باہر نہیں آنے دیتی۔ کچھ بھی سہی لیکن اس بار تو گرمیوں کا جلالی سورج اس طرح سر چڑھ آیا کہ ہم نے دل میں ٹھان ہی لی کہ چاہے قرض لینا پڑے لیکن تعطیلات شمالی پاکستان میں ہی گزاری جائیں گی خواہ وہ جگہ بالکل ہی اجنبی کیوں نہ ہو۔ آخر کب تک اس آرزو کو جو گرمی کے ساتھ چمکتی اور بجھ جاتی، ہم تھپکاتے رہتے۔ اور پھر ہمیں اس سے زیادہ اپنی غزلوں اور کہانیوں کا فکر تھا جو چاکیواڑہ، بکرا پیڑی اور گاڑی کھاتہ قسم کے غیر رومانی ماحول میں مرجھانے لگی تھیں۔ گیتوں میں سے رس اور کہانیوں میں سے پھول غائب ہو رہے تھے۔ ادھر ماہِ نو میں پاکستان کی حسین سرزمین اور سکاتی ہوئی وادیوں کی تصویریں دیکھ دیکھ کر لوٹ جاتا تھا۔ ایک دن ایک بزرگ شخص نے جو ہرگز سبز پوش یا خضر صورت نہ تھا مجھ سے کیفے سبزنہ میں کافی پیتے ہوئے کہا تھا:

"برگساں اور کانٹ کی نہیں، وارث شاہ اور لطیف کی باتیں کرو۔ لائبریریوں کی نہیں، تاکستانوں اور پہاڑوں پر جھلملاتی ہوئی برف کی باتیں کرو۔ جاؤ، حسین، بلند اور رنگین چیزوں کے متعلق سوچو۔" اور اچانک شعور کے پردہ پر مری سے لطیف کاشمیری کے آئے ہوئے خط نے جگہ لے لی۔ جس نے بڑے خلوص سے مری بلایا تھا۔

مری۔ حسین، بلند اور رنگین! اب میرا دل بے قرار تھا۔ کراچی کی تیز ہوا سے بھی زیادہ بے قرار لیکن میں نے دل سے کہا:

"اے میرے دل! تو صبر کر۔ بے وقوف مت بن — اگر مری جانا اتنا ہی آسان ہوتا تو پھر تو کب کا ہو آتا۔"

لیکن میرے دل نے کہا۔ حضرت! آپ ہمیشہ کباب میں ہڈی بنتے ہیں۔ ریل میں بیٹھئے اور جائیے۔ کونسے آپ ہفت اقلیم سر کرنے چلے ہیں۔

میں نے دل کو فوراً قائل کیا۔

"جی ہاں اس زمانے میں ہفت اقلیم سر کرنا آسان ہے لیکن دل کو خوش کرنا شاید بہت مشکل ہوگیا ہے۔ سنئے مسٹر! کرایہ نہیں ہے اور ہم بغیر ٹکٹ سفر کر کے فی الحال جیل جانے کی موڈ میں نہیں ہیں، سمجھے۔"

دل بے چارہ خاموش تھا۔ مخلص دوست کی طرح، اور کئی دن بالکل خاموش رہا۔ لیکن ایک دن دروازہ پر ڈاکیہ کی دستک کے ساتھ فوراً چیخ اٹھا کیونکہ ایک ایڈیٹر[1] نے اتفاق سے نہ صرف کئی افسانوں اور نظموں کے پیسے بھیج دیئے تھے بلکہ سابق نوکری کی تنخواہ بھی عنایت فرمائی تھی۔

"کہئے کون جیتا؟ آپ یا میں۔ بولئے اب بھی کوئی عذر ہے۔ چلئے میں۔ میاں زندہ رہنا سیکھو اور میری بات مانا کرو۔ میں تم سے آگے تک دیکھ سکتا ہوں۔ چلو اٹھو۔" میری آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں اور میں محسوس کرنے لگا کہ مری صرف عالیشان ہوٹلوں، زرق برق لباسوں والی بیگمات، کانونٹوں اور کالجوں میں پڑھنے والی گلیمرس لڑکیوں اور چمکدار کاروں والے رئیسوں کے لئے ہی نہیں، ہر کی

---

[1] : یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ! — ورنہ اتفاق اور ایسا اتفاق!! (مدیر)

پیار بھری باہنیں سیاحوں، طالبعلموں اور غریب فنکاروں کے لئے بھی دراز ہیں۔

دوسرے دن سے میں نے کراچی کو خیرباد کہنے کی تیاری شروع کردی۔ سفر کے خوشگوار تصورات اور زمین کی نئی اور اجنبی مسکراہٹوں کے تصور سے جی خوش تھا۔ حالانکہ میں نہ کوئی کولمبس یا واسکوڈی گاما تھا اور نہ یوری گاگرین ہی تھا۔ جو تسخیرِ زمین یا سیرِ کائنات کے لئے نکلا ہو۔ لیکن میں خاصا ایڈونچرس تھا اور مجھے خوشی تھی کہ میں اپنے ہی دیس کی مانوس گلیوں، سوندھی مٹی سے مہکتی ہوئی بستیوں اور عام بولیوں ٹھولیوں سے آباد میلوں کی سیر کرنے چلا ہوں جہاں زندگی سست، دھیمی، قدرتی اور گیتوں بھری ہے۔ چنانچہ اب کراچی کے بازار اور پُر رونق سڑکیں ایک دم سے پرکیف اور رومانی رومانی نظر آنے لگیں۔ انتظار اور تیاری کے دو دن تیزی سے گزر گئے اور سفر کی رات دوستوں سے گپ لڑانے اور سڑکوں پر گشت کرنے میں گزری۔ میرے دل میں ایک عجیب فتح مندانہ احساس ابھر رہا تھا۔ کراچی ہمیں نہ چھوڑنے ہم کراچی کو چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ جیسے کراچی میرا دامن پکڑے ہو اور میں اس کا دامن جھٹک کر جا رہا ہوں۔ مسافر کی طرح پردیسی کی طرح۔ آج کراچی کی نیون لائٹوں سے جگمگاتی صدر کی ٹیکنی کلر سڑکیں بڑی البیلی لگ رہی تھیں۔ لوگوں کے مانوس چہرے اور دوستوں کے قہقہے بڑے پیارے معلوم ہو رہے تھے۔ میں اعلان کر چکا تھا:

"دوستو! میں کراچی کی گرفت توڑ سکتا ہوں۔ بالکل اس طرح جس طرح راکٹ زمین کی کشش کو پھلانگ کر خلاؤں میں جا سکتا ہے میں کراچی سے دور جا سکتا ہوں جس کے ہم خواب دیکھا کرتے ہیں۔ آج اس کے دروازے ہمارے لئے بھی کھل گئے ہیں۔ آؤ، کافی کا ایک تلخ پیالہ پیو اور مجھ مسافر کو دیس کے سندر روپ اس کے مرغزاروں اور گلزاروں کے نام سلام کہو۔"

آج میرے دوست واقعی خوش تھے۔ پہلی بار بڑے خوش شاید اس لئے کہ کچھ دن آپس میں نہ ملنے کی امید پیدا ہو گئی تھی لیکن وہ ناخوش بھی تھے کہ ہم سفری نہ ہوئی اور ہم سفر کی خوشگوار وادیوں میں ہمراہ نہ چل سکے۔

وہ خوش بھی تھے اور اداس بھی! آج رات مختلف چوکوں، بس اسٹینڈوں اور چائے خانوں میں ان سے ملاقات ہوئی تو ان سب کے چہرے چمکدار اور الفاظ خوشگوار تھے۔ آج ان کے مصافحے روز کی طرح نرم نہ تھے اور مجھے یہ فکر تھی کہ اب اس شہر میں اور کون اتنا اذیت پسند ہوگا جو بغیر کافی پیئے ان کے طویل مختصر افسانے سن لے گا!

صبح کی جلد جاگ اٹھنے والی سڑکوں پر سے ہو کر رکشہ ٹیکسی کینٹ اسٹیشن کی طرف دوڑ گئی۔ ٹرین کی روانگی میں کچھ دیر تھی۔ پلیٹ فارم مسافروں سے اور ان کے رخصت کرنے والوں سے پٹا ہوا تھا۔ ہم نے انٹر کلاس کی ایک برتھ پر قبضہ کر لیا اور اپنے رخصت[1] کرنے والوں کی توقع میں پلیٹ فارم پر گھومنے لگے۔ لیکن پلیٹ فارم پر ایک بھی شناسا نہ تھا۔ ایک بھی چہرہ۔ ایک بھی رومال۔ ایک بھی آنچل اور ایک بھی ہاتھ اپنا نہ تھا۔ ٹرین گارڈ کی جھنڈی کے ساتھ رینگنے والی تھی کہ ایک دوست آتا ہوا نظر آیا۔ جس سے کل ملاقات نہ ہوئی تھی کیونکہ وہ کسی مشاعرہ میں مدعو تھا۔ ہم دل ہی دل میں اس شخص کے خلوص اور محبت کے قائل ہونے ہی والے تھے کہ کھڑکی میں منہ ڈال کر اس نے چلتی ہوئی گاڑی کا ساتھ دیتے ہوئے کہا۔

"یار معاف کرنا دیر ہوگئی۔ رات بڑی شاندار آزاد نظم کہی تھی۔ خیر اب تو جاؤ ــــ خط میں لکھ کر بھیجوں گا ــــ خدا حافظ۔"

"خدا حافظ" ــــ اور ٹرین چھاؤنی کے صاف ستھرے اسٹیشن سے باہر نکل گئی ــــ پلیٹ فارم پر کئی آنچل، کئی رومال، کئی ہاتھ اور کئی چہرے مسافروں کو ابھی تک الوداع کہہ رہے تھے۔

"جلدی جلدی خط بھیجنا۔ اپنا فوٹو بھی بھیجنا" کوئی ماں اپنے بیٹے کو ابھی ابھی چیخ کر کہہ رہی تھی اور میں نے پہلی بار سوچا کہ کراچی کا بھی دل کی دھڑکنوں سے کوئی تعلق ہے۔ کئی آنکھیں جانے والوں کی آنکھوں میں جانے کیا کہہ رہی تھیں۔ شاید وہ کہہ رہی تھیں۔ "ہم پھر ملیں گے" اور بڑا سا ڈیزل انجن ٹرین کو آہنی پٹریوں پر سے کر اڑنے لگا اور گاڑی تیزی سے کراچی کی حدود سے گزرنے لگی۔ شہر کی مانوس سڑکیں۔ پل۔ چوراہے، گھر اور درخت دور تک مسافروں

---

[1] : این خیال است و محال است و جنوں! (مدیر)

[2] : "ہمت مرداں مددِ خدا" (مدیر)

کے چہروں کے سامنے پھیلے ہوئے تھے جو رسالے دیکھ رہے تھے یا اخبار پڑھ رہے تھے۔ گاڑی اپنے آہنی پہیوں سے ایک مخصوص ساز بجاتی ہوئی کراچی کے گنجان علاقے کو پیچھے چھوڑتی ہوئی بڑھ گئی۔ کسی بنگلے کوٹھیوں کے لانوں پہ بچے کھیل رہے تھے وہ ٹرین دیکھ کر رُکے۔ ہمارا منہ چڑایا اور کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ بہت سی کاریں اور سواریاں سڑکوں پر سے گزر رہی تھیں اور درختوں کی شاخیں دھیرے دھیرے جھوم رہی تھیں۔ کراچی کے کاروباری بازاروں' دواؤں' علاج معالجوں۔ سگریٹوں اور بسکٹوں کے اشتہار جابجا دیواروں پہ نظر آرہے تھے جیسے وہ کراچی کے رخصتی پیغام سنا رہی ہوں اور دور ہوتی ہوئی کراچی اب ہر لحظہ پیاری نظر آنے لگی۔ میں آپ ہی آپ اس کے خیابانوں۔ پارکوں اور اس کی عالیشان عمارتوں کو افق کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر سوچنے لگا:۔

"اے میرے شہر! جب دس سال قبل میں تیرے بازاروں اور گلی کوچوں میں اپنی ماں، بہنوں اور بھائیوں کے ساتھ آیا تو تو میرا شہر نہ تھا۔ تیرا چہرہ اجنبی تھا۔ میں نے تیرے گلی کوچوں میں نئی امید، اور نئی زندگی کی جوت دیکھی۔ یہاں مجھے تعلیم ملی یہیں میں نے لڑکپن کی حدود سے نوجوانی میں قدم رکھا اور پہلی مرتبہ مجھے چاندنی چنبیلی کے پھول اور رات کے ستارے اچھے معلوم ہوئے۔ محبت نے یہاں پہلی بار میرے دل کے دروازے پر دستک دی اور دریچے میں روشنی پھیلائی، یہاں نفرت بھی ملی اور پیار بھی۔ یہاں مایوسی کے اندھیرے بھی نکلے اور کامیابی کے چاند بھی۔ اے میرے شہر! تو نے مجھے پیار اور احساس کے پھول بھی دیئے اور نفرت و دل شکنی کے کانٹے بھی۔ یہاں میں نے زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پہلی دفعہ دیکھا۔ پیار کی پہلی دستک سن کر اس کے لئے دروازے کھول دیئے لیکن اس کی ہر دستک ٹریفک کے غل میں ڈوب ڈوب گئی یہاں میں نے طوفانی ہواؤں اور برسات کی راتوں میں افسانے بھی لکھے اور گیت بھی گائے۔ چاندنی راتوں میں جب بادل خوبصورت جزیروں کی طرح نظر آتے ہیں اور سمندری ہوائیں چلتی ہیں میں نے اپنے دریچوں میں محبت کی خوشبو سونگھی لیکن وہ گلاب کی کلیاں نہیں، اکثر میکس فیکٹر کی مہک تھی۔

اے میرے شہر! تو عظیم ہے۔ اور آج جب میں تیری حدود سے نکل رہا ہوں تو میرا دل تیری محبت سے لبریز ہے۔ یہاں ہماری زندگی کے گم شدہ جزیرے ہیں اور یادوں کے سرسبز کنج بھی۔ مجھے تیرا ہر رنگ پیارا ہے۔

گاڑی پارکنگ پٹڑیوں کے جال پھلانگتی اور بل کھاتی جھومتی ہوئی شہر سے نکل آئی تھی۔ اس کی نشانیاں آہستہ آہستہ پیچھے ہوتی گئیں اور کراچی کی گرفت ٹوٹ گئی اور مصروف، تیز اور رنگا رنگ جدید زندگی پل کی پل میں پیچھے رہ گئی! ایک چھوٹی سی پٹیا پر لکھا تھا:۔ "کراچی دس میل" ——! میں یہ سوچنے لگا کراچی کی انگلیاں آخری لمس ہے۔ یہاں سے میرا شہر ختم اور میرا سفر شروع ہے۔ یہ پگڈنڈی کا پہلا موڑ۔ راستے کا سنگ میل اور شہر کی آخری آواز ہے۔ اب میں اپنے شہر کے اچھے اور برے لوگوں سے دور جا رہا تھا۔ میرا شہر جہاں زندگی کا ایک سمندر بھی ٹھاٹھیں مارتا ہے اور لوگوں کے دماغوں میں فکر معاش بھس کی طرح گھس گیا ہے۔ جہاں کیڈلک کاریں، ٹرامیں، بسیں اور گدھا گاڑیاں ہیں۔ جہاں ملک میں سب سے زیادہ مزدور اور طلبا اور طالبات ہیں۔ جہاں دھنواں اگلتے ملوں کی چمنیاں ہماری جدید اور صنعتی قوم ہونے کا اعلان کرتی ہیں۔ جہاں شہر کم اور ہوٹل زیادہ ہیں۔ اور جہاں قہوہ خانوں میں شام ہوتے ہی عینکوں کے موٹے شیشوں اور الجھے ہوئے بالوں والے شاعر اور ادیب مل کر بیٹھتے ہیں۔ کافی کے تلخ پیالے پیتے ہیں اور سگریٹ کے دھوئیں کے پیچھے سے زندگی کی بہار اور خوبصورتی کے خواب دیکھتے ہیں۔ آگے بڑھتی ہوئی توانا اور متحرک زندگی کے افق پر جن کی نگاہیں ہیں جو اقبال۔ برگساں۔ شوپنہار۔ کی کتابیں پڑھتے ہیں اور دن بھر محنت کر کے روزی کماتے ہیں۔ جہاں فن تجارت ہے اور تجارت فن ہے۔ جہاں میرے پیارے پیارے دوست کئی کئی سال تک سمندروں کے نیلگوں رنگ، باغ کی شام، اور ساحلوں پر تاڑ کے بلند درختوں کو نہیں دیکھ سکتے۔ جہاں بحرِ عرب کی بیکراں سرکش موجیں ساحل ریگزار پہ آ کر بچوں کے پیر چومتی اور تجارتی جہاز لنگر اٹھا کر عالمی برادری اور قوموں کے رشتے استوار کرتے ہیں اور جس کے کلبوں میں اطالوی گانے امریکی رقص، ہسپانوی عورتیں جاپانی لباس اور جنوبی امریکہ کی موسیقی ملتی ہے۔ جہاں طیاروں پہ سے بغداد اور اصفہان اور بنکاک

پیشتر و تیزتر

دو غلطوں، سیم اور تھور، کے خلاف جہاد۔
امریکی سائنسی مشن کی آمد اور اس مہم کے سلسلے
میں مشورہ و تعاون

ایوان معاصر نقاشی (راولپنڈی)

پاکستان میں بالعموم اور نئے دارالحکومت 'اسلام آباد' میں
بالخصوص علم و فن کی گرمئ بازار ترقی میں ایک اور اضافہ
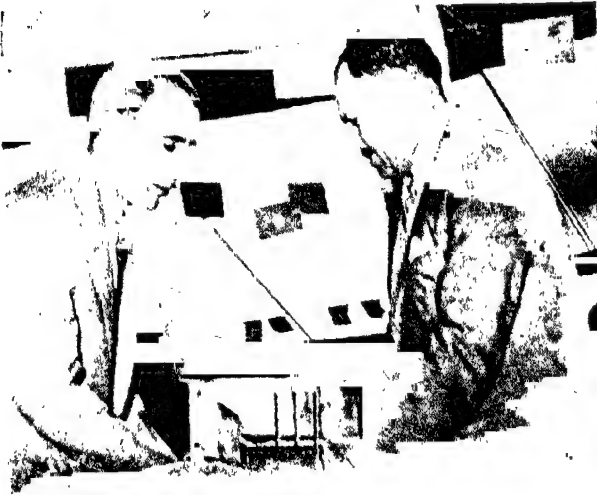
کارخانہ گرمائی بجلی (حیدرآباد)
صدر پاکستان کو پاور اسٹیشن کے ماڈل کی پیشکش

اور دلّی اور نیویارک سے ماسکو اور لندن سے اپنی اپنی بولیاں اور قومی لباس پہنے ہوئے مسافر اترتے ہیں۔ ہاں یہ میرا شہر تھا۔ اور ٹرین ملیر کے سرسبز کھیتوں اور نخلستانوں سے تیزی سے گزر رہی تھی۔ آگے وسیع صحرا پھیلا تھا جس میں بارش نے نرم گھاس بچھا دی تھی۔ ٹرین ایک دل کش ساز کی دھن پر ٹیلوں، ببول کے سنہری پھولوں والے درختوں اور ٹیلیفون کے کھمبوں کو پیچھے چھوڑتی دوڑتی، جا رہی تھی۔ دشت اور خار مغیلاں۔ میں نے منظر کی یکسانیت سے بیزار ہو کر اخبار میں پناہ لی اور پھر افسانوں کی کتاب میں۔

ٹرین دوڑتی رہی اور چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں کو چھوڑتی گئی۔ ان ہی بستیوں میں کہیں قریب ہی ٹھٹھ کا شہر تھا۔ جہاں سے ماضی میں ہماری تہذیب کے کئی قافلے گزرے تھے۔ جہاں شاہجہان کی پر وقار مسجد اور علما کے بے چراغ و گل مزار تھے۔ لیکن ٹرین اب کوٹری کے بڑے سے اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ اور مجھے ایک دم سے کوٹری بیراج یاد آ گیا۔ اب ہم سندھ کی وادی میں آ گئے تھے۔ اسٹیشن پر لوگ اپنے علاقائی لباسوں میں ملبوس نظر آ رہے تھے۔ اکثر دیہاتی اور کسان تھے۔ ٹرین اتنی دیر کھڑی رہی کہ شاید ہم دریائے سندھ پر جا کر مچھلی کا شکار کر کے آ جاتے لیکن ہم نے تازہ مچھلی کے کباب خریدے اور کھائے اور ٹرین چل دی۔ چند منٹ بعد ہی ٹرین دریائے سندھ کے عظیم پل کے اوپر سے گزر رہی تھی۔ پل کے آہنی پیکر کے اوپر سے گاڑی کوندتی اور گاتی ہوئی گزر رہی تھی اور نیچے عظیم دریائے سندھ کی وسیع اور بیکراں پانی کی شفاف چادر پھیلی ہوئی تھی —— جو اس میدانی علاقے میں اپنی زرخیز مٹی کو بچھاتا ہوا صدیوں سے اسی دھیمی رفتار سے بہہ رہا تھا۔

میں سوچنے لگا اگر یہ دریا وادیٔ مہران کی موجِ رواں ہمارے دیس میں نہ ہوتا تو ہمارا ملک تہذیب سے بھی کتنا بے خبر ہوتا اس دریا نے ہماری تہذیب کی کاکلیں سنواری اور اس وادی میں نغموں اور گیتوں کو جگایا ہے۔ اس کی زرخیز مٹی میں کپاس اور گیہوں کی قیمتی فصلیں ہی نہیں پیدا ہوتیں بلکہ ان کی بدولت یہاں کے محنتی ہاریوں کے ہاتھوں میں الغوزے[1] اور سارنگی بھی آ جاتی ہے۔ اس دریا نے قدم قدم پر تہذیب کے نشان چھوڑے ہیں جو اس کے راستے بدل جانے سے آہستہ آہستہ ویرانوں میں بدل گئے۔ موئنجو دارو، ٹھٹھ، سہوان اور ہالہ اس کے بیٹے ہیں اور موجودہ حیدرآباد اسی کے کناروں پر آباد ہے۔ اس دریا نے اسکندر کے گھوڑوں کی ٹاپیں بھی سنی ہیں اور چنگیز خاں کی ظالم فوجوں کا رخ بھی موڑا ہے۔ یہیں اسلام کی اذان پہلی بار گونجی اور نئے تمدن کا پودا لگا۔ اس زمانے میں بھی دریا کا پاٹ اتنا زبردست تھا کہ اس کے دونوں کنارے بیک وقت مشکل ہی سے نظر آتے تھے تو پھر سیلاب کے زمانے میں تو یہ دریا واقعی سندھ ساگر ہی بن جاتا ہے۔ دریا گزر گیا —— اور اس کے کناروں پر سیلابوں کی لائی زرخیز مٹی دور دور تک بچھی ہوئی تھی۔ پانچ دریاؤں کی زرخیزی اور سیرابی لانے والا یہ عظیم اور طوفانی دریا اس علاقے کی تہذیب اور تاریخ کا خالق ہے —— جہاں اس کی طوفانی لہریں ہر سال ہزاروں لوگوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیتی ہیں وہاں اس کی زرخیزی اور اس کی سونا اگلنے والی دھرتی بھی اسی کی ممنون ہے۔ ان ہی لہروں کی بدولت ہمارے عہد کا مایہ ناز کارنامہ کوٹری بیراج کا نہری نظام قائم ہے جس نے اجاڑ اور بنجر وادیوں کو سرسبز مرغزاروں اور سنہری کھیتوں میں بدل دیا ہے۔ اور جہاں الغوزوں کی راگنیاں گونج اٹھی ہیں۔ جب یہ دریا اپنی عادت کے مطابق رخ بدلتا تھا تو اس علاقے کی زندگی اور تہذیب بھی اپنا رخ بدل لیتی تھی۔ آج انسان اس کی سرکش اور فیاض لہروں کو اپنا تابع بنا رہا تھا اور پھر اسکی مٹی زیادہ زرخیز اور اس کے گیت زیادہ رنگین ہو جائیں گے۔

میں ان ہی خیالات میں گم تھا کہ دریائے سندھ کا بیٹا، "حیدرآباد" آ گیا اور اس کے گھروں کے دودکش اور اس کی سڑکیں نظر آنے لگیں۔ یہاں صحرا کی ویرانیوں کی جگہ دریا کی طرف سے آنے والی ہوا کے جھونکے تھے۔ ہر طرف سرسبز درخت اور باغ تھے۔ نہریں اور کھیتیاں تھیں —— میں اس شہر میں پہلے بھی آیا تھا مگر آج میں اس شہر سے گزر رہا تھا —— کلہوڑوں اور تالپوروں کا بسایا ہوا یہ شہر قدیم کہنہ آثار سے بھرا پڑا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ ایک شام کو اس شہر کے شاداب اور خاموش باغ

[1]: اور اب اصلاحات اراضی کے بعد سے وہ اپنی زمینوں اور قسمت کے مالک آپ بن گئے ہیں۔ ان الغوزوں اور سارنگیوں کی کیف آفریں صدائیں اور بھی زیادہ ہو گئی ہیں۔ (مدیر)

میں ایک بوڑھے سندھی نے سارنگی پر مجھے سچل سرمست کا ایک گیت سنایا تھا جس کے بول تصوف اور محبت سے پُر تھے۔ اور پھر گھنٹی بجی، وسل ہوئی۔ اور ٹرین حرکت میں آگئی۔ لیکن اب ہم گاڑی میں نہ تھے۔ کیونکہ ہم نے حیدرآباد میں دو چار گھنٹے گزارنے کے لئے فی الحال یہیں کا ٹکٹ لیا تھا۔ ہاں ہم گاڑی میں رات کر سکتے۔ اور گاڑی لق و دق جنگل میں سے گزرنے لگی۔ جا بجا کھیت، اور کالے کالے درخت رات کے اندھیرے میں مجرموں کی طرح سر جھکائے پیچھے کی سمت بھاگے جا رہے تھے اور گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی سندھ کی وادیاں اور دشت و جبل پھلانگتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ میں نے ڈائننگ کار سے کھانا منگا کر کھایا اور سونے کی کوشش کرنے لگا دیر تک خراٹوں کی وجہ سے کمپارٹمنٹ میں غل و شور رہا آخر میں نے سوٹ کیس سے راتوں کی نیند حرام کر دینے والا سنسنی خیز ناول نکالا جس سے خراٹے لینے والوں کی نیند حرام ہوگئی اور میں کچھ دیر سو سکا۔

جب کافی دیر بعد آنکھ کھلی تو ٹرین کسی بڑے سے کشادہ جنکشن پر کھڑی تھی۔ یہ خیرپور تھا۔ اسٹیشن پر گلاب کے پھولوں اور دھان کے کھیتوں سے گزر کر آنے والی ہوا آ رہی تھی۔ کئی مسافر ڈبے سے اتر گئے اور کئی مقامی ہاری اور سندھ کے کسان آئے۔ ان کے لباس مقامی اور سادہ تھے۔ کچھ دیر بعد ٹرین کا بھاری بھرکم ڈیزل انجن پھر ٹرین کو لے کر آگے بڑھ گیا اور ٹرین رات کے ہلکے ہلکے سرمئی اندھیرے میں سرپٹ دوڑنے لگی۔ دونوں طرف بجلی کے کھمبے، بھرے بھرے کھیت، ببول، نیم، کیکر، آم اور شیشم کے درخت بھاگے جا رہے تھے کئی جگہ نہریں چمک جاتی تھیں۔ یہ کسانوں اور دھرتی کے بیٹوں کی سرزمین تھی۔ یہاں ہل کے نشان تھے اور مٹی کے گھروندے تھے۔ یہ سرزمین، اس کے انسان اور اس کے کچی مٹی کے گھروندے اتنے ہی پرانے تھے جتنی اس علاقے کی تہذیب۔ یہاں موئنجوداڑو — پاکستانی علاقہ میں ایک قدیم مہتم بالشان تہذیب کا مظہر — کی گلیاں تھیں اور سہوان اور ہالہ کے مٹی کے برتن تھے۔ یہ سچل سرمست اور شاہ لطیف کے عشق اور پیار کا دیس تھا۔ یہ مومل رانو، سسی پنوں اور عمر ماروی کی الفت کی داستانوں کی سرزمین تھی۔ یہ ہاریوں کے الغوزوں، ان کے آنسوؤں اور مسکراہٹوں کی دھرتی تھی۔

اور گاڑی جیسے اپنی دھن میں مست اپنے قدموں کی تال میں گم مدہوش اور لہکتی ہوئی چلی جا رہی تھی اور میں دیر تک وطن کے دشت و جبل سوتے ہوئے جنگلوں اور بھیگتی ہوئی رات کی سیر کرتا رہا اور پھر برتھ پر چڑھ کر سو گیا نیند کا فرشتہ سبحان مجھ کو پھر کراچی کی گلیوں میں لے گیا تھا۔ جب میں جاگا تو ٹرین کی کھڑکی سے سپیدۂ سحر جھانک رہا تھا اور دور کھیتوں اور میدانوں پہ ہلکا ہلکا نور برس رہا تھا۔ ستارے رخصت ہو رہے تھے اور صبح کی تازہ دم ہوا، اور بھیگی بھیگی پون جو دھان کے نرم پودوں، نہروں کے کنارے اُگنے والے پھولوں کی شبنم، ستاروں کی موسیقی، دھرتی کی شادابی اور مٹی کی خوشبو سے بسی ہوئی ہے۔ ہولے ہولے آ رہی تھی۔ ٹرین سندھ عبور کر کے نہ جانے کب پنجاب کی حدود میں داخل ہوگئی تھی۔ درختوں کی شاخیں سپیدی مائل آسمان کے آگے سیاہ تصویروں کی مانند کھڑے تھے۔ جب میں منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہوا اور ٹائلٹ سے باہر آیا تو گاڑی بہاولپور کے بڑے اور خاموش اسٹیشن سے گزر رہی تھی اور صبح کی پھیلتی اور اُبلتی روشنی میں کھیتوں کے بیچ سے دیہاتی ناریاں کنوئیں سے پانی بھر بھر کر اٹھائے لئے جا رہی تھیں۔ مٹی کے گھڑے، بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی اور ہولے ہولے اٹھتے ہوئے قدم۔ جنگلے کے باہر رنگ برنگے پھول کھلے تھے اور سرسبز درختوں کی گھنی شاخوں میں چڑیاں شور مچا رہی تھیں۔ کتے پلیٹ فارم پر بڑے مصروف انداز میں ادھر سے ادھر دوڑتے پھرتے تھے۔ یہ کتے ہر اسٹیشن کے بڑے ہی مانوس فیچر ہیں جو کسی نہ کسی مال گاڑی کسی یارڈ۔ پلیٹ فارم یا کسی جنگلے کے سرے پر اینڈتے ضرور نظر آتے ہیں۔ ایک جگہ پلیٹ فارم پر سرخ سرخ گلاب اور کنیر کے پھول کھلے تھے۔ میں چپکے سے اتر گیا اور دو چار پھول توڑ ہی لایا۔ یہ بہاولپور کا سرخ گلاب تھا۔ پاس ہی سے اونٹوں کا طویل قافلہ اپنی گردنیں اٹھائے جرس کارواں کے نغمے بکھیرتا ریت میں سے جا رہا تھا۔ یہ تاجروں کا قافلہ تھا۔ جو دور دراز کی منڈیوں میں سامان لے جاتے تھے۔ اصفہان کے نمدے، بخارا کے قالین۔ کشمیر کے سیب۔ افغانستان کے پھل۔ غزنی کے میوے۔ تاتار کی مشک اور بغداد کی شرابیں۔ مشرق وسطیٰ

حسن سامنے تھا، پھر گاڑی رینگی اور فراٹے بھرنے لگی، اور لمحوں کی قطار جیسے ٹھہر گئی۔ وقت جیسے اضافی ہے۔ اور مشین کی رفتار رخ بدل ڈالتی ہے۔ درخت سورج کی اولین کرنوں سے جو افق پر سرخ کرنوں کا جال بچھائے تھیں، سیاہی کا لبادہ اتار کر سبز ہو گئے۔ کھیتوں پر نکھار آگیا اور ان کے کنارے جوہڑوں اور تالابوں میں پانی چمکنے لگا۔ اب گاڑی پنجاب کے میدان میں سے گزر رہی تھی اور چاروں طرف کھجور کے جھنڈ۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں اور گیہوں اور کپاس کے کھیت تھے۔ تھوڑی دیر بعد میں جب چائے کے گرم گھونٹ پی رہا تھا تو ٹرین گڑم دھم گڑم دھم کرتی ہوئی وسیع و عریض چمکدار ستلج کے اوپر سے گزر رہی تھی۔ وسیع ستلج بوڑھا ستلج۔ چمکدار ریت اور شفاف پانی والا ستلج۔ اس کا آہنی پل گزر گیا اور دریا کی بل کھاتی ہوئی چوڑی دھار چاندی کی کناری کی طرح دور تک چمکتی رہی۔ گاڑی تیزی سے نہروں کے پلوں۔ کھیتوں، آم اور کیکر اور پیپل اور بڑ کے گھنے درختوں کو چونکاتی ہوئی دوڑتی رہی۔ کچے کچے مٹی کے گھروندے، بیل گاڑیاں اور ریلوے کراسنگ پر رکے ہوئے راستے۔ گیہوں کے نرم نرم اُگے ہوئے پودے، چنے کپاس اور دھان کی فصل اور گنجان اور بلند و بالا درخت سب سفر میں دلکش اور پیارے نظر آتے تھے۔ شاید اس لئے کہ وہ زندگی کی ایسی تصویریں تھیں جو ایک جھلک دکھا کر چھپ جاتی ہیں۔ سفر نئے نظارے اور نئے افق ہی نہیں روشن کرتا بلکہ وہ ہم کو نئے نئے چہرے، نئے نئے ساتھی، اور نئی نئی محبتیں بھی دے جاتا تھا۔ نئی منزلیں ابھرتی ہیں اور پرانی سرحدیں مٹ جاتی ہیں۔ نئی پگڈنڈیاں نئی صورتیں اور سوندھی سوندھی مٹی کی بستیاں، ہمارا سفر جاری رہا۔ ٹرین سفید دولت، کپاس کے ان کھیتوں سے گزرتی رہی جہاں ان گنت سپید چاندی کے پھول درختوں پر ستاروں کی طرح میلوں تک چمک رہے تھے۔ جہاں نوجوان دوشیزائیں اپنے دامنوں میں پکے ہوئے کپاس جمع کر رہی تھیں۔ شہر کی شاید ہی کسی فیشن ایبل گل پیرہن خاتون کو معلوم ہو کہ دور دیہاتوں میں کھیتوں کے درمیان ان کے تیتری کے پروں ایسے لباسوں کے لئے کیا کام کیا جاتا ہے۔

ٹرین آم کے باغوں اور پھلوں کے کنجوں سے سرگرداں چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر دھول اڑاتی بے نیازی سے طوفان کی طرح گزرتی رہی۔ کئی بستیوں کے پیارے پیارے اونگھتے ہوئے سے نقوش افق سے ابھرتے اور دم بھر میں پیچھے مٹ جاتے۔ مٹی کے چھوٹے چھوٹے گاؤں، بھینسیں، گائیں۔ زندگی اور حیوان۔ انسان اور حسن۔ زندگی کی ازلی اور ابدی قدریں۔ کھیتوں کے مینڈھ اور درختوں کے گھنے سائے صدیوں کی صنعتی اور توانا زندگی کو اپنے سائے میں لئے مطمئن تھے۔ جیسے انہیں معلوم ہو کہ زندگی بڑی بھرپور۔ بڑی رسیلی اور مدھر ہے۔ زندگی کی ممتا کا دودھ ابل رہا ہے اور دھرتی اپنے جوان بیٹوں سے بھری پڑی ہے۔ ابھی ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم، طاقتور قوموں نے تباہی کے لئے نہیں بنایا۔ اور زندگی کچے گھڑوں۔ چوپال کی بانسری کھلیان اور چودھری کی حویلی کا نام ہے۔ کھیت۔ درخت۔ اپلے کھلیان۔ مٹی کے گھر۔ بھینسیں اور مضبوط جوان قہقہے اور لوگوں کے سروں پر بندھے ہوئے صافے اور پگڑ — اور چوپالوں میں حقے کی گڑگڑ — دور افق پر اور کبھی بالکل قریب زندگی کتنی اصل، معصوم اور زرخیز تھی۔ میں گزرتی ہوئی ٹرین میں سے اپنے وطن کے انسانوں کے یہ البیلے نقش دیکھتا رہا جو دور تھے، مدھم تھے مگر جاندار تھے۔ اصلی گھی، مکھن۔ مٹی کے سوندھے برتنوں اور گیتوں کی بستیاں۔ سچ مچ زمین آج بھی اپنے بیٹوں پر مہربان تھی —!

گاڑی پنجاب کے اہم صنعتی اور زرعی مقامات سے ٹھہرتی ہوئی گزرتی گئی۔ اوکاڑہ کے کپاس کے مل۔ منٹگمری کے ڈیری فارم اور تندرست مویشی اور پھلوں کے باغ اور خانیوال کے کارخانے ان کی چمنیاں اور کئی شہروں کی بھرپور گلیاں۔ اجنبی اجنبی اور دیکھے دیکھے سے لوگ۔ ملتان اس لئے یاد ہے کہ وہاں صرف گرمی تھی اور گرد گورستان اور گدا نظر نہ آئے۔ شاید اب کراچی یہ سب چیزیں اس قدر افراط سے ہیں کہ ملتان ان کے آگے پھیکا ہو۔ ملتان پر دیر تک گاڑی کھڑی رہی تھی اور ہم دل ہی دل میں اس شہر کی قدامت، عظمت اور بزرگی کی یاد تازہ کرتے رہے — جہاں سے کچھ ہی دور، نشیمن گوشہ میں خواجہ فرید رح (بہاولپوری) کا مزار مبارک ہے، جن کی عظیم کافیاں اور دوہے آج بھی زبان زد خلائق ہیں۔ اور وہ ملتان جہاں عارف حقیقت شمس تبریز نے نعرہ

معرفت بلند کیا اور جہاں بے شمار بزرگانِ دین۔ علما اور بادشاہوں کے مقبرے اور تاریخی یادگاریں ہیں۔ ملتان جو ہماری تہذیب۔ ثقافت اور تاریخ میں ایک شہر نہیں بلکہ ایک علامت ہے۔ جو دلّی، بغداد اور قرطبہ کا اہم پلّہ ہے جب تک ٹرین اس شہر سے نہ چل دی ہم یہی سوچتے رہے اور پھر ٹرین میں سے اس شہر کے در و بام۔ قدیم مقبرے اور مدرسوں کی نیم تاریک ڈیوڑھیوں پر نگاہیں ڈالتے آگے چلے گئے۔ ٹرین میں ملتانی ہینڈلوم۔ دریاں۔ کھیسوں اور پردوں کا ایک تاجر ہم کو ملتانی ہینڈلوم کی بابت تفصیل سے بتا رہا تھا۔ آج کل ملتان میں صرف ہینڈلوم ہوتا ہے۔

اور پھر ہم اونگھنے لگے۔ ٹرین نہروں سے پالی ہوئی سرسبز زمین سے بڑی تیز رفتاری سے گزر رہی تھی۔ کئی اسٹیشن گزرتے چلے گئے۔ دور دور تک آسمان کی نیلگوں روشنی کھیتوں کی سنہری پٹی سے مل رہی تھی۔ اور سڑکوں پر کہیں کہیں ٹریکٹر نظر آ رہے تھے۔ لیکن پھر بھی کھیتوں میں کسانوں کے تپتے ہوئے جسم محنت میں مصروف نظر آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی عورتیں بھی مصروف تھیں ان کے بچے اور بوڑھے بھی۔ ان کے بیل اور ہل بھی۔ زندگی کے وہ عظیم اَن داتا جنہوں نے صدیوں سے دھرتی کی خشک چھاتی پر گیہوں کی سنہری بالیاں اور انگور کی بیلیں بوئی ہیں۔ جنہوں نے مل کر انسانی تہذیب اور معاشرہ کے یہ عظیم تاج محل ابھارے ہیں۔ تہذیب اور گیہوں کی بالیاں۔ کتنا قدیم رشتہ ہے ان کا۔ یہ ان کے کھلیان، یہ ان کے گھروندے، یہ ان کے گیت، کاش ہم ان کو پہچان لیں۔ ان کے چہروں پر محبت کی گہری مسکراہٹ اور مضبوط ہاتھوں میں دھرتی کی لگام ہے۔ ان کے اشاروں پر آرٹ، زندگی اور پیار جوان ہیں۔

اور اس طرح گاڑی نہ جانے کس گیت میں خوش۔ کس تال پر سر دھنتی اور کس منزل کی دھن میں رواں رہی اور لوگ بالآخر لاہور کی باتیں کرنے لگے۔ جنہیں لاہور اترنا تھا وہ بھی اور جنہیں آگے جانا تھا وہ بھی۔ حالانکہ لاہور ابھی دور تھا لیکن تذکرہ جاری تھا۔ گاڑی ان باتوں سے بے نیاز ایئرکنڈیشن ڈبے کے جگمگاتے چہروں۔ فرسٹ کلاس میں مہکتے ہوئے خوشبودار سگریٹوں کے دھوئیں۔ سیکنڈ کلاس کے تاش کھیلتے اور رسالے پڑھتے مسافروں اور تھرڈ اور انٹر کے زندگی سے ہمکتے ہوئے لبریز اور کھچا کھچ بھری ہوئی بوگیوں کو لئے۔ اپنے اندر لڑکیوں کے لہراتے ہوئے آنچلوں کا رنگ، بچوں کی مسکراہٹیں۔ ماؤں کے خواب اور جوانوں کی حرکت لئے ہوئے روز کی طرح آج بھی بڑھتی رہی اور اندرونی گڑگڑاہٹ اور زندگی کے غل شور سے بے نیاز تیزی سے چھانگا مانگا کے سرسبز اور وسیع جنگل کو پھلانگتی جا رہی تھی۔ چھانگا مانگا۔ جو مغربی پاکستان کا ایک قیمتی اور بہترین جنگل ہے۔ جنگل میں سے عجیب بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی جس میں پھلوں اور پھولوں کا سانس شامل تھا۔ جنگل میں ایک بڑا سہانا سایہ چھایا ہوا تھا۔ اور ہوائیں آہستہ آہستہ جنگل میں کھیل رہی تھیں بلند و بالا درختوں کی شاخیں کانپ رہی تھیں اور ہریل اور طوطے اڑے جا رہے تھے۔ ٹیں ٹیں۔ ٹیں ٹیں۔ جیسے وہ کہہ رہے ہوں:۔

"جنگل عظیم ہیں ۔ جنگل عظیم ہیں"

اور اندر مسافر کہہ رہے تھے ان جنگلوں میں پہلے بہت چوری ہوتی تھی صاحب۔ ہر سال لاکھوں روپے کی لکڑی کاٹ لی جاتی تھی۔ یہ فوریسٹ ڈیپارٹمنٹ والے اب کافی سخت ہو گئے ہیں اور باہر کیکر۔ آم۔ پیپل۔ شیشم۔ شاہ بلوط۔ ناشپاتی۔ فالسے۔ جامن اور مالٹے کے جھنڈ پیچھے چھوڑتی ہوئی ٹرین گزرتی رہی۔ خوشبو کے جھونکے کھڑکی سے اندر آتے اور گزر جاتے ایک بس سڑک پر سے جو شیر شاہ سوری کی گرانڈ ٹرنک روڈ تھی، چلی جا رہی تھی۔ بس کے آگے لکھا تھا "لاہور" ـــــ اور واقعی تھوڑی دیر بعد گاڑی لاہور کے نواحی میدانوں کھیتوں اور نہروں کو عبور کرتی چلی جا رہی تھی لوگ تیار ہو رہے تھے، اور کمریں کس کر آنے والی بھیڑ کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھے۔ لاہور آ رہا تھا ـــــ افق پر لاہور نمودار ہونے لگا جیسے جیسے لاہور آ رہا تھا میرا دل نہ جانے کیوں تیزی سے سینے میں دھڑکنے لگا تھا۔ شاید اس لئے کہ لاہور پاکستان کا سب سے زیادہ بارونق اور پُرمذاق شہر تھا۔ اور میں ریت سے اٹا ہوا سر سے پاؤں تک مسافر معلوم ہو رہا تھا۔ شاید اس لئے

رکھنو آگیا ہوتی، امرتسر، بمبئی اور کلکتہ اور حیدرآباد دے کر ہم نے لاہور حاصل کیا تھا یا شاید اس لئے کہ میں اس شہر میں تیرہ سال پہلے رہ چکا تھا۔ شاید اس لئے کہ اس شہر سے وابستہ پرانی یادیں ابھرنے لگی تھیں یا شاید اس لئے کہ لاہور ایک شہر کا نام نہیں ایک تہذیب۔ ایک تمدن، ایک ملک، ایک قوم اور ایک کلچر کا نام ہے۔ بہرحال میرا دل دھڑک رہا تھا اور میں لاہور کے افق کو دیکھ رہا تھا ـــــ لاہور آرہا تھا ـــــ لاہور آگیا تھا۔

راوی کا گنگناتا ہوا رومان پرور سیم گوں تاریخی پانی۔ راوی کے پرسکون اور اونگھتے ہوئے کنارے، آہنی پل اور لاہور کے گنجان باغات، مقبرے اور گنبد۔ اقبال کا لاہور ظفر علیخاں کا لاہور۔ غلام رسول مہر۔ عبدالمجید سالک اور چراغ حسن حسرت کا لاہور۔ پطرس اور تاثیر کا لاہور۔ منٹو اور اختر شیرانی اور اے حمید کا لاہور۔ احمد ندیم قاسمی، اور فیض احمد فیض کا لاہور "لیل و نہار" اور "امروز" کا لاہور، عبدالرحمٰن چغتائی اور استاد اللہ بخش کا لاہور۔ ٹرین گھڑگھڑاتی ہوئی اتنی ساری دل کش شخصیتوں اور بھرپور یادوں کے شہر لاہور کی طرف جب جا رہی تھی تو اس کے ہرے بھرے گنجان اور بلند درختوں۔ چوڑی چوڑی بھری بھری نہروں اور مہکتے ہوئے باغوں کو جگاتی، چونکاتی شہر کے بازاروں اور پلوں سے گزرنے لگی۔ سڑکوں کے مانوس لوگ کالج کے لڑکے اور لڑکیاں فیشن ایبل مرد عورتیں اور لاہور کے زندہ دل راہ گیر نظر آنے لگے۔ لاہور آچکا تھا۔ یہ اس کے حسین اور پیارے گلی کوچے تھے۔ وہ گلی کوچے جن میں تیرہ سال پہلے ہم نے قدم رکھا تھا جب پاکستان کے لوگوں کے دلوں کی طرح ان گلی کوچوں میں محبت اور خلوص کے آنسوؤں نے ہمارا استقبال کیا تھا۔ جب لاہور آکر ہم نے پہلی دفعہ اس تاریخی اور صحت مند شہر میں آزاد زندگی میں سانس لیا تھا۔ جہاں ہم والٹن کیمپ میں ٹھہرے تھے۔ ہم لٹے ہوئے اور تباہ حال تھے۔ ہمارے ذہن میں الٹی ہوئی ٹرینیں۔ عورتوں کے ننگے جلوس۔ برہنہ مائیں۔ جلے ہوئے گھر۔ اور طویل انسانی قافلے تھے۔

لیکن لاہور نے ہمارے زخموں پر محبت کا پھایا رکھا تھا۔ اور ہم کو نیا گھر اور نئی زندگی دی تھی۔ ٹرین اسی قدیم مانوس شہر کے عظیم الشان اور جگمگاتے ہوئے اسٹیشن میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ دھیمی ہوئی اور میں بے قراری سے پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ کئی دوست کئی مانوس چہرے موجود تھے۔ پلیٹ فارم پر بلا کی بھیڑ تھی اور مسافروں اور قلیوں میں تصادم ہوتے ہوتے رہ جاتا تھا۔ آخر ہم ایک کنارے آکر ایک دکان سے آم اور انگور لے کر کھانے لگے۔ جب آدمی آم اور انگور کھائے تو ذہن میں خیالات بھی اچھے آتے ہیں۔ چنانچہ میں سوچ رہا تھا کہ لاہور کے لوگ کتنے مخلص اور زندہ دل ہیں۔ وہ اس طرح خوش خوش شاداب چہروں کے ساتھ دوستوں سے بغلگیر ہو رہے تھے یا مصافحے کر رہے تھے جیسے ابھی مالٹوں کا رس پی کر آئے ہوں۔ اونچے اونچے لمبے لمبے طرے دار صلفے اور شلواروں والے صاف ستھرے لوگ اور زور زور سے ہنس کر گپیں مار رہے تھے۔ ان کے صحت مند چہرے سرخی مائل جسم توانا اور باتیں زندگی سے بھرپور تھیں۔ میں سوچنے لگا کیوں نہ ہو یہ باغ جناح کے گلپوش وسیع لانوں اور سایہ دار مہکتے ہوئے تناور درختوں کا شہر ہے۔ یہ بادامی باغ اور شالامار اور میلہ چراغاں کا لاہور ہے۔ داتا دربار، درمیاں میر اور چوبرجی اور کرشن نگر کا لاہور ہے۔ یہ ان گنت کالجوں اور ہزاروں مدرسوں کا آباد شہر ہے۔ یہ تحریک خلافت اور منشور پاکستان کا دیار ہے۔ یہ ہماری قومی امنگوں اور قلعہ لاہور کی بلند فصیلوں اور برجیوں کا شہر ہے۔ یہ ثقافتی تحریکوں اور آرٹ کونسل کا مرکز ہے۔ یہ خوش نویسوں۔ ایڈیٹروں اور صحافیوں اور ناشروں کا دبستاں ہے۔

اچانک کسی نے زور سے میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔ میں نے مڑ کر دیکھا جاوید نجم اور صہبا تینوں قلیوں کے ساتھ سامان لئے موجود تھے قبل اس کے کہ میں حیران ہوں صہبا بولے:

"ہم مری جا رہے ہیں حالانکہ وہاں کوئی مشاعرہ نہیں ہے!" اور جاوید صاحب خوش ہو کر بولے "۔

"بھئی ان سے پوچھ تو لو۔ کیا پتہ یہ لاہور میں ہی اتر پڑے ہوں۔

میں نے جاوید اور صہبا اور نجم کو اپنا کمپارٹمنٹ دکھایا جہاں میرا سامان موجود تھا اور ان کو بھی اس میں گھسا لیا۔ اب یہ میرے ہم سفر تھے۔ ان میں سے دو اخبار نویس اور ایک مشہور شاعر ہے۔ یہ تینوں اکثر ساتھ سفر کرتے ہیں۔ ہم سامان رکھ کر فوراً کسی ایسی پرسکون سی جگہ کی تلاش میں ایک ریفرشمنٹ روم میں آگئے جہاں چائے کے ساتھ ان سے باتیں کی جا سکیں کیونکہ ہم کئی ماہ بعد ملے تھے۔ ان کے ذریعہ نہ صرف لاہور کی عوامی زندگی کا پتہ چلا بلکہ یہ بھی معلوم ہوا کہ اب لاہور کتنا پھیل گیا ہے۔ جب تک ٹرین نہ رینگی ہم لوگ مری کے قیام کے بارے

میں سفر کرتے رہے۔ اب ان لوگوں کی وجہ سے مری میں قیام کا معاملہ آسان ہو گیا تھا۔ ریفریشمنٹ روم سے نکل کر ہم کمپارٹمنٹ میں آ گئے اور ٹرین ہولے ہولے عظیم اسٹیشن کے بارونق۔ جانے پہچانے چہروں والے پلیٹ فارم سے رینگنے لگی۔ میں دروازہ پر کھڑا دیر تک عابد کو دیکھتا رہا جو لاہور کی روایتی دوستی کا نشان تھا۔ جو مجھ سے ملنے کے لئے دس میل کا سفر سائیکل پر کر کے آیا تھا اور جس نے مجھے انگور اور آم کھلائے۔ پلیٹ فارم پر ایک سفید رومال ہمارے نام کا بھی تھا۔ اب اندر ڈبے میں میرے تین ساتھی تھے لیکن وہ حسب عادت تاش کے پتوں میں محو ہو گئے اور میں پہلے کی طرح سفر کی دلکشی میں۔ ڈبے میں اور بھی کئی مسافر آ گئے تھے جو اپنی جگہوں کی باتیں کر رہے تھے۔ ٹرین اسٹیشن کی وسیع حدود سے آہستہ آہستہ نکل گئی اور میں کھڑکی میں سے یارڈ کے آہنی پٹڑیوں کے جال پر سمٹتی پھیلتی ٹرین کو لاہور سے گزرتے دیکھنے لگا۔ یہ دستکاروں۔ گاموں۔ مانجھوں اور پہلوانوں کا شہر۔ یہ چھوٹے چھوٹے بازاروں۔ اور اونچی اٹاریوں اور مہکتی ہوئی روشن گلیوں کا دیار۔ تنگ اور گندے لیکن بارونق ہوٹلوں اور چائے خانوں سے آباد۔ جہاں محلے کے بے فکرے زندہ دل شاموں اور دوپہروں کو سنہری چائے کے ساتھ گذارتے ہیں۔ وہ سرشام انوس گلیوں، گنگناتے ہوئے جھومتے ہوئے پھرنے والے آزاد لوگ یا مشرق کے تنگ بارونق الف لیلوی بازاروں اور پراسرار اونچی تاریک عمارتوں کا شہر۔! ٹرین تیز سے تیز تر ہو رہی تھی اور لاہور ایک پرانے دوست کی طرح مسکرا رہا تھا۔ اس کے باغوں کی شاخیں۔ اس کے در و بام کی دھوپ۔ اس کی گلیوں کے موڑ۔ اس کی مسجدوں کے مینار۔ اس کی سڑکوں کے مانوس چہرے سب آہستہ آہستہ دور ہو رہے تھے۔ ایک بوڑھا ایک پرانی سال خوردہ بارہ دری کے کنارے کھڑا ٹرین کو مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ شاید اس میں اس کا کوئی بیٹا جا رہا تھا یا سب ہی اس کے بیٹے تھے۔

"بارہ دری۔ بوڑھا اور ریل"

قدیم اور جدید کی حسین ترین تصویر۔ میں سوچنے لگا کہ یہ بوڑھا بھی ایک طرح سے لاہور ہے۔ یہ کابلی دروازہ اور کشمیری دروازہ ہے۔ یہ پرانی فصیل کے سائے میں اونگھنے والا انجان بے نام درخت ہے!

آصف جاہ اور نورجہاں کے مقبروں پر وقت کے انمٹ نقوش ابھر رہے تھے اور ہرے بھرے بلند درختوں کی اوٹ سے جہانگیر کے مقبرے کے بلند مینار جھلک رہے تھے۔ ایک شہنشاہ کا مقبرہ۔ ایک ملکہ کا مقبرہ۔۔ پہلے شاہ میں یہ خوش ہو رہی تھی کہ کتنے گمگشتہ فسانوں پر سے نقاب اٹھ رہی تھی۔ انارکلی کے مقبرے پر ویرانی چھائی ہوئی تھی اور سرو شاخوں میں ہوا چیخ رہی تھی۔ روح تقدیس وہ فاتحہ خواں ہو جیسے۔

۔ اور پرے ایک شہنشاہ کا سفید مرمریں مقبرہ چمک رہا تھا۔ جیسے راوی کے دودھیا اور چمکتے ہوئے پانی میں انارکلی کی محبت تحلیل ہو۔ جیسے اس سرزمین کا ذرہ ذرہ محبت اور جبر۔ مرمر اور خون کی آمیزش لئے ہوئے ہو۔ نورجہاں کے مزار پر اداسی کھیل رہی تھی۔ شکستہ گنبد کہ

برمزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے

ویران در و بام اور صدیوں کی فریاد کناں بے بس راوی کی لہریں۔ راوی جس نے مغلوں کے ایوانوں میں گونجنے والے نغمے بھی سنے جس نے مرمریں شہزادیوں کے ہجر کی داستانیں بھی سینے میں چھپا لیں اور ان کے محلوں کے اندر گھٹ جانے والی آوازیں بھی سن لیں۔ جس نے شاہزادہ سلیم کی محبت بھی دیکھی اور انارکلی کی سرد اور زرد لاش بھی اپنے سینے پر اٹھائی۔

راوی سینکڑوں رومانوں اور محبتوں کا مدفن

راوی افسانوں اور حکایتوں کا دریا

راوی مغلوں کے وقار اور شان کی بوڑھی نشانی

راوی ہمیشہ جوان رہنے والے لاہور کی چہیتی، شریر اور البیلی نازک دوشیزہ۔ راوی گذر گیا تھا۔

لاہور پیچھے جا چکا تھا۔

کامران کی بارہ دری میں سرد ویران اداسی چھا رہی تھی اور بادشاہی مسجد اور جہانگیر کے مقبرے یادوں کی طرح ذہن سے دور ہو رہے تھے اور ٹرین پھلوں کے باغوں۔ فارموں اور لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں سے والہانہ اٹھلاتی ہوئی نکلی جا رہی تھی۔ مٹر اور شلجم اور مولی اور پالک اور میتھی اور سرسوں اور گاجر کے تر بتر وسیع کھیت۔ گاؤں اور پگڈنڈیاں راستے اور گھروندے پیچھے کی طرف گم ہوتے گئے۔

سرسبز کھیتوں، ہنگھٹوں اور پگڈنڈیوں پر سنہری دھوپ پھیل گئی تھی۔ تیز گام کا ڈیزل انجن گاڑی کو طوفان کی رفتار سے اپنی منزل کی طرف اڑائے لئے جا رہا تھا۔ ہم نے ریفریشمنٹ روم سے گرم کافی پی اور کافی کی پیالیوں پر ہم سفر نئے چہروں اور گنگناتی ہوئی شاداب پھیلی ہوئی زندگی کا جام صحت پیا۔ ہم سب خاموش تھے لیکن نجم اپنی پرانی یادیں بڑے جذباتی انداز میں دہرا رہا تھا۔ وہ اس علاقے میں اب سے دس بارہ سال قبل رہا تھا۔ ایک چھوٹے

سے چمک میں۔ اس کے دل میں بے حد حسین یادیں تھیں اور باہر باغوں اور بستیوں پر ہریل اور طوطے اڑ رہے تھے۔ نہ جانے کتنے اسٹیشن گذر گئے اور ہم زمین کی پیار بھری باتیں اور محبوب افسانہ نگاروں کے تذکرے کرتے رہے۔ اسی دوران شیخوپورہ کا اسٹیشن بھی آیا اور گذر گیا ــــ شہزادہ سلیم عرف شیخو کا شہر ــــ نہ جانے کیسا تھا یہ شہر۔ اس کے در و بام سونے سونے اور اداس لگتے ہوئے تھے۔ اس کی بارہ دریاں اداس۔ گلیاں آباد اور دریچے گم سم تھے۔ بستیاں جو نہ دیکھی جا سکی ہوں، کتنی پر اسرار معلوم ہوتی ہیں ــــ اہم تینوں نے آخر سازش کرکے انجم سے کلام سننے کی متحدہ فرمائش کر ہی دی۔ انجم اپنی محبوب نظم بڑی پرگداز آواز میں سنا رہا تھا ؎:

شہر سے تیرے صبا آئی ہے کھوئی کھوئی

اور پھر سیف کی نظم

جب ترے شہر سے گذرتا ہوں

انجم کی آواز لہکتی گئی اور ہم ٹرین سے باہر آہنی پٹڑیوں پر کوندتی اور لپکتی ہوئی موسیقی کی تال پر بنٹی اور دمڑی کی باتیں کرنے لگے ــــ صہبا جو کئی ماہ پنڈی کے ہوٹلوں میں گذار چکا تھا وہاں کی باتیں سنا رہا تھا۔ پھر ہم نے کراچی کے ہلیفی اور صدر کی رنگین حکایتیں سنائیں۔ باہر چیکتے ہوئے امنگوں بھرے دلوں کی طرح سرشار اشجار اور باغوں کو دیکھتے رہے۔ ٹرین عظیم۔ سرسبز اونچے درختوں۔ کنجوں اور مالٹے کے باغوں کی جھلکیاں دکھاتی ہوئی گجرانوالہ کے اسٹیشن پر آکر رک گئی۔ مٹی کے سوندھے برتنوں۔ گھریلو دستکاریوں اور خوش ذائقہ مفرح مالٹوں کا شہر ــــ ہم ٹرین سے اتر کر پلیٹ فارم پر سہ پہر کی لطیف ہوا اور مالٹے کھانے لگے۔ اجنبی زمین۔ اجنبی آسمان۔ اپنا ہی دیس لیکن زندگی میں کتنا تنوع ــــ تازگی اور تبدیلی! ہم ایک ایک شے پر اجنبیت اور مسرت کی نظر ڈالنے کا حق رکھتے تھے۔ یہ انسان۔ یہ دیواریں۔ یہ درخت۔ یہ دور سے آہستہ آنے والی ہوا۔ یہ بچوں اور عورتوں کی آوازیں۔ یہ صحت مند دوشیزاؤں کی بھیڑ اور سمن زاروں اور سایہ دار سڑکوں پر تانگوں کے چلنے کی آوازیں سب کتنی رومانی کتنی حسین لگتی ہیں۔ پل بھر کی اجنبی تصویریں ــــ ایک لڑکی کپارٹمنٹ کے دروازے پر کھڑی لاہور کے کالج کے ایک لڑکے کو رخصت ہوتے ہوئے رومال دے رہی تھی۔ ٹرین چلدی اور لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے جلدی سے نظر بچا کر ان کو دوپٹے کے پلو میں جذب کر لیا۔ ٹرین ہولے ہولے رینگ گئی۔ ہم قلیوں اور سامان سے لدے ہوئے مسافروں سے سر ٹکراتے ایک ڈبے میں دوڑ کر

چڑھ گئے جو اتفاق سے کا نڈیا خواتین کا نہ تھا۔ ٹرین اپنی مخصوص تال پر پٹڑیوں کو روندتی ہوئی گرجتی بڑھ رہی تھی۔ دور تک مالٹوں کے باغ اور کھیت جھکے ہوئے تھے ۔ درخت مجرموں کی طرح سر جھکائے خاموش پیچھے کی طرف لوٹ رہے تھے۔ کہیں کہیں پگڈنڈی پر کسی شوخ پیراہن کی جھلک نظر آتی اور پل بھر میں چھپ جاتی۔ گھروندے۔ پنگھٹ اور رہٹ کی آوازیں۔ نہریں اور برگد کے اونچے درخت۔ بھینسیں آرام سے تالابوں میں کھڑی تھیں اور جاوید گرمی سے تنگ آکر ان کو رشک سے دیکھ رہا تھا۔

"کاش میں بھینس ہوتا یار۔ تو یہاں مزے کرتا"

"لیکن میں پھر بھی ہی بھسا تا رہتا تمہارے آگے" انجم بولا۔

"اور اب کیا کرتے ہو" صہبا نے فوراً چوٹ کی

"یہ ثابت کرتا ہوں کہ بھینس عقل سے بڑی ہے"!

"یار یہ بھینسیں دیکھ کر تو مجھے سکون اور قدامت کی مکمل تصویر محسوس ہوتی ہے ــــ گوتم بدھ کے زمانے میں بھی اسی طرح ہوتا ہوگا ــــ جاوید نے دو دنگلوں کو گھورتے ہوئے کہا ــــ اچانک ٹرین سست ہو کر آہنی پٹڑیوں کو کاٹتی، تراشتی چناب کے عظیم پل پر سے گذر رہی تھی۔ چناب کا آہنی پل اور نیچے وسیع، خاموش۔ چوڑا چکلا اور لہراتا چناب دریا میں کشتیاں اور ان میں ملاح تھے۔ ملاحوں کے ہونٹوں پر دور دیسوں۔ اجنبی غموں اور پردیسیوں کے پرانے گیت تھے۔ ان کے جال میں مچھلیاں اور دلوں میں پرانی صدیوں پرانی گمبھیر زندگی تھی میں سوچنے لگا اب بھی کوئی سوہنی اپنے مہینوال سے کچے گھڑے پر ملنے رات کے بکراں اندھیروں میں جاتی ہوگی۔ کوئی ہیر کوئی رانجھا چھپ چھپ کے ان مہکتے ہوئے کنجوں اور پنگھٹوں کی اوٹ میں ملتے ہوں گے۔ ان کے پائل کے چھا بجھن بجتے ہوں گے ــــ چناب عظیم چناب۔ باغوں فصلوں اور گیہوں کی بالیوں کا دریا۔ دریا کے کنارے کچے گھروندے تھے۔ ان گھروندوں میں ملاح اور دھرتی کے کسان بیٹھے تھے۔ ان کے ہل اور بیل تھے طبلے کی تھاپ پر وارث شاہ کے گیت اور دیواروں پر تنکوں کی بنی ہوئی ٹوکریاں لٹکی ہوئی تھیں۔ اناج کے بھرے بھرے کھلیان اور پرانے صحت مند گیت تھے۔

دریا دور رہ گیا تھا اور ہم خاموش اور مسحور زمین کے زرخیز طلسمی خدو خال دیکھتے رہے۔ ٹرین شام کے جھٹ پٹے میں کتنی ہی شاداب بستیوں کتنے آباد اسٹیشنوں۔ نہروں اور پلوں سے ہو کر گذرتی رہی اور پھر آبادیاں اور پھیلاؤ ہوتی

آیا۔ جہلم تیز گام نے ڈیزل انجن سے ناطہ توڑا اور پرانے دخانی کوئلے والے انجن سے جوڑا۔ یہاں سے دہکتا گرجتا ہوا آہنی انجن آگے کے سفر پر سینہ تانے گذرنے لگا۔ لالہ موسیٰ سے میدان ختم اور کوہسار شروع ہو گئے لیکن ہم پہنچے اس وقت جب یہ انجن دندناتا ہوا جہلم کے بے تاب۔ چمکدار اور طوفانی دریا کے پل پر سے ٹرین کو بے تحاشہ آواز اور سرشاری سے لئے جا رہا تھا۔ مجھے اس دریا کی ایک جھلک دیکھنے کی بڑی خواہش تھی۔ ہمارے افسانوں اور گیتوں کا دریا۔ نیچے دریا کا سرد پانی دور افق پا نظر آنے والے موہوم سرمئی کشمیری پہاڑوں سے جا ملا تھا۔ جہاں سری نگر کے بازاروں میں ہاؤس بوٹ تیر رہے ہوں گے۔ جہلم کشمیر کا بیٹا ہے۔ ایک بوڑھا مسافر زیر لب کہہ رہا تھا۔ اور نیچے بوڑھے ماتو اور ملاح غمگین تھکے ہوئے لہجے میں جہلم کی صدیوں پرانی موجوں پر بادبانی کشتیوں کو لے کر نہ جانے کہاں جا رہے تھے۔ ان کی نگاہیں دور پہاڑوں کے پرے چمکنے والی برفیلی چوٹیوں پر تھیں جہاں چنار اور سرو اور چیل کے درختوں سے چھپی ہوئی بستیوں میں کوئی ان کے قدموں کی آہٹ کا انتظار کرتا ہو گا ــــ پرانا۔ مقدس اور عظیم جہلم گذر گیا ــــ دریا نہ جانے کتنے شہروں کی زندگی کو دیکھتا ہوا صدیوں سے اس استقلال سے بہہ رہا تھا۔ اس نے زندگی کے کتنے مناظر دیکھے تھے اس کے کناروں پر سفیدے کے اونچے درخت اور گھونسلوں والی بستیاں تھیں۔ دریا کا پانی گدلا اور سست تھا۔ اس پتھر نے اسکندر کی فوجوں۔ آریاؤں۔ تاتاریوں۔ افغانوں اور مغلوں کے جرار لشکروں کی غریب الوطن لاشوں کو اپنی غضب ناک لہروں کے حوالے کیا تھا اور فاتحوں کے گھوڑوں کے سموں کو چوما تھا۔ اس کے پورس آج بھی کناروں پر آباد زندگی کے سہانے گیت گا رہے تھے۔ ٹرین جہلم کے اسٹیشن پر ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ دریا کی طرف سے نرم خوشگوار اور تر و تازہ ہوا کے جھونکے کسی مونس کی طرح مسافروں کا حال پوچھتے تھے۔ اسٹیشن پر لمبے تڑنگے اونچے اونچے جوان چھ فٹے دوڑتے پھر رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر دل خوشی سے بھر جاتا ہے اور ان سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ سادہ مزاج۔ دوست اور گرم جوش انسان اگر ایک جہلمی مسافر نے ہم کو دریا کی تازہ مچھلی کے کباب نہ بھی کھلائے ہوتے تو بھی اپنی رائے یہی ہوتی۔ ٹرین ذرا کی ذرا ٹھہر کر پھر پنڈی کے لئے روانہ ہو گئی ــــ اور سپاہیوں، مجاہدوں، نڈر بے باک نوجوانوں والی فوجی چھاؤنیوں سے باوقار اور سر بلند گذرتی بستیوں کو چونکاتی چٹانوں کو کاٹتی اور جنگلوں کو بیدار کرتی شام کی پہلی زرد روشنی میں بڑھتی رہی کوہسار اور چٹانیں سیاہ دیواروں کی طرح جگہ جگہ سر اٹھاتیں اور پل کی پل میں گم ہوتی پیچھے جا رہتیں۔

بلند اور بلند تر۔ ٹرین کا انجن دیو کی طرح پہاڑیوں کے غرور کو ٹھکراتا ہوا پوٹھوہار کے علاقے سے گذرتا رہا۔ ٹرین بل کھاتی اور پیچھے ہوئے چہرے ــــ لہراتے ہوئے آنچل، مرمریں بانہیں۔ بچوں کی انگلیاں اور پریشان بل۔ سب دور تک کھڑکیوں کے ساتھ نمایاں ہو جاتے اور پھر ٹرین مڑ کر سیدھی ہو جاتی اور سب کچھ چھپ جاتا اور ٹرین چڑھتی اترتی جنگلوں وادیوں اور اجنبی گلپوش خیابانوں سے چھپتی ہوئی گذرتی ہلکی سرنگوں کے اندھیرے میں بڑھنے لگی۔ ٹرین اچانک ایک تاریک سرنگ میں گئی اور کئی پہاڑوں کا جگر چیرتی ہوئی بل کھاتی ہوئی نکل گئی۔ مزدوروں کے محنتی جفاکش بازوؤں نے چٹانوں اور پہاڑوں کو کاٹ کر وادیوں اور بستیوں کو ملا دیا تھا۔ پہاڑ انسانوں کے تعلقات اور میل کو نہ روک سکے اور ٹرین فوجی لشکر کے اعتماد کے ساتھ دھواں اڑاتی ہمالیہ کے کوہ دامن کی طرف بڑھتی رہی۔ اونچے دیار، سپیدے انجیر اور چیل کے درختوں پر شام کی سنہری، روپہلی دھوپ کے آخری شگوفے چٹک رہے تھے اور پرندے کھیتوں، وادیوں، جنگلوں اور باغوں سے اپنے آشیانوں کو لوٹ رہے تھے۔ درختوں میں سبز اور نارنجی اور نیلے اور سنہرے پروں والے پرندے شور مچا رہے تھے۔ اور نیچے مکئی کے کھیتوں میں انسان کے محنتی ہاتھ نرم پودوں کو پروان چڑھا رہے تھے۔ ٹرین بے نیازی سے ہمیشہ کی طرح اپنے راستے پر مسافروں کو نئی بستیوں اور شہروں کی طرف لے جا رہی تھی۔ مسافروں نے راولپنڈی کی تیاری شروع کر دی تھی۔ شام گہری دھند میں لپٹی جا رہی تھی، اور آسمان پر گہرے بادل چھا رہے تھے اور ہوا تیز اور سرد ہو گئی تھی۔ کئی اونچی پہاڑیوں اور ان کی ڈھلوانوں پر اگے ہوئے نرم نونہال کھیتوں سے دامن جھٹکتی ہوئی ٹرین چک لالہ سے گذر کر راولپنڈی کے قریب آ گئی۔ جوں جوں راولپنڈی قریب آ رہی تھی، سفر کی تھکان ہم سب پر جیسے ایکدم سے ٹوٹ پڑی تھی۔ ہم سب نے سوائے انجم کے گردآلود بال بکھرے ہوئے رومانٹک انداز میں اپنا پسندیدہ گانا ؏

"ہم نے تو جب بھی کلیاں مانگیں کانٹوں کا ہار ملا"

دھیمی درد بھری آواز میں گا رہا تھا ٹائیلٹ میں جا کر جماہیاں لیتے ہوئے کپڑوں پر سے گرد سفر جھاڑی اور حلئے درست کئے تاکہ راولپنڈی والے جو ہمیشہ صاف ستھرے صحت مند اور نکھرے ستھرے ہوتے ہیں ہم کراچی کے چوہیا اٹھائی گیرے نہ سمجھ لیں۔ ابھی ہم باری باری ٹائیلٹ سے برآمد

ہی ہوئے تھے کہ ٹرین سگنلوں، کیبنوں، مال گاڑیوں۔ پلیٹ فارموں اور آہنی پٹڑیوں کے وسیع و عریض پھیلتے اور بڑھتے جال کو کاٹتی گونجتی اور گرجتی آہستہ آہستہ اپنے سرتال میں مگن راولپنڈی کے صاف ستھرے اور بڑے سارے پلیٹ فارموں اور بھرے پُرے آباد اور بارونق اور بے حد بڑے اسٹیشن پر جاکر ٹھہر گئی۔ ہم کمپارٹمنٹ کے دروازے پر دھڑکتے ہوئے دل اور حیران نگاہوں سے کھڑے تھے جہاں بہت سارے سرخ پوش قلیوں کے علاوہ ہمیں وصول کرنے والا کوئی اور نہ تھا۔ ہم سب بڑے بن ٹھن کر بہت احتیاط سے جیسے کسی گاؤں سے چھٹ کر آئے ہوں اترے۔ ابھی قلی آپس میں سامان کے لئے لڑ جھگڑ ہی رہے تھے کہ بادل زور سے گرجے اور ایکدم سے سخت بارش دور تک زور شور سے برسنے لگی ــــ

"اجنبی دیس کا استقبال" صہبا نے سگرٹ کا کش اگلتے ہوئے کہا۔

"لیکن ابھی تو اولے بھی پڑیں گے تم نے سر منڈایا ہوا ہے" میں نے جاوید کی گنجی چاند کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ مٹی سے سوندھی سوندھی مہک اٹھنے لگی اور ہوا کے سرد جھونکے بھوک کی آگ کو تیز کرنے لگے۔ ایسٹیشن کے شیڈ پر بجلی کی چمک سے بارش کی دھاریں چاندی کی طرح بہہ رہی تھیں اور موسلا دھار بارش کی بوندیں جلترنگ بجا رہی تھیں۔ ہماری تھکن تقریباً اتر چکی تھی۔ ہم بھاگتے دوڑتے اور پھسلتے ٹکٹ دے کر جب باہر آئے تو گھوڑے کی افادیت کا پہلی بار قائل ہونا پڑا جو ایک مریل سے تانگے کو لئے جا رہا تھا۔ دور تک وسیع و عریض بارونق شہر کی شاہراہیں موسم بہار کی بارش سے دھل کر صاف ہو گئی تھیں۔ ایک تانگہ بارش سے بھیگی ہوئی سڑک پر خاموشی کو چیرتا جا رہا تھا۔ اور پھر اس کے بعد ہم اس تانگے میں بھیگتے بھاگتے اس راولپنڈی کی اجنبی طویل اور ان دیکھی شاہراہوں سے گذر رہے تھے جس کی دید کی آرزو ہم کو دور سے لائی تھی۔ تانگہ سست اور بارش تیز تھی۔ شہر اجنبی ہم غریب لیکن غریب شہر نہ تھے۔ یہ اپنا دیس اپنا وطن تھا۔ یہ راولپنڈی۔ مال روڈ، ایڈورڈ روڈ، مری روڈ اور سید پوری روڈ کی ہی نہیں ہستی گیٹ۔ بنی چوک۔ ننڈے بازار اور لال کرتی اور راجہ بازار کی پنڈی بھی تھی جہاں ان گنت گرما گرم ہوٹل اور دوست بھی تھے جہاں راولپنڈی کم اور گھوڑے تانگے زیادہ ہیں۔ جہاں تنگ گلیوں میں زندہ دل انسانوں اور گھوڑوں کا کھوے سے کھوا چھلتا

ہے۔ جب ہم تازہ مہکتے ہوئے گرم گرم بھٹے کھدتے ہوئے راجہ بازار میں آئے تو تانگہ سست تر اور بارش تیز تر ہو چکی تھی۔ اس لئے ہم لپک کر ایک ہوٹل میں گھس گئے اور زندگی حسین اور رائڈر ویتھر کے بارے میں مزید سوچے بغیر تربتر کپڑوں سمیت گرم گرم پراٹھے اور نان کباب کھانے میں لگ گئے۔ اس کے بعد جب ہم کشمیری سنہرے رنگ کی چائے کے خوشبودار گھونٹ پی رہے تھے تو گلیوں میں سے بلند قہقہے لگانے والے اونچی اونچی آوازیں باتیں کرنے والے اور لڑتے جھگڑتے لوگ، مانوس لوگ گذر رہے تھے۔ گلیوں اور بازاروں کی آواز سن کر ہم یہ بھول چکے تھے کہ ہم کو بل چکانے کے لئے چیک بھنانا اور رات کو ٹھہرنے کے لئے کئی منتظر مہربان دوستوں کے دروازوں پر دستک دینی ہے لیکن باہر سڑکوں۔ گلیوں، درختوں اور چھتوں پر بارش تیز ہوتی جا رہی تھی۔

صبح جاوید اور صہبا صاحب کی بھوک ہڑتال کی دھمکی کے خوف سے ہم اور ساتجم دوپہر کی بس سے ٹیکسلا دیکھنے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ اپنا سامان چھوڑ کر صرف کیمرے ساتھ لے کر ہم بس میں جا ڈٹے جو وقت مقررہ سے صرف ایک گھنٹے پہلے چل پڑی کیونکہ بہت بھیڑ کی وجہ سے سواریوں کے لئے جگہ نہ تھی۔ ہم شہر کی تنگ اور کشادہ سڑکوں سے گذر کر ایبٹ آباد روڈ سے گذر رہے تھے اور سفیدے۔ چیل اور الائچی کے خوبصورت درخت جو سرسبز اور تر و تازہ تھے۔ جھوم رہے تھے۔ بس شہر سے نکل کر لہراتے بھرتے کھیتوں، چھوٹے چھوٹے گاؤں اور ندیوں پر سے ہوتی ٹیکسلا جانے والی سڑک پر چڑھ رہی تھی۔ بس میں زیادہ تر ایبٹ آباد اور واہ کے مسافر تھے۔ ہماری منزل جلد آ گئی۔ بس خوبصورت سرسبز ٹیلوں پر جو شیشم کے درختوں اور سپیدے اور ناشپاتی اور سیب کے درختوں سے ڈھکے ہوئے تھے گذری۔ گہری نشیبی وادیوں کو پھلانگتی ٹیکسلا آ گئی۔

ٹیکسلا امید کے مطابق بے حد تاریخی اور عظیم یادگاروں کا وارث تھا۔ یہاں گندھارا تہذیب کی مورتیاں۔ یونان کی آرٹ کا فن اور بدھ کے سنگین پیکر تھے جو زبان حال سے انسان کے ہاتھوں، اس کی انگلیوں کے غیر مرئی گیت بن کر زندہ تھے۔ جیسے انسان کی لافانی آرزوئیں پتھروں میں چھپ کر زندہ رہتی ہوں! ایک طرف بدھ آلتی پالتی مارے صدیوں سے انسانی نجات کے لئے گیان میں تھے۔ ٹیکسلا میں یونانی تہذیب کے نقش ہیں۔ سکندر اعظم کے وقت یہ شہر اپنی زندگی۔ سنگ تراشی اور خوبصورتی میں ایشیا کا مرکز تھا۔ صدیوں بعد انسان ہی کے خارا شکن اور سُبک ہاتھوں

نے پہاڑوں کو کاٹ کر اشوک اور بدھ کے اس عظیم گہوارے کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ اس شہر کی عورتوں کے زیور چمکائے تھے۔ ان کے مٹی کے برتن ان کی گڑیاں۔ ان کے اناج صاف کرنے کے آلے اور دیگچیاں۔ مردوں کے ہتھیار اور کسانوں کے ہل۔ تصویریں اور سنگتراشی کے نمونے۔ ایک تصویر میں کسان کھلیان میں اناج صاف کر رہا ہے اور عورتیں اس کے ساتھ کام کر رہی ہیں۔ صدیوں سے انسان تاریخ کے راستے پر ایک ہی طرح نظر آتا ہے۔ زندگی کا نروان داتا۔ تہذیب کا خالق آج بھی اسی طرح ٹیکسلا کے پاس کے کھیتوں میں اسی طرح اناج کھلیانوں میں بھر رہا ہے۔

ایک جگہ پہاڑی پر اشوک کا کتبہ نصب تھا جس پر بدھ مذہب کی تبلیغ کے چند نکات کندہ تھے۔ یہ پیغام شاید بندوسار کے لئے تھا یا کنشک کے لئے یا آنے والی انسانی نسلوں کے لئے یا ان یوروپی سیاحوں کے لئے جو کیمرے لٹکائے حیرت و تعجب کے ساتھ ایشیا کی عظمت اور تقدیس کے کھنڈرات میں پھر رہے تھے۔ سنگین اصنام اور تراشیدہ در و بام پر شام پھیلی جا رہی تھی۔ ہم عجائب گھر سے پنڈی واپس آ گئے۔

دوسرے دن ہم راجہ بازار میں مری کے بس اڈے پر سامان رکھوا کر اس سفر کے لئے روانہ ہو رہے تھے جو کئی سال سے آرزو بنا ہوا تھا۔

بس مری روڈ سے تیزی سے گذر رہی تھی۔ سنہری دھوپ میں نیم اور شاہ بلوط اور سیب کے درخت نہا رہے تھے اور ٹلی کے درختوں میں چڑیاں پھدک رہی تھیں۔ بس آہستہ آہستہ بلندی پر چڑھنے لگی۔ ہم نے دیکھا دور وادی میں ایک نئی بستی۔ ایک نیا شہر تعمیر ہو رہا تھا ــــ اسلام آباد ــــ ان گنت مشینیں اور مزدور دھرتی کے چہرے کو سنوار رہے اور نیا دارالحکومت تیزی سے بن رہا تھا۔ جو شہر ہی نہیں مرکزِ نگاہ بھی ہوگا۔

دیارِ پاک کی آرزوؤں اور امنگوں کا نیا مرکز۔ اور ہم دیر تک کھڑکیوں میں سے انسانوں کی محنت اور لگن کو مڑ مڑ کر دیکھتے رہے۔

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد

اور جب بس ...... چھرا پانی اور بانسری گلی سے ہو کر چیل اور دیودار اور زیتون کے جنگلوں سے گذر رہی تھی تو نیچے وادیوں سے وہ دھنکی ہوئی روئی کی طرح بادل اٹھ رہے تھے۔ سنی بنک کے پہلے موڑ پر آ کر بس رکی اور آسمان پر گھرے تاریک بادل پھار رہے تھے اور سرد ہوا نے مجھ کو اٹیچی کیس سے سوئٹر نکالنے پر مجبور کر دیا۔ ہم سنی بنک سے مری کے بس اڈے پر پہنچ گئے جہاں ہم ان طلسم زدہ شہزادوں کی طرح محسوس کر رہے تھے جنہیں پریوں کے دیس میں لے آیا گیا ہو۔ بوڑھے پاتو اور پہاڑی قلی کمر پر سامان رسیوں سے باندھ کر ہم کو ایک ایسی حسین پراسرار اور شاداب دنیا کی طرف لے جا رہے تھے جہاں چیڑ، دیار، یوکلپٹس، چنیر، صنوبر، اور اخروٹ کے درخت جنگلی عناب اور بنفشہ کے پھول اور لطیف کاشمیری کی حسین کہانیاں اور اس کا خلوص تھا ـــ!

جب ہم کشمیر پوائنٹ میں سرخ چھت والی کاٹیج میں آئے تو نیچے وادیوں کی طرف سے۔ دور برف پوش چوٹیوں اور بلند و بالا بادلوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں سے بھیگی ہوئی ہوا آئی۔ چیڑ اور یوکلپٹس کی شاخیں لہرائیں اور گرج کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ یہ مری کا تعارف تھا۔

ادارہ مصنّفین پاکستان
آدمجی ادبی انعامات
۱۹۶۱ء

اردو : (۱) جمیلہ ہاشمی (سمرسٹ، مغربی پاکستان)
ناول : "تلاشِ بہاراں" (پانچ ہزار روپے)
(۲) میر عبدالصمد (پشاور)
تنقید: خوشحال اور اقبال (پانچ ہزار روپے)

بنگلا: (۱) رشید کریم (مشرقی پاکستان)
ناول : "اُتّم پُرش" (پانچ ہزار روپے)
(۲) عبدالرزاق (مشرقی پاکستان)
ناول : "کنیا کماری" (پانچ ہزار روپے)

منصفین: (اردو) ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، سید عابد علی عابد، پروفیسر حمید احمد خاں، پروفیسر وقار عظیم، پروفیسر ممتاز حسین،

منصفین: (بنگلا) ڈاکٹر محمد شہید اللہ، ڈاکٹر قاضی مطہر حسین، ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر سجاد حسین، پروفیسر منیر چودھری۔

★

غزل

عبداللہ خاور

نکہتِ ناز، سکوتِ دلِ ویراں کو نہ چھیڑ
وادیٔ یاس میں اُمڈے ہوئے طوفاں کو نہ چھیڑ

اُفقِ ذہن پہ ہے شامِ تغافل کا طلوع
ہم نفس، اب کسی بھولے ہوئے عنواں کو نہ چھیڑ

دل میں خوابیدہ ہیں بدلی ہوئی نظروں کے کنول
ان دھندلکوں میں حجابِ غمِ پنہاں کو نہ چھیڑ

یاد آیا ہے اُن آنکھوں کے ترنم کا پیام
سیلِ احساس! ابھی پردۂ مژگاں کو نہ چھیڑ

چشمِ بے خواب پہ اک موجِ نفس بھی ہے گراں
صرصرِ یاس! چراغِ تہہ داماں کو نہ چھیڑ

چند لمحات کو احساس کی رو سے نہ الجھ
ظلمتِ شب! لب و عارض کے شبستاں کو نہ چھیڑ

نیم خوابی کے تسلسل میں حسیں انگڑائی
دل یہ کہتا تھا کہ اس موجِ خراماں کو نہ چھیڑ

قربِ رنگیں کی ہوا موجِ خراماں سے چلی
لمسِ ابرو نے کہا زلفِ پریشاں کو نہ چھیڑ

دستِ سیمیں کی کرن، چشمِ تمنا پہ گری
حسرتِ دید! ابھی دامنِ مژگاں کو نہ چھیڑ

عمر بھر جاگتے رہنے کا ہے پیماں تجھ سے
اے شبِ ہجر! مرے خوابِ گریزاں کو نہ چھیڑ

اے صباحت کی کرن، میرے خیالوں میں نہ آ
نکہت و رنگِ سمن، خاکِ بیاباں کو نہ چھیڑ

برگِ گل، ذہن کے تاریک خلا میں نہ دمک
لبِ رنگیں کے تصور، لبِ لرزاں کو نہ چھیڑ

دلِ مجروح سے، اے پرسشِ پنہاں، نہ گذر
حسرتِ قربِ حسیں! تارِ رگِ جاں کو نہ چھیڑ

قصۂ "شاخِ گل و دستِ نگاریں" نہ سنا
آہ، مرجھائے ہوئے سنبل و ریحاں کو نہ چھیڑ

اپنی راہوں پہ مجھے "شہرِ نوا" یاد نہ کر
"سخنِ رنگِ رخ، و دیدۂ حیراں" کو نہ چھیڑ

سایۂ سرو و صنوبر کے گریزاں افسوں
زیرِ لب، نغمۂ تسکینِ دل و جاں کو نہ چھیڑ

رسمِ پیماں شکنی خود بھی حسیں ہے خاور
توڑ دے ساز، سکوتِ شبِ ہجراں کو نہ چھیڑ

عبدالرؤف عروج

جنوں ہلاکِ تخیل، خرد نشانۂ شعر
تمام عالمِ احساس ہے بہانۂ شعر

نسیمِ صبح کے لہجہ میں ذکرِ دوست کرو
قبولِ سمع نہیں حرفِ محرمانۂ شعر

چلو کہ ہجر کی تلخی کو یوں ہی کم کر لیں
بنامِ یار ملی فرصتِ فسانۂ شعر

اُس ایک آنکھ سے پوچھو کہاں سے آیا ہے
غمِ حیات میں اندازِ دلبرانۂ شعر

نہ آرزو نہ تمنا نہ جستجو نہ طلب
کدھر گیا ہے مرا سوزِ عاشقانۂ شعر

ترا جمالِ دل آرا غزل سہی لیکن
کہاں فسونِ حقیقت کہاں فسانۂ شعر

یہ انقلاب فضا ہے کہ پھر شبِ مہتاب
سجا سکی نہ کوئی محفلِ شبانۂ شعر

کسی کے دھیان کی خوشبو کسی کی یاد کا رنگ
تمام عہدِ محبت نگار خانۂ شعر

طلسمِ ہوش ربا تھی فضائے شہر نگار
مگر یہ خواب سی کیفیت فسانۂ شعر

گلاب سے مہک اٹھے مرے خیالوں میں
کسی کی یاد نے لوٹا دیا زمانۂ شعر

عروجؔ فکر مشینوں میں ڈھلتی جاتی ہے
یہ تاب کار زمانہ نہیں، زمانۂ شعر

غزل

مشاہد عشقی

اک نقش ہے، ایسا کوئی گہرا بھی نہیں ہے
پر دل نے بھلانا اسے چاہا بھی نہیں ہے

ہے یوں تو بھرے شہر میں تنہائی کا احساس
دل ڈھونڈے جو تنہائی تو تنہا بھی نہیں ہے

پروانے تو آئیں گے اگر شمع جلے گی
اور یہ کسی اک شب کا تماشا بھی نہیں ہے

مجھ سے بھی جدا ہوگا کسی روز کوئی شخص
اس طرح تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں ہے

گو کشمکشِ زیست نے رکھا نہ کہیں کا
ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں ہے

ہر شخص کو تم اپنا سمجھ لیتے ہو عشقی
اپنا تو یہاں کوئی شناسا بھی نہیں ہے

★ ★ ★

"تیز ہوا ہے مانجھی!"

(گوادر کا ایک ساحلی لوک گیت)

ظہیر ریاض

پسنی، گوادر، جو حال ہی میں مغربی پاکستان کا حصہ بنا ہے، اپنی مخصوص ساحلی ثقافت کی حامل بستی ہے۔ یہاں کی زبان میں کچھ کاٹھیاواڑی روزمرہ ہے تو کچھ پشتو الفاظ کی آمیزش بھی۔ جب مانجھیوں کی کوئی ٹولی اپنی دیسی ساخت کی کشتیاں لے کر سمندر کی منہ زور لہروں سے مقابلہ کرنے کے لئے نکل کھڑی ہوتی ہے تو یہ گیت کورس کی شکل میں گایا جاتا ہے جس کے آہنگ میں مانجھی، ان کی منگیتریں، محبوب ہستیاں اور عورتیں شریک ہوتی ہیں اور کافی دیر تک یہ سماں بندھا رہتا ہے۔

گیت کے ترجمے میں اصل کی روح، دُھن اور روشِ اظہار کی پابندی کی گئی ہے۔ (ادارہ)

عورت: — تند اور تیز ہوا ہے مانجھی — میرے مانجھی!
دل دھڑکتا ہے نہ جا (خاک ہو میرے منہ میں)
میرے اشکوں کا بھرم ہی رکھ لے — میرے مانجھی!

مانجھی: — تیری آنکھوں سے امڈتا ہوا طوفاں مجھ کو،
گہرے پانی سے بھی گہرا ہے — اے نگلی نموؔ [۱]
بیچ منجدھار میں آواز سنوں گا تیری (تیری آواز بنے گی چپو)
میری مانجھن!

عورت: — تند اور تیز ہوا ہے مانجھی!
بادباں تیرے سلامت رہیں طوفانوں میں،
بازوؤں میں لیے ہے لہروں سے نکلنے کا کمال،
میری دعا ہے مانجھی — تیز ہوا ہے مانجھی!

مانجھی: — تیرے نینوں کے کنول میں ہے مکمل جادو
تیری آواز بنے گی چپو
میری مانجھن

---

[۱]: صدیوں پرانی لوک کہانی کی روایتی محبوبہ۔

انقلاب پاکستان

احسن علوی

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں تاریخ پاکستان کا ایک نیا اور روشن ورق الٹا گیا اور ملک اپنے صحیح مؤقف کو پہچان گیا۔

یہ کتاب اس عظیم الشان، خاموش اور دور رس انقلاب کی تفسیر وتا…

اس میں فاضل مصنف نے فلسفۂ انقلاب پر گفتگو کرتے ہوئے انقلاب کے اسباب اور اس کے اصلاحی اقدامات کی بڑی جامع کیفیت پیش کی ہے جس سے اس کی روح کو سمجھنے اور مستقبل کی راہیں متعین کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔

یہ کتاب عام قارئین، مدارس کی لائبریریوں اور قومی اداروں کے لئے بہت مفید ثابت ہوگی۔

متعدد تصاویر، نفیس کتابت وطباعت، قیمت ایک روپیہ ۵۰ پیسہ (علاوہ محصول ڈاک)

ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

وک نے تیرے
زمانے میں !
سے کافر کا
نقش میں
ہر کیلئے
ہوائی
ہے -

"اردو اور افغان" بقیہ صفحہ ۱۸

تذکیر و تانیث میں بھی پشتو کا یہی اثر موجود ہے ۔ فارسی میں تذکیر و تانیث کا وجود ہی نہیں ۔ عربی میں مذکر و مؤنث ہے مگر قواعد اس میں استثنا کی اجازت نہیں دیتے ــــ چنانچہ ایک سو سماعی مؤنثات کے علاوہ اسم کے آخر میں تائے تانیث، الفِ مقصورہ یا الفِ ممدودہ پایا جائے تو وہ لفظ مؤنث ہے اور باقی سب مذکر۔ اس لئے فارسی کے کسی لفظ کو مونث یا مذکر بولا جائے تو وہ اردو کا اثر ہے ۔ مولانا کا خیال ہے کہ اردو میں پردیسی لفظ جس قدر بھی آئے ہیں اُن کی تذکیر و تانیث افغان استادوں کی پیروی میں متعین ہوئی ہے ۔ ویسے پشتو کا کلیہ قاعدہ ہے کہ و، ہ، ی، میں سے کسی ایک حرف پر ختم ہونے والا لفظ مؤنث ہے باقی سب مذکر۔ مولانا نے قدیم پشتو کے اثر کا سراغ لگایا ہے ۔ مثلاً قدیم اردو میں یہ الفاظ مذکر مانے جاتے تھے ۔ حالانکہ اب یہ سب مؤنث مان لئے گئے ہیں :-

طلب، مضراب، شراب، تاب، رکاب، ضرب، جیب، دوزخ، مسند، مسجد، امید، عید، کلید، زنار، ناموس، مجلس، آتش وغیرہ وغیرہ

دلی اور لکھنؤ میں بہت سے لفظوں کی تذکیر و تانیث مختلف فیہ رہی ہے ــ بعض الفاظ کو دونوں طرح صحیح مان لیا گیا ہے ۔ دہلی میں یہ اب بھی مذکر ہی بولے جاتے ہیں یا اساتذہ نے سن ستاون سے پہلے تک انہیں مذکر ہی باندھا ہے ۔ مثلاً :- خراش، ململ، سیر، حد، دشنام، ایجاد، بار، پروانہ، پیداوار، قلم، قامت، مخمل، شکن، پند، پیکان، بہشت، سیل، غور، فتراک، فکر، وغیرہ ۔ مولانا کے نزدیک اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ دہلی اور روہیل کھنڈ وغیرہ میں پٹھانوں کی نسلیں زیادہ آباد ہیں اور یہ لوگ زیادہ تر ان لفظوں کو مذکر ہی بولتے ہیں اور پشتو میں بھی یہ مذکر ہی ہیں ۔

غرض ان مثالوں سے پشتو اور اردو ہی نہیں بلکہ ان کے بولنے والوں میں بھی ایک بنیادی رشتہ نظر آتا ہے ۔ جو ہمارے لئے اپنائیت کی تجدید کے لئے ایک دعوت عمل بھی ہے ۔ اور بیش از بیش اتحاد و یگانگت کی تحریک بھی ٭

"سوغات" (جدید نظم نمبر)

سہ ماہی "سوغات" قبل ازیں بنگلور (میسور) سے شائع ہوتا تھا ۔ اب اس کی اشاعت کراچی اور بنگلور سے بیک وقت عمل میں آنے لگی ہے ۔ جو اردو زبان و ادب کی ترقی کے سلسلے میں ایک نہایت خوشگوار واقعہ ہے اور اہلِ ذوق کے لئے نویدِ مسرت کیونکہ یہ درحقیقت اردو ہی کا آہنگ ہے جو زمانہ کے نشیب و فراز کے باوجود پاکستان اور ہندوستان کا یکساں مقبول آہنگ ہے او دونوں ملکوں سے بدستور بہ شدتِ تمام بلند ہو رہا ہے اور آئندہ کے لئے بہت خوش گوار علامت ہے ۔ ع "نو زخن بچہ نہ سکے کا نفسِ اعدا سے" ۔ اگر یہ کہا جائے کہ رسالہ کا مرعوب کن حد تک ضخیم جدید نظم نمبر متن کے ۲۰۰ صفحات پر محیط اپنے گوناگوں صوری و معنوی محاسن، اہم مواد، مطالب جامعیت و ہمہ گیری اور ہند و پاک کے متعدد ممتاز ترین ناقدین و مترجمین کی کاوشوں سے بھرپور ہونے کے اعتبار سے معرکہ آرا حیثیت رکھتا ہے تو یہ بے جا نہ ہوگا ۔ اس کی حیثیت بلاشبہ تاریخی ہے اور اس میں مبالغہ کا کوئی شائبہ نہیں ۔ کیونکہ یہ ہمارے ادب و فن کی موجودہ غیر یقینی، غیر متعین، بحرانی اور ڈانواں ڈول کیفیت کو دیکھتے ہوئے عین اس وقت بروئے کار آیا جبکہ اس کی اشد ضرورت تھی ۔ اور اگر یہ فی الحقیقت ہماری شاعری میں کوئی نئی زوردار تحریک جاری نہ کر سکے تو کم از کم سوچنے والے دماغوں کو فکر و نظر کی دعوت ضرور دے گا ۔ اور یہ بھی بڑی بات ہے ۔

فاضل مدیر ــــ جناب محمود ایاز ــــ نے جس سعی و کاوش، والہانہ ذوق و شوق اور بلند شعور، احساس اور مقصد کے ساتھ چند چیدہ اہم موضوعات کا تصور اور لحاظ کر کے ان پر زبردستی مضامین تیار کروائے ہیں اور جس خوش سلیقگی کے ساتھ ان کو ترتیب دیا ہے، وہ بجائے خود ایک کارنامہ ہے اور صحافتی کار پردازی کی ایک عمدہ مثال ایک منفرد تصور پیش کرتا ہے یہ "بہار برگ پراگندہ را بہم بربست" ہی کا مصداق نہیں بلکہ یہ بھی کہ مدیر کی ذاتی کاوش، نفاستِ ذوق اور خونِ جگر کو اس کی پیش کش میں کس حد تک دخل ہے بعض امور میں اجتہادی کوشش خصوصیت سے نمایاں ہے ۔ ہم اپنے موقر معاصر کی اس خصوصی پیشکش کا تہِ دل سے خیر مقدم کرتے ہیں اور سر دست صرف اس کے تعارف ہی پر اکتفا کرتے ہیں ۔ اس لئے کہ ــــ سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکراں کے لئے ۔

ایسی وقیع پیشکش کا محض سرسری تذکرہ اس کے ساتھ بھی ناانصافی ہے، اُن مسائل و معاملات سے بھی ناانصافی ہے جو اس میں پیش کئے گئے ہیں ۔ اور خود مبصر سے بھی ناانصافی اس لئے "ماہِ نو" کے اگلے شمارہ میں اس پر تفصیلی نظر ڈالی جائے گی ــــ (ادارہ)

کارٹونوں کی دنیا میں

مصباح الحق

کارٹون : ریحان

یہ کارٹون ساز بھی فن کار تو اچھے ہیں پہ بدنام بہت ہیں - اور ان کی دنیا میں قدم رکھتے ہوئے ڈر ہی لگتا ہے کیونکہ ,, جس کو ہوں جان و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں ؟،،- آخر کون یہ چاہے گا کہ اس کی ہیئت کذائی اس طرح مسخ ہوجائے کہ لوگ باگ چہ میگوئیاں کرتے پھریں اور اسکی ہنسی اڑائیں ؟ غالب نے ,, نقش فریادی ہے کس کی شوخئی تحریر کا ؟،، شاید ایسے ہی موقع پر کہا تھا - کسی ایسے بگڑی تصویر کو دیکھ کر جس کی کسی ,, انور ،، کسی ,, اجمل ،، کسی ,, عزیز ،، کسی ,, ریحان ،، نے بری طرح گت بنا دی ہو !

مگر نہیں کارٹون اپنی عجیب و غریب ہیئت کذائی کے باوجود کچھ ایسے مضحکہ انگیز بھی نہیں ہوتے - اچھے کارٹونوں میں کچھ نہ کچھ بات ضرور ہوتی ہے - فن ، ہاں اسکو فن ہی کہتے بن پڑتی ہے ، جب کہ اس میں وہ تمام لوازمات موجود ہیں جو کسی چیز کو نقش بناتے ہیں - جب کسی الٹی سیدھی لکیریں کھینچنے والے کے ذہن میں ایک خاص قسم کی خلش ہوتی ہے ، اور ظاہر ہے کہ کارٹون ساز کچھ ایسا ہی ٹیڑھا میڑھا ذہن لیکر پیدا ہوتا ہے کہ وہ

ناقد : کون ہوتا ہے حریف دم مرد افگن نقد !

کتاب کی فریاد : الامان ! الامان ! ”ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں !

ہر چیز کو ترچھا بینڈا ہی دیکھتا ہے ،- تو ایسے کافر کا کیا کرے کوئی ؟ وہ تو خواہی نخواہی اپنے نقش میں ضرور کوئی الٹی ہی بات پیدا کرے گا - تھوڑی دیر کیلئے یوں سمجھ لیجئے اس کے دل میں شیکسپیئر کے ہوائی پربت ,, پک ،، کی شوخ ، شریر روح سما جاتی ہے - ہنسی ٹھٹھوں کی البیلی روح جو ہر بات سے کھیلتی ہے - کسی چیز کا سیدھا رخ نہیں الٹا ہی رخ دیکھتی ہے - اس عاشق کی طرح جو ,, مومن ،، کی زبان میں کوچہ رقیب میں بھی سر ہی کے بل جاتا ہے—تو وہ کارٹون بنانے لگتا ہے - عجیب و غریب ہیولے تراشتا ہے جو اپنے انوکھے پن کے باوجود بھلے اور پرمعنی لگتے ہیں - بے ڈھنگا پن کسی چیز میں فی نفسہ موجود نہیں ہوتا بلکہ دیکھنے والی آنکھ اس میں بے ڈھنگا پن محسوس بھی کرتی ہے اور پیدا بھی کرتی ہے - جہاں کوئی بات دکھائی نہ دے ، وہاں پیدا بھی کرلیتی ہے - ٹھس طبیعت کے آدمی کو ، ظاہر ہے بے ڈھنگی چیز میں بھی کوئی ایسی ویسی بات دکھائی نہیں دے گی - یہ تو مچلتی ہوئی ، منچلی ،

افسانہ : سچی کہانیوں کی تلاش میں !
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں !

حکمت: حکیم دیوجانس کلبی (۱۹۶۱ء)
''قطرہ ہے دریا ہم کو!،،
(ان دیکھے سمندر پر مضامین خیالی)

کھلنڈری طبعت ہی ہے جو اس قسم کی کارستانیاں کرسکتی ہے۔

کارٹونوں میں بسم اللہ ربط سے نہیں بےربطی سے ہوتی ہے اور اسکا آلہ کار تسکین ذوق نہیں بلکہ تضحیک اور استہزا ہے۔

مگر ایسے سنجیدہ موضوع میں اس قسم کا دخل در معقولات کیا معنی؟ اسکی تفصیل کیلئے کیوں نہ کسی کارٹون ساز ہی کی قلم کاریوں سے بات آگے بڑھائی جائے - اور وہ بھی پاکستانی کیونکہ فنکار ہونے میں سنجیدہ و فکاہی فنکار دونوں ہی یکساں ہیں۔ ہمارے یہاں ''انور،،، ''اجمل،، ''عزیز،، اور ''ریحان،، نے نام پیدا کیا ہے - ان میں سے بوجوہ ''ریحان،، زیادہ موزوں ہے کیونکہ اس کا تعلق براہ راست دنیائے اردو سے رہا ہے۔ ''پاک سرزمین،،، ''سیارہ،، ''لیل و نہار،، اور سب سے بڑھکر ''ماہ نو،، جس میں اسکے کارٹون وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں— اور اس کے فن کی نوعیت بھی بہت مختلف ہے، سکونی نہیں متحرک۔

سب سے پہلے تو ہمیں یہ بات ذہن سے نکال دینی چاہئیے کہ کارٹون کوئی معمولی چیز ہیں جو سنجیدہ توجہ کے لائق نہیں۔ محض تفریح کا سامان یا وقتی اور سرسری حظ کا باعث - یعنی ان میں کوئی پائدار بات نہیں ہوتی جو ایک مستقل قدر کی حیثیت اختیار کرے۔ کارٹون ساز جوہر بھی رکھتا ہے اور بصیرت بھی - ضروری نہیں وہ اپنے ساتھ کوئی نظریہ لے کر ہی چلے - فنکار کا کام تو بس یہ ہے کہ جو موضوع بھی اسے سوجھے یا سجھایا جائے اسکو پیش کرنے کیلئے اپنی صلاحیتوں کو کام میں لائے - پیشکش کا دار و مدار تمام تر اسی بات پر ہوگا - اور فیضان اس لحاظ سے ابلاغ کا جامہ پہن لیتا ہے۔ اس سے اسکا فن فرمائشی یا کاروباری نہیں بن جاتا - یہ خالص تخلیقی ہی رہتا ہے۔ ''ریحان،، ایک ذہین انسان کی طرح اپنے فن کارٹون سازی کے مخصوص پیرایوں میں سوچنا جانتا ہے۔ اس کی پرواز فکر اپنے مخصوص میدان میں دیگر فنون کے اعلیٰ مدارج کے عین متوازی ہے۔ اس کا ذہن دور کی کوڑی لانے اور گوناگوں عناصر میں تال میل پیدا کرنے میں طاق ہے۔ وہ بطور خود بھی موضوعات سوچ سکتا ہے اور دوسروں کے پیش کئے ہوئے موضوعات پر بھی خیالوں کے گھوڑے دوڑا سکتا ہے - اس کا ذہن تیزی سے بے شمار سمتوں میں دوڑنا شروع کر دیتا ہے اور مکڑی کے جالے کی طرح دور دور، باریک باریک، آڑی ترچھی لکیروں کا تانا بانا بکھیر دیتا ہے - اس کے نقوش یوں بھی مکڑی کے جالے کے تاروں ہی کی طرح لانبے لانبے، باریک باریک اور نفیس، ملائم اور لچھے دار ہوتے ہیں - خیالات اور پیرایوں یعنی مضمون کا کس کس ڈھنگ سے تصور کیا جا سکتا ہے اور اسے کس کس ڈھنگ سے باندھا جاسکتا ہے - یہ بھی کارٹون سازی کو جانچنے کا عمدہ ذریعہ ہے۔ اس بات میں ہمارا جواں فکر فنکار اچھوتا نکتہ پیدا کرنے میں ماہر ہے اور بسا اوقات بڑے بڑے اچھے تصورات پیدا کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں بہت سی چیزیں فنکار کی مدد کرتی ہیں -

سب سے پہلے چونچال طبیعت - کیونکہ اسکے بغیر کوئی شخص کارٹونسٹ بن ہی نہیں سکتا - اس لحاظ سے وہ

نظم: ہے مشق سخن جاری اور . . . . کی مشقت بھی!

کاخ بلند! "انٹیلیکچول"

ملنے کا پتہ :- ہر شام کسی کونۂ کیفے میں ملیگا !

شیکسپیئر کا چلتا پھرتا ،، پیک ،، معلوم ہوتا ہے - اور نت نئی سوچیں سوچتا ہے - اسکی کوئی سوچ اوروں کی نہیں ہوتی - ہر چال تیر بہدف کہ کارٹون کو دیکھتے ہی اس کا جواب خندۂ زیر لب ہو یا بے ساختہ قہقہہ - سنجیدہ فن کی طرح استہزا کے جو تلازمے یعنی جوڑ توڑ ہوتے ہیں وہ کارٹونوں میں بھی نہایت اہم ہیں - اس مضمون کے ساتھ جو کارٹون پیش کئے جارہے ہیں ان کو دیکھئے - یہ کاخ بلند ہے یا ،، اونچی ہے آشیانہ ......،، کا مصداق ؟ کیا ہمارے اکثر ادیب چائے دانیوں اور چائے کی پیالیوں میں گم یا کسی نشے کی پینک میں نت نئے ،، رومانی ،، خیالات میں ڈوبے نہیں رہتے ؟ یا پھر کنویں کے مینڈک بن کر — کارٹون خود ہی بتا دیگا وہ کہاں ہے — ان دیکھی چیزوں کا فرضی نقشہ کھینچنا ہمارے شاعروں کا پرانا وطیرہ ہے - پچھلے دنوں جب کراچی میں موسلادھار بارشوں سے کوچہ و بازار میں پانی ہی پانی ہو گیا تو کارٹون ساز کی نگاہ نے پانی میں پھنسی ہوئی بسوں ہی کو کشتی تصور کرلیا اور لگے سوار تسکین جوع کے لئے بسوں کی چھتوں سے مچھلیاں پکڑنے اور بعض سوفن لنگر لنگوٹے کس کر غوطہ‌زنی کی مشق کرنے - ،، ریحان ،، نے بارش کے باعث بھوک ننگ کے بعض بہت ہی عبرتناک نقشے پیش کئے ہیں - وہ جانتا ہے کہ کس نشانے کے لئے کونسا تیر ٹھیک ہے - اور وہ تیر عین نشانے پر بیٹھتا ہے -

ہم جانتے ہیں کہ یہ زندہ دلی ایک بھرپور زندگی ہی سے ابھر سکتی ہے - ہمارے اکثر کارٹونسٹ بس کارٹون بنالیتے ہیں مگر نکتہ آفرینی نہیں کر پاتے - ان میں زندگی کی دھڑکنیں نہیں پیدا کرتے - محض کاغذ پر ایک چھاپ اور بس !

اس سے ایک اور خصوصیت بھی پیدا ہوتی ہے - کارٹونوں کی جیتی جاگتی متحرک وضع - اس کے خطوط جامد نہیں رواں دواں ہونے چاہئیں - جاندار اور محسوس وضع کے ساتھ کتنے ہی غیر محسوس وغیرمرئی اشارات و کنایات لئے ہوئے - اس کے ہاں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی قدرتی کیمرے نے کسی چلتی پھرتی چیز کا بہت ہی بدیع شاٹ لے لیا ہے -

ایک اور نامور فنکار ،، عزیز ،، ہے جو شبیہیں کھینچتا ہے - وہ ایک اور ہی قسم کا آرٹ ہے - بڑا شخصی - اسکے لئے بھی بڑی مہارت اور شوخئی تصور ضروری ہے - سہ ماہی ،، نقوش ،، کے بعض شماروں میں ایسے متعدد نہایت عمدہ کارٹون پیش کئے گئے ہیں - مگر کارٹونوں کا لطف جبھی ہے کہ وہ زندگی کی جھلکیاں پیش کریں - یہ بات کچھ ،، ریحان ،، ہی کا حصہ ہے - اس لحاظ سے اسکی حیثیت ایک پیش رو کی بھی ہے اور پیش تاز کی بھی -

اس کی سب سے بڑی خوبی ہے : زندگی پر نظر ، مشاہدہ کی تیزی اور فراوانی - جہاں بھی زندگی ہو وہیں اسکی نگاہیں بھی ہیں - پاکستان کا گوشہ گوشہ اور زندگی کا ہر ہر پہلو اسکی خوردبین یا باریک بین نظر سے اوجھل نہیں - کراچی ہو یا لاہور یا سابق مغربی پنجاب کا کوئی شہری یا دیہی کونا کھدرا ، سابق سرحد ہو یا کشمیر یا سندھ یا مشرقی پاکستان ، خشکی یا تری اونچائی یا گہرائی - اسکی بےباک تیزبین عقابی نگاہوں کی دسترس سے دور نہیں - اور وہ سب کی زندگی ، سب کے خدو خال ، اوضاع و اطوار ، لباس وغیرہ کو بڑی چابکدستی کے ساتھ اجاگر کرسکتا ہے - اس کا ثقافتی و علمی پس منظر وسیع ہی نہیں ، آفاقی بھی ہے - روزنامہ ،، لیڈر ،، (کراچی) میں اس کے جو کارٹون شائع ہوتے رہے ہیں وہ اسکے بین الاقوامی مسائل و معاملات پر بڑے ہی تیز اور اچھوتے طنز کے حامل ہیں — ایک طعن مہذب -

،،مکی ماؤس،، نامی والٹ ڈزنی کا نام ایک خاص قسم کے قلمی سکرپ تیار کرنے کے لئے شہرہ آفاق ہے - اور اسکی قدرت محتاج بیان نہیں - یہ سب کارٹونوں ہی کا دل آویز سلسلہ ہیں اگرچہ وہ کاغذی پیرھن نہیں بلکہ ان کی دنیا سلولائیڈ کی دنیا ہے - انہی کا چلتا پھرتا سا عکس کومک رسالوں میں نظر آتا ہے - اسی قسم کے دلچسپ کارٹون جو اپنے ساتھ ساتھ عبارت کا چٹخارہ بھی لئے ہوئے ہیں ،، سیارہ ،، میں چھپتے رہے ہیں -

کارٹونوں کی ایک اور صنف ہے جو مضحک نہیں سنجیدہ روش ہے جو صدر کینیڈی کو پیش کرنے میں بلکہ ،،یو ایس آئی ایس،، نے حال ہی میں برتی ہے- ہمارے کارٹون ساز چاہیں تو اسے بھی بہ آسانی اپنا سکتے ہیں — یہ بڑی بحث کی بات ہے کہ کارٹونوں کا مقصد اولیٰ اصلاح ہے - لیکن ان سے جو حظ حاصل ہوتا ہے وہ حاصل زندگی ہے- کیونکہ اس سے انسان واقعی زندہ دل بن جاتا ہے اگر یہ بات درست ہے ،اور یقیناً درست ہے، تو ہمارے گرم جوش کارٹون ساز باقاعدہ فن کاروں سے کچھ کم خدمت انجام نہیں دیتے - کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنے ان چارلی چیپلنوں اور بل مالڈینوں کو اپنے گوشئہ دل میں جگہ نہ دیں -

افسوس یہ مضمون ہے — ٹھوس ، سنجیدہ - کارٹون نہیں ورنہ میں زندہ دلی کی ایک لہر پیدا کردیتا جو ہم سب کو اپنے ساتھ بہالے جاتی - وہاں جہاں ،، پک ،، کی لازوال روح کام کرتی ہے- اور خشک بے ذوق لوگوں کو زندہ دلی کا پیغام دیتی ہے-

کارٹون اپنی زبان آپ ہوتے ہیں اور اپنی تنقید کا حق خود ادا کرتے ہیں - ان پر ٹھوس مغز نقادوں کی بے کیف باتوں کا طومار کیا باندھا جائے - اگرچہ ایسی تنقید کی ضرورت بھی ہے اور محل بھی - شاید اسکے لئے کوئی اور موقع موزوں رہے - کیونکہ یہ تو ایک ٹیڑھے میڑھے پیکر کو سیدھی سادی لکیروں میں لانے کی ایک ابتدائی کوشش ہے اور بس - اب کے اس نگارش میں جو خالص ذہنی قسم کے کارٹون پیش کئے جارہے ہیں شاید وہ خود ہی چپ چاپ تنقید کا حق ادا کردیں——کچھ تو سمجھے خدا کرے کوئی ! جہاں تک ،، ان ٹیلیکچول ،، لوگوں کا تعلق ہے :
صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے *

ادبی مجاور : یوم حضرت '' ساعر سخن پوری '' منانے کے لئے چندہ . . . . !

—:*:—